

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 📖

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share>

میر ظہیر عباس روستمانی

0307-2128068 📞

@Stranger ❤️ ❤️ ❤️ ❤️ ❤️ ❤️ ❤️

نوییل امن

کے سو برس

باقر نقوی

پہلی اشاعت : دسمبر ۲۰۱۱ء
کمزورنگ : انڈیز پبلشنگ، فون : 32751324
قیمت : ۳۰۰ روپے
جملہ حقوق محفوظ

نوبل امن کے سو برس | باقر نقوی

Nobel Ann Ka: Son Baras
Translation
Compiled and Translated by : Baqar Naqvi

Kutub Market, District 17, St# 3,
Vridi Bazar, Karachi, Pakistan
P: (92-21) 32751325
e-mail: abazayart@yahoo.co.uk

کامیاب صنعت کار، تاجر اور انشورنس کی عظیم شخصیت

روشن علی بھیم جی

کے نام

جو زندگی بھر امن اور جمہوریت کے حامی رہے

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔

پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 📌

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share>

میر ظہیر عباس روستمانی

0307-2128068 📞

@Stranger ❤️ ❤️ ❤️ ❤️ ❤️ ❤️

امن

”امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں

امن گندم کے کھیت ہیں

سفیدے کے درخت ہیں

لوہن کا آئیل ہے

بچوں کے ہستے ہوئے ہاتھ ہیں

شاعر کا قلم ہے اور مصور کا مُو قلم

آزادی ان سب کی صفات کی ضامن

اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے“

فیض احمد فیض

(”میں امن انعام کے منظر سے اکتباس“)

اشعار پر

[illegible]

جیس برٹس	Thucyd	پن شمس
جی ٹوٹ سوارڈ	تھیوڈور مینڈویٹ	پاموٹا کی لوزا
جوزف آسٹن جیمز لین	Thomas Aquinas	برٹا لٹرن
جواہر سنڈ ریلوم		پل کھتن
جینس گلینڈش	ٹ	
جی کے اے پل، پپ:	ٹوماس آئیر	
جیمز ایمر	Taine	پ
جبریل ایلکس	ٹاڈ برٹ، پپ:	پال ہٹری، پچامن ڈی استورٹل
جیمز بلیمنا	ٹینیسی	ڈی کوشاں:
جان ساٹن، سر:	ٹریگہ لی	Paincott
جیمز ایمرس	ٹامس کا بلاکی	پینسکٹ
جان ریڈی مٹ	ٹافٹ	پولی نمیں
جارج کنگلٹ ہارٹش	ٹریگہ لی	پنے
جبریل پریٹک	ٹاسٹوے	پٹر
G.H. Stevenson	Teygva Lie	پارکس کیز من
جوزف الٹن بکر	ٹوٹو	پال
Giuseppe Laotta	ٹریویر ہٹش	Pandus Pilate
جان اسٹورٹ وٹلو	Teygva Havelmo	Pierre Lat
جان ٹیلپ	ٹونی بلیر	Plutarch
جیمز فریک		پروٹیا کا فریڈرک
جانسی، صدر:	ٹ	پٹرینڈر ریل
جان آن		پاپا کے اعظم جان پال XXIII
جے جارج سوار	ج	پای کئی
Jul Lög	Jorgen Gunnarsson	پامیدو
جان ایف۔ گینڈی	Lovland	Puchla
جان مگیڈو	پاوڈے	پال شتم
جینی کارڈ	جارج آند	پارکال
جمال عبد الناصر	Janus	پنھن
جوزف پتہ گارینا لڈی	جان ہنس	ت
جان کینتھ گاربر ایٹو		

جزل نگر

جان پال دوئم

Judas Iscariot

Jeremiah

جوزف رابلاٹ

جواہر دھیر

جان ہیوم

جیری لینکس

چارلج پبل

جان جیمس لین

جان لاک

ج

Chulalongkorn

چارلس ڈاؤز

چارلس بریٹن، شپ:

چارلس فرے ولفیان

جیمز کافلی شیک

چرچل

Charles Piguy

چارلس پیگو

چارلس ویکل

چرچل لائی

جیمز لین

ح

ح

خ

خوشی

د

دانت

دانتو

دانتو لائی

ڈ

d'Estournelles

ڈیوڈ ہیزل:

Dante

ڈیوڈ

d'Estournelles de

Constant

Hecamp

ڈیوڈ لائی:

ڈیوڈ لینکس وی کوسا

ڈیوڈ فرس

ڈیوڈ فرس آرن

ڈیوڈ رائی

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

D. V. Gomon

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

م

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈ

ر

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس (معد)

Rahm

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس، لائی:

ڈیوڈ لینکس، لائی:

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

Rothschild

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

Rapachi

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

ڈیوڈ لینکس

راہم
سکھنہ فرانیہ
سیلا یوکہ

سینٹ پال
سکھت
سکھنہ آندہ
سپاں یوہار

Rene Cassin
رامیرس انجم
رامیرس مکنہ مارا
Rene Stralhuuski

ش

Schucking

شیجے
شاہ ہنری چارم
شاہ ہنری
شاکا
شاجے

سمر پٹیس
سم شوریج
سینٹ عتر
سپیل رھونہ
سیمولی کوہروز
سارنہا انجم
سکھنہ انجم
تلی

ریمیرس یوہار
راہنہ گاندھی
رگہ پنا مینچولم
راو رگہ
راہن
راٹ پلاٹ

شاں رگہ برانیہ
شہزادے شوقو
شاہ لادوق

سینٹر رمل
سینٹ فرانس آف آسی

ز

Sucroup

سیرو

زار

شیکھنہ
شاہ ہاکون ہنم

Stressmann

سروٹن چپگل
سارنہا ہن

ژ

شیطان
شیمس ڈیوی
شپاں ہرے
شاہ پاراٹ
شاہ دھور
شیمس ہینی

Salvador de Idadaniaga

Stiddam

G.M. de Kewiet

سارنہا ہن

ژان پامپے

Jean Jauris

ژان ہنری کھانہ

Jean Idonwet

Zeeu Jakutinsky

ژاک ولور

ژاک سانغ

ص

صہر ٹوہن

Sibons

سینٹ چان

ساکو

ساولت

سلیمان

سیمون یوہار

سیلا یوکہ

سیرانو

سیرٹنہ

س

سباہن فریک

سپیل لارو:

سوکیر نوم (آریج ہشپ):

سیر

ض

کیلاگ	فلڈ مارش سر جان ول	
کیتھن	فنی مو	
کیور	Fallbeu	ط
کارل فان آرتشس	فادر ڈومینیک جیرو	
کڈے	فلپ جان ٹوئی ٹیکر	
کارلوس ساویو رالاس	فرچن	ظ
کارولین لگ	Fridtjof Hansen	
گرڈن	فرانسوا مریج	ع
کارل مارکس	فیکریس	
کارل فان آرتشس	فریج راک ولیم وی ٹھکرک	Isaiah یسعیاہ
Kenton	فرانز کاٹا	غ
کینٹوشس		
کاڈزورڈ		
کاساویو		ف
کینیڈی، جیورن	ق	
Kennan	ک	
کوریج لریکٹ		
کر جے، جیور		
کاسن	کاشی	فریج راک یسعی
کیمپن ڈرے فیس	کیمپل بیٹرمن	فلپ الیمین پوپ
کارلا آلیان آدر	کرچین لاسے	فرانیڈ برخ ریسس
کوشین	کچی ٹامس	فریج فینیس، پروفیسر:
Carl von Ossietzky	کرو پاٹین	فرانسس لٹل لے سر:
کولیو	کانت	فریج لکھورا
کینجر	کمارٹ، ڈاکٹر:	French
کینیڈی	کولہ سن:	فریج راک ولیم فول:
کیرن، جیمین	Clementson	فاسٹ
کارل سیڈ برگ	کلاون	فان رجڈان برگ
کلی جے	کلیئر	فریج ٹیفٹ یونیسماں
کارل فان آرتشس	کلیسیے	فرانکا
	کراسو ویتام	فریک کیلاگ
		فریج ٹکس روزویٹ
		فوک ہما ڈاٹ
		Fethand Pellouist

Lincoln
Lucrezia de' Medici

لی
لارڈ بائینڈ آر
لیوں بوجھا
لکھن
لاؤتے

Lord Gunningham of
Hydhope
لیسٹر باؤنڈ جین

Luthich
لارڈ لٹچر
لومبا

لٹچر
لائسنس کارل پانگ

Leo Stillard
لیسٹر براؤن
لڈوگ کواٹی ڈے
لی ڈاک جھو

Lion Juhauz
لائسنس پانگ
لیسٹ وائینسا
لیو لکھن

لارڈ تسوکرمان
لائڈ ایکس وودی
لی بی
لوق میک نیس

م

کولڈ چوف
Gidsha Anderson
Giulio Androcotti
گرو ہارلم برنڈ لینڈ
Gunnar Raaldhuarn

ل

لیوپلڈ (شار)
لوق رینڈ

Lentucci

L. van Har

Lamprecht

لنڈ لینڈ

لی ہون بٹرا

لائب رٹور

لائڈ جارج

لٹھر چائیلڈ

لوق جی روم:

لڈوگ کوئینڈے

لیپسن

لوسے گرین

لائٹ فٹ

لٹھر

لیو ٹسٹنس

لارڈ مارٹھ کف

لڈوگ ہیلبرگ

لٹوی ٹوف

لارڈ ٹسٹنس

لارڈ مارٹیری

لارڈ ہالڈور

ل

لکھ

کولیس

کارلوس فیلیپ زمبیزو نیو اور

ہونڈے راموس ہونڈا

لکھ بائنگ ایل

لکھ شس

گ

Gitz

کلڈ سفن

گٹاف ہرنے

گٹاف اسٹریسے مان

گرسے لارڈ

گور

گوسے

گیلیلیو

گاندھی

رابندرنا تھ ٹیگر

گٹار ہروال

Guirard

Guno Hambidge

Gunnat John

گونٹار

Goring

گرومیکو

گوبکر راونڈا

گولڈامیر

گوتم بدھ

گارشیا رٹوس

گارشیا

فہرست

17	ناہد و سنا	باقر نقوی کی ایک بڑی نیکی
27	رضی بختی	قابل رشک کا سامہ
33	باقر نقوی	سجن ہائے غنیمتی
39		کم ڈے جنگ 2000
		Kim Dae-jung
		اس برس انعام نہیں دیا گیا۔ 1999
50		جان ہیوم - ڈیوڈ ہرمبل 1998
		John Hume - David Trimble
66		جوڈی ویلیز اور آئی سی بی ایل 1997
		Jody Williams
78		کارلوس فیلیپ زیمینیر بیلو - جوزے راموس - ہونا 1996
		Carlos Filipe Ximenes Belo - José Ramos-Horta
103		جوزف رات بلاٹ 1995
		Joseph Ratzel
121		یا سر عرفات - شیمون پیرے - اسحاق رابین 1994
		Yasser Arafat - Shimon Perez - Yitzhak Rabin

141	1993	نیلسن منڈیلا - ایف ڈی کلرک
		Nelson Mandela - F.W. de Klerk
156	1992	ریگوبرتا منچو ٹم
		Rigoberta Menchú Tum
171	1991	آنگ سان سوکی
		Aung San Su Ki
180	1990	میخائیل گورباچوف
		Mikhail Gorbachev
198	1989	ڈالائی لاما - چہاروزم
		The 14th Dalai Lama
—	1988	اس برس انعام نہیں دیا گیا۔
212	1987	آسکر ایریس مارٹنس
		Oscar Arias Sánchez
226	1986	ایلی ویزل
		Elie Wiesel
—	1985	اس برس انعام نہیں دیا گیا۔
240	1984	ڈیسمنڈ ٹوٹو
		Desmond Tutu
255	1983	لےچ والیسا
		Lech Walasa
267	1982	آلوا میرڈال - الفاٹسو گارسیا رابلس
		Alva Myrdal - Alfonso Garcia Robles
—	1981	اس برس انعام نہیں دیا گیا۔
283	1980	ایڈولفو پیرے اسکیوئل
		Adolfo Pérez Esquivel
297	1979	مادر ترسیا
		Mother Teresa

311	1978	محمد انوار السادات - مناحیم بگین
		Mohammad Anwar al-Sadat - Menachem Begin
—	1977	اس برس انعام نہیں دیا گیا۔
327	1976	بیتی ولیمز - مرید کوریگین
		Betty Williams - Mairead Corrigan
340	1975	آندرے سخاروف
		Andrei Sakharov
357	1974	شاں میگ برائیڈ - ایسا کوسا تو
		Sean MacBride - Eisaku Sato
395	1973	ہنری کسینجر - لی ڈاک تھو
		Henry Kissinger - Le Duc Tho
—	1972	اس برس انعام نہیں دیا گیا۔
405	1971	ویلی برانڈت
		Willy Brandt
429	1970	نارمن بارلاگ
		Norman Barlaug
—	1969	اس برس انعام نہیں دیا گیا۔
460	1968	رینے گاسن
		René Gassin
—	1967	
	1966	ان برسوں میں انعام نہیں دیا گیا۔
	1965	
479	1964	مارٹن لوتھر کنگ جونیئر
		Martin Luther King Jr.
—	1963	اس برس انعام نہیں دیا گیا۔
498	1962	لینس پاولنگ
		Linus Pauling

523	1961	داگ ہامر ہولڈ	Dag Hammarskjöld
533	1960	البرٹ جان لونولی	Albert John Lutuli
553	1959	فلپ نوئل بیکر	Philip Noel-Baker
578	1958	جارج پیرے	Georges Pire
595	1957	لیسٹر باؤلز پیرسن	Lester Bowles Pearson
—	1956		
	1955	ان برسوں میں انعام نہیں دیا گیا۔	
	1954		
618	1953	جارج کیٹلیف مارشل	George G Marshall
635	1952	البرٹ شوائتزر	Albert Schweitzer
654	1951	لیون یوہا	Léon Jouhaux
678	1950	رالف بنش	Ralph Bunche
696	1949	لارڈ بائیڈ آر	Lord Boyd Orr
—	1948	ان برسوں میں انعام نہیں دیا گیا۔	
	1947		
716	1946	ایمیلی گرین بالچ - جان ریلی ماٹ	Emily Greene Balch - John Raleigh Mott

750	کارڈیل ہل	1945
	Gardel Hull	
—		1944
		1943
		1942
	ان برسوں میں انعام نہیں دیا گیا۔	1941
		1940
		1939
		1938
759	رابرٹ سسیل	1937
	Robert Cecil	
780	کارلوس مارویدرا لاماس	1936
	Carlos Saavedra Lamas	
789	کارل فان آزیٹسکی	1935
	Carl von Ossietzky	
792	آرتھر ہنڈرسن	1934
	Arthur Henderson	
810	نورمان انجیل	1933
	Sir Norman Angell	
—	اس برس انعام نہیں دیا گیا۔	1932
835	جین ایڈمز نیچولس	1931
	Jane Addams - Nicholas Murray Butler	
842	نونا تھن سندر بلوم	1930
	Larz Olof Jonathan [Nathan] Söderblom	
863	فرینک کیلاگ	1929
	Frank Kellog	
—	اس برس انعام نہیں دیا گیا۔	1928

874	فرڈینینڈ بویسز - لڈویگ کویڈے	1927
	Ferdinand Buisson - Ludwig Quidde	
900	اریستو بری آں - گسٹاف اسٹریسے مان	1926
	Aristide Briand - Gustav Stresemann	
923	سیر آسٹن چیمبرلین - چارلس ڈاوس	1925
	Sir Austen Chamberlain - Charles G. Dawes	
—	ان برسوں میں انعام نہیں دیا گیا۔	1924
		1923
925	فریڈرک نانسن	1922
	Fridtjof Nansen	
942	ہالمار برانٹنگ - کرسچیان لانگے	1921
	Hjalmar Branting - Christian Lange	
958	لی ایل یوڈوا	1920
	Léon Jouhaux	
970	ووڈرو ویلسن	1919
	Woodrow Wilson	
—		1918
		1917
	ان برسوں میں انعام نہیں دیا گیا۔	1916
		1915
		1914
973	ہنری لافانتین	1913
	Henri La Fontaine	
974	ایلی ہوروت	1912
	Elihu Root	
976	ٹوبیاس آسز - آلفریڈ ہرمن فرائیڈ	1911
	Tobias Aaser - Alfred Hermann Fried	
—	اس برس انعام نہیں دیا گیا۔	1910

979	آگستے بیرنارت - پال ہنری ایستورنیل ڈی کونسٹانس	1909
	Auguste Beemant - Paul Henri Benjamin d'Estournelles de Constant	
982	کلاس پونٹس آمالڈسن - فریدریک ہاجر	1908
	Klas Pontus Amalson - Fredrik Bajer - Sweden	
1006	ارنستو تئدورا مانیتا - لویس ریناو	1907
	Ernesto Teodoro Maneta - Louis Renault	
1046	تھیوڈور روزویلٹ	1906
	Theodore Roosevelt	
1051	برتھا فان سمر	1905
	Bartha van Sumner	
—	اس برس انعام نہیں دیا گیا۔	1904
1058	رینڈل گرمر	1903
	Randal Gremer	
1066	ایلی ڈوکومون - البرٹ گابٹ	1902
	Elie Ducommun - Albert Gabat	
1084	ہنری ڈومانٹ - فریڈرک پاسی	1901
	Henry Dunant - Frederic Passy	
1087	اشاپیہ	



باقر نقوی کی ایک بڑی نیکی

باقر نقوی نے اب سے دو برس پہلے، ایک صدی کے نوٹیل ادبی خطبات کا ترجمہ کیا اور ڈاکٹریٹ کی اس مرتبہ وہ ہمارے لیے امن خطبات کی سوقات لائے ہیں۔ کہنے کو یہ نوٹیل امن انعام حاصل کرنے والے سیاسی اور سماجی مدیرین کی تقریریں ہیں لیکن انھیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ علم و ادب اور دانش و بینش کے شادوروں سے ملاقات ہو رہی ہے۔ یہ لوگ جنھوں نے امن کی مختلف جہتوں کے لیے کام کرتے ہوئے اپنی زندگیوں لگا دیں، ان میں سے بیشتر علم و ادب اور فلسفے کے کوچے سے بھی ہو کر گزرے تھے۔ بیشتر خطبات پڑھتے ہوئے ان پر ادب پاروں کا گمان گزرتا ہے۔ ان تمام خطبات میں ”امن“ کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہے اور اس کی مختلف حالتیں بیان ہوئی ہیں جن کی مختلف زمانوں اور زمینوں کے دانش مندوں نے آرزو کی ہے۔ یہ خطبات دنیا کے مختلف علاقوں میں مانس لینے والے امن کے پیہمروں کے خیالات ہیں۔

ہم اس وقت جس انتہا پر اور انتہا پسندی کا شکار ہیں اس میں ان خطبات کی اہمیت دو چند نہیں، وہ چند ہو جاتی ہے۔ باقر نقوی کو مبارک ہو کہ انھوں نے ان کا ترجمہ کر کے امن کی کوششوں میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔

اس مرحلے پر جی چاہتا ہے کہ اختاپون، اشوک اعظم اور باقریڈ نوٹیل کو ایک مانس میں یاد کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ایک فرعون، ایک شہنشاہ اور ایک موجد کس طرح امن کی سرکار میں ایک ہیں۔

اختاپون کا پیدائشی نام آمن حوطب چہارم تھا۔ فرعون کے اٹھارہویں خاندان کا یہ نواں فرعون تیرہ برس کا تھا جب 1375 ق م میں تخت نشین ہوا۔ وہ بنیادی طور پر خواب دیکھنے والا تھا۔ اس کے خوابوں نے مصری مذہب کو یکسر بدل دیا اور اسی لیے وہ دنیا کا پہلا وحدانیت پرست کہلاتا ہے۔ فرعون کے خاندان میں وہ لوگ پیدا ہوتے تھے جن کا پسندیدہ مشغلہ پڑوسی ملکوں پر لشکر کشی اور ملک کی سرحدوں کو وسیع سے وسیع تر کرنا تھا۔ اختاپون تخت نشین ہوا تو اسے اپنے خوابوں سے فرحت نہ تھی کہ وہ فوجی مہمات پر نکلتا اور زر و جواہر، گنیزیں اور

غلام سمیٹ کر لایا۔ فتوحات اور لشکر کشی اس کے لیے نہایت مایہ ناز کام تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شام، فلسطین اور ایشیائے کوچک جو مصری سلطنت کا حصہ اور اس کے باج گزار تھے وہ حملہ آوروں کے قبضے میں چلے گئے۔ اس نے اپنے جرنیلوں کو جنگی مہمات کے لیے خطیر رقم دینے سے انکار کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فوج میں اس کی مخالفت بڑھتی چلی گئی۔ مصری جرنیلوں اور پروہتوں کے لیے یہ ناقابل برداشت صورت حال تھی کہ ان کا فرعون امن اور انسانوں کی فلاح کی بات کرے۔ اس کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ اس نے کل ۱۷ برس حکومت کی اور دنیا کا واحد آدرش وادی فرعون دنیا سے رخصت ہوا۔ وہ دنیا کا پہلا حکمران ہے جس نے جنگ سے نفرت کی اور امن کے خواب دیکھے۔ اسے بین الاقوامی نگہ نظر کا پہلا پیامبر بھی کہا جاتا ہے۔

گلدھ (بہار) کے موریہ خاندان کا تیسرا بادشاہ اشوک، اخناتون کے ایک ہزار برس بعد پیدا ہوا۔ ہندو بھارت کا یہ بیٹا اور چندر گپت موریہ کا پوتا ۲۷۳ ق م میں مراٹھہ آیا۔ اپنے دادا چندر گپت موریہ اور باپ ہندو بھارت نے اس کے لیے ایک عظیم سلطنت چھوڑی تھی۔ وہ اپنا وقت عیش اور شکار میں گزارتا رہا۔ باج شاہی سر پر سجانے کے ۸ برس بعد وہ اپنے عظیم لشکر کے ساتھ پربوس کی طاقت ور اور دولت مند ریاست کالنگ (جنوبی اڑیسہ) پر حملہ آور ہوا اور اسے تیس تیس کر دیا۔ یہ اس کا پہلا حملہ اور پہلی فتح تھی۔ کہا جاتا ہے کہ طاقت کے نشے میں سرشار اشوک جب اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کالنگ کے میدان میں اپنی فتح کا نظارہ کرنے کے لیے نکلا تو اس کی نگاہوں کے سامنے دور دور تک پھیلا ہوا میدان تھا جس میں ایک لاکھ سے زیادہ سپاہیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ مردار خور پرندے ان پر اتر آئے تھے۔ بہت سے نیم مردہ تھے۔ کراہتے ہوئے اور پانی مانگتے ہوئے۔ قریب کی بستیوں سے عورتیں آن پہنچی تھیں جو میدان جنگ میں بکھری ہوئی لاشوں میں اپنے رشتے دوستی تھیں اور آہ بکا کرتی تھیں۔ کالنگ کے میدان میں اس نے دیکھا کہ فتح کا چہرہ کتنا بھیانک ہے۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ اپنے گھوڑے سے اتر اور اس کے ساتھ چلنے والا شاہی دستہ بھی گھوڑوں سے اتر گیا۔ اشوک نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور روجہ کیا۔ اس کا گریہ تاریخ میں محفوظ ہو گیا:

یہ میں نے کیا کر دیا؟ اگر یہ فتح ہے تو شکست کسے کہتے ہیں؟

یہ فتح ہے یا شکست؟

یہ انصاف ہے یا نا انصافی؟

یہ شجاعت ہے یا بددلی؟

کیا بچوں اور عورتوں کا قتل بہادری ہے؟

کیا میں نے یہ سب کچھ اپنی سلطنت کو وسعت دینے اور دولت مند کرنے کے لیے کیا

یا دوسری بادشاہت کی شان و شوکت کو غارت کرنے کے لیے؟

کسی نے اپنا شوہر کھودیا، کسی نے اپنا باپ اور کسی نے اپنا بچہ

اور کوئی بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں ہی قتل ہوا۔ لاشوں کے یہ انبار کیا ہیں؟

یہ فتح کے نشان تھے یا شکست کے؟

اشوک کا یہ نوحہ اور کالنگ کے میدان سے لوٹ کر آنے کے بعد اس کے لکھوائے وہ فرامین جو پتھر دیوں پر کندہ کیے گئے اور اشوک کی وسیع و عریض سلطنت کی حدوں کے اندر نصب کیے گئے، انھیں پڑھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم عدم تشدد پر راجح یقین رکھنے والے ایک ایسے امن پسند اور انسان پرست فلسفی کے خیالات سے ملاقات کر رہے ہیں جو رواداری کی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ وہ بدھ مت اختیار کر چکا تھا لیکن دوسرے تمام مذاہب کا اور اپنی رعایا کی مذہبی روایات اور شرافت کا احترام لازمی سمجھتا تھا۔

کالنگ کی فتح کے بعد اشوک اعظم نے کبھی گوشت نہیں چکھا۔ کسی فوجی مہم پر نہیں گیا۔ اس کے سپاہیوں کی تلواروں کو زنگ لگتا رہا اور اس کی سلطنت میں چوکڑیاں بھرتے ہوئے جانوروں اور اڑتے ہوئے پرندوں کو بھی جان کی امان ملی۔

آج سے 2282 برس پہلے پیدا ہونے والا شہنشاہ اشوک، جو اشوک اعظم کہلایا، درحقیقت انسان اعظم ہے۔ اشریفہ نوبیل کے نام سے رائج امن انعام، خطبات اسی انسان اعظم کی پیروی کرنے والوں کی کھاتین جنھوں نے اپنے اپنے انداز میں امن کو دیکھا، اسے چاہا اور اسے حاصل کرنے میں اپنی زندگیاں لگا دیں۔ کالنگ کے میدان میں اشوک کی کالا پلٹ ہو گئی تھی۔ اسی طرح انیسویں اور بیسویں صدی کے دو مشہور نام جو بلاکت خیزی سے جڑے ہوئے ہیں، انھوں نے جب بیج کا سامنا کیا تو ان کی زندگیاں منقلب ہو گئیں۔

ان میں سے ایک اشریفہ نوبیل ہے جس کی ایجادات ڈائنامائٹ اور ہیلو سرامیٹ نے دنیا کو اپنی بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا اور ان ایجادات سے پہلے لڑی جانے والی جنگیں بچل کا کھیل محسوس ہونے لگیں۔ دوسرا البرٹ آئن سٹائن ہے جس کی تحقیق اور تجربات کے نتیجے میں ایٹم بم جیسے عفریت نے جہنم لیا اور فوجی انسان کو معجزہ ہستی سے مٹانے کا ایک ایسا ننھ ایجاد ہوا جس کی تباہی کی جھلکیاں مختلف مذہبی کتابوں میں بیان ہونے والی قیامت کے ذکر میں دکھائی دیتی ہیں۔

نوبیل کی شاہ کن ایجادات نے اس کے قدموں میں دولت کے انبار لگا دیے اور آئن سٹائن شہرت کی بلند یوں پر فائز ہوا۔ ان جانے میں سہی، انسانیت کی تباہی کے لیے بلاکت خیز سامان مہیا کرنے پر ان دونوں کا ضمیر انھیں تادم مرگ کچھ کے لگاتا رہا۔ آئن سٹائن نے اپنے گناہ کا کفارہ یوں ادا کرنے کی کوشش کی کہ وہ صلح جوئی اور امن پسندی کی عالمی مہم کا حصہ بن گیا۔ نوبیل نے ڈائنامائٹ ایجاد کی تھی تو اس کا خیال تھا کہ اس کی یہ ایجاد چٹانیں اڑا کر ریل کی پٹریاں بچھانے، پہاڑیوں کے درمیان سے پانی کا راستہ نکالنے اور سڑکیں بنانے کے کام آئے گی۔ لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی ایجاد انسانیت کی خدمت سے زیادہ بلاکت خیزی کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ ڈائنامائٹ کی فروخت میں دن دن رات چوگنا اضافہ ہوا اور نوبیل کی یہ ایجاد اس کے لیے سونے کی کان ثابت ہوئی۔ یہ دولت اس کے لیے مزا بن گئی۔ اس نے ایک تنہا انسان کی زندگی گزاری۔

وہ خاندان کی لذت سے عمر بھر نا آشنا رہا۔ ایسے میں وہ دولت کے اس ذخیرہ کا کیا کرتا جس میں روز اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم صرف مسجد، مدرسے اور یتیم خانے کی تعمیر کو اپنے ہم مذہبوں کی فلاح اور روزِ حشر اپنی نجات کا ذریعہ جانتے تھے۔ مغرب میں دولت یا جائیداد کو تعلیم و تحقیق اور انسانی فلاح کے مختلف شعبوں کے لیے وقف کر دینے کا وہ یہ صدیوں پرانا ہے۔ اس نے کفارے کے طور پر سائنس کے تین شعبوں میں اعلیٰ تحقیق اور ادب میں تحقیقی کام انجام دینے والوں کے لیے سالانہ ایک خطیر رقم اور سونے کے تمغے کے اجرا کے لیے اپنی وصیت لکھی۔

نوبیل انعامات کے بارے میں کچھ لوگوں کو یہ گمان ہے کہ نوبیل فاؤنڈیشن اس کے وارثوں نے قائم کی۔ حقیقت یہ ہے کہ نوبیل نے اپنی موت سے کئی برس پہلے ایک ایسی فاؤنڈیشن بنانے کا ارادہ کر لیا تھا جو طبیعیات، کیمیا، طب اور ادب کے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے کسی ایک فرد یا افراد کی خدمات کا اعتراف کرے اور انھیں سالانہ خطیر رقم انعام کے طور پر دے۔ ان چار شعبوں کے علاوہ پانچواں شعبہ امن کا تھا۔ اس انعام کی محرک تقریر نوبیل کی ایک پرانی دوست نواب بیگم برتھا فان سٹمر بنی۔ انیسویں صدی کے جنگ زدہ اور امن کو مزے سے ہوئے یورپ میں امن کی کئی تحریکیں چل رہی تھیں اور برتھا ان میں سرگرمی سے حصہ لیتی تھی۔ اس نے 1889 میں ایک ماول ”اپنے ہتھیار رکھ دو“ لکھا جسے فوری طور پر مقبولیت اور شہرت ملی۔ اس ماول کے بارے میں ”جنگ اور امن“ جیسے عظیم ماول کے خالق لیوناسٹاف نے لکھا کہ ”اس ماول کے امن کی تحریک پر وہی اثرات مرتب ہوئے جو امریکا میں غلامی کے خلاف چلنے والی تحریک پر میریٹ پیچراسٹو کے ماول ”انگل نامزگین“ کے ہوئے تھے۔“

تقریر نوبیل نے برتھا کے اس ماول کو پڑھا اور وہ اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی دولت میں سے امن کے فروغ کے لیے رقم مختص کرنے کے بارے میں برتھا کی تجویز پر سنجیدگی سے غور شروع کیا۔ ان دونوں کے درمیان 1892 اور 1893 کے درمیان امن انعام قائم کرنے کے بارے میں طویل خط کتابت ہوئی رہی۔ یہ خطوط نوبیل فاؤنڈیشن، اسٹاک ہولم میں محفوظ ہیں اور 2001 میں ان میں سے بعض اہم خطوط شائع بھی ہو چکے ہیں۔

تقریر نوبیل نے اپنے وصیت نامے کی دستاویز پر 27 نومبر 1895 کو دستخط کیے۔ اس میں 5 شعبوں میں سالانہ خطیر رقم اور سونے کا تمغہ دینے کی بات کی گئی تھی۔ ”امن انعام“ کے حوالے سے نوبیل نے لکھا تھا کہ ”یہ انعام اس فرد کو دیا جائے گا جس نے قوموں کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے کے حوالے سے بہترین کام کیا ہو۔ اس کے علاوہ انواع کے سسر خاتمے یا ان میں تخفیف اور امن کانفرنسوں کے انعقاد کے لیے جدوجہد کی ہو۔“

نوبیل نے اپنی اس وصیت کے بارے میں برتھا کو کچھ نہیں بتایا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی موت سے چند دنوں پہلے بھی عالمی سطح پر امن قائم کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف امن تنظیموں کو رقم فراہم کرنے کے

لیے نوٹیل کو خط لکھتی رہی۔ اس بارے میں نوٹیل نے اسے آخری خط 21 نومبر 1896 کو لکھا۔ اس کے چند ہفتوں بعد وہ شخص دنیا سے رخصت ہو گیا جس کے قائم کیے ہوئے انعامات ایک صدی سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد بھی دنیا بھر کے انسانوں سے داد و تحسین حاصل کر رہے ہیں۔

امن انعام کی محرک نواب بیگم برتھا فان سٹمر کو یہ انعام 1905 میں دیا گیا۔ اس کو دیا جانے والا یہ اعزاز ان لوگوں کے لیے باعث افتخار تھا جو ہتھیاروں میں تخفیف اور قوموں یا گروہوں کے درمیان جنگ کے سخت خلاف تھے۔ اس موقع پر خطبہ دیتے ہوئے برتھا فان سٹمر نے کہا تھا:

تمام ابدی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ خوش حالی حالت امن ہی میں پیدا ہوتی اور پرہیزگارانہ چہرہ ہوتی ہے اور تمام ابدی انسانی حقوق میں سے ایک حق فرد کے زندہ رہنے کا حق ہے۔۔۔ ہمارے سماج کی عسکری تنظیم امن سے انکار کی بنیاد پر رکھی گئی ہے جو انسانی زندگی کی قدر کی توہین ہے۔۔۔

”اگر آپ مجھے امن کے میدان میں کام کی تفصیل سے مطلع کرتی رہیں گی اور اگر میں یہ سنوں کہ امن کی تحریک عملی سرگرمی کی راہوں پر آگے بڑھ رہی ہے تو میری طرف سے مالی امداد ہوتی رہے گی۔۔۔“

انگریز نوٹیل نے یہ الفاظ اس وقت کہے تھے جب میں 1892 میں اپنے شوہر کے ساتھ ان سے ملنے برلن گئی تھی جہاں ان دنوں ایک امن کانفرنس ہو رہی تھی۔۔۔ امن پسندی کی وکالت کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے ذاتی رسوم اور طاقت کے وسائل کتنے حقیر درجے کے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تعداد میں وہ کم ہیں اور اختیار میں کم زور مگر جب وہ خود کو اور ان آدرشوں کو حقیقت کی روشنی میں دیکھتے ہیں جن کے وہ پیروکار ہیں تو وہ خود کو بلند ترین مقاصد کے خدمت گاروں کے روپ میں پاتے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کا انحصار اس امر پر ہے کہ یا تو ہمارا یورپ ماکامیوں اور کھنڈرات کی نمائش گاہ بن جائے گا، یا ہم اس خطرے کو نال کھتے ہیں اور اس عہد میں جلد فاضل ہو جائیں گے جس کو امن اور قانون کا عہد کہا جاسکتا ہے۔

برتھا جب اپنا یہ خطبہ دے رہی تھی اس وقت اسے یقین تھا کہ دنیا کے جنگجو عناصر کو پسپا ہونا پڑے گا۔ 1905 کی اس جلیل القدر تقریب میں تقریر کرتے ہوئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی گھٹری جاتی ہے جب 1914 میں وہ جنگ چھڑ جائے گی جو دنیا کی تاریخ میں جنگ عظیم کے نام سے یاد کی جائے گی اور اس کے خاتمے کے صرف 21 برس بعد ایک اور جنگ عظیم آغاز ہوئی جس کے بعد یہ دونوں جنگیں تاریخ میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے نام سے درج ہوں گی۔ کروڑوں شہری اور لاکھوں سپاہی ان دو جنگوں میں کھیت رہیں

گئے۔ یورپ کے درجنوں اہم شہر اور سیکڑوں بستیاں نابود ہو جائیں گی۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی لیکن اسے اور اس کے بعد آنے والوں کو آج بھی یقین ہے کہ آخر کار جنگ جو عمارت پر پڑے گی اور آخری فتح امن کی ہوگی۔

1905ء سے آج 2012ء میں ہم اپنے ارد گرد نظر ڈالیں تو جنگیں آج بھی جاری ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یورپ نے دو جنگوں میں اپنی تہی و بہبودی کے بعد یہ طے کر لیا کہ اس کے اسلحہ ساز کارخانے دولت کا انبار سمیٹنے کے لیے جدید ترین اسلحہ تیار کرتے رہیں گے لیکن اس کا استعمال ہندوچینی، شرقی اوسط، افریقا اور ایشیا میں ہوگا۔ یہ امریکا اور یورپ کے حکمرانوں کا متفقہ فیصلہ ہے جس کے نتائج بیسویں صدی میں ہم نے دیکھے اور اب اکیسویں صدی میں بھی دیکھ رہے ہیں۔

ہوا تو یہ چاہیے تھا کہ جنگوں میں ہوشیاریا اضافے کے بعد دنیا میں امن کی بات کرنے والوں کے جو محلے پست ہو جاتے لیکن آپ باقر نقوی کے ترجمہ شدہ ان امن خطبات کو پڑھتے چلے جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنگ مخالف افراد کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور ایسی تنظیمیں تیزی سے وجود میں آتی ہیں جنہوں نے تحریک اسلحہ اور جنگی ساز و سامان پر ہونے والے ہوشیاریا اخراجات کے خلاف دنیا بھر میں احتجاج کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس کی ایک سائنس کی مثال 1997ء کا وہ نوبل امن انعام ہے جسے جوڈی ولیمز اور اس کی تنظیم آئی سی بی ایل (بارودی سرنگوں پر بین الاقوامی پابندی کی تنظیم) کو دیا گیا۔ بارودی سرنگیں امن عالم کے لیے اور عام انسانوں کے لیے ایک بھیانک خطرہ بن چکی ہیں اور جہاں سے افواج رخصت ہو گئی ہیں اور امن قائم ہو چکا ہے وہاں بھی آج تک ان کی خلیں آتش می ختم نہیں ہوئی۔ بارودی سرنگوں کے شکار افغانی بچے اور مرد ہمارے گلیوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ ہمارے بہت سے لوگوں کو یہ بات شاید یاد ہو کہ شہزادی لیلیا نے ان سرنگوں پر مکمل بندش کے حوالے سے بہت سرگرمی سے کام کیا تھا۔ آئی سی بی ایل نامی تنظیم کی رکنیت دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ایک ہزار سے زیادہ شہری تنظیمیں حاصل کر چکی ہیں۔ 1997ء تک ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر میں ۷۵ کروڑ بارودی سرنگیں بکھی ہوئی تھیں۔ گزشتہ 15 برسوں کے دوران اس تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ ایک الم ناک حقیقت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات دل کو سنہالا دیتی ہے کہ 1997ء میں ہی جوڈی ولیمز، آئی سی بی ایل اور متعدد جنگ مخالف مددگاروں اور دانشوروں کی مسلسل کوششوں کے سبب کینیڈا کے شہر اوتاوا میں 121 ملکوں نے ان جان لیوا بارودی سرنگوں کی مکمل مخالفت پر دستخط کیے۔ یہ جوڈی ولیمز جیسے امن دوست انسانوں اور اداروں کی ایک بڑی جیت تھی اور اسی کے بعد جنگ زدہ علاقوں میں بارودی سرنگوں کو تلاش کرنے اور انہیں ناکارہ بنانے کے کوششوں میں بہت تیزی آئی۔ یاد رہے کہ زمینی بارودی سرنگوں میں، افریقہ، نوبل کی بلاکت خیز ایجاد نیلا سائیٹ استعمال ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ جنگ میں فتح حاصل کرنے والوں نے سمندروں میں بھی بارودی سرنگیں بچھا دیں اور اسی لیے بارودی سرنگ سمیٹ بھری جہاز بنائے گئے لیکن زمینی بارودی سرنگوں کا معاملہ بہت ہول ناک ہے۔ اسی کے بارے میں بات کرتے ہوئے جوڈی ولیمز نے اپنے خطبے میں کہا تھا:

زمینی بارودی سرنگ دوسرے چھپا روں سے اس لیے مختلف ہے کہ ایک بار یہ زمین میں دبا دی جائے اور دبا نے والا سپاہی اس کو چھوڑ کر چلا جائے تو یہ ایک فوجی اور شہری میں، ایک عورت اور بچے میں اور ایک بوڑھی دادی اماں میں جو گھر کا چوٹھا جلا نے کے لیے کڑیاں چننے نکلی ہو تمیز نہیں کر سکتی۔ بارودی سرنگ ہمیشہ ابد الابد تک شکار کے لیے تیار رہتی ہے۔ عام لفظوں میں بارودی سرنگ مستعد ترین سپاہی ہے۔ جنگ ختم ہو جاتی ہے مگر بارودی سرنگ موت کا کھیل جاری رکھتی ہے۔

اس وقت کمبوڈیا میں ساٹھ لاکھ کے قریب زمینی بارودی سرنگیں ملک کے پچاس فی صد علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ افغانستان میں غالباً نوے لاکھ زمینی بارودی سرنگیں بکھی ہوئی ہیں۔ امریکی فوج کے مطابق افغانستان پر روسی فوج کی یلغار کے دنوں میں پورے ملک میں تین کروڑ کے قریب بارودی سرنگیں بچھائی گئی تھیں۔ سربھہ یوگوسلاویہ میں چند سالہ لڑائی کے دوران ملک کے مختلف حصوں میں ساٹھ لاکھ بارودی سرنگیں بچھائی گئیں۔ انگولا میں نوے لاکھ موڈینق میں دس لاکھ صومالیہ میں دس لاکھ میں اسی طرح گنتائی گئی تو آپ اکتا جائیں گے۔ نہ صرف یہ کہ ہمیں زمین میں دفن بارودی سرنگوں کی فکر کرنی ہے بلکہ ہمیں ان کے اس اہار کی بھی فکر کرنی ہوگی جو استعمال کے لیے تیار اور موجود ہے۔ اندازہ ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں دس سے بیس کروڑ تک زمینی بارودی سرنگوں کا اہار لگا ہوا ہے۔

نوبیل امن انعام کی بعض ممبروں پر اعتراضات بھی ہوئے ہیں لیکن قہور اور ہنری کسنجر کو دیا ہوا امن انعام اس قدر متنازعہ ہوا کہ امن کمیٹی کے کاراکمین مستعفی ہو گئے۔ آنزک راہن، شمعون پیریز، یا سر عرفات، ریگور ٹامن، چنچم، جی کارز، الگور، براک او با ما کو دیے جانے والے امن انعام بھی شدید تنقید اور تنازعے کی زد میں رہے۔

اسی طرح کچھ نام ایسے ہیں جن کے بارے میں بہت سے مدعوں اور دانشوروں کا خیال ہے کہ امن کے لیے ان کی خدمات اتنی زیادہ تھیں کہ یہ انعام انھیں ملنا چاہیے تھا۔ ان میں مہاتما گاندھی، ہٹلر، روزویلٹ اور کئی دوسرے نام شامل ہیں۔ گاندھی جی 37 ویں، 38 ویں، 38 ویں اور 47 ویں امن انعام کے لیے نامزد کیے گئے لیکن انھیں انعام نہیں ملا جس پر کمیٹی کے مختلف اراکین نے معذرت کی۔

مہاتما گاندھی کو امن انعام کا نہ ملنا روے کے مختلف دانشوروں اور امن انعام کمیٹی کے مختلف اراکین کے ضمیر میں چھبھتا رہا اور اس تا سنف کا وہ اظہار بھی کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1989 میں دلائی لامہ چہار دہم کو انعام دیتے ہوئے انعامی کمیٹی کے چیئرمین نے کہا تھا کہ ”یہ (انعام) مہاتما گاندھی کی یاد کو بھی ایک طرح کا خراج عقیدت ہے۔“ اور 2006 میں سیکریٹری برائے نارویجن نوبیل کمیٹی نے کہا ”ہماری 106 برس کی تاریخ میں کسی فرد کو نظر انداز کیے جانے کی سب سے بڑی مثال مہاتما گاندھی کی ہے جنھیں نوبیل امن

انعام نہیں دیا گیا۔ گاندھی کو نوبل امن انعام دے مٹنے سے کوئی فرق نہیں پڑا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نوبل کمیٹی گاندھی (کے نام کی شمولیت) کے بغیر گزارہ کر سکتی ہے؟

امن کا معاملہ صرف ہتھیاروں کی تخفیف کا ہی نہیں، ان انسانوں کا بھی ہے جو لاکھوں کی تعداد میں ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے اندر نفرت اور عداوت کی بارودی سرنگیں لیے پھرتے ہیں۔ ان نفرتوں نے کتنے ہی علاقائی تنازعات کو جنم دیا ہے۔ ان میں سے ایک شمالی آئرلینڈ میں امن قائم کرنے کا مسئلہ رہا ہے۔ آئرلینڈ کی بنگلہ آری اور برطانیہ کے درمیان چلنے والے مسلح تصادم کو ختم کرنے میں بہت سے افراد اور اداروں نے اپنا کردار ادا کیا۔ ان کوششوں کے حوالے سے 1976 میں دو خواتین بنی ولیمز اور مرید کوریگن کو نوبل امن انعام دیا گیا۔ جب کہ 1998 میں آئرلینڈ کی تنازعہ کا حل تلاش کرنے کے حوالے سے یہ انعام جان ہیوم اور ڈیوڈ ٹرمبل کے حصے میں آیا۔ جان ہیوم نے نوبل امن خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا:

ہمارے تنازعہ کے پچھلے تیس برسوں میں کھرے ملاں اور مرا سر ہولناکی کے بہت سے لحاظ آئے ہیں۔ بہت سے لوگ احتجاج میں تھے کہ شاید ڈیلیوٹی سٹنس کے یہ الفاظ سچ ہو جائیں کہ:

لبے عرصے کی قربانی دل پتھر کر دیتی ہے

کبھی نہ ختم ہونے والے عرصے سے، اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ ہمارے لوگ ہر آنے والے دن کو جھیلے رہے ہیں اور انہوں نے اپنے رہنماؤں کی ہمت خزانہ میں کئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے کہ وہ ان حالات کا حل تلاش کرنے کی ہمت کریں تاکہ ہماری نئی نسل ہر صبح ایک تبسم آمیز امید سے اپنے مستقبل کا انتظار کرے۔

دراصل یہ انعام ان ہی کا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ آج کے دن کی کیا اہمیت ہے کہ یہ دن اپنی پوری توانائی کے ساتھ ہمارے امن کے عمل کو مستحکم کرے گا۔

جان ہیوم اور ڈیوڈ ٹرمبل امن قائم کرنے کے لیے اپنی کوششوں میں کامیاب رہے تو اس میں بہت سے لوگوں نے اپنا حصہ ڈالا تھا، لیکن سب سے ابتدائی اور اہم کاوشیں بنی ولیمز اور مرید کوریگن کی تھیں۔ یہ دونوں گھریلو عورتیں تھیں لیکن ایک جاں کا حادثہ نے ان کی قلب ماییت کر دی۔ بنی ولیمز نے اپنی آنکھوں سے وہ حادثہ دیکھا تھا جس میں ایک شدید زخمی شخص نے برطانوی سپاہیوں سے بھاگنے کی کوشش میں اپنی گاڑی ایک عورت اور اس کے تین بچوں پر چڑھا دی تھی۔ ماں زخمی ہوئی لیکن تینوں بچے بچے رہے۔ ان بچوں کی فلم مرید کوریگن سے حادثے کی بنی مشاہد بنی ولیمز نے رابطہ کیا اور پھر وہ تشدد اور دہشت گردی کو ختم کرنے کی مہم میں جڑ گئیں۔ انہوں نے عام شہریوں سے اپیل کی کہ وہ امن کی تائید میں ان کا ساتھ دیں۔ انہوں نے مظاہرے کیے جن میں شرکاء کی تعداد ہشت گنی۔ ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے خاردار بار جھیں

ہٹائیں۔ مورچہ بندیاں مسارکیں اور کوریلا جنگ کے خلاف شہری آبادی کو کھینچا کر دیا جو خون خرابے اور جنگ و جدل سے بڑا راست متاثر ہو رہی تھی۔ ان دونوں گھریلو عورتوں نے دہائیوں سے چلنے والی خون ریزی کے خلاف جو محاذ قائم کیا تھا، اس نے شمالی آئرلینڈ کے تنازعے کو رفتہ رفتہ ختم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ان کی اسی جدوجہد کو تسلیم کرتے ہوئے نوبل امن کمیٹی نے ان دونوں کو 1976 کا امن انعام عطا کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے بنی ولیمز نے کہا:

ہم خفا ہیں و مسائل کی بربادی پر جو روزانہ جنگجو یا نہ روش کی بدولت ہو رہی ہے جب کہ انسان تباہی کے عالم میں جی رہے ہیں۔ کچھ تو جلد آنے والی موت کی امید میں، جوان کو ناامیدی سے رہائی دلائے گی۔ ہمیں اس بات پر بہت غصہ آتا ہے کہ ہر منٹ 500,000 ڈالر جنگ پر اور جنگ کی تیاریوں پر خرچ ہو رہے ہیں جب کہ ان میں سے ہر ایک منٹ میں آٹھ سے زیادہ انسان بے توجہی کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ ہر دن 12000 انسان بے توجہی، نا کافی غذا اور بد بختی کی جھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ پھر بھی ہر روز 720 ملین ڈالر فوجی ساز و سامان پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ ذرا اس دیوانگی کی ترجیح پر غور تو کیجیے۔ ذرا اس طرح بھی سوچیے کہ اگر کسی طرح ایک منٹ میں اسلحے پر خرچ ہونے والے 500,000 ڈالر کو ان 12000 افراد میں تقسیم کر دیا جائے جو اس دن مارے جانے والے ہیں تو ہر بد قسمت کو فی منٹ چالیس ڈالر سے کچھ زیادہ مل جائے گا اور وہ بد بختی میں مرنے کے بجائے عیش سے زندگی گزار سکے گا۔ اگر پورے دن اسلحے پر ہونے والا خرچ بچا لیا جائے تو ان بارہ ہزار مر جانے والوں میں 720,000,000 ڈالر تقسیم ہوں گے۔ کو یا ہر بد قسمت کو ایک دن میں 60,000 ڈالر مل جائیں گے۔۔۔ وہ لوگ جو ہمارے زمانے میں مسکرت کی تائید جاری رکھتے ہیں، وہ قتل انسانی کو ایسی خود کشی کی طرف مائل کر رہے ہیں کہ جب ہر طرف موت اور بربادی ہوگی۔

ان خطبات میں مغربی جرمنی کے وفاقی چانسلر ویلی براونٹ کا خطبہ ہمارے لیے بطور خاص پڑھنے کی چیز ہے۔ یہ خطبہ انہوں نے دسمبر 1971 میں امن انعام وصول کرنے سے پہلے دیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ شروع ہونے والی تھی۔ ویلی براونٹ کا استقبال کرتے ہوئے نوبل امن کمیٹی کی مسز آڑے لایونا (Mrs. Aase Lionaes) نے کہا تھا:

دو ترقی پذیر قومیں جنہیں افلاس کے چنگل سے نکلنے کے لیے امن کی اشد ضرورت ہے، جنگ میں مصروف ہیں اور جس طرح دنیا بھر کے سیاست دان معصوم جانوں پر نکتے ہوئے نئے زخموں سے اپنی آنکھیں چہلے اور دلوں کو پتھر کیے بیٹھے ہیں

قابلِ شرم ہے۔۔۔ جنوبی ایشیا ایک تباہ کن جنگ کے دہانے پر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگوں کے لیے تیاریاں ہو رہی ہیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں بچے بھوک سے مر رہے ہیں اور کروڑوں ہاتھ ایک وقت کی غذا کی دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہیں۔ ان مفلوک الحال ملکوں میں اگر کوئی شے فراواں ملتی ہے تو وہ اسلحہ ہے۔ اس سے مجھے فرہنگی روز ویٹ کے مندرجہ ذیل الفاظ یاد آ رہے ہیں،
”ہمارے لیے جنگ کے اختتام سے زیادہ تمام جنگوں کی ابتدا کے اختتام کی ضرورت ہے۔“

مسز آرزو لاہوری کے ان جملوں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کچھ نہیں سیکھا۔ آج بھی ہمارے کروڑوں ہاتھ ایک وقت کے کھانے کی دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہیں اور ان بے بس لوگوں کے دیکھوں کا مداوا کرنے کی بجائے ہم گھریلو روپے اسلحے کی خریداری اور جنگ کی تیاری پر خرچ کر رہے ہیں۔
آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ”امن“ کو ایک غیر مرقی شے نہ سمجھیں۔ وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اور اس کے ایک ہزار ایک مفہوم ہیں۔ اہلبہائی کھیتیاں، ہرے بھرے بیٹروں کے درمیان چلتی ہوئی ہوائیں، فضا میں تیر جانے والے ہمدے اپنے آشیانے کے لیے ٹٹکے چنتی ہوئی ننھی سی چڑیا، چولھے پر چڑھی ہوئی کھد بد کرتی ہنڈیا اور توڑے یا تھوڑے آتی ہوئی گرم روٹی کی سونڈھی خوشبو، ڈنگلے قدموں سے اپنی ماں کی طرف چلتا ہوا بچہ اور اس کے لبوں سے نکلتی ہوئی کھکاری، اپنی گڑیا کو سینے سے لگا کر ماں، مافی یا دادی سے بچل پر یوں کی کہانی سنتی ہوئی بچی، پریم کہانی سناتا ہوا کوئی گیت، شادی کی محفل میں ڈھولک کی تھاپ، رقاصہ کی چندلیوں سے لپٹے ہوئے گھنگھروں کی چھنگ، اپنی تختی کو ملتان میٹی سے لپیتی ہوئی کوئی لڑکی اس خیال میں گم کہ آج وہ اس پر کون سا نیا لفظ کہے گی۔ ہر گھر، ہر گلی اور ہر چوبارے کے یہ پڑسکون مناظر ”امن“ کے موقلم کی مصوری ہیں۔
آرچ بپس سوئیڈن نے 1930 میں کہا تھا کہ ”انسان نے اپنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔“

پہلی جنگ عظیم کی تباہی دیکھ کر اتنی ہی دل دوز بات کہی جاسکتی ہے لیکن جب تک ٹینکوں اور توپوں سے روئے جانے والے کھیتوں میں نازک اور ننھی سی کونسل چپکے سے اپنا سر نکالتی رہے گی اور جب تک کوئی ننھا بچہ ہمک کر اپنی ماں کے سینے سے لپکتا رہے گا۔ یقین رکھیے کہ اس وقت تک انسان ہتھیار نہیں ڈالے گا۔
نوٹیل امن خطبات کو پڑھتے جاتے تو بدترین زمانوں میں بھی آپ کو یقین رہے گا کہ امن کو پہنچا نہیں کیا جاسکتا۔

باقر نقوی کوہارک باد کہ انھوں نے اتنی اہم دستاویزات کو یک جا کیا اور ہم تک پہنچایا۔ آج کے پراشوب دور میں اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے۔

کئی برس پہلے ایک سویڈش بچے کی دو سطرین نظر سے گزری تھیں:

”مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میرے باا ایک فوجی ہوں

قابل رشک کارنامہ

اس سے پہلے کہ باقر نقوی کی اس کتاب کے بارے میں کچھ عرض کر دوں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ باقر نقوی اور اکادمی بازیافت کی طرف سے یہ سوغات ہمیں اس لمحے پیش کی جا رہی ہے جب ہم آئے دن بد امنی اور دہشت گردی کا شکار ہیں، یعنی اس کتاب کی اہمیت اور معنویت اس دور میں عجب انداز میں ہم پر مسل رہی ہے۔

یہ کتاب امن کا نوٹیل انعام حاصل کرنے والے افراد کو انعام کے وقت پیش کیے گئے تہنیتی کلمات اور ان کی جانب سے دیے گئے خطبات کے عمدہ اور محتاط ترجمے پر مشتمل ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب سے زیادہ ایک ایسی بلند آواز کی صورت رکھتی ہے جو تمام عالم کو ان نوٹیل انعام یافتگان کی طرف سے دی جا رہی ہے جن کے دل امن و آشتی کی عواہش اور انسانی فلاح کے جذبے سے لبریز ہیں۔ اس آواز کو ہم تک پہنچانے میں باقر نقوی کی انسان دوستی اور امن پسندی بھی شامل ہے۔

اس امر کا اظہار بھی مجھے گفتگو کے آغاز ہی میں کر دینا چاہیے کہ اس کتاب میں شامل تمام نوٹیل امن انعام یافتہ افراد کے بارے میں اگر اظہار خیال کیا جائے اور انسانیت کی خدمت اور امن عالم کے لیے جو کام انہوں نے کیا ہے، اس کے بارے میں بے حد اختصار سے بھی گفتگو کی جائے تو بھی اس کے لیے ایک الگ دفتر درکار ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس تفصیل اور طوالت کی زیر نظر تحریر کسی طرح شمول نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ ہمیں اگر امن کے موضوع پر گفتگو کرنی ہو تو اس کے لیے بھی تفصیل سے کام لینا سر دست ممکن نہیں ہے۔ اس کی دوجوہ ہیں۔ اول یہ کہ اس موضوع کا اجرائی مطالعہ یا جائزہ بھی آج کی عالمی صورت حال کو تہذیبی، سیاسی اور فکری تناظر ہی میں نہیں بلکہ جغرافیائی اور اقتصادی سیاق و سباق میں دیکھنے اور اس حوالے سے تاریخ کے مختلف ادوار میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں، ان کے پس منظر اور داخلی محرکات کے سمجھنے کا

مطالبہ کرتا ہے۔ یہ کام تمام تر اختصار میں بھی خاصی لطوالت چاہتا ہے۔ ددم یہ کہ امن آج کی دنیا کا سب سے اہم اور سنگین موضوع ہے اور اس دور کے انسانی معاشرہ کی ساخت اور ان کو درپیش حالات کا اس وقت سب سے بڑا محرک بھی۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے کم و بیش ہر کونے میں کسی نہ کسی حوالے اور انداز سے اہل دانش و فکر اس پر آئے دن گفتگو کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر بات کرنے کے لیے ہمیں نہ صرف ان گفتگوؤں سے باخبر ہونا چاہیے بلکہ ان کے تناظر ہی میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں یہ ایک الگ نوعیت کا کام ہے جس کو اس موقع پر چھیڑنا درست نہ ہوگا۔

افریڈ نوٹیل کون تھا اور اس نے اپنی دولت کا ایک خطیر حصہ ادب، امن عالم اور سائنس کے شعبے میں کام کرنے والے لوگوں کے لیے کیوں وقف کیا؟ اس پر ہم بات نہیں کریں گے، اس لیے کہ اب ان باتوں سے ہمارے ہاں بہت سے لوگ بخوبی واقف ہیں اور جو لوگ نہیں ہیں اور جاننا چاہتے ہیں، انھیں یہ ساری تفصیلات نوٹیل کی اپنی ویب سائٹ کے علاوہ اور بھی بہت سی ویب سائٹس پر با آسانی مہیا ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں بھی تہنیتی کلمات کے علاوہ بعض انعام یافتگان نے اس حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ میں اپنی اس تحریر میں نوٹیل انعام پانے والوں کے بارے میں ہی مختصراً کچھ کہنے پر اکتفا کروں گا۔ امن کا موضوع، جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، آج کی دنیا کا ایک بہت بڑا اور بے حد گہمیر موضوع ہے، لیکن ایسے موضوعات کے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہو جاتا ہے، عام طور پر ان میں ایک طرح کی خفگی اور رسمی انداز در آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایسے موضوع پر بات کرتے ہوئے کچھ پہلو اور نکات ایسے ہوتے ہیں جن پر گفتگو کرنے والا شخص زور دیتا ہے یا دینا چاہتا ہے۔ لہذا ایک طرح کی اکتا دینے والی نگہار پیدا بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن نوٹیل امن کے سو برس کے خطبات کا یہ مطالعہ اس لحاظ سے بالکل مختلف ہے کہ اس میں ہمیں یکسانیت اور نگہار سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ ہر شخص اپنے انداز سے اور ایک الگ زاویے کو نمایاں کرتے ہوئے اپنی بات کرتا ہے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ ان سب لوگوں کو امن کا انعام تو بے شک ایک لڑی میں پڑا دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سب کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے ہے، اس لیے ان کی گفتگوؤں میں فکر اور اظہار کا خاصا تنوع نظر آتا ہے۔ دوسری ایک اور اہم بات یہ ہے کہ نوٹیل انعام یافتگان کے لیے محض شکریے کے اظہار کی رسم نہیں رکھی گئی بلکہ ان سے فرمائش یہ کی جاتی ہے کہ وہ ایک باضابطہ خطبہ یا مقالہ پیش کریں۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ خطبہ دینے والا اپنے موضوع کے پیش نظر بھرپور تیاری کر کے آتا ہے۔ یوں اس کی گفتگو میں گہرے غور و فکر کے ساتھ موضوع کا نام کا پوری جامعیت کے ساتھ احاطہ ہوتا ہے۔ یہاں میں چند حوالے یا مثالیں پیش کرتے ہوئے اپنی بات واضح کرنا چاہوں گا۔

۲۰۰۰ء کا امن انعام کم ڈے جنگ کو دیا گیا تھا، اس لیے کہ انھوں نے کوریائی ریاستوں کے مابین انسانی حقوق کے سلسلے میں مثالی خدمات انجام دیں۔ ان ریاستوں کے درمیان امن، موافقت اور مصالحت

کا یہ راستہ ہموار کرنے کے لیے انھیں کس پامردی اور بلند جوشکی کا مظاہرہ کرنا پڑا، اس کی مثال ان کے خطبے میں ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

میری زندگی میں پانچ موقعے ایسے آئے جب میں نے آمروں کے ہاتھوں آنے والی موت کو قریب سے دیکھا تھا۔ چھ برس میں نے قید میں گزارے اور چالیس برس یا تو میں نظر بند رہا یا ملک بدری اور کڑی نگرانیوں میں۔ اپنے عوام کے سہارے اور دنیا بھر کے جمہور پسند دوستوں کی ہمت افزائی کے بغیر میں ان مشکلات کو جھیل نہیں سکتا تھا۔ میرے گہرے ذاتی یقین نے بھی مجھے قوت و ہمت عطا کی ہے۔

دوسری مثال نیلسن منڈیلا کی ہے۔ وہ جنوبی افریقا کے عظیم رہنما کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اور انھوں نے اپنے خطبے میں امن اور جمہوری حکومت کے قیام اور نسلی امتیاز کے خاتمے کے لیے بے مثال جدوجہد کی۔ ان کی زندگی میں سخت ترین مراحل آئے۔ اپنی زندگی کے بہترین عرصے میں سے کم و بیش تین دہائیاں انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے گزاریں۔ لیکن جب وہ اقتدار میں آئے تو انھوں نے کسی انتقام کی بات نہیں کی بلکہ سفید و سیاہ سے بالاتر ایک ایسے جمہوری معاشرے کے قیام کے لیے اپنے عزم کو تازہ کیا اور کہا کہ ہم سب جنت کے باسیوں کی طرح اکٹھے رہیں گے، ایک ایسے سماج میں جہاں ہر فرد بشر کو برابری کے حقوق حاصل ہوں۔ جہاں سب آزادی، خوش حالی اور منصفانہ حاکمیت کے حق دار ہوں گے اور کوئی ضمیر کا قیدی نہ ہوگا۔ یہ ہے اس شخص کا رویہ اور طریقہ عمل جس کی زندگی کے طویل اور قیمتی برس قید و بند کی نذر ہوئے ہیں۔

مدرثریہا کے نام ہی نہیں، کام سے بھی ہم سب لوگ بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ انھوں نے نوبل انعام کے حوالے سے بہت شان دار خطبہ دیا تھا۔ اس خطبے کی خاص بات اس کا عالمانہ مزاج یا دانش ورانہ سطح نہیں ہے، بلکہ اس میں سچے انسانی تجربے کا دل کو گداز دینے اور موہ لینے والا بیان ہے۔ اور ایک سنجیدہ اور بے ریا سادگی۔ مدرثریہا کے خطبے کو پڑھتے ہوئے انسان کو کئی بار یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی آنکھیں نم ہوتی جاتی ہیں، خاص طور پر اس طرح کے واقعات کو پڑھتے ہوئے جن میں انھوں نے ایک عورت کا قصہ سنایا ہے جسے وہ ایک جگہ سے تین دہرے لوگوں کے ساتھ اٹھا کر اپنے گھر لائی تھیں۔ وہ عورت بہت خراب حالت میں تھی لیکن اس نے ان سے اپنی بھوک، سردی یا تکلیف، کسی بھی چیز کی شکایت نہیں کی۔ جب اسے بستر پر لٹایا گیا تو اس کے چہرے پر بہت حسین مسکراہٹ تھی۔ اس نے بڑی محبت سے مدرثریہا کا ہاتھ پکڑ کر شکر یہ کہا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ ایسے واقعات کو سن کر انسان تو انسان، پتھر تک پگھل سکتا ہے، میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ اسی طرح انھوں نے ایک شخص کا واقعہ بتایا ہے جو مڑک پر رہتا تھا جسے وہ اپنے گھر لے آئی تھیں تو اس نے کہا تھا کہ وہ مڑک پر ایک جانور کی طرح جی رہا تھا مگر اب ایک فرشتے کی طرح مرے گا۔ اس کو

ملنے والی عزت اور عظمت اچھی لگ رہی تھی کہ اب وہ خوشی اور اطمینان سے باتیں کر رہا تھا اور یوں سکون سے مر سکتا تھا، کسی پر الزام دھرے بغیر اور کسی کو بددعا دیے بغیر۔ دیکھیے یہ باتیں انسان کی اچھائی اور بھلائی پر ہمارے یقین کو مستحکم کرتی ہیں، زندگی کو ہمارے لیے پسندیدہ اور پر عظمت بنا دیتی ہیں۔ مدرٹریا نے اپنے خطبے میں ایک مقام پر بڑی عمدہ بات کہی ہے:

میرے نزدیک ہم اصلی سماجی کارکن نہیں ہیں۔ لوگوں کی نظروں میں ہم سماجی کام کرتے نظر آتے ہیں مگر ہم لوگ دراصل دنیا بھر کے دلوں کی فکر کرتے ہیں۔ ہم دن کے چوبیس گھنٹے یسوع مسیح کا دل چھوتے رہتے ہیں۔ ہم چوبیس گھنٹے ان کے سامنے حاضر رہتے ہیں، جیسے ہم اور آپ۔ آپ خدا کی اس موجودگی کو اپنے خاندان میں لانا چاہتے ہیں اس لیے کہ خاندان اکٹھا دعا کرتا ہے، اکٹھے رہتا ہے۔ میرے خیال میں ہم کو اپنے خاندان میں امن برپا کرنے کے لیے بسوں اور بندوبستوں کی ضرورت نہیں، بس ہم اکٹھے رہیں، ایک دوسرے سے محبت کریں، امن لائیں، خوش رہیں، سب گھر میں ایک ساتھ رہنے کی طاقت پیدا کریں۔ اسی طرح ہم دنیا کی تمام خرابیوں کو دور کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

خواتین و حضرات! باقر نقوی کی ترجمہ کردہ اس خوب صورت کتاب، اس کے موضوع، اس میں اٹھائے گئے سوالات اور چھیڑے گئے مباحث پر بات کرنے کا حق تو یہ ہے کہ اس میں سے بار بار اقتباسات نقل کیے جائیں، لیکن خدشہ اس میں یہ ہے کہ اس طرح تو کتاب ہی دیباچے میں نقل ہو جائے گی۔ اس لیے کہ جن لوگوں نے ان موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے، انھوں نے اپنے اپنے موضوع سے پورا انصاف کیا ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ہر ایک بات کرنے والے نے دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ اور ہمیں ایمان داری اور غلوں سے داد دینی چاہیے باقر نقوی کو بھی کہ انھوں نے اس دل کو اس کی جھڑکنوں کے ساتھ یعنی زندہ حالت میں (اعلیٰ معیاری اچھے ترجمے کی صورت میں) ہم تک منتقل کیا ہے۔ بہر حال میں یہاں کم سے کم ایک حوالہ اور دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ حوالہ ہے بیٹی ولیمز کے خطبے کا۔ بیٹی ولیمز سیاسی لیڈر، انسان دوست کارکن یا دانش ور کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ ایک عام عورت تھی لیکن زندگی کے ایک واقعے نے اسے یہاں تک پہنچا دیا۔

10 اگست 1976 کو شمالی آئر لینڈ کے شہر بلفا سٹ کی گلیوں میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا تھا۔ ایک آدمی، فرار کی کوشش میں، پیچھا کرنے والوں کو چھوڑ دینے کی کوشش میں اپنی گاڑی لے کر ایک گلی میں پھنسی گیا تھا۔ اچانک کوئی چلنے کی آواز آتی ہے، مہلک زخمی ڈرائیور گاڑی کے اسٹیرنگ پر گر جاتا ہے، گاڑی پکڑا کر ایک باڑ سے ٹکرا جاتی ہے، اور ایک ماں اور تین بچوں پر چڑھ جاتی ہے۔ ماں اگرچہ شدید

زخمی ہوئی مگر بچ گئی جب کہ اس کے تینوں بچے موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔
اس علاقے میں جہاں تین بچے ہلاک ہوئے تھے ایک گھریلو خاتون رہتی
تھی۔ اس نے کار کے باڑ سے کمرانے کی آواز سنی اور جوں ہی وہ موقع کی طرف
دوڑ کر پہنچی، اس کی آنکھوں میں خوف کا پورا منظر سامنے آیا۔ اسی لمحے اس عورت کے
دماغ میں کچھ ہو گیا: ایسا ہوا جیسے کوئی ہندو ٹوٹ گیا ہو۔

اس گھریلو عورت اور ان ہلاک ہونے والے بچوں کی خالہ نے مل کر قدم اٹھایا۔ انسانیت کے اور
امن کے نام پر ایک مہم کا آغاز کیا۔ لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنا گیا، کے مصداق ذاتی سطح پر شروع
کی گئی مہم آگے چل کر کائناتی سطح تک موثر ہو گئی۔ یہ ہے انسان کی محنت، لگن اور جذبہ صادق سے آغاز کی گئی
جسکو کا حاصل۔ محض یہ واقعہ ہی ہمارا غمناک کرنا دینے کے لیے کافی ہے، لیکن میں آپ کو سچائی سے بتاتا ہوں
کہ اس عام گھریلو عورت نے جو خطبہ دیا ہے، وہ بھی روکنے کھڑے کر دینے والا ہے۔ اس نے جنگ اور
اسلحے پر اٹھنے والے اخراجات کا ایک بالکل الگ تناظر پیش کیا ہے، ذرا ملاحظہ فرمائیے:

ہر منٹ 500,000 ڈالر جنگ پر اور جنگ کی تیاریوں پر خرچ ہو رہے ہیں! جب
کہ ان میں سے ہر ایک منٹ میں آٹھ سے زیادہ انسان بے توجہی کی وجہ سے مر
جاتے ہیں۔ ہر دن 12,000 انسان بے توجہی، نا کافی غذا اور بد بختی کی بھیشت
چمچہ چلتے ہیں، پھر بھی ہر روز 720 ملین ڈالر فوجی ساز و سامان پر خرچ کیے
جاتے ہیں۔ مگر اس دیوانی ترجیح پر غور تو کیجیے: جب لوگ مر رہے ہوں تو آخر
ہمارے پاس سوچنے کے لیے وقت تو ہونا چاہیے! ذرا اس طرح بھی سوچیے: اگر
کسی طرح اسلحہ جات کا ایک منٹ کا 500,000 ڈالر کا خرچ بچا لیا جائے اور ان
12,000 افراد میں تقسیم کر دیا جائے جو اس دن مارے جانے والے ہیں تو ہر ہر
قسمت کوئی منٹ چالیس ڈالر سے کچھ زیادہ مل جائیں گے تو بد بختی میں مرنے
کے بجائے وہ عیش میں زندگی گزار سکیں گے۔ اگر پورے ایک دن اسلحے پر ہونے
والا خرچ بچا لیا جائے تو ان بارہ ہزار پر 720,000,000 ڈالر تقسیم ہوں
گے۔ گویا ہر ہر قسمت کو اس ایک دن میں 60,000 مل جائیں گے۔ اس قسم کی
مربضانہ ترجیحات کیا پیش کر رہی ہیں! ایک ناپاک درجے کی دولت آزادی اور
سوشلزم کی حفاظت کے نام پر خرچ کر دی جاتی ہے۔ بلاشبہ شاید مرے ہوئے اور
مرنے والے مطمئن ہوں گے کہ آزادی اور سوشلزم کتنی مہارت اور زیرکی سے
بچائی جا رہی ہے۔

دیکھا آپ نے، یہ ہے دیکھنے کا الگ زاویہ جو انسانیت کو موت کے پنجوں سے نکال کر زندگی کی

طرف لے آتا ہے، جو امن پر، جمہوری اور منصفانہ معاشرت پر اور انسان پر ہمارے اعتبار کو نیا استحکام عطا کرتا ہے اور ہمارے اندر زندگی گزیدہ انسان کو زندگی پر اور انسان بننے کی خواہش عطا کرتا ہے۔

”نوبل امن کے سوہرے“ کی یہی وہ بے مثال خصوصیت ہے جو اس کتاب کو نظریات کا اور افکار کا پائندہ بنانے کی بجائے زندگی کی اور زندہ رہنے کی آرزو کی دستاویز بنا دیتا ہے۔ اسے ایک عہدے کی سطح پر لے آتا ہے جو انسانی فطرت میں خیر کے جوہر کا ثبوت ہے اور اس سے انسانیت کے کمٹ منٹ کا اظہار بھی۔ اس لیے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب لائبریری میں یا شیف میں آنے والی نئی اور خوب صورت کتابوں میں اضافہ نہیں ثابت ہوگی بلکہ یہ آج کے انسان کے لیے جو خوف، دہشت گردی اور قلت آمیز ہتھکنڈوں کے نرغے میں ہے، زندگی بخش پیغام ثابت ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے والے ہمارے معاشرے میں تو پھیلنا ہی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے ہمارے مقتدر سیاست دانوں کو بھی بار بار پڑھنا چاہیے تاکہ انھیں معلوم ہو کہ اپنے ملک کے لیے اور انسانیت کے لیے کام کرنے والے انسان اپنے خطے میں اور اپنے اپنے شعبے میں کس کس طرح سوچتے اور کس انداز سے کام کرتے آئے ہیں اور اب اگر انھیں فلاح مقصود ہے تو انھیں کس طرح کام کرنا چاہیے، اپنے وطن، اپنی قوم اور پوری انسانیت کے لیے۔

اب رہی بات باقر نقوی کے ترجمے کی۔ ہم اب تک سنتے آئے ہیں کہ خوب صورت ترجمہ اصل متن سے باوفا نہیں ہوتا اور اگر باوفا ہو تو خوب صورت نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ باقر نقوی نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ خوب صورت یا معیاری ترجمہ اپنے متن سے باوفا بھی ہو سکتا ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ ترجمے کی خوب صورتی یا معیار کی بنیادی شرائط میں اس کا متن کے قریب تر یا باوفا ہونا بھی شامل ہے۔ باقر نقوی کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر باسہولت اور یکساں قدرت حاصل ہے اور ان میں ترجمے کی بہت غیر معمولی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس وقت جو لوگ نہایت اعلیٰ درجے کا ترجمہ کرتے ہیں، ان میں باقر نقوی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ وہ جس سلاست، روانی اور متن کی روح میں اتر کر ترجمہ کرتے ہیں، وہ بے مثال اور شان دار داد کا مستحق ہے۔

پہلے ”نوبل ادبیات“ اور اب ”نوبل امن کے سوہرے“ کی صورت میں انھوں نے ترجمے کے میدان میں جو قابل رشک کارنامے سرانجام دیے ہیں، وہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں انھیں جاودا مقام دلانے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن یہاں میں اپنی ایک خواہش کا بھی اظہار کرنا چلوں تو کیا مضائقہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہوا اگر باقر نقوی صاحب اب اس کام کے فوراً بعد سائنس کے شعبے کے حوالے سے بھی ایسا ہی ایک اور بڑا کام سرانجام دینے میں مصروف ہو جائیں۔ میں پودے یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اردو کی عظیم خدمت ہوگی، بلاشبہ۔ خدا انھیں ہمت دے۔ اس وقت میں باقر نقوی صاحب کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں، اس کتاب کے شان دار تراجم پر اور ساتھ ہی ساتھ اکادمی بازیافت کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں اس قابل قدر کام کی اہمیت پر۔

سرخ ہائے گفتنی

الفریڈ نوتیل نے اپنی مشہور زمانہ وصیت میں لکھا تھا:

ایسا بہت جلد ہونے والا ہے کہ تمام ریاستیں خود اپنے آپ سے عہد کریں گی کہ وہ سب مل کر جارحیت کرنے والے پر حملہ کریں گی۔ اور یہی طریقہ جنگ کو ناممکن بنائے گا، بلکہ بے رحم ترین اور نامعقول طاقت کو بھی ایک ثالثی عدالت کے سامنے فریاد کرنی پڑے گی، یا پھر وہ خاموش ہو کر بیٹھ رہے گی۔ اگر سرور کئی اتحاد [ماروے، سوئڈن اور ڈنمارک] میں تین ریاستوں کے بھلے سر ریاست شامل ہو جائے تو صدیوں کے لیے امن یقینی ہو جائے گا۔

یاد رہے کہ الفریڈ نوتیل نے 1896 میں انتقال کیا تھا اور یہ جملے چند برس پہلے لکھے گئے تھے۔ اس زمانے میں بھی جنگیں ہوتی تھیں، مگر اتنی مہیب نہیں جتنی کہ نوتیل کے بعد ہوئی ہیں۔ پھر اٹھارہ برس بھی نہیں گزرے تھے کہ دنیا نے پہلی عالمی جنگ کی تباہی دیکھی، جس میں جرمنی اور روس کو شکست ہوئی تھی۔

پھر کیا ہوا؟ کیا جنگیں رک گئیں؟

جی نہیں!

پہلی عالمی جنگ کے پچیس تیس برس بعد ایک بار پھر، اوروں کے ساتھ، جرمنی اور روس جنگ کے میدان میں کود پڑے اور جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اب پچاس ساٹھ برس بعد، جو تاریخ کے اعتبار سے بہت مختصر عرصہ ہوتا ہے، ہم ایک بار پھر ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جس میں انصاف کے نام پر ایسی نا انصافیوں کی ابتدا ہوئی ہے کہ یہ ہمارا بھرا، گلاب، بڑگس، سون، گل، مہر، کنول، گیندے، موتیا، پیسے اور چینی کی جاں فزا خوش بوؤں اور طرح طرح کے کڑوؤں رنگوں سے مزین کردہ ایک بار پھر بارود، انجم، کیمیا،

مہمات، راکٹ اور بخارات کے بھیاں کمرکات کے سامنے حیران کھڑا سوچ رہا ہے کہ اب کیا ہوگا؟ ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ ہم، روز بہ روز، امن کی جستجو کے بہانے، بادلوں کا خواستہ بڑی تہی کے غار کے وہانے کی طرف سرکتے جا رہے ہیں۔ ہمارا حال اس کسرت کرنے والے کا سا ہے جو ایک ہی مقام پر رکھی مشین پر میلوں دوڑتا رہتا ہے مگر اصل وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے بڑھنا نہیں ہوتا۔

نوٹیل امن کے سوچیں کتاب ہی نہیں، ایک دستاویز ہے ان باتوں کی، ان واقعات اور ان رجحانات کی جن پر نظر ڈالنے سے احساس ہوتا ہے کہ ایک صدی کی محنت کے باوجود ہم امن کے لحاظ میں بھلے اخلاقی، تہذیبی اور عالمی ترقی کے تیزی کی طرف بڑھتے رہے ہیں۔ سوچیں پر محیط اس دستاویز کو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج سے قبل بھی ہم آج ہی کے سے عالمی انداز میں سوچتے تھے۔ بس فرق اتنا تھا کہ اس وقت سائنس کے کوششے اتنے سریع، اتنے وسیع اور اتنے عام نہیں ہوئے تھے۔ بالخصوص امن، اور اس کی دشمنی، کے بارے میں اس وقت بھی وہی سوچ تھی آج جسے ہم دہراتے رہتے ہیں۔

ہمیں ویں صدی کے معاملات پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ انسانیت نے تمام شعبوں میں بہت ترقی کی ہے مگر جنگ، اسلحہ بندی، تنازعات میں ترقی مشکوک ہی نظر آتی ہے۔ ترقی مشکوک اس لیے کہ اسلحوں کے زیادہ بھیاں، زیادہ ہلک اور خوں خوار ہونے کو ترقی تو نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ جب ہم تمدن کی بات کرتے ہیں تو قدیم انسان کو اس لیے غیر ترقی یافتہ کہتے ہیں کہ وہ وحشی تھا، ظالم تھا، اور خود غرض تھا۔ تو کیا آج کا انسان کم وحشی ہے، کم ظالم ہے اور کم خود غرض ہے؟

ہم نہیں ویں صدی کے شروع سے امن پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ باوجود ان تھک کام اور بلند ہوتی ہوئی خواہشات کے امن مستحکم ہونے کے بجائے نازک سے نازک تر ہوتا جا رہا ہے۔

مثال کے طور پر، میں 1905 میں دیے گئے بیرونی برقی فنانسٹر کے نوٹیل خطبے میں ظاہر کیے گئے خدشات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جن کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مدبر نہیں، ایک عجیبی جو آئندہ ہونے والے واقعات کی پیش بینی کر رہی تھی:

آئیے، اب ہم پوری دنیا میں نظر دوڑاتے ہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم امن پسند ترقیات اور ان کے مثبت نتائج کے حصول کے دعووں میں حق بجانب ہیں بھی کہ نہیں۔ حال ہی میں مشرقی بعید میں دنیا کی تاریخ کی [روس اور جاپان- 1904-1905] ایک بدترین جنگ ہوئی ہے۔ اس جنگ کے بعد ایک انقلاب آیا جو اس جنگ سے بھی زیادہ ہول ناک تھا، جس نے وسیع روسی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا تھا، ایسا انقلاب جس کے حتمی نتائج کا ابھی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں آتش زنی، وکیتی، بمباری، موت کی سزاؤں، قیدیوں سے کھینچا کھینچا بھرے قید خانوں، تشدد اور قتل عام کی خبریں مل رہی ہیں، مختصر یہ کہ شیطانی تشدد کا رقص جاری ہے۔ اسی دوران، مرکزی اور مغربی یورپ میں، جو جنگ سے بال بال بچ

گیا تھا، ہنگامی، دھمکیاں، ٹھواری جھکار، بخار زدہ بحری عسکریت اور اسلحہ بندی کا دور دورہ ہے۔ انگلستان، جرمنی اور فرانس میں ماول لکھے جا رہے ہیں جن میں مستقبل میں ہمسایہ ممالک کی جانب سے اچانک حملے کے پلاٹ پیش کیے جا رہے ہیں جن کے باعث اسلحہ بندی کا پاگل پن زیادہ تیزی سے پھیل رہا ہے۔ دفاعی قلعے تعمیر کیے جا رہے ہیں، آہوز کشتیاں تیار کی جا رہی ہیں، پورے کے پورے علاقے بارودی مرگموں سے خطرناک بنائے جا رہے ہیں، جنگ میں استعمال کے لیے غبارے جہازوں (airship) کے تجربے کیے جا رہے ہیں، اور یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو رہا ہے گویا اب ہمسایے پر حملہ کرنا ہی ریاستوں کا ناگزیر فریضہ رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ دوسری جنگ کانفرنس کا پروگرام دیکھ کر (جو 1907 میں ہونے والا ہے) ایسا لگتا ہے جیسے کہ یہ امن کانفرنس نہیں جنگ کی کانفرنس ہو۔ ان ماری صورتوں کے پیش نظر، کیا لوگ اب بھی یہی کہتے رہیں گے کہ امن کی تحریک فروغ پا رہی ہے؟

106 برس قبل برحقا یہ کہہ رہی تھی۔ اگر میں کچھ آج کے بارے میں کہا جائے تو بڑی حد تک صحیح معلوم ہوگا۔ تو کیا ہم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر واقعی کہہ سکتے ہیں کہ ہماری دنیا نے امن کے معاملے میں کوئی ترقی کی ہے؟ صرف برحقا ہی نہیں، تقریباً سب ہی اسی قسم کی باتیں کرتے آئے ہیں۔ اس مقام پر میں 1930 میں دیے گئے آرمی بشپ سوئڈر بلوم کے نوٹیل خطبے سے اس کے ایک دوست کے لکھے خط کا بھی اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں جس میں اگرچہ مابعد جنگ کے تجربات پیش کیے گئے ہیں مگر اس میں جو درد مندی ہے، جو پکار ہے، جو مایوسی ہے وہ پڑھنے والے کا دل کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ دنیا نے ابھی تک پورا خون نہیں دیکھا ہے، جو انسانی ہوش و حواس، گناہ، رشک اور ظلم کی خاطر بہا یا گیا تھا

اس دن جنگ بندی کے ہمراہ بنگل، جھنڈے اور خوشیاں نہیں تھیں، بلکہ اس دن تو وہ ایک قبر سے دوسری قبر، ایک میدان سے دوسرے میدان، ٹنگرائی پھر رہی تھی ہمارے کانوں کو اب بھی اپنے ذہنی دوستوں کی موت کی کراہیں سنائی دیتی ہیں اسلموں کی پچاسیم شتم ہو گئی ہے، انسان دیوالیہ ہو چکا ہے، لوگ تھک کر رختہ ہو چکے ہیں، اس بات پر خوش ہیں کہ موت سے بچ لگے ہیں۔

انسان نے اپنے ہتھیار ڈال دیے ہیں اس کو فتح نہیں کہا جاتا، یہ تو تمام حربوں کی شکست ہے!

مختصروں میں لپٹے، بیمار، بھوکے اور بدحواس لوگ بے مقصد تباہ شدہ میدانوں میں پھرتے دکھائی دیتے ہیں عارضی جنگ بندی کی بھیانک خاموشی میں وہ اپنے راستے تلاش کرتے پھر رہے ہیں، اُن

مٹروں کی یاد میں ہیں جو کہیں تھے، کبھی تھے
عظیم دنیا دے چکی ہے، منظم طاقت ٹوٹ پھوٹ چکی ہے، پرانے خدا خون اور نفرت سے آلودہ
ہو گئے ہیں

اب پرانے کپڑوں کو جلانا پڑے گا، خون بھری وردیاں اب کسی کام کی نہیں رہی ہیں، اب نہ یہ
بچوں کو ڈرا سکتی ہیں، نہ جانوں کو سمجھا سکتی ہیں
تمغے اور اعزازات اب خجاعت کے نشان نہیں رہے، اب یہ بندھن بن گئے ہیں، مرقی ہوئی لعل
کے بندھن۔ اسلحے خون کا مزہ بھول چکے ہیں
اب موت کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں، ندوہ آوازیں جو کبھی مٹی کے نیچے سوئے ہوئے لبوں سے نکلا
کرتی تھیں

جن لوگوں کو ہم سے چھین لیا گیا ہے، شاید ان کے دلوں سے بنی کھا دیا رہے بعد پھولوں کو زندگی
دے رہی ہے۔ مگر، ان ہی دلوں سے خواب اچانک چھین لیے گئے تھے
جنگ کو محبت کے بھلے نفرت سکھائی تھی

وہ ہاتھ جو ایک دوسرے کو پیار سے سہلانا چاہتے تھے اب شکور رہے ہیں
وہ لب جو اچھی اچھی، پیاری پیاری باتیں کرنے کے آرزو مند تھے مرجھا گئے ہیں
زندگی چہ انی گنی ہے اس کی جگہ موت حطا کر دی گئی ہے
پھول اب انتقام کی بات نہیں کرتے اور ان دلوں سے پھوٹ کر نکال رہے ہیں جنہیں گرم جوشی سے
یا د کیا جاتا ہے، تلخ حقیقت میں پیوستہ، اب وہ صرف خوابوں میں کھیل رہے ہیں
ہوا میں پھڑ پھڑاتے پھرے، اور گرجتے ہوئے دھول، تازہ ہواؤں اور نیلے آسمانوں کے نیچے
پھیلے ہوئے ہیں

گھوڑوں کے محموں کی مپ مپ، دھول کی تھاپ، اور جم جم کرتے ٹھل کی چٹکھاڑا گے آگے چلتی ہے
آدمی ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں
چینٹیس اور پچوس کی عمر والے نہیں کہ ان کے دلوں میں اب کوئی خواہش باقی نہیں رہی اب ان کو نہیں
بلایا جاتا

مگر ابھرتے ہوئے، ان نو جوانوں کو بلایا جاتا ہے، جنہیں نئے خدا، نئے خیالات، نئے خواب اور
نئے فرائض سوئے جانے والے ہیں
ان نو جوانوں کو جنہیں ایک نئی دنیا بنانی ہے؟
... بے چاری دنیا!

میرے اکثر دوست مجھ سے پوچھتے رہے ہیں کہ بالترجمہ اس کتاب کے لیے اتنی عرق ریزی، اتنی
محنت اور اتنا وقت کس لیے صرف کرتے ہو؟ یہ دنیا سدھرنے کے بجائے تباہی کی طرف بڑھتی جا رہی

ہے اہم نے خود بھی تو دیکھا ہے کہ جنگ کے حوالے سے حالات بہتر نہیں ہوئے ہیں۔ انسان کو میرا جواب یہ ہوتا تھا کہ میں پڑھنے والوں کو ماشی کا آمیزہ دکھا کر مستقبل کے لیے بہتر سوچنے کے لیے تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہوگی کہ بالخصوص وہ جو اقتدار کی خواہش کرتے ہیں، اس دستاویز کے مندرجات کا نصاب کی کتب کی طرح مطالعہ کریں۔ انسان صرف اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر ہی عالم نہیں بن جایا کرتا۔ اس کو مطالعہ کرنا چاہیے، مطالعہ — کہ مطالعہ ہی عالم بناتا ہے، مدبر بناتا ہے، اور سکھاتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

اس سے قبل شائع ہونے والے میری کتاب ”نوٹیل ادبیات“ دنیا بھر کے عظیم ترین ادیبوں کی شاہکار تحریروں پر مشتمل تھی، جب کہ زیر نظر کتاب میں مستند ادیبوں کی تحریریں نہیں، سیاست دانوں اور امن کے لیے کام کرنے والوں کی تحریریں ہیں، مگر ان لوگوں کے خطبات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ لوگ مدبرین ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب بھی تھے۔ بات یہ نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم ادیب لوگ ایک انداز میں لکھنے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور جب کوئی غیر ادیب لکھتا ہے تو اس کا انداز مختلف ہوتا ہے، اس لیے وہ زیادہ تازہ اور خوش گوار ہوتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں ان برسوں کے ابواب شامل نہیں ہیں جن میں افراد کے بچائے اداروں کو انعامات دیے گئے تھے۔ کئی انعام یافتگان نے خطبے نہیں دیے تھے۔ کچھ نے صرف پیغامات ہی بھیجے تھے جن کے تراجم شامل کر دیے گئے ہیں۔ تقاری کی سہولت کے لیے ہم نے فہرست میں انگریزی حروف میں انعام یافتگان کے نام اور برصغیر بھی شامل کر دیے ہیں۔

اس کتاب کی عبارت کے درمیان قاری کو کچھ متن [] اس نوعیت کی قوسین میں نظر آئے گا۔ یہ مترجم کی طرف سے سہولت کے لیے، یا مندرجات کی تشریح کے لیے، شامل کی گئی عبارت ہے۔ غیر ملکی زبانوں کے نام اردو میں دیے گئے ہیں، ساتھ ہی نامانوس ناموں کو () اس قسم کے قوسین میں انگریزی میں بھی درج کر دیا گیا ہے تاکہ تحقیق کرنے والوں کے لیے آسانی ہو۔

میری پچھلی کتاب ”نوٹیل ادبیات“ کی جتنی پڑی آئی ہوئی میرے گمان میں بھی نہیں تھی۔

”نوٹیل ادبیات“ کی اشاعت کے فوراً بعد سے ہی سے ہندو پاک کے رسائل اور اخبارات میں مضامین شائع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر رؤف پارکھی، زاہدہ حنا، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، امجد اسلام امجد، شفیق عقیل، رفیع الزماں زبیری، فراست رضوی، پروفیسر علی حیدر ملک، ڈاکٹر سلیم اختر، اے عیام، صبا اکرام، رضی مجتبیٰ، ڈاکٹر انوار احمد، خالد احمد، ”چہار سو“ کے مدیر گلزار جاوید، ہندوستان کے رسالے ”ذہن جدید“ کے مدیر زبیر رضوی، لندن کے رسالے ”پرواز“ کے مدیر صابر ارشد عثمانی، ایڈیٹر اسکاٹ لینڈ کے ڈاکٹر حسن بیگ کا شکر گزار ہوں کہ ان حضرات نے اس کتاب پر رسائل اور اخبارات میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ یہ وہ نام ہیں جن کی تحریریں مجھ تک پہنچ سکی ہیں۔ ہو سکتا کہ اور بھی ہوں، مجھے جن کا علم نہیں۔ بحریہ کے ذریعے بھی لوگوں نے میری بہت افزائی فرمائی اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

”نوبل ادبیات“ کی قبولیت اور اس کو پاکستان کے اس وقت کے سب سے بڑے غیر سرکاری اعزاز UBL-Jang Literary Excellence Award سے نوازے جانے سے میری ہمت میں اضافہ ہوا۔ ٹورنٹو، کناڈا کی ایک تنظیم نے بھی اس کتاب کو ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے جس کی تقریب اگلے برس ہوگی۔ لاہور سے شائع ہونے والے خالد احمد کے رسالے ”بیاض“ نے اپنے ایک شمارے کا سرورق ”نوبل ادبیات“ کے سرورق ہی کو بنا کر ایک بالکل نئے انداز میں اس کی پذیرائی کی۔

انٹرنیٹ کے ذریعے وصول ہونے والے پہلے پیغام نے میرے دل کو چھو لیا تھا جسے میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ یہ پیغام اردو زبان میں درویش علی صاحب کی جانب سے آیا تھا جن سے میری واقفیت نہیں۔ پیغام کے الفاظ تھے:

عرض ہے کہ آپ نے ہم جیسے انگریزی نہ جاننے والوں پر (دل کی کہانیوں سے کہتا ہوں کہ) ”نوبل ادبیات“ لکھ کر جو احسان عظیم کیا ہے اس تشکر کو ظاہر کرنے والے الفاظ بنے ہی نہیں ہیں۔ آپ کی محنت کو جھٹک کر دونوں ہاتھوں سے سلام کرتا ہوں۔ دعا گو ہوں کہ خالق کائنات آپ کو جسمانی اور معاشی خوشی کے ساتھ ایک لمبی عمر عطا کرے۔ شاید اس دعا میں میرا مفاد بھی پوشیدہ ہو کہ باقر نقوی صاحب ”نوبل ادبیات“ کی طرح کے تراجم اردو داں طبقے کو دے سکیں تاکہ دماغ کے پردے دا ہو سکیں۔

درویش علی صاحب کی دعا قبول ہو گئی ہے، کہ ”نوبل امن کے سو برس“ کی صورت میں مزید تراجم پیش خدمت ہیں۔

میں اس کتاب کی تیاری کے دوران ہمت افزائی کے لیے پروفیسر ڈاکٹر عقیل رضوی، پروفیسر سحر انصاری، زاہدہ حنا، سلیم یزدانی، مہدی امام، اسرار گاندھی، صابر ارشد عثمانی، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، پیارے دوست احمد رشید، فرخ سلیم، سمن مرزا، اکبر حیدر قبادی اور اپنی شریک حیات فیروزہ کا شکر گزار ہوں کہ ان سب کی دلچسپی اور ہمت افزائی سے اس ضخیم کتاب کی تکمیل ہوئی۔

خدا کرے کہ اب دنیا میں امن کا بول بالا ہو!

باقر نقوی

لندن

6 ستمبر 2011

Email: baqar@baqarnaqvi.com

کم ڈے نیٹ

اعلان تجلیل

جغالت مآب، دودمان مٹائی کے ارکان، عائی مرتبت خواتین و حضرات! مارویائی نوتیل کمیٹی نے 2000 عیسوی کا امن انعام کم ڈے نیٹ کو عطا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ انعام ان کی اس جدوجہد کے صلے میں دیا جا رہا ہے جو انہوں نے اپنی تمام زندگی جنوبی کوریا میں، بالعموم جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے، اور بالخصوص امن کے حصول اور شمالی کوریا سے مصالحت کے سلسلے میں کیا ہے۔ ہم ان کو حیرت میں محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک سوال اٹھایا گیا تھا، ”کیا یہ انعام محض مصالحت کی کوششوں کے لیے دیا جاتا ہے یا اس وقت نہیں، اس لیے کہ یہ کوششیں تو ابھی شروع ہی ہوئی ہیں؟“ اس کے جواب میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ دو کوریائی ریاستوں کے مابین کم ڈے نیٹ کی جانب سے انسانی حقوق کے سلسلے میں کی ہوئی کوششوں ہی نے ان کو اس انعام کا حق دار ٹھہرا دیا ہے۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ شمالی کوریا سے موافقت کے سلسلے میں ان کی پامردی، اور خصوصاً پچھلے برس کے دوران ان سے حاصل ہونے والے نتائج نے ہی اس انعام کے لیے کم ڈے نیٹ کی حق داری میں نئے اور اہم ابعاد کا اضافہ کر دیا ہے۔

بین الاقوامی امن کے سلسلے میں ہونے والی پہچانی ہی کے پیش نظر نوتیل کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہمیں اس بنیادی اصول پر توجہ دینا چاہیے ”کہ کچھ نہیں کرو گے، تو کچھ پاؤ گے بھی نہیں۔“ لہذا امن کا یہ انعام صلہ ہے ان اقدامات کا جو اس وقت تک کیے گئے ہیں۔ بہر حال، جیسا کہ امن کے انعام کی تاریخ کے سلسلے میں ہوتا آیا ہے، اس برس بھی یہ انعام ہمت خیزی کے لیے دیا جا رہا ہے تاکہ امن اور موافقت و مصالحت کے طویل راستے پر قدم آگے ہی کی طرف بڑھتے رہیں۔

کسی حد تک یہ ہمت ہی کا معاملہ ہے کہ کم ڈے نیٹ اپنے ارادوں پر پامردی سے قائم رہنے کو چاہے

سے ہی پچاس برس کے دوران اٹلی ہونی دشمنی کی دیوار کو توڑ کر بٹائے باہمی کا ہاتھ اس مرحلہ کے پار تک بڑھانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو شاید آج کی دنیا کی سب سے زیادہ نگاہ داشتہ مرحلہ ہے۔ ان کی شخصیت ایسی سیاسی ہمتوں کا نشان رہی ہے جس سے بد قسمتی سے، دوسرے متنازعہ علاقوں میں اکثر نہیں پائی جاتیں۔ امن کا معاملہ بھی کچھ ہماری زندگیوں جیسا ہی ہوتا ہے جس میں ہم بلند و بالا کو ہمارا پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلا قدم ہی سب سے مشکل قدم ہوتا ہے۔ مگر آخری مسکورگیں لچات میں تو آپ کو بے شمار سائنسی مل جایا کرتے ہیں۔ اسے وگنر (Stavanger) کے Gunnar Roaldkvam نامی ادیب نے ان کیفیات کو کتنی مرادگی اور مناسبت سے اپنی نظم ”آخری قطرہ“ میں پیش کیا ہے:

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ہم نے
پانی کے دو قطرے دیکھے
ایک، جو پہلا بن کر چکا
دوسرا آخری قطرہ تھا

پہلا قطرہ سب سے بہادر
سب سے ہمت والا تھا

مجھ کو گرا چھا لگتا تھا
آخری قطرہ بن کر گرا،
وہ قطرہ جو آخر ہم کو
منزل پر پہنچائے
جہاں ہمیں آزادی ہو

لیکن میں اس سوچ میں ٹم ہوں
پہلا قطرہ کون بنے گا؟

آج کم ڈے جنگ جمہوری جنوبی کوریا کے صدر ہیں۔ اقتدار کی منزل تک کا راستہ طویل، بہت طویل تھا۔ انہوں نے کئی عشروں پر محیط ایک آمرانہ حکومت سے بد ظہر ہارنے والا جنگ کی تھی۔ ان سے یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ آپ میں اتنی طاقت کہاں سے آئی۔ اب ایسے سوال کا جواب بھی سن لیجیے۔ ”میں نے آمرانہ حکومتوں کی مزاحمت میں اپنی تمام طاقت استعمال کی ہے، اس لیے کہ اس کے سوا عوام کی حفاظت اور جمہوریت کو تقویت پہنچانے کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ میں خود کو ایک ایسا مالک مکان جیسا محسوس کرتا تھا جس کے گھر میں ڈاکو ٹھس آئے ہوں۔ اپنی حفاظت کی پروا کیے بغیر مجھے دراندازوں سے اپنے خاندان، اور مال و اسباب کی حفاظت کے لیے یہی جنگ کرنی تھی۔“

کم جب صدی کے پانچویں عشرے میں قومی اسمبلی کے چناؤ میں حصہ لے رہے تھے تو سرکاری

امیدواروں کے علاوہ تمام امیدواروں کے خلاف سرکاری طاقت کا استعمال کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں کم قومی اسمبلی میں منتخب ہونے میں کامیاب تو ہو گئے مگر اس برس کی کامیابی دیر پا کامیابی نہیں تھی کہ تین دن بعد ہی ایک فوجی بغاوت برپا ہوئی اور اسمبلی تحلیل کر دی گئی۔ کم نے ہار نہیں مانی۔ تقریباً دس برس کی مسلسل آن تھک سیاسی جدوجہد کے بعد، بالآخر انھوں نے قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنی جگہ بنائی۔ حزب اقتدار نے ان کو خریدنے کی پوری کوشش کر ڈالی مگر کم برائے غرور سخت شے نہ تھے۔

1971ء میں کم ڈے بنگلہ نے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا اور تمام تر دھاندلی کے باوجود چھپالیس فی صد ووٹ حاصل کر لیے۔ فوجی حکومت کی لیے یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ نتیجے کے طور پر ان کو بطور عرصے تک پہلے قید کیا گیا، انھوں نے گھر میں نظر بندی چھلی اور پھر جاپان و امریکا میں جلاوطنی کے دن گزارے۔ ان کو اغوا کرنے اور جان سے مار دینے کی کوششیں بھی کی گئیں۔ ان تمام آزمائشوں کے باوجود کم امرانہ حکومت کے مقابلے میں اپنی بے باک مخالفت سے باز نہیں آئے۔

مارویائی Spring کے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے میں نے 1979ء میں جنوبی کوریا کا دورہ کیا تھا جس کے دوران کم ڈے بنگلہ کے حامیوں سے میرا رابطہ بھی ہوا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے ایک کڑی کی حیثیت سے کم کے اسکینڈل کی رابطوں میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

قید و بند کے سخت حالات میں بھی، کم ڈے بنگلہ نے زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی صورت نکال لی تھی۔ وہ اپنی ناقابل شکست خوش امید کی وجہ سے قید خانوں میں حاصل ہونے والی خوشیوں کے بارے میں لکھتے بھی رہے۔ دینیات، سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور ادب پر ہر قسم کی مشرقی اور مغربی کتابیں ان کے مطالعے میں رہیں۔ انھوں نے اپنے اہل خاندان سے مختصر ملاقاتوں، قریب ترین دوستوں کے آنے والے خطوط اور ان کے جواب لکھ سکنے کے مواقع نکال کر اپنی مصروفیات کو دلچسپ بنایا۔ اس کے علاوہ جیل کے اندر ہی ایک چھوٹے سے قطعہ زمیں پر روزانہ ایک گھنٹہ باغبانی میں صرف کرنے کی بھی انھیں اجازت ملی ہوئی تھی۔

کم ڈے بنگلہ کی کہانی ان جیسے دوسرے انعام یافتگان، بالخصوص نلسن مینڈیلا اور آندرے سٹاروف کے تجربات سے بہت ملتی ہے۔ ان کے علاوہ مہاتما گاندھی سے بھی، جن کو انعام تو نہیں ملا تھا، مگر وہ اس کے حق وارضور تھے۔ ذرا فاصلے سے دیکھنے والوں کو اس قسم کے ناقابل تغیر جذبات کم ڈے بنگلہ کو ایک ٹھہر بیومن کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ اس نقطے پر بھی Laureate نہایت متین نظریے کے ساتھ کہتے ہیں۔ ”لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بہت حوصلہ مند انسان ہوں، اس لیے کہ میں چھ سات بار جیل جا چکا ہوں اور میں نے بار بار اپنی زندگی میں موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ میں آج بھی ویسا ہی مزدول ہوں جیسا کہ لڑکپن میں تھا۔ ان تمام تجربات کے باوجود جو مجھے اپنی زندگی میں ہوئے ہیں، مجھے قید و بند سے خوف نہیں آتا۔ مگر جب بھی مجھے اسیر کیا گیا ہے میں خوف زدہ بھی ہوا ہوں اور پریشان بھی۔“ اس درجے کی خود غمی

انسان کو ہمت کی ڈگر سے ہٹا نہیں سکتی!

کم ڈے یٹنگ نے 1987 اور 1992 کے صدارتی انتخابات میں بھی حصہ لیا تھا۔ اگر فوجی حکومت ان کے راستے میں نہ بھی کھڑی ہوتی، تب بھی، ایسے ملک میں جسے علاقائیت نے تقسیم کر رکھا ہو ان پر الزام لگا دیا جاتا تھا کہ ان کا ایک غلط علاقے سے تعلق ہے۔ بالآخر، جدو جہد کی صعوبتوں سے تھک کر کم ڈے یٹنگ نے 1992 کے انتخابات کے بعد عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

مگر 1997 میں کم ڈے یٹنگ کو ایک نیا موقع نظر آیا۔ اور ان کے سیاسی دشمنوں کے آپس میں شدید اختلافات کے باعث فوجی حکومت کا سب سے بڑا مخالف صدر چن لیا گیا۔ یہ واقعہ اس بات کا ثبوت تھا کہ بالآخر جنوبی کوریا کو دنیا کی جمہوریتوں میں ایک مقام مل گیا تھا۔

نئے صدر کو انتقام کا خیال ضرور آیا ہوگا۔ اس کے بھلے، جیسا کہ نیشنل مینڈیلا نے کیا تھا، کم ڈے یٹنگ نے اپنی سیاسی شہنشاہت میں درگزر اور مصالحت کے مضبوط تحفے لگائے اور نیشنل مینڈیلا ہی کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ کم ڈے یٹنگ نے بھی درگزر کی راہ اپنائی، حتیٰ کر ناقابل معافی حرکات کے بارے میں بھی دریا دلی دکھائی۔

جو کچھ ہوا وہ ایک سیاسی انقلاب تھا۔ مگر انقلاب کے بعد بھی پرانے دور کے کچھ نقوش باقی رہ جایا کرتے ہیں۔ جمہوری تناظر میں دیکھا جائے تو، جنوبی کوریا کو قانونی اور حقائق نظام کے اصلاحات کے سلسلے میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ایٹمی انٹرنیشنل کے مطابق جنوبی کوریا کے قید خانوں میں اب بھی طویل عرصے کے سیاسی سزایا فتنہ محبوس ہیں۔ کچھ لوگ اصرار کرتے ہیں کہ منظم محنت کشوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا جاتا۔ اس ضمن میں ہمارا جواب یہ ہے کہ ہمارے خیال میں کم ڈے یٹنگ اس جمہوری عمل کی تکمیل کریں گے نصف صدی سے وہ جس کے سب سے بڑے داعی رہے ہیں۔

آج کل ایشیا میں انسانی حقوق کی موجودہ کیفیات کے بارے میں ایک اہم بحث جاری ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی حقوق کا شبہ مغرب کا چھوڑا ہوا ہے جس کے استعمال کے ذریعے مغرب اپنی سیاسی اور تہذیبی برتری مسلط کرنا چاہتا ہے۔ کم ڈے یٹنگ اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتے، اسی طرح جیسے وہ اس خیال سے بھی انکار کرتے ہیں کہ انسانی حقوق کے کائناتی تناظر میں کچھ خاص نوع کے ایشیائی بھی ہوتے ہیں۔ اسی خیال کی بنیاد پر نوبیل کمیٹی نے بھی اس برس کے انعام کے فیصلے کے وقت کم ڈے یٹنگ کے ان اہم اقدامات کو پیش نظر رکھا ہے، مشرقی ایشیا میں انسانی حقوق کی ترقی کے سلسلے میں جو انہوں نے کیے ہیں۔ جس طرح 1996 کے امن انعام یافتہ ہوزے راموس ہونا نے، جو اس محفل میں بہ نفس نفیس موجود تھا، کہا ہے، کم ڈے یٹنگ نے بھی مشرقی تیمور کے بارے میں شد و مد سے آواز اٹھائی تھی۔ مشرقی تیمور میں انسانی حقوق کے تحفظ کے استعمال کے لیے بین الاقوامی فوج میں اسی جنوبی کوریائی فوج کی شمولیت، جس کو چند برس قبل اپنے ہی ملک میں سیاسی حزب اختلاف کو دبانے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا تھا، کم ڈے یٹنگ کا ایک بڑا علامتی قدم تھا۔

۱۹۹۱ء کی انعام یافتہ آنگ سان سوکی (Aung San Suu Kyi) کی برمی آمریت کے خلاف جدوجہد میں بھی کم نے عملی طور پر مدد کی تھی۔ اس مرحلے پر ہم اس کو بھی یاد کرنا چاہتے ہیں، جس پر اپنا انعام وصول کرنے سے روکنے کے لیے ماڈے کے سفر پر پابندی لگائی گئی ہے۔ بد قسمتی سے برمی حکومت ایک بار پھر آنگ سان سوکی پر اپنا دباؤ بڑھا رہی ہے۔

کم کو جنوبی کوریا میں وسیع اصلاحات کے پروگرام اور شمالی کوریا سے امداد دیا بھی کے عملی اقدام کے لیے، جس کو عام طور پر "sunshine policy" کا نام دیا گیا ہے، منتخب کیا گیا تھا۔ یہ اصطلاح ایک سیاح کے بارے میں Aesop کے کہے ہوئے قصے میں استعمال کی گئی تھی جس نے تیز شمالی ہواؤں سے بچنے کے لیے اپنے جسم پر اپنا بھاری بھر کم لبادہ لپیٹ لیا تھا، مگر آخر میں سورج کی کرنوں سے ملنے والی برہمتی ہوئی تھارت کے باعث اس کو تارنا پڑا تھا۔

Sunshine Policy، اگر شمالی ہواؤں کو روکنے کے لیے نہیں تو کم از کم دونوں کوریائی ریاستوں کے درمیان امداد دیا بھی کے بڑھتے ہوئے تعامل کے ذریعے سرد مہری کو کم کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ کم ڈے جنگ نے صاف الفاظ میں یہ واضح کر دیا ہے کہ جنوبی کوریا اپنے شمالی پریمی پر قبضہ کرنے یا اسے اپنے اندر ضم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ہدف دراصل یہ ہے کہ دونوں ایک بار پھر ہم خیال ہو جائیں، اگرچہ دونوں یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے لیے بھی بہت وقت درکار ہوگا اور بہت تیاریاں کرنی پڑیں گی۔

اس میں ذرہ برابر بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ دونوں کوریائوں کے بین 'وینٹنٹ' اور آپس میں موافقت کے لیے ہونے والے عمل کے آغاز کا اصل محرک کم ڈے جنگ ہی رہے۔ لیکن ان کے کردار کا اگر [جرمنی کے سابق چانسلر] ولی براؤنٹ سے موازنہ کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، جن کے Ostpolitik نے دونوں جرمن ریاستوں کے درمیان تعلقات کو عام سطح پر لانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، جس کے لیے ان کو نوٹیل امن انعام عطا کیا گیا تھا۔ محض براؤنٹ کی Ostpolitik ہی دونوں ریاستوں کی یکجائی کی بنیاد نہیں تھی، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ 1989-90 میں ہونے والے انعام کی شروعات ہی سے ہوئی تھی۔ جنوبی کوریا کے نقطہ نظر سے جرمنی کی ایک جاتی کا سیاسی پہلو خاصا کشش کا حامل ہے، مگر معاشیاتی پہلو کچھ ایسا ہے جو جرمنی کے مقابلے میں کوریا کو بہت گراں ہو سکتا ہے، اگر اس میں زیادہ پھرتی دکھانے کی کوشش کی جاتی۔

پچھلے برس جون میں پینانگیاںگ میں ہونے والی سربراہی ملاقات میں کم ڈے جنگ اور کم جنگ کے درمیان ہونے والی بات چیت محض ذیلی ڈھلے بیانات اور ہوائی خطابت سے کچھ زیادہ اہم رہی تھی۔ پچاس برس کی دہریوں کے بعد آپس میں ملنے والے خاندانوں کی تصویروں نے پوری دنیا پر کبرے اثرات مرتب کیے تھے۔ یہ ملاقاتیں خواہ کتنی ہی کڑی نگرانی میں کیوں نہ ہوتی ہوں، خوشی سے ٹٹکنے والے آنسو پانجون جام (Panmunjon) کی سرحدوں پر دکھی جانے والی سرد مہری ہنرتوں اور مایوسیوں کے مقابلے میں بے حد متاثر کن تھیں۔

شمالی کوریا کے لوگ ایک طویل عرصے نہایت مشکل حالات میں رہے ہیں۔ بین الاقوامی برادری، شدید سیاسی جبر کے باوجود زیادہ عرصے تک ان کی بھوک سے لاتعلقی، اور خاموش نہیں رہ سکے گی۔ اس کے برعکس شمالی کوریا کے سیاسی رہنماؤں کے کردار کو دونوں ملکوں کے درمیان مصالحت کی جانب اٹھائے جانے والے پہلے قدم پر افریقین کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

دنیا کے بیشتر حصے میں سرد جنگ کا عہد ختم ہو چکا ہے۔ دنیا بالآخر Sunshine Policy کے ذریعے جزیرہ نما کوریا میں سرد جنگ کی باقیات کو کھینچنے دیکھ سکے گی۔ اس میں وقت لگ سکتا ہے۔ مگر عمل شروع ہو چکا ہے، اور بلاشبہ آج کے انعام یافتہ کم ڈیڑھ جنگ سے زیادہ کسی نے اس عمل میں ہاتھ نہیں بنایا ہے۔ گویا شاعر کے الفاظ میں ”پہلا قطرہ سب سے بہاؤں سب سے ہمت والا تھا۔“

نوبیل کمیٹی کے صدر Gunhar Berge کی زبانی

خطبہ

جذبات مآب، دو دمان شاہی، مارویائی نوبیل کمیٹی کے ارکان، عزت مآب مہمانان، خواتین اور حضرات! انسانی حقوق اور امن کے لیے ماروے کی سرزمین ایک متحرک مقام، اور نوبیل کا امن انعام ایک متحرک پیغام ہے جو تمام انسانیت کو امن کے لیے خود کو وقف کر دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ میں اس اعزاز کے لیے جانے پر بے حد وحساب شکر گزار ہوں۔ مگر اس لمحے میرا ذہن کوریا کے ان بے شمار عوام اور ساتھیوں کی طرف منحرف ہے جنہوں نے اپنے آپ کو بہ رضا و رغبت جمہوریت اور انسانی حقوق کی بحالی کے لیے، اور دونوں کوریائی ریاستوں کے انعام کے خواب کو پورا کرنے کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اور میرا فیصلہ یہ ہے کہ یہ اعزاز ان ہی کو ملنا چاہیے۔

اس لمحے مجھے دنیا کے وہ بہت سے ممالک اور دوست بھی یاد آ رہے ہیں جنہوں نے میرے عوام کی جمہوریت حاصل کرنے کی کوششوں میں اور کوریائوں کے ملاپ کی جدوجہد کی فیاضانہ امداد فرمائی ہے۔ میں خلوص دل سے ان سب کا بھی شکر گزار ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ جون کے مہینے میں ہونے والی پہلی جنوبی شمالی کوریائی سربراہی ملاقات اور کوریائوں کے درمیان ملاپ کی کوششوں کی اہتمام و جہات میں سے ایک وجہ ہے جس کے لیے مجھے نوبیل امن انعام سے نوازا گیا ہے۔

مہمانان گرامی!

میں آپ حضرات سے جنوبی شمالی کوریائی رشتوں کی درباری کے عمل پر باتیں کرنا چاہوں گا، نوبیل کمیٹی نے جس کو اس اعزاز کی توصیف کی بنیاد بنایا ہے۔ میں نے جون کے مہینے کے وسط میں شمالی کوریا کے قومی

دفاعی کمیشن کے چیئرمین کم یا نگ ای (Kim Jong-il) سے ملاقات کے لیے پیانگ یا نگ کا سفر کیا تھا۔ میں گھبراہٹ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ جانتے ہوئے کہ کیا موقع ہو سکتا ہے، مگر مجھے اس بات پر یقین تھا کہ مجھے اپنے عمام کے لیے اور جزیرہ نما کوریا کے امن کی خاطر ضرور جانا چاہیے۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ یہ سربراہ ملاقات کامیاب ہوگی یا نہیں۔ تین سالہ جنگ کے بعد نصف صدی سے تقسیم شدہ جنوبی اور شمالی کوریا نے باہمی بدگمانی اور خواروارتا روں کے پار کی دشمنیوں کے مائے میں زندگی گزاری ہے۔

اس حالت خطر کو جس میں ہم ایک عرصے سے ایسا وہ تھے امن اور امداد باہمی میں تبدیل کرنے کے لیے میں نے فروری 1998 میں صدر منتخب ہونے کے بعد اپنی Sunshine Policy کا اعلان کیا اور یکسانیت کے ساتھ شمال سے، تین نکات پر منحصر مصالحت کی پیغام رسائی جاری رکھی۔ پہلا نکتہ یہ تھا کہ ہم اشتراکیت کے ذریعے یکجہائی کو قبول نہیں کریں گے۔ دوسرا نکتہ تھا کہ ہم شمال کے انعام کے ذریعے، یکجہائی کی کوشش نہیں کریں گے۔ اور تیسرا نکتہ یہ تھا کہ جنوبی اور شمالی کوریا امن و آشتی، امداد باہمی اور ہم بودیت کے متلاشی رہیں گے۔ میرے خیال میں یکجہائی کا اس وقت تک انتظار کیا جاسکتا ہے جب تک فریقین پھر سے ایک ہو جانے کے بارے میں آسودہ اور مطمئن ہوں، خواہ اس کے لیے کتنا ہی طویل عرصہ درکار کیوں نہ ہو۔ پہلے تو شمالی کوریا نے اس خیال سے مزاحمت کی کہ Sunshine Policy اس کو سر کرنے کا ایک پرفریب منصوبہ ہے۔ مگر ہمارا خلوص نیت سے اپنے ارادے پر قیام، اور دنیا بھر سے اس پالیسی کی وسیع پیمانے پر معاونت نے، جس میں ماروے جیو پالیسی ذہنیت والا ملک بھی شامل تھا، شمالی کوریا کو اس بات پر قائل کر دیا کہ اس کو بھی اسی انداز میں جواب دینا چاہیے۔

پچھلے پچاس برسوں کے دوران شمالی کوریا نے جزیرہ نما کوریا سے امریکی افواج کے انخلا کو تنازعے کا بنیادی نکتہ بنا رکھا تھا۔ میں نے چیئرمین کم سے کہا، ”حقیقت تو یہ ہے کہ کوریائی جزیرہ نما دنیا کی چار بڑی طاقتوں، ریاست ہائے متحدہ امریکا، جاپان، چین اور روس کے محاصرے کی کیفیت میں ہے۔ ہم جس قسم کے سیاسی جغرافیائی علاقے میں ہیں اس جیسا علاقہ دنیا میں اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس میں جزیرہ نما کوریا پر امریکی افواج کی موجودگی، صرف آج ہی نہیں بلکہ دونوں ریاستوں کی یکجہائی کے بعد بھی، مانع ہوگی مڈرا یورپ کی طرف نظر کیجیے۔ NATO اتحاد تشکیل دیا جا چکا تھا پھر بھی امریکی افواج یورپ میں موجود تھیں تاکہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ کی طاقتوں کو طاقت آزمائی سے باز رکھا جاسکے۔ مگر اب، اشتراکی گٹھ جوڑ کے زوال کے بعد بھی، NATO اور امریکی افواج یورپ میں موجود ہیں اس لیے کہ یورپ کے امن اور استحکام کے لیے آج بھی ان کی ضرورت ہے۔“

میری اس توضیح کو سن کر چیئرمین کم نے، حیرت انگیز طور پر، بہت مثبت رد عمل ظاہر کیا۔ طویل عرصے سے اپنائے ہوئے شمالی کوریا کے مطالبے میں یہ ایک بڑی تبدیلی تھی، اور جزیرہ نما کوریا سمیت شمال مشرقی ایشیا میں امن کے تناظر میں ایک با معنی پیش رفت۔

ہم نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ منقسم خاندانوں کے معاملات کو جلد سلجھایا جانا چاہیے۔ اس لیے سربراہی ملاقات کے بعد سے، فریقین ان کے دھموں کا مداوا کرنے کے مسئلے میں مناسب اقدام کر رہے ہیں۔ چیئر مین اور میرے درمیان باہمی اقتصادیات کی ترقی کے فروغ پر بھی اتفاق ہوا۔ اس طرح فریقین نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کی رو سے کوریائی ریاستوں کے درمیان اقتصادی ترقی بڑھانے، سرمایہ کاری کے تحفظ اور دوسرے نکمے سے بچاؤ کے لیے چار قانونی دستاویزات کی تیاری کا حکم جاری کیا گیا۔ اسی اثنا میں ہم نے شمال کوئین لاکھن کھاد اور پانچ لاکھن غذا کی انسانی اعانت بھی فراہم کی ہے۔ سربراہی اجلاس کے بعد سے کھیل کوہ، تہذیب اور ثقون لطیفہ، اور سیاحت کے میدان میں تبادلے کی شروعات بھی ہو چکی ہے۔ مزید یہ کہ تناؤ کی کمی اور امن کی دیرپا بھائی کے لیے دونوں ریاستوں کے وزرائے دفاع نے ملاقات کی ہے، جس میں ایک دوسرے کے خلاف کبھی جنگ نہ کرنے کا عہد بھی کیا گیا ہے۔ انھوں نے جنوبی اور شمالی کوریا کے درمیان ریلوے اور سڑکوں کے ٹوٹے ہوئے رابطوں کو بحال کرنے کے لیے ضروری فوجی تعاون پر زور دیا۔

اس یقین پر کہ دونوں کوریاؤں کے درمیان امن کی بھائی کے لیے محض رشتوں کی استواری ہی کافی نہیں۔ میں نے چیئر مین کو امریکا اور جاپان سے بہتر رشتے استوار کرنے پر آمادہ کرنے کی پُر زور الفاظ میں حمایت بھی کی ہے۔ پیانگ یاگ سے واپسی پر میں نے صدر کلنٹن اور جاپان کے وزیر اعظم مورے کو شمالی کوریا سے تعلقات کے فروغ کی ترغیب بھی دی ہے۔

میں نے اکتوبر کے آخری دنوں میں سیول میں ہونے والی تیسری ASEM سربراہی ملاقات میں اپنے یورپی دوستوں کو بھی ایسے ہی مشورے دیے تھے۔ شمالی کوریا اور امریکا کے درمیان، اور یورپ کے بہت سے ملکوں اور شمالی کوریا کے درمیان حالیہ دنوں میں کچھ مثبت قدم اٹھائے گئے ہیں۔ میں پُر امید ہوں کہ یہ اقدام جزیرہ کوریا پر امن کے فروغ میں فیصلہ کنی اثر ڈالیں گے۔

خواتین و حضرات!

کئی عشروں پر محیط، جمہوریت کے لیے کی جانے والی میری جدوجہد کے دوران مجھے مسلسل اس مزید کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ مغربی طرز کی جمہوریت ایشیا کے لیے مناسب نہیں، اس لیے کہ ایشیا اس کی اس سے محروم ہے۔ اس بات کا سچ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مغرب سے کہیں پہلے سے، عظمت انسانی کا احترام ایشیا کے نظام خیال میں موجود تھا، اور ہماری دانش کی روایات میں بھی اس کی جڑیں گہری تھیں۔ ”عوام ہی جنت ہیں۔ عوام کی خواہشات جنت کی خواہشات ہوتی ہیں۔ اسی طرح لوگوں کا احترام کرو جیسے تم جنت کا احترام کرو گے۔“ تین ہزار برس سے کوریا اور چین کی سیاسیات کا یہی مرکزی عقیدہ رہا ہے۔ پانچ صدی بعد ہندوستان میں بدھ مت نے انسان کی عظمتوں اور اس کے حقوق کی ارفع اہمیت کی تبلیغ شروع کی تھی۔

اور بھی بہت سے مرؤجہ نظریات اور ادارے تھے جنھیں نے عوام کو سب سے آگے رکھا ہے۔

کنفیوشس کے چیلے Mencius کا قول ہے ”بادشاہ جنت کا جیسا ہوتا ہے۔ جنت اسے منعاف۔ حکمرانی کے لیے نکلتی ہے۔ اگر وہ نا کام ہوتا ہے اور عوام پر ظلم کرتا ہے تو جنت کی طرف سے عوام کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس سے نجات حاصل کر لیں۔“ اور یہ سب کچھ جان لاگ کے Social Contract اور معاشرتی حاکمیت کے نظریات سے دو ہزار برس قبل ہو رہا تھا۔

(حضرت) عیسیٰ کی پیدائش سے قبل چین اور کوریا میں جاگیر داری کو ختم کر کے ضلعوں اور prefectures میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ سرکاری افسروں کی بھرتی کے لیے امتحانات کی شروعات کی تاریخ ایک ہزار سال پرانی ہے۔ ایک مستحکم جانچ پڑتال کے نظام کے ذریعے بادشاہ اور اس کے اعلیٰ افسران کی حکمرانی پر نظر رکھی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ ایشیا عظیم اور منظم اداروں کی روایات کی دولت سے مالا مال تھا، جو جمہوریت کے لیے زرخیز مٹی فراہم کرتے تھے۔ مغرب کا کمال اداروں کی ترتیب میں تھا، جو ایک قابلِ تعریف کامیابی کے مترادف تھا جس نے تاریخ انسانی کو بہت فروغ دیا ہے۔

ایشیا کے ان ملکوں میں جہاں مظاہر کی روایات قدیم ہیں، مغربی جمہوریت کے بنائے ہوئے ادارے پھیل چکے ہیں، جیسا کہ کوریا، جاپان، فلپائن، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، ہندوستان، بنگلہ دیش، نیپال اور سری لنکا میں صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ شمالی تیمور کے عوام نے اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر، جن کو خوں خمار جنگجو گروہوں سے شدید خطرات لاحق تھیں، اپنی آزادی کے لیے انتخابات میں حصہ لیا۔ سن مار (مابلقہ برما) میں مادام آنگ سن سوکی اب بھی جمہوریت کی جدوجہد کرنے والے ہر اول دستوں کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ ان کو عوام کے بیش تر حقوق کی ہمدردیاں حاصل ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہاں بھی جمہوریت غالب آئے گی اور منتخب حکومتوں کا دور واپس آکر رہے گا۔

مہمانانِ گرامی!

میرا ایمان ہے کہ جمہوریت ہی وہ اصل قدر ہے جو انسانی عظمتوں کے لیے کام کرتی ہے کہ ہمیشہ اقتصادی ترقی اور سماجی انصاف کا یہی ایک قابلِ اعتماد راستہ رہا ہے۔

جمہوریت کے بغیر کسی ریاست کے اجتماعی وسائل باور نہیں ہوتے، نہ معاشیات میں مسابقت ہو سکتی ہے اور نہ ملک میں ترقیات۔

بغیر جمہوری بنیادوں کے کسی قوم کا اقتصادی اوجھا چڑھتا نہیں بنائے ہوئے محل کے مانند ہوتا ہے۔ لہذا، جمہوریہ کوریا کے صدر کی حیثیت سے میں نے اپنے ملک کے جمہوری نظام کی ترقی کے لیے، منڈی کی معیشت کے لیے اور پیداواری خوش حالی کے لیے متوازن انتظامات کیے ہیں اور اسی پر میری حکومت کی بنیادیں استوار کی گئی ہیں۔

اپنے مقاصد کی برآری کے لیے، پچھلے ڈھائی برسوں میں ہم نے ایسے اقدام کیے ہیں جو ہمارے ملک کے شہریوں کے جمہوری حقوق کی ضمانت دیتے ہیں۔ ہم اپنے ملک کے مالیاتی، تجارتی، عوامی اور محنت کش

طبقات میں اصلاحات کے معاملے میں بھی ثابت قدم رہے ہیں۔ مزید یہ کہ ہم نے بلا کسی تفریق کے، اپنے ملک کے تمام باشندوں کی، جن میں کم آمدنی والے طبقے بھی شامل ہیں، پیداواری خوش حالی اور انسانی محنت کے وسائل کی ترقی کے لیے کام کیے ہیں اور ان میں خاصی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں۔

کوریان اصلاحات کو جاری رکھے گا۔ ہم نے نہ صرف موجودہ اصلاحات کی کوششوں کو جاری رکھنے کا عہد کیا ہے بلکہ ایسی اصلاحات کی بھی منصوبہ بندی کی جارہی ہے جن کی کامیابی سے اکیسویں صدی میں ہماری معیشت اول درجے پر فائز ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ ہم اپنی روایتی صنعتوں کی طاقت، bio-tech، برقیاتی اور معلوماتی وسائل کے میدان کے بے شمار امکانات کی کھجانی پر ارتکاز سے اپنے تمام ہدف حاصل کر لیں گے۔

اکیسویں صدی میں آنے والا عہد دانش و اطلاعات بے اندازہ دولت کے عہد کی نشان دہی کر رہا ہے مگر اس میں ممالک کے درمیان تیزی سے بڑھنے والی مالیاتی فلیج کے خطرات بھی پوشیدہ ہیں۔ یہ مسئلہ امن اور حقوق انسانی کے لیے بھی شدید خطرہ ہے، اور ہمیں نئی صدی میں ان طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑے گا جو جمہوریت کو زیر کرتی ہیں، تشدد کے راستے اختیار کرتی ہیں۔ ہمیں امن اور انسانی حقوق کو درپیش نئے چیلنج کا ان اقدامات سے مقابلہ کرنا پڑے گا جن سے اخلاقی فلیج میں کمی واقع ہو، سراجھدی ہمیں ترقی پذیر ممالک اور سماج کے فرائض کیے ہوئے طبقات کو نئے عہد میں اپنے سراجھدی لے کر آگے بڑھنا ہوگا۔

جلالت مآب، دودمان شاہی، خواتین و حضرات!

اجازت ہو تو میں کچھ الفاظ اپنی ذات کے بارے میں بھی کہوں۔ میری زندگی میں پانچ موقعے ایسے آئے جب میں نے آمروں کے ہاتھوں آنے والی موت کو قریب سے دیکھا تھا۔ چھ برس میں نے قید میں گزارے اور چالیس برس یا تو میں نظر بند رہا یا ملک بدری اور کڑی گمانیوں میں۔ اپنے عوام کے سہارے اور دنیا بھر کے جمہور پسند دوستوں کی ہمت افزائی کے بغیر میں ان مشکلات کو جھیل نہیں سکتا تھا۔ میرے کمرے ذاتی یقین نے بھی مجھے قوت و ہمت عطا کی ہے۔

میں اس یقین کے سہارے زندہ رہا، اور زندہ ہوں کہ خدا ہمیشہ میرے سراجھدی رہا ہے۔ یہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ اگست 1973 میں، جاپان میں جلاوطنی کی دوران مجھے ٹوکیو کے ہٹل کے کمرے سے، جس میں مقیم تھا، اس وقت کی جنوبی کوریا کی فوجی حکومت کے خفیہ سرکاروں نے اغوا کر لیا تھا۔ اس خبر نے پوری دنیا کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ خفیہ ادارے کے گماشتے مجھ کو اپنی کشتی پر لے گئے جو ساحل کے قریب منگر انداز تھی۔ انہوں نے میری مشکلیں کس دیں، آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیں اور کپڑا ٹھونس کر میرا منہ بند کر دیا تھا۔ اور اس وقت جب وہ مجھے سمندر کی لہروں کی مذر کرنے والے تھے، میری نظروں کے سامنے یسوع مسیح ظاہر ہوئے۔ میں ان سے لپٹ گیا اور اپنی جان کی بھیک مانگنے لگا۔ عین اس وقت مجھے موت کے منہ میں جانے سے بچانے کے لیے آسمان سے ایک طیارہ اُترا تھا۔

میں تاریخ کے انصاف پر بھی یقین رکھتا ہوں۔ 1989 میں فوجی حکومت نے مجھے موت کی سزا سنائی تھی۔ چھ ماہ میں قید میں رہا، اور موت کے دن کا انتظار کرتا رہا۔ موت کے خوف سے اکثر مجھ پر کچکی طاری ہو جایا کرتی تھی۔ مگر تاریخ کی اس حقیقت سے مجھے سکون ملتا تھا کہ بالآخر انصاف کی فتح ہوتی ہے۔ اس وقت بھی تھا، اور آج بھی میں تاریخ کا ایک مشتاق قاری ہوں۔ مجھے علم ہے کہ برعہد میں، اور ہر خطے میں، جو کوئی اپنے عوام اور انسانیت کی خاطر صالح زندگی گزارتا ہے، کامیاب نہ ہوا ہو، ہولناک انجام سے دوچار ہوا ہو، تب بھی تاریخ کی نگاہ میں وہ فتویٰ اور صاحبِ عزت ہوتا ہے؛ اور اگر کوئی بدویاقتی سے وقت موجود پر حاوی ہو بھی جائے تب بھی تاریخ ہمیشہ اس کو شرمناک شکست خوردہ کی حیثیت میں یاد رکھتی ہے۔ اس میں کوئی رُو رعایت نہیں ہوا کرتی۔

جلالت مآب، دو دمان شاہی، خواہن و حضرات!

امن کے نوبیل انعام کو قبول کرتے ہوئے، انعام کی عزت پانے والا ہر فرد کبھی نہ ختم ہونے والے فرض کا پابند ہو جاتا ہے۔ میں نہایت افسوس سے آپ کے رُو بہ رُو عہد کرتا ہوں، جیسا کہ تاریخ کے بڑے لوگوں نے ہمیں سکھایا ہے اور انٹرنیٹ نوبیل کی توقعات کے عین مطابق، میں اپنے ملک میں اور دنیا بھر میں حقوق انسانی اور امن کے لیے، اپنے لوگوں کے درمیان مفاہمت اور امداد دیا ہی کے لیے اپنی بقیہ زندگی وقف کرتا ہوں۔ میں آپ سے ہمت افزائی کی توقع بھی کرتا ہوں، اور ان افراد سے بھی امداد کا طالب ہوں جو جمہوریت کے فروغ اور ساری دنیا کے لیے امن کے خواہاں ہیں۔

شکریہ!



جان ہیوم ڈیوڈ ٹرمبل اعلان تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات!

اس برس گلفرائینڈ کے دن ایک معاہدے پر دستخط ہوئے تھے جو حقیقت میں ڈربازی کا ایک عمل تھا جس کے ذریعے شمالی آئرلینڈ میں ایک عرصے سے جاری خون آشام تنازعے کا پرامن حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ۲۵ مئی کو ہونے والی مذاہدہ راست رائے شماری میں عوام نے بھاری اکثریت سے اس معاہدے کی توثیق کر دی۔ معاہدے میں طے شدہ اصولوں کی بنیاد پر جون کے مہینے میں انتخابات کے ذریعے شمالی آئرلینڈ اسمبلی وجود میں آئی اور خزاں کے موسم میں تصفیے سے معذور ماضی کے دشمنوں نے اکٹھے اسمبلی کے اجلاس میں شرکت بھی کی ہے۔

ہم سب ان مسائل سے اچھی طرح آگاہ ہیں جو آگے آنے والے ہیں۔ اس برس کے موسم خزاں میں دہشت گردی کے حملے بھی ہوئے ہیں اور ہم نے جانیں ضائع ہوتی دیکھی ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوا ہے کہ یہ حملے محض اکاؤنٹدارداتیں ہیں، کہ یہ ایک طرح سے گلفرائینڈ سے معاہدے کے بنیاد پر دیر پا امن کی تلاش میں معاون ہوئے ہیں۔ آئرش ریپبلک آئی (IRA) کی نافذ کردہ جنگ بندی، جو تلاش امن کی سب سے اہم شرط تھی، اب بھی قائم ہے۔ لہذا، اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری پریشان حال دنیا کے حالات اچانک تبدیل ہو سکتے ہیں، اس برس کے گلفرائینڈ کے بعد سے صورت حال مختلف رہی ہے۔ تشدد کا شیطانی چکر ٹوٹ چکا ہے۔ امن کا عمل اپنی الگ رفتار سے جاری ہے جس کے باعث پہلے جیسے تشدد کی فضا کی واپسی خلاف قیاس ہے، اگرچہ عمل کے تسلسل کے دوران ہمیں معمولی دھچکوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

ماروے کی نوبل کمیٹی نے دو حضرات کا انتخاب کیا ہے جنہیں ان کی رائے کی مطابق، بہ طور خاص امن کے

عمل میں معاونت کے لیے اعزاز دیا جانا چاہیے، یعنی جان ہیوم اور ڈیوڈ ہیرمل۔ اپنے سرگرمی پر امن شمال میں بے پایاں مسرت کے ساتھ ہم آپ دونوں کو 1999 کا امن انعام حاصل کرنے کے لیے خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ ان بہت سے افراد میں سر فیہرست ہیں جنہوں نے آئرلینڈ اور اس کے باہر امن کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔

جان ہیوم اور ڈیوڈ ہیرمل، دونوں شمالی آئرلینڈ سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں وہ تنازعے کے ساتھ اور تنازعے میں ہی رہتے رہے ہیں۔ دونوں ہی سر پر آور وہ سیاست دان ہیں اور شمالی آئرلینڈ کی ان دوسب سے بڑے سیاسی جماعتوں کی رہنمائی کرتے ہیں، جو تقسیم زدہ عوام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان دونوں نے خود کو اس راہ پر چلنے کے لیے وقف کر دیا ہے جس کا معاہدے میں فیصلہ کیا گیا ہے؛ کہ تنازعات کو امن کے ساتھ ہی حل کیا جانا چاہیے۔ استعواپ رائے میں اس معاہدے کی جس شدت سے حمایت کی گئی ہے، اس سے صحاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں نے صحیح سمت کا انتخاب کیا ہے۔

سرست کی ہوا کے لیے اپنے با زبان تراشائی سیاسی رہنمائی نہیں ہوتی، اصل رہنمائی تحریک کی ابتدا کرنے اور صحیح وقت پر کام کرنے میں ہوتی ہے۔ دوسرے سیاسی رہنماؤں کی طرح، دونوں انعام یافتگان نے مل کر ایسی اہمیت کی فضا تیار کرنے میں معاونت کی ہے جس کے ذریعے پرامن طریقے سے مناسب مضامین ممکن ہو سکے۔ سیاسی رہنماؤں کی حیثیت میں وہ اپنے حلقے کے عوام کو ضمانت دیتے ہیں کہ پرامن طریق پر چلنے سے ہی حل کی طرف پیش قدمی ہو سکے گی جس پر دونوں خطے قائم رہیں گے، اور ان سے بہتر حالات میں زندگی گزار سکیں گے جو جنگ کے جاری رہنے کی صورت میں درپیش ہوتے۔ تناؤ کی حالت کے ایسے موقعوں پر بڑے پیمانے کی دالٹ اور ہمت کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آج کے انعام یافتگان نے دونوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

مگر دونوں کے درمیان اختلافات ہیں۔ 1970 میں تشدد کی بدھتی ہوتی لہروں کے زمانے میں جان ہیوم نے ایک سیاسی جماعت، سوشل ڈیموکریٹک اینڈ لیبر پارٹی کی بنیاد رکھنے میں حصہ لیا اور بلا شرکت غیرے اس کے سربراہ بن گئے۔ یہ ایک قومیت پسند سیاسی جماعت ہے، مگر اصولوں کی بنیاد پر ڈیڈ کھڑی رہی، کہ صرف پرامن طریقے ہی استعمال ہونے چاہئیں۔ ہر کسی سے زیادہ پس منظر میں، ڈیوڈ ہیوم ہی امن کے عمل کے معمار ہیں، جس کا اعادہ گڈ فر اینڈ کے معاہدے میں کیا گیا ہے۔ یہ بغیر کسی اضطراب کے اس موقع پر قائم ہیں کہ مذاکرات اور اداراتی حل ایک ساتھ ہونے چاہئیں۔ ان لوگوں کو بھی، جنہوں نے اپنی سیاسی جدوجہد کو تشدد کے ذریعے آگے بڑھانے کا راستہ چننا ہے، امن کے عمل میں شامل ہونے، اپنی حکمت عملی کو تبدیل کرنے کے مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں، اور ان کے وعدوں پر اعتبار کیا جانا چاہیے۔ بالخصوص بڑھتے ہوئے تشدد کے دنوں میں کبھی کبھی ہیوم کو شدت پسندوں کے لیے بھی نرم رویہ اپنانے پر نہایت درشت نکتہ چینی برداشت کرنی پڑی تھی، ان کی اپنی صفوں سے بھی اور غیروں کی جانب سے بھی۔ مگر اپنی ذاتی راست بازی کے سہارے، ہیوم مضبوطی سے جمے رہے، اور ان کی تدبیریں کامیاب رہیں۔

شمالی آئرلینڈ کے نوبیل ادب انعام یافتہ شمس مینی نے دو انعام یافتگان کے درمیان فرق کو بیان کرنے کے لیے خارپشت اور لومڑی کی حکایت استعمال کی تھی۔ اس نے لکھا تھا، ”جان ہیوم ایک خارپشت کی مانند ہے جس کو معلوم تھا کہ بڑے سچ کا بول بالا تو ہونا ہی ہے۔“ اس کے برعکس نوبل پریز مل ”ایک چالاک لومڑی ہے جو اپنی فائش و رانہ صفائی اور سیاسی دلیری کے باعث جانتا تھا کہ 1998 ہی وہ وقت تھا جس میں ایک با عزت اور معقول سبائیت کی گھجائش کی طرف پیش قدمی کی جاسکتی ہے۔ ایسا کرنے میں اس نے سارے شمالی آئرلینڈ کے باشندوں کے لیے ایک معتبر اور پسندیدہ مستقبل کے امکانات روشن کیے تھے۔“

جب برہیل شمالی آئرلینڈ کی سب بڑی ریڈیسی سیاسی جماعت اسپریمینٹ پارٹی کے منتخب لیڈر بنے تھے وہ اعلیٰ پیمانے کی سیاست میں نسبتاً نووارد تھے اور مصالحت نہ کرنے والے یونیٹسٹ کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے، مگر جلد ہی انھوں نے دکھا دیا کہ ان کی شخصیت میں اور بھی سیاسی پہلو پوشیدہ تھا، اس لیے کہ انھوں نے صاف طور پر محسوس کر لیا تھا کہ موجودہ حالات یونیٹسٹوں سے زیادہ کچک مار دیے کے متقاضی ہیں۔ ان کی سربراہی میں لوگوں کے خوف اور بدگمانی میں کافی حد تک کمی آئی جس کے باعث یونیٹسٹوں کی اکثریت گڈ فرائینڈ سے معاہدے کی حمایت میں صف آرا ہو گئی۔ یہ کہنا شاید ضروری نہ ہو کہ برہیل بھی اپنے مکمل مسابقتی لہجے کے لیے سخت نکتے کے ہدف بنے تھے۔

وہی لوگ جنہیں ذاتی سطح پر اپنے حقوق کی پامانی کا تجربہ ہوا ہو جنھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بیادوں کو قتل ہوتے دیکھا ہو، جن کی زندگیوں خسارے میں، خوف میں اور بدگمانی میں گزری ہوں، صرف وہی بتا سکتے ہیں کہ اس نوعیت کے حالات میں زندگی گزارنا کیسا ہوتا ہے، یا جب ایسے اشتعال دلانے والے حالات کا سامنا ہو تو ان کا رویہ عمل کیسا ہوتا ہے۔ امن کا نوبیل انعام پانے والی خاتون Alva Myrdal کی فلسفی سسلا بوک Sissela Bok نے اپنی کتاب ”A Strategy for Peace“ میں ”The Pathology of Partisanship“ کے بارے میں بتایا ہے کہ حالت جنگ کس طرح ہم میں ایسی ذہنی حالت پیدا کر سکتی ہے جس میں ہم بے گناہ افراد کا احترام کرنے، ان پر رحم کرنے سے عاری ہو جاتے ہیں۔ اس نے Stephen Spender جیسے ادیب کی دہشت ناک حالت کا ذکر کیا ہے جس کو بھی ہسپانوی خانہ جنگی کے دوران اسی قسم کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ سسلا اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ فقط مضبوط و مستحکم رہبری اور اداروں کی ضمانت کے ذریعے ہی سماج اس قسم کی معذرتوں کے بوجھ کو برداشت کر سکتا ہے۔

ہم لوگوں کو جو اب اسے اندر کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں، خاکساری کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور جلد فیصلے نہیں کرنے چاہئیں۔ فیصلے کرنا ہمارا کام نہیں۔ تنازعہ ہم کو فیصلوں میں الجھاتا بھی نہیں۔ یہ عام انسانی حقیقتوں پر روشنی ڈال کر ہمیں کچھ بتاتا ہے۔ طرف داری کا مرض اس کا ایک پہلو ہوتا ہے۔ فیصلہ ہی ہمیں بتاتا ہے کہ مار دھاڑ کیوں زیادہ مار دھاڑ ہی کو جنم دیتی ہے۔ یہ عجیب و غریب بھی ہے اور امید افزا بات بھی کہ شمالی آئر لینڈ میں فریقین کی دہائیوں کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب زیادہ لوگ اس معاملے میں آگے بڑھ کر کہہ رہے ہیں کہ درگزر اور مصالحت انتقام سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اپنے اطراف کی دنیا پر نظر کرتے ہیں تو

ہمیں نظر آتا ہے کہ مارو دھاڑ کا طویل ماضی سننے کے بعد امن کے متلاشی یہی چاہتے ہیں کہ انصاف کی پکار کو مصالحت اور معافی کے ماتحت ہونا چاہیے۔ ہم نے جنوبی افریقا کی مثال سے بھی یہی سیکھا ہے۔ دنیا میں بھلا اور کون ہے جو شمالی آئرلینڈ میں، دو متضارب حقیقتوں جیسے حالات میں گرفتار ہے؟ اسی اثناء میں سہیلہا ہمیں بتاتی ہے کہ مصالحت کی خواہشوں کو ابھارنے اور ہمیں تشدد سے دور لے جانے میں طاقت و قیادت اور ادارتی ضمانتیں کتنی اہم ہوتی ہیں۔ ہمارے انعام یافتگان ایسی قیادت ہی کی طرف داری کرتے ہیں۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ دونوں فریق پر معتدل اور مشمولہ رویوں کے باعث تنقید کی گئی ہے۔ اتنا خوف اور اتنی بدگمانی ہو چکی ہے کہ بہت سے لوگ مخالفین کے ارادوں کے نیک ہونے پر یقین نہیں کرتے۔ مشمولہ حکمت عملی کو اپنانے کا مطلب ہوتا ہے بدگمانی سے بالا راہ کرنا تا توڑنا اور خوف کی پروا نہ کرنا۔ یہی ہے مصالحت کی حکمت عملی۔ بلاشبہ، ایسے حالات بھی ہیں جن میں دوسرے فریق کے نیک ارادوں پر بھروسہ کرنا ایک طرح کا بھولا پن ہوگا۔ اور ایسا کرنے میں خطرات بھی ہوں گے۔ مگر حقیقی امن کے عمل کو آگے بڑھانے میں ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو خطرہ لینے کے لیے تیار ہوں۔ ہمیں دلاویروں کی یا، دوسرے لفظوں میں، بھولے لوگوں کی ضرورت ہوگی، جو ہاتھ بڑھانے کے لیے تیار ہوں۔ کبھی کبھی بھولا پن حیرت انگیز طور پر حریف کو بالکل نہتہ کر دیتا ہے۔

سیمیلایوک کے قول کے مطابق، قیادت کے علاوہ، ہمیں اداروں کی ضمانتوں کی بھی ضرورت ہوگی گڈ فرائیڈ سے معاہدہ ایسی اداراتی ضمانتیں فراہم کرتا ہے۔ یہ نہ کسی کی نمائندگی کرتا ہے، نہ کبھی ایسا کوئی ادارہ تھا۔ یونیٹس اب بھی یونیٹس ہیں اور نیشنلسٹ اب بھی نیشنلسٹ ہیں۔ انھوں نے اپنے تنازعات کے پُر امن حل کے لیے ادارے حاصل کیے ہیں اور ہیں۔

اجازت ہو تو ہم اس سے متوازی اپنے تجربات کا ایک خلاصہ پیش کریں۔ 1814 میں ماروے کو سوئیڈن کے ساتھ اتحاد پر مجبور کیا گیا تھا۔ ماروے کی سر زمین پر ماروے کے کسانوں کی فوج اور سوئیڈن کی پیشرو فوج کے درمیان، جو ہما عظیم یورپ سے میچولین کو شکست دے کر واپس ہوئی تھی، جنگ چھڑ گئی۔ بڑی طاقتوں نے مداخلت کر کے ماروے کی جنگ کو ختم کر دیا۔ انھوں نے، جس میں برطانیہ عظمیٰ شریک تھا، فیصلہ کیا کہ ماروے کو سوئیڈن سے اتحاد کر لینا چاہیے۔ مگر ماروے کو اپنانا آئینی نظام جاری رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس طرح ہتھیاروں کی جگہ سیاسی اداروں نے لی تھی۔ Clausewitz کی مشہور حکایت کے برعکس، دوسرے طریقوں سے سیاست جنگ کا تسلسل بن گئی۔ اکانوے برس بعد وہ اتحاد پُر امن طریقے سے کالعدم ہو گیا۔ جب سوئیڈن کے نوٹیل نے ماروے کی نوٹیل کو امن کا انعام دینے کی ذمہ داری سونپی تو ان دونوں حریفوں کے درمیان یہ عمل ایک پُر امن علامت بن گیا۔

۱977 میں ماروے کی نوٹیل کمیٹی نے 1976 کا امن انعام مرید کوریگن (Mairead Corrigan) اور بیلی ولیمز (Beryl Williams) کو عطا کیا تھا جن کا شمار آئرلینڈ کے امن پسندوں میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد سے مستقل یہی کہا جا رہا ہے کہ وقت اس انعام کے لیے مناسب نہیں تھا۔ اس بار بھی ہمارے کانوں میں یہی

آوازیں آرہی ہیں کہ ہمارا انتخاب عاجلانہ ہے، کہ دیہ پا امن کا حصول ابھی دور کی بات ہے۔ یہ دلیل آرمائی سے سمجھ میں آرہی ہے اور ہمیں اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہو سکتی تھی اگر ہم یہ کہنے کے قائل ہوتے کہ امن کا قیام یقینی ہے۔ مگر ان انعامات کے سلسلے میں، جیسا کہ اوروں میں بھی ہوا ہے، کمیٹی کے ارکان کے ذہنوں میں یہ بات بھی ہوتی تھی کہ انعام کو موجودہ حالات کی عکاسی کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ اس کو امن کی ترقی کا موجب ہونا چاہیے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ امن کے قیام کے عمل میں طویل عرصہ لگ سکتا ہے اور اس کی راہ میں الٹ پھیر بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے معاملات میں ضروری ہوتا ہے کہ فساد کے امکانات کے باوجود پیش قدمی پر توجہ مرکوز رہے، اور ان افراد پر بھی جو اس نیک عمل کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کی ہمت رکھتے ہوں۔ پسپائی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ساری کوششیں بے کار گئیں۔ اس کے ذریعے اگلے موقع پر از سر نو ہونے والی کوششوں کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔ یہی طریقہ ہوتا ہے امن کی عمارت تعمیر کرنے کا، میکس ویبر (Max Webber) کے مطابق، جیسے، آہستہ آہستہ سخت نگرانی میں سوراخ کیا جاتا ہے۔ اس راستے میں کام جاری رکھنا انتہائی ضروری ہوتا ہے جیسا کہ اشتائی نوک چمک کا درست کرنا۔ اور موجودہ درجے کی طرف توجہ دلانے کے ذریعے ہی مزید ترقی میں ہاتھ بٹایا جاسکتا ہے۔

ہمارے دونوں انعام یافتگان نے بھلائی کے لیے بہت بڑا کام کیا ہے۔ ان دونوں نے بڑی ہمت کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ اسی طرح اوروں نے بھی۔ جیری ایڈمز (Gerry Adams)، برٹی لیبرن (Bertie Ahern)، ٹونی بلیئر (Tony Blair)، اور بل کلنٹن (Bill Clinton) ان بہت سے ناموں میں چند نام ہیں جنہوں نے گلفرائیڈے معاہدے کی تکمیل کے آخری درجے پر اہم کردار ادا کیا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے سینیٹر جارج میشل (George Mitchell) نے، جنہوں نے ثالثی کی تھی، دونوں انعام یافتگان کے کام کا

کتنا درست تجزیہ کیا میں جس کا حوالہ دینا چاہتا ہوں ”نہ مسٹر ہیوم کے بغیر امن کا عمل شروع ہو سکتا تھا، اور نہ مسٹر میشل کے بغیر معاہدہ۔“ ہمارے لیے یہ افکار کی بات ہے کہ ہم آپ دونوں کو آج اور اس جگہ اعزاز دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی، ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس راہ میں کئی مشکلیں بھی ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے اطمینان کا باعث ہے کہ آپ اس عمل کی رہنمائی کریں گے، اور آپ کو کئی جہتوں سے اس کی محکم حمایت بھی حاصل ہے۔

صدر مارو یائی نوبیل کمیٹی فرانسس سیرسٹا کی زبانی

خطبہ — جان ہیوم

جلالت مآب، ماروے کی نوبیل کمیٹی کے ارکان، عزت مآب، مخاطبین اور حضرات! میں اپنے قلب کی گہرائیوں سے نوبیل کمیٹی کا شکر گزار ہوں جس نے مجھ کو آج اس اعزاز سے سرفراز کیا

ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح انھیں بھی اس بات کا علم ہے کہ یہ امن انعام آئرلینڈ کے عوام کا ہم پر فرض تھا، بالخصوص انہیں مثال کا جنھوں نے اس تنازعے کے مہیب سائے میں زندگی بھی گزاری ہے اور اس کے دکھ بھی جھیلے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ڈیوڈ ہارمیل مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ نوپل انعام بے حد درمند اور انسانی جذبات سے مملو انسانیت کی اس وسیع دنیا کی طرف سے ان لوگوں کے لیے، ہم جن کی نمائندگی کرتے ہیں ہم دونوں کو عطا ہو رہا ہے۔

ہمارے تنازعے کے پچھلے تیس برسوں میں کبرے سلال اور مراہر ہول نائی کے بہت سے لمحات آئے ہیں۔ بہت سے لوگ احتجاج میں تھے کہ شاید ڈیوڈ ہارمیل کے الفاظ سچ نہ ہو جائیں:

”لے عرصے کی قربانی دل پتھر کر دیتی ہے“

کبھی نہ ختم ہونے والے عرصے سے، اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ ہمارے لوگ ہر آنے والے دن کو جھیلے رہے ہیں اور انھوں نے اپنے رہنماؤں کی ہمت افزائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے کہ وہ ان حالات کے حل تلاش کرنے کی ہمت کریں تا کہ ہماری نئی نسل ہر صبح ایک تبسم آمیز امید سے اپنے مستقبل کا انتظار کرے۔ دراصل یہ انعام ان ہی کا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ آج کے دن کی کیا اہمیت ہے، کہ یہ دن اپنی پوری توانائی سے ہمارے امن کے عمل کو مستحکم کرے گا۔

آج ہم بھی پچاس برس قبل بنائے جانے والے انسانی حقوق کے عالمی اعلان کی منظوری کا دن منا رہے ہیں اور دنیا بھر میں بھی اس کا یوم منایا جا رہا ہے۔ یہ صحیح بھی ہے اور مناسب بھی کہ ہر سال میں بین الاقوامی سطح پر آج کا دن امن کی اعانت کے لیے مختص کر دیا گیا ہے جس میں انسانی حقوق کا پورا احترام ہو۔ یہ صحیح بھی ہے اور مناسب بھی کہ ہمارے ملکی قوانین میں بھی انسانی حقوق کے کنونشن کی سفارشات گڈ فرائیڈے معاہدے کے عنصر کی صورت میں شامل ہوں۔

امن کے سلسلے میں کام کرنے کے دوران یورپ کے تجربات نے میرا دل بڑھایا ہے۔ میں ہمیشہ اس کے قصے کو بیان کرتا ہوں، اس لیے کہ یہ اس قدر مراد ہے مگر اتنا کھرا کہ دنیا کے کسی بھی علاقے کے تنازعے پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ 1979 میں یورپ کی پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے اسٹراسبرگ میرا جانا ہوا تھا۔ میں نے اسٹراسبرگ اور Kehl کے درمیان کا پل پیدل چل کر عبور کیا تھا۔ اسٹراسبرگ فرانس میں ہے۔ Kehl جرمنی میں واقع ہے۔ دونوں شہر ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ میں چلتے چلتے، پل کی پیچوں سے ٹک کر تھوڑی دیر کو ٹک کر سوچ میں پڑ گیا۔ ادھر جرمنی ہے اور ادھر فرانس۔ آج سے تیس برس قبل، دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے بعد اگر میں اس جگہ کھڑا ہوتا، جب صدی میں دوسری بار پچیس ملین افراد قتل ہو چکے تھے اور کہتا کہ ”فکر نہ کرو۔ تیس برس بعد ہم سب ایک متحد یورپ کا حصہ ہوں گے، ہمارے تنازعات حل اور جنگیں ختم ہو چکی ہوں گی اور ہم ایک دوسرے کے مفاد کے لیے کام کر رہے ہوں گے“ تو مجھ کو کسی ذہنی امراض کے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا گیا ہوتا۔ مگر آج یہ سب کچھ ہو چکا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ دنیا بھر

میں یورپی پارلیمنٹ تنازعات کے حل کیے جانے کا سب سے بہترین نمونہ ہے، اور ہر ایک کا فرض ہے، بالخصوص ان لوگوں کا جو تنازعات کے علاقوں میں رہتے ہیں، کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ یہ سب کس طرح ہو گیا اور اس کے اصولوں کو اپنے علاقوں کے تنازعات کے حل میں استعمال کریں۔

سارا تنازعہ ہی اختلاف کا ہے، فرق نسل کا ہے، مذہب کا یا قومیت کا ہے۔ یورپ کے سرخیلوں نے فیصلہ کیا کہ فرق میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ فرق فطری ہوتا ہے۔ فرق دراصل انسانیت کا ٹیڑھ ہے۔ فرق ایک پیداہنی حادثہ ہوتا ہے اور اس کو کبھی نفرت یا تنازعے کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ فرق کا جواب یہ ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔ اور اسی میں امن کا بنیادی اصول منظر ہے کہ فرق کی یو قلمبلی کا احترام کیا جائے۔

تو یورپ کے لوگوں نے ادارے تشکیل دیے جنہوں نے فرق کا احترام کیا۔ وزیروں کی کونسل، یورپی کمیشن اور یورپی پارلیمنٹ وغیرہ۔ مگر ان سب کو باہمی معاشی فوائد کے لیے مل کر کام کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ انہوں نے خون نہیں، اپنا پسینہ بہایا ہے اور اس عمل میں انہوں نے بد اعتمادی کی ہماری رکاوٹیں مسمار کر دی ہیں اور ایک نیا یورپ وجود میں آیا ہے جو فرق کے احترام کے اقرار کی بنیاد پر روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔

بس یہی کچھ ہم شمالی آئرلینڈ میں کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہمارا معاہدہ، عوام نے جس کی بھرپور حمایت کی تھی، تفاوت کا احترام کرنے والے اداروں کی تشکیل کہتا ہے مگر اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ ہم مل جل کر اپنے باہمی مفاد کے لیے کام کریں گے۔ ہماری اسمبلی انتخاب کرنے والے افراد کے تناسب کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے تاکہ اس میں ہر طبقے کی نمائندگی ہو۔ نئی انتظامیہ کو بھی اسمبلی کے ارکان اسی بنیاد پر منتخب کرنے ہوں گے تاکہ ہر طبقے کے لوگ ایک ساتھ مل کر کام کریں۔ آئرلینڈ کے دونوں حصوں کے درمیان، اور برطانیہ اور آئرلینڈ کے درمیان بھی ادارے ہوں گے اور وہ بھی عوام کے مشترک مفاد کا اور تفاوت کا احترام کریں گے۔

ایک بار یہ ادارے وجود میں آگئے اور ہم نے اپنے مشترک مفاد میں مل جل کر کام کرنے کی ابتدا کر دی، اب ہی زمنوں کے اندمال کا عمل شروع ہوگا، تب ہی ہم ماضی کی بے اعتدالیوں اور تعصبات کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکیں گے اور معاہدے اور تفاوت کے احترام کی بنیاد پر ہمارا نیا معاشرہ وجود میں آئے گا۔ اپنے دونوں حصوں کے عوام کی شناخت کا احترام ہوگا اور طریقہ میں سے کوئی بھی فاتح نہیں ہوگا۔

دنیا بھر سے ملنے والے بے انتہا تعاون اور یک جہتی کے پیغامات نے امن کے عمل کو جاری رکھنے میں ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہم اہل آئرلینڈ اس یک جہتی اور تعاون کی قدر کرتے ہیں، ساتھ ہی امریکا، یورپی یونین اور دنیا کے اطراف پھیلے ہوئے دوستوں، سب کے شکر گزار ہیں۔ اس خیر خواہی اور جذبات کی فراخ دلی کی عدم موجودگی میں امن کا حصول ممکن ہی نہیں تھا۔ اس روایتی موقع پر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آئرلینڈ میں موسم بہار کے اس امن و امید کے حصول کے عمل میں بہت سے افراد نے ہماری کوششوں

میں اپنی تمام ہنرمندیوں اور گہرے جذبات کے ساتھ ہمارا ہاتھ بٹایا تھا۔ ہم شکر گزار ہیں وزیرائے عظمٰی ٹونی بلیر اور برقی کبیرن کے، ریاست ہائے متحدہ کے صدر ہل کلنٹن کے اور یورپی یونین کے صدر ژاک دلیورا اور ژاک سانچ کے اور ان تین افراد کے جنہوں نے بات چیت کے دوران ہماری مدد کی تھی۔ یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکا کے ایوان بالا کے لیڈر سینیٹر جارج میل، فین لینڈ کے ہیری ہولکری (Harri Holkeri) اور کینیڈا کے جنرل جان ڈی چسٹی لین (John Chastelain)۔ ہم اپنی نہایت ممتاز سیکریٹری آف اسٹیٹ مونا فو لم (Mona Fowlem) کو اس موقع پر بھلا گس طرح فراموش کر سکتے ہیں۔

جزیرہ نما آئر لینڈ میں دو اہم سیاسی روایات مشترک ہیں۔ تاریخ نے ہمارے مقدر میں ساتھ ساتھ رہتا لکھ دیا ہے۔ ان سیاسی روایات کے نمائندے آج اس مقام پر آپ کے سامنے ایسا وہ ہیں۔ ہم سال ہا سال کی مشکلات اور اندوہ کے باوجود مشترک اخلاص اور عزم کے ساتھ آئر لینڈ کو امن اور برداشت کی ایک نئی علامت بنا کر ہی دم لیں گے۔

سیاسی ہدف کے حصول کی کوششوں میں آئر لینڈ نے بہت سے جائیں گوائی ہیں۔ خوں ریزی کے ذریعے سیاسی تبدیلی صرف اس تبدیلی کا راستہ رکھتی ہیں جو صحیح کچ اہم ہوتی ہے، یعنی قلب انسانی میں تبدیلی۔ اب ہمیں تبدیلی کے مستقبل کی ایسی تشکیل کرنی ہوگی جو صحیح معنوں میں بنیادی ہو جس کا مقصد حقیقی یکسوئی پر ارتکاز ہو، جو آئر لینڈ اور اس کے عوام کی بھلائی کے لیے مثالیت پسندی کی اور مجدد اہم کی نئی طاقتوں کو استعمال کر سکے۔

اپنی سیاسی زندگی کے دوران میں نے غیر معمولی ہمت اور استقلال والے منفرد مرد اور عورتوں کو تشدد کا شکار ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اپنی تباہ شدہ زندگیوں میں بھی ان میں ایسی بے زبان خجاعت کا ظہور دیکھا ہے جو تشدد کرنے والی شیطنت کو، قمارت گر تشدد کو اور بے مقصد اوچھے پن کو اپنی خاموشی سے لٹکا رہی ہے۔ میں نے مختلف النوع سیاسی وابستگیوں رکھنے والے افراد کے درمیان امن کے حصول کے ارادوں کو ایک مشترک بندھن بنتے ہوئے دیکھا ہے۔

میں نے غلط فہمی اور تناؤ کے دور میں بھی آزمائش اور برطانوی عوام کی دوستی کو تمام تر تنگ ذہن سیاسی اختلافات کے باوجود بڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہم دو ہمسائے جزیرے ہیں جن کا مقبوم ایک ساتھ دوستی اور بھائی چارے کے ساتھ رہنا ہے۔ ہم دوست ہیں، اور امن کا حصول ہماری دوستیوں کو اور مستحکم کرے گا اور ایک ساتھ ہم کو ایسے بے شمار رشتے اور بندھن بنانے کی اجازت دے گا جو ہم کو مختلف طریقوں سے متحد رکھیں گے۔ گڈ فرائینڈس معاہدہ پورے آئر لینڈ کے عوام کے لیے نئے مستقبل کی راہیں دکھاتا ہے۔ تفاوت اور سیاسی اختلافات کے احترام کی بنیادوں پر تعمیر کیا ہوا مستقبل۔ ایک ایسا مستقبل جس میں سب اپنی تمام تر آہنگوں اور اعتقادات کے ساتھ شادماں رہ سکیں، جس میں بھی ان کے نشانات امتیاز ہوں نہ کہ تقسیم کا خوف مسلسل۔ یہ معاہدہ ایسی گنجائش پیدا کرتا ہے جو کسی کی بھی سیاسی روایت کی، کسی گروہ کی یا کسی فرد کی

self-respect کو کم نہیں کرتی۔ یہ ہم سب کی شمالی آئرلینڈ میں اور آئرلینڈ کے پورے جزیرے کے تمام باسیوں کو اجازت دیتا ہے کہ ہم ایک ساتھ ہو جائیں اور بالاشتراك سب کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ کسی سے اپنی دل پسند امنگوں یا اعتقادات کو ترجیح دینے کے لیے نہیں کہا جاتا۔ ہم سب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم اپنی ہی طرح دوسروں کے خیالات اور حقوق کا احترام کریں، اور مل کر مشترک تصورات کا ایک ایسا عہد نامہ تیار کریں جو نئی دنیا، اور سب کے حقوق کے مقاصد سے متحرک دنیا پر استوار ہو۔ یہی ہے وہ کچھ جس پر نیا اور متفقہ آئرلینڈ بنے گا۔ ہم میں سے ہر ایک کا یہی مطالبہ ہے۔

آئرلینڈ کے دونوں حصوں کے عوام اکٹھے ہو کر امن کے لیے سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے، بیلٹ باکس کے ذریعے، بھاری اکثریت سے گزراؤں کے معاہدے پر صاد کیا ہے۔ انھوں نے کڑے ارادوں کے ساتھ طے کیا ہے کہ امن کو سنگ خارا کے جگر میں پیوست کر دیا جانا چاہیے تاکہ اس کے تمام امکانات پر مقصد کے استقلال کے ساتھ استفادہ کیا جاسکے۔

اب یہ سرگروہ کے اہل سیاست پر منحصر ہے کہ وہ آئرلینڈ کے عوام کے فرمان پر قطعی عمل کریں۔ ایک عرصے سے ان کے دلوں میں جس امن کی امنگ رہی تھی، اس کے قیام اور پرورش کے لیے ایسے مستحکم ادارے قائم کریں کہ اس جزیرے سے تشدد اور بے اعتمادی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قلع قمع ہو جائے۔ اب آئرلینڈ میں نئے آفاق کی جانب بڑھنے کی سرگرمیوں کا آغاز کیا گیا ہے۔

میں ان سب کو سلام کرتا ہوں جنھوں نے اس عمل کو ممکن بنایا ہے، ان رہنماؤں کو اور یہاں جماعتوں کے تمام ارکان کو جنھوں نے معاہدے اور نئے مستقبل کی تشکیل میں ہاتھ بٹایا ہے؛ ریکی بلیکمن اور شاہی کے طرف داریوں کی تحریک کے سرخیلوں کو بھی جنھوں نے بہ کمال پیش رفت اور عالی جنہی ایک مختلف راہ اپنائی ہے؛ آئرلینڈ کے سرحدی کے عوام کو بھی جنھوں نے امن کی طرف اپنے قدم بڑھائے ہیں، اور اس کے حصول کو ممکن بنایا ہے۔

اور اب ہمارے سامنے ایک نئی تاریخ کی تشکیل کا چیلنج ہے؛ یہ دکھانے کا کہ ماضی کی نا انصافیاں اور رنجشیں نئے جذبات اور دریا دل عملیت کی راہ کے روڑے نہیں بن سکتیں۔

میری خواہش ہے کہ میں آئرلینڈ، شمال اور جنوب، کے زخم مندمل ہوتے دیکھوں، اور دونوں حصوں کو یورپ میں اپنا کردار ادا کرتا دیکھوں تاکہ تمام آئرلینڈ والوں کے درمیان وطن دوستی اور نئی کوششوں کے مشترک بندھن مضبوط ہوں۔

میری خواہش ہے کہ میں دنیا کے تمام لوگوں کے لیے آئرلینڈ کو ایسی مثال بننا دیکھوں جس میں لڑائی جھگڑوں سے نہیں بلکہ اعلیٰ آدرشوں کے لیے جیسا زندگی کا مقصد ہو، جس میں ہر فرد احترام اور عزت کا حق دار ہو۔

میری خواہش ہے کہ آئرلینڈ کو ایسی شراکت بننا دیکھوں جس میں جنگ ہو تو افلاس کو مٹانے کے لیے، جہاں ہم کنارے لگا دیے جانے والوں اور ناداروں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں، جہاں ہم مل جل کر ایسے

مستقبل کی تعمیر کریں جو ہمارے ارفع خوابوں جیسا عظیم ہو۔

آئرش شاعر لونی میک نیس (Louis MacNiece) نے اُمید اور قرار کے ایسے الفاظ لکھ دیے ہیں جو میرے نزدیک ہم سب کو درپیش چیلنج شمال، جنوب، یونیسٹ اور فیشنلسٹ کی غمازی کرتے ہیں:

”ایک زخشدہ ستارے کے ٹپٹل

راہ ہموار ہوتی ہے اپنی

زندگی ہی ہے ہمارا انجام

اک ذخار سمندر کی طرح“

یہی ہے وہ سفر ہم اہل انڈینڈ جس پر نکل پڑے ہیں۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، دنیا ابھی بچپن میں نہیں گزری۔ انسان کے حقوق کے اعلان کا جشن منا رہی ہے۔ میرے نزدیک ایک بے مثال موزونیت ہے، ایک قسم کا سنا عراشہ عمل ہے، اس اتفاق میں کہ میں اور میرے ساتھی، اس سماج کی نمائندگی کر رہے ہیں جس کو تاریخ کی ہولناکیوں نے ایک عرصے تک تقسیم کیے رکھا تھا، اور آج، اس اعزاز میں ہم دونوں شراکت دار ہیں۔ میں بہ کمال انکسار اس اعزاز کو قبول کرتا ہوں، اپنے عوام کی جانب سے، جو یہ سبیل کے نزاع کے بعد، ایک ساتھ امن سے رہنے کا عہد کر چکے ہیں۔ ہمارا عہد Universal Declaration ہی کے الفاظ اور اصولوں کی بنیاد پر ایسا رہا ہے۔ میرے لیے اور میرے عوام کے لیے اس سے بڑا اور کیا اعزاز ہو سکتا تھا کہ میں اس مناسب موقع پر ان کی ترجمانی کر رہا ہوں۔

میں اپنے گرام کو مارٹن لوتھر کنگ جونیئر (Martin Luther King Jr) کے، مکمل امید کے، قول کے ساتھ ختم کرنا چاہوں گا جو میرے نزدیک اس صدی کا ایک عظیم ہیرو تھا:

”ہم فتح مند ہو کر رہیں گے۔“

شماره ۱۰۰

خطبہ - ڈیوڈ فرمیل

جلالتِ مآب، عزتِ مآب، ماریا فی نو بیل کمپنی کے ارکان، محوِ تین و حضرات!

فوتیمل انعام عام طور پر نامزد کیے جانے والے افراد کو دیا جاتا ہے۔ اس میں کے نامزد افراد ہیں جان ہیوم اور میں، شمالی آئرلینڈ کے دو سیاست داں۔ میری عزت افزائی ہے، کہ جان ہیوم کی طرح میرا نام بھی اس اعزاز کے لیے چننا گیا ہے۔

تاہم، کچھ معنوں میں، ایک امن انعام کے لیے وہ افراد کا منتخب کیا جانا انصافی بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً امر لینڈ سے میں بے شمار اتحاد پسند اور قوم پرست افراد کے نام پیش کر سکتا ہوں، جو مجھ سے کہیں زیادہ اس

انعام کے حق دار ہیں۔ اور اس میں ان ہزاروں افراد کے نام بھی شامل کر دیے جیسے جنہیں میں نہیں جانتا، جو پیدائش کے وقت سے اس کے گواہ ہیں، جنہوں نے خود اپنی زندگی میں وہی کیا ہے جسے ورڈز ورکھ نے ”وہ چھوٹی چھوٹی بے نام مہربانیاں اور محبتیں جن کو بھلا دیا گیا ہے“ کہا ہے۔

اور چوں کہ میں جانتا ہوں کہ شمالی آئرلینڈ میں ایسے ہزاروں ہیر و اور ہیر وئیں ہیں، تو کتنے ہی ہزار ہوں گے جو کرہ ارض پر امن کے سداول دستے میں رہ کر جنگ کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو ان علاقوں میں امن کی خاطر سداول دستے میں شامل ہوتے ہیں جہاں امن نہیں ہے۔ بلو زینیا، کوسوو، غزہ، قبرص، روانڈا، انگولا۔

ظاہر ہے کہ تمام ہیر و اور ہیر وئوں کے نام نہیں لیے جاسکتے، جو دنیا بھر میں امن کے لیے کام کرنے والے انہوہ میں اس وقت بھی شامل ہیں جب ہم یہ کلام کر رہے ہیں۔

اگر ان کے نام لینا ممکن نہ ہو، جب بھی ہم دنیا بھر میں امن کی سرحدوں پر ان کی موجودگی کو محسوس تو کیا جاسکتا ہے۔

اتنا سب کہنے کے ساتھ ساتھ، میں آپ کے اس خوف کو دور کر دینا چاہتا ہوں کہ کہیں میں اس تحفے اور چیک کو قبول کرنے سے انکار نہ کر دوں۔ شمالی آئرلینڈ کے عوام ایسے لوگ نہیں جو تحفے کے گھوڑے کے دانت دیکھنے لگ جائیں۔ مجھ پر لازم ہے کہ میں اس تحفے کو شمالی آئرلینڈ لے جاؤں، محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں اس سلسلے سے ہو کر آ رہا ہوں۔

شمالی آئرلینڈ میں سیاست بھی عجیب طرح کی ہے کہ۔ اگر جان ہیوم کو متنا ملا ہے تو ضروری ہے کہ ہمیں بھی ملے۔

یہ ایک آفاقی سچائی ہے کہ tree lunch جیسی کوئی شے نہیں بھاگتی [یہ محاورہ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ مفت میں کچھ بھی نہیں ملتا]۔ ایسا ہے تو پھر جان کو اور مجھے اس شب ضیافت کے کھانے کے عوض اور کچھ نہیں تو شاید کوئی گیت ہی گانا پڑے گا۔ مختصر، کچھ لوگ ہم سے توقع کر رہے ہیں کہ ہم ایک ماہر کی طرح کلام کریں اور مشورہ دیں کہ امن کیسے قائم کیا جاتا ہے۔

ماہر لوگ کہتے ہیں کہ کھانے کے عوض گیت سنانے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق پہلا اور محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ کچھ گول مول تصوراتی بیانات دے دیے جائیں۔

تو کیا گول مول اور تصوراتی بیانات ایک ہی چیز نہیں ہوتے؟ میرا جس رسم و رواج سے تعلق ہے مگر میں جن کا پابند نہیں ہوں، اس میں پہلی ویسی انجیل عوام کی زبان میں تحریر کی گئی تھی، جس نے روشن خیالی کی زبان کو بہت کچھ دیا ہے۔ یہ الفاظ کے ٹھیک استعمال کی بڑی قیمت لگاتی ہے، اور ان کو احتیاط سے استعمال

ہو۔ ”انعام میں ملے ہوئے گھوڑے کے منہ کے دانت دیکھنا“ چچی صدی عیسوی کا محاورہ ہے جس کو پہلی بار سیٹ جیروم نے استعمال کیا تھا۔ گھوڑے کی عمر اور اس طرح اس کی قیمت کا اندازہ اس کے دانت دیکھنے سے ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس محاورے سے ان کی مراد تحفے میں ملی ہوئی شے کی قیمت کا اندازہ کرنا تھا، جو ایک عجیب بات ہے۔

کرتی ہے، اس قدر احتیاط سے کہ اکثر ہمارا دماغی کا جذبہ مثالیت سے بے توجہی کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔
ایسا ہے تو نہیں۔ مگر میں ذاتی طور پر، اور شاید تہذیبی طور پر، ایسی تقریروں پر شبہ کرنے کا عادی
ہو گیا ہوں کہ جو تقریریں گھن گرج اور غصے کا استخراج ہوتی ہیں، وہ ارادے میں تو مثالیت پسند ہوتی ہیں،
مگر ان کا نفاذ ناممکن ہوتا ہے، اور میں اس قسم کی خطابت کی مزاحمت کرتا ہوں جو بصیرت کو بخارات میں
تبدیل کر دیتی ہے۔ جبلی طور پر، میں ایسے شخص کے ساتھ اپنی پہچان رکھتا ہوں جس نے کہا ہے کہ جب اس
نے ایک سیاست دان کو اپنی بصیرت کے بارے میں بات کرتے سنا تو [میں نے] اُسے آنکھوں کے ڈاکٹر
کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا!

لیکن، اگر آپ ایک امکانی انٹر لینڈ کے بارے میں کچھ سننا چاہتے ہیں، یوٹوپیا کے بارے میں
نہیں، بلکہ ایک عام مثالیت قسم کی سوسائٹی کے بارے میں، ویسکی ہی عیب دار جیسے کہ عیب دار انسان ہوتے
ہیں، اور ویسکی ہی صاف ستھری جیسے صاف ستھرے انسان ہوتے ہیں، تو میں امید کرتا ہوں کہ میں آپ کو
مایوس نہیں کروں گا۔

میرا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ جان یا مل، یا دونوں ہی، امن کے سائنس دانوں کی طرح کچھ دیر اس
سبق پر بات کریں جو ہم نے شمالی انٹر لینڈ کی تجربہ گاہ میں سیکھا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ہم سائنس دان ہوں
اور عوام تجربے کے چوہے [یعنی تھوڑے مشعل]۔

اپنے بارے میں بات کرنے سے انکار کرنے کی دو بہترین وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے، کہ مجھے اس
بات کا یقین نہیں کہ شمالی انٹر لینڈ کی سیاسی تجربہ گاہ میں میری حیثیت ایک سائنس دان کی ہے۔ دراصل مجھ پر
اکثر ایسے دن گزرے ہیں، بالخصوص حالیہ عرصے میں، جب میں نے خود کو سائنس دان کم اور [تجرباتی] چوہا
زیادہ محسوس کیا ہے!

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر میں کسی تنازعے کے پس منظر میں خاصی سنجیدگی سے اپنی لیاقت کا اندازہ
کروں، جس میں شمالی انٹر لینڈ کا معاملہ ایک نمونہ ہو تو واقعی مجھے اپنے بارے میں کچھ تحفظات ضرور ہیں، اس
سے قطع نظر کہ دوسرے تنازعات کے کیا حل نکلے ہیں۔

جو کچھ بھی ہو، مگر دراصل سچ وہی ہے جو اس کے خلاف ہے۔

ذرا ظہریے، میں تفصیل بیان کرتا ہوں۔

میرا یقین ہے کہ کیسائی معاملہ کیوں نہ ہو مسائل میں، پہلا منفرد ٹھوس اور ناگزیر قدم یہ ہوتا ہے کہ
منفرد حالات کے پیش کردہ مسائل کا حل ڈھونڈا جائے۔

اب، کاش میں کہہ سکتا کہ وہ بصیرت میری اپنی ہی تھی، مگر مسئلے کے ٹھوس اور مخصوص حالات کے
بارے میں اُسی کی سیاسی بصیرت مرکزی کردار ادا کرتی ہے جس کا عملی سیاست میں ایک قابل احترام فلسفی کے
طور پر اعتراف کیا جاتا ہے۔

یقیناً، میرا اشارہ اخباروں کے محترم سیاسی فلسفی، اور بے مثال پارلیمانی سیاست دان ایڈمنڈ برک (Edmund Burke) کی طرف ہے۔

وہ صدی کا سب سے زیادہ طاقت ور اور پیہرا نہ صلاحیت کا سیاسی دانش ور تھا۔ اس نے امریکی انقلاب کی پیش بندی کی تھی اور غیر مقدم بھی کیا تھا۔ اس نے انقلاب فرانس کے تاریک پہلوؤں کی پیش بندی کی تھی اس نے، انسان کی تکمیل پذیری کے غلط نظریے کی بنیاد پر، اس سیاسی تشدد کی بنیادوں کی چھان بین بھی کی تھی، جو فرانسیسی انقلاب کے بعد سے ہم میں وبا کی طرح پھیل گیا ہے۔ قدامت پسند (Conservatives) اور روشن خیال (Liberals) دونوں ہی اس کو اپناتے ہیں۔ برطانیہ اور آئرلینڈ، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ، بلکہ پوری دنیا اس کو اپنا سکتی ہے، کہ برک کا پارلیمانی جمہوریت میں قانون کی حکمرانی پر یقین، ہمارا ہی اجارہ نہیں، بلکہ یہ تو ہر ملک، ہر رنگ اور ہر مذہب کے عرووں اور عورتوں کا پیدائشی حق ہے۔

مگر بلاشبہ ہمارے نزدیک آئرلینڈ میں وہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایک پروٹسٹنٹ باپ اور کیتھولک ماں کا بیٹا، برک وہ انسان تھا جس نے اپنی بات اور اپنے عمل دونوں کے ذریعے مذہبی روایات کا احترام کیا، اور اپنی آئرش بنیادوں اور برطانوی پارلیمانی نظام کا اعتراف کیا تھا، جس میں نشوونما پا کر اس کا جوہر قابل ابھرا تھا۔ آج، جب ہم نہ صرف ہتھیار اور کلمہ بارد کو بے اختیار کرنا چاہ رہے ہیں، بلکہ دل و دماغ کو بھی، برک ہمارے لیے نہ صرف ایک طاقت ور نمونہ ہے فلسفہ کثرت الوجود کے پیرو آئرش فرد کا، بلکہ ہر طرف کے سیاست دانوں کے لیے بھی ایک طاقت ور نمونہ ہے۔

برک بہترین نمونہ ہے اس کا بھی، جسے امکانات کا سیاست دان کہا جاسکتا ہے۔ وہ سیاست دان جو ایک باعمل امن کی تلاش میں ہیں، کسی مکمل دنیا میں نہیں، جس کا کبھی وجود ہی نہیں تھا، بلکہ اس نقص بھری دنیا میں بھی، جو ہمارا واحد کارخانہ ہے۔

چوں کہ وہ عملی سیاست کے فلسفی ہیں، بخارات کی بصیرت رکھنے والے نہیں، اور چوں کہ ان کے خیالات اراداتی تجربات سے ملنے ہیں، اس لیے امن حاصل کرنے کی عملی سیاست کے لیے وہ ایک اچھے قلمرو ہو سکتے ہیں۔

میں دوسرے دو فلسفیوں کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا، ممتاز ادیب آموز اوڑ (Amos Oz) کا جو عرب قوم سے رابطے میں رہے ہیں، اور جارج کینان (George Kennan) کا جو سوویت یونین میں امریکا کے سفیر رہ چکے ہیں، جنہوں نے امریکا کی مابعد جنگ کی خارجہ پالیسی کا پایہ رکھا تھا۔

یہ تینوں، برک، اوڑ اور کینان خاص طور پر انقلابی تشدد کے معاملے میں بہت سخت رویہ رکھتے ہیں۔ کہ سیاسی، مذہبی اور نسلی دہشت انگیزی جو تجزیاتی بھلائی کی تلاش کی وجہ سے ہوتی ہے، جب لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف مکمل بنانے کی کوشش کی جائے۔

اب، ان منفی باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ میرے پاس آخر کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ ضرور ہے، مگر یہ فرض سے غفلت ہوگی اگر میں صرف خیال ہی ہم زادوں کو جادو کے زور سے اکٹھا تو کر لیتا ہوں مگر جشن میں آسیب کی نشان دہی میں چوک جاتا ہوں۔

دنیا میں فسطائی طاقتیں بھی ہیں۔ ان کو شکست دینے کے لیے پہلا قدم ان کی نشان دہی ہوگا۔ اب اجازت دیجئے کہ میں، بزرگ، اوز اور کینان کی مدد سے، فسطائیت کے بدلو دار فوراً رے کوڈ ٹھونڈ نکالوں، جس میں سے زیادہ تر سیاسی، مذہبی اور نسلی تشدد اہلتا ہے جو انسانیت کی ترقیاتی کامیابیوں کو آلودہ کرتا ہے۔

بزرگ کو یقین تھا کہ آلودگی کا ماخذ تجریدی تکمیل کی افلاطونی تلاش ہے، جس سے ہم دوسروں کے نفعی، سیاسی، مذہبی اور اقتصادی نظریات کو تشدد کے ذریعے تبدیل کرنے کا جنون کہہ سکتے ہیں۔ میں افلاطونی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مغربی دنیا میں تجریدی کمال کی بے رحم تلاش افلاطون کی ”جمہوریہ“ سے شروع ہوتی ہے۔ فرانسیسی اور روسی انقلاب کے ساتھ یہ ایک بلند مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ مائسیدوں نے اس کو نئی کیرائیوں میں جا پھینکا، اور اشتراکیت کے زوال کے بعد یہ تمام قومی، نسلی اور مذہبی تنازعات میں موجود رہی ہے، کہ اشتراکیت خود بھی اقتصادی نظام کو کسی بھی قیمت پر مکمل بنانے کا نہایت بے رحم افلاطونی تجربہ تھی۔

بزرگ نے افلاطونی تکمیل پذیری کے کھپے کو چیلنج کیا جس کا سب سے اہم کردار روسو تھا۔ روسو انسان کو کامل اور سوہنائی کو بد عنوان گردانتا تھا۔ بزرگ کا خیال تھا کہ آدمی ناقص ہے اور سوہنائی سلامتی کرنے والی ہے۔ انقلاب نے ان نظریات کی جانچ کی، اور وہ بزرگ ہی تھا جو عملی سیاست میں سب سے زیادہ ترقی پسند ثابت ہوا۔

اسے تجریدی تصورات سے خوف آتا تھا۔ 1781 میں اس نے کہا تھا، ”دوسری تجریدات کی طرح تجریدی آزادی بھی غفلت ہوتی ہے۔“ سات برس بعد اس نے انقلاب سے اختلاف کیا تھا، اور صحیح پیمائش کوئی کی تھی کہ جھوم کی جگہ سازش لے لی اور سازش کی جگہ ایک آمر لے گا۔

بزرگ نے پیمائش کوئی کی تھی کہ روسو کی روش کے آخری سرے پر انسان کا تکمیل پذیری نہیں بلکہ سوہنائی اور سرکامی کے پیمائش سے واسطہ ہوگا۔ اور یہی ثابت ہوا۔ اور یہی اس وقت بھی ثابت ہوا تھا جب اسرائیلی نے سوویت آدمی کو کامل بنانے لگا تھا۔ ایسا ہی کچھ چین میں مائو (Mao) کے ساتھ ہوا تھا، اور پال پات (Pd) کے ساتھ کمبوڈیا میں۔ لہذا، جب بھی ہندوئیت کے مال کے ذریعے تکمیل کی خواہش کی جائے گی تو ہر تنازعے میں یہی ثابت ہوگا۔

آرموں آرمیں ہی نیچے پر پہنچا ہے۔ حال ہی میں ایک ریڈیو پروگرام میں اس کو ایک سیاسی دیوانے کی تعریف کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس نے تعریف اس طرح کی تھی، ”سیاسی دیوانہ وہ ہوتا جو اپنے آپ کے بھلے دوسروں میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ پہلی نظر میں وہ عوام کا ہی خواہ لگے گا، مگر قریب سے دیکھو تو وہ تمہیں دہشت پسند دکھائی دے گا۔“

سیاسی دیواندہ نہیں ہوتا جو خود کا مل ہونا چاہتا ہے۔ جی نہیں! وہ آپ کو کامل بنانا چاہتا ہے۔ وہ آپ کو ذاتی طور پر، سیاسی طور پر، مذہبی اعتبار سے، نسلی اعتبار سے یا جغرافیائی اعتبار سے کامل بنانا چاہتا ہے۔ وہ آپ کے ذہن کو، آپ کی حکومت کو، آپ کی سرحدوں کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ وہ آپ کی نسل کو تبدیل نہیں کر سکے گا، اس لیے وہ آپ کو صفحہ ہستی سے مٹا کر اپنے دماغ سے بھی مٹا دے گا۔

بزرگ نے کہا تھا ”جیکوبینوں (Jacobins) [سیاسی بنیاد پرستوں] کے پاس ناقص لوگوں کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا۔“

ہم شمالی آئرلینڈ والے دافوں سے میرا نہیں۔

ہمارے ہاں بھی چند دیوانے ہیں جو اسٹر (Ulster) کے برطانوی لوگوں کو ایک یوٹوپیائی آئرش ریاست میں ٹھونسے کے خواب دیکھا کرتے ہیں، جو نظریاتی اعتبار سے اس کی آبادی کی خواہش سے زیادہ آئرش ہوگی۔ ہم میں وہ دیوانے بھی ہیں جو شمالی قومیت پرستوں کو ایسی ریاست میں مستقل طور پر دبائے رکھنا چاہتے ہیں جو اس کے باسیوں کی خواہش سے زیادہ برطانوی ہوگی۔

مگر چند دیوانے ایسے بھی ہیں جو بنیادی مسئلہ نہیں۔ جی نہیں، مسئلہ اُس وقت اٹھتا ہے جب سیاسی دیوانے خود کو ایک اخلاقی طور پر جائز تحریک میں چھپا لیتے ہیں۔ جب ایک دہرا خطرہ درپیش ہو جاتا ہے۔ پہلا خطرہ یہ ہے کہ ہم دہشت پسندی کے ذریعے انقلاب لانے پر کمر بستہ گرد ہوں کی جہالت کی وجہ سے اصلاح کے جائز مطالبوں کو رد کر دیتے ہیں۔

ایسی صورت میں تجربہ کہتا ہے کہ آگے بڑھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جمہوری لوگ وہی کریں، آئرش ادیب یوگان ہیرس (Eoghan Harris) جس کو اختیار کا اچھا استعمال کہتا ہے۔ یعنی وہی اعمال جو ان کے اپنے لوگوں کے لیے کیے جاتے ہیں۔

اس طرح ہر اصلاح پسند گروپ کا اخلاقی فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دیوانوں سے خود نمٹے۔ مریا کے جمہوریت پسندوں کو مریائی فلسفائیوں کو ٹھیک کرنا چاہیے۔ PLQ کو حماس (Hammas) سے نمٹنا چاہیے۔ شمالی آئرلینڈ میں آئینی قوم پرستوں کو ریپبلکن مخالف رائے رکھنے والے دہشت گردوں سے نمٹنا اور آئینی اتحاد پسندوں کو پریسٹنٹ دہشت گردوں کا سامنا کرنا چاہیے۔

ایک دہرا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے عمل کی تلاش میں ہم دیوانوں کے تاریک پہلوؤں سے انکار کرتے ہیں، انسانی فطرت کے تاریک پہلو سے۔ سب اس سے اتفاق نہیں کریں گے مگر ہم شیطنیت کے وجود کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بالخصوص، اس قسم کی سیاسی شیطنیت جو کسی شخص، یا کسی سرحد کو کامل بنانا چاہتی ہو۔

اس کے کئی چہرے ہوتے ہیں۔ سمجھ تو مشکوک مریائی فوجیوں جیسے دکھائی دیتے ہیں جو قتل عام کے لیے مطلوب ہیں، جیسے Srebrenice میں آٹھ ہزار مسلمانوں کے قاتل، کچھ وہ ہیں جو بغداد میں آمرانہ

اقتدار کے حامل ہیں، کچھ وہ ہیں جو اوماگھ (Omagh) پر بموں کے حملے کے لیے مطلوب ہیں۔
مجھے جو بات پریشان کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مغربی سیاست میں دلا سے کی لڑیاں ملتی ہیں۔ کبھی امید ہوتی
ہے کہ حالات اچھے بھی خراب نہیں۔ کبھی یہ امید بندھتی ہے کہ لوگوں کو دہشت سے ڈر لے جایا جاسکتا ہے۔

ہمیں جس بات کی ضرورت ہے وہ جارج کینان (George Kennan) کا اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ
کو دیا جانے والا مشورہ ہے، جو اس نے ماسکو میں برسوں قیام کی بنیاد پر، اپنے زمانے کے دہشت گردوں سے
ٹھٹھنے کے لیے چھٹے عشرے میں دیا تھا "ان کے لنگوٹیا یا رنہ بنو، ایسے مشترکہ مقاصد نہ رکھو حقیقت میں جن
کا وجود نہیں ہوتا، اعتماد خیرگیانی کا اظہار نہ کیا کرو۔"

میں ان واضح الفاظ کی ان سے سفارش کروں گا جو شاید سمجھتے ہیں کہ قسطنٹیوں سے معاملہ کرنا محض
ایک کھیل ہے جس سے کسی کو گزند نہیں پہنچے گی۔

میرے فلسفی میری رہنمائی بھی کرتے ہیں کہ ظلمت کی طاقتوں سے لڑائی کا بہتر طریقہ کیا ہوتا
ہے۔ اس مقام پر ہم کو ایک بار پھر بزرگ کی بات یاد آتی ہے، کہ سیاست چند تجربہ کی نقطہ ہائے نظر یا ماضی کے
سہارے سے بنی نہیں، بلکہ ٹھوس تفصیلات اور موجودہ مخصوص حالات پر گہری نگاہ رکھنے سے آگے بڑھتی ہے۔

بزرگ کہتا ہے، "حالات" [صرف] حالات ہی سیاسی اصول کو حقیقت کا روپ، اس کی پہچان کا
رنگ، اور امتیازی اثر دیتے ہیں۔ حالات ہی بنی نوع انسان کے لیے ہر شہری اور سیاسی اسکیم کو فائدہ مند یا
مضر بناتے ہیں۔"

یہی ہے معاملے کا ایک چھوٹا سا مغز۔ دوسرے تنازعات پر بھی یہی کچھ صادق آتا ہے۔ موجودہ
حالات پر مذاکرات کرنے والوں کو ماضی کی مثالوں سے چکا چوند نہیں ہونا چاہیے۔ پہلا قدم بے خیالی کے
خلاف ہو یا حقیقت کی جانب، ترقی کے امکانات کو راستہ دیتے ہوئے ہی اس پر آگے بڑھنا چاہیے۔

ہیں، میں نے یہی کرنے کی کوشش کی ہے، اتحاد پرستوں سے کہنا کہ حالات کو بہتری کی جانب
بڑھنے کا موقع دیں۔ لگتا ہے کہ اسٹریٹ کے برطانوی عوام اپنے خلاف کی جانے والی ہتھیائیں برس کی مسلح جدوجہد
سے باہر نکل رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری اپیلوں پر بڑے نیا ضامنہ انداز میں کان دھرے ہیں۔ ماہرین کہتے
ہیں کہ مراعات دینا کم زوری کی نشانی ہوتی ہے۔ مگر بزرگ کا کہنا ہے کہ "سیاست میں مٹا ڈونا درنیک نہادی کا
مظاہرہ کرنا دانش مندی نہیں ہوتی، اور ایک عقیم سلطنت اور چھوٹے ذہن ایک ساتھ نہیں چلتے۔" ہم برطانوی
سلطنت پر غور کرتے ہیں تو یہ الفاظ کتنے جیمبرانہ لگتے ہیں۔ اور ہم لوگ اس عقلی روایت کے وارث ہیں جو
آئمریزی بولنے والوں کے تہذیبی اتحاد سے اپنی شناخت کرنے اور ان کے سیاسی مفادات میں شرکت کرنے
کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔

مگر امن کا حصول نیک نہادی سے کچھ زیادہ کا طلب گار ہوتا ہے۔ یہ ایک مخصوص نوعیت کی
مصلحت اندیشی طلب کرتا ہے، اور کبھی رضا مندی جو نہ بہت باقاعدہ ہو۔

جوڈی ویمس اور آئی سی بی ایل

اعلان تجلیل

جلاالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات!

اس لمحے ہمارے درمیان ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے اعتقاد میں غیر متزلزل بھی ہیں اور جو یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ایسے کام کیے جاسکتے ہیں جو دنیا کو یکسر بہتر محفوظ اور نرم دل بنا سکتے ہیں اور جو مشکل نظر آنے والے کام کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ ایسے افراد ہماری توصیف اور شکرانے کے حق دار ہیں۔ ہمیں آج ایسے لوگوں میں سے چند کا اوسلوئی ہال میں خیر مقدم کرتے ہوئے بے انتہا مسرت ہو رہی ہے۔ (ICBL) (International Campaign to Ban Landmines) کے نمائندہ آپ کو اور اس مہم کو جاری رکھنے کی سب سے بڑی طاقت جوڈی ویمز، سب کو ہم صمیم قلب سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ سب نے نہ صرف اس کام کو آگے بڑھایا ہے، بلکہ یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ ناممکن بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ آپ نے ایسے ہتھیاروں کی نکلانہی کے استعمال کے خلاف بین الاقوامی سطح پر رائے عامہ کو ابھارنے میں مدد کی ہے جو بالکل مستحکم اور بے گناہ لوگوں کو چاہیے آتے ہیں۔ آپ نے یہ امکانات بھی پیدا کر دیے ہیں کہ رائے عامہ کی اس لہر کو سیاسی عمل میں بدلا جاسکے۔

ہم سب کو اعتراف ہے کہ اس کام کا ایک بڑے حصے کو ابھی پایہ تکمیل تک پہنچانا باقی ہے۔ بہت سی قومیں، جن میں بڑی قومیں بھی شامل ہیں، اس ہتھیار کا استعمال ترک کر دینے کا وعدہ کرنے کے سلسلے میں متذبذب کا شکار ہیں۔ اندازاً ایک سو پچاس بارودی سرنگیں ابھی تک بکھی ہوئی ہیں اور ان کے خاتمے کے لیے بہت کام کرنا باقی ہے۔ بارودی سرنگوں سے رنجی ہو کر معذور ہونے والے بے گناہ افراد کے لیے روزگار کے باعزت مواقع مہیا کرنے کی کوششوں کی ابھی صرف ابتدا ہی ہوئی ہے۔ مگر آپ کی بے لوث کوششوں کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے اور ایسے ادارے وجود میں آگئے ہیں جن کی بنا پر امید ہے کہ ہم دنیا کو زمینی

بارودی سرنگوں سے مکمل طور پر پاک کرنے کا ہدف حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ماہ متعین ہے، اور تحریک کی ابتدا ہو چکی ہے۔ یہ کم درجے کی کامیابی نہیں، بلکہ بہت اہم اور فیصلہ کن جدوجہد کی طرف پہلا قدم ہے۔ آج ہم اسی اقدام کی پذیرائی کر رہے ہیں۔

اس سلسلے میں، وسیع پیمانے پر لام بندی اور عوام کی شرکت کا ارتکاز جو ہم دیکھ رہے ہیں امید افزائی کی ایک صورت ہے، کہ ہم موجودہ مسئلے کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ امید ہمیں ایسی نظیر فراہم کرتی ہے جس کی بنا پر عالمی سطح پر اس مسئلے [سے متعلق] سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ چھوٹے بڑے، ایک ہزار سے زیادہ غیر سرکاری اداروں کے لیے، جنہوں نے اس مسئلے پر کمر باندھ رکھی ہے، IGBL ایک چھتری کا کردار ادا کرتا ہے۔ ماریوائی نوٹیل کمیٹی ان تمام اداروں کا احترام کرتی ہے اور وسیع پیمانے پر ان کی ایک جہت کارکردگی سے حاصل ہونے والے اثرات کی نشان دہی کرنا چاہتی ہے۔ اس عمل کی ایک اور نمایاں صفت، جس پر غور کیا جانا چاہیے یہ ہے کہ سیاسی سطح پر کس طرح پیش قدمی کی جائے۔ ایک ہفتہ قبل کینیڈا کے شہر آٹوا میں، ایک سواکیس ممالک نے جان لیوا زمینی بارودی سرنگوں کی مکمل ممانعت پر دستخط کر دیے ہیں۔ وزیر خارجہ لائیڈ ایکس وروی کے ذریعے کینیڈا کی حکومت نے اس سلسلے میں پہل کی تھی، جب 1996 میں انہوں نے تمام ممالک کو آٹوا میں مدعو کیا تھا۔ ایکس وروی نے اس موقع اجتماع کے بارے میں کہا تھا کہ ”ایسا معاہدہ ایک مؤثر طاقت فراہم کر سکے گا جس کی بنا پر اخلاقی نوعیت کا معیار متعین ہوگا کہ ان بارودی سرنگوں کی پیداوار، استعمال، ذخیرہ اندوزی، اور ان کی رسد پر ہمیشہ کے لیے پابندی لگا دی جانی چاہیے۔“ اس سلسلے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ بے شمار استثنا کے ذریعے اس معاہدے کو کم زور نہ کیا جائے تاکہ زیادہ ملک اس میں شرکت کی طرف راغب ہو سکیں، بلکہ اس کے ذریعے دنیا کو ایک واضح پیغام دیا جائے۔ ”اگرچہ اس وجہ سے بہت سے ممالک نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے ہوں گے، مگر بلاشبہ عوام کی زبردست تائید اور سیاسی دباؤ کے پیش نظر بڑے ممالک کو اس میں شامل ہونا پڑا۔“

بارودی سرنگوں کا مسئلہ ایک زمانے سے بین الاقوامی فہرست عمل پر رہا ہے۔ Landmine Protocol to the Conventional Weapons Convention کے سلسلے سے 1980 میں یہ زیر بحث بھی آیا تھا۔ جب 1995-96 میں Protocol میں تبدیلیوں کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی تب محسوس کیا گیا تھا کہ اس ضمن میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔

نومبر 1991 میں Vietnam Veterans of America Foundation وائٹمن ڈی سی میں اور فرینکفرٹ میں Medico International نے بارودی سرنگوں کی روک تھام کرنے کے لیے تحریک چلانے پر اتفاق کیا تھا۔ جب 1993 میں زمینی بارودی سرنگوں کے بارے میں پہلی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس میں چالیس ملکوں کے مندوبین نے شرکت کی تھی۔ اس کے اگلے برس جنیوا میں پچھتر اداروں کے نمائندہ مندوبین شریک ہوئے تھے۔ آج یہ صورت حال ہے کہ ایک ہزار سے زیادہ ادارے IGBL کے

ٹرکمن بن چکے ہیں۔ اس مقبول عام عمل سے منسلک ہونے کی وجہ سے آئندہ میں شروع کیا جانے والا عمل ایک نئی سیاسی شروعات کا باعث بن گیا اور فراموش کاری کا شکار اس مسئلے کو دوبارہ سامنے لایا گیا تھا۔

یہ ابتدا بہت دلچسپ ہے، جو بظاہر اقوام متحدہ اور بین الاقوامی گفت و شنید کے نظام کو ہونے والی پیش رفت سے بھی آگے دے گی، اور ان کوئی زندگی بھی چھٹا کرے گی۔ مؤثر سیاسی عمل اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب سرحد پر اس کا ہاتھ بنایا جائے۔ مقامی سطح پر، اگرچہ یہ پرانی خبر ہے، ایک سو پچاس برس قبل پہلی بار پہلا de Tocqueville نے امریکی جمہوریت کا یادگار تجزیہ پیش کیا تھا۔ یاد رہے کہ نمائندہ ادارے خلا میں کار سیاست جاری نہیں رکھ سکتے۔ ان کو کسی نہ کسی صورت میں رائے عامہ میں موجود رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور عوامی سطح پر جو بھی تاثر بنے اس کو افراد اور متنوع اداروں اور انجمنوں کی مدد و اداران کے رہ نمائی کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔ یہ ہیں وہ بنیادی اداراتی عناصر جن کو ہم شہری سوسائٹی کے نام سے جانتے ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر مسئلہ یہ ہے کہ کوئی شہری سوسائٹی سرے سے وجود میں آئی ہی نہیں۔ شاید اسی وجہ سے، اور یہ حیرت کی بات بھی نہیں، کہ اقوام متحدہ کبھی اتنی پراثر نہیں ہوئی ہے جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔ مگر غیر سرکاری اداروں کے، بلکہ کئی قومی حکومتوں کے اور بین الاقوامی سیاسی نظاموں کے بین ہونے والے وسیع تعاون میں، جس میں اقوام متحدہ سب سے آگے رہتی ہے، ہمیں ایسے نقوش ابھرتے نظر آتے رہے ہیں جو ایک عالمی سوسائٹی کا روپ دھار سکتے ہیں۔ دوسری قریبوں میں بھی ایسی جھلکیاں دکھائی دی ہیں، مگر بمشکل تمام اس قدر ہی صاف جتنی کہ اس مخصوص معاملے میں نظر آ رہی ہیں۔ اور ایک نمایاں امید کی کیفیت میں یہ ہم کو مزید ترقی کے لیے اسی سمت اشارہ کر رہی ہیں جس میں ہم ایک زیادہ پُر امن دنیا کے امکانات دیکھ رہے ہیں۔

تو پھر، زمینی بارودی سرنگیں ایسا مسئلہ کیسے بن گئیں جن کے بارے میں اتنی عالم گیر تشویش پیدا ہو گئی ہے؟ دنیا میں ایسے ہتھیار بھی تو موجود ہیں جو کئی معنوں میں زیادہ ہولناک ہیں زیادہ بڑے خطرے کا باعث ہیں، بالخصوص جوہری ہتھیار۔ اور کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم کچھ اقسام کے ہتھیاروں پر پابندی لگا کر دوسرے معنوں میں، اور ہتھیاروں کے استعمال کو، اور اسی طرح جنگوں کو جائز بنا رہے ہیں؟ امن کے سلسلے میں یہ کبھی مصلحت اندیشی ہے کہ بس صرف چند ہتھیاروں پر پابندی لگا دی جائے؟

بلاشبہ، جوہری ہتھیاروں کی بابت بھی ہم نے ایسی ہی سہرا دی دیکھی ہے، اور نارویائی نوبیل کمیٹی نے مختلف مواقع پر، زیادہ دور میں 1995 میں بھی، جوہری ہتھیاروں کے اضافے کے عملی مخالفین کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ جوہری ہتھیاروں اور زمینی بارودی سرنگوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ پہلا ہتھیار تو امریکا ہے اور دوسرا اقرا کا۔ اس کے باوجود ان دونوں میں اک قدر مشترک ہے۔ دونوں ہی شکار ہونے والوں کو، ایک طرح سے، روایتی جنگ سے دور رکھتے ہیں۔ دونوں ہی شہری آبادیوں کو نشانہ بناتے

ہیں اور ان کے اثرات لڑی جانے والی جنگوں کے بعد کی نسلوں تک پہنچتے ہیں۔ یہ ایسے ہتھیار ہیں جو امن کے زمانے میں بھی جنگ کے سائے پھیلاتے ہیں۔ زندگی کے لیے اور اعضائے انسانی کے لیے بھی خطرات ہر طرف ہیں اور کبھی نہ ختم ہونے والے ہیں۔ مگر شہری آبادیوں اور دو براہمن میں جنگ کے عواقب کے اثرات کی حد بندی کرنا امن کے لیے کام کرنے والوں پیش نظر ایک اہم مقصد رہا ہے۔

اس وقت بھی، جب کہ جوہری جنگ ہم سب پر سایہ فلک ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ 1945 کے بعد سے اب تک نہ واقع ہونے والا خطرہ ری ہے۔ زمینی بارودی سرنگیں، گتیں نہ گتیں، ہر روز پھٹ رہی ہیں۔ [افسوس کہ] ان کے شکار ہو کر مرنے اور پاچھ ہونے والے، ہر برس 26000 ہزار کے لگ بھگ لوگ، ہم میں سے مفلس ترین اور بے کس ترین افراد ہی ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اسے افراد کا شکار ہونا ہی اتنا ہولناک پہلو نہیں بلکہ زیادہ ہولناک تو ان بے شمار افراد کے لیے ہے جو پڑ خطر علاقوں میں رہتے ہیں مگر جنہیں یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کو تھیل کود کے لیے کہاں بھیجیں، یا وہ جس علاقے میں گھر کے چوٹے روشن کرنے کے لیے ایندھن تلاش کرتے پھرتے ہیں وہاں ان کی زندگیوں کو بڑے خطرات لاحق ہیں۔ ایسے افراد اپنی زمین کے استعمال اور اپنا سماج بنانے کے مواقع کے حق سے محروم کر دیے گئے ہیں۔

ICBL اور جوہری ولیمز کا کام ترک اسلحہ جات ہے۔ ماریوینی نوٹیل کمیٹی نے بارہا ترک اسلحہ جات کرنے کی کوششیں کا، یا نوٹیل کمیٹی کے اپنے الفاظ میں ”ہتھیار بند افواج میں کمی“ کرنے کے کام کا احترام کیا ہے۔ بے ہتھیاری تناؤ کو کم کرتی ہے اور اس کے ذریعے جنگ کے خطرات میں بھی کمی ہوتی ہے۔ ICBL اور جوہری ولیمز کے کام کا بنیادی مقصد وہی ہے جو میں نے ابھی بیان کیا ہے، جنگ سے شہری آبادیوں کی حفاظت! یہ انسانیت سے متعلق ایک منسوبہ ہے۔ انسانیت کے احترام میں ماریوینی نوٹیل کمیٹی کی روایتی کوششیں امن کے انعام سے شروع ہوتی ہیں، جو پہلی بار 1901 میں ریڈ کراس کے بانی ہنری ڈونانٹ (Henry Dunant) کو چھلایا گیا تھا۔ انسانیت کی مہلای کے سلسلے میں کیا جانے والا کام انسانی ذہن میں موجود جنگ اور تشدد کی وجہ کو دور کرنے کے ذریعے جنگ کے امکانات کو روکتا ہے۔ انٹرنیشنل نوٹیل کے الفاظ میں انسان دوستی کی کوششیں کا مقصد ہوتا ہے ”قوموں کے درمیان برادری“ کے جذبات پیدا کرنا۔ یہ مخلوقوں کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ ہوتا ہے، دونوں کی طرف، جو یا تو اپنا چھو چکے ہیں یا اس کے خطرے میں ہیں۔ یہ مظاہرہ ہے خیر گیری کا اور دروندی کا جو تمام قومی سرحدوں سے ماورا ہوتی ہے۔

یہ ایک متعلقہ ہے کہ نہیں، کہ زمینی بارودی سرنگوں کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہی نوٹیل کی سب سے نمایاں ایجاد تھی، یعنی ڈائنامائٹ۔ نوٹیل بنیادی طور پر ایک نیک انسان تھا، اور وہ ہتھیاروں کی ٹکنا لوجی میں ڈائنامائٹ کی طاقت کے بارے میں فکرمند رہا کرتا تھا۔ اس کے حق میں ایک بار تو اس نے نظریہ تسدید (Doctrine of Deterrence) بھی پیش کیا تھا۔ اس نے اپنی قرین دوست، امن کی بڑی پرچارک برتھا

فان سٹمر (Bertha von Sumner) کو لکھا تھا کہ امن کے لیے ہونے والے اجتماعات کے مقابلے میں اس کے کارخانے جنگوں کو روکنے کے معاملے میں زیادہ نتیجہ خیز ہیں۔ مگر شاید وہ اس بات کا زیادہ قائل نہیں رہا ہو گا۔ شاید اسی لیے اس نے امن انعام جاری کرنے کا فیصلہ کیا تھا، ممکنہ طور پر جس کا خیال لیڈی برتھا فان سٹمر ہی سے آیا ہوگا۔ تو اس کا مقصد خوف کے برابر اثر امن کے حصول کو اعزاز دینا نہیں تھا، بلکہ تحفے اور بھائی چارے کے امن کو۔ برتھا فان سٹمر کا خیال اس کی وصیت کے مخصوص الفاظ سے مترشح ہوتا ہے، جن میں اس نے امن کے لیے منعقد کرنے والے اجتماعات کو امن انعام کی کسوٹی قرار دیا تھا۔ اور نوبل کے انتقال کے بعد 1905 میں خود لیڈی برتھا فان سٹمر ہی پہلی عورت تھیں جس کو امن کا انعام دیا گیا تھا۔ بہت کم عورتوں کو یہ انعام دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے زیادہ عورتوں کو اس گروہ میں شامل ہونا چاہیے تھا مگر ہمیں اس کی شروعات کی نیک نامی ضرور ملنی چاہیے۔ اپنی بے لوث، اُن تھک اور انسانیت و امن کے لیے بار آور خدمات سے جوڈی ولیمز، لیڈی برتھا فان سٹمر کی لائق جانشین ٹھہرتی ہیں جس نے نوبل کو اس انعام کا تصور پیش کیا تھا، اور جو اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ امن کی جڑیں انسانی دماغ میں بیوست ہوئی چاہئیں۔

ایک اہم قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ عملی طور پر اب بارودی سرنگوں کا ایک بہت بڑا مسئلہ بین الاقوامی یادداشت نامہ بن چکا ہے۔ ایک عالم گیر مائے بن چکی ہے کہ اس مسئلے کے بارے میں کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اور دنیا کو زندگی بارودی سرنگوں کے جال سے نکالنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اسی کی تحسین اور ان کی کوششیں کے شکرانے کے لیے آج ہم ICBL اور جوڈی ولیمز، دونوں کو 1997 کے امن کے نوبل انعام کا اعزاز پیش کر رہے ہیں۔ بارودی سرنگوں کی تیاری اور ان کی فروخت کا خاتمہ، تمام موجود بارودی سرنگوں کی تباہی اور ان سے متاثر ہونے والے افراد کی امداد کے ایک وسیع اور محنت طلب کام کی ابھی صرف ابتدا ہوئی ہے۔ آئیے ہم امید کریں کہ اس عمل کو مزید تیز کر دیا جائے تاکہ اس کام کو زور شور سے کیا جائے اور مستقبل قریب میں جان لیوا بارودی سرنگوں سے پاک دنیا ایک حقیقت بن سکے۔

Pror. Francis Sejersted صدر نشین، نارویائی نوبل کمیٹی

خطبہ

جلالت مآب، نارویائی نوبل کمیٹی کے عزت مآب ارکان، جناب عالی اور مہمانان گرامی! آج اس مقام پر ICBL کے نمائندوں کے ہمراہ، 1997 کا امن مشترکہ انعام حاصل کرنے کے لیے موجودگی میرے لیے باعث افتخار ہے۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں جنہوں نے نوبل کمیٹی کے رویہ و ہمیں اس انعام کے لیے مامور کیا، اُن بہت سے نامزدگان کے ساتھ جنہوں نے بھی بڑی تن دہی اور توجہ

سے امن اور اس بین الاقوامی مہم کے لیے کام کیا ہے۔

میں خود کو حد درجہ مفتخر پاتی ہوں، مگر اس اعزاز سے جو کچھ بھی ذاتی شناخت ملتی ہے، میں انجھتی ہوں کہ یہ دنیا کو بد لحاظ ہتھیار سے پاک کرنے کے لیے کیے جانے والی انسان دوست کوششوں میں بہت بلند اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ نوٹیل کمیٹی کے الفاظ میں اس بین الاقوامی جدوجہد نے ”ایک عمل کی ابتدا کی جس نے صرف چند ہی برسوں میں جان لیوا بارودی سرنگوں پر بندش کو خواب و خیال سے ایک قابل عمل حقیقت میں تبدیل کر دیا ہے۔“

مزید، کمیٹی نے یہ بھی دیکھا کہ یہ جدوجہد ایک وسیع عوامی سطح پر ابھری ہے اور عوام کی اس درجے کی لگن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے جس کی پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ بہت سی چھوٹی اور درمیانہ درجے کی قومی حکومتوں کی اس مسکن سے وابستگی کی وجہ سے بھی یہ کام امن کی ایک معقول اور با عمل پالیسی بن کر نمایاں ہوا ہے۔

جان لیوا بارودی سرنگوں پر بندش کی خواہش نئی نہیں۔ اس صدی کے ساتویں عشرے میں ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی نے، چند ایک غیر سرکاری اداروں کی معیت میں دنیا پر زور ڈالا تھا کہ انھیں ان ہتھیاروں پر نظر کرنی چاہیے جو ضرر رساں بھی ہیں اور غیر امتیازی بھی۔ ان میں زمینی بارودی سرنگ خاص توجہ کا باعث ہے۔ لوگ اکثر سوال کرتے ہیں کہ اس ایک ہتھیار ہی پر توجہ کیوں مرکوز ہے۔ زمینی بارودی سرنگ کسی اور ہتھیار سے کتنی اور کیوں مختلف ہے؟

زمینی بارودی سرنگ دوسرے ہتھیاروں سے اس لیے مختلف ہے کہ ایک بار یہ زمین میں دبائی جائے اور دبائے والا سپاہی اس کو چھوڑ کر چلا جائے تو یہ ایک فوجی اور شہری میں، ایک عورت اور بچے میں، اور ایک بوڑھی دادی اماں میں جو گھر کا چولہا جلانے کے لیے لکڑیاں چھننے لگی ہو، تمیز نہیں کر سکتی۔ مشکل یہ ہے کہ فوجی نقطہ نگاہ سے جنگ کے دوران کسی ایک دن، ایک یا دو ہفتے، بلکہ اگر جنگ طویل ہو جائے تو ماہ دو ماہ تو اس ہتھیار کے استعمال کرنے کا جواز ہو سکتا ہے مگر جنگ بندی کے بعد بارودی سرنگ امن کے دنوں یا زمانوں کا اور اک نہیں کر سکتی۔ بارودی سرنگ ہمیشہ ابد الابد تک ہتھیار کے لیے تیار رہتی ہے۔ عام انفجروں میں، بارودی سرنگ مستعد ترین سپاہی ہوتی ہے، یعنی وائی، چوکی دار کا کام کرتی ہے۔ جنگ ختم ہو جاتی ہے مگر بارودی سرنگ موت کا کھیل جاری رکھتی ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد سے دنیا کے بیشتر تنازعے اندرونی تنازعے رہے ہیں۔ ان جنگوں میں اکثر و بیشتر، زمینی بارودی سرنگ ہی ہتھیار رہی ہے۔ اس حد تک کہ گروہوں زمینی بارودی سرنگیں تقریباً 70 ملکوں کو آلودہ کیے ہوئے ہیں۔ ان ملکوں میں بھاری اکثریت ترقی پذیر ممالک کی ہے، بنیادی طور پر ان ملکوں میں جن کے پاس اس فحشست کو دور کرنے کے لیے، اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی اور اپاہج ہونے والے افراد کی دیکھ بھال کے لیے وسائل نہیں ہوتے۔ نتیجے میں بین الاقوامی برادری کو عالمی سطح پر ایک

انسانی بحران درپیش ہے۔

اجازت ہو تو میں اس وبا کے درجے کی مثالیں پیش کروں۔ اس وقت کہوڈیا میں چالیس سے ساٹھ لاکھ تک زمینی بارودی سرنگیں ملک کے پچاس فی صد علاقے میں پائی جاتی تھیں۔ افغانستان میں غالباً نوے لاکھ زمینی بارودی سرنگیں بکھری ہوئی ہیں۔ امریکی فوج کے مطابق، افغانستان پر روسی فوجوں کی یلغار کے دنوں میں پورے ملک میں تین کروڑ کے قریب زمینی بارودی سرنگیں بچھائی گئی تھیں۔ ساہو یوگوسلاویہ میں چند سالہ لڑائی کے دوران ملک کے مختلف علاقوں میں ساٹھ لاکھ زمینی بارودی سرنگیں بچھائی گئیں۔ انگولا میں نوے لاکھ موزمبیق میں دس لاکھ صومالیہ میں دس لاکھ۔ میں اس طرح گنتائی گئی تو آپ اکتا جائیں گے۔ نہ صرف یہ کہ ہمیں زمین میں دفن بارودی سرنگوں کی فکر کرنی ہے، بلکہ ہمیں ان کے اس افبار کی بھی فکر کرنی ہوگی جو استعمال کے لیے تیار موجود ہے۔ اندازہ ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں دس سے بیس کروڑ تک زمینی بارودی سرنگوں کا افبار موجود ہے۔

جب IGRG نے 1970 دنیا کے تمام ملکوں پر زور دیا کہ وہ بلا امتیاز افراد کو زخمی اور اپہا ج کرنے والے ہتھیاروں پر پابندیاں بڑھانے پر غور کریں تو زمینی بارودی سرنگوں پر پابندی کی بہت کم حمایت کی گئی۔ کئی برسوں کی گفت و شنید اور معاملات کے نتیجے میں 1980 کا Convention on Conventional Weapons (CCW) وجود میں آیا۔ یہ معاہدہ زمینی بارودی سرنگوں کو ضابطے میں لانے میں معاون ہوا تھا۔ جب کہ یہ احتجاج کمان داروں کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کب اس ہتھیار کا استعمال صحیح ہوگا اور کب صحیح نہیں ہوگا، اس نے ان کو دوران جنگ اس قانون کے اطلاق کے بارے میں فیصلے کرنے کی بھی اجازت دی تھی۔ بد قسمتی سے لڑائی کے جوش میں جنگ کے قوانین ذہنوں میں صحیح طرح نہیں سماتے۔ جب آپ خود کو بچانے کی کوشش کر رہے ہوں تو اس وقت آپ جو بھی ہاتھ آئے استعمال کر گزرتے ہیں۔

ان دنوں مرد جنگ تیزی پر تھی اور اندرونی تنازعے جو اکثر بڑی طاقتوں کی نیابت میں ہونے والی جنگ ہوا کرتے تھے پھیلتے گئے۔ بالآخر، سوویت بلاک کے انہدام کے ساتھ، لوگوں نے جنگ اور امن دونوں کو بدلے ہوئے انداز میں دیکھنا شروع کر دیا۔ اور لوگوں نے اس پر بھی غور شروع کر دیا کہ جو مری مبادی کے مہیب خطرے کے امکانات کی عدم موجودگی کی صورت میں مرد جنگ کے دوران لڑائیاں کسی طرح لڑی جاتی تھیں۔ تب انھیں پتا چلا کہ اس دور میں لڑی جانے والی اندرونی لڑائیوں میں سب سے پرفریب ہتھیار افراد کش زمینی بارودی سرنگ تھا جو کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہ اس نے ایک بھیانک وبا کی صورت پورے کرۂ ارض کو آلودہ کر دیا ہے۔

مرد جنگ کے اختتام کے ساتھ ہی جب کچھ امن قائم ہوا تو اقوام متحدہ ان قوموں میں نفوذ کرنے کے قابل ہوئی جو جنگ وجدل کے باعث لوٹ پھوٹ گئے تھے اور جب عملاً اس کے قدم وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ لاکھوں کروڑوں زمینی بارودی سرنگیں، جو امن و آشتی کے سر پہلو پر اثر انداز ہو رہی تھیں، ان سو رانگیوں

کی جنگ کے بعد کی تعمیر نو میں رختہ بن رہی تھیں۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ اگر آپ کمبوڈیا کے دارالحکومت پام پن میں ہوں، اور آپ امن فوج کی کارروائیاں شروع کرنا چاہتے ہوں تو یہ کام نہایت آسان معلوم ہوگا۔ مگر جب آپ ساحل کے عقبی علاقوں میں فوجیں اتارنا چاہیں، جہاں چالیس سے ساٹھ لاکھ تک زمینی بارودی سرنگیں مٹی سے ڈھکی ہوئی ہیں تو آپ یقیناً ایک بڑے مسئلے سے دوچار ہوں گے، اس لیے کہ سارے اہم راستوں میں بارودی سرنگیں بکچی ہوئی ہیں۔ ماسن معاملہ کے کا ایک جزو لاکھوں مہاجرین کو وطن واپس لانا تھا تا کہ وہ کمبوڈیا میں بنائی جانے والی نئی جمہوریت کے انتخابات میں اپنا حق رائے دی استعمال کر سکیں۔ ایک جزو ان کو واپس لانے کے منصوبے میں سرخاندان کو خاطر خواہ زمین دینا بھی تھا تا کہ وہ خود کفیل ہو سکیں، تا کہ وہ ملک کی معیشت پر بوجھ نہ بنیں، تا کہ وہ ملک کی تعمیر نو میں حصہ لے سکیں۔ مگر انھیں پتا چلا کہ اتنی ساری زمینی بارودی سرنگوں کی موجودگی میں خاندانوں کو رہائش نہیں دی جا سکیں گی۔ اور خاندانوں کو کیا ملا؟ صرف پچاس ڈالر فی خاندان اور ایک برس کے کھانے کو چاول۔ یہ ہے اثر زمینی بارودی سرنگوں کا!

یہ دراصل غیر سرکاری اداروں ہی کا فیض تھا کہ ہم سنجیدگی سے اس مسئلے کی گہرائیوں میں جا کر عمل سچا کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ اس ہتھیار کو کس طرح سرے سے ختم ہی کر دیا جائے۔ ترقی پذیر ملکوں میں زمینی بارودی سرنگوں پر کام کرنے والے غیر سرکاری اداروں کو کامیابی نہیں ہوئی۔ بچوں کے گروہ، ترقیاتی ادارے، مہاجرین کے ادارے، طبی اور انسانی بنیادوں پر امداد فراہم کرنے والے ادارے۔ سب کو زمینی بارودی سرنگوں کے بحران سے نمٹنے کی بابت اپنے پروگراموں میں اور ان لوگوں کے بارے میں کتر بیونت کرنی پڑی جو اس سلسلے میں امداد فراہم کر رہے تھے۔ یہی زمانہ تھا جب انسانی ہم دردی کی بنا پر زمینی بارودی سرنگوں کو ناکارہ بنانے والے غیر سرکاری ادارے وجود میں آئے تھے اس کوشش میں کہ وہ آلودہ دیہاتی علاقوں کی زمینوں کو ان ہتھیاروں سے پاک کر سکیں۔

وہ تو ہیں مٹھی بھر ادارے تھے، جو انسانیت اور انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کرنے میں مجھ تھے جنھیں نے 1991 کے اواخر اور 1992 کی ابتدا میں منظم انداز میں ان ہتھیاروں کی بندش کے لیے کوششیں کی تھیں۔ 1992 کے اکتوبر میں Handicap International, Human Rights Watch, Medico اور Vietnam Veterans of America Foundation نے ایک جا میکر زمینی بارودی سرنگوں کے استعمال، تیاری، تجارت اور ذخیرہ اندوزی پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا تھا۔ حکومتوں کو انسانیت کی بھلائی کے لیے بارودی سرنگوں کی صفائی اور متاثرہ افراد کی بھلائی کے لیے زیادہ امداد دینا کرنے پر بھی زور دیا گیا تھا۔

اس ابتدا سے ہی IGBL ایک ہزار اداروں کا غیر معمولی اتحاد بن گیا تھا جو اگلے 60 ملکوں میں زمینی بارودی سرنگوں کی بندش کے لیے ایک مشترکہ ہدف کے حصول کے لیے کوشاں رہا۔ اور جوں جوں مہم

میں اضافہ ہوتا گیا، روٹماسکین کو وسعت دی گئی تاکہ وہ ان لوگوں کی نمائندگی کر سکے جو اس عالمی تحریک میں شریک ہوئے ہیں۔ ہم نے افغان اور کمبوڈیا کی مہمات کو ساتھ ملا لیا اور 1986 میں Radda Barnen نامی ادارے کو اور جنوبی افریقہ اور کینیا کے اتحاد کو بھی اس سال کی ابتدا میں شامل کیا اور ہم اپنا برف حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھتے رہے۔ اور چھ برسوں میں ہم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ اس برس ستمبر میں 89 ممالک یمن اوسلو میں اکٹھے ہوئے اور آسٹریا کے چٹس کیے ہوئے میاق کے سودے کی بنیاد پر سال کی ابتدا میں بندش کے بارے میں بات چیت مکمل کر لی گئی۔ پچھلے ہفتے ہی، آٹووا، کینیڈا، میں 121 ممالک میاق ممانعت سے یک جہتی کے لیے اکٹھے ہوئے۔ اس میاق پر جلد سے جلد عمل درآمد کی سیاسی حمایت کے اظہار کے لیے یمن ممالک، کینیڈا، مارشس اور آئرلینڈ نے اس پر فوراً اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

اپنی تاسیس کے پہلے چند برسوں میں IGBL کی نشوونما شامل میں ہوئی، ان ممالک میں جہاں جان لیوا زمینی بارودی سرنگیں بنانے والے خاصی بڑی تعداد میں تھے۔ حکمت عملی یہ تھی کہ قومی، علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر اس کی پیداوار کی ممانعت کی جائے۔ اس حکمت عملی کا ایک جزو یہ تھا کہ دنیا بھر کی حکومتوں کو اس عمل پر نظر ثانی کرنے کے لیے کہا جائے۔ ساتھ ہی کوشش کی جائے کہ IGBL کی جانب اس کے بنانے کی ممانعت ہو۔ اس میں ہم کامیاب نہیں ہوئے۔ مگر ڈھائی برس کے نظر ثانی کے عمل کے دوران، اور اس دباؤ کے ساتھ جو ہم بڑھاتے تھے انسانیت کے اس عالمی مسئلے پر بڑھتی ہوئی بین الاقوامی توجہ نے اثر دکھانا شروع کیا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا نے 1992 میں اس ہتھیار کی درآمد کے اتوا کی قانون سازی کر کے پہلا قدم اٹھایا۔ جب اس قانون کے مصنف سینیٹر لی ہی (Leahy) امریکا میں اس ہتھیار کی ممانعت کی جنگ میں مشغول تھے، دوسری قومیں اس کی ابتدائی لیڈر شپ میں اس سے آگے نکل گئیں۔ بلجیم پہلا ملک تھا جس نے مارچ 1995 میں اندرون ملک اس کی نقل و حمل، پیداوار، تجارت اور ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کی تھی۔ آسٹریا، ناروے، سوئیڈن اور دیگر ممالک نے اس کی پیروی کی۔ لہذا جب GGW بھی اس مہم میں ناکام ہو رہا تھا، حکومتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ممانعت کے مطالبے کر رہی تھیں جو کبھی ایک یوٹیو پیٹی برف کہا جاتا تھا، زور پکڑتا، اور لیا وہ متحرک ہوتا جا رہا تھا۔

جس وقت یہ مسئلہ متحرک تھا، جب GGW کے آخری ممبروں میں اس پر نظر ثانی کی جا رہی تھی، ہم نے کوشش کی کہ انفرادی طور پر وہ حکومتیں جنہوں نے عملی اقدام کیے تھے یا ممانعت کے مطالبے کیے تھے اکٹھے ہو کر ایک خود تشکیلی بلاک بنائیں۔ اعداد و شمار کی خود اپنی بھی ایک طاقت ہوا کرتی ہے۔ لہذا GGW کے آخری دنوں میں ہم نے ان سب کو دعوت دی، اور ان سب کے نمائندے آئے بھی۔ مٹی بھر حکومتوں نے ہمارے ساتھ بیٹھنے اور اس پر بات چیت کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ زمینی بارودی سرنگوں پر ممانعت کی تحریک یہاں سے کس منزل کی طرف جائے گی۔ تاریخی اعتبار سے، غیر سرکاری ادارے اور حکومتیں ایک

دوسرے کورفئیں نہیں مخالفین کی حیثیت میں دیکھتی آتی ہیں، ہمیں ان سب کے اکٹھے ہونے پر اچھٹا ہوا تھا۔ پہلی بیٹنگ میں سات، یا شاید نو، دوسری میں چودہ اور تیسری میں سترہ ارکان شریک ہوئے تھے۔ تیسری بیٹنگ کے ختم ہونے تک، جس میں مئی 1996 کی تیسری تاریخ تک نظریاتی کا اجتماع ختم ہو رہا تھا، کینیڈا کی حکومت نے ایک سرکاری بیٹنگ کی مہمان داری کی پیش کش کر دی تھی، جس میں ممانعت کی حامی حکومتیں اکٹھے ہو کر اس بات کی حکمت عملی تیار کریں کہ ممانعت کے فیصلے کو کس طرح حاصل کیا جائے۔ GGW کے نظریاتی کے عمل سے وہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا جو ہم چاہتے تھے تو پھر ہم کو یہ سوچنا تھا کہ اور کیا کریں۔

تیسری سے پانچویں اکتوبر تک آنڈوا میں ہماری بیٹنگ ہوئی جو بڑی مسکور کن تھی۔ اس میں پچاس حکومتیں مکمل ارکان کی حیثیت میں اور چوبیس مبصرین شامل تھے۔ IGBL بھی اجتماع میں حصہ لے رہی تھی۔ اس کا بنیادی مقصد ایک 'اعلان آنڈوا' کی تیاری تھا، ریاستیں جس پر دستخط کے ذریعے زمینی بارودی سرنگوں کی ممانعت کا اشارہ دیں گی، اور ایک "Agenda for Action" طے پائے گا جس میں منزل ممانعت کی راہ کا تعین ہوگا اور اس طرف پیش قدمی کا مستحکم خاکہ بھی۔ ہم سب اس کے لیے بالکل تیار تھے مگر چند لوگ کینیڈا کے وزیر خارجہ کے اختتامی کلمات کے مختصر تھے۔ وزیر خارجہ ایکس وردی کھڑے ہوئے اور انھوں نے سب کو اعلان آنڈوا اور "Agenda for Action" کی تیاری پر مبارکباد پیش کی۔ اس تقریر کو ممانعت کی تحریک کے اوزار کے طور پر دیکھا گیا۔ مگر وزیر خارجہ نے صرف مبارکبادی پر اکتفا نہیں کی۔ انھوں نے اپنی تقریر ایک چیلنج پر ختم کر دی۔ کینیڈا کی حکومت نے دنیا کو ایک برس کے اندر کینیڈا واپس آنے اور جان لیوا زمینی بارودی سرنگوں کی مکمل ممانعت کے بین الاقوامی بیاق پر دستخط کا چیلنج دے دیا۔

IGBL کے ارکان خوشی سے پاگل سے ہو گئے مگر کمرے میں موجود حکومتوں کے نمائندوں پر موت کا سراٹا طاری تھا۔ حتیٰ کہ ممانعت کی حامی ریاستوں کے نمائندے بھی اس چیلنج سے خوف زدہ ہو کر رہ گئے تھے۔ کینیڈا کی حکومت نے سفارتی آداب و انداز کی خلاف ورزی کر کے نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن کے مصداق ان سب کو چٹان اور کھائی کے درمیان کھنکھاتا کر دیا تھا۔ ان سب نے کہا تھا کہ وہ ممانعت کے حامی ہیں۔ وہ آنڈوا آئے تھے بیاق ممانعت کی راہ عمل تیار کرنے، اور انھوں نے ارادے کے اعلان پر دستخط بھی کیے تھے۔ اب وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ انھیں کچھ نہ کچھ جواب تو دینا تھا۔ سب دم بخود تھے۔ ہم لوگوں نے کھڑے ہو کر زور سے تالیاں بجا دیں، جب کی حکومتی ارکان منہ بسور رہے تھے۔ مگر جب انھیں ابتدائی جھٹکے سے آفاقہ ہوا تو ان حکومتوں کے نمائندوں نے، جو جلد از جلد واقعی بیاق ممانعت چاہتے تھے، چیلنج قبول کیا اور مل جل کر کم سے کم وقت میں بیاق ممانعت کا معاملہ طے کر ہی ڈالا۔

وہ کام جسے ہم Ottawa Process کے نام سے جانتے ہیں، ایکس وردی چیلنج سے شروع ہوا تھا۔ یہ بیاق خود اس ممانعت کے بیاق کی بنیاد پر بنا تھا جس کا مسودہ آسٹریا نے تیار کیا تھا، اور جس کو یانا میں، بان (Bonn) میں، برسلز میں ہونے والی سلسلے وار بیٹنگوں میں طے کیا گیا تھا، اور جو بوسلو میں ستمبر میں

ہونے والے تین ہفتے طویل مذاکرات میں فیصل ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ بیق کے لیے ہونے والے مذاکرات تاریخی حیثیت کے حامل تھے۔ وہ کئی وجوہ کی بنا پر تاریخی تھے۔ پہلی بار چھوٹی اور درمیانہ درجے کی طاقتیں IGBL میں شامل غیر سرکاری اداروں کے ساتھ مل کر دنیا کے اسلحہ خانوں کو اس خوف ناک جھڑپ سے پاک کرنے کے بیق کی شرائط طے کرنے کی غرض سے اکٹھی ہوئی تھیں۔ پہلی بار بڑی، چھوٹی اور درمیانہ درجے کی طاقتیں ممانعت کے بیق کو کم زور کرنے کے لیے ایک بڑی عالمی طاقت کے دباؤ کو خاطر میں نہیں لائیں۔ یہ بھی شاید پہلی بار ہوا تھا کہ گفت و شنید کے لیے پیش کیے جانے والے مسودے کے مقابلے میں ایک زیادہ طاقت ور بیق طے پایا تھا۔ بیق اتفاق کا یہ خیال بھی نہیں بن سکا، جو بلاشبہ ایک بے کار بیق پر منتج ہو جاتا۔

اوسلو میں ہونے والی گفت و شنید نے دنیا کو جان لیوا زمینی بارودی سرنگوں کی ممانعت کے ایسے بیق کا تحفہ دیا ہے جو رخنوں اور تخلفات سے تقریباً پاک صاف ہے۔ یہ بیق جان لیوا زمینی بارودی سرنگوں کے استعمال، ان کی پیداوار تجارت اور ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کرتا ہے۔ یہ بیق دستخط کیے جانے کے چار برس کے اندر اندر ریاستوں میں ذخیرہ کردہ تمام زمینی بارودی سرنگوں کی تباہی چاہتا ہے۔ یہ تمام ریاستوں سے بارودی سرنگوں کی مکمل صفائی اور زخمی ہونے والوں کی امداد میں اضافے کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ایک کامل بیق نہیں، مہم والوں کو ان کی صفائی میں استعمال ہونے والے اوزار amhandling device اور arrive vehicle mines کے بارے میں تشویش ہے۔ ہم ترتیب کے لیے ہچکار کھنے والی بارودی سرنگوں کے بارے میں بھی فکر مند ہیں۔ ہم غیر سرکاری افراد پر بھی اس بیق کا براہ راست اطلاق اور زخمی افراد کی امداد کے بارے میں سخت زبان کا استعمال پسند کریں گے۔ مگر چونکہ حکومتوں کے قریبی تعاون سے یہ بیق ممکن ہوا ہے، ہمیں یقین ہے کہ سالانہ اجتماعات اور نظریاتی کانفرنسوں کے ذریعہ، بیق میں، جن کا انعقاد طے پایا ہے، یہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

جیسا کہ میں بیان کر چکی ہوں، پچھلے ہفتے، ایک سواکس ملکوں نے آئووا میں بیق پر دستخط کر دیے ہیں۔ تین ملکوں نے ایک ساتھ اس کی توثیق بھی کر دی ہے، اس کے جلد سے جلد عمل میں لانے سے بین الاقوامی برادری کے سیاسی ارادوں کا پتا چلتا ہے۔ یہ واقعی قابلِ تحریف ہے۔ امریکا میں ہونے والی خانہ جنگی اور کریمیا کی جنگ کے بعد سے زمینی بارودی سرنگوں کا استعمال ہوتا رہا ہے پھر بھی ہم ان کو دنیا کے اسلحہ خانوں سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ یہ کامیابی حیرت ناک بھی ہے اور تاریخی بھی۔ اس سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ شہری سوسائٹیوں اور حکومتوں کو مل کر کام کرنا چاہیے نہ کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا مخالف سمجھیں۔ یہ بیق بتاتا ہے کہ چھوٹی اور درمیانہ درجے کی طاقتیں شہری سوسائٹی کے ساتھ مل کر انسانیت کے تخلفات کی جانب زیادہ سرعت سے متوجہ ہو سکتی ہیں۔ اس قسم کا اشتراک سرحد جنگ کے بعد کی دنیا میں ایک نئے قسم کی عالمی طاقت ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ IGBL کی وجہ سے بہت فرق پڑا ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی دین میاق ہے۔ ہمیں سب سے بڑا فخر میاق پر ہے۔ یہ کہنا ایک احمقانہ فعل ہوگا کہ نوبل انعام کوئی زیادہ فخر کی بات نہیں۔ بلاشبہ ہم کو اس پر فخر ہے۔ اس لیے کہ نوبل انعام اس مہم کے انجام کی توثیق کرتا ہے۔ یہ اس حقیقت کی بھی توثیق ہے کہ غیر سرکاری اداروں نے پہلی بار حکومتوں کے بہت قریب ہو کر، اقوام متحدہ اور ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی کی معیت میں اسلحے پر قابو پانے پر کام کیا ہے۔ ایک ساتھ ہو کر ہم نے ایک مثال قائم کی ہے۔ ایک ساتھ مل کر ہم نے تاریخ میں تہذیبی کی ہے۔ بوسلو میں فرانس کی سفیر کے اختتامی کلمات بہترین تھے۔ انہوں نے کہا تھا، ”یہ واقعہ ہمیش میاق کی وجہ سے تاریخی نہیں۔ یہ اس لیے تاریخی ہے کہ پہلی بار ریاستوں کے رہنماؤں نے اکٹھے ہو کر شہری سوسائٹی کی خواہشات پوری کی تھیں۔“

بین الاقوامی مہم ان سب کی شکر گزار ہے۔ ایک ساتھ ہو کر ہم نے وہ کام کیا ہے کہ دنیا کو ایک دن بارودی سرنگوں سے مکمل طور پر پاک کرنے پر زندگی فراہم کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے۔

آپ سب کا شکریہ



کارلوس فیلیپ زیمینیز بیلو

ہوزے راموس - ہورٹا

اعلان تجلیل

جلالت مآب، صدورہ عزت مآب، خواتین اور حضرات

مارویائی نوبیل کمیٹی کی جانب سے میں آپ سب کو اس برس کے نوبیل انعام دیے جانے کی محفل میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج افریڈ نوبیل کے انتقال کو ایک سو برس ہو گئے ہیں۔ انتقال سے ایک برس قبل اس نے اپنی وصیت لکھی تھی جس میں طے کیا تھا کہ اس کی پس انداز معقول درجے کی دولت سے ہر سال پانچ انعامات دیے جائیں گے؛ سائنس کے لیے تین، ادب کے لیے ایک اور ایک امن کے لیے، ان لوگوں کو جن کے کام نے، ان کے الفاظ کے مطابق، ”انسانیت کو سب سے بڑا فائدہ پہنچایا ہو“۔ وصیت میں یہ بھی تحریر تھا کہ امن کا انعام ماروے کی (پارلیمان) Storting کی ایک کمیٹی کی طرف سے ماروے کی سر زمین پر دیا جائے گا۔ آج ہمیں اسناک ہوم یاد آ رہا ہے، جہاں دوسرے تمام انعامات دیے جا رہے ہیں، اور جہاں انتقال کی صد سالہ برسی پر افریڈ نوبیل کو یاد کیا جا رہا ہے۔

نوبیل بلاشبہ غیر معمولی طور پر ایک کامیاب کاروباری انسان تھا، مگر اس کا دل محض کاروبار ہی میں نہیں رہتا تھا۔ اس کے بہترین اور دل خوش کن لحاظ تجربہ گاہ میں گزرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایجادات اس کی زندگی کا حصہ بن گئی تھیں۔ اس کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ سائنس اور ادب میں، محض دلچسپی ہی نہیں، بلکہ مکمل یقین رکھتا تھا۔ اس کا سب قابل ذکر وصف ان مصروفیتوں میں اس کا اخلاقی انداز کار تھا جس کے ذریعے ایک بہتر دنیا بنانے کے امکانات نظر آتے تھے۔ امن کے انعام کے فیصلے میں اس کا تناظر بہت واضح طور پر ابھرتا ہے۔ اس پر بحث کی جاسکتی ہے کہ ڈائنامائٹ کی ایجاد نے، جس کے استعمال سے اور زیادہ مہلک ہتھیار تیار کیے جاسکتے تھے، امن سے اس کے لگاؤ کو ہمیز کیا تھا۔ مگر اور بھی محرک لبریں تھیں، لبریں جو اس کی اخلاقی جبلت کو ابھارتی تھیں، اس میں سب سے پہلی اور سرور آور وہ شخصیت

مستقبل میں امن کا انعام پانے والی خاتون برتھافان سٹمر (Bertha von Sumer) اور ہم عصر امن کی تحریک تھی۔

نوبل نے ایک بہت اہم ورثہ چھوڑا تھا، جس میں ایک بہتر دنیا کا تصور بھی شامل تھا، اور ایک فعال انعامی ادارے کا قیام بھی، جس کے ذریعے اس کے تصورات کی تکمیل ہوتی تھی۔ ہم لوگ، جن کو وراثت کے انتظامی معاملات سنبھالنے پر مامور کیا گیا ہے، انکسار کے ساتھ اور اس انسان، الفریڈ نوبل، کے لیے دل کی کبرائیوں سے احترام کے ساتھ اپنا فرض نبھا رہے ہیں اور آج اس کو احترام کے ساتھ یاد کر رہے ہیں۔

نیک تمناؤں، اور اس یقین کامل کے ساتھ کہ اس برس کے انتخاب کے ساتھ ہم نے نوبل کی وراثت کو جس قدر ممکن ہو سکا ہے، بہتر طریقے سے سرانجام دیا ہے، ہم اپنے انعام یافتگان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ کارلوس فیلیپ زیمینیز بیلو اور ہوزے راموس - ہورٹا کو، ان کی دیر پا کوششوں کے لیے جن کے ذریعے انھوں نے مشرقی تیمور کے میں سلام پرانے تنازعے کا ایک منصفانہ اور پُر امن حل تلاش کیا ہے، 1996 کا امن انعام دیا جا رہا ہے۔ رو سے کے اس پُر امن برف زار تک پہنچنے میں آپ نے اپنے وطن سے اتنا طویل سفر کیا ہے جس قدر کہ اس کروڑ ارض پر ممکن ہو سکتا تھا۔ پھر بھی امن، انصاف اور مصالحت کے موقعوں کے مقابلے میں ہم دونوں کے درمیان کا فاصلہ کبھی کم ہے۔ ہم شکر گزار ہیں، اور ہمیں فخر ہے کہ اپنی اہم اور بے لوث مصروفیات میں سے آپ نے اس سفر کے لیے وقت نکالا اور ہمیں آپ کو اعزاز دینے کا موقع فراہم کیا۔

مشرقی تیمور کے تنازعے کو فراموش کردہ تنازعہ“ کہا جاتا رہا ہے۔ مگر اس کو بالکل فراموش نہیں کیا گیا، کہ یہ بین الاقوامی فہرست عمل پر، بدلتے ہوئے درجات کی اہمیت کے ساتھ، میں برسوں سے، مسلسل موجود رہا ہے۔ مگر اس کو کبھی ترجیح نہیں دی گئی۔ یہ مسئلہ کبھی اوپر نہیں آیا۔ ایسے بہت سے مفادات تھے جن پر زیادہ توجہ کی ضرورت تھی اور مشرقی تیمور تو کسی قدر چھوٹا سا معاملہ تھا۔ شاید ہی کبھی دنیا کی سیاست کی بے رحمی اس سے زیادہ واضح طور پر جتائی گئی ہوگی۔ Realpolitik کی متعدد مصلحتوں نے ایسے بے رحم طرز کی نئی نو آبادی کو قائم ہونے دیا ہے۔ 6 سے 7 لاکھ کی آبادی میں سے تقریباً دو لاکھ جانیں براہ راست یا بالواسطہ، اندونیشیائی قبضے کی نذر ہو گئیں۔ آج بھی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں۔ ایسے بہت سے ممالک ہیں جو مشرقی تیمور کے مقابلے میں اندونیشیا سے اپنے ”Realpolitik“ تعاون کو ترجیح دے رہے ہیں۔ بظاہر یہ ایک نہایت مایوسی کی کیفیت ہے، جس کے درمیان ہمارے انعام یافتگان نے وہاں کے محام کے لیے ایک منصفانہ اور پُر امن حل تلاش کرنے میں اپنی ان تھک کوششیں جاری رکھی ہیں۔

مشرقی تیمور کے لیے 1975 کے خزاں کا موسم فیصلہ کن تھا۔ سب سے پہلے پرانے نوآبادیاتی آثار یعنی پرچمالیوں کا انخلا ہوا۔ پھر ایک اندرون کی کشمکش تائی شروع ہو گئی جس میں ایک طرف تیموری جمہوری یونین تھی اور دوسری جانب Fretilin تحریک آزادی۔ اور خزاں کا اختتام اندونیشیا کے حملے پر

ہوا۔ ایک ملک کو فتح کیے ہوئے اکس برس گزر گئے ہیں مگر اس کے عوام کو بین الاقوامی سطح پر قوم کا درجہ نہیں دیا گیا ہے۔ لامون - ہونا Frellin رہتا تھا اُن اعتدال پسندوں میں سے جو جمہوریت کا احترام کرتے ہیں۔ اس نام نہاد خانہ جنگی کے دوران وہ ملک سے باہر تھے اور تمبر کے مہینے میں واپسی پر انھوں نے جنگ میں انجمن جماعتوں میں صلح کرانے کی کوشش کی۔ حملے کے بعد سے وہ ملک سے باہر رہے تھے اور جبرہ تعدی کی تفصیلات کی کھجائی، تمام دنیا میں اس کا پرچار کرنے اور بین الاقوامی سطح پر مشرقی تیمور کی ترقیاتی کرنے میں انھوں نے اُن تھک ذاتی قربانیاں دی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے کامیابی کے ساتھ شمالی تیمور کے کئی گروہوں کو ایک قومی محاذ میں متحد کیا چاہا ہے اور اندونیشیا کے ساتھ تنازعے کا ایک اہم و مندانہ حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں مشرقی تیمور کے عوام کی سالمیت کا احترام کیا گیا ہو۔ لوگ مذاق میں کہتے تھے کہ وہ "Frellin رہنما کم اور ڈیموکریٹک یونین کا بے ضابطہ رکن زیادہ ہے۔" یہ قول اس کردار کو واضح کرتا ہے جو ہونا - لامون نے ایک مصالحت کنندہ اور ثالثی کی حیثیت میں ادا کیا ہے۔ جیسا کہ بشپ بیلو نے بھی زور دے کر کہا ہے کہ آج ہونا - ساموں یا اس کے کسی مددگار کی شرکت کے بغیر اس تنازعے کے حل کی تلاش میں کوئی سنجیدہ بات چیت ناممکن تصور ہے۔

1983 میں بشپ بیلو، جو ایک غیر معروف پادری تھے مشرقی تیمور میں رومن کیتھولک کلیسا کا مذہبی تنظیم مقرر کر دیا گیا اور اس وقت سے وہ اس علاقے میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ہمد وقت ہونے والے تشدد اور اذیت کے درمیان مصالحت، ثالثی اور مقابلے کی فضا میں بار بار ثالثی سے انھوں نے بہت سے لوگوں کی جانیں بچائی ہیں۔ حریفوں کے درمیان تشدد تنازعات کے رچ بچاؤ میں پس جانے کے خطرات ہوتے ہیں۔ "میرے لیے دھا کرؤ" ایسے ہی ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا، "اس لیے کہ اب مجھے دو طرفہ مدافعت کرنی پڑ رہی ہے۔" مگر بشپ بیلو اب ایک ثالث سے کہیں زیادہ بڑی شخصیت بن چکے ہیں: امن کا یہ علم بردار اپنے شدت سے آزمائے ہوئے لوگوں کے لیے مرکزِ اہتمام اور مستقبل کے لیے امید کے نمائندے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جو محبت اس کے عوام اس کے لیے محسوس کرتے ہیں، ان ہی بنیادی اصولوں سے ابھرتی ہے جس پر یہ محمود کار بند رہا ہے۔ لوگوں کا احترام کرو۔ ان کی انسانیت کو ابھرنے کے لیے مکمل آزادی فراہم کرو۔ پھر ان سے پوچھو کہ وہ اندونیشیائی یا پرتگالی ہونا چاہتے ہیں یا خود مختار۔ بشپ بیلو اپنے عوام کو ستائے ہوؤں کی باطنی بصیرت میں شامل کرتے ہیں، جو کہاں داروں اور جاہلوں کی اندرونی بصیرت سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ کیوں ہے یہ ساری بے رحمی؟ یہ تو اپنے مقصد بھی حاصل نہیں کر پاتی! آپ کو احترام اسی وقت ملے گا جب آپ خود بھی احترام کریں گے۔

اس سال 1965 میں ہنگری میں ہونے والی بغاوت کی سوویت یونین کے ہاتھوں وحشیانہ پامالی کو چالیس برس ہو گئے ہیں۔ مغرب نے مداخلت نہیں کی۔ چوں کہ ہنگری سوویت یونین کے مفادات کے دائرہ اثر کے اندر واقع تھا، اس پر حملے کو ایک ضروری "Realpolitik" گردان کر قبول کرنا ضروری تھا۔ یاد

سمجھئے کہ چالیس برس بعد جو کچھ آزاد جنگری میں ہوا، چالیس برس قبل اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ کہا گیا ہے کہ مشرقی تیمور کا انڈونیشیا کے ساتھ الحاق ایک تاریخی حقیقت ہے۔ مگر تاریخ نے کبھی کسی چیز کو ابد تک کے لیے حقیقت تسلیم نہیں کیا ہے۔ تاریخ ہمیشہ آگے بڑھتی رہتی ہے۔ ہم نے گزشتے عشرے میں اگر کچھ سیکھا ہے تو اتنا کہ جو نظام جتنا جبری ہوتا ہے، اتنا ہی بوجھل ہوتا ہے۔ تاریخ میں ایسی طاقتیں بھی رہی ہیں جو طاقت ور ترین فوجی قوت سے بھی زیادہ قوت والی تھیں۔ تشدد اور وحشت سے امن حاصل نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ کہ ہم تشدد کے شیطانی چکر کھڑ کر باہر نکلنے کی ہمت نہیں پیدا کرتے، دیر پا امن کے مواقع ہاتھ نہیں آتے۔

زندہ رہنے کا حق، بنی نوع انسان کی طرح ترقی اور تکمیل کا حق، تعظیم کا حق، انسانی حقوق کا مرکز ہوتا ہے۔ 1960 میں آلبرٹ لٹولی (Albert Lutuli) کو نوبل کا امن انعام دیے جانے کے بعد سے انعام کی حق داری کے بنیادی معیاروں میں سے ایک معیار انسانی حقوق پر کام کرنا رہا ہے۔ متواتر تائید کی جاتی رہی ہے کہ یہی راستہ صحیح راستہ ہے، حالاں کہ اس معیار کے چٹے جانے پر عقیدہ بھی کی گئی ہے، اس لیے کہ کچھ کے قول کے مطابق، اس کا امن سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ مگر حقیقتاً ہم سمجھتے ہیں کہ انسانی حقوق اور امن کے درمیان ایک کڑی بنائے کے عمل کے دوران ہم معیاروں کے کائناتی اور بنیادی پہلوؤں سے واقف ہوتے ہیں۔ امن، استحکام اور ہم آہنگی کو دو طرفہ تعظیم کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ کتنا مرادہ اور کیسا کائناتی ہے یہ پیغام۔ ایک بار اس کو من لیا جائے تو اگلا قدم ہوتا ہے تعظیم کو، تہذیبی روایتوں کے مطابق اداروں کی حیثیت دینا۔ دوسری طرف منظم انداز کے تشدد کو عالمی انسانی حقوق کے تصور کے ڈھانچے میں کبھی رو نہیں کیا جاسکتا۔ تشدد کے شکار ہی ایسی حقیقت کے گواہ ہو سکتے ہیں۔ تشدد کے شکار افراد کی آوازوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے تقریباً ان دو لاکھ افراد کی آوازوں کو ضرور، جن کی جائیں قتل عام سے یا بھوک سے، یا مشرقی تیمور پر انڈونیشیا کے حملے کے دوران ضائع ہوئیں۔

اس برس دو معزز افراد کارلوس فیلپ زیمینیز بیلو اور ہوزے راموس - ہورٹا ہیں جنہوں نے اپنے عوام کے لیے ان تھک محنت اور عظیم ذاتی قربانیوں سے کام کیا ہے۔ مشکل ترین حالات میں بھی انہوں نے اپنی انسانیت، عقیدے اور مستقبل کی پاس داری کی ہے۔ ان کے کام کی توصیف کے لیے اور مشرقی تیمور کے بہتر مستقبل کے لیے مارویائی نوبل کمیٹی آج ان کو 1996 کے امن کا نوبل انعام عطا کرتی ہے۔

مارویائی نوبل کمیٹی کے صدر نیشن پروفیسر Francis Sejersted کی نوابی

خطبہ کارلوس بیلو

جلالت مآب، مارویائی نوبل کمیٹی کے عزیز ارکان عزت مآب وزیراعظم، وزیر حضرات، ارکان

پاریمان، ارکان سفارت، محترم دوست، مہمان گرامی، خواتین و حضرات۔
 ”قومیں اس کی فائش کا اعلان کریں گی، ایوان اس کی تعریف کا جشن منائے گا۔ اگر اس نے طویل عمر پائی، تو اس کا نام ہزاروں سے زیادہ عظیم الشان ہوگا، اور اگر اس کا انتقال ہو گیا تو وہ سب کو مطمئن کر دے گا۔“ (فائش 11-10، 39)“

عزت مآب خواتین و حضرات، میں انجیل مقدس کے باب ’فائش‘ کی اس عبارت سے ابتدا کر رہا ہوں کہ یہ الفاظ اُس انسان کی اہمیت کا اظہار ہیں ہم آج جس کو یاد کر رہے ہیں، امن کا یہ باتوقیر انعام جس سے معنون ہے۔ ہم آج، دس دسمبر کو، انسانیت کے فیض دہاں، امن کے متلاشی، انفریڈ نوبیل کی سو سالہ برسی بھی منا رہے ہیں۔

لائق امتیاز افراد انسانیت کی یادداشت سے کبھی محو نہیں ہو سکیں گے، اس لیے کہ اس کی فائش پر، انسانیت کی بھتری کے اس کے عقیدے پر، انسانیت کی ترقی کے لیے سائنس کے میدان میں اس کے کارہائے نمایاں پر، ہر سو تمام صاحبان ایمان، تمام نظریات، کسی نہ کسی طریقے سے اس کی ہر مندی اور اس کی حرمت کے قائل ہیں۔

ایسے لائق افراد مسلسل ان لوگوں کے ضمیر کو مضطرب کرتے رہتے ہیں جو انسانیت کی بھلائی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر ایک کو کسی بھی طرح، کسی انداز میں بھی، بنی نوع انسان کو زیادہ بددور اور شفیق بنانے میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔

وہ کیا وجوہ تھیں جو شرقی تیمور کے کیتھولک بشپ کو اس اجتماع میں کشان کشاں لے آئی ہیں؟ میں بھی ایسے سماج کا نمائندہ ہوں، آپ جس سے اچھی طرح واقف ہیں، جہاں حالات کے باعث لوگوں کی خواہشات اور توقعات محدود ہوتی ہیں۔

آئیے اس مرحلے پر ہم Terentius [قبل مسیح کے مشہور ڈراما نگار، جس کو انگریزی میں Terence کہا جاتا ہے۔] کے الفاظ [Terentius 1, 1, 25] ”Homo sum, humani nihil a me alienum puto“ سے استفادہ کرتے ہیں۔

آئی، انسان ہونے کے ناتے، جو کچھ انسانیت کو درپیش ہے، اس سے پہلوچی نہیں کر سکتا۔ ایک طبقے کے عوام کا لڑکھونڈ ہونے کے باعث مجھے لوگوں کی تقدیر کا سراجھے دار ہونا پڑے گا، اس انتظام کو اپنے اوپر لیتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ اس میں کس قسم کے اور کتنے خطرات مضمر ہیں۔ تمام انسانوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا صرف ان ہی کا استحقاق نہیں ہوتا جو عوام کے مقدر کی رہنمائی کرتے ہیں، بلکہ جو سماج میں اعلیٰ مقام پر فائض ہوتے ہیں بلکہ یہ تو ہر طبقے، عہدے اور حیثیت کے لوگوں کا

فرض ہوتا ہے۔

کھیرا کا رکن ہونے کے باعث میں نے اپنے اوپر ذمے داری لے لی ہے کہ میں ان تمام حالات میں جو انسانیت سے متعلق عیسائی تصورات سے نکرتے ہیں اور جو کھیرا کی تعلیمات کے منافی ہیں ان کو واضح بھی کروں گا اور جہاں ضرورت ہوگی ان کی نفی بھی کروں گا۔

کیتھولک بشپ مخلوق خدا کا نمبربان ہوتا ہے۔ اس کا مشن روحانی ہوتا ہے۔ اور اس قسم کا مشن انحصار کرتا ہے روحانی ذرائع پر، افراد کی رہنمائی پر اور یسوع مسیح پر اعتقاد کی بنیاد پر۔

مگر بنی نوع انسان روحانی ابعاد تک ہی محدود نہیں رہتا کہ جس انسان کو امن حیث انگل اور روحانیت کو بچا لیا جائے۔ اس پہلو سے کوئی بھی کیتھولک بشپ غیر جانب دار نہیں رہ سکے گا جب ہر زاویے سے انسانی توقعات پوری نہ ہو رہی ہوں۔

لہذا کسی کیتھولک بشپ سے منسوب کیا جانے والا نوٹیل امن انعام کسی ایک فرد سے اٹھایا عقیدت کے لیے نہیں ہوگا بلکہ بنیادی طور پر تمام انسانوں کے حقوق کی پاس داری اور ترقی کے لیے ہوگا، کیتھولک کھیرا نے جس پر صدیوں کام کیا ہے۔

دوسری پیشگی کا نوٹیل کی تعلیمات کا کہنا ہے کہ: ”کھیرا کا خیال ہے کہ وہ اپنی آخری امید کے اٹھان آزادی کی تبلیغ، ضمیر کی عظمت اور حقوق کے ساتھ، جو خدائی منصوبوں کے مطابق انصاف پر مبنی ہوں، عوام کی دلی خواہشات پر لپک کہے گا۔“

کھیرا کو تفویض کیے ہوئے فرائض اپنی فطرت میں سماجی اور سیاسی نہیں، بلکہ محض مذہبی ہوتے ہیں۔ روشن خیالی اور طاقت کے ایلے ہوئے فوارے کی طرح، یہ کھیرا کی خصوصیت ہوتی ہے، جو انسانی معاشرے کو بخیر اور مستحکم بنانے میں مدد و معاون ہوتی ہے۔

عزت مآب حضرات! عالی مرتبت! مشرقی تیمور کے عوام کی تکالیف سے متعلق پچھلے اکیس برسوں پر محیط کھیرا کی کوششوں سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ ان لوگوں کے بشپ کی حیثیت سے میں اس نوٹیل امن انعام کو کسی ایک فرد کے لیے افکار کا باعث نہیں سمجھتا، بلکہ میں اس کو مشرقی تیمور کے عوام کے ناقابل متعلق حقوق کے دفاع کے ضمن میں کھیرا کے کیے ہوئے کام پر واجب اٹھایا عقیدت تصور کرتا ہوں۔

”تو نے اس کو خدا سے کچھ درجہ کم بنایا ہے، تو نے اس کو حسن اور بقا کے تاج سے سرفراز فرمایا ہے۔“

(مناجات 6،8)

اس مناجات کے مصنف کے لیے، انسانی عظمت کا پائیدار دی میں گھر کر رہی ہے، جس کو خدا نے خلق کیا ہے۔

بنی نوع انسان کے بارے میں یہ میرا عقیدہ بھی ہے اور علم بھی ہے جو میری رہنمائی کرتا ہے اور مجھے اُکساتا بھی ہے جب میرا ضمیر فیصلہ کر رہا ہوتا ہے کہ مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔

بہر حال بنی نوع انسان کے عقائد اور تصورات کے ساتھ اس ممتاز اجتماع سے خطاب بھی خاصا انسانیت پسند ہو سکتا ہے، مگر مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے درمیان کچھ چیزیں مشترک ہیں، یعنی ہمارا دعویٰ ہے کہ انسان ہی انسانی تصور اور انسانی اعمال کا موضوع ہے۔ ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ کسی فرد کی قدر اور امتیاز، انفرادی عقیدے، مذہب، سیاست، فلسفے، نسل اور جلد کے رنگ پر منحصر نہیں ہوتا۔

انسان کا وجود آزادی کے لیے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک فرد کی حقیقت وجود اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب وہ اپنی پسند کی اور اپنے اعمال کی ذمہ داری کے بارے میں، بغیر کسی قسم کے خوف یا دھمکی کے فیصلہ کرنے کے قابل ہو۔

آزادی کا وجود عوام میں تکمیل پاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس معاشرتی اور نسلی گروہ سے وہ تعلق رکھتا ہے، اسی کے پس منظر میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔

آزادی کا وجود اسی ماحول میں تکمیل پاتا ہے جہاں احترامِ باہمی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی بنی نوع انسان کا، ان لوگوں کے ہاتھوں جو سماج کے ذمہ دار ہوتے ہیں، اس کے بنیادی حقوق کے سلسلے میں احترام نہیں کیا جاتا، تو نتیجے میں ہم جبر سے، غلامی، خود مری، افراد کی موت اور عوام کی موت سے دوچار ہوتے ہیں۔

عواظین و حضرات، یہ بنیادی اصول ہر فرد پر لاگو ہوتے ہیں، اسی طرح یہ کھینسا پر بھی لاگو ہوتے ہیں جو خود بھی دھوکا کرتا ہے کہ انسان کی منزلت خود خدا میں پیوست اور مکمل ہوتی ہے۔

افراد کو خلق کرنے والے خدا نے سماج میں بھیجا ہے، مگر اس کے علاوہ، ہر فرد کو پکارا بھی جاتا ہے خدا کے بچوں کی طرح، اس کے وجود میں غم ہونے کے لیے اور خدا کی خوشی میں شرکت کے لیے۔

مزید یہ کہ کھینسا یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر اس رہائی عطیے کی اور ابدی زندگی کی امیدنا پیدا ہو جائے تو انسانی وقار برقی طرح بخروج ہو جاتا ہے۔

کیسٹھولک کھینسا یسوع مسیح کو عظیم نجات دہندہ گردانتا ہے۔ بلاشبہ یسوع مسیح ہر انسان کو اس کی صحیح منزلت دیتا ہے اور ہر قسم کی اخلاقی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔

کھینسا یسوع مسیح کے تعارف میں ہر ایک کی اصل حیثیت کو اور اس کے پیشے کو منکشف کرتا ہے، اس لیے کہ یسوع ہی سر دار ہے اور معیار ہے، تجدید شدہ انسانیت کا، یگانگت کا، پیدا کا، فلول اور امن کی روحانیت کا، جس کی تمنا سب کو ہوتی ہے۔

جلالت مآب، فوٹل کمیٹی کے ارکان اور دنیا بھر سے آئے ہوئے میرے دوستوں، آپ کے سامنے فوٹل انعام برائے امن حاصل کرنے کے موقع پر میں غور کو بہت فضیلت یافتہ پاتا ہوں۔ مگر جس قدر بھی تواضع مجھ کو ملے گی، میرے خیال میں یہ اس لیے نہیں ہوگی کہ میں کون ہوں اور میں نے کیا کام کیا ہے۔ میں اس پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ میں اس مقام پر ہوں مشرقی تیمور کے بے آواز عوام کی آواز بن کر جو آج، جسمانی طور پر نہیں تو روحانی اعتبار سے میرے ساتھ ہیں۔ وہ لوگ کیا مانگتے ہیں، سوائے امن کے تشدد کے خاتمے کے اور اپنے انسانی حقوق کے احترام کے؟ میری پُر جوش تمنا ہے کہ 1996 کا یہ امن انعام اس ہدف کو قریب تر لے آئے۔

سب سے زیادہ، بلکہ میرے سے زیادہ، میں اپنے تمام تر افسار اور احتیاط کے ساتھ جان پال دوئم کو یاد کر رہا ہوں جنہوں نے پہاڑی مشکلات کے ہوتے ہوئے ایک عہد ساز جدوجہد کی اور پلینڈ اور دوسری قوموں کی سر زمین سے اشتراکیت کی غلامی کو دلیں نکالا دے دیا، جن سے یہ کہہ دیا گیا تھا وہ حقیقت پسندی کے جذبے کے ساتھ اشتراکیت کو اپنے مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیں۔ سماجی باپ نے مجھے نہ صرف ایک مثال، بلکہ عمیق وجدان سے سرفراز کیا ہے، جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ جان پال دوئم کے لیے میرے تشکر کے الفاظ سچ سچ میرے احساسات کی ترجمانی نہیں کر پا رہے ہیں۔

میں اوروں کو بھی یاد کر رہا ہوں، بالخصوص ایشیا والوں کو، جو اس مقام پر کبھی ایسا وہ نہیں ہو سکے ہیں۔ کبھی نہ ختم ہونے والے انتقام سے میں مہاتما گاندھی کے کارناموں اور انہما کے عقیدے کی تحریک کو بھی یاد کر رہا ہوں جو تہذیبی کا باعث ہوئی ہے۔ مجھے چین بھی یاد آ رہا ہے، اور میں 'وی چنگ ہینگ (Wei Jing Sheng) کی سلامتی کی بھی دعا کر رہا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ بہت جلد وہ اپنی قید کی کھڑی سے اسی طرح رہائی پائیں گے، جیسے انڈونیشیا کے رہنما بدنام زمانہ Boven Digul جیل سے طویل عرصے کی ظالمانہ قید سے آزاد ہوئے تھے۔ یقیناً، ان ہی انڈونیشیائی رہنماؤں کو 1948 میں، جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا، اسی اوسلو میں رفعت حاصل ہوئی تھی، جب وہ اپنی آزادی اور عظمت کی جنگ لڑ رہے تھے۔ میں بڑر انڈونیشیائی ہر اول دستوں کو بھی یاد کر رہا ہوں، اور مجھے احساس ہے کہ تاریخ ہمیں بہت کچھ سکھا سکتی ہے بشرطے کہ ہم ایک لمحے کو اس کے تہول اور اس کی کھراہیوں پر غور و فکر کریں۔

میں کہیں اوسلو میں موجود اپنے عانی وقار متقدمین کے روبرو تمام تر عجز و افسار کے ساتھ ایسا وہ ہوں۔ میں اپنی چشم تصور سے مقدس ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کو بھی "پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے وعدوں کی سر زمین کے طرف دیکھتے ہوئے" دیکھ رہا ہوں۔ یہ الفاظ مجھے اپنے محبوب مشرقی تیمور کے پُر غم و مایوس مالائین [کوہ مردار] کی بھی یاد دلانے لگے ہیں جس کے قریب ہی مشرق کی سمت میری پیدائش ہوئی تھی، جس

کے مغرب میں ماؤنٹ ریمیو واقع ہے۔ جب میں اپنے وطن کی سرزمین پر متعدد سفر کے دوران ان کو ہماروں پر نظر کرتا ہوں تو (خودکوائی کی کیفیت میں) بلند آواز سے کہتا ہوں: اب وقت آگیا ہے کہ مشرقی تیمور میں جنگی توپوں کو، ایک بارہ اور ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جانا چاہیے، اب وقت آگیا ہے کہ میرے وطن کی سرزمین پر بسنے والوں کو امن و آسودگی میسر ہو، اب وقت آگیا ہے کہ صحیح معنوں میں مذاکرات ہوں۔ تمام نیک خواہشات رکھنے والے لوگوں کو انسانی فراست اور حکمت کے ذریعے، پُر امن طریقے سے، امن، آشتی، باہمی عزت اور انسانی وقار کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

مشرقی تیمور امن اور وقار کی تلاش میں مشکل ہی سے اکیلا ہوگا، اور یہ بہت ضروری ہے کہ اوروں کے کیے ہوئے کام کا اعتراف بھی کیا جائے۔ پچھلے سال مجھے بلٹاسٹ میں مقیم 1976 کے انعام یافتہ جناب مرینڈ کاریکان میگوانز (Maitead Corrigan Maguire) کی میزبانی کا شرف نصیب ہوا تھا، امن کے سلسلے میں جن کی کوششوں کا ساری دنیا میں اعتراف کیا گیا ہے۔ مسٹر میگوانز کی اہلیہ نے بہ کمال مہربانی بلٹاسٹ کے اس متاثرہ علاقے کا دل گداز اور معلوماتی دورہ کرایا تھا، جس میں ایک رات قبل ایک سپاہی کے چھوڑ دیے جانے پر احتیاج میں کئی گاڑیاں مذرا آتش کر دی گئی تھیں، جس نے ایک اٹھارہ برس کی لڑکی کو قتل کر دیا تھا۔ میری دعا ہے کہ مستقبل قریب میں شمالی آئر لینڈ کے عوام کو حقیقی امن، انصاف اور سکون نصیب ہو۔

پچھلے برس میری ملاقات جناب مقدس دلائی لامہ (Dalai Lama) سے ہوئی تھی، اور ان کی داناوی اور شفقت کا مجھ پر بہت گہرا اثر ہوا تھا۔ تبت کے باشندے اور ان کے مقامی لوگوں کے سماجی گروہ میری دعاؤں سے کبھی پرے نہیں رہیں گے، جن کو حملہ آور جدیدیت سے، جو خود کو تہذیب کا داعی سمجھتی ہے، روز افزوں خطرات درپیش ہیں۔

میں دعا کو ہوں مشرق وسطیٰ اور افغانستان کے لیے، جن کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، اور وسطی امریکا میں امن کے تسلسل کے لیے بھی۔ اور کوئی بھی انسان بدوئٹی اور روانڈا کی غلیم جھیلوں، اور زائر کے علاقے سے بھلا کس طرح لاطعلق رہ سکتا ہے جہاں کی انسانیت اپنے اوپر ہونے والی افیتوں کے حل کی متقاضی ہے۔

جنوبی افریقا میں امن کی تلاش فزوں تر ہوتی جا رہی ہے۔ میرے نزدیک آرچ بشپ ڈیسمینڈ ٹوٹو کی کارگزاری اس طریقہ کار کی ایک روشن مثال ہے جس میں بچائی کو انسانی حقوق کے ساتھ پیوست کیا جاسکتا ہے، جس طرح مزاح اور انکسار کو راست بازی میں آمیز کیا جاسکتا ہے، اور میں دعا کو ہوں کہ میں ان کے لبائے کا سزاوار ہو سکوں۔ برما میں آنگ سان سوکی (Aung San Suu Kyi) کی باکمال قوت اور ان کے فیوض کو سلام پیش کرنا ہوں اور دعا کو ہوں کہ جلد ہی ان کو اور ان کے عوام کو گھمبھ کے دن دیکھنے نصیب

ہوں۔ خدا کرے کہ ان کے بیٹانوں سے نکلنے والی موسیقی کا حسن فوجوں اور قوموں کے دلوں کو گداز دے گا۔
 آئیے اب ہم برما میں، اور سارے عالم میں، وہ معروف علاقے ہوں یا غیر معروف، عہد نامہ قدیم کے باب Amos "انصاف کو پانی کی طرح جاری ہونے دو" کو جاری کریں۔

اور آئیے ہم دنیا بھر کے ان بہت سے بے نام افراد کو یاد کریں جو انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ روز بہ روز جو بین الاقوامی کمیٹی کو اپنے حقوق کے لیے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، پروٹسٹنٹ ہوں یا کیتھولک، ہندو ہوں یا بدھ مذہب کے ماننے والے، خواہ وہ قدیم زمانوں کے روایتی عقائد رکھنے والے ہوں، الہ ایمان ہوں یا کافر۔

دنیا ان لوگوں پر ملامت کرتی ہے جو اپنے مقامی مذاہب کے دفاع میں جھجھکیا اٹھالیتے ہیں، اور ان سے اپنی شکایات پر آواز اٹھانے کے لیے غیر متعدد طریقے اختیار کرنے کے لیے کہتی ہے۔ مگر جب لوگ غیر متعدد راستہ اختیار کرتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ان کی پروا نہیں کرتا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ لوگ دیکھتے ہیں، مرتے ہیں اور قتل اس کے کہ دنیا یہ اقرار کرے کہ واقعی کوئی مسئلہ ہے، ٹیلی ویژن کے کیمرے روزانہ عوام کے گھروں تک ان واقعات کی تصاویر پہنچا رہے ہوتے ہیں۔ اس برس نوٹیل کمیٹی نے بہادرانہ اور دانش مندی کے فیصلے کے ذریعے مشرقی تیمور پر اپنی نظریں مرکوز رکھی ہیں۔ ان کا یہ عمل مشرقی تیمور کے لیے تلاش امن اور ان کے دیکھوں کے ازالے کے کھلے اعتراف کے مترادف ہے۔

میں ایسے فرد کی حیثیت سے ان مسائل پر بات کر رہا ہوں، جس پر گواہی کی ذمہ داری ہے، ان واقعات کی ہے جو میں نے اپنی آنکھوں دیکھے اور اپنے کانوں سے سنے ہیں، تاکہ میں جس کو بچ جانوں اس پر اپنا رد عمل بھی ظاہر کروں، تاکہ امید کی شمع روشن رہے، تاکہ گروہ ارض پر زندگی کی حرارت باقی رہے۔ میں ایک روحانی رہنما کی حیثیت میں کلام کرتا ہوں، سیاست دان بن کر نہیں، جو درحقیقت میں نہیں ہوں۔ حالیہ چند ہفتوں میں کچھ مضامین میں مجھے کو "سراپہ کھلے بان" کہا گیا ہے، اس کا احوال کیے بغیر کہ میرا موجودہ پیشہ لڑکپن کی ملازمت یعنی بھینسوں کی رکھوالی سے ابھرا ہے، خطا کے پتلے کی طرح، جس پر ایسے حالات میں اخلاقی رہنمائی کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے جن پر میرے عمل سے مکمل طور پر کوئی بھی کبھی خوش نہیں ہوا ہے۔

کچھ کا خیال ہے کہ اگر مشرقی تیمور میں جنگ نہ ہو رہی ہوتی تو میں اپنا سارا وقت مشکل میں پھنسے نوجوانوں کی دیکھ بھال میں صرف کرتا، جو سینٹ جان باسکو (St. John Bosco) کے Salesian ہونے کے ناتے میرا مذہبی فریضہ بھی ہے۔ مگر یہ تو کسی درجے تک ہی ہوتا: کہ میں تو اب بھی اپنا کافی وقت مشرقی تیمور کے نوجوانوں کے مسائل سننے اور ان کو مشورے دینے میں صرف کرتا ہوں، اس لیے کہ ان کے ماضی کے حالات کے پیش نظر یہ ضروری ہے۔ یہ میری خاص الخاص ذمہ داری ہے جو مجھے پسند بھی ہے۔

اپنی تمام ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مجھے یہ تو کرنا ہی ہوگا۔ سینٹ جان ہاسکو کا قول ہے کہ ہمیں یہاں کے بعد آرام کا موقع ملے گا، مگر اس دنیا میں نہیں۔ اور میری زندگی کے پچھلے تیرہ برس کے عرصے نے، میں نے جس میں مشرقی تیمور میں ذمہ داریاں سنبھالی ہیں، اوروں کے مقابلے میں ہاسکو کے فیصلے کو کتنا صحیح ثابت کیا ہے۔ مگر جو کچھ ضروری ہے اس میں میری اپنی جاں فشانی ایک قلیل حصہ ہے، جس میں اوروں کی شرکت لابدی ہے۔ میں ان سب کی طرف نیک خواہشات کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں جو مشرقی تیمور، پورے ایشیا، افریقا، مغربی نصف کرہ ارض، تمام یورپ، یونین اور بلقان کے ممالک ہی میں نہیں، بلکہ ہر جگہ، جدوجہد آزادی کے لیے حقیقی معاونت اور اخلاقی امداد فراہم کرتے ہیں۔

مشرق تیمور کے معاملے میں ان تھک کوششوں کے لیے مجھ پر اقوام متحدہ کی ستائش بھی لازم آتی ہے، اس مسئلے کو اتنے عرصے تک زندہ رکھنے میں جس کا مرکزی کردار رہا ہے۔ تمام دکانوں کے پیش نظر، ماری مشکلوں کے باوجود، اقوام متحدہ نے گنت شنید کا سلسلہ جاری رکھنے میں ثابت قدمی دکھائی ہے، اس امید پر کہ ایک نہ ایک دن، دنیا کے دوسرے علاقوں سمیت، مشرقی تیمور میں دیر پا امن قائم ہوگا۔

ایسا کوئی اور ادارہ موجود نہیں جو تاریخ اور اعتبار کے تناظر میں اقوام متحدہ کی جگہ لے سکے۔ ہم اس حقیقت سے سرف نظر نہیں کر سکتے کہ 1940 کے عشرے میں جب اس کی ابتدا ہوئی تھی انڈونیشیا کی قومی آزادی کی تحریک میں اقوام متحدہ کی مدد نے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ جب انڈونیشیا کی نوآبادیہ جمہوریہ نوآبادیاتی طاقتوں اور ان کے اتحادیوں کی بربریت کے خلاف بے مثال بہادری اور ہمت کے ساتھ برسرِ پیکار تھی، اسی عالمی ادارے نے بالآخر اس کو ناکامی پر غلبہ اخلاقی پشت پناہی مہیا کی تھی۔ اقوام متحدہ کے اخلاقی دباؤ ہی کے باعث ولندیزی حکومت اور اس کے اتحادی اتنی آزادی سے فوجی کارروائی نہیں کر سکے جس طرح دوسری نوآبادیاتی طاقتیں اقوام متحدہ کے 1945 میں قیام سے قبل کر رہی تھیں۔ اس حقیقت کو ہرگز بھلایا نہیں جانا چاہیے۔ لہذا عالمی عوام الناس کے مفاد کے پیش نظر دنیا کو آنے والے ماہ و سال میں اقوام متحدہ کو مستحکم کرنے کے لیے جتنا بھی ممکن ہو ضرور بالضرور کرنا چاہیے۔

یہ بات صاف صاف کہہ دی جانی چاہیے کہ امن کو حقیقت بنانے کے لیے ہمیں چلک دار ہونے کے ساتھ ساتھ عقل مندی سے بھی کام لینا ہوگا۔ ہمیں صدق دل سے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف بھی کرنا ہوگا اور امن کے حصول کے لیے اپنے آپ کو بدلنے کے لیے اقدام بھی کرنے ہوں گے۔ میں خود بھی اس اصول سے مترا نہیں ہوں گا۔ ہمیں اپنے غصے اور عداوت کے جذبات کو انتقام اور دوسرے بدفصلت جذبات کو نکال پھینکنا ہوگا، اور امن کے ادنیٰ کارکن بننے کے لیے ہم کو اپنی قلب مابیت بھی کرنی ہوگی۔

مشرق تیمور کے لوگ ہٹ دھرم نہیں وہ درگزر کرنے میں اور اپنی تلخیوں کو بھلانے میں کوتاہی نہیں

کرتے۔ اس کے برعکس وہ اپنے لیے، اپنے سماج کے لیے اور اپنے علاقے کے لیے حقیقی امن کے خواہش مند ہیں۔ وہ انڈونیشی بھائیوں اور بہنوں سے اپنے رشتے استوار کرنا چاہتے ہیں اور اپنے درمیان میل ملاپ اور برداشت کے جذبات پیدا کرنے کے راستوں کے متلاشی ہیں۔

باہمی احترام کا جذبہ ہی مصالحت کی بنیاد بنتا ہے۔ ہمیں مشرقی تیمور میں ہونے والے انسانی حقوق کے حدود مسائل کو حل کرنے کی سنجیدہ کوشش کرنی چاہیے۔ یکھیمانے تو اپنی کشتی پانی میں ڈال دی ہے۔ ہم نے انصاف اور امن کا ایک کمیشن بنا دیا ہے، جو مسائل کو حل کرنے کے لیے مقتدر قوتوں کا ہاتھ بنانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

انسانی حقوق کے خود مختار افسران مشرقی تیمور جاتے رہے تو اورنگستان وہی کرتے رہے ہیں کہ وہاں کیا کیا جانا چاہیے۔ پہلے قدم کے طور پر گرانڈونیشی ریاست کے انسانی حقوق پنج شیلا (Panca Sila) کے پانچ اصولوں کی بنیاد پر مشرقی تیمور کے سیاسی اسیروں کی رہائی کی اشد ضرورت ہے۔ امن کے حدود راستوں کو کھولنے میں یہ ایک اہم قدم ہوگا۔

خواتین و حضرات، میں آپ کو یاد دلانے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اسی اسمبلی میں، میرے پیش رو کی انجیل پر اسرائیل کے سابق وزیر اعظم، آنجنہانی اسحاق رابین نے، نیو یارک میں تقریر کرتے ہوئے، جب ان کی صدر عرفات سے تاریخی ملاقات ہوئی تھی، کہا تھا ”خوں ریزی بند کرو۔“

میں بھی اس انجیل کو اپناتے ہوئے کہتا ہوں کہ ”خوں ریزی بند کرو۔“ میں اس میں ”عقلم و ختم بند کرو، تشدد ختم کرو، تنازعات سے پرہیز کرو“ کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔ آئیے، ہم ایک میز کے اطراف بیٹھ کر ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس لیے کہ ہم مشرقی تیمور کے عوام کے دکھوں کو طویل عرصے کے لیے جاری نہیں دیکھنا چاہتے۔ میرے خیال میں انعام دینے میں نوبیل کمیٹی کا اور اس کے صدر Francis Sejersted کا بھی بنیادی مقصد یہی ہے۔

خواتین و حضرات، مشرقی تیمور کو موقع فراہم کیا جا چکا ہے کہ اس محترم اسمبلی میں ان کے متعدد سپوتوں کی کوٹھتی ہوئی آوازوں کے ذریعے اس کو ساری دنیا میں سنا جائے۔ مگر میری خواہش ہے کہ مشرقی تیمور کی طرف دنیا کو اسی طرح تیزی سے متوجہ ہونا چاہیے جس طرح اس نوعیت کے دوسرے آفت زدہ علاقوں میں مسائل حل کرنے کے لیے اقدام کیے گئے ہیں۔

دنیا میں اور بھی جگہیں ہیں جہاں ایسی نوعیت کے مسائل ہیں، جہاں لوگ تیمور کی جیسی ہیبت ناک کیفیات میں زندگی گزار رہے ہیں مگر ان کی آواز کے سنے جانے کے امکانات بھی نہیں۔

ہر روز ہمارے گھروں پر جنگوں کی پیدا کردہ دکھ بھری خبریں اور تصاویر کی بھرمار ہوتی ہے۔ جیسا کہ

فادرانو وییرا (Antonio Vieira) کہتے ہیں، ”جنگ کا یہ عفریت کیا کر رہا ہے کہ کھینا کی شمشین پر خدا بھی محفوظ نہیں۔“

میں تمام نیک نیت انسانوں سے، بالخصوص ان سے جو صاحبانِ اقتدار ہیں، اپیل کرتا ہوں کہ وہ ان بے شمار تنازعات کے حل تلاش کریں۔ ایسے حل جو انصاف اور ہم آہنگی کی بنیاد پر ہوں، تاکہ بنیادی حقوق کا احترام کیا جاسکے۔

میں ذرائعِ ابلاغ کے صاحبانِ ہنر سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ کربہٴ عرض کے طول و عرض میں ہونے والے رسل و رسائل کو سچائی اور رحمِ دلانہ ضابطوں کا پابند کریں، ایسے ضابطوں کا جن میں بغیر کسی جانب دارانہ ہیر پھیر کے، سچائی پر معنی سماج کی تعمیر کی آزادی ہو۔

قبل اس کے کہ میں آپ سے اجازت چاہوں، میں دنیا بھر کے نوجوانوں کو، بالخصوص مشرقی تیمور کے نوجوانوں کو، ایک پیغام دینا چاہتا ہوں۔

”سماج آپس میں ہٹے ہوئے ایسے دائروں کا پارچہ ہوتا ہے جس میں ہم آنے والی فصل کو دنیا میں پُر امن زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے حصے کے تجربات شامل کرنا فرض ہوتا ہے۔ میرے دنیا بھر کے پیارے نوجوانو، آپ کے کاندھوں پر اس ذمے داری کا بوجھ ہے کہ آپ آنے والے نکل کو ایسے سماج میں بدل دیں جس میں امن، ہم آہنگی اور بھائی چارے کی فرماں برداری ہو۔“

پیارے نوجوانو میں اپنی یادوں سے کھنگال کر ہندوستان کے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی نظم کا ایک ٹکڑا پیش کرنا چاہتا ہوں:

جوانی اک کنول کے پھول کے مانند ہوتی ہے
ہماری زندگی میں جو فقط اک بار کھلتا ہے
اسے ضائع نہ ہونے دے

کوئی بھی واقعہ فقط ایک تنہا حرکت نہیں ہوتا۔ مشرقی تیمور کے ہم دو بیٹوں ڈاکٹر ہوزے رامس - ہونا اور مجھے، نوبل امن انعام اس لیے عطا ہو رہا ہے کہ عوام کے بہت سے گروہوں اور اداروں کی محنتِ صادقہ سے یہ واقعہ حقیقت کا روپ دھار رہا ہے۔

اس لمحے میں سب سے پہلے تو مانوس کے شاہ اور ان کی ملکہ کی خدمت میں شکریا ادا پیش کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اس محترم اجتماع میں شرکت فرما کر مشرقی تیمور کے عوام کے دکھوں پر مرہم رکھا ہے۔

میں مشرقی تیمور والوں کی جانب سے نوبل امن کمیٹی کے ارکان کا بھی شکریا ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ان

کے حالیہ ناز پر نظر کریم کی ہے۔

ماروے کی حکومت اور پارلیمنٹ کے ارکان امن کا انعام دینے کے فیصلے پر بہ کمال انکسار آپ کا بھی شکر گزار ہوں۔

میں پرتگال اور دوسری دوست اقوام کا، اور ان محترم شخصیات کا بھی جنہوں نے نوبل امن انعام کے لیے ہمارے نام پیش کیے ہیں، شکر گزار ہوں۔

دنیا بھر کے تمام تیموریوں کو جو یہاں موجود ہیں، میں ناقابل بیان شکر اور یک جہتی کا تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مقدس پوپ جان پال دوم کی خدمت میں بھی، جنہوں نے شرقی تیمور کے عوام کے دکھوں پر ہر لمحہ اپنی نظریں جمائے رکھی ہیں، میری فرزندانہ اطاعت اور میرا وعدہ، کہ میں یسوع مسیح سے یک جہتی اور وفاداری پر ثابت قدم رہوں گا۔

پاپائے اعظم کے کمیشن برائے انصاف و امن کے لیے، بالخصوص کمیشن کے صدر کارڈینل راجر ایچگارے (Cardinal Roger Etchegaray) کے لیے عمیق تھکر کے عمیق جذبات جنہوں نے کھینچے تیمور سے براہ راست روابط رکھے۔

میں دوسرے مذاہب کے ان دوستوں کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں جنہوں نے سوچ بچار اور بہادرانہ اعمال سے یہ ممکن بنایا کہ نوبل امن انعام شرقی تیمور کے کیتھولک کلیسا کو عطا ہو۔

ان تمام غیر سرکاری اداروں، انسانیت پسند گروہوں، کلیسا سے منسلک گروہ اور افراد سے بڑی نا انصافی ہوگی اگر ہم اس موقع پر اپنے شکرانے میں ان کو فراموش کر دیں جو بغیر کسی تشکر کے، فنا موٹی سے محنت کرتے رہے کہ تیموریوں کو خاطر خواہ امداد پہنچتی رہے اور جنہوں نے پوری کوشش کی کہ تیمور کا مسئلہ گردنیاں کی تہوں میں دفن ہو کر نہ رہ جائے۔ ہم ان سب کو اپنی خوشیوں میں شریک دیکھنا چاہتے ہیں۔

آخر میں دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے ارکان کی خدمت میں تھکر کے جذبات۔ انہوں نے ہم کو زبان دی کہ جس کے ذریعے دنیا تیموریوں کے دکھ درد میں شریک ہو سکے۔ میں ان تمام افراد کو سلام پیش کرتا ہوں جو تیمور کے بارے میں اخلاعات بہم پہنچاتے ہیں، جو اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں، جس میں سے کچھ شرقی تیمور کی مٹی کے پیوند بھی ہو چکے ہیں۔

’کوئی جو ہر شے کا خالق ہے اور ہر ذی روح کا باپ ہے، ہم کو قوت، ہمت اور دانش عطا کرے گا، تاکہ ہم انسانی برادری کے لیے جہد کریں، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک خدا کی شبیہ جیسا ہے۔‘ (Gen.

خطبہ — ہوزے راموس — ہورٹا

جڑالت مآب دو دمان شاہی، عزت مآب ارکان نوبیل کمیٹی، صدور، وزرائے اعظم، جناب عالی! آپ سب کی اجازت سے میں اپنے ابتدائی کلمات Gamões, Fernando Pessoa, Agostinho Neto, Jorge Amado and Xanana Gusmão کی زبان میں ادا کرنا چاہوں گا۔

اندونیشیا کی پچھلے اکیس برسوں کی وحشیانہ تو آبادی اور تہذیبی جبر کے باوجود جس نے صدیوں ایک زبان اور ایک تہذیب کو معجزہ برستی سے ملانے کی کوشش کی ہے، جو انداز پانچ سو برسوں کے عرصے میں ہمارے علاقے تک پہنچی تھی، مشرقی تیمور میں تمام تر ثابت قدمی کے ساتھ زندہ ہے۔

نوبیل امن انعام حاصل کرنے والے مشرقی تیمور کے دوسرے پرٹگالی فرد (پہلے ہمارے محترم ہشپ کارلوں بیلو) ہونے کے ماتے میں اپنی تاریخی وراثت اور شعور کی نفی کروں گا اگر میں اس خطبے کو اس زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں شروع کروں جو دنیا کے پانچ علاقوں کے دو سو ملین افراد کو متحد کرتی ہے۔

نہایت عمیق جذبہ انکسار کے ساتھ میں ہشپ کارلوں بیلو کے ساتھ 1996 کا نوبیل امن انعام وصول کر رہا ہوں جو مشرقی تیمور کے عوام کو عطا کیا جا رہا ہے۔

میرا کبھی نہ ختم ہونے والا تقطیر ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے مجھے انعام کے لیے نام زد کیا تھا۔ میں عمر بھر ان کا احسان مند رہوں گا، اور میں ان کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ خداوند متعال کے عطا کردہ عظیم تحفے، صحت اور دانش، امن کی خدمت کے لیے ہمیشہ بروئے کار لائے جائیں گے، صرف اپنے ملک ہی کے لیے نہیں، بلکہ ان تمام علاقوں کے امن، سلامتی، آزادی اور جمہوریت کی خدمت کے لیے جہاں تک میری ٹیخٹ آواز سنی جاسکے۔

نوبیل کمیٹی کے ارکان میری داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہم کو 1996 کے امن انعام کے لیے منتخب کیا ہے۔ آپ کا کرۂ ارض کے آفت رسیدہ اور کم حیثیت لوگوں کو کشادہ دلی سے یاد رکھنا اور باہمت طریقے سے ریاستوں کی جبروت کے سامنے ڈٹ جانا اس عظیم ملک کی روح اور تاریخ کے بارے میں بہت کچھ کہہ دیتا ہے جس نے دوسری عالمی جنگ کے عفریت کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔

پچھلے کچھ برسوں میں ماروے نے تاریخی دشمنوں کے درمیان گفت و شنید اور امن کے حصول میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ مشرق وسطیٰ اور مرکزی امریکا میں، آپ کی محتاط فطرت، مستحکم ارادوں اور موجدانہ

طریقہ کار نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کے ہٹلر پیچیدہ تنازعات حل کیے جاسکتے ہیں اگر کوئی غیر جانب دار ثالثی کرنے والا بیچ میں موجود ہو بشرطے کہ تنازعات میں الجھے ہوئے فریق جنگ ختم کرنے کے خواہش مند ہوں۔

ماروسے، کاسٹاریکا اور پرتگال وغیرہ جیسے چھوٹے ممالک ان تنازعات کے حل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جس میں بڑی بڑی زور آور طاقتیں ماکام ہو جاتی ہیں۔ سیاست اور ثالثی بڑی طاقتوں ہی کا استحقاق نہیں ہوتی۔ چھوٹے اور اوسط درجے کے ممالک، جن میں نو سسلطامیت کے جراثیم نہ ہوں، اور اخلاقی راست بازی جن کی اصل طاقت ہو وہ تنازعات میں الجھے فریقوں میں محنت و شہید کے دروازے کھولنے میں زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مشرقی تیموری کلیسا

1996 کے امن انعام کا اصل جیتنے والا ہمارا روحانی رہنما تو کارلوس بیلو ہی ہے۔ دراصل بیلو مشرقی تیمور کے عوام کی روایتی لچک، اخلاقی راست بازی، منزلت، شہادت، امن و آشتی اور آزادی کی تلاش کے جذبات کی تجسیم ہے۔ کارلوس بیلو کی شخصیت میں مشرقی تیمور کے عوام اپنے وجود کو درپیش روزانہ کے خطرات میں روحانی سکون اور احساس تحفظ کو دیکھتے ہیں۔

مشرقی تیمور کے عوام کا سب کچھ ان کے کلیسا کی ملکیت ہے۔ لہذا 1996 کا نوبل امن انعام بھی پورے کلیسا، باہمت مبلغین، راہباؤں، عام کارکنوں اور مشرقی تیمور کے عوام کو خراج عقیدت کے مانند ہے۔

میرے صے کا نوبل امن انعام Dom Martinho da Costa Peace and Democracy نام کے فاؤنڈیشن کو جائے گا۔ میں جانتا ہوں ایک عظیم شخصیت کے لیے یہ ایک حقیر سا خراج عقیدت ہوگا، جس نے اپنے کلیسا اور عوام کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ہے۔

تحریک یک جہتی

میں ان تین اداروں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ماضی میں میرے عوام کو کم مشہور گمراہوں کی نظر میں بڑی اہمیت کے انعامات سے نوازا ہے۔ Bergen کے انسانی حقوق فاؤنڈیشن کے پروفیسر تھورالف رافٹ (Thoralf Ratto) کو، کیلی فورنیا کے گلیٹس مین (Gleitsman) فاؤنڈیشن کو اور دی ہیگ میں قائم United Nation's Peoples Orgination کو میرا دست بستہ پنام پہنچے۔

دنیا کے بہت سے حصوں میں بکھرے ہوئے اپنے مردوں عورتوں اور بچوں کو میں اپنی خوشیوں میں شریک کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ہم کو اپنی زندگی کے کتنے قیمتی برس عطا کیے ہیں۔ ان کی فیاضی یک جہتی

تحریک کے بغیر آج ہم کہیں زیادہ مفلس اور تنہا ہوتے۔ ہمارے کچھ ساتھی اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں جن میں Denis Freney, Michelle Turner, Michel Robert, Carlos Vilares شامل ہیں اور وہ خوب صورت گزیا جیسی سارا ٹیلر (Sarah Taylor) بھی، جس کو خدا اولاد عالم نے صرف پندرہ برس ہی کی عمر میں اٹھا لیا تھا۔ ہم ان سب کو ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

انگولا، کیپ ورڈے، گنی بساؤ، موزمبیق، سائڈ توے اور پریسیپے کو میری خصوصی مبارکباد اور دائمی تشکر نفس دوست اور موزمبیق کے صدر مملکت جو کم ہیسانو (Joaquim Chissano) کے لیے، جنہوں نے ہماری خوشیوں میں شرکت کے لیے اوسلو کے سفر کی زحمت اٹھائی۔

آپ شدید تنہائیوں کے اس زمانے میں بھی ہمارے مقولے رہے ہیں جب دنیا کے نزدیک ہمارا وجود ہی نہ تھا، یا ہم کو جھٹھکا رہا لانے کے آسان طریقے بتائے جا رہے تھے۔ ٹوئٹل کی اس ششمن سے میں آپ کے آنجہانی پیش رو صدر مہورا مہیل (Samora Mósés Machel) کے لیے اپنا مرغم کرتا ہوں جو سر زمین افریقا کے غنیمت فرزندوں میں سے تھے۔

میرا خصوصی اور عمیق شکر یہ انگولا کے جوزے ایڈورڈو سانتوس (José Eduardo dos Santos)، کیپ ورڈے کے مسکرمینس مانیرو (Mascarenhas Monteiro)، گنی بساؤ کے نینو ویرا (Nino Vieira) اور سائڈ توے اور پریسیپے کے صدر کے لیے اور ان کی دوستیوں اور فیاضیوں کے اعتراف کے لیے۔

آپ کے عوام اور ممالک نے ہماری تنہائی کے دنوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ دنوں میں بھی آپ ہمارے ساتھ رہیں گے۔

انگولا کے عوام کے طرف ہمارا دست یک جہتی و دوستی دراز ہے، جو ہمارے تصورات سے کہیں زیادہ پریشانیوں میں گھرے رہے ہیں اور اب بھی قومی موافقت کے تکلیف دہ عمل سے گزر رہے ہیں۔

انگولا نے مہیسا اور جنوبی افریقا کی آزادی کے لیے بہت بھاری قیمت ادا کی ہے۔ پھر بھی پریشانی زبان بولنے والے دو ممالک، انگولا اور موزمبیق، کے کردار کا خاطر خواہ اعتراف نہیں کیا گیا ہے، جو انہوں نے جنوبی افریقا کی آزادی کے سلسلے میں ادا کیا تھا۔

پرتگال

اس محترم ششمن سے، میں اپنی طرف سے اور مشرقی تیمور کے عوام کی جانب سے دائمی تشکر پیش کرنا چاہتا ہوں پرتگال کے عوام کو، پرتگال کے صدر اور اپنے عزیز دوست، ہمدرد اور اصول پسند انسان ڈاکٹر ہورگے سمپایو (Jorge Sampaio) اور ان کے پیش رو ڈاکٹر ماریو سوارس (Mário Soares) کو۔

عزت مآب، جناب صدر! آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے حیرت انگیز اور فیاض، موجودہ اور سابق، ارکان پارلیمان اور حکومت کو، ان کی مردانہ کوششوں اور ہماری جدوجہد آزادی میں معاونت کے لیے ہماری دلی توصیف سے آگاہ کریں۔

کئی برس تک آپ نے اپنے شراکت داروں کی بے توجہی بلکہ دشمنی کے جذبات کے خلاف یورپی یونین میں تنہا لڑائیاں لڑی ہیں۔ آپ نے نہ صرف مشرقی تیموریوں کو بلکہ دنیا کی دوسری چھوٹی قوموں پر بھی واضح کر دیا ہے کہ اصول اور اخلاقیات پر تجارتی مفادات حاوی نہیں ہوئے ہیں۔

برازیل

میں حال ہی میں برازیل گیا تھا، جہاں ہر ایک نے میرا والہانہ استقبال کیا تھا۔ میں انیسار کے جذبات کے ساتھ صدر ہوزے سارنے (Jose Sarney) سے درخواست کروں گا کہ وہ صدر فرنانڈو ہرنی کارڈوسو (Fernando Henrique Cardoso) کو اور ان کی معرفت سے برازیل کی عظیم مملکت اور اس کے عوام کو ہمارے تحسین کے جذبات سے آگاہ فرمائیں۔ Betinho, Dom Paulo Evaristo اور Dom Helder Gamara، برازیل کے تنگ دست عوام کے شعور کو اور پوری دنیا کو میری گرم جوش تہنیت پہنچے۔

جلالت مآب!

یہ تقریر دراصل اس کی ہے جسے آج اس جگہ بنا تھا وہ ہمت، برداشت اور تدبیر کی حامل ایک ممتاز شخصیت ہے۔ وہ شخص کوئی حیرم کیے بغیر، صرف امن کے بارے میں اپنے تصورات کے، آزادی اور اپنے عوام کی عظمت کے سبب قید خانے میں مجبوس ہے۔

مشرقی تیمور کے عوام کا رہنما زامانا گسماؤ (Xanana Gusmão) اپنے ملک سے ہزاروں میل دور ایک قید خانے میں ہے جہاں اس سے رابطہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ 1993 میں اس پر چلائے جانے والے مقدمے کو پوری دنیا میں ملامت کا نشانہ بنایا گیا تھا، جو عالمی سطح پر جمہوریہ اندونیشیا کے بابائے قوم سوہارنو (Sukarno) کے ولندیزی مقدمے اور حرمت جیہانا جائز اقدام سمجھا جاتا ہے۔

میں زامانا اور اس کی معرفت اپنے پیارے دوستوں نینو کونس سانتانا (Nino Konis Santana)، ڈیوڈ ایکس (David Alex)، تہور مطان راک (Tahur Matan Ruak)، فرنانڈو آراؤجو (Fernando Araújo) اور تمام مشرقی تیموری ضمیر کے قیدیوں کے آگے جو مشرقی تیمور اور اندونیشیا کی جیلوں میں بند ہیں، تشدد کا نشانہ بنائے جانے والے ہزاروں افراد، بیواؤں اور یتیموں کے آگے احترام اپنا سر خم کرتا ہوں۔ میں

مربا لائے اور ہزاروں جان دینے والوں کو بھی اپنا سلام پیش کرتا ہوں۔
 زمانہ کی معرفت اپنے عوام کے آگے یہ کمال احترام، وفاداری اور انکسار اپنا سر خم کرتا ہوں اس لیے
 کہ وہ شہید تھے، حقیقی ہیرو اور امن کے داعی تھے۔

انڈونیشیائی عوام کا نیا نظام حکمرانی

1965 میں ہانڈ کے گئے انڈونیشیائی عوامی نظام کے مشرقی تیموری ہی اسکے شکار نہیں تھے۔ تیس
 برس سے انڈونیشیائی عوام بھی قتل عام، قید اور تشدد کا شکار ہیں اور ان کے ادیبوں، صحافیوں، معلمین اور
 دوسرے رہنماؤں پر پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ مسلمان، کیتھولک، بدھ مت اور ہندو مذہب کے پیروؤں
 سب کو اپنے حصے کے جبر کا سامنا ہے۔ اگرچہ عوامی نظام کی کوئی غیر تعصبانہ پالیسی ہے تو وہ جبر مسلط
 کرنے کی پالیسی ہے۔

میں ان لاکھوں انڈونیشیائیوں کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں جو خود اپنی ہی آزادی اور جمہوریت
 کی جدوجہد کے دوران جان سے گئے، نئے نظام کے قید خانوں میں مڑے تھے، یا جو چین، الہامیہ،
 سوویت روس اور مغربی یورپ میں نقل مکانی کرنے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔ میں بہتوں سے ملاقات کر چکا
 ہوں اور اپنے عوام کے دیکھوں اور غمازوں کے بارے میں گھنٹوں طویل باتیں کر چکا ہوں۔

یہودیوں کے قتل عام سے حاصل ہونے والے سبق

1933 میں، دوسری عالم گیر جنگ کی شروعات سے چند ماہ قبل واشنگٹن میں منعقد ہونے والی
 National Meeting for Moral Rearmament میں، میری شریکین نے صدر روز ویلٹ کا ایک دل سوز
 پیغام پڑھا تھا۔

میں اسی وقت جب کانگریس کے مندوبین صدر روز ویلٹ کا پیغام سن رہے تھے اور تالیماں بجا رہے
 تھے، جرمنی سے آنے والے نو سو یہودیوں سے بھرا ایک بحری جہاز فورٹ اے کے ساحل پر ٹکرا اندازہً واشنگٹن کے
 فیصلے کا انتظار کر رہا تھا کہ مسافروں کو ریاست ہائے متحدہ میں پناہ دی جائے یا ان کو واپس جرمنی بھیج دیا
 جائے۔

بالآخر اخلاص آئی کہ ان کو مہاجرین کی حیثیت دیے جائے کی درخواست رد کر دی گئی ہے۔ وہ پریشان
 مہاجرین National Meeting for Moral Rearmament کے اخلاقی نمائندوں کو قائل نہیں کر سکے
 تھے کہ ان کو درجہ شہریت کا خطرہ حقیقی تھا۔ وہ نو سو آدمی، عورتیں اور بچے جرمنی واپس بھیج دیے گئے اور ان
 میں سے بہت بڑے موت خانوں کی بھیجٹ چڑھ گئے۔

Jewish Holocaust کے نصف صدی سے زیادہ عرصے بعد تک، اور آسٹریلیا اور امریکا کے اصل

باشندوں کی نقلی غشی کے صدیوں بعد بھی، وہی رویہ اپنایا جا رہا ہے جس نے آج بھی اس قسم کے جرم کے ارتکاب کی اجازت دی ہے۔

رائے سازی کرنے والے رہنما، معتمدین، اویب اور صحافی جو نسلی تعصب اور امتیاز میں غیر جانبداری کا ڈھونگ رچاتے ہیں ان کو چھوٹی قوم کے ساتھ سیاسی زنا کی مرتکب ہونے والی بڑی قوم اور بے رحم فوجوں کے ہاتھوں کم زور عوام کے استحصال کے جرم کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔

آج بھی یہودیوں کے معبودوں کی بے حرمتی کی جارہی ہے۔ خانہ بدوش افراد کے خلاف آج بھی تعصب برتا جا رہا ہے۔ اصلی مقامی افراد آج بھی اپنی آنکھوں سے اپنے اجداد کی زمینوں پر قبضے ہوتے دیکھ رہے ہیں، ان کی تہذیب، ان کے عقائد، سیاحوں کی کچھپی کا سامان بنائے جا رہے ہیں۔

ماضی کے یہودیوں اور آرمینیائیوں کی طرح، گروہوں، خانہ بدوشوں، تبت کے رہنے والوں، آسٹریلیا کے اصل باشندوں، نیوزی لینڈ کے ماوریوں، New Caledonia کے کاکا کیوں، مغربی صحارا کے باشندوں اور امریکا کے اصل باشندوں کی طرح مشرقی تیموریوں کو بھی تاریخ کا ضمیمہ اور قابلِ صرف عوام بنایا جا رہا ہے۔

سرد جنگ کا ضمیمہ

مشرقی تیمور کے تنازعے کو سرد جنگ کے سیاسی سیاق و سباق میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ 1975 کے موسم بہار میں ایک تصویر اخباروں کی سرخروئی بنی تھی۔ میں اس تصویر کا حوالہ دے رہا ہوں جس میں بچے کچے سفارت کاروں، سی آئی اے کے ملازمین اور چند مراعات یافتہ افراد طفیلیوں کو اس وقت نکالنے کے لیے ایک امریکی ہیلی کاپٹر سائیکان میں IKS کے سفارت خانے کی چھت پر اترتا دکھائی دیتا تھا جب ویت کانگ کے ہاتھوں سائیکان کا سقوط ہو رہا تھا۔ تصویر نے ہزاروں الفاظ سے کہیں بہتر طریقے سے ہندو چینی علاقے سے امریکا کی پسپائی کا منظر پیش کیا تھا۔

ایک اور بڑا عظیم میں، Horn of Africa میں، ایک برس قبل بنیاد پرست فوجی افسروں کے ہاتھوں امریکا کے طویل ترین اتحادی اتحادی انجولیا کے ہیل سلاسی (Haile Selassie) کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تھا۔ اس کے مزید جنوب کی جانب پر ملائی سلطنت کا زوال ہو گیا تھا۔ یہ تمام واقعات لنڈن جانسن (Lyndon Johnson) کی damina theory کو پیش کر رہے تھے جس کی بنیاد پر ہندو چینی علاقے میں امریکا نے مداخلت کی تھی۔

اسی geopolitical سیاق و سباق میں صدر جیرالڈ فورڈ (Gerald Ford)، ہنری کسینجر (Henry Kissinger) دسمبر 1975 میں اپنے ایشیائی دورے میں جکارتا بھی گئے تھے تا کہ اس علاقے کے رہنماؤں کو اس بات کا یقین دلائیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا ایشیا کے تحفظ پر کیے گئے اپنے وعدوں کا پاس کرے گا۔ مشرقی تیمور پر کیا جانے والا حملہ جو فورڈ کی جکارتا سے روانگی کے چند گھنٹوں بعد ہی ہوا تھا،

1975 کی سرحد جنگ کا ایک ضمیمہ تھا۔ اور بعد کے آنے والے دنوں، ہفتوں اور برسوں میں ہلاک ہونے والے محض ویت نام کی جنگ کے بعد کا ضمیمہ تھے۔

نوآبادیاتی سرحدوں کی حرمت

ان واقعات کے ذریعہ برس بعد، جون 1974 میں، Timorese Social Democratic Association کے سیکرٹری خارجہ کی حیثیت میں، جو ایک مہینے قبل تشکیل پائی تھی، میرا جگانا جانا ہوا تھا۔ مجھے انڈونیشیا کے وزیر خارجہ جناب آدم ملک (Adam Malik) سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ ملاقات کے تین دور کے بعد ملک صاحب نے مجھے ایک خط لکھا تھا جس کا کچھ حصہ یوں تھا:

تیمور (شرقی) کے عوام سے استثناء کے بغیر، ہر ملک کی آزادی ہر قوم کا حق ہوتا ہے؛

— مستقبل میں آزادی کے حصول کے بعد جو بھی تیمور پر حکمرانی کرے گا، دونوں ملکوں کے مفاد میں، انڈونیشیا کی حکومت ہمیشہ اس سے اچھے تعلقات، دوستی اور تعاون استوار رکھے گی۔

ایک برس بعد میں، اپریل 1975 میں، پھر انڈونیشیا گیا اور صدر سوہارتو (Suharto) کے بڑے مشیر جنرل علی مورتوپو (Ali Murtopo) سے ملاقات ہوئی، جن سے میں نے دوستانہ تعلقات کی باہمی خواہش کو دہرایا تھا۔ جنرل مورتوپو نے مجھے یقین دلایا تھا کہ انڈونیشیا شرقی تیمور کے علاقوں پر کوئی دعوئی نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود جلد ہی ہمیں پتا چل گیا کہ ایک انڈونیشیائی جنرل کے الفاظ اتنی ہی آسانی سے رد کیے جاسکتے ہیں جتنی آسانی سے ادا کیے گئے تھے۔

کچھ بہت معمولی عمر بنیادی مسائل کو حل کیا جانا ضروری ہے۔ کیا انڈونیشیا کا شرقی تیمور پر کوئی جائز تاریخی حق ہے؟

جمہوریہ انڈونیشیا کی موجودہ سرحدیں Dutch East Indies انتظامیہ کی پیداوار ہیں۔ مغربی نیوگینی کو تاریخی، تہذیبی اور نسلی قرابت اور جغرافیائی تسلسل کی وجہ سے جمہوریہ میں ضم نہیں کیا گیا تھا۔ صرف ایک ہی کڑی تھی جس نے مغربی نیوگینی کے انضمام کی مانید کی تھی مختصر عرصے کے لیے ولندیزی نوآبادیات کا قبضہ۔

برلین کانفرنس میں افریقا کی ظالمانہ یک طرفہ نو تشکیل کا ذمہ دار آج کے افریقا کے مسائل کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ مگر نوآبادیاتی سرحدوں کے غیر منصفانہ احترام ہی کی وجہ سے آج وہاں کچھ امن اور استحکام ہے، جس نے افریقا، لاطینی امریکا اور ایشیا کو پارہ پارہ ہونے سے بچا لیا ہے۔

عراق کے صدر صدام (Saddam) نے بھی کویت پر حملے کے ذریعے نئے سرے سے سرحدوں میں تہدیبی کی کوشش کی تھی جو اس کے اپنے خیال کے مطابق غیر منصفانہ نوآبادیاتی وراثت تھی۔ بحرین پر ایران کا بھی دعوئی ہے۔ نام نہاد غیر منصفانہ حد بندیوں کی بنیاد پر لاطینی امریکا میں بھی ریاستوں کے درمیان کچھ تنازعے چل رہے ہیں۔

عوام کا حق خود ارادیت

بگہ بیش کے Chittagong Hill Tracts سے Bougainville, Kurdistan, Sri Lanka, India, Tibet, Chechnya, Ogoni, West Papua تک کیڑوں افراد اپنا سب سے بنیادی حق طلب کر رہے ہیں۔ اور اگر ہم ان کے دعووں اور مسائل کی قدر مشترک تلاش کریں تو وہ عوام کے حق خود ارادیت کے علاوہ کچھ اور نہیں۔

زیادہ تر معاملات میں علاقہ کی کا مطالبہ نہیں ہوتا۔ لوگ صرف ایک قوم کی حیثیت میں اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی بقاء کے طالب ہوتے ہیں۔ جس میں ان کی سر زمین اور ان کا ماحول قارت گر multinational اداروں سے محفوظ رہ سکے۔ جب ان کے مطالبات پورے نہیں کیے جاتے تو وہ دوسری نوعیت کی جدوجہد کے ساتھ اپنے مطالبات میں اضافے بھی کر دیتے ہیں۔

جب نوآبادیتی دور ختم ہو رہا تھا اس زمانے میں جہاں مقامی حکومتیں نہیں ہوتی تھیں وہاں حق خود ارادیت کی آڑ میں آزادی کے مطالبے کیے جاتے تھے مگر آج کل کے تنازعات میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ نوآبادیاتی ماحول کے سب سے نمایاں خدوخال مشرقی تیمور اور مغربی صحارا ہیں۔ مغربی صحارا کے معاملے میں اقوام متحدہ کا ادارہ علاقائی طاقتوں کی جوڑ توڑ میں یرغمال بن گیا ہے۔

کسی ملک کی علاقائی سالمیت کا تحفظ اسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جب وہ لوگ جو اقتدار میں ہوتے ہیں ملک کے مقامی افراد اور قوموں کے بنیادی مطالبات اور خواہشات کا پورا ادا کر رکھتے ہوں۔ وحشیانہ طاقت کا استعمال لوگوں کے خوابوں اور خواہشات کو خاموش یا سست تو بناسکتا ہے مگر ایک نہ ایک دن برسوں سنگت والا غمراہیہر کر ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

مشرقی تیمور کے عوام کا حق خود ارادیت

مشرقی تیمور کے عوام کا حق خود ارادیت وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مغربی صحارا کے ہسپانوی علاقے کے علاوہ اقوام متحدہ کی decolonization فہرست پر 1960 سے مشرقی تیمور سب سے بڑا علاقہ ہے جسے اب تک حق حکومت نہیں دیا گیا ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اس مسئلے پر اب تک دو قراردادیں منظور کر چکی ہے۔

بین الاقوامی عدالت "پرتگال بمقابلہ آسٹریلیا" مقدمے کے 30 جون 1995 میں اپنے فیصلے میں کہہ چکی ہے کہ حق خود ارادیت سب کے لیے یکساں طور پر ہے اور مشرقی تیمور کے عوام بھی اس کا حق رکھتے ہیں۔

پہلے سے لگائی گئی شرائط کے بغیر مذاکرات اور GNRIM Peace Plan

اسرائیل اور فلسطین کے درمیان امن کے مذاکرات اور جنوبی افریقا کی جمہورت کی قلب مابیت ہمیں نئی امید فراہم کرتے ہیں کہ اگر طرفین میں مسائل کے حل کی سیاسی بصیرت ہو تو تمام ناقابل حل مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔

آج اس کمرے میں مشرقی تیمور کے سر مکتبہ فکر کے رہنما موجود ہیں، جن میں سے کچھ تو مشرقی تیمور سے، پرتگال سے اور آسٹریلیا سے آئے ہیں۔ میں سب کی ترجمانی کرتے ہوئے کہنا چاہوں گا کہ ہم سب، اقوام متحدہ کی سرپرستی میں، کسی شرط کے بغیر، انڈونیشیائی ارباب اقتدار سے تنازعے کے ایک مکمل بندوبست کے لیے مذاکرات کا عمل شروع کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اپنے ملک کے عوام سے مکمل مشاورت کے بعد Xanana Gusmão نے اس منصوبے کی منظوری دی تھی جس کو GNRIM Peace Plan کا نام دیا گیا ہے، اور جو 22 اپریل 1992 کو یورپی پارلیمنٹ کو پیش کیا گیا تھا۔

GNRIM Peace Plan تنازعے کے حل کی راہ میں سب سے معمولی قدم کے مسائل اب بھی موجود ہے۔

پہلا دور — انسانیت کا دور

اس دور کو پوری طرح نافذ کرنے میں دو برس کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ اس میں تینوں گروہوں کو اقوام متحدہ کے ساتھ مل کر ”حق خود ارادیت“ کے مرکزی مسئلے کو چھیڑے بغیر وسیع بنیاد کی ”confidence building measures“ (CBMs) کو نافذ کرنا ہوگا۔

CBMs میں تمام قیدیوں کی رہائی، تشدد اور سرسری مذاکرات پر عمل درآمد پر پابندی اور علاقے میں انڈونیشیا کی فوجوں میں کمی پر عمل کیا جانا شامل ہونا چاہیے۔

یہی وہ خیالات ہیں جن پر، انڈونیشیا کو شرمندہ کیے بغیر، فوری عمل کیا سکتا ہے۔ ان سے انڈونیشیا کی بین الاقوامی حیثیت میں اضافہ بھی ہوگا اور علاقے میں اس کی موجودگی پر اعتراض بھی کم ہوگا، اور حالات میں تہدیلی بھی آئے گی۔

وقت کی پابندی کے پیش نظر اس منصوبے کا پورا متن اس خطبے کے تحریری متن کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے۔

دوسرا دور اختیار خود انتظامی، پانچ برس کے لیے

دوسرا دور جس میں پانچ سے دس برس لگ سکتے ہیں، حقیقی سیاسی خود اختیاری کا عرصہ ہوگا جس میں

جمہوری طور پر مقامی منتخب اسمبلی کو خالص اختیارات سونپ دیے جائیں گے۔
دوسرے دور کے آخر میں، علاقے کی خود مختار حیثیت کو باہمی اتفاق سے بڑھایا جائے گا۔
قبضے کی نفرت زدہ علامت، فوج، کی موجودگی کے بغیر ایک وقفے کی آزادی کا لطف اٹھانے کے بعد
شرقی تیمور کے باشندے اس انتظام کو مزید کچھ عرصے کے لیے بھی بڑھانے پر تیار ہو سکیں گے۔
اس کے برعکس، بدلتی ہوئی نسلیں، اور انڈونیشیا کے عوام کے رویے اور احساس میں تبدیلیاں شرقی تیمور
کو اپنا ایک آزاد ہمسایہ بن جانے پر راضی کر دے گی۔

تیسرا دور حق خود ارادیت

اگر سارے گروہ اس پر راضی ہو جائیں کہ تیسرے دور میں فوراً شمولیت کی جائے گی تو حق خود
ارادیت پر اقوام متحدہ لائے شماری کا انتظام کر دے گی جس کے نتیجے میں اس علاقے کی حتمی حیثیت طے ہو
سکے گی۔

اگر خدا نے چاہا اور شرقی تیمور آزاد ہو جاتا ہے تو، خواتین و حضرات، مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ
کو اپنے ملک کے مستقبل اور اس علاقے میں اس کے کردار کے بارے میں تصور میں شریک کروں۔

مستقبل کے بارے میں ہمارا تصور

شرقی تیمور ثمن بڑی تہذیبوں کے چوراہے پر ہے؛ میلانیشیائی (Melanesian) تہذیب، جو
ہمارے بھائی بہنوں کو جنوبی اوقیانوسی علاقے سے مربوط کرتی ہے، ملایائی۔ پولی نیشیائی تہذیب جو ہم کو
جنوبی ایشیا سے ملائی ہے، اور لاطینی کیتھولک اثر، جو تقریباً پانچ سو برس پرانی پرتگالی نوآبادیات کا ورثہ
ہے۔ یہ ایک وسیع تاریخی اور تہذیبی کیفیت ہے جو ہم کو ایسی منفرد حیثیت میں لاکھڑا کرتی ہے جس میں ہم
علاقے کے عوام کے درمیان تعاون اور باہمی اشتراک کے پل تعمیر کر سکتے ہیں۔

پرتگال

شرقی تیمور پرتگال سے قریبی تعلقات قائم رکھے گا جس نے تقریباً پانچ سو برس تک ہم پر حکومت کی
تھی اور آج ہم کو حق خود ارادیت دلانے میں سنجیدہ ہے۔ پرتگال اور شرقی تیمور ASEAN کے دو بڑے
اہم شریک کار ELA، افریقا اور لاطینی امریکا سے بھی تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

آسٹریلیا اور بحر الکاہل کا جنوبی علاقہ

شرقی تیمور کے تارکین وطن کی اکثریت آسٹریلیا میں آباد ہے۔ مباد جو اس کے کہیں شرقی تیمور

کے معاملے میں آسٹریلیا کے کردار پر افسوس ہے پھر بھی ہم آسٹریلیا کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہزاروں مشرقی تیموریوں کو اپنی زمین پر پناہ دے کر اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ آسٹریلیا کی موجودہ اور ماضی کی حکومتوں کے نمائندوں نے انڈونیشیا کی حکومت پر مشرقی تیمور میں انسانی حقوق کی کیفیت کے بارے میں زور ڈالا ہے۔ کسی اور مغربی ملک نے اس بارے میں استقلال کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔

ہم دوسری عالمی جنگ میں ایک ساتھ لڑے ہیں اور مشرقی تیمور کے لوگوں نے بھی اس مشترکہ مقصد کے لیے اپنی جانیں دی ہیں۔ اور اب مستقبل میں، ہم مدد کے لیے آسٹریلیا کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ایک خود مختار مشرقی تیمور آسٹریلیا سے قریبی تعلقات کا اور South Pacific Forum کی رکنیت کا خواہاں ہوگا۔

ASEAN اور APEC

ہمیں احساس ہے کہ ہمارا جغرافیہ ہمیں دنیا کے اس علاقے میں اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہم بودیت کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لیے ہم اپنی آزادی حاصل کرنے کے چند دنوں کے اندر ہی ASEAN اور APEC کی رکنیت حاصل کرنا چاہیں گے۔

ایک علاقہ امن کے لیے

ہم تنخواہ دار فوج نہیں رکھیں گے۔ اپنے خارجہ تحفظ کے لیے ہم ایک ”میتا قی غیر جانب داری“ پر بھروسہ کریں گے جس کے ضامن اقوام متحدہ کی سکیورٹی کاؤنسل کے مستقل ممبران ہوں گے۔ ہم اقوام متحدہ اور اپنے ہمسایوں سے توقع کریں گے کہ وہ ہمارے علاقے اور مشرقی تیمور کے اطراف کے سمندروں پر مبنی ایک علاقہ امن و ترقیات کی تشکیل کا اعلان کریں گے۔

قانون کی عمل داری

ہماری کوشش ہوگی کہ ہماری ریاست ایک مستحکم جمہوریہ ہو جس کی بنیاد ایسے قانون کی عمل داری پر ہو جو ہمارے عوام کی خواہشات اور ایک آزاد اور جمہوری انتخاب کے عمل سے ظہور میں آئے ہوں۔

انسانی حقوق اور بین الاقوامی فرائض

تمام بین الاقوامی حقوق کے معاہدے پاریمان کی توثیق کے لیے پیش کیے جائیں گے۔ ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسانی حقوق سرحدوں سے ماورا ہوتے ہیں اور انھیں ریاستی حاکمیت پر فوقیت ہونی چاہیے۔

ہم ابتدائی درجوں سے ہی تعلیمی انصاف میں انسانی حقوق کو ایک مضمون کی حیثیت میں شامل کریں گے۔ ہم عملی طور پر ایک خیال ممالک، غیر سرکاری اداروں اور ذرائع ابلاغ کے ساتھ مل کر اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی مشین کو مستحکم کریں۔

عام معافی اور قومی مفاہمت

مشرقی تیمور میں انڈونیشیائی انتظامیہ پولیس اور سکیورٹی کے محکموں میں کام کرنے والے مشرقی تیموریوں کو آزاد تیمور سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی ملازمتیں بحال رہیں گی۔ ایک خوش گوار تبدیلی کے ذریعے آزادی کے حصول میں ہر ملک کے چلانے میں ان کی عملی شمولیت کی اشد ضرورت ہوگی۔ ہماری سوسائٹی کی بنیاد انتقام پر نہیں ہوگی۔ اپنے اعتبار اور رُجے کے باعث کیتھولک کلیسا کو ہماری سوسائٹی کے عمل شایانی میں بڑا اور اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔

اگست 1975 کے مختصر عرصے کے فساد میں بہت سے مشرقی تیموری مارے گئے تھے۔ اور بہت سارے حملے کے بعد بھی مارے گئے تھے، اس لیے کہ اس تحریک کے رہنماؤں نے، میں جس سے منسلک تھا، منعقد اور جلاوطنوں کا کردار ٹھوس سنبھال لیا تھا۔

قومی تعمیر نو اور ترقیات

مشرقی تیمور نسبتاً ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ مگر 18,883 مربع کلومیٹر رقبے اور (1974 کے اعداد و شمار کے مطابق) ساٹھ لاکھ آبادی کے اعتبار سے دنیا کی کم از کم چالیس ریاستوں سے بڑا نہیں، تو چھوٹا بھی نہیں ہے۔ یہ ملک زیادہ تر زرعی اشیاء، گوشت اور مچھلی کی پیداوار کے معاملے میں خود کفیل ہے۔ اس میں تیل، قدرتی گیس، سنگ مرمر اور manganese کے، جو شیشہ گری کے کام آتی ہے، بڑے ذخائر ہیں۔

حملے کے دوران ہزاروں افراد بے گھر ہو گئے تھے۔ زیادہ تر لوگ اپنی جائیداد چھوڑ کر بھاگ گئے، ان کو مذرا آتش یا سستے داموں فروخت کر دیا تھا۔ ان حالات کا مداوا کیا جائے گا۔ ایک اختیاری بندوبست کا منصوبہ بنایا جائے گا تا کہ ہزاروں بے گھر مشرقی تیموری اپنے اجداد کی زمین پر واپس آسکیں۔ ہم عوام کے لیے مفت عام تعلیم اور صحت کی نگہداشت میں یقین رکھتے ہیں۔ تنخواہ دار فوج نہ رکھنے سے جو بچت ہوگی وہ ان سہولتوں پر صرف کی جائے گی۔ عالمی ادارہ صحت کے تعاون سے ہم طبیعاً، چھپوٹ اور ای قسم کی دوسری بیماریوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کریں گے۔

انڈونیشیائی تارکین وطن

اس وقت اندازاً ایک لاکھ انڈونیشیائی تارکین وطن مشرقی تیمور میں رہتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر مفلس

ہیں جو ہمارے ملک میں بہتر زندگی کی تلاش میں آئے تھے۔ مشرقی تیمور میں آباد انڈونیشیا کے تارکین وطن کو خوش آمدید کہا جائے گا۔

سویاتو کی حکومت کی کارگزاری، اور اب اسے کیا کرنا چاہیے

کوئی بھی ایمان داری سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ جنرل سویاتو کی تیس سالہ حکومت نے کوئی اچھا کام نہیں کیا ہے۔ پچھلے تیس برسوں میں اس نے شاندار کام کیا ہے۔ سویاتو کی حکومت نے انڈونیشیا کی معیشت کو حد درجہ مفلسی سے اٹھا کر ملک کو معاشیاتی مانگیر بنا دیا ہے۔ معیار زندگی، تعلیم، صحت عامہ اور غذائی پیداوار شاندار درجے تک پہنچ گئی ہے۔

صدر سویاتو کو اپنی قیادت کی برائی کے ثبوت کے طور پر تمام قیدیوں کو رہا کر دینا چاہیے اور انڈونیشیا کے سب سے بڑے ادیب PDI، Pramodya Ananta Toer کے رہنما، بابائے انڈونیشیا مرحوم بنگ کارنو کی بیٹی میگاوٹی سوکارنو پٹری (Megawati Sukarnoputri)، انڈونیشیا کے شیخ و اینسا (Lech Walesa) مختار پاکپان (Mukhtar Pakpahan) سری بن تانگ (Sri Bintang) اور انڈونیشیا کے عظیم ماہر ماحولیات جارج اڈیونڈرو (Adijondro) وغیرہ سے فردا فردا ملاقات کرنی چاہیے۔

PRD کی قیادت اور اس میں شامل مجاہدین انڈونیشیا کے بہترین فرزندوں میں سے ہیں۔ ان سب کی کچڑ بھنڈ کے بجائے ان کو مستقبل کے بارے میں مذاکرات کے لیے قعرِ صدارت میں دعوت دینی چاہیے۔

انڈونیشیا میں پُر امن جمہوری تبدیلی کی سرپرستی

کوئی بھی ملک، خواہ وہ قدرتی نعمتوں سے کتنا ہی مالا مال کیوں نہ ہو، اپنے تئیں ایک جزیرہ بن کر نہیں رہ سکتا۔ ہر لمحہ سکڑتی ہوئی دنیا اور مسابقتی ماحول میں، جہاں جدید برقی رسل و رسائل آمروں کی دی ہوئی جبری خاموشی کی بندشوں کو توڑ ڈالتے ہیں، انڈونیشیا مشرقی تیمور کے عوام کے حق خود ارادیت کی خواہشوں کو اور خود اپنے ملک کی قانونی حکمرانی کو مدغم نہیں سکتا۔

اگلے دو تین برس میں خود انڈونیشیا میں بھی تعمیر آئے گا۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ریاستہائے متحدہ، کناڈا اور یورپی یونین کو انڈونیشیا میں ایسی ترقی پذیر مگر جمہوری اصلاحات کی ہمت افزائی کرنی چاہیے جس میں قانون کی حکمرانی ہو اور مشرقی تیمور کی خود ارادیت کے لیے سنجیدہ کوششیں شامل ہوں۔

بین الاقوامی کمیونٹی کا کردار

ہم نے اپنے مستقبل کے بارے میں خوش امید رہنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ انڈونیشیا اور ASEAN میں شامل اپنے تمام ہمسایوں کی طرف ہم دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور ان سے مشرقی تیمور کی آزادی کی کوشش

میں ہاتھ بٹانے کی درخواست کرتے ہیں۔

امریکا، کناڈا، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، جاپان اور انڈونیشیا کے دوستوں کے ساتھ مل کر اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کی سرپرستی میں، یورپی یونین کو با معنی مذاکرات آگے بڑھانے کے لیے زور ڈالنا چاہیے۔ صرف امریکی انتظامیہ ہی سب سے بڑی طاقت ہے جس نے انڈونیشیا اور مشرقی تیمور میں حالات کو تھریل کرنے پر زور دیا ہے۔ میں صدر کلنٹن (Clinton) کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مشرقی تیمور کے معاملات میں دلچسپی لی ہے۔ میں ان سے درخواست کرتا ہوں اپنی جوان ہمت توانائیوں اور دردمندی کے استعمال سے اس تنازعے کا ایک مستقل حل تلاش کرنے کی کوشش کریں، جس کو انھوں نے ایک بار unconscionable کہا تھا۔

مغرب اور فروختِ اسلحہ

ہم یہ نہیں کہتے کہ انڈونیشیا کو مکمل معاشیاتی پابندیوں کی مزاد دی جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کسی ملک پر معاشیاتی دباؤ ڈالنے سے اس کے جمہوری ضمیر رکھنے والے طبقے کی فزائش اور اس کے رویے میں مثبت تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔

پھر بھی، ہمیں یہ سوچ کر ہی کراہیت آنے لگتی ہے کہ مغربی ممالک، جو انسانی حقوق کے بارے میں بلند بانگ دعوے کرتے نہیں تھکتے، وہی سب سے زیادہ ہتھیار بناتے ہیں جنھوں نے دوسری عالمی جنگ کے دوران، ترقی پذیر ملکوں میں بیس لاکھ سے زیادہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

زمینی بارودی سرنگیں، متعدد کے آلات، بکسٹر بم اور کیمپائی ہتھیار انسانوں کو ازیت ناک موت دینے کی غرض سے ایجاد کیے گئے ہیں۔ ان کے شکار زیادہ تر عورتیں اور بچے ہوتے ہیں۔ اسلحے ایجاد کرنے والے، ان کے کارخانوں میں کام کرنے والے اور سیاست دان بھی کے اپنے پیارے خاندان بھی ہوتے ہیں، تو دوسرے انسانوں کو ڈکھ پہنچاتے وقت یہ سب اتنے بے حس کیوں ہو جاتے ہیں؟

انسانی حقوق اور ”ایشیائی قدریں“

برما، تھائی لینڈ، فلپائن، جنوبی کوریا اور چین اور انڈونیشیا میں ابھرنے والی جمہوری طاقتیں دنیا کو یہ بتاتی ہیں کہ انسانی حقوق مغرب ہی کی ایجاد نہیں ہیں۔

ہزاروں ایشیائی جنھوں نے ٹیلا، بنگاک، رنگون اور بیجنگ کی سڑکوں پر اپنی جانیں دی ہیں ایسی مام نہاد ”ایشیائی قدروں“ کے لیے نہیں مرے ہیں جو ایشیا کے عوام کو ویسے ہی بنیادی انسانی حقوق دینے سے انکار کرتی ہوں، جیسے کہ یورپ، لاطینی امریکا اور افریقا کے بے شمار ملکوں کے عوام کو حاصل ہیں۔

جنوبی کوریا

جنوبی کوریا کے عوام جنھوں نے طویل آمریت اور طویل عرصے کے قبضوں کو برداشت کیا تھا، جمہوریت کی جدوجہد میں کامیاب ہوئے تھے، مگر ہندوؤں کے زور پر نہیں، اپنے اتحاد کے ذریعے جو سول (Seoul) اور کوانگجو (Kwangju) کی گلیوں میں فوجیوں سے دست بردست لڑائیوں کے ذریعے کامیاب ہوئے تھے۔

جنوبی کوریا کے عوام بھی ان کو معاف کر کے اپنی بلند نظری کا ثبوت دے سکتے ہیں، جنھوں نے کبھی ان پر ظلم ڈھائے تھے۔ تاریخ میں ایسا بھی ہوا ہے کہ مقتدر افراد کو بے لگام جرائم میں مگوث کیا جاتا ہے۔ مگر جو آج اقتدار میں ہیں انھیں انصاف کے نام پر برآمد کے انتقام کی ترغیب سے پھینک دینا چاہیے۔ موت کی سزا کو ختم کر دیا جانا چاہیے اور کوریا کے بہادر عوام کو سابق صدر چن دو ہوان (Chun Do Hwan) کو سزائی یعنی موت کی سزا کو ہرقید میں تبدیل کر کے ایک اچھی مثال قائم کرنی چاہیے۔ میں اس مقام سے اپنے کوریائی بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ ان سے جو شکست کھا چکے تھے، برگر بدلہ نہ لیں۔ فتح میں بھی [انسان کو] فیض رساں ہونا چاہیے۔

برما

میں برما کے بہادر عوام اور ان کی منتخب کردہ رہنما آنگ سان سول کی (Daw Aung San Suu Kyi) کو جمہوریت، قانون کی حکمرانی اور انسانی حقوق کے لیے جانے والی جدوجہد میں اپنے دلی اتحاد کی یقینی دہائی کرنا چاہتا ہوں۔

ایسے وقت میں جب ASEAN کے کچھ ممبران SLORC کی حکومت سے مل کر برما کے عوام کو جمہوری فتح دلانے سے چشم پوشی کر رہے تھے، ہم کو برما میں جمہوریت کی بحالی کی کوششوں کی دہائی امداد کے لیے کھڑا ہونا چاہیے۔

یورپ اور امریکا کی ستائش کی جانی چاہیے کہ ان کی قیادت نے برما میں SLORC کی عائد کردہ پابندیوں کے خلاف جمہوریت کی بحالی کی کوشش میں اضافی سیاسی اور معاشی امداد فراہم کی ہے۔

■ میں خیلا میں ہونے والے Forum of Democratic Leaders کے اجلاس کے قائدین، کم ڈے یونگ (Kim Dae Jung) اور کوری اکیو (Gary Aquino) کی جانب سے تسلیم کی جانے والی سفارشات کی ہم نوائی کرتا ہوں۔

چین، تائیوان اور تبت

جب 1975 اور 1976 میں اقوام متحدہ کی سکیورٹی کاؤنسل مشرقی تیمور پر غور کر رہی تھی، چین ہمارا قریب ترین اتحادی تھا۔ میں نے چینی سفارت کاروں سے بہت قریب ہو کر کام کیا تھا۔ چار دوسرے مستقل ارکان کی بے توجہی کے باوجود چین غیر مستقل ارکان کی مدد سے مشرقی تیمور کے بارے میں دو قراردادیں منظور کروانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اسی لشکر اور شخصین کے احساس کے ساتھ میں چینی قیادت سے درخواست کروں گا کہ وہ آزادی، تقریر، قانون کی حکمرانی اور جمہوریت کی بنیاد پر ایک کھلے معاشرے کے لیے اپنے عوام کی خواہشات کا احترام کریں۔ آخر، یہ وہی تو حقوق ہیں چین کا آئین جنہیں ہر چینی باشندے کو دینے کا وعدہ کرتا ہے۔

چین کے بہترین بیٹوں میں سے ایک وائی زینگ زین (Wei Jing Zhen) بھی ہے۔ اس کی ملامتیں تائیوان کا ضیاع ہو رہا ہے جب کہ چینی کے عوام اور ان کا ملک ان سے فائدے حاصل کر سکتا ہے۔

تائیوان کے عوام نے اپنی ذہنی بلوغت، ذمے داری کے باعث امن اور جمہوریت سے وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ جب کہ تائیوان کی جانب سے چین سے کوئی تنازعہ نہیں ہے، اور جب تک کہ دونوں ملکوں کے انضمام کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوتی، میں سمجھتا ہوں کہ مذاکرات اور امن کی خدمت ہوگی اگر تائیوان کو بصر کی حیثیت سے اقوام متحدہ میں شمولیت کی اجازت دے دی جائے، جیسا کہ ماضی میں جنوبی اور شمالی کوریا، جنوبی اور شمالی ویت نام کے سلسلے میں کیا گیا تھا۔ چین نے آخر ان کے معاملے میں تو کوئی تعرض نہیں کیا تھا؟

چین کو امن اور اعتدال پسندی کے بارے میں تبت کے عوام کی آواز پر بھی دھیان دینا چاہیے۔ کئی برس ہوئے تبت کے روحانی رہنما محترم دلائی لامہ نے تبت میں امن کے چینی ابواب اختیار کو امن کا ایک معتدل منصوبہ بھی پیش کیا ہے۔

قبرص

قبرص، جو جمہوری روایات اور برداشت کی ایک شان دار مثال ہے، تقسیم ہے اور اس پر ایک NATO اتحادی کا قبضہ بھی ہے، جس کی جنگوں اور تشدد سے بھری تاریخ سب کے سامنے ہے۔

حال ہی میں مجھے Kykko B Lyceum کے Glasses G11 اور G22 کے طلبہ نے نکوسیا سے اپنے خط میں لکھا ہے:

”آپ کا وطن سمندر کے اُس پار کا ایک مقبوضہ علاقہ ہے۔ ہمارا وطن Mediterranean کے آخری

مرے تک جزوی طور پر قبضے میں ہے۔ ہم ایک تقسیم شدہ شہر میں رہتے ہیں اور ہمیں خط تقسیم پار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔“

Kykka B Lyceum کے طلبہ سے میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ قدیم آرمینیا کی طرح تم لوگ بھی ایک دن اپنی گم کردہ زمین کو پا لو گے۔

قیامت کے پیشین گو

پچھلے چند برسوں میں دنیا بڑے ڈرامائی انداز میں تبدیل ہو چکی ہے اور status اور irreversibility کے نظریہ ساز سویت روس کے مستقبل کی وجہ سے نامعتبر ہوئے ہیں۔

کون کہہ سکتا تھا کہ آرمینیا کے عوام، جن پر سیکڑوں برس سے اذیت برس رہی ہے، ایک دن اپنے ملک کو واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ پوری دنیا نے حبشہ کے عوام کے خلاف سازش کی۔ امریکا، روس اور کیوبا سب نے اس چھوٹی سے قوم سے پہلو تھپی کی ہے۔ دو بڑی قوموں، اسرائیل اور فلسطین نے جو ازلی دشمن رہی تھیں ایک تکلیف دہ مذاکرات کے عمل کی شروعات کرنے کی ہمت کی ہے۔ جنوبی افریقا میں دو سابقہ دشمن اپنا ایک مشترکہ گھر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آخر میں قسمت کی پیشین گوئیوں کے لیے، حکومت میں شامل ان لوگوں کے لیے جو ہمیشہ ہمیں حقیقت کا درس دیتے نہیں تھکتے، اجازت دیجئے کہ میں ان کو ایک برس پہلے کی بی بی سی کی ایک خبر یاد دلاؤں۔

یہ واقعہ 1991 کا جب میں سویٹزرلینڈ کے ایک چھوٹے سے شہر Nyon سے اپنی کار میں اقوام متحدہ کے جنیوا میں واقع دفتر جا رہا تھا، ایک اور تصفیعی اوقات کے لیے، اسی جگہ جہاں کچھ سفارت کاروں کے پاس اصل لوگوں سے اصلی مسائل سننے کے لیے بالکل وقت نہیں ہوتا۔

بی بی سی والے ہم کو ایک خلا نورد کا قصہ سنا رہے تھے جو چند ماہ قبل ایک تاریخی سفر پر خلا میں گیا تھا۔ جس وقت اس کے رائٹ نے اڑان بھری تھی اس کے پاس سوویت یونین کا پاسپورٹ اور قومیت تھی جو دنیا کی سب سے خوف زدہ کر دیئے والی فوجی سلطنت نے اس کو عطا کی تھی۔

جب وہ اشتراکی مرکزین کے لیے قابل فخر خلائی سرکھل کر کے زمین کے سفر پر روانہ ہونے والا تھا تو وہ ملک ہی باقی نہیں رہا تھا جس پر اس کو واپس جانا تھا۔ اس طاقت ور سلطنت کا زوال ہو چکا تھا۔ لہذا اس کو چند دن اور خلا میں چکر لگانا پڑا تھا، اس وقت تک، جب زمین پر چند لوگ یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو چکے تھے کہ وہ کس ملک جاسکے گا۔

اس واقعے کے بیان ہی کے ساتھ میں اپنا خطاب اس امید پر ختم کرنا چاہوں گا کہ ہمارے خلاف کتنی ہی وحشیانہ طاقت کیوں نہ استعمال کی جائے، ہمارے خواب کبھی نہیں مریں گے۔

خدا آپ سب پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔

شکریہ!



یاسر عرفات شیمال پیرے اسحاق رابین اعلان تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات!
مارہ یائی کمیٹی نے شرق وسطیٰ میں امن کے قیام میں ان کی کوششوں کے لیے 1994 کا انعام،
حروفِ تہجی کے انتہا سے، یاسر عرفات، شیمال پیرے اور اسحاق رابین کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے لیے
یہ مسرت کا موقع ہے کہ آج ہم تینوں انعام پانے والوں کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ یہ لوگ
نہایت پیچیدہ سیاسی عمل میں بہت مصروف ہیں۔ ہم اپنے قلب کو نیا دو کشاہد محسوس کر رہے ہیں کہ انعام
حاصل کرنے کے لیے آپ نے اس چھوٹے سے برف نزار ملک میں تشریف لانے کے لیے وقت نکالا۔
شرق وسطیٰ کے مقدر پر دنیا کا اس قدر توجہ دینا محض اتفاق نہیں۔ شرق وسطیٰ کا یہ تنازعہ، یا تنازعات،
ہم سب کے لیے خاص طور سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ شرق وسطیٰ اس مقام پر واقع ہے جہاں ایشیا اور
یورپ ملتے ہیں۔ یہی وہ زمین ہے جس میں کئی بڑے مذاہب کی جڑیں پیوست ہیں۔ اس لیے، شرق وسطیٰ وہ
آئینہ ہے جس میں دنیا خود کو منعکس دیکھتی ہے۔ وہاں جس طرح تنازعات حل کیے، یا نہیں کیے جاتے ہیں،
مثال ہیں امید پیدا کرنے کی، یا دوسرے علاقوں میں ان کو ٹھنڈا کرنے کی۔ اسی وجہ سے محض انعام یافتگان
کی سرگرمیوں ہی پر نہیں تمام واقعات پر نہایت فکر مندی سے نگاہ رکھی جاتی ہے۔
مجھے اپنے ایک ذاتی مشاہدے پر کچھ کہنے کی اجازت دیجیے۔ چوں کہ ہماری نشوونما پر ولسٹنٹ عیسائی

روایات کے مطابق ہونی تھی، ہمارے ذہنوں میں، ابتدائی اسکول کے دوران، ماروے اور فلسطین دونوں ملکوں کی تاریخ اور جغرافیہ پہلے ہی کوٹ کوٹ کر بھری جا چکی تھی۔ وہی برس پہلے جب میں پہلی بار فلسطین گیا تھا، مجھے ایسا محسوس ہوا گویا ایسے ملک میں آ گیا ہوں، عرصہ دراز سے جس سے واقف ہوں۔ ایسا نہیں تھا، کہ میں نے اس کی پیچیدہ اور خوبی تاریخ انجیل سے پڑھ لی تھی۔ بچپن کے تصورات بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں؟ وہ ملک میری یادوں میں بسا ہوا تھا۔ میں یروشلم اور جریکو (Jericho) جا چکا تھا۔ مرا تھ ہی، مجھ میں کہری روحانی بے چینی بیوست تھی، جو holocaust نے ہم یورپ والوں کے دلوں میں پیدا کی تھی۔ اسرائیل کی ریاست کے قیام کے ذریعے عالمی برادری نے ایک غلط کو صحیح کرنے کی کوشش کی تھی، اور شاید صحیح ہی کیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے ذہن میں زیادہ بے چینی سمراہت کرنی محسوس کی، جریکو کے قریب واقع یکمپ کے اجڑے منظر گو دیکھ کر ہی نہیں، اس ثبوت سے کہ آج پھر کچھ لوگ در بدر ہوئے ہیں۔ کیا اس تاریخ کی کوئی انتہا نہیں ہے؟ کیا مزید بے انصافی کیے بغیر نا انصافی کا مداوا نہیں ہو سکتا؟

اس برس کے انعام یافتگان کے انتخاب کے ماقدوں نے کہا ہے کہ نوبیل کمیٹی اس تنازعے سے اتنے فاصلے پر ہے کہ اس کو سمجھ نہیں سکتی۔ شاید! غالباً وہی جو اس کے درمیان رہتے ہیں اس کے معافی جانتے ہیں۔ اس کے برعکس، وہی لوگ اس کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے زیادہ وسیع مناظر ہوں، اور وہی، ایبسن (Ibsen) کے الفاظ میں ”کھوکھلے ہاتھوں کے ذریعے، ایک بہتر تصور کے لیے“ واقعات کو دیکھ سکتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان نظاروں کو ہم آہنگ کرنا مشکل کام ہے۔ پس، اس برس کے انعام یافتگان نے بالکل سچی کچھ کیا ہے۔ تنازعے کے درمیان رہتے ہوئے بھی انہوں نے اس سے پرے دیکھنے کی صلاحیت قائم رکھی ہے۔

کمیٹی کے نزدیک، اسرائیل اور PLO کے درمیان پچھلے برس ہونے والے نام نہاد اوسلو بیقی کا مطلب یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ کے واقعات نے نیا موڑ لایا ہے۔ اس میں اختلافی بات یہ تھی کہ دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے کے وجود کا اقرار کر لیا تھا۔ کم از کم، اس اقرار کے باعث کہ، ”تشد و تشدد پیدا کرتا ہے“ کے خوف ناک چکر سے باہر نکلنے، اور پرامن ہم بودیت کے ممکنہ راستے کھل گئے تھے۔ معابدوں کی جھکیں کے بعد سے ترقیات زیادہ حرمی ہو گئی ہیں۔ اس کا اخلاق اسرائیل اور فلسطینی عوام کے درمیان تعلقات، اور اسرائیل اور اس کی ہمسایہ ریاستوں کے درمیان تعلقات، دونوں پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ وزیر اعظم لائین نے کل کی پریس کانفرنس میں کہا تھا، اوسلو بیقی نے دنیا بھر سے تعلقات کی بہتری کے راستے ہموار کر دیے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ نوبیل کمیٹی کو انتظار کرنا چاہیے تھا۔ مگر یہ کہنا کہ اوسلو بیقی کے نتیجے میں، ہر میدان میں، جو کچھ حاصل کیا گیا ہے اسے نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہمیں اس کا انتظار کرنا پڑتا، کانت (Kant) نے اپنے مشہور مضمون میں جسے ”اہمی امن“ کہا تھا، تو ہمیں ایک طویل عرصے تک انتظار کرنا پڑتا۔ امن کو ابد الابد کے لیے جیتنا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر فیصلے میں کسی عمل میں داخل

ہونے کے غصہ کو شامل ہونا چاہیے، ایسا عمل جس میں امن کا وعدہ شامل ہو۔ نوٹیل امن انعام ان کوششوں کے لیے جو کی گئی ہوں، اور ایسی مزید کوششوں کی ہمت افزائی کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ انعام کے بارے میں الفرید نوٹیل کا ارادہ بھی یہی تھا۔

کمیٹی کا خیال ہے کہ اس برس کے انعام یافتگان وہ افراد ہیں جو اسلوبِ مذاق کے، اور اس پر عمل کرانے کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے، روز بہ روز، ہونے والے مذاکرات پر نظر رکھی، اور اس پر مبنی مشکل اور ضروری فیصلے کیے تھے کہ دوسری پارٹی کو کیا رعایات دی جائیں۔ جنگ اور نفرت کے زخم آلودہ حالات میں، انہیں اپنے مقابل کو کم سے کم اعتبار دینا تھا، یہ اعتبار بھی کر لیا تھا کہ امن کے لیے دیے جانے والے ہتھارے اصلی ہیں، اور یہ بھی اعتماد کرنا تھا کہ اگر انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو کوئی اس کو تھامنے والا بھی ہوگا۔ اس شرط پر انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا جو اکیلا تھا ساس کے لیے بڑی ہمت دیکار ہوئی ہے۔ ایسے مذاکراتی کھیل کی کامیابی کے لیے ایک قسم کی موزونیت ہوئی چاہیے۔ دونوں فریق یہ احساس کرنے کے قابل ہوں کی "لو اور دو" کا تہا۔ اندازِ امری پر ختم ہوگا۔ تینوں انعام یافتگان شکرے کے مستحق ہیں کہ وہ اتنا زک توازن برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ رعایات کے بعد رعایات ہوئی چاہیں ورنہ عمل رک جائے گا۔ اب تک دونوں جماعتوں نے بہت کچھ دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ عمل کے دوران ایسا کچھ نہیں کیا جائے گا کہ "کھیل کے اصول" ٹوٹ جائیں۔

بہت سی وجوہات کی بنا پر، جو زیادہ واضح نہیں ہیں، اور میں جن پر وقت ضائع نہیں کروں گا، دنیا نوٹیل امن انعام کی عزت کرتی ہے۔ اس وجہ سے نوٹیل کمیٹی کو ترجیح ملتی ہے کہ وہ اپنے منصب سے سرگرم رہے۔ قول شخصہ، اخلاقی انصاف کا لہجہ اور بھلے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ہم اپنے غرائض بڑے انکسار کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ دور سے دیکھنے والے کو، شاید اس دور سے دیکھنے والے کے لیے جو دنیا کے مراعات یافتہ اور پرامن گوشے سے تعلق رکھتا ہے، اخلاقی بنانا آسان، بلکہ زیادہ ہی آسان ہوتا ہے۔ مذاقی طور پر میں اس بات کا قائل ہوں کہ امن انعام کی عزت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں سے تکبر کو خارج کر دیا گیا ہے۔ اس طرح انعام پانے والا حقیقی اخلاقی منصوبے۔ امن۔ کی مدد کر سکتا ہے۔ ارادہ یہ نہیں تھا کہ کسی کو نیک چلتی کی سند دی جائے، پس، نوٹیل کے اپنے دیے ہوئے رہنما مثالوں کے مطابق امن کے لیے عملی کام کرنے والے کو انعام دیا جائے۔

شروع ہی سے کمیٹی نے امن کے لیے عملی کام کی ایک وسیع تعریف متعین کر رکھی ہے۔ اس کا حلقہ انسانی بھلائی کے کام کا ہے، انسانی حقوق سے سیاسی عمل کے راستے تک ہے، جو تنازعات کی ممانعت کرے ان کو روکے یا ان کو حل کرے۔ اور ہمارے انعام پانے والے حضرات نے، بڑی شدت اور ہمت سے، اسی اہم اور آخری علاقے میں مداخلت کی ہے۔ نفرت اور تشدد، نفرت اور تشدد کو جنم دیتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ اس خوف ناک چکر میں گرفتار تھا ابے شمار افراد پر یہ بھوت سوار ہو چکا تھا۔ گھر جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، کچھ ایسے

بھی ہیں جو اس سے باہر نکلنے کی طاقت رکھتے ہیں جو سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور پُر امن ہم بودیت کی تلاش میں اپنی ڈگر پر واپس چلے جاتے ہیں۔ شاید ایسے لوگ ہی اس احترام اور تعریف کے مستحق ہوتے ہیں۔ کیا ہمیں یہ نہیں سکھایا گیا تھا کہ ایسی واپسی ہی سب سے زیادہ مثالی کی وجہ ہے؟

ایسے ہی ایک سابقہ موقع پر میں نے مدطائی مشاعر اور دانش ور اسٹیفنس اسپنڈر کے تصورات کو یاد کیا تھا، جب اس نے ہسپانوی خانہ جنگی میں حصہ لیا تھا۔ اس کے نزدیک فسطائیت کے خلاف جنگ اعلیٰ مقصد تھی، مگر ایک ایسا وقت آیا جب اس نے اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ اس پر خوف ناک انکشاف ہوا تھا کہ جنگ اس پر کیسے بھیمانہ اثرات مرتب کر رہی تھی۔ ”مجھے معلوم ہو گیا تھا“ اس نے لکھا تھا، ”کہ اگر میں ہر مارے جانے والے بچے کے بارے میں بلا رُور رعایت نہیں سوچتا تو گویا میں بچوں کے مرنے کی ہرگز کوئی پروا نہیں کرتا۔“ اسپنڈر میں اتنی بہادری تھی کہ وہ اپنی اس قسم کی تزکیائی خود احتسابی کر سکتا تھا، اور اس خوف ناک چکر کو توڑ کر باہر نکل سکتا تھا۔

اس طرح میں انعام یافتگان کے کردار کا احاطہ کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں، نہ ان کے ارادوں کا، جو وہ آئندہ کرنے والے ہیں، جس کا خود انہیں بھی خیال نہیں ہوگا۔ میں صرف اتنا بتانا چاہ رہا ہوں کہ صورت حال کتنی پیچیدہ ہے اور فیصلہ کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ مگر میرا اصل پیغام کچھ اور ہے، بہت محدود مگر ضروری؛ میں توجہ مرکوز کرنا چاہ رہا ہوں اس حیرت اور یک سوئی کی طرف جس سے انہوں نے اوسلو مذاکرات کے شروع ہونے کے بعد سے اہم سیاسی اقدام کیے ہیں۔

تینوں انعام پانے والے ایسے درجات پر فائز ہیں جن میں ان کے پاس واقعات پر اثر انداز ہونے کی طاقت ہے۔ مگر ان کی حیثیت سب کے سامنے ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے مداخلت کروا قعات کی صحت بدلنے، نفرت اور تشدد کے خوف ناک چکر کو توڑ کر باہر نکلنے اور موافقت کی راہوں کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ رہنماؤں کی حیثیت میں وہ امن کے حصول کی تمنا کو ہمیز کر رہے ہیں، بلاشبہ جو عوام کے دلوں میں بھی اگھڑائیاں لے رہی ہے۔ ماضی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، مگر اس کی طرف مختلف رویے اپنائے جاسکتے ہیں۔ اس کے مزایے میں رہنے کا بھی فیصلہ کیا جاسکتا، یا پھر اس کے استعمال سے بہتر مستقبل کی تعمیر بھی کی جاسکتی ہے۔ ہمارے انعام یافتگان نے آخر الذکر راہ اپنانے کا فیصلہ کیا ہے، اور اب تک وہ اس میں کامیاب رہے ہیں: اب واقعات نے ایک نیا موڑ کاٹا ہے۔

حالات اب بھی پھر پورتلو کی کیفیت میں ہیں، نشانات تشدد قتل و عدم تحفظ نظر آ رہے ہیں، اور اس حکام ابھی بہت دور کی بات ہے۔ پھر بھی ہمارے دوستوں نے نہ صرف یہ دکھا دیا ہے کہ مصالحت کا راستہ نکالا جاسکتا ہے، بلکہ انہوں نے بڑی ہمت سے اس راستے پر کئی قدم آگے کی طرف بڑھائے ہیں۔ ان کوششوں کی پسندیدگی میں، اور اس امید پر کہ جو عمل انہوں نے شروع کیا ہے وہ جاری رہے گا، آج انہیں نوبل امن سے نوازا جا رہا ہے؛

Francis Sejersted، صدر نشین، ماریو یائی نوبیل کمیٹی کی زبانی

خطبہ - جناب یاسر عرفات

جلالت ماب شاہ ہارالد (Harald)، جلالت ماب ملکہ سوئیا، پروفیسر سیر سٹیل، صدر نشین نوبیل امن کمیٹی، عزت ماب، محققین و حضرات!

قرآن کریم سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

”جب، اگر وہ امن کے حصول پر راضی ہو جائیں، تم بھی ان کی طرف جھکو، اور اللہ پر بھروسہ کرو۔“ (قرآن الکریم، 8:62)

جب سے میرے عوام کی طرف سے مجھے اپنے گم کردہ گھروں کی بازیابی کا دُشوار فرض سونپا گیا ہے، میں خود کو ایک گرم جوش عقیدے سے لبریز پاتا ہوں، کہ گھروں سے نکالے ہوئے لوگ، جو اپنے گھروں کی کھینچوں کے ساتھ اپنے کئے ہوئے دست و پاؤں جسم کے ناقابلِ علاجی حصے، اٹھائے ہوئے ہیں، اور وہ جو اپنے وطن میں دشمنوں کو اپنے نام کی طرح گلے سے لگائے ہوئے ہیں، ایک دن، اپنی تمام قربانیوں کے طفیل، واپسی اور آزادی سے نوازے جائیں گے۔ اور یہ بھی کہ، درد سے بچے ہوئے لمبے راستوں کا مشکل سفر ان کی دہلیزوں پر ختم ہوگا۔

اب، جب کہ ہم ہلال امن کی پہلی رویت کو ایک ساتھ منا رہے ہیں، میں ان شہیدوں کی آنکھوں میں جھانک رہا ہوں، جن کی نگاہ میرے شعور میں سرائیت کر گئی ہے، اور اب، جب کہ میں اس شہنشاہ پر ایسا دہا ہوں، وہ مجھ سے اپنے وطن اور اپنی خالی کی ہونے جگہوں کے بارے میں استفسار کر رہے ہیں۔ میں ان سے اپنے آنسو چھپا رہا ہوں اور ان سے کہہ رہا ہوں: ”تم کتنے صحیح تھے۔ تمہاری فیاض قربانیوں نے ہم کو اپنی مقدس زمین سے پیار کرنے کے قابل بنایا ہے، اس پر پہلا قدم رکھنے کی توفیق دی ہے، مشکل محاذ لے کے لیے، امن کے محاذ لے لیے، بہادریوں کے امن کے لیے۔“

اب، جب کہ ہم اپنے اندر کی تخلیقی قوتوں کی دوبارہ بیداری کا جشن منا رہے ہیں اور اپنے ہمسایوں سے بلند، اپنے جنگ آلودہ گھروں کی تجدید کر رہے ہیں، جہاں ہمارے بچے ایک ساتھ کھیلتے ہیں اور پھول چھنے میں مقابلے کرتے ہیں، اب، میں اپنے فلسطینی عرب عوام کے دلوں میں قومی اور انسانی تقاضا محسوس کرتا ہوں جن میں کبھی نہ ختم ہونے والی طاقتِ صبر اور داد و بخش ہے، جن کے دل وطن، تاریخ اور عوام کے درمیان بندھن کے جذبات سے لبریز ہیں، جنہوں نے وطن کی قدیم داستان میں رزمیہ امید کا ایک نیا باب شامل کیا ہے۔

میں اس نوبیل انعام کو معنون کرتا ہوں ان کے نام، اس مہربان اور صبر آزما قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں کے نام، صنوبر اور شبنم کی، آگ اور پسینے کی اس قوم کے نام۔ میں اس [انعام] کو ان بچوں کے لیے رکھ رہا ہوں، جن سے وعدہ کیا گیا ہے آزادی کا، بچاؤ اور تحفظ کا، بیرونی دھمکیوں یا اندرونی استحصال سے آزاد وطن کا۔

میں جانتا ہوں، میں اچھی طرح جانتا ہوں، جناب صدر نشین، کہ بلند و برتر اور بڑا معنی خیز انعام دیا گیا ہے مجھے اور میرے شرکائے کار جناب اسحاق رابین اسرائیلی وزیر اعظم اور جناب شیماں پیرے وزیر خارجہ، کی کامیابیوں کو توقیر عطا کرنے کے لیے؛ مگر تلاشِ راہ کی ہمت افزائی کے لیے بڑے قدموں اور عمیق آگاہی کے ساتھ، سچے ارادوں کے ساتھ تا کہ ہم قلبِ مابیت کر سکیں امن کے انتخاب کی، بہادریوں کے امن کی، الفاظ سے عمل اور حقیقت تک، کہ ہم قابل ہو سکیں پیغام کو آگے لے جانے کے لیے، ہم کو جس پر مامور کیا ہے ہمارے عوام نے، اور انسانیت نے اور ایک آفاقی اخلاقی فریضے نے۔

فلسطینی، جن کے قومی مقاصد، اپنے عرب بھائیوں کی طرح اُس کمال اور منصفانہ امن کی خاطر، عرب اسرائیلی باپ امن کی حفاظت کرتے ہیں، جو ”زمین پر امن“ کی بنیاد پر اور بین الاقوامی جواز اور تجاویز کی تکمیل امن کے باعث وجود میں آیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایک بیش بہا اثاثہ ہے اور ہمارے مفاد میں ہے۔ یہ ایک حتمی انسانی اثاثہ ہے جو ایک فرد کو، پابندیوں سے مبرا، کسی بھی علاقائی، مذہبی یا گروہی انفرادیت کی نشوونما کی آزادی دیتا ہے۔ یہ عرب اسرائیلی رشتوں میں ان کی فطری مصومیت کو تازہ دم کرتا ہے، اور عرب جذبے کو عدم پابند انسانی اظہار کے ذریعے یہودی یورپی اسی کے ہمیت ادراک کا اختیار دیتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے یہ اذیت گزیدہ یہودی جذبے کو اجازت دیتا ہے اپنے بے زنجیر اظہار کا، اس عذاب کے لیے جو فلسطینیوں نے اپنی شکاف زدہ سرخ میں سہا ہے۔ جنھوں نے اذیتیں سہی ہوں، ان کے درد کو صرف اذیت گزیدہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

امن ہمارے مفاد میں ہے۔ اس لیے کہ منصفانہ امن کی فضا ہی میں فلسطینی اپنی جائز آزادی اور خود مختاری حاصل کر سکتے ہیں، اپنی قومی اور تہذیبی شناخت کی نشوونما کر سکتے ہیں، ساتھ ہی مستحکم رشتہ ہائے ہمسائیگی سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں اور اسرائیلی عوام سے باہمی احترام اور تعاون کے رشتے استوار کر سکتے ہیں۔ اس کے بدلے میں اسرائیلی مشرق وسطیٰ کی اپنی شناخت کو واضح کر سکتے ہیں اور عرب ہمسایوں کی طرف اپنے معاشیاتی اور تہذیبی درپیکوں کو کھول سکتے ہیں۔

عرب اپنے علاقے کی ترقی کے خواہاں ہیں، طویل جنگ زدہ برسوں نے، جس کو دنیا کے جمہوری، تکثیریت اور خوش حالی کے ماحول میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے سے روک دیا تھا۔

جس طرح جنگ ایک بڑی مہم ہوتی ہے اسی طرح امن بھی ایک چیلنج اور بازی ہوتا ہے۔ اگر ہم امن کو طوفان کے درمیان بادبازوں کو برداشت کرنے کے لیے وسائل فراہم نہ کریں، اگر ہم امن کی نشوونما اس لیے روک دیں کہ وہ طاقت حاصل کر سکے، اگر ہم اس کو بڑھنے اور طاقت حاصل کرنے کا موقع فراہم نہ کریں تو بازی بے کار یا ضائع ہو سکتی ہے۔ لہذا میں اس سر نشین سے امن میں شریک ساتھیوں سے امن کے عمل کو تیز کرنے کی درخواست کرتا ہوں تاکہ [مقبوضہ علاقوں سے] واپسی کا عمل شروع ہو، تاکہ تیزی سے نئے مرحلے پر پہنچنے کے لیے انتخابات کرائے جاسکیں، تاکہ امن کی جڑیں گہری ہو سکیں، اس کی نشوونما ہو سکے اور امن ایک

حقیقت بن کر استوار ہو سکے۔

ہم نے امن کا عمل، زمین برائے امن کی بنیاد پر اور فلسطینی عوام کے جائز حقوق کے حصول کے لیے اقوام متحدہ کی قرارداد 242 اور 338 اور دوسرے بین الاقوامی فیصلوں کی بنیاد پر شروع کیا تھا۔ اس کے باوجود امن کا عمل پوری گنجائش کی حد تک جاری نہیں ہو سکا ہے، اعتماد کا نیا ماحول اور امن معاہدے کے پہلے اور دوسرے برسوں میں کیے جانے والے اقدام بڑے ہمت افزا رہے ہیں اور کارروائیوں کو آسان کرنے اور تحفظات کو ختم کرنے کے کا تقاضا کرتے ہیں۔ جو کچھ باقی رہ گیا ہے، خصوصاً انتحالی اقتدار اور مغربی کنارے سے اسرائیلی انتحالی اور نئی آبادیوں کے بارے میں اقدامات، تاکہ انخلا مکمل ہو سکے، اس کو پورا کیا جانا چاہیے۔ یہ عمل ہماری سوسائٹی کو اپنے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر نو کرنے اور اپنی وراثت اور علم کے ذریعے ایک نئی دنیا بنانے کے مواقع فراہم کرے گا۔

میں اس سیاق و سباق میں امن کانفرنس کے کفیل روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکا سے امن کے عمل کی امداد میں بڑے قدم اٹھانے اور تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کا مطالبہ کرتا ہوں۔ میں ماروے اور مصر سے بھی مطالبہ کرتا ہوں، جو پہلے ممالک تھے جنہوں نے اوسلو، واشنگٹن اور قاہرہ سے شروع ہونے والے اسرائیلی/فلسطینی معاہدہ برائے امن کی نگہداشت کی تھی، تاکہ اس سے پیدا ہونے والے قابل قدر اقدام کی پیروی کی جائے۔ امن کے عمل، بہادریوں کے امن کے ساتھ اوسلو اور دوسرے ممالک کا بھی نام روشن رہے گا جنہوں نے کثیر پہلو گفت و شنید کی کفالت کی تھی۔

اس مرحلے پر میں دنیا کے تمام ممالک، بالخصوص عطیات دینے والے ممالک سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ جلد اپنے حصے کے عطیات کی ادائیگی کریں تاکہ فلسطینی عوام اپنے معاشیاتی اور سماجی مسائل پر قابو پانے کی کوشش کریں اور اپنے بنیادی ڈھانچوں کی تعمیر نو اور تجدید کر سکیں۔ ضروری مادی حالات کی غیر موجودگی میں امن کے عمل کو مستحکم نہیں کیا جاسکتا، اس لیے امن پھل پھول نہیں سکتا۔

میں امن کے عمل میں اپنے حصے داروں سے بھی مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ ضروری، مکمل اور مزویرائی (strategic) پیش بینی کی مدد سے امن کے عمل کو مضبوط بنائیں۔

صرف اعتماد ہی امن نہیں لاسکتا، مگر حقوق اور اعتماد کا اعتراف یہ کام کر سکتا ہے۔ حقوق کے اعتراف میں ناکامی نا انصافی کا احساس پیدا کرتی ہے، راکھ میں دبے ہوئے انگارے کو دبکتا رکھتی ہے، امن کو خوف کے سراپ کی طرف متحرک کرتی ہے اور پھٹنے پر تیار ہوتا ہے (use) کو دوبارہ روشن کرتی ہے۔

ہم امن کو ایک تاریخی مزویرائی حق انتخاب کے طور پر دیکھتے ہیں۔ داؤ پیچ کی طرح نہیں، جو نفع یا نقصان کے وقتی حسابات پر منتج ہو۔ امن کا عمل سیاسی عمل نہیں ہوتا، یہ ایک مرکب کارروائی ہوتا ہے جس میں قومی آگاہی، معاشیاتی، سائنسی اور تکنیکی ترقیات ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح جیسے تہذیبی، سماجی اور تحقیقی انضمام ضروری کردار ادا کرتے ہیں، جو امن کا نچوڑ ہوتے ہیں اور اس کے عمل کو مضبوط کرتے ہیں۔

میں ان سب پر نظر ثانی کرتا ہوں، جب میں امن کے اس مشکل راستے کو یاد کرتا ہوں ہم جس پر چلے ہیں، مگر ہم نے ایک مختصر فاصلہ ہی طے کیا ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو ہمت اور انتہائی جاں بازی سے تیار کرنا ہوگا، طویل فاصلے طے کرنے کے لیے، مکمل اور منصفانہ امن کے ٹھکانے کی طرف، تاکہ ہم امن کی تخلیقی قوت کے عمیق معنی کو سمجھ سکیں۔

جب ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم امن کے ساتھ اکٹھے رہیں گے تو ہمیں ایسی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے جو وقت اور سطحوں کی حدوں سے بلند ہو۔ مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی سے انفلا کے لیے وہاں بسائی جانے والی نئی ہستیوں کے سوال پر دل کی گہرائیوں سے غور کیا جانا چاہیے، اس لیے کہ یہ واقعات جغرافیائی اور سیاسی اتحاد کے مساکن پر ضرب لگاتے ہیں، اور مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی کے علاقوں کے درمیان رتل و رساں کی آزادی کے آڑے آتے ہیں اور تھاو کے ارتکازات کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ اس امن کی روح کے منافی ہیں اور اس کی طمانیت کو مجروح کرتے ہیں، ہم جس کو قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہوشلم کے سوال پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، جو مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں سب کی روحانی جنت کے مترادف ہے۔ یہ فلسطینیوں کا شہر ہے جہاں یہودیوں کے متبرک مقامات بھی ہیں جو اسلامی اور عیسائی متبرک مقامات جیسے احرام کے لائق ہیں، لہذا ہم کو اس حقیقت کو پوری دنیا کے لیے روحانی ہم آہنگی کے روشن مینار اور تہذیب اور مذہبی وراثت کے نقطہ شعاع کی طرح پیش کرنا چاہیے۔ اس سیاق و سباق میں، ایک اہم کام جو امن کے عمل کو آگے کی طرف بڑھاتا ہے اور ہم کو اپنے ذہنوں کی گہرائیوں میں بیٹھی ہوئی رکاوٹوں کو اٹھانے میں مدد کرتا ہے، وہ حوالات اور قید میں ڈالے ہوئے افراد کی رہائی کا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ان کو رہا کیا جائے تاکہ ان کی مائیں، ان کی بیویاں اور بچے ایک بار پھر مسکمانے لگیں۔

ہمیں اس نوزائیدہ بچے کو موسم سرما کی ہواؤں سے بچنا چاہیے، ہمیں اس کی پرورش دودھ اور شہد سے کرنی چاہیے، دودھ اور شہد کی مرزین سے، سالم، ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کی مرزین، مقدس مرزین سے، امن کی مرزین سے۔

میں آخر میں امن کے اپنے ساتھیوں جناب اسحاق رائین وزیر اعظم اسرائیل اور جناب شیماں ہیرے وزیر خارجہ اسرائیل کو نوبل امن انعام دیے جانے پر کو مبارکباد دینا چاہوں گا۔

میری مبارکباد وہ دوست ملک کے لیے، ماروے کے عوام کے لیے، اور ان کی کفالت کے لیے، ان کی گرم جوش مہماں نوازی کے لیے جو ان کی تاریخ اور ان کی شرافت پر دال ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، خواتین و حضرات، کہ ہم اپنے آپ کو دریافت کریں گے امن کے ماحول میں، نہ کہ جنگ اور مقابلے میں، اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ اس کے بدلے میں اسرائیلی بھی خود کو جنگ سے زیادہ امن میں دریافت کریں گے۔

اللہ اکبر!

امن ہو اس دھرتی پر!
اور نیک تمنا میں تمام انسانوں کے لیے!
شکریہ!

خطبہ — جناب شیمال بیرجے

جلالت مآب، ارکان مارویائی نوٹیل کمیٹی، وزیر اعظم جناب بروڈنڈ لائڈ (Brundland)، وزیر اعظم اسحاق رابین، صدر نشین عرفات، ارکان مارویائی حکومت اور ممتاز مہمانان!
میں شکر گزار ہوں نوٹیل انعام کمیٹی کا، اُن کے فیصلے کے لیے، جنہوں نے مجھے اس سال کے امن انعام پانے والوں میں نامزد کیا۔

میں اسحاق رابین کے ساتھ اس انعام کو حاصل کرنے پر مسرور ہوں، جن کے ساتھ میں نے یہ سب محنت کی ہے، اپنے ملک کے دفاع کے لیے، اور اب ہم ایک ساتھ اپنے علاقے کے امن کے لیے، محنت کر رہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یاسر عرفات کو انعام دیا جانا مناسب ہے۔ ان کا، تصادم کے راستے پر چلنے کے عزم کو ترک کر دینا اور مذاکرات پر راغب ہونے کے اُن کے ارادے نے ہمارے اور فلسطینی عوام کے درمیان امن کی راہ کھولی ہے۔

ہم جنگ جیتی کے پورے چھپے چھوڑ رہے ہیں اور ایک ساتھ امن کے راستے پر گامزن ہو رہے ہیں۔ یہ سب ماروے کے عوام کی عقل مندانہ سرپرستی اور نیک خواہشات کے باعث، نہیں اسلحہ میں شروع ہوا تھا۔
اپنے ایام شباب سے ہی میں نے سمجھا ہے کہ اگر کوئی اپنے سفر کا منصوبہ احتیاط سے تیار کرتا ہے تو اس کو اپنی منزل مقصود کے خواب دیکھنے اور دیکھتے رہنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ انسان کے محسوسات اس کی عمر کے مطابق ہوتے ہیں مگر اس کی عمر اس کے خواب کے مطابق ہوتی ہے۔ حیاتیات کے قوانین کا اطلاق امید افزا تمنا پر نہیں ہوا کرتا۔

میں سفید فام روس کے ایک چھوٹے سے یہودی قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ اب وہاں یہودیوں کے نام کی کوئی چیز نہیں رہی۔ بچپن ہی سے میں نے اپنی جائے پیدائش کو اپنی زندگی کے راستے کا ایک پڑاؤ سمجھا تھا۔ میرے خاندان کا اور میرا خواب تھا اسرائیل میں سکونت اور جافا (Jaffa) کی بندرگاہ کا سفر۔ اگر یہ خواب اور یہ سفر ہماری خواہش نہ ہوتا تو میں شعلوں کی نذر ہو گیا ہوتا، جیسا کہ ہمارے بہت سے لوگوں کا حشر ہوا تھا، جن میں زیادہ تر ہمارے اہل خاندان تھے۔

میں اسرائیل کے قلب میں واقع ایک زربق گاؤں کے اسکول میں داخل ہوا تھا۔ گاؤں اور اس کے میدان خاردار تار سے گھیرے گئے تھے جس نے اس کے سبزے کو اطراف کی دشمنیوں کی اداسی سے الگ کر دیا تھا۔ صبح کے وقت ہم اپنے کامروں پر درانٹیاں رکھے فصل کی کٹائی کے لیے نکل جاتے۔ شام کے وقت ہم اپنے کامروں پر رائفل مانگے گاؤں کے دفاع کے لیے نکلتے۔ یوم السبت کو ہم اپنے عرب ہمسایوں سے ملاقات کو جاتے۔ یوم السبت کو ہم ان سے امن کی باتیں کرتے، حالات کو بٹنے کے باقی دن، اندھیرے میں رائفل سے نکلتی ہوئی گولیوں کا تہاڑہ کرتے تھے۔

بن شیمون (Ben Shimon) یوتھ ویج سے میرے کامریڈ اور میں، Galilee زبیر میں واقع Kikbutz Alumot گئے۔ ہمارے پاس نہ گھر تھے نہ بجلی اور نہ ٹکے کا پانی۔ مگر ہمارے خواب بلند پرواز اور تصورات عالی شان تھے ایک نئی مساواتی عقیدے پر مبنی سوسائٹی کا قیام جو اپنے تمام ارکان کو عزت بخشنے۔ سب کچھ تو پورا نہیں ہوا، مگر سب کچھ بے کار بھی نہیں کیا۔ جو کچھ پورا ہوا اس نے ایک نیا پیش منظر تخلیق کر دیا تھا۔ جو کچھ پورا نہیں ہوا وہ اب بھی ہمارے دلوں میں موجود ہے۔

دو عشرے، وزارت دفاع میں مجھے ایک شخص کے ساتھ بہت قریب ہو کر کام کرنے کی سعادت ملی تھی، جو میرے خیال میں ہمارے زمانے کا سب سے عظیم یہودی تھا، اور اب بھی ہے۔ اسی سے میں نے سیکھا تھا کہ مستقبل کے تصور ہی کو حال کا ایجنڈا ترتیب دینا چاہیے؛ کہ انسان اپنے عقیدے کے بل بوتے پر ہی اپنے راستے کی مشکلات پر قابو پا سکتا ہے؛ انسان کا کام ہو سکتا ہے مگر اس کو ناامید بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ان سب سے بڑھ کر، میں نے سیکھا تھا کہ سب سے زیادہ پر عقل، غور و فکر، اخلاقی غور و فکر ہوتا ہے۔ اے بوڈین گوریان [اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم] کا انتقال ہو چکا ہے مگر ان کے تصورات اب بھی پھل پھول رہے ہیں؛ ایک نرالی قوم بننا اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن سے رہنا۔

ہم نے جو جنگیں لڑیں وہ ہم پر تھوپی گئی تھیں۔ اسرائیل کی دفاعی افواج کے طفل، ہم نے سب جنگیں جیت لیں، مگر وہ عظیم کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہمیں جس کی تمنا تھی؛ فتوحات کی ضرورت سے رہائی۔ ہم نے ثابت کر دیا کہ حملہ آور ضروری نہیں کہ فاتح ہوں، مگر ہم نے سیکھا کہ فاتح ضروری نہیں کہ امن حاصل کر لیں۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ جب جنگ انسانی مسائل کے حل کے لیے استعمال کی جاتی ہے تو وہ موت کے کرب میں مبتلا ہوتی ہے، گویا اس کی تدفین کا وقت آچکا ہوتا ہے۔ انجیل ہمیں سکھاتی ہے کہ تلوار گوشت کھاتی ہے مگر غذا فراہم نہیں کر سکتی۔ رائفلیں نہیں صوام جیتتے ہیں۔ اور یہ جنگ سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جنگیں جیتنے کے لیے، اور خاص کر انھیں ماننے کے لیے، ہمیں بہتر آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے، بہتر رائفلوں کی نہیں۔

ایک زمانہ تھا جب جنگیں ترجیح کی کمی کی صورت میں لڑی جاتی تھیں۔ آج امن ہے جو "no-choice"

کا پسندیدہ انتخاب ہے۔ سام کی وجوہات عمیق اور ناقابل تردید ہیں۔ مادی دولت اور سیاسی طاقت کے وسائل کے بھندہ بھری ہو چکے ہیں۔ اب جنگ کے ذریعے حاصل ہونے والے علاقے سے ان کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اب وہ دانش کی قوت کا نتیجہ ہوتی ہیں، جو تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔

اسرائیل نے، جو دراصل ایک ریگستانی ملک ہے، اپنے کھیتوں میں سائنس کے اخلاق سے کمال کی زراعتی پیداوار حاصل کر لی ہے، جب کہ نہ اس نے اپنے علاقے وسیع کیے ہیں اور نہ پانی کے بھندہ۔

سائنس کو سیکھا جاسکتا ہے، جیتا نہیں جاسکتا۔ ایسی فوج جو علم پر قبضہ کر سکے، ابھی تک تیار نہیں کی جاسکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قبضہ کرنے والی فوجیں اب ماضی کی چیز بن چکی ہیں۔ حتیٰ کہ دفاعی مقاصد کے لیے بھی کوئی ملک محض فوج پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ علاقائی سرحدیں ballistic missiles کے لیے رکاوٹ نہیں ہیں، اور کوئی بھی ہتھیار جوہری اختراعات کی ڈھل نہیں بن سکتا۔ لہذا، آج، ہٹا کی جنگ کو سیاسی دانش اور اخلاقی پیش بینی کی بنیاد پر ہونا چاہیے، فوجی طاقت پر مہر گز نہیں۔

سائنس، ٹکنالوجی اور اطلاعات — انہی ہوں یا بُری آفاق ہو چکی ہیں۔ یہ سر جھکڑ جاتی ہیں۔ ان کی دستیابی جلد کے رنگ اور مقام پیدا نش پر منحصر نہیں ہوتی۔ مغرب اور شرق، شمال اور جنوب کی تمیز جو ماضی میں اہمیت رکھتی تھی، ایک نئی تمیز کے مقابلے میں اب اپنی اہمیت کھو چکی ہیں: ان کے درمیان، جو امن کے نئے امکانات کے ساتھ آگے بڑھ جائیں یا جو کالی میں پیچھے رہ جائیں۔

ممالک، دنیا کو دوستوں اور دشمنوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ آج کے دشمن عالم گیر ہیں: افلاس، قحط، مذہبی بنیاد پرستی، بدعتی ہونی سحرانیت، نسلی دوائیں، جوہری ہتھیاروں کا پھیلاؤ، ماحولیاتی تباہی۔ یہ دشمن سب قوموں کے لیے خطرہ ہیں۔ اسی طرح جیسے سائنس اور اطلاعات تمام قوموں کے لیے امکانی دوست ہیں۔

مستند سفارت کاری اور حکمت عملی کا مقصد دشمنوں کی شناخت کرنا اور ان کا مقابلہ کرنا ہوا کرتا تھا۔ اب انہیں خطرات کی شناخت کرنی ہوتی ہے، مقامی ہوں یا عالمی، اور ان سے نیرو آزمایا ہونا پڑتا ہے، قبل اس کے کہ وہ آفت بن جائیں۔

جوں ہی ہم دشمنوں سے بھری دنیا کو چھوڑتے ہیں، ہم خطرات کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر مستقبل میں جنگیں چھڑیں تو غالباً وہ جنگیں ہوں گی احتیاج کی: کم زور کا احتیاج طاقت ور کے خلاف۔ طاقت ور کم زور پر قبضے کے لیے جنگ نہیں کرے گا۔

مشرق وسطیٰ کو اس فخر کو کبھی نہیں کھٹا چاہیے کہ وہ تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ مگر گہوارے میں رہتے ہوئے ہم ہمیشہ شیر خوار نہیں رہ سکتے۔

آج بھی، اپنے ایم شباب کی طرح، میں اپنے خواب لیے پھرتا ہوں۔ میں دو [خوابوں] کا ذکر کرنا چاہوں گا: یہودی موام کا مستقبل اور شرق وسطیٰ کا مستقبل۔

تاریخ میں، یہودیت خود یہودیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب رہی ہے۔ یہودی لوگ کم تھے مگر یروشلم کا جذبہ طاقت ور ہوا گیا۔ کروڑوں گھروں میں انجیل ملے گی۔ کتابوں کی کتاب کا اخلاقی جلال تاریخ کی گردشوں سے کبھی مغلوب نہیں ہوا ہے۔

مزید یہ کہ کئی بار تاریخ انجیل کے غیر فانی خیالات کے سامنے گھٹتی ہوئی ہے۔ اس پیغام نے ”واحد غیر مرقی“ خدا نے انسان کو خلق کیا، اپنی شبیہ کی صورت میں، پس آدمی کے لیے برتر اور کم تر جیسے درجات نہیں ہیں، اس آگاہی میں یہ بات مثال گردی ہے کہ نیکی دانش کا اعلیٰ ترین پیکر ہے، اور شاید حسن اور ہمت کا بھی۔ پچاسی کے پچندے تیر اور گیس خانے انسان کو نابود کر سکتے ہیں مگر انسانی قدروں کو، اس کی عظمت اور آزادی کو ختم نہیں کر سکتے۔

یہودی تاریخ انسانیت کے لیے ایک ہمت افزا سبق پیش کرتی ہے۔ تقریباً چار ہزار برس تک ایک چھوٹی سی قوم اپنے ساتھ ایک تنظیم پیغام لیے پھرتی رہی تھی۔ ابتدا میں اس قوم نے اپنی ہی زمین پر قیام کیا تھا، بعد میں در بدر ہو گئی۔ یہ قوم حالات کے مد و جزر سے مقابلہ کرتی رہی، بار بار اذیت کا شکار ہوئی، جلاوطن کی گئی اور کھلی گئی۔ پوری تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی نہ عظیم سلطنتوں میں، نہ نوآبادیات میں، نہ مقبوضہ علاقوں میں کسی قوم کی جس کی ایسے ایسے اور بد قسمتی کی طویل داستان ہو، جو زنجیروں کو توڑتی ہوئی ایک بار پھر سرفراز ہوئی ہو، آزاد ہوئی ہو اور اپنے بکھرے ہوئے اجزا کو سمیٹی ہوئی ایک نئی قومی مہم پر روانہ ہوئی ہو۔ جس نے شبہ کرنے والوں کو، وہ اندرونی ہوں یا بیرونی، شکست دی، اپنی زمین اور زبان کی تجدید کی، اپنی شناخت بحال کی اور کامیابیوں اور فضیلتوں کی بلندیوں پر سرفراز ہوئی۔

بنی نوع انسان کے لیے یہودی قوم کا پیغام ہے کہ اخلاق پر مبنی تصورات ہر قسم کی مصیبت پر فتح پا سکتے ہیں۔

ہماری صدی ختم کے قریب ہے۔ اب نئے تنازعات تہذیبی ضروریات پر ہوں گے علاقے پر نہیں۔ یہودی تہذیب صدیوں پرانی ہے، اب اس نے اپنی زمین میں جڑیں پیوست کر دی ہیں۔ تاریخ میں پہلی بار تقریباً پانچ ملین افراد ایرانی کو اپنی وطنی زبان کی طرح بولتے ہیں۔ یہ زیادہ بھی ہے اور کم بھی۔ زیادہ اس لیے کہ پہلے کبھی اتنی تعداد میں عبرانی زبان بولنے والے نہیں تھے، مگر کم اس لیے کہ پانچ ملین افراد پر مشتمل تہذیب مشکل سے مرایت کرنے اور کامنے والی عالمی ٹیلی وژن تہذیب کا سامنا کر سکتے گی۔

اسرائیل کے قیام کے پانچ عشروں میں ہم نے اپنے علاقائی مرکز کے دوبارہ قیام پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ مستقبل میں ہماری ساری کوششیں اپنے روحانی مرکز کو مستحکم بنانے پر ہوں گی۔ Judaism یا Jewishness — یقین، تاریخ، زبان اور زبان کا گھلاؤ ہے۔ یہودی ہونے کا مطلب ہے، ایسے لوگوں سے تعلق ہونا جو منفرد بھی ہیں اور عالمی بھی۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہمارے بچے، اپنے اجداد کی طرح، گزراں اور بناوٹی نہیں ہوں گے، بلکہ وہ انسانی جذبے کی کھتی میں تاریخی یہودی مل چلا تے رہیں گے؛

کہ اسرائیل صرف ہمارے عوام کا وطن ہی نہیں، ہماری وراثت کا مرکز ہوگا، کہ یہودی عوام دوسروں سے فیض یاب ہوں گے مگر ساتھ ہی ان کے لیے بھی روحانی فیوض کا منبع ہوں گے۔

مشرق وسطیٰ کے بیش تر بالغ افراد مفلس اور آفت رسیدہ ہیں۔ یہاں فوقیت کے نئے پیمانے کی ابتدا ضرورت ہے، جس میں جتھیا ر سب سے نچلے رینے پر اور ایک علاقائی منڈی کی معیشت سب سے اوپر ہو۔ اس علاقے کے زیادہ تر باہمی ساتھ فی صد سے زیادہ۔ انکارہ برس سے کم عمر کے ہیں۔ ان کو ایک نیا مستقبل پیش کیا جاسکتا ہے۔ اسرائیل نے اپنی تعلیم کو کمپیوٹرائز کر دیا ہے، اور اس کے بہترین نتائج نکلتے ہیں۔ تعلیم کو پورے مشرق وسطیٰ میں کمپیوٹرائز کیا جاسکتا ہے، تاکہ نوجوان محض ایک گریڈ سے دوسرے گریڈ تک نہیں، ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف بڑھیں۔

مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کا کردار ایک بڑی اور دست گیر علاقائی تجدید میں حصہ لینا ہونا چاہیے۔ مشرق وسطیٰ ہونا چاہیے بغیر جنگ کا، بغیر دشمن کا، بغیر ballistic missile کا اور بغیر جوہری بم کا۔ ایسا مشرق وسطیٰ جس میں، بغیر کسٹم کی اجازت اور بغیر پولیس لائسنسوں کے، آدمی، سامان اور خدمات کی آسان ترسیل ہو۔

ایسا مشرق وسطیٰ جس میں ہر عقیدے کا انسان اپنی زبان میں عبادت کر سکے۔ عربی، عبرانی، لاطینی یا جس زبان میں وہ چاہے۔ اور جس میں دعائیں بغیر سنسر کے، بغیر کسی روک ٹوک کے اور کسی گودکھ پہنچائے بغیر اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکیں۔

ایسا مشرق وسطیٰ جس میں قومیں معاشیاتی برادری کی جدوجہد کر سکیں اور تہذیبی تکثیریت کی ہمت افزائی کر سکیں۔

ایسا مشرق وسطیٰ جہاں نوجوان مرد اور عورتیں یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر سکیں۔
ایسا مشرق وسطیٰ جہاں معیار زندگی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے کسی طرح بھی کم نہ ہو۔
ایسا مشرق وسطیٰ جہاں پانی کی روائی خشکی بجھانے، فصل اگانے اور ریگستان کو گلزار بنانے کے کام آئے؛ جس میں بداندیش سرحدیں، موت، بھوک اور مایوسی نہ تقسیم کر سکیں۔
ایسا مشرق وسطیٰ جس میں مسابقت ہو مگر غلبہ نہ ہو۔

ایسا مشرق وسطیٰ جس میں لوگ ایک دوسرے کے میزبان ہوں، برہمنال نہ ہوں۔
ایسا مشرق وسطیٰ جو قتل کا میدان نہ ہو، بلکہ میدان تخلیق و روئیدگی ہو۔
ایسا مشرق وسطیٰ جو اپنی تاریخ کا عمیق احترام کرے اور اس میں نئے اور بلند رُتبہ یاب کا اضافہ کرے۔

ایسا مشرق وسطیٰ جو پوری دنیا کے لیے روحانیت اور تہذیب کی خدمات کا مرکز ہو۔
انعام کے لیے شکرگزاری کے ساتھ میں اس عمل سے وفاداری کا عہد کرتا ہوں۔ ہم اس دور میں پہنچ گئے

ہیں جس میں دنیا کے لیے بات چیت ہی واحد راستہ ہے۔

خطبہ — اسحاق رابین

جلالت تآب، عزت تآب، محترم ارکان مارویائی نوبیل کمیٹی، عزت تآب وزیر اعظم مادام گرو ہارلم برونڈلاند، وزراء ارکان پارلمان، اور منکر، ساقی انعام یافتگان، ممتاز مہمانان، خواتین و حضرات۔

ایسی عمر میں جب زیادہ تر نوجوان جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں، ریاضی کے رازوں اور انجیل کے معنوں کو سمجھانے کی، اس عمر میں جب محبت کی پہلی کئی بھلتی ہے، سلسلہ برس کی بالائی عمر میں، مجھے ایک رائفل تھما دی گئی تھی، تاکہ میں اپنا دفاع کر سکوں ساتھ ہی بد قسمتی سے خطرے کے پیش نظر کسی کو قتل بھی کر سکوں۔

یہ میرا خواب نہ تھا۔ میں انجینئر بننا چاہتا تھا۔ میں نے ایک زرعی اسکول میں تعلیم حاصل کی اور سوچا تھا کہ چلے بھٹے مشرق وسطیٰ میں آبیات کا انجینئر ایک اہم پیشہ ہوگا۔ میں آج بھی ایسا ہی سوچتا ہوں۔ باوجود اس کے مجھے ہندوق سنہالائی پڑی تھی۔

میں نے کئی عشرے فوجی خدمات انجام دیں۔ میری کمان میں نوجوان مرد اور عورتیں جو زندہ رہنا چاہتے تھے محبت کرنا چاہتے تھے موت کی آغوش میں چلے گئے۔ میری کمان میں انہوں نے دشمنوں کے فراو مارے، جو ہم کو مارنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

خواتین و حضرات!

اپنی موجودہ حیثیت میں مجھے اسرائیل کی ریاست پر، اور حال ہی میں مشرق وسطیٰ کے دوسرے علاقوں پر بھی، پرہیز کرنے کے بہت مواقع ہیں۔ طیارے پر سے نظر آنے والے مناظر دم بخود کر دینے والے ہوتے ہیں، کبرے نیلے رنگ کی جھیلیں، کبرے بزرگ کے میدان، بھورے رنگ کے ریگستان، پتھر لیے پہاڑ، اور دیہاتوں میں کچھڑے سفیدی پھرے اور سرخ رنگ کی چھتوں والے مکانات۔

قبرستان۔ جہاں تک نظر جائے قبریں ہی قبریں۔

مشرق وسطیٰ کے ہمارے علاقے میں سیکڑوں قبرستان ہیں ہمارے وطن اسرائیل میں۔ مصر میں، شام میں، لبنان میں اور عراق میں بھی۔ طیارے کی کمزکی سے، ہزاروں فٹ اوپر سے، بے شمار لوح قبور خاموش نظر آ رہی ہیں۔ نگران کے مالوں کی آوازیں، مشرق وسطیٰ سے پوری دنیا تک، بھڑوں میں پھیلی رہی ہیں۔

یہاں کھڑا ہوا، میں اپنے پیاروں، اور دشمنوں کو بھی اپنا سلام پیش کرتا ہوں۔ میں تمام ملکوں کے جان گنوائے والوں کو بھی اپنا سلام پیش کرتا ہوں: ان کے اہل خانہ کو بھی جنہوں نے موت کے جاں کا دھم اٹھائے ہیں: ان معذوروں کو بھی جن کے دشمنوں کے تشنات کبھی مندرل نہیں ہوں گے۔ آج کی رات میں ان میں

سے ہر ایک کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں، اس لیے کہ یہ اہم انعام ان کا ہے، تنہا ان ہی کا ہے۔
خواتین و حضرات!

میں ایک نو جوان آدمی ہوں جو ان برسوں میں بڑا ہوا ہے۔ میں نے اپنی عمر کے بہتر برسوں میں جو یادیں جمع کی ہیں، ان میں سے جنہیں میں اپنے آخری وقت تک زیادہ یاد کروں گا وہ یہ خاموشیاں ہیں۔
کبریٰ خاموشی لمحے بھر بعد کی، اور خوف ناک خاموشی لمحے بھر پہلے کی۔

میں نے ایک فوجی کی طرح، ایک کماں دار کی حیثیت میں، درجنوں احکامات جاری کیے اور میگزینوں کا ردوائیوں کا حکم دیا تھا۔ اور فتح کی خوشیوں اور موت کے ظم کے ساتھ، میں اس لمحے کو ہمیشہ یاد رکھوں گا جب میں نے ایک کارروائی شروع کرنے کا حکم دیا تھا! اس سکوت کو، جب تجربہ کار افسران یا کابینہ کے وزرا اپنی نشستوں سے آہستہ سے اٹھتے ہیں، ان کی واپسی کے منظر کو، دروازہ بند ہونے کی آواز اور پھر خاموشی، میں جس میں اکیلا رہ گیا تھا۔

وہ لمحہ ہوتا ہے جس کو آپ گرفت میں لے لیتے ہیں، کہ آپ کے ایک فیصلے کی نتیجے میں جو آپ نے ابھی کیا ہے، لوگ موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ لوگ، میری اپنی قوم کے لوگ، کسی اور قوم کے لوگ۔ اور ان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

اس وقت، وہ نہیں بھی رہے ہوتے ہیں اور وہ بھی رہے ہوتے ہیں، منصوبے بن رہے ہوتے ہیں، اور محبت کے خواب بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں، ایک باغ لگانے یا ایک مکان بنانے کے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں، اور ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ زمین پر یہ ان کے آخری لمحات ہیں۔ ان میں سے کسی کی قسمت میں موت لکھی ہوئی ہے؟ کسی کی تصویر کل کے اخبار میں ایک سیاہ حاشیے میں شائع ہوگی؟ جلد ہی، کسی کی ماں رو رہی ہوگی؟ نقصان کے بوجھ سے کسی کی دنیا ریزہ ریزہ ہوگی؟

ایک سابقہ فوجی آدمی کی طرح، میں بھی ہمیشہ یاد رکھوں گا لمحے بھر پہلے کی خاموشی کو! اس سکوت کو جب گھڑی کی سوئیاں آگے کی طرف چکراتی معلوم ہوتی ہیں، جب وقت ختم ہو رہا ہوتا ہے، اور ایک گھنٹے بعد، ایک منٹ بعد، شعلے بھڑکنے لگیں گے۔

اس مہربان تہاؤ کے لمحے سے پہلے، جب انگلی لہلی کو دباتی ہے، اس سے پہلے، جب فلیٹ جلنا شروع کرتا ہے، اس لمحے کی خوف ناک خاموشی میں، جب سوچنے کو کچھ وقت باقی ہوتا ہے، تنہا، کیا یہ واقعی ضروری ہوتا ہے کہ عمل کیا جائے؟ کیا اور کوئی صورت نہیں ہوتی؟ کوئی اور راستہ نہیں ہوتا؟
اور حکم دیا جاتا ہے، اور شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔

”خدا بکھڑگا رہی واپسوں [ننھے ننھے بچوں] پر ترس کھاتا ہے“ یہودا امیچائی (Yehudah Amichai) نے لکھا تھا، جو اس شب ہمارے ساتھ ہیں۔

”بچوں پر ہے رحم خدا کا“

لڑکوں پر اسکول کے ہتھ کم
بالکل رحم نہیں کرتا وہ ان کے بزرگوں پر
جن کو اپنے کیے کے بدلے
کبھی کبھی چاروں پیروں پر چلنا پڑتا ہے
جلاقی ریت کے رستے ہو کر
جا پہنچیں گے زخموں کے اسٹیشن پر
بہتے خون کے ساتھ“

عشرے گزر گئے تھے، خدا نے مشرق وسطیٰ میں نہ منصف بچوں پر ترس کھایا ہے، نہ اسکول کے لڑکوں پر، اور نہ
ان کے بزرگوں پر۔ کئی نسلوں سے مشرق وسطیٰ پر رحم نہیں ہوا ہے۔
خواتین و حضرات!

میں ایک نوجوان تھا جو پوری طرح بڑا ہو چکا ہے۔ اور وہ تمام یادیں جو میں نے بہتر برس میں جمع کی
تھیں، میں ان میں امیدیں تلاش کر رہا ہوں۔

ہمارے لوگوں نے انھیں زندگی دینے کے لیے چنا ہے۔ کتنا خوف ناک ہے یہ کہنا کہ ان کی زندگیاں
ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ آج کی شب ان کی نظریں ہم پر لگی ہوئی تھیں اور ان کے دل ہم سے پوچھ رہے
تھے: ان مردوں اور عورتوں کو دیے ہوئے اختیار کس طرح استعمال کیے جا رہے ہیں؟ وہ کیا فیصلہ کریں گے؟
کیا ہم کل کسی صبح میں آنکھ کھولیں گے؟ کیا وہ دن امن کا ہوگا؟ جنگ کا؟ قہقہوں کا یا آنکھوں کا؟

ایک بچہ پیدا ہوتا ہے از حد غیر جمہوری دنیا میں۔ وہ ماں اور باپ کا انتخاب نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی جنس کا،
اپنی جلد کے رنگ کا، اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا یا اپنے وطن کا انتخاب نہیں کر سکتا۔ وہ حویلی میں پیدا ہوا
کسی باڑے کے بندے میں۔ ایک جاہل حکومت میں رہتا ہے یا جمہوری حکومت میں، وہ اس کا انتخاب نہیں
کر سکتا۔ جس لمحے وہ مضامین پڑھتا ہے اس دنیا میں آتا ہے، اس کی قسمت اس کی قوم کے رہنماؤں کے
ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس کو سکون کی زندگی نصیب ہوگی یا مایوسی کی، تحفظ کی یا خوف
کی۔ اس کی تقدیر ہمارے سپرد کی جاتی ہے سلجھانے کے لیے ملکوں کے صدور کو اور وزرائے اعظم کو، وہ جمہوری
ہوں یا کچھ اور۔

خواتین و حضرات!

جس طرح دو انگلیوں کے نشانات ایک جیسے نہیں ہوتے، اسی طرح دو لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اور
ہر ملک کے اپنے قوانین اور تہذیب، روایات اور رہنما ہوتے ہیں۔ مگر بس ایک ہی آفاقی پیغام ہوتا ہے جو
پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے، ایک ہی احساس ہے جو مشترک ہو سکتا ہے، نسلوں میں، جو ایک
دوسرے سے نہیں ملتیں، تہذیبوں میں جو ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتی ہیں۔

یہ وہی پیغام ہے جو یہودی قوم کے پاس ہزاروں برس سے موجود ہے، پیغام جو کتابوں کی کتاب میں ملتا ہے، جو میرے لوگوں نے تمام مہذب لوگوں کو وراثت میں دیا ہے، "Vnishmartem me'od" "Deuteronomy Inatshoteichem" کے الفاظ میں "لہذا، اپنے لیے اچھا سوچو" یا عصری معنوں میں یہ زندگی کی تقدیس کا پیغام ہے۔

قوموں کے رہنماؤں کو اپنے لوگوں کو ضروری اچانچے فراہم کرنے چاہئیں۔ اگر کرو گے تو انھیں زندگی کا لطف اٹھانے کا موقع فراہم کرو گے؛ اظہار کی اور نقل و حرکت کی آزادی کا؛ غذا اور مکان کا؛ اور سب سے اہم شے۔ زندگی کا۔ ایک آدمی اپنے حقوق کا لطف نہیں اٹھا سکتا اگر وہ زندہ لوگوں میں نہیں رہتا۔ اس لیے ہر ملک کو اپنے قومی مزاج کے کلیدی عناصر کی حفاظت کرنی چاہیے؛ اپنے باشندوں کی زندگی کی۔

ان زندگیوں کا دفاع کرنے کے لیے ہم اپنے باشندوں کو فوج میں بھرتی کرتے ہیں۔ اور اپنے ان باشندوں کی زندگی کے دفاع کے لیے جو فوج میں بھرتی ہوتے ہیں ہم سرمایہ خرچ کرتے ہیں، جہازوں پر، ٹینکوں پر، بکتر بند گاڑیوں پر، کانگریٹ کے مورچوں پر۔ ان سب کے باوجود ہم اپنے باشندوں اور فوجیوں کی زندگیوں کی حفاظت میں ناکام رہتے ہیں۔ دنیا کے ہر کونے میں فوجی قبرستان ایک خاموش ثبوت ہوتے ہیں ناکامی کا اپنے رہنماؤں کی، انسانی زندگی کے احترام کی۔

انسانی زندگی کے احترام کا ایک ہی بنیادی طریقہ ہے۔ نہ بکتر بندی، نہ ٹینک، نہ جہاز، نہ کانگریٹ کے مورچے۔

واحد بنیادی حل ہے امن۔

خواہن و حضرات!

فوجی چشے کو ایک خاص paradox لاحق ہوتا ہے۔ ہم اپنے فوجیوں میں سب سے اچھے اور سب سے بہادر کو فوج میں لیتے ہیں۔ ہم انھیں ساز و سامان مہیا کرتے ہیں جس پر غلطی رقم خرچ ہوتی ہے۔ ہم ان کو اس دن کے لیے کھین تر بیت دیتے ہیں جب ان کو اپنا فرض ادا کرنا ہوتا ہے۔ اور ہم ان سے بہترین کی توقع کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم دل سوز دعا نہیں کرتے ہیں کہ وہ دن کبھی نہ آئے کہ جہاز کبھی نہ اڑیں، ٹینک آگے نہ بڑھیں، کہ سپاہی کبھی حملہ نہ کریں، جس کے لیے ان کو اچھی طرح تربیت دی گئی تھی۔

خدا سے دعا ہے کہ احترام زندگی کی وجہ سے یہ سب کچھ نہ ہو۔

تاریخ، من حیث الکل، اور خصوصاً جدید تاریخ، بڑی تباہ کن مراحل سے گزری ہے، جب قومی رہنماؤں نے، فاسد نظریات، سرکش فسطائیت اور شیطانی تاسیت کے نام پر اپنے باشندوں کو توپوں کی خوداک بنایا تھا۔ قطار بنائے قتل گاہوں کی جانب جاتے ہوئے بچوں اور جدید شمشانوں کے دروازوں پر کھڑی عورتوں کی تصویروں کو ہماری نسل، اور آنے والی نسلوں کے سر رہنما کی آنکھیں کے سامنے لہرائی رہنا چاہیے۔ ان کو ہر صاحب اقتدار کے لیے حبیہ ہونا چاہیے۔

تقریباً حکومت، جس نے آدی اور احرام زندگی کو دنیا کے منظر کے مرکز میں نہیں رکھا، وہ تباہ ہوئی اور موجود نہیں رہی۔ آپ ہمارے زمانے میں یہ سب خود دیکھ سکتے ہیں۔

مگر، یہ مکمل تصویر نہیں۔ احرام زندگی کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمیں اس کو خطرے میں بھی ڈالنا چاہیے۔ کبھی کبھی اپنے باشندوں کے دفاع کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ ان کی زندگی اور ان کی خود مختاری کے لیے لڑا جائے۔ جمہوری ریاست کا یہ عقیدہ ہوتا ہے۔

خواتین و حضرات!

اسرائیل کی ریاست میں، آج میں جہاں سے آیا ہوں، اسرائیلی افواج میں، مجھے جس کی کمان کرنے کی سعادت ملی تھی، ہم نے ہمیشہ احرام زندگی کو اعلیٰ ترین قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہم نے اسی وقت جنگ کی ہے جب کوئی خوف ناک تھوار ہم کو قتل کرنے کے ورپے ہوئی ہے۔

اسرائیل کی تاریخ، اور اسرائیلی دفاعی افواج کی سرگزشت ان فوجیوں کے بڑاؤں و افعات سے بھری پڑی ہیں جنہوں نے خود کو قربان کر دیا تھا، جو اپنے زخمی ساتھیوں کو بچانے کی کوشش میں اپنی جان سے گئے تھے، جنہوں نے دشمن کے علاقے میں معصوم لوگوں کو بچانے کی کوشش میں اپنی جان دے دی تھی۔

آنے والے دنوں میں ایک مخصوص کمیشن اسرائیلی دفاعی افواج کے سپاہیوں کے لیے ایک ضابطہ کردار (Code of Conduct) مکمل کر لے گا۔ انسانی زندگی کے لیے جو ضابطہ ہوگا، وہ درج ذیل ہے:

”اس کی اعلیٰ ترین اہمیت کے اعتراف میں، سپاہی ہر ممکن طریقے سے، اپنی یا دوسروں کی جان کو اسی وقت خطرے میں ڈالے گا جب اپنے مشن کی تکمیل کے لیے شدید ضرورت ہوگی۔“

اسرائیلی دفاعی افواج کی نظر میں احرام زندگی ان کے عمل سے مترشح ہوگا، ان کے غور شدہ منصوبوں سے، ان کی دانش مندانہ تربیت اور اس کی مدد انہ بجا آوری سے، پیشہ وارانہ انداز میں مناسب درجے کے خطرات سے نمٹنے اور احتیاط کرنے سے، اور اپنے ہدف کی حصول میں سامنے کے اثرات کو کم کرنے کی مسلسل کوشش سے۔“

کئی برس آگے تک جنگ ختم ہو چکی ہو جب بھی۔ جب ہماری زمین پر امن قائم ہو جائے گا۔ یہ الفاظ دشمنی کا ستون بن کر ہمارے ٹیمپ کے سامنے ہوں گے، راہ دکھانے والی روشنی کی طرح۔ اور ہمیں اس پر فخر ہے۔

خواتین و حضرات!

ہم امن کی تعمیر کی کوشش میں ہیں۔ اس کا غنیمت کے معمار اور انجینئر اس وقت بھی، جب ہم یہاں جمع ہو رہے ہیں، تہ پر تہ اینٹ پر اینٹ، کڑی پر کڑی، امن کی تعمیر میں مشغول ہیں۔ کام مشکل بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ غلطیاں پورے ڈھانچے کو زمین بوس اور ہم پر آفت نازل کر سکتی ہیں۔

لہذا، سفاک دہشت گردی اور دیوانے منصوبوں کی حامل دشمنی کے باوجود بھی ہم اس کام کی بخوبی تکمیل

پر مستعد ہیں۔

ہم معمم ارادوں اور تجمل کے ساتھ امن کی تلاش جاری رکھیں گے۔

ہم ہاتھ نہیں کھینچیں گے۔

ہم ہمت نہیں ہاریں گے۔

امن ہمارے دشمنوں پر فاتح ہوگا، اس لیے کہ اس کا مقابل ہم سب کے لیے بھیاں بن جائے گا۔

اور ہم ہی غالب ہوں گے۔

ہم ضرور غالب ہوں گے اس لیے کہ ہم امن کی تعمیر کو اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے ایک عظیم نعمت

سمجھتے ہیں۔ ہم اس کو اپنے تمام، ہر طرف کے، ہمسایوں کے لیے اور اس کا عظیم میں شریک ساتھیوں۔

ریاست ہائے متحدہ، روس، ناروے اور پوری بنی نوع انسانیت کے لیے بھی ایک نعمت گردانتے ہیں۔

ہم صبح سویرے اٹھتے ہیں، مختلف لوگ بن کر۔ امن، اچانک! ہم اپنے بچوں کی آنکھوں میں بھی

امید کے دیے جلتے دیکھ رہے ہیں۔ ہم روشنی دیکھ رہے ہیں اپنے سپاہیوں کے چہروں پر، گلیوں میں، بسوں

میں، کھیتوں میں۔

ہمیں ان کو مایوس نہیں کرنا چاہیے۔

ہم ان کو مایوس نہیں کریں گے۔

آج، اوسلو کی اس چھوٹی سی شہر نشین پر کھڑا ہوا میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں مبلغ ہوں اسرائیلی کی نسلوں کا،

اسرائیلی کے چڑواہوں کا، اسی طرح جیسے شاہ داؤد چڑواہے تھے، گلے بانوں اور انجیر کے درختوں کو چاک

لگانے والوں کا، جس طرح پیغمبر Amos تھے اداوں کے باغیوں کا، جیسے کہ پیغمبر Jeremiah تھے اور ان

لوگوں کا جو پیغمبر یونس کی طرح سمندر میں چلے گئے تھے۔

میں سفیر ہوں شاعروں کا اور ان لوگوں کا جنہوں نے، پیغمبر Isaiah کی طرح جنگ کے اختتام کے

ثواب دیکھے تھے۔

میں سفیر ہوں یہودیوں کی اولاد کا، جیسے ابراہیم اسٹائن اور باروخ ایبی نورا (Baruch

Spinoza)، جیسے Maimonides، سگموند فرائیڈ (Sigmund Freud) اور فرانتز کاٹکا (Franz Kafka)۔

اور میں سفیر ہوں ان لاکھوں کا جو Holocaust میں تھک ہو گئے، جن میں بلاشبہ کئی اسٹائن اور

فرائیڈ رہے ہوں گے جو ہمارے ہاتھ سے جاتے رہے، شمشانوں کے شعلوں کی زد میں انسانیت کا۔

میں یہاں یروشلم کا سفیر ہوں، جس کے دروازوں کے محاصرے کے دوران میں نے جنگ کی تھی؛

یروشلم، جو ہمیشہ سے رہا ہے، آج بھی ہے، اور ہمیشہ رہے گا، اسرائیلی کی ریاست کا ابدی دار الحکومت اور ول

بن کر یہودیوں کا، جو دن میں تین بار اس کی جانب رخ کر کے عبادت کرتے ہیں۔

اور میں سفیر ہوں ان بچوں کا جنہوں نے امن کی منانہ کشتی کی ہے؛ اور سینٹ پیٹرز برگ اور اولیس البابا

سے ترک وطن کرنے والوں کا۔

میں اس مقام پر محض آنے والی نسلوں کے لیے کھڑا ہوں، تاکہ ہم سب جمعے کے قائل ہوں، جو آج آپ نے ہمیں عنایت کیا ہے۔

میں اس مقام پر سفیر کے طور پر ایٹا وہ ہوں اپنے ان ہمسایوں کا جو کبھی ہمارے دشمن تھے۔ میں یہاں ایٹا وہ ہوں ان لوگوں کی بلند پرواز امیدوں کا سفیر جن کر جنھوں نے تاریخ کے دیے ہوئے کو پر داشت کیا ہے، پھر بھی، صرف یہودی عوام ہی کے نہیں، پوری انسانیت کے تذکروں کے صفحات پر اپنا نام ثبت کیا ہے۔ میرے ساتھ اس مقام پر موجود ہیں پانچ ملین باشندے اسرائیل کے، یہودی اور عرب، ڈروڈ، Circassian — امن کے لیے دھڑکتے ہوئے پانچ ملین دل اور پانچ ملین آنکھیں جو امن کی توقعات کے ساتھ ہم پر اپنی نظریں جمائے ہوئے ہیں۔

خواتین و حضرات!

میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، سب سے پہلے، اسرائیل کی ریاست کے ان باشندوں کا، ان کی نسلوں کا، اور سیاسی ترغیبات کا؛ امن کے لیے جن کی قربانیاں اور ان تھک جھد و جدوجہد میں امن کے ہدف سے قریب لے آئی ہیں۔

میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اپنے شرکا — مصریوں، اردنیوں، فلسطینیوں اور Palestinian Liberation Organization کے صدر نشین یا سرعرات کا، ہم جن کے ساتھ امن کے ال انعام میں شریک ہیں، جنھوں نے امن کا راستہ اختیار کیا ہے، جو مشرق وسطیٰ کے تذکرے میں امن کا ایک نیا صفحہ تحریر کر رہے ہیں۔ میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اسرائیل کی حکومت کے ارکان کا اور سب سے زیادہ اپنے ساتھی، جناب شیمان ہیرے کا، جن کی توانائی اور امن کی لگن ہم سب کے لیے مثال ہے۔ میں اپنے اہل خاندان کا، ان کی مدد کے لیے، شکر گزار ہوں۔

اور میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، بلاشبہ، نوبیل کمیٹی کے ارکان کا اور بہادر مارویائی عوام کا، اس درخشاں اعزاز کے لیے جو انھوں نے ہم کو عطا کیا ہے۔

خواتین و حضرات!

مجھے اس تقریر کو ایک روایتی یہودی دعا کے ساتھ ختم کرنے کی اجازت دیجیے جو میرے عوام پڑھتے رہے ہیں، اچھے اور بُرے دنوں میں، اُس وقت سے جس کا حساب ممکن نہیں۔

”خدا اپنے بندوں کو طاقت عطا فرمائے گا، خدا اپنے عوام پر خیر کرے گا ہم سب پر۔“
امن کے ساتھ۔“

نیلسن منڈیلا

ایف ڈی کلرک

اعلانِ تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، خدائے مہربان!

مارویائی نوبل کمیٹی نے نسلی امتیاز رکھنے والی حکومت کے پُر امن اتمام اور ایک نئے جمہوری جنوبی افریقا کی بنیاد رکھنے کے کوششوں کے لیے نیلسن آرمنڈیلا اور فریڈرک ویلم ڈی کلرک کو 1993 کا امن کا نوبل انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم آج ان انعام یافتگان کو بہ طیب خاطر خوش آمدید کہتے ہیں۔

ایسا تیسری بار ہو رہا ہے کہ نوبل کمیٹی نے انسانی حقوق کی وکالت کرنے والوں کو انعام سے نوازا ہے، جنہوں نے جنوبی افریقا میں نسلی امتیاز پر مبنی حکومت کے خلاف جدوجہد میں عملی طور پر حصہ لیا ہے۔ جنوبی افریقا پر اتنی توجہ کیوں دی گئی ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام اور بھڑکی حکومت کے زوال کے بعد نسلی امتیاز کے نظام کو مکمل طور پر مسترد کر دیا گیا تھا۔ ایک عام رویہ کے تحت اداروں کے ذریعے نسلی امتیاز پر مبنی روک ٹوک کو ہٹایا اور قدیم نوآبادیاتی نظام مسما کر کیا جا رہا تھا۔ مگر مبینہ اس وقت جب یہ رویہ عام ہو گئی تھی، جنوبی افریقا نے مخالف رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ 1948 کے بعد سے [جنوبی افریقا میں] قانون سازی اور اداروں کی تشکیل کے ذریعے یا قاعدہ ایک ایسا وحشی نظام مسلط کیا جا رہا تھا جس میں نسلی امتیاز کو مرکزیت حاصل تھی۔ اور اس طرح بھڑکی نسل کی بنا پر جبر کو اختیار کی علامت بنا دیا گیا تھا۔ نسلی امتیاز کے نظام نے نسل پرستی کو ایک چہرہ عطا کر دیا تھا۔ جب تقریباً ایک بیڑھی قومی افریقین نیشنل کانگریس کے رہنما ابرٹ لوٹولی کو 1960 کا نوبل امن انعام دیا گیا تھا تو اس نے اداروں کے ذریعے انسانی برابری کی بیخ کنی

کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ایک عیسائی ہونے کے باعث، لوٹوئی کے مذہبی عقیدے میں انسانی برابری جائز نہیں تھی۔

اس نے کہا تھا:

”ایک عیسائی اور وطن پرست ہونے کے باعث میں ان حرکات کا خاموش تماشا بنی نہیں رہ سکتا تھا، جن کے ذریعے زندگی کے تقریباً ہر طبقے میں، انسان میں موجود خدائی عنصر کی بے قدری کی جا رہی تھی یا اس کی حدود متعین کی جا رہی تھیں جن سے پرے، اپنی سیاہ جلد کے باعث انسان کو اپنے خالق کی خدمت کی کوشش کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے حالات میں جب ملکی قانون انسان کو رنگ دار بنانے پر خدا پر معترض ہو، ایسی چیز تھی جسے، بحیثیت ایک عیسائی کے، میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔“

لوٹوئی کو 1860 کا امن انعام دے کر، نارویائی کمیٹی نے ایک شروعات کی تھی، کچھ معنوں میں، جو ایک نئی پالیسی بن گئی۔ اس کے بعد سے انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کرنا امن انعام دیے جانے کے لیے ایک اہم کسوٹی بن گیا، جیسا پہلے نہیں ہوتا تھا۔ یہ کسوٹی نزاعی بھی رہی ہے، اس لیے کہ انسانی حقوق کے لیے کام کرنا بہت سے علاقوں میں تنازعے کا باعث ہوا ہے۔ اور ایک سطح پر، کچھ وقت کے لیے یہ صحیح ثابت بھی ہوا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ کمیٹی کی اس پالیسی کو دنیا بھر میں اور مختلف تہذیبوں میں سراہا بھی گیا ہے۔

اگر پائیدار امن کے حصول کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہو، تو اس عمل میں ایک دوسرے کے کردار کا احترام، دیانت اور عظمت کا پاس ہونا اہم ترین ضرورت ہوگی۔ پائیدار امن کے لیے ایمانوئل کانت (Immanuel Kant) کے دو سو برس قبل لکھے ہوئے مشہور مضمون کا بھی یہی اہم نکتہ تھا۔ اس نے امن کو انصاف کے تصور سے نسمی کیا تھا جو اس کے سیاسی فلسفے کا بنیادی پتھر تھا۔ مرد و جنگ کے درمیان، خیال پرستی کی بنیاد پر کیے جانے والے جبر کے باعث، جو اس زمانے کی آمرانہ حکومتوں کے ہاتھوں روا رکھا جا رہا تھا، یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ امن تشدد کے میزان پر انحصار کرتا ہے، اور یہ بھی کہ زبردستی اور دباؤ سے استحکام پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی خیالات نے ان لوگوں کی ہمت خزائی کی ہوگی جو انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کے ذریعے امن کے حصول پر معترض ہوتے تھے۔ آج ہم پر واضح ہو رہا ہے کہ جبر کی شدت کی بنیاد پر کھڑی ہونے والے حکومتیں نازک ترین ہوتی ہیں۔ نہ وہ آزادی فراہم کرتی ہیں نہ استحکام دیتی ہیں۔ انسان کے بنیادی حقوق میں رختہ ڈالنے اور انسانی رُحے اور عزت نفس کی فائسہ تیغ کٹنے سے ہی اختلافات بڑھتے ہیں۔ ایسی حکومتیں جلد یا بدیر اپنے آپ کو ایسے گرد و باد میں پاتی ہیں جس میں جنگ، بد امنی اور خون ریزی کا سامنا ہوتا ہے۔

جنوبی افریقا بہت عرصے سے ایسے شیطانی چکر کے زرخیز میں الجھا ہوا ہے۔ پھر بھی، 1990 کی ابتدا میں حکومت نے اپنے نئے صدر فریڈرک ویلم ڈی کلرک کی حکمرانی میں اپنی پالیسیاں الٹ دی ہیں۔ تقریباً اٹھائیس برس کی قید کے بعد نیشنل مینڈیٹ کو غیر مشروط رہائی دے دی گئی ہے اور نسلی امتیاز ختم کرنا حکومت کی

پالیسی کا حصہ بن گیا ہے۔ کس درجے تک حالات کی یہ تبدیلیاں اخلاقی بہتری لاتی ہیں، سر شخص کو خود اس پر غور کرنا چاہیے۔ جنوبی افریقا ایک عرصے سے اس شیطانی چکر کے زنجیر میں الجھا ہوا ہے اور یہ صرف وقت ہی بتائے گا، آیا یہ شروعات تاثیر سے ہوتی ہیں یا نہیں۔

مذاکرات کی شروعات میں افریقی نیشنل کانگریس فطری شراکت دار تھی، جس کے لیڈر نیلسن مینڈیلا قید خانے سے سیدھے مذاکرات کی میز پر پہنچائے گئے تھے۔ وہ ابتدا ہی سے نسلی امتیاز کے مخالف تھے۔ پہلے تو وہ ان لوگوں میں شامل تھے جو گاندھی کے اہلکار کے طریقہ کار سے متاثر تھے۔ مگر 1960 میں شارپ ویل میں ہونے والے قتل عام سے ماحول بہت سنگین ہو گیا۔ 1962 میں مینڈیلا کو قید کر دیا گیا اور وہ انٹیکس برس تک محبوس رہے۔ 1990 میں رہائی کے چند ماہ بعد وہ نیشنل فاؤنڈیشن اور ایلی وینڈل فاؤنڈیشن کی شراکت میں اوسلو میں منعقد کی جانے والی "مفرت کانفرنس" میں شرکت کے لیے آئے تو ہمیں ان کو خوش آمدید کہنے کا موقع ملا تھا اس کانفرنس میں مختلف گروہوں کے سربراہ اور وہ مردوں اور عورتوں نے شرکت کی تھی۔ اس ماحول میں نیلسن مینڈیلا کی شخصیت ابھر کر سامنے آئی۔ انہوں نے اخلاقی اختیار کے ساتھ اور ایسے تعمیری لہجے میں خطاب کیا جس نے منہ و جان پر کبریاں اٹھ چھوڑا۔ یہ سب کچھ میں اپنے ذاتی یادوں کے خزانے سے کھنچا کر نکال رہا ہوں، مگر میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ احساسات صرف میرے ہی نہیں تھے۔

بہت سے لوگوں کو نیلسن مینڈیلا کے قید سے رہا ہونے کے بعد ان کے بظاہر تلخ انداز کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے خود بھی کہا تھا اگر ان کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہوتا تو شاید وہ اپنے ذہن میں تلخ خیالات ہی کو پالتے رہتے۔ مگر پس اندیشی کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ان تمام لوگوں کو جو انصاف کے لیے ایسی بڑی قربانیاں دے چکے ہوتے ہیں، اس بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ وہ سب رائے کاں نہ ہوں، اور ایسے ہی خیالات ان کے دلوں سے تلخیوں کو دور کر دیتے ہیں۔

دو قطعی مختلف انداز نظر کے حامل، انعام پانے والوں میں، ایک نے جاہلوں کی طرف سے اور دوسرے نے مجبوروں کی طرف سے، اس شیطانی چکر کو توڑنے کے لیے آگے قدم بڑھائے ہیں، ان کا ملک جس کے زنجیر میں تھا ان شروعات کو دنیا دیکھ رہی ہے، شروعات جو دونوں افراد کی بلند ذاتی راست بازی اور سیاسی دلیری سے عبارت ہیں۔ دونوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ماضی کے کبرے زخموں کو نہیں کریدیں گے۔ اس عمل کے باعث وہ دوسرے بہت سے علاقوں کے تنازعات میں الجھے ہوئے رہنماؤں سے بہت مختلف ہیں، حالاں کہ جنوبی افریقا کے رزم شاید دوسری جگہوں کے زخموں سے کہیں زیادہ کبرے ہیں۔ مینڈیلا اور ڈی کلرک نے مفاہمت کرنے، نہ کہ متبادل تلاش کرنے، کا فیصلہ کیا ہے جس میں کہیں زیادہ تمکیناں بڑھتیں اور مزید خونیں تنازعات پیدا ہوتے۔ مفاہمت کی پالیسی کا ایک اور زاویہ ہوتا ہے جس میں کچھ لو کچھ دو کے ذریعے کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ اس بنیاد پر ہونے والا سیاسی عمل مفاہمت بلند سیاسی خوبی کو منعکس کرتا ہے۔ مگر کامیابی حاصل کرنے کے لیے تمام گروہوں کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔

جنوبی افریقا میں نہایت محترم اور مدبرانہ سیاست کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اور یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ 1990 میں میٹریڈا کی رہائی کے بعد یہ ہوا ہے۔ اداروں کے ذریعے نسلی امتیاز پر چلنے والی حکومت گرائی جا چکی ہے، ایک جمہوری آئین نافذ کر دیا گیا ہے اور ایک وسیع الہیاد عارضی ایگزیکٹو بورڈ کاؤنسل قائم کر دی گئی ہے۔ مکمل جمہوری انتخابات کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے۔ اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس ساری پیش رفت کا سہرا جس میں سے ایک جمہوری جنوبی افریقا ابھر رہا ہے، ان دونوں انعام یافتگان کے سر بندھتا ہے۔ پھر بھی ہمیں علم ہے کہ یہ عمل ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ خلیں کے خطرات بھی موجود ہیں۔ ایسے گروہ بھی ہیں جو مذاکرات میں شریک نہیں تھے، یا جنہوں نے ان مذاکرات سے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ جنوبی افریقا آج بھی ایک ایسا سماج ہے جو تنہوں، خوف اور تشدد سے عبارت ہے۔ مذاکرات کے دوران مارے جانے والوں کی گنتی دس ہزاروں تک پہنچی ہے۔ شیطانی چکر فیصلہ کن حد تک توڑا نہیں جاسکا ہے۔ لہذا آج وہاں دو مبارزت طلب میلانات ہیں: تنازعہ اور مفاہمت۔ اس مسلسل عمل میں یہ ضروری ہے کہ تمام گروہ نیک نیتی سے اپنا کردار ادا کرنے کا مظاہرہ کریں تاکہ تشدد کا خاتمہ ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان گروہوں کو مفاہمت اور کچھ لو کچھ دے کے مسلسل عمل میں عملی طور پر شریک کیا جائے۔ اس کے لیے ناقابلِ شبہ تدریجی اشد ضرورت ہے۔

تو کیا ہمیں اس وقت تک انعام دینے کے لیے انتظار کرنا چاہیے تھا جب تک کہ مفاہمت کی پالیسی کی کامیابی میں حتمی شروعات نہ ہو جاتی؟ کچھ لوگ تو ایسا ہی کہیں گے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی حتمی شروعات کی بات کرنا عقل مندی ہوگی؟ امن اور مفاہمت کے لیے ان تھک کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پچھلے پڑ جانے سے نئے تنازعے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس لیے نوٹیل انعام دیتے ہوئے نارویائی نوٹیل کمیٹی اس عمل میں کسی نہ کسی طرح ضرور شریک رہے گی۔ نوٹیل نے اپنی وصیت میں لکھا تھا کہ انعام اس فرد یا ان افراد کو دیا جائے گا جنہوں نے پچھلے برس کے دوران امن کے لیے سب سے زیادہ کام کیا ہو۔ نوٹیل کمیٹی کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ نیشنل میٹریڈا اور ولیم ڈی کلرک نے امن اور مفاہمت کے حیرت انگیز نتائج کے حصول میں شان دار خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے امن کو ایک موقع فراہم کیا ہے۔ اب امن غالب ہوتا ہے یا نہیں یہ صرف وقت ہی بتائے گا۔

افریقہ نوٹیل کی یہ نیت بھی تھی کہ انعام دینے والا ادارہ بھی امن کے حصول کے عمل میں مثبت کردار ادا کرے۔ لہذا نوٹیل کمیٹی امید کرتی ہے کہ اس برس کا انعام جنوبی افریقا میں مکمل جمہوریت اور امن کے حصول میں ہونے والی کوششوں میں، خواہ وہ کتنا چھوٹا سا حصہ ہی کیوں نہ ہو مثبت کردار ضرور ادا کرے گا۔

نوٹیل امن انعام دینا نارویائی نوٹیل کمیٹی کا استحقاق ہے۔ ہم ان لوگوں کے لیے عمیق تحسین اور احترام کے جذبے کے تحت ایسا کرتے ہیں جو خوف اور تشدد سے مملو دنیا میں اپنی انسانیت کو قائم رکھتے ہیں، جو مساکین کو حل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں، اور جو اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نیشنل

مینڈیلا اور ولیم ڈی کلرک کی مفاہمتی پالیسیاں نہ صرف جنوبی افریقا کے لیے امید کے چراغ روشن کرتی ہیں بلکہ یہ تمام دنیا کے لیے ایک نشان دار نمونہ پیش کرتی ہیں کہ شیطانی چٹھروں، خوف اور تشدد کے ماحول سے کس طرح باہر نکلا جائے۔

Francis Sejersted، صدر نشین، ماریائی نوٹیل کمیٹی کی زبانی

خطبہ نیلسن منڈیلا

جلالت مآب شاہ مارے، عزت مآب، ماریائی نوٹیل کمیٹی کے محترم ارکان! عزت مآب وزیر اعظم، مادام گرو ہارلم برونڈلاند (Madame Gro Harlem Brundtland)، وزراء ارکان پارلیمان اور سفراء رفیع انعام یا فنگان، مسٹر ایف ڈی کلرک، ممتاز مہمانان گرامی، خواتین و حضرات! میں ماریائی نوٹیل کمیٹی کے ارکان کی خدمت میں اپنا دلی شکرانہ پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ہم کو نوٹیل کا امن انعام دے کر سرفراز کیا اور ہمارے رتبے کو رفعت عطا کی ہے۔ میں اس موقع پر اپنے ہم وطن عوام اور انعام میں شریک ساتھی کو اور ریاست کے صدر ایف ڈی کلرک کو اس بلند اعزاز کے دیے جانے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ہم دونوں مل کر اپنے دو ممتاز جنوبی افریقیوں، آں جہانی چیف البرٹ لوتولی (Albert Lutuli) اور محترم عالی آرج بپ دیمند لوتو (Desmond Tutu) کے اعزاز میں شریک ہو رہے ہیں جنھوں نے نسلی امتیاز کے شیطانی نظام کے خلاف بنیادی امداد، ہم پہنچائی اور آپ نے جن کو نوٹیل انعام عطا کر کے ویسا ہی خراج پیش کیا ہے وہ جس کے حق دار تھے۔ یہ ہماری جیا کی تونہ ہوگی اگر ہم اپنے پیش روؤں میں ممتاز نوٹیل امن انعام یافتہ آں جہانی مکرم مارٹن لوتھر کنگ جونیئر (Martin Luther King Jr) کو بھی شامل کر لیں۔ انھوں نے بھی اسی نوعیت کے ایک بڑے معاملے کے متعلقہ عمل میں، آج جنوبی افریقا جس سے نبرد آزما ہے، اپنا حصہ ڈالا تھا اور موت سے ہم آغوش ہو گئے تھے۔ ہم یہاں جنگ اور امن، تشدد اور عدم تشدد، نسلی منافرت اور احترام آدمیت، جبر اور مجبوری، آزادی اور انسانی حقوق، افلاس اور طلب سے آزادی کی دوئی کو چیلنج کر رہے ہیں۔ اس مقام پر ہماری حیثیت اپنے ملک کے اُن لاکھوں افراد کے نمائندوں سے کچھ زیادہ نہیں جنھوں نے ہمت کر کے اس سماجی نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جنگ، تشدد، نسلی منافرت، ظلم و ستم، جبر و تعدی اور عوام کا افلاس جس کا نچوڑ ہے۔ میں یہاں نمائندگی کر رہا ہوں کہ ارض کے ان کروڑوں افراد کی، نسلی عدم امتیاز کی تحریکوں، حکومتوں اور

اداروں کی جنموں نے ہمارا ہاتھ بٹایا ہے، ملک کی حیثیت میں جنوبی افریقا اور اس کے عوام سے لڑنے کے لیے نہیں، بلکہ ایک غیر انسانی نظام کی مخالفت کے لیے، انسانیت کے خلاف نسلی امتیاز کے جرم کو ختم کرنے کے لیے۔ یہ بے شمار افراد، ہمارے ملک کے اندر بھی اور باہر بھی، جن میں روحانی شرافت تھی، بغیر کسی ذاتی منفعت کی طلب کے، استبداد اور نا انصافی کی راہ میں ڈٹ گئے۔ انھیں احساس ہو گیا تھا کہ کسی ایک فرد کو زخم لگانا سب کو زخمی کرنے کے مترادف ہے اور وہ انصاف اور عام انسانی انصاف کے دفاع کے لیے متحد ہو کر کمر بستہ ہو گئے۔ ان کی ہمت اور ثابت قدمی ہی تھی جس کی بنا پر ہم آج تاریخ کا تعین بھی کر سکتے ہیں جب تمام انسانیت متحد ہو کر ہماری صدی میں ہونے والی انسانیت کی تاریخ کی سب سے نمایاں فتح کا جشن منائے گی۔ جب وہ لمحہ آئے گا، ہم سب، ایک ساتھ مل کر نسلی منافرت پر، نسلی امتیاز پر اور اقلیت کی حکومت پر باہمی فتح کی خوشی منائیں گے۔

وہ فتح بالآخر پانچ سو برس قدیم خریقی نوآبادی کی تاریخ کو دفن کر دے گی، پرستگلی سلطنت کے قیام کے ساتھ جس کی ابتدا ہوئی تھی۔

اس طرح تاریخ میں ایک بڑا قدم اٹھایا جائے گا، دنیا کے عوام کی خدمت کے لیے اور نسلی منافرت سے جنگ کرنے کے لیے، وہ جہاں بھی ہو اور جس جگہ بھی ہو۔

خریقی براعظم کے بالکل جنوبی سرے پر ان لوگوں کے نام پر ایک قیمتی یادگار تعمیر کی جا رہی ہے جنہیں تمام انسانیت کے نام پر دکھاٹھانے پڑے تھے جب آزادی کے لیے، امن کے لیے، انسانی وقار کے لیے اور انسان کی تکمیل کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

اس محلے کو سگوں میں نہیں ٹولا جاسکتا۔ نہ ہی ان کا حساب کیا جاسکتا ہے ان تمام کمیاب دھاتوں اور قیمتی پتھروں کی قیمت سے، جو افریقا کی دھرتی کے بطن میں پوشیدہ ہیں، جن پر ہم اپنی پیش رونسلوں کے نقوش قدم پر چلتے پھرتے رہتے ہیں۔

اس کو ناپا جانا چاہیے خوشیوں اور بہبود سے ان بچوں کی، ان باشندوں کی جو کبھی خطرے میں تھے کسی سوراخ میں اور ہمارے پیش بہا خزانوں میں۔

بچوں کو بالآخر جنوبی افریقا کے کھلے میدانوں میں کھیلنا چاہیے، جنہیں نہ بھوک کا درد ستاتا ہو نہ بیماریاں ان کو پامال کرتی ہوں، نہ انھیں لاعلمی کے، ایذا رسانی کے اور بد سلوکی کا زیا نے لگتے ہوں، اور نہ انھیں ایسے کام کرنے پڑتے ہوں جن کے بوجھان کے معصوم و نازک جسم اٹھانے کے قابل نہ ہوں۔

اس جہیل القدر اجتماع کے سامنے، ہم نئے جنوبی افریقا کی جانب سے عہد کرتے ہیں کہ ہم World Declaration on the Survival, Protection and Development of Children کے اصولوں اور مقاصد پر پوری تن دہی سے عمل کریں گے۔

جس محلے کے بارے میں ہم نے باتیں کی ہیں، ان کو ان بچوں کے والدین کی خوشیوں سے بھی ناپا جانا

چاہئے، جو زمین پر چل سکیں بلا کسی رہزنی کے خوف کے، سیاسی یا مالی منفعت کے لیے مارے جانے کے خوف کے، یا ان کی طرف نفرت سے تھوکے جانے کے خوف کے، اس لیے کروہ بھکاری ہیں۔

انہیں بھی مایوسی کے اس گراں بوجھ سے نجات ملنی چاہیے جو وہ اپنے دلوں میں لیے پھرتے ہیں، جو بھوک کی پیداوار ہیں، جو بے گھر بھی ہیں اور بے روزگار بھی۔

اس تحفے کی قیمت ہمارے ملک کے عوام کی خوشیوں اور بہبود سے ماپی جانی چاہیے جنہوں نے دکھ اٹھائے ہیں اور جو ایسی تمام غیر انسانی دیواریں مسمار کر دیں گے جو انہیں آپس میں تقسیم کرتی ہیں۔

ہمارے عظیم عوام کو عظمت انسانیت کے ان تمام اعمال کو فراموش کرنا ہوگا جن کے ذریعے کچھ کو آقا اور باقی ماندہ کو غلام بنا دیا گیا تھا، اور ہر ایک کو دوسرے کا شکار کرنے والوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا، جن کی بقا دوسرے کی تباہی پر منحصر تھی۔

ہمارے مشترکہ انعام کو اس مسرت بخش امن سے ماپا جانا چاہیے جس کو فتح نصیب ہوگی، اس لیے کہ مشترکہ انسانیت کو، جو سفید اور سیاہ کو ایک نسل میں پیوست کرتی ہے، ہم میں سے ہر ایک سے کہنا ہوگا کہ ہم سب جنت کے بامیوں کی طرح اکٹھے رہیں گے۔

لہذا ہم زندہ رہیں گے، اس لیے کہ ہم ایسا سماج تخلیق کریں گے جو اس کا اعتراف کرے گا کہ تمام لوگ برابری کی بنیاد پر پیدا ہوئے ہیں اور جس میں ہر فرد بشر ایک ہی معیار کے طرز زندگی کا، آزادی، خوش حالی، انسانی حقوق اور منصفانہ حاکمیت کا حق دار ہوگا۔

ایسے سماج کو پھر کبھی اس بات کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے کہ اس میں ضمیر کے قیدی ہوں، کہ اس میں انسان کے بنیادی حق پامال کیے جاسکیں۔

نہ اس بات کی اجازت ہوگی کہ ایک بار پھر کبھی حق حکمرانی غصب کرنے والے، جو اپنے رقیب مقاصد کے حصول کے لیے عوام سے انکا حق حاکمیت سلب کرنے کی تاک میں رہتے ہیں، پر امن تبدیلیوں کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا کر سکیں۔

اس سلسلے میں ہم ان افراد سے اپیل کرتے ہیں جو ہر ماہ حکمران ہیں، کروہ نو تیل امن انعام یافتہ ہماری رفیق آجگ ماں ملو کی کورہا کریں اور ہمارے عوام کے مفاد میں ان سے اور ان لوگوں سے سنجیدہ مذاکرات کریں وہ جن کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ہم دعا گو ہیں کروہ جن کے پاس طاقت ہے، بغیر کسی تاخیر کے ایسا کریں گے اور ان [مادام ملو کی] کو موقع دیں گے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں اور عزائم کے ساتھ اپنے ملک اور اپنے عوام، سب کی بھائی کے لیے کام کر سکیں۔

اپنے ملک کی مایہ ناز اور ٹھوکریں کھاتی ہوئی سیاست سے قطع نظر، میں اس موقع پر مایوسی کو تیل سینی کے ساتھ مل کر اپنے شریک انعام مسٹر ایف ڈی ڈیوڈی کلرک کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یہ بڑی دلیری کی بات تھی کہ انھوں نے نسلی امتیاز کے ذریعے ہمارے ملک کے ساتھ کیے جانے والے ہولناک سلوک کا اعتراف کیا ہے۔

انھوں نے اپنی دانش مندانہ دور اندیشی کے باعث قبول کر لیا تھا کہ جنوبی افریقا کے عوام کے ساتھ براہدگی کی سطح پر مذاکرات ہونے چاہئیں، یہ طے کرنے کے لیے کہ دونوں اپنے مستقبل کے لیے کیا فیصلے کرتے ہیں۔

مگر ہمارے ملک میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو غلطی سے اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی ان سماجی اور علاقائی روایات سے چپے رہ کر ہی امن و انصاف کے حصول میں شریک ہو سکتے ہیں جنھوں نے ہمیں سوائے تباہی اور کچھ نہیں دیا ہے۔

ہماری خواہش ہے کہ ان لوگوں کو بھی عقل سلیم عطا ہو اور وہ سمجھ سکیں کہ تاریخ کو مسترد نہیں کیا جاسکتا، کہ ناپسندیدہ اور کمرہ ماضی کو دوبارہ رائج کر کے نیا سماج تخلیق نہیں کیا جاسکتا، خواہ اسے کتنے ہی دل بھانے والے انداز میں کیوں نہ پیش کیا جائے۔

ہم اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ملک کی بہت ساری جمہوری تحریکوں کو، Patriotic Front کے ارکان سمیت، خراج عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں جنھیں نے ہمارے ملک کو ایسی جمہوری تبدیلی کے قریب لانے میں خود بھی مرکزی کردار کیا ہے، جیسی کہ آج موجود ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ان تحریکوں کے بہت سے نمائندے جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ہمارے وطنی ڈھانچوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں، ہمارے ساتھ اسلو تشریف لائے ہیں۔ انھیں بھی رسم انعام نوازی میں شریک سمجھنا چاہیے جو نوبیل امن انعام عطا کرتا ہے۔

ہمیں قوی امید ہے کہ اپنی تخلیقاتی جہد کے دوران جنوبی افریقائی دنیا کی اس کائناتِ اصغر کی طرح ہوگا جو خود اپنی تخلیق میں کوشاں ہے۔

اس کائناتِ اصغر کو ایک جمہوری دنیا ہونا چاہیے جس میں احرامِ انسانیت ہو، جو افلاس کی ہولناکی، بھوک سے، محرومیوں سے اور جہالت سے پاک ہو، جس میں فتنہ جنگیوں اور بیرونی جارحیت کا عذاب نہ ہو، جو لاکھوں افراد کو ہجرتوں کی صعوبتوں پر مجبور نہ کریں۔

جنوبی افریقا کی ریاست اور براعظم افریقا کا جنوبی منظم جس عمل میں مصروف ہے، ہم سب کو اٹھارے اور ترقیب دے رہا ہے کہ ہم ان ضوفائی لہروں کو سر کریں اور اس علاقے کو ایک ایسی زندہ مثال بنائیں، پوری دنیا کے صاحبانِ ضمیر جس کی خواہش کریں۔

ہمارے نزدیک نوبیل امن کا یہ انعام ان معاملات کی ستائش کے لیے نہیں ہے جو گزر چکے ہیں اور جاری ہیں۔

ہم ایسی آوازیں سن رہے ہیں جو کہتی ہیں کہ یہ ایک انجیل ہے ان کائناتی لبوں کی طرف سے، جنھوں

نے ہمیشہ اور ہر جگہ پر نسلی امتیاز کے نظام کا اختتام چاہا ہے۔

وہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی باقی ماندہ زندگی کو اپنے ملک کے بے نظیر، دکھ بھرے تجربات کے بیان کرنے میں صرف کریں، کہ عملی طور پر انسانی زندگی کے لیے جمہوریت، انصاف، امن، نسلی عدم امتیاز، جنسی برتری، ہر فرد کے لیے خوش حالی، ایک صحت مند ماحول، برادری اور عوام سے یک جہتی ہو۔

اس ایٹل سے متاثر ہو کر، جو منزلت آپ نے ہمیں عطا کی ہے، ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم بھی جس قدر ممکن ہو، اپنی دنیا کی تجدید کریں گے تاکہ مستقبل میں کوئی بھی ”کروڑ ارض کا بد نصیب“ نہ کہلائے۔

ہم اپنی آئندہ نسلوں کو یہ کہنے کا موقع نہ فراہم کریں کہ بے اشتیاقی، بکسیت یا خود غرضی نے ہم کو انسانیت کے آدھش پر پورے اترنے میں ناکام کیا ہے نونٹل امن انعام جس کو سمونے ہوئے ہے۔

کاش ہم سب کی کوششیں یہ ثابت کر دیں کہ مارٹن لوتھر کنگ جونیئر بالکل صحیح تھا، جب اس نے کہا تھا کہ اب انسانیت کو ظالمانہ طریقے سے نسلی منافرت اور جنگ کی اندھیری راتوں کا قیدی نہیں بنایا جاسکتا ہے جن میں ستارے بھی نہ جھمکاتے ہوں۔

کاش ہم سب کی کوششیں یہ ثابت کر دیں کہ وہ [مارٹن لوتھر کنگ جونیئر] محض خواب دیکھنے والا نہیں تھا جب وہ کہہ رہا تھا کہ حقیقی بھائی چارے اور امن کا حسن سونے، چاندی اور جواہرات سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ وہ صبح کبھی تو آئے گی!

شکریہ!

خطبہ - ایف ڈی کلرک

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات!

ابھی صدی کو ختم ہونے اور نئے ہزارے کے طلوع میں لگ بھگ چھ برس باقی ہیں۔ تین برس بعد افریقہ نونٹل کی صد سالہ برسی ہوگی اور آٹھ برس بعد اس انعام کی شروعات کو ہو جائیں گے۔

اس دوران ہم نے نئی نوع انسان کی تاریخ کی طویل اور خوف ناک جنگیں دیکھی ہیں۔ آج جب ہم یہ الفاظ ادا کر رہے ہیں:

مخصوص یونین پر کوئلے برس رہے ہیں؛

جارجیا، آرمینیا اور آذربائیجان میں تنازعہ ہے؛

افریقہ میں تباہ کن جنگیں اور تنازعات سلگ رہے ہیں۔

انگولا میں، صومالیہ میں اور حال ہی میں برونڈی میں، اور میرے اپنے ملک میں، باوجود ہماری اتنی

ساری کامیابیوں کے، سیاسی تشدد کے باعث اس برس کی ابتدا سے اب تک تین ہزار سے زیادہ جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔

جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے، بے گناہ بالخصوص بچے ہی ان تنازعات میں متاثر ہوتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ تنازعات کی روک تھام اور نئے آفاق کی تخلیق، دنیا کے بچوں کا ہم پر فرض ہے۔ وہ سب اپنی زندگی میں امن اور شریفانہ مواقع کے حق دار ہیں۔ میں اپنے اس خطاب کو ان سب کے اور UNICEF کے نام معنون کرنا چاہوں گا جو ان کے حالات کو سدھارنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔

ہم کو یہ سوال کرنا چاہیے کہ ہم آفاقی امن کے حصول کی منزل کی جانب بڑھ بھی رہے یا نہیں۔ یا پھر ہم تاریخ کے چلتے ہوئے بچے پر بے مقصد اور بے لحاظ تباہی کی دوڑ میں الجھے ہوئے ہیں۔ کیا 1901 میں شروع کیے جانے والے امن کے انعامات کا جلوس بنی نوع انسان کو امن کی طرف لے جا رہا ہے؟

اسی عظیم اعزاز پر غور کرتے ہوئے جو ہم کو امن کے انعام کے نام سے عطا کیا گیا ہے، ہمیں تمام تر انکسار کے ساتھ یہ سارے سوالات کرنے چاہئیں۔ ساتھ ہی ہمیں امن کی ماہیت پر بھی غور کرنا چاہیے:

سب سے بڑا امن، میرے خیال میں، وہ امن ہے جو ہم خداوند لا ینزال پر اپنے یقین سے اور اپنے خالق کے ساتھ استوار رشتے سے حاصل کرتے ہیں۔ بحران ہم کو عاجز کر سکتے ہیں، اور معرکے ہمارے اطراف قیامت ڈھا سکتے ہیں لیکن اگر ہمیں ان سے حاصل ہونے والے یقین پر بھروسہ ہو تو ہم امن سے لطف اندوز ہوں گے اس امن سے جو ہر قسم کے ادراک سے بھی بلند ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی کا مذہبی یقین لا دینی معنوں میں بھی امن کی جانب بڑھتے ہوئے قدم میں دخل سکتا ہے۔ میں اس وقت، دنیا میں امن اور انسانی رشتوں پر اس کے اثرات کے صرف چند تناظر پیش کر سکوں گا:

امن کا مطلب صرف تنازعات کی غیر موجودگی نہیں ہوتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سی جاہلانہ سوسائٹیوں میں تنازعات مفقود رہے ہیں۔ تنازعات کی کمی کی جڑیں ہم آہنگی، نیک نیتی، خیر خواہی یا گروہوں کے درمیان رضامندی ہی میں نہیں ہوتیں، بلکہ اکثر خوف میں، لاعلمی میں اور نااطاقی میں ملتی ہیں۔

لہذا، انصاف یا رضامندی کے بغیر حقیقی امن حاصل نہیں ہو سکتا۔

نہ ہی امن کا مطلب محض مٹاؤ ہوتا ہے۔

بنی نوع انسان کے معاملات کبھی نہ ختم ہونے والی سیلابی کیفیت میں رہتے ہیں۔ افراد یا گروہوں یا سیاسی جماعتوں یا ملکوں کے مابین رشتے ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ نئے معاملات ہمیشہ ابھرتے رہتے ہیں اور ان پر مستقلاً نگاہ رکھنی ہوتی ہے۔ تناؤ پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کو کم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بنیاد پرست جنگجو اقلیتیں امن کو تباہ کر دیتے ہیں اور ان کو قابو میں رکھنا ہوتا ہے۔

لہذا بغیر مسلسل کوششوں کے، منصوبہ بندی اور مشق کے، اصل امن قائم نہیں ہو سکتا۔

تنازعات کی غیر موجودگی یا ٹھہراؤ کی کیفیت کا مطلب امن نہیں ہوتا۔

امن ایک ذہنی کیفیت ہوتا ہے۔

ایسی کیفیت جس میں ممالک، سماج، جماعتیں اور افراد اتفاق رائے اور مصالحتوں سے، نہ کہ دھمکیوں، دباؤ اور تشدد سے، اپنے اختلافات ختم کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔

امن ایک ڈھانچا بھی ہوتا ہے۔

ایسا ڈھانچا جس کے اپنے ضوابط، قوانین، معاہدے اور رسم و رواج ہوتے ہیں، جو ممالک، سماج، جماعتوں اور افراد کے درمیان ناگزیر مفاد پرست جھگڑوں کے حل کے طریقے مہیا کرتے ہیں۔ وہ بھی ڈھانچا ہی ہوتا ہے جس میں اجتماعی، حرکی اور اقتصادی ترقیات کے اصولوں پر عمل کیا جاتا ہے۔

امن کی جستجو میں ہم نے ہمیشہ خود سے یہ سوال کیا ہے کہ ہمیں ایسے حالات پیدا کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے جس میں امن فروغ پانچ سکے کی حالت کی نشان دہی آسان ہوتی ہے جو اس کے خلاف عمل پیرا ہوتے ہیں، اور ان کو جڑ سے اکھاڑنا ضروری ہوتا ہے۔

جس ماحول میں مفلسی اور محرومیوں کا رائج ہو وہ امن کے لیے کبھی سازگار نہیں ہوتا۔

جہاں تعلیم کی اور آگاہی کی کمی ہو وہاں امن فروغ نہیں پاتا۔

جبر و تشدد، نا انصافی اور استحصال امن کے لیے زہر قاتل ہوتے ہیں۔

گروہوں کے درمیان خوف اور رشک اور غیر حقیقت پسندانہ توقعات کی بے لگامی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوتی ہے۔

نسلی درجہ بندی اور مذہبی تعصب امن کے قاتل دشمن ہوتے ہیں۔

بچوں کے انسانی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ایسی ہی کیفیات کی نمایاں صفات کا حامل ہوتا ہے، اس لیے یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی چاہیے کہ تاریخ کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ سے جنگ اور تشدد کی زلادینے والی کہانی کے مترادف ہوتا ہے۔

نگرائس میں خوشامیدی کی بھی وجوہات ہوتی ہیں۔

دنیا بھر میں امن کی متلاشی طاقتیں سرگرم عمل ہیں۔ ان میں معاشی ترقی بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ آزاد تجارتی منڈی کی پیدا کردہ معاشی ترقی سماجی اصلاح پر منتج ہو رہی ہے جو مفلسی کے اخراج اور دولت کی فراہمی میں معاون ہوتی ہے، جس سے مفلس کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

یہ عالمی آبادی کی تعلیم اور معلومات میں ایسے اضافے گزر رہی ہے ماضی میں جس کی مثال نہیں ملتی۔

معاشرتی اور معاشی رشتوں میں تہذیبیاں لا رہی ہے اور فرسودہ سیاسی نظام پر غیر معمولی دباؤ ڈال رہی ہے، خواہ وہ دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے۔

اور معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ جمہوریت بھی آگے بڑھتی ہے۔ جہاں بھی معاشی بالیدگی ہوگی، وہیں

جمہوری ادارے اور نمائندگیاں ترقی پائیں گی ادارے جو ہمیشہ امن کے لیے ایک ڈھانچہ فراہم کرتے ہیں۔ یہ امر بہت معنی خیز ہے کہ خالص اور عالم گیر جمہوریتوں کے درمیان کسی دور میں بھی جنگ نہیں ہوتی ہے۔ [جب کہ] مطلق العنان اور آمرانہ ریاستوں کے درمیان بے شمار جنگیں ہوتی ہیں۔ جمہوریتوں اور آمریتوں کے درمیان جنگیں ہوتی ہیں بیش تر، جمہوری اقدار یا حملوں کے دفاع کے لیے۔ مگر ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس میں آزاد اور جمہوری قوتوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہوں۔ اس کی وجوہات صاف ظاہر ہیں:

تعلیم یافتہ اور باخبر لوگوں کو جنگ کے لیے اکسانا مشکل ہوتا ہے اگر ان کے بنیادی حقوق کا خاطر خواہ تحفظ کیا جاتا ہو۔

ان لوگوں کو جنہیں ایک مخصوص حد تک مادی آسائشیں ہوں، ایسے غیر ضروری تنازعات میں الجھنا بہت مشکل ہوتا ہے جن سے ان کا رومن سہن خطرے میں پڑ جائے۔

ایسے عوام کو آمرانی سے جنگ ہوتی کی طرف راغب نہیں جاسکتا جس میں وہ توپوں کی غذا بن جائیں۔ ذرائع ابلاغ، بالخصوص ٹیلی ویژن، نے جنگوں اور تنازعات پر سے ان کی فریب نظر نشان کی قلبی اتار دی ہے جو پہلے ان پر چڑھی ہوتی تھی۔

ایسی طاقتوں کے ذریعے اچھی ترقی ہو رہی ہے۔ عالمی سطح پر جمہوریت کے لیے موجودہ آئینی ترقی، معاشی ترقی پر جس کا دارو مدار ہو امن کے لیے نعمت سے کم نہیں۔

ہمارے ملک کی قلب مابہیت اور ہمارے عوام کی بیداری کی بھی ایسی ہی طاقتیں، جن میں اور طاقتیں بھی شامل ہیں، ذمے دار ہیں۔

جنوبی افریقا میں ہونے والی بنیادی اصلاحات، بیرونی دباؤ سے نہیں بلکہ ان معاشرتی تبدیلیوں سے ہوتی ہیں جنہوں نے معاشی ترقی میں نمو پیدا کی ہے۔

جس دباؤ نے نسلی امتیاز کو مسما کر دیا ہے، وہ دراصل ہتھیار کی جدوجہد سے نہیں، بلکہ امن سے محبت کرنے والے کروڑوں لوگوں کی شہروں کی طرف رجعت اور معاشی ترقی میں شمولیت سے پیدا ہوا تھا۔

ہمارے ملک میں ہونے والی ناگزیر مگر بد رس تبدیلیاں بنیادی طور پر متاثر کرنے والی سیاسی تقریریں سے یا اعلانات سے نہیں، بلکہ ان حقائق کی بنا پر ہوتی تھیں جو کروڑوں لوگوں کے گھروں میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے پہنچائے تھے۔

بھر بھی، ایک بہت اہم عنصر جس کی آگے بڑھنے کی قوت نے جنوبی افریقا کو ایک نئی قسمت سے آشنا کیا، وہ تھا قلوب کی بنیادی تبدیلی۔ اور یہ تبدیلی دونوں جانب ہوتی تھی جو کئی عشروں سے تنازعات میں الجھے ہوئے تھے۔

یہ تبدیلی اچانک نہیں، بلکہ یہ نفوس کی تطہیر، مداومت، جاری تنازعات کی بے اثری، ناکام طرز عمل اور

اس کے ساتھ ہونے والی انصافیوں کے سلسلہ عمل کا نتیجہ ہے۔

اس طرح عمل نے نیشنل پارٹی کو اس نقطے پر لا کھڑا کیا جہاں اس کو نسلی امتیاز سے ماتا توڑنا پڑا اور ایک مختلف شروعات کرنی پڑی۔ یعنی ہمیشہ کے لیے ہر قسم کے امتیاز سے کنارہ کشی۔

اس طرح ہم، جنوبی افریقائی، اس نقطے پر پہنچ گئے جہاں سے نسلوں سے جاری انصافیوں اور تعصبات، عداوتوں اور خوف کو ختم کرنے کا عمل شروع ہوا جنہوں نے ہم کو تقسیم کر رکھا ہے۔ اس عمل نے ہم کو مصالحت کی طرف راغب کیا جس میں ہم امن کے لیے ایسی سوچ پیدا کر سکے ہیں جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ انہوں نے جنوبی افریقہ کے لیے نئے آئین کی راہ ہموار کی جس پر پارلیمان میں بحث جاری ہے۔ یہ آئین اہتمام کرتا ہے کہ:

آئینی نظام میں قانون آئین اور حقوق کے مسودہ قانون کو بالادستی حاصل ہو۔

انفرادی، گروہی اور سماج کے بنیادی حقوق کے لیے مسودہ قانون کے ذریعے ایسا تحفظ ہو جو عالمی سطح پر قابل قبول ہو۔

ایک خود مختار آئینی عدالت ہو جو آئین اور بنیادی حقوق کے قوانین کی رکھوالی کرے۔

اسنے واضح آئینی اصول متعین ہوں جن پر مستقبل کے آئین کو بھی عمل کرنا پڑے۔

طاقت ور مرکزی حکومت اور وفاقی اصولوں پر مبنی حکومتوں کے درمیان طاقت اور فرائض میں توازن ہو اور خاص اکثریتوں اور آئینی تہذیبوں کے لیے تراکیب کا تعین ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ عبوری آئین معاہدوں اور اصولوں، اور دیکھ بھال کا ایسا مناسب ڈھانچہ فراہم کرتا ہے جو ہمارے پیچیدہ سماج میں قیام امن کے لیے ضروری ہے۔

یہ ہر میدان میں تمام جنوبی افریقائیوں کی سچی اور مکمل شمولیت کو یقینی بناتا ہے۔ یہ رنگ، دھرم، درجات یا جنس کی بنیاد پر امتیاز نہیں کرتا۔

اس میں وہ تمام تحفظات شامل ہیں، ہمارے سماج کے تمام عناصر کو جن کی ضرورت ہوگی، جن کے ذریعے وہ اپنی شناخت اور اپنے رہن سہن کو برقرار رکھ سکیں گے۔ یہ ہر فرد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی حقوق کی مناسب ضمانت بھی فراہم کرتا ہے۔

اگر ہم مضبوط ارادہ کر لیں، جس کا میں ذکر کر چکا ہوں، تو مجھے یقین ہے کہ وہ ڈھانچہ بھی کامیاب ہو جائے گا، جو امن کے لیے اشد ضروری ہے ایسا ارادہ جو لوگوں کو آپس کے تنازعات کو، جبر اور تشدد کے بجائے، گفت و شنید سے، مصالحت اور معاہدوں سے طے کرنے پر آمادہ کرے۔

خود وہ کہتے ہی مازک کیوں نہ ہوں، مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی جنوبی افریقہ میں ایسے ادارے قائم ہیں۔ ہمارے سارے رہنماؤں کو، جن میں مسٹر منڈیلا کے ساتھ میں بھی شامل ہوں، ایسے اداروں کو مستحکم کرنے کی مثال قائم کرنی ہوگی۔ ہمیں اقلیتوں کی صف بندیوں سے مزاحم ہونے میں بڑی داناہی کی ضرورت

ہوگی، جو فائدہ جنگی دھمکیاں دے رہی ہیں۔ ہمیں امن کے قیام کے لیے، ہم جس کا وعدہ کر چکے ہیں، بنائے گئے ڈھانچے کے دفاع کے لیے ثابت قدم رہنا ہوگا۔

اس میں مروت کو کوئی گنجائش نہیں۔ ہم سب کو جو امن پر یقین رکھتے ہیں، اپنے ملک کے عوام کو باور کمانے کے لیے کہ ان کے حقوق اور سلامتی کا مکمل تحفظ کیا جائے گا، اپنی کوششوں کو تیز کرنا ہوگا۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اپنی کوششوں میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ جنوبی افریقا کے تمام باشندے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم کو ایک دوسرے پر انحصار کرنا ہوگا، کہ ہم میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہوگا اگر ہم نے مل جل کر کام نہیں کیا، کہ ہم سب کا کام ہو جائے گا اگر ہم نے تنگ نظر گروہی مفادات کے حصول کی کوشش کی۔

پانچ برس قبل اگر کوئی یہ پیشین گوئی کرتا کہ ایک دن مسٹر مینڈیلا کو اور مجھے ایک ساتھ 1993 کے نوبیل امن انعام سے نوازا جائے گا تو لوگ اس کی ذہنی حالت پر شک کرنے لگتے۔ مگر آج ہم دونوں آپ کے سامنے موجود ہیں۔

ہم دونوں سیاسی حریف ہیں۔

ہم کلیدی مسائل پر شدید اختلاف رکھتے ہیں اور جلد ہی رائے شماری میں ایک دوسرے کے برعکس ہوں گے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ہم امن کے ڈھانچے کو، جو قائم کیا جا چکا ہے، مستحکم کرنے کے ارادے کے ساتھ ایسا کریں گے۔

ہم ایسا ہی کریں گے۔ اور دوسرے رہنما بھی ہمارے ساتھ ہوں گے اس لیے کہ ہمارے ملک کے عوام اور ان کی بھلائی کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ ماضی کے تنازعات سے ہمارے ملک کے عوام میں سے کسی کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ اب تھنپے کے ذریعے ہم سب فتح یاب ہو رہے ہیں۔

مصالحات ہر جانب سے قربانیاں طلب کرتی ہے۔ مسٹر مینڈیلا کے طرف داروں یا میرے ساتھیوں دونوں کو اپنے نصب العین کو ترجیح دینا، جن کے حصول کے وہ عشروں سے خواہش مند تھے آسان کام نہیں تھا۔ مگر ہم نے یہ بھی کر دکھایا ہے۔ اور چوں کہ ہم نے کر دکھایا ہے، اس لیے امید قائم ہے۔

مستقبل قریب میں ہونے والی رائے شماری ماضی کے نہیں، مستقبل کے بارے میں ہوگی۔ سفید یا سیاہ کے افریکان اور کھوسا قبائل کے بارے میں نہیں ہوگی۔ یہ ہمارے عوام کے مسائل اور ان کے مستقبل کے بارے میں ہوگی۔ نسلی امتیاز یا مسلح جدوجہد کے بارے میں نہیں، امن کے مستقبل اور استحکام کے لیے، ترقی اور خوش حالی کے لیے، قومی تعمیر کے لیے ہوگی۔

نیشنل پارٹی کا لیڈر بننے کے بعد میں نے 8 فروری 1989 میں اپنی تقریر میں کہا تھا:

ہمارا ہدف ایک نیا جنوبی افریقا ہے:

کھل غور پر بدلا ہوا جنوبی افریقا:

ایسا جنوبی افریقا جو خود کو ماضی کی دشمنیوں سے آزاد کرے گا؛
ایسا جنوبی افریقا جو جبر و تسلط سے، خواہ وہ کسی نوعیت کے کیوں نہ ہوں، پاک ہوگا؛
ایسا جنوبی افریقا جس میں معقول افراد پر مبنی جمہوری قوتیں باہمی ہدف کے حصول کے لیے اور انتہا پسندی کے خلاف صف آرا ہو جائیں گی، خواہ وہ کسی بھی طرف سے آتی ہوں۔
اس کے بعد سے ہم نے، سیاسی، روحانی اور کاروباری رہنماؤں کے طفیل مؤثر ترقی کی ہے۔ میں مسٹر مینڈیلا سے کہوں گا: آپ کا شکریہ! اور امن کے انعام کو قبول کرتے ہوئے میں ان تمام افراد کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہوں گا جو ہماری سرزمین پر امن کے قیام کے لیے کام کر رہے ہیں۔ میں تمام جنوبی افریقیوں کی طرف سے، براہ راست یا بالواسطہ اپنی کم زوریوں کے اعتراف کے ساتھ اور بہ کمال انکساری، اس انعام کو قبول کرتا ہوں۔
میں ان کا بھی شکر گزار ہوں جنہیں نے جنوبی افریقا میں ہونے والی مصالحت اور اصلاح کے لیے اس انعام کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے راستے میں بہت ساری رکاوٹیں تھیں اس لیے یہ اب بھی بہت بڑا خطرہ ہے۔ مگر وہ ایسی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
غظیم جنوبی افریقائی مشاعروں میں سے ایک N P van Wyk Louw نے لکھا ہے:
کشاہو سو کو مار جھرقی!

جنوب کے سب بڑے ستاروں کے اکیلی
بلند پرواز کرنے والی خوشی کبھی، کیا
تری غم انگیز خاموشی سے بلند ہوگی؟
کوئی نذر حسن شیرے آگے
نہ جاسکے گا بلند یوں تک
جو مثال بردار جھومتے بالوں کی صورت
تری بلند اور سوچ میں ڈوبی چوٹیوں پر
ہوا میں لہراتے رہتے ہیں ہر سو
نہ تجھ میں ایسا عمل ہو پنہاں
جو آسمان کی عمیق پہنائیوں میں گونجے
اور ادوار کی ناتوانی کا منہ چڑائے

جنوبی افریقا میں جو بھی ہو رہا ہے وہ کچھ ایسا ہی ہے۔ کوئی عمل جو زمیں کی فضاؤں میں گونج رہا ہو۔
امن کے حصول کی مہم کی طرح۔ یہ عمل جنوبی افریقائیوں میں امیدوں کے چراغ روشن کرتا ہے۔ یہ عمل صحارا کے قبیلے ریگستانوں میں نئے آفاق دکھاتا ہے۔ یہ ہمارے علاقے اور ہمارے ملک کے لانا انتہا پوشیدہ امکانات کی قفل کشائی کرتا ہے۔

ریگو برٹا مین چوٹم اعلان تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات!

مارویائی نوبیل کمیٹی نے 1992 کا نوبیل امن انعام ریگو برٹا مین چوٹم کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ریگو برٹا مین چوٹم! ہم آپ کو اوسلو میں انعام وصول کرنے کے لیے تشریف لانے پر خوش آمدید کہنے میں یک کونہ مسرت محسوس کر رہے ہیں۔ خوش آمدید، شمال کے علاقے کے اس چھوٹے سے مرد ملک میں جو آپ کے اپنے ملک سے بہت فاصلے پر ہے۔ جغرافیائی اور سماجی، دونوں اعتبار سے یہ فاصلہ بہت طویل ہے، مگر بالخصوص اس انعام کے موقع پر ہم اس کو قرب غی محسوس کر رہے ہیں۔ تنازعے اور جنگیں جہاں کہیں بھی دنیا میں ہو رہی ہوں، دونوں پوری دنیا کے لیے ہمیشہ تشویش کا باعث ہوتی ہیں۔ اسنے فاصلے کے باوجود بھی ہم کو سنے مالا میں ہونے والے ایک مقامی تنازعے سے خطرہ محسوس کر رہے ہیں، فوجی اعتبار سے نہیں، مگر اس لیے کہ یہ دنیا کے مستقبل پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ گو سنے مالا کی حالت ہمارے نزدیک ایک مخصوص معنی رکھتی ہے، اس لیے کہ یہ اتنا عام مسئلہ ہے کہ ہم سب کو اس کے حل میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔ ہم ایسے مسائل کو مقامی اور نسلی علاقہ دہی، قدیم باسیوں کے حقوق، ماحول اور وسائل میں اشتراک، مفلس اور ثروت مند کے درمیان خلا گزدانتے ہیں۔ میری مراد سماج میں عورت کے کردار سے ہے۔ گو سنے مالا ان معاملات میں جو راہ اختیار کرتا ہے وہ ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ اس لیے ہم خود کو اس میں گرفتار پاتے ہیں۔

قرابت اس کا ایک اور پہلو ہے، ریگو برٹا مین چوٹم جیسی شخصیت جس کے باعث ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ عمومی انسانیت میں جو ہماری اشد ضرورت ہوتی ہے، ہمارے امن اور رضامندی کے خواب میں، بہتر زندگی کی ہماری خواہش میں، با عزت زندگی گزارنے کے ہمارے حق کے احترام میں ظاہر ہوتی ہے۔ انسان ہونے کے ماتے نسلی، تہذیبی اور جغرافیائی تقسیم کے باوجود ہماری اپنی اپنی ضرورتیں ہوتی ہیں۔

ایک لمحہ حال جیسا، ہمیں اس قربت کا احساس دلاتا ہے جو ہماری مشترکہ انسانیت کا جزو لا ینفک ہے۔ ایک وحشی دنیا میں غیر مسلح انسانیت پر قرار رکھنے کے باعث ریگو برنامین چوٹم ہمارے بہترین اندرون سے اپیل کرتی ہے، خواہ ہم کتنے کے رہنے والے ہوں اور خواہ ہمارا پس منظر کچھ بھی ہو۔ وہ ایک منصفانہ جدوجہد کی مستحکم علامت کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ریگو برنامین ایک Quiché انڈین ہیں۔ وہ گوئےمالا کے پہاڑوں میں واقع ایک مفلس انڈین گاؤں میں پیدا ہوئی تھیں۔ اسی تہذیب میں بڑھیں اور بالغ ہونے کے بعد انہوں نے سپانیول زبان کا مطالعہ کیا۔ جیسا کہ وہ اپنی خوردنوشت سوانح حیات میں بیان کرتی ہیں، وہ بچپن میں گاؤں میں اپنے خاندان سے بہت قریب رہی تھیں مگر اقداس کی ماری ہوئی تھیں۔ فاقہ کشی سے بچنے کے لیے انھیں بچپن ہی میں کپاس کے بڑے بڑے کھیتوں میں کپاس چننے کا کام کرنا پڑا تھا، جہاں انسانوں کے ساتھ جانوروں سے ذرا بہتر سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اپنی خوردنوشت سوانح حیات میں وہ لکھتی ہیں، ”جب میں اپنے بچپن کے بارے میں سوچتی ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتی ہوں کہ مجھ پر تو کبھی بچپن آیا ہی نہیں۔ میں کبھی بچی تھی ہی نہیں۔ میں کبھی اسکول نہیں گئی، میری نشوونما کے لیے مناسب غذا نصیب نہیں ہوئی، مجھے تو کچھ بھی نصیب نہیں تھا۔ میں خود سے سوال کرتی ہوں کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہوا ہے؟“ یہ تھا اُن کا حال اُس وقت، جب وہ زندگی کی راہوں میں چلتے ہوئے ہوش سنبھال رہی تھیں۔ ان کو وہ دنیا کیسی لگی ہوگی جس نے ان سے ان کا بچپن چھین لیا تھا؟ یہ ہے وہ سوال جو آج ہم سب کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایسی اندرونی طاقت اور انسانیت کے ذخیرے کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں جو خراب ترین حالات سے بھی مقابلہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیں جو کچھ بتاتے ہیں وہ واقعی سننے کے قابل ہوتا ہے۔

ریگو برنامین چوٹم کو انڈین لوگوں کی زمینوں کی ضبطی کا بھی تجربہ ہوا تھا۔ ان گاؤں کا ان سیکڑوں دیہات میں سے تھا جنہیں مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا گیا تھا۔ قتل عام کی روش روزمرہ کی بات تھی۔ گوئےمالا کو اگرچہ 1982 میں شہری حکومتیں نصیب ہوئی تھیں مگر ان کے زمانے میں بھی دیہی علاقوں میں بے شمار قتل عام ہوئے۔ سیکڑوں اجتماعی قبریں پائی گئی ہیں۔ صرف اسی برس کی ابتدا سے امریکا اور کیناڈا کی انسانی حقوق کے اداروں نے امریکی کارروائی کے بعد 380 موت کی سزاؤں اور عقوبتوں کے 80 واقعات کا پتہ لگایا ہے۔ زمینوں سے جبری انخلا کے جواب میں گوریلوں کو بھی پورے سماج پر اندھا چاند عظم و ستم کے سونے فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ریگو برنامین چوٹم کا خاندان بھی اُس شدید جبر و تعدی کا نشانہ بنا ہے۔ اُن کے والد نے، جو اپنے گاؤں کے منتخب رہنما تھے، کاست کا دل کی یونین بنائی تھی جسے وسیع پیمانے پر لوگوں کی حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ ان کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ فوج نے ان کی والدہ اور بھائی کو وحشیانہ عظم کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جیسا کہ ہم کو بچپن سے کہنا سکھایا گیا ہے، اس سال کو لبیس کو امریکا ”دریافت“ کیے ہوئے پانچ سو برس

ہونے کو آئے ہیں، یا یوں کہا جائے کہ جب سے نوآبادیاتی راج کی ابتدا ہوئی ہے اس پر ہی منانے سے کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ دنیا بھر میں قدیم باشندوں (aborigin) کے حقوق کا مسئلہ سنجیدگی سے زیر غور لایا گیا ہے۔ دنیا کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں امریکا کے حالات زیادہ واضح ہو کر ابھرے ہیں۔ یہ پورا ایک براعظم تھا، کولمبس کے زمانے میں جس کی آبادی کم و بیش 100 ملین رہی ہوگی۔ ان انڈین لوگوں میں سے آج معدودے چند ہی باقی رہ گئے ہیں، اور صحیح معنوں میں اصل انڈین تہذیب صرف چند چھوٹے چھوٹے علاقوں میں محدود پائی جاتی ہے۔ انڈین تہذیب دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں کیوں یورپی تہذیب کا دباؤ برداشت کرنے میں کم زور رہی ہے؟ جو عمل امریکا میں ہوا ہے، ایسا دنیا کے بہت ہی کم علاقوں میں دیکھا گیا ہے۔ یہ عمل بہت الجھا ہوا ہوتا ہے، اور یہ عمل اس کا زیادہ تجزیہ کرنے کا نہیں، مگر جو بات صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض وقتوں میں بعض علاقوں میں ہمیں چھوٹ کی چار یوں، اموات، جنگ اور غارت گری کی بے ترتیبی کے علاوہ ایک اور مختلف طاقت کا سامنا ہوتا ہے، اور وہ قدیم باشندوں کی ایک باقاعدہ نسلی صفائی (ethnic cleansing) کے نظام کی صورت میں پیش آتی ہے، جس کو صحیح معنوں میں نسل کشی کہا جاسکتا ہے۔ قدیم باشندوں کے حقوق کے تحفظ، ان کی تہذیب کا احترام اور ان کو امن اور باہمی مفاہمت سے زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہمیں ریگلو پرناسین چوٹم جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ ماریائی نوبیل کمیٹی کے لیے یہ بھی ایک حسن اتفاق ہی تھا کہ کولمبس دریافت کی برسی کے موقع پر وہ نوبیل انعام کے مستحق لوگوں میں سب سے طاقت ور شخصیت بن کر سامنے آئی ہیں۔

ریگلو پرناسین چوٹم نے فیصلہ کیا کہ وہ خود کو اپنے لوگوں کی سیاسی اور سماجی بھلائی کے لیے وقف کر دیں گی۔ نہایت دل آویز اور علامتی صاف گوئی سے وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں ہمیں بتاتی ہیں کہ ان کے لیے یہ کتنا مشکل فیصلہ تھا کہ وہ اپنے لیے اولاد اور خاندان کی تمنا نہیں کریں گی۔ وہ بتاتی ہیں کہ انہوں نے اپنی ہم نسل آبادی کے لیے، نہ کہ اپنی ذات کے لیے بلکہ اپنے خاندان کے لیے، خوشیوں کی فراہمی کو اپنے ذمے داری سمجھ لیا اور جب نسل کشی کا معاملہ ہو تو ایسی ذمے داری کا بوجھ زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کے خلاف فیصلہ کیا۔ ”میں بہت الجھن میں تھی“ وہ لکھتی ہیں کہ ”سماج اور بے شمار دوسرے معاملات مجھے تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔ میں ہمیشہ دل برداشتہ رہتی تھی۔“ وہ GUG کی فعال رکن بن گئیں۔ پھر انہوں نے ایک ادارے کے قیام میں شرکت کی جو ”انقلابی سچیوں“ کے نام سے موسوم ہوا۔ ”صحیح معنوں میں ہم لوگوں نے لفظ انقلابی کے معنی سمجھے، یعنی ’قلب ماہیت‘۔ اگر میں نے اسے سمجھ کے ہی بڑے پردہ و جہد کا راستہ اختیار کیا ہوتا تو میں اس وقت پہاڑوں پر ہوتی۔“ اپنی سیاسی مصروفیتوں کے باعث انہیں میکسیکو میں بارہ برس کی جلا وطنی اختیار کرنی پڑی تھی۔ وہ اقوام متحدہ میں انڈین لوگوں کے پہلے نمائندوں میں سے ایک تھیں، اور اقوام متحدہ کے اس گروپ کی رکن ہیں جو انڈین عوام کے انسانی حقوق کے لیے کام کرتا ہے۔

اپنی کتاب A Strategy for Peace میں سوئیڈش / امریکی اخلاقی پروفیسر سسلا یوک (Sissela)

(Bok) "pathology of partisanship" کو تشدد کے استعمال کے وحشیانہ اثر سے تعبیر کرتی ہیں۔ جو کوئی بھی تشدد کا عمل اختیار کرتا ہے وہ اپنی انسانیت کھودے گا اس طرح تشدد سے تشدد پیدا ہوتا ہے اور نفرت سے نفرت اُگتی ہے۔ اُس نے انگریزی زبان کے شاعر اسٹیفنی اسپنڈر (Stephen Spender) کا حوالہ دیا ہے جس نے بذاتِ خود ہسپانوی خانہ جنگی میں حصہ لیا تھا: "مجھ پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ اگر میں نے مرچے کے قتل کو غیر متعصبانہ نظر سے نہیں دیکھا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے بچوں کے قتل کی سرگز کوئی پروا نہیں کی۔" "نمر کوئی" "pathology of partisanship" کے شیطانی پتھر سے باہر کیسے نکل سکتا ہے؟ یہ تو بہت آسان ہوتا ہے کہ آپ دور ہی دور سے عدم تشدد اور نفرت کے خاتمے کے لیے آواز لگاتے رہیں، جب کہ آپ کو خود دوسری جانب سے ہونے والے اندھے تشدد کا سامنا نہ ہو۔ یہ ہماری ذمہ داری نہیں کہ ہم ایسے واقعات پر رائے ظاہر کریں یا اس پر ملامت کریں۔ ہم اکتفا ضرور کر سکتے ہیں کہ ہم لوگوں کی اُن روشن مثالوں کی طرف اشارہ کریں جو تشدد کے ماحول میں رہ کر بھی اپنی انسانیت کو بچائے رکھتے ہیں، اور ان لوگوں کی طرف جو اُن ہی وجوہ کی بنا پر ہمارے احترام اور تعریف کے مستحق ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہمیں امید دلاتے ہیں کہ شیطانی پتھر سے باہر نکلنے کے بھی راستے ہوتے ہیں۔

میں نے کئی بار ریگو برنامین جوئم کی خود نوشت سوانح حیات کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی انسانی دستاویز ہے۔ یہ ظلم کو سنجیدہ اور حقیقت کے انداز میں بیان کرتی ہے۔ اس کی عقیقی طاقت اخلاقی طیش اور محنتی ہے۔ کچھ سطحوں میں، وہ تشدد اور تعذیب کے ذمہ دار لوگوں سے نفرت کا اظہار بھی کرتی ہیں مگر ساتھ ہی ان کا بیان دل خوش کن انسانیت کا بھی مظہر ہے۔ تقریباً تفریحی انداز میں وہ تشدد کے ماحول میں چھوٹی چھوٹی دلچسپ تفصیلات کا بھی تذکرہ کرتی ہیں۔ بڑی محبت سے وہ اندرین رسوم کو بھی بیان کرتی ہیں۔ جس دل موہ لینے والے انداز میں انہوں نے اوسلو میں کرنل راڈرگیز سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے میں اس سے بہتر مثال پیش نہیں کر سکتا۔ انہوں نے لکھا ہے، "ہم نے ایک دوسرے سے تبریک کے چند الفاظ کہے اس آدمی نے، جس نے میری ماں کو قتل کیا تھا، مجھے نو تیل انعام کے لیے مامزد ہونے پر مبارکباد پیش کی اور اس موقع کو قومی افتخار کہا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ اپنی تہ میں ہم سب انسان ہیں۔ یہ کسی دور کے شامرا سے ملاقات جیسی ملاقات تھی۔ ان سے بات کرتے ہوئے مجھے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔"

دنیا پر بہت زیادہ بھروسہ کرنا حماقت ہے، مگر اس سے بڑی حماقت یہ ہے کہ اس پر کم بھروسہ کیا جائے۔ ریگو برنامین جوئم کے کام کا ہدف، جیسا کہ انہوں نے مختلف مواقع پر بیان کیا ہے، مفاہمت اور امن ہی ہے۔ وہ بہتوں سے زیادہ جانتی ہیں کہ مستقبل کی مفاہمت کی بنیادیں اس اسلوب میں مضمر ہوتی ہیں جس میں آپ اپنی جدوجہد کرتے ہیں۔ نہایت وحشیانہ حالات میں بھی انسان کو اپنے اس عقیدے کو بدل نظر رکھنا چاہیے کہ ہم سب میں کچھ نہ کچھ انسانی احساسات ضرور رہتے ہیں۔ ریگو برنامین جوئم نے اس عقیدے کو بچا کر رکھا ہے۔ ان کی ان تمام کوششوں کی توصیف اور احترام میں نو تیل مارویائی کسمی آج ان کو نو تیل امن انعام پیش کر رہی ہے، شکریہ!

خطبہ

جلالت مآب شاہ اور ملکہ مارو سے محترم ارکان مارویائی امن کمیٹی، عزت مآب وزیر اعظم، عزت مآب ارکان حکومت اور سفرائے کرام، پیارے کوٹے مالائی ہم وطن بھائیو اور بہنو، خواتین و حضرات۔

میں 1992 کے نوبیل امن انعام کی عطا کے موقع پر عمیق جذبات اور افتخار محسوس کر رہی ہوں۔ ایک عمیق افتخار اور جذبات اپنے ملک کے لیے اور اس کی قدیم تہذیب کے لیے بھی۔ اپنی کمیٹی کی اقدار کے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی جن کا حصہ ہوں، اپنے ملک کی محبت کے لیے بھی اور مادہ فطرت کے لیے بھی۔ جو کوئی بھی اس کو سمجھتا ہے وہ زندگی کا احترام کرتا ہے، اور اس جدوجہد کی ہمت افزائی کرتا ہے جس کا ہدف ایسے مقاصد ہوتے ہیں۔

میں اس انعام کو اپنی ذات کے لیے کوئی صلہ نہیں سمجھتی، بلکہ اس کو امن کی جدوجہد، انسانی حقوق کے اور اپنے مقامی لوگوں کے حقوق کے لیے ایک بڑی فتح جانتی ہوں جو 500 برس سے پرانہ تھی، نکلے نکلے ہیں اور لٹل لٹلی کے، جبر و استبداد کے اور تعصب کے شکار ہیں۔

اجازت دیجئے میں آپ سب کو یہ بتاؤں کہ میرے نزدیک یہ انعام کیا ہے۔

میری رائے میں نوبیل امن انعام ہم سے وہی کچھ کرنے کا تقاضا کرتا ہے جس کے لیے دیا جاتا ہے اور جس کے لیے دنیا بھر میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ ایک اُن مہل خزانہ ہونے کے علاوہ یہ انعام وہ چھپا رہے جس سے لڑا جانا چاہیے امن کے لیے، انصاف کے لیے، ان لوگوں کے حقوق کے لیے جو بے پناہ معاشی، سماجی اور سیاسی عدم مساوات کے شکار ہیں، جو اس دنیا میں عام ہے ہم جس میں زندہ ہیں اور جہاں اس نگرے پر بننے والی اکثریت توقع کرتی ہے کہ ایک نہ ایک دن اعلیٰ انسانی اقدار کی بنیاد پر اس کی ایک نئی دنیا میں قلب مابیت ہوگی۔

یہ نوبیل انعام ایک معیاری نشان کی مثال ہے جو ہماری ہمت افزائی کرتا ہے کہ ہم ملامت کریں کوٹے مالاکے عوام کے خلاف امریکا میں اور پوری دنیا میں کی جانے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی، اور ایک مثبت کردار ادا کریں میرے ملک کے لیے ایسے ضروری کاموں میں جن کی بدولت امن اور سماجی انصاف کا حصول ممکن ہو سکے۔

نوبیل انعام ایک علامت ہے امن کی، اور ان کوششوں کی جو ایک حقیقی جمہوریت کی تعمیر کے لیے جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ انعام کوٹے مالاکے شہری حلقوں کو اُکسائے گا کہ وہ سب مل کر ایک محکم قومی یکا نگت کے ذریعے ایسے امن کے حصول کے عمل کی گفت و شنید میں اپنا کردار ادا کریں، جو کوٹے مالاکے عوامی امنگوں کا مظہر ہو (حالانکہ بہا اوقات خوف کے باعث یہ ممکن نہیں ہوتا) اور جو سیاسی اور قانونی بنیادوں پر اس طرح قائم ہو کہ اندرونی مسلح تصادم کی بنیاد بننے والے مسائل بھی اس کو کسی طرح تبدیل نہ کر سکیں۔

اس میں ہرگز کوئی شبہ نہیں کہ یہ پورے براعظم کے مقامی باشندوں کی جدوجہد کے لیے ایک نشان امید ہے۔ یہ مرکزی امریکی عوام کو خراج تحسین بھی ہے جو آج بھی تلاش میں سرگرداں ہیں، جمہوریت اور احترام باہمی کی بنیاد پر اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے، استحکام کے لیے اور ترقی و تکمیل کے لیے۔

مقامی عوام کے اور انسانی حقوق کے اداروں کو ہر طرف سے، ممبرانِ حکومت سے، عملی طور پر تمام امریکی صدور سے، اور پوری دنیا سے ملنے والے مبارک باد کے پیغامات نے اس انعام کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ دراصل ان کے نزدیک نوٹیل امن کا یہ انعام کسی ایک فرد کے لیے نہ صرف ایک صلہ ہے، ایک قرار ہے، بلکہ ایک اہتدائے اس سخت جدوجہد کی کامیابی کی، حمایت کی جو ابھی تک حاصل نہیں ہوئی ہے۔

تفریق کے طور پر دیکھا جائے تو یہ ایک عجیب تناقض ہے کہ میرے اپنے ملک میں ہی مجھے اس بات پر شدید اعتراضات اور اختلافات کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ ایک Quiché انڈین کونوٹیل امن انعام کیوں دیا جا رہا ہے؟ شاید اس لیے کہ لاطینی امریکا میں، بالخصوص گونے مالا میں مقامی نسل والوں سے، عورتوں سے، انصاف اور امن کا تقاضا کرنے والوں سے تعصب مخصوص سماجی اور سیاسی حلقوں کی جڑوں میں پیوست ہے۔ موجودہ حالات میں، اس بے ترتیب اور ابھی ہوئی دنیا میں ماریوٹائی نوٹیل امن انعام کی کمیٹی کا اس محترم انعام کا مجھ کو عطا کیا جانا اس حقیقت کی آگاہی کو واضح کرتا ہے، کہ اس طرح بھی طاقت اور ہمت فراہم کی جاتی ہے امن کی جدوجہد کی، مفاہمت اور انصاف کو نسلی امتیاز اور تہذیبی تعصب کے خلاف جدوجہد کو۔ کہ اس طرح بھی ہمارے عوام کے درمیان ہم یودیت اور یک جہتی کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔

نہایت کبرے ڈکٹنگریک گوئٹھمینان کے ساتھ میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ 1992 کے نوٹیل امن انعام کو اس وقت تک عارضی طور پر میکسیکو سٹی میں رکھا جائے گا جب تک کہ گونے مالا میں امن نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ اپنے ملک میں مجھے ایسے سیاسی حالات نظر نہیں آتے جن میں کسی منصفانہ حل نکلنے کی کوئی امید ہو۔ یہ اطمینان اور تشکر اس وجہ سے ہے کہ ہمارے ہمارے ملک میکسیکو، نے ہمارے ملک میں امن قائم کرنے کے لیے بے حد کوششیں کی ہیں، کہ اس نے اتنی تعداد میں ملک بدر کیے جانے والے گونے مالا نیوں کو ہر چھپانے کی جگہ دی ہے، ہمیں قدیم Aztecs تہذیب کے گہوارے Museo del Templo Mayor میں جگہ فراہم کی ہے کہ یہ انعام اس وقت تک وہاں محفوظ رکھا جاسکے جب تک کہ گونے مالا میں، Quetzal کی زمین پر، اس کی حفاظت کے لیے امن قائم نہیں ہو جاتا۔

امن انعام کے دیے جانے کی مجموعی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے میں کچھ ان لوگوں کی طرف سے بھی کہنا چاہوں گی جن کی آوازیں سنی نہیں جاسکتیں یا اپنی رائے دینے کی سزا میں جن کی آوازوں کے گلے گھوٹ دیے گئے ہیں، اور ان لوگوں کی طرف سے بھی جن کو کنارے سے لگا دیا گیا ہے، جن کے ساتھ تعصب برتا گیا ہے، جو افلاس کے مارے ہوئے ہیں، ضرورت مند ہیں اور ان کی طرف سے جو انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور جبر کا نشانہ بننے والے انسان کی طرف سے بھی جنہوں نے، بہر حال، صدیاں جھیلی ہیں مگر اپنا ضمیر، اپنا عزم اور اپنی امید نہیں گنوائی۔

خواتین و حضرات، اجازت چاہتی ہوں کہ میں اپنے ملک اور مایاؤں کی تہذیب کے بارے میں کچھ عرض کر سکوں۔ مایا عوام ترقی کر کے جغرافیائی اعتبار سے تقریباً 300,000 مربع میٹر کے رقبے پر پھیل چکے ہیں، یہ لوگ جنوبی میکسیکو، ہلیو، گوئے ملا، ہونڈیوراز اور ایل سالواڈور میں مقیم ہیں۔ ان کی تہذیب مایا کی اعتبار سے ترقی کر کے ایک ادارہ بن چکی ہے اس نے ریاضی کے میدان میں بڑے بڑے سائنس دان اور فلکیات، زراعت، تعمیر اور انجینئرنگ کے بڑے دماغ پیدا کیے ہیں۔ ان میں محترمہ رازی، معوری، پارچہ لانی اور نقش نگاری کے بڑے بڑے فن کار بھی جنم پا چکے ہیں۔

مایاؤں نے ریاضی میں 'صفر' کی قیمت کا تعین اسی زمانے میں کیا تھا جب ہندوستان میں اس کو دریافت کیا گیا تھا، اور بعد میں یہ عربوں تک پہنچا۔ ریاضی کی بنیاد پر کی ہوئیں ان کی فلکیاتی پیشبینیوں کو یوں حیرت انگیز تھیں اور آج بھی ہیں۔ انھوں نے چارچین کیلنڈر سے بھرپور پوکس کیلینڈر تیار کیا تھا، اور ادویات کے میدان میں انھوں نے کاسٹمر کے اندر جزائی کے کام سے انجام دیے ہیں۔

مایاؤں کی کتابوں میں سے ایک، جو سپانوی فاتحین کی تہذیب سے بچ رہی تھی، جس کو Codex of Dresden کے نام سے جانا جاتا ہے، جس میں گرنوں پر تحقیق کے نتائج درج ہیں اور 68 جدول دیے گئے ہیں جن کے مطابق 33 برس بعد [یہاں ان کی مراد شاید مکمل سورج گرہن سے ہے۔] سورج گرہن واقع ہوتا ہے۔ آج اس عجیب احرام پر زور دینا زیادہ ضروری ہے جو مایا تہذیب عمومی طور پر زندگی اور فطرت کے بارے میں کرتی ہے۔

کون پیش بندی کر سکتا ہے کہ یہ لوگ اور کبھی بڑی بڑی مائنس فتوحات کرنے کے قابل ہو سکتے تھے اگر ان کو محن اور آگ کے ذریعے مغلوب نہیں کیا جاتا، اور ان کو نسلی تہذیب کا نشانہ نہیں بنایا جاتا جس سے 500 برس میں 50 ملین افراد متاثر ہوئے ہیں۔

میں ہی نوبیل امن انعام کے معنی بیان کرتے ہوئے کہنا چاہوں گی کہ سب سے پہلے تو یہ خراج تحسین ہے ان انڈین لوگوں کے لیے جو اس لیے قتل اور غائب کیے گئے کہ وہ ایسی باوقار اور منصفانہ زندگی کے متمنی تھے جس میں بھائی چارہ بھی ہو اور انسانوں کے درمیان اتفاق ہوا میل ملاپ ہو۔ ان لوگوں کے لیے بھی جو انڈین عوام کی زندگی میں افلاس اور نظر اندازی میں تہذیب کی امید کرتے تھے ان کے لیے جو صحیح ہستی سے غائب کر دیے گئے، اور بے آسرا گونے مالائیوں کے ساتھ ساتھ پورے امریکی براعظم کے لیے بھی یہ ایک خراج تحسین ہے۔ ان معاملات میں بڑھتی ہوئی فکر مند خوش آئند ہے۔ اگرچہ یہ 500 برس بعد پیدا ہو رہی ہے، دکھوں کے لیے، تعصبات کے لیے، جبر اور استحصال کے لیے ہمارے عوام جس کا نشانہ بنے رہے ہیں، اور ان کے لیے بھی جو اپنی کائناتی بصیرت اور زندگی کے تصور کے باعث پامردی سے اٹھ رہے ہیں اور بالآخر امیدوں کی کچھ پھومتی ہوئی کرنیں دیکھ رہے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ جڑیں جن کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا تھا، کس طرح امید اور مستقبل کے تصور کے باعث پھر سے اٹھنا شروع کریں گی!

یہ [انعام] بڑھتی ہوئی ان بین الاقوامی دلچسپیوں کی بھی نمائندگی کرتا ہے، اور ابتدائی انسانی حقوق

کا ادراک بھی، جو امریکا کی براعظموں میں بسے 60 ملین انڈین عوام کی تہذیب سے متعلق ہے، اور ان کی فریاد کی بھی، اس لیے کہ انھوں نے 500 برس کے جبر و استحصال بھیلے ہیں۔ انھوں نے اس عہد میں ایسی نسل کشی جھیلی ہے جس کا کوئی تقابل نہیں کیا جاسکتا، جس سے دھڑے ممالک نے اور امریکا کے ممتاز افراد نے فائدے اٹھائے ہیں۔

انڈین عوام کے لیے اب آزادی ہونی چاہیے، وہ امریکی براعظم کے باسی ہوں یا دنیا میں کہیں کے بھی ہوں، اس لیے کہ جب تک وہ زندہ ہیں، حقیقی زندگی کے لیے امید کی ایک شمع روشن رہے گی۔

نوٹیل امن انعام کے حصول پر پورے براعظم کے انڈین اداروں کی طرف سے کی جانے والی خوشی کے اظہار اور دنیا بھر سے آنے والے مہارک باد کے پیغامات اس فیصلے کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ امریکا کے قدیم عوام کے یورپ کے اوپر قرض کا اقرار ہے، یہ انسانیت کے ضمیر سے ایک اپیل ہے کہ ان لوگوں کو نوآبادی استحصال کے ذریعے کنارے سے لگا دیے کے عمل کو منادیا جانا چاہیے، یہ فریاد ہے زندگی کے لیے، امن، انصاف، اور انسانوں کے درمیان مساوات اور اخوت کے لیے۔

انڈین عوام کے تصور کے محکمے کا اظہار اسی انداز میں ہوتا ہے جیسے کہ آپس میں ان کے رشتے ہوتے ہیں۔ پہلے تو انسانوں کے درمیان، ابدان کے ذریعے۔ دھڑے، زمین کے ذریعے جو ہماری ماں ہے، اس لیے کہ وہی ہمیں زندگی دیتی ہے، کہ وہ ہمیں تجارت کی جنس نہیں ہے۔ تیسرے فطرت کے ساتھ، اس لیے کہ ہم اس کا حصہ ہیں، اس کے مالک نہیں۔

ہمارے لیے مادر زمین نہ صرف معاشیاتی مال کا منبع ہے جو ہمیں جوار دیتی ہے، جو ہماری زندگی کا ایک عنصر ہے، مگر وہ ہمیں اور بہت کچھ بھی مہیا کرتی ہے، بہت سے صاحبان اختیار آج جس کی خواہش کرتے ہیں۔ زمین ہماری جڑ ہے، ہماری تہذیب کا منبع ہے۔ یہ ہماری یادوں کی امن ہے، ہمارے اجداد کو خوش آمدید کہتی ہے، اس لیے چاہتی ہے کہ ہم بھی اس کی عزت کریں، اور بدلے میں، ملامت سے اور احترام کے ساتھ اسے وہی کچھ واپس کریں جو وہ ہمیں عطا کرتی ہے۔ ہمیں اس کی بھلائی کا خیال رکھنا ہوگا کہ ہمارے بیٹے اور پوتے اس سے مستفید ہوتے رہیں۔ اگر دنیا اب بھی نہیں سیکھتی کہ فطرت کی عزت کیسے کی جاتی ہے تو ہماری نئی نسلوں کا مستقبل کیا ہوگا؟

اسی قسم کے بنیادی اصولوں سے براعظم امریکا کے قدیم مقامی لوگوں کے کردار بنتے ہیں، خواہ وہ مخلوط نسل کے ہوں، سیاہ فام ہوں، سفید فام ہوں یا ایشیائی۔ پورے سماج کی ذمہ داری ہے کہ وہ معقول طریقے سے ایک دھڑے کا احترام کرے، ایک دھڑے سے مواد کا تبادلہ کرے اور سائنسی کامیابیوں سے سبق حاصل کرے۔ قدیم مقامی لوگوں کو نہ کبھی وہ مقام ملا تھا نہ اب ان کے پاس ہے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے عوض ان کو ملنا چاہیے تھا، حالانکہ انھوں نے ان اہم میدانوں کی ترقی میں کردار ادا کیا ہے۔

اگر قدیم مقامی تہذیب اور یورپی تہذیب آپس میں، بغیر کسی تباہی، استحصال، تعصب اور افلاس کے پرامن طریقے اور ہم آہنگی سے تبادلوں کر رہی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں انسانیت کے لیے بہتر اور قیمتی

کامیابیاں حاصل کر سکتی تھیں۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جب یورپی لوگ امریکا آئے تو اس وقت وہاں ایک خوش نمو اور مستحکم تہذیب موجود تھی۔ ہم ”امریکا کی دریافت“ کی بات نہیں کر سکتے اس لیے کہ دریافت اس کو کہتے ہیں جس کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہ ہو، یا جو پوشیدہ ہو۔ مگر امریکا اور اس کی مقامی تہذیب تو رومن سلطنت اور قرون وسطیٰ کے یورپ کے زوال کے بعد اپنے آپ کو خود دریافت کر چکی تھی۔ اپنی تہذیب کی خصوصیت انسانیت کی میراث کا حصہ ہوتی ہے اور یہ علم رکھنے والوں کو حیران کرتی رہتی ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ قدیم مقامی لوگوں کی میں جن کا حصہ ہوں، اپنے سائنسی علم کو انسان کی ترقی کے لیے استعمال کرتے رہنا چاہیے، اس لیے کہ ہم میں بے پناہ قابلیت موجود ہے اور ہم اپنی قدیم وراثت کو یورپی تہذیب اور دنیا کے دوسرے حصوں کی تہذیبوں سے یک جا کر سکتے ہیں۔

مگر یہ جیسے داری، جو ہمارے خیال کے مطابق فطری اور تہذیبی وراثت کی بحالی ہے، معقول اور رضامندی کی بنیاد پر علم اور قدرتی وسائل کے استعمال کے لیے ہوتی چاہیے جس میں حکومت اور سماج کی جانب سے مساوات کی ضمانت ہو۔

ہم مقامی قدیم لوگ روایت اور جدیدیت کو یک جا کرنے کے خواہش مند ہیں مگر، ہر قیمت پر نہیں۔ ہم اس بات کو نہ برداشت کریں گے نہ اس کی اجازت دیں گے کہ ہمارا مستقبل برعظیموں کے درمیان ایک ممکنہ نسلی سیاحی کے منصوبے کے محافظوں جیسا ہو۔

ایسے وقت میں جب دنیا بھر میں کولمبس کی امریکا آمد کی پانچ سوویں تقریب کی گونج ہو، پسے ہوئے قدیم مقامی عوام کا تقاضا ہوگا کہ ہم لوگ دنیا پر اپنے وجود اور اپنی تہذیبی شناخت کی قدر و قیمت کے حق کو جتائیں۔ ہماری تہذیب اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم بھی ان فیصلوں میں عملی طور پر شریک ہوں جو ہمارے مقدر پر اور ہماری قوموں کی ترقی و تعمیر پر اثر انداز ہوں۔ ان ساری باتوں کے باوجود کیا ہمیں اس سوچ بچار میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے کہ اس میں وہ عناصر شامل ہوں جو ضمانت دیں ہمارے مستقبل کی، جدوجہد اور برداشت کی، ہمت کی، اپنی روایات کی حفاظت کی جس کو اتنے سارے خطرات لاحق ہیں، اپنی جدوجہد کے ساتھ فاداری کی جو مختلف ممالک، حکومتوں، اداروں اور دنیا کے باشندوں کے اداروں میں جاری ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ میں ان دنوں کے خواب دیکھتی ہوں جب قدیم مقامی اور دوسرے لوگوں کے درمیان رشتے مستحکم ہوں گے، جب وہ اپنی صلاحیت اور قابلیت کو یک جا کر کے اس گھرے پر زندگی کو کم غیر مساوی بنائیں گے انسانیت کے حق کیے ہوئے سائنسی اور تہذیبی خزانوں کے پھیلاؤ کو بہتر بنائیں گے تاکہ امن اور انصاف پھیلے پھولے۔

آج جنرل اسمبلی اپنے سینتالیس ویں اجلاس میں اقوام متحدہ کے 1993 کے سال کو دنیا کے قدیم مقامی لوگوں کے سال کے طور پر منانے کا اعلان کرے گی جس میں انڈین عوام کے اداروں کے اور Continental Movement of Indigenous, Blacks and Popular Resistance کے سربراہ موجود ہوں۔

سب ریکی طور پر اجلاس میں شریک ہوں گے تاکہ 1993 کو صحیح معنوں میں اقدام کا سال بنایا جائے جس میں مقامی عوام کو ان کے قومی سیاق و سباق میں صحیح مقام دیا جاسکے اور انھیں باہمی بین الاقوامی معاہدوں میں بھی شریک کیا جاسکے۔

’بین الاقوامی سال برائے عالمی قدیم عوام‘ کی کامیابی اور عالمی اعلان کی تیاریاں نتیجہ تیار ہونے پر شمار انڈین بھائیوں کی شرکت کا، غیر سرکاری اداروں کا اور ماہر ورکنگ گروپ کی کامیاب کوششوں کا اور اقوام متحدہ میں مثال کئی ملک کی مزید جامع کوششوں کا۔

ہمیں امید ہے کہ اسمبلی قدیم مقامی عوام کے حقوق کے اعلان میں منسوب کی ضابطہ ہندی میں اس سلسلے کی حقیقی مشکلات کا بغور مطالعہ کرے گی جو ہم انڈین امریکیوں پر بہت رہی ہیں۔

ہمارے عوام کو دیکھ پہنچانے والے مسائل پر غور و خوض کے لیے ایک سال مخصوص ہوگا۔ اس سلسلے میں ہم تجاویز پیش کرنے کے لیے مختلف نوعیت کے کام کرنے کے لیے تیار ہیں جن کے ذریعے منسوبوں پر عمل کے لیے دیا جائے جاسکے۔ یہ سب کچھ مناسب انداز میں ان لوگوں سے نسلی امتیاز، جبر، تعصب اور استحصال ختم کرنے کے لیے یقینی جواز اور دلائل کے ساتھ کیا جائے گا جن کو افلاس اور کم نامی میں ڈھکیل دیا گیا ہے۔ امن کا یہ نوبل انعام کرۂ ارض کے ملا مت زدہ افراد کے لیے ایک پہچان ہے، ہمت افزائی ہے اور ان کے مستقبل کے لیے ایک مقصد کی مانند ہے۔

میری خواہش ہے کہ تمام لوگوں میں ایک شعوری احساس امن اور انسان سے ایک جہتی کا جذبہ پیدا ہوگا، جو نئے ہزارے میں مساوات اور عزت کی نئی راہیں پیدا کرے گا، جن پر اخوت کی خاکیت ہوگی، ظالمانہ تنازعات کی نہیں۔

آج کل ہر سمت یہی خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ جنگ اور تشدد کی جگہ پوری نسل انسانی کو اپنی تاریخی اقدار کو بچانے کے لیے اختلاف میں بھی یک جہتی کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ کچھ کرنے کے لیے ہم سب کو مل کر کرۂ ارض پر زندگی کے اہم عناصر میں تبدیلی اور قلب مابیت کی کوشش کرنی ہوگی، جو اس کبرے اخلاقی بحران سے نمٹ سکے، انسانیت جس سے خونم خون ہو رہی ہے۔ بلاشبہ، یہ عمل مستقبل کے ڈھانچے پر فیصلہ کن طریقے سے اثر انداز ہوگا۔

اس بات کا بہت امکان ہے کہ سیاسی اور معاشی قوت کے کچھ مراکز، کچھ مدبرین و دانش ور حضرات انسانی سرگرمیوں کے میدان میں قدیم مقامی نسل کے لوگوں کی عملی شمولیت کے فوائد سے آگاہ نہ ہوئے ہوں۔ پھر بھی، مختلف سیاسی اور دانش ور ’Amerindians‘ کی شروع کردہ تحریک بالآخر ان لوگوں کو قائل کر دے گی کہ، معروضی مصلحت نگاہ سے، ہم ان تاریخی متبادلات کا حصہ ہیں جو آج کل بین الاقوامی سطح پر زیر بحث ہیں۔

خواتین و حضرات، اجازت چاہتی ہوں کہ میں بے لاگ اور راست الفاظ میں اپنے ملک کے بارے میں کچھ کہوں۔

نوبل امن انعام نے جس توجہ کو کوسے مالا پر مرکوز کیا ہے، وہ اس بات کی واضح کرتی ہے کہ انسانی حقوق کو اب بین الاقوامی سطح پر نظر انداز نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کو بھی وقار بخشنے کی جو میرے ملک میں سماجی اور منصفانہ مساوات کی جدوجہد میں اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔

یہ بات پوری دنیا والے جانتے ہیں کہ کوسے مالا کے عوام نے اپنی جدوجہد کے نتیجے میں اکتوبر 1944 میں، ایک عرصے کے لیے جمہوریت حاصل کی تھی، جس میں اداریت اور انسانی حقوق مرکزی فلسفے کی بنیاد رہے ہیں۔ اس وقت کوسے مالا اپنی مکمل قومی حاکمیت کی جدوجہد کے باعث امریکی ہر اعظم میں ایک استثنیٰ کی کیفیت میں تھا۔ پھر بھی، 1954 میں ایک سازش نے، جو طاقت کے رزاقی مراکز، نوآبادی کے ورثہ اور بیرونی طاقتوں کے مفاد پرستوں نے تیار کی تھی، جمہوری حکومت کو مسلح حملے کے نتیجے میں ختم کر دیا تھا، اور اس طرح جبر کا پیرانا نظام دوبارہ مسلط کر دیا گیا تھا جو میرے ملک کی تاریخ کا امتیازی وصف رہا ہے۔

حکومت کے خلاف بغاوت کو کچلنے کی کوشش میں آمرانہ حکمرانوں نے بڑے خون خرابے کیے ہیں۔ انہوں نے دیہات کو تہس نہس کر دیا ہے، ہزاروں، خصوصاً انڈین کاشت کاروں، سیکڑوں ٹریڈ یونین کے کارکنوں اور طلبہ، سربراہ اور وہ دانش وروں، سیاست دانوں، مذہبی رہنماؤں اور راہباؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اگرچہ قوم کی حفاظت کے نام پر اس باقاعدہ غارتگری کے ذریعے ہن لاکھ کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے جبراً بے دخل کر دیا گیا ہے؛ بے شمار افراد کو ہمسایہ ملکوں میں پناہ دینی پڑی تھی۔ کوسے مالا میں اس وقت تقریباً 100,000 یتیم اور 40,000 یتیمائیں ہیں۔ سیاست دانوں کو قاتل کرنے کا طریقہ حکومت کی پالیسی کے طور پر کوسے مالا میں ایجاد کیا گیا تھا۔

آپ جانتے ہیں کہ میں ایک مقتول خاندان کی واحد بچ جانے والی فرد ہوں۔

میرا ملک ایسے بحران میں تباہ ہوا ہے دنیا میں جس کی مثال نہیں ملتی۔ دنیا میں ہونے والی تہذیبوں نے انواع کی طاقت کی ہمت افزائی سے ملک کے لیے ایک آئین کی تیاری کی سیاسی راہ ہموار کی تا کہ سیاست کے میدان میں ہمت ہو اور حکومت کو شہری حلقوں کے حوالے کیا جاسکے۔ اس نئی حکومت کو آٹھ برس ہو چکے ہیں اور کچھ میدانوں میں کچھ اہم تہذیبیاں ہوتی ہیں۔

پھر بھی، ان کشا دیگوں کے باوجود، معاشیاتی بحران کے درمیان، جبر اور انسانی حقوق کی پامانی جاری ہے، جو تیز ہوتی جا رہی ہے، اس حد تک کہ آبادی کا تقریباً چوراسی فی صد حصہ مفلس، اور تقریباً ساڑھے فی صد مفلسی کے نچلے درجے پر ہے۔ مسلسل دہشت لوگوں کو اپنی اہم ضروریات کے آزادانہ اظہار سے روکتی ہیں۔ اندرونی طور پر مسلح تنازعے اب بھی باقی ہیں۔

کچھ دنوں سے میرے ملک میں دنیاوی بحران کے حل اور کوسے مالا میں 1962 سے جاری مسلح تنازعے کے سیاسی حل کی تلاش نے مرکزیت اختیار کر لی ہے۔ اس عمل کی ابتدا حکومت کے فرمان کے مطابق کے Comision Nacional de Reconciliación اور Nacional Guatemalteca (URNG) کے درمیان ہونے والے اس معاہدے سے ہوئی تھی اور سلو میں جس پر دستخط ہوئے تھے۔ یہ معاہدہ پہلا قدم تھا

جس کے ذریعے گوئٹے مالا میں Agreement of Esquipulas کے جذبے کو متعارف کیا جا رہا تھا۔
اس معاہدے اور URNG اور گوئٹے مالا کی سوراگنی کے مختلف حلقوں کے درمیان بات چیت، اور
مذاکرے مذاکرات ہوئے اور صدر سیرانو (Serrano) کی حکومت نے بھی حکومت اور گوریلوں کے مابین
بات چیت کی شروعات کی جن کے نتیجے میں تین معاہدے ہو چکے ہیں۔ بہر حال انسانی حقوق کے موضوع کو
بہت وقت لگا ہے، اس لیے کہ یہ گوئٹے مالا کے مسائل کا مرکزی موضوع ہے، اور اس موضوع کے اطراف اہم
اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود بات کافی آگے بڑھی ہے۔

ان مذاکرات کا مقصد ہے کہ ان کے ذریعے معاہدے ہوں تاکہ گوئٹے مالا میں حقیقی جمہوریت قائم ہو
اور جنگ کا اختتام ہو۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں، متعلقہ فریقوں کی خیر-گلی اور شہری حلقوں کی عملی شمولیت
سے قومی یک جہتی قائم ہو سکتی ہے، تاکہ سارے پرانے مقاصد اور ارادے پس پشت ڈال دیے جائیں اور
گوئٹے مالا کو اس الجھن سے نکالا جائے جو بددی محسوس ہونے لگی ہے۔

بات چیت اور سیاسی اہتمام و تنظیم، بلاشبہ ان مسائل کے حل کے مناسب طریقے ہیں جن کے ذریعے
گوئٹے مالا کے عوام کی زندگی کی ضروریات پوری کی جانے کے لیے ملک میں جمہوریت قائم کی جا سکتی ہے۔
پھر بھی، میں اس بات کی قائل ہوں کہ اگر گوئٹے مالا کے مختلف النوع حلقے اپنے فطری اختلافات کا احترام
کرتے ہوئے بھی متحد ہونے کے لیے کچھ بنیادیں فراہم کر سکیں تو وہ سب مل کر ان مسائل کے کوئی نہ کوئی حل
نکال سکیں گے جو گوئٹے مالا میں ہونے والی جنگ کا سبب ہوئے ہیں۔

دوسرے شہری حلقوں اور بین الاقوامی کمیونٹی کو مطالبہ کرنا چاہیے کہ URNG اور حکومت کو اتنا وقت نہیں
لینا چاہیے جس میں وہ انسانی حقوق پر مذاکرات میں پھنسے ہوئے ہیں، اور انھیں آگے بڑھ کر کام کرنا چاہیے تاکہ
کہ جلد از جلد اقوام متحدہ کے تصدیق شدہ معاہدے ہو سکیں۔ اسی مرحلے پر یہیں اوسلو میں یہ واضح کرنا
ضروری ہے کہ گوئٹے مالا میں انسانی حقوق کا معاملہ، اس وقت، وہ سب سے ضروری مسئلہ ہے جس کو حل ہونا
چاہیے۔ میرا یہ کہنا نہ سمجھنی ہے اور نہ بلا جواز ہے۔

بین الاقوامی اداروں، The United Nations Commission on Human Rights، The Interamerican Commission of Human Rights اور بہت سے انسان دوست اداروں کی تحقیقات
ہے کہ گوئٹے مالا ان امریکی ملکوں میں سے ایک ہے جس میں بڑے پیمانے پر ان حقوق کی خلاف ورزی
ہو رہی ہے، اور بے شمار واقعات میں عام طور پر تحفظ فراہم کرنے والی قوتیں ملوث پائی گئی ہیں۔ یہ بہت
ضروری ہے کہ عوام اور خصوصاً انڈین لوگوں پر جبر اور ایذا رسانی کا خاتمہ ہو۔ جبری بھرتی اور نوجوانوں کے
Patrols of Civil Self Defense میں انضمام کو، جو خاص کر انڈین افراد پر لگا ہوتا ہے، فوراً روک دیا جانا
چاہیے۔

جتنی جلد ممکن ہو، گوئٹے مالا میں جمہوریت قائم ہونی چاہیے۔ یہ اشد ضروری ہے کہ انسانی حقوق کے
معاہدوں پر عمل درآمد ہو یعنی نسل پرستی ختم کی جائے، اور سماج کے تمام حلقوں کو انجمن سلازی اور ملک میں

آمدرفت کی آزادی کی ضمانت دی جائے۔ المختصر، یہ ضروری ہے کہ تمام میدان، مکمل حقوق کے ساتھ کثیر گروہی سوسائٹی پر کھلے ہوں، ملک کو فوج کے قبضے سے پاک کیا جائے اور ترقیات کے لیے ایسی بنیاد فراہم کی جائے کہ ملک کو آج کی کم ترقیاتی کیفیت اور افلاس کے چنگل سے رہائی ملے۔

ان تمام ممالکوں میں سب سے تلخ، جسے عوام کا ایک بڑا حصہ جھیل رہا ہے، جبری ملک بدری کا ماحکمہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ فوجی دستوں کے ہاتھوں عوام کو جبراً اپنے گاہوں، اور اپنی مادر زمین کو چھوڑنا پڑا جہاں ان کے پڑکھوں کی قبریں ہیں، جہاں فطرت نے ان کو زندگی دی اور ترقی پذیر سماج مہیا کیا۔ اس سب کچھ نے مل کر سماجی اداروں کا ایک مربوط نظام اور ایک کام کرتی ہوئی جمہوریت دی۔

کوئٹے مالا میں در بدر اور ملک بدر ہونے والوں کا معاملہ بڑا دل شکن ہے۔ کچھ کو تو پوری زندگی کے لیے دوسرے ملکوں میں رہنے کی سزا دی گئی ہے، جب کہ اکثریت اپنے ہی ملک میں در بدر ہے۔ ان لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے پر اور خشک مالوں، گھائیوں اور تکلیف دہ جگہوں پر رہنے پر۔ کچھ کو تو کوئٹے مالا کا باشندہ بھی نہیں سمجھا جاتا، مگر مارے ہی افلاس اور بھوک کی سزائیں جھیل رہے ہیں۔ وہاں اس وقت تک اپنی جمہوریت قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ سارے مسائل حل نہیں کیے جاتے اور ان لوگوں کو اپنی زمینوں پر اور اپنے گاہوں میں دوبارہ آباد نہیں کیا جاتا۔

نئی کوئٹے مالا کی سوسائٹی میں زمین کی ملکیت کے بنیادی مسئلے کو نئے سرے سے ترتیب دیا جانا چاہیے، تاکہ ذرا ملتی صلاحیتیں ترقی کر سکیں اور ساتھ ہی زمینیں ان کے حقیقی مالکوں کو واپس آجائیں۔ اس عظیم نو کے معاملے میں فطرت کا احترام لازمی ہونا چاہیے تاکہ اس کی حفاظت کے لیے اس کو زندگی کو پیدا کرنے کی قوت اور صلاحیت واپس مل سکے۔

سماجی انصاف جمہوریت کی سب سے بڑی پہچان ہوتا ہے۔ یہ تقاضا کرتا ہے کہ نوزائیدہ بچوں کی خوف ناک حد تک بڑھی ہوئی شرح اموات کا، ناقص غذاؤں کا، تعلیم کی کمی کا، اور زندگی گزارنے کے لیے ناکافی مشاہدے کا حل دریافت کیا جانا چاہیے۔ یہ مسائل کوئٹے مالا کی آبادی پر بڑی طرح اثر انداز ہو رہے ہیں، اور بظاہر شان کا کوئی حل دکھائی دیتا اور نہ حل ہونے کی کوئی امید نظر آتی ہے۔

آج کی سوسائٹی کے خدوخال عورت کے کردار سے ابھرتے ہیں پھر بھی عصبانہ نازک کو مکمل آزادی ابھی تک دنیا کے کسی بھی ملک میں پوری طرح حاصل نہیں ہوئی ہے۔

کوئٹے مالا کی تاریخی ترقی اب اس بات کی مظہر ہے کہ نئے کوئٹے مالا کی سماج میں عورتوں کی عملی اعانت کو ناقابل تنسیخ ہونا چاہیے، جس کا، میرے ناقص خیال میں، اندین عورتوں نے اپنے کردار سے خود ہی مطالبہ کر دیا ہے۔ یہ نوٹیں امن انعام قرار ہے ان کا جو دنیا کے بیش تر ممالک میں آج بھی شدید ترین استحصال، تفریق اور گنہارے سے لگا دیے جانے کا شکار ہیں، مگر اب بھی دنیا کو زندگی اور زرخیزی سے نواز رہی ہیں۔

ان مسائل کے حل کے بغیر کسی بھی ملک میں جمہوریت، ترقیات اور جدت کا حصول ناممکنات میں سے ہوگا۔

کوئے مالا میں قدیم مقامی لوگوں کے حقوق اور ان کی شناخت کا احترام اٹھایا ہے، جن کو نہ صرف نوآبادیاتی دور میں بلکہ دور جمہوریت میں بھی نظر انداز اور نا پسند کیا گیا ہے۔ قومی سطح کے ہر پہلو پر مقامی قدیم آبادی کے کردار کی تھکیل کے بغیر ایک آزاد، خود مختار اور جمہوری کوئے مالا کا تصور بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک بالکل نیا تجربہ ہوگا، ایسے خدو خال کا، ابھی ہم جس کو بیان بھی نہیں کر سکتے۔ مگر یہ اصلی کوئے مالائی قومیت کے امتیازی وصف کو تاریخ میں جگہ دے گا، اس سچے خاک کے گوجو ایک طویل عرصے سے دھندلایا ہوا ہے۔

اس ضرورت کی اہمیت ہی وہ مسائل ہیں جو مجھے، اس ششماں سے، اس موقع پر مجبور کر رہے ہیں کہ میں قومی رائے اور بین الاقوامی کمیونٹی سے اصرار کروں کہ وہ کوئے مالا میں زیادہ عملی دلچسپی دکھائے۔

اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ایک نوپل انعام یافتہ ہونے کی حیثیت میں میرا کوئی کردار ہو سکتا ہے، کوئے مالا کے امن کے لیے مذاکرات کے عمل میں بہت سے امکانات پر غور کیا گیا ہے، مگر اب میں سوچتی ہوں کہ یہ کردار امن کے فروغ، قومی یک جہتی، اور قدیم مقامی لوگوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں زیادہ کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس طرح کہ میں ضرورت کے مطابق کچھ اقدام کر سکوں، اور اس امن انعام کو محض کاغذ کا ایک ٹکڑا بننے سے بچا سکوں جس کو وہ کر کے میز کے ایک خانے میں رکھ دیا گیا ہو۔

میں تمام سابق اور گروہی حلقوں سے درخواست کرتی ہوں، جو کوئی مالائی محام کا حصہ ہیں، کہ وہ مسلح تنازعے کا پیرامن حل تلاش کرنے کے عمل میں حصہ لیں، سیاہ فام ladinos اور انڈین لوگوں کے درمیان مستحکم یک جہتی کی تعمیر کریں، جو سب مل کر اپنے اختلافات میں رہتے ہوئے بھی ایک ”کوئے مالائیت“ تخلیق کریں۔

ان سطور کے ساتھ میں بین الاقوامی کمیونٹی کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ مخصوص عمل کے ساتھ اس کا پتھر میں حصہ لیں تاکہ تمام پارٹیاں اپنے ان اختلافات کو دور کر سکیں جو مذاکرات کو انتظار کرو اور دیکھو کی کیفیت میں رکھے ہوئے ہیں، تاکہ وہ سب سے پہلے انسانی حقوق کا ایک معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوں۔ اس کے بعد، مذاکرات دوبارہ شروع ہوں اور ان مسائل کی نشان دہی کریں جن پر مصالحت ہو سکتی ہے، تاکہ امن کے معاہدے پر دستخط ہو جائیں اور اس کی فوری توثیق ہو جائے، اس لیے کہ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے کوئے مالا کے موجودہ حالات میں بڑی بہتری آجائے گی۔

میری رائے یہ بھی ہے کہ اقوام متحدہ اس میں زیادہ راست انداز میں شرکت کرے، یعنی محض مشاہدہ کرنے والے کا کردار ادا کرنے سے آگے بڑھے اور اس عمل کو آگے بڑھانے میں معاونت کرے۔

خواتین و حضرات، اس حقیقت کا، کہ میں نے امریکی براعظم کو فوقیت دی ہے، اور خصوصاً اپنے ملک کو، یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے دوسرے لوگوں کے مفادات اور امن کے دفاع میں، زندہ رہنے کے لیے ناقابل اشتغال حقوق کے لیے ان کی مسلسل جدوجہد کے لیے میرے دل و دماغ میں کوئی اہم جگہ نہیں ہے۔ یہاں جمع ہونے والوں کی اکثریت مندرجہ بالا حقیقت کا ثبوت پیش کرتی ہے، اور ان سطور کے ذریعے میں تمہاری اکتسار کے ساتھ آپ کی خدمت میں اپنا یہ تشکر پیش کرتی ہوں۔

پچھلے چند برسوں میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ دنیا بھر میں کرداروں میں بھی بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔ مشرق اور مغرب کے درمیان تنازعہ ختم ہو چکا ہے اور سرد جنگ اپنے اختتام کو پہنچ گئی ہے۔ ان تبدیلیوں نے، جن کے اصل پیکر کی ابھی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی، بہت سے خلا چھوڑے ہیں کہ دنیا کے لوگ ان کو استعمال کرنے کے لیے آگے آئیں، جدوجہد کریں اور قومی قطعات زمین اور بین الاقوامی توثیق حاصل کریں۔

آج ہمیں جنگ کرنا ہوگی ایک بہتر دنیا کے لیے، جو فلاس اور نسلی پرستی سے پاک ہو، پر امن مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا کے لیے جہاں سے 1991 کا نوبل امن انعام حاصل کرنے والی شخصیت مادم آنگ ساں سٹو کی کی آزادی کی درخواست کی جاتی ہے، بلقان میں ایک منصفانہ اور پرامن حل کے لیے، جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے اختتام کے لیے، نگارا کا کے استحکام کے لیے، ایل سلواڈور کے امن معاہدے پر عمل درآمد کے لیے، ہائیٹی میں جمہوریت کے دوبارہ قیام کے لیے، پناما کی مکمل حاکمیت کے لیے، اس لیے کہ یہ سب بین الاقوامی حالات میں اعلیٰ ترین انصاف کے مقاصد کو پیش کرتے ہیں۔

ایک پرامن دنیا جو استحکام مہیا کرے، سوسائٹی کے سماجی اور تہذیبی ڈھانچے کے لیے، باہمی رشتے اور اتفاق سے جن کی جڑیں گہری ہوں اور جن کا اثر توانا ہو۔

جب ہم پرامن ہم بودیت اور ماحول کے تحفظ کے لیے کوشش کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں پوری فہم انسانیت کی دلی خواہشات کے مطالبات ہوتے ہیں۔ ہم جدوجہد کرتے ہیں وہ مستقبل کو پاک کرتی ہے اور اس کی تکمیل کرتی ہے۔

ہماری تاریخ ایک زندہ تاریخ ہے، جو دھڑکتی ہے، جس نے کئی صدیوں کی قربانیاں سہی ہیں اور اب بھی زندہ ہے۔ اب یہ مزید قوت کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ وہ جج جو ایک طویل عرصے سے سونے پڑے ہوئے تھے آج کسی اشتباہ کے ساتھ جاگ اٹھے ہیں، حالاں کہ وہ آج ایسی دنیا میں اٹھوے بن رہے ہیں جو اس وقت الجھاؤ اور غیر یقینی سے عبارت ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ عمل طویل اور الجھا ہوا ہوگا، مگر یہ کوئی یوٹوپیا نہیں ہے اور ہم، یعنی انڈین لوگ، اس کے اطلاق پر نیا بھروسہ کر رہے ہیں۔

کوئٹے والا کے عوام اکٹھے ہوں گے اور اک مستقبل تعمیر کرنے میں اپنی طاقت سے واقف ہوں گے۔ وہ مستقبل کی کاشت کی تیاری کر رہے ہیں، تاکہ خود کو واحد کی مشابہت سے چھٹکارا دلا سکیں، تاکہ اپنی وراثت کو دوبارہ دریافت کریں۔ ایک اصلی شناخت والا ملک تعمیر کرنے کے لیے۔ ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے۔

کوئٹے والا کے گروہی مونڈائیگ میں شامل garinunas، Ladinos اور انڈین لوگوں کے تمام رنگوں اور نازک پہلوؤں کے اتصال سے، بغیر کسی تردد کے ہمیں کئی ایک رنگ بنانے ہوں گے جو مکمل بے جوڑ اور مخالفانہ نہ ہوں۔ مگر ہم انہیں چمک اور ایک اعلیٰ معیار عطا کریں گے اسی طرح جیسے ہمارے پارچہ باف انسانیت کے لیے بہترین اور چمکتے جھلملاتے رنگوں کا مثالی huipil blouse تحفہ بن کر تیار کرتے ہیں۔

آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔

آنگ ساں سو کی

اعلان تجلیل

جیالات مآب، عزت مآب، عزمین و حضرات!

آج ہم یہاں مادام آنگ ساں سو کی کے اعتراف کمال اور ان کو 1993 کا نوبل امن انعام دے جانے کے لیے جمع ہوئے ہیں، جنہوں نے جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے نمایاں کام کیے ہیں۔ یہ موقع بہت مہربان اور جزوی مگر متعدد جذبات کو بیدار کر رہا ہے۔ انعام پانے والی شخصیت اس موقع پر موجود ہونے سے قاصر ہے۔ یہ عظیم کام، جس کا ہم اعتراف کر رہے ہیں، ابھی انجام کو نہیں پہنچا ہے۔ مادام اب بھی ایک مشکل جنگ لڑ رہی ہیں۔ ان کی دلیری اور اپنے مقصد سے ان کے والدین لگاؤ نے ان کو اپنے ہی ملک، مہما میں غمیر کا قیدی بنا دیا ہے۔ ان کی غیر موجودگی ہمارے قلوب کو خوف اور تشویش میں مبتلا کر رہی ہے، جو شاید ان کے اپنے اہل خاندان کے لیے صرف معمولی خوف اور تشویش کا باعث ہو۔ ہم اس موقع کو خوش آمدید کہتے ہیں جس پر ان سے، ان کے شوہر مائیکل آریس (Michael Aris) سے اور ان کے بیٹوں الیکو انڈرا اور کم سے انجبار ہمدردی کیا جا رہا ہے۔ ہم آپ کے احساسات میں شریک ہیں اور آپ کے اوسلو تشریف لائے، اپنی اہلیہ اور اپنی والدہ کی جانب سے انعام قبول کرنے پر آپ سب کے شکر گزار ہیں۔

ہمارا خوف اور ہماری تشویش دونوں امیدوں اور یک گونہ جذبہ اعتماد سے پر ہیں۔ امن اور مصالحت کی اس مشکل جنگ میں ہم ان افراد پر بھروسہ کرتے ہیں جو مثال قائم کرتے ہیں، جو علامت کا روپ دے سکتے ہیں اسے، ہم جس کی تلاش میں ہوتے ہیں اور جس کو بہتر طریقے سے متحرک کر سکتے ہیں۔ آنگ ساں سو کی محض ایک فرد ہے۔ ان کی شخصیت دے داریوں اور استحکام کو متحد کرتی ہے، ایسے تصور کے ساتھ جس کا بنیادی مقصد اکائی کا حصول ہے، جس کے اہم عناصر جمہوریت، انسانی حقوق کا احترام، گروہوں کے درمیان

مصالحات، عدم تشدد اور انفرادی و اجتماعی تہذیب ہونے چاہئیں۔

انہوں نے خود صاف طور پر اشارے کیے ہیں کہ وہ خصوصاً مہاتما گاندھی اور اپنے والد آنگ مراں سے جنہوں نے برما کی آزادی کی تحریک کی رہنمائی کی تھی بہت متاثر ہوئے ہیں۔ عدم تشدد کے فلسفی اور جزیل، دونوں بہت سی باتوں پر اختلاف کرتے ہیں، مگر ان دونوں میں بنیادی نوعیت کی یکسانیت بھی پائی جاتی ہے۔ دونوں میں، خالص آزادی، سچا انکسار اور بھول مادم سلو کی کہہ ان کے والد کی ”کھری سادگی“ نظر آتی ہے۔ آنگ مراں کے نزدیک رہنمائی ایک فریضہ تھا جو صرف انکسار کی بنیاد پر ادا کیا جاسکتا تھا، ان لوگوں کے اعتبار اور احرام کے ساتھ جن کی رہنمائی کی جاتی تھی۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ گاندھی اور اپنے والد سے جدوجہد فیضان کے ساتھ آنگ مراں سلو کی نے اپنے موقف میں اپنے انفرادی افکار بھی شامل کیے ہیں آج وہ جن کی بنیاد پر بلند ہیں۔ اس موقف کا مرکزی آہنگ وہی عین سادگی ہے، جو وہ اپنے والد میں پائی تھیں۔ وہ اپنی سوچ میں مرکزیت ہمیشہ انسانی حقوق کو دیتی ہیں تاکہ احرام آدمیت کا صحیح معنوں میں تحفظ ہو۔ آدمی کو ایک آزاد معاشرے میں صرف زندہ رہنے کا حق ہی نہیں، اس کو یہ حق بھی ہے کہ اس کا احرام کیا جائے۔ اس پلیٹ فارم سے انہوں نے سنجیدہ حقیقت پسندی اور تصوراتی مثالیت کے غیر معمولی امتزاج کو بھی پیش کیا ہے۔ اور اس کے معاملے میں یہ محض ایک بھیکے تک ہی محدود نہیں رہا، انہوں نے بڑی محنت سے یہ بھی دکھا دیا ہے کہ اس قسم کے نظریات کو عملی سیاست میں بھی ڈھالا جاسکتا ہے۔

امن اور مصالحات کے نظریے کو عمل میں ڈھالنے کے ضمن میں سب سے اہم شرط ہوتی ہے عدم خوف زدگی۔ آنگ مراں سلو کی اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ ان کا ایک مضمون شروع ہی ہوتا ہے اس بیان سے کہ ”طاقت نہیں، دراصل خرابی کی جڑ ہوتا ہے خوف۔“ اس بیان سے ان کا اشارہ اپنے ملک کی آمرانہ حکومت کی طرف تھا۔ اس حکومت نے خود اپنی خرابی کا سامان کیا ہے اس لیے کہ وہ ان ہی لوگوں سے خوف زدہ رہتی ہے جن کی رہنمائی کی دھوے دار ہے۔ اس عمل نے اس کو ایک شیطانی پتھر میں الجھا دیا۔ اس کے برعکس ان [آنگ مراں سلو کی] کے نزدیک رہنماؤں ہی کے لیے نہیں، عدم خوف زدگی ہم سب کی پہلی اہم ضرورت ہوتی ہے۔ انہوں نے تین جہاں بدوق کی مال کے سامنے سیزن تان کر مخالفت کی ہمت کی تھی۔ کیا اس قسم کی ہمت کا کوئی بھی مقابلہ کر سکتا ہے؟ اس منہجر کے ذہن میں اس وقت کیا خیالات آرہے ہوں گے جس نے بالکل آخری لمحے کوئی نہ چلانے کا حکم دیا تھا؟ شاید وہ سلو کی کی بہادری سے متاثر ہو گیا تھا، شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وحشیانہ طاقت کے استعمال سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ تشدد خود اپنا ہی سب سے بڑا دشمن، جب کہ عدم خوف زدگی اس کا تیز ترین ہتھیار ہوتا ہے۔ یہ محض آنگ مراں سلو کی کی متاثر کن ہمت ہی نہیں جو گاندھی اور ان کے اپنے والد آنگ مراں کی طرح، ان کو ایک طاقت ور علامت بناتی ہے۔ آنگ مراں اپنی جدوجہد کے دوران قتل کر دیے گئے تھے مگر جنہوں نے ان کے سیاسی قتل کا انتظام کیا تھا، وہ سمجھے تھے کہ اس طرح ان کو

برما کی سیاست سے باہر کر دیا جائے گا، مگر ان کا خیال قطعی غلط نکلا۔ آنگ ماں آزاد برما کی متحدہ کرنے والی علامت بن کر ابھرے جہاں آج بھی ایک آزاد سوسائٹی کے لیے لڑائی جاری ہے۔ اس مثال اور ان کے والد کی اپنی ہمت کے باعث، اپنے عوام میں ان کے بلند رُتبے نے، ان کی موت کے چالیس برس بعد، آنگ ماں کی کوہ مقام عطا کیا ہے جس کی ان کو ضرورت تھی۔ بلاشبہ آنگ ماں کی نے اپنی وراثت کو قبول کیا ہے اور وہ اپنی ہمت کے بل پر، صرف برما ہی کے سماج کے لیے نہیں، ایشیا کے بقیہ علاقوں اور دنیا کے دوسرے علاقوں کے لیے بھی متحدہ کے خلاف بغاوت کی ایک طاقت و علامت بن کر ابھری ہیں۔

میرے خیال میں ہم عام لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اپنی ہمت اور اعلیٰ نصب العین کے باعث، آنگ ماں کی ہماری بہترین صلاحیتوں کو ابھارتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل پر اپنا یقین برقرار رکھنے کے لیے ہمیں بھی بعینہ ان جیسی شخصیت کی ضرورت ہے۔ یہی چیز ہے جو علامت کے طور پر ان کو ایسی طاقت دیتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان سے کیا جانے والا تکلیف دہ ہمتاؤں میں ایسی خلاف ورزی محسوس ہوتا جو ہمارے دلوں کو آزردہ کر دیتا ہے۔ اپنے گھر کی قید پر مجبور، یہ منحنی سے عورت مثبت امیدوں کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔ اس کی موجودگی ہمارے دلوں کو اعتماد اور بھلائی کی قوت پر یقین کرنا سکھاتی ہے۔

آنگ ماں سو کی 1945 میں پیدا ہوئیں۔ ابھی ان کی عمر صرف دو برس تھی کہ ان کے والد کو قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کو اپنے والد یاد نہیں۔ اس کی ماں سفیر تھیں، اور اس طرح آنگ ماں کی کے ابتدائی دن ملک سے باہر گزرے تھے۔ 1967 میں انھوں نے سیاست، فلسفے اور معاشیات میں سینٹ پیٹریکس کالج آکسفورڈ سے ڈگری حاصل کی۔ 1969 کے بعد سے انھوں نے اقوام متحدہ نیویارک میں ملازمت کی۔ 1972 میں منیت کے ایک ماہر برطانوی مائیکل آؤس سے شادی کر لی۔ کچھ دنوں بعد ان میں قیام کیا مگر ساتویں عشرے کے درمیان میں واپس آکسفورڈ چلی گئیں۔ دو بچوں کی گھریلو خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ آنگ ماں کی نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھیں اور جدید برمی ادب کا مطالعہ کیا۔ کچھ دنوں کیونویونیورسٹی جاپان میں اور Indian Institute of Advanced Studies دہلی میں ملازمت کی۔ 1988 میں لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کی ملازمت چھوڑ کر برما واپس ہوئیں۔ ان کی مصروفیات میں کہیں اس بات کا مشاہدہ تک نہیں ملتا کہ 1988 میں وہ یہ کردار ادا کریں گی۔ مگر انھوں نے اس کی اچھی طرح تیاری کر رکھی تھی۔

اس بات کے بہت سارے ثبوت موجود ہیں کہ ان کے عوام کے مقصوم کا مستقل بوجھ انھیں کے ذہن پر رہتا ہے۔ ان کے شوہر نے ہم کو بتایا ہے کہ وہ بار بار مجھے یاد دلاتی رہتی تھیں کہ ایک دن مجھے کو برما واپس آنا ہوگا، اور یہ بھی کہ وہ میری امداد پر بھروسہ کریں گی۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، ان کا مطالعہ زیادہ سے زیادہ برما کی جدید تاریخ پر مرکوز رہتا ہے۔ برما کی تاریخ میں ان کے والد کے کردار کے مطالعے نے ان کی سیاسی وفاداری کو ان معنوں میں فروں تر کر دیا ہے کہ والد کے لہادے کا بوجھ اب بیٹی کے کندھوں پر آ پڑا ہے۔

جاپان منتقلی کے دوران وہ بالکل اپنے والد کے نقش قدم پر چل رہی تھیں۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران

آنگ سان نے جاپان ہی کی سر زمین پر برما کی آزادی کو ترجیح دی تھی۔ جب جاپان نے برما پر یلغار کی تھی تو آنگ سان اور اس کے ساتھی بھی ان ہی کے ساتھ برما گئے تھے۔ مگر جلد ہی انھوں نے برطانوی استعمار کی فوجوں سے جنگ کے بجائے برما کو اتحادی فوجوں سے بازیاب کرانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ جنگ کے اختتام کے بعد انھوں نے برطانیہ سے مذاکرات کی سربراہی بھی کی جس کے نتیجے میں بالآخر برما کو آزادی ملی۔ آنگ سان سلو کی کوششوں سے ہوا کہ انھیں ان کارگزاریوں کا اور ان آدرشوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے جن کے زیر اثر برما کو آزادی ملی تھی۔ اپنے ایک عمدہ مضمون میں انھوں نے ہندوستان اور برما کے نوآبادیاتی تجربوں کا تقابلی کرتے ہوئے برما کے تہذیبی ورثے کے خصوصی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ نتائج بہت اہم ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے کہ آپ کس روایت کا حصہ ہیں، آپ اپنی شناخت کراتے ہیں کہ آپ کیا ہیں۔ آنگ سان سلو کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے قومی اور تہذیبی ورثے کے جن بہترین پہلوؤں سے وہ روشناس ہوتی ہیں، لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول کرائیں اور انھیں کے ذریعے سے اپنی شناخت بھی کرائیں۔ ایسی عمیق دانش اور اتنا شدید احساسِ شناخت ہی ان کی سیاسی جدوجہد کی غیر معمولی توانائی ہے۔

آنگ سان سلو کی 1988 میں برما واپسی بظاہر سیاسی حالات کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی خفیف والدہ کی علالت کی وجہ سے ہوتی تھی۔ مگر، اسی زمانے میں سیاسی شورش شروع ہو چکی تھی۔ مظاہرے ہو رہے تھے پولیس سے جھڑپیں ہو رہی تھیں جن میں دوسو کے قریب افراد مارے جا چکے تھے۔ جب وہ اپنی والدہ کے آخری دنوں میں ان کی تیمارداری میں مشغول تھیں، بد امنی جاری تھی۔ یہ صورت حال تھی جب انھوں نے اس میں عملی حصہ لینے کا فیصلہ کیا جس کو انھوں نے ”قومی آزادی کی دہری جدوجہد“ کا نام دیا تھا۔

فوج 1962 میں حکومت پر قبضہ کر چکی تھی۔ 1988 میں پھوٹنے والے فسادات بڑھتے ہوئے جبر و تعسُّد کا بوجھل تھے۔ اسی سال کے موسم گرما میں، جب حالات ناگفتہ بہ ہو رہے تھے آنگ سان سلو کی نے حکومت کو ایک خط لکھ کر مداخلت کی، جس میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ آزاد معزز افراد پر مشتمل ایک مشاورتی کونسل قائم کی جائے جو ملک میں رائے شماری کا انتظام کرے۔ اپنے خط میں انھوں نے طرفین کے درمیان نظم و ضبط کی ضرورت پر اور طاقت کے استعمال سے پرہیز پر زور بھی دیا تھا اور تمام سیاسی اسیروں کی رہائی کا مطالبہ بھی کیا تھا۔

دو برس بعد رگمن کے شویدا کون، پگولا کے سامنے آنگ سان سلو کی نے کئی لاکھ افراد سے خطاب کیا جس میں انسانی حقوق، جمہوریت اور عدم تہدد کی بنیاد پر ایک سیاسی نظام العمل پیش کیا گیا تھا۔ کئی ہفتوں کے پس و پیش کے بعد 18 ستمبر کو فوج نے برہم عمل کے طور پر پابندیوں کو مزید سخت کر دیا۔ State Law and Order Restoration Council (SLORC) کے نام کی کونسل بنادی گئی اور مارشل لا نافذ کر دیا گیا جس کے تحت جلسے جلوس پر پابندیاں عائد کر دی گئیں، جن کو توڑنے والے کو بغیر کسی پیشی کے جیل کی مراد دی جاسکتی تھی۔

سیاسی جماعتوں پر پابندی نہیں لگائی گئی (مثلاً اس لیے کہ جلسے جلسوں پر بندش کے پیش نظر اس کی ضرورت نہ تھی)۔ SLORG کے قیام کے ایک ہفتے بعد آنگ سلا کی اور حزب اختلاف کے کچھ ارکان نے مل کر NLD (National League for Democracy) بنیاد رکھ دی۔ مادام سلا کی نے شدت سے سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں، اجتماعات پر پابندیوں اور فوجی اشتعال کو لکنا اور پودے ملک میں بڑے بڑے سیاسی جلسے کیے۔ ان کی سیاسی مہم کی قابل ذکر بات ملک کے مختلف نسلی گروہوں سے ان کی اپیل تھی جو روایتی طور پر ایک دوسرے کے مخالف رہتے تھے۔

یہ ان کی ذاتی نیک نامی ہی رہی ہوگی جس نے حکومت کو اتنے عرصے تک پس و پیش میں پر مجبور کیے رکھا تھا، مگر جولائی 1989 میں ان کو ان کے اپنے گھر ہی میں قید کر دیا گیا۔ مئی 1990 میں انتخابات ہوئے جس میں NLD کو بھاری اکثریت سے کامیابی ہوئی اور قومی اسمبلی میں 80 فی صد سے زیادہ نشستیں مل گئیں۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ یہ کامیابی دراصل آنگ سلا کی ذات کی کامیابی تھی۔

آخر SLORG نے آزادانہ انتخابات کرائے کیوں تھے؟ اس لیے کہ انھیں [آمرؤں کے ٹولے کو] اس سے کہیں زیادہ مختلف نتیجے کی توقع تھی، ایسے نتیجے کی جو کسی نہ کسی طرح انھیں اقتدار میں رہنے کا جواز فراہم کر دیتا۔ اس قسم کی حکومتوں کی دشواری واضح ہو گئی کہ وہ اپنے کذب ہی کے جال میں پھنس گئی۔ بہر حال، انھوں نے انتخابات کے نتیجے کو ملنے سے انکار کر دیا، یعنی انتخابات منسوخ کر دیے گئے۔ SLORG قائم رہی مگر کمتر جواز کے ساتھ۔ عدم جواز اکثر زیادہ بے رحمی کا باعث بنتا ہے۔ یہ منشی ہر نیشنل کی اخلاقی کے مطابق انسانی حقوق کی مسلسل پامالی ہو رہی ہے۔ آج، ہر مائیک حکومت دنیا کے سب سے زیادہ جارحانہ حکومت بن چکی ہے۔ پچھلے کئی عشروں سے مادیاتی فونٹل کمیٹی نے امن کے کئی انعامات انسانی حقوق کے لیے کیے جانے والے کام کی قدر شناسی کے لیے دیے ہیں۔ ایسا اس یقین کا دل کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ ہر انسان کے لیے عزت کے ساتھ زندہ رہنے کا حق امن کے حصول کا بنیادی عنصر ہوتا ہے۔ اس علم میں ایک اور محرک پوشیدہ ہوتا ہے کہ اپنی بنیادی صورت میں، انسانی حقوق کا قیاس محض مغرب کا تصور نہیں کر یہ ہر بڑی تہذیب میں مشترک ہوتا ہے۔ اجازت ہو تو اس ضمن میں آنگ سلا کی کے ایک مضمون ”جمہوریت کی جستجو میں“ سے ایک اقتباس آپ کے گوش گزار کروں:

”جہاں انصاف نہیں وہاں قابل اطمینان امن نہیں ہو سکتا۔

کہ انصاف پر مبنی قوانین جو انسانی حقوق کے پاس دار ہوتے ہیں امن اور تحفظ کے لیے لازمی ہوتے ہیں، انھیں کوئی تنگ ذہن ہی رد کرے گا جو امن کو اختلاف کو خاموش کرنے اور اپنی طاقت کو بچانے کی ضمانت سمجھتا ہو۔ ہر مائیک لوگ امن اور مومنیت کو ٹھنڈک اور مایہ سے ہم رشتہ کرتے ہیں۔

شجر کا مایہ سچ مچ ٹھنڈا ہوتا ہے

والدین کے مایہ زیادہ ٹھنڈے ہوتے ہیں

اسا تذکرہ کے سہارے تو کچھ اور بھی ٹھنڈے ہوتے ہیں

حاکم کا سایہ ان سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے

ہر ٹھنڈک سے زیادہ ٹھنڈی بدھ کی تعلیمات

لہذا عوام کو محفوظ رکھنے والی امن اور تحفظ کی ٹھنڈک، یعنی حکومت کو بدھ کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیے۔ ان تعلیمات کا مرکز ہوتی ہے چٹائی، نیکو کاری اور پیار بھری مہربانی۔ بدھ کے عوام ایسی ہی حکومت کے متلاشی ہیں جو ان خصوصیتوں کی بنیاد پر استوار ہو۔“

ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا ہے کہ اپنے ملک کے اندر کی سیاسی ایذا رسانی نے انعام پانے والے کو ہزات خود انعام حاصل کرنے سے روک دیا ہو۔ 1936 میں کارل فان آزی بشسکی (Carl von Ossietzky) کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا جو ہٹلر کے عقوبت خانے میں بیمار تھا۔ ایسا ہی آندرے سفاروف (Andre Sakharov) اور شیخ وائلسا (Lech Walesa) کے ساتھ ہو چکا ہے۔ حکومت کے زوال سے پہلے آرمی ٹیڑ کی انتقال کر گیا تھا مگر سفاروف اور وائلسا نے اپنی جہد کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ ہمیں امید ہے کہ آئنگ سماں ملوکی، کی جہد جہد بھی کامیابی سے سرفراز ہوگی۔

پھر بھی، ہمیں اس امکان کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ ایسا آخری بار نہیں ہوگا کہ امن کا انعام پانے والا آ نہیں سکے گا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری جمعی دنیا میں امن اور مصالحت ایک باری میں حاصل نہیں کیے جاسکتیں گے۔ ہم اپنے معیارات کو کم نہیں کریں گے۔ برخلاف اس کے، ایک بہتر دنیا ہم سے اس سے بھی زیادہ ہوشیاری طلب کرتی ہے، اور اس سے فزوں تر بہادری، اور اپنے آپ میں عمیق صداقت اس برس کی انعام پانے والی شخصیت نے بھی جس کا تذکرہ کیا ہے۔ فرد کی حیثیت میں یہ ہم سب پر لاگو ہوتا ہے، مگر ان پر زیادہ جو طاقت اور اقتدار کے سنگھاسن پر براجمان ہیں۔ آئنگ سماں ملوکی جیسا انکسار کا اٹھنا سیکھے، اور دلیری کا۔ نتیجہ ہو سکتا ہے رہنے کے لیے ایک بہتر دنیا۔

Francis Sejersted، صدر نشین، ماہویائی نوبل کمیٹی کی زبانی

تقریر قبولیت

(آئنگ سماں ملوکی کی طرف سے ان کے بیٹے الیکو انڈرا آری کی زبانی)

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات!

میں اپنی والدہ آئنگ سماں ملوکی کی جانب سے اس عظیم ترین نوبل امن انعام کو قبول کرنے کے لیے

آپ کے رو بہ رُو اسی مقام پر ایستادہ ہوں۔ چوں کہ حالات نے میری والدہ کو یہاں موجود ہونے کی اجازت نہیں دی ہے اس لیے میں اپنی تمام تر کوششوں سے ان جذبات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا جیسی کہ میرے خیال میں وہ خود کرتی۔

سب سے پہلے تو میرے خیال میں وہ کہنا شروع کرتی کہ یہ نوپل انعام ان کے لیے نہیں بلکہ ہر ما کے عوام کے نام ہے۔ وہ کہتی کہ یہ انعام ان کے اپنے لیے نہیں بلکہ ان تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے ہے جو اس لمحے جب میں یہ پتلے کہہ رہی ہوں، مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں اپنی خوش حالی کے لیے، اپنی آزادی اور اپنی زندگی کے لیے اور ایک جمہوری ہر ما کے حصول کے لیے۔ یہ انعام انھیں کا ہے اور بالآخر ہر ما کی جمہوریت، آزادی اور امن کے لیے کی جانے والی طویل جدوجہد میں کامیابی بھی انھیں کی ہوگی۔

اُن کے بیٹے کی حیثیت میں یہ الفاظ افا کرتے ہوئے میں یہ بھی کہوں گا کہ میں ذاتی طور پر پُر یقین ہوں کہ اپنے نیاز اور ذاتی قربانی کے ذریعے وہ ایسی قابل قدر علامت بن گئی ہیں جس کے ذریعے ہر ما کے عوام کی حالت ناز کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ کسی کو اس حالت ناز یا بد حالی کو کم درجے کی نہیں سمجھنا چاہیے۔ حالت ناز ان کی جو شہروں، قصبوں، دیہات میں، زندہ ہیں فلسطینی میں، محرومی میں، قید میں، پکے ہوئے ہیں اور عذاب میں ہیں، حالت ناز ان نوجوانوں کی، ہر ما کے مستقبل کی، جو طیریا میں مر رہے ہیں، جنگوں میں، جہاں وہ فرار ہو کر پناہ گزین ہیں؛ بدھ ماہیوں کی جو زد و کوب اور بے عزت کیے گئے ہیں۔ میری والدہ کے علاوہ، ہم کو اُن قابل احترام عمر رسیدہ خراؤ کفراموش نہیں کرنا چاہیے جو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیے گئے ہیں۔ میں اُن سب کی جانب سے اپنے قلب کی تمام تر کہرائیوں سے اس اعلیٰ ترین اعزاز کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ یہ جان کر کہ اتنے دور دراز کے علاقے میں بھی ان کے دکھ اور درد کو محسوس کیا جا رہا ہے، آج ہر ما کے عوام اپنے سر ذرا نیا وہ لوچے کر سکتے ہیں۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ رنگون کے ایک احاطے میں ہونے والی جدوجہد، اس بڑی جدوجہد کا حصہ ہے جو سیاسی ظلم، حیات انسانی کی نجات اور نفسیاتی تسلط کے خلاف پوری دنیا میں جاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ انعام ان لوگوں کے لیے بھی اعزاز کے مترادف ہے جو جہاں کہیں بھی ہوں، اس جدوجہد میں شریک ہیں۔ یہ بھی بلا سبب نہیں کہ آج اوسلو میں ہونے والا یہ اجتماع اسی دن ہو رہا ہے جو انسانی حقوق کا بین الاقوامی دن ہے، اور پوری دنیا میں منایا جاتا ہے۔

جناب صدر! آپ کی کمیٹی کے انتخاب کو دنیا بھر میں سراہا گیا ہے۔ صرف چند دن قبل ہی اقوام متحدہ نے متفقہ رائے سے ایک تاریخی تجویز منظور کی ہے جس میں اقوام متحدہ کے موجودہ سیکریٹری جنرل کی اس تقریر پر صاف کیا گیا ہے جس میں اس انعام کی اہمیت پر اور میری والدہ کی رہائی کے لیے کی جانے والی اپیلوں کا اعادہ کیا گیا ہے۔ جس میں انسانی حقوق کے بارے میں عالمی تآسف کا بھی کھل کر ذکر کیا گیا ہے۔ تنہا اور دنیا کی تمام قوموں سے الگ، اختلاف رائے کی واحد آواز انھی تھی تو رنگون میں حکمران ٹولے سے؛ مگر بہت تاخیر

سے اور بہت کم زور۔

حکمران ٹولے نے پچھلے تیس برسوں میں برما کی ماضی کی منہری ڈھرتی، کو اس طرح تاج کیا ہے کہ آج وہ دنیا کی سب سے پس ماندہ اور معاشی طور پر تہی دست سر زمین ہو گئی ہے۔ رنگون پر حکومت کرنے والی طاقت کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا بھی وہی حشر ہو گا جو ایسی حکومتوں کا مقصوم ہوا کرتا ہے جو اپنی حکمرانی کو خوف سے، جبر سے اور نفرت سے مسلط رکھنا چاہتی ہیں۔ 1988 میں جب برما کی سڑکوں پر جمہوریت کے لیے کی جانے والی جدوجہد شروع ہوئی تھی، وہ پہلی لبرٹی جو مشرقی یورپ، ایشیا اور افریقا میں اٹھنے والی بین الاقوامی سمائی کا پیش خیمہ بنی۔ برما 1988 سے آج تک جبر کی طاقتوں، ضدی ٹولے اور SLOR کے ہاتھوں مسلسل عذاب سہہ رہا ہے۔ پھر بھی ان قوموں کی مثالیں، جنہوں نے کامیابی سے جمہوریت حاصل کی ہے، برما کی قوم کو یہ پیغام دے رہی ہیں کہ معاشی اعتبار سے ناقابل عمل مطلق العنانیت اس حکومت کو ایک دن اپنے ساتھ بہالے جائے گی۔ اور آج بڑھتی ہوئی کثرت زر، بد انتظام معاشی کیفیت اور تقریباً بے وقعت Kyat کے باعث برما کی حکومت بلاشبہ اسی کی فصل کاٹ رہی ہے جو وہ بونتی آتی ہے۔

پھر بھی مجھے قوی امید ہے کہ محض معاشیاتی انہدام ہی سے یہ حکومت زمین بوس نہیں ہوگی، بلکہ حکمران ٹولے کو ایسی ایٹلوں کے آگے ایک دن سرخم کرنا ہی پڑے گا جیسی کہ نوٹیل کمیٹی نے اس برس کے امن انعام کے ذریعے کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ موجودہ حکومت میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خوف اور جبر کی موجودہ پالیسیوں کو جو بدھ مت کے پیرو برما کی وراثت کے مقدس اصولوں میں پگاڑ پیدا کرتی ہیں، کراہیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ کوئی کھوکھلی خوشامیدی نہیں بلکہ میری والدہ کا یقین کامل ہے، جس پر وہ، احتمالات میں اپنی جماعت کی ان مختلف علاقوں سے بھی کامیابی کے بعد جہاں فوجی اور ان کے اہل خاندان بستے ہیں، اور ان صاحبان اقتدار سے معاملت کے دوران پہنچی ہیں۔ میری عمیق ترین خواہش ہے کہ وہ اعتدال اور مصالحت پسند عناصر جو صاحبان اقتدار میں موجود ہیں، برما کے اس مشکل ترین وقت میں اپنے ساتھیوں کو اپنے ذاتی احساسات اور جذبات سے ضرور آگاہ کریں گے۔

میں جانتا ہوں کہ اگر میری والدہ آج آزاد ہوتیں تو شکرا نے کے ساتھ وہ آپ سے اس دعا کی بھی خواہش کرتیں کہ جامد اور مجبور دونوں اپنے اپنے ہتھیار چھینک دیں اور یک جا ہو کر ایک قوم کی تعمیر کریں جس کی بنیاد انسانیت اور امن کے جذبات پر ہو۔

اگرچہ میری والدہ کو اکثر ایسی سیاسی مخالفت کرنے والی شخصیت کے نام سے پکارا جاتا ہے جو پرامن طریقے سے جمہوری تبدیلی کی کوشش کرتی ہے، میں یاد رکھنا چاہیے بنیادی طور ان کی جستجو روحانیت پر مبنی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے کہا ہے، ”اصل انقلاب روحانی ہوتا ہے“ اور انہوں نے لکھا بھی ہے: ”جدوجہد کے ”ضروری روحانی مقاصد“ اس مقصد کا انحصار انسانی ذمے داری پر ہوتا ہے اور ایسی ذمے داری کی اساس ہوتی ہے ”تصور کمال، اس کے حصول کی ترغیب، اس کا راستہ تلاش کرنے کی دانش، اور آخر تک نہیں تو اس پر

آگے بڑھنے کا ارادہ، ہم از کم انفرادی حدود سے بلند ہونے والے فاصلے کی ضرورت۔ ”وہ کہتی ہیں کہ ”بھرپور زندگی گزارنے کے لیے ہم میں ہمت ہونی چاہیے کہ ہم دیمروں کی ضرورتوں کی ذمہ داری لیں، ہمیں اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا چاہیے۔“ اور وہ ثابت قدمی سے اس کو اپنے عقیدے سے مسلسل مستحکم کرتی ہیں جب وہ لکھتی ہیں کہ ”ہم ما کی روایتی تہذیب کی بنیاد بدھ مت، اس انسان کو اعلیٰ ترین جاتی ہے جو تمام موجودات میں تنہا بدھیت کی اعلیٰ ترین کیفیت کو حاصل کر سکے۔ ہر انسان میں اپنے ذاتی ارادے سے سچ کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ دیمروں کو بھی اس کے حصول میں مدد فراہم کرتا ہے۔“ آخر میں وہ کہتی ہیں، ”ہم ما میں جمہوریت کی خواہش ان لوگوں کی حدود جہد ہے جو بھرپور زندگی گزارنا چاہتے ہیں، با معنی اور برابری کی زندگی، عالمی برابری کے دیمرے آزاد افراد جیسی زندگی۔ انسان کی کبھی نہ رکنے والی کوشش کا ایک تجربہ بھی یہاں ہے کہ وہ ثابت کرے کہ انسانی روح اپنی فطری خرابیوں سے بلند ہو سکتی ہے۔“

ایسا دیمر کی بار بار رہا ہے کہ میرا سب سے چھوٹا بھائی اور میں، دونوں ایک ساتھ روے میں اپنی والدہ کے لیے انعام وصول کر رہے ہیں۔ پچھلے سال ہم نے Thorolf Rana Prize for Human Rights وصول کرنے کے لیے بزرگن کا سفر کیا تھا، جو اس برس کے حیرت انگیز وقوے کا پیش خیمہ تھا۔ اس وقت تک، ہمارے دلوں میں ما روے کے عوام کے لیے خصوصی جذبات جاگزیں ہو چکے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ بہت جلد میری والدہ ہذا اپنے احساسات کا اظہار کر سکیں گی، میری زبان سے نہیں، خود اپنی زبان سے۔ اس انسان، ان کے اور برما کے عوام کے لیے اس قسم کی امداد کرنا ارض کے متفاد دیمروں کے دو عوام کو یک جا کرنے میں معاون ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے کے بتائے جانے کے بعد اور بھی بہت کچھ ہوگا۔

میں صمیم قلب سے آپ سب کا شکر گزار ہوں۔ دعا اور امید ہے کہ آج کے بعد سے رخنوں کا اندمال شروع ہو جائے گا۔ اور برسوں تک 1991 کا نوبل امن انعام برما میں پرامن کے حصول کی جانب ایک تاریخی قدم کے طور پر دیکھا جائے گا۔ ماضی سے سیکھے ہوئے سبق بھلائے نہیں جائیں گے، مگر ہمیں مستقبل سے ویسی ہی امیدیں ہیں جتنی کہ آج۔

میخائل گورباچوف اعلان تجلیل

جلالت مآب دو دمان شاہی، عزت مآب، محاتین و حضرات! اس برس کا نوبل امن انعام سوویت یونین کے صدر میخائل گورباچوف کو پیش کیا جا رہا ہے۔ ماریائی نوبل کمیٹی نے یہ انعام ان کے رہنمائی نہ کردار کے اعتراف کے لیے دیا ہے جو انہوں نے شرق/مغرب تعلقات میں ہونے والی بنیادی تبدیلیوں کے سلسلے میں ادا کیا ہے۔ بلاشبہ صدر گورباچوف نے دوسرے افراد اور دوسری قوموں سے تعاون کیا تھا۔ مگر اہم علی الاعلان اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا کثیر الجہات تعاون اور سوویت یونین کی جانب سے ان کی کوششیں ہی فیصلہ کن ثابت ہوئی تھیں۔ اسی وجہ سے نوبل کمیٹی نے 1990 میں انھیں اعزاز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہم اس دنیا میں جو اب بھی تنازعات کی زد میں ہے، ڈرامائی تبدیلیوں کے آثار محسوس کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے سامنے اس بات کی روشن علامات موجود ہیں کہ امن کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ شرق اور مغرب، طاقت کے دو زور آور قالب، زندگیوں کو خطرے میں ڈالنے والے تنازعے کو ہمیں پشت ڈالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اس کے بجائے، انہوں نے مصالحت کی بنیاد پر ٹھوٹ اور عبیر آزمائش پر قدم بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب ان کے سامنے ایک پرامن ڈھانچا کھنڈا کرنے کا ہدف ہے جس کے ذریعے دور رس قلب مابیت کا عمل شروع ہو، اور یہ عمل ہمارے حصے کی دنیا میں لاہدی جاری رہے گا۔

ہم نے شرق اور مغرب کے درمیان اس نئے موسم کے ثمرات ابھی سے دیکھ لیے ہیں۔ یورپ کی قدیم قوموں نے، جیسے پولینڈ، چیکو سلواکیہ، ہنگری اور اب شرقی جرمنی نے بھی، دوبارہ اپنی آزادی حاصل کر لی ہے، اچھا ہوا یا برا، اپنے قومی نصیب کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ اگرچہ دیانت کے اس عمل کے اپنے مسائل ہیں، اور ہمارے بڑا عظیم کے تمام علاقوں میں یہ ابھی تک پوری طرح منہانا نہیں جا سکا

ہے، پھر بھی آج، شاید ایک ہزار برس میں پہلی بار عوام کے یورپ، اور جس امید ہے کہ پڑا من یورپ کے امکانات پیدا ہو چکے ہیں۔

اس وجہ سے سرگز نہیں کہ کرۂ ارض کے ہمارے علاقے میں ہتھیاروں کی دوڑ زوال آمادہ ہو رہی ہے۔ بدلتی میں اور خوف کے باعث نصف صدی تک یہ دوڑ جاری رہی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آئینی پردے کے دونوں جانب عقلی اور مالیاتی وسائل کا خوف ناک خیاب ہوا ہے۔ بالآخر اس میں بھی، ہم تہدیلی دیکھ رہے ہیں۔

دسج چلانے کی، دو طرفہ کے ساتھ ساتھ کثیر الجہت، گفت و شنید کے ذریعے، جلد اور حقیقت پسندانہ مفاہمت نے ہمیں اس عمل کی طرف رواں کیا ہے جس میں مقررہ فوجوں اور موت بانٹنے والے ہتھیاروں میں کمی بھی شامل تھی۔ پچھلے چند ماہ میں تخفیف اسلحہ کے معاہدے ہوئے ہیں جیسا ہماری دنیا میں پہلے، بلکہ گزشتہ صدیوں میں بھی کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس برس کے امن انعام کے فیصلے کے ذریعے نوٹیل امن کمیٹی اس امر پر زیادہ زور دینا چاہتی ہے کہ اب بھی دنیا کو محفوظ بنانے اور وراثت کے زیادہ ذمہ دار اور معقول استعمال کے بے حد حساب امکانات موجود ہیں۔ جس انداز سے تنازعے کی جگہ تعاون نے لے لی ہے، دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی اس کے نتائج ابھرے ہیں۔ کچھ علاقائی تنازعے حل ہو گئے ہیں، یا کم از کم، کسی حل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ سرد جنگ کے زمانے کے غیر مصالحتی رویے نے گفت و شنید کے ایسے نمونے پیدا کر دیے ہیں جن میں علاقائی کمیونٹی کے مفاد اور ذمہ داری کی جگہ نظریاتی غور و فکر نے، یا اکثر استعمال ہونے والے، طاقت کے توازن کے بے رحم قوانین نے لے لی ہے۔

ان تہدیلیوں نے اقوام متحدہ کو ایک نئی زندگی عطا کر دی ہے؛ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں اقوام متحدہ کے قیام کے بعد پہلی بار اس کو وہ کردار ادا کرنے کے مواقع ملے ہیں جو اس کے قیام کے اولین مقاصد تھے۔ یہ قانون کی حکمرانی اور قوموں کے درمیان امن کی بحالی کی بنیاد پر بین الاقوامی کمیونٹی کی تخلیق کی اعلیٰ ترین ذمہ داری پر عمل شروع کر سکتی ہے۔

سوویت یونین کے صدر میخائل گورباچوف کو اس برس کا نوٹیل امن انعام دیا جانا ایک تاریخی واقعے سے کم نہیں، اس لیے کہ ہماری کمیٹی کی جانب سے ماضی میں دیے جانے والے انعامات، مثال کے طور پر 1975 کا انعام حقوق انسانی کے عظیم شہنشاہی آئینہ سٹاروف، اور 1983 کے امن انعام کے لیے فرید یونین کے رہنما سٹالینسکا کے انتخاب کو سوویت یونین اور پولینڈ میں سرد مہر مخالفت سے لیا گیا تھا، جس میں نارویائی نوٹیل کمیٹی کے جواز سے انکار کا عنصر بھی شامل تھا۔ اس بنیاد پر بھی یہ انعام ایک سنگ میل ٹھہرتا ہے۔ نارویائی نوٹیل کمیٹی سمجھتی ہے کہ آج کے واقعے اور دس دسمبر 1975 اور 1983 کے درمیان کا تاریخی ربط مستقبل کے لیے خوش آئند ہوگا۔

مارویائی نوبیل کمیٹی ایک خود مختار ادارہ ہے جو نہ حکومت کو اور نہ ہمارے ملک کی مارویائی اسمبلی (Storting) کو جواب دہ ہے۔ کمیٹی کے پانچ ارکان صرف اپنے ضمیر کو جواب دہ ہیں اور ان سب کے فیصلے ان کی ذاتی سیاسی مصلحتوں اور معقول سمجھ بوجھ کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ تاہم ہمارے لیے واضح رہنما اشارے دیے گئے ہیں جو سو برس قبل نکھی گئی انٹریڈ نوبیل کی وصیت کے مطابق ہیں۔

اس برس کا انعام بھی انٹریڈ نوبیل کی اپنی خواہشات اور پسند کے عین مطابق ہے۔ نوبیل کی خواہش تھی کہ انعام اس شخص کو دیا جائے جس نے ”قوموں کے درمیان بھائی چارے“ کو فروغ دینے کے لیے کام کیا ہو۔ ان کے زمانے میں عام طور پر تنازعات کے حل کے لیے بین الاقوامی تعاون کی جگہ یہی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ نوبیل کی خواہش یہ بھی تھی کہ جو کوئی بھی ”تنخواہ دار فوجوں“ کی تعداد میں کمی کے لیے اور ”امن کے حصول کے لیے اجتماعات“ کرے جس کو آج کے الفاظ میں تحفہِ اعلیٰ اور مذاکرات کہا جاتا ہے۔ اس کو امن کے انعام سے نوازا جائے۔

شاؤدو مارویائی، ہماری کمیٹی انٹریڈ نوبیل کی خواہشات سے اتنی زیادہ ہم آہنگ رہی تھی جتنی کہ اس برس رہی ہے۔

ہم ایک مخصوص احساسِ دل جمعی و مہمانیت کے ساتھ امن کا انعام صدر گر باچوف کو عطا کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک نے، شاید مختلف انداز میں، تناؤ اور جنگ کی دھمکیوں کا تجربہ کیا ہو جن کے منہوس سرمایے مابعد جنگ کے عرصے پر لہراتے رہے ہیں۔ سوویت یونین کی دی ہوئی ”کھلے پن“ اور ”تعاون کی خواہش“ جیسی نئی اصطلاحات، اور حقیقت پسندانہ مصالحت کے لیے اس کی رضامندی نے صدر گورباچوف کی رہنمائی میں نئی امیدوں کے چراغ روشن کر دیے ہیں۔

ہمیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ سوویت یونین اپنی مرحلوں کے اندر ڈرامائی قلبِ ماہیت کے عرصے سے گزر رہا ہے کہ آمریت کو جمہوریت سے تبدیل کیا جا رہا ہے کہ یونین کے سرکار کو اپنے بارے میں خود فیصلے کرنے کے حقوق دیے جا رہے ہیں اور آزاد مندی کے ذریعے معیشت کو قابو کیا جا رہا ہے۔ یہ قلبِ ماہیت ایک مہذبہ تکلیف دہ عمل ہے، جس میں قربانی شامل ہوتی ہے۔ مگر سوویت یونین کے عوام کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے عظیم ملک کے لیے بیرونی دنیا کا احترام اور ان سے وابستہ توقعات کبھی اسے عمیق نہیں تھے جتنے کہ آج ہیں۔ آج تک ”عظیم جنگِ حب الوطنی“ کی ہم ہلکہ کوئی چیز نظر نہیں آئی ہے، جو اس ملک اور ہمارے مغربی اتحادیوں نے مل کر دیکھا نہ ”قومی اشتراکیت“ کے خلاف لڑی تھی۔ اس وقت، وہ راستہ جو عالمی جنگ سے سرد جنگ تک جاتا تھا، مایوسی کی حد تک مختصر ثابت ہوا تھا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس وقت ہم سرد جنگ کے خاتمے کا جشن منا رہے ہیں۔

یوٹائیٹل گورباچوف 1931 میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے تھے جو Stavropol کے جوار میں اور قفقاز کے پہاڑی سلسلے کے شمال میں واقع، اور سوویت یونین کا حصہ تھا۔ اس سے ملحق قدیم غیر روسی

ممالک جارجیا، آرمینیا اور آذربائیجان تھے جن میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی جڑیں گہری تھیں۔ ہمارے انعام یافتہ دراصل جنوبی سوویت یونین کے رہنے والے تھے۔ وہ کسان خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور نظم انقلاب کے 14 برس بعد پیدا ہوئے تھے جس نے روسی سلطنت ہی کو نہیں، پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس وقت پیدا ہوئے تھے جب سوویت زراعت اجتماعیت کے ڈرامائی عمل سے گزر رہی تھی۔ ان کی نشوونما ایک اجتماعی باڑے میں ہوئی تھی، جہاں ان کے والد ایک ٹریکٹر اسٹیشن پر کام کرتے تھے۔

جس وقت بچپنی عالمی جنگ چھڑی تھی، وہ آٹھ سالہ طالب علم تھے اور صرف 15 برس کے تھے جب جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کیا تھا۔ جنگ کے زمانے کے حالات کے باعث ان کی اسکول کی تعلیم بکھری بکھری اور محدود رہی تھی۔ ان کو جبراً محاذ جنگ پر متبادل فوجی کی حیثیت میں لے لیا گیا تھا۔ جب امن ہوا تو وہ 14 برس کے تھے اور اپنی تعلیم شروع کر سکے تھے، مگر عام طور پر ان کی عمر کے لڑکے موسم گرما کی تعطیل میں کام کیا کرتے تھے۔ جلد ہی وہ کمیونسٹ پارٹی کے نوجوانوں کے ادارے سے وابستہ ہو گئے، اور جلد ترقی پا گئے تھے۔ جب اکیس برس کے ہوئے تو باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن بن گئے۔

دو برس بعد انھوں نے شمالی تھتاز میں واقع اپنے آبائی گاؤں کو خیرباد کہا اور قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ماسکو یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ وہیں ان کی نہ صرف رئیس ریڈو رینکو (Raisa Titorenko) سے ملاقات ہوئی، جو بعد میں ان کی اہلیہ بن گئیں، بلکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کی تحریک طلبہ کی فعال رکن بن گئے۔ ان کی ذمہ داریوں میں یونیورسٹی کے ساتھی طلبہ میں نظریات کا پرچار کرنا تھا۔ انھوں نے قانون کی ڈگری حاصل کر لی اور پھر واپس Stavropol چلے گئے جہاں ان کو کمیونسٹ یوتھ مومنٹ میں کل وقتی ملازمت مل گئی۔ 25 برس کی عمر میں وہ محکمے کے باقاعدہ رکن بن گئے تھے، جہاں زراعت ان کی خصوصی ذمہ داری تھی۔ 1967 میں انھوں نے زراعت میں دوسری ڈگری حاصل کر لی اور جلد ہی پارٹی کی مقامی حکومت کی انتظامیہ کے رکن بنا دیے گئے۔

اس برس کا انعام پانے والے 1970 میں قومی سطح کی عملی سیاست میں فعال ہو چکے تھے۔ 1970 ہی میں ان کی قسمت نے یووری کی اور 47 برس کی عمر میں ان کو پورے سوویت یونین کی زراعت کی شریک ذمہ داری سونپ دی گئی اور وہ کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفاتر میں شامل ہو گئے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ماسکو ان کا مستقل مستقر بن گیا۔ سات برس بعد ان کو سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کا سب سے طاقتور شخص لیڈر چن لیا گیا۔ یہ 1985 کا واقعہ تھا، جب ان کی عمر صرف 54 برس تھی۔ آج وہ بین الاقوامی سطح کی شخصیت بن چکے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری ہوتے ہوئے وہ سوویت یونین کی نئے سرے سے بنائی گئی پارلیمنٹ کے منتخب صدر بن گئے ہیں۔

اگرچہ میخائیل گورباچوف متاثر لیاقت اور صلاحیت رکھنے والے انسان ہیں، انھوں نے حال ہی میں اصرار کیا ہے کہ ان کے خاندان کی داستان خود ایک تاریخ ہے، یا دوسرے لفظوں میں وہی سوویت یونین کی

تاریخ ہے۔ گورباچوف دراصل اولاد ہیں انقلاب اور عالمی جنگ کے، لینن کے، اسٹالن کے، خروشیوف کے اور بریژنف کے سوویت یونین کی۔ اور اس دنیا کے پھرے لوگوں کی طرح وہ اس سوسائٹی کی پیداوار ہیں جس میں ان کی نشوونما ہوئی ہے۔

آج یہ سوویت سوسائٹی ایک تاریخی تجربہ ہے جس کی بنیادیں پل گئی ہیں، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ گورباچوف اسی سوسائٹی کے سانچے کو توڑنے کے قابل ہو گئے تھے، جس میں وہ خود ڈھلے تھے۔ اور جیسا کہ انہوں نے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں کہا تھا، جس میں انہوں نے Perestroika پر، جس کی وہ علامت ہیں، بات کرتے ہوئے کہا، ”ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم مزید عرصے اس طرح زندہ نہیں رہ سکتے جس طرح ہم رہ رہے ہیں۔ ہمیں زندگی کے ہر علاقے میں بڑی تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔“

ہمارے انجام یافتہ اپنی تمام زندگی اصلاحی اشتراکی تھے، جو وہ آج بھی ہیں، حالانکہ یہ بات ہم کو دہلا سکتی ہے، جس کا انہوں نے امریکا میں دیے گئے حالیہ انٹرویو میں اعلان کیا تھا۔ ہم سچ مچ اتنے دیہے ہوئے نہیں ہیں۔ مگر یہ موقع ہے اور نہ محل کہ ہم سوویت یونین کے اندرونی معاملات پر گفتگو کریں۔ بس مارویائی نوٹیل کمیٹی نے صدر گورباچوف کو بین الاقوامی سیاست میں رہنما کردار ادا کرنے کے سلسلے میں امن کا انعام دے دیا ہے۔

ہماری کمیٹی نے سوویت یونین کی زندگی کے ایک مخصوص منظر پر غور کیا ہے۔ کہ صدر گورباچوف نے بہت زیادہ کشادگی کا آغاز کیا ہے۔ بڑی حد تک انہوں نے بین الاقوامی اعتبار کو فروغ دینے میں مدد بھی کی ہے۔ اور بہت زیادہ کشادگی نے کئی معنوں میں تخفیفِ اسلحہ پر مبنی وسیع معاہدے، اور شرق و مغرب کے مابین تعاون کو یقینی بنایا ہے، جو آج ہمارے سامنے ہے۔

پوری دنیا سوویت یونین کے تعجب انگیز معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل سے نمٹنے کی ڈرامائی اور بہادرانہ جدوجہد کو دیکھ رہی ہے، جس نے ملک کو بلا کر رکھ دیا ہے۔ مارویائی نوٹیل کمیٹی بھی اس کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ صدر میخائیل سرگے ویچ گورباچوف، کو امن انعام کی پیشکش کو سمجھا جائے گا ضرورت کے وقت بڑھنے والے ایک ہاتھ کی مانند، سوویت عوام کے لیے نیک تمناؤں کے مانند، دیکھنے والی بیرونی دنیا کے لیے ایک نشان کے مانند، جو ان کی جدوجہد کو ایک ساقی کی نظر سے دیکھ رہی ہے، اور تاریخ میں پیش آنے والے واقعات میں ان کے احساسِ شراکت داری کے مانند۔

یہ کہا جا رہا ہے کہ اس برس کا نوٹیل امن کا صدر گورباچوف کو دیا جانا کچھ زیادہ ہی دلیرانہ عمل تھا۔ ہماری دلیری میخائیل گورباچوف کی دلیری کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی جب انہوں نے اس راستے پر قدم رکھا جس نے آج انہیں انعام کا حق دار بنا دیا ہے، یا اس دلیری کے مقابلے میں جو سوویت یونین کے بہت سے لوگوں نے بھی نئے سرے سے اپنی تاریخ رقم کرنے میں دکھائی تھی۔

Ms. Gidske Anderson، صدر نشین، مارویائی نوٹیل سوسائٹی کی زبانی

خطبہ

جناب صدر نشین، خواتین و حضرات!

یہ لمحہ میرے لیے اس لمحے سے کم جذبات خیز نہیں جب مجھے پہلی بار نوٹیل کمیٹی کے فیصلے کا علم ہوا تھا۔
کراہیے موقعوں پر عظیم لوگوں نے انسانیت سے خطاب کیا تھا، اخلاقیات اور سیاسیات کو یکجا کرنے کے لیے
کام کرنے کی اہمیت کرنے والے مشہور لوگ، جن میں میرے ہم وطن بھی شامل تھے۔

نوٹیل امن انعام کے دیے جانے پر ذہن میں ایک بظاہر سادہ سوال ابھرتا ہے: امن کسے کہتے ہیں؟
اپنے خطبے کی تیاری کے وقت مجھے ایک پرانی روسی انسائیکلو پیڈیا میں "peace" کا مطلب
"commune" نظر آیا تھا، یعنی، ایک روایتی روسی کسان کی زندگی کا حجرہ۔ میں نے اس تعریف میں، لوگوں کی
مجھے کے مطابق، ہم آہنگی، اتفاق، باہمی امداد اور تعاون کو جاگزیں پایا۔

ایسا احساس دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے آئین میں، فلسفیوں کے تحریروں میں، قدیم سے حال تک،
ملتا ہے۔ یہاں بہتوں کے نام پہلے بھی لیے جا چکے ہیں۔ میں ایک اور نام کا اضافہ کرنے کی اجازت چاہتا
ہوں "امن" دولت اور انصاف کو پھیلاتا ہے، جو قوموں کی خوش حالی کا حصہ ہوتے ہیں۔ "وہ امن جو" محض
جنگ سے مہلت دے امن کہلانے کے قابل نہیں۔ "امن کا اصل مفہوم ہوتا ہے "عمومی نصیحت۔" یہ پہلے
تقریباً دو سو برس قبل Vasily Fyodorovich Malinovsky نے لکھے تھے جو Tsarskoye Selo
Lyceum کے ڈین تھے جہاں عظیم پٹھکن نے تعلیم پائی تھی۔

اس کے بعد سے امن کے تصور کے ضمن میں تاریخ نے بہت کچھ اضافہ کیے ہیں۔ اس جوہری دور
میں اس کا مطلب نسل انسانی کی بقا کی کیفیت بھی ہوتا ہے، مگر نچوڑ وہی ہوتا ہے جیسا کہ عمومی دامنائی والے اور
دانش ور رہنما، دونوں سمجھتے ہیں۔

اس دور میں امن کا مطلب ہے، عام درجے کی ہم بودی سے تعاون کی طرف پرواز، اور قوموں کے
درمیان مشترکہ تخلیقی صلاحیت۔

حمدن کی، ارضیت و آفاقیت کی جانب، حرکت کو امن کہتے ہیں۔ آج سے پہلے کبھی یہ خیال کہ امن کی
تقسیم نہیں ہو سکتی، اتنا سچا نہیں لگا تھا۔

اختلاف کے تقاضا اور ارتباط کی صورت میں امن یکسانیت میں اکائی نہیں ہوتا مگر اکائی میں یو قلمبوی ہوتا ہے۔
مثالیت کے اعتبار سے امن سے مراد تشدد کی عدم موجودگی ہے۔ یہ ایک اخلاقی قدر ہوتا ہے اور اس
موقع پر ہمیں راجیو گاندھی یاد آتے ہیں جو چند دن قبل کتنی بے دردی سے قتل کر دیے گئے۔

میں آپ کی کمیٹی کے فیصلے کو سحریت یونین میں ہونے والی تبدیلیوں کے عظیم بین الاقوامی اعتراف کے

متراف گردانتا ہوں۔ یہ ہماری نئی سوچ کی پالیسی پر اعتماد کا اظہار بھی ہے، جو اس یقینِ کامل کی بنیاد پر ہے کہ بیسویں صدی کے اختتام پر طاقت اور اسلحے کی اہمیت کو دنیا کی سیاست سے دہس نکال دیا جائے گا۔

مجھے انعام دیے جانے کے فیصلے کو میں ایک عمل سمجھتا ہوں، ایک جہتی کا، اس یا دیگر کام سے جو سوویت عوام سے کوششوں، دشواریوں، قوتِ ارادی، لاگت اور کردار کا طلب گار ہے۔ اور ایک جہتی ایک آفاقی قدر ہے جو گزیر ہوئی جا رہی ہے ترقی کے لیے اور بنی نوعِ انسان کی ہمت کے لیے۔

مگر ایک جدید طرز کی ریاست کو ایک جہتی کے لائق ہونا چاہیے، یا یوں کہا جائے کہ اس کو قوی اور چین اتھواری معاملات میں ان پالیسیوں پر عمل کرنا چاہیے جو اس کے عوام کے اور دنیا بھر کے عوام کے مفاد میں ہوں۔ یہ کارہدف کتنا بھی واضح ہو، آسان نہیں ہوتا۔ زندگی بہت زیادہ گراں بہا اور خاصی پیچیدہ شے ہے، ان منصوبوں سے بھی زیادہ قابلِ قدر جو اس کو بہتر کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ بالآخر زندگی ان سے بدلہ لے لیتی ہے جو اس پر، نیک نیتی سے کسی، تجربہ کی بندوبست ٹھونہنا چاہتے ہیں۔ Perestroika نے ہمیں اپنے ماضی کے بارے میں یہی احساس دلایا ہے، اور حالیہ برسوں کے حقیقی تجربے نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہمیں تہذیب کے عام قوانین سے نباہ کرنا چاہیے۔

بہر حال یہ سچے دیر سے ہوا، مگر مجھے اعتراف ہے کہ 1985 کے مارچ/اپریل میں ہمیں ایک فیصلہ کن اور تکلیف دہ اور متبادل صورت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جب میں جنرل یگور یوٹس کا عہدہ سنبھالنے پر راضی ہوا، جو صحیح معنوں میں اس وقت ریاست کا سب سے بڑا عہدہ تھا، تو مجھے احساس ہوا کہ اب ہم پہلے کی طرح زندہ نہیں رہ سکیں گے اور یہ بھی کہ میں اس عہدے پر رہنا پسند نہیں کروں گا جب تک کہ مجھے بڑی اصلاحات کرنے میں مدد فراہم نہ کی جائے۔ مجھ پر یہ بھی آشکار ہو گیا تھا کہ ہمیں کچھ کرنے میں بہت عرصہ درکار ہوگا، مگر سچ تو یہ ہے کہ میں تصویر بھی نہیں کر سکا تھا کہ ہمیں کتنے مہربان مسائل اور مشکلات کا سامنا ہوگا۔ میرے خیال میں اس وقت کوئی بھی ان کی پیش بینی نہیں کر سکتا تھا۔

جو اس وقت حکمرانی کر رہے تھے انھیں معلوم تھا کہ ملک میں درحقیقت کیا ہو رہا ہے، ہم نے بعد میں جس کو "zastoi" کا نام دیا تھا، جس کا ترجمہ "جمود" ہی کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ ہماری سوسائٹی محض وقت گزاری کر رہی ہے، کہ وہ ٹیکنالوجی کے اعتبار سے ترقی یافتہ دنیا سے بہت پیچھے رہ جانے کا خطرہ مول لے رہی ہے۔ مرکزی انتظام کے تحت چلنے والی ریاست، رگ و پے میں مراہت کر جانے والا آمرانہ اور نوکر شاہی کا نظام، نظریاتِ گرفتہ سیاست، مائنس اور معاشرتی خیالات پر اجارہ داری، ہماری دولت کو ہڑپ کر جانے والے فوجی ملکیت کے کارخانے، جس میں عقلی مسائل بھی شامل تھے، ناقابلِ برداشت فوجی اخراجات جو شہری کارخانوں اور عہد کی معاشرتی کارگزاریوں کا گلا گھونٹ رہے تھے، اور انقلاب کے عرصے میں کی جانے والی کامیابیوں کی تلخ کئی کر رہے تھے جو حقیقی تھیں اور جن پر ہم سب کو فخر تھا۔ سو یہ تھی ملک کی حالت۔ نتیجے کے طور پر دنیا کے دولت مند ترین ملکوں میں سے ایک، جس میں بے پناہ امکانات تھے زول

آمادہ ہو رہا تھا۔ ہماری سوسائٹی، معاشیاتی اور عقلی اعتبار سے زوال کی طرف مڑتی جا رہی تھی۔

اس کے باوجود، عام انداز میں دیکھنے والوں کو ملک کی حالت بہتری، استحکام اور امن و امان کا منظر پیش کر رہی تھی۔ نشر و اشاعت کے ذریعہ اثر پہنکاؤ ہوئی سوسائٹی کو خبر ہی نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور ملک کے لیے مستقبل قریب میں کیا ہوگا۔ بلکہ سے ہلکا احتجاج جبر سے دیا دیا جاتا تھا۔ زیادہ تر لوگ ان کو بے دین و ملحد، بہتان پرداز اور انقلاب دشمن سمجھتے تھے۔

۱۹۸۵ کے موسم بہار میں یہ کیفیت تھی، اور احوال، چیزوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دینے کی، یا پھر محض زیبا نشی جھڑیلیاں کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ ہم اپنے آپ کو اور عوام کو دھوکا دیتے رہیں۔

ملک کی اندرونی کیفیت کا منظر ایک دوسرے کا سا تھا۔ خارجہ پالیسی کا یہ عالم تھا کہ مشرق اور مغرب ایک دوسرے کے مقابل صف آراء، دوستوں اور دشمنوں کے درمیان بے لوج تقسیم، مرد جنگ کے اوصاف رکھنے والے و ہر اندیش پڑاؤ بنے ہوئے تھے۔ مشرق اور مغرب دونوں فوجی مقابلے کی منطق کے گرفتار تھے اور اسلحے کی دوڑ کے باعث خود کو کم زور کرتے جا رہے تھے۔

موجودہ ڈھانچوں کی اکھاڑ پھچاؤ کے بارے میں سوچنا آسان نہیں تھا۔ پھر بھی، اس خیال سے کہ ایک ناگزیر تہدی ہمارے سامنے منہ کھولے کھڑی ہے، ملکی اور بین الاقوامی دونوں تناظر نے ہم کو تاریخی انتخاب کرنے کی طاقت ہم پہنچائی، میں نے جس پر کبھی افسوس نہیں کیا۔

Perestroika نے، جو ایک بار پھر ہمارے عوام کو عام سمجھ داری کی طرف راغب کر رہا ہے، ہمیں اپنے اندرون کو دنیا کے سامنے کھول دینے پر آمادہ کیا ہے، اور ملک کی اندرونی ترقیات اور اس کی خارجہ پالیسی کے درمیان معیاری رشتے کو بحال کیا ہے۔ مگر یہ سب سمجھ کرنے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ان لوگوں کو، جن کو یقین تھا کہ حکومت کی پالیسیاں ہمیشہ امن کے حصول کے لیے تھیں، ہم نے تجویز پیش کی جو پالیسی کئی اعتبار سے مختلف تھی، مگر موجودہ امن کے حصول کے لیے واقعی صحیح تھی، اس کو جاری رہنا چاہیے۔ ہم نے خارجہ پالیسی کے ضمن میں نئی سوچ کی تجویز پیش کی۔

اس طرح ہم بڑی تبدیلیوں کی راہ پر چل پڑے، جو ہمارے خیال میں میں ویں صدی میں ہمارے ملک اور عوام کے لیے بامعنی ہو سکتی ہیں، مگر ہم نے یہ سب کچھ تمام دنیا کے لیے بھی کیا۔

میں نے Perestroika اور نئی سوچ کے بارے میں اپنی کتاب ان الفاظ سے شروع کی تھی۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ ہم کو سمجھا جائے۔“ کچھ عرصے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہ تو پہلے سے ہو رہا تھا، مگر میں اس شریں سے، ان الفاظ کو ایک بار پھر دہرانا چاہوں گا۔ چوں کہ ہمارے ملک میں لا انتہا تبدیلیاں شروع ہو چکی ہیں اس لیے کہ ہم کو سچ سچ سمجھنا سمجھنا اور ہم پر یقین کرنا آسان ثابت نہیں ہوگا۔ ان کا حجم اور ان کی سنگیناں ایسی ہیں جو ایک عمیق تجزیہ چاہتی ہیں۔ Perestroika پر روایتی دانش کے اطلاق سے کچھ حاصل نہیں

ہوگا۔ یہ بے نتیجہ بھی اور خطرناک بھی ہوگا، اگر شرطیں عائد کر دی جائیں، اور کہا جائے کہ ”جوں ہی آپ، سوویت یونین والے، ہم مغرب والوں سے بالکل مشابہ ہو جائیں گے، ہم آپ کو سمجھیں گے بھی اور آپ پر یقین بھی کریں گے۔“

کوئی بھی یہ تفصیل سے بیان کرنے کی حالت میں نہیں ہے کہ Perestroika سے کیا ظہور میں آئے گا، مگر یقینی طور پر یہ توقع کرنا خود فریبی ہوگی کہ Perestroika کسی بھی چیز کی نقل پیش کر سکے گا۔

بلاشبہ دوسروں کے تجربات سے سیکھنا وہ کام ہے جو ہم کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ہو بہو دوسروں جیسے ہو جائیں گے۔ ہماری سیاست بین الاقوامی برادری میں اپنی شناخت کی حفاظت کرے گی۔ ہمارے جیسا ملک، اپنی کھلی ہوئی انفرادی ساخت، تہذیبی یوگمونی اور الم ناک ماضی، عوام کی تاریخی عظیم کوششوں اور کار عظیم کے ساتھ، وہ ملک ہے جو اکیسویں صدی کے تہذیبی سفر کے لیے اپنا راستہ خود تلاش کرے گا۔ Perestroika کو اس سیاق و سباق میں سوچنا پڑے گا، ورنہ یہ ناکام ہو جائے گا اور اس کو ترو گردیا جائے گا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ ایک ہزار سال کی تاریخ کو نظر انداز کر دیا جائے، وہ تاریخ جو ہمارے سنجیدہ تجربے میں ہے، تاکہ ہم اس سچ کو تلاش کر لیں جس کو لے کر ہمیں مستقبل کی طرف بڑھنا ہے۔

ہم پوری طرح جدید تہذیب کا حصہ بننا چاہتے ہیں، تاکہ بنی نوع انسان کی آفاقی قدروں کے ساتھ زندگی گزاریں، بیرونی دنیا سے معاشیاتی رشتوں میں بین الاقوامی قوانین کے معیار پر عمل کریں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنے مشترکہ گھر کے مستقبل کی خاطر دنیا بھر کے لوگوں کی ذمہ داریوں کے بوجھ کو اٹھانے میں شریک ہوں۔

نئے معیار کی طرف تبدیلی کا ایک عرصہ سوسائٹی کی زندگی کے تمام حصوں کے لیے دردناک عجوبہ ہوتا ہے۔ جب ہم Perestroika کی بنا ڈال رہے تھے تو ہم ہر شے کا باقاعدہ تخمینہ لگانے اور پیش بینی کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ہماری سوسائٹی آگے بڑھنے کے معاملے میں دشوار نگلی، وہ ایسی بڑی تبدیلیوں کے لیے تیار نہیں تھی جو لوگوں کے مفاد پر اثر انداز ہوں اور ان کو ہر شے چھوڑنی پڑے جن کے وہ برسوں سے عادی ہو گئے ہیں۔ شروع میں ہم نے اپنی بے انتہائی کے باعث بڑی توقعات پیدا کر دیں، اس پر غور کیے بغیر کہ لوگوں کو مختلف انداز میں رہنے اور کام کرنے کا عادی ہونے میں وقت لگتا ہے، اور لوگ توقع کرنے لگتے ہیں کہ بنی زندگی کہیں اوپر سے آئے گی۔

اب Perestroika اپنی سب سے ڈرامائی ہیئت میں داخل ہو گیا ہے۔ Perestroika کے فلسفے کی حقیقی پالیسی میں قلب مابیت کے بعد سے، جو پرانے طرز زندگی کو فاش کرنے سے شروع ہوا تھا، مشکلات بڑھتی شروع ہو گئیں۔ بہت سے لوگ خوف زدہ ہو گئے اور ماضی کی طرف واپس جانے کے خواہش مند ہو گئے۔ یہ صرف وہی لوگ نہیں تھے جو قابو رکھتے تھے طاقت پر انتظامیہ کی، فوج اور حکومتی ایجنسیوں کی، مگر

اور بہت سے لوگوں پر بھی، گزرے ہوئے عسروں میں جن کے مفاد اور طریق زندگی کا امتحان درپیش تھا، اور جو فراموش کر چکے تھے کہ پیش قدمی کس طرح کی جاتی ہے، آزاد کس طرح رہا جاتا ہے، اور خود کشیل کس طرح ہوا جاتا ہے۔

پس بے چینی، احتجاج کا بیجان اور بے حد، مگر سمجھ میں آنے والے، مطالبات اگر فوراً پورے کر دیے گئے تو مکمل ابتری پر منتج ہوں گے۔ نتیجے میں — تعمیری اختلاف کے بجائے بڑھتے ہوئے سیاسی جذبات، جو صرف جمہوری نظام میں روا ہوتے ہیں، جو اکثر تباہ کن اور غیر مناسب بھی ہوتے ہیں، انتہا پسند قوتوں سے قطع نظر، گروہ بند علاقوں میں خصوصاً ظالم اور غیر انسانی ہوتے ہیں۔

پچھلے چھ برسوں کے دوران ہم نے بہت کچھ رو کر دیا ہے جو ہماری سوسائٹی کی تجدید اور قلبِ ماہیت کے راستے میں حائل ہوا تھا۔ مگر جب سوسائٹی کو آزادی دی گئی تو وہ خود کو بھی پہچان نہ سکی، اس لیے کہ وہ بہت عرصے 'آئینے سے پرے' زندہ رہی تھی۔ اختلافات اور خرابیاں سطح پر ابھر آئیں، حتیٰ کہ خون بھی بہایا گیا، حالاں کہ ہم خون ریزی سے اجتناب میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اصلاح کی منطق، تردید کی اور بے صبری کی منطق سے ٹکرائی جو تنگ نظری اور تعصب کو جنم دیتی ہے۔

ایسے حالات میں، جن میں بہت سے مواقع بھی اور بڑے خطرات بھی ہوتے ہیں، Perestroika کے بحران کے نقطہ عروج پر، ہماری ذمہ داری ہوتی ہے اپنی راہ پر قائم رہنا، اس طرح کہ روزمرہ کے مسائل پر بھی توجہ رہے جو پالیسی کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہوتے ہیں، اور ہم کو اس طرح سے کہنا پڑا ہے کہ ممکنہ سماجی اور سیاسی دھماکے روکے جائیں۔

اب میں اپنے موقف کی طرف آتا ہوں۔ جہاں تک بنیادی پسند کا سوال ہے میں نے بہت پہلے ہی حتیٰ اور ناقابلِ تسخیر فیصلہ کر لیا ہے۔ نہ کوئی شے اور نہ کوئی فرقہ دایم سے ہو یا بائیں سے، مجھے Perestroika پر اپنے موقف، اور نئی سوچ سے دست کش کر سکے گا۔ میں اپنے خیالات اور یقینِ کامل میں تبدیلی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔

مجھے کامل یقین ہے کہ قلبِ ماہیت کے عمل سے گزرنے کے دوران پیدا ہونے والے مسائل صرف آئینی طریقوں ہی سے حل کیے جاسکتے ہیں۔ اسی وجہ سے میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ یہ عمل جمہوریت اور اصلاحات کی حدود کے اندر ہی رہے۔

اس کا اخلاقی قوموں کی خود مختاری کے مسائل پر بھی ہوتا ہے، جو ہمارے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ ہم ان تراکیب کی تلاش میں ہیں جو آئینی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے ہمارے مسائل کو حل کر سکیں۔ ہمیں عوام کی جائز پسند کا بھی خیال ہے، اس خیال کے ساتھ کہ اگر بالکل شفاف رائے شماری کے ذریعے عوام واقعی سوویت یونین سے علاحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیں تو اس عمل کی تکمیل کے لیے ایک طے شدہ عبوری عرصہ درکار ہوگا۔

ایسے ملک میں پرامن راستوں سے گزرتا آسان نہیں ہوتا، جہاں لوگوں کی نسل کے بعد نسل کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ جن کے پاس طاقت ہوتی ہے وہ اختلاف کرنے والوں کو سیاست سے الگ کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ قید بھی کر سکتے ہیں۔ صدیوں سے ملک کے تمام مسائل بالآخر تشدد کے ذریعے ہی حل کیے جاتے رہے ہیں۔ ان سب نے ہماری 'سیاسی تہذیب' پر، اگر یہاں یہ اصطلاح صادق آتی ہو تو، کبھی نہ ملنے والے نقوش چھوڑے ہیں۔

ہماری جمہوریت 'درو میں جنم' لے رہی ہے۔ ایک سیاسی تہذیب ابھر رہی ہے، ایسی جو بحث اور بحثیریت پر یقین رکھتی ہے، قانون کے نظام پر بھی، اور اس پر بھی کہ اگر جمہوریت کو کام کرنا ہے تو ایک مضبوط حکومت کی ضرورت ہوگی جس میں سب کے لیے ایک ہی قانون ہو۔ یہ عمل سخت کم ہو رہا ہے۔ Perestroika کی تلاش میں ثابت قدمی کو ایک موضوع جس پر آج کل بحث ہو رہی ہے، جمہوری تہذیبی سے سپردگی سے ناپا جانا چاہیے۔ ثابت قدمی کا یہ مطلب نہیں کہ ہم جبر، تحکم یا آزادی اور حقوق کے امتناع کی طرف لوٹ جائیں۔ میں اس سے کبھی اتفاق نہیں کروں گا کہ ہماری سوسائٹی ایک بار پھر عرصہ اور سفید میں عوام کے نائب اور عوام کے دشمن میں تقسیم ہو جائے۔ آج ثابت قدمی سے مراد ہے سیاسی اور سماجی بحثیریت کے دائرے میں رہ کر عمل کرنا، قانون کی عمل داری کا قائم ہونا تاکہ اصلاحات کا عمل جاری رہے، ریاست اور معاشیاتی نظام ڈھیر نہ ہونے پائے اور بے ترتیبی پیدا کرنے والے عناصر کو تہی پھیلا نے سے روکا جاسکے۔

ان سب کے لیے، موقع کی مناسبت سے، کچھ قدم اٹھانے پڑتے ہیں تاکہ وقتی اور دور رس فرائض پر عمل کے لیے راستے تلاش کیے جاسکیں۔ ایسی کوششیں کی جاتی ہیں، معاشیاتی اقدامات اور مناسب مفاہمت کے معاہدے کیے جاتے ہیں تاکہ لوگ انھیں دیکھ سکیں۔ میں قائل ہو گیا ہوں کہ One-Plus-Nine کا بیان تاریخ کے صفحات پر ایک ایسے ہی قدم، ایک عظیم موقع کے طور پر لکھا جائے گا۔ نہ ہمارے سرارے فیصلے قبول کیے جاتے ہیں اور نہ صحیح معنوں میں سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے زیادہ تر فیصلے غیر مقبول ہیں، ان پر تنقید کی جاتی ہے مگر زندگی کے دامن میں ہمارے لیے اور بہت سی حیرانیاں ہیں، بالکل اسی طرح جیسے کبھی ہم اس کو بھی حیران کر دیں گے۔ سوویت رہنماؤں کے کیے ہوئے فیصلوں پر جلد بازی میں نتائج اخذ کرنا، صدر کے ہر فرمان سے معلوم کرنا کہ ان کا جھکاؤ کیا ہے یا دائیں جانب ہے، آگے کی طرف ہے کہ پیچھے کی طرف، ایک بے معنی اور لا حاصل کوشش ہوگی۔

اصلاحات کو انتہا پسندانہ انداز میں جاری رکھتے ہوئے اور یکساں انداز میں اپنی سوسائٹی کو جمہوری بناتے ہوئے، ہم ان سوالوں کے جوابات تلاش کریں گے جو ہمیں آگے بڑھتے ہوئے درپیش ہوتے ہیں۔ مگر ہم دانا فی سے، اٹھتے ہوئے ہر قدم کو تولتے ہوئے، آگے بڑھتے رہیں گے۔

ہماری سوسائٹی میں ایک اتفاقی رائے ہے کہ ہم کو مملکت منڈی کی معیشت کی طرف بڑھنا ہوگا۔ ابھی اس پر اختلافات ہیں کہ ہم کس طرح اور کتنی تیزی سے آگے بڑھیں۔ کچھ لوگ اس کے حق میں ہیں کہ خواہ کچھ بھی

ہو، ہمیں عبوری عرصے میں ہر ممکن تیزی سے قدم آگے بڑھانے چاہئیں۔ اگرچہ اس کو ہم جوئی کہا جائے گا، ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ایسے خیالات پسند کیے جاتے ہیں۔ لوگ عوامیت پسندی سے جلد تھک جاتے ہیں اور آسانی سے ڈگمگا جاتے ہیں۔ لہذا سستی سے آگے بڑھنا اور لوگوں کو پس و پیش میں رکھنا بھی اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے۔ ان کے لیے آج کی زندگی مشکل ہے، خاصی اذیت کی زندگی ہے۔

ہمارا نیا نیم قی اتحاد اپنے آخری مراحل میں پہنچ چکا ہے۔ اس کی تسلیم ہماری کثیر الاقوامی ریاست کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کرے گی۔

ایک وقتی جست آمادہ علاقہ جدی کے جذبات اور ہاو ہو کے بعد، جب تقریباً ہر گاؤں اپنی خود مختاری کا دعوے دار ہو رہا تھا، موجود حقیقتوں، ہضمی خطرات اور مسئلے کے سنجیدہ جائزے کی بنیاد پر ایک مرکز جو طاقت حرکت میں آتی شروع ہو رہی ہے۔ اور اب یہی عنصر سب سے اہم ہے۔ رائے عامہ میں باہم اتفاق کے حصول کی محامیش بڑھ رہی ہے، اور یہ احساس بھی کہ ہمارے پاس ایک ریاست ہے، ایک ملک ہے ایک مشترکہ زندگی ہے۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کی حفاظت ہمارا پہلا فریضہ ہے۔ اس کے بعد ہی ہم یہ طے کریں گے کہ ہم کس پارٹی میں شریک ہوں اور کس خدا کی پرستش کریں۔

Perestroika کے طوفانی اور متاثرہ عمل نے، بالخصوص پچھلے دو برسوں میں، ہمیں ریاست کی لیڈر شپ کے مسائل اور جانچ پڑتال میں الجھائے رکھا ہے۔ نئے کثیر جماعتی نظام کے ماحول، خیالات کی آزادی، نئی دریافت شدہ گروہی شناخت اور جمہوریتوں کی خود مختاری نے ہم سب کو الجھائے رکھا ہے۔ یہ مسئلہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ ہمیں سوہائلی کے مفادات کو مختلف جماعتوں، گروہوں، دوسرے علاقائی، مذہبی یا نجی مفادات کو ریاستی تناظر میں دیکھنا چاہیے کہ ان کو بھی اپنے وجود کا، سیاسی عمل اور عوامی زندگی میں حصہ لینے کا حق ہے۔

خواتین و حضرات، بین الاقوامی سیاست بھی ایک علاقہ ہے جہاں بہت کچھ اس بات کی صحیح تشریح پر منحصر ہوگا کہ سوویت یونین میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ یہ آج بھی سچ ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔

ہم اب اس سمت بڑھ رہے ہیں جو عالمی کمیونٹی میں ایک فیصلہ کن نقطہ ہو سکتا ہے، جہاں عالمی کمیونٹی اور بڑی ممکنات والی ریاستوں کو، جو دنیا میں ہونے والے واقعات پر اثر انداز ہو سکتی ہیں، فیصلہ کرنا پڑے گا کہ سوویت یونین کے بارے میں ان کا موقف کیا ہے اور ان کو اس بنیاد پر عمل کرنا ہوگا۔

میں دنیا کے حالیہ واقعات پر جتنا زیادہ غور کرتا ہوں، مجھے اتنا ہی یقین ہوتا جاتا ہے کہ دنیا کو بھی Perestroika کی ضرورت ہے، اس سے کسی طرح کم نہیں جتنی کہ سوویت یونین کو ہے۔ خوش قسمتی، کہ موجودہ پالیسی مارشل کی نظروں میں رشتوں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے، اور اس حقیقت کی بھی کہ اب Perestroika اپنے نازک مرحلے میں داخل ہو چکا ہے، اس لیے سوویت یونین کو اس کی کامیابی کے لیے بڑے چیلن پر ہمدردی کی ضرورت ہے۔

حالیہ دنوں میں ہم دوسرے ملکوں اور سب سے زیادہ مغربی قوموں کے ساتھ اپنے معاشی کردار کے

بارے میں سنجیدگی سے سوچتے رہے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ ہم کو ایسے اقدام کرنے ہوں گے جو ہمیں اپنے آپ کو کشادہ کرنے میں معاون ہو سکیں، تاکہ ہم عالمی معیشت کا نامیاتی حصہ بن جائیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمیں اپنے اقدامات کا Group of Seven اور یورپی کمیونٹی سے ایک نوع کی synchronisation کرنی ہوگی۔ دوسرے معنوں میں ہم بین الاقوامی تعاون کے لیے بنیادی طور پر نئے مرحلے کی بات سوچ رہے ہیں۔

ان مہینوں میں ہمارے ملک میں نظم و ضبط میں ہونے والے بحران پر قابو پانے اور رفتہ رفتہ حسب معمول زندگی گزارنے کے بارے میں بہت کچھ فیصلہ کر لیا جائے گا۔ اس سیاق و سباق میں جن کثیر خصوصی کاموں پر غور کیا جائے گا ان کو چند درجہ ذیل تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

— ایک وسیع عمرانی اتفاق کی بنیاد پر، اپنی یونین کے نئی آئینی ڈھانچے کی روشنی میں، خالص، آزاد اور بہ رضا رغبت وفاق کے جمہوری عمل کو پائدار بنانا۔
— معاشی اصلاح کو تیز تر بنانا تاکہ جائیداد کے نئے نظام کی بنیاد پر ایک مخلوط منڈی اور نئے معاشیاتی نظام کی بنیاد پر سکے۔

— عالمی معاشیات کے لیے ملک کے دروازوں کو کھولنے کے سلسلے میں مضبوط قدم اٹھانا، اور روٹی کے تھالے کی شرح کو عالمی بینک اور امریکیٹنل مانیٹری فنڈ کی رکنیت کے ذریعے مہذب قوانین کے روشنی میں طے کرنا جو عالمی منڈی کو قبول ہوں۔
یہ تین علاقے بہت قریبی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔

اس لیے Group of Seven اور European Community کے درمیان بات چیت کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک مشترکہ عمل کے پروگرام کی ضرورت ہے جسے اگلے چند برسوں میں نافذ ہونا چاہیے۔
اگر ہم نئے دور کے تعاون سے منسلک مفاہمت پر پہنچنے میں ناکام ہو گئے تو ہمیں دوسرے راستے تلاش کرنے پڑیں گے، اس لیے کہ وقت بہت قیمتی ہے لیکن اگر ہم کو اس نئے مرحلے میں جانا ہے تو وہ جو اس میں حصہ لیتے ہیں بلکہ عالمی سیاست کو نئے سانچوں میں ڈھالتے ہیں، انھیں خود بھی تبدیل ہونا پڑے گا تاکہ وہ اپنے فلسفیانہ تناظر پر، بدلی ہوئی دنیا کی حقیقتوں پر اور ان سے پیدا ہونے والے فرائض پر نظر ثانی کر سکیں۔ ورنہ عملی اقدام کے لیے مشترکہ پروگرام بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔

سوویت قیادت، مرکزی اور جمہوریتوں کی قیادت اور سوویت عوام کا ایک بڑا حصہ دونوں اس ضرورت کو سمجھتا ہے، حالانکہ ہماری سوسائٹی کا ایک بڑا حصہ، ہر ایک نہیں، ایسے خیالات سے رغبت رکھتا ہے۔ کچھ پرچم بردار بھی ہیں جو وطنی وفاداری کو اپنی اجارہ داری سمجھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم بیرونی دنیا کے معاملے میں نہ الجھیں۔ ان کے بعد وہ لوگ ہیں جو اس راستے کو اپنے لیے محفوظ کرالینا

چاہتے ہیں اس قسم کی شرکت اپنے مفاد کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ جیسے جیسے سوویت یونین Perestroika پر عمل کرے گا، نئی دنیا کی تعمیر میں اس کا حصہ با معنی ہوتا جائے گا۔ ہم نے نئی سوچ کی بنیاد پر جو کچھ کیا ہے اس نے بین الاقوامی تعاون کو پُر امن طریقوں سے آگے بڑھایا ہے۔ پچھلے تین برس کے عرصے میں مغرب کے ساتھ عام سیاسی تعاون میں ہم آگے بڑھے ہیں۔ مشرقی یورپ کی اہم جمہوریوں اور جرمنی کے مسائل کے حل کی تلاش میں اس کا سخت امتحان ہوا تھا۔ اس نے خلیج فارس کے بحران کے شدید دباؤ کا بھی کامیابی سے سامنا کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تعاون، جس کی ہم سب کو ضرورت ہے، زیادہ اثر پذیر اور نازیز ہوگا اگر ہماری محیشتیں ایک دوسرے سے زیادہ قریب آجائیں اور کم و بیش ایک جھنڈی روانی سے کام کرنا شروع کر دیں۔

میرے نزدیک یہ بات سورج کی طرح روشن ہے کہ اگر سوویت Perestroika کامیاب ہوتا ہے تو دنیا کے لیے ایک نئے نظام کی تعمیر کا اچھا موقع ہوگا۔ اور اگر Perestroika کام ہوتا ہے تو تاریخ کے اوراق میں ایک نئے عہد کے کم از کم، مستقبل کی ممکنہ پیش بینی میں، داخل ہونے کے امکانات معدوم ہو جائیں گے، مجھے یقین ہے کہ یہ تحریک جو ہم لوگوں نے اس ہدف کے لیے شروع کی ہے اس کی کامیابی کے قوی امکانات ہیں۔ بنی نوع انسان کو حالیہ برسوں میں بہت فائدے ہوئے ہیں، اور اس نے ایک مثبت حرکت کی ابتدا کی ہے۔

سرد جنگ ختم ہو چکی ہے۔ جوہری جنگ کا خطرہ عملی طور پر کافور ہو چکا ہے۔ آئینی پردہ ہٹ چکا ہے۔ جرمنی متحد ہو چکا ہے، جو یورپ کی تاریخ کا ایک عظیم الشان سنگ میل ہے۔ ہمارے بڑے اعظم پر راج ایسا کوئی سکہ نہیں ہے جو خود کو مکمل طور پر خود مختار سمجھتا ہو۔

دو جوہری طاقتیں USSR اور USA، مقابلے کے میدان سے نکل کر باہمی تعامل کے دالان میں منتقل ہو چکی ہیں، اور کچھ معاملات میں سراجھے داری کے کاروبار میں شریک ہو چکی ہیں۔ اس واقعے نے بین الاقوامی موسم پر فیصلہ کن اثرات ڈالے ہیں۔ اس کو محفوظ، اور نئے مادے سے لبریز کر دیا جانا چاہیے۔ سوویت امریکا کے موسم کی حفاظت کی جانی چاہیے کہ یہ عالمی ہمدردی کا مشترکہ اثا ہے۔ سوویت امریکا قریب کی سمت اور امکانات میں کسی ترمیم سے پورے کرۂ ارض کے لیے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں۔

Helsinki Final Act میں جاگزین خیالات نے حقیقی معنی خیزی اختیار کرنی شروع کر دی ہے، اصل پالیسیوں میں ان کی قلب مابیت ہو رہی ہے اور ان کو ایک نئے یورپ کے لیے فرمان جیس سے ایک مقررہ اور موضوعاتی انسا حاصل ہو چکا ہے۔ یورپی سلامتی کے لیے اداروں کی تشکیل شروع ہو چکی ہے۔

حقیقی تخفیفِ اسلحہ کی ابتدا ہو چکی ہے۔ اس کا پہلا مرحلہ مکمل کے قریب ہے، START Treaty پر دستخط کے بعد، جو مجھے امید ہے جلد ہو جائیں گے وہ وقت آئے گا جب ان خیالات پر عملی طور شروع ہوگا، جو مستقبل کے لیے پیش کیے جا چکے ہیں، مگر ایسا لگتا ہے کہ نئے مرحلے کے لیے ایک عمومی تصور پیدا کرنا ہوگا۔ یہ تصور اس تمام گفت و شنید کا احاطہ کرے گا، جو تخفیفِ اسلحہ کے مسائل کے مقدم عنا سر اور مسائل سے متعلق

ہوں گی اور یورپ، مشرق وسطیٰ، افریقا اور ایشیا میں ہونے والی تہذیبوں کو منعکس کریں گی۔ ایسا تصور جو ان تمام بڑے ابتدائی اقدامات پر مبنی ہوگا جو صدر رٹش اور صدر متران کے درمیان کیے گئے تھے۔

فوجیں اور فوجی اخراجات کم کیے جا رہے ہیں۔ غیر ملکی فوجیں دوسرے ممالک کے علاقے خالی کر رہی ہیں۔ ان کی طاقت کم ہو رہی ہے اور ان کی ترتیب کی سمت زیادہ دفاعی ہوتی جا رہی ہے۔ فوجی صنعتوں کی تہذیبی کے ابتدائی قدم اٹھائے جا چکے ہیں اور جو کچھ ناقابل تصور تھا آج ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ حالیہ سرد جنگ کے حریف اہل میدان میں ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں۔ فوجی افسروں کو ان سہولتوں کے معائنے کرائے جا رہے ہیں جو کچھ عرصہ پہلے بڑے چیلانے پر خفیہ تصور کیے جاتے تھے اور دونوں demilitarize کیے جانے کے طریقوں پر غور کر رہے ہیں۔

پورے یورپ اور دنیا کے بیشتر علاقے میں ابلاغ کا ماحول اتنا تبدیل ہو گیا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا، اس کے چیلانے، ان کی شدت اور دوسرے ممالک اور ان کے عوام سے تعلقات کا نفسیاتی ماحول بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ ریاستوں کے درمیان رشتوں کے نظریاتی انہدام نے، ہم نے جن کو نئی سوچ کے اصولوں میں سے ایک قرار دیا تھا، بہت سے تعصبات کے بت گرا دیے ہیں، طرف داریوں اور بدگمانیوں کے رویے زمین یوں کر دیے ہیں، اور بین الاقوامی رشتوں کی فضا کو صاف کر دیا ہے۔ مجھے پھر بھی، یہ لکھنا پڑے گا کہ مغرب کے مقابلے میں ہماری جانب سے یہ عمل زیادہ عمیق اور بے تکلفانہ تھا۔

میں پورے ہلوثق سے کہہ سکتا ہوں کہ یورپی عمل نے پہلے ہی سے تغیرنا پذیر (irreversibility) کے عناصر حاصل کر لیے تھے، یا کم سے کم اس درجے کے تنازعات کو جو کئی صدیوں سے، خصوصاً تیسویں صدی سے، یورپ سے مخصوص تھے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

اور اگر یہ عمل ضروری تحریک حاصل کر لے تو مستقبل قریب میں ہر قوم اور ہر ملک کے پاس ایک بے مثال استحکام کی کمیونٹی کے امکانات ہوں گے، جو پورے کرہ ارض کے بالائی حصے پر محیط ہوگی۔ یہ شرطیں کہ وہ اس میں اپنا حصہ خود ڈالیں۔

ایسے سیاق و سباق میں، ایک نیا یورپ تخلیق کرنے کے عمل میں، جس میں ازکار رفتہ پودے اور بوسیدہ دیواریں ہمیشہ کے لیے ماضی کو منتقل کر دی جائیں گی اور ریاستوں کے درمیان سرحدیں تقسیم کن مقصد کھودیں گی، فرماں روا قوموں کی خود مختاری بالکل مختلف انداز میں حاصل کر لی جائے گی۔

اس کے باوجود، یورپی خلا کا ہمارا تصور محض اوقیانوس سے Ural [کے پہاڑی سلسلے] تک ایک بے عمل نظام کا نہیں ہے۔ چوں کہ سوویت یونین اس میں شامل ہے، جس کا ساحل بحرالکاہل تک جاتا ہے اور اوقیانوسی امریکا اور کناڈا، جن کے قدیم دنیا سے ناقابل علاج کی سلسلے ہیں، اس کی جغرافیائی سرحدوں سے پرے ہیں۔ خیال ہرگز یہ نہیں ہے کہ اپنی تہذیب کے ایک حصے کو یورپی پلیٹ فارم بمقابلہ بتیرہ دنیا سے بیہوش کر دیا جائے۔ اس قسم کے شبہات موجود ضرور ہیں، مگر اس کے برعکس، خیال یورپ کے اتحاد کی معیار حرکت

کی بنیاد پر بڑھنے کا ہے، جو سیاسی تجسیم ہے فرمان بھری کی پورے یورپ کے لیے۔ بنی نوع انسان کے درمیان راست بازی کی بنی باہمی رشتے داری کے لیے اور یورپی تاریخ کے ایک نئے پرامن مقصد کے سیاق و سباق میں یہ سب کچھ ضرور کیا جانا چاہیے۔ حال ہی میں، کتنا عجیب کہا تھا میرے دوست Giulia Andreani نے کہ ”یورپی دنیا کے امن کے لیے مغرب/مشرق کے درمیان نقطہ مضامنت ہی ترقی کے لیے کافی نہیں ہو گی۔ پھر بھی، ان کے درمیان اتفاق بہت بڑا قطعہ ہوگا۔“ ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکا، مشرقی قریب و بچید، سب کو اس مشرک مقصد کے لیے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

ہمارے نقطہ نظر سے دنیا کے تحفظ کا نیا نظام، پسند کی آزادی اور مفاد کے توازن کے اصولوں پر ہی استوار ہو سکتا ہے۔ ہر ریاست، اور کئی موجودہ اور ابھرتے ہوئے مقامی ریاستی گروہوں، کے اپنے مفاد ہوتے ہیں۔ یہ سب ہر ائمہ ہیں اور احرام کے حق دار ہیں۔

ہم اس کو خطرناک حد تک ازکار رفتہ سمجھتے ہیں، مثال کے طور پر ’سویت / چینی‘، ’سویت / جرمن‘، ’سویت / امریکی‘ یا ’امریکی / ہندوستانی‘ تعلقات وغیرہ کے باعث شبہات پیدا ہونے لگیں۔ ہمارے زمانے میں ایسے تعلقات سب کے مفاد میں ہیں۔ بگڑتے ہوئے تعلقات، جہاں بھی ہوں، ہم سب کا مشرک نقصان ہے۔ اکیس ویں صدی کی تہذیب کی طرف بڑھنا یقیناً معمولی یا آسان نہیں ہوگا۔ آپ مابعد جنگ کے پیدا کیے ہوئے خطرات یا ماضی کی ذوقی وراثت سے ایک دم چھٹکارا نہیں پاسکتے۔ بین الاقوامی معاملات میں ہمیں ایک موڑ کا تجربہ ہو رہا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ تہذیب کی تاریخ میں آنے والے ایک طویل عرصے کی فہارت پرامن ابتدا ہو رہی ہے۔

مشرق اور مغرب کے درمیان مقابلے کم ہونے، یا بالکل نہ ہونے سے پرانے تھپے ابھرنے لگتے ہیں، جوہری جنگ کے خطرات کے مقابلے میں جو کم اہمیت رکھتے ہیں۔ مرد جنگ کی پھلتی ہوئی برف پرانے قہنیوں اور دھوئیں کو آشکار کرتی ہے اور بالکل نئے مسائل تیزی سے جمع ہونے لگتے ہیں۔

ہم کو دیر پا امن کی مابوں میں پہلے ہی بہت سے رکاؤئیں اور خطرات نظر آنے لگے ہیں، بشمول مندرجہ ذیل خطرات کے:

- کئی ملکوں اور علاقوں میں برہمنی ہونی قومیت، علاقہ دگی، اور انتشار پیدا کرنے والے اعمال۔
- امیر اور مفلس ملکوں کے درمیان بڑھتے ہوئے سماجی / معاشی فرق کے درجے اور معیارہ کروڑوں لوگوں کی مفلسی اور شفافیت کے بین الاقوامی اداروں کے حوالے سے ترقی یا فتر ممالک کے رہن بہن کے معیار دیکھنے کے نتیجے میں ابھرنے والے عوامی احتجاج میں وحشت / جذباتیت، حتیٰ کہ دہشت گردی۔ مفلسی، دہشت گردی کو، اور ریاستوں کے درمیان ناقابل پیشین گوئی روپے رکھنے والی آمرانہ حکومتوں کو بھی جنم دیتی ہے۔
- ماضی میں ہونے والے ترقیاتی کاموں کے خوف ناک اعزاز میں بڑھتے ہوئے اخراجات، جیسے ماحولیاتی تباہیوں اور توانائی کے بنیادی وسائل کا خاتمہ، برہمنی ہونی آبادی، نشے کا استعمال، وغیرہ۔

— پڑامن پالیسیوں اور خود غرض معیشتوں کے درمیان تفاوت، جو تکنیکی چودھراہٹ کے حصول پر تلے ہوئے ہوں۔ جب تک یہ دونوں خطوط اکٹھے نہیں کیے جاتے مختلف، موافق حلقوں میں تہذیب کے تعطل کے امکانات پڑھتے جائیں گے۔

— جدید اسلحہ سازی میں بہتری، خواہ وہ تحفظ کے بہانے ہی کیوں نہ ہو۔ یہ نہ صرف اسلحے کی دوز میں نئے اضافے کا باعث ہوگا اور ریاستوں میں پہلے سے اسلحے کے خطرناک ارتکاز، بلکہ تخفیف اسلحہ اور ترقیات کے عمل کے درمیان علاحدگی پر منتج ہوگا اور ابھرتی ہوئی نئی عالمی سیاست میں کٹاؤ کا باعث ہوگا۔

عالمی برادری ان سب کو کس طرح سہہ سکے گی؟ یہ سارے کام بے حد پیچیدہ نوعیت کے ہیں مگر ان کو موقوف بھی نہیں کیا جاسکتا اور دیر کرنے میں بہت دیر ہو سکتی ہے۔

میں قائل ہوں کہ ان مسائل کو حل کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں سوائے اس کے کہ بالکل نئے انداز میں تعامل کی ضروریات کی جائے۔ ہم اس قسم کے تعامل کے لیے مجبور ہیں یا پھر ایسے مثبت رویوں کے ساتھ گزارا نہیں کر سکیں گے جو ابھر کر طاقت ور ہوتے جا رہے ہیں، اور ہم ان کو قربان بھی نہیں کر سکتے۔

بہر حال اس کو حاصل کرنے کے لیے عالمی برادری کے تمام ارکان کو ان پرانے گھسے پٹے طریقوں اور تحریکوں کو تھوڑا دینا ہوگا، جو سرد جنگ کے دوران پروان چڑھی ہیں اور جن میں ایک دوسرے کی کم زوریوں کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی عادت بھی چھوڑنی پڑے گی۔ ہمیں خصوصیتوں اور اختلافات کا، جو ہمیشہ موجود ہوتے ہیں، احترام کرنا ہوگا، اُس صورت میں بھی جب ساری دنیا میں انسانی حقوق اور آزادیوں کا پاس کیا جا رہا ہو۔ میں بار بار کہتا رہتا ہوں کہ مخالفت فریق کو ایک صحت مند مسابقت میں، اور ترقیات کے ایک اہم عنصر میں بدلا جاسکتا ہے۔ ایک دوسرے کا مطالعہ کرنے اور تبادلہ خیالات میں مصروف ہونے کی ترغیب باہمی اعتماد و افزائی کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

علم اور اعتماد نئے عالمی نظام کی بنیادیں ہیں۔ پس، میرے خیال میں ضرورت ہے، سیکھنے کی اور اقوام متحدہ کی چھتری کے نیچے اکٹھے رو کر کرۂ ارض کے مختلف علاقوں کے واقعات کی پیش بینی کرنے کی، رائٹس دانوں، فلسفیوں اور انسانی سوچ کے یک جا کرنے کی۔ خواہ کتنی ہی چوکس کیوں نہ ہوں، پالیسیاں انسان ہی کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہمیں یہ ضمانت دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ دل جمعی کی ضرورت ہوگی کہ عالمی برادری کے ارکان کے کیے ہوئے فیصلے تحفظ، خود مختاری اور اہم مفادات پر منفی اثر نہیں ڈالیں گے اور اس کے دوسرے ارکان فطری ماحول اور دنیا کی اخلاقی فضا کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

میں ایک امید پر مت انسان ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اسلحے ہو کر اب ہم صحیح تاریخی فیصلے کریں گے، صدیوں اور ہزاروں کے سوڑ پر سٹنے والے موقعے کو ضائع نہیں کریں گے اور مشکل ترین تبدیلی حالات کو ایک پُر امن عالمی نظام میں بدل دیں گے۔ طاقت کے توازن کے بجائے مفادات کا توازن، فائدوں کی تلاش کے بجائے مصالحت اور اتفاق کی تلاش، دوسروں کے مفادات کی قیمت پر اور لیڈر شپ کے دھموں کے

بجائے برابری کا احترام یہ ہیں وہ عوامی ترقی کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں اور جو پیش دیں صدی کے تجربے رکھنے والے معقول لوگوں کے لیے آسانی سے قبول ہونے چاہئیں۔

ایک مکمل طور پر پُر امن کرۂ ارض کے امکانات ان مشترکہ کوششوں میں ہیں، جن کے ذریعے ایک بین الاقوامی جمہوری علاقہ وجود میں آسکے، جس میں ریاستیں انسانی حقوق اور ان کے باشندوں کی خوش حالی کی ضمانت ہو، اور ہر جگہ ویسے ہی حقوق اور ویسی ہی خوش حالی کا پُر چار کیا جائے۔ ایک ترقی پذیر جدید دنیا اور اس کے عوامی کارآمد ادارہ کی ناگزیریت یہ ہونا چاہیے۔

مجھ پر ایک بار سے زیادہ شبہ کیا گیا ہے کہ میں خیالوں کی دنیا میں رہتا ہوں، خاص کر جب پانچ برس قبل میں نے سنہ 2000 تک جوہری ہتھیاروں کے استخراج کے لیے ایک بین الاقوامی حفاظتی نظام قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اُس وقت تک اس نظام کے قائم ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر دیکھیے، پانچ برس گزر چکے ہیں مگر کیا اس سمت پیش قدمی کے لیے کوئی جنٹلمن ہوئی ہے؟ کیا ہم بے اعتباری کی دلیلیز کو پار نہیں کر سکے ہیں، اگرچہ بے اعتباری مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی ہے۔ کیا دنیا میں سیاسی سوچ میں معقول حد تک تبدیلی نہیں ہوئی ہے؟ کیا عالمی برادری کی اکثریت بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے ذریعے سیاسی ہدف حاصل کرنے کی کوشش کو قابل قبول نہیں سمجھتی؟

خواتین و حضرات، اب سے دو ہفتوں بعد میرے ملک پر ماسکو جرمی کے حملے کو ٹھیک پچاس برس ہو چکے ہوں گے۔ اور مزید چھ ماہ بعد پُرل ہاربر پر حملے کی پچاس ویں برسی ہوگی، جس کے بعد جنگ عالمی ایسے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کے یاد میں آج بھی ڈکھاتی ہے۔ مگر یہ دونوں واقعات موجودہ نسل کو دیے جانے والے موقع کی قدر شناسی کی ترغیب دیتے ہیں۔

انجام کار مجھے پھر کہنے دیجیے کہ میں نوٹیل انعام کو ادراک کا اظہار سمجھتا ہوں، اپنے ارادوں کا، اپنی تمناؤں کا، غمیت قلبِ مابینیت کے اس عمل کا جو آج ہمارے ملک میں شروع ہو چکا ہے، اور نئی سوچ کے تصورات کا۔ میں اس کو آپ کا جواب سمجھتا ہوں Perestroika کا جس کے ذریعے میں نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں اس [انعام] کے لیے کمیٹی کے ارکان کا شکر گزار ہوں اور انھیں یقین دلانا چاہتا ہوں، اگر میں ان کے ارادوں کو سمجھ سکا ہوں، کہ انھوں نے غلطی نہیں کی ہے۔

دلائی لامہ - چہار دہم اعلان تجلیل

جلاالت مآب، عزت مآب، خوتمن و خنفرات!

نوبیل امن انعام ان چہر انعاموں میں سے ایک ہے جو انٹرنیٹ نوبیل سے منسوب ہیں اور آج کے دن دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے پانچ انعام اسٹاک ہوم میں دیے جاتے ہیں، اور دلائی نوبیل کمیٹی تمام انعام یافتہ افراد کو مبارکباد پیش کرتی ہے جو آج ہی کے دن سویڈن کے دارالحکومت میں دیے جائیں گے۔ اس برس کے انعام کی تقریب اس لحاظ سے خصوصی خوشی کا موقع ہے کہ انعام پانے والوں میں سے ایک کا تعلق ناروے سے ہے Trygve Haavelmo جن کو معاشیات کا نوبیل انعام دیا جا رہا ہے۔ ہم اس اعزاز کے لیے ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اس برس کا نوبیل امن انعام عزت مآب دلائی لامہ کو دیا جا رہا ہے جو اپنی آزادی کے دوبارہ حصول کی جدوجہد اور تشدد کے استعمال کی مسلسل مزاحمت میں اپنے عوام میں سب سے آگے ہیں۔

1959 سے دلائی لامہ، تقریباً اپنے ایک لاکھ ہم وطن افراد کے ساتھ ایک گروہ کی صورت میں ہندوستان میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ دنیا کا پہلا ہندو وطن گروہ نہیں، مگر یقیناً یہ ان معنوں میں پہلا ہے جس نے آزادی کے لیے کوئی جنگجو تحریک نہیں بنائی ہے۔ یہ عدم تشدد کی پالیسی کچھ زیادہ ہی عجیب و غریب نظر آتی ہے، جب اسے اس تناظر میں دیکھا جائے کہ ان کے ملک پر قبضے کے بعد سے تبت کے عوام پر کتنے ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ اس ظلم کا دلائی لامہ نے جواب یہ دیا تھا کہ ہمیں ایسے پرامن حل کے بارے میں سوچنا چاہیے جو چینی حکومت کے مذاوات کو مطمئن کر سکے۔ دلائی لامہ کے معاملے کے مقابلے میں، تاریخ میں کسی اعلیٰ کی ایسی جدوجہد کی مثال نہیں ملتی جس میں ایک حریف کی طرف سے زیادہ مسالمانہ رویہ اختیار کیا گیا ہو۔ نظری طور پر ہم دلائی لامہ کا تقابل مہاتما گاندھی سے کر سکتے ہیں جو اس صدی میں امن کے سب

سے بڑے پر چارک تھے اور دلائی لامہ خود بھی اپنے آپ کو گاندھی کی پیروی کرنے والوں میں سے ایک سمجھتے تھے۔ لوگوں نے اکثر تعجب کیا ہے کہ خود گاندھی کو نوٹیل انعام سے کیوں نوازا نہیں گیا، اور موجود نوٹیل انعام کمیٹی بھی، دلائی لامہ کو اس برس کے انعام کا حق دار سمجھتے ہوئے، اس تعجب میں شریک ہو سکتی ہے۔ اس برس کے انعام یافتہ ایک جوہلی بھی مناسکتے ہیں، اس لیے کہ ان کو تبت کے عوام کے چند حویس دلائی لامہ کے عہدے پر فائز ہوئے، جب ان کی عمر صرف چار برس کی تھی، پچاس برس ہو چکے ہیں۔

ان کے دلائی لامہ بنائے جانے کے عمل کی، جوان کے انتخاب پر منتج ہوا تھا، کھرائی میں جانا ایک مغربی کے لیے ایک بالکل نئے میدان علم میں قدم رکھنے کے مترادف ہوگا، جہاں یقیناً خیالات اور عمل وجود کے ایسے پہلو ہوتے ہیں ہم جنہیں جانتے ہی نہیں یا ہم ان کو فراموش کر چکے ہیں۔

بدھ مذہب کی روایات کے مطابق مرنیا دلائی لامہ سابقہ دلائی لامہ کا نیا وجود ہوتا ہے۔ جب تیر حویس دلائی لامہ کا 1933 میں انتقال ہوا تھا تو ان کے نئے وجود کی تلاش شروع کی گئی تھی، الہام اور فاضل لامہ حضرات سے تعامل کے دوران کچھ اشارے ملے تھے۔ بادلوں سے بنے عجیب قسم کے نقش آسمان میں لہراتے گزرے جن میں انتقال کر جانے والے لامہ کو تم بدھ کے انداز میں نظر آئے جن کا رخ جنوب کی جانب تھا۔ مگر دو دن بعد اسی منظر میں لامہ کا رخ مشرق کی طرف تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ مشرق میں نئے لامہ کی تلاش شروع کی جائے۔ اور فوراً ہی ایک وفد مشرق کی طرف روانہ ہو گیا یہ لوگ پہلے تبت کی مقدس جھیلوں کی طرف گئے، جن کے پانی کی سطح پر مستقبل کی جھلکیاں نظر آ سکتی تھیں۔ اس سلسلے میں جو اشارہ ملا تھا وہ ایک خانقاہ کی طرف تھا، اور ایک مکان کی جانب جس کی چھت فیروزہ رنگ کے کچھریل سے چھائی گئی تھی۔ وفد نے ادھر کا رخ کیا۔ پہلے انھیں خانقاہ ملی، اس کے بعد گھر نظر آیا جو مشرقی تبت کے Takster نام کے گاؤں میں واقع تھا۔ اس گھر میں ایک کسان اور اس کا خاندان رہتا تھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ ان کے ہاں کوئی بچہ ہے یا نہیں۔ پتا چلا کہ ان کے تین بچے ہیں (Tenzin Gyatso) م کا ایک دو سال کا ایک بچہ تھا۔ اس بچے کے ہاتھوں کئی ناقابل تشریح کام ہونے کے بارے میں سن کر وفد اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اپنے سفر کی آخری منزل پر پہنچ گیا ہے۔ اس طرح چودھواں دلائی لامہ مل گیا تھا۔

مذہب کی اقلیم میں اور بہت سی باتوں کی طرح، یہ بھی ایسی بات نہیں تھی جس کی وجہ دریافت کی جاتی۔ ہم اکثر ایسے مظاہر سے دوچار ہوتے ہیں جو ایسی حقیقت ہوتے ہیں جو عام حقیقتوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ایسے مظاہر کے لیے ہمیں عقلی دلائل کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، سوائے ایک مقدس تعجب کے۔

اپنی پوری تاریخ میں تبت ایک محصور ملک رہا ہے، جس کا بیرونی دنیا سے بہت کم رابطہ تھا۔ جدید دنیا میں بھی اس کی یہی صورت ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے رہنما اپنے ملک کی قانونی حیثیت بحال کروانے اور اس کو ایک خود مختار ریاست بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ بہت ساری وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بیرونی دنیا نے بھی تبت کی مدد کرنے کے بارے میں اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کی

ہے، جب کہ ایک سو پچاس برس سے رفتہ رفتہ چین اس ملک پر قابض ہوتا گیا ہے اور جو تہت کے باشندوں سے ان کی اپنی توثیح کی بنیاد پر راست مخالفت کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا رہا ہے کہ تبت ہمیشہ سے چین کا حصہ رہا ہے۔ تبت پر قابض ہونے کے ساتھ International Commission of Jurists کے مطابق، چینی، انفرادی یا قومی حیثیت میں، ایک پوری قوم کو منانے کے فاسد جرم کے مجرم رہے ہیں۔

اگر ہمیں گویا تسلسلہ برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور ان دیگر گول حالات میں ان کو اپنے عوام کی سیاسی رہنمائی کا کردار ادا کرنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی اس وقت تک ملک پر ان کے مددگار (Regents) حکومت کرتے رہے تھے۔ اب، ایک سولہ برس کے لڑکے کو دلائل لامہ کے خطاب کے ساتھ، بغیر کسی سیاسی تجربے کے، بد مذہب کی تعلیم کے سوا، جو انہوں نے اپنی نشوونما کے دوران حاصل کر لی تھی، زمام اختیار سنبھالنی تھی۔ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات My Life and My People میں بڑی شگفتگی سے تبت لاماؤں کی کنجش گردی کا حال بیان کیا ہے، اور یہ اعلان بھی کیا ہے کہ جو کچھ انہوں نے سیکھا ہے وہ اس سیاسی کردار کے لیے کوئی معمولی تیاری نہیں تھی جو ان کو تفویض کیا جانے والا تھا۔ یہی بنیاد تھی جس پر انہوں نے عدم تشدد کی پالیسی بنائی تھی، جس کے ذریعے انہوں نے چینی حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک بد مذہب ہونے کے ناتے ان کا فرض تھا کہ وہ کسی زندہ مخلوق کو گزند نہ پہنچائیں، بلکہ ہر طرح کی حیات کے لیے دردمندی کا اظہار کریں۔ اس پر حیرت نہیں کی جانی چاہیے کہ وہ لوگ جو دنیا کی حقیقتوں سے قریبی معنوں میں متعلق ہیں ان کو ان کے فلسفے پر غور کرنا چاہیے جو عام فوجی حکمت عملی کے خیالات سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔

بلاشبہ، عدم تشدد کی پالیسی بھی عملی مصلحتوں کی بنیاد پر بنائی گئی تھی؛ چھ ملین افراد پر مشتمل ایک چھوٹی سی قوم، جس کے پاس قابل ذکر فوج تک نہ ہو، اور اس کو دنیا کی عظیم ترین طاقتوں کی افواج کا ہرہ کا سامنا ہو۔ ایسے حالات میں، دلائل لامہ کے خیال میں، عدم تشدد کی پالیسی کا راستہ ہی عملی راستہ تھا۔

اسی مناسبت سے انہوں نے 1950 میں چینی حکمرانوں سے معاملات طے کرنے کی بار بار کوششیں کی تھیں۔ ان کا مقصد تھا ایسے حل کی طرف قدم بڑھانا جو تنازعے میں شامل دونوں پارٹیوں کو باہمی احترام اور برداشت کی بنیاد پر قبول ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دلائل لامہ نے تبت کی طرف سے تشدد کی مزاحمت کرنے سے اپنا اختیار بھی واپس لگا دیا تھا۔ اور ان کے اختیار کا استعمال فیصلہ کن ثابت ہوا، اس لیے کہ دلائل لامہ کی حیثیت میں، اور بد مذہب کے عقیدے کے مطابق، وہ روایتی رہنما سے بڑھ کر ہیں کہ ان کی ذات دراصل پوری قوم کی علامت ہے۔ ان کی اپنی شخصیت میں دیوتاؤں کے رنگ جھلکتے ہیں جو بلا کسی شبہ کے توثیح کرتی ہے کہ، باوجود کھلی اہانتوں اور فحش اشتعال کے، قوم کے عوام نے کیوں ان کی محو ہشات کی تابع داری کی اور تشدد کے استعمال سے گریز کیا۔

ہندوستان میں اپنی جلا وطنی کے دوران انہوں نے اپنے عوام کے لیے اسلحہ کے استعمال کے بغیر، ان تحک

صبر کے ساتھ جدوجہد کی۔ ان کو اپنی خودنوشت سوانح حیات کو My Life and My People کا عنوان دینے کا حق پہنچتا ہے، اس لیے کہ اہل بیت کی زندگی ہی ان کی زندگی ہے۔ مگر سوائے اقوام متحدہ کی پوپلی تجاویز کے جو 1961 اور 1965 میں منظور کی گئی تھیں، بیرونی دنیا سے ان کی سیاسی حمایت نہ ہونے کے باوجود تھی۔ ساتھ اور مشرق وسطیٰ کے دوران دلائل لامہ ماضی کے مقابلے میں ایک قابلِ رحم صورت کی مثال سمجھے جاتے رہے تھے؛ بد قسمتی سے ان کا خوب صورت اور با معنی امن کا فلسفہ اُس وقت کی دنیا میں ماموزوں ہو کر رہ گیا تھا۔

مگر آٹھویں عشرے کے دوران حالات نے ڈرامائی گروتھی ہے۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ بہت میں جو کچھ ہو رہا تھا اور اب بھی ہو رہا ہے عام طور پر سب کے علم میں ہے، اور قوموں کی مداخلت کی بہت سے لوگوں کے مستقبل کے لیے ایک قسم کا مشترکہ احساس ذمہ داری پیدا ہو گیا ہے کہ ان کی آزمائشیں اور مصیبتیں بہت والوں کے جذبات کو شکست دینے میں ناکام ہو گئی ہیں، اس کی اور وجہ ہے؛ اس کے برعکس ان میں قومی احساسِ تفاخر اور شہرت، اور اپنی بقا کا عزم بڑھ گیا ہے، جس کا اظہار ان کے ہونے والے مظاہروں میں ہو رہا ہے۔ دنیا کے دوسرے علاقوں کی طرح، یہاں بھی یہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ جنوبی قومی طاقت کے استعمال سے پرامن مظاہروں کے کچل دیے جانے سے مسائل حل نہیں کیے جاسکتے۔ دوسرے علاقوں کی طرح، بہت میں بھی تھامزوں کو سیاسی اور فوجی گرفت و شنید کے ساتھ حل کیا جانا چاہیے۔

دلائل لامہ کی گرفت و شنید کی پالیسی کا کئی اسمبلیوں اور بین الاقوامی اداروں میں خیر مقدم کیا گیا ہے؛ ریاست ہائے متحدہ کی سینیٹ، مغربی جرمنی کی پارلیمنٹ Bundestag، یورپ کی پارلیمنٹ، ریاست ہائے متحدہ کی کانگریس، آسٹریلیا کی پارلیمنٹ کے ساتھ ارکان، اور سوئٹزرلینڈ کی قومی اسمبلی۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ دلائل لامہ کو ان کی کوششوں کی ستائش اور مقاصد کی معاونت میں کئی بین الاقوامی اطلاعات اور اعزازات دیے جاتے ہیں۔ سب ایسا معلوم ہونے لگا ہے کہ معاملات صحیح سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں، اور ماضی میں جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے، اس کو دلائل لامہ کی عدم تشدد کی ثابت قدم پالیسی کا ثمر ہی کہا جاسکتا ہے۔

سوچی سمجھی حکمت عملی کی تشکیل میں ناکامی کے باعث، آغاز کار میں کوئی اور مسائل کو پس پشت ڈالنے کے میلان اور مجہول رویہ اختیار کرنے کے رجحان کے باعث اچھی طرح سمجھے میں آنے والی وجوہ کے مطابق عدم تشدد کی پالیسی کو کبھی کبھی منفی بھی گردانا گیا ہے۔ مگر ایسا ہے نہیں؛ عدم تشدد کی پالیسی اعلیٰ درجے کی سوچی سمجھی حکمت عملی ہوتی ہے، یہ یکسو ذہن اور با مقصد عمل کی طالب ہوتی ہے، مگر طاقت کے استعمال سے باز رکھتی ہے۔ وہ لوگ جو اس قسم کی پالیسی کو اپناتے ہیں، وہ مسائل سے نظریں نہیں جھاتے، ان میں اخلاقی جرأت ہوتی ہے جو سب کچھ ہو چکا ہو تو، ان لوگوں سے آگے بڑھ جاتی ہے جو ہتھیار اٹھانے پر بھروسہ کرتے ہیں۔ غیرت انگیز معیار کی خود قہر بندی کے ساتھ اس قسم کی جرأت ہی دلائل لامہ کے رویے کی کردار سازی کرتی ہے۔ ان کی عدم تشدد کی پالیسی بھی، بہت احتیاط سے سوچی اور طے کی گئی ہے۔ جیسا کہ پچھلے اپریل میں

انہوں نے خود کہا تھا، جب لہاسا کے ایک پرامن مظاہرے پر فوجیوں نے اندھا چند گولیاں برسائی تھیں؛ ”جیسا کہ میں کئی بار وضاحت کے ساتھ کہہ چکا ہوں، ہمارے نزدیک عدم تشدد ہی واحد راستہ ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ ہمارے معاملے میں تشدد خود کشی کے برابر ہوگا۔ اسی وجہ سے، مواد ہمیں اچھا لگے یا برا، صرف عدم تشدد ہی واحد راستہ ہے، جو صحیح بھی ہے۔ بس ہمیں صرف مزید صبر اور عزیمت کی ضرورت ہے۔“

1987 میں دلائی لامہ نے تبت کے لیے امن کا ایک منصوبہ پیش کیا تھا، جس کا نچوڑ یہ تھا، جیسا کہ خیال کے معاملے میں تجویز کیا گیا ہے جس کو چینی حکومت نے منظور بھی کر لیا ہے، کہ تبت کو امن کا علاقہ گردانا جائے۔ اس منصوبے میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا ہے کہ تبت میں چینی اثرات کی ہجرت کو روکا جائے۔ یہ اس درجہ بڑھ چکی ہے کہ تبت والوں کو خود اپنے ملک میں اقلیت بن جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ حقیقت بھی کم توجہ کی طالب نہیں ہے کہ اس منصوبے میں تبت کے بے مثال فطرتی ماحول کی حفاظت کے انتظام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ بڑے پیمانے پر اشجار تراشی کی وجہ سے ہمالیہ کی ڈھلان بے ہنگام ارضی کٹاؤ کا شکار ہو رہی ہے، جو ہندوستان اور بنگلہ دیش میں سیلاب کی تباہیوں کا بھی سبب ہے۔ امن کا یہ منصوبہ چین سے کسی قسم کے مذاکرات کی شروعات میں ناکام ہو گیا ہے، باوجودیکہ دونوں کے درمیان تضادات زیادہ گہرے نہیں تھے۔ مصالحت پر دلائی لامہ کی رضامندی، یکپارچہ 15 جون کو ان کے یورپی پاریمان سے خطاب میں زیادہ وضاحت سے پیش کی گئی تھی، جہاں انہوں نے تبت کے لیے عمل آزادی کے مطالبے سے دست برداری سے تیاری کا بھی اعلان کیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ ایشیائی عظیم طاقت ہونے کے باعث تبت میں چین کے فوجی مفادات بھی ہیں، اور وہ اس وقت تک کے لیے تبت میں چین کی فوجی موجودگی کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، جب تک کہ ایک علاقائی امن کے منصوبے کو منظور نہ کر لیا جائے۔ انہوں نے اس پر بھی رضامندی کا اظہار کیا تھا کہ اگر تبت والوں کو مکمل اندرونی خود مختاری دے دی جائے تو وہ چین کو تبت کی خارجہ اور دفاعی ذمہ داری بھی سونپنے کے لیے تیار ہیں۔

امن قائم کرنے کی کوششوں میں دلائی لامہ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ دیمروں کے خرچ پر طاقت کا اقدہ نہیں بنانا چاہتے۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے اس سے زیادہ کے طالب نہیں ہیں جسے ہر ایک، جس میں بلاشبہ چینی بھی شامل ہیں، ابتدائی حقوق گردانتا ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں ایک زمانے سے قوموں اور عوام کے درمیان بدگمانی اور اور زور آوری کے رشتے رہے ہیں اور جہاں صرف طاقت کے استعمال پر حقیقی پالیسی کا مدار رہا ہے، ایک نیا عقیدہ ابھر رہا ہے کہ تنازعات کی عقدہ کشائیوں کے لیے طاقت کا یکساں استعمال کم سے کم حقیقت پسندانہ حل ہوتا ہے۔ جدید ہتھیاروں نے، دراصل، ایسے عمل کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

دنیا سکرچکی ہے۔ عوام اور قومیں ایک دیمرے پر زیادہ انحصار کرنے لگی ہیں۔ اب کوئی بھی صرف اپنے مفاد کے مطابق عمل نہیں کر سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ تمام سیاسی، معاشی اور ماحولیاتی مسائل کے لیے باہمی ذمہ داریوں کو قبول کیا جائے۔

اس کے پیش نظر کم لوگ دلائی لامہ کے فلسفے کو محض خیال پرستی سمجھ کر رد کرنے کی جرأت کریں گے۔ اس کے برعکس اس امر پر زور دیا جانا زیادہ حق بہ جانب ہوگا کہ دلائی لامہ کی دی ہوئی عدم تشدد کی خوش خبری ہی سچی اور حقیقی ہے، جس میں مستقبل کے لیے زیادہ فوائد پنہاں ہیں۔ اور اس کا صرف جیت ہی پر نہیں، ہر ایک تنازعے پر اطلاق ہوتا ہے۔ کروڑوں پے ہوئے انسانوں کی امیدیں آج بہت ہی طاقتوں سے وابستہ ہو گئی ہیں، اس لیے کہ وہی امن دلا سکتی ہیں۔ ان کے حقوق کی راسخی اب اتنی زیادہ واضح، اور ان کی جدوجہد کا استحکام اتنا مزہ زور ہو گیا ہے کہ عارضی طور ان کو اسلحے کی طاقت ہی سے روکا جاسکتا ہے۔

عزت مآب دلائی لامہ کو انعام دیے جانے کے ذریعے ہم ان کے کام کی، اور ان غیر مسلح عوام کی، جو زمینوں کے لیے آزادی اور انسانیت کے لیے امن کی خاطر قدم آگے بڑھا رہے ہیں، مدد کر رہے ہیں۔

Egil Aarvik، صدر نشین، نارویجیائی نوبل کمیٹی کی زبانی

خطبہ

بھائیو اور بہنو!

آج آپ کے درمیان ہونا میرے لیے عزت کا باعث ہے۔ اتنے سارے پرانے دوستوں کو یہاں پا کر، جو دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے ہیں اور مجھے دوست بنا کر، جن سے آئندہ ملاقاتیں ہوں گی، میں بہت خوش ہوں۔ جب میں دنیا کے مختلف حصوں کے لوگوں سے ملتا ہوں تو مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ بنیادی اعتبار سے ہم سب برابر ہیں، کہ ہم سب انسان ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے لباس مختلف ہوں، ہماری جلد کا رنگ مختلف ہو یا ہم مختلف زبانیں بولتے ہوں۔ یہ سب تو سطحی باتیں ہیں۔ مگر بنیادی طور پر، ہم ایک جیسے انسان ہیں۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو ہم کو ایک دوسرے سے قریب رکھتی ہے۔ یہی ہم کو ایک دوسرے کو سمجھنے اور ان سے دوستی اور قربت قائم کرنے کے قابل بناتی ہے۔

جب میں اس سوچ میں تھا کہ آج کس موضوع پر بات کروں، میں نے فیصلہ کیا کہ میں آپ سے ان عام مسائل پر تبادلوں، ان خیالات کروں گا ایک انسانی خاندان کی حیثیت میں ہم سب کو جن کا سامنا ہوتا ہے۔ چوں کہ ہم سب اس چھوٹے سے کرۂ ارض کے شراکت دار ہیں ہمیں اتفاق اور امن کے ساتھ ایک ساتھ اور فطرت کے ساتھ رہنا سیکھنا چاہیے۔ یہ محض ایک خواب نہیں ایک ضرورت ہے۔ ہم ایک دوسرے پر مختلف طریقوں سے اس قدر انحصار کرتے ہیں کہ جدا جدا گروہوں طرح نہ تو زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ اس بات سے لائق رہ سکتے ہیں کہ گروہوں کے باہر گیا ہو رہا ہے؛ کہ ہمیں ایک دوسرے کی خوش نصیبی میں شریک کر فی چاہیے جس سے لطف حاصل ہو۔ میں آپ سے محض ایک عام انسان کی حیثیت میں مخاطب ہوں؛ ایک معمولی راہب کی طرح۔ میں جو کچھ کہوں، اگر آپ اسے کسی قابل سمجھیں، تو میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس پر عمل

کرنے کی کوشش کریں گے۔

آج میں آپ کے سامنے بہت کے عوام کی حالتِ زار اور ان کی آرزوؤں کے بارے میں اپنے احساسات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نوبیل انعام ایک انعام ہے جس کے وہی عوام حق دار ہیں، اپنی ہمت کے لیے اور پچھلے چالیس برسوں کے غیر ملکی قبضے کے باوجود کام نہ ہونے والے عزم کے لیے۔ میں اپنے ملک کے محصور ہم وطن مردوں اور عورتوں کے آزادی و ترقی کی حیثیت میں آپ سے بات کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں ان لوگوں کے لیے پیش یا نفرت کی بنیاد پر کچھ نہیں کہنا چاہتا جو ہمارے ملک کے باشندوں کے بے انتہا مصائب کے، ہماری زمین کی تباہی کے ان کے گھروں اور تہذیب کی تباہی کے ذمے دار ہیں۔ وہ بھی انسان ہیں اور ہماری دردمندی کے حق دار بھی ہیں۔ میں اپنے ملک میں آج اپنے عوام کی افسوسناک حالت اور ان کی تمنائوں کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں، اس لیے کہ آزادی کے لیے ہماری جدوجہد میں صداقت ہی سب سے بڑا ہتھیار ہے جو ہمارے قبضے میں ہے۔

یہ احساس ایک قسم کا بھٹی چارہ اور بہنا پا اور دوسروں کے لیے محبت کی گرمی اور دردمندی استوار کرنے میں مددگار ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر ہم سب ایک جیسے انسان ہیں، جو خوشیوں کے خواباں ہوتے ہیں اور مصیبتوں کو ماننے کی کوشش کرتے ہیں۔ بدلے میں یہ ضروری بھی ہوتا ہے، اگر ہم کو اس ہمدردی سے بھرتی ہوئی دنیا میں زندگی گزارنی ہو، اس لیے کہ اگر ہم، دوسروں کی ضرورتوں کا خیال کیے بغیر، خود غرضانہ طور پر وہی کرنا چاہیں جو ہمارے مفاد میں ہو تو ہم نہ صرف دوسروں کو بلکہ اپنے آپ کو بھی نقصان پہنچائیں گے۔ اس صدی کے دوران یہ حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آگئی ہے۔ ہم جانتے ہیں، مثال کے طور پر، کہ اگر آج ہم جوہری جنگ شروع کر دیں تو یہ ایک قسم کی خودکشی ہی ہوگی، یا ہواؤں اور سمندروں کو مہلک یا آلودہ کرنے سے ہم اپنے لیے فوائد حاصل کریں، تو ہم اپنے بچہ کی بنیاد ہی کو تباہ کر دیں گے۔ باہمی انحصار پر مجبور ہونے کے باعث ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ ہم خود میں ایک آفاقی ذمے داری پیدا کریں۔

آج ہم واقعی ایک عالمی خاندان بن چکے ہیں۔ دنیا کے ایک حصے میں کچھ ہو تو ہم پر بھی اثر پڑتا ہے۔ یہ منفی واقعات پر صادق نہیں آتا مگر مثبت معاملات میں یہی ہوتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے جدید طریقوں کے طفیل ہمیں صرف یہی نہیں معلوم کہ دوسری جگہ پر کیا ہو رہا ہے، بلکہ وہ واقعات بھی ہم پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں جو ہم سے بہت فاصلے پر ہوں۔ مشرقی افریقا میں بموں کے رہنے والے بچے ہم میں احساسِ افسردگی پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں بھی خوشی کا احساس ہوتا ہے جب ہم عشروں سے بنی ہوئی برہمنی کی دیوار کے جدا کیے ہوئے کسی خاندان کو دوبارہ یکجا ہوتا دیکھتے ہیں۔ جب ہمارے ملک سے میلوں دور کوئی جوہری حادثہ ہوتا ہے تو ہماری فضلیں اور ہمارے موبی آلودہ ہو جاتے ہیں اور ہماری صحت اور ہماری زندگیوں بھی خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ اور جب جنگ میں ملوث دو حریفوں کے درمیان امن ہو جاتا ہے تو ہمارا تحفظ بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔

مگر جنگ ہو یا امن، فطرت کا تحفظ ہو یا تباہی، انسانی حقوق کا فروغ ہو یا اس میں خلل اندازی، اخلاقی اور جمہوری اقدار کی کمی ہو یا ترقی، انسانی ادراک میں خلل یا رخنے ایک محدود مظاہر نہیں رہتے جن کا آزادانہ تجزیہ کیا جاسکے۔ درحقیقت، دونوں ہر درجے پر ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں اور ان کی طرف اتنی ہی احتیاط کے ساتھ برہنہ پڑتا ہے۔

جنگ کی عدم موجودگی کے احساس کا امن اس انسان کے لیے کسی کام کا نہیں ہوتا جو بھوک یا سردی کے باعث مر رہا ہو۔ یہ خمیر کے قیدی پر کیے ہوئے تشدد سے ہونے والے درد کو ختم نہیں کرتا۔ یہ ان لوگوں کو سکون فراہم نہیں کرتا، ممانہ والے ملک کی پر رحمانہ شجر تراشیوں سے ہونے والے سیلاب میں جن کے پیاروں کی جان گئی ہو، امن و چین پا سیدار ہوتا ہے جہاں انسانی حقوق کا احترام کیا جاتا ہو، جہاں لوگوں کو غذا ملتی ہو اور جہاں افراد اور قومیں آزاد ہوں۔ خود اپنا اور اپنے اطراف کی دنیا کا امن صرف ذہنی سکون کی ترقی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ سطور بالا میں بیان کیے گئے دوسرے مظاہر بھی اسی طرح آپس میں منسلک ہوتے ہیں۔ اسی طرح، مثال طور پر، ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ کی صورت میں صاف ماحول، دولت اور جمہوریت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، خصوصاً جوہری جنگ کی حالت میں مادی ترقی انسانی خوشی کے لیے کافی نہیں ہوتی۔

انسانی سرفرازی کے لیے مادی ترقی یقیناً اہم ہوتی ہے۔ ہم نے بہت میں تکنیکی اور معاشی ترقی پر بہت کم توجہ دی تھی، اور اب ہمیں احساس ہو رہا ہے کہ ہم غلطی پر تھے۔ بالکل اسی طرح، روحانی ترقی کے بغیر مادی ترقی بھی مسائل پیدا کر سکتی ہے۔ کچھ ملکوں میں ظاہری ترقی پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور باطنی ترقی کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے۔ میرے خیال میں دونوں ہی اہم ہیں کہ ان میں توازن قائم کیا جانا چاہیے۔ مغرب سے آنے والے سیاح، اہالیانِ بیت کو خوش و صرم اور زندہ دل قوم کہتے ہیں۔ یہ ہمارے قومی کردار کا حصہ ہے، جو تہذیب اور مذہبی اقدار سے بنتا ہے، جو اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ ہر کچھ رکھتے والی مخلوق، انسان اور حیوان دونوں، سے محبت اور مہربانی کے ذریعے پیش آنا اس بات کی کلید ہے کہ آپ میں باطنی امن ہے یا نہیں، کہ اگر آپ میں باطنی امن ہے تو ظاہری مسائل آپ کے عمیق امن اور آسودگی کے احساس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ ایسی ذہنی کیفیت میں آپ، اپنی باطنی خوشی کو باقی رکھتے ہوئے، سکون اور دہل کے ذریعے حالات سے معاملہ کر سکتے ہیں۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ باطنی امن کے بغیر، خواہ آپ کی زندگی مادی اعتبار سے کتنی ہی پرسکون کیوں نہ ہو، مساعد حالات آپ کو فکر مند پریشان اور ناخوش ہی رکھیں گے۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ بہت اہم مسئلہ ہے، اس لیے ان مظاہر کے، اور دوسری قسم کے اندرونی مظاہر کے درمیان کے رشتوں کو سمجھنے کے لیے، اور توازن کے ساتھ مسائل کو حل کرنے کے لیے مختلف پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آسان کام نہیں ہوتا۔ مگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا کہ آپ ایک مسئلے کو حل کرنے کے دوران انتہائی مشکل دورا مرحلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ لہذا حقیقتاً ہمارے پاس کوئی نعم البدل نہیں ہوتا؛ ہمیں ایک آفاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا چاہیے، جغرافیائی اعتبار سے نہیں، مگر

ان مسائل کے پیش نظر جو ہمارے کرۂ ارض کے لیے مسائل پیدا کر رہے ہیں۔

ذمے داری صرف ہمارے ممالک کے رہنماؤں پر یا ان پر جو کسی مخصوص عہدے کے لیے منتخب یا تعینات کیے گئے ہیں، نہیں ہوتی۔ یہ ہم سب پر عائد ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر امن ہم میں سے ہر ایک سے شروع ہوتا ہے۔ جب ہم میں باطنی امن ہو تو ہم اپنے اطراف کے ساتھ بھی امن سے رہ سکتے ہیں۔ جب ہمارا سماج امن کی حالت میں ہو تو ہم اپنے ہمسایہ سماج کے ساتھ بھی امن سے رہ سکتے ہیں۔ جب ہم دوسروں کے لیے محبت اور مہربانی کے احساس رکھتے ہیں تو یہ جذبہ نہ صرف دوسروں کو محبت اور خبر گیری کا احساس دلاتا ہے بلکہ یہ باطنی محبت اور امن پیدا کرنے میں دوسروں کی بھی مدد کرتا ہے۔ اور بھی طریقے ہوتے ہیں جن سے ہم شعوری طور پر محبت اور مہربانی کا احساس پیدا کرنے کا کام کر سکتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ کے لیے ایسا کرنے کا مؤثر طریقہ مذہب پر عمل سے نکلتا ہے۔ دوسروں کے لیے یہ غیر مذہبی طریقوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ اہم تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو ایک دوسرے کے لیے، اور فطری ماحول کے لیے جس میں ہم زندگی گزارتے ہیں، سنجیدگی سے اپنا ذمے داری پر عمل کرنا چاہیے۔

ہمارے اطراف ہونے والے واقعات نے میری ہمت آزمائی کی ہے۔ دوسرے ملکوں، بالخصوص یورپ، کے نوجوانوں کے ماحول کی خطرناک تہی کے سدباب کے مطالبے کے بعد، جو معاشی ترقیات کے نام پر کیے جا رہے ہیں، عالمی سیاست کے رہنماؤں نے اس مسئلے میں با معنی اقدام شروع کر دیے ہیں۔

World Commission on the Environment and Development کی جانب سے اقوام متحدہ کے سیکریٹری کو پیش کی جانے والے Brundtland Report حکومتوں کو مسئلے کی اہمیت کی تعلیم دیے جانے کی طرف ایک اہم قدم تھی۔ جنگ میں تباہ ہونے والے علاقوں میں امن کی بحالی اور کچھ قوموں کو خود مختاری کے حقوق دینے کے فیصلے کے نتیجے میں سوویت اقوام کو افغانستان سے نکلنا پڑا اور آزاد میسوپیا کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مسلسل عدم تشدد کی عوامی کوششوں کی وجہ سے اور بہت سے ملکوں کو جمہوریت سے قریب لانے کے سلسلے میں فلپائن کے دارالحکومت منیلا سے مشرقی جرمنی کے دارالحکومت برلن تک بڑی ڈرامائی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ سرد جنگ کے ختم ہونے سے بر جگہ کے لوگ نئی امیدوں سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ فلسطینیوں کو اپنے ملک میں تبدیلی لانے کی چینی عوام کی کوششوں کو ظالمانہ انداز میں کچل دیا گیا تھا۔ نگران کی کوششیں بھی امید کا منبع بنی ہیں۔ فوجی طاقت چینی عوام کی آزادی کی خواہش اور اس کے حصول کے مصمم ارادے کو ختم نہیں کر سکی ہے۔ میں خاص طور پر اس حقیقت کو پسند کرتا ہوں کہ ان نوجوانوں نے، جن کو تعلیم دی گئی ہے کہ طاقت بندوق کی مانی سے پیدا ہوتی ہے، عدم تشدد کو اپنا اختیار بنانے کا انتخاب کیا ہے۔

یہ مثبت تبدیلیاں اٹھارے کمری ہیں کہ دلیل، بحث اور آزادی کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والی خواہش ہی بالآخر فتح یاب ہوتی ہے۔ جہاں جنگ، تشدد اور جبر ایک طرف ہو اور امن، دلیل اور آزادی دوسری جانب تو

آخر اندک رہی بالادست طاقت ٹھہرتی ہے۔ یہ احساس کہ ہم تبت والے بھی ایک دن پھر آزاد ہوں گے، ہمارے دلوں کو امیدوں سے لبریز کر دیتا ہے۔

مجھے نوٹیل امن کا انعام کا دیا جانا، ایک دو راخوادہ تبت کے سادہ سے راہب کو یہاں ماروے میں، ہم تبت والوں کو امید سے سرشار کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ باوجودیکہ ہم نے تشدد کے ذریعے اپنی طرف توجہ مبذول نہیں کرائی ہے، ہمیں بھلا یا نہیں گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ ان قدروں کو جن کو ہم اپنے کیلچے سے لگائے رکھتے ہیں، بالخصوص ہر نوع کی حیات کے لیے، ہمارے احرام اور صداقت کی طاقت پر ہمارے ایمان کی آج پذیرائی اور ہمت خزانہ کی جارہی ہے۔ یہ ہمارے معلم مہاتما گاندھی کے لیے، جن کی مثال ہم سب کے لیے نشان راہ رہی ہے، خراج عقیدت بھی ہے۔ اس برس کا انعام یہ اشارہ ہے کہ آفاقی ذمے داری کا احساس اُجاگر ہو رہا ہے۔ میں دنیا کے اس حصے کے رہنے والوں کے دل میں تبت کے مصیبت زدہ عوام کے لیے سنجیدہ فکر مندی پر غور مند ہوں۔ یہ صرف ہم تبت والوں کے لیے ہی امید کا سرچشمہ نہیں، بلکہ ساری دنیا کے ستائے ہوئے لوگوں کے لیے بھی ہے۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، چالیس برسوں سے تبت غیر ملکی قبضے میں ہے۔ آج ایک لاکھ پچیس ہزار کے قریب چینی فوجیں تبت میں تعینات ہیں۔ کچھ اداروں کے اندازے کے مطابق قابض فوجیوں کی تعداد نصف ملین تک بھی ہو سکتی ہے۔ اس عرصے میں تبت کے عوام کو ان کے بنیادی انسانی حقوق، زندہ رہنے کی آزادی، نقل و حرکت، تقریر، عبادت وغیرہ سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔ تبت کی چھ ملین آبادی کا چھٹا حصہ براہ راست، چینی حملے اور قبضے کے باعث موت کی بھیمنٹ چڑھ چکا ہے۔ تہذیبی انقلاب کی شروعات سے پہلے ہی، تبت کی کئی خانقاہیں، مندر اور تاریخی عمارات تباہ کر دی گئی تھیں۔ جو کچھ بچ رہی تھیں وہ تہذیبی انقلاب کے دوران ہمار کر دی گئی ہیں۔ میں اس نکتے کی تفصیلات پر، جو مضبوط تحریر میں بھی آچکی ہیں، زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتا۔ جس چیز کا احساس زیادہ ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ 1979 کے بعد سے، جس میں چند خانقاہوں کی دوبارہ تعمیر اور ایسی ہی کچھ علامتی آزادیاں دی گئی تھیں، تبت کے عوام کے انسانی حقوق کی آج بھی باقاعدہ خلاف ورزی کی جارہی ہے۔ پچھلے چند گھنٹوں میں یہ خراب حالت بد سے بدتر ہو گئی ہے۔

اگر ہندوستان کی حکومت نے اور دنیا کے مختلف اداروں نے، جلا وطن کی جانے والی کمیونٹی کی اتنی فیاضی سے مدد نہ کی ہوتی اور ان کو پناہ نہ دی ہوتی، تو آج ہماری پاش پاش قوم بکھرے ہوئے ٹکڑوں سے ذرا ہی زیادہ ہوتی۔ ہماری تہذیب، ہمارا مذہب اور ہمارا قومی ایک سب کچھ ختم کر دیا گیا ہوتا۔ فی الحال ہم نے جلا وطنی کے عالم میں بھی اسکول اور خانقاہیں قائم کر لی ہیں۔ اپنے لوگوں کی خدمت اور ان میں اپنی تہذیب کے سچ بونے کی غرض سے جمہوری ادارے بھی بنائے ہیں۔ اس تجربے کی بنیاد پر ہم مستقبل کے آزاد تبت میں مکمل جمہوریت قائم کرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح جلا وطنی میں جیسے جیسے جہد یہ خطوط پر ہماری کمیونٹی ترقی کرتی ہے، ہم اپنی شناخت اور تہذیب کی حفاظت بھی کریں گے اور اپنے لاکھوں ہم وطن

مردوں اور عورتوں کو امید کی دولت سے مالا مال بھی کریں گے۔

ہمارے سامنے اس وقت سب سے ضروری مسئلہ بڑی تعداد میں تبت میں چینی آبادکاروں کا ہے۔ اگرچہ قبضے کے پہلے چند عشروں میں چینیوں کی خاصی تعداد تبت کے مشرقی علاقوں میں منتقل کر دی گئی تھی۔ تبت کے صوبوں Amdo (Chinghai) اور Kham میں (جن کا زیادہ تر حصہ بمسایہ چینی صوبوں میں ضم کر دیا گیا ہے) 1983 سے بہت بڑی تعداد میں چینی افراد کو (مرکزی اور مغربی تبت، جس کو عوامی جمہوریہ چین نام نہاد تبت کا خود مختار علاقہ کہتی ہے) بسایا جا رہا ہے۔ اس طرح، بڑی تیزی سے تبت کے لوگوں کو خود ان کے اپنے ملک میں اپنی اقلیت میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ اس واقعے کو، جو تبت کی قوم کی بقا، اس کی تہذیب اور روحانی وراثت کو خطرے میں ڈال رہا ہے، اب بھی روکا اور اٹھا جاسکتا ہے۔ مگر اس کو فوراً روکا جانا چاہیے، قبل اس کے کہ بہت دیر ہو جائے۔

احتجاج اور تشدد آمیز جبر کا نیا دور، جس کی شروعات 1987 میں ہوئی تھی اور لہاسا میں مارشل لا کے نفاذ تک جس کا عروج تھا، اس برس کے مارچ تک چینیوں کے تبت میں ہولناک داخلے کے خلاف تھا۔ ہماری بھلا وطنی میں ہم تک جو احکامات پہنچی تھے، ظاہر کرتی تھیں کہ سخت ترین سزاؤں اور تبت کے باشندوں سے غیر انسانی سلوک کے باوجود لہاسا اور تبت کے کئی شہروں میں پرامن اور احتجاجی جلوں جاری ہیں۔ ہم تک پہنچنے والی احکامات کے مطابق، مارچ کے احتجاجی جلوسوں کے دوران تحفظ کے ذمے دار فوجیوں کے ہاتھوں دو سو سے زیادہ تبتی یا تو ہلاک ہو چکے تھے یا عقوقیت خانوں میں قید ہیں جن پر تشدد عام ہے۔

ایسے خراب حالات کے پس منظر میں مزید ہلاکتوں کو روکنے کی خاطر میں نے تبت میں امن اور انسانی حقوق کی بحالی کی تجویز پیش کی تھی، جس کو عام طور پر پانچ نکاتی امن منصوبے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میں نے اس منصوبے کے خدوخال امرابہرگ میں اپنی ایک تقریر میں بھی پیش کیے تھے۔ میرے خیال کے مطابق یہ منصوبہ عوامی جمہوریہ چین سے مذاکرات اور گفت و شنید کا ایک حقیقی اور مناسب ڈھانچا پیش کرتا ہے۔ چین کے رہنماؤں نے اب تک اس پر اپنا کوئی تعمیری رد عمل ظاہر نہیں کیا ہے۔ اس جون میں چینی جمہوری تحریک کے وحشیانہ امتناع نے میرے اس خیال کو تقویت پہنچاتی ہے کہ تبت کے لیے کسی بھی قسم کا بندوبست اسی وقت معقول ہوگا جب اس کے لیے کافی بین الاقوامی ضمانتیں فراہم کی جائیں۔

پانچ نکاتی امن منصوبہ اہم اور آپس میں منسلک نکات کو مخاطب کرتا ہے، میں نے جن کا تذکرہ اپنے اس خطبے کے پہلے حصے میں کیا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔ (1) پورے تبت کی، جس میں Khan اور Amdo صوبے بھی شامل تھے، انہما کے اصول کے مطابق، قلبِ ماہیت کی جائے۔ (2) چین کی آبادی کی منتقلی کی پالیسی سے دست برداری کا اعلان کیا جائے۔ (3) تبت کے عوام کے بنیادی حقوق اور جمہوری اداروں کا احترام کیا جائے۔ (4) تبت کے قدرتی وسائل کی بحالی اور حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ (5) تبت کے مستقبل کی حیثیت کا تعین کیا جائے اور چین اور تبت کے عوام کے درمیان رشتوں کی بحالی کی جائے۔ میں نے

اسٹراٹ برگ کی تقریر میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ بہت کم ایک مکمل اور خود مختار سیاسی وجود کا رتبہ دیا جائے۔
اس موقع پر میں انسانی امن کے علاقے کے تصور کی وجہ پیش کرنا چاہوں گا جو پانچ نکاتی منصوبے کا مرکزی عنصر ہے۔ میں قائل ہوں کہ یہ صرف بہت ہی کم لیے نہیں، ایشیا کے امن اور استحکام کے لیے بھی بہت اہم ہے۔

میرا خواب یہ ہے کہ پورے بہت کی سطح مرتفع ایسی پناہ کا علاقہ بن جائے جہاں انسانیت اور فطرت امن اور ہم آہنگی کے توازن میں زندہ رہ سکیں۔ یہ ایسی جگہ ہو جہاں پوری دنیا کے لوگ، بغیر دنیا کے تناؤ اور بوجھ سے پرے رہ کر اپنے اندرون کے امن کے صحیح معنی تلاش کر سکیں۔ اس طرح بہت امن کے فروغ اور ترقی کا تخلیقی مرکز بن سکے گا۔

مندرجہ ذیل نکات انہما کے مجوزہ علاقے کے کلیدی نکات ہیں:

— بہت کی پوری سطح مرتفع فوجوں سے خالی کر دی جائے گی۔

— بہت کی پوری سطح مرتفع پر جوہری ہتھیاروں اور دوسرے فوجی ساز و سامان کی تیاری، تجربات اور ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہوگی۔

— بہت کی سطح مرتفع دنیا کی سب سے بڑے فطرتی پارک اور حیاتی کرے (biosphere) میں قلب ماہیت کر دی جائے گی۔ حیوانی اور نباتی زندگیوں کے تحفظ کے لیے سخت قوانین نافذ کیے جائیں گے، قدرتی وسائل کے استحصال پر کنٹرول کیا جائے گا تاکہ ان سے منسلک فضائی نظام کو نقصان نہ پہنچایا جا سکے، اور آباد علاقوں کے لیے ترقیات کی پالیسی وضع کی جائے گی۔

— جوہری ہتھیاروں کی تیاری، استعمال اور دوسری نیکیا لوثی، جو خطرناک فضلے خارج کرتے ہیں، ممنوع کیے جائیں گے۔

— قدرتی وسائل اور پالیسی کو امن کے عملی فروغ اور ماحول کے تحفظ کی طرف راغب کیا جائے گا۔ امن کو آگے بڑھانے اور ہر نوع کی حیات کی مہمان نوازی کے لیے بہت کو مکان کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

— بہت میں انسانی حقوق کے تحفظ اور بہت خزانوں کے لیے بین الاقوامی اور علاقائی ادارے قائم کیے جائیں گے۔

بہت کی بلندی اور (یورپی کمیونٹی کے برابر) جسامت کے ساتھ ساتھ اس کی افرادی تاریخ اور عمیق مذہبی وراثت نے اس کو ایشیا کے مرکز میں امن کی مثالی جائے پناہ کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ بہت ایک پُر امن بدھ قوم ہونے اور ایشیا کی بڑی، اور اکثر حریف، طاقتوں کے درمیان رکاوٹی سیاست کا تاریخی کردار ادا کرنے کے قابل بھی ہے۔

ایشیا میں موجود تناؤ کم کرنے کی خاطر سوویت یونین کے صدر جناب گورباچوف نے تجویز پیش کی ہے کہ چین اور سوویت سرحدوں سے فوجوں کو ہٹا کر اس علاقے کی "امن پسند اور اچھی ہمسائیگی" میں قلب ماہیت

کر لی جانی چاہیے۔ خیال کی حکومت نے بھی بہت پہلے تجویز پیش کی تھی کہ ہمالیائی مملکت خیال کی جس کی سرحدیں تبت سے ملتی ہیں، امن کا علاقہ قرار دے دیا جائے، اگرچہ اس تجویز میں اس ملک کو غیر فوجی بنانے کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔

ایشیا کے استحکام اور امن کے لیے ضروری ہے کہ بڑا اعظم کی بڑی اور ممکنہ حریف طاقتوں کو الگ رکھنے کے لیے درمیان میں ایک امن کے علاقے کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ایشیا کی سب سے زیادہ آبادی والے دو ملکوں چین اور بھارت کو الگ رکھنے کے لیے ان کے درمیان ایک حقیقی امن کا علاقہ قائم ہونا بھی ایک ضروری امر ہے۔

انہما کے علاقے کے قیام کے لیے ضروری ہوگا کہ تبت سے فوجیں واپس بلا لی جائیں، تاکہ تبت سے ملحق ہمالیائی علاقے سے ہندوستان اور خیال بھی اپنی فوجیں اور فوجی مہاز و سامان ہٹا لے جائیں۔ یہ مقصد بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعے ہی حاصل کیا جانا چاہیے۔ یہ ایشیا کی تمام ریاستوں، بالخصوص چین اور ہندوستان کے بہتر مفاد میں ہوگا، اس لیے کہ یہ عمل ان کے تحفظ میں اضافہ کرے گا، ساتھ ہی ساتھ ان کے معاشیاتی اور دور دراز کے علاقوں میں فوجی موجودگی کے بوجھ کو بھی کم کرے گا۔

تبت حکمت عملی کے ذریعے خالی کیا جانے والا پہلا غیر فوجی علاقہ نہیں ہوگا۔ جزیرہ نما سینائی کے کچھ حصے بھی، جو مصر اور اسرائیل کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرتے ہیں کچھ عرصے کے لیے غیر فوجی بنا دیے گئے ہیں۔ بلاشبہ کاسٹاریکا عمل طور پر غیر فوجی ملک کیے جانے کی بہترین مثال ہے۔ اس لیے تبت بھی کوئی پہلا علاقہ نہیں ہوگا جو فطرت کے تحفظ کا blaspheme بنے گا۔ دنیا بھر میں اس قسم کے بہت سے پارک بنائے جا چکے ہیں۔ کچھ بہت ہی فوجی اہمیت کے علاقے بھی فطری ”امن پارک“ میں تبدیل کیے جا چکے ہیں۔ اس کی دو مثالیں ہیں، کاسٹاریکا / پاناما کی سرحد اور کاسٹاریکا / نکاراگوا کی سرحد پر واقع Si A Paz کا منصوبہ۔

ابھی سال جب میں نے کاسٹاریکا کا دورہ کیا تو میں نے دیکھا، کس طرح غیر فوج کا ایک ملک کامیابی سے ایک مستحکم جمہوریت بن سکتا ہے جو امن سے وفادار بھی ہو اور ماحول کا محافظ بھی۔ اس منظر نے تبت کے لیے میرے تصور کو اس یقین میں بدل دیا کہ تبت کے لیے پیش کیا جانے والا منصوبہ بھی حقیقت پسندانہ ہے، محض ایک خواب نہیں۔

اب میں آپ سب کا اور اپنے ان دوستوں کا بھی، جو یہاں موجود نہیں، ذاتی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ تبت والوں کی حالتِ زار کے لیے جس فکر اور دردمندی کا آپ نے اظہار کیا ہے، اس نے ہم سب کے دلوں کو صوبہ لیا ہے اور ہماری ہمت کا باعث ہوا ہے کہ ہم، اسلحے کے زور پر نہیں بلکہ عزم اور صداقت کے طاقت و رجحان کے ذریعے آزادی اور انصاف کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں تبت کے تمام عوام کی طرف سے بول رہا ہوں اور آپ سے گزارش کروں گا کہ ہماری تاریخ کے اس دقیق موقع پر آپ تبت کو فراموش نہ کیجیے گا۔ ہم بھی اُمید کرتے ہیں کہ ہم ایک زیادہ بڑا امن، دردمند اور خوب

صورت دنیا کے قیام میں معاون ہوں گے۔ مستقبل کے افکار سے آزاد تہت، دنیا کے تمام ضرورت مندوں کی، فطرت کے تحفظ کی، اور امن کی ترقی کی کوششوں میں اپنی مدد و ضرور فراہم کرے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ روحانی اور عملی رویوں کو یک جا کرنے کی ہماری قابلیت ایک خاص مدد ہوگی، خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ یہی میری امید بھی ہے اور دعا بھی۔

میں آپ کے ساتھ ایک چھوٹی سے دعا بھی کرنا چاہوں گا جو مجھ کو بڑا عزم اور مبارک دیتی ہے:

جب تک امن سلامت ہے
اور جب تک زندگی باقی ہے
اس وقت تک میں بھی پابند رہوں
دنیا کی بد بختی کو دور کرنے میں

شکریہ!



آسکرایریس سانچس اعلان تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات!

اس برس کا نوبل امن انعام، اُن چھ انعامات میں سے جو آج پیش کیے جا رہے ہیں، بنیادی اعتبار سے خراج تحسین اور تشکر ہے آسکرایریس سانچس کے قابلِ تعریف کام کے لیے جو انہوں نے امریکا میں دیر پا امن حاصل کرنے کے سلسلے میں انجام دیے ہیں۔

حال یہ برسوں میں دنیا کے کچھ علاقوں کو خانہ جنگی اور تنازعات کے بہت تلخ تجربات ہوئے ہیں۔ ایک عرصے سے عدم تحفظ، جبر، آزادی کا فقدان اور افلاس ان 25 ملین افراد میں سے اکثریت کا مقدر ہے ہیں جو اس علاقے میں رہتے ہیں۔

ان لوگوں کے لیے اب ایک نئی امید پیدا ہو گئی ہے۔ اسی برس 7 اگست کو نکاراگوا، ایل سلواڈور کو نئے مالا، ہندو یوراس اور کاسا ریکا کے صدور نے مرکزی امریکا میں امن کے لیے ایک منصوبے پر دستخط کیے ہیں۔ ساویائی نوبل کمیٹی یقین کرتی ہے کہ یہ منصوبہ ترقیات کے ایسے نئے امکانات پیدا کر رہا ہے جو ایک آزاد اور یقین سوز ماحول کے ذریعے خود نہیں تنازعے کا متبادل فراہم کرے گا۔

اس منصوبے کے پیچھے اس برس کے انعام پانے والے، کاسا ریکا کے صدر آسکرایریس ہیں۔ آج وہ مرکزی امریکا کے عوام میں امن کے سب سے بڑے توجہ کے طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ اُن جمہوری اقدار کے بھی توجہ ہیں جو اگر حاصل کی جائیں تو دیر پا امن کے لیے ایک فیصلہ کن شرط اولین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منصوبہ پوری دنیا میں امن کے حصول کے لیے ایک سنگ میل کے مترادف ہے۔

وگنر ہیو کو نے کہا تھا کہ ”کوئی شے ایک بروقت خیال سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔“ ہمیں یقین ہو جانا چاہیے کہ اس وقت اس منصوبے سے بڑھ کر اور کوئی خیال نہیں ہو سکتا تھا جو مرکزی امریکا میں آشکار ہوا ہے۔ یہ

حقیقت کہ یہ منصوبہ نتیجہ ہے دستخط کرنے والی ان پانچویں ریاستوں کے درمیان ہونے والے تعاون کا، اس امر کو واضح کرتی ہے کہ دستخط کرنے والوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کا وقت آ پہنچا ہے۔ لہذا آسکر ایریز کو دیے جانے والے امن کے انعام کو اس منصوبے پر کام کرنے والی دوسری تمام ریاستوں کے سربراہوں کی کوششوں کے اعتراف کے طور پر بھی لیا جانا چاہیے۔

چھپالیس سالہ آسکر ایریز دوسرے فوٹیل امن انعام پانے والوں کے مقابلے میں خاصے کم عمر ہیں۔ اس لیے، اس بات کا قوی امکان ہے کہ ان کی زندگی میں ہونے والے بہت سے کام ابھی ہونے باقی ہیں۔ مگر انہوں نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے، ظاہر کرتا ہے کہ وہ مرکزی امریکا کے اہم ترین رہنماؤں میں سے ہیں۔ ان میں وہ ذاتی اور نظر باقی پس منظر اور ضروری تجربہ موجود ہے جس کے ذریعے وہ اس علاقے میں شروع کیے جانے والے امن کے منصوبے پر کام جاری رکھ سکتے ہیں۔

انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز 29 برس کی عمر میں 1970 میں کیا تھا، جب وہ سابق صدر ہوزے فیکریس (José Figueres) کے مددگار کے طور پر سامنے آئے تھے جو دوبارہ انتخاب میں حصہ لے رہے تھے۔ انتخابی مہم کامیاب ہوئی تھی۔ فیکریس نے 1970 کے انتخابی میں کامیابی حاصل کی اور آسکر ایریز قومی منصوبہ بندی اور سیاسی معاشیات کے وزیر کے طور پر ان کی حکومت میں شامل ہوئے۔ آسکر ایریز 1978 میں قومی اسمبلی میں نیشنل لبریشن پارٹی کے نمائندے کے طور پر منتخب ہوئے۔ اس وقت وہ پارٹی کے بین الاقوامی سیکریٹری تھے اور 1979 میں اس کے جنرل سیکریٹری بن گئے۔ 1985 میں انھیں صدارتی امیدوار کے طور پر نامزد کیا گیا تھا اور انتخاب میں کامیاب ہو کر وہ صدر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

غالباً یہ اتفاق نہیں کہ وہ کاسٹاریکا کے صدر ہی ہیں جو مرکزی امریکا کے لیے امن کے منصوبے کی مرکزی قوت بنے۔ ان کا ملک کئی اعتبار سے واقعی امن کا گہوارہ ہے، ایسے علاقے میں جہاں بد قسمتی سے سب کچھ رہا ہے سوائے امن کے۔ اس دور میں بھی جب کاسٹاریکا ہسپانوی نوآبادی تھا، یہ ملک کچھ خصوصیات کا حامل تھا۔ جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے یہ کوئی امیر ملک نہیں تھا۔ اس میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو سونے کے متلاشی یا دوسرے قسمت آزمائی کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ یہ ملک بڑے اور منافع بخش ادارے بنانے کے لیے بھی بہت چھوٹا تھا اس نوآبادی میں باہر سے آ کر بسنے والوں نے بس اتنی زمین حاصل کی جو ان کے مان نفع کے لیے کافی ہو، اور ان پر خودی زراعت کی مقامی ضرورت تھی اور اس کے لیے لوگوں کے پاس گھناؤنی تھی۔ اس کو آباد کرنے والا خود بھی ایک عام محنت کش کسان تھا۔

اس طرح کاسٹاریکا میں اونچے طبقے کی جاگیر داری، جس میں مفلس افراد کی اکثریت پر حاکمیت کی جا سکے، نہیں پنپ سکی جیسا کہ دوسری دنیا کے ملکوں میں عموماً پایا جاتا ہے۔ اس کی قلیل آبادی، جو 1821 میں صرف 65,000 تھی، زیادہ تر چھوٹے زمیندار نما کاشت کاروں پر مشتمل تھی۔ اس کی آبادی تہذیبی اور معاشیاتی اعتبار سے ایک نسلی بھی تھی اور چوں کہ ملک نوکریاں ہی اور ہسپانیہ کی مرکزی انتظامیہ سے نسبتاً الگ تھلگ تھا، اس

کا مزاج خود بخاری اور آزادی کے بارے میں توانا اور لچک دار بن گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں، یہ ملک جمہوری روایات کے لیے ایک مثالی مرکز تھا۔

انیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں جب کاسٹاریکا ایک خود مختار جمہوریہ بنا، اس کی قلب مابیت میں نہ اسلحہ استعمال ہوا اور نہ خون ریزی ہوئی۔ اس کے پوری تاریخ میں فوجی طاقت کا استعمال غیر ضروری رہا ہے، اور اس کو اس بات پر فخر ہو سکتا ہے کہ اس میں 1890 کے عشرے سے ایک مستحکم اور دیر پا جمہوریت قائم ہے۔

اس وقت سے اب تک اس ملک کا یہی خاصہ رہا ہے۔ 1948 میں ایک مختصر مسلح بغاوت کے بعد یہاں ایک نیا آئین نافذ کیا گیا تھا۔ آئین میں یہ اعلان ہوا تھا کہ کاسٹاریکا فوجی طاقت کا حامل نہیں ہوگا۔ کوئی اس ادارے کے بارے میں کچھ بھی کہے اس بات کا اقرار کرنا پڑے گا کہ اس کی تنسیخ امن میں ایسی دلچسپی ظاہر کرتی ہے جو اس دنیا میں نسبتاً غیر معمولی ہے۔

اگرچہ اس کی سرحدوں پر مسلح پھرے دار ہوتے ہیں، صحیح معنوں میں یہاں کوئی فوجی طاقت نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کاسٹاریکا میں سپاہیوں سے زیادہ تعلیم دینے والے افراد ہیں۔ کچھ تو یہاں تک دھمکی کرتے ہیں کہ اس ملک کا توپ خانہ سرکاری دوروں میں اکیس توپوں کی سلامتی تک دینے کے قابل نہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ مخصوص تفصیل اب تک ٹھیک کر لی گئی ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس ملک کی اصل پیداوار کافی ہے اور دیانت دار عوام۔ سچ تو یہی ہے کہ اس کی پیداوار قابل تعریف ہے۔

روایتی طور پر کاسٹاریکا کی شہری مقتدرہ نے تعلیم، صحت اور معاشیاتی ترقیات میں سرمایہ کاری کو فوقیت دی ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشیاتی ترقی اور سماجی مساوات کے اعتبار سے کاسٹاریکا ایک غیر معمولی علاقہ ہے۔ یہ بات اس حقیقت کے باوجود بھی سچ ہے کہ بیسویں صدی کے ساتویں عشرے سے تیل کی برکت ہوئی اور کافی کی گرتی ہوئی قیمتوں کے باعث یہاں کے معاشی مسائل میں اضافہ ہوا ہے۔

مرکزی امریکا میں امن کے قیام کے عمل میں کاسٹاریکا کے مرکزی کردار کا پس منظر ملک کی جمہوری روایات ہیں۔

اس کام میں ایک مثبت موڑ 1983 میں آیا تھا جب ام نہاد کان ماڈورا (Gortadora) گروپ نے امن کے لیے ایک اکیس نکاتی ایجنڈا پیش کیا تھا۔ یہ گروپ میکسیکو، ونیزویلا، کولمبیا اور پیناما پر مشتمل تھا اور اس منصوبے میں نکاراگوا، ایل سلواڈور، گوئٹے مالا، ہنڈوراس اور کاسٹاریکا شامل تھے۔ اس کو عوام کے سامنے پیش کرنے سے پہلے ان پانچ ملکوں کے رہنماؤں نے منظور کیا تھا۔ کچھ پیچیدہ وجوہ کی بنا پر، جن کے تفصیلات یہاں پیش نہیں کی جا سکتیں، یہ منصوبہ امن کا بیاق نہیں بن سکا۔ مگر اس نے لوگوں کو متوجہ ضرور کیا، بالخصوص مغربی یورپ اور کناڈا کی ہمدردیاں بھی حاصل کیں۔ ریگن انتظامیہ نے اپنے اعلان میں کہا ہے کہ یہ منصوبہ ”علاقے کے مسائل کے دیر پا حل کے لیے بہترین بنیاد“ ہے۔ مگر کان ماڈورا منصوبہ سیاسی اعتبار سے ”ظہیرا

ہو پائی،“ ثابت ہوا، کہ علاقے میں فوجی سرگرمی میں اضافہ ہوتا رہا۔

جب آسکر ایریز کا سٹاریکا کے صدر بنے تو انھوں نے کان ماڈورا گروپ کے ارادوں کے تکمیل پر فوراً کام شروع کر دیا۔ ٹکارا گوا، گوسے مالا، ایل سلواڈور اور ہونڈوراس کے صدر کے ساتھ انھوں نے ایک نیا امن منصوبہ تیار کیا، جس پر بالآخر، اس برس اگست میں دستخط ہو گئے ہیں۔ اصولی طور پر، یہ منصوبہ انھیں خیالات پر مبنی تھا جو کان ماڈورا منصوبے کی بنیاد بنے تھے، مگر اس کی تجاویز زیادہ قطعی ہیں۔ اور بہت سی باتوں کے علاوہ، اس کی بنیاد ٹکارا گوا، ایل سلواڈور اور گوسے مالا کی خانہ جنگی میں جنگ بندی، تمام گوریلا سپاہیوں کے لیے معافی، ایمرجنسی کی معطلی، سیاسی قیدیوں کی رہائی، پریس کی آزادی اور جمہوری طریقے حکومت پر ہے۔

اس منصوبے کے بارے میں دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ منصوبہ دستخط کرنے والی پانچ ریاستوں کا اپنا منصوبہ ہے، یعنی یہ انھیں کا سوچا ہوا، ان کا دستخط شدہ اور کسی بیرونی دباؤ سے پاک ہے۔ یہ کچھ کم اہم نہیں ہے، اس لیے کہ یہ مرکزی امریکا کے حالات کے بارے میں ایک مخصوص نقطہ نگاہ پیش کرتا ہے، کہ تمام تنازعات علاقے کے اندرونی معاملات ہیں، اور یہ بھی کہ یہ موجودہ سماجی اور معاشیاتی نا انصافیوں کا نتیجہ ہیں۔

جیسا کہ تیسری دنیا میں اکثر ہوتا ہے، یہ سوال ہے مفلس بے زمین افراد اور جاگیرداروں کے درمیان نا انصافی کے رشتوں کا۔ اس کے علاوہ یہ سوال ہے طاقت کے وحشیانہ استعمال کا کسی نوعیت کے حزب اختلاف کے ساتھ ایک اقلیتی حکومت کا جو بے رحمی سے تعصب برتی ہے۔ ایک بار پھر یہ وہی کہانی ہے ثروت مند اقلیت کی جو مفلس کے انصاف کے مطالبات پر اسلحے کے زور پر مانع ہوتی ہے۔ اور ہمیشہ کی طرح یہ انقلابی طاقتوں کی رہائی پر منتج ہوتا ہے۔ پھر جب مقدر طاقت سیاسی اور سماجی تنظیم نو کے بجائے جبر سے رد عمل ظاہر کرتی ہے تو نتیجہ تنازعے کے علاوہ کچھ اور نہیں نکلتا، شاید اس کو کچھ اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔

مرکزی امریکی امن منصوبہ ایک مختلف قسم کے مسئلے سے دوچار ہے۔ ارادہ صاف ظاہر ہے: پہلے کہ تنازعہ پانچ ریاستوں کے اندرونی مسائل کا نتیجہ ہے اس لیے ان پانچوں ریاستوں کو خود ہی مسائل کو حل کرنا ہوگا۔ اس اصول کی مطابقت سے، یہ منصوبہ جس کا مشورہ دیتا ہے، تمام مخالف طاقتوں کو باہر سے حاصل کرنے والی امداد کے سلسلے کو بند کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں امن کے منصوبے کے پیغام کی صرف ایک ہی تاویل ہوگی: بیرونی طاقتوں کو اگر وہ اس علاقے میں امن کی حمایت کرنا چاہتی ہیں تو، ہر اس عمل کو ترک کرنا ہوگا جو کبھی نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی کی آگ کو ہوا دے سکتا ہے۔ متحارب فریقوں کو مدد کی ضرورت ہے مگر ایسی مدد کی جو زیریں حالات کو تبدیل کرے جو تنازعے کی بنیاد بن رہی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کسی اصلاح سے پہلے استحکام اور امن کا قیام ضروری ہوتا ہے۔ اس دلیل کی کم زورئی یہ ہے، اگر اس کو صحیح مان بھی لیا جائے، کہ استحکام لانے کو ششیں ان طاقت ور گروہوں کی مددگار ہو سکتی ہیں جو اصلاح کی مخالفت کرتی ہیں، لہذا ایسا عمل اختلافی حالات کو مستحکم کرے گا۔

ظاہر ہے کہ اس کا حل اس نظریے میں ملے گا کہ اس عدم توازن کو جو تنازعے کی جڑوں میں بیٹھا ہوا ہے تبدیل کیا جائے۔ اگر اس میں کامیابی ہو تو امن اور استحکام کا قیام ان بنیادوں پر ہونا چاہیے جو خود عوام کے لیے بھی قابل قبول ہوں۔ یہی حقیقت ہے تمام فریقوں کو جسے قبول کرنا ہوگا۔

اس مرحلے پر ہم امن منصوبے کے قابل غور پہلو کی طرف آتے ہیں، یعنی، امن اور جمہوریت کے مابین رشتوں کے اندرونی اصول پر۔

کاسٹریکا کے صدر اسکراہیٹس نے صدارت کی افتتاحی تقریر میں اسی اصول کو ایک ہم نکتہ بنایا ہے۔ مائیکل نے فرمایا کہ ہمارے تجربے نے ہم کو سکھایا ہے کہ جمہوری طریقہ حکومت اس مستقبل کے لیے بڑے امکانات فراہم کرتا ہے جو انصاف پر انحصار کرتا ہے۔ افلاس اور دوسروں پر انحصار سے بچنے کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ صحیح طرح سے منتخب کیے جانے والے اداروں کے ذریعے حکومت کی جائے۔

دراصل اسکراہیٹس یہ کہہ رہے ہیں کہ حکومت کی [کسی بھی] قسم سے کہیں زیادہ اہم جمہوریت ہوتی ہے۔ درحقیقت امن کے لیے کام کرنے کے لیے جمہوریت ایک اہم آلہ ہے۔

اس سے قطع نظر کہ ہماری جمہوری روایات کتنی قدیم ہیں نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اکثریت کی حکمرانی کا اصول بے عیب نہیں۔ بہت سے معاملات میں ہم صرف اپنے یقین کردہ ہدف کی طرف گھزن ہیں۔ مگر جمہوریت کا واضح فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ جمہوریت کھڑی آگے بڑھتی ہے۔ اور چوں کہ ہم اسی راہ پر ہیں اس لیے ہم نے وہ کچھ حاصل کر لیا ہے دنیا بھر کی نئی جمہوریتیں جس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ لہذا ضروری ہے کہ ہم نئی جمہوریتوں کے معیار کو پرکھتے وقت اس تاریخی پہلو کو پیش نظر رکھیں۔ ان کی اپنی مشکلات ہوتی ہیں، جیسی کہ ہمیں پیش آتی تھیں۔

مرکزی امریکا کے موجودہ حالات سے ہم پُر امید ہیں، اس لیے کہ جمہوریت کو موقع دیا گیا ہے۔ آمرانہ حکومتوں کے مقابلے میں جمہوریت عوام کی مدد پر انحصار کرتی ہے۔ اور یہ مدد عوام کے تجربات پر منحصر ہوتی ہے۔ جب تک جمہوریت آزادانہ انتخابات، آزادی اظہار اور معتدل معاشی ترقی کے ساتھ ایمان دارانہ سماجی انصاف فراہم کرتی رہے گی عوام کی مدد سے مثبت ترقیات ہوتی رہیں گی۔

جمہوریت کے مستقبل کا انحصار عوام کی توقعات کے کم از کم، حصول پر ہوتا ہے۔ کسی آمریت سے نجات کا مشکل ہی یقین سے کیا جائے گا اگر اس کے متبادل نظام میں بد عنوانی ہو، نا انصافی ہو اور آزادی کا فقدان ہو۔ جہاں عوام کی حکومت کی ہوتی ہے وہاں کچھ مطالبے بھی ہوتے ہیں ان افراد سے جو حکومت کر رہے ہیں اور ان سے بھی جو اپنے رہنما منتخب کرتے ہیں اخلاقی معیار کے بھی مطالبے ہوتے ہیں اور اس کے بھی کہ ایسے آدرش اپنائے جائیں جن سے عام طور پر انکار نہ کیا جاسکے۔

اس پس منظر میں یہ بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے کہ مرکزی امریکی امن منصوبہ امن اور جمہوریت کے سلسلے میں کیوں اتنا مستحکم ہے۔ امن قائم ہو جائے تو جمہوریت بھی قائم ہو جائے گی۔ اس طرح یہ امن کا منصوبہ محض

خواب اور امید ہی نہیں۔ یہ ایک طاقت ور چیلنج ہے، نہ صرف ان پانچ ملکوں کے رہنماؤں کے لیے، بلکہ ہم سب کے لیے بھی۔ اگر ہم اپنی طرف سے اس میں کچھ شامل کر سکتے ہیں جو اس علاقے کی ترقی پر اثر انداز ہو سکے تو اس کو سماجی اور معاشیاتی آزادی دینا چاہیے، اور ایسی حکومت کی نشوونما جو، دہمیری جگہوں کی طرح، مرکزی امریکا میں بھی امن کی کنجی ہو۔

امن کا انعام دینے کے لیے عام طور پر دو ہدف ہوتے ہیں۔ اس میں امن کے انعام کے معاملے میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ ۱۔ سکریٹریس کو انعام کی پیشکش ایک نتیجے کے حصول کا اعتراف ہے، یعنی امن کا منصوبہ۔ اس کی نظریں مستقبل پر ہیں اور یہ اخلاقی مدد ہے اس منصوبے کی بنیاد پر امن کی کوششوں کی۔ بہت غور و خوض کے بعد نارویائی نوبل کمیٹی چاہتی ہے کہ نوبل امن انعام کی ٹیک نامی کو ان کے پلڑے میں رکھا جائے جو جدوجہد کرتے ہیں جمہوریت کے لیے، انصاف کے لیے، ترقیات کے لیے اور اپنے ملکوں کے عوام کے نظری حقوق کے لیے۔

۲۔ سکریٹریس ان لوگوں میں سے ہیں جو ایسے ہدف کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ ان کا نام آج ان ناموں میں سب سے آگے ہے جو امن کے کام کے سلسلے میں مرکز نگاہ ہیں، جو عوام کی خواہشات اور انسانی حقوق کے پانی میں ٹنگا ہوا ہے۔ نوبل کمیٹی امید کرتی ہے کہ امن کا یہ انعام اس علامتی قمارت کی کامیابی میں معاون ہوگا جو امن کے لیے ہے اور مرکزی امریکا کے جنگ سے بیزار عوام کے لیے تعمیر کی جا رہی ہے۔

Egil Aarvik صدر نشین، نارویائی نوبل کمیٹی کی زبانی

خطبہ:

صرف امن ہی نئی تاریخ رقم کر سکتا ہے

امن کی خواہش

امن، بڑی حد تک، اس خواہش میں مضمر ہوتا ہے جس کی دل سے کوشش کی جائے۔ میرے چھوٹے سے ملک کا سناریکا کے باشندوں کو ایراسم (Erasmus) کے الفاظ کا ادراک ہو گیا ہے۔ ہمارے عوام نیچے لوگ ہیں، جن کی اولاد نے نہ کبھی کوئی سپاہی دیکھا ہے نہ ٹینک اور نہ جنگی جہاز۔ میرے مہمانوں میں سے ایک جو آج اس تقریب میں موجود ہیں (مقابلہ صدر) José Figueres Ferrer ہیں، وہی جنہوں نے میرے ملک سے 1948 میں مسلح افواج کا خاتمہ کیا تھا اور ہماری تاریخ کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا تھا۔

میں لاطینی امریکی ہوں

میں یہ انعام ۲۰ سگریس نامی شخص کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے ملک کے صدر کی حیثیت میں وصول کر رہا ہوں۔ مجھے نہ کسی کا نمائندہ ہونے کا غرہ ہے نہ میں عاجزی سے خوف کھاتا ہوں، جو مجھے بڑے بڑے مقاصد رکھنے والوں کی صف میں کھڑا کر رہی ہے۔

میں اس انعام کو اُن 400 ملین لاطینی امریکیوں میں سے ایک فرد کی حیثیت میں وصول کر رہا ہوں جو خود مختاری حاصل کرنے کے لیے، جمہوریت کی خاطر کتنی بد بختی اور کتنی نا انصافی جھیل رہے ہیں۔ میں اُس لاطینی امریکا سے آ رہا ہوں جس کا چہرہ درد سے، بے تحاشا ملک بدری سے، تھک دے اور بے شمار مردوں عورتوں کی قید و بند اور اموات کے کریہہ نشانات سے مسخ ہے۔ میں اُس لاطینی امریکی علاقے سے آ رہا ہوں جہاں اب بھی ایسے آمرانہ نظام موجود ہیں جو پوری انسانیت کے لیے باعثِ شرم ہیں۔

امریکی زخموں کے نشانات

امریکا پر لگے زخموں کے نشانات گہرے ہیں۔ لیکن اس وقت امریکا آزادی کی طرف واپس جانا چاہ رہا ہے، اور جیسے جیسے وہ جمہوریت کے قریب آتا جائے گا اس کو آمروں کے چھوڑے ہوئے تشدد کے خوف ناک دنیائے شہر بدری اور موت کا سامنا ہوگا۔ امریکا کو بے اندازہ مسائل پر قابو پانا ہوگا۔ نا انصافی ماضی کی وراثت کی مہلک کارگزاریاں، سماجی بے بسی، معاشیاتی ابتری، بد عنوانی اور دھرمی بہت سی سماجی برائیوں نے اور بھی خراب کر دیا ہے۔ خرابیاں فاش ہیں، اُن دیکھنے والی آنکھوں کے لیے جو دیکھنے کی زحمت گوارا کریں۔ درپیش چیلنج کی جسامت کو دیکھتے ہوئے، یا بے شمار تباہی کے پیغام بدوں کے علامات؛ کہ افلاس کی جنگ میں شکست ہوگی، مٹاؤی؛ کہ جمہوریتیں زمین بوس ہو جائیں گی اور دعوے؛ کہ امن قائم کرنے کے کوششیں بے اثر ہوں گی تعجب نہیں کر لوگ بے ہمتی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میں اس شکست پسندی کو نہیں مانتا۔ میں بد بختی، تشدد اور نفرت کو حقیقت سمجھ کر برداشت کر لینے والا آدمی نہیں۔ میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ اپنے دکھوں کے اظہار پر، بھوکے انسان کے ساتھ تخریب کاری کی طرح پیش آنا چاہیے۔ میں اس بات کو کبھی نہیں مانوں گا کہ کسی سامنے کے جواز کے لیے، چیزوں کو جنوں کا توں رکھنے کے لیے یا ایک مختلف دنیا کی آرزو کو توجہ دینے کے لیے قانون کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ قانون خود مختاری کا راستہ ہے اس لیے اس راستے کو ہر شخص کی ترقی کے لیے کھلا ہونا چاہیے۔

خود مختاری معجزے کرتی ہے

خود مختاری معجزے کرتی ہے۔ آدمیوں کو آزاد کرنے کے لیے ہر چیز ممکن ہے۔ ایک آزاد اور جمہوری

امریکا درجہ چیلنجوں سے ٹٹ سکتا ہے۔ جب میں نے کانٹا ریکا کی صدارت سنبھالی تھی، میں نے امریکی براعظموں کے درمیان آزادی اور جمہوریت کے لیے ایک اتحاد بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔ میں نے اس وقت کہا تھا، اور آج اس کو دہرا رہا ہوں، کہ ہمیں ان حکومتوں کا اتحادی نہیں بننا چاہیے جو اپنے عوام پر جبر کرتی ہیں۔ لاطینی امریکا میں دو جمہوریتوں کے درمیان کبھی جنگ نہیں دیکھی گئی۔ ہر معترض آزادی، ہر ایمان دار قوم کے لیے غلام کو ختم کرنے کی کوشش کی مدد کو یہ وجہ کافی ہے۔

امریکا انتظار نہیں کر سکتا

امریکا کی آزادی، پورے امریکا کی آزادی، انتظار نہیں کر سکتی۔ میں اس دنیا سے آیا ہوں جہاں بڑے بڑے مسائل ہیں، آزادی کی حالت میں ہم جن پر قابو پالیں گے۔ میں ایسی دنیا سے آیا ہوں جسے جلدی ہے، اس لیے کہ بھوک انتظار نہیں کر سکتی۔ جب امید کا دامن چھوڑ دیا جاتا ہے، تشدد بالکل ناخیر نہیں کرتا۔ خود مری کا لے سے بھاگتی ہے۔ میں اس دنیا کا باسی ہوں جہاں اگر ہم یہ طے کر لیں کہ خود مختاری کی سب سے پیش قدمی سے پیچھے نہیں ہٹیں گے اور اگر ہم کو ہر ظالمانہ ارادے کو مایوس کرنا ہے، تو ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہوگا۔ میں اس دنیا سے آ رہا ہوں جو گوریلے اور سپاہی کی جنگ بندی کا انتظار نہیں کر سکتی؛ نوجوان مر رہے ہیں، بھائی مر رہے ہیں، اور کل کون جواب دے گا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ میں اس دنیا کا باشندہ ہوں جو قید خانوں کے دروازوں کے کھلنے کا انتظار نہیں کر سکتی، پہلے کی طرح آزاد لوگوں کے اندر جانے کے لیے نہیں، بلکہ ان کے باہر آنے کے لیے جو ان میں مقید ہیں۔

امریکا کی خود مختاری اور جمہوریت کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں، اور آمروں کے چنگ سے آزادی کے لیے، بد بختی سے آزادی کے لیے ہمیں دنیا کے اتفاق کی ضرورت ہے۔

میں مرکزی امریکا کا باشندہ ہوں

میں اس انعام کو 27 ملین افراد کی جانب سے قبول کر رہا ہوں۔ مرکزی امریکا کی جمہوری، پیداری کے پیچھے ایک صدی سے زیادہ کی بے رحم آمریتوں، عام نا انصافیوں اور افلاس کی تاریخ ہے۔ میرے چچوں نے سے امریکا کے سامنے دو راستے دیے یا تو ایک اور صدی کا تشدد سبھا یا خود مختاری کے [مجھسی جانے کے] خوف پر قابو پالے۔ صرف امن ہی ہماری نئی تاریخ لکھ سکتا ہے۔

ہم مرکزی امریکی مایوس نہیں ہوں گے۔ ہم تاریخ کو صحیح کر دیں گے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہم یقین کر لیں کہ امن خواب ہے، انصاف یونوی پیائی ہوتا ہے، اور مشترک خوش حالی ناممکن! کتنے افسوس کی بات ہے کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو یہ نہیں سمجھ سکتے کہ مرکزی امریکا کے سابق تختستانوں پر قومیں اپنا حق جتا رہی ہیں اور پورے حق کے ساتھ اپنے عوام کے بہتر مستقبل کے لیے کوشش کر رہی ہیں!

کتنے افسوس کی بات ہے کہ کچھ لوگوں کو احساس نہیں ہو رہا ہے کہ مرکزی امریکا اپنے ماضی کو طویل نہیں دینا چاہتا، بلکہ ایک نیا مستقبل بنانا چاہتا ہے، نوجوانوں کے لیے امید کے ساتھ اور بزرگوں کے لیے وقار کے ساتھ۔

خوابوں کو حقیقت بنانا

مرکزی امریکی خاکسائے اگرچہ بے شمار رنگوں اور تفریق کا علاقہ ہے مگر اس میں ایک قسم کا دل خوش کن اتفاق بھی پایا جاتا ہے۔ کروڑوں مرد عورت آزادی اور ترقی کے خوابوں کے شریک ہوئے ہیں۔ کچھ ممالک میں ان خوابوں کو انسانی حقوق کی باقاعدہ خلاف ورزی کے ذریعے زائل کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے؛ شہروں اور ملکوں میں بے ادبگی کی کوشش سے پاش پاش کیا جاتا ہے اور افلاس کی ایسی حقیقتیں سامنے آتی ہیں اتنی شدید کہ جن کو دیکھ کر دل دھڑکنا بند کر دیتے ہیں۔ شعرا جو بنی نوع انسان کے لیے باعث افتخار ہوتے ہیں جانتے ہیں کہ لاکھوں افراد ان کے اپنے ملکوں میں انھیں پڑھ نہیں سکتے اس لیے کروڑوں ٹھکانہ ہوتے ہیں۔ زمین کی اس ٹنگ سی مٹی پر مصوٰر اور مجسمہ ساز بھی ہیں ہم جن کی ہمیشہ تحسین کریں گے جب کہ امریکی ہیں ہم جنہیں یا د بھی نہیں رکھنا چاہتے اس لیے کروڑوں صدیوں کی سب سے زیادہ پالی ہوئی انسانی اقدار کو پامال کرتے ہیں۔

مرکزی امریکا مسلسل صرف خواب ہی نہیں دیکھ سکتا، نہ وہ ایسا کرنا چاہتا ہے۔ تاریخ مطالبہ کرتی ہے کہ خوابوں کو حقیقت بن جانا چاہیے، مابھی، جب کہ ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اور آج، جب ہم اپنے مستقبل کو اپنے ہاتھوں سنوار سکتے ہیں۔ اس علاقے میں، جہاں لاطینی امریکا کی سب سے قدیم اور مستحکم جمہوریت کا گھر ہے کاسٹاریکا اور جہاں بے حد بے رحم اور ظالم آمریتوں کی تاریخ رہی ہے، جمہوری بیداری خوف سے چمکے ہوئے کے لیے خاص قسم کی وفاداری مانگتی ہے۔

یہ دیکھنے کے باوجود کہ ماضی کی آمریتیں صرف بد بختی اور معذور امیدیں ہی جہنم دینے کے قابل تھیں، کتنا اطمینان ہے یہ بہانہ کہ ایک آمریت کی خرابی کو اس کی مخالف [آمریت] سے ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ مرکزی امریکا میں کسی کو بھی آزادی سے خوف کھانے کا حق نہیں، کسی کو مکمل سچ کی تبلیغ کی اجازت نہیں ہے۔ ایک عقیدے کی خرابی ہر عقیدے کی خرابی ہوتی ہے۔ یہ سب انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کی دشمن ہیں۔ جیسا کہ پائیکال نے کہا تھا، ”زیادہ علم ہمیں تنگی بنا دیتا ہے۔ کم علمی ہم کو کٹر عقیدت مند بنا دیتی ہے۔“

تاریخ صرف خود مختاری کی طرف ہی بڑھ سکتی ہے۔ تاریخ صرف انصاف سے محبت کرتی ہے۔ تاریخ کے مخالف سمت میں چلنا شرمندگی، افلاس اور جبر کی راہ پر چلنے کے برابر ہوتا ہے۔ آزادی کے بغیر انقلاب نہیں رہتا۔ ہر قسم کا جبر انسان کے جذبے کے خلاف ہوتا ہے۔

آزادی — ایک مشترک اشتیاق

مرکزی امریکا ایک دردناک چور ہے پکھڑا ہے! اس کو سامنا ہے درد انگیز افلاس کا، پہاڑوں یا

حکومتوں کی جانب سے آنے والے کچھ مطالبات کا، صدیوں کی نسلوں کی آزادی کی فریادوں کے باوجود کہ مختلف نظریات کی آمریتوں کو لایا جائے۔ اس سے قطع نظر کہ عام بد بختی کے مسائل گھبر رہے ہیں جیسا کہ ہم ان کو شمالی/جنوبی سیاق و سباق میں جانتے ہیں، مشرق اور مغرب کے تنازعے کو شامل کر دیا گیا ہے۔ جہاں افلاس تنازعہ نظریات اور خود مختاری کے [مجھسی جانے کے] خوف سے ملتا ہے، صاف نظر آتا ہے کہ مرکزی امریکا میں بد بختی کی ایک صلیب کی تجسیم ہو رہی ہے۔

ہمیں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ مرکزی امریکا کے افلاس اور سیاسی چیلنج کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے چھٹکارا، بد بختی سے اور خوف سے۔ جو کوئی بھی کفر مذہبیت کے ذریعے مسائل کے حل کا مشورہ دیتا ہے وہ دراصل مستقبل میں مسائل کے اور بھی بڑے ہو جانے میں مدد کرتا ہے۔

یہ ان تمام انسانوں کی مشترک خواہش ہے جنہوں نے ہمیشہ مرکزی امریکا کے لیے آزادی کی کوشش کی ہے۔ کسی کو بھی اس روحانی اتحاد سے ندراری نہیں کرنی چاہیے۔ ایسا کرنا ہمارے امریکا کو مزید سویرے کے خوف ناک جبر، بے معنی اموات اور آزادی کی جنگ کی سزا دینے کے مترادف ہوگا۔

میں کا سٹاریکا کافر زندہ ہوں

میں اس انعام کو 'کاسٹاریکا' کے شاخیں لاکھ عوام کی جانب سے وصول کر رہا ہوں۔ میرے عوام اپنی مقدس خود مختاری کو دہ سمنڈروں سے حاصل کرتے ہیں جو ہمیں مشرق اور مغرب دونوں جانب سے گھیرے ہوئے ہیں۔ جنوب سے، شمال کی طرف سے، کاسٹاریکا ہمیشہ آمروں اور آمریتوں کے نرغے میں رہا ہے۔ ہم غیر مسلح لوگ ہیں اور بھوک سے آزاد رہنے کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ امریکا کے لیے ہم امن کی علامت ہیں، اور ہم ترقیات کی علامت بنے رہنے کی امید رکھتے ہیں۔ ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ امن ترقیات کا لازمہ بھی ہے اور ثمر بھی۔

اساتذہ کا ملک

میرا ملک اساتذہ کا ملک ہے۔ لہذا یہ امن کا ملک ہے۔ ہم اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں پر پوری آزادی سے بحث کرتے ہیں۔ چوں کہ ہمارا ملک اساتذہ کا ملک ہے، ہم نے فوجی چھاؤنیاں ختم کر دی ہیں، اور ہمارے بچے اپنی بفلوں میں کتابیں دیئے اسکول جاتے ہیں، کامرے پر رانگھلیں رکھ کر نہیں۔ ہم یقین رکھتے ہیں بات چیت پر، معاہدوں پر، اتفاق حاصل کرنے پر۔ ہم تھوڑے مسترد کرتے ہیں۔ چوں کہ میرا ملک اساتذہ کا ملک ہے، ہم مخالفین کو قائل کرنے پر یقین رکھتے ہیں، شکست دینے پر نہیں۔ ہم گرے ہوؤں کو کھینچنے کے بجائے اٹھانے پر ترجیح دیتے ہیں، ہم ایسی معیشت چاہتے ہیں جس میں لوگ یک جہتی کے جذبے کے ساتھ

ایک دوسرے سے تعاون کریں، ایسی معیشت نہیں، جس میں وہ خود اپنی ہی نمستی کے لیے مقابلہ کریں۔
میرے ملک میں 118 برس سے تعلیم لازمی رہی ہے۔ صحت کی خبر گیری اب ہر باشندے کا حق ہے اور
عوام کے لیے گھر کی فراہمی میری حکومت کا بنیادی مقصد ہے۔

ایک نئی معیشت

جس طرح ہم اپنی بہت سی کامیابیوں پر فخر کرتے ہیں، ہم اپنے مسائل اور پدیشانیوں کو بھی خفیہ نہیں
رکھتے۔ ہم میں مشکل حالات میں ایک نئی معیشت قائم کرنے اور شرح نمو کی تجدید کرنے کی صلاحیت ہوئی
چاہیے۔ ہم نے کہا ہے کہ ہم کو ایسی معیشت نہیں چاہیے جو ملکی ضروریات سے اور سب سے کم رُجے والوں کی
طلب سے بے بہرہ ہو۔ ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ معاشیاتی نمو کی خاطر ہمیں ایک زیادہ مساواتی سماج تخلیق
کرنے کی امید کو ترک کرنا نہیں چاہیے۔ ہمارے ملک میں کرۂ ارض کے مغربی نصف کے تمام ممالک کے
مقابلے میں کم بے روزگاری ہے۔

ہزار فوجوں سے زیادہ طاقت ور

مرکزی امریکا کے ان تلخ برسوں میں ہمارے ملک کے بہت سے افراد کو خوف پیدا ہو گیا ہے کہ بیمار
ذہنوں اور بے بصارت شدت پسندی کے زیر اثر، اس علاقے میں موجود تشدد کا سنا ریکا میں بھی پھیل سکتا
ہے۔ کچھ لوگوں کا خوف تو اس مقام تک پہنچ گیا ہے کہ تشدد کو اپنی سرحدوں سے دور رکھنے کے لیے ہمیں فوج
رکھنی ہوگی۔ کتنی نادان سوچ ہے یہ! ایسے خیالات تو چاندی کے ان تیس سگوں سے بھی کم قیمت ہیں جو یہودا
Judas کو دیے گئے تھے۔ کاسا ریکا کا قلعہ، وہ قوت جو اس کو ایک غیر مرقی طاقت بناتی ہے، وہ جو اس
کو ہزاروں فوجوں سے زیادہ طاقت ور بناتی ہے، خود مختاری کی طاقت ہے۔ جب کوئی بھی اپنے خیالات پر
ایمان داری سے قائم رہتا ہے، جب کوئی خود مختاری سے خوف نہیں کھاتا، تو وہ مطلق العنان ضرر میں سے
قابل ہو جاتا ہے۔

ہم اس بات سے واقف ہیں کہ کاسا ریکا کی آزادی ہی سیاسی منصوبوں کی تکمیل کی اجازت دیتی ہے، جس
سے ملک کی ساری کبادی فیض یاب ہوتی ہے۔ صرف آزادی ہی لوگوں کو برداشت سے معاملہ کرنے کی
اجازت دیتی ہے۔ وہ تکلیف دہ راستے جن پر کیوبا، نکاراگوا، پیراگوا، چلی اور دوسرے آوارہ گردی کرتے
پھرتے ہیں، اور بے شمار لوگ جو اپنے ملکوں کو واپس نہیں جاسکتے، مذہبی جنونیت کے اصولوں کی کما ہی دیتے
ہیں۔ نہ خود مختاری کا کوئی لیبل بچتا ہے نہ جمہوریت کا کوئی رنگ۔ جمہوری لوگوں سے ملاقات کے تجربے ہی
سے ان کے جمہوری ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

امن کا منصوبہ

مرکزی امریکا کی تشدد کے قربت کے پیش نظر کاسٹاریکا نے اپنی پوری تاریخ کے ساتھ، اور خصوصاً اپنی ابھرتی ہوئی مثالیت کے باعث، مجھے ممنون کر دیا کہ میں اپنے عوام کے امن کو ان کی پُر خلوص مذاکرت کی عادت کو اور ان کی برداشت کی ضرورت کو علانیہ کی رزم گاہ میں متعارف کراؤں۔ عوام کا خاتم ہونے کے نامے، میں نے مرکزی امریکا کے لیے امن کا ایک منصوبہ تجویز کیا ہے۔ یہ منصوبہ بھی سیمون بولیوار (Simón Bolívar) کی آزادی کی فریاد کی بنیاد پر ہے جو Contadora Group اور Support Group کے باہمت اور محکم کام میں ظاہر ہوا ہے۔

میں پانچ صدور میں سے ایک ہوں

میں ان پانچ صدور میں سے ایک ہوں جنہوں نے دنیا سے عہد کیا کہ وہ اپنے عوام کی خواہشات کے مطابق تباہ کریں گے: جبر کی تاریخ کا آزادی سے بھوک کی تاریخ کا ترقی کے مقدر سے، مافوں کی چیخ اور جوانوں کی موت کا امید سے: امن کے ایسے رستے پر چل کر جس پر ہم اکٹھے کام زن ہونے کے خواہش رکھتے ہیں۔

عوام کی امید ہی آگے بڑھانے والی سب سے توانا طاقت ہوتی ہے جوئی حقیقتیں جنم دیتی ہے اور جو آزادی پر آزادی کی راہیں کھولتی ہے۔ ایک بار امید قابو پالے تو ہمت کو دانش میں مدغم ہو جانا چاہیے۔ پس یہی ایک طریقہ ہے تشدد کو باطل کرنے کا، ایک ہی طریقہ ہے خاموشی کو برقرار رکھنے کا جس سے جارحیت کا پڑامن جواب دیا جاسکتا ہے۔

مہم کتنی ہی عالی ظرف کیوں نہ ہو کچھ لوگ خواہش بھی کریں گے اور تا سید بھی کرنا کام ہو۔ کچھ لوگ جنگ کو مسائل کے حل کے عام واقعے کے طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ کبھی ستم ظریفی ہے کہ جنگ کے دوران رکاوٹوں سے طاقتور قوتیں ان سے ناراض ہو جاتی ہیں جو غزوات کے منہ سے کو ختم کرنے کوشش کرتے ہیں۔ کبھی ستم ظریفی ہے کہ جنگ کے خاتمے کی کوششیں فتنے اور حملوں کی شروعات کا سبب بنتی ہیں، گویا ہم کسی حق پرست کی فہم میں خلل یا کسی ضروری عمل میں رخنہ ڈال رہے ہوں، دل توڑنے والی خرابی میں نہیں۔ کتنی ستم ظریفی ہے کہ امن قائم کرنے والی کوششوں کے دوران یہ پتا چلتا ہے کہ بہت لوگوں کے نزدیک نفرت محبت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے، فوجی فتوحات کے ذریعے طاقت حاصل کرنے والے دلیل کو فراموش کر دیتے ہیں، شرم کما بھول جاتے ہیں اور تاریخ سے غداری کرتے ہیں۔

ہتھیاروں کو خاموش ہو جانے دیجیے

مرکزی امریکا کے پانچ صدور نے دیم پائمن کے حصول کے لیے ایک بیلق پر دستخط کیے تھے۔ ہم ہتھیاروں کو خاموش اور آدنی کو بولنے دیکھنا چاہتے تھے۔ ہمارے بیٹے روایتی ہتھیاروں سے قتل کیے جا رہے تھے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوہری ہتھیاروں سے دنیا کے ختم ہو جانے کی ہولناکیوں کے بارے میں امن کہ جوہری جنگ کے خوف نے ہمیں روایتی جنگ سے لاپرواہ کر دیا ہے۔ ہیروشیما کی یادیں ویت نام کی یادوں سے کئی زیادہ طاقتور ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ روایتی ہتھیار بھی ایٹم بم ہی طرح خوفناک سمجھے جاتے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ لوگوں کا تھوڑا تھوڑا کر کے مارا جانا اتنا ہی بھیاں سمجھا جاتا جتنا کہ ایک وقت میں بہت سے لوگوں کا مارا جانا! کیا ہم واقعی ایسی غیر منطقی دنیا میں رہتے ہیں کہ اگر ہر ملک کے پاس ایٹم بم ہو تو ہم روایتی ہتھیار اٹھانے میں زیادہ ہچکچاہٹ محسوس کریں گے، کہ دنیا کی قسمت کسی ایک پانگل انسان پر منحصر ہے؟ کیا اس طرح عالمی امن زیادہ محفوظ ہوگا؟ کیا ہمیں اس میں دس صدی کی جنگوں میں 78 ملین افراد کے مارے جانے کو فراموش کر دینے کا حق ہے؟

دنیا آج ان لوگوں میں منقسم ہے جو جوہری ہتھیاروں سے مارے جانے کے خوف میں مبتلا ہیں، اور جو روایتی ہتھیاروں سے لڑی جانے والی جنگوں میں روز بروز مارے جاتے ہیں۔ آخری جنگ کا خوف اتنا بڑا ہے کہ ہتھیاروں کی دوڑ اور غیر جوہری ہتھیاروں کے استعمال کے امکان نے سب سے زیادہ خوفناک بے حسی پھیلائی ہے۔ ہمیں فوری جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ہماری ذہانت مانگتی ہے اور ہماری ہمدردی تاکید کرتی ہے۔ اس یقین کی کہ نہ ہیروشیما کی اور نہ ویت نام کی ہولناکی دہرائی جائے گی۔

ہتھیار خود ہی نہیں چل جاتے۔ وہ جو نا اُمید ہو جاتے ہیں، اُن کو چلاتے ہیں۔ وہ جن پر عقیدے سوار ہو جاتے ہیں، اُن کو چلاتے ہیں۔ ہمیں جنگ کرنی ہوگی بے خوف امن کے لیے، اور ہم کو دلیری سے چیلنج قبول کرنا ہوگا، اُن کا جو نا اُمید ہیں اور ان کے خطرات کا جو شدت پسند ہیں۔

میں شاعر سے کہتا ہوں

وہ امن کا منصوبہ جس پر ہم پانچ صدور نے دستخط کیے ہیں، ہر قسم کے چیلنج کو قبول کرتا ہے۔ امن کا راستہ کٹھن ہے، بہت کٹھن ہے۔ ہم مرکزی امریکا میں امن کی حصول کے لیے ہر ایک کی مدد کے خواہاں ہیں۔ مرکزی امریکا میں امن کی کامیابی کے بجائے اس کی شکست کی پیشین گوئی کرنا آسان ہے۔ یہی حال تھا اس وقت جب انسان نے اُڑنے کی خواہش کی تھی، اور جب اس نے خلا کو فتح کرنا چاہا تھا۔ یہی حال دو عالمی جنگوں کے ان مشکل دنوں میں تھا جو ہماری صدی نے جھیلی ہیں۔ یہی حال تھا اور آج بھی ہے جب انسان کو سامنا ہے خوفناک امراض کا اور دنیا سے افلاس اور بھوک کے ختم کرنے کے کام کا۔

تاریخ ان آدمیوں کے ہاتھوں نہیں لکھی گئی تھی جنہوں نے ناکامی کی پیشین گوئی کی تھی، جنہوں نے

خواب دیکھنے چھوڑ دیے تھے جنھوں نے اپنے اصولوں کو خیر باد کہہ دیا تھا، جنھوں نے اپنی کابلی کو اجازت دے دی تھی کہ وہ ان کی ذہانت کو سٹا دے۔ اگر کچھ لوگ اکثر اوقات میں فتح حاصل کرنے کی کوشش میں اکیلے تھے تو ان کے چلو میں ان کے عوام کا ہوشیار جذبہ تھا، یقین تھا، اور کئی نسلوں کے نصیب تھے۔

مثالی کچھ مرکزی امریکا کے مشکل دنوں میں بھی تھا، ہم آج جن میں زندگی گزار رہے ہیں، مثالی یہ آج کے موجودہ چوراہوں کی پیش اندیشی تھی کہ ہمارے امریکا کے عظیم ترین شاعر رولین ڈاریو نے مندرجہ ذیل منہرے لکھے تھے اس یقین کے عالم میں کہ تاریخ اپنے راستے ہی چلے گی:

”دعا کرو، مرے نیا نصوص اے خدا پرستو، لاف رنو

دعا کرو، عصمت والو، خالص لوگو، جنت والو اور پول والو

ایک سفارش، اک استدعا کے ہم غما ہشمند

پہلے ہی سے ہم پیلا سے ہیں، بھوکے ہیں کب کے

بن جذبہ کے، بن جیون کے، بن اوشا کے، بن پُتنگ^۱

پاؤں نہیں، کوئی پتکے نہیں ہے، سناٹو^۲ ہے نہ خدا“

میں اس زندہ جاوید شاعر کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم خواب دیکھنا ترک نہیں کریں گے، ہم دانش سے

خوف زدہ نہیں ہوں گے، ہم آزادی سے دور نہیں بھاگیں گے۔ اس ابدی شاعر سے میں کہنا چاہوں گا کہ

مرکزی امریکا میں ہم Quixote کو فراموش نہیں کریں گے، ہم زندگی سے دست بردار نہیں ہوں گے، ہم

جذبوں سے منہ نہیں موڑیں گے اور ہم خدا پر اپنے یقین پر ثابت قدم رہیں گے۔

میں ان پانچ افراد میں سے ہوں جنھوں نے ایک بیاق پر دستخط کیے ہیں، ایک وعدہ کیا ہے جس میں،

حقیقی معنوں میں، اپنے تمام تر جذبوں کے ساتھ امن کی خواہش کی گئی ہے۔

آپ سب کا شکریہ!



ایلی ویزیل اعلان تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، عوامین و حضرات!

آج سے ٹھیک پچاس برس قبل نوبیل امن انعام جرمنی کی عوامی شخصیت اور جنگ کے مخالف کارل فان آزی بشسکی کو عطا کیا گیا تھا۔ وہ مخصوص انعام تاریخ کا سب سے زیادہ متاثرہ انعام تھا۔ تسمیوں کی فی فی قائم ہونے والی حکومت، ریائی نوبیل کمیٹی کی سخت نکتہ چیں تھی اور جرمنی کے باشندوں کو نوبیل انعامات قبول کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔

اس قسم کا رد عمل، ایک طرح سے اتنا کافی تھا کہ اس کو نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ اس کے برعکس ہمیں دلچسپی ہوئی چاہیے اس رد عمل میں جو جرمنی کے علاوہ دوسرے ملکوں سے آیا تھا۔ بہتوں کو یقیناً خوشی ہوئی تھی مگر اور بھی کئی مبصرین تھے جنہیں اس بارے میں شک تھا۔ سیاست اور پریس کی مرمر آوردہ شخصیتوں کا خیال تھا کہ آزی بشسکی اپنی تنبیہات اور اکتشافات میں بہت سخت تھا۔ کچھ اس کو کمیونسٹ گردانتے تھے۔ سہر حال، یہ کہا جاتا تھا کہ امن کے معاملے میں انعام کا کوئی خاص کردار نہیں تھا بلکہ جرمنی کی حکومت کو براہ راست مشتعل کرنے کی کوشش معلوم ہوتا تھا۔

اس قسم کے تعلقات کی موجودگی نتیجہ تھی اس وقت کے سیاسی اور اخلاقی معیار کی، جن کے روشنی میں ہنگر کی حکومت کو جانچا جاتا تھا۔ اکثر لوگ آزی بشسکی کے تناظر میں، یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ جمہوریت کے لیے کون سے خطرات نمودار ہوئے تھے۔ اور آخر کار جب خطرے کی نشان دہی ہو گئی تھی تو لوگ ہنگر کی دہائے سے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے اور ان کے پاس، سوائے جمہوریت کی چیخا کردہ ٹھٹھا نہ سیاست کے، بظاہر اس سے نمٹنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ تسمیت کی تشکیل کے ابتدائی برسوں میں ایک عام رویہ غیر مشکوک و جذباتیت کا تھا۔ بلاشبہ لوگ ہنگر کے مخالف تھے، مگر ایسا کب ہوتا ہے کہ سیاست دانوں سے اختلاف نہیں ہوتا

؟ اور بلاشبہ لوگ 'خفا کی پوش' کے غلم کے بارے میں افواہوں سے بھی واقف تھے، مگر کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ ملک کے غیر معمولی حالات کے پس منظر میں ان کا اندازہ لگایا جاتا؟ کم از کم، ملک میں ایک مستحکم حکومت تو تھی، اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ہٹلر جمہوری طریقوں سے منتخب کردہ رہنما تھا۔ بہت سے لوگوں کو کسی ناگزیر انجامی آفت کا خوف تھا۔ مگر کچھ لوگوں کو شبہ ہو رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور یہ ان کی بے بصیرت تھی جس نے آفت کو آنے دیا۔ ایسن کا مٹن بنانے والا ایک بار پھر صحیح ثابت ہوا۔ "جب بصیرت کم زور ہو تو کھر والے ساتھی کو بہترین شکار مانتا ہے۔"

کارل فان آزی ایٹسکی میں بصیرت تھی۔ اس شخص میں ہمت ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے کہتا ہے، لہذا اس نے سچائی اور انصاف کے لیے ایک مڈرگواہ کا کردار ادا کیا ہے۔ نوبیل کمیٹی کو مبارکباد کہ اس کو نوبیل امن انعام عطا کیا ہے۔ اس کی گواہی خود اس کا مقدر بھی تھی آزی ایٹسکی اس ہولناک حکومت کی ملاقات سے جانبر نہیں ہوسکا، جو یورپ کے قلب میں اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔

پچاس برس بعد آج امن انعام اس کو دیا جا رہا ہے جو بچ نکلا تھا۔ 1945 میں اس راکھ کے ڈھیر پر، جس کے شعلوں نے چھ لاکھ یہودیوں کو نابود کر دیا تھا، سترہ سالہ ایلی ویزیل بیٹھا ہوا تھا، ابراہیم کا اکھوتا بیٹا، ایک اور اسحق، جو ایک بار پھر، بالکل آخری لمحے میں، Moriah کی پہاڑی پر قربانی کی موت سے بچ نکلا تھا۔ وہ آج انعام وصول کرے گا اس لیے کہ وہ بھی سچائی اور انصاف کا گواہ بن گیا ہے۔ موت کے کیمپوں کے جہنم سے نکل کر وہ انسانیت کے لیے ایک پیغام بر بن کر آیا ہے نفرت اور انتقام کے پیغام کے ساتھ نہیں، بلکہ بھائی چارے اور کفارے کے پیغام کے ساتھ۔ وہ ایک طاقت ور ترجمان بن چکا ہے بنی نوع انسان کے لیے اور لانتہا انسانیت کے لیے جو ہمیشہ ایک دیر پا امن کی بنیاد ہوتی ہے۔ ایلی ویزیل ہی وہ واحد شخص ہے جو بچ گیا تھا۔ اس کی شخصیت وہ جذبہ ہے جو فاتح ہوا ہے۔ ان کے چکر میں ہم ایک آدمی کو دیکھتے ہیں جو ایک اہم روحانی رہنما اور اور پیش رو بننے کے لیے قعر مذلت سے بلند ہوا ہے۔

نوبیل کمیٹی یہ ضروری سمجھتی ہے کہ ہمارے پاس ایک پیش رو ہونا چاہیے، ایسے دور میں جب خوف، جبر اور نسلی تعصب دنیا میں موجود ہو۔

نوبیل امن انعام کی آج کی پیش کش ایک پل کی تعمیر ہے درمیان اس جہنم کے جس نے اپنی جان اس واقعے کے خلاف دی جو ہونے والا تھا اور اس یہودی کے، جس نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے ایسے حواصل کے خلاف جنگ کے لیے کہ اب ایسے الم ناک واقعے کا اعادہ نہ ہو سکے۔ یہ مناسب ہوگا کہ اس پل کی دونوں جانب ایک نوبیل امن انعام ہو۔

ایلی ویزیل 30 ستمبر 1928 کو Carpathian پہاڑی سلسلے کے درمیان واقع رومانیہ کے شہر Sighet میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اور اس کی تین بہنیں ایک پرسکون خاندان کی گود میں پلی بڑھی تھیں، جو یہودی روایات اور مذہب سے سختی سے منسلک تھا۔ ایلی کی عمر اس وقت 14 برس کی تھی جب ہنگری کے یہودیوں کی

ملک ہدري شروع ہوئی تھی۔ اس وقت Sighet پر ہنگری کا قبضہ تھا، اور شہر کی یہودی آبادی کو ذلت آمیز طریقے سے Auschwitz جانے والی مال گاڑیوں کے فلیوں میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ وہیں انھوں نے اپنی ماں اور سب سے چھوٹی بہن کو گیس کی پھینپوں میں جاتے دیکھا تھا۔ بعد میں ان کے والد Buchenwald لے جائے جانے کے دوران انتقال کر گئے تھے۔

اپنی کتابوں کے ذریعے ایلی ویزیل نے نہ صرف ان واقعات کا آنکھوں دیکھا حال پیش کیا ہے، بلکہ اس شیطانی طاقت کا تجزیہ بھی کیا ہے جو واقعات کے پیچھے کا فرما تھی۔ ان کی سب سے اہم فکر یہ سوال یہ ہے کہ ہم ایسے واقعات کو دوبارہ ہونے سے روکنے کے لیے کیا اقدام کر سکتے ہیں؟

دہشت کے وہ حالات جن کا انھیں موت کے کیمپوں میں سامنا ہوا تھا، جو باقی دنیا پر بعد میں آہستہ آہستہ کھلے تھے، اپنے معیار کے مطابق بنی نوع انسان کی تاریخ میں نئے تھے۔ Holocaust کا واقعہ جنگ کے اندر خود ایک جنگ تھا، غفلت کی سلطنت لیے، جہاں اتنی بھیانک برائی ہے جس نے تمام سیاسی اور اخلاقی اصولوں کو تھس تھس کر کے رکھ دیا۔ اس سے ایک نیا پہلو ابھرا تھا اس کی نظریاتی بنیاد کے مطابق، جو صرف بیمار دماغوں ہی کی پیداوار ہو سکتی ہے، یہ ایک بہت بڑا جرم تھا جو کسی ایک نسل سے متعلق تھا۔ پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، مگر جو کبھی ناقابل تصور تھا اب ممکن ہو گیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ سابق حکومتوں نے حقیقی یا تصوراتی مخالفین کے خلاف وحشیانہ سزائیں استعمال کی تھیں، مگر ان کے پس منظر میں ہمیشہ منطقی وجہ کا، اگرچہ وہ راہِ راست سے منحرف ہی رہی ہے، ایک عنصر موجود تھا۔ یہ سزائیں نتیجہ تھیں کسی حقیقی یا امکانی زخم کا یا جرم کا۔

مگر یہودیوں کے لیے، اور کسی حد تک رومانیہ کے لوگوں کے لیے، حالات مختلف تھے۔ نازی حکومت کی انتانیوں میں ایسے فارم بھی ملے ہیں جو یہودیوں کی گرفتاری میں استعمال کیے جاتے تھے۔ ان میں عام قسم کی تفصیلات کا اندراج کیا جاتا تھا، یعنی نام، جنس، مذہب، پتا اور گرفتاری کی وجہ۔ آخری خانے، یعنی گرفتاری کی وجہ میں صرف ایک لفظ لکھا جاتا تھا ”یہودی“۔

لہذا جو کچھ ہوا اس کی سب سے بڑی خرابی صرف شکار ہونے والوں کی تعداد ہی نہیں تھی، یہ صرف فیکٹری ٹما قتل گاہوں کی موجودگی ہی نہیں۔ نہیں، بڑی خرابی یہاں ہے اس فلسفے میں جس نے ایسی صنعت کو ممکن بنایا۔ یہی وہ نکتہ ہے جو ایلی ویزیل ہم پر واضح کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی مہم بچ جانے والوں کے لیے دنیا کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ ان کا مقصد ہمارے ضمیر کو جگانا ہے۔ خرابی سے ہماری لاپرواہی ہم کو جرم کا شریک بناتی ہے۔ یہ وجہ ہے لاپرواہی پر ان کے حملے کی اور ایک نئے holocaust کو روکنے کی کوششوں پر اصرار کی۔ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ بعید از قیاس تھا، ہو گیا ہے۔ ہم اس کو ایک بار پھر ہونے سے روکنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ بھولے نہیں، ایک نئی بے بصارت لاپرواہی میں غرق نہ ہو جائیے، بلکہ اپنے لوگوں کو چاقی اور انصاف میں، انسان کی شوکت میں، آزادی میں اور کفارے میں شامل کیجیے۔

ایلی ویزیل کا موت کے کیمپوں میں عارضی قیام 1945 کے موسم بہار میں Buchenwald میں ختم ہوا، جب امریکی سپاہیوں نے قیدیوں کو آزاد کیا تھا۔ دوسرے یہودی بچوں کے ساتھ ان کو فرانس بھیج دیا گیا تھا۔ فرانس میں ان کا قیام جزوی طور پر صحت یابی اور کئی حد تک تعلیم کے لیے تھا۔ انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور قل ایب کے ایک اخبار کے نمائندے بننے سے پہلے تک سوربون میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے صحافی کی حیثیت میں امریکا کا سفر کیا، نیو یارک کے ایک یہودی اخبار کے نمائندے کے فرائض انجام دیے اور 1963 میں امریکی شہریت حاصل کر لی۔ اس دوران انھوں نے کئی کتابیں شائع کیں، جن میں پہلی کتاب (1956) Night تھی۔ ان کی تصنیفات، جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں، اب تک چھپس کمل کتابیں، بہت سے مضامین اور خطبات پر مشتمل ہیں۔ ان کو کئی اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا ہے۔

ایلی ویزیل باسٹن یونیورسٹی میں انسانیات کی پروفیسری کے علاوہ نیو یارک میں اعزازی پروفیسر بھی ہیں۔ وہ امریکی صدر کے شروع کیے ہوئے American Holocaust Commission کے رینما ہیں۔ ایلی ویزیل کے معاملے میں سوانحی تفصیلات غیر ضروری ہیں۔ ان کا سب سے اچھا تعارف ان کی تحریریں اور اس کمیشن کے لیے کیے جانے والی ان کی کوششیں ہیں۔

فطرتاً، یہ ان کے اپنے لوگوں کا مقدر تھا جس نے [اس ادارے میں] ان کی شرکت کی ابتدا کی تھی۔ ان برسوں میں ان کے پیغام نے ایک عالمی کردار حاصل کر لیا ہے۔ مختلف انداز اور مختلف سیاق و سباق میں پیش کیے جانے کی وجہ سے یہ ایک انسان کی طرف سے پوری انسانیت کو بھیجا جانے والے پیغام ہے۔ اس کی شرکت لا انتہا ہے، اور اس کے دائرے میں وہ سب آتے ہیں جو دکھی ہیں، وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ آزادی اور انسانی عظمت، وہ لاطینی امریکا میں ہو یا ایشیا میں، یورپ میں ہو یا جنوبی افریقا میں، ان کی زندگی کا مقصد بن گئی ہے۔

ان کی شمولیت بنیاد ہے ایک شدید احساس ذمے داری کی ان اسباق پر، تاریخ ہمیں جن کی تعلیم دیتی ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ عوام اور تہذیبیں جو اپنی تاریخ کو فراموش کر دیتی ہیں ایک دن ان کو دہرانا ان کا مقدر ہو جاتا ہے اور یہ ان کے اپنے تجربات کے پس منظر کے خلاف ہے کہ ایلی ویزیل ہمیں اس سے متنبہ کر رہے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ان لوگوں کے مقدر کے گھسے کو بھلا دیں جو انتقال کر چکے ہیں۔ اگر ہم بھلا دیتے ہیں، تو یوں ہے جیسے ہم ایک بار پھر انھیں موت کے منہ میں ڈال رہے ہوں، اور ان کی زندگی اور موت دونوں کو بے مقصد بنانے کے ذمے دار ہوں۔ تسمیہ میں مستقبل کا ایک پہلو بھی ہے؛ ہمیں غیر مشتبہ فوج بائیت کو راہ دے کر ایک جوہری holocaust کی راہیں نہیں کھولنی چاہئیں۔ ہمیں اپنے آپ کو اس یقین پر کرنا قابل یقین و قوم نہیں ہوگا، اپنے آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہیے اس لیے کہ یہ پہلے ہو چکا ہے اور تاریخ ہمیں تنبیہ کر چکی ہے۔

وہ فرض اور ذمے داری ایلی ویزیل جس کی تبلیغ کرتے ہیں بنیادی طور پر ماضی کی بول مکیوں کے

دہرانے کے خوف کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی مصروفیت سے زیادہ ہے جو مستقبل میں برائی کی طاقتوں کی امکانی فتح کو روکنے کے لیے ہوتی ہے۔ اس عمل کی تخلیقی طاقت نفرت اور انتقام نہیں، بلکہ امن کی آرزو ہے، زندگی سے محبت ہے اور انسانی عظمت کا احترام ہے۔ یا جیسا کہ ایلی وینیل نے خود کہا ہے، ”میں اس کی دوبارہ تعمیر کی کوشش سے جس کو انھوں نے تباہ کیا ہے، اپنے قاتلوں کو فتح کروں گا۔“

اس طرح، ایلی وینیل Auschwitz کے وقوع کے بعد اس کی راکھ پر بیٹھے رہے۔ طوفان اور آتش نے ان کی زندگی کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ ان کا خاندان نیست و نابود کر دیا گیا تھا۔ ان کی بہنوں میں سے دو زندہ تھیں، حالاں کہ اس وقت ان کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ وہ بے گھر اور بے وطن تھے۔ ایک انسان کی حیثیت میں ان کی شناخت بھی خطرے میں تھی۔ اب وہ صرف قیدی نمبر 87713 تھے۔ آتش زدہ سرجل پر بیٹھے ہوئے ایک بے امید، بے مستقبل ملال کی طرح تھے جس کا جہاز تباہ ہو چکا تھا۔ صرف یادیں باقی رہ گئی تھیں۔ اور راکھ کے ماحول میں، ملازم کی طرح وہ وہاں بیٹھے رہے اور انھوں نے آسمان کی طرف نظر کر کے خدا سے سوال کیا تھا، ”آخر کیوں؟“ ایسا کیوں ہوا تھا؟ اور مجھے کیوں زندہ باقی رہ جانا تھا؟ پیارے خدا، تیرے اپنے منتخب چھ ملین افراد موت کے منہ میں کیوں ڈالے گئے تھے؟ تو اس وقت کہیں تھا جب انھوں نے بارہ برس کے لڑکوں کو Auschwitz میں دار پر لٹکا دیا تھا، یا چھوٹے بچوں کو Auschwitz میں زندہ جلا دیا تھا؟

اس وقت ان کی عمر سترہ برس تھی، اور بھلا اتنا کچھ ہونے کے بعد پوری زندگی کیسے گزاری جاسکتی تھی؟ اندوہ اتنا شدید تھا، اور زندگی کا تجربہ اتنا تلخ تھا۔ وہ تھے تو صرف سترہ برس کے مگر فریادوں کے تنہا ہیبر ہو گئے تھے۔ ”تم سب جو گزرتے جا رہے ہو، کیا یہ سب تمہارے نزدیک کچھ نہیں ہے؟ ٹھہرو، اور دیکھو، اگر کہیں میرے غم جیسا کوئی غم ہے بھی۔“

مگر وہ زندہ تھے اور کچھ عرصے بعد ان پر واضح ہو گیا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی مقصد ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے گناہ تھے، ایسے فرو جو بتا سکتا تھا کہ کیا ہوا ہے، تاکہ مرنے والے والوں کی موت ضائع نہ جائے، تاکہ زندہ رہنے والے سب حاصل کر سکیں۔

مسئلہ یہ تھا کہ واقعے کا بیان ممکن نہ تھا۔ کوئی بھی انسان موت کے کیمپوں کی دہشت کو صحیح طرح بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا بیان کرنا بڑی آسانی سے مرنے والوں سے نگہداری ہو سکتا تھا۔ مگر خاموشی اس سے بھی بڑی نگہداری ہوتی۔

وہ دس برس تک خاموش رہے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک صحافی کی حیثیت میں ان کی ملاقات فرانسیسی شاعر اور نوبل انعام یافتہ فرانسوا ماریے (Francis Mauriac) سے ہو گئی۔ اس ملاقات نے ان کی خاموشی کے بند کو توڑ دیا۔ پہلے [اپنی کتابوں] Night کے ذریعے اور اس کے بعد، بہت کم عرصے ہی

میں Dawn پھر The Gates of the Forest، The Town Beyond the Wall، The Accident

اور ڈراموں Zalmen A Beggar in Jerusalem اور Ani Maamin - "I believe" کے ذریعے انھوں نے اپنا اظہار کیا۔

ایلی ویزیل کی کتابیں اور مطبوعات اسی موضوع پر ہیں یعنی سب میں Holocaust موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں: ”آپ Auschwitz سے باہر توکل سکتے ہیں مگر Auschwitz آپ کے باہر سے کبھی نہیں نکل سکے گا۔“ لیکن، اگرچہ موضوع وہی ہے، اور اگرچہ وہی قصہ بار بار دہرایا جا رہا ہے، مگر اس میں سے ہر بار ایک نیا راستہ نکلتا ہے، نئے پہلو ظاہر ہوتے ہیں۔ ویزیل کی تحریر میں ایک قابل ذکر ترقی نمایاں ہے۔ ہمیں ایک انسان میں، جس نے اپنی دیانت دار حیثیت اور انفرادی شناخت دوبارہ حاصل کر لی ہو، دور بینی کی علامتِ حیرت نظر آتی ہے۔

شرذمات میں ہر شے دن اور رات کی طرح ہوتی ہے۔ Night کے آخری صفحے میں وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس کو ایک چہرہ نظر آتا ہے جو دوپ کی سلیڈ کی ہوتی کھوپڑی کی طرح نظر آتا ہے۔ Dawn میں دن طلوع نہیں ہوتا۔ پوری کتاب رات کی ظلمت سے جنگ ہے۔ مسلسل اس درد انگیز سوال کا ہے ”اکیس اذیت ناک یادوں کے بوجھ تلے کوئی ایک با معنی زندگی کس طرح گزار سکتا ہے؟“ کیا جو من فلسفی سمجھ ہے جب وہ کہتا ہے کہ یادیں کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت کی خدمت گزاری کرتی ہیں؟ کیا دن اور رات کے بعد کوئی راستہ نہیں ہے؟

دھڑے دھڑے [اس کا] جواب آتا ہے۔ ہم کو The Town Beyond the Wall میں سویرے کی پہلی اخلاص ملتی ہے، جس میں دو قیدی، جن میں ایک دیوانہ ہے اور دوسرا کوٹکا، ایسا طریقہ دریافت کر لیتے ہیں جس میں وہ آپس میں رابطہ کر سکتے ہیں۔ کوٹکا قیدی اپنی خاموشی کو توڑ لیتا ہے اور دیوانہ یہ ظاہر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ وہ ایسا دیوانہ بھی نہیں۔ دونوں ایسا رشتہ استوار کر لیتے ہیں جس میں دونوں کی نجات ہے۔ ایسے ہی خیالات The Gate of the Forest میں اور A Beggar in Jerusalem میں بھی ابھرتے ہیں، اور جیسے جیسے کتابیں آگے بڑھتی ہیں، روشنی نیا وہ چمک دار ہوتی جاتی ہے۔ آدمی اپنے آپ کو بلند کر لیتا ہے۔ جذبہ فتح یا ب ہو جاتا ہے۔ Night کے معنے کا جواب اس بنیاد پر نہیں ہے کہ ہوا کیا ہے، سوائے مستقبل کے واقعات کے جن میں تمکین کا دوبارہ ظہور ہوتا ہے۔ یہی ہے جس کو The Reround song کا نام دیتے ہیں جو Ani Maamin میں ظاہر ہوتا ہے: میں خدا کے باوجود خدا پر یقین رکھتا ہوں! میں بنی نوع انسان کے باوجود بنی نوع انسان پر یقین رکھتا ہوں! میں ماضی کے باوجود مستقبل پر یقین رکھتا ہوں!

اور مشکل سے حاصل کیے ہوئے اس یقین کے ساتھ وہ کرۂ ارض کے تمام انسانوں کے لیے اپنے پیغام کے ساتھ آج ہم سے آگے ہیں۔ یہ وہ پیغام ہے جو نہ صرف ہمارے ضمیر کو بیدار کرتا ہے، ہم میں لا انتہا یک جہتی بھی القا کرتا ہے جہاں افراد ایک دوسرے کو، مستقبل کے لیے، شیطنت اور ظلمت کی یادوں سے پرے ”اس پار کا شہر“ تعمیر کرتا پاتے ہیں۔

یہ ہے وہ اتفاقی کیفیت جو ایلی وینزیل نے کامیابی سے اپنے پیغام کے ساتھ پیش کی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ ایسی خاموش تقریر کے ذریعے، کسی فرد نے اتنی کامیابی حاصل کی ہے، یا اس کو وسیع پیمانے پر مانا گیا ہے۔ الفاظ بڑے نہیں ہیں، اور ان کو ادا کرنے والی آواز بھی دھیمی ہے۔ سنائی دینے والی آواز امن کی آواز ہے۔ مگر اس کی قوت شدید ہے۔ سچ، کہ یہ چھوٹی سی چٹکاری بچنے والی نہیں، بلکہ یہ تو ہمارے مستقبل کے یقین کی ایک شعلہ بار مشعل بن جائے گی۔ سچ، کہ قیدی نمبر A7713 ایک بار پھر انسان بن گیا ہے۔ ایسا انسان جو انسانیت کے لیے وقف ہو گیا ہے۔

اور، ایک بار پھر، توریت کے پہلے باب Tord Jakob پر [فلسطین کے دریائے جبلوک کا منظم جو اب نہر زرقا کے نام سے موسوم ہے۔] ہم ایک نوجوان یہودی سے ملتے ہیں۔ وہ جس نے راتوں کے اندھیرے میں خدا سے بحث کی تھی، وہ جس نے اپنے مخالف کو رہا کرنے سے انکار کر دیا تھا جب تک کہ مخالف نے اس کو دعا دی نہیں تھی اور جو چھوڑ گیا تھا اس جگہ کو فجر کے طلوع سے پہلے، جو اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔ یہی تھا وہ انسان جس کے لیے عرش سے مستقبل کا وعدہ کیا گیا تھا ”(اب) تمہارا نام اسرائیل ہوگا“ اس لیے کہ تم شہزادے کی طرح خدا اور انسانوں کی طاقت میں شریک ہو، جو غالب ہو چکی ہے۔“

اس انسان کے اعتراف میں، جس کے جذبے نے موت اور بے عزتی کی قوتوں پر فتح پائی تھی، اور بدی کے خلاف صف آرائی کے انقلاب کی امداد کے لیے، نارویائی نوبیل کمیٹی آج ایلی وینزیل کو نوبیل امن انعام پیش کرتی ہے۔ ہم ہر نسل کے تمام کروڑوں افراد کی جانب سے ایسا کر رہے ہیں۔ ہم یہ قدم ان لوگوں کی یاد میں اٹھا رہے ہیں جو مر چکے ہیں، مگر اس امید کے ساتھ کہ یہ انعام ایک معمولی سی امداد ہوگی امن کے لیے جو تمام انسانیت کی سب سے بڑی آرزو ہے۔

نارویائی نوبیل کمیٹی کے صدر نشین Egil Aarvik کی زبانی

خطبہ:

امید، مایوسی اور یادداشت

ایک ہابیدی [صیہونی] قصے میں لکھا ہے کہ نیک نامی کے مالک ریہائی "بعل-ہم۔" تو نے، جس کو ہمیشہ (Besht) کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا، ایک اشد ضروری مگر خطرناک مہم شروع کی تھی: "مسح کی آمد میں غلبت کے لیے"۔ یہودی عوام کے لیے، تمام انسانیت کے لیے جو بڑی مشکل میں گرفتار تھی۔ اور جن کو بہت ماری برائیاں گھیرے ہوئی تھیں۔ ان کو فوراً بچایا جانا تھا۔ تاریخ میں ذیل انداز کے لیے پوشٹ کو مزاد دی گئی تھی: ایک دور افتادہ جزیرے پر اپنے ایک مخلص ملازم کے ساتھ جلا وطنی کی مایوسی کے عالم میں ملازم نے اپنے آقا سے درخواست کی کہ وہ اپنی پراسرار طاقت سے دونوں کو گھر واپس پہنچا دے۔ "ناممکن!" ہمیشہ نے جواب دیا،

”میری طاقت مجھ سے چھین لی گئی ہے۔“ ”تو آپ کوئی دعا کیجیے، مغفرت کی دعا کیجیے، یا کوئی معجزہ کیجیے۔“
 ”ناممکن“ مانگ نے جواب دیا، ”میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔“ اور پھر دونوں ساتھ مل کر رونے لگے۔

پھر اچانک آقا اپنے ملازم سے مخاطب ہوا ”ذرا مجھے دعا یا دُکراؤ۔ کوئی بھی دعا۔“ ”دیکھیے، اگر میں کرسکا“ ملازم نے جواب دیا۔ ”میں خود بھی سب کچھ بھول چکا ہوں۔“ ”سب کچھ۔ بالکل سب کچھ؟“ ”جی ہاں، سوائے۔۔۔۔۔“ ”سوائے کیا؟“ ”سوائے حروف کے۔“ ”یوشہ یہ سنتے ہی غوثی سے چلا یا“ ”تو پھر تمہیں انتظار کس بات کا ہے؟ تم حروف کی تلاوت شروع کرو اور میں تمہارے ساتھ ساتھ دہراتا جاؤں گا۔“ اور پھر دونوں جلاوطنوں نے تلاوت شروع کی، پہلے سرکوشی میں، پھر ذرا اونچی آواز میں ”الف بے، جیم، دال۔۔۔۔۔“ اور یہ تلاوت بار بار ہوتی رہی، سر بار زیادہ قوت سے، زیادہ گرم جوشی سے، حتیٰ کہ یوشہ میں اس کی طاقتیں نمود کر آئیں، اور اس کی یادداشت واپس آگئی۔

مجھے یہ کہانی بہت پسند ہے اس لیے کہ یہ مسیحا نہ تو قحط کو واضح کرتی ہے، جو میری اپنی ہی ہے۔ اور یہ انسان کی دوستی کی صلاحیت کو اجاگر کرتی ہے جو اپنی قلب ماہیت کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مجھے یہ اس لیے بھی پسند ہے کہ یہ یادداشت کی باطنی طاقت کو بھی واضح کرتی ہے۔ یادداشت کے بغیر ہمارا وجود بالکل اوتار یک ہو جاتا ہے، قید کی اس کو بھری کی طرح جہاں روشنی بھی نہیں پہنچ پاتی، کسی مقبرے کی طرح، جو زندگی کو مسترد کرتا ہے۔ یادداشت نے یوشہ کو بچا لیا تھا، اور وہ صرف یادداشت ہی ہے جو انسانیت کو بچائے گی۔ میرے نزدیک امید بغیر یادداشت کے ویسی ہے جیسے یادداشت بغیر کسی امید کے۔

جس طرح آدمی خوابوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، وہ امید کے بغیر بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر خواب ماضی کی یاد دلاتے ہیں تو امید مستقبل کو طلب کرتی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا مستقبل ماضی کے مسترد کرنے کی بنیاد پر بنے گا؟ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے موزوں نہیں۔ ماضی کا مقابل مستقبل نہیں بلکہ ماضی کی غیر موجودگی ہوتا ہے، مستقبل کا مقابل ماضی نہیں، بلکہ ماضی کی غیر موجودگی ہوتا ہے۔

ایک یاد زمانہ، جنگ کے بعد۔ مقام: پیرس۔ ایک نوجوان زندگی کو دوبارہ ترتیب دینے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اس کی ماں، اس کا باپ، اس کی چھوٹی بہن، سب داغ مفارقت دے چکے ہیں۔ وہ تنہا ہے۔ امید کی حدود پر اس کے باوجود وہ ہمت نہیں ہاتا۔ اس کے برعکس وہ رہنے کے لیے جگہ کی تلاش میں ہے۔ ایک نئی زبان سیکھ لیتا ہے۔ کچھ دوست بھی بنا لیتا ہے جو اس ہی کی مانند یقین رکھتے ہیں کہ بھائی کی یادیں برائیوں کے مقابلے میں ڈھل کا کام دیں گی، موت کی یاد موت کے خلاف ڈھل کا کام کرے گی۔

اسے یقین ہے کہ سب ٹھیک چلے گا۔ اس لیے کہ وہ ایسے عالم سے واپس آیا ہے جہاں خدا نے، جس کی مخلوقات نے اس سے نغذاری کی ہے، اس لیے اہتمام چھپا لیا تھا کہ وہ سب کچھ ہوتا دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ بنی آدم، تاج کا ہیرا، کامیاب ہو گیا تھا، ایک اٹالیا بنا رہا تھا۔ قہر کرنے میں، جو جنت کی طرف نہیں، بلکہ اور آگے جہنم کی طرف لے جاتا ہے، تاکہ وہاں ایک متوازی سوراخ بنائی جائے، ایک نئی ”تخلیق“، اپنے شہزادوں

اور خدا کی سمیت، قوانین اور اصولوں کے ساتھ، جنٹروں اور قیدیوں سمیت۔ ایک دنیا، جہاں ماضی کی پروا نہیں کی جاتی۔ جو کسی کام کا نہیں رہا۔

مال و اسباب سے ماوراء تمام انسانی رشتے منقطع، قیدی خود کو ایک سماجی اور تہذیبی خلا میں پاتے تھے۔ ”بھول جاؤ“ ان سے کہا گیا تھا، ”بھول جاؤ کہ تم کہاں سے آئے ہو، بھول جاؤ کہ تم کون تھے۔ صرف حال ہی تمہارے کام کا ہے۔“ مگر حال آقا کی چکوں کی ایک جھپک جیسا تھا۔ مکمل طاقت ور خود ہی ذبح کرنے والا بھی تھا، یہ اسی کا فیصلہ تھا کہ کون زندہ رہے گا اور کس کو مرنا ہوگا؛ کس پر تشدد ہوگا، اور کس کو انعام دیا جائے گا۔ ایک رات کے بعد دوسری رات، بے شمار آگے بڑھتے ہوئے لوگ آسمان کو روشن کرتے ہوئے سطحوں میں غائب ہوتے گئے۔ کائنات پر خوف کا غلبہ تھا۔ دراصل یہ ایک اور کائنات تھی؛ فطرت کے قوانین کی قلب مابیت ہو گئی تھی۔ بچے بوڑھوں کی مانند ہو گئے تھے، بوڑھے بچوں کی مانند بیسور رہے تھے مرد اور عورت، یورپ کے ہر کونے سے آئے ہوئے، اچانک بے نام اور بے چہرہ مخلوق، راشن پر ملنے والے شوربے اور روٹی کے ٹکڑے کے محتاج اور اسی خوف ناک اضمات کے حق دار۔ ان کی خاموشی بھی ویسی ہی تھی اس لیے کہ اس میں گزر جانے والوں کی یادوں کی کونج پنہاں تھی۔ اس ملعون کائنات میں زندگی اتنی مسخ شدہ اور اتنی غیر فطری ہو چکی تھی کہ اس میں سے ایک نئی قسم پیدا ہو گئی تھی۔ لاشوں کے درمیان گزرتے ہوئے یہ علمان گزرتا تھا کہ شاید ان میں کوئی زندہ بچ گیا ہو۔

اس کے باوجود بعد میں ہم کو حقیقی مایوسی نے آگھیرا۔ جی ہاں! بعد میں۔ جوں ہی ہم اس ڈراؤنے خواب سے جاگے اور ہم نے اس کے معنی کی تلاش شروع کی۔ وہ تمام ماہرین قانون، طب یا دینیات، شاہ عری اور قانون لطیفہ کے، باغ کے اور کوئے کے چاہنے والے ہی تھے، جنہوں نے نہایت سنگ دلی سے قلب عام کا حکم صادر کیا اور اس عمل میں خود بھی شامل ہو گئے۔ ان کی کایا پلٹ کیا ظاہر کر رہی تھی؟ کیا ان کی اخلاقی، تہذیبی اور مذہبی یا وراثت کی کوئی تشریح کی جاسکتی ہے؟ ان سب کا انکار کرنے والوں کی بے حسی اور کیفیت جمود کی حالت کو۔ اور ان کے اتحادیوں کی خاموشی کو۔ ہم کیا کبھی سمجھ سکیں گے؟ اور سوالوں کا سب سے بڑا سوال: اس وقت خدا کہاں تھا؟ بغیر Auschwitz کے خدا کا تصور اتنا ہی محال تھا جیسے خدا کے بغیر Auschwitz کا۔ اس لیے سب کچھ پھر سے دیکھنا ہوگا چوں کہ ہر چیز بدل چکی تھی۔ ایک ہی جھٹکے میں نوع انسانی کی کامیابیاں ختم ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ کیا Auschwitz تہذیب کا حاصل تھا یا کج روی تھا؟ ہم ہیں اتنا جانتے ہیں کہ Auschwitz نے تہذیب سے ویسا ہی سوال کیا تھا جس طرح کہ Auschwitz سے پہلے ہر چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا تھا۔ مائٹسی تجربہ ریت، سماجی اور معاشی طاقت، قومیت، نا اشرافی کا خوف، مذہبی انتہا پسندی، نسلی تعصب اور اجتماعی دیوانگی۔ بالآخر ان سب نے Auschwitz میں اپنا ظہور کیا تھا۔

اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہوا تھا کہ یہ سب کیوں جاری رکھا جائے؟ اگر ہماری یادداشت ہمیں اسی

نقطے پر واپس لے آتی ہے تو پھر گھر کیوں بنایا جائے؟ ایسی دنیا میں بچے کیوں پیدا کیے جائیں جس میں خدا اور آدمی نے ایک دوسرے کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔

بلاشبہ ہم ماضی کو بھلانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ کیوں نہیں؟ کیا انسان کے لیے یہ فطری نہیں کہ جو کچھ اس کو دکھ پہنچائے یا اسے شرمندہ کرے وہ اس کو دباوے؟ کسی جسم کی طرح، یادداشت بھی اپنے زخموں کو بھاتی ہے۔ بے خواب راتوں کے بعد جب دن نکلتا ہے تو بھوت کو واپس جانا پڑتا ہے اور مرے ہوؤں کو اپنی قبروں کو لوٹ جانا پڑتا ہے۔ مگر تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ہم اپنے مردوں کو دفن نہیں کر سکے۔ نگران کی قبریں ہمارے اندر موجود ہیں۔

سب کچھ بھول جانا کبھی ہماری خواہش نہیں رہی ہے۔

یاد رکھنا ایک شریفانہ اور ضروری طرز عمل ہے۔ یادداشت کے تقاضے اور یادداشت کو تازہ کرنے کا عمل روزِ ازل سے ہم تک پہنچا ہے۔ اس جیسا اور کوئی حکم خداوندی نہیں جو انجیل میں بار بار آیا ہو۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم عطا ہونے والی اچھائیوں کو اور دکھ دینے والی برائیوں کو یاد رکھیں۔ سال کے نئے دن، Rosh Hashana [نئے یہودی سال کا پہلا دن] کو Yom Hazikaron [نہی کی] یادوں کا دن بھی کہا جاتا ہے۔ اس دن، جو کائناتی انصاف کا دن ہے، آدمی خدا سے [اس دن کو] یاد رکھنے کی اپیل کرتا ہے؛ ہماری نجات اسی پر منحصر ہے۔ اگر خدا ہمارے دکھوں کو یاد رکھنا چاہے گا تو سب کچھ ٹھیک ہوگا؛ اور اگر وہ انکار کرے گا تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ لہذا، یادداشت کو مسخرہ کرنا ایک ربانی عذاب ہو جاتا ہے، ایسا عذاب جو ہمیں گزری ہوئی تباہیوں کو دہرانے، ماضی کی جنگوں کی سزا دے گا۔

یہودی روایات میں کوئی بات اس قدر مخالفت اور دہشت نہیں پیدا کرتی جتنی کہ جنگ۔ ہمارے ادب میں جنگوں [کے تذکرے] کی کمی ہے [جنگوں سے] ہماری کراہیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خدا نے بے انصافی کو ختم کرنے اور جنگوں سے نجات کے لیے توریت کو خلق کیا تھا۔ تاہم یہودی جنگجو نظر انداز کیے گئے ہیں؛ تاہم یہودی میں تو Judas Maccabeus [کامن] کا تذکرہ تک نہیں ہوا ہے؛ Bar-Kochba کا [جس نے 135 میں سلطنتِ روم کے خلاف ایک خود مختار اسرائیل کا اعلان کیا تھا۔ مترجم] بیان ہے، مگر منفی انداز میں۔ دناؤ کو، جو ایک بڑے جنگجو اور فاتح تھے، عبادت گاہ بنانے کی اجازت نہیں ملتی؛ وہ تو ان کے امن کے پرچم ہمارے سامنے سلیمان تھے جو خدا کے رہنے کے لیے گھر تعمیر کرتے ہیں۔ بلاشبہ کچھ جنگیں ضروری یا ناگزیر رہتی ہوں گی۔ مگر کوئی بھی مقدس نہیں سمجھی جاسکتی۔ ہمارے نزدیک کسی جنگ کا مقدس ہونا تضاد ہے۔ جنگ ان کو انسانی خصائص سے محروم کرتی ہے، کتابہ قدر کرتی ہے اور ان کو ذلیل کرتی ہے جو جنگ کی ابتدا کرتے ہیں۔ تاہم یہودی کہتی ہے کہ ”عقل مند وہ لوگ ہوتے ہیں جو امن قائم کرتے ہیں۔“ مثلاً اس لیے کہ عقل مند لوگوں کی

یا دواشت بہتر ہوتی ہے۔

اس کے باوجود فراموش کر دینا، حتیٰ کہ بھول جانے کی خواہش کرنا بھی انسانی ہے۔ قدیم لوگ اس کو خطرے ربانی سمجھتے تھے۔ دراصل، اگر یا دواشت نجات میں مدد دیتی ہے تو فراموش کر دینے کا عمل ہم کو زندہ رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ ہم کس طرح اپنا روزمرہ گزار سکتے ہیں اگر ہمہ وقت اپنے اطراف خطرات اور بدروحوں کے بارے میں فکر کرتے رہیں؟ تا لمود؟ میں بتاتی ہے کہ فراموش کر دینے کی صلاحیت کے بغیر آدمی سیکھنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ بھلا دینے کی صلاحیت کے بغیر آدمی ایک مستقل اور مقنوع موت کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خدا، اور صرف خدا ہی سب کچھ یا درکھ سکتا ہے۔

زندہ رہنے کے لیے جو کچھ ضروری ہوتا ہے اس کو بھلا دینے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ ہم یا دواشت کے بارے میں اپنی سب سے بڑی ذمہ داری کو کس طرح نبھا سکتے ہیں۔ کسی بھی نسل کو اس متنازعے کا، اتنے دباؤ میں سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بچ جانے والے، زندہ لوگوں کو سب کچھ بتا دینا چاہتے تھے مظلوموں کی تنہائی اور ان کے غم کے بارے میں، ماؤں کو پانچ بنادینے والے آنسوؤں کے بارے میں اور آتشیں آسمان کے نیچے بد بختوں کی دعاؤں کے بارے میں۔

انہیں بچے کو بتا دینا چاہیے تھا، جو اپنی ماں کی کوڑ میں چھپا ہوا، آہستہ آہستہ پوچھ رہا تھا، ”کیا اب میں رو سکتا ہوں؟“ انہیں اس بیمار فقیر کے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا جو جانوروں کے لیے بنائی گئی گاڑیوں میں بند، اپنے ساتھیوں کے لیے دعا کر رہا تھا۔ اور اس چھوٹی سی لڑکی کے بارے میں بھی، جو اپنی دادی سے چھٹی ہوئی سرگوشی میں کہہ رہی تھی: گھبراہٹ نہیں، موت سے خوف نہ کھائیے۔ میں تو خوف زدہ نہیں ہوں۔“ صرف رات برس کی تھی، وہ چھوٹی سی بچی جو بغیر کسی خوف کے اور بغیر کسی ملال کے موت کی آغوش میں چلی گئی۔ ہم میں سے ہر ایک ہر قصے کو اور ہر مقابلے کو بیان کرنے پر مجبور تھا۔ مرنے والوں کی کچھ ایسی خواہشیں اور ایسے ہیستس تھیں کہ ہم میں سے ہر ایک کو ایسی دینے پر مجبور تھا۔ چوں کہ نام نہاد مہذب دنیا کو ان کی زندگیوں کی ضرورت نہ تھی، اس لیے اس دنیا کو ان کی موت سے آباد ہو جانے دو۔

عظیم مورخ شیمین ڈیووف (Shimon Dubnov) ہمارا رہنما تھا۔ موت کے آخری لمحے تک وہ Riga کے یہودی پاڑے میں اپنے ساتھیوں سے بار بار کہتا رہا، ”یہودیو، یہ سب کچھ لکھ ڈالو۔“ اس کے کہے پر توجہ کی گئی۔ راتوں رات، یہودی پاڑوں میں، بلکہ موت کے کیمپوں میں بھی، بے شمار مقتولین روزنامے اور تاریخ لکھنے والے بن گئے۔ حتیٰ کہ Sonderkommandos بھی وہ تو ان یہودی جو اس وقت تک موت کی بھٹیوں میں لاشیں ڈالنے اور اس کی ماکھ بنانے کے لیے مامور ہوتے تھے جب تک کہ خود ان کے مرنے کا وقت نہیں آجاتا تھا۔ ایسے لوگ اس لالچ میں ان فرائض کو قبول کر لیتے تھے کہ شاید اس طرح وہ اپنے کسی دوست یا

عزیز کو بچا سکیں گے، یا ان کو جب تک زندہ رہیں گے مال یا بہتر غذا فراہم ہوتی رہے گی۔ [جو اپنے ساتھیوں کو بھٹیوں میں جلانے پر مجبور تھے کچھ غیر معمولی دستاویزیں چھوڑ گئے تھے۔ کوئی دینا ایک آئینہ کیفیت بن گیا تھا۔ وہ ہمارے لیے نفیس، خطوط، روزنامے اور ناولوں کے ٹکڑے چھوڑ گئے تھے جن میں سے کچھ سے پوری دنیا واقف ہے، جو ابھی تک مٹائے نہیں ہو سکے ہیں۔]

جنگ کے خاتمے کے بعد ہم نے سوچا کہ Treblinka کی ایک رات کے عظم، بے حس قتل عام اور بے توجہی سے پیدا ہونے والے غصے کا تذکرہ ہی کافی ہوگا: اور اس کے بیان کے لیے، انسانیت کو جگانے کے لیے اور تشدد کرنے والے کو آئندہ تشدد سے باز رکھنے کے لیے مناسب الفاظ اور سازگار وقت کا چنا کافی ہوگا۔ ہم نے سوچا کہ دنیا کے تمام بچوں کو آئندہ کے لیے بھوک اور خوف سے دور رکھنے کی خاطر Theresienstadt کے یہودی پاڑے کے ایک بچے کی لکھی ہوئی نظم ہی سنا دینا کافی ہوگا۔ آئندہ اور ہمیشہ کے لیے انسانی حقوق کی پامالی کو روکنے کی خاطر موت کے ایک کیمپ میں "انتخاب" کے عمل کا بیان کرنا کافی ہوگا۔

ہم نے سوچا کہ نفرت کی ان طوفانی لہروں کا بیان کافی ہوگا جو یہودی عوام کے مردوں پر ہر طرف سے نازل ہوئی تھیں، تاکہ ایک باری ہر کسی سے صرف اس بنا پر نفرت کا تدارک ہو جائے کہ وہ "مختلف" ہے، سیاہ فام ہے یا سلیب فام، یہودی ہے یا عرب ہے، عیسائی ہے یا مسلمان ہے۔ کوئی بھی ہو، سیاہی، فلسفیانہ اور جنسی اعتبار سے جس کی سمت مختلف ہو۔ یہ مادہ لوجی ہے کہ نہیں؟ بلاشبہ ہے تو، مگر کسی مخصوص منطق کے بغیر نہیں۔ ہم نے بہت کوشش کی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ سب سے پہلے تو زبان کی وجہ سے زبان نے ہمیں مایوس کیا ہے۔ ہمیں ایک نئی لغت ایجاد کرنی ہوگی، اس لیے کہ ہمارے الفاظ کا کافی تھکا ہوا ہے اس لیے ان میں اب کوئی مرثیہ یا پید تھی۔

اور پھر، ہمارے اطراف کے لوگوں نے سننے سے انکار بھی کیا: اور جنھوں نے سنا انھوں نے یقین کرنے سے انکار کیا، اور جنھوں نے یقین کیا وہ پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکے۔ جی ہاں! وہ سمجھ ہی نہیں سکے۔ کوئی بھی سمجھ نہیں سکا۔ وراسل، کیمپوں کا تجربہ [سننے والوں کو] فہم سے عاری کر دیتا ہے۔

تو کیا ہم ناکام ہو گئے تھے؟ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہم واقعی ناکام یا بے ہو گئے تھے۔

اگر 1945 میں کوئی ہم سے کہتا کہ ہمارے عرصہ حیات میں تقریباً ہر عظیم پر مذہب کی بنیاد پر جنگ ہوگی، ایک بار پھر ہزاروں بچے بھوک سے مر جائیں گے تو ہم کبھی یقین نہیں کرتے۔ یا پھر نسلی تعصب اور شدت پسندی ایک بار پھر مراٹھائے گی، تو ہمیں اس پر بھی یقین نہ آتا۔ نہ ہی ہمیں اس بات پر یقین آتا کہ ایسی حکومتیں بھی ہوں گی جو مسیح و ایسا جیسے انسان کو اس لیے آزادی سے محروم کرنے دیں گی کہ وہ اختلاف کرنے کی ہمت کرتا ہے۔ اور وہ اکیلا نہیں ہے۔ دلائل اور بائبل بائبل کی حکومتیں اس سے بھی آگے بڑھ

جاتی ہیں، تشدد اور ایذا رسانی کا سنا نہ بنانے میں اختلاف کرنے والوں کو، ادیبوں کو، سائنس دانوں کو اور دانش ورؤں کو۔ یادداشت کی اس شکست کی تشریح بھلا کیسے ہو؟

ان میں سے کسی کی بھی تشریح کیسے کی جائے؛ نسلی امتیاز کی ناجائز دست اندازی، جو بلا تخفیف اب بھی جاری ہے۔ نسلی تعصب بھیا تک ہے، مگر جب یہ قانونی ہونے اور صحیح ہونے کا بہانہ تلاش کرے، جب نسلین سینڈیل جیسے آدمی کو قید کر دیا جائے، تو یہ اور بھی زیادہ ناگوار ہو جاتا ہے۔ نسلی امتیاز کا تسمیت سے تقابلی کیے بغیر اور اس کے ”آخری فیصلے“ پر۔ جو ہر قسم کے تقابلی کو جھٹلاتا ہے۔ ہم دونوں نظاموں کو، ان کی فرض کردہ قانونیت کے باوجود، ایک ہی کیمپ میں رکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور بھیا تک دہشت گردی؛ ایم ان میں بر مثال کیا جائے، استہول کے یہودی عبادت خانے میں خون سرد کر دینے والا قتل عام، پیرس کی سڑکوں پر احمقانہ اموات۔ تمام مہذب قوموں کو دہشت گردی کو غیر قانونی کر دینا چاہیے۔ بلا تشریح و جواز، اس کو منانے کے لیے جنگ کی جانی چاہیے۔ کوئی بھی جواز نہیں اس کا، اور مقصود اور بے سہارا پیچوں کے قتل عام کا کوئی بھی سبب قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ Andrei Sakharov, Vladimir and Masha Slepak, Ida Nudel, Josef Biegun, Victor Brailowski, Zakhar Zonshein, جیسے افراد اور ان کے علاوہ دوسرے مشہور یا غیر مشہور لوگوں پر ملک چھوڑنے کی ظالمانہ پابندیاں قبول نہیں کی جاسکتیں۔ اور اسرائیل بھی تو ہے، جسے دہزار پیرس کی جناح و طہنی اور ارضیں پیرس کی خود مختاری کے بعد بھی امن نصیب نہیں۔ میری خواہش ہوگی کہ یہ لوگ، جو میرے اپنے ہیں، تمام عرب ہمسایہ ملکوں سے رشتے استوار کرنے میں کامیاب ہوں، جیسا کہ مصر نے کیا ہے۔ ہمیں ان سب کو امید ہا کرنے کے لیے دیا ڈالنا چاہیے جو اقتدار میں ہیں۔

اور، ایک بار پھر ہم یادداشت کی طرف واپس آتے ہیں۔ ہمیں اپنے لوگوں کے دیکھوں کو یاد رکھنا چاہیے، اور اسی طرح ہمیں، انتھوپیا، کمبوڈیا کے لوگوں کو، کشمی والوں کو، Mesquite اندین لوگوں کو اور ارجنٹائن کے گم ہو جانے والوں (”desaparecidos“) کو بھی غبرست طویل ہے۔ نہیں بھولنا چاہیے۔

آئیے ہم Job [انجیل کا ایک کردار] کو بھی یاد کریں جس کا سب کچھ کھو گیا تھا۔ اس کے بچے، اس کے دوست، اس کا مال اسباب حتیٰ کہ خدا سے اس کے دلائل بھی، اس کے باوجود بھی اس نے ہمت کی اپنے آپ کو دوبارہ سمیٹنے کی، اپنی زندگی بنانے کی۔ Job نے طے کر لیا تھا کہ خدا کے عطا کیے ہوئے تحقیق کے عمل سے مانتا نہیں توڑے گا خواہ وہ کتنا ہی عیب دار یا کم زور کیوں نہ ہو۔

Job، ہمارا جد۔ Job جو ہمارا ہم عصر بھی ہے۔ اس کی ابتلا پوری انسانیت سے متعلق ہے۔ کیا اس نے کبھی اپنا عقیدہ ترک کیا تھا؟ اگر ایسا ہے بھی تو، اس کو اپنی سرکشی [کے دور ہی] میں باز یاب کر لیا تھا۔ اس نے دکھا دیا تھا کہ عقیدہ و سرکشی کے لیے ضروری ہوتا ہے، اور یہ بھی کہ مایوسی سے پرے بھی امید ممکن ہوتی

ہے۔ اس کی امید کا منبع اس کی یادداشت تھی، جس طرح ہمارے لیے بھی ہونی چاہیے۔ چلنا کہ ہم یاد رکھتے ہیں اس لیے ہی مایوس ہوتے ہیں۔ چوں کہ ہم یاد رکھتے ہیں اس لیے ہم مایوسی کو مسترد کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ میں قاتلوں کو یاد رکھتا ہوں، میں قتل ہونے والوں کو یاد رکھتا ہوں، ایسے وقت میں بھی جب میں امید کے لیے ایک بڑا ایک وجوہ ایجاد کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہوتا ہوں۔

ایسا وقت بھی ہوتا ہوگا جب ہم نا انصافی کو روکنے میں بے بس ہوتے ہیں، مگر ایسا وقت کبھی نہیں ہونا چاہیے جب ہم احتجاج کرنے میں ناکام ہوں۔ تا لمود کہتی ہے کہ ایک واحد انسان کو بچا کر آدمی دنیا کو بچا سکتا ہے۔ ہم تمام قید خانے کھول دیں اور سارے قیدیوں کو آزاد کرنے میں بے بس ہوں گے مگر ایک قیدی سے اپنی یک جہتی کا اعلان کر کے تمام جیلروں کو مزیم ٹھہرا سکتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی جنگ کو ختم کرنے کی حیثیت میں نہیں ہوتا، مگر ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر لعنت بھیجنیں اور اس کی تمام تر خوف ناکی کو واضح کریں۔ جنگ فاحش نہیں، صرف ٹکھٹے اور شکار چھوڑ جاتی ہے۔ میں نے دھشت کے قصے سے شروعات کی تھی۔ اور دھشت کی طرح، بنی نوع انسان کو پہلے سے بھی زیادہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ انسانیت کو پورے کرۂ ارض کے لیے امن کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے، جوہری جنگوں کے ذریعے جسے مکمل تباہی کے خطرے کا سامنا ہے۔ ایسی تباہی جسے صرف انسان شروع کر سکتا ہے، انسان ہی اس کو روک بھی سکتا ہے۔ بنی نوع انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ مخلوق کے لیے امن خدا کا تحفہ نہیں، ایک دوسرے کے لیے ہمارا اپنا تحفہ ہے۔



ڈیسمنڈ ٹوٹو

اعلان تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات!

اس برس کے نوبیل امن انعام کی پیشکش کے ذریعے، روایتی نوبیل کمیٹی ایک متحد کرنے والی شخصیت کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتی ہے جو جنوبی افریقا کے نسلی امتیاز کے مسئلے کو پُر امن طریقوں سے حل کرنے کی تحریک کے اہم رہنما ہیں۔ اس وقت جو حالات ہیں ان میں کسی طرح بھی ایک پُر امن حل، ناگزیر نہیں، جبر، اس قدر بے رحم جبر ہے کہ ایک پُر تشدد انقلاب ایک سمجھ میں آنے والا رد عمل ہو سکتا ہے۔ ایک جنوبی افریقی باشندے کے لیے ”رہاے میرے ملک، رو“ کا نعرہ لگانا اس وقت جتنا مناسب ہے، پہلے کبھی نہ تھا۔ ایسے حالات میں یہ بات اور بھی قابل غور ہو گئی ہے کہ بنی نوع انسان آزادی کے لیے ایک پُر امن طریقہ اختیار کرنے کے قابل ہے۔

نوبیل کمیٹی کی رائے یہ ہے کہ اس عمل میں جس سے جنوبی افریقا کی آزادی گزر رہی ہے، پورے براعظم افریقا کے لیے، اور پوری دنیا کے امن کے لیے دور رس نتائج پیدا ہوں گے۔ یہ ایک رائے ہے، جو اقوام متحدہ کی بہت سی تجاویز میں بھی پیش کی گئی ہے۔ سیکورٹی کاؤنسل کی حالیہ قراردادیں اس اکتوبر کے مہینے میں منظور کی گئی ہیں۔ جنوبی افریقا میں نسلی تعصب کو امن کے لیے خطرہ اور بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مترادف سمجھا جاتا ہے تو کچھ غلط نہیں۔

خوش قسمتی سے ایک عرصہ میں متبادل موجود ہے۔ ایک وسیع محاذ پر جدہ ہے اور دہل کے ہتھیاروں کے ساتھ تحریک چل رہی ہے۔ ایک تحریک سچائی کی، آزادی اور انصاف کی۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہی متبادل ہے جس کو کامیاب ہونا چاہیے جنوبی افریقا کے بشپ ڈیسمنڈ ٹوٹو کو اس برس کے امن انعام کے

لیے منتخب کیا گیا ہے۔

اس تحریک میں انھوں نے جتنا حصہ لیا ہے، اور اب بھی لے رہے ہیں، وہ مستقبل کے امید کی علامت ہے، ملک کی سفید فام اقلیت کے لیے بھی اور سیاہ فام اکثریت کے لیے بھی۔ ڈیسمنڈ ٹوٹو تنہا عات کے صرف ایک ہی طریقہ عمل کے شارح ہیں، وہی جو مہذب قوموں کے مثالیان نشان ہوتا ہے۔

آج سے 25 برس قبل، ایک جنوبی افریقی کو امن کا نوبل انعام دیا گیا تھا اس موقع پر البرٹ ٹوٹو جسے افریقی نیشنل کانگریس کے صدر نشین، جن کو انعام پیش کیا گیا تھا۔ کینی کی یہ خواہش ہے کہ اس برس کے انعام کو تہدید کے طور پر دیکھا جائے اعتراف ہمت اور دلیرانہ تحمل کا جس سے سیاہ فام افریقیوں نے نسلی تعصب کے نظام کے خلاف پُر امن جدوجہد کی ہے۔ یہ اعتراف ان لوگوں کے لیے بھی ہے، جو تمام دنیا میں، نسلی برابری اور انسانی حقوق کی تحریک کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوئے ہیں۔

بد قسمتی سے صرف جنوبی افریقا ہی میں انسانی حقوق کی پامالی نہیں ہو رہی ہے۔ ایک اور سابقہ انعام یافتہ، ایمنسٹی انٹرنیشنل، نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ دنیا کے 117 ممالک میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے، اور یہ بھی کہ 60 ملکوں میں ضمیر کے قیدی عذاب کے شکار ہو رہے ہیں۔ کثرت سے وحشیانہ طاقت کے استعمال نے ہمارے دور کے چہرے کو مسخ کر دیا ہے۔ پھر بھی، اگر دیکھنا چاہیں تو ہم امن کا چہرہ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ شہداء ہمیں اس کی تلاش میں زنداں کے سلاخوں اور خاردار تاروں کے پار ہی کیوں نہ جھانکنا پڑے۔ ان سب کے باوجود نئی امیدیں ابھرتی رہتی ہیں، اور ہر موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح انسانیت کا جذبہ نفرت کی طاقت کے زیرِ تسلیم آنے سے انکار کر دیتا ہے۔

کچھ دن قبل نیلی وٹن کے طفیل ہم کو اس برس کے انعام پانے والے جوہانسبرگ کے جوار میں نظر آئے تھے۔ سیاہ فام آبادی کا قتل عام ہوا تھا۔ کیمرے کی آنکھ تباہ شدہ مکانات، انسانوں کے جسم کے ٹکڑے اور بچوں کے کچلے ہوئے کھلونے دکھائی دیتے تھے۔ بے گناہ لوگ مارے گئے تھے۔ موت سے ہم آغوشی کے قریب زخمی عورتیں اور بچے تھے مگر جب پولیس اپنے قیدیوں کو اپنی گاڑی میں بھر کر لے جا چکی تو ڈیسمنڈ ٹوٹو کھڑے ہوئے اور انھوں نے خوف زدہ اور بگڑے ہوئے افراد کے اجتماع سے خطاب کیا۔ "نفرت نہ کیجیے" انھوں نے کہا۔ "آزادی کے لیے ہمیں امن کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔"

اسی قسم کی قسمیں اور انکسار کے ساتھ ہم اس شخص کو نوبل انعام پیش کر رہے ہیں۔

آزادی کی جدوجہد میں ڈیسمنڈ ٹوٹو کی معاونت کو اس وقت ایک خاص مفہوم عطا ہوا تھا جب 1978 میں انھیں ساؤتھ افریکن کانسل آف چیمبرز کا پہلا سیاہ فام سیکریٹری منتخب کیا گیا تھا۔ یہ کانسل آف چیمبرز جنوبی افریقا کے کلیسا کے نمائندوں اور ورلڈ کانسل آف چیمبرز دونوں کا مشترکہ فورم ہے۔ اس میں ملک کے سارے اہم کلیسا شامل ہوتے ہیں۔ سوائے Baer کلیسا کے جو نسلی امتیاز کے مسئلے پر اختلاف کے نتیجے میں اس ادارے سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ کیسٹووک کلیسا اس گلے جوڑ کا ایک نام نہاد رکن ہے، مگر وہ کانسل کا سب

سے طاقت ور دیکھا رہا ہے۔

جنوبی افریقا کے تمام باشندوں کا 75 فی صد حصہ کھنسا کا رکن ہے، اس طرح واقعی یہ ایک نمائندہ ادارہ ہے۔ چند ہی ادارے ہیں جو سیاہ فام آبادی کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

کانٹنسل کے ایک سربراہ اور متحرک رہنما کے طور پر ڈیسمونڈ ٹوٹو نے "ایک جمہوری اور منصفانہ سوچائی جس میں نسلی بنیاد پر تفریق نہ ہو" کے اصول کو اپنا ہدف قرار دیا ہے۔ ان کا کم سے کم مطالبہ ہے، "سب کے لیے مساوی سماجی حقوق، Pass Laws کی منسوخ، تعلیم کا ایک مشترک نظام اور سیاہ فام افراد کی جنوبی افریقا سے نام نہاد وطن کی سر زمینوں پر جبری ملک بدری کا انسداد۔"

ان مقاصد اور اپنی عملی کارکردگی دونوں کے باعث South African Council of Churches نے گنجائش سے زیادہ کام کیا ہے اس طرح یہ کانٹنسل انسانی حقوق کی تحریک میں ایک ذمہ دار ستارے کی صورت اختیار کر گئی ہے اور آزادی کی جدوجہد اور نسلی تعصب کے شکار افراد کی امداد کے سلسلے کی مرکزی قوت بن کر ابھری ہے۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ جب لاکھوں انسان ملک بدر کیے جا رہے ہوں تو کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ ان کے گھر مسمار کر دیے جاتے ہیں۔ ان کی ذاتی ملکیت ان سے چھین لی جاتی ہے۔ ان کی نوکریاں ختم ہو جاتی ہیں، اور ان کو جسمانی طور پر اٹھا کر کھلے میدانوں میں صرف ایک ٹھیس اور ایک بددیواری جوار کے ساتھ پھینک دیا جاتا ہے جس پر ان کو زندہ رہنا ہوتا ہے اس طرح تیس لاکھ افراد ملک بدر کیے جا چکے ہیں، جب کہ لاکھوں اپنی باری کے منتظر ہیں۔

اگر ہم ایک لمحے کے لیے ذاتی امانت سے چشم پوشی کر بھی لیتے ہیں جب بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نئے حالات میں ان لوگوں کی بقاء کے لیے کون مدد کو آئے گا؟ کون ان کو مکان فراہم کرے گا، پانی پہنچائے گا، بیماروں کو دوا دے گا اور بچوں کی تعلیم کا انتظام کون کرے گا؟

ظاہر ہے کہ اس نظام میں سیاسی قیدی بھی ہوں گے۔ ان کا حجم صرف یہ ہے کہ وہ ایک آزاد سماج اور انسانی حقوق کے طلب گار ہوں گے۔ وہ توقید میں ہیں، تو ان کے اہل خاندان کی امداد کون کرے گا؟

وہاں ایک نام نہاد "مہجور کارکن" کا بھی مسئلہ ہے۔ اس نظام میں نا کافی مشاہدے پر کام کرنے والے افراد کو اپنے اہل خاندان سے دور رہ کر زندگی گزارنی ہوتی ہے اس پر مستزاد مشہور زمانہ Pass Laws جو سیاہ فام افراد کو اجتماعی قید میں رکھ کر اپنے ہی ملک میں ان کو غیر ملکی بنا دیتے ہیں۔ جو کوئی بھی قانون شکنی کرتا ہے وہ گروہی گرفتاری اور قانونی امداد کے بغیر غیر معینہ مدت کی قید کا خطرہ مول لیتا ہے۔

یہ تصور کرنا کچھ مشکل نہیں کہ ایسے نظام کے نتیجے میں، بہت ساری سماجی، طبی اور قانونی مشکلات آتی ہیں جن کے لیے South African Council of Churches سے امداد فراہم کی جاتی ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ کانٹنسل کا نوے فی صد بجٹ مغربی دنیا کے کھنساؤں سے چندے کی صورت میں آتا ہے، جب کہ ہمیں یہ جان کر تشویش پیدا ہو گئی ہے کہ ایسے قوانین بنائے جا رہے ہیں جن کی رو سے کانٹنسل کو اپنے سرمایے

کے استعمال کے حق سے محروم کر دیا جائے گا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، نسلی تعصب صرف جنوبی افریقا ہی تک محدود نہیں۔ دوسری عالمی جنگ سے قبل اس قسم کے قوانین نسبتاً عام تھے اور عالمی رائے عامہ خصوصاً اس کے بارے بالکل غمزدہ نہیں تھی۔ بہر کیف 1945 کے ”فرمان اوقیانوس“ اور ”اعلان انسانی حقوق“ سے، جن میں نئے خیالات پیش کیے گئے تھے، حالات خاصے تبدیل ہو گئے ہیں۔

جنگ کے دوران اس بات کے آثار پیدا ہو رہے تھے کہ شاید جنوبی افریقا میں زیادہ دیر دلی کی پالیسی بنے گی۔ مگر وہاں فرمان اوقیانوس میں پیش کیے گئے خیالات کا زیادہ اثر نہیں ہوا، اور جب نیشنلسٹ پارٹی کو 1948 میں کامیابی ہوئی تو حالات اور زیادہ خراب ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب نسلی برتری کے قوانین بتائے اور نافذ کیے گئے، اور وہ اقدام جس کو 1948 سے قبل کے رجحانات کے خلاف ’برعکس انقلاب‘ کہا گیا تو صحیح تھا۔ تاریخ کبھی مخصوص نوعیت کی ستم ظریفیوں سے مبرا نہیں ہوا کرتی۔ وہی شخص جو نسلی برتری کے قوانین کے نفاذ کا سب سے زیادہ ذمہ دار تھا، یعنی نیشنلسٹ پارٹی کا پہلا وزیر اعظم ڈاکٹر ڈینیئل مالان (Daniel Malan)، نہ صرف کھیسائی تھا بلکہ ’جی ریٹارڈ جیج‘ کا مقرر کیا ہوا پادری بھی تھا۔ اور اب ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ نسلی برتری کا سب سے حریف مخالف بھی ایک کھیسائی ہے، بلکہ بے شک ہے۔ اس طرح تاریخ اپنی قسطیوں کی تصحیح کرتی ہے۔

تاریخ کی ستم ظریفی کا پھیلاؤ سمجھ اس سے بھی زیادہ ہے۔ نسلی برتری نظام ہی کی بالواسطہ وجہ سے ڈیسمنڈ ٹوٹو اس عہدے کے کھیسائی بن گئے تھے جس پر وہ آج موجود ہیں۔ ان کی اولین خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنیں، مگر ان کے والدین کی مالی حالت کے باعث یہ ممکن نہیں تھا۔ لہذا انھوں نے، اپنے والد کی طرح، معلم بننے کی کوشش کی۔ 1957 میں حکومت نے ”Bantu Education“ نافذ کر دیا، جو کئی معنوں میں سیاہ فام آبادی کے لیے تعلیم کا انسداد تھا۔ جب ٹوٹو نے خود کو تعلیم سے دور ہوتا ہوا محسوس کیا تو پادری بننے کے تیاری شروع کر دی۔ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ یہ قدم انھوں نے اعلیٰ تصورات کے زیر اثر نہیں اٹھایا تھا، ”میں میرے دل میں آگیا تھا کہ اگر میں کھیساکا حصہ بن جاؤں تو پادری کا پیشہ بھی ایک راستہ ہوگا اپنے عوام کی خدمت کرنے کا۔“

جی ہاں! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کھیساکا کو لینے پر راضی تھا۔

ظاہر ہے کہ، ڈیسمنڈ ٹوٹو بلند تصورات کے بغیر نہیں تھے اور بہت سے دوسرے افراد کی طرح بلند آدرش ان کے اپنے خاندان سے ملے تھے۔ بچپن میں West Rand کے علاقے Klerksdorp میں انھیں برداشت اور ہمدردی کا سبق دیا گیا تھا۔ انھوں نے خود کہا ہے، ”میں نے نفرت کبھی نہیں سیکھا ہی نہیں۔“ ان کی شخصیت کی نشوونما میں ان کے والدین کے آدرش صاف جھلکتے ہیں۔

ٹوٹو بارہ برس کے تھے جب ان کا خاندان جوہانسبرگ منتقل ہو گیا تھا، جہاں ان کے والد اسکول میں

پڑھاتے تھے اور والدہ ماجدہ ایسا افراد کے اسکول میں صفائی اور کھانا پکانے پر مامور تھیں۔ وہیں انہوں نے کم زور اور کم حیثیت والوں کے ساتھ ہمدردی کرنا سیکھا تھا۔ اور یہیں ان کی ملاقات اس شخص سے ہوئی شاید جس نے ان کی زندگی کے ابتدائی دور پر سب سے اثرات مرتب کیے سفید فام پادری ٹریور ہڈلسٹن (Trevor Huddleston) جو پس ماندہ علاقے صوفیا ٹاؤن کے کھیساکے پادری تھے۔ ٹوٹو کہتے ہیں کہ ”ایک دن اپنی ماں کے ساتھ اپنی گلی میں کھڑا ہوا تھا کہ میں نے ایک سفید فام انسان کو پادری کے لباس میں سامنے سے گزرتے دیکھا۔ جوں ہی وہ ہمارے سامنے سے گزرا، اس نے میری ماں کی بھریم کے لیے اپنے ہیٹ کو اوپر اٹھا کر اپنے سر کو ذرا سا غم کیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک سفید فام آدمی اور ایک کم تر درجے کی سیاہ فام عورت کو اس طرح سلام کرے۔“ اس دن کے بعد سے جب بھی ان سے پوچھا جاتا کہ وہ سفید فام افراد سے نفرت کیوں نہیں کرتے تو وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ سفید فام افراد کے معاملے میں وہ نوجوانی سے ہی خوش قسمت رہے ہیں۔

مگر حالاں کہ انہوں نے کبھی نفرت کرنا نہیں سیکھا، مگر انصافی کے خلاف ان سے زیادہ غصہ کون کر سکتا ہے۔ ملک کے ارباب اختیار سے وہ ہمت اور دلیری کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں۔ اپنی جان کو لاحق خطرات کے باوجود وہ منظم رہے کے جلووں میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔ ان کے واضح نقطہ نگاہ اور دلیر انداز کار نے ان کے نام کو فریقا کی آزادی کی تحریکوں کے اتحاد کی علامت بنا دیا ہے۔

ڈیسمونڈ ٹوٹو نے ثابت کر دیا ہے کہ امن کے لیے چلائی جانے والی تحریک خاموشی سے قبولیت کی نہیں، ضمیر کو ابھارنے اور ایک نوع کے طیش کی طالب ہوتی ہے، تاکہ ارادوں میں استحکام پیدا ہو اور انسانی جذباتوں میں روح پھونکی جاسکے تاکہ تحریک کو اپنی قدر و قیمت اور کامیابی کی طاقت کا اندازہ ہو۔ لہذا آج ہم امن کے اس معرکے کی خاطر ایک مثبت ”ہاں“ کہتے ہیں۔

اداکارہ لیو ایلمین (Liv Ullmann) نے ہمیں ایک لیبانی لڑکے کا قصہ سنایا، جس سے پوچھا گیا تھا کہ وہ انتقام پر یقین رکھتا ہے یا نہیں۔ اس نے جواب میں کہا تھا ”ہاں“ وہ انتقام پر یقین رکھتا ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ انتقام کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے؟“ تو لڑکے نے جواب میں کہا تھا کہ ”ایک برے انسان کو اچھا انسان بنانا انتقام کے مترادف ہوتا ہے۔“

اسی قسم کے خیالات جہالت کے خلاف انسانی جذبے کے پھٹے کام کرتے ہیں۔ ایسے خیالات کے مالک لوگ ہی حقیقی امن ساز بھی ہوتے ہیں اور متحمل بھی، جو نہ صرف مقدس ہوتے ہیں، بلکہ وہی اس زمین کے اور جنوبی افریقا کی زمین کے بھی مالک ہوں گے۔ 23 ملین رنگ دار لوگ کم از کم اسی زمین کی وراثت کے حق دار ہوں گے، جس طرح کہ 4.5 سفید فام لوگ ہیں۔

یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ ڈیسمونڈ ٹوٹو کو امن کا انعام دیا جانا کیا جنوبی افریقا کے نسلی امتیاز کے نظام کے بارے میں فیصلہ صادر کرنے کے مترادف تو نہیں سمجھا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس نظام نے خود اپنے

بارے میں فیصلہ سنا دیا ہے۔ نسلی تعصب بنی نوع انسان کے لیے باعثِ شرمِ حقیر کے اظہار کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ نسلی تعصب کا استعمال اور اس کا ایک سیاسی نظام کے طور پر دفاع انسانی تہذیب سے ہرگز میل نہیں کھاتا۔ اس لیے اس برس کا امن انعام غمیروں کو جگانے کی کوشش ہے۔ یہ فریبِ نظر ہے، اور ہونا بھی چاہیے کہ مراعات یافتہ گروہ جبر کے ذریعے اپنی صورتِ حال کو برقرار رکھ سکتے ہیں کہ ہمارے مستقبل میں ایسی چیزوں کی گنجائش ہوگی، بالکل جھوٹ ہے، اور کسی کو بھی اس پر یقین کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

اپنی کتاب Roots میں سیاہ فام مصنف الیکس ہیلی (Alex Haley) اپنے افریقی جد، نگرہ غلام کنہا کنتے (Kunta Kinte) کا تذکرہ کرتا ہے، جو اپنے سفید فام آقا کا کوچمان بن گیا تھا۔ اس کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ اپنے آقا کو تہذیبی فارمولوں میں منعقد ہونے والی پیش و عشرت کی محفلوں میں لے جاتا تھا۔ ایک شام جب وہ فارم کے باہر بیٹھا ہوا آقا کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا اس نے اپنے تجربات کا فلسفیانہ تجزیہ شروع کیا۔ مصنف کے مطابق، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سفید فام لوگ جس ناقابلِ یقین پیش و عشرت میں زندگی بسر کرتے ہیں، کیا واقعی ایسا ممکن ہو سکتا ہے! بہت دنوں، اور بہت سے ایسی پارٹیوں کے بعد اسے اس بات کا احساس ہوا شروع ہوا کہ سفید فام لوگوں کا وجود اور رہن سہن غیر معمولی طور پر مصنوعی تھا، خوب صورت خوابوں جیسے جھوٹ پر مبنی، جو وہ اپنے آپ سے بولا کرتے تھے کہ برائی سے بھلائی پیدا ہو سکتی ہے اور جن محروموں کے خون پسینے سے ان کی آسائشیں ممکن ہو سکتی ہیں ان ہی کو انسان سمجھنے سے انکار کرنے کے باوجود بھی کیا ایک مہذب معاشرہ ممکن ہو سکتا ہے؟

کنہا کنتے بالکل صحیح تھا۔ نگرہ آبادی کی غلامی امریکی تمدن سے اسی طرح، موافق تھی، جیسے جنوبی افریقا میں نسلی امتیاز۔

تاریخ میں ایسی مثالیں کم کم ملتی ہیں کہ مراعات یافتہ گروہ رضا کارانہ طور پر مجبوروں کے حق میں اپنی مراعات سے دستبردار ہوئے ہوں۔ جنوبی افریقا میں بھی ایسا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پھر بھی وہاں بغیر خوں ریزی کے تنازعے کے حل کے امکانات ابھی موجود ہیں۔ ایسے ہی حل کے لیے ذیسمند ٹوٹو لڑ رہے ہیں۔ اس لیے انھیں امن کے امکان کی پیش کش ایک فیصلہ نہیں، ایک مہارزت ہے، آگے بڑھایا ہوا ایک ہاتھ ہے، اسی طرح جیسے کہ ذیسمند ٹوٹو کا ہاتھ مصالحت اور کفارے کے لیے آگے بڑھا ہوا ہے۔ قبل اس کے کہ تاریخ کے عام عقویدِ جرم کا وقت ختم ہو جائے، کاش غالب اقلیت اس نیک سماعت کو پہچان لے اور موقع سے فائدہ اٹھالے۔

یہی سمجھا جائے گا کہ ذیسمند ٹوٹو ایک سفید فام شخص کے ہاتھوں انعام کا دیا جانا کئی معنوں میں ایک سنگِ دلانہ تجربہ ہے۔ ایسے موقع پر خیالات کو اس بات کی اجازت نہ دینا کہ ایک سفید فام انسان اپنے رنگ دار رشتے کے بھائی کے خلاف کس چیز کا مرتکب ہوا ہے، ممکن نہیں ہوگا۔ احسانات کی اس فہرست کے بارے میں سوچنے سے جو افریقا کے دکھوں، آنسوؤں اور خون سے لکھی گئی ہے، افسردگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس ذلت اور استحصال کے بارے میں بھی سوچیں، غلاموں کی پہلی کھوپ سے صدیوں کے نوازا دیا کی استحصال تک،

جو اس بڑے عظیم کے لوگوں نے برداشت کیے ہیں۔ اس قسم کے دن ہماری یادیں درد انگیز ہو جاتی ہیں، اس لیے ہمیں کہ سفید فام انسان کیا کر چکا ہے اور کیا کر رہا ہے، مگر اس لیے بھی کہ آج اس نے کیا کرنے سے غفلت برتی ہے۔

لہذا اس انعام کو افریقا کے ڈیسمونڈ ٹوٹو کو پیش کرتے وقت ہمارے دلوں میں فوری طور پر یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ انعام حاصل کرنے والے کے سامنے ہمارے لب سے پہلا لفظ وہ ادا ہو جو ان کے لوگوں پر نا انصافیوں اور نسلی نفرتوں سے لگائے ہوئے زخموں پر ہمارے دلی افسوس کا اظہار کرے۔

لیکن ہمارے دل میں غالب احساس شکرانے اور مؤدب خوشی کا ہے، اس لیے کہ ہم محبت کی تخلیق قوت کے یقین پر خود کو ان سے متحد پاتے ہیں۔ اپنے گرم جوش عیسائی اعتقاد کے ساتھ وہ ہمارے بہترین کے نمائندے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے جس پر نوبیل کمیٹی نے بہت زیادہ زور دیا ہے، وہ یہ ہے کہ آزادی کی جدوجہد ڈیسمونڈ ٹوٹو جس کی رہبری کر رہے ہیں، نا انصافی کے خلاف ہے جس میں سیاہ فام اور سفید فام دونوں شامل ہیں۔ مثلاً ملے متحدہ ہیں۔ اس میں ہمیں افریقہ نوبیل کی وصیت میں انسانی بھائی چارے کے دل گداز الفاظ کی تائید بھی صاف نظر آتی ہے۔

اس کی روشنی میں ہم ڈیسمونڈ ٹوٹو کے آگے اپنے سر خم کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی جدوجہد ہماری بھی جدوجہد ہے، اور ہم ان کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ وہ آج لاکھوں افراد کے شکرانے کی علامت کے طور پر امن کا انعام وصول کر رہے ہیں اور شاید یہ ایک نیک شگون بھی ہے، سیاہ فام اور سفید فام افریقیوں کی فتح کا، جو انہوں نے امن اور آزادی کی جدوجہد کی مخالف باقیات پر پائی ہے۔ ایسے میں مارٹن لوتھر کنگ کے الفاظ کو یاد کرنا بر محل ہے جو انہوں نے اپنی شہادت سے قبل ادا کیے تھے: ”میں نے موجودہ سر زمین دیکھی ہے۔“

اگرچہ موجودہ سر زمین کی طرف سیاہ فام افریقیوں کی پیش رفت اب بھی مشکل ہوگی، یہ انسانیت کا طریق ہے ہم جسے ایک ساتھ پار کریں گے اس قوی امید کے ساتھ کہ ”ہم غالب ہوں گے۔“ لہذا انعام وصول کرنے والی شخصیت کے لیے ہمارا پہلا لفظ ”امید اور جیت کا لفظ ہوگا“ ”جی ہاں بالکل! میں اپنے قلب کی کہانیوں میں یہ یقین جاگزیں پاتا ہوں کہ ایک دن ہم ضرور غالب ہوں گے۔“

مارو یائی نوبیل کمیٹی کے صدر نیشن Egil Aarvik کی زبانی

خطبہ

خواجہ تین و حضرات!

جنوبی افریقا سے چلنے سے پہلے، اس سر زمین پر، میں جس سے بے انتہا محبت کرتا ہوں، جنوبی افریقا

کاؤنسل آف چرچز کی کی ایگزیکٹو کمیٹی کا ایک فوری جلسہ طلب کیا گیا تھا جس میں ہمارے سارے رہنما شریک تھے۔ ہم نے جلسہ اس لیے طلب کیا تھا کہ ہماری سرزمین پر بڑھتے ہوئے بحران میں اسی میں تقریباً دو ہزار جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ ہم نے Witwatersrand کے کچھ متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا۔ میں اور لوگوں کے ساتھ East Rand بھی گیا تھا۔ اس دوران ہم ایک بزرگ خاتون کے گھر بھی گئے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ جب ان کے والدین اپنی ملازمت پر گئے ہوتے تھے، میں اپنے پوتے اور پڑوسیوں کے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ ایک دن جب کچھ طلبہ اسکول میں اپنی کلاسوں کا بائیکاٹ کر رہے تھے، پولیس نے ان کو کھدیڑا، انکروہ مکھ کے گھروں کے درمیان بھاگ کر غائب ہو گئے۔ پولیس اس بڑی بی کی گئی جا پہنچی۔ وہ اپنے گھر کے ہچھواڑے باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی تھی، جب کہ اس کے حوالے نیچے مکان کے سامنے کے احاطے میں کھیل رہے تھے۔ بڑی بی کی بیٹی اس کو پکارتی ہوئی بھاگ کر اندر آئی۔ بڑی بی کا پوتا گھر کے اندر دروازے کے بالکل قریب، مرا پڑا تھا۔ پولیس نے اس کی پیٹھ پر کوئی ماری تھی۔ بچہ صرف چھ برس کا تھا۔ چند ہفتوں بعد، ایک سفید فام عورت اپنے سیاہ فام نوکر کا رجسٹریشن کرانے کے لیے سیاہ فام باشندوں کی آبادی میں داخل ہوئی۔ سیاہ فام بلوائیوں نے اس کی گاڑی پر پتھراؤ کیا۔ نتیجے میں اس کا چند ماہ کا بچہ مر گیا۔ یہ جنوبی افریقہ میں شریک ہونے والی تازہ بد امنی کے دوران کسی سفید فام کی پہلی موت تھی۔ ایسی دو موتیں بھی بہت ہوئی ہیں۔ یہ ہے نسلی امتیاز کے بڑے نقصان کا ایک مجموعہ ماحصلہ۔

ہر روز کیپ ٹاؤن کے قریب کے squatter camp جس کو K.T.O. کہا جاتا ہے، سرکاری سرکارے پلاسٹک سے بنائی گئی چھوٹی چھوٹی کھوپڑیوں کو مسمار کرتے رہتے ہیں جو شادی شدہ جوڑے اپنے ازدواجی اقرار پر شہیدگی سے عمل کرنے کے لیے بناتے ہیں۔ نتیجے میں ان کو پانی میں لت پت گدیوں پر گزر کرنا پڑتا ہے جب کہ ان کے گھروں کے سامان ان کی پٹنگوں کے پائنتی کچرے ہوتے ہیں اور کیپ کی سرما کی بارش میں بھیستے اور میں میں کرتے ہوئے بچے ان کی کدوں میں ڈبکے ہوتے ہیں۔ سرکاری کالندے ہر روز ایسی بے درو مسماری کرتے رہتے ہیں۔ ان عورتوں نے ایسا کون سا پڑا جرم کیا ہے کہ بھروسوں کی طرح ان کا تعاقب کیا جائے۔ وہ ہیں اپنے شوہروں کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں، جو ان کے بچوں کے باپ ہیں۔ دنیا کے ہر علاقے میں ان کی تعریف کی جائے گی مگر جنوبی افریقہ کے اس علاقے میں جس کو بیہوشیوں کی سرزمین کہا جاتا ہے، جو فیملی ڈے کی تعطیل منانے کا دعویٰ کرتا ہے، ان دلیر عورتوں سے وحشیانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ غریب اور کیا چاہتے ہیں سوائے ایک اچھی اور پائیدار گھریلو زندگی کے۔ بد قسمتی سے ان کی اپنی پیدائش کی سرزمین پر ہی، اپنے بچوں کے والد کے ساتھ رہنا قابل مزا جرم ہو گیا ہے۔ اس طرح جان بوجھ کر سیاہ فام باشندوں کی خاندانی زندگی، حادثاتی طور پر نہیں، بلکہ حکومتی پالیسی کے تحت تباہ کی جا رہی ہے۔ خدا کے بندوں، بنی نوع انسان کو نسلی امتیاز کے لیے کوئی بڑی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے، جو کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔

میں ایک نہایت خوب صورت سرزمین سے تعلق رکھتا ہوں جس کو خدا نے بے شمار حیرت انگیز قدرتی

وسائل، وسیع میدانوں، حصار کرتے ہوئے کوہساروں، نغمہ بار پرندوں، نیلے آسمانوں میں آویزاں چمکتے ہوئے درخشندہ ستاروں، آفتاب کی چمھاتی کرنوں، مہربری کرنوں کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ ہمارے پاس خدا کی دی ہوئی نعمتیں اتنی مقدار میں ہیں کہ ہر باسی کے لیے کافی ہیں، مگر نسلی امتیاز کے ذریعے کچھ نے اپنی خود غرضیوں کو ظاہر کر دیا ہے کہ وہ اپنی طاقت کے بل پر کیے جانے والے حریصانہ عمل سے اپنے حق سے زیادہ وسائل پر قابض ہو جانا چاہتے ہیں۔ وہ 87% زمین پر قابض ہیں، جب کہ وہ ہماری آبادی کے صرف 13% فی صد کے برابر ہیں۔ بقیہ لوگوں کو صرف 13% پر قناعت کرنی پڑ رہی ہے۔ 73% فی صد آبادی کو اپنی زمین کے جس پر وہ پیدا ہوئے ہیں، سیاسی مسائل کے بارے میں با معنی فیصلے کے عمل سے باہر کر دیا گیا ہے۔

سنے آئین میں تین ایوان بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے، سفید فام کے لیے، رنگ دار جلد والوں کے لیے اور ہندوستانیوں کے لیے۔ مگر سیاہ فام باشندوں کا ایک بار تذکرہ کرنے کے بعد آگے چل کر ان کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس طرح سنے آئین میں بھی، جس کو مغرب کے بعض علاقوں میں صحیح سمت میں ایک قدم کہا گیا ہے، نسلی امتیاز اور نسلی گروہ بندی کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ آئینی کمیشیاں، چار سفید فام، دو سیاہ فام اور ایک ہندوستانی کے تناسب سے بنائی گئی ہیں۔ یعنی سیاہ فام 'صفر'، 'دو' جمع - ایک، کبھی برابر ہو ہی نہیں سکتے، چار کا تو کہنا ہی کیا۔ اس طرح یہ آئین قانونی طور پر سفید فام اقلیت کی حکمرانی کو دائمی بناتا ہے۔ سیاہ فام افراد سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی سیاسی توقعات کو پورا کر سکیں گے، زندہ رہنے کے لیے ناقابل افلاس زدہ علاقوں میں بین تھان (bantustan) کے بانڈوں میں یعنی جنوبی افریقا کے وہ دس علاقے جو سیاہ فام باشندوں کی رہائش کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے، بد نصیبی سے پڑ علاقوں میں، کبھی نہ ختم ہونے والی سیاہ فام بیکاری کے علاقوں میں اور اس بین تھان میں رہ کر جس کو بلقان کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا ہے۔ دراصل ایک باقاعدہ نظام کے ذریعے سیاہ فام کو جنوبی افریقا کی شہریت سے محروم اور ان کو اپنے ہی مادر وطن میں غیر ملکیتوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ یہ ہے نسلی امتیاز کا فیصلہ کن حل، ویسا ہی حل جیسا کی ماتسیدوں نے یہودیوں کے لیے ہٹلر کے آریائی پاگل پن میں تلاش کیا تھا۔ جنوبی افریقا کی حکومت بہت چالاک ہے۔ غیر ملکی بھی حقوق کا دعویٰ کر سکتے ہیں، مگر بہت کم کا، سیاسی حقوق کا تو ہرگز نہیں۔

نسلی امتیاز کے نظریاتی مخابروں کی جھکیں کی پیروی میں تین طبقوں سے زیادہ خدا کے بندوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر کے گھروں کو مسمار کر دیا گیا ہے، جب کہ ان کے واسیوں کو بین تھان کے کیمپوں میں ڈھیر کر دیا گیا ہے۔ میں 'ڈھیر' کا لفظ جان بوجھ کر اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ یہ ازکار و فتنہ اشیاء کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جو کوڑے کے ڈھیروں پر پھینک دی جاتی ہیں، انسانوں کے لیے نہیں۔ نسلی امتیاز کے نظام نے یقینی بنا لیا ہے کہ اللہ کے بندے اس لیے اشیاء کی طرح استعمال کیے جائیں، صرف اس لیے کہ وہ سیاہ فام ہیں، ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہ کوڑے دان ان جگہوں سے بہت دور ہیں جہاں غذا کا حصول آسان نہیں۔ بچے بھوک سے بلبلاتے ہیں، اور اکثر غذا ہت کی کمی کے باعث ناقابل علاج بیماریوں میں مبتلا

ہو جاتے ہیں۔ یہ سب ان کے ساتھ حادثاتی طور پر نہیں ہوتا، حکومت کی پالیسی کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ ایسے علاقے میں بھوکے رہتے ہیں جو پورے ہندوستان کے لیے روٹی کی فیکٹری کا کردار ادا کر سکتا ہے، ایسی سر زمین جو بڑے پیمانے پر غذائے آمد گزرتی ہے۔

باپ اپنے خاندان کو یکن شان وطن میں اپنے بد قسمت وجود کو زندہ رکھنے کے لیے چھوڑ جاتا ہے، جب کہ اگر وہ محوش قسمت ہو تو نام نہاد سفید فام انسانوں کی بستیوں میں ایک تارک وطن کی طرح، گیارہ ماہ تک ایک جنسی قیام گاہوں میں غیر فطری زندگی گزارتا ہے، جہاں وہ عصمت فروشی، بے تحاشا شراب نوشی وغیرہ کا نشانہ بنتا ہے۔ یہ تارک وطن محنت کش پالیسی حکومت کی اعلان کردہ ہے، ڈیج ریٹائرمنٹ چھوڑنے بھی، جو حکومت پر نکتہ چینی میں بالکل تامل نہیں کرتا، اس کو ہمارے سماج کا سرطان کہہ کر ملامت کی ہے۔ یہ سرطان جو سیاہ فام خاندانوں کو کھانا جا رہا ہے، حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی ہے۔ یہ بھی بے انداز انسانی دکھوں سے عبارت نسلی امتیاز کا خمیازہ ہے۔

نسلی امتیاز نے تفریق پر مبنی تعلیم کے کئی بچے جنے دیے، جیسے بنیو تعلیم، تعلیم غلامی وغیرہ۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ جتنا ایک سفید فام بچے کی تعلیم پر خرچ ہوتا ہے اس کا صرف دس فی صد سیاہ فام بچے پر خرچ ہوتا ہے۔ یہ تعلیم ہی ہے جو فیصلہ کن طور پر الگ اور نامساوی ہے۔ ماسی میں انسانی وسائل کی خورد و دو ہو گئی اس لیے کہ حکومت کی سیاسی مصلحت اندیشی کے مطابق اللہ کے بندوں کو اپنی منصفانہ تکمیل سے روکا جا رہا ہے۔ نسلی امتیاز پر مبنی غیر منصفانہ پالیسی کی جنوبی افریقا کو بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے، اس لیے کہ وہاں نسلی تعصب پر مبنی کم نظر پالیسی پر عمل کے براہ راست نتیجے میں ہندوستانی صلاحیتوں کا فقدان پیدا ہو گیا ہے۔ ہم ایک اخلاقی کائنات میں رہ رہے ہیں اور خدا کی نیک اور صحیح چیزوں کی پرستش کرتے ہیں۔ لہذا اس معاملے میں، جنوبی افریقی حکومت اور اس کے مددگار باقاعدہ اپنی بارود کی پٹاری کے ساتھ ساتھ جلد کیے جا رہے ہیں۔

ذہیر سارے غیر مساوی قوانین کے ذریعے نسلی امتیاز برتا جا رہا ہے، جیسے کہ پاپولیشن رجسٹریشن ایکٹ، جس کا فرمان یہ ہے کہ جنوبی افریقیوں کی ان کے نسلی زمروں کے مطابق درجہ بندی اور رجسٹریشن کی جائے۔ بارہا، نتیجے میں یہ بھی ہوا ہے کہ ایک ہی خاندان کا ایک بچہ سفید فام مندرجہ کیا گیا ہے جب کہ اپنی جلد کے ذرا دبے ہوئے رنگ کی بنا پر دوسرے کی رنگ دار حیثیت میں درجہ بندی کی گئی ہے۔ لہذا، وہ (دوسرا) اپنی آئندہ زندگی میں بے رحمانہ طور پر زیادہ حقوق کی حق وارذات کی رکھیت سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ محرومی بچپن کی کئی خود کشیوں پر منتج ہوتی ہے۔ یہ بھی بہت بڑی قیمت ہے جو نسلی پاکیزگی کے نام پر ادا ہو رہی ہے جس کی کسی طرح بھی تائید نہیں کی جاسکتی۔ اور بھی قوانین بنائے گئے ہیں، مثلاً Prohibition of Mixed Marriages Act جو ایک سفید فام فرد اور دوسری نسل کے فرد کے درمیان ازدواج کو غیر قانونی قرار دیتا ہے۔

نسلی ایک جائز ازدواج کے درمیان رکاوٹ بن جاتی ہے۔ دو افراد جو محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں، اپنی نسل کے باعث محبت کو ازدواج کے بندھن میں بدلنے سے روکے جاتے ہیں۔ ایک نہایت خوب صورت

عمل کو ناپاک اور مکروہ بنا دیا جاتا ہے۔ The Immorality Act کے مطابق زنا اور خرام کاری اس صورت میں غیر قانونی ہوتے ہیں اگر سفید فام اور دوسری نسل کے افراد کے درمیان واقع ہوں۔ جوڑوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے پولیس کو تاک جھانک کرنے والوں کے اپنی درجے تک گرا دیا گیا ہے۔ بہت سے سفید فام افراد نے اس قانون کے تحت جیل آنے والے مصیبت خیز نتائج اور بدنامی سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی ہے۔ یہ قیمت بھی بہت بھاری اور ناقابل برداشت ہے۔

ایسا شیطانی نظام، جو عام اور قابل قبول طریقوں کے تحت ناقابل دفاع ہے، ملکی سلامتی کے بہانے بنائے گئے بہت سارے خوف ناک قوانین پر انحصار کرتا ہے جو صرف جنوبی افریقہ سے مخصوص ہیں۔ ایسے بھی قوانین ہیں جن کے تحت کسی بھی شخص کو غیر معیہ مدت کے لیے حوالات میں بھیجے کی اجازت ہوتی ہے، جو وزیر قانون اور اس کے حکم کے مطابق ریاست کی سلامتی کے لیے خطرہ ہو۔ اس کو زیر کی مرضی کے مطابق، قید تہائی میں ڈال دیا جاتا ہے، جس تک اہل خاندان، وکیل اور ڈاکٹر کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔ یہ بہت سخت سزا ہے، جب کہ بظاہر وزیر کو پیش کیے گئے ثبوت نہ تو کھلی عدالت میں جانچے گئے ہوں، جو شاید کھنچ جانچ پر مثال پر شاید قابل قبول بھی نہ ہوں، شاید نہیں، مگر باہر والے کو پتا نہیں چل سکتا۔ یہ جبر کی حکومت کے لیے بہت آسان ایجاد ہے، اور وزیر کو بہت محتاط ہونا ہوتا ہے کہ کہیں وہ لالچ میں آ کر کھلی عدالت میں ثبوت کے امتحان کے عمل میں ہیر پھیر کرنے کو شش نہ کرنے لگ جائے، اور قانون کی دی ہوئی طاقت جس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جس میں وہ خود مدعی بھی متصف بھی ہوتا ہے ہاتھ سے گنوا دے۔ کئی، بلکہ بہت سارے افراد، حوالات ہی میں پراسرار حالات میں انتقال کر چکے ہیں۔ انسانی زندگی کے حوالے سے یہ سب بھی بہت مہنگی غلطیاں ہیں۔ وزیر خود بھی لوگوں کو بغیر کسی متوازن تفتیش کے امتناع میں پابند کر سکتا ہے۔ عین سے پانچ برس کے حکم امتناع کے تحت پابند ایک فرد غیر فرد ہو جاتا ہے جس کا حکم امتناع کے عرصے کے دوران ذکر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کسی اجتماع میں شرکت نہیں کر سکتا جب کہ اجتماع دو یا دو سے زیادہ افراد کے یک جا ہونے کو کہا جاتا ہے۔ اگر دو یا دو سے زیادہ افراد کسی ممنوعہ فرد سے باتیں کریں تو وہ اجتماع کے زمرے میں آ جاتے ہیں۔ امتناع کی ماری عورت شاید یا بغیر خاص اجازت کے اپنے بچے تک کے جنازے میں شرکت نہیں کر سکتی۔ اس کو غسل کے دنوں میں چھ بجے شام سے دوسرے دن چھ بجے صبح تک، اور جمعے کے دن چھ بجے شام سے پیر کے دن صبح چھ بجے تک اپنے گھر میں موجود رہنا پڑتا ہے۔ جس علاقے میں اس کو محدود کر دیا گیا ہو اس سے باہر جانے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ نہ وہ سیر کر سکتی ہے اور نہ کسی تفریح پر۔ یہ کتنی شدید سزا ہے جو ثبوت کے بغیر، یا عدالت میں ثبوت کی تفتیش کے بغیر دی جاتی ہے جب کہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ممنوعہ فرد کو ثبوت دکھانا دے گئے ہیں۔ یہ ان گنے پنے قوانین کے فراہم کردہ بنیادی انسانی حقوق میں بھی خطرناک خلل اندازی ہے جو سیاہ فام افراد کو اپنے مادری وطن میں حاصل ہیں۔ ان کو نقل و حرکت اور اجتماعات میں حصہ لینے کی بھی آزادی میسر نہیں۔ انھیں زمین کی ملکیت کے تحفظ کی آزادی نہیں، نہ اپنے ذاتی معاملات زندگی کے فیصلے

کرنے کی آزادی ہے۔ مختصراً، افسوس کہ یہ سر زمین جسے ہر طرح سے نعمت بخشی گئی ہے، انصاف کو مستحق ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جنوبی افریقی اور زمبیا کے دو باشندے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ زمبیا کے باشندے نے اپنے ملک کے وزیر برائے معاملات بحریہ کے بارے میں سن سنی تھی۔ جنوبی افریقا کے باشندے نے پوچھا، ”مگر تمہارے ملک کی تو سمندر تک رسائی نہیں، تمہارے ہاں وزیر معاملات بحریہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ زمبیا کے باشندے نے شرقی بہ شرقی جواب دیتے ہوئے کہا، ”محبوب! تمہارے جنوبی افریقا میں بھی تو وزیر انصاف ہے، ہے کہ نہیں؟“

ایسے نظام کے خلاف ہمارے عوام کم از کم 1912 سے، افریکن نیشنل کانگریس کے ساتھ مل کر پرامن احتجاج کر رہے ہیں۔ انھوں نے پرامن احتجاج کے مروجہ طریقے استعمال کیے ہیں۔ تحریری فریادیں، مظاہرے، وفود، حتیٰ کہ ایک مجبور سی مزارحتی لڑائی بھی کی ہے۔ ہمارے عوام کو اس سے بڑا خراج تحسین کیا ہوگا کہ اب تک صرف جنوبی افریقا میں دو افراد کو نوٹیل کا امن انعام دیا گیا ہے، اور وہ دونوں سیاہ فام ہیں۔ امن سے محبت کرنا ہمارے لوگوں کے لیے عیب بن گیا ہے۔ نوٹیل کے طور پر حکمران ہٹ بھڑی اور تشدد میں پولیس کے گھوڑوں کے ذریعے، آنسو گیس کے ذریعے، بغیر مقدمہ چلائے جس کے ذریعے، ملک بدری کے ذریعے، حتیٰ کہ موت کے ذریعے اضافہ کرتے ہیں۔ ہمارے عوام نے 1960 میں Pass Laws کے خلاف Sharpeville میں پرامن احتجاج کیا تھا جس میں 69 افراد مارے گئے، کئی کو زراہ ہوتے ہوئے عتب سے گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ ہمارے بچوں نے غیر معیاری تعلیم کے خلاف گانا گایا اور کتبے اٹھائے ہوئے پرامن کوچ کرتے ہوئے احتجاج کیا۔ 1976 میں بہت سے لوگ سولہ جون اور اس کے بعد مارے گئے یا قید کر دیے گئے۔ اس شورش میں پانچ سو سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ بہت سارے بچے ملک بدر کر دیے گئے۔ ان میں سے بہتوں کا توان کے والدین کو پتا بھی نہیں۔ ابتدائی تعلیم، آئینی نظام سے سیاہ فام افراد کا اخراج، سیاہ فام افراد پر مشتمل بناوٹی مقامی حکومتیں، روز افزوں بے روزگاری، بڑھتے ہوئے کرائے اور جنرل سیکز ٹیکس کے خلاف ہمارے عوام نے بائیکاٹ اور مظاہرے بھی کیے ہیں۔ وہ دن کی کام چھوڑ کا میاب ہڑتال بھی کی ہے۔ 150 افراد جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ یہ بہت بڑی قیمت ہے جو ادا کی گئی ہے۔ مغرب میں اس وحشیانہ کھیل میں جانوں کے ضیاع پر بہت کم نفرت کا غصے کا اظہار کیا گیا ہے۔ مہربانی کر کے کوئی اس پر روشنی ڈالنے کی رحمت کرے جس نے مجھ کو الجھا رکھا ہے۔ جب کوئی پادری قانع ہو جاتا ہے اور بعد میں مردہ پایا جاتا ہے تو مغرب کے ذرائع ابلاغ اس کو خوب اچھا لیتے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ ایک آدمی کی موت پر بھی اتنی تشویش ہوتی ہے۔ مگر اسی ہفتے میں جب پادری مردہ پایا گیا تھا، جنوبی افریقا کی پولیس احتجاج میں حصہ لینے والے چھٹیس سیاہ فام افراد کو موت کی نیند سلا دیتی ہے، چھ ہزار سیاہ فام افراد اسی نوع کے واقعات میں نوکری سے برخاست کر دیے جاتے ہیں، مگر ان کا کہیں ذکر بھی نہیں کیا جاتا۔ تو کیا ہمیں یہ بتایا جاتا ہے، میں جس کا یقین نہیں کر سکتا، کہ ہم سیاہ فام افراد اشیائے صرف ہیں، کہ ہمارا خون ارزاں ہے، کہ مشکل کے وقت

سفید فام پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہمارے خلاف متحد ہو جائیں گے؟ میں اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ جان بوجھ کر ہم کو یہ پیغام پہنچایا جا رہا ہے۔

ایسا ہو بھی تو، ہمارے پیش نظر ایک سر زمین ہے جو انصاف سے ماوراء ہے، اور امن و تحفظ سے خالی ہے۔ بے چینی ہمارا اپنا ملکی رنگ ہے، اور یہ افریقا کے منظر نامے پر اس وقت تک چھایا رہے گا جب تک کہ اس کی بنیادی وجہ نسلی امتیاز کو بالآخر ختم نہیں کر دیا جاتا۔ اس وقت فوج شہری آبادی پر چھاؤنی چھائے ہوئے ہے۔ خانہ جنگی جاری ہے۔ جنوبی افریقی مقابلے پر ہیں۔ جب 1960 میں افریقی نیشنل کانگریس اور Pan-Africanist Congress پر پابندی لگا دی گئی تھی تو انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ اسلحہ مزدوروں کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کے علاوہ ان کے سامنے اور کوئی راستہ نہیں۔ South African Council of Churches نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ ہم خلاف ہیں، ہر قسم کے تشدد کے، نظام جبر کے، نا انصافی کے نظام کے اور ان کے جو نظام کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ ہم ان کے بھی خلاف ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ حالت مجبوری یہ قدم اٹھانا پڑا ہے۔ آپ جابر ہوں یا مجبور، یہ کہنا کوئی نئی بات نہیں کہ ان لوگوں کے ہاتھوں جو دہشت گرد یا مجاہدین آزادی کہلاتے ہیں، جنوبی افریقی کیفیت میں تشدد باہر سے داخل نہیں کیا جا رہا ہے۔ جنوبی افریقی صورت پہلے ہی سے تشدد ہے، اور بنیادی تشدد ہے نسلی امتیاز، باشندوں کی بالآخر بے دخلی، غیر معیاری تعلیم، بغیر مقدمے کے محبوس کیا جانا، خاشاک بدوش مزدوری کا نظام وغیرہ۔

ہماری سرحدوں پر جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ ایک جنوبی افریقی دوسرے جنوبی افریقی کے خلاف صف آرا ہے۔ جنوبی افریقی سپاہی میسپا سے لڑ رہے ہیں، جو اپنے ملک پر جنوبی افریقا کے غیر قانونی قبضے کے خلاف ہیں، جو غیر منصفانہ اور استعماری نسلی امتیاز کے جبری نظام کو پھیلانا چاہتا ہے۔

جنوبی افریقا میں امن نہیں ہے۔ امن اس لیے نہیں ہے کہ وہاں انصاف نہیں ہے۔ جب تک اس خوب صورت سر زمین کے تمام باشندوں کو انصاف میسر نہیں ہو جاتا، نہ حقیقی امن قائم ہو سکتا ہے اور نہ جانی و مالی تحفظ۔ انجیل مقدس انصاف سے میرا امن کی قائل نہیں، ورنہ ہم اس جگہ جہاں امن نہ ہو وہاں امن، امن، امن، پکار رہی ہوئی۔ خدا کی عطا کردہ سلامتی، یعنی امن میں تقویٰ، عدل، کامیابی، افراط سے پر حیات، فیصلوں کے عمل میں شمولیت، نیکی، قہقہہ، خوشی، مرحمت، حصے داری اور مصالحت سب کچھ شامل ہے۔

میں نے جنوبی افریقا کے بارے میں تفصیل سے بات کی ہے، اس لیے کہ میں اس سر زمین کے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہوں، مگر چوں کہ یہ دنیا کی کائناتِ اصغر بھی ہے اور اس کی مثال بھی ہے، جو دوسرے علاقوں میں مختلف درجات میں پائی جاتی ہے۔ جہاں کہیں نا انصافی ہو وہاں سب سے پہلے ہمیشہ امن ہی گھٹا ہوتا ہے۔ ایل سلواڈور میں، نکاراگوا میں اور سارے جنوبی امریکا میں جابرانہ حکومتیں رہی ہیں جنھوں نے عداوت کو ابھارا ہے۔ ساقی باشندے ایک دوسرے کے خلاف مورچہ زن ہو گئے، جس نے ان بیرونی طاقتوں کو بھی ملوث کر دیا جو اپنے حلقہ اثر کو پھیلانا چاہتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہم نے دیکھا ہے مشرق وسطیٰ میں،

کوریہ میں، فلپائن میں، کمپوچیا میں، ویتنام میں، السر میں، افغانستان میں، موزمبیق میں، انگولا میں، زمبابوے میں اور اشتراکیت کے آئینی پردے کے پیچھے بھی۔

چوں کہ گمراہی ارض عدم تحفظ کا شکار ہے، اس پر بسنے والی قومیں احمیاریوں کے حصول کی پاگل دوڑ میں مبتلا ہیں۔ تباہی پھیلانے والے احمیاریوں پر اربوں ضائع کیے جا رہے ہیں، جب کہ کروڑوں افراد فاقہ کشی پر مجبور ہیں۔ اس کے باوجود نہایت بے شرمی سے دفاعی بجٹ پر اتنا خرچ کیا جا رہا ہے جس سے اللہ کے بندوں کے پیٹ کو روٹی مہیا کی جا سکتی ہے، تعلیم دی جا سکتی ہے، اور ایک مکمل اور خوش حال زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ ہم اپنے پیٹ بھرنے سے کئی گنا زیادہ کی صلاحیت رکھتے ہیں، مگر ہر روز ہاتھوں میں مشکل لیے دنیا کی، دیر سے دی ہوئی اور کم مقدار خیرات کے لیے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے انسانیت کے سوکھے مزے ڈھالنے ہمیں آسیب کی طرح پریشان کرتے رہتے ہیں۔ آخر ہم کب سیکھیں گے؟ کب دنیا کے لوگ کھڑے ہو کر کہیں گے جس، بہت ہو چکا۔ خدا نے ہمیں شراکت اور موافقت کے لیے بنایا ہے۔ خدا نے ہمیں انسانی خاندان بننے کے لیے بنایا ہے، اور ہم اسی لیے اپنا وجود رکھتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ہم کو تو تنہا خود کفیل بننے کے لیے نہیں، ایک کو دوسرے پر انحصار کے لیے بنایا گیا ہے، اور ہم ہیں کہ خود ہی اپنے وجود کے قانون کو توڑنے کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ آخر کب ہمیں عقل آئے گی کہ اسلحہ کی روز افزوں دوڑ عالمی عدم تحفظ میں اضافہ کرتی ہے۔ اب ہم اس وقت کے مقابلے میں، جب ہماری ٹیکنالوجی کم زور تھی اور مالی سکت کم تھی، ایک بھیاںک جوہری قیامت کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔

جب تک ہم اپنا پٹا مار کر کام نہیں کرتے، تا کہ خدا کے بندے، ہمارے بھائی بہن، ہماری انسانیت کا خاندان، سب مل کر بنیادی انسانی حقوق سے بہرہ مند ہوں، پھر پورے زندگی گزارنے کے حق، نقل و حمل کے حق، کام کرنے کے حق اور پوری طرح انسان ہونے کی ویسی آزادی نہیں رکھ سکتے، جو خودیہ سوج مسج کی انسانیت سے کسی طرح بھی کم نہ ہو، تو ہم بڑی سنگ دلی سے خود اپنی تباہی کے راستے پر آگے بڑھتے رہیں گے، یقیناً جائیں، ہم عالمی خود کشی سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں، جس سے بچا جاسکتا ہے۔

ہمیں کب علم ہو گا کہ بنی نوع انسان ایک لا انتہا قدر کی شے ہے، اس لیے کہ اس کو خدا کی شبیہ کی صورت میں خلق کیا گیا ہے، کہ اگر اس کو اس سے کم حیثیت میں دیکھا گیا تو یہ کلمہ کفر کے مترادف ہو گا، جو بالآخر ایسا کرنے والوں پر پلٹ پڑے گا۔ کسی انسان کو انسانوں کی صلاحیت سے محروم کرنے والے خود ان صلاحیتوں سے محروم ہو جایا کرتے ہیں۔ جبر جابر کو کچھ کم نہیں تو، مجبور کے برابر ہی محروم کر دیتا ہے۔ مکمل آزاد ہونے یا یوں کہیے کہ انسان ہونے کے لیے ایک کو دوسرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم انسان بن سکتے ہیں، مگر صرف دوستی میں، رفاقت میں، سماج میں، koinonia میں [قرنی شراکت کے ذریعے رازداری]، امن میں۔

آئیے، ہم سب مل کر امن والے بنیں، وہ جنہیں ہمارے آقا کی مصالحت کی وزارت میں نشان دار حصہ داری سونپی گئی ہے۔ مگر ہم امن چاہتے ہیں، جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے، تو ہمیں انصاف کے لیے کام کرنا

چاہیے۔ آئیے، ہم اپنی تلواروں کو کوٹ کوٹ کر تلوں میں تبدیل کر دیں۔

خدا ہمیں پکار رہا ہے کہ ہم اس کے ساتھ مل کر کام کریں، تاکہ ہم اس کی سلطنتِ سلامتی، انصاف، نیکی، برکت، نگہ داری، شرافت داری، قہقہوں، خوشیوں اور منہالت کو وسعت دے سکیں تاکہ اس دنیا کی تمام سلطنتیں ہمارے خدا اور اس کے بھیجے ہوئے یسوع مسیح کی سلطنت بن جائیں اور ابد الابد تک اُسی کی حکمرانی ہو۔ آمین! جب ہی مقدس سینٹ جان کی حیرت انگیز الہامی بصارت کی تکمیل ہوگی۔ (Rev. 6:9)

9۔ اور اس کے بعد میں نے دیکھا، اور تم بھی دیکھو گے، ایک عظیم افراط و کثرت کو، کوئی انسان جس کا شمار نہیں کر سکتا، تمام قوموں کی، بھائی بندی کی، عوام کی اور بولیوں کی، اس کے تخت اور تختے کے سامنے، سید قبا پہنے ہوئے اور [وہا کے لیے] ان کے ہاتھ کی اٹھی ہوئی پتیلیوں کی؛

10۔ اور ایک آواز کہتی بلند ہوئی، ”نجات ہمارے خدا ہی کی طرف سے ہے، جو تخت پر متمکن ہکا ہے، اور اس کے تختے کی طرف سے۔“

11۔ اور سارے فرشتے کھڑے ہوئے تھے اس کے تخت کے اطراف، بزرگوں اور چار درندوں کے اطراف، اور (سب کے سب) تخت کے آگے منہ کر کے گر کر خدا کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔

12۔ کہتے ہوئے، ”آمین! تقدیس، شان، دانش، شکرانہ، عزت، طاقت و جبروت، ہمیشہ ہمارے خدا ہی کے لیے ہے۔“



لیخ والینسا اعلان تجلیل

جلالت مآب، دودمان مٹائی، عزت مآب، مومنین و حضرات!
”ہر گاہ کہ خاندان انسانیت کے ہر فرد کی جمعی منزلت کا اقرار اور لائٹنگ مساوی حقوق ہی دنیا میں
آزادی، امن اور انصاف کی بنیادیں ہیں۔“

مندرجہ بالا الفاظ سے انسانی حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کے اعلان کی شروعات ہوتی ہے، وہ
اعلان جو امن کے تصور کی اس تعریف کے ساتھ، مارویائی نوٹیل کمیٹی کی جانب سے پولینڈ کے ٹریڈ یونین کے
رہنما لیخ والینسا کو اس برس کا نوٹیل امن انعام دیے جانے کی بنیاد بنا ہے۔

انسانی حقوق کی تحریک یقیناً امن کی جدوجہد کا ایک ناقابلِ علاج حصہ ہے۔ اس کی بنیاد پر انعام
دیے جانے والے کا انتخاب نئی بات نہیں، جنوبی افریقی انعام پانے والے البرٹ لوبولی (Albert Luthuli)،
ریاست ہائے متحدہ امریکا سے مارٹن لوتھر کنگ (Martin Luther King)، روس کے آندرے سخاروف (Andrei Sakharov)
اور ارہیناٹن کے ایڈولفو پیری اسکویئل (Adolfo Pérez Esquivel) نے ان ہی
بنیادوں پر انعام پائے ہیں۔ کمیٹی سمجھتی ہے کہ اس برس کا نوٹیل امن انعام حاصل کرنے والی شخصیت انسانی
حقوق کی تحریک چلانے والوں میں اس منصب کے لائق ہے۔

انسانی حقوق کے سلسلے پر غور ایک جانا پہچانا مسئلہ پیدا کرتا ہے کہ ”انسانیت اتنی ست رفتاری سے کیوں
آگے بڑھتی ہے؟“ اس کے باوجود عام طور پر یہ مانا گیا ہے کہ وہ امن جو انسانی حقوق کی پامانی اور اس کے
دفاع کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے، وہ امن نہ تو دائم رہتا اور نہ ہو سکتا ہے۔

مثالیہ موجودہ نسل نے جس طرح یہ سبق سیکھا ہے اس سے پہلے کی نسلوں کو اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔
جسمانی اور ذہنی دہشت جیسی برائیوں کے ساتھ فوجی فتوحات اور غیر ملکی غلبے سے لوگوں کو ایک بڑے سچ کو

کچھنے کا موقع ملا ہے کہ ”آزادی اور زندگی ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔“ امن وہاں وجود پاتا ہے جہاں لوگ آزاد فضاؤں میں رہتے اور مسائل لیتے ہیں۔

ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ایسے خیالات اقوام متحدہ کے اعلان انسانی حقوق کے عتب میں ہوتے ہیں، دنیا بھر کی کمیونٹی نے جس کو قوموں اور عوام کے مابین پرامن ہمبودی کے طور پر اپنا لیا ہے، ماریوٹائی نوبل کمیٹی کے نزدیک امن کے انعام کے فیصلے کے لیے یہ ایک فطری ترقی کے مسائل تھا۔ اس برس کے انعام کی پیشکش کے ذریعے کمیٹی نے ایک بار پھر امن کی تعریف کے اپنی تصویر کی طرف عالمی کمیونٹی کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نوبل کمیٹی کا سوچ بچار اور اس کے فیصلے لاپرواہی طور پر قومی اور سیاسی سرحدوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ ماریوٹائی نوبل کی وصیت میں امن کے انعام کے لیے دیے گئے رہنما اصول کے مطابق فیصلے کی ذمہ داری صرف نوبل کمیٹی ہی ہوتی ہے، اور اس پر کسی قسم کا بیرونی دباؤ کام نہیں کرتا۔ اس طرح نوبل کمیٹی اس [مددگار] ہاتھ سے کسی طرح بھی کم یا زیادہ نہیں ہوتی جو ان افراد یا گروہوں کی طرف بڑھتا ہے جو امن اور آزادی کی آرزو کرتے ہیں، خواہ وہ کہیں کے بھی رہنے والے ہوں، اور دنیا ان کے جذبات کو محسوس کرتی ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ماریوٹائی نوبل کی وصیت کی روح کے مطابق ہی ہے کہ امن کا انعام ان لوگوں سے اتحاد کے جذبے کا آمیزہ دار ہو جو انسانیت کے اعلیٰ ترین مقاصد کے مطابق امن کے لیے جدوجہد کرتے ہوں۔

اس مسئلے میں انسانی وقار ایک اہم تصور ہوتا ہے۔ اس جملے کے دو مرکزی پہلو ہیں: پہلا یہ ہے کہ انسانیت کے وقار کا مسئلہ ناقابل تخیل ہے، اور دوسرا یہ ہے کہ ایک فرد ہی نہیں، سارے انسان ہمیشہ ایک ہی قدر کے حق دار ہوتے ہیں۔ اس کا فطری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانیت کے وقار کا دفاع ہم سب کا مشترکہ فریضہ ہے۔ ہر قسم کے خیالات یک جہتی، حتیٰ کہ ایک دوسرے سے محبت کرنے کے حکم کی بنیاد بھی اسی میں مضمر ہے۔ انسانی وقار انسانیت کی مشترکہ جائیداد ہے، وہ جائیداد ہم سب جس کی ذمہ داری میں اچھے دار ہیں۔ ہم سب ایک عام انبوہ کی صورت میں بستے ہیں، اس طرح کہ ہم دوسروں کے مقصوم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ایک اور نوبل انعام یافتہ ادیب ارنسٹ ہیمنگ وے انگریزی کے مشاعر جان ڈن (John Dunn) کے ایک مشہور مقولے سے اپنے ایک ماول کی ابتدا کرتا ہے جو اس نکتے کو حیرت افزا سراحت سے روشن کرتا ہے: ”کوئی بھی شخص بذات خود جزیرہ نہیں ہوتا، ہر انسان پورے بنا عظیم کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے، اگر سمندر ایک روڑا بھی بہا لے جائے تو یورپ چھوٹا ہو جائے گا، جیسے ایک راس زمین، اسی طرح جیسے تم اور تمہارے دوست ایک فرد کی موت بھی مجھے کوئی نہ کر دیتی ہے، اس لیے کہ میں بنی نوع انسان کا حصہ ہوں۔ لہذا یہ کبھی نہ پوچھنا کہ [اس بار] گھنٹی کس کے لیے بج رہی ہے؟ [ہو سکتا ہے کہ] یہ تمہارے لیے ہی بج رہی ہو۔“

یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ہمیں انسانیت کی یکتائی کو سمجھنا چاہیے۔ ”ایک [معمولی] انسان کی موت مجھے کوٹاہ کر دیتی ہے۔“ زنجیروں میں جکڑا ہر بھائی میری شرمندگی ہوتا ہے۔ آزادی کی ہر مجبور تمنا، ہر انسانی حق کی پامانی میری ذاتی شکست ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ہم بنی نوع انسان سے اور اس کے مقصود سے بیوستہ ہیں۔

انسانی یکتائی کے اس آدرش کی بنیاد پر اس برس کے انعام پانے والے نے ایک مشعل روشن کی ہے۔ [ان کی یونین] Solidarity کا نام، ایک تابندہ نام ہے۔ یہ مشعل انھوں نے بغیر ہتھیار کے اٹھائی ہے۔ لفظ، جذبہ اور آزادی کا تصور ان کے ہتھیار تھے۔ اور جیسا کہ اکثر ہوتا آیا ہے، جدوجہد کو ذاتی قربانی کی طلب تھی، اگرچہ مقصد بالکل سادہ تھا کہ محنت کش اپنے ادارے بنانے کا حق رکھتے ہیں۔ یہ وہ حق ہے جس کا اقوام عالم کے اعلان میں اعادہ کیا گیا ہے۔

مارویاتی نوٹیل کمیٹی نے اس میدان میں کر دیا۔ کے تمام ملکوں میں محنت کشوں کو اپنے نمائندہ ادارے بنانے کا حق ہے، شیخ والینسا کی کوششوں کا احاطہ کیا ہے۔ اس سیاق و سباق میں Solidarity کا نام عالمی سطح پر کبرے معنی رکھتا ہے۔ شیخ والینسا کا نام اندرونی پویش سیاست سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ Solidarity جس کے وہ ترجمان ہیں، انسانیت کی وحدت کے اظہار کی علامت ہے۔ اس لیے وہ ہم سب کے بھی ہیں۔ دنیا نے ان کی آواز سن لی ہے اور ان کے پیغام کو سمجھ لیا ہے۔ نوٹیل انعام تو محض اس کی تصدیق ہے۔

شیخ والینسا نے Solidarity کے نام کو محض ایک گروہ کے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے بنائے جانے والے اتحاد سے کہیں زیادہ اہم بنا دیا ہے۔ Solidarity تنازعات اور اختلافات کے پر امن حل کی نمائندہ جماعت کی علامت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے جس میں ہمارے متعلقین ایک دوسرے کے لیے احترام اور دیانت داری کے جذبے کے ساتھ شریک ہوں۔

تنازعات اور اختلافات بہت ہو سکتے ہیں، اور مختلف قسم کے رد عمل پر منتج ہو سکتے ہیں۔ اور لوگوں کو ان میں الجھے ہوئے ناگزیر پیچیدہ فیصلوں اور نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا ہی موقع تھا اگست 1980 کا ایک دن، جب شیخ والینسا نے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر گدانسک (Gdansk) کے لینن پارک کے اطراف آہنی تاروں سے بنے ہوئے احاطے کو چڑھ کر پار کر کے اپنے ہاتھوں میں مائیکروفون تھاما تھا، اور ایک ہی لمبے میں وہ پولینڈ کے محنت کشوں کے درمیان باہمی اتفاق کے رہنما بن گئے تھے۔ انھیں زیر دست مشکلات کا سامنا تھا۔ ان کے لیے حکمت عملی کے انتخاب مسئلہ آسان نہیں تھا۔ مگر ہدف بالکل واضح تھا: محنت کشوں کو منظم ہونے کا حق اور ملک کے صاحبان اقتدار سے مزدوروں کے اجتماعی مسائل پر بات چیت کرنے کے حق کا حصول۔ مگر ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ ہدف کو حاصل کرنے کے لیے انھیں کئی راستوں میں سے کس پر قدم بڑھانا ہوگا۔

یہ موقع نہیں جس میں ہم ان سیاسی حالات کا تجزیہ کریں، شیخ والینسا نے خود کو جن میں گھرا ہوا پایا تھا۔

اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ حالات بہت مشکل تھے۔ اس وقت ہمارے سامنے جو حالات ہیں ان کے پیش نظر وہی سب سے دلچسپ حکمت عملی تھی لیٹو وائیٹس نے جسے اپنایا تھا، یعنی امن اور مصالحت کی حکمت عملی۔ اور جیسا کہ اس طرح کے حالات میں ہوتا آیا ہے، بات چیت کا مطلب ہوتا ہے مصالحت پر رضامندی۔ اور اس مقام پر یہ اس لیے اور بھی زیادہ ضروری تھا کہ مخالف طاقت خود بھی مشکل، معاشی اور سیاسی حالات سے نبرد آزما تھی۔ اس طرح قومی خواہش کے مطابق مزدوروں کی انجمن Solidarity نام نہاد پولش حزب اختلاف کی نمائندہ بن کر سامنے آئی تھی۔ یہ کوئی مخالف جماعت نہیں تھی جو طاقت کو استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ اس وقت تو یہ ایک روحانیت اور دانش افزا طاقت کا معاملہ تھا جو عوام میں اپنی مقبولیت کے باعث، اندر ہی سے موجودہ نظام میں حمایت کر سکتی تھی اور ان کے درمیان تنازعات کو حل کر سکتی تھی۔

بجائے اس کے کہ وہ تھمدک راستہ اپنائی، پرامن راستے پر قدم بڑھا کر Solidarity تیزی سے بڑھتی ہوئی تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ لیٹو وائیٹس نے دیرری سے، خلی ہاتھ آگے بڑھ کر جو قدم اٹھائے تھے پولینڈ کے لاکھوں مزدوروں اور کسانوں نے ان کی جدوجہد میں شامل ہو کر ان کا دلہانہ استقبال کیا تھا۔ اس طرح، آج کے دن ان کو امن کا نوبل انعام پیش کر کے کمیٹی نہ صرف ان کو احترام دینا چاہتی ہے بلکہ تشکر کے جذبات کا اظہار بھی کرنا چاہتی ہے، ان کی پرامن جماعت کے لیے جس کے ذریعے انھوں نے یہ راستہ اپنایا تھا۔

وائٹس اور وہ تحریک جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں، ان اعلیٰ ترین انسانی آدرشوں کے مطابق ہیں جن کی نہ صرف Solidarity سے تعلق رکھنے والوں نے بلکہ پولش کھیسا نے بھی تصدیق کی ہے۔ یہ بالکل انحصار بخش سیاسی وابستگیوں ہی پر نہیں، بلکہ انسانی اقدار کے تصورات اور انسانی حقوق کے نظریاتی اتحاد کی بنیاد پر استوار ہے۔

کمیٹی اس اعلان سے محروم نہیں کہ پولش کھیسا، جو دیرری یورپی کھیسوں کے مقابلے میں ایک مرد دل عزیز کھیسا ہے، لیٹو وائیٹس کی طرف داری میں کتنا یکساں رہا ہے، اور اس سبب سے Solidarity کی پیش بہا اخلاقی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اس معاملے میں کھیسا سے اسی کردار کی توقعات وابستہ کی جاتی ہیں جو وہ پولینڈ کے سماج میں ادا کر سکتا ہے۔

غیر ملکی ہونے کے باعث ہمیں بالخصوص ان کیفیات کا علم ہے جن میں Solidarity نے، کھیسا سے اپنے تعلقات کے باعث، امن اور مصالحت کے لیے رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ ہم نے لاکھوں کی تعداد میں افراد کو کھیسا کے اطراف جمع ہوتے، اور اپنی سر زمین اور اپنے مقاصد کی برآوری کے لیے دعائیں کرتے دیکھا ہے۔ ہم نے انھیں آزادی پر قربان ہو جانے والوں پر چڑھائے جانے والے پھولوں کو اپنے آنسوؤں سے تر کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ان کی نہی لڑی جانے والی لڑائی ایسی لڑائی ہے جو انھوں نے اپنے لیے ہی نہیں، ساری دنیا کے آزادی سے محبت کرنے والے عوام کے لیے لڑی ہے۔

یہی وہ تناظر ہے جس میں ماریو یاٹی ٹوئیل کمیٹی نے شیخ والینسا کی ذاتی لہذا کو دیکھا ہے۔ انھوں نے جو راستہ اختیار کیا وہ گفت و شنید، کامن اور مصالحت کا راستہ تھا۔

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اس میں یہ کس بڑی طرح واضح ہو چکا ہے کہ دیانت اور تنازعات کا پُر امن حل پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ طاقت کا وحشیانہ استعمال ہمیں کہیں منزلوں تک لے جاتا ہے۔ اگر تاریخ نے ہمیں کچھ سکھایا ہے تو یہ کہ زیادہ عرصے تک تشدد اور طاقت کا استعمال صرف موت کی طاقتوں کو متحرک کرتا ہے۔

ہر قسمی سے ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ تاریخ کی آواز ہمیشہ انسانیت اور امن کی فتح کا اعلان نہیں کرتی۔ یہ سوال پوچھنا بھی بر عمل ہوگا کہ کیا آدرش اور اخلاق پر مبنی اچھے رویوں کے لیے درحقیقت کامیابی کے امکانات موجود ہیں؟

یقیناً شیخ والینسا کے بارے میں بھی یہی سوال پوچھا جاسکتا ہے۔ کچ تو یہ ہے کہ اگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوتے جن کے لیے وہ کام کر رہے تھے تو بڑی حیرت کی بات ہوتی۔ وہ کسی قسم کا سیاسی بھومچال پیدا کرنے والی شخصیت نہیں، بس ان کو پولش مزدوروں کے مفادات اور ان کے حالیہ مطالبات کی فکر تھی۔ مگر ایسے مطالبات ہمیشہ تو کامیاب نہیں ہوا کرتے، خواہ وہ کتنے ہی حق بجانب کیوں نہ ہوں، جیسا کہ شیخ والینسا کے معاملے میں تھے۔

شیخ والینسا نے کوئی سیاسی پرہم نہیں بلند کیا تھا، نہ انھوں نے پُر امن ہڑتال کے علاوہ اور کوئی حربہ استعمال کیا تھا، ساری دنیائے جس کو مانتے ہیں۔ نہ ہی انھوں نے حقوق انسانی کے اعلانات کی رو سے مدد طلب کی تھی، جو اقوام متحدہ اور ہلینکی معاہدے سے صادر ہوئے تھے۔ ان کی خواہش صرف مذاکرات ہی تھے۔ ان کے نزدیک صرف دو ہی باتیں اہمیت کی حامل تھیں، مزدوروں کے معاشی حالات اور مذاکرات کا حق۔

اس ایک رُخے ارتکاز پر ذہنی کا پس منظر وہ سادہ سی حقیقت تھی کہ ان حقوق کو تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ سے کئی موقعوں پر بھی تکفیل پیدا ہوئی تھیں۔ 1956 میں، 1970 میں اور ایک بار پھر 1980 میں۔ یہ ساری شورشیں بلکم وکاست زمین مسائل سے متعلق تھیں: سماجی حالات، آزادی اظہار اور اداروں کی تشکیل کا حق۔

اس پر حیرت کا اظہار کیا جاسکتا ہے کہ ایسے مقاصد کا حصول اس قدر مشکل کیوں ہے۔ جو لوگ بین الاقوامی مزدور تحریک کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں، انھیں علم ہوگا کہ اس قسم کی مشکلات ہمیشہ سے موجود رہی ہیں۔ یہ آج بھی عجیب سی بات لگتی ہے کہ کام کرنے والے افراد کے بنیادی حقوق سلب کیے جاسکتے ہیں، اس سے قطع نظر کہ وہ کس نظریے اور کس معاشی نظام سے تعلق رکھتے ہوں۔ بہت سے لوگ شاید ہی اس بات پر یقین کریں گے کہ ایسی سرحدیں بھی ہوتی ہیں جن کے پیچھے مزدوروں کے حقوق کے حق میں تحریکیں چلانے کی

ضرورت نہیں ہوتی؛ ظاہر ہے کہ ایسی سرحدوں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ ملٹ و الیمنسا نے طاقت کے مرکزی ڈھانچے کو چیلنج کیے بغیر ہی بنیادی سماجی حقوق کے لیے تحریک چلائی تھی، ان کی تحریک پر ناگزیر سیاسی اور نظریاتی رنگ حاوی تھے۔

جیسے جیسے Solidarity کے خلاف سیاسی اختلاف ابھرتا گیا، انسانیت اور انسانی حقوق کے بارے میں اس کا اپنا شعور اجاگر ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ ظاہر ہوتا گیا کہ مزدوروں کے بنیادی حقوق کے لیے کی جانے والی ملٹ و الیمنسا کی تحریک شروع ہی سے مزدوروں کے حقوق کے لیے کی جانے والی عالمی تحریک کی امداد تھی۔ اور اس سلسلے پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جاتا رہا۔ بالخصوص دانشوروں کے گروہ کی طرف سے جو تحریک میں شامل تھے اور پوٹش کھیمیا کی جانب سے بھی۔

انسانی حقوق کے لیے تحریک چلانے والوں کے لیے ہمیشہ سے مسائل رہے ہیں، اس سے قطع نظر کہ وہ دنیا کے کس حصے میں رہتے یا کام کرتے ہوں کہ: کس طرح مثالی ہدف حاصل کیے جائیں جب وہ ذمے دار بن چکے ہوں، ساتھ ہی ساتھ حالات کے مطابق ممکنہ امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ کیا یہ عقل مندی نہیں کہ مطالبات کو اعتدال پر رکھا جائے اور بہتری کی کوشش آہستہ آہستہ کی جائے؟

ملٹ و الیمنسا کو بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔ کیا ایک محتاط رویہ، جس میں کچھ کامیابی حاصل ہو جائے، صحیح طریقہ ہوگی؟ یا پھر ایسا خطرہ مول لیا جائے، جس میں کچھ کھودینے کا امکان ہو؟ اس قسم کے مسائل سے واقفیت کے بغیر پوٹش Solidarity تحریک کا سمجھنا ممکن نہیں۔

موجودہ حالات کی ایک حقیقت پسندانہ قدر چٹائی سے یہ اخذ کیا جاسکے گا کہ وہی بہترین راستہ تھا جس کا ہدف معاشرتی کثیریت (pluralism) پر یقین رکھنے والی ایسی یک جماعتی حکومت ہو جو مستقبل میں ترتیب بندی اور گفت و شنید کی آزادی اجازت دے۔ ایسا عمل پہلا گفت و شنید کا ماڈل تھا۔

ہمیں اب معلوم ہوا ہے کہ اس قسم کی میانہ روی حکمت عملی بھی ناکام ہو گئی تھی۔ Solidarity آج ایک غیر قانونی جماعت بن چکی ہے۔ ہڑتالوں اور ہذاکرات کے باعث، جو گفت و شنید کا سنجیدہ اظہار تھے، ملک میں ہنگامی حالات کے نفاذ اور ملٹ و الیمنسا کی گرفتاری و قید پر منتج ہوئے۔

اگرچہ ہنگامی حالات ختم اور ملٹ و الیمنسا قید سے آزاد کیے جاسکے ہیں، ان کی آزادی کو محدود کر دیا گیا ہے۔ ان کی اپنی قدر چٹائی کے مطابق موجودہ حالت نے انہیں آج ہمارے درمیان موجود ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔ امن کا انعام حاصل کرنے والی شخصیت کی نشست خالی ہے اور ہم جو آواز سنیں گے وہ ان کی نہیں ہوگی۔ اس لیے، آئیے، ہم ان کی خالی نشست سے اٹھنے والی خاموش تقریر کو سننے کی کوشش کریں۔

اس وقت ملٹ و الیمنسا کو، اس تحریک کے اختتام پر جو جدوجہد اور قربانیوں سے بھرپور تھی، ایک فاتح کی صورت میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا اختیار کیا ہوا راستہ اتنا مختصر اور اتنا آسان نہیں تھا۔ اور ایسا محسوس کیا جاسکتا ہے کہ جو ہدف انہوں نے اپنے لیے مقرر کیے تھے وہ آج بھی اتنے ہی دور ہیں۔

مگر کیا لیخ والینسا آج خاموش ہیں؟ کیا وہ فتح سے بالکل عاری ہیں؟ کیا ان کے مقصد کو شکست ہوئی ہے؟ بہتوں کا خیال ہے کہ ان کی آواز کبھی اتنی زیادہ توانا نہیں تھی کہ اس کی پہنچ اس سے زیادہ ہوتی جو آج ہے۔ گڈانسک سے آنے والا برقیاتی مستری، دستورالہ کی وادی کے بڑھتی کا بیٹا، آزادی اور انسانیت کا پرچم اتنا بلند کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ پوری دنیا اس کو ایک بار پھر دیکھ سکتی ہے۔ اُن کے یقین اور بصیرت کی طاقت کم زور نہیں ہوتی ہے۔ اس کے اعمال بین الاقوامی مزدور کی تاریخ کا ایک باب بن چکے ہیں، اور مستقبل اس کے نام کو ان لوگوں کے زمرے میں رکھ کر یاد کرے گا جنہوں نے آزادی انسانیت کی وراثت میں اپنا بھی حصہ ڈالا ہے۔ ایک بار پھر معمار کا رد کیا ہوا پتھر بنیادی پتھر بن چکا ہے، اس بار آزادی اور انسانیت آمیز جمہوریت کی عمارت کا مختلف درجات کی کامیابیوں کا بنیادی پتھر آج ہماری دنیا میں بلند ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

یہ بہر حال طے ہے کہ لیخ والینسا کی کوششوں میں ہمارے عصر کے لیے ایک اہم پیغام ہے۔ کمیٹی کی رائے ہے کہ وہ اُن سب کے لیے بھی ایک وجدان اور روشن مثال کی مانند ایسا دہ ہیں، جو مختلف ممالک میں آزادی اور انسانیت کے لیے برسرِ پیکار ہیں۔

اگر مستقبل میں، جو ہمارے خیال میں زیادہ دور نہیں، پوش ارباب اختیار اور ملکی مزدوروں اور کسانوں کے مابین مصالحت کی کوشش ہوئی تو لیخ والینسا کی شرکت ضروری بھی ہوگی اور ناگزیر بھی۔

بچوں کو وہ عام محنت کش اور فارم پر کام کرنے والے مزدور کی نظروں میں ایک فاتح ہیں، وہ دیکھتا اور عوام کی نظروں میں بھی فاتح ٹھہرتے ہیں۔ اور دنیا بھر میں وہی ان عظیم تر جہانوں میں سے ایک ہیں، آزادی کی آرزو مندی کے ترجمان، جنہیں کبھی خاموش نہیں کیا جاسکے گا۔

لیخ والینسا نے انسانیت کو زیادہ بڑی اور ناقابلِ تسخیر بنا دیا ہے۔ اُن کی ذورِ قوت خوش قسمتی یہ ہے کہ انہوں نے وہ فتح پائی ہے جو ہماری سیاسی دنیا میں نصیب نہیں۔ اُن کو امن کے انعام کی پیشکش ان کی فتح کی طاقت کو خراج عقیدت ہے جو ایک شخص کے اپنے یقین میں، اس کے تصور میں، اس کی ہمت میں جاگزیں ہوتی ہے اور اس کی پکار پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

مارویاتی نوٹیل کمیٹی کے صدر نشین Egil Aarvik کی زبانی

خطبہ — Bogdan Cywinski کی زبانی

خوانین وہ حضرات!

1983 کا نوٹیل امن انعام پانے والے کی حیثیت میں، گڈانسک جہاز سازی کے کارخانے کا ایک

کارکن اور پولینڈ میں آزاد ڈیڑھ یونین کی تحریک کے بنیاد گزاروں میں سے ایک، آپ سے مخاطب ہو رہا ہے۔ یہ کہنا سب سے آسان بات ہوگی کہ میں اس عظیم امتیاز کے لائق نہیں۔ پھر بھی، جب میں اس لمحے کو یاد کرتا ہوں جب میرے ملک کے طول و عرض میں اس انعام کی خبر پھیلی تھی، ابھرتے ہوئے جذبات اور عالم گیر خوشیوں کے وقت لوگوں نے سمجھا تھا کہ وہ سب اس انعام میں اخلاقی اور روحانی اعتبار سے شریک ہیں، اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں اس کو اعتراف کی دلیل سمجھتا ہوں کہ اُس تحریک نے، میں نے جس میں اپنی تمام تر قوت صرف کی تھی، انسانوں کی یہ طریق احسن خدمت کی ہے۔

میں اس عطا کو قبول کرتا ہوں، اپنے عمیق احترام اور اس کی معنویت کے ساتھ، اور مجھے اس بات کا اعتراف بھی ہے کہ یہ اعزاز ذاتی طور پر مجھ ہی کو نہیں بلکہ Solidarity کو، عوام کو اور ان خیالات کو نشا گیا ہے جن کے لیے ہم نے لڑائیاں لڑی ہیں، اور امن اور انصاف کے حصول کے لیے ہم آئندہ بھی لڑتے رہیں گے۔ اور مجھے اس انعام سے کسی اور قسم کی خواہش نہیں ہے سوائے اس کے کہ یہ انعام امن اور انصاف کے حصول میں ہمارے ملک کا بلکہ ساری دنیا کا مددگار ہو۔

میرے اقولین الفاظ جن سے میں آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں، آپ کے ذریعے اُن تمام لوگوں کے لیے بھی ہیں جو مجھے بچپن سے جانتے ہیں: امن اور اخلاقی سب کے لیے سہا طرف، شمال ہو کہ جنوب، مشرق ہو کہ مغرب۔

میں اس قوم کا ایک فرد ہوں جو گزشتہ کئی صدیوں سے مشکلات اور الٹ پھیر کا شکار رہی ہے۔ اُس وقت دنیا کا ردِ عمل خاموشی یا محنت بے دردی سے عبارت رہا ہے جب حملہ آور فوجوں نے پولینڈ کی مرحدوں کو پار کیا تھا اور ایک خود مختار حکومت کو وحشی طاقت کے آگے اپنا سرنگوں کرنا پڑا تھا۔ ہماری قومی تاریخ نے کئی بار ہمیں تلخیوں اور احساس سے بھر دیا ہے۔ مگر اس میں امید کے لیے ایک بڑا سبق تھا۔ اس عطا کے شکریے کے ساتھ، میں سب سے پہلے اپنی جانب سے اپنے لشکر کا اظہار کرنا چاہتا ہوں اپنے اس یقین کے ساتھ کہ یہ پولینڈ کے عوام کی امیدوں کو تہرا کر دے گا، اس قوم کی امیدوں کو جو پوری انیسویں صدی ایک لمبے کے لیے بھی اپنی آزادی کی تہا سے راضی نہیں ہوتی اور دوسری قوموں کے ساتھ اپنی آزادی کی جنگ بھی لڑتی رہی ہے۔ وہ امید جو پچھلے چالیس برسوں میں اوپر نیچے ہوتی رہی ہے، یعنی میرا پوری عرصہ حیات یاد رکھنے والی تاریخی تاریخ 1944, 1956, 1970, 1976, 1980 کے سالوں سے بھرا ہوا ہے۔

اور اگر میں اس مرحلے پر خود کو اجازت دوں اور اس موقع پر اپنی زندگی کا تذکرہ کروں تو اس کی وجہ میرا یقین ہوگا کہ یہ انعام بہت سے لوگوں میں سے ایک کو عطا کیا گیا ہے۔

میں اس وقت جہانی کے مراحل میں تھا جب یہ ملک عالمی جنگ کی تہاڑوں اور بکھری ہوئی راکھ سے نکل کر تعمیر نو کی منزل سے گزر رہا تھا، جس میں میری قوم نے دشمن کے سامنے اپنے سر کو نہ جھکا کر ایک بڑی قیمت ادا کی تھی۔ میں مزدوروں کی اُس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جو ویسی پولینڈ کے چھوٹے چھوٹے قریوں میں پیدا

ہوئی تھی اور تعلیم حاصل کر کے کارخانوں میں ملازمت کے باعث اپنے حقوق کے بارے میں با شعور ہوئی اور سماج میں اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ وہی زمانہ تھا جب مزدور اور کسان اپنے حقوق سے واقف بھی ہو رہے تھے مگر ان کے ساتھ کھلی نا انصافیاں بھی ہو رہی تھیں اور ان کے تصورات کے خواب چکنا چور بھی ہو رہے تھے۔ میں صرف تیرہ برس کا تھا جبہ جون 1956 میں 'پونزان' کے مزدوروں کی روٹی اور آزادی کے لیے کی جانے والی براس جدوجہد کو ٹھون میں شہلا دیا گیا تھا۔ تیرہ ہی برس کا لڑکا - Romek Strzalkowski بھی تھا جو اس جدوجہد کے دوران مارا گیا تھا۔ اور یہ Solidarity یونین ہی تھی جس نے پچیس برس بعد مطالبہ کیا تھا کہ اس کی یاد منا کر اسے خراج عقیدت پیش کیا جائے۔ دسمبر 1970 میں جب مزدوروں کے احتجاجی مظاہروں نے بلقان کے ساحلی شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، میں گڈانسک کے جہاز ساز کارخانے میں کام کرتا تھا اور ہڑتالیں کرانے والوں میں شامل تھا۔ میرے ساتھی مزدوروں کی، جنہوں نے اپنی جانیں گنوائی تھیں، تشدد اور مایوسی کی تلخ یاد میرے لیے وہ سبق تھا جو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

چند برس بعد، جون 1976 میں، Ursus اور Radom کے مزدوروں کی ہڑتالیں ایک نیا تجربہ تھیں جنہوں نے مزدوروں کے مطالبات اور تقاضات پر نہ صرف میرے یقین کو پختہ تر کر دیا تھا بلکہ باہمی اتفاق اور استحکام کی ضرورت کو واضح کر دیا تھا۔ اس یقین کامل نے مجھ کو 1978 کے موسم گرما میں آزاد ریڈ یونین کی طرف راغب کیا، جو باہمت افراد کے ایک گروہ نے مزدوروں کے حقوق اور منزلت کے حصول کے لیے بنائی تھی۔ 1980 کے جولائی اور اگست میں ہڑتالوں کی ایک لہر نے پورے پولینڈ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس وقت ہڑتال کے مقاصد محض مالی حالات سے کہیں بڑے درجے کے تھے۔ میری زندگی کی راہ، جدوجہد کے وقت، مجھ کو گڈانسک کے کارخانے میں لے آئی۔ پورا ملک گڈانسک اور Szczecin میں کام کرنے والے مزدوروں کے ساتھ ہے۔ گڈانسک، Szczecin اور Jastrzebie میں ہونے والے معاہدوں پر دستخط ہوئے اور Solidarity یونین وجود میں آئی۔

پولینڈ کی بڑی ہڑتالیں، میں نے جن کا ابھی ذکر کیا ہے، خاص قسم کے واقعات تھے۔ ایک طرف تو ان کا کردار بھیاںک نتائج کا حامل تھا جن میں وہ کی گئی تھیں، اور دوسری طرف ان کے اور بھی مقاصد تھے۔ پویش کارکن جنہوں نے ان ہڑتالوں میں حصہ لیا تھا وہ دراصل اپنی قوم کی نمائندگی کر رہے تھے۔ میں جب اپنی زندگی کی راہیں کو یاد کرتا ہوں تو تشدد، نفرت اور جھوٹ سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایسے تجربات سے حاصل ہونے والا سبق یہ تھا کہ ہم تشدد سے اس وقت تک مؤثر اختلاف نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم خود اس سے ہتھ پائ نہیں کرتے۔

واردات سے پیران برسوں کی مختصر تاریخ میں گڈانسک معاہدہ حقوق کا ایک عظیم فرمان تھا جس کو کبھی منایا نہیں جاسکتا۔ 1980 میں کیے جانے والے معاہدوں کی بنیاد ہمت، احساس ذمہ داری اور محنت کش عوام سے یک جہتی پر ہے۔ طرفین کو احساس ہو چکا ہے کہ اگر خون خرابے کو روکنا ہے تو باہمی رضامندی حاصل کرنا

ہوگی۔ اس طرح ہونے والا معاہدہ مشعل راہ ہوگا جس کی پیروی کرنی ہوگی اور یہی وہ واحد موقع ہے جس میں سے طاقت کے استعمال اور ناامید جدوجہد کے درمیان کا راستہ نکلتا ہے۔ ہمارا ایتقان ہے کہ ہمارا مقصد انصاف پر مبنی ہے اور یہ بھی کہ پُر امن طریقے سے اپنا جہد حاصل کرنے کی کوشش نے ہمیں طاقت اور آگاہی عطا کی ہے کہ ہمیں کن حدوں کے پار نہیں جانا چاہیے۔ تو جو کبھی ناممکن معلوم ہو رہا تھا اب زندگی کی حقیقت بن کر سامنے آگیا ہے۔ ہم نے اباب اختیار سے آزاد یونین بنانے کا حق حاصل کر لیا ہے، محنت کش عوام جس کی بنیاد رکھ سکیں گے اور اس کو چلا سکیں گے۔

ہماری یونین Solidarity ابھر کر سماجی اور اخلاقی آزادی میٹھا کرنے کی ایک طاقت و تحریک بن چکی ہے۔ قلمانی کے ہندوؤں سے آزاد ہونے والے عوام اصلاحات اور ترقیات کے طلب گار ہیں۔ ہم نے اپنے وجود کے لیے ایک مشکل جنگ لڑی ہے۔ وہ ہمارے، بلکہ پورے ملک کے لیے، ایک مادر موقع تھا اور اب بھی ہے۔ میرے خیال میں اس موقع نے اباب اختیار کے لیے بھی راہوں کی نشان دہی کر دی ہے، اگر وہ ریاست کو امداد باہمی کے ذریعے چلانے کے بارے میں سوچیں، جس میں تمام باشندے شریک ہوں۔ فریڈ یونین کی ایک تحریک کی صورت میں Solidarity نے نا اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ مقرر کردہ آئینی نظام کی مخالفت کی ہے۔ Solidarity کے قانونی قیام کے پندرہ مہینوں کے اندر اس کی سرگرمیوں کے نتیجے میں نہ کوئی ہلاک ہوا ہے اور نہ زخمی۔ ہماری تحریک نے دن دوپہ اور رات چوگنی ترقی کی ہے، مگر ہم نے اپنی جدوجہد کو اپنے حقوق اور سرگرمیوں کی آزادی کے حصول کی جدوجہد کے اندر محدود رکھا تھا، اور ہم نے خود پر بھی ناگزیر خود ساختہ پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ ہماری طاقت کا واحد منبع رہا ہے کارکنوں، کسانوں، دانش وران اور قوم کا اتحاد، ان لوگوں کا اتحاد جو عزت، صداقت کے اور اپنے ضمیر کے مطابق ہم آہنگی کی زندگی چاہتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہو چکا ہے، ہمیں اس پر خاموشی کی نقاب فال دینی چاہیے۔ خاموشی بھی تو کلام کر سکتی ہے! مگر اس مقدس موقع پر ایک بات ضرور کہنی جانی چاہیے کہ نہ تو پولینڈ کے عوام مغلوب ہوئے ہیں اور نہ انھوں نے تشدد اور بربر ادراکش خون ریزی کا راستہ اختیار کیا ہے۔

ہم تشدد نہیں کریں گے۔ ہم یونین کی آزادی نہیں گنوائیں گے۔ ہم اپنے عوام کو اپنے عقیدے کی خاطر قید نہیں ہونے دیں گے۔ قید خانوں کے دروازے کھول دیے جانے چاہئیں اور اپنے شہری حقوق اور یونینوں کا دفاع کرنے والوں کو فوراً رہا ہو جانا چاہیے۔ ہماری تحریک کے گیارہ رہنما افراد پر مقدمہ چلانے کا اعلان کالعدم ہونا چاہیے۔ اور ان تمام لوگوں کو جنھیں یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی پاداش میں سزائیں سنائی جا چکی ہیں، اپنے گھروں کو واپس ہونے اور اپنے ملک میں کام کاج کرنے کی اجازت دی جانی چاہیے۔ ہمارے حقوق اور ہماری عزت کا دفاع ہو، ساتھ ہی ساتھ عزت کے جذبے ہم پر کبھی غلبہ نہ پاسکیں۔ کیا وہ راستہ ہے ہم نے جس کو اپنے لیے چن لیا ہے۔

پولینڈ کا تجربہ، نوبیل انعام نے جس کو اظہر من الشمس کر دیا ہے، ایک مشکل اور لمبا مافی التجربہ تھا۔ اس

کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ یہ تجربہ مستقبل میں جھانک رہا ہے۔ انسانی ضمیر میں جو کچھ ہوا ہے اور جس نے انسان کے رویوں کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے، اس کو نیست و نابود نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہے، اور دائم رہے گا۔ ہم اپنی قومی آرزوؤں کے وارث ہیں، اور شکر اس بات کا ہے کہ ہم کو ایسے بے عمل تودے میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا جس کی اپنی کوئی آرزو نہ ہو۔ ہم اس یقین کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں کہ قانون سے مراد قانون، اور انصاف کا مطلب انصاف ہو کہ ہماری مشقتیں کچھ معافی رکھتی ہیں اور ضائع نہیں ہوتیں، کہ ہماری تہذیب آزادی کے ماحول میں ترقی کرتی ہے۔

ایک قوم کی حیثیت میں ہم کو حق ہونا چاہیے اپنے معاملات میں فیصلے کرنے کا اور اپنے مستقبل کو سنوارنے کا۔ یہ کسی اور فرد کے لیے کسی قسم کے خطرے کا باعث نہیں ہوگا۔ ہماری قوم اپنے عہد کی دنیا کے پیچیدہ حالات میں اپنی مقصوم کی ذمہ داریوں سے پوری طرح واقف ہے۔

اس کے باوجود کہ پچھلے دو برسوں میں میرے ملک میں کیا ہوا رہا ہے، میں اب بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ہمارے سامنے معاملات کو طے کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں، اور یہ بھی کہ پولینڈ کو جس قسم کے مشکل مسائل درپیش ہیں وہ ارباب اختیار اور عوام کے درمیان صرف گفت و شنیدی سے سلجھائے جاسکتے ہیں۔

اپنے اجداد کی مرزمن کے حالیہ دورے پر پوپ جان پال دوم نے اس نکتے پر فرمایا تھا: پولینڈ کے یا ہماری دنیا کے محنت کشوں کو اس قسم کے مذاکرات کا کیوں حق ہے؟ اس لیے کہ محنت کش محض پیداوار کا آلہ نہیں ہوتا، مگر ایسی شے ہوتا ہے جو پیداوار کے عمل میں سرمایے سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی محنت کے باعث انسان مالک ہو جاتا ہے، اپنے کارخانے کا، اس کی محنت کے عمل کا، اس کی جاں فشانی کے ثمرات اور ان کی تقسیم کا۔ اور اگر اس کو احساس ہو جائے کہ اس کی باہمی کوششیں سے ہونے والی پیداوار میں انصاف پر مبنی اس کی حقیقی شراکت داری بھی ہوگی تو وہ قربانیوں کے لیے بھی تیار رہتا ہے۔

لیکن میں اصل احساس ہے ہم جس سے قاصر ہیں۔ اگر محرومی، تلخی اور لاچاری کا وہ دورہ ہو تو کچھ بھی بنایا نہیں جاسکتا۔ یوروہ جو ایک با اتحاد کی طاقت کا مزہ چکھ لے اور آزادی کی ہوا میں سانس لے لے، اس کو کپلا نہیں جاسکتا۔ مذاکرات ممکن ہیں اور ہم ان کا حق رکھتے ہیں۔ حالات کی اٹھائی ہوئی دیواروں کو قابل فتح ٹکڑے نہیں جتنا چاہیے۔ میری سب سے بڑی جوش خواہش یہ ہے کہ میرا ملک چر امن قلب مابیت کے تاریکی موقعے کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اور یہ بھی کہ پولینڈ ایک دن دنیا کو ثابت کر دے کہ طاقت کے استعمال کے بجائے پیچیدہ ترین حالات کو بھی مذاکرات کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے۔

ہم مذاکرات کے لیے تیار ہیں۔ ہم کسی بھی وقت، اپنے مطالبات اور ان کی وجہ کو اپنے عوام کے فیصلے کے لیے پیش کرنے کے لیے بھی آمادہ ہیں۔ اور ہمیں ہمتہ برابر بھی نہیں کہ وہ کیا فیصلہ صادر کریں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے ہر ملک کو عزت کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل، افراد کے، خاندانوں کے، اور تمام گروہوں کے حقوق کا دنیا کے کونے کونے میں احترام کیا جائے گا۔

پولینڈ میں شہری اور انسانی حقوق کا احترام ہماری قومی شناخت کے اور پورے یورپ کے مفاد میں ہے۔ چوں کہ ایک پرامن پولینڈ یورپ کے مفاد میں ہے، آزادی کے لیے پولینڈ کی آرزوؤں کا گنگا کھی کھینچا نہیں جائے گا۔ پولینڈ میں اندرونی امن کے حصول کا واحد راستہ مذاکرات ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ یورپ کے لیے بھی یہ امن کا ناگزیر عنصر ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ پولینڈ کے عوام کی جاں فشانی نے دنیا بھر میں ان کے لیے ہمدردی اور ان سے ایک جہتی کے جذبات کو ابھارا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس ارفع مقام سے ان سب کے لیے کبرے تھنکر کا بدیہ پیش کروں جو پولینڈ کی اور پولینڈ کے عوام کی مدد کر رہے ہیں۔ کیا میں اس عواہش کا بھی اظہار کر سکتا ہوں کہ ایک مثبت ارادے کے ساتھ پولینڈ میں مذاکرات اور انسانی حقوق کے عمل کو مستحکم کیا جائے؟ میرا ملک ایک بڑے معاشیاتی بحران کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ اور اس بحران میں پولینڈ کے خاندانوں کے وجود کا ذرا مافی انجام پوشیدہ ہے۔ پولینڈ میں مستقل معاشیاتی بحران یورپ کے لیے بھی دردناک بن سکتا ہے۔ لہذا پولینڈ کی مدد لازم ہے، اور وہ مدد کا حق دار ہے۔

میں اس بنیادی نکتے کا اعادہ ضروری جانتا ہوں کہ اس وقت پولینڈ کو مفاہمت اور مذاکرات کی اشد ضرورت ہے۔ میرے خیال میں یہی کچھ پوری دنیا پر لاگو ہوتا ہے کہ ہم کو بات چیت جاری رکھنی چاہیے، کہ ہم نہ کوئی دروازہ بند کریں اور نہ ایسا کوئی قدم اٹھائیں جو مفاہمت کے راستے کو مسدود کر دے۔ اور ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہی امن دینا پڑے گا جو انصاف اور اخلاقی نظام کی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہو۔

دنیا کے بہت سے حصوں میں لوگ ایسے حل کی تلاش میں ہیں جو دو بنیادی قدروں، امن اور انصاف، کی کڑیوں کو آپس میں ملا دے۔ یہ دونوں انسانیت کے لیے روٹی اور نمک کی مانند ہیں۔ ہر ملک اور ہر گروہ کا ان قدروں پر ناقابل تہیج حق ہے۔ کوئی بھی تنازعہ اس راستے پر چلنے کی سہ کوشش کے بغیر حل نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے عہد کی نہایت اہم ضرورت ہے کہ وہ آرزوئیں جو دنیا بھر میں موجود ہیں ان کو تسلیم کیا جائے۔

ہماری کوششوں اور تلخ تجربات نے دنیا پر انسان سے اتحاد کی قدر کو اجاگر کر دیا ہے۔ اس عزت افزا رتبے کو قبول کرتے ہوئے میں ان لوگوں کو یاد دہا کر رہا ہوں، میں جن سے اتحاد کے جذبات کے ذریعے منسلک ہوں؛ سب سے پہلے ان کو جنھوں نے میرے ملک میں مزدوروں کے شہری حقوق کی جدوجہد میں سب سے بڑی قیمت ادا کی ہے۔ اپنی جان!

ان دوستوں کو جنھوں نے Solidarity کے دفاع میں اپنی آزادی گنوائی، جنھیں قید کیا گیا اور جو ابھی تک مقدمات کی پیشی کے منتظر ہیں۔

اپنے ہم وطن مزدوروں اور شہریوں کو جنھوں نے Solidarity کی تحریک میں اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے خواب دیکھے، جن کو رسوائی کا سامنا ہے اور جو قربانیوں کے لیے آمادہ ہیں، جنھوں نے دلیری اور دانش کو ہم رشتہ کر سیکھا ہے، اور ان مقاصد سے وفاداری نبھا رہے ہیں، ہم جن کے لیے آگے بڑھے ہیں۔

الو مرڈال

الفانسو گارشیا رابلس

اعلان تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، محترم حضرات!

لوگ اکثر ہم سے سوال کرتے ہیں کہ امن انعام کے لیے نامزد کرنے کا عمل زیادہ مشکل تو نہیں ہوتا ہوگا۔ ان وجود کو، جنہوں نے اس قسم کا سوال اٹھایا ہے، سمجھنا کچھ مشکل تو نہیں۔ فطری طور پر، امن کے لیے ہونے والی کوششوں میں خلل کا ہونا امن انعام سمیٹی کے لیے بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مہربان رہنا یہی اور بدقسمتی ہے جب قومی سرحدیں عبور کی جاتی ہیں اور اسلحے کے زور پر کھلی جارحیت کی جاتی ہے۔ اس وقت احساسِ مایوسی اور بھی بڑھ جاتا ہے جب خبریں ملتی ہیں کہ معصوم لوگ مارے جا رہے ہیں اور پڑائی دشمنیاں پھر سے زندہ کی جا رہی رہی ہیں۔

ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں اس میں سکون نہیں رہا۔ تناؤ اور عمل طلب مسائل ہمارے دور کے غالب نقوش ہیں۔ تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنسوں اور امن کے فروغ کے لیے کی جانے والی دوسری زبان کی کوششوں کے باوجود ہتھیاروں میں اضافے کی دوڑ جاری ہے۔ فوجی اخراجات بڑھ کر 65 بلین ڈالر سالانہ تک پہنچ چکے ہیں۔ جوہری ہتھیار سب سے بڑی پریشانی کا باعث ہیں۔ ان ہتھیاروں کے ساتھ بڑی طاقتوں کی فحش ریزی کی صلاحیت اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے، اور ایسا لگتا ہے کہ انسانی کو صفحہ ہستی سے مایود کیا جاسکتا ہے۔ محشر یہ کہ ہمارے عہد میں قومیت کے لیے بہت سامان بہم ہیں۔

مگر جیسا کہ اس برس کے انعام یافتگان میں سے ایک نے اعلان کیا ہے: ”نہت ہار دینا انسانیت

نہیں۔ ”درحقیقت عوام کی سطح سے اسی قسم کے خیالات کے پیش نظر ریاضیاتی نوٹیل کمیٹی نے اسی برس اپنا انتخاب کیا ہے۔

کمیٹی کی رائے میں آلو مرڈال (Alva Myrdal) اور الفانسو گارشیا رابلس (Alonso Garcia Rables) دو وجود کی بنا پر ممتاز امیدوار ثابت ہوئے ہیں۔ پہلی وجہ تو اقوام متحدہ میں خفیفہ اسلحہ کے ضمن میں دونوں کے اہم کردار اور اعلیٰ درجے کے کام ہیں، بین الاقوامی سطح جس کو پسند کیا گیا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ انھوں نے دنیا کو اسلحہ کے مسائل کے بارے میں بہت اہم تفصیلات فراہم کی ہیں اور اسے عالمہ کو ہونے والے واقعات کی آگاہی دی ہے اور عوام کی مشترک ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے۔

ان دونوں کو نوٹیل انعام کی پیش کش کے ذریعے۔ اُن اس کردہجے والے کئی پہلوؤں کے باوجود۔ کمیٹی ایسے نکات پر توجہ مرکوز کرنا چاہتی ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہر حال مثبت ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو محض ڈراؤنے میلانات پر توجہ دلانے سے ہی مطمئن نہیں ہوتے بلکہ ان کو بدل دینے کے لیے اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں بھی استعمال کرتے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں تشویش اور مایوسی چند سخت جان لوگوں کو پریشان نہیں کر سکی ہے جو یہ پیغام پہنچانا چاہتے ہیں کہ ابھی تک انسانیت کے مقصوم پر آخری مہر شہت نہیں ہوئی ہے اور یہ بھی کہ ہمیں درپیش تنازعات اور تصادم ہی جوہری ہولوکاسٹ کی امکانی وجود نہیں بن سکتے۔

امن اور خفیفہ اسلحہ کے لیے نہ صرف مغربی دنیا میں رائے عامہ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے بلکہ بہت سی بین الاقوامی مرحلوں کے پار تک پہنچ رہی ہے۔ جوہری ہتھیاروں کی دوڑ کو روکنے کا خیال اب کوئی ناممکن مسئلہ نہیں رہا ہے۔ بحر اوقیانوس کے دونوں جانب کی سیاسی قیادت کو اب اس سے یک جہتی کا احساس ہو گیا ہے اور تقریباً سب اس سلسلے میں مدد فراہم کر رہے ہیں۔ یہ شاید وقت کے تقاضے کی وجہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ کی کئی ریاستوں سے کانگریس اور سینیٹ کے حالیہ انتخابات میں جوہری ہتھیاروں کو ان کے موجودہ درجے تک محدود کر دینے کے حق میں ہونے والے لوگ اکثریت سے منتخب ہوئے ہیں۔

مغربی دنیا میں امن اور خفیفہ اسلحہ کی رائے عامہ کے رہنما اس بات پر برہم ہوتے ہیں کہ مشرق میں ان کے خیالات پر کتنا کم دھیان دیا جاتا ہے۔ مگر ان کے اتحادیوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے دلوں میں جوہری جنگ کے ذریعے مکمل تباہی کا خوف سب سے زیادہ ہے، ایسا خوف جس کے بارے میں ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ اتنی ہی شدت سے محسوس کیا جاتا ہے جس طرح کہ ہمارے خطے میں کیا جاتا ہے۔ بہر حال، تمام تنازعات سے بالاتر، اُن میں ایک احساس بقا ضرور ہے۔

پھر بھی، کسی بھی صورت میں اس مسئلے سے پہلو تہی انسانیت نہیں ہوگی اور بالکل یہی اہم نکتہ ہے اس پیغام میں جو ہمیں اس برس کے انعام یافتگان سے ملا ہے۔

خفیفہ اسلحہ کے سلسلے میں آلو مرڈال کی خدمات کا ایک عرصے سے بین الاقوامی سطح پر اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔ کئی انعامات اور اعزازات جو اُن کو ملے ہیں، بین الاقوامی کمیٹی میں ان کی اعلیٰ حیثیت پر

دلالت کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ غریبے اور مفادات کے اعتبار سے، ان کی نگین کا احاطہ بہت وسیع ہے۔ محدودی کے تیسرے عشرے سے انھوں نے جدید سوشلزم کو ایک فلاحی ریاست بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ عورتوں کی آزادی اور ان کو مدد کے حقوق دلانے میں سرگرم رہی ہیں۔ انھوں نے خود کو ایک اعلیٰ درجے کی سفارت کار ثابت کیا ہے، اور وہ پہلی خاتون تھیں جن کو اقوام متحدہ کے ایک مہمے کا سربراہ بنایا گیا تھا۔

ایسے موقع پر یہ زیادہ مناسب اور مددگار ہے کہ نارویائی نوبل کمیٹی اُن کے بے باک اقدام کا اعادہ کرے جو انھوں نے ناروے کی طرف سے دوسری عالمی جنگ کے دوران کیا تھا۔ اس کے لیے جلالیت مآب شاہ ہاکون ہفتم (King Haakon VII) نے انھیں Freedom Cross سے نوازا تھا۔

اَلو مَرْدَال عالمی کمیونٹی کی فردیت مگر نظریاتی اعتبار سے ان کی جڑیں نارویائی آئینی اصولوں اور ہمارے جمہوری آدرشوں میں پیوست ہیں۔ یہی وہ آدرش ہیں جو اُس وقت اُن کے بھرک ہوئے جب وہ جیوفا میں اقوام متحدہ کے خفیہ اسلحہ کے مذاکرات میں سربراہی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ مگر یہی نہیں؛ اقوام متحدہ کے دوسرے معاملات میں بھی وہ امن اور خفیہ اسلحہ کی پُر جوش ترجمان رہی تھیں۔

ایک ماہر محقق کی حیثیت میں، جسے عالمی سیاست کے مسائل کا وسیع پیمانے پر ادراک ہو، انھوں نے نہ صرف بین الاقوامی مباحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ اپنی ادبی تخلیقات میں بھی اپنے خیالات کو بڑے پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عظیم مثالی شخصیات سے اتفاق یا اختلاف کرنا دونوں آسان ہوتا ہے۔ اَلو مَرْدَال بھی اس اصول کے اعتبار سے کچھ مختلف نہیں، مگر تمام مرد اور عورتیں اس بات سے اتفاق کریں گی کہ ان کا نام اُن تمام لوگوں کے لیے نقطہ اتصال کرکام کرتا ہے جو اب بھی اس نظریے کے داعی ہیں کہ ذہن کو بالآخر مادے پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔

آج، جب وہ اکہا ہی برس کی ہو چکی ہیں، وہ پلٹ کر اپنے ادوار زندگی کو دیکھ سکتی ہیں جو ضرورت کے پیش نظر نہ صرف بہت زرخیز بلکہ ڈرامائی بھی رہے ہیں۔ یہ اوقات امید اور مایوسی کے درمیان، اور بلاشبہ بہت خزانہ آوری اور بے ہمتی کے درمیان بھی، جھولتے رہے ہوں گے۔

ایسے مواقع پر بہت کچھ اور بھی کہا جاسکتا ہے، جب کوئی فرد اپنی محنت کے پھل دیکھ رہا ہو، جب اس کی زندگی کے بہترین لمحات میں اس کے خواب شرمندہ تعمیر ہو رہے ہوں۔ اس سلسلے میں ہمیں Bjarnstjerne Bjarnson کے الفاظ بھی یاد آ رہے ہیں:

وہ سب کچھ، جو تیری امید کی کرنوں سے روشن تھا

وہ سب کچھ، جس کو تیرے خوف نے سینچا

وہ اب تیری سے اُگنے لگ گیا ہے

کئی ظاہر ہو جوہ کی بنا پر الفاٹسو گارشیا رائٹس شمالی ملکوں میں کم جانے جاتے ہیں۔ مگر جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، دنیا کا فاصلا بڑا حصہ شمال سے باہر ہے۔ جب کہ بین الاقوامی سطح پر تحفظِ اقلہ کا وہ کام جو گارشیا رائٹس کے نام سے موسوم ہے عالمی شان ہے۔ میکسیکو میں 1967 میں ہونے والے معاہدے کی پیچھے ان ہی کی قوت کا رفرما ہے، جس کے ذریعے لاطینی امریکا کو عدم جوہری علاقہ قرار دیا جا چکا ہے۔ اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس معاہدے کے الفاظ پر گارشیا رائٹس کی کبریٰ چھاپ ہے، اپنے مخصوص معاملات کے علاوہ یہ معاہدہ ہم کو اس انسان اور اس کی سوچ کے انداز کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے۔

اس معاہدے کی نئے شدہ قابل ذکر خصوصیت، دنیا میں پہلی بار، جوہری طاقت میں چھپی تباہ کن قوت کا حقیقی ادراک دلانا تھا۔ معاہدے کی ابتدا اس اعتراف سے ہوئی تھی کہ جوہری ہتھیار صحیح معنوں میں دفاعی ہتھیار نہیں بلکہ خود اپنی مکمل تباہی کے ہتھیار ہیں۔ معاہدے کے الفاظ کے مطابق، یہ ہتھیار نسلی انسانی کی سالمیت پر حملے کے مترادف ہیں اور بالآخر یہ دنیا کو ناقابلِ بود و باش تک بنا سکتے ہیں۔

یہ صحیح کہا گیا ہے کہ سیاسی مسائل کے حل کے لیے پہلی ضروری شرط ان مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی اخلاقی جرأت ہے۔ اکثر یہی شے ہے جس کی کمی ہوتی ہے، اور خاص کر جوہری ہتھیار کے مسائل پر یہی لاگو ہوتی ہے۔ یہ عجیب ترغیب ہوتی ہے کہ اس کو جانتے ہوئے بھی آنکھیں بند کر لینے کو جی چاہتا ہے، اس طرح، جیسے کہ ادراک کے عمل میں کوئی رکاوٹ ڈال دی گئی ہو۔ ہم ایسی کیفیت میں نہیں ہوتے کہ ہم خود اپنی توجیہ کو اس کے منطقی نتیجے تک پہنچا سکیں۔ اکثر ایسے نقطے پر ہم پسپا ہو جاتے ہیں اس لیے کہ ہم درحقیقت جو کچھ جانتے ہیں اس کا سامنا کرنے کی ہم میں ہمت نہیں ہوتی ہے۔ جدید جوہری ہتھیاروں کے پیدا کردہ حالات کی سچائیاں اتنی خوف ناک ہیں کہ ان کے ادراک کا تصور ہی ہماری صلاحیتوں کو ٹھن کر دیتا ہے۔

امریکی سماج اور اقتصادیات کے ماہر اور ادیب پروفیسر جان کیلبرائتھ (John Kenneth Galbraith) نے اس کیفیت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

”وہ بچائی، لوگ جس سے مال منول کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ ہے کہ یہ چھوٹا سا کیریڈ ارض [جنگوں میں] جوہری ہتھیاروں کے تباہی کے بعد باقی نہیں رہ سکتا۔ جب لوگوں سے پوچھا گیا کہ کیا ہم اپنے بچوں اور پوتوں کے لیے زندگی چاہتے ہیں تو جواب میں کہا گیا کہ ہاں ہم چاہتے ہیں۔ جب جوہری جنگ کے بارے میں پوچھا جاتا ہے، جو ہماری جانوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے، تو ہم اس کو ہمیشہ اپنے ذہنوں سے جھٹک دیتے ہیں۔ انسان نے اپنی فاپذیری کے علم اور خیال کے ساتھ جیسا سیکھ لیا ہے۔ اور اب اس نے اس خیال کو بھی قبول کر لیا ہے کہ سب اکٹھے مر سکتے ہیں، کہ اس کی اولاد دور اولاد کا بھی وجود نہیں رہے گا۔ قبولیت کی اس صلاحیت پر ہم صرف تعجب ہی کر سکتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے اذہان ان خیالات کو قبول تو کر لیتے ہیں مگر ان کی حقیقت سے ہم آفوش نہیں ہوتے۔ اس تصور کا عمل یا تو بہت بڑا ہے یا بہت مہیب ہے۔ ہمارے ذہن کسی دور دراز کے جنگل میں ہونے والی جنگ کا تصور کر سکتے ہیں اور اس کے مسترد

ایک ہدف نہیں ہے!

”ہمیں اس بات پر یقین کرنے کی ہمت ہونی چاہیے کی آدمی اپنی تمام تر دلی خواہشوں کے ساتھ امن کا خواہاں ہے، مگر محض ’امن، دو، امن، دو‘ جیسے نعرے ایجاد کر لینے ہی سے ہم امن حاصل نہیں کر سکتے۔ امن کے لیے کام کرنے والوں کے سامنے جو چیلنج ہے وہ ایک واحد عالمی سوال / جواب ہی میں منظر نہیں ہے، بلکہ بے شمار تنازعات کے پڑ امن حل میں اور امن کے حصول کے لیے مختلف سطحوں پر دباؤ میں ہے۔“

نہیں یہی کچھ ہے جس کے لیے امن انعام حاصل کرنے والوں نے سعی کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ”تعمیری تجاویز حاصل کرنے کے لیے کڑی کوشش کرنا“ کیا معنی رکھتا ہے، اس بات کو وہ عام لوگوں کے مقابلے میں بہتر جانتے ہیں۔ انہوں نے کوئی سہل اور مختصر راستہ اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اس لیے کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تخفیفِ اسلحہ کے لیے مذاکرات کا بنیادی حقائق کی سطح پر اور بڑی طاقتوں کے درمیان افہام و تفہیم پر ہونا کتنا ضروری ہے۔

اور جب ہم ”کچھ لو اور کچھ دو“ کے تصور کی بات کرتے ہیں تب ہمیں پتا چلتا ہے کہ تخفیفِ اسلحہ کا معاملہ کتنا محکا دینے والا اور کتنا گہمیر ہے۔ نہ صرف امن کی خواہش کا اظہار کافی ہے اور نہ محض اس بات کا اعلان کر دینا کہ جوہری ہتھیار تکف کر دیے جانے چاہئیں۔ اس قسم کے مقاصد کے لیے وسیع چیلانے کا اتفاق حاصل کر لینا چنداں مشکل نہیں ہوگا۔

مشکل تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان مقاصد کا حصول عملی طور پر سیاسی فیصلوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اور یہ مسئلہ ہے بھی ایسا، جس کا سامنا کرنے کے لیے ہمت درکار ہوگی۔

ہم نے بڑھتی ہوئی بے صبری سے دیکھا ہے کہ جوہری طاقتوں کے نزدیک تخفیفِ اسلحہ کے لیے کسی معقول معالجے کا حاصل کر لینا بھی کتنا مشکل ہوتا ہے، اور ہم یہ سوال بھی کر سکتے ہیں کہ ہونے والے تمام تر مذاکرات کے باوجود مزید کوئی کارروائی کیوں نہیں ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ نظریاتی اختلافات بہت وسیع ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ باہمی بے اعتباری کے پشتوں کو توڑنا ممکن نہ ہو، بد قسمتی سے جن کی بہت نشوونما ہو چکی ہے؟ ایک بار پھر یہ خوف ہی ہے جو عالمی سطح پر کیے جانے والے سیاسی فیصلوں پر حاوی بھی ہے اور اثر انداز بھی؟

ایک مرادہ ما جواب دے دینا کچھ آسان نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہو جس پر غور کیا جانا چاہیے۔

مگر ہمیں نظر آ رہا ہے کہ بڑی طاقتوں کے درمیان قوت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد اور شدید مقابلہ جاری ہے۔ اس جدوجہد میں بہت ساری جماعتیں شامل ہیں جو اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ وہ اپنے ضروری مفادات کے تحفظ پر مجبور ہیں، اور جو واقعی اپنے ملک کی سالمیت کو خطرے میں ڈالنے کے خوف میں مبتلا ہیں۔ اسی وجہ سے وہ سب کی سب، فوجی حفظہ، ماتقدم پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہیں۔ اس قسم کے رویے کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

مگر اس بارے میں اور بہت کچھ بھی کہنا ہے کہ بڑی طاقتیں۔ جس کو ایک علاقائی دام کہا گیا ہے۔ ایسے دام میں گرفتار ہیں جس میں متعلقہ جراثیمیں اسلحہ بندی کے لیے ایک دوسرے کی ہمت افزائی کر رہی ہیں۔ آئیے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ یہ دام کس طرح کام کرتا ہے: مشرق میں، جو پچھلے دہائی کے ابتدائی حالات بتاتی ہیں کہ مغرب والے مزید اسلحہ بندی کے منصوبے بنا رہے ہیں ماسی وجہ سے مشرق، خود اپنے تحفظ کے خیال سے، اسلحہ بندی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور ادھر مغرب میں یہ ابتدائی کچھ بتاتی ہیں کہ مشرق میں نئے اقسام کے اسلحے بنائے جا رہے ہیں لہذا مغرب کو کسی رد عمل پر مجبور ہونا پڑتا ہے، جب کی دوسری صورت میں انھیں اس کی ہمت بھی نہ ہوتی۔ طریقہ کو، ایک دوسرے پر الزامات دھرتے ہوئے، اسلحہ بندی کا جواز مل جاتا ہے۔

اصولی اعتبار سے ان لوگوں کا، جو موجودہ ”ترقیات“ کے ذمے دار ہیں، شدید باؤ کا شکار ہونا لازمی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر ایسے حل تک پہنچنا مشکل ہو گا جو تمام فریق کے اپنے خیال کے مطابق، تحفظ کو یقینی بنائے۔ اس قسم کے حل تک پہنچنے کے لیے بہت مختلط تشخیص کی ضرورت ہو گی جس میں مرکزی مسئلہ ہو گا تمام گروہوں کا، اختلافات کے باوجود، ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے: کیا جوہری طاقتیں اپنے پیدا کردہ تازہ صورتی حالات، میں اس قسم کا پلیٹ فارم مہیا کرنے کے قابل ہو بھی سکیں گی یا نہیں؟ اس لیے کہ کوئی بھی اس حلقے میں نہیں رہ سکے گا کہ آج دنیا کی تمام قوموں کے لیے، سب سے بڑا، ایک مشترک مفاد موجود ہے، یعنی جوہری ہتھیاروں کی دوز کو روکنا۔ یہ ہے وہ مسئلہ ہمیں جس پر نظریں جمانی رکھنی چاہئیں، اور لازم ہے کہ اس ہدف تک پہنچنے کی ہماری تمام کوششیں مربوط رکھی جائیں۔

ان حالات کی روشنی میں تخفیف اسلحہ کے کام میں ہم دو واضح کیرسز ابھرتی صاف دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے سامنے اب ایک بے حد باریک ہیں، صبر آزما اور وقت طلب کام ہے: یعنی بین الاقوامی سطح پر مذاکرات کے ذریعے اسلحہ میں تخفیف کا کیا جانا۔ اور اس بات پر بھی زور دینا چاہیے کہ ان ہی خطوط پر دیر پا اور حقیقی نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ مگر ہمارے سامنے مختلف امن کی تحریکوں کا اضافی کام بھی ہے جس کے ذریعے شعوری طور پر رائے عامہ کا تیار کیا جانا ہے اور یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اگر رائے عامہ کو صحت مند اور طاقت ور بنانا ہے کہ وہ اور بہت ہی بین الاقوامی مرحلوں کے پار جائیں تو یہ بین الاقوامی مذاکرات کی کامیابی میں ایک فیصلہ کن عنصر ہو سکتی ہے۔

آگے کا راستہ طویل بھی اور مشکل بھی نظر آئے گا، اور بلاشبہ تصور اور صبر کا طالب بھی ہو گا۔ اور ممکن ہے کہ پختہ انداز پر بھی اثر انداز ہو جو دیکھنے میں سچ دکھائی دیتی ہے پھر بھی جاری رہنے کی ہمت کرنی ہے۔ اٹو مرڈال اور گارشیارا رابلس کو اس برس کا انعام پیش کرتے ہوئے، ماریائی نوٹیل کمیٹی ان کڑی کوششوں کا اعتراف کرنا چاہتی ہے جو ان دونوں نے تخفیف اسلحہ کے مشکل بین الاقوامی مذاکرات کے ذریعے تعمیری حل کی تلاش میں کی ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ کمیٹی چاہتی ہے، اور اس سلسلے میں ہمیں یقین ہے کہ ہم انعام یافتگان کے جذبات کے مطابق ہی کہہ رہے ہیں۔ کہ اس میں کے انعام کو امن اور تخفیفِ اسلحہ کے لیے تیار کی جانے والی رائے عامہ کے لیے دستِ امداد کے طور پر سمجھا جائے، جسے خود انہوں نے ایک قابلِ قدر الہام ثابت کیا ہے۔

نارویائی نوبیل کمیٹی کے صدر نشین Egil Aarvik کی زبانی

خطبہ — الوا مر ڈال

تخفیفِ اسلحہ، ٹیکنالوجی اور تشدد میں فروغ

جناب چیئرمین اور محترم مہمانانِ گرامی!

سب سے پہلے یہ میرا واضح اور پسندیدہ فرض ہے کہ میں اس اعزاز کے لیے اپنا تشکر پیش کروں جو مجھے 1982 کے نوبیل امن انعام کے ذریعے عطا کیا گیا ہے۔

اس کے بعد میں چاہوں گی کہ نہ صرف میں تخفیفِ اسلحہ کے عام موضوع پر بات کروں بلکہ آپ کی توجہ مبذول کرواؤں اسلحے اور مزور ٹیکنالوجی کے درمیان سلسلے اور تشدد میں فروغ کی جانب۔ جس انسان کی عظمت اور اس کے حقوق کی پامانی کی تشدد میں اضافے کو اور اذیت رسائی کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ یہ سب گواہ ہیں اہانت کے ناقابلِ یقین تسلسل کے اور دکھوں کے جو انفرادی طور پر مردوں اور عورتوں پر روا رکھے گئے ہیں۔

پھر بھی میں، اس انعام کی میرے اور ڈاکٹر گارشیا کے درمیان مساوی تقسیم پر، نوبیل کمیٹی کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ یہ تقسیم اس بات کو واضح کرتی ہے کہ یہ انعام صرف ہم دونوں کی ذاتی تحسین کے لیے نہیں بلکہ پوری تحریک کے لیے ہے جس کا مقصد امن کی ترقی اور تشدد میں کمی ہے اور یہ بات ہمارے لیے بڑی اہمیت افزائی کا باعث ہوئی ہے۔ نارویائی نوبیل کمیٹی کے صدر نشین ایگیل آرویگ (Egil Aarvik) نے بھی یہ بات زور دے کر کہی ہے۔ انعام نے اس احتجاج کی پوری حمایتی تحریک کو، جو فی زمانہ دہشت انگیز ہتھیار یعنی جوہری بم کے استعمال کے خلاف کی جارہی ہے، قانونی اعتبار بخشتا ہے۔ اور اس کا بڑی طاقتوں کے سر پر آورہ سیاسی رہنماؤں اور فوجی سپہ سالاروں پر اثر انداز ہوا لگتا ہے۔

میں جان بوجھ کر ”امن کی کوشش“ کے فقرے کو بار بار استعمال نہیں کر رہی ہوں۔ امن کے حصول کے لیے محنت کا خیال ہر آدمی کے دل میں جاگزیں ہے۔ مگر محنت جو فی زمانہ قوموں کے درمیان خاصی اہم ہو گئی ہے، اس کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ یہ ابدی امن کے حاصل کرنے یا قوموں کے درمیان تمام تنازعات کے حل

کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ تنازعات کی اقتصاد کی اور سیاسی جڑیں بے حد مضبوط ہوتی ہیں۔ نہ ہی یہ آدمیوں کے درمیان دیدہ پاہم آہنگی کی کیفیت پیدا کرنے کا دعویٰ کر سکتی۔ ہمارا فوری ہدف بالکل معمولی ہوا چاہیے: اس کا مقصد بنی نوع انسان کو درپیش سب سے بڑے خطرے جوہری ہتھیاروں کے استعمال کے خطرے سے بچاؤ اور انسانیت کی بقاء ہونا چاہیے۔

میں ابتدائی میں اس بات پر زور دینا چاہوں گی کہ مجھے خاص طور پر اس بات سے بڑی غوثی ہوتی ہے کہ اس موقع پر یہ انعام ان دو قوموں کے باشندوں کو دیا جا رہا ہے جو جوہری ہتھیاروں سے پاک ہیں اور کسی معاہدے میں شریک بھی نہیں ہیں۔ ذرائع ابلاغ اس بات پر بہت کم روشنی ڈالتے ہیں، اس لیے کہ وہ بڑی طاقتوں کے بلاک اپنے درمیان مقابلے ہی پر اپنی تمام توجہ صرف کیے رہتے ہیں۔ آخر دنیا میں اور بھی ممالک ہیں، جن میں سے زیادہ تر نے بڑی طاقتوں کا یہ خیال بن کر خدمت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

مثالی مجھے اس بات کا بھی اضافہ کرنا چاہیے۔ امید ہے کہ یہ کسی ترقی نہیں ہوگی کہ ہم دونوں نمائندوں نے اقوام متحدہ میں تخفیف اسلحہ کے مذاکرات کے دوران یہ ثابت کر دیا ہے کہ محض خطابت کسی طرح بھی کافی نہیں ہوا کرتی۔ ہم نے تجزیے پر اور تعمیری باتیں کرنے پر زیادہ زور دینے کی کوشش کی ہے۔

تخفیف اسلحہ کے مقصد میں تیزی پیدا کرنے کے لیے بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ گارسیا رانلس نے بڑی ذہانت سے Tlatelolco معاہدہ تیار کیا اور بڑی استواری سے کوشش کی ہے کہ پورے لاطینی امریکا کو جوہری ہتھیاروں سے پاک علاقہ بنایا جائے۔ وہ اب تک جوہری طاقتوں کو پابند کرنے والے ایسے معاہدوں میں شریک کرنے میں کامیاب بھی ہے ہیں جن کی رُو سے انھیں ان قوموں پر جوہری ہتھیاروں کے استعمال سے باز رہنا ہوگا جنھوں نے جوہری ہتھیاروں سے پاک علاقے میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔

میں نے بھی، اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ، بہت تفصیلی اور ٹھوس تجاویز پیش کی ہیں۔ ہمیں کچھ کامیابیاں بھی ہوئی ہیں، اگرچہ بڑے معاملات پر بہت کم۔ مگر مثال کے طور پر، ہم سوئیڈش حکومت کے بجٹ میں (Swedish International Peace Research Institute) SIPRI کے اور Hagfors میں قائم کیے جانے والے زلزلے کے کم مشہور مرکز کے اخراجات کے لیے رقم مخصوص کرانے میں کامیاب رہے ہیں۔ اب ہم آزادانہ طور پر، جدید ترین ساز و سامان کی مدد سے، زیر زمین جوہری تجربات سے پیدا ہونے والے چھوٹے سے چھوٹے جھٹکوں پر نظر رکھنے اور بین الاقوامی سطح پر سیاسی مصلحتوں کی رکاوٹوں کے بغیر، ان کے نتائج کی اشاعت کر سکتے ہیں۔ یہ کام حال ہی میں ان کوششوں سے کیا جاسکا ہے جن کے ذریعے جوہری تجرباتی جہازوں کی بین الاقوامی سطح پر کھلی تصدیق ممکن ہوئی ہے۔

ہمارے دو مکمل کی یہ کوششیں امکانات کی مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہیں، ان کوششوں کی نئی کے لیے، جن کے ذریعے جوہری ہتھیار کی طاقت رکھنے والے ممالک حقائق کو چھپاتے ہیں۔ یا کم از کم سچ کو پھیلنے سے دیر تک روکے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل، چھوٹی طاقتیں تخفیف اسلحہ کے مذاکرات میں اس سے

کئی زیادہ اثر انداز ہو سکتی ہیں چنانچہ انھوں نے اب تک کیا ہے۔ مگر پھر ہمیں خود بھی خوشی کی وہ دیوار منہدم کرنے میں اپنا پورا زور استعمال کرنا ہوگا جو بد قسمتی سے، بڑی طاقتوں نے بین الاقوامی مباحثوں میں چھوٹی طاقتوں کے رسوخ کو پرے رکھنے کے لیے کھڑی کی ہے۔

سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ عوام اور ہمارے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ ملکوں کی حکومتوں کو اس بات کا احساس ہو کہ جوہری ہتھیار کی ملکیت نہ ہونے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے ان تک رسائی حاصل کرنا۔ جوہری ہتھیار کے بغیر ہم کو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ ہم ان بڑی طاقتوں کے دائرہ اثر میں آجائیں گے جو مہلک ترین ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کے مقابلے میں دفاع ممکن نہیں ہوتا۔

عام طور پر یہ خیال تقویت پا رہا ہے کہ دنیا اب آہستہ آہستہ شمالی منطقت کے شہروں، کھیت کھلیانوں اور ان لوگوں میں تباہی پھیلانے والے ہدف کی جانب برہمتی جا رہی ہے جنہوں نے ہماری تہذیب کی آبیاری کی ہے۔ ہمارے دور کی سب سے زیادہ تکلیف دہ حالت، جو دنیا کی تباہی کی یاد تازہ کرتی ہے، بظاہر ناقابلِ نجات غلط خیالات سے پیدا ہو رہی ہے؛ یعنی اب ہتھیاروں اور تشدد کے استعمال سے کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

کسی لانا ہتھیار کے خطرے کے امکانات کے باوجود بھی یہ بھلا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک نیم تباہ دنیا کے کھنڈر سے ایک زیادہ خوش حال اور نئی دنیا جنم لے؟ یہ غلط تصویر ہے، کر نقصان کے باوجود فتح میں کامیابی ہی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے، ہمارے جوہری دور کا سب سے بڑا فریب نظر بن گیا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کی بڑی طاقتیں جس قسم کی منصوبہ بندیاں کر رہی ہیں جس میں اربوں کی دولت لگائی جا رہی ہے، بے کم و کاست جنگ کی تیاریوں کے سوا کچھ اور نہیں۔ نئے اعلیٰ تکنیکی ہتھیاروں کے منصوبے صرف تصوراتی "فتوحات" کے مقاصد حاصل کرنے کی نئی جنگی حکمت عملی ہی ہیں۔

بین الاقوامی میزائلوں کی نئی نسل، پرانی حکمت عملی ہی کو آگے بڑھانے کی نئی کوشش ہے؛ مثال کے طور پر ریاست ہائے متحدہ کے MX (جو اگر ممکن ہوئے تو، 1986 سے قبل تیار نہیں ہو سکتیں گے)، SS-17، SS-18 اور SS-19 کے جواب میں نکمیں گے جو اس وقت موجود ہیں۔ یہ ہتھیار اس حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتیں گے کہ دونوں بڑی طاقتیں 1960 سے ایک فیصلہ کن طاقت کی حامل ہو گئی تھیں؛ یعنی دونوں ایک دوسرے کی مرکزی سر زمین کو ایک فیصلہ کن ضرب لگا سکتی تھیں۔ اس وقت بھی یہ نام نہاد "تشدد کا توازن" موجود تھا۔ اور جیسا کہ میں کئی بار اس کی نشان دہی کر چکی ہوں، اس وقت بھی دونوں بڑی طاقتیں ایک دوسرے پر جوہری بم پھینکنے کے عمل سے باز رکھنے کی "کافی" صلاحیت رکھتی تھیں۔

کینیڈی کے صدر منتخب ہونے کے فوراً بعد 1960 میں جنرل ٹیلر نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ سواورو سو کے لگ بھگ دو مار کرنے کی صلاحیت رکھنے والے میزائل کافی ہوں گے؛ اور بہت سے ماہرین نے بھی اسی قسم کے ہندو بست پیش کیے تھے۔ ایک دوسرائس دانوں بک جارج بونڈی (McGeorge Bundy) اور

ہربرٹ یارک Herbert York نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ایک میزائل ہی کافی ہوگا۔ ہتھیاروں کی دوڑ کے جاری رہنے کے دوران مامرین اس نتیجے پر قائم رہے تھے کہ ایک بڑا عظیم سے دوسرے بڑا عظیم تک پہنچنے اور حریف کو جوہری ہتھیار کے استعمال سے باز رکھنے کے لیے چار سو کے لگ بھگ بم کافی ہوں گے۔ اس سے آگے قدم بڑھانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ناپائیداری میں مزید اضافہ ہوگا کہ یہ سب کچھ بالکل غیر ضروری تھے اور ان کی کیا قیمت ادا کی گئی ہے؟

اس بارے میں کہ کافی توازن کیا جاتا ہے اور واقعی "توازن" اور "ممانعت" کے تصورات کیا ہوتے ہیں، بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ اور اس سادہ حقیقت کے باوجود جو مامرین نے ظاہر کی ہیں، بدگمانیاں بڑھتی رہی ہیں اور دوسرا گ کے کافی ہونے کے باوجود بھی زیادہ ضرورت پر زور دیا جاتا رہا ہے۔

اس موضوع پر ذہیروں کاغذات کے مطالعے اور بے شمار مواقع پر خود بہت کچھ لکھنے کے بعد، جس پر کان نہیں دھرے گئے ہیں، میں سچ کچھ خود کو تھکتا ہوا محسوس کرنے لگی ہوں۔ مگر حقیقت کو بار بار دہرانا اور ان پر زور دیتے رہنا چاہیے۔ میں نے انگریزی زبان میں لکھے جانے والی اپنی کتاب The Game of Disarmament کے صحیح شدہ پیش لفظ میں اس کا اعادہ کیا ہے۔ بالآخر، اسنے دنوں بعد، آج یہ پیش لفظ سوشل زبان میں ترجمے کے بعد Tiden نامی جریدے میں شائع ہو رہا ہے۔

دور مار کرنے والے بین الاقوامی میزائل پر ہی مباحث کے ارتکاز کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ دوسرے جوہری ہتھیاروں پر یہی دلائل لاگو نہیں ہوتے۔ میں اس وقت تک اس حقیقت کو، کہ ایک ہی کافی ہے اور مزید کی ضرورت نہیں، دہراتی رہا ہوں گی جب تک کہ یہ سیاست دانوں کے ذہن میں پیٹھ نہیں جاتی۔

و بڑی طاقتوں کے درمیان کی حریفانہ کشمکش کے نتائج ہمیں اس مقام پر پہنچا رہے ہیں جو نہایت خوف ناک ہیں۔ اب تو یہ عمل روک تھام کی صلاحیت سے آگے بڑھ کر جنگ کی شروعات تک پہنچ رہا ہے۔ خاص کر امریکا میں اس موضوع پر نئی کتابوں کے سیلاب میں یہی کچھ بیان کیا گیا ہے۔ میں اس موقع پر بس ایک اقتباس پر اکتفا کروں گی جو 13 اپریل 1982 کے واشنگٹن پوسٹ کے شمارے سے لیا گیا جو ایک قابل احترام اخبار ہے اور جسے کسی طرح بھی بنیاد پرست نہیں گروانا جاسکتا:

"بہت دن ہوئے ایسا وقت بھی آگیا تھا جب ریاست ہائے متحدہ اور سوویت یونین کے بھیا تک اسلحہ خانوں کی مزید وسعت بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ 37 برس کا پانچل پن تھا، سادہ لوحوں کی ضعیف عقل افراد کے خلاف دوڑ تھی، اندھے پن میں لڑکھڑائی ہوئی مہذب قوموں کی دوڑ میں مسابقت تھی اس لکیر کی طرف جس کے خطرات ناقابل بیان ہیں۔"

اب فوری ضرورت ہے ایک وقفے کی، جس میں دونوں جانب جوہری ہتھیاروں کی تیاری کو روک دیا جائے۔

میں ان تمام لوگوں سے اتفاق کرتی ہوں جو واقعی حقیقی تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر ہر

قسم کے اسلحے پر پابندی کو بہتر جانتے ہیں۔ کاش صرف مقتدر لوگوں ہی کو اتنا باور کرا دیا جائے کہ اس سلسلے میں آگے بڑھنے والی طاقتیں بالکل دیوانی ہیں۔ کچھ دن قبل ہی، جب سے باسٹن اور اسٹاک ہوم دونوں میں میری ملاقاتیں بین الاقوامی تحریک میں شامل طبی ڈاکٹروں سے ہوئی ہیں، یہ سب کچھ اچھی طرح سمجھ میں آنے لگا ہے۔ اس تحریک میں شرق اور مغرب دونوں جانب سے آنے والے ماہرین تقریباً 38,000 کی تعداد میں شریک ہوئے ہیں۔ دراصل اسی لمحے وہ اسٹاک ہوم میں ایک میٹنگ کر رہے ہیں۔

اب معاہدین نے بھی صاف الفاظ میں تشریح کر دی ہے کہ انسان جو میری ہتھیاروں کے خطرے سے کس طرح کاروبار میں غلام کرتے ہیں۔ ایک طرف تو صرف آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں، اور یہ دراصل، ایک ”عام آدمی“ کا روٹل رہا ہے۔ دوسری جانب ایک قسم کی قوم پرستی کے مانیفولیا کے ذریعے بھونڈے لفظوں میں ماہرین جس کو ایذا رسائی کا خبط کہتے ہیں۔ دشمن کو مستحکم بڑھا کر پیش کرنا، اس سے پیش آنے والے خطرات کو ضرورت سے زیادہ بڑھلا، عوام کو یہ باور کرانا کہ وہ ایک ”دشمن مطلق“ ہے اور ان کو ہڑپ کر جانے پر تیار ہے۔ اور اس دہل سے زیادہ اسلحے کے طلب کی جاتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ پاگل پن نظر آتا ہے جب ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ دونوں بڑی طاقتوں کے پاس ضرورت سے کہیں زیادہ اسلحہ موجود ہے۔

لبنی ماہرین نے نہایت صاف انداز میں ثابت کیا ہے کہ جو میری ہتھیاروں کے تسلط ہونے کی صورت میں، ترقی یافتہ ممالک میں بھی، رنجی ہونے والوں کو ملتی امداد پہنچانے کے لیے ہمارے ذرائع کتنے ناکافی ہیں۔ عقوبت کا مانیفولیا، جس کے عقب میں وہ طاقت ہے جسے آئرن ہاور نے فوجی/صنعتی الجھاؤ کا نام دیا ہے، اب دھڑک رہی ہے جو سیاست دانوں کو اسلحوں کی غیر محدود وڈ میں شامل ہونے پر اکساتا ہے۔ اس کو قوم پرستی سے بھی آگے لایا جاتا ہے جو ریاستوں کے درمیان مفادات کے تنازعے کے دوران بھڑک اٹھتی ہے۔ مگر یہ سب فطری حب الوطنی کی سرحدوں سے بھی پرے ہوتا ہے، جو اپنے ملک اور اس کی روایات سے محبت کی بنا پر ہوتا ہے۔ ہم نے حال ہی برطانیہ عظمیٰ اور ارجنٹائن کے درمیان اس قسم کی مسخ شدہ قوم پرستی کی مثالیں دیکھی ہیں۔

زیادہ سے زیادہ ملکوں میں عام سمجھ بوجھ کی زبان بولتی ہوئی ایک بہت بڑی مزاحمتی تحریک اٹھی ہے جو ان تمام قوتوں سے مبارزت کر رہی ہے جو دنیا کو اسلحہ کی دوڑ اور فوجی نظام میں ڈھکیل دینا چاہتی ہیں۔ فی الوقت، اس تحریک نے نیدرلینڈ اور ناروے جیسے ممالک میں قابل ذکر قوت حاصل کر لی ہے، مگر حال میں مغربی جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ میں بھی اس کو کامیابیاں نصیب ہوئی ہیں۔ مشرق میں تو یہ لوگوں کے دلوں میں بھی رہتی ہے، اگرچہ وہاں اس کو اپنی آواز بلند کرنے میں زیادہ مشکل پیش آتی ہے۔

جو میری ہتھیاروں کے خلاف احتجاج کی اس نئی عوامی تحریک میں کھینچا اور پیشرووں کی انجمنیں رہنمائی نہ کردار ادا کر رہی ہیں۔ بد قسمتی سے میرے پاس وقت نہیں کہ میں جو میری ہتھیاروں کی قبولیت کے خلاف اٹھنے والے اس سیلاب احتجاج کی تفصیل بیان کروں۔ مگر اپنے تمام تر افسار کے ساتھ، میں اس بات پر

یقین رکھتی ہوں کہ وہ افراد جو دنیا میں سیاسی قوت رکھتے ہیں، آج نہیں تو کل، عوامی خواہشات کے آگے سرخم کرنے پر مجبور ہوں گے۔

تشدد اور ٹیکنالوجی

جنگ قتل کے مترادف ہے۔ اور وہ تمام فوجی تیاریاں جو آج کل مکمل بڑے مقابلوں کے سلسلے میں کی جا رہی ہیں ان کا مقصد قتل عام ہے۔ جوہری عہد میں شکار ہونے والوں کو ٹیکڑوں ہزاروں میں نہیں ملین میں شمار کیا جائے گا۔

تلخ سچائیوں کا سامنا کیا جانا چاہیے۔

ہم جس عہد میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس کو جہالت ہی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ہماری تہذیب نہ صرف عسکریت کے عمل سے، بلکہ ظالمت کے عمل سے بھی گزر رہی ہے۔

ایسی دو خصوصیتیں ہیں جو اس احتمالہ میلان کا امتیازی نشان ہیں۔ اجازت ہو تو۔ اسی طرح جیسے میرے خطبے کی زیادہ تر باتوں کو خلاصے اور سادگی سے بیان کرنا پڑا ہے۔ میں اختصار سے اس مقابلے اور تہذیب کی نشان دہی کروں۔ طاقت کے حصول کے لیے مقابلہ ہو رہا ہے تاکہ بے تحاشا برہمٹی ہوئی ٹیکنالوجی کا استحصال کیا جائے جو تعاون کی مخالفت کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے ہمہ وقت بڑھتے ہوئے تشدد اور زیادہ پرفریب ہتھیاروں کا استعمال۔ یہی ہے جو ہمارے عہد کو بربریت اور بے رحمی کا نشان دے رہی ہے۔ مگر اب حق کوئی کا وقت آ جانا چاہیے۔

مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ یہ الفاظ بہت کڑے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ انہی طاقتیں بھی برسر عمل ہیں، تاکہ اس بد قسمت ترقی کو روکنے کی کوشش کی جائے۔

کیا میں اس مرحلے پر ایک ذوقی اعتراف کروں؟ میں نے ہمیشہ عالمی سطح پر ہونے والی ترقیات کو نیکی اور بدی کی طاقتوں کے درمیان کشاکش گردانا ہے۔ مگر اس کو یسوع مسیح اور شیطان کے درمیان کی کشاکش کا مادہ سامان نہیں دیا جانا چاہیے، اس لیے کہ میرے نزدیک یہ عمل صرف ہمارے گرد ارض اور ہماری تہذیب ہی تک محدود نہیں، بلکہ عام معنوں میں مثلاً اس کو برمز (نیک) اور برمن (بد) کے درمیان کی کشاکش گردانا جانا چاہیے۔ زندگی کے بارے میں میرا ذاتی فلسفہ تو بس اخلاق کا ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بدی کی طاقتوں نے اب اپنے ہاتھوں میں زیادہ سے زیادہ قوت کا ارتکا کر لیا ہے۔ تو کیا ہم اس بات پر یقین کر لیں کہ برائی قوموں کے رہنما جائیں گے، سامنے کھڑی اس چٹان کو دیکھیں گے وہ جس کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور ایک دن اپنے رخ تبدیل کریں گے؟

کم از کم نتائج اثنانویہ کے بعد سے ہماری تہذیب کو ترقیات کی طرف لے جانے والی طاقت بظاہر ترقی

کرتی ہوئی ٹیکنالوجی ہی رہی ہے۔ مگر ٹیکنالوجی ایک دو دھاری تلوار ہے۔ نیکی کی طاقتیں اور بدی کی طاقتیں دونوں ہی اس سے اپنے کام نکال سکتی ہیں۔ اور ایسا لگتا ہے جیسے ہم انسان شعوری طور پر ان میں سے کسی کو پسند نہیں کر سکتے ہیں، نہ ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قابل غور نتائج سے باہر کس طرح نکلیں۔

دوسرے اندازِ ترقی والی کھاتے داری کی تشکیل میں، ایک مثبت اندازِ فطری طور پر بے حد تیز ترقی کا رہا ہے جس نے کروڑوں انسانوں کے اچھے سارے دکھوں کا مداوا کیا ہے تاکہ ان کی زندگی کے مدارج قابلِ اطمینان حد تک بلند ہو سکیں۔ ایجادات اور فطرت دریا فتوں نے باہمی اور متبادل ابلاغ کے لیے پورے براعظموں کے دروازے کھول دیے ہیں، بشرطے کہ ہم ان سے مستفید ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیکنالوجی کے حق میں، صرف دو اوزں کے میدان ہی میں نہیں بلکہ ان سے کہیں زیادہ، سائنسی اختراعات کا مثبت اندازِ ترقی کیا جانا چاہیے۔

مگر دوسری جانب، بے شمار علاقوں میں بدی کی طاقتوں کی فتوحات زیادہ آشکار ہیں۔ میں اس مرحلے پر، اپنے آپ کو وہاں تک محدود رکھوں گی میں جن کے بارے میں واقعی کچھ جانتی ہوں گی، اور جو سب سے زیادہ نامبارک ترقی بھی ہے: یعنی اسلحوں کا بڑھتا ہوا کردار۔ سب سے پہلے تو اسلحے مستقبل میں ہونے والی جنگوں کی طرف اشاروں کے ذریعے متحارب قوموں کی خدمت گزاری کرتے ہیں۔ جنگ اور جنگ کے لیے کی جانے والی تیاریوں نے ایک طرح کا منطقی جواز حاصل کر لیا ہے۔ ٹیمپوں اور غجروں کی ادنیٰ حد تک، تیاری اور ان کی درآمد کے ذریعے اسلحوں کے ہبہ ناک پھیلاؤ نے ان کو ہر کس و نا کس کی دسترس تک پہنچا دیا ہے۔ تشدد کے مسلک نے افراد کے درمیان رشتوں تک رسائی حاصل کر لی ہے ہم روز جس کی ترقی معکوس کا نظارہ کرنے پر مجبور ہیں؛ گلیوں میں تشدد کا گھروں کے اندر کے تشدد کا یہ ہیں وہ نمونے جو ہم نے اپنے جوانوں کے لیے تیار کیے ہیں۔ یہ سب کچھ ہم یوں ہی نہیں ہو جاتا۔ سائنس اکتشاف کرتی ہے کہ عملی طور پر عقلی تربیت یا فتنہ و سائنس کا ایک نصف، قاحلانہ مقاصد پر مامور کیا جا رہا ہے۔ جنگ کے بعد کے برسوں میں ہم ایک ایسی ترقی کا مشاہدہ کرنے کے قابل ہوئے ہیں جو بیرونی دنیا پر ہماری کی مرادہ مثال سے ہر نوع کے ترقی یا فتنہ شکنی ایجادات تک پھیلی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک غیر مرقی طیارے STEALTH ہی کو لے سکتی ہوں، یا امترے کی دھار سے زیادہ تیز مقابلے کے تشکیل کو جو ASW (Anti-Submarine Warfare) کی صورت میں دنیا کے سمندروں میں کھیلا جا رہا ہے۔

میں نے اشارنا بیان کر دیا ہے کہ جھکیا کس طرح اجتماعی فوجی تشدد اگرچہ پیدا نہیں کرتے، بڑھاتے ضرور ہیں۔ مگر ہمیں باہم مربوط سطحوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے، اس حقیقت کے ساتھ کہ اوپر بیان کیا گیا انفرادی تشدد اور ہمارے شہروں میں کی جانے والی وارداتیں بڑی حد تک نتیجہ ہیں اسلحے کے پھیلاؤ کا۔

اسلحوں کا اتنی آسانی سے دستیاب ہونا کتنا غیر اہم ہے؟

اس پر غور و فکر ہونا چاہیے۔ کتنی بار اور کن جھکیاؤں سے قتل ہو جاتے ہیں اور مہمائیے جاتے ہیں؟

سورائٹیوں میں، خاندانوں میں، جو درحقیقت عام طور پر کیے جانے والے جرائم معلوم ہوتے ہیں؟ یہ اسلحے کہاں سے آتے ہیں، یہ سنیچر کی رات کے ڈرامے جو سٹیکوں میں ڈاکے کے اوزار بنتے ہیں، یا وہ دہشت گرد جو دہشت گرد استعمال کرتے ہیں؟ ان کی فروخت یا درآمد کی اجازت کیسے دی جاتی ہے؟

یہ حقیقت کہ جنگ پر اقوام متحدہ کے جاری کردہ فرامین کے باوجود بڑی طاقتوں کی جانب سے زیادہ سے زیادہ ”قدغن“ لگائی جانی چاہیے اور فطری اعتبار سے بہت سی قوموں کی جانب سے طاقت کی مشق ہوتی رہنی چاہیے، میری دانست میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہے اس بھیا تک عمل کو جاری رکھنے میں، جسے میں نے اپنے دور کا اسلحہ جاتی اور دہشت گردی کا مسلک کہا ہے۔

حرابی نظام صرف عملی جنگ یا اسلحوں کی خریداری ہی سے مسلط نہیں ہوتے۔ یہ بنیادی طور پر ہاں زیادہ بچتے پھولتے ہیں جہاں نوجوان عوام کو فوجی تربیت اور دفاعی طریقوں وغیرہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ مشقیں اور فوجی کھیل ان بنیادی اخلاقی اقدار کو چاٹ جاتے ہیں جو ”تم قتل مرگز نہیں کرو گے“ جیسے احکامات میں مضمر ہوتے ہیں۔ درحقیقت ہم زیادہ مر داشت کرتے ہیں اس کے برعکس، جو مذہبیت اور بین الاقوامی قوانین ہم میں مراہت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ خوف زدہ کرنے والی بات ہے کہ حالیہ برسوں میں دہشت گردی میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ یہ ہمارے جیسے پُر امن ملکوں تک میں پہنچ گئی ہے۔ اور ”علاج“ کے طور پر انفرادی سرحدوں اور سموتوں کی زندگیوں کو محفوظ بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ حفاظتی طاقتیں تیار کی جارہی ہیں۔ ایک سیاست دان کی زندگی زیادہ پرخطر ہوتی جا رہی ہے۔ بڑھتی ہوئی اس طاقت اور اس کا توڑ کرنے والی طاقت کا سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا؟

بہت سے ممالک اپنے ہی باشندوں کو آزار پہنچاتے ہیں، ان کو جیلوں، ہتھوڑی کیمپوں میں قید کرتے ہیں۔ ظلم و ستم ہمارے نظام کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ شیخ والینسا کے دکھ انسانی حقوق کی پامالی کی علامت کے طور پر نظر آتے ہیں، جو ملکوں ہو رہی ہے۔

تشدد کے فروغ کا ایک انتہائی عنصر ذرائع ابلاغ بھی ہیں جو بلاشبہ بہت اثر پذیر ہیں۔ بالخصوص وہ اخلاعات جو تصویریں ذرائع سے ذہنوں میں داخل ہوتی ہیں۔ اس موضوع پر وسیع پیمانے پر تحقیقات ہوتی ہیں اور کئی ملکوں میں نتائج بھی ہوتے ہیں۔ کچھ پروگرام ایسے ہوتے ہیں جن سے صرف وقتی اثر پیدا ہوتا ہے جب کہ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ذہنوں میں دیر پا تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔

عوامی ذرائع ابلاغ میں پیش کیا جانے والا تشدد امتیازی اثر بھی ڈالتا ہے۔ اچھے کردار کا کیا ہوا تشدد، بُرے کردار کے تشدد کے مقابلے میں ہمارے ادراک کی کہرائیوں میں اثر جاتا ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بچے اور نوجوان ذہن وحشیانہ انداز کے اعمال کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔ لہذا ان نقوش کو چھان کر رد کر دینے کی کم زوری، جو ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں، بین الاقوامی سیاق و سباق میں دوسرے نتائج کا باعث ہوتی ہے؛ فلم اور خبروں کے ذریعے مغربی دنیا کے اخلاق اور رواج تیسری دنیا کو سکھائے جاتے

ہیں، جو ایسے اسلحے کی درآمد کے مترادف ہوتے ہیں جو مشکل ہی سے کسی مقابلہ مست میں کارآمد ہوتے ہوں۔
میں علامتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ ہمارے سماج میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔

آخر میں، ایک لمحے کے لیے میں ٹیکنالوجی اور امن کے موضوع پر واپس آنا چاہوں گی۔ میں یہ قدم صرف اس لیے اٹھا رہی ہوں کہ مجھے ایک عملی تجویز پیش کرنی ہے۔ میں اس سلسلے میں انٹرنیٹ نوبیل کا تذکرہ کرنا چاہوں گی، ایک آدمی جو شاید دوسروں کے مقابلے میں ٹکنالوجی کے دو دھاری پن کو بہتر طور پر علامت کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

نوبیل امن کا سچا دوست تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کا ایجاد کیا ہوا تباہی کا مادہ، ڈائنامائٹ، جنگ کو اس قدر بے معنی بنا دے گا کہ وہ ناممکن ہو جائے گی۔ وہ غلطی پر تھا۔

مگر ٹیکنالوجی کی قوتوں کے ساتھ عام طور پر مل کر، اس کی اور دوسروں کی ایجادات فنی اور بدی دونوں کے لیے استعمال کی جاسکتی ہیں۔ سائبر و گیمز میں ایک اچھی مثال ہے، جس کا خود اس نے بھی حوالہ دیا تھا۔ یہ (مادہ) درد دل میں تسکین پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے، جیسا کہ میری طرح، خود اس کو بھی تجربہ ہوا تھا۔ اس کو بند کرنا ہوں، اور بنی نوع انسان کو بھی، دھماکے سے اڑانے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ نوبیل نے خود بھی ایک بڑی جنگی صنعت قائم کی ہے۔

اس شخص کے سینے میں، جیسا کہ اکثر انسانوں میں ہوا کرتا ہے، دو دھیں بستی تھیں۔ بہر کیف، علم نفسیات نے اندرون کے پے دے مرکاز نے اور اس بھول بھلیاں کو فاش کرنے کا عمل شروع کر دیا ہے جو ہماری شخصیتوں کا حصہ ہے۔

میں نوبیل کے وصیت نامے سے ایک اقتباس پیش کرنا چاہوں گی، میرے خیال میں جس پر اب تک عمل نہیں کیا گیا ہے اور جس کی مدد سے امت ایک عملی اہمیت ہے۔ نوبیل کہتا ہے کہ اس سرمایے کا مقصد "امن کے جلسوں کا قیام اور ان کے فروغ" کی مدد کرنا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے، وصیت کے لکھے جانے کے بعد تقریباً سو برس کے عرصے میں امن کا کوئی جلسہ منعقد نہیں کیا گیا ہے۔ میں آنے والے برسوں کے لیے پالیسی میں تبدیلی کا مشورہ دینا چاہوں گی کہ "امن کے جلسوں" کو قائم کرنے والوں کو بھی نوبیل انعام پانے والوں کی طرح دعوت دی جانی چاہیے۔ ایسے جلسوں میں حرکی قوت رکھنے والے ذہن دانشوروں، حقیقی تجزیے کرنے والوں اور بحث میں حصہ لینے والوں سے اہم سوالات کرنے کے مواقع حاصل ہوسکیں گے۔ اسلحے کے خلاف ابھرنے والی طاقت و تحریکیں بھی جو زور پکڑ رہی ہیں، معاون بھی ہوں گی اور انھیں اس قسم کی تقویت بھی ملے گی کہ وہ ہمارے مستقبل کی تعمیر میں مدد فراہم کرسکیں۔

ایدولفو پیرے اسکیویل اعلانِ تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات!

ما روایتی نوٹیل کمیٹی نے ایدولفو پیرے اسکیویل کو 1980 کا امن انعام پیش کیا ہے۔

انہوں نے اپنی زندگی کے کئی برس ارجنٹائن میں اور پورے لاطینی امریکا میں انسانی حقوق کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ یہ سماجی اور سیاسی آزادی کی جدوجہد میں عدم تشدد کے اصولوں کے ان تھک اور ثابت قدم پیہمیسی ہیں۔ انہوں نے اندھریے میں ایک چراغ روشن کیا ہے، وہ چراغ جسے ہماری کمیٹی کی رائے میں کبھی گل نہیں ہونے دیا جانا چاہیے۔

مزید یہ کہ ایدولفو پیرے اسکیویل قوموں کے درمیان رشتوں میں بھی عدم تشدد کے پیہمیسن ہیں۔ مثال کے طور پر، انہوں نے ارجنٹائن اور چلی کے درمیان علاقائی تنازعے کے خطرے بڑھنے کے امکانات کی نشان دہی کی ہے۔

انسانی حقوق کے فروغ کی جدوجہد کے تناظر میں 1980 کا سال 1979 سے کچھ زیادہ ہمت افزا ثابت نہیں ہوا ہے۔

پچھلے سال ایشیا کے سب سے بڑے ملکوں میں سے ایک، ایران، خالمانہ اور آمرانہ حکومت کو اکھڑا پیہنگے کے لیے تن کر کھڑا ہو گیا، ایک بڑی طاقت کے تحفظ سے دست برداری کا اعلان کیا جس نے پرانی حکومت کا ساتھ دیا تھا، اور اپنے ملک کی افواج میں تیزی سے کمی کی ابتدا کی۔

بعد میں اس پر ایک پریوی ملک نے حملہ کر دیا اور اس سے شروع ہونے والی جنگ ابھی تک جاری ہے۔ مزید یہ کہ پورے ایک برس تک ایرانی قوم متحیر و متماشاکی بنی رہی تھی، ایک جنگ کی، جو ایک بڑی طاقت نے متصل ملک میں شروع کی تھی۔ یہ جنگ بھی ابھی تک چل رہی ہے۔

افغانستان کی جنگ کے مہیب سرائے دنیا کے اس حصے کے مردوں اور عورتوں پر بھی پڑے ہیں، ہم ماریوفاقی جس سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت سے ذہنوں میں آزادی اور انسانی حقوق کے تھیں جانے کا خوف سا سا گیا ہے۔ اس برس خزاں کے موسم میں یورپ نے پلینڈ میں آزادی کی جدوجہد کی شروعات بھی دیکھی۔ اعتراض اور حقیقت کے مطابق اقدام اس تحریک کا خاصہ رہا ہے۔ اس نے اپنے لیے محدود ہدف مقرر کیے ہیں، عدم تشدد کی پالیسی کو اپنایا ہے؛ انسانی حقوق کے معاملے میں اس کی لازوال روحانی بنیاد احترام پر ہے۔ ہمیں نتیجے کا انتظار ہے، امید اور تشویش کے ساتھ یہ جانتے ہوئے کہ اس کا بہت کبیرا اثر ہوگا ہمارے پورے براعظم پر بھی اور اس کی سرحدوں سے پرے بھی۔

شمالی آئرلینڈ کی دو باہمت عورتوں، مریٹھ کورٹین اور مینی ولیمز نے، جنہیں 1976 کا امن انعام دیا جا چکا ہے، علی الاطلاق کہا ہے کہ انھوں نے ایدو فلوجیرے اسکیمیل کو امن انعام کے لیے نامزد کیا ہے۔ ان [دونوں] کو امن انعام دیا گیا تھا، اس لیے کہ اپنے تلخ تجربے کی بنا پر، وہ عملی طور پر کام کرنے کے لیے تیار تھیں، امن کے لیے، بھائی چارے کے لیے اور باہمی احترام کے رشتوں کے لیے شمالی آئرلینڈ میں، پریسٹنٹ اور رومن کیتھولک گروہوں کے درمیان، جو دہشت کی تباہی میں، نفرت انگیزی میں اور مار پیٹ میں گرفتار تھے۔

یہ دونوں بہادر عورتیں اپنی مرضی سے، سنگین ذاتی دباؤ کی شدت اور کھنچاؤ پر داشت کرنے کو تیار تھیں، اس تناؤ کی حالت میں جو ان کی سر زمین پر اب بھی طاری تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امن کے لیے بھائی چارے اور انسانی وقار کے لیے جدوجہد کتنی مشکل ہو سکتی ہے۔

کودکی [شہر] میں اپنی جلاوطنی کی قید و بند سے 1975 کے انعام یافتہ آندرے سٹاروف نے اپنی اہلیہ کے ذریعے اس وقت اسکیمیل کو تہنیت کا پیغام بھیجا تھا جب اس کے اطراف انسانی حقوق کے خاص کردار قید اور جلاوطنی کے ذریعے مایہ دگر دیے گئے تھے۔

اپنے پیغام میں سٹاروف نے اپنے ادراک کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے، ”تمہارے ملک اور لاطینی امریکا کے دوسرے ملکوں کو مشکلات اور مسائل کا ہوا لپیہ درپیش ہے، امن کے لیے تمہاری جدوجہد کو، اور اس امداد کو جو جر کی چکی میں پسے ہوئے دیکھی لوگوں تک تم نے پہنچائی ہے، تم سے دور دوسری دنیا میں رہنے والے اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔“

پچھلے برس، نوبیل امن انعام مدرٹریا کو دیا گیا تھا۔ انھوں نے بے انتہا محروم، بے یار و مددگار، مردود اور لب کو لوگوں کے لیے کلکتے میں اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بہت کام کیا تھا۔

اس کمیٹی نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ جن ہر گریموں کے لیے ان کو انعام دیا گیا تھا وہ بہت وسیع نہیں تھیں، بلکہ انھیں اس جذبے کے لیے انعام دیا گیا تھا جس نے انھیں اس کام پر آمادہ کیا تھا۔ وہ لوگ جو ان تک اور ان کی مہنوں تک لائے جاتے تھے وہ لطف اندوز ہوتے تھے، ”اس احساس سے جس سے انھیں

ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور ان کے ساتھ آدمی کی طرح وقار اور احترام کا سلوک کیا جاتا تھا۔
مدرسہ ریسہ کو انعام پیش کیے جانے کے وقت یونیورسٹی کے تقریباً باقی ہال میں جو الفاظ استعمال کیے گئے تھے ان کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

”کیا سیاسی، سماجی یا سائنس کا کوئی دانش ورانہ کا بے عظیم، بین الاقوامی یا قومی سطح پر، خواہ وہ کتنا ہی اثر پذیر ہو، خواہ اس کے کارپروڈان کتنے ہی مثالیت پسند اور اصولی کیوں نہ ہوں، ہمیں ریت پر بنی ہوئی عمارت کے سوا کچھ اور دے سکتے ہیں، جب تک کہ معمار عمارت بنانے سے پہلے مدرسہ ریسہ کے خیالات سے استفادہ نہیں کر لیتے؟“

ہماری کمیٹی کی رائے کے مطابق یہ وہی جذبہ ہے جو ان کے ہم مذہب اسکویئل کو مدرسہ ریسہ کی سرگرمیوں سے مختلف اور زیادہ وسیع میدان کا انتخاب کرنے پر ابھارتا ہے۔ انہوں نے اپنے اطراف بچھل ہوئی سیاسی اور سماجی دنیا کو بدلنے کے لیے ایک سماجی اور سیاسی پکار کو سنا ہے اور اس کا جواب بھی دیا ہے تاکہ آدمی کے حق اور وقار کے لیے سب کے دلوں میں احترام کے جذبے کو ابھارا جائے اور نئی آدم اس سے مستفید ہوں۔

میں ایک بار پھر پچھلے برس کی تقریب تکمیل سے ایک اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:
”مدرسہ ریسہ اپنے اطراف کی دنیا میں، جیسی کہ نکلتے اور اور پیر میں شہروں کے بدترین پس ماندہ علاقوں میں پائی جاتی ہے، کام کرتی رہتی ہیں۔ مغربہ فلس اور دولت مند لوگوں میں، فلس اور دولت مند ملکوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتیں۔ سیاست سے انھیں کبھی سروکار نہیں رہا ہے، مگر ان ہی مقاصد کے ساتھ معاشیاتی، سماجی اور سیاسی کام ان کی اپنی زندگی بھر کے کام سے مکمل طور پر ہم آہنگ رہا ہے۔“
اس اعتبار سے اس برس کے انعام میں پچھلے برس کے انعام کی مماثلت پائی جاتی ہے۔

ایدولفو اسکویئل بیونس آئیرس میں 1931 میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک معروف ماہر تعمیرات ہونے کے ساتھ ساتھ سنگ تراش بھی ہیں۔ ان کے تراشے ہوئے مجسمے ارجنٹائن میں کئی عوامی جگہوں پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ 1968 میں انھیں بیونس آئیرس کی نیشنل اکادمی میں فن تعمیرات اور سنگ تراشی کا پروفیسر بنایا گیا تھا۔
1971 میں ان کی زندگی میں ایک بڑا موڑ آیا: لاطینی امریکا کے رومن کیتھولک کلیسا میں ایک روحانی کمال کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی، جو ان پر بھی اثر انداز ہوئی۔ کلیسا کے کئی اندرونی حلقوں میں کلیسا اور عیسائیوں کی سماجی ذمہ داریوں کے بارے میں نئے سوالات اٹھائے جا رہے تھے۔ ان میں عام معنوں میں نہ صرف انسان کے لیے احترام کے بلکہ اقتصادی اور سماجی اصلاحات کے بارے میں سوالات بھی شامل تھے۔ مزدوروں اور کسانوں سے روابط قائم کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔

مگر اسکویئل کے اپنے ملک ارجنٹائن میں بدلتے ہوئے حالات نے حقوق انسانی اور عدم تشدد سے ان کی لگن کو شدید کر دیا۔ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ دہشت گردی کا اور دہشت کے مقابلے کا سلسلہ نہ شروع ہو جائے۔ اسکویئل نے ایک گروہ میں شرکت کرنی جو دہشت گردی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا مخالف

تھا اور وہ مومن داس گاندھی کے عدم تشدد کے ذریعے آزادی کے حصول کی تحریک سے متاثر تھا۔
 Montevideo میں 1968 میں ہونے والی ایک کانفرنس میں ایک تنظیم قائم کی گئی جسے پورے لاطینی
 امریکا میں عملی طور عدم تشدد کا پرچار کرنا تھا۔ 1974 میں یہ طے ہوا کہ اس کام کو مستقل بنیادوں پر کیا
 جانا چاہیے، اور اسکیوئل کو سیکریٹری جنرل کا عہدہ پیش کیا گیا۔ اس نئی ذمہ داری کے لیے انھیں پروفیسری
 کو شہر بادکھتا پڑا تھا۔

تنظیم کا نام ”امن اور انصاف“ اس کے بنیادی اغراض و مقاصد کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی نام کے ساتھ اس
 کی اثناہتیں پورے لاطینی امریکا میں ہم خیال گروہوں کے درمیان ایک جہتی کی زنجیر کی کڑی ثابت ہوئیں۔
 ان کی سرگرمیاں ہیونس آئرس کے معمولی سے دفتر سے شروع ہوئی تھیں اور اب بھی وہیں سے ہو رہی ہیں۔
 سیکریٹری جنرل کی حیثیت سے اسکیوئل نے کانفرنسوں اور گفت و شنید کے لیے نئی ممالک کے دورے
 کیے۔ دو موقعوں پر ان کو گرفتار کر کے ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ برازیل سے 1975 میں اور ایکواڈور سے 1976
 میں۔ 1976 میں اس تنظیم نے اقوام متحدہ کو حقوق انسانی کا کمیشن قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ لاطینی امریکا
 میں ہونے والی انسانی حقوق کی پامانی کے ثبوت کے طور پر دستاویز تیار کی گئی۔ اس کام میں امداد حاصل کرنے
 کے لیے اسکیوئل نے کئی یورپی ممالک کے دورے کیے۔

وہاں سے واپسی پر اسکیوئل کو ہیونس آئرس میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر الزامات لگائے گئے اور ان
 سے پوچھ گچھ کی گئی۔ انھوں نے ہمیں اٹاٹا بتایا ہے کہ قید خانے میں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا
 تھا۔ چودہ مہینے بعد ان کو رہا کر دیا گیا، مگر انھیں پولیس تھانے پر حاضری دینی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور
 بھی پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ 1979 میں پابندیوں میں کچھ نرمی کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے ”امن
 اور انصاف“ کے لیے دوبارہ کام شروع کر دیا۔ اس میں انھیں کچھ تازہ سفر کے مواقع ملے جن میں یورپ کا
 سفر بھی شامل تھا۔ اس میں خزاں کے موسم میں وہ اپنے پڑوسی ملک چلیے گئے تاکہ کئی مختلف تنظیموں، اداروں
 اور گروہوں سے بات چیت کا سلسلہ جاری ہو۔ ان میں نام نہاد ”Group of 24“ سے بھی گفتگو کا سلسلہ رہا
 جس میں مختلف مکاتب فکر کے لوگ شامل تھے۔

1970 کے اوائل میں ارجنٹائن کو ایسے حالات کا تجربہ ہوا جو خانہ جنگی سے کچھ کم نہ تھا۔ مرکز سے بھی
 ہونی تنظیمیں، فراخی سے فراہم کیے گئے ہتھیار، قتل و غارت اور خوف کا بنا ہوا ماحول، بم کے حملے، اغوا اور
 تاوان وغیرہ کا دور دورہ تھا۔ شہروں میں جنگ کا ماحول ہو گیا تھا، وارداتیں زیادہ تر راتوں میں کی جاتی تھیں
 جس میں داییں بازو کے دہشت گرد ملوث ہوتے تھے۔

متواتر آنے والی حکومتیں بحران کو حل کرنے میں ناکام رہی تھیں۔ ان میں اتنا نہ بچنے
 والوں کی تعداد 1976 کی خوف ناک شایات سے آگے نکل گئی تھیں۔

فوجی حکومت جو اس وقت اقتدار میں تھی خود شدید قسم کے تشدد پر عمل پیرا تھی۔ ہزاروں افراد قاتل ہو

گئے تھے اور ہمیں معلوم ہے کہ ان میں سے بہتوں پر تشدد کیا جاتا تھا اور قتل کر دیے جاتے تھے۔ یہ سب کچھ کبریٰ خاموشی کے پردوں کے پیچھے ہوتا تھا، بغیر کسی اعلان کے، بغیر عدالتی فیصلوں کے۔ وہ لوگ بھی اس کا نشانہ بن رہے تھے جن کو کسی بھی نوعیت کی دہشت گردی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

عوامی رائے کے ماحول کو بننے سے روکنے کے لیے، لا پرواہی اور ان طریقوں کی بظاہر منظوری کے لیے ارجنٹائن کے لوگوں کے خوف سے اپیلیں کی گئی ہیں کہ وہ 1970 جیسے حالات کو دوبارہ تازہ نہ ہونے دیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ خوف اب بھی فضاؤں میں لہرا رہا ہے، مگر اس لیے کہ خاموشی کی فصیل میں دراڑیں نہ پڑنے پائیں، ساتھ ہی ساتھ جو لوگ غائب ہو گئے ہیں ان کے بارے میں بات کرنا یا لکھنا بھی ایک بڑے خطرہ عمل ہو گیا ہے۔ جو لوگ غائب ہوئے ہیں ان میں وہ صحافی بھی شامل ہیں جنہیں نہ صرف یہ کہ بہت کچھ معلوم تھا بلکہ وہ اپنی معلومات کی تصدیق کرنا چاہتے تھے۔

اس پورے پریشان کن دور میں ایدولفو پیرے اسکیویل اپنے اصولوں پر سختی سے ڈٹے رہے ہیں۔ وہ خود بھی دور رس سماجی اور سیاسی اصلاحات کے مددگار رہے تھے۔ اس حد تک تو وہ بائیں بازو کی پھیلائی ہوئی دہشت گردی اور اس کے پس پردہ نیت کی قدر دانی کرنے کی کیفیت میں تھے۔ مگر جب وہ موہن داس گاندھی اور ان کی عظیم مثال کے ہم خیال بن گئے، تو 1970/71 میں انہوں نے مرن بڑت کا قدم اٹھایا۔ انہوں نے دائیں اور بائیں بازو دونوں کی دہشت گردی کے خلاف ایسا کیا تھا۔ ان کا یہ اقدام، اور بہت کچھ ہونے والے واقعات کے علاوہ Fiat کارخانے کے ایک ڈائریکٹر کے اغوا اور بعد میں کیے جانے والے بلیک میل کے خلاف تھا۔

اسی وجہ سے ان طریقوں کے خلاف پیکار کے باعث، آج وہ ایک عظیم اخلاقی قوت کے حامل ہو گئے ہیں۔ وہ بڑی متانت سے ان لوگوں کو جواب دے سکتے ہیں، جو پولیس کے ان طریقوں کے خلاف، ان کے احتجاج کو دہشت گردیوں کی پشت پناہی گردانتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں:

”ہم نے، ہر قسم کے، جبر کی مذمت کی ہے۔ ہم نے جزیروں، گرنیوں اور فوجی افسروں کے بے خطا اہل خاندان کے قتل کی مذمت کی ہے۔ ہمارا سیاسی جماعتوں سے کسی قسم کا واسطہ نہیں، نہ ہی کسی مسلح گروہ سے ہے۔ ہم انجیل کی عدم تشدد تعلیمات کے مطابق کام کرتے ہیں، جسے ہم آزادی کے لیے ایک طاقت سمجھتے ہیں۔“

”امن اور انصاف“ کے نام کی علامت ہی احتجاج، دہشت اور تشدد کی نفی کرتی ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں: ”آپ انسانی حقوق کی بابت محض اذیت رسانی، قید و بند اور قتل پر ہی بات نہیں کر سکتے۔ بے شک، یہ سب سے بھیانک پہلو ہے۔ مگر ہمیں اس کسان کی طرف بھی نظر کرنی چاہیے جس کے پاس کوئی زمین نہیں اور وہ بھوک سے ہلاک ہو رہا ہے۔“ گاندھی کی طرح، اسکیویل کے نزدیک، عدم تشدد مجبوراً دنیا کی، جیسی بھی وہ ہے، قبولیت ہی کا نام نہیں۔ یہ ایک حکمت عملی ہے، دنیا کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کی، ایسی تدبیروں کے ذریعے نیک ارادوں اور نتائج کا گلا نہیں گھونٹتے جن کو حاصل کرنا ان کا مقصد ہو۔

یہی ہے وہ کچھ، میگزین جرنل اور "امن اور انصاف" تحریک جس کی قیادت کرتے ہیں۔ اس کی تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے، جن کا اپنا الگ دفتر ہے، بیونس آئرس سے جن کو مربوط رکھا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کے مذہبی اتحاد جیسا ہے مگر مذہب کی بنیاد پر کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا جاتا۔ پھر بھی، اس جوش و جذبے اور نئے خیالات میں اس کی جڑیں بیوست ہیں، جولاٹینی امریکا پر حاوی رومن کیتھولک کلیساؤں میں پچھلے پندرہ برسوں سے حرکت میں ہے، جس کے نتیجے میں 1968 میں کولمبیا کے Medellin اور 1978 میں میکسیکو کے Puebla کے درمیان ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔

پھر بھی، یہ نئے رجحانات، جنہیں خاصی مزاحمت سے دوچار ہونا پڑا ہے، کلیسا اور وسیع سطح پر عوام کے درمیان نئے رشتے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلیسا انتظامیہ اور عام آدمی، دونوں کو کمیونٹی کے اندر نئی ذمہ داریاں پوری کرنی چاہئیں۔ کلیسا کو محض رسمی فرائض کی ادائیگی ہی پر قناعت نہیں کرنی چاہیے یعنی ہتسمہ، دعا، یہ اجتماعات، جنازے وغیرہ، جو ان کے عام طریق میں سے ہیں۔ نہ ہی اس کی رحم اور ایثار ذات کے جذبے کے تحت ضرورت مندوں کی سماجی ضرورتیں پوری کرنے پر قناعت کرنی چاہیے، اگرچہ یہ بھی ان کی ذمہ داریوں کے احاطے میں آتے ہیں۔ نہ ہی اس کو ذاتی طور پر اپنے پڑوسی یا اپنے قریبی حلقے میں آنے والوں کا خیال رکھنے جیسی انسانی ذمہ داری پر قناعت کرنی چاہیے۔

رومن کیتھولک فلسفے میں evangelisation ایک کلیدی لفظ رہا ہے، اور اس لفظ نے اپنی معنی میں خاصی وسعت پیدا کر لی ہے۔ بے شمار کارکنان اور تہذیبی خیال کے گروہ پیدا ہو چکے جن میں مرد اور عورت مباحثے کرتے ہیں اور اپنی کمیونٹی کے لیے ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں۔ مقصد مقلد اور محروم کو بھی شامل کرنا ہے۔ کوششیں کی گئی ہیں کہ ان کے حقوق کے حصول کے لیے نئی تنظیموں کی تشکیل کے ذریعے، یا پھانے اداروں کو امداد دے کر انہیں منظم کیا جائے۔ کلیسا پر بہت دباؤ ہے کہ سیاسی، اقتصادی اور سماجی مسائل کے بارے میں اپنے رویے کی حد بندی کرے۔

اس میں بہت سارے رجحانات شامل ہیں: تنظیموں کے پاس پہلے سے تیار شدہ نمونے یا نظام بنے ہوئے نہیں ہوتے جو ایک مکمل کمیونٹی تیار کر سکیں۔ نہ ان کے پاس اقتصادی اور مالیاتی حکمت عملی کے ایسے کوئی نسخے ہوتے ہیں جن سے کسی ریاست کو اس طرح فلاحی بنایا جاسکے کہ سب اس سے فیض یاب ہو سکیں۔ یہ اس دنیا کے کلیساؤں کے عمل کے زمرے سے باہر ہے۔ مگر کم از کم سوسائٹی سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایسے حالات سے سمجھوتا نہ کرے جو مرد اور عورت کو اپنے لیے، یا دوسروں کے لیے احرام حاصل کرنے کو ناممکن بنائے۔ سوسائٹی کے رہنماؤں سے بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی سیاست میں، بغیر کسی استثنیٰ کے، تمام مردوں اور عورتوں کے انسانی وقار کا احترام کریں گے۔ یہ تنظیم ایسی ہر پالیسی کو منظور کرتی ہے جو لالچ، خود غرضی، اور طاقت کی بازی کی پیداوار ہوتی ہے، اور جو عوام الناس کو نظر انداز کرتی ہے۔

یہی وہ منزل ہے جہاں لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی جگہ لیں کہ ان کے نزدیک

عدم تشدد کی حکمت عملی ہی واحد راستہ ہے۔ افلاس پھیلیوں کی طرح کثیر تعداد میں دہشت گردی کے اندے بچے دیتا ہے، اور جیسا کہ انہوں نے ایک بار کہا تھا، دہشت گردی افلاس میں اضافہ کرتی ہے۔ ان پر یہ صاف واضح ہے کہ تشدد اس مقدمہ ہی کو تباہ کر دیتا جس کو حاصل کرنے کے خواب دیکھے گئے تھے۔ لاطینی امریکا ایک ذیلی براعظم ہے جس میں حد سے زیادہ درجے کے مختلف کیفیات والے بہت سارے ممالک ہیں۔ ان میں سے کئی ارجنٹائن سے کہیں زیادہ مفلس ہیں؛ اُن میں سے کئی کو مختلف نسلوں کی آبادی کے مختلف گروہوں میں، کبرے تاریخی تنازعات برائے ملے ہیں؛ اور کئی ارجنٹائن سے کہیں زیادہ چھوٹے اور زیادہ محتاج ہیں۔ پھر بھی، یہ کمیٹی سمجھتی ہے کہ ایدولفو پیرے اسکیویل کے پاس پورے لاطینی امریکا کے لیے ایک پیغام ہے۔ اور یہ پیغام صرف دنیا کے اسی حصے کے لیے مخصوص نہیں۔

لاٹینی امریکا کی بہت ساری تنظیمیں ایک ہی اساس کے اصولوں پر رواں ہیں۔ ”امن اور انصاف“ کے ارکان بہت نہیں ہوں گے۔ مگر ان اساسی اصولوں کو بہت سے ملکوں میں اعلیٰ درجے کے ترجمانوں کی خدمات حاصل ہیں، ایسے لوگ جو اسکیویل سے زیادہ مشہور ہوں گے۔ لاطینی امریکا سے نارویائی نوبل کمیٹی تک ان کی آواز اپنی قوت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنی پاکیزگی اور صفائی کی بنیاد پر پہنچی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کے اپنے ملک کو ان کے کام کے ثمرات ملیں گے، کہ وہ ان کی آواز پر کان دھرے گا، دہشت اور اسلحہ دہشت، ہزار تفری اور ردِ عمل کے شیطانی نرسے کو توڑ کر باہر نکلے گا، اور پورے لاطینی امریکا کے لیے ایک مثال قائم کرے گا۔

کمیٹی کے انتخاب پر رائے زنی کرتے ہوئے بیونس آئرس کے ایک انگریزی اخبار نے مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے:

”اب ارجنٹائن میں طاقت کا توازن تبدیل ہو گیا ہے، اُن کے درمیان، جو کسی طرح بھی ایک مخصوص بدف حاصل کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں، اور جو اسرار کرتے ہیں کہ جرم بہر حال جرم ہوتا ہے، اس سے قطع نظر کہ کس وجہ سے اس کا ارتکاب کیا گیا ہے اور مرتکب کون ہوتا ہے۔“

یہ بھی ایک خوش آمد بات ہے کہ ارجنٹائن کے بڑے اخباروں میں سے ایک نے، جو غلطی سے شبہ کرتا ہے کہ نارویائی نوبل کمیٹی نے مختلف نظام رکھنے والے دوسرے ممالک میں، جہاں آج کے ارجنٹائن جیسے حالات ہیں، انسانی حقوق کی پامانی کو نظر انداز کیا ہے۔ مگر اخبار یہ کہہ کر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اگر یہ شبہ غلط ثابت ہو جاتا ہے تو انعام کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔

ہمارے لیے یہ بہت امید افزا بات ہے۔

نارویائی نوبل کمیٹی کو، اس کے اپنے ملک میں اور ملک سے باہر بھی، بار بار الزام دیا گیا ہے کہ وہ دنیا کو نارویائی نظریاتی رویے اور نارویائی مفاد کے تناظر میں، نارویائی عینک سے دیکھتی ہے۔

مگر ہم بخوشی کمیٹی کے اس بیان کو قبول کرتے ہیں، جو اسکیویل کے دورے کے بعد ایک مضمون میں،

جو چلی کے ایک بڑے ہفت روزہ ارجمیدے میں شائع ہوا تھا جسے، سابق وزیر انصاف پروفیسر Sinhuéga نے ”یہ کون ہے؟“ کے عنوان سے تحریر کیا تھا!

”یہ (مارویائی نوبل کمیٹی) ہمارے کے کام اور خیالات سے واقفیت رکھتی ہے۔ اس کو اذیت دہانی اور غائب ہوجانے والے افراد کے بارے میں بتایا جا چکا ہے۔ جس قدر بھی انسانی زندگی شامل حال ہو وہاں [ماروے میں] انسانی زندگی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔“

ہوسکتا ہے کہ کمیٹی کے انتخاب میں مارویائی تہذیبی پس منظر جھلکتا ہو۔ شاید یہ مارگزیو نہیں۔ مگر اس معاملے میں، جیسا کہ اور معاملوں میں بھی ہوا ہے، یہ پس منظر قیمتی طور پر ایک ٹیل بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے، ہمارے اور دنیا کے دوسرے خطوں کے انسانی احرام کے جھمبھیں لوگوں کے درمیان، جن میں اولیو پیرے اسکویٹل اور اس کے رفقا بھی شامل ہیں۔

مارویائی نوبل کمیٹی کے صدر نشین Professor John Sanness کی زبان

خطبہ

نوبل کمیٹی کے ارکان، بھائیو اور بہنو!

اتنی نیک نام اکادمی سے نوبل امن انعام حاصل کرنے کے بعد میں آپ کے رومرو حاضر ہوں، تاکہ میں اپنے بڑا عظیم اور اپنی جدوجہد کے افکار میں آپ کو بھی شریک کروں۔

میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ذخیرہ علم کے اس ایوان میں گفتگو کرنے کی دعوت دی ہے۔ نہ صرف ذاتی طور پر میرا خیر مقدم کیا گیا ہے بلکہ اس دعوت کے ذریعے میری توصیف، تصدیق اور عزت کی گمنی ہے، یہ دعوت جس کی حامل ہے، ان اقدار اور اعمال اور انصاف کے سلسلے میں، ہمارے عوام جس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں تاکہ احرام اذیت کی شرط کے ساتھ سچا امن حاصل کیا جائے۔

میں تمام تر انکسار اور استحکام کے ساتھ ایک عوامی آدمی کی حیثیت میں آیا ہوں تاکہ آپ کو ان حقائق میں شریک کر سکوں، میں جن سے واقف ہوں اور جن کے درمیان زندگی گزار رہا ہوں۔

اس انعام کو حاصل کرتے ہوئے، میں نے فوراً ہی اپنے آپ سے کہا تھا کہ میں اس کو اپنے ذاتی وقار کے لیے نہیں بلکہ لاطینی امریکا کے عوام، بالخصوص مفلس، سب سے چھوٹے، ضرورت مند، مقامی کسان، مزدور، جوان اور کئی ہزار مذہبی ارکان کی جانب سے وصول کیوں گا جو ہمارے بڑا عظیم کے شدید بے آسائش مقامات پر کام کرتے ہیں۔ اور ان تمام افراد کی جانب سے بھی، جو غلبے سے مہز اساج کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

میں اپنی توجہ کا رخ لاطینی امریکائیوں کی اذیتوں اور امیدوں کی طرف موڑنا چاہوں گا، کسی سیاست داں

یا سماجیات کے ماہر فن کی حیثیت میں نہیں، بلکہ ایک آدمی کی حیثیت میں، جو اپنے عوام کی انسانی حقوق کی روزمرہ کی جدوجہد میں ان کے ساتھ ہو، ان کی اقدار کا معترف ہو اور جو ان کی امیدوں، عقائد اور مکمل آزادی میں ہمہ امہ کا شریک ہو۔

پچھلے عشرے میں کھینا نے ایک نئے قسم کی سوچ اور عمل کی شروعات کی ہے: اُس بھٹی یا بہن کے عقائد سے التفات کرو جو ڈکھی ہو، محروم ہو، مفلس ہو۔

ہمارے مزدوروں، کسانوں، جوانوں، بزرگوں اور بچوں کے چہروں میں ہمارے آقا یسوع مسیح کا چہرہ ہوتا ہے، جو ہم سے اپنے بھائیوں اور بہنوں سے محبت کا تقاضا کرتا ہے۔

لاٹینی امریکی ہشپ حضرات نے جو لاٹینی امریکی حقائق کا اندازہ لگانے کی غرض سے میکسیکو کے Puebla de los Angeles میں جمع ہوئے تھے، اس قسم کے خیالات ظاہر کیے تھے: کھینا کی اہل ذمہ داریوں میں پہلی فوقیت مفلس کی ہونی چاہیے۔

اور ان سب میں سے، جو ہمارے عوام کی زندگی کے بارے میں سوچ کے راستے میں آتا ہے، نئی دینیات اور نئے عقائد موجود نہ ہو رہے ہیں۔

اس طرح عقیدے کی اصابتی سمجھ کا قیاس ابھرتا ہے کہ ہماری زندگی کو کیسا ہونا چاہیے کہ داد و دہش کے معاملے میں مفلس خود کو علاحدہ گروہ کے حیثیت میں نہ پائیں، بلکہ نظام کی نا انصافیوں کا نتیجہ سمجھیں جو عوام کے کنارے لگا دیے جانے، دکھ اور بھوک کا اصل باعث ہوتی ہیں۔

یہ ایک طرح کی مشارکت ہے تمام پہلوؤں سے تجربات کی، اور اس حقیقت کے علم کی۔ بھیمانیوں کے نزدیک عقیدہ ان مسائل سے الگ نہیں ہو سکتا، گویا دینیات، اپنے ڈھانچے اور ذاتی پہلوؤں کے اعتبار سے، عقیدے کی پرچھائیں اور لفظ کی اخلاقی طاقت سمجھی جاتی تھی، نا انصافی اور گناہوں سے آزادی کی۔

غور و غوص سچائی کے ادراک کا صرف ایک جزوی پہلو رہ جاتا ہے، اگر یہ خود کو عام بھلائی اور انصاف کی نگہ میں ڈھال نہیں لیتا۔ سچائی محض تجرید نہیں ہوتی، بلکہ کچھ گزر رہے لیے ہوتی ہے، اور اسی وقت گرفت میں آتی ہے جب اس بات کا احساس ہو جائے۔

یہی ایک ٹھوس کام ہے، جسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں بھیمانیوں کو کرنا چاہیے، جو ہمارے عوام کو آزادی کی راہ فراہم کرے گا۔

دوسرے بہت سے لوگوں اور عیسائی تنظیموں کی طرح، لاٹینی امریکا میں خدمات برائے امن و انصاف کا ہمارا ادارہ جس کا میں General Coordinator اور اس کے مقاصد کا موجودہ ترجمان ہوں۔ نئی سوسائٹی کی تشکیل میں کوشاں ہے جو زبردستی اور نا انصافی سے آزاد ہو اور جس کے باسی آپس میں بھٹی چارے اور خدا کی رضامندی سے زندگی بسر کریں۔

ہماری آوازاں لوگوں کی آواز بننا چاہتی ہے جن کی کوئی آواز نہیں ہوتی، جو نکالے ہوئے ہیں، جو فروتن

ہیں، جو کم زور اور حقیر ہیں۔

ہمارے ہاتھ ان کی زبان بولنا چاہتے ہیں جو محنت کرتے ہیں، جو ان کوششوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں جن کے ذریعے نیا عالمی اتفاق ترتیب ہو، جس کی بنیاد محبت، انصاف، آزادی اور سچائی پر ہو۔

ہمارا تجربہ ایک براہ راست نتیجہ ہے اس نکتہ کا، ہمارا برتاؤ نظر یہ ہے عدم تشدد کا، جس کی بنیاد انجیل ہے۔ یہ ایک جذبہ ہے ایک طریقہ ہے، شمولیت کی ایک طاقت ہے، جو جہد کرتی ہے سب سے کم زور کی غورتوں کے لیے، جو ہمارے آقا کے منتخب کردہ ہیں، جو اپنی روح کے ذریعے ان کو زندہ کرتا ہے تاکہ وہ خود کو منظم کریں اور اپنے ہاتھوں آزادی حاصل کرنے کے لیے متحد ہو جائیں۔ پس، اس طرح ہم لاطینی امریکا میں اپنا کام کر رہے ہیں۔

اب میں لاطینی امریکا کے بارے میں بات کرنا چاہوں گا، اس حقیقت کے بارے میں، ہمارے محب پال ششم نے جس کو "امید کا براہ اعظم" کہا تھا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لاطینی امریکا میں، جب ہم مدد کرنے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں دھچکا لگتا ہے اختلاف بینی کا، اپنی قوموں کی ترقیات کے دو ماڈلوں کے درمیان، جو طاقت اور سماجی تفریق کا نتیجہ ہیں۔

ہماری لاطینی امریکی قوموں نے اپنے عوام کے بارے میں کہا ہے، "انہوں نے اپنی لیاقت کو استعمال کرنے کے موقعوں سے فائدے اٹھائے ہیں اور دکھا دیا ہے کہ وہ اپنے منصفانہ حقوق کے جائز حصول میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

ان حقوق کا لگا بھونٹنا نہ صرف ان کی اخلاقی صلاحیتوں پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ ہمارے ممالک کی اقتصادی توئگری اور ترقیات پر بار ہوتا ہے۔ لاطینی امریکا ایسی ناہموار اقتصادی نمو کے خوف میں مبتلا رہتا ہے جس کی ترقیات میں اس کے عوام کی شرکت نہیں ہوتی۔ اس سے تصادم پیدا ہوتا ہے جو مختلف طریقوں سے ہماری سوسائٹی کے ہر حصے میں سرایت کر جاتا ہے۔

میں بولیویا کے جیسے حالات کی بات کر رہا ہوں جہاں کی فوجی حکومت کوئی توجہ نہیں دیتی اور عوام کی خواہشات کو دبا رہی ہے۔

میں سلواڈور کی بات کر رہا ہوں، جہاں برسوں کا جاری عام تشدد کا، جو پیداوار ہے تسلط اور قانونی طاقت کے ذریعے نا انصافی کی، جو آج پیرامن حل کے عملی امکان کو رنج و ملح کرنا چاہتا ہے۔

میں کیوبا کی بات کر رہا ہوں، اس کے قیدیوں کی اور سیاست دانوں کی، جو ذمے دار ہیں انسانی حقوق کی بے محابا خلاف ورزیوں کے۔ میں بات کر رہا ہوں پیراگوئے، چلی، برازیل، کوسٹے مالا جیسے ملکوں کی، جہاں نہ کسی آئینی نظام کی کوئی گنجائش ہے، نہ کوئی مادہ ہے کسی ایسے محدود اور فرسبی آئینی نظام کی شروعات کا، جو عوام کو اپنی قسمت سنوارنے کے لیے ان کے تحقیق شدہ حقوق فراہم نہ کر سکیں۔

میں خود اپنے ازمینائیں کی بات کر رہا ہوں جہاں کے حالات نے نا انصافی کے نظام کی راہ ہموار کی

ہے، ہمارے بقیہ وسیع لاطینی امریکا کی سر زمین جس میں شریک ہے، انھیں، واسنے اور بائیں، دونوں جانب سے تشدد و ورثے میں ملا ہے جس کے نتیجے میں لوگ قتل کیے گئے ہیں، زخمی اور غائب ہوئے ہیں، اذیتوں کا نشانہ بنے ہیں، قید ہوئے ہیں اور جلا وطن کیے گئے ہیں۔

یہ حالت، جو پریشان کن بھی ہے اور غیر منعطفانہ بھی، ہماری قومی زندگی کے سرفراز دھارے میں جاری و ساری ہے۔ یہ غائب ہو جانے والوں کے اہل خاندان کے لیے غم کا باعث ہوتی ہے، بالخصوص ماؤں کے لیے، Plaza de Mayo کی ماؤں کی طرح جن کا بہادارانہ اور بین الاقوامی اقدام ہمارے امن و صبر آزما گواہ ہے اس غم و اندوہ کا، اپنے گم شدہ بیٹوں کی فکر میں وہ جس سے گزر رہی ہیں۔

کلیسرا، کارکنوں کی تنظیموں، سیاسی جماعتوں اور انسانی حقوق کے دفاع کے اداروں، سب نے اس مسئلے کے کسی حل کا مطالبہ کیا ہے جو ارجنٹائن کے باشندوں کے ملاپ میں رکاوٹ ہیں۔

میں مندرجہ بالا انھما فیوں کے بارے میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا، اس لیے کہ آخر الذکر آپ کے ہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ایسے معاملات ہیں مجھے جن کو اپنے ملک میں سلجھانا چاہیے اور موجود حکومت سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ میں ارجنٹائن جمہوریہ اور چلی کے درمیان، جو میرے بھائی ہیں، سرحدی تنازعے میں پوپ کے مفاہمتی کردار کی کھل تا سید کرتا ہوں۔

ہم جانتے ہیں کہ مقدس جان پال دوم نے فرمایا ہے کہ ہم دونوں ممالک کے درمیان ایسا کوئی فرق نہیں جس کو امن کے ساتھ طے نہ کر لیا جائے۔ ہمیں اس یقین کے ان منفرد فوائد کا بھی اندازہ ہے جو اسی قسم کی کسی دوسری آفت میں بھی ہو سکتے ہیں، آئیں برپا ہونے کے عمل میں ہیں، اسلحے کے بیوپاریوں کے طفیل، اور ان کے طفیل جو لاطینی امریکا کے بھائیوں کو تقسیم کرنے والی جماعتوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔

بس امن ہی واحد حل ہے، اس لیے کہ جنگ کا مطلب ہے بے فائدہ خون ریزی، اور اس کے علاوہ، دونوں عوام کے وقار میں خلل اندازی، اور ان میں بھی خلل اندازی جو محض تنازعے کے تماشین ہیں۔

میں ایک براعظم کی بات کر رہا ہوں جس میں کروڑوں افراد رہتے ہیں جنھیں سیاسی وجود کی بنا پر اور مظلوموں کی یونین کے خلاف بھوک، مخصوص بیماریوں، جہالت، بے گھری، اور ایذا رسانی کے تشدد کا سامنا ہے۔

خلاصے کے طور پر میں لاطینی امریکا کے بارے میں بات کر رہا ہوں جہاں ہمیں عوام کے انسانی حقوق کی پامالی کا تجربہ ہو رہا ہے۔ تشدد ہو رہا ہے ان کے ساتھ جو فاقہ گرد ہے گئے ہیں، جو قید میں ہیں، جن کو ایذا دی جا رہی ہے، جنھیں جلا وطن کیا جا رہا ہے، ذرائع ابلاغ پر جن کی آزادی سلب کر لی گئی ہے وغیرہ۔ یہ محض افراد کے حقوق پر ہی حملے نہیں ہیں جن کا تدارک کرنا چاہیے۔ ہمیں تجزیہ کرنا چاہیے اس حقیقت کے تمام پہلوؤں کا، بناوٹ کے ان کبرے نقائص کا جو اس نوعیت کے تنازعاتی حالات پیدا کرتے ہیں۔ افراد کے وقار کی بھائی کی جدوجہد کے لیے ہمیں سوسائٹی پر نظر ڈالنی ہوگی جسے عوام کے حقوق کی بھائی کے لیے سمجھ کرنا ہوگا۔

مگر یہی برا عظیم اور یہی عوام ایک دوسرے کے ساتھ نہ زندگی گزارتے ہیں، اس امید پر کردہ اپنی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ اور اس کا بغیر میں، جس میں انصار کے ساتھ میں خود کو شامل کرتا ہوں، ہمیں اپنے ہاتھ اور اپنے عقیدے پر کلمہ کرنا ہوگا۔

آپ میں سے جو لوگ مفلس لوگوں کی اس جدوجہد میں شریک ہونا چاہتے ہیں، ان کے لیے میں ان نہایت مشکل حالات کی اور دنیا کے امن کے تناظر میں ان کی اہمیت کے نظارے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

لاٹینی امریکا خود کو اسی طرح نہیں دیکھتا، مگر خود کو ایک اقتصادی/سیاسی نظام اور ایک بین الاقوامی سیاسی نظام میں الجھا ہوا پاتا ہے جس کی گہری قلب مابیت ہو رہی ہے۔ اس کے تشدد کے نظارے ہماری ہم عصر دنیا کے تشدد کو منعکس کرتے ہیں۔ اس کی نا انصافیاں ایک غیر منصفانہ بین الاقوامی نظام میں بندھی ہوئی ہیں، وہ نظام جس کی ظہری ساخت، جان پال دوئم کے الفاظ میں "اسی پر زہ کاریاں ہیں جو تصدیق شدہ انسان پرستی میں نہیں بلکہ مافوق میں ملتی ہیں، جو ایک بین الاقوامی معیار پیدا کرتی ہے، جس میں دولت مند مفلس کے مال کے بل پر زیادہ دولت مند اور مفلس مزید مفلس ہو جاتا ہے۔"

ایسے حالات پیدا کرنا ضروری ہوتے ہیں جو اس میکا نزم کو مقبوف کرنے کی اجازت دیتے ہیں تاکہ ایک ملک کے دوسرے ملک پر غلبے کو محفوظ دیا جائے۔ میں Puebla کی میٹنگ میں شریک لاٹینی امریکا کے خدام دین کی معیت میں، دموے سے کہنا چاہتا ہوں کہ ایک ساتھ زندگی گزارنے کی صلاحیت میں "۔۔۔ تمام انسانوں میں ایک عام نوعیت کی بنیادی بھلائی ہوتی ہے، جو کچھ انسانوں کو دوسروں کے فائدے کے لیے آلے کی طرح استعمال کرنے سے روکتی ہے، تاکہ ہر ایک کچھ مخصوص نیک مقاصد کے لیے قربانی پیش کرنے کے لیے راضی ہو۔ یہی عام علامتیں آزادی کے وجود پر دلیل ہوتی ہیں۔"

اور ہمارے نزدیک مختاری وہ قابل منتقلی قابلیت ہوتی ہے جو ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ یہی وہ قابلیت ہے جو عمل اشتراک اور ملاپ کی اجازت دیتی ہے جو انسان کو دنیا سے، اپنے بھائی بہنوں سے اور خدا سے پوری طرح رابطہ کرنے کی ہمت عطا کرتی ہے۔

میں نہایت فکر مندی سے دیکھتا ہوں کہ یہ بین الاقوامی نظام، بڑی کثیر القومی اداروں کی موجودگی میں بھی، شرکت میں اضافے اور اکثریت سے رابطوں میں بہتری کی پروا نہیں کرتا۔ ضروری ہے کہ نئے ادارے بنائے جائیں جو سیاسی شراکت کی اجازت دیں، حاکم اور محکوم کے درمیان فاصلے منائیں، اقلیت کے حقوق کی تائید کریں اور انصاف کے پرانے اور ازکار رفتہ نظاموں سے چھٹے نہ رہیں۔

وہ اصول ہی، جو طاقتوروں نے بنائے اور بغیر دنیا پر مسلط کیے ہیں، ہمارے عہد کے اسلحے کے دوڑ کے بڑے جرائم کو ممکن بناتے ہیں۔ یہی اصول وسائل کی بے مقصد تقسیم کا باعث ہوتے ہیں، جن کو ہماری قوموں کی ترقیات میں استعمال کے لیے وقف کیا جاسکتا ہے۔ یہی طاقتیں نا انصافی اور غلبے کی کیفیات کی ابتدا کردہ ہیں اور انہیں دوبارہ جنم دیتی ہیں۔ اس قسم کی رکاوٹیں عوام کے حقوق کے استعمال کے آڑے آتی ہیں

اور کارکنوں کو اپنی محنت اور اپنے سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد کی راہیں فراہم کرتی ہیں۔ لاطینی امریکا میں بھی ویسائی ہو رہا ہے جیسا پولینڈ میں، افریقا اور ایشیا میں ہو چکا ہے۔

انسانی حقوق کا مقصد وہی ہے، کم و بیش جیسا کہ ریاست ہائے متحدہ اور سوویت یونین میں ہے۔ ہم خاص کر 1975 کے نوٹیل امن انعام یافتہ، ڈاکٹر آندرے سفاروف کے لیے اپنی حمایت کا اعلان کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ انا تولی شارسکی (Anatoly Shcharansky) کے ساتھ انھیں اپنی آزادی دوبارہ نصیب ہوگی۔ یہ دونوں حضرات اس وقت سوویت یونین میں حراست میں ہیں۔ ہم یہاں بات کرتے رہے ہیں اس تکلیف اور اذیت کی، لاطینی امریکا جس میں گرفتار ہے، اور بالخصوص، میں نے اپنے ملک ارجنٹائن کے حالات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ہم یہاں دنیا کے لوگوں کے مسائل میں الجھتے رہے ہیں۔ ہم نے ان کی ان تھک جدوجہد اور ان کے ناقابل منتقلی حقوق کے دفاع کے بارے میں بھی بات کی ہیں۔

اب میں اپنی امیدوں کے بارے میں بات کرنا چاہوں گا، کیوں کہ یہی وہ جذبہ ہے جو ہمارے افعال اور لگن کو قوت فراہم کرتا ہے۔

اس پر بات کی شروعات کرتے ہی مجھے شہید امن، سلواڈور کے آرچ بشپ موسیو آسکر رومیرہ (Monsignor Oscar Romero) یاد آتے ہیں، جنھوں نے انجیل پر اپنے کام میں عوام کو اس طرح شریک کر لیا تھا کہ لوگ ان پر جان بک دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ ان کی شہادت بھی امید کا نشان بن گئی ہے۔ ہماری امید یسوع مسیح کا نیک نہاد اثنا روہے جو بعثت اور کرمس کے ان دنوں کے موسم میں ہمارے عرض البلد کے لوگوں کے ضمیر کو مستحکم کرتا ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں، کیوں کہ سینٹ پال کے ساتھ ہم یقین کرتے ہیں کہ محبت کبھی نہیں مرقی، اور بنی نوع انسان نے، تاریخی عمل کے دوران، ہر گرم عمل افراد کے مکمل حقوق کے ساتھ، یک جہتی میں محبت کا ایک محصورہ (enclave) بنا دیا ہے۔

دنیا میں ہماری کوئی محدود نہیں رہ سکتی سماجی یا انصافیوں، اقتصادی اور سیاسی نظام پر تنقیدی فیصلے پر عمل درآمد نیک، یا ان کے گناہوں کی ملامت تک جوڑے دار تھے۔

ہر عیسائی کو قدم اٹھانا چاہیے۔ ایسا قدم، جس کی بنیاد اس عقیدے پر نہ ہو کہ عیسائی کے پاس سماجی مسائل کے رازوں کی کنجی ہے، یا اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ حالات کی قلب ماہیت کے لیے انجیل سے معصوم مثالیں کیسے نکالی جاسکتی ہیں۔

عیسائیوں کو تمام نیک نیت انسانوں کے ساتھ مل کر قدم اٹھانے چاہیے، تاکہ ان کی معمولی قوت ایک زیادہ منصفانہ اور رحم دل دنیا کی تعمیر میں امداد کرے۔

میں زور دے کر اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ایسی دنیا ممکن ہے۔ ہمیں جس سماجی نظام کی تلاش ہے وہ یوٹوپیہ نہیں ہے۔ یہ ایسی دنیا ہے جس میں سیاسی حیات، عام نیکی

کے حصول میں، حاکم اور محکوم کی عملی شرکت سے ہی سمجھی جاتی ہے۔

ہم جبری اتفاق رائے پر یقین نہیں رکھتے۔ ہم شے کے عادی ہیں، جہاں کہیں بھی انسانی حقوق کو نقصان پہنچتا ہے، بلند و بالا مفادات کے نام پر کیا جاتا ہے۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ میرے نزدیک انسان سے بلند کوئی مفاد نہیں۔

میری گمن عوام کے بلوغ اور پختگی میں ہے، جو پدرانہ شفقت اور سرپرستی کے بغیر بھی خود پر حکمرانی کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے ہم پُر امید ہیں۔ ہم عوام کی صلاحیتوں اور شرکت پر یقین رکھتے ہیں، جو روز بروز سیاسی شعور حاصل کر رہے ہیں اور سوسائٹی کی تبدیلی اور مکمل جمہوریت کی خواہشات کا اظہار کر رہے ہیں۔ انصاف کی بنیاد پر تبدیلی، مگر شفقت کے ساتھ۔ اور ان کے نزدیک یہی شہر امن ہے، جس کا حصول ان کی سب سے بڑی خواہش ہے۔

ہمیں اسی کام پر تن من دھن سے لگ جانا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری آواز ہم نوا آوازوں کے chorus کی تشکیل میں معاون ہو، تاکہ انصاف کے لیے ہونے والا شور و غل کسی اور آواز کو سننے نہ دے۔

میں اسی امید پر زندہ ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ بہت سے لوگوں کے ساتھ ایک دن میں اس میں شریک ہوں گا۔ میں پُر اعتماد ہوں کہ ایک دن ہماری رہزنی کو شش بار آور ہوگی۔

ہم اپنے آقا کے منصوبے کے لیے کام کر رہے ہیں، وہی، پیغمبر Isaiahi نے جس کا وعدہ کیا تھا، جب انہوں نے کہا تھا:

قوموں پر آقا ہی کی حکمرانی ہوگی اور وہ صحیح سمت میں لوگوں کی رہنمائی کرے گا، وہ اپنی تلواروں کو بنوں میں تہہ ل کر دیں گے اور اپنے بھانوں کا استعمال ترک کر دیں گے۔ ایک قوم دوسری قوم کے خلاف تلوار نہیں اٹھائے گی، نہ وہ پھر کبھی جنگ کرنا سیکھیں گے۔

میں آخر میں، ایک بار پھر، نوبیل کمیٹی کے ارکان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور ان سب کا جو یہاں موجود ہیں، اور اردے کے تمام باشندوں کا، جنہوں نے مجھے یہ اعلیٰ امتیاز بخشا ہے۔

میں بے حد جذباتی ہو رہا ہوں، اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں امن کے جد و جہد میں اپنی کوششوں کو دوہرا کر دوں گا۔

میں اپنے آقا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنی لامتناہی شفقت کے ساتھ ہمارے دل و دماغ روشن کرے اور امن و انصاف کی راہ پر ہماری رہنمائی کرے۔

امن اور نیک خواہشات؛ سب کے لیے!

بہت بہت شکریہ!

مدر ٹریسا اعلان تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات! مارویائی نوبل کمیٹی نے 1979 کا امن انعام مدر ٹریسا کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ 1979 کا سال امن کا سال نہیں تھا؛ قوموں کے درمیان تھنوں اور تنازعات، عوام اور نظریات کو از حد غیر انسانی اور سنگ دلی کے طور طریقوں سے برتا گیا ہے۔ ہم نے جنگوں اور تشدد کا بے مہار استعمال دیکھا ہے، ہم نے عرش رومی اور انتہا پسندی کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دیکھا ہے، ہم نے انسانی زندگی کی شان و شوکت کی اہانت بھی دیکھی ہے۔

ہم نے مغلوب کر دینے والا مہاجروں کا سیلاب دیکھا ہے۔ ہمارے لبوں پر تسلی کشی کا ذکر یوں ہی تو نہیں آیا تھا۔ بہت سے ملکوں میں بالکل بے گناہ لوگ دہشت گردی کا نشانہ بنے ہیں۔ مزید یہ کہ اس سال ہم کو وہ واقعہ بھی یاد آ رہا ہے، جب صرف ایک نسل قبل عملی طور پر پورے ایک نسلی گروہ کو صفحہ ہستی سے مایود کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ماضی کی ایک غصہ یا د کی مانند Holocaust کی فلموں کے سلسلے نے ہمیں دہلا کر رکھ دیا تھا، اور اب ہم 1979 کو یاد کرتے ہیں تو ہم میں سے کوئی بھی یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مستقبل میں ایسا واقعہ پھر نہیں ہوگا۔

مارویائی نوبل کمیٹی نے اس کو صحیح اور بر محل سمجھا کہ اسی برس دنیا کو Fridtjof Nansen کے الفاظ ”اپنے ہمسایے سے محبت ایک حقیقت پسندانہ پالیسی ہوتی ہے“ کی یاد دلانے کے لیے مدر ٹریسا کو انعام دیا جائے۔ مدر ٹریسا کے زندگی بھر کے کام کے بیان کے لیے ہم ایک مابہ نوبل انعام یافتہ (Albert Schweitzer) البرٹ شوائتسر کے نعرے ”زندگی کے لیے تعظیم“ کو یاد کرتے ہیں جس کو انہوں نے اپنے کام کے خزانے نعرے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

پچھلے برسوں میں کمیٹی نے ان مدبرین کو جنہوں نے ان حالات میں کام کیے ہیں جو ہماری ناقص دنیا میں وجود میں آ رہے تھے بارہا انعامات دیے ہیں۔ کمیٹی کے خیال میں انہوں نے تنازعات کے پُر امن حل تلاش کرنے میں، نئی جنگوں کو روکنے میں، اور ان جنگوں کو، جو شروع ہو چکی تھیں، بند کرنے میں زبردست کردار ادا کیا ہے۔

کمیٹی نے مثالیت پسندوں کو انعام دیا ہے جنہوں ایک بہتر دنیا کی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں جنگ بے مقصد اور ناقابل تصور ہوگی اور روایتی تدبیر ایک فالتو چیز ہوگا۔

یہ انعام ان لوگوں اور اداروں کو دیے گئے ہیں جنہوں نے بین الاقوامی انسان دوست کام اور تعاون کے ذریعے قوموں کی برادری میں اپنے حصے کے کام کیے ہیں، افریقہ، نوٹیل نے جس کے خواب دیکھے تھے۔ سائنس دانوں اور مستعد اداروں کو انعام دیا گیا تاکہ وہ معاشی اور سماجی محرومیوں، حتیٰ کہ بھوک اور افلاس کو مغلوب کر سکیں، جو دنیا میں بھائی چارے اور امن کے لیے مزید خطرہ ہیں۔ کمیٹی نے دنیا کے مختلف ملکوں کے مساوات اور برادری کے چمکیں لوگوں کو امن کے انعام سے نوازا ہے۔

اس نے انسانی حقوق کے ماہر افراد کو انعام دیا ہے، جنہوں نے مردوں اور عورتوں کو ان کی دیانت کی حفاظت اور، ان کے جسم اور روح کو ریاستی طاقت کی بد استعمالی سے بچانے میں مدد کی ہے۔

ایسے بہت سے راستے ہیں، ہم کو بھارتی چارے اور امن کے اپنے ہدف تک پہنچنے کے لیے جن کو ضرور تلاش کرنا چاہیے۔

مدرٹریا کو 1979 کا امن کا انعام دے کر کمیٹی نے ایک مرکوز نگاہ سوال اٹھایا ہے جو ہم کو ہر راہ میں درپیش ہوتا ہے: کیا سیاسی، سماجی یا سائنس کا کوئی دانش ورانہ کار عظیم، بین الاقوامی یا قومی سطح پر، خواہ وہ کتنا ہی اثر پذیر ہو، خواہ اس کے کارپردازان کتنے ہی مثالیت پسند اور اصولی کیوں نہ ہوں، ہمیں ریت پر بنی ہوئی عمارت کے سوا کچھ اور دے سکتے ہیں، جب تک کہ معمار عمارت بنانے سے پہلے مدرٹریا کے خیالات سے استفادہ نہیں کر لیتے۔

مدرٹریا البانیہ کی ایک رومن کیتھولک خاندان میں، یوگوسلاویہ کے شہر Skopje میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی یادوں کو کھنکھل کر بتاتی ہیں کہ صرف بارہ برس کی عمر میں انہوں نے مفلس لوگوں کے لیے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ چند برس بعد ان کو، مشنریوں کی زبانی، بنگال کے حالات کا پتا چلا، اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک مشنری کی حیثیت میں ہندوستان میں کام کریں گی۔ سولہ برس کی عمر میں انہوں نے Irish Lorena Order میں شمولیت اختیار کر لی، جس کی راہبائیں کلکتے میں ایک مشن اسٹیشن چلا رہی تھیں۔ 1929 سے 1946 تک انہوں نے اسی ادارے کے لڑکیوں کے اسکول میں تعلیم دینے کا کام کیا۔

1946 میں انہوں نے شہر کے غلامت بھرے علاقے میں مفلس لوگوں کی خدمت کرنی کے اجازت مانگی۔ اپنے قول کے مطابق انہوں نے اسے کام کے اندر ایک نیا کام سمجھا تھا۔

انھیں اس علاقے میں مفلسی اور غلاطت کے ڈھیروں پر مرتے ہوئے لادارٹ بیمار مرد اور عورتیں اور آوارہ پھرتے ہوئے ہزاروں یتیم بچے ملے جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔

ان لوگوں کے حالات دیکھ کر مدرٹریسا میں ان کے لیے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، جس میں انھوں نے اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ انھوں نے کانوٹ کی آرام دہ رہائش اور لڑکیوں کے فیشن ایبل اسکول کو خیر باد کہہ دیا۔ انھیں ان پس ماندہ علاقوں میں کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ 1948 میں ان کو Loreta Order کی وردی کے بدلے سستی ہندوستانی ساڑی پہننے کی بھی اجازت مل گئی اور نرسنگ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے اپنا نیا کام شروع کر دیا۔

پندرہ برس بعد، 1965 میں، مدرٹریسا کے Order کو پاپائے روم کی سرپرستی حاصل ہو گئی اور وہ دینی کن (Vatican) کی نمائندہ بن گئیں۔ گزرتے ہوئے برسوں کے دوران مشنری کے رفاہی کام میں اتنا اضافہ ہو گیا، جس کا کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ بعد میں بہت سی مقامی اور غیر ملکی خواتین جوق در جوق اس خدمت میں شامل ہوتی گئیں اور ان سب کو اس میں بھرتی کر لیا گیا۔ اس کو مرد و دھاروں کے ایک معاون ادارے کی مدد بھی حاصل ہوتی تھی۔ اس ادارے کی سرگرمیوں میں پس ماندہ علاقوں میں اسکول، یتیم بچوں کے لیے مکانات، چلتے پھرتے دوا خانے، کوڑھ کے علاج کے مراکز، قریب امرگ افراد کی قیام گاہ، غذائی فراہم کرنے والے باورچی خانے اور کارکنوں کی تربیت کے علاوہ اور بھی کام شامل تھے۔

عالیہ بریسوں میں اس Order کی سرگرمیاں بڑھ کر تیس سئے مکوں میں پھیل گئی تھیں، اگرچہ ان کی مرکز کی سرگرمیاں ہندوستان اور بنگلہ دیش ہی پر مرکوز تھیں۔ آج بھی، سماجی بہبود اور جان بچانے کے کام سے تقریباً سات ملین افراد مستفید ہوتے ہیں۔

مارویاتی نوٹیل کمیٹی یہ جان کر خوش ہے کہ اس Order کی سرگرمیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر ان سرگرمیوں کے لیے شماریلی اطلاعات پر انحصار نہیں کیا جاتا؛ کمیٹی نے ایسی شماریلی اطلاعات جمع یا تیار نہیں کی ہیں جن کی مدد سے دوسرے اداروں اور اس کی کارکردگی کا تقابل کیا جاسکے۔ انھوں نے بہت سے ایسے کام بھی کیے ہیں جن کو بہت احرام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ نہ کمیٹی نے دنیا میں جسمانی اور ذہنی مصائب کو دور کرنے کے لیے کام کرنے والے اداروں کے اور عوامی اداروں کے درمیان تعلقات پر کسی قسم کا غور کیا ہے۔

کمیٹی کے نزدیک وہ جذبہ ہی فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے جو اس نوعیت کے کام میں سرایت کر گیا ہے۔ مدرٹریسا کا ان کے ادارے میں یہی بنیادی اضافہ ہے جس کو انھوں نے بنایا ہے اور چلا رہی ہیں۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ لوگ جوق در جوق اس ادارے میں شامل ہونا چاہتے ہیں، اور یہی راز ہے جس کی بنا پر دنیا والے ان کے کام میں دلچسپی لیتے ہیں اور ان کا احرام کرتے ہیں۔ مدرٹریسا کا زندگی کے بارے میں بنیادی رویہ اور ان کی شخصیت کی خصوصیت اسی سے ابھرتی ہے۔

یہی ان کے عیسائی عقیدے کی بنیاد ہے۔ نوٹیل انعام کے پہلے اعلان کا انھوں نے ان الفاظ میں

جواب دیا تھا: ”میں اس انعام کو مغلسوں کی طرف سے قبول کرتی ہوں۔ یہ انعام دنیا کی مفلسی کا اعتراف ہے۔ یسوع مسیح نے فرمایا تھا: ”میں بھوکا ہوں، میں پرہیز ہوں، میں بے گھر ہوں؛ سو مغلسوں کی خدمت کے ذریعے میں ان کی خدمت کر رہی ہوں۔“

دراصل وہ محض اسی بات کو دہرا رہی تھیں جو وہ بارہا کہہ چکی ہیں: ”دراصل، مغلسوں کے جسم کے ذریعے ہم یسوع مسیح کے جسم کو چھو رہے ہوتے ہیں۔ مغلس کو کھانا کھلا کر ہم یسوع مسیح کی بھوک مٹا رہے ہوتے ہیں، ہم پرہیز یسوع مسیح کو کپڑے پہنا رہے ہوتے ہیں، بے گھر یسوع مسیح کو پناہ دے رہے ہوتے ہیں۔“ ایک بار اور انہوں نے کہا تھا، ”جب میں کسی کوڑھی کے زخم صاف کر رہی ہوتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے آقا کی تیمارداری کر رہی ہوں۔“ ہر انسان میں انھیں یسوع مسیح ہی نظر آتے ہیں اور یہی ان کی نگاہ میں انسان کو مقدس بناتا ہے۔

فرد اور افراد کے لیے احترام اور قدر و منزلت ان کے عمل کا ہالہ ہے۔ جب، سب سے زیادہ تنہا، قریب المرگ، لاوارث، دھتکارے ہوئے کوڑھیوں کو، وہ اور ان کی مددگار خواتین گرم جوش دردمندی سے ہاتھوں ہاتھ ملتی ہیں جس میں کسی قسم کے مفاد کا شائبہ بھی نہیں ہوتا، تو دراصل وہ انسان کے روپ میں یسوع مسیح کو دیکھ رہی ہوتی ہیں۔

وہ ہمیشہ اس بات کا بہت خیال رکھتی ہیں، اور اس پر خود عمل بھی کرتی ہیں کہ کسی مستحق کو دیے جانے والے تحفے، جو انسان ہونے کے ماتے، وصول کرنے والے کو احساسِ ذلت سے دوچار کر سکتے ہیں، بھائے جذبہ تفکر اور امن کے، تلخی اور دشمنی کا باعث بھی ہو سکتے ہیں۔

ان کے نزدیک دینے والے اور لینے والے کے درمیان ایسا رشتہ استوار ہونا چاہیے جو اس سے منسلک عام قسم کے تصوراتی امتیاز کو ختم کر دے۔ ان کی نظر میں لینے والا، جو عمومی معنوں میں لینے والا ہوتا ہے، دینے والا بھی ہوتا ہے، ایسا دینے والا جو سب سے زیادہ دیتا ہے۔ عطا کرنا۔ کسی شے کا اپنے پاس سے عطا کرنا ہی وہ عمل ہے جو سب سے زیادہ خوشی دیتا ہے، اور وہ شخص جس کو عطا کرنے کی اجازت ہو اسی کو سب سے زیادہ قیمتی تحفے ملتے ہیں۔ جہاں دیمروں کو گاہک یا لینے والے نظر آتے ہیں، ان کو اپنے کام کرنے والے ساتھی جیسے دکھائی دیتے ہیں، ایک رشتہ جو تشکر کی توقع کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ باہمی سمجھوتے اور احترام پر ہوتا ہے، ایک گرم جوش انسانی تعلق ہوتا ہے۔

وہ اور ان کی ساتھی کارکن بہنیں اپنے کام کو اپنی قلبی ذمہ داری سمجھتی ہیں، بوجھ نہیں۔ ان کے ”گھروں“ کے معانی کو جانے والے بہت سے لوگوں نے اپنے اولین تاثرات بیان کیے ہیں جو لبِ مزک پڑے قریب المرگ یا ان کے مراکز پر آکر، نکال باہر کیے گئے، مرنے والے کوڑھیوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان کے پہلے تاثر کے بھیا نک ہونے کی زیادہ توقع ہوتی ہے۔ مگر فوراً ہی، وہ خود کو ایسے پُر سکون اور ماضی کے ماحول میں پاتے ہیں جو ان کی ساتھی کارکن اپنے اطراف بنا لیتی ہیں۔ یہ ہے مددگار اور ان کی کارکن

بہنوں کی زندگی۔ ایک سخت محنت، افلاس اور طویل دنوں اور راتوں کی زندگی، ایک زندگی جس میں ان کی دوسری خوشیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی، سوائے ان مول خوشی کے۔

ایک ماریو یانی شاعر نے، جو مدرٹریسا کے مذہبی عقیدے کا سناٹا نہیں، ایک نظم لکھی تھی جس میں پوشیدہ شخصیت کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

جیون وہ سبک دے سکتا ہے جو ڈکھ بن نہ سکے
کسی کو سبک دینا وہ سبک ہے۔ جسے کوئی سمجھ نہ سکے
دنیا پر منڈلاتا اک ڈکھ۔ آنسو سے کپ کم ہوئے
اس کا گلیان ملے تو یہ بھی مانتی جیسا ہوئے
کون مہار سبکے گا یہ سب گور کنارے تک
کڑوے کڑوے آنسو رو کر

دن کے اتنے سارے گھنٹے سال کے اتنے دن؟

مدرٹریسا اور ان کی کارکن بہنوں کے نزدیک نہ گھنٹے ضائع ہوتے ہیں اور نہ دن مان کے لیے سارے سہرت کے لحاظ ہیں۔

مدرٹریسا کا سارا کام عیسائی عقیدے کے مطابق ہے۔ انھوں نے ان لوگوں کے لیے بھی کام کیا ہے جو ان کے ہم مذہب نہیں ہیں، وہ ہندوستانیوں کے درمیان ایک یورپی شخصیت ہیں، مگر یہ حقیقت کبھی ان کے آڑے نہیں آتی، اور شاید اس طرح کہنا درست ہوگا کہ ان کے جذبے سے کیے ہوئے کام خود اپنے راستے کے سارے پتھر بنا دیتے ہیں۔

1972 میں صدر جمہوریہ ہند نے ان کے بارے میں یہ الفاظ ادا کیے تھے:

”مدرٹریسا ان آزاد کردہ ریحوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے مذہب، نسل اور قومیت کی ہماری حدیں عبور کر لی ہیں۔ ہماری موجودہ پریشان حال دنیا میں، جو کبھی نہ ختم ہونے والے تنازعات اور نفرتوں کی وبا میں گھری ہوئی ہے، جو زندگیوں بچائی جاتی ہیں اور مدرٹریسا جیسے لوگ جس طرح کے کام کر رہے ہیں، وہ اپنی نوع انسان کے مستقبل کے لیے نئی امیدوں کی نوید ہیں۔“

ایک ہندوستانی صحافی نے حال ہی میں لکھا ہے: ”یہ ’بہنیں‘ جس چیلرے اور بردبار انداز میں، مراڑیوں میں ملبوس اور مقامی زبانوں سے اپنی واقفیت کے باعث۔ نہ صرف عیسائی خیر خواہی کی بہترین علامت

ہیں، بلکہ ہندوستانی تہذیب اور سماج میں، کوتم بدھ سے مہاتما گاندھی تک، پس ماندہ انسان کے لیے بڑے درویشوں، اہالیانِ بصیرت جیسے، اور اپنے بے حد و حساب کام کے باعث شیکسپیر کے الفاظ میں، شفقت کا معیار ہیں۔“

مدرٹریا، ذاتی طور پر، مال دار اور مفلس قوموں کے درمیان موجود خلیج کے درمیان لپا بنانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ دراصل انسانی وقار کے ان کے تصور نے یہ پل تعمیر کیا ہے، بغیر کسی قرض اور خرچ کے۔ فطری طریقے سے ہی انہوں نے اس پل کے ذریعے اس خلیج کو پار کیا ہے۔ ہندوستان میں لوگوں کے درمیان اس قسم کے مقابلے کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ لوگوں نے کھلے باز دلوں سے ان کا شکر مقدم کیا ہے، اور اس کے لیے ہندوستان لائق تحسین ہے۔

مختلف عقائد کے لوگوں میں ان کے پیغام کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ہمیں ان کی اپنی روایات میں ان سوالات کے وہیے ہی جوایات کا تجسس ملتا ہے جو ہمارے انسانی وجود کا حصہ ہیں۔

اپنے پیغامات کے ذریعے وہ انسان کے جہاں اندرون تک پہنچ سکتی ہیں اگر کسی اور مقصد کے لیے نہیں تو انسان کے اندر امکانات پیدا کرنے کے لیے یا کسی بھلائی کا سچ بولنے کے لیے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان امید کی دولت سے عاری ہوتا، اور امن کے لیے کام کرنا بے معنی ہوتا۔ یہ انسان کے، یعنی ان مردوں اور عورتوں کے بارے میں مدرٹریا کے اپنے تصور کے موافق ہوتا، اس لیے کہ وہ مسیح کی خدمت کرنا اور ان سے مزید قریب ہونا چاہتی ہیں۔

مدرٹریا نے ایک بار کہا تھا، ”ان میں برسوں میں لوگوں کے درمیان رہ کر کام کرنے کے دوران میں مجھے اس بات کا زیادہ احساس ہوا ہے کہ کسی انسان کا غیر ضروری ہوجانا ایسی خراب بیماری کے برابر ہے انسان کو جس کا کبھی تجربہ بھی نہیں ہو سکتا۔“ انھیں یقین ہے کہ آج کل کی خراب ترین بیماری کوڑھ یا سب وق نہیں، بلکہ یہ احساس ہے کہ اُس کی اب کسی کو ضرورت نہیں رہی، جس کو ہر شخص بے یار و مددگار چھوڑ دے۔ بالکل اسی قسم کے حالات کے، مفلسوں کے مفلس، لوگ پہلے انسان تھے جن کو مدرٹریا کی پناہ اور خلوص کی گرمی نصیب ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان لوگوں کو اپنے چاہے جانے کا احساس ہو اور ان کو دینا ہی احترام ملے جیسا کہ ایک باوقار انسان کو ملنا چاہیے۔

مدرٹریا اپنے اطراف کی دنیا میں، جیسی کہ نکلتے اور اور دوسرے شہروں کے بدترین پس ماندہ علاقوں میں پائی جاتی ہے، کام کرتی رہتی ہیں۔ غمزدہ مفلس اور دولت مند لوگوں میں، مفلس اور دولت مند ملکوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتیں۔ سیاست سے انھیں کبھی سروکار نہیں رہا ہے، مگر ان ہی مقاصد کے ساتھ معاشیاتی، سماجی اور سیاسی کام ان کی اپنی زندگی بھر کے کام سے مکمل طور پر ہم آہنگ رہا ہے۔

قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی کوششوں میں، ہمیں ان کے کام سے سبق حاصل کرنا چاہیے، جو وہ مصیبت میں گرفتار لوگوں کے لیے کرتی ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر امن کے لیے ہماری کوششیں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب وہ مفلس قوموں کی عہد داری کو بخروج نہ کریں۔ دولت مند قوموں کو اپنی تمام امداد مدرٹریا کے جذبے کے ساتھ دینی چاہیے۔

مارویاتی نوبل کمیٹی کے فیصلے کے اراکوں کی تحریک کے لیے عالمی بینک کے صدر رابرٹ میکنا مارا

(Robert MacNamara) کے مندرجہ ذیل الفاظ سے بہتر اور کیا جواز ہو سکتا تھا، ”مدر رزیا اس لیے نوٹیل امن انعام کی حق دار ہیں کہ وہ امن کو سب سے بنیادی انداز میں فروغ دیتی ہیں، یعنی انسانی وقار کے احترام کے اعتراف کے ذریعے۔“

ما ریاقی نوٹیل کمیٹی کے صدر نشین Professor John Sarhness کی ٹیلی

خطبہ

چوں ہم کہ اس جگہ نوٹیل امن انعام پر خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، میرا خیال ہے کہ ہمیں سینٹ فرانسس آف اسیسی (St. Francis of Assisi) کی دعا پر حنفی چاہیے جو مجھے ہمیشہ حیران کر دیتی ہے۔ ہم اس کو ہر صبح اپنے مقدس اجتماع میں پڑھتے ہیں، اس لیے کہ یہ ہم سب پر صادق آتی ہے، اور میں ہمیشہ متعجب ہوتی ہوں کہ چار پانچ ہزار برس قبل، جب سینٹ فرانسس آف اسیسی نے یہ دعا لکھی تھی، وہ ایسی ہی مشکلوں میں تھے جیسی کہ آج ہمیں درپیش ہے۔ ہم اس دعا کو اس لیے پڑھتے ہیں کہ یہ ہم پر بھی اتنی ہی موزوں ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میں سے کچھ کے پاس یہ دعا موجود ہے، لہذا، آئیے ہم سب مل کر دعا کریں:

”میرے آقا، مجھے اپنے امن کا واسطہ بنا، کہ جہاں نفرت ہو میں وہاں محبت لاؤں؛ کہ جہاں شط ہو وہاں میں وہاں مغفرت کا جذبہ لاؤں؛ کہ جہاں نا اتفاق ہو میں وہاں ہم آہنگی لاؤں؛ کہ جہاں قلعہ ہو میں وہاں سچ لاؤں؛ کہ جہاں شبہ ہو میں وہاں عقیدہ لاؤں؛ کہ جہاں نا امیدی ہو میں وہاں امید لاؤں؛ کہ جہاں اندھیرے ہوں میں وہاں روشنی لاؤں؛ کہ جہاں افسردگی ہو میں وہاں خوشی لاؤں۔“

میرے آقا، مجھے توفیق دے کی میں تسلی دوں، بجائے اس کے کہ تسلی کا متمنی رہوں؛ کہ میں سمجھوں بجائے اس کے کہ سمجھا جاؤں؛ کہ میں محبت دوں بجائے اس کے کہ مجھ سے محبت کی جائے؛ اس لیے کہ خود کو فراموش کرنے سے ہی کوئی خود کو پاتا ہے؛ کہ معاف کرنے ہی سے معاف کیا جاتا ہے؛ کہ موت ہی سے کوئی ابدی زندگی میں جاگتا ہے۔“

ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، اس موقع کے لیے جو آج ہم کو میسر ہے، امن کے اس تحفے کے لیے، جو ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم اس امن میں زندہ رہیں، اور اس پر بھی کہ یسوع مسیح انسان کے روپ میں مغلوں کو اچھی خبر پہنچانے آئے ہیں۔ خدا ہوتے ہوئے بھی وہ ہر بات میں انسان کی طرح ہیں سوائے گناہ کے، اور انہوں نے واضح الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ وہ خوش خبری دینے کے لیے آئے ہیں۔ خوش خبری یہ تھی کہ امن سب کے لیے ہے، اور یہی ہم سب کی خواہش بھی ہے۔ یعنی سکون قلب اور خدا کو یہ دنیا اتنی پسند تھی کہ اس نے اپنے بیٹے کے حوالے کر دی یہ ایک عطا تھی ایسی جس کے بارے میں یہ تک کہا جاسکتا ہے کہ خدا کو بھی دکھ

ہوا تھا، اس لیے کہ وہ دنیا سے اتنا پیار کرتا تھا کہ اپنے بیٹے کو عطا کر دی، اور اس نے انھیں کنواری مریم کو عطا کر دیا، اور مریم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟

جیسے ہی وہ ان کی زندگی میں آئے وہ فوراً ہی یہ خوش خبری دینے چلی گئیں، اور جوں ہی وہ اپنے عم زاد کے گھر پہنچیں، بچہ نو زائیدہ بچہ۔ ایلیز بیچہ کے رحم میں بچہ خوشی سے اٹھ اٹھ پڑا۔ وہی ننھوہ بچہ، اور امن کے پہلے پیغمبر۔ ان سب نے امن کے شہزادے کو پہچان لیا تھا اور قرار کیا کہ یسوع مسیح تمہارے اور میرے لیے خوش خبری لے کر آئے ہیں۔ اور گویا کہ یہ کافی نہ تھا انسان بن جانا کافی نہ تھا تو انھوں نے مسیح پر انتقال کیا، اس عظیم محبت کو دکھانے کے لیے، تمہارے لیے اور میرے لیے اور کوڑھی کے لیے، بھوک سے مرتے ہوئے انسان کے لیے، برہنہ انسان کے لیے، صرف کلکتے ہی کی زمین پر نہیں بلکہ افریقا کی، لندن کی، اور اوسلو کی زمین پر اور اسرار کیا کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کریں، اسی طرح جیسے وہ ہم سے محبت کرتے ہیں۔ ہم انجیل میں صاف صاف پڑھتے ہیں اس طرح محبت کرو جس طرح ہم نے تم سے محبت کی ہے۔ جیسے میں تم سے محبت کرتا ہوں جیسے کہ [آسمانی] باپ نے مجھ سے محبت کی میں تم سے محبت کرتا ہوں اور جتنی شدت سے [آسمانی] باپ نے اس سے محبت کی، اس نے اس کو ہمیں دے دیا، اور ہم ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں، ہمیں بھی اتنا ہی دینا چاہیے کہ ہم کو دکھ ہونے لگے۔ صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ میں خدا سے محبت کرتا ہوں، مگر میں اپنے ہمسایے سے محبت نہیں کرتا۔ سینٹ جان کہتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو اگر تم یہ کہتے ہو کہ تم خدا سے محبت کرتے ہو جب کہ تم اپنے ہمسایے سے محبت نہیں کرتے۔ تم خدا سے کس طرح محبت کر سکتے ہو جس کو تم دیکھ نہیں سکتے، اگر تم اپنے ہمسایے سے محبت نہیں کرتے جس کو تم دیکھ سکتے ہو، چھو سکتے ہو جس کے ساتھ رہتے ہو، لہذا ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ محبت کتنی ہو تو دکھ دیتی ہے۔ اس نے یسوع مسیح کو دکھ دیے کہ وہ ہم سے محبت کرتے تھے اور اس یقین کے لیے کہ ہم اس کی عظیم محبت کو یاد رکھتے ہیں، اس نے خود کو زندگی کی غذا بنا دیا اس کی محبت کی، ہماری بھوک کو مٹانے کے لیے۔ خدا کے لیے ہماری بھوک اس لیے ہے کہ ہم محبت کے لیے خلق کیے گئے ہیں۔ ہم اس کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ ہم اس لیے خلق کیے گئے ہیں کہ ہم محبت کریں اور ہم سے محبت کی جائے، اور پھر وہ آدمی بن گئے تاکہ ہم ان سے محبت کریں اور وہ ہم سے محبت کریں۔ وہ خود بھوکے، برہنہ، بے گھر، بیمار، قیدی، تنہا، غیر مطلوب بن گئے اور انھوں نے کہا: تم نے میرے ساتھ یہ کیا ہے۔ ہماری محبت کے بھوکے ہو، مگر ہمارے لوگوں کی بھوک کیسی ہے۔ ہمیں اسی بھوک کو تلاش کرنا ہے، یہ خود ہمارے گھر میں ہی ہوگی۔

میں نہیں بھول سکتی جب مجھے ایک گھر میں جانے کا موقع ملا تھا، جہاں بیٹوں اور بیٹیوں کے بوڑھے ماں باپ تھے وہ لوگ جنہیں ایک ادارے میں ڈال کر شاید بھول گئے تھے۔ میں وہاں گئی، اور میں نے دیکھا کہ اس گھر میں ان کے واسطے سب کچھ موجود تھا، ہر طرح کی خوب صورت چیزیں تھیں، مگر ہر شخص دوا دارے کی طرف ہکتا رہتا تھا۔ میں نے کسی ایک کے بھی چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ میں نے ایک بہن سے پوچھا:

ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ یہاں سب کچھ ہے مگر لوگ دروازے کی طرف کیوں نکلتے رہتے ہیں؟ یہ مسکراتے کیوں نہیں؟ میں تو لوگوں کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کی اتنی عادی ہوں، مرتے ہوئے لوگوں کے لبوں پر بھی۔ پھر انہوں نے کہا: یہ تقریباً ہر روز ہوتا ہے کہ وہ انتظار کرتے ہیں، امید کرتے ہیں کہ ان کا بیٹا یا بیٹی ان سے ملنے آئے گی۔ ان کو دکھ ہوتا ہے کہ وہ بھلا دیے گئے ہیں۔ تم نے دیکھا کہ ایسے میں محبت کا کام آتی ہے، کہ افلاس ہمارے گھر کے اندر ہے، حتیٰ کہ محبت سے بے توجہی بھی۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے خاندان میں بھی کوئی خدائی محسوس کر رہا ہو، بیمار ہو، پریشان ہو کہ یہ ہر شخص کے لیے مشکلوں کے دن ہیں۔ تو کیا ہم موجود ہیں؟ انے والوں کے لیے، ماں اپنے بچوں کے لیے؟

میں بہت حیران تھی یہ دیکھ کر کہ مغرب کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں نشے کی عادت میں گرفتار ہیں۔ میں نے کوشش کی وجہ معلوم کرنے کی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، تو جواب یہ ملا تھا کہ خاندان میں کوئی ان کا انتظار نہیں کرتا۔ ماں باپ دونوں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ نوجوان والدین کسی ادارے میں ہوتے ہیں اور بچہ مڑکوں پر کسی اور کام میں مصروف ہوتا ہے۔ ہم امن کی بات کر رہے ہیں۔ ایسی ہی چیزیں امن کو تھوڑا بولا کرتی ہیں۔ مگر میرے خیال میں استقامت حاصل امن کے لیے سب سے تباہ کن ہے اس لیے کہ یہ مداہ راست جنگ ہے، قتل ہے مداہ راست خود ماں کے ہاتھوں قتل۔ اور ہم مقدس کتاب میں لکھا دیکھتے ہیں: اگر ماں اپنے بچے کو بھول بھی جائے، پھر بھی میں تم کو نہیں بھولوں گا۔ میں نے تم کو اپنے ہاتھ کی پتیلی میں بنایا ہے۔ اس نے ہمیں اپنے ہاتھ کی پتیلی میں خلق کیا ہے، ہم اس سے اتنے قریب ہیں جیسے خدا کے ہاتھ میں ایک مازائیدہ بچہ۔ اور یہی، ابتدائی جملہ مجھ پر بہت اثر کرتا ہے کہ اگر ایک ماں کچھ ناممکن چیز بھول جائے اگر وہ تمہیں بھول جائے تو بھی میں تمہیں نہیں بھولوں گا۔ تو آج سب سے بڑی تباہی استقامت حاصل ہے۔ ہم یہاں کھڑے ہیں اس لیے کہ ہمارے والدین کو ہماری خواہش تھی۔ اگر ہمارے والدین ہمارے ساتھ بھی وہی کرتے تو آج ہم یہاں نہ ہوتے۔ ہمیں بچوں کی خواہش ہے، ہم ان سے محبت کرتے ہیں، مگر ان لاکھوں کا کیا ہوگا۔ بہت سے لوگ بچوں کے لیے پریشان ہیں، ہندوستان میں، افریقہ میں جہاں بے شمار بچے مر جاتے ہیں، ماں کافی فدایت سے، بھوک وغیرہ سے، مگر لاکھوں اپنی ماؤں کی مرضی سے مر رہے ہیں۔ تو آج کی سب سے بڑی تباہ کاری یہی ہے۔ اس لیے کہ اگر ایک ماں اپنے بچے کو قتل کر سکتی ہے۔ تو مجھے تم کو، یا تمہیں مجھ کو قتل کرنے میں کیا باقی رہ گیا ہے۔ کہ ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں ہے۔ میں یہی اپیل ہندوستان میں کرتی ہوں، ہر جگہ یہی اپیل کرتی ہوں: کہ بچوں کو دنیا میں آنے دیجیے، یہ بچوں کا سال ہے تو ہم ان کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ میں نے سال کی ابتدا میں کہا تھا، ہر جگہ یہی کہا تھا، کہ اس برس کو ہمیں اس طرح منانا چاہیے کہ ہم ہر بچے کی، جو پیدا ہو چکا ہے یا پیدا ہونے والا ہے، خواہش کریں۔ اب تو سال بھی ختم ہونے والا ہے، تو کیا ہم نے واقعی پیدا، یا پیدا ہونے والے بچوں کی خواہش کا اظہار کیا ہے؟ میں آپ کو کچھ خوف ناک باتیں بتاتی ہوں۔ ہم ایک استقامت سے دوسرے استقامت تک لڑ رہے ہیں، ہم نے بہت سی جانیں

بچائی ہیں، ہم نے کیننگ، اسپتالوں اور پولیس اسٹیشنوں تک اپنی آواز پہنچائی ہے، مہربانی کرو، بچوں کو مت مارو، ہم لینے کے لیے تیار ہیں۔ دن کے اور رات کے ہر کھٹے کوئی نہ کوئی ہوتا ہے، بے شمار بن بیہوش ماؤں سے کہو، ہم تمہیں پناہ دینے کے لیے تیار ہیں، ہم تمہارے بچے کو پال لیں گے، ہم اس کو گھر بھی مہیا کریں گے۔ بہت سے خاندان، جن کے ہاں اولاد نہیں، بچے چاہتے ہیں، بچے ہمارے لیے خدا کی نعمت ہیں۔ ہم ایک اور بھی اچھی بات کر رہے ہیں۔ ہم فقیروں کی، اپنے کورج کے مریضوں، جھونپڑیوں والوں، سڑک کنارے رہنے والوں، اور فیملی پلاننگ کرنے والوں کی تربیت بھی کر رہے ہیں۔

اور صرف کلکتے میں چھ برسوں میں سب کچھ کلکتے میں ہی ہوتا ہے ان خاندانوں میں جن کے ہاں بچے ہوتے ہیں، 61,273 کم بچے پیدا ہوئے ہیں اس لیے کہ انہوں نے پریز کے ذریعے فطری فیملی پلاننگ کی ہے، خود پر ضبط ہے، ایک دوسرے سے محبت کی خاطر۔ ہم ان کو حرارت مانپنے کے آلے کی تربیت دیتے ہیں جو بہت اچھی چیز ہے، بہت آسان، اور ہمارے مفلس لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ اور آپ کو پتا ہے کہ وہ ہم سے کیا کہتے ہیں؟ ہمارا خاندان صحت مند ہے، ہمارا خاندان یکساں ہے، اور ہم جب بھی چاہیں بچے ہو سکتے ہیں۔ کتنا آسان ہے سڑکوں پر رہنے والے، وہ فقیر اور میرے خیال میں، جب ہمارے یہ لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں تو ہم آپ کیوں نہیں کر سکتے، کہ ہم ان زندگیوں کو، جنہیں خدا نے ہم میں اتارا ہے، تباہ نہ کریں۔

مفلس لوگ بہت بڑے لوگ ہیں۔ وہ ہمیں بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ ایک دن ان میں سے ایک شکر یہ ادا کرنے آیا تھا اور کہا تھا: تم لوگ جنہیں نے کونارپن کی قسم کھائی ہے، ہمیں فیملی پلاننگ سکھانے کے لیے بہترین لوگ ہو۔ اس لیے کہ ایک دوسرے کی محبت میں خود پر قابو رکھتے ہو۔ میرے خیال میں انہوں نے نہایت خوب صورت جملہ ادا کیا ہے۔ اور میں وہ لوگ ہیں جن کے پاس شاید نہ کھانے کو ہے نہ رہنے کے لیے جگہ، مگر یہ عظیم لوگ ہیں۔ مفلس حیرت انگیز لوگ ہوتے ہیں۔ ایک شام ہم باہر گئے اور سڑک پر سے چار افراد کو ساتھ لے آئے۔ ان میں سے ایک [عورت] بڑی خراب حالت میں تھی۔ میں نے بہنوں سے کہا: تم دوسرے تین کا خیال رکھو، میں اس کا خیال رکھوں گی جو سب سے زیادہ بڑی حالت میں ہے۔ تو میں نے اس کے ساتھ وہ کچھ کیا جو میں کر سکتی تھی۔ میں نے اس کو ہسٹری میں لٹایا، تو اس کے چہرے پر کتنی حسرت مسکراہٹ تھی۔ اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ پکڑا، اور جوں ہی اس نے صرف ایک لفظ منہ سے نکالا، شکر یہ، اور وہ انتقال کر گئی۔

اس وقت میں اپنے ضمیر کا تجزیہ کرنے پر مجبور ہو گئی اور میں نے خود سے سوال کیا کہ اگر میں اس عورت کی جگہ ہوتی تو کیا کرتی۔ اور میرا جواب بالکل مادہ تھا۔ میں پہلے اپنے بارے میں کچھ کنا چاہتی، میں نے کہا ہوتا کہ میں بھونکی ہوں، میں مر رہی ہوں، مجھے مردی لگ رہی ہے، درد ہو رہا ہے، بس میں کچھ کیا ہوا، مگر اس نے تو مجھے بہت کچھ دے دیا ہے اس نے مجھے شکرانے کی محبت دی ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے جان دی۔ اس آدمی کی طرح جس کو ہم نے گھر سے اٹھایا تھا، جس کے آدھے جسم کو کیڑے کھا چکے تھے، ہم جس کو

اپنے گھر اٹھا لائے تھے۔ [اس نے کہا تھا] میں سڑک پر ایک جانور کی طرح جی رہا تھا، مگر اب میں ایک فرشتے کی طرح مروں گا، جس کی نگہداشت کی گئی ہے، جس سے محبت کی گئی ہے۔ اس کی عظمت کتنی اچھی لگ رہی تھی جو مرتے وقت اس طرح کی باتیں کر رہا تھا، جو مر سکتا تھا کسی پر الزام دہرے بغیر، کسی کو بد دعا دیے بغیر، کسی سے بھی اپنا تقاضا کیے بغیر۔ ایک فرشتے کی طرح۔ یہی میرے لوگوں کی عظمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یسوع مسیح کے کہے پر یقین رکھتے ہیں جب انہوں نے کہا تھا: میں بھوکا تھا، میں بد ہشت تھا، میں بے گھر تھا، میں غیر مطلوب تھا، غیر محبوب تھا، ادوارث تھا۔ تم نے یہ سب کچھ مجھ کو دیا ہے۔

میرے نزدیک ہم اصلی سماجی کارکن نہیں ہیں۔ لوگوں کی نظروں میں ہم سماجی کام کرتے نظر آتے ہوں مگر ہم لوگ دراصل دنیا بھر کے دلوں کی فکر ہیں۔ ہم دن کے چوبیس گھنٹے یسوع مسیح کا دل چھوتے رہتے ہیں۔ ہم چوبیس گھنٹے ان کے سامنے حاضر رہتے ہیں، جیسے ہم اور آپ۔ آپ خدا کی اس موجودگی کو اپنے خاندان میں لانا چاہتے ہیں، اس لیے کہ خاندان اکٹھا دعا کرتا ہے، اکٹھے رہتا ہے۔ میرے خیال میں ہم کو اپنے خاندان میں امن پیدا کرنے کے لیے بہوں اور بندوقوں کی ضرورت نہیں جس ہم اکٹھے رہیں، ایک دوسرے سے محبت کریں، امن لائیں، خوش رہیں، سب گھر میں ایک ساتھ رہنے کی طاقت پیدا کریں۔ اس طرح ہم دنیا کی تمام خرابیوں کو دور کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

اتنے ذکھ تھ، اتنی غرتیں تھ، اتنی مصیبتیں تھ، اور ہم اپنی دعا سے، گھر میں اپنی قربانیوں سے شروعات کر رہے ہیں۔ محبت گھر سے شروع ہوتی ہے، یہ نہیں کہ ہم کتنی محبت کرتے ہیں، بلکہ ہم جو کام کرتے ہیں کتنی محبت سے کرتے ہیں۔ یہ تو صرف قادر مطلق خدا کی لیے ہی ہے ہم کتنا کرتے ہیں اس سے فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ وہ لا انتہا ہے، مگر ہم اس عمل میں کتنی محبت شامل کرتے ہیں؟ ہم کسی فرد کی خدمت کر کے اس کی کیا خدمت کرتے ہیں؟

کچھ دن پہلے کلکتے میں چینی حاصل کرنا بہت دشوار ہو گیا تھا۔ ہمیں پتا نہیں کہ یہ بات بچوں تک کس طرح پہنچی گئی۔ چار برس کے ایک ہندو لڑکے نے اپنے گھر جا کر والدین سے کہا میں تین دن تک چینی نہیں استعمال کروں گا، اپنے حصے کی چینی میں مدرٹریا کے بچوں کو دوں گا۔ تین دن بعد بچے کے والدین نے ہمارے گھر آئے۔ میں ان سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی، بچہ تو میرا نام بھی لے نہیں سکتا تھا، مگر اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کیا کرنے آیا ہے۔ پس اتنا جانتا تھا کہ وہ ہمیں اپنی محبت میں شامل کرنا چاہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ سب سے بہت محبت ملی ہے۔ جب سے میں یہاں آئی ہوں سب مجھے محبت، اصلی محبت سے گھیرے ہوئے ہیں۔ میں محسوس کر سکتی ہوں کہ ہندوستان کا ہر فرد، فریقہ کا ہر فرد مجھ سے بہت قریب ہے۔ اور آج اپنی بہن کی کتھا سنا کر مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ میں کانوٹ بہنوں کے ساتھ ہوں تو بالکل ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا میں کلکتے میں اپنی بہنوں کے ساتھ ہوں۔ اس جگہ بھی، بالکل اپنے گھر کی طرح۔

اور میں یہاں آپ سے باتیں کر رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ یہاں کسی مفلس کو تلاش کریں،

سب سے پہلے اپنے گھر میں۔ اور محبت نہیں سے شروع کریں۔ اپنے لوگوں کے واسطے خوش خبری بن جائے۔ اپنے ہمسایے کے بارے میں معلوم کیجیے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں؟ مجھے ایک ہندو خاندان کا عجیب تجربہ ہوا تھا، جن کے آٹھ بچے تھے۔ ایک صاحب میرے گھر آئے اور انہوں نے کہا کہ ایک خاندان ہے جس میں آٹھ بچے ہیں اور کئی دنوں سے انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا ہے، کچھ کیجیے۔ میں کچھ چاول لے کر فوراً ان کے گھر پہنچی۔ میں نے بچوں کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھوک ماری رہی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ آپ نے کبھی بھوک دیکھی بھی ہے مگر میں نے تو کئی بار دیکھی ہے۔ خاتون خانہ نے چاول لیے لیا، اس کو دو حصوں میں بانٹا اور پھر وہ باہر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں چلی گئی تھیں، اور تم نے کیا کیا ہے۔ اور اس نے مجھے بالکل سادہ سا جواب دیا۔ وہ بھی بھوکے ہیں۔ مجھے جھینکا مانگا، یہ جان کر کہ وہ لوگ بھی بھوکے ہیں۔ کون لوگ ہیں وہ ایک مسلمان خاندان جنہیں وہ جانتی تھی۔ اس شام میں زیادہ چاول نہیں لائی تھی اس لیے کہ میں جانتی تھی وہ جسے داری کے لطف کا لطف اٹھائیں۔ مگر وہ بچے، جن کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے، اپنی ماں کے ساتھ خوش ہو رہے تھے اس لیے کہ اس کے پاس دینے کے لیے محبت تھی۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا، اس طرح محبت شروع ہوتی ہے۔ گھر سے۔ میں آپ لوگوں کو پسند کرتی ہوں۔ آپ نے جو کچھ مجھے دیا ہے میں اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ میرے لیے یہ بہت بڑا تجربہ تھا۔ میں ہندوستان جاری ہوں اور امید ہے کہ پندرہ تاریخ تک واپس آؤں گی اور امید ہے کہ آپ کے لیے محبتیں لے کر آؤں گی۔

میں جانتی ہوں کہ آپ نے اپنے فالتو مال میں سے نہیں دیا ہے، مگر آپ نے اس وقت تک نہیں دیا جب تک آپ کو چوٹ نہیں لگی تھی۔ آج ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، میں اتنی حیران تھی، ان بچوں کے لیے جو بھوکے تھے، کتنی خوشی تھی وہ۔ ان جیسے بچوں کے لیے محبت کی، دیکھ بھال کی اور نرمی کی ضرورت ہے، جیسی انہیں اپنے والدین سے ملتی ہے۔ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملا، اور ایک دوسرے کے بارے میں معلومات سے ہم بہت قریب ہوئے ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ ہم ہندوستان اور افریقا کے بچوں کی مدد کریں گے، ہم پوری دنیا کے بچوں کی مدد کریں گے، اس لیے کہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ہماری بہنیں پوری دنیا میں کام کر رہی ہیں۔ اور اس انعام سے جو امن کے انعام کے طور پر ملا ہے، میں بہت سے لوگوں کے لیے گھر تعمیر کروں گی، جن کے گھر نہیں ہیں۔ اس لیے کہ میں اس پر یقین رکھتی ہوں کہ محبت گھر سے شروع ہوتی ہے، اور اگر ہم ناداروں کے لیے گھر بنا سکیں تو، میرے خیال میں، زیادہ سے زیادہ محبت پھیلے گی۔ اور اس طرح کے محبت بھرے میل ملاپ کے ذریعے ہم امن لاسکیں گے، جو ناداروں کے لیے خوش خبری ہوگی۔ سب سے پہلے اپنے خاندان کے نادار، ہمارے ملک کے نادار، پھر دنیا کے نادار۔

اور یہ سب کرنے کے لیے، ہماری بہنوں اور ہماری زندگیوں، سب کو اپنی دعاؤں میں بننا پڑے گا۔

انھیں یسوع مسیح کے ساتھ بنا جائے گا کہ سمجھ سکیں اور اس میں شریک ہو سکیں۔ چوں کہ آج دُکھ بہت ہیں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ یسوع مسیح کا جذبہ پھر سے پیدا ہو رہا ہے۔ اور ہم اس جذبے کو بانٹنے کے لیے موجود ہیں، لوگوں کے دُکھوں کو بانٹنے کے لیے۔ پوری دنیا میں، صرف نادار ملکوں ہی میں نہیں، مگر مجھے مغرب کی مفلسی کو دور کرنا بہت مشکل معلوم ہوا ہے۔ جب میں کسی کو سڑک پر سے بھوکا اٹھاتی ہوں تو میں اس کو ایک پلیٹ چاول اور روٹی کا ایک ٹکڑا دیتی ہوں، اور اسے مطمئن کرتی ہوں۔ میں نے وہ بھوک منادی ہے۔ مگر ایک انسان جس کو باہر نکال دیا گیا ہے، جو غیر مطلوب ہے، بے محبت، خوف زدہ۔ جس کو سماج باہر کر دیا گیا ہے ایسی مفلسی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے، اور اتنی ہوتی ہے کہ میں اس کو بہت مشکل پاتی ہوں۔ ہماری کمپنیاں مغرب میں اس قسم کے لوگوں کے لیے کام کر رہی ہیں۔ تو آپ کو ہمارے لیے ضرور دعا کرنی چاہیے کہ ہم وہ خوش خبری دے سکیں، مگر ہم آپ کے بغیر وہ کام نہیں کر سکتے، آپ کو اپنے ملکوں میں خود کرنا ہوگا۔ آپ کو ناداروں کو پہچاننا ہوگا، ممکن ہے کہ یہاں کے لوگوں کے پاس ماڈی چیزیں ہوں، ہر چیز ہو، مگر میں سمجھتی ہوں کہ اگر ہم سب اپنے گھروں میں دیکھیں تو ہمیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکمانے میں کتنی مشکل ہوتی ہے، اور یہ بھی کہ ہم محبت کی ابتدا ہوتا ہے۔

تو آئیے، ہم سب ایک دوسرے سے مسکرا کر ملیں، اس لیے کہ مسکنا ہر محبت کی ابتدا ہوتی ہے، اور ایک بار ہم ایک دوسرے سے محبت کرنا شروع کر دیں، تو ظاہر ہے کہ ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں اس لیے آپ دعا کریں، ہماری بہنوں کے لیے، اور میرے لیے، اور ہمارے بھائیوں کے لیے، اور ہمارے ساتھی کارکنوں کے لیے جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں کہ ہم خدا کی نعمتوں کے وفا دار ہیں، اس سے محبت کے لیے اور آپ کے ہم راہ اس کی خدمت کے لیے۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے، ہم نہیں کر سکتے تھے اگر آپ نے ہماری دعاؤں میں دینے کے اس جاری عمل میں اپنے تجنوں کے ساتھ شرکت نہ کی ہوتی۔

مگر میں نہیں چاہتی کہ آپ مجھے اپنے اموال فراہاں میں سے دیں، میں چاہتی ہوں کہ آپ تکلیف ہونے تک دیتے رہیں۔

مجھے ایک آدمی نے چند روز قبل بھیجے جو میں بس سے بستر سے لگا ہوا ہے۔ وہ صرف اپنے دلہنے ہاتھ کو حرکت دے سکتا ہے۔ اور اس کی پسندیدہ ساتھی تمباکو نوشی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں ایک ہفتہ تمباکو نوشی نہیں کروں گا اور تم کو یہ ذرا بھیج رہا ہوں۔ اس کے لیے یہ کتنی بڑی قربانی رہی ہوگی، مگر دیکھیے کتنی خوب صورت ہے یہ مہربانی، کس طرح اس نے دُکھوں میں شرکت کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے روٹی خریدی اور ان کو دی جو بھوکے تھے۔ خوشی دونوں جانب تھی۔ ایک خوشی لے رہا تھا اور دوسرا خوشی دے رہا تھا۔ یہ میرے اور آپ کے درمیان ہے یہ خدا کی دی ہوئی نعمت ہے کہ ہم محبت کو آپس میں بانٹ سکتے ہیں۔ اور ہمیں اس کو اسی طرح چھوڑ دینا چاہیے جیسا کہ یسوع مسیح کے لیے تھا۔ آئیے، ہم ایک دوسرے کو اسی طرح پیار کریں جس طرح انھوں [یسوع مسیح] نے ہم سے محبت کی تھی۔ آئیے ہم ان سے غیر متقسم محبت کریں۔ اور ان سے محبت کی خوشی

میں ہم ایک دوسرے کو کچھ دیں، خاص کر اب کہ کرمس اتنا قریب ہے۔ آئیے ہم اپنے دلوں کو یسوع مسیح کی محبت کی خوشی سے لبریز کر لیں۔ ہم ان سب کو اس خوشی میں شریک کریں جن سے ملاقات ہو اور یہ دیکھتی ہوئی خوشی اصلی ہو اس لیے کہ کوئی وجہ نہیں کہ یسوع مسیح کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم خوش نہ ہوں۔ یسوع مسیح ہمارے دلوں میں ہیں، ناداروں کے دلوں میں ہیں ہم جن سے ملتے ہیں، اُن مسکراہٹوں میں ہیں جو ہم دیتے ہیں اور اُن مسکراہٹوں میں ہیں جو ہمیں ملتی ہیں۔ آئیے ہم عہد کریں کہ اب کوئی بچہ غیر مطلوب نہیں ہوگا، کہ ہم سب سے مسکراتے ہوئے ملیں، خاص کر اس وقت بھی جب مسکرانا مشکل ہو۔

میں اس وقت کو کبھی نہیں بھول سکتی جب ریاست ہائے متحدہ کی مختلف یونیورسٹیوں سے چودہ کے قریب پروفیسر کلکتے میں ہمارے گھر تشریف لائے تھے۔ تب ہم باتیں کر رہے تھے کہ قریب امرگ لوگوں کے لیے مخصوص گھروں میں گئے تھے۔ کلکتے میں قریب امرگ لوگوں کے لیے ایک گھر ہے جس میں صرف کلکتے کی سڑکوں سے اٹھائے گئے 36,000 داخل ہوئے تھے ان میں سے 18,000 افراد کو خوب صورت موت نصیب ہوئی اور وہ اپنے خدا کے پاس چلے گئے۔ وہ سب پروفیسر ہمارے گھروں میں آئے اور ہم نے باتیں کیں محبت کی، دروہندی کی۔ تب ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا، مدرائیں کوئی ایسی بات بتائیے جس کو ہم ہمیشہ یاد رکھیں۔ میں نے ان سے کہا، ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیے اور اپنے اہل خاندان کو وقت دیجیے۔ پھر ایک اور مہمان نے مجھ سے پوچھا، کیا آپ مثلاً دی شدہ ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں، مگر بسا اوقات میں یسوع مسیح کی طرف دیکھ کر مسکرانے کو بہت مشکل پاتی ہوں، اس لیے کہ وہ کبھی کبھی بہت مطالبہ کر سکتے ہیں۔ یہ واقعی سچ ہے، یہی وہ مرحلہ ہے جہاں محبت سچ میں آجاتی ہے، جب مرحلہ توجہ طلب ہو جاتا ہے پھر بھی ہم ان کی طلب کو خوشی سے انھیں دے سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے آج کہا ہے کہ اگر میں جنت میں اور کسی وجہ سے نہیں جاسکی، تو کم از کم اس شہرت کی وجہ سے ضرور جاؤں گی جس نے مجھے پاک اور قربان کر دیا ہے اور واقعی مجھے جنت میں جانے کے لیے تیار کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنی زندگی بہت خوب صورتی سے گزارنی چاہیے، اس لیے کہ یسوع مسیح ہمارے ساتھ ہیں اور وہ ہم سے محبت کرتے ہیں، بڑی بڑی باتوں کی وجہ سے نہیں، محبت بھری چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے۔ اس لیے ماروے محبت کا ایک گھونسلہ بن جاتا ہے، اور یہ کتنا اچھا ہے کہ یہاں سے امن کا ایک مرکز دیا جا رہا ہے کہ ہمیں سے ایک مائزائیدہ بچے کی زندگی کی خوشی برآمد ہو رہی ہے۔ اگر آپ دنیا میں ایک مشعل بن جاتے ہیں، تب واقعی نوبیل امن انعام ماروے کی عوام کی جانب سے ایک تقسیم تحفہ ہوگا۔

خدا آپ سب کو اپنی لازوال نعمتوں سے مالا مال کرے۔



محمد انوار السادات

مناخم بیگن اعلانِ تجلیل

جلالت آباد، عزت آباد، خواتین و حضرات!

نویٹل کمیٹی نارویائی نے مصر اور اسرائیل کے درمیان امن کے لیے ہونے والے دو معاہدوں میں مصر لینے کے عوض، جن پر 17 ستمبر 1978 کو کمپ ڈیوڈ میں دستخط ہوئے تھے مصر کے صدر انوار السادات اور اسرائیل کے وزیر اعظم مناحم بیگن کو 1978 کا امن انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

امن انعام کی تاریخ کے پچھلے تقریباً اسی برس میں کیا جم نے اس جیسی تقریب دیکھی تھی، جیسی کہ شاہ Haukon پنجم کے قدیم تلے Akershus میں واقع ہوئی تھی، جنگ اور بد امنی کی یادوں کے ساتھ جس کا ذکر ہماری مرز میں کے روزنامے میں کیا گیا تھا۔

امن انعام کی تاریخ میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ نویٹل کمیٹی نے پریشان اور تباہ حال مشرق وسطیٰ کے دو مدبرین مملکت کو انعام دیے جانے کے لیے موزوں سمجھا ہو۔

نہ کبھی اس انعام کو معاہدوں سے منسلک کیا گیا تھا، جیسا کہ کمپ ڈیوڈ کے دو معاہدوں کے سلسلے میں ہوا ہے، جس کی بنیاد پر دو مدبرین مملکت کو انعام عطا کیا گیا ہے جن کے کاموں پر اتنی سنگین ذمے داریاں آپڑی ہیں۔

نہ کبھی امن کے انعام نے مصر اور اسرائیل کے عوام سے، اور نزاع زدہ جنگ سے پامال مشرق وسطیٰ سے، امن کے سلسلے میں کسی بڑی اور زیادہ دلیرانہ امید کا اظہار کیا ہے۔

مصر کے صدر انوار السادات اور اسرائیل کے وزیر اعظم موشے مٹن کو امن کے انعام کا دیا جانا تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں مصر اور اسرائیل کے مابین ہمیں صرف ایک معاملہ یاد آ رہا ہے۔ اسرائیلیوں کے انکشاف کے مطابق، یہ معاملہ دس تین ہزار برس قبل شاہ داؤد کے بیٹے، زیدک شاہ سلیمان اور مصر کے فرعون کے درمیان ہوا تھا۔

دنیا کا یہی وہ حصہ تھا جس میں 6,000 برس قبل تہذیب کا ایک گہوارہ دریافت ہوا تھا، جس کا دنیا کے دوسرے حصوں پر گہرا اثر ہوا تھا اور جہاں انسانی تہذیب نے ترقی کی تھی۔ آج اسکول جانے والا بچہ، اپنی تاریخ کی کتابوں کے طفیل، جانتا ہے کہ یہیں سے ہماری تحریر کی تاریخ شروع ہوئی تھی، اور تاریخی اعتبار سے ہم رشتہ تینوں مذاہب، اسلام، یہودیت اور عیسائیت، کی نظریں، ان تہذیب کی عظمت کے ساتھ دنیا کے اسی حصے پر مرکوز رہی ہیں جہاں سے ان کے مذاہب پھیلے تھے۔

ایشیا، یورپ اور افریقا کے درمیان واقع مشرق وسطیٰ، نہ صرف تہذیبوں کا منجم تھا، بلکہ معاشی مفادات اور بیرونی فاقہ کشی کی لڑائیوں کا میدان رہا ہے۔ بار بار کی جنگوں، بیرونی غلبوں اور اندرونی تفرقہ بندیوں نے نہایت بھونڈے پن سے اس کی تہذیبی چمک دمک اور مادی خوش حالی کو مٹا دیا ہے۔

ہمارے زمانے میں عربوں کی بیرونی غلبے سے چھٹکارا پانے کی کوشش کو اس وقت کامیابی نصیب ہوئی تھی جب مصر نے برطانوی تسلط کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ قومی آزادی کی اس جہد میں انوار السادات نے رہنمائی نہ کردار ادا کیا تھا۔

اسی وقت سے چھوٹے چھوٹے یہودی گروہوں میں ایک قومی تحریک شروع ہو گئی تھی، جو ہزار برس سے دنیا بھر کے مختلف ممالک میں بکھرے ہوئے تھے مگر ہمہ وقت اپنے تاریخی وطن کی یادوں سے چپے رہے تھے۔ برابری کی مخالفت نے، جو ہٹلر کے یورپی یہودی قتل عام پر منتج ہوئی تھی، ان کو اپنے لیے تحفیہ حاصل کرنے اور اپنے ملک اسرائیل کی دوبارہ تخلیق پر اکسایا۔ اس طرح اقوام متحدہ کی عملی شرکت سے 1948 میں اسرائیل کی ریاست قائم ہوئی تھی۔ اسرائیل کی ریاست اور قومیت اب ایک سیاسی اور انسانی حقیقت بن چکی ہے۔

اسرائیلی ریاست کے قیام نے پورے مشرق وسطیٰ میں ایک نئے تنازع کو جنم دیا۔ پچھلے تیس برسوں میں یہ تنازعہ یہودیوں اور عربوں کے درمیان چار جنگوں کا باعث بنا، جن سے نہ صرف بے انتہا مادی تباہی ہوئی ہے، اس نے دونوں ملکوں کے درمیان فساد کو بھی تیز کر دیا ہے۔

جنگ اور تباہی کے ساتھ ساتھ، بہر حال، امن کی تخلیقی قوتوں نے بھی اپنے لیے ایک راستہ تلاش لیا ہے۔ اس عرصے میں، اس نفسیاتی دیوار میں دراڑ ڈالنے کے لیے، جو ایک طویل عرصے تک عرب اور اسرائیلی ریاستوں کے درمیان آفریقے کی وجہ بنی رہی تھی، نیک نیتی اور خوش امید کی بھی خاصی متحرک رہی ہے۔ یہ ایسی دیوار ہے جس کے نہایت خوف ناک پہلو ہیں، ایک بار انوار السادات نے جس کو آسٹریلیائی ماحل کے

قریب کی Great Barrier Reef کے ممالک قرار دیا تھا۔

دو افراد جنہوں نے امن کی اس کوشش میں اہم کردار ادا کیا ہے وہ میکریٹری آف سٹیٹ ہنری کسنجر اور صدر جمی کارڈر تھے۔

مشرق وسطیٰ میں ہنری کسنجر کا مشن اس جنگ کے اختتام کے فوراً بعد شروع ہوا تھا، جس میں ایک طرف اسرائیل تھا اور دوسرے جانب مصر اور شام تھے۔

میں ان کا وہ پھر تیار کردار اچھی طرح یاد ہے جو انہوں نے یوم کپور جنگ کے جنگجو حریفوں کو جینوا امن مذاکرات کی میز پر لانے کی کوشش میں ادا کیا تھا۔

دسمبر 1973 میں منعقد ہونے والی کانفرنس کا نتیجہ ایک معاہدہ تھا جو مصر اور اسرائیل کے درمیان چند اہم نکات کی بنیاد پر طے پایا تھا، جس میں قیدیوں کا تبادلہ، حدود متعین کردہ علاقوں سے فوجوں کا انخلاء، تحفظ کی ضمانت، جنگ بندی کو مستحکم کرنے کے لیے دوسری کچھ کارروائیاں اور طویل المیعاد امن کے معاہدے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

1973 کی یوم کپور جنگ کے جنگجو حریفوں کے درمیان ہنری کسنجر کی مدد سے ہونے والے معاہدے نے وہ بنیاد فراہم کی تھی جس پر جمی کارڈر نے 1978 کے کیمپ ڈیو مذاکرات منعقد کیے تھے۔

ایک پُر امن بندوبست کی تکمیل کی کوشش میں صدر انوار السادات کا یروشلم کا 19 نومبر 1977 باہمت سفر ایک نہایت ڈرامائی اقدام تھا۔

صدر رسادات نے اسرائیلی پارلیمنٹ Knesset سے خطاب کے دلیرانہ عمل سے ایک ہی وار میں ایک بیچارے کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اب کیمپ ڈیو کی ملاقات کے لیے راستہ صاف ہو چکا تھا، جہاں بنیاد کی اہمیت کے دو معابدوں کے ذریعے پہلے تعمیر کی قدم اٹھائے گئے۔

۱۔ مشرق وسطیٰ کے امن کے لیے معابد سے کا ڈھانچا اور

۲۔ مصر اور اسرائیل کے درمیان امن کی کوششوں کے لیے معابد سے کا ڈھانچا

ایک وقت کے دو دشمن ملکوں کے درمیان مستقبل کے امن کی بنیاد فراہم کرنا ہی وہ کام تھا جس کے لیے صدر انوار السادات اور وزیر اعظم مناکم بیگن کو 1978 کے نوٹیل امن انعام سے نوازا گیا ہے۔

مشرق وسطیٰ میں ہونے والی چار جنگیں دراصل نئے تنازعات، نئی مادی تباہی اور انسانی ایسے کا پیش خیمہ بنی تھیں۔

اس اندھیرے میں ہمیں اچانک روشنی کی ایک ہلکی سی جھلک اور ایک فتح بغیر جنگ نظر آتی تھی، جب صدر انوار السادات یروشلم کے لیے، جس کو انہوں نے اسرائیلی پارلیمنٹ Knesset میں اپنی تقریر میں ”شہر امن“ کے نام سے یاد کیا تھا، روانہ ہوئے تھے۔

ان کے پھیلے ہوئے بازو اور امن کی پیش کش، دوستی اور تعاون معابد سے کا ڈھانچے کے جذبے کی

بنیاد بنے جس نے بہت سی سفارتی، معاشرتی اور تہذیبی رابطوں کی حقیقتوں کی طرف اشارے کیے ہیں جنہیں معاہدوں میں شامل کیا جانا چاہیے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا کے صدر جی کارٹر، مصر اور اسرائیل کے درمیان بنائے جانے والے اس پل کے مرکزی معمار تھے جس کو ایک وقت کے دو دشمنوں کو یک جا ہونے اور ایک معاہدے کا ڈھانچا فراہم کرنے کا موقع دینے کے لیے بنایا گیا تھا۔

صدر السادات نے امن کے قیام کی جانب اٹھائے ہوئے اہم قدم کی رہنمائی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا ”جی کارٹر جی وہ بے نام سپاہی تھے۔“

جہاں تک کیمپ ڈیوڈ میں مشرق وسطیٰ کے دوسرے معاہدے کا سوال ہے تو بظاہر [دریائے اردن کے] مغربی کنارے اور کولان پہاڑی کے بارے میں گفت و شنید اور محکمات کے لیے ابھی بہت وقت دیکر رہے۔

صرف مستقبل ہی ان سوالات کا جواب فراہم کر سکتا ہے۔ اس دوران، دنیا کو مصر اور اسرائیل کے عوام کی خوشیوں میں حصہ لینے کا موقع ملنا چاہیے، کہ اسرائیل کے قیام کے بعد سے پہلی بار ایک معاہدہ کامیابی سے محکمات کے مراحل تک پہنچا ہے، جو اس علاقے کے دیر پا امن کے لیے ایک حقیقی موقع فراہم کر رہا ہے، جس پر ایک عرصے سے جنگ کے مہیب بادل چھائے ہوئے تھے۔

تاریخ پر اثر انداز ہونے والی طاقتوں کے متنازعہ نظریوں پر شرط لگائے بغیر، یہ عمومی اتفاق رائے ہے کہ مصر کے صدر انوار السادات اور اسرائیل کے وزیر اعظم مےشم بگن، دونوں نے ماضی کے دو دشمنوں کے درمیان امن کی تلاش میں کلیدی کردار کیے ہیں، جو دنیا بھر کے امن کے مخلص دوستوں کے لیے خوشی کی بات ہے۔

ان دونوں افراد میں کئی باتیں مشترک ہیں: دونوں اس صدی میں پیدا ہوئے تھے جو عالمی جنگوں، بڑے انقلابات، نسلی مسائل اور غیر ملکی غلبوں سے عبارت تھی۔

دونوں ہی تاریخ کے مرکزی دھارے میں فعال رہے تھے جن میں سیاسی اور سماجی تنازعات شامل ہیں۔ اپنی زندگی کے ابتدائی برسوں ہی سے انہوں نے خود کو اپنے ملک کی تقدیر سے منسلک کیے رکھا ہے، انہوں نے اپنی مرز میں کی حاکمیت کے لیے اور انسان کی آزادی کے لیے جنگیں لڑی ہیں، قید میں اور مشفق کیمپوں میں مصیبتیں جھیلی ہیں۔

ان کے زندگیوں اور راستے اس امن کے لیے ایک دوسرے سے ملے ہیں جس سے ایک نیا دور طلوع ہو سکتا ہے، مادی تجدید کا اور امن کا، صرف ان دونوں کے اپنے دو ملکوں ہی کے لیے نہیں، بلکہ پورے مشرق وسطیٰ کے لیے۔

صدر انوار السادات 25 دسمبر 1918 کو پیدا ہوئے۔ ان کا ابتدائی بچپن دریائے نیل کے کنارے واقع Mit Abul-Kum نامی ایک گاؤں میں گزرا تھا۔ ان کی والدین اپنی زمین اور اپنے گاؤں کی زندگی سے روحانی

رشتے کے گہرے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں، جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔

ان کا بچپن ایک شاعرانہ جھلے میں سمویا ہوا ہے: ”میں نے Mit Akul-Kum سے جو کچھ پایا، اسی نے مجھے خوشی دی۔“ اس میں شامل ہے ان کا فطرت سے احساسِ یکجہلی، خاندان کی زندگی، جس میں ایک دادی بھی شامل تھیں، جو اگر چہ ٹھانڈی تھیں مگر اپنی دانش کے لیے مشہور تھیں۔

آج بھی، جب وہ اپنی دادی کے بارے میں بات کرتے ہیں تو، صدر سادات اتنی گرم جوشی اور عقیدت سے کرتے ہیں، کہ ہم فوراً ہی محسوس کر لیتے ہیں کہ ان کے دل میں ان کی دادی کی محبت آج بھی زندہ ہے۔ انھیں اب بھی ان کے مادہ الفاظ یاد آتے ہیں۔ ”کوئی چیز بھی اتنی اہم نہیں، مگر یہ حقیقت کہ تم اس زمین کے بیٹے ہو۔ زمین کبھی مر نہیں سکتی، کہ اس میں تخلیق کے راز پوشیدہ ہیں۔“

صدر سادات اپنے عقیدے کا تعین اس طرح کرتے ہیں ”میں کبھی بھگ نہیں سکتا، اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ میری جڑیں، اس گاؤں میں، اس مٹی کی کبرائی میں بیٹھتی ہیں، جس سے میں، درختوں اور دوسرے نمو پانے والی اشیاء کی طرح، پیدا ہوا ہوں۔“

اپنے پورے متلاطم عرصہ حیات میں، سادات نے اس اندرونی یک رنگی اور توازن کی ضرورت محسوس کی ہے، جو مٹی سے نسبت نے انھیں دی ہے۔

ان کے بچپن اور ایامِ شباب کے دوران مصر پر برطانیہ کا ظہر تھا۔

ابتدائی سے سادات اپنے ملک کی آزادی کے لیے لڑنے پر تیار تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے فوجی افسر بننے کا فیصلہ کیا تھا، اور جمال عبدالناصر سے مل کر، جو ان کے اسکول کے ساتھی تھے، انھوں نے 1939 میں، جب وہ صرف انیس برس کے تھے، افسروں کے ایک خفیہ گروہ کی بنیاد ڈالی، جس کا مقصد مصر کو غیر ملکی عمل داری سے نجات دلانا تھا۔ اپنی جدوجہد کے دوران 1942 میں وہ گرفتار ہوئے اور افسر کے عہدے سے برخاست کر دیے گئے۔ قید سے کامیاب فرار کے بعد وہ روپوش رہے، اور 1946 میں دوبارہ گرفتاری کے بعد تین برس کی مزا پا کر پھر قید کر دیے گئے۔

1950 میں انھیں فوج میں بحال کر دیا گیا تھا۔ 1952 کے مصری انقلاب کے جس نے شاوق فاروق کو معزول کر دیا تھا، روحانی رہنماؤں میں سے ایک سادات تھے۔

1969 میں صدر ناصر نے ان کو مصر کے نائب صدر کے عہدے پر فائز کر دیا تھا اور ان کے انتقال کے بعد 1970 میں وہ مصر کے صدر منتخب ہوئے۔

صدر سادات نے مشکل ترین حالات میں اپنے ملک کی رہنمائی کی، جب ملک جنگ اور دور رس معاشیاتی مسائل میں گھرا ہوا تھا۔

صدر سادات کی اس بات کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ انھوں نے اپنے ملک کے معاشی اور سماجی مسائل کے حل کے ادراک کے باعث اسرائیل سے مصالحت ضروری سمجھی اور اس کی جھکیں کا بیڑہ اٹھایا تھا۔

اس تمام عرصے میں صدر سادات کی پالیسیوں نے واضح کیا ہے کہ ان کے ملک کو اپنے پرانے مسائل پر دوبارہ غور کرنا چاہیے، اور مذاقی طریقوں سے انحراف کرنے کی اہمیت کرنی چاہیے۔

پچھلے تیس برسوں میں مشرق وسطیٰ کے عوام چار جنگوں کا نشانہ بن چکے ہیں اور امن کے امکانات دور دور تک نظر نہیں آتے۔ امن کے عمل کے حصول میں صدر سادات کا سب سے بڑا حصہ یہ رہا ہے کہ ان میں اس شیطانی چکر کو توڑ کر باہر نکلنے کی اہمیت اور دور راند لینی ہے۔

ذاتی اور سیاسی دونوں اعتبار سے ان کا فیصلہ کردہ، اسرائیلی پارلیمان سے خطاب کرنے کی وزیر اعظم منہ شیم بیکس کی، 17 نومبر 1977 کی دعوت کو قبول کر لیں گے ہو لیرانہ اور دور رس تھا۔ یہ ماضی سے انحراف اور نئے عہد کی طرف باہمت قدم اٹھانے کا ایک ڈرامائی اقدام تھا۔

یروشلم میں سادات نے اپنے مطالبات بڑی دیانت داری سے پیش کیے مگر عوض میں امن، مصالحت اور اسرائیل کو ایک ریاست کی حیثیت میں تسلیم کرنے کی پیش کش بھی کی۔

سادات کے بڑھائے ہوئے ہاتھ کو یکمپ ڈیوڈ کے دوسرے اہم حلیف منہ شیم بیکس نے تقام لیا۔ ان حالات نے، جن میں منہ شیم بیکس 1913 میں پولینڈ کے شہر Brest-Litavsk میں پیدا ہوئے تھے ان کو ایک نقطہ ابتدا اور ان کے متلاطم دور حیات کے لیے ایک فیصلہ کن پتہ فراہم کیا۔

سامیت کے خلاف تشدد اور بڑھتے ہوئے حالات کے کبرے نقوش کے اثرات نے، ان کی ابتدائی عمر ہی میں، یہودیوں کے قدیم وطن اسرائیل میں واپسی کی تمنا کی نشوونما کی تھی۔

قانون کی تعلیم کے دوران انھوں نے Jewish Youth Movement میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ 1939 میں فلسطین ہجرت کرنے والے مظلوم یہودیوں کے حق میں ہونے والے ایک مظاہرے میں شرکت کی پاداش میں انھیں قید کر دیا گیا تھا۔ ایک قلیل عرصے جیل میں رہنے کے بعد وہ فرار ہو کر لیتھوینیا چلے گئے، اس امید میں کہ اس ملک سے ان کو فلسطین میں داخل ہونے کا موقع مل جائے گا۔ 1939 میں لیتھوینیا پر سوویت روس کے قبضے نے عملی طور پر اس کو ناممکن بنا دیا۔ وہاں ان کو گرفتار کر کے آٹھ برس کی مزدوری گہمی اور سائنیریا کے ایک یکمپ میں قید کر دیا گیا۔

سوویت یونین پر جرمنی کے حملے کے بعد ان کو، ہزاروں دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ، اس امید پر رہا کر دیا گیا تھا کہ یہ لوگ پولینڈ کی فوج میں بھرتی کیے جائیں گے جس کو سوویت کے خلاف جدوجہد میں استعمال کیا جاسکے گا۔ بیکس نے اب پولینڈ کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی جس کو سوویت سر زمین پر تربیت دی جانی تھی۔ اس کے بعد ان سب کو Transjordan بھیجا جاتا تھا۔ 1942 میں بیکس وہاں سے فلسطین پہنچ گئے، جو اس زمانے میں برطانوی انتظام میں تھا۔

اس وقت برطانوی ارباب سب اختیار نے یہودیوں کے لیے ہجرت کے پروانوں کے اجماع پر سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں، جو دوران جنگ جرمن گیس کے شمشانوں میں جھونکے جانے کے خطرات سے دوچار تھے۔

وہ نظم بیگن نے ان مشکل ترین پابندیوں کو توڑنے میں اپنی تمام قوت استعمال کی۔ انھوں نے Irgun Zvai Leumi نامی ایک قومی لڑاکا ادارے میں شمولیت اختیار کر لی، اور جلد ہی اس کے رہنما بھی بن گئے۔

ابتدائی چند برسوں میں Irgun جرمنی، سوویت کے خلاف برطانوی ارباب اختیار کا ساتھ دیتا رہا۔ بہر حال، ایک باقاعدہ نظام کے تحت یورپی یہودیوں کے استعمال کے باوجود، جب برطانیہ نے فلسطین کی طرف یہودیوں کی ہجرت کی پالیسی پر سختی سے عمل جاری رکھا تو Irgun نے بیگن کی رہنمائی میں زیادہ سرکش رویہ اپنایا اور یہ مطالبہ بھی کر دیا کہ نہ صرف یہودیوں کے لیے دروازے کھولے جانے چاہئیں بلکہ ان کو ایک آزاد اسرائیلی ریاست قائم کرنے کا بھی حق ملنا چاہیے۔

اس کے بعد سے 1947 تک بیگن اور روپوش تحریک Irgun نے برطانوی انتظامیہ کے خلاف بے رحم جدوجہد جاری رکھی۔ ایک وقت وہ بھی آیا تھا جب برطانوی ارباب اختیار نے ان (بیگن) کے سر کی قیمت تیس ہزار پاؤنڈ مقرر کر دی تھی۔

1947 میں جب عربوں اور یہودیوں کے درمیان فساد پھوٹ پڑا تو یہودی اداروں نے بالآخر Irgun کو باقاعدہ تسلیم کر لیا اور اس کو یہودیوں کی فوجی تنظیم Haganah میں ضم کر دیا گیا تھا۔

جب اسرائیل کی ریاست 1948 میں ایک حقیقت بن گئی تو بیگن نے Herut نام کی اپنی ایک سیاسی جماعت بنائی جو بنیادی طور پر اسرائیلی لیبر پارٹی Mapai کی مخالف تھی، بن گوریان جس کے رہنما تھے۔

1977 کے انتخابات میں Likud نام کے قدامت پسند اتحاد کو اکثریت حاصل ہو گئی اور 21 جون 1977 کو بیگن اسرائیل کے وزیر اعظم بن گئے، اور یہی وہ شخص تھے جس نے اسرائیل کی ریاست کی جانب سے صدر سادات کے بڑے ہاتھ کو تھما تھا۔

مصر اور اسرائیل اب مختصر مدت کی عارضی صلح کے وقفوں کے علاوہ، تیس برس کی عداوت کے اختتام کے امکانات سے محفوظ ہو رہے ہیں۔

بین الاقوامی قانون کے پیچیدہ مسائل، ساتھ ہی ساتھ فوجی اور معاشی مسائل، کو اب حل ہو جانا چاہیے اور پرانی بدگمانیوں اور تعصبات کو ایک طرف رکھ دیا جانا چاہیے۔

ایسے بڑے کام کی اصلیت کا بیان نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ مگر کیا اس سے یہ دکھایا جاسکتا ہے کہ اس علاقے کے عوام کے درمیان بالکل نئے رشتے استوار کیے جاسکتے ہیں جہاں کئی عشروں سے جنگ نے امیدوں کے سورج کو گہن لگا رکھا ہو؟

Knesset سے اپنے تاریخی خطاب میں، آج کے نوبل امن انعام یافتہ، انوار السادات نے ان سوالات کا مندرجہ ذیل الفاظ میں جواب دیا تھا:

”میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں کہ آج ہمارے پاس امن کے قیام کا ایک نادر موقع ہے اور ہمیں اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ اگر واقعی ہم امن کی جدوجہد کے بارے میں سنجیدہ ہیں۔ اگر ہم اس موقع کو

ضائع یا کم زور کر دیتے ہیں تو ہم ایک بھیاں تک خون ریزی سے دو چار ہوں گے اور وہ جو اس کے خیال کی سازش کرے گا انسانیت کی تاریخ کی لعنت اسی کے سر ہوگی۔“

اسی موقع پر آج کے دوسرے انعام یافتہ وزیر اعظم ہنری کلنٹن نے امن کے امکانات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

”میں یقین ہے کہ اگر ہم امن حاصل کر لیتے ہیں، سچا امن، تو زندگی کی تمام عمل داری میں ہم ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور مشرق وسطیٰ میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوگا، ہمو اور پھٹنے پھوٹنے کا، ترقیات کا اور آگے بڑھنے کا، بالکل قدیم زمانوں جیسا۔“

دنیا بھر میں ٹکیوں کے تمام طرف داران خیالات کی پیروی کریں گے جو ان دو انعام یافتگان نے امن کو قائم کرنے کی اس بڑی ذمہ داری کے بارے میں پیش کیے ہیں۔

یہی وہ خواہش ہے جس کا شمار کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے میں بھی کیا گیا ہے۔

”مشرق وسطیٰ کے عوام امن کے لیے بے چین ہیں، تاکہ انسانی اور قدرتی وسائل کے اتنے وسیع خزانے کو علاقے کے امن کی تلاش میں استعمال کیا جائے تاکہ یہ علاقہ دنیا بھر کی قوموں کے لیے مثالی ہم بودیت اور تعاون کی مثال بن جائے۔“

آج، پوری دنیا میں، ہم بین الاقوامی حقوق انسانی کی تیسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔

میں امید کرتی ہوں کہ دائرہ قطب شمالی کی کوبلن چھپے ہوئے ہمارے چھوٹے سے سرکاری ملک میں دیے جانے والے نوبل امن انعام کی یہ تقریب، دنیا بھر کو ایک صبر آزما یاد دہانی کرائے گی کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں مصر اور اسرائیل کے نمائندوں نے سب سے عظیم فتح کے جشن میں، مصالحت اور دیر پا امن کے قیام کے لیے ہاتھ ملائے ہیں، جو انسانی وقار اور انسانی حقوق کے احرام کی بنیاد پر حاصل ہوا ہے۔

نارویائی نوبل کمیٹی کی صدر نشین Aase Lohne کی زبانی

خطبہ — صدر انوار السادات

(سید مارچی کی زبانی)

جلالت مآب، عزت مآب، وزیر اعظم اسرائیل، مادام صدر نشین، ارکان نوبل امن انعام کمیٹی، عزت مآب، ممتاز مہمانان، خواتین و حضرات! السلام علیکم!

یہی وہ ذاتی طریقہ ہے جس میں، ہر دن، ہم ایک دوسرے کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ یہ الفاظ ہمارے قلب

کی گہرائیوں سے نکلنے والے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہم ہمیشہ یہی کہتے ہیں اور یہی چاہتے بھی ہیں۔
جلالت مآب، خواتین و حضرات!

مجھ کو امن کا انعام دیے جانے کے فوٹیل انعام کی کمیٹی کے فیصلے کا مصری عوام نے، نہ صرف ایک افکار کے طور پر، بلکہ اس علاقے میں، جس کو خدا نے انسانیت کے لیے مہولی، عیسیٰ اور محمد کا تحفہ دینے کے لیے منتخب کیا ہے، امن کے حصول کے لیے کی جانے ہماری اُن تھک کوششوں کے آفاقی اعتراف کے طور پر خیر مقدم کیا ہے۔
جلالت مآب، خواتین و حضرات!

قدر شامی حق ہوتی ہے بلند ترین دیانت رکھنے والے انسان کا؛ یعنی صدر جمہوریہ کارزکا، امن کی راہ کی نکالوں پر غالب آنے کی جن کی تنہا کوششیں ہماری اعتراف کی مستحق ہیں۔

وہی امن کی راہ ہے، جس کی پوری تاریخ انسانی تہذیب کے طلوع سے ملتی ہے، مصر کے عوام نے جس کو اپنے جینیٹیس، اور اپنی صلاحیت کے قابل سمجھا ہے۔ دنیا بھر کے عوام میں سے کوئی بھی امن سے اتنا مخلص نہیں رہا ہوگا، اور کوئی بھی انصاف کے اصولوں سے اتنا وابستہ نہیں رہا ہوگا جو کسی بھی حقیقی امن کا سبب میل ہوتا ہے۔

کیا میرے لیے اس جلیل القدر اور ممتاز اجتماع کو یہ بتانا ضروری ہوگا کہ تاریخ کا پہلا تحریری امن معاہدہ تین ہزار سال قبل راسیس اعظم اور Hmites کے شاہزادے Hatusilis کے درمیان ہوا تھا جنہوں نے ”اچھا امن اور اچھا بھائی چارہ“ کا اصول طے کیا تھا۔

اس کے بعد سے، ہر دور میں، جب جنگیں ایک ضروری خرابی ہونے کے باوجود ہوتی رہی تھیں، جب کہ مصر کا حقیقی جینیٹیس امن چاہتا تھا۔ اور اس کی بلند نظری تہذیب نہیں تعمیر مانگتی تھی، تخلیق کے لیے نہ کہ برباد کرنے کے لیے، ہم یوریت کے لیے، استخراج کے لیے نہیں۔ اس طرح خداوند متعال نے مصر کی سر زمین کو ہمیشہ عزیز رکھا ہے؛ یہاں مہولی رہے ہیں، بیرونی غلبے اور نا انصافی کے باعث یسوع مسیح فرار ہو کر یہاں پناہ گزین ہوئے، اور قرآن نے بھی اس کو برکتیں دی ہیں۔ اور اسلام نے، جو انصاف، مساوات اور اخلاقی قدروں کا مذہب ہے، مصر کی ابدی روحانیت کے لیے اس میں نئے پہلو شامل کیے ہیں۔

ہم نے ہمیشہ سمجھا ہے کہ، دلاوری، ہمت، عقیدہ اور تقسیم، جو جنگ کے رومانوی تصور کی خصوصیت رہے ہیں، اس عہد میں بھی جب جنگ صرف عمومی تہذیب کے مترادف رہی ہے، زندگی کو زرخیز کرنے کے لیے، نہ کہ موت کو پیدا کرنے کے لیے۔

اسی جذبے کے تحت انفریڈ فوٹیل نے انعام کو قائم کیا تھا، جو اس کے نام سے منسوب ہے، جو بنی نوع انسان کے امن کی، بالیدگی کی، ترقی اور خوش حالی کی راہوں پر گامزن ہونے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔
خواتین و حضرات!

ان ہی سب [حقائق] کی روشنی تھی کہ میں نے ایک برس قبل امن کے قیام کی طرف پیش قدمی کی، اس

علاقے کے لیے جہاں انسان پر خدا کا کلام نازل ہوتا تھا۔

در اصل وہ ابدی مصر ہی تھا جو میری زبان سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں جنگوں کو ختم کر دینا چاہیے، کہ ہمیں زندگی کو حق اور صداقت کی ٹھوس بنیاد پر سنوانا چاہیے۔ اور یہی پکار تھی، جس میں خواہشات جھلک رہی تھیں، مصری عوام کی، عرب کی بڑی اکثریت کی، اسرائیلی عوام کی، کروڑوں مردوں، عورتوں، بچوں اور دنیا بھر کے عوام کی، آپ جنہیں آج اعزاز بخش رہے ہیں۔ اور یہی کروڑوں لوگ فیصلہ کریں گے کہ مشرق وسطیٰ کے ذمے دار رہنماؤں نے کس حد تک انسانیت کی امیدوں کا جواب دیا ہے۔

ہم اب آگئے ہیں، امن کے عمل میں، ایک لمحے کی صداقت تک جو ہم سب سے تقاضا کر رہا ہے کہ ہم حالات کو نئی نگاہ سے دیکھیں۔ مجھے یقین ہے، آپ سب جانتے ہیں، کہ جب میں نے یروشلم کا تاریخی دورہ کیا تھا، میرا مقصد محض ایسا کوئی معاہدہ کرنا نہیں تھا، جیسا کچھ سیاست داں کرتے ہیں۔

میں نے یہ سفر کیا تھا اس لیے کہ میں قائل ہو چکا تھا کہ اس نسل اور آنے والی نسلوں کا ہم پر قرض ہے، کہ ہم امن کی تلاش میں کوئی کوشش اٹھانہ رکھیں۔ یہ آدرش انسانی تاریخ کا سب سے بڑا آدرش ہے، اور ہم نے اس کو ایک پروردہ امید سے زندہ حقیقت میں تبدیل کرنے کا، بھیڑت اور تخیل کے ذریعے لوگوں کے دل اور دماغ چیتے کا اور ان کو ناشدناشی کے پرے دیکھنے کی صلاحیت دینے کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے، ایک سال قبل، Knesset میں کیا کہا تھا۔ میں نے کہا تھا: ”میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں کہ آج ہمارے پاس امن کے قیام کا ایک مادر موقع ہے اور ہمیں اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، اگر واقعی ہم امن کی جدوجہد کے بارے میں سنجیدہ ہیں۔ اگر ہم اس موقع کو ضائع یا کم زور کر دیتے ہیں تو ہم ایک بھیا تک خون ریزی سے دوچار ہوں گے اور وہ جو اس کے ضیاع کی سازش کرے گا انسانیت کی تاریخ کی لعنت اسی کے سر ہوگی۔“

میں اس مقدس اور دل گداز موقع پر عہد کرنا چاہتا ہوں کہ ہم مصری، ماضی کے بچائے مستقبل کو ذہن میں رکھتے ہوئے، اس بات کا پکا ارادہ کر چکے ہیں کہ پورے خلوص کے ساتھ جیسا کہ ہم نے ہمیشہ کیا ہے، ہم امن کی راہ کے متلاشی رہیں گے، اور اسرائیلی اور احق کے فرزندوں کے درمیان موافقت حاصل کرنے میں کوئی کوشش اٹھانہ رکھیں گے۔ اس عہد کی تجدید کے ساتھ، میں امید کرتا ہوں کہ دوسری جہاتیں بھی اس پر قائم رہیں گی، میں دوبارہ ان باتوں کا اعادہ کرتا ہوں جو میں نے ایک برس قبل Knesset میں کہی تھیں۔

جنگ میں ضائع ہونے والی ہرجان ایک انسان کی جان ہوتی ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ عرب ہو کہ اسرائیلی۔

ایک بیوی جو بیوہ ہو جاتی ہے انسان ہوتی ہے، جس کو ایک خوش حال خاندان میں رہنے کا حق ہوتا ہے، عرب ہو یا اسرائیلی۔

معضوم بچے، جو پدری خبر گیری اور ہمدردی سے محروم ہو جاتے ہیں سب ہمارے ہی بچے ہوتے ہیں،

وہ عرب زمین پر رہتے ہوں یا اسرائیلی زمین پر، ہم ان کو ایک خوش حال اور روشن مستقبل فراہم کرنے کے ذمے دار ہوتے ہیں۔

ان سب کے لیے اور اپنے تمام بیٹوں اور بھائیوں کی زندگی بچانے کے لیے؛

اپنے سماج کو تحفظ اور اعتماد مہیا کرنے کے لیے؛

آدمی کی نشوونما کے لیے، اس کی بھلائی اور ایک باعزت زندگی میں شرکت کے لیے؛

اپنی آنے والی نسلوں کی ذمہ داری کے لیے؛

اپنی ہر زمین پر پیدا ہونے والے ہر بچے کے لیے

یہ ہے ہمارا تصور امن کا جس کو میں دہرا رہا ہوں آج۔ یوم حقوق انسانی کے موقع پر۔

میں اس کی روشنی میں امن کے اپنے تصور سے آپ سب کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں؛

پہلی بات: اصلی امن کا نچوڑ، جو تحفظ اور دائمیت فراہم کرے، انصاف ہوتا ہے۔ کسی بھی قسم کا امن، جو

انصاف کی بنیاد پر اور عوام کے حقوق کے اعتراف کی بنیاد پر استوار نہ کیا گیا ہو، ریت کی عمارت [کی مثال]

ہوتا ہے، جو پہلے ہی صدمے میں ڈھک جاتا ہے۔

امن کے عمل میں شامل ہوتی ہے ایک ابتدا اور اختتام کی طرف اُٹھنے ہوئے قدم۔ اختتام کی طرف پہنچنے

کی صورت میں عمل کو اپنے ہدف کے حصول پر منتج ہونا چاہیے۔ ہمارا ہدف ہے علاقے کے تمام باشندوں،

بالخصوص فلسطینی عوام کو تحفظ فراہم کرنا اور ان کو ایک باعزت اور آزاد زندگی گزارنے کے حقوق کی بحالی۔ ہم

مضبوطی سے اپنے ہدف کی جانب بڑھ رہے ہیں جو اس علاقے کے تمام لوگوں کے لیے ہے۔ یہی میرا موقف

ہے۔ کیپ ڈیوڈ کی روح اسی میں پوشیدہ ہے۔

دوسری بات: امن کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا قائم رہنے کے لیے، اس کو مکمل ہونا، اور اس میں تنازعے کے

تمام حصے داروں کی شمولیت ہونی چاہیے۔

تیسری بات: ہمارے علاقے میں امن اور خوش حالی ایک دوسرے سے منسلک اور ہم رشتہ ہیں۔ ہماری

کوششیں دونوں کے حصول کے لیے ایک جیسی ہونی چاہئیں، اس لیے کہ کسی انسان کو تباہی کے ہتھیار رکھے

ہاتھوں ہلاکت سے بچانا اتنا ہی اہم ہوتا ہے جیسے اس کو شیطانی طلب اور آفت کے لیے نہ پھوڑنا۔ جنگ

ہمارے علاقے کے مسائل کا علاج نہیں۔ اور آخر میں یہ بات کہ امن ایک حرکی تعمیر ہوتا ہے جس میں ہر ایک کو

اپنی حصے کی ایٹ لگانی ہوتی ہے۔ یہ ایک باضابطہ معاہدے یا معافی سے کچھ زیادہ کا طلب گار ہوتا ہے؛ کہیں

ایک حرف زیادہ اور کہیں ایک حرف کم۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو سیاست دانوں کی ضرورت ہوتی ہے جو بصیرت

اور تفہیم سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور جو حال سے پرے مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اسی یقین کامل کے ساتھ جو ہماری تاریخ اور ہمارے عقیدے میں بیجوت ہے، مصر کے عوام مشرق

وسطی میں امن حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس علاقے کے لیے جو پوری دنیا کے لیے غیر معمولی

امیت کا حامل ہے۔ ہم کسی کوشش سے دریغ نہیں کریں گے، ہم مایوس نہیں ہوں گے، ہم اپنے عقیدے کا دامن نہیں چھوڑیں گے، اور ہمیں یقین ہے کہ بالآخر ہم اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔

میں آپ سے استدعا کروں گا کہ آپ سب میری اس دعا میں شریک ہوں کہ وہ دن جلد آئے جب امن کا دور دورہ ہو، انصاف اور عوام کے حقوق کے اعتراف کی بنیاد پر، جنہیں اپنی زندگی سنوارنے، اپنا مستقبل بنانے اور انسانیت کی خوش حالی کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈالنے کا حق حاصل ہو۔

خطبہ — جناب منہاجم بیگن

جلالت مآب، عزت مآب، مادام صدر نشین، نوبل انعام کمیٹی کے ارکان، جناب مرہی، نمائندگان مصر و اسرائیل، خواجین و حضرات!

سب سے پہلے میں آپ حضرات سے اپنی پیش کردہ گولڈامیر، ایک عظیم رہنما اور وزیر اعظم، کو خراج عقیدت پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا جنہوں نے پوری دل جمعی سے اسرائیل اور اس کے ہمسایوں کے درمیان امن قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کی مبارک یادیں یہودی عوام اور تمام امن کی خواہاں قوموں کے دلوں میں ہمیشہ جاگزیں رہیں گی۔

میں اسرائیل کی سر زمین، Zion اور یروشلم کی زمین سے آیا ہوں، اور اس مقام پر ایسا وہ ہوں انکسار کے ساتھ، اور اس فخر کے ساتھ کہ میں یہودی عوام کا بیٹا ہوں، اور اس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جو Holocaust اور غازی کے مراحل سے گزری ہے۔

قدیم یہودیوں نے دنیا کو تصور دیا تھا، ابدی امن کا، آفاقی تحفظ، اسلحہ کا، اور جنگ کی تعلیم اور تربیت کی تنبیہ کا۔ دو پیغمبروں Yeshayahu Ben Amotz اور Micha HalMorashi نے، خدا کے سامنے تلے آدنی کے روحانی اتحاد کی پیش بینی کرتے ہوئے، اور اس کی جانب سے یروشلم میں اترنے والی وحی کے الفاظ پر مبنی، دنیا کی قوموں کو مندرجہ ذیل الفاظ میں تصور پیش کیا تھا:

”اور وہ اپنی تلواروں کو گھوٹ گھوٹ کر بھوں، اور اپنے بھاؤں کو تراشنے والے آکھڑوں میں بدل دیں گے۔ کوئی قوم کسی قوم کے مقابلے میں تلوار نہیں اٹھائے گی، نہ آئندہ کبھی جنگ ہوگی۔“

ہم فانی بندے جو ایز دی عاقبت اندیشی پر یقین رکھتے ہیں، ان مقدس پیشین گوئیوں کو یاد کرتے ہوئے خود سے سوال کرتے ہیں کہ یہ تصورات حقیقت میں کب بدلیں گے؟ ہم کو صرف اس صدی کا ماضی یاد ہے، اور ہم اس سے اچھی طرح واقف بھی ہیں۔ ہم چاروں طرف گھومتے ہیں، اور دیکھتے بھی ہیں۔ یہ قوم کے کروڑوں افراد مسلح ہیں۔ زمین کے پیٹ میں چھپائے اور سمندروں کی تہ پر پڑے ہوئے بین الاقوامی میزائل انسان کو اور اس کی بنائی ہوئی تمام چیزوں کو تباہ کر سکتے ہیں۔ افریڈ نوبل کے زمانے میں نہیں، مگر

ہمارے عہد میں، انسان خود کو تباہ کرنے اور کرۂ ارض کو Tohu Vevahu [یہ کنایہ ہے، انجیل مقدس کی آیت کا] ابتدا میں خدا نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا۔ اور زمین خالی اور [tohu and vohu] بے رنگ روپ تھی۔ [میں تبدیل کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ ان حالات میں کیا ہم ایک ابدی امن کے اپنے عقیدے پر قائم رہیں گے، یا رہ سکتے ہیں جو ایک دن انسانیت پر حکمراں ہوگا؟ جی ہاں، ہم رہ بھی سکتے ہیں اور رہیں گے بھی۔ شاید ہمارے کرۂ ارض کی مکمل تباہی کی صلاحیت ہی۔ جو انسانیت کی تواریخ میں پہلی بار حاصل ہوئی تھی۔ ایک دن، خدا کی مدد سے، تباہی کے تمام آلوں کی مکمل تباہی، اور کرۂ ارض پر ابدی امن کا باعث ہوگی، ہماری پرانی نسلیں جس کی دعا میں کرتی تھیں، جو تمام قوموں کا حصہ ہوگا۔ ماضی کے المیوں اور ناامیدیوں کے باوجود، ہمیں انسان کے اس خواب، اس مستحکم عقیدے اور اس تصور سے لاتعلق نہیں ہونا چاہیے۔

امن انسانیت کا حسن ہے۔ سورج کی روشنی ہے۔ نونہال کا تبسم، ماں کا پیار، باپ کی خوشی اور خاندان کی یک جہتی ہے۔ یہ آدمی کی مفر ازلی، انصاف کے مقصد کی فتح اور سچائی کی مشادمانی ہے۔

مگر ہماری نسل کو، خواتین و حضرات، ایک ناقابل بیان دور کا سامنا تھا۔ چھ ملین یہودی۔ مرد، عورتیں اور بچے۔ یورپ کی کئی قوموں سے زیادہ افراد، بلاوجہ، ایک مذہب براعظم کے بچوں، سچے سمجھے منصوبے کے مطابق، موت کے منہ میں ڈھکیل دیے گئے۔ یہ انسان کی تاریخ میں وقتاً فوقتاً پیش آنے والا، انسانی ظلم یا بربریت کا کوئی اچانک سیلاب نہیں تھا۔ یہ کسی قوم کی تباہی کا ایک منظم نکیل تھا جو چھ برس کے طویل عرصے تک پوری دنیا کی آنکھوں کے سامنے کھیلایا جاتا رہا تھا۔ وہ جو بد قسمتی سے انسانی عزت سے جہی، بھوکے، درمائدہ، بالآخر راکھ میں تبدیل کر دیے گئے تھے، اپنی رہائی کے لیے فریاد کرتے رہے مگر کوئی ان کی مدد کو نہیں پہنچا۔ چند مشہور اور ناقابل فراموش استثنا کے سوا سب کے سب، تباہ کرنے والے کا سامنا کرنے کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے۔

ایسے وقت میں، جو پہلے کبھی نہیں گزرا تھا، کھڑے ہونے اور لڑنے کی گھڑی آگئی، آدمی کے احرام کے لیے، بقاء کے لیے، آزادی کے لیے، ان تمام قدروں کے لیے جو اس کے خالق نے اس کو عطا کی ہیں، ہر اس ناقابل انتقال حق کے لیے انسان جس کا سزاوار ہوتا ہے اور جس کے لیے زندہ رہتا ہے۔ یقیناً، ایسا وقت بھی آتا ہے جب انسان کے لیے، کسی بجا مقصد کے لیے لڑنا بھی سب سے اہم حکم بن جاتا ہے۔ ماروے نے ایسے دن دیکھے ہیں، اور ہم نے بھی۔ صرف ایسے حکم پر عمل سے ہی امن کے تصور کی نشاۃ الثانیہ ہوتی ہے۔ آپ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ہاتھ پاؤں مارتے ہیں امن کے ماحول میں زندہ رہنے کی امید اور توقعات کی ضمانت کے لیے قربانیاں دیتے ہیں، اپنے لیے، اپنے لوگوں کے لیے، اپنے بچوں کے لیے، اپنے بچوں کے بچوں کے لیے۔

سب کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ آزادی کے لیے لڑنے والے جنگ سے نفرت کرتے ہیں، میں نے اور میرے دوستوں نے Zeev Jabotinsky سے یہ احساس لیا ہے، اس کی اپنی مثال سے، اور اس

مثال سے جو اس نے ہمارے لیے [جدید انٹی کے بابائے قوم] جوزیپے گاریبالدی (Giuseppe Garibaldi) سے لی ہے۔ ہمارے روحانی بھائیوں نے، وہ جہاں بھی رہے ہیں، یہ سب اپنے آقاؤں اور اساتذہ سے سیکھا تھا۔ یہ ہمارا مشترکہ یقین ہے کہ اگر آپ اپنی کوششوں اور قربانیوں سے ایسی آزادی حاصل کرتے ہیں جس میں امن کا تصور ہو تو آپ کو امن کے لیے ہی کام کرنا چاہیے کہ زندگی کے لیے اس سے زیادہ مقدس اور کوئی مقصد ہو ہی نہیں سکتا۔

اور اس طرح نوزائیدہ اسرائیل امن کے لیے ہاتھ پیر مارنا، بے چین ہونا، اس کے حصول کے لیے ان تھک محنت کرتا رہا ہے۔ میرے ساتھی اور میں، سب اپنے پیش رو رہنماؤں کے نقوش قدم پر چلے ہیں، پہلے ہی دن سے، جب ہمارے لوگوں نے اپنے مستقبل کی نگہداشت کا فرض ہم کو سونپ دیا تھا۔ ہم ہر جگہ گئے ہیں، ہم نے اسرائیل اور اس کے ہمسایوں کے درمیان مذاکرات کی ہر کوشش کی ہے، ایسے مذاکرات کی جو بغیر امن کے ایک تجربے کی خواہش کے سوا کچھ نہیں۔

ہم نے اس کو حقیقت میں بدلنے کے لیے بہت محنت کی ہے۔ اس لیے کہ یہ ہمارے لیے، ہمارے ہمسایوں کے لیے اور پوری دنیا کے لیے فیض کا حکم رکھتا ہے۔ امن کے ماحول میں، تہذیب کا قدیم گہوارہ، مشرق وسطیٰ توانا ہو جائے گا اور اس کی قلب مابیت ہو جائے گی۔ اس کے ہر خطہ زمین پر عوام کو آزادی ہوگی سفر کی، خیالات کی اور مال کی ترسیل کی۔ زرعی شعبے میں تعاون اور ترقی سے ریگستان گلستان بن جائے گا۔ صنعت و حرفت ایک بالکل نئی زندگی کی ضمانت ہوں گی۔ پانی کے منبہ تلاش کیے جائیں گے اور تمام قوموں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تقریباً شمال بھر سولج کی روشنی کا استعمال ممکن بنایا جائے گا۔ جی ہاں! دنیا کے چوراہے پر کھڑا مشرق وسطیٰ، مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب کے درمیان بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کا تیز ترین مرکز بن جائے گا۔ ایسا مرکز جو ہر طبقے میں انسانی ترقی کی تخلیقی کوششوں کا مرکز ہوگا۔

پچھلے برس کے دوران امن کے لیے بہت کوششیں کی گئی تھیں اور بہت سے اہم واقعات پیش آئے تھے۔ جمہوریہ عرب مصر کے صدر نے اسرائیل کے ابدی دار الحکومت یروشلم آنے اور اسرائیلی پارلیمان Knesset سے خطاب کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ جنوں ہی وہ پیغام ہم تک پہنچا، بغیر کسی تاخیر یا تردد کے میں نے اور میرے ساتھیوں نے اسرائیلی حکومت کی طرف سے ان کو اپنے ملک کے دورے کا دعوت نامہ پیش کر دیا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ بہت احترام اور تپاک سے آپ کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اور حقیقتاً، احترام اور تپاک سے ہی ان کا خیر مقدم کیا گیا تھا، عوام کی طرف سے، پارلیمان کی طرف سے اور ہماری قومی حکومت کی طرف سے۔ ہمیں اپنے درمیان اختلاف رائے کا علم بھی ہوا۔ مگر جب بھی ہم یروشلم کے ان دنوں کو یاد کرتے ہیں، تو ہم کہتے ہیں کہ وہ روشن اور خوب صورت دن تھے دوست نوازی اور اتفاق رائے کے ماحول میں اسماعیلیہ کی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ نوبل امن انعام کے روایتی جذبے میں ہی ہم نے ایک دوسرے سے نہایت عقیم مہد و بیان کیے تھے "نہ مزید جنگ اور نہ مزید خون ریزی۔ ہم گفٹ و شنید کے ذریعے اتفاق

”کر رہے تھے۔“

ہم مانتے ہیں کہ ہمیں مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ کسی کو یہ نہیں بھلنا چاہیے کہ ہم ساتھ ہی پرانے، کولہ، کولہ المیوں سے بھرے، تنازعات کا معاملہ کر رہے ہیں۔ ہمیں وقتی استوار کرنے اور اپنی زندگی کو امن سے بچانے کے لیے ان سب کو پس پشت ڈالنا ہوگا۔

کیمپ ڈیوڈ میں ملاقات میں بہت سی مشکلات سرکاری گئی تھیں، جہاں ریاست ہائے متحدہ کے صدر جیمی کارٹر نے تعمیر امن میں ناقابل فراموش کوششیں، اُن تھک تواری اور بے انتہا ریاضت صرف کی تھی۔ وہاں، باوجود سارے اختلافات کے، ہم نے تنازعات کے حل نکالنے، مسائل پر رضامندی کی اور امن کے مجوزہ ڈھانچے پر دستخط کیے۔ دستخط ہوتے ہی ہمارے ملکوں میں اور دنیا بھر میں خوشیاں منائی گئیں۔ امن کی سمت جانے والے راستے کی فرش بندی ہو گئی تھی۔

اب ہم جس دور پر آگے بڑھ رہے تھے وہ فطرتی گفت و شنید کا تھا، جس میں امن معاہدے کی تکمیل ہوتی تھی، جس کا وعدہ کیمپ ڈیوڈ میں کیا جا چکا تھا۔ دونوں ملکوں کے وفد نے بہت محنت کی ہے، اور میرا خیال ہے کہ ایک مسودہ تیار کر لیا ہے، جس پر اگر دستخط ہو گئے، تو ملکوں کے درمیان یہ امن کے حصول کے لیے ایک اچھا معاہدہ ہوگا جنھوں نے جنگ اور دشمنیاں ختم کرنے اور ایک نیا عہد شروع کرنے میں تعاون کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ایسا معاہدہ، اس راہ پر پہلے گزریہ قدم کی مانند ہوگا جو ہمارے علاقے میں مکمل امن قائم کرنے میں مدد کرے گا۔

اگر ان ہی کوششوں کی وجہ سے صدر سادات اور مجھ کو امن کا انعام دیا گیا ہے تو مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس شرف نشین سے ایک بار پھر انھیں مبارکباد پیش کروں۔ جیسا کہ میں چند ہفتے قبل، انعام کے اعلان کی صبح، یروشلم اور قاہرہ کے درمیان براہ راست گفتگو میں کر چکا ہوں۔

اب مجھے خود بھی اپنے قلب کی گہرائیوں سے اپنے تھکر کا اظہار کرنا چاہیے، اس اعزاز کے لیے جو آپ نے مجھے بخشا ہے۔ میں محتاجین و حضرات، اس سے قبل، مجھے یہ یاد دلانے کی اجازت دیجیے کہ آج ایک اہم مراکز کا دن ہے۔ بین الاقوامی حقوق انسانی کا نفاذ۔ ہمیں اس کی پہلی دفعہ کے نشان دار الفاظ کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ یہ الفاظ اس اعلان کے نچوڑ کا تاریخی اظہار ہیں جس میں آدمی اور باشندے کے حقوق کی پاس داری کی گئی ہے۔ اعلان کہتا ہے: ”سارے انسان درجے اور حقوق کے اعتبار سے برابر اور آزاد پیدا ہوئے ہیں۔ ان کو دلیل اور ضمیر کی نعمت عطا کی گئی ہے اور ان کو ایک دوسرے کے لیے برادری کے جذبے کے ساتھ عمل کرنا چاہیے۔“

آزاد عورتوں اور مردوں کو، وہ جہاں بھی ہوں، لگا تا تحریک چلائی چاہیے تاکہ انسانی قدریں ایک عمومی تسلیم اور عمل کی حقیقت بن سکیں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دنیا کے بہت سے حصوں میں ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا ہے۔ ان قدروں کے بغیر انسانی حقوق اور حقیقی امن، ہم جس کے خواب دیکھتے ہیں،

خطرے میں تھا۔

ان وجود کی بنا پر جن کو ہم خود ہی سمجھ سکتے ہیں، مگر جس کو تمام مرد اور عورت قبول کریں گے، میں اپنے معزز سامعین کو اپنے ہمدردی والوں اور قیدیوں کے بارے میں بتانا چاہوں گا جو اپنے بنیادی حق سے محروم کر دیے گئے ہیں؛ اپنے گھر جانے کا حق۔ میں ان ہمدردی ہمت والے لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو نہ صرف عزت کیے جانے کے، بلکہ آزاد دنیا کی امداد کے بھی حق دار ہیں۔ میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو اپنے اذیت ناک دکھوں کی گہرائی سے بھی عمر بھر کی ہوائی دعا دہراتے رہتے ہیں؛

انگلینڈ میں یروشلم میں گزرے!

انسانی حقوق کی سالمیت اور حفاظت، گزیرے ہیں تاکہ قوموں اور افراد کو ان کے اصل معنی معلوم ہو سکیں۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اب مادام صدر نشین نوبل انعام کمیٹی اور اس کے تمام ارکان سے کہوں کہ آپ کا شکریہ۔ میں اس کبیر امتیاز کے لیے آپ سب کا شکر گزار ہوں۔ بہر حال یہ میری نہیں، میرے عوام کی لمانت ہے۔ ان قدیم لوگوں اور نئی زندگی حاصل کرنے والی قوم کی جو صدیوں کی دہدردی اور عقوبت کے بعد اپنے ہزرگوں کی زمین کی محبت اور احترام میں واپس آئے ہیں۔ یہ قابل احترام اعتراف ان ہی لوگوں کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ انہوں نے اتنے دکھ جھیلے ہیں اس لیے کہ انہوں نے اتنی جانیں کھوئی ہیں، اس لیے کہ وہ امن سے محبت کرتے ہیں اور اس کی تمنا اپنے دل کی عظمت کے لیے اور ہمسایوں کے لیے کرتے ہیں۔ ان کی جانب سے بھی میں انکسار کے ساتھ اس انعام کو انھیں کے نام سے قبول کرتا ہوں اور اپنے قلب کی گہرائیوں سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں جلالت مآب شاہ کی خدمت میں عین تشکر پیش کرتا ہوں ان کی اس موقع پر فیاضانہ مہربان نوازی کے لیے جو میری اور میری اہلہ کے لیے کی گئی ہے۔

جلالت مآب، عزت مآب، ارکان نوبل انعام کمیٹی اور خواتین و حضرات؛

77 برس قبل، امن کا پہلا انعام دیا گیا تھا۔ ڈان ہنری ڈوناٹ (Jean Henry Dunant) اس کے

وصول کنندہ تھے۔ دسمبر 1901 کی دسویں تاریخ کو ماروے کی پارلیمان کے صدر نے فرمایا تھا:

”ماروے کے عوام نے ہمیشہ مطالبہ کیا ہے کہ ان کی آزادی کا احترام کیا جائے۔ وہ اس کے دفاع کے

لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی انھیں امن کی ضرورت اور خواہش رہی ہے۔“

خواتین و حضرات، میں امرائیل کے عوام کی جانب سے یہ صدا احترام یہ الفاظ آپ کی خدمت میں پیش

کر رہا ہوں۔ شکریہ!

بیٹی ولیمز

مریڈ کوریگن

اعلانِ تجلیل

بجائے مات، دو دمانِ مٹائی، عزت مات، خواتین و حضرات!

10 اگست 1976 کو شمالی آئر لینڈ کے شہر بلفاست کی گلیوں میں ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا تھا۔ ایک آدمی، فرار کی کوشش میں، پیچھا کرنے والوں کو غچہ دینے کی کوشش میں اپنی گاڑی لے کر ایک گلی میں پہنچ گیا تھا۔ اچانک گولی چلنے کی آواز آتی ہے، مہلک زخمی ڈرائیور گاڑی کے اسٹیرنگ پر گر جاتا ہے، گاڑی پھرا کر ایک باڑ سے ٹکرا جاتی ہے، اور ایک ماں اور تین بچوں پر چڑھ جاتی ہے۔ ماں اگرچہ شدید زخمی ہوئی مگر بچ گئی جب کہ اس کے تینوں بچے موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔

یقیناً، یہ واقعہ اتنا عجیب نہیں تھا؟ نہیں، بد قسمتی سے واقعی اتنا عجیب نہیں تھا۔ جس زمین پر بھی جنگ اپنے بچے گاڑتی ہے، خوف اور تشدد پھوٹ پڑتے ہیں۔ بچوں کی ہلاکت کسی طرح بھی قابلِ ذکر نہیں ہوتی۔ اس قسم کے واقعات جنگ کی محض لاپرواہی تھی، نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہم نے بارہا دیکھا بھی اور سنا بھی ہے کہ خوف کے عالم میں ہم اپنا ردِ عمل ظاہر کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے بڑی خرابی یہ ہے کہ تشدد کا یہ واقعہ نفرت کو غذا پہنچاتا ہے، جو مزید تشدد کی پرورش کرتی ہے۔

مگر 1976 کے اگست میں بلفاست کے اس واقعے نے بالکل ہی مختلف نتیجہ پیش کیا۔ اسی وجہ سے یہ واقعہ اس قدر قابلِ ذکر ہو گیا ہے۔

اس علاقے میں جہاں تین بچے ہلاک ہوئے تھے ایک گھریلو خاتون رزقی تھی: اس نے کار کے باڑے

نگرانے کی آواز سنی اور جوں ہی وہ موقع کی طرف دوڑ کر پہنچی، اس کی آنکھوں میں خوف کا پورا منظر سما گیا۔
اسی لمحے اس عورت کے دماغ میں کچھ ہو گیا: ایسا ہوا جیسے کوئی ہندوٹ گیا ہو۔

اس منظر نے اس کو ہلا کر رکھ دیا، بلکہ مزید یہ ہوا کہ اس پر تشدد اور دہشت انگیز واقعے کے خلاف کچھ کر گزرنے کی پُر جوش خواہش اس پر طاری ہو گئی۔ اوہ خدا! اب ہمیں کچھ کرنا ہی پڑے گا! مشورے کرنے یا منصوبہ بنانے کے لیے وقت نہیں تھا! اس نے اس انداز میں سوچا ہی نہیں، بس وجدانی کیفیت میں وہی کچھ کیا جو اس کے دل نے کہا وہ اس سڑک پر واقع ہر مکان پر گئی، جہاں یہ حادثہ ہوا تھا۔ خوف کا لبریز پیلہ الٹ چکا تھا: وقت آگیا تھا کہ ہر عام مرد اور عورت کو ایسے بے رحم تشدد پر احتجاج کے لیے اٹھ کھڑے ہونا چاہیے۔ اب یہ سیاسی رویوں یا مذہبی عقائد کا معاملہ نہیں رہ گیا تھا۔ بس اس کا ایک ہی علاج تھا: عوام خود اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں نے ایک گھریلو عورت کی مہم میں کچھ دلچسپی دکھائی، اور اسے دہشت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے آئرش عوام کے نام ایک ایمل نشر کرنے کا موقع فراہم کیا۔ امن کو اب ایک کنارے خاموش بیٹھا نہیں رہنے دیا جائے گا۔ اب، امن کو آگے بڑھنا ہی ہوگا!

اس کی ایمل کا فوراً جواب ملا۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں نے ان کی پکار پر لبیک کہا۔ سب سے پہلے تینوں بچوں کی خالہ آگے بڑھی، اور ان دو عورتوں نے مل کر جنگ زدہ علاقے کی طرف، اپنے صلح کے مادہ نگر دل کو چھو لینے والے پیغام کے ساتھ، دیرینے سے قدم بڑھائے۔ اس مختصر سی ابتدا سے آج ساری دنیا میں وہ کچھ ہوا ہے جس کو شمالی آئرلینڈ کی امن تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔

آج، وہ گھریلو خاتون اور ان تین بچوں کی خالہ، دونوں ہمارے ساتھ ہیں۔ بیٹی ولیمز اور مرید کورٹین دونوں 1976 کا نوبل امن انعام وصول کرنے آئی ہیں۔

یہ عورتیں اپنی مہم میں کیوں کامیاب ہوئی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ محاذ جنگ کے دونوں جانب امن کی آرزو نے جڑیں پکڑ لی ہیں۔ بیٹی ولیمز اور مرید کورٹین نے جو کچھ کہا ہے وہ ہزاروں دلوں کے خیالات کی گونج ہے۔ اس لیے وہ عام ذہانت کی ترجمان بن گئی ہیں جو تشدد کے سامنے بے بسی کے احساس کے باوجود اوسط درجے کے مرد اور عورت کی دلی خواہش ہے۔

نگراس سے بڑھ کر، اس سنگین تنازعے کے جوہر پر، ان کے باہمت عمل نے ایک نئی روشنی ڈالی ہے جس نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا۔ لوگوں کے دماغ کسی طرح ایک کھانچے میں پھنس کر رہ گئے: اب عام ذہانت کی باتوں کے سننے والے باقی نہیں رہے تھے۔ وہ جذبہ جو آب مکوں مکوں پھیل گیا ہے، وہی ہے جس کو نارویائی شاعر Bjarnstjerne Bjarnson نے ”جذبات کی شدید ضرورت“ کہا ہے۔

شمالی آئرلینڈ کا تنازعہ ان موذی چیزوں سے پیدا ہوا تھا جو تاریخ کی کبرانیوں میں دبی ہوئی تھیں۔ ان کو حل کرنے کی بے شمار کوششیں ہوئی تھیں مگر اب تک سب نامکمل گئی تھیں۔ وہ جو اعتدال کے نام پر زبان کھولنے کی سعی کرتے تھے ہرے کانوں والوں سے باتیں کرنے لگتے تھے۔ ہر طرف ایک ناامید دستبرداری کا

عالم ساطاری تھا، دہشت اور تشدد لوگوں کے روزمرہ کا حصہ بن گیا تھا۔ گلیوں میں مورچے بن گئے تھے۔ شہر کے ایک حصے کو دوسرے سے الگ کرنے کے لیے دفاعی کیمرس کھینچ دی گئی تھیں۔ ہمسایوں کے درمیان ایک منہمک خاموشی پیدا ہو گئی تھی، حتیٰ کی بچوں کو بھی تشدد کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ سوسائٹی خود اپنے خلاف جنگ کی حالت میں تھی، اور اگرچہ عقل کا کہنا تھا کہ ہتھیار کبھی دیر پا امن نہیں لاسکتے، کوئی بھی اس کا قابل عمل متبادل پیش کرنے کے قابل نہیں تھا۔

شمالی آئرلینڈ کی پہلی بارے میں کچھ نہ کچھ غیر حقیقی ضرور ہے، ذراؤنے خواب جیسا۔ ایک پرامن کھلی اچانک جنگ کے میدان میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور اس جنگ کے مارے ہوئے آپ کے اپنے دوست اور پرہیزی ہوتے ہیں۔ سکول کے بچے تک جنگ کے کھلونے بن گئے ہیں۔ گھروں کی، دکانوں کی، دفینوں کی، شراب خانوں کی اور کارخانوں کی فضا تک بدگمانی اور نفرت سے آلودہ ہو گئی ہے۔ کوئی بھی جدوجہد اس جدوجہد سے زیادہ گزری نہیں ہو سکتی جو ان لوگوں کے درمیان ہو جو حقیقت میں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہوں۔ صحیح معنوں میں اسی کو جذبات کی شدید ضرورت کہا جاتا ہے۔

ایسی ہی صورت تھی جس میں بیٹی ولیمز اور مریتھ کوریگن تن کر کھڑی ہو گئیں، اور نہ چوکنے والی وحشت کے مزاحمتی انہوں نے غلط سمت سے شروعات کی۔ اوپر سے نہیں، چالاک ذہنوں کے درمیان سے نہیں جو سیاہی بصیرت کے حامل تھے۔ نہیں، انہوں نے عام آدمی سے رابطہ کیا، ایک گھرے اور سادہ پیغام کے مزاحمتی نہیں تشدد اور دہشت گردی کے استعمال کو ختم کرنا ہوگا۔ ہمیں امن اور باہمی امداد کی بنیاد پر اپنا مستقبل تعمیر کرنا ہوگا۔ جنگ، کسی مسئلے کو حل کرنے سے معذور، محض احتمال اور شیطانی عمل ہے۔

یہ کہنا بہت آسان ہوگا کہ یہ سب کچھ نظیر من القس ہے اور یہ کہ کوئی بھی مایوسی کے عالم میں، بے مقصد جنگ کے بارے میں یہ سب کچھ کہہ سکتا ہے۔ جی ہاں! مگر درحقیقت ہر انسانی تنازعے کا حل کسی بالکل سادہ اور عیاں عمل سے مل سکتا ہے جو مصالحت اور باہمی امداد کے راستے پر پہلے قدم کی مانند ہوتا ہے۔

بس، کچھ اسی طرح تھا، جو شمالی آئرلینڈ میں ہوا۔ دونوں طرف سے مرد اور عورتیں اکٹھا ہوئیں اور انہوں نے مظاہرے کی صورت میں کوچ کیا، امن کی تائید میں، وہ سب جس کے لیے بے قرار ہو رہے تھے۔ خاردار تاروں کی رکاوٹیں ہٹا دی گئیں، مورچہ بندیاں مسمار کر دی گئیں، اور منہمک خاموشی توڑ دی گئی۔ پڑوسیوں اور ملک کے باشندوں نے ہاتھ ملائے اور ایک ساتھ رہنے کے لیے، ملکی تعمیر کے لیے بات چیت شروع کر دی۔ بیٹی ولیمز اور مریتھ کوریگن کی شروع کردہ مہم بھرپور اور خالص انسانی تھی۔ اس نے اس وجدان کا ثبوت پیش کیا جو سادگی سے شروع ہونے والا تھا، سچا اور خالص، بلاشبہ، جو اس قدر صحیح تھا۔

نوبل امن انعام جیتنے والے آندرے مخاروف نے کبھی کہا تھا کہ بہت سے حالات میں ہمیں مثالی بدفہم سمجھنے کرنے پڑتے ہیں، حالانکہ کبھی کسی لمحے اس راستے کا سامنا کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے جو بدفہم کی طرف لے جاتا ہے۔ ایسے آدرش کے بغیر بھی، ناامیدی ہو سکتی ہے، اور ہم تاریکی میں بھٹک سکتے ہیں، ایک بندگی

میں، جہاں کسی امید کا امکان نہیں تھا۔

مخالفوں کے اتفاق رائے ہی سچے ہیں جتنے کہ بیٹی ولیمز اور مرید کوریجن کے۔ انہوں نے کبھی دھوکا نہیں کیا کہ وہ ایسے شاہی راستے کی نشان دہی کر سکتی ہیں جو ان کے ہدف تک لے جائے گا، مگر وہ اس پہلے قدم کے بارے میں کسی مغالطے میں نہیں تھیں، اس راستے پر جس کا اٹھایا جانا ضروری تھا۔

درحقیقت، ایسا کرنے میں انہوں نے گوریلا جنگ و جدل کی بنیاد پر تباہ کن ضرب لگا دی تھی اور یہ کہنا کچھ ضروری نہیں رہ گیا ہے کہ اگر آبادی کا ایک بڑا حصہ جنگ کو رد کر دیتا تو گوریلا امر گرمیاں خود بہ خود بے کار ہو جاتیں۔

یورپی وہ نقطہ ہے جہاں سے شمالی آئرلینڈ امن تحریک کو حتمی طاقت ملنے والی تھی: اس کا اعلان تھا، جو عمل سے ثابت ہو گیا، کہ شمالی آئرلینڈ کے عوام، جو عشروں سے مقابلے کی حالت میں رہے ہیں اب ان سب سے ٹک آپکے ہیں۔ امن کی خواہش نے انہیں تازہ قوت رفتار دی ہے؛ کثیر تعداد میں لوگوں کو اب احساس ہو گیا ہے کہ دہشت نہ کبھی سماجی مافضائی کا جواب پیش کر سکتی ہے اور نہ کوئی باقاعدہ عمل پیش کر سکتی ہے۔

کہ آئرلینڈ کے لوگ اب حالات کو پہچان گئے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی کو ان میں داخل لیا ہے، جو ہم سب امید کرتے ہیں پہلے سو رہے کی نوید ہوں گے، نئے دن کی، جو اسٹرکے شدت سے جھکے عوام کے لیے دیر پا امن لائے گا۔

دیر پا امن کی طرف لے جانے والا راستہ طویل اور دشوار ہو سکتا ہے، اور یقیناً ایسے بہت سے لوگ ہوں گے جنہیں اب بھی یقین نہیں ہے کہ امن کی تحریک مستقبل قریب میں کچھ حاصل کر سکتی ہے۔ مسلمہ طور پر، اکثر اوقات عدم تشدد کے چھوٹے گروہ کو ڈانٹ دیا گیا ہے، ان کی تفحیک کی گئی ہے اور ان پر یونیویٹائی کا لیبل لگا یا گیا ہے۔ شمالی آئرلینڈ کی امن تحریک کو بھی ایسے الزامات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، اور ان کے ساتھ ایسا تو پہلے بھی ہو چکا ہے۔

ایک ناقابل حرج حقیقت بہر حال باقی راقی ہے کہ انہوں نے امن کے راستے پر پہلا باہمت قدم رکھا تھا۔ انہوں نے یہ عمل انسانیت اور اپنے مسایہ کی محبت کے نام پر کیا تھا۔ آخر کسی کو تو معاف کرنے کی شروعات کرنی تھی۔ اپنے پڑوسی سے محبت کرنا انسانیت کی بنیاد ہے جس پر ہماری مغربی تہذیب کی تعمیر ہوئی ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ ہم اس محبت کی دست گیری کر سکیں، بالخصوص ان حالات میں، جب اس سے ہاتھ اٹھالینے کا دباؤ پڑ رہا ہو۔ مگر نہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اس کی چمک میں اضافہ ہو جانا چاہیے جب نفرت اور انتقام کے جذبات اس پر حاوی ہونے لگیں۔

انسانی برادری کا جذبہ بھی انسانی حقوق کی بنیاد ہے جو ہمارے نزدیک امن کے تصور کا ایک حصہ ہے۔ ہمیں اس بات کا یقین دلانا چاہیے کہ ہم میں سے ہر ایک انسانی زندگی کے وقار کے حق سے اظہار اندوز ہوتا ہے۔ ہماری دنیا کے مستقبل کا دار و مدار اس حق میں اضافے کی پرورش میں ہماری کامیابی پر ہے۔

مجھے خبر نہیں کہ بین ولیمز اور مرید کوریگن اس سے نکلنے والے نتائج سے باخبر تھیں یا نہیں جب انھوں نے اس تحریک کی ابتدا کی تھی؛ مگر مجھے پورا یقین ہے کہ انھیں اس بات کا احساس ہونا شروع ہو گیا ہے کہ یہ طاقتیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کس طرح اس کے اطراف مزید قوی ہوتی جا رہی ہیں۔ انھوں نے ان پر جوش طاقتوں کو بے مہار کر دیا ہے جو اتنے سارے ذہنوں میں خوابیدہ تھیں، اور اسی میں سے امن کی ایک تحریک پیدا ہو گئی، اس وقت سے صین قبل، جب انھیں اس کا احساس ہوا تھا۔ ایک چھٹی ہوئی سادگی اور اعتماد کے ساتھ انھوں نے ذمہ داری قبول کی ہے اس [تحریک] کی جس کی انھوں نے شروعات کی ہے؛ اور انھوں نے یہ سب کچھ لداؤ یا ہی اور اپنے بے شمار دوستوں/بھروسوں کی بے مثال اعانت سے کیا ہے۔

آج کوئی نہیں جانتا کہ یہ منظم تحریک کبھی اپنے ہدف حاصل کر بھی سکے گی یا نہیں؛ مگر اس کی رہنمائی کرنے والوں/اویوں کو پورا حق ہے یقین کرنے کا اور اس ہدف کے حصول کے لیے کام کرنے کا۔ شمالی آئرلینڈ میں اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی اتنے سارے لوگ ہیں جو ان کی امید اور یقین میں جھکے ہوئے ہیں۔ بین ولیمز اور مرید کوریگن نے دکھا دیا ہے کہ امن کے فروغ کی خاطر لوگ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں سکھا دیا ہے کہ امن، ہم جس کے لیے کوشاں ہیں، وہ شے ہے جسے انسان کی اپنی انفرادی کوششوں سے حاصل کیا جانا چاہیے۔ یہی وہ پیغام ہے جس کو انھوں نے اپنی سرگرمیوں کے ذریعے نئی طاقت سے آشنا کیا ہے۔

افریڈ ٹوٹیل مستقل اسی فکر میں رہتا تھا۔ جسکو اور ایجاد کرنے والے دماغ کے حامل نے، جیسا کہ وہ ہمیشہ سے تھا، ان سوالات کے جواب میں کہ امن کیسے حاصل کیا جائے، بہت سے نظریات پیش کیے تھے۔ 1891 میں اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ ”بہت سی پُر اندیشہ صورتوں میں تشدد کے استعمال میں ایک وقتی توقف فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے۔“ اور یہ [وقف] اسی بنیاد پر مزید کام کرنے کا موقع فراہم کرے گا۔ ہم چیز یہ تھی کہ ہر مخالف کیمپ میں خیر سگالی کے جذبے کو تعینات کیا جائے۔ تمام لوگوں سے دوستانہ کے لیے ایک بنیاد ہوتی ہے، اور سب سے اہم مسئلہ محض اس بنیاد کی دریافت ہے۔

ان ہی خیالات کے زیر اثر افریڈ ٹوٹیل نے اپنی وصیت میں شرط لگائی تھی کہ اس کے انعامات ان لوگوں کو دیے جائیں گے جنہوں نے آدمی کے درمیان بھائی چارے کے فروغ کے لیے سب سے نیا وہ کام کیا ہو۔ لیکن، بہت سے لوگ یقیناً یہ کہیں گے کہ ہماری آج کی وحشت انگیز دنیا میں اس قسم کی شرائط پر عمل کا خیال کچھ نیا وہی مرادہ لگتی ہوگی۔ اس قسم کی رائے کے بارے میں افریڈ کا جواب شاید یہ تھا: اچھا! تو مجھے نوع انسانی کی ترقی کی ایسی کوئی ایک مثال ہی دکھا دو، مگر میں نے جس کا، یوڈو، بیٹی اور فراری کہہ کر، مذاق نہ اڑایا ہو۔

1976 کے امن انعام میں شریک دونوں عورتوں نے بے معنی شبہات کے سامنے سر خم کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کبھی اپنے کام کی مشکلات کی پروا نہیں کی؛ بس وہ اپنے کام میں جتنی رہی ہیں، اس لیے کہ

انھیں پورا یقین تھا کہ یہی کچھ ہے جس کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں ذہنی نظریات کی، چالاک حکمت عملی کی یا پر آشوبہ اطلاعات کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہیں! اس میں ان کا حصہ کنیں زیادہ بہتر تھا: ایک باہمت، بے غرض عمل، جو ہزاروں کے لیے روحانی فیضان ثابت ہوا، جس نے عظمت میں ایک شمع روشن کی تھی جس نے ان لوگوں کو نئی امید دلائی جو سمجھتے تھے کہ ساری امیدیں ختم ہو چکی ہیں۔

ہم امن اور مفاہمت کی خاطر بیٹی ولیمز اور عریضہ کوریگن کو مڈر ہو کر خطرناک میدان جنگ میں قدم بڑھانے پر تحسین پیش کرتے ہیں۔ ان کے اسی کام کی بنا پر نارویائی نوبیل کمیٹی نے ان کو اعزاز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہے وہ دنیا کے لیے ایک مثال ہے۔ ان کا عمل ہمارے تمدن کی بنیاد سے ہم آہنگ ہے، اور یہ ایسے تصور سے پیدا ہوا ہے جو ایک مشعل کی طرح ہمارے مستقبل کو روشن کر رہا ہے۔ جو کچھ انھوں نے بتایا ہے، اس کے لیے میں ایک بار پھر نارویائی شاعر Bjarnstjerne Bjarnson کے مندرجہ ذیل مصرعے پیش کرتی ہوں:

زمین کی ناروا فضا سے بھی پرے
دھنک کے رنگ سے سجا ہوا دُعا کا گِل
آدنی کے واسطے، ایک رہنما چراغ
صبح کے یقین سے چمک اٹھا
کہ انتقام فتح کر سکے ملال کو
یہی تو اُس کا قول تھا،
یہی تو اُس کا عہد تھا

نارویائی نوبیل کمیٹی کی صدر نشین Aase Lionaes کی زبانی

خطبہ — بیٹی ولیمز

میں آج ایک احساسِ انکسار، احساسِ تاریخ اور احساسِ امتیاز کے ساتھ آپ کے سامنے ایسا وہ ہوں۔
میں آپ کے سامنے ہمت کی طرف سے ایک چیلنج کو نام دینے کے لیے بھی ایسا وہ ہو رہی ہوں۔
میں نوبیل امن انعام حاصل کرنے میں فروتنی محسوس کر رہی ہوں، اس لیے کہ اس مہم میں شامل افراد کی بڑی تعداد نے ہماری رہنمائی کی طرف اتنی توجہ دلائی ہے کہ اس جیسا انعام دیے جانے کا جواز پیدا ہو سکا ہے۔ عریضہ کوریگن اور میں، دونوں اپنی تمام زندگی اس بات سے مطمئن رہیں گی کہ ہم نے امن کے لیے پہلی آواز اٹھائی تھی، ایسی آواز جس نے، نہ صرف شمالی آئرلینڈ کے عوام بلکہ جیسا کہ ہمیں جلد ہی احساس ہو گیا تھا،

پوری دنیا کے عوام کے دلوں میں بے پناہ خواہش کے دروازے کھول دیے۔ اس میں ماروے کے عوام کے دل بھی شامل ہیں، ہمارے مقصد کے لیے، جن کی فیاضی ہماری مہم کے پھیلاؤ کی سب سے بڑی وجہ بنی ہے۔ مگر امن کی خواہش کو صرف بے لگام چھوڑ دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اگر ہم اپنی تمام تر توانائی اور مثبت ارادے کے اظہار کے ساتھ اپنے آپ کو منظم نہ کرتے تو، جیسا کہ پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے، لوگوں میں تشدد کے اس فضول استعمال کے روکنے کی محض بیزار اور وقتی طلب ہی پیدا ہوتی۔

لہذا پہلے ہی ہفتے کے دوران مائٹریڈ کوریگن، کیا مان میکیون (Ciaran McKelown) کے ساتھ مل کر ہم نے Movement of the Peace People کی بنیاد رکھی، تاکہ اس خواہش کی حقیقی رہنمائی ہو سکے جو ہمیں پورا یقین تھا کہ عوام کی اکثریت کے دلوں کی کبرائی میں جاگزیں تھی، اور ان کے دلوں میں بھی، جو شاید سر بار مار ہماری مخالفت پر مجبور تھے۔

Peace People کی پیدائش کے علاوہ وہ پہلا ہفتہ مجھے ہمیشہ یاد آئے گا۔ ان کے لیے جو بہت قریبی تھے اس ہفتے کی سب سے طاقت ور یاد ایک نوجوان ری پبلکن کی موت اور گاڑی کے نیچے آ کر تین بچوں کی ہلاکت رہے گی۔ 10 اگست 1976 کی سہ پہر سے پہلے لا پڑوا اور احمقانہ تشدد نے ایک کھری بے دلی کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ مگر ایک خوف ناک لمحے کے تشدد نے، چار کم عمر افراد کی ہلاکت نے، لوگوں کو پھٹ پڑنے کا موقع فراہم تو کیا تھا مگر ساتھ ہی امن کی ایک حقیقی تحریک کے امکانات بھی پیدا کر دیے۔ شاید، اس حقیقت نے، کہ اس گاڑی میں چھ ماہ کا ایک بچہ بھی تھا جو ہلاک ہو گیا تھا، اس سانحے کو ناقابل برداشت بنا دیا تھا۔ یا چوں کہ وہ تینوں بچے ایک ہی خاندان سے تھے، تو نہال اینڈریو، چھوٹا جان اور آئڈیہ سالاہ جون میگوائر، جو ایک واقعے میں ہلاک ہوئے تھے اور ان کی ماں بھی، ایلی، جو مریض کی بہن تھی، شدید زخمی ہوئی تھی، اس لیے اندوہ زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ شاید اس مہیب اور غیر ضروری جانی نقصان نے لوگوں کو اس ہفتے ہزاروں کی تعداد میں سڑکوں پر نکل پڑنے پر اکسایا تھا۔ اور ہمیں وہ نوجوان ری پبلکن نہیں بھولتا اس دن جس کی جان گئی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ سپاہیوں کو گولی مارنے کی کوشش میں خود مارا گیا ہو، اور کچھ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہی ہوا وہ جس کا حق دار تھا۔ جہاں تک ہمارا معاملہ ہے، خواہ مخواہ ایک جان اور ضائع گئی۔ ہمارے نزدیک تو پچھلے آٹھ برسوں میں ضائع ہونے والی ہر جان، اور ہر لڑی جانے والی جنگ میں جانے والی ہر جان غیر ضروری طور پر ضائع ہوئی ہے، یعنی ایک ماں کی محنت حقارت سے ٹکرا دی گئی ہے۔

ہم تو زندگی کی تخلیق کی مانتے ہیں، ہم جنگ اور تہی کے مخالف ہیں، اور اس خوف ناک ہفتے ہم غصے میں چٹکائے تھے کہ تشدد کو روکنا پڑے گا۔

مگر ہم نے شوق کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا شروع کیا۔ کیا مان میکیون لکھتی ہے کہ The Declaration of the Peace People سادہ فقرہوں میں حقیقی امن کی راہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور اس اعلان کی اشاعت کے ساتھ، ہم نے The Movement of the Peace People کی بنیاد رکھنے کا بھی

اعلان کر دیا تھا۔ چار مہینوں پر محیط مظاہروں کے سلسلے کی منصوبہ بندی بھی شروع کی تھی کہ ان کے ذریعے ہم لاکھوں افراد کو حرکت میں لائیں گے اور انھیں چیلنج کریں گے کہ وہ اعلان کے راستے پر آگے بڑھیں۔

الفاظ تو آسان ہیں مگر راستہ آسان نہیں۔ یہ بات تاریخی نوٹیل انعامات سے تعلق رکھنے والوں کو یاد رکھنی ہوگی۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر ہمیں نہ صرف ہر قسم کے تشدد کو مسترد کرنا ہوگا، بلکہ اس کے ساتھ ہمیں امن کے کام کی جستجو بھی کرنی ہوگی۔ اور انھیں انجام بھی دینا ہوگا۔ ہمت، مشقت اور نغمن کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔

ان چار مہینوں میں لاکھوں افراد باہر نکل آئے تھے اور اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو آج ہم یہاں کھڑے نہ ہوتے۔ لہذا اس انعام کو حاصل کرتے ہوئے مجھے اپنی بے بنیادیت کا احساس ہو رہا ہے، اس کے باوجود میں Peace People کی طرف سے اس انعام کو قبول کرنے کو اپنے لیے فخر سمجھتی ہوں۔

میں تاریخ کو بھی اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ میں ان تمام لوگوں کو جانتی ہوں جو انعام حاصل کے لیے یہاں پہلے کھڑے ہو چکے ہیں۔ پہلے تو ہمیں بالخصوص مارٹن لوتھر کنگ یاد آتے ہیں، جن کی یادیں اور جن کا آدرش ہمارا سرمایہ ہیں، اور جن کی آواز آج بھی ہمارے کانوں میں الہام بن کر اترتی ہے، جس طرح اس نے دنیا بھر کے کروڑوں افراد پر اثر کیا تھا جو عملی طور پر انصاف اور امن کے لیے تشدد سے پاک جدوجہد میں شریک تھے۔

مجھے اور میری کو بچھلے برس برلن کی International League of Human Rights سے کارل فان آریٹسکی (Gail von Ossietzky) کے نام کے تحفے حاصل کرنے کا اعزاز نصیب ہوا ہے۔ لہذا میں ایک خاص وجہ سے اس آدمی کے بارے میں سوچ رہی ہوں جسے بیالیس برس قبل اس وقت نوٹیل امن انعام سے نوازا گیا تھا جب وہ ہٹلر کے جرمنی میں محبوس تھا۔ وہ انعام حاصل کرنے تو نہ آ سکا تھا مگر کتنی ہمت افزائی ہوئی ہوگی ان سب کی جو مایوسی کے عالم میں صحیح طریقے سے زندگی گزارنے کے لیے، جو جب بھی تھا، اور آج بھی عدم تشدد کا راستہ ہے۔

جب ہم کارل فان آریٹسکی اور ان کو یاد کرتے ہیں جو قید کی سختیاں جھیل رہے تھے تو ہم ان کو بھی یاد کرتے ہیں جو اس وقت شمالی آئرلینڈ کی جیلوں میں قید تھے، نوجوان مرد اور عورتیں، روایتی انداز میں تشدد پر بہکائے ہوئے، ہم جن کی قبل از وقت رہائی اور تشدد سے پاک سوسائٹی میں شمولیت چاہتے ہیں۔ اور ہم ایڈولفو پیرے ایسکیویل (Adolfo Pérez Esquivel) جیسے انسان کو بھی یاد کرتے ہیں جو ارجنٹائن میں مقدمہ چلائے بغیر جیل میں ٹھونس دیے گئے ہیں۔ ہم دنیا بھر کے ایسے ہی کتنے قیدیوں کے بارے میں بھی فکر مند ہیں جن کا ”حجم“ صرف یہ ہے کہ وہ تشدد کے بغیر انصاف اور انسانی رشتوں پر مبنی مراہم پر یقین رکھتے ہیں۔ لہذا ہم خود کو ماضی سے شروع ہونے والی تاریخ کی قطار میں ایسا وہ پاتے ہیں، اور ہم اپنے بارے میں سوچتے ہیں اور ان سب کے لیے بھی، جو انسانی تاریخ میں خطرات میں گھرے ہوئے۔ زندگی گزار رہے ہیں۔

اور تاریخ کے احساس کے ساتھ ہم میں شاید بالخصوص اس موقع پر۔ عورتوں کے لیے۔ ایک مخصوص احساس احترام بھی پیدا ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ روایتی طور پر جنگ کرنا تو ہمیشہ مردوں کی ذمہ داری رہی ہے، حالانکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اکثر و بیش تر عورتیں ہی تشدد کی وجہ بنتی رہی ہیں۔ مگر عورتوں کی آواز، ان کی آواز جو نئی زندگیوں کو دنیا میں لانے میں بہت قریب سے شامل رہی ہیں، ہی نہیں گئی ہے، جب بھی انہوں نے جنگ کے بعد جنگوں میں زندگی کی بربادی کے خلاف التجائیں کی ہیں۔ تشدد سے پاک دنیا کے لیے جدوجہد میں عورتوں کی آواز کا ایک خاص کردار رہا ہے، ایک خاص روحانی طاقت رہی ہے۔ ہم مذہبی فرقہ پرستی یا نظریاتی تقسیم کو جنگجو جنسیت میں تبدیل نہیں کرنا چاہتے۔ مگر ہمیں پورا یقین ہے جیسا کہ کیران میکین یقین کرتی ہے، جو روحانی طور پر ہمارے ساتھ ہے کہ اس جدوجہد میں عورت کا بھی ایک کردار ہے۔

سو ہمیں یہ اعزاز دیا جا رہا ہے، تمام عورتوں کے لیے، خصوصاً تشدد سے پاک ایک منصفاانہ اور پرامن سوسائٹی کی جدوجہد کی رہنمائی کے لیے۔ محبت کو آگے بڑھانے کے لیے جذبہ رحم و انش سے زیادہ اہم ہوتا ہے، امن کے کام میں جس کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ ٹھنڈے دماغ کے مقابلے میں اکثر وجدان بھی زیادہ طاقتور سرچ لائٹ ہوتا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے، اور غور سے سوچنا چاہیے، لیکن اگر سوچنا شروع کرنے سے پہلے ہم میں جذبہ رحم نہیں ہوگا تو امکان ہے کہ ہم نظریات پر جنگ کرنے لگ جائیں۔ پوری دنیا نظریاتی اور مذہبی اعتبار سے، دائیں کے ہٹلر یا بائیں کے، لوگ اپنے اختلافات کی بنیاد پر جنگ کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ پھر بھی پورا انسانی خاندان جذبہ رحم کی مدد سے متحد ہو سکتا ہے۔ اور جیسا کہ کیران نے حال ہی میں اسرائیل میں کہا ہے، ”ہمدردی کا جذبہ انسانی حقوق کو خود بخود پہچان لیتا ہے۔ اس کو کسی فرمان کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

کئی صدیوں سے، مختلف تمدن میں اپنے نسوانی کردار کی وجہ سے، عورتوں کو عوامی معاملات سے الگ کر دیا گیا ہے، اور اسی وجہ سے انہوں نے اپنی توجہ گھریلو معاملات تک محدود کر لی ہیں۔ اور وہ خالص حقیقتوں سے زیادہ رابطے میں رہتی ہیں، جیسے ولاد کی پیدائش اور محبت وغیرہ۔ انسانیت کی تاریخ میں شاید اب وہ لہجہ آگیا ہے کہ بھلا کے لیے ان حقیقتوں کی جنگ پر منتج ہونے والی شعلیں بار مہمات کے مقابلے میں، قابل فخر مقام دیا جانا چاہیے۔

مگر ہم اس مسئلے کی بنا پر تقسیم نہیں، محض ایک فطری اور باعث احترام اور محبت بھرا تعاون چاہتے ہیں۔ عورت اور مرد مل کر اس کو بخوبی صورت عوام سے آباد دینا بتا سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے خود کو ”امن کے لوگ“ کہلوا دیا ہے۔

لہذا آج لوگوں کے اعسار کے باعث، مجھے اس مقام پر ایسا وہ ہونے پر فخر ہے، اور میں اس اعزاز کو سب کی جانب سے قبول کرتی ہوں۔

مگر میں خفا بھی ہوں۔ روز روز کے انسانی زندگی کے ضیاع پر میں آج بھی اتنی ہی خفا ہوں، جیسی اس

دن تھی جب میں نے ایک جوان زندگی کو ہلفاسٹ کی نگلی میں کچلا ہوا دیکھا تھا۔

میں خفا ہوں، ”امن کے لوگ“ بھی خفا ہیں کہ وطن میں جنگ جاری ہے، اور ہم ساری دنیا میں اسی حماقت کو رفتہ رفتہ بڑھتی جنگ میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جو اس چھوٹی سی جنگ کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوف ناک ہے جسے شمالی آئر لینڈ کی چھوٹی آبادی کو جھیلنا پڑ رہا ہے۔ ہم خفا ہیں و مسائل کی بربادی پر جو روزانہ جنگجو یا نہ روش کی بدولت ہو رہی ہے، جب کہ انسان تباہی کے عالم میں جی رہے ہیں، کچھ تو جلد آنے والی موت کی امید میں، جو ان کو امید کی سے رہائی دلائے گی۔ ہمیں اس بات پر بہت طیش آتا ہے کہ ہر منٹ 500,000 ڈالر جنگ پر اور جنگ کی تیاریوں پر خرچ ہو رہے ہیں؛ جب کہ ان میں سے ہر ایک منٹ میں آٹھ سے زیادہ انسان بے توجہی کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ ہر دن 12,000 انسان بے توجہی، نا کافی غذا اور بد بختی کی جھینٹ چڑھ جاتے ہیں، پھر بھی ہر روز 720 ملین ڈالر فوجی ساز و سامان پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ ذرا اس دیوانی ترجیح پر غور تو کیجیے: جب لوگ مر رہے ہوں تو آخر ہمارے پاس سوچنے کے لیے وقت تو ہونا چاہیے! ذرا اس طرح بھی سوچیے: اگر کسی طرح اسلحہ جات کا ایک منٹ کا 500,000 ڈالر کا خرچ بچا لیا جائے اور ان 12,000 افراد میں تقسیم کر دیا جائے جو اس دن مارے جانے والے ہیں تو ہر بد قسمت کو فی منٹ چالیس ڈالر سے کچھ نیلہ مل جائیں گے۔ تو بد بختی میں مرنے کے بھلے وہ پیش میں زندگی گزار سکیں گے۔ اگر پورے ایک دن اسلحے پر ہونے والا خرچ بچا لیا جائے تو ان بارہ ہزار پر 720,000,000 ڈالر تقسیم ہوں گے۔ گویا ہر بد قسمت کو اس ایک دن میں 60,000 مل جائیں گے۔ اس قسم کی مریشانہ ترجیحات کیا پیش کر رہی ہیں! ایک ناپاک درجے کی دولت آزادی اور سوشلزم کی حفاظت کے نام پر خرچ کر دی جاتی ہے۔ بلا شبہ شاید مرے ہوئے اور مرنے والے مطمئن ہوں گے کہ آزادی اور سوشلزم کتنی مہارت اور نیرنگی سے بچائی جا رہی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ یہ دیوانہ پن اور اخلاق سے عاری توازن ایک رات میں نہیں بدلا جاسکتا: ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک بہت بڑی جدوجہد کے بغیر یہ سب نہیں بدلے گا، جب تک کہ اسلحے پر وسائل کے ضیاع کو روکنے اور عوام پر اس کی سرمایہ کاری کے لیے پھر پوجہ و جہد نہیں کی جائے گی اور مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کرۂ ارض پر بسنے والے تمام عوام اپنی زندگی جینے کے قابل نہیں ہو جائیں گے۔ اور وہ جدوجہد سب سے بڑی ہونی چاہیے، عدم تشدد کی جدوجہد جس کے ذریعے دنیا کو اسلحے سے پاک کرنا ہوگا۔ اس کام کے لیے لیبی اور موت کے من کو دبانے والی ہمت سے کہیں زیادہ ہمت اور ثابت قدمی کی ضرورت ہوگی اور آدمیوں کو نہ صرف جنگ کو ختم کرنا ہوگا بلکہ ان کو جنگ کی تیاری نہ کرنے کے لیے بھی ہمت کرنی ہوگی۔

کسی بھی دن ہمیں [امریکی ادیب اور شاعر] کارل سینڈ برگ (Carl Sandburg) کے الفاظ کو سمجھنے سے لینا ہوگا، ”کسی ایک دن جنگ ہوگی اور کوئی بھی نہیں آئے گا۔ کیا وہ دن واقعی محبوب صورت دن نہیں ہوگا؟“ کسی ایک دن ”جنگ“ ہوگی مگر کوئی بھی نہیں آئے گا۔ اور بلاشبہ اگر کوئی نہیں آئے گا تو جنگ بھی

نہیں ہوگی۔ اور ہمیں کہیں جانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، ہمیں جنگ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، مگر ایسا لگتا ہے کہ جنگ کے لیے "نہیں" کہنے کے لیے زیادہ ہمت کی ضرورت ہوتی ہے بہ نسبت "ہاں" کہنے کے، اور شاید ہم عورتوں نے بہت طویل عرصے تک اس خیال کی ہمت افزائی کی ہے کہ اکثر بچوں اور عورتوں کا دفاع کرنے کے لیے، جنگ کرنا بہادری اور مردانگی ہوتی۔ لہذا آج کے دن کے بعد سے ہر جگہ عورتوں کو مردوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیے کہ وہ ہمت پیدا کریں جنگ پر نہ جانے کے لیے، اسلحہ بند دنیا کے لیے کام نہ کرنے کے لیے، بھڑا امن کی دنیا کے اور تشدد سے پاک دنیا کے لیے۔

اس قسم کی حقیقی ہمت کے لیے لوگوں کو رکاوٹیں دور کرنی چاہئیں جو انہیں تقسیم کرتی ہیں۔ ہم اس گروہ ارض کی سطح پر تقسیم ہیں، مادی رکاوٹوں سے، جذباتی رکاوٹوں سے، نظریاتی رکاوٹوں سے، اور رکاوٹوں سے تعصب میں، ہر طرح کی نظرتوں میں۔

چند ہفتوں پہلے پوری دنیا نے صدر سادات کو امن کے حصول کے لیے براہ راست امرائیل جاتے دیکھا تھا۔ برسوں سے بڑی طاقتیں مشرق وسطیٰ میں الجھی رہی ہیں۔ اس کے باوجود جب ہم روسیوں کو اپنی خوف ناک مزامکوں کے ساتھ پے پے کرتے اور امریکیوں کو نیٹو مان ہم کی تیاری میں آگے بڑھتے دیکھ رہے تھے تو ہم نے یہ بھی دیکھا کہ جنگ کرنے والی قوموں میں سے ایک قوم کے رہنما براہ راست، ایک بڑی طاقت کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک امن کے مشن پر روانہ ہو رہے تھے۔ سادات کے مشن کی اچھی بات اس کا مخصوص نتیجہ نہیں تھی، بلکہ یہ حقیقت تھی کہ سادات کو احساس ہو گیا تھا کہ مسئلہ جیسا کہ انہوں نے خود کہا تھا،

7

فی صد "نفسیاتی" تھا۔ دراصل، جنگ ہر جگہ نفسیاتی مسئلہ ہی ہوتی ہے۔ یہ خوف، بدگمانی، شبہ اور عقوبت کا ایک الجھاوا ہوتی ہے، اور اگر صدر سادات جیسے تیس فی صد فرق کے لیے اپنی اور امرائیلیوں اور مشرق وسطیٰ کی دوسری قوموں کے درمیان جنگ کی طرف مائل ہو سکتے ہیں تو وہ کم از کم ہر اہم نفسیاتی رکاوٹ کو توڑنے کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار ہو سکتے ہیں۔

ہم "امن کے لوگ" ہونے کی وجہ سے بہت آگے تک جاسکتے ہیں۔ ہم رکاوٹیں توڑنے پر یقین تو رکھتے ہیں، مگر ہم پوری تن دی سے عمام کے درمیان مفاہمت کے ذریعے ان کو ایک دوسرے سے قریب لانے، ایک دوسرے کی زبان بولنے، ایک دوسرے کے عقائد اور خوف کو سمجھنے اور ایک دوسرے کو نفسیاتی، فلسفیانہ اور جذباتی اعتبار سے سمجھنے پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ آپ کے لیے اپنے قریبی ہمسایے کو قتل کرنا کہیں مشکل ہوتا ہے، بہ نسبت ان ہزاروں مخالف دشمنوں کے جو آپ سے بہت دور کسی جوہری میزائل کے نشانے پر ہوں۔ ہمیں ایسی دنیا تخلیق کرنی ہوگی جس میں نہ کوئی اجنبی ہو، نہ میزائل کے نشانے کے برابر فاصلے پر ہو، اور یہ کام بہت محنت کا طلب گار ہوتا ہے۔

بس ایک ہی طاقت، جو تمام رکاوٹوں کو دور کر سکتی ہے، محبت کی طاقت ہوتی ہے، بھائی کی اور روحانی

طاقت ہوتی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ایک سادہ سا مسافر، ایک معمولی سا معائنہ بھی دو افراد کے درمیان کی دشمنی کو دور کر سکتا ہے۔ پوری دنیا میں دوستی کے ایسے افعال کو ایک دوسرے سے غریب دیکھتے تو آپ دیکھیں گے کہ پہلی عالمی جنگ کی خندقوں کے اندر کی درد انگیز دوستی کے لمحات اتنا قیر معاملات نہیں رہ جائیں گے بلکہ انسانی معاملات کا قانون بن جائیں گے۔

مگر دوستی کے ایسے طریقوں کے پیچھے لگن کی قوت بھی ہوتی چاہیے۔ ایک بار ہاتھ ملانا یا گلے ملنا ہی کافی نہیں ہوتا، یسوع مسیح کے ساتھ ایک بوسے کے ذریعے ہمدردی کی گئی تھی۔ دوستی کے ابتدائی طریقوں پر عمل کرنا چاہیے، روزانہ ہر اس چیز یا اس عمل میں تعاون کرنا چاہیے جو زندگی کو بہتر بنائے اور تشدد میں مزاحم ہو۔

ہم ہر روز انسانی معاملات میں پیدا ہونے والے بحران کے بارے میں سنتے رہتے ہیں۔ مگر حقیقی بحران وہ ہے جو نوٹیل کی اس عظیم روایت کے ہمارے پیش رو ماہرین اور محققین نے بڑی خوبی سے بیان کیا تھا، جب انھوں نے کہا تھا کہ آج کا سوال تشدد یا عدم تشدد کا نہیں ہے، دراصل آج کا سوال ہے عدم تشدد یا عدم وجود کا۔

ہم اپنے دل کی گہرائیوں اور نہایت جوش سے وابستہ ہیں، عدم تشدد کے مقصد سے، سچائی کی قوت اور محبت کی روحانی قوت سے۔ ان لوگوں سے، جو ہمیں سادہ لوح اور یونیورسٹی مثال پسند گردانتے ہیں، ہمارا کہنا ہے کہ ہم ہی اصلی حقیقت پسند ہیں۔ اور وہ لوگ جو ہمارے زمانے میں حریت (militarism) کی تائید جاری رکھتے ہیں، وہ نسلی انسانی کو ایسی خود کشی کی طرف مائل کر رہے ہیں جب دائیں اور بائیں والا، دائیں مرچکا ہوگا اور بائیں مرچکا ہوگا، اور موت اور تباہی ہوگی دائیں، بائیں اور مرکز میں، مشرق میں اور مغرب میں، شمال میں اور جنوب میں۔

ہم ان لوگوں کی جو پٹا کون اور کریمین اور دوسرے تمام حربی مراکز کو چوبیس گھنٹے روشن رکھنے کے خواہاں ہیں، روشن خیالی اور حقیقی معنوں میں تخلیقی زندگی کی مثال دیکھنا چاہتے ہیں، تباہی کرنے والوں اور خود کشی کی تیاری کرنے والوں کی مثال نہیں۔ ساتھ ہی، ہم ان لوگوں کو غیر ضروری اور غیر منصفانہ دیکھوں سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں جو بیرونی علاقہ بھری آبادیوں میں ٹھنڈے ہوئے ہیں، ارجنٹائن کے اور دوسرے زندانوں میں کراہ رہے ہیں، سوئے کے جہس زدہ تنازعات سے سائبیریا کی بد فلی بد بختی تک عقوبتوں میں گرفتار ہیں۔ سب سے زیادہ ہم ان بچوں کے لیے غوش حالی کی دعا کرتے ہیں جو ہماری آج کی لاپرواہی سے مر جانے والے ہیں، ہم جس کو تبدیل کرنے میں ناکام ہیں۔ مگر دعا ہی کافی نہیں ہوتی، وہ کتنی ہی دیکھ کر کیوں نہ ہو۔ ہمیں ضرورت ہے لگن کی، سخت مشقت کی اور ہمت کی۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کرہ ارض کے اس چھوٹے سے علاقے پر جس کو شمالی آئرلینڈ کہتے ہیں ہمیں کیا کچھ کرنا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اپنی بقیہ زندگی بھر بہت کچھ کرتے رہنا ہوگا۔ آج ہمیں نوٹیل انعام مل رہا ہے، جس کو ”کرہ ارض پر کسی انسان کو ملنے والا اعلیٰ ترین اعزاز“ کہا جاتا ہے۔ مگر ایسا ہے تو خوب ہے،

مگر سچ تو یہ ہے کہ ہم اس ذمے داری کے خوف سے لرز رہے ہیں جو اس قسم کا اعزاز ہم پر ڈالنے والا ہے۔
مگر جب ہم اس کو حاصل کر رہے ہیں، تو ہم اس حسین مرغزار پر بہائے گئے اور مزید بہائے جانے والے
خون کے بارے میں سوچتے ہیں جو Mourne Mountains کی پڑ شکوہ بلندیوں سے Glens of Antrim،
اپنے پیارے بلناسٹ سے گاؤنی Fermanagh اور Foyle کے دل موہ لینے والے ساحلوں سے Armagh
کے شہر بارباغوں تک پھیلا ہوا ہے۔

ہم نہ صرف انگریز نوٹیل کے اور نوٹیل انسٹی ٹیوٹ کے مقرض ہیں کہ انہوں نے تشدد سے پاک ایک
سوسائٹی کی تشکیل کے سلسلے میں ہمارے کام کو زیادہ پرامن بنا دیا ہے، بلکہ ہم تو پوری دنیا کے بھی مقرض ہو گئے
ہیں۔ ایک خاص طرح سے ہم ماروے کے عوام کے بھی مقرض ہیں جنہوں نے ہمارے کام کو اپنے کپچے سے
لگا لیا ہے۔ صرف ان ہی کی مالی امداد سے ہم اپنے مراکز قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، جہاں سے ہر
طرح کے منصوبوں کی معاونت کی جاتی ہے۔ ہمیں اتنا سارا کام کرنا ہے، اور ایسا بہت کچھ ہے جو ہمیں اپنے
لیے بھی کرنا پڑے گا ورنہ یہ سب کچھ کسی کام کا نہ رہے گا۔ مگر گھنٹوں کے بل آہستہ آہستہ اٹھنے کے لیے ہماری
اعانت میں، اور بالخصوص اس خیرش رو دنیا میں ہماری مدد کرنے میں، تمام تر افواہ بازی کے باوجود نہ جھکنے والی
وفاداری میں، مارویائی عوام نے شمالی آئرلینڈ کے امن کے لیے ویسی ہی معاونت کی ہے جیسی کہ انہوں نے
بلجئیش کے، اور دنیا کے دوسرے علاقوں کے دیکھی لوگوں کے لیے کی تھی۔ شاید کسی دن نوٹیل امن انعام خود
ماروے کے عوام ہی کو دے دیا جائے۔

ہم ماروے کے عوام کو اور نوٹیل کمیٹی کو شکریہ ہزار بار (Tusen Talk) بار بار کہنا چاہتے ہیں۔
اور پوری دنیا کے لیے بھی ہم وہی پیغام دہرانا چاہتے ہیں ہم نے جس کا اعلان اگست 1976 میں کیا
تھا۔ "امن کے عوام" کا اعلان یہ تھا:

"امن کی اس تحریک کی جانب سے دنیا والوں کے لیے ہمارا ایک سادہ سا پیغام ہے،
ہم زندہ رہنا، محبت کرنا اور ایک منصفانہ پرامن سوسائٹی تشکیل دینا چاہتے ہیں،
ہم اپنی اولاد کے لیے بھی وہی کچھ چاہتے ہیں جو اپنے لیے چاہتے ہیں، کہ گھر میں، کام اور تحصیل کی
جگہوں پر ہماری زندگی امن اور خوشیوں بھری ہو۔

ہمیں احساس ہے کہ ایسی زندگی کا حصول ہم سب سے پوری نگیں، سخت مشقت اور ہمت کا طالب ہے،
ہمیں احساس ہے کہ ہماری سوسائٹی میں ایسے بہت سے مسائل ہیں جو تنازع اور تشدد کے ماتخذ ہیں،
ہمیں احساس ہے کہ چلنے والی ہر گولی اور پھیننے والا ہر ہم اس کام کو اور بھی مشکل بنا دیتا ہے،
ہم ہم اور گولی اور تشدد کی ہر تکنیک کے استعمال کو مسترد کرتے ہیں،

ہم اپنے آپ کو وقف کرتے ہیں کام کے لیے، ہر روز، اپنے قریبی اور دور کے ہمسایوں کے ساتھ مل
کر ایسی پرامن سوسائٹی تشکیل دینے کے لیے جس میں ہونے والے ایسے، ہم جن سے واقف ہیں، ہماری بد

آندرے سخاروف اعلان تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، عوامین و جمہرات!
ماروے کی پارلیمان کی نوبل کمیٹی نے 1875 کا نوبل امن انعام آندرے دیسٹریو ووج سخاروف کو عطا کیا ہے۔

اپنی وصیت میں، جو فریڈ نوبل نے 1896 میں اپنے انتقال سے قبل تحریر کی تھی، حکم دیا تھا کہ یہ انعام اس شخص کو دیا جائے جس نے ”عوام کی برادری کے درمیان، باقاعدہ فوجوں کے انسداد یا تخفیف میں، اور امن کے فروغ کے لیے اجتماعات کے لیے سب سے زیادہ اور سب سے اچھا کام کیا ہو۔“
جیسی کی توقع کی جاتی ہے، وقت کے ساتھ ساتھ ان احکام کے ذیل میں امن کی تصور کے بارے میں بدلتے ہوئے رویوں کے مطابق نوبل کمیٹی کی تاویلات بھی بدلتی رہی ہیں۔
پچھلے 74 برسوں میں امن انعام پانے والوں کی مثالیں موجود ہیں۔ کمیٹی نے جن لوگوں کو انعام دیے ہیں ان میں شامل ہیں:

بین الاقوامی قانون کے تصور کے داعی؛

Léon Jahaux جیسے سماجی انصاف کے داعی؛

Albert Schweitzer جیسی انسانیت پسند کاروائیوں کے لیے؛

Bertha von Suther اور Carl von Ossietzky کے جیسے صلح جو یا نہ کام کے لیے؛

Albert Lutuli اور René Cassin, Martin Luther King, کے جیسے انسانی حقوق کے فروغ

کے کام کے لیے۔

ابتدا ہی سے کمیٹی کے فیصلوں پر خاصی تنقید اور بحث ہوتی رہی ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ فیصلے غلط

تھے۔

نوبل کمیٹی ایک خود مختار ادارہ ہے جو جماعتوں، گروہوں یا ریاستی اختیار سے ماورا ہے۔ اس کے فیصلے انگریز نوبل کی وصیت میں دیے گئے احکامات اور ارادوں کی روشنی کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ اگر کمیٹی اپنے فیصلوں پر، سہولت یا موقع پرستی کے باعث، کسی قسم کے دباؤ اور خوف کو اثر انداز ہونے دے تو یہ ناقابل معافی فرائض سے پہلو تہی کے مترادف ہوگی۔

اس برس نوبل کمیٹی نے اپنا انعام اس عہد کے انسانی حقوق کے سب سے بڑے داعی کو دیا ہے۔

انعام دیے جانے کے انتخاب کے سلسلے میں کمیٹی نے مندرجہ ذیل وجوہ پیش کی ہیں:

”سخاروف کی نڈر ذاتی وابستگی، آدمیوں کے درمیان امن کے بنیادی اصولوں کی برقراری کے پُر خلوص کام کے لیے ایک نہایت طاقتور تحقیقی تحریک ہوتی ہے۔ غیر مصالحتی انداز اور ناقابل شکست قوت کے ساتھ سخاروف نے انسانی وقار کی پامالی میں ہر قسم کے طاقت کے غلط استعمال کے خلاف جنگ کی ہے، اور انھوں نے انصاف کے اصولوں پر مبنی حکومت کے لیے بھی کچھ کم جدال نہیں کیا ہے۔

سخاروف نے یقینی انداز میں اصرار کیا ہے کہ مستحکم بنیادوں پر قائم، آدمی کے ناقابل پامالی حقوق ہی دیر پا اور حقیقی بین الاقوامی تعاون کے لیے محفوظ بنیاد فراہم کر سکتے ہیں۔

اس طرح، خاص طور پر مشکل حالات میں، انھوں نے ان قدروں کو فروغ دیا ہے، جو امن کے سچے چاہنے والوں کو ایک پرچم تلے یک جا کرتی ہیں۔“

ہم سے بار بار کہا جاتا ہے کہ 1940 اور 1945 کے دوران ہر پارٹنر نے عالمی جنگ آنے والی نسلوں کے انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے لڑی مبنی تھی۔ یہ قوتیں جو اس عالمی مقصد کے لیے لڑی تھیں، اور وہ جنھوں نے اس کے حصول کے لیے اپنی جانیں قربان کی تھیں، انھوں نے لڑائی کے میدان میں جنگ تو جیت لی تھی؛ مگر انسانی وقار کا دیر پا قیام حاصل نہیں ہوا تھا۔

جنگ کے بعد کے برسوں میں اقوام متحدہ نے بنیادی انسانی حقوق کے عالمی اعلان اور اس کی آفاقی منظوری کے لیے دو اجتماعات کے انعقاد کے سلسلے میں اُن تھک محنت کی ہے۔ اس نے یہ سب اس یقین کے ساتھ کیا ہے کہ دنیا میں دیر پا امن کے مستقل قیام کے لیے یہ حقوق اور آزادیاں ضروری ہیں۔ زیادہ تر ممالک ان خیالات سے متفق ہیں۔

اب بھی باوجود تمام کوششوں اور قربانیوں کے، دنیا کے بہت سے حصوں میں کروڑوں افراد ایسے ہیں جو بالکل بنیادی انسانی حقوق سے بھی بہرہ مند نہیں؛ ایسے بھی علاقے ہیں جہاں پہلے انھیں یہ حقوق حاصل تھے مگر اس جنگ کے اقامت کے بعد سے وہ اس حق سے محروم کر دیے گئے ہیں۔

اس عوامی اعلان کے معمار، René Cassin، جن کو امن کا نوبل انعام بھی دیا جا چکا ہے اس سے واقف ہیں۔ انھوں نے موجودہ حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

”یہ اعلان ایک آدرش دیتا ہے ہم جس کی پیروی کر سکیں، اور اس پر عمل کے لیے رہنما اصول طے کرتا ہے۔ اس کے باوجود آج کی دنیا کی ایک جھلک بتاتی ہے کہ اس آدرش کے اصولوں تک پہنچنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ایسا ایک بھی ملک نہیں، بشمول سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک کے، جو اس اعلان کی دفعات پر عمل کرنے پر فخر کا اظہار کر سکے۔“

ہم زندہ رہنے کے حق کی پابھالی دیکھ رہے ہیں۔ مزاروں سے ماورائے قتل اور خون ریزی جاری ہے۔ عورتوں کا استحصال ہو رہا ہے، قتل کا دور دورہ ہے، خمیر کی آزادی اور آزادی اظہار کی اہانت ہو رہی ہے، ہر طرف نسلی تعصب جاری ہے۔ یہ ساری خرابیاں اتنی پھیل گئی ہیں کہ ان کو چھپایا بھی نہیں جاسکتا۔“

پھر بھی ایسی صورت حال میں ہمیں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ نہیں جانا چاہیے۔ اس کے برعکس یہ تمام ذمے دار افراد کے لیے ایک لٹکار ہے، قومی سرحدوں سے قطع نظر کہ وہ انسانی وقار کے استحکام کی جدوجہد کو تیز کریں اور ایسے مزار افراد کے اطراف جمع ہو جائیں جو طوق و زنجیر کے لیے اپنی گردنیں جھکانے سے انکار کرتے ہیں۔

اس برس کے انعام پانے والے آندرے سخاروف 1921 میں ماسکو میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ماسکو یونیورسٹی سے طبیعیات کی تعلیم حاصل کی اور کم عمری ہی میں کئی سائنسی مضامین شائع کر کے خاصی توجہ حاصل کر لی تھی۔

1948 سے 1968 تک سخاروف نے جوہری تحقیق کے ایک ادارے میں کام کیا، جہاں سائنس دانوں کی ایک نیم جوہری جھیلیوں کی تیاری کے سلسلے میں خفیہ کام کر رہی تھی۔

سخاروف خود کہتے ہیں کہ اس تحقیق میں سائنس دانوں کی نیم، جس میں وہ بھی شامل تھے، براہ راست صرف فوجی مقاصد ہی کے لیے کام نہیں کر رہی تھی۔ اس کا مقصد جوہری طاقت کو دوسرے کاموں میں بھی استعمال کرنے کے لیے ضروری تحقیق کرنا تھا۔

حالاں کہ 1949 میں سوویت یونین نے بھی، ریاست ہائے متحدہ امریکا کی طرح، اپنا جوہری بم تیار کر لیا تھا، مگر سوویت یونین کے مقابلے میں امریکی بم تکنیکی اعتبار سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔ سخاروف کا خیال تھا کہ امن کے مفاد کے پیش نظر، ضروری تھا کہ دونوں طاقتوں کے درمیان بدترتی کو کم کیا جائے تاکہ اسلحہ کی دوڑ میں توازن ہو، اور جوہری جنگ کی شروعات کے خطرات کم سے کم ہوسکیں۔

بیس برس کی عمر میں سخاروف کو Russian Academy of Science کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا، جس کے وہ سب سے کم عمر رکن تھے۔ اپنے ملک کی طرف سے سائنسی کام کرنے کے عوض ان کو دوبارہ Order of Lenin، اور ایک بار Stalin Prize سے نوازا جا چکا ہے، اور تین مختلف موقعوں پر Hero of Socialist Labour کے اعزاز کے لیے نامزد کیا جا چکا ہے۔

1968 میں ان کے رُتبے اور اندازِ حیات میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ ان کو اپنے تحقیقی عہدے سے ہٹا کر

Academy of Science کے ذیلی ادارے Physics Institute میں تعینات کر دیا گیا۔

سخاروف کے حالات اور رُستے میں تبدیلی ان کی سوچ اور اس کے بر ملا اعتراف کا براہِ راست نتیجہ تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب Sakharov Speaks میں لکھا ہے:

”1957 کے شروعات میں لائنس پالنگ (Linus Pauling) اور آلبرٹ شوائنسر (Alber Schweitzer) جیسے اہم افراد کے دنیا بھر میں دیے جانے والے بیانات کے اثرات سے قبل ہی میں نے اپنے آپ کو جوہری دھماکے سے پیدا ہونے والی تابکار کثافت کے مسائل کا ذمے دار محسوس کیا تھا۔“

سخاروف نے اس حقیقت کو کہ وہ ان نتائج پر پہنچے تھے مارنٹن رکھارڈس انھوں نے خود بڑی صاف گوئی سے ارباب اختیار کے نام اپنے خطوط میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ انھیں امید تھی کہ وہ اس اعتراف کے ذریعے آزاد تہاظر خیالات کی بنیاد رکھ سکیں گے، مگر اس معاملے میں انھیں بہت مایوسی ہوئی تھی۔ بہر حال سخاروف کا خیال ہے کہ ایک طرح سے ان کے نظریات کا کچھ اثر ہوا تھا۔ یہ اس وقت ہوا جب ریاست ہائے متحدہ امریکا اور سوویت یونین نے 1963 میں فضا میں، خلا میں اور سمندروں میں جوہری ہتھیاروں کے تجربات پر پابندی کا ایک معاہدہ کیا تھا۔

ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ہماری قہرمانی کی مکمل تہی ہے، جس کے نتیجے میں جوہری جنگ ہو سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خطرہ صرف عالمی سطح پر ایسے تعاون سے ہی دور ہو سکتا ہے جو قومی اور نظریاتی سرحدوں کی قلبِ ماہیت کر دے۔

اس سلسلے میں وہ ریاست ہائے متحدہ اور سوویت یونین کے درمیان قریبی رابطوں سے بہت فکرمند ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان دو عالمی طاقتوں کے درمیان پُر امن ہم یودیت صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب ان دونوں ریاستوں کے سیاسی نظام میں کسی حد تک مشابہت ہو۔ سخاروف کا خیال ہے کہ اس قسم کا تعاون ہی جوہری جنگ کا، جس کو وہ اجتماعی خودکشی کہتے ہیں، متبادل پیش کر سکتا ہے۔

جہاں تک اس سسٹم میں ان کے اپنے ملک کے حصے کا سوال ہے، وہ جمہوریت کے احیا، نوکریاں کی نفی، تحقیق افواج اور سائنسی معاملات وغیرہ میں اصلاحات پر زور دیتے ہیں۔

ان دو عالمی طاقتوں کے درمیان قریبی تعاون میں سخاروف کو عالمی بھوک، آبادی کی زیادتی اور فضائی آلودگی کے حل کی مشترکہ کوششوں کے امکانات بھی نظر آتے ہیں۔

ان کے خیال میں ایک مادی امداد کا منسوبہ تیسری دنیا میں ایک ہم آہنگ اور معاشی ترقیات کی دیر پا بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔

سخاروف سمجھتے ہیں کہ صنعتی ملکوں کی طرف سے بڑے پیمانے پر دی جانے والی امداد کے باعث ہونے والی مالیاتی کمی سے ان ملکوں کی اسلحہ بندیوں کے اخراجات میں بھی کمی ہو سکے گی۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، یہی خیالات تھے جو اقوام متحدہ میں بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ اس دہائی کے چھپے جو فلسفہ ہے، وہ اس اپیل میں پہاں تھا جو اقوام متحدہ نے دولت مند ممالک سے کی تھی، جس کی رو سے ترقی پذیر ملکوں کی لداو کے لیے ان سب کو اپنی قومی آمدنی کا ایک فی صد دینا تھا۔

سٹاروف کا مقالہ Manifesto جس نے دنیا کے بڑے حصے میں ہلچل پیدا کر دی تھی، ان کی پہلی اثاعت تھی جس میں انھوں نے دیناقت اور عقلی آزادی کی پالیسی کے لیے اپنے خیالات سے ملتا جلتا ایک ضروری نسخہ پیش کیا تھا۔

بعد کی اثاعتوں میں جن میں Sakharov speaks اور My Country and the World شامل ہیں، Manifesto میں اٹھائے گئے کچھ مسائل کے بارے میں پیش کیے گئے ان کے کچھ نظریات میں تبدیلی آئی ہے۔ وہ ان تبدیلیوں کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تبدیلی بین الاقوامی منظر نامے پر حالیہ دنوں میں ہونے والے ڈرامائی واقعات کے باعث اور ان کی اپنے اور بیرونی ملکوں کے افراد کے ساتھ گفتگو اور ان کے اپنے تجربات کی بنا پر ہوئی ہیں۔ یہ محض مستقبل کے خوابوں کی الجھن کی وجہ سے نہیں، جتنا کہ ان خطرات کی الجھن کی وجہ سے ہے جو غماب اور حقیقت کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دیتے ہیں۔

اپنے مقالے Manifesto میں پیش کیے گئے خیالات کا تجزیہ کرتے ہوئے سٹاروف وضاحت کرتے ہیں کہ جس وقت انھوں نے یہ مقالہ تحریر کیا تھا، اس وقت تک وہ تنہائی اور نہایت آرام دہ سائنسی ماحول میں رہ رہے تھے جہاں باہر کی دنیا سے ان کا کسی قسم کا رابطہ نہیں تھا۔

انھوں نے اپنی اس وقت کی زندگی کے احوال اس طرح بیان کیے ہیں:

”میں عوام سے بالکل الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔“

ایک بات چیت میں وہ مزید کہتے ہیں:

”ابتدا 1968 میں تحریر کیے گئے میرے مقالے کا تجزیہ کرتے ہوئے آپ کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا

کہ اس وقت میں thermonuclear ہتھیاروں اور ان کے تباہ کن نتائج، انسان کی تباہی، جینیاتی نتائج وغیرہ پر نہایت غور مند تھا۔

میری زندگی کچھ ایسی تھی کہ میں نے عالمی مسائل پر غور و فکر شروع کر دی تھی، جب کہ زیادہ اہم انسانی اور ذاتی مسائل پر میری توجہ بہت بعد میں شروع ہوئی۔“

اپنے مانتھی انسانوں سے روزانہ کے قریبی تعلق نے ہی انھیں اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے روزمرہ پر غور کریں اور شدت سے ان کے مسائل کے حل تلاش کرنے کی جدوجہد کریں۔ انھوں نے ارباب اختیار کے نام اپنے کھلے خطوط میں ان ہی مسائل کا تذکرہ کیا، اور ضروری اصلاحات کا مطالبہ کیا ہے۔ عوام کے ایک وسیع حلقے تک اپنی تجاویز پہنچانے کی کوشش میں سٹاروف نے 1970 میں اپنے کچھ مانتھیوں اور دوستوں سے مل کر انسانی حقوق کی کمیٹی کی بنیاد ڈالی تھی۔

اس کمیٹی کا مقصد انسانی حقوق کے فروغ کے لیے ایسی تعمیری اصلاحات کے لیے قانونی دائرے میں رد کر کام کرنا تھا جو 1948 کے اقوام متحدہ کے اعلان برائے انسانی حقوق میں بیان کے ہوئے اصولوں کے مطابق ہوں۔

سخاروف مصر رہے کہ ارباب اختیار کو مندرجہ ذیل اہم مقاصد کے لیے کوشش کرنی چاہیے: پلٹا پردہ مقدمات کے عمل کی منسوخی؛ ایسے پولیس قوانین کا اجرا جن کی مدد سے عوام تک مکمل اطلاعات پہنچیں؛ قید خانوں کے نظام کی اصلاح؛ سیاسی قیدیوں کے لیے عام معافی؛ موت کی سزا دینے والے قوانین کی منسوخی؛ کھلی مرحدیں؛ اور سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیے جانے والے نفسیاتی اداروں پر مکمل پابندی۔

سخاروف کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ Agreement on Security and Cooperation in Europe میں امن کے لیے ان کے ضروری خیالات کی بازگشت ہوئی ہے، اسی برس کی یکم اگست کو جن پر پینتیس مختلف ممالک نے بیسنگی میں دستخط کیے تھے۔

بیسنگی کے معاہدے کی ساتویں طبقہ کہتی ہے کہ:

”تمام شریک ریاستیں انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا احترام کریں گی، بشمول سب کے لیے آزادی خیالات، ضمیر، مذہب یا عقیدہ، بلا امتیاز جنس، زبان یا مذہب۔“
یہ معاہدہ آگے چل مزید کہتا ہے کہ:

تمام لوگ بہت آزادی اور فروغ کے لیے کام کریں گے، شہری، سیاسی، سماجی، تہذیبی، اور دوسرے حقوق اور آزادی کے لیے، جو ہر انسان کے پیدا کی وقت اور اس کی آزادی اور لازمی ترقی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔
یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتوں نے اس دستاویز میں انسانی حقوق کو قوموں کے درمیان دیتا ہے کے ایک اہم عنصر کے طور پر شامل کیا ہے۔

اب نہ کوئی ریاست اور نہ کوئی سیاست داں اپنی اخلاقی اور سیاسی ذمہ داریوں کو، جو ان شقوں کے ذریعے عائد کی گئی ہیں، کسی بین الاقوامی قانون میں چھپائے گئے دلائل کی آڑ میں کیا سکتا ہے اور نہ ان سے بچ سکتا ہے۔ اب ایسا کرنا انسانیت اور امن سے غداری ہوگا۔

آندریہ سخاروف نے واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنے حصے کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔

نویٹل کمیٹی کے الفاظ میں: ”امن کے سلسلے میں آندریہ سخاروف کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے بڑے ہی مشکل حالات میں بڑے مؤثر طریقے سے، قربانی نفس کے عظیم جذبے کے ساتھ، ان قدر کے احترام کے حصول کے لیے جدوجہد کی ہے جو بیسنگی معاہدے میں شامل ہیں۔“

سخاروف نے انسانی حقوق کے لیے، تحریفِ اسلحہ کے لیے اور قوموں کے درمیان تعاون کی جدوجہد میں امن کو اپنا حتمی ہدف رکھا ہے۔ ہر ملک کے عوام کے حالات کی بہتری کے لیے کی جانے والی ان کی کوششوں کو، آج ہم 1975 کے نویٹل کے امن انعام کے ذریعے خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

نوبل کمیٹی اس بات کی شدت سے مذمت کرتی ہے کہ آندرے سخاروف کو خود یہاں آکر امن انعام حاصل کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

یہی اس شخص کے ساتھ بھی ہوا تھا جس کو چالیس برس قبل 1935 کا نوبل امن انعام دیا گیا تھا۔ اس کا نام تھا Carl von Ossietzky۔

سخاروف کے 1968 کے معروف مقالے Manifesto کے مروجہ پر کوشش کے مندرجہ ذیل الفاظ رقم لکھا:

”صرف وہی آدمی، جو ان کے لیے ہر روز جنگ کرتا ہے، آزادی اور زندگی کا حق مار رہا ہے۔“
آندرے دیپتری ادویچ سخاروف نے واقعی آزادی اور زندگی دونوں کا حامل ہونے کی کوشش کی شرط کا حق ادا کر دیا ہے۔

مارٹین نوبل کمیٹی کی صدر نشین Aase Lonaes کی زبانی

خطبہ — ایلینا بونیر سخارووا کی زبانی

امن، ترقی اور انسانی حقوق

نوبل کمیٹی کے محترم ارکان، خواہن و حضرات!

امن، ترقی اور انسانی حقوق — یہ تینوں ہدف ایک دوسرے میں گھٹلے ملے ہوئے ہیں: یہ ناممکن ہے کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک ہدف حاصل کر لیا جائے، اگر دوسرے دونوں نظر انداز کر دیے گئے ہوں۔ یہی وہ غالب خیال ہے جو میرے خطبے کا مرکزی موضوع ہے۔ میں شکر گزار ہوں کہ یہ عظیم اور نمایاں نوبل امن انعام مجھ کو عطا کیا گیا ہے اور آج مجھ کو یہاں سے کچھ کہنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ خاص طور پر میرے لیے کمیٹی کے الفاظِ اعتراف باعثِ تسکین ہیں جو اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ انسانی حقوق کا دفاع ہی وہ بنیاد ہے جس پر اصل اور دیر پا بین الاقوامی تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خیال بہت اہم ہے: میں اتفاق کرتا ہوں کہ بغیر آزاد تبادلات کے ضمیر کی آزادی کے حقِ اشاعت کے سفر کرنے کے حق اور ملک کے انتخاب کے حق کے جس میں زندگی گزارنے کا ارادہ کیا جائے، بین الاقوامی اعتماد باہمی اور ایک خفیفہ الطہ اور بین الاقوامی تحفظ ناقابلِ تصور ہیں۔ اسی طرح میں اس امر سے بھی متفق ہوں کہ ضمیر کی آزادی، دوسرے شہری حقوق کے ساتھ سائنسی ترقی کی بنیاد فراہم کرتی ہے اور اس امر کی ضمانت بن جاتی ہے کہ سائنسی اقدامات انسانیت کو نجات دتا راج نہیں کریں گے اور سماجی حقوق کے دفاع کے بدلے میں امکانات کی سیاسی ضمانت ہوگی، معاشیاتی اور سماجی ترقی فراہم کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ میں انسانیت کی

تقدیر بنانے میں اصلی اور فیصلہ کن با معنی شہری اور سیاسی حقوق کے نظریے کا دفاع کرنا چاہوں گا۔ یہ نظریہ عام طور پر مقبول مارکسی نظریے سے اور technocratic رویے سے قیمتی طور پر مختلف ہے، جس کے مطابق مادی حقیقتیں اور سماجی و معاشیاتی حالات ہی فیصلہ کن اہمیت کے حامل ہوتے ہیں (مگر یہ کہنے میں میرا عوام کے مادی حالات سے انکار کا، بلاشبہ کوئی ارادہ نہیں)۔

میں اس خطبے میں ان سب کا اظہار کرنا چاہوں گا اور میں، بالخصوص، چند ٹھوس مسائل پر بات کرنا چاہوں گا جو انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے متعلق ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان مسائل کا حل ضروری ہے، اور ہمارے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے خطبے کو ”امن، ترقی، انسانی حقوق“ کا عنوان دیا ہے۔ اس میں فطری طور پر 1968 کے میرے مقالے ”ترقی، پرامن ہم بودیت اور عقلی آزادی“ کے عنوان سے ایک شعوری مشابہت ہے، جس سے میرا خطبہ اپنے مواد اور مفہام کے اعتبار سے، بہت قریب ہے۔

یہ کہنے کے لیے بہت مواد موجود ہے کہ بنی نوع انسان، جو بیس ویں صدی کے دوسرے نصف کی ولہیز پر ہے، اپنی تاریخ کے ایک مخصوص فیصلہ کن اور نازک دور میں داخل ہوئی ہے۔

Thermonuclear میزائلیں، جو اصولی اعتبار سے پوری انسانیت کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اس وقت موجود ہیں؛ ہمارے عہد کے لیے یہی سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ معاشی، صنعتی اور سائنسی ترقیات کے طفیل نام نہاد ”روایتی“ اسلحہ جات اور بھی خطرناک ہو گئے ہیں؛ کیمیائی اور باکٹیریائی ہتھیاروں کا تو ذکر ہی کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صنعتی اور تکنیکی ترقی، مطلقاً، قطعاً اور آزار کو قابو کرنے کا سب سے بڑا عنصر ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ ترقی ہمارے قدرتی وسائل کو نکل جاتی ہے، اور ہمارے فضاوی ماحول میں، مہارک تہذیبی کا باعث ہوتی ہے، ہم کو جس میں زندہ رہنا ہوتا ہے۔ اس طرح انسانیت کو سنگین ماحولیاتی خطرات کا سامنا ہے۔ زندگی کے روایتی پیکریوں میں تیز قدم تہذیبیوں کے نتیجے میں بلا روک ٹوک آبادیاتی اضافہ ہوا ہے، جو تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں زیادہ نظر آتا ہے۔ آبادی میں اضافے سے پہلے ہی خامے پیچیدہ معاشی، سماجی اور نفسیاتی مسائل پیدا ہوئے ہیں، اور مستقبل میں مزید ناگزیر اور بڑے مسائل کا باعث ہوں گے۔ بہت سے ممالک میں، بالخصوص ایشیا، افریقا اور لاطینی امریکا میں کروڑوں افراد کی زندگی میں غذا کی کمی دیرا عنصر ہوگی، جو پیدائش کے لمحے سے ہی سے فاقہ کشی کے سزاوار ہوں گے۔ اس کے پیش نظر مستقبل کے منظر نامے دہشت انگیز ہیں اور بہت سے ماہرین کی رائے میں، کامیاب سبز انقلاب کے باوجود المناک ہوں گے۔

پھر بھی، ترقی یافتہ ممالک میں بھی لوگ کھٹیں مسائل سے دوچار ہیں۔ ان میں سے ایک وہ دباؤ ہے جو ضرورت سے زیادہ شہر کاری کی وجہ سے ہے، وہ تمام تہذیبیاں جو کمیونی کے سماجی اور نفسیاتی استحکام میں خلل انداز ہوتی ہیں؛ فیشن اور رجحانات کی متواتر پیروی، بے حس اور دیوانے پن کی حد تک زندگی کی تیز رفتاری؛

نفسیاتی اور ذہنی انتشار میں اضافی فطرت اور عام حالات سے دور ہوتی ہوئی بے شمار زندگیوں، بکھرتے ہوئے خاندان، چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور آسائشوں کی کمی، سماج میں اخلاقی اصولوں کا انحطاط اور لوگوں میں عام طور پر اس طرح کا احساسِ کمزوری میں اب ان کے لیے کوئی معقول ہدف باقی نہیں۔ اس قسم کے پس منظر میں ہمیں ہنگامہ خیز مظاہر کا ایک ڈھیر دکھائی دیتا ہے، جہانم میں، شراب نوشی میں، نشہ آور اشیاء کے استعمال میں، دہشت ناک اعمال میں روز افزوں اضافے وغیرہ۔ دنیا کے قدرتی وسائل کا اختتام، آبادی کی زیادتی کا خطرہ، کھربوں بین الاقوامی سیاسی اور سماجی مسائل ترقی یافتہ ملکوں پر بھی بہت زیادہ دباؤ پیدا کر رہے ہیں، اور بہت سے لوگوں کو بھروسہ کر دیں گے یا محرومی کا خطرہ پیش کریں گے جو فساد اور بے امنی کے عادی بن چکے تھے۔

بہر حال آج دنیا کو جس انداز کے مسائل درپیش ہیں اس میں انسانیت کی سیاسی قطبیت (polarization) جو نام نہاد پہلی دنیا [مغربی]، دوسری دنیا [اشتراکی] اور تیسری دنیا [ترقی پذیر ممالک] کہلاتی ہے، ایک زیادہ فیصلہ کن اور اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ دو طاقتوں، اشتراکی ریاستیں، دراصل، آمرانہ اور پارانڈیش ریاستیں بن چکی ہیں جن میں، زندگی کے ہر طبقے میں، ایک ہی جماعت بے انتہا اختیار کی حامل ہے۔ وہ بے حد ترقیاتی امکانات کی حامل ہیں، اور کرۂ ارض کے پیش تر حصے پر اپنا اختیار برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک ریاست چینی عوامی جمہوریہ ابھی تک صرف ایک معقول ترقیاتی درجے پر پہنچ سکی ہے، جب کہ دوسری ریاست سوویت یونین نے اپنے منفرد قدرتی وسائل کے ناجائز استعمال سے، اور اپنے باشندوں کی قوتوں اور ان کی مسلسل برہمستی ہوتی تنگ دستی پر مزید بوجھ ڈال کر ایک بڑی جنگی صلاحیت اور نسبتاً بلند اگرچہ ایک طرفہ، معاشیاتی ترقی حاصل کر لی ہے۔ مگر سوویت یونین میں بھی عوام کا معیار زندگی کم ہے، اور ان کے شہری حقوق، دوسری نسبتاً چھوٹی اشتراکی ریاستوں کے مقابلے میں محدود ہیں۔ تیسری دنیا میں بھی بہت پیچیدہ عالمی مسائل ہیں، جہاں ایک غیر متحرک معیشت بھی بین الاقوامی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث نظر آتی ہے۔

مزید یہ کہ اس قسم کی قطبیت دنیا کو درپیش بڑے خطرات کو مزید سبب فراہم کرتی ہے، مثال کے طور پر جوہری تباہی کا خطرہ، قحط، ماحول کی آلودگی، قدرتی وسائل کا اختتام، افزائشِ نسل کی کثرت اور سلبِ انسانیت (dehumanization)۔

اگر ہم فوری اور اہم مسائل کی ساری پیچیدگیوں پر غور کریں تو، مجھے یقین ہے کہ سب سے پہلے یہ نکتہ اٹھایا جانا چاہیے کہ سماجی اور تکنیکی ترقی کی رفتار میں کمی کرنے کی کوئی کوشش، شہر کاری کے عمل کو الٹا چلایا جانا، تباہی اور قبائلی اندازِ حیات کی واپسی، ماضی بعید کی معقول قومی روایات کی نشاۃ الثانیہ کے تمام عمل غیر حقیقی ہوں گے ترقی یافتہ ہو رہے ہیں، اور اس کو روک دینے سے تمدن کے زوال اور تباہی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس کو بہت زمانہ نہیں گزرا ہے جب لوگ مصنوعی کھانا، مشینی زراعت، زہریلی کیمیا اور مشینی طریقوں سے موقوف تھے۔ اب آوازیں اٹھنے لگی ہیں کہ روایتی اور کم خطرناک قدیم زرعی طریقوں کو واپس لایا جائے۔ مگر

اُس دنیا میں جہاں کروڑوں افراد بھوک کے کرب میں مبتلا رہتے ہوں کیا اس قسم کے اقدام کیے جانے چاہئیں؟ اس کے برعکس، اس میں شبہ نہیں کہ ہمیں زیادہ ترقی یافتہ زرعی طریقوں کی ضرورت ہے، اور ترقی پذیر ملکوں سمیت تمام دنیا میں جدید طریقوں سے کی جانے والی زراعت کو پھیلایا جانا چاہیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ طبی تحقیق اور اس کی دوسری شاخوں میں تحقیق کے نتائج کو عام طور پر استعمال کیا جانا چاہیے جس میں bacteriology، virology، neuro-physiology، انسانی جینیات اور جینیاتی جراثیمات کے استعمال کے امکانات کو ہم رد نہیں کر سکتے، خواہ اس میں بد معاملگی کے امکانی خطرات کا خدشہ بھی ہو۔ اس کا اطلاق ان تحقیقات پر بھی ہوتا ہے جو عقلی اعمال کی نقل [مصنوعی فہانت] پر مبنی نظام بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں عوام الناس کے رد عمل پر قابو پانے کی کوشش، دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ سے ایک ہم خیال نظام کی تخلیق، اخذات کے انتخاب اور ان کی حفاظت کا نظام وغیرہ بھی شامل ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی تمام تحقیقات خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں اگر ان کے نتائج غیر ذمہ دار اور مازداری کے پردوں میں کام کرنے والی نوکر شاہی کے ہاتھوں میں چلے جائیں، مگر یہ انسانیت کے لیے فہانت فائدہ مند بھی ہو سکتے ہیں اگر ان کی جانچ پرکھ اور سماجی سائنسی تجزیے سخت ریاستی نگرانی میں کیے جائیں۔ ہم مصنوعی مائوں کے زیادہ وسیع اطلاق، synthetic غذا یا زندگی کے مرکب کو جدید خطوط پر استوار کیے جانے کو بھی رد نہیں کرتے، ہم برحق ہوتی خود کاری (automatization) اور صنعتی پیداوار کی افزائش کو بھی رد نہیں کر سکتے، خواہ اس میں معاشرتی مسائل کی الجھنیں بھی شامل ہوں۔

ہم thermonuclear طاقت سے چلنے والے بجلی گھروں کی تعمیر یا جوہری طبیعیات پر کی جانے والی تحقیق پر اعتراض نہیں کر سکتے، اس لیے کہ ہمارے تمدن کا انحصار ہی توانائی پر ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کو یاد دلانا چاہوں گا کہ پچیس برس قبل میں اور میرے استاد Igor Jeugenivich Tamm نے، جن کو طبیعیات کا نوبل انعام دیا گیا تھا، اپنے ملک میں جوہری طبیعیات پر تحقیق کی بنیاد رکھی تھی۔ اس تحقیق کو کلاسیکی magneto thermal isolation کے میدان میں لیزر کے استعمال کرنے کے طریقوں میں بہت وسعت حاصل ہوئی ہے۔

ہم ایسی مشقوں پر اعتراض نہیں کر سکتے جن کا مقصد کائنات کے نہ صرف اُن حصوں پر، جو ہمارے کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہیں، بلکہ عالم موجودات کے دوسرے شعبوں پر بھی قابو پانا ہے، جس میں ہماری زمین سے باہر کے تمدن سے آنے والے اشاروں میں مزاحم ہونے کی کوشش بھی شامل ہے۔ اس قسم کے تجربات کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں، مگر ان کے نتائج اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔

میں نے ابھی صرف چند ہی مثالیں پیش کی ہیں، مگر بلاشبہ اور بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ درحقیقت ترقیات کے سارے اہم پہلو دھماکے کی مثال آپس میں بنے ہوئے ہیں، اپنے تمدن کے نظام کی مکمل تباہی کا خطرہ لیے بغیر ان میں کسی ایک کو بھی خارج نہیں کیا جاسکتا۔ ترقی ناقابل تقسیم شے ہے۔ مگر ترقی کی میکینک

میں عقلی عناصر خاص کر مار کرتے ہیں۔ خاص کر اشتراکی ممالک میں ان عناصر کو زیر انداز کرنے کی کوشش عام ہے، بلاشبہ جو عوام پسند نظریاتی عقائد کے سرکاری فلسفے کی وجہ سے ترقیات کی ایک مسخ شدہ تصویر، یا ان کے انکوار اور نظموں پر منتج ہوں گے۔ ترقی صرف اسی وقت ممکن اور بے ضرر ہوتی ہے جب اس کو مناسب قیود میں رکھا جائے۔ سب سے اہم مسئلہ ماحول کے تحفظ کا، ایک واضح مثال ہے جس میں عوام کی رائے کا کردار آزاد ساج اور آزادی ضمیر کو خاص طور پر صاف نظر آنا چاہیے۔ انسانی کے انتقال کے بعد، چھٹے عشرے میں، ہمارے ملک میں پیدا ہونے والی جمہوری آزادی خیالی کے باعث یہ ممکن ہوا ہے کہ ہم کھلے بندوں اس مسئلے پر بحث میں شامل ہو سکتے تھے۔ مگر مسئلے کا مؤثر حل اضافی سماجی اور بین الاقوامی کنٹرول کا طلب گار ہوتا ہے۔ سائنسی نتائج اور تدریجی تحفیض اس طرح کا فوجی اطلاق بھی اتنا ہی پر اندیشہ ہوتا ہے، جس کو عوامی رائے اور آزاد ساج ہی سے بین الاقوامی اعتبار ملتا ہے۔ mass human behaviorism کی جو مثال میں نے ابھی پیش کی ہے یہ ایک اور ہی قسم کی ہے، اگر چہ قاری کو یہ دور رس نظر آئے گی۔

ضمیر کی آزادی، مطلع عوامی رائے کی موجودگی، بخیریت نوعیت کا تعلیمی نظام، پریس کی آزادی اور تمام اطلاعات تک بلا روک ٹوک رسائی وغیرہ اشتراکی ممالک میں کم یاب ہیں۔ یہ نتیجہ ہے معاشی، سیاسی اور نظریاتی وحدت وجود کا، جو ان قوموں کے کردار کا جزو ہو چکی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ شرائط ایک لاپرواہی ضرورت ہیں، اسی لیے نہیں کہ ترقی کی بد استعمالی کو نظر انداز کیا جائے، مگر ہم اس کو مستحکم بھی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات خاص طور پر اہم ہے کہ موثر تعلیمی نظام اور تحقیقی احساس وراثت ایک نسل سے دوسری نسل تک، دانش ورانہ آزادی کے ماحول ہی میں ممکن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اخلاقی غلامی، قابل افسوس نوکری شاہی کی موافقانہ طاقت جو ابتدائی سے کرم خیزی کا کردار ادا کرتی ہے انسانی دانش پر، ادب پر اور فن کے میدانوں پر فطری طور پر منتج ہوتی رہی ہے، عمومی دانش کے انحطاط پر، bureaucracy پر، پورے تعلیمی نظام کی ضابطہ بندی پر، سائنسی تحقیق کے انحطاط پر اور ہر قسم کے تحقیقی کام کی ترغیب کو پس پشت ڈالنے اور تحلیل کرنے پر۔

ایک ایک قطب دنیا میں آمرانہ ریاستیں، دیتانت کے طفیل، آج ایک قسم کی دانش ورانہ انجی صفائی کے موقع سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اندرونی جدیلیاں، جن کو ہم سب ضروری سمجھتے ہیں، نہیں ہوتی ہیں تو بہت جلد ان جیسے کاموں پر مجبور ہونا پڑے گا۔ دیتانت کے بہت سے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ بھی ہے۔ اگر یہ واقع ہوتا ہے تو دنیا کے حالات میں جہاں کے کا خطرہ چھوڑا مارا بڑھے گا۔ مغربی ملکوں، اشتراکی ملکوں اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان تعاون کا ایک وسیع محاذ امن کے لیے ضروری ہوگا، جس کے ذریعے سائنسی نتائج کے تبادلے، ٹیکنالوجی، تجارت کے تبادلے ہوں گے اور باہمی معاشی امداد بھی فراہم کی جائے گی، خصوصاً جہاں غذا کے مسائل درپیش ہوں گے۔ مگر ایسے تعاون کو کھلی سوسائٹیوں کے درمیان باہمی اعتماد کی بنیاد پر ہونا چاہیے یا اگر اس کو دوسری طرح پیش کیا جائے تو فراخ ذہن کے ساتھ، حقیقی

مسادات کی بنیاد پر ہونا چاہیے، جمہوری ملکوں کے اس ٹھٹھ کی بنیاد پر نہیں جو انھیں اپنے آمرانہ ہمسایوں سے درپیش ہو۔ ورنہ تعاون خود کو اپنے ڈراؤنے ہمسایے میں ختم کرنے کی کوشش کے مترادف ہوگی۔ لیکن، اس قسم کی پالیسی کا مطلب ہوگا ایک خطرناک موقعے کو کل پر ملوثی کرنا، جو ایک دن، دوسرے دروازے سے، دس گنا طاقت کے ساتھ، پھر واپس آدھکے گا۔ یہ میونخ پالیسی کا ایک اور سادہ سا پہلو ہے۔ دیتانت کی کامیابی کا اسی وقت یقین ہو سکتا ہے جب شروع ہی سے یہ تمام ملکوں کی مسلسل فراخی، عوام کے ہوش مند احساس، آزادانہ تبادلہ اطلاعات اور ہر ملک کے شہری اور سیاسی حقوق کے مکمل احترام کے ساتھ ساتھ چلے۔ مختصر، مادی حلقے کے علاوہ دیتانت کو عقلی اور نظریاتی حلقے میں بھی نافذ العمل ہونا چاہیے۔ فرانس کے صدر گیسکارڈ د'استائنگ (Giscard d'Estaing) نے اپنے ماسکو کے دورے کے درمیان بڑے تعریفی انداز میں اس کا اظہار کیا تھا۔ جب ایک اہم اصول کی پرورش داؤ پر لگی ہوئی ہو تو ایسے میں قوم کے کم نظیر امید پرستوں کی تنقید سننے کے قابل ہوتی ہے۔

تحقیق اس طرح پر آنے سے پہلے اس موقع پر ایک بار پھر میں اپنی کچھ تجاویز آپ حضرات کے گوش گزار کرنا چاہوں گا۔ سب سے پہلے میرا خیال ہے تحقیق اس طرح، انسانی حقوق اور ماحول کے تحفظ کی خاطر، اقوام متحدہ کے زیر اثر، ایک بین الاقوامی مشاورتی کمیٹی قائم کی جائے۔ میری رائے میں ایسی کمیٹی کے پاس حق ہونا چاہیے جو حکومتوں کو اپنے سوالات اور سفارشات کے جواب دینے پر مجبور کر سکے۔ اس قسم کی کمیٹی ایک اہم ادارہ ہوگی جو انسانیت کے سب سے اہم مسائل، بین الاقوامی بحث اور اطلاعات پر کام کرنے کی مجاز ہوگی۔ میں متحضر ہوں کہ اس خیال کی تائید ہواور اس پر بحث کی جائے۔

میں اس بات پر بھی زور دینا چاہوں گا کہ میرے خیال میں اقوام متحدہ کی افواج کو ریاستوں اور نسلی گروہوں کے درمیان فوجی تنازعات کو روکنے کے لیے زیادہ استعمال کیا جانا چاہیے۔ میں اقوام متحدہ کے امکانی اور ضروری کردار کا بہت احترام کرتا ہوں اور میں اس ادارے کو انسانیت کے مستقبل کی سب سے اہم امید سمجھتا ہوں۔ حالیہ برس اس ادارے کے لیے مشکل اور پُر اندیشہ ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب My Country and the World میں لکھا ہے، مگر یہ اس وقت چھپ کر آئی جب ایک افسوس ناک واقعہ ہو چکا تھا: جنرل اسمبلی، عملی طور پر کسی بحث کے بغیر، ایک قرارداد منظور کر چکی تھی جس میں صیہونیت کو ایک قسم کی نسلیت اور نسلی تعصب کی تحریک گردانا گیا تھا۔ تمام غیر جانب دار جانتے ہیں کہ صیہونیت نظریہ ہے یہودیوں کی قومی شناخت، الشانہ کا، دو ہزار سالہ علاقہ دہی کا، اور یہ بھی کہ یہ تحریک کسی کے خلاف نہیں ہے۔ اس قسم کی قرارداد کی منظوری نے، میرے خیال میں، اقوام متحدہ کے وقار کو دھچکا پہنچایا ہے۔ اس قسم کی تحریکوں کے باوجود، جو ادارے کے کچھ نئے ارکان کے رہنماؤں کی عاقبت مائندیشی کے نتیجے میں پیش کی جاتی رہی ہیں، مجھے یقین ہے کہ جلد یا بدیر یہ ادارہ انسان کی زندگی کے بارے میں اپنے منشور کے مطابق کردار ادا کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے دور کے مرکزی سوال، اسلحے کی تخفیف کے مسئلے کی طرف آؤں۔ میں نے اپنی کتاب My Country and the World میں اپنے موقف کے بارے تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ قوموں کے درمیان اعتبار کو فروغ دیا جائے اور بین الاقوامی جانچ کے ذریعے امداد کے استعمال کے ضوابط کی پابندی پر زور دیا جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا اگر دینتانت کو نظریاتی حلقے تک وسعت دی جائے، اور یہ اضافی کشادگی کی پیش قیاسی کرے۔ میں نے اپنی کتاب میں بین الاقوامی معاہدوں کی ضرورت اور دوسری ریاستوں کو اسلحے کی فراہمی کی حدود مقرر کرنے پر زور دیا ہے۔ اس پر بھی کہ ہمیں باہمی رضامندی کی بنیاد پر نئے اسلحے کے نظام کو روک دینا چاہیے اور ہمیں خفیہ از سر نو اسلحہ بندی کی بندش کے، غیر معین حنا سر کے استخراج کے، اور خصوصاً ایک سے زیادہ جوہری بم لے جانے والی میزائلوں کے امتناع کے معاہدے کرنے چاہئیں۔

جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ کیا ممکنگی اعتبار سے تخفیف اسلحہ کا مثالی بین الاقوامی معاہدہ ہوگا؟

میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے معاہدے سے پہلے ہمارے پاس ایک سرکاری اعلان ہونا چاہیے۔ اگرچہ ابتدائی مرحلوں میں، فوجی طاقت اور مقابلے کے علاقوں کے بارے میں، اعلان کا سرکاری ہونا ضروری نہیں (جوہری بم کی تعداد سے ان افراد کی گنتی تک جو فوجی خدمات کے لیے موجود ہوں)۔ اس معاہدے کا پہلا قدم اس بات کا یقین کرنا ہوگا کہ فوجی اعتبار سے اہم علاقے اور ہر قسم کی فوجی طاقت کی برابری کے لیے ہر ایک میں کمیٹی کی جائے تاکہ معاہدہ کرنے والی ایک پارٹی کے مقابلے میں دوسری پارٹی کی برتری کی صورت میں مناسب توازن رکھا جائے۔ یہ [فیصلہ] سب سے پہلے اس امکان کو مستحکم کر دے گا کہ ایک علاقے [مثلاً یورپ] کے لیے کیا ہوا معاہدہ دوسرے علاقے (یعنی سوویت چین میں سرحد) کی فوجی استطاعت کے استحکام کا باعث نہ بنے۔ دوسرے یہ کہ مختلف طاقتوں کی اہمیت کے اعتبار سے قدرتی تقابلی کی بنیاد پر ہونے والی امکانی مائنسافیاں [معاہدے سے] خارج کر دی جائیں گی۔ (مثالی کے طور پر، یہ کہنا مشکل ہو گا کہ میزائلوں کو چلانے والی کتنی توپیں ایک لڑاکا بحری جہاز کے برابر ہوں گی، وغیرہ)۔ تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں دوسرا قدم یہ ہوگا کہ ہر ملک اور ہر علاقے کی فوجی طاقت میں ایک ساتھ مناسب کمی کی جائے۔ دو سطحوں پر کی جائی والی تخفیف اسلحہ کے لیے اس قسم کا ایک فارمولا مارے ممالک کے لگاتار تحفظ کی یقین دہانی کرے گا، تاکہ ہر علاقے میں، جہاں کسی امکانی مقابلے کا خطرہ ہو وہاں فوجوں کی برابری کو برقرار رکھا جائے، ساتھ ہی ساتھ ان معاشی اور سماجی مسائل کا حل بھی پیش کیا جائے جو فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ کئی ماہروں اور سیاست دانوں نے بھی اسی قسم کے نظریات کا پرچار کیا ہے، مگر ابھی تک ان میں کسی کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی اب جب کہ انسانیت جوہری holocaust کے دھماکے کے ذریعے مکمل تباہی کے خطرے سے دوچار ہے، میں اُمید کرتا ہوں کہ انسانی وجود کی بنیاد پر یہ قدم اٹھانے سے گریز نہیں کیا جائے گا۔ بنیادی اور متوازن تخفیف اسلحہ، حقیقتاً ممکن بھی ہے اور ضروری بھی، جو دنیا کو درپیش

فوری اور تباہ کن پیچیدہ مسائل کا حل بھی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کا نیا دور جس کو دہشتانیت کا نام دیا گیا ہے، جو پلٹنکی کانفرنس میں اٹھایا گیا تھا، اصولی طور پر اس سمت میں نئے امکانات کی نشان دہی کرتا ہے۔

پلٹنکی کانفرنس میں ہونے والا معاہدہ خاص طور پر ہماری توجہ حاصل کرتا ہے اس لیے کہ پہلی بار سرکاری اخبار کو نازک ایشیادوں میں پیش کیا گیا ہے جو بین الاقوامی تحفظاتی مسائل کے حل کے امکانات کو ظاہر کرتا ہے۔ اس دستاویز میں تعلقات کے، بین الاقوامی تحفظ کے، انسانی حقوق کے، اطلاعات کی آزادی اور سفر کی آزادی کے بارے میں دور رس اطلاعات شامل کیے گئے ہیں۔ اس میں شامل حکومتوں نے حقوق کے تحفظ کی حلقہ ضمانت بھی فراہم کی ہے۔ غلام ہے کہ ہم اس مقام پر تعینات کی ضمانت کی بات نہیں کر سکتے، مگر ہم نئے امکانات کی بات ضرور کر سکتے ہیں جو طویل عرصے کے منصوبوں کے ذریعے حاصل کیے جاسکتے ہیں، اگر قومیں اور بالخصوص جمہوریتیں، ایک متحد اور با اصول رویہ اختیار کریں۔

اس میں انسانی حقوق کے بہت سے مسائل الجھے ہوئے ہیں، میں نے اپنے خطبے کا آخری حصہ جس کی تذکرہ کر دیا ہے۔ میں زیادہ تر اپنے ملک کے بارے میں بات کرنا پسند کروں گا۔ پلٹنکی کانفرنس کے بعد کے مہینوں میں اس سمت میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے، بلکہ کچھ معاملات میں تو سخت رویے رکھنے والوں نے زیادہ مشکلات پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

بین الاقوامی تہائے اطلاعات، مرضی کے ملک میں قیام، تعلیم کے لیے دوسرے ممالک کا سفر، ملازمت، صحت کے مسائل اور عام نوعیت کی سیاحت جیسے مسائل پر بھی اس کا اخلاق ہوتا ہے۔ اپنے بیان پر زور دینے کے لیے میں کچھ مثالیں دینا چاہوں گا، جو بلا کسی قصہ کے اور کوئی خاص منظر کے پیش کرنے کی کوشش کے بغیر چٹنی مٹی ہیں۔

آپ سب مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ مثال کے طور پر ڈنمارک کے بچے اپنی بائیکل پر سوار ہو کر Adriatic تک بلا کسی روک ٹوک جاسکتے ہیں۔ کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ نوجوان جاسوں بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر روس کے بچوں کو اس طرح سفر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے حالات میں آپ کو اس قسم کی اور بھی مثالیں مل جائیں گی۔

آپ کے علم میں ہوگا کہ اشتراکی ممالک کے دباؤ کی وجہ سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے خلائی سیارے کے ذریعے بھیجے جانے والے ٹیلی وژن پروگراموں پر قدغن لگا دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب جب کہ پلٹنکی معاہدے پر دستخط ہو چکے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ اس مسئلے پر دوبارہ غور نہ کیا جائے۔ کمیونٹی سوویت باشندوں کے لیے یہ اہم بھی اور دلچسپی کا باعث بھی ہے۔

سوویت یونین میں معذور افراد کے لیے مصنوعی اعضا اور می مشینوں کی بہت کمی ہے۔ مگر کوئی بھی سوویت معذور خواہ اس کو بیرونی ملکوں سے امداد بھی ملتی ہو، دعوت ملنے پر بھی بیرون ملک نہیں جاسکتا۔ سوویت یونین میں غیر اشتراکی اخبار فروخت نہیں کیے جاسکتے، حتیٰ کہ اشتراکی رسائل کے سارے

شارے بھی ایک ساتھ خریدے نہیں جاسکتے۔ اخلاقی امر کی جڑ سے بھی کم ملتے ہیں۔ یہ بہت کم دکانوں پر دستیاب ہوتے ہیں، اور جوں ہی آتے ہیں لوگ خریدتے اور عام قسم کے کاغذات میں چھپا کر لے جاتے ہیں۔

اگر کوئی شخص سوویت یونین سے ہجرت کرنا چاہے تو اس کے پاس اپنے قریبی عزیز کا دعوت نامہ ہونا چاہیے۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ ناقابل حل مسئلہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تین لاکھ (مشرقی) جرمن مغربی جرمنی جانا چاہتے ہیں، جب کہ سفر کرنے والے جرمنوں کے لیے پانچ ہزار فی سال کا کوٹا مقرر کر دیا گیا ہے۔ یعنی ان افراد کو ساٹھ برس کی منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ بالخصوص ان خاندانوں کے لیے جن کے قریب غیر سوویت علاقوں میں رہتے ہیں، اپنے اعزہ سے ملنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ”کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں“ کے مصداق ہے چارے لوگ آمرانہ طرز کے ارباب اختیار کے رحم و کرم پر رہتے ہیں جس کی کوئی حد نہیں۔

سفر کی آزادی، اپنی پسند کے علاقے میں زندگی گزارنے کی آزادی، لاکھوں [kalkhoz] جماعتی روسی باڑوں میں کام کرنے والے [افراد کے حقوق روزانہ پامال کیے جاتے ہیں، اسی طرح ہزاروں کریمیائی تاتار لوگوں کی جنہیں تیس برس قبل غلامانہ طریقے سے کریمیا سے ملک بدر کر دیا گیا تھا، اپنے وطن واپس جانے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ بلشکی میثاق ایک بار پھر ضمیر کی آزادی کی تصدیق کرتا ہے۔ لیکن، اس میثاق کی شقوں کی سفارشات کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ان پر عمل درآمد کے لیے ایک بے رحم اور آن تھک جدوجہد کرنی ہوگی۔ اپنے عقیدوں کے باعث، سوویت یونین میں عدالتی اور غیر عدالتی اداروں کے ہاتھوں لاکھوں افراد مزاحمت کرتے ہیں، ان سے بھی ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے جو اپنے بچوں کو مذہبی ماحول میں پالنا چاہتے ہیں، اس ادب کی تعلیم دینا چاہتے ہیں جو عام قوانین کے اعتبار سے قابل قبول ہیں، یا جو ملک چھوڑنا چاہتے ہیں۔ جنہوں نے نا انصافیوں کا نشانہ بننے والوں کا دفاع کیا ہے، مزا پانے یا مقدمات کا سامنا کرنے والوں کے حالات کی اشاعت یا ترسیل کی ہو ان کے قید خانے کے حالات کی اطلاعات کی فراہمی میں معاونت کی ہو، اخلاقی سطح پر، ان لوگوں کی عقوبت محل نظر ہے۔

ذرا تصور کیجیے کہ اس وقت بھی، جب ہم ایک ہال میں جشن کے لیے جمع ہیں، ضمیر کے لاکھوں قیدی، سال بھر کی بھوک کے باعث غذا کی (قیدیوں کو وہ امن اور دوائیں بھیجنے پر پابندی کے باعث) پروٹین کی اور وہ امن اور دوائیں کی اور استطاعت سے زیادہ محنت کا شکار ہو رہے ہیں۔ وہ کانپ رہے ہیں مروی سے، سلین سے اور اندھیرے قید خانوں کی مکان کی وجہ سے، جہاں وہ انسانی وقار کے لیے اور indoctrination machine کے خلاف اپنے عقیدے کے لیے، بلکہ ادراک کی مکمل تہی کے لیے، کبھی نہ ختم ہونے والی جدوجہد کرنے پر مجبور ہیں۔ مشفقانہ کیمپ کے نظام کے خصوصی خدوخال اعتیاد سے چھپا دیے گئے ہیں۔ مشقی بھر لوگوں کے تمام ذکاوت ختم ہو گئے ہیں، اس لیے کہ ان کے الزامات کی صداقت کے بہترین ثبوت افشا کرنے

کی خاطر پردے ایک طرف کر دیے گئے ہیں۔ انسانی وقار کے تصور کا تقاضا ہے کہ تمام قیدی افراد کے لیے، اس سے قطع نظر کہ وہ کتنے مجرم ہیں، اس نظام میں فوری تبدیلی کی جائے۔ مگر معصوم افراد کے دکھوں کا کیا ہوگا؟ سب سے خراب تو وہ جہنم ہے جو Dnieperopetrovsk, Sytshevk, Blagoveshensk, Kazan, Chernakovsk, Orid, Leningrad, Tashkent, کی خصوصی نفسیاتی مشا خانوں میں دہک رہا ہے۔

آج میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں تفصیلات بیان کروں، مخصوص لوگوں کے مقدموں کی اور ان کے مقصوم کی۔ اس موضوع پر ادب کا ایک انبار موجود ہے: کیا میں آپ کو متوجہ کر سکتا ہوں نیو یارک کے Chronical Press کی مطبوعات کی طرف، جو Soviet Samizdat نام کے جریدے کی نقول شائع کرنے کے بلبر ہیں اور جو اسی نوعیت کی تازہ ترین اطلاعات پر مبنی اعلامیے شائع کرتے ہیں۔ میں اس مقام پر کچھ مجبوس افراد کے نام لکھنا چاہوں گا، جنہیں جانتا ہوں۔ جیسا کہ آپ کو کل بتایا گیا تھا، میں گزارش کروں کہ آپ سب، ضمیر کے اور میرے ملک کے قید خانوں میں مجبوس تمام سیاسی قیدیوں کو یاد کریں جو میرے ساتھ اس انجام کے اعزاز میں شریک ہیں۔ کچھ نام، میں جن سے واقف ہوں، لیے جا رہے ہیں:

Plyush, Bukarsky, Glushan, Novak, Maria Semina, Nadeshda Stetishnaya, Stefania Shabatura, Irina Klymet-Stasia, Irina Senik, Niyala Sadunskite, Anut Karapetian, Osipov, Kronid Ljubarsky, Shumuk, Vira, Rumashok, Khaustov, Superin, Paulash, Simutia, Karatunskiy, Volery, Martshenko, Shuchezich, Parlenkov, Chemoglas, Abanokin, Sushenkiy, Meshener, Stetishny, Sazonov, Rade, Shukinov, Heifetz, Munushet, Na-Chun, Butman, Lukinenko, Ogurtsov, Sergeyenko, Antonuk, Lupynas, Rukun, Plushchuk, Kargar, Belov, Igumov, Soldatov, Nistuk, Kierend, Jashkezich, Zdanovyy, Tammujah, Shuchverdjan, Zagrahian, Arkun, Narkashan, Ashakun, Mirauskas, Stas, Stenjuk, Chundylau, Udashko, Romaniuk, Vorobiov, Gel, Pronjuk, Gladko, Malchetsky, Grazis, Prishliak, Supeliak, Kolymet, Suprei, Valdiman, Demidov, Bernishuk, Shaskov, Garkatov, Berchov, Turk, Ziukauskas, Balanin, Lisatol, Petov, Chjekulin, Gorodetsky, Chjemotol, Bulakanov, Bandar, Kalintchenko, Kolomin, Plumpu, Jaugelis, Fedaseyev, Osudchij, Budulak-Shurgin, Makarenko, Malkin, Shtem, Luzur Liuharsky, Feldman, Raitkur, Shkolnik, Murzienko, Fedarov, Dymshits, Kuznetsov, Nendeleich, Aban, Penson, Knach, Wilt Zulmanson, Izrail Zulmanson

اور بے شمار افراد۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو وطن بدر ہیں یعنی Anatoly Martshenko, Nashpits, اور Zimenok۔

مصطفیٰ زیمیلوف، Kovalyev اور Tverdachlebov کے مقدمات کے فیصلے ملتے جلتے والے ہیں۔ میں جن قیدیوں سے واقف ہوں ان سب کے نام لینے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اور بہت سے بھی ہیں، میں جنہیں نہیں جانتا یا جن کے بارے میں مجھے مکمل معلومات فراہم نہیں ہیں۔ مگر میں جو کچھ کہنا چاہ رہا ہوں ان میں تمام نام مضمحل ہیں اور میں ان تمام سے معذرت کا طلب گار ہوں میں جن کے نام نہیں لے سکا ہوں۔ بیان کیا گیا میرا نام، جو یہاں لکھا گیا ہے یا نہیں لکھا گیا ہے، سخت اور بہادرانہ مقصوم، دکھ اور انسانی وقار کے

لیے برسوں کی جدوجہد کا نرماندہ ہے۔

اذیت یافتہ لوگوں کے مسئلے کا حل بین الاقوامی معاہدوں کی بنیاد پر آزادی ہونا چاہیے: تمام سیاسی قیدیوں کی، ضمیر کے تمام محبوب قیدیوں کی، عقوبت خانوں میں بند اور نفسیاتی شکنجوں کے افراد کی، اگر ضروری ہو تو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے منظور شدہ قرارداد کی بنیاد پر۔ یہ تجویز کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اسی کی بنیاد پر اس کا اطلاق ہوگا۔ سوویت یونین پر، انڈونیشیا پر، چلی پر، جمہوریہ جنوبی افریقا پر، آئین پر، برازیل اور ہر ملک پر۔ چون کہ انسانی حقوق کے اقوام متحدہ کے اعلان انسانی حقوق میں انسانی حقوق کے تحفظ کا اعلان کیا گیا ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خالصتاً کسی ملک کا اپنا اندرونی معاملہ ہے۔ اس بدف کو حاصل کرنے کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے، کم نہیں ہوگا، خواہ اس کا راستہ کتنا ہی طویل کیوں نہ محسوس ہو۔ اقوام متحدہ کے حالیہ جلسے میں ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ راستہ طویل ہوگا، جب ریاست ہائے متحدہ نے اس کو واپس لینے کے لیے ہی سہی، سیاسی معافی کی ایک تجویز پیش کی تھی، ان کوششوں کے بعد جو بغیر کسی وجہ کے کچھ ملکوں کی طرف سے USA کی خیال کے مطابق، ڈھانچے کی میعاد کو بڑھانے کے لیے کی گئی تھیں جو معافی کے تصور کو پورا کرے گا۔ جو کچھ ہوا مجھے اس پر افسوس ہے۔ کسی مسئلے کو یوں ہی نظروں سے اوجھل نہیں کیا جاسکتا۔ میں پوری طرح قائل ہوں، بجائے اس کے کہ ہزاروں معصوم افراد کو حوالات میں بند رکھ کر ان پر تشدد کیا جائے، چند لوگوں کو آزاد کر دینا ہی بہتر ہوگا خواہ وہ کسی خطا کے مجرم ہی کیوں نہ ہوں۔

اس قسم کے حل کو نظر انداز کیے بغیر ہمیں الگ الگ کرنا چاہیے ہر فرد سے ہونے والی نا انصافی کے لیے اور انسانی حقوق کی پامانی کے لیے۔ ہمارے مستقبل کے بڑے حصے کا انحصار اسی پر ہے۔

میں اس بات کا قائل ہوں کہ انسانی حقوق کی حفاظت کی جدوجہد کے لیے، ہمیں سب سے پہلے مختلف ممالک کی حکومتوں کے مقلوبین کے محافظ کا کردار ادا کرنا چاہیے، ان حکومتوں کی مکمل تہی یا ان پر ملامت کیے بغیر۔ ہمیں انقلاب نہیں، اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک چلک دار، بھٹیڑی، صبر کرنے والی کمیونٹی کی ضرورت ہے جو چنیدہ طور پر اور آزمائشی طور پر تمام سماجی نظاموں کے تجربات کا غیر آمرانہ استعمال کر سکے۔ درج ذیل کسے کہتے ہیں؟ مفاہمت کسے کہتے ہیں؟ ہم الفاظ کی فکر نہیں کرتے، بلکہ رضا و رغبت کے ساتھ ایک دوستانہ معاشرہ، ایک بہتر عالمی نظام بنانا چاہتے ہیں۔

ہزاروں برس پہلے انسانی قبائل کو بقا کی جدوجہد میں بہت محرومیاں ملی تھیں۔ اس جدوجہد میں ہمیں ایک انجمن سے معاملہ کرنا اہم نہ تھا، بلکہ صحیح انداز میں سوچنے کی صلاحیت حاصل کرنا، قبیلے کی دشمنی کی ہوائی دالش اور تجربے کی حفاظت کرنا اور ایسے سلسلے تیار کرنا تھا، جو دوسرے قبیلوں سے تعاون بڑھا سکے۔ آج پوری فسل انسانی کو اسی قسم کی آزمائش کا سامنا ہے۔ لانا تھا خلا میں بہت سی تہذیبوں کا وجود لایا ہی ہے، ان میں ہماری تہذیب سے زیادہ عقل مند اور زیادہ "کامیاب" تہذیبیں بھی ہو سکتی ہیں۔ میں اس کا ناقی مشرور ہونے کا

شال مک برائیڈ

ایسا کو ساتو

اعلان تجلیل

جلالت مآب، دو دمان شانی، عزت مآب، خواتین و حضرات! اپنی آخری وصیت لکھنے سے چند برس قبل انگریز نوٹیل نے برتھا فان سٹ (Bertha von Suther) کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ اس کے ڈائنامائٹ بنانے والے کارخانے، امن کے جلسوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی سے، جنگوں کو کسی حد تک، ختم کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ”جس دن دو فوجیں ایک سیکنڈ میں ایک دوسرے کو ختم کر سکیں گی، اس دن اُمید ہوگی کہ تمام مہذب قومیں اپنی فوجوں کو جنگ کرنے سے باز رکھنے پر مجبور ہو جائیں گی۔“ 1890 کے عشرے میں انگریز نوٹیل نے اس نوعیت کا تصور پیش کیا تھا۔

جولائی 1945 میں پہلے جوہری بم کے عملی تجربے کے بعد، سائنس دانوں کو یقین ہو گیا تھا کہ دنیا کو ہر قسم کی جنگ کے امکان کو ختم کرنے کے ایک نئے مرحلے کا سامنا ہے۔ اس قسم کے ہتھیار سے لیس انسانیت ایک پلیئر پر پہنچ گئی تھی، اگر اس پلیئر کو پار کیا گیا تو جارج اور دفاع کرنے والے دونوں کا مقدر تہی ہوگا۔ امن کا متبادل مکمل مستحکم ہو گیا تھا۔ بے پناہ دہشت کے درمیان، جس نے جوہری سائنس دانوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ دنیا کو ہوش میں آنے کی ترغیب دیں، ایک اُمید پیدا ہوئی تھی کہ اسلحے پر پابندی ہوگی اور امن کو ایک موقع ملے گا۔

چارو ناچا، ایسی دنیا میں جہاں اندرونی نا اتفاقی بھری ہوئی دنیا کے امن کو مشرق اور مغرب کے درمیان ایک خوف ناک توازن کا تابع کر دیا گیا تھا۔

تباہی کے دہانے پر ہوتے ہوئے بھی جنگوں کو ختم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہی پرانا انداز اپنایا گیا تھا، ایسے دور میں جس کو بھی ہم نے غلطی سے مابعد جنگ کا نام دے دیا ہے۔ زندگیوں کی بربادی جاری تھیں، جانیدادیں ویران پڑی تھیں، دماغوں میں اندھیرا تھا اور دنیا کے ہر کونے میں خوف جوش مار رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم رفتہ رفتہ جنگ اور نا اتفاقی کی وجود سے واقف ہو گئے ہوں؛ ہو سکتا ہے کہ ہماری اپنی سرحدوں پر کیے جانے والے الیموں کے بارے میں ہمیں رفتہ رفتہ اپنی ذمہ داری کا بھی احساس ہو گیا ہو۔ اس کا یقین کرنے میں ایک قسم کا اطمینان محسوس ہوتا ہے، مگر اپنی تمام کوششوں کے باوجود ہم ان وجود کو دور کرنے میں کوئی قابلِ تعریف پیش رفت نہیں کر سکے ہیں۔

آج کے جیسے دن، نونٹل امن انعام کے دیے جانے کے ساتھ، کچھ کم سہی مگر ترقیات کے کچھ فائدہ مند پہلوؤں کے بیان کرنے کا جواز پیدا ہو گیا ہے۔ حالیہ برسوں میں دستانہ کے فروغ کے خیال سے ہسپار پہلو اور دوطرفہ مذاکرات شروع کیے گئے ہیں۔ ہم ایسے عہد میں جی رہے ہیں جس میں بڑی حد تک گفت و شنید کو مقابلے اور علاقہ جدگی سے بدل دیا گیا ہے۔ صرف چند برس قبل اس قسم کی معاملہ بندیوں کو ہم جن کے نقوش دیکھ سکتے تھے، خالصتاً یونیویٹری گردانا جاتا تھا۔ اب تو پوری دنیا خیالات و تصورات کے تبادلے سے توقعات اور امیدیں لگائے بیٹھی ہے۔

اس حقیقت میں کہ پوری دنیا اب تشدد اور اختیارات کے غلط استعمال کو مسترد کرتی ہے، مجھے اب امید کی کرنیں نظر آنے لگی ہیں۔ ہم عالمی سطح پر رائے کی انجمنی لبروں کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کو جنگ سے پیدا ہونے والی ممانعت سمجھنے سے گریز کرنا چاہیے، اس لیے کہ اکثر ان لبروں کے آگے آگے وہ لوگ نظر آتے ہیں جنہیں جنگ کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہوا، بلکہ آپ اس کو امن پر سچے یقین کا نام دے سکتے ہیں۔ میں رائے کی جس فضا کے بارے میں بات کر رہا ہوں وہ صرف جنگ سے لڑائی تک محدود نہیں۔ بڑے پیمانے پر سماجی، سیاسی اور اقتصادی ظلم کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ اور یہ صحیح اور منصفانہ ہے، نا انصافی کے خلاف جدوجہد امن کی عکاسی میں پوشیدہ ہے۔

دوسروں کے ساتھ نا انصافی، ہم میں سے ہر ایک پر حملہ آور ہوتی ہے۔ انسانی حقوق کی جدوجہد میں ہمارے عہد کے سب سے بڑے مشعلی بردار انگریز انڈر سولز سمیت من (Alexander Solzhenitsyn) کا کہنا ہے کہ ہمارا مقصد ہونا چاہیے کہ ہم بنی نوع انسان کے دل سے اس خیال بنی کو نکال دیں کہ کسی کو بھی انصاف کے خلاف، قانون کے خلاف اور باہمی معاہدوں کے خلاف، طاقت کے استعمال کا اختیار ہے۔ کسی بھی زمانے میں، دنیا بھر کے وسیع حلقوں میں یہ خیال نہ اتنا سمجھا گیا ہے اور نہ قبول کیا گیا ہے جتنا کہ ہمارے دور میں ہو رہا ہے۔ یہ اس دنیا کے لیے، جو خوف ناک امکانات سے پر ہے، ایک اچھی علامت ہے۔

نہ کوئی سیاسی مدد، نہ کوئی حکومت اس حالت میں ہوگی کہ وہ اس کے بارے میں مجموعی رائے کا پاس کیے بغیر قدم اٹھا سکے۔

ماروے کی پاریمان *staring* کی نوٹیل کمیٹی پر یہ گراں ذمے داری عائد کی گئی ہے کہ وہ ان افراد یا اداروں کا انتخاب کرے جو اس برس کا انعام پانے کے لیے موزوں ہوں۔

اس کی مشکل ہی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ کمیٹی کے فیصلے پر بحث نہیں ہوگی۔ جب شعر برس قبل پہلا انعام دیا گیا تھا، اُس وقت سے ایسا ہوتا آ رہا ہے۔ یہ امر ثابت کرتا ہے کہ امن کے تصور کی حد بندی کتنی مشکل ہے۔ اس قسم کے گزشتہ مواقع پر نوٹیل کمیٹی نے انعام کے لیے ان لوگوں کا انتخاب کیا ہے امن کے لیے جن کی کوششیں بہت سارے مختلف میدانوں پر محیط رہی ہیں۔ انہوں نے اس میں کانفرنس کی میز پر معاملہ کرنے والے مدبرین، انسانی حقوق کا دفاع کرنے والے بین الاقوامی قانون کے ماہرین، باغی، فطرت انسانی کے ماہرین، مثالیت پسند، نتائج پرست (pragmatist) اور خواب دیکھنے والوں کو شامل کیا ہے۔

اس موقع پر دونوں انعام پانے والے ان مراکز سے ہیں جنہوں نے ماضی میں کوئی انعام پانے والا پیدا نہیں کیا ہے۔ دراصل ایسا کوسا تو پہلے اشیائی ہیں جنہیں امن کا انعام دیا جا رہا ہے۔ وہ آج ہمارے سامنے اُس ملک کے نمائندے کی حیثیت میں موجود ہیں جسے جوہری جنگ کی ناقابل بیان دہشت کا تجربہ ہوا تھا۔ اس خوف ناک تجربے نے جاپانی قوم پر کمرے نقوش چھوڑے ہیں، مگر بقیہ ہم سب لوگوں کے لیے بھی ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے نام ایسے واقعات کی علامت ہیں مستقبل میں ہمیں جن کی مزاحمت کی کوشش کرنی ہوگی۔

شال ملک برائیڈ اُس ملک کے باشندے ہیں جو برسوں سے تلخ اور ملال انگیز تنہا رہنے کی تماشائگہ بنا رہا ہے۔ ان کے تجربے نے انہیں مختلف قسم کی کوششوں کے ذریعے بین الاقوامی تعاون کے فروغ میں مہمیز کیا ہے۔

انعام پانے والے دونوں حضرات مختلف نوعیت کے کارامن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مشکل امن سیاست اور معاملہ بندی کی مدد سے انہوں نے اپنے آدرش کے فروغ کی عملی کوشش کی ہے۔ جو ہدف انہوں نے حاصل کر لیے ہیں ان کو ہمیشہ سے سرے سے حاصل کرنے کی ضرورت بہر حال رہے گی، اس لیے کارامن اور انصاف، دنیا کو جن کی شدت سے ضرورت ہے، مستحقاً خطرے میں ہیں۔

ایسا کوسا تو نومبر 1964 سے جون 1972 تقریباً آٹھ برس تک جاپان کے وزیر اعظم رہے تھے۔ یہ عرصہ ان کے پیشرووں کے مقابلے میں زیادہ طویل تھا۔ تمام جمہوریوں میں حکومت کے سربراہ کی حیثیت مختلف زاویوں سے منانے پر رہتی ہے، اور سارا کو بھی شدید گنتی چینی کا نشانہ بنے تھے۔ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوتے ہی سارا کو نے اعلان کیا تھا کہ وہ جاپان کے لیے بین الاقوامی سیاست میں ایک بڑی اقتصادی طاقت کی حیثیت سے رعب حاصل کرنے کو کوشش کریں جو ملک کے رعبے کے ہم پام ہوگا۔ دوسرے ملکوں کے مبصرین کو ان پر نظریں جمائے رکھنی تھیں، کہ وہ اپنے پروگرام کی کس طرح تعمیل کرتے ہیں۔ کیا جاپان اپنی پُر زور خارجہ پالیسی میں قوم پرست پہنچ کی طرف واپس چلا جائے گا؟ بہت سے لوگوں کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اقتصادی قوت کے نتیجے میں برصغیر ہونی عموماً عوامی قومی وقار کا پاس اور اندرونی پالیسی جاپان پر حاوی ہو رہی تھی، جیسا کہ دوسری طاقتوں کے ساتھ ہوا ہے۔

یہ جلد ہی واضح ہو گیا تھا کہ جاپان ایسی خارجہ پالیسی کی پیروی کرے گا جس کا مقصد دوسرے ممالک سے اپنی کافرورش ہوگا۔

جنگ کے بعد، بہت سے ممالک کی یادداشت میں ایک جارح اور حربی جاپان کے نقوش زندہ تھے۔ وہ ممالک، جنہیں جاپانی قبضے کے تجربات تھے کم بدگمانی کا شکار نہیں تھے مگر بری توقعات کے ساتھ دنیا اس تضحیل کے عمل کو دیکھ رہی تھی جاپان نے جس کی ابتدا کی تھی۔

جاپان کی خارجہ پالیسی اور تحفظ کی پالیسی ان ذمے داریوں سے عبارت تھی جو دوسری عالمی جنگ کے بعد اس پر چھوٹی گئی تھی۔ 1947 میں جاپان نے جو آئین اختیار کیا تھا اس میں صراحت سے بیان کیا گیا تھا کہ جاپانی قوم ان حقوق سے دست برداری کا اعلان کرتی ہے جو پہلے آزاد قوم کی حیثیت سے ضروری گردانے جاتے تھے۔ "دوسرے ممالک سے تنازعات پھک نے میں جنگ اور طاقت کے استعمال کی دھمکیوں سے دست برداری کا اعلان کیا جاتا ہے۔" یہ ایک ملک کے آئین کی ایک بے مثال شق تھی۔ یہ اصول امریکی قبضے کے ارباب اقتدار کی جانب سے مقرر کیا گیا تھا جو اسی حقیقت کا نتیجہ تھا۔ جاپان میں 1945 میں جریت کو کھل دیا گیا تھا، جس کے نتیجے میں عوام پر طاقت ور مسلمانند رویوں کا اثر بڑھ گیا تھا۔

حکومت کے سربراہ کی حیثیت میں ساتو نے بارہا یاد دلایا کہ جنگ کے خلاف شق کی بنیاد ہی پر ملکی پالیسی کی بنیاد ہونی چاہیے۔ جہاں تک جوہری ہتھیاروں کا سوال ہے، انہوں نے تین اصولوں پر زور دیا جن پر ان کی حکومت خود کو استوار کرے گی۔

"نہ کبھی اس قسم کے ہتھیار تیار کریں گے نہ کبھی ان کو رکھیں گے اور نہ کبھی جاپان میں ان کو متعارف کرائیں گے۔" جاپانی عوام نے ساتو کی بتائی امن کی پالیسی سے پورا تعاون کیا ہے، اور اس امر کا خلاف بھی شدید رد عمل ظاہر کیا ہے کہ شاید کبھی کسی اور سمت ان کا رخ موڑ دیا جائے۔ اکثر و بیشتر کہا جاتا رہا ہے کہ جاپانی عوام کو جوہری ہتھیار سے چوڑی ہو گئی ہے۔ اس قسم کی چوکا پیدا ہونا صحت مندی کی نشانی ہے، اور دوسرے ممالک کو بھی اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

وزیر اعظم کی حیثیت میں جب بھی ساتو نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جاپان اپنے ہدف صرف پرامن طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، تو انہوں نے یقینی طور پر وہی رائے ظاہر کی ہے جسے عوام کی اکثریت کا تعاون حاصل تھا۔

وزیر اعظم بننے کے فوراً بعد ہی انہوں نے جنوبی کوریا سے تعلقات بہتر بنانے کا حربہ کر لیا تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان ایک دوستانہ معاہدے پر دستخط ہوئے اور 1965 کے خزاں کے موسم میں اس کی توثیق ہو گئی۔ فوراً ہی دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے۔

یہ معاہدہ بحرالکاہل کے علاقے کے کئی ممالک اور جاپان کے درمیان تعلقات کی بہتری کے واسطے منصوبے کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا۔ 1957 کے خزاں میں ساتو ایک طویل سفر پر نکلے، جس کے دوران انہوں

نے بہت سے ملکوں کا دورہ کیا تھا، جن میں برما، ملائیشیا، سنگا پورہ، تھائی لینڈ، لائوس، انڈونیشیا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فلپائن اور جنوبی ویت نام شامل تھے۔ ان کے اس سفر کے مقاصد میں دو ستانہ تعلقات کی مضبوطی، تجارت کی ترقیب، سیاسی تعاون کا فروغ اور زیادہ فعال تہذیبی تبادلوں کی شروعات شامل تھیں۔ بڑے پیمانے پر اس سے اتفاق کیا جاتا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اتفاق رائے کے فروغ میں تجارتی تعلقات سب سے زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں۔ اس میدان میں ایک بار شروعات ہو جائے، اور باہمی مفادات کی دریافت ہو جائے، تو دوسرے معاملات میں بھی تعلقات کے بڑھنے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، حالیہ برسوں میں مشرق / مغرب تعلقات میں بھی یہی طریقہ معاون ہوا ہے۔ ایشیا میں، سراتو کی سربراہی میں جاپان نے تجارتی تعلقات بڑھانے، ترقی پذیر ممالک کی امداد بڑھانے اور علاقائی تعاون کو بڑے پیمانے پر بڑھانے کی ہمت افزائی کرنے میں پیش قدمی کی ہے۔ دراصل جاپان ہی جنوب مشرقی ایشیا میں وزیروں کی ایک کانفرنس کے قیام کا ذمہ دار تھا جس میں اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ ایشیا کے لیے ایک بین الاقوامی ترقیاتی بینک کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ جاپان خود اس قیاس کی بنا پر کہ اس علاقے میں امن کی فروغ کے سلسلے میں اس پر خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس بینک کا ایک بڑا حصہ دار بنا تھا۔ سراتو کے اپنے خیال کے مطابق اس سلسلے کا سب سے اہم عنصر یہ تھا کہ اس طرح علاقے کے ممالک بہتر طور پر مادی اور تہذیبی وسائل کے استعمال کے قابل ہو سکیں گے۔

ابتدائی سے جاپان کی دوستانہ پالیسی کو ایک بنیادی مشکل کا سامنا ہوا تھا، یعنی معاہدوں کے ذریعے جاپان کے امریکا سے قریبی تعلقات استوار تھے جن پر، بالخصوص ویت نام کی جنگ کے دوران، کچھ حلقوں کی طرف سے تنقید کی گئی تھی۔ نہ صرف یہ کہ جاپان نے ویت نام میں کسی قسم کی فوجی شراکت داری نہیں کی تھی، بلکہ ایسا کو سراتو نے تو شرکائے جنگ کو ترقیب بھی دی تھی کہ وہ بغیر کوئی شرط عائد کیے، ایک دوسرے کے قریب آئیں تاکہ جنگ بندی اور امن پر بات کی جاسکے۔ سراتو نے جولائی 1965 میں جاپان کی قومی اسمبلی میں اپنی تقریر کے دوران کہا بھی تھا کہ جنگ کبھی سیاسی مسائل حل نہیں کر سکے گی۔ 1966 کے موسم بہار میں جاپان کی حکومت نے امن کے امکانات کی تلاش کی کوشش بھی کی، مگر یہ کوشش ناکام ہوئی تھی۔

حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے سراتو کے ساتھیوں پر بھی ذمہ داری آپڑی تھی کہ وہ متنازعہ مفادات میں ایک توازن قائم رکھیں۔ امریکا سے معاہدے پر عمل کرتے ہوئے، انھوں نے زیادہ آزادی کا مطالبہ بھی کیا تھا۔ جاپانی عوام کے نزدیک بالخصوص یہ زیادہ اہم تھا کہ ان جزیروں کی واپسی کے لیے امریکا سے معاہدے کیے جائیں، دوسری عالمی جنگ کے بعد سے امریکا جن پر قابض تھا۔ پانچ برس کی ان تھک کوششوں کے بعد سراتو ایسے معاہدے میں بھی کامیاب ہو گئے جس کے ذریعے جاپان کو کوریا، کیناوا اور اوگا ساوا ما جزائر پر فرماں روائی کا حق دے دیا گیا تھا۔ ان کی اس کامیابی نے دونوں ملکوں کے درمیان کے تعلقات میں موجود ایک اہم بدمزگی کا ازالہ کیا، ساتھ ہی پورے علاقے میں پائیداری کو مستحکم کرنے میں بھی مدد دی۔ اس کامیابی

کے ذریعے جاپانی عوام بھی قائل ہو گئے کہ ان کے خارجہ سیاسی مقاصد بھی مذاکرات کے ذریعے حاصل کیے جاسکتے ہیں، جارحانہ حرکات اور دھمکیوں سے نہیں۔

جاپان کے لیے خاص طور پر یہ بات اہم تھی کہ معاہدے میں یہ یقین فراہم کیا گیا تھا کہ اوکیناوا میں امریکی اڈوں پر جوہری ہتھیار نہیں رکھے جائیں گے۔ 1951 میں ہونے والے اس معاہدے کو صحیح سمت میں ایک قدم کے نام سے پکارا جاسکتا ہے جس نے قومی سلامتی کی جاپانی خواہش کو پورا کیا تھا۔ سلامتی کے معاہدے اور اصل امن کے معاہدے نے قیاسیہ طے کر دیا تھا کہ جاپان کو اپنے دفاع کا اختیار ہوگا اور اسے اقوام متحدہ کے فرمان کے مطابق اجتماعی سلامتی کے عہدہ پیمان میں شرکت کا حق ہوگا۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر جاپان کا دفاعی نظام قائم کیا گیا ہے۔ اس بات کا عام طور پر اقرار کیا جاتا ہے کہ بعد کے برسوں میں جاپان نے اس سلسلے میں خاصے ضابطہ کا مظاہرہ کیا ہے۔ کسی بڑی طاقت نے یکساں درجے کی میانہ روی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے؛ دراصل، بہت سارے چھوٹے ممالک اتنی فوجی طاقت رکھتے ہیں جو جاپان سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ جاپان کا ایک بھی سیاست داں تنہا اس کریڈٹ کا حق دار نہیں۔ کسی بھی قسم کے فوجی ابھار کے خلاف جاپانی عوام کا رد عمل اتنا شدید ہے کہ کوئی اور پالیسی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

مقاتلوں کے دو حکومت میں موجودیت یونین سے تعلقات میں بھی قابل ذکر مثبت تبدیلی دیکھی گئی تھی۔ روسیوں کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہوا، اس لیے کہ جزائر شانی KURIL پر کوئی دعویٰ کسی جاپانی حکومت کو قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر مقاتلوں کے دو براعظموں میں، دونوں ملکوں کے وزرائے خارجہ کے دوروں کے بعد خارجہ پالیسی اور تجارت میں کم تعاون نہیں ہوا تھا۔

عوامی جمہوریہ چین اور جاپان کے درمیان سفارتی تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے ممالک کی طرح، جاپانی حکومت نے ایسی پالیسی اختیار کی تھی جس کی رو سے فارموسا کی حکومت تسلیم کر لی گئی تھی۔ اس کے باوجود ٹوکیو اور بیکنگ کے درمیان ربط کے بہت سے اہم نقطے قائم کر دیے گئے تھے۔ ہندو جگ کانفرنس کے سلسلے میں اپریل 1965 میں وزیر اعظم سراتو کے خاص سفیر کی وزیر اعظم چو این لائی سے گفتگو ہوئی تھی جس میں عوامی جمہوریہ سے فرمی تعلقات کی جاپانی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔ سیاسی رکاوٹوں کے باوجود دونوں ممالک کے درمیان تجارت میں اضافہ ہو گیا، اور باہر کی دنیا نے دیکھا کہ جاپانی صحافیوں کو تہذیبی انقلاب کے دوران کام کرنے کی اجازت دی گئی تھی، جب کہ دوسرے ملکوں کے صحافی عوامی جمہوریہ چھوڑ پر جانے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔ کئی موقعوں پر سراتو نے بیکنگ کے درازوں کو کھلا رکھنے کی ضرورت پر بات کی تھی۔ لہذا جب تک جاپان نے فارموسا کی حکومت کو تسلیم کرنے کی پالیسی جاری رکھی چین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنا ناممکن تھا۔ پھر بھی، بین الاقوامی فضا کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہر وقت دونوں ریاستوں کے درمیان تعلقات میں رکاوٹ کا احساس قائم رہے۔

ایشیا کے بہت سے تنازعات میں، بالخصوص ہندوستان اور پاکستان اور اندونیشیا اور ملائیشیا کے درمیان

تنازعے میں سراتو نے ذاتی طور پر مداخلت کی تھی تاکہ طرفین کو اپنے اختلافات دور کرنے پر راضی کیا جائے۔ اُن ملکوں کو جنہیں جاپانی قبضے کے دوران نقصانات اٹھانے پڑے تھے ہر جانے کے طور پر ادا کی جانے والی خاصی رقوم کی ادائیگی بھی ایک عنصر تھا جس نے سراتو ہی کے دور اقتدار میں کئی ممالک کے ساتھ تعلقات کی بحالی میں مدد دی تھی۔ دیرینہ اختلافات کی شدت گھٹائی گئی تھی اور نئے باہمی مفادات پیدا کیے گئے تھے۔ اچھے بہسلے کی پالیسی کا، سراتو جس کے مرکزی مٹارج تھے ایشیا کے وسیع علاقے میں خیر مقدم کیا گیا تھا۔ یہ کہنا کہ جاپانیوں کے اقتصادی رسومِ تنازعے کے وجہ سے ہوں گے اور ان کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، کسی بھی طرح مجموعی نقوش کو تبدیل نہیں کر دیتا۔

ایسا کو سراتو کو 1974 کا انعام کے دیے جانے میں نوٹیل کمیٹی اس امر پر زور دینا چاہتی ہے کہ دوسری قوموں کے ساتھ قریبی اور دوستانہ تعاون کے فروغ میں جاپانی عوام نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ جاپان کے رویے نے مشرقی ایشیا میں امن کو استحکام بخشتا ہے اور بہت سے ملکوں کی ترقی اور اقتصادی نمو کی بنیاد رکھنے میں معاونت کی ہے۔ جنگ کے بعد جاپان میں قومیت کی پالیسی کے رجحانات کا مقابلہ کرنے، بین الاقوامی تعاون اور معاہدات کی ضرورت کا بار بار اظہار کرنے، ثالثی کا کردار ادا کرنے اور اس کے ذریعے اختلافات کو سلجھانے میں سراتو نے امن کے لیے بہت بڑی خدمت کی ہے۔

نوٹیل کمیٹی نے سراتو کے دیے ہوئے بیانات کو بہت اہمیت دی ہے جن میں انہوں نے عہد کیا ہے کہ وہ اپنے اس نظریے سے منسلک رہیں گے کہ جاپان نہ کبھی جوہری ہتھیار بنائے گا، نہ حاصل کرے گا اور نہ اپنے پاس رکھے گا۔ ایسے وقت میں، جب اس امکان کے خطرات بڑھ رہے ہوں کہ زیادہ سے زیادہ قومیں اس قسم کے ہتھیار حاصل کریں گی، یہ ضروری ہے کہ جاپان، سراتو کی رہنمائی میں 1970 میں جوہری ہتھیار کے پھیلاؤ کی ممانعت کے معاہدے پر دستخط کر دے۔

اس وقت سراتو نے اعلان کیا تھا کہ مزید ریاستوں کو اس قسم کے ہتھیار کے حصول سے روکنا جاپان کے قومی مقاصد کے مطابق ہے۔ مقصد یہ تھا کہ بین الاقوامی تناؤ کم کیا جائے، ہر ملک سے دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں، اور بین الاقوامی تعلقات کے قیام میں مدد کی جائے، جو امن کے مقاصد کے فروغ کا باعث ہوں۔ سراتو کو امید تھی کہ عدم پھیلاؤ معاہدے پر عمل درآمد کے ساتھ ایسے مؤثر اقدامات کیے جائیں گے جن کے نتیجے میں دنیا میں جوہری ہتھیاروں کی تعداد میں کمی ہوگی۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ اس معاہدے کی اہمیت کو پیشِ خیمہ ہونا چاہیے ایسی عملی ترقی کا جو اسلحہ بندی میں کمی کے مقصد کو فروغ دے۔

ابھی تک جاپان نے عدم پھیلاؤ کے معاہدے کی توثیق نہیں کی ہے، حالاں کہ بعد میں آنے والی حکومت نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اعلان کیا ہے کہ اس برس اس کے لیے کام کیا جائے گا۔ مستقبل کے فیصلوں کی ذمہ داری کسی ایک فرد پر عائد نہیں ہوتی، اس امر پر زور دے دینا چاہیے گا کہ جاپانی عوام کا رویہ مستقبل کے معاملات پر فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ نوٹیل کمیٹی امید کرتی ہے کہ اس برس کے انعام کو ان لوگوں

کی ہمت افزائی کی توجیح سمجھا جائے گا جو اس مرکبیتی بنانے کے لیے کام کریں گے کہ اسلحے کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے کو وسیع ترین تعاون حاصل ہو۔

پوری دنیا میں امن سے محبت کرنے والے لوگ اس امید کی پرورش کریں گے کہ جنگ کے خوف اور طاقت کے استعمال کے بغیر مستقبل میں ایشیا کی ترقی جاری رہے گی۔ کاش یہ امید پوری ہو کہ بحر الکاہل امن کا حقیقی بحر بنے! اس معاملے میں جاپان کا کردار فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہوگا۔

اس برس دوسرے انعام حاصل کرنے والے آئرلینڈ کے شاں مک برائیڈ ہیں، جو 26 جنوری 1904 میں پیرس میں پیدا ہوئے تھے۔ نوجوانی کے دنوں میں انھوں نے تمام تر خوف سے مملو آئرلینڈ کی آزادی کی جدوجہد دیکھی تھی۔ یہ تجربہ کئی طریقوں سے دیر پا اثر انگیز ثابت ہوا تھا۔ کئی برس صحافی کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی، اور 1937 میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس پیشے نے ان کو ایذا رسیدہ افراد کے حقوق کے لیے زیادہ موثر طریقے سے کام کرنے کے قابل بنایا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد وہ آئرلینڈ کی قومی اسمبلی Dail Eireann میں داخل ہوئے جس کے، 1947 سے 1958 تک وہ رکن رہے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب یورپی کاؤنسل European Convention on Human Rights کا مسودہ تیار کر رہی تھی۔ اس کام کا مقصد ایسے ادارے کا قیام تھا جس کے ذریعے دنیا میں کبلی باراشائی حقوق کو عالمی تحفظ دلایا جائے۔ 4 نومبر 1950 یورپ کی تاریخ میں ایک بہت بڑا دن تھا جب روم میں منعقد ہونے والے یورپی اکان کے وزرائے خارجہ کے اجلاس میں اس پر دستخط کیے گئے تھے۔ مک برائیڈ نے اس اجلاس کی کامیابی کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کے بعد سے انھوں نے نہ صرف یورپ بلکہ پوری دنیا میں انسانی حقوق کے احرام کو فروغ دلانے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔ اپنی تقریروں اور مضامین کے ذریعے وہ ہر ملک کے ارباب اختیار کو انسانی حقوق کے معاہدوں پر عمل درآمد کرانے اور افراد کے حقوق کی ضمانت کے لیے اکسالتے رہے ہیں۔

انھیں 1961 میں International Board of Amnesty International نامی ادارے کا صدر منتخب کر لیا گیا تھا۔ انھوں نے کئی برس تک، بڑے بے باک انداز اور محنت کے ساتھ اس ادارے کی سربراہی کی۔ اس دوران انھوں نے اذیت کا نشانہ بننے والے عروہوں اور عورتوں کے حقوق کے لیے کئی ملکوں کے دورے بھی کیے اذیت کے خلاف احتجاج بھی کیے اور انسانی اور ہمسائیگی کے احساس محبت کے لیے ملکوں کو اکسالتے بھی رہے۔ ان کے میدان عمل میں ایشیا، افریقا اور امریکا شامل تھے۔ اس تحریک میں ان کی اپنی توانائی اور سرگرمی نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے نا انصافی کے خلاف جنگ میں دنیا کے ضمیر کو متحرک کیا۔ اس ادارے کو عالمی درجے کا رسوخ حاصل ہوا، اور اسے وسیع پیمانے پر تسلیم بھی کیا گیا۔ اپنے ان تھک و لولے کے ساتھ انھوں نے نئے مسائل کو نمٹایا۔ مک برائیڈ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اس ذاتی فضا کو تبدیل کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہوگا جو بالآخر فرد کی آزادی میں زبردستی اور ظالمانہ مداخلت

کو روکنے کی ضمانت دینے کے قابل ہو سکے۔ مگر وہ اس امر سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں کہ پوری دنیا میں ایسے بے شمار افراد ہیں جو اپنے غمیر کے ہاتھوں اس تحریک میں کردار ادا کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

بنک برائید نے نظریاتی اور اصولی دونوں میدانوں میں، اور عملی منظرے میں رد کر کام کیے ہیں۔ انہوں نے ایک رہنما کردار اور ایک عام کارکن کی ذمہ داریوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا ہے۔ انسانی حقوق کو مستحکم بنانے اور اس حفاظت کے لیے کام کرنے کے سلسلے میں انہوں نے ایک انفرادی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

1963 سے 1970 تک International Commission of Jurists کے سیکریٹری جنرل کی حیثیت میں بھی وہ خاصے فعال رہے ہیں۔

یہ ادارہ 1952 میں مغربی جرمنی میں قائم کیا گیا تھا اور اس کا ابتدائی مقصد مشرقی جرمنی اور مشرقی یورپی ممالک میں نا انصافیوں کے ارتکاب کو قلم بند کرنا تھا۔ مگر بعد میں یہ ادارہ ہر ملک میں انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف عملی طور پر سرگرم ہو گیا۔ مختلف ممالک کے ماہرین قانون نے اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ جس میں ماروے کی نمائندگی Terje Wald کر رہے تھے جو اس وقت کی عدالت عظمیٰ کے صدر تھے۔

International Commission of Jurists کو جس نے کئی گراں بہا مضامین شائع کیے ہیں، اپنی سرگرمیوں کے باعث بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور اسے اقوام متحدہ کے اداروں میں خاصا رومخ حاصل ہو گیا ہے۔ اس توقیر کا اعتبار اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ ماروے سمیت پچاس سے زیادہ ممالک اس کو از خود ادا خراجہم کرتے ہیں۔

شمالی ملک برائید سیکریٹری جنرل کی حیثیت میں حد سے زیادہ فعال رہے ہیں اور بڑے پیمانے پر اس کمیشن کی نیک نامی میں اضافے کا باعث ہوئے ہیں۔

انہوں نے ہمیشہ انفرادی حقوق کے تحفظ کے لیے کی جانے والی قانون سازی میں اضافے اور اس پر عمل درآمد پر بہت زور دیا ہے کہ انفرادی طور پر، سر ریاست کو قومی قانون سازی اور اس سے ملحق بین الاقوامی اجتماعات دونوں کے لیے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا چاہیے۔ ان کے خیال میں، اس طرح بین الاقوامی قوانین بنائے اور ان میں اضافے کیے جاسکتے ہیں تاکہ فرد کو زیادہ تحفظ کی ضمانت ملے۔ مثال کے طور پر، جب شمالی ملک برائید ستمبر 1967 میں اوسلو میں منعقد ہونے والے مذاکرے میں شریک تھے تو انہوں نے مشرقی یورپی ممالک کے درمیان بنیادی آزادیوں اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے ایک کمیشن کے قیام کا خیال پیش کیا تھا۔ یورپی کاؤنسل کے ارکان ممالک کے درمیان ہونے والے کنونشن ہی کے خطوط پر اسی قسم کے کنونشن کا قیام ان کی تجویز تھی۔ انھیں امید تھی کہ اس قسم کے علاقائی معاہدوں کے ذریعے ہی حقوق کے ایسے تحفظ کے سلسلے میں حقیقی ترقی ہو سکتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ UNO کے انسانی حقوق کے فرمان کو ایک زندہ حقیقت کا روپ دینے کے بارے میں بہت کام کیا جاسکتا ہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ انسانی حقوق کی ایک عالمی عدالت قائم کی جائے جس کے پاس ان افراد کی شکایات کے ازالے کے لیے اختیار ہوں جن کو

عالمی سطح پر قبول کیے گئے منصفانہ اصولوں کی خلاف ورزی کے ذریعے اذیت کا نشانہ بنایا جا رہا ہو۔ مثال کے طور پر برائیدہی کے رائے کے مطابق کوئی بھی ریاست مکمل حاکمیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی جس میں عالمی بنیاد پر قابل قبول انسانی حقوق کا تحفظ نہ کیا جا رہا ہو۔ اس نوعیت کے حقوق پوری انسانیت کا مشترکہ اثاثہ ہوتے ہیں، کسی ملک کے ارباب اختیار کو بنیادی انفرادی حقوق کی پامالی کا حق نہیں ہوتا۔ اپنا بدفہم حاصل کرنے میں ہمیں ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے، مگر ملک برائیدہی اس موضوع پر بات چیت کی اہمیت پر زور دیتے ہیں، اس لیے کہ یہ عمل خود ہمارے تازہ اور سنجیدہ محبت، ہمسائیگی اور انسانی احترام کے لیے ایک منبع ہوگا۔

کوئی بھی عمل جو انسانی وقار کی خلاف ورزی ہو، خواہ وہ کتنی بھی ہو رہا ہو، خود انسانیت کی بر ملا بے عزتی ہوتا ہے۔

امن کے لیے منظم طور پر کیے جانے والے ایسے تمام کام، جیسے International Peace Bureau میں ملک برائیدہی کی عملی شرکت کو وسیع پیمانے پر قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ Peace Bureau کی تاریخ کا سلسلہ 1892 تک جاتا ہے؛ یہ ایک موثر ادارے کے طور پر قائم کی گئی تھی، جنگ کی مخالف ان تمام انجمنوں کے لیے، جو پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں اور جن کا کام League of Nations کی بنیاد رکھنا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اس Bureau کو تسلیم کیا گیا تھا مگر اس کے اغراض و مقاصد میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی، یعنی، ان کا مقصد بین الاقوامی تنازعات کے لیے عدم تشدد کی تلاش میں بین الاقوامی افکار کا فروغ تھا۔

1910 میں Peace Bureau کو نوپیل امن الحام سے نوازا گیا تھا۔ کچھ عرصے سے ملک برائیدہی اس ادارے کی کئی معتبر حیثیتوں پر فائز رہے ہیں۔

بین الاقوامی تعاون کی اپنی قسم داریوں سے پہلی لگن کے باعث ملک برائیدہی نے بہت پہلے ہی انفرادی حقوق کے تحفظ کے لیے اقوام متحدہ میں ایک ہائی کمشنری کے قیام کا خیال پیش کیا تھا۔ اس سوال پر UNO کی بہت سی کمیٹیوں اور جنرل اسمبلی میں برسوں بحث کی جاتی رہی ہے۔ ماروے ان ممالک میں سے ایک ہے جنہوں نے اس تجویز کی بھرپور تائید کی ہے۔ بد قسمتی سے اس برس اور پچھلے برس UNO کے مباحث سے پتا چلتا ہے کہ اس خیال کی تجسیم کے لیے ابھی ایک لمبا سفر طے کرنا ہے۔ اس دوران کام کو جاری رکھنا ہوگا، اس خیال کے ساتھ کہ اس بدفہم کے حاصل کرنے میں کامیابی ثابت قدمی کی بنا پر گھر بہت صحت رفتار ہوگی۔

1968 میں UNO کے انسانی حقوق کے سال کے دوران ملک برائیدہی نے بہت سے غیر سرکاری اداروں کے لیے، جو انسانی حقوق کے لیے کام کر رہے تھے، ایک مشترکہ کمیٹی کے قیام کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ انہیں خود امداد دیا بھی کے طور پر، اس ادارے کو چلانے کا فرض سونپا گیا تھا، جو اپنی متفقہ کوششوں اور رسوخ کے باعث اس کام کا اہل قرار پایا ہے۔ عملی طور پر معاملہ بندی کرنے والے ایک ہنرمند کی حیثیت میں ان کا اعتراف اور احترام کیا جاتا ہے، اور بہت سی کانفرنسوں اور مذاکرات میں ان کی لگن کی قوت اور ان کے

آدرش دونوں کے ثبوت پائے گئے ہیں۔

میں برس سے زیادہ عرصے سے مک برائیڈ انسانی حقوق کے مقاصد کے فروغ میں ایک مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی کوششوں کو کامیاب ہوتے دیکھا ہے۔ دنیا بھر میں، ان کے ضروری پیغام کو جو "Love thy Neighbour" کے بلا سکی چکر کے برابر ہے، بڑی تعداد میں سننے والے حاصل رہے ہیں۔ انسانی حقوق کے احرام میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے، اس کے باوجود کہ ہم جو کرنا چاہتے ہیں اس میں ابھی بہت کچھ باقی ہے، اور اس میں مک برائیڈ کی کوششیں کم نہیں ہیں۔

مک برائیڈ کو نوبل امن انعام کی پیش کش سے مارویا تھی پارلیمان کی نوبل کمیٹی امن کے اہم کام کی وکالت کرنے والے ایک تمیمی کو خراج تحسین پیش کر رہی ہے۔ کمیٹی قائل ہے کہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مک برائیڈ کے بے شمار دوست آج کے دن ان کی خوشیوں میں شریک ہوں گے جو دراصل انسانی حقوق کا دن ہے۔ پچھلے موقعوں پر بھی نوبل کمیٹی کو دوسرے کئی لوگوں کو یہ انعام دینے کی سعادت نصیب ہوئی تھی جنہوں نے انسانی حقوق کے لیے بڑے کام کیے تھے۔ امن کا انعام پانے والوں کے اس حلقے میں مک برائیڈ کا نام بھی اپنی جگہ بنا رہا ہے جنہوں نے انسانیت کو ظلمات میں روشنی دکھائی ہے۔

اس وقت مک برائیڈ کو اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے شیلیا کی صورت میں ایک نئی اور مشکل ذمہ داری کا سامنا ہے۔ انھوں نے اپنے مستقبل کے کام کے بارے میں ذاتی طور پر خوش امید کی کا اظہار کیا ہے۔ دنیا اقوام متحدہ میں ان کی خدمات کو توقعات کے نظر سے دیکھے گی۔

مارویا نوبل کمیٹی کی صدر نشین Aase Lohne کی زبانی

خطبہ شال مک برائیڈ

ضرورت بقا

عزت مآب، خواتین و حضرات!

میں تقریباً ایک کیفیت یا اس میں آپ کے خوب صورت ملک اور شہر میں یہ انعام حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں، جس اعزاز کا میں کسی طرح بھی حق دار نہیں۔ یاں جزوی طور پر، اس لیے کہ ہم ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جہاں جنگ، تشدد، بے رحمی اور بدھمتی ہوئی اسطر بندی انسانیت کی سوچ پر حاوی ہے، مگر اس سے بھی زیادہ، اس لیے کہ انسانیت تو خود بھی تباہی کا سامنا کرنے میں اپنی طاقت پر بے عمدہ یا خوف زدہ ہے۔

ان بنیادی تبدیلیوں کے اثرات پر کم کم غور کیا گیا ہے جو پچھلے تیس برسوں میں ہمارے اطراف رونما ہوئی ہیں اور مزید ہوئی جا رہی ہیں۔ پھر بھی، ان خوف ناک مائنس اور مادی ترقیات نے جو اس زمانے میں

ہوئی تھی انسانی سوسائٹی کے پورے ڈھانچے کو بنیادی طور پر تہذیبی کر کے رکھ دیا ہے۔ حتیٰ کہ انسانی نسل کی بقا کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ چکرا دیئے والے اس سائنسی اور مادی انقلاب نے ہماری زندگی کے ہر بنیادی پہلو کو تہذیبی کر دیا ہے۔ سائنسی ترقیات کے ساتھ ساتھ ہمارے سماجی اور سیاسی ڈھانچوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ان میں نوآبادیات کے انہدام نے، وقت سے پہلے ہی، اس نہایت غیر متعافانہ نسلی، سماجی اور معاشیاتی نظام کے تحسب کو بھی بے پردہ کرنا شروع کر دیا جو ہمارے درمیان جاں ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں ایک ناموزوں طریقہ تیار کیا گیا تھا جو نوآبادیاتی اور معاشی تسلط کے متبادل کے طور پر ایک سماجی نظام کی بنیاد بنایا گیا تھا، بھوک، انصاف اور مساوات کی بنیاد پر تحفظ کی فراہمی سے آزادی کے لیے۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان نتائج کے حصول کے لیے کی جانے والی جاں فشائیاں عالمی سطح پر بے کاری معنی ہیں۔ بھوک اور قحط کا آسیب آج بھی دنیا پر لہرا رہا ہے اور بڑے پیمانے پر موت کا اور آزار کا سبب بن رہا ہے۔

اس تیز رفتار انقلاب کے درمیان انسان نے جوہری توانائی کو دریافت کیا اور اس کو تہذیبی کے ہتھیاروں کی جانب موڑ دیا ہے۔ اب، انسانیت کی تاریخ میں پہلی بار، کرۂ ارض کی ہر زندہ شے کی تہذیبی انسانوں کے اختیار میں آگئی ہے۔ تقریباً جوں ہی یہ توانائی دریافت ہوئی، جوہری بم کے ذریعے ہیرہ و شیشا اور ناگاساکی کی آبادیاں تہس نہس کر دی گئیں۔ اس کے بعد سے مزید بے شمار افراد جوہری ہتھیار کے خوف ناک نتائج کی پھینٹ چڑھ چکے ہیں جو تجرباتی طور پر استعمال کیے گئے تھے۔

اس نرم دست سائنسی اور مادی انقلاب نے ہماری سوسائٹی اور ماحولیات کے ہر عنصر کو عملی طور پر تہذیبی کر کے رکھ دیا ہے۔ انسانیت کی تاریخ میں اس سے قبل ایسا دور نہ تھا اور بنیادی تہذیبی کرنے والا کوئی انقلاب نہیں آیا ہے۔ نہ پہلے کبھی انسانیت کو اتنے سارے اور مہیب مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ شاید اس سائنسی انقلاب ہی کا نتیجہ ہے، یا اس سے ملا نظما اتفاق ہے کہ عملی طور پر تمام انسانی رشتوں میں عوامی اور ذاتی اخلاقیات کا تحمل انہدام ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے عوامی اور ذاتی اخلاقیات بہت اچھے تو نہیں تھے مگر تھے تو سبھی ان کو ایک معیار سمجھا جاتا تھا اور ان پر کسی حد تک عمل بھی کیا جاتا تھا۔ مگر اب نہ ان کا وجود ہے، نہ انھیں قبول کیا جاتا ہے اور نہ ان کی پابندی کی جاتی ہے۔

بین الاقوامی قوانین کا ایک طے شدہ اصول ہے کہ وہ ہتھیار اور جنگ کے طریقے جو فوجی یا غیر فوجیوں کے درمیان امتیاز نہ کر سکیں، ان کو استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ غباروں سے برمائے جانے والے بم غیر قانونی قرار دے دیے گئے تھے "dum-dum" نامی گولیوں کو بھی غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا اور ان کا استعمال اس بنیاد پر مجرم تھا کہ وہ غیر ضروری دکھ کا باعث ہوئی تھیں۔ اسپتالوں اور شہری ہدف پر بمباری غیر قانونی تھی۔ یہ سارے اصول اچانک ناپاک ہو گئے ہیں۔ ان کے بارے میں وہ بھی بات نہیں کرتے ان پر عمل جن کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ تاریخ کے سب سے زیادہ ہیمنہ ظالمانہ اور خوف ناک ہتھیار جوہری

ہم کو غیر قانونی تک قرار نہیں دیا گیا ہے۔ ان قیامت انگیز ہتھیاروں کی تیاری اور ان کی ترقی کا عمل نہ صرف ”عام“ سی بات ہو گئی ہے بلکہ انھیں ”قابل احترام“ سمجھا جاتا ہے۔ اور عوامی اخلاقی معیاروں کے انہدام کا سب سے خوف ناک پہلو وہ خاموشی ہے جو انسانی قوانین کے پاس داروں نے اختیار کر رکھی ہے۔ حکومتیں براہ راست یا نیابت میں جنگ شروع کر دیتی ہیں جن کا اعلان تک نہیں کیا جاتا۔ دوسرے ممالک پر حاوی ہونے کے لیے مسلسل طاقت کا استعمال یا طاقت کے استعمال کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ غیر انسانی جنگوں میں شہری، مردوں، عورتوں اور بچوں پر ہم برائے جاتے ہیں اور بلا امتیاز ان کا قتل عام کیا جاتا ہے، انسانوں، مویشیوں اور فصلوں کو تباہ کرنے کے لیے کیمیائی بم استعمال کئے جاتے ہیں۔ قیدیوں سے نہ صرف بڑا سلوک کیا جاتا ہے بلکہ ان کو باقاعدہ ایسی اذیتیں دی جاتی ہیں جو تاریخ کے وحشیانہ دور سے بھی بڑی نوعیت کی ہوتی تھیں۔ بعض حالات میں تو یہ سب کچھ ان حکومتوں کی براہ راست یا خاموش منظوری سے کیا جاتا ہے جو مہذب ہونے، حتیٰ کہ عیسائی ہونے کی دعوے دار ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو خود فوج اور پولیس اذیت رسانی کی مخصوص تربیت کا اہتمام کرتی ہے اور اذیت کی نئی تراکیب ایک ملک سے دوسرے ملک برآمد کی جاتی ہیں۔ اندرونی خلفشار پیدا کرنے، ممالک میں اختلاف پھیلانے، جمہوری طریقوں سے منتخب کردہ حکومتوں کو گرانے اور مخالفین کے سیاسی قتل میں خفیہ طاقتوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ کئی تو حکومت کے رہنما اقتدار میں رہ کر ناجائز دولت اکٹھا کرنے کے لیے اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ اکثر، حکومت گرانے کے بعد اس کے ارکان اور ان کے مددگاروں کا قتل عام کیا جاتا ہے۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک نسلی گروہ کو اکھاڑ کر دوسرے گروہ کو برباد کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعے اقتدار پر قبضہ جاری رہے، اور اس کے لیے یکسر قتل عام سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا ہے۔

ہم عصر مناظر کے معاملے سے یہ صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اکثر وہی لوگ غلط مثال قائم کرتے ہیں جو اقتدار میں ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں زمام اقتدار ہو اگر وہی لوگ نا انصافی کریں، اذیت رسانی اور قتل پر عمل کریں تو یہ ناگزیر نہ ہوگا کہ جو شکار ہیں وہ بھی ان ہی طریقوں سے اپنا رد عمل ظاہر کریں۔ یہ کیفیت ہمہ وقت اور غیر انسانی سلوک کو نظر انداز نہیں کرتی، بلکہ ہماری دنیا میں بڑھتے ہوئے تشدد اور ظلم کی جذبی توضیح کرتی ہے۔ یہ دنیا جو ہم نے ابھرتی نسلوں کے لیے تیار کی ہے اُن کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ میں ”ہم“ کے استعمال پر زور دوں گا، جس سے مراد اس صدی کا بنی نوع انسان ہے، جس نے اس دنیا کے لیے آخری دن تیار کر لیا ہے، جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ آج کے نوجوانوں کے ایک گروہ نے غیر فطری طور پر خدا پر یقین سے انکار تو نہیں کیا ہے، کچھ خروش رو ہو گئے ہیں، کچھ نشر آوری میں اپنی فراری منہاسی تلاش کرتے ہیں، جب کہ کچھ ایسے بھی ہیں جو عملی اور نظریاتی طور پر ان مقاصد کی تلاش میں رہتے ہیں جو Universal Declaration of Human Rights اور اسلیمہ جات پر مکمل پابندی میں مضمر ہیں۔ یہ لوگ اکثر دل برداشتہ ہو جاتے ہیں بے اعتباری کی اس خلیج سے جو حکومتوں، مذہبی رہنماؤں اور خود متہم قوم کے دعووں اور تصورات کے درمیان

پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ فلیج تمام اداروں پر سے اعتماد کے اٹھ جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ البرٹ شواٹسز (Albert Schwaetzer) حتمی طور پر صحیح تھا جب اس نے اس امر کی نشان دہی کی تھی کہ انسان نے ”پیش بینی اور اپنے اعمال کے نتائج کی پیش بندی“ کرنے کی استعداد کھودی ہے۔ نہ صرف یہ کہ انسان نے یہ قابلیت کھودی ہے بلکہ اس کو اس بات کا احساس بھی نہیں کہ فراست اور مثالیت سے خالی دانش خطرناک ہوتی ہے۔ تو مثالیت کیا شے ہوتی ہے؟ مثالیت ایک اخلاقی یقین کی کیفیت ہے جو انسانیت کی جدوجہد بظاہر اور فطری نیکیوں سے فیض یاب ہونے میں اس کی مدد کرتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ کوئی انسان نہیں تھا جس نے کائنات کی تخلیق کی ہے خواہ آپ ایک خدا پر یقین رکھتے ہوں یا بہت سے خداؤں پر، یا آپ کسی رہائی موجودگی سے انکار کرتے ہوں کہ انسان نقصان پہنچائے بغیر ان قوانین میں تبدیلی نہیں کر سکتا، کائنات پر جن کی حاکمیت ہے۔

میں نے ان فلسفیانہ اور اخلاقی مسائل کی طرف توجہ مبذول کرادی ہے تاکہ اس ذمے داری کی نشان دہی ہو جائے جو دنیا کی موجودہ حالت میں مذہبی رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔ عوامی اور ذاتی اخلاقیات کا انہدام معمولی بات نہیں جو بڑے سائنسی انقلاب سے ان کی معاملہ بندی میں ماکامی کی وجہ سے ہوا ہے، ہم جس سے گزر رہے ہیں اپنے ڈھلنے کے اعتبار سے تمام کلیسا یک سنگی (monolithic) ہیں اور حالات کو آسانی سے اپنے مطابق نہیں کر پاتے۔ مگر بہت سے معاملات میں وہ اتحاد کا حصہ بنے ہیں بلکہ کبھی کبھی غیر منصفانہ نظام کا بھی حصہ رہے ہیں۔ اکثر وہ ایسے مواقع پر خاموش رہے ہیں جب انھیں انصاف کے مطالبے کی رہنمائی کرنی چاہیے تھی۔ مذہبی لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ انصاف اور امن کے لیے ہونے والی جدوجہد کا مرتب حصہ نہیں جو رہائی و زندگی عاقبت اندیشی پر یقین رکھتے ہیں انھیں اسرار کرنا چاہیے کہ ان کے مذہبی نظام رہنمائی فراہم کریں۔

ضروری ہے کہ حکمرانوں اور مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کو احساس ہو کہ انصاف کے بغیر امن نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ اقتصادی حالات جو بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچے، آزار اور افلاس کی مزادیں وہ شکار ہونے والوں کے خلاف اپنے اندر حملہ آوری کی ترتیب کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے ڈھلنے جو بنی نوع انسان کو انسانی حقوق یا انسانی وقار سے محروم کرتے ہیں وہ انصاف کے حصول میں رکاوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بنیاد پرستی اور مذہبی تعصب بھی حملہ آوری کے زمرے میں آتے ہیں۔ اکثر و بیشتر، وہ لوگ جو status quo کا دفاع کرتے ہیں وہ دراصل جبر کے تسلسل کا دفاع کر رہے ہوتے ہیں جو غیر منصفانہ ہوتا ہے۔ یہ اس لیے ایسا ہے کہ بالخصوص جنوبی افریقی علاقوں میں، سیاسی اور اقتصادی ڈھلنے نسلی امتیاز اور نوآبادیاتی استحصال کی بنیادوں پر کھڑے کیے جاتے ہیں۔

قیاساً، افریڈ نوٹیل نے اپنی وصیت کے ذریعے چاہا ہے کہ ان افراد کی جنھیں اس انعام کے لیے منتخب کیا جائے، اس موقع پر دنیا کے امن کے لیے اپنی تجاویز پیش کرنے کا موقع ملے اگر میں موجودہ حکومتی

اور مذہبی-اداروں کی سست رفتاری کے خلاف شکایت کرتا پایا گیا ہوں تو یہ بھی ٹھوکی تباہی کی اجازت کے زمرے میں آئے گا۔ میری پہلی تجویز اس امر کے بارے میں ہوگی جسے انٹریڈ نوٹیل نے ”دہشتوں کی دہشت اور سب سے بڑے جرم“ - جنگ کا نام دیا ہے۔ یہ خوف آج پوری انسانیت کو لاحق ہے۔ جنگ تمام انسانی اقدار کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے اور ہر شے کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوتی ہے، بنی نوع انسان جس کی خواہش اور پرویش کرتی ہے۔

میرے خیال میں یہ صحیح ہوگا اگر میں اس موقع پر اوسلو میں سویڈن کے سابق سفیر برائے ناروے، گورنر رالف ایڈ برگ (Rolf Edberg) کے الفاظ کا اقتباس پیش کروں۔ جو آج کل SIPRI کے صدر نشین ہیں۔ اور جو ہری عہد میں جنگ کی بے معنویت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”پہلے زمانے کی جنگوں میں نظر آنے والے دشمن کے خلاف حملے کیے جاسکتے تھے جب کہ مستقبل کی غیر شخصی جنگوں میں ایسا نہیں ہوگا، جن میں ایک انسانی شکل کی غمخوار مشین، کمپیوٹر کی ہدایات کے مطابق، سمندر کے اُس پار بسنے والی مخلوق کی مکمل تباہی کے لیے بن دیاتی دکھائی دے گی۔ پہلے زمانے کی جنگ، جس میں جسمانی جنگ بھی شامل ہے، رہنے کے قابل جگہوں اور علاقوں کے لیے، گم و بیش، ایک کھلی جدوجہد ہوتی تھی۔ جب کہ جوہری جنگ میں کوئی علاقہ نہیں ہوتا جس کو فتح کیا جائے یا جس کا دفاع کیا جائے، اس لیے کہ حملہ آور اور جن پر حملہ کیا جا رہا ہو، دونوں ایک ہی طرح کی مکمل تباہی کے خطرے میں ہوتے ہیں۔ پچھلے زمانے کی جنگوں میں اگلی صحنوں کا سپاہی اپنے گروہ کی وفاداری میں اپنی جان قربان کرتا تھا، اس یقین پر کہ اس کے پاس اپنے اہل خاندان اور قوم کو بچانے کا موقع ہے۔ جب کہ ہائیڈروجن بم سے لڑی جانے والی جنگ میں ہر وہ شے جس کی حفاظت پر وہ مامور ہوتا ہے، اسی کے ساتھ بھسم ہو جائے گی۔

پچھلے زمانے کی جنگوں کے، خواہ وہ کچھ بھی رہے ہوں، کچھ بھی ہوتے تھے۔ مگر اب ہائیڈروجن بم نے جنگ کرنے کے عمل کو عالمی سطح پر ایک کاہل حاصل بنا دیا ہے۔

سچ، کہ ایک بار ہم فطرت کی قوتوں سے چھیڑ چھاڑ کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں تو فساد برپا کرنے کے بے شمار امکانات ہوں گے۔“

لہذا، امن کو انسانیت کے لیے ایک ناگزیر حکم کی مانند ہونا چاہیے۔ اس ظاہرہ نتیجے میں سے بہت سارے احکام نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان احکام کی تکمیل نسبتاً آسان ہو جائے گی اگر دنیا بھر میں وہ لوگ جو اقتدار میں ہوں ایسے اخلاق کے رنگ میں رنگ جائیں جس کا بنیادی مقصد امن ہو اور اگر ان میں سماجی ذمے داریوں کا اخلاقی ادراک بھی ہو۔ اس نئے اخلاق کی تعمیر میں بنیادی کردار کھینسا کا ہونا چاہیے۔

امن کے عملی احکام شدید اور دور رس ہوتے ہیں۔ مگر ان کے لیے کوئی مختصر طریقہ نہیں، ہر ایک کو جلد از جلد سلجھایا جانا چاہیے۔ ان کی تفصیلات یہ ہیں:

(۱) جوہری ہتھیار سمیت، تمام قسم کے ہتھیاروں پر عام اور مکمل پابندی

- (2) جنگ کی نہیں، امن کی حدود بنانا
 - (3) قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر انسانی اور اقلیتی حقوق کا مؤثر تحفظ
 - (4) قومی اور بین الاقوامی تنازعات کے حل کا خود کار اور سیاست سے پاک ہندوبست، جو امن کے لیے خطرہ ہوں اور نا انصافیوں کی بنیاد بنیں
 - (5) ایک بین الاقوامی حکم جو تمام ضروری اشیاء کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنائے
 - (6) نا انصافی کو بلا طاقت کے، ناجائز استعمال کو روکنے کے لیے ایک بین الاقوامی عدالت اور قانونی نظام کا قیام جو خود کار سطح اختیار کے حامل ہوں
 - (7) امن قائم کرنے والی ہمہ دہ اختیارات کی، ایک بین الاقوامی فوج اور پولیس کی تشکیل
 - (8) بالآخر ایک عالمی پارلیمان اور حکومت کا قیام
- میں بہت سے لوگوں کو کہتے ہوئے سن سکتا ہوں "میونخ" "نا قابل حصول" بلاشبہ یہ مشکل کام ہوں گے مگر ان کا متبادل کیا ہے؟ انسانی نسل کی تفریق یا یقینی تباہی!
- اس مقالے میں ان آٹھوں احکام پر مکمل تفصیل سے کلام نہیں کیا جاسکتا جن کا میں نے خاکہ پیش کیا ہے۔ مگر میں ان اقدامات پر ضرور زور دے سکتا ہوں جو کیے جاسکتے ہیں اور ان نا قابل وقائع مشکلات کی طرف اشارے بھی کر سکتا ہوں جو ہماری موجودہ سعی میں موجود ہیں۔

ہتھیاروں پر عام اور مکمل پابندی

1961 کے آخر تک یہ تمام حکومتوں کا اور اقوام متحدہ کا طے شدہ مقصد تھا۔ اس مقصد کو ترک کیوں کر دیا گیا؟ کیوں اب اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا جاتا؟ 1961 میں جس حد تک معاہدہ ہوا تھا اس کا اندازہ ابتدائی عبارت کے مندرجہ ذیل ٹکڑوں سے لگایا جاسکتا ہے جو سوویت روس اور ریاست ہائے متحدہ کے 20 ستمبر 1961 کے مشترکہ بیان کا حصہ تھے:

"ا۔ معاملہ بندی کا ہدف ایسے پروگرام کے لیے معاہدے کا حصول تھا جو یقینی بنائے گا:

(الف) کہ ترک اسلحہ جات عام بھی ہوگا اور مکمل بھی، اور بین الاقوامی مسائل کے حل کے لیے جنگ کا استعمال نہیں ہوگا

(ب) کہ ترک اسلحہ جات کے ساتھ ایسے قابل اعتبار اور مؤثر طریقہ کار اپنائے جائیں گے جو اقوام متحدہ کے فرمان کے مطابق تنازعات کے پُر امن حل اور امن کے قیام کو یقینی بنائیں۔

۲۔ عام اور مکمل ترک اسلحہ جات کا پروگرام اس امر کو یقینی بنائے گا کہ ریاستوں کے پاس صرف ایسے غیر جوہری ہتھیار قوت، سہولتیں اور ادارے ہوں گے جو مشفقہ طور پر، اندرونی امن و آشتی کے لیے اور

باشمقوں کے تحفظ کے لیے ضروری ہوں گے؛ کہ ریاستیں اقوام متحدہ کی امن فوج کی تائید کریں گی اور اس کے لیے طے شدہ نثری بھی فراہم کریں گی۔“

اس وقت تیار کیے گئے سوویت اور امریکی میاق کے مسودوں میں نہایت وسیع پیمانے پر رضامندی کا اظہار تھا، اور محض چند نثری نکات باقی رہ گئے تھے۔ پھر بھی، چند برسوں کے اندر ہی ان مقاصد کو ”سرد جنگ“ میں بدل دیا گیا تھا۔ کیا وہ وقت آ نہیں گیا ہے کہ ہم عام اور مکمل ترک اسلحہ جات کی طرف واپس لوٹ جائیں؟

ترک اسلحہ جات کی طرف برحسنا تو درکنار بڑی طاقتیں اسلحہ کی اتنی بڑی دوڑ میں شریک ہیں جو دنیا میں پہلے کبھی دیکھی نہیں گئی۔ مذاکرات صرف دفاعی اسلحہ اور دور مار کرنے والے جوہری میزائلوں کے پھیلاؤ کو محدود کرنے کے لیے کیے جا رہے ہیں۔ اور یہ صرف اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اسلحہ کی دوڑ اتنی مہنگی پڑ رہی ہے کہ معیشتیں دیوالیہ ہو رہی ہیں؛ وہ مزید پھیلاؤ کو سہار نہیں سکتیں۔ موجودہ مذاکرات ترک اسلحہ جات سے متعلق نہیں ہیں، ان کا تعلق مرحلہ وار اسلحہ بندی سے ہے۔

جوہری اسلحہ جات

اگرچہ صحیح معنوں میں جوہری اسلحہ عام اور مکمل ترک اسلحہ جات کے زمرے میں آتے ہیں، ان کو انسانیت سے متعلق قوانین کے سیاق و سباق میں بھی برتا جانا چاہیے۔

جوہری ہتھیاروں کے اسلحہ خانے میں اس وقت اپنے جوہری میزائل موجود ہیں کہ ان سے دنیا کو تین مرتبہ مکمل طور پر تباہ کیا جا سکتا ہے۔ باوجود کانفرنسوں اور ”Partial Disarmament Measures“ کے، جوہری ہتھیاروں کو قانونی حق سے محروم کرنے کے سلسلے میں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ جوہری ہتھیار کے اسلحہ خانے کا حجم روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ میزائلوں میں لے جائے جانے والے چھوٹے جوہری بم پوری دنیا کے فوجی اقدوں، ہوائی جہازوں، سمندری جہازوں، آباد رشتیوں وغیرہ میں، پہلے مقابلے میں کم از کم زیادہ تعداد میں، پھیلے ہوئے ہیں۔ جوہری ہتھیاروں کے تجربات پر پابندی کے میاق اور عدم پھیلاؤ کے میاق عوام کی تشویش کو کم کرنے میں زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوئے ہیں۔

غالباً کسی میدان پیشہ ور اور کارکردگی کے مابین خلل بے اعتباری اتنی وسیع نہیں ہوگی جتنی کی جوہری اسلحہ جات کے میدان میں پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، وہ ہتھیار جو غیر ضروری طور پر نکالنا نہ ہوں، یا وہ جو اپنے اثرات کے اعتبار سے لڑنے والوں اور شہری ٹھکانوں میں امتیاز کرنے کے قابل نہ ہوں، ہیگ اور جنیوا کنونشن میں غیر قانونی قرار دیے جاتے ہیں۔ انسان دوست قوانین کے ہیں وہ بنیادی اصول ہیں جنہیں متبرک سمجھ کر بین الاقوامی کنونشن اور اقوام متحدہ کی کئی قراردادوں میں محفوظ کیا گیا ہے۔ ایسے اور کون سے ہتھیار ہوں گے جو جوہری بم یا warhead سے زیادہ بے امتیاز ہیں؟ تو پھر ”dum-dum“

کولیوں کو غیر قانونی کیوں قرار دیا جائے اور جوہری بم کو نہیں؟ اس کے باوجود کچھ ناقابل تشریح وجود کی بنا پر بالخصوص جوہری ہتھیاروں کو جینوا کنونشن کے نظر ثانی شدہ متن میں غیر قانونی قرار دینے سے انکار کیا گیا ہے۔ اگر انسان دوست قانون کو بمعنی اعتبار دیا جاتا ہے، یا جوہری ہتھیاروں پر مکمل پابندی لگائی جاتی ہے تو سب سے پہلا شوق قدم یہ ہوگا کہ جوہری ہتھیاروں کے استعمال کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔ اس کام کے لیے یا تو ایک سادہ سا کنونشن برپا ہو یا موجودہ کنونشن میں ایک شق کا اضافہ کر دیا جائے جس کی رو سے جوہری ہتھیاروں کا استعمال غیر قانونی ہو جائے۔

پھر بھی، اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس قدم کے ساتھ ہی جوہری ہتھیاروں کی تیاری، فروخت، تبادلوں اور انبار سازی کو غیر قانونی قرار دیا جائے اور موجودہ ہتھیاروں کو تلف بھی کیا جائے۔ ان کے کنٹرول، تھم دینا اور معائنے کے سلسلے میں یقیناً ہر قسم کے مسائل پیدا ہوں گے، مگر بسا اوقات اس تاثر سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایسے بہت سے مسائل مشکلوں کی تلاش اور معاہدوں کو روکنے یا ان میں تاخیر کرنے کی غرض سے اٹھائے جاتے ہیں۔ تو کیوں نہ نہایت سادگی سے جوہری ہتھیاروں اور ان کے پرزوں کے استعمال، تیاری، فروخت، تبادلوں اور انبار سازی کو غیر قانونی قرار دینے سے شروعات کی جائے؟ تو اب کیوں نہ مکمل طور پر تمام جوہری ہتھیاروں کی تیاری کو بھی روک دیا جائے؟

کیا واقعی یہ سچ نہیں ہے کہ سب یا کچھ جوہری طاقتیں جوہری ہتھیاروں کی تیاری، فروخت، تبادلوں، انبار سازی اور استعمال میں آزادی چاہتی ہیں؟ اگر واقعی ایسا ہے تو اس سچ کو دنیا کے عوام کے سامنے اہم تشریح بیان کر دیا جانا چاہیے۔ نشر اور ادویہ کی تقسیم غیر قانونی ہے۔ پھر بھی مدنی ایٹم (self-righteous) اور مہذب حکومتیں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے جوہری انجنوں کو تیار کرنے اور ان کو تقسیم کرنے کے حق کی دعوے دار ہیں۔

برسوں کچھ حکومتوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ، اور صرف وہی، جوہری ہتھیار بنانے کے رازوں سے واقف ہیں، اور جب تک کہ یہ راز انھیں کے پاس رہیں گے، دنیا محفوظ رہے گی۔ اور یہ کہنا کہ جوہری تباہی کی تکنیک کچھ چنیدہ ”کلائم اعتباراً“ طاقتوں کا راز رہ سکے گی، ایک احمقانہ غمازی ہوگی۔ یا، یہ کہ وہ چنیدہ طاقتیں ایسے اعتبار کے قابل ہیں۔ افسوس کہ اس عہد میں حکومتوں کے چال چلن ایسے نہیں رہے ہیں کہ ان کی عدالت اور ان کی راست بازی پر بھروسہ کیا جاسکے۔

اقوام متحدہ کی تجویز کردہ عالمی ترک اسلحہ جات کانفرنس

اس امر سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ اقوام متحدہ کے ذریعے ترک اسلحہ جات کی کوششیں خاصی حد تک منفی ثابت ہوئی ہیں، اس لیے ہمیں کہ کوششوں کی غلطی کی گئی ہے، یقیناً اقوام متحدہ کا ادارہ اسی حد تک، یا اتنی ہی تیزی سے آگے جاسکتا ہے جتنی کی اس کے ارکان اجازت دیں گے۔ بڑی طاقتوں کو انفرادی طور پر بھی سلامتی

کاؤنسل میں پیش ہونے والی کسی بھی تجویز کی منظوری کو روک دینے کا حق حاصل ہے، اس کے علاوہ 138 ترکمن ریاستوں میں سے محض چند ہی ہیں جو ترک اسلحہ جات کے معاملے میں فعال رہی ہیں۔ تاثر یہ جتا رہا ہے کہ یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ ہے کہ اس کو بڑی طاقتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہیے، کہ جوہری ہتھیاروں کے جادو کے اطراف کا ہالہ یہ ہے کہ صرف بڑی طاقتیں ہی اس کو سمجھ سکتی ہیں۔ کسی بھی صورت میں، بہت ہی کم طاقت ور ریاستیں خود اپنے فوری مسائل اور اپنی اقتصادی بقا کے معاملات کے باعث ترک اسلحہ جات پر عمل نہیں کرتیں، بہت تو ایسی بھی ہیں جو بعض وجوہات کی بنا پر اپنی فوجوں میں توسیع پر کام کرتی نظر آتی ہیں۔ اس مقام پر میں منطقہ شمالی کے ملکوں کو اعزاز کے ساتھ اس سے خارج کرنا چاہتا ہوں، ترک اسلحہ جات میں جن کی ثابت قدمی اور تعمیری اقدام قابل قدر رہے ہیں۔ میں اس ضمن میں گھانا (انجیانی صدر انکرومہ کے دور کی کوششیں، جو امید ہے کہ ہم عصر گھانا میں دوبارہ شروع کی جائیں گی) پولینڈ، رومانیہ، کناڈا اور ہندوستان کی کوششوں کی بھی۔ باوجودیکہ ہندوستان اب جوہری طاقت بن چکا ہے۔ تحسین کرنا چاہتا ہوں۔ امید کی جاتی ہے کہ غیر وابستہ ریاستیں ایک بار پھر عملی اور مستقل طور پر اپنی توجہات کے رخ عام اور مکمل ترک اسلحہ جات کی طرف موڑیں گی۔ یہی وہ ممالک ہیں، جن کا میں نے مذکورہ کیا ہے اور امن کے بارے میں جن کا مفاد سب سے زیادہ ہے۔

اب عام طور پر اس بات کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ Conference of the Committee on Disarmament (GCD) نے جو عملی طور پر کسی نہ کسی پیکر میں 1961 سے وجود میں رہی ہے، کچھ کام نہیں کیا ہے، ایسا مخصوص ہوتا ہے کہ جیسے اس نے جان بوجھ کر روس کے General and Complete Disarmament Under Strict International Control اور ملے ہوئے متحدہ کے Outline of Basic Treaty on General and Complete Disarmament in a Peaceful World کے مطابق کے مسودوں کو کامیابی سے دٹا دیا ہے۔ GCD کی ناکامی کی وجہ شاید اس کی ساخت ہے یا کچھ یا ساری بڑی طاقتوں کی ترک اسلحہ جات کے بارے میں عدم دلچسپی ہے۔

GCD کی ناکامیابی یا بے عملی کی وجہ سے 36 غیر وابستہ ریاستوں نے 1965 میں اقوام متحدہ سے عالمی ترک اسلحہ جات کی کانفرنس کے انعقاد کی سفارش کی تھی۔ کسی نہ کسی وجہ سے یہ سفارش ہوا ہو گئی اور 1971 تک اس کو بھلادیا گیا تھا، جب سوویت روس نے اس کو دوبارہ زندہ کرنے کا خیال پیش کیا۔ سوویت تجویز کا نہ صرف سرد مہری سے بلکہ کچھ ممالک میں تو دشمنی سے استقبال کیا گیا تھا۔ بہر حال، بالآخر جنرل اسمبلی میں اس عزم کے ساتھ قرارداد منظوری گئی تھی کہ، ”یہ زیادہ پسندیدہ ہوگا کہ ضروری تیاریوں کے بعد، ایک عالمی ترک اسلحہ جات کی کانفرنس کے انعقاد کے لیے فوری اقدام کیا جائے جس میں تمام ریاستوں کو حصہ لینے کا موقع مل سکے۔“

کسی کی کسی وقت اقوام متحدہ کی قراردادوں میں کی گئی لٹاچی کے گورکھ چند سے کا خلاصہ تیار کرنے کی

بھی کوشش کرنی چاہیے۔ اقوام متحدہ کی یہ بالکل بے معنی اور کبھی نہ ختم ہونے والی مال منول کی زبان ہے جو ایسے لوگوں کو فہم دلایا کرتی ہے جو یقین بھی رکھتے ہیں اور جنہیں ان خطرات کا ادراک بھی ہے جو دنیا کو درپیش ہیں۔ یہ میکرٹریٹ کا تصور نہیں بلکہ ان کا تصور ہے جو کچھ نہ کہنے کے لیے زبان کو اذیت سے دوچار کرتے ہیں۔ دس برس جوتے بھسنے کے بعد ”فوری اقدام“ کی بات کرنا خاصا امید افزا تھا؛ مگر اب ہم 1974 کے اختتام کے قریب ہیں مگر اقوام متحدہ کی ترکیب اسلحہ جات کی کانفرنس کا دور دورہ رنگ کہیں نشان نہیں باوجود اس کے کہ فوری اقدام کا اعلان کیا گیا تھا۔ تقریباً قابل تصور موضوع پر دنیا بھر میں کانفرنس ہوتی رہتی ہیں، تو اقوام متحدہ کی عالمی کانفرنس برائے ترکیب اسلحہ جات کے بارے میں یہ مستحقی اور متذبذب کیوں؟

یہی وجہ ہے جن کی بنا پر بین الاقوامی امن بیورو کو پریذیڈنٹ میں ہونے والی اپنی ترکیب اسلحہ جات کی کانفرنس میں جنرل اسمبلی سے یہ مطالبہ کرنا پڑا تھا کہ وہ 17 جون 1975 سے قبل اقوام متحدہ کی عالمی کانفرنس برائے ترکیب اسلحہ جات کے انعقاد کا اعلان کرے۔

بہت سے لوگ سوال کریں گے کہ اتنی ساری کانفرنسوں کے بعد ایک اور کانفرنس کے انعقاد کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بالکل بے کار ہوں گی اگر ان کو حکومتوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح میں اب اس مقام پر آگیا ہوں جسے میں امن اور ترکیب اسلحہ جات کی جدوجہد میں ایک اہم عنصر گردانتا ہوں۔ بد قسمتی سے یہ ایک استثنائ نہیں بلکہ اصول رہا بن گیا ہے کہ جنگ، امن اور ترکیب اسلحہ جات کے تمام معاملات میں عوام نہیں ہوتے بلکہ حکومتیں ہوتی ہیں جو آخری فیصلے کرتی ہیں۔ دراصل ہمارے فیصلے کرنے والی حکومتیں تو برائے نام ہوتی ہیں جب کہ فیصلوں پر کئی بڑے طاقت ور مفاد والے اثر انداز ہوتے ہیں۔

وابستہ مفادات اور ماہرین

میں اس وقت ”وابستہ مفادات“ کے الفاظ ان کے وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں، جن میں صرف وابستہ مالی مفادات ہی نہیں بلکہ پیشہ ورانہ وابستہ مفادات اور فرقہ بندی اور سیاسی وابستہ مفادات بھی شامل ہیں۔ امن اور جنگ کے مسائل یا اسلحہ جات کے مقابلہ ترکیب اسلحہ جات کے مسائل کو عوام کے سامنے کبھی نہیں رکھا جاتا۔ عوام کو کبھی موقع ہی نہیں دیا جاتا کہ وہ حقیقت سے واقف ہوں یا مسائل کے فیصلے میں شریک ہوں۔ حتیٰ کہ ایسے معاملات میں اکثر پارلیمان کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یا مشورہ کیا جاتا ہے تو جزوی طور پر۔ ترکیب اسلحہ جات سے متعلق فیصلے ہندوواڑوں کے پیچھے فوج کے سربراہوں سے مل کر کیے جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو ”ماہرین“ کہا جاتا ہے جن سے اسلحہ بندی، ترکیب اسلحہ جات، جوہری ہتھیار، جنگ اور امن سے متعلق تمام سوالات کیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان سے انسان دوست قوانین سے متعلق سوالات بھی کیے جاتے ہیں۔ یہی وہ ماہرین ہیں حکومتیں جن سے ان اہم سوالات پر، جن پر انسانیت کے مستقبل کا دارومدار ہوتا ہے، مشورے کرتی ہیں۔ یہ فطری بات ہے کہ زیادہ تر حکومتوں کو ایسا ہی کرنا چاہیے؛ حکومت کے ارکان

فوجی معاملات کے ماہر نہیں ہوتے یہی ہے وہ نکتہ جس میں مکمل یا عام ترکیب اسلحہ جات کے ہمارے مسائل کے مراکز اعصاب (Nerve Centres) پوشیدہ ہوتے ہیں۔

کون ہیں یہ "ماہرین"؟ فوجی افسران، عموماً ایسی ذات کے، یا سوسائٹی کے ایسے طبقے سے ہوتے ہیں، جن کا پیشہ جنگ کی تیاری کرنا ہوتا ہے، اس سے کوئی مطلب نہیں کہ وہ حملہ آور جنگ ہو یا دفاعی جنگ، اس امر کا انحصار حالات پر ہوتا ہے۔ مگر جنگ کی تیاری کے لیے اسلحہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا پیشہ و رانہ فرض ہوتا ہے، بہترین فوج اور بہترین اسلحہ جات کا حصول۔ تو بہترین اسلحہ کیا ہوتا ہے؟ ایسا اسلحہ جو کسی بھی ممکنہ دشمن کو تباہ کر کے رکھ دے۔ اسی لیے حکومتیں ایسے ماہرین کے مشوروں پر انحصار کرتی ہیں جن کا مقصد ہوتا ہے ایسی فوجی مشین کی تیاری جو تباہی کے سب سے بڑے ہتھیاروں سے لیس ہو جن کا حصول ممکن ہو ان کے دلوں میں سب سے بڑی دشمنی، ہوائی اور سمندری فوج اور طاقت ور ترین اسلحہ کے حصول کی آرزو ہوتی ہے۔ بلا شبہ، جوہری بم کسی بھی روایتی اسلحہ سے زیادہ کاری ہوتا ہے، اسی لیے یہ ماہرین ان کے استعمال کو غیر قانونی نہیں ہونے دینا چاہتے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ایک معمولی بم کے مقابلے میں دھماکے کے ٹکڑوں سے بھرا بم نیا وہ افراد کو ہلاک کرے گا، اسی لیے وہ اس کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اعصابی گیس کے بم اور نیپام بم بہت بڑے اثر اور ہلاکت خیز ہوتے ہیں اس لیے ان کے استعمال میں آزادی ہونی چاہیے۔ "Dum-dum" گولیاں کم قدر کی ہوتی ہیں اس لیے بغیر کسی حقیقی زحمت کے ان کو غیر قانونی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ فوج نیا وہ قابل احترام اور کم نفرت کے قابل ہوتی ہے جو کچھ انسانی پہلوؤں۔ "Dum-dum" گولیوں کے غیر قانونی قرار دیے جانے پر رعایت دینے کو تیار ہو جاتی ہے۔

لہذا، ماہرین، حکومتیں جن سے ترکیب اسلحہ جات کی بابت مشورے کرتی ہیں، وہ ہوتے ہیں جن کا پیشہ ہوتا ہے جنگ کرنا، اور زیادہ تباہی پھیلانے والے ہتھیار کا حصول۔ تربیت کے ذریعے، فلسفے کے ذریعے، پیشہ وری کے ذریعے یہ "عام اور مکمل ترکیب اسلحہ جات" کے، اور کسی بھی صورت میں ترکیب اسلحہ جات کے، مخالف ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ باحیا، مخلص اور خدا ترس ہوتے ہوں، مگر ان کا پیشہ جنگ اور اسلحہ بندی ہوتا ہے۔ اپنے پیٹے اور تربیت کے باعث یہ لوگ مقررہ مفاد پر مجبور ہوئے بغیر نہیں روک سکے۔ کسی باضمیر معترض، یا رہنمائے امن سے حکومتیں مشورے نہیں کیا کرتیں کیوں نہیں؟

فوجی ماہرین کے علاوہ جو حکومتوں کو اسلحہ جات کے بارے میں مشورے دیتے ہیں، ان کے بھی کچھ مالی مفادات ہوتے ہیں، جیسے اسلحوں سے اور عسکری / صنعتی کاروبار سے، جو اسلحے کے بڑھتے ہوئے استعمال سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ صنعتی / عسکری گٹھ جوڑ کے لیے، اور بینکوں کے لیے جو صنعتی / عسکری کاروبار سے مالی فوائد حاصل کرتے ہیں اسلحے کی دوڑ ایک نعمت کے مترادف ہوتی ہے۔ دور دراز میں ہونے والی جنگ کا، جیسی کی جنوب مشرقی ایشیا میں یا مشرق وسطیٰ میں ہو رہی ہے، مطلب ہوتا ہے اسلحے کی بڑھتی ہوئی ترسیل اور صنعتی / عسکری کاروبار کے لیے نیا وہ منافع، اس کا غیر مقدم نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں امن کا ماحول اسلحہ ساز

صنعت کے لیے خوش آمد نہیں ہوتا۔ عام اور مکمل ترک اسلحہ جات ریاست ہائے متحدہ، فرانس، برطانیہ اور جرمنی اور دوسرے تمام ملکوں کے اسلحہ بنانے والے کارخانوں کے لیے تباہی کا پیغام ہوتا ہے۔

اشتراکی ملکوں میں منافع کے طالب صنعتی/عسکری اداروں کا وجود نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ترک اسلحہ جات سے پیدا ہونے والے حالات سے جلد معاملہ کر سکتے ہیں۔ عسکری/صنعتی کاروبار قومی ملکیت اور کنٹرول میں ہوتا ہے۔ ان کے لیے ترک اسلحہ جات کا مطلب ہوتا ہے اسلحہ کی برہمستی ہونی پیداوار سے، صارفین کے لیے اور بیرونی مندیوں کے لیے، از خود صنعتی ترقی کی پیداوار میں تبدیل ہو جانا۔ انھیں ترک اسلحہ جات سے نقصان نہیں، صرف فائدہ ہی ہو سکتا ہے۔ مغربی طاقتوں کے مقابلے میں ترک اسلحہ جات کے لیے سوویت یونین کی مخلصانہ رضامندی کی یہی وجہ رہی ہے۔

اشتراکی ممالک میں عسکری/صنعتی اداروں کے وابستہ مفادات ترک اسلحہ جات کو پسند کرتے ہیں، جب کہ مغربی دنیا کے صنعتی/عسکری ادارے اسلحہ بندی میں ہر قسم کے اضافے کے بہت طاقت ور طرف دار عناصر ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ اور مغربی یورپ کے عسکری/صنعتی اداروں کے منظم حمایتیوں کے رسوخ کو سرے سے نظر انداز کرنا بڑی حماقت ہوگی۔ نظر نہ آنے والی یہ طاقتیں خاموشی سے NATO اور بیشتر مغربی حکومتوں کی غلام گردیشوں میں ہمدردت مصروف کار رہتی ہیں۔ ان کے وسائل لامحدود اور رسوخ بڑے ہوتے ہیں۔ یہ عناصر مل کر وابستہ مفادات کا ایک بہت بڑا گڑھ بن جاتے ہیں جو بہت خاموشی سے عام اور مکمل ترک اسلحہ کے خلاف کام کرتا رہتا ہے۔

عسکری اور صنعتی وابستہ مفادات کے علاوہ سیاسی اور نظریاتی مضامینوں سے ابھرنے والے وابستہ مفادات بھی ہوتے ہیں اور وہ دوسرے میدانوں کی پالیسیوں اور نظریات کے عمل میں اسلحہ بندی کے حمایتی بن جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے ترک اسلحہ جات کی راہ میں روڑے اٹکانے والے ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ وہ کسی ایک طرف ہی کے اجارہ دار نہیں ہوتے۔

میں نے آپ کی توجہ ان عسکری، مالیاتی اور نظریاتی وابستہ مفادات کی طرف مبذول کرائی ہے جو عام اور مکمل ترک اسلحہ جات کی مخالفت کرتے ہیں، تاکہ میں ترک اسلحہ جات کے میدان میں غیر سرکاری اداروں اور رائے عامہ کے کردار پر زور دے سکوں۔

رائے عامہ ”ہم عوام۔۔۔“

پچھلے تیس برسوں میں آنے والے غیر معمولی مائٹھی انقلاب کے نتائج تھیں مخالفانہ اور خطرناک رہے ہیں، مثلاً جوہری بم۔ مگر یہ انقلاب اپنے ساتھ کچھ طریقے بھی لایا ہے جو ہمیں جوہری بموں اور تباہی کے دوسرے انجنوں سے محفوظ رہنے کے قائل بناتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ (ریڈیو اور ٹیلی ویژن) کی آمد کے ساتھ بڑے پیمانے پر لکھنے پڑھنے کی قابلیت اور تعلیم دنیا کی رائے عامہ پر شدت سے اثر انداز ہوئے ہیں، ماضی

میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ رائے عامہ کو اب حالات حاضرہ اور سیاست کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔ حکومتیں اپنے اعمال اور اپنی پالیسیوں کو اپنے عوام سے چھپا نہیں سکتیں۔ اب ایسا کوئی پردہ نہیں ہو سکتا جو خبروں اور تبصروں کے انتشار کو روک سکے۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سیاہی تبصرہ نگاران حکومت کی خفیہ سرگرمیوں کی کھوج کر سکتے ہیں اور رائے عامہ کو ان سے مطلع بھی کر سکتے ہیں۔ ایک بار مسائل کے بارے میں اطلاعات بہم ہو جائیں تو رائے عامہ بن بھی سکتی ہے اور اس کو سنا بھی جاسکتا ہے۔

یہ ایک نئی ایجاد ہے جو ذرائع ابلاغ کے ذریعے طاقت کے مرکزِ ثقل میں تبدیلی کی رہنمائی کرتی ہے؛ حکومت سے عوام کی طرف۔ یہ ایک نئے قسم کی ترقی ہے جس نے ویت نام کی جنگ کے دوران ظہور کیا تھا۔ یہ امریکی اور عالمی رائے عامہ تھی جس نے ریاست ہائے متحدہ کو ویت نام سے واپسی پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جنگ میں مصروف ایک ملک کے بچیوں کو اس کی اپنی اور عالمی رائے عامہ نے، اپنی لکھنوں ہی میں روک دیا تھا۔ اس سے قبل دورانِ جنگ سر حکومت کو غلط ہوا صحیح، اپنے عوام کی پوری تائید حاصل ہوتی تھی۔ اب چوں کہ عوام خود دیکھ سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ ان کی حکومت کیا کر رہی ہے، وہ حکومت کو دبا سکتے ہیں۔ ویسا ہی اب انسانی حقوق اور فائٹ ورائن آزادی کے حق کے سلسلے میں سوویت یونین میں ہو رہا ہے۔

یہ ایک نئی اور خوش آمد تہذیبی ہے جس کو ابھی تک نہ حکومتیں خود اور نہ غیر حکومتی علاقے والے پوری طرح سمجھ سکے ہیں۔ یہ تبدیلی پریس اور عوامی ذرائع ابلاغ کو غیر معمولی طاقت فراہم کرے گی۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیاری سے اس بات پر نظر رکھنی ہوگی کہ پریس اور دیگر ذرائع ابلاغ حکومتوں اور مالی مفادات رکھنے والوں کے قبضے میں نہ چلے جائیں۔ غیر سرکاری علاقے والوں کو اس نئی طاقت کو تعمیری انداز میں استعمال کرنا ہوگا۔ کسی اور میدان میں یہ اتنا ضروری نہیں ہوتا، اور اب سے پہلے کبھی یہ اتنا ضروری بھی نہیں تھا کہ عوامی رائے عامہ کو موجودہ جنگ اور امن کے خطرات سے آگاہ رکھا جائے۔

میں کیوں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اب بہت اہم ہوگئی ہے؟ اس کا جواب بالکل مرادہ سا ہے۔ اسلحہ بندی اتنی تیزی سے بڑھی ہے اور اسلحہ اتنا مہنگا ہوا ہے کہ کسی وقت بھی کوئی سپہ سالار اپنی حکومت کو متنبہ کر سکتا ہے کہ ”اس وقت ہماری اسلحہ جاتی برتری ہے، مگر چھ مہینوں بعد یہ باقی نہیں رہے گی؛ اس لیے یہی وقت ہے جب کہ لگانے کا۔“ اس سے مطلب نہیں کہ یہ مشورہ دینے والا جبرل کتنا غلط ہو سکتا ہے؛ یہ مشورے کی کیفیت ہوتی ہے جو حکومتوں پر اثر انداز ہوتی ہے، جو ایک بحران کو بھڑکتی ہوئی جنگ میں تبدیل کر سکتی ہے۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر یہ کہنے کا وقت آگیا ہے کہ ”ہم عوام.....“ جن کا اقوام متحدہ کے فرمان میں حوالہ ہے، مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام جوہری ہتھیار غیر قانونی قرار دیے جائیں اور تمام اسلحہ جات مکمل طور پر ترک کیے جائیں۔ یہ اشد ضروری ہے کہ دنیا کے عوام کو اپنی بقا کے معاملات میں یوں لائے کا حق ہو۔ غیر سرکاری علاقے والے بھی ویسے ہی سہارا دیتے ہیں جیسے کہ ”مابین“، یا وہ، اسلحہ بندی اور جنگ میں جن کا مفاد ہوتا ہے۔

یہ بڑے فرڈ میں ہونے والی International Conference of the International Peace Bureau نے اقوام متحدہ کی عالمی کانفرنس برائے ترک اسلحہ جات میں "We the people..." کا مطالبہ پیش کرنے کی تیاری کر لی ہے جس میں غیر سرکاری سیکٹر سے کم از کم تین نمائندے ہوں گے۔ International Peace Bureau Conference نے بالکل صحیح کہا ہے:

ضروری ہے کہ اگر کانفرنس کامیاب ہو تو (اقوام متحدہ کے) فرمان کی روح کو مؤثر کیا جائے تاکہ "ہم عوام..." کی آواز سنی جاسکے۔ اقوام متحدہ میں براہ راست جمہوری نمائندگی کی غیر موجودگی میں، یہ سب اُن غیر سرکاری اداروں کے ذریعے کیا جائے جو عام اور مکمل ترک اسلحہ جات کے امور میں دخل رکھتے ہیں۔ دوسری صورت میں عالمی ترک اسلحہ جات کانفرنس اُن اہم سرکاری، عسکری اور صنعتی اداروں میں اپنی نمائندگی کرے گی جن کے مفادات اسلحہ بندی میں اضافے کے جاری رہنے سے وابستہ ہیں۔ دراصل یہ حکومتیں اور صنعتی/عسکری ادارے ہی ہیں جو آپ بیک ترک اسلحہ جات کے مقاصد حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ اور وہی اسلحہ بندی میں اضافے کی دوڑ اور عسکری اداروں کے قیام کے بھی ذمے دار ہیں۔

جب تک یہ سب نہیں کیا جاتا اور حکومتوں کو عام اور مکمل ترک اسلحہ جات کی اہمیت کے کھلے دل سے مطالعے کی طرف راغب نہیں کیا جاتا، مجوزہ کانفرنس کسی کام کی نہیں ہوگی۔

عورتوں کا مخصوص کردار

جس طرح ترک اسلحہ جات سے متعلق سوالات عسکری ماہرین کے لیے اور اُن کے لیے چھوڑ دیے جاتے ہیں جن کے اسلحہ بندی سے وابستہ مفادات ہوتے ہیں، عام طور پر اِس موضوع کے سوالات کے جوابات کو بھی عورتوں ہی کا استحقاق گردان کر ان کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سوائے "آلوا میرڈال" (Alva Myrdal) کے باعزت استثناء کے عورتوں کو اسی طرح ترک اسلحہ جات سے مستثنیٰ رکھا جاتا ہے جیسے دوسرے اہم سرکاری عہدوں سے۔ اس کے باوجود، کہ وہ ان کے بچے ہی ہوں گے جنگ جن کے گھروں کو تاراج کرے گی۔ میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہے کہ عورتوں میں امن کے امور کی نیا وہ اچھی سمجھ ہوتی ہے اور وہ آسانی سے ماہرین اور سفارت کاروں کے نمائندگی دلائل سے "مرعوب" نہیں ہوتیں۔ ان کو ترک اسلحہ جات کے تمام مذاکرات اور کانفرنسوں میں حتمی طور پر فیصلہ کن کردار دیا جانا چاہیے۔ یقیناً، امن اور جنگ دونوں، اتنے ہی عورتوں کے بھی مسائل ہیں جتنے کہ مردوں کے، بلکہ شاید کچھ نیا وہی۔

امن اور انسانی حقوق دونوں آپس میں ہم رشتہ ہیں

امن اور انسانی حقوق کے درمیان بنیادی رشتوں کی صحیح معنوں میں اب شناخت ہوئی ہے۔ اُن دُعا نچوں کی، جو لوگوں کو انسانی حقوق، انصاف اور انصاف سے محروم رکھتے ہیں، اب شناخت ہو رہی ہے اور

وہ نظام جو لوگوں کو فاقہ کشی یا غیر انسانی حالات کے غاروں میں ڈھکیل دیتے ہیں، انسانی حقوق اور انسانی وقار دونوں سے انکار کے مترادف ہیں۔ یہی وہ حالات ہیں جو لوگوں کو زبردستی کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اسی لیے عالمی اعلان برائے انسانی حقوق میں مشہور کیا گیا ہے کہ: "ضروری ہے کہ اگر، آخری حربے کے طور پر، انسان کے لیے کوئی اور راستہ نہیں، سوائے غلیم اور جبر کے خلاف بغاوت کے، تو انسانی حقوق کا قانون کے ذریعے بچاؤ کیا جانا چاہیے۔"

اس اعتراف نے کہ انسانی حقوق کی پامانی بھی جنگ کی وجوہ میں سے ہے، 10 دسمبر 1948 کو قوموں نے عالمی اعلان برائے انسانی حقوق کو جاری کرنا منظور کیا۔ یہ وہ تاریخی دستاویز تھی بھی، اور اب بھی ہے، جس کو تاریخ میں پہلی بار بنی نوع انسان نے اختیار کیا تھا۔ اس کو تمام اسکولوں میں نصاب کے طور پر پڑھایا جانا چاہیے، تمام پارلیمانوں میں اس کی نمائش ہونی چاہیے، اس کو کھیساوں میں بھی متن کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔

میگنا کارا (انگلستان 1215)، امریکا کا اعلان آزادی (1776)، فرانس کا 1789 کا La Déclaration des Droits de l'Homme کارل مارکس کی کتاب Das Kapital وغیرہ سب بہت اہم دستاویز تھیں مگر علاقے اور حدود کے بارے میں محدود تھیں۔ 1948 کا عالمی اعلان عالمی بھی ہے اور مکمل بھی۔ میں عالمی اعلان کی اہمیت پر مزید زور نہیں دے سکتا۔ بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہ انسان اور ریاست کے مابین رشتوں کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ دنیا کے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کو ہمارے عہد کی تنزلی کی بہتری کے لیے، جس نے اخلاقیات کے معیار مسمار کر دیے ہیں، اسے استعمال کرنا چاہیے۔

پھر بھی، کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس کے نفاذ کے لیے کتنا کم کام کیا گیا ہے۔ اس کے نفاذ کے دو تحریری عہد نامے، جن کی تیاری میں پندرہ برس سے زیادہ صرف ہوئے تھے ابھی تک عمل میں نہیں آئے ہیں۔ ان کو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا تھا مگر ان کا نفاذ اسی وقت ممکن ہوگا جب 35 ممالک اس کی توثیق کریں۔ ان دونوں کی موجودہ صورت حال مندرجہ ذیل ہے:

بین الاقوامی عہد نامہ برائے اقتصادی، سماجی اور تہذیبی حقوق، مجوزہ 1966

(16 دسمبر 1966 کو منظور کیا گیا)

دسمبر 1974 تک اس عہد نامے پر:

- 51 ممالک نے دستخط کیے تھے

- 29 ممالک نے اس کی توثیق کی یا منظوری دی

- 35 ممالک کی منظوری ضروری تھی، اس پر عمل درآمد شروع کرنے کے لیے۔

بین الاقوامی عہد نامہ برائے شہری اور سیاسی حقوق، مجوزہ 1966

(16 دسمبر 1966 کو منظور کیا گیا)

دسمبر 1974 تک اس عہدے پر:

- 50 ممالک نے دستخط کیے

- 28 ممالک نے اس کی توثیق کی یا منظوری دی

- 35 ممالک کی منظوری ضروری تھی، اس پر عمل درآمد شروع کرنے کے لیے

ان دو عہدناموں کے علاوہ انسانی حقوق کے اور بھی کنونشن ہیں جن کی توثیق اور جن پر عمل درآمد ہونا تھا۔ مگر اس سے نیا وہ ضرورت ہے مقامی اور بین الاقوامی سطح پر ان کی موثر تعمیل کی۔ میں مشورہ دیتا چاہوں گا کہ یونیورسٹیوں اور نوجوان نسل کے اداروں کو سرگرمی سے ان سوالات پر ارتکاز کرنا چاہیے تاکہ ان کی آوازوں پر دھیان دیا جائے۔ سمجھوتہ ہونی نسل کو اپنی حکومتوں سے مطالبہ کرنے کا حق ہے کہ وہ ان اصولوں کی تعمیل کریں جن کو وہ اپنے سمجھ کر دعوے کرتی ہیں اور جو اس اعلان میں شامل ہیں۔ ہر ملک میں ان مسائل کے لیے ایک سرگرم عوامی مہم شروع ہونی چاہیے۔

دنیا کے انتظام اور امن کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ مختلف حصوں میں بڑے پیمانے پر انسانی حقوق سے روگردانی کا سلسلہ جاری ہے۔ ملکوں ملکوں سیاسی قیدیوں پر تشدد اور ان کے قتل عام کا سلسلہ ایک متحدی سرطان کی طرح سرایت کرتا جا رہا ہے۔ Reports of Amnesty International ایک اثنا ریہ پیش کرتی ہیں، اس موذی مرض کے درجے اور اس کے فروغ کی تفصیلات کا جن کو تنہائی سے چیلنج نہیں کیا جاتا۔ فریقا کے جنوبی خطے میں نسلی امتیاز کا عائد کیا جانا اور فریقا کے عوام سے غلاموں جیسا سلوک کا رواج رکھنا اقوام متحدہ کے اصولوں کی توہین ہے۔ اسی طرح، جنوبی فریقا کا ٹیمبیا پر غیر قانونی قبضے سے دست برداری کا صاف انکار اور ٹیمبیا کے سیاسی قیدیوں پر کورے برسا اسیا عمل ہے جس کے خلاف حکومتوں کو قدم اٹھانے چاہئیں۔

عالمی اعلان برائے انسانی حقوق میں اسی سلسلے کے ایک اور حق کا بھی اضافہ کیا جانا چاہیے۔ وہ ہے ”قتل کے حکم سے انکار کرنے کا حق“۔ عالمی کانفرنس برائے مذہب اور امن (منعقدہ 1971) اور سوئٹزرلینڈ کے شہر باون میں منعقدہ کانفرنس ”مشاورت برائے کھیمیا“ (1970) دونوں میں بہت واضح نتائج کو شامل کیا گیا تھا: ”ہم سمجھتے ہیں کہ باضمیر انصاف کا استعمال انسانی وقار کا حصہ ہوتا ہے اور اس طرح ہر فرد کو اپنے ضمیر یا کبرے عقیدے کی بنا پر فوجی خدمت یا مسلح تنازعات میں براہ راست یا بالواسطہ شرکت سے انکار کے حق کا یقین ہونا چاہیے۔ ضمیر کی بنا پر اعتراض کا حق ان کے لیے بھی ہوتا ہے جو کسی مخصوص جنگ میں شرکت کے لیے راضی نہیں ہوتے، اس لیے کہ ان کے نزدیک ایسی جنگ میں شرکت جائز نہیں جس میں بڑے پیمانے پر تباہ کرنے والے ہتھیار استعمال کیے جانے والے ہوں۔ یہ کانفرنس اس بات کا بھی اقرار کرتی ہے کہ فوج کے ارکان کو بھی حق ہے، بلکہ ان کا فرض ہے، کہ وہ ایسے فوجی احکام ماننے سے انکار کر دیں جن میں جرم سرزد ہو یا

جنگی جرم ہوں یا ان میں انسانیت کے خلاف جرم کیا جا رہا ہو۔“

میں نے ان مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جو ان نتائج سے پیدا ہوتے ہیں اس لیے کہ یہ بالخصوص آج کی دنیا سے متعلق ہیں۔ کسی ایک فرد کا قتل کر دینے یا تشدد کرنے، یا انسانیت کی جوہر کی تباہی کی تیاری میں شرکت سے انکار میرے نزدیک بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

اقوام متحدہ کا کردار

اقوام متحدہ پر تنقید کرنا آسان ہے مگر تنقید کرتے وقت اس کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اس کا انحصار زمین ریاستوں پر ہے اور یہ بھی کی اس کے دفاتر اتنی ہی دور تک جاسکتے ہیں جتنی کہ ریاستیں اجازت دیں گی۔ میں اقوام متحدہ کے کردار کے بارے میں رائے عامہ کی اہمیت پر زور دیتا چاہوں گا۔ رائے عامہ جس قدر اقوام متحدہ کے کام میں لچکسی لے گی حکومتیں اسی حد تک آگے بڑھنے پر تیار ہوں گی۔ پھر بھی، بد قسمتی سے اقوام متحدہ میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ رائے عامہ تک نہیں پہنچ پاتا اس لیے اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ یہ کارآمد ہوگا اگر حکومتیں اور پارلیمان خود اقوام متحدہ کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ اس میدان میں World Federation of United Nations Associations ایک کارآمد کردار ادا کرتی ہے مگر اس کو اقوام متحدہ اور حکومتوں سے براہ راست زیادہ امداد ملنی چاہیے تاکہ وہ اپنے کام کو بڑھانے کی اہل ہو سکے۔

کچھ ایسے کام ہیں جو اقوام متحدہ کو زیادہ موثر بنانے کے لیے مفید طریقے سے کیے جاسکتے ہیں:

(الف) مصالحتی آلوں کی فراہمی، جو ابتدائی مباحث اور مصالحت کا آغاز کرتی ہیں جہاں بھی مستقبل میں کسی تنازعے کے پیدا ہونے کا امکان ہو۔

(ب) مصالحتی نظام، جو کسی تنازعے کے وجود کے دوران کام کرتا ہے

(ج) اقوام متحدہ کا نظام جو مسلح تنازعات کے دوران انسان دوست قوانین میں خلل اندازی کے بارے میں شکایات کی وصولی کو اور ان کی تفتیش کو ممکن بنائے۔

(د) میکریری جبرل کو مکمل اختیار دیا جائے کہ تنازعہ حقیقت کا مشن سمجھنے کا، کسی بھی معاملے میں جس میں انسانی حقوق میں خلل اندازی کا امکان ہو، بالخصوص جس میں قیدیوں پر الزم کی جارہی ہو۔

(ه) بین الاقوامی عدالت انصاف کے لیے لازمی حلقہ اختیارات اور مشاورتی رائے ظاہر کرنے کے لیے ایک وسیع حلقہ اختیارات۔

یہ بہت زیادہ دور رس اصلاحات نہیں ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ کافی قابل قدر بات ہوں گے۔ اس سے زیادہ بنیادی تبدیلیاں، جن میں حکمرانی سے جزوی دست برداری کے امکانات شامل ہیں، بالخصوص جب عام

رضا کار اداروں کی اہمیت

اعلیٰ تعلیمی صلاحیتوں اور بڑے ذرائعِ ابلاغ کی وجہ سے رائے عامہ اب اس قائل ہو گئی ہے کہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ واقعات پر اثر انداز ہو سکے۔ حالیہ برسوں میں غیر سرکاری ادارے بڑھتے ہوئے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ حقیقتاً اب صرف اُن ہی کی آزاد گواہییں ہیں جو پریس اور ذرائعِ ابلاغ کے ذریعے رائے عامہ کو ہوشیار کرتی ہیں۔ International Commission of Jurists اور International Association of Democratic Lawyers نے انسانی حقوق اور قانون کی حکمرانی کو ایک دوسرے سے منسلک کرنے کے عمل میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ Amnesty International نامی ادارہ بڑی کامیابی سے قیدیوں پر کیے جانے والے تشدد کی طرف توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ان تینوں اداروں نے انسانی حقوق کو پامال کرنے والوں کو عدالتوں میں کھسیٹ کر انسانِ وحشی کی بہت خدمت کی ہے۔ نسلی امتیاز کے میدان میں کھیساکشی عالمی کاؤنسل اور Anti-Apartheid Association نے مل کر قابلِ قدر خدمات کی ہیں۔ ترکِ اطہر جات کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اداروں نے مل کر قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں:

The Society of Friends

The Women's International League for Peace and Freedom

The International Peace Bureau,

[The] International Confederation for Disarmament and Peace and the World Peace Council

Soviet Peace Council

World Congress of Peace Forces

میرے خیال میں رضا کار اداروں کا کردار زیادہ سے زیادہ اہم ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وہ ادارے ہیں جو ضروری آزادی اور آغازِ کار کے ذریعے ہماری دنیا میں عقیدے کی بحالی اور مثالیت کو رائج کریں گے۔ یہ سب زیادہ سے زیادہ مدد اور ہمتِ انسانی کے حق دار ہیں۔

اگر ترکِ اطہر جات میں کوئی کامیابی ہوئی تو غیر سرکاری اداروں کے اُن تھک اور بے غرض کام کی وجہ سے ہی ہوگی۔ الثریخ ٹوئٹل نے اپنے زمانے میں اسی کی زیادہ قدر دانی کی تھی۔ اب یہ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ بڑی طاقتیں اطہر بندی کے خطرناک راستے پر آگے بڑھ رہی ہیں۔ ”گم نامی“ کا سنگِ میل بالکل ہمارے سامنے آچکا ہے۔ کیا اس راستے پر بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا جاسکتا ہے؟ جی ہاں! اگر رائے عامہ اپنی طاقت کو استعمال کرے جو اب اس کے پاس موجود ہے۔

خطبہ — ایسا کوسا تو

جوہری عہد میں امن کی تلاش اور جاپان

عزت مآب، خواتین و حضرات!

ایسے ممتاز اجتماع میں، روایات سے بھرپور نوٹیل امن انعام کے حصول کا غیر معمولی افتخار جس کو سرکاری دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، درحقیقت، میری زندگی کے ناقابل فراموش لمحات میں سے تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا انوکھا اعزاز تنہا مجھ کو ہی نہیں بخشا گیا ہے، جاپان کے عوام بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ دوہری عالمی جنگ کے بعد کے برسوں میں جاپانی عوام نے امن کی تحفظ اور فروغ کے لیے بڑی کوششیں کی ہیں۔ اس طرح انہوں نے انسانیت کی ترقی اور خوش حالی میں حصہ لیا ہے۔ لہذا، جاپان کے عوام کی طرف سے میں بڑے احترام سے مارویائی پارلیمان کی نوٹیل کمیٹی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے ہم کو یہ اعزاز عطا کیا ہے۔ میں جاپان کے ایک باشندے کی حیثیت میں بڑے افتخار اور انفرادی انکسار کے ساتھ اس انعام کو قبول کر رہا ہوں۔

میں سان فرانسسکو کے میثاقی امن کے بعد 22 برسوں کے ایک تہائی عرصے میں جاپان کا وزیر اعظم رہا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا یہ بہت مناسب موقع ہے کہ ہم جاپان کے عوام کی جانب سے امن کے انتخاب پر اور ان کی کوششوں پر نظر ڈالیں جن کی بنا پر انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔

اگر امن کا حصول ہی تمام مدبروں کا انتہائی مقصد ہوتا ہے تو، یہ تو ایک بہت معمولی سی شے ہوتی جو ہر فرد کی روزمرہ کی زندگی میں اس سے منسلک ہوتی ہے۔ اس بات کو اگر مانوس الفاظ میں کہا جائے تو، یہ ایک کیفیت ہوتی ہے جو ہر فرد اور اس کے خاندان کو اجازت دیتی ہے، کہ وہ بلا کسی خوف کے، اپنی زندگی کے مقصد کے حصول میں کوشاں رہیں۔ یہ صرف ان ہی حالات میں ممکن ہوتا ہے جب ہر فرد، انسانیت کے مستقبل سے مایوس ہوئے بغیر، اپنے آپ کو وقف کر دے، اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے، اس کوشش کے لیے کہ وہ انسانیت کی تاریخ میں اپنی تخلیقی اور تعمیری کامیابیوں، فنون، تہذیب، مذہب اور دوہری مصروفیتوں کے نقوش چھوڑ جائے۔ یہ ہے وہ امن جو ضروری ہوتا ہے تمام افراد، عوام، قوموں کے لیے، اور اس طرح تمام انسانیت کے لیے۔

اگرچہ سترھویں صدی کی ابتدا سے اٹھائی صدی کے عرصے میں دنیا کے دوسرے علاقوں کی متعدد پریشانیوں نے زندگی کو بگاڑ رکھا تھا، جاپان ایک تنہائی کی کیفیت میں پڑ سکون زندگی گزار رہا تھا، اس طرح کہ نہ اس کو کسی سے خطرہ تھا، نہ کسی اور کو اس سے خطرہ تھا۔ پھر یوں ہوا کہ انیسویں صدی کے وسط میں جاپان کو ایشیا میں یورپی طاقتوں کی برہمنی ہوئی موجودگی کا سامنا ہوا، اس نے اپنی تنہائی کی پالیسی کو پرے رکھا، باہر کی

دنیا کے لیے اپنے تمام دروازے کھول دیے اور 1868 کے جاپانی انقلاب ترتیب نو (Meiji Restoration) کے ذریعے ملک کو ایک جدید ریاست بنانے کے پروگرام پر گامزن ہو گیا۔

بعد میں جاپان کے عوام کو مختلف نوعیت کی گردشوں کا تجربہ ہوا، جاپان بین الاقوامی تنازعات میں مکتوث ہوا، اور نیچے کے طور پر اسے تاریخ میں پہلی بار دوسری عالمی جنگ کے دوران اپنی زمین پر بھیانک ترین جدید حربی جنگ و جدل کا تجربہ ہوا۔ جاپان دنیا کا واحد ملک ہے جسے جوہری بمباری کی تباہ کاریوں کے دکھ چھیلنے پڑے تھے۔ اس تجربے نے جاپانیوں کے دلوں پر ان مہلک نتائج چھوڑے، جن کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے برصغیر کی جنگ سے دست بردار ہو گئے ہیں۔

1945 کی شکست سے حاصل ہونے والے تلخ سبق نے ان کو کبھی نہ چھٹنے والے عزم کے ساتھ امن کی تلاش میں سرگرمیاں کر دیا، اور ہمارے عوام نے اپنے پرانے آئین میں تبدیلیاں کر دیں۔ نیا آئین ایک طرف انسانی حقوق کے تحفظ کی بنیاد پر استوار ہے تو دوسری طرف جنگ سے لاطعلقیت پر۔ جاپان کا آئین دفعہ 9 میں مندرجہ ذیل قرار کرتا ہے:

”انصاف اور توازن کی بنیاد پر بین الاقوامی امن کی سنجیدگی سے آرزو کرتے ہوئے جاپان کے عوام، اپنے قومی حق حکمرانی کی بنا پر، ہمیشہ کے لیے جنگ کو اور بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لیے طاقت کے استعمال کرنے کی دھمکیوں کو مسترد کرتے ہیں۔“

بین الاقوامی تنازعات کے حل میں طاقت کے استعمال کو مسترد کرنے کا ایسا اعلان مذاقی بحیرہ، (Kellogg-Briand) کا فلسفہ جس کی بنیاد تھا، جاپانیوں کے علاوہ دوسرے عوام نے بھی کیا ہے۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ جاپان جیسی بڑی طاقت کو قومی اتفاق کے ساتھ اس سمت کوشش کرتے رہنا، اور مستقبل میں بھی اس قسم کے رویے پر قائم رہنا چاہیے تھا۔

شکست کے بعد کے عرصے کی الجھن کے باعث پچھلے تیس برسوں میں جاپان بہت تہذیبی ہو گیا ہے۔ قوم کی دوبارہ تعمیر، اس کی اپنی فرماں روا آزادی کے حصول کے ساتھ اقتصادی اور سماجی ترقی، سترھویں صدی کے چھٹے عشرے کی سائنسی اور تکنیکی نشوونما۔ اس دوران ہمارے عوام نے کچھ اہم انتخاب بھی کیے۔

ان میں سے پہلا انتخاب تھا جوہری ہتھیار سے لیس نہ ہونے پر از خود اتفاق۔ یہ امر اکثر واضح کیا گیا ہے کہ اقتصادی سرگرمیوں کے بڑھنے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بڑی ترقی ہونے کے باعث جاپان میں جوہری ہتھیار بنانے کی استطاعت ہو گئی ہے۔ لیکن، استطاعت ہونے کے باوجود، یا شاید اسی وجہ سے، جاپان کے عوام نے خود اپنے طور پر حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ جوہری ہتھیار سے لیس نہیں ہوگا۔ جاپانی حکومت کی بھی یہی پالیسی ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بات کا دوبارہ اعلان کرنا چاہتا ہوں، اور اہم کرتا ہوں کہ میرے ممتاز سننے والے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیں۔

یہ بالکل فطری امر ہے کہ تمام اقتدار ہاتھ میں رکھنے والے کسی مدبر کے سامنے ملکی سلامتی کا سوال ہمیشہ سب سے اہم ہوگا۔

حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی، اقوام متحدہ کے کردار کی اہمیت کے احساس کے ساتھ، اقوام متحدہ کے منشور کی بنیاد پر میں نے ایک پالیسی وضع کی تھی کہ موجودہ بین الاقوامی حالات میں میرے ملک کے تحفظ کو برقرار رکھا جائے گا۔ ان حالات کی روشنی میں، جس میں میرا ملک تھا، اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ Japan-US Mutual Security and Cooperation Treaty پر عمل کیا جائے گا۔ یہ ميثاق کسی بھی ملک کے خلاف نہیں ہے، بلکہ یہ تو امن کے قیام کی بنیادی شرائط کو مستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی اصل مطلب ہے اس ميثاق کا۔

ہم ۱۹۵۰ء میں دسویں صدی کے آخری حصے میں، اور جوہری عہد میں رہ رہے ہیں۔ میں نے جاپانی پارلیمان (National Diet of Japan) میں 1968 میں کی جانے والی اپنی پالیسی تقریر میں اس امر کے بارے میں اشارے کیے تھے کہ تمام ملکوں کو جو مشترکہ مسئلہ درپیش ہے وہ یہ سوال ہے کہ ہم اس جوہری عہد سے بچ کر کیسے نکلیں۔

میں نے بہت غور و خوض کے بعد جاپان کی پالیسی کے مطابق کہ یہ ملک جوہری ہتھیار نہیں رکھے گا، تین غیر جوہری اصول طے کیے تھے۔ یہ پالیسی بیان کرتی ہے کہ ہم جوہری ہتھیار نہیں بنائیں گے، کہ یہ ہماری ملکیت نہیں ہوں گے اور یہ بھی ہم ان کو اپنے ملک میں لائیں گے بھی نہیں۔ بعد میں ہماری 'ڈائمٹ' نے اس کی دوبارہ توثیق بھی کر دی تھی۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مستقبل کی تمام حکومتیں اس پالیسی پر عمل کریں گی۔

میرے ہی دور اقتدار میں جاپان کی حکومت نے جوہری عدم پھیلاؤ کے ميثاق کے نتائج سے اتفاق کرتے ہوئے عوام کی دیرینہ خواہشات کے مطابق اس پر دستخط بھی کر دیے تھے۔ آئین کی شرائط کے مطابق، قبل اس کے کہ توثیق کا عمل مکمل کیا جائے، 'ڈائمٹ' کی منظوری ضروری ہوتی ہے، میری خواہش ہے کہ بغیر کسی تاخیر کے یہ تمام کارروائیاں مکمل ہو جائیں۔

جنگ و جدل کے لیے تھر مونیکہ سیر تو مافی کے استعمال میں خوف ناک تباہی کا امکان ہوتا ہے۔ وراثی جوہری ہتھیاروں کا پھیلاؤ یعنی نوع انسان کی بقا کے امکانات کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ ترکیب جوہری اسلحہ جات اب از حد ضروری ہو چکا ہے۔ لہذا یہ خوش آئند بات ہے کہ ریاست ہائے متحدہ اور سوویت یونین کے درمیان Strategic Arms Limitation Talks میں اچھی پیش رفت ہوئی ہے۔

اس کے باوجود بھی یہ پیش رفت صرف مسئلے کو موجودہ درجے پر ٹھہر کر دینے کے مترادف ہے۔ ہمارے عوام سنجیدگی سے امید کرتے ہیں کہ دنیا جلد وہ دن دیکھے جب تمام جوہری ہتھیار ختم کر دیے جائیں گے۔ اگر مجھے اس کو زیادہ حقیقت پرندانہ طریقے سے، یا زیادہ سادگی سے پیش کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں

گا کہ جوہری طاقتوں کی جن میں ریاست ہائے متحدہ اور سوویت یونین سب سے آگے ہوں، کم از کم اپنے معیاری اور مقدار کی جوہری ہتھیاروں کو منجمد کر دینا چاہیے، اور ان میں درجہ بدرجہ کمی اور ان پر کنٹرول کے زیادہ موثر طریقے کو سنجیدگی سے تلاش کرنا چاہیے۔

میں اس سیاق و سباق میں ان پانچ قوموں پر جو اس وقت جوہری ہتھیاروں سے لیس ہیں، یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ دنیا میں امن کے قیام کے لیے ان پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جاپانی عوام نہایت سنجیدگی سے امید کرتے ہیں کہ جوہری طاقتیں تعمیری کوششیں کریں گی تاکہ جوہری ہتھیاروں میں عہدہ ساز کمی اور کنٹرول ہو۔

{2}

میں اپنے دو حکومت کی دوسری کامیابی جاپان کو ’اوگا ساوارا‘ اور ’اوکیٹاوا‘ جزائر کی واپسی کو گردانتا ہوں۔

دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر جو بین الاقوامی نظام نافذ ہوا، اس سے بدتر بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اس نظام میں کچھ ایسے بھی عناصر تھے جو اپنے اندرون مابینداری کے بیج لائے تھے۔ تقسیم ہو جانے والے ملک اس حالت کی بڑی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ مزید یہ حقیقت کہ دنیا کے منقسم ممالک کی اکثریت کا ایشیا میں ہونا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اس براعظم میں کس نوعیت کا عالمی تناؤ یک جا ہو گیا ہوگا۔

1951 میں سان فرانسسکو میں جاپانی معاشی امن پر دستخط ہوئے اور ہمارے ملک کے جزو لاینفک ’اوکیٹاوا‘ اور ’اوگا ساوارا‘ جزیروں کو ریاست ہائے متحدہ کے زیر انتظام دے دیا گیا اور بقیہ حق حکمرانی جاپان کے پاس ہی رہا۔ شکست کی حقیقت کی وجہ سے ہمارے ملک کو اس انتظام پر رضامند ہونا پڑا تھا۔

مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ، دنیا رفتہ رفتہ استحکام اور خوش حالی کی طرف بڑھی، جب کہ ہمارے ملک نے دوبارہ کافی اقتصادی اور سفارتی طاقت حاصل کر لی تاکہ وہ قوموں کی کمیونٹی کی فضا میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ اور ان ترقیات کے ساتھ، ان خواہشات پر، جن کا میں نے ذکر کیا ہے اور جو ہمارے قومی شعور میں گھر کر چکی ہیں، نئے سرے سے غور کیا جائے۔

واضح طور پر، ایک ملین جاپانیوں کے لیے یہ ایک نامناسب صورت حال تھی کہ لڑائی کے ختم ہونے کے تیس برس بعد بھی وہ غیر ملکی تسلط میں رہیں۔ ہمارے عوام میں ’اوکیٹاوا‘ کی واپسی ایک وسیع قومی اتفاق رائے کی خواہش بن کر ابھری۔

اس وقت تک ’اوکیٹاوا‘ کو سرد جنگ کے ڈھانچے میں ایک اہم جنگی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ بحر بھی، میں نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالتے ہی اپنے اس عہد کا اعلان کر دیا کہ ”جب تک ’اوکیٹاوا‘ کو واپس کیا نہیں جائے گا، جاپان مابعد جنگ کے عرصے سے مکمل طور پر باہر نہیں نکلتے گا۔“ میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ’اوکیٹاوا‘ کو

ایسے نامناسب حال میں چھوڑنے سے ایشیا میں زیادہ تناؤ بڑھے گا، اس لیے کہ اس مجمع الجزائر کی بہت اہم حیثیت تھی، اور اس لیے بھی کہ اوکیناوا کی واپسی بحرالکاہل کے مغربی علاقے میں استحکام کا باعث ہوگی۔

اب میں قائل ہو چکا تھا کہ جاپان اور ریاست ہائے متحدہ جیسے ملکوں کے درمیان، جن میں جمہوریت بھی ہے اور بلند معیار زندگی بھی، مختلف مفادات کے پیش نظر، کسی اور طرح نہیں، صرف پُر امن مذاکرات کے ذریعے ہی کمر آؤ سے بچنا مشکل ہوگا۔ حقیقت تو یہی ہے کہ اوکیناوا کی واپسی پر ہونے والے مذاکرات بہت بڑا چیلنج تھے۔ خوش قسمتی سے، مسودہ تیار کرنے والوں کی دانش اور پیش بینی نے، سان فرانسسکو میں قیام امن کی دفعہ ۳ کے ذریعے ہمارے لیے ترتیب نو کا ایک راستہ چھوڑ دیا تھا۔

مشترکہ اور باہمی دوستی کی روشنی میں اور جاپان / امریکا تعلقات کے استحکام کی بنیاد پر، ایشیا میں تناؤ کم کرنے کی خاطر، اور عالمی امن کے حصول کے لیے میں نے ریاست ہائے متحدہ سے اُس وقت کے حالات میں پُر امن تبدیلی کی صورت میں اوکیناوا کی واپسی کی خواہش کی تھی۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مذاکرات آسان تھے۔ پھر بھی ایک دوست ملک کی حیثیت میں ریاست ہائے متحدہ نے جاپان کی خواہش کو رضامندی کے جذبات کے ساتھ سنا۔ بالآخر سفارتی مذاکرات کے ذریعے دنیا کی تاریخ نے ایک غیر معمولی واقعہ رونما ہوتے دیکھا۔

اس سیاسی حل کے نتیجے میں، جاپان کے اطراف شرقی ایشیائی منطقے میں امن اور استحکام کو تقویت ملی۔ مزید برآں، امریکا اور جاپان کے درمیان کے دوستانہ رشتے جو امن اور استحکام کی کلید تھیں، مزید مستحکم بنیادوں پر رکھ دیے گئے۔ کوپا، ایک مزید صورت حال تخلیق کی گئی، جو چین کے ساتھ تناؤ میں بتدریج کمی کی بنیاد بنی۔

میرا یقین ہے کہ اوکیناوا کی واپسی علی الاطلاق کیفیت میں ایک پُر امن ترمیم کی مثال بنی ہے جس نے ایشیا میں تناؤ میں کمی اور بحرالکاہل کے مغربی علاقے میں استحکام پیدا کیا۔

(3)

میں نے جاپان کے خارجہ رشتوں کے میدان میں ہمیشہ تمام ملکوں سے دوستانہ تعلقات کی، بلکہ ان میں بہتری کی بھی کوشش کی ہے۔ شہزادہ شوٹو کو جو چھٹی صدی عیسوی کے آخر سے ساتویں صدی تک زندہ رہے تھے قدیم جاپان کے ایک ممتاز سیاسی رہنما تھے ساتھ ہی اس دور کے ایک عظیم مذہبی رہنما بھی تھے جب جاپان میں بدھ مت متعارف کرایا گیا تھا۔ جاپان کی پہلی آئین سارا اسمبلی شہزادے شوٹو کو کے اعلان سے شروع ہوتی ہے: ”ہم آہنگی و دینی اصول ہے جس کا احترام کیا جانا چاہیے۔“ یہ جذبہ ایک مردِ عزیزِ آدرش ہے جو جاپان کی تاریخ میں جاری و ساری رہا ہے۔

اپنی حد تک، میں نے ہم آہنگی کے اس جذبے کو اپنی سیاسی زندگی کا رہنما اصول بناتے ہوئے ”عالمی

ظرفی اور ہم آہنگی کے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ میرا اپنا ایک پسندیدہ قول ہے: ”ہم یہاں کھڑے ہیں اور ہم وہاں؛ مگر ہم رہیں گے دوست ہی۔“ یہ فطری امر ہے کہ ہم مختلف رہیں۔ اس کے باوجود سب کو ان اختلافات کو برداشت کے ساتھ قبول کرنا چاہیے اور ایسا طریقہ تلاش کرنا چاہیے جس میں باہمی افہام و تفہیم کے ساتھ ہم ایک ساتھ زندگی گزار سکیں۔ یہ دراصل ایک اخلاقی اصول ہے جس نے سیاسی زندگی میں میری رہنمائی کی ہے۔ میں یہ کہتے ہوئے بہت خوش ہوں کہ اس کو جاپان کے اور دنیا کے بہت سے نیک نیت لوگوں کی تائید حاصل ہے۔

یہ جذبہ جب خارجہ تعلقات کے میدان میں استعمال کیا جاتا ہے تو ایسی پالیسیوں میں داخل جاتا ہے جو پرامن اور بردبارانہ ہو جاتی ہیں، محاذ ملکوں کے درمیان نظریاتی اور سماجی اختلافات ہی کیوں نہ ہوں۔

اس جذبے کی تحریک کے زیر اثر سب سے پہلے میں نے ایشیا کی سفارت میں اچھی ہمسائیگی کے فروغ پر زور دیا تھا۔ بہت سے ملکوں اور ان کے مسائل کی وجہ سے ایسے موقع بھی آئے تھے جب اس پالیسی پر عمل کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اس کے باوجود میں نے کبھی ایسی پالیسی نہیں اپنائی تھی جو ایک غیر ملک کو دشمنی کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کرتی، اور میں ہمیشہ نہایت سنجیدگی سے مذاکرات کے لیے تیار رہا کرتا تھا۔

اپنے ذہن کو اسی نقطہ نگاہ پر مرکوز رکھتے ہوئے میں نے، وزیر اعظم ہتے ہی، سنجیدگی سے جمہوریہ کوریا کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کرنے کے لیے کام کیا۔ مذاکرات کے دوران بہت سے نشیب و فراز آئے جن کی اصل وجہ کوریائی اور جاپانی عوام کے قومی احساسات تھے جو ماضی میں جزیرہ ٹوا کوریا پر جاپان کے تسلط اور اس علاقے کی تقسیم کی حقیقت کی پیداوار تھے۔

اس کے باوجود سب سے پہلے اپنے نزدیک پڑوسیوں سے مساوات، باہمی مفادات اور حقیقت پسندانہ جذبے کی رہنمائی کا رگڑ ثابت ہوئی۔ جنوری 1966 میں جاپان اور جمہوریہ کوریا کے درمیان ایک مذاق اور اس سے ہم رشتہ کنی معاہدے نافذ ہوئے۔ اس طرح مابعد جنگ جاپانی سفارت کاری کا ایک بہت بڑا ملوث شدہ مسئلہ حل ہوا۔

آئیے، اب ہم چھٹے عشرے کے جنوب مشرقی ایشیا پر نظر کرتے ہیں۔ ویت نام کی جنگ کے باوجود، جو خوش قسمتی سے ہندو چینی جزیرہ نما سے باہر نہیں پھیلی تھی، اس پورے علاقے کی معیشت کا ہموار رفتار سے فروغ ہوا۔

یہ فروغ پھر تھا مختلف ممالک کی ان کے رہنماؤں کی قیادت میں کی جانے والی آن تھک کوششوں اور ابتدائی شروعات کا۔ میرے خیال میں، جاپان نے بھی اس ترقی میں ہاتھ بنایا تھا۔ جاپان ان قوموں میں سب سے آگے تھا جنہوں نے 1966 میں ایشیائی ترقیاتی بینک کے قیام میں حصہ لیا تھا۔ جاپان نے جنوب مشرقی ایشیا کی چلی اقتصادی ترقی کانفرنس میں بھی عملی کردار ادا کیا تھا، اور ایشیائی بحر الکاہل کاؤنسل میں بھی حصہ لیا تھا۔ اس طرح اس نے علاقائی تعاون اور باہمی استحکام کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ جنوب مشرقی ایشیا

کے رجمنٹ ہمارے ملک کے کردار کو بڑا درجہ دیتے ہیں، جو اس نے معیشت اور ٹیکنالوجی کے غیر معمری میدانوں میں ادا کیا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں اس تعاون پر زیادہ عملی توجہ دینی چاہیے تاکہ واضح نتائج حاصل کیے جاسکیں۔ اس کے علاوہ Youth Overseas Cooperation Corps کی سرگرمیاں بھی ہیں، جس کے ارکان مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر معیار زندگی بڑھانے میں خود دست بدست کام کرتے ہیں اور اپنا پسینہ بہاتے صرف جنوب مشرقی ایشیائی کے لیے نہیں بلکہ پوری ترقی پذیر دنیا کے لیے۔ میری وزارت عظمیٰ کے دوران ان کی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں ایشیائی رہنماؤں کے ساتھ رومہ و ملاقاتوں کے مواقع اور باہمی اتفاق رائے کے طفیل، اپنے علاقے میں دوستی کی فضا پیدا کرنے اور ہمسایوں کے ساتھ اچھے رشتے استوار کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔

(4)

یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ 1901 میں میرا ظہور ہوا تھا، اسی سال، جب پہلا نوٹیل امن انعام دیا گیا تھا۔ 74 برس کے عرصے میں نوٹیل انعام نے دنیا میں امن کی تلاش کے روشن اور تاریک پہلو دیکھے ہیں۔ اپنے عرصہ حیات میں مجھے بھی ایسے تجربات ہوئے ہیں۔ اس لیے، میرا خیال ہے کہ مجھے اپنے عصری تمدن کو درپیش بہت سے موضوعات میں سے ایک موضوع پر کچھ مشاہدات پیش کرنے کی اجازت دی جانی چاہیے۔ یہ موضوع تھرمو نیوکلیر (thermonuclear) توانائی کے استعمال کے مسئلے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ تھرمو نیوکلیر توانائی کا ایک پہلو اس کی بے پناہ اسکاٹی تباہی کی طاقت ہے۔ اسی وجہ سے، یہ توانائی انسانیت کے لیے ایک مثبت ناک خطرہ ہو سکتی ہے، بشرطے کہ یہ کس طرح استعمال کی جاتی ہے۔ ایک اور پہلو جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، یہ ہے کہ یہ بے حساب توانائی کا منبع ہے اور مستقبل کے تمدن کے لیے نئے افق کھول سکتی ہے۔

آج انسانیت کو آبادی، غذا، قدرتی وسائل، توانائی اور ماحول کے مشکل چیلنج کا سامنا ہے۔ یہ نہایت سنگین مسائل ہیں جو اس دنیا کا امن تباہ کر سکتے ہیں، اگر ہم حل کی تلاش میں لاپرواہی کا انتخاب کریں۔ صنعتی ترقی یا فتنہ ممالک، قدرتی وسائل کے حامل ممالک، اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان نا اتفاقی کی فلیج بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر توانائی کے نئے وسائل کے فروغ کے ذریعے، بالخصوص جوہری توانائی، جو دنیا بھر میں توانائی کی پائیدار فراہمی کا یقین دلا سکتی ہے، اس مشکل پر قابو نہیں پایا جاتا تو ایک وقت آئے گا جب ہم ایک جنگلی میں جا پکچیں گے۔

پھر بھی جوہری توانائی کا پرامن استعمال ہمیں، جوہری فیصلے اور اس سے تحفظ کے ایسے مسائل سے دوچار کرتا ہے جو اس کے فروغ کا آخری مرحلہ آگیا ہو۔ لیکن ایسا آخری مرحلہ ایک ناگزیر مرحلہ ہے، ہمیں جس کو اس وقت تک برداشت کرنا ہوگا جب تک کہ تکنیکی اختراع میں کوئی بڑی دریافت نہیں ہو جاتی۔ مجھے

یقین ہے کہ جب تک ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ پر غیر متزلزل اجماع برقرار رکھتے ہیں، بشرطے کہ دنیا کے ذہن ترین دماغ متحد رہیں، انسانیت اپنے مستقبل کے لیے ایسا تمدن تشکیل دینے کی صلاحیت رکھتی ہے جس میں لامحدود امکانات ہوں گے۔ لیکن جوہری گلیوٹ (Nusion) کے میدان میں تحقیق اور ترقی کو جس کو صاف ترین جوہری توانائی کا منبع سمجھا جاتا ہے۔ سنگین مسائل لاحق ہونے لگتے ہیں جب اس کا عملی استعمال شروع ہوتا ہے، اگر اس کے لیے ایک بین الاقوامی نظام اور تحقیقی ادارہ نہ قائم کیا جائے۔

کئی برس قبل میں نے چین غیر جوہری اصول پیش کیے تھے جن کے ذریعے امن کے لیے جاپان کے عوام کے عزم کا اعہار ہوتا تھا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، ایسا اس لیے کیا گیا تھا کہ پوری جاپانی قوم حرمو نیوکلیر کے خلاف ہے جو ان کے انسان بھائیوں کی ہلاکت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

سب سے پہلے میں بین الاقوامی معیار کا تحفظ تیار کرنے کی ضرورت ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ جوہری توانائی کے پرامن استعمال کی تحقیق اور ترقی کے لیے ایسے عمومی بین الاقوامی اصول اپنائے جانے چاہئیں جو ماحولیات کے مسائل کا خیال رکھیں۔ اس کے لیے بنیادی ضرورتوں میں بین الاقوامی معیار کے تحفظاتی نظام کی سب سے پہلے ضرورت ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ International Atomic Energy Agency اس سلسلے میں ضروری اقدام کرے گی جو جوہری توانائی کے پرامن استعمال اور فروغ میں معاون ثابت ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جوہری ایندھن کے تبادلوے اور تعین کے لیے ایک بین الاقوامی معاہدہ ہونا چاہیے۔ تمام دنیا میں توانائی کی کمی کے باعث اس بات کا بہت خطرہ ہے کہ مستقبل میں کسی وقت بھی جوہری توانائی کے حصول کی بے لگام دوڑ شروع ہو جائے گی۔ یہ کہنا چنداں ضروری نہیں کہ اس نوعیت کی ترقی امن کے لیے اور بنی نوع انسان کی خوش حالی کے لیے خطرہ ہوگی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ مستحکم مستقبل کے تصور کے لیے ابھی سے قدم اٹھانے ہوں گے۔

متذکرہ بالا امکانات کی روشنی میں ضروری ہوگا کہ ایک معاہدے کی بنیاد پر، جوہری ایندھن کے تبادلوے اور تعین کے لیے ایسے کسی نظام کی بنیاد رکھی جائے، جس کے تحت اس قسم کے ہر ایندھن کو ایک بین الاقوامی ایجنسی کے انتظام میں دے دیا جائے، جس کا فرض ہوگا کہ ضرورت مند ملکوں کو ایندھن کی ترسیل کی یقین دہانی کرے۔

آخر میں، جوہری ایندھن پر تحقیق اور اس کے فروغ کے لیے بین الاقوامی تعاون کا مسئلہ پیدا ہوگا۔ حرمو نیوکلیر توانائی کے موثر استعمال کے لیے ایک نظام کا حیر رفاہ قیام کسی ایک ملک کے ہن کی بات نہیں ہوگی، خواہ اس کے وسائل کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں۔ میرا قیاس ہے کہ اگر ہم دنیا کے سب سے بڑے دماغوں کو یکجا کر سکیں تو جوہری گلیوٹ کے عملی استعمال کے لیے دیکر وقت کم ہو سکتا ہے، اگرچہ موجودہ پیشین گوئیوں کے مطابق اس میدان میں، دریافت کو میں سے تیس برس تک کا عرصہ لگ سکتا ہے۔

جاپان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بہت آگے نکل چکا ہے۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ

اگر ایک بین الاقوامی تحقیقی سہولت کی تشکیل ہو جائے تو ہمارے نوجوان دماغ اس کام میں رضا کارانہ طور پر شریک ہونے کے لیے بخوشی تیار ہوں گے۔

میں ان تین نکات پر روشنی ڈالنا چاہوں گا جن کو میں ”جوہری توانائی کے پرامن استعمال کے تین اصول“ کے نام سے پکارتا ہوں۔ کافی عرصے سے کنہور (Kossil) اینڈ سن کے بحران کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ متعدد تنبیہات کے باوجود جوہری توانائی کے پرامن استعمال پر نا کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ اس کی وجوہات میں سے ایک وجہ ٹھک نظر قومیت کو قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ قومیت نے قوموں کی کمیونٹی میں آزادی اور مساوات کی علامت کا کردار ادا کیا ہے۔ اگر سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو دنیا میں ابھی تک قومیت کا تاریخی کردار شروع نہیں ہوا ہے۔

پھر بھی، اگر بنی نوع انسان کے مستقبل کو وسیع کرنے کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ٹھک نظر اور غور دہیں قومیت واقعی جوہری توانائی کے پرامن استعمال کے فروغ میں آڑے آ رہی ہے۔ اس کے ارتقا میں اضافہ تو یقینی طور پر نہیں کر رہی ہے۔ تمام لوگوں کو امن کو ایک حقیقت بنانے اور ایسی بنیاد فراہم کرنے کے لیے جس پر انسانیت کا ارتقا اور مستقبل کی بہتر زندگی کا انحصار ہو مثبت کوششوں کے لیے متحد ہو جانا چاہیے۔

(۵)

میں نوٹیل امن کمیٹی کے ممتاز ارکان کے فیصلے کے نتیجے میں نوٹیل امن انعام پانے پر اپنے آپ کو اس وقت بے حد خوش قسمت محسوس کر رہا ہوں۔ میں اس لیے بہت جذباتی ہو رہا ہوں کہ اس انعام کا مطلب ہے کہ امن کے لیے برسوں پر پھیلی ہوئی میری کوششوں کا بین الاقوامی سطح پر اعتراف کیا گیا ہے، مگر جب میں پلٹ کر جاپان کی تاریخ پر نظر ڈالتا ہوں تو سوچتے لگتا ہوں کہ میرے ملک میں مجھ سے پہلے بہت سے لوگوں نے امن کے لیے کام کیے تھے جن کی کوششیں میری کوششوں سے کہیں زیادہ تھیں، اور شاید وہ لوگ اس امن انعام کے مجھ سے زیادہ مستحق ہوتے۔

میں صرف ٹھک نظر معنوں میں امن کے لیے کام کرنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہمارے عوام، اپنی کوششوں اور قابلیتوں کے زور پر، دنیا کے تمدن کے فروغ میں بڑے کام کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

اگر ہزاروں برس پہلے نوٹیل انعام شروع کیا گیا ہوتا تو ادب کا سب سے پہلا انعام حاصل کرنے والی ایک جاپانی عورت ہو سکتی تھی۔ اور اگر جاپان نے کئی صدیوں قبل بین الاقوامی کمیونٹی میں حصہ لیا ہوتا تو طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور اقتصادی سائنس کے انعامات پانے والوں میں کئی ایک جاپانی شامل ہوتے۔ اس وقت تک نوٹیل انعام پانے والے، مجھ سمیت، صرف پانچ افراد ہیں۔ میرے خیال میں

ہمارے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔

میں یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جاپانی تاریخ اور تمدن بڑے انوکھے راستوں پر گھڑن رہے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوسری قوموں سے اپنی دوریوں کے باعث ہم ایک طرح کے سماجی انٹری پن میں گرفتار ہیں اور عوام کی حیثیت میں ہم اپنی صلاحیتوں کے چبانے پر دنیا کے تمدن میں اپنا خاطر خواہ حصہ نہیں ڈال سکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ دنیا کے عوام سے اپنی بد قسمت کوتاہیوں کی بنا پر، رسوخ تو کیا، ہم ان سے رابطے بھی نہیں قائم کر سکے ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ بالخصوص حالیہ برسوں میں، مغربی تمدن اور تہذیب کو اپنانے کی جلدی میں، ہم دنیا کو اپنے تہذیب و تمدن سے پوری طرح روشناس نہیں کما سکے ہیں۔

بنیادی طور پر جاپانی قوم کو سمجھنا دشوار ہے، اس لیے کہ ہماری تہذیب مغربی اور دوسرے ایشیائی ممالک سے بہت مختلف ہے۔ چوں کہ یہ امر واقعہ ہے، اس لیے ہمیں اپنے آپ کو بہتر طور پر پیش کرنے کے لیے زیادہ کوشش کرنی چاہیے تھی۔ میں اس اعتراف پر مجبور ہوں کہ ایسے وقت میں جب بین الاقوامی تفہیم کی بہت ضرورت تھی، اپنے آپ کو متعارف کرنے کے سلسلے میں ہماری کوششیں کافی تھیں۔

میں جب اپنے ملک کی ذہانت اور اپنے عظیم لوگوں کے بارے میں سوچتا ہوں جو بین الاقوامی پہچان بنانے میں ناکام رہے ہیں تو میں اس بیش قیمت انعام کے حصول پر اپنے آپ کو زیادہ خوش قسمت تصور کرنے لگتا ہوں۔ ساتھ ہی، میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بہترین الاقوامی ادراک حاصل کرنے کے لیے زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔

میں اس انعام کو تہذیبی اعتبار سے زیادہ با معنی بنانا چاہتا ہوں۔ اس لیے، میرا ارادہ ہے کہ میں اس انعام کے ذریعے اپنے اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے درمیان رابطوں کو بہتر بناؤں گا۔

ان انعامات کے قیام کے پیچھے، بلاشبہ انٹرنیشنل نوٹیل کا ارادہ تھا کہ قوموں کے درمیان پر امن رشتے استوار ہوں۔ اپنی جانب سے میں یقین دہانی کرنا چاہتا ہوں کہ میں، انٹرنیشنل نوٹیل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، بین الاقوامی کمیونٹی کی بہتری کے لیے اپنے ملک کے لوگوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے، اور دنیا کو ان کوششوں سے متعارف کرانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ آپ کا شکریہ!

ہنری کسنجر

لی ڈک تھو

اعلان تجلیل

بجالات ماب، عزت ماب، نحاتین و حضرات!

اس برس کی 23 جنوری کو ریاست ہائے متحدہ امریکا اور ویت نامی جمہوریہ کے درمیان جنگ بندی کا ایک معاہدہ ہوا تھا۔

ماروینا پاریمان کی ٹوئیل کمیٹی نے 16 اکتوبر کے اپنے اجلاس میں دونوں مرکزی مندوبین، ہنری کسنجر اور لی ڈک تھو کو جو چار برس کی محنت کے بعد جنگ بندی کا معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، 1973 کا ٹوئیل امن انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

کئی طویل اور تلخ برسوں تک لڑنے والی ویت نام کی شہری آبادی، اور دونوں طرف کے فوجیوں کو جنگ نے ڈکھ اور محرومیاں دی ہیں۔ اس جنگ نے نہ صرف ویت نام اور اس کے عوام کو الجھائے رکھا، اس نے دونوں ملوث ملکوں کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے ملکوں کی فضا کو زہر آلود کر رکھا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے بعد سے ویت نام کو کبھی مسلسل امن کا لطف نصیب نہیں ہوا تھا۔ عالمی جنگ کے ختم ہونے کے بعد فرانس کو اشتراکی رہنمائی میں، ایک طاقت ور مسلح مزاحمتی تحریک کا سامنا تھا۔

ایک آزاد ویت نامی ریاست کے قیام اور تسلیم کیے جانے کے مسئلے کے حل کی تمام کوششیں کام ہو چکی تھیں۔ اب ایک کھلی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جنگ میں ملوث فرانسیسی فوجیوں کی تعداد چار لاکھ تھی پھر بھی

فرانس اپنے حریف کو کچلنے میں ناکام رہا تھا۔ 1954 میں Dien Bien Phu کے مقام پر فرانس کی شکست کے بعد جنوبی جنگ بندی کا ایک معاہدہ ہوا تھا اور حد بندی کی ایک کیرکھی گئی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ آزاد انتخابات کے بعد ملک کو متحد کر دیا جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ جنوبی ویت نام کی نئی حکومت کا موقف تھا کہ شمال میں قائم اشتراکی حکومت کے زیر انتظام انتخابات منعقد نہ کیے جاسکتے۔ نتیجے میں ویت نام کی سر زمین پر دو ریاستیں ابھریں۔ 1954 اور 1960 کے درمیان دونوں حکومتوں کی باقاعدہ تشکیل ہوئی۔ ایک اشتراکی ریاست تھی جب کہ جنوب کی دوسری ریاست غیر اشتراکی تھی۔

جنوبی ویت نام کی حکومت کے خلاف ایک کوریڈا تحریک وجود میں آگئی۔ 1960 میں اس کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ اس برس کے آخر میں FLN National Liberation Movement کے نام سے ایک مشترکہ ادارہ اور کمان قائم ہوئی۔ جنوبی ویت نام کا موقف تھا کہ یہ تحریک شمالی ویت نام کی حکومت کی نگرانی میں کام کرتی ہے۔

بعد کے برسوں میں جنوبی ویت نام کی حکومت FLN کی برہنہ ہوتی سرگرمیوں کو روکنے میں ناکام رہی۔ یہ بھی ظاہر ہو گیا تھا کہ جنوبی ویت نام میں مؤثر انتظامیہ اور حکومت کا قیام ناکام ہو گیا ہے۔

1964 میں کچھ فیصلے کیے گئے جن کے نتیجے میں اگلے چند برسوں میں امریکی فوجیں ایشیا کی سر زمین پر جنگ کرنے والی تھیں۔ اس وقت یہ فوجیں جنوبی ویت نام میں ہونے والی خانہ جنگی اور دونوں ویت نامی ریاستوں کے درمیان کی جنگ میں الجھی ہوئی تھیں۔ یہ فیصلہ جنوبی ویت نام کی زمین پر بڑے پیمانے کی امریکی فوجی مداخلت، شمالی ویت نام کے مخصوص ٹھکانوں پر بمباری اور لائوس اور کمبوڈیا کے ذریعے شمالی ویت نامی فوجوں کے لیے رسد کی سہولتوں پر ہوائی حملوں پر بھی منتج ہوا۔ مارچ 1969 میں ویت نام میں امریکی فوجوں کی تعداد 500,541 افراد تک پہنچ گئی تھی۔ امریکی فوجوں کے اعلانے کا مقابلہ جنوبی ویت نام میں مزید شمالی ویت نام کی فوج سے کیا گیا تھا۔

آج دنیا کو معلوم ہے کہ جنگ نے ویت نام کے عوام پر کیا ستم توڑے ہیں۔ جدید طریقہ جنگ کی مشینی بے رحمی خانہ جنگی کی دہشت مافیہ سے کچھ کم نہیں۔ یہاں جنگ کے شکار ہونے والوں کی لہرہ سینے والی اور مرنے اور زخمی ہونے والوں، یتیموں، جنگی قیدیوں، جبراً بے دخل ہونے والوں اور جنگ کے علاقوں سے بھاگنے والے بے شمار بے گھر لوگوں کی تفصیلات کا ذکر ابھی کچھ ضروری نہیں۔

1969 میں ویت نام سے امریکی فوجوں کا ہڈ رتج انخلا شروع ہو گیا تھا۔ دسمبر 1972 تک، ایک وقت کے پچاس لاکھ فوجیوں میں سے 27,000 باقی رہ گئے تھے۔ مگر جنوبی ویت نام میں بڑے حملوں اور شمالی ویت نام میں پچھلے برس کے دسمبر تک۔ تازہ ہوائی حملوں کے ساتھ جنگ جاری تھی۔

پھر بھی، ویت نام میں جنگ بندی اور امن کے لیے ہونے والے مذاکرات میں جن کی 1969 میں پیرس میں شروعات ہوئی تھی، معمولی رہنے پر سے تھے۔ آخر، اسی برس 23 جنوری کو ریاست ہائے متحدہ

کے معاملہ پر دنا ہنری کسنجر اور شمالی ویت نام کے نمائندے لی ڈک تھو کے درمیان جنگ بندی طے ہوئی اور 27 جنوری کو معاہدے پر دستخط ہو گئے۔

مارویائی پاریمان کی نوبل کمیٹی اچھی طرح جانتی تھی کہ امن کا نہیں جنگ بندی کا معاہدہ ہوا ہے۔ انھیں احساس تھا کہ ویت نام میں ابھی امن نہیں ہوا ہے اور ویت نام کے عوام کے ڈکھ ختم نہیں ہوئے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ویت نام کے واقعات اب بھی دنیا کے دقتانت کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ جنگ بندی کا معاہدہ ویت نام میں امن کے راستے پر پہلا، مگر بے انتہا اہم قدم تھا۔

ہمیں امید ہے کہ یہ دونوں مدتہ معاملہ پر دنا جن کو اس سال کا امن کا انعام دیا جا رہا ہے، انعام کے مقصد کی ویسی ہی سمجھ بوجھ اور ارادے کا مظاہرہ کریں گے جیسا کہ چانسلر ویلی برانٹ (Willy Brandt) کی اسی سال میں کی جانے والی اپنی تقریر میں کیا تھا جب ان کو 1971 کا امن دیا گیا تھا۔

”نوبل امن انعام سب سے بڑا اعزاز ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بڑی ممنونیت کا بوجھ ڈالتا ہے، جیسی کسی سیاسی ذمہ داری رکھنے والے شخص پر ڈالی جاسکتی ہو۔“

نوبل کمیٹی کے نام اپنے 22 نومبر کے خط میں ہنری کسنجر نے اپنی عمیق ممنونیت کا اظہار کیا ہے۔ اپنے خط میں اور چیزوں کے ساتھ انھوں نے لکھا ہے:

”نوبل انعام کی عطا نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ یہ روئے زمین پر امن کی تلاش کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے، جس کی کوئی خواہش ہی کر سکتا ہے۔ جب میں ان لوگوں کی فہرست پر نظر ڈالتا ہوں جنہیں مجھ سے پہلے اس طرح معزز کیا گیا ہے، تو میں اس کو صرف انعام کے ساتھ ہی قبول کر سکتا ہوں۔

سیاست ہائے متحدہ کے، بلکہ پوری دنیا کے عوام، اس امید میں شریک ہیں، جس کا اظہار نوبل امن انعام کمیٹی نے کیا ہے کہ اس تنازعے کے تمام شرکاء اس جنگ بندی کو دیکھی ہند چینی عوام کے لیے دیر پا امن میں بدلنے کے لیے خود کو اخلاقی طور پر ذمہ دار سمجھیں گے۔ یقیناً، میری حکومت، اپنی حد تک، اپنی پالیسی پر اس طرح عمل پیرا رہے گی کہ یہ امید حقیقت میں بدل جائے۔“

مجھے یقین ہے کہ تمام ہوش مند لوگ ڈاکٹر کسنجر کے بیان پر نوبل کمیٹی کی خوشیوں میں شریک ہوں گے۔ نوبل امن انعام اکثر ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو قوموں کے درمیان امن یا جنگ کی حکومتی پالیسی کی ذمہ داری میں براہ راست شریک نہیں ہوتے۔ یہ انعام ان لوگوں اور اداروں کو دیے گئے ہیں جو ایک بہتر دنیا کی تخلیق کی کوشش میں قوموں کے درمیان تعاون کو فروغ دیتے ہیں۔ ایسی دنیا کے لیے جس میں بھوک نہ ہو جس میں نسلی تعصب اور نسلی منافرت نہ ہو اور ان افراد کو انعام دیے گئے ہیں جو ایسی دنیا کے خواب دیکھتے ہیں جس میں جنگ ناقابل تصور ہو۔

مگر نوبل انعام ان افراد کو بھی دیے گئے ہیں جو سیاسی ذمہ داری کا استعمال کرتے ہیں اور واقعات کے چکر دینے والے گرداب میں گئے گئے ہوئے ہوتے ہیں۔ انھیں اس لیے انعام دیے گئے تھے کہ

اپنی سرگرمیوں کے دوران انھوں نے اس راستے کی نشان دہی کی ہے جن پر چلنا چاہیے۔ کوئی جان نہیں سکتا تھا کہ اس راستے پر قدم بڑھائے جائیں گے یا نہیں، مگر انھوں نے انسانوں کے امن کی طویل اور مشکل راہ پر اپنی شمع روشن کیے رکھی ہے۔ انھیں انعام دیا گیا تھا، اس لیے کہ سیاہی طور پر ممکن ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے، انھوں نے امن کے لیے کام کیا، اگرچہ وہ بے عیب نہیں تھا، مگر اس راہ پر بڑھنے والا ایک قدم ضرور تھا۔

آج کے حالات کے پیش نظر سو دسواں سال ہم 1950 پر نظر کریں، جب یہ انعام فلسطین میں اقوام متحدہ کے نمائندے رالف بنش (Ralph Bunche) کو اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان جنگ بندی کے حصول کے لیے دیا گیا تھا۔

رالف بنش کے بعد سے تین مہینوں پر، 1956 میں 1967 میں اور اب ایک بار پھر 1973 میں، مشرق وسطیٰ میں کھلی جنگ نے جنگ بندی کو منسوخ کیا ہے۔ اپنے عمل سے انھوں نے جو راہ دکھائی تھی اس پر قدم نہیں بڑھائے گئے۔

آج، بالآخر، مشرق وسطیٰ میں چوتھی جنگ کے بعد، اس بات کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں کہ بنش نے جس نئی جنگ بندی کی امید کی تھی، وہ ایسے امن کی بنیاد بنے گی جو دنیا کے اس حصے میں تمام رہنے والوں کو دیر پا تحفظ فراہم کرے گا۔

1971 میں یہ انعام ایک ذمے دار مددگار، چانسلر ویلی ہمانٹ کو دیانت کے لیے ان کی ذاتی خدمات اور یورپ میں تعاون کی پالیسی کے لیے دیا گیا تھا۔

دو جرمن عوام کی اکثریت کو یہ یاد کرانے کا میاں ہو گئے تھے کہ یورپ میں امن اور مذاکرات کی ایسی پالیسی ہونی چاہیے جس کی بنیاد پر حقیقی طاقتوں کے درمیان رشتوں کو تسلیم کرنا پڑے گا، اور اس حقیقت کو بھی کہ جرمنی کی زمین پر اس وقت دو جرمن ریاستیں موجود ہیں۔

یہ بالکل درست حل نہیں تھا۔ پھر بھی ایک ذمے دار مددگار اور یورپ کے قلب میں موجود ایک قوم کے رہنما ہونے کی حیثیت میں ویلی ہمانٹ نے امن کی پالیسی کا راستہ اہلایا کہ صرف وہی ممکن تھا۔

دو ذمے دار سیاست دانوں کو 1973 کا انعام دیتے وقت بھی مارویائی Starting کی نوٹیل کمیٹی اپنے اس یقین پر زور دیتی ہے کہ کئی تنازعات کے حل کے لیے بھی، جو جنگ کو شروع کر سکتے ہوں یا کر چکے ہوں، مذاکرات ہی کا سہارا لینا چاہیے، نہ کہ مکمل فتح کے لیے مکمل جنگ کی جائے۔

عمل تلاش کرنے والے دو افراد جنہیں امن کا انعام دیا گیا ہے، بہت مختلف نظاموں کے نمائندے ہیں۔ ایک اسی مغربی نظام کا جس میں خود ہماری پاریمان کام کرتی ہے، اور دوسرے اشتراکی نظام کا۔ ہم کو اس فریب میں نہیں رہنا چاہیے کہ وہ مختلف نظاموں اور نظریات کے درمیان موجود اختلافات کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، مگر نوٹیل کمیٹی ہمیشہ فکر مند رہی ہے کہ امن کی مثلاًشی دنیا میں، کوئی ایک، مسلح طاقت کے گل پر اپنے نظام کو دوسروں پر ٹھونسے کا حق اختیار نہیں کر سکتا۔ مختلف نظاموں پر چلنے والی حکومتوں کو بھی امن کے ساتھ مل

جیل کر رہنا اور مذاکرات کے ذریعے اپنے تنازعات کو حل کرنا چاہیے۔
 لی ڈک تھو نے کمیٹی کو مطلع کیا ہے کہ فی الحال وہ انعام کو قبول کرنے کی حالت میں نہیں ہیں، جس کی وجہ انھوں نے ویت نام کی موجودہ کیفیت بتائی ہے۔ موجودہ اصولوں کے مطابق کمیٹی یکم اکتوبر 1974 تک ان کے انعام کو روک سکے گی۔ اس کو توقع ہے کہ 23 جنوری کے جنگ بندی کے معاہدے کے مطابق ویت نام میں حالات بہتر ہو جائیں گے اور ان کے لیے انعام قبول کرنا ممکن ہو جائے گا۔
 اس سال ہنری کسنجر کو ریاست ہائے متحدہ کا سیکریٹری آف اسٹیٹ بنا دیا گیا ہے۔ کمیٹی کے نام اپنے خط میں انھوں نے لکھا ہے:

”مجھے بہت افسوس ہے کہ بار بار پیدا ہونے والے بحرانوں سے گھری ہوئی اس دنیا میں کام کے دباؤ کی وجہ سے میں 10 دسمبر کو انعام کی تقریب میں شرکت کی غرض سے اوسلو نہیں آسکوں گا۔ میں نے اپنے ملک کے سفیر جناب Byrne سے درخواست کی ہے کہ اس موقع پر وہ میری نمائندگی فرمائیں۔ تاہم، اگر آپ چاہیں تو، میں مستقبل کی کسی اور مناسب تاریخ کو خطبہ پیش کرنے کے لیے آسکتا ہوں، جیسا کہ میں سمجھتا ہوں، مرنوٹیل امن انعام پانے والے کو دینا ہوتا ہے۔“

کمیٹی کو خزاں کے موسم تک ڈاکٹر کسنجر کی مصروفیات کا علم ہے۔ پھر بھی اس کو افسوس ہے کہ وہ آج انعام حاصل کرنے کے لیے خود نہیں آسکے ہیں۔ ہم مستقبل میں ان کا خطبہ سننے کے آرزو مند ہیں۔

ہنری کسنجر 1923 میں جرمنی کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ 1938 میں ان کا خاندان فرار ہو کر ریاست ہائے متحدہ چلا گیا۔ ان کے والد نے، جو ایک مدرسی تھے نیویارک کے ایک دفتر میں کام کیا۔ 1943 میں ہنری کسنجر کو فوجی خدمات کے لیے طلب کر لیا گیا، اور وہ امریکی باشندے بن گئے۔ انھوں نے یورپ پر آخری حملے میں حصہ لیا تھا۔ انھیں ایک جنوبی جرمن شہر کی انتظامی ذمہ داری سونپی گئی تھی جو قابض اتحادی فوجوں کے زیر انتظام تھا۔ 1946 میں انھیں ہارورڈ یونیورسٹی سے دینیقہ مل گیا۔ 1954 میں انھیں European Peace Settlement after the Napoleonic Wars کے عنوان سے لکھے گئے مقالے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی۔

1950 میں انھوں نے نیویارک میں Council of Foreign Relations کے ایک گروپ کے لیے تحقیقی کام کیا۔ اس گروپ نے ریاست ہائے متحدہ امریکا اور سوویت یونین کے تعلقات، خصوصاً جوہری دور میں فوجی سلامتی کے مسائل کا تجزیہ کیا تھا۔

1957 میں وہ پھر ہارورڈ گئے، جہاں 1962 میں ان کو پروفیسر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ صدی کے پانچویں اور پچھٹے عشرے کے دوران انھوں نے مختلف سیاسی موضوعات پر بہت کچھ لکھا۔ انھوں نے صدر آئزن ہاور اور صدر کینیڈی کے لیے کچھ تحقیقی کام بھی کیے تھے۔ کسی جماعت سے منسلک ہوئے بغیر 1968 کے انتخابات کے دوران نیلسن راکسفلر (Nelson Rockefeller) پر وگرام تیار کرنے میں بھی مدد

کی۔ 1968 کے بعد انہوں نے صدر ٹکسن کے مشیر کے طور پر کام کیا۔ جنوری 1969 سے انھیں امریکی صدر کے ساتھ سلامتی کے مشیر کے طور پر کام سونپا گیا۔ 1973 میں وہ میکریٹری آف اسمیٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ڈاکٹر کسنجر کی تمام تحریروں میں ہمیں ایک بنیادی رویہ نظر آتا ہے جس نے انھیں اس کردار کے لیے منتخب کر دیا جو انہوں نے 1969 میں ادا کیا تھا۔ یہی رویہ 1945-46 میں جرمنی کے انتظامی ذمے داریوں میں ان کے کردار میں بھی ابھرتا نظر آتا ہے۔

لوگن کو اب بھی وہ جملہ یاد ہے جو ایک جرمن یہودی تارک وطن نے، جو اپنی آبائی سر زمین پر مہاجرے کے بعد امریکی وروی پہنچے ہوئے واپس آیا تھا، جس کے خاندان کے سترہ افراد تسمیوں کے دور میں مارے گئے تھے، کہا تھا، ”ہم اپنا انتقام لینے کے لیے نہیں آئے ہیں۔“

یہ رویہ عوام اور قوموں کے درمیان تعلقات کے بہت پہلے سے بنے تصورات کی نشان دہی کرتا ہے، ایسا رویہ جو فسطائیت کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ نہ جرمن اور یہودی خون رکھنے والے ایک نوجوان میں اور نہ ان لوگوں سے معاملت میں جنہوں نے بنیاد پرستوں کو اخلاقی جہنم میں گر جانے دیا ہے۔

ڈاکٹر نے اپنے مقالے میں کسنجر نے یورپ میں 1814 کے بعد کے طویل عرصے تک چلنے والے امن پر بات کی ہے، اس عرصے میں جو باوجود کبھی کبھی ہونے والی جنگ کے پیدا کیے ہوئے تعطل کے سو برس بعد، یعنی 1914 تک جاری رہا تھا۔

اس عرصے پر بات کرنے والے بہت سے تاریخ دان فوجی طاقت کے توازن پر زیادہ زور دیتے ہیں؛ فوجی اعتبار سے کوئی بھی ایک طاقت پورے یورپ پر حاوی ہونے کے قابل نہیں تھی۔ جیسا کہ 1814 سے پہلے نپولین نے، اور 1914 کے بعد جرمنی نے کیا تھا۔

دوسری جانب کسنجر اس حقیقت پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ ریاستوں کے درمیان تعلقات کے عالم گیر اصولوں کی بنیاد پر، امن ایک بین الاقوامی نظام کا پابند تھا۔ اس زمانے میں بھی سیاسی نظام بہت مختلف ہوتے تھے اور بہت ساری طاقتوں کے اپنے اپنے مختلف انواع مفادات ہوا کرتے تھے مگر بڑی حد تک وہ اصولوں اور قوانین کا احترام کرتی تھیں، اسی وجہ سے وہ جنگ کی وجہ بننے والے، نظام اور مفاد کے اختلافات سے پرہیز کرتے تھے۔

اسی لیے، یہ بالکل فطری تھا کہ امن کے فروغ کے لیے بھی کسنجر، پیشے اور فن دونوں کے اعتبار سے، سیاسی حکمت عملی پر زیادہ زور دیتے تھے۔

خارجہ پالیسی پر کسنجر کا اپنا خیال تھا کہ امن کا قیام ان اصولوں کی بنیاد پر ہونا چاہیے، سب ریاستیں، بالخصوص بڑی طاقتیں، جن پر عمل کریں۔ صرف ایک ریاست کا ان پر عمل کرنا کافی نہیں ہوتا اس کے برعکس، اگر کچھ ریاستیں کسی بھی قیمت پر امن کی طلب گار ہوں، اور دوسری ریاستیں اصولوں پر عمل چھوڑ دیں،

تو خطرناک صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر یٹ کے اپنے مقالے میں انھوں نے اس کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

”جب بھی امن اسداؤ جنگ کے طور پر کسی طاقت یا طاقتوں کے گروہ کا اولین مقصد ہوا ہے، بین الاقوامی نظام، بین الاقوامی کمیونٹی کے سب سے بے رحم و کرم پر رہا ہے۔“

اس قسم کی پالیسی جنگ کا باعث ہو سکتی ہے، اور سب سے خوفناک مثال 1938 کا میونخ معاہدہ تھا، جس میں مغربی طاقتوں نے چیکو سلواکیا کو قربانی کے بکرے کی طرح ہٹلر کو پیش کر دیا تھا۔ اس وقت ایسے بھی لوگ موجود تھے جن کا خیال تھا کہ اس سودے بازی کے ذریعے امن ”ہمارے عرصہ حیات“ تک کے لیے محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اس وقت کسی کو اس کا ادراک ہی نہیں ہو سکا تھا کہ ہٹلر نے تمام بین الاقوامی اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

یہ کہنا ضروری نہیں رہ گیا ہے کہ 1930 کے تجربات کا کسفر جیسے پس منظر رکھنے والے انسان کی سوچ پر اثر انداز ہونا لازمی تھا۔ ان کے خیال میں، جب بھی سیاسی شدت پسندوں کو کسی ریاست میں طاقت ملی ہے، وہ خطرناک ثابت ہوئے ہیں، اس لیے کہ وہ ریاستوں کے درمیان رشتوں کے مستقل اصولوں کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ اشتراکی حکومت کو کھرے اندیشوں کے ساتھ دیکھتے رہے ہیں، اور ان ہی اندیشوں نے 1950 کے عشرے میں مغرب اور اس کی سلامتی کے بارے میں ان کی سوچ پر اثر ڈالا تھا۔

اس کے ساتھ ہی، اوروں کے مقابلے میں وہ ابتدا ہی سے، جوہری ہتھیاروں کی موجودگی کے باعث، انسان کو لاحق خطرات سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اس فکر میں رہے ہیں کہ ریاست ہائے متحدہ اور مغربی یورپ جوہری ہتھیاروں پر انحصار کے بغیر، جو اگرچہ نہایت واہیات متبادل ہے، ہٹلر کس طرح اپنا دفاع کر سکیں گے۔

انھوں نے اپنی امیدیں اس خیال پر مرکوز رکھیں کہ جوہری ہتھیاروں کے دور میں ہر بڑی طاقت کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ اس کا سب سے بڑا غرض جوہری ہتھیاروں کی جنگ کو پھوٹ پڑنے سے روکنا ہوگا۔ اس لیے اس احساس کا ادراک حد درجہ ضروری ہوگا، خواہ وہ کسی بھی سیاسی نظام اور نظریات کی نمائندگی کرتی ہو۔

اس حقیقت کے ادراک کے بعد، عالمی سطح پر قبول کیے گئے نئے نظام کی بنیاد پر، ان کو ایک دوسرے سے نئے رشتے استوار کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا، جیسا کہ 1914 سے قبل یورپ میں ہوا تھا۔ یہ تھا کسفر کا مشروطہ، ان کے عظیم تجربے کی بنیاد پر بنائی جانے والی خارجہ پالیسی کی بنیاد پر۔

ان کی رائے میں، اس قسم کی دنیا میں ریاست ہائے متحدہ کو ”عالمی حقانے دار“ کا کردار ادا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ دوسری طاقتوں کو بھی، جن میں سوویت یونین اور چین شامل ہوں، براہمدی کی سطح اور براہمدی کے حقوق اور دوسرے داریوں کے ساتھ امن کے لیے مدعو کیا جانا چاہیے۔

کسٹمر فٹری کام کے ماہر نہیں! جب وہ ماسکو اور پیکنگ کے سفر پر روانہ ہو رہے تھے تو واشنگٹن میں ان کی میز پر طے کیے جانے والے مسائل کے دو کوک حل نہیں تھے۔ انہوں نے ان مسائل کو اپنے مشرور خطات، پیغامات اور سوالات کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی تھی۔

یہ بڑا تجربہ ہمیں ان حالات سے باہر نکلنے کا ایک راستہ دکھاتا ہے جو دوسری عالمی جنگ اور بعد کی سرد جنگ نے پیدا کیے تھے۔

کسٹمر نے 1969 سے جو پالیسی پیش کرنے کی کوشش کی ہے، وہ 1969 سے بہت پہلے کے ان کے اپنے خیالات پر مبنی ہے۔ کسی کو دیانت کی پالیسی میں ان کی ذاتی کارگزاری کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

ایک حالیہ انٹرویو میں انہوں نے صاف الفاظ میں واضح کیا ہے کہ چونکہ ان کے سامنے متضاد مفادات، نظام اور نظریات ہیں اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ بڑی طاقتوں کے درمیان تعلقات میں دیانت کی کوشش کی جائے۔ اس لیے یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ جو دوسری جنگ کے خطرات کو کم کیا جائے۔ دیانت ملکوں کو مذاکرات کے مواقع فراہم کرتا ہے تاکہ جب ضروری ہو فوری اقدام کیے جائیں، اور یہ میانہ روی کے اظہار کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے بحران کی وجہ سے اس پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

اس برس کے امن انعام حاصل کرنے والے کو حقیقت پسند شخصیت کہا گیا ہے۔ وہ اپنے ملک کو بھی خارجہ پالیسی میں زیادہ نظریاتی اور جذباتی انداز سیاست اختیار کرنے کے خلاف تنبیہ کرتے ہیں۔ ان کی حقیقت پسندی ان کی سوچ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے جو بدلتے حالات اور وقت کے ساتھ ہمیشہ ایک بنیادی اخلاقی رویہ بن جاتی ہے۔ خطرے سے بھرپور ایک ناقص اور رنگا رنگ دنیا میں ایک مدبرانہ ذمہ داری ہی ان کی مصروفیت رہی ہے۔ اب وہ خود ہی اس ذمہ داری کے بوجھ کو اٹھائے ہوئے ہیں۔

آنے والے برسوں ہی میں ہمیں پتا چلے گا کہ ان کا تجربہ ہمیں ایک محفوظ دنیا کے راستے پر کہاں تک لے جاتا ہے۔ مگر اس کا دارومدار نہ فقط ہنری کسٹمر پر ہے اور نہ ریاست ہائے متحدہ پر۔

اس تنازعہ کی کسوٹیوں میں سے ایک تو مشرق وسطیٰ کا تنازعہ ہے، دوسری کسوفی ویت نام ہے۔ یہاں نتیجہ ان تمام حریفوں کے کردار پر منحصر ہوگا جو تنازعہ کا حصہ ہیں، یعنی تنازعہ کے علاقے کی دونوں ریاستیں اور عالمی طاقتیں جو اس میں مداخلت کریں گی۔

ہمارے علاقے میں اور یورپ میں بھی سلامتی اور تعاون کے عالمی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے، جو اس عظیم تجربے کی دین ہے، حالات دیانت کی طرف جاتے دکھائی دے رہے ہیں۔

آج مٹھی بھر عظیم مدبرین کانفرس کی میز پر بیٹھے دنیا میں جنگ اور امن کے سوالات سلجھا رہے ہیں۔ ٹھکر کروڑوں لوگ جن کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ سیاست دان ہی اکیلے اس بوجھ اور ذمہ داری کو اپنے کاندھے پر اٹھائے رہیں۔ ہمیں خود بھی ایک عملی اور مثبت رویے کے

ذریعے امن کی اپنی امیدوں کی بجا آوری کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔
 مرحلوں سے قطع نظر، صرف اداروں ہی کو نہیں، دنیا بھر کے لوگوں کو ایک زبان میں، امن کی زبان
 میں، اتنی زور سے آواز اٹھانی چاہیے کہ سیاست دان سننے پر مجبور ہو جائیں۔
 یہی وہ لوگ ہیں جو آج گفت و شنید سے کیے ہوئے معاہدوں کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ یہ غیر اخلاقی
 ہی نہیں، ایک خطرناک رویہ ہے۔

ریاستوں کے درمیان جنگ بندی کے معاہدوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے، نہ ہی ان کو محض کاغذی
 تباہ و برباد سمجھنا چاہیے، بلکہ ریاستوں کے درمیان جنھوں نے ان پر دستخط کیے ہوں، ان کی اخلاقی ذمہ داری
 سمجھنا چاہیے۔ بین الاقوامی معاہدوں اور اداروں کے بارے میں ایمان دارانہ رویے ہی امن کی راہ پر قدم
 بڑھانے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

بہمیں جس امن کی تلاش ہے اسے محض فوجی تنازعات سے بچاؤ ہی پر منحصر نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا میں حقیقی
 امن کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ ہر ملک کو اپنے باشندوں کے لیے وہ زندگی مہیا کرنی چاہیے جو بلا تفریق نسل،
 مذہب، نظریہ یا قومیت ہو جو ایسی زندگی کا موقع فراہم کرے جو خوف سے، تشدد سے، دہشت گردی سے ماورا
 ہو۔ ایسی زندگی جس میں بنیادی انسانی حقوق محفوظ ہوں اور ہر فرد بشر کا ورثہ پائائے ہو۔

مارویانی نوٹیل کمیٹی کی صدر نشین Mes Aase Lionaes کی زبانی

تقریر قبولیت

(امریکی سفیر برائے ماروے Thomas R. Byrne کی زبانی)

نوٹیل امن انعام محض ایک فرد کے لیے ہی نہیں ہوتا، ایک مقصد کے لیے بھی ہوتا ہے۔ امن کے حصول
 سے زیادہ یہ امن کی تلاش کو ایک علامت بنا دیتا ہے مگر چرچاتی نقطہ نگاہ سے میں اس اعزاز کو اپنے لیے بے
 انتہا عزیز جانتا ہوں، میں اسے اسی تلاش کی کوشش اور اسی عظیم مقصد کی جانب سے قبول کر رہا ہوں۔

تجربے نے سکھایا ہے کہ ہمیں امن کو ایک مازک شے، ایک نقش بر آب کیفیت سمجھنا چاہیے جس کی
 جڑیں اتنی اتھلی ہوتی ہیں کہ سیاسی بے قناعتی اور سماجی کھینچا تابی کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ ہم اس تجربے سے
 حاصل ہونے والے سبق کو قبول کرتے ہیں اور ان کے ذریعے اس حل کے لیے بھی کام کرتے ہیں جو کم از کم
 دباؤ کے مہیے کی تخفیف کرتے ہیں، ورثہ ہماری بے توجہی سے جنگ امن پر حاوی ہو جاتی۔

کسی حقیقت پسند کے لیے امن طاقت کے ایک دیر پا انتظام کے مماثل ہوتا ہے، جب کہ ایک مثالیت
 پسند کے لیے، ایسا ٹکڑا اور واضح ہدف ہوتا ہے جو اس کے حصول کے طریقے کی مشکل کو نظروں سے اوجھل کر
 دیتا ہے۔ مگر thermonuclear نیکٹولوجی کے اس عہد میں دونوں میں سے کوئی بھی انداز نظر انسان کی

سلامتی کو یقینی نہیں بنا سکتا۔ اس کے بجائے، امن پر، ایک آدرش کی طرح عمل کرنا چاہیے۔ ایک احساس ذمہ داری اور موافقت ہی کو تمام قوموں کے رویے کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ انصاف کا کوئی مشترک رویہ تلاش کیا جاسکتا ہے، اور اس کو ضرور تلاش کیا جانا چاہیے، کہ اس سے پہلو ترقی صرف "منصفانہ" جنگیں ہی بردہ پا کریں گی۔

نوبل انعام کی قبولیت کی اپنی تقریر میں ولیم فاکنر (William Faulkner) نے امید ظاہر کی تھی کہ "انسان صرف بردداشت ہی نہیں کرے گا، وہ حاوی ہو جائے گا۔" ہم آج ایسی پیچیدہ دنیا میں رہ رہے ہیں جس کو صرف برداشت کرنے کے لیے ہی انسان کو اس پر حاوی ہونا پڑے گا۔ زیادہ تیز رفتار ٹیکنالوجی پر جو اس کے قابو سے اور متنازعہ اظہار سے نکل جانے والی ہے جنھوں نے اس کی امن پسند فطرت کو جھٹلایا دیا ہے۔

یقینی جنگ نے ویت نام کو ایک غیر یقینی امن دیا ہے۔ جہاں کبھی صرف ناامیدی اور درددلری تھی، وہاں آج امید ہے، خواہ وہ کتنی ہی کم زور کیوں نہ ہو۔ شرق وسطیٰ کی کم زور جنگ بندی پر ایک عمل جنگ کا آسیب لہرا رہا ہے۔ ہندوچین میں، شرق وسطیٰ میں، کھل بھی، دیر پا امن نہیں قائم ہو سکتا جب تک کہ محارب قوموں کو سیاہی ہم ساری کے مقابلے میں اسلحہ بند تازے کی فضولیت کا احساس نہیں ہو جاتا۔

امریکا کا ہدف امن کا ایک ڈھانچا کھڑا کرنا ہے، ایسا امن جس میں تمام قوموں کی حصے داری ہو اور سب سچے دل سے اس کے وفادار ہوں۔ ہم ایک دیر پا دنیا کی تلاش میں ہیں، محض ایک ہدف کی طرح نہیں، بلکہ ایک عمل کی طرح جو ایک پڑ سکون سماج کی شریکانہ انسانی توقعات کو پورا کرے۔

اگر امن، ایک آدرش کی طرح، ہمارا مقصود ہو، تو امن کا تجربہ ہمارا شعار ہونا چاہیے۔ اس طرح کرنے کے لیے ہر قوم کو یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ اور امن کے فیصلے ان کی قوم کے دکھ یا خوش حالی پر منتج ہوتے ہیں۔ انٹریڈ نوبل کو احساس تھا کہ امن کسی ایک شخص یا ایک قوم کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ لوگوں کی وسیع انظرری اور تمام دنیا کے لیے نیک تمناؤں کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ لوگوں کی انفرادی کامیابیوں کا یاد رکھنا ضروری نہیں ہوتا، اس لیے کہ اگر دیر پا امن قائم ہوتا ہے تو یہ انسانیت کی کامیابی ہوگی۔

ان خیالات کے ساتھ میں اس انعام کے لیے جہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔

ولی برانت

اعلان تجلیل

جلالت مآب، محققین و حضرات!

اس نوبل انعام کی تقریب پر ایک نئی جنگ کے ماسے لہرا رہے ہیں۔

وہ زمین جس پر، پچھلے برس کے انعام پانے والے نارمن بورلاگ (Norman Borlaug) کی تحقیق کے نتیجے میں گیسوں کی فصل کی سنہری بالیاں لہرائیں تھیں، آج ہم کے گڑبڑ کا قبرستان بنی ہوئی ہے۔
دو ترقی پذیر قومیں جنہیں افلاس کے چنگل سے نکلنے کے لیے امن کی اشد ضرورت ہے، جنگ میں منہر ہو رہے ہیں۔

جس طرح دنیا بھر کے سیاست داں معصوم جانوں پر لگتے ہوئے سنے زخموں سے اپنی آنکھیں چمکائے اور دلوں کو پتھر کیے پیٹھے ہیں، قابل شرم ہے۔

اس بھیاں تک پس منظر میں، ہم ان کے شکر گزار ہیں جو امن کے لیے محنت کرتے ہیں۔

ہماری آنکھیں آج ڈاکٹر رالف بنش (Ralph Bunche) کی متلاشی ہیں جو آج ہم میں نہیں رہے۔
ڈاکٹر رالف بنش کو عرب اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی پر کام کرنے کے لیے 1950 کا نوبل امن دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر بنش زندگی بھر امن کی وکالت کرتے رہے۔ نسلوں اور عوام کے درمیان امن کے قیام کے لیے۔ وہ سمجھیں برس تک اقوام متحدہ کے سب سے بے غرض کارکنوں میں سے ایک تھے۔
ما رو یانی پاریمان کی نوبل کمیٹی اُن کو ہمیشہ تشکر آمیز جذبات کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھے گی۔

پہلے نوبل امن انعام دیے جانے کو ستر برس ہو گئے ہیں۔ 1901 کے انعام میں سوئس باشندے
ژاں ہنری ڈونانٹ (Jean Henry Dunant) اور فرانسیسی باشندے فریڈرک پسی (Frédéric
Passy) شریک تھے۔ جنگ کے قیدی اور معذور ہونے والوں کے، ہنری ڈونانٹ کے درمندانہ کام کے

نتیجہ

میں 1864 میں ریڈ کراس وجود میں آئی اور جینیوا کنونشن کی بنیاد پڑی تھی۔ بین الاقوامی تنازعات میں فریڈریک ہلمس کی بالارادہ عائلی کے کام کے نتیجے میں، جہاں اور بہت کچھ ہوا تھا، 1889 ایک بین الاقوامی مالی اتحاد کی تشکیل بھی ہوئی تھی۔

اس سنگ میل پر ٹھہر کر اس شخص کی بابت سوچنا فطری معلوم ہوتا ہے، جس نے اپنی بے مثال وصیت میں عالمی سطح پر جنرل القدر نوبل انعامات دینے کے لیے ادارے کی بنیاد رکھی تھی۔

بہت سے لوگوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ آخریڈ نوبل اسلئے کیسیا کا ماہر تھا، تو اس نے امن کے انعام کے لیے اپنی جائیداد کا پانچواں حصہ دینے کا فیصلہ کیوں کیا؟

اس کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انگریز مشاعرے کے تصورات امن کے زیر اثر اس نے ایسا فیصلہ کیا تھا، یا غالباً یہ امن کی بڑی طرف دار برتھان سٹمر (Berta von Suttner) سے اس کی قربت رفاقت کا نتیجہ تھا، جس نے اس کو اس راہ پر لگا دیا۔ برتھان کے نام اپنے ایک خط میں نوبل نے عالمی امن کے لیے باقاعدہ کام کرنے کے امکانات پر بحث کی تھی، جو اس وقت ایک غیر معمولی خیال تھا، اور جیسا کہ ہم نے دیکھا، یہ قیصرانہ بات ہو اس نے لکھا تھا، ”اس کا بہترین حل ایک مذاق ہو سکتا ہے، جس میں تمام حکومتیں شامل ہوں، تاکہ کسی حملے کی صورت میں سب مل کر مقابلہ کریں۔ اور بعد میں یہی جرنوی طور پر فوجوں کی واپسی کا باعث ہو سکے۔“

1945 میں اقوام متحدہ کی تشکیل کے ساتھ نوبل کا تصور اس ادارے کے فرمان کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول بن گیا۔

گزشتہ 70 برسوں میں نوبل کے امن کے خواب کی تعبیر کے حصول کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں۔ اس برس مارویائی پاریمان کی نوبل کمیٹی نے امن کا انعام ایک ایسے آدمی کو دینے کا فیصلہ کیا ہے، اپنے پوری عملی سیاسی زندگی میں جس کے نزدیک امن کا آدرش ایک راہ نمائندارے کی مانند رہا ہے۔ میری مراد [جرمنی نے] وفاقی چانسلر ویلی ہمانٹ سے ہے۔

ویلی ہمانٹ چوتھے جرمن باشندے ہیں جس کو نوبل امن انعام دیا گیا ہے: ان سے پہلے جن کو یہ انعام دیا گیا تھا وہ وزیر خارجہ گئٹاف اسٹریس مان (Gustav Stresemann) تاریخ داں لڈویگ کوئی ڈے (Ludwig Quidde) اور صحافی کارل فان آزیٹسکی (Carl von Ossietzky) تھے۔

ہمانٹ 1913 میں لیوپک میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا ابتدائی دور شباب جدید جرمنی کی تاریخ کے سب سے الم ناک دور میں گزرا تھا جب تاسیت کا فروغ ہو رہا تھا، ہٹلر کی آمرانہ ریاست انسانیت کے ساتھ ظلمانہ سلوک پر عمل پیرا تھی، جو پہلے تو جرمنی تک محدود تھا، مگر بعد میں یورپ کے دوسرے ملکوں تک پھیل گیا تھا۔ ویلی ہمانٹ کی زندگی کا انداز ہی تاسی حکومت کے خلاف جدوجہد سے عبادت تھا۔ 1933 میں ہی،

جب ان کی عمر صرف انیس برس تھی، وہ ماروے میں سیاسی مہاجر ہو گئے تھے ماروے میں انہوں نے اپنے دو بچپن کے سات اہم برس ایک فعال صحافی کے طور پر گزارے۔

برانت اپنا سارا وقت کام، تعلیم یا تھیوریوں کے مظالم کا نشانہ بننے والوں کی مدد میں صرف کرتے جو جرمنی کے باہر مہاجرین کی زندگی گزار رہے ہوتے یا جرمنی کے اندر حقوق کی کمیوں میں محصور ہوتے تھے۔
23 نومبر 1936 کو مارویائی پارلیمنٹ کی نوٹیل کمیٹی نے جرمن مصلحت کارل فان آرتیشکی کو انعام دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ آرتیشکی die Welkbühne نامی رسالے سے منسلک صحافی تھے جنہوں نے جرمنی کی فوجوں کی تعیناتی سے لگن طور پر اختلاف کیا تھا۔ آرتیشکی اس مہم گرفتار کر لیے گئے جس رات پارلیمنٹ کی عمارت میں آگ لگی تھی۔ اس کے بعد ان کو ہٹلر کے مقبوت خانے، Papenburg-Esterwegen میں پانچ برس کی قید ہو گئی۔

1946 میں البرٹ آئن اسٹائن (Albert Einstein) نے آرتیشکی کو انعام دیے جانے کے بارے لکھا تھا: ”اس سادہ سے فانی انسان کو عظمت کے اس بڑے اعزاز کی عطا مارویائی پارلیمنٹ کی نوٹیل کمیٹی کی اہمیت پر ہمیشہ دلیل رہے گی۔“

پوری دنیا میں آرتیشکی کی امیدواری زیر بحث آئی تھی۔ اس موضوع بحث پر اکتھار خیال کرنے والوں میں ایک ہائینرک مان (Heinrich Mann) بھی تھا جس نے لکھا تھا، ”آرتی، جو اب لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا ہے، بڑا خوش قسمت ہے کہ دنیا کے ضمیر نے اس کے، اور اس کی زبان کے لیے آواز مانی ہے۔“

1935 میں آرتیشکی کو انعام دیے جانے کے واقعے کو یاد کرتے ہوئے ہمیں اس محنت کو نہیں بھولنا چاہیے جو نوجوان جرمن مہاجر ولی برانت نے آرتیشکی کی امیدواری کے بارے میں کی تھی۔

جب آرتیشکی کو انعام دینا طے پا گیا تھا، انہوں نے کسی قسم کے خوف کو راستے کا پتھر نہیں بننے دیا۔ متفید اور موت کا منتظر ہونے کے باوجود بھی انہوں نے انعام قبول کرنے سے انکار کے لیے Göring کے دباؤ کو رد کر دیا تھا۔

1940 میں جب جنگ کی آگ ماروے تک پہنچ چکی تھی، دوسرے لوگوں کی طرح، ولی برانت کو بھی ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ جب ہٹلر نے ولی برانت کی جرمن شہریت منسوخ کر دی تو مارویائی پارلیمنٹ نے ان کو ماروے کی شہریت عطا کر دی تھی۔ اس وقت وہ سوئیڈن میں مقیم تھے۔ سوئیڈن میں قیام کے دوران ولی برانت نے جرمنی میں جمہوریت اور ماروے کی آزادی کے لیے کام کیا۔ ماروے میں شاید ہی ایسا کوئی صحافی ہوگا جس نے ماروے کی جدوجہد آزادی کے لیے ولی برانت سے زیادہ مضامین اور کتابیں لکھی ہوں۔ ان کی تحریروں میں سے چند ہی کا ذکر کیا جا سکتا ہے: ماروے میں جنگ، ماروے کی جدوجہد، اوسلو ولی ورکی کی جدوجہد، ماروے کی آزادی کا سفر، وغیرہ جیسے کتنے ہی مضامین اور خطبات سوئیڈن میں ماروے کے مسئلے سے آگاہی کے لیے، اور جنگ کی شروعات میں ماروے پر قبضے سے آزادی کے لیے لکھے تھے۔

ہمارا ملک اُس شیطانی دور میں وولی برائنٹ کے کارناموں کا بے انتہا ممنون ہے۔

1945 کے موسم بہار میں امن کے قیام کے بعد ماروے اور جرمنی ہی نہیں بہت سارے ملکوں نے ان کو عہدوں کی پیش کش کی تھی۔ ایک برس بعد برلین میں ماروے کے پریس انٹرویو کی حیثیت میں انھوں نے جرمنی میں قیام کیا، جو جنگ میں مکمل شکست کے باعث کھنڈر بن چکا تھا۔

معاشیاتی اور اخلاقی اعتبار سے جرمنی کی صفر کے برابر حیثیت ہونے کے باوجود وولی برائنٹ نے جمہورت سے محبت کرنے والوں کے ساتھ مل کر ایک جمہوری جرمنی کی تعمیر کے لیے کام کیا۔

جنگ کے بعد کے عرصے میں وولی برائنٹ نے جرمنی میں جو کام کیا۔ اس میں برلین کی آزادی کے لیے کی گئی باہمت کوششوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ماروے اور دیگرے ممالک کی برلین کی آزادی کے لیے جدوجہد اس خیال سے منسلک رہی ہوگی کہ برلین کی شکست سے مراد یورپ میں امن کی شکست ہوگی۔

ولی برائنٹ نے اپنی کتاب My Way to Berlin میں لکھا ہے، ”اگر ہم نے برلین دے دیا ہوتا تو آج دنیا کا امن اور بھی کم زور ہو جاتا۔ امن کا ہونا ضروری تو ہے، مگر آزادی اور انصاف کے حصول کے لیے بھی کم ضروری نہیں۔“

ولی برائنٹ نے برلین کے میئر ہونے کے دوران کے نازک حالات میں جس خود اعتمادی اور ہمت کا مظاہرہ کیا ہے۔ 1961 میں بنائی جانے والی دیوار کے ذریعے پیدا ہونے والے بے تحاشا سیاسی جبر اور بے اطمینانی کے باوجود اس نے برلین کو مکمل تباہی کے خطرے سے بچا لیا ہے۔

برلین کے بعد، جرمن پارلیمنٹ Bundestag کے رکن ہو کر وولی برائنٹ بان چلے گئے۔ وہاں وہ Social Democratic Party کے لیڈر بنے اور 1965، 1961 اور 1969 میں پارٹی کے چانسلر کے امیدوار بنے۔

1966 کے سیاسی حالات میں جرمنی میں دو اتحادیوں Christian Democrats اور Social Democrats نے مل کر حکومت بنائی۔ اس حکومت میں وولی برائنٹ وزیر خارجہ اور نائب چانسلر بنے۔

ان بنیادی اور وسیع سیاسی ذمے داریوں کے تناظر میں وہ اپنی حکومت کی طرف سے بہت سے بین الاقوامی اقدام کر سکے تھے جن کے نتیجے میں بین الاقوامی دیتانت کی موجودہ امید برقی ہے۔ جرمنی کی خارجہ پالیسی کے مزید مخصوص اہم ہدف اس وقت قائم ہوئے جب 1969 میں وولی برائنٹ وفاق کے چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

جرمنی کی تاریخ اور وولی برائنٹ کی زندگی میں یہ ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں، 1969 میں جرمنی میں اس بار Social Democrats اور Free Democrats کے اتحاد سے ایک نئی حکومت وجود میں آئی تھی۔ نئی حکومت کے اعلان نے کہ وولی برائنٹ چانسلر اور وائٹرشیل (Walter Scheel) وزیر خارجہ ہوں گے، یہ واضح کر دیا تھا کہ حکومت پچھلی پالیسی کے

تسلسل اور تجدد پر عمل چرارہنا چاہتی ہے۔ خارجہ پالیسی کے معاملے میں بھی پچھلی پالیسیوں کے تسلسل اور کچھ نئے اثا روں پر زور دیا گیا تھا۔

1948 میں جب وفاقی جمہوریہ جی ٹی کا نراڈ آڈن اور (Konrad Adenauer) اس کے پہلے چانسلر بنے تھے۔ پہلے حکومتی بیان میں آڈن اور نے کہا تھا کہ مغربی جرمنی مغربی یورپی ممالک کے ساتھ ہوگا۔ اس بین الاقوامی کیفیت میں وفاقی جمہوریہ نے مغربی ملکوں کے ساتھ معاشیاتی اور فوجی تعاون کی خواہش کی تھی۔ دوسرے بہت سے ملکوں نے بھی پیچھے دیکھنے کے بجائے آگے دیکھنے اور تھک نظر تو معیوں اور سرحدوں کے اس پار دیکھنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ ایک ایسی پرامن ہم بودیت کی تعمیر ہو، جرمنی بھی جس کا حصہ بنے۔ امن کی یہی پالیسی تھی جس نے جہاتی اور اس سے متعلق خطرات سے باہر نکلنے میں جرمنی کی مدد کی تھی، جس کے نتیجے میں مذاقی روم پر دستخط ہوئے اور 1958 میں یورپی یونین کی بنیاد پڑی تھی۔

حکومت کے سربراہ کی حیثیت میں ولی برانت نے مغربی یورپی تعاون کے اصولوں سے روگردانی نہیں کی ہے اس کے برعکس، انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک طاقت ور اور آپس میں تعاون کرنے والے مغربی یورپ کے لیے مشرقی اور مغربی یورپ کے درمیان مقابلے کی فضا کو تعاون میں بدلنا ہوگا۔ جیسا کہ سب کو علم ہے، چھٹے عشرے کی ابتدا میں جب کمیونٹی کی توسیع کی کوشش شروع کی گئی تو یورپی کمیونٹی کے اندر ایک ظہور اف پیدا ہو گیا تھا۔

ہیگ میں منعقد ہونے والی 1969 کی سربراہ ملاقات میں برانت نے کمیونٹی کی توسیع کا ایک اعلان پیش کیا تھا جو بہت اہمیت کا حامل ثابت ہوا ہے۔ جرمنی کی یہ پیش قدمی یورپی یونین کی توسیع کا نقطہ آغاز تھی۔ 6 نومبر 1970 کی سربراہ ملاقات میں چانسلر نے کہا تھا، ”وفاقی جمہوریہ جرمنی مغربی یورپی اتحاد کی وسعت، استحکام اور تعاون کی کوششوں کا مرکز رہی ہے۔ اور اب جو کچھ مشرقی یورپی ہے اس کو بھی جرمنی کے اقدامات سے ہم رشتہ کیا جائے گا۔“

28 اکتوبر 1969 کو برانت نے پارلیمان کے اجلاس میں، جس میں حکومت کی پالیسی پر بحث ہو رہی تھی، کہا تھا، ”NATO کی میں برس کی کامیابی ہمارے مستقبل کی حفاظت کی ضمانت ہے۔ اس مذاقی کا اتحاد یورپ میں دینامیت کے لیے لاجدی ہے۔“

مغربی یورپ کے معاشیاتی اور سیاسی استحکام اور اتحاد کی بنیاد پر، اور NATO کے چند ممالک کی مدد سے برانت کی حکومت نے سوویت یونین اور دوسری مشرقی یورپی ریاستوں کے درمیان دینامیت پر مزید عملی پالیسی تیار کی۔

نوبل کمیٹی نے ویلی برانت کو امن کا انعام دینے کے جواز میں اپنی یادداشت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے، ”نوبل کمیٹی ان شخصوں اقدامات کو بہت اہم جانتی ہے جو ایسے دینامیت کی طرف لے جاسکتے ہیں، جو ویلی برانت نے وفاق جرمنی کے وزیر خارجہ کی حیثیت میں 1966 سے اور چانسلر کی حیثیت میں 1968 میں کیے تھے۔“

ان ٹھوس اقدامات کا ذکر 28 اکتوبر 1969 میں ہونے والے سرکاری بیان کی چوتھی شق میں کیا گیا ہے۔ پہلی شق ان اقدامات کو بیان کرتی ہے جو یورپی یونین کی گہرائی اور وسعت کے لیے، استحکام اور اس میں اندرونی سیاسی تعاون کے ضمن میں کیے گئے تھے۔

دوسری شق سوویت یونین سے عدم تشدد کے معاہدے کا تذکرہ کرتی ہے۔ تیسری شق پولینڈ سے مذاکرات اور اس قوم کے ساتھ دشتوں کی بحالی کے اقدامات سے متعلق ہے۔ چوتھی شق میں وہ بیان درج ہے جو اسلحے کے عدم پھیلاؤ پر دستخط کی خواہش کے بارے میں دیا گیا تھا۔ حکومت نے پہلے ہی برس اس معاہدے پر دستخط کر دیے تھے۔ اس پہلے قدم کے ساتھ ہی برائٹ کی حکومت نے مشرق اور مغرب کے درمیان با معنی مذاکرات کے لیے راستہ ہموار کر دیا تھا۔

اس پھر تیسرے عمل کے ساتھ انھوں نے دینانت کے بارے میں وفاقی جمہوریہ کی خواہش کی وضاحت اور اعتماد میں اضافہ کیا۔ ایسی دینانت کی پالیسی کے لیے جو یورپ کے لوگوں کو قریب لے آئے، یہ ضروری ہوگا کہ دونوں حریف مرد جنگ کی ختمیوں سے باہر نکل آئیں۔ برائٹ نے After the Victory کے عنوان سے لکھی کتاب میں جو 1944 میں اسٹاک ہوم سے شائع ہوئی تھی، لکھا تھا، ”ایک دن آئے گا جب جنگ کی تمام تر ترسلیں بھلا دی جائیں گی۔ اسی دن تمام یورپی لوگوں کو ایک [نیا] یورپ حاصل ہوگا۔“

برائٹ کی مشرقی یورپ کی پالیسی نظریوں کو دفن کرنے اور جنگ کی اجتماعی قبروں سے بالا ہو کر تعاون کی ایک کوشش ہے۔ ان کے نزدیک تعاون کتنا ضروری تھا، اس کا اظہار انھوں نے وارسا کی پس ماندہ ہستی میں واقع یہودی یادگار سے سامنے گھٹنے ٹیک کر کیا تھا۔

سوویت یونین کے ساتھ جرمنی کے تعلقات میں نرمی برائٹ کی کوششوں کا پہلا ٹھوس نتیجہ تھی جو عدم تشدد کے بارے میں 12 اگست 1970 کو ماسکو میں ہونے والے معاہدے پر دستخط سے نکلا تھا۔ اس معاہدے میں اس بات پر اتفاق کیا گیا ہے کہ تمام متنازع مسائل کو پرامن طریقوں سے حل کیا جائے گا، اور یہ بھی کہ امن اسی وقت مستحکم ہوگا جب دونوں ملک ایک دوسرے کی سرحدوں کی پامنائی سے احتراز کریں گے۔ دونوں ملکوں نے اعلان کیا کہ دوسرے ملکوں پر ان کے کوئی سرحدی دعوے نہیں ہیں اور یہ بھی کہ وہ تمام ملکوں کی موجودہ سرحدوں کا احترام کریں گے۔ اس معاہدے میں زیادہ معاشیاتی، تکنیکی و رہنمائی تعاون کی باہمی خواہشات بھی شامل کی گئی تھیں۔

وفاقی جمہوریہ نے وزیر خارجہ والٹر شیل کے ایک خط کے ذریعے جو سوویت یونین کے وزیر خارجہ گرومیکو (Gromyko) کو لکھا گیا، اتفاق کیا تھا کہ یہ معاہدہ وفاقی جمہوریہ جرمنی کے سیاسی عزائم سے متصادم نہیں ہے۔ اس طرح وفاقی جمہوریہ جرمنی یورپ میں ایک پرامن نظام کے قیام کے لیے اقدام کرے گی جو جرمن محام کے، خلق خود ارادیت کے ذریعے، دوبارہ متحد ہونے کو ممکن بنائے گا۔

اس معاہدے کی دستخط کی تقریب میں ولی برائٹ نے جرمن عوام کے لیے ٹیلی ویژن پر تقریر کی تھی جس میں انہوں نے حکومتی اعلان کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا، ”ہمارے قومی مفادات ہمیں مشرق اور مغرب کے درمیان کھڑے رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ہمارے ملک کو مغربی اور مشرقی یورپ کے درمیان تعاون اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جرمنی کے عوام کو سعودیت یونین کے ساتھ اور مشرقی یورپ کے تمام عوام کے ساتھ حقیقی امن کی ضرورت ہے۔ یہی ہمارا رہنما اصول رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا، اور امن کے ایسے ہی کام میں یہ معاہدہ معاون ہوگا۔“

ماسکو میں 7 دسمبر 1970 کو دستخط ہونے والے معاہدے کے فوراً بعد پولینڈ کے ساتھ رشتوں کی بحالی کا ایک معاہدہ ہو گیا۔ اس معاہدے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ وفاقی جمہوریہ نے پولینڈ کی مغربی سرحد Oder-Neisse line کو تسلیم کر لیا تھا۔ مزید یہ بھی طے پا گیا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان اب کوئی علاقائی تنازعہ باقی نہیں رہا۔

جرمنی کی ایک خواہش کہ پولینڈ میں رہنے والے جرمن نژاد اپنی مرضی سے جب چاہیں پولینڈ چھوڑ سکتے ہیں، معاہدے میں تو شامل نہیں تھی پھر بھی اس حق کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔

وارسا میں کی گئی ایک تقریر میں برائٹ نے جرمن عوام سے کہا کہ بہت کچھ کہا تھا، مندرجہ ذیل باتیں خصوصی طور پر کہیں تجھیں، ”میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ یہ ایک مشکل سفر ہے، مگر یہ مستقبل میں امن کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہوگا۔ اور ہمارا معاہدہ ایک منحوس ماضی اور قربانیوں کا علامتی اختتام ہوگا۔ یہ عوام اور قوموں کے درمیان ایک نیا تعمیر کرے گا۔ یہ ان خاندانوں کے ملاپ کے راستے کھولے گا جو دور ہو گئے ہیں اور ایسی سرحدوں کے لیے جو پہلے سے کم علاحدہ کرتی ہوں۔“

وفاقی جمہوریہ کی حکومت نے ان دو معاہدوں کو پارلیمان کی توثیق کے لیے پیش کرنے کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ چاروں قابض طاقتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہونا چاہیے جس کی رو سے جرمن وفاقی جمہوریہ کے لیے مغربی برلن تک ایک راہ داری مہیا کی جائے گی۔

چاروں طاقتوں کے درمیان اس سال 3 ستمبر میں کیے جانے والے معاہدے کے ساتھ یہ شرط بظاہر پوری کر دی گئی ہے۔ اس معاہدے میں چاروں طاقتیں اس بات پر متفق ہو گئی ہیں کہ وہ برلن کے معاملے میں فوجی طاقت استعمال نہیں کریں گی اور تمام مسائل پر امن طریقے سے حل کیے جائیں گے۔

وفاقی جمہوریہ اور مغربی برلن کے درمیان نقل و حرکت میں تعاون کیا جا رہا ہے اور مغربی برلن کے باشندوں کے مشرقی برلن اور DDR کے سفر کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ یہ حقیقت کہ مغربی برلن کے باشندے ”دیوار“ کے اس پار رہ جانے والے اہل خاندان سے ملنے جا سکیں گے، انسانی نقطہ نگاہ سے بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس معاہدے نے اس دور کو اپنے انجام تک پہنچا دیا ہے جس میں مغربی برلن، مشرقی اور مغربی طاقتوں کے درمیان تنازعے کی جڑاں گماہ بنا ہوا تھا، تنازعات جنہوں نے سیاسی مجرمانہ اور جنگی

کیفیات پیدا کی ہیں۔

برائٹ نے اس برس نومبر میں [اخبار] Die Zeit کے اپنے ایڈیٹر میں مندرجہ ذیل باتیں کہی ہیں:

”اس میں کوئی شک نہیں کہ برلین معاہدے شہر کے طویل المیعاد مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب ہم یورپی امن نظام کے بہت قریب پہنچ جائیں گے۔ دیوار اب بھی موجود ہے، مگر اب اس کو پار کرنا کم مشکل رہ گیا ہے۔“

میں نے ان چار مشکل معاملات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو یورپی برائٹ کی تعاون اور دیانت کی پالیسی کا ٹھکانہ ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کی یہ پالیسی یورپ کے تناؤ کو کم کرنے کے اقدامات کے لیے راستہ ہموار کر سکے۔ یورپی برائٹ نے خود اپنے ایک ایڈیٹر میں کہا ہے کہ اس بات کی بہت امید ہو گئی ہے کہ یورپ میں، اور بالخصوص مرکزی یورپ میں، فوجوں اور اسلحے میں باہمی طور پر تخفیف ہو سکے گی۔

ہمیں امید کرنی چاہیے کہ یورپ میں اس سمت میں پیش رفت عالمی امن کے نظام کی بنیاد بنے گی۔

چھٹے سال سوویت روس کے ادب کے نوبل انعام یافتہ ادیب الیگزینڈر سولزے بیتسن نے انعام دیے جانے والی تقریب کے بارے میں سوینڈش اکادمی کو ایک خط لکھا جس میں وہ کہتے ہیں: ”۔۔۔ پھر بھی میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ امن کے نوبل انعام کی تقریب انسانی حقوق کے دن منعقد ہوتی ہے۔ نوبل انعام پانے والے اس اتفاق کی ذمہ داری سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔“

یورپ کے لیے یورپی برائٹ کا امن منصوبہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسی ذمہ داری موجود ہے۔ امن کے لیے ان کے کام کا مطلب ہے کہ تمام ملکوں کے عوام کے لیے بلا خوف و خطر باعزت زندگی گزارنے کے امکانات ہوں۔ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ ایسے یورپ میں زندگی گزاریں جس میں نہ علاحدہ کرنے والی دیواریں ہوں اور نہ ایسی سرحدیں ہوں جن کی پاسبانی راکٹوں کے ذریعے کی جاتی ہو، ایسا یورپ جس میں Henrik Wergeland کے الفاظ میں، گلاب کی چھاڑی کی محض ایک شاخ ہی سرحد کی نشان دہی کے لیے کافی ہو۔

یورپی برائٹ کے امن کے کام کی ابتدا مشکل سے ہوئی تھی۔ ہم نے تاریخ کی سب سے زیادہ بد بدلت والی جنگوں میں سے ایک کا تجربہ کیا ہے۔ ہم جنوبی ایشیا کی ایک تباہ کن جنگ کے درمیان ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے عوام ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو رہے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگوں کے لیے تیاریاں ہو رہی ہیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں بچے بھوک سے مر رہے ہیں اور کروڑوں ہاتھ ایک وقت کی غذا کی دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہیں۔ ان مفلوک الحال ملکوں میں اگر کوئی شے فراواں لگتی ہے تو وہ اسلحہ ہے۔ اس سے مجھے فریضگیں روز ویلٹ کے مندرجہ ذیل الفاظ یاد آ رہے ہیں، ”ہمیں جنگ کے اختتام سے زیادہ تمام جنگوں کی ابتدا کے اختتام کی ضرورت ہے۔“

میں اس انعام کو بین الاقوامی جنگل میں فعال ایک سیاست داں کو عطا کرنے میں امید کی جھلک دیکھ رہا ہوں۔ اس طرح، ان پر اب ذرا زیادہ ذمہ داری عائد ہو رہی ہے کہ وہ ایسا کردار ادا کریں جس سے ایک

زمانے سے چاہا ہوا امن کا ثمرہ حاصل ہو سکے۔ ہم خود دیکھ سکتے ہیں کہ ویلی برانت کی پالیسی سے سیاسی برف پتھلی شورو مچ ہو گئی ہے، اور یہ حقیقت یورپ کی نئی زندگی کے لیے نئی قسم کی امیدیں پیدا کر رہی ہے۔

بہت سے جنگ اور جنگ میں بھگت ڈالنے والے ہمیں یاد دلاتے رہیں گے کہ امن کا حصول اور اس کو قائم کرنا آسان اور یک وقت کی کام نہیں۔ امن کے لیے کام کرنا ایک مسلسل عمل سے عبارت ہے۔ یہ ایک منصوبہ ہوتا ہے جس پر ہر روز، بار بار کام کرنا پڑتا ہے۔

مگر عوام تو بغیر یقین اور امید کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ہم امید بھی اور یقین بھی رکھیں گے کہ پرانے دشمنوں کی سرحدوں کے اس پار مصالحت کی کوشش کو اسی جذبے کے رنگ میں لیا جائے جس میں وہ کی جا رہی ہے۔

اگر یہ امیدیں پوری ہوں تو ویلی برانت ہماری تاریخ میں امن کے اور مصالحت کے عظیم حیرمن چانسلر کی حیثیت میں زندہ رہیں گے۔

نوبل کمیٹی کی صدر نشین Mrs. Aase Lionæs کی زبانی

خطبہ:

ہمارے عہد کی امن پالیسی

1971 (ا) کا نوبل امن انعام ایسے شخص کو دیا گیا ہے جو اب بھی سیاست میں فعال ہے؛ لہذا یہ اس کی موجودہ نہ کہ ماضی کی کوششوں کے اعتراف میں ہی دیا جاسکتا ہے۔

کل میں نے شکرنے کا اظہار کیا تھا، آج میں اپنے عہد کی امن پالیسی پر بات کرنا چاہوں گا۔ اپنے ذاتی تجربات کے بارے میں اور فطری طور پر، اس کی بابت کہ میرا ملک کیا کر سکتا ہے، بلکہ اس بارے میں کہ ہم یورپ میں، اور یورپ سے باہر کی دنیا کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ مگر یہ بہت کم ہے، جو ہندوستان اور پاکستان کی لام بندی کی نئی جنگ میں ہماری لا چاری سے صاف ظاہر ہے۔

یہی وقت ہے جب میں اپنے اصولوں کو صاف طور پر بیان کر سکتا ہوں؛ سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ جنگ کو محدود ہی نہیں، بالکل ختم کر دینا چاہیے۔ کسی قسم کا قومی مفاد امن کی مشترکہ ذمہ داری سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ تمام خارجہ تعلقات میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے، لہذا یورپی اور عالمی تحفظ کے لیے خارجہ پالیسی کا مقصد ہونا چاہیے کہ تناؤ میں کمی ہو اور سرحدوں کے پار رسل و رسائل میں انصاف ہو۔

وزیر خارجہ و انٹرنیشنل اور میں، دونوں اس اصول کے قائل ہیں کہ امن سے محبت کرنے کا ارادہ ہی کافی

نہیں ہوتا، ہمیں امن کی تنظیم بھی کرنی چاہیے۔

ہم جنگ لڑتے ہیں، ہم امن بحال کرتے ہیں، مگر جب یہ ایک مستقل فریضہ بن جائے تو امن بھی ایک چیلنج بننے لگتا ہے۔

جنگ کو کس طرح روکا جائے، یہ ایسا سوال ہے جو یورپ کی روایات میں شامل ہے، یورپ کے پاس یہ سوال کرنے کے لیے بہت سی وجوہات رہی ہیں۔ جو سیاست دان اپنے روزانہ کے مفادات کے تنازعے میں عادلانہ امن کی خدمت کرتا ہے اسے ان اخلاقی ذمہ داریوں سے طاقت حاصل ہوتی ہے جو اس کی بچھلی نسلوں نے اکٹھا کیا ہوتا ہے۔

ہمارے اخلاقی اور سماجی تصورات کی تشکیل و مزارعہ کی عیسائیت نے کی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ”منصفانہ جنگ“ کے پرچم تلے کی جانے والے بہتری خلاف ورزیوں کے باوجود اس دنیا میں بھی امن حاصل کرنے کی بار بار کوششیں کی گئی ہیں۔

ہماری قوت کا دوسرا ماخذ ہے انسانیت پرستی اور کھائسکی فلسفہ۔ ایسا نوبل کانٹ نے ریاستوں کی آئینی کنفیڈریشن کی شرط ان لفظوں میں رکھی ہے جو آج کی انسانی نسل کے سامنے ایک واضح سوال پیش کرتے ہیں: انھوں نے کہا تھا کہ ایک دن آئی کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ یا تو وہ قوموں کے قانون کے زیر اثر متحد ہو جائے یا چند ملکوں سے اس تہذیب ہی کا قلع قمع کر دے جس کو اس نے مزارعوں پر اس کی محنت سے بنایا تھا؛ جب ضرورت اس کو مجبور کرے گی کہ وہ ہی کرے جو اس کو بہت پہلے اپنی آزاد و جواہات کی بنا پر کرنا چاہیے تھا۔ تیسرا ماخذ ہے اشتراکیت جو ملک کے اندر اور بیرون ملک سماجی انصاف کی خواہش کے ساتھ موجود ہے۔ اور اس اصرار کے ساتھ کہ اخلاقی قوانین کا اخلاق صرف افراد پر ہی نہیں قوموں اور ریاستوں پر بھی ہونا چاہیے۔

امن کی پالیسی پر عمل ایک سنجیدہ فعل ہے۔ میں خود بھی اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ کوشش کرتا ہوں کہ میرے ملک ہی میں نہیں، دنیا بھر میں دہل اور جھٹ کے لیے راستہ ہموار کیا جائے؛ کہ دلیل متقاضی ہے کہ ہم امن کی خواہش کریں اس لیے کہ امن کی تعمیر موجودگی کا مطلب ہے دہل کی شدید کمی۔

جنگ اب مجبوری نہیں رہی بلکہ غیر مجبوری ہو گئی ہے۔ اگر یہ عام خیال نہیں ہے تب بھی، میرا خیال ہے کہ امن کی پالیسی اس عہد کی اصلی سیاست بن چکی ہے۔

حقیقی سیاست، جس کا جرمنی میں ایک بارہ برس کے عرصے میں بڑی طرح استحصال ہوا ہے، طاعنوقی حقیقت ثابت ہو چکی ہے۔ آج ہم اپنے اور دنیا کے درمیان بدداشت کے قابل توازن کے متلاشی ہیں۔ مگر میری سیاسی اثر پذیری کا میزان یہ کہے کہ میں نے جرمنی میں احساں حقیقت کی راہ ہموار کی ہے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے اپنی زندگی کا حق ادا کر دیا ہے۔

میں اس مقام پر بھی وہی کہہ رہا ہوں جو جرمنی میں کہتا رہتا ہوں: ایک اچھا جرمن قوم پرست نہیں ہو

سکتا۔ ایک اچھا جرمن اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ یورپ کے بلاوے کو رد نہیں کر سکتا۔ یورپ ہی کی ذریعے جرمنی، اپنے اصل کی طرف، اور اپنی تاریخ کی تخلیقی طاقتوں کی طرف واپس آتی رہا ہے۔ ہمارا یورپ، جو دیکھوں اور کامیوں کے تجربے کی پیداوار ہے، دیکھوں کا جبری مقصد ہے۔

(۱۱) بنی نوع انسان کی خود کشی کی دھمکی کے زیر اثر، ہم یودیت خود آدمی کے وجود کے لیے ایک سوال بن چکی ہے۔ ہم یودیت بہت سے قابل قبول امکانات میں سے ایک نہیں، بلکہ یہی اہم کی بقا کا واحد امکان رہ گئی ہے۔

وہ کیا شے ہے جس نے پچھلے پچیس برسوں میں یورپ کی ترقیات کو ایک کردار کی حیثیت عطا کی ہے؟ پہلا دور تھا میٹر ازمر نو تعمیر اور دیو مرا تھا مسلسل تناؤ۔ مشرق اور مغرب کا تنازعہ۔ مشرق اور مغرب کے تنازعے نے، جس کی جڑیں یورپ کے زیادہ حصوں میں نہیں تھیں، بہت بھاری طاقتوں کو ابھارا تھا۔ میں اس عرصے کے دوران برلین میں، جو مشرق اور مغرب کا چوراہا بنا ہوا تھا، بڑی طرح الجھا ہوا تھا۔ میں اس میں اتنا اور اضافہ کرنا چاہوں گا کہ خصوصاً اُن دہشت انگیز برسوں میں، میری ذمہ داریوں میں امن کے تحفظ کے لیے مدد فراہم کرنا بھی شامل تھا۔ اس وقت بھی تھا، اور اب بھی میرا یقین ہے کہ اگر مغرب نے خود کو میرے شہر سے نکل جانے دیا ہوتا تو یہ ان لوگوں کی بد قسمتی تو ہوتی ہی جو اس سے براہ راست متاثر ہوتے، وفاقی جمہوریہ جرمنی، مغربی یورپ، اور ریاست ہائے متحدہ کے ساتھ ساتھ یہ امن کے لیے بھی بے حد خطرناک ہوتا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب اسٹالین نے 1948 کی ناکر بندی کی تھی، اور یہی کچھ اس وقت بھی ہوا تھا جب 1958 میں خروشیف نے اسی قسم کی دھمکی دی تھی۔

میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خود کو ہمیشہ صحیح سمجھتے ہیں۔ میری زندگی کے سفر نے مجھے ہمیشہ اپنی حیثیت پر غور کرنے کی عادت پر مجبور کیا ہے۔ مگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اپنی نوجوانی کے زمانے سے ہی ان بنیادی عقائد نے میری رہنمائی کی ہے جو اپنے ملک میں اور بیرون ملک بھی، اچھی ہمسائیگی کے راستے پر چلاتے رہے ہیں۔

برلین کے میسر کی حیثیت میں مجھے تجربہ ہوا کہ ناک صورت حال ہماری سوچ پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ مجھے اگرچہ اس بات کا اندازہ تھا کہ ثابت قدمی امن کے مقصد کو پورا کرتی ہے۔

1961 اور 1962 کے بحران کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس عرصے کی بارے میں اور کچھ بھی عرض کروں۔ برلین کی دیوار کا، عوام کے لیے افسوس ناک نتائج کے علاوہ، سب سے تکلیف دہ پہلو بچے کچے شہر کی بیہودہ تقسیم تھا۔

اس کبرے گھاؤ کے کچھ بین الاقوامی مشا رہے بھی تھے۔ مغربی طاقتیں مغربی برلین کی سرپرستی کے بارے میں اپنے امانتوں پر اٹھیں۔ مگر بغیر کسی ارادے کے انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ برلین کا مشرقی حصہ پوری طرح ان کے حریف کے قابو میں ہے۔ چاروں طاقتوں کی حیثیت بھی اس حقیقت کو

تبدیل نہیں کر سکتی تھی کہ یہ دیوار دو جوہری طاقتوں کے درمیان خط تقسیم بن چکی ہے۔ اور کسی بھی مقتدر ذمے داری نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ مغربی طاقتوں کو فوجی طاقت کے استعمال اور جنگ کا خطرہ مول لے کر بھی اپنے حصے کا تحفظ کرنا چاہیے، جو ازل دن سے ان سب کی مشترکہ ذمے داری تھی۔

مگر اس کا ایک اور بھی پہلو ہے۔ لفظی کے آڑ میں نامردی۔ یعنی ایسے قانونی نقطوں پر ڈٹ جانا جو کبھی حقیقت نہیں بن سکتے اور ایسے اتفاقات سے نمٹنے کے لیے منسوبے بنانا جو ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ نازک لمحات میں ہمیں خود ہی کچھ کرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا کہ لفظوں کے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

جذباتی احتجاج اپنی جگہ ٹھیک بھی اور ضروری بھی تھے مگر ان سے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔ دیوار اپنی جگہ قائم تھی۔ ہمیں اس کے ساتھ نباہ کرنا سیکھنا تھا، اور مجھے نوجوان مظاہرین کو تباہی سے روکنے کے لیے پولیس طلب کرنی پڑتی تھی۔ برلن کو جانے والے راستوں کی رکاوٹیں اپنی جگہ برقرار تھیں۔ یوہک سے چیکو سلوواکیا کی سرحد تک پھیل چلا بھی، جس نے جرمنی کو تقسیم کر دیا تھا، قائم تھی اور کھری ہوتی جا رہی تھی۔ بھول [جرمن سوتیں تاریخ داں] گولومان (Golo Mann) بغیر ٹرپ کے بتوں کے، تکمیل جاری تھا مگر کچھ ہو نہیں رہا تھا۔ اگر واقعی لوگوں کی امداد کرنی تھی اور امن کو محفوظ کرنا تھا تو یہ ضروری تھا کہ سیاسی امکانات کی اسے سرے سے ترتیب کی جائے۔

کیوبا کے بحران نے، ایک زیادہ ڈرامائی پیمانے پر اور زیادہ خطروں سے لبریز، جوہری دیوؤں کے درمیان بدلتے ہوئے تعلقات اور ان کی حدوں کو واضح کر دیا تھا۔

میں اکتوبر 1962 کی ابتدا میں، جان الف گینڈی سے ملنے گیا تھا۔ انہوں نے ریاست ہائے متحدہ کی جانب رخ کی ہوئی میزائلوں کے خطرات کے بارے میں بات کی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ غلط انداز کی خطرے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، برلن کے چاروں طرف فوجوں کا اثر دھام تھا۔ جب 23 اکتوبر کی شام کو صدر کینیڈی نے کیوبا کے بارے میں اپنی سب سے اہم تقریر کی تھی، تو انہوں نے اس سلسلے میں دو بار پولیس کا بھی ذکر کیا تھا۔ میں ان کے نظریے سے متفق تھا اور جیسا کہ ہوا بھی، ہمارا علاقہ بالکل پر امن رہا۔ احساسِ ذمے داری اور ٹھنڈا دماغ کیوبا کے بحران پر غالب آ گیا تھا۔ یہ ایک معنی خیز تجربہ اور ایک نقطہ عروج تھا۔

چند ہفتے قبل میں نے ہارورڈ میں ہم بودیت کے بارے میں باتیں کی تھیں۔ برلن پر اپنے تجربے کی بنا پر، میں نے کہا تھا کہ حقیقت پسندانہ خود اعتمادی کو سیاسی اور نظریاتی حریف سے ملاقات کرنے سے خوف نہیں کھانا چاہیے۔ موجودہ دور کی بے یقینی کو ہمیں مذہب کرنے کی بھی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ میں نے سوال کیا تھا کہ بات کرنے کی تیاری کے بغیر حریف سے ملاقات کرنے سے کیا حاصل ہوگا؟ بات کرنے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف رعایت نہیں ہوگی، مگر کچھ لو اور کچھ دہ، اور مصالحت کے لیے تیار رہنا امن کے لیے ایک عملی پالیسی ایک عرصے تک ہماری دانش ورانہ اور مادی حیات کا امتحان ہوگی۔

(iii) عالمی جنگ کی درپیش کھائی پر نظر ڈالنے کے بعد ہم نے خود کو عالمی سطح کے مسائل میں گھرا ہوا پایا: بھوک، آبادی میں اضافہ، ماحولیاتی خرابیاں، اور کم ہوتے ہوئے قدرتی وسائل۔ صرف وہی لوگ جو دنیا کے اختتام کو قبول کرتے ہیں یا اس تصور کو دلچسپی ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس حجم کے مسائل کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔

ہمارے زمانے میں پڑھنے لکھنے لوگ ہمیں وہ کچھ فراہم کرتے ہیں جو ان کی مہارت اور اخلاص سے بڑھ کر ہو۔ ان کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ نظریات اور سماجی نظام میں کیا فرق ہوتا ہے۔ انہیں صرف اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ آئی ڈی کا کوئی مستقبل ہے بھی کہ نہیں۔ انہیں ان مسائل کی فکر ہوتی ہے جو ریاستوں کی اپنی سرحدوں کے اس پار اور براعظموں سے بھی پرے ہوتے ہیں۔ وہ سیاست کو مائنس بنا دیتے ہیں، اور یہ مائنس وہ ہوتی ہے جس میں امیر اور زیادہ ترقی یافتہ طاقتوں کو شامل ہونا پڑتا ہے۔ وہ مائنس جس پر کوئی بھی ملک، اپنے لیے مزید کام نہیں کر سکتا۔

ہمیں صرف تشدد سے بچنے کے لیے ہی امن نہیں درکار ہے؛ ہمیں اس کی ضرورت نجات دینے والے تعاون کی بنیاد پر ہوتی ہے، جس کے بارے میں بات کر چکا ہوں۔ اور جس طرح یہ امن کا قیاس کر لیتا ہے، اسی طرح یہ امن کی تخلیق میں مدد بھی دے سکتا ہے، اس لیے کہ جہاں نجات کے لیے تعاون ہوتا ہے وہیں امن بھی ہوتا ہے؛ اور رفتہ رفتہ ان کا باہمی اعتبار بھی قائم ہو جاتا ہے۔ میرا ملک اب بڑی طاقت نہیں رہا، اور نہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہی طور ایک معاشی اور سائنسی طاقت ضرور ہے، اور میں سمجھتا ہوں، بلکہ کہہ بھی سکتا ہوں، کہ ہم ایسے تعاون کے لیے تیار ہیں، کسی وقت بھی اور کہیں بھی، خواہ اس سوال پر حکومت یا حزب اختلاف میں نزاع ہی کیوں نہ ہو۔

آج جس کو امن کی تحقیق کہا جاتا ہے، میں نے اس کے بعض پہلوؤں پر بات کی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پچھلے دس برسوں سے ایک نئی قسم کی بین الاقوامی سیاست کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ تنازعے کے خطرے کو ختم کیے بغیر سرحدوں کو باقی رکھنے کے بے ثمر نتائج کے باوجود ہر دو جنگ کوئی عملی حل پیش کرنے میں ناکام رہی ہے۔ لہذا، متعدد طاقتوں نے تناؤ کو کم کرنے کی غرض سے مشکل خطرات کو حدود کے اندر رکھنے کی کوشش شروع کی۔ کیوبا اور برلن سے انہوں نے تنازعات کو قابو میں رکھنے کے ٹریکیں کیں۔ ڈیگال اور ٹکسن نے مقابلے کے بجائے مصالحت، اور بریڈنبرگ اور کوسینس نے اپنے انداز میں مغرب سے اپنے تعلقات بڑھانے کے راستے اختیار کیے۔

ایک چھوٹے چٹانے پر، آٹھ برس قبل جب میں برلن کا میسر تھا، میرا خیال تھا کہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانا اس سے بہتر ہے کہ کوئی بھی قدم نہ اٹھایا جائے۔ برسوں کی عداوت کے بعد جب لاکھوں افراد کو کرسمس پر اپنے اقربا سے ملنے کے لیے راہ داریاں دی گئیں، تو یہ بذات خود ایک نیا، اور بظاہر متناقض ہو سکتا ہے۔ مگر یہ حالات میں تبدیلی تو ہے جو احساس ہونے کے بعد آئی ہے۔

اس کے بعد سے اور بار بار اس کی تقریر کے وقت سے جب میرا ہم بودیت کا تصور ایک چیلنج بن گیا تھا، ایک وزیر خارجہ کی حیثیت میں، دو برس پہلے کے حکومتی اعلان، ماسکو، وارسا اور برلین کے مذاقی کی روشنی میں آپ کو یہ دیکھ کر کہ میں نے کیا راستہ اختیار کیا ہے، حیرانی نہیں ہوگی۔ اس میں نہ کوئی فریب نظر ہے نہ تذبذب۔ مگر میں وہی کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو میں کہتا ہوں۔

ہم بودیت کے لیے ایک عملی پالیسی کو نہ خوف کی بنیاد پر، نہ چاہیے اور نہ اندھے اعتبار پر۔ میں جانتا ہوں کہ مغربی اتحاد کام کرے گا، ممکنہ دشمن بھی فریب نظر کا شکار نہیں ہوں گے۔ مگر ہمیں بھی اسی خیالی اصول کو ترجیح دینا چاہیے کہ مختلف سماجی اور معاشی نظام پر استوار حکومتیں سنگین تنازعات میں الجھے بغیر ایک ساتھ رہ نہیں سکتیں۔

ایک بار ہم بغیر جبر کے اکٹھے محفوظ ہو کر رہنے لگ جائیں تب رفاہی اداروں کی تنظیم پر کام کیا جائے گا۔ اگر اس کے محرکات میں شروع ہی سے بیرونی مقاصد شامل ہو گئے تو ایک نئی جہد شروع ہو جائے گی۔ حد بند یوں کے ذریعے نظریاتی اختلافات ہیں بھی اور ہوتے بھی رہیں گے۔ نظریے کے بجائے اگر ہم مفاد کی بات کریں تو ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ خود کلامی کے بجائے مشرق اور مغرب کے درمیان ان مسائل کے حل کے لیے مذاکرات کیے جائیں جو ہمارے مشترک مفادات کی بابت ہوں تو، باوجود مسلسل اختلافات کے ہمت افزائی ہوگی۔

باہمی مسائل کے حل سے مراد ہے 'بلاک' کی سرحدوں سے پرے ریاستوں کے درمیان یا معنی تھانوں کے ذریعے رشتوں کی استواری۔ اس کا مطلب ہوگا تنازعے کی قلب مابیت، یعنی دونوں جانب کے پُر امن خطرات کے باوجود حقیقی یا مفروضہ سرحدوں کی نفی۔ اس کا مطلب ہوتا ہے عملی طریقوں سے اعتماد کی بحالی۔ اور یہ اعتبار طویل عرصے سے موجود تنازعات کے حل کی بنیاد بن سکتا ہے۔ یہی موقع یورپ کے لیے وہ موقع ہو سکتا ہے جس پر جیسا کہ بتا ہو چکا ہے، تھابا اٹلنٹن یا ماسکو یا پکنگ کا حکم نہیں چل سکتا۔

بڑی عالمی طاقتوں میں کتنا بھی زور کیوں نہ ہو یہ ایک مسئلہ حقیقت ہے کہ ساتھ ہی ساتھ اور بھی مقامی کشش کے دائرے وجود میں آ رہے ہیں۔ تو کیا اس کا کوئی فائدہ ہوگا اگر ہم مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنے لگیں کہ فلاں فلاں وقت تک نہ جانے اور کتنی عالمی طاقتیں وجود میں آجائیں گی؟ ہم اس وقت ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جس میں بہت کچھ ہے اور جس میں بہت ساری تہدیلیاں ہونے والی ہیں۔ اس بڑے کھیل کے میدان میں چھوٹی قوموں کا بھی کردار ہے؛ وہ بھی اپنے طریقے سے طاقت کا استعمال کر سکتی ہیں وہ خود اپنی بھی اور دوسروں کی بھی مدد کر سکتی ہیں، اسی طرح وہ خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے خطرہ بھی بن سکتی ہیں۔

میرے خیال میں ریاستوں کے عالمی نظام میں چین کا داخلہ سب قلمی قلب مابیت کے مسائل نہیں ہے؛ دو، تین یا اس بھی زیادہ عالمی طاقتوں کے مراکز پہلے ہی سے موجود ہیں۔ مگر بہت سی وجوہات کے باوجود عالمی

اکھاڑے میں چین کا داخلہ جو ایک جوہری طاقت بھی ہے اور ترقی پذیر ملک بھی، ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اور یہ واقعہ دوسری دنیا میں لمحہ لمحہ بڑھتے ہوئے مسائل کے تناظر میں ترقی یافتہ قوموں کے لیے بڑھتی ہوئی بے کئی کا باعث ہو رہا ہے۔

بمبھلی جنگ کے بعد بھی یورپ کی طاقت قائم رہی ہے، اور اس کے سامنے ایک بڑا مستقبل موجود ہے۔ مغربی دنیا میں، یورپی یونین سے پرے بھی، یورپ کی ترقی کے امکانات ہیں، جو Jean Monnet کے خیال کے مطابق ایک دن ایسا اتحاد بن جائے گا، جو دنیا کے مسائل کی ذمہ داریوں میں، ریاست ہائے متحدہ امریکا سے آزاد نگہ میرے خیال میں اس سے متصل رہ کر، ایک اہم ساتھ دار ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے لیے تعاون بڑھانے اور پورے یورپ میں امن کی مشترکہ حفاظت کرنے کے مواقع ہیں بلکہ اگر مجھے اندرونی نظریاتی رکاوٹوں کا علم نہ ہوتا تو میں یہاں تک کہہ دیتا کہ ایک ”یورپی اتحاد برائے امن“ بھی وجود میں آسکتا ہے۔

(iv) مجھے احساس ہے کہ نوٹیل امن انعام کے واقعات کی تاریخ میں جرمن افراد نے کیسا اور طبعیات کے میدانوں میں امن کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اور اس [امن کے] میدان میں بھی ہماری نمائندگی کی ہے۔ جنگ کے دوران ہمیشہ امن کے مطالبے کیے گئے ہیں، اور میرے ملک میں، کسی وقت بھی، امن کے نظریاتی افراد کی کمی نہیں رہی ہے۔

مجھے 1927 کا نوٹیل انعام حاصل کرنے والے پروفیسر لڈوگ کوئیلے کی اچھی طرح یاد ہیں۔ انھیں تاریخ کے مطالعے سے جس علم اور فراست کا تجربہ ہوا اس نے ان کو بین الاقوامی عدم جنگ تحریک میں شامل کیا تھا اور کئی برس تک وہ جرمن امن سوسائٹی کے چیئرمین کے عہدے پر فائز رہے۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران وہ Bund Neues Vaterland [وفاقی وطن آبائی] کے ڈکٹن رہے تھے جو ”یورپ“ کے لیے ایک عمدہ بہانہ تھا اور جس کے اولین ارکان میں برلن کے مستقبل کے میئر ارنسٹ رائٹر (Ernst Reuter) اور ابرٹ آئن اسٹائن جیسے نابغہ روزگار شامل تھے۔ کوئیلے جو 1907 میں ”لڈویریا“ کی آئین ساز اسمبلی اور

0 2 - 9 1 9 1

Weimar اسمبلی کے ڈکٹن رہے تھے، ثالثی کے اصول اور League of Nations کے بڑے مددگار تھے۔ ذاتی سطح پر قربانی کرتے ہوئے انھوں نے جمہوری شہری ہمت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کا انتقال ہلاولٹی میں ہی ہوا تھا۔

میرے اور نوٹیل انعام پانے والے پہلے جرمن گسٹاف ایسٹریسے مان کے درمیان ایک واضح ناتا ہے۔ جس وقت انھیں نوٹیل انعام دیا گیا وہ بھی عملی سیاست میں تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ معنوں میں ہم دونوں مختلف ہیں، صرف حالات کے پیش نظر ہی نہیں، سیاسی اور ذاتی مزاج میں بھی، اور ماضی کا کوئی تصور بھی ان کو کم نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود ماضی کے مثالی کرداروں کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہوا کرتی، اور ہمیں اس بنا پر شکر گزار ہونا چاہیے۔

دوسری عالمی جنگ ہی کی طرح پہلی جنگ کے بعد بھی شبہات اور بے رحمی ہوئی تھی۔ بے انتہائی کے عہد نے یورپی قوموں کو قریب نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ اسٹریسے مان ہی تھا جس نے جنگ بندی کے پانچ برس بعد یہ تصور پیش کیا تھا، جو اندرونِ یورپ اور اس کے باہر بھی قبول کیا گیا تھا کہ اپنے اپنے موقف پر ڈالے رہنے کے باعث ہم سب بے ثمر رہنے پر مجبور ہوں گے۔ اس کا خیال تھا کہ قبل اس کے کہ ہم بحری کی جانب پڑھیں، ہمیں امن کو بحال کرنا ہوگا۔ ہر شخص ان کی طرح نہیں سوچ رہا تھا۔ ایسے لوگ بڑی تعداد میں تھے جن کا خیال تھا کہ بے اعتباری کے لبادے کو اس وقت تک اتارنا نہیں جاسکتا جب تک کہ کئی قسم کے سدھار نہیں کیے جاتے۔ ایسا ہی مسئلہ اس وقت بھی تھا جیسا کہ آج درپیش ہے۔ اس وقت کے وزیرِ بخارجہ آگنہ بند کر کے قاتل نہیں ہو گئے تھے انھوں نے جدوجہد کی تھی، جس کے لیے ان کو بھی اپنی امن پالیسی کے لیے مہذب ہمت کی ضرورت تھی۔

جنگ کے بوجھ کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان فرانسیسی اور جرمن تعلقات کا ہوا تھا۔ وہاں کے علاوہ کسی اور جگہ بے اعتباری کا پہاڑ بلند نہیں تھا۔ اسٹریسے مان نے اس کو سر کرنے کی کوشش کی، اور دوسری جانب سے اس کی اپیل کا مثبت جواب Aristide Briand نے دیا تھا، جس کو اسی نوبل انعام میں شریک کیا گیا تھا۔ انگلستان کی مدد سے لوکارنو میں جو کچھ حاصل ہوا تھا، اسٹریسے مان نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا، ”پہلی بات تو یہ ہے کہ دریائے Rhine کے علاقے میں دیر پا امن، جس کی ضمانت دو عظیم یورپی قوموں نے دی تھی، حلفیہ وعدہ کر کے قائم کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف طاقت استعمال نہیں کریں گے جس میں دوسری ریاستوں کی جانب سے بھی اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ وہ اس ملک کی مدد کو آئیں گے جس پر اس متبرک معاہدے کی خلاف ورزی میں حملہ کیا جائے گا۔“

آپ دیکھیں گے کہ یہ جملہ اس لیے میرے لیے بہت اہم ہے کہ اس میں طاقت کے استعمال سے لاطعلقی کے اظہار کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ کینہ پرور پروپیگنڈے کے باعث جرمنی کی پالیسی کو غلط سمجھا یا غلط معنوں میں لیا گیا تھا کہ جرمنوں نے اس چیز سے لاطعلقی کا اظہار کیا جو ان کا حق تھی۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ ہم نے لوگوں کو تحفظ کا احساس دلانے اور باہمی اعتبار کا ایک نیا یا باب کھولنے کے لیے طاقت کے استعمال سے لاطعلقی کا اظہار کیا تھا۔

دیر پا امن کی کیفیت میں، جس کے بارے میں اسٹریسے مان نے اس وقت بات کی تھی، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، ان لوگوں نے ایک بار پھر خلل پیدا کیا تھا جنہوں نے اپنے طور پر طاقت کے استعمال سے لاطعلقی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ لوکارنو میں حاصل کیا گیا تھا، کاروبار میں نہیں تھا۔ اس نے تو ان راستوں کو بھی تلاش کر لیا تھا جن پر ایک اور جنگ کے بعد لوگ قدم رکھنے والے تھے۔

مجھے اس وقت رابرٹ شومان (Robert Schuman) یاد آ رہے ہیں جو فرانسیسی جانب سے کتنے شریفانہ خیالات کے آؤں تھے اور چارلس ڈیگال جیسا مدبر جس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ پیہرا نہ تصورات

دکھتا ہے، جب کہ جرمنی کی جانب سے قدامت پسند اور تعمیری خیالات کا عظیم سیاست دان کا نراڈ آڈن اور تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کو بڑھاپے میں یہ رتبہ دیا گیا تھا تا کہ وہ اپنے زندگی میں طویل عرصے سے چاہے والے خواب سچ ہوتے دیکھ سکے اور جرمنی اور فرانس کے درمیان مصالحت ہو جائے، اس کی یہ کوشش بھی کامیاب ہوئی تھی کہ وفاقی جرمنی ابھرتے ہوئے یورپی اتحاد کا اور اوقیانوس کے اتحاد میں براہ کا رکن بن جائے۔ اس وقت کے حالات کے مطابق ہمارا جو بھی فیصلہ ہوتا، یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ مغرب میں ڈالی جانے والی اس بنیاد کے بغیر آج ہم اس قابل نہیں ہو سکتے تھے کہ ہم مشرق میں آج کے مقاعد پرے کر سکتے۔

جرمنی اور اس کے مشرقی پڑوسیوں کے تعلقات ہی میں سب سے زیادہ پریشانیاں تھیں، یعنی بد اعتمادی کا ایک پہاڑ درمیان میں جاگٹھا۔ ہمارے سامنے یہی سب سے بڑا کام تھا۔ ہم نے چاک سے کبیر کھینچ کر یہ سب کچھ حاصل نہیں کیا ہے؛ دراصل ہم نے تو ابھی صرف ابتدائی کی ہے، مگر ہم نے اس جانب قدم بڑھایا ضرور ہے اور یہ ہم اسی راہ پر کر سکتے ہیں جس پر ہم سے پہلے کے لوگوں نے بھی قدم بڑھائے تھے۔

یورپی میثاق تاریخ کے جذبے کے سہارے قائم ہے اس میں سے وہ تاریک عرصہ منہا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کو باقاعدہ شامل کیا گیا ہے۔ *Carl von Ossietzky* کو دیا جانے والا امن کا انعام، اور وہ بھی بطلر کے اس شیطانی دور میں، بہت بڑی بات تھی۔

■ **لڈویگ کوہنڈے** کے ساتھ مل کر وہ جرمن امن سوسائٹی میں فعال رہا تھا۔ اپنے دھار دار قلم سے اس نے مسکریٹ اور قومیت کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ اس نے 1921 میں لکھا تھا، ”بہت سی قوموں نے ایک دوسرے سے لڑائیاں لڑی ہیں مگر اب تو ایک ہی قسم کا بہا ہے؛ یورپ کے باشندوں کا لبہ۔“ اس عہد نے اس سے شہری ہمت سے زیادہ کی طلب کی تھی، اس نے اس کی زندگی طلب کی تھی۔

انعام عطا کیے جانے سے ذرا پہلے، ان لوگوں نے جو اس وقت اقتدار میں تھے، ایک بے چارے قیدی سے یہ یقین دہانی طلب کی تھی کہ وہ انعام لینے سے انکار کر دے گا۔ اس انکار کے بدلے اس کو رہا کر دیا جائے گا، مالی تحفظ دیا جائے گا اور مستقبل میں اس کو پریشان نہیں کیا جائے گا۔ *Ossietzky* نے حصار انکار کر دیا اور واپس قید خانے چلا گیا۔ اس وقت میری عمر بائیس برس تھی اور میں برلین میں غیر قانونی طور پر مقیم تھا۔ میں براہ راست اس مہم میں شریک تھا اور میں اس کے دلیرانہ فیصلے سے واقعی بہت متاثر ہوا تھا۔

Carl von Ossietzky کی شخصیت میں نوبیل کمیٹی نے ایک ایسے آدمی کو اعزاز بخشا تھا جو انعام کو حاصل کرنے میں اسے نہیں ملتا تھا۔ وہ انعام دراصل اقتدار پر قابض بربریت پر اس کی اخلاقی فتح تھا۔ میں آج آزاد جرمنی کی جانب سے نوبیل کمیٹی کو اس کا بعد از وقت شکریہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ میں ان لوگوں کو بھی سلام پیش کرنا چاہتا ہوں جو اپنے عقائد کے مطابق دوسرے طریقوں سے قیدیوں اور اذیت رسیدہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

اس مقام پر، بالخصوص میں ان عربوں اور عورتوں کے لیے اپنا سر خم کرتا ہوں جنہوں نے ہٹلر کے خلاف مزاحمت میں شرکت کی تھی۔ میں تمام ملکوں میں مزاحمت کے مابینہ ارکان کا بھی تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ جرمن مزاحمت نے لڑائی لڑیں اور قربانیاں دی تھیں، شائستگی کے لیے، قانونیت اور آزادی کے لیے۔ انہوں نے اس جرمنی کو بچایا ہے جس کو میں اپنا سمجھتا ہوں اور جو قانون کی حکمرانی اور آزادی کے ساتھ دوبارہ قائم ہو کر میرا ہے۔

میرے لیے ماضی وہ کچھ ہے جس نے پوری دنیا کو دکھا دیا کہ جرمنی نے اپنے آپ سے صلح کر لی ہے، اسی طرح جیسے ایک تارک وطن اپنے وطن کی پڑا من اور انسانی خصوصیات کی بازیافت کرتا ہے۔ (۷) اس وقت بھی جب میں وزیر خارجہ تھا، میں نے کہا تھا کہ ہمارے ملک کی پالیسی کو سربراہ امن کے تحفظ میں common denominator ہونا چاہیے۔ موجودہ وزیر خارجہ اور میں، دونوں جانتے ہیں کہ امن کی پالیسی کو محض تعریف و توصیف سے بڑھ کر ہونا چاہیے۔ ہر ایک کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ وہ خاص طور پر اس بارے میں کتنا کچھ کر سکتا ہے، بالخصوص وفاقی جمہوریہ جرمنی جیسا ملک ایک مہم برداری سے بندھا نہیں رہ سکتا، بلکہ اس کو ایک مخصوص حصہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ وہ جوابات جو ہمیں خود دینے چاہیے ان کو دوسروں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ کوئی بھی ہمیں اپنے فرض سے سبک دوش نہیں کر سکتا اور حالات کی حقیقتوں کے پیش نظر جو کچھ کرنا ہو صرف ہم ہی کر سکتے ہیں۔

میں نے حقیقتِ حالات بیان کر دی ہے۔ ہم ان کو سمجھ ہی نہیں سکتے اگر ہم خود فریبی میں مبتلا ہوں یا سیاست کو قانونی دھوکوں سے درہم بردہم کرتے ہوں۔ صدر پاسکیوی (Paasikivi) نے فرمایا تھا کہ کریملین کوئی مقامی عدالت نہیں، اور میں اس استعارے میں دانشمندان کو بھی شامل کروں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہٹلر کے لگائے ہوئے جنگی زخم ابھی تک بھرے نہیں ہیں، مگر میں نے انسانی حقوق اور حق خود ارادیت کے اصولوں پر سودا کرنے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں۔

حالات کی حقیقتوں کے تناظر میں دیکھنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کسی کی علاقائی سالمیت پر سوال اٹھائے جائیں، بلکہ سرحدوں کا احترام کیا جانا چاہیے۔ جب ہم نے فوجی دست برداری کے لیے معاہدے کی تجویز پیش کی تھی اور مشرقی پڑوسیوں کو اپنی باتوں پر یقین کرنے کے لیے کہا تھا، تو ہم دراصل اسی بات کو آگے بڑھا رہے تھے جو ہم سے پہلے کی مغربی جرمن حکومت مغربی ممالک سے اپنے معاہدوں کے ذریعے کہہ چکی تھی۔ ہماری پالیسی کا منطقی تسلسل یہ تھا کہ سرحدوں کے احترام کا اطلاق مشرقی یورپ سے ہمارے تعلقات پر اور دونوں جرمن ریاستوں کے تعلقات پر بھی ہونا چاہیے جو دو اتحادی قہاموں کا حصہ بن چکی تھیں۔

امن کی خواہش اور دھوکوں کے درمیان کا تناؤ، جو مقابلے کی عرصے میں جرمن سیاست دانوں کے کام پر حاوی رہا ہے، جذباتی تنازعات کے ذریعے بڑے بڑے مسائل کی صفائی پر منتج ہوا۔ اس کے نتیجے میں ہماری مشرق اور مغرب پالیسی وجود میں آئی۔ ہم نے دھوکوں کو قبول کیا اور اپنی قومی کلماتی کے تصور کو زائل نہیں

ہونے دیا۔ اس کے برعکس، ہم نے قومی مفاد کی خاطر شرقی یورپ کے ساتھ رشتوں کی نئے سرے سے ترتیب کی۔ یہ صرف معاہدوں اور اور ضروریات کا توازن نہیں ہے، نئے راستوں کے کھولنے اور اور سرحدوں کی اہمیت کو کم کرنے کا ایک وسیع اور متنوع عمل ہے۔

مجھے Ostpolitik کا لیبل پسند نہیں، مگر کوئی اس کو کس طرح واپس سے سکنا ہے جو تقریباً ایک ضرب المثل بن چکا ہو اور Gemütlichkeit کی طرح جو بظاہر ناقابل ترجمہ ہے اور بین الاقوامی اصطلاحات میں قابل قبول بھی ہو اس لفظ پر ماضی کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اور اس سے خارجہ پالیسی کی غلط تعبیریں بھی ہو سکتی ہیں، اسی طرح جیسے کسی الماری کی کئی درازیں ایک ساتھ کھولی جاسکتیں۔ درحقیقت، دینانت کی ہماری پالیسی مغرب میں شروع ہوئی ہے اور اس کی جڑیں مغرب ہی میں چوست ہیں۔ ہمیں مغرب میں جسے داری بھی اور شرقی سے مصالحت بھی چاہیے۔

کسی کو اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ مغربی یورپی اتحاد جس میں ہم فعال کردار ادا کر رہے ہیں، ہمارے نزدیک اولین ترجیح ہے۔ اوقیانوسی اتحاد ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ پھر بھی دنیا کی بدلتی ہوئی صورت حال، بلکہ مغرب کے معاہدوں کی حقیقتوں کی روشنی میں، اور جہاں تک ممکن ہو ان کو سوویت یونین اور بیٹائی دارما کے ساتھ داروں سے عام اور دوستانہ تعلقات استوار کرنے چاہئیں۔ میں اس سلسلے میں صدر پامپیدو (Pompidou) اور وزرائے اعظم ہیٹھ (Heath) [برطانیہ] اور گولمبو (Emilia Galamba) [وزیر اعظم اطالیہ] سے بنی نہیں، حقیقتاً اپنے تمام دوستوں اور اتحادیوں سے بھی متفق ہوں۔

بچوں کے جرمن قوم کی دونوں ریاستوں کو اس سے فائدہ ہوگا، ہم سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ پولینڈ سے اپنے معاہدوں کی توثیق کریں گے۔ وفاقی حکومت کی ترجیحات میں سے ایک یہ ہے کہ بیٹائی دارما کے ارکان سے نرم اور بامعنی رشتے استوار کیے جائیں۔ تمام تر مشکلات کے باوجود اور جرمنی میں موجود چاروں طاقتوں کے حقوق اور ذمے داریوں کا احترام کرتے ہوئے جرمن عوامی جمہوریہ سے ہمارے تعلقات بڑھ رہی اور بین الاقوامی روایات کی بنیاد پر استوار کیے جائیں گے۔ برلین کے مسئلے پر چار طرفہ معاہدے کے ذیل میں دیے گئے اعلان کی بنیاد پر جرمنی کے دونوں حصوں کے درمیان مذاکرات نے واضح کیا ہے کہ جہاں قانونی نظریات میں موافقت نہ ہو سکتی ہو، محض بات چیت سے بھی الجھے ہوئے معاملات سلجھائے جاسکتے ہیں۔

وفاقی جمہوریہ اپنی حدود سے اچھی طرح واقف ہے۔ ساتھ ہی، اس کو احساس ہے کہ یقینی طور پر اس کے پاس طاقت ہے اور وہ خود بھی ایک طاقت ہے جو ہمد وقت امن کی خدمت کے لیے ہے۔ ہم جس طرح طاقت کی روایتی سیاست بازی سے کاروباری امن پالیسی کی طرف قلب مابہت کر رہے ہیں، اس کو توازن کے عمل اور مقصد کی تبدیلی کے درمیان سمجھنا چاہیے۔ ایسے کام کے لیے اپنے آپ کو فتح کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اپنی سیاسی قوت اور امکانات کا اندازہ لگانا پڑتا ہے جو کسی طرح بھی طاقت کی سیاست بازی کے روایتی

نظریے کی ضرورت سے کم حقیقی نہیں ہوتا۔ اس اندازے کو مقدس قومی امنیت سے یورپی اور کائناتی سطح پر ایسی اندرونی پالیسی کی طرف لے جانا چاہیے جو اس بات کا یقین فراہم کرنے کی ذمہ داری محسوس کرے کہ کسی جنگ کا بھی آدمی ہو اس کا اپنا ایک وجود ہوتا ہے جو انسانی احترام کا حق دار ہوتا ہے۔

(vi) اُن چند عناصر کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو یورپی امن کے حلقے کو ممکن بنا سکتے ہیں، میں اداراتی نظریات پر غور کرنے میں وقت برداشتیں کریں گا جن کو تھوڑے عرصے میں عمل میں نہیں لایا جاسکتا۔ مگر میں بین الاقوامی قانون کے عمومی اصولوں پر اپنے یقین کا اظہار ضرور کریں گا خواہ ان کو کتنا ہی نظر انداز کیوں نہ کیا جائے۔ انھیں اقوام متحدہ کے فرمان میں حاکمیت، علاقائی استحکام، عدم تشدد، قوموں کا حق خود ارادیت اور انسانی حقوق جیسے پابند کرنے والے اصول ملے۔

یہ اصول ناقابل انتقال ہیں اگرچہ میرے علم کے مطابق، ان کا اطلاق اکثر کم زور ہوتا ہے۔ اتفاق سے، سیاست دان کی مشکلوں میں سے ایک مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ بالخصوص حکومت کے سربراہ کی حیثیت میں ہمیشہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا اپنا خیال کیا ہے، اس لیے کہ امن کی خاطر وہ ہمیشہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ مزید یہ کہ میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ مغربی یورپ کے انضمام کے مسلسل عمل سے یونین کے عمومی تحفظ اور تعاون میں کوئی ہکا بکا پیدا نہیں ہوگا۔ برطانیہ کی شمولیت کے ساتھ، ابھرتا ہوا یورپی اتحاد مشرقی یورپ کے خلاف خود کو ایک بلاک میں تبدیل نہیں کر رہا ہے، مگر اپنے سماجی عناصر کو مستحکم بنانے سے بھی، یہ یورپی تحفظ کے انعام کو متوازن بنانے میں ایک اہم عنصر ثابت ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اندرونی طور پر پیوستہ اتصال، بنیاد پر نظر آنے والے تعاون سے متفاد ہو۔

میں تو یہ بھی کہوں گا کہ یورپ اور امریکا کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں کو برابری اور خود اعتمادی کی بنیاد پر ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ ریاست ہائے متحدہ کو جتنا نیا دھبہ اٹھانا پڑے، اتنا ہی وہ عظیم ملک ہماری دوستی اور اہلیت پر بھروسہ کر سکے گا۔

میں جو نکات پیش کر رہا ہوں وہ حقیقتاً اس مشروئے پر مبنی ہیں کہ ہمیں سب سے پہلے دنیا کے ہر نظام اور ہر نظریے کو اس کی موجود صورت میں بین و عن قبول کرنا ہوگا۔ جس درجے کے عیوب ہم کو درپیش ہیں ان کا ادراک کرتے ہوئے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم امن کا ایسا ڈھانچا بنانے کی کوشش کریں جو ماضی کے دوسرے نظاموں اور امنیتوں سے زیادہ دیر پا ہو اور جس کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہماری عمومی یورپی پالیسی قوموں اور ریاستوں کی صدیوں پرانی شناختوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ دراصل، ہمیں ریاستوں اور گروہوں کے درمیان ایسا توازن قائم کرنا ہوگا جس میں ہر ایک اپنی شناخت اور تحفظ کو برقرار رکھ سکے۔ مگر اس قسم کے توازن کو محض فوجی توازن سے زیادہ ہونا چاہیے۔

دوسری بات: ہمیں ریاستوں کے درمیان رشتوں کے درمیان، بغیر کسی استثنا کے طاقت استعمال کرنے کی دھمکی سے پرہیز کرنا ہوگا۔ اس میں موجودہ مرکبوں کے احترام کی ضرورت بھی شامل ہے۔ مگر

مرحدوں کی سالمیت کا مطلب دشمنوں کے درمیان ان کو باڑ کی طرح مستحکم کرنا نہیں ہو سکتا۔

تیسری بات: طاقت کے استعمال سے دستبرداری سے پرے، خواہ وہ دو طرفہ ہو یا کثیرالجہت، ہم اسلحے پر کنٹرول کے معاہدوں میں یورپی قوموں کی، برابری کی بنیاد پر شمولیت سے مزید تحفظ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لیے مرکزی یورپ میں طاقت کے توازن میں کمی پر سنجیدہ مذاکرات کرنے ہوں گے۔

چوتھی بات: ریاستوں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کے اصول کا احترام کیا جانا چاہیے، مگر صرف عدم مداخلت ہی کافی نہیں ہوگی۔ ایک پُر امن یورپ اپنے ارکان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ دوسروں کی دہلیلوں کو سنیں، تاکہ مفادات کے لیے کی جانے والی جدوجہد جاری رہے۔ یورپ کو بدداشت کی ضرورت ہے۔ اس کو آزادی خیال کی ضرورت ہے، اخلاقی بے توجہی کی نہیں۔

پانچویں بات: اب وقت آگیا ہے کہ نئے قسم کا معاشرتی، تکنیکی اور سماجی تعاون بڑھایا جائے اور کل یورپی بنیاد کی ڈھانچے کی تعمیر کی جائے۔ مزید برآں، [ماضی کا] یورپ ایک ثقافتی کمیونٹی بن کر ابھرا تھا، اور اس کو دوبارہ وہی ہو جانا چاہیے جیسا کہ پہلے تھا۔

چھٹی بات: دیر پا امن کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد سماجی تحفظ ہوتی ہے۔ دراصل ماڈی طلب ایک مجبوری ہوتی ہے، اور کسی طرح بھی ہو، یورپ میں اس کو ارتقا کے ذریعے قابو کیا جانا چاہیے۔

ساتویں بات: یورپ کو دنیا بھر میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا ہو گا۔ اس سے مراد عالمی امن کی مشترکہ ذمہ داری ہے، اور اس کا مطلب باہری دنیا کے لیے انصاف کی ذمہ داری ہے، تاکہ ہر طرف پھیلی بھوک اور بد بختی پر قابو پایا جاسکے۔ محض جنگ کا فقدان امن نہیں ہوتا، امن اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، اگرچہ کچھ قومیں فقط اسی سے مطمئن ہو سکتی ہیں۔ ایک دیر پا اور منصفانہ امن کے نظام کے لیے تمام قوموں کی ترقی ضروری ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں ہمارا مقصد دور افتادہ اور تجربی بدف کے پیچھے بھاگنا نہیں، بلکہ اپنے اختلافات کو جتنی سنجیدگی سے ہو سکے، سلجھانا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کچھ کے نزدیک، بالخصوص نئی نسل میں، یہ بہت کم ہے، اور دوسرے لوگوں کے نزدیک مارا عمل بہر حال بہت سست ہے۔ یہ نقصان دہ نہیں بلکہ اس صورت میں مددگار ہوتا ہے جب نوجوان نسل از کار رفتہ ڈھانچوں اور نئے امکانات کے درمیان بے انتظامی کے خلاف بغاوت پر اتر آئے، اور جب وہ مشابہت اور حقیقت کی تردید پر احتجاج کرے۔ میں وہ کچھ کہنے پر یقین نہیں رکھتا جو نئی نسل مجھ سے کہلوانا چاہتی ہے، مگر میں اس سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنی بچی ہوئی توانائیوں کو ہمارے ساتھ دیتی اور ذمہ دار تعاون میں صرف کرے۔

ہم کو احساسِ تناسب، تجزیے اور برداشت کی اشد ضرورت ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہمیں نئے ابعاد پر نگاہ رکھنے اور ان سے غٹنے کی توانائی کی بھی ضرورت ہے۔ اس کام کے پھیلاؤ کے پیش نظر جو ہمارے سامنے ہے، ہمیں مستقبل پر ایمان رکھنے اور سنجیدہ حقیقت بینی کے ایک صحت مند امتزاج کی ضرورت ہے۔ تو

کیا، یورپ اور امن کی تنظیم سے بھی زیادہ اہم کوئی کام ہو سکتا ہے؟

(vii) عملی سیاست کے میدان میں دو اہم کام ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں: یورپ میں تحفظ اور تعاون پر ایک کانفرنس اور فوج میں کمی کا معاملہ۔ ساتھ ہی ساتھ اس سے قطع نظر کہ وہ کسی بلاک کا حصہ ہیں یا نہیں، یورپ کی قوموں کو معاشیاتی، تکنیکی اور ثقافتی تعاون کی ترقی پر توجہ دینی چاہیے، جو یورپ کی ترقی کے منصوبوں کے حجم کے مطابق ہو اور جو یورپ کی ترقی کے لیے ضروری ہو۔ اور اس مقصد کی تکمیل میں قومی سرحدوں کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔

اس کانفرنس کو تعاون کے امکانات اور ساتھ ہی ساتھ تحفظ کے مسائل پر بھی غور کرنا ہوگا۔ میں یورپ کے مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب کے درمیان معاشیاتی اور دوسرے تعاون کے امکانات، مشترک مفادات اور ذمے داریوں کو پورا ہونا دیکھ رہا ہوں، جو سب کے لیے زیادہ تحفظ کا باعث ہوں گے۔

طاقت سے دست برداری کو قانون کی حیثیت ملنی چاہیے، مریاست جس کے احترام کیپابند ہو اور جو کسی قسم کی مداخلت کی اجازت نہ دے۔ اس راہ پر قدم بڑھا کر، جو مختصر نہ ہوگی، ہم یورپ میں تحفظ کا ایسا نظام قائم کر سکتے ہیں جو دنیا کے حالات کے مطابق تمام بلاکوں پر نافذ ہو جن میں ریاست ہائے متحدہ اور سوویت یونین بھی شامل ہوں۔

فوج میں متوازن کمی اس مقصد کا راستہ ہموار کر سکتی ہے۔ میں نے 1968 کے موسم بہار میں "signal of Reykjavik" کو شکل دینے کی کوشش کی تھی اور ظاہر ہے کہ میں اس پسپائی کو بھلا نہیں سکا ہوں جو اس کے بعد ہمیں کرنی پڑی تھی۔ آئندہ پیش آنے والی راہ خاصی مشکل ہوگی۔ جو لوگ عالمی اور علاقائی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں، اور جو کچھ جدید و انتہائی سطح کی کمیٹی دس برس کی محنت و مشاقت سے حاصل کر سکی ہے۔ بحر منجمد جنوبی، تجرباتی دھماکے، خلا، اسلحے کا عدم پھیلاؤ، سمندری تہ اور حیاتی تنصیبات۔ بہت کچھ ہونے کے باوجود بھی پُر امید ہیں۔ دوسروں کے ساتھ بڑی طاقتیں بھی، اپنے اختلافات کے باوجود امن کے بچاؤ کے لیے مشترکہ مفادات کے جزوی مواقع حاصل کر رہی ہیں۔

میں تو ایک خاص وجہ سے اور بھی زیادہ پُر امید ہوں۔ اس برس میں نے فوج میں کمی کے پہلوؤں پر، علاحدہ علاحدہ صدر نکسن اور مسٹر بریڈن دونوں کے سامنے ایک ہی سوال رکھا تھا، اور دونوں سے موافقانہ جواب پایا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی طاقتوں کے رہنما بھی سوچ رہے ہیں کہ شاید وہ بھی اب فوجی مقاصد کے لیے اخراجات بڑھا نہیں سکیں گے۔

(viii) امن کی تنظیم کے خلاف بھی طاقتیں ہیں۔ ہم نے وہ برہمیت بھی دیکھی ہے، انسان جس میں پھر مبتلا ہو سکتا ہے۔ نہ مذہب، نہ نظریہ اور نہ شان دار ثقافتی انقلاب انسان کے قلب کی کہانیوں سے پھوٹنے والی نفرتوں کے امکانات کو رد کر سکتے ہیں جو قوموں کو تہذیب کے غار میں دھکیل دیتے ہیں۔ آزادی کی طرح امن بھی ابتدا سے اپنی اصل حالت میں رہتا ہے۔ ہمیں اس کو اصل حالت میں لانا پڑے گا۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں تنازعات کی جڑ تک پہنچنا پڑے گا۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں امن اور تنازعات پر تحقیق ایک بڑا مسئلہ بن جاتی ہے۔ اور میرے نزدیک، سیاست کے علاوہ دیکھنا ہماری دنیا میں صحیح معنوں میں طاقت کا قابل اعتبار متبادل ہے۔

ایک اور مخالف طاقت ہے ہمیں جس سے گزارہ کرنا ہے، وہ ہے دباؤ ڈالنے والے گروہوں کی قومی امانیت۔ یورپ میں وہ تقریباً اب بھی نظر آتے ہیں اور نئی ریاستوں کی بے لگام امانیت اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ وہ ان قدیم قوموں کے ہمراہ پہنچنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتیں جو صدیوں پہلے وجود میں آئی تھیں۔ نظریات، ان کے قریب اور پیروی کرنے والے ہم بودیت کے بنیادی اخلاقی اصولوں کو نظر انداز کرتے ہیں اس لیے کہ وہ اپنے نظریات کی پاکیزگی کے لیے، یا بہتر نظریات کے حصول کے لیے انسانیت کو ”مسوا“ چاہتے ہیں۔ ایسی طاقتوں کے درمیان دیہ پا امن کے حج نہیں ہوئے جاسکتے۔ امن کی پالیسی کو انہیں سمجھانا چاہیے کہ ریاستیں اور نظریات اپنے اندر کوئی انجام نہیں رکھتے، بلکہ وہ با معنی زندگی گزارنے اور ترقی کرنے کی کوشش میں خراہ کی مدد کرتے ہیں۔

کھل چھنے کی جستجو آدمی کے لیے خطرہ ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ مکمل صداقت ان کی ملکیت ہے، وہ جو اپنے خواہوں کی جنت میں اور ابھی حاصل کرنا چاہتے ہیں اس میں ہی کوئی باؤ کر دیتے ہیں جس میں انسانیت کے احرام کی فصل اگائی جاسکتی ہے۔ یورپی جمہوریت کی روایت بھی کسی مذہب انسانیت سے واقف نہیں، سوائے ایک نظریاتی خصوصیت کے جو اسے جبر کا راستہ دکھاتی ہے۔ ایسے میں آزادی غلامی بن جاتی ہے۔

نوجوان لوگ مجھ سے توقع کرتے ہیں کہ میں ان کے سوالات کے جواب میں غیر مشروط ”ہاں“ یا ”ایک سیدھا سادہ“ ”نہیں“ کہوں گا۔ مگر میرے لیے یہ ناممکن ہو چکا ہے کہ میں کسی ایک سچ پر یقین کروں، واحد صداقت پر، اس لیے میں اپنے نوجوان دوستوں اور دھروں سے، جو سنا چاہتے ہیں، کہتا ہوں کہ دراصل صداقتیں کئی قسم کی ہوتی ہیں، محض ایک ہی صداقت نہیں ہوتی جو تمام دوسری صداقتوں کو خارج کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بوقلمونی پر، اور اس طرح صبحے پر یقین رکھتا ہوں۔ اسی کو زرخیزی کہتے ہیں۔ یہ اشیا کے وجود کے بارے میں سوالات اٹھاتی ہے۔ یہ اتنی طاقت ور ہو سکتی ہے کہ قدیم ترین سنگ بند (assilised) انصاف کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔ مزاحمت کے دوران شبہات نے اپنی قدر و قیمت ظاہر کی تھی۔ یہ اتنی سخت جان ہوتی ہے کہ بزمیت کو بھی پیچھے چھوڑ سکتی ہے، اور فائین کو وہم میں مبتلا کر سکتی ہے۔

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ آدمی اپنے امکانات میں کتنا امیر اور ماتحت ہی ماتحت کتنا محدود ہو گیا ہے۔ ہم اس کو اس کی جارحیت اور بھائی بندی دونوں سے بچا سکتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی ایجادات کا اخلاق اپنے مفاد کے لیے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر ان ہی کے ذریعے وہ اپنی تہی کا سامان بھی کرتا ہے۔ آئیے اب ہم اپنے ضرورت سے زیادہ خوف ناک مطالبات سے دست بردار ہو جائیں۔ میں عملی ہمدردی پر یقین رکھتا ہوں، اس لیے انسان کی ذمہ داری پر بھی مجھے اعتماد ہے۔ اور میں امن کی غیر مشروط ضرورت

پر بھی ایمان رکھتا ہوں۔

ایک جمہوری سوشلسٹ ہونے کے ماتے میرے خیالات اور میرے کام کا رخ ہمیشہ تبدیلی کی طرف ہوتا ہے۔ میں آدمی کو نئے سرے سے بنانے کا خواہش مند نہیں ہوں کہ اس کو کسی نظام پر مجبور کرنے کا مطلب ہے اس کو برباد کرنا، مگر میں انسانی تعمیر پذیر کی پر یقین رکھتا ہوں۔

میں نے اپنے عرصہ حیات میں ابھرتے اور غائب ہوتے ہوئے بہت سے مراب دیکھے ہیں، ایسی بے ترتیبی، ہزاریت اور معنوی مرادگی بھی دیکھی ہے۔ ایک طرف احساس ذمہ داری مشتوق تھا، جب کہ دوسری طرف تصویر پید تھا۔ مجھے اس بات کا تجربہ بھی ہے کہ کسی کے اعتقاد میں یقین، ثابت قدمی اور اتحاد کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ خصوصاً دکھ درد کی کیفیت میں اخلاقی قوت عود کر آ کر رہے۔ بہت سی چیزیں جن کو مردہ سمجھ لیا گیا ہو، زندہ ثابت ہو جاتی ہیں۔

ابتدا میں الفریڈ نوبیل نے سوچا تھا کہ امن کا انعام صرف چھ بار دیا جائے گا، مگر پانچ برس بعد، اور اس کے بعد اس انعام کی ضرورت نہیں رہے گی۔ مگر یہ بہت عرصے جاری رہا ہے، ورنہ مجھے آپ سے آج کے دن بات کرنے کا موقع نصیب نہ ہوتا۔

برتھا فان سمر (Bertha von Sumner) کو جسے 1905 میں امن انعام دیا گیا تھا، ضرورت سے زیادہ امید تھی کہ اس کی کتاب Lay Down Your Arms بہت مقبول ہوگی۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس کتاب میں اب بھی بہت دلچسپی رکھتے ہیں، کیوں نہ ہو، اس لیے کہ میں اب بھی بخوشی اپنی شناخت نوجوانی کی بے تصنع انسانی محبت سے کرنا پسند کرتا ہوں۔ مگر اپنے آپ کو اور آپ سب لوگوں کو ان لوگوں کی یاد دلائے بغیر اپنی تقریر ختم نہیں کر سکتا جو اس لمحے بھی جنگ کے حالات میں زندگی گزار رہے ہیں، بالخصوص ہندوستانی برصغیر میں اورویت نام میں۔ میں اُن میں مشرق وسطیٰ کے اور دوسرے بحرانی علاقوں کے افراد کو بھی شامل کروں گا۔ میں زور شور سے اپیلیں کرنے کا قائل نہیں، اس لیے کہ دوسروں سے میانہ روی اور معقولیت طلب کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ مگر یہ خواہش میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی کر آ رہی ہے؛ کاش وہ سب جو جنگ کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں، امن کو قائم رکھنے کی دہلی پر اپنی طاقت کو صرف کریں۔



نارمن بور لاگ

اعلان تجلیل

انگریز نوٹیل نے 27 نومبر 1895 کو تیار کی جانے والی اپنی وصیت میں وہ شرائط شامل کی تھیں جو نوٹیل انعام وصول کرنے والوں کو پوری کرنی ہوتی ہیں۔ پہلا جیرا گراف کہتا ہے کہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جس نے پچھلے برس کے دوران ”مٹی نوع انسان کو غنیمت ترین فائدے سے نوازا ہو۔“

مارویائی پاریمان کو بہت سے نامزد امیدواروں میں سے انعام جیتنے والے کے انتخاب میں اس شرط کو ملحوظ خاطر رکھنا لازم ہوتا ہے۔

آج انسانیت کے فائدے کے لیے کیا ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے بہت سے جواب دیے جاسکتے ہیں، اسے ہی مختلف اور کثیر پہلو اور اسے ہی دلچسپ جیسا کہ انسان خود ہوتا ہے۔

کیا تاریخ ہمیں کوئی پرچم فراہم نہیں کرتی جو ہمہ وقت انسان کی بنیادی ضرورت کی نشان دہی کرتا ہو؟

کروہ کون سا فائدہ ہے جو اسے مطمئن کرے گا؟

ہماری ڈرامائی صدی کے دوران یورپ کے تاریخی واقعات کے سب بڑے واقعے، 1917 کے روسی انقلاب، کے دوران اس کے پرچم پر لکھا گیا تھا: ”روسی اور امن۔“ روسی اور امن معجزاتی ضرورتیں ہیں، مٹی نوع انسان نے جن کو ہمیشہ اپنا ہدف بنایا ہے، جو اس کی نشوونما کے لیے اہم امرکائی قوتیں رکھتے ہیں۔

فاقہ کشی سے آزادی ان مزید آزادیوں میں سے تھی جن کو ہمارے عالمی ادارے، اقوام متحدہ نے، 1945 میں بنیادی انسانی حق کے طور پر تمام لوگوں کے لیے تسلیم کیا تھا۔ 16 اکتوبر 1945 کو FAO یعنی United Nations Organization for Food and Agriculture اپنی خصوصی ایجنسی تھی جس کا قیام عمل میں آیا تھا۔

1945 میں FAO کے سیکریٹری جنرل اور تغذیہ کے ماہر لارڈ بائوڈ آرر (Lord Boyd Orr) کنوینٹیل

امن انعام پیش کیا گیا تھا۔

اس برس نارویائی پارلیمان کی نوٹیل کمیٹی نے نوٹیل امن انعام ڈاکٹر نارمن بورلاگ نامی سائنس دان کو پیش کیا ہے اس لیے کہ اس دور کے کسی ایک فرد سے زیادہ انھوں نے بحوثی دنیا کو روٹی فراہم کرنے میں مدد دی ہے۔ ہم نے اس امید پر یہ انتخاب کیا ہے کہ روٹی فراہم کرنے کا یہ عمل عالمی امن بھی فراہم کرے گا۔ یہ ایسا کون سا سائنس دان ہے جس نے گندم کے کھلیانوں میں بنی اپنی تجربہ گاہ میں دنیا میں غذا کی ایسی نئی صورت حال پیدا کرنے میں مدد دی ہے جس نے آبادی میں دھماکا خیز اضافے اور ہماری غذائی پیداوار کے درمیان ڈرامائی دور میں مایوسی کو خوش امید میں بدل دیا ہے۔

نارویائی نوبل کا ایک انسان، نارمن بورلاگ، 25 مارچ 1914 کو ریاست ہائے متحدہ کی ریاست آئیوا کے شہر گرینسکو میں ایک چھوٹے سے زرعی باڑے میں پیدا ہوا۔ پہلے تو اس نے مینیسوتا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی، مگر اس کے اندر چھپے ایک زراعت کے ماہر کو ایک دن انسانیت کے لیے بہت بڑی خدمت انجام دینی تھی۔

بورلاگ کو 1944 میں جینیات کے ماہر کی حیثیت سے راکسٹر فاؤنڈیشن میں ملازمت ملی تھی۔ 1942 میں فاؤنڈیشن میں انھوں نے میکسیکو کی حکومت کے تعاون سے میکسیکو میں ایک زرعی پروگرام تیار کیا تھا اس منصوبے کے دو پیتھالوجسٹ پروفیسر اسٹاک مین (Stakman) اور جے جارج ہرار (J. George Harar) رہنمائی کر رہے تھے اس منصوبے کا مقصد میکسیکو کی زراعت کا فربہ شگ تھا اور اس کے ذریعے مقامی طور پر غذا کی پیداوار میں بہتری اور فراہمی میں اضافہ ہونا تھا امن کے لیے غیر معمولی اہمیت کے کام کے لیے، جو اس زرعی پروگرام نے انجام دیا تھا، نارویائی پارلیمان کے دس ارکان نے، 1962 میں راکسٹر فاؤنڈیشن کو نوٹیل امن انعام کے لیے نامزد کیا تھا۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ 1951 میں اوسلو میں قائم نارویائی سائنس اکادمی نے پروفیسر اسٹاک مین کو جو ریاضی اور فطری سائنس کے آدمی تھے اپنا صدر منتخب کر لیا تھا۔

میں برس بعد ان کے شاگرد ڈاکٹر نارمن بورلاگ کو نارویائی زرعی کالج نے اعزازی ڈاکٹریٹ سے نوازا اس ادارے کے ریکٹر پروفیسر Jul Låg نے اعلان کیا کہ یہ اعزاز انھیں مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر دیا گیا ہے۔

”ڈاکٹر بورلاگ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری گندم کی پیداوار میں ترقی کے پرامثر کام اور ان نتائج کی بنیاد پر دی گئی ہے جو انھوں نے ترقی پذیر ملکوں میں زراعت کے فروغ کے لیے کیے ہیں۔ ڈاکٹر بورلاگ اور ان کے ساتھیوں نے اناج کی نئی نسل پر جو کام کیے ہیں ان کے نتیجے میں ان کی فصل مقدار کی اور معیاری [دونوں] اعتبار سے اتنی بہتر ہو گئی ہے جس کا پہلے امکان نہیں تھا۔“

یہ امتیاز ان بے شمار عالمائے اعزازات میں سے ہے جو ڈاکٹر بورلاگ کو ریاست ہائے متحدہ امریکا،

پاکستان، ہندوستان اور کناڈا کی یونیورسٹیوں اور ایگریکلچرل کے دوسرے اداروں نے دیے تھے۔
ڈاکٹر بورلاگ 1944 میں بین الاقوامی مرکز برائے جوارو گندم میں شامل ہوئے۔ آج وہ میکسیکو کے Wheat Improvement Program کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔

اس دن کے بعد سے، جب جیکبیں برس پہلے ڈاکٹر بورلاگ نے لاناچ میں بہتری لانے کا کام شروع کیا تھا، آج تک انہوں نے اپنی تمام توانائی اُن تاریخی نتائج کے حصول کے لیے استعمال کی ہے جو دنیا بھر میں آج ”سبز انقلاب“ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ انقلاب دنیا کے اس علاقے میں رہنے والے ان کروڑوں لوگوں کی زندگیوں کی بہتری کو ممکن بنائے گا جسے آج ”گندم افریقہ کی دنیا“ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

قدیم تمدن وادی قومیں، جنہیں جدید دور کی شروعات تک، سزاؤں جیسی بھوک کا متواتر شکار رہنا پڑا تھا، اب گندم میں خود کفیل ہو سکتی ہیں۔ روزمرہ کی روٹی کے لیے نام نہاد مال دار قوموں پر ان کا ایک طویل اور ذات آمیز انحصار اب ختم ہو جانا چاہیے۔

گندم کی تحقیق کے نتائج کے عقب میں، جس پر بے رہی اعداد و شمار کے زبان میں بات ہو سکتی ہے، ہمیں ایک حریک، مندرجہ ذیل اور غیر رسمی محقق سائنس دان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بورلاگ صرف آدرش وادی ہی نہیں، بلکہ بنیادی طور پر، ایک عملی شخصیت کا نام ہے۔ سبز انقلاب پر ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ اُن کی لڑائی صرف خود روگھاس پھوس اور رنگ جیسی پیچیدہ ہی سے نہیں، بلکہ سرکاری افسروں کی اتنی ہی مہلک التوائی حرکتوں سے بھی ہے جو تیز عمل میں روڑے ثابت ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل شبیہ ہمیں اس کی یاد دلاتی ہے:

”سلیپتے سے چھپائی ہوئی، دنیا کا گلا گھونٹنے والی افسر شاہی، اپنی نوع انسان کے لیے بڑے خطرات میں سے ہے۔“

ڈاکٹر بورلاگ انتظار برداشت نہیں کر سکتے: ان کے ذہن پر ایک اہم بوجھ ہے، ایسا بوجھ جس کو اترنا چاہیے، بلکہ ابھی اتر جانا چاہیے۔

اس کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں: میں بے مبر انسان ہوں اور ابھرتے ہوئے ملکوں کی غذا اور زراعت کی بہتری کے لیے ترقی کے کام میں سست رفتاری کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس میں yield یا kick-off یا yield blast-off کی وکالت کروں گا۔ دنیا میں غذا کے مسائل جس اہمیت اور جسامت کے ہیں، ان کی روشنی میں ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے۔

اپنے کام سے قطع نظر ایک سائنس دان اور تحقیق کے میدان کے ایک ممتاز تنظیم کی حیثیت میں ڈاکٹر بورلاگ میکسیکو کے Wheat Institute کے تربیت یافتہ نوجوان سائنس دانوں کے لیے ایک رہنما بھی ثابت ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر بورلاگ اپنے شاگردوں کو کھیتوں میں لے جا کر تعلیم دینا پسند کرتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ بہت سے لوگ جب ان سے کوئی ٹیکچر دینے یا مقالہ لکھنے کی درخواست کرتے ہیں تو انہیں اس قسم کا جواب ملتا ہے، ”آپ کیا پسند کریں گے۔ روٹی یا کافد؟“

جب 1944 میں ڈاکٹر بورلاگ نے میکسیکو زرعی منصوبے پر کام شروع کیا تھا، اس وقت بہت کم لوگ آبادی کی شرح نمو اور دنیا میں غذا کی پیداوار کے درمیان رشتے کے بارے میں فکر مند ہوتے تھے۔ جنگ کے بعد بہت سی نو آبادیاتی سلطنتیں رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئیں، اور ساتھ سے سر ترقی پذیر علاقے آزاد قومی ریاستیں بن کر ابھرے تھے اور ان میں صحت کا ناقابل یقین مفلس معیار تھا جو ہمارے ضمیر کے لیے ایک دھچکا تھا۔

اپنے عالمی ادارہ صحت کے ذریعے اقوام متحدہ نے صدی کے پانچویں عشرے میں ان ریاستوں میں پھیلی بڑی بیماریوں کے خلاف بڑے پیمانے پر مہم شروع کی تھی۔ ان اسنادوں کی جتنی کوششوں سے ترقی پذیر ملکوں کی شرح اموات میں کمی کی ابتدا ہوئی۔ اور صدی کے چھٹے عشرے، یک طرفہ ترقی پذیر ملکوں ہی میں نہیں، پوری دنیا میں آبادی کا اچانک اضافہ پریشان کن ہو گیا۔

آبادی میں دھماکا خیز اضافے پر دو ذراویوں سے دھماکے کیے جا رہے ہیں؛ خاندانی منصوبہ بندی کی بابت اخلاعات سے پہلے تحقیق کے ذریعے اور زرعی پیداوار میں اضافے کے ذریعے۔

جب بورلاگ اور دوسرے سائنس دانوں نے میکسیکو کے گندم مرکزوں میں اپنے کام کی ابتدا کی تھی، اس وقت میکسیکو کے ارباب اقتدار کو اپنے ملک کی زراعتی طاقت کا کم اندازہ تھا۔ قیاس کیا جاتا تھا کہ اس ملک میں نہ سازگار موسم تھا اور نہ ترقی یافتہ زراعت کے قابل مٹی تھی۔

راکفیلر فاؤنڈیشن کے منصوبے سے مسلک گندم پر تحقیق کرنے والوں کو میکسیکو کی مدد کے لیے بھیجا گیا تا کہ وہ کم سے کم وقت میں اس ملک کو اپنی مدد آپ کرنے کے قابل بنائیں۔ سائنس دانوں کو اپنے دفاتر میں کافدوں کی اوٹ میں کام کرنے والے مشیروں کا نہیں، بلکہ کھیتوں میں جسمانی محنت کے ذریعے عملی طور پر کام کرنے کا کردار ادا کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔

بہت سے نوجوان سائنس دانوں کے لیے یہ آخری اصول ان کے سماجی رتبے کا ناقابل قبول امتحان رہا ہوگا، مگر بلاشبہ یہ ایک تو انا حکمت تھی۔

ہزار انقلاب کے بارے میں ڈاکٹر بورلاگ کی تحریریں بتاتی ہیں کہ میکسیکو گندم پر وگرام کا مقصد ان عناصر کا تجزیہ کرنا تھا جو پیداوار میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔ مزید برآں، خیال یہ تھا کہ نوجوان سائنس دانوں کو پیداوار سے متعلق سائنسی نظم و ضبط کی تربیت بھی فراہم کی جائے۔ ڈاکٹر بورلاگ کے مطابق تحقیق کا مطلب مختلف اقسام کے کھیت تیار کرنا تھا جو زیادہ مقدار میں پیداوار دیں، ان میں بیماریوں سے مزاحمت بھی ہو اور ان کا معیار بھی ایسا ہو جو ان کو بہتر دینی معاشیاتی طریقوں کے لیے موزوں بنائے، یعنی، مصنوعی کھاد کے

استعمال کے لیے، بہتر تیار کی ہوئی مٹی کے لیے اور مشینوں کے استعمال کے لیے۔

ان تمام مسائل پر سائنس دانوں کے گروہ کے متحدہ حملوں کا نتیجہ میکسیکو براعظم گندم کی صورت میں برآمد ہوا، اب جس سے سب واقف ہیں، جو حیرت انگیز پیداوار دیتا ہے، جس میں بیماریوں کے انہدام کی قوت ہے، جو مصنوعی کھاد کے زبردست استعمال میں معاونت کرتا ہے۔ پہلے زمانے کی گندم کی اقسام کے برعکس، نئی اقسام دنیا کے مختلف موسم والے دور دراز علاقوں میں بھی کاشت کی جاسکتی ہیں۔

میکسیکو گندم پروگرام کا سب سے اہم واقعہ اس کی ”پستہ قد قسم“ کی تیاری تھا۔ ڈاکٹر بورلاگ اور ان کے مددگاروں کی تحقیق کے بعد، پیوند کاری اور انتخاب کے ذریعے، نام نہاد جاپانی نسل کی گندم سے ایک قسم تیار ہوئی جو آب ”پستہ قد قسم“ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ گندم کی وہ اقسام ہیں جو پہلے زمانے کی لمبی پتیوں والے پودوں کی قسم کے برعکس، چھوٹی پتیاں نکالتی ہیں۔ لمبی پتیوں والی گندم کی اقسام، جن پر صدی کے پانچویں عشرے میں کام ہوا تھا، زیادہ پیداوار دیتی ہیں مگر چابک چھج جاتی ہیں اگر ان کو مخصوص مقدار سے زیادہ مصنوعی کھاد دے دی جائے۔ پستہ قد اقسام مصنوعی کھاد کی دہری یا تھری مقدار تک برداشت کر لیتی ہیں اور ماہی کے 450 کلو فی ڈیکار (یعنی پچاس ہیکٹار کے اعلیٰ علاقے) کے مقابلے میں 800 کلو فی ڈیکار پیداوار دیتی ہیں۔ ان اقسام کو دنیا کے مختلف حصوں میں کاشت کیا جاسکتا ہے اس لیے کہ سورج کی روشنی کی طوالت یا مٹی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ یہ دوسری تمام اقسام کے مقابلے میں کھاد ملی یا بغیر کھاد کی زمین، دونوں میں بہتر ہوتی ہیں، مصنوعی آب پاشی کے ساتھ یا بغیر آب پاشی کے۔ اس کے علاوہ یہ اقسام گندم کی بدترین دشمن زنگی پھپھوند اور [aromyces] پودوں کی ایک قسم کی بیماری کی شدید مزاحمت کرتی ہیں۔

گندم کی زیادہ پیداوار دینے والی اقسام کے طفیل 1956ء میں میکسیکو اس اناج میں خود کفیل ہو گیا تھا، اور حالیہ برسوں میں اس ملک نے کئی لاکھ ٹن گندم برآمد بھی کی ہے۔

FAO کی دعوت پر ڈاکٹر بورلاگ نے 1959ء میں پاکستان کا دورہ کیا۔ وہ پاکستان سے گندم کے کئی ماہرین کو تحقیق کے لیے میکسیکو کے تحقیقی مرکز لے جانے میں مددگار ہوئے۔ تھم بڑی کوششوں کے بعد ڈاکٹر بورلاگ پاکستانی ارباب اقتدار اور دوسرے غیر ملکی ماہرین کو قائل کرنے کے بعد پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کو بھی میکسیکو نسل کی گندم کی پاکستان میں کاشت پر راضی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس زمانے میں سال بہ سال پاکستان کی فصل زری پیداوار ملکی ضروریات سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ گندم کی پیداوار بہت کم تھی، تقریباً 100 کلو فی ہیکٹر کی اوسط کے برابر تھی۔ زری طریقے قدیم طرز کے تھے زمین پر ضرورت سے زیادہ فصل اُگائی جا چکی تھی، اور مصنوعی کھاد کا استعمال کم کم تھا۔

نوکر شاہی کو کامیابی سے قابو کر لینے اور بدگمانی، حتیٰ کہ اس قسم کی افواہوں کو سر کر لینے کے بعد کہ ڈاکٹر بورلاگ کی دریافت کردہ گندم ملک کی آبادی کو باغیچہ اور ماہر دے گی، یہ فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان ایک

مخصوص مقدار میں میکسیکو سے مکئی کی نئی نسل کے بیج درآمد کرے گا۔ ایک بار یہ بیج متعارف کرا دیے گئے اور بہترین فصلوں کی صورت میں پیداواری نتائج سامنے آ گئے تو کامیابی کا فاتحانہ مارچ شروع ہو گیا۔ آج پاکستان کی گندم کی پیداوار سات ملین ٹن کے برابر پہنچ گئی ہے اور ملک گندم کی ضروریات میں خود کفیل ہو گیا ہے۔ یہ کامیابی، جو تین سے چار سال کے عرصے میں حاصل ہو گئی تھی، معمولی بات نہیں تھی، اور چوں کہ صدر پاکستان نے ذاتی طور پر اس پروگرام کی تائید کی تھی اور یہ بھی کہ میکسیکو میں حاصل ہونے والے نتائج کو بنیاد کے طور پر استعمال کیا جائے گا، پاکستان کئی برسوں کی تحقیق اور تجربات کی محنت سے بیج نکلا۔

ڈاکٹر یو ر لاگ 1963 میں ہندوستان گئے، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا گندم کی وہ نسل جو میکسیکو میں تیار کی گئی ہے، اس ملک میں استعمال کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ اور تاریخ نے خود کو دہرایا۔ 1968 میں ہندوستان میں متر و ملین ٹن کی سب سے زیادہ پیداوار ہوئی۔ ہندوستان میں اس کامیابی کا جشن، ڈاک کے خاص ٹکٹ کے احمد اسے منایا گیا، جن پر "The Indian Wheat Revolution 1968" لکھا تھا۔

میکسیکو، ہندوستان اور پاکستان میں کامیابی کے بعد گندم کی نئی نسلیں ترکی، افغانستان، ایران، عراق، تیونس، مراکش اور لبنان میں متعارف کرائی گئیں۔ اب سویت یونین بھی میکسیکو کے International Maize and Wheat Research Center سے تعلقات برقرار رکھنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔

پچھلے پچیس برسوں میں ڈاکٹر یو ر لاگ کے حاصل کردہ عظیم نتائج کی تفصیل بیان کرنے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ وقت۔ مگر کسی شبہ سے بالاتر، یہ طے ہو گیا ہے کہ ان کی کوششوں سے گندم کی پیداوار اور معیار میں اضافے نے پیداوار اور آبادی میں اضافے کی بڑھتی ہوئی طلب کے بحران کو متوقف کر دیا ہے، بہت سے سائنس دان ایک عرصے سے جس کی پیش گوئیاں کر رہے تھے۔

ڈاکٹر یو ر لاگ کی عظیم کامیابیوں کا تجزیہ اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ اس میں عوام کا ایک سلسلہ ہے، جو نہ صرف اقتصادی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی معاملات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور یہ سب محض ترقی پذیر ملکوں ہی میں نہیں ہوتا، بلکہ بین الاقوامی تعلقات پر بھی اثر ڈالتا ہے۔

بڑی اہمیت کے مسائل، جیسے کہ امداد کا بھی، جو صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ملکوں کو فراہم کرتے ہیں، بنیادی تجزیہ کیا جانا چاہیے۔ یہ بات واضح ہے کہ ہم ترقی پذیر ملکوں کو امانت کی بے آمد پر مزید انحصار نہیں کرنے دے سکتے۔ زرعی مشینوں کی خریداری اور تکنیکی معلومات کی فراہمی کو زیادہ فوقیت دی جانی چاہیے۔

گندم کی نئی قسمیں ترقی پذیر ملکوں کے اقتصادی منظر کی مکمل قلب مابیت کرنے کے قابل ہوں گی۔ اگر اہل سیاست اس ترقی کے ساتھ ساتھ ایسی اقتصادی پالیسی پر بھی عمل پیرا ہوں جس کا مقصد عام اقتصادی ترقی ہوگا، تو سوائی زیادہ مال دار ہوگی اور صنعت زیادہ بولمکوں ہوگی۔ زراعت سے حاصل ہونے والی اضافی پیداوار کے باعث ہونے والی اضافی آمدنی کی وجہ سے تمام سرگرمیوں میں لبروں کی صورت میں

"ring-effects" کا پیدا ہونا لازمی ہوگا۔ بوائے، کھاد کی تیاری، زمین کی کوڑائی، فصل کی کٹائی وغیرہ جیسی ملازمتوں میں اضافے ہو سکتیں گے، سال میں کئی بار بازارکاری (marketing) کرنی ہوگی۔ موسم پر منحصر بے روزگاری میں کمی ہوگی، ترقی پذیر ملکوں میں صحیح انداز میں پیدا کی ہوئی متوازن معیشت فالتو انسانی طاقت کے لیے کام مہیا کر سکے گی۔ مثال کے طور پر لیسٹر براؤن (Lester Brown) نے اپنی کتاب Seeds of Change میں اسرار کیا ہے کہ [ان سب وجوہ کی بنا پر] مقامی سطح پر مزدور کی قلت پیدا ہو سکتی ہے۔

زراعت میں نئی ٹیکنالوجی معیشت کے دوسرے علاقوں۔ صنعت، تعمیرات وغیرہ کی سرگرمیوں میں نئی جان ڈال سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، پیداوار میں اضافے کی وجہ سے مصنوعی کھاد کے کارخانے، موزکین، آب پاشی، ریلوے، صنعتی سامان کے گودام، لٹاج کے گودام، اور میس وغیرہ مہیا کرنی ہوں گی۔ دور افتادہ علاقوں میں اسکول اور اسپتال وغیرہ بنانے کی وجہ سے اقتصادی زرخیزی بڑھے گی۔ ہم کسی بھی زاویے سے اس پر نظر ڈالیں، سبز انقلاب کے اثرات مکمل پیداواری اضافے پر منتج ہوں گے جس کی وجہ سے ترقی پذیر ملک بہتر حالت میں ہوں گے، اور غذا کے معاملے میں انھیں انفرادی کے مقابلے میں آزاد فیصلہ ہوگی۔

'Foreign Affairs' نامی رسالے میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں لیسٹر براؤن کہتا ہے کہ ایشیا میں لٹاج کی نئی نسل زرعی انقلاب میں وہی کیفیت پیدا کرے گی جو اٹلیس ویں صدی میں بھاپ سے چلنے والے انجن نے یورپ کے صنعتی انقلاب میں کی تھی۔ یا جیسا کہ یوجین بلیک (Eugene Black) نے کہا ہے کہ لٹاج کی نئی اقسام "تہذیبی کے انجن" ہوں گی۔

فقط یہ "تہذیبی کے انجن" ہی معاشرے میں کسانوں کی حیثیت کو اور اپنی زندگی کے بارے میں ان کے رویوں کی قلب ماہیت نہیں کر سکتیں۔ آمدنی کی تقسیم کی ایک نئی پالیسی، ہی کسان کو مفلسی اور مردہ دلی کے شیطانی چکر سے نکلنے میں مدد کر سکے گی، جو دراصل محتاجی کی فطری دین ہوتا ہے اور جس کی موجودگی میں مستقبل کے کوئی امکانات نہیں ہوتے۔ بہت سے لکھنے والے، جنھیں ترقی پذیر ملکوں میں کسانوں کی آبادی سے واسطہ رہا ہے، کہتے ہیں کہ کسان ان معنوں میں قدامت پسند ہوتے ہیں کہ وہ تہذیبی نہیں چاہتے۔ مگر ڈاکٹر بورلاگ کا، جو کسانوں کے بڑے مدح خواں ہیں، خیال ہے کہ جب تہذیبیاں معیار زندگی کو بلند کریں گی تو ایشیا کے کسان بھی تہذیبی کو قبول کر لیں گے۔ ڈاکٹر بورلاگ کے الفاظ میں، "کسان غیر تعلیم یافتہ ہو سکتا ہے مگر اس میں سمجھ ہوتی ہے۔"

لٹاج کی نئی اقسام اور ضروری سرمایہ کاری کے ساتھ کسان ارباب اختیار سے تعلیم، سفر، زرعی کریڈٹ وغیرہ کے بارے میں مطالبے بھی کریں گے۔ سرمایے کے بھوکے کسان معیشت کی تشکیل کے مراحل میں سیاسی دباؤ بھی ڈال سکتے ہیں۔ ارباب اختیار کو جنھیں قبول کر پڑے گا۔ اس طرح سیاسی سرگرمی میں بھی اضافہ ہوگا۔ پھر بھی، ڈاکٹر بورلاگ کو احساس ہے کہ جہاں لٹاج کی نئی اقسام کسانوں کی بونتی ہوئی فصلوں میں

اضافے کا باعث ہوئی گی، وہیں سبز انقلاب سے منفی قسم کے سماجی مسائل بھی پیدا ہوں گے۔ اگر ترقی پذیر ملکوں کے سیاست دان منصفانہ فیکس مناسب سود کی شرح پر زرعی کریڈٹ کی فراہمی اور قابل دفاع ملازمتوں کی پالیسی کے ذریعے ضروری حالات پیدا نہیں کر سکے تو سماجی نا انصافیاں بھی ہو سکتی ہیں۔

اس سال کے اگست کی مہینہ تاریخ کو زرعی کالج میں کی جانے والی اپنی تقریر میں ڈاکٹر بورلاگ نے اپنے سماجی تصورات کا اس طرح اظہار کیا ہے: "میں نے گندم پر کام کیا ہے، مگر گندم جو محض ایک عمل انگیز شے ہے، تصویر کا ایک حصہ ہے۔ میں تمام ملکوں کی مکمل اقتصادی ترقی میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ صرف تمام مسائل پر مسئلے سے ہی ہم ہر معاشرے کے تمام لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کر سکتے ہیں، تاکہ وہ اچھی زندگی گزار سکیں۔ اس گمراہی کے تمام لوگوں کے لیے ہم اسی کے خواہاں ہیں۔"

مگر یہ تو ذمہ داری ہے، چیلنج ہے، جس کا مقابلہ متعلقہ ممالک کے سیاسی ارباب اقتدار کو کرنا ہوگا۔ اس سائنسی اضافے اور ان کی اپنی انتظامی صلاحیتوں کے ذریعے ڈاکٹر بورلاگ نے مستقبل کے بارے میں ہمارے تجزیے اور اس کے امکانات میں ایک حرقِ عنصر داخل کر دیا ہے۔ انہوں نے ہمارے تاثر کو پھیلا دیا ہے؛ انہوں نے مابینِ اقتصادیات، سماجی منصوبہ بندی کرنے والوں اور سیاست دانوں کو چند عشروں کا وقت دیا ہے، جس میں انہیں اپنے مسائل حل کرنے ہوں گے، خاندانی منصوبہ بندی، معاشی مساوات، سماجی تحفظ اور سیاسی آزادی کو متعارف کرانا ہوگا، جن کا ہوا ضروری ہے، تاکہ ہر مفلس، کم زور پرورش والے عوام کو روزانہ کی روٹی اور ایک پُر امن مستقبل فراہم ہو۔

اور عین اسی میدان میں، ڈاکٹر بورلاگ نے امن کو ایک عظیم تحفہ دیا ہے۔ جنگ کے بعد کے گمراہی پر پھنسے ہوئے ہیں، ہم میں سے ان لوگوں نے جو فراط کے صنعتی معاشرہ میں رہتے ہیں تقریباً ہیبت زدہ انداز میں دنیا کی برہمتی ہوئی آبادی اور دنیا کے غذا کے وسائل کے درمیان فرق پر مباحثہ کیے ہیں۔ زیادہ تر مابین جنہوں نے اس مسئلے پر رائے دی ہے، مابین امید کی کاٹھار تھے۔ دنیا دو آفتوں کے خطرات کے درمیان جھونپتی رہی ہے۔ برہمتی ہوئی آبادی اور جوہری بم۔ دونوں ہی مہلک خطرات پیش کرتے ہیں۔

اس نا قابلِ برداشت حالت میں روز قیامت جیسے دن کی دھمکی ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر بورلاگ ششمن پر آتے ہیں اور بیچ دار گرد و کوکاث ڈالتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں مستحکم امید دلائی ہے۔ امن کا اور زندگی کا متبادل۔ سبز انقلاب!

صدر ششمن ماریو یاقوئی نوئیل کشی Gunhar Jahn کی زبان

خطبہ:

سبز انقلاب، امن اور انسانیت

نمکن، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، غذا کی مناسب مقدار کے بغیر نہ وجود میں آیا ہوگا، نہ ہی باقی رہ سکے گا۔ پھر بھی، غذا وہ شے ہے، دنیا کے رہتلا جس کو ہمیشہ موجود جانتے ہیں، اس حقیقت کے باوجود کہ دنیا کی نصف سے زیادہ آبادی بھوک میں مبتلا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان تاریخ میں موجود سب سے روگردانی پر اصرار کر رہا ہے۔

آدم اور حوا کے وقت سے لے کر زراعت کی ایجاد تک غذا کی فراہمی کو یقینی نہ بنا سکنے کے باعث آدمی کی بلکا غیر یقینی رہی ہوگی۔ تاریخ کے طویل، اور چند لمے، قبل از تاریخ، زمانے میں جب آدمی آوارہ شکار اور غذا جمع کرنے والا تھا، غذا کی کمی دیکھی مہمان کی ترقی میں رکاوٹ رہی ہوگی۔ ان حالات کے زیر اثر انسانی آبادی کی نشوونما بھی غذا کی محدود درسد کے باعث محدود تھی۔

چند لمے اور کبر آلود ماضی میں، جب قدیم حجری (Mesolithic) عہد نے جدید حجری (Neolithic) عہد کو راستہ دیا تھا، تو اچانک وسیع اور علاحدہ جغرافیائی علاقوں میں ایسے نہایت کامیاب موجدین اور انقلابیوں کے گروہ ابھرے کہ دنیا نے اس سے قبل دیکھے نہ تھے۔ جدید حجری عہد کے عروں اور عورتوں کے گروہ، غالباً عورتوں نے زیادہ تر غلے، پھلیوں، بیج کی فصلوں اور سارے اہم جانوروں کو شکاری بنالیا، جن کا آج بھی انسان کی بڑی غذاؤں میں شمار ہوتا ہے۔ بظاہر نو ہزار سال قبل Zagros پہاڑی سلسلے کی وادیوں میں، آدمی زراعت پیشہ بھی اور گلے بان بھی ہو گیا تھا، جس کے بعد جلد ہی مزدوری کی اور دیسی زندگی کی ابتدا ہو گئی۔

ہر طرف ایسی ہی ایجادات اور ترقیات نے جلد ہی وہ بنیاد فراہم کر دی جس سے جدید زراعت اور حیوانات کی صنعت اور درحقیقت، دنیا بھر کے مہمان وجود میں آئے۔ ان کے اخلاف کی بے پناہ قدر کے باوجود ہم بنی نوع انسان کے کسی بھی مربی کو اس کے نام سے نہیں جانتے۔ درحقیقت، یہ پچھلی صدی ہی میں، اور بالخصوص پچھلے پندرہ برسوں میں۔ مؤثر کاربن ڈیٹنگ سسٹم کی ترقی کے بعد۔ ہوتا ہے کہ ہم نے ان زمانی واقعات کو بہ طور پر سمجھنا شروع کر دیا ہے جنہوں نے ہماری دنیا کے مقبوم کی صورت گری کی ہے۔

پھر بھی زراعت کی ایجاد انسان کو غذا کی قلت، بھوک اور قحط سے نجات نہیں دلا سکی۔ ماقبل تاریخ کے عہد میں بھی آبادی کے بڑھتے ہوئے طوفان نے انسان کی کافی غذا پیدا کرنے کی صلاحیت کو اکثر خطرے میں ڈال دیا ہوگا۔ پھر، جب خشک سالی یا بیماریوں اور کیڑے مکوڑوں کی وبا نے فصلیں تباہ کیں تو نتیجہ قحط کی صورت میں نکلا، کہ قدیم زمانوں میں وقتاً فوقتاً ایسی تباہیاں ہوتی رہی ہیں، انجیل اس کی طرف وافر اشارے کرتی ہے۔ لہذا خداوند نے کہا، ”میں نے تم کو غضب اور پھپھوند سے مغلوب کر دیا ہے۔“ ”بیج مٹی میں فاسد ہو گیا ہے، غلے کے ڈھیرے ویران پڑے ہیں، کھلیان مسمار ہو گئے ہیں، اس لیے کہ مٹی کے پھول مرجھا گئے ہیں۔۔۔ میدان کے درندے بھی تم پر بھونکتے ہیں، کہ پانی کے دریا خشک ہو گئے ہیں، اور آگ نے جنگل

کی جہاں گاہوں کو برائی میں بدل دیا ہے۔“

گزشتہ زمانوں میں پودوں کی بیماریاں، خشک سالی، ویرانی اور نا امیدی، بار بار آنے والی تباہیاں بنی تھیں۔ اور قدیم علاج کیا تھا: مافوق الفطرت روحوں یا خداؤں سے مناجاتیں! اس کے باوجود ”ہمیشہ بھرے گودام“ کا تصور اپنے بنیادی چکر میں ظاہر ہوا ہے، جیسا کہ فرعون کے خواب اور یوسف کی تعبیر اور آنے والے قحط کے لیے تیاریوں سے ظاہر ہے، جیسا کہ توریت کا یہ اقتباس بتاتا ہے۔ ”اور سات برس کا قحط آنا شروع ہوا، جیسا کہ یوسف نے کہا تھا۔۔۔ اور قحط ہر زمین پر تھا۔۔۔ مگر مصر کی سر زمین پر روٹی موجود تھی۔“ مگر اپنے وقت میں یوسف اپنے خدا کی مدد سے دانش مند تھے۔

مگر آج ہمیں زیادہ عقل مند ہو جانا چاہیے؛ نہ صرف ہمیں مائنس اور اپنے خداؤں کی مدد سے اپنی غذا کی رسد کو بڑھانا چاہیے، بلکہ اس کو حیاتیاتی اور طبیعیاتی آفتوں سے محفوظ بھی رکھنا چاہیے اور ضرورت کی صورت میں غذا کے بین الاقوامی ذخائر سے مدد لینی چاہیے۔ اور غذا کے یہ ذخائر تمام ضرورت مندوں کے لیے کھلے ہونے چاہئیں، عین اُس وقت جب قحط حملہ آور ہوں بعد میں نہیں۔ آدمی کو مستقبل کی قحط سالی کی مزاحمت کرنی چاہیے، اور ضرور کرنی چاہیے، بھلے اس کے کر وہ پارسیا نہ تانت کے ساتھ قحط سالی کے انسانی طبع کی، بعد از قحط، بازیافت کرے، جیسا کہ اس نے ماضی میں کئی بار کیا ہے۔ اگر ہم نے مستقبل میں قحط سالی ہونے دی تو، بغیر کسی مروت کے، ہم مجرمانہ غفلت کے گناہگار ہوں گے۔ انسانیت اس قحط کو برداشت نہیں کر سکتی۔

الفریڈ نوٹیل بھی غذا کی اہمیت کے بارے میں بہت باضمیر انسان تھا، اس لیے اس نے ایک بار لکھا تھا: ”میں مرجانے والوں کی یادگاروں کے بجائے، زندہ افراد کے شکم کی زیادہ پروا کروں گا۔“

عالمی مزدن کے مفکر کا انحصار بنی نوع انسان کا معیار زندگی بلند کرنے پر ہے۔ 1969 کا نوٹیل امن حاصل کرنے والے ادارے International Labor Organization کے منشور میں اس کے رجحان اصولوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ”عالمی اور دیر پا امن صرف اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب اس کی بنیاد سماجی انصاف پر ہو۔ اگر آپ امن کے خواہش مند ہیں تو انصاف کا شت کیجیے۔“ یہ کتنا شان دار اصول ہے؛ کوئی بھی اس بلند پایہ اصول سے اختلاف نہیں کر سکتا۔

یعنی طور پر، تمام انسانوں کے لیے وافر مقدار میں غذا کی فراہمی سماجی انصاف کا پہلا بھر ہے۔ سہ وہ شخص جو اس دنیا میں پیدا ہوا ہے، غذا اُس کا اخلاقی حق ہے۔ پھر بھی، آج دنیا کی پچاس فی صد آبادی بھوکے سوتی ہے۔ غذا کے بغیر انسان بس چند ہفتے زندہ رہ سکتا ہے؛ اس کے بغیر، سماجی انصاف کے تمام حنا سرے معنی ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اوپر بیان کیے گئے رجحان اصول کو اس طرح لکھنا چاہیے: اگر آپ امن کے خواہش مند ہیں تو انصاف کا شت کیجیے، مگر ساتھ ہی ساتھ ایسے کھیت بھی تیار کیجیے جن میں زیادہ روٹی پیدا کی جاسکے، ورنہ امن [باقی] نہیں رہے گا۔

یہ اعتراف کر بھوک اور سماجی بد نظمی ایک دوسرے سے منسلک ہیں، نئی بات نہیں، اس لیے کہ

عہد نامہ تیش میں اس کا ثبوت موجود ہے۔ ”اور یہ سب تو گزر جائے گا، مگر جب وہ بھوکے ہوں گے، تو وہ خود کو شراب کریں گے اور اپنے بادشاہ اور اپنے خدا کو بد دعائیں دیں گے۔“

حال یہ ”در میں“ شاید ہی کسی نے بھی اسے چبھتے ہوئے انداز میں غذا اور امن کے باہمی تعلق کو بیان کیا ہوگا، سوائے بھوک کے خلاف جنگ کرنے والے FAO کے پہلے ڈائریکٹر جنرل اور انٹرنیشنل انعام یا فٹ لارڈ جان بائیڈ آر کے۔ ان کے مشہور الفاظ تھے ”امن بھوکے شکم پر تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔“ دانش کے یہ مرادہ الفاظ جو اکیس برس پہلے ادا کیے گئے تھے آج بھی اسے ہی درست ہیں جیسے کہ اس دن، جب ادا ہوئے تھے۔ یہ الفاظ مستقبل میں اور بھی زیادہ با معنی ہو جائیں گے جب دنیا کی آبادی آسمان سے باتیں کرنے لگے گی، جب سماجی دباؤ اور مصوحت بڑھے گی۔ لارڈ آر کی فہمائش کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ دنیا بھر میں بے ترتیبی اور سماجی ابتری ہوگا، اس لیے کہ بنیادی حیاتی قانون یہ ہے کہ جب زندہ حیوانی ماحول والوں کی زندگی کو غذا کی کمی کا خطرہ ہو تو سب ایک بار ٹوٹ پڑتے ہیں اور اپنے آزدی کے حصول کے لیے تشدد پر اتر آتے ہیں۔

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ یہ زمین، اسے دن بعد بھی۔ ”مراعات یا فٹ دنیا“ اور ”فراموش کردہ دنیا“۔ دو دنیاؤں میں بنی ہوئی ہے۔ مراعات یا فٹ دنیا میں خراط سے پر ترقی یافتہ قومیں ہیں، جن میں دنیا کی پچیس سے تیس فی صد آبادی رہتی ہے، جس کی اکثریت پر قیام ماحول میں زندگی بسر کرتی ہے، انسان کو ”یاد عدل“ کے باہر جس کا کوئی تجربہ نہیں تھا فراموش دنیا ترقی پذیر ملکوں پر مشتمل ہے، جہاں کی اکثریت، یعنی دنیا کی پچاس فی صد آبادی، افلاس میں گزراوقات کرتی ہے، جس میں بھوک ان کی ثابت قدم ساتھی ہوئی ہے اور قحط کا خوف ان کی دلی آفت۔

جب انٹرنیشنل امن کمیٹی نے سبز انقلاب میں میرے کام کی بنیاد پر مجھے 1970 کے انعام کے لیے منتخب کیا تو میرے خیال میں، وہ دراصل ایسے فرد کو منتخب کر رہی تھی جو ایک اہم علامتی کردار ہو، زراعت اور غذا کی پیداوار کے میدان کا، ایسی دنیا میں جو بھوک ہے امن کی بھی، اور روٹی کی بھی۔ مگر میں تو ایک بڑی نیم کا ایک ٹرکین ہوں جو کئی اداروں، دفاتروں، میزادوں، سائنس دانوں اور کرداروں۔ چھوٹے اور فروتن کسانوں پر مشتمل ہے، برسوں سے جو غذائی پیداوار کے محاذ پر ایک خاموش، کبھی کبھی ہارتی ہوئی، خاموش جنگ لڑتے رہے ہیں۔ پچھلے تین برسوں میں جنوبی ایشیا کے کثیر آبادی والے کئی ملکوں میں، پانچ برس قبل جہاں وسیع پیمانے پر قحط سالی کا خطرہ منڈلا رہا تھا، گندم، چاول اور جوار کی پیداوار میں قابل دید ترقی ہوئی ہے۔ پیداوار میں اضافہ نتیجہ تھا اناج میں فی ایکڑ فائدے کا، جو ایک خصوصی ارتقا تھا، اس لیے کہ ان ملکوں میں کھنی آبادی کے باعث کاشت کے لیے رقبے میں اضافہ ممکن نہیں ہے۔

مقبول ذرائع ابلاغ میں یہ بتانے کے لیے کہ پچھلے تین برسوں میں اناج کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے ”سبز انقلاب“ کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی۔ غالباً، سبز انقلاب کی اصطلاح کا عام طور پر استعمال قبل از وقت، زیادہ نوا میدی ہے، یا بہت وسیع معنوں میں ہے۔ اکثر و بیشتر، یہ بہت سے ملکوں کے وسیع علاقوں میں

تمام پیداواروں کی yield فی ایکڑ کا تاثر دیتی ہے۔ کبھی تو اس سے یہ مطلب بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تمام کسان اس کامیابی سے برابر برابر فائدے حاصل کر رہے ہیں۔

ایسے مضمرات حقائق کو زیادہ سادہ بنا دیتے ہیں، منسج کر دیتے ہیں۔ صرف وہی فصلیں جن میں اب تک قابل تعریف بہتری ہوئی ہے گندم، چاول اور جوار کی ہیں۔ دوسرے اہم دلیے کی پیداوار جیسے غنمو (جانوروں کا چارہ)، باجرا اور جو وغیرہ پر کم اثر ہوا ہے، نہ ہی دالوں، یا پھلیوں پر مشتمل فصلوں میں کوئی قابل ذکر بہتری ہوئی ہے جو دلیا کھانے والی آبادیوں کے لیے ضروری اناج ہیں۔ مزید یہ کہ یہ واضح ہوا چاہیے کہ اب تک کے بڑے اضافے آب پاشی کے علاقوں میں ہوئے ہیں، نہ ہی دلیا کے اناج اگانے والے تمام کسانوں نے نئے جج کے استعمال سے اور نئی تکنیک سے فائدے اٹھائے ہیں۔ تاہم بہت سارے چھوٹے اور بڑے، کسان نئے جج اور نئی تکنیک کو تیزی سے اپنا رہے ہیں، اور پچھلے تین برسوں سے ان لوگوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

سبز انقلاب کی وجہ سے بارانی علاقوں میں دلیے کی پیداوار میں تہذیبی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے، مگر دوسرے ملکوں میں خاصی تہذیبیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔

ان سب خوبیوں یا خرابیوں کے باوجود، ہندوستان، پاکستان اور فلپائن میں دلیے کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ دوسرے جن ممالک میں خاصی بہتری دیکھنے میں آتی ہے ان میں افغانستان، سیلون، انڈونیشیا، ایران، کینیا، ملائیا، مراکش، تھائی لینڈ، تیونس اور ترکی شامل ہیں۔

سبز انقلاب کی اہمیت کا اندازہ لگانے کی کوشش سے پہلے ہمیں جانچنے والے کے نقطہ نظر کو مقرر کرنا چاہیے۔ فراموش کردہ دنیا کے ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں مراعات یافتہ اور بہتات رکھنے والی قوموں کے بیشتر لوگوں کے نزدیک سبز انقلاب کے بالکل مختلف معانی ہیں۔ افراط یافتہ صنعتی ترقی یافتہ قوموں میں گندم، جوار اور غنمو کے دیو قامت ذخائر عام ہیں، مویشی، خنزیر، اور مرغیوں کو چربی سے فریہ بنانے کے لیے دلیے کے اناج، گوشت، دودھ، انڈے، اور سبزیاں کھانا عام لوگوں کی دسترس میں ہوتا ہے۔ متوازن غذا گھل، کم و بیش از محدود مل جایا کرتی ہیں اور دلیے کی مصنوعات روزمرہ کی خوراک کا محض ایک مختصر حصہ ہوتی ہیں۔ اس لیے، ان سو برائیوں کے زیادہ تر لوگوں کو ترقی پذیر ممالک کے عوام کو زیادہ پیداوار والے اناج، گندم، چاول، جوار، غنمو اور باجرا فراہم کرنے کی اہمیت کا مشکلی سے ادراک ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں صنعتی ترقی یافتہ ملکوں کی شہری آبادی کی اکثریت ان باتوں کی اہمیت کو فراموش کر چکی ہے جو بچپن میں انہوں نے ”ہمیں آج کی روٹی چاہیے“ جیسے الفاظ سے سیکھی تھیں۔ وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ غذا سپر مارکٹ سے آتی ہے، مگر بہت کم لوگ، ضروری سرمایہ کاری، محنت، جدوجہد اور زرعی باڑوں کی محرومیوں سے پرے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو انہیں ”آج کی روٹی“ مہیا کرنے والوں کو پیش آتی ہیں۔ چوں کہ شہروں میں رہنے والوں کا اپنی مٹی سے رشتہ کٹ چکا ہے، اس لیے وہ غذا کو عام ضرورت کی اشیاء سمجھنے لگے ہیں اور ان

مشکلات اور تکلیفات کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو روزانہ ان کے کسانوں اور بارے برداروں کو پیش آتی ہیں۔ جو اگرچہ ریاست ہائے متحدہ جیسے ملکوں میں تمام کام کرنے والوں کے صرف پانچ فی صد کے برابر ہوتے ہیں، اپنی قوم کو اس کی ضرورت سے زیادہ غذا انکم پہنچانے کے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔

اس سے زیادہ خراب بات یہ ہے کہ شہروں کے باہر شہر و غل مچا کر اپنی حکومت پر تنقید کرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے کسانوں کی زرعی پیداوار کو اندرون ملک اور بیرونی منڈیوں کی طلب سے متوازن کرتے رہتے ہیں، اس کوشش میں کہ صارف کو معقول قیمت پر غذا بھی فراہم ہوتی رہے اور کسانوں اور بارے والوں کو مناسب اجرت بھی ملتی رہے۔

شدید تضاد یہ ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور دوسرے ایشیائی اور افریقی ترقی پذیر ملکوں کی سڑ سے انہی فی صد آبادی کا پیشہ، بہت دیر کے درجے تک، زراعت ہے۔ زمین خشکی ہوتی ہے، سخت ہے، کھاد بننے والے پودوں سے خالی ہے، اور اکثر جگہ سے کٹی پھٹی ہوتی ہے، فصلوں کی پیداوار کم اور فاقہ کشی کے درجے پر ہے اور صدیوں سے کھڑے پانی کی طرح ساکن ہے۔ افلاس ہر طرف دیرہ بجائے ہوئے ہے، اور ہٹا کا انحصار سال بہ سال دیے کے لٹا کی فصلوں کی کامیابی اور ناکامیابی پر رہتا ہے۔ ان قوموں میں کم غذائیت اور خراب غذائیت دونوں دور دور پر پھیلے ہوئے ہیں اور بقا کے لیے اور ذہنی و جسمانی جینیاتی قابلیت کی ارتقا کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی غذا بنیادی طور پر دیے پر مشتمل ہوتی ہے، جو سڑ سے انہی فی صد تک کیلوری اور پینسجہ سے سڑ فی صد تک پر وٹین فراہم کرتا ہے۔ حیوانی پروٹین اتنے قلیل اور گراں ہوتے ہیں کہ آبادی کے ایک بڑے حصے کی پہنچ سے باہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بہت سی قومیں دوسری عالمی جنگ سے قبل خود کفیل تھیں اور دیباہ آمد بھی کرتی تھیں، مگر پیداوار کے مقابلے میں آبادی کے زیادہ اضافے کے باعث کہ اب ان کا انحصار درآمد پر ہوتا ہے۔ سب اس کے امکانات بہت کم ہیں کہ ان ملکوں میں زراعتی علاقہ برصغیر ہوتی طلب کو پورا کر سکے گا۔ فصلوں کی پیداوار کے ایک مقام پر ٹھہرے رہنے اور آبادی کے خوف ناک درجے تک اضافے کی وجہ سے حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔

بھلائی ہوتی دنیا کے کروڑوں محروم لوگوں کے لیے، بھوک جنم جنم کا ساتھی رہی ہے، اور اس کے اطراف کے مائے میں فاقہ کشی بھی گھٹات لگائے رہی تھی۔ ان محروموں میں دو ملین کو، جنہیں مایوسیوں میں رہتے عرصہ بیت گیا تھا، ہزار انقلاب ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے جس نے مستقبل کے لیے امید پیدا کر دی ہے۔

اس ہزار انقلاب سے ہونے والی ضرب کی جسامت اور اہمیت کی بہترین مثال ہندوستان، پاکستان اور فلپائن میں دیے کا پیداوار کی اضافہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں گندم کی فی ہیکٹر پیداوار میں اضافہ ہزار انقلاب کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ چاول کی فی ہیکٹر پیداوار میں اضافے نے مغربی پاکستان میں اہم کردار ادا کیا ہے جب کہ اب تک ہندوستان میں اسے کم کامیابی ملی ہے۔ جوار کی پیداوار میں اضافے نے ہندوستان اور پاکستان دونوں میں دیے کا معمولی مگر با معنی پیداوار میں اضافہ کیا تھا اور چاول کے

پیداواری اضافے کی وجہ سے فلپائن، سیلون اور انڈونیشیا میں دہلیے کی پیداوار میں تہذیبی آئی گئی۔
ہندوستان اور پاکستان میں ہونے والا سبز انقلاب، جو نتیجہ ہے گندم کی پیداوار میں پیش رفت کا، نہ
قسمت کا کوئی کرشمہ ہے اور نہ کسی قدرتی حادثے کا نتیجہ۔ یہ کامیابی تھی مستحکم بنیادوں پر کی جانے والی تحقیق
کی، پہلی نظر میں جس کی اہمیت بالذات نہیں تھی اس لیے کہ پس منظر میں، دنیا کی دوسری طرف میکسیکو میں،
دو عشروں میں جارحانہ انداز میں گندم پر تحقیق ہوئی تھی، جس نے نہ صرف گندم کی پیداوار کے معاملے
میں میکسیکو کو خود کفیل بنا دیا بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی پیداوار کو ہمیز کر دیا تھا۔ میکسیکو ہی میں زیادہ پیداوار
دیے جانے والی چھوٹے قدرتی فصلوں کی منصوبہ بندی کی گئی، نسل سازی کی گئی اور ان کی نشوونما کی گئی۔ وہیں نئی
پیداوار کی ٹیکنالوجی بھی تیار کی گئی تھی جو ان اقسام کو اپنی بلند جینیاتی قوت کا اظہار کرنے کی اجازت دیتی
ہے، جب ان کو صحیح طرح سے کاشت کیا جاتا ہے، کہ یہ اپنے بلند جینیاتی پیداواری قوت کا اظہار کریں، جو بالا
قدر فصل کے مقابلے میں دو گنی یا تین گنی پیداوار دیتی ہے۔

زرعی پیداوار میں معجزے نہیں ہوتے۔ نہ ہی گندم، چاول یا جوار میں کوئی معجزاتی قسم کی چیز ہے
جو شروپ حیات بن کر قدیم روایتی زراعت کی ساری خرابیوں کو دور کر دے اس کے باوجود میکسیکو کی پست
قد گیہوں کی قسم، اور ان کی حالیہ ہندوستانی اور پاکستان کی پیدا کردہ نسلیں ہی سبز انقلاب کی بنیادی شروعات
کی عمل انگیز عنصر بنی ہیں۔ اونچے درجے کی جینیاتی پیداوار غیر معمولی قسم کی مطابقت، پست قدر پیال، طاقت ور
اثر پذیری، کھاد کی طاقت ور خودک کی اعلیٰ درجے کی کارکردگی، اور بڑے پیمانے پر امراض کی مزاحمت،
سب نے مل کر میکسیکو کی پست قدر قسم کو سبز انقلاب کی شروعات کا طاقت ور عمل انگیز عنصر بنا دیا ہے۔ اب یہ
کسانوں کی پسند بن گئی ہیں، اور پاکستان میں 1969-1970 میں چھوٹے پیمانے پر رقبے کے پچھن فی صد علاقے
پر گندم کی کاشت کی گئی اور ہندوستان میں چودہ ملین رقبے کے چھتیس فی صد علاقے پر میکسیکو کی گندم اور اس
کی دوسری اقسام کی کاشت کی گئی ہے۔ گندم کی کاشت میں یہ تیز اضافہ صرف میکسیکو کی پست قدر قسم ہی پر منحصر
نہیں تھا، اس میں میکسیکو سے پاکستان اور ہندوستان میں ساری نئی ٹیکنالوجی کا تبادلہ بھی شامل تھا، جو اتنی زیادہ
منافع کی پیداوار حاصل کرنے کی قوت رکھتی تھی۔ شاید میکسیکو میں کی جانے والی تحقیق کے نتائج کا پچھتر فی
صد واقعی سفارش، جس میں کھاد کی سفارشات بھی شامل تھیں، براہ راست پاکستان اور ہندوستان میں نافذ کی
گئی تھیں۔ جہاں تک ہتیر پچھن فی صد کا سوال ہے، تو پاکستان اور ہندوستان کے سائنس دانوں کے ہاتھوں کی
گئی اعلیٰ درجے کی تحقیق نے، جب کہ درآمد شدہ جی کٹی گنا لیے جا رہے تھے وہ ضروری اطلاعات فراہم کر
دی تھیں جن کے ذریعے میکسیکو کے طریقے کو تبدیل کر کے ٹھیک ٹھیک پاکستان اور ہندوستان کے حالات کے
مطابق بنایا جا رہا تھا۔

جس طرح میکسیکو سے نئے جی اور نئی ٹیکنالوجی کا ہندوستان اور پاکستان تبادلہ اہم تھا، اُسی طرح
فصل پیدا کرنے والی تحریک کی حکمت عملی کا میکسیکو سے تبادلہ بھی ضروری تھا۔ اس حکمت عملی نے زیادہ

پیداوار کی مانج کے سنے جج کی قوت کو قابو میں کیا اور نئی ٹیکنالوجی کو محکم حکومتی اقتصادی پالیسی کی طرف موڑ دیا جو کسان کو اس کے مانج کی ایک معقول قیمت دلائے اور زراعت کی تمام ضروریات کی فراہمی کے لیے۔ جیسے جج، کھان گیز سے مارنے اور غیر ضروری خود رو گھاس کو ختم کرنے کی دوائیں۔ کریڈٹ دلائے گی جن سے وہ یہ سب اشیا خرید سکیں۔ اجتماعی طور پر ان تفصیلات کی فراہمی اور حکمت عملی وہ بنیاد بنے جس پر سبز انقلاب کا ارتقا ہوا تھا۔

زراعت کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی زیادہ منافع دینے والی مختلف اقسام کے عمل نقل کے ساتھ ایک بالکل نئی ٹیکنالوجی اور حکمت عملی کا، اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنے قلیل عرصے میں، اتنی بڑی کامیابی سے استعمال دیکھا نہیں گیا تھا۔ عمل نقل کی یہ کامیابی ایسا واقعہ تھی جو بڑی سائنسی اور سماجی اہمیت کی حامل تھی۔ اس کی کامیابی کا انحصار پیداواری پروگرام کی اچھی تنظیم، باہمت تعمیل اور تجربے کا سائنسی رہنماؤں پر تھا۔

پستہ قد میکسیکی اقسام کے ساتھ تجرباتی شروعات ہندوستان اور پاکستان میں 1963ء ہوئی تھی اور 1964ء تک جاری رہی۔ دونوں ممالک میں نتائج نہایت امید افزا تھے۔ لہذا، 1963ء میں 350 اور 250 ٹن میکسیکی پستہ قد گندم کے جج، بڑے پیمانے پر، زرعی باڑوں میں پرکھنے کے لیے پاکستان اور ہندوستان میں درآمد کیے گئے۔ ایک بار پھر، نتائج نہایت ہمت افزا تھے اور ہندوستان نے 1966ء میں اٹھارہ ہزار ٹن جج در آمد کر کے اپنے مثبت رد عمل کا اظہار کیا۔ ایک برس بعد پاکستان نے بھی بیالیس ہزار ٹن جج در آمد کیے۔ ان درآمدات کے ساتھ ہی دونوں ملکوں میں گندم کی پیداوار کا انقلاب شروع ہو گیا۔ ایسا تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا کہ اتنی بڑی مقدار میں دو دراز کی زمینوں سے جج درآمد کیے، اور کامیابی سے نئی زمین میں کاشت کیے گئے تھے۔ ان درآمدات نے تین سے پانچ برس سے کم عرصے میں سبز انقلاب کے فوائد حاصل کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔

پچھلے تین برسوں میں دونوں ملکوں میں گندم کی پیداوار میں قابل دید اضافہ ہوا ہے۔ سبز انقلاب سے پہلے پاکستان میں 1965ء کی 4.6 ملین ٹن کی پیداوار کے مقابلے میں تین برسوں میں 1969ء 1968ء اور 1970ء میں بالترتیب 6.7، 7.2 اور 8.4 ملین ٹن گندم پیدا ہوئی۔ 1968ء میں ہماری پیشین گوئی کے مقابلے میں دو برس پہلے ہی مغربی پاکستان گندم میں خود کفیل ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں گندم کی پیداوار 1964-65ء میں 12.3 ملین ٹن تھی جو 1968، 1969، 1970ء میں بڑھ کر بالترتیب 18.7، 16.5 اور 20 ملین ٹن ہو گئی۔ ہندوستان خود کفالت کے درجے تک پہنچ رہا ہے اور غالباً اب تک خود کفیل ہو گیا ہوتا، اگر چاول کی پیداوار تیزی سے بڑھی ہوئی، اس لیے کہ چاول کی مسلسل کمی کے باعث گندم کا استعمال بڑھ رہا ہے۔

International Rice Research Institute (IRRI) کی فلپائن میں تیار کیے ہوئے پستہ قد چاول کے پودوں کے ذریعے زیادہ منافع دینے والی قسم کے ساتھ نئی ٹیکنالوجی کو، جو اس کو زیادہ پیداواری بناتی ہے، مغربی پاکستان میں متعارف کرائے جانے کے باعث پچھلے دو برسوں میں چاول کی پیداوار میں بھی

بہت اضافہ ہوا ہے۔ بد قسمتی سے، ہندوستان اور مشرقی پاکستان کے مائسوں کے علاقوں میں یہ قسم صحیح طرح جم نہیں سکی ہے، لہذا مقامی طور پر اس کا اثر بہت معمولی ہوا ہے۔ نئی اقسام جو آب تیار کی جا رہی ہیں وہ اس کیفیت کا ازالہ کریں گی۔

ہندوستان اور پاکستان میں گندم اور چاول کی پیداوار نے نہ صرف غذا کی پیداوار میں اضافہ کیا ہے بلکہ اس نے کسانوں کی معیشت کو بھی مثبت انداز میں متاثر کیا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے کسانوں کی آمدنی، جو پست قدر پودوں والی نئی میکسیمیائی گندم کو ان کے بتائے ہوئے انتظامی طریقوں سے کاشت کر رہے ہیں، جن کا انھیں مشورہ دیا گیا ہے، مقامی اقسام کی کاشت کے ذریعے ہونے والی سہولتیں ڈالر فی ہیکٹر آمدنی سے بڑھ کر 162 ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ پچھلی تین فصلوں کی اضافی پیداوار نے ہندوستان اور پاکستان کی قومی آمدنی میں بالترتیب 1.4 بلین ڈالر اور 640 ڈالر کا اضافہ کیا ہے۔ معیشت میں اس بڑے اضافے کے باعث قوت خرید میں بڑے اثرات ہوئے ہیں۔

کاشت کا رقبہ بڑھانے اور آب پاشی کے نظام کو بہتر بنانے کی خاطر ہندوستان اور پاکستان میں بے شمار ٹیوب ویل لگائے جا رہے ہیں۔ اندازہ ہے کہ 1968-70 کی فصلوں کے موسم میں ہندوستان میں پچھتر ہزار ذاتی ٹیوب ویل لگائے جا چکے ہیں جن کے باعث مزید 1.4 ہیکٹر رقبہ آب پاشی کے نظام میں زیر کاشت آگیا ہے۔ اس طرح غذائی پیداوار کے امکانات میں کشاوتی آتی ہے۔ اندازہ ہے کہ ابھی تک ہندوستان کی آب پاشی کی نصف سے کم قوت کی ترقی ہو سکی ہے۔

اگر زیادہ منافع دینے والی گندم اور چاول کی اقسام ہی وہ عمل انگیز عناصر ہیں جنہوں نے سبز انقلاب کو ہمیز دی ہے تو کیسائی کھاد نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کو توانائی فراہم کی ہے۔ زیادہ منافع دینے والی اقسام نے کھاد کے استعمال میں بہت اضافہ کیا ہے۔ نئی اقسام نہ صرف کھاد کی بھاری خوراک سے متاثر ہوتی ہیں بلکہ پرانی اقسام کے مقابلے میں ان کا استعمال زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ بڑے قدر کے پودوں والی تمام اقسام مردہ کھوٹا جن کھاد کے عوض اس اضافی کھاد کو دیتی ہیں، جب کہ نئی اقسام کی فصلیں فی کھوٹا جن کھاد کے عوض پچیس کھوٹے زیادہ لانا پیدا کرتی ہیں۔ ہندوستان میں 51-1950 میں ہائڈروجن کھاد کا استعمال 58 ہزار ٹن تھا جو 65-1964 میں بڑھ کر 538 ٹن ہو گیا تھا اور 70-1968 کی فصلوں کے دوران یہ حجم بڑھ کر 1.2 ملین ٹن پہنچ گیا ہے، جن کا تقریباً ساٹھ فی صد ملک ہی میں تیار ہوتا ہے۔ فاسفیٹ کی کھپت اندازاً ہائڈروجن کے نصف کے برابر ہوتی ہے۔ کھاد کا بیش تر حصہ گندم کی کاشت میں استعمال ہوتا ہے۔ 74-1973 میں ہائڈروجن کی کھپت اور مقامی پیداوار کا اندازہ بالترتیب تین ملین ٹن اور ڈھائی ملین ٹن لگایا گیا ہے جو حیرت انگیز تین گنا اضافے کے مقابلے میں پیداوار میں پانچ گنا اضافے کا باعث ہوگا۔ کھاد کے ہدف کا حصول لازمی ہوگا اگر دلیے کا 29 ملین ٹن کا پیداواری ہدف حاصل کرنا ہے۔

گندم کی پیداوار میں دریافت مشینوں کے استعمال میں تیزی سے اضافہ کر رہی ہے۔ 1968 میں ہونے

والی بڑی فصل سے قبل دو کافانوں میں تیار شدہ ٹریکٹروں کی لمبی قطار گاؤں کے انتظار میں ہوا کرتی تھی، اب یہ صورت حال ہے کہ ٹریکٹر کے خریداروں کو تحریری درخواست دینی پڑتی ہے اور ایک یا دو برس انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اگر چہ اب پانچ کافانے اٹھارہ ہزار ٹریکٹر تیار کرتے ہیں اس کے باوجود 70-1968 میں چونتیس ہزار درآمد کیے جاتے تھے۔

روایتی طریقوں سے، مانسوں کی بارشوں سے پہلے بیلوں کے کھروں سے روٹنے کے ذریعے اناج کا بالیوں سے نکالنا اور ہوا کی مدد سے دانے کو بھوسے سے الگ کرنا اب تقریباً ممکن ہو گیا ہے۔ اس لیے لاکھوں کی تعداد میں چھوٹی مشینیں بنائی گئی ہیں اور پچھلے تین برس سے لاکھوں دیسی دکانوں پر ان کی فروخت شروع ہو گئی ہے۔ اس طرح فصلوں کی کٹائی کے بعد کھلیان کو نقصان سے بچایا جاسکتا ہے اور نئی دیسی صنعتوں میں بھی ملازمتوں کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔

مزید یہ کہ مشینوں کا بلا واسطہ استعمال دیے کی پیداوار میں تیزی اور مثبت انداز میں اثر پذیر ہوا ہے۔ جب چھوٹی سیکائی مشینوں نے [کھلیانوں میں] بیلوں کی جگہ لے لی، تو بیلوں کو اگلی فصل کی وقت پر تیاری کے لیے زمین جوڑنے میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔ زمینوں کی وقت پر تیاری بھی ٹریکٹروں کی طلب میں اضافے کی ایک اہم وجہ ہے۔ کیمیائی کھاد کے زیادہ استعمال کے ساتھ ساتھ گندم اور چاول کی نئی اقسام کے تعارف سے قبل زمین کی تیاری اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھی اس لیے کہ پودوں میں کھاد کے کم استعمال کی وجہ سے پیداوار کم ہوا کرتی تھی۔ زیادہ تر کسان ریت کی فصل میں ایک ٹن گندم اور خریف کی فصل میں ڈیڑھ ٹن چاول، یعنی مکمل ڈھائی ٹن فی ہیکٹر اناج کی توقع رکھتے تھے۔ مگر زیادہ پیداوار والی اقسام کے استعمال، زیادہ کھاد ڈالنے، وقت پر پانی، اور کیتوں کی باقاعدہ نگہداشت کے باعث کسان اب اسی زمین سے پانچ ٹن گندم اور سات ٹن چاول فی ہیکٹر، یعنی مکمل بارہ ٹن اناج فی ہیکٹر فی سال پیداوار حاصل کر سکتے ہیں جب کہ پرائی اقسام اور پرانے طریقوں سے سے مکمل ڈھائی ٹن فی ہیکٹر پیداوار ہوتی تھی۔ اگر پودے بہترین وقت پر نہ لگائے جائیں تو گندم کی پیداوار تین ٹن اور چاول کی پیداوار چار ٹن تک گر سکتی ہے، یعنی سالانہ مکمل بارہ ٹن کے بجائے صرف سات ٹن پیداوار ہوگی۔ کچھ ترقی یافتہ کاشت کار اب دھری کے بجائے تھری کاشت کرتے ہیں جس میں گندم/موگ/چاول/گندم/چاول/آلو یا ایک ہی برس میں چاول کی ایک بعد تین فصلیں اگاتے ہیں۔ فصلوں کی شدت بڑھانے سے غذا کی پیداوار بھی بڑھتی ہے اور ملازمتیں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں پیداواری حساب بجائے فی ہیکٹر فی کلو کی بنیاد کے بجائے فی کلو۔ فی ہیکٹر۔ فی سال کیا جانا چاہیے۔

دیے کی پیداوار میں مشینوں کے استعمال نے اب تک مزدوروں کے لیے ملازمتوں میں کمی کے بجائے اضافہ ہی کیا ہے، مزید برآں اس نے انسانی توانائی کی مشقت میں کمی اور کارکردگی میں اضافہ کیا ہے، بالخصوص ہندوستان میں۔

کروڑوں کسانوں کی، جنھوں نے کامیابی سے نئی گندم، نئے چاول اور جوار کی اقسام اگائی ہیں۔ آمدنی میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ اور اس نے کھانا، پیمپ، مشینوں اور دوسری چیزوں کی طلب میں اضافے سے زرعی صنعت کو ہمیز کیا ہے۔ بہت سے دیہاتوں میں کسانوں نے ذخیرے کی بہتر سہولتوں کے لیے سرمایہ کاری کی ہے۔ کچھ مقامات پر کچی مٹی کے بجائے کچی اینٹوں سے مکانات بنائے جانے لگے ہیں۔ مکانات میں روشنی، کنویں پر لگی موٹروں کے لیے زیادہ بجلی استعمال کی جانے لگی ہے۔ عام استعمال کی اشیاء کی طلب میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ دیہات میں ٹرانسپورٹ اور دوسرے ریڈیو کی خریداری میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے، جن کے ذریعے حکومت بجلی، بارش، تعلیمی منصوبوں کے ساتھ دور افتادہ علاقوں تک پہنچ سکتی ہے۔ سلائی کی مشینیں، بائیسکل، موٹر اسکوٹر اور موٹر مائیکس دیہات میں پہنچ گئی ہیں، اور گاؤں کے درمیان ٹرک اور بسیں چلنے لگی ہیں۔

سبز انقلاب نے ہندوستانی حکومت کو عوامی خدمات میں بہتری لانے پر مجبور کر دیا ہے۔ اگرچہ 1968 کی تاریخ ضمنی فصل کے باعث ذخیرے کے لیے جگہ کا شدید بحران پیدا ہو گیا تھا، حکومت نے بر وقت ترتیب سے اس مسئلے کا خاطر خواہ حل نکال لیا تھا اور بہت کم اناج ضائع ہوا۔ پچھلے دو برسوں میں کسانوں اور اخباروں کی تنقید کے باعث ذخیرے کی وسعت میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ بڑھتی ہوئی پیداوار کا ذخیرہ کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ دیہات والے بہتر ہو گئے، بہتر عوامی نقل و حمل اور بہتر اسکول طلب کر رہے ہیں، اور ان کے لیے ان سہولتوں کی فراہمی شروع ہو گئی ہے۔ اس طرح دانش اور محنت میں غلا حدی، جس کو ہندوستان کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی نے چالیس برس قبل ہندوستان کی زراعت کے لیے آفت قرار دیا تھا، اب ختم ہو رہی ہے۔ سبز انقلاب کی لائی ہوئی جبری تبدیلیاں، جن کی میں نے ہندوستان میں گندم کی پیداوار میں بہتری کے ذریعے جھلک پیش کی، اب مغربی پاکستان، سیلون، فلپائن اور تھائی لینڈ میں بھی اثر انداز ہو رہی ہیں، اگرچہ مختلف ممالک میں مختلف فصلوں یا ان کے اعضاء کی وجہ سے مختلف قسم کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

اگرچہ غذا کی پیداوار میں سبز انقلاب کا حصہ معنی خیز اور معقول ہے، اس کے باوجود تقاضا کے اعتبار سے موجودہ عالمی ضروریات کے حجم کے تناظر میں واجباً ہے۔ ہنلاہر، سب سے بڑی کامیابی پچھلے تین برسوں میں دلیے کی پیداوار میں تیزی سے بڑھتا ہوا اضافہ ہے اور ترقی پذیر ملکوں میں پیدا ہونے والی اس اعتماد کی فضا ہے کہ غذا کے معاملے میں وہ خود کفیل ہو رہے ہیں۔ شاید اس سے بھی زیادہ بامعنی اداروں اور ان کے رویوں میں تبدیلی ہے جو دلیے کی پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ ہو رہی ہے۔

All-India Coordinated Wheat Improvement Program، جو ہندوستان میں بڑی حد تک گندم انقلاب کا ذمے دار ہے، دنیا کے سب سے بڑے مختلف النوع اور پھیلا ہوا گندم پر تحقیق کا پیش نامہ ہے۔ اس کی کامیابی نے ایک طرح کا اعتماد، ایک احساس مقصد اور ایک نوع کی نگرانی پیدا کر دی ہے۔ ہندوستان میں گندم پر حالیہ دینی معیشت کی تحقیق دنیا کی سب سے اعلیٰ درجے کی تحقیق کے برابر ہے۔

سمازی کا پیش نامہ بہت وسیع، بہت مختلف النوع اور بڑا جنگجویاں ہے، اس نے پہلے ہی کئی اقسام پیدا کردی ہیں جو 1965 میں میکسیکو میں متعارف کرائے گئے پروگرام سے کہیں آگے نکل چکا ہے۔ نئی ہندوستانی اقسام کا پہلا گروپ، جو تجارتی سطح پر پہلے ہی موجود تھا، میکسیکو سے لائے ہوئے منتخب مادوں سے جزوی طور پر ہندوستان ہی میں اخذ کیا گیا تھا۔ دوسرے گروپ کی اقسام اب جن کو بڑھایا جا رہا ہے، ان ملاوٹوں کا انتخاب ہے جو ہندوستانی اور میکسیکو کی اقسام سے بنائی گئی ہیں۔ ان اقسام کی تخلیق اور تقسیم کی سرعت نے پہلے ہی بیماریوں کی مزاحمت کو تھیل کر دیا ہے اور اس طرح تباہ کرنے والی وباؤں کے خطرات کم سے کم ہو گئے ہیں، اس وقت اور بھی کم ہوں گے جب طفیلی نسل کے مرض آوروں (pathogens) میں تبدیلیاں ہوں گی۔

عام طور پر تشہیر شدہ اور غلط رائے کے برخلاف، میکسیکو سے درآمد کیے ہوئے اصلی بونے گندم میں، جو مقامی ہندوستان ٹائپ کا بدل تھا، یقیناً وسیع پیمانے پر بیماریوں سے مزاحمت کی صلاحیت تھی۔ مگر جدید ترین ہندوستانی اقسام بیماریوں سے مزاحمت میں، اور جینیاتی اعتبار سے اصلی اقسام سے بہت بہتر ہیں۔ یہ نسبتاً بڑی مختلف النوع بیماری کی وباؤں کے خطرات کو کم تو کرتی ہے مگر ان کے خطرات کو مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتی، جیسا کہ USA کے وسیع علاقے میں 1970 کے موسم گرما میں آنے والی غیر متوقع اور تباہ کن بیماریوں کی وباؤں سے صاف ظاہر ہو گیا ہے۔ تمام ممالک میں ایسی وباؤں کے خلاف تحفظ ان اقسام کے ذریعے ممکن ہے جن میں ذوق، ثابت قدم اور مختلف النوع نسل سازی [بریدنگ] کے پروگرام کے ذریعے بیماریوں کی مزاحمت پیدا کی گئی ہو، جیسا کہ اس وقت ہندوستان میں کیا جا رہا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ وسیع پیمانے کا بیماریوں پر نظر رکھتے کا، اور پودوں کی پٹھالوجی کا ایک مستحکم پروگرام ہو جو نسل سازی کے پیش نامے میں معاونت کرے۔ ایسے پیش ناموں سے زیادہ پیداواری اور بیماریوں سے مزاحمت کرنے والی اقسام تیار کی جاسکتی ہیں تاکہ وہ مرض اور عناصر میں ہونے والی تبدیلیوں کو بروقت روک سکیں۔ ہندوستانی پروگرام گندم کی حیاتی / کیمیائی، صنعتی اور غذائی خاصیتوں کی تحقیق میں مہارت بھی پیدا کر رہا ہے۔

مثالیہ سب سے اہم امداد یہ ہوگی کہ گندم کی پیداوار میں ویسے ہی طریقے اور تدابیر استعمال کی جائیں جیسی کہ پہلے میکسیکو میں آرائی گئی ہیں، اور جو آب ہندوستان اور پاکستان میں کی جا رہی ہیں، تاکہ یہ دوسرے بہت سے ملکوں میں دوسری فصلوں کے پیداواری پروگرام کے لیے ایک ماڈل کا کردار ادا کر سکیں۔

مغربی پاکستان نے چاول کی پیداوار میں انقلاب لانے کے لیے گندم کا ماڈل کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ اگرچہ ہندوستانی چاول پروگرام پیداوار کے معاملے میں ابھی تک ملکی سطح پر کامیابی حاصل نہیں کر سکا ہے، اب بہت سے دوسرے علاقوں میں تیزی سے ترقی کی جا رہی ہے اور ایسا ممکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ علاقہ جس میں نئی ٹیکنالوجی سے نئے حج بونے گئے ہیں اتنا بڑا ہوگا کہ ایک برس کے اندر قومی پیداوار پر اثر انداز ہوگا۔ ایشیاء، افریقا اور لاطینی امریکا کے بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں چارہ، باجرو، جو سویا بین اور کپاس کی پیداوار کی پرامن شروعات کرنے کے لیے اقسام اور نئی ٹیکنالوجی دستیاب ہیں۔ حکومت کی جانب سے قومی پیداواری

مہم میں ارادے اور نگرانی کی، سیاسی اور مالی تعاون کی، اور چند مامورین اور نگرانی رکھنے والے سائنس دانوں اور رہنماؤں کی ضرورت ہے۔

پیداوار کی مہم میں سائنسی رہنمائی کے لیے معیار کا ہونا ایک اہم عنصر ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے، مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ کچھ ترقی یافتہ ملکوں کے بہت سے زرعی سائنس دان قیاسی نیک نامی اور ضرورت کے پیش نظر زراعت کے لیے اپنی وفاداری سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ اور کچھ اداروں نے انھیں چھپنے کے لیے پردہ فراہم کر دیا ہے۔ کچھ تعلیمی اور تحقیقی اداروں نے زرعی محکموں کی جانب سے کی جانے والے بنیادی تحقیق کے لیے وقت کی کچھ پابندیاں بھی عائد کر دی ہیں، خواہ غذائی پیداوار بڑھانے اور اس کی فراہمی جاری رکھنے کے لیے کی جانے والی تحقیق کتنی بنیادی ہی کیوں نہ ہو۔ افراد کو اب اپنے مقاصد خود پورے کرنے ہوں گے، اگر ان کی ذاتی خواہش ہو تو وہ سائنس کی خدمت کریں، مگر اداروں کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ سوسائٹی کی خاطر زراعت کی خدمت کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو باعزت طور پر پوری کرنے کے لیے ان کو سائنس دانوں اور سائنسی رہنماؤں کی مدد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جن کا بنیادی مقصد انسانیت کی خدمت کرنا ہے۔

میں بہت پر زور طریقے سے یہ بات دہرانا چاہتا ہوں کہ اب بڑی امریکی قوتوں کا ایسا مواد اور تکنیک دستیاب ہے جس کی مدد سے سبز انقلاب کو زراعت کے انسانی میدانوں میں پھیلایا جاسکتا ہے۔ مگر اس امریکی قوت کو اصلی قدروں میں تبدیل کرنے کے لیے سائنسی اور انتظامی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر وہ رہنما کون کہاں؟ کہاں ہیں وہ رہنما جو ضروری سائنسی مہارت، نظریے، عام سمجھ بوجھ، عمرانی آگاہی، رہنمائی کی خصوصیت اور امریکی داد و بخش کو بالخصوص بنی نوع انسان کے لیے اور بالعموم بھوکوں کے لیے حقیقی داد و بخش میں بدلنے کا محکم ارادہ رکھتے ہیں؟ اب ایسے لوگ کم کم ہیں، لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی شناخت کریں اور ان کو اپنے تعلیمی اداروں میں شامل کریں اور غذا کی فراہمی کے لیے اپنی مہمات میں انھیں استعمال کریں۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے، بلکہ ان کی اشد ضرورت ہے، اس لیے کہ امریکی قدروں کو رہنماؤں کی ضرورت کے انتظار میں بے کار چھوڑ دینا کسی اچھے سے کم نہیں ہوتا۔ یہ کوئی نظریہ نہیں ہے، یہ ایک حقیقت ہے، اس حقیقت کے پیش نظر کہ اسی ملک میں مختلف متوازی اقسام کی فصلوں کے پیداواری پروگرام کے لیے بھی رہنمائی ایک فیصلہ کن عنصر رہی ہے

مگر کسی کو یہ سوچنے بھی نہیں دینا چاہیے کہ ہم اپنی تحقیقی کوششوں کے دوران کچھ آرام بھی کر سکتے ہیں۔ مارے کامیاب عملی کام کے پہلے اور بعد میں تحقیق ہونی چاہیے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ گندم کی پیداوار کے سلسلے میں ہندوستان اور پاکستان میں تیز رفتار تبدیلی میکسیکو میں دو مشروں کی جزوی تحقیق کی وجہ سے ممکن ہوئی تھی۔ تو پھر یہ ہونی کیسے؟

1943 میں، اقوام متحدہ کے ادارے Food and Agriculture Organization (FAO) کے قیام

سے کئی برس پہلے، امداد باہمی کی بنیاد پر میکسیکو میں ایک زرعی تحقیقی پروگرام شروع کیا گیا تھا۔ یہ میکسیکو کی

وزارت زراعت اور راکٹریلر فاؤنڈیشن کے درمیان ایک پیش قدم منصوبہ تھا جو جوار، گندم اور پھلیوں کی فصل کی پیداواری مقدار بڑھانے کے لیے میکسیکو کی حکومت نے شروع کیا تھا۔

اس زمانے میں میکسیکو ملک میں استعمال کیے جانے والے گندم کا، اور جوار کا پچاس فی صد سے بھی نامزد درآمد کرتا تھا۔ گندم کی پیداوار کم منافع بخش اور ساکن تھی۔ قوی سطح پر اس کی اوسط پیداوار 750 فی ہیکٹر تھی، حالاں کہ گندم کی زیادہ تر فصل آب پاش زمین پر کاشت کی جاتی تھی۔ سبز انقلاب سے پہلے ایسی ہی کچھ صورت ہندوستان اور پاکستان میں بھی تھی۔ میکسیکو کی معنی "مقلد" بھی تھی اور کیمیائی کھاد کی "عیاشی" سے نا آشنا بھی۔

میکسیکو کی ضرورت فوری تھی، لہذا پیداوار بڑھانے کی غرض سے ایک مادہ براحتہ تحقیقی پروگرام مرتب کیا گیا۔ راکٹریلر فاؤنڈیشن کے فلسفے کے مطابق "میکسیکو کو اپنی مدد آپ کرنے کے لیے مدد کرنا" چاہیے تا کہ اس کے غذا کے اور زراعتی عمل کے مسائل حل ہوں۔ میری یہ خوش فہمی اور اسحقا ق بھی تھا کہ بالکل ابتدا سے اس پروگرام میں شامل تھا، اور پچھلے چھ بیس برسوں سے اس سے منسلک ہوں۔ سب سے پہلے تو ان عناصر پر غور و خوض کیا گیا جو پیداوار کی حد بندی کے ذمے دار تھے ان میں جینیات اور پودوں کی نسل سازی کے مابین اندرونی ذمے دارانہ تحقیقات، دیکھی معاشیات، زمین کا باغیچہ پن، پودوں کی بیماریاں، اور کیڑوں مکوڑوں کے علوم کے مسائل شامل تھے۔ ان میں دلچسپی کی کیمیا اور بائیو کیمسٹری بعد میں شامل کیے گئے تھے۔

1943 میں پودوں کی نسل سازی کرنے والوں، مٹی کے سائنس دانوں، پانیوں کے پتھولوجسٹ اور کیڑوں مکوڑوں والوں نے ایک گروہ کی صورت میں ابتدائی کام شروع کیا اور ان کا ارتکاز 1944 میں گندم کی فصل کے مختلف مسائل پر غور و خوض پر تھا۔

میکسیکو کے سائنس دانوں کی تربیت کے لیے، جو تحقیق اور ترقی کے اس کام میں معاونت کر رہے تھے ایک شوق کا اضافہ بھی کیا گیا۔ یعنی جن افراد میں تو تعلقات دیکھی گئیں غیر ممالک میں ان کی تربیت کے لیے فیلوشپ کا انتظام بھی کیا گیا، تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجے جائیں، اور وہ مستقبل میں میکسیکو کی زراعت کی رہنمائی کر سکیں۔

ابتدائی سے تحقیق کا رخ پیداوار کی طرف اور گندم کی پیداوار بڑھانے سے منسلک مسائل کی جانب تھا۔ سائنسی افراد کی سخت قلت اور پیداواری پروگرام پر کام کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری تنصیلات کا جلد سے جلد ذخیرہ کرنے کی وجہ سے غیر متعلق "علمی تخیلوں" کی تلاش کی ہمت شکنی کی جاتی تھی۔

پروگرام کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے ہر سال ساری علاحدہ فصلوں کی دو نسلیں کاشت کی جاتی تھیں۔ ایک نسل کو سمندر سے قریب اٹھائیس ڈگری شمالی عرض البلد کے علاقے "سونورا" میں خزاں میں کاشت کیا گیا تھا، جہاں دن رفتہ رفتہ چھوٹے ہوتے جا رہے تھے، دوسری کاشت "ٹولواچا" اٹھارہ ڈگری عرض البلد میں سطح سمندر سے ڈھائی ہزار بلندی پر گرمی کے موسم میں کی گئی تھی، جب رفتہ رفتہ دن بڑے ہونے شروع

ہو رہے تھے۔ اس تکنیک کے استعمال سے ہم نے زیادہ مقدار میں طویل ذروں کی حساسیت سے غیر متعلقہ تکنیک سے متعدد اقسام کی گندم کے حج تیار کیے ہیں جن میں مختلف ماحولیات کو قبول کرنے اور خود کو بیماری سے بچائے رکھنے کی صلاحیتیں ہیں۔

میکسیکو اور قریبی ممالک میں گندم کی پیداوار میں اضافے کے لیے یہ خصوصیات قابل قدر تھیں، مگر میں برس بعد یہ اور بھی قابل قدر ہو گئیں جب میکسیکو کے گندم کی اقسام ہندوستان اور پاکستان میں متعارف کرائی گئیں۔ ان خصوصیات کے اتصال کے بغیر میکسیکو اقسام کی پاکستان میں عمل نقل ناممکن ہوتی، اور سبز انقلاب کی شروعات یقینی طور پر کئی برسوں کی تاخیر سے ہوتی۔

جوں ہی میکسیکو میں تحقیق سے کوئی معنی خیز بہتری برآمد ہوئی، اقسام میں، کیمیائی کھاد کے بارے میں سفارش یا کاشت کے طریقوں کے بارے میں، تو ان کو فوراً زرعی باڑوں میں لے جایا جاتا اور پیداواری پروگراموں میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ ہم نے کبھی اقسام یا طریقوں کی پختگی کا انتظار نہیں کیا، مگر جوں ہی بہتر تبدیلیاں ہاتھ آ جاتیں تو ہم ہر سال ان کو استعمال کرتے۔ سائنسی میدان کے اکثر کمال پرست جنھوں نے ناقابل حصول حیاتیاتی کمال کی تلاش میں عمریں گزار دی ہیں، ایسے سادہ سے اصولوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور ان کی عمر پھر کی مایوسانہ کامی غذا کے پیداوار میں کچھ اضافہ نہیں کر پاتی۔

زرعی باڑوں میں نئی اقسام اور نیکمالوٹی کے مظاہرے وہی سائنس دان کرتے تھے جنھوں نے ان کو تیار کیا تھا۔ دراصل منصوبے کے عرصے کو بڑھائے جانے سے قبل ہی گندم کی پیداوار میں انقلاب حاصل ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے تحقیق کرنے والے سائنس دانوں کو پیداوار میں رکاوٹوں کے بارے میں کچھ کرنا تھا۔ کسانوں کو جن کا سامنا تھا۔ تحقیق کرنے والوں کو کسانوں سے رابطے میں اسی فلسفے اور حکمت عملی کو استعمال کرنا تھا جو ہندوستان اور مغربی پاکستان میں گندم کی افزائش کے پروگرام میں ہوا تھا۔ لیکن بعد میں دونوں ملکوں میں پیداواری پروگرام کے طے کردہ عرصے کو بڑھا دیا گیا تھا۔

میکسیکو کے گندم کا پیداواری منافع 1948 سے ہی بڑھنا شروع ہو گیا تھا اور یہ رجحان اب تک جاری ہے۔ پچھلے پچیس برسوں کے دوران پیداوار کا قومی اوسط 750 کلو فی ایکڑ سے بڑھ گیا کر 3,000 کلو کے لگ بھگ ہو گیا ہے، جو چار گنا اضافے کے برابر ہے۔ اسی عرصے کے دوران مجموعی پیداوار سات گنا بڑھ گئی ہے۔ 1956 میں پہلی بار میکسیکو گندم میں خود کفیل ہوا تھا، اس کے بعد سے اب تک خود کفیل رہا ہے۔ میکسیکو میں گندم کا خاموش انقلاب اب برس بعد ہندوستان اور پاکستان میں شروع ہونے والے سبز انقلاب کا مورث اعلیٰ تھا۔

جب سے کیمیائی کھاد کا استعمال بڑھا ہے اور پیداواری منافع سڑھے چار ہزار کلو فی ایکڑ تک پہنچ گیا ہے، پودوں کے ایک دوسرے پر گر جانے سے پیداوار میں مزید اضافہ محدود ہو گیا ہے۔ اس لیے گندم پیدا کرنے والے دنیا کے مختلف ممالک میں موزوں پست قدر پودوں والے گندم کی تلاش شروع ہو گئی ہے تاکہ

پیداوار کے اضافے کی اس رکاوٹ کو دور کیا جائے۔ نورمن - 10، جو جاپان کی ایک نہایت پست قد گندم ہے، موزوں ثابت ہوئی ہے۔ سلسلے وار دو غلے پن اور دوبارہ دو غلے پن کے تجربات کے ذریعے 1954 میں اعلیٰ درجے کی میکسیکو گندم سے ایک پونے نسل کی گندم تیار کی گئی۔ اس نئے طریقے سے، نئی اقسام کی زیادہ منافع دینے والی قوت نے، ساڑھے چار ہزار کلو فی ہیکٹر کی پچھلی پیداوار کے مقابلے میں نو ہزار کلو فی ہیکٹر کی پیداوار دینی شروع کر دی۔ میکسیکو کا پست قد گندم 1961 میں میکسیکو میں تقسیم کیا گیا اور اچھے کسانوں نے مزید پانچ، چھ، سات بلکہ آٹھ ٹن فی ہیکٹر تک پیداوار برپا کی اور اس طرح سات برس کے اندر اندر قومی سطح پر اوسط منافع بڑھ کر دو گنا ہو گیا۔ خاموش انقلاب کی یہی وہ پست قد میکسیکانی گندم کی اقسام تھیں جن کی عمل انگیزی نے ہندوستان اور پاکستان میں سبز انقلاب برپا کر دیا۔

ابتدائی سے Mexican Agricultural Program کو بہت سے دہرے ممالک نے دلچسپی سے دیکھا تھا۔ جوں جوں ترقی و اصلاح ہوتی گئی، راکشیلر فاؤنڈیشن زرعی ترقیاتی پروگرام کے لیے بہت سے ممالک کی امداد کی درخواستوں کے انبار میں دبتا چلا گیا۔ Cooperative Mexican Agricultural Program ایک ماڈل ادارہ بن چکا تھا۔ Cooperative Colombian Agricultural Program جو زیادہ تر جوار گندم، آلو، گھوڑوں کے لیے چارے، اور مویشی میں دلچسپی لیتا تھا، 1950 میں قائم ہوا تھا۔ اسی طرح Cooperative Chilean Agricultural Program بھی 1955 میں، گندم اور گھوڑے کے چارے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ برصغیر میں 1956 میں جوار چارے کی فصل اور باجڑے کی پیداوار میں امداد کے لیے اور زراعت کی یونیورسٹی تعلیم کے لیے Cooperative Indian Agricultural Program کی بنیاد رکھی گئی۔ آگے چل کر ان پروگراموں نے دنیا کے مختلف ممالک میں زرعی پیداوار میں بہتری اور زرعی تعلیم دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس دوران دو پروگرام جو اصل جوار گندم اور پھلیوں کے دانوں کی فصل تک محدود تھا، جلد ہی مزید دوسری فصلوں کے لیے پھیلا دیا گیا۔ بڑی تعداد میں میکسیکانی نوجوانوں کو تحقیق اور تربیت کے لیے شامل کر لیا گیا۔ تحقیق میں عام طور پر ترقی اچھی تھی اور تربیتی پروگرام بھی بار آور ہوئے۔ 1943-1963 کے درمیان مجموعی طور پر 550 طلبہ نے زرعی تحقیق اور تربیت میں حصہ لیا، جن میں سے 200 کو ماسٹر آف سائنس کی ڈگری تفویض کی گئی اور تقریباً تیس افراد کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگریاں دی گئیں جب وہ ملک سے باہر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تربیت یافتہ ماسٹرز دانوں کی اس فصل سے 1961 میں National Institute of Agricultural Research نام کا ادارہ وجود میں آیا۔ راکشیلر فاؤنڈیشن نے اپنے واسطے کام ڈھونڈ لیا، جو اس کے مقاصد میں سے ایک تھا۔

میکسیکو کے تجربے نے بتایا ہے کہ ترقی پذیر ملکوں میں زرعی ترقی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تربیت یافتہ افراد کا فقدان ہے۔ تجربوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ تربیت ایک سست و عمل ہے۔ جہاں تربیت

یافتہ سائنس دانوں کے زمانے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ کھانکس برس پہلے میکسیکو کا حال تھا، اور جیسا کہ آج ایشیا، افریقا اور لاطینی امریکا کے ممالک کا حال ہے، ہر ایک ملک کو اپنی طلب پوری کرنے کے لیے اٹھارہ سے پچیس مستعد اور تربیت یافتہ سائنس دانوں اور معلموں کی ضرورت ہوگی۔ بہت سے غیر ترقی یافتہ ملکوں میں غذا کی کمی کی وجہ سے جو دباؤ پیدا ہوا ہے، اس کے پیش نظر ان کے پاس اتنا بھی وقت نہیں جس میں وہ سائنس دانوں کی ایک کھیپ پیدا کر سکیں، جو غذائی پیداوار کے مسائل سے نہرو آزما ہو سکے۔ اور اس طرح صحیح معنوں میں 1960 میں فلپائن کے علاقے Los Baños میں پہلا بین الاقوامی تحقیق اور تربیت کا ادارہ International Rice Research Institute (IRRI) منیلا میں قائم کیا گیا تھا تاکہ چاول کی فصل کے لیے کام کیا جائے، ایک عرصے سے جو غفلت کا شکار ہو رہی تھی۔ اس ادارے کو فورڈ، راکفلر فاؤنڈیشن اور فلپائن کی حکومت کی مشترکہ مالی امداد فراہم کی گئی تھی۔

میکسیکو میں گندم، جوار اور آلوؤں پر تحقیقی مراکز میوں کو 1959 میں باقاعدہ بین الاقوامی بنا دیا گیا تھا اور 1963 میں اس کو متبادل بین الاقوامی مرکز بنا دیا گیا تھا۔ International Center for Maize and Wheat Improvement (CIMMYT) کو میکسیکو کی حکومت، فورڈ اور راکفلر فاؤنڈیشن سے امداد ملتی ہے۔ حال ہی میں U.S. Agency for International Development (U.S.AID), United Nations Development Program (UNDP), Inter-American Development Bank اور (BID) کی مزید مدد فراہم کی گئی ہے۔

کولمبیا میں قائم قیصر مرکز، International Center of Tropical Agriculture (CIAT) اور مائیکیریا کے International Institute of Tropical Agriculture (IITA) حالیہ قائم شدہ ادارے ہیں جن میں ان مسائل پر غور اور مختلف نسلوں، جانوروں کی نسلوں کی ترقی کی رفتار کو ہمیز کیا جاتا ہے ساتھ ہی ماہر سائنس دانوں کی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ CIAT کو فورڈ فاؤنڈیشن سے، راکفلر فاؤنڈیشن سے اور Canadian International Development Agency (CIDA) سے مالی امداد فراہم کی جاتی ہے، اور یہی ادارے مائیکیریا کی حکومت کے تعاون سے IITA کو بھی امداد دیتے ہیں۔

یہ چار بین الاقوامی ادارے دنیا بھر میں پھیلے بین الاقوامی، قومی اور مقامی تحقیقی اور تربیتی مرکزوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ نیٹ ورک کم سے کم وقت اور دام میں سائنسی اور بنی نوع انسان کے مسائل حل کریں گے اور ان کے نتائج کو دنیا بھر میں عام کریں گے۔

ایسی سنگٹھم کوشش کے اثرات ابھی سے عالمی سبز انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ نئی اقسام اور نئی تکنیک ہی سبز انقلاب کی محرکات میں سے ہیں ہی جو ان فصلوں کو زیادہ پیداواری بنا دیتی ہیں۔ فلپائن، سیلون، ملائیشیا اور مغربی پاکستان میں یہ IR 8 چاول تھا جو International Rice Research Institute میں تیار کیا گیا تھا۔ CIMMYT کی تیار کردہ یونی نسل کی میکسیکانی گندم نے

ہندوستان اور پاکستان میں سبز انقلاب کو ہمیز کیا ہے، اور اب یہ ترکی، افغانستان، ایران، مراکش اور تیونس میں پھیل رہی ہے۔ سبز انقلاب میں مدد سے، یا شاید زیادہ، حصہ لینے والی، وہ باہر اور بدگوار رہنمائی تھی جس نے ان مرکزوں کو تجربے کار سائنس دانوں کو پیداواری فصلوں کے پروگرام کی تنظیم کرنے اور قومی پیداواری مہمات کی ترقی کی امداد کی عارضی ذمہ داریاں سونپی ہیں۔

یہ تمام بین الاقوامی مرکز، قومی زرعی تحقیق، پیداوار اور تربیتی پروگرام کی مدد کے لیے بنائے گئے تھے ان کے بدلے نہیں تھے۔ یہ مراکز دنیا بھر میں، علاقائی، قومی اور مقامی سطح پر غذائی فصلوں کے مسائل کو حل کرتے ہیں اور تمام اداروں کو ایک نیٹ ورک رابطہ مہیا کرتے ہیں اس نیٹ ورک کی ریزرچ کی بڑی اب بھی موجود ہے، اور اس کو آئندہ بھی قائم رہنا چاہیے۔ ان اداروں کو عالمی سطح پر زیادہ مالی امداد اور کارکن فراہم کیے جانے چاہئیں جو تیزی سے بڑھتی ہوئی غذائی ضروریات کے چیلنج کا مقابلہ کر سکیں۔

لیکن یہ بین الاقوامی مراکز ایسی بے مثال حیثیت میں ہیں کہ مختلف قومی پروگراموں کو امداد فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ خود مختار اور غیر سیاسی بین الاقوامی تنظیمیں ہیں جو اگرچہ بنیادی طور پر انہی اداروں سے امداد حاصل کرتی رہی ہیں مگر اب انھیں بہت سارے مختلف النوع ذرائع سے امداد فراہم ہوتی ہے۔ ان کے سائنسی کارکن بھی بین الاقوامی سطح کے ہیں، جن میں فصلوں کی پیداوار پر اثر انداز ہونے والی مختلف قسم کی سائنسی تہذیبوں کی نمائندگی ہے۔ ان کے کارکنوں میں فصلی پیداوار کے ماہرین بھی شامل ہیں، جنھیں سائنسی مہارت اور قومی اداروں کی تنظیم اور فصلی پیداواری پروگراموں میں امداد کا وسیع تجربہ ہے۔

یہ مرکز نہ صرف مختلف قومی اداروں، بلکہ دوسری بین الاقوامی تنظیموں کے کام میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں، جیسے Food and Agriculture Organization (FAO) of the United Nations, the United Nations Development Program (UNDP) وغیرہ اور دوسرے بین الاقوامی ترقیاتی بینک۔ ہر برس یہ مراکز مختلف سیاسی حلقوں کے ممالک کے کام میں بھی ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔

میں اس امر کا قائل ہوں کہ بین الاقوامی زرعی تحقیقی انسٹی ٹیوٹ قوموں کے درمیان عام ضروریات کی غذاؤں میں اضافے کی بنیاد پر ادماک کا ایک ہندسہ بھی تیار کر رہے ہیں۔ ہمیں اس ہندسہ کو انٹریڈ نیشنل کے جذبات ”قوموں کے درمیان بھائی چارے کا فروغ“ کی بنیاد پر استقامت دینی چاہیے۔

طلوعِ عرصے پر محیط اور عالمی درجے کی اہمیت کی تحقیق کے لیے انفرادی طور پر یہ بین الاقوامی مراکز بنیادی سہولتوں سے لیس ہیں، مثلاً پودوں کی نسل افزائی، بیماریوں کی تشخیص کرنے والے اور کمزوروں کی سائنس کے میدانوں میں تحقیق کے ماہرین کو، جو عالمی سطح پر کام کرتے ہیں، یہ مراکز مواقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ اہم فصلوں کے، اچھی طرح سے سوچے ہوئے، قسم قسم کی جین کے ذخیرے تیار کریں۔ عام طور پر فصلوں کی آخری اقسام کا چناؤ مرکزوں پر ہی ہوتا ہے مگر ان کو دنیا کے مختلف حصوں میں قومی پروگرام کے شرکائے کار کو بھیج دیا جاتا ہے جو ان قسموں کا انتخاب کرتے ہیں جو ان کی ضروریات پر پورے اترتی ہیں بالآخر اسی میں سے کئی

بہترین تجارتی اقسام تیار ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ تمام مرکز بین الاقوامی فصلی پیداوار کے تجربات پر مبنی سلسلے تیار کرتے ہیں، جن میں دنیا بھر کی بہترین تجارتی اقسام اور مددگاروں کی چند امید افزا اقسام بھی شامل ہوتی ہیں۔ یہ اقسام بوائے کے لیے چھتیس ملکوں کے اسی مقامات پر مددگاروں کو بھیج دی جاتی ہیں۔ مددگاروں سے ملنے والی اطلاعات، خلاصہ تیار کرنے کے لیے، CIMMYT کو واپس کر دی جاتی ہیں اور یہ خلاصہ، بعد میں، دنیا کے ہر حصے کے سائنس دانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ پیداواری منافع، مطابقت، بیماریوں اور حیرانگی مزارعت کے بارے میں ایک برس میں جمع کیے ہوئے ایسے تجربے کے اعداد و شمار فصلوں کی تحقیق کرنے والے سائنس دانوں کے لیے، ان اطلاعات کے مقابلے میں، جو صرف دس پندرہ برس کے ایک محدود مقام کے خود مختار تجربے سے حاصل ہوتے ہیں، زیادہ بلا معنی اور قابل قدر ہوتے ہیں۔

یہ بین الاقوامی مراکز ایسی منفرد حالت میں بھی ہوتے ہیں کہ وہ تمام سائنسی نظم و ضبط کی عملی یا زیر ہجرتی قسم کی تربیت فراہم کر سکتے ہیں جو فصلی پیداوار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس قسم کی تربیت بالخصوص ترقی پذیر ملکوں کے نوجوان سائنس دانوں کے لیے قابل قدر ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ انھیں، اپنے ملک واپس ہونے پر، تحقیقی کام کی ضروریات کے لیے تیار کرتی ہے، اور یہ مزید قابل قدر ہوگی اگر سائنس دان بعد میں گریجویٹ سطح پر اپنی تعلیم جاری رکھیں۔

سبز انقلاب کا پچھلے تین برسوں کی کامیابیوں کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے، میں اس بات کو دوبارہ کہنا چاہوں گا کہ دیے، چاول، جوار اور گندم، بالخصوص گندم کی، پیداوار میں اضافہ کروڑوں انسانوں کی بھلائی کے تناظر میں واقعی قابل دید اور بے تحاشا اہم رہا ہے۔ پھر بھی یہ مجموعی ضروریات کے اعتبار سے اب بھی معمولی ہے۔ یاد رہے کہ دنیا کی پچاس فی صد آبادی کم غذائیت کا شکار ہے، اور اس سے زیادہ فی صد غالباً سائیدہ فی صد، خراب غذائیت سے آلودہ ہے؛ لہذا ہمیں محنت کی اجازت نہیں۔ جب کہ آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے، موجودہ خراب حالت کو مزید خراب ہونے سے روکنا ہی کافی نہیں ہوگا۔ ہمارا مقصد ہونا چاہیے کافی غذا پیدا کرنا، تاکہ موجودہ بھوک کو مٹا دیا جائے، اور اس کے ساتھ ہی خراب غذائیت کی درستی کی کوشش کی جائے۔ اس وقت، ترقی پذیر ملکوں میں بھوک مٹانے کے لیے، ہمیں دنیا بھر کی دیے کی پیداوار کو تیس فی صد بڑھانا چاہیے۔ اگر دنیا کی مجموعی پیداوار کو تیس فی صد بڑھانا معمولی بات ہوتی تو، اس سے قطع نظر کہ کس علاقے کی پیداوار بڑھائی جائے، یہ پھیلاؤ ریاست ہائے متحدہ، کناڈا، آسٹریلیا، ارجنٹائن اور روس میں کہیں بھی بڑی سرعت کے ساتھ کیا جاسکتا تھا۔ مگر اس طرح کی ترقی سے ترقی پذیر ملکوں کی بھوک کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ ان کی کم زور معیشت ان کو غذا کی درآمد میں تیس فی صد اضافے کی اجازت نہیں دے سکے گی۔ اس سے بھی زیادہ خرابی یہ ہے کہ اگر ترقی پذیر ملکوں میں موجودہ پیداوار کو تیس فی صد تک بڑھایا بھی جائے، جو میرے خیال میں سبز انقلاب کی حالیہ کامیابیوں کی بنیاد پر ممکن ہوگا تب بھی اس وقت بھوک کا مسئلہ اس درجے پر ہے کہ یہ ختم نہیں ہو سکے گا۔ اس وقت ضرورت مندوں تک، جن کی قوت خرید کم

ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے، مسئلہ غذا کے الجھے ہوئے سماجی / معاشی مسائل بھی باقی ہیں۔ یہ سب سے بڑا الاشغال مسئلہ ہے جسے اقتصادی ماہرین، سماجی ماہرین اور سیاسی رہنماؤں کو حل کرنا ہوگا۔

مجھے یقین ہے کہ اگر تمام پالیسی ساز لوگ آبادی کے اضافے کے کنٹرول میں مناسب دلچسپی لینے لگیں، طاقت ور زرعی ٹھوس جاتی اور اقتصادی ترقی پر دھیان دینے لگیں تو آج کی بہت سی سماجی خرابیاں جلد ہی ماضی کا حصہ بن جائیں گی۔ گرم علاقوں اور زیریں گرم علاقوں میں وافر مقدار میں سورج کی روشنی میسر ہے اور ان میں دوسرے بڑے حیاتیاتی اثاثے بھی ہیں، اور ان اثاثوں کو مفلس اور بھوکوں کے لیے با معنی دولت میں بدلنے میں تاخیر کرنا بھربھرا نفع ہوگا۔

کچھ مبصرین نے کہا ہے کہ سبز انقلاب نے جتنے مسائل حل کیے ہیں ان سے زیادہ پیدا کیے ہیں۔ میں اس بات کو نہیں مان سکتا، اس لیے کہ میرے خیال میں، بنی نوع انسان کا نئے مسائل کے لیے جدوجہد کرنا قیام کے پرانے مسائل سے بہتر ہے۔ یقیناً غذا کی پیداوار میں status quo سے وفاداری، جب آبادی میں اضافے کا دباؤ ہو، وہ زنجیر نہیں توڑ سکتی جس نے کسانوں کو افلاس اور بھوک سے جکڑ رکھا ہو، ایک سوال ضرور پوچھا جانا چاہیے: کیا یہ سب کچھ سبز انقلاب پر تنقید کے لیے ہے، اس کی تمام تر کامیابیوں کے باوجود کہ دنیا کی سماجی / اقتصادی خرابیاں درست نہیں کی جاسکتیں جو آدم و حوا کے زمانے سے اب تک جمع ہو رہی تھیں؟ ہمیں بدلنا تو ضرور چاہیے، ورنہ ہم نسلاً تباہ ہو جائیں گے، بالکل ایسی طرح جیسے کھریا مٹی کے آخری دور میں ڈائینوسار تباہ ہو گئے تھے۔

سبز انقلاب صحیح سمت میں ایک تبدیلی ہے، مگر اس نے دنیا کی قلب مابہیت "یوٹوپیا" میں نہیں کی ہے۔ صحیح معنوں میں کوئی بھی ان کی حدوں سے واقف نہیں سوائے ان کے جنھوں نے اس کی ابتدا کی تھی اور اس کی کامیابی کے لیے لڑے بھی تھے۔ مگر ٹھوس کامیابی ہوئی ہے، جیسا کہ میں نے ٹھوس مثالوں سے واضح کیا ہے۔ میں نے ان نئے مادوں پر زیادہ انحصار کرنے کے مواقع کی نشان دہی بھی کی ہے، جو نئے ایجاد کردہ طریقوں سے پیدا کیے گئے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر، میں اس حقیقت پر اس سے زیادہ زور نہیں دے سکتا کہ مزید ترقی منحصر ہے، ذہن، یک جا اور ثابت قدم حکومتی رہنماؤں، مدبروں، تاجروں، مائنس دانوں، معنوں اور ابلوغ کے اداروں پر جن میں پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن شامل ہیں۔

مگر ارتقا کا عمل جاری ہے، ہمیں لگاتار ترقی کرنی چاہیے، اور ہم کر بھی سکتے ہیں۔ گندم اور دوسرے ولیوں کی بہتر اقسام اور زیادہ حصول کی قوت والی اقسام کی پیداوار جس میں زیادہ پروٹین ہوں، تخلیق کے مراحل میں داخل ہو چکی ہیں۔

ہمیں ان کے مقابلے میں جو اس وقت موجود ہیں، انسان کے بنائے ہوئے زیادہ پیداواری قوت اور بہتر غذائی معیار والے نئے دلیے کی پیداوار کے امکانات کی پوری چھان بین کرنی چاہیے۔ انسان کی بنائی دلیے کی فصل، Triticale، جو گندم اور رزق کے ملاپ سے تیار ہوئی ہے، امید ہے کہ ایک دن ایسی فصل بن جائے گی۔

پچھلے چھ برسوں میں 'مینی ٹوبا' یونیورسٹی کے تعاون سے میکسیکو کے International Corn and Wheat Center نے Triticale میں بہتری لانے کے لیے نسل سازی کا ایک بڑا پروگرام شروع کیا ہے۔ پچھلے تین برسوں میں جم نے ایک بہت زرخیز قسم تیار کی ہے، اور اب تک کے نتائج یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ مطلوبہ اوصاف کے احوال سے اب کئی اقسام کی خصوصیات ایک قسم میں ظاہر ہو گئی ہیں، اس طرح ایک نئے قسم کا دلیا پیدا ہو گیا ہے جو گندم سے بہتر معیار کا حامل ہے۔

Triticale کے سلسلے میں حاصل شدہ بہتری اس بنیادی مطالعے کی شروعات کی طالب ہے کہ دلیے کی مختلف موجودہ نسلوں یا ان کے جنگی رشتہ داروں کے ملاپ سے دہری نسلیں تیار کی جائیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایک انفرادی خلیے کی بانٹ میں بہتری اور embryo-culture تکنیک میں ہارمون اور غذائیت کے ملائے سے، تاکہ ایک تہذیبی طریقہ پیدا ہو جائے، اور ہدفی خلیوں کے درمیان دو نسل پن بھی پیدا ہو جائے، polyploidy اور mutation داخل کرنے کے طریقے سے کئی حیرت انگیز امکانات پیدا ہو جائیں گے اور حاصل ہونے والی نسلوں کے درمیان ملاپ ہو جائے گا، جو پہلے ملاپ کے قابل نہیں تھے۔ حتیٰ کہ protoplasmic کے اور خلیے کے دو نسل پن کے بعد پودے کی بہتری کے لیے خلیے کی تفریق کی افزائش بھی ممکن نظر آتی ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ دلیے اور دالوں میں بہتری لانے کے لیے وسیع ملاپ کا ایک بڑا پروگرام بنایا جانا چاہیے۔ اس میں جدید تکنیک کے ذریعے زفانی (consummate) زرخیز کاری کے کئی دلیے کا آپس میں جینیاتی ملاپ کیا جانا چاہیے اور ان دو نسلوں (hybrid) کا پھیلاؤ ہونا چاہیے۔ اگر نئے احوالات کا سلسلہ بن سکے اور اس کو دہرایا جاسکے، جیسے جوار اور غمو، گندم اور جو یا گندم اور چاول، تو بعد میں روایتی طریقے سے وسیع پیمانے پر بہتری کے امکانات کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

بد قسمتی سے تمام دلیوں میں ضروری امائنو تیزابوں کی، بالخصوص 'لائیزین' کی کمی ہوتی ہے، جو حسب معمول نشوونما اور صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ پروٹین کی کمی عام ہے، بالخصوص بچوں میں، اور اس کے زیادہ تر شکار یا تو موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں یا جسامتی اور ذہنی طور پر عمر بھر کے لیے مفلوج ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ غذا کے طور پر کمی کو پورا کرنے سے اتفاق ہو جاتا ہے، نیا وہ پیداواری دلیوں کے اناج کی اقسام، میں بلند سطح کے پروٹین اور امائنو تیزاب کا توازن ان کا بہترین حل ہوتا ہے، اس لیے کہ اس میں اضافی خرچ یا مخصوص تعلیمی کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی، اور اس بات کے امکانات بھی ہوتے ہیں کہ جسم میں ان کی پیدا نش بھی ہونے لگے۔ جوار کی opaque-2 gene امائنو تیزاب لائیزین کی پیداوار کو بھی دوگنا کر دیتی ہے جو انسانوں اور جانوروں دونوں کی صحت اور نشوونما کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

اسی طرح، ایتھوپیا کے جو کی ایک قسم اور کچھ Triticale میں جین ہوتی ہیں، جن کی مدد سے ضروری غذائی مادے غیر معمولی طور پر بڑھ جاتے ہیں۔ پودوں کی نسل سازی کرنے والے ایسی جین کی پیداوار بڑھانے اور

دوسری خصوصیات کے لیے بہترین جین سے ایک جا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح نہ صرف غذا کی پیداوار میں بڑے اضافے ہوں گے بلکہ ان کا غذائی معیار بھی بڑھے گا۔ چونکہ ہم غذائی کمی کو مصنوعی طریقوں سے پورا کرنے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، میرا خواب یہ ہے کہ ہم اسی طرح دلیوں کے پودوں کے لیے بھی مصنوعی مقویات سے چھٹکارا پالیں، تاکہ وہ مانی بوجھ بھی ہلکا ہو جائے جو کسانوں پر دباؤ کا باعث بنتا ہے اور ان کو نئی ٹیکنالوجی میں پوری طرح حصہ لینے کی رکاوٹ سے بھی آزا دی مل جائے۔

میں اپنے خواب میں دیکھتا ہوں، سبز، توانا، زیادہ پیداواری گندم، چاول، جوار، گرمو، اور باجروں کے لہلہاتے کھیت جن میں، بغیر کسی خرچ کے 100 کلوگرام فی ہیکٹر مائیکرو جین سے nodule-forming اور nitrogen-fixing bacteria کی حیرت انگیز کارکردگی۔ 1909 میں یہ mutant strains of *Rhizobium cerealis* ایک بہت بڑے mutant پیدا کرنے والے پروگرام سے تیار کیے گئے تھے جن کے ذریعے دال کے پودوں کی جڑوں اور دوسرے nodule-bearing پودوں سے strains of *Rhizobium sp* حاصل کیے جاتے تھے۔ اس سائنسی دریافت نے دنیا بھر میں لاکھوں برس پرانے زرعی پیداواری طریقے میں انقلاب برپا کر دیا ہے، اس لیے کہ اب کسانوں کو اپنی فصلوں کے لیے ضروری کیمیائی کھاد ویرا راست ان چھوٹے چھوٹے حیرت انگیز جراثیم سے مویا ہو جاتی ہے جو ہوا سے مائیکرو جین کسب کرتے ہیں اور اسے بغیر کسی خرچ کے دلیوں کے پودوں کی جڑوں میں پہنچا دیتے ہیں، جن میں لانج کی صورت میں، ان کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔

پھر میں جاگ اٹھتا ہوں اور یہ دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہوں کہ mutation genetics کے پروگرام ایسی جزئیات میں مصروف ہیں جیسے گندم کے پنوں پر ڈال دھس اگانا اور ان کے بال اتار لینا۔ اگر ہم ماضی کی حیاتیاتی کامیابی پر پوری طرح انحصار کرتے ہیں اور مستقبل کی کامیابی سے فائدے حاصل کرتے ہیں تو، جو نمونہ میرے خواب میں پیش کیا گیا ہے، اس کے لیے ہمیں تحقیق اور تعلیم پر ماضی سے کہیں زیادہ سرمایہ کاری کرنی ہوگی۔

بہت کم سرمایہ کاریاں میکسیکو میں گندم پر کی جانے والی تحقیق سے ہونے والے سماجی اور معاشی فائدوں کی ہدایتی کر سکیں گی۔ 1943 سے 1964 تک سرمایہ کاری سے تخمیناً 750 فی صد سالانہ منافع ہوا تھا۔ یہ مطالعہ گندم کے پستہ قد پودوں کے قومی پیداوار پر اثرات سے پہلے کیا گیا تھا۔ اگر اب فوائد کا حساب کیا جائے جس میں پاکستان، ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک میں پیداوار کے اضافے شامل ہوں تو اعداد و شمار خیالی طور پر زیادہ حیرت انگیز نکلیں گے۔

پھر بھی، خطیر رقوم خرچ کی جارہی ہیں تمام ملکوں میں، وہ ترقی یافتہ ہوں یا ترقی پذیر، اسلحہ بندیوں پر اور نئے جوہری یا ہلاکت خیز اسلحوں پر، جب کہ بہت معمولی رقمیں خرچ کی جاتی ہیں زرعی تحقیق پر اور تعلیم پر، زندگی کو انسانی بنانے کے لیے، نہ کہ اس کو کم رتبہ کرنے یا تباہ کرنے کے لیے۔

ہزار انقلاب کو بھوک اور محرومی کے خلاف آدمی کی جنگ میں وقتی کامیابی نصیب ہوئی ہے، اس نے آدمی کو مائیس لینے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اگر اس کا پوری طرح نفاذ ہو جائے تو یہ انقلاب اگلے تین عشروں تک زندہ رہنے کے لیے وافر غذا مہیا کر سکتا ہے۔ مگر انسان کی خوف زدہ کردینے والی نسلی تسلسل کی قوت کو کام دینا پڑے گا، ورنہ ہزار انقلاب کی کامیابی محض چند روزہ ہو کر رہ جائے گی۔

زیادہ تر لوگ ابھی تک "آبادی کے چین" کے قدمہ قامت کا اندازہ نہیں کر سکے ہیں۔ ابتدا میں صرف دو تھے آدم اور حوا۔ وہ زمین پر کب وارد ہوئے ابھی تک یہ ایک سوال ہی ہے، جس کا جواب نہیں مل سکا ہے۔ مسیح کے زمانے تک، دنیا کی آبادی اندازاً 250 ملین تک پہنچی تھی۔ تب اور اب کے درمیان، آبادی بڑھ کر ۵ اعشاریہ 5 بلین تک پہنچ چکی ہے۔ جدید ادویات کے آنے تک اضافہ بالخصوص تیز رہا ہے۔ اگر 2 فی صد فی سال کی موجودہ شرح سے اضافہ جاری رہا تو 2000 تک آبادی 6.5 بلین تک پہنچ جائے گی۔ اس وقت ہر سیکنڈ یا گھنٹہ کی ہر جگہ کے ساتھ دنیا کی آبادی میں دو اعشاریہ دو مزید افراد کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اضافے کی تال، گھنٹہ کی ہر جگہ، کے ساتھ آبادی بڑھ کر 1380, 1390 اور 2000 تک بالترتیب دو اعشاریہ سات، تین اعشاریہ تین اور 4 تک پہنچ جائے اگر انسان کو اس حقیقت کا احساس نہ ہو اور اپنی تباہی کی طرف اسی طرح بڑھتا رہا۔ ہر گز رستے عشرے کے ساتھ گھنٹہ کی ہر جگہ مسلسل بڑھتی جائے گی، تو یہ سب کچھ کہاں ختم ہوگا؟

ماتھس [Malthus] اٹھارویں صدی کے انگریز فلسفی] نے دیرینہ صدی قبل اس خطرے کا اشارہ دے دیا تھا۔ مگر اس نے خاص طور پر اس امر پر زور دیا تھا کہ آبادی غذا کی فراہمی کی رفتار سے زیادہ تیز ہوگی۔ وہ اپنے زمانے میں غذا کی پیداوار کے سلسلے میں آدمی کی قوت میں بڑھوت اضافے کا اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ نہ ہی وہ پیش بینی کر سکا تھا پریشان کن جسمانی اور ذہنی نتائج کا جو انسان کے، سرگرتے ہوئے، زہریلے اور ٹھکڑے بلاؤں عظیم کے اور جھونکروں کے شور و آلے ماحول میں شخص کر رہنے سے پیدا ہوں گے۔ کیا انسان اس کچاؤ کو برداشت کر سکے گا؟ غیر معمولی دباؤ اور کھنچاؤ انسان کے اندر کی حیوانی جبلت کو بڑھا دیتے ہیں اور اس کو پاگل ہوتے ہوئے غمے میں گم مستحکم، غیر منطقی اور سماجی طور پر خلل انگیز رویہ اپنانے پر اکساتے ہیں۔

ہمیں اس حقیقت کا احساس کرنا چاہیے کہ انسان کی زندگی کی سب سے پہلی ضرورت کافی غذا ہوتی ہے۔ ایک مناسب اور شفیق زندگی کے لیے ہمیں اچھی تعلیم، سودمند ملازمت، آرام و قیام گاہ، اچھا لباس، موٹر اور ہمدرد معاشرہ فراہم ہونا ضروری ہے۔ جب تک ہم یہ سب فراہم نہیں کرتے، بھوک سے نہیں، آدمی ماحول کی پیدا کردہ بیماریوں سے ہی جلد ختم ہو جائے گا۔

اور اب بھی، میں بنی نوع انسان کے مستقبل کے لیے اچھی امیدیں رکھتا ہوں، اس لیے کہ تمام حیاتیاتی آبادیوں میں پیدائش کے وقت قدرتی طور پر ایسے انتظامات ہوتے ہیں جو ماحول کی وسعت کے مطابق آبادی میں رد و بدل کرتے رہتے ہیں۔ بلاشبہ انسان میں بھی ایسے انتظامات ہوتے ہیں۔ مگر قدرت نے ابھی

نیک انسانی آبادی میں توازن بڑھانے اور ماحول کی اپنی صلاحیت کے مطابق عالمی سطح پر آبادی میں رد و بدل کے لیے خود کو جتایا نہیں ہے۔ اس لیے نوع انسانی کے لیے یہ نہایت خطرناک ہوگا کہ وہ پاگل پن میں اس وقت تک آبادی میں اضافہ کرتی رہے کہ بالآخر قدرتی انتظامات سب کچھ اپنے ہاتھ میں لیں۔ انسان کے لیے درستی کا یہ سب بڑا امتحان ہوگا۔

چوں کہ انسان ایک منطقی مخلوق ہے، پھر بھی، میں پُر اعتماد ہوں کہ اگلے دو عشروں میں اسے اس بات کا پوری طرح اندازہ ہو جائے گا کہ غیر ذمے دارانہ انداز میں آبادی بڑھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود کشی کے راستے پر آگے بڑھ رہا ہے، اور آبادی میں رد و بدل سے بنی نوع انسان کے لیے ایک پرسکون اور اچھی زندگی مل سکتی ہے۔ اگر انسان عقل مندی سے یہ فیصلہ کرے گا اور اگر تمام قومیں Ares, Mars, Thor کی پرستش سے دست بردار ہو جائیں تو بنی نوع انسان کو خود نوٹیل انعام مل سکتا ہے جو اس کو دیا جائے گا جس نے قوموں کے درمیان بھائی چارے کو فروغ دینے کے لیے سب سے زیادہ کوشش کی ہو۔“

لہذا، ”تمام دنیا میں بنی نوع انسان کی خوش حالی کے لیے“ بیس ویں صدی کی سائنس اور ٹیکنیکی ترقی اور اخلاق کے لیے اس کو Isalah کی پیشین گوئیاں سچی ثابت ہوتی نظر آئیں گی:۔۔۔ اور ریگستان شادمان ہو جائیں گے، اور گلاب کی طرح کھل اٹھیں گے۔۔۔ اور تپش سے مرزا و مرزین تالاب بن جائیں گی، اور پیاسے علاقے پانی کے چشمے [بن جائیں گے]۔۔۔“

کاش یہ الفاظ سچے ہو جائیں!



رینے کا سن اعلان تجلیل

بچپن ہی بازنوئل امن انعام تنہا کسی ایک فرد کو 1964 میں ملا تھا اس برس کا انعام مارٹن لوتھر کنگ کو دیا گیا تھا۔ ج وہ زندہ نہیں تھا اس برس اپریل کی چار تاریخ کی انسانی حقوق کے لیے یہ برس کتنا تلخ رہا ہے کہ انسانی حقوق کے حوالے سے نیگرو عوام کی عدم تشدد کی تحریک کے رہنما کی حیثیت میں وہ قتل ہو گئے۔ ان کی موت سب سے افسوس ناک واقعہ ہے جو دنیا میں بچپن ہی بازنوئل امن اور نگرہنگالی کے کسی داعی کو پیش آیا ہے۔ مارویائی پاریمان کی نوبل کمیٹی نہایت احسان مندی کے ساتھ مارٹن لوتھر کنگ کو یاد کرتی ہے اور ان کی یاد میں امن کے لیے دعا کرتی ہے۔

برس کے سوینڈش کلب میں 27 نومبر 1895 کو افریڈ نوبل نے اپنی وصیت پر دستخط کیے تھے جو بعد میں اتنا مشہور ہو گیا ہے۔ یہ واقعہ رمان ریمو اگلی میں، دس دسمبر 1896 کو اس کی موت سے تقریباً ایک برس پہلے کا تھا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں، نوبل نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کی دولت سے حاصل ہونے والی آمدنی پانچ حصوں میں تقسیم کی جائے گی اور ان لوگوں کو انعام میں دی جائے گی جنہوں نے نئی نوع انسان کے لیے سب سے زیادہ کام کیا تھا۔ اس کی بہت مختصری وصیت میں ایک جملہ ہے جس کی بنا پر ہم نے اس برس کے انعام پانے والے پروفیسر رینے کاہن کے بارے میں لکھا تھا۔ وہ جملہ یہ ہے، ”میری واضح خواہش یہ ہے کہ انعام دیتے وقت انعام کے لیے نام زد فرد کی قومیت پر توجہ نہیں دی جائے گی کہ وہ اسکیڈے نیویا کا ہے یا نہیں۔“

قومیت، نسل، مذہب، جنس یا سماجی حیثیت سے قطع نظر، یہ دراصل ان کی نظر میں انسان کی قدر ہے جو پروفیسر کاہن کی زندگی میں اور کام میں جان ڈال رہی ہے۔ اور بنیادی طور پر انسانی قدر کے تحفظ اور آدمی

کے حقوق میں ان کی شرکت ہے، جیسا کہ عالمی اعلان برائے انسانی حقوق میں بیان کیا گیا ہے، جس کی بنیاد پر نارویائی پارلیمان کی نوٹیل کمیٹی آج یہ انعام ان کو پیش کر رہی ہے۔

رہنے کا سن 1887 میں جنوبی فرانس کے علاقے Bayonne میں پیدا ہوئے۔ اقوام متحدہ کے اعلان برائے انسانی حقوق کا مسودہ آج سے ٹھیک بیس برس قبل جسے 10 دسمبر 1948 میں منظور کیا گیا تھا، انھوں نے ہی تیار کیا تھا۔ اس وقت کا بن تقریباً ساٹھ برس کے تھے۔ اگرچہ اسی وقت ان کا نام بین الاقوامی سطح پر مشہور ہوا تھا، مگر ایک طویل عرصے سے ان کی قیمتی زندگی انسان کی خدمت میں صرف ہو رہی تھی۔

قانون کی تعلیم کے حصول کے عرصے بعد ہی، انھیں پہلی عالمی جنگ میں جھونک دیا گیا تھا۔ 1916 میں ایک جرمن گولی نے انھیں جتنی معذور بنا دیا تھا، اور اسی کے بعد سے وہ امن کی طالب جدوجہد میں بخت گئے تھے۔

میں آپ کو ان کی عظیم کوششوں کے بارے میں بتانا چاہوں گا، جو انھوں نے معذور سپاہیوں، جنگی یتیموں اور یتیم ہونے والے 80,000 فرانسیسی بچوں کے لیے کی تھیں۔ ان لوگوں کی رفاہ کے لیے جو تنظیم انھوں نے قائم کی تھی، اور چلائی بھی تھی اس کے تقریباً دس لاکھ افراد رکن تھے۔ اور یہ کام ہی تھے جو اس سماجی قانون کے پیچھے کارفرما تھے جس نے جنگ کا شکار ہونے والوں کے سماجی اور معاشی تحفظ کے حقوق کا یقین دلایا تھا۔

جنگ سے متاثر ہونے کے لیے ان کی خدمات فرانس یک ہی محدود نہیں تھیں۔ 1921 اور اس کے بعد کے برسوں میں انھوں نے اٹلی، پولینڈ، جرمنی، چیکوسلوواکیا اور آسٹریا کے جنگ آزمودہ افراد کے لیے کئی کانفرنسیں منعقد کی تھیں۔ 1932 اور 1933 میں ترکی، اطالیہ، جاپان کی تائید میں بڑے مظاہرے ترتیب دیے تھے۔ مگر یورپ میں 1930 کے تباہ کن سیاسی مضمرات۔ برہمنی ہونی، مائوسیت اور فسطائیت۔ کے باعث امن کی فضا قائم کرنے اور تمام ملکوں سے آنے والے جنگی سپاہیوں کے مسائل کی سمجھ بوجھ کا سلسلہ اک دم ختم ہو گیا۔

1924 سے 1938 تک کا بن نے League of Nations for Disarmament میں کام کیا۔ جب 1940 میں فرانس میں چند دنوں کے لیے جنگ بند گئی تو رہنے کا بن پہلے شہری تھے جو جنرل ڈیگال کی اپیل پر بورڈ کے راستے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ جون کی 20 تاریخ کو وہ لندن پہنچ گئے، جہاں وہ ڈیگال کی جلاوطن حکومت میں وزیر برائے انصاف بنا دیے گئے تھے۔ لیکن انھوں نے، اور بہت سے کاموں کے علاوہ، ونسٹن چرچل اور ڈیگال کے درمیان ہونے والا معاہدہ تیار کیا تھا جسے بعد میں آزا فرانسیسی افواج کا فرمان ہوا تھا۔

فرانس کے شہر کوکی میں قائم ہونے والی حکومت نے کا بن کی فرانسیسی شہریت معطل کر دی اور غیر حاضری کا دوسری عالمی جنگ میں فرانس پر جرمنی کا قبضہ ہونے کے بعد کوکی کوئی شہر میں جرمنی کی وفادار ایک شہری حکومت بنائی گئی تھی جس نے لاکھوں فرانکو مزاحمتیں سنا گئیں تھیں۔

میں ان کو موت کی سزا سنائی تھی۔

دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے ساتھ ہی کاہن کی زندگی کے بہت اہم دور کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب تمام ملکوں کے لوگوں کو پہلی بار پتا چلا تھا کہ ہٹلر کے جنگ کے پہلو اور عزائم کیا تھے۔ یہ شخص سیاسی مقاصد کے لیے ایک مکمل جنگ نہیں تھی۔ یہ نسلی گروہوں کی نیستی تھی، ایک نسل کشی تھی، دنیا کو جس کا پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔

حقوق کی کمیوں سے آنے والی ظلم و بے رحمی اور یہودی نسل کے لوگوں کی بیچ کئی کی اطلاعات نے ہائے عامہ کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ یہ خوف ناک واقعہ اظہار بنا ہے مطالبات کا جو تمام قوموں کی حکومتوں سے کیے گئے ہیں کہ ایک بین الاقوامی حقوق کے مل کے ذریعے انسانی قدروں پر آئندہ ایسے حملوں کا تدارک کیا جائے۔

یہ خیال 1945 میں پورا ہوا جب اقوام متحدہ نے اپنے میاق میں Commission on Human Rights قائم کرنے کی دفعہ مثال کی۔ کمیشن کا کام ایک عالمی اعلان برائے انسانی حقوق کی تیاری اور ایک بین الاقوامی کنونشن کا قیام تھا جو تمام ریاستوں کو ان حقوق کو حقیقت بنانے پر پابند کرے گا۔

ایک تاریخی ترمیم کے ذریعے فرانس کا ایک نمائندہ رہنے کاہن اور ریاست ہائے متحدہ کی ایک شخصیت ایٹھنر روز ویلٹ (Eleanor Roosevelt) [صدر روز ویلٹ کی اہلیہ] نے مل کر اعلان حقوق انسانی کی بنیاد رکھی تھی۔ سو برس قبل، ان دونوں قوموں نے اعلانات منظور کیے جو آدمی کے بنیادی حقوق کی ضمانت دیتے تھے۔ میرا اشارہ امریکی اعلان آزادی 1776 اور فرانسیسی اعلان انسانی حقوق 1789 کی طرف ہے۔

مگر اعلان حقوق انسانی، جس پر ایٹھنر روز ویلٹ اور رہنے کاہن اپنے محکم نقوش چھوڑنے والے تھے 1776 کے امریکی اعلان آزادی یا فرانسیسی اعلان برائے حقوق انسان 1789 سے بھی آگے بڑھ گیا، یعنی وہی کچھ ان شقوں میں بھی تھا جیسا کہ وہی اعلان حقوق 1918 میں پایا جاتا ہے۔

ایٹھنر روز ویلٹ انسانی حقوق کے کمیشن کی صدر نشین تھی، اور رہنے کاہن اس کے نائب تھے۔ مگر اعلان کی دستاویز رہنے کاہن نے مرتب کی تھی۔

مثالیہ لوگ کہیں گے کہ جدوجہد برائے حقوق انسان، تعصب رنگ و نسلوں کے خلاف، اقلیتوں کے خلاف، مذہبی گروہوں کے خلاف اور عورتوں کے خلاف تھی۔ کہ یہ سب بہت نیک کام ہیں، مگر کیا ان سب کا امن سے کوئی واسطہ ہے؟

کسی اور نے بہتر یا زیادہ سچا جواب نہیں دیا ہے سوائے نور دہال گریگ (Nardahl Grieg) کے جس نے اپنی ایک نظم ”نوجواں کے لیے“ کے مندرجہ ذیل الفاظ میں کہا ہے:

تشد سے بچانے کے لیے حیرت حفظ!

یہ رہی تلوار تیری

یقین کر اپنی پیاری زندگی پر

کہ ہے انسان ہی تو قابلِ قدر

جن پچاس قوموں نے اقوام متحدہ کے میاق پر اپریل 1945 میں سان فرانسسکو میں دستخط کیے تھے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ دیر پا امن فرد کے حقوق اور قدر کے احترام پر ہی تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ کس قسم کا امن ایک ملک میں قائم ہو سکتا ہے جس میں لوگ آزاد نہ ہوں۔ جہاں وہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے، اپنے نظموں کی اشاعت نہیں کر سکتے، جہاں وہ قانون کی نگاہوں میں برابر نہیں ہو سکتے، جہاں ان کو تشدد اور جنگ آمیز مٹاؤ کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

میاق کے ابتدائی میں یہ طے کیا گیا ہے کہ امن اور تحفظ اس کے مقاصد ہیں۔ دوسرے حصے میں رکن ممالک انسان کے بنیادی حقوق اور فرد کی قدر پر اپنے یقین کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ انسانی حقوق کے احترام اور امن کے تحفظ پر ایک محکم یقین ہی تھا جس کی بنیاد پر اقوام متحدہ نے پہلا عالمی اعلان برائے انسانی حقوق جاری کیا تھا۔

کمیشن برائے انسانی حقوق کو ایک بڑے مشکل کام کا سامنا تھا۔

دنیا کو اطمینان دلانے کے لیے اقوام متحدہ کا میاق کئی بار کہتا ہے کہ وہ انسانی حقوق کے فروغ کے لیے کام کرے گا، مگر ہمیں میاق میں ان حقوق کا کئی سراغ نہیں ملتا۔ لہذا سوال یہ تھا کہ یہ جو پچاس یا ساٹھ ملکوں کے باشندے ہیں، جو تعلق رکھتے ہیں دنیا کے ہر حصے سے، ہر طبقے کی ترقی یافتہ تہذیبوں سے، مختلف روایتوں، مذاہب اور نظریات سے، تو ان لوگوں کے نزدیک انسانی حقوق کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ مغربی یورپ کے عوام کچھ اسی طرح کے تصورات رکھتے ہیں، مگر چینی، انڈونیشیائی اور ہائیتی کے عوام آزادی، مساوات اور معاشی و تہذیبی حقوق کے الفاظ سے کیا مطلب اخذ کرتے ہیں؟ تو کیا اس قسم کی رفاہی ریاستوں اور ان ترقی پذیر ملکوں کے درمیان کوئی نقطہ ہائے ملاقات تھے؟ مثال کے طور پر یورپی ممالک میں ”سونا کئی میں عورتوں کے حقوق“ کے مطلب پر ہم آسانی سے متفق ہو سکتے ہیں۔ مگر دنیا کے دوسرے ممالک کے عوام میں، جہاں ایک عورت کی قیمت چار اونٹوں کے برابر سمجھی جاتی ہو، وہاں اس کی توثیق کس طرح کی جاسکتی ہے؟

ان دشواریوں کے پیش نظر، کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ کمیشن کو یہ ضابطے تیار کرنے میں دو برس کا وقت لگ گیا، جسے 1948 میں پیرس میں منعقد ہونے والے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں سر کوئی آسانی سے قبول کر سکتا تھا۔ مگر وہاں بھی، جہاں ہمارے سامنے ایک مکمل طور پر تیار مسودہ پیش کیا گیا تھا، ہم نے سنانوے جلسوں میں دو مہینے کا وقت لیا۔ اور تیس دفعات کے اعلان میں کی جانے والی تہذیبوں پر بحث کے دوران 200 بار رائے شماری کی گئی تھی۔

مگر اس طرح ہم ایک اعلان کو وجود میں لائے تھے، جو انسان کے عمومی حقوق کے پرچم کے طور پر ایسا وہ ہے، خواہ ہم دنیا کے کسی بھی حصے میں، اور کسی بھی قسم کے نظام کے تحت رہتے ہوں۔ جن ملکوں نے اس کے حق میں رائے دی انھوں نے خود کو پابند تو نہیں کیا، مگر معاہدے کے دوران از خود اعلان کیا تھا کہ ہر شخص کو

حق ہونا چاہیے، زندہ رہنے کا، آزادی کا اور ذاتی تحفظ کا، کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں، کہ ہر شخص کو حق ہے تعمیر کی آزادی کا، برابر کے کام پر برابر کی اجازت کا، کام کے مناسب اوقات کا، اور مفت تعلیم کا۔ آخر میں، دفعہ 30 کہتی ہے: ”اس اعلان میں شامل کسی بات سے یہ مطلب نہیں نکالا جائے گا، کہ کسی ریاست، گروہ یا شخص کو حق ہوگا ایسی کسی سرگرمی میں حصہ لینے کا، یا ایسے کام کرنے کا، جن کا مقصد ان حقوق اور آزادیوں کی تباہی ہو، جو اس اعلان میں دی گئی ہیں۔“

ہمیں، جو یہاں موجود ہیں، یہ حقوق انٹرمین انٹیمس سچائیوں کی طرح لگ رہے ہیں، مگر اپنے اطراف کی دنیا کے حالات پر ایک طائرانہ نظر ہمیں قائل کر دے گی کہ کچھ ریاستوں میں، جی ہاں، زیادہ تر ریاستوں میں، اس مادہ سے اعلان میں کیے گئے وعدے ریت پر لکھی ہوئی تحریر معلوم ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی قانون کی نظر میں، بہر حال، یہ اعلان نئے خیالات کی پیداوار تھا، جب کہ پہلے ہونے والے ہر عہد کے قوموں اور حکومتوں کے درمیان کے رشتوں کو تواضع کا پابند کیا تھا، مگر اس نئے اعلان نے خود فرد کو اپنا نقطہ ارتکاز بنادیا ہے۔

ہر آدمی کو، خواہ وہ سماجی تنظیم کے کسی بھی نظام میں رہتا ہو، ان حقوق کی ضمانت دی جانی چاہیے۔ اس لیے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اعلان برائے انسانی حقوق دنیا کی سوہانگئی کا آئین ہے۔ یہ ہمارے مشترکہ آدرش کا اظہار کرتا ہے، اور اس ہدف کی تجسیم کرتا ہے، ہر شخص جس کو حاصل کرنے کی کوشش کر سکے۔ یہ ایک چیلنج ہے جس سے ہم کسی ملک کے سیاہی نظام کے معیار کو ماپ سکتے ہیں۔

لہذا، یہ اعلان تاریخ میں ایک خط تقسیم سمجھا جاتا ہے۔ یہ بین الاقوامی قانون کے پرانے اور طے شدہ نظریے سے آزادی حاصل کرتا ہے، جی ہاں، یہ ہمیں قدیم خود مختار ریاستوں کی سرحدوں کے اس پار دنیا کی سوہانگئی کی طرف دیکھنے کی اجازت دیتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ معترضین اور مایوسانہ ذہنیت رکھنے والے فوراً کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو بہت دور کی بات ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ وہ صحیح ہیں۔ مگر ہمیں کچھ روشن مقامات ضرور تلاش کرنے چاہئیں۔ اس لیے کہ وہ موجود ہیں۔ ہم صحاف دیکھ سکتے ہیں کہ اعلان انسانی حقوق کے اصول کس طرح انسان کے ذہن میں جڑیں پکڑ رہے ہیں۔ جنگ کے بعد قائم ہونے والی مٹی یا اتنی ریاستوں نے اس اعلان کے کچھ حصے کو یا پورے اعلان ہی کو، اپنے آئین میں شامل کر لیا ہے۔

تاریخی نقطہ نگاہ سے میں اب بھی یقین کرتا ہوں کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اعلان برائے انسانی حقوق کی 10 دسمبر 1948 کو منظوری نے ایک نئے عہد کی شروعات کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک انقلابی ارتقا کی شروعات ہو، جو صدر روز ویلٹ کے خواب کی تعبیر کو حقیقت میں بدل دے۔ ایک دنیا خوف سے آزاد، اور طلب سے آزاد۔

انسانی حقوق کے کمیشن نے اعلان کے کچھ مسودے پر 10 برس صرف کیے تھے۔ اس بے انتہا محنت

کے کام میں، جس میں ہر قسم کے تصور اور ہر لفظ کی صحت کو تمام زبانوں میں پیش کیا گیا تھا، پروفیسر کاہن کی حیثیت کلیدی تھی۔ انھوں نے ہر مرحلے پر مسائل کو ضابطہ بند کیا، وضاحت کی اور صاف کیا تھا۔ وہ اپنی ضابطہ بندیوں میں بلور کی مانند شفاف، اور اپنے ہدف کے حصول میں ثابت قدم تھے مگر وہ ہمیشہ معاونت کرتے اور دوسروں کی رائے کو برداشت کرتے تھے۔ وہ اپنے موقف پر سختی سے قائم رہتے، مگر جب انھیں اس بات کا احساس ہو جاتا کہ فوری طور پر ان کے قبول کیے جانے کا امکان نہیں تو وہ مسئلے پر اُل رہنے کے بجائے اسے قبول کر لیتے۔ اس کے بعد جو عرصہ گزرا، جس نے بہت سی نئی قوموں اور نئی ضرورتوں کو ابھرتے دیکھا، اس نے ثابت کیا کہ کئی تجویز جو ابتدا میں 1948 میں رد کردی گئی تھیں اب کنونشن کے متن میں شامل کر دی گئی ہیں۔

کاہن نے ایک غیر متحرک ٹارٹ کا کردار بھی ادا کیا تھا۔ جو شہری اور سیاسی حقوق پر زیادہ زور دیتا تھا۔ جو یورپی انداز خیال اور مشرقی یورپ کے نقطہ نگاہ کے درمیان معاشی، سماجی اور تہذیبی پلڑے میں زیادہ وزن دیتا تھا۔

اور جب اعلان برائے انسانی حقوق۔ جو پیداوار تھا بہت سے دماغوں، مذاہب، بہت سے خیالات اور بہت سے دلوں کی۔ بالآخر تیار ہو گیا، تو یہ بنیادی کار عظیم تھا جسے کاہن کی ذہنی کاوشوں کا۔ تو پھر، پروفیسر کاہن کتنے مطمئن ہیں آج اپنے کام سے؟ چند ہفتے قبل بروٹلم پوسٹ میں شائع ہونے والے اپنی ایک مضمون میں انھوں نے لکھا تھا:

یہ اعلان ہمارے لیے ایک آدرش ہے، اور یہ ہمارے اعمال سے رہنما اشارے حاصل کرتا ہے۔ مگر حقیقت پر ایک نظر ڈالنا یہ دکھانے کے لیے کافی ہے کہ ہم اپنے آدرش سے کتنے دور ہیں۔ کوئی بھی ملک، حتیٰ کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بھی یہ فخر نہیں کر سکتے کہ وہ اعلان کی مرادی دفعات کی تکمیل کر چکے ہیں۔ ایک دفعہ پھر جنگ اور آدرش، جن کے لیے ہم نے جنگ کی ہے، فاصلوں میں گم ہو گئے ہیں اور نئی ریاستوں نے اپنی خود مختاری حاصل کر لی ہے، وہ انسانی حقوق سے قطع نظر اپنے معاملات خود حل کرنے کی طرف مائل ہو رہی ہیں۔

ہم زندہ رہنے کے حق کی پامانی دیکھ رہے ہیں، خوفِ مزا کے بغیر موت اور قتل عام کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ عورتوں کا استحصال، بڑے پیمانے پر فاقہ کشی، ٹیمبر کی آزادی اور تقریر کی آزادی کی بے احترامی، نسلی تعصب۔ یہ تمام برائیاں اتنی پھیل چکی ہے کہ ان سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

مگر ان کوتاہیوں پر پروفیسر کاہن ناامید نہیں ہوتے۔ وہ تعلیمی کام کی اہمیت یاد دلاتے ہیں صرف بچوں کے لیے ہی نہیں، بلکہ بالغوں کے لیے بھی تاکہ زرخیز مٹی میں اعلان کے خیالات کی نشوونما ہو سکے۔ اور یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ UNESCO کے مذاق کے مصنفین میں سے ایک کاہن خود بھی تھے۔

اعلان برائے انسانی حقوق کو قانونی طور پر تمام ریاستوں پر لازم کرتے ہوئے، ریچ کاہن نے دو عہد ناموں کی تیاری میں حصہ لیا تھا، جنہیں اعلان کے اٹھارہ برس بعد دسمبر 1966 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی

نے متفقہ طور پر منظور کر لیا تھا۔

1948 میں اعلان کی منظوری اور 1966 میں کنونشن کے قیام کے درمیان کے اٹھارہ برسوں میں انفرادی طور پر کچھ ریاستوں ہی میں نہیں، بلکہ پوری دنیا میں ایک اہم سیاسی واقعہ رونما ہوا۔ اس واقعے کی طرف اشارے میں اس حقیقت کا حوالہ دیا جاسکتا ہے کہ 1948 اور 1966 کے درمیان تقریباً ساڑھے سٹے ملک اقوام متحدہ کے رکن بنے۔

نئی ریاستوں کے کچھ مفادات تھے جو اقوام متحدہ میں شامل دوسری ریاستوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان کے نزدیک سوال دنیا کے کلاسیکی سیاسی حقوق کا نہیں بلکہ ان ملکوں کے حق خود اختیاری سے متعلق اصولوں اور ان کی اقتصادی ترقی سے متعلق تھا۔ اس لیے ہشاید کہا جاسکے کہ قوموں کا انعام ترقیات سے پہلے کا معاملہ تھا جو صنعتی ترقی یا فزیمالک پہلے ہی طے کر چکے تھے۔

اقوام متحدہ میں موجود ایک طاقت ور عنصر نے بھی دو مہد ناموں کو اعلان سے زیادہ وسعت دیتے ہوئے، ان کے متن پر اپنا نقش چھوڑا تھا۔ اس کے باوجود تاریخ میں پہلی بار دو بین الاقوامی اجتماعات نے متفقہ طور پر آدمی کو کچھ بنیادی حقوق دینا منظور کیا تھا۔

کسی ملک نے ابھی تک ان دو مہد ناموں کی۔ ایک شہری اور سیاسی حقوق سے متعلق اور دوسرا اقتصادی، سماجی اور تہذیبی حقوق سے متعلق۔ توثیق نہیں کی ہے۔ قبل اس کے کہ یہ جائز ہوں، چنانچہ اس ملکوں کو ان کی توثیق کرنا لازمی ہے۔ ایک پرامید اشارے کی صورت میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ نارویائی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ممکنہ اعتبار سے جتنی جلد ممکن ہو سکے، وہ از خود اپنی پاریمان میں ان کی توثیق کے لیے ایک تجویز پیش کرنے پر تیار ہے۔ یہ توقع نامناسب نہیں کہ دوسرے اسکیٹنڈینیویائی ملک بھی ایسا ہی کریں گے۔

اسی جیسے ڈیبر کے ایک مردوں، پورے میں برس قبل، آدھی رات سے ذرا پہلے Palais de Chaillot میں، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں، انسانی قدر اور انسانی حقوق کا یہ تاریخی اعلان منظور کیا گیا تھا۔

ان میں لاکھ افراد کو، جو آج جبر کے اندھیرے میں زندگی گزار رہے ہیں، اس اعلان کا علم نہیں تھا، مگر ایک چھوٹی سی شمع جلانی گئی تھی اور اعلان میں شامل اخلاقی احکامات، ویسے ہی، جو موٹی کی تختیوں پر کندہ تھے، آنے والے برسوں میں انسانی ضمیر، اور نیک و بد کے بارے میں اس کے ادراک کی تجدید نو میں ایک طاقت ور کردار ادا کریں گے۔

آج جہاں انسانی حقوق اور آزادی کا احترام نہیں وہاں امن نہیں۔ ہر روز جنگ کے میدان میں نوجوان ہلاک ہوتا ہے۔ ہر روز قیدی زندانوں اور محبوسیت خانوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ وہ اُس آدرش کے لیے لڑتے بھی ہیں اور دیکھ بھی اٹھاتے ہیں، انسانی حقوق کا اعلان جن کی آواز بلند کرتا ہے۔

مگر صرف انہیں سے طلب نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک سے بھی طلب ہے، جنہیں پورا یقین ہے کہ ان سے یہ حقوق چھینے نہیں جاسکتے۔ 1968 ہی وہ سال ہے۔ انسانی حقوق کا سال۔ جس نے ہمیں ایک قدیم سچ کا

الم ناک شیت دیا ہے: امن۔ آزادی کی طرح، ناقابل تقسیم ہے، ہر ایک کو ہر روز اسے نئے طریقے سے پکڑتے رہنا چاہیے۔

صدر نشین مارویائی نوبل کمیٹی Gunhar Jahn کی زبانی

خطبہ:

انسانی حقوق کا میثاق

دسویں دسمبر کے اجلاس میں، مجھے ذاتی طور پر مارویائی قوم کی نوبل امن انعام قائم کرنے والے، اس کے جینی، انگریڈ نوبل، 10 دسمبر 1896 کو جس کا انتقال ہوا تھا، خراج تحسین پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، اور تمام انعام پانے والوں کو بھی جنہیں 1901 سے انسانیت کی خدمات کے لیے نوازا گیا ہے، مگر مجھے احساس ہے کہ میں نوبل امن انعام کمیٹی کے اکان کا شکریہ ادا نہیں کر سکا، بالخصوص کمیٹی کی صدر نشین Mrs. Aase Lonaes کا جنہوں نے اقوام متحدہ کے 1948 میں منعقد ہونے والے جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ماروے کی نمائندگی کی تھی، جس کی تیسری کمیٹی نے عالمی اعلان برائے انسانی حقوق پر غور کیا تھا۔

لہذا، قبل اس کے کہ میں اپنے کلام کی ابتدا کروں، میں اس خطا کا ازالہ کرنا ضروری جانتا ہوں، جسے غیر ضروری بھول ہی سمجھا جانا چاہیے اس خود مختاری اور کٹھن غیر جانب داری کے باعث، جو نوبل امن انعام کمیٹی نے رواجی ہے، اس انعام، اس کمیٹی اور دنیا بھر کے اس کے حاصل کرنے والوں کے وہ انارے ہیں یا خیر ان وقار میں مستقل اضافہ ہی کیا ہے مزید یہ کہ جب رائے عامہ اور بلند اخلاقی قدروں والے نوبل کمیٹی کے انتخاب پر اتفاق کرتے ہیں تو انعام کے قائم کرنے والے کے متلاشی ہدف کا زیادہ قریب سے جائزہ لیا جاتا ہے۔

یہ نوبل کمیٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ بہت احتیاط سے اپنے انتخاب کو عوام میں مشتہر کرے، اور انعام پانے والے کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے طور پر ان تمام اسباب و عوامل کو عوام کے سامنے پیش کرے، جن کی بدولت وہ امن اور اس کے دوسرے عناصر کے حصول میں کامیاب ہوا ہے۔ اپنے ضمیر کی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کے بعد ہی اس کو اس بات حق پہنچتا ہے کہ وہ ماضی سے اب تک ہونے والی ترقیات پر نظر کرے، اس امید پر کہ وہ اپنے سننے والوں کو۔ دوسرے تمام لوگوں سمیت۔ قائل کر لے گا، ان ضروریات، اور ان امکانات کے لیے جو ایک بہتر اور شفیق دنیا بنانے کی طرف پیش قدمی میں معاون ہوں گے۔

میں ابتدا ہی میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اس صدی کی شروعات کے بعد میں نے شمولیت کی صلاحیت آنے سے ذرا قبل۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ میں صحیح معنوں میں اس وقت

اپنی تعلیم کے ابتدائی دور میں تھا اور مجھے بین الاقوامی اور سماجی مسائل کے مطالعے میں دلچسپی بھی تھی۔ بچپن ہی سے میں ایسے شہری کارناموں کا پُر جوش شیدائی تھا جو اپنے ایک خانہ دانی دوست اور فوجی ڈاکٹر کے ہاتھوں ہوتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ اسی طرح، کچھ عرصے بعد نہ صرف کیپٹن ڈریس (Captain Dreyfus) بلکہ دوسرے کم مشہور لوگوں کے ساتھ کی جانے والی مجرمانہ انصافیاں بھی مجھے افسردہ کر دیا کرتی تھیں۔ پھر بھی، پروفیسر بننے کے لیے قانون اور ادب کے مطالعے کے دوران، اپنی کم گوئی یا خود بے اعتدالی کے باعث، میں مسلمہ طور پر سیاسی موضوعات سے گریز کرتا تھا، باوجودیکہ ذمے داریوں اور اقرارناموں کے تکنیکی قوانین پر اخلاقی، بالخصوص نیک نیتی کے اصولوں، کا غلبہ ہوتا ہے۔ اسی طرح، افراد کی چھوڑی ہوئی وصیتوں پر عمل کرانے کے ریاستی حقوق کے سماجی پہلو بھی اقلیت کے حائل ہوتے ہیں۔

درحقیقت 1914-1918 کی جنگ، جس نے میری وقتی اور آرام دہ اخلاقی مساوات کو یا اگر میں خود پر زیادہ سختی نہ کروں تو میری متناظر مہذب حد بندی کو درہم و برہم کر دیا تھا۔ اس جنگ نے مجھ پر ناقابل رد واپس مہر ثبت کر دی ہے، جیسا کہ میرے بہت سے معاصر لوگوں کی ساتھ ہوا ہے۔ مگر یہ میدان جنگ یا اسپتالوں کی زیادہ قابل دید بول ناکی نہیں تھی جس نے ہمیں آلودہ کیا ہے، بلکہ یہ جنگ کے تکلیف دہ احساسات اور دور رس اور فضول خرچ نتائج تھے، معذور سپاہی، خاندانوں کے لیے روزی کمانے والے افراد۔ ہم سب کی بھلائی کے لیے مرجانے والے۔ میں خود کو اس خیال کو قبول کرنے کے قابل نہیں پا رہا تھا کہ ان متاثرہ لوگوں کے ساتھ قومی یک جہتی کو ایک قسم کی خیراتی امداد تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ میں جلد ہی ان لوگوں میں شامل ہو گیا تھا جو قومی کمیونٹی کی خدمت کے دوران اٹھائے گئے شخصی نقصانات کے معاوضے کی تصدیق کے لیے لڑے اور فاتحانہ انداز میں لڑے تھے۔ ہمارے ملک کے انسانی وقار اور عام بہتری کے لیے، جو اس وقت افرادی قوت میں کمی کا شکار تھا، ضرورت تھی کہ روایتی پنشن کے علاوہ ہمارے بہت سے معذور کار آزمودہ سپاہیوں کو سوسائٹی میں ایسے طریقوں سے دوبارہ ضم کر لیا جائے، جیسے معنوی اعزاز کے بینکوں کا قیام، پیشہ ورانہ تربیتی پروگرام، چھوٹے پیمانے پر کاروبار کے لیے قرضے کی فراہمی، اور قوم کے مخصوص تحفظ میں 800,000 بچوں کی پرورش اور تعلیم وغیرہ۔

یہ اس پہلی مہم کا نتیجہ تھا جس کے لیے میرے بہت محترم ساتھیوں اور میں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ ضروری ہے کہ ہم پہلے اصولوں کی طرف واپس جائیں اور ان لوگوں کے لیے پرورش کریں، احترام کی اعلیٰ ترین نگین کی، جنہوں نے محض اس مفروضے پر خود کربان کر دیا تھا کہ بس یہ آخری جنگ تھی۔ اور ہمیں جوں ہی معاوضے دینے کے قانون کی منظوری کا یقین دلایا گیا، ہم نے مستقبل کے لیے بنیادی کام شروع کر دیا تھا۔

ہماری طرف سے پہلا اثر رہ جسٹائی اظہار (ILO) International Labor Organization کی تشکیل میں امداد تھا، جس میں 1921 سے دونوں حالیہ دشمنوں، کی جانب سے معذور فوجیوں کے مختلف اداروں کے نمائندے شریک رہے ہیں۔ البرٹ تھامس (Albert Thomas) کے زیر سرپرستی و تائید ہم نے

اپنی سماجی قانون سازی کو مربوط کرنا شروع کیا تھا، جو کچھ ہو چکی تھی اور جو منصوبہ بندی کے مراحل میں تھی، ساتھ ہی امن کے لیے اپنی توقعات کے لیے رابطے بھی کیے تھے۔

اس طرح ہمیں، جنہوں نے ایک ساتھ جنگ لڑی تھی، خود کو منظم کرنے کا موقع مل گیا، تاکہ ان مدبرین کو اندازہ فراہم کی جائے جنہوں نے واقعی اس عالمی جنگ سے سبق حاصل کیا تھا اور اس کے دوبارہ واقع ہونے کے انداز کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری کوششوں کا اندازہ سابقہ فوجیوں کی بڑے پیمانے پر 1922 میں French Association for the League of Nations (GIAMAG) میں شمولیت سے اور 1925-1926 کے دوران International Confederation of Disabled Veterans کے قیام سے ہو جاتا ہے، جس کے نہایت سنجیدہ رہنماؤں نے اُس وقت اپنے رسوم، اپنی آزادی اور اکثر اپنی زندگیوں کو بھی خطرے میں ڈالا، جب فرمتیں بیچنے والے اور تشدد کے پیچھے بھی ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے جرمنی اور دوسرے ملکوں کی حکومتوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ذاتی طور پر میں اس تقریر کو کبھی نہیں بھول سکتا جو ہٹلر کے دوست رودولف ہیس (Rudolph Hess) نے 1934 کے سیاہ سال میں 6 جولائی کو میونخ میں کی تھی جس میں اس نے کھلا اعلان کیا تھا کہ ماسی حکومت، جو پہلے سے ہی سیاسی قتل کے لیے مشہور تھی، آزاد ملکوں میں سابق فوجیوں کے حوصلوں کو ڈھانے کی تیاری کر رہی تھی، افسوس کہ وہ بالکل صحیح کہہ رہا تھا۔ یہ ایک کارہ لا حاصل تھا جب ہم میں سے کچھ نے مستقبل کی جنگی حملہ آوری کی اس ابتدائی حرکت کو روکنے کی کوشش کی تھی۔

اس وقت GIAMAG کی امن سازی کی کوششوں کی اطلاع نوبیل امن انعام کمیٹی کو دی گئی تھی، مگر پولینڈ پر حملے نے یورپ کو آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں لیا شروع کر دیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ پہلی عالمی جنگ سے بچ جانے والوں کی حیثیت میں، اس مقام پر مجھے شدت سے یاد آنے والا خراج عقیدت پیش کرنے کی اجازت دی جائے گی، ان کو بھی جو اسے خوش قسمت نہیں تھے کہ بچ جاتے، مگر انہوں نے اپنے آخری وقت تک امن کو بچانے کی کوشش کرنے والوں میں شرکت کا اعزاز پایا۔

اس دوران قطعی مسائل نے خود لگ آف نیشنز پر حملے شروع کر دیے تھے۔ بالآخر یہ ضروری ہو گیا تھا کہ جاپان کو خارج کر دیا جائے۔ مگر ہٹلر کے جرمنی کا معاملہ سمجھ اور رہی تھا۔ معاہدوں کے خلاف اقلیتوں کے تشدد کی شکایات ملنے پر 1933 کی جینیوا اسمبلی نے ایک بہت معتدل متن [کی تجویز] پر اتفاق کیا تھا، جس میں تمام ریا ستوں سے کہا گیا تھا کہ "وہ مخصوص مہدناموں کے ذریعے پابندی کی گئی تھیں یا نہیں" پھر بھی وہ ان تمام لوگوں کے لیے جو ان کے علاقے میں بستے ہیں، بنیادی حقوق کا احترام کریں گی۔ ہٹلر نے اس قسم کے اثباتی اقرار کو برداشت نہیں کیا۔ اُس نے اس کو بہانہ بنا کر شور و غوغا کے ساتھ لگ آف نیشنز سے مانا توڑ لیا اور اس طرح وہ اس اسلحہ بندی کے کسی مخفی پروگرام کی جانچ پڑتال سے بچ لگا جس پر وہ بڑے پیمانے پر عمل کرنے والا تھا۔

میں اس واقعے کو اس لیے بیان نہیں کر رہا ہوں کہ یہی دوسری عالمی جنگ کا واحد جواز تھا، مگر اس لیے کہ یہ اس وقت کے قابلِ نفرت تمام کاموں کی اصلیت پر روشنی ڈال رہا ہے، جنہوں نے ایسی مہلک تباہی کی شروعات کی تھی جس میں بہتر ملین افراد جان سے چلے گئے۔ ان لوگوں کے لیے، جنہیں لڑنے پر مجبور ہونا پڑا تھا کہ اس جہت نامک مشین کو جو انسانی آزادی اور وقار کی تباہی کے لیے تیار کھڑی تھی، روکا جائے۔ دوسری عالمی جنگ ایک "crusade for human rights" بن گئی تھی۔ میں اس کو اس لیے اور بھی بیان کر رہا ہوں کہ افسوس، اس فاتحانہ crusade کے مشکل سے ایک صدی بعد ہم اب بھی بہت سے قومی رہنماؤں کو ریاستوں کے زور بھکرائی بننے والوں پر مکمل اور بلا شرکتِ غیر حاکمیت پر اٹھنا خیال کرتے سنتے رہتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ ان تمام اصولوں کا اعلان کرتے رہتے ہیں جو ان کے خیال میں، ایک بار پھر دنیا کو ایک قانونی تعطل کی کیفیت کے خطرے میں، اور جنگوں میں الجھا رہے ہیں، جو مثالی مقامی علاقوں تک محدود درج ہیں، مگر دراصل پوری انسانیت کے نقصان کا باعث ہوں گی۔

جب فرانس نے، برطانیہ سمیت، طے کر لیا کہ وہ پولینڈ کے جائز دفاع کے لیے امداد فراہم کرے گا، تب یہ آگاہی ہم پر اچانک پڑی کہ ایک دیونیکل مقدار کا تنازعہ مآگزیر ہو گیا ہے۔ 1940 کے موسمِ سرما میں، جب میں ایک معمولی پروفیسر کی حیثیت کا آدمی تھا، میں نے انسان اور انسانی کمیونٹی کے مقابل ایک عنفویت قرار یا مست پر لعنت بھیجی تھی، اور میں نے انسانی حقوق کے احترام کے لیے قربانی کو لازمی ہدف قرار دیا تھا، ہم سب جس کے پابند تھے۔ اگلے برس ستمبر 1941 میں میرے ملک میں ایک وقتی آفت کے بعد، جب میں اتحادیوں 'Fighting France' کے ٹرانکڈے کی حیثیت میں لندن میں تھا میں نے مقبوضہ ملکوں کی آوازوں کو اُبھارا تھا، جب ہم جے پیل اور روز ویلٹ کے ہمراہ مستقبل کے لیے انسانی حقوق کی بنیاد پر قائم امن کی ضرورت کا اعلان کر رہے تھے۔ پھر ایسا کیوں ہے، کہ ایک بار فتح و جود میں آئی اور نیستی و نابودی کے بھیاں بک کیمپوں کی تفصیلات منظرِ عام پر آگئیں تو ہم لوگوں سے کیسے گئے وعدوں کو بڑی بے شرمی سے توڑ سکتے تھے؟

بین الاقوامی امن کی اہمیت کا اندازہ کرنے سے پہلے، جس میں تمام آدمیوں کے حقوق کا احترام ہو، اور اس وسیع بین الاقوامی مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے پہلے، میں نے خود کو جس کے لیے مکمل طور پر وقف کر دیا ہے، میں نے، ذرا زیادہ تفصیل سے، ان مرحلوں کو بیان کرنے کی ضرورت سمجھی ہے، جن راستوں سے 1920 اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان میری بین الاقوامی سرگرمیاں گزریں تھیں۔ چونکہ نوبل کمیٹی نے اپنی صدر نشین کی تقریر کے ذریعے میری ان تمام کوششوں پر تبصرہ کیا ہے جو میں اس میدان پر پچھلے پچیس برسوں کے دوران کر چکا ہوں، میں ان کو دہرانے سے گریز کروں گا۔

اس کے علاوہ، اور خاص کر چوں کہ میں خود کو دو گنا مراعات یافتہ پاتا ہوں، نہ صرف انسانی حقوق کے معاملے میں کام کرنے کے لیے بلکہ قومی، بین الاقوامی اور علاقائی، تین مختلف سطحوں پر کام کرنے کے

لیے، اس لیے میں اپنے حاصل کردہ تجربات سے کچھ نتائج اخذ کرنا اور کچھ سبق سیکھنا چاہوں گا۔
1940 تک انسانی حقوق کے ضمن میں انسانی کمیونٹی کی اجتماعی کوشش انسان دوستی کے معاق کے ذریعے، 1864 سے بین الاقوامی ریڈ کراس کے معاق تک، اور جنگ کے قوانین پر ہونے والے ریگ کنونشن کی بنیاد پر غلامی کی لغت اور بردہ فروشی کے خلاف جدوجہد کے لیے وقف تھی۔ اس مرکزے (nucleus) میں چھوٹ کی بیماریوں اور جعل سازی کی روک تھام، اسلحہ کی خرید و فروخت، سفید فام غلامی، اور اس کے بعد دہشت گردی وغیرہ سے متعلق کچھ مہم نامے شامل کیے جاسکتے تھے۔ ان معاملات کے علاوہ، انسانیت کی جانب سے، مداخلت وغیرہ اکثر مسئلے اٹھائے گئے ہیں، مگر وہ یا تو ناخیر سے اٹھائے گئے تھے، جیسے آرمینائی قتل عام یا وہ نوآبادیاتی استحصال میں بدل گئے تھے۔

لیگ آف نیشنز نے آدمیوں کی سرف مخصوص قسموں پر دھیان دینے کی ضمانت دی تھی: قومی اقلیتوں کو اور ان علاقوں کی آبادیوں کو جو دوسرے ملکوں کے قبضے میں تھیں۔ ایک وسیع فرمان کے ساتھ International Labor Organization ہی سرف وہ انتہائی تھی جو مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرتی تھی۔

اچانک وہ دنیا جس نے فائنس منڈوش اور بے شمار خلاف ورزیاں دیکھی تھیں، جو کسی اصلی گروہ کے حکم پر ہی کی جاسکتی ہیں، ایک ناگہاں مسئلے سے دوچار تھی: پورے آدمی کی اور آدمیوں کے حقوق کی حفاظت۔ اس حقیقت کی روشنی میں ہمیں 1945 کی کھل قومی سان فرانسسکو کانفرنس میں اقوام متحدہ کے معاق کی منظوری پر اس کے مندوبین کے تامل پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔ یقیناً جانے کر انھوں نے، وعدے کے مطابق، اس نئی تنظیم کی اہم ترین ضرورت، بین الاقوامی امن کے ساتھ انسانی حقوق کو شامل کیا تھا۔

انھوں نے کچھ مخصوص بنیادی طور پر ترجمان اداروں کو اس میدان کا استحقاق عطا کیا تھا۔ اگر وہ بے دل نہیں تھے تو بے انتہا محتاط لوگ تھے۔ انھوں نے اس معاق میں ویسے ہی چونکس بیانات شامل کرنے کی ہمت نہیں کی جیسے کہ International Labor Organization کے آئین میں داخل کیے گئے تھے۔ انھوں نے وہ طرزِ تحریر اختیار کیا جو کچھ کم زور، بلکہ ذومعنی تھا؛ مثال کے طور پر ”حقوق انسانی کی ہمت افزائی کے لیے“ دفعہ 2:7 جو خصوصاً ریاستوں کے دائرہ اختیار کے بارے میں ہے، 56، 65، 13 اور 62 فقرات سے متصادم ہے۔ بالآخر انھوں نے دفعہ 68 کے تحت انسانی حقوق کو یقینی بنانے کے لیے ایک خصوصی ادارہ بنام Commission on Human Rights تشکیل دیا، مگر اس کے اختیارات کی وضاحت میں ناکام رہے تھے جس کے نتیجے میں 1946 کے بعد اقوام متحدہ کے ادارے Economic and Social Council نے اس کو دوسرے کمیشنوں جیسے ایک کمیشن کی حیثیت دی جو اقوام متحدہ کے معاون ادارے تھا۔

ان نامولات اور ایسی چند توں کے مبہم کردار کے نتیجے میں خود Commission on Human Rights کو شروع سے ہی اپنے کردار اور اختیارات کے بارے میں شبہات پیدا ہو گئے تھے۔ بس واحد اسٹی تھا وسیع

مگر چونکہ کس فرمان جو جنرل اسمبلی کے 1946 کے اجلاس نے Charter of Human Rights کی تشکیل کے لیے جاری کیا تھا، مان فرانسکو کانفرنس میں جسے تیار کرنے کی یا تو ہمت نہیں تھی یا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

یہ کمیشن جس میں ابتدائی سے مختلف قوموں کے اور رنگ پریشوں کے اٹھارہ ارکان شامل تھے جو کام کرنے کے اپنے فیصلوں میں اپنی جہالت کے مطابق فیصلوں اور بین الاقوامی اعلان کے منظم انسانی منشور کے مطابق آگے بڑھتے تھے۔ اٹھارہ مہینے سے کم عرصے میں اس نے ایک مسودہ تیار کر کے جنرل اسمبلی میں پیش کر دیا جو ایک سو اجلاسوں میں نہایت جذباتی بحث و تجویس کے بعد تیس دفعات کی شکل میں 10 دسمبر 1948 کو منظور کر لیا گیا۔

اپنے وجود کے مطابق یہ اعلان، جسے بعد میں "عالمی" کہا گیا، اور جس کا عدالتی طور پر کوئی لازمی کردار نہیں تھا، اعلیٰ درجے کا ایک تاریخی واقعہ تھا۔ یہ اخلاقی نوعیت کی پہلی دستاویز ہے جسے منظم انسانیت نے اس پہلے کبھی اختیار نہیں کیا تھا، اور یمن ایسے وقت میں جب مائیکسی دہائیوں کے باعث انسانی طاقت فطرت کے مقابلے میں وسیع جیتانے پر مدد چکی تھی اور جب یہ فیصلہ کرنا ضروری ہو گیا تھا کہ ان طاقتوں کو کس قسم کے تعمیری کاموں میں استعمال کیا جائے۔ اس کی خاصی اخلاقی اور سیاسی گونج رہی ہے۔ رائے شماری سے باز رہنے والی آٹھ ریاستوں کے مقابلے میں اڑتالیس نے حصہ لیا، اور یمن رائے شماری کے شروع ہونے کے وقت چند ارکان نے اعلان کو اس طرح قبول کر لیا کہ انہوں نے رائے شماری میں حصہ لیا تھا۔ بعد میں تمام ریاستوں نے اقرار کیا کہ اقوام متحدہ نے اس کی حمایت کی تھی، باوجودیکہ انہوں نے اس کے حصوں کو اپنے آئین کا حصہ نہیں بنایا تھا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو اعلان اپنے کسی اختیار سے محروم نہیں ہوا ہے۔ یہ اپنے ان تمام اختیارات اور حقوق انتخاب کو اصولوں کا درجہ دیتا ہے جن پر عمل پیرا ہوئے بغیر انسان پوری طرح اپنی جسمانی، اخلاقی اور عقلی انفرادیت کو پانہیں سکتا۔ بہت سے گرم گرم مباحث کے بعد، بطریق روز ویلٹ نے شروع سے آخر تک جن کی صدارت کی تھی، عالمی اعلان انگلستان، شمالی امریکا اور فرانس کے کلاسیکی قومی اعلامیات کی حدود سے باہر لکھ لیا تھا۔ جیسا کہ ہر فرد کو اپنی زندگی اور سوسائٹی میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے، اس اعلان نے انسانی حقوق کی فہرست میں انسان کے کام کرنے کے حقوق اور چند معاشیاتی، سماجی اور تہذیبی حقوق بھی شامل کر دیے تھے۔ مختصر یہ کہ دفعہ 22 جیسے فارمولوں کے طفیل جو بعد والے حقوق پر لاگو ہوتے ہیں، اس نے ان [حقوق] کے اور قدیم آئینوں کے درمیان ایک متناظر توازن قائم کر دیا ہے، ایسا توازن جس کو قائم کرنا اور عملی طور پر برقرار رکھنا، جب یہ انفرادی حکومتوں پر منحصر ہوتے ہیں، مشکل ہوتا ہے۔

اس اعلان کی دوسری نمایاں صفت اس کی عالم گیر ہے؛ بغیر کسی قسم کے تعصب کے یہ ہر انسان پر لاگو ہوتا ہے؛ حکومتوں کی اقتصادی اور سیاسی کیفیت سے قطع نظر تمام علاقوں پر اس کا اخلاق ہوتا ہے۔ یہ

مختلف سماجی گروہوں سے متعلق افراد کی حیثیت میں وسعت پیدا کرتا ہے، بالخصوص کمیونٹی سے متعلق فرائض کی بابت جن کا وہ حصہ ہوتے ہیں، مگر اس کے عوض یہ جمہوری سوبہائی کو متحرک کرتا ہے اور ریاست کی مطلق العنانیت کی نفی کرتا ہے۔

اگر چہ اعلان کی تیاری اور اس کی منظوری نسبتاً آسان اور کامیاب کام تھا، مگر سب جانتے ہیں کہ انسانی حقوق کے بیاق کا تین ٹکڑوں پر مشتمل نقش (triptych) دوسرے دو حصوں سے کہیں زیادہ مشکل تھا اور ان کے لیے زیادہ وقت درکار تھا۔ انسانی حقوق کے کمیشن کو اسمبلی میں دو عہد نامے تیار کرنے میں چھ برس کا وقت لگا تھا: ایک شہری اور سیاسی حقوق سے متعلق، اور دوسرا اقتصادی، سماجی اور تہذیبی حقوق کے بارے میں۔ اس کام میں دو بڑی مشکلیں سرکاری تھیں۔

پہلی مشکل تو یہ طے کرنا تھا کہ عوام کے حقوق خود اختیاری کو، پہلے جنھیں سیاسی نوعیت کے اجتماعی اصول سمجھا جاتا تھا، عہد ناموں میں شامل کیا جائے یا نہیں، تا کہ عالمی اعلان میں ہیومن رائٹس حقوق نافذ ہو سکیں، جو صرف فرد کے حقوق کے علاوہ یا اجتماعی استعمال سے متعلق تھے۔ تاریخی اعتبار سے نوآبادیات کے انہدام کی طرف پیش قدمی اور علاقوں کی غلامی سے نجات بھی ایک حل تھا جو دوسری عالمی جنگ کے دوران فاتحانہ حمایت آزادی کے اصولوں کا منطقی نتیجہ تھا۔

دوسری مشکل ایک سادہ مگر عملی کی نوعیت کی ہے۔ طویل بحث و مباحثہ کے بعد اس کا حل اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں نکالا گیا تھا۔ اسمبلی نے پہلے تو، یعنی 1950 میں ایک عہد نامے ہی میں تمام حقوق کو شامل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر بعد میں اس نے ارادہ بدل دیا اور کمیشن کو حکم دیا کہ وہ دو مختلف عہد نامے تیار کرے اور ہر ایک میں ریاست کی ذمہ داری بڑھائی جائے اور ان کا حلاق کیا جائے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ ایسا نظام ہی دونوں قسم کے حقوق کی خصوصیات کے لیے بہتر ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس پر گیارہ برس تک کام جاری رہا۔ کام کی سست رفتاری کا اندر جزوی طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر برس نئی آزاد ہونے والی ریاستیں جو جنرل اسمبلی کی تیسری کمیٹی میں شامل ہوتیں، انھیں عہد نامے کی عام فائدہ مندی اور بالآخر اداروں پر پڑنے والے اثرات پر غور کرنا اور رائے قائم کرنی ہوتی تھی۔ مگر یہ اندر صرف جزوی طور پر جائز ہو سکتا ہے۔ اس تاخیر کی سب سے اہم وجہ کچھ طاقتوں کی خواہشات میں منہمک تھیں کہ وہ اس بحث میں جس قدر ممکن ہو تاخیر چاہتی تھیں اس لیے کہ انسانی حقوق کے کمیشن میں ووٹ سے منظور کیا جانے والا اطلاق ان کی ریاستی حکمرانی میں دخل اندازی سمجھا جاتا تھا۔ 1996 میں ہونے والی آخری رائے شماری میں صرف اس لیے اتفاق ہوا تھا کہ حقوق انسانی کے سال کے ابتدا ہوتے وقت اس میں مزید تاخیر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مزید یہ کہ اس کی بڑی قیمت چکانی پڑی تھی۔ دونوں عہد ناموں کے اطلاق کے مساکی، بلکہ عہد نامے میں شامل شہری اور سیاسی حقوق اس حد تک کم زور ہو گئے تھے کہ ان کی حیثیت محض اختیاری ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس سلسلے میں جو کچھ معاوضہ مل رہا تھا وہ

غیر سرکاری اداروں کے رسوم کے باعث تھا، اور وہ بھی نئی طور پر ان اداروں سے انٹیل کی صورت میں حاصل ہو رہا تھا جو عہدہ مول کو نافذ کرنے پر مامور تھے۔

لہذا جرنل اسمبلی کے متفقہ ووٹ کے بعد، انسانی حقوق کا بیلق مکمل ہو گیا تھا۔ جیسا کہ بیکری جرنل لائٹھائٹ (U. Thant) نے کہا تھا، ”اب یہ مکمل ہو گیا ہے۔“

عالمی اعلان کے بیس برس بعد، کیا آج ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ہم مطمئن ہیں؟ جب ہم انسانی حقوق پر نہیں اس الجھاؤ پر غور کرتے ہیں، دنیا کی قومیں جس سے نکل آئی ہیں، اور ان تمام مشکلات پر نظر ڈالتے ہیں، ایک کے بعد ایک جنہیں سر کرنا پڑ گیا تھا، تو ناخیر سے انسانی حقوق کے بیلق کی قبولیت اور اس کا نفاذ ایک جلی غوش کن واقعہ معلوم ہوتا ہے جو وقتی قانونی انقلاب کی راہ ہموار کرتا ہے۔ جہاں چہ بنیادی سوال کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا مختلف خود مختار ریاستوں نے اپنے علاقہ عمل میں پیدا ہونے والے معاملات کے حل کرنے میں اپنا روایتی اقتدار باقی رکھا ہے یا کھو دیا ہے۔ ریاستوں کا علاقہ اختیار ہمیشہ ایک بنیادی مسئلہ ہو گا اور رہے گا۔ مگر مستقبل میں یہ خالص نئی معاملہ نہیں رہ جائے گا۔ کچھ معاملات میں، جیسے کہ کوئی مسئلہ کسی خاص وجہ کی بنا پر کسی بین الاقوامی ادارے کے سامنے پیش ہو جائے، یا پوری بنی نوع انسانی سے متعلق ہونے کے باعث، یا کسی اور وجہ سے تہذیبی ہو کر کسی طرح ان کے پاس پہنچ جائے۔ اس کے دو مطلب ظہریں گے: پہلا مطلب تو یہ ہو گا کہ ہر فرد بشر کو مستقل طور پر انسانی سہرا بنی کے رکن کے رُجے تک پہنچ جانا چاہیے۔ اس کو ہم قانونی زبان میں بین الاقوامی قوانین کے تابع ہو جانا کہیں گے، دوسرا مطلب یہ ہو گا کہ ریاستیں اپنے جاکمانہ حقوق کو ایک بین الاقوامی قانون کے تحت استعمال کریں گی، جس کا اظہار پاپائے اعظم جان پال XXIII نے Encyclical Pacem in terris میں کیا جو ان کا وصیت نامہ ہے۔

مگر کیا یہ نتیجہ ہماری پہنچ میں ہو گا؟ اس مرحلے پر ہمیں عوامی نمائندوں کے احساس ذمہ داری سے انٹیل کرنی ہوگی، ساتھ ہی عام آدمی کی خواہشات سے بھی، جو عوامی رائے کی تشکیل میں معاون ہوتی ہیں۔ وہ ناخیر جس نے عہدہ مول اور انسانی حقوق کے فرمان کی تیاری اور نفاذ کے سلسلے میں رکاوٹیں پیدا کی تھیں، انسانی حقوق کی ممانعتوں کی ترقی کے خلاف گئی تھی۔ ان سستیوں نے تمام ملکوں کی انتظامیہ کی کسی دھمکی آمیز تشکیل کے بغیر، پرانی سوچ کی طرف پلٹ جانے کا موقع فراہم کیا تھا، جیسا کہ ہٹلر نے اپنے نمائندے گوہلب (Goebbels) کی زبانی جلیو میں ظاہر کیا تھا۔

در حقیقت یہ رکاوٹیں انسانیت کے لیے زہر قاتل نہیں تھیں، اور ان کے منہوس اثرات کسی حد تک کم کر دیے گئے ہیں، مگر جب محنت کرنے والے گروہوں نے دل سے اہم سوال اٹھائے تو عالمی یا محدود سطح کے مسائل تیزی سے سلجھائے گئے، یا ان کی توثیق کی گئی اور یا تو وہ نافذ ہو گئے یا عہدہ ہی نافذ ہو جائیں گے۔ اس مرحلے پر میں غلامی کی مثال پیش کرنا چاہوں گا، جس کے خلاف 1926 کے معاہدے کی طرز پر

1956 میں ایک کنونشن بنایا گیا تھا۔ میں بہت سے عہد ناموں کا ذکر کرنا چاہوں گا جو (قومیت، سیاسی حقوق، شادی کی رضامندی، تنخواہوں وغیرہ کے میدان میں) عورتوں کے حالات بہتر بنانے کے لیے تیار کیے گئے تھے اور ملازمتوں میں تعصب کے خلاف (ILO, 1958) تعلیم (UNESCO, 1960/1962) اور حالیہ نسلی تعصب کے خلاف، جن پر 1965 دسمبر میں اقوام متحدہ میں رائے شماری کی گئی تھی اور اب نافذ ہونے والے ہیں۔

اس تاخیر سے جو فائدے ہوئے ہیں میں ان کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا کہ تمام ریاستوں کو موقع فراہم کیے گئے تھے جو یا تو آزادی یا یکجہلی نہیں، یا آزادی پانے والی تھی، تا کہ عہد ناموں پر گفت و شنید ہو سکے اور وہ اس میں اضافے کر سکیں۔ نئی ریاستوں کے نمائندوں نے مشکلات کو آسان کرنے کے سلسلے میں جو عملی سرگرمی دکھائی ہے، اس کو بھلایا نہیں جاسکتا۔

تیسری حقیقت جس پر میں زور دینا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ 4 نومبر 1950 کو یورپی کنونسل کی ٹرکن ریاستوں نے انسانی حقوق کے نام نہاد تحفظ کی تجویز کو قبول کر لیا تھا۔ کنونشن برائے تحفظ حقوق انسانی و بنیادی آزادی جس کا مقصد یورپی سماجی میثاق سمیت عالمی اعلان کا اخلاق ہے، 1953 سے نافذ ہے۔ اور یہ کام کر بھی رہا ہے اس کے اثرات دہری نوعیت کے ہیں۔ ایک طرف تو اس کی دفعات ٹرکن ممالک کے درمیان بندھن بنی ہوئی ہیں، اور اس طرح یہ قومی قانون پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ دوسری طرف، اس پر عمل درآمد یورپی قوانین کی نگرانی میں ہوتا ہے جو اسی کام کے لیے بنائے گئے ہیں؛ یعنی یورپی کمیشن برائے انسانی حقوق، وزیروں کی کمیٹی اور یورپی عدالت برائے انسانی حقوق۔ یہ تمام اہم کمپنیاں ریاستوں اور افراد کے معاملات میں بڑے آرام سے کام کرتی ہیں۔ ان کے سامنے پیش ہونے والے معاملات خاصی تعداد میں ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو، اگرچہ کم ہوتے ہیں انھیں عدالتی احکام کا سامنا ہوتا ہے جن میں فیصلہ کن اختیار کا کمانہ ہوتا ہے جن پر، کنونشن میں فریق ریاستیں، پابندی سے عمل کرتی ہیں۔ سبب وجود اس کے کہ ان معاملات میں مایوس لوگ کیا کہتے ہیں، ہماری نظر میں، کم از کم ایک براعظم ہے جس میں ریاستوں کی ایک پڑاؤ صف بندی ہے جو دوسری عالمی جنگ سے حاصل ہونے والے سبق پر توجہ دیتی ہے۔ بد قسمتی سے، ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ یورپ کا ایک حصہ اس کنونشن کے رسوخ سے باہر کا علاقہ ہے۔ اگرچہ کانونسل کے ارکان کے درمیان تعمیل کی قوت میں ایک طرح کی مامواری پائی جاتی ہے، گیارہ ریاستوں نے ان امکانات کو قبول کر لیا ہے کہ ان کے خلاف گروہ یا افراد شکایات کریں گے۔ مگر کچھ نے تو کنونشن کو صرف اس حد تک قبول کیا ہے جہاں تک وہ دوسری ریاستوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ میرے ملک سمیت دوسرے دو ملکوں نے اب تک توثیق نہیں کی ہے۔ اور بالآخر اس وقت ایک ٹرکن ہے جس کے خلاف دعوے کیے جا رہے ہیں کہ وہ کنونشن کا احترام نہیں کرتا۔

اب ہم تین میدانوں - قومی، بین الاقوامی اور علاقائی - میں تجربے کی قوت اور مسلسل تجربے کی بنیاد پر کچھ نتائج اخذ کرنے کی حیثیت میں آگئے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ بغیر کسی تعصب کے ہر ریاست میں ضمانتوں اور بالخصوص خود مختار عدلیہ کا ایک نظام ہونا چاہیے جس سے ہر شخص مستفید ہو سکے۔ کسی ریاست کو بیرونی مداخلت سے بچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے حلقہ اقتدار میں انسانی حقوق کا احترام اور آزادی کو یقینی بنائے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس اعلان کی عالمی حیثیت میں کسی قسم کی کمی کی اجازت کا سوال بھی پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ تمام انسانوں کے لیے، بلا کسی تعصب کے، کچھ بنیادی آزادیاں اور حقوق ہوتے ہیں۔ اور افراد میں سے وہ سب سے مجبور اور کم زور ہوتے ہیں جو اعلان کی وسعت میں کمی کی کوشش سے متاثر ہوتے ہیں۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اعلان کے اصولوں کی عالمیت علاقائی سطح پر ان کے نفاذ کے نظام میں مزاحمت پیدا نہیں کرتی۔ 1948 میں ہونے والی تبدیلیوں کے بعد یورپ نے اس کی بہترین مثال پیش کی ہے، اور میں، عالمیت کا ایک مستعد پرستار، اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ نفاذ کے کچھ طریقے ایسے ہوتے ہیں جن کو منظم ہمسایہ اور یکساں تہذیب کی قومیں آسانی سے قبول کر لیتی ہیں۔ قانون اور روایات پر عمل کرنے والے سماج بے اصولی سے ایجاد نہیں ہوا کرتے۔ لہذا، امید کی جاتی ہے کہ نئی دنیا بھی علاقائی ہر امتیں تشکیل دے گی۔ ایشیا، افریقا اور اشتراکی دنیا میں ان تصورات پر پیش ہوتی رہتی ہیں مگر ابھی تک ان سے متعلق مجھے اُمید نہیں ہوئی۔

چوتھے مرحلے پر، یہ بہت ضروری ہے کہ انسانی حقوق کے بیعق کو جلد از جلد عمل میں لایا جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ دنیا کی چھتیس ریاستوں کو ہر عہد نامے کی توثیق کرنی چاہیے۔ میرے اندازے کے مطابق، ابھی تک ایک بھی حکومت نے تحفظات کے ساتھ بھی، اس کی توثیق نہیں کی ہے۔ لہذا ہمیں یہ کہنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ یہ اقوام متحدہ کی غلطی ہے کہ وہ کچھ نہیں کرتی، فی الحال قانون کے ماہرین نے اپنی جانب سے قدم اٹھائے ہیں۔ اب یہ عوامی رائے پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ملکوں کو اپنے حصے کے کام کرنے پر اکسائے۔

اس مرحلے پر میں یورپی عوام سے ایک خصوصی اپیل کرنا چاہوں گا۔ 1950 کے کنونشن کے ذریعے حاصل ہونے والے تمام فوائد کے باوجود وہ اختلافات جو اس کے متن کو عالمی عہد نامہ برائے شہری حقوق سے الگ کرتے ہیں، یورپ کے حکومتی ماہرین کے مطابق، اسے اہم نہیں ہیں کہ وہ یورپی ریاستوں سے اعلان کی توثیق میں رکاوٹ کا باعث ہوں۔

ان کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ ایک بہت اچھی مثال ہوگی اگر تمام عوام ایک ساتھ مل کر اس کی توثیق کے لیے کام کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ دوسرے براعظموں کے لیے بے حد ضروری انسانی حقوق کو یقینی بنانے کے لیے کام کریں گے۔ میرے خیال میں عہد ناموں کا نفاذ اس امید کی جانب ایک اہم پیش رفت ہوگا مستقبل قریب کے لیے ہم جس کی تمنا کر سکتے ہیں۔

اب تک میں نے اپنے اخذ کردہ نتائج کو بالعموم عالمی اعلان تک، اور بالخصوص اس کے ذیلی مقاصد تک محدود رکھا ہے۔

غیر مرکزی شہری تنظیموں کو وسیع پیمانے پر عدالتی ترتیب نو کے منصوبوں پر غور و فکر سے باز نہیں آنا چاہیے۔ جیسے کہ انسانی حقوق کے لیے ہائی کمشنر کی تشکیل، لوگوں کے لیے کوئی بین الاقوامی عدالت کا قیام وغیرہ مگر میرے خیال میں یہ ضروری ہے، جہاں تک ممکن ہو کہ انہیں اقوام متحدہ کے اس نوعیت کے کیے ہوئے کام سے ٹھوس نتائج اخذ کرنے کے لیے ان پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ جب عہد ناموں کے مہیا کردہ میکانزم کو عملی طور پر جانچ لیا جائے گا تب ان کو مستحکم اور مربوط کرنے کا وقت آئے گا۔ پہلے سے ملے کر وہ طریقوں کو نافذ نہ کرنے کا، خواہ وہ کتنے ہی نا کافی کیوں نہ ہوں، مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہوں گے جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تناؤ اور تکلیفوں سے بھری اس بے آرام دنیا میں ”پچھلی اگست کی راتیں“ پھر کبھی آئیں گی۔ ہمیں اس کے اتحاد کو مستحکم کرنے کے کسی بھی موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔

اس دوران، معاہدوں کے قطعی نفاذ کے مسئلے کے علاوہ، اور بھی مسائل ہوں گے، بغیر کسی تاخیر کے جن کا سامنا کرنا ہوگا۔

ان میں سے ایک مسئلہ انسانی حقوق کے کمیشن کے کردار پر زور دینا ہے۔ اعلان اور عہد ناموں کی تیاری کے فرائض کی تکمیل کے بعد یہ ایجنسی مختلف قسم کے سلسلہ تعقیبات کے خلاف کنونشن کے لیے بہت باقاعدہ طریقے سے کام کرتی رہی ہے۔ مگر یہ پچھلے دو برس سے ایسی ایجنسی بننے کی کوشش کرتی رہی ہے جو مختلف نوعیت کے معاملات کے بارے میں اطلاعات یا مشورے بہم پہنچانے کے راستے کی تلاش میں ہو، ایسا کام کرنے کی، جو اس کے نظریاتی کردار کے حلقے سے باہر ہے، اور جس کو کبھی سے کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ کمیشن انسانی حقوق کے احرام کی بابت رپورٹوں کی جانچ پڑتال کے اپنے کردار پر زور دے، رپورٹوں پر جن کی فراہمی لازمی ہوتی ہے۔ یہ کمیشن کے صدر نشین کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایجنٹوں اور بین الاقوامی ریڈ کراس کی سرگرمیوں کے تحفظ کے دو سرے اہم طریقے بھی اختیار کرنے چاہئیں۔ چوں کہ 1949 کے جنیوا کنونشن کے بعد تمام مسلح تنازعات کے واقعات کو شامل کرنے کے لیے، بلکہ ان کے لیے بھی جن کا شمار بیرونی جنگوں میں نہیں ہوتا، ریڈ کراس کا کردار وسیع کر دیا گیا ہے۔ اب کئی بار پچھلے چند برسوں میں، اور حال ہی میں بیفرا میں ثابت ہوا ہے کہ انسانیت دوست مشن پر بھیجے جانے والے ریڈ کراس کے ایجنٹوں کو ہراساں، دھمکایا، ہلکا قتل بھی کر دیا گیا ہے، اور کبھی تو تحفظ کی خاطر انہیں واپس بلا لینا بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔

میں یہ سب کچھ پڑھ کر شرمندہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا ہوں۔ میرے خیال میں دنیا میں کوئی بھی کام اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ انسانی حقوق کے ساتھ زیلا دنیوں کی پیش بندی کرنا اور ان کو روکنے کا ہے۔ انسانیت کا فرض ہے کہ وہ اس پر نظر رکھے، اس کی حفاظت کرے اور ان لوگوں کی حفاظت کرے جو اس کی نمائندگی

کرتے ہیں اور جو اس کی سوچندہ گر میوں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتے ہیں۔ آج ملں امن کے بین الاقوامی حالات کے صرف ایک پہلو پر بات کر رہا ہوں۔ اس کے دوسرے پہلوؤں، جیسے تعلیم، ترقی، اطہر جات، تکنیکی اور مالی معاونت کو فراموش کرنا محکم نظری کے مترادف ہوگا۔

بلاشبہ امن کی تنظیم کی بنیاد وجود اور تفکر پر ہی رکھی جانی چاہیے۔ تو قیغ رکھی جاتی ہے کہ غیر معمولی کوششوں سے، تعلیم سے، اور کچھ دور رس ذہنی رویوں کے ذریعے ترقی اطہر جات میں، بھوکے لوگوں سے یک جہتی میں، خاندانوں کے یا سو راکھی کی اکائیوں سے تعاون کے کاموں میں تبدیلی لائی جائے۔ مگر صرف وجہ یا دلیل ہی کافی نہیں ہوتی۔ جہذا باقی عناصر، اور بالخصوص انصاف کے احساس کو ان پر نہیں چھوڑ دینا چاہیے جو انہیں نفرت اور تباہی کی خدمت کے لیے درہم برہم کر دیتے ہیں۔

میں اعلیٰ ترین اختیارات کے ساتھ اس ملک سے اجازت چاہتا ہوں جہاں امن اور قانون کو اس قدر عزت دی جاتی ہے۔ لہذا آپ امن اور قانون کے خادم ایک فرانسیسی باشندے کو انسانیت پر عقیدہ رکھنے کے علامتی اظہار کے لیے، ایک فرانسیسی شاعر کے دوسرے پیش کرنے کی اجازت دیں گے، جسے ادب کے ابتدائی انعامات میں سے ایک انعام سے سرفراز کیا جا چکا ہے:

میرے ملک نے مجھے ایسی محبت کے رنگ میں رنگ دیا ہے جو اس کی سرحدوں تک محدود نہیں رہتا اور جس جتنا زیادہ فراموشی ہوتا ہوں، خود کو انسانیت سے اتنا ہی قریب محسوس کرتا ہوں۔
اڈیٹوں کے اُن برسوں میں، جب تمام لوگوں کی آزادی خطرے میں تھی، انہیں آخری وقت تک جدوجہد کرنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ اب اس اعلان کا وقت آگیا ہے کہ امن کے قیام اور انسانی وقار کے لیے ہم میں سے ہر ایک کو کام کرنا ہوگا، اور آخری وقت تک لڑنا ہوگا۔

مارٹن لو تھرکنگ جونیر

اعلان تجلیل

بہت زیادہ برس نہیں گزرے ہیں کہ مارٹن لو تھرکنگ کا نام دنیا بھر میں مشہور ہو گیا ہے۔ نو برس قبل، ریاست الاباما کے شہر ٹائٹ کومری میں تین گرو عوام کے رہنما کی حیثیت سے انھوں نے سفید فام افراد کے ساتھ برابری کی بنیاد پر عوامی ٹرانسپورٹ استعمال کرنے کے حق کے لیے کی تحریک شروع کی تھی۔

مگر اس لیے نہیں کہ انھوں نے ایک نسلی اقلیت کی برابری کی جدوجہد کی رہنمائی کی تھی، جس کی وجہ سے مارٹن لو تھرکنگ کو شہرت ملی۔ ایسا تو بہت سے لوگوں نے کیا ہے اور ان لوگوں کے نام بھلا دیے گئے ہیں۔ لو تھرکنگ کا نام باقی رہے گا کہ انھوں نے جس انداز سے جدوجہد چلائی ہے اور جن الفاظ سے انھوں نے بنی نوع انسان کو مخاطب کیا تھا، وہ الفاظ ان کی شخصیت کی پہچان بن گئے:

”جو تمھارے داہنے رخسار پر ظمانچہ مارے، اس کو بایاں رخسار بھی پیش کر دو!“

دسمبر 1955 میں پچاس ہزار سیاہ فام باشندوں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور فتح پائی۔ یہ تو ابتدا تھی۔ اس وقت مارٹن لو تھرکنگ کی عمر صرف تینیس برس تھی۔ وہ ایک نوجوان آدمی تھے، اس کے باوجود پختہ کار ہو چکے تھے۔ اُن کے والد ایک پادری ہیں، جنھوں نے کسی کی مدد کے بغیر اپنی زندگی بنائی اور اپنے بچوں کو اچھا گھریلو ماحول فراہم کیا جس میں ان کو نسلی منافرت کی ذلت سے بچانے کی کوشش کی۔ رنگ دار جلد کے عوام کی ترقی کی قومی انجمن کے رکن، اور ایک عام شہری کی حیثیت سے، وہ شہری حقوق کی تحریکوں میں شریک رہے اور ان کے بچے بھی انھی کے نقش قدم پر چلے۔ کم سنی ہی میں مارٹن لو تھرکنگ کو افراد اور کمیونٹی کے ساتھ کی جانے والی معاشی مامواری کا ادراک ہو گیا تھا۔

بچپن ہی سے ان کے ذہن پر اس کے اُن مرث نقوش مرتب ہو گئے تھے، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں جس سے ثابت ہو سکے کہ کم سنی ہی میں انھوں نے سیاہ فام افراد کے حقوق کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے

کا ارادہ کر لیا تھا۔

طالب علمی کے دور میں ان کا زیادہ وقت شمالی ریاستوں میں گزرا، جہاں اگرچہ قوانین ویسی نسلی تفریق سمجھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے جیسی کہ انھیں جنوب میں جھینپی پڑتی تھی، مگر روزانہ کی زندگی میں سفید اور سیاہ فام اکٹھے نہیں ہوتے تھے۔ پھر بھی شمالی ریاستوں میں رہن سہن، خصوصاً یونیورسٹی کا معاشرتی ماحول تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ باسٹن یونیورسٹی میں، جہاں سے انھوں نے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی، ان کی ملاقات کوریٹا اسکات (Coretta Scott) سے ہوئی تھی جو موتی کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ وہ ان ہی کی ریاست الاباما کے ایک اوسط درجے کے سیاہ فام خاندان کی فرد تھیں، جو جنوب ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

شادی کے بعد اس نوجوان جوڑے کو ایک فیصلہ کرنا تھا: وہ شمال ہی میں رہیں جہاں زندگی کے لیے زیادہ تحفظ اور بہتر ماحول میسر تھا، یا وہ جنوب واپس چلے جائیں؟ انھوں نے جنوب واپس جانے کا فیصلہ کیا جہاں مارٹن لوتھر کنگ کو مانت گومری میں Bapists پادری کا عہدہ مل گیا تھا۔

ان کی زندگی ایسی سوسائٹی میں گزری جہاں سیاہ فام اور سفید فام کے درمیان ایک کڑی بار موجد تھی۔ اس سے بدتر یہ بات تھی کہ سیاہ فام کمیونٹی خود آپس ہی میں بٹی ہوئی تھی۔ اس کے رہنما پیکار میں رہتے اور ہر درجے کے لوگ اپنے تعلیم یافتہ ارکان کی بے حس سے مالاں تھے۔ ان کی مردہ دلی کی وجہ سے بہت کم لوگ سیاہ فام افراد کی ترقی کے کاموں میں دل چسپی لیتے تھے۔ اکثریت بالکل لاپرواہ تھی، اور وہ جنھیں کسی نقصان کا اندیشہ نہ تھا، جو تھوڑا بہت انھیں میسر تھا، اس کے چھن جانے کے خوف میں جتا رہتے تھے۔

جیسا کہ مارٹن لوتھر کنگ کو معلوم ہوا، سیاہ فام پادریوں کو اپنی کمیونٹی کے سماجی مسائل کی کوئی پیدائش تھی، بہتوں کی رائے یہ تھی کہ مذہبی رہنماؤں کو عوام کی سماجی اور معاشی بہتری کے لیے کام کرنے والی لادھب تحریکوں سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ انجیل کا پرچار کریں اور انسانی دماغوں کو آسمانی [مذہبی] معاملات پر مرکوز رکھیں۔

1955 کی ابتدا میں مختلف سیاہ فام گروہوں کو متحد کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ مارٹن لوتھر کنگ کا کہنا تھا کہ ”سیاہ فام کمیونٹی کی الم ناک تفریق کسی ربا فی معجزے ہی سے دور ہو سکے گی۔“ وہ مانت گومری کے حالات کی جو تصویر کشی کرتے ہیں، وہ کسی طرح بھی امید افزا نہیں؛ 1954 کے آخر میں بھی سیاہ فام افراد نے اپنے موجودہ رُجے کو ایک حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا تھا، اور کسی نے بھی عملی طور پر اس نظام کی مخالفت نہیں کی تھی۔ مانت گومری ایک پرامن شہر تھا۔ مگر اوپری سطح کے نیچے بے چینی سلگ رہی تھی۔ کچھ سیاہ فام پادری، اپنے خطیبوں اور ذاتی رویوں سے سیاہ فام کی برآمدی کے مسائل کے جھینپی بنے ہوئے تھے جس نے بہتوں کو تازہ اظہار اور ہمت دی تھی۔

پھر 5 دسمبر 1955 کا بائیکاٹ ہوا۔

ایسا لگتا تھا جیسے یہ بائیکاٹ محض ایک اتفاق کا نتیجہ تھا۔ ظاہرہ وجہ تو ایک بس میں اپنی نشست ایک سفید فام کو دینے سے انکار کی وجہ سے مسز روزا پارکس کی گرفتاری تھی۔ وہ بس میں سیاہ فام افراد کے لیے مخصوص حصے کی ایک نشست پر بیٹھی ہوئی تھیں، جو سفید فام افراد کے لیے مخصوص حصے سے ملحق تھا اور وہ حصہ بھر چکا تھا۔ مسز پارکس کی گرفتاری نے نہ صرف عوام میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی، بلکہ ان کو راست اقدام پر اکسایا، جو اس وجہ سے ہوا تھا کہ مارٹن لوتھر کنگ کو سیاہ فام افراد کے لیے انسانی حقوق کی تحریک میں مرکزیت ملنے والی تھی۔

انہوں نے اپنی کتاب *Stride toward Freedom* میں لکھا ہے کہ صرف بس کا تنازعہ ہی نہیں بلکہ 5 دسمبر کا بائیکاٹ شروع ہونے کے بعد ان کو ادارے کا صدر نشین چن لیا گیا تھا تا کہ وہ تحریک کو آگے بڑھائیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ انتخاب ان کے لیے حیرت کا باعث تھا؛ اگر ان کو سوچنے کا موقع دیا جاتا تو غالباً وہ انکار کر دیتے۔ جب 4 دسمبر کو ان سے کہا گیا تو انہوں نے مدد کی تھی، مگر وہ سمجھنے لگے تھے کہ عیسائیت کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اس تحریک کی ابتدا اخلاقی طور پر صحیح تھی۔ تب انھیں ’کوچھوڑیو‘ کا مضمون ’شہری مافرمائی‘ یاد آیا جسے انہوں نے اپنے ابتدائی دنوں میں پڑھا تھا اور جس نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ ان کو چھوڑیو کے مضمون کا ایک جملہ یاد آ گیا: ”ہم اب کسی شیطانی نظام کی مدد نہیں کر سکتے۔“ مگر وہ مطمئن نہیں ہوئے تھے کہ بائیکاٹ کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ تاہم 4 دسمبر کی شام تک انھیں یقین تھا کہ سائچو فی صد نیکرو اس سے اتفاق کریں گے، اور یہ کافی حد تک کامیاب ہوگا۔

5 دسمبر کی صبح، جب ایک بس کے بعد دوسری بس، بغیر کسی ٹیکٹ مسافر کے گزری تو انھیں احساس ہوا کہ بائیکاٹ صد فی صد کامیاب ثابت ہوا ہے۔

مگر آخری فتح حاصل نہیں ہوئی تھی، اس لیے کہ ابھی تک کسی نے یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ تحریک ”تشدد کا بدلہ تشدد سے نہیں لیا جائے گا“ کے نعرے کے مطابق چلائی جائے گی۔ مارٹن لوتھر کنگ نے 5 دسمبر 1955 کو بزاروں افراد سے مخاطب ہو کر یہ پیغام دیا تھا۔ ان کے مطابق انہوں نے ایسی فیصلہ کن تقریر پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ ان کے اپنے الفاظ یہ تھے:

”ہم نے اکثر اپنے سفید فام بھائیوں کو یہ احساس دلایا ہے کہ ہم سے جو ملوک کیا جاتا ہے ہم اس سے مطمئن ہیں۔ مگر آج رات ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں اس برداشت سے بچایا جائے جو ہمیں آزادی اور انصاف سے کم کسی چیز پر صبر کرنے پر تیار کرتی ہے۔

مگر ہمارا طریقہ کار ترغیب کا ہوگا، جبر کا نہیں۔ ہم اپنے لوگوں سے صرف اتنا کہیں گے کہ اپنے ضمیر کو اپنا رہنما بناؤ۔ ہمارے قدم عیسائی تعلیمات کے اصولوں کی رہنمائی میں ہی اٹھیں گے، ایک بار پھر ہمیں یسوع مسیح کے الفاظ سننے ہوں گے جو صدیوں سے فضاؤں میں گونج رہے ہیں ”اپنے دشمن سے محبت کرو، جو تمہارے لیے بددعا کرے اس کے لیے برکت کی دعا کرو، اور ان سب کے لیے بھی دعا کرو جو تمہیں کینہ پروری

سے استعمال کریں۔“

آخر میں انھوں نے کہا:

”تم جی داری سے احتیاج کرو گے مگر وقار اور عیسائی محبت کے ساتھ (نا کر) جب تاریخ لکھی جائے تو تاریخ دانوں کو یہ کہنا پڑ جائے ”کیا عظیم لوگ تھے۔ وہ سیاہ فام لوگ جنھوں نے ہماری تہذیب کی رگوں میں وقار کے نئے معنی داخل کر دیے ہیں۔“ یہ ہمارے لیے چیلنج ہے اور یہی ہماری زبردست ذمہ داری ہے۔“ یہ نعرہ تھا ہی ایسا کہ سننے والوں کے دلوں میں اتر گیا۔ جیسا خود مارٹن لوتھر نے کہا، یہ مانت گومری کے لیے ایک تاریخی لمحہ تھا۔

ان کے الفاظ نے نیکرو اکثریت کو انسانی حقوق کی جدوجہد پر آمادہ کر دیا۔ پورے جنوب میں، اس نعرے کے جذبے سے مست ہو کر لوگوں نے سیاہ فام اور سفید فام کے درمیان، ریستورانوں، دکانوں، اسکولوں، عوامی پارکوں اور کھیل کے میدانوں میں نسلی تفریق کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ ایسی زبردست حمایت کیسے ممکن ہوئی؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں اس مضبوط پوزیشن پر نظر کرنی پڑے گی جو نیکرو عوام میں مذہبی رہنماؤں کو حاصل ہے۔ فرصت کے اوقات میں گرجا گھر ہی ان کی آخری پناہ گاہیں ہوتی ہیں؛ لیکن، اپنی روزانہ کی مشکلات کے باوجود ان کی شخصیتیں ارفع ہو جاتی ہیں۔ ان ایٹلوں پر ہی عمل نہیں ہوتا جو کہتی ہیں کہ بغیر اسلحے کے جنگ لڑو، اس لیے کہ سیاہ فام افراد میں مذہب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔

کامریس میں منظور کیے گئے قوانین اور امریکی عدالت عالیہ میں دیے گئے فیصلوں کے باوجود، یہ جدوجہد نہیں بھی کامیاب ثابت نہیں ہوئی، اس لیے کہ ان قوانین اور فیصلوں کے ساتھ تخریب کاری کی گئی تھی، جیسا کہ 1955 کے بعد ہونے والے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔

تخریب کاری اور قید و بند کے باوجود نیکرو عوام نے اپنی اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ شاید ہی کبھی انھوں نے ان اصولوں کے خلاف تشدد کا بدلہ تشدد سے کام لیا جو ان کے لئے بنائے گئے تھے حالانکہ ہمارے نزدیک فوری رد عمل ہونا لازمی تھا۔ ہم ان نوجوان طالب علم افراد کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں جو ریستورانوں میں سفید فام کے لیے مخصوص نشستوں پر بیٹھ گئے تھے؟ ان کو کھانا نہیں دیا گیا، مگر وہ بیٹھے رہے۔ سفید فام لڑکوں نے ان کی ہنسی اڑائی، توہین کی اور جلتی ہوئی مگرے سے ان کی گردنوں کو داغ لگوا دیا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان کے پاس وہ طاقت تھی جو صرف یقین ہی دے سکتا ہے، یقین کہ وہ اپنے ایک حق کے لیے لڑ رہے ہیں اور ان کی جدوجہد ضرور کامیاب ہوگی، اس لیے کہ وہ پُر امن طریقے اپنائے ہوئے ہیں۔

مارٹن لوتھر کنگ کا یقین سب سے پہلے تو یسوع مسیح کی تعلیمات میں پھرتا ہے، مگر کوئی بھی پوری طرح ان کو سمجھ نہیں سکتا، جب تک کہ اسے یہ علم نہ ہو کہ وہ ماضی اور حال کے عظیم دانش وروں کے خیالات کے زبراٹھ ہیں۔ ان کو مہاتما گاندھی نے بہت متاثر کیا ہے، جن کی مثال نے انھیں قائل کیا ہے کہ اسلحے کے بغیر

بھی جدوجہد کا میاں ہو سکتی ہے۔ گاندھی کو پڑھنے سے پہلے، وہ تقریباً اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ مسیح کی تعلیمات پر صرف افراد کے بارے میں عمل کیا جاسکتا ہے، مگر گاندھی کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ وہ غلطی پر تھے۔

وہ کہتے ہیں کہ ”تاریخ میں گاندھی غالباً پہلے شخص تھے جنہوں نے مسیح کی محبت کے اخلاق کو محض افراد کے درمیان باہمی عمل کی سطح سے بلند کر کے ایک طاقت ور اور موثر سماجی قوت بنا دیا تھا۔“
گاندھی کی تعلیمات میں انہیں ان سوالوں کے جوابات مل گئے تھے جو کافی عرصے سے انہیں پریشان کر رہے تھے: معاشرتی اصلاحات کے لیے انسان کو کیا کچھ کرنا ہوتا ہے؟

وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ”مجھے پتا چلا کہ گاندھی کا عدم تشدد تحریک کا فلسفہ ہی اخلاقی اور عملی اعتبار سے جبر کے شکار انسانوں کی جدوجہد آزادی حاصل کرنے کے لیے درست طریقہ ہے۔“

مارٹن لوتھر کنگ پر ہر سمت سے یلغار ہوتی ہے۔ سب سے بڑی یلغار وہ مزاحمت تھی جو سفید فام شدت پسندوں کی طرف سے درپیش تھی۔ اعتدال پسند سفید فام اور خود ان کی فسل کے لوگوں کا بھی خیال تھا کہ وہ بہت تیز چل رہے ہیں، کہ ان کو انتظار کرنا چاہیے اور انہیں وقت کو اپنی مخالفتوں کو کم زور کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ آٹھ پادریوں نے اپنے ایک کھلے خط میں اس پہلو اور دوسرے پہلوؤں کی طرف ان کو متوجہ کیا تھا۔ مارٹن لوتھر کنگ نے 1963 میں ہر منظم چل سے اپنے ایک خط میں ان الزامات کا جواب دیا تھا۔ میں اس خط کی کچھ سطور پیش کرنا چاہوں گا:

”حقیقت یہ ہے کہ وقت خود غیر جامد دار ہوتا ہے انسانی ترقی کبھی ناگزیریت کے پیروں پر چل کر نہیں آتی۔ یہ انسانوں کی آن تھک کوششوں سے آتی ہے، جو خدا کے ساتھ مل کر کام کرنے پر تیار ہوتے ہیں اور اس محنت کے بغیر وقت خود سماجی جمود کی قوتوں کا اتحادی بن جاتا ہے۔“
اس الزام کے جواب میں جوآن پر لگا یا تھا، انہوں نے کہا:

”آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ مذاکرات ہونے چاہئیں۔ دراصل راست اقدام کا مقصد ہی یہی ہے۔ عدم تشدد کا راست اقدام، ایسے تناؤ کو اپننا چاہتا ہے کہ ایک کمیونٹی جس نے مذاکرات سے بار بار انکار کیا ہے، موضوع کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جائے۔“

وہ ان لوگوں کو یاد دلاتے ہیں کہ غیر عوام کو انسانی حقوق کے سلسلے میں قانونی طریقے سے بار بار کوشش کرنے اور تشدد اختیار کیے بغیر ایک بھی کامیابی نصیب نہیں ہوتی ہے۔ جب ان سے جدوجہد کے دوران قانون شکنی کے بارے میں دوبارہ پوچھا گیا تو ان کا جواب تھا:

”دو طرح کے قوانین ہوتے ہیں: منصفانہ اور غیر منصفانہ۔ غیر منصفانہ قانون ایک ضابطہ ہوتا ہے جو اخلاقی قانون کے مطابق نہیں ہوتا۔“

غیر منصفانہ قانون ایک ضابطہ ہوتا جو اقلیتی گروہ کو عدلی اور طاقت ور اکثریتی گروہ کی فرماں برداری پر

مجبور کرتا ہے، مگر خود اکثریتی گروہ اس کو اپنے اوپر لاگو نہیں کرتا۔
— جو ایک غیر منصفانہ قانون توڑتا ہے، اس کو اس عمل کو کھلے اور محبت کے انداز میں کرنا اور سزا کو قبول کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

مارٹن لوتھر کنگ نے کھیرا کی بھی خبر لی۔ مائٹ کو مری کے بس کے تنازعے کے دوران انھیں توقع تھی کہ پادری اور یہودی رہنما ٹیکو کے پکے ساتھی ہوں گے۔ مگر ان کو بہت مایوسی ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ”سب کے سب، ہمت ور ہونے سے زیادہ محتاط رہے اور امن کر دینے والی حفاظت اور کھیرا کے نقشین رقیب شیشوں کے پیچھے خاموش بیٹھے رہے تھے۔“

سفیر عام کھیرا کے نمائندوں سے مارٹن لوتھر کنگ کی مایوسی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں، اس لیے کہ عیسائی تعلیمات کی سب سے پہلے تعلیم یہی تھی کہ ”تم اپنے پرہیزی سے محبت کرو گے۔“
تفریق کے خلاف جنگ میں اگر فتح ہوئی تب بھی معاشیاتی میدان اور سماجی ملاپ میں نسلی تعصب تو جاری رہے گا۔ ایک حقیقت پسند ہونے کے ماتے مارٹن لوتھر کنگ اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ اپنی کتاب Strength to Love میں وہ لکھتے ہیں:

”عدالت کے احکام اور وفاقی ایجنسیاں عدم تفریق میں تو بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں، مگر عدم تفریق صرف ایک جزوی، اگرچہ ضروری، قدم ہے، اس ہدف کی طرف جو ہم بالآخر حاصل کرنا چاہتے ہیں، یعنی عام، مگر خالص گروہوں کے مابین اور باہمی رہن سہن۔“

مگر کسی عمل کو بھی آدمیوں کے دل اور روح کو چھونا چاہیے تاکہ وہ روحانی طور پر قریب آئیں، اس لیے کہ یہ فطری بھی ہے اور صحیح بھی۔“ سچے پرہیزیوں کے مابین حقیقی انضمام اسی وقت ہو سکے گا جب ان فرائض کو دلی طور پر قبول کیا جائے جن کو قانونی طور پر لاگو نہ کیا جاسکتا ہو۔

مارٹن لوتھر کنگ کی پہلی جدوجہد ان کے اپنے ملک میں چلائی گئی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ صدیوں پرانا، روایتی اور بے رحم تنازعہ اب اپنے حل کے قریب آ پہنچا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ وہ راستہ جو انھوں نے اور ان کے عوام نے اپنے لیے متعین کیا ہے، دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی امید کی روشنی پھیلائے، ایسی امید جو نسلوں، قوموں اور سیاسی نظاموں کے درمیان کے تنازعات کو سلجھا سکتی ہے، نہ آگ سے اور نہ تلواریں سے، بلکہ ایک سچی برادری محبت سے؟

کیا ہمارے مشاعرہ Arnulf Overland کے الفاظ سچ ہو سکیں گے؟

”نستے صرف ابدی منبعوں پر ہی اعتبار کر سکتے ہیں۔ صرف روح ہی فتح دلائی ہے۔“

یہ (الفاظ)، ایک بے واسطہ اور نامعلوم خواب کی مانند محسوس ہوتے ہیں، مگر خواب کے بغیر اور خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی کوشش کیے بغیر زندگی زندہ رہنے کے قابل نہیں۔

آج کا انسان جو مری ہم کا حامل ہے اور وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے اسلمے اور فوجی سرازو سامان کو ایک

طرف رکھ کر اس پیغام کو سنیں جو مارٹن لوتھر کنگ نے اپنی اپنی جہد و جہد کے دوران اپنی نسل کی جانب سے ہمیں دیا ہے۔ لوتھر کنگ اپنے ملک کی مرحدوں سے پرے بھی دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

”پہلے سے کہیں زیادہ، میرے دوست، تمام نسلوں اور قوموں کے آدمی، آج پرہیزی ہوتے ہوئے بھی چیلنج کیے جا رہے ہیں۔ اب ہم زیادہ عرصے تک ایک دوسرے سے الگ رہنے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایسی غلطی کبھی اخلاقی ناکامی کہلاتی تھی؛ آج یہ ہمیں آفاقی خود کشی کی طرف لے جائے گی اگر ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ بنی نوع انسان کو باقی رہنے کا حق ہے، تو ہمیں جنگ اور تباہی کا متبادل تلاش کرنا ہوگا۔ اخلاقی جہازوں اور میزائلوں کے ہمارے دور میں وہی راستے ہیں: عدم تشدد کا راستہ یا عدم وجود کا راستہ۔“

اگرچہ مارٹن لوتھر کنگ خود کسی بین الاقوامی تنازعے میں ملاوث نہیں، مگر ان کی اپنی جہد و جہد امن و مندر سے بھلے جانے والے ناقوس کی آواز کی مانند ہے۔

وہ مغربی دنیا کے پہلے شخص ہیں جس نے دکھا دیا ہے کہ بغیر تشدد کے بھی جہد و جہد کی جاسکتی ہے۔ جہد و جہد کے دوران مردانہ محبت کو ایک حقیقت بنانے میں بھی انہوں نے پہل کی ہے اور ان کا یہ پیغام تمام آدمیوں، تمام قوموں اور تمام نسلوں کے لیے ہے۔

آج ہم مارٹن لوتھر کنگ کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں، جو وہی جہد و جہد پر اپنے عقیدے سے کبھی دست بردار نہیں ہوئے، جنہوں نے اپنے عقیدے کے خاطر دکھ بھیلے ہیں، کئی بار قید ہوئے، ان کا گھر بھوں کا نشانہ بنا ہے، ان کی اپنی اور ان کے خاندان کی زندگیاں ختم کرنے کی دھمکیاں بھی دی گئیں ہیں، پھر بھی ان کا عزم لڑکھڑایا نہیں ہے۔

مارٹن لوتھر کنگ کی نوبل کمیٹی نے امن کے اس دلیر چیمپیئن کو 1964 کا امن انعام دینے کا فیصلہ کیا

ہے۔

خطبہ:

امن اور انصاف کی جستجو

مارٹن لوتھر کنگ کی نوبل کمیٹی کے شکریے کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ میں اپنا خطبہ شروع کروں، جس نے اتنے بڑے اعزاز سے مجھ کو اور ریاست ہائے متحدہ میں شہری آزادی کی تحریک کو نوازا ہے۔ انسان کی زندگی میں اکثر اوقات تکمیل و اتمام کے ایسے ناقابل بیان لحاظ آتے ہیں جن کی تشریح ان علامتوں کے ذریعے نہیں کی جاسکتی جن کو الفاظ کہتے ہیں۔ ان کے معنی کا اظہار دل کی ناقابل سماعت زبان کے ذریعے ہی کیا جاسکتا

ہے۔ یہ ایسا ہی لمحہ ہے جس کا اس وقت مجھے تجربہ ہو رہا ہے۔ میں اس اعلیٰ اور دل خوش کن لمحے سے تباہی نہیں بلکہ عدم تشدد کے تمام ہیروکاروں کی طرف سے ملاحظہ ہو رہا ہوں، جو نسلی، انصافی کے بے درد پستے کے خلاف بڑی ہمت سے کام کر رہے ہیں، اور اس عمل کے ذریعے جنہوں نے اپنی انصافی قدر کے نئے تجنیے متعین کر دیے۔ ان میں سے بہت سے نوجوان بھی ہیں اور مہذب بھی۔ بقیہ بڑی عمر کے اور عام درجے کے افراد ہیں۔ ان کی اکثریت مفلس اور غیر تعلیم یافتہ ہے۔ مگر سب ایک خاموش عقیدے کے ساتھ اس بات پر متحد ہیں کہ ذلت کی تفریق کو قبول کرنے سے بہتر ہے کہ وقار کے ساتھ دیکھ کر لیے جائیں۔ یہی آزادی کی جدوجہد کے حقیقی ہیرو ہیں۔ یہ شریف لوگ ہیں، میں جن کی جانب سے نوبیل امن کا یہ انعام قبول کر رہا ہوں۔

اس مقام میں اس تاریخی اور بلند بالا شمشین کو اس تکلیف دہ مسئلے پر بات کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں جو آج بنی نوع انسان کو درپیش ہے۔ جدید دور کا انسان اس پوری دنیا کو مستقبل کی پرجوالہ دلیز پر لے آیا ہے۔ وہ سائنسی کامیابیوں کی حیرت انگیز نئی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے۔ اس نے مشینیں بنائی ہیں جو سمجھتی ہیں، اور ایسے اوزار بنا لیے ہیں جو ستاروں کے درمیان خلاؤں کے ناقابل عبور علاقوں میں جھانک سکتے ہیں۔ اس نے سمندروں کو پار کرنے کے لیے عظیم الجثہ کِل اور آسمانوں کو دوسرے دینے کے لیے دیوثانہ عمارات تعمیر کر لی ہیں۔ اس کے ہوائی جہازوں اور خلائی جہازوں نے طویل فاصلوں کو مختصر کر دیا ہے، وقت کو زنجیر کر لیا ہے اور کرہ ہوائی میں شاہراہیں تعمیر کر دی ہیں۔ یہ جدید انسان کی سائنسی اور تکنیکی ترقی کی چند حیا دینے والی تصویر ہے۔

پھر بھی، سائنس اور ٹکنالوجی میں ایسی نظر فریب چھلانگ اور مستقبل میں بہت سی آنے والے غیر محدود چھلانگوں کے باوجود، کچھ بنیادی شے ہے جو ابھی ہاتھ نہیں آئی ہے۔ جذبے کا ایک قسم کا افلاس ہے جو ہماری سائنسی اور تکنیکی بہتات کے تاب دار مقابل کے سچ حائل ہے۔ مادی اعتبار سے ہم جتنے زیادہ متمول ہیں، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اتنے ہی زیادہ غماش ہیں۔ ہم نے پردوں کی طرح ہوا میں اڑنا اور مصلیٰ کی طرح سمندر میں پیرا سیکھ لیا ہے مگر ہم بھائیوں کی طرح ایک ساتھ رہنے کا سادہ ترین فن نہیں سیکھ سکے ہیں۔

ہم آدمی، اندرونی اور بیرونی، دو دائروں میں رہتا ہے۔ ہمارا اندرون روحانی دائرے کا آخری سرا ہوتا ہے جس کا اظہار فن، ادب، اخلاقیات اور مذہب میں ہوتا ہے۔ ہمارا بیرون پرزوں، ٹکنیک، کارزار اور وزارت کی پیچیدگی ہے جس کے ذریعے ہم زندہ رہتے ہیں۔ آج ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اندرون کو بیرون میں گم ہو جانے دیا ہے۔ ہم وہ کام کرتے ہیں جن کے ذریعے اس سرے کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں جن کے لیے ہم زندہ رہتے ہیں۔ جدید دور کی زندگی کو شاعر Thoreau کے کمال نے کتنی خوب صورتی سے چند لفظوں کے اچھے متوالے میں سمودیا ہے "Improved means to an unimproved end"۔ یہی ہماری سب سے بڑی پریشانی ہے، یہی آئندہ مسئلہ ہے جو انسان پر ہمہ وقت سوار رہتا ہے۔ آج اگر ہمیں اس جال سے نکلنا ہے تو ہمیں اپنی اخلاقی اور روحانی "کابلی" کو نکال باہر کرنا ہوگا۔ بڑھی ہوئی مادی طاقتیں بڑھے

ہوئے خطرات کا باعث ہوتی ہیں، اگر ساتھ ہی ساتھ روحانیت میں بھی مناسب ترقی نہیں ہوتی۔ جب انسانی فطرت کا ”بیرون“ اس کے ”اندرون“ پر حاوی ہو جاتا تو دنیا پر کھرے طوفانی بارش چھانے لگتے ہیں۔

روحانی اور اخلاقی کابلی کا مسئلہ، جو انسان کا سب سے اہم دوسرا بنا ہوا ہے، تعین بڑے مسائل میں اپنا اظہار کرتا ہے جو آپس بچہ بن جانے کی انسانی اخلاقی عواہش سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سارے مسائل اگرچہ تنہا اور الگ نظر آتے ہیں، مگر آپس میں اس طرح بیوستہ ہوتے ہیں کہ ان کو الگ الگ نہیں کیا جاسکتا۔ میری مراد نسلی نا انصافی، اخلاسی اور جنگ سے ہے۔

اس مرحلے پر میں پہلے جس مسئلے کا تذکرہ کرنا چاہوں گا، وہ ہے نسلی نا انصافی۔ نسلی نا انصافی کی شہینت کو دور کرنے کی جدوجہد ہی ہمارے وقت کی بہت ساری کوششوں میں سے ایک، اور سب سے اہم ضرورت ہے۔ ریاست ہائے متحدہ کے نیکو عوام کی موجودہ انگریزی آزادی اور انسانی برابری ”ابھی“ اور ”اسی وقت“ کی بنیاد پر ہونے والے ایک کھرے جذباتی عزم کی پیداوار ہے۔ ایک زاویے سے ریاست ہائے متحدہ میں شروع ہونے والی شہری حقوق کی جدوجہد ایک مظہر ہے جس کو امریکی تاریخ کی روشنی میں سمجھا جانا اور موجودہ امریکی حالات کے تناظر میں اس سے نمٹا جانا چاہیے۔ مگر دوسرے زاویے اور زیادہ اہم درجے سے، آج جو کچھ امریکا میں ہو رہا ہے وہ نسبتاً دنیا میں ہونے والے واقعات کا ایک مختصر بخور ہے۔

فلسفی اشریڈ مارٹن وائٹ ہیڈ (North Whitehead) کا قول ہے کہ ”ہم ایسے وقت میں زندہ ہیں جس میں تہذیب اپنا بنیادی تناظر تبدیل کر رہی ہے، جو تاریخ میں ایک بڑا موڑ ہے، جہاں اُن قبل از قوم تصورات کی جن پر سماج کی تعمیر ہوئی ہے، چھان بھٹک ہو رہی ہے، ان پر سوال اٹھائے جا رہے ہیں اور ان میں کھری تبدیلیاں بھی ہو رہی ہیں۔“ آج ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ آزادی کا پیدا کردہ دھماکا ہے اور وکٹوریہ کو (Victor Hugo) کے الفاظ میں اس ”تخیل کی آگاہی ہے جس کا وقت آگیا ہے۔“ بے قیامی کی کھری گزشتہ اہم جو آج ہم سن رہے ہیں وہ دو ماضی سے محروم عوام کی گھن گرج ہے جو جبر کے عقوبت خانوں سے بلند ہو کر آزادی کے روشن چوٹیوں تک، ایک پر شکوہ عوامی ترانے کی صورت میں فضاؤں پر چھا رہی ہے جس کے بول ہیں، ”باطل سے دینے والے اے آسمان نہیں ہم۔“ پوری دنیا میں، ایک بخار کی طرح، تاریخ کی سب سے وسیع تحریک آزادی پھیل رہی ہے۔ عوام کی اکثریت نے اپنی نسل اور اپنی زمین کے استحصال کو منادینے کا عہد کر لیا ہے۔ عوام جاگ اٹھے ہیں اور سمندر کی بہا لے جانے والی اونچی لہروں کی طرح اپنے برف کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آپ سترہویں، ہرنگی، ہر بندگا، ہر مکان میں، طلبہ میں، کھیناؤں میں اور سیاسی اجتماعات میں ان کی غزاہٹ کون سکتے ہیں۔ تاریخ میں صدیوں چلنے والی تحریک وہی تھی جس میں مغربی یورپ کی سدائیاں اور قومیں مختلف نوع کی ”فتوحات“ کے لیے نکل کھڑی ہوتی تھیں۔ وہ عرصہ، یعنی نو آبادیاتی عہد، اب ختم ہو چکا ہے۔ مشرق مغرب سے بغل گیر ہو رہا ہے۔ کرۂ ارض پھر سے تقسیم ہو رہا ہے۔ جی ہاں، ہمارا نقطہ نظر بھی تبدیل ہو رہا ہے۔

تاریخ کے طلبہ کو ان تبدیلیوں پر حیرت نہیں کرنی چاہیے۔ مجبور عوام ہمیشہ مغلوب نہیں رہ سکتے۔ آزادی کی خواہش بالآخر عیاں ہو کر رہتی ہے۔ انجیل مقدس وہ پیمان خیر قصہ بیان کرتی ہے جس میں (حضرت) موسیٰ نے فرعون کی عدالت میں کھڑے ہو کر کس طرح پکار کر کہا تھا، ”میری اُمت کو نکل جانے دو۔“ یہ ایک مسلسل قصے کا ابتدائی باب ہے۔ ریاست ہائے متحدہ کی موجودہ جدوجہد اسی ابتدائی باب کا اگلا حصہ ہے۔ اندرونی کچھ چیزوں نے ٹیکسہ کو اپنا پیدا کنی حق یا دلا یا ہے، اور کچھ بیرونی چیزوں نے یا دلا یا ہے کہ اس کو کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔ شعوری یا لاشعوری طور پر وقت کی پکار نے اس کو گرفت میں لے لیا ہے، اور اپنے افریقی سیاہ فام اور ایشیائے کے زرد فام بھائیوں، جنوبی امریکا، جزائر شرق الہند اور ریاست ہائے متحدہ کا ٹیکسہ و نسلی انصاف اور اپنی موجودہ زمین کی طرف ایک احساسِ غفلت کے ساتھ سے بڑھ رہا ہے۔

خوش قسمتی سے نسلی نا انصافی کی سیاہ رات کو ختم کرنے کی جدوجہد کی طرف کچھ با معنی پیش قدمی ہوئی ہے۔ ہم نے ایشیا اور افریقا میں آزادی کے طلوع کا شاندار تماشا دیکھا ہے۔ تیس برس قبل پورے افریقا میں صرف تین خود مختار قومیں تھیں مگر آج پینتیس افریقی قومیں نوآبادیاتی غلامی سے نجات پا کر ریاستیں قائم کر چکی ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ میں ہم نے بتدریج نسلی عداوت کی کے نظام کو منہدم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ سرکاری اسکولوں میں نسلی عداوت کو غیر قانونی قرار دینے کا عدالتِ عالیہ کا 1954 کا فیصلہ ”علاقہ مگر مہم“ پورے نظریے کے لیے آئینی اور قانونی موت تھا۔ عدالت نے فیصلہ صادر کیا تھا کہ علاقہ سہولتیں بنیادی طور پر عدم مساوات ہے اور ایک بچے کو اس کی نسل کے باعث علاقہ رکھنا اس کو قانونی تحفظ فراہم نہ کرنے کے مترادف ہے۔ یہ فیصلہ حق وراثت سے محروم کردہ لوگوں کو اعزاز کے لیے امید کی ایک کرن بن کر آیا۔ اور پھر چند ماہ کے بعد ایک روز روشن طلوع ہوا جب ”شہری حقوق“ کا ایک زبردست مسودہ قانون ہماری مرز زمین کا قانون بنا۔ یہ بل، سب سے پہلے صدر کینیڈی نے جس کی سفارش کی تھی، کردہ لوگوں امریکیوں کی غالب اکثریت کی مدد اور استقلال سے، جس میں ٹیکسہ اور سفید فام دونوں شامل تھے منظور ہوا تھا۔ انسانی حقوق کی متلاطم جدوجہد کے درمیان یہ ایک دلچسپ موقع تھا! ایک دوسرے اعلانِ بریت کی ابتدا تھی، جس نے مساوی مواقع فراہم کرنے کے لیے ایک نئی قانونی بنیاد مہیا کر دی تھی۔ اس بل پر بحث کے دوران ہم نے رضامندی کے کچھ بہت افزا اور حیرت انگیز اشارے بھی دیکھے ہیں۔ میں یہ اطلاع فراہم کرنے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں کی عام طور پر ریاست ہائے متحدہ کے جنوبی علاقے کی زیادہ تر آبادیاں Civil Rights Law کی تعمیل کر رہی ہیں اور اس عمل کے دوران خاصی سنجیدگی کا مظاہرہ بھی کر رہی ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ کے حالیہ صدارتی انتخاب کے دوران ایک اور علامت ابھری ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محاطات آگے بڑھ رہے ہیں۔ امریکی عوام نے اس امیدوار کو زبردستی کے جس کا تشخص شدت پسندی، نسلیت اور مراجعت سے تھا، بڑی پختگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہماری قوم کے وہ لوگوں نے فائیم بازو کے بنیاد پرستوں پر کاری وار کیا ہے۔ انھوں نے ہمارے سماج کے ان لوگوں کو بھست دی ہے جو سفید فام کو ٹیکسہ کے

خلاف صف آرا اور قوم کو فسطائیت کے خطرناک راستے پر گام زن کرنا چاہتے ہیں۔

میں آپ کو غلط تاثر نہیں دینا چاہتا۔ مسئلہ ابھی پوری طرح حل نہیں ہوا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں نیکرو کی آزادی کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے میں ابھی بہت طویل وقت درکار ہے۔ اگر انجیل مقدس کی تشبیہاتی زبان استعمال کی جائے تو کہا جائے گا کہ ہم منہر کی غبار آلودہ زمین چھوڑ چکے ہیں، ایسے بحر قلزم کو پار کر چکے ہیں جس کا پانی سرما کی چھید نے والی سردی کی گراں مزاحمت سے سخت ہو چکا تھا۔ مگر قبل اس کے کہ ہم موجودہ مرز بین کے ارفع ساحلوں تک پہنچیں، ہمیں ایک پریشان کرنے والی گم راہ کن راہی درپیش ہے۔ ابھی ہمیں بنائین کی انوکھی چوٹیوں کا اور مزاحمتوں کے دیو دیگل کو ہساروں کا سامنا ہے۔ مگر صبر اور استقلال کے ساتھ ہم آگے بڑھتے رہیں گے، جب تک کہ ناامیدیوں کی ہر واہی بلند ترین امیدوں کی نئی چوٹیوں میں تبدیل نہ ہو جائے، جب تک کہ مژم اور انکسار کا عمل تکبر اور غیر معطقیہ کو زمیں یوں نہ کر دے، جب تک کہ نا انصافی کی کھردری زمین کی سطح مساوات میں قلب مابیت نہ ہو جائے، اور جب تک کہ روشن آنکھوں کی شکنیں دو گرنے والی دانش تعصب کے ہموار علاقوں کی قلب مابیت نہ کر دے۔

ریاست ہائے متحدہ میں شہری حقوق کی تحریک کے اہم مراکز کہہ رہے ہیں کہ وقار مساوات، ملازمتیں اور شہریت کے مطالبات پر نہ کوئی سمجھتا ہوگا اور نہ ان کو ملتی کیا جائے گا۔ اگر اس کا مطلب مزاحمت اور تنازعہ ہے تو، فیہا۔ ہم دبے والے نہیں۔ اب ہمیں خوف بھی نہیں آتا۔

ایک لفظ جو ہمارے مجاہدے کی روح اور اس کے بیرون کی علامت ہے، عدم تشدد ہے، اور یہ بلاشبہ وہی عنصر ہے جس نے ایک فرد کو انعام کے قابل گردانا ہے جس کو جدوجہد کے رشتے سے بچھڑا جاتا ہے۔ عام معنوں میں، عدم تشدد کا مطلب یہ ہے کہ جدوجہد کے لیے اسلحہ پر بھروسہ نہیں کیا جائے گا۔ اس کا مطلب اُن روایات اور قوانین سے عدم تعاون بھی ہے جو تعصب اور غلامی کی حکومت کی پہچان ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے، احتیاج میں عوام کی براہ راست شمولیت ہو، بجائے اس کے کہ اُن بالواسطہ طریقوں پر انحصار کیا جائے جن میں عوام کی عملی شرکت بالکل ہی نہ ہو۔

عدم تشدد کا یہ مطلب بھی رہا ہے کہ ہمارے عوام نے حالیہ برسوں میں جدوجہد میں شمولیت کے دوران خود زخم سہے ہیں، بجائے اس کے کہ دوسروں پر زخم لگائے جاتے۔ اس کا مطلب، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ بھی ہے کہ نہ ہم اب خوف زدہ ہیں اور نہ دبے والے ہیں۔ مگر کسی حد تک، اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کو خوف زدہ کرنا نہیں چاہتے اور نہ اُس سماج میں خوف پھیلانا چاہتے ہیں، ہم جس کا ایک حصہ ہیں۔ یہ تحریک سرگزشت سفید فام افراد کی لہانت اور غلامی کے ذریعے نیکرو کی آزادی کی خواہاں نہیں۔ یہ کسی پر فتح پانا نہیں چاہتی۔ یہ تو امریکی سماج کی آزادی چاہتی ہے اور تمام عوام کی خود کار آزادی میں شامل ہونا چاہتی ہے۔

تشدد کے ذریعے نسلی انصاف کا حصول ناقابل عمل بھی ہے اور غیر اخلاقی بھی۔ میں اس حقیقت سے بے بہرہ نہیں کہ تشدد اکثر عارضی نتائج فراہم کرتا ہے۔ قوموں نے اکثر جنگ کے ذریعے ہی آزادی حاصل کی ہے۔

مگر وقتی فتوحات کے باوجود تشدد کبھی پائیدار امن نہیں لاسکتا۔ یہ سماجی مسائل کا حل نہیں۔ یہ صرف سنے اور پیچیدہ مسائل پیدا کرتا ہے۔ تشدد ناقابل عمل ہے اس لیے کہ یہ اوپر سے نیچے لانے والی چٹپاں سیڑھی کی طرح ہے جو سب کی تباہی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ غیر اخلاقی اس لیے ہے کہ مخالف کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے، بجائے اس کے کہ اس کا اتفاق رائے حاصل کرے۔ یہ مقصد کرنے کے بجائے نیست و نابود کرتا ہے۔ تشدد اس لیے بھی غیر اخلاقی ہے کہ یہ محبت کے بجائے نفرت کے ماحول میں پھلتا پھوٹتا ہے۔ یہ کیونٹی کو تباہ کرتا ہے اور برادری کو ناممکن بناتا ہے۔ یہ سماج کو مذاکرات کے بجائے خود کشاکی کی کیفیت میں سمجھوڑ دیتا ہے۔ تشدد بالآخر خود اپنی شکست کا باعث ہوتا ہے۔ یہ بچ جانے والوں میں تمغیاں، اور تباہ کرنے والوں میں بے رحمی پیدا کرتا ہے۔

عدم تشدد حقیقی معنوں میں روحانیت اور اخلاقیات کی تلافی کرتا ہے، جس کو جدید دور کے انسان کی سب سے اہم الجھن کہتا ہوں۔ یہ اخلاقی طریقے سے اخلاقی پہلوؤں کو مامون کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عدم تشدد ایک طاقت ور اور منصفانہ ہتھیار ہے۔ تاریخ کا یہ سب سے منفرد ہتھیار ہے، جو بغیر زخم لگائے کاٹتا ہے اور چلانے والے آدمی کو مرفراز کرتا ہے۔

میں اس طریقے پر یقین رکھتا ہوں، اس لیے کہ میرے خیال میں یہ واحد طریقہ ہے ایک بکھرے ہوئے سماج کو اکٹھا کرنے کا۔ یہی وہ طریقہ ہے جو مذہب اکثریت کے شعور سے اپیل کر کے واجب انصاف کو رائج کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس نے بے ہمہری خوف، غرور اور غیر منطقییت کے ذریعے اپنے تعمیر کو سو جانے دیا ہے۔

عدم تشدد مزاحمت کا راستہ ہے پیغام کا مندرجہ ذیل مادہ طریقے سے خلاصہ بیان کر سکتے ہیں: حکومت اور دوسرے اداروں کی پہلے قدم اٹھانے میں ناکامی کے باوجود ہم نا انصافی کے خلاف راست اقدام کریں گے۔ ہم بے جا قوانین پر عمل نہیں کریں گے نہ بے جا طریقوں پر کام کریں گے۔ ہم یہ سب کچھ پرامن اور اشکاف طریقے سے اور خوش مزاجی سے کریں گے، اس لیے کہ ہمارا مقصد ترغیب دینا ہے۔ ہم عدم تشدد کا طریقہ اپناتے ہیں اس لیے کہ ہمارا مقصد ایسا سماج ہے جو خود اپنے لیے بھی پرامن ہو۔ ہم الفاظ کے ذریعے ترغیب دینے کی کوشش کریں گے، پھر بھی اگر الفاظ کا کام رہے تو ہم اپنے عمل سے ترغیب دینے کی کوشش کریں گے۔ ہم بات چیت کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہیں گے اور مناسب منسلحت کے خواہش مند ہوں گے پھر بھی ضروری ہوگا تو تکلیف اٹھانے کے لیے بھی تیار رہیں گے، حتیٰ کہ جسے ہم سچ سمجھتے ہیں اس کی گواہی کے لیے اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈالیں گے۔

نسلی نا انصافی کے مسئلے کے حل میں کامیابی کی مثالیں کم نہیں۔ مومن داس کرم چند گاندھی نے بڑے عمدہ طریقے سے برطانوی سلطنت کے جبروت کو لکا رکھا اور اپنے عوام کو صدیوں کے سیاسی تسلط اور معاشیاتی استحصال سے نجات دلائی تھی۔ انہوں نے صرف سچائی، روحانی قوت، اور ہمت کے ہتھیاروں سے، زخم لگائے بغیر جہد و جہد کی تھی۔

پچھلے دس برسوں میں ریاست ہائے متحدہ کے شہرے بہادر مردوں اور عورتوں نے اخلاقی قوت، اور عدم تشدد کی تاثیر کی کوئی دی ہے۔ ہزاروں بے چہرہ، گم نام، سنگ دل نوجوان، سیاہ اور سفید فام دونوں، تعلیم کے تاج محل کو وقتی طور پر خیر باد کہہ کر تعصب کے خلاف مزاحم ہوئے ہیں۔ ان کی باہمت باضابطہ سرگرمیاں نا انصافی کی جھلسانے والے ریگستان کے سچ ایک فرحت افزا انگلستان بنی ہیں۔ وہ ہماری پوری قوم کو جمہوریت کی ان عظیم سکری باؤٹیوں کی طرف واپس لے گئے ہیں جو ان کے اجداد نے آئین کی ترتیب اور آزادی کے اعلان کے دوران کھودی تھیں۔ ایک دن پورا امریکا ان کے کاہنوں پر فخر کرے گا۔

مجھے خاصا ادراک ہے انصافی کم زوریوں کا، نا کامیوں کا، عدم تشدد کے اثرات کا، اور کلمہ کھلا تشدد کی وکالت کا۔ مگر میں اب بھی اس بات کا قائل ہوں کہ عدم تشدد عملی طور پر صحیح بھی ہے اور اخلاقی اعتبار سے اچھا طریقہ بھی ہے۔ پرانے مسائل اور نسلی نا انصافی کو حل کرنے کا۔

ایک اور لڑائی جو جدید دنیا پر چھائی ہوئی ہے، وہ افلاس کی بیماری ہے۔ ایک دیونگیاں 'آکلوپس' کی طرح یہ زمینوں اور دیہاتوں پر پھیلے ہوئے اپنے بازوؤں سے پوری دنیا کو پریشان کرتی رہتی ہے۔ دنیا کی تقریباً دو تہائی آبادی روزانہ بھوکے موتی ہے۔ ان کے بستر یا تو شہروں کی گلیاں ہوتی ہیں یا دیہات کی خاک آلودہ سڑکیں۔ ان افلاس کے مارے خدا کے بندوں کی اکثریت کو نہ کبھی کوئی عام ڈاکٹر، نہ دانتوں کے ڈاکٹر کا علاج نصیب ہوا ہے۔ افلاس کا یہ مسکرتی یافتہ مرا لک کی درجات میں بیٹھتی ہوئی آبادی میں ہے، نام نہاد غیر ترقی یافتہ مرا لک میں بھی یہی کچھ موجود ہے، یہ ایک وسیع معاشیاتی غلطی کے طور پر خود امیر ملکوں کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اب میرے ملک بنی کو لے لیجیے۔ ہم نے صنعتی پیداوار کا ایسا عظیم نظام بنایا ہے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ ہم دنیا کی سب سے زیادہ دولت مند قوم بن گئے ہیں۔ اس برس ہماری قومی مجموعی پیداوار 1650 ارب ڈالر تک پہنچ جائے گی۔ پھر بھی ہم از کم ہمارے ساتھی باشندوں کا پانچواں حصہ، یعنی دس ملین خاندان، جن میں تقریباً چالیس ملین افراد شامل ہوں گے، افلاس کے ذلت آمیز سماج میں گرفتار رہے گا۔ ایک اعتبار سے، امریکی باشندوں کا افلاس ایشیا اور افریقا کے افلاس سے زیادہ مایوس کن ہے۔ ایشیا اور افریقا کے مفلسوں کی حالت 'مرگ انہو جھٹے وارڈ' کی مصداق ہے، جو اکثریت کے لیے زندگی کی حقیقت ہے، وہ سب اس لیے مفلس ہیں کہ ان کے علاقے میں استحصال کے باعث ترقیات نہیں ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس امریکا کے مفلس جانتے ہیں کہ وہ دولت مند ترین قوم کے فرد ہیں، اور اگرچہ وہ افلاس کے ایک جزیرے میں گرفتار ہیں، ان کے اطراف مادی خوش حالی کا ٹھاٹھیں مارنا سمندر موجود ہے۔ ان کے پس ماندہ علاقوں سے روزانہ بلند ہوتی چیمائے ہوتی شیشے اور آئین سے بنی ہوئی عمارتیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ چھ سو میل کی رفتار سے پرواز کرتے جیٹ ہوائی جہاز ان کی ملاحیت سے پڑا بادلوں کے آسمان سے گزرتے رہتے ہیں، مصنوعی سیارے خلا سے چاند کی تفصیلات دکھاتے رہتے ہیں۔ صدر جانسن نے اپنے پارلیمانی خطاب میں اس تضاد کا ذکر کرتے ہوئے خبر دی تھی کہ "ریاست ہائے متحدہ امریکا کا معیار زندگی دنیا بھر میں سب

سے بلند ہے، مگر ساتھ ہی افسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”خراط کی اس چکا چھند میں در بدر کی اور بے روزگاری کے سایے بھی ابرا ہے۔“

تو یہ واضح ہے کہ اگر آدمی کو اپنی روحانیت اور اخلاقی پس ماندگی کے زندان سے رہائی حاصل کرنی ہے تو اسے کسی نہ کسی طرح دنیا بھر کے ”دولت مندوں“ اور ”مفلسوں“ کے درمیان پھیلی خلیج پر پلی تعمیر کرنے ہوں گے۔ جدید دنیا کی غیر مت پر سب سے اہم مسئلہ افلاس ہی ہے۔

افلاس کے بارے میں کوئی بات نئی نہیں۔ نئی بات تو یہ ہے کہ اس کو دور کرنے کے لیے ہمارے پاس ہر سال موجود ہیں۔ ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے قبل لوگوں نے آبادی اور پیداوار کے جڑواں مسئلے سے پریشان ہونا شروع کیا تھا۔ مائٹھس (Malthus) نامی ایک فکرمند انگریز نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے نہایت خوف ناک نتائج اخذ کیے تھے اس نے پیشین گوئی کی تھی کہ انسان ہر درجہ عالمی فاقہ کشی کی طرف بڑھ رہا ہے، اس لیے کہ دنیا میں خوراک کی پیداوار سے زیادہ اس کو کھانے والے بڑھ رہے ہیں۔ بعد کے سائنس دانوں نے Malthus کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف کیا اور کہا کہ اس نے دنیا کے مسائل اور انسان کی خوش تدبیری، دونوں کا غلط اندازہ لگایا ہے۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے کہ ہارورڈ کے ایک ماہر ارضیات ڈاکٹر کیرلی ماتھر (Kirtley Mather) نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا عنوان Enough and to Spare تھا اس نے جو بنیادی موضوع پتنا تھا وہ یہ تھا کہ جدید دنیا میں قحط سالی قطعاً ناممکن ہے اس لیے آج کے ایجنڈے پر لکھا ہونا چاہیے: کسی سر زمین، کسی شہر، کسی دسٹرکٹ پر بھوک اور تنگ دستی کیوں ہو، جب آدمی کے پاس وسائل بھی ہیں اور سائنسی علم بھی، جن کے ذریعے تمام بنی نوع انسان کو زندگی کی بنیادی سہولتیں، ہم پہنچائی جاسکتی ہیں؟ ریگستان تک میراب کیے جاسکتے ہیں اور ان کی بالائی سطح بھی تبدیل کی جاسکتی ہے۔ ہم زمین کی کمی کا ٹھکڑہ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ پچیس ملین مربع میل قابل کاشت ہے، جس میں سے ہم صرف سات ملین مربع میل رقبے سے کم پر کاشت کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس وٹامن، غذائیت، غذائی کیمیا اور انجم کی ہر جہتی کا حیرت انگیز علم موجود ہے۔ انسانی قوت کے وسائل کی کوئی کمی نہیں، کمی ہے تو انسانی ارادے کی۔ اکثر خوش حال اور محفوظ لوگ اپنے درمیان موجود افلاس اور محرومی سے لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ممالک میں مفلسوں کا خیال دلوں سے نکال دیا گیا ہے، اور ان کو ہماری سوسائٹی کے مرکزی دھارے سے بھی نکال باہر کر دیا گیا ہے، اس لیے کہ ہم نے ان کو غیر مرقی ہو جانے دیا ہے۔ بالکل اسی طرح، جیسے عدم تشدد نے نسلی نا انصافی کی بد صورتی کو عیاں کر دیا ہے، افلاس کی بیماری کو بھی منظر عام پر لانا ہوگا اور اس کا علاج کرنا ہوگا، مرض کی علامتوں ہی کو نہیں، اس کی بنیادی وجوہات کو بھی دور کرنا ہوگا۔ یہ بھی ایک غرض ناک جدوجہد ہوگی، مگر ہمیں اس کے علاج کا طریقہ معلوم کرنے سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے، خواہ یہ کام کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔

اب افلاس کے خلاف عالمی چیلانے پر جنگ کرنے کا وقت آچکا ہے۔ ثروت مند قوموں کو اپنے وسیع

وساں کو ترقی پذیر دنیا کی ترقیات پر خرچ کرنا چاہیے، جاں کو علم اور بھوکے کو غذا فراہم کرنی چاہیے۔ بڑی قوم ہمیشہ مہربان قوم ہوتی ہے۔ اگر ایسے لوگوں کے لیے فکر نہ کرے تو نہ کوئی فرد بڑا ہو سکتا اور نہ کوئی قوم۔ ہماری مذہبی روایات کے ریشے ریشے میں یہ عقیدہ کندہ ہے کہ انسان کو خدا کی شہادت میں خلق کیا گیا ہے کہ اس کی غیر مادی روح لامتناہی قدر کی حامل ہے کہ اس کی وراثت اور وفار کی قدر و قیمت ہے۔ اگر ہم اس کو ایک اخلاقی حقیقت سمجھتے ہیں تو کسی انسان کو بھوکا دیکھ کر آدمیوں کو بیمار اور فاقہ کشی کی حالت میں دیکھ کر ہم محض تماشائی بن کر بیٹھے نہیں رہ سکتے، اگر ہم ان کی مدد کر سکتے ہوں۔ دولت مند قوموں کو دولت مند اقلیت اور مفلس اکثریت کے درمیان حامل خلیج کو پائنے کی حتی الوسع کوشش کرنی چاہیے۔

تمام تجربے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اہل ثروت کو افلاس زدہ لوگوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ دونوں ہی مقسوم کی ایک بافت کا حصہ ہیں۔ تمام زندگیاں آپس میں رشتے دار ہیں اور تمام انسان باہمی انحصار پر مجبور ہیں۔ مفلس کا دکھا میر کو گھٹاتا ہے اور مفلس کی نجات امیر کو بڑھاتی ہے۔ ہم ناگزیر طور پر اپنے بھائی کے گھبران ہیں اس لیے کہ حقیقتاً ہم ایک ہی ڈھانچے میں گھٹھے ہوئے ہیں۔ جون ڈن نے اس صداقت کا بڑے مہترج انداز میں تجزیہ کیا ہے، جب اس نے کہا تھا:

کوئی بھی آدمی خود کفیل جزیرہ نہیں ہوتا
ہر شخص ایک بڑا عظیم کا ٹکڑا ہوتا ہے، ایک مرکز کا حصہ
اگر سمندر میں ایک تودہ بھی بہہ جائے
تو یورپ بھی چھوٹا ہو جائے گا
اسی طرح، جیسے ایک راس زمین
اسی طرح، جیسے تم اور تمہارے دوست
ایک فرد کی موت بھی مجھے مختل کر دیتی ہے
اس لیے کہ میں انسانیت میں شامل ہوں
لہذا، کبھی نہ پوچھو کہ گھنٹی کس کے لیے بج رہی ہے
مثلاً یہ تمہارے لیے بج رہی ہے

تیسری بڑی شیطنت جو ہماری دنیا کو درپیش ہے، جنگ ہے۔ حالیہ واقعات نے ہمیں صاف طور پر یاد دلایا ہے کہ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی قوموں کے اسلحہ خانوں میں کمی نہیں، بلکہ ان میں اضافے کر رہی ہیں۔ دنیا کی بڑی ترقی یافتہ قوموں کے افہان کا ارتکا ز فوجی ٹکنالوجی پر ہے۔ Limited Test Ban Treaty کے باوجود جوہری ہتھیاروں کا پھیلاؤ روکا نہیں جا سکا ہے۔ اس کے برعکس، پہلی غیر تسلیم نام، اور نام نہاد کم ترقی یافتہ طاقت، چینی عوامی جمہوریہ کے ہاتھوں جوہری دھماکے نے پوری انسانیت کو ہتھوڑے ہستی سے منادہجے کے امکانات کے پرفریب وسیع آفاق وا کر دیے ہیں۔ یہ حقیقت، کہ بنی نوع انسان

زیادہ تر جوہری جنگ کے خطرات کو اس لیے اپنے ذہن سے محو کر دیتا ہے کہ اس کا خیال بہت تکلیف دہ ہے اس لیے یہ ناقابل قبول ہے۔ ایسی سوچ ہمدردی پر مبنی ہے۔ خطرات کو کم نہیں کرتی۔ رد کرنے کا طریقہ وقتی طور پر تشویش کو چھپا تو سکتا ہے مگر ذہنی سکون اور جذباتی تحفظ فراہم نہیں کرتا۔

لہذا، جنگ کی طرف انسان کا رجحان اب بھی قائم ہے۔ مگر تجربے سے حاصل ہونے والا علم ہمیں بتاتا ہے کہ جنگ فرسودہ ہو چکی ہے۔ ایسا زمانہ بھی رہا ہوگا جب شیطانی قوتوں کی ترقی کو پھیلنے سے روکنے کے لیے جنگ نے ایک منفی اچھائی کا کام کیا تھا، مگر جدید ہتھیاروں کی تباہ کن طاقت نے اس امکان کو بھی ختم کر دیا ہے کہ جنگ ایک منفی اچھائی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم یہ قیاس کر لیں کہ زندگی زندہ رہنے کے قابل ہے اور آدمی کو باقی رہنے کا حق ہے تو ہمیں جنگ کا کوئی مقابلہ تلاش کرنا ہوگا۔ اس دور میں جب ہر طرف خلاقی سیارے اڑتے پھرتے ہوں اور خود کار میزائلیں زمین کے اطراف موت کی شاہراہیں بناتی ہوں، کوئی قوم جنگ میں فتح کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ایک نام نہاد محدود جنگ بھی خوف ناک انسانی بربادی، سیاسی اٹھل پھٹل اور روحانی ازالہ فریب سے زیادہ مصائب کی وراثت چھوڑ کر جائے گی۔ خدا نخواستہ اب عالمی جنگ صرف دھواں دہلی ہوئی لاکھ کی صورت میں انسانی نسل کی ایک کوئی شہادت چھوڑے گی، جس کی غلطیوں نے انسان کو بے رحم اور قطعی موت کے راست پر گام زن کیا ہے۔ لہذا، اگر انسان جھجکے کے بغیر جنگ سے آنکھیں اڑاتا رہا تو وہ اس زمین کو ایسے جہنم میں بدل دے گا جس کا دانستہ (Dante) بھی تصور نہیں کر سکا ہوگا۔

لہذا میں آپ سب کی خدمت میں، اور ان سب کی خدمت میں جو ان الفاظ کو آئندہ پڑھیں گے، یہ کہنا چاہوں گا کہ عدم تشدد کے فلسفے اور حکمت عملی پر فوراً کام کیا جائے اور انسانی تباہی کے ہر میدان میں اس کا سنجیدگی سے تجربہ کیا جائے، جس میں قوموں کے درمیان رشتے بھی شامل ہوں۔ قومی ریاستیں ہی جنگ کرتی ہیں، جنہوں نے ہتھیار بنائے ہیں، جو اپنی فوج انسان کی زندگی کے لیے خطرہ ہیں اور جو اپنے کردار میں نسل کش بھی ہیں اور خود کش بھی۔

ہمیں ان کی قدیم عادتوں سے، طاقت کے وسیع ڈھانچوں سے اور ناقابل بیان الجھے ہوئے مسائل کے حل سے بھی نمٹنا ہے۔ مگر جب تک کہ ہم اپنی انسانیت سے مکمل طور پر دست بردار نہیں ہو جاتے اور ان ہتھیاروں کی موجودگی میں جو ہم نے خود بنائے ہیں، خوف و نا طاقتی کے آگے سرخم نہیں کرتے، یہ انتہائی لازمی اور ضروری ہوگا کہ قوموں کے درمیان جنگ اور تشدد کا خاتمہ کیا جائے کہ اسی طرح نا انصافی ختم کی جاسکتی ہے۔ صرف سفید فام افراد کے ساتھ برابری سے سفید فام اور نیکو افراد کے مسائل حل نہیں ہو سکیں گے، اگر سماج میں برابری تشدد کے زور پر ہو اور دینا تباہی کی طرف جاری ہو۔

میں ان مسائل کی پیچیدگی کو کم کرنا نہیں چاہتا، تخفیف اسلحہ اور امن کے حصول کے لیے جن کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ ہم میں غمازش ہے اور نہ ہمت، نہ ایسے مسائل سے نمٹنے کی بصیرت، جب تک کہ ہم اس سلسلے میں اپنے ذہنی اور روحانی نو قدری

(reevaluation) کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ ارتکاز میں ایسی تبدیلی کے ساتھ جو ہمیں دیکھنے کی صلاحیت دے کر دیتے ہیں جو بالکل اصلی اور طاقت ور معلوم ہوتی ہیں، واقعی اب اصلی نہیں اور اپنے انجام کو پہنچنے والی ہیں۔ ہمیں اعلیٰ سطح کی کوشش کرنی ہوگی اور اس کے لیے، اشتیاق پیدا کرنے کے لیے تاکہ ہم ایک نئی دنیا میں قدم رکھیں جو اب ممکن ہو گئی ہے، "ایسا شہر جس کی بنیادیں تھیں، جس کو سوچنے اور تعمیر کرنے والا خدا ہے۔"

ہم منفی راستوں پر چل کر ایک پرامن دنیا نہیں بنائیں گے۔ اتنا ہی کہنا کافی نہیں کہ "ہم کو جنگ نہیں کرنی چاہیے۔" امن سے محبت کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے قربانی دینی چاہیے۔ ہمیں جنگ کے اثرات کے لیے صرف منفی کوشش نہیں، بلکہ امن کے لیے ایک مثبت عہد کرنا چاہیے۔ یونانی ادب میں Ulysses اور Sirens کے بارے میں ایک مسکوک قصہ ہے، جو اب تک ہمارے لیے محفوظ ہے۔ Sirens میں گانے کی اتنی پیاری صلاحیت تھی کہ ملارج ان کے جزیرے کی طرف کھینچے چلے جاتے تھے۔ بہت سے جہاز ان کے جزیرے کی طرف [ہمیشہ کے لیے] چلے گئے۔ جزیرے کی کشش میں لوگوں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی، اپنے گھر باں اپنے فرائض اپنی عزت سب کچھ فراموش کر بیٹھے اور موت کے منہ میں چلے گئے۔ Ulysses نے طے کر لیا تھا کہ Sirens اس کو بہکا نہیں سکیں گے، اس لیے پہلے اس نے خود کو شتی کے آہنی مستول سے باندھ کر باندھ لینے کا فیصلہ کیا، اور اس کی کشتی کے چلانے والوں نے اپنے کانوں کو لاکھ ٹھونس کر بند کر لیا۔ مگر بعد میں کشتی بانوں نے اپنے آپ کو بچانے کا نیا طریقہ ایجاد کر لیا: وہ گلوکار Orpheus کو اپنے ساتھ کشتی پر لے گئے، جس کے گیت Sirens سے کہیں زیادہ مریے تھے۔ جب Orpheus نے Sirens کو بھلا کون سنا؟

سو ہمیں جنگ سے بچنے کے لیے منفی تصورات ہی پر انحصار نہیں، امن کے لیے مثبت عہد بھی کرنا چاہیے۔ ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ امن کی موتی جتنی کہیں زیادہ عمریلی ہے، ایک کائناتی نغمہ ہے جو جنگ کی بے آہنگی سے کہیں زیادہ اعلیٰ ہے۔ جس طرح بھی ممکن ہوں ہمیں دنیا کی تمام قوموں کی بہتری، امن و آشتی کو حقیقت بنانے اور انسان کے تخلیقی جوہر کے مثبت استعمال کے لیے عالمی طاقتوں کی کمیونٹی تانی کی حرکیات کی قلب ماہیت کرنی چاہیے۔ مختصر یہ کہ ہمیں جھجھکیوں کی دوڑ کو "امن کی دوڑ" میں بدل دینا چاہیے۔ اگر ہم امن کے لیے ایسا مثبت حملہ کرنے کی گمن ہے تو ہم امیدوں کے اب تک مہر شدہ دروازوں کو کھولنے اور اپنے کائناتی نوے کو تخلیقی تکمیل کی دعا میں بدل دیں گے۔

میں نے اب تک جو کچھ کہا اس کا چھوڑ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی یقیناً نسلی نا انصافی، افلاس اور جنگ کے مسائل کو حل کرنے کی انسانی صلاحیت پر مبنی ہے۔ ان مسائل کا حل اس نکتے پر ہے کہ انسان اپنی اخلاقی ترقی کو مانتی ترقی کے برابر رکھے اور ہم آہنگی سے زندہ رہنے کا عملی فن سیکھے۔ کچھ برس قبل ایک مشہور ناول نگار کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے کاغذات میں مستقبل میں لکھی جانے والی کہانیوں کے پلاٹ کی ایک فہرست ملی تھی، جس میں ہر فہرست پر جملہ لکھا ہوا تھا، "ایک بکھرے ہوئے خاندان کو وراثت میں ایک مکان ملتا ہے جس میں

سب کو اکٹھا رہنا ہوگا۔" بنی نوع انسان کا یہی سب سے بڑا نیا مسئلہ ہے۔ ہم کو بھی وراثت میں ایک بڑا مکان ملا ہے، ایک عظیم "عالمی گھر" جس میں ہم سب کو اکٹھے رہنا ہے کالاً ہویا کورا، مشرقی ہویا مغربی، بت پرست ہویا یہودی۔ کیتھولک ہویا پروٹسٹنٹ، مسلمان ہویا ہندو، ایک خاندان ہے جو بلاوجہ بکھرا ہوا ہے، اپنے خیالات، تہذیب اور مفادات کے باعث، اور چون کہ ہم اب ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، ہمیں بہر حال اس بڑی ساری دنیا میں ایک ساتھ رہنے کے طریقے چھیننے ہوں گے۔

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری وفاداریاں فرقوں پر نہیں مذہبی اتحاد کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ ہمیں اب اپنی بالائین وفاداری من حیث الکل بنی نوع انسان کے ساتھ رکھنی چاہیے تاکہ ہم انفرادی سو مائٹیوں میں "بہترین" کا تحفظ کریں۔

ایک عالمی فیلوشپ کا نعرہ جو قبیح، نسل، درجے اور قوم کے بجائے ہمسائیگی کے لیے ہو وہی حقیقی نعرہ ہوگا جس میں تمام انسانوں کے لیے بلا کسی شرط کے محبت ہو۔ اس اکثر غلط سمجھے جانے والے تصور کو جسے دنیا بھر کے غلطے جیسے شاعروں نے ایک کم زور اور ہزدل قوت کی طرح رد کر دیا تھا، آج انسان کی بقا کے لیے مطلق ضرورت سمجھا جا رہا ہے۔ جب میں محبت کا تذکرہ کر رہا ہوتا ہوں تو میں کسی زود جس اور کم زور رد عمل کی بات نہیں کرتا، جو ایک معمولی جذباتی یہودیوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔ میں دراصل اس طاقت کی بات کرتا ہوں جسے تمام عظیم مذاہب نے متحد کرنے والا ایک اعلیٰ اصول زندگی گردانا ہے۔ محبت ایک طرح سے وہ کھنچی ہوئی ہے جو قطعی حقیقت کے طرف لے جانے والے دروازے کو کھولتی ہے۔ قطعی حقیقت کے بارے میں ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، بدھ مت یقین کی قطعی حقیقت کو کتنی خوب صورتی سے سینٹ جان کے پہلے Epistle میں سمودیا گیا ہے۔

آئیے، ہم ایک دوسرے محبت کریں! کہ محبت خدا کی امانت ہے!

اور ہر وہ شخص جو محبت کرتا ہے، خدا سے پیدا ہوتا ہے اور خدا سے واقف ہوتا ہے۔

وہ جو محبت نہیں کرتا، خدا سے واقف نہیں! اس لیے کہ خدا محبت ہے۔

اگر ہم ایک دوسرے سے محبت کریں تو خدا ہماری اندر جاگزیں ہوتا ہے،

اور اس کی محبت ہمارے اندر مکمل ہو جاتی ہے

ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ یہ جذبہ ہی دور کا فرمان ہوگا۔ جیسا کہ "آئلڈ مائن ٹی" نے کہا ہے "محبت وہ قطعی قوت ہے جو موت اور شیطانت کے مردود انتخاب کے مقابلے میں اچھی زندگی کا انتخاب کرتی ہے۔ اس لیے ہماری فہرست میں پہلی امید یہی امید ہونی چاہیے کہ محبت ہی فاتح ہوگی۔" نہ ہم اب نفرتوں کے خدا کی پرستش کر سکتے ہیں اور نہ انتقام کی قربان گاہ میں اپنا سر خم کر سکتے ہیں۔ نفرت کی ہمیشہ برہمتی ہوئی لہریں تاریخ کے سمندر کو متلاطم کرتی ہیں۔ تاریخ ایسی قوموں اور ایسے افراد کی باقیات سے بھری پڑی ہے جنہوں نے نفرت کا، خود شمشلی کا راستہ اختیار کیا تھا۔ دنیا کے مسائل کے حل کی کلید محبت ہے۔

میں آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میرا ذاتی ایمان ہے کہ ایک دن آدمی ہر اٹھائے گا اور تیزی سے تہی کی

طرف جاتے ہوئے دور کو نئے احکامات جاری کرے گا۔ اس عہد کی کشاکش اور بے اعتباری کے بجائے کچھ اچھی اور معنی خیز پیش رفت ہو رہی ہے۔ استحصال اور جبر کا قدیم نظام چمکیاں لے رہا ہے، اور ایک ناپائیدار دنیا کی کوکھ سے انصاف اور مساوات کے نئے نظام جنم لے رہے ہیں۔ سماج کی سب سے غلیظ سطح والوں کے لیے مواقع کے دروازے بند رہ چکے ہیں۔ قیموں اور جوتیوں سے محروم آبادی کے لیے مجسم نوکا ایک نیا احساس پنپ رہا ہے، مایوسیوں کے تاریک پہاڑوں کی بنیادوں میں سے امید کی ایک عمرگنگ نکالی جا رہی ہے۔ "تاریکیوں میں بیٹھنے والوں نے ایک عظیم روشنی دیکھ لی ہے۔" یہاں وہاں، اور فرد یا گروہ، محبت کرنے کی ہمت کر رہا ہے، اور اخلاقی بلوغت کی اعلیٰ بلندیوں تک اٹھ رہا ہے۔ سو، حقیقی معنوں میں زندہ رہنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ لہذا، میں ابھی تک مستقبل سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔ مانا کہ ماضی کی آسمان روی کی غمناکی ناممکن ہے۔ مانا کہ امن اور آزادی کی جہد کی رہنمائی کرنے والے اب بھی تکلیف دہ قید و بند اور موت کی دردناک وحمکیوں کا ہدف ہیں؛ عقوبت کے طوفانوں کے تھیٹرے کھاتے رہیں گے، حتیٰ کہ ان میں یہ احساس پیدا ہونے لگے کہ وہ اس بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتے اور اس ترغیب سے بھی چھٹکا نہیں پاسکتیں گے کہ با عزت پسپائی سے ان کو ایک پرسکون زندگی میسر ہو سکتی ہے۔ مانا کہ ہمیں ایک عالمی بحران کا سامنا ہے جو ہمیں زندگی کے متلاطم سمندر کے چلا کھڑا کرنا ہے۔ مگر ہر بحران کے اپنے خطرات اور امکانات ہوا کرتے ہیں۔ نجات بھی ہو سکتی ہے اور تباہی بھی۔ ایک تاریک اور انجھی ہوئی دنیا میں اب بھی خدا کی سلطنت آدمیوں کے دلوں کو مسخر کر سکتی ہے۔



لائسنس پانگ اعلان تجلیل

ہیروشما اور ناگاساکی پر جوہری بم کے گرائے جانے کے فوراً بعد برٹ آئن اسٹائن نے مندرجہ ذیل بیان دیا تھا:

”اب وقت آگیا ہے کہ انسان کو جنگ کو خیر باد کہہ دینا چاہیے۔ بین الاقوامی مسائل کے حل کے لیے جنگ حل کا معقول طریقہ نہیں رہ گئی ہے۔ اب، جب کہ ایک جوہری بم، جیسا کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرایا جا چکا ہے، پورے ایک شہر کو تباہ کر سکتا ہے، یعنی پولیس کے برائے شہر کی پوری آبادی کو ہلاک کر سکتا ہے، تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ ہم دہلی کی انسانی طاقت کو قوموں کے درمیان تنازعات حل کرنے میں استعمال کریں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم انصاف کے اصولوں کے مطابق بین الاقوامی قانون بنائیں، اقوام متحدہ کو مستحکم بنائیں، اور آئندہ کے لیے دنیا میں امن قائم کریں۔“

اس وقت آئن اسٹائن کے الفاظ پر کم لوگوں نے کان دھرے تھے۔ بس ایک آدمی تھا جس نے ان الفاظ کو کبھی نہیں بھلایا، وہ آدمی، آج ہم جس کا خیر مقدم کر رہے ہیں، وہ آدمی جس کو نارویائی پارلیمان کی نوبل کمیٹی نے اس برس کے انعام کے لیے منتخب کیا ہے۔ لائسنس کارل پانگ، نہ صرف جوہری ہتھیاروں کے تجربات کے خلاف بلکہ ان ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے خلاف بھی، نہ صرف ان کے استعمال کے لیے خلاف، بلکہ بین الاقوامی حل کے لیے ہر قسم کی جھگڑوں کے خلاف بھی 1946 سے ان تھک مہم چلا رہے ہیں۔

لائسنس پانگ کیمیا کے پروفیسر، 39 برس سے 'پارادینا' میں قائم کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہیں، جہاں ان کا 1931 میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر کیا گیا تھا۔ کیمیا کے نوبل امن انعام کے علاوہ ان کو بہت سارے اعزازات اور تمغے دیے جاتے ہیں، ان کے ملک میں بھی اور بیرون ملک بھی۔ وہ بلا کسی جھجے کے ایک رائٹس داں کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

البرٹ آئن اسٹائن کی درخواست پر 1946 میں، دوسرے سات اور سائنس دانوں کے ساتھ مل کر لائسنس پائلنگ نے Emergency Committee of Atomic Scientists قائم کی، آئن اسٹائن جس کے صدر نشین تھے۔ کمیٹی کی سب سے اہم ذمہ داری یہ تھی کہ وہ دنیا بھر کے عوام کو جوہری ذرات کے نگرے ہونے اور جوہری بم کی تیاری کی وجہ سے ہونے والی غیر معمولی تہدلیلوں سے آگاہ کریں۔ رابرٹ جنگ (Robert Jungk) کے الفاظ میں ”ایسے آدمیوں نے ایک حربی جدوجہد کی ابتدا کی تھی، جو سیاسی معاملات میں بالکل غفلت کتب تھے۔“

انسان اپنے دل میں جس امید کی پرورش کر رہا تھا کہ دوسری عالمی جنگ کے ختم ہونے کے بعد امن اور ترک اسلحہ جات کا ایک دور شروع ہوگا، وہ پوری نہیں ہوئی بلکہ مشرق اور مغرب کے درمیان کے اختلافات اپنی تمام تر بدہمت حقیقتوں کے ساتھ ابھرنے لگے، جنگ کے دوران کیا جانے والا تعاون بکھر کر رہ گیا اور اس کی جگہ باہمی ناخوش و نارنج کے خوف کے شبہات جنم لینے لگے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری طاقتوں کے درمیان اسلحہ بندی کی دو شرط ہو گئی، یہ دیکھنے کے لیے کہ کون سب سے پرامن جوہری ہتھیار تیار کر سکتا ہے۔ اور پھر خاموشی کے ساتھ، جنگ کے خلاف اور امن کے لیے، بتدریج ”تشدد کا توازن“ قبول کر لیا گیا۔

اور اگست 1948 میں سوویت یونین بھی جوہری بم بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

اسلحہ بندی کی دوڑ نے ایسا ماحول پیدا کر دیا جس نے نہ صرف ترک اسلحہ جات اور امن کی ترقی کو مشکل بنا دیا بلکہ امن اور آزادی اٹھنا بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔

بالآخر، اس جنگ کی قوت رفتار کم ہو گئی، اور وہ دم جم ہوتی چلی گئی۔

مگر لائسنس پائلنگ آگے بڑھتے رہے ان کے نزدیک پسپائی ناممکن تھی۔

پہلے چند برسوں میں، ان کا سب سے بڑا مقصد ہائیڈروجن بم کو حقیقت بننے سے روکنا تھا۔ وہ اپنی تقریروں اور خطبوں میں اس سے ہونے والی ہلاکتوں اور مصائب سے اپنے ہم وطن افراد کو آگاہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے اعلان کیا تھا کہ ”اس بم کے مقابلے میں جوہر و شیمیا اور ناگاساکی پر گرائے گئے تھے اس (ہائیڈروجن) بم کی تباہی سو گنا، ہزار گنا ہی نہیں دس ہزار گنا ہو سکتی ہے اس کے اثرات اس کے حجم پر اور اس امر پر منحصر ہوں گے کہ وہ سطح زمین سے کتنی بلندی پر پھٹتا ہے۔“ انھوں نے یہ بیان 1947 میں دیا تھا، اور بعد میں ہونے والے ہائیڈروجن بم کے تجربات نے ان کی پیشین گوئی کے امکانات کو ثابت کر دیا۔

3 فروری 1950 کو پائلنگ نے نیویارک کے ’کارنیگی ہال‘ میں ایک بڑے مجمعے سے خطاب کیا تھا،

اس باران کا خطاب ہائیڈروجن بم کی تیاری کے خلاف احتجاج تھا۔ بعد میں ان کی تقریر The Ultimate Decision نامی ایک کتابچے کی صورت میں شائع کی گئی تھی۔

انہوں نے اپنی تقریر کی ابتدا ان نتائج کے بیان سے کی تھی، جو کسی بڑی جنگ میں ہائیڈروجن بم کے استعمال سے ہو سکتے ہیں: ایک ارب مرد اور عورتوں کی موت اور گریہ ارض کے فضا میں تابکار ملاوٹ، جن کی وجہ سے ایک بھی انسان، جانور اور پودے بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔

آگے چل کر وہ کہتے ہیں:

”دنیا کے مسائل کا حل۔ جوہری جنگ کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم دنیا میں ضروری بالضرور قانون اور ہدایت کو

بواج دیں۔

عوامی احساسات کے اُکسائے ہوئے ہمارے سیاسی رہنماؤں کو سمجھنا چاہیے کہ امن سب سے اہم ہدف ہے۔ وہ امن جو اپنی انسانیت کو، آدمی کے ہر ادارہ جذبے کو منعکس کرتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ روس کا سماجی اور اقتصادی نظام ریاست ہائے متحدہ کے نظام جیسا ہی ہو تا کہ یہ دو عظیم قومیں ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہ سکیں۔ اس اتنا ضروری ہے کہ ریاست ہائے متحدہ کے لوگ روس کے لوگوں کا احترام کریں، ترقی کے لیے ایک ساتھ کام کریں اور باہم اعتراف کریں کہ اب جنگ انسانیت کی قسمت کے فیصلے کے قابل نہیں رہی ہے۔ ایک بار دنیا کے لوگ اس قسم کے احساسات کا اظہار کر دیں تو مشرق اور مغرب، دنیا کے تمام معاملات میں منصفانہ فیصلے کر سکیں گے اور زیادہ سے زیادہ روشن مستقبل کے لیے شانے سے شانہ ملا کر آگے بڑھ سکیں گے۔“

1950 کی اس تقریر کے بعد اسی موضوع پر خطبوں کا ایک سلسلہ چلا تھا کہ اگر ایک بڑی جوہری جنگ

چھڑ جائے تو کیا ہوگا؟

ایسے بہت سے لوگ تھے جنہوں نے لائسنس پلاننگ کی تنبیہ پر دھیان دیا تھا مگر ان کے الفاظ پر امریکی عوام کی طرف سے کوئی رد عمل نہیں آیا۔ سائنس دانوں اور امن کے اداروں کے باہر کے لوگ ان سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ اور خود عوام بھی انہیں کتنا جانتے تھے؟ ریاست ہائے متحدہ میں۔ جیسا کہ بعد میں ہمارے کے عوام میں ہوا۔ ان کی تنبیہات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

ریاست ہائے متحدہ نے اپنے پہلے ہائیڈروجن بم کا نومبر 1952 میں تجربہ کیا تھا، اور اس کے بعد 1953 میں روس نے بھی تجربہ کیا۔ اب سرد جنگ ایک زیادہ غیر مصالحتانہ دور میں داخل ہو چکی تھی، مگر لائسنس پلاننگ کی آواز خاموش نہیں کی جاسکتی تھی۔ اُن تھک اور بڑا لائسنس پلاننگ، جن کے نظریات کو بہت سے سائنس دانوں کی حمایت حاصل تھی، بار بار اپنی تنبیہ کو دہراتے رہے تھے کہ اگر ہائیڈروجن بم استعمال کیا گیا تو خوف ناگ تہدی ہوگی اور بڑے پیمانے پر انسانی جان کا ضیاع ہوگا۔ لائسنس کہتے تھے ”ان ہتھیاروں کے حجم پر کوئی قیامی حد نہیں لگائی جاسکتی۔“

اس وقت پلاننگ کے دستخط سے جاری ہونے والی 15 جولائی 1955 کی اپیل Mainau اعلان کے نام سے اچھی طرح جانی جاتی ہے۔ اس پر باؤن نوٹیل انعام پانے والوں نے دستخط کیے تھے، جن میں بیشتر

سائنس دان تھے۔ یہ پائل اتنی اہم دستاویز ہے کہ میں اس کا حوالہ دینا چاہوں گا:

”ہم دستخط کرنے والے، سائنس دان ہیں مختلف ممالک کے، مختلف مذاہب کے، مختلف سیاسی ترجیحات کے۔ ہمارے ہم صرف نوٹیل انعام کے ذریعے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں، مہربانی سے جو ہمیں دیے گئے ہیں۔ اپنی خوشی سے ہم نے اپنی زندگیوں کو سائنس کی خدمات کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ہمارے نزدیک عوام کے لیے بہتر زندگی کا یہی ایک راستہ ہے۔ ہم دہشت سے دیکھ رہے ہیں کہ یہی سائنس بنی نوع انسان کو اپنے آپ کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے وسائل مہیا کر رہی ہے۔ مکمل فوجی استعمال سے جو آج قابل عمل ہے، کمرۂ ارض کو جو مری تا بکاری سے اس حد تک آلودہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک دن تمام انسان صفحہ ہستی سے غائب ہو جائیں گے۔ غیر لڑاکا لوگوں کے ساتھ غیر جانب دار بھی مر سکتے ہیں۔

اگر بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ شروع ہو جائے تو کون اس بات کی ضمانت دے سکتا ہے کہ یہ بڑھ کر ایک خوف ناک تنازعہ نہیں بنے گی؟ ایک قوم جو ایک مکمل جنگ میں الجھی ہو یہ ہمارے دینی ہے کہ وہ نہ صرف اپنی زندگی تباہ کر رہی ہے، بلکہ پوری دنیا کو خطرے میں ڈال رہی ہے۔

ہمیں اس بات سے انکار نہیں کر ساید ان ہتھیاروں کے خوف سے ہی امن قائم رکھا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود میرے خیال میں یہ ایک وہم ہی ہوگا، اگر حکومتیں یہ سمجھتی ہیں کہ ان ہتھیاروں کے خوف سے وہ بہت عرصے تک جنگ کو مال سکتی ہیں۔ خوف اور تناؤ نے اکثر جنگیں پیدا کی ہیں۔ اسی طرح، ہمارے نزدیک یہ یقین بھی ایک وہم ہے کہ چھوٹے تنازعات ہمیشہ روایتی ہتھیاروں کی جنگ سے حل کیے جاسکتے ہیں۔ جب خطرہ حد سے زیادہ بڑھ جائے تو کوئی بھی قوم کسی بھی قسم کے ہتھیار کو استعمال کرنے سے باز نہیں آئے گی۔ سائنسی ٹیکنالوجی جسے تیار کر سکتی ہو۔

ہر قوم کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ بالآخر وہ طاقت کے استعمال سے دست بردار ہو جائے گی۔ اور اگر وہ اس عمل کے لیے تیار نہیں ہے تو وہ صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔“

اس وقت کے دشوار موسم میں، یہ بات تعجب نہیں تھی کہ رفتہ رفتہ لائسنس پائلنگ تنہا اور ماٹ باہر کر دیے گئے تھے اس شبہ کی بنا پر کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔

پچھلی صدی کے پانچویں عشرے میں کئی مختلف موقعوں پر، مثال کے طور پر 1952 میں، ارباب اقتدار نے ان کا پاسپورٹ اس وقت تک کے لیے روکے رکھا تھا جب وہ سائنسی نوعیت کی کانفرنس میں شرکت کے لیے سفر کرنا چاہتے تھے۔ یہ بتا دینا انصاف کے مطابق کافی ہوگا کہ واشنگٹن سے براہ راست درخواست پر ان کا پاسپورٹ جاری کر دیا گیا تھا۔

1955 میں ڈاکٹر پائلنگ ریاست ہائے متحدہ کی سینیٹ کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے تھے جو پاسپورٹ کے دفتر کے بارے میں تحقیقات کر رہی تھی۔ اس وقت ان سے کمیونسٹوں اور کمیونسٹوں کے ہمدردوں سے تعلقات کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ اس زمانے میں اکثر لوگوں کے ساتھ ایسا ہوا کرتا

تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ خود کمیونسٹ ہیں، تو لائٹنس پائلنگ نے جواب میں یہی کچھ دہرایا تھا جو انہوں نے کئی بار صفا کہا تھا: کروہ کمیونسٹ نہیں، کروہ کبھی کمیونسٹ نہیں رہے تھے، کروہ crypto کمیونسٹ تھے نہ مارکسسٹ، کہ انہوں نے نہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کی مدد کی تھی اور نہ پارٹی کی ہدایات پر عمل کیا تھا۔ اس سینئر نے جو تفتیش کر رہا تھا کہا کہ اس کے اپنے تاثر کے مطابق ”کمیونسٹ اپنی پارٹی کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔“ کیسٹی اس سے آگے پیچ نہیں سکی اس لیے پائلنگ کو چند برسوں کی مہلت مل گئی۔

جو کوئی بھی پائلنگ اور ان کے خیالات سے واقف ہو، جس نے بھی ان کو تقریر کرتے سنا ہو اور ان کی تحریریں پڑھی ہوں، یا ان کو تقریر کرتے سنا ہو، اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کسی طرح بھی کمیونسٹ نہیں۔ اس دوران، ریاست ہائے متحدہ، برطانیہ، مغربی جرمنی اور سوویت یونین نے جنوں ہی اپنے جوہری تجربات بڑھائے، کریمیا کی فضا میں جوہری تابکاری بڑھ گئی تھی۔

جلدی زیادہ سے زیادہ سائنس دان، ہومانی صحت اور موروٹی عناصر کے بارے میں غورمند تھے ان تجربات کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔

جوہری تابکاری کے خطرات کو بھانپنے والوں میں لائٹنس پائلنگ بھی شامل تھے اور 1950 کے عشرے میں انہوں نے اپنے وقت اور اپنی توانائی کا بہترین حصہ تجرباتی دھماکوں کے خلاف مہم میں صرف کیا۔ وہ مسلسل کہتے رہے تھے کہ ان تجربات کو جوہری اور ہائیڈروجن بم رکھنے والی طاقتوں کے درمیان معاہدے سے روکا جانا چاہیے اور یہ بھی کہ معاہدے کو عملی بین الاقوامی نگرانی میں نافذ کیا جانا چاہیے۔ جوہری بموں کے تجربات کے خلاف جدوجہد کے دوران لائٹنس پائلنگ ساری دنیا میں مشہور بھی ہوئے اور متنازعہ بھی رہے۔

مستقبل کی نسلوں پر ہونے والی جوہری تابکاری کے اثرات کا اندازہ کرنے کی غرض سے لائٹنس پائلنگ نے اپنے طور پر تفتیش کی اور ریاضیاتی تخمینے لگائے، اور جو تخمینے انہوں نے پیش کیے وہ ہمیشہ تحفظات کے ساتھ پیش کیے تھے، اس لیے ان میں بہت سے نامعلوم عناصر بھی شامل تھے۔

انہوں نے بار بار کہا ہے، ”ہو سکتا ہے کہ میرے پیش کیے ہوئے اعداد و شمار بہت زیادہ ہوں، ہو سکتا ہے کہ بہت بار یہ کم بھی ہے ہوں،“ مگر ان کے پیش کیے ہوئے تخمینوں کو دہروں کی تائید حاصل رہی ہے۔ میں آپ کو البرٹ شوائٹزر (Albert Schweitzer) کا صرف وہ پیغام یاد دلانا چاہتا ہوں جو اوسلورینڈیو سے 123 اپریل 1957 کو نشر ہوا تھا۔

سب سے پہلے تو پائلنگ کو ریاست ہائے متحدہ کے جوہری توانائی کمیشن کے دو سائنس دانوں E. Teller اور W.F. Libby کے اختلاف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ریاضیاتی نتائج پر انہیں زیادہ اختلاف نہیں تھا، جتنا کہ اس سے اخذ کیے ہوئے نتائج کے تخمینوں سے تھا۔ ٹیلر اور ٹیلی مانتے ہیں کہ جوہری تابکاری نقصان دہ ہے، مگر اس حقیقت کو اضافی سمجھتے ہیں جب اس کو

ان خطرات کے مقابلے میں رکھا جائے جوہری ہتھیاروں کے نہ ہونے کی صورت میں جو درپیش ہوں گے۔
دوسری جانب تجرباتی دھماکوں کے بارے میں پائلنگ کا موقف اس پر منحصر نہیں کہ اس میں کتنے کم یا زیادہ لوگ متاثر ہوں گے۔

ڈاکٹر یونیورسٹی، سینٹ لوئیس کے طلبہ سے 15 مئی 1957 کے اپنے خطاب میں انہوں نے اس وقت تک کی معلومات کی روشنی میں انسان کے وراثتی عناصر پر تابکاری کے اثرات کے بارے میں باتیں کی تھیں۔ بہت سی باتوں کے علاوہ انہوں نے کہا تھا، ”میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی منصوبے پر کسی انسان کو قربان نہیں کیا جانا چاہیے، بالخصوص ایسے جوہری ہتھیاروں کی بھرتی کے لیے جو کروڑوں افراد کی موت کا باعث ہو سکتے ہیں، اور اس نہ خوب صورت دنیا کو ہم جس میں ہم رہتے ہیں تباہ کیا جاسکتا ہے، نہ کسی انسان کو قربان کیا جاسکتا ہے۔“

اس خطاب کے بعد انہوں نے اپنی اپیل تیار کی جو عوام کی کشش کا باعث ہوئی تھی۔ اس اپیل پر 2,000 سے زیادہ امریکی سائنس دانوں نے دستخط کیے تھے اور بعد میں جب اس کو مشترکہ کیا گیا تو 49 ملکوں کے 8,000 غیر ملکی طلبہ نے بھی اس پر دستخط کر دیے۔

1958 میں شائع ہونے والی اپنی کتاب 'No More War' میں لائسنس پائلنگ نے دستخط کے حصول کے بارے میں تفصیلات بیان کی تھیں۔

یہ درخواست سائنس دانوں کی انفرادی کوششیں کا نتیجہ تھی۔ کوئی ادارہ اس کے مشترکہ کرنے اور دستخط حاصل کرنے کا ذمہ دار نہیں تھا۔ سارا کام محض شخصی بھرپور جذبے اور انجام دیا تھا۔

جنوری 1958 میں لائسنس پائلنگ اور ان کی اہلیہ ایوا ہیلن پائلنگ (Ava Helen Pauling) نے 11,021 دستخطوں کے ساتھ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل داگ ہامر ہولڈ (Dag Hammarskjöld) کو ایک اپیل پیش کی تھی۔ پائلنگ نے اپنی اپیل میں لکھا تھا:

”ہم سائنس دان جن کے نام اور دستخط نیچے دیے گئے ہیں، اصرار کرتے ہیں کہ جوہری ہتھیاروں کے تجربات کو بند کرنے کے لیے فوراً ایک بین الاقوامی معاہدہ کیا جائے۔

جوہری ہتھیار کا ہر تجربہ دنیا کے ہر حصے پر تابکار عناصر کا اضافی بوجھ ڈالتا ہے۔ تابکاری کی ہر مقدار دنیا بھر کے انسانوں کی صحت پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے اور انسانی ”پلانز“ کے جراثیم کے خزانے کو نقصان پہنچاتی ہے، جس کے نتیجے میں مستقبل کی نسلوں میں شدید قسم کی خرابیوں والے بے شمار بچے پیدا ہوں گے۔

جب تک صرف تین طاقتوں کے ہاتھوں میں یہ ہتھیار موجود ہیں، ان پر کنٹرول کے لیے ایک معاہدہ کارآمد ہوگا۔ اگر تجربات جاری رہے، اور ان ہتھیاروں کی ملکیت مزید حکومتوں تک پھیل جاتی ہے تو کچھ غیر ذمہ دار قومی رہنماؤں کے ہاتھوں انسانی تہی کی جوہری جنگ شروع ہونے کے خطرات بڑھ سکتے ہیں۔
جوہری ہتھیاروں کے تجربات کو روکنے کے لیے ایک بین الاقوامی معاہدہ عمومی ترک اسلحہ جات

اور جوہری ہتھیاروں کے انسداد کی طرف پہلا قدم ہو سکتا ہے، جو جوہری جنگ شروع ہونے کے امکانات کو بھی دور کر سکتا جس سے پوری انسانیت کے لیے بڑی تباہی ہو سکتی ہے۔

ہمارے درمیان تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے ایک گہرا مشترک ہدف ہے۔ سائنس دان ہونے کے باعث ہم خطرات کا علم رکھتے ہیں اس لیے ہم پر خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی کہ ہم ان خطرات کو مستحکم کریں۔ ہم اس کو ضروری جانتے ہیں کہ جوہری ہتھیاروں کے تجربات کو روکنے کے لیے جلد از جلد ایک بین الاقوامی معاہدہ بنایا جائے۔“

یورپچر، 1958 میں، پہلے سے کوئی معاہدہ کیے بغیر سوویت یونین نے، ریاست ہائے متحدہ اور برطانیہ عظمیٰ نے جوہری ہتھیاروں کے تجربات بند کر دیے۔

سائنس دانوں کے اظہار کا۔ جن میں سب سے آگے لائنس پالنگ اور ایمرٹ شوٹنبرگر تھے۔ اس سلسلے میں کیا کردار تھا، اس بارے میں وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسرے سائنس دانوں کے ساتھ مل کر ان دونوں نے لوگوں کو جوہری ہتھیاروں کے تجربات کے خطرات سے آگاہ کیا، اور ظاہر ہے کہ ہر حکومت کو رائے عامہ کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے، اس کا کھلے ہندوں اظہار کیا جائے یا نہیں۔

پالنگ کی مہم کو اندرون ملک بھی اور بیرون ملک بھی، بے حد حیرت و توجہ ملی۔ ایک بار پچر، ریاست ہائے متحدہ کی Internal Security Subcommittee نے ان کو پوچھ چھچھے کے لیے طلب کیا۔ پہلا انٹرویو 21 جون 1960 کو اور دوسرا اسی برس کی 11 اکتوبر کو ہوا تھا۔ پالنگ کی درخواست کے مطابق سماعت کھلے عام کی گئی، اور اس کی روئیداد ہر ایک کے مطالعے کی خاطر شائع کی گئی تھی۔

ذیلی کمیٹی کا بنیادی مقصد یہ دریافت کرنا تھا کہ گیارہ ہزار دستخط کس طرح حاصل کیے گئے تھے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ایٹل کمیونسٹوں کے اشارے پر کی گئی تھی۔ اور لائنس پالنگ کو ایک بار پھر کمیونسٹ ہونے کے الزام کا سامنا تھا۔

پالنگ نے سوال کے جواب بڑے کھلے دل اور مصفا سے دیے۔ کمیونزم کے بارے میں ان کے اپنے رویے کے جواب میں انہوں نے کہا تھا، ”پارادینا“ میں ایک میٹنگ کے دوران میں نے ایک حلفیہ بیان دیا تھا جو میں نے یہ کہنے کے لیے تیار کیا تھا کہ نہ میں کمیونسٹ ہوں، نہ میں کبھی کمیونسٹ تھا، اور نہ کبھی میں کمیونسٹ پارٹی سے میرا کوئی تعلق رہا ہے، اور یہی سچ ہے۔۔۔“

بعد میں، سماعت کے دوران انہوں نے کہا، ”میں جتنا کچھ مارکسزم کے بارے میں جانتا ہوں اس زیادہ جانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم کسی بارے میں بھی بہت زیادہ جان نہیں سکتے۔۔۔ میں سمجھ کی ماوریت کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ مگر میں سنسر شپ پر یقین نہیں رکھتا۔ میں اساعت کی آزادی پر یقین رکھتا ہوں۔“

انہوں نے ذیلی کمیٹی کو تمام حقائق سے آگاہ کر دیا، کہ کس طرح 11,021 سائنس دانوں نے ایٹل پر

دستخط کرنے پر آمادہ ہوئے تھے۔

مگر جب ذیلی کمیٹی نے ان لوگوں کے ناموں کی فہرست طلب کی جنہوں نے دستخط اکٹھا کرنے میں ان کی مدد کی تھی تو ان کا جواب تھا، ”میرا خیال ہے کہ شاید میری شہرت اور میری مثال نے نوجوان لوگوں کو امن کے لیے اس طرح کام کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں خود کو محفوظ کرنے کے لیے آدرش والے اور پُر امید لوگوں کو قربان کر دوں۔ اور میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔۔۔ اس لیے کہ جس کسی کو بھی اس کمیٹی کے سامنے پیش ہونا پڑا تو وہ خطرے میں ہوگا۔ اس کی ملازمت ختم ہو سکتی ہے۔“

لائسنس پائلنگ کے لیے ذیلی کمیٹی کی جانب سے کیے گئے سوالوں کا جواب دینے سے انکار کرنا، ایک مشکل معاملہ تھا، اور انہیں احساس تھا کہ کانگریس کی تختیر کرنے پر انہیں مزائے قید کا خطرہ تھا۔

پائلنگ نے ذیلی کمیٹی کی جانب سے ان لوگوں کے نام طلب کرنے کے خلاف، جنہوں نے اپیل پر دستخط حاصل کرنے میں ان کی مدد کی تھی، عدالت کا فیصلہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہر شخص کو فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا آئینی حق حاصل ہوتا ہے۔ پائلنگ دو وجوہ کی بنا پر موافقانہ فیصلہ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ عدالت عالیہ میں ان کی اپیل سنی نہیں گئی تھی اس لیے کہ ذیلی کمیٹی نے معاملے کو واپس لے لیا تھا۔ اس نے محض اپنی معلومات پر مبنی ایک رپورٹ شائع کر دی جس میں چند بڑے اخبارات پر تنقید کی تھی کہ وہ ایک طرفہ ہو گئے تھے اور انہوں نے پائلنگ کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔

اگرچہ مختلف محکموں کی جانب سے مخالفت کی جا رہی تھی، پائلنگ کا نام اور ان کے خیالات بہتر انداز میں سامنے آئے اور جس طریقے سے ان کے معاملے کی سماعت کی گئی تھی انہیں مزید تائید حاصل ہوئی، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے جب ایک اچھے مقصد پر حملہ کیا جا رہا ہو۔

نڈر لائنس پائلنگ اور ان کی اہلیہ ایوا ہیلن پائلنگ نے سیکڑوں تقریروں اور ٹیکچروں کے ذریعے اپنی مہم جاری رکھی۔ ان کی اہلیہ نے ان کی ہر قدم پر ہمت افزائی کی اور پیش بہا تعاون کیا ہے۔ عورتوں کے لیے خاص اپیل رکھنے والے ان کے امن ٹیکچر بہت اثر انگیز رہے تھے۔

ایک مختصر سی تقریر میں لائنس پائلنگ کی تمام تقریروں پر اور کانفرنسوں پر بات کرنا ممکن نہیں۔ لہذا مجھے اپنے آپ کو امن اور ترک اسلحہ جات کی چند کانفرنسوں تک ہی محدود رکھنا پڑے گا، جیسے 1959 میں جوہری اور ہائیڈروجن بم کے خلاف بیرو شیمیا میں منعقد کی جانے والے کانفرنس، جس میں انہوں نے وہ تجویز خود تحریر کی تھی جو میٹنگ کے بعد جاری کی گئی تھی۔

اس تجویز میں کہا گیا تھا کہ ایک بین الاقوامی معاہدہ ہونا چاہیے جس میں قوموں کو ضمانت دینی چاہیے کہ جوہری بم کے تجربات اور نئے بموں کی تیاری پر کام نہیں کیے جائیں گے۔ نہ ہی اس قسم کے ہتھیار دوسری قوموں میں تقسیم کیے جائیں گے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان ایک طیر جانب دار علاقہ قائم کیا جانا چاہیے۔ غیر جانبدار رہنے والے ملکوں میں، بشمول شرقی اور مغربی جرمنی، اور ان سے ملحقہ ملکوں میں، اور جاپان میں؛

قدرتی طور پر چین کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

مئی 1961 میں لائٹس پلانگ اوران کی اہلیہ نے جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے خلاف اوسلو میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ چندہ ملکوں کے سائنس دانوں نے شرکت کی، اور منظور کی جانے والی تجویز کا اہم نکتہ یہ تھا کہ جوہری ہتھیاروں کو دوسرے ملکوں تک پھیلانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، اس لیے کہ اس قسم کا پھیلاؤ کچھ ممالک کی طاقت میں اضافہ کرے گا جو جان بوجہ کہ جوہری ہتھیاروں سے پیدا ہونے والے جنگ کے خطرات میں اضافہ کریں گے۔ مزید یہ بھی کہ ان ہتھیاروں کا پھیلاؤ ترک اسلحہ جات کے امکانات کو کم بھی کر دے گا۔

یکم ستمبر 1961 کو سوویت یونین نے فضا میں جوہری تجربات دوبارہ شروع کر دیے اور پچاس میگاٹن طاقت کے بم کا دھماکا کرنے کا اعلان کر دیا۔ 18 اکتوبر کو پلانگ نے وزیر اعظم خروشیف کو ایک تار روانہ کیا جس میں اس منسوبے پر عمل درآمد نہ کرنے کی عاجزانہ درخواست کی گئی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے ایک تار صدر کینیڈی کو بھی روانہ کیا تھا، اس درخواست کے ساتھ کہ ریاست ہائے متحدہ اعلان کر دے کہ اب فضا میں کوئی تجربہ نہیں کیا جائے گا، بشرطے کہ سوویت یونین پچاس میگاٹن کے جوہری بم کے دھماکے کو منسوخ کر دے۔ انھیں خروشیف کی جانب سے 26 دسمبر کا لکھا ہوا جواب موصول ہوا جس کا نچوڑ یہ تھا کہ افسوس ہے کہ سوویت یونین نے جوہری ہتھیاروں کے تجربات جاری رکھے گا، اور انہوں نے افسوس ظاہر کیا تھا کہ طے شدہ فیصلوں کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ وجود یہ وی گئی تھیں کہ مغربی طاقتیں خود کو مسلح کر رہی ہیں، اور سوویت یونین اس عمل سے اپنے لیے خطرہ محسوس کرتا ہے۔

اس طرح اپنی تمام کوششوں کے باوجود لائٹس پلانگ کامیاب نہیں ہوئے۔

ساتھ ہی وہ جوہری بم کے حملے سے بچاؤ کی پناہ گاہوں کے معاملے میں بڑی طرح الجھے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ پناہ گاہیں جوہری جنگ میں مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد میں کمی نہیں کر سکیں گی، اس لیے کہ ان کی تعمیر یہ غلط تصور پیش کرے گی کہ جوہری جنگ ہونی اتنی خطرناک نہیں۔ وہ اپنی تقریروں اور مضامین کے ذریعے عام لوگوں کے لیے اس نکتے پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے رہے۔

نومبر 1961 میں پلانگ اوران کی اہلیہ کو ماسکو کی سائنس اکادمی نے اپنے صد سالہ جشن میں شرکت کے لیے مدعو کیا تھا۔ وہاں قیام کے دوران، دونوں سے ترک اسلحہ جات اور امن کے بارے میں نیکچر دینے کی فرمائش کی گئی تھی۔ پلانگ کا نیکچران ہی دلائل پر مبنی تھا جو انہوں نے ریاست ہائے متحدہ میں استعمال کیے تھے مگر انہوں نے سوویت یونین کے نئے جوہری تجربات کے خطرات پر زور دیا تھا۔ وہاں انھیں اس دہیل کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ سوویت یونین کو تجربات جاری رکھنے پر اس لیے مجبور ہونا پڑا ہے کہ اسے ایسے ہتھیار کی ضرورت ہے جن کی مدد سے جوہری جنگ کو چھڑانے سے روکا جاسکے۔ پلانگ نے واضح کیا کہ ایسی ہی دہیل ریاست ہائے متحدہ کے وہ لوگ پیش کرتے ہیں جو جوہری تجربات کو جاری رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔

ماسکو میں قیام کے دوران، پالنگ نے وزیر اعظم خروشیف سے ایٹمی واپس کی درخواست کی تھی۔ جب ان کی درخواست رد کر دی گئی تو انہوں نے روسی رہنما کو وہ خط لکھے اور جوہری تجربات پر پابندی لگانے سے متعلق معاہدے کا ایک مسودہ بھی بھیجا تھا۔ ان کی تجویز بنیادی طور پر 25 جولائی 1963 کے معاہدے کے مسودے سے ملتی ہے جو تجربات پر پابندی سے متعلق ہے۔

نیم مارچ 1962 کو ریاست ہائے متحدہ نے فضا میں جوہری تجربات دوبارہ شروع کر دیے۔ اکتوبر 1962 میں پالنگ یہ کہنے کے موقف میں آئے کہ پچھلے برس کے دوران سوویت یونین میں شروع کیے جانے والے تجربات فضا میں دو گنا تابکاری کا باعث ہوئے ہیں، اور اس تابکاری کی مقدار اتنی ہی ہے جتنی کہ مجموعی طور پر پچھلے سالہ برس کے تجربات نے فضا میں گھولی ہے۔

1963 سے جاری رہنے والے مستقل تعطل کی وجہ سے جوہری تجربات پر پابندی کے معاہدے پر بحث کے دوران اس وقت کچھ پیش قدمی ہوئی جب ریاست ہائے متحدہ، سوویت یونین اور برطانیہ عظمیٰ بھی معاہدے میں شامل ہو گئے۔ ماسکو میں اس معاہدے پر 25 جولائی 1963 کو دستخط ہوئے تھے اور 10 اکتوبر سے اس پر نفاذ شروع ہوا تھا۔ اب تک زیادہ تر ملکوں نے اس پر دستخط کر دیے ہیں، جب کہ فرانس اور چین نے دستخط سے گریز کیا۔

امریکی عوام سے اپنے 26 جولائی کے بہترین خطاب کے دوران، انجمنی صدر جان کینیڈی نے کہا تھا: پھر بھی، صحت کے عام خطرات کے مقابلے میں ہمارے بچے، ہمارے بچوں کے بچے، جن کی ہڈیوں میں سرطان ہو خون میں لیوکیمیہ ہو، یا ان کے پیچھے پھڑوں میں زہر ہو، اعداد شمار کے حساب سے ایک چھوٹا سا خطرہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ قدرتی خطرہ نہیں ہے، اور یہ اعداد شمار کا مسئلہ بھی نہیں۔ ایک انسانی جان کا ضیاع، یا ہمارے چلے جانے کے بعد بھی اگر کوئی معذور بچہ پیدا ہو تو، ہم سب کے لیے فکر کا باعث بنتا ہے۔

صدر کینیڈی نے اپنی تقریر میں صاف کہا ہے کہ جوہری تجربات کے بارے میں ان کے خیالات ان ہی اخلاقی رویوں پر مبنی ہیں، لائسنس پالنگ جس پر ایک عرصے سے قائم ہیں۔

کسی کو بھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ دراصل لائسنس پالنگ خود جوہری تجربات پر پابندی کے یا بیڑی طاقتوں کی کوششوں کے معاہدے کے ذمے دار ہیں جو سب کو قبول ہوں۔

مگر کیا ہم محض اس بات پر یقین ہے کہ یہ بیوقوف مکمل نہ ہوا ہوتا اگر اس کا ذمے دار کوئی سائنس دان نہ ہوتا، جس نے ممال بہ ممال اپنی ان تحکک کوششوں سے ابواب اقتدار اور عوام کو یہ باور نہ کرایا ہوتا کہ جوہری تجربات حقیقی طور پر کتنے خطرناک ہوتے ہیں؟

صدر کینیڈی نے بھی اپنی تقریر میں جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے بڑے خطرے پر زور دیا تھا، جو زیادہ سے زیادہ ملکوں کو لاحق ہے۔ ان کے اپنے الفاظ تھے، ”میں آپ سے ایک لمحہ توقف کرنے اور اس بات پر غور کرنے کی استدعا کرتا ہوں کہ جوہری ہتھیاروں کا بہت سارے ہاتھوں، چھوٹے بڑے، ذمے دار

اور غیر ذمے دار دنیا بھر میں بجھڑے بہت سارے ملکوں کی دسترس میں آ جانے کا مطلب کیا ہوگا۔ کسی کے لیے نہ چین ہوگا، نہ استحکام، نہ حقیقی تحفظ اور نہ ترک اسلحہ جات کا کو کوئی امکان بھی نہیں ہوگا۔“
Test Ban Treaty کا نفاذ ہو چکا ہے، مگر یہ ایک مکمل ترک اسلحہ جات اور امن کی جانب پہلا اور چھوٹا سا قدم ہے۔

راستہ ضویل اور مشکل ہو سکتا ہے، مگر لائٹنس پالنگ اس امر پر محکم یقین رکھنے والے انسان ہیں کہ ایک دن بنی نوع انسان جنگ پر پابندی میں کامیاب ہو جائے گی، ”مجھے یقین ہے کہ دنیا میں فوج کی شیطانی طاقت سے، جوہری بموں کی طاقت سے بھی بڑی ایک طاقت ہے۔ نیکی کی، اخلاق کی اور انسانیت پرستی کی طاقت۔“

ان کی رائے میں ممکن ہوگا کہ ان طاقتوں کو ایک عالمی کمیونٹی بنانے میں شامل کیا جائے، جس میں قوموں کے اعمال پر بین الاقوامی قانون اور انصاف کے ذریعے نگرانی کی جائے اور قابو رکھا جائے۔
جہاں تک میں جانتا ہوں، لائٹنس پالنگ نے مستقبل کے لیے کوئی ٹھوس پروگرام تیار نہیں کیا ہے۔ مگر ایک بات یقینی ہے: کہ وہ سائنس کے کردار پر بہت بھروسہ کرتے ہیں جو ان کے World Peace Research Organization قائم کرنے کے خیال سے ثابت ہوتا ہے، جو اقوام متحدہ سے منسلک ہو اور سائنس کی ہر شاخ کی، جس میں فطرتی سائنس اور انسانیات بھی شامل ہوں، نمائندگی کرے۔

اس قسم کی تنظیم کو علم اور عقل کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے۔ اسی وجہ سے لائٹنس پالنگ نے California Institute of Technology کی اپنا سادینا شاخ سے استعفیٰ دے کر ’مرائنا باربرا‘ میں قائم Center for the Study of Democratic Institutions میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ ان کے قول کے مطابق یہ قدم انہوں نے اس لیے اٹھایا ہے کہ یہ ادارہ امن پر کام کرنے کی پوری آزادی فراہم کرتا ہے۔
وہ اس موقع کو مستقبل کے منصوبوں پر تحقیق کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔
یہ لائٹنس پالنگ کا بلند اخلاقی رویہ ہے جس نے ان کو جوہری ہتھیاروں کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا ہے۔

اپنی مہم کے ذریعے، لائٹنس پالنگ نے خود پر ایک اخلاقی ذمے داری عائد کر لی ہے جو ان کے خیال میں سائنس کو اٹھانی چاہیے بنی نوع انسان کے مقصوم کے لیے، آج بھی اور مستقبل کے لیے بھی۔
یہ سائنس دان کی فطرت سے اس کے رازوں کو پھیننے کی خواہش ہے جو لائٹنس پالنگ کو کبھی مطمئن نہیں ہونے دیتی۔ جب تک دنیا قائم ہے، ہمیشہ راز اور مخپے دماغ نئے ہدف کے حصول کے لیے نئی مہمات جاری رکھیں گے۔

اگر لائٹنس پالنگ، اپنی ان تھک کوششوں کے ذریعے سائنس اور اس کے آدرش کو کم ہی سمجھتا رہے۔ تاہم وہم کردیے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تب ان کی مہم ایسی قابل قدر ہو جائے گی جس کی ہم آج کے زندہ لوگ،

مشکل سے اتنی متاثر کر پائیں گے جتنی کہ اس کا حق ہے۔

صدر مشین، ریڈیو ٹیلی کمیونٹی Gunhar Jahn کی زبانی

خطبہ:

سائنس اور امن

مجھے یقین ہے کہ اب کبھی کوئی بڑی جنگ نہیں ہوگی۔ ایسی جنگ جس میں جوہری fission اور جوہری fusion سے بنے خوفناک ہتھیار استعمال ہوں گے۔ اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ سائنس دانوں کی وہ دریا فتنیں جن کی بنیاد پر اسے خوفناک ہتھیار بنائے گئے ہیں، اور جو آج ہمیں دنیا کی تاریخ کے ایک نئے عہد میں، امن اور معقولیت کے عہد میں، داخل ہو جانے پر مجبور کر رہی ہیں، جب دنیا کے مسائل جنگ سے یا طاقت کے ٹک پر نہیں، بلکہ دنیا کے قانون کے مطابق حل ہوتے ہیں، اس طریقے سے جس میں تمام قوموں سے انصاف رہتا ہے اور تمام لوگوں کے لیے بھلائی ہوتی ہے۔

ایک بار پھر میں آپ کو یاد دلانا چاہوں گا، جیسا کہ میں نے 1962 کا نوٹیل انعام قبول کرنے کی تقریر میں کیا تھا، کہ انٹریڈ نوٹیل "بڑے چکانے پر تھی پھیلا نے والا ایسا مادہ یا ایسی مشین ایجاد کرنا چاہتا تھا جس کے خوف سے جنگ کرنا ہمیشہ کے لیے ناممکن ہو جائے۔" دو تہائی صدی کے بعد سائنس دانوں نے دھماکا خیز مادے دریافت کر لیے تھے جو نوٹیل ایجاد کرنا چاہتا تھا: fission کرنے والے یورینیم اور پلوٹونیم، جن کی طاقت نوٹیل کے پسندیدہ دھماکا خیز مائٹرو گھیسرین سے دس ملین گنا زیادہ تھی؛ اور fusion کے قابل مادہ یعنی تھیم ڈیوٹرائیڈ، مائٹرو گھیسرین کے مقابلے میں جس کی دھماکا کرنے کی طاقت پچاس ملین گنا زیادہ تھی۔ ان خطرناک مشینوں کی پہلی مشین جس میں یہ مادے شامل تھے۔ یورینیم 235 اور پلوٹونیم 239 fission بم - 1945 میں Alamogorda ہیروشیما میں اور ناگاساکی میں گرائے گئے تھے۔ پھر 1954 میں، نو بڑے بعد، پہلے fission-fusion-fusion superbombs میں سے 20 میگا ٹن کے Bikini بم کا (تجرباتی) دھماکا کیا گیا تھا، 1945 میں گرائے گئے fission بم کے مقابلے میں جس کی طاقت ایک ہزار گنا زیادہ تھی۔

اس ایک بم - 1954 کے شہر بم - میں ایک ٹن سے کم جوہری دھماکا خیز مادہ شامل تھا۔ اس بم کے دھماکے سے پیدا ہونے والی طاقت، ان تمام دھماکوں کی مجموعی طاقت سے زیادہ تھی جو دنیا کی تاریخ میں ہونے والی تمام جنگوں میں کیے گئے تھے جس میں پہلی اور دوسری عالمی جنگیں بھی شامل ہیں۔

اب تک ہزاروں سپر بم تیار کیے جا چکے ہیں، اور آج، پہلے جوہری بم کی تیاری کے اٹھارہ برس بعد،

جوہری طاقتوں کے پاس ان ہتھیاروں کا استعمال انہما ہے کہ اگر ان کو جنگ میں استعمال کیا جائے تو کروڑوں افراد مارے جائیں گے اور ہمارا تمدن اس تباہی سے بچ نہیں سکے گا۔

نوبیل کی سوچتی ہوئی مشینیں وجود میں آگئی ہیں اور جنگ ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دی گئی ہے۔

دنیا نے اب تاریخ کے اپنے ابتدائی دور سے، جس میں قوموں کے درمیان تلوار سے جنگ سے حل کیے جاتے تھے سنجیدگی کے عہد کی طرف قلبِ مابہیت شروع کر دی ہے، جس میں جنگ منسوخ کر دی جائے گی اور عالمی قانون اس کی جگہ لے لے گا۔ قلبِ مابہیت کا پہلا بڑا درجہ چند ماہ قبل ہی طے ہوا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ، برطانیہ عظمیٰ اور سوویت یونین نے برسوں کے مذاکرات کے بعد ایک میثاق پر دستخط کیے ہیں جس کی رو سے فزکس زمین، سمندروں کی کھراڑوں اور فضاؤں کی بلندیوں میں جوہری ہتھیاروں کے تجربات ختم کر دیے جائیں گے۔ اس میثاق کی توثیق دنیا کے تقریباً تمام ممالک نے کر دی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ شاید مستقبل کے تاریخ داں اس میثاق کو قوموں کی حکومتوں کی طرف سے اٹھائے جانے والے تاریخ ساز اور اہم ترین قدم کے طور پر لکھیں گے، اس لیے کہ یہ معاہدوں کے سلسلے کا پہلا معاہدہ ہے جو ایک نئی دنیا کی طرف رہنمائی کرے گا جس میں جنگ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہوگی۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ امن اور سائنس ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہو گئے ہیں۔ سائنس کی دریافتوں کے باعث، بالخصوص بیچھلی صدی کے درمیان، دنیا بہت تہذیبی ہو گئی ہے۔ ہمارا اضافی علم اب افلاس اور فاقہ کشی کو مٹانے، بیماریوں کے باعث دکھوں میں کمی، اور دنیا کے ویرانوں کے استعمال سے انسانیت کی بھلائی کے امکانات پیدا کر رہا ہے۔ مگر جنگ کے انداز میں، دھماکوں کی طاقت میں کئی ملین گنا اضافے اور بم گرانے کے طریقوں میں سب سے بڑی تہذیبی ہونے لگی ہے۔

یہ تہذیبیاں سائنس دانوں کی دریافتوں کے نتیجے میں ہوئی ہیں، اور پچھلے دو عشروں میں سائنس دانوں نے ان کی طرف اپنے سائنسی انسانوں کی توجہ دلانے، نئے ہتھیاروں کی تیاری کو روکنے، دنیا سے جنگ کو ختم کر دینے میں رہنمائی نہ کر سکا اور ادا کیا ہے۔

اس قسم کے عمل میں سب سے پہلے ان سائنس دانوں نے حصہ لیا جو جوہری بم کی تیاری میں شامل تھے۔ مارچ 1945 میں، پہلے جوہری بم کے گرائے جانے سے قبل، Leo Szilard نے صدر فرانکلین روزویلٹ کے نام ایک مراسلہ بھیجا تھا جس میں اس نے واضح کیا تھا کہ جوہری ہتھیاروں پر کنٹرول کے لیے ایک بین الاقوامی نظام شاید ہمارے تمدن کو بچالے۔ جوہری سائنس دانوں کی ایک کمیٹی نے، جنہو فریک (James Franck) جس کے صدر نشین تھے 11 جون 1945 کو ریاست ہائے متحدہ کے سیکریٹری برائے جنگ کو ایک رپورٹ روانہ کی تھی جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ بغیر اعلان کے جاپان کے خلاف جوہری بم استعمال نہیں کیا جانا چاہیے ورنہ یہ عمل ان ہتھیاروں کی روک تھام کے لیے ہونے والے بین الاقوامی کنٹرول کے معاہدے کے حق میں بڑا ہوگا۔

1946 میں ایبرٹ آئن اسٹائن، میرلڈ یورے (Harold Urey) اور دیگر سائنس دانوں نے امریکی عوام کو جوہری بم اور جوہری دھماکے کے بارے میں تعلیم دینے کی غرض سے ایک تنظیم بنائی تھی۔ Emergency Committee of Atomic Scientists نام کی اس تنظیم نے (جس کو آئن اسٹائن کمیٹی بھی کہا جاتا تھا) پانچ برس کے عرصے پر محیط ایک تعلیمی مہم چلائی تھی۔ اس مہم کی خاصیت مندرجہ ذیل جملوں سے واضح ہوتی ہے جو 1946 کے آئن اسٹائن کے بیان کا حصہ تھے:

”آج جوہری بم نے دنیا کی فطرت میں گہری تبدیلیاں کر دی ہیں، اور نتیجے کے طور پر انسان اپنی خود کو ایک نئے ماحول میں پاتی ہے، جس کے مطابق وہ اپنی سوچ کو تبدیل کر رہی ہے۔۔۔ اس سے پہلے کبھی ایسی جنگ ممکن نہیں ہوتی تھی، جس میں ایک قوم سرحدوں کے پار اپنی فوجیں بھیجے بغیر اس پر حملہ آور ہوتی ہو۔ اب راکٹوں اور جوہری بموں کے باعث کرۂ ارض کے کسی بھی ٹھٹھے کی آبادی کا مرکز ایک واحد اچانک حملے کے ذریعے تباہ ہونے سے بچ نہیں سکتا۔۔۔ بہت کم لوگوں نے جوہری بم دیکھے ہوں گے۔ مگر تمام انسانوں سے اگر چند حقائق بیان کر دیے جائیں تو وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بم اور حقیقی جنگ کا خطرہ ایک حقیقت ہے، جو زیادہ ڈراؤنی ہے۔ یہ براہ راست، دنیا کے ہر انسان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہم اس کو جزلوں، سفینروں، اور سفارت کاروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے کہ وہ نسلوں پر محیط عرصے تک حل ہی تلاش کرتے رہ جائیں۔ ایسے ہتھیار کے خلاف سائنس کے پاس کوئی دفاع نہیں ہوگا، جو پورے تمدن کو مکمل طور پر تباہ کر سکتا ہو۔ ہمارا دفاع نہ اسلحہ جات میں ہے، نہ سائنس میں اور نہ روپوشی میں۔ ہمارا دفاع قانون کی عمل داری میں ہے۔۔۔ مستقبل کی سوچ کو جنگوں کو روکنا ہوگا۔“

اسی عرصے اور بعد کے برسوں میں، سائنس دانوں کی بہت سی دیگر تنظیمیں عوام کو جوہری بموں اور جوہری جنگ کے بارے میں تعلیم دینے میں فعال رہی ہیں، اس سلسلے میں بالخصوص ریاست ہائے متحدہ میں Federation of American Scientists، برطانیہ غرضی میں قائم Atomic Scientists' Association اور World Federation of Scientific Workers کا ذکر کرنا چاہوں گا جس کی روایت بہت سے ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

15 جولائی 1955 کو ایک بہت طاقتور بیان جاری کیا گیا تھا، جس کو Mainau Declaration کہا جاتا ہے۔ اس بیان کو جاری کرنے والوں میں باؤن نوٹیل انعام پانے والے بھی شامل تھے۔ اس بیان نے تحریک کی تھی کہ جوہری عہد کی ایک بڑی جنگ پوری دنیا کو خطرے میں ڈال دے گی، اور یہ بیان مندرجہ ذیل جملوں پر ختم ہوا تھا، ”تمام قوموں کو آخری حربے کے طور پر طاقت سے اٹھایا، لا تعلقی کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس پر عمل کرنے پر تیار نہیں تو ایک دن ان کا وجود صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔“

بڑے مرتبے کی ایک دستاویز، Russell-Einstein Appeal، کو برٹینڈ رسل نے 9 جولائی 1955 کو شائع کیا تھا۔ رسل نے، جو کئی برس سے دنیا میں امن کے سب سے زیادہ فعال کارکن رہے ہیں، چند ماہ قبل

ہی اس دستاویز کا مسودہ تیار کیا تھا، اور آئین انسانوں نے اپنی موت سے دو دن قبل اس پر دستخط کیے تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے نو عدد سائنس دانوں نے بھی دستخط کیے تھے۔ انجیل کی شروعات اس جملے سے ہوئی تھی، ”ان اہم ناک حالات میں جو آج انسانیت کو درپیش ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ سائنس دانوں کو ایک کانفرنس میں یک جا ہو کر ان خطرات کا محاسبہ کرنا چاہیے جو بڑے پیمانے پر تباہی پیدا کرنے والے ہتھیاروں کی تیاری کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔“ اور اس کا اختتام اس نصیحت پر ہوا تھا، ”اگر ہم چاہیں تو، اب خوش حالی، دانش اور علم کی صورت میں ترقی ہمارے سامنے ہے۔ تو کیا ہمیں ان کے عوض موت کا انتخاب کر لیا جائے، اس لیے کہ ہم اپنی دشمنیوں کو فراموش نہیں کر سکتے؟ ہم انسان کی حیثیت میں، انسانوں سے انجیل کرتے ہیں کہ اپنی انسانیت کو یاد رکھو، اور باقی سب کچھ فراموش کر دو۔ اگر تم ایسا کر سکتے ہو تو ایک ابدی جنت کا راستہ کھلا ہوا ہے، اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو تم عالمی موت کا خطرہ مول لے رہے ہو۔“

اس انجیل نے Pugwash Continuing Committee کی تشکیل کا راستہ ہموار کیا، برٹریڈ رسل جس کے صدر منتخب ہوئے، اور اس کے بعد Pugwash کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا (1957 سے 1963 تک) کھل گیا رہ کانفرنس منعقد ہوئیں۔ پہلی چند کانفرنسوں کے لیے مالی امداد سائرس ایٹن (Cyrus Eaton) نے فراہم کی تھی اور پہلی کانفرنس ان کی جائے پیدائش Nova Scotia کے گاؤں Pugwash میں منعقد ہوئی تھی۔

Pugwash کانفرنسوں کے کچھ کے مندوبین ایسے سائنس دان رہے ہیں جن کے اپنے ملکوں کی حکومتوں سے روابط تھے مگر کچھ ایسے بھی تھے جن کے حکومتی اداروں سے کوئی ربط نہیں تھا۔ کانفرنسوں نے ترکیبیں حیات کے سائنسی اور عملی پہلوؤں پر غیر روایتی انداز میں، پوری طرح، کھرے اور تعمیری انداز میں مباحث کی اجازت دے دی ہے، جس کی وجہ سے بہت قابل قدر تجاویز سامنے آئی ہیں۔ میری رائے میں Pugwash کانفرنس 1963 کی Bomb Test Ban Treaty کی تشکیل اور تصدیق میں نہایت بڑا اثر انداز میں کامیاب رہی ہیں۔

Bikini کے مقام پر ہونے والے پہلے fission-fusion-fission بم کے تجربے کے بعد یکم مارچ 1954 کو انسانوں اور انسانی نسل میں مخصوص خرابیوں کا، جو تابکار مادوں کی وجہ سے ہوئی ہیں، معاملہ کافی زور شور سے اٹھایا گیا ہے۔ رسل-آئین انسان انجیل میں تابکار مادوں کے منفی اثرات کا تذکرہ پہلی Pugwash کانفرنس میں بھی کیا گیا تھا۔ 24 اپریل 1957 کو اوسلو میں اپنے Declaration of Conscience میں ڈاکٹر البرٹ شوائتزر نے منفی اثرات کا تذکرہ کیا تھا اور بڑی قوموں سے مطالبہ بھی کیا تھا کہ وہ جوہری ہتھیاروں کے تجربات روک دیں۔ اس کے بعد 15 مئی 1957 کو واشنگٹن یونیورسٹی کے کچھ سائنس دانوں کی مدد سے میں نے Scientists' Bomb Test Appeal تحریر کی، جس پر دو ہفتوں کے اندر دو ہزار سے زیادہ امریکی سائنس دانوں نے دستخط کیے اور چند ماہ کے اندر 49 قوموں کے 11,022 سائنس دانوں کے دستخط ہو گئے۔ 15 جنوری 1958 کو جب میں نے داگ ہیمر ہولم کو درخواست کی صورت

میں ایپل پیش کی تھی، تو میں نے کہا تھا کہ میرے خیال کے مطابق یہ دنیا کے سائنس دانوں کی ایک بڑی اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس Bomb Test Appeal میں پانچ ہجرا گراف تھے۔ پہلے دو نیچے بیان کیے جا رہے ہیں:

”ہم سائنس دان، جن کے نام نیچے درج کیے گئے ہیں، اصرار کرتے ہیں کہ جوہری بموں کے تجربات پر پابندی لگانے کے لیے فوری طور پر ایک بین الاقوامی معاہدہ کیا جائے۔

دنیا کے ہر حصے پر جوہری بم کا تجربہ تابکار عناصر کا اضافی بوجھ ڈال دیتا ہے۔ یہ اضافی مقدار دنیا بھر کے انسانوں کی صحت پر منفی اثرات ڈالتی ہے اور انسانی germ plasma کو بھی نقصان پہنچاتی ہے جس کی وجہ سے مستقبل میں آنے والی نسلوں میں معذور بچے پیدا ہو سکتے ہیں۔“

میں پچھلے بیان کو تفصیل سے بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، جو تنازعے کا باعث ہو رہا ہے۔ ہر برس پیدا ہونے والے 100 ملین بچوں میں سے 4,000,000 میں بڑے چنانے پر جسمانی یا ذہنی نقص پائے گئے ہیں، ایسے نقص جو ان کے والدین کے لیے دکھ کا باعث ہوتے ہیں اور سماج پر ایک بڑا بوجھ پڑ رہا ہے۔ جینیات کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ جینیاتی mutation کی وجہ سے تقریباً پانچ فی صد بچے، یعنی ہر 100,000 نو زائیدہ قدرتی طور پر زیادہ توانائی تابکاری-cosmic شعاعوں اور قدرتی تابکاری کے باعث نقص کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، اس لیے کہ ہمارے اعضائے متماثل ان سے محفوظ نہیں۔ شماریاتی اندازے غیر یقینی ہیں، مگر جینیات کے ماہرین متفق ہیں کہ شماریاتی اندازے بالکل غلط نہیں۔

مزید یہ کہ جینیات کے ماہر مانتے ہیں کہ انسانی متماثل کے خلیے اگر زیادہ توانائی کی تابکاری سے مزید متاثر ہوتے ہیں تو مستقبل کے برسوں میں mutation کا عمل بڑھ جائے گا اور زیادہ تعداد میں معذور بچے پیدا ہوں گے اور یہ اضافی اثرات کی زیادتی کے تناسب سے ہوں گے۔

فضا میں جوہری ہتھیاروں کے دھماکے تابکار fission کی پیداوار، cesium 137, strontium 90, iodine 131 اور دوسری پیداوار کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ نیوٹرون جو دھماکے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں مائیکرو جن مرکزوں سے مل کر فضا میں بڑی مقدار میں کاربن کے تابکار آئیسوٹوپ، یعنی کاربن-14 بناتے ہیں جو بعد میں انسانی جسم کے بنیادی مالیکیول میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس تابکار fission کی پیداوار انسان کے germ plasma کو نقصان پہنچاتے ہیں اور اس طرح زیادہ تعداد میں معذور بچے پیدا ہوتے ہیں۔

کاربن-14 پڑمیں خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ سوویت سائنس دان O.I. Leipunsky نے 1957 میں بتایا تھا کہ جوہری تجربات کی یہ تابکار پیداوار نسل انسانی کو cesium 137 اور دوسری fission پیداوار کے مقابلے میں زیادہ نقصان پہنچائے گی اگر نسل انسانی کاربن-14 کی درمیانہ زندگی سے 8,000 برس سے زیادہ تک باقی رہ گئی۔ بموں کے تجربات سے پیدا ہونے والے کاربن-14 کے جینیاتی اثرات کے اس سے زیادہ قریب آزادانہ اندازے United States Atomic Energy Commission کے ڈاکٹر

ڈاکٹر زیلے اور ڈاکٹر ہولیسٹ (Teller, Zelle, and Hollister) نے پیش کیے ہیں۔ خصوصی طور پر مکمل حقیقت یہ ہے کہ نام نہاد ”صاف ستھرے“ بموں کے تجربات کے دوران معمولی fission والے بم fission-fusion-fission بموں سے زیادہ کاربن-14 پیدا کرتے ہیں۔

Trondheim میں قائم Norwegian Institute of Technology کے ریڈر جیڈال (Reida Nydal) کے ایک حالیہ مطالعے نے دکھایا ہے کہ جوہری تجربات زمین میں کسی اور کسی حد تک تبدیلیاں کرتے ہیں۔ کائناتی شعاعوں کی پیدا کردہ کاربن-14 عام طور پر فضا میں، سمندروں میں اور biosphere میں اتنی مقدار میں موجود رہتی ہے جو قدرتی طور پر بلند سطح کی تابکار توانائی کے ذریعے ایک سے دو فی صد تک جینیاتی تبدیلی کا باعث ہوتی ہے۔ جیڈال نے اپنی تفتیش سے دکھایا ہے کہ پچھلے دس برسوں میں کیے جانے والے جوہری دھماکوں نے فضا میں کاربن-14 کی مقدار دو گنا سے زیادہ کر دی ہے، اور یہ بھی کہ چند برسوں میں انسانوں کے اندر اس کی مقدار بڑھ کر حسب معمول مقدار کی دو یا تین گنا ہو جائے گی جس کے نتیجے میں جین mutation rate بڑھ جائے گا اور زیادہ معذور بچے پیدا ہوں گے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عام طور پر پیدا ہونے والے بچوں کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں جوہری تجربات کی وجہ سے معذور ہونے والے بچوں کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ اس کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مگر میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں، اور ڈاکٹر شائٹلز اور دوسرے بہت سے ماہرین سے اتفاق کرتا ہوں، کہ ہر فرد بشر اہم ہوتا ہے، اور ہماری حرکتوں سے متاثر پیدا ہونے والے ہر بچے کو ایک ڈکھ بھری اور بد بختی کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ صدر کینیڈی نے امریکی عوام سے اپنے 14 جولائی 1963 کے ریڈیائی خطاب میں کہا ہے کہ: ایک بھی انسانی زندگی کا ضیاع، یا ایک بچے کی بھی ناقص ساخت۔ جو اس وقت پیدا ہوگا جب ہم جانچنے ہوں گے۔ ہمارے لیے پریشانی کا باعث ہونا چاہیے۔ ہمارے بچے، ہمارے بچوں کے بچے محض اعداد و شمار نہیں کہ ہمارے نزدیک وہ غیر اہم ہوں۔“

ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ناقص ساخت کے بچے بموں کے تجربات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے پچھلے چھ برسوں میں ان کو شمار کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ میرے اندازے کسی حد تک سال بہ سال تبدیل ہوتے رہے ہیں، اس لیے کہ تجربات کی نئی اطلاعات ملتی رہی ہیں اور کرہ ارض کی تابکار آلودگی میں اضافہ ہوتا رہا ہے، اس لیے اعداد و شمار میں ترمیم ضروری نہیں سمجھی گئی۔

میرے تخمینے کے مطابق 1952 سے 1963 کے درمیان ہونے والے بموں کے تجربات سے پیدا ہونے والی 137 cesium اور fission کی دوسری پیداواری آلودگیوں سے 100,000 زندہ بچے جسمانی اور ذہنی خامی کے ساتھ پیدا ہوں گے، اور مزید 1,500,000 معذور بچے پیدا ہوں گے اگر نسل انسانی ان تجربات سے پیدا ہونے والی کاربن-14 کے اثرات سے بچ نکلے۔ اس کے علاوہ اس سے تقریباً دس گنا زیادہ حمل ضائع ہوں گے اور بچپن کے دوران fission کی مصنوعات سے مر جانے والے بچوں کی تعداد ایک ملین

ہوگی، جب کہ کاربن-14 کے باعث پندرہ ملین بچے جان سے ہاتھ دھوئیں گے۔ اور دوسرے تجربات کی وجہ سے اس سے کہیں زیادہ بچے معمولی خرابیوں کے حامل ہوں گے، یہ معمولی خرابیاں، جینیاتی اموات کو جنمیں جز سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہیے، ایک نسل سے دوسری نسل تک جاتی ہیں، اور مزید خرابیوں اور اموات کا باعث ہوتی ہیں۔

تقریباً پانچ فی صد fission - پیداواری اثر اور کاربن-14 کا پیداواری اثر پہلی نسل میں ظاہر ہو جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جسمانی اور ذہنی نقص سمیت 10,000 زندہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور حمل کے دوران 100,000 کے قریب اموات ہوتی ہیں۔

یہ تخمینے ان کے مہمہ ہیں جو سائنس دان اور بین الاقوامی کمیٹیاں پیش کرتی ہیں۔ یہ ہمارے تخمینے غیر یقینی ہوتے ہیں، اس لیے کہ ہماری اطلاعات میں نقص ہوتا ہے۔ عام طور پر تخمینے اس لیے ناقص ہوتے ہیں کہ اصلی اعداد و شمار کے اعتبار کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تخمینے کے پانچویں حصے کے مہمہ کم ہوں گے یا تخمینے کے پانچ گنا کے مہمہ زیادہ ہوں گے؛ مگر دراصل غلطیاں کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔

مزید یہ کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ تابکاری لیوکیمیہ کے علاوہ اور دوسری بیماریوں کا بھی باعث ہوتی ہے۔ سائنس دان تابکاری کی چھوٹی مقدار سے پیدا ہونے والے carcinogenic تعامل پر اختلاف کر سکتے ہیں، اسی طرح جیسے کاربن-14 کے بارے میں ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجربات سے پیدا ہونے والے strontium 90 سے لیوکیمیہ اور ہڈیوں کا سرطان ہو سکتا ہے؛ آئیوڈین 131 تھا رائیڈ سرطان کا باعث ہو سکتا ہے اور کاربن-14 یہ تمام بیماریاں پیدا کر سکتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق، اس جسمانی اثر کے باعث جو تابکار مادوں سے کرۂ ارض کو آلودہ کر رہا ہے، تقریباً 200,000 افراد اپنی طبعی عمر تک پہنچنے سے دس سے پندرہ برس پہلے ہی ہلاک ہو جائیں گے۔ United States Federal Radiation Council کے 1962 کے تخمینے کے مطابق 1961 تک ہونے والے جوہری تجربات کی وجہ سے ایک لاکھ افراد صرف لیوکیمیہ اور ہڈی کے سرطان سے ہلاک ہو جائیں گے۔

اوپر دیے گئے تخمینے 600 میگاٹن وزن کے بموں کے ہیں۔ اب ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آخر کس قربانی کی قیمت پر فضا میں صرف ایک 20 میگاٹن بم کے تجرباتی دھماکے کیے جا رہے ہیں؟ ہمارا جواب ہوگا۔ اگرچہ یقینی نہ ہونے کے باوجود یہ خوف ناک ہوگا۔ کہ اگر ان قربانیوں سے نسل انسانی بچ بھی جاتی ہے تب بھی، پانچ لاکھ بچوں میں سے پچاس ہزار زندہ تو رہیں گے مگر ان میں کتنی جسمانی اور ذہنی خرابیاں ہوں گی، اور شاید 700,000 افراد جو ابھی زندہ ہیں قبل از وقت لیوکیمیہ یا اور کسی بیماری سے مر جائیں گے جو انہیں تجربات کی آلودگیوں کے وجہ سے لاحق ہوں گی۔

ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے کہ دنیا میں زیادہ تر قوموں نے، 1963 کے میناق پر دستخط کے ذریعے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ وہ فضا میں جوہری تجربات نہیں کریں گے۔ مگر یہ کتنا برا فیصلہ ہے کہ یہ میناق دوسرے

قبل نہیں کیا گیا تھا۔ اب تک کیے جانے والے 600 میگا ٹن کے تجربات میں سے تین چوتھائی، یعنی 450 میگا ٹن کے تجربات 1961 اور 1962 میں کیے گئے تھے۔ 1959 یا 1960 یا 1961 میں بملاق اس لیے نہیں ہو سکا تھا کہ ریاست ہائے متحدہ، برطانیہ عظمیٰ اور سوویت یونین کے درمیان زیر زمین تجربات کے محاسن کے طریقوں پر اختلافات تھے۔ یہ اختلافات 1963 میں دور نہیں کیے جاسکے تھے مگر نفاذ میں تجربات روکنے کا بملاق ہو گیا تھا۔ انسانیت کے لیے یہ کتنا بڑا المیہ تھا کہ حکومتوں نے 1961 میں تجربات دوبارہ شروع کرنے کے خوف ناک قدم اٹھانے سے پہلے اس عمل کو قبول نہیں کیا تھا۔

اب میں چھ برس قبل پیش کی جانے والی جوہری تجربات کی بندش کی درخواست کے بقیہ حصوں کے اقتباسات بھی پیش کروں گا اور ان پر گفتگو بھی کروں گا۔

”جب تک یہ ہتھیار تین بڑی طاقتوں کے ہاتھوں تک محدود رہیں ان پر کنٹرول کے بارے میں معاہدہ کارآمد ہوگا۔ اگر تجربات جاری رہے، اور ان ہتھیاروں کا تعارف مزید حکومتوں تک پھیل جاتا ہے تو کسی بے احتیاط اور غیر ذمے دار قومی رہنما کے اقدام کی وجہ سے ایک بھیا تک جوہری جنگ چھڑنے کے خطرات بہت زیادہ بڑھ جائیں گے۔“

جوہری بموں کے تجربات کو روکنے کے لیے اب ایک بین الاقوامی معاہدہ ترک اسطرح جات، جوہری ہتھیاروں کی قابل عمل تہنیق اور ایسی جنگ کے امکانات کو دور کرنے کی طرف پہلا قدم ہوگا، جو اگر ہوگئی تو پوری انسانیت کے لیے تباہی کا پیغام ہوگی۔

ہم اور ہمارے دوست سب کے سب انسانوں کی بھلائی کے بارے میں بہت فکر مند ہیں۔ ایک سائنس دان ہونے کے باعث ہمیں خطرات کا علم ہے، اس لیے یہ ہماری ذمے داری ہے کہ ہم لوگوں کو ان خطرات سے آشنا کریں۔ لہذا، ہم ہر قسم کے جوہری ہتھیار کے تجربات کو روکنے کے لیے فوری طور پر ایک بین الاقوامی بملاق کو ضروری سمجھتے ہیں۔“

یہ دلیل کتنی وزنی ہے؟ تو کیا موجودہ ہتھیاروں سے لڑی جانے والی جوہری جنگ تمام انسانیت کی تباہی پر منتج ہوگی؟ جوہری ہتھیاروں کی جسامت، مقدار اور اتنا بار بار غور کیا جائے تو جواب ”ہاں“ میں ملتا ہے۔ 25 میگا ٹن وزنی ایک جوہری بم گریہ عرض کے کسی بھی بڑے شہر کو تباہ اور اس کی آبادی کو ہلاک کر سکتا ہے۔ ایسے ہزاروں بم، اور ان کے گرانے کے وسیلے (میزائل)، بنائے جا چکے ہیں۔

جوہری ہتھیاروں کے موجودہ انبار کے بارے میں معلومات جاری نہیں کی گئی ہیں۔ 1960 میں ہونے والی چھٹی Pugwash کانفرنس کے مندوبین نے 60,000 میگا ٹن کے دھماکے کا تخمینہ پیش کیا تھا۔ یہ دوسری عالمی جنگ میں گرائے جانے والے دھماکا خیز مادے سے 10,000 گنا زیادہ ہے۔ یہ اس بات کو ظاہر کرتا کہ 1945 کے بعد سے ہر برس دنیا میں فوجی دھماکے کا اتنا بڑا گنا ہوتا گیا ہے۔ پچھلے تین برسوں میں جوہری ہتھیاروں کی مسلسل تیاری کی روشنی میں، میرے تخمینے کے مطابق، 1963 تک یہ انبار 320,000

میگاٹن تک پہنچ جائے گا۔

یہ تخمینہ مندرجہ ذیل حقائق کی روشنی میں قابل یقین ہے۔ 12 نومبر 1961 ریاست ہائے متحدہ کے سیکریٹری برائے دفاع نے بیان کیا تھا کہ اس وقت تک ان کی فضا نیے کے پاس B-52 بمبار 630، B-58 بمبار 55 اور 1,000 کے قریب B-47 بمبار موجود ہیں، یعنی ان کی مجموعی تعداد 1,685 تھی۔ ان میں سے ہر جہاز 25 میگاٹن کے ایک ساتھ دو بم، یعنی 50 میگاٹن وزن کے بم لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ گویا، ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک مار کرنے والے یہ 1,685 بمبار جہاز (یا میزائل) 84,000 میگاٹن وزن کے بم لے جاسکتے ہیں۔ میں اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ ان جہازوں کے لیے بم مہیا نہیں کیے گئے ہیں۔ سیکریٹری برائے دفاع نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ ریاست ہائے متحدہ کے پاس دوسرے 10,000 طیارے اور راکٹ بھی ہیں جو میگاٹن وزن کی سطح کے بم لے جاسکتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ اور سوویت یونین کے مجموعی میگاٹن جوہری بموں کے مقابلے میں سوویت یونین دو گنا ٹن کے تجربات کر چکا ہے، اور تعجب نہیں کہ سوویت انبار بھی بہت بڑا نہ ہوگا۔ اندازاً ریاست ہائے متحدہ کے انبار کے مقابلے میں ان کا انبار بھی غالباً ایک تہائی یا ڈیڑھ گنا کے برابر ہوگا۔

320,000 میگاٹن جوہری بموں کے انبار کا اصل مطلب اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے: اگر کل ہی 6 میگاٹن کی جنگ ہو اور اس میں دوسری عالمی جنگ کے برابر دھماکے کی طاقت کا استعمال کیا جائے، اور دوسرے دن بھی ویسی ہی جنگ ہو، اور ہر دن اسی طرح دھماکا خیز مادہ استعمال ہو، اور 146 برس تک ہر روز ایسا ہی ہوتا رہے تب کہیں جا کر موجودہ دھماکا خیز مادہ ختم ہوگا۔ مگر درحقیقت، یہ پورا انبار ایک ہی دن میں استعمال ہو جائے گا، اس دن جب تیسری عالم گیر شروع ہوگئی۔

بہت سے سائنس دانوں نے قیاسی جوہری حملوں کے ممکنہ اثرات کے بارے میں تخمینے پیش کیے ہیں۔ ایک تخمینہ جو ریاست ہائے متحدہ کا گمریس کی خصوصی ذیلی کمیٹی برائے جوہری تابکاری میں پیش کیا گیا تھا، اُن نقصانات کے بارے میں تھا جو ریاست ہائے متحدہ میں 250 جوہری بموں سے ہونے والے ممکنہ حملے کی صورت میں ہوگا، جن کا مجموعی وزن 2,500 ٹن ہو اور وہ آبادی، صنعتی مراکز اور فوجی تنصیبات پر کیا گیا ہو۔ 1957 کی آبادی کے اعداد و شمار کے مطابق، ایک گواہی میں تخمینہ پیش کیا گیا تھا، کہ ایسے جوہری حملے کے ساتھ دن بعد 120 ملین آبادی میں سے 38 ملین امریکی افراد قلمبند بن جائیں گے، 28 ملین شدید زخمی ہوں گے مگر زندہ بچ جائیں گے، بقیہ بچ جانے والے ستر ملین افراد معمولی زخموں اور تابکاری کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ ایک چھوٹا سا جوہری حملہ ہوگا جو موجودہ جوہری ہتھیاروں کے انبار کے ایک فی صد کے برابر ہوگا۔ ایک بڑی جنگ میں ہتھیاروں کے انبار کا دسواں حصہ، یعنی 30,000 میگاٹن دھماکا خیز مادہ، امریکا، سوویت یونین اور دوسرے یورپی ممالک کے گنجان آباد علاقوں پر استعمال ہو سکتا ہے۔ Institute of Defense Analysis, Washington, D.C کے George E. Pugh اور Hugh Everitt کی

تابکاری کے بارے میں خصوصی ذیلی کمیٹی کی سماعت میں پیش کی جانے والے تجزیاتی رپورٹ کی مدد سے ہم جنگ کے یہ تخمینے پیش کر رہے تھے۔ ان کے مطابق جنگ کے شروع ہونے کے ساتھ دن کے بعد ان علاقوں میں رہنے والے 800 ملین میں 720 افراد موت کے گھاٹ اتر جائیں گے، ساتھ ملین زندہ تو رہیں گے مگر شدید زخمی ہوں گے، اور دوسرے بچ جانے والے صرف ہیں ملین ہوں گے۔ اور جو لوگ بچ رہیں گے ان کا حشر کیا ہوگا، یہ Everett اور Pugh کی اس رپورٹ کی تفصیلات سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ”بالآخر، یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ساتھ دن کے اندر ہونے والے شکار مکمل شکار نہیں ہوں گے۔ ان کی اطلاع میں تاخیر سواری کی بد انتظامی، ریل و ریل میں رکاوٹیں، سویشی کا مٹ جانا، جینیاتی تبدیلیاں، تابکاری کے زہر کا آہستہ آہستہ سرایت کرنا وغیرہ ہوگا۔“

قوموں کے درمیان کسی بھی قسم کا تنازعہ جنگ کا جواز نہیں ہو سکتا۔ جوہری ہتھیاروں کے خلاف ایسا کوئی دفاع نہیں ہے جس پر حملے کی شدت بڑھانے سے قابو نہ پایا جاسکے۔ قوموں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ”مہر و د“ جنگ لڑ سکیں، جس میں صرف ”چھوٹے“ جوہری ہتھیار استعمال ہوں۔ آج کی چھوٹی جنگیں بھی خطرناک ہیں، اس امکان کے پیش نظر کہ ایک چھوٹی سی جنگ بھی دنیا بھر کی تباہی کا باعث ہو سکتی ہے۔ دنیا کے لیے جنگ کو کا لعدم کر دینا ہی عقل مندی ہے۔

اب جوہری طاقتوں اور دوسری تمام قوموں کا اعلان کر دہدہف یہی ہے۔ ہم سب ریا ستہائے متحدہ، سوویت یونین اور برطانیہ عظمیٰ کے شکر گزار ہیں کہ انھیں کے عمل سے دنیا کی دوسری تمام قوموں نے جوہری ہتھیاروں کے تجربات پر پابندی کے معاہدے کو قبول کر لیا ہے۔ ایک امریکی ہونے کے ناتے میں بالخصوص اپنے عظیم صدر جان ایف کینیڈی کا شکر گزار ہوں، صرف انیس دن قبل جنھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں صدر کینیڈی کی نگہ عزم اور سیاسی ہنر مندی کے بغیر یہ عظیم بین الاقوامی معاہدہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔

1963 کے Test Ban Treaty کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ یہ ترک اسلحہ جات کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہ دکھانے کے لیے گراور کیا قدم اٹھائے جاسکتے ہیں، میں آپ کو صدر کینیڈی کے خطاب سے کچھ اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 26 ستمبر 1961 کے اجلاس سے کیا تھا۔

”یہ ہدف (ترک اسلحہ جات کا) اب کوئی خواب نہیں رہا۔ یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اسلحے کی لامحدود دوڑ کے مقابلے میں ترک اسلحہ جات میں پوشیدہ خطرات تو کچھ بھی نہیں ہیں۔۔۔۔

ہمارے ترک اسلحہ کے پروگرام میں مندرجہ ذیل اقدام شامل ہیں:

- (۱) تجربات کا مکمل انسداد دنیا کی تمام قوموں کی طرف سے۔۔۔
- (2) Asian کرنے کے قابل مائوں پر (دوسری) قوموں تک پہنچنے پر پابندی۔۔۔

(3) دوسری قوموں تک جوہری ہتھیاروں کی رسائی پر کنٹرول.....

(4) جوہری ہتھیاروں کو خلا سے دور رکھنا.....

(5) جوہری ہتھیاروں کی بتدریج تباہی؛ اور

(6) جوہری ہتھیار لے جانے والے وسائل کی تیاری پر پابندی، اور موجودہ وسائل کی بتدریج تباہی“

1963 کے میاق کے ذریعے ان میں سے پہلے ہدف کی طرف پیش قدمی شروع ہوئی ہے، اگرچہ پوری نہیں۔ چھ مہینے قبل اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی سیاسی کمیٹی نے، 97 ووٹوں کے مقابلے میں ایک ووٹ سے ایک تجویز منظور کی ہے جو انٹارہ قوموں پر مشتمل ترکیب اسلحہ جات کمیٹی سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جوہری ہتھیاروں کی تیاری سے متعلق تمام دھماکوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرائے۔ ہمیں اس ہدف کو بہر صورت حاصل کرنا ہوگا۔

صدر کینیڈی کا تجویز کردہ چوتھا قدم۔ جوہری ہتھیاروں کو خلا سے دور رکھنا۔ کئی قوموں سے اقوام متحدہ میں ووٹ دینے سے پرہیز کرنے کے چیلان کے ذریعے دوماہ قبل اٹھایا گیا ہے۔

تیسرے نکتے پر عمل۔ جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا انسداد۔ بین الاقوامی تھائوں کی اور جنگ کے بھڑک اٹھنے کے امکانات میں خاصی کمی کا باعث ہو سکتا ہے۔ 1960 کے میاق کا قطب جنوبی کو جنگ سے پاک علاقہ بنانا ایک نظیر پیش کرتا ہے۔ لائٹنی امریکا کی دس قوموں نے تجویز پیش کی ہے کہ ان کے پورے براعظم کو دوسرا جوہری ہتھیاروں سے پاک علاقہ بنا دیا جائے؛ ایسی ہی ایک تجویز براعظم افریقا سے بھی پیش کی گئی ہے۔ ان تجویزوں کی منظوری مستقبل کے امن کی طرف ایک اہم قدم ہوگا۔

اس سے بھی زیادہ اہم مرکزی یورپ کو فوجوں سے پاک علاقہ بنانے کے اصول کی درازی ہوگی، جیسا کہ Rapacki اور Kennan نے چند برس قبل تجویز کیا تھا۔ اس تجویز کے تحت پورا جرمنی، پولینڈ، چیکو سلوواکیہ، اورشاید کچھ دوسرے ممالک بھی فوجوں سے پاک کر دیے جائیں، اور ہمیشہ کے لیے ان کی سرحدوں اور قومی سالمیت کی ضمانت اقوام متحدہ کے ذریعے فراہم کی جائے گی۔ اس وقت میں برلن اور جرمنی کے پیچیدہ معاملات پر کھل کر گفتگو نہیں کر سکتا، مگر مجھے یقین ہے کہ اگر جوہری تباہی کے علاوہ کبھی کوئی عمل لگایا سکا تو وہ علاقے کو فوجوں سے پاک کرنے سے ہوگا، دوبارہ فوجوں کی تعیناتی سے نہیں۔

صدر کینیڈی، صدر جانسن، چیئرمین خروشیف، وزیراعظم میکملسن اور دوسرے قومی رہنماؤں نے اعلان کیا ہے کہ اس طوفان کو روکنے کے لیے ہمیں عمومی اور مکمل ترکیب اسلحہ جات کے ہدف کی طرف بڑھنا ہوگا، اور تمام موجودہ مخفی ہتھیاروں، اور ان کو لے جانے کے وسائل کو تباہ کرنے کی ابتدا کر دینی چاہیے مگر پہلے ان سب کی تباہی کے، بڑی طاقتیں مزید ہتھیار تیار کر رہی ہیں اور اس طرح دنیا خطرے میں ہی رہے گی۔

مگر، ترکیب اسلحہ جات کی طرف کوئی پیش قدمی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ میرے خیال میں اس سوال کا جزوی جواب یہ ہے کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں، ان میں کچھ طاقت ور بھی ہیں، جنہوں نے اس مسئلے کو

ابھی تک تسلیم نہیں کیا ہے کہ اب جنگ کو خرابا دیکھ دینے کا وقت آگیا ہے اس جواب کا ایک حصہ یہ ہے کہ ایک ایسی بڑی طاقت موجود ہے جس کو قوموں کی برادری میں شریک نہیں کیا گیا ہے۔ چین کی عوامی جمہوریہ جو دنیا کی سب سے بڑی آبادی رکھنے والی قوم ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ ریاست ہائے متحدہ اور سوویت یونین ترکیب اسلحہ جات کی طرف کوئی بڑا قدم اٹھائیں گے جب تک کہ وہ ممکنہ طاقت۔ یعنی عوامی جمہوریہ ترکیب اسلحہ جات کے بیباق میں شامل نہیں ہوئی، اور چینی عوامی جمہوریہ معاہدے میں اس وقت تک شامل نہیں ہوگی جب تک کہ اس کو قوموں کی برادری میں اس کے رتبے کے مطابق جگہ نہیں دی جاتی۔ چین کو تسلیم کرنا دنیا کے امن کے لیے کام کرنے کے مترادف ہے۔

میں یہ توقع نہیں کرتی چاہے کہ آئندہ کئی برس تک، بلکہ عشروں تک، موجودہ جوہری ہتھیار تباہ کر دیے جائیں گے، جیسا کہ فلپ نوئل بیکر (Philip Noel-Baker) نے اپنے نوبل خطبے میں، جو 1959 میں دیا گیا تھا، کہا ہے کہ کچھ جوہری ہتھیار چھپا لیے جائیں گے یا خفیہ طریقے سے بنائے جائیں گے اور پھر ان سے غیر مسلح دنیا کو ڈرایا جائے گا اور اس طرح ہتھیاروں کے انبار کی تباہی کے پروگرام کے سست ہو جانے کا امکان ہے۔ کیا ایسا کوئی فوری طریقہ نہیں جس کے ذریعے ہم جوہری جنگ کی شروعات کے موجودہ خطرے کو کم کر سکیں جو کسی عظیم یا نفسیاتی غلطی سے، یا ایسے واقعات کے سلسلے سے شروع ہو جائے جن کو عقل مند ترین قومی رہنما بھی نہ روک سکیں؟

مجھے یقین ہے کہ ایسا ممکن ہے، اور میں امید کرتا ہوں کہ اس پر قومی حکومتیں ضرور غور کریں گی۔ میری تجویز ہے کہ کسی قومی/بین الاقوامی طریقے سے، بہت احتیاط کے ساتھ، ایسا نظام قائم کیا جائے جو جوہری ہتھیاروں کے انبار پر کنٹرول بن سکے؛ مثال کے طور پر امریکی جوہری ہتھیار صرف اسی وقت استعمال کیے جا سکیں جب امریکی حکومت اور اقوام متحدہ دونوں مل کر اس کی اجازت دیں، اور اسی طرح سوویت یونین بھی اپنے جوہری ہتھیار اسی وقت استعمال کر سکے گا جب سوویت حکومت اور اقوام متحدہ دونوں نے مل کر اس کی منظوری دی ہو۔ اسی طرح کے دوسرے کنٹرول کا نظام چھوٹی طاقتوں کے لیے بھی قائم کیا جائے جنہوں نے اپنے جوہری ہتھیار تباہ نہ کر دیے ہوں۔

اس تجویز کی طرف ایک معمولی سا قدم بھی، جیسے جوہری ہتھیاروں کے کنٹرول کے نظام میں اقوام متحدہ کے نمائندوں کی منظوری، جوہری جنگ کی شروعات کو کافی حد تک کم کر سکتا ہے۔

ایک اور بھی طریقہ ہے جس سے ہمارے تمدن کو لاحق موجودہ خطرے کو فوری طور پر کم کیا جاسکتا ہے۔ ایک مستحکم معاہدے کے ذریعے، جس میں حیاتیاتی اور کیمیائی طریقوں سے جنگ کرنے کی ایجابات کے معائنے کا ایک نظام ہو، اور ان کو روکا جاسکے۔

چارلس فیل پانچویں Pugwash کانفرنس میں شرکت کرنے والے مائنس داں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس وقت کی تباہ کرنے والی جوہری طاقت حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں کی طاقت کے مقابلے میں کہیں

کے نبلے کے امکانات کی اجازت فراہم کرے۔ پھر بھی، میں مشورہ ہوں گا کہ یہ اختتام اسی وقت حاصل کیا جا سکے گا جب کسی قسم کی عالمی قانون سازی کے ذریعے، برہنہ میں بعد، اقوام متحدہ کے زیر نگرانی، دنیا کے ہر ملک میں، عوام کی اپنی حکومتوں کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کریں، جو قومی انتخابات سے الگ ہوں۔

عالمی قوانین میں اس قسم کے اضافے کے حصول کو ہر سول لگ سکتے ہیں۔ اس دوران بڑی قوموں کی پالیسیوں میں تبدیلی کے ذریعے بھی بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حالیہ چند برسوں میں، کچھ چھوٹے ملکوں میں جان بوجھ کر بغاوتیں اور خانہ جنگیاں کرائی گئی ہیں، جن کو بڑی طاقتوں نے مزید ہتھیار اور فوجی مشیروں کی فراہمی کے ذریعے خراب بھی کیا ہے، جس کی وجہ سے جنگوں میں درندگی بڑھی ہے اور عوام کے دیکھوں میں اضافہ ہوا ہے۔ 1963 کے دوران چار ملکوں، اور پچھلے برسوں میں کئی اور ملکوں میں بھی جمہوری طور پر ایسی منتخب حکومتوں کے تختے بھی الٹے گئے ہیں جن کی پالیسیاں سماج اور اقتصادی سدھار پر مبنی تھیں، اور ان کی جگہ اگر اکسانے سے نہیں تو بڑے ملکوں کی منظوری سے، فوجی آمریتیں قائم کی گئی ہیں۔ بڑی طاقتوں کی یہ حرکتیں عسکریت اور قومی اقتصادی مفادات سے منسلک ہیں، جو اب بہت پڑانے طریقے ہو چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ بہت جلد دنیا کی رائے عامہ کا دباؤ ان پالیسیوں کو ختم کرنے اور ایسی پالیسیوں کی تبدیلی پر منتج ہوگا جن میں اخلاقیات، انصاف اور عالمی برادری جیسی خوبیوں سے میل کھاتی ہوئی غویاں ہوں گی۔

جنگوں کی منصوبہ بندی کے لیے کام کرنے میں، ہم انسانی آزادی اور انسان کے انفرادی حقوق کے لیے بھی کام کر رہے ہوں گے۔ اقتصادی استحصال کے ساتھ جنگ اور قومیت، انسان کی شخصی آزادی کے سب سے بڑے دشمن رہے ہیں۔ میرے خیال میں، دنیا سے جنگ کی منصوبہ بندی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی بہتری قوموں اور تمام انسانوں کے مفادات میں ہوگی۔

مجھے خوش ہے کہ مجھے مارشلائی پاریمان کے پچھلے 75 برسوں میں کیے جانے والے بے مثال کام پر ان سے اظہار تشکر کا موقع فراہم ہو رہا ہے۔ اس سرگرمی کے دوران اسٹارنگ نے قوموں کی پاریمانوں کی رہنمائی کی ہے۔ مجھے اسٹارنگ 1880 کا یہ کہنا یاد ہے کہ قوموں کے درمیان ٹائی کے لیے مستقل بیاق ہونے چاہئیں، اور یہ بیان بھی یاد ہے کہ ”اسٹارنگ اس بات کی قائل ہے کہ عوام کی اکثریت اس خیال سے متفق ہے۔ اسی طرح، جیسے بہت عرصہ پہلے انسان اور انسان کے درمیان طاقت کے قانون کی جگہ قانون اور انصاف نے لے لی تھی، تاکہ عوام اور قوموں کے درمیان تنازعات کا حل ناقابل مزاحمت قوت سے ہو سکے۔ عام انسان کے شعور میں جنگ، قبل از تاریخ جہالت کا نقش قدم ہے اور نسل انسانی کے لیے لعنت ہے۔“ اب ہم اس قبل از تاریخ جہالت کے نقش قدم کی نسل انسانی کے لیے اس لعنت کو، ہمیشہ کے لیے مٹا دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ہم تم اور میں، خوش قسمت ہیں کہ ہم اس غیر معمولی عہد میں زندہ ہیں، دنیا کی تاریخ کے اس منفرد عہد میں، اس عہد میں جو پچھلے ہزارے اور دیکھوں، اور مستقبل کے امن، انصاف، اخلاقیات اور انسان کی خوش حالی کے درمیان ایک خط فاصل کی مانند ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں جنگ کی جگہ پر عالمی قانون کے نفاذ میں حصہ لینے کا موقع مل رہا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس عظیم کام میں ہم ضرور کامیاب

داگ ہیمر ہولد اعلان تجلیل

مارویاتی پارلیمان کی نوٹیل کمیٹی نے 1961 کا نوٹیل امن انعام بعد از مرگ، داگ ہیمر ہولد کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

داگ ہیمر ہولد 1905 میں پیدا ہوئے تھے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کاؤنسل کے سیکریٹری جنرل بننے سے پہلے، تعلیم کے ختم ہوتے ہی، وہ اپنے ملک سویڈن کی انتظامیہ سے منسلک ہو گئے تھے۔

ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان کا علم ان کے منتخب کردہ میدان سے باہر دور در تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کا مخصوص موضوع معاشیات سمجھا جاتا تھا، جس میں انھوں نے 1934 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی جس کے مقالے کا عنوان تھا "Konjunkturspridningen"۔ اس ڈگری سے قبل وہ لسانیات اور قانون میں ڈگریاں حاصل کر چکے تھے۔ 1936 میں سویڈن کی وزارت مالیات میں شامل ہوئے، اور 1941 سے 1948 تک سویڈن کے Riksbank کے بورڈ کے چیئرمین رہے تھے۔ 1945 میں وہ حکومت کی تجارت اور مالیات کی پالیسی کے مشیر رہے تھے۔ 1947 میں سویڈن کے دفتر خارجہ میں شامل ہو گئے۔ 1951 میں کابینہ کے وزیر مقرر ہوئے۔ جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے، وہ کسی مخصوص پارٹی کے رکن نہیں تھے اور وزیر کی حیثیت سے انکا تقرر سیاسی نہیں بلکہ ان کی مہارت کی بنیاد پر ہوا تھا۔ تجارتی معاہدوں کے لیے دوسرے ملکوں میں جانے والے سویڈن کے مالیاتی وفود کی سربراہی کے علاوہ انھوں نے UNISCAN مذاکرات میں سویڈن کی نمائندگی کی تھی۔ کچھ عرصے کے لیے وہ OEEC کے نائب چیئرمین بھی رہ چکے تھے۔

اس قسم کی ایک مختصر یا دوہائی ہمیں ممتاز دانش ورانہ قابلیت کے حامل انسان داگ ہیمر ہولد کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتاتی، شان کی لیاقت سے بھرپور شخصیت پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔ بہت سے لوگوں کو اس قسم کا خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ مگر ہم میں سے جو لوگ انھیں سیکریٹری جنرل بننے سے پہلے سے جانتے

تھے اس نوجوان شخص کی ان تھک و سوج علمی قابلیت اور اپنے وطن کی خدمت سے منسلک انتظامی ذمے داریوں میں ان کے خاموش اور انکسار آمیز طریقے سے بہت متاثر تھے۔

1953 میں انھوں نے اقوام متحدہ کے سیکریٹریٹ میں سیکریٹری جنرل کا عہدہ سنبھالا تھا۔ جنرل اسمبلی میں سویڈن کے وفد کے رکن اور نائب چیرمین کی حیثیت میں 1951 میں اور چیرمین کی حیثیت میں 1952 سے اقوام متحدہ سے ان کا رابطہ رہا تھا۔ سیکریٹری جنرل بننے پر انھوں نے Trygve Lie کی جگہ سنبھالی جنھوں نے نہ صرف اقوام متحدہ کی انتظامیہ کی ترتیب کی تھی اور اس کی نئی عمارت کی تعمیر کے منصوبے میں بھی حصہ لیا تھا، بلکہ انھوں نے سیکریٹری جنرل کے عہدے کو زیادہ اہم اور اقوام متحدہ کے اندرونی حلقے میں آزاد مقام دیا تھا۔ دوسرے فنکشنوں میں، انھوں نے وہ جگہ سنبھالی جسے انتظامی ساز و سامان کی حیثیت اور کچھ مخصوص روایات حاصل ہو گئی تھیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اتنا اہم رتبہ سنبھالتے ہوئے ڈاگ ہامر ہولڈ کو پوری طرح احساس تھا کہ آنے والا وقت ان کے لیے آسان ثابت نہیں ہوگا۔ Trygve Lie کو پیش آنے والی مشکلات سے اچھی طرح واقف تھے۔ اپنے کام کے حجم اور پیچیدگی سے واقف ہوتے ہوئے، اپنی تمام تر کوششوں اور قوتوں کے استعمال کے ساتھ انھوں نے خود کو اس کے لیے مکمل طور پر وقف کر دیا تھا۔ 1953 میں لکھے گئے ایک نئی خط میں وہ کہتے ہیں، ”یہ خیال ہی کہ ہدف اتنا اہم ہے، کہ اس کے علاوہ ہر چیز کو ایک طرف رکھنا ہوگا، ایک بڑا احساس آزادی دیتا ہے اور انسان کو لاحق ہونے والی ہر شے سے لاتعلقی کر دیتا ہے۔“

اکثر کہا گیا ہے کہ شروع دن ہی سے انھیں سیاست دان کے بجائے ایک مشیر کا کردار ادا کرنا پسند تھا، یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ انھیں پہلے سے طے کردہ کام بجالانا زیادہ پسند تھا، بجائے اس کے کہ وہ خود فیصلے کرتے۔ جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں، یہ اندازہ صحیح نہیں ہے۔ شروع سے، یعنی 1953 سے، جب انھوں نے مرکزی دفاتر اور سیکریٹری جنرل کے کردار اور سرگرمیوں کا احاطہ کیا تھا، یہ طے کر لیا گیا تھا کہ یہ مرکزی دفاتر اور سیکریٹری جنرل کی ذمے داری ہوگی کہ وہ رکن قوموں کے مقاصد اور مسائل کے بارے میں پوری آگاہی حاصل کریں، اور سیکریٹری جنرل ذاتی طور پر اپنی رائے سامنے رکھے، اس کی اپنی رائے کو اقوام متحدہ کے فرمان کی بنیاد پر ہونا چاہیے، اور ایک لمحے کے لیے بھی اس کے اصولوں سے پہلو تہی نہ کرے، چاہے اسے اقوام متحدہ کے ارکان سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ پہلے دن ہی سے انھوں نے ملکوں کے نمائندگان سے انفرادی طور پر نجی گفت و شنید کے ذریعے تنازعات کے حل کو اہمیت دی تھی، جس کو بعد میں ”خاموش سفارت کا طریقہ“ کا نام دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی، اس لیے کہ اس قسم کی غیر رسمی ملاقاتیں ایک ضروری عمل کی طرح ہمیشہ ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی، تاکہ مختلف نظریات کے درمیان کا راستہ تلاش کیا جاسکے۔

باہر سے ایسا لگا ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ زیادہ فعال ہوتے گئے، مگر میرے خیال میں،

اس کو بدلتے ہوئے حالات ہی کا نتیجہ کہا جاسکے گا نہ کہ ان کے نظریات میں تبدیلی کا ماحصل۔ ہر موقع محل پر جو انھیں درپیش ہوا، ان کے ذہن میں ایک ہی ہدف ہوتا تھا: اقوام متحدہ کے خیالات کے تحت خدمت۔ انھوں نے خود کو بین الاقوامی خدمت گار کہا جس میں ”بین الاقوامی“ کے لفظ پر زور زیادہ تھا۔ اس طرح ان کا ایک ہی آقا تھا، اور وہ اقوام متحدہ کا ادارہ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ داگ ہیمر ہولڈ نے اپنی غیر رسمی ملاقاتوں سے بہت کچھ حاصل کیا تھا، اور یہ بھی کہ انھوں نے طاقت ور ذاتی پیش قدمی کا مظاہرہ بھی کیا تھا، پھر بھی عوام الناس کو ان کی ذاتی حصے داری کا علم انھیں کوششوں سے ہوتا تھا جن میں رکن ممالک کے درمیان معاہدے کے لیے کیے جانے والے مذاکرات کا کام ہو جاتے تھے یا جن میں ان کو دیے گئے احکامات واضح نہیں ہوتے تھے، اور ان کو مجبوراً اپنی انگلی اٹھانا پڑتی تھی، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے۔ ایسے بہت سے معاملات کی تفصیلات کا بیان ممکن نہیں جن میں انھوں نے مداخلت کی اور جن پر سیکریٹری جنرل کی حیثیت سے اپنے مقامات چھوڑے تھے۔

پہلے اور سب اہم تنازعات جن کے حل ان جیسے خداداد ذمہ داری تھے مشرق وسطیٰ سے ابھرے تھے۔ ان میں سے پہلا تنازعہ 1955 کا تھا جو اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان پیدا ہوا تھا۔ اقوام متحدہ کے نمائندے کی حیثیت میں وہ سرفریق اور اقوام متحدہ کے درمیان مذاکرات کے ذریعے معاہدے حد بند یوں اور نظر رکھنے والی اقوام متحدہ کی چوکیاں قائم کر کے تناؤ کم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ذاتی طور پر ان کا خیال تھا کہ تناؤ کی کمی مستقل نہیں ہوگی اور ان کا قیاس صحیح تھا۔

دوسرے دن، ستمبر 1956 میں برطانیہ عظمیٰ، فرانس اور مصر کا تنازعہ، جو مصر کے نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لینے کے اعلان سے پیدا ہوا تھا، سلامتی کاؤنسل کے سامنے پیش ہوا۔ اکتوبر 1956 میں داگ ہیمر ہولڈ نے نجی ملاقاتوں کے ذریعے خود تنازعے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی، اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ مسئلے کا کوئی اطمینان بخش حل نکل آئے گا۔ مگر اکتوبر 1956 کے آخر میں اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا اور اکتوبر کی تیس تاریخ کو مسئلے کے حل کے لیے سلامتی کاؤنسل کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ اجلاس اس وقت تک کام ہو گیا جب برطانیہ عظمیٰ اور فرانس نے علاقے سے اسرائیل کی فوجیں واپس بلانے کی تجویز کے خلاف ویٹو استعمال کر دیا۔ دوسرے دن ہی، یعنی 31 اکتوبر کو برطانیہ اور فرانس نے مصر پر حملہ کر دیا۔ 31 اکتوبر کو سلامتی کاؤنسل کے اجلاس میں سب سے پہلے داگ ہیمر ہولڈ نے تقریر کی۔ اپنی بے باک تقریر میں انھوں نے ہٹا رہے کیا تھا کہ اگر تمام رکن ریاستوں نے اقوام متحدہ کے فرمان کی تمام شقوں پر عمل درآمد نہیں کیا تو وہ استغنیٰ دے دیں گے۔

اس کے فوراً بعد 31 اکتوبر ہی کو جنرل اسمبلی کا اجلاس برپا ہوا اور یکم نومبر کو ایک تجویز منظور ہوئی جس کی رو سے تمام فریقوں سے فوراً لڑائی بند کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور سیکریٹری جنرل سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ حالات پر نظر رکھیں اور اسمبلی کو فیصلے پر درآمد کرنے کے طریقوں سے مطلع کریں۔ درحقیقت سیکریٹری

جنرل کو دو برس اختیار کر دیے گئے تھے۔ تیسری نومبر کو ہمر ہولڈ نے بتایا کہ برطانیہ عظمیٰ اور فرانس دونوں اس شرط پر لڑائی ختم کرنے کے لیے تیار ہیں کہ اسرائیل اور مصر دونوں اس بات پر راضی ہو جائیں کہ جنگ بندی کی دیکھ بھل کرنے کے لیے اقوام متحدہ کی فوج تعینات کی جائے گی جو مصر اور اسرائیل کی سرحد پر ہونے والی خلاف ورزیوں کو روکے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ بند ہو گئی، اور ایک حد مقرر کر دی گئی جس کی نگہبانی کے لیے اقوام متحدہ کی فوج تعینات کر دی گئی۔

انہوں نے اسی طرح کے ایک اور قہیے کے حل میں براجمہ لیا تھا جو لبنان، اردن اور عرب ریاستوں کے درمیان 1958 میں برپا ہوا تھا۔ اس میں ریاست ہائے متحدہ اور برطانیہ عظمیٰ دونوں شریک تھے۔ ان تنازعات کے دوران، ان کی تمام قابلیتوں کی سہافی کو میدان مل گیا تھا، بالخصوص معاملات کو پھرتی اور سختی سے نمٹانے کی صلاحیت کو، اور داگ ہمر ہولڈ کو اقوام متحدہ کے منشور کی روشنی میں ان تنازعات کے بطریق احسن سلجھانے کا کریڈٹ پہنچنا چاہیے۔ اس علاقے میں امن قائم ہو گیا ہے۔ یہ امن کے آدرش کی فتح ہے اقوام متحدہ جس کا اظہار ہے، اور بلاشبہ اس فتح نے سیکریٹری جنرل کی حیثیت کو بہت مستحکم کر دیا ہے۔

اقوام متحدہ کے منشور میں شامل امن کا تصور ہمیشہ داگ ہمر ہولڈ کے لیے رہنما اصول رہا ہے۔ انہوں نے ان اصولوں کا استعمال اس وقت بھی کیا تھا جب 30 جون 1960 کو کانگو کی آزادی کے دوران کچھ مسائل پیدا ہوئے تھے۔

بدقسمتی سے، یہاں ہمارے پاس نوآبادیات کے اختتام سے متعلق اقوام متحدہ کے مسائل پر بات کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں اس موقع پر خود کانگو میں ادا کیے جانے والے اقوام متحدہ کے کردار تک ہی محدود رکھوں گا۔ جب 30 جون 1960 کانگو کو آزادی ملی تھی، اس وقت وہ ایک متحد ریاست تھا۔ کاسا بونگو (Kasavubu) کانگو سے صدر منتخب ہوئے اور [پیتربیس] لومبیا (Lumumba) وزیر اعظم بنائے گئے تھے۔ لومبیا نے ہمیشہ ایک متحد کانگو کی حمایت کی تھی۔

نئی حکومت کو بڑی مشکلات کا سامنا تھا: انتظامیہ جو بے یوم وصالوں کے ہاتھ میں تھی، ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی، فوج نے بغاوت کر دی تھی، سفید فام آبادی کا زیادہ حصہ فرار ہو چکا تھا، اور بے یوم کے فوجیوں نے مداخلت کر دی تھی۔۔۔ جزوی طور پر سفید فام باشندوں کی حفاظت کے لیے، اور یکم جولائی کو کنوینٹ کے صوبے نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔

یہ تمام عناصر۔۔۔ انتظامیہ کا انہدام، فوج کی بغاوت، اور کنوینٹ کی کانگو سے علاقہ دہی کے پس منظر میں Kasavubu اور لومبیا کا اقوام متحدہ سے یکم جولائی کو شہری معاملات میں معاونت اور 12 جولائی کو فوجی مدد کی درخواست۔ پریشان کن تھے۔ 13 جولائی کو بھیج جانے والے تار میں لومبیا نے زور دے کر کہا تھا کہ کانگو کو بے یوم کے فوجیوں کے حملے سے بچانے کے لیے فوجی مدد دے کر رہو گی۔

ہمر ہولڈ سلامتی کا کونسل کے بغیر خود کانگو کے شہری معاملات میں معاونت کی درخواست کو قبول

کرنے کے مجاز تھے مگر فوجی امداد کے لیے سلامتی کا ڈنسل ہی کا فیصلہ ضروری تھا، جس کا انہوں نے 13 جولائی کو اجلاس طلب کر لیا۔

یہ بہت اہم اجلاس تھا، اس لیے کہ اقوام متحدہ کی تاریخ میں یہ ایک نیا موڑ تھا۔ یہاں پہلی دفعہ ہوا تھا کہ اقوام متحدہ نے کسی نوآبادیاتی حکومت کے اختتام کے مسئلے میں پیدا ہونے والے مسائل سے نمٹنے کے لیے فوجی طاقت استعمال کی تھی۔ سلامتی کا ڈنسل نے اپنی متفقہ رائے قرار داد میں بلیم کو حکم دیا تھا کہ وہ کانگو کے علاقے سے اپنے فوجیں واپس بلا لے، اور سیکریٹری جنرل کو اختیار دیا گیا تھا کہ کانگو کی حکومت سے مشاورت کے ساتھ جیسے بھی فوجی مدد ضروری ہو فراہم کرے جب تک کہ ملک کی اپنی فوجیں، کانگو حکومت کے اپنی مانگے میں، اپنے فرائض پورے کرنے کے قابل نہیں ہو جاتیں۔

کانگو کو دی جانے والی فوجی امداد میں افریقی قوموں کے، اور غیر جانب دار سوئیڈن اور امریکنڈ کے، فوجی دستے شامل تھے۔ مشرقی یورپ یا پرانی نوآبادیاتی طاقتوں کے فوجی شامل نہیں کیے گئے تھے۔ یہ فوج لڑنے کے لیے نہیں، صرف امن فوج کا کردار ادا کرنے کی مجاز تھی، اور اس کو اندرونی پالیسیوں سے متعلق تنازعات میں مداخلت کا اختیار نہیں دیا گیا۔ ہتھیاروں کا استعمال صرف اپنے بچاؤ کے لیے کیا جاسکتا تھا۔

اس قسم کی فوجی امداد کانگو حکومت کی توقعات پر پوری نہیں اترتی تھیں، جس نے اقوام متحدہ کی فوجوں کے ذریعے بلیم کی فوج کا اخراج چاہا تھا، جب کہ اقوام متحدہ کا اقدام اس مفروضے پر تھا کہ بلیم سلامتی کا ڈنسل کا حکم مانے گا اور کانگو سے اپنی افواج کو واپس بلا لے گا۔

بلیم نے یہ نہیں کیا، اس حقیقت کے باوجود کہ کانگو کی حکومت کے نام جاری کردہ 14 جولائی کے ایک رقعے میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جوں ہی حالات سدھر جائیں گے اور قانون کی حکمرانی قائم ہو جائے گی، بلیم کی فوجیں کشمکش میں قائم ہونے والوں پر واپس بلا لی جائیں گی۔

اس طرح، شروع کے چند دنوں میں لومبار کی توقعات کے مطابق اقوام متحدہ کی مداخلت سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا، اور تازہ دم بلیم فوج کانگو کے لیے روانہ کر دی گئی۔

نتیجے میں، 14 جولائی سے 20 جولائی 1960 تک لومبار نے کچھ اہم اور غیر متوقع اقدام کیے۔ سب سے پہلے، 14 جولائی کو انہوں نے خروشیف کو ایک تاثر بھیجا، یہ اعلان کرتے ہوئے کہ اگر مغربی طاقتوں نے کانگو کے خلاف اپنی جارحیت جاری رکھی تو وہ روس سے امداد طلب کر لیں گے۔ جولائی کی 15 تاریخ کو انھیں خروشیف کی طرف سے بہت افزا جواب مل چکا تھا۔

اس کے ساتھ ہی کانگو کا تنازعہ مشرق اور مغرب کے درمیان مجاہدوں کا عنصر بن چکا تھا، جس کی وجہ سے کانگو میں ہنر ہولڈ اور اقوام متحدہ کی پوزیشن بہت خراب ہو گئی تھی۔

دن اور مہینے گزرتے گئے اور ان کی مشکل آسان نہیں ہوتی۔ کانگو کے مسئلے پر اقوام متحدہ کی راہ میں ماری اسکائی رکاوٹیں جمع ہوتی گئیں۔ خود کانگو کے باشندوں کے درمیان ایک متحدہ کنفیڈریشن پر اختلاف،

کنوچا کو بلیم کی امداد لومبا کے لیے روسی امداد، مرکزی حکومت کی تحلیل، مونو تو کی فوجی حکومت، لومبا کا قتل، اقوام متحدہ اور ہنمر ہولڈ پر روس کا بڑھتا ہوا شکنجہ دباؤ اور اقوام متحدہ کی کارروائی۔ جتنا کچھ ہو رہا تھا اس موقع پر اس کی تفصیل نہیں دی جاسکتی؛ مگر اس زمانے سے متعلق دستیاب دستاویز کے معائنے سے ظاہر ہو جائے گا کہ اقوام متحدہ نے تین تہا جمہوریہ کانگو کو ایک آزاد مملکت بنانے پر کام کیا تھا اور وہ آدنی جو سب سے توصیف کا حق دار ہے اس کا نام ہے داگ ہنمر ہولڈ ہے۔

باربارہ سلامتی کاؤنسل اور جنرل اسمبلی کے اجلاسوں میں انھوں نے اپنی پالیسیوں کا دفاع کیا اور سرخ رو رہے۔ وہ مستقل اسرار کرتے رہے تھے کہ اقوام متحدہ کے ذریعے کانگو کی شہری اور فوجی، ہر قسم کی امداد دی جانی چاہیے اور اس معاملے میں کسی بھی مفاد پرست بلاگ کے نمائندے کو اپنا اثر ڈالنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ تو کیا اب بھی یہ حیرت کی بات ہوگی کہ وہ حملوں کا نشانہ رہے، کبھی مغرب کی طرف سے، مگر زیادہ اور شکنجہ انداز میں سوویت یونین کی طرف سے، جس کی ایک علاحدہ طاقت کے طور پر پیش قدمی نے اقوام متحدہ کے ادارے کے تصور پر وار کیے تھے؟ سوویت رہنماؤں کو پرسکون اور معتبر انداز میں جواب دیتے ہوئے داگ ہنمر ہولڈ نے کہا تھا کہ وہ اس عہدے پر اس وقت تک رہیں گے جب تک اقوام متحدہ کے اقتدار کا دفاع کرنے اور اس کو مستحکم کرنے کے لیے ان کی ضرورت ہوگی۔ اور انھوں نے مزید کہا: وہ سوویت روس یا کوئی اور بڑی طاقت نہیں جس کو اقوام متحدہ کی گھیبانی اور تحفظ کی احتیاج ہے، دراصل باقی تمام کو اس کی ضرورت ہے۔

مگر ان کی قسمت میں زیادہ دن زندہ رہ کر اپنی پالیسی کو انجام تک پہنچانا نہیں لکھا تھا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ایک میننگ کے لیے ہوائی سفر کے دوران حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ اس میننگ سے انھیں امید تھی کہ کانگو اور کنوچا کی فوجوں کے درمیان لڑائی ختم ہو جائے گی، جو حال ہی میں، اقوام متحدہ کی قرارداد کے نفاذ کے دوران 21 فروری 1961 کو پھوٹ پڑی تھی۔ اس قرارداد کے ذریعے اقوام متحدہ کی فوج کانگو میں خانہ جنگی روکنے کی خاطر فوری اقدام کے لیے کہا گیا تھا، اور صرف آخری حربے کے طور پر طاقت کے استعمال کی اجازت تھی۔ اقوام متحدہ سے مزید تاکید کی گئی تھی کہ بلیم کی تمام فوج، مع شیران جو اقوام متحدہ کی کمان میں نہیں ہیں، فوراً واپس بلا لیے جائیں۔

ہنمر ہولڈ 12 ستمبر کو کانگو کی حکومت کی دعوت پر اقوام متحدہ کے امدادی پروگرام کی تفصیلات پر بات کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ جب داگ ہنمر ہولڈ نیویارک سے چلے گئے تو انھیں علم تھا کہ کنوچا کے حالات خراب ہیں، مگر انھیں ڈاکٹر فیر (Linner) کی رپورٹ کے ملنے سے پہلے معلوم نہیں تھا کہ کنوچا اور اقوام متحدہ کی فوجیں ایک دوسرے سے لڑ رہی ہیں۔

اپنے دوسرے کے پہلے چند دنوں میں انھیں جنگ بندی کرانے میں ماکای ہونی، لہذا داگ ہنمر ہولڈ نے کنوچا کے صدر شاہیے (Tshombe) سے نجی سطح پر رابطے کی کوشش کی؛ جیسا کہ انھوں نے شاہیے کو بھیج

گئے اپنے پیغام میں واضح کیا تھا، کانگو کی ریاست کے اندر رہتے ہوئے تنازعے کا فوری اور پُر امن حل تلاش کرنا ان کا مقصد تھا۔

و ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ 18 ستمبر کو شاہیے کو ملے جانے کے درمیان داگ ہنمر ہلڈ کا طیارہ گر کر تباہ ہو گیا۔ وہ اور جہاز پر سواران کے دوسرے ساتھی بھی ہلاک ہو گئے۔

تب اور تب تک نہیں۔ ہنمر ہلڈ اور اقوام متحدہ پر ہونے والی تنقید کو خاموش کر دیا گیا تھا، مگر 13 سے 18 ستمبر تک کے عرصے میں کنوگا میں ہونے والی کارروائیوں پر، اس بار مغربی حلقوں سے، شدید نکتہ چینی کی گئی جس میں انگریزی قدامت پسند اخباروں کی طرف سے ہونے والی نکتہ چینی زیادہ شدید تھی۔

داگ ہنمر ہلڈ کو شدید اور بے لگام تنقید کا سامنا کرنا پڑا، مگر انہوں نے اس راستے سے روگردانی نہیں کی جو انہوں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ اس راستے کو جس پر چل کر اقوام متحدہ کو ایک مؤثر اور تعمیری بین الاقوامی ادارہ بنانا تھا، جس میں ایک مضبوط انتظامیہ ہو، جس میں بین الاقوامی سطح کے لوگ شامل ہوں اور اس کے منشور میں بیان کیے گئے اغراض و مقاصد کے مطابق اپنے فرائض انجام دے رہے ہوں۔ ہمیشہ کی طرح ان کا ہدف اقوام متحدہ کے منشور ہی کو مرکزی حیثیت دینا تھا جس کے ذریعے دنیا کے تمام ملک اپنے آپ کو خود مضبوط میں لائیں۔ آج ہمیں ان کا ہدف اور افتادہ محسوس ہوگا، اور جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، دور افتادہ ہے بھی۔ داگ ہنمر ہلڈ کو اس بات کا پوری طرح احساس بھی تھا، اور 1360 میں اپنی تقریر میں انہوں نے کہا تھا:

”انسانی سماج کی ترقیات کے کام کرنا کسی نامعلوم ساحل پر کام کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جو کچھ کیا جاتا ہے، ایک دن بے کار ثابت ہوتا بھی دیکھا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنی حدود کے اعتراف کی خاطر اپنی بہترین صلاحیت کے ساتھ کام نہ کرے، مگر ارتقا کے قطعی نتیجے پر یقین کے ساتھ جس میں تعاون کرنا ہمارا استحقاق ہے۔“

ان کو فعال رکھنے والی طاقت دراصل ان کا یہ یقین تھا کہ انسانوں کے درمیان خیرخواہی کا جذبہ ایک دن ایسے حالات پیدا کر دے گا جس میں دنیا پر امن کا راج ہو جائے گا۔

ما روینی پاریمان کی نوٹیل کمیٹی نے آج شکرگزاری کے جذبات کے ساتھ ان کے کام کی اور ان کی کامیابیوں کی، جس کے لیے وہ لڑتے رہے ہیں، تاکہ آدمیوں اور قوموں کے درمیان امن اور آشتی قائم ہو انہیں بعد از مرگ، امن کا انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

آئیے ہم داگ ہنمر ہلڈ کی یاد میں ایسا وہ ہو کر ان کو خراج عقیدت پیش کریں۔

تقریر قبولیت

(ناروے میں سویڈن کے سفیر رالف ایڈمرگ کی زبانی)

ہاگ ہیمر ہولڈ کی وراثت کے منتظمین کی درخواست پر میں بے پایاں افسردگی کے ساتھ 1861 کا نوبیل امن انعام بعد از مرگ وصول کر رہا ہوں جو میرے دوست بھی تھے اور ہم وطن بھی۔

میں شکر گزار ہوں گا اگر میں وہی کچھ کہہ سکوں جو خود انھوں نے سوچا تھا اور خود کہتے، اگر وہ اس مقام پر آج ایسا وہ ہوتے۔

بلشعہ اس شریفین پر بلائے جانے کو وہ ایک علامت کے طور پر دیکھتے جہاں انسانی نیک نیتی کو اسنے بڑے اعزاز دیے گئے ہیں۔ جس میں جنوبی افریقا کی عدم تشدد کی آزادی کے دو بڑے وکیل بھی شامل تھے؛ دو مختلف نژاد انسان، مگر دونوں ایک ہی ہدف کے حصول کے خواہش مند۔

میرے ہم وطن اس بڑے عظیم میں ابھرنے والی بیداری کے بارے میں بہت فکر مند رہا کرتے تھے، جو ان کے خیال میں ان کا مستقبل بننے والا تھا۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا کہ اگلی دہائی کو یہ تو افریقا کے نام ہونا چاہیے یا انیم بم کے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ قوموں کی کمیونٹی میں نئی قوموں کا اہم کردار ہوگا۔ اسی لیے انھوں نے اپنی تمام تر قوت اور خواہشات، بلکہ کچھ اور بھی، اس راہ کو ہموار بنانے میں صرف کر دیا تھا جو ان کے مستقبل کا راستہ تھی۔

افریقا ان کے اس فلسفے کی سب سے بڑی کسوٹی تھا، جسے وہ اقوام متحدہ میں متعارف کرنا چاہتے تھے۔ امن اور انسانی حقوق کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والا رابطہ ان کا مستقل مسئلہ تھا۔ سب باشندوں کے لیے، برداشت، قانونی تحفظ، مساوی سیاسی حقوق اور مساوی معاشیاتی مواقع۔ جو ان کے نزدیک کسی بھی قوم میں ہم آہنگ زندگی کے لیے لازمی تھے۔ قوموں کے درمیان بھی یہ ضروری بن گئے تھے۔

وہ ہم کو یاد دلاتے رہتے تھے کہ ماضی میں آدمی کس طرح اپنے خاندان کی تنظیم کیا کرتا تھا، خاندان کس طرح مل کر قبیلے اور گاؤں بن جاتے تھے اور کس طرح قبیلے اور گاؤں عوام اور قومیں بن جایا کرتے تھے۔ مگر قوم بن جانے کی آخری منزل نہیں۔ وہ اقوام متحدہ کے منشور کو ایک رہنما کی مثال دیکھتے تھے جس سے ایک منظم بین الاقوامی کمیونٹی وجود میں آ سکتی ہے۔

بڑی شدت کے ساتھ، جو سال بہ سال بڑھتی رہی تھی، وہ جنرل اسمبلی کے لیے اپنی سالانہ رپورٹ میں اخبار کرتے تھے کہ اقوام متحدہ کو ترقیات کے لیے ایک حتمی مشین کی طرح کام کرنا چاہیے۔ اپنی آخری رپورٹ میں، ڈراماٹیز لہجے میں انھوں نے رکن ریاستوں کو آڑے ہاتھوں لیا تھا جو سمجھتی ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھیں پرامن ہم بودیت حاصل ہو جائے گی۔ یہ فلسفہ ہمہ وقت بڑھتے ہوئے باہمی انحصار کی دنیا کے فلسفے کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا جہاں قوموں کے پاس ایسے اسلحے موجود ہیں جن کی تباہی کی طاقت کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔ اقوام متحدہ کو بین الاقوامی تعاون کے نیا دہ نئے طریقے ایجاد کرنے چاہئیں۔

انھوں نے اس برس کی اپنی آخری رپورٹ 17 اگست کو تیار کی تھی۔ اب یہ رپورٹ ان کے وصیت

نامے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

مساوی حقوق کے بارے میں منشور میں لکھے چھوٹے بڑے لفظ انھیں بہت جان دار اور ہمت افزا نظر آئے تھے۔ ان کے نزدیک، دراصل چھوٹی قوموں، اور بالخصوص ترقی پذیر ممالک کو اپنے مستقبل اور تحفظ کے لیے اقوام متحدہ کی زیادہ ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک بڑی طاقت نے ان سے استغنیٰ طلب کر لیا تو انھوں نے اپنا عہدہ چھوڑنے اور ادارے کو بے سہارا کر دینے سے انکار کر دیا تھا۔

پچھلے برس کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے اس خوفناکی منظر کا صحیح معنوں میں اندازہ نہیں کیا جاسکے گا جب تک کہ ان کے وہ الفاظ دہرائے نہ جائیں جو انھوں نے اپنے والد "ہالمار ہنر ہولڈ" کے بارے میں لکھے تھے۔ "ایک مستحکم عقیدہ رکھنے والا کوئی بھی انسان، جس سے کسی تنازعے میں الجھا ہوا ہوتا ہے، اس کے آگے نہ ہاتھ پھیلاتا ہے اور نہ اس سے کوئی معاملہ کرتا ہے۔ ایک تجربے کار آدمی اپنے اعمال کا بہترین محاسب ہوتا ہے۔ بالآخر اس کی اپنی مدد ہی اس کے یقین کے کام آتی ہے۔" یہ الفاظ خود ان پر کہتے ہوئے تھے جب انھوں نے کانگو میں کارروائی کے لیے منشور کے اصولوں کے مطابق سرکاری ملازمین کے ایک بین الاقوامی ادارے کا دفاع کیا تھا۔

اگر انھیں کسی قسم کا اضطراب محسوس ہوا تھا تو اس لیے کہ ضرورت سے زیادہ گرم ماحول میں امن اور عوام کے بہبود سے متعلق سوالات پر بات کی جا رہی تھی۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو اپنے رخسار پر ٹکائے، جیسا کہ وہ ہمیشہ غور سے کسی بات کو سننے وقت کرتے تھے، ان کو دیکھنے والے چشم دید کواد کے دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ سبک سبز کے پیچھے کی میز پر براہیمان یہ دہلا پتلا انسان آخر کس کی نمائندگی کر رہا ہے؟ کیا روایتی اور مہذب سفارت کاری نئے شور و غل میں غرق ہونے والی ہے؟ یا پھر عالمی کمیونٹی کے تصورات رکھنے والا یہ شخص مستقبل کا پیام بردار ہے؟

ہم آخری جملے میں کہی گئی بات پر یقین کے خواہاں ہیں۔ خود ان کو اپنے آدرش پر قائم کر دینے والی اپنی صلاحیت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ انھوں نے اس بات کو اپنے آخری مضمون میں اس طرح بیان کیا تھا: "اپنے آدرش کو پانے کی کوشش میں کی جانے والی پسپائی آدرش کی خرابی کا ثبوت نہیں ہوتی۔" ایسا ایمان زندگی کے بارے میں کسی طے شدہ فلسفے کی بنیاد پر ہی پیدا ہوتا ہے۔ جو بھی ان سے مل چکا ہے اس نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ ان کے اپنے اندرون میں ایک علاقہ خاموشی کا بھی ہے۔ اور شاید کوئی بھی اس علاقے میں کبھی داخل نہیں ہو پایا تھا۔

مگر ہمارے خیال میں شاید آخری کتاب and Thou کے ترجمے کے دوران ان پر وہی آشکار ہو گیا تھا جو ضروری تھا، جس پر یہودی فلسفی مارٹن بوب (Martin Buber) نے اپنے اس عقیدے پر انحصار کیا تھا کہ ملاقات ہی زندگی ہے۔ وہ خود بھی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ بہت سے غیر مرقی پل و جود رکھتے ہیں، لوگ جن پر اپنے آدرشوں، نسلوں اور قوموں کی حدود سے بلند ہو کر انسان کی حیثیت سے ملاقات کر سکتے

تھا۔

اور فری تمبر کی اس دات کے دھندلکے، اور بظاہر بے معنویت میں ہم شاید کچھ اہم چیزیں دیکھنے کی ہمت کر سکیں۔ تباہ شدہ جہاز کے کچھرے ہوئے بلے میں کچھ کتابیں بھی تھیں۔ ان میں ”من و تو“ اور سوئڈش زبان میں ترجمہ کیے ہوئے اس کے کچھ صفحات بھی تھے۔ جہاز کی شبیہ اڑان سے قبل ہی انہوں نے اپنے دوست ٹامس کمپس (Thomas à Kempis) کے پاس Imitation of Christ چھوڑی تھی۔ اس کے صفحات کے درمیان حلف نامہ تھا جو انہوں نے سیکریٹری جنرل کا عہدہ اٹھاتے وقت پڑھا تھا۔

”میں ڈاگ ہیمر ہولڈ حلفیہ قرار کرتا ہوں کہ میں اپنی تمام تر وفاداری، تیز اور شعور سے وہ تمام فرائض انجام دوں گا جو اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے عہدے کی مناسبت سے انجام دینے کے لیے مجھے تفویض کیے گئے ہیں اور میں تمام امور کی انجام دہی میں اقوام متحدہ کے مفاد کو پیش نظر رکھوں گا۔“

اگر وہ آج یہاں موجود ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ خدمت کو فرض سمجھنے کے بارے میں کچھ ضرور کہتے۔ میرے ہم وطن پوری دنیا کے باشندے بن گئے تھے۔ وہ جہاں سے آئے تھے وہاں بھی ان کو ایسا ہی سمجھا جاتا تھا۔ مگر وہ جھڑتے ہوئے بتوں کی خزاں کی ایک ٹھنک شام تھی جب انہیں اپنے بچنے کے شہر کہا لاوا پس لایا گیا تھا، اور وہ ایک بار پھر ہمارے ہو گئے تھے، وہ اپنے گھر واپس آ گئے تھے۔ وہ اپنی اندرونی دنیا کو چھپائے ہوئے تھے مگر اس موقع پر سارے فاصلے مٹ گئے تھے اور ہمیں محسوس ہوا کہ وہ ہم سے بہت قریب آ گئے تھا۔

اس لیے، جب میں اپنے عظیم ہم وطن کو دیے جانے والے اعزاز کے بارے میں شکریہ پیش کریں گا، جو کسی بھی انسان کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے، تو میں جو کچھ بھی کہوں گا، اپنی پوری قوم کی طرف سے کہوں گا۔ ڈاگ ہیمر ہولڈ کو دی جانے والی انعام کی رقم سے ان کے نام کا ایک فنڈ قائم کیا جائے گا اور ان ہی کاموں میں صرف کیا جائے گا جو ان کو دل و جان سے عزیز تھے۔



البرٹ جان لوٹولی اعلانِ تجلیل

اس برس مارویائی نوبیل کمیٹی نے دو امن انعامات دیے تھے، 1960 کا امن انعام البرٹ جان لوٹولی کو اور 1961 کا انعام بعد از مرگ ڈاگ ہیمر ہولڈ کو دیا جا رہا ہے۔

دونوں انعام پانے والے کئی وجوہ کی بنا پر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ البرٹ جان لوٹولی کی زندگی اور ان کے کام افریقی قبائلی اور مسیحی اثرات کے نمونے ہیں، جب کہ ڈاگ ہیمر ہولڈ مغربی تہذیب کی پیروی کرتے تھے۔ لوٹولی کی سرگرمیاں ان کے اپنے ملک تک محدود رہی ہیں، جب کہ ڈاگ ہیمر ہولڈ بین الاقوامی سطح پر کام کرتے تھے۔ اس فرق کے باوجود ان میں ایک بات مشترک تھی: دونوں اپنے ملک کے افراد اپنی قوم، اور تمام قوموں کے درمیان انصاف کو قائم کرنا چاہتے تھے، یا ہم اس کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ دونوں اقوام متحدہ کے عیاق اور انسانی حقوق کے اعلان میں شامل آدرش کے لیے جنگ کرتے رہے ہیں۔

البرٹ جان لوٹولی 1898 میں پیدا ہوئے۔ وہ زولو قبیلے کے سرداروں کی اولاد میں سے ہیں، مگر اسکول کے زمانے سے ان پر مسیحی اثرات غالب آ گئے تھے۔ پہلے امریکی اسکول میں، جہاں انھوں نے تعلیم بھی حاصل کی اور اپنی تربیت کے دوران وہاں طالب علموں کو پڑھایا بھی تھا۔ بعداً (Natal) کے آدم کالج سے امتحان میں کامیابی کے بعد اسی کالج کے تدریسی شعبے کے رکن بھی ہو گئے، جہاں وہ استاد بھی رہے، اور ان کے تعلیمی انصاب میں زولو عوام کی تاریخ بھی شامل تھی۔ سترہ برس معنمی کرنے کے دوران انھوں نے جنوبی افریقا کی سیاست میں بالکل حصہ نہیں لیا تھا۔

لوٹولی کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی اس وقت آئی، جب ان کو اپنے قبیلے کی سرداری کے فرائض نبھانے کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ قبیلے کے سردار کا انتخاب سرکار کرتی ہے اس لیے کہ وہی سردار کو تنخواہ بھی دیتی ہے۔ اس بنیاد پر ہی 1952 میں سرکار نے ان کو سردار کے عہدے سے برطرف بھی کر دیا تھا۔ سترہ برس قبیلے

کے سردار ہونے کی وجہ سے وہ اپنے قبیلے کی کمیونٹی کے ارکان سے روزانہ ملتے رہتے تھے اور انھوں نے جنوبی افریقا، ہندوستان اور ریاست ہائے متحدہ کے کھیاؤں میں عملی طور پر حصہ بھی لیا تھا۔

استاد اور سردار دونوں حیثیتوں میں لوٹوئی نے نمایاں کام کیے۔ سردار کی حیثیت میں انھوں نے اپنے فرائض سمجیدگی سے ادا کیے اور اس عمل کے ذریعے انھوں نے اپنے قبیلے والوں کی محبت جیت لی۔ انھوں نے قبیلے کے قدیم رسم و رواج کو بحیثیت کے تصورات میں مدغم کرنے کے مختلف طریقوں سے اس کی اقتصادی حالت میں بہتری کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر چینی بنانے والے کارخانوں میں جدید طریقوں کو متعارف کرایا۔

اپنی زندگی کے اس دور کے بارے میں بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: قبیلے کی سرداری کے بعد سترہ برس میں نے اسکول میں تعلیم کی۔ میں نے پچھلے تیس برس بڑے بولوے اور میرے اپنے عوام کے حالات میں بہتری لانے کے لیے کام کیا، تاکہ جنوبی افریقا کی کثیر نسلی سماجی اور دوسرے مملکتوں میں میرے عوام کے تعلقات بہتر اور ہم آہنگ ہوں۔ میں نے ان کوششوں میں ہمیشہ اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس عموئل عرصے میں، سال بہ سال، میں نے کھیسا اور دوسرے اداروں، جیسے کہ Christian Council of South Africa اور Joint Council of Europeans and Africans اور Native Representative Council وغیرہ کی تنظیم میں بہ خوشی اپنا ذاتی وقت بھی صرف کیا ہے۔

مگر، اُن کا عالمی جنگ کے بعد کیا جانے والے کام، جو دنیا کے لیے مرکز نگاہ بنا تھا، وہ نہ تعلیمی، نہ قبیلے کی سرداری اور نہ عیسائی اداروں کی اُکسیت کی وجہ سے ہوا تھا۔

وہ طاقتیں جنھوں نے البرٹ لوٹوئی پر تعلیمی سرگرمیوں کو چھوڑ دینے اور سیاست میں داخل ہونے پر راضی کیا تھا، سفید فام حکمران طبقے کے دباؤ کی بنا پر حرکت میں آئی تھیں، جو جنوبی افریقا کی دوسری نسلوں پر بھی دباؤ ڈال رہی تھیں۔ 1944 میں وہ افریقی نیشنل کانگریس کے رکن بن گئے، جس کا قیام 1912 میں عمل میں آیا تھا۔ 1952 میں انھیں صدر نشین منتخب کر لیا گیا، جس پر وہ کانگریس کے ممنوع ہونے تک فائض رہے تھے۔ ان برسوں میں صدی کے چوتھے عشرے سے آج تک انھوں نے جو سب سے پہلا اور اہم کام کیا ہے، ہم اسی کے لیے یہ اعزاز پیش کر رہے ہیں۔

لوٹوئی کی کارنامیوں کا کچھ انداز لگانے کے لیے ہمیں اس سماجی کے بارے میں جاننا ہوگا جس میں وہ کام کرتے تھے۔ جنوبی افریقا کے سفید فام باشندے سترہویں صدی کے نصف آخر میں وہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان سے پہلے آنے والے فرانسیسی پروٹسٹنٹ تھے اور اُن کے بعد میں آنے والے ولندیزی کسان تھے۔ انھوں نے زمینیں صحاف کی تھیں اور اب ان کی نسلیں - Boers - وہاں آباد ہیں۔ وہ لوگ ملک کو اپنی آبائی سرزمین سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس ایسی اور کوئی زمین نہیں ہے۔ جب کہ انگریز آبادکار، جو اٹھارویں صدی کے آخر میں اس سرزمین پر وارد ہوئے تھے، انھوں نے اپنی دھرتی ماما سے اپنے رشتے قائم رکھے تھے۔

پہلے مقامی ولندیزی جنھوں نے بعد میں آنے والوں کے لیے راستہ صاف کیا تھا Hottentot تھے اور جھاڑیوں میں رہنے والے مقامی تھے۔ ایک الگ نسلی وجود کی صورت میں Hottentot کا تو نام وئٹان بھی مٹ چکا ہے مگر یورپی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ آپس میں شادی بیاہ کے ذریعے انھوں نے بڑے پیمانے پر ان میں نام نہاد "رنگ دار لوگوں" کی نسلی خصوصیات منتقل کی تھیں۔

جب Boers اندرون ملک کی طرف بڑھے تو انھیں مقامی قبائل کا، جس میں زولو شامل تھے، سامنا کرنا پڑا تھا، جن سے جنگ ہوئی اور انھیں زیر کر لیا گیا۔ اس قبیلے میں جو آج کی جنوبی افریقا کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ دوسرے نسلی عناصر بھی شامل ہوئے: ولندیزیوں نے مشرقی انڈیز سے ٹالیا کے لوگوں کو غلام بنا کر بڑی تعداد میں درآمد کیا، جب کہ برطانیہ والے گتے کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے مزدور ہندوستان سے لے آئے تھے۔ انیسویں صدی میں دو کمیونٹیاں تشکیل پا چکی تھیں: Boers کی جمہوریہ ٹرانسوال (Transvaal)، اور Orange Free State۔ اور جنوبی افریقا کی برطانوی نوآبادی۔ ان سب پر سفید فام آقاؤں کی حکومت رہی۔ نئی صدی کے آغاز کے قریب دونوں سماج نے مل کر 1893-1902 میں Boer جنگ لڑی جس میں بالآخر برطانیہ فتح پا ب رہا۔ اس جنگ کے نتیجے میں 1901 میں جنوبی افریقا ایک خود مختار برطانوی نوآبادی بن گیا۔ اس وقت دنیا کو سفید اور سیاہ فام عوام کے رشتوں کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں۔

پچھلے پچاس برسوں میں جنوبی افریقا نے، دوسرے ملکوں کی طرح، ذرا ملتی قہذیب سے کان کنی، صنعتی، تجارت اور دوسری نوعیت کی مصروفیتوں کی طرف پیش قدمی کی۔ جیسا کہ دوسرے ملکوں میں بھی ہوا ہے، شہری آبادی تیزی سے بڑھی ہے۔

موجودہ زمانے کے جنوبی افریقا کی آبادی 14.7 ملین کے قریب ہے، جس میں تقریباً 3.3 ملین سفید فام ہیں۔ بقیہ لوگوں میں 9.6 افریقی ہیں، 0.4 کے قریب ایشیائی (زیادہ تر ہندوستانی) ہیں، اور 1.4 ملین ملی جلی نسل کے لوگ ہیں جنھیں "رنگ دار" (the coloured people) کہا جاتا ہے۔ 6.9 افریقیوں میں تقریباً 3.3 افراد سفید فام لوگوں کے زرعی علاقوں میں رہتے ہیں، جن میں سے زیادہ تر سفید فام زمین داروں کے زرعی باڑوں میں مزدوری کرتے ہیں۔ اور 3.7 مخصوص علاقوں میں، اور 2.6 ملین شہروں میں رہتے ہیں۔

اگرچہ، یہ اعداد و شمار صرف تخمینے ہیں، یہ وہاں کے سماج کی تصویر پیش کرتے ہیں، جس کی اقتصادیات، اور مستقبل دونوں کا انحصار تمام نسلوں کے ایک ساتھ مل جل کر کام کرنے پر ہے۔ یہ اعداد و شمار اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ تمام نسل کے لوگوں نے مل جل کر اس سماج کی تشکیل کی ہے۔ سفید فام آبادی اکیلے یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ایک ناقابلِ حذر حقیقت ہے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سفید فام آبادی کا مقام کیا ہے؟ اس سماج میں غیر سیاہ فام لوگوں کو حکومت اور ریاست کے کام میں شرکت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ نسلی تعصب برتا جاتا ہے، قانونی، اقتصادی اور سماجی، تمام معاملات میں۔ اور سفید فام اور غیر سفید

قام کے درمیان یہ تعصب رفتہ رفتہ جنگ کے بعد کے برسوں میں برہنہ ہوتا رہا ہے۔ جو لوگ آج ملک کے حاکم ہیں ان کا مقصد دونوں سماجوں۔ سفید فام اور غیر سفید فام۔ کے درمیان ایک خط فاصلہ کھینچنا ہے، باوجود اس حقیقت کے کہ واقعات کی رفتار نے صاف ظاہر کر دیا ہے کہ اس ملک کا پورا سماج تمام نسل کے لوگوں کی مشترکہ کوششوں سے بنا ہے۔ اس وقت میں ان قوانین اور احکام کے تانے بانے کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا جو سفید فام اور غیر سفید فام افراد کے درمیان باہر قائم رکھنے کے لیے جاری اور نافذ کیے گئے تھے۔ ان قوانین کا مقصد غیر سفید فام کو زندگی کے ہر شعبے میں پابند اور محدود کرنا تھا۔ نہ اس کو رائے دی کا حق ہے اور نہ اپنے مقام کا خود احاطہ کرنے کا؛ 'ٹراہ داری' کے پر والے (Travel Pass) کے نظام کے تحت اس کو اپنی پسند کے مقام پر رہنے کا حق تک نہیں، بلکہ اس کو تو اپنا آجر منتخب کرنے کا بھی حق نہیں؛ اس کو عملی طور پر پولیس کے قلم کے خلاف داری کا حق نہیں، اس کو اسی قسم کی تعلیم کا حق نہیں جو سفید فام افراد کو حاصل ہے۔ سفید فام اور غیر سفید فام کے درمیان کسی قسم کے جنسی رشتے قائم کرنے کی بھی اجازت نہیں، اور اس قسم کے مجرم کے سرزد ہونے کی صورت میں دونوں فریق کے جرم کی سزا غیر سفید فام کو بھیجی جاتی ہے۔ افریقی نسل کے عیسائی کو اسی چھت کے نیچے خدا کی عبادت کی اجازت نہیں، جس کے لیے سفید فام عبادت کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ، غیر سفید فام غلام نسل سمجھے جاتے تھے۔

تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے، اگر غیر سفید فام اس پر تادیب کے خلاف احتجاج کرتے ہیں؟ حیرت اس بات پر ضرور ہے کہ احتجاج میں ان کی جانب سے تشدد کیوں نہیں ہوتا۔ ان کا صبر غیر معمولی اور جدوجہد کی طاقت بے پناہ ہے۔

وہ سفید فام اور غیر سفید فام کے درمیان تعصب ہی تھا جو 1912 میں افریکن نیشنل کانگریس کی تشکیل کی بنیاد بنا۔ اس کے بنیاد گزار وہ غیر سفید فام افریقی تھے جنہوں نے، اپنے ملک میں رہ کر یا باہر جا کر اس وقت تعلیم حاصل کی تھی جب اس کا موقع فراہم تھا۔ پہلے تو افریکن نیشنل کانگریس نے سیاسی رسوخ کے لیے ارباب اختیار کو درخواستیں بھیجیں اور وفد روانہ کیے۔ مگر جب یہ کوششیں بار آور نہیں ہوئیں، اور نئے قوانین منظور اور نافذ ہو گئے تو افریقی نیشنل کانگریس نے زیادہ راست اقدام اختیار کیا، خصوصاً 1949 کے بعد۔ اس صدی کے پانچویں عشرے میں لوڈوئی نے افریکن نیشنل کانگریس میں حصہ لینا شروع کیا، اور 1944 میں اس کے رکن بن گئے۔ انھیں 1945 میں بحال کے صلیب کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ دسمبر 1952 میں وہ افریکن نیشنل کانگریس کے صدر بنا دیے گئے؛ اس عہدے پر وہ اس وقت تک فائز رہے جب تک کہ حکومت کی جانب سے کانگریس پر پابندی نہیں لگا دی گئی تھی۔

یہ ان عبوری برسوں کا زمانہ تھا جس میں بائیکاٹ، مزاحمتی مہمات اور ہڑتالوں جیسے سخت اقدامات ضروری تھے، جن کے ذریعے لوڈوئی نے افریکن نیشنل کانگریس کو متاثر کیا تھا۔ خود ان کا کہنا ہے کہ کانگریس نے کبھی کوئی مخصوص قرارداد منظور نہیں کی، جس سے ظاہر ہوتا کہ اس کی جدوجہد کو پیرامن طریقے سے آگے بڑھایا جائے

گا۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کی ہر مہم پُر امن طریقوں ہی سے چلائی گئی ہے، اور اس پالیسی کو کانگریس کی انتظامیہ کی تائید حاصل رہی ہے۔ لوٹولی خود بھی ہمیشہ تشدد کے استعمال کے خلاف رہے ہیں۔ اس ادارے کو اپنے اندر ہی کی دو مخالف سمتوں سے دباؤ کا سامنا رہا ہے؛ پڑانے ارکان جو کل کا راستہ اپنانے کی وکالت کرتے ہیں، ان ہی کا ایک، نوجوان ارکان کا، گروہ چاہتا ہے کہ جنوبی افریقہ مکمل طور پر غیر سفید فام ریاست بنادی جائے۔

فریکن نیشنل کانگریس میں لوٹولی کی عملی شرکت کی بنا پر حکومت نے ان کو تنبیہ کی؛ یا تو ان کو اپنے قبیلے کی سرداری چھوڑنی ہوگی یا کانگریس میں اپنی نشست انھوں نے دونوں حیثیتوں کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ انھیں سرداری کے رُتبے سے معزول کر دیا گیا؛ جس کے بعد انھوں نے اپنا ایک بہت اہم اعلان "The Chiet Speaks" جاری کیا، جس کے اختتامی الفاظ تھے: "آزادی کا راستہ مسلح سے ہو کر گزرتا ہے۔" اپنے اعلان میں انھوں نے کہا تھا:

"اسنے برسوں کے اعتدال کا حاصل کیا رہا ہے؟ کیا حکومت یا اس کی نیشنلسٹ یا یونائیٹڈ پارٹی کی طرف سے کبھی کوئی متبادل برداشت یا اعتدال کا اظہار کیا گیا ہے؟ نہیں! بلکہ پچھلے تیس برسوں میں ہمارے حقوق اور ترقیات پر پابندی لگانے والے اسنے قوانین نافذ ہوتے دیکھے ہیں کہ ہم اس درجے پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہمارے کوئی حقوق ہی باقی نہیں رہے ہیں؛ کاشتکاری کے لیے کافی زمین ہی نہیں، ہمارے واحد اثاثے، مویشی کم ہوتے جا رہے ہیں، ہمارے گھر محفوظ نہیں، نہ مصنگ کی تنخواہیں ملتی ہیں، ملازمتیں ہیں، رہداری کے پیمانے کے صورت میں ہمیں آنے جانے کی آزادی نہیں، کرپشن کے قوانین، بڑے پیمانے پر لوگوں کی آمد پر کنٹرول کا نفاذ مختصر یہ کہ سفید فام گوادو کی برتری کو یقینی بنانے کے لیے برسوں سے ہم اپنے اوپر جبری برہمناء دیکھ رہے ہیں۔

میں، اس پس منظر میں، اپنی پوری انفرادی ذمہ داری کے ساتھ امریکن نیشنل کانگریس (میدال) کے زیرِ سرایہ، اپنے لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہوں، اس نئے جذبے کے ساتھ جو آج انھیں متحرک کر رہا ہے، وہ جذبہ جو انصافیوں کے خلاف سنگتِ ارادوں اور عدم تشدد کے ذریعے کھلے بندوں اور بہادری سے بغاوت کر رہا ہے اور اپنا اٹھار کر رہا ہے۔

فریکن نیشنل کانگریس اپنی عدم تشدد اور مجہول مزاحمت کی مہم کے باعث حکومت کے لیے وبال تو ہو سکتی، مگر حیرت ہی نہیں، اس لیے کہ یہ حکومت یا ریاست کا تنہا اٹھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہے، بلکہ صرف اتنی گزارش کر رہی ہے کہ برادری کی بنیاد پر ملک کی حکومت میں سماج کے ہر طبقے کو شریک کیا جائے۔

ایسے قوانین اور حالات کی، بلا کسی مروت کے جو خدا کی عطا کردہ طاقت - انسان کو انفرادی طور پر ذلیل کر رہے ہیں، خواہ وہ ریاست کے ہاتھوں ہو رہی ہو یا افراد کے، سینٹ پیٹر کی لٹاکر کے جذبے کے ساتھ مخالفت کی جانی چاہیے، جب انھوں نے وقت کے ارباب اقتدار سے کہا تھا: ہم خدا کی اطاعت کریں یا

انسان کی؟ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ جہاں تک جنوبی افریقا کی غیر سفید فام آبادی کا تعلق ہے، کوئی بھی ایسے قوانین اور حالات کو قبول نہیں کر سکتا جو انھیں ذلیل کرتے ہوں۔ جب کہ کسی بھی مردار کی خواہ وہ کسی بھی حیثیت کا ہو ایسے ذلت آمیز قوانین کا بلا خوف و خطر مقابلہ کرنا ہوگا۔

آزادی کے خلاف کام کرنے کی صورت میں کچھ افراد یا خاندانوں کے لیے آگے بڑھنا اور ڈکھ اٹھانا ناگزیر ہوگا کہ: آزادی کا راستہ صلیب سے ہو کر گزرتا ہے۔“

1952 میں جب افریکن نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہونے پر ان کو سرداری کے عہدے سے معزول کر دیا گیا تو ان کو تین برس تک اپنے شہر سے باہر قدم نکالنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ 1954 میں وہ ایک جلسے سے خطاب کرنے کی غرض سے جوہانسبرگ گئے، جو رنگ دار لوگوں کو صوفیہ ماؤن سے زبردستی نکال کر چھانگا ہوں کی سر زمین پر بھیج دینے کے خلاف احتجاج کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ ان کو اس میٹنگ میں خطاب کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور مزید دو برس تک اپنے ضلع سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

1956 میں 155 دوسرے افراد کے ساتھ گرفتار کر کے ان پر بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ 1957 میں ان پر اور 64 دوسرے افراد کے خلاف الزامات واپس لے لیے گئے، باقیہ تمام لوگوں کو 1961 میں بری کر دیا گیا تھا۔ 1958 میں انھوں نے کئی بڑے عوامی جلسوں میں شرکت کی، اور ایک بار پھر ان پر سفر کی پابندی لگا دی گئی، اور اس بار یہ پابندی پانچ برسوں کے لیے عائد کی گئی تھی۔ 1960 میں راہداری کے پروانے کے ضابطوں کے خلاف بڑے پیمانے پر مظاہرہ ہوا تھا جس کے دوران 'شارپ ویل' کے واقعات ہوئے، جہاں پولیس نے جھپٹے پر گولیاں چلائی تھیں، جس سے کئی ہلاک ہوئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ علاقے میں ایمر جنسی نافذ کر دی گئی اور تھوک کے بھاء گرفتاریاں کی گئیں۔ لوٹوٹی کو جنھیں 1956 سے جاری ملک کے خلاف فحشاری کے مقدمے میں گواہی کے لیے طلب کیا گیا تھا، بہت سے افراد کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا، مگر ان کو گواہی دینے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

پچھلے برس کے دوران وہ گھر پر ہی رہے، انھیں اپنے گاؤں سے باہر جانے اور انھیں کسی بھی قسم کے جلسے میں شرکت کرنے کی ممانعت تھی۔ مزید یہ کہ اب وہ افریکن نیشنل کانگریس کے صدر نہیں رہے تھے اس لیے کہ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، کانگریس کو حکومت کے حکم پر 1960 میں تحلیل کر دیا گیا تھا۔

اب وہ اپنے گاؤں ہی میں رہتے تھے، ان کو نقل و حرکت اور عوامی مباحثے میں تقریر کی ممانعت ہے، مگر وہ اب بھی اپنی خود-اختیار کردہ پالیسی کے مطابق اخباروں میں اپنے خیالات کے مضامین شائع کرتے رہتے ہیں۔ دسمبر 1919 میں ان پر سفر کی پابندی لگنے سے قبل۔ جنوبی افریقا کے قیام کی پچاس ویں سال گرہ سے ایک برس قبل۔ انھوں نے ایک طویل مضمون بعنوان Fifty Years of Union - A Political Review لکھا تھا اور South Africa Institute of Race Relations کو بھیجا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق، اس مضمون میں انھوں نے جنوبی افریقا کی حکومت کی اختیار کردہ پالیسی کے بارے میں اپنا موقف مکمل طور پر اور

صاف صاف بیان کر دیا تھا۔

اس مضمون میں، جنوبی افریقا کی حکومت پر ان کے حملے پہلے کے مقابلے میں زیادہ شدید اور تفصیل سے کیے گئے ہیں۔ یہ بحث اور نسلی امتیاز کی پالیسی پر حملے اور اس میں بیان کردہ منصوبہ، کہ غیر سفید فام کیوں کو خود اپنے طریقوں سے ترقی کرنا چاہیے، ایک نئی بات ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ یہ خطوط فاصل کس نے کھینچے ہیں؟ اس کا جواب ہے: ان کے پیرو کار غیر سفید فام افراد نے نہیں، بلکہ ان سفید فام لوگوں نے، جو اقتدار میں ہیں۔ غیر سفید فام کے تو کوئی حقوق ہی نہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ وہ پچاس سالہ جشن میں شرکت کریں یا عمویشیاں منائیں۔ غیر سفید فام باشندوں کے پاس، سب کے لیے آزادی اور جمہوریت کے حصول کے لیے، ہمت اور مہر سے کام کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

ان کے اس مضمون کے بعد، جنوبی افریقا اب ایک جمہوریہ بن چکا ہے اور برطانوی دولت مشترکہ کا حصہ نہیں رہا، مگر اس تبدیلی کے بعد بھی سفید فام اور غیر سفید فام افراد کے درمیان رشتوں میں بہتری نہیں آئی ہے، نہ اس نے لولوں کے رویے میں کسی قسم کی تبدیلی کی ہے۔ وزیر اعظم Stridam کو خط میں نہایت مختصر انداز میں اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے، جن پر وہ ہمیشہ سے قائم رہے ہیں، لکھتے ہیں:

”ہم ایسے سماج پر یقین رکھتے ہیں جس میں سفید فام اور غیر سفید فام دونوں ہم آہنگی سے رہ سکیں، برابری سے زندگی کی تمام نعمتوں میں شریک ہوں، ہمارے ملک میں جس کی بہتات ہے، اور اپنے اجداد کے مشترکہ ملک کے لیے کام کر سکیں۔“

ہم عوام کے بھائی چارے اور ہر فرد کی انفرادی قدر اور احترام پر یقین رکھتے ہیں۔ میری کاتھریس نے کسی بھی نسل کے لیے کبھی کسی قسم کی نفرت کا اظہار نہیں کیا ہے۔“

لولوںی بار بار اب تک، یہی بات دہراتے آئے ہیں۔

ان کی سرگرمیوں کا انداز ہمیشہ مستحکم اور کبھی نہ جھکنے والا رہا ہے۔ اپنے لوگوں کے لیے کی جانے والی جدوجہد میں وہ کبھی تشدد کے استعمال کی طرف راغب نہیں ہوئے ہیں۔ کسی بھی شے نے ان کے اس عہد کو جو، ان کی مرثیت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، کہ کسی بھی صورت میں تشدد اور دہشت کا استعمال نہیں کیا جانا چاہیے، کبھی متزلزل نہیں کیا ہے۔ نہ کبھی انھوں نے کسی سفید فام انسان سے نفرت کی ہے نہ کسی کو اس عمل پر اکسایا ہے۔

البرت لولوں کی جنگ ان کے اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر لڑی گئی ہے، مگر اس میں اٹھائے گئے مسائل ان کے پار بہت دور تک جاتے ہیں۔ ان کے پیغامات ان سب کے لیے ہوتے ہیں جو قوموں کے اندر اور قوم کے درمیان انسانی حقوق کے احترام کے لیے کام کرتے ہیں۔

تو کیا ہم یہ سوال کر سکتے ہیں: کیا غیر سفید فام، اپنے دکھوں، اپنی ذلت اور اپنے صبر کے ساتھ دنیا کی دوسری قوموں کو دکھ سکتے ہیں کہ ان راستوں پر چل کر، بغیر تشدد کے بھی انسانی حقوق حاصل کیے

جاسکتے ہیں، جن پر چلنے کا ہم یورپی لوگوں نے عقلی اور جذباتی طور پر عہد کر رکھا ہے، مگر ہم سب نے بھی جس کو چھوڑ دیا ہے؟

اگر کبھی جنوبی افریقا کے غیر سفید فام عوام تشدد اور دہشت پر بھروسہ کیے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے تو یہ لوگوں جیسے بڑے اور ایمان دار رہنمائی کے فیض سے ہوگا جو اپنے اخلاقی معیار کے باعث، اپنی پالیسیوں کی تائید میں لوگوں کو مجتمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے اپنی بلوغت کے دوران اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا، اور اپنے ہم وطن عوام کی محبت میں، بغیر کسی تلخی اور تشدد کے، بہت دُکھ جھیلے ہیں۔

مگر جنوبی افریقا کے غیر سفید فام عوام کی آزادی کے لیے ہونے والی جدوجہد پر کبھی ایسا دن آتا ہے کہ وہ قتل و غول ریزی پر منتج ہو تو اس میں لوگوں کی آواز نہیں سنائی دے گی۔ مگر ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کا طریقہ کار غیر متزلزل اور واضح تھا۔ اور وہ ہرگز ایسا نہیں ہونے دیتے۔

آئیے، ہم خاموشی سے ایسا وہ ہو کر البرٹ جان لوٹولی کو احترام سے پُر خراج عقیدت پیش کریں۔
صدر نشین مارویائی نوبیل کمیٹی Gunhar Jahn کی زبانی

خطبہ:

افریقا اور آزادی

گزشتہ سو برسوں میں، ہماری صدی کے کچھ عظیم ترین افراد انعام حاصل کرنے کے لیے یہاں ایسا وہ ہوئے تھے، ایسے لوگ جن کے نام اور کام نے انسانی تاریخ کے صفحات کو مالا مال کیا ہے، ایسے لوگ جن کو آئندہ نسلیں اس لیے یاد رکھیں گی کہ انہوں نے ہماری دنیا کو ایک نئی صورت عطا کی ہے۔ کمی کو Grautville نام کے ایک گاؤں پر حیرت نہیں ہونی چاہیے، جسے آپ میں سے بہتوں نے پہلے نہیں سنا ہے، جو کسی نقشے پر بھی واضح نہیں ہوتا۔ ایک پس ماندہ دیہاتی علاقے کی اجلا وطنی اور جنوبی افریقا کی اندرونی سیاسی گلیوں سے اٹھا لائے جانے والے، اور اسی مقام پر، ان عظیم ہستیوں کے سایے میں، ایسا وہ کیے جانے والے شخص پر کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میں اس شرف نشین پر ایسا وہ ہوں جہاں ہمارے عہد کی بڑی ہستیاں ایسا وہ ہو چکی ہیں۔

نوبل امن انعام، جو مجھ کو یہاں تک لے آیا ہے، میرے لیے تعین خصوصیات کا حامل ہے۔ سب سے پہلے تو یہ میرے اُس کام کے لیے خراج تحسین ہے جو میں نے رنگ کی کیر کے دونوں جانب کے نسلی مسائل کا پُر امن حل تلاش کرنے کے سلسلے میں کیا ہے۔ میری کوشش کسی طرح بھی منفرد نہیں۔ جنوبی افریقا کے علاقے میں انسان کی آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کی شروعات میں نے نہیں کی، دو برس افریقی

محب وطن۔ مخلص انسانوں۔ نے مجھ سے پہلے ہی شروع کر دی تھی۔ ایک عیسائی اور محب وطن ہوتے ہوئے میں بھی آگے نہیں دیکھ سکتا تھا، جب باقاعدہ کوششیں کی جا رہی تھیں، زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں انسان کے اندر موجود خدائی عنصر کو گھٹانے کی، یا ایک حد مقرر کرنے کی، جس کے پرے ایک سیاہ فام انسان کو اپنے خالق کی حتی الامکان خدمت کی کوشش کی بھی اجازت نہ ہو۔ ایسے حالات میں، جہاں کے قوانین کے ذریعے خدا پر تنقید کی جا رہی ہو کہ اس نے رنگ وارجلد والے انسانوں کو خلق کیا، ایک عیسائی ہوتے ہوئے لا تعلق رہنا میرے لیے قابل برداشت نہیں تھا۔

دوسری طرف، یہ انعام ایک جمہوری اعلان ہے باہمی اتفاق کا، ان لوگوں کے ساتھ جو میرے علاقے کی دنیا میں آزادی کے علاقے کو وسیع کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اس طرح، یہ ایک قسم کا اٹھارہ ہے جو مجھے اور کروڑوں انسانوں کو، جو میری ہی طرح سوچتے ہیں، بے پناہ اہمیت عطا کرتا ہے۔ آج بھی دنیا میں ایسے انسان موجود ہیں جو جنوبی افریقا کے نسلی مسئلے کو کالے اور گوروں کے درمیان ایک مادہ سمجھتا سمجھتے ہیں۔ ہمارے ملک کی حکومت نے بڑی احتیاط سے دنیا کے سامنے اس مسئلے کو اسی رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس کے اثرات دو قسم کے ہیں۔ اس نے نسلی بحران کے حقیقی مسائل کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ اس طرح حکومت کے اس دعوے کو تقویت دی ہے کہ نسلی مسئلہ جنوبی افریقا کا داخلی معاملہ ہے۔ اس طرح، دنیا کے سامنے ہمارے مسئلہ اتنا چھوٹا بنا دیا گیا ہے کہ دنیا کے سامنے صحیح معنوں میں پیش نہیں ہو سکتا ہے۔

ایک اور زاویہ سے، یہ ایک خوش آئند اعتراف ہے اس کردار کا جو فریقی عوام نے پچھلے پچاس برسوں میں پرامن طریقے سے ایک سوہائلی بنائے میں ادا کیا ہے جس میں نسلی نہیں، صرف صلاحیت، قوم کے کسی فرد کی حیثیت کو متعین کرے گی۔

یہ انعام نہ تھا میرے لیے ہو سکتا ہے، نہ ہی صرف جنوبی افریقا کے لیے۔ یہ تو پورے افریقا کے لیے ہے۔ اس وقت جدال اور نسلی تنازعات نے افریقا کو بڑی طرح مار رکھا ہے۔ تو، یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ آدمیوں کے درمیان بھائی چارے اور امن کی خدمت کے عوض انعام حاصل کرنے نے افریقا ہی سے ایک آدمی آیا ہوا ہے۔ ہمارے زمانے میں افریقا میں بہت کم امن رہا ہے۔ ہمارے براعظم کے شمال ترین سرے سے جہاں سات برس سے جنگ جاری ہے، مرکز اور جنوب تک جنگیں لڑی جا رہی ہیں، کچھ اسلحوں کی مدد سے اور کچھ اس کے بغیر۔ میرے اپنے ملک میں، 1960 میں، جس کے لیے انعام دیا جا رہا ہے، ایک ریاست ہے جس میں کئی ماد کے لیے ہنگامی حالات کے قوانین نافذ تھے۔ مثلاً رپ ول نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں، ایک دوپہر میں 69 آدمی گولی سے اُڑا دیے گئے تھے اور 180 زخمی ہوئے تھے اور مراثی لگائی جیسے علاقے میں اب بھی ہنگامی حالات کے قوانین نافذ ہیں۔ ہمارا براعظم جبر کے خلاف انقلاب کی کیفیت میں ہے۔ اور امن و انقلاب کا ایک ساتھ مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ لہذا، جب تک جبر کی طاقتوں کا تختہ نہیں الٹ دیا جاتا، امن قائم نہیں ہو سکتا۔

بڑی طاقتوں نے ہمارے براعظم کو تاش کر کے رکھ دیا ہے، افریقی عوام پر فوجی فتوحات اور اقتصادی غلبے کے ذریعے، ہم پر غیر ملکی حکومتیں مسلط کر دی گئی ہیں۔ قومیت اور قومی وقار کو طاقت سے کچل دیا گیا ہے؛ روایتی اقتصادیات اور قدیم رسوم تروبادا کر دی گئی ہیں اور انسانی ہنرمندی اور توانائی کو صرف ہمارے فاتحین کے مفاد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں کہیں امن نہیں، آدمیوں کے درمیان کوئی برادری نہیں ہو سکتی۔

مگر اب، ہمارے براعظم کی انقلابی فعالیت ماضی کو پیچھے چھوڑتی جا رہی ہیں۔ براعظم کے شمال سے جنوب تک ہر جگہ ہمارے عوام، اپنی زمینوں کو، حکومت میں شریک ہونے کے اپنے حق کو، آدمی ہونے کی حیثیت میں اپنے وقار کو اور اپنی قومیت کو واپس طلب کر رہے ہیں۔ اس طرح، انقلاب کی لہجی میں، افریقا میں امن اور بھائی چارے قومی حاکمیت کے احیا اور خود مختاری کے ذریعے، انسانی وقار اور برادری کی بنیاد دوبارہ رکھی جا رہی ہے۔

یورپ میں رہتے ہوئے اس کو سمجھنے میں آپ کو دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کا براعظم بھی انقلابی مشکلات کے سلسلوں سے گزر چکا ہے جس میں آپ کی جاگیر دارانہ پس ماندگی نے صنعتی ترقی، سبکی قومیت، جمہوریت اور اعلیٰ معیار زندگی کے لیے جگہ خالی کر دی تھی۔ ایک سنہری دور کے لیے۔ نسلوں نے جس کے لیے جدوجہد کی ہے۔ آپ کے عہد انقلاب نے، جو اٹھارویں صدی سے ہماری صدی تک پھیلا ہوا تھا، تاریخ کے خوفی ترین انقلاب سمجھے گئے ہیں۔ مگر اس کے مقابلے میں افریقی انقلاب ایک عشرے میں تقریباً تین چوتھائی براعظم پر چھا گیا ہے، اور ہماری نسل اس کی آخری تکمیل کے مناظر جلد دیکھنے والی ہے۔ یعنی، یورپ کے مقابلے میں، ہمارا افریقی انقلاب، ہمارے طفیل، مرعب، تیز اور نسبتاً خون سے پاک ہے۔

افریقی انقلاب کے نسبتاً پر امن ہونے کی شہادت معتبر مبصرین نے دی ہے۔ ریچرڈ سٹریوٹی ورنٹی کے پروفیسر G.W. de Kiewiet نے 1960 کے ایک Hoernlé Memorial Lecture میں کہا تھا: یہ سچ ہے کہ سیاسی خود مختاری کے حصول کے دوران کوئی خاص تشدد نہیں ہوا۔ اگر ان معنوں میں دیکھا جائے تو دراصل، افریقا میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ صرف اصلاحات ہوئیں۔“

کیپ ٹاؤن یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر D.V. Cowen نے Hoernlé Memorial Lecture for 1961 میں ہماری جدوجہد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے: ”یہ [جنوبی افریقا کے سفید فام] لوگ بہت خوش قسمت ہیں کہ جنوبی افریقا میں ان کو بڑے اعلیٰ معیار کے غیر سفید فام لوگ ملے ہیں، جو پورے براعظم کی کسی بھی آبادی کے مقابلے میں بہتر ہیں۔“ جو افریقا کی طرف حقارت سے دیکھتے ہیں انھیں ان الفاظ کو سمجھیں نہیں بھولنا چاہیے۔

مثلاً آپ کے معیار کے مطابق ہماری انقلابی اصلاح کی لہر دیر سے اٹھی ہے۔ مگر ایسا ہے۔ مگر ہم دیر سے شامل ہو رہے ہیں جدید دور کی روشن خیالی میں، خود مختاری حاصل کرنے میں، آزادی میں اور جمہوریت

میں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی میں ان [تہذیبوں] کی رفتار کا تعین ہم نے نہیں کیا تھا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں ترقیات کی مثال یورپ نے پیش کی تھی۔ صرف اب ہمارا براعظم اپنے آپے میں آ رہا ہے، اور اپنے مقدر کو غیر ملکی حکمرانی سے واپس لے رہا ہے۔

اگرچہ میں اکیلے افریقا کی بات کرتا ہوں، مگر یہ تقسیم در تقسیم ہے نسل، زبان، تاریخ اور روایات میں؛ سیاسی، اقتصادی اور گروہی سرحدوں کے ذریعے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ باوجود ان مختلف قسم کی تفریقات کے، افریقا کا ایک مقصد اور ایک ہی ہدف ہے۔ اس کی اپنی خود مختاری کا حصول۔ پورا افریقا، اس کے دونوں علاقے جن میں سیاسی کامیابی ہوئی تو ہے مگر ابھی تک ان کی اقتصادی پس ماندگی دور نہیں ہوئی ہے، اور میری اپنی سرزمین کی بھی، جس کی سیاسی جنگیں انجام تک لڑی جاتی ہیں۔ پورے افریقا کا ایک ہی مقصد ہے: ہمارا ہدف ہے، ایک متحد افریقا، جس میں معیار زندگی بڑھتا رہے اور آزادی کا فروغ ہوتا رہے، جس میں جہالت اور بیماریوں کی قدیم وراثت کا صفایا کر دیا گیا ہو، جس میں نوآبادیاتی طاقتوں کے جوتوں تلے دبے انسانی وقار کی بازیافت ہو۔ ہمارے گروٹوں افراد نے انقلابی جذبے کے ساتھ اپنے ہدف کے لیے کوشش کی ہے، کتابوں کے نمائندگی کے، مظاہروں کے اور کہیں تو اسلحے کے ذریعے، جو سفید فام برتری کے اُکسانے پر اٹھائے گئے تھے ان ہی سب سے افریقا میں حقیقی امن کی امید وابستہ ہے۔ جو کچھ بھی طریقے استعمال کیے گئے ہیں، صرف نسلی امتیاز کی استبداد کے خلاف کیے گئے تھے۔

یہ ایک تضاد ہے کہ نہیں کہ افریقا کو اپنے ہنگامے اور انقلاب کے زمانے میں اس انعام کا حق دار سمجھا گیا ہے۔ کتنا عظیم ہے یہ تضاد اور کتنا بڑا ہے یہ اعزاز، کہ امن اور بھائی چارے کے لیے دیا جائے۔ الا انعام ایسے شخص کو ملے جو ایسے ملک میں رہتا ہو جہاں بھائی چارہ ایک غیر قانونی نظریہ ہو، ممنوع ہو جس پر سسر ہو، جہاں آدمی کی بھائی کے لیے بات کرنا، کام کرنا، مہم چلانا خطرناک اور قابلِ مزا ہو، جس پر قید کیا جاتا ہو، بغیر مقدمے کے، جہاں پچھلے 300 برس سے نسلی مسائل کو پورا امن طریقے سے حل کیے جانے کے لیے جمہوری طریقے نہ ہوں، اور جہاں سفید فام اقلیت افریقا کی سب سے بڑی اسلحہ بردار فوج کے مل پر قابض ہو۔ یہ ہے جنوبی افریقا!

یہاں بھی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سفید فام لوگوں نے طے کر لیا ہے کہ وہ بہتری کے بارے میں، افریقا کی آزادی کی جدوجہد کے بارے میں، انسان کی برابری کے بارے میں اور آزادی کے مطالبے کے بارے میں سوچیں گے نہیں۔ ان آدمیوں کے لیے جدوجہد کے دوران اپنے بے شمار ہم وطن افراد کے ساتھ مجھے بے حد پریشان کیا گیا، حتیٰ کہ قید میں ڈال دیا گیا تھا، مگر ہم نے مہم کیا ہے کہ نئے دور کی تلاش میں جس میں ہم امن اور بھائی چارے کے ساتھ رہ سکیں، ہم ہمت نہیں ہاریں گے۔

ضروری نہیں کہ میں جنوبی افریقا کے بارے میں تفصیل سے بات کروں، اس کا سوشل نظام، اس کی سیاست، اس کی اقتصادی اہلیت اور قوانین سب نے زبردستی دنیا کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ یہ ہمارے وقت

کے عجائب گھر کی ایک قدیم شے ہے، بنی نوع انسان کے تاریک ماضی کا شمار ہے، ایسے عہد کی منتائی ہے جو ہر جگہ یا تو مر گئی ہے یا مر رہی ہے۔ یہاں نسلی برتری کے مسلک اور سفید فام فضیلت کی خدا کی طرح پرستش کی جاتی ہے۔ بہت کم سفید فام افراد ہیں جو بد عنوانی سے باز رہتے ہیں، اور ان کے بال بچے اس بات پر یقین کرنا سیکھ جاتے ہیں کہ سفید فام لوگ یقینی طور پر برتر، کامل، چالاک، جفاکش اور لائق ہوتے ہیں، کہ سیاہ فام افراد یقینی طور پر کم تر، کامل، احمق، ناکارہ اور نادری ہوتے ہیں۔ اس دیومالائی بنیاد پر کہ ”ان [سفید فام] میں کامیابی کا سب سے حقیر، ہمارے [سیاہ فام] بڑے سے بھی بڑا ہوتا ہے“ یہ دھوکا کیا جاتا ہے کہ سفید فام ہر وہ چیز بناتے ہیں جو ملک کے کام کی ہوتی ہے۔ اس کے شہر، اس کی صنعتیں، اس کی کانیں اور اس کی زراعت، اور جہاں وہی اس قابل اور حق دار ہیں کہ وہ ان چیزوں کے مالک ہوں اور ان کو کنٹرول کریں، جب کہ سیاہ فام افراد شہروں میں وقتی طور پر رہنے والے ہیں، صرف خدمت گاری کے قابل ہیں، اور اقتدار میں شرکت کے لیے نا اہل ہوتے ہیں۔ جنوبی افریقا کے وزیر اعظم فاکٹر Verwoerd نے، جو اس وقت Bantu Affairs کے وزیر تھے افریقی تعلیم کی پالیسی پر بات کرتے ہوئے کہا تھا: ان لوگوں [افریقیوں] کے لیے یورپی کمیونٹی میں کچھ اقسام کے مزدوروں سے بڑی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

اس دیومالا میں کچھ نئی بات بھی ہے۔ افریقا کا ہر حصہ جو سفید فام افراد نے فتح کیا تھا، کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ نہیں، اس دکھ سے گزرا ہے، جس میں تلخ ترین غلامی بھی شامل ہے، جو انیسویں صدی عیسوی میں افریقا میں رائج تھی۔ اس دور رفت کی ظلمت میں مڑی کا عنصر روشنی کی وہ عمودی سرنگ تھی جو بیہوشی میں لے کھودی تھی، روشنی کی وہ سرنگ جس نے ہماری ابتدائی روشن ضمیری کی ابتدا کی تھی۔ بعد میں آنے والی اس وقت کی حکومتوں نے، جب بددعوتوں کے ہاتھوں سیاہ فام آدمی کو دیے جانے والے بھیا نک ترین دکھ کی کمی کے لیے بہت کم، یا کچھ بھی نہیں کیا کیا تھا، ڈاکٹر ڈیوڈ لیونگسٹن (David Livingstone) اور ڈاکٹر جان فیلپ (John Philip) اور دیگر مسیحی مبلغین جو تباہ کن تقابوت کے آگے سماجی انصاف کے لیے سینہ سپر ہو گئے تھے۔ یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ میں نے جن لوگوں کے نام لیے ہیں وہ آج بھی کچھ جنوبی افریقیوں کے نزدیک ملعون ہیں۔ اس طرح، غلامی کا بھوت، جبری مزدوری کے جگر میں، آج بھی لہرا رہا ہے، جسے ہم زرعی قید خانے کے نام سے پکارتے ہیں۔ مگر، لیونگسٹن اور فیلپ کی روایت آج بھی ان چند لوگوں کے شہیل زندہ ہے جو ان ہی کے خطوط پر کام کرتے ہیں۔ یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ آج کے حالات میں، عیسائی مشن جو عیسائی سماجی انصاف فراہم کرتا ہے، ہمارے نزدیک ایک ہراول دستہ جیسا ہے۔ اس میدان میں ہماری ترقیات حکومت کے بغیر جاری رہی ہیں۔ اس سلسلے میں، دیر سے کسی، مگر جنوبی افریقا کا کلیسا ہم لوگوں کے لیے ایک وسیع چیلنج کے نام سے کام کرتا نظر آ رہا ہے۔ کلیسا اپنے بنیاد گزار کے قول پر سنجیدگی سے توجہ دینا نظر آ رہا ہے، جس نے کہا تھا، ”میں آیا ہوں کہ انھیں زندگی ملے اور فراط کے ساتھ۔“ اس میں جنوبی افریقا کے کلیسا کو موجودہ دور میں انسان کی بہتری کے لیے کام کرنے کا حکم تھا۔ اس سلسلے میں جنوبی

افریقا کے عوام، بالخصوص عیسائیوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ انھیں 1960 میں Gambia میں جوہانسبرگ میں منعقد ہونے والی World Council of Churches کی کانفرنس کے فیصلوں پر سختی سے غور کرنا چاہیے، جس میں اس دور کے کلیسا کے مشن کو واضح ہدایات دی گئی تھیں۔ اس میں انسانیت کو درپیش موجودہ مسائل کے بارے میں عیسائی پیغام میں کوئی ابہام نہیں چھوڑا گیا تھا۔ میں World Council of Churches کی وسعت نظری پر انھیں مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ افریقا میں ہمارے لیے اس کے مطالب اور معافی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ جنوبی افریقا کے نسلی امتیاز کے خیالات کوئی نئی بات نہیں، مگر اس مسئلے میں جنوبی افریقا منفرد ہے؛ نہ صرف یہ کہ یہ خیالات ہماری جدید دنیا میں بچ گئے ہیں بلکہ ان کا دفاع کیا جاتا ہے، ان کو وسعت دی جاتی ہے، اور قانون سازی کے ذریعے ان کی اعانت کی جاتی ہے، ایسے وقت میں جب دنیا کے بڑے حصے میں تاریخی طور پر یا تو انھیں بڑی بے حیائی سے ضابطوں میں چھپایا جاتا ہے یا رفتہ رفتہ ان کو نابود کیا جاتا ہے۔ یہ خیالات جنوبی افریقا میں اس لیے بچ گئے ہیں کہ ان کی سرپرستی کرنے والے ان سے فائدے اٹھاتے ہیں۔ وہ ملک کے موجودہ حالات پر سفیدی پھیر دیتے ہیں؛ اس حقیقت پر کہ ملک پر سفید فام حکومت قائم ہے جس کو غیر ضروری مراعات یا فز سفید فام اقلیت منتخب کرتی ہے؛ اس حقیقت پر کہ شہروں کے قریب کی سیاسی فی صد بہترین زرعی زمین، بازار اور ریلوے سفید فام افراد کی ملکیت اور قبضے کے لیے مخصوص ہیں اور اب حالیہ Group Areas کی قانون سازی کے باعث سفید فام افراد کی طبع غیر سفید فام سے زمینیں چھین کر سفید فام افراد کو دے رہی ہے؛ اس حقیقت کے پیش نظر کہ تمام ہنرمندی اور بڑی تنخواہوں کی ملازمتیں صرف سفید فام کے لیے ہیں؛ اس حقیقت کے پیش نظر کہ تمام یونیورسٹیوں کی تعلیمی فعالیتیں صرف سفید فام کے لیے مخصوص ہیں؛ اس حقیقت کے پیش نظر کہ سفید فام بچے کی تعلیم پر تقریباً 64 روپے طائفہ پاؤنڈ فی سال کے برابر رقم خرچ ہوتی ہے جب کہ ایک افریقی بچے پر صرف 9 روپے طائفہ پاؤنڈ خرچ کیے جاتے ہیں، اور ہندوستانی یا رنگ دار بچے پر 20 پاؤنڈ فی سال خرچ اٹھتا ہے؛ اس حقیقت کے پیش نظر کہ سفید فام بچوں پر سولہ برس کی عمر تک تعلیم لازمی ہے، جب کہ غیر سفید فام بچوں کی تعلیم بہت کم بھی ہے اور کافی بھی؛ اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہر سال تقریباً ایک ملین افریقی باشندے بے شمار pass اور permit کے قوانین کو توڑنے کی پاداش میں جہان بھر رہتے ہیں یا قید کر دیے جاتے ہیں جو سفید فام افراد پر لاگو نہیں ہوتے۔

میں پالنے سے لے کر قبر کی منزل تک، جنوبی افریقا کی زندگی کے ہر پہلو پر بے مکان باتیں کر سکتا ہوں۔ مگر یہ تمام حقیقتیں اب پوری دنیا پر آشکار ہوتی جا رہی ہیں۔ ان پر دنیا کی توجہ کی تیز اور زائد روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ آپ بھی کوشش کرو دیکھیے جس طرح ہماری حکومت اور اس کے اندر خواہ "علاقہ ترقیات" اور بالآخر "عوامداری" اور نام نہاد "یونیورسزم" جیسے شہد بھرے الفاظ کے استعمال کے پردے میں کریں گے، مگر کسی طرح بھی جنوبی افریقا کے حالات کی حقیقت کو چھپایا نہیں جاسکتا۔ میں نے ایک عیسائی کی حیثیت میں ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ "نسلی امتیاز" یا "علاقہ ترقیات" کے پردے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ناقابل معافی

ہے۔ یہ سب کچھ ان لوگوں کے لیے کتنا غیر اہم ہے، جن سے ان کی زمینیں اور ملازمین چھین لی جاتی ہیں، اس کی تلاش میں جو یقیناً دنیا کا سب سے ڈراؤنا خواب ہے۔ یہ ڈراؤنا خواب سماج کے کسی کوئے کے غیر اہم گروہ یا Ku Klux Klan جیسے لوگوں کا نہیں، ہمارے سماج میں بھی جن کے ذرات موجود ہیں۔ دراصل یہ حکومت کی ایک سوچی سمجھی پالیسی ہے، جس کو عملی طور پر سفید فام آبادی کے ایک بڑے حصے کی تائید حاصل ہے، اور جس کو سفید فام باشندوں کی اکثریت بغیر کسی مزاحمت کے برداشت کر رہی ہے، مگر خوش قسمتی سے اب سفید فام باشندوں کی ایک باہمت اقلیت اس کو رد کر رہی ہے، جو اب غیر سفید فام آبادی کے ساتھ ہو گئی ہے، جو شدید مد سے نام نہاد علاحدہ ترقیات کی مخالفت کر رہی ہے۔

کویا افریقا کی خود مختاری کا یہ سنہری عہد جنوبی افریقا کے زوال اور انحطاط کا عہد تاریک بھی ہے، جس کے ذمے دار وہی لوگ ہیں جنہیں افریقا کے جنوبی گوشے میں اُس وقت لایا گیا تھا جب یورپ میں انقلابی تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور دبائے گئے بنیادی انسانی حقوق اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ اور اس طرح اُن پر ترقیاتی تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

اس انحطاط اور حرکت معکوس کی موجودگی میں، آدمیوں کے درمیان تلخی خوف ناک بلندیوں تک بڑھ جاتی ہے، اعتبار گھٹنے لگتا ہے تو معیشت زوال پذیر ہو جاتی ہے، بے روزگاری بڑھتی ہے، حکومت آمرانہ ہو جاتی ہے، قانونی اور آئینی دستور العمل کو برداشت نہیں کرتی، تشدد اور جارح ہو جاتی ہے، زیادہ پولیس کی فٹری، مزید فوج اور زیادہ اسلحے کی ضرورت ہونے لگتی ہے، بغیر مقدمے، بغیر سزا کے لوگ غائب ہونے لگتے ہیں اور تعزیری کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کی پس ماندگی کے تمام پھندے اور تمام حکم ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ تعلیم چالاک سے مرضی کی باتیں سکھائے جانے کی پستی تک گر جاتی ہے، اخلاعات عامہ کے عناصر کچ رو اور طرف دار ہو جاتے ہیں، سنسریپ امرتھل کی طرح پھیلنے لگتی ہے، کتابیں ممنوع ہونے لگتی ہیں، بلیک لسٹ کرنا عام ہو جاتا ہے۔ ایسی ساری خرابیاں زمین پر اپنے سایے ڈال دیتی ہیں۔ بہا عظم افریقا کی عظمت کے عہد میں، یہ ہے آج کا جنوبی افریقا۔

نکمر اس سطح کے نیچے ایک سرگتھی کا جذبہ موجود ہے۔ جنوبی افریقا کے لوگ کبھی بھی محض اطاعت گزار نہیں تھے۔ ہماری ایک طویل روایت ہے، اپنے قومی حقوق کے لیے جدوجہد کی، جو 300 برس قبل سفید فام قوموں کی نوآبادی کے شروع ہونے تک جاتی ہے۔ ہماری تاریخ غیر ملکی غلبے کی مخالفت سے، احتجاج سے اور جبر کے سامنے سرخم کرنے سے انکار سے عبارت ہے۔ ہمارے کچھ عظیم ناموں پر نظر کیجیے: عظیم جنگجو اور قوم کا معمار شا کا (Shaka) تھا، جس نے قبائل کو زولو قوم کے چکر میں یکجا کیا تھا، میں خود جس کی پیداوار ہوں؛ Eshoe Moshoe، عظیم مدبر قوم کا معمار تھا، جس نے Basuto قوم کی تشکیل کی تھی اور اس کی سر زمین Basutoland کو جنوبی افریقا کے پنجے سے بچایا: Xosas کا Hintsa، جس نے سفید فام حملہ آوروں کے ہاتھ اپنا علاقہ دے دیے پر موت کو ترجیح دی تھی۔ یہ سارے نام اور دوسرے شاہی نوعیت کے نام، اور

دوسرے مردانہ قبائل نے جواں مردوں سے سفید قام لوگوں کی مداخلت کی مزاحمت کی تھی۔ اور ان خاندانوں پر بھی غور کیجیے جنہوں نے ان عظیم لوگوں کی پرورش کی تھی۔ میں ان صابریں کی نشان دہی کر رہا ہوں، جنہوں نے صدیوں پہلے شمال سے جنوب کے آخری سرے تک نقل و وطن کرنے میں ہمیشہ پھرے رہنے والے دیاؤں کو عبور کیا، انہوں نے ان دیکھے جنگوں کو کاٹ کر راستے بنائے، اس زمانے کے منہ زور اور مہلک طاعون کی وبا سے جانبر ہوئے جو استوائی افریقا پر پھیلی ہوئی تھی، اور درندوں کا شکار ہونے سے بچنے کے لیے لڑے۔ ان سب نے یہ مشکلیں برداشت کیں۔ انہوں نے افریقا کے ان علاقوں کو آباد کیا تا کہ ہمارے قابل مستقبل تعمیر کریں، اپنی اولاد کے لیے سب، جب کہ سماجی اور سیاسی حالات بدل چکے ہیں اور ہمیں درپیش مسائل مختلف ہیں، ہم بھی، یعنی ان کی اولاد، اپنے آپ کو مشکل حالات میں پاتی ہے، جہاں ہمیں انسان کی حیثیت میں باقی رہنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ اگرچہ وقت کے ساتھ جدوجہد کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں، مگر آزادی کے لیے انسان کی آفاقی کوششیں نہیں بدلتی ہیں۔ ہم نے، اپنے موقع محل میں، اپنی مرضی سے عدم تشدد کا راستہ اپنایا ہے۔ اس راستے میں ہم نے بڑی بہادرانہ مہمات چلائی ہیں۔ جنوبی افریقا کے رہنماؤں کی تمام ترقی پسند طاقتیں، میری پوری زندگی اور میری تمام قوتیں، اس طریقے پر صرف کردی گئی ہیں، اس کوشش میں کہ یہ جنوبی افریقا کے مفاد میں ہے کہ تباہی سے بچا جائے، اور ہم نے اس کے لیے بڑی بہادری سے قربانیاں پیش کی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ جنوبی افریقا کا سماجی نظام نسلی امتیاز اور نسلی جبر کی نشانی ہو مگر اس کے عوام بنی نوع انسان کے ناقابل تغیر جذبے کی زندہ مثال ہیں۔ برسوں سے، بے بس کردینے والی مشکلات کے باوجود انہوں نے بھری پڑی زندگی اور افتخار کے ساتھ۔ آزاد انسان کی طرح۔ زندہ رہنے کے ناقابل یقین عزم اور استقلال کی کوششیں کی ہیں۔ اس میں ہمارا ملک منفرد نہیں۔ آپ کی حالیہ اور ہمت افزا تاریخ، جب طاقت کے محور نے پورے یورپ کو فتح کر لیا تھا، بنی نوع انسان کے اس ناقابل تغیر جذبے کی گواہ ہے۔ یورپ کے لوگوں نے مزاحمتی مہمات ترتیب دیں اور انہوں نے اپنی نسلی برتری کی عقیدت اور عالی نژاد (Herrenvolk) ذہنیت سے بالآخر سمیت اور قسطنطینیت کا زور توڑ دیا۔

تمام عوام، اپنی تاریخ کے کسی نہ کسی مرحلے پر ایسی جدوجہد میں تشکیل دیے گئے تھے مگر عام طور پر، وقت گزرنے کے ساتھ آزادی کی راہ کی، ایک کے بعد دوسری، رکاوٹوں کو مسما رہوتے دیکھا گیا ہے۔ جنوبی افریقا میں ایسا نہیں ہوا۔ یہاں رکاوٹیں مسما رہیں ہو رہی ہیں۔ ہر قدم جو ہم آگے کی طرف بڑھتے ہیں، ہر کامیابی، جسے ہم پیش قدمی کے لیے تیار کرتے ہیں، نئی اور اونچی رکاوٹوں کے ذریعے بے کار کر دی جاتی ہے۔ رنگ کی بنیاد پر ہونے والی رکاوٹ کم زور نہیں ہوتی، زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے آزادی لڑنے والوں کی پہنچ سے قریب ہوتی جاتی ہے جدوجہد کی تلخی بڑھتی جاتی ہے۔ اکثر و بیشتر، ہمارے عوام کے اجتماعی مظاہرے طاقت کے ذریعے پسپا کیے گئے ہیں، مگر ان کو کبھی خاموش نہیں کیا جاسکا ہے۔

کچھ استثنا کے ساتھ قانون کی حکمرانی کے نام پر کیے جانے والے ہر مہم تاؤ پر ہمارے عوام ہمیشہ بڑے امن رہے ہیں۔ اگر آج امن کا انعام ایک سیاہ فام کے ذریعے جنوبی افریقا کو دیا جا رہا ہے، تو اس لیے نہیں کہ ہم نے امن اور انسانوں کے درمیان بھائی چارے کی جنگ جیت لی ہے۔ ہرگز نہیں۔ افریقا کے دوسرے عوام کے مقابلے میں شاید ہم فتح کی منزل سے زیادہ دور ہیں۔ مگر حکومت کے ہاتھوں ہم نے جتنے دکھ جھیلے ہیں، اتنے ہی نظم و ضبط سے ہم اپنے منتخب کیے ہوئے راستے پر گامزن ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انکی وجہ سے یہ انعام دیا جا رہا ہے۔

کتنا آسان تھا کہ جنوبی افریقا میں سفید فام باشندوں کے غلبے کے خلاف فطری طور پر پیدا ہونے والے جذبات کفریات اور سفید فام آبادی سے انتقام کی خواہش میں بدل دیا جاتا۔ یہاں، جہاں ہر روزہ زندگی کے ہر شعبے کا غیر سفید فام "صرف یورپ والوں کے لیے" جیسے حاضر و ناظر اشتہار کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے، اور اسی طرح کا حاضر و ناظر پولیس کا سپاہی اس کو نافذ کرتا ہے۔ یہاں اس کی توقع کی جاسکتی تھی کہ سیاہ فام افراد کے خلاف سفید فام کے تکبر کو توڑنے کے لیے ایک نئی قسم کی نسلیت برپا ہوتی۔ ایسا نہیں کیا گیا ہے، تو یہ محض ایک حادثہ نہیں ہے۔ ایسا اس لیے ہوا ہے کہ جان بوجھ کر اور مشاوری انداز میں، پچھلے پچاس برس میں، افریقی قیادت نے خود کو، افریکن نیشنل کانگریس کی اچھا، پچھلے عشرے میں جب تک اس پر پابندی نہیں لگی تھی اور جس کی صدارت کا مجھے اعزاز دیا گیا تھا، ثابت قدمی سے نسلی تکبر کے خلاف آراستہ کر دیا تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس عمل کے دوران ہم نے ان لوگوں کے فطری جذبات سے آسان جذبات انگیز اپیل کے مواقع کھودے، جنہیں آزادی دینے سے انکار کر دیا گیا تھا، کیا ہم نے ایک آسان اور جذباتی اپیل کے موقع کو رد کر دیا۔ ہمیشہ سے ہمارا وژن ایک عدم تسلیم پرست، جمہوری جنوبی افریقا کا تھا جو ان تمام لوگوں کو جو ہمارے ملک میں آباد ہیں کامل باشندے کی حیثیت دے اور تمام حقوق اور تمام ذمے داریوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کرے۔ اس آودش کے اتمام کے لیے ہم نے محکم طور پر محنت کی ہے اور ہم محکم طور پر محنت کرتے رہیں گے۔

یہی وژن تھا جس نے افریکن نیشنل کانگریس کو دوسرے نسلی گروپ کے ارکان کو دعوت دینے پر آمادہ کیا تھا جو ہماری طرح آدمی کے درمیان بھائی چارے اور تمام عوام کے لیے آزادی پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ مل کر نسلیت سے مبرا اور جمہوری افریقا کے قیام کے لیے کام کریں۔ اس طرح افریکن نیشنل کانگریس نے اپنے دور میں کانگریس الائنس بنایا اور برلن پارٹی اور پروگریسو پارٹی کے قیام کو خوش آمدید کہا، جو کسی حد تک ان آودشوں کی تائید کرتی ہیں۔

جنوبی افریقا کے سچے محب وطن، میں جن کی نمائندگی کر رہا ہوں، مکمل جمہوری حقوق سے کم پر کسی طرح بھی راضی نہیں ہوں گے۔ ہم براہ راست، بالغ رائے دی اور حکومت کے ہر شعبے میں انتخاب کے لیے کھڑے ہونے کے حق سے کم پر مطمئن نہیں ہوں گے۔ معاشی معاملات میں، ہر شعبے میں ہم برابری کی بنیاد

وہ پر مواقع اور ملک کے موافق وسائل سے فیض یابی سے، جس کو اب تک "صرف سفید فام باشندوں" نے اڑایا ہے، سب کے لیے ہونے سے کم پر مطمئن نہیں ہوں گے۔ تہذیب کے معاملے میں بھی ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہوں گے جب تک صرف قابلیت کی بنیاد پر تمام تعلیمی اداروں کے دروازے سب پر کھول نہیں دیے جاتے۔ سماجی حلقوں میں، ہم نسلی بنیاد پر منحصر تمام رکاوٹوں کی مسامحہ سے کم پر ماضی نہیں ہوں گے۔ ہم یہ سب مطالبے تنہا افریقی نسل کے لوگوں ہی کے لیے نہیں کر رہے ہیں۔ ہم یہ مطالبہ جنوبی افریقیوں، وہ سفید فام ہوں یا سیاہ فام، سب کے لیے کر رہے ہیں۔ ان معاملات پر کسی قسم کی مصالحت کر لینا خود غرضی ہو گی، اس لیے کہ حالات کی تبدیلی سے اقتصادی، سیاسی اور سماجی مراعات کی شیرینی، جس کو کمیونٹی کا ایک طبقہ ہڑپ کر جاتا ہے، شرابی میں بدل جائے گی، اور یہ جمہوریت سے بدترین دغا بازی ہوگی۔ گویا عملی طور پر نسلی امتیاز فریضہ عائن کا خلیق کیا ہوا عفریت ثابت ہو رہا ہے۔

ہمارے ملک میں پریشان کن نسلی تعلقات کی خلاف ورزی کے لیے "تولیت" (Trusteeship)، "جداگانہ ترقیات" اور ہر معاملے میں "شریکت داری" جیسے بہت سارے معنوی لغزے ایجاد کیے گئے ہیں۔ یہ کوششیں ہیں ہم کو جمہوریت کی راہ سے بھٹکانے کی، یہ تاخیری حربے ہیں جو سوائے غلطی کے کسی کو بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ کسی قسم کا نرم خو یا خوب صورت نام دے دینے سے کبھی گھناؤنی فطرت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ ہم ایسی پالیسیوں کو مسترد کرتے ہیں اس لیے کہ انسان نے جس کے لیے کوشش کی ہے یہ اس کے معیار پر پوری نہیں اترتی؛ یہ انسان کی ارفع تمناؤں کی دل شکنی کرتی ہیں جو ادوار میں ہونے والی تمام تر تبدیلیوں کے باوجود بدلے نہیں ہیں، تمناؤں، اقوام متحدہ کے اعلان برائے انسانی حقوق جن کا انتہائی عروج ہے۔ یہی ہمارا موقف ہے۔ ہم اسی کے لیے لڑتے ہیں۔

دیر پا اقدار کی خاطر ان کی لڑائی میں بہت سی چیزیں ہیں جنہوں نے آزادی کے جذبے کو برداشت کیا ہے۔ جنوبی افریقا کے عوام سے اور ان سے محبت کرنا جو ابھی تک افریقا کے غیر نجات یافتہ علاقوں میں بسے ہیں، جہاں سفید فام انسان دلیرانہ انداز میں - کائناتی وراثت - جمہوریت پر اپنا مالکانہ حق جتانے میں سب سے بلند چیزیں - جنہوں نے ہمیں برداشت کیا ہے - قائم ہیں؛ ترقی پسند عوام اور پوری دنیا کی حکومتوں کی گراں قدر حمایت، جن میں اس ملک کی حکومت اور عوام شامل ہیں۔ میں آج جن کا مہمان ہوں، یعنی ایشیا میں ہمارے بھائی، بالخصوص خود مختار افریقی ریاستوں میں رہنے والے، وہ تنظیمیں جن کا نقطہ نظر وہی ہے ہم نے جسے کریم ارض میں بکھرے ہوئے ملکوں میں قبول کیا ہے؛ اقوام متحدہ اور انفرادی طور پر اس کی رکن ریاستیں وغیرہ۔ عملی طور پر انسانی معیار کی بلندی کے ذریعے، دنیا کے امن کے دفاع میں، ان گروہوں نے ہمارے لافانی عقیدے کی سچائی اور ذہنی کو مضبوط کیا ہے۔ ان سب سے میں کہوں گا کہ ہم اکیلے ہوتے تو کم زور رہتے۔ ہم اپنے دل کی کھراڑیوں سے آپ کی تائید و حمایت کرتے ہیں، جس کا ہم صحیح طرح سے اظہار نہیں کر سکتے، نہ جسے بھی ہم فراموش کر سکتے ہیں، ابھی یا مستقبل میں، جب فتح ہمارے چلو میں ہوگی اور

جنوبی افریقا کی آزادی اس کے عوام کے ہاتھوں میں ہوگی۔

بہر حال، ہم جنوبی افریقی بھی اس کو سمجھتے ہیں، شاید جیسا دوسرے بھی سمجھتے ہوں، کہ ہمارے لیے آزادی باہر سے تھکنے میں نہیں آئے گی۔ ہمیں اپنی آزادی خود بنانی ہوگی۔ تمام دیانت دار آزادی کے متوالوں نے اس کام کے لیے خود کو وقف کر دیا ہے۔ ہمیں ضرورت ہے ایسی ہمت کی جو خطرے کے ساتھ بڑھتی رہے۔

آزادی کی ہماری کوشش کا مستقبل کچھ بھی ہو، ہمارا منشا ہے عوام کی رہائی، جن کی آزادی سے انکار کیا گیا ہے۔ صرف اسی بنیاد پر افریقا اور دنیا کا امن مضبوطی سے قائم کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا منشا ہے قوموں اور عوام کے درمیان مساوات۔ صرف اسی طرح انسان کا بھائی چارہ مضبوطی سے قائم کیا جاسکتا ہے۔ نہایت ہمت افزا اور خوشی کی بات ہے، آپ کو یاد دلانا، کہ سفید فام حکومت کے ہاتھوں اہانت اور عذاب کے باوجود بھی، آزادی کی تلاش میں افریقا کا جذبہ عام طور پر نہایت پُر امن رہا ہے۔

اگر میں نے اپنے ملک کے نسلی مسائل پر ذرا زیادہ تفصیل سے بات کی ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے براعظم کے دوسرے ملکوں کو ایسے مسائل کی تکلیف نہیں ہے، مگر صرف اس لیے کہ جنوبی افریقا میں نسلی مسئلہ نہایت گہبیر ہے۔ پورے براعظم کے کسی اور ملک میں شاید سفید فام نسل کی برتری کا اتنی شدت، عزم اور پائیداری سے اظہار نہیں کیا جاتا۔ اس طرح نسلی امتیاز کے مخالفین ان کی اگلی صفوں میں ہوتے ہیں، جو سفید فام نسل کی برتری کے خلاف جنگ کر رہے ہوتے ہیں۔

اپنے خطبے کے اختتام تک پہنچنے سے پہلے، میں افریقا کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اپنے غموں اور مصیبتوں، آزمائشوں اور کامیابیوں، اور کچھ کامیابیوں کے باوجود ماضی، اور کسی حد تک حال سے پرے نظریں جمائے رکھے، اور خود کو ایک ابھرتے ہوئے براعظم کی طرح دیکھے، جہاں صدیوں کی غلامی کے خول کو توڑ کر آزادی باہر آ رہی ہے۔ یہ افریقا کا دور ہے۔ اس کی تکمیل کی پہل ہے، جی ہاں، اس وقت جب اس کو رفعت کی بلندیوں تک پہنچنے کے لیے اپنے مقتدر سے بھڑکنا چاہیے، یہ کہتے ہوئے کہ: ہماری جنگ حتیٰ نجیب اقدار اور لائق انتہاؤں کے لیے، زمین اور انسان کی غلامی کے لیے نہیں۔

آج کی دنیا میں افریقا اہم ترین موضوع اور دنیا کے مفاد اور فکر کا مرکز ٹکا رہا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ تاریخ نے اس کے دوسرے جنم میں جان بوجھ کر تاخیر کی ہے؟ حالات اس کو ناقابل فرار چیلنج کے مقابل کر رہے ہیں، مگر اپنے اور بنی نوع انسان کی خدمت کے مواقع فراہم کرنے کے لیے۔ اگر یہ چیلنج سے کتراتا ہے اور مواقع کو نظر انداز کرتا ہے، تو اگر تباہ نہ ہوا تو شرمندہ ضرور ہوگا۔ وہ اپنے مقتدر کو کسی طرح دیکھتا ہے، اس کے لیے یہی سب سے اہم بات ہوگی، بجائے اس کے کہ وہ ماضی کی اہانت اور دکھ کے شکوے کرتا رہے۔

یہ خطاب اس سے زیادہ نہیں کر سکتا کہ کچھ سوالات اٹھائے اور افریقی رہنماؤں اور عوام پر چھوڑ دے کہ وہ ان کے تسلی بخش جوابات فراہم کریں، اعلیٰ اقدار اور مہذب عمل کے ذریعے جو اس طرح کے بھی ہو سکتے

وقت کی رحمت پہ قدموں کے نشان
نشان قدموں کے
جن سے اک اور سفر ہو آغاز
زندگی کا مستیزک مقصد
دیکھ کر جس کو ہوا یوں برا اور تیرا
جس کی کشتی ہے شکستہ پھر بھی
نئی امید سے لبریز کرے دل اپنا

ماضی کی نا انصافیوں کے زخموں کے نشان چاٹ رہا ہے، مگر کیا (فریقا) اتنا بلند نہیں ہو سکتا کہ وہ انتقام نہ لے؟ دوستی کے لیے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو ہانت آمیزی سے جھٹکنے اور انصاف اور راست بازی کی ڈہائیوں کے ٹھکرائے جانے کے باوجود بھی کیا دشمنی کو دوستی میں بدلنے کی کوشش نہیں کی جاسکتی؟ اس کی زمینوں، اس کی خود مختاری اور اس کے مواقع کے چھینے جانے کے باوجود۔ عجب کہ یہ سب اکثر حمدان اور عیسائیت کے نام پر ہوتا رہا ہے۔ کیا اس پر غور نہیں ہونا چاہیے کہ اسے انسان کی ترقی اور انسانی رشتوں کی تعمیر میں فریقا کی اپنی مخصوص خوشبود سے مہکتا ہوا اپنا حصہ ڈالنا چاہیے، جو اس کی مختلف النوع تہذیبوں سے ملو ہو، اور اس طرح اس دور کی انسانی کامیابیوں کی بنیاد پر ایک شان دار عمارت تعمیر کرے جو انسان کے بھٹکس کے لیے اعلیٰ ترین خراج ہو۔

اسے اپنی جھگیل کے لمحات کو اس وقت تک چیلنج کے طور پر دیکھنا چاہیے، جب تک اس میں سے نسلی امتیاز کو نکال باہر نہیں کر دیا جاتا، اور دنیا کو مطمئن کرنے کے ایک موقع کی طرح کہ اس کی قومی تمنا میں صرف سفید فام غلبے کو دور کرنے اور سیاہ ذات سے بدلے میں نہیں ہیں، بلکہ ایک غیر نسلی جمہوریت تعمیر کرنے میں ہیں، جو ایک یا دو گار بھائی چارہ ہیں ایک برادرانہ کمیونیٹی ہو، جس میں کسی کے خلاف رنگ اور نسل کی بنیاد پر تعصب نہ کیا جائے۔

تو پھر، نئی خود مختار ریاست پر مائل پیچیدہ سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی مسائل کا کیا کیا جائے؟ یہ اور نوآبادیاتی عہد کی دوسری ورثہ، جو نوآبادیاتی عہد کی دین ہیں، کیا اپنی آخری حد تک افریقی قیادت کی مدد سے، خوش تدبیری، ایثار اور راست بازی پر اور جمہوری فن حکمرانی کے کبھی خم نہ ہونے والے عقائد کے اعتراف پر بوجھ بنی رہیں گی۔ ہم سب کے نزدیک، جو آزاد ہیں یا نہیں، وقت کی پکار یہ ہے کہ افریقی دھرتی مانا کے بقا کو نجات دلائی جائے۔

تعارفات کی ماری دنیا میں، جو انسان کے بنائے ہوئے جوہری ہتھیاروں سے مکمل طور پر تباہ ہونے کے قریب پہنچ چکی ہے، تاریخ کے فرمان اور چیلنج کے جواب میں، ایک آزاد اور خود مختار افریقی تعمیر ہو رہا ہے:

”اٹھو اور چکو، کہ تمہاری روشنی طلوع ہو گئی ہے۔“ ایک بار پھر، دوسری قوموں کی معیت میں، مشرق اور مغرب کے درمیان ٹانگی کی یہ آخری امید ہے، اور یہ حق دار ہے بڑی طاقتوں سے اس مطالبے کا ”تکواروں کو ہلوں میں بدل دو“ اس لیے کہ بنی نوع انسان کا دو تہائی حصہ بھوکا اور ناخواندہ ہے؛ تاکہ انسانی قوت، انسانی ہنرمندی اور انسانی قابلیت امن کی خدمت میں مصروف ہو جائے، کہ اس کا متبادل ناقابل تصور ہے۔ یعنی جنگ، تباہی، اور ویرانی؛ تاکہ اور ایک کمیونٹی کی تشکیل پائے جو کروڑوں مردوں اور عورتوں کی یادگار بن سکے، داگ ہیمر ہولڈ جیسے شخص و جاں فدا اور ممتاز عالمی باشندوں کی یادگار، جنہوں نے اس لیے اپنی جانیں فدا کر دیں کہ ہم امن اور خوش حالی کے ماحول میں زندگی گزار سکیں۔

اس عالمی شان کام کے لیے افریقا کی قابلیت کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ اس کی جنگ کبھی اس کی اپنی نہیں تھی، یہ زمین کی فتح کی جنگ تھی، نہ دولت کا انبار لگانے اور لوگوں پر غلبہ پانے کی جنگ تھی، یہ جنگ تھی انسان کے حقوق کے اعتراف اور ان کے تحفظ اور حقیقی طور پر آزاد عوام کے لیے ایک آزاد دنیا کے قیام کے لیے۔



قلب نوئل بیکر اعلان تجلیل

اکثر جب طوفانی بادل گھبر کر آتے ہیں تو شاید اسی لیے دنیا کو مطلع کیا جاتا ہے کہ یہ ٹکڑ خطرے کا سامنا کرنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ یورپ میں اس صدی کے تاریک سال 1914 میں شروع ہوئے تھے، اور ابھی تک ہم پر منڈلا رہے ہیں۔ اس پورے عرصے میں، تقریباً بیٹا لیس برس، قلب جان نوئل بیکر نے، وہ جنگ کا زمانہ ہو یا جنگوں کے درمیان کا عرصہ، اپنے آپ کو ذکی انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ، ان کی کبھی نہ رکنے والی اور ان تھک کوشش یہ ہوتی تھی کہ جنگ کی شروعات ہی گورو کا جائے۔

ان کے جوانی کے دنوں میں ہم نے قلب نوئل بیکر کو فرانس کے Quaker Ambulance Unit میں اور اطالیہ میں پہلی عالمی جنگ میں دیکھا تھا؛ ہم نے انھیں فریڈرک فریڈرکسن (Fridtjof Nansen) کے ساتھ روس اور یونان میں ان کے غنیمت کام کے دوران بھی کھڑے دیکھا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے بعد بھی وہ جنگ کے پیدا کردہ مہاجرین کے مسئلے کے حل کے لیے کام کر رہے تھے تاہم 1918 کی عارضی جنگ بندی کے بعد کے پورے عرصے میں ہم نے ان کو ترک اسلحہ جات اور امن کے مقاصد کے لیے اعلانات کرتے بھی سنا تھا۔ اس کے بعد سے ہمیں کبھی کبھی مایوسیوں نے گھیرا ہے، اس کے باوجود نوئل بیکر کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی امید ختم کرنے کا خیال نہیں ابھرا کہ مستقبل میں سیاسی تنازعات کا حل اسلحے سے نہیں صرف مذاکرات سے نکلے گا۔

شاید آج نوئل بیکر ہی وہ انسان ہیں جو ترک اسلحہ جات کے موضوع پر سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں، جو ان مسائل کی مشکلات کو سب سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ 1958 میں شائع ہونے والی اپنی کتاب The Arms Race میں جس کو وہ A Programme for World Disarmament کا نام دیتے ہیں، ان راستوں کی

نشان دی کی ہے ہمیں جن پر آگے بڑھنا چاہیے۔

نوبل بیکر میں ان کی اپنی ذات کے لیے مشکل ہی سے کوئی اُمٹگ پائی جائے گی۔ ان کے نزدیک صرف مقصد ہی سب سے اہم ہوتا ہے۔ اگر اس کو کسی طرح بڑھایا جاسکے تو ان کے نزدیک بے معنی ہوگا [یہ سوچنا] کہ اس میں کس کا نام ہو۔

جب ہم ان کے بے غرض اور مثالی رویے کو دیکھتے ہیں تو اس کا جواز دینا مشکل ہو جاتا ہے، جب تک کسی کو اس معاشرتی ماحول کے بارے میں کچھ علم نہ ہو جس میں ان کی پرورش ہوئی ہے۔

کئی نسلوں سے ان کے خاندان کا [ایک مذہبی ادارے] Society of Friends سے تعلق رہا ہے جسے Quakers [ایک مذہبی فرقہ] کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ان کے والد، جوزف ایلین بیکر (Joseph Allen Baker) کناڈا میں پیدا ہوئے تھے، جہاں ان کا خاندان 1819 میں آئرلینڈ سے ہجرت کر کے آکا وہو گیا تھا۔ 1870 کے آس پاس جوزف ایلین بیکر کو ان کے والد نے اپنے نئے خاندانی کاروبار کی ایک شاخ کی دیکھ بھال کرنے کی غرض سے انگلستان بھیج دیا تھا۔ وہیں انھوں نے ایک نہایت مذہبی خاتون ایلزبتھ ماسکرپ (Elizabeth Mascrip) سے شادی کر لی۔ ان کے بیٹے فلپ 1889 میں پیدا ہوئے۔ جوزف ایلین بیکر کی انگلستان میں زندگی اس معاشرتی ماحول کی وضاحت کرنے میں مدد دیتی ہے، غالباً، جو ان کے بیٹے کے بے غرض کردار اور زندگی میں تعمیری رویے کے ذمے دار تھی۔

Quakers کے خیالات، یعنی ضرورت مند بھائیوں کی مدد کرنے کی خواہش مندی کے احساس نے ایلین بیکر کو انیسویں صدی کے بعد لندن میں وسیع پیمانے پر خوش حالی کے لیے کام کرنے پر اکسایا تھا۔ اس طرح وہ لندن کے پس ماندہ علاقوں سے متعارف ہوئے جہاں انھوں نے اسکول قائم کیے بلکہ ان لوگوں کو خود پڑھایا بھی جو لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے، لوگوں کے لیے رہنے کے بہتر مکانات، صحتی فیس اور بہتر آمد و رفت کے نظام کے لیے بھی کام کیے۔ اس دوران ان کے فلاحی کام نے ان کو London County Council کی رکنیت کے رُتبے تک پہنچا دیا۔ 1900 سے 1918 تک وہ برطانوی پارلیمان کے رکن بھی رہے جہاں وہ لبرل پارٹی کے بنیاد پرست بازو میں شامل تھے۔ ایک سیاسی آدمی ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنا بیشتر وقت امن کے لیے کام کرنے پر لگایا۔ جب 1914 کا مہلک سال قریب آ رہا تھا، وہ تمام ملکوں میں امن سے محبت کرنے والوں کے درمیان رشتے استوار کرنے میں انتہائی محنت سے کام کر رہے تھے۔ مذہبی پس منظر اور سرائی رکھنے کے باعث انھوں نے یہ ضروری جانا کہ مختلف مذاہب، بالخصوص انگلستان اور جرمنی، کے عیسائیوں کو متحد ہو کر جنگ کی مخالفت کرنی چاہیے۔ مگر ایلین بیکر کی کوششیں بے کار گئیں، اور 1914 کا سال طلوع ہو گیا۔ شبہات اور بے یقینی کو راہ دینے کے بجائے، وہ نئے سرے سے وڈرو ولسن (Woodrow Wilson) کے League of Nations کے خیال سے متاثر ہوئے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ایک مہذب اور نہایت ہم آہنگ خاندانی زندگی کے رسوم اور وجدان کے باعث

ضرورت مندوں کے لیے ان کے ماں اور باپ کے فلاحی کام ان پر اثر انداز ہوئے، اور اس کے نقوش ان کے بیٹے کی زندگی کے ردیوں پر بھی ثبت ہوئے۔

ہیپنوتل بیکر کو جامعاتی تعلیم کا فائدہ بھی ملا تھا، جو ان کے والد کو میسر نہیں ہوا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم یارک کے ایک Quaker اسکول میں ہوئی۔ 1906 میں جب ان کی عمر سترہ برس تھی، انھوں نے ہلسوانیا کے Haverford کالج میں تعلیم پائی اور 1908 سے 1912 تک وہ کیمبرج یونیورسٹی میں رہے تھے۔ ان کا مرکزی مضمون بین الاقوامی قانون تھا، جس میں انھوں نے ڈگری بھی حاصل کی۔ پہلی عالمی جنگ سے قبل کے سال انھوں نے سوڈن اور میونخ میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ 1924 سے 1926 تک انھوں نے لندن یونیورسٹی کے بین الاقوامی تعلقات کے شعبے میں پروفیسر کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔

میں نے ان کی تعلیم کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان کی جامعاتی پڑھائی کا بعد میں ان کے کام پر خاص اثر پڑنے والا تھا۔ محووظ طور پر وہ کہتے ہیں کہ جب تک ان کے پیش نظر باقاعدہ تحقیق کیا ہوا مسودہ نہ ہو، وہ کسی کے افسوس یا ترغیب میں آکر کوئی بیان نہیں دیتے۔ وہ کبھی اپنے مخالف کے دلائل کو یوں ہی رد نہیں کر دیتے، بلکہ بغیر کسی تعصب یا تحقیق کے ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ جو لوگ ان سے متعلق نہیں ہوتے، ان کے موقف پر انھیں ملامت نہ کریں، اور جب تک کہ وہ خود اپنے موقف کو ثابت نہیں کر دیتے اپنا فیصلہ نہیں سنا دیتے۔

جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تھی اس وقت نوکل بیکر صرف 26 برس کے تھے۔ ایک Quaker ہونے کے وجہ سے وہ جنگ میں عملی حصہ لے رہے تھے۔ انھوں نے ایک Quakers' Ambulance Unit قائم کیا اور فرانس میں جنگ کی پہلی صفوں میں خود بھی کام کیا۔ اطالیہ میں انھوں نے Trevelyan کے تحت British Ambulance Unit میں بھی خدمات انجام دی تھیں۔

نوکل بیکر کے ذہنی جھکاؤ، ان کی پرورش، جنگ کے تجربے نے شاید ان ہی سب چیزوں نے، جوں ہی جنگ ختم ہوئی۔ ان خرابیوں کو دور کرنے کی طرف ان کو متوجہ کیا ہوگا جو جنگ کا نتیجہ تھیں۔ انھوں نے محسوس کیا ہوگا کہ ان کا ضمیر، جو کچھ ان کے اختیار میں ہو، وہ سب کچھ کرنے کے لیے انھیں پکار رہا تھا جن سے مستقبل میں ہونے والی جنگ کو روکا جاسکے۔ لہذا، یہ فطری بات تھی کہ وہ بین الاقوامی ادارے لیگ آف نیشنز سے وابستہ ہو جاتے۔

جن لوگوں کو پہلی عالمی جنگ کے ختم ہونے کے بعد کے برسوں کے حالات کا کچھ علم نہیں، انھیں مشکل ہی سے احساس ہوگا کہ لیگ آف نیشنز سے کتنی امیدیں وابستہ کر لی گئی تھیں۔ تاریخ میں پہلی بار ایک ادارے کے طور پر، ریاستوں کی ایک انجمن کی تشکیل کی گئی تھی جس کا مقصد تھا جنگوں کا اسد ان، بالخصوص عوام کی خوش حالی، صحت اور اقتصادی معاملات میں بین الاقوامی تعاون۔ اگرچہ اس ادارے کے ارکان میں روس، جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ جیسے مراکز شریک نہیں تھے، بہت سے لوگ اس لیگ کو ایک نئے عہد کی شروعات میں

ایک آلے کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ لیگ اس امید کو پورا کرے گی، اس کی ابتدا کے وقت سے لوگ جس کی تمنا کر رہے تھے، اور امید کر رہے تھے اب چنگیں نہیں ہوں گی۔

لڑائی کے ختم ہونے کے فوراً بعد، نوئل بیکر کو دفتر خارجہ کے اس شعبے میں تعینات کر دیا گیا تھا جو لیگ آف نیشنز کے منصوبے سے متعلق تھا۔ 1919 میں نوئل بیکر مر رابرٹ سیسل (Robert Cecil) کے معتمد کی حیثیت میں پیرس کے مذاکرات میں شریک ہوئے۔ انھوں نے لیگ آف نیشنز اور پھر نیشنل لیبر آرگنائزیشن کے مہم نامے کے مسودے کی تیاری میں معاونت کی فوراً بعد ہی ان کو لیگ آف نیشنز کے Mandate کے شعبے میں ملازم رکھ لیا گیا تھا۔

1920 میں نوئل بیکر کی زندگی میں ایک عہد کی شروعات ہوئی۔ یہ وہی سال تھا جس میں انھوں نے Fridtjof Nansen کے ساتھ کام شروع کیا تھا جو اس وقت تک جاری رہا جب تک نینسن زندہ رہے۔ ضروری نہیں کہ میں روس، یونان اور ایشیائے کوچک میں انسانی بہتری کے لیے کیے جانے والے نینسی کے کام کا ذکر کروں۔ ہم سب ان سے واقف ہیں مگر میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ نوئل بیکر نے ان کاموں میں بطور مددگار، بلکہ نینسی کے دوست کے طور پر تعاون کیا تھا۔ مجھے اس عرصے میں ان دو افراد کے درمیان ہونے والی خط کتابت کو پڑھنے کا موقع ملا تھا، اور ان کے یہ خطوط نوئل بیکر کی معاونت پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔ انھوں نے شہرت کی چمک دمک سے پرے رہ کر خاموشی سے کام کیا تھا، اور اسی انداز میں ماروے میں لیگ آف نیشنز میں نینسن کے مشیر کے طور پر بھی کام کیا۔ ان کو 1927 اپنے ایک خط میں نینسی نے لکھا تھا:

”بیارے بیکر!

میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے بہت پہلے ہی اپنے دل کی گہرائیوں سے تمھیں شکریے کا خط لکھنا چاہیے تھا کہ تم جینوا آئے اور مجھے بہترین مدد فراہم کی۔ تم اچھی طرح واقف ہو کہ اس سے میری مراد کیا ہے، مگر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں تمھارے بغیر کس طرح اتنا سارا کام کر پاتا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ میں نے لیگ کے لیے جو کچھ کیا ہے، تمھارے بغیر نہیں ہو سکتا تھا، کم از کم اس انداز سے تو نہیں، جیسے کہ ہوا ہے۔ اور شروع سے اب تک اسی طرح ہوتا آیا ہے۔ بیارے دوست، میں اور کس طرح کہوں کہ تم نے میرے لیے اور لیگ کے لیے کتنا کام کیا ہے، اور تم نے اس میں کتنا وقت صرف کیا ہے۔ میری صرف اتنی خواہش ہے کہ دوسروں کے لیے اس طرح کام کرنا تمھیں بہت ذاتی سمجھ فراہم کرے۔ اونچے آدرش کے لیے بغیر خود غرضی کے کام کرنا تو ٹھیک ہے، مگر، چوں کہ ہم اس دنیا میں رہتے ہیں، کم از کم دوسروں کے لیے یہ امر طمانیت کا باعث ہوگا اگر دوسرے کام کرنے والوں کو بھی ان کا جائز حق ملے۔“

ماروے میں ہم نوئل بیکر کو نینسی کا سرف مددگار اور دوست سمجھنے کو زیادہ موزوں جانتے ہیں۔ مگر یہ حصہ ان کی زندگی کے کئی ابواب میں سے ایک باب ہے۔ اس وقت سے، جب وہ خط لکھا گیا تھا میں نے جس کا ابھی تذکرہ کیا ہے، اب تک تیس برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے، جس میں نوئل بیکر نے ترک اسلحہ جات کے

لیے اُن تھک کام کیا ہے۔

اگرچہ نوئل بیکر نے لیگ آف نیشنز کے افسر کی حیثیت میں نسبتاً کم عرصے کام کیا تھا، وہ عملی طور پر لیگ کے لیے مسلسل کام کرتے رہے، پہلے کاؤنسل اور اسمبلی میں عمر راہٹ سمیل کے مشیر کی حیثیت میں، اور بعد میں ترک اسلحہ جات کے لیے آر تھر اینڈرسن (Arthur Anderson) کے مشیر کے طور پر، اور بالآخر 1931 سے 1933 تک ترک اسلحہ جات کے کمیشن میں۔ انھوں نے لیگ کے لیے دوسرے میدانوں میں بھی کام کیا تھا۔

انھوں نے اپنے تجربات، اور اس زمانے میں زیر بحث اہم سوالات پر اپنے خیالات، اپنی کتابوں (1925) The Geneva Protocol، (1926) The Coolidge Disarmament Conference اور (1936) The Private Manufacture of Armaments میں تحریر کیے تھے۔

ہم میں سے کون ہے جسے آج Geneva Protocol اور اس پر اٹھائے گئے سوالات یاد ہیں؟ اس وقت ریاستوں پر قومی حکمرانی کے دے دینے کا خوف جاری تھا، ساتھ ہی ماہرین کے ٹھوک بھی تھے جنہوں نے Protocol کو ختم کر دیا تھا۔ اس وقت کے حالات ہی ایسے تھے کہ Protocol نے ثالثی اور اعتماد کی بنیاد ڈال دی ہوئی، جو بعد میں ترک اسلحہ جات کی راہ ہموار کر دیتے۔ جیسا کہ نوئل بیکر خود لکھتے ہیں: ہماری فہم کو دنیا کی، اور سب سے زیادہ یورپ کی عسکریت سے جان چھڑا لینا چاہیے، جو ہماری بچھلی نسلوں نے ہم پر مسلط کر دی ہے۔ یہ ایسی مہلک بیماری ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں، جن کے لیے صرف تسکین پہنچانے والی دواؤں کافی نہیں ہوتیں جو مہذب سوسائٹی کی محنت کا باعث ہو سکتی ہیں، اگر اس کو جلد ختم نہیں کر دیا جاتا۔ مگر Protocol کی جو اس سمت میں ایک صحیح قدم تھا، دوسری دستاویزوں کے ساتھ ضائع ہونے کے لیے خاموشی سے الماریوں میں ڈال دیا گیا، اس لیے کہ آج کی طرح جب بھی نوئل بیکر کے ان الفاظ کا اطلاق ہوتا تھا، ”وہ لوگ جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ کارآمد بین الاقوامی ادارے بنائے جاسکتے ہیں، اب آگے قدم بڑھانا چاہتے ہیں۔ اور جنہیں اس پر شبہ ہے وہ ہچکچاتے ہیں۔“ وہ بعد والے لوگ تھے جو اس موقع پر فاتح رہے تھے۔

اپنی کتاب Disarmament میں نوئل بیکر تمام سوالات پر بحث کرتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ بین الاقوامی ترک اسلحہ جات امکانات کی حدود میں آتا ہے۔ پھر بھی، ایک حقیقت پسند ہوتے ہوئے، وہ ان مشکلات کو زیادہ جگہ دیتے ہیں جو ترک اسلحہ جات کو پیش آئیں گی۔ ان میں سب سے بڑی مشکل ہوگی باہمی کنٹرول کی منظوری۔ وہ کہتے ہیں، ”بہت سے لوگوں کا خیال ہوگا کہ درحقیقت، یہ اسکیم کبھی قبول نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ اس میں عسکری آزادی کی قربانی دینی پڑے گی، موجودہ حالات کے پیش نظر جس پر کسی حکومت کے راضی ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔“

اپنی کتاب *The Private Manufacture of Armaments* میں نوئل بیکر نے مواد کا ایک بڑا خزانہ اکٹھا کیا ہے تاکہ اس کردار پر سے پردہ اٹھایا جائے جو اس صنعت نے ادا کیا ہے۔ اُس وقت بہت سے لوگوں نے یقین کر لیا تھا کہ اسلحے کی نجی صنعت اسلحہ بندی پر اکسانے میں ایک اہم عنصر تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک بار جب نجی ملکیت ختم کر دی جائے گی اور اسلحہ سازی کی صنعت کو ریاست چلانے لگے گی، تو اسلحہ بندی کی بوڑکی سب سے بڑی وجہ ختم ہو جائے گی۔ اس میدان میں ترقیات نے واضح کر دیا ہے کہ ریاست کی ملکیت ہونے کے باوجود حالات بہتر نہیں ہوئے ہیں۔ مگر نوئل بیکر کی کتاب واضح کرتی ہے کہ نجی اسلحہ ساز صنعت کی ملک کی حکومت سے ساز باز تھی، اس لیے اس کا کردار اہم تھا۔ اس وقت کی طرح، اُس وقت بھی ریاست کی پالیسی ہی فیصلہ کن ثابت ہوا کرتی تھی۔

نوئل بیکر نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کی عمیق طبیعت، معقولیت، فراست اور ان کی قابل احترام سمجھ بوجھ کا اندازہ ہوتا ہے جو اس کتاب کی قدر کو اس عہد سے بھی آگے لے جاتی ہے جس میں یہ لکھی گئی تھی۔ ان سب کے باوجود صرف ان کی تحریر ہی نہیں بلکہ ان کی ذاتی سرگرمیوں نے سب سے بڑا تعاون کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ بین الاقوامی مفاہمت کے بارے میں جس قدر بھی کام ہوا ہے، وسیع معنوں میں، ذاتی طور پر اور اپنے ملک کے نمائندے دونوں حیثیت میں، سب میں ان کا ہاتھ تھا اور یہ بات سچ بھی ہے۔ ان کی طرح طرح کی سرگرمیوں سے، جو انہوں نے دونوں جنگوں کے درمیانی وقفے میں لیگ آف نیشنز اور بین الاقوامی سیاست میں جاری رکھی تھیں، پورا انصاف نہیں ہو سکتا کہ بغیر کسی انحصار کے اگر پوری تفصیل بیان کی جانے لگے تو یہ تقریر ختم ہی نہیں ہوگی۔

1929 میں نوئل بیکر برطانیہ کے دارالعوام میں لیبر پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے منتخب ہوئے، اور 1930 کے عشرے میں وہ لیبر پارٹی کے سب سے اہم ترجمان رہے تھے جس کا خیال تھا کہ انگلستان کو اپنی خارجہ پالیسی میں لیگ آف نیشنز کے دیے ہوئے خطوط پر آگے بڑھنا چاہیے۔ ایک اور موقع پر یہ روئے ان کی شدید مزاحمت کی صورت میں ظاہر ہوا تھا، جب یہ مشورہ دیا جا رہا تھا کہ برطانیہ کو مسوولینی کے اکتھوپا پر حملے کے باوجود اطالیہ کے خلاف پابندیاں ختم کر دینی چاہئیں۔ وہ ہسپانیہ کی جنگ میں برطانیہ کی عدم مداخلت کی پالیسی کے سخت خلاف تھے اور انہوں نے ماسوٹ کے معاملے میں برطانیہ کے مذہب رویے پر بھی تنقید کی تھی۔ وہ بھی اس گروہ کے رکن تھے جو چل جس کی رہنمائی کر رہے تھے جس نے لمطابقت اور ماسوٹ کی مداخلت بے جا کے خلاف مزاحمت کی تنظیم کی کوشش کی تھی۔ ان قوموں کی امداد فراہم کرنے کے لیے، جنہیں خطرے کا سامنا تھا، انہوں نے لیبر پارٹی کے نمائندے کی حیثیت میں چیکو سلواکیا، اور بعد میں فن لینڈ کے دورے کیے تھے۔ خود اپنے ملک میں، نوئل بیکر نے لیگ آف نیشنز یونین کی بنیاد میں مدد کی تھی اور وہ اس کے عملی طور پر سرکردہ اہلکار میں سے تھے جسے 1930 کے عشرے میں بے پناہ تائید حاصل ہوئی تھی۔

مگر، 1920 اور 1930 کے عشروں کے دوران بھی لیگ آف نیشنز ہی نوئل بیکر کے کام کی توجہ کا مرکز

رہی تھی۔ اگرچہ، تو ایسے چند ہی افراد ہوں گے جنہوں نے لیگ آف نیشنز کے تعارف کے لیے، اور لوگوں کو اس کی اہمیت سمجھانے اور اس کی تائید کرنے میں اس قدر کام کیے ہوں گے۔ 1926 میں شائع ہونے والی اپنی لا جواب کتاب The League of Nations at Work میں انہوں نے لیگ آف نیشنز کے تصور اس کی تنظیم، اس کے کام، اور اس وقت تک کی کامیابی کی ایک واضح تصویر پیش کی ہے۔ کافی عرصے تک انہوں نے مستقبل کے لیے لیگ کی اہمیت پر عقیدت بھری امید قائم رکھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں: ”گویا، یہ امید رکھنا مناسب ہوگا، کہ اگر مستقبل میں کبھی کسی بھی قسم کے پیچیدہ نظام حکومت کی ضرورت پیش آئی تو لیگ کے ادارے اس کے لیے ایک مستحکم بنیاد فراہم کر سکیں گے۔“ مگر وہ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کہ اس قسم کی امید بے کار بھی ہو سکتی ہے۔ ”مگر لیگ کے مستقبل کے بارے میں ایک شبہ ضرور ہے جو بہت زیادہ امید رکھنے والے مبصرین کو بھی خاموش کر سکتا ہے۔ اور وہ شبہ یہ ہے، کیا اس کے اداروں کو واقعی موقع دیا جائے گا کہ وہ کسی نئی عالمی جنگ اور اس کے نتیجے میں ہونے والی مکمل تباہی سے پہلے، جو اپنے ساتھ سب کچھ بہالے جائے گی، اپنی طاقت مجتمع کر سکیں گے؟ کیا بین الاقوامی تعاون اور باہمی اعتماد کی قوتیں، لیگ جن کو زندہ کر رہی ہے، اتنی طاقت ور ہوں گی کہ وہ مسکریٹ، بغارت، شبہات اور انتقام کی طاقتوں سے ٹک سکیں؟

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، ماسوچ اور ہٹلر نے لیگ آف نیشنز کا صفایا کر دیا تھا۔ آج بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے لیگ آف نیشنز کے کام کو بھلا دیا ہے، اور ایسے بھی ہیں جو لیگ کو برا بھلا کہتے ہیں کہ وہ 1930 میں اٹھنے والے طوفان کو روکنے میں ناکام رہی تھی۔ اس نے ان کو مایوس کر دیا ہے اور مستقبل پر ان کے عقیدے کو ان سے چھین لیا ہے۔ تو یہ کس کام کی رہی؟ وہ پوچھتے ہیں۔

نونل بیکر مایوسی اور دل شکستگی کو قریب پہنچنے نہیں دیتے۔

اگرچہ ان کو یہ سب دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ جس کے لیے انہوں نے اپنی نوجوانی کے اتنے برس محنت کی تھی وہ سب ان کی آنکھوں کے سامنے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ پھر بھی، 1945 کے بعد انہوں نے ایک بار پھر ہوبہوان ہی آدرشوں کے لیے جنگ کی ٹھان لی تھی، لیگ آف نیشنز جن کی نمائندہ بنی تھی۔

1942 میں وہ جمہلی حکومت کے رکن بنادیے گئے تھے اور 1945 میں انہوں نے اعلان کے ساتھ کام کیا۔ ان کو اقوام متحدہ کے Preparatory Commission کا نمائندہ بنا دیا گیا۔ لیگ آف نیشنز سے حاصل کیے گئے تجربات کے ساتھ انہوں نے سفارشات کی تیاری میں مدد کی تھی جس کے ذریعے اقوام متحدہ کی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے مختلف شعبے اور اس سے منسلک ادارے، جیسے Food and Agriculture Organization وجود میں آئے۔ انہوں نے International Refugee Organization کو بھی آگے بڑھایا، اور یورپ کے لیے ایک علاحدہ اقتصادی کمیشن کے قیام کے لیے سفارشات بھی پیش کی تھیں۔ یہ تھیں ان کے کارہائے نمایاں میں سے کچھ کی تفصیلات۔

اس عرصے میں وہ برطانوی حکومت کے نمائندے تھے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بڑی حد تک، ذاتی

طور پر وہ بہت ہی تجاویز کے متن اور ترتیب کے ذمے دار تھے اور انھیں اس بات کا صلہ دیا جانا چاہیے کہ ان سب کو برطانیہ کی جانب سے قبول کر لیا گیا تھا۔

برطانیہ کی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے ان کا کام ان سب سے کئی زیادہ امور پر محیط تھا۔ وہ نوکل بیکر ہی تھے جنھوں نے ہندوستان، آئرلینڈ اور نیو فاؤنڈ لینڈ کے مذاکرات کی رہنمائی کی، اور سر اسٹیم پرانا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مذاکرات کے مسائل کے کامیاب حل کے وہی ذمے دار تھے ان سارے مسائل میں شاید سب سے اہم وہی [ہندوستان کا] مسئلہ تھا۔

نوکل بیکر کے تمام بین الاقوامی مشن کی تفصیل میں، جن کے وہ ذمے دار تھے، جانا ممکن نہیں ہوگا، مگر میں صرف اتنا بتانے کی اجازت چاہتا ہوں کہ انھوں نے امدادی تنظیم UNRRA کے کام میں عملی شرکت کی تھی، اور یہ بھی کہ انھوں نے World Health Organization اور UN Economic and Social Council میں برطانیہ کی نمائندگی کی تھی۔

جب پہلی کی حکومت ختم ہوئی، اس وقت نوکل بیکر کے اپنے ملک کی نمائندگی ختم ہونے والی تھی۔ مگر لیبر پارٹی کی شیڈو کابینہ کے رکن کی حیثیت میں انھوں نے خارجہ پالیسی پر حزب اختلاف کی جانب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ پچیس ان کی فہرستوں کے تنازعے پر بحث کے دوران دارالعوام میں کی جانے والے تقریر اچھی طرح یاد ہے جس میں انھوں نے سوئیز پر حملے کی شدید مذمت کی تھی، اس لیے کہ برطانوی حکومت نے اقوام متحدہ میں گئے بغیر خود ہی وہ قدم اٹھا لیا تھا۔

ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ 1958 میں نوکل بیکر نے سب سے اہم کام کیے تھے۔ The Arms Race اس کتاب میں انھوں نے ترک اسلحہ جات کے مسئلے پر پہلو سے بحث کی تھی۔ ترک اسلحہ جات کے مسئلے کے حل کرنے کی کوشش میں پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں وزنی اور مامدانہ دلیلیں اور دیے گئے مختصراً اندازوں کے باعث یہ کتاب پڑھنے والے پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ اسلحہ بندی اور جدید دور کے اسلحہ جات پر جو عام طور پر جوہری ہتھیار، بلکہ کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار کہے جاتے ہیں، مصنف کے کام اور واضح بیانات ایسے تھے جن پر صرف چند لفظوں میں مناسب رائے دینا ناممکن ہے۔

اس کتاب میں وہ عالمی جنگ کے بعد سے ترک اسلحہ جات پر معاہدہ کرنے کی سرحد و جہد کی کھوج لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کوششوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جن کے ذریعے برپارٹی کو منظور قابل قبول کنٹرول نظام تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ تمام کوششیں اس لیے ناکام ہوئی تھیں کہ کوئی بھی اپنے ملک کے اندر بیرونی گہرائی پر راضی نہیں تھا۔

جہاں نوکل بیکر کی رائے ہے کہ 1955 تک سوویت یونین اس ماکامی کا ذمے دار تھا وہیں وہ یہ بھی سوچنے پر تیار نظر آتے ہیں کہ بعد میں مغرب والے اپنے مطالبات میں بہت جٹ دھرم ہو گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو یقین ہونا چاہیے کہ آج سوویت یونین سنجیدہ نظر آتی ہے، جب کہتی ہے کہ ہم ترک اسلحہ پر تیار ہیں۔

ترک اسلحہ جات مکمل طور پر ہونا چاہیے، اور اس کو مؤثر ہونا ہے تو اسے ہر قسم کے اسلحے پر نافذ ہونا چاہیے۔ اپنی کتاب میں نوئل بیکر ان امکانات پر بحث کرتے ہیں جو مؤثر کنٹرول کے لیے موجود ہیں، نہ صرف ترک اسلحہ جات کے لیے، بلکہ باہمی کنٹرول کے لیے بھی، اور اس سلسلے میں کئی قطعی اور قطعی تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ اپنی تجاویز پر کیے جانے والے اعتراضات کو یک لخت رد کرنے کے بجائے، وہ مکمل حقائق سے ان کا تور پیش کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ انھیں اس بات پر یقین ہے کہ ہمیں اس خطرے کو قبول کر لینا چاہیے خواہ وہ مؤثر اور مکمل طور پر قابل اعتبار ثابت نہ ہو سکے، اس لیے کہ یہ خطرہ نسبتاً کم ہے، مقابلے میں محض بے مقصد ادھر ادھر کی باتیں کرنے، جو ہم آج کر رہے ہیں۔ نوئل بیکر اقوام متحدہ کے ذریعے اجتماعی کنٹرول کا نظام تیار کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اپنی کتاب میں، یا اپنے خیالات کا جواز پیش کرنے میں، وہ کسی مقام پر بھی محکم حقائق کے ذریعے اپنے بیانات کو صحیح ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔

نوئل بیکر بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلحہ بندی کی دوڑ بذات خود جنگ کی بہت ساری وجوہ میں سے ایک اہم وجہ ہے۔ اگر ایک ملک اسلحہ بندی کرتا ہے تو دوسرے ملکوں کے اعتبار کی تیغ کھینچتی ہوئی ہے، اور ان کے خطرے میں ہونے کے احساسات بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں، وہ بھی اسلحہ بندی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ کوئی حکومت ضروری پیش بندی نہ کر کے اپنے ملک کے تحفظ کو خطرے میں ڈالنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی، جب کہ اس کے پڑوسی ممالک سرے سے پاؤں تک اسلحے میں لدے نظر آتے ہوں۔ اس طرح سارے ملکوں میں اسلحہ بندی کی دوڑ جاری رہتی ہے۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے، اعداد و شمار کی مدد سے یہ دکھاتے رہتے ہیں کہ حالیہ برسوں میں یہ دوڑ کس طرح تیز ہوئی ہے۔

اپنے بے حد حساب تجربے کے باعث جنگوں کے درمیان کے عرصے میں ان ہی مسائل پر کام کرنے سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا ہے، اور یہ یقین کیا نہایت بھولپن ہوگا کہ نوئل بیکر اس بات کے قائل ہیں کہ ترک اسلحہ کے مسائل آسانی سے حل ہو جائیں گے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ ان کے خیال میں اس کے بہت روشن امکانات ہیں۔

جس طرح کہ ہم سب جانتے ہیں آج ترک اسلحہ جات کا اس بات پر انحصار ہے کہ مغرب اور مشرق کسی کنٹرول کے نظام پر متفق ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ نوئل بیکر کو یقین ہے کہ 1945 کے بعد سے اس کے ہوجانے کے امکانات اتنے روشن نہیں تھے جتنے کہ آج دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کی خوش امیدی 1958 میں ماسکو میں خروشیف اور میکویان (Mikoyan) سے ہونے والی ان کی بات چیت سے زیادہ مستحکم ہوئی ہے۔ ان سے یہ تاثر ملا ہے کہ جب [روسی رہنمایان] ترک اسلحہ کے بارے میں بات کرتے ہیں تو مخلص ہوتے ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں ان کے اخلاص کا سرفہی طرح امتحان ہو سکتا ہے کہ ان کو ترک اسلحہ جات کے کنٹرول کے بارے میں تفصیلی متن پیش کیا جائے جو ان کے لیے قابل قبول ہو۔

کچھ لوگ نوئل بیکر کو الزام دیتے ہیں کہ ترک اسلحہ جات کے مسائل کے معاملے میں ان کا رویہ بہت

رومانوی ہوتا ہے۔ ایسے نکتہ چینی لوگوں سے ان کا کہنا ہے، جس نے بھی 1918 کے بعد سے ہونے والے ترک اسلحہ جات کے مذاکرات کی قریب سے دیکھا ہو اسے کامیابی کے بارے میں خوش امید کی تصویر اور نہیں کہا جاسکتا۔ مگر جو اسلحہ بندی کی موجودہ دوز کو سمجھتا ہو اس کو بھی قنوطیت کا تصور اور نہیں گردانا جاسکتا، جو شاید زیادہ بڑی غلطی ہوگی۔ ترک اسلحہ اور باضابطہ امن کے منصوبوں کے قابل عمل ہونے کے بارے میں شکست پسند ذہنیت ہی سب سے بڑی مصیبت پذیر غلطی رہی ہے، جو جدید دور کی جمہوری حکومتوں کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

شکست پسند ذہنیت رکھنے والے، وسوسہ پسند اور قنوطی لوگوں سے کنکٹ مشر نہیں۔

ایسے لوگ شاید ہی کبھی دنیا کو بہتر بنا سکیں گے۔ ایسا تو صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خوش امید و خوش عقیدہ ہوں اور ناکام کوششوں کی صورت میں نئی کوششیں کرنے والے ہوں، پرانے طریقوں کی ناکامی پر نئے طریقے آزمانے والے ہوں۔

پلپ ٹوکل بیکر اپنے مخصوص ڈھانچے میں ڈھلے انسان ہیں۔ زندگی بھر وہ Quakers کے بلند و بالا آدرش سے وابستہ رہے ہیں۔ بلا کسی نسلی یا مذہبی تعصب کے انھوں نے ہمیشہ اپنے انسانوں کی مدد کی ہے، انھوں نے ایسی دنیا بنانے کی کوشش کی ہے جس میں انسانوں یا قوموں کے درمیان وجود کی جدوجہد کے لیے تشدد اور اسلحہ کی ضرورت نہ رہے۔

ناامیدیوں اور ناکامیوں کے باوجود، پلپ ٹوکل بیکر نے کبھی ہار نہیں مانی، بلکہ انھوں نے پامردی سے مستقبل پر اور ایک نئی اور بہتر دنیا کے حصول پر نظر جمائے رکھی ہے۔

صدر نشین مارٹیاں نوبل کمیٹی Gunnar Jahn کی زبانی

خطبہ :

امن اور اسلحہ بندی کی روش

کل میں نے اس اعزاز کے حصول پر اپنا تھکر پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اعزاز مجھے کیوں دیا گیا ہے؟، (مستر Gunnar Jahn نے پیشکش کی اپنی تقریر میں جنوبی طور پر اس سوال کا جواب دیا تھا) میں تمام انسانوں میں سب سے زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میں اپنے باپ کا بیٹا تھا۔ میں Norman Angell کا قریبی دوست تھا۔ میں نے کیمبرج کے ایک طالب علم کی حیثیت میں کیمبرج یونین میں ان سے بات کی تھی، جب انھوں نے اپنی پہلی اور اہم جواب دہی کی تھی۔ میں اگست 1914 کی چارٹر رینج کو کمپل میں ان کے کیمبر میں ان کے پاس تھا، ان کی آواز سنی تھی جب (برطانوی پارلیمان کی گھڑی) بج گئی تھی۔ آجی

رات کا گھنٹا بھایا تھا، جس وقت گھڑ سوار توپ خانہ فرانس کے لیے ریل گاڑی میں سوار ہونے کو شہر ایڈ Embankment سے وکٹوریا ریلوے اسٹیشن کی طرف آگے بڑھ رہا تھا اور جس علم تھا کہ توپیں چلتی شروع ہو گئی تھیں، کہ پہلی عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جب وہ جنگ ختم ہوئی تھی، مقدر نے فیصلہ کر دیا تھا کہ میں نارٹ سیبل کے لیے، آرٹھر ہینڈرسن کے لیے اور Fridtjof Nansen کے لیے کام کروں۔

میں آپ کو ہزاروں قصے سناسکتا ہوں کہ سیبل اور ہینڈرسن نے کس طرح مدد کی تھی لیگ آف نیشنز کی تشکیل اور بحکیمیل میں، بین الاقوامی عدالت کے قیام میں، بہت سے حلقوں میں عالمی تعاون بڑھانے میں؛ کہ انھوں نے کس طرح ہر قسم کے اسلحہ جات کی کمی کی پالیسی کے عام جملوں کو عملی تنہاویہ میں بدلا تھا، جن کی بنیاد پر معاہدہ ہو سکتا؛ کہ انھوں نے کس طرح دنیا کی رائے بالعلم کی رہنمائی کی تھی، جسے اس وقت کی اہم حکومتیں، ایک منصوبے کے ذریعے 1882 میں ترکیب اسلحہ جات میں حد درجہ کی کرنے کے لیے استعمال کر سکتیں، اگر ان میں وہ حوصلہ اور اتنی بالغ نظری ہوتی جس کی ضرورت تھی؛ کہ وہ عظیم - تاریخ کا سب سے پہلا - موقع کس طرح ضائع کیا گیا تھا، جب وہ اپنے مقاصد کے لیے لڑ رہے تھے۔

یہ ان ہی عظیم کارہائے نمایاں کا اور ان کی غیر متذبذب ہمتوں کا صلہ ہے کہ آپ نے انھیں گزرے ہوئے دنوں میں اعزاز بخشا، اور میرا خیال ہے کہ آج بھی انھیں کو اعزاز بخش رہے ہیں۔

اور رہا Fridtjof Nansen — تو اپنے تمام دوستوں اور ساتھیوں کے لیے غنیمت سب سے زیادہ قابل اور تمام انسانی عظمت کے عناصر کے باعث، عظیم آدمیوں میں سب سے آدبی تھا۔ وہ انتہائی بین الاقوامی مدیر بھی تھا جتنا یہ کہ وہ منجند شمال کا کھوجی تھا۔ حقیقتاً، اس کے بین الاقوامی کام کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس امر کو تلاش کرنے کے لیے اپنی یادوں کو کھنگالنا پڑے گا کہ اس نے کس طرح اتنی بے پایاں اور بے مثال شہرت پائی۔ پوری دنیا کو آج بھی یاد ہے کہ اس نے گرین لینڈ کے برف زار کو کس طرح عبور کیا تھا، جہاں دوسرے تمام کھوجی ناکام ہو گئے تھے؛ تمام ماہرین کے مشوروں کے خلاف، سمندر میں بہتے ہوئے خطرناک برفانی تودوں کے درمیان سے، وہ اپنی پارٹی کو ایسے بیلان برف زار مشرقی ساحل تک لے گیا تھا جہاں سے واپسی کے امکانات نہیں تھے۔

جب وہ قطب شمالی تک پہنچنے کے لیے چلا تھا تو، ایک بار پھر ہر ماہر نے اس کو باز رہنے کا مشورہ دیا تھا، اور اس نے اپنے جہاز Fram کو طلب کر لیا تھا، اس لیے کہ وہ بحر منجمد شمالی کے برفیلے میدان میں پھنس گیا تھا، اور اس کے سامنے بس ایک ہی راستہ تھا جس پر وہ سفر کر سکتا تھا: سرف آگے کی طرف کا راستہ؛ جس سے چلنا ممکن نہ تھا۔

جب Fram نامی جہاز اپنا آدھا سفر طے کر چکا تھا، وہ شمال میں اتنی دور تک پہنچ گیا تھا جہاں اس سے پہلے کوئی انسان نہیں جا سکا تھا، اور یقینی تھا کہ مزید اٹھارہ ماہ میں وہ فاتح بن کر دوسری طرف ابھرے گا، اور نیلسن کا کہا ثابت ہو جائے گا۔

مگر وہ قطب شمالی سے محروم رہے گا، اس لیے ٹینسی۔ اپنے واحد ساتھی جانسی کے ساتھ۔ گلوں اور برف پر کھینچی جانے والی گاڑیوں سمیت، kyak کے راستے Franz Joseph Land تک پہنچنے کی کوشش کرے گا، اور سردی کے موسم میں وہیں قیام کرے گا۔ اُس کے پاس وائزلیس نہیں تھا، Fram پھر کبھی اس کو نہیں ملا، وہ سفر 1,100 میل کا تھا، جس میں ہر میل پر ہر طرح کے خطرات تھے۔ کیا کسی میں ٹینسن جیسی جمہور اور مستحکم ارادہ تھا، جب Fram کے پہلو میں، چاندنی میں چمکتے ہوئے برف زار پر کھڑے ہو کر اُس نے Fram کے ماروے نژاد کپتان Sverdrup کو اوداع کیا تھا؟

ٹینسن، جس نے جیوا کے سفارتی قہقہے پر دھاوا بولا تھا، وہی ٹینسن تھا جس نے قطب کی سمندری رکاوٹوں کو عبور کیا تھا۔

نوبل کمیٹی نے 1922 میں اس کو جو نوبل امن انعام سے نوازا تھا، وہ اس کے انسانیت دوستی کے کام کے لیے تھا، جو اس نے لیگ آف نیشنز کے ہائی کمشنر کی حیثیت میں کیا تھا۔ کتنے اچھے طریقے سے اس نے یہ انعام حاصل کیا تھا! جنگ کے طوفان نے یورپ میں جو تباہی پھیلانی تھی اس کو صاف کرنے کے لیے اس نے لیگ آف نیشنز کو نئی طاقت دلائی تھی، اس کو ایک صلح و مہمانت کا آلہ کار بنا دیا تھا، اور دنیا والوں کے لیے امید اور تعمیر نو کی علامت بنا کر پیش کیا تھا۔

اور اس کی کامیابیوں کے نتائج دور رس ثابت ہوئے، جب اقوام متحدہ نے لیگ آف نیشنز کی جگہ لی تھی؛ UN Refugee Organization، UNRRA جس نے اس کے شروع کیے ہوئے کاموں پر کروڑوں ملین ڈالر خرچ کیے تھے، High Commissioner for Refugees، World Refugee Year، the UN Economic Aid، Children's Fund (UNICEF)، UN Technical Assistance وغیرہ پر۔ یہ کہنا حیرت انگیز نہیں ہوگا کہ یہ سب کچھ اُس کی بہت پہلے کی کامیابیوں سے ابھرے تھے۔ اس کے باوجود اپنے زمانے میں اُس نے سیاسی اور سفارتی میدان میں جو تاریخی کام کیے تھے، ان کے سامنے یہ سب کچھ بچ تھا۔ ٹینسن کو بڑے دلوں کے ساتھ یقین تھا کہ دنیا کو ایک نئی بین الاقوامی نظام کی ضرورت تھی، جس کی بنیاد طاقت پر نہیں، قانون پر ہو، وہ سب کچھ بہت قریب سے جانتا تھا، اور اسے طاقت کی سیاست کی اندرونی کارگزاریوں اور پرانی خفیہ سیاست سے نفرت تھی، اس نے اپنی تمام تر قوت اور ہمت نئے نظام کی کامیابی کی جہد کے لیے وقف کر دی تھی۔

وہ لیگ کی پہلی اسمبلی میں ماروے کے وفد کا قائد ہو کر گیا تھا، جب کہ اس کا وزیر اعظم اس کا نائب بن کر اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ گویا، پہلی ہی نظر میں ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ وفد کس نوعیت کا ہوگا۔ لیگ آف نیشنز میں الہانیہ کی شرکت کے دعوے پر غور کرنے کے لیے ایک مختصر سی کمیٹی بنائی گئی تھی جس میں لارڈ سمیٹل کے ساتھ یہ بھی ایک رکن تھا۔ طاقت کی سیاست کی وجوہ کی بنا پر جب اطالیہ نے کھلے لفظوں میں مخالفت کا اعتراف کیا تو برطانیہ اور فرانس نے اطالیہ کی حمایت کی تھی۔

مگر مینیسوی اور سمیٹل دونوں کانٹل تھے کہ الہانیہ ایک قوم ہے اور اس کو لیگ میں شامل ہونا چاہیے۔ اس مختصر کمیٹی میں ان کو شکست ہوئی، اور سمیٹل نے مینیسوی سے دریافت کیا تھا کہ اس سوال پر کیا پوری اسمبلی میں مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟

مینیسوی کا فوری جواب تھا، ”لازمی طور پر ہمیں کرنا چاہیے۔“
 ”مگر بڑی طاقتیں ہمارے خلاف ہوں گی۔“ سمیٹل نے تنبیہ کی۔
 ”بلاشبہ، ہم کریں گے۔“ گویا اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

ان کے نزدیک یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا، اس لیے کہ ان کے خیال میں معاملہ حق کا تھا۔ لیگ کی ایک سب سے چھوٹی قوم کے ترجمان کے طور پر بھی وہ ان طاقتوں کو چیلنج کرنے پر تیار تھے جنہوں نے انہی دنوں جنگ چلی تھی، اور وہ لیگ میں طاقت کی سیاست کو داخل کرنا چاہ رہے تھے۔ اور اس موقع پر ان کی حقارت آمیز توہین جائز تھی۔ پوری اسمبلی میں عام بحث میں مینیسوی اور سمیٹل، ناروے اور جنوبی افریقا، فاتح ٹھہرے۔ بڑی طاقتوں کو شکست ہوئی، اور الہانیہ لیگ کا ٹرکن بن گیا۔
 کتنی بار یہ منظر دہرایا گیا تھا!

مینیسوی اور سمیٹل نے کمیٹی کو شہرت دلائی، اور بعد میں لیگ کی Council and Commissions کو بھی شہرت ملی۔ سمیٹل نے کہا تھا، ”لیگ کے لیے شہرت تازہ خون ہے۔“ یہ مقولہ واقعی یاد رکھنے کے قابل ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے نمائندے Giuseppe Motta نے ایک بار مشورہ دیا کہ جرمنی کو لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی جانی چاہیے؛ گویا اس نے اپنے سر پر فرانس کے سابق وزیر اعظم Viviani کو، سمیریو (Gicero) جیسی خوش گفتار فرانسیسی بوچھاڑ کرنے کی دعوت دے دی تھی۔ ویویانی کے بعد مینیسوی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ Motta حق بجانب ہے۔ بعد کے برسوں میں مینیسوی نے Stresemann اور Luther کو راضی کر لیا کہ وہ بھی اس (مشورے) میں شامل ہو جائیں۔

1923 میں موسولینی (Mussolini) نے ایک مرحلہ کی چھڑپ کو بہانہ بنا کر ”کارفو“ جزیرے پر قبضہ کر لیا۔ یونان نے بدحواسی میں لیگ اور پیرس میں Allied Council of Ambassadors دونوں سے اپیل کی؛ سمیٹل نے، اپنی حکومت کی نیم مخالفت کے باوجود لیگ کی استعداد کو پرقرار رکھا، مینیسوی نے اسمبلی کو اپنی تائید پر مجتمع کیا، چھوٹی قوموں کو اکٹھا کیا اور موسولینی کی دھمکیوں کا جواب دیا، اسمبلی میں دھواں دھار تقریر کی، اور قسطنطنیہ مندوبین کے نمائشی دلائل کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

سمیٹل نے کہا تھا، ”مینیسوی ایک ستون تھا جس کے اطراف تمام نمائندے اکٹھے ہو گئے ہیں تاکہ اس کو نافذ کریں جو صحیح بھی ہے اور منصفانہ بھی ہے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ڈراوٹی کارفو اسمبلی میں مینیسوی نے لیگ کو بچا لیا تھا، شاید اس نے جنگ کو

چھڑنے سے روک دیا تھا؛ کارفو کو ایک غیر محتاط حملہ آور سے نجات دلائی جو سلطنت بنانے پر مائل ہوا تھا؛ (کئی بار یونان کے وزیر اعظم بنے والے) Venizelos نے مجھے بتایا تھا کہ یہ لیگ کی سب سے بڑی فتح تھی اور مینسن کے بغیر یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

ہدایات، غلامی، جبری مشقت، بین الاقوامی عدالت کا لازمی اختیار، اجتماعی تحفظ، روس کی شمولیت، لیگ کی آئینی نشوونما۔ ان سب میں وہی رہنما تھا؛ بقول سیمبل "اس نے سب کو اپنی ہمت اور اپنے اعتماد میں سے کچھ نہ کچھ دیا تھا" اور سیمبل کے استعارے کے مطابق "اس کا جہاز اب بھی Fram ہی تھا"۔ مگر اب رومور کے مقابلے میں اس کے نزدیک ایک امر سب سے ضروری تھا۔ ترکی اسلحہ جات!

مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس ماروے کے جدید Viking کی مدح ختم کروں اس کی ایک تقریر کے اقتباس سے جو اس نے 1926 میں کی تھی۔

"یہ مسئلہ کہ جنگ کو کس طرح صفحہ ہستی سے مایود کر دیا جائے سب سے پہلا سوال ہے، نہ صرف بین الاقوامی، بلکہ عدم سیاسی بھی۔۔۔"

اگر ہم جنگ کو مایود نہیں کر دیتے، اگر ہم اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک نہیں دیتے، اگر ہم اسلحے کو کم یا محدود نہیں کر دیتے تو۔۔۔ میں اس بات پر یقین کر لیتا چاہیے کہ مستقبل میں، جیسا کہ ماضی میں ہو چکا ہے، اسلحہ، اسلحہ کا توڑ پیدا کریں گے؛ اتحاد اور اتحاد کا توڑ پیدا کریں گے، شبہات اور عدم اعتماد۔۔۔ بین الاقوامی بحرامات پیدا کریں گے، پہلے یہ رہنمائی کریں گے، شاید چھوٹی جنگوں کی طرف، مگر بعد میں لاپرواہی جنگ، غلیم پیدا کریں گے، جیسی کہ ہم خود اپنے عہد اور اپنی نسل کے دور میں دیکھ چکے ہیں۔

اگر ہم اپنے اسلحے قائم رکھیں گے، اگر ہم ترکی اسلحہ جات کے کام کو آگے نہیں بڑھائیں گے، جسے لیگ آف نیشنز نے بڑی کامیابی سے آگے بڑھایا تھا، تو یقینی طور پر جنگ آکر رہے گی۔"

1926 میں یہ الفاظ کہے گئے تھے 1933 میں، جب مینسن نہ جینوا میں ماروے کے لیے بولے نہ بنی نوع انسان کے لیے، تو ترکی اسلحہ جات کانفرنس، کام ہوگئی، عہد ناموں کا نظام تاج دیا گیا، جب مطلق طاقت کی سیاست کی طرف واپس ہوئی، منبوریہ، چاکو، ابی سینیا، ہسپانیہ، آسٹریا، میونخ کے ملال انگیز سلسلے ہوئے، اور دوسری عالمی جنگ ہوئی، مینسن جس کی پیشین گوئی کر چکے تھے۔

اور آج، تیس برس بعد، اسلحہ بندی کی دوڑ کے معاملے میں ہم کہاں کھڑے ہیں، اور کس مینسن نے عہد کے سب سے بڑے مسئلے کے بارے میں سوچا ہے؟ اسلحہ بندی کی دوڑ اب بھی جاری ہے؛ بلکہ یہ اب کہیں زیادہ ٹھوس ہو رہی ہے، کہیں زیادہ مہنگی ہوگئی ہے، اور پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک۔

اسلحہ بندی کی دوڑ کے خطرات کیا ہیں؟ میں ایک پرانی بے ضرر مثال کا مبادیہ چاہتا ہوں۔ حقائق اب بھی قائم ہیں اگرچہ آدھی جا چکے ہیں۔

1905 میں برطانوی بحریہ نے ایک بڑی مزاحمت تیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا، یہ دکھانے کے لیے کہ جرمنی

کبھی جنگ نہیں جیت سکتا اور بہتر ہے کہ وہ مدِ طاووی بحریہ کو دیے ہوئے چیلنج سے دست بردار ہو جائے۔ انھوں نے Dreadnought نام کے ایک عظیم بحری جہاز کا منصوبہ بنایا، اس طاقت ور کراں کو خطرہ دینا تو کہا، وہ پوری جرمن بحریہ ہی کو غرق کر سکے۔ (Dreadnought کے سمندر میں اتارے جانے سے پہلے، اقتدار میں آنے والے ایک وزیر اعظم نے اور لارڈ بالفور نے، جن کی وزارتِ عظمیٰ نے اس کی تیاری سے اتفاق کیا تھا، دارالعوام میں اعتراف کیا کہ شاید Dreadnought کی تیاری ایک سنگین غلطی تھی اور یہ سچ ثابت ہو گیا۔)

اس واقعے نے ایک ہی رات میں اٹھائیس جرمن جنگی جہاز اور بکتر بند حفاظتی جہاز کا کاروبار دے دیا۔ مگر جرمنوں نے بھی جوابی Dreadnought تیار کر لیا تھا، اور انھوں نے اٹھائیس نہیں بلکہ تراسی مدِ طاووی جنگی جہاز اور حفاظتی بکتر بند جہاز کا کاروبار دے دیا، جو جرمن بحریہ کے شاید کئی گنا طاقت ور جہاز کو تباہ کر سکتے تھے۔ (1906 میں ہمارے پاس جرمنی، آسٹریا اور اطالوی بحریہ کے مجموعی جہازوں کے مقابلے میں چوتھیں جہاز زیادہ تھے۔)

دوسرے لفظوں میں، قومی دفاع کے لیے Dreadnought کی ضرورت نہیں تھی مگر وہیں برس بعد، جٹ لینڈ کی لڑائی میں، جہاں صرف Dreadnought کام آتے، ہمارا فرقہ دو کے مقابلے میں ایک کا تھا؛ اگر ہمارے کماں داروں نے غلطی کی ہوئی، خوش قسمتی سے جو نہیں ہوئی، تو ہم صرف لڑائی ہی نہیں شاید جنگ بھی ہار جاتے۔

جنگی حکمت عملی کے اعتبار سے Dreadnought سب سے زیادہ سنگین نوعیت کی غلطی تھی؛ سیاسی اعتبار سے یہ مطلق تباہی تھی۔ اس نے جرمن بحریہ کے ایڈمرل اور وزیرِ دفاع Tirpitz Alfred von کو اور جرمنی کے ان عہدہ داروں کو جو جنگ چاہتے تھے بے اندازہ طاقت فراہم کر دی تھی؛ سال بہ سال Dreadnoughts کے حصول کی دوڑ جرمنی اور برطانیہ دونوں میں مبہوت اور مبہوت کی توڑ پر منتج ہوئی؛ 1909 تک ہمارے وزیرِ خارجہ، لارڈ گری کے مطابق یہ واحد عنصر تھا جس نے یورپی ٹھانڈ اور جنگ کے خطرے میں اضافہ کیا تھا۔

1912 میں امریکی جے پی جی، جو اس وقت مدِ طاووی بحریہ میں تھے اور جرمن چانسلر بیٹھ مان ہالو ویک (Bethmann-Hollweg) دونوں نے اپنی حکومتوں کو تنبیہ کی تھی کہ اگر اس کو روکا نہیں گیا تو اس کی بدولت دو برس کے اندر پھر جنگ شروع ہو جائے گی۔ تقریباً اسی ہی دنوں میں یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی۔

جب جنگ ختم ہو گئی تو لارڈ گری نے اپنا مشہور فتویٰ لکھا تھا: ”یورپ میں اسلحے کا بے پناہ پھیلاؤ، اور اس کا پیدا کردہ احساسِ عدم تحفظ۔ یہی دو عناصر تھے جنہوں نے جنگ کو ناگزیر بنا دیا تھا۔ یہی ہے تاریخ کا سچ، کہ زمانہ حال کو ماضی سے سبق سیکھنا چاہیے۔“

(ایسا اس لیے ہے کہ تمام مدبرین جنہوں نے جنگ لڑی ہے، لارڈ گری کے فتوے سے متاثر ہیں کہ لارڈ جارج اور بالفور نے ریاست ہائے متحدہ کے وزیرِ چارلس ہیوز (Charles Hughes) کی مدد کی تھی، تا کہ 1922 کا بیلق واشنگٹن ہو جائے، ایسا معاہدہ جس نے جنگی جہازوں اور طیارہ بردار بحری جہازوں میں کمی

اور مشہور زمانہ 15:15:2 تناسب قائم کر کے ریاست ہائے متحدہ، برطانیہ اور جاپان کے درمیان بے قراری اور غصے سے عبارت بحری اسلحہ بندی کی دوڑ کو روک دیا تھا۔ اس معاق نے عمومی ترک اسلحہ جات کے معاہدے کا لا جواب آغاز کر دیا تھا، جو عہد نامے کے تحت، لیگ آف نیشنز کرنے والی تھی (مگر، افسوس کہ عمومی ترک اسلحہ جات کا معاہدہ کبھی نہیں ہوسکا۔ جب 1932 طویل تیاریوں کے بعد ترک اسلحہ جات کانفرنس منعقد ہوئی تو ریاست ہائے متحدہ کے صدر Hoover نے بحریہ میں 10:10:6 تناسب کی مزید کمی کی تجویز پیش کر دی، جو فوجوں میں ظالمانہ کمی کے مترادف تھی، جس میں پہلے درجے کے منصوبے کے تحت، تمام بینک اور بھاری موٹائل توپیں اور تمام ہمسار ہوائی جہازوں کو ختم کر دیا جانا تھا، اور دوسرے درجے پر معافی و نرمائی کے مطابق جرمنی پر اسلحہ بندی کی پابندی نافذ کی جانے والی تھی۔

جرمنی، روس، اطالیہ اور تمام درمیانہ اور چھوٹے درجے کی طاقتوں نے اس منصوبے کی پُر زور طریقے پر پزیرائی کی تھی۔ مجھے ڈاکٹر کریمین لائنگے اور ان کے ماریو پائی مارتھیلوں کی خوشی اچھی طرح یاد ہے جب یہ تجویز پیش کی گئی تھی۔ اگر برطانیہ راضی ہو جاتا تو کانفرنس کامیاب ہو گئی ہوتی۔

برطانیہ کے بہت سے لوگ راضی ہونا چاہتے تھے جن میں مائیب وزیر اعظم مسٹر بالڈون (Baldwin) اور کنزرویٹو پارٹی کے قائد شامل تھے۔ وہ تو اس سے آگے نکل جانا چاہتے تھے کہ دس ہزار ٹن سے زیادہ وزن کے تمام جنگی جہاز تمام طیارہ بردار جہاز، ہر قسم کے فوجی جہاز، سب ختم کر دیے جائیں۔ اس سے مراد آبدوز کشتیوں کا خاتمہ بھی ہوتا، اور سر بردار و درجہ بحری طاقتوں کی اس نوعیت کی پیش کش کی صورت میں کانفرنس کبھی ناکام نہیں ہوتی، مگر برطانوی حکومت کی کابینہ میں آویزش تھی، مسٹر بالڈون کو چند ہفتوں سے شکست ہو گئی، ایک برطانوی ایڈمرل کو کانفرنس میں کہنے کا موقع مل گیا کہ ”جنگی جہاز جن کے پاس ہوں، ان کے لیے یا قوت سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں، ہمیں اتنے سے الفاظ سے اس نے صدر ہو کر منصوبے کو ختم کر دیا۔

کامیابی سے اتنے قریب ہونے کے بعد کانفرنس ناکام ہو گئی، اسلحہ بندی کی دوڑ کوئی تولاتی مل گئی، اہم حکومتیں طاقت کی سیاست کے ناپاک اصولوں کی طرف لوٹ گئیں، اپنی سینیا اور عہد ناموں سے غداری ہوئی، دوسری عالمی جنگ بالکل اسی عمل کے ذریعے آگئی، ہینسین اور سیمل نے جس کی پیشین گوئی کی تھی۔

اور پھر جنگ میں کیا ہوا؟ جنگی جہازوں نے کیا کردار ادا کیا، جن کے لیے اتنی امیدیں خاک میں مل گئی تھیں؟ وہ تقریباً بے کار چھلے جب کہ جیسا کہ روایتی ملاح اور ہم سب جانتے ہیں، تیس برس میں دوسری بار آبدوز کشتیوں نے ہمیں تقریباً مراد لیا تھا۔

اور آج؟ اسلحہ بندی کی دوڑ جاری ہے، ہوائی جہاز بحری جہازوں کے لیے، جوہری تولاتی سے چلنے والی آبدوز کشتیاں اور جوہری میزائل مستقبل کے تجارتی قافلوں کے لیے جن کے بغیر برطانیہ جی نہیں سکتا، مہلک خوف بن گئے ہیں، قیامت بن گئے ہیں۔

نہ صرف یہ بلکہ 1906 میں Dreadnought کے بننے سے پہلے اس کے موجد، امیر البحر ایڈمرل لارڈ

بشر (Lord Fisher) نے کہا تھا، ”ہماری بحری برتری کے خلاف کسی قسم کی بات کرنا بھی نامعقولیت ہوگی۔“ اسلحے کی دوڑ کی شروعات کے نصف صدی بعد، جس میں جنگی جہازوں کی شمولیت قابل افسوس تھی، ہم بحری طاقت میں تیسرے درجے پر ہیں؛ ہم نے دیکھا کہ کسی ایک قوم کا متعارف کرایا ہوا بڑی طاقت والا دنیا ہتھیار کس طرح دوسری قوموں تک پہنچ جاتا ہے، اور جس قوم نے اس کو متعارف کرایا ہو اسی کے تحفظ کو خطرہ بن جاتا ہے؛ کس طرح یہ اسلحہ بندی پر اُکساتا ہے اور مزید نئے ہتھیار شامل کرتا ہے جو بحری جنگ و جدل میں ان قوموں کی زندگی کو خطرہ بن جاتے ہیں جن کا سارا دارمدار ہی سمندر پر ہوا حتیٰ کہ بحری ہتھیاروں ہی کے معاملے میں، ہر موقع پر، 1906، 1932، 1955 میں ہونے والا کی یا ترک اسلحہ پر معاہدہ قوموں کے تحفظ کے لیے کتنا بہتر ہے، بھلے اس کے کہ بحری جنگ کے لیے مزید طاقت والے جنگی جہاز متعارف کرائے جائیں اور ان کی دیکھ بھل کی جائے۔

مگر جنگ کے دوسرے ”جدید“ طریقے مزید کتنی بڑی حقیقت بن گئے ہیں۔ ہماری موجودہ اسلحہ بندی کی دوڑ کی حقیقت اس کا ثبوت ہے۔

لارڈ گرے کا خیال تھا کہ 1914 سے پہلے کی مسابقت دیوانہ پن تھی؛ 1939 سے پہلے تو یہ دوڑ اور زیادہ تیز تھی؛ 1945 کے بعد سے اتنی زیادہ ہو گئی جس کا 1939 میں کسی نے خواب بھی نہ دیکھا ہوگا۔

1914 کے امن کے زمانے میں قوموں کے پاس پانچ ملین سے کچھ زیادہ فوجیں ہوتی تھیں؛ آج سولہ ملین سے زیادہ ہیں۔ 1914 میں جنگوں کی تیاری میں اندازاً 500 ملین پاؤنڈ سے زیادہ اخراجات ہوتے تھے؛ آج یہ خرچ 40,000 ملین پاؤنڈ ہو چکا ہے۔

سب سے بڑی رقم فوجی تحقیق پر خرچ کی جاتی ہے، زیرک سائنس دانوں پر، تاکہ موجودہ ہتھیاروں کو بہتر بنایا جاسکے اور نئے اور زیادہ تباہ کن ہتھیار سے داموں تیار کیے جاسکیں، جن کو موجودہ ہتھیاروں کے مقابلے میں تیزی سے استعمال کیا جاسکے۔

1938 میں برطانیہ نے 6 ملین پاؤنڈ سے زیادہ عسکری تحقیق پر خرچ کیے تھے 1953 میں 100 ملین؛ 1959 میں 210 ملین۔ قیمتوں میں تہذیبی کے ساتھ یہ مرکزی تخمینہ ہے، جو پیش گنا زیادہ ہے اس خرچ سے جو ہمیں برس قبل کیا جاتا تھا۔

ریاست ہائے متحدہ نے 1940 میں عسکری تحقیق پر 5 ملین پاؤنڈ خرچ کیے، جو ہمارے مقابلے میں کم تھے۔ 1958 میں انہوں نے 1.900 ملین پاؤنڈ خرچ کیے جو ہمارے مقابلے میں نو گنا زیادہ تھے؛ اور اس میں شہ نہیں کہ سوویت یونین نے اس سے بھی زیادہ خرچ کیے ہوں گے۔ ہر قسم کے ہتھیاروں کے معاملے میں نتائج انقلابی رہے ہیں؛ برطانیہ اب اپنی زمینی فوجوں کو نئے ہتھیاروں سے لیس کر رہا ہے، رائل فیلڈ سے لے کر بینک تک، سب کچھ ہوائی ذریعے سے بھیجا جائے گا؛ فرانس دو گنی رفتار کے ہمارے ہوائی جہاز بنا رہا ہے۔

مگر 1945 کے بعد سے نام نہاد جدید ہتھیاروں میں بڑی تہذیبی آتی ہے۔ جوہری بم کی خون جھاڑیجے

دانی تاہم سب ہم سب اچھی طرح آشنا ہیں۔ 1945 میں ہیروشیما میں گرایا جانے والے جوہری بم ہمارے دس من والے blackbuster بموں سے دو ہزار گنا زیادہ تباہ کن تھا جو ہمارے ہولبا زوں نے برلن پر گرائے تھے۔

اس (جوہری بم) نے ایک لمحے میں 100,000 لوگ ہلاک کیے اور مزید ایک لاکھ افراد معذور ہو گئے، جل گئے، اندھے ہو گئے اور جوہری تابکاری بیماریوں سے چھینی ہو گئے؛ 1959 میں، اس بم کے باعث جو 4 برس قبل گرایا گیا تھا، بے شمار افراد میرے سے ظہر ہونے والی بھیا تک بیماریوں سے ہلاک ہوئے تھے۔ اوسلو کے مساوی ایک شہر بالکل تباہ ہو گیا تھا؛ مکانات، کارخانے، دفاتر، فوجی ٹھکانے اور بندرگاہیں۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

1954 میں کیا جانے والا نام قہار ہائیڈروجن بم کا تجربہ پہلی، وحشی thermonuclear ایجاد۔ ہیروشیما پر گرائے جانے والے بم سے تقریباً ایک ہزار گنا زیادہ تباہ کن تھی۔ شہری دفاع کا ایک کتابچہ، جو برطانوی وزارت داخلہ نے جاری کیا تھا، ہمیں بتاتا ہے کہ ایک دس میگا ٹن بم۔ یعنی جو نوٹیل کی دھماکا خیز ایجاد کے دس ملین ٹن کے برابر ہے۔ جو 1954 کے ہتھیار کے مقابلے میں کمتر ہوگا۔ لندن کو صفحہ ہستی سے مٹا دے گا؛ پورے مرکز کی تہیں، اور اس کے اطراف پھرے ہوئے شعلوں کا ایک ہالا، جس سے کسی کا بچ نکلنا معجزہ ہی ہوگا۔

ہتھیاروں کی تیاری کی رفتار بدستوری ہی جا رہی ہے۔ چار برس کے عرصے میں، جب سے حکومت نے ”کھل“ ترک اسلحہ جات کے بارے میں بات کرنی بند کر دی ہے اور اس کے بجائے جدید طریقے اختیار کیے ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں؛ آواز کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار بمباروں کی تیاری؛ درمیانہ درجے کی میزائلوں کی تیاری، جس کی رسائی 1,200 اور 500,1 میل کے برابر ہوگی؛ بین البراعظمی میزائل جو 1961 تک تیار ہو کر کارآمد ہو سکتے ہیں؛ سوویت یونین اس وقت تک ہر مادہ پندرہ میزائل بنانے لگے گا؛ ہائیڈروجن بم کا شمار ان ہتھیاروں میں ہونے لگے گا جنہیں ایک لڑاکا / بمبار جہاز اور بین البراعظمی میزائل لے جاسکیں گے۔

ہم جوہری توانائی سے چلنے والی آبدوز کشتیاں بھی دیکھ رہے ہیں؛ جوہری بم بردار میزائل پولا یوس بھی، جلد ہی تیار ہو جائے گا جسے پانی کے اندر سے داغا جاسکے گا۔ ہم نے کیمیائی اور حیاتیاتی طریقے کی جنگی تیاریاں بھی دیکھی ہیں۔

چک وائش (Pugwash) مائنس دانوں نے، ریاست ہائے متحدہ کے مسٹر مارجس ٹیٹس (Cyrus Eaton) نے جن کی فیاضانہ امداد کی ہے، اس برس بتایا ہے کہ انسانوں کی بڑے پیمانے پر بلاکٹ کے لیے زہریلی گیس اور biologicals کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ گوئرنگ (Goering) نے ایک غمبھی (herve) گیس کو جسے اس نے Tabun کا نام دیا ہے، بکروں کے ایک ریوڑ پر استعمال کیا تھا؛ ہمارے بکرے پاگل ہو کر اس ایک دوسرے کو ہلاک کرتے رہے، اور چند ہی باقی بچے تھے جو بعد میں شدید درد

کے بعد خود بھی ہلاک ہو گئے تھے۔

ایک امریکی جنرل نے ہمیں بتایا ہے کہ ہماری معیسی گیس اب دی گئی زیادہ زور آور ہے، جب کہ دوسرے تو اس سے بھی زیادہ بتاتے ہیں۔ بیماری پھیلانے والے ہتھیار (biologicals) بھی اتنے ہی زور آور ہو سکتے ہیں، اور اگر وہ بڑے پیمانے کی وبا شروع کر دیں، تو اس سے بھی زیادہ خوف ناک ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ نیک ترین ارادوں کے ساتھ (میں سپہ سالاروں کے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں) بڑی عسکری حکومتوں نے اپنے کیمیائی اور حیاتیاتی رازوں کو چھپا رکھا ہے، سپہ سالار حضرات tactical atomic bomb اور low-yield thermonuclear device جیسے نرم اور کم راہ کن جملوں میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ جیسے جن کے خلاف، ان ہتھیاروں کے بتانے والے سائنس دان، کھلے فٹکوں میں بغاوت کرتے ہیں۔ مگر ہر ملک کے باشندوں کو احساس ہونا چاہیے کہ موجودہ ہتھیار بندی کی دوڑ کی اصل حقیقت کیا ہے۔ ان کے نمایاں خدو خال کیا ہیں؟

سب سے پہلے تو ہمارے بین الاقوامی معاملات کا یہ سب سے زبردست عنصر ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ تاریخ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز تضاد ہے کہ مرنیا ہتھیار قومی دفاع کے لیے تیار کیا جاتا ہے، مگر سب ماسٹرین مشق تھا کہ جدید، بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے، اور فوراً مہیا کیے جانے ہتھیاروں نے دفاع کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ تیسرے، یہ کہنا ایک طے شدہ غلطی ہے کہ ایک غیر معینہ مستقبل میں صرف دو عسکری ”دیو“ ہوں گے، اس سے زیادہ نہیں۔ اگر اسلحہ کی دوڑ جاری رہی تو دس برس میں چھ یا اس سے بھی زیادہ دیو ہو سکتے ہیں، اور کون جانتا ہے کہ کون سی قوم سب سے بڑا دیو ہوگی۔ چوتھے ہتھیاروں میں ترقی نے ہمیں اچانک، فیصلہ کن اور ناقابل اصلاح حالت کے قریب تک پہنچا دیا ہے۔

پانچویں یہ کہ عسکری معاملات میں Johns Hopkins Operations Analysis Office کے لیے کام کرنے والے ادارے کے سربراہ اوڈا کٹر ایلس جانسن (Ellis Johnson) کا خیال ہے کہ روس کی جانب سے ایسے مسمارکن حملے کا امکان موجود ہے۔ اور لوگوں کا خیال ہے کہ 10,000 میگاٹن بم اور زمینی اقبوں اور سمندر سے مار کرنے والے میزائل رکھنے والا ملک ریاست ہائے متحدہ، جو اپنی حملے کے خطرے سے پہلے ہی روس کو تباہ کر دے گا۔

چھٹے یہ کہ ہم ان کے استعمال کے لیے مسلسل تیار کیے جاتے ہیں۔ پچاس برس قبل ہیگ کنونشن نے جنگ کے قوانین کی تدوین کر دی تھی، جن میں گیس یا زہر کے استعمال کی، کھلے شہروں اور شہریوں پر غواہ وہ زمین پر ہیں یا سمندر میں، فضا سے آگ بھرانے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔

دس برس کے اندر ہی پہلی عالمی جنگ میں یہ سارے اصول توڑ دیے گئے تھے۔ مگر دوسری عالمی

جنگ، پہلے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ کم زور کر دی گئی تھی۔

پہلی جنگ میں زیرِ مٹی گیس تھی۔ میں اس وقت Ypres میں تھا جب پہلی بار کلورین کے بادل فضا میں چھوڑے گئے تھے۔ گیس کی سوخت بلند اور دو میل لمبی دیوار بلند تھی؛ میں نے دیکھا کہ فرانسیسی نوآبادی کے سپاہی خوف سے اپنے ہتھیار پھینک کر بھاگ رہے تھے؛ میں نے سانس نہ لے سکنے کے باعث کناڈا کے سپاہیوں کو مرتے دیکھا، جب کہ ان کے منہ سے پیلے رنگ کا جھاگ نکل رہا تھا، ہمارے پاس بھی گیس تھی، مگر گیس چیمبر نہیں تھے، ہم جانتے ہیں کہ کبھی، بہادر دی کے باعث، وحشی قلم بھی سر لیا جاتا ہے مگر عقوبتی کیچپ کی منہم جلا دی نہیں سکی جاتی۔ ہمارے ہاں بھی جا سوئی اور فگھاری اور مزائے موت رہی ہے، مگر کبچا پوکے thumbscrew اور rack والے عقوبت خانے نہیں تھے۔

اور اب ہمیں کیا ہو رہا کہ ہم تیسری عالمی جنگ کی تیاری کر رہے ہیں؟

جب ہنگر پولینڈ میں سترہ ملین یہودیوں کو ختم کر رہا تھا، ہمارے پاس کئی ملین جرمن قیدی تھے، ہم نے ان کو قتل نہیں کیا، ہم نے کسی قسم کا بدلہ نہیں لیا۔ مگر اب حکومتیں بار بار اسرار کر رہی ہیں کہ اگر ان پر یا ان کے اتحادیوں پر حملہ کیا گیا، تو وہ فوراً ایسے ہتھیاروں سے جوابی حملے کریں گی جو گروڑوں، عربوں، عورتوں اور چھوٹے بچوں کو ختم کر دیں گے، جن پر ان کی حکومتوں کے کیے ہوئے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

جس بنیاد پر ہمارا مغربی تمدن بنا ہے، اس میں کیا اخلاق رہ گیا ہے؟

ہم اسلحہ کی دوڑ کو کیسے روک سکتے ہیں؟

میں ایک سادہ سی بات کہنا جانتا ہوں: جب تک آپ اس پر یقین نہیں رکھتے کہ جنگ، بلکہ تمام جنگیں روکی جاسکتی ہیں، ترکیبِ اسلحہ جات کی باتیں احمقانہ ہی ہوں گی۔ مغرب کی حکومتوں نے 1952 میں UN Commission میں اعلان کیا تھا: ”ترکیبِ اسلحہ جات کا مطلب اصول بنانا نہیں، جنگ کو اس طرح ناممکن بنانا ہے کہ ملکوں کے درمیان شہاداتِ مذاق کے مطابق طے ہونے لگیں۔ اس بدف کو حاصل کرنے کے لیے، تمام ریاستوں کو چاہیے کہ دنیا کو اسلحہ سے پاک بنانے کے لیے آپس میں تعاون کریں، جس میں فوجوں اور اسلحوں کو اس حد تک کم کر دیا جائے کہ۔۔۔ کوئی بھی ریاست جنگ کی شروعات کے قابل ہی نہ رہ جائے۔“

آٹھ برس قبل مغرب کی حکومتوں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کا اعلان کیا تھا، لیکن مقصد تھا، مسئلہ خروشیف نے ہیزل اسمبلی کے پچھلے ستمبر کے اجلاس میں جس کا اعلان کیا تھا۔

جب تک کہ ایک آئین جیسی مستحکم تجویز کے ذریعے اس کو بین الاقوامی پالیسی کا سب سے اعلیٰ مقصد نہیں بنا دیا جائے گا، اور فوری کارروائی نہیں کی جائے گی، میرے خیال میں ترکیبِ اسلحہ جات کے تمام مذاکرات بے کام ہو جائیں گے۔

اس طرح کے قانون بنانے کی کوششوں سے کہ ہتھیار کس طرح استعمال کیے جائیں گے، جنگیں نہیں روکا کرتیں۔ مجھے خوف ہے کہ اس قسم کی جزوی کوششوں سے جو پچھلے چار برس سے کی جا رہی ہیں ہم کچھ حاصل

نہیں کر سکتیں گے۔ اگر اور کچھ کرنا ممکن نہ ہو تو، ہر کوئی جزوی کوششوں کو قبول کر لے گا اگر وہ حقیقی ہوں اور اگر وہ اعتماد پیدا کریں۔

کچھ لوگ واقعی اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ بڑے قدموں کے مقابلے میں چھوٹے قدم اٹھانے زیادہ آسان ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نکتے کی تائید میں خام انگریزی کے ایسے محاوروں کے حوالے دیتے ہیں "انتہائی احوال نہ ہو جسے تم چاہنا سکو"۔ اسی کو اعلیٰ درجے کی فرانسیسی زبان میں "بہتر اچھے کا دشمن ہوتا ہے" کہا جاتا ہے اور وہی زبان میں "جتنا آہستہ سواری کرو گے اتنا ہی دور تک جاؤ گے"۔ میرے خیال میں روس میں یہ اس بات پر منحصر ہوگا کہ بھیڑیوں کے غول آپ پر حملہ آور ہیں یا آپ کے گھوڑے کے ٹم پر۔ دراصل، ہمارے سامنے بھیڑیوں کا غول ہے سید یہ ہتھیار۔ جو ہماری اپنا ایز کی پر حملہ آور ہے۔

میں اپنے عقیم ماہر اقتصادیات اور مفکر جان اسٹورٹ میلز (John Stuart Mills) کے الفاظ کو ترجیح دوں گا جس نے کہا تھا "بڑی برائی کے مقابلے میں چھوٹی خلاف کم کامیاب نہیں ہوتی، بالکل ہی کامیاب نہیں ہوتی۔" یہ لائد جارج نے کہا تھا "دنیا میں سب سے خطرناک بات ہوتی ہے، ایک خلا کو دو چھلانگوں میں پار کرنا۔" ہماری آج کی اسطر بند دنیا، اور مستقبل کی بغیر اسلحہ کی دنیا کے درمیان ایک بہت بڑا خلا ہے جو مستقبل قریب میں ہمارے سامنے ہوگا۔

اس جزوی کوششوں پر بات نہیں کروں گا، جن پر پچھلے برسوں میں بہت بحثیں ہو چکی ہیں؛ صرف نئے جوہری ہتھیاروں کی تیاری کو روکنا؛ اچانک حملے کے خلاف تیاری کرنا؛ مالی (بچت کی) اخلاعات کا تہاڑ کرنا؛ اور بھی کئی کوششیں ہیں، اگر یہ کسی مجموعی ترکی اسطر جات کا حصہ نہیں ہوں تو، میرے خیال میں، سب کی ناکامی لادٹی ہے۔

مجھے بہت مسرت ہے کہ فی الحال ان کو رد کر دیا گیا ہے، کہ عمل ترکی اسطر جات کے محیط منصوبے پر نئی Committee of Ten گنگو کرے گی، اور اس کو حکم دیا گیا ہے کہ کم سے کم وقت میں تفصیلی تجاویز پیش کرے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کمیٹی کو مسٹر فرڈیننڈ کی ان تجاویز پر عمل کرنا چاہیے جو چند دن قبل انھوں نے اسمبلی میں پیش کی تھیں۔ کچھ لوگ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ کمیٹی کی تجاویز کی بنیاد پر شروعات اس لیے خطرناک ہوگی کہ اس میں کریملین کی رہنمائی نظر آئے گی۔ اس پر مجھے "کرک" کے ایک اسکاتش پادری یاد آ گئے ہیں۔ ایک عرصے کی قطعہ سازی کے بعد، جب مکئی کی فصلیں مرجھا رہی تھیں، کسانوں نے پادری سے درخواست کی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ کچھ بارش کر دے۔ پادری صاحب نے ہڑبڑا کر جواب دیا، "نہیں، نہیں۔ جب تک مشرق کی ہوا چل رہی ہے، میں ایسا نہیں کر سکتا!"

کیا ہم واقعی ان تجاویز پر بات نہیں کر سکتے جو مشرق کی طرف سے آرہی ہوں؟ مگر میں سمجھتا ہوں کہ شاید اسی لمحے کامیابی کے سب سے زیادہ امکانات ہوں گے، شاید ڈاکٹر کریمین لاسٹنگ کا "سپر ہی موقع"

ایک بار پھر آگیا ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ ہمیں پہلے معلوم ہونا چاہیے کہ کیا مسٹر ٹروٹیف واقعی سنجیدہ ہیں؟ میں شبہ کرنے والوں کے سوال کا تین طرح سے جواب دے سکتا ہوں۔ پہلا تو یہ ہے کہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ مسٹر ٹروٹیف سنجیدہ ہیں یا نہیں، اور یہ اس وقت تک معلوم نہیں ہوگا جب تک کہ ہم بلا کسی تاخیر کے سنجیدہ مذاکرات شروع نہیں کریں گے۔ دوسرے یہ کہ اگر ہم گفت و شنید کریں گے تو یقینی طور پر ہمیں ایک ہفتے کے اندر ہی معلوم ہو جائیگا کہ وہ سنجیدہ ہیں یا نہیں۔ تیسرے یہ کہ اگر ہم اسمبلی کے فرمان کے مطابق معین کردہ بنیاد پر فوراً مذاکرات شروع نہیں کر دیتے تو وہ کہہ سکتے ہیں، اور سب اس پر یقین کر لیں گے کہ ہم لوگ خود ہی سنجیدہ نہیں۔

”عمومی اور مکمل ترکِ اسلحہ جات“ مسٹر ٹروٹیف ہی کے الفاظ ہیں، ان ہی نے تجویز پیش کی ہے کہ چار برس کے اندر تمام اسلحے اور تمام فوجیں ختم کر دی جائیں، سوائے ان قوموں کے جو اپنی ریل سٹوں میں امن کے قیام کے لیے جگے اسلحے پر دارِ رضا کا رافواج پر انحصار کرتی ہیں۔ انھوں نے عمومی اور مکمل معاہدے اور کنٹرول کی تجویز بھی پیش کی ہے، جس میں کسی قسم کی حدود یا تحفظات نہ رکھے جائیں۔ دوسرے لفظوں میں، انھوں نے ایک قطعی ہدف اور ایک نظامِ الاوقات کی تجویز بھی پیش کی ہے جس کے تحت اس کو حاصل کیا جائے۔

ان کا مقصد، اور میں اس کو دوبارہ کہنا چاہتا ہوں، صرف وہی ہے، مغرب کی حکومتوں نے 1852 میں جس کا اعلان کیا تھا، اور اگر میں اسمبلی میں ہونے والی تقریروں کو غلط نہیں سمجھا ہوں تو، ایسا کوئی بھی نہیں ہے جو اب اس کو فیصلہ کن سمجھنے سے انکار کر رہا ہے۔

تو کیا یہ نظامِ الاوقات زیادہ خواہش مندی ہے؟ یقیناً گریز کن تاخیر میں خطرات ہیں، مگر اتنی وسیع اور انقلابی تہدیلی کے لیے چار برس بہت کم ہیں، تمام تکنیک نئی کے باوجود اس میں چھوڑ آئیں، یا تو اس بھی لگ سکتے ہیں۔ امید ہے کہ مسٹر ٹروٹیف اس میں چپک دکھائیں گے، بشرطے کہ صحیح معنوں میں ترکِ اسلحہ جات کی کوشش کی جا رہی ہو۔

بہر حال، مجھے امید ہے کہ نئی Committee of Ten کو یاد ہوگا کہ چند برس قبل ایک امریکی مندوب نے کیا کہا تھا، جتنی دیر تک آپ ترکِ اسلحہ جات کو جاری رکھتے ہیں، یہ اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے، تکنیکی مسائل آسان ہو جاتے ہیں، اور معاہدہ یقینی طور پر کامیاب ہوگا۔

مگر ضروری ہے کہ پہلے ایک معاہدہ ہو، جس کے ذریعے ابتدائی تحفظ ہوگا۔

ہم نے اپنے British United Nations Association کے بیان میں کہا تھا کہ عقل مندی ہوگی کہ پہلے اولین مرحلے کا معاہدہ ہو جائے، زمینی، بحری اور ہوائی فوج سب کی نفری میں کمی کی جائے۔ ایک یا دو ملین افراد روس، چین اور امریکا کے اور دوسری قوموں کے لیے کم نفری، اسی کے مطابق روایتی اسلحوں میں کمی، بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے موجودہ ہتھیاروں کا معینہ طریقوں سے تلف کیا جانا، بجٹ میں

حد بندی اور کمی، اس کے علاوہ مناسب معائنے اور کنٹرول کا نفاذ۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پہلے مرحلے کے بیاق کی کم از کم اصول کی حد تک، اس بات کو واضح کر دینا چاہیے کہ دوسرے اور تیسرے مرحلوں پر مزید کمی کرنی ہوگی، کہ اگر قطعی مقاصد صاف طور پر ہر شخص کے ذہن نشین کرا دیے گئے تو پوری گفت و شنید کتنی زیادہ آسان ہو جائے گی۔

تو یہ پروگرام عملی طور پر کیسا ہوگا؟ کیا بہت سارے غیر حل شدہ مسائل کا سامنا بھی ہوگا؟ ظاہر ہے کہ عام ترکیب اسلحہ جات کا بیاق طویل اور پیچیدہ دستاویز پر مبنی ہوگا۔ مگر وسعت نظری سے دیکھا جائے تو (سپانوی ادیب اور سفارت کار) Salvador de Madariaga کے الفاظ (جو 1928 میں ادا کیے گئے تھے) آج بھی اسے ہی سچ ہیں۔ ”بھٹکنی مشکلات سیاسی اعتراضات کی وردی پہنے ہوئی ہیں۔“

اور دراصل زمینی، بحری اور ہوائی فوج میں کمی، روایتی ہتھیاروں کی منسوخی یا کمی، عسکری مالیات میں کمی یا حد بندی کے تقریباً تمام ممکنہ مسائل برسوں پہلے حل کر لیے گئے تھے۔ لندن اور واشنگٹن کے بحری بیاق، 1932 کی ترکیب اسلحہ جات کانفرنس کی اصلاحات، 1933 مارچ کی امراتھونی ایڈن کانفرنس بمائے ترکیب اسلحہ جات کا مسودہ وغیرہ بیاق کے دفعات کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں، Gammea of Ten جن سے ابتدا کر سکتی ہے۔

مگر ایک نئی مشکل پیش آسکتی ہے، وہ ہے جوہری ہتھیاروں کا خفیہ انبار۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ جوہری طاقتیں اپنے تمام جوہری اور ہائیڈروجن بم ختم کر دینے پر ماضی ہو بھی جاتی ہیں، تو یہ کس طرح یقین کیا جائے گا کہ کوئی مافرمان حکومت، دنیا کو بلیک میل کرنے کی غرض سے، اپنے موجودہ انبار کا دس یا بیس فی صد حصہ سیسے سے بنے ہوئے خفیہ مقامات پر چھپا کر رکھ نہیں لے گی، کوئی جسے پا بھی نہ سکے گا؟

”اب یہ ایک حقیقت ہے“ مرنوسٹن چرچل نے دارالعوام میں کہا تھا ”کہ پلوٹونیم کی اتنی مقدار جو شاید اس میز پر موجود کسی کو بھی بھرنہ سکے ایسے ہتھیار تیار کر سکے گی جو اگر اکیلے کسی بڑی ریاست کے ہاتھ آجائے تو وہ دنیا پر غلبہ پا سکتی ہے۔“

حال یہ برسوں کے تعطل کی یہی سب بڑی وجہ رہی ہے۔ کچھ حکومتوں نے دلائل پیش کیے ہیں کہ جوہری طاقتوں کے تحفظ کی ضمانت اسی میں ہے کہ ان کے ہتھیاروں کے انبار کے ایک بڑے حصے کو کسی متوقع حملے کے خلاف مانع کے طور پر محفوظ رکھا جائے، کہ مکمل تہذیب اسی وقت محفوظ رکھ سکے گی جب تک کہ [Geiger Counter Geiger] کا ایجاد کیا ہوا ایک اوزار جس کی مدد سے خفیہ تابکار مادوں کا پتا چلایا جاسکتا ہے [جیسا کوئی معجزاتی اوزار یا طریقہ ایجاد نہ ہو جائے جو کانگریٹ کے پیچھے چھپائی ہوئی ہلکی سے ہلکی تابکاری کا پتا لگا سکے۔

لیکن ہم اگر نئے Geiger Counter کا انتظار کرنے لگے تو، جیسا کہ [امریکی صدر کے مشیر] مسٹر اسٹاسن (Stassen) نے 1957 میں کہا تھا، ہمیں بیسیوں برس لگ جائیں گے، یا شاید ہمیشہ ہی اس کا انتظار

کرنا پڑے گا۔ تو پھر، اس عرصے میں کیا ہوگا جب ہم انتظار کی کیفیت میں ہوں گے؟
کیا فرانس جوہری ہتھیار بنانا بند کر دے گا؟ اور کیا اتنی وسیع طاقت رکھنے والا چین بھی.....؟ فرانس اور
چین، اور ان کے بعد یقیناً جاپان، ہندوستان، پاکستان، جرمنی، اٹالیہ اور دوسرے ملک بھی جوہری کلب کے
رکن بن جائیں گے۔ اس وقت ہی ایسے تقریباً ایک درجن ممالک ہیں، جو ایک عشرے کے اندر اندر ضروری
مادے اور ہتھیار کر سکتے ہیں۔ لہذا، محض Geiger Counter کے انتظار کا مطلب ہے سب کے لیے
خوف ناک خطرہ۔ اس کے علاوہ ہم اور کبھی کیا سکتے ہیں؟

ضرور کر سکتے ہیں۔ ہم بم لے جانے والی صلاحیتوں کو ختم کر سکتے ہیں، یعنی ٹھنڈی ہوائی جہازوں اور
میزائلوں کو جن کے ذریعے جوہری بم استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ یہ خاصاً آسان کام ہوگا: مسٹر خروشیف
نے اسی کی تجویز پیش کی ہے؛ کنٹرول کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اقوام متحدہ کے انسپکٹروں سے چھپا کر ہتھیار
جہازوں اور میزائلوں کی تیاری اور تجربات نہیں کیے جاسکیں گے، نہ ہی فوجوں کو ان کے استعمال کی تربیت
دی جاسکے گی ہے۔

دوسری بات یہ ہے، میری اطلاع کے مطابق اصولی طور پر اتفاق ہو چکا ہے کہ ہم زمینی، بحری اور فضائی
افواج ختم کر سکتے ہیں، جن کے بغیر کوئی حکومت کسی پر حملہ آور نہیں ہو سکے گی۔

تیسری بات، ہم ہر قسم کے طریقوں پر عام اور مکمل کنٹرول قائم نہیں کر سکتے جس میں ایسے جوہری پلانٹ
بھی شامل ہوں جو جنگ کی تیاریوں میں کام آسکتے ہیں؛ میں نے مسٹر خروشیف اور ان کے ساتھیوں سے اس
موضوع پر تفصیل سے باتیں کی تھیں، اور مجھے یقین ہے کہ حتمی ترک اسلحہ جات پر وہ متفق ہو جائیں گے۔

Geiger Counter سے کہیں زیادہ یہ تین قاعدے ہی حتمی تحفظ ہو سکتے ہیں، یہ جوہری ہتھیاروں
کے انبار کو خفیہ رکھنے کی تمام تر فیہات کو ختم کر دیں گے۔ ہتھیاروں کی دوڑ کو جاری رکھنے کے مقابلے میں ایسے
نظام کو قبول کر لینے میں خطرات کم ہی ہوں گے۔

ترک اسلحہ جات خود کوئی پالیسی نہیں؛ یہ اقوام متحدہ کی عام پالیسی کا ایک حصہ ہے اس کے بغیر اقوام
متحدہ کے ادارے اس طرح کام نہیں کر سکتے جیسا کہ انھیں کرنا چاہیے۔

ہم قوم کے لیے یہی سب سے زیادہ محفوظ اور قابل عمل دفاع کا نظام ہے۔ ماضی کے بارے میں
کھست پسندی بہت بڑی غلطی ہوتی ہے؛ 1932 میں منعقد ہونے والی ترک اسلحہ کانفرنس کی ناکامی مگر بڑا
نہیں تھی؛ صاف نظر آتا ہے کہ ناکامی کی وجہ انسانی غلطیاں تھیں۔

عروضی جہتیں نے دوسری عالمی جنگ کے بارے کہا تھا کہ یہ "تاریخ کی سب سے غیر ضروری جنگ
تھی۔" (ماضی کے بارے میں کھست پسندی بہت بڑی غلطی ہوتی ہے) مستقبل کے بارے میں کھست
پسندی قیہم ہے۔ کچھ زیادہ کرنے میں اتنے خطرات نہیں ہوتے جتنے کہ بہت کم کرنے میں ہوتے ہیں۔ اسی
مقام سے 1926 میں نیلسن نے کہا تھا، "ضروری ہے کہ زندگی کے بڑے معاملوں میں پسپائی کے لیے راستہ

نہ چھوڑا جائے۔۔۔ ہمیں پیچھے چھوڑے ہوئے وہ تمام کچل تباہ کر دینے چاہئیں جو ہمیں پرانی پالیسی اور پرانے نظام کی طرف لے جائیں، اس لیے کہ دونوں ہی لہارت فضا میں کامیاب ہیں۔“

اس عہد میں جب اہم توڑا جا چکا ہے، چاند کے گرد چکر لگایا گیا ہے، بیاریوں پر قابو پالیا گیا ہے، کیا ترکیب طرہ جات اتنا مشکل معاملہ ہے کہ اسے دور کا مہانا خواب ہی رہنا چاہیے؟ اس کا جواب ”ہاں“ میں دینے کا مطلب ہی نوع انسان کے مستقبل سے مایوس ہونا ہے۔

کہتے ہیں، ”سیاست ممکنات کا فن ہوتی ہے۔“ اس نوعیت کا بوسیدہ اور فرسودہ فقرہ شکست خوردہ پسپائی کا بہانہ فراہم کرتا ہے، قہر اس کے کہ مسئلے کی حقیقی مشکلات کا سامنا کیا جائے؟ (جمہوریت ایسی اصلاحات کی عوامی تائید کو منظم کرنے کا فن ہوتی ہے جو تکنیکی طور پر ممکن ہوتے ہیں، اور جن کو عوام چاہتے ہیں۔ ترکیب طرہ جات تکنیکی طور پر قومی دفاع کے دوسرے طریقے کے مقابلے میں کتنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ کون اس میں شک کرے گا کہ عوام یہی چاہتے ہیں؟) نیلسن پرہلا شخص تھا، جس نے یہ جملہ کہا تھا جسے دوسروں نے دہرایا ہے کہ ”مشکل وہ کام ہوتا ہے جسے کے لیے کم وقت درکار ہو جب کہ ناممکن کام وہ ہوتا ہے جس کے لیے ذرا زیادہ وقت درکار ہو۔“ اگر سیاست ممکنات کا فن ہوتی ہے، تو نیلسن کے نزدیک تدبیر ناممکنات کا فن ہوتا ہے؛ اور یہ تدبیر ہی ہے، آج ہماری حیران اور زخمی انسانیت کو جس کی ضرورت ہے۔

نکمر اس اعلیٰ درجے کے تدبیر کے ساتھ ہمارے سامنے ایک عظیم سفر ہو سکتا ہے، خطرات، بلکہ طوفان سے بچنا اگر ہمیں بالآخر اپنی منزل تک پہنچنا ہے تو ہمیں Fram جیسے جہاز کی ضرورت ہوگی۔



جارج پیرے اعلان تجلیل

ماربوئی پارلیمان کی نوبیل کمیٹی نے ڈومینیکس ری پبلک کے بلیم نژاد باشندے فادر جارج پیرے کو اس برس کا نوبیل انعام پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے، ان کی کوششوں کی بنا پر جو انہوں نے مہاجرین کو اپنے کیمپ چھوڑنے اور آزادی اور وقار کی زندگی کی طرف واپس لوٹنے کے لیے کی تھی۔

مغرب کے ہم سب لوگ فادر پیرے کے کام سے واقف ہیں۔ ہم نے اس انسان کے بارے میں اخبارات میں پڑھا ہے، جس نے اپنے ذاتی اقدام پر معذور مہاجرین کو بچانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ یہ بہتر اور روشن مستقبل کی امیدوں سے خالی، بوڑھے اور معذور لوگ ہیں جو کیمپوں میں پڑے تھے، اس لیے کہ اس سنگ دل اور ظالم دنیا کو، جس کے نزدیک علاحیت اور کارکردگی ہی سب کچھ ہوتی ہے، ان کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

صرف سات ہفتے قبل ہم نے فادر پیرے کو اوسلو میں مہاجرین کے لیے اپنے کام کے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا۔ یونیورسٹی کے بڑے ہال میں کی گئی تقریر اخباروں میں شائع ہوئی تھی، اس طرح ماروے والے ان کے عملی کام کے شمار ہوئے، جو انہوں نے مشکلوں کے باوجود شروع کیا ہے۔ فادر پیرے نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کا مقصد محض ان افراد کی مادی ضروریات کو پورا کرنا ہی نہیں تھا، بلکہ ان بد قسمت لوگوں میں سے ہر ایک کی مرجھائی ہوئی خود اعتمادی کو بحال بھی کرنا تھا جو برسوں سے مہاجرین کے کیمپوں میں اپنے دن گزار رہے تھے۔

جیسا کہ ہر ایک کو معلوم ہونا چاہیے، آج مہاجرین کا جو اتنا بڑا مسئلہ ہمارے سامنے ہے، یہ دو عالمی جنگوں کا پیدا کردہ ہے۔ اور یہ بیسویں صدی کے مانتھے کے سیاہ ترین دامنوں میں سے ایک دامن ہے۔ مگر مہاجرین کے لیے بہت کچھ کیا بھی جا چکا ہے۔

1945 میں جب جنگ ختم ہوئی تو United Nations Relief and Rehabilitation Administration کو بے گھر لوگوں کی نگہداشت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ بعد میں International Refugee Organization نے یہ ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ اب یہ دونوں ادارے ختم کر دیے گئے ہیں اور ان کے فرائض United Nations High Commissioner for Refugees کی فرائض میں ضم کر دیے گئے ہیں۔ جن کی کامیابیاں اہم ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔ اسی کے اعتراف میں 1954 کا نوٹیل امن انعام 1955 میں اس ادارے کو دیا گیا تھا۔

اس موقع پر میں نے اپنی تقریر میں مہاجرین کے لیے قانونی حیثیت کے حصول کے لیے کیے جانے والے کام کا تذکرہ کیا تھا، جس کے ذریعے، جن ملکوں میں انھیں بسایا گیا ہے وہیں ان کو ملازمت حاصل کرنے میں مدد فراہم کی جاسکے، یا جیسا کہ ہائی کمشنر ڈاکٹر فان ہوویں گوڈہارت (Dr. van Heuven Goedhart) نے اس وقت کہا تھا کہ مہاجر کو معاشی، قانونی اور سماجی بنیاد فراہم کی جائے جو انھیں، خود اپنی کوششوں سے، نئی زندگی بنانے میں مدد دے، مگر دس برس بعد بھی، 1955 تک یورپ میں 300,000 مہاجرین تھے جن میں سے 70,000 کیپ ہی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہائی کمشنر نے اسی وقت مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کام میں لگائے جانے والے بے شمار ارٹھوں نے ان کی جان نسیب میں ڈال دی تھی۔ سب سے مشکل مہاجرین کے قبول کرنے میں کی جانے والی ہچکچاہٹ تھی، جنھیں مایہ ناز غیر ملکی گردانا جاتا تھا۔

اس کے بعد سے ان لوگوں کی آمرانی کے لیے بہت کچھ کیا جا چکا ہے، جس میں کئی نئی مہاجر اداروں نے بہت کام کیے ہیں، جو مغربی دنیا میں قائم تھے۔ مگر ان کا سب سے مشکل مسئلہ اب بھی باقی ہے کہ ان سب کو صرف اسی مدد سے بچایا جائے جو ایک انسان دوسرے انسان کو فراہم کر سکتا ہے، ذاتی تعلقات کی استواری کے ذریعے، جو ایک مہاجر میں اعتماد بحال کرے کہ وہ ایک بار پھر لوگوں کے درمیان انسان بن کر رہ سکتا ہے۔

یہی وہ کام تھا قادر پیرے نے جس کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا، اور یہی ان کا سب سے بڑا کام ہے۔

قادر پیرے نے خود ہمیں بتایا کہ 27 فروری 1949 کا دن تھا، جب وہ ایتالیس برس کے تھے کہ اچانک اور ایک آن جانے جھٹکے سے وہ مہاجرین کے مسئلے کی طرف راغب ہو گئے۔ اس سے قبل وہ ایک ڈیمینکس مبلغ کی حیثیت میں لوگوں کے دکھ درد میں شریک رہا کرتے تھے۔ بالخصوص بچوں کے۔ مگر UNRRA کے ایک افسر کی گفتگو کے دوران مہاجرین کی مایہ ناز حالت سن کر وہ چونک پڑے تھے اور انھوں نے خود سے سوال کیا شروع کر دیا تھا کہ وہ ان در بدر لوگوں کی بھلائی کے لیے کیا کام کر سکتے ہیں جو کیمپوں میں محصور تھے جس میں اکثریت سن رسیدہ اور معذور افراد کی تھی، جن کے لیے، بظاہر صرف اپنی

کوششوں سے، اپنے لیے ایک نئی زندگی بنانے کی کوئی امید نہیں رہ گئی تھی۔

صاف ظاہر تھا کہ اس درجے کے مہاجرین کے لیے مؤثر امداد بہت مشکل ہوگی، اس لیے کہ امداد کو ہر طرح سے قرض سمجھنا ناممکن ہوتا ہے، جیسا کہ خاص کر نوجوانوں کی مدد کے لیے کیا جاتا ہے، جو کام کے لیے تربیت یافتہ بھی ہوں اور معذروں بھی۔ عمر رسیدہ لوگوں کے لیے، کم از کم ابتدا میں، لوگوں سے مکمل طور پر درد مندی اور محبت کی بنیاد پر بے غرض امداد کی توقع کی جانی چاہیے۔

فادر پیرے نے ابتدا میں کفالت کی اسکیم کی کوشش کی، یعنی انہوں نے کیمپ میں منظم مہاجرین کو نجی اور کفیلی افراد سے متعارف کرایا، جو انہیں خط لکھنے، پارسل یا رقم بھیجنے پر تیار تھے۔ آج میں ملکوں کے 15,000 کفیلی 15,000 مہاجرین سے براہ راست رابطے میں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، مہاجرین کو کیمپ سے باہر کے لوگوں سے متعارف کرایا گیا ہے، جو ان کے بارے میں ایک خاص قسم کے جذبات رکھتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ ان کے لیے وہ پارسل اور خطوط کتنی خوشیاں لاتے ہوں گے اس طرح، ان کے پاس امداد کے لیے لوگوں کی رضا مندی کے قابل مشاہدہ ثبوت موجود ہیں۔

مگر اور یہ ایک بہت بڑا ٹکڑا ہے کہ وہ اب بھی کیمپوں ہی میں رہ رہے ہیں۔ مہاجرین سے ملاقات کے ذریعے فادر پیرے کو معلوم ہوا ہے کہ اس [کیمپ میں رہنے] کے کیا معنی ہوتے ہیں۔

لہذا 1950 میں انہوں نے مہاجرین کو کیمپ چھوڑنے میں مدد کرنے کا کام کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں، سب سے پہلا مرحلہ تھا عمر رسیدہ افراد کا۔ چار برس کے اندر وہ بلجیم میں عمر رسیدہ افراد کے لیے چار گھر بنانے میں کامیاب ہو گئے جہاں، فادر پیرے کے اپنے الفاظ میں، وہ لوگ پرسکون ماحول میں اپنی ترک شدہ مرزبین کے خواب دیکھنے لگے۔ تھیں ان گھروں میں انہیں زندگی کی آخری سانس تک پناہ، کپڑے، کھانا، دوائیں مہیا کی جاتی رہیں گی۔

تو یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ فادر پیرے کا انسانی نیکی، اور اپنے ہم نسل لوگوں کے لیے جذبہ رحم کا اظہار صحیح بنیادوں پر رکھا گیا تھا، اس لیے کہ عمر رسیدہ لوگوں کے لیے قائم کیے گئے یہ گھر رضا کارانہ امداد اور افراد کے نجی مالی عطیات کا نتیجہ تھے۔ مگر اس کے عقب میں جاری پیرے کی شخصیت ایسا وہ نظر آتی ہے، جو ضرورت مند لوگوں کی امداد کے لیے لوگوں کو جگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

یہ تھی ابتدا ان کے کام کی، مگر ہم میں سے بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ فادر پیرے نے اپنی کوششوں اور دوسروں کی امداد کے ذریعے اپنے کام کو کس طرح وسعت دی کہ وہ [مہاجرین کے لیے] پچھلے تین برسوں میں پانچ عدد یورپی گاؤں بنانے میں کامیاب ہو گئے، پہلا [جرمنی کے شہر] Aachen میں، دوسرا آسٹریا کے علاقے Bregenz میں، اور تیسرا Augsburg میں۔ چوتھا، جو براہ راست کے نزدیک ہے اور Fridtjof Nansen کے نام کیا گیا ہے، اور اس برس 21 ستمبر کو Saar کے علاقے میں ایک اور گھر کی بنیاد رکھی گئی ہے، جو البرٹ شوامبرگر کے نام کیا گیا ہے۔

فادر پیرے نے 1950 میں Aid to Displaced Persons کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہ بلجیم کا ادارہ تھا اور اس کا صدر مقام جارج پیرے کے اپنے Huy نامی گاؤں میں تھا۔ یہ سوسائٹی 1957 میں ایک بین الاقوامی ادارہ بن گئی اور جب فادر پیرے نے یورپی گاؤں کی اسکیم شروع کی تو اس ادارے نے اپنی سرگرمیوں کو بڑے پیمانے پر وسیع کر دیا۔

”سوسائٹی کے مقاصد میں بے وطن مہاجرین کو، اس سے قطع نظر کہ ان کی قومیت کیا ہے، ان کا مذہب کیا ہے، بالخصوص کثالت کے ذریعے، نرسنگ ہسپتال کے اور یورپی دیہات کے ذریعے، سرنومیت کی ماڈی اور اخلاقی امداد پہنچانا تھا جن کا اپنا کوئی ملک نہیں، اور ان کے اطراف Europe of the Heart کی صورت میں طاقت کا ایک حصار تیار کرنا تھا۔“

سوسائٹی کو سات ارکان پر مشتمل ایک انتظامی کاؤنسل چلاتی ہے، جس میں اس وقت بلجیم سے دو، جرمنی سے ایک، آسٹریا سے ایک، فرانس سے ایک، سویٹزرلینڈ سے ایک اور کسمبرگ سے ایک فرد شامل ہے۔ سوسائٹی کے صدر اور کاؤنسل کے چیئرمین جارج پیرے خود ہیں۔ اس وقت اس ادارے کی شاخیں بلجیم، آسٹریا، جرمنی، فرانس، کسمبرگ اور سویٹزرلینڈ میں قائم ہیں، جب کہ اس کے قومی دفاتر ڈنمارک اور اطالیہ میں کام کر رہے ہیں۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، عمر رسیدہ لوگوں کے لیے فادر پیرے کے قائم کیے ہوئے پناہ گھر رضاکاری اور نجی افراد کے چندوں کی بنیاد پر چلتے ہیں۔ دراصل، جب یہ پناہ گھر بنائے جا رہے تھے، فادر پیرے کو بلجیم کی حکومت کو ایک عہد نامہ دینا پڑا تھا کہ وہ ہرکاری ذرائع سے امداد کے طالب نہیں ہوں گے۔ یہی شرط ان کے بعد کے کام پر بھی رکھی گئی تھی، لہٰذا طور پر جسے نجی ذرائع سے مالی امداد فراہم ہوتی رہی ہے۔ تو کیا یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے کہ فادر پیرے اپنے وقت کا بیش تر حصہ اپنے منصوبوں کے لیے مالی امداد اکٹھا کرنے میں صرف کرتے ہیں؟ چوں کہ، فادر پیرے کسی سے بھیک نہیں مانگتے، ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ نقد وصول ہونے والی امداد کا بڑا حصہ چھوٹی چھوٹی رقموں میں ان لوگوں سے ملتا ہے جن کی آمدنی اوسط درجے کی ہوتی ہے۔

بلجیم میں سوسائٹی کی بین الاقوامی قلب ماہیت سے ذرا پہلے، فادر پیرے اور ان کے قریب ترین شریک کار خزانے مل کر ایک اور سوسائٹی بنائی تھی، دنیا کے کسی حصے میں کسی بھی قسم کی مشکل میں امداد فراہم کرنا جس کا مرکزی مقصد تھا۔ اس ادارے کا نام Europe of the Heart in the service of the World رکھا گیا تھا، جس میں تمام ملکوں کو متحدہ مذہب، زبان یا تہذیب سے قطع نظر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس طرح اس ادارے کی کارگزاریاں یورپ کے مہاجرین سے پرے بھی پھیل گئی تھیں، اس لیے کہ اب فادر پیرے پورے مغربی یورپ کے لوگوں سے انسانی بھائی چارے کے نام پر جتیر دنیا کے باسیوں کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی اپیل کر رہے تھے۔

میں نے فادر پیرے کے کام کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے: ان کی کفالتی اسکیم کی عمر رسیدہ لوگوں کے لیے پناہ گھروں کی، اور ان کے یورپی گاؤں کی۔ میں نے Europe of the Heart in the Service of the World کی تشکیل کے مقاصد بیان کیے ہیں۔ اگر ان کے کام کا احاطہ محض بجائے جانے والے مہاجرین کے شمار سے لگایا جائے تو کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کوئی بڑا کام نہیں تھا۔ مگر جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، صرف شماریات پر انحصار کرنا خطرناک ہوگا۔ فادر پیرے کا دلی جذبہ کہیں زیادہ عظیم ہے، جس نے ان کے مشن کو محرک کیا ہے اور آدمیوں کے دلوں میں اس کے جچ بولے ہیں، اس لیے کہ وہ ہمیں اچھے نتائج کی امید دلاتے ہیں: ضرورت مند بے اور انسان کے لیے انسان کا بے غرض کام۔

اٹھارہ برس کی عمر میں فادر پیرے بلجیم میں ڈومینیکن خانقاہ La Sane میں داخل ہوئے۔ ان کی تربیت کا پروگرام، ایک برس ابتدائی نوآموزی، تین برس فلسفے کی تعلیم، اور چار برس دینیات کی تعلیم پر مشتمل تھا۔ سماجی کاموں میں ان کی دلچسپی نے انھیں سماجیات کی تعلیم کی طرف راغب کیا، اور 1936 میں فیلاڈلفیا کی ڈگری لینے کے بعد انھوں نے Louvain یونیورسٹی میں فلسفہ اخلاق اور سماجیات کی تعلیم حاصل کی۔ اس طرح فادر پیرے نے بھی بہت سے ڈومینیکن لوگوں کے چلے ہوئے راستے پر قدم رکھا۔ Dominican Order کے ایک رکن کے مطابق، اس آرڈر کا کردار ہمیشہ سے دانش ورانہ رہا ہے، جس کا امتیازی طرز حصول علمیت ہے، خاص کر فلسفے میں اور دینیات میں۔ اسی وجہ سے اس آرڈر کا یونیورسٹی کی زندگی سے قریبی رابطہ رہا ہے۔

وہاں کی تعلیم، مطالعہ، اور یونیورسٹی کی زندگی نے فادر پیرے پر بہت اثر کیا تھا۔ یونیورسٹی کی زندگی انسان کو وسیع انٹلکچرل دیتی ہے اور اس پر کفر مذہبی عقیدے کا اثر کم ہو جاتا۔ مگر نظریہ علمیت اکثر بد مزہ ہو جاتا ہے اور انسان کو دنیا کی حقیقتوں سے دور ایک ماحول میں جھکاتا ہے۔

اس کے باوجود فادر پیرے دانش ور کی کے خول میں بند نہیں ہوئے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کی زندگی نے انسانوں کی جانب ان کے رویے میں کفر مذہبیت کی تنگی پیدا نہیں کر دی تھی۔ مگر اس کے باوجود، قیامان کی تعلیم سے منسلک کوئی زیادہ عمیق بات تھی، جس نے فادر پیرے کو اپنے کام کے لیے اُکھایا تھا۔ تو کیا ان کا کام انسانوں سے ان کی محبت کے عملی اظہار کا عین جذبہ نہیں ہو سکتا؟

اوسلو ہی میں اپنی ایک تقریر میں فادر پیرے نے کہا تھا کہ ہر فرد بشر کی لائقیت قدر و قیمت ہوتی ہے، کہ اس روئے زمین پر محبت ہمارا سب سے بڑا اثاثہ ہے اور ہم ہر انسان سے اپنے رشتوں پر عمل کر کے رشتے کو ایک ٹھوس پیکر عطا کر سکتے ہیں۔ اس کو وہ اس طرح دیکھتے ہیں: پڑوسی سے محبت کے ذریعے ایک انسان تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ مہاجرین کی کفالت، عمر رسیدہ لوگوں کے لیے گھروں اور دیہات کے ذریعے امداد کرنے کے طریقے کے ذریعے ہی انھوں نے یہی کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

شاید ایسے بھی کچھ لوگ ہو سکتے ہیں جو دیہات بنانے کے ذریعے مہاجرین کی امداد کے طریقے کو مشکل

پاتے ہوں۔ میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ مہاجرین کو سنے بنائے گئے دیہات میں جمع کرنا ان کو سماج سے کاٹ دینے کے مترادف ہے، اس لیے کہ ان کے بچوں کی نشوونما کی خاطر ضروری ہے کہ وہ سماج کا حصہ ہوں۔ یہ کسی حد تک صحیح ہو سکتا ہے، مگر پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مہاجرین، جن کو فادر پیرس نے نجات دینا چاہتے تھے، نوجوان اور تندرست نہیں ہوتے۔ ان کے مہاجر دوستوں کی جوتہا اور الگ تھلگ ہوتے ہیں، اچانک ایک غیر ملکی ماحول میں پھینکا نہیں جاسکتا کہ وہ خود اپنا راستہ بنائیں۔ فادر پیرس نے اوسلو میں اپنے مہاجرین کے بارے میں کہا ہے، ”یہ لوگ بارہ چودہ برس سے اپنے ہمالیہ کے دھیر پر بیٹھے اُس ریل گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں جو کبھی آنے والی نہیں۔“ دراصل، یہ ہیں وہ لوگ، فادر پیرس نے جن کے لیے دیہات بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں تاکہ دھیرے دھیرے ان کو سنے سماج میں اس طرح شامل کیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو ان میں نا انصافیوں اور بدخواہی سے محفوظ سمجھیں جو اکثر غیر ملکیوں کے ساتھ روا رکھی جاتی ہیں۔

فادر پیرس نے اپنے دو دیہات کو Fridtjof Nansen اور البرٹ نینسن کے نام کیا ہے۔ فادر اکثر نینسن کے بارے میں کہتے رہتے ہیں کہ وہ کسی مخصوص کلیسا کا رکن نہیں تھا مگر مہاجرین کے لیے، جنگی قیدیوں کے لیے، روس کے قحط کے مارے لوگوں کے لیے اس نے ہمیشہ برادرا نہ محبت کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

البرٹ شوائنزر نے بھی اپنی پوری زندگی ان ہی اصولوں کے تحت بسر کی تھی، اور اس نے اپنے ہر کام میں ان ہی اصولوں پر عمل کیا تھا، اگرچہ وہ کسی قسم کے عقائد پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ فادر پیرس کی نظر میں، اُن سب کا عمل نیک ہوتا ہے جو مذہب، رنگ یا قومیت سے قطع نظر برادرا نہ محبت کے جذبے کے ساتھ اس ڈکھ بھری دنیا میں کام کر رہے ہوتے ہیں۔

فادر پیرس نے جنگ کے زخموں کو مندرجہ ذیل کرنے کی خاطر مہاجرین کے لیے کام شروع کیا تھا۔ مگر اب وہ اس سے آگے، بہت آگے تک دیکھ رہے ہیں، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے کہ ہمارا مقصد ”نوآبادیات، نوآبادیات کے خلاف اور نسلی فسادات کی خلیج پر روشنی اور محبت کا ایک اوجھا پل تعمیر کرنا“ ہے۔ دراصل ہمیں اس سے زیادہ کرنا چاہیے، اپنے عمل کے ذریعے ہمیں انسانوں، قوموں اور نسلوں کے درمیان انجیل کے تعلیم کیے ہوئے برادرا نہ مسلک کا پرچار کرنا چاہیے۔ انٹریڈ نوٹیل نے اسی تصور کا اظہار کیا تھا، جب اس نے اپنی وصیت کے ذریعے حکم دیا تھا کہ امن کا انعام اس کو دیا جانا چاہیے جس نے قوموں کے درمیان برادرا نہ مقاصد کے حصول کے لیے سب سے زیادہ یا سب سے اچھا کام کیا ہو۔

اسی وجہ سے آج نارویائی پارلیمان کی نوٹیل کمیٹی فادر جارج پیرس کو امن کا نوٹیل انعام پیش کرنے میں بے پایاں مسرت و افتخار محسوس کر رہی ہے۔

صدر نشین نارویائی نوٹیل کمیٹی Gunnar Jahn کی زیانی

خطبہ

امن کی بنیاد: برادرانہ جذبہ محبت

”لوگ بہت ساری دیواریں تو بنا دیتے ہیں مگر کافی ٹیل نہیں بناتے۔“ (نیوٹن)

میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ ایک باقاعدہ خطاب نہیں، بلکہ ایک پیغام ہے، دل سے لگا ہوا پیغام، جو اسی شہر میں 21 اکتوبر 1958 میں کیے جانے والے بیان کا تسلسل ہے۔ اس دن میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ ”اس شام میرے دل کی خواہش ہے کہ آپ کے دلوں سے ربط قائم کرے۔“ پھر دسویں اور پندرہویں نومبر کو ماروے کے قلب سے، کلاسیکی روحان کی طرح، آسمانی بجلی کی صورت، ایک جواب آیا تھا۔ 10 نومبر کو تین بج کر پندرہ منٹ پر ماروے کی پاریمان کی نوٹیل کمیٹی کے صدر نشین کی جانب سے ایک تار موصول ہوا۔ نومبر کی 15 کو جلالہ ماب شاہ Olave کا خط ملا جنہوں نے لکھا تھا:

”میرے عزیز قادر پیرے!

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے ماروے میں اپنے قیام کے بعد اس ملک سے محبت کا اظہار کیا تھا، اور اس سے بھی زیادہ مسرت اس بات پر ہے کہ بے گھر افراد کے لیے آپ کے غصہ کیا خزانہ کام کے اعتراف میں آپ کو نوٹیل امن انعام دیا جا رہا ہے۔

میں اپنے دل کی گہرائیوں سے آپ کو مبارکباد دہ اور انسانیت کے لیے کیے جانے والے آپ کے کام اور اس کے تسلسل کے لیے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔“

میری زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ میں نے 21 اکتوبر ہی کو سب کچھ کہہ دیا تھا۔ ایک امریکی صحافی نے ایک بار مجھ سے کہا تھا، ”تمہاری زندگی ایک paradox ہے۔“ میں اس کی توجہ شاہ Charles Péguy کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جس نے کہا تھا:

”ایک واحد دقیقے کی تاریخ لکھنے کے لیے مجھے ایک دن درکار ہوگا۔ ایک منٹ کی تاریخ لکھنے کے لیے ایک برس درکار ہوگا۔ ایک کھنے کی تاریخ لکھنے کے لیے مجھے پوری زندگی درکار ہوگی۔ اور ایک دن کی تاریخ لکھنے کے لیے پوری ابدیت درکار ہوگی۔ انسان کچھ بھی لکھ سکتا ہے سوائے اپنے کیے ہوئے کام کی تاریخ کے۔“

”امن پر ایک اور ٹیکچر سے بھلا کیا فائدہ ہوگا؟ امن ایسی شے نہیں جس پر کوئی ٹیکچر دیا جائے، اس کے لیے کچھ کیا جانا چاہیے۔“ میرے دوست ڈاکٹر شواکسز نے اسی جگہ 4 نومبر 1954 کو اپنے نوٹیل خطبے میں کہا تھا: ”ہمیں اپنے ضمیر میں اس لازمی حقیقت کا بہت پہلے ہی کا اعتراف کرنا چاہیے تھا کہ ہم انسان بننے کے بجائے نہر میں بہتے جا رہے ہیں۔“ اسی موقع پر وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ”انسانی جذبہ جو ہمارے

عہد میں دانش ورانہ یقین پیدا کرنے کے قابل ہو، وہ ایک نئی ذہنیت ہوتی ہے، اخلاقی ذہنیت۔ اسی یقین سے متاثر ہو کر میں خود بھی اس سچائی کا اعلان کرنا چاہتا ہوں، اس امید پر کہ شاید میری گواہی کے باعث اس کو صرف قابل تعریف جذبہ ہی نہیں بلکہ ایک امر محال سمجھ کر رد نہیں کیا جائے گا۔ نہ جانے کتنی سچائیاں ہیں جو ایک عرصے سے پڑی ہوئی ہیں، جن پر کسی نے توجہ ہی نہیں کی ہے، اس لیے کہ کسی نے ان میں حقیقت بننے کی صلاحیت کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔“

امن کو حقیقت کا روپ دینے کا ایسا کون سا طریقہ ہے، سوائے اس کے کہ انسانی ابتلا کے مسئلے کا حل تلاش کیا جائے؟

(1) انسان کی مدد کیجیے

نوٹیل انعام ملا ہو یا نہ ملا ہو اپنے ساتھی انسانوں سے رابطے میں رہنے والا اُن کے دکھ درد کو مشترک اخلاقی اور مادی ذمے داری سمجھتا ہے۔ مگر خود کو ان کے دور کرنے کے قابل نہیں سمجھتا۔ عام سمجھ بوجھ اور عمل کرنے کی خواہش، بے دلی ہی سے سہی مگر جلد ہی ہمیں دھروں کی تکلیف کو سمجھے، یا نظر انداز کیے بغیر ہی اپنی کارکردگی کو ایک مخصوص حد تک محدود کر لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ 10 نومبر کے بعد سے مجھ تک پہنچنے والے بہت سے پیغامات میں سے میں صرف دو کو پڑھ کر سنا چاہتا ہوں جو ان مسائل پر اچھی طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ دونوں پیغامات ایسے افراد کے لکھے ہوئے ہیں جنہوں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں، جنہیں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوا ہے کہ ان کا سب کچھ ختم ہو چکا ہے، اس لیے اُن میں وہ بصیرت ہے، جو مسائل کو غیر کی نظر سے دیکھنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ پہلے پیغام میں لکھا ہے:

”مرسلز کی بین الاقوامی نمائش میں لگے ہوئے کناڈا کے پولیٹین میں سماجی خدمات کے بارے میں جلی حروف میں لکھے ہوئے ایک پیغام نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اس پیغام کا نچوڑ یہ تھا: ”کسی بھی طریقے سے مدد کرنا سکون بخش نہیں تھا، سوائے اس کے جو پوٹو گین سے کیا جائے۔ اس سلسلے میں Aid to Displaced Persons بہترین ذریعہ ہے اور اسلی طریقہ بھی یہی ہے۔ اقوام متحدہ کی سطح پر، یا کہیں اور کیے جانے والے فیصلوں میں، جن تک یورپ والوں کی پہنچ نہیں ہوتی، امن کے لیے کام کرنے کا یہی ایک موثر طریقہ ہے۔ عام آدمی کے لیے بڑے بڑے سیاسی سوالات میں شامل ہونا مایوس کن ہوتا ہے، جب کہ اپنے خیالات کی عملی ترسیل کے لیے Aid to Displaced Persons کا ادارہ ہمیں ہر طرح کے مواقع فراہم کرتا ہے۔“

مجھے ایسے قومی لوگ بالکل متاثر نہیں کرتے جو یہ کہتے ہیں کہ نوٹیل امن انعام تشدد کو ختم کرنے میں کام رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ روحانی اعتبار سے دنیا آگے کی طرف بڑھ رہی ہے، آہستہ سہی، مگر بہتری

ضرور آرہی ہے۔ گویا، ہم تین قدم آگے بڑھتے ہیں تو دو قدم پیچھے پلٹ جاتے ہیں۔ اہم بات مگر یہ ہے کہ تیسرا قدم آگے ہی کی طرف بڑھتا رہے۔ اس میں بنی نوع انسان کو موقع ملتا ہے، اور آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو اس کو ممکن بناتے ہیں، جو مسلسل آگے کی طرف بڑھتے رہتے ہیں، جو رک کر صفیں درست کرنے کے بعد پھر آگے بڑھتے ہیں، آگے بڑھتے ہیں اور مسلسل کوشاں رہتے ہیں، اور آپ کے جذبے کی لہروں کے مہارے اور لوگ بھی آگے کی طرف بڑھتے ہیں۔ آپ لوگ بڑی ہوشیاری سے آگے بڑھتے ہیں، عملی طور پر اور سمجھ بوجھ کے ساتھ۔ کبھی غریبانہ انداز میں بھی۔ مگر ہمیشہ انسان اور انصاف کے لیے، انتہائی محبت اور وقار کے ساتھ۔“

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مباحثوں کا ڈکھا ایک مسئلہ تو ہے مگر اس میں کامیابی ہو رہی ہے، اُسی طرح جیسے کہ دوسرے انسانی ڈکھوں میں ہوتا آیا ہے، کہ یہ بہت سارے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں کہ وہ بھی امن کی جدوجہد میں حصہ لیں۔

دوسرے خط میں یہ تصور اور تیزی سے اجاگر ہوا ہے، جس کا متن مندرجہ ذیل ہے:

”مب سے پہلے میں نے اپنے آپ سے کہا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، قابلِ تعریف تو ہے، اور اگر وہ عمر رسیدہ لوگوں کے لیے دس بیس مکان بنانے میں کامیاب ہو بھی گئے تو وہ جملہ خداداد کے ایک معمولی حصے ہی کو بچا سکیں گے۔۔۔۔۔ مگر آپ اپنے کام میں جتے رہے اور آپ کی کامیابی ایک geometric progression جیسی ہوتی گئی۔ وہ وقت آنے والا تھا، بلکہ اب آ بھی گیا ہے، جب آپ اس کیفیت میں ہوں گے کہ سارے مسائل کو سلجھا سکیں گے، یا اس کے بڑے حصے کی طرف پیش قدمی کر رہے ہوں گے۔ آپ اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ اسی طرح، بلکہ صرف اور صرف اسی طریقے سے حل نکل سکتا ہے، یعنی ایک کام پر دل و جان سے جلت جانا، خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو کہ عاقبت اندیشی کا تقاضا ہے کہ کبھی ہمت نہ ہارو۔“

محبت کا پہلا قدم، اولاً جو صرف چند معلوم لوگوں کی بھلائی لگتا ہے، بالآخر پوری دنیا پر اثر انداز ہو جاتا ہے، ایک بین الاقوامی بندھن بن جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی کارکردگی واقعی عالی شان ہے۔“

”محبت کا پہلا قدم“ جیسا جملہ لکھنے والے نے جس طرف اشارہ کیا ہے، وہ نہ صرف آپ کو ایک مقصدی انسان بنا دیتا ہے (جو خود بھی ایک طاقت ور نسبت ہے) بلکہ اس سے بھی کئی قدم آگے بڑھ کر بنی نوع انسان سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ یہ رابطہ جزا دینے والا ہے، آپ کے لیے، اور ان کے لیے بھی، آپ جن سے ملے رہتے ہیں۔ آپ انسانیت کو محض تصور بننے کی اجازت دینے کا خطرہ مول نہیں لیتے، نہ اسے تجریدی نہ نظریاتی ہونے دیتے ہیں، جب تک کہ یہ ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ پھر، ایک بار وہی ہو جاتی ہے درحقیقت جو ہے، یعنی

ایک انفرادی آدمی، ایک ذاتی بحران، ایک مقدر اور مخصوص ضروریات۔ پھر، دل دوبارہ اپنا عالمی شان بھلائی کا کردار اختیار کر لیتا ہے اور صلح ہو عمل شروع کر دیتا ہے؛ یعنی محبت، آغاز کار، استواری، حقیقت پسندی اور صبر۔

محبت! محبت کے ذریعے ہم اپنے بھائیوں کے دلوں کے قریب آ جاتے ہیں۔ زندگی کی ابتدا میں، زندگی کے پورے عرصے میں اور اپنی زندگی کے اختتام تک۔ حال ہی میں ایک مباحثہ نے اپنی مربی دادی کو ایک خط میں لکھا تھا: ”میں ہمیشہ آپ کے خط کے انتظار میں رہتا ہوں کہ ان میں سے نکلنے والی حرارت میرے لیے غمانیت کا باعث ہوتی ہے۔ جی ہاں! میں سمجھتا ہوں کہ روحانی اقتدار ہی ہماری دنیاوی زندگی کی سب سے اہم چیزیں ہوتی ہیں۔ ان کے بغیر زندگی مایوسیوں سے ایسی لبریز ہوتی ہے کہ زندہ رہنے کے قابل نہیں رہ جاتی۔ اکثر، جب میں تنہا ہوتا ہوں تو میں آپ کو اپنے قریب محسوس کرتا ہوں، گویا آپ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہیں اور میرے گال پر ہلکی ہلکی تھپکیاں دیتی رہتی ہیں۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ میں اپنا سر آپ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھ دوں اور آپ کے جسم اور آپ کے پیار کی حرارت کو اپنے جسم میں مرایت کرتا محسوس کروں۔ مجھے اپنے آپ کو ہمیشہ یہ یاد دلانا پڑتا ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ ہو سکتے ہیں مگر صرف روحانی طریقے پر۔ یہ خیال میری دل جوئی کرتا ہے، اس لیے کہ روحانی بندھن سب سے زیادہ اچھے دینے والے ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں کبھی دھوکا نہیں دیتے کہ یہ ہمارے ساتھ قبر، بلکہ اس سے بھی آگے تک جانے والے ہیں۔ مجھے تسلی دینے، اور میری زندگی کے آخری برسوں کو زندگی کا بہترین عرصہ بنانے پر میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں اپنی اس زندگی کے آخری حصے کو بڑے اطمینان سے بسر کر رہا ہوں، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ بنگری میں دفن ہونے کی میری آخری خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔“

آغاز کار میں نے کئی بار کہا بھی ہے اور لکھا بھی ہے: ”محبت کرنے والا دل ایک موجد ہوتا ہے۔“ کہ یہ لوگوں کی مدد کرنے اور انھیں سکون پہنچانے کے بڑا دل طریقہ نکال لیتا ہے۔ یہ ہمیشہ تازہ دم اور زندگی سے بھرپور رہتا ہے؛ اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمیشہ سرسبز رہتا ہے۔ ماروے کے ایک اہم اخبار کا مدیر اس سے واقف تھا، جب اس نے لکھا تھا: ”ایک پرانی کہوت ہے کہ وہ شخص جو پودے لگاتا اور پھول اگاتا ہے اس کو [انگریزی زبان میں] ”سبز انگشت“ کہتے ہیں۔ لہذا فادر پیرس سبز انگلیوں والے انسان ہیں۔ جب بھی کبھی ان کا دل کسی کے دل سے ملتا ہے، فوراً ہی اس میں کچھ اگنے لگتا ہے۔“

استواری 21 اکتوبر کو میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مسٹر فنی مو (Finn Mae) نے کہا تھا، ”آپ نے کچھ ایسی تفصیلات بیان کی ہیں جو میرے نزدیک بہت ضروری تھیں اور اس کام سے مخصوص بھی، جس کے بارے میں آج رات آپ نے باتیں کی تھیں۔ وہ ضروری شے ایک فرد ہے جو وقف کر دینا چاہتا ہو اپنی تمام تر قوت، یقین اور سرگرمی ان لوگوں کی انسانیت میں خود داری اور یقین بحال کرنے میں، جنہیں اپنا سب کچھ

چھوڑ کر فرار پر مجبور ہونا پڑا تھا۔“

حقیقت پسندی آدمی سے آدمی کا رابطہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ہمیں دوسروں سے اپنی مرضی کے مطابق ہونے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے، بلکہ ہمیں ان کو ویسا ہی قبول کر لینا چاہیے جیسے کہ وہ ہوں۔ یقیناً، اس کے لیے بے انتہا صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالکل ممکنہ طور پر ایک مہاجر خاتون نے بلجیم کے ایک معروف اخبار میں لکھا تھا: ”بہت کم لوگ پوری طرح سمجھ سکتے ہیں کہ مہاجرین سے معاملہ کرنے میں کتنی محبت اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب یہ لوگ اپنے ملک چھوڑتے ہیں تو صرف ان کا کردار اور ان کی تہذیب ہی ان کا اثاثہ ہوتی ہیں کہ Europe of the Heart کے دیہات میں عمر رسیدہ افراد کے لیے بنے مکانوں میں رہنے والوں کی، ہر روز کون سی تکلیفیں اٹھانی جانی چاہیے، اور کس وہم کا علاج کیا جانا چاہیے۔“

ہمیں تمام مسائل کے اجتماعی حل کے لیے، اور اعداد و شمار کے بارے میں ہمیشہ چوکس رہنا چاہیے۔ ہمیں اپنے پڑوسیوں سے بھی اپنی جیسی محبت کرنی چاہیے۔ انفرادی طور پر ہر ایک کی مدد کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ سب کی مدد نہیں کی جاسکتی۔ آخر ایسا کون ہوگا، جو ہر ایک کو اپنی زندگی مکمل طور پر دے سکے؟ مگر جو کام ایک آدمی اکیلے نہیں کر سکتا، بہت سارے لوگوں کے ارادے سے کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً امن کی سمت لے جانے والا کوئی یقینی طریقہ نہیں ہوتا، سوائے اس کے جو چھوٹے چھوٹے جزیروں اور مہاجرینوں کے حقیقی نیکستانوں سے شروع ہو اور وہ جزیروں اور نیکستان شمار میں مسلسل بڑھتے رہیں، اور اس وقت تک ایک دوسرے کے ساتھ بنے رہیں، جب تک کہ سب مل کر پورے کرۂ ارض کے گرد ہالے کی صورت اختیار نہیں کر لیتے۔

(2) کسی بھی انسان کو فراموش نہیں کرنا چاہیے

کتنی غلطی پر ہوتے ہیں وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ میں نے دنیا بھر کے لوگوں کے مسائل کو اجڑے ہوئے لوگوں کے ڈرامائی کام میں سمودیا ہے۔ دوستو! جب بھی میں ان لوگوں کی مدد کر رہا ہوں جو یورپ کے مہاجرینوں کا ایک قلیل حصہ ہیں، تو ان کے عقب میں مجھے وہ تمام مہاجر بھی نظر آ رہے ہوتے ہیں جو یورپ ہی میں نہیں، بلکہ دنیا کے ہر کونے میں ہوتے ہیں، میں جن کی مدد کو پہنچ نہیں سکتا۔ میں نے حال ہی میں "The Seven Sorrow of the World" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا تھا جس میں لکھنے والے نے دنیا کے سات بڑے مہاجر مرکروں کی تفصیل دی تھی۔

مہاجرینوں کی اس بڑی تعداد کے پیچھے مجھے کتنے دکھ نظر آ رہے ہوتے ہیں: فاقہ کشی، بے گھری، قید اور دوسرے بہت سارے دکھ۔ جذامیوں کے لیے کام کرنے والے میرے ساتھی Follereau نے لکھا کہ 11 نومبر کو مجھے لکھا تھا:

”کیا بتاؤں، میں اس بات پر کتنا فخر محسوس کرتا ہوں کہ مجھے آپ کے دوستوں میں شمار کیا جاتا ہے۔
[امید ہے کہ] وہ تمام لوگ جو سماجی نا انصافیوں اور انسانی بد بختی کے خلاف جہاد کر رہے ہیں، وہ تمام لوگ جو
چاہتے ہیں کہ روئے زمین پر نیک نیت آدمیوں کے درمیان امن کا راج ہو، [ایک دن] سب ایسے ہی اعزاز
سے نوازے جائیں گے۔ ان دنوں میں جاپان میں جذامیوں کے مرکز دیکھنے آیا ہوا ہوں۔ یہاں کے بعد
میں کوریا اور فارموسا جاؤں گا۔ اگر وہ ایسی میں کوئی اُن ہوتی پیچیدگی نہ ہوتی تو میں کرسٹنک پیرس پہنچ جاؤں
گا۔ کیا میں بالآخر آپ سے ملاقات کی سعادت حاصل کر سکتا ہوں؟ مگر مجھے احساس ہے، جیسا کہ آپ نے
مجھے بتایا تھا، کہ ہمیں ایک دوسرے کو جاننے کے لیے ملاقات ضروری نہیں۔ میں افریقا میں گاؤں بنانے کی
پیشکش کا وعدہ بھولا نہیں ہوں۔ مجھ امید ہے کہ حالات مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے کی اجازت دیں گے۔
ایک بار پھر، میں آپ کو جہ دلی سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آپ کا چاہنے والا پرتو ستار

اور پھر، یوں ہے کہ ہم دونوں کے درمیان ویسا ہی انکسار ہے، جیسے کہ ہم ہیں، ہم وہی کچھ کر رہے
ہوتے ہیں، خدا نے ہمیں جو کچھ کرنے کے لیے سونپا ہے، اور میرا کام ہوگا محبت، نعمت، حقیقت پسندی اور
صبر، تاکہ ہجرت کرنے والے لوگوں کی خدمت میں جہاں تک ممکن ہو اپنا چھوٹا سا ٹل چلاتا رہوں گا۔ نہ
صرف یہ کہ ہم کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں اپنی اپنی جگہ ہی رہنا چاہیے، دنیا سے قطع تعلق کر کے نہیں، بلکہ
جہاں بھی ہوں وہاں سے امن کے لیے کام کرتے رہیں۔ ایک ماہر تعمیرات نے مجھے خط میں لکھا تھا ”جدوجہد
جاری رہتی ہے، اور ایسے گروہوں فراہم جن کو بتایا جانا چاہیے کہ تمام لوگ ایک دوسرے کے بھائی ہیں،
کہ ان میں کا ہر ایک، دوسرے سے برا درنا نہ بندھن میں بندھا ہوا ہے۔“

(3) مقدس اتحاد

5 مئی 1957 کو آگس برگ میں تیسرے یورپی گاؤں کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے میں نے اپنی تقریر
میں سامعین سے کہا تھا:

”ہمارے آپس کے اختلافات کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں، انھیں بہر حال سٹھی ہی رہنا چاہیے کہ جو
کچھ ہمیں تقسیم کرتا ہے وہ ہمارے درمیان رشتوں کے مقابلے میں کم اہمیت کا ہے۔ امن کے ساتھ رہنے کا
بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم میں باہمی محبت اور احترام ہو کہ ہمیں اپنے درمیان مشترک رشتے کا خیال رکھنا
چاہیے۔ اس مشترک رشتے کا بہترین نام ہے آدمی۔ ہمیں ایک بار پھر، بلکہ ہمیشہ یا درکھنا چاہیے کہ ہماری نگاہ
ہر شخص کے اندر پوشیدہ انسان پر رہے، اس سے قطع نظر کہ وہ ہم سے کتنا مختلف ہے، اپنے خیالات میں، اپنی
سماجی حیثیت میں، اپنی ذہنیت میں یا اپنے عقائد میں۔ اور ہمیں ہمیشہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہمیں ہر آدمی کی
حقیقی قدر کا اندازہ کرنا چاہیے، وہ قدر جو ہمیشہ لا انتہا ہوتی ہے۔“

وہ جو اپنی تمام تر قوت صرف اپنے ایک بھائی کو بچانے میں صرف کر دیتا ہے، اور جو اپنے ایک اور بھائی کو ویسا ہی عمل کرنے پر راغب کر لیتا ہے اُسے فوراً "the common denominator" کے حیرت انگیز مظہر کا تجربہ ہو جاتا ہے۔

ایک تاریخی یا شہدے نے جس سے اکتوبر کے مہینے میں میری ملاقات ہوئی تھی، میرے جانے کے دو دن بعد مجھے لکھا تھا: "پہلے دن ہی سے آپ اجنبی نہیں بلکہ بھائی جیسے لگے ہیں، جس سے ہم اپنی پوری زندگی واقف رہے ہوں، اور جس کی رکوں میں وہی خون دوڑ رہا ہو جو ہماری اپنی رکوں میں ہے۔" ایک اہم سرکاری افسر نے، جو ہمارے نو مہر کے پیغام کو سمجھ گیا تھا، لکھا تھا: امداد پہنچاتے وقت، وہ کوئی بھی ہو، آپ سر آؤں گی کو آؤں گی تصور کرتے ہیں۔۔۔ روحانی طاقت سے غم ہو جانے والی کمان کا قوس چاند پر جانے والے مارکٹ کے مدار سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ ہم مذہب، فلسفے اور مابینہ نکات پر اختلاف کر سکتے ہیں، اور ہمیں کرنا بھی چاہیے، مگر ہمیں سر آؤں گی کو وہی ہونے دینا چاہیے جو کہ وہ ہے: ایک انسان، جو دوسرے انسان سے نہ بہتر ہے نہ کمتر، اتنی ہی توجہ کا حق دار ہے جتنی کہ دوسرے آؤں گی کو دی جائے۔" برلن سے ایک خاتون نے مجھے لکھا تھا، "میں برلن کے اخبار کا ایک مضمون بھیج رہی ہوں جس نے مجھے بہت متاثر کیا اور مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بہت سے لوگ اس مضمون کو پڑھ کر اگر دل سے اچھے کام کرنے لگ جائیں تو یہ دنیا ایک بہتر جگہ ہو جائے گی۔ ہمیں محض اتنا کہہ کر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے کہ آج کے لوگ ناقص ہیں۔ یہ کہہ دینا بہت آسان ہے۔ مگر ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ ہم انہیں بہتر بنائیں، اس لیے کہ تنازعات اور رقابتیں صرف جنگ کی طرف لے جاتی ہے، اور آج، جنگ کا مطلب ہے دنیا کا اختتام۔ ہم کبھی اس حقیقت پر اس سے زیادہ زور نہیں دے سکتے کہ بالآخر، بھلائی ہمیشہ برائی پر فتح یاب ہوتی ہے۔"

دوستو، ایسے مرحلے پر معمولی تنازعات اور قومی لاف زنی تو بین کے زمرے میں آ سکتے ہیں۔ لہذا مجھے بھائی بندی کے کچھ تعجب خیز پیغامات سنانے کی اجازت دیجیے۔

فرانسیسی ریپابلیکین (Azra) کا پیغام ایک دعا کی صورت میں آیا ہے:

"اے میرے پروردگار!

تیرے قانون کی نصیحتوں سے متاثر ہو کر، ہم یہاں ایک نیا یورپی گاؤں بنانے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہم بھائی بندی اور محبت کے کام کی تکمیل کے لیے آئے ہیں، اور تجھ سے اس گاؤں کی بنیاد پر رہتیں نازل کرنے کی دعا کرتے ہیں۔

اے میرے پروردگار! ہمیں امن اور یک جہتی کے ساتھ رہنے کے لیے اس دنیا میں کون لایا تھا؟ وہ تو ہی تو ہے، جس نے ہمیں معقولیت کی نعمت سے نوازا ہے تاکہ ہم فطرت کی طاقت پر قابو پا سکیں، نہ کہ ہم ان زندگیوں کی، جو ہم پر تیرے قرض کی صورت میں، بے حرقی کرنے کے لیے نیت نئے طریقے دریافت کرنے لگیں، اور عالمی بھائی بندی کے خوش حال عہد کو [انجام کی طرف سفر میں] تیز تر کر دیں۔ کاش یہ

مہارک اجتماع، جو بھائی بندگی کی علامت ہے، وہ دن طلوع کرے، جس پر تیری ہزار گنا نعمتیں نازل ہوں، جب پوری نسل انسانی ایک خاندان کی طرح بن جائے، اور جب اس کے تمام ارکان دکھوں اور محرومیوں اور اذیتوں سے نجات پا جائیں جو ابھی تک ان پر قہر پٹی ہوئی ہیں، اور اپنی آزمائشوں کے باعث پاک ہو کر اور ممتاز بن کر آئندہ کی زندگی امن و یک جہتی میں بسر کریں۔ اے رحیم خدا! اے نعمتوں اور نصیبوں کے مالک! ان سب پر اپنی نعمتیں نازل کر جو بھلائی کے لیے کام کرتے ہیں، اور ان سب پر بھی جو لوگوں کو ہمت دلاتے ہیں، اور اس بڑے دل والے انسان فادر ڈومینیک پیرے (Father Dominique Pire) پر بھی اپنی نعمتیں نازل کر، اور جس کام کا اس نے بیڑہ اٹھایا ہے اسے بھی کامیابی سے ہم کنار کر، اے پروردگار! نعمتیں نازل کر تمام آدمیوں پر، ہمارے بھائیوں پر، ان پر جو ہمت بڑھاتے ہیں، مقبولیت اور دانش سے، اور ان سب کے دلوں کو امن کے جذبے، محبت اور میل جول کے جذبات سے بھر دے۔“

اور یہ رہا، ایک جرمین سرخیج کا پیغام: ”کبھی کبھی انسان اپنی مرضی کے خلاف چلنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، کروہ آپ کے راستے پر گامزن ہو جائے، اور آپ کی مثال بنے۔ آپ سے ملاقات کے بعد میرے ساتھ بھی کچھ ہوا ہے۔ اس لیے میں، سادہ لفظوں میں آپ سے اپنی پہلی ملاقات اور بعد میں سنگ بنیاد کی تقریب کے تاثرات پیش کر رہا ہوں، اور میری درخواست ہوگی کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں اس کو الفاظ کے بالکل سچے معنوں میں قبول کریں۔“

ایک امریکی کا پیغام کچھ اس طرح ہے: میں ایک یہودیہ ہوں، پھر بھی کیتھولک عقیدہ رکھنے والوں کے ساتھ موافقت کے جذبات رکھتی ہوں۔۔۔ تمام اچھے لوگوں سے، اس سے قطع نظر کہ ان کا تعلق کہاں سے ہے۔“

ایک شاہی شدہ جوڑا لکھتا ہے، ”انسانیت کے لیے آپ کے کام کی عالی شان مثال اس ابدی امید اور یقین کو زندہ کر دیتی ہے جو ہمارے دلوں میں پر مردہ پڑی ہوئی ہے، کہ ایک اچھا ماحول دنیا کو بہتر بنا دے گا۔ بدبینی کے ان اُداس کر دینے والے دنوں میں، آپ ایسے عمل اور ایسی شرافت کو علامت بنا دیتے ہیں جو ان لوگوں کو ایک نئی امنگ اور نئی زندگی دے سکتی ہے جو آدمی کے وحشیانہ پن کی وجہ سے آدمیوں پر اٹھ بار کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم میں سے ایک کیتھولک ہے اور دوسرا یہودی ہے اور ہم دونوں کو اپنی امیدوں اور خیالات میں ایک نئی بصارت کا تجربہ ہوا ہے، اور ہمارا عقیدہ، اور ہمارا انسان سے محبت کرنے کا طریقہ ویسا ہی ہے جیسا کہ یسوع مسیح کا تھا، جس طرح آپ کسی درجے یا کسی نسل کے انسان سے رابطہ کرتے ہیں۔“

یہ پیغام ایک عورت کی جانب سے ہے جس کا شوہر جیم کے علاقے Breendonck کے عتوقتی کیمپ میں ختم کر دیا گیا تھا، جس کا اکھوتا بیٹا میں برس کی عمر میں کسی اور عتوقتی کیمپ میں مرا، اور وہ خود Ravensbrück کے عتوقتی کیمپ میں موت کے قرب سے ہو کر گزری تھی۔ وہ لکھتی ہے:

”سماتی درجے پر، میں ان سب کو اپنی حیثیت کے مطابق مدد فراہم کرتی ہوں، جو مجھ سے مدد کے

طالب ہوتے ہیں، اس سے قطع نظر کہ وہ کس خیال کے حامل ہیں۔ مجھے اس عمل پر کسی شاہ باغی کی ضرورت نہیں؛ بس یہ میری فطرت ہے۔ برداشت، مہربانی اور سخاوت۔ یہی میرا طریقہ ہے؛ اور خدا بھی مجھ پر مہربان ہے، اس لیے کہ اس طرح وہ مجھے اپنی تنہائیوں کو کم کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔“

ایک اور پیغام ہے، ایک اہم فرانسیسی افسر کا: ”ہمارے ماریائی دوست [امن کے انعام کے لیے] اس سے بہتر انتخاب نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ اس طرح وہ ایک بار پھر اعتراف کرتے ہیں کہ محبت اور سخاوت ہی امن کے حقیقی سرچشمے ہیں۔“

ایک کھولک مبلغ کا پیغام ہے، ”آپ کی امن جانب اللہ کا میاں سب کے لیے مبارک ہے، اس لیے کہ آپ کی تعریف کے ذریعے، ہم انجیل کی صدائوں اور نیکیوں کا دعویٰ کرتے ہیں جو زندگی اور نجات دیتی ہیں۔“ ایک پریسٹنٹ مرشد کا پیغام، ”نوبیل امن انعام کے لیے اپنے انتخاب پر میری دلی مبارکباد قبول کیجیے، جو آپ کے تمام دوستوں کے لیے بے پایاں خوشی کا باعث ہے۔ ذاتی طور پر، میں بھی بے انتہا شاکام ہوں۔“ ایک ماریائی خاتون کا پیغام، ”یہ انعام آج کی دنیا کے تاریک گردوں کے لیے ایک چمک دار ستارہ ہے۔ روشنی کی اس کرن کے لیے، آپ کا کام جس کا منیع ہے، میں آپ کو مبارکباد دیتی ہوں۔“

اور یہ ہے ایک پریسٹنٹ آواز، ”میں ایک پریسٹنٹ ہوں، اور ہمارے ایک مذہبی جرمیدے کی معلومات نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں آپ کی تعریف کروں اور آپ کے کام کا احترام کروں، جس میں اب میں خود بھی دلچسپی لینے لگا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھی، سینٹ فرانسس آف اسسپی کی خوب صورت دعا کی تجسیم کی کوشش کر رہے ہیں، اور دراصل، جہاں بھی مایوسی ہوتی ہے، وہیں خدا کی مدد سے آپ امید بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔“

کارسیکا کے ایک صحافی کا ایک جملہ ہے، ”مجھے کوئی بھی شے اس سے زیادہ مسرت فراہم نہیں کرتی جتنی کہ یہ ثبوت کہ امن کی روح ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔“

اور آخر میں یہ گوانی اپنے ایک ہم وطن کی ہے، ”یہ کتنے اطمینان کی بات ہے کہ ماؤنٹ اور اس کی ماہریر سیکلی خود پسندی کی پامال کی ہوئی اس دنیا میں اب بھی اتنے تیز فہم اور نڈر دماغ موجود ہیں جو سخاوت و خیرات کو متبرک خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔“

وہ انسان بھائیوں کے درمیان موجود متبرک اتحاد، جو خود کو ایک باوقار اور ذمے دار حیثیت میں دریافت کرتے ہیں، جب کہ وہ تیسرے کو بچانے کے لیے مل کر کام کر رہے ہوں، بدگمانی، تنگ نظری اور تعصبانی رکاوٹوں کو دور کرتا ہے جو انسانی محبت کو اور ملانے والی قوتوں کو زیر آلود کرتی ہیں۔ اب ہمیں محبت کی طاقت پر یقین کرنا اور اس کو ہر کار لانے دینا چاہیے۔ واضح رہے کہ مشترکہ بردوانہ محبت کے لیے اصولوں پر مصالحت کی ضرورت نہیں ہوتی، مگر اس کے برعکس صحیح سوچ رکھنے والے اس کو پسند کرتے ہیں۔ یہاں برداشت کو جج میں نہیں لانا چاہیے۔ یہ منفی حرف شفاف ضمیر رکھنے والوں کے نزدیک ہے دلی کی رعایت کے

متضاد ہے۔ بلکہ ہمیں باہمی مفاہمت اور باہمی احترام کی بات کرنی چاہیے۔ ہر انسان کو اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے۔ اگر میرا پرہیزی مجھ سے مختلف رائے رکھتا ہے، تو کیا مجھے اس کو بددیانت یا بد معاشرہ سمجھنے کا حق ہوگا؟ بلکہ کیا ہمیں عام طریقے پر یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ اچھا ہے اور توقع کرنی چاہیے کہ وہ اپنے ضمیر کے احکام کے مطابق عمل کرے گا؟ تمام مبلغین میں سربراہ اور دہ Thomas Aquinas نے مذہبی عقائد میں اختلافات کے بارے میں لکھا ہے: ”اگر ایک آدمی واقعی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یسوع مسیح کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے تو وہ گناہگار ہوگا اگر وہ ان کی اطاعت کرتا ہے۔“

دس برس سے ہم نے ہمیشہ ان ہی اصولوں کے مطابق عمل کیا ہے، مہاجرین کے لیے اور یورپ میں برادریانہ محبت کے لیے، جو ہم مہاجرین میں پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سینٹ پال کے ان الفاظ کے باوجود نوٹیل امن انعام نے مجھے مجبور کیا ہے، کہ میں اپنی عادتوں اور بہترین فیصلوں کے خلاف پلٹ کر دیکھوں: ”کوئی بھی آدمی، جو بدبادی کے عمل میں شریک رہا ہو اور ٹھٹھٹھا چاہتا ہے وہ خدائی کاموں کے لیے موزوں نہیں ہوگا۔“

میں ہر سماجی سے انفرادی طور پر اور بڑے سکون کے ساتھ ملا ہوں، جس طرح کہ ایک انسان سے ملا جانا چاہیے۔ مگر ہر ایک نے مطالعہ باطن اور ماضی میں چھان بین کرنے میں میری رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے، جس نے مجھے یہ معلوم کرنے کا موقع فراہم کیا ہے کہ بنیادی طور پر، ان دس برسوں میں ہم محض انفرادی انسانی رابطوں کی ایک مستحکم زنجیر بنا سکے ہیں، جس کی ابتدا 27 فروری میں برسلز میں ہونے والی ایک مختصر سی گروہی ملاقات سے ہوئی تھی۔ یہ ملاقات بعد میں دوستوں کے دوستوں تک، اور اس کے بعد ان کے بھی دوستوں تک پھیل گئی، اور اس نے ہمیں اس مقام پہنچا، جہاں ہمیں معلوم افراد کی طرح نہیں بلکہ اصلی بھائیوں کی طرح دوبارہ متحد کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دوستوں اور ان جیسے دوسروں کی یہ زنجیر جلد ہی Europe of the Heart بلکہ شاید ایک دن World of the Heart بن جائے گی۔ 10 نومبر کے بعد سے مجھے ان لوگوں کی متفقہ مدد کرنے میں بہت خوشی محسوس ہوتی جو روایتی پارلیمان کی نوٹیل کمیٹی میں انتخاب اور فیصلے کرتے ہیں، اگر یہ سب اس ”پردے“ کے لیے نہ ہو رہا ہوتا، جس کے پیچھے ہماری طرح دوسرے برادر بھی رہتے ہیں، جنہیں زندہ رہنے کا اتنا ہی حق ہے جیسے ہم کو، مگر زیادہ برادریانہ محبت کی ضرورت کے ساتھ۔ اس مقام ہم اس سے زیادہ اور کیا پیغام دے سکتے ہیں ان کے رہنماؤں کو اور ان کے زیادہ منکسر المزاج لوگوں کو کہ: ”مشرقی بھائیو، ایشیائی بھائیو، میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم میں سے ہر ایک کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔“

(4) ذمہ داری

1958 کا نوٹیل امن انعام ایک کارگزاری کی انتہا نہیں، بلکہ ابتدا ہے، ایک تازہ ابتداء، سرگرمیوں کی

تجدید کا تسلسل ہے، اُن سب کا جو پچھلے دس برسوں میں کی گئی تھی۔ ذمے داری بہت بڑی شے ہوتی ہے۔ ایک آدمی، جس نے ایک بار مجھے کام کرتے دیکھا تھا، مجھے لکھا ہے:

”میں نوٹیل امن انعام پانے کے موقع پر آپ کو ملنے والے مبارک باد کے پیغامات میں اپنا بھی پیغام شریک کرنا چاہتا ہوں، اور یہ میں کر رہا ہوں، اگرچہ مجھے یقین ہے کہ یہ امتیاز ذاتی طور پر آپ کے لیے معمولی ہے، اس لیے کہ آپ اس اعزاز کو صرف اُن روحانی اصولوں سے منسوب کرتے ہیں، آپ جن پر قائم ہیں۔ ساتھ ہی، آپ کو اس خوشی کا اعتراف بھی کرنا پڑے گا جو آپ کو اس انعام نے دی ہے، خواہ وہ ذاتی ہی کیوں نہ ہو۔ [اس میں شک نہیں کہ] خیالات اور آدمی ایک ساتھ چلتے ہیں۔ [مگر] آپ اپنے خیالات کی اس حد تک تعمیم کرتے ہیں کہ آپ ان کے مردار بن جاتے ہیں۔ آپ [ذہنوں میں] یقین القا کرتے ہیں، اور اپنے اصولوں کو بیان کرنے میں اپنے آپ کو بیان کر دیتے ہیں۔“

اور کوئی اس نکلنے والے کو کیا جواب دے جو ان چند الفاظ میں سب کچھ بیان کر دیتا ہے، ”اب، آپ ہر شخص کے خواب امن کا حصہ بن گئے ہیں۔“

خواہ آپ یقین کرنے والے ہوں یا نہیں، پیارے دوست، مجھے اپنی محبت دیجیے، اپنا سہارا دیجیے اور میری مدد دیجیے کہ ہم سچی دوستی کو آگے بڑھائیں۔ آخر میں، آپ کے لیے میں نہایت مرادہ، مگر رفیع الشان مصرعے پیش کرتا ہوں جو حال ہی میں ایک روسی مہاجر نے لکھے ہیں، جس کو میں نے دوبارہ ایک باوقار زندگی فراہم کی ہے۔ اس نے ان مصرعوں کو ”The Work of the Reverend Father Dominique Pire“

کا عنوان دیا ہے۔ یہ ہیں مصرعے:

”یہ پیمانہ بدمر ہے، یا روشنی کی کرن ہے زمیں پر۔۔۔“

کہ انسانِ دل کے لیے اک تسکین۔۔۔

کہ عالمی نسب لب کا وعدہ۔۔۔

کہ خود دستِ قدرت کا بخششِ دلار۔۔۔



لیسٹر باؤلز پیرسن اعلانِ تجلیل

مارویائی پاریمان کی نوٹیل کمیٹی نے 1957 کا نوٹیل امن انعام کنناڈا کے لیسٹر باؤلز پیرسن کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، لیسٹر پیرسن 1948 سے 1957 تک کنناڈا کے وزیر خارجہ رہے تھے اور انتخابات میں شکست کی وجہ حکومت کو استعفیٰ دینا پڑا تھا۔

لہذا، اس برس کا نوٹیل امن انعام ایک سیاست داں کو دیا جا رہا ہے جو اب بھی کنناڈا کی پاریمان کے ایک آزاد رکن ہیں۔

مثالیہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جنگ کو روکنے کے سلسلے میں جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ ممکن نہ تھا، اگر وہ عملی طور پر سیاست میں نہ ہوتے۔ بلاشبہ، اس نکتے پر بحث کی جا سکتی ہے، مگر میں جس بات پر زور دینا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ امن انعام ایک سیاست داں یا ایک وزیر کو نہیں، بلکہ ایک آدمی کو دیا جا رہا ہے، جس کا نام لیسٹر پیرسن ہے، اس کی ذاتی خصوصیات، طاقت و آقاؤ کار، استحکام اور ثابت قدمی۔ کی وجہ سے، جو اس نے جنگوں کو روکنے یا محدود کرنے اور امن کو بحال کرنے کے سلسلے میں دکھائی ہے، اور ایسے حالات میں جہاں تیزی اور عقل مندی لازمی تھی، تاکہ دنیا بھر میں جنگی تھلاوے کے پھیلنے سے پیدا ہونے والی بے چینی کو دور کیا جاسکے۔

لیسٹر باؤلز پیرسن 1897 میں کنناڈا کے شہر نورمانو میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد اچھی شہرت کے مالک میٹھووسٹ مہلک تھے ان کے بیٹے مذہبی مگر وسیع انصرماحول میں پلے بڑھے تھے جب کہ ان کی تربیت میں کھیل کود بھی شامل تھا۔ ان کے والد نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ بیٹے کو اچھی تعلیم ملے۔ پھر ان کا نورمانو یونیورسٹی میں تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ ہو گیا تھا، مگر پہلی عالمی جنگ ان کی تعلیم میں

خلل انداز ہوئی، اور اٹھارہ برس کی عمر میں وہ یونیورسٹی میڈیکل کورس میں رضا کار کے طور پر بھرتی ہو گئے۔ جنگ کے خاتمے پر، جس میں وہ عملی طور پر شامل تھے انھوں نے اپنی تعلیم دوبارہ شروع کی اور 1919 میں بی اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ ایک وقفے کے بعد وہ اپنے چچا کے گوشت کے کارخانے کی طرف سے دھینے پر تعلیم کے لیے آکسفورڈ میں داخل ہو گئے۔ 1923 میں انھوں نے ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ کچھ دن استاد کے فرائض انجام دیے اور نوڈو یونیورسٹی میں جدید تاریخ کے شعبے میں مائیب پروفیسر ہو گئے۔

1938 میں جب وہ اکتیس برس کے تھے لیسنر پیرن کناڈا کی وزارت خارجہ میں ملازم ہو گئے۔ یہ قدم ان کے تعلیمی پیشے کے خاتمے اور سرکاری افسری کی ابتدا کا باعث ہوا۔ پہلے وہ 1935 تک آئووا میں وزارت خارجہ میں فرسٹ سیکریٹری رہے، اس کے بعد انھیں لندن میں کناڈا کے ہائی کمشنر کے دفتر میں کاؤنسلر تعینات کر دیا گیا تھا۔ 1941 میں وہ وزارت خارجہ میں اسسٹنٹ انڈر سیکریٹری تعینات ہو کر آئووا چلے گئے، اور ایک برس بعد انھیں واشنگٹن میں کناڈا کے منسٹر کے طور پر تعینات کر دیا گیا، جہاں وہ 1946 تک رہے، جس عرصے میں انھوں نے دو سال سفیر کے طور پر بھی کام کیا۔ اس کے بعد دو برس تک وہ اپنے ملک میں انڈر سیکریٹری رہے۔ جب 1948 میں وہ کناڈا کی حکومت میں وزارت خارجہ کے سیکریٹری آف امیٹ بنے تھے اس وقت ان کی عمر اکیڑن برس تھی۔

یہ تھا ایک مختصر سا خاکہ مسٹر پیرن کی زندگی کا، جو بلاشبہ ان کی قابلیت اور ذہنی استطاعت کی گواہی دیتا ہے، مگر یہ اس بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ انھوں نے کیا کچھ حاصل کیا، کس طرح انھوں نے ان مسائل کا سامنا کیا جو ان کے فرض منصبی کے دوران پیش آئے تھے، یا کیوں انھوں نے مسائل حل کیے، اور کس طریقے سے حل کیے تھے۔

قدرتی طور پر، اس عرصے میں، جب لیسنر پیرن وزارت امور خارجہ میں سرکاری افسر تھے، وہ اپنے نظریات اور رائے صرف کناڈا کی حکومت ہی کے سامنے پیش کر سکتے تھے۔ پھر بھی، ان برسوں میں، جو نیا وہ تران کے لیے تربیتی نوعیت کے تھے انھوں نے وسیع تجربہ حاصل کیا اور اپنے نظریات کو بھی وسعت دی تھی۔ اسی زمانے میں بین الاقوامی مسائل پر ان کے نظریات کی تشکیل ہوئی۔ انھوں نے 1933-34 میں عالمی ترک اسٹوڈنٹ کانفرنس میں حصہ لیا، 1935 میں لندن بحریہ کانفرنس میں شرکت کی اور اسی برس وہ لیگ آف نیشنز کے سلیجویں اجلاس میں کناڈا کے وفد کے رکن کے طور پر شریک ہوئے۔ لیسنر پیرن کے لیے یہ کانفرنسیں بہت زیادہ اہمیت افزا تھیں۔ ہوائی گاس لیے کہ ہم سب، جنھیں لیگ آف نیشنز سے واسطہ پڑا ہے، محسوس کرتے تھے کہ ہمہ وقت ہم ایک کھست سے دوسری کھست کی طرف رواں رہتے تھے۔ مگر، نو جوان لیسنر پیرن، ان سب میں حصہ لیتے ہوئے، براہ راست مشاہدہ کرتے ہوئے، بہت قیمتی تجربوں سے گزرے تھے جن سے انھیں بعد میں ہونے والی کامیابیوں میں بے اندازہ مدد ملی تھی۔

1935 سے 1941 تک لندن میں کناڈا کے ہائی کمیشن کے دفتر میں لیسنر پیرن کی موجودگی ان کے لیے

بہت اہم اور سبق آموز تھی، اس لیے کہ اس وقت جو کچھ یورپ میں ہو رہا تھا، وہ مستقل طور پر اس سے بہت قریب رہے تھے۔

انہوں نے 1930 کے درمیانی عرصے کے بعد یورپی جمہوریتوں کے حالات کا اندازہ پیش کیا ہے۔ یہ ان [جمہوریتوں] کی اندرونی اور خارجہ پالیسی پر سنگین تنقید ہے، اور اندرون ملک اقتصادیات پر قابو پانے میں ناکامی، جب کہ بیرون ملک مسائل پر متذبذب ہے اور اس امید پر بار بار ہٹلر کے سامنے جھکنا کہ اس طرح امن کو محفوظ کیا جاسکے گا، اور بالآخر 1938 کا میونخ کا بحران آپہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ کناڈا کے لوگوں میں لیسٹر ہاؤس پہلے آدنی تھے جنہیں شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ جو راستہ اختیار کیا گیا ہے، اور اس سے جو کچھ مقصود ہے وہ حاصل نہیں کیا جاسکے گا۔ جنگ تو ہو کر رہے گی۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، 1942 سے 1946 تک لیسٹر ہاؤس واشنگٹن میں کناڈا کے سفارت خانے میں مشنر اور سفیر رہ چکے تھے۔ اس دوران انہیں دنیا کے حالات پر نظر کرنے کے بہت مواقع ملے تھے، انہوں نے امن کے ڈھانچے کی تشکیل کے سلسلے میں بہت کام بھی کیا تھا۔ یہ کام 1943 میں، جنگ کے ختم ہونے کے بہت بعد شروع ہوا تھا۔

انہوں نے 1943 میں Hot Springs میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں قابل ذکر فرض ادا کیا تھا، جو زمانہ امن میں دنیا کی خوراک اور اہم اشیاء کی تقسیم سے متعلق تھی۔ اس کام میں لیسٹر ہاؤس کا کیا ہوا کام بہت واضح تھا۔ اپنی کتاب The Story of FAO میں Gave Hambidge نے ان کے بارے میں لکھا ہے: ”مائیک ہیرسن، نوجوان، منکسر المواجه، ہمدرد، ذہین اور تیز حس مزاج کے مالک انسان ہیں، انہیں مختلف نوعیت کے خیالات کے مابین مؤثر مصالحت تلاش کرنے میں ملکہ بھی حاصل ہے، اور انہوں نے ہاٹ اسپرنگز کانفرنس میں بہت اچھا تاثر چھوڑا تھا۔“

انہیں Interim Commission for Food and Agriculture کا صدر نشین منتخب کیا گیا تھا، جس کا کام FAO کی مستقبل بنیادوں پر تنظیم تھا۔ یہ مہرج نے کمیشن میں کیے جانے والے ان کے کام کے بارے میں لکھا ہے: ”Interim Commission کے دو سالہ کامیاب کارکردگی کے دوران سب سے زیادہ ذمے داری ان ہی نے اٹھائی تھی۔“

Quebec میں 1945 میں ہونے والی میٹنگ میں، جب FAO کی بنیاد ڈالی گئی تھی، یہ کمیشن ختم ہو گیا تھا۔ اس موقع پر لیسٹر ہاؤس نے جو کچھ کہا تھا اس کا اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں ابتداء ہی سے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ جو بری تحقیق کے میدان میں مائنس نے جوئی ترقی کی ہے اس سے بین الاقوامی تعاون کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ مگر ان کے الفاظ واضح کرتے ہیں کہ بحیرہ انسانیت کے لیے ان کا اپنا ایک تصور ہے، ایک ایسی دنیا کا جس میں نہ خوف ہو اور نہ طلب۔

انہوں نے فرمایا تھا: ”ہم، اس کانفرنس کے شرکاء، جانتے ہیں اور ہم نے اس کا مظاہرہ بھی کیا ہے کہ اگر

تعمیر کے رتھ میں سائنس کو جوت دیا گیا تو وہ کیا کچھ کر سکے گا۔ بہر حال، انسان کے خوف نے اس کو جوہری مابودی کے رتھ میں بھی جوت دیا ہے۔ رتھوں کی اس دوڑ میں، جس میں حصہ لینے والے دونوں رتھوں میں سائنس بھی ہوئی ہے تو ہماری ساری امیدیں خوف، ہمال کنی اور خوش ایک ہی نکتے پر مرکوز ہوں گے۔ اس مقابلے میں اگر ہمیں شکست ہوئی ہے تو وہ سب کچھ جو ہم یہاں کر رہے ہیں یا جو کچھ لندن، یا واشنگٹن، یا سان فرانسسکو، یا ماسکو میں کریں گے اس کا ویسا ہی نتیجہ ہوگا جیسا کہ سینٹ لارنس خلیج میں چینیکی ہوئی ایک سنکری سے لکھے گا۔ مگر، اگر ہم میں ذرا بھی ہوش مندی ہوئی اور اگر ہم نے سائنس کی تباہ کرنے والی طاقت پر کسی قسم کا سماجی کنٹرول قائم کر دیا، جس کا مطلب ہے کسی قسم کا بین الاقوامی کنٹرول، اور سماجی ترقی کو سائنسی ترقیات کے ہم پلہ کر دیا تو جو کام ہم نے Quaker میں کیا ہے وہ انسان کی ان کوششوں میں دیر پا امداد کے مترادف ہوگا جو وہ نفرت، شبہ اور موت کے جنگل سے نکلنے کے لیے کر رہا ہے، جب کہ بہت سارے طاقت ور خود غرض اور بھیا تک مفادات آج بھی اس کو دلدل میں پھنسائے رکھنے کے لیے مرگرم ہیں۔“

یہ پہلے 1945 میں کہے گئے تھے۔ اس کے بعد سے بارہ برس بہت چکے ہیں، اور ہم صرف وہی دوڑ دیکھ رہے ہیں، ڈرانے والی اور ہلاکت خیز، اس لیے کہ اگر یہ اسی طرح جاری رہی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا! اگر پورے بنی نوع انسان کی نہیں تو اس کے بڑے حصے کی مکمل تباہی، یا زوال پڑے گی۔

یہی بات، کہ یہی حقیقت ہے، ہمارے زمانے کے بین الاقوامی تنازعات پر مسٹر پیرسن کے یقین کا مل پر اثر انداز ہوئی کہ انھیں کس طریقے سے سلجھایا یا حل کیا جائے۔

یقین اسی وقت، جب FAO کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی، لیسٹر پیرسن نے UNRRA کی تنظیم میں حصہ لیا تھا، بنیادی طور پر جس کے قیام کا مقصد جنگ کے ختم ہونے کے بعد جنگ سے تباہ ہونے والے ممالک کی اقتصادیات کی بحالی تھا۔ اس ادارے کو ان لوگوں کی بہبود کے لیے بھی کام کرنا تھا جو جنگ یا عتوبتوں کے باعث بے گھر ہو گئے تھے۔ UNRRA کا قیام 1943 میں عمل میں آیا تھا، اور لیسٹر پیرسن اس کی Supply Committee کے صدر منتخب بنادے گئے تھے۔ اور 1946 میں وہ بے گھر افراد کے لیے بنائی گئی ذیلی کمیٹی کے صدر منتخب بنادے گئے تھے۔

UNRRA کے لیے کیے جانے والے کام پر لیسٹر پیرسن کی ذاتی عہدوں کے ویسے ہی نتائج ثابت ہیں جیسے کہ FAO کی تنظیم کے دوران واضح ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کام کا فائدہ اس لیے لیا تھا کہ وہ بنی نوع انسان کے لیے ایک بہتر دنیا پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے حقیقت پسندانہ انداز میں مسائل کے سلجھانے کی کوشش کی۔ 1944 میں UNRRA کی ایک نشست کے بعد انھوں نے کہا تھا، ”لہذا، UNRRA کو محض اپنا کام کر دینے پر ہی اکتفا نہیں کرنی چاہیے؛ بلکہ اس کو اتنے عمدہ طریقے سے کرنا چاہیے کہ آہستہ مگر ثابت قدمی

سے کام کرنے والی حکومتوں کو، بین الاقوامی امن کا ڈھانچا تیار کرنے میں دل لگا کر کام کرنے کی ہمت پیدا ہوا اتنی اچھی طرح کہ یہ مردوں اور عورتوں دونوں کو مثالی امید فراہم کرے جو، اگر یہ ڈھانچا اگر اتوا ایک بار پھر اس کے کھنڈر سے دب کر رہ جائیں گے۔“

1946 میں لیسٹر پیرسن آؤڈا واپس ہوئے جہاں انھیں 1948 میں امور خارجہ کا وزیر بنا دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ نو برس تک فائز رہے۔

اس عرصے کے دوران مسٹر پیرسن کا بہت ساری اہم کانفرنسوں میں کردار رہا جنہیں بین الاقوامی تنازعات کے حل ڈھونڈنے کا کام سونپا گیا تھا، مگر بین الاقوامی سیاست میں ان کا اہم ترین کام اقوام متحدہ کے ڈھانچے کے اندر ہی محدود رہا تھا۔

1945 میں سان فرانسسکو میں ہونے والی کانفرنس میں، جہاں اقوام متحدہ کے چارٹر کی تشکیل کی گئی تھی، وہ کناڈا کے وفد میں مشیر کی حیثیت سے شامل تھے۔ یہ ان لوگوں میں سے ایک تھے جنہوں نے کناڈا کی جانب سے بڑی طاقتوں کے لیے حق استرداد (veto power) کے خلاف دلائل پیش کیے تھے۔ یہ بحث انہوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں بھی جاری رکھی تھی۔ اس بات ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے 1950 کی United for Peace کی قرارداد کی بھی بہت تن دہی سے حمایت کی تھی۔ اس قرارداد میں اس امکان کو بھی شامل کیا گیا تھا کہ جب سلامتی کاؤنسل کے سامنے ایک حملہ آور جنگ کا مسئلہ پیش ہو اور کاؤنسل کو حق استرداد کے ذریعے اپنے فرائض ادا کرنے سے روکا جا رہا ہو تو، اڑتالیس کھنڈے کے نوٹس پر جنرل اسمبلی کا اجلاس بلا دیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ قرارداد بڑی طاقتوں کے حق استرداد کو کم زور کر رہی تھی۔

جہاں تک ان کے لیے ممکن ہوا، لیسٹر پیرسن نے اقوام متحدہ کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، تا کہ یہ ادارہ جتنی سے اور موثر انداز میں کام کر سکے۔

جب سے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا ہے، ایک کے بعد دوسرا بین الاقوامی تنازعہ کھڑا ہوا ہے اور ادارے کی اخلاقی قوت کو شدید امتحان درپیش رہا ہے۔

پہلا سب سے اہم تنازعہ جو اقوام متحدہ کے سامنے آیا وہ فلسطین کا سوال تھا۔ اس مسئلے پر 1947 میں ایک خاص اجلاس میں غور کیا گیا تھا۔ مسٹر پیرسن کو سیاسی کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا تھا اور مخصوص کمیٹی برائے فلسطین نے سفارش کی تھی کہ فلسطین پر برطانوی راج کو ختم کیا جائے اور یہ بھی کہ اس ملک کو یہودی اور عرب مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جنرل اسمبلی کے دوسرے اجلاس میں ان سفارشات پر غور کیا گیا۔ اس کے بعد تقسیم کے سوال پر ایک ایڈ ہاک کمیٹی میں بھی غور کیا گیا جس میں مسٹر پیرسن نے بڑے سرگرمی سے حصہ لیا۔

ان سفارشات کا ایک مثبت نتیجہ نکلا۔ فلسطین کے مسئلے کو کچھ عرصے کے لیے معرزیہ ایٹو میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے مسٹر بیرن نے جنرل اسمبلی کے ہر اجلاس میں حصہ لیا، سوائے 1955 کے اجلاس کے، جب کہ وہ 1952 میں اس کے صدر بھی رہے تھے۔ ہر بار انھوں نے قابل ذکر کام کیے۔ اگرچہ میں اس موقع پر پیش ہونے والے تمام مسائل کے بارے میں بات نہیں کر سکتا، میں صرف کوریا کے مسئلے پر کچھ کہنا چاہوں گا، جس میں وہ اس وقت تک کے لیے جنگ کو محدود کرنے کے حق میں تھے جب تک حملہ آور کو اپنے علاقے میں واپس جانے پر مجبور نہیں کر دیا جاتا۔ وہ ان لوگوں کے مخالف تھے جو جنگ کو اس وقت تک جاری رکھنا چاہتے تھے جب تک، بقول ان کے، ”فتح حاصل نہیں ہو جاتی۔“

کوریا میں ہونے والی لڑائی کے بارے میں بیرن نے خود کہا تھا کہ ”کوریا میں ہونے والی جنگ کے بارے میں آزاد قوموں کا عمل محدود تھا اور ان کا مقصد شمالی کوریا اور چینی عوام کی تباہی نہیں تھا، بلکہ لڑائی کو مقامی حدود تک رکھنا، حملے کو روکنا، اور اس کے بعد امن کی پیش بندی کے طور پر، جنگ بندی کو روکنے کے انتظامات پر مذاکرات کرنا تھا۔“

یہ الفاظ ان کے مثبت اور حقیقت پسندانہ رویے کو منعکس کرتے ہیں۔ صرف کوریا کے تنازعے پر ہی نہیں۔ یہی وہ تھا، یکساں طور پر وہ ہمیشہ جس پر قائم رہے۔ اگر اسلحے کے استعمال کے بغیر جنگ کو روکنا ممکن نہ ہو تو۔ ان کا مشورہ یہ تھا ہے کہ مقصد کے حاصل ہوتے ہی لڑائی بند کر دینی چاہیے، مزید آگے نہ بڑھیں، بلکہ ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کیجیے جس میں حتمی ہدف کا حصول ہی اصل مقصد ہو، یعنی امن۔

1956 میں دوسری بار دنیا کو قابل تصور حد تک جنگ کی بھڑکتی آگ کا سامنا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ کتنا قریبی لگتا ہے، اور ہم سب کو وہ تمام واقعات اچھی طرح یاد ہیں۔

1956 کے جولائی کے آخر میں اچانک مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کر دیا۔ ستمبر کے مہینے میں نہر سویز کا تنازعہ سلامتی کاؤنسل کے سامنے پیش ہوا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ایک امکانی حل نکال لیا گیا ہے۔

پھر، اکتوبر کی انتہی تاریخ کو اسرائیل کی فوجوں نے اس علاقے پر دھاوا بول دیا۔ تیس تاریخ کو فرانس اور برطانیہ کی جانب سے مصر کو دھمکی موصول ہوئی اور دوسرے دن ہی ان ممالک نے اس علاقے پر حملہ کر دیا۔

سلامتی کاؤنسل نے فوراً ہی حملہ آوروں کو لڑائی روک دینے کا حکم صادر کیا تھا مگر اس حکم کو برطانیہ اور فرانس نے حق استرداد (veto) کے ذریعے کالعدم کر دیا۔

اس کے بعد یہ مسئلہ جنرل اسمبلی میں پیش ہوا، اور نومبر کی دوسری تاریخ کو رائے شماری کے لیے ایک

قرارداد پیش ہوئی جس میں حملہ آوروں کو فوری طور پر جنگ بند کرنے کا حکم دیا جانا تھا۔

اس تجویز کے پیش ہونے سے پہلے، لیسٹر ہاؤس رات دن کانفرنسوں میں اور غیر سرکاری گفت و شنید میں کہتے رہے تھے کہ اس تجویز کو اتنا وسیع کر دیا جائے کہ اس کی بنیاد پر تنازعے کا حل بھی نکال لیا جائے اور امن قائم ہو جائے۔ اپنے عمیق تجربے، شہت روپے اور مستحکم عزم کے ساتھ انہوں نے واضح کیا کہ اس تجویز میں مسئلے کے حل کے لیے کوئی تدبیر نہیں پیش کی گئی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ معاملہ فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے اور یہ خطرناک واقعہ دنیا کو تباہی کے دہانے پر لے جاسکتا ہے۔

مگر لیسٹر ہاؤس بہت نہیں ہارے، حالات کہ دوسری نومبر کی پیش کردہ قرارداد سے وہ کچھ حاصل نہیں ہو سکا تھا جو وہ چاہتے تھے۔ ایسی نازک اور خطرناک صورت حال میں دوسرے راستے، تلاش کرنے ضروری ہو گئے تھے۔ نومبر کی چار تاریخ کو انہوں نے جنرل اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی جس میں میگزیری جنرل سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ جنرل اسمبلی کے سامنے اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں متنازعہ علاقے میں اقوام متحدہ کی فوج تعینات کرنے کا منصوبہ پیش کریں، جس کو علاقے میں جنگ بندی کرانے اور اس کی نگرانی کرنے کی ذمہ داری سونپی جائے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، یہ کام کر دیا گیا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد سے کبھی حالات اتنے گمبھیر نہیں ہوئے تھے جیسے کہ نہر سویٹزر کے تنازعے کے دوران تھے اور اقوام متحدہ کو اس سے پہلے کبھی اتنی بڑی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بہر حال، واقعی جو کچھ ہم اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جارحیت کے خلاف اخلاق کی قوت ایک بہتر فیصلہ ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حملہ آور طاقتوں کو طاقت آزمائی سے پہلے جھنجھٹے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ لہذا، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سویٹزر کا تنازعہ اقوام متحدہ کی فتح تھی اور اس آدمی کی بھی فتح تھی جس نے دنیا کو بچانے میں سب سے زیادہ کام کیا تھا۔ اور وہ آدمی لیسٹر ہاؤس ہی تھے۔

ہنگری کے انقلاب کے دوران لیسٹر ہاؤس نے جنرل اسمبلی کے فوری خاص اجلاس سے خطاب کیا تھا۔ انہوں نے بڑی شد و مد سے وکالت کی تھی کہ ایک بین الاقوامی خود مختار مقتدرہ کو ”ہنگری کے عوام کو اختیار دلانا چاہیے کہ وہ کسی خوف و خطر کے بغیر اپنی پسند کی ایک آزاد اور جمہوری حکومت قائم کریں“ پھر انہوں نے خود ہی سوال کیا، ”مگر کیوں؟“ اور پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا، ”کیا اب ہمیں ہنگری کے لیے بھی اقوام متحدہ کا ایک مشن قائم نہیں کرنا چاہیے، جب اس بات پر اتفاق کیا جا چکا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں اقوام متحدہ کی ایک مقتدرہ قائم کی جائے گی؟“

مگر، ہنگری کے انقلاب کے دوران اقوام متحدہ بالکل بے بس تھی۔

لیسٹر ہاؤس کو بارہا NATO کا نہایت سرگرم مددگار کہا گیا ہے۔ اس ادارے میں ان ممالک کے دفاع کے لیے، جہاں کی زندگی کا انداز جمہوری اور فرد کی آزادی کی بنیاد پر رہا ہے، انہیں دنیا میں امن اور انسانی

حقوق کو برقرار رکھنے کی ضمانت ملتی رہی ہے۔ وہ NATO ممالک کے مابین امداد باہمی کو سیاسی، اقتصادی اور سماجی میدانوں تک پھیلائے کے لیے بھی کوشاں رہے ہیں۔

لیسٹر پیرسن شاید آخری آدمی ہوں گے جسے اس بات پر یقین ہوگا کہ فوجی طاقت بالآخر امن قائم کر سکے گی۔ 1955 میں انھوں نے کہا تھا:

”نہ کسی فرد، نہ کسی قوم، نہ قوموں کے کسی گروہ کو اس بات پر اطمینان ہوگا کہ دنیا کے امن کا دارو مدار اجتماعی فوجی طاقت اور علاقائی سیاسی اتحاد کے ذریعے جنگ کو روکنے پر ہو سکتا ہے۔ جوہری ہتھیاروں کی تیاری اور فی الوقت چند بڑی طاقتوں، اور جلد ہی دوسری طاقتوں کے اسلحہ خانوں میں ان کی شمولیت کے پیش نظر بے اطمینانی بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے یہ زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ فوجی طاقت کو قائم رکھے ہوئے بھی، جنگ کے خطرات کو کم کرنے کی کوشش کی جائے اور رفتہ رفتہ اس طاقت کو غیر ضروری بنا دیا جائے۔“

بنی نوع انسان کی طویل داستان میں، محض اسلحہ، خواہ وہ کتنے ہی طاقت ور کیوں نہ ہوں، تا دیر تحفظ کے لیے کبھی کافی نہیں ہوئے ہیں۔ دفاع کے لیے آپ کی طاقت ان لوگوں کی کم زوری بن جاتی، جن کے خلاف آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو اپنے دفاع کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ آپ کا تحفظ ان کے لیے خطرہ بن جاتا ہے، لہذا وہ زیادہ اسلحہ میں اپنے لیے تحفظ تلاش کرتے ہیں۔ اور بھر ایک شیطانی چکر شروع ہو جاتا ہے جو ماضی میں ناقابل بیان بدبختی اور تباہی کا باعث ہوا ہے، اور اگر اس کو توڑا نہیں گیا تو اب یہ بنی نوع انسان کو صفحہ ہستی سے مٹا بھی سکتا ہے۔ تب تو کافی اجتماعی طاقت بھی اس کا آخری حل نہیں ہو سکتی۔ اور بالآخر اس کا مطلب یہ ہے کہ امن کی بنیاد کسی ایسی شے پر ہوئی چاہیے جو طاقت سے زیادہ پائیدار ہو۔“

لیسٹر پیرسن کا تخیل کسی خواب دیکھنے والے جیسا نہیں۔ وہ حقائق کی بنیاد پر اپنے تجربات کی روشنی میں زندگی کو اور دنیا کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا دوراندیش آدرش تجربات کے مواد سے تعمیر ہوا ہے۔

مجھے خود کو لیسٹر پیرسن کی جنگ کو روکنے یا بند کرانے والی کچھ اہم سرگرمیوں تک محدود دیکھنا پڑا ہے، اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں نے صرف ان کی کوششوں کے نتائج کی تفصیل پیش کی ہے، ان کی شخصیت کا زندہ خاکہ نہیں کھینچا ہے۔ یہ کرنا بھی کچھ آسان نہیں، جب معاملہ لیسٹر پیرسن جیسے آدمی کا ہو، کمیشنوں میں، اجلاسوں میں اور غیر رسمی نوعیت کے مباحث کے دوران، جن کا زیادہ تر کام سفارتی سطح کا رہا ہو۔

صرف وہی لوگ، جنھوں نے لیسٹر پیرسن کے ساتھ کانفرنسوں حصہ لیا ہو، ان کے آن تھک ارادوں اور کسی مسئلے کے حل کے لیے تعمیری خیالات پیش کرنے کی ان کی غیر معمولی صلاحیت کا مشاہدہ کر سکے ہیں۔ اگر ان کی پیش کردہ تجویز مسترد کر دی جاتی تھی تو وہ خوشامیدی کے ساتھ اپنی تمام تر کوشش کو ایک اور حل کی تلاش میں لگا دیتے تھے جس کو شاید وہ زیادہ آسانی سے قبول کرانے میں کامیاب ہو سکیں۔ ان کے نزدیک اہم بات یہ تھی کہ کوشش کبھی ترک نہیں کرنی چاہیے، بلکہ مطلوبہ ہدف کی طرف کم از کم ایک قدم آگے بڑھنا چاہیے۔

جب کوئی نہایت اہم مسئلہ درپیش ہو تو لیسٹر پیرسن مصالحتانہ رویے والے انسان نہیں رہتے، لیکن ان کا خیال ہے کہ بین الاقوامی مسائل پر مذاکرات کی بنیاد اس کوشش پر ہونی چاہیے کہ دوسرے فریق کو سمجھا جائے اور اس سے، درمیان کے نصف فاصلے تک، آگے بڑھ کر ملا جائے تاکہ اعتماد کی فضا پیدا ہو۔ صرف اسی وقت تصفیے کی امید پر مذاکرات آگے بڑھ سکتے ہیں جب اعتماد کی فضا تیار کر دی گئی ہو۔

بہر حال ایسے کام میں ان اصولوں سے غدار کی نہیں کرنی چاہیے جن کی بنیاد پر اقوام متحدہ قائم کی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اقتصادی اور سماجی ترقیات پر کام کیا جانا چاہیے جس سے افلاس دور ہو، کھل اور آزاد و خود مختار حکمرانی ہو اور آمرانہ حکومتوں سے دوری ہو، خواہ وہ اندر کی پیداوار ہوں یا باہر سے تھوپی گئی ہوں، ترقی پسندانہ انسانی حقوق، شخص و قار اور قد و انسانی کا حصول مرکزی مقصد ہو۔

لیسٹر پیرسن کو یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب اقوام متحدہ کے وسیلے سے تمام قوموں اور نسلوں پر مشتمل ایک عالمی سماج قائم ہوگا اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ ایسے آدرش کا، خواہ وہ کسی جیکر میں ہو، محض اعتراف ہی ہمیں اپنے مخالفین کے ساتھ بھی بنیاد کی قرابت کی یاد دلاتا ہے۔ یہ وہ قدر ہے جسے ہم، اگر ہم میں ذرا بھی انکسار ہو تو، کبھی پہنچ نہیں سکتے۔

لیسٹر پیرسن کے کام کو تناؤ اور نہ صرف قوموں، بلکہ نسلوں اور مختلف تہذیبوں کے درمیان، کھلے تنازعات کے زمانے میں بھی آگے بڑھایا گیا ہے۔ ساتھ ہی، ممکن کی ترقی نے ملکوں کو زیادہ قریب، اور ایک کو دوسرے کا دستِ ہجر کر دیا ہے۔ کوئی تنازعہ جو کسی بھی علاقے میں پیدا ہو جاتا ہے عملی طور پر پوری دنیا کو متاثر کر لیتا ہے۔

”اب ہم ایک عہد میں داخل رہے ہیں“ لیسٹر پیرسن کہتے ہیں، ”جس میں تہذیبوں کو پہلو بہ پہلو، پھر امن اور بدل کے ساتھ رہنا سیکھنا پڑے گا اور ہمیں ایک دوسرے سے سیکھتے ہوئے، ایک دوسرے کی تاریخ، قانون اور تہذیب اور آدوشوں پر غور کرتے ہوئے ایک دوسرے کی زندگیوں کو بڑھتی کرنا پڑے گا۔ اس چھوٹی سی مگر ضرورت سے زیادہ آبادی والی دنیا میں اس کے متبادل غلط فہمی، تناؤ، تصادم اور مصیبت ہی ہو سکتے ہیں۔“ یہ حقیقت کہ دنیا کو زردار اور بے زر کے درمیان انتخاب کی کیفیت کا سامنا کرنا ہوگا، اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہ ہمارے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ زندگی کو فوقیت ملے یا موت کی پہلے کے مقابلے میں ہم پر زیادہ لازم کر دیتا ہے کہ ہم صحیح راستے کا انتخاب کریں، ہمیں بین الاقوامی تنازعات کے سلجھانے میں کسی بھی قابل تصور طریقے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح کوئی بھی بدف حاصل نہیں ہوگا جب تک کہ وہ لوگ جن کا فرض تنازعات کا سلجھانا ہوتا ہے امن کے حصول کی کوششوں میں ماکام ہو جائیں۔

جیسا کہ لیسٹر پیرسن نے کہا ہے ”ہمارے زمانے میں ماکامی کی یا شدید غلطی کی۔ سزا پہلے سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ نئی نوع انسان کے لیے اب مزید غلطی کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔“

اب بھی، اس سے قطع نظر کہ دنیا کا منظر کیسا ہے، لیسٹر پیرسن قنوطی پر گز نہیں۔ اگر وہ قنوطی ہوتے تو، ان

کے پاس اتنی برداشت اور طاقت کہ اس سے آتی جو انہوں نے اپنے کام کے سلسلے میں دکھائی ہے۔ ان کی کوششیں ممکن نہ ہوتیں اگر زندگی کی نیک قوتوں کی آخری فتح کے طاقت ور عقیدے نے ان کی مدد نہ کی ہوگی۔ میں آخر میں، لیسنر جیسن کے ایک خطبے سے اقتباس پیش کرنا چاہوں گا جو انہوں نے پرنسٹن یونیورسٹی میں 1955 میں دیا تھا:

”حقیقت یہ ہے کہ، موت اور تباہی کے دیے ہوئے سرچیلنج کے مقابلے میں، ہمیشہ آزاد لوگوں ہی کی طرف سے جواب آیا ہے کہ: ”یہ ہرگز نہیں ہوگا۔“ ایسے جوابات سے انسان نے نہ صرف خود کو بچا لیا ہے، بلکہ اپنا مستقبل بھی یقینی بنا لیا ہے۔

کاش اس بار بھی ایسا ہی ہو، جب ہمیں جوہری مہم کے خوف ناک اور تباہ ناک ممکنات کا سامنا ہے۔“
صدر نشین نارویائی نوبل کمیٹی Gunnar Jahn کی نوبل

خطبہ:

امن کے چار چہرے

میرے لیے اس وقت اس سے بڑی کوئی مشکل نہیں کہ میں اس موثر اور میرے اپنے لیے، یادگار موقع پر اس آدرش اور مقصد کے مابین نشان کچھ کہوں جنہوں نے نوبل امن انعام کا تصور پیش کیا ہے۔ سب سے پہلے تو میں اس عظیم انسان، الفریڈ نوبل، کو اپنا خراج تحسین پیش کرنا چاہوں گا، جس نے اس انعام، اور دوسرے انعامات، کو ممکن بنایا ہے۔ تاریخ میں مثلاً ڈونا دربی کسی آدمی میں مثالیت پسندی اور حقیقت پسندی اتنی خوبی سے یک جا ہوئی ہیں، جیسی کہ اس میں۔ شاعری بھی اور عملی کاروبار بھی۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں اس کے ایجاد کیے ہوئے ڈائنامائٹ اور دوسری دھماکا خیز اشیاء کے بارے میں، اور یہ بھی کہ ان کے استعمال کے بارے میں اس نے کس طرح فریاد کی تھی۔ پھر بھی، تصورات بھی تو دھماکا خیز ہو سکتے ہیں، اور اس کے پاس بہت سے تصورات تھے جو اچھے بھی تھے اور امن اور جنگ دونوں سے متعلق بھی۔ وہ ”انسانی حقوق اور عالمی بھائی چارے“ کے بارے میں بات بھی کرتا تھا اور نگھتا بھی تھا، اور ان آدرشوں کو حاصل کرنے کے لیے کسی نے بھی، اب تک، اتنی محنت سے کام نہیں کیا ہے۔

میں اس لمحے بالخصوص اس کے جملے ”لمبی لمبی تقریریں امن کو یقینی نہیں بنا سکتیں“ کی فراست کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔

میں ایک بار پھر مانوے آنے پر بہت خوش ہوں، وہ ملک جس سے میری اپنی ذات دوستیوں کے باندھن، آزادی اور منفاہمت کے باعث بہت قریب رہی ہے۔ میں نے بہت سے بین الاقوامی اجتماعات میں

نارویائی مندوین کے ساتھ مرچور کر کام کیا، اور ان مجلسوں سے مجھے جولڈت ملی ہے وہ ان فوائد کے برابر ہے جو میں نے ان سے حاصل کیے ہیں۔

شاید آپ کو مجھے معاف کرنا پڑے، اگر میں اپنے ذاتی تجربے سے امن کے بارے میں کچھ اپنے الفاظ استعمال کروں۔ میرے عرصہ حیات میں مادی سائنس کے میدان میں اتنی بڑی اور زیادہ عالمی شان کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں جو پہلے کی صدیوں میں بھی نہیں ملی تھیں۔ اس کے نتیجے میں، وہ انسان جو 1507 میں زندہ تھا، 1907 میں ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ مطمئن رہا ہوگا جو صرف پچیس برس قبل مرے ہیں اور آج دوبارہ زندہ ہو جائیں۔

لیکن، انسان کی مادی ترقی اور سماجی اور اخلاقی ترقی کے درمیان ایک بڑی وسیع فلیج پیدا ہو گئی ہے، ایسی فلیج کہ اگر اس کو کم نہیں کیا، یا بالکل بٹا نہیں گیا تو ایک دن وہ اسی میں کھو جائے گا۔ انسان نے بیرونی خلا کو مسخر کر لیا ہے۔ مگر اپنے آپ کو مسخر نہیں کر پایا ہے۔ اگر کر لیا ہوتا تو وہ سائنسی کامیابیوں کے تباہ کن امکانات کی وجہ سے اتنا فکرمند نہ ہو رہا ہوتا جتنے کہ فکرمند ہم آج ہیں۔ مختصر یہ کہ اخلاقی احساس اور مادی طاقت کے درمیان آج توازن نہیں رہا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ عدم توازن بنیادی طور پر ہمارے زمانے کی بے ترتیب، ”خوف ناک بیس ویں صدی“ کے تنازعات کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔

میرا پورا رد و رجوع اسی بے ترتیبی میں گزرا ہے، بین الاقوامی تنازعات کی، خوف کی اور عدم تحفظ کی فضاؤں میں۔ میں ایک سپاہی کی حیثیت میں پہلے عالمی جنگ سے بچ نکلا تھا جب کہ میرے بہت سے ساتھی نہیں بچ سکے تھے۔ میں دوسری عالمی جنگ میں ایک غیر فوجی کارکن کی حیثیت میں ہوتے ہوئے بھی ایسے خطرے میں رہا ہوں کہ وردی اور بغیر وردی کے آدمیوں میں کوئی امتیاز نہیں رہ گیا تھا اور میں اس کے بعد سے زندہ ہوں، جیسے کہ آپ سب ہیں، باوجود مرد جنگ کے ایک طویل عرصے کے جس کے دوران ہم نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی میدان میں تباہی کی کامیابیاں حاصل کی ہیں، ایسی کہ اگر جنگ کا ایسا تیسری بار ہو جاتا ہے تو یہ جنگ مکمل نیستی کے امن پر منتج ہوگی۔

لہذا، میں مجبور تھا، اور مجھے کچھ موقع بھی مل گیا تھا، امن کے بارے سوچنے کا، 1914 کے بعد اپنی ناکامیوں پر غور کرنے کا، ان امکانات اور نتائج کے خوف سے کانپنے کا، اگر ہم اسی طرح ناکام ہوتے رہے۔ مجھے جنگ کے لیے اور اس کی فضولیت کی ایک چھبٹی ہوئی تمثیل اچھی طرح یاد ہے۔ یہ 1914-1918 کی لڑائیوں میں بہنے والے خون اور قربانیوں سے متعلق نہیں، لندن کی شہری تباہی سے متعلق ہے جو 1941 میں بمباری کی ابتلا سے ہوئی تھی۔

یہ آگ اور موت کی ایک لرزدہ خیر رات کے بعد کی ایک اداس صبح کی بات ہے۔ میں رات کی بمباری سے سگلتے ہوئے کھنڈر گھروں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ ایک دن پہلے یہاں سرخ اینٹوں سے بنے نفیس،

ستھرے اور عام درجے کے مکانوں قطار تھی جن میں مزدور خاندان بستے تھے۔ اب یہاں صرف لمبے کے ڈھیر تھے، سوائے ایک عمارت کے جس کی سامنے کی دیوار باقی رہ گئی تھی، جو شاید کسی قسم کے کمیونٹی کلب کا حصہ تھی۔ اس دیوار پر ایک کتبہ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا "1914-1918 کی عالمی جنگ کے دوران Alice Street کے بایسوں کی مقدس یاد میں، جنہوں نے امن کے لیے جان دی۔" آج Alice Street کے ان لوگوں کے بچے اور پوتے ایک بار پھر 1939-1945 کی زیادہ بڑی جنگ میں قربان ہو گئے ہیں۔ امن کے لیے؟ اکثر ایسا بھی وقت آتا ہے جب ایسا معلوم نہیں ہوتا۔

سچ کہ 1945 کے بعد سے امن کی باتیں ہوتی ہیں، جتنی میرے خیال میں، تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ کم از کم، ہم اس کے بارے زیادہ سنتے بھی اور پڑھتے بھی رہے ہیں، اس لیے کہ یہ انسان کے ادا کیے ہوئے الفاظ، اچھائی کے ہوں یا برائی کے، آسانی سے کروڑوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

اکثر و بیشتر الفاظ اچھے اور جوش دلانے والے بھی ہوتے ہیں، جو ہماری امیدوں کی، اور امن کے لیے ہماری دعاؤں کی تجسیم ہوتے ہیں۔ مگر جب ہم سب امن کے لیے دعا کر رہے ہوتے ہیں تو آزاد انسانوں کی طرح، ہمیشہ ان پالیسیوں کی حمایت نہیں کرتے جو امن کے لیے ہوتی ہیں، یا ان کو رد کر دیتے ہیں جو امن کے لیے [نہیں ہوتیں۔ ہم اپنی قسم کا امن چاہتے ہیں، جو ہمارے اپنے طریقے سے قائم کیا گیا ہو۔

پھر بھی، آج قوموں کے لیے متبادل انتخاب اتنا ہی آسان ہے جیسا کبھی افراد کے لیے تھا: امن کا یا فساد کا۔ کسی ریاست کی زندگی کی فرد کی زندگی کی طرح، مزبور طاقت اور ایک اکائی کی خواہش کے مطابق، خواہ وہ کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، سدھارا نہیں جاسکتا، مگر ایک گروہی اتفاق سے کیا جاسکتا ہے، مستقبل میں جس میں تمام ریاستوں کو شامل ہونا چاہیے۔ آج، مکمل تباہی کی طاقت سے لیس، ایک شکاری ریاست یا شکاری ریاستوں کا ایک جتنا، انفرادی شکاریوں کی طرح، برداشت نہیں کیا جاتا۔

تو پھر، ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ایک تعمیقی امن اور تحفظ قائم کیا جائے جس کی بنیادیں مستحکم ہوں۔ اس موضوع پر ہر دور کے عظیم مفکرین نے ہزاروں صفحے سیاہ کیے ہیں، لہذا، چند مرمی اور محدود خیالات میں آپ مجھ سے زیادہ کی توقع نہیں کر سکتے۔ بد قسمتی سے، میں انگریز نوبل ہی کے الفاظ میں "آسمانوں تک بلند کرنے کے لیے کچھ بلند خیالات" پیش نہیں کر سکتا۔

اس تمام میرا ارادہ بہت معمولی نوعیت کا ہے۔ میں مسکے کو اس کے چاروں پہلوؤں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ جس کو میں "امن کے چار پہرے" کہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہیں: امن اور خوش حالی یا تجارت، امن اور طاقت، امن اور پالیسی یا سیاست اور امن اور عوام۔

امن اور خوش حالی

امن کا ایک چہرہ قوموں کی خوش حالی میں منعکس ہوتا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر، ہم سب کی یادداشت

میں، اور اب، خیالات بہت تبدیل ہوئے ہیں اور میں کہوں گا کہ، یہ مزید تبدیلیوں کے عمل سے ہوا ہے۔ بہت زیادہ دن نہیں گزرے ہیں، جب جنگ کی وجوہ میں سب سے زیادہ اہمیت اقتصادی عناصر کو دی جاتی تھی۔ یہ اس وقت ہوتا تھا جب، اب کے مقابلے میں، لوگ ہم سے بڑھ کر، انسانی چال چلن میں بہت اہمیاک سے عاقلانہ مقصدیت تلاش کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے فلسفی اے جھکتے تھے، گویا اس میں حقیقی خود غرضی یا ذاتی منفعت کی نیت ہوگی، جو قوموں کو تنازعات کی طرف لے جاتی ہے۔ کسی حد تک ایسا تھا بھی۔ مگر اس صدی میں ہم نے، کم از کم، بیٹوں کی پیچیدگیوں کو زیادہ گہرائی میں جا کر سمجھنا سیکھ لیا ہے، جو ہم کو انفرادی اور قومی دونوں صورتوں میں اکساتی ہیں۔ ہمارے لیے اس کا کوئی کرڈٹ لینا عقل مند نہیں ہو گی۔ طعنہ زن لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ناقولیت کبھی اتنی واضح نہیں تھی جتنی کہ اب ہے، یا خصوصاً جنگ کے بارے میں۔

ہم اب جانتے ہیں کہ جدید جنگ کے طریقے میں، جو خاصے بڑے درجے پر لڑی جاتی ہے، کسی بھی فریق کو کسی قسم کا امریکی اقتصادی فائدہ نہیں ہوتا۔ جیت ہو یا ہار، سوائے بربادی اور تباہی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو کچھ بھی انسان کو لڑائی اور تکلیف، معذوری اور موت کی طرف لے جاتا ہے اس کے لیے مادی اعتبار سے نیت اب کسی طرح بھی ذاتی فائدے کی نہیں ہوتی۔

بہر حال، اگر ہم براہ راست جنگ کی وجوہ میں اقتصادی عناصر پر زیادہ زور نہیں دیتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دیر پا اور تحقیقی امن کے لیے ان کی زیادہ اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ لوگ اب محض تجارت کے لیے جنگ نہیں کرتے، مگر تجارت کی کمی ایسے حالات پیدا کر سکتی ہے جس میں لوگ جنگ کی طرف راغب ہو سکتے ہیں۔ رشتہ سیدھا سادہ ہے۔ ضروری نہیں کہ مفلس قوموں کے مقابلے میں امیر قومیں زیادہ امن سے محبت کرنے والی ہوں۔ ضروری نہیں کہ افلاس کے ساتھ عدم استحکام بھی ہو، لوگوں کو اپنی فصلوں یا اپنی ملازمتوں کے لیے خوف زدہ ہونا ضروری نہیں جو ایسا خوف، ایسا تناؤ اور ایسی محرومیاں پیدا کریں جن کی وجہ سے جنگیں ہوتی ہیں۔ مگر پریشانیاں اور افلاس۔ بالخصوص کروڑوں پیسے ہوئے ایشیائیوں اور افریقیوں کا جاگ اٹھنا۔ جنگ کے خطرات کو بڑھا سکتا ہے۔

اس بات کا احساس واقعی مشکل ہو گیا ہے کہ صرف میں برس قبل روئے زمین کے زیادہ حصے پر افلاس تقریباً ایک طے شدہ امر تھا۔ مگر بلاشبہ ہمیشہ کچھ تصور پرست رہے ہیں، اور 1939 سے قبل ایشیا اور افریقا میں عملی طور پر عام معیار زندگی کو بلند کرنے کے امکانات پر بہت کم غور کیا جاتا تھا، جس طرح آج اس کو ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ شاید صرف شمالی امریکا میں ہر آدمی خود کو ایک موٹر کار کا حق دار سمجھتا ہے، مگر ایشیا میں تو ایسے کروڑوں لوگ ہیں جو صرف خوراک اور آزادی کی توقع کرتے ہیں۔ اب وہ کسی طرح بھی نوآبادیات، بد نصیبی اور محرومی کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول نہیں کریں گے۔ ہمارے وقتوں میں بین الاقوامی سماجی ساخت میں ہونے والی تمام انقلابی تبدیلیوں کی یہی سب سے اہم وجہ ہو سکتی ہے۔

بچھلی بڑی جنگ تک، عمومی مادی ترقیات کی توقعات مغربی انسان سے مخصوص تھیں۔ اب، جنگ اور اس کے عواقب و نتائج نے کرہ ارض کے ہر حصے میں اقتصادی اور سماجی ترقیات کو ایک سیاسی ضرورت بنا دیا ہے۔ اگر ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں تو امن نہیں ہوگا۔ اب آفاق میں فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں جن کے بارے میں ہم، مغرب کے رہنے والے، بہت لاپرواہ ہیں۔ اس کے باوجود یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بیرونی خلا میں ہماری نظر کی وسعت کی ضرورت ہوگی۔

پہلے کے مقابلے میں آج، مسلسل افواہیں اور پریشانیوں کی بڑی اور ہم و جود بن گئی ہیں بین الاقوامی تناؤ کے ان حالات کی جو جنگ کو جنم دیتی ہیں۔ دوسری طرف، اگر ان نئی اور تعمیری طاقتوں کو جو آج انسانوں اور علاقوں میں مصروف بہ عمل ہیں، اور چند برس قبل بے حرکت اور مغلوب تھیں، تعاون اور پرامن ترقیات کی طرف موڑا جائے، تو یہ طاقتیں بنی نوع انسان کو جنگ کے خوف سے دور رکھ سکتی ہیں۔

آرنلڈ ٹاؤن بی (Arnold Toynbee) نے اس امید اور اس آدرش کی آواز کو بلند کیا تھا جب اس نے کہا تھا: ”آئیے دانی نسلیں بیسیویں صدی کو تنازعات اور ٹھٹھکی ایجادات کے عہد کی طرح نہیں، بلکہ ایک ایسے عہد کی طرح یاد رکھیں گی جس میں انسانی سوسائٹی نے پوری نسل انسانی کی بہبود کو ایک عملی ہدف کی طرح سوچنے کی ہمت کی تھی۔“

کاش، وہ بہت زیادہ خوشامیدی کا شکار نہ رہا ہو۔

میرا خیال ہے کہ اسی پس منظر میں ہمیں ان خیالات کے بارے میں اپنے رویے کو دوبارہ جانچنا چاہیے، جو کچھ عرصے سے زیادہ بیگانے ہو گئے ہیں۔ ہم میں انیسویں صدی کے اپنے بہت سے مفکرین اقتصادیات کو کٹھنی مانتے پرست سمجھنا ایک فیشن مابن گیا ہے۔ مثال کے طور پر، ہم نے آزاد تجارت کے پس پردہ چھپے ہوئے بلند سیاسی مقصد کو کم تر سمجھا ہے۔ اس کے باوجود کم از کم انگریزی بولنے والی دنیا میں، وہ آدرش رچرڈ کولڈن (Richard Cobden) نے جس کا نہایت پرجوش اظہار کیا تھا، صرف تجارت سے متعلق نہیں تھا۔ ان لوگوں نے قوموں کی آزاد اور دوستانہ سوسائٹی کا تصور پیش کیا تھا، جن کے لیے آزادانہ تجارت فوری طور پر اچھے تعلقات کی وجہ اور نتیجہ بن گئی تھی۔ یہ ہماری بیسیویں صدی پر ایک تلخ تذکرہ ہے کہ ”آزاد تجارت“ کے جیسے ہی کو ایک پرانا اور غیر حقیقی ہلہ دے دیا گیا ہے۔

ہم سب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جنگوں کے دوران کے افسردہ اور پریشان کن اقتصادی حالات میں اقتصادی قومیت کے تلامذہ کا ابھرنا ناگزیر تھا۔ مگر کیوں اسے مارے لوگ اسی طرح سوچتے رہے پر تیار نظر آتے ہیں، جب کہ حالات، جنہوں نے انہیں پیدا کیا ہے، اب مختلف ہیں؟

ہم کچھ ذرا زیادہ ہی قیاس کرنے لگے ہیں کہ انسان کا آج اس کے کل، اور اس بعد والے کل ہی جیسا ہوگا۔ کچھ معنوں میں آج کی اقتصادیات انیسویں صدی کی توسیعات سے کم ہی مختلف ہیں کہ وہ متدی اور پابندی کے بے قاعدہ عرصے سے متعلق تھیں، مگر وہ وقت کے لحاظ سے قریب ترین تھیں، اور وہ اب بھی ہماری

سوچ پر حاوی تھا۔

سائنسی اور تکنیکی دریا فیتوں جنھوں نے جنگ کو ہمارے لیے لانا تھا حد تک خوف ناک بنا دیا ہے، اسی تعامل کا حصہ ہیں جس نے ہم سب کو قریب رکھنے والے جال میں بن رکھا ہے۔ اس کے لیے ہم ایک جدید اصطلاح بنا ہی انحصار استعمال کرتے ہیں۔ لب لباب اس کا یہ ہے کہ یہ بالکل وہی کچھ ہے جسے انیسویں صدی میں اقتصادیات کے ماہر بین الاقوامی تجارت کے فوائد اور تقسیم کار (division of labour) کہا کرتے تھے۔ اصل فرق یہ ہے کہ بے حساب اقتصادی قومیت - جو مزدوری کی تقسیم میں اپنی رجعت پسندانہ رکاوٹیں کھڑی کیا کرتی تھی - اس وقت کے مقابلے اب کہیں زیادہ خلاف قاعدہ اور غیر منطقی ہے، جب انیسویں صدی کے روشن خیال دماغ اس کے خلاف تبلیغ کیا کرتے تھے اور کچھ عرصے جس کی تبلیغ کرتے تھے اس پر عمل کرانے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔

عام آدمی انبویہ جمہوریت کے اس دور میں اپنا اقتصادی ہدف جتنا بلند کرے گا، سیاسی استحکام اور امن کے لیے یہ اتنا ہی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم مل جل کر اتنی ہی آزاد تجارت کریں، تاکہ ہر علاقہ اور ہر آدمی تقسیم محنت کی مناسبت سے وہی کچھ کر سکے وہ جسے بہتر طریقے اور لیاقت سے کر سکتا ہو جو انیسویں صدی کی اقتصادیات کی بنیاد اور اس دور کے خیالات اور پالیسی کے مطابق تھا۔ کوئی اور ملک اس [مزا] کو مارے سے بہتر طور پر نہیں سمجھ سکا ہے، اور کسی بھی ملک میں امن کی لہر اتنی کھری اور اتنی پھیلی ہوئی نہیں ہے۔

اس منہجے میں، مابعد جنگ ہماری کارکردگی اس سے کہیں بہتر ہے جس کا اعتراف کرنا فیشن کے خلاف ہے۔ General Agreement on Tariff and Trade کے تحت تجارتی رکاوٹوں کو کم کرنے اور قومی حکومتوں کی تجارتی پالیسیوں کو منہج بنانے میں حقیقی ترقی ہوئی ہے۔ بلاشبہ اب تک اس کامرائی کی حدود دہی ہیں، اور اس میں پسپائی بھی ہوئی ہے، مگر ترقی زیادہ ہوئی ہے، اور ہمارے مقابلے میں وسیع علاقے میں زیادہ ہوئی ہے، بارہ برس قبل ہم میں سے کوئی بھی اعتماد کے ساتھ جس کی پیشین گوئی کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اب یورپی قومیں خود کو آگے بڑھ رہی ہیں، کامن مارکٹ اور اس سے منسلک تجارتی علاقوں میں، عوام کی اقتصادیات کی یکجہائی کی مہم کے ذریعے جو چند برس قبل لگی طور پر محض تصوراتی ہی محسوس ہوتی تھی۔ کیا اس باہمی اقتصادی نقش کو آگے بڑھانے کی پیشین گوئی بھی اب بھی اتنی ہی تصوراتی ہوگی؟ کیا اب وہ وقت آ نہیں گیا ہے جب ہمیں ایسے باہمی اقتصادی انحصار کے بارے میں سوچنا شروع کر دینا چاہیے جو بحر اوقیانوس پر پل کے مصداق ہو جو کم از کم ڈالر اور غیر ڈالر ممالک کے درمیان رکاوٹوں کو مسمار کر دے، جس نے، آئینی پردے کے بعد کی مابعد [مرد] جنگ میں One World کو تقسیم کر دیا ہے؟

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب بہت غیر حقیقی ہے۔ میں جواب میں صرف اتنا کہوں گا کہ پچھلے عشرے میں ہم نے آدمی کے سیاسی اور سماجی رویے میں بہت کھربے انقلابات دیکھے ہیں۔ یہ بہت الم ناک ہوگا اگر وہ

لوگ جو امن کے آرڈر کو چاہتے ہیں، جو قومی سطح کے مقابلے میں بڑے پیمانے پر سیاسی تعاون کے طلب گار ہیں، انہوں نے ہماری جدید دنیا کی اقتصادی تہذیبی کی رفتار کا کم تخمینہ لگانے میں غلطی کی ہے۔

جس طرح آج ہم معیار زندگی بڑھانے بغیر اور اس احساس کے بغیر کہ پورا سماج اس سے مستفید ہو جس میں دولت اور افلاس کی دو انتہائیں نہ ہوں، ایک مستحکم جمہوریت نہیں قائم کر سکتے، اسی طرح ہم ایک ہی سمت میں بڑھنے والی عمومی اقتصادی اور سماجی ترقی کے بغیر پُر امن دنیا تعمیر نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس پائے کا بڑھتا ہوا معیار زندگی رکھنا ہوگا، جس میں کم از کم بین الاقوامی سطح پر تمام قوموں کے درمیان موجود ہمواریاں بڑھنے نہ پائیں۔ ان غلطوٹ پر حقیقی ترقی کے لیے ہمیں اس سطح کی کارکردگی کی ضرورت ہوگی جو دنیا بھر میں آزاد ترین تجارت کے ذریعے، لوگوں کو ایک بندھن میں باندھے اور بین الاقوامی سرمایہ کاری اور اس کے پھیلاؤ کی بنیاد قائم کرے اور امید ہے کہ اس کے نتیجے میں امن قائم کرے۔

امن اور طاقت

اب میں امن اور طاقت کے موضوع کی طرف آنا چاہتا ہوں۔

ہر ریاست کو اپنی سوچ کے مطابق اپنے دفاع کے لیے مناسب انتظامات کا حق ہوتا ہے، بشرطے کہ یہ کسی دوسری ریاست پر بار نہ ہو۔ ہر ریاست اس بات سے انکار کرتی ہے کہ وہ اپنے دفاع کے علاوہ بھی کسی مقصد کے لیے فوجی طاقت اکٹھا کرتی ہے۔ درحقیقت، دنیا کے اس ٹکڑے کے خوف کے اور تحفظ کے غرض سے میں کسی بھی ریاست کے لیے اس قسم کا انکار مناسب معلوم ہوتا ہے، خواہ اس کے انتہائی مقاصد اور اس کے رہنماؤں کی پالیسیاں مضامین کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں۔

مزید یہ کہ بجز اس کے کہ اس کی افواج اس قسم کی لڑائی کے ارادے رکھتی ہوں، جیسے کی تیسرے عشرے میں ماس ریہناؤں کے صفحہ امکان یہ ہوتا ہے کہ ہر ریاست اپنے وسائل اور دولت کا ضرورت سے زیادہ حصہ اپنے دفاع کی طرف موڑ دیتی ہے۔ اسلحہ جات کا اقتصادی بوجھ اب تقریباً ناقابل مزاحمت ہو گیا ہے، اور جہاں رائے عامہ حکومت پر دباؤ ڈال سکتی ہے وہاں دباؤ ہمیشہ بذوق کے لیے کم سے کم ہوتا ہے اور دال دلیا کے لیے زیادہ سے زیادہ۔

اس کے باوجود ریاست پر طاقت کے ذریعے دفاع پر خرچ کرنے کو اقتصادیات کے علاوہ دوسرے عناصر کی روشنی میں کیا جانا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسی طاقت اگر دوست ممالک کی دفاعی فوجی طاقتوں کے اشتراک اور تعاون سے نہ ہو تو امکان اس بات کا ہوتا ہے کہ ہمارے الفاظ میں، یہ فضولی ہوگی، تحفظ اور روک تھام دونوں کے لیے اس قسم کا تعاون عموماً ریاستوں کے اتحاد پر منتج ہوا کرتا ہے۔ یہ ضروری ہو سکتا ہے اس دنیا میں ہم جس میں رہ رہے ہیں، مگر وہ ایک ممکنہ جنگ کے علاقے کو اس امید پر نہیں بڑھاتے کہ زیادہ

اور متحدہ طاقت کسی قسم کی جنگ کو روک دے گی۔ جب وہ کردار میں خالصتاً دفاعی ہوں تو، ایسے اتحاد آسمان فتح کے لالچ کو پیچھے ڈال کر امن قائم کر سکتے ہیں۔ مگر وہ کبھی پوری اقوام متحدہ سمیت بڑے اتحاد کے دوسرے بہتر نعم البدل سے زیادہ نہیں ہو سکتے، جسے امن کا تحفظ کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا، مگر اب وہ اکثر سرد جنگ کی جولاں گاہ بنی ہوئی ہے۔

مزید یہ کہ جو طاقت آپ اور آپ کے اتحادی اپنے تحفظ کے لیے اکٹھی کر سکتے ہیں شراب بین الاقوامی فضا میں بڑھ جاتی ہیں، یا کسی اور کے تحفظ کو بڑھاتی محسوس ہوتی ہیں۔ اور ایک شیطانی چکر شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا ماضی میں نتیجہ کبھی امن نہیں ہوا ہے، بلکہ جنگ ہی بھڑک اٹھی ہے۔ بین الاقوامی تناؤ کے خوف کے باعث تیار کیے جانے والے اسلحہ، سوائے ایک قلیل مدت کے، کبھی امن قائم نہیں کر سکتے ہیں۔ میں کسی مختصر عرصے کی ضرورت کے بارے میں نہیں بلکہ طویل عرصے کی اثر پذیری کے بارے میں بحث کر رہا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہ [اسلحہ] سانس لینے کا موقع فراہم کرتے ہیں جس کے دوران ہم ایسے تحفظ کی بہتر بنیاد تلاش کر سکتے ہیں جو خود بھی اسلحہ میں کمی پر منتج ہوتا ہے۔

ابنائی تحفظ کے یہ اتحاد محدود ہوتے ہیں علاقے میں، اور مخصوص ہوتے ہیں اپنے کردار میں۔ اور یہ مخالف اتحاد بننے پر اکساتے ہیں۔ مثال کے طور پر، آج ہم اس نقطے پر پہنچ چکے ہیں جہاں دو-۳ اور صرف دو- طاقتوں کے بہت بڑے بڑے ذخیرے سامنے آئے ہیں۔ ایک دوسرے کو خوف سے لگا رہے ہیں اور دنیا اس خیریت میں ہے کہ اب کیا ہوگا۔

اگر اقوام متحدہ تحفظ کے ایک ادارے کے طور پر مؤثر ہوتی۔ جو نہیں ہے۔ تو یہ زیادہ محدود و انتظامات غیر ضروری بھی ہوتے اور نا پسندیدہ بھی۔ مگر اس کے ہوتے ہوئے، کیا ہم اقوام متحدہ کو کچھ طاقت فراہم نہیں کر سکتے جو۔ اسمبلی کی اجازت کے تحت۔ کم از کم چھوٹے تنازعات سے نمٹنے اور ان کو بڑی جنگ میں تبدیل ہونے سے روکنے میں کارآمد ہو سکے؟

یقیناً، امن میں خلل ڈالنے والے کسی بڑے کے خلاف ایک بین الاقوامی فوج کا خیال آج نا معقول سا ہی لگتا ہے۔ مگر کم از کم ایک برس قبل سویٹزر کے معاملے کے پردے میں ہم نے ایک بین الاقوامی فوج تعینات کر کے صحیح سمت میں قدم اٹھایا تھا۔ اس فوج کی پیدائش اچانک جراحی جیسی تھی۔ اور نو زائیدہ کا استقبال پس بنیادی سنا تھا، جب کردائیوں کے لیے۔ جن میں سب اہم ما روے تھا۔ نہ کوئی مثال تھی اور نہ تجربہ جو اس کی رہنمائی کرتی۔ پھر بھی، UNEF، جو خالص اور اپنی نوعیت کی پہلی بین الاقوامی پولیس تھی، حرکت میں آئی تھی۔

اس کی تنظیم بڑی تیز رفتاری سے کی گئی تھی اگرچہ اس کی خدمات محدود تھیں اور اس کا اختیار واضح نہیں تھا۔ اور اس کا کریڈٹ سب سے پہلے تو اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل اور ان کے مددگاروں کو دیا جانا چاہیے۔

چار بڑا عظیموں سے اقوام متحدہ کی رکن نو قوموں کے افراد پر مشتمل UNEF بلند جذبوں اعلیٰ مقصد کے ساتھ، تنازعے میں الجھی فوجوں کے درمیان، آگے بڑھی تھی۔ اقوام متحدہ کے پیرامن نیلے رنگ کے نشان کے

تھے، اس نے بھڑکتی ہوئی سرحد پر کم از کم تمام سب ملکوت قائم کیا ہے۔ اس نے گھمائی کی ہے اور جنگ بندی کرانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

جو کچھ ہوا ہے میں اس کی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کر رہا ہوں۔ اس علاقے میں امن نہیں ہے۔ اقوام متحدہ میں اس فوج کے کردار اور مستقبل کے بارے میں اتفاق نہیں ہے۔ بڑی طاقتوں کے درمیان چیخوش میں یا ان کے مقابلے میں یہ بے کار ہو گئی۔ مگر اس نے پچھلے برس سوئیز میں، صرف ایک جھڑپی میں لگی آگ کو سب کچھ جلا دینے والی بھیانک آگ بننے سے روکا ہے، اور مستقبل میں اس قسم کے حالات میں پھر کام آ سکتی ہے۔

کم از کم ہم نے ضروریات تو کی ہے۔ اگر اس بنیاد پر ہم کچھ زیادہ مستقل اور طاقت ور چیز تعمیر نہیں کرتے، تو ہم ایک بار پھر حقیقتوں کو نظر انداز کرنے، مواقع کو مسترد کرنے اور اپنے اعتماد سے فطرتی کے مرتکب ہوں گے۔ کیا ہم کبھی کچھ نہیں سیکھیں گے؟

آج، کیا ہم بغیر کسی طاقت کے اپنا دفاع کر سکتے ہیں، اس لیے کہ تباہ کن جوہری میزائل کے آگے کوئی بھی طاقت موثر نہیں ہوتی؟ درحقیقت، اس کی طاقت نے ہی اس کے استعمال کو ناقابل برداشت بنا دیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے انتقامی استعمال سے جس قسم کی ہلاکت خیزی ہوگی۔ اس کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ لہذا، امن باقی ہے مگر دہشت کی میزان پر بے اطمینانی سے جھول رہا ہے، اور پوری طاقت کا استعمال اس لیے ناکام ہو رہا ہے کہ اس کا جواب مکمل تباہی پھیلائے گا۔ امن کی بہر حال، اس کا بنیاتی خود کشی کے لرزاں استرداد سے زیادہ اہم ہونا ہوگا۔

میرا اور ناقابل فرار حقیقت یہ ہے کہ آج ہم اپنی سہرا کی کا دفاع نہیں کر سکتے، اس لیے کہ مکمل جنگ کا مطلب مکمل تباہی ہے، اور اگر جنگ ایک پالیسی کی طرح استعمال کی جاتی ہے تو آخر کار ہمیں مکمل جنگ کا سامنا ہوگا۔ اس لیے، امن کا بہترین دفاع طاقت سے نہیں بلکہ جنگ کی وجوہ کو دور کرنے سے، اور بین الاقوامی معاہدوں سے ہوگا جو امن کو زیادہ محکم بنیادوں پر قائم کریں گے، بجائے تباہی کے خوف کی بنیاد پر۔

امن اور پالیسی

لہذا، امن کا تیسرا رخ پالیسی اور سیاست ہے۔ اگر ہم بین الاقوامی طور پر اس محاذ پر کچھ متخیل اور کچھ تمہید، غزم اور قربانی، کا مظاہرہ کر سکیں، یہ دکھانے کے لیے کہ دفاع کی منصوبہ بندی اور ترقیات کے معاملے میں منظر نامہ اس سے بہتر ہوگا، جیسا کہ ابھی ہے۔ سنگ دل حقیقت، بہر حال، یہ ہے کہ ہم جنگ کی تیاری تو پیش از وقت پیدا غفرتوں کی طرح کرتے ہیں اور امن کی تیاری عقل سے عاری ہونوں کی طرح۔

ہماری پالیسی اور سیاست۔ جس طرح سرد جنگ میں دونوں حریف ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔ ایسی سخت گیر اور دفاعی ہوتی جا رہی ہے جیسے چالیس برس قبل متحدوں میں جنگیں لڑی جاتی تھیں، جب دونوں

حریف گہری سے گہری خمدیں کھودتے اور اپنے اپنے گڑھوں میں ہی قیام کرتے تھے۔ پہلے کی جانے والی فوجی حرکت بغیر کسی فائدے کے کشت و خون پر منتج ہوتی تھی، اس لیے، کچھ وقت کے لیے، ہر قسم کی حرکت سے پرہیز کیا جاتا تھا۔

ضروری ہے کہ ہمیں آج کی بین الاقوامی پالیسی میں اس قسم کی خطرناک بے حرکتی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اصل ذمہ داری اس مقصد کے لیے دو بڑی طاقتوں کی ہے، ریاست ہائے متحدہ اور سوویت یونین کی۔ کوئی پیش رفت نہیں ہوگی اگر ایک فریق محض آواز لگائے ”ہم بددیت“۔ جو ایک بانجھ تصور ہے۔ اور ”چوٹی کی میٹنگ میں بات چیت“ کی جب کہ دوسرا جواب میں کہے ”دلائل نہیں“، ”h good talk“ کے بغیر مذاکرات نہیں ہوں گے۔“

انجھے ہوئے خوف ناک مسائل کے حل کے لیے، جو آج ہمیں خوف اور لڑائی کے ذریعے تقسیم کیے ہوئے ہیں اور طاقت کے دونوں بلاک امن کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں ہمیں ایک نئے اور قوی عزم کی ضرورت ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو بحث اور مذاکرات میں نئی تکنیک استعمال کی جائے۔ ہمیں مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے، ایک ایک کر کے، درجہ بدرجہ، اگر اچھا وکی بنیاد پر نہ ہو سکے، تو کم از کم یا ہی برداشت اور اپنے مفاد کی خاطر ہی سہی۔

میں دو بڑوں یا تین بڑوں یا چار بڑوں کی اعلیٰ سطحی، قابل دید ملاقات کی وکالت نہیں کر رہا ہوں، جہاں قدم رکھنا محال ہو جہاں تیز ہوائیں چل رہی ہوں، مگر صاف کوئی، سنجیدگی اور مکمل تہاڑے خیالات کے ذریعے۔ بالخصوص ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان۔ سیاسی اور سفارتی وسیلوں سے ملاقاتیں ضرور ہونی چاہئیں۔ ایسے تہاڑے خیالات کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مغرب اس بات کا اقرار کرے کہ ایسے کچھ مسائل ہیں، جیسے جرمنی کی کھپائی اور مشرق وسطیٰ کا استحکام، سوویت یونین کی شمولیت کے بغیر جن کا حل ہونا ممکن نہیں۔ جہاں جہاں، کسی علاقے یا کسی مسئلے میں اس ملک کو اپنے تحفظ کو یقینی بنانے کا جائز حق ہے اس کو وہاں وہاں ان میں شامل کیا جانا چاہیے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ بدلے میں، سوویت یونین بھی اس بات کا احترام کرے کہ بغیر کسی بیرونی مداخلت کے یا اندرونی قوتوں کی ہمت افزائی یا باہر سے آنے والی امداد سے تخریب کاریوں کے، عوام کو اپنی حکومت کی نوعیت کا خود فیصلہ کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔

اس نوعیت کے راستے میں، جیسا کہ میں سمجھتا ہوں، پھر دوپے والی پیچیدگیاں، مشکلات اور خطرات موجود ہیں۔ پھر بھی، جتنی بڑی مشکلات ہوتی ہیں، اتنی ہی طاقت سے ان کو حل کرنے کی کوشش کی ضرورت ہوگی، دونوں حریفوں کی جانب سے اور براہ راست گفت و شنید سے، تاکہ پہلے ہی قدم میں ان سب مشکلوں کو بے لباس کر دیا جائے یا بالکل باہر کر دیا جائے۔

شاید اس قسم کی سفارتی کوشش کامیاب نہ ہو۔ مجھے ان کی پیچیدگی، بلکہ ان کے خطرات کے بارے

میں کوئی خوش فہمی نہیں۔ ایک شمالی امریکی ہوتے ہوئے، میں محض اتنا کہنا چاہوں گا کہ ہمیں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ ایسی کسی ناکامی کی ذمے داری ہماری نہیں ہوگی۔ سب سے پہلی ناکامی تو یہ ہوگی کہ کوشش کرنے سے انکار کیا جائے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم آگے بڑھیں، صرف طاقت کے مل پر نہیں، بلکہ دانش مندی اور خود اعتمادی سے، تاکہ معاہدوں کے امکانات پر توجہ مرکوز کی جائے، بجائے اس کے کہ ماضی کی غلطیوں ناکامیوں یا خرابیوں پر اختلافات ہوں۔

یہ حماقت ہوگی اگر تیز، آسان اور مکمل حل کی توقع کی جائے۔ یہ توقع کرنا بھی حماقت ہوگی کہ لڑائی اور خوف اچانک قائب ہو جائیں گے بلکہ اس کے برعکس، یا اس سے بڑی حماقت یہ ہوگی کہ کچھ نہ کیا جائے کہ بیٹھ جائیں اور جواب دیجیے میزائل کا میزائل سے، توپن کا توپن سے اور پابندی کا پابندی سے۔ یہ پالیسی اور سفارت کا مکمل دیوالیہ پن ہوگا، اور اس سے امن نہیں ہوگا۔

امن اور عوام

اس مضمون کے آخری درجے پر، میں عوام کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں کہ امن سے ان کا سب سے اہم رشتہ کیا ہوگا؛ یہ حقیقت ہے کہ پہلے سے گھٹان آباد کردہ ارض کی آبادی میں ہر سال تیس ملین افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں اس سچائی کی تفصیل میں نہیں جانا چاہوں گا کہ امن، بالآخر، افراد کے دلوں اور مافوں میں محض مجموعی احساس اور جذبات کی صورت میں ہوتا ہے۔

[سترہویں صدی عیسوی کے ہلندیزی فلسفی] اسپینوزا (Spinoza) نے کہا تھا، ”امن وہ نعمت ہے جو روح کی نیکی سے پیدا ہوتی ہے۔“ بلاشبہ اس کا مطلب تھا کہ تخلیقی امن خردی نیکی اور نعمت کا کل حاصل جمع ہوتا ہے۔ مگر ماضی میں انسان بد قسمتی سے اکثر اس امن کا ان طریقوں سے اٹھار کیا کرتا تھا جو نیکیوکاری کے بجائے زیادہ طاقت ور ہوتے تھے۔

تکمرانوں اور حکومتوں کے لیے آدمی کو جنگ کے لیے اکسلا زیادہ آسان ہوا کرتا تھا۔ دراصل، جب لوگ اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں آزاد ہوتے تھے، تو اکثر وہ اپنی حکومتوں کو زیادہ جنگجو ہونے کے بجائے زیادہ پرامن ہونے پر برا کہا کرتے تھے۔

شاید یہ اس حقیقت کی وجہ سے ہوتا تھا کہ ماضی میں انسان تنازعات کے باعث رنجی ہونے، درد میں مبتلا ہونے یا موت سے خوف کے بجائے تنازعات سے پیدا ہونے والی نیکیاں بے قراری اور ممکنہ فتوحات سے ملنے والے انعامات کی طرف زیادہ کھینچتے تھے۔

مزید یہ کہ پہلے زمانے میں، جنگ کا دارما زیادہ زیادہ دست اور تکین ہوتا تھا اس لیے کہ یہ عام زندگی کی بے رنگی سے روحانوی علاحدگی کا احساس فراہم کرتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو، ہر بار، شروع ہونے سے پہلے

جنگ زیادہ پسند ہوتی تھی۔

کنناڈا کے ماہر نفسیات ڈاکٹر G.H. Stevenson نے ایک بار کہا تھا، "قومی رہنما لوگوں کو لڑائی بھڑائی کے رویوں کی طرف بڑی آسانی سے راغب کر لیتے ہیں۔ کسی بھی قسم کی لڑائی بھڑائی زیادہ تر آدمیوں پر ایک قسم کا تنویدی (hypnotic) اثر ڈالتی ہے۔ ہم آدمی لوگ جنگ کو پسند کرتے ہیں۔ ہم پسند کرتے ہیں، اس کے پیدا کردہ جوش کو، بیجان اور جاوید کو، اور پابندی سے آزادی کو۔ ہم سماجی طور پر اس کے منظور کردہ تشدد کے مواقع کو پسند کرتے ہیں۔ ہم پسند کرتے ہیں، اس کے فراہم کیے ہوئے اقتصادی تحفظ کو اور شہری محنت کی ایک رنگی سے چھٹکارے کو۔ ہم پسند کرتے ہیں، بہادری کے لیے دیے جانے والے انعامات کو، سفر کے لیے ملنے والے مواقع کو، مرد کی دنیا میں مرد کی رفاقت کو، اور اس کی نشر آور قدرت کو۔ اور ہم موت سے آنکھیں لڑانے سے محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ نفسیاتی کم زوری امن کے طور پر لیتے کے لیے مسلسل ڈراوا ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم کو محفوظ رکھا جائے ان کم زوریوں سے، اور ان رہنماؤں سے جو اس کم زوری سے فائدے اٹھاتے ہیں۔" شاید یہ سب اب بدل چکا ہے۔ یقیناً، جنگ میں اب چمک دکھ نہیں رہ گئی ہے۔ انیسویں صدی کے پتلی مگر دلیرانہ عرصہ تکیر اب صنعتی تکیر بن چکی ہے۔ اب سودا کے ہاتھ میں یا تو "تجرباتی ٹی" (Test Tube) ہے یا اس کی انگلی جو مری جن پر ہے۔ آدمی کے جذبات پر اس کا منفیہ اثر ہونا چاہیے۔ اس کو نتائج کا احساس ضرور ہونا چاہیے، اور جب وہ جن دبائے تو [اس کے دلانے کی] دیکھ پر بھی اس کا منفیہ اثر ہونا چاہیے۔

عوام اور امن کا ایک اور مطلب ہے۔ جب تک عوام ایک دوسرے کو سمجھ نہ لیں، امن کیسے ہو سکتا ہے، اور یہ کس طرح ہو سکتا ہے، اگر وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے؟ کیا ہی ہم بدویت کس طرح ہو سکتی ہے اگر سب ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہوں، اگر انھیں ایک دوسرے کو زیادہ جاننے کی اجازت نہ ہو؟ لہذا ہمیں رابطے اور آمد و رفت کے خلاف تنے ہوئے پر دیوں کو چاک کر دینا چاہیے۔

مجھے احساس ہے کہ رابطے کا مطلب مزاحمت بھی ہوتا ہے اور دیوتی بھی، کہ لاطینی نیک نہاد ہو سکتی ہے اور تنہائی صلح جو۔ مگر میں اس کے بارے بھلا کیا کہہ سکتا ہوں کہ ایک کو دوسرے کے بارے میں جان بوجھ کر بدخواہی سے جھوٹی خبر دی جائے۔ اس کی ہمت افزائی کرنا۔ یا اس کی اجازت دینا۔ لوگوں کے درمیان بہتر رشتوں کے لیے خلوص کا سخت امتحان ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر، مجھے خود یقین ہے کہ وہی لوگ امن کی خواہش رکھتے ہیں۔ میں اس لیے اور بھی یقین کر رہا ہوں کہ ان میں سے بہت لوگ سمجھتے ہیں کہ امریکی ان کو جنگ سے جھکا رہے ہیں کہ ان پر حملہ ہونے کا خطرہ ہے۔ لہذا میں بھی ایسے حالات میں ایسا ہی سمجھوں گا، اگر مجھے متوازن اور معروضی اطلاعات نہ ملیں کہ ریاست ہائے متحدہ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ سامی طرح، سودیت یونین کے بارے میں ہمارا مغربی خوف بھی جزوی طور پر اس ملک کے لوگوں کے بارے میں معلومات کی کمی و جد سے رہا ہے۔

مادامی کی وجہ سے ہونے والی اس قسم کی غلط فہمی خوف کو جنم دیتی ہے، اور خوف امن کا سب سے بڑا

دشمن رہا ہے۔

مشترک خوف، جس کا مطلب ہوتا ہے ایک مشترک دشمن، جو بد قسمتی سے طاقت ور ترین قوت ہوتا ہے، جو لوگوں کو یک جا کر دیتا ہے، مگر کسی اور شے کے خلاف۔ بیرونی خلا کی فتح میں شاید اس نوعیت کے امکانات ہو سکتے تھے۔ سیارگان کے درمیان سرگرمیاں ہمیں سیارگان کی امن دے سکتیں گی۔ زمین کی فضا میں ایک بار ہم مریخ کے خلائی جہاز منڈلاتے دیکھ لیں تو ہم سب ایک ساتھ ہو جائیں گے۔ اور قومیں مل کر، ایک واقعی متحدہ اقوام متحدہ میں چلا کر گئیں گی۔ ”ہمیں اس طرح دھمکانے کی انھیں ہمت کیسے ہوتی۔“

بہر حال، اس وقت مجھے اس بد قسمت حقیقت کا زیادہ احساس ہے کہ بجائے امن کے، لوگ جنگ کی صورت میں جلد متحیر ہو جاتے ہیں؛ امید کی بنا پر نہیں خوف کی وجہ سے۔ جہاں عام لوگوں کی خواہش کی بنیاد پر ایک ہو جاتا ہے تو عسکری معنوں میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حملہ جنگ ہو سکتی ہے۔ کسی قوم کے حالات جنگ میں ہونے کا مطلب ہوتا ہے کہ تمام لوگ جنگ میں شامل ہیں اور یہ صورت امن حاصل کرنے یا قائم کرنے میں زیادہ مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔

جب ہر شخص براہ راست جنگ میں شریک ہو تو ایسا امن حاصل کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے جس میں مستقبل کی جنگوں کے سچ نہ ہوں، مثلاً پولین کے زیر نگین فرانس سے امن حاصل کرنا نسبتاً آسان تھا، اس لیے کہ دشمن کے ذہن میں وہ عام فرانسیسیوں سے بالکل الگ تھا، جب کہ ہٹلر کے زیر نگین جرمنی میں ایسا نہیں تھا، کہ وقت کے عمومی غصے کے باعث جرمنی کا ہر باشندہ دشمن لگتا تھا۔

اب میں اپنی آخری بات کی طرف آنا چاہتا ہوں۔ اگر لوگ آزاد نہیں ہوں تو تعلیقی اور دیر پا امن نہیں ہو سکتا۔ شخصی اور قومی جبلت کو تباہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا کرنے کی کوشش میں آمرانہ حکومتیں نہ صرف اندرونی بلکہ بین الاقوامی تنازعات کھڑے کر دیتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قانون کے ماتحت اقتدار کا سوہرائی کی بنیاد اور امن کے محافظ کے طور پر احترام کیا جانا چاہیے۔ انسان کی زندگی کے ہر حصے اور خیالات میں ریاستی طاقت کی تجاوزات اقتدار کے غلط استعمال کے مترادف ہوتی ہیں، اور یہ عمل آزادی کا تباہ کرنے والے اور حقیقی امن کا دشمن ہوتا ہے۔

بالآخر گھوم پھر کر سارا قضیہ ہمیشہ عوام کی طرف واپس جاتا ہے، ایسی ہی فرد اور چیلنج کے اس کے رد عمل کی طرف جس کا اسے سامنا ہوتا ہے۔

ایسے حالات کے اپنے رد عمل میں اسے ایک فرد کی طرح ملنا پڑتا ہے، اور فرد اس حقیقت کو قبول کرتا ہے کہ وہ اکیلا، گروہ یا سوہرائی کے مقابلے میں، غالب نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ عوام کی خواہش کے خلاف غلبے کی کوشش کرتا ہے تو مشکل میں پڑ جائے گا، تو وہ مصالحت کر لیتا ہے اور، متفق ہو جاتا ہے اور برداشت کر لیتا ہے۔ نتیجے کے طور پر لوگ اپنی قومی سوہرائی میں جنگ یا پٹیل کے بغیر عام طرح زندگی گزارتے ہیں۔ لہذا ایک دن بین الاقوامی سوہرائی میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اگر امن چاہیے تو مصالحت، برداشت اور اتفاق ہونا ہوگا۔

ہم اس آڈیشن سے اتنے دور نہیں کہ مایوسی اور شکست خوردگی کو راہ دینا آسان ہوتا ہے۔ مگر اس کے مخالف کے خلاف ایسا راستہ اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی کہ یہ جلد بازی اور غیر منصفاانہ عمل کی طرف لے جاتا ہے۔

میں اس نکتے پر ایک عظیم امریکی جج Learned Hand کا حوالہ پیش کرنا چاہوں گا: ”میری نوع انسان جن مسائل کو سلجھانے پر آمادہ ہوتی ہے، وہ کبھی نہیں سلجھتے۔ وہ اس لیے حل نہیں ہوتے کہ وہ حل کے قابل نہیں ہوتے، یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ قابل موافقت نہیں ہوتے۔ مخالف ہڑے کسی حل پر بہت کم راضی ہوتے ہیں، اور تنازعہ حل ہوئے بغیر ماضی کی چند لکوں میں گم ہو جاتا ہے، اگرچہ شاید وہ تاریخ بن کر دوبارہ ابھر بھی سکتا ہے اور اس پر لڑائی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ قائب بھی ہو جاتا ہے اس لیے کہ اس کو کسی قسم کی مصلحت سے بدل دیا جاتا ہے، جو اگرچہ کسی فریق کو پوری طرح قبول نہیں ہوتا، پھر بھی فتح کا ایک قابل برداشت نعم البدل پیش کرتا ہے، اور وہ جسے نعم البدل ملتا ہے اسے تجربے کی زیادہ سے زیادہ قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے، ایسا تجربہ جو دل کو بیاض بنا دیتا ہے اور اس کے ذہن کو دھڑے کے دلوں کو سمجھنے کی صلاحیت دے دیتا ہے۔

اس کے باوجود بیاض اور مفاہمتی دل رکھنے والے، اور اپنے عمومی انفرادی طور طریقے میں پرامن جبلت رکھنے والے لوگ لڑاکا، حتیٰ کہ بے رحم قومی جانور بن سکتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بس سکی امن اور جنگ کا اصل مسئلہ ہے۔

یہ مسئلہ کہ وہ لوگ جو لڑاکا نہیں ہوتے کیوں لڑتے ہیں، ایک نئے اور ڈرامائی انداز میں دوسری عالمی جنگ کے دوران لندن میں ایک کرسس کی شب میرے سامنے ہوا تھا۔ ہوائی حملے کے بھونپو اپنی روزمرہ کی بھینک سمیر کر چکے تھے۔ ابھی ان کی آخری ہلکی سے گراہ ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ طیارہ شکن توپوں نے گر جانا شروع کر دیا۔ میں ان کی گڑگڑاہٹ کے درمیان ہم کے پھٹنے کی دہلا دینے والی آوازیں سن سکتا تھا۔ واقعی، یہ کوئی بڑا حملہ نہیں تھا، مگر ایک یا دو ہم میرے کمرے کے بہت قریب گرتے محسوس ہوئے تھے۔ میں اپنے بستر پر لیجا مطالعے میں مصروف تھا، اور اس ہلچل سے نکلنے، یا کم از کم بھوں سے اپنا ذہن بنانے کے لیے، میں نے بڑھ کر ریڈیو کھول دیا۔ میں بے مقصد ریڈیو کے ڈائل کو ادھر ادھر گھما رہا تھا کہ اچانک میرا کمرہ محبوب صورت carol موسیقی سے بھر گیا۔ موسیقی کی دل پذیر لہروں نے جنگ کی آوازوں کو دبا دیا اور ایک لمحے کے لیے میری نظروں میں زمانہ امن کا دل مشا کرنے والے کرسس کا نقشہ کھوم گیا۔ پھر کسی اعلان کرنے والے کی آواز سنائی دی جو جرمن میں بول رہا تھا۔ چوں کہ یہ جرمنی کا کوئی ریڈیو اسٹیشن تھا وہ سب جو carol گا رہے تھے جرمن ہی تھے۔ اتنی ہی جلد میں ہوا میں چنگھاڑتے ہوئے جنگ اور موت کا پیغام دے رہے تھے جرمن موسیقی امن اور نجات کے پیغام کے ساتھ ہوا میں لہرا رہی تھی۔ جب ہم ایک ہی قومی منہجے سے نکلنے والی ان دو آوازوں کے متناقضے کو سلجھالیں گے، تو بالآخر ہم امن اور جنگ کے مسئلے کو سلجھانے کے قابل کیفیت میں ہوں گے۔

جارج کیٹلٹ مارشل

اعلانِ تجلیل

جب کیڈمٹ فرسٹ کیپٹن جارج کیٹلٹ مارشل نے ورجینیا ملٹری انسٹی ٹیوٹ سے گریجویشن کیا، عین اسی دن وقت مار دیا آئی پاریمان کی نوبل کمیٹی پہلی بار نوبل انعام دینے کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ اس دن مارشل کو جس نے اپنی عمر کے انیس برس بھی مکمل نہیں کیے تھے اس کے فوجی افسر کا خط ملا تھا جس میں اس نے اخلاص دی تھی کہ محقق بورڈ نے اس کو فوج میں داخلے کے لیے موزوں پایا ہے، اور یہ بھی کہ ان کو کمیشن کا پروانہ ان کی انیسویں سالگرہ کے بعد ملے گا۔ اسی دن اوسلو میں پہلا نوبل امن انعام دیا گیا تھا۔ انعام ہنری ڈیڈمانٹ (Henri Dunant) کو دیا گیا تھا، جس نے ریڈ کراس کے ادارے کی بنیاد رکھی تھی، اور فریڈرک پاسی (Frédéric Passy) کو بھی جس نے پہلی فرانسیسی امن سوسائٹی منظم کی تھی اور جو بین الاقوامی ثالثی معاہدوں کے کام کا پہل کا رہا۔

اگر اس وقت کوئی لفٹ جارج مارشل سے کہتا کہ پچاس برس بعد نہ صرف وہ امریکی ریڈ کراس کے صدر ہوں گے، بلکہ ایک دن ان کو امن انعام بھی ملے گا۔ تو اس پیشین گوئی پر شاید ہی یقین کیا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ نوجوان جارج مارشل نے کبھی خود کو چشم تصور میں مستقبل کا جنرل بھی دیکھا ہو، مگر ان کو اس جذبہ باقی اندیشے اور نتیجے پر پہنچنے میں طویل راستہ طے کرنا پڑے گا، کہ جنگ سے حاصل کیا جانے والا اجتماعی بدفہم، جس کو بھاگنا جاسکتا ہے، یہ ہوگا کہ ایک اور جنگ کے واقع ہونے کو ناممکن بنا دیا جائے۔ یہ ایسا راستہ ہوگا جو ان کو زبرد آسمان، زمین اور سمندروں کے اتنے وسیع علاقوں تک لے جائے گا، جہاں ان سے قبل کوئی بھی کماں دار نہ پہنچا ہوگا، اور ان کو اتنے زیادہ جنگ کے میدان، اور اتنی بڑی تہاہیاں دیکھنی نصیب ہوں گی جو ان سے پہلے کسی جنرل نے نہ دیکھی ہوں گی، اور ان کو ایسے منصوبے بنانے اور اتنی بڑی افواج اور بحری بیڑوں اور فضائی فوجوں کی براہ راست کماں داری کرنی ہوگی، جیسی شاید تاریخ میں کبھی نہ ہوئی ہوگی۔

وہ ایسی اہم چیزیں ہیں جنہیں مارشل کی نشوونما کے سلسلے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ پہلی اہم بات یہ ہے کہ ان میں سیکھنے کی کبھی نہ ختم ہونے والی پیاس تھی، سمجھنے کی، جاننے کی، اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ انفرادی حد تک سپاہیوں میں گہری دلچسپی لیتے تھے اور سپاہیوں کی بہبود کے لیے ان تھک کام کرتے تھے۔ یہ دونوں باتیں ان کے کام، اور ان کے ذہن کی روحانی اور سماجی نشوونما میں بہت دور رس اثرات کا باعث بنی تھیں۔

جن لوگوں کے لیے وہ ذمہ دار ہوتے تھے ان کے بارے میں مکمل تفصیلات حاصل کرنے کے لیے ایک معنی ہوا کرتے تھے کہ کبھی کبھی وہ اپنے ہم عصر لوگوں کے لیے پریشان کن مسئلہ بن جایا کرتے تھے۔ کیس برس کی عمر میں وہ فلپائن میں دور دراز کی چوٹی اور تنہا چوٹیوں کی کماں داری پر مامور تھے انہوں نے مقامی لوگوں کی زبان، رسم و رواج اور مذہبیت کا بغور مطالعہ کیا، انہیں احساس ہوا کہ نظم و ضبط کا انحصار جس کی وہ بہت قدر کرتے تھے، سب سے پہلے ان کے اپنے ضبط نفس پر اور اپنی صلاحیت پر ہونا چاہیے، کہ انہیں عقل مندانہ طور پر مصروف رکھے، تاکہ ان کو دیے جانے والے ہدف ان کی دلچسپیوں کو قائم رکھیں۔ وہ الفاظ ان کے لیے سب سے بڑھ کر رہنما بن گئے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے فوجی اسکول میں گریجویٹیشن کرنے والے طلبہ سے تقریر میں کہا تھا۔ ”وہ الفاظ تھے: عزت نفس اور ایثار ذات۔“

یہ نوجوان سپاہی اپنے ساتھیوں سے بہت کچھ کا، مگر اپنے آپ سے کچھ زیادہ ہی کا طالب تھا۔ چار برس بعد جب اس نے V.M.I. سے گریجویٹیشن کیا تو اس کے نام پر مابلی کا ایک بھی اندراج نہیں تھا۔ اور اس کی پوری زندگی میں ایسا ہی ہوا۔ ان کا ریکارڈ ہمیشہ بالکل صاف ستھرا رہا ہے۔ افسران نے انہیں جس کام پر بھی ان کو مامور کیا، انہوں نے اسی نوعیت کی اعلیٰ قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ جس عزت کے وہ حق دار بنے تھے وہ اس وقت بھی انہیں ملی، جب وہ فلپائن سے واپس کے بعد 1916 میں واپس ریاست ہائے متحدہ میں دوسری بار تعینات کیے گئے تھے۔ انہوں نے امریکی ریاست اوتا (Utah) کے ایک کیمپ میں تربیت دینے کی ذمہ داری سنبھالی تھی، اور جب یہ کیمپ بند ہوا تو اس کیمپ کے کماں دار کو اپنے ماتحت افسران کی کارکردگی پر اپنے تاثرات قلم بند کرنے تھے۔ ایک عمومی سوال پر: ”کیا آپ اس افسر کو حالت جنگ میں اپنی کمان میں اپنا نائب بنانا پسند کریں گے؟“

کرنل نے اس سوال کے جواب میں، مارشل کے لیے لکھا تھا: ”ہاں، مگر میں اس کی مامحتی میں کام کرنا پسند کروں گا۔۔۔ میری دانست میں پوری فوج میں اس جیسے پانچ افراد بھی نہیں ہیں جو میدان [جنگ] میں کسی ڈویژن کی کمان سنبھال سکیں۔“

اس کے بعد کرنل نے سفارش کی تھی کہ ضابطوں کی پروا کیے بغیر ان کو بریگیڈیئر جنرل کے عہدے پر ترقی دی جائے، اور اپنے اس بیان پر زیادہ زور ڈالنے کے لیے لکھا تھا: ”یہ مجھ سے 1,800 فائلوں سے کچھ زیادہ جونیئر ہے۔“

ایسی شہرت اور سفارش کے ساتھ مارشل جون 1917 میں امریکی فوجوں کے بحری قافلے کے پہلے جہاز

پر سوار فرائس کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ قابل یقین تیاریوں کی ضرورت، اجرتی، بے ترتیبی، اور اسلحے اور کولہ بارود کی کمی کی وجہ سے 27,000 سپاہیوں میں سے، 25,000 اموات ہوئیں اور [یہ سانحہ] کئی برس تک مارشل کے لیے ڈراؤنا خواب بنا رہا۔ ان کو اس اور دوسرے ڈویژنوں کی تنظیم کے لیے chief of operations کی ذمہ داری سونپی گئی۔ بعد میں یہ جنرل پیرشنگ (Pershing) کے مددگار بنے تھے۔ امریکی فوج کے سرکاری ریکارڈ میں اختصار سے درج کیا گیا تھا: "ان کو مٹا کمانڈ کے جنرل پیڈ کوارٹر میں ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ St. Mihiel پر حملے کے لیے منصوبہ تیار کریں۔ جوں ہی لڑائی شروع ہوئی، ان کو اس جنگ کے لیے تقریباً 50,000 سپاہیوں اور 2,700 توپوں کو Argonne کے محاذ کے لیے تیار کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی۔" ان کو عارضی طور پر منجبر، لیٹینیٹ کرنل اور کرنل بنایا گیا، ان کو جنرل پیرشنگ نے، یہ جن کے قریب ترین ماتحت تھے، بریگیڈیئر جنرل کے عہدے پر ترقی دینے کی سفارش کی تھی۔ مگر اعلیٰ عہدے داروں نے جنرل پیرشنگ کی سفارش منظور نہیں کی، اور جنگ بندی کے بعد وہ ایک بار پھر کینیڈین بنا دیے گئے؛ اس لیے کہ امریکی قانون کے مطابق زمانہ امن میں فوقیت کے سخت ترین قوانین کے مطابق ہی ترقیاں دی جاسکتی ہیں۔ اور مارشل کو ایک بار پھر کرنل بننے کے لیے پندرہ برس تک انتظار کرنا پڑا تھا۔

اسی لیے، یہ جب فوج کے سربراہ بنے تو ترقی کے قوانین میں تہدیلی کے لیے ان کی سفارشات کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہا تھا۔ یہ تہدیلیاں ستمبر 1940 میں منظور کر لی گئیں، اور سال کے آخر سے قبل ہی آئرن ہاور (Eisenhower) نامی ایک منجبر کو کرنل بنا دیا گیا تھا، اس کے بعد 366 کرنلوں کو پچلاگ کر اسے بریگیڈیئر جنرل بنا دیا گیا تھا۔

جنگ کے برسوں کے دوران مارشل Tientsin میں تین برس تک تعینات رہے تھے۔ اور جس طرح وہ فلپائن میں جرمنیوں کی نسلی جغرافیہ اور تاریخ پر سند سمجھے جاتے تھے اسی طرح Tientsin میں بھی انہوں نے چینی تہذیب، تاریخ اور زبان پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ وہ واحد امریکی افسر تھے جو بغیر کسی مترجم کے اپنے سامنے پیش ہونے والے چینی گواہوں پر حرج کر سکتے تھے۔ اپنے فرصت کے چند کھنڈہ روزانہ چینی زبان لکھنا سیکھنے پر صرف کیا کرتے تھے۔

کساد بازاری کے دور میں وہ ایک بار پھر کرنل بنا دیے گئے، سپاہیوں کی تنخواہیں اس قدر کم کر دی گئی تھیں کہ ان میں شادی شدہ افراد کو بڑی مشکل ہوا کرتی تھی۔ اور رجسٹر کے کماں دار نے اپنا پہلا مارشل ایڈ پر گرام شروع کیا۔ انہوں نے اپنے سپاہیوں کو مرغیاں اور سبزی پالنے کی تربیت دی، انہوں نے ان کو ترکاریاں اگانے کی بھی تربیت دی۔ انہوں نے سستا کھانا فراہم کرنا شروع کیا جس میں، پندرہ سینٹ کے عوض خاندان کے ہر فرد کو کھانا فراہم کیا جاتا تھا؛ قیمت ایک ہی کھانے کی ہوتی تھی مگر بہت سے سپاہیوں کے خاندانوں میں کئی افراد ہوا کرتے تھے۔ وہ [خود مارشل] اور ان کی اہلیہ بھی وہی کھانا کھاتے تاکہ یہ سارا نظام لوگوں کو خیرات نہ معلوم ہو۔ مارشل کے ماتحت کیمپ بڑھتے رہے، جن میں بے روزگاری سے نمٹنے کے لیے

فوجی تربیت کے ساتھ کچھ اور بھی سکھایا جانے لگا تھا۔ ان کیمپوں کے کم زورہ خون کی کمی والے اور بے مہارہ افراد میں یہ [مارشل] خاص دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے ان کے لیے اسکول بنائے، ان سے چھوٹے موٹے اخبار شروع کرائے، شوقیہ ٹھیسر، دانتوں کی نگہداشت کی سہولت فراہم کی، اور ان میں شراب نوشی بند کرائی۔ 1938 میں مارشل جب فوج کے سپر سالار بنے تو انہوں نے وابٹنگٹن سے سپاہیوں کے لیے ہمدردیاں حاصل کیں، اور انہیں یہ باور کرایا کہ محض جسمانی نگہداشت کے علاوہ بھی فوجیوں کی ضروریات ہوا کرتی ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ میں اس وقت مختلف چوکیوں، کیمپوں اور چھاؤنیوں میں اندازاً 174,000 فوجی تعینات تھے۔ مارشل نے اپنی پہلی شش ماہی رپورٹ میں لکھا تھا:

”ایک فوج کی صورت میں ہم غیر موثر تھے۔ ہمارے ساز و سامان عالمی جنگ کے اختتام کے وقت جدید تھے، نگراب وہ بڑے چپانے پر بے کار ہو چکے تھے۔ دراصل مابعد جنگ کی مسلسل تڑاؤں خرابی اور تصرف نے فوج کو ایک تیسرے درجے کی طاقت بنا کر رکھ دیا ہے۔“

ریاست ہائے متحدہ کے پاس ایسی فوجی طاقت نہیں تھی جو جنگ کو، حتیٰ کہ امریکا پر کسی حملے کو بھی، روک سکے۔ مارشل نے اپنے بے بس ملک کے خلاف بڑھتے ہوئے امکانات جنگ میں افریڈ نوٹیل کے الفاظ ”تہا صرف نیک ارادے ہی امن حاصل نہیں کر سکتے“ کی صداقت کو صاف محسوس کر لیا تھا۔

ان ہی برسوں کے دوران قتل اس کے کہ امریکا کی سر زمین پر کوئی حملہ ہوتا، جنگ کی زبردست تیاریوں کی راہ ہمار کی گئی تھی۔ ان ہی برسوں کے دوران مارشل کی اہلیہ جوآن سے بہت قریب تھیں، ہر رات دعا کیا کرتی تھیں ”خدا یا، ان کی وقت عطا فرما۔“

مارشل کی ذمہ داریاں، جب کہ انہیں جنگ کے برسوں کے بہت بار اٹھانے پڑے تھے، کسی انسان کے طاقت سے بہت زیادہ تھیں۔ پھر بھی وہ ہارے نہیں، شاید، جیسا کہ سینیٹر رسل (Russell) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے، ”زیادہ تر لوگ اپنی الٹا عزمی کے غلام ہوتے ہیں۔ جنرل مارشل اپنی ذمہ داریوں کے غلام تھے۔“

کبرے احساں ذمہ داری نے، جسے دیوانہ پن بھی کہا جاسکتا ہے، ان پر فولا دی ضبط نفس اس طرح نافذ کر دیا تھا کہ وہ ایک طرح سے ان کا عارفانہ عقیدہ بن گیا تھا۔ انہوں نے اس کو ایک برجستہ اور ایسی کھلی تقریر میں بیان کیا تھا، جیسے انہوں نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ جون 1941 میں انہوں نے Trinity کالج ریاست کنٹیکٹ کے شہر ہارٹ فرڈ کے اسٹن عقیدے (Episcopalian) [اسٹن نظام، جس کے مطابق مذہبی اقتدار اعلیٰ کسی فرد کے بجائے، مجموعی طور پر اسٹن نظام کو حاصل ہوتا ہے۔] کے کلیسا میں اپنے خطاب میں کہا تھا: ”وہ خود بھی اسٹن عقیدہ رکھنے والے انسان ہیں اور باقاعدہ کلیسا میں جایا کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا، ”میں جانتا ہوں کہ میرا یہاں آج آپ کے ساتھ ہونا میری روح کے لیے نیک شگون ہے۔“ اس کے بعد انہوں نے مزید کہا، ”[اس وقت] اگر میں اپنے دفتر میں ہوتا تو میں روح کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔“ اور پھر

انہوں نے تشریح کی کہ ان کے نزدیک نظم و ضبط کے کیا معنی ہوتے ہیں، ان کا یہ عمل ہی ان کی فکر اور ان کے کام کا احاطہ کرنے میں ان کے خطاب کو اہم بتاتا ہے۔

”ہم حوصلے کی طاقت کو ذہنی عادت کی طاقت میں بدل رہے ہیں۔ ہم نظم و ضبط کو خوف کے بجائے انفرادی احرام کی بنیاد بنا رہے ہیں۔۔۔ یہ حوصلہ ہی ہوتا جس سے جنگ جیتی جاتی ہے۔ لڑائی کرنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ یہ جذبہ ہی ہوتا ہے جسے ہم جنگ میں استعمال کرتے ہیں، اور یہی مسکے کو محل کرتا ہے۔

سپاہی کا دل، سپاہی کا جذبہ، سپاہی کی روح ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ جب تک کہ سپاہی کی روح اُسے مہمان نہیں دیتی ہے اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، اور وہ خود بھی ماکامیاب ہوگا، اس کا کماں دار بھی، اور آخر میں اس کا ملک بھی۔۔۔ یہ حوصلہ ہی ہوتا ہے جو فاتح ہوتا ہے۔۔۔ فرانسیسی ابھی تک ایسی لغت حاصل نہیں کر سکے ہیں جس میں اس لفظ کی تشریح کی گئی ہو۔۔۔

یہ ایک لفظ سے کہیں زیادہ ہے۔ کسی بھی ایک لفظ سے زیادہ، یا کئی الفاظ سے زیادہ، جن کی چٹائش کی جاسکے۔

حوصلہ ایک ذہنی کیفیت ہوتا ہے۔ یہ پختگی ہوتا ہے، ہمت اور امید۔ اسے اعتماد کہتے ہیں، ولولہ کہتے ہیں اور وفا داری کہتے ہیں۔ یہ elan ہے، esprit de corps ہے اور عزم ہے۔

یہ استحکام کی قوت ہوتا ہے، جذبہ ہوتا ہے جو آخر تک قائم رہتا ہے تاکہ ارادہ کامیاب ہو۔ اس کے ساتھ ہر کچھ ممکن ہو جاتا ہے، اس کے بغیر ہر شے منہسوب، تیار، صنعت سب کچھ صفر کے برابر ہوتے ہیں۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ جذبہ ہی ہوتا ہے جو آخر تک باقی رہتا ہے۔ لہذا ایسا ہی ہوتا ہے۔“ یہ غیر معمولی خطاب ایک عقیدہ بھی ہے اور ایک نظام عمل بھی۔ یہ واحد تقریر ہے جس میں مارشل نے براہ راست اور مکمل کراپے خیالات کا اظہار کیا ہے جو۔ ان کے روزِ مزد کے کام کے علاوہ۔ ان پر زیادہ حاوی رہے ہیں۔

”ہم اس حوصلے کی تعمیر کر رہے ہیں۔ اپنی صلاحیتوں میں ایسے اعلیٰ ترین اعتماد سے نہیں جس کے ذریعے دوسرے لوگوں کو فتح کیا جائے یا نیچا دکھایا جائے؛ نہ فولاد سے بنی اعلیٰ ترین توپوں سے، نہ ہوائی جہازوں سے اور نہ ہم بھینکنے والی آلات پر بھروسے سے۔

ہم اس کی تعمیر کر رہے ہیں اُن اشیاء پر جو لا انتہا طاقت کی مالک ہوتی ہیں۔ ہم اس کی تعمیر یقین پر کر رہے ہیں، اس لیے کہ جب انسان یقین کرنے لگتا ہے تو وہ ناقابلِ تغیر ہو جاتا ہے۔ ہم نے ولولے سے کہیں زیادہ بڑی اشیاء کی خواہش کی ہے، ایسی اشیاء جو خوشامیدی یا خود اعتمادی سے کہیں زیادہ نفیس ہوتی ہیں، بعض ایسی اشیاء جنہیں دانش یا جذبات کا نام دیا جاتا ہے، بلکہ ان کو جو انسانی جذبات میں پائی جاتی ہیں، جس پر صرف روحانیت کا قبضہ ہوتا ہے۔

ہماری یہ فوج ایسی اخلاقی عادت کی مالک ہے جس کو ہم اشارے میں بنیادی طور پر انسانیت کی اعلیٰ ترین خواہشات سمجھتے ہیں۔ سروکاری طاقتوں پر جو دنیا پر حکومت کرتی ہیں اور کرتی رہیں گی۔

میں اس کو قدرتِ مطلقہ [Omnipotence] کہتا ہوں۔ آپ کی تعریف اور سہارے سے یہ قادی مطلق حوصلہ اس وقت تک قائم رہے گا، جب تک کہ زمینی اشیاء کے بجائے جذباتی اشیاء طاقت ور رہیں گی۔“

مگر ٹیڈی کے خطاب کے بعد مارشل نے محفوظ رکھنے والی اپنی زر و بکتر میں پناہ لے لی۔ بوران کے دل و جاں میں اٹھنے والے جوش اور ولولے کا الفاظ میں اظہار، 1945 میں ان کی ششماہی رپورٹ سے قہقہے نہیں ہوا؛ سپاہیوں کے لیے ان کے ہم دودی کے اپنے الفاظ میں جو ہمیشہ بچٹ پڑنے والے معیار کے حال ہوتے تھے:

”قوموں کے لیے یہ ناممکن تھا ہے کہ لڑنے والے آدمی کی خدمات کا اجر دے سکیں۔ تنخواہ کا ایسا کوئی معیار نہیں جو اتنا بلند ہو کہ لڑائی کے دوران کسی ایک سپاہی کے صرف چند لمحوں کے کرب کا، جسمانی پریشانیوں کا، یا گھر چھوڑنے اور قوم کے تحفظ کے لیے خطرناک علاقوں میں رہنے سے ہونے والی شدید ذاتی زخموں کا اجر دے سکے۔“

مارشل کو نوبل امن انعام اس لیے نہیں دیا جا رہا ہے کہ انھوں جنگ کے دوران کام کیے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے جو کام کیے ہیں کہ جنگ کے بعد، اس سے حاصل ہونے والی کامیابی کا منطقی نتیجہ امن ہوتا ہے، اور امن کے قیام کے لیے یہی وہ بڑا کام ہے جس کے لیے نوبل کمیٹی نے انھیں اعزاز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مگر وہ ایسی دستاویزات ہیں جن سے جنگ کے دوران جمہوری دنیا کے لیے جبرل مارشل کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

جب 8 مئی 1945 کو فتح نصیب ہوئی تو مارشل کو سیکریٹری برائے جنگ، ری پبلکن محترم ہنری ایلمسی (Simson) کے دفتر میں طلب کیا گیا تھا، جو کسی زمانے میں الیہو روٹ [Elihu Root] کے قانونی شریک کا رہے تھے، جنھیں 1912 میں نوبل امن انعام بھی دیا گیا تھا۔ مسٹر ایلمسن نے دوسرے چودہ جزیروں اور دوسرے اعلیٰ افسران کو بھی مدعو کیا تھا۔ وہ مختصر مالاہ سیاست داں مارشل سے مخاطب ہوا اور کہہ:

”جناب عالی، میں آپ کے ایک ذاتی قرض کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں جو، پورے ملک کے اشتراک میں، مجھ پر واجب ہے۔ ایسا کوئی شخص کبھی اعلیٰ بلندیوں تک نہیں پہنچا ہے جو اپنے بارے میں سوچتا ہو۔ آپ نے اپنے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ میں نے آج تک اس چیلنج کی ذمہ داری نہیں دیکھی ہے جو کسی انسان نے پوری کی ہو۔“

زندگی کے آخری دور میں نئے دوست بنانا ایک غیر معمولی بات ہوتی ہے، میری عمر میں یہ ایک سست عمل ہوگا، مگر ایسا کوئی شخص نہیں جس کے لیے میرے دل میں اتنا عمیق احترام ہو اور جس کے لیے میں اتنا لگاؤ رکھتا ہوں۔ میں نے اپنے عرصہ حیات میں بہت سے سپاہی دیکھے ہیں مگر، جناب عالی، آپ سے اچھا سپاہی میں

نے آج تک نہیں دیکھا ہے۔

یہ اس ملک کی خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسا انسان اس منصب پر فائز ہے۔“

اور جب مارشل نے نومبر 1945 میں خود چیف آف اسٹاف کے منصب سے استعفیٰ دیا تو ایام جنگ کے مشترک سپر سالاروں میں سے ان کے برطانوی ساتھیوں نے ایسا پیغام ارسال کیا تھا یقیناً جس کا کوئی ثانی نہیں۔ اس پیغام پر برطانیہ کے چیف آف امپیریل جنرل اسٹاف سر آلن بروک (Sir Alan Brooke) جو اب Lord Alan Brooke بن چکے ہیں، ایڈمرل آف دی فلیٹ Lord Gunningham of Hydhope اور مارشل آف دی رائل ایئر فورس Lord Portal of Hungerford نے دستخط کیے تھے۔ پیغام میں کہا گیا تھا: ”ریاست ہائے متحدہ کے چیف آف اسٹاف کے منصب سے چھ برس بعد آپ کی سبک دوشی پر ہم، برطانوی کمانڈ چیفس آف اسٹاف، آپ کے ساتھی، آپ کو پیغام الوداع ارسال کرتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے دو عظیم دوست اور شیدائی، فیلڈ مارشل مرجان ڈیل (John Dill) اور ایڈمرل آف دی فلیٹ سر ڈڈلی پاؤنڈ (Dudley Pound) اب اس دنیا میں نہیں جو اس پیغام میں اپنا نام بھی شامل کر سکتے۔ امریکا کی تاریخ میں سب سے عمدہ اور سب سے زیادہ طاقت ور فوج کے معمار کی حیثیت سے آپ کا نام آپ کے اور دوسرے ملکوں کے عظیم سپاہیوں میں شامل کیا جائے گا۔

ہم جب تک آپ کے ہمراہ امریکا اور برطانیہ کے اعلیٰ عہدوں پر رہے تھے آپ کی قابل اعتماد فلاح، اعلیٰ اصول، اور وسعت نظر ہم سب کے احترام کا باعث رہے تھے۔ آپ نے ہمیشہ اپنی صاف گوئی سے ہمیں نوازا، اپنی شخصیت کے عمر سے ہمیں فخر کیا، اور مقصد کی وحدت سے ہمیں متاثر کیا اور ایک مشترک مقصد کے لیے بے غرض دیانت داری سے کام کیا ہے۔

سب سے زیادہ ہم اس بات پر آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمارے دو ملکوں کی افواج کے درمیان باہمی اہتمام اور تعاون کا رشتہ بنانے میں ہمیشہ رہنمائی نہ کر دار ادا کیا، جس کا ہماری فتح میں کتنا بڑا حصہ ہے، اور ہم یقین کرتے ہیں کہ آنے والے برسوں میں یہ ہمارے حمدان کے لیے کتنا مفید ہوگا۔

آپ کو الوداع کہنے کے لیے، جس نے ہمارے پیشروانہ احترام سے زیادہ ہماری ذاتی قربت حاصل کی ہے، ہم ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں جو آج سے دو سو برس قبل تحریر کیے گئے تھے:

دوست سچائی کا ہے، اور روح سے مخلص ہے جو

ہے عمل میں خوش عقیدہ، خوش نما اعزاز میں

جو کبھی وعدہ نہ توڑے، جو بغرض ہر گز نہیں

نام کا جویا نہیں جو، دوستی توڑے نہ جو“

مسٹر اسٹینسن کے الفاظ میں قومی تھکر اور برطانوی سپر سالاروں کے پیغام کے مین ہمارے سامنے جنرل مارشل کی شش ماہی رپورٹ بھی ہے جس میں ان کی عسکری وصیت بھی ہے اور اس نظام کا تعارف بھی جو بعد

میں مارشل ایڈ کمانڈ سے جانا گیا۔

اس موقع پر ان کی رپورٹ کا آخری حصہ ہے، جو سب سے اہم ہے۔ مارشل نے اس کو "مستشرقہ دفاع کے لیے" کا نام دیا ہے۔ انہوں نے اس کی شروعات اس بیان سے کی ہے کہ بیرونی دشمن کے خلاف قوم کے تحفظ کی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے فوج کو اپنے قریبی مستقبل سے بہت آگے تک کا منصوبہ تیار کرنا چاہیے۔ "یورپوں سے لوگ اپنے ذاتی تحفظ کے بارے میں فکرمند رہے ہیں۔۔۔ مگر ان کو تباہیوں سے بچنا جن میں کروڑوں افراد اپنی جانوں سے گئے ہیں اور ان کے گھر مسمار کیے گئے ہیں ابھی تک ممکن نہیں ہوا ہے۔" اس کے بعد وہ قومی پالیسی کے لیے واشنگٹن کے منصوبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میرے خیال میں ہمیں ابتدا کرنی چاہیے، اس الم ناک غلط فہمی کی درستی کے ساتھ کہ تحفظ کی پالیسی جنگ کی پالیسی ہوتی ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد جنگ کی حد بندی ایک ہی قوم۔ جرمنی۔ نے کی ہے۔ اس نے قریب ترین [واقعات] سے ابتدا کی ہے۔ جرمنی کا عسکری فلسفی کلاؤز وٹز (Clausewitz) جنگ کو ایک خاص قسم کے سیاسی تشدد کا عمل کہتا ہے۔ پروشیا کا فریڈرک (Frederick of Prussia) جو جرمنی میں ایسی جنگجو روایت چھوڑ گیا تھا جس نے اب اس کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، جنگ کو ایک ایسا حربہ سمجھتا تھا جو اس کی خواہش کو نافذ کرے گا خواہ وہ غلط ہو یا صحیح۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ناقابل شکست عسکری طاقت سے وہ کسی بھی قسم کی سیاسی دہلیز جیت سکتا ہے۔ اسی نظریے کو ہٹلر نے آگے بڑھایا جو اس کو عمل کا میانی کے کنارے تک لے گئی تھی۔ یہی نظریہ ہے جاپان کا بھی۔ یہ ایک بحرمانہ نظریہ ہے، اور دوسرے اقسام کے جرم کی طرح اس نے بار بار اپنا سر اٹھایا ہے، اس وقت سے، جب سے انسان نے اپنے پڑوسیوں، گروہوں اور قوموں کے ساتھ رہنا شروع کیا ہے۔ بہت عرصے سے جنگ کو غیر قانونی بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، یعنی جس بنیاد پر قتل کو غیر قانونی بنایا گیا ہے۔ مگر، قتل کو ممنوع کرنے کا قانون خود قتل کو نہیں روکتا۔ اس کو نافذ کرنا ہوتا ہے لیکن، نافذ کرنے والی طاقت کو سختی سے جمہوری طریقوں سے قائم رکھنا ہوتا ہے۔ کسی بڑی فوج کو منصوبے بنانے کے لیے گروہوں کے حکم کے تابع نہیں رکھنا چاہیے۔ ایک باشندہ سپاہی طاقت کے ایسے غلط استعمال کا محافظ ہوتا ہے۔"

اور وہ زور دے کر نتیجہ نکالتا ہے:

"اگر اس قوم کو تقسیم رہنا ہے تو اس کو ابھی سے اس بات کو اپنے ذہن میں جاگزیں کر لینا چاہیے کہ اب یا مستقبل میں جنگ ان لوگوں کی پسندیدہ شے نہیں ہوتی جو امن کے لیے پُر جوش ہوتے ہیں۔ یہ ان کی پسند ہوتی ہے جو سیاسی مفاد کے لیے تشدد کا سہارا لیتے ہیں۔"

مارشل کو سپر مالار کے منصب سے ریٹائر ہوئے مشکل سے ایک ہفتہ گزرا ہوا کہ صدر ٹرومین (Truman) نے ان کو سفیر خاص کے طور پر چین بھیج دیا تاکہ وہ کمیونسٹوں اور کو مین ٹانگ (Kuomintang) یعنی جیا ٹانگ کافی ہیک (Chiang Kai-shek) کے درمیان ہونے والی خانہ جنگی کو روکنے کی کوشش کریں۔ وہ

کامیاب نہیں ہوئے، اس لیے کہ جب مارشل [چین سے] چلے گئے تو دونوں حریفوں نے اپنے درمیان کیے ہوئے معاہدوں کا پاس نہیں کیا۔ مگر مارشل نے چین میں جو کچھ دیکھا اور سیکھا تھا اس نے ان کے عزم کو مستحکم کر دیا، جنگ کی تباہ کاریوں نے جسے ان کے ذہن میں جائز نہیں کر دیا تھا اور جسے اب چین کے بارے میں، صدر ژوئین کے لیے تیار کی گئی رپورٹ میں ابھر کر سامنے آنے کا موقع مل گیا ہے۔

”یہ ان [مارشل] کی رائے تھی کہ خراب ہوتی ہوئی معاشی حالت میں چین اور اس کے عوام کی مدد کرنے کے لیے، تا کہ چین میں امن اور اتحاد قائم ہو، کچھ قدم اٹھانے ہوں گے۔ جنرل مارشل کا خیال تھا کہ چین کا مسکری اور سیاسی اتحاد اسی وقت مستحکم اور دیر پا ہو سکتا جب اس ملک میں مستقل طور پر عام معاشی بہتری لائی جائے گی۔“

یہ ایسی رائے ہے جسے مارشل نے دوسرے سطحوں میں زیادہ عمومی انداز میں ان الفاظ کے ذریعے متشکل کیا ہے: ”تاریخ نگاروں کے لیے اپنے فرض میں ناکام رہے ہیں، انھیں ان وجوہ کو دریافت کرنا اور منکشف کرنا چاہیے تھا جو جنگ کا باعث ہوئی ہیں اور جن سے جنگ کو ناممکن بنایا جاسکتا ہو۔“

اور جب 1947 میں صدر ژوئین کے اصرار پر مارشل نے سیکریٹری آف اسٹیٹ مینا قبول کیا، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جنگ اور بہتری کی وجوہ کو دیکھ سکتے تھے، اس لیے کہ وہ ان وجوہ کو جتنا ممکن ہو انسانیت سے دور کرنا چاہتے تھے اور اس طرح جنگ کو ناممکن بنانا چاہتے تھے۔

ان کا خدشہ، جنگ کے بارے میں ان کا خوف، اور ان کا یہ احساس کہ ایک اور جنگ کا مطلب انسانی تہذیب کا مکمل انہدام ہوگا، انٹریڈ نوبل کے ذہن کے خدشے سے بہت ملتا جلتا تھا جب وہ اپنی وصیت تیار کر رہا تھا۔ 1893 میں اس نے ایک خط میں لکھا تھا:

”میں اپنی جائیداد کا ایک حصہ فروخت کر کے ایک انعام کی بنیاد رکھنا چاہتا ہوں جو ہر پانچویں برس دیا جائے گا (تقریباً چھ بار اس لیے کہ اگر تیس برس کے اندر ہم اپنے نظام کو سدھارنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تو چاروں چارہم بریت کی طرف لوٹ جائیں گے)۔

انعام اس مرد یا عورت کو دیا جائے گا جس نے یورپ میں عام امن کے خیال کو آگے بڑھانے میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہو۔“

اس نے نے مزید لکھا تھا:

”نیشی علاقوں کا ایک نیا قلم، ظلمات میں حرکت کر رہا ہے، اور شاید ہم دور سے آنے والی اس کی گزرگاہ کوٹ کوٹ رہے ہیں۔“

مارشل اس کو روکنا چاہتے تھے نوبل کو جس کا خوف تھا۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد چار ماہ سے کم عرصے میں انھوں نے یورپ کو امداد فراہم کرنے کا ایک منصوبہ پیش کیا جو ان کے نام سے چیک کر رہا تھا۔ انھوں نے ہارورڈ یونیورسٹی میں اپنی تقریر میں کہا تھا:

”ہماری پالیسی کسی ایک ملک یا نظریے کے لیے نہیں، بلکہ بھوک، افلاس، مایوسی اور بد امنی کے خلاف ہے۔ اس کا مقصد دنیا میں کام کرتی ہوئی اقتصادی بھائی بننا چاہیے، تاکہ ایسے سیاسی اور سماجی حالات کو ابھرنے کی اجازت ہو جن میں آزاد ادارے زندہ رہ سکیں۔ میرے خیال میں ایسی اعانت چھوٹے چھوٹے ملکوں میں نہ دی جائے جو بحرانات سے منسلک ہو۔ کوئی بھی اعانت جو مستقبل میں حکومت دینا چاہے، اسے اصلاح کرنی چاہیے چرچائے کہ یہ محض وقتی تسکین کے لیے ہو۔“

مارشل نے دو برس عوام اور کانگریس میں لڑائی کے ساتھ اپنے منصوبے پر عمل کیا۔ اور جب مارشل کا منصوبہ ایک زندہ حقیقت بن گیا، اور اس پر عمل کے لیے ادارے تشکیل پائے گئے تو مارشل پیچھے ہٹ گئے۔

مگر ایک بار پھر ان کو خدمت کے لیے طلب کیا گیا، اور ستمبر 1950 میں وہ سیکریٹری برائے دفاع بنا دیے گئے۔ جب انہوں نے ذمہ داری سنبھالی، تو وہ اس پوزیشن میں آگئے تھے کہ مستقبل میں ریاست ہائے متحدہ کے دفاع کے لیے پیش کیے گئے اپنے ہی خیال کے مطابق باقاعدہ فوج کے بجائے جمہوری طور پر جبری بھرتی کی جائے۔ جب یہ کام ہو گیا تو ایک بار پھر وہ ریٹائر ہو گئے، مگر اس بار اپنی زندگی کے خوابوں کے حصول کے لیے ورجینیا میں اپنے چھوٹے سے قطعہ زمین پر تھرکاریاں اگانے کے لیے۔

ان کے پیش کردہ پروگرام کے بعد کے گزرے ہوئے برسوں نے ان کے تعمیری کردار کو ثابت کر دیا ہے۔ اور مارشل ایڈ کی کوکھ سے جو ادارے پیدا ہوئے ہیں انہوں نے ان مشکل برسوں میں سب سے زیادہ اس خیال کو آگے بڑھایا ہے جسے نوبل نے ”یورپ میں عام امن کا خیال“ کہا تھا اور نوبل نے اپنی وصیت میں قوموں کے درمیان بھائی چارے کے جو خیالات پیش کیے تھے ان کے حصول ہی کے لیے مارشل نے ایک ڈھانچا پیش کیا تھا، جو ان کی اپنی خواہش کے اعتبار سے کافی تھا۔

لہذا، نوبل امن انعام جارج کیٹلت مارشل کو دیا جا رہا ہے۔

صدر نشین ماریائی نوبل کمیٹی Carl Joachim Hambro کی زبانی

خطبہ:

امن کی ضروریات

میں پچھلے چوبیس گھنٹوں کے دوران بڑی اور عجیب حیرت میں رہا ہوں کہ مجھے اعزاز بخشا گیا ہے، اور اس کے جواب میں مجھ سے آج شب کچھ کہنے کی درخواست کی گئی ہے۔ جب کہ کوئی موضوع نہیں دیا گیا، یہ صاف ظاہر ہے کہ آپ کے ذہنوں پر جو سب سے افضل سبب ہے وہ امن کا ہے۔

بغیر کسی حد کے امن کے موضوع پر گفتگو کی جاتی رہی ہے، اور ان کوششوں پر جو دنیا کی تاریخ میں دیے جا

اور عام نوعیت کے امن کے حصول کے لیے بار بار کی گئی ہیں۔ عارضی طور پر کامیابی ہوئی تو ہے مگر 1814 کے الم ناک واقعات کے سبب سب منہدم ہو گئی ہیں۔ میں، سب کی توجہ اس سمت کی طرف کرنا چاہتا ہوں جہاں امن کے حصول کی کامیابی کے امکانات امید افزا دکھائی دیتے ہیں۔

میں کوشش کروں گا کہ میرے خیالات اور گزارشات آسان ترین ہوں، اگرچہ میں ان لوگوں جیسی خطابت کی جادوگری اور فن سے محروم ہوں، جنہیں کل نوبل کمیٹی نے اسٹاک ہولم میں اعزاز بخشے ہیں۔ میں اپنی گزارشات پیش کرنے میں یہ فرض کروں گا کہ آپ پچھلے آٹھ برسوں کے مباحث اور کوششوں سے کسی حد تک واقف ہیں، اور ہر اس حالت سے بھی جو دنیا کی تاریخ میں مدعوئل اور مسلسل امن پر حاوی رہی ہے۔

خاص طور پر میں Pax Romana [لاٹینی زبان میں امن کو Pax کہتے ہیں۔ Pax Romana سے مراد رومن سلطنت کا وہ دور امن ہے جو ستائیس برس قبل مسیح آگسٹس اول کے دور سے شروع ہو کر 180 عیسوی تک قائم رہا تھا۔] کے برسوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جو عیسائی عہد کی تقریباً مکمل پہلی دو صدیوں تک قائم رہا تھا۔ میں اس لیے اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں کہ 1813 کے موسم بہار میں میرے ساتھ ایک ذاتی واقعہ ہوا تھا، جس نے مجھے بد گہرا اثر ڈالا ہے۔ Chaumont میں واقع امریکی ہیڈ کوارٹر میں رات دیر سے واپسی پر میں نے اپنے دوستوں کے ایک گروہ سے رات گزارنے کی خواہش کی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ عارضی طور پر غائب تھے، لہذا، میں نے ایک خالی کمرہ منتخب کیا اور کسی کتاب کا مطالعہ ہوتا کر فائدہ کے آنے تک اس کا مطالعہ کرتا رہوں۔ وہاں موجود کتابیں فرانسیسی یا جرمن زبانوں میں تھیں۔ چوں کہ میں انھیں آرمینی سے پڑھ نہیں سکتا تھا، اس لیے میں نے تلاش مزید کی۔ اور بالآخر ایک انگریزی نصاب ملی جو Gaul [رومن دور کا ایک علاقہ۔] کی تاریخ پر تھی۔ کسی دلچسپ حصے کے تلاش میں ورق گردانی کرتے ہوئے میری نظریں مشہور رومن امن کے بیان پر ٹھہر گئیں۔ اس باب میں ایک بیان تھا رومن فوجوں کی تعیناتی کا، اس طویل عرصے میں، جب ایک لشکر [جرمن شہر] کولون میں، دوسرا کوہلو میں، تیسرا سے انیس (Mayence) اور ریزہ لشکر ٹائر (Trier) میں تھا۔ اب ہوا یوں کہ ہماری اتحادی فوجوں کی تعیناتی بھی بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ ایک ہزار آٹھ سو برس قبل ہوا کرتی تھی، جب کہ امن کمیشن پیرس میں بیٹھا لیگ آف نیشنز کی پالیسی تیار کرتا تھا۔

میں یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہ رہا ہوں کہ وہ عسکری تعیناتی جس کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے NATO کی آج کی وفاقی تعیناتی جیسی ہی تھی۔ آج درمیان خطرہ بالکل مختلف نوعیت کا ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ غیر معمولی تاریخی اعادہ بتاتا ہے کہ ماضی کے سبق کو نظر انداز کرتے ہوئے، ہماری صدی کی دو الم ناک عالمی جنگوں کے نتائج اور گوریائی جہد کے نتیجے کے باوجود ہم نے آنکھ بند کر کے قدم اٹھایا ہے۔

میرے وطن میں عسکری سلامتی بار بار مجھے بتاتے ہیں کہ ہم امریکیوں نے سبق سیکھ لیا ہے۔ مگر میں ان سے بالکل اتفاق نہیں کرتا اور 1845 اور 1850 کے درمیان کی امریکا کی وسیع طاقت کے سرچشمہ کی طرف

ان کی توجہ دلانا چاہتا ہوں، جو کسی زمانے میں امن کے تحفظ کے لیے ضروری تھا۔ میرے خیال میں، اس کے بعد راستہ نتیجے میں جنوبی کوریا پر ظالمانہ چڑھائی ہوئی، جس نے کچھ وقت تک اس میدان جنگ میں موجود ہماری فوجوں کو مکمل شکست کے خطرے سے دوچار کر رکھا تھا۔ میں اس کے بارے میں شدید جذبات کے ساتھ بات کر رہا ہوں، اس لیے کہ 1939 میں اور دوبارہ 1950 میں اچانک مجھے اپنے ملک کی عسکری طاقت کی تعمیر نو کا فرض سونپ دیا گیا تھا، تاکہ فوری ضرورت پر یہ طاقت استعمال ہو سکے۔

یہ ابتدائی کلمات آپ کو یہ فرض کرنے پر مائل کر سکتے ہیں کہ میرا مشورہ برائے ترقی عالمی امن بڑی حد تک مختصر ہوگا عسکری طاقت پر۔ فی الوقت موجودہ خطر دنیا میں امن کا قائم رہنا بڑی حد تک عسکری طاقت اور اتحادیوں کے اتصال ہی کا مرہون وقت ہے۔ مگر غیر معینہ مدت تک بڑی فوجوں کا قائم رکھنا عملی طور پر پالیسی کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ میں اس عرصے میں ایک ساتھ مل کر مضبوطی سے کھڑا ہوا ہوگا، یعنی، اس موجودہ حالت میں، مگر میں اسرار گروں گا، کہ ہمیں کوئی اور حل ڈھونڈنا ہوگا، اور میں اس مقام اسی موضوع پر بات کرنا چاہوں گا۔

ایک سپاہی کو نوٹیل امن انعام کے دیے جانے پر خاصی چڑھ گیا ہوا ہوتا ہے۔ افسوس کہ میرے نزدیک یہ اتنی عجیب بات نہیں جیسی کہ بظاہر اوروں کو نظر آتی ہے۔ میں جنگ کی جیت مایوں اور المیوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ آج، American Battle Monuments Commission کے صدر تشریف کی حیثیت میں، یہ میرا فرض ہے کہ میں سمندر پار کے بہت سے ملکوں، اور بالخصوص مشرقی یورپ، میں فوجی قبرستانوں کی تعمیر اور ان کی دیکھ بھال کی نگرانی کروں۔ انسانی جانوں کے اعتبار سے جنگ کے خسارے کی تفصیل، بہت سے بھی کھاتوں میں نفاست سے لکھی ہوئی میرے سامنے بکھری ہوئی ہے، جن کے کتابت مزار، کھاتے کے کالم کی طرح ہیں۔ میں شدت سے اس کوشش میں ہوں کہ جنگ کے قبر کوٹنے کا کوئی طریقہ نکالا جائے۔ تقریباً روزانہ مجھ سے جنگ میں ہلاک والے والوں کی بیویاں، مائیں اور اہل خاندان رابطے کرتے ہیں۔ گویا ہمہ وقت ماحصل کا الیہ میرے سامنے ہوتا ہے۔

میں آپ کو اپنے عملی فکر میں شریک کرنا چاہتا ہوں تاکہ جنگ کو ٹالنے کا کوئی کارآمد طریقہ تلاش کیا جائے۔ سب سے پہلے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ میں موجودہ نہایت خطرناک حالت کو معمولی نہیں سمجھتا، جو امن کے موضوع پر فطرتی طور پر ہماری سوچ پر اثر انداز ہوتی ہے، مگر میرے خیال میں امن کو حاصل کرنے کے طریقے اور اس کو طویل عرصے تک قائم رکھنے کے لیے اس [خطرناک حالت] کو اصل بنیاد بنانا چاہیے۔ آج ایک سخت عسکری قیام بہت ضروری ہے۔ اس کو کتنی دیر تک قائم رکھنا چاہیے، میں اس کا اندازہ کرنے کے لیے تیار نہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ ایک بھروسے کے قائل اور دیر پا امن تعمیر کرنے کے لیے یہ ایک نہایت سنگ بنیاد ہوگی۔ طویل عرصے تک جاری رہنے والے امن کا انحصار ایک معتدل عسکری طاقت اور دوسرے عناصر پر ہوگا، جو کم اہمیت کے حامل نہیں ہوں گے۔ شاید سب سے اہم واحد عنصر ہوگی روحانی باز

آخری تا کر قوموں کے درمیان خیر سگالی، یقین اور اتفاق رائے پیدا کیا جائے۔ بلاشبہ اس میں اقتصادی عناصر ایک اہم کردار ادا کریں گے۔ طاقت کا توازن حاصل کرنے کے لیے، عواہدہ کتنے ہی ناگوار کیوں نہ لگیں، معاہدوں پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔ اور ان سب کے ساتھ دانش بھی ہو اور اس دانش پر عمل کرنے کا ارادہ بھی ہونا چاہیے۔

میں اس مختصر ہی تقریر میں امن کے سب سے اہم جزو کا صرف ایک بہت محدود خلاصہ ہی پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن، میں غور کرنے کے لیے تین زیادہ مخصوص میدانوں کا انتخاب کرنا چاہوں گا۔

پہلے میدان کا تعلق ہے بہتر تعلیم کے امکانات سے۔ پُر امن زندگی پر اثر انداز ہونے والے مختلف عناصر پر، ان کی ترقی اور ان کے خلیں دونوں کے بارے میں۔ چوں کہ مغرب کی ہماری جمہوریتوں کا دار و مدار ایمان داری سے عوامی اتفاق رائے پر منحصر ہوتا ہے، میرا ہمیشہ اس بات پر یقین رہا ہے کہ ہمارے اسکولوں کو اس میں اپنا کردار ادا کرتے رہنا چاہیے۔ میرے خیال میں، ان تمام عناصر کے بغور مطالعے سے جو ماضی میں امن کی مسامری کی بنیاد بنے تھے اور اب مختلف واقعات کی بنا پر تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، امن کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے ہمارے اسکولوں، یا کم از کم ہمارے کالجوں میں، جنہیں ہم سینئر ہائی اسکول کے نام سے پکارتے ہیں، ایسے نصاب ہونے چاہئیں جو صرف ہمارے مستقبل کے باشندوں کو تاریخی توازن میں ماضی کے واقعات کے بارے میں معلومات فراہم کریں، بلکہ سائنسی انداز میں ان تمام حالات کی تفصیلات بیان کریں جو امن کی تباہی کا باعث ہوئے ہیں، جنہوں نے زندگی میں خلیں اندازی کی ہے اور جنگ کی ہولناکیوں کا باعث ہوئے ہیں۔

مثالیہ ہمارے پاس اپنی صدی میں جنگ کے الم ناک شعلوں سے بچنے کا ایک آخری موقع تھا۔ مثال کے طور پر، دوسری عالمی جنگ کا چیلنج صدی کے تیسرے عشرے کے شروع میں آکر واضح ہونے سے قبل ہی گزر چکا تھا، اگر حالات کو سنبھال لیا جاتا۔ ہم ان واقعات سے اچھی طرح واقف ہیں، جیسے کی Rhineland کی طرف پیش قدمی، حبشہ اور منچوریا پر چڑھائی وغیرہ مثالیہ، عسکری حالات کو توازن میں رکھنے کے لیے جمہوریتوں کو استحکام دینے کا بھی ایک آخری موقع تھا۔ ہمارے پاس ایک اور موقع تھا کہ ہم اقتصادی میدان میں لیکن دین کے ذریعے ان قوموں کے جذبات کے اندر نفوذ کر جاتے جو امن کے لیے خطرے کا باعث ہو رہی تھیں۔ اگر جنگ سے پیدا ہونے والے تمام تر امتیاز اور تباہی کی پیش بینی کر لی جاتی، اور اگر ان مسئلوں کا تمام پہلوؤں سے جائزہ لے لیا جاتا جو جنگ کے لیے خطرہ بن رہے تھے تو یقیناً سمجھوتے کے تمام امکانات پر کبرائی میں جا کر غور کر لیا گیا ہوتا۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے شاگردوں کو، جہاں تک ممکن ہو بغیر کسی قومی تعصب کے، پہلے ان حالات کا ادراک کرنا چاہیے جو ماضی کے المیوں کا باعث ہوئے ہیں اور ان تنظیم اصولوں کو طے کرنے کی کوشش کر لی جاسیے جن کے ذریعے مسلسل ایک بہتر درجہ کے تمدن کی طرف پُر امن پیش قدمی ہو

نیکے۔ ماضی سے بے شمار پُر از معلومات سبق ملتے ہیں، مگر ان کے اظہار میں ایسی کوشش کا فرما ہوتی ہے کہ یہ ایسے رنگ میں رنگے نظر آئیں کہ ان سے قومی نقطہ نظر موافقانہ انداز میں پیش ہو۔ ہمارے ملک کے اسکولوں کی تاریخ میں گزرے برسوں میں، جو شمال میں لکھی گئی ہیں، خانہ جنگی کی ایک مخصوص تصویر ابھرتی ہے جو جنوب میں لکھی تاریخ سے مختلف ہے۔ ایسا رد عمل امن اور تحفظ کے بارے میں بھی بہت عام ہے۔ مگر ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہم ایک نہایت سائنسی دور میں رہ رہے ہیں۔ اب سائنس کی ترقی کا دار و مدار حقائق پر ہوتا ہے نہ کہ پسند اور تعصب پر۔ ہو سکتا ہے کہ اس دور میں ہم، ماضی کے مسخ کیے جانے والے حقائق کی رعایت کے ساتھ کوئی راستہ تلاش کر سکیں۔

میں اس بات کو ضروری سمجھتا ہوں کہ امن کے عام مسئلے کا حل وسیع معنوں اور عوام کی بنیادی انسانی رائے کی بنیاد پر ہی ہونا چاہیے۔ لیگ آف نیشنز، اقوام متحدہ اور اس قسم کے اداروں کی افرادی کوششیں بھی بہت اہم ہوتی ہیں، بلکہ بے حد ضروری ہوتی ہیں، مگر ان کو مطلوبہ ہدف کی جانب پہلا قدم ہی سمجھنا چاہیے۔ ہمیں بڑی حد تک پڑھانے والوں کی غیر جانب داری پر بھروسہ کرنا چاہیے تاکہ سچ کو صحیح تناظر میں پیش کیا جاسکے، ہمیں سائنسی طریقہ ہی استعمال کرنا چاہیے۔ [اس پر میں اس لیے زور دے رہا ہوں] کہ سائنس دان، خواہ وہ کسی قومیت کے حامل ہوں، اپنے مسائل کے حل کے لیے عام طریقے استعمال کرتے ہیں۔

اپنے دوسرے مشورے کے لیے، میں چاہوں گا کہ قومی رویوں پر غور کیا جائے جو امن جیسے بڑے مسئلے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے غلط نہیں سمجھیں گے، اگر میں اپنا نقطہ نظر واضح انداز میں پیش کرنے کی خاطر آپ کی توجہ اپنے ملک کی طرف، اور مخصوص حالات کی طرف مبذول کراؤں جو وہاں پائے جاتے ہیں۔ قضا اور فاصلوں کی، ذنوں اور گھنٹوں کے ہجڑے گھنٹوں اور منٹوں میں طے ہونے کی حیرت انگیز تسخیر کے باوجود عمومی معنوں میں میرا ملک اب بھی دنیا کے پُر آشوب علاقوں سے دور افتادہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ محدود ہونے کے باوجود، ہماری علاقائی ہمیں سلگتے ہوئے بین الاقوامی مسائل پر غیر جانب دارانہ موقف اختیار کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

مزید یہ کہ آبادی کے معاملے میں میرا ملک مخصوص انداز میں بنا ہے۔ ہماری آبادی میں بہت سے قدیم تاریخی نسب کے خاندان بھی ہیں۔ میرے ملک کی آبادی میں یورپی ملکوں، اور موجودہ قطیفی ریاستوں، کے مابعد باشندے بھی شامل ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب روسیوں نے ماسکو سے پہلے قطیفی پرواز شروع کی تھی، جو دنیا کے اوپری سرے کے ایک اس چھوٹے سے ہوائی فوے پر اترنے والی تھی جہاں وانکوور [Vancouver] میں دریائے کولمبیا پر قائم فوجی چوکی میری کمان میں تھی، چند گھنٹوں کے اندر اندر میرا مکان سیکڑوں روسیوں کے، جو غالباً ریاست ہائے متحدہ ہی کے باشندے تھے، نرغے میں تھا۔ اطالوی، جرمن، یونانی اور بہت سارے لوگ جو ہمارے ملک میں آجیے تھے اب ہماری تاریخی آبادی کا حصہ ہیں۔

میرے خیال میں، اس حقیقت سے ہم میں دوسروں کے مسائل پر فکر کرنے کا احساس پیدا ہوا ہے۔ وہاں، پسے ہوئے لوگوں کی مدد کرنے اور ان لوگوں کو سہارا فراہم کرنے کی خواہش، جن پر اچانک مشکلات آپڑی ہوں، بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

فطری طور پر، ہم ڈنمارک والوں، ولندیزیوں یا فرانسیسی افراد کے۔ جو ایک ساتھ مل کر رہتے ہیں مگر قومی وراثت کے باعث بہت مختلف ہیں۔ مسائل کو ان کے حقیقی تناظر میں نہیں دیکھ پاتے۔ پھر بھی، میرے خیال میں، ہم میں ایک قسم کی تیاری پائی جاتی ہے تعاون کی، جو آج کی دنیا کے سب سے بڑے اور امید افزا عناصر میں سے ہے۔ اگرچہ ہم ان مسائل کی تفصیلات سے پوری طرح واقف نہیں، نہ ہی ہم ان سے بیگانے ہیں، ہم آپ کے تاریخی اتحاد اور شبہات میں ڈھیل نہیں ہوتے۔

اگر میری یہ سوچ صحیح ہے کہ ان عناصر نے ہمیں امن جیٹ التوم، امن کی جستجو میں فائدہ پہنچایا ہے، تو میرا مشورہ یہ ہوگا کہ ان عناصر پر منحصر اصولوں کی بنیاد پر تمام قوموں کے درمیان تعاون اور بہتر اہتمام و تنظیم کی جانی چاہیے۔

مجھے احساس ہے کہ اس تصور کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ امریکا میں ہم نے اپنے گھروں، قصبوں اور شہروں کی تہی کے ڈکھنیں جھیلے ہیں۔ ہم نے طویل عرصے کی ایسی غلامی بھی نہیں جھیلی ہے جس میں ہم مکمل طور پر کسی فاتح کے رحم و کرم پر رہے ہوں۔ ہم نے صحیح معنوں میں آزادی کا لطف اٹھایا ہے۔ دراصل، ہم تو آزادی کی آزادی، اور احترام کو روزمرہ کی چیز سمجھنے لگے ہیں، اور بظاہر ہم اس وقت تک بے پروا رہتے ہیں، جب تک کہ ایسا کوئی تنازعہ نہیں ابھرتا جو مغربی یورپی ملکوں کے باشندوں کے لیے مشکل مسئلہ بن جائے، جو اپنی آزادی، اپنے تحفظ اور اپنے قومی وقار کے سلسلے میں یہ وہی خطرات سے شاید ہی کبھی میز آرہے ہوں۔ اس کے باوجود، میں سمجھتا ہوں کہ ریاست ہائے متحدہ کے عوام نے آزادی کی خوف ناک جدوجہد میں لڑنے اور جان دینے کا مظاہرہ کیا ہے، جو ہمیں بہت عزیز ہے، اور اس مشورے کے مقصد کے لیے بڑے پیمانے پر اپنے لوگوں کی قربانی دینے پر اور مغربی ملکوں کے فائدے کے لیے کثیر دولت صرف کرنے پر آمادہ رہے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ ہمارے اور آپ کے ملکوں کے حالات اور درمیان کے اتنے وسیع فاصلے کے باعث غلط فہمیوں کا ہونا لازمی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تعاون کا رویہ پوری طرح ثابت ہوا ہے۔ میں اس پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ مغربی یورپ کی جدوجہد میں ہمارے کرداروں عروہوں اور عورتوں کی والہانہ شمولیت، اور آپ کے عوام سے قریبی رابطوں کے نتیجے میں اوقیانوس کے آپ کے کنارے کے مقابلے میں ہمارے کنارے پر کم غلط فہمیاں ہوں گی۔

مثال کے طور پر، میں نے پہلی عالمی جنگ کے دوران ڈچلی برس فرانس میں صرف کیے ہیں۔ میں بارہا فرانس کے کسانوں کے گھروں میں رہا ہوں اور راتوں میں دیر تک باورچی خانوں کی آگ کے سامنے بیٹھ کر ان سے باتیں کی ہیں۔ میری ان سے اچھی واقفیت رہی ہے، میں نے ان کو پسند بھی کیا ہے، بلکہ کچھ معاملات

میں تو میں نے ان سے محبت تک کی ہے۔ اب، آپ ہی بتائیے کہ یورپ کے موجودہ باشندوں میں سے کتنوں کے ایسے روابط رہے ہیں جن میں وہ امریکا کے عوام کے گھروں، باغیچوں اور شہروں سے اتنے قریب ہوئے ہیں۔ چند لوگ نیو یارک، واشنگٹن اور شکاگو سے واقف ہوں گے، مگر یہ بڑے شہر تو امریکا کے دل اور جذبات کی نمائندگی نہیں کرتے۔

اور تیسرا معاملہ میں جس پر بات کرنا چاہوں گا وہ ان کروڑوں افراد کے مسائل سے متعلق ہے جو غیر معیاری حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور جنہیں اب احساس ہو چلا ہے کہ انسانوں کو خدا کی جانب سے دیے ہوئے حقوق میں سے انہیں ان کا پورا حصہ ملنا چاہیے۔ ان کی تمنائیں ان قوموں کے لیے چیلنج ہیں جن کے پاس بہت کچھ ہے، کہ انہیں زیادہ مفلس لوگوں کی بہتری کے لیے امداد فراہم کرنی چاہیے۔ موجودہ بحران میں یہ مسئلہ خصوصی ہے، مگر دیر پا امن کی کسی بھی کامیاب جدوجہد کے لیے یہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں سوال محض خود غرضی کا نہیں، اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہ لوگ ایسے حالات میں ہیں جس کی مثال ایک کیماری سے دی جاسکتی ہے جس میں ایک، دو یا کئی مختلف النوع انداز زندگی کے اکھوے پھومتے ہوں۔ ہماری جمہوریت، اس لفظ کی ہماری تشریح کے عین مطابق جمہوریت ہی ہے۔ اگر ہم دانش اور فراخ دلی کے مطابق عمل کریں تو، ہم جمہوریت ہی کے ذریعے مفلسوں کی ان خواہشوں کی، ایک خوش حال اور بہتر زندگی کی جانب رہنمائی کر سکتے ہیں۔

بمیں جمہوریت کو ایک ایسی طاقت کے روپ میں پیش کرنا چاہیے جو اپنے اندر نسل انسانی کی ترقیات کے لامتناہی امکانات رکھتی ہے۔ اپنے عمل سے ہمیں یہ بھی واضح کرنا چاہیے کہ ایسی جمہوریت ایک بہتر انداز زندگی کا ذریعہ بنتی ہے۔ استبداد کو محض آزادی اور عزت نفس کی اخلاقی طاقت برائے افراد کے سامنے لگوں ہو جانا چاہیے، مگر ہمیں اس بات کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ یہ جمہوری اصول خالی پیٹ میں نشوونما نہیں پاتے، اور اس کا بھی کہ لوگ آمرین کے جھوٹے وعدوں کی طرف اس لیے راغب ہوتے ہیں کہ وہ مایوس ہوتے ہیں اور وہ ان سے ایسے بد نصیب حالات سے بہتری کے وعدے کرتے ہیں، جس میں وہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ پھر بھی، صرف مادی امداد ہی کافی نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں، آج دنیا میں سب سے اہم شے روحانی باز آفرینی ہے جو عام طور پر انسانوں کے درمیان good faith کو دوبارہ استوار کر سکے گی۔ دل شکستہ لوگوں کو بلند درجے کے اصولوں سے حاصل ہونے والی آہنگ کی اشد ضرورت ہے۔ ایسی قیادت ایک بظلمہ اجراع ہوتی ہے، برداشت کے خلاف، بدگمانی کے خلاف اور بلا امتیاز غیر عدم تحفظ کے خلاف [جو مصلحت کرا جگمگ پر منتج ہوتے ہیں۔] امید کی جاتی ہے کہ جمہوری قومیں ضروری قیادت فراہم کر سکیں گی۔

ابھی جن نکتوں پر میں نے بات کی ہیں وہ امن کی طرف سے چند مشوروں سے زیادہ نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ ان میں نہ کوئی چھپاتی شے پوشیدہ ہے نہ کوئی قہر از وقت وعدہ، مگر کئی میدانوں میں کوشش کرنے کا کوئی نعم البدل نہیں۔ کوشش ہونی چاہیے جوش کے ساتھ فراخ دل ہونے، دوستی کے ساتھ کام

کرنے، رکاوٹ پیدا کرنے کے بجائے مدد کرنے کی کوشش کرنے کی۔ [اور] تجزیے کی کوشش ہونی چاہیے تاکہ جنگ کی وجوہ تلاش کی جائیں اور ان عناصر کی، جو امن کے حق میں ہوں، اور ان کے اخلاق پر غور کیا جانا چاہیے، ایسے مشکل معاملات میں جو ہماری بین الاقوامی گت و شنید پر محیط ہوں۔ مادی کوشش ضرور ہونی چاہیے۔ تمام ذمے داریوں کی شروعات کے لیے، وہ عسکری ہوں یا اقتصادی، جن پر دنیا کے توازن کا انحصار ہو۔ اگر ہم اسی طرح آگے بڑھیں گے تو ایک حرکی فلسفہ تیار ہوگا جس پر وقت یا جگہ کی پابندیاں نہیں ہوں گی۔ امریکا میں ہمارا ایک عقیدہ ہے جو ماضی کی گہرائیوں سے ہم تک آیا ہے۔ یہ مختلف زمینوں سے تعلق رکھنے والے عرووں اور عورتوں کے عقائد سے پھوٹتا ہے، جنہوں نے اس قوم کی بنیاد رکھی ہے اور اس کو عظیم بنایا ہے۔ ہم اس عقیدے میں جیسے دارینہ ان بہت سی قوموں سمیت پرانی دنیا کی اور نئی قوموں کے ساتھ، جو امن کے مقاصد کے لیے ہمارے ساتھ ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ہم ابھی کم عمر ہیں، مگر ہم اپنے اس آدرش کو اس ایتقان کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں کہ ان میں جو طاقت ہے، ترغیب دیتی ہے اور عمل کرنے پر اکساتی ہے۔ میں کسی طرح بھی یہ نہیں کہنا چاہ رہا ہوں کہ ہم لوگوں کو اپنے [امریکی] طرز حکومت کو اختیار کرنے کی طرف مائل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس مقام پر میں ان بنیادی قدروں کی طرف [ضرور] اشارہ کرنا چاہوں گا جن پر دوسری جمہوریوں کی طرح، ہماری حکومت بھی استوار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عہد یا وقت سے ماورا ہیں اور نئی نوع انسانی کے لیے جائز ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ [قدریں] تصورات کو روشن کریں گی اور جذبات کو ابھاریں گی۔

میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس کے سب بڑے محرک، عالمی درجے کے انسانیت پرست، ڈاکٹر البرٹ شوائتھر ہیں جنہیں آج 1952 کا نوبل امن انعام دیا جا رہا ہے۔ میں اس کو اپنے لیے بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ میں اس برس ان کے ساتھ انعام میں شریک ہوں۔ ان کی زندگی میری زندگی سے کہیں مختلف رہی ہے، اور ہم سب کو خوش ہونا چاہیے کہ کرۂ ارض کے مفلس اور جاہل افراد کے درمیان انہیں امن انعام سے نوازا جا رہا ہے۔

مجھے اس بحث کو وسیع اور مخصوص نوعیت کے سوچ بچار کے لوگوں کی شمولیت سے زیادہ الجھلا نہیں چاہیے، جو دنیا میں دیر پا امن کے درجہ بدرجہ حصول کے لیے ایک مضبوط انداز نظر رکھتے ہیں۔ مجھے خوف ہے، بلکہ میں کسی حد تک پر یقین ہوں کہ عظیم جد چل کی طرح اپنے خیالات کے طاقت ور اور چبھتے ہوئے اظہار پر قدرت نہ رکھنے کے باعث، میں اپنے نکات کو اتنے صاف طور پر واضح نہیں کر سکا ہوں جس اہمیت اور اعتبار سے وہ میرے ذہن میں موجود ہیں۔ پھر بھی، میں نے اپنی حد تک بہترین کوشش کی ہے، اور امید ہے کہ میں نے کچھ ایسے سچ بول دیے ہیں جو اچھے پھل لے آئیں گے۔

البرٹ شوائنزر اعلان تجلیل

البرٹ شوائنزر 1875 میں Alsace میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش سے صرف چند برس قبل یہ علاقہ جرمن سلطنت کا صوبہ بن چکا تھا۔ انھوں نے Alsace کو فرانس میں ضم ہوتے دیکھا، دیمری عالمی جنگ میں اس پر جرمنی کا قبضہ ہوا، اور بعد میں ایک بار پھر یہ فرانس کا حصہ بن گیا۔ اس سرحدی علاقے میں لگ کر بڑے ہونے کے دوران شوائنزر ابتدائی عمر سے ہی تین زبانوں یعنی Alsace کی یولی، ہائی جرمن اور فرانسیسی سے واقف ہو گئے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت نے انھیں جرمن اور فرانسیسی تہذیب و تمدن کی گہری بھیرت عطا کی تھی۔

مگر البرٹ شوائنزر کبھی کسی ایک قوم سے وابستہ نہیں ہوئے۔ ان کی پوری زندگی اور ان کا سارا کام تمام انسانوں کے لیے ایک پیغام ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ کس نسل سے ہیں اور ان کی قومیت کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شوائنزر پر، ہم سب کی طرح، کسی گھریا ان کے بچپن اور بلوغت کے زمانے پر کسی ملک کی چھاپ نہیں پڑی۔

ایک عیسائی رہنما کے بیٹے، البرٹ شوائنزر ایک چھوٹے سے گاؤں گنکس باخ (Günsbach) کے ایک خوش حال اور ہستے بستے گھرانے میں تلے بڑھے تھے۔ انھوں نے کسانوں کے بچوں کے ساتھ گاؤں کے اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ بچپن کے اس زمانے نے، جس کا انھوں نے خود تذکرہ کیا ہے، ایک نوخیز لڑکے میں وہ اوصاف ابھرتے دیکھے جاسکتے تھے جنہوں نے ان کو بعد میں ایک باکردار آدمی بنا دیا۔ انھوں نے اپنے بچپن کے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کا تذکرہ بھی کیا ہے، جنہوں نے اچانک ان اوصاف کی طرف ان کی آنکھیں کھول دی تھیں، جو پہلے سے ان کے اندرون میں خوابیدہ تھے۔ مثال کے طور پر، انھوں نے پہلی ایک عمر رسیدہ یہودی کے بارے میں بتایا، جو ان کے گاؤں سے اکثر گزرتا تھا،

کس طرح وہ لڑکوں کا منتہ بنا کرتا تھا اور کس طرح ان کی چھینڑ چھاڑ کا صرف ایک ہنگی سے مسکراہٹ سے جواب دیا کرتا تھا۔ اس یسودی کی مسکراہٹ البرٹ شوائنزر پر چھا گئی، اور انھوں نے بعد میں اس عمر رسیدہ انسان کا احترام کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے ایک اور واقعے کا تذکرہ کیا ہے، جو کچھ یوں تھا کہ ایک دن انھوں نے اسکول کے ایک سانگھی کو گٹھنی کے دوران اٹھا کر بیچ دیا تھا۔ بعد میں اس لڑکے نے شوائنزر سے کہا ”اگر میں بھی تمھاری طرح روز بخنی پی سکتا تو میں بھی طاقت ور ہو سکتا تھا۔“ ان الفاظ نے نوجوان البرٹ پر بہت اثر کیا، اس کے بعد سے انھوں نے نہ صرف بخنی پینا چھوڑ دیا بلکہ صرار کیا کہ وہ بھی کسانوں کے لڑکوں کی طرح کے لباس پہنا کریں گے۔ ایک اور واقعہ کچھ یوں ہے، کہ ایک لڑکے نے انھیں چڑیوں کے شکار پر راضی کر لیا، مگر قبل اس کے کہ شکار پر بندوق داغی جاتی شوائنزر نے آگے بڑھ کر چڑیوں کو اڑا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہم سب کو بچپن میں ایسے تجربات ہوتے ہیں، مگر ہم ان کو بعد کے برسوں میں بھول جایا کرتے ہیں، یا جب ”بلوغت کی عقل مندگی“ کے دوران ان کی یاد آتی ہے تو ہم صرف مسکرا دیتے ہیں۔ مگر البرٹ شوائنزر کے لیے یہ کچھ اور بنی ہو جاتے تھے ایسے ہی احساسات نے بھلے بھولے ہونے کے ان کی یادوں کو تازہ کیا ہے اور بعد کی زندگی میں ان کے تجربات اور دانش کی بنیاد بنے ہیں۔

گاؤں کے اسکول کے بعد انھوں نے مینسٹر (Münster) میں اور پھر مل ہاؤس (Mülhausen) میں اپنی تعلیم جاری رکھی، جہاں وہ اپنے چچا اور چچی کے ساتھ رہتے تھے وہ اس بات کا خود اعتراف کرتے ہیں کہ وہ کوئی خاص ہونہار طالب علم نہیں تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ”میں غالباً بہت زیادہ خواب دیکھنے والا طالب علم رہا ہوں۔“ صرف ان اساتذہ نے، جن سے ان کے ذاتی رابطے رہے تھے کارکردگی میں ان کو اوسط درجے سے بلند پایا تھا۔ تاریخ اور سائنس ان کے خاص مضامین رہے ہیں۔ یہ بچپن اور بلوغت کے درمیان نشوونما کے برسوں کے دوران ہوا تھا کہ انھوں نے اپنے اطراف کی دنیا کو غور سے دیکھا اور سوال کرنا شروع کیا تھا ”کیوں؟“ وہ خود کہتے ہیں کہ ”چودہ اور ستر برس کی عمر کے دوران مجھ میں سوشل پر بات کرنے کی نرم دست عواہش پیدا ہوئی تھی۔ سچ اور اشیا کے مقاصد کی تلاش میرا جنون سا بن گئی تھی۔“ کچھ لوگ کہیں گے کہ ان میں کا پوشیدہ سائنس داں تھا جو جاگ اٹھا تھا۔ تو کیا شاید وہ ہستی کا معما تھا جس کے حل کی عواہش اشعوری طور پر ان میں زور کر رہی تھی؟ اس عرصے کے دوران انھیں موسیقی سیکھنے کی اپنی عظیم صلاحیت کو ابھارنے کا موقع بھی ملا، بچپن ہی سے جس کا ان میں رجحان پایا جاتا تھا۔ اور پھر انھوں نے [موسیقار] یوحنا باخ (Johann Bach) پر اپنے ماہرانہ کام کی ابتدا کی۔

لڑکپن کے البرٹ شوائنزر کی قابل شاخت لیاقت، بلوغت کے دور میں ابھر کر سامنے آئی، وہ لیاقت جو ان کے کام اور زندگی کو اتنی زبردستی بنانے والی تھی، برزندہ شے کے لیے رحم کے عین جذبات، اور یہ یقین کہ وہ لوگ جو خوش حال زندگی گزار رہے ہیں ان لوگوں کے قرض دار ہیں جو کم خوش قسمت ہیں، اور ان پر کم خوش قسمت افراد کی مدد کرنا فرض ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ”جہاں تک میری یادداشت مدد کرتی ہے، دنیا بھر کی

بدبختیوں کا خیال میرے لیے ہمیشہ دکھ کا باعث ہوا ہے۔“

بلاشبہ، اپنے بد حال اور مایوس سائنسی انسانوں کے لیے اس نوجوان کا احساس یکا گت، اور مقصد وجود کے معنی کی تلاش ہی اس کی اپنی جنہی خصوصیات کو ابھارنے پر منتج ہوئی تھی۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ جس ماحول میں اس لڑکے کی نشوونما ہوئی تھی، اسی نے ان کو مستحکم کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ اس کا گھر، اس کے والد کے خطبے، اور اس کی پر داشت، سب نے مل جل کر، جو اسے کفایت بخش باغ نے جھٹکا کی تھی، جہاں ایک ہی چھت کے نیچے کھیلنے اور پڑھنے کی عبادتیں کی جاتی تھیں، اس لڑکے کی ذہن کو مذہبی اور حساس بنادیا تھا۔ اور ان خانہ دانی روایات نے جو بد روشن خیالی تک جاتی تھیں۔ ان کے مانا ایک مہر و ف پادری تھے۔ اس لڑکے پر کبرے اثرات مرتب کیے تھے۔ یہ خیال، شوائنزر کے اپنے خیالات سے ملتا ہے، اس لیے کہ جنس کی کبھی نہ ختم ہونے والی اپنی دائمی بھوک کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ”روشن خیالی کا جذبہ جو اپنے مانا سے ورثے میں ملا تھا، مجھ میں دوبارہ جاگ اٹھا ہے۔“

میں نے البرٹ شوائنزر کی نوجوانی کے بارے میں تفصیل سے بات کی ہے، اس لیے کہ، میرے خیال میں، یہ تفصیل ان کی بعد کی زندگی اور ان کے کام کی تشریح کرتی ہے۔ ان کے اندر پہلے سے روشن ایک شعلہ تھا، وہ شعلہ جوانوں نے اپنی پوری زندگی روشن رکھا اور جوان کی ہر سرگرمی کے لیے وجدان کا منبع رہا ہے۔ دیکھیے کہ وہ خود کیا کہتے ہیں: ”یہ یقین کامل ہی ماما سچا مشیر رہا ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی اسی طرح سوچتے اور محسوس کرتے رہیں گے جیسے کہ عالم شباب میں کیا کرتے تھے۔“ میں نے جنہی طور پر اس کا خیال رکھا ہے کہ میں وہ نہ بنوں جسے ہم سب ”ایک تجربے کا انسان“ سمجھتے ہیں۔ اپنی زندگی کی تجرباتی دا نش جو ہم اپنی نئی نسل کو دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ ”اپنے آدرش کے اندر رہتے ہوئے ہی ترقی کرنا کہ زندگی اسے تم سے چھین نہ سکے۔“

اسکول کے دن ختم ہونے کے بعد البرٹ شوائنزر نے اپنی اعلیٰ تعلیم شروع کی، جس میں برسوں کا مطالعہ اور محنت طلب کام کرنا تھا۔ وہ جنس جوانوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں محسوس کیا تھا، اب تک بڑھ کر ایک ناقابل تشفی خواہش بن گیا تھا، ان تمام سوالوں کے جوابات حاصل کرنے کی، جوان کو گھبرے ہوئے تھے۔ اور اگر ہم البرٹ شوائنزر کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس عمیق جذبہ احترام اور تقدس کو سمجھنا پڑے گا وہ جس میں سچائی کو رکھتے ہیں، جو انہوں نے بڑے غور و فکر کے بعد اخذ کی ہوئی ہے۔ انہوں اپنی اوائل عمری ہی میں اس حرام کا مظاہرہ کر دیا تھا، اور اس کے بارے میں ہمیں ان کے وہ الفاظ آج بھی یاد ہیں جو وقت کے گزرنے کے باوجود ذہن سے محو نہیں ہوئے ہیں: ”اگر مجھے تلاش صدق کے جذبے سے دست بردار ہونا پڑتا تو سب سے پہلے میں اپنے آپ سے دست برداری کرتا۔“

ان کا یہ سول کا مطالعہ بہت عمیق اور کامیاب تھا۔ اپنے مذہبی اور فلسفیانہ مطالعے کے علاوہ انہوں نے یسوع مسیح اور انجیل پر اپنا کام شروع کیا اور فلسفے، تمدن اور اخلاقیات پر اپنے کام کا خاکہ تیار کرنا شروع کیا۔

ساتھ ہی ساتھ وہ باخ کی موسیقی سنتے اور باخ کے کام میں غرق رہتے، اسی موسیقار کے کام پر سند کی حیثیت اختیار کرتے گئے اور اس کی موسیقی کی غیر معمولی تشریح بھی کرتے رہے تھے۔ ان تمام سرگرمیوں کے باوجود وہ آلات موسیقی بنانے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے، اور یہ ان ہی کا فیصل تھا کہ بہت سارے پرانے آلات موسیقی نام نہاد جدیدیت سے محفوظ رہے۔

مگر اس تمام وقت جب وہ اپنے تخلیقی کام میں مجھے سب سے تھے ان کے اپنے اندرون سے اٹھنے والی آواز انہیں چین نہیں لینے دیتی تھیں۔ کیا ان جیسے انسان کو جس نے اتنا آرام دہ بچپن اور خوش گوار لڑکپن گزارا ہو یہ حق ہے کہ وہ ان تمام خوشیوں کو اپنا حق سمجھے؟ خوشیوں کا فطری حق، اور دنیا کے تمام دکھ ان کے ذہن میں اکٹھے ہو گئے تھے اور وہی ان کی مستقبل کی زندگی اور کام کی رہنمائی کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ بات ان پر آشکار ہوتی گئی کہ یہ وہ شخص جسے زندگی میں بہت اچھی چیزیں دستیاب رہی ہوں، اسے دوسروں کو بھی اسی قسم کی چیزیں لوٹانا چاہیے، ان سے کم نہیں، اور اس کو زندگی کے ہر قسم کے بار اور تمام دکھوں میں شریک ہونا چاہیے۔ یہ خیالات ہمیشہ ویسی ہی شدت سے واپس نہیں آتے تھے مگر آہستہ آہستہ اور بڑی بے رحمی سے ابھرتے تھے۔ بالآخر، ان کے اپنے الفاظ میں ”وہ پورے آسمان کو ڈھک لیتے تھے“ اور انہیں برس سے تیس برس کی عمر کے دوران ان کو اس فیصلے پر آمادہ کرتے تھے کہ وہ کلیسا کی طرف متوجہ ہوں یا تعلیم کی طرف یا موسیقی کی طرف۔ اس کے بعد تعلیم اور فنون کے میدانوں میں اپنی آرزو پوری کرنے کے بعد، وہ اپنے ساتھی انسانوں کی طرف متوجہ ہوئے، تاکہ وہ زیادہ براہ راست طریقے سے ان کی امداد کر سکیں۔

البرٹ شوٹنزر نے جو کچھ اپنی زندگی کے بارے میں لکھا ہے اس سے ہم نے اخذ کیا ہے کہ انہوں نے کوئی حتمی منصوبہ تیار نہیں کیا تھا۔ مگر ایک دن 1904 میں، جب وہ آئیس برس کے تھے انہیں چرس میں French Protestant Missionary Society کی ایک اہیل پر ہنے کا اتفاق ہوا جس میں فرانسیسی استوائی افریقا کے سیاہ فام افراد کے لیے مدد کی استدعا کی گئی تھی۔ اس اہیل نے براہ راست ان کے ایک سوال کا جواب مہیا کر دیا تھا: ”میں کس طرح زیادہ بہتر مدد کر سکتا ہوں؟“ وہ سیاہ فام افراد پر سفید فام افراد کے واجب الادا قرض چکانے میں معاون ہونا چاہتے تھے اور انہوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس مقصد کے لیے خود کو تیار کریں گے۔ اس کے لیے انہیں ڈاکٹر بننا پڑا تھا۔

ہمیں اس فیصلے کی پیچیدگی کی تہہ تک پہنچنا پڑے گا: تیس برس کی عمر تک پہنچنا، فلسفے اور دینیات کا ایک معروف ماہر ہونا، باخ پر کتاب لکھنا اور باخ کی موسیقی کا عالمی درجے کا مترجم ہونا، اور اس کے بعد ان سب کو مختصر کرنا اور خود بیان کرتے ہیں کہ کام کی شروعات کرنے سے پہلے انہوں نے ڈاکٹر بننے کا دشوار راستہ کیوں اختیار کیا تھا: ”میں الفاظ کے استعمال کے بغیر کام کرنے کے لیے ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ کئی برس سے میں الفاظ کا استعمال کر رہا تھا۔ لہذا، میرا نیا پیشہ انجیل کی محبت پر بات کرنا نہیں ہوگا، بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے کام کرنا ہوگا۔“

طب کی تعلیم شوائنزر کی زندگی کے سات سال-1905 سے 1913- نکل گئی۔ اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

”فطری سائنس کے حصول نے مجھے اس علم سے کچھ زیادہ ہی دیا، میں جس کی تلاش میں تھا۔ میرے لیے یہ ایک روحانی تجربہ تھا۔ مجھے ہمیشہ سے یہ احساس تھا کہ نام نہاد انسانیت، میں جس کے بارے میں فکر مند تھا، نفسیاتی خطرے کا باعث تھی اس لیے کہ وہ شاید ہی کبھی واضح صداقتوں سے پردے اٹھاتی ہے، مگر اکثر قدرتی فیصلے کرتی ہے، جو صدق کا بھی بدل بدل کر سامنے آتے ہیں، اس لیے کہ ان کا بلبل ہی ایسا ہوتا ہے۔

اب اچانک میں ایک الگ دنیا میں تھا اب میں سچائیوں کے ساتھ کام کر رہا تھا جن کی بنیاد حقیقتوں پر تھی، اور میں ان لوگوں میں سے تھا جو سمجھتے تھے کہ ہر بیان حقیقت کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے۔“

طب کی تعلیم نے انھیں بہت تسکین پہنچائی؛ بلاشبہ یہ ایسا ہی تھا جیسے ان کو ایک بالکل نئی دنیا میں بھیج دیا گیا ہو۔ اس کے باوجود اپنی طبی تعلیم کے دوران (جس کے اخراجات کے لیے انھیں ٹیکس وینے پڑتے تھے اور موسیقی کے آلات کے استعمال کے مظاہرے بھی کرنے پڑتے تھے) انھوں نے فلسفے اور دینیات پر اپنا کام جاری رکھا اور اس عرصے میں انھوں نے بائبل پر اپنے کام کی حتمی زبان میں اشاعت بھی مکمل کر لی، جس میں بائبل پر ان کی تفسیر اور Agues [موسیقی کا ایک انداز] کا مطالعہ شامل تھا۔

1913 میں شوائنزر نے اپنی تعلیم مکمل کی اور ڈاکٹر آف میڈیسن کی سند حاصل کر لی۔ افریقا میں اپنے اسپتال کے منصوبے کے لیے انھیں سرمایہ کی ضرورت پڑی، جس کے لیے انھوں نے دوستوں اور جاننے والوں سے بچک تک مانگی۔ اس دوران، Protestant Missionary Society نے ان کی ”راخ الاعتقادی“ پر اپنے تحفظات کا اظہار کر دیا تھا، اور جب تک کہ شوائنزر نے اس بات کا وعدہ نہیں کر لیا تھا کہ وہ اپنی سرگرمیاں صرف طبی حد تک محدود رکھیں گے، اور عیسائی مبادیہ فام افراد کے عقائد پر اثر انداز نہیں ہوں گے، سوسائٹی نے انھیں قبول نہیں کیا تھا۔

اور بالآخر، 1913 کے گڈ فرائیڈے کے موسم بہار میں البرٹ شوائنزر نے Lambarené مغربی افریقا کا سفر اختیار کیا۔ Lambarené خطہ استونی کے قریب Ogawé نامی دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جو ساحل سے تقریباً 125 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہیں سے شوائنزر نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا، تعلیمی دنیا سے بالکل مختلف زندگی کا، وہ جس میں داخل ہو رہے تھے جسے بہت مختلف قسم کی صلاحیت کی ضرورت تھی۔ یہیں، قبل تاریخ دور کے جنگلوں کے درمیان، انھوں نے پس ماندہ مقامی لوگوں کے لیے اپنا کام شروع کیا، جن کا ایسے مفید فام انسان سے پہلا تعارف ہو رہا تھا، جو اپنے ساتھ پورپی مہمڈن ساتھ لایا تھا اور اس کے ساتھ نئے مسائل بھی شراب، بیماریاں، موجودہ سماجی نظام کا انہدام، مختصر یہ کہ مردہ خرابی جو ایک مفید فام اپنے ساتھ پہلی بار لاتا ہے۔ مگر بہت جلد گھلا کر شوائنزر میں نہ صرف انتظامی صلاحیتیں بھی تھیں، بلکہ ان میں اور بھی ہنر تھے جیسے مکانات، چھوٹیڑوں کی تعمیر بیمار لوگوں کے علاج کے

لیے جن کی اشد ضرورت تھی۔

اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ شوائسز ران وحشی لوگوں کی ذہنیت کو سمجھتے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کو نہ یورپی کی آنکھ سے دیکھا، نہ اپنی سماجی روایات اور اخلاقی اصولوں سے پرکھا۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایک سے زیادہ شادی کو اس سماج کا ایک فطری پہلو سمجھا اور انہیں اس بات کا ادراک تھا کہ اس کو ختم کرنے کی کوشش میں حالات بہتر ہونے کے بجائے بگڑ جائیں گے۔ نہ وہ اس نظریے کے قائل ہوئے کہ سیاہ فام افراد کو تعلیم دے کر ان سے افسرانہ اور دانش وری کے کام لیے جاسکتے ہیں۔ وہ اس وقت تک ان کے موجودہ نظام اور روایات کو مسہار کرنے کے خواہش مند نہیں تھے، جب تک کہ ان کے لیے اس سے بہتر نظام پیش نہیں کیا جاتا۔ وہ جانتے تھے کہ ان لوگوں کی امداد اس طرح رفتہ رفتہ کی جائے کہ ان کے موجودہ سماجی نظام میں اچانک امتحان نہ پھیل جائے۔ انہیں احساس تھا کہ ان کی ذمہ داری طویل اور مشکل ہوگی، اور یہ بھی کہ اگر کامیاب ہوا ہے تو انہیں ایسے سادہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے، مقامی لوگ جن کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

لہذا وہ ان کی مدد کرتے ہیں، انہیں شفا دیتے ہیں اور ان کے ساتھ روز بہ روز، سال بہ سال ان تھک محنت کرتے ہیں تا کہ رفتہ رفتہ ان کو مضرت رساں اور طاقت ور وہم کے چنگل سے نجات دلائیں؛ اس امید پر کہ ایک دن وہ بے شمار اور تلخ مایوسیوں سے انہیں نجات دلانے اور ایک ایسا جج بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ان میں انجیل کی محبت پیدا کرے گا۔ اگر ہم بیماریوں سے جہاد کی بنیاد پر ان کی کامیابی پر ان کے کام کو پرکھنا چاہیں تو یقیناً انہیں ایک ڈاکٹر کی حیثیت میں دیکھنا ہوگا۔ مگر ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان کی شخصیت اور انجیل سے ان کی محبت کا پرچار بالآخر زیادہ کامیاب ہوگا اور مزید یہ کہ یہ مختلف نسلوں کے درمیان بھٹی چارے کی ترقی کی نشوونما میں مدد و معاون ہوگا۔ اگر ہم شوائسز کی زندگی کی خود نوشت تفصیلات کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ محض خطبے دینے والے مبلغ نہیں، بلکہ ایک حقیقت پسند اور جنگل کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے آگاہ انسان ہیں، ایسے جن کا کام سب زیادہ وہ ہیں ہوتا ہے جہاں دیکھ زیادہ ہوتے ہیں، جہاں ان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

مگر، افریقہ میں البرٹ شوائسز کا قیام زیادہ دن نہیں رہا۔ جب 1914 میں پہلی عالمی جنگ چھڑی تو ایک جرمن باشندے ہونے کے باعث انہیں کڑی نگرانی میں رکھا گیا، اور 1917 میں انہیں اور ان کی اہلیہ کو فرانس کے ایک کیمپ میں محصور کر دیا گیا تھا۔ وہاں مہیا سہولتوں نے انہیں مذہبی، فلسفیانہ اور سماجی مطالعے کو جاری رکھنے کا زیادہ موقع فراہم کیا، جس کو انہوں نے کبھی ترک نہیں کیا تھا؛ جب وہ افریقہ میں تھے تب بھی وہ اپنی راتوں کا کچھ حصہ اس کے لیے وقف رکھا کرتے تھے۔

1918 میں جب شوائسز کو محصوری سے رہائی ملی تو وہ بیمار تھے اور 1924 تک یورپ ہی میں مقیم رہے۔ اس کے بعد سے انہوں نے افریقہ ہی میں قیام کیا ہے، سالے 1939 اور 1948 کے چند مختصر یورپی

دوروں کے اور اب بھی وہ وہ ہیں متمم ہیں۔

ان کے یورپ کے دورے ہمیشہ دوڑتے بھاگتے ہوتے رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں آرام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انھوں نے بہت سے اعلیٰ درجہ کے مظاہرے کیے ہیں، لوگوں کو خط دینے اور Lambarene میں بننے والے اسپتال کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے، انھوں نے رفتہ رفتہ جس کی توسیع کی ہے۔ انھوں نے سماجی اور مذہبی موضوعات پر خطبے دیے ہیں، جب کہ ہر لمحہ اپنے فلسفے کی توضیحات تلاش کرتے رہے ہیں، جس کا کچھ اظہار دوسرے افراد کو بھی اور زندگی کے راستے دکھاتا ہے۔ ہم یہ کبھی نہیں بھول سکتے کہ شوآنقر ایک آدمی ہیں جو خیالات کا بہت احترام کرتے ہیں، اور ان ہی کے ذریعے وہ ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں جو وہ خود اپنے آپ سے پوچھتے ہیں، یعنی ”اگر ہم خیالات سے دست بردار ہو جائیں، تو ہم روحانی طور پر دیوالیہ ہو جاتے ہیں“ اور وہ مزید کہتے ہیں کہ ”جو کوئی بھی انسان کے خیالات کے ذریعے سچ کی دریافت کرنے کی صلاحیت پر یقین نہیں رکھتا وہ تشکیک پرستی میں بہکنے لگتا ہے۔“

شوآنقر کا ملک کی طاقت پر یقین رکھنا اور صداقت کی طلب کے لیے ان کی بے تابی غیر متزلزل اور غیر متغیر ہے۔ مگر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نظام کا پابند اور منطقی خیال ہم کو صرف ایک خاص مقام تک لے جاسکتا ہے، اس سے پرے نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ”دانش صرف اتنی ہی ترقی کی اجازت دیتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ تفصیل بیان کر سکیں اس دنیا کی، اور اس کے ارتقا کی جسے ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ عالمی تناظر میں جو چیز کسی قابل ہوتی ہے وہ ہے معنی کی گرفت، ہر شے کا مقصد، اور وہ کچھ جسے ہم کر نہیں پاتے۔“ ان کا خیال ہے کہ وہ پہلے مغربی مفکر ہیں جس نے اس ریزہ ریزہ کردینے والے نتیجے کا اعتراف کرنے کی ہمت کی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ فلسفے اور عالمی تناظر سے دست برداری کی ہے جس میں زندگی محفوظ ہوتی ہے۔

مگر کئی برس بعد وہ اس فلسفے کو ایک سادہ سے لکھیے میں [پودے کی] قلم کی طرح جھانکے ہیں، جس کو ہم ”زندگی کا احترام“ کہتے ہیں۔ 1915 کے ایک دن۔ جب وہ چالیس برس کے تھے۔ فریقا کے ایک دریا میں سفر کرتے ہوئے، انھوں نے سورج کی کرنوں کو پانی پر جھللاتے دیکھا تھا، جس کے اطراف جنگلی تھیں اور دریائی گھوڑوں کا ایک جھنڈ دریا کے کنارے دھوپ کھا رہا تھا۔ ان وقت ان پر وحی کی مانند وہ جملہ نازل ہوا جس نے ان خیالات کی صحیح ترجمانی کی ہے یعنی ”زندگی کا احترام۔“ ایک بار پھر، جیسا کہ ان کے بچپن اور لڑکپن میں ہوا تھا، ایک سادہ سے واقعے نے ان کے لیے دوازے کھول دیے۔

”مگر“ وہ کہتے ہیں کہ ”کوئی باقاعدہ منطقی استدلال اور دانش کے ذریعے اس تک نہیں پہنچ سکتا، اس لیے کہ دونوں میں کوئی بھی نہ دنیا کی صفائی فراہم کر سکتا ہے اور نہ زندگی کے مقصد کی۔“ صفائی اسی سے ملتی ہے جس کو وہ عنصری خیال کہتے ہیں۔ اور یہ ہم کو اس ناگفتنی شے کے احترام کی طرف لے جاتی ہے جس کو زندگی کہتے ہیں، زندگی کی تصدیق کی طرف جو زندہ رہنے کی خواہش سے زیادہ ہوتا ہے۔ شوآنقر اس کو اس

طرح بیان کرتے ہیں کہ ”میں [ایک] زندگی ہوں، جو زندہ رہنا چاہتی ہے دوسری زندگی کے درمیان، جو [خود بھی] زندہ رہنا چاہتی ہے۔“ اس میں زندگی کی ایک نوعیت کی تصدیق ہے جو وجود سے پرے احترام ہے ان سب کا جو زندہ رہنا چاہتے ہیں، تا کہ سرودہ شے جو بحال رکھتی ہے، غذائیت فراہم کرتی ہے، اور جو ممتاز کرتی ہے اس زندگی کو جو اچھی اور مثبت ہو، اور ان کے سوا سب کچھ شیطانی ہے، منفی ہے۔ ان خیالات میں شوائزر ایک کا کثافی اخلاق تعمیر کرتے ہیں، اور اس کے ذریعے یقین کرتے ہیں کہ بنی نوع انسان روحانی عمل اشتراک میں اہدیت سے مل جاتا ہے۔ وہ اس کو زندگی کا فلسفہ کہتے ہیں یعنی ”اخلاقی تصوف۔“

البرٹ شوائزر کو لا آدری [agnostic]—وہ لوگ جو خدا یا کائنات یا کسی اور چیز کی ابتدا کے بارے میں علم رکھنے سے انکار کرتے ہیں [کہا جاتا رہا ہے۔ اگر کسی لا آدری کو آدمی سمجھا جاتا ہے اور وہ احترام کرتا ہے کہ ہم ضروری سوالات کے جواب نہیں معلوم کر سکتے، تو پھر منصفانہ طور پر اس اصطلاح کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ مگر وہ اس دلیل کو ایک قدم آگے لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر معقول سوچ کو بہت دور تک لے جایا جائے تو وہ غیر معقول تصوف کی طرف لے جاتی ہے۔

میں اس کو اس طرح کہنا پسند کروں گا کہ جہاں خیال اپنی حد تک پہنچ جاتا ہے، وہیں سے عقیدہ شروع ہو جاتا ہے، تب ہم مذہب سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ شوائزر نے خود اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ”زندگی کے لیے احترام کا عالمی تناظر مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے، عیسائیت سے، اس کی عملی محبت سے اور شوق سے قریب تر ہوتا ہے۔۔۔ عیسائیت کی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں یسوع مسیح کا جذبہ بھرا ہوا ہو، تا کہ وہ زندہ ہو، شدید ہو، محبت کا مذہب ہو، جو اس کو ہونا چاہیے۔ چوں کہ میں خود عیسائیت کے پرستاروں میں سے ہوں، میں دیانت اور صدق کے ساتھ اس کی خدمت کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ خیال جو اس سادہ، اخلاقی / مذہبی خیال - احترام برائے زندگی - پر منتج ہوا ہے عیسائیت اور اس خیال کو ایک دوسرے سے قریب لا سکتا ہے۔“

تو میں سمجھتا ہوں کہ جو احترام برائے زندگی کے بارے میں، مذہب کے بارے میں، اور بھائی چارے کے تصور کے بارے میں البرٹ شوائزر ہم سے کہنا چاہتے ہیں۔ ایسے بے شمار لوگ جنہوں نے بنی نوع انسان سے اس کے بارے میں باتیں کی ہیں، حال کے مقابلے میں ماضی میں زیادہ تھے جب کہ بھائی چارے کا تصور آج کے دوسرے نعروں کے شور میں دبا جا رہا ہے۔

مگر ان پریشان کن اور غیر یقینی حالات میں لوگ کسی ایسی شے کی تلاش میں ہیں جو انہیں اس یقین کی اجازت دے کہ ایک دن بنی نوع انسان کے ہاتھوں میں امن اور گرمجوشی کی لگام ہوگی۔

اگر ایسا احترام زندگی اور بھائی چارے کا تصور انسانوں کے دلوں کی زندہ حقیقتیں ہو سکیں، تو کو کیا ہم نے افراد کے قوموں کے اور نسلوں کے دیر پا امن کی بنیادیں رکھ دی ہیں۔

ہم سب کو احساس ہے کہ ہم اب بھی اس پرف سے بہت فاصلے پر ہیں۔ یہ اس دور کے نوجوان ہی

ہوں گے جو اس راستے پر قدم آگے بڑھائیں گے۔ البت شوانتزر نے جس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اپنی پوری طویل زندگی کے دوران یہ خود اپنے شباب سے مخلص رہے ہیں اور انہوں نے ہم کو دکھایا ہے کہ ایک انسان کی زندگی اور اس کا خواب ایک ہو سکتا ہے۔ ان کے کام نے بھلی چارے کے تصور کو ایک زندہ حقیقت بنا دیا ہے، اور ان کے الفاظ بے شمار لوگوں کے ذہنوں تک پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے ان میں جڑیں پکڑ لی ہیں۔

صدر نشین مارویائی نوٹیل کمیٹی Gunnar Jahn کی نوابی

خطبہ:

امن کا مسئلہ

امن کے اپنے خطبے کے لیے، نوٹیل امن انعام نے مجھے جس پروقا را عزاز پر مجبور کیا ہے، اس کے لیے میں نے امن کے اس وقت موجود مسئلے کو منتخب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا کرتے ہوئے میں نے اس انعام کی بنیاد رکھنے والے کے جذبے پر عمل کیا ہے، جس نے خود کو وقف کر دیا تھا ان مسائل کے لیے جیسے کہ اس زمانے میں موجود تھے اور جس کو توقع تھی کہ اس کی قائم کردہ فاؤنڈیشن مختلف طریقوں سے امن کی خدمات کی ہمت افزائی کرے گی۔

میں ان حالات کے تذکرے سے شروعات کروں گا جو دو جنگوں کے اختتام کے وقت تھے ہم حال ہی میں جس سے گزر رہے ہیں۔

ان بدترین کے لیے، جو دو عالمی جنگوں کے بعد مذاکرات کے ذریعے آج کی دنیا کی تشکیل کے ذمے دار تھے حالات بہت نا سازگار تھے۔ ان کا مقصد ایسے حالات پیدا کرنا نہیں تھا جو وسیع پیمانے پر کامیاب ترقیات کا باعث ہوں، بلکہ انھیں فتح کے نتائج کو مستقل بنیادوں پر قائم کرنا تھا۔ اگر ان کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا تب بھی وہ اس کو ایک رہنما اصول نہیں بنا سکتے تھے۔ ان پر لازم تھا کہ وہ خود کو محض فاتحین کی وصیت پوری کرنے والے ہی سمجھیں۔ وہ عوام کے درمیان انصاف کی بنیاد پر تعلقات استوار کرنے کی آرزو نہیں کر سکتے تھے؛ ان کی تمام تر کوششیں فاتحین کے نہایت ماروا مطالبات کو حقیقت بننے سے روکنے کی ضرورت کی غرض سے ہو جاتی تھیں، مزید یہ کہ انھیں فتح کرنے والی قوموں کو قائل کرنا ہوتا تھا کہ جب بھی ان کے مفادات اور نظریات آپس میں ٹکرائیں تو وہ آپس میں مصالحت کریں۔

ہمارے موجودہ حالات میں کیا ناقابل برداشت ہے۔ اور فاتحین اور ان کے ساتھ ہی مفتوح بھی اس کو سہنا شروع کرنے لگے ہیں۔ یہ اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ تاریخی حقیقتوں پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی تھی،

کر کیا صحیح اور فائدہ مند ہے۔

یورپ کا تاریخی مسئلہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ گزشتہ صدیوں میں، بالخصوص نام نہاد بڑے حملوں کے عہد میں، مشرق کے عوام مغرب اور جنوب مغرب میں دور دور تک پہنچ گئے تھے اور زمینوں پر قبضے بھی کر لیے تھے۔ تو پھر یوں ہوا کہ بعد میں آنے والے مہاجرین پہلے سے بسے ہوئے مہاجرین میں گھل مل گئے۔ ان لوگوں کی جزوی آمیزش اسی زمانے میں ہوئی، اور سرحدوں کے اندر ہی نسبتاً ہر قسم کی سیاسی سوسائٹیاں بن گئی تھیں۔ مغربی اور مرکزی یورپ میں، اس ارتقا نے ایسے حالات پیدا کیے جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ شفاف ہو گئے اور انیسویں صدی کے دوران اپنی اہم وضع قطع میں یقینی ہو گئے۔

دوسری جانب، مشرق اور جنوب مشرق میں یہ ارتقا اس درجے تک نہیں پہنچا۔ قومیتوں کی ہم بودیت کے ساتھ رک گیا، جو ضم ہونے میں ناکام رہیں۔ ہر شخص زمین کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ کچھ لوگ علاقائی حقوق کا دعویٰ بھی کر سکتے تھے اس لیے کہ گنتی میں وہ زیادہ ہیں اور ایک عرصے سے اس پر قابض ہیں، جب کہ دوسرا کہہ سکتا تھا کہ اس نے زمین کو قابل کاشت بنانے میں کام کیا ہے۔ لہذا، اس کا ایک ہی عملی حل ہو سکتا تھا کہ اسی علاقے میں دونوں اسکے رہیں اور ایک سیاسی سوسائٹی کا حصہ بن جائیں، ایسی مصالحت کے ساتھ جو دونوں کو قبول ہو۔ یہ ضروری ہوتا اگر انیسویں صدی کی دو تہائی سے پہلے حالات اس کج پہنچ جاتے۔ اس لیے کہ اس کے بعد قومی ضمیر کی ترقی برہنہ تھی جو اپنے ساتھ اہم نتائج لے کر آئی۔ اس ترقی نے عوام کو اجازت نہیں دی کہ تاریخی حقیقتیں اور سبب ان کی رہنمائی کریں۔

پہلی عالمی جنگ کی ابتدا ان حالات میں ہوئی تھی جو مشرق اور مشرقی یورپ پر غالب تھے۔ اس لیے، دونوں جنگوں کے ختم ہونے کے بعد بتائے گئے نظام میں مستقبل کے تنازعات کے حل موجود ہیں۔ جنگ کے بعد کے نئے نظام میں تنازعات کے بیجوں کا ہونا لازمی ہے، اگر یہ تاریخی حقائق کو مد نظر نہیں رکھتا اور ان حقائق کی روشنی میں مسائل کے متصفانہ معروضی حل نکالنے کے لیے بتایا گیا ہو۔ صرف ایسا ہی حل مستقل حل ہو سکتا ہے۔

تاریخی حقیقت اس وقت ہیروں کے روئے دی جاتی ہے جب دو فریق ایک ہی ملک پر حریفانہ دعوے رکھتے ہوں اور صرف ایک فریق کے دعووں کا اعتراف کیا جائے۔ وہ حقوق جو دو قومی یورپ کے تنازعہ حصوں کے بارے میں رکھتی تھیں ان کی قدر کبھی برابر نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ درحقیقت دونوں ہی مہاجر ہیں۔

اسی طرح، ہم تاریخ کی توہین کے مجرم ہیں اگر، ایک نئے نظام کی قیام میں، ہم سرحدوں کے ساتھ ساتھ اقتصادی حقائق کو سامنے نہیں رکھتے۔ ایسا ہی معاملہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم قدرتی طور پر نیچے زمینوں کو بندرگاہ کے حق سے محروم رکھنے کے نقطہ نظر سے حد بندی کرتے ہیں، یا ایک خام مال کے متحمل علاقے اور دوسرے علاقے کے درمیان جس کا استعمال کیا جاسکتا ہے، رکاوٹوں کو بلند کرتے ہیں۔ اسی طرح

ہم ایسی ریاستیں بناتے ہیں جو اقتصادی طور پر زمرہ نہیں رہ سکتیں۔

تاریخی حقوق کی، اور انسانی حقوق کی، سب سے واضح خلاف ورزی وہ ہوتی ہے جو کچھ لوگوں کو اس زمین پر ان کے حق سے محروم کرے وہ جس پر اقامت پذیر ہوں، اس مقصد سے کہ وہ [مجبور ہو کر] دوسرے علاقے میں منتقل ہو جائیں۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر، فاتح طاقتوں نے لاکھوں افراد کو ایسی قسمت دینے کا فیصلہ کیا، اور نہایت سخت حالات میں اس سے ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کسی ایسے مشن کے بارے میں کس قدر کم علم تھے جس کا مقصد ایک معقول اور منصفانہ تنظیم نو ہو اور جو ایک سازگار مستقبل فراہم کرنے کا ضامن ہو۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد سے ہماری کیفیت کی تصویر کشی کی گئی ہے، اس حقیقت سے کہ اب تک کسی امن کے معاہدے پر دستخط نہیں ہوئے ہیں۔ صرف جنگ بندی کی قسم کے معاہدے کیے گئے ہیں، اس لیے کہ ہم درحقیقت تنظیم نو کرنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے، خواہ وہ کتنی ہی زیادتی کیوں نہ ہو کہ ہم وقتی ضرورتوں کے پیش نظر، ان جنگ بندیوں پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں، اور ہم کوئی قابل پیش بینی مستقبل نہیں رکھ سکتے۔

یہ تو ہے ہماری موجودہ کیفیت۔ اب ہم امن کے مسئلے کو کس طرح حضور کرتے ہیں؟

اگر بہت ہی مختلف روشنی میں دیکھا جائے تو جدید جنگ ماضی کی جنگوں سے مختلف ہے۔ جنگوں میں اب ایسے موت اور تباہی انگیز ہتھیار استعمال کیے جاتے ہیں جو ماضی کے مقابلے میں بہت زیادہ مؤثر ہوتے ہیں، لہذا پہلے سے زیادہ شیطانی ہوتے ہیں۔ اب تک تو جنگ کو ایک برائی سمجھا جاسکتا تھا، انسان کو جسے قبول کرنا پڑتا تھا اس لیے کہ یہ ترقیات کے کام آتی تھی، بلکہ اس کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اس [نکتے] پر بحث کی جاسکتی ہے کہ اس کے صدقے میں طاقت ور ترین خوبیوں والے لوگ بچتے رہے تھے اس طرح [جنگ] تاریخ کی راہوں کا تعین کرتی رہی ہے۔

مثال کے طور پر یہ دھوکا کیا جاسکتا ہے کہ بائبل والوں پر سائزس اعظم کی فتح نے مشرقِ قریب میں ایک سلطنت کی بنیاد رکھی تھی جس کا تمدن اس سے کہیں زیادہ بلند تھا جو اس نے نکال باہر کر دیا تھا، اور سکندر اعظم کی فتوحات نے نئے نسل سے سندھ تک، یونانی تمدن کے لیے راستے کھول دیے تھے۔ کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے، جب جنگ بہتر تمدن کو کم رتبہ تمدن سے بدل دیتی ہے، جیسا کہ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ہوا تھا، جب عربوں کو فارس، ایشیائے کوچک، فلسطین، شمالی افریقا اور ہسپانیہ جیسے ممالک پر حاکمیت مل گئی تھی، جو اس وقت تک یونانی / رومن تمدن کے زیر اثر پھیل چکے ہوئے تھے۔

گویا، ایسا بھی محسوس ہوگا کہ ماضی میں، جنگ اسی طرح ترقیات کے سلسلے میں فائدہ مند ہو سکتی تھی، جس طرح اس کے خلاف کام کرتی تھی۔ [مگر] ہم بہت مشکل سے یہ دھوکا کرنے کے مجاز ہوں گے کہ جدید جنگ ترقیات کی نمائندہ ہو سکتی ہے۔ اس میں پوشیدہ برائی ہمارے لیے پہلے سے کہیں زیادہ بوزنی ہو گئی ہے۔

[اس موقع پر] یہ یاد رکھنا معقول ہوگا کہ 1914 سے پہلے والی نسل نے ہتھیاروں کی بے انداز ذخیرہ اندوزی کو منظور کیا تھا۔ [اس کے حق میں] دیکھیں یہ دئی گئی تھی کہ عسکری فیصلہ زیادہ سرعت سے کیا جاسکے گا اور یہ بھی کہ مختصر جنگوں کے ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس رائے کو بغیر کسی تعرض کے قبول کر لیا گیا تھا۔

چوں کہ انھیں جنگ کے طریقوں میں بتدریج انسانی رحم دئی کی توقع تھی، لوگ اس بات کے بھی قائل ہو گئے تھے کہ مستقبل کے تنازعات کے نتیجے میں ہونے والی برائیاں بھی نسبتاً ہلکی ہوں گی۔ [دراصل] یہ قیاس ابھرا تھا 1864 کے جینیوا کنونشن کی شرائط کے نفاذ سے، جو ریڈ کراس کی کوششیں کا شاخسانہ تھا۔ دشمنی ہونے والوں کی عمدداشت، جنگی قیدیوں کے ساتھ انسانی سلوک، اور شہری آبادی کی بہبود کے سلسلے میں باہمی ضمانتوں کا تہاہ ہو چکا تھا۔ اس عہد و پیمان سے کچھ نتیجے اخذ کیے گئے تھے جن کے لیے آنے والی جنگوں میں ہزاروں لڑنے والے اور شہری، شہرگزار ہونے والے تھے۔ مگر، جنگ کی بد بختیوں کے مقابلے میں، جو موت اور بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے جدید ہتھیاروں کے متعارف ہونے کے بعد تمام حدیں پھلانگ چکی تھیں، یہ معمولی ہو کر رہ گئی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اب جنگ کو رحم دل بنانے کا سوال ہی نہیں رہا۔ مختصر جنگ کے تصور نے، اور اس کے طریقوں میں انسانی رحم دئی کے باعث، جسے 1914 کی جنگ کے بعد پھیلا یا گیا تھا، لوگ، درحقیقت جنگ کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیتے، جیسے کر لینا چاہیے۔ وہ اس کو ایک طوفان کی مانند سمجھتے ہیں جو سیاسی فضا کو صاف کر دینے والی تھی، اور ایک ایسے واقعے کی طرح، جو ہتھیار بندی کو ختم کر دے گی، جو قوموں کی تباہی کا باعث ہونے والی تھی۔

جب کہ کچھ لوگ جنگ کی اس لیے حمایت کرتے تھے کہ وہ اس سے فائدے کی توقع رکھتے تھے، دوسرے لوگوں کی توقعات عالمی طرف تھیں کہ یہ جنگ، دوسری تمام جنگوں کو مسدود کرنے کی لیے لڑی جانی چاہیے۔ بہت سے بہادر دل انسان اس یقین پر جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے کہ وہ اس دن کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں جب جنگ کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

اس تنازعے میں، جیسا کہ 1939 میں ہوا تھا، یہ دونوں تصورات بالکل غلط ثابت ہوئے۔ سال بہ سال نہ صرف قتل و غارت کی گئی، بلکہ وحشیانہ انداز میں مسلسل کی جاتی رہی۔ 1870 [جہمینی اور فرانس کے درمیان] کی جنگ کے مقابلے میں یہ جنگیں دو محدود ریاستوں کے درمیان نہیں، بلکہ دو عالمی گروہوں کے درمیان تھیں، اور اس طرح بنی نوع انسان کا ایک بڑا حصہ اس کے زلغے میں آگیا، اور یہ المیہ [مراد وینٹن] مرکب ہو گیا تھا۔

چوں کہ ہم جانتے ہیں کہ جنگ کتنی ہولناک برائی ہے، ہمیں اس کے روکنے کے لیے کوئی کوشش اٹھانی نہیں رکھنی چاہیے۔ اس وجہ میں ایک اخلاقی وجہ بھی شامل کی جانی چاہیے: پچھلی دو جنگوں کے دوران، ہم ایسے غیر انسانی سلوک کے مجرم رہے ہیں جس کو سن کر لوگ کانپ اٹھتے ہیں اور مستقبل کی کسی جنگ میں ہم اس سے زیادہ بڑی خرابی کے مجرم ٹھہریں گے۔ تو، یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

تو ہمیں ان حالات کا سمجھنا چاہیے۔ انسان سوپر ہمن بن گیا ہے۔ وہ اس لیے سوپر ہمن ہے کہ اس کے قبضے میں نہ صرف جسمانی مادی قوتیں ہیں، بلکہ سائنسی اور تکنیکی ترقیات کے طفیل، اس کی کمان میں اندرونی قدرتی قوتیں بھی آگئی ہیں جنہیں وہ اپنے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ کسی کو فاصلے سے قتل کرنے کے لیے اس کو محض اپنی جسمانی توانائی استعمال کرنی پڑتی تھی؛ تیر چلانے کے لیے کمان خم کرنا پڑتی تھی۔ سوپر ہمن ترقی پا کر اس درجے تک پہنچ گیا ہے جہاں تیار کیے گئے ایک آلے کے طفیل وہ کیمیائی مصنوعات کے دھماکے سے پیدا ہونے والی توانائی کو استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے ذریعے وہ ایک نہایت کارگر حرکت کرنے والی شے کو خاصے طویل فاصلے تک پھینک سکتا ہے۔

اس کے باوجود سوپر ہمن ایک مہلک نقص کا شکار بھی ہے۔ وہ سوپر ہیومن (superhuman) درجے تک نہیں پہنچ پایا ہے، اس لیے کہ وہ سوپر ہیومن توانائی پیدا نہیں کر سکا ہے۔ اس کو ضرورت ہے ایسی وجہ کی جس کی بنا پر وہ اس [سوپر ہیومن] قوت کو مکمل طور پر مناسب اور فائدہ مند نتیجے کے لیے استعمال کر سکے، تہی اور فائدہ منانے کے لیے نہیں۔ چوں کہ وہ اس سے قاصر ہے، اس لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی فتوحات، اس کے لیے نعمت بننے کے بجائے مہلک خطرہ بن جاتی ہیں۔

اس سیاق و سباق میں، کیا یہ بات اہم نہیں کہ پہلی عظیم دریافت بارود کے دھماکے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی طاقت پر قابو، کوسب سے پہلے فاصلے سے قتل کرنے کے ذریعے کے طور پر دیکھا گیا تھا؟ اندرونی جھماکا کرنے والے (combustion) انجن کے طفیل، فضا پر حکمرانی انسان کے لیے ایک فیصلہ کن اور اہم پیش رفت تھی۔ اس کے بدلے، اس موقع کو آدمیوں نے فوراً آسمانی بلندی سے مارنے اور تباہ کرنے کے لیے چڑھایا۔ اس ایجاد نے ایک حقیقت پر زور دیا ہے جس کو اب تک شہود مد سے رد کیا گیا ہے: سوپر ہمن جس قدر طاقت حاصل کرتا ہے اتنا ہی مفلس ہو جاتا ہے۔ خود کو آسمان سے برسنے والی تہی سے بچانے کے لیے خود اس کو بھی شکار کیے جانے والے جانور کی طرح زیر زمین پناہ لینی پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اخلاقی قدروں کی بے مثال تہی کا شریک جیم بھی بننا پڑتا ہے۔

ایٹم کے ٹکڑے کرنے سے آزاد ہونے والی وسیع طاقت کی دریافت اور اس کے مابعد استعمال سے ایک نیا مرحلہ درپیش ہو گیا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ہی، یہ پتا چل گیا تھا کہ ایک بم کی تہی کی طاقت ناقابل شمار ہونے کی ہے، اور یہ بھی کہ بڑے پیمانے پر اس کے تجربات بھی اس پیمانے کی آفت برپا کر سکتے ہیں جن سے نسل انسانی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ حال ہی میں پوری طرح ہم پر اس کی دہشت واضح ہوئی ہے۔ اب ہم بنی نوع انسان کے مستقبل کے سوال کو دیر مال نہیں سمجھتے۔

مگر ایک ضروری امر، ہمیں جس کا اپنے ضمیر میں اعتراف کرنا پڑے گا، اور ہمیں جس کا بہت پہلے ہی اعتراف کر لینا چاہیے تھا، یہ ہے کہ اس طرح ہم اس حد تک وحشی ہوتے جا رہے ہیں کہ ہم سوپر ہمن بن جائیں۔ ہم نے جنگ کی حقیقتوں کو برداشت کرنا سیکھ لیا ہے کہ دوسری عالمی جنگ میں انسانوں کے ہجوم کے

ہجوم مارے جاتے تھے کہ پورے پورے شہر مع اپنی آبادیوں کے جویری بم سے نیست و نابود کر دیے گئے تھے، کہ آگ لگانے والے بموں سے انسان جلتی ہوئی مشعلیں بنا دیے جاتے تھے۔ یہ سب باتیں ہمیں ریڈیو یا اخبارات سے معلوم ہوتی ہیں، اور ہم ان کے بارے میں اس انداز سے فیصلے کرتے ہیں کہ وہ لوگ ہم میں سے تھے یا ہمارے دشمنوں میں سے۔ جب ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ایسے کام نتیجہ ہوتے ہیں غیر انسانی اعمال کا، تو ہمارے اعتراف کے ساتھ یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ جنگ کی حقیقت ہمارے لیے کوئی اور راستہ نہیں چھوڑتی سوائے اس کے کہ ہم ان کو قبول کر لیں۔ بغیر کسی جدوجہد کے اپنی قسمت کے لکھے پر جتھیا رڈال دینے سے ہم وحشیانہ پن کے مجرم ٹھہرتے ہیں۔

دراصل، ہم سب کو خود اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ ہم سنگ دلی کے مجرم ہیں۔ کاش اس احساس کی خوف ناکی ہمیں اپنی کالی سے باہر نکالے، تاکہ ہم اپنی امیدوں کو اور اپنے ارادوں کو اس عہد کی آمد کی طرف مبذول کریں، جس میں جنگ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

اس امید، اور اس ارادے کا ایک ہی قصد ہونا چاہیے کہ جذبے میں تبدیلی کے ذریعے، ہم اس بلند و بالا وجہ کو حاصل کر لیں جو ہمیں اپنے اختیار میں موجود طاقت کے غلط استعمال کرنے سے باز رکھے۔

جس نے سب سے پہلے جنگ کے خلاف خالص اخلاقی دلیل پیش کرنے کی ہمت کی، اور اخلاقی ارادے کے تحت وجہ کی ضرورت پر زور دیا تھا وہ تھا رائٹر ڈیم کا عظیم انسانیت پرست ایرائسمس (Erasmus)۔ اس کی کتاب 'امن کی خرید و' 1817 (Querela pacis) میں منظر عام پر آئی تھی [اور پچھلی صدی میں اس کے کئی زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے ہیں۔] اس کتاب میں وہ امن کو سامعین کی جستجو میں اسٹیج پر پیش کرتا ہے۔

یرائسمس کو اپنے سوچ کے انداز کے چند ہی بقی خواہ ملے تھے۔ ایک اخلاقی عہد نامے کی توقع کرنا جو امن کی طرف جانے والی راہ کی طرف اشارہ کرے، ایک یونیورسٹی آدرش سمجھا جاتا تھا۔ کانٹ نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کیا تھا۔ اُس نے اپنے مضمون "دائمی امن" (Perpetual Peace) میں جو 1795 میں منظر عام پر آیا تھا، اور دوسری اشاعتوں میں بھی، امن کے مسائل پر بات کرتے ہوئے، اپنے اس یقین کو ظاہر کیا ہے کہ امن اسی وقت ہوگا جب بین الاقوامی قانون کو اقتدار ملے گا، جس کے تحت ایک بین الاقوامی ثالثی عدالت قائم ہوگی جو قوموں کے درمیان تنازعات کو حل کرے گی۔ اس کے خیال میں اس مقتدرہ کو بتدریج بڑھتے ہوئے احترام کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے، اور خالصتاً عملی نیتوں کی بنا پر ہی لوگ قانون کی پاس داری کریں گے۔ کانٹ شدت سے اصرار کرتا ہے کہ محض اخلاقی دلیل کے نتیجے میں لیگ آف نیشنز کا تصور نہیں کیا جاسکتا، سوائے قانون کے کامل ہونے کے۔ اس کو یقین ہے کہ کامل ہونے کا عمل خود ہی ہوگا۔ اس کی رائے میں 'فطرت، جو سب سے بڑی فن کار ہے' لوگوں کی بتدریج رہنمائی کرے گی اور یہی صحیح ہو گا، مگر ایک طویل عرصے کے بعد تاریخ کے اقدام اور جنگوں کے ڈنگھوں کے ذریعے، بین الاقوامی قانون پر

اتفاق ہوگا جو دائمی امن کی ضمانت دے گا۔

ایک ایسی لیگ آف نیشنز کا منصوبہ جس کو ثالثی کا اختیار ہو، درحقی کے ساتھ پہلی بار سلی (Sully) نے تیار کیا تھا جو شاہ ہنری چہارم (Henry IV) کا دوست بھی تھا اور وزیر بھی۔ اس پر تفصیل سے Abbé Castel de Saint-Pierre نے اپنی تین کتابوں میں بحث کی تھی، جن میں سے سب سے اہم کا عنوان تھا Plan for Perpetual Peace between Christian Sovereigns۔ کانٹ کو اس میں پیش کیے گئے خیالات کا علم تھا، مثلاً ایک اقتباس کے ذریعے سے جسے روسو (Rousseau) نے 1761 میں شائع کیا تھا۔

آج ہم بین الاقوامی اداروں کے مؤثر ہونے کے بارے میں اپنے تجربات کی بنا پر، جو ہمیں لیگ آف نیشنز اور اقوام متحدہ سے حاصل ہوئے ہیں، فیصلے کر سکتے ہیں۔ ایسے ادارے تنازعات کے شروع ہوتے ہی ان پر ثالثی اور ایک قدم آگے بڑھ کر بین الاقوامی منصوبوں کی تیاری اور اسی قسم کے دوسرے کام کے سلسلے میں، موجودہ حالات کی روشنی میں اپنی خدمات پیش کر سکتے ہیں۔ لیگ آف نیشنز کی کامیابیوں میں سب سے اہم کامیابی تھی 1922 میں بین الاقوامی سطح پر قابل قبول پاسپورٹ کا اجراء، ان لوگوں کے لیے جو جنگ کے باعث بے وطن ہو جاتے ہیں یا ایسے لوگوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی اگر اس نوعیت کی کوئی سفری دستاویز نہ ہوتی، جسے نانسن (Nansen) کی تجویز پر شروع کیا گیا تھا۔ اگر اقوام متحدہ کا وجود نہ ہوتا تو 1945 کی جنگ کے بعد بے گھر ہونے والے لوگوں کا کیا حشر ہوتا؟

پھر بھی، یہ دونوں ادارے امن قائم نہیں کر سکے۔ ان کی کوششیں ماکامی سے دوچار ہوتی ہی نہیں، اس لیے کہ وہ مجبور تھے، ایک ایسی دنیا میں، جہاں امن کے لیے کوئی مروجہ جذبہ نہیں تھا۔ اور قانونی ادارے ہوتے ہوئے بھی وہ ایسے جذبے پیدا نہیں کر سکتے تھے یا اخلاق کی روح صرف جذبے کو پیدا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ کانٹ نے خود کو دھوکا دیا تھا جب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ امن کی تلاش میں اس سے صرف نظر کر سکتا ہے۔ ہمیں اسی راستے پر چلنا چاہیے اس نے جسے ترک کر دیا تھا۔

مزید یہ کہ ہم امن کے بارور ہونے کے لیے بہت طویل عرصے تک اس تحریک کا انتظار نہیں کر سکتے، جس کو اس نے ضروری سمجھا تھا۔ آج، جنگ کا مطلب ہے نیست و نابود ہو جانا، کانٹ جس کو بھانپ نہیں سکا تھا۔ امن کو یقینی بنانے کے لیے فیصلہ کن قدم اٹھائے جانے چاہئیں، اور بغیر کسی تاخیر کے فیصلہ کن نتائج حاصل کیے جانے چاہئیں۔ صرف جذبے کے ذریعے ہی یہ سب کیا جاسکتا ہے۔

کیا جذبہ وہ کچھ کرنے کے قابل ہوتا ہے، ہمیں اپنی پریشانی میں اس سے جس کی توقع ہوتی ہے؟ ہمیں اس کی طاقت کو کم نہیں سمجھنا چاہیے، جس کی شہادت بنی نوع انسان کی پوری تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ جذبہ ہی تھا جس نے اس انسان دوستی کو جنم دیا تھا جو آغاز ہے تمام ترقیات کا، کسی بلند تر وجود کی جانب۔ انسان دوستی کے متاثر کیے ہوئے ہم اپنے آپ سے وفادار ہیں اور تخلیق کرنے صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک مخالف جذبہ سے متاثر ہو کر ہم اپنے آپ سے بے وفائی کرتے ہیں اور ہر طرح کی غلطی کا

شکار ہو جاتے ہیں۔

وہ بلندی جہاں تک جذبہ پہنچ سکتا ہے، ستر ہویں اور اٹھارویں صدی میں منکشف ہوئی تھی۔ اس نے وہم پرستی، جادو ٹونے، اذیت رسانی اور قسم قسم کے دھرمی ظلم اور روایتی حماقتوں کو ختم کرنے میں یورپ کے ان لوگوں کی رہنمائی کی جو قرون وسطیٰ سے اس کے لامنت دار تھے۔ اس نے پرانے طریقوں کو نئے ارتقائی طریقے سے بدلا جو ان پر عمل کرنے والوں کو کبھی حیران نہیں کرتے۔ وہ سارا کچھ، جو ہم نے نیک اور سچے تمدن سے حاصل کیا ہے، اور جو اب بھی ہمارے پاس ہے، جذبے کے ظہور میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

بعد میں، اس کی طاقت زوال پذیر ہو گئی، اس لیے کہ جذبہ مراکتبی ججھو میں غرق دنیا میں اپنے اخلاقی کردار کے لیے مہارا حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا۔ اور اس کو ایسے جذبے سے بدل دیا گیا ہے جس کو یقین نہیں تھا کہ انسانیت کو کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے، اور کم تر آدرشوں سے مطمئن ہو جانا چاہیے۔ آج اگر ہم کو اپنے زوال سے بچنا ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم ایک بار پھر اسی جذبے سے وفادار ہو جائیں جس کو ایک نیا معجزہ کر دکھانا چاہیے، بالکل اسی طرح، جیسا کہ قرون وسطیٰ میں کیا تھا، پہلے سے بھی زیادہ برا معجزہ۔

جذبہ مراکتبی ہے یہ علاحدگی میں بھی زندہ رہتا ہے جس نے اپنے اخلاقی کردار کے ساتھ ہم آہنگی سے دنیا میں باقی رہنے کی مشکل پر قابو پا لیا ہے جس کو احساس ہو گیا ہے کہ اس کو اور کوئی گھر نہیں میسر ہو سکتا سوائے انسان کی بنیادی فطرت کے۔ خود مختاری کے ذریعے حاصل کیے جانے والے احساس کی قبولیت اس کا اضافی سرمایہ ہے۔

اس کو یقین ہے کہ رحم، جس میں اخلاقیات جزو چکنی ہیں، اس وقت تک اپنا اصل تناسب نہیں اختیار کرتا، جب تک کہ یہ انسان ہی کو نہیں، ہر زندہ شے کو گلے نہیں لگاتا ہے۔ پرانی اخلاقیات میں، جن میں مضبوط عقیدے کی کہرائی اور قوت نہ ہو، زندگی کی تعلیم کی اخلاقیات شامل کر دی گئی ہیں اور اس کا جواز آہستہ آہستہ شناخت حاصل کر رہا ہے۔

ایک بار پھر، ہم آدمی سے اپیل کرنے کی جسارت کر رہے ہیں، سوچنے اور محسوس کرنے کی، اور اس کو ترغیب دے رہے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اپنے آپ سے وفاداری کرے۔ ہم اس کی فطرت کی عمیق خوبیوں پر اپنے اعتماد کا دوبارہ اقرار کرتے ہیں۔ اور ہمارے زندہ تجربات ہمیں صحیح ثابت کر رہے ہیں۔

1950 میں Documents of Humanity نام کی ایک کتاب آئی تھی جس کو Göttingen یونیورسٹی کے کچھ پروفیسروں نے مل کر ترتیب دیا تھا جو مشرقی جرمنی سے 1945 کی خوف ناک ملک بدری کے باعث ایک جا ہو گئے تھے۔ [اس میں] مہاجرین مرادہ لفظوں میں اس امداد کی باتیں بتاتے ہیں جو مشکل وقت میں ان کو دشمن قوموں نے پہنچائی تھی، ان لوگوں نے جنہیں ان سے نفرت کرنی چاہیے تھی جس سے پہلے شاید ہی کبھی مجھے کسی کتاب نے اتنی شدت سے گرفت میں لیا ہوگا، جیسا کہ اس کتاب نے کیا تھا۔ [میرے خیال

ہیں] یہ ایسے کسی بھی شخص کے لیے مقوی دوا ہوگی جس کا انسانیت سے اعتبار اٹھ گیا ہو۔
امن ہوتا ہے یا نہیں اس کا انحصار سست پر ہوگا، جس طرف افراد کی ذہنیت ترقی پاتی ہے اور پھر، بعد میں، ان کے قوموں کی۔ ماضی کے مقابلے میں آج سچائی میں بہت سے معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ایہ آئینہ، سٹی، Abbe Castel de Saint-Pierre اور دوسرے جو اپنے وقتوں میں امن کے معاملات میں منہمک ہوتے تھے، شہزادوں سے معاملے کرتے تھے، عام لوگوں سے نہیں۔ ان کی کوششیں مرکوز ہوتی تھیں ایک ورائے قومی مقتدرہ کے قیام پر، جس کو مشکلات میں عائلی کرنے کا اختیار ہو، ان تنازعات پر جو شہزادوں کے درمیان پیدا ہوں۔ کانٹ نے اپنے مضمون ”دائمی امن“ میں سب سے پہلے پیش بینی کی تھی ایک عہد کی جب لوگ خود پر حاکم ہوں گے، اور جب، ملاطین نہیں، وہ خود امن کے مسئلے سے متعلق ہوں گے۔ اس نے اس ارتقا کو ترقی سمجھا۔ اس کے رائے میں، شہزادوں کے مقابلے میں امن کی دیکھ بھل پر لوگ زیادہ مائل ہوں گے، اس لیے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں جنگوں کی لاقی ہوئی بد بختی بھگتنی پڑتی ہے۔

یقیناً، اب وہ وقت آگیا ہے، جب حکومتوں کو خود عوام کی وصیت پوری کرنے والا بننا ہوگا۔ مگر امن سے لوگوں کی پیداائی محبت پر کانٹ کا اعتماد مدلل نہیں تھا۔ چونکہ عوام کی خواہش نے، جو ہم غنیمت کی خواہش ہوتی ہے، ناپائیداری کا، اور براہ راست جذباتی پر اگندگی کا خدشہ دور نہیں کیا ہے، اس لیے یہ ایک نہایت اہم ذمے داری کا مظاہرہ کرنے میں ناکام ہوئی ہے۔ پچھلی دو جنگوں میں بدترین درجے کی ملت پروری کا مظاہرہ کیا گیا تھا، اور آج اس کو مختلف عوام کے درمیان باہمی مفاہمت کی راہ کا سب سے بڑا روڑا سمجھا جاسکتا ہے۔

ایسی ملت پروری کو لوگوں کے درمیان صرف انسانیت پرستی کے آدرش کے دوسرے جنم کے ذریعے ہی پسپا کیا جاسکتا ہے، جو اپنے ملک سے ان کی وفاداری کو صحیح آدرشوں کے ذریعے فطری بناتی ہے۔
سمندر پار کے ملکوں میں بھی جعلی ملت پرستی جست آمادہ ہے، بالخصوص ان لوگوں میں جو پہلے سفیر فام غلبے میں زندگی بسر کرتے تھے، اور جنہیں اب خود مختاری ملی ہے۔ اب وہ ملت پرستی کے واحد آدرش بن جانے کے خطرے میں ہیں۔ بلاشبہ، امن بھی، جو اب تک کئی علاقوں میں جاوی رہا ہے، آج خطرے میں آگیا ہے۔

یہ لوگ بھی صرف مذہب انسانیت کا آدرش اختیار کرنے کے ذریعے اپنی سادہ لوح ملت پرستی پر قابو پا سکتے ہیں۔ مگر یہ تبدیلی کس طرح لائی جاسکتی ہے؟ صرف اسی وقت جب ہمارے اندر جذبہ ایک زندہ قوت بن جاتا ہے، اور ایک تمدن کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے جو انسانیت پرستی کے آدرش کی بنیاد پر ہوتا ہے، ان عوام پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تمام آدمی، حتیٰ کہ نیم مہذب اور وحشی بھی، جو مہم کی صلاحیت رکھتے ہیں، انسانیت پرست جذبہ پیدا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ ان میں، جتنے کے لیے تیار آتش گیر مادے کی طرح پوشیدہ رہتا ہے جسے صرف ایک چنگاری کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہت سے لوگوں نے، جو ایک مخصوص درجے کے متمدن ہیں، یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایک دن امن کا راج ضرور ہوگا۔ دسویں صدی قبل مسیح کے Amas نامی پیغمبر کے الفاظ میں پہلی بار یہ لفظ ملا تھا اور یہودی اور عیسائی مذاہب میں یہ خدا کی سلطنت پر یقین کے معنوں میں لیا جاتا رہا ہے۔ یہ چھٹی صدی قبل مسیح کے عظیم چینی مفکرین، کنفیو شس (Confucius) اور لائو تے (Lao-tse)، پانچویں صدی قبل مسیح کے مائی تے اور چوتھی صدی قبل مسیح کے منگ تے (Meng-tse) کے نظریے میں پایا جاتا ہے۔ ٹولسٹوئے اور دوسرے ہم عصر مفکرین میں یہ دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔ لوگوں نے اس کو یوں پیا بھی کہا ہے۔ مگر آج کے حالات ایسے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس کو حقیقت بننا چاہیے، ورنہ انسانیت مکمل طور پر نیست و نابود ہو جائے گی۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں امن کے مسئلے کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں ضروری نہیں کہ وہ نیا ہو۔ میرا یقان ہے کہ اخلاقی وجوہ کی بنا پر جنگ کے رد کرنے میں اس مسئلے کا حل پوشیدہ ہے، اس لیے کہ جنگ ہم کو انسانیت کا بھرم بنا دیتی ہے۔ رائٹ ڈیم کے ایر آئمنس، اور اس کے بعد کے دوسرے کئی لوگ پہلے ہی اس کو سچ قرار دے چکے ہیں، ہم کو جس کے ساتھ ہو جانا چاہیے۔

میں پوری سچائی سے اپنے لیے جس نئے پن کا دھوکا کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ انسانی جذبہ بنی ذہنیت کی تخلیق کی صلاحیت رکھتا ہے، یعنی ایک اخلاقی ذہنیت۔ اس یقان سے متاثر ہو کر میں بھی اس سچائی کا دھوے دار ہونا چاہتا ہوں، اس امید کہ میری کواہی اس کو ایک قابل تعریف احساس، بلکہ ایک عملی امر حال کی صورت میں رد کرنے سے بچا سکتی ہے۔ بہت ہماری سچائیاں ایک عرصے سے توجہ سے محروم پڑی ہیں اس لیے کہ کسی نے بھی ان میں حقیقت بننے کے امکانات کا تصور ہی نہیں کیا ہے۔

صرف اسی وقت جب امن کا آدرش لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے، اس امن کو مؤثر طور پر قائم رکھنے کے لیے ادارے قائم کیے جاتے ہیں اور ان سے توقع کی جاتی ہے کہ اپنے فرائض پوری طرح انجام دیں گے۔

آج بھی، ہم اس عہد میں رہی رہے ہیں، جس میں امن نہیں، آج بھی قومیں دوسری قوموں سے خطرہ محسوس کرتی ہیں، آج بھی ہمیں ہر قوم کو، خوف، ہاک، جھجھکیوں کے ذریعے، اپنے دفاع کے لیے تیار رکھنے کے ہونے کا حق دینا چاہیے۔

ایسی خراب صورت حال میں بھی، جس میں ہم جذبے کے ابتدائی نتائج تلاش کرتے ہیں، ہمیں اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔ یہ نتائج اور کچھ بھی نہیں سوائے کوشش کے جو لوگ کرتے ہیں، جہاں تک ممکن ہو کفارے کے لیے مان زیادتیوں کا جو ایک دوسرے پر جنگ کے دوران روا رکھتے ہیں۔ لاکھوں قیدی اور ملک بدر افراد اپنے گھروں کو لوٹنے کے منتظر ہیں، کچھ جو کسی غیر ملکی طاقت کے ہاتھوں بلاوجہ سزا کاٹ رہے ہیں، اپنی رہائی کے منتظر ہیں، بے شمار انصافیاں اب بھی مرجانے کی ماہ دیکھ رہی ہیں۔

ان کے نام سے جو امن کے لیے جان مارتے ہیں، میں لوگوں سے استدعا کرتا کروں کہ اس نئی شاہراہ پر اپنا

پہلا قدم اٹھائیں۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے دفاع کے لیے ضروری طاقت کا ایک ریشہ بھی نہیں گنوائے گا۔ اگر ہم جنگ کی نا انصافیوں کو ختم کرنے کے لیے قدم اٹھاتے ہیں جس کا ہمیں ابھی تجربہ ہوا ہے، تو ہم تمام لوگوں میں آہستہ آہستہ اعتماد بحال کر سکیں گے۔ اعتماد سب سے بڑا سرمایہ ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی موثر کام نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سر حلقے کی سرگرمیوں میں ایک کیفیت پیدا کرتا ہے جن سے ترقی بارور ہوتی ہے۔ اس طرح پیدا کی ہوئی اعتماد کی فضا میں ہم دو جنگوں کے پیدا کردہ مسائل کے منصفانہ بندوبست کی تلاش شروع کر سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میں نے لاکھوں افراد کی امیدوں اور خیالات کا اظہار کیا ہے جو ہمارے علاقے میں ہونے والی جنگ کے خوف میں جی رہے ہیں۔ کاش میرے الفاظ ان کے مطلوبہ معنی کی ترسیل کر سکیں، اگر وہ دنیا کے دوسرے حصے تک پہنچ جاتے ہیں۔ یعنی خدق کے اُس پار۔ ان لوگوں تک، جو وہاں بھی اسی قسم کے خوف میں جی رہے ہیں۔

کاش وہ لوگ بھی جن کے ہاتھوں میں عوام کی قسمت ہے، سرگرمی سے ہر اس چیز سے پرہیز کریں جو موجود حالات کو مزید خراب، بلکہ زیادہ خطرناک کرتی ہے۔ کاش وہ پختہ پال کے الفاظ کو اپنے دلوں میں جاگزیں کر لیں؛ ”خواہ تمہارے دل میں کچھ بھی ہو، اگر ممکن ہو تو، تمام لوگوں کے ساتھ امن کے ساتھ زندگی گزارو۔“ یہ الفاظ صرف افراد ہی کے لیے نہیں، قوموں کے لیے بھی اہم ہیں۔ کاش تمام قومیں، امن قائم کرنے کے لیے، اپنی تمام کوششیں بروئے کار لے آئیں اور جذبے کو ابھرنے اور عمل کرنے کا وقت فراہم کریں۔



لیوں یوحا اعلان تجلیل

اس برس انٹرنیٹ نوبیل کا امن انعام لیوں یوحا کو پیش کیا جا رہا ہے۔

لیوں یوحا، جدوجہد سے پرمزور طبقے کی بلندی کے لیے کیے جانے والے اپنے عمر بھر کے کام پر پلٹ کر [یک گونہ غر سے] نظر کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کے حالات کی بہتری کے لیے۔ مزدور طبقے کے معیار زندگی کی بہتری کے لیے ٹریڈ یونین کے ذریعے لڑا ایک عالمی شان اور اہم کام ہے، مگر اور بہت سے لوگوں نے بھی تو خود کو ایسے کام کے لیے وقف کر دیا ہے کہ صرف یہی انھیں نوبیل امن انعام حاصل کرنے کے لیے آج یہاں تک نہیں لایا ہوگا۔ یہ اس لیے یہاں موجود ہیں کہ انھوں نے اوائل عمری ہی سے اپنے آپ کو بار بار امن کے لیے اور جنگ کے خلاف جدال میں جھونکا ہے، اور اس سلسلے میں وہ International Labor Office، International Federation of Trade Unions، لیگ آف نیشنز، اقوام متحدہ اور یورپی تحریک میں شامل رہے ہیں۔ قومی سرحدوں کے پار یکجہتی والے تعاون اور خود قوموں کے اندر اور قوموں کے درمیان سماجی اور اقتصادی ماحولاری کو دور کرنا، ان کے نزدیک جنگ کے خلاف جنگ کے بہترین ہتھیار رہے ہیں۔ مگر ان کے سامنے کہیں زیادہ وسیع مقصد رہا ہے: ایسی سماجی تحریک کو ڈھالنا جو، ان کے الفاظ میں، کل کا انسان پیدا کرے، وہ انسان جو ایسی سوچائی کی تشکیل کرنے کے قابل ہو جس میں جنگ کبھی ممکن نہ رہے۔

لیوں یوحا، فیکٹری کے ایک مزدور کے ہاں 1878 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے آپ تیرہ برس کی عمر سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور بالآخر اپنے والد کی طرح وہ دیا سلاقی کے کارخانے میں کام کرنے لگے اور جلد ہی فرانسیسی ٹریڈ یونین کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ 1903 میں وہ ایک قومی تنظیم C.G.T. (General Confederation of Labour) کے سیکریٹری بن گئے، اور ساری عمر اس تنظیم سے

و البتہ رہے، اور ہر طرح کے برے بھٹے دنوں میں اسی کے وفادار رہے۔

اپنی کتاب Le Syndicalisme Français میں، جو 1913 میں شائع ہوئی تھی، فطری طور پر، جس پر اس وقت کے حالات کی مہر ثبت تھی، انہوں نے فرانسیسی ٹریڈ یونین کی تنظیم اور اس کے اغراض و مقاصد بیان کیے ہیں۔ ایسی کتاب میں جو بنیادی طور پر اجتماعی عمل کے بارے میں ہے، قابل ذکر بات ان کا یہ پُر زور فیصلہ ہے کہ ہمیں فرد کو جگانا اور تعلیم دینا چاہیے تاکہ اس کو مستقبل کی سوسائٹی کی تعمیر کا عظیم اور کنکرن فرض سونپا جائے۔

یوحا مصائب سے پُر اور مشکل وقت میں بھی فرانسیسی ٹریڈ یونین تحریک کے سہرا دل دستے میں شامل رہے ہیں۔ ہر فرد پر جنگ اور کساد بازاری سختی کا باعث رہی ہے، ٹریڈ یونین تحریک نکلنوں میں بی، دوبارہ یک جا ہوئی اور پھر حصوں میں بٹ گئی۔ اپنے اصولوں سے وفادارہ یوحا نے حتی الامکان اتفاق کو دور کرنے کی سعی کی ہے، مگر جہاں تفرقے سے پرہیز نہیں کیا جاسکا وہاں انہوں نے ٹریڈ یونین کے غیر کمیونسٹ حصے سے وفاداری کی ہے۔ ان کا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہر ٹریڈ یونین میں ہر قسم کے لوگوں کے لیے جگہ ہونی چاہیے اور یہ بھی کہ اس کی تشکیل مزدوروں کے اتحاد پر قائم ہونی چاہیے، اور سیاسی جماعتوں کو ان سے باہر ہی رکھا جانا چاہیے۔ نتیجے کے طور پر، وہ خود کبھی عملی سیاست داں نہیں رہے ہیں، سوائے ان تنازعات کے دوران، جو غیر جمہوری طاقتوں سے رہے ہیں، جیسے دو عالمی جنگوں کے دوران اور قسطنطنیہ سے، اور اشتراکیت سے جنگوں کے بعد۔ وہ جنگ کے دوران Popular Front in France میں بھی شامل رہے ہیں اور حالیہ برسوں میں انہوں نے اشتراکیت کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لیا ہے۔

ہم اس وقت تک یوحا کی کارکردگی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب تک کہ فرانسیسی ٹریڈ یونین تحریک میں ان کی سرگرمی کے بارے میں کچھ معلومات ہم نہ ہوں، مگر سچ تو یہ ہے کہ آج ہم بنیادی طور پر بین الاقوامی تعاون اور امن سے متعلق ان کے کام پر توجہ دے رہے ہیں۔

اپنے دو بڑے شباب میں بھی، پہلی عالمی جنگ کی ابتدا سے قبل، وہ قومی مخالفتوں کو کم کرنے اور جنگ کے خلاف لڑائیوں میں شامل رہے ہیں۔ ان کی سرگرمی کی سب سے نمایاں مثال 1911 میں ہونے والی برلن کی اس میٹنگ کی ہے جو فرانسیسی، جرمن اور برطانوی ٹریڈ یونین کے نمائندوں کے درمیان ہوئی تھی، جس میں جنگ کے خلاف احتجاج کرنے کے بارے میں گفت و شنید ہوئی تھی۔ اس میٹنگ کا پس منظر وہ تناؤ تھا جو فرانس اور جرمنی کے درمیان مراکش میں مفادات کے تنازعے کے باعث پیدا ہوا تھا۔ فرانس نے مراکش کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا تھا، اور جولائی کے مہینے میں [جرمنی کے شہنشاہ] قیصر ویلہلم (Kaiser Wilhelm) نے جرمنی کے مفادات کی حفاظت کے لیے آگادیر (Agadir) کی طرف ایک جنگی جہاز روانہ کر دیا تھا۔ اس واقعے نے دونوں ملکوں میں قومیت کی ایک زبردست لہر پیدا کر دی تھی جو بہت آسانی سے جنگ میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

برلن میں ہونے والی میٹنگ کو وہ اہمیت نہیں ملی جس کی توقع تھی۔ جرمنی کے مشورے پر، نمائندگی طور

پر، جرمن ٹریڈ یونین تحریک کے مطالعے کے لیے G.G.T کے صرف چند مندوبین برلین گئے تھے مگر اس نام نہاد مطالعے نے جنگ کے خلاف ایک بہت بڑا عوامی مظاہرہ پیدا کیا تھا۔ بعد میں، اُسی برس، پیرس میں ایک اور میٹنگ ہوئی جس میں جرمنی، ہسپانیہ اور برطانیہ عظمیٰ کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔

اپنی کتاب Le Syndicalisme français میں یوحا نے Contre le guerre نامی باب میں ان دونوں ملاقاتوں کے بارے میں بات کی ہے۔ یہ باب مزدوروں سے جنگ کی مخالفت کرنے کی ایک شعلہ خیز اپیل ہے، ایسی اپیل جو اس حقیقت پر زور دیتی ہے کہ نجی سرمایہ داری اور بڑی صنعتوں میں مختلف ممالک کے درمیان مسابقت جنگ کی نمایاں وجہ بنتی ہیں۔ یہ امر بالکل تعجب خیز نہیں ہے کہ یوحا نے اس کیفیت کو اس روشنی میں دیکھا، اس لیے کہ اس وقت فرانس اپنی نوآبادیاتی سلطنت قائم کر رہا تھا، اور جرمنی کی صنعت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ لہذا اس کا حملہ اپنے ملک کی نوآبادیاتی پالیسی کی طرف تھا، جرمنی کی طرف نہیں، اور اس نے نڈر ہو کر قومیت کی لہر کی مخالفت کی جو دونوں ملکوں کو اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہی تھی۔ اس کے باوجود ہمیں اب معلوم ہوا ہے کہ جنگ کا خطرہ ان ریاستوں کے ہاتھوں کم نہیں تھا جن کا نجی سرمایے پر کنٹرول ہوتا ہے، ان کی اپیل جہلی عالمی جنگ سے پہلے مزدوروں کی طاقت کو جنگ کے خلاف حرکت میں لانے کی ایک بڑی کوشش کی طرح اب بھی قائم ہوگی۔ یہ فرانسیزیوں اور جرمنوں کے درمیان رابطے کی پہلی سنجیدہ کوشش تھی۔ وہ اس کی ضرورت پر زور دے کر کہتے ہیں، کہ اس طرح تلخیاں اور نفرتیں بھلانے کی شروعات کی جاسکتی ہے جو فرانس اور جرمنی کے عوام کی درمیان رابطے میں پچھلے چالیس برسوں میں پھیلی ہے۔ اس طرح ہم فرانس اور جرمنی کے عوام کے درمیان 'entente cordiale' [یہ برطانیہ اور فرانس کے درمیان 8 اپریل 1904 کو دستخط ہونے والے کئی معاہدوں کے سلسلے کا نام ہے] کر رہے ہیں جو دنیا کے امن کے لیے بہت ضروری ہے۔“

اس وقت ایسے بہت سے لوگ تھے، جن میں یوحا بھی شامل تھے جنہیں یقین ہو گیا تھا کہ مزدور عوامی جینانے پر تحریک سے جنگ کو روک سکیں گے۔ مگر، کوئی بھی اپیل، جس میں پچھلی اپیل شامل تھی جو جولائی 1914 میں G.G.T نے بھیجی تھی، کارگر نہیں ہونے والی تھی۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، 1914 میں جنگ شروع ہو گئی، اور یوحا نے بھی اس میں عملی طور پر حصہ لیا تھا، اس لیے کہ جنگ ہر اس بات کے دفاع کے لیے کی جا رہی تھی جس کے لیے انھوں نے اپنی تمام زندگی کام کیا تھا؛ یعنی جمہوریت اور آزادی۔ انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ جرمنی کی فتح کا مطلب یورپ میں جمہوریت اور آزادی کی تباہی ہوگا۔

اس کے باوجود جنگیں ختم ہوتی ہیں اور ہر ایک کو جو پیش پیش کرتا ہے، وہ پرامن تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور یوحا بھی کچھ کر رہے تھے۔ 1914 کے موسم خزاں میں G.G.T نے ایسے امن کے خاکے تلاش کر لیے تھے جو بحیثیت وہی کچھ تھے American Federation of Labor نے جن کی تجویز پیش کی تھی، اور اس کا مرکزی مضمون ایک بار پھر صدر ولسن کے چودہ نکات میں دیکھا گیا تھا۔

جنگ کے خاتمے کے بعد یوحا نے G.C.T، میں اپنی ذمے داری سنبھال لی۔ مگر اس بار ان کو وسیع پیمانے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔

1919 میں پیرس امن کانفرنس کے دوران مزدوروں کے لیے اٹھائے گئے مسائل کے لیے بنائی جانے والی کمیٹی میں انھیں رکن کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا، اور اس طرح انھیں International Labor Organization کی بنیادگزاروں میں حصہ لینے کا موقع ملا تھا۔ اسی برس انھیں اس کی منتظمہ کا ایک رکن بنا دیا گیا تھا، وہ جس پر آج بھی فائض ہیں۔ 1919 میں ان کو انٹرنیشنل فدریشن of Trade Unions کا نائب صدر چن لیا گیا تھا۔

آئیے، سب سے پہلے ہم International Labor Office کے ایک رکن کی حیثیت سے یوحا کی کارکردگی پر نظر ڈالتے ہیں۔ یہ ادارہ وہ واحد بین الاقوامی تنظیم ہے جو جنگ کے بعد باقی رہ گیا ہے۔ یہ وہی ادارہ ہے جس کی سرگرمیاں کئی وسیع میدانوں میں جاری ہیں اس کا مقصد دیر پا امن کے حصول کے راستے کی رُوکاؤئیں دور کرنا ہے، جیسا کہ اس کے آئین میں درج کیا گیا ہے:

۱۔ ”چونکہ لیگ آف نیشنز کا بنیادی مقصد عالمی امن کا قیام ہے، اور ایسا امن صرف اسی طرح قائم کیا جا سکتا ہے، جب اس کی بنیاد سماجی انصاف پر ہو؛

۲۔ اور چونکہ مزدور کی موجودہ حالت اس طرح کی نا انصافی، سختی، اور بڑے پیمانے پر عوام کی تنگ دستی کی صورت میں ایسی بد امنی پیدا کر سکتی ہے جو امن اور ہم آہنگی کو خطرے میں ڈال رہی ہے۔۔۔

۳۔ اور چونکہ اس کے علاوہ، کسی بھی قوم کے مزدور کے لیے نرم حالات پیدا کرنے میں نا کامیابی، دوسری قوموں کے راستے کی رکاوٹ بن جاتی ہے جو اپنے ملک میں حالات بہتر بنانے کی خواہش رکھتی ہیں؛

۴۔ [اس لیے] بڑے پیمانے کی ذمے داری رکھنے والی قومیں، جن کے دل میں انصاف اور انسانیت کا جذبہ ہو، اور وہ دنیا کے لیے دیر پا امن کی خواہش مند ہوں، مندرجہ ذیل کے لیے رضامندی کا اظہار کرتے ہیں۔۔۔“

اس کے بعد وہ شقیں آتی ہیں جو Labour Organisation کی تنظیم اور اس کی سرگرمیوں کی حد بندی کرتی ہیں۔ یہ ادارہ کچھ مخصوص معاملات کے باعث لیگ آف نیشنز سے مختلف ہے: اس میں صرف حکومتوں کی نمائندگی ہوتی ہے، جب کہ ILO کے سارے تلمذیہ یونینوں اور آجروں کے نمائندوں کے ساتھ ساتھ حکومتوں کے نمائندے بھی ہوتے ہیں۔ لہذا اس کی سرگرمیاں دیگر یونینوں کے شرکت کار کی بنیاد پر ہوتی ہیں جو مزدوروں سے متعلق مسائل کے بارے میں مختلف انواع تصورات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ دونوں فریق محنت و شنید کے لیے ایک بین الاقوامی مرکز پر اکٹھے ہوتے ہیں؛ نیک خواہشات اور اتفاق رائے کے لیے ذاتی سطح پر ملاقاتیں اور مباحث سے زیادہ کوئی بھی طریقہ مدد و معاون نہیں ہو سکتا ہے۔ تیس برس کے اس کے قیام کے دوران ILO کا کام سماجی انصاف اور مختلف ممالک میں کام کرنے کے لیے ایک جیسے حالات پیدا

کرنے کے نقطہ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ ادارہ نئے پیدا ہونے والے مسائل پر فوری غور کرنے کے لیے ہمیشہ مستعد رہتا ہے، اور اس نے ان سے نمٹنے میں کبھی ہز دلی نہیں دکھائی ہے۔ جو کچھ بھی کام ہوا ہے، پڑا اثر رہا ہے، اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس کا کام امن کی خدمت ہے۔

بیس برس کے تمام عرصے میں یوفا ILO کی منظمہ کے رکن رہے ہیں، اور اس کا کوئی بقیہ حیات رکن ایسا ہے نہیں جس کا ان کے کام سے تعلق کیا جاسکے۔

International Labor Office میں مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت میں یوفا لیگ آف نیشنز کی کمیٹی کے رکن بھی رہے ہیں جن کو ترک اسلحہ جات کی تحقیق کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی۔ انہوں نے اپنی نہایت دل چسپ کتاب Désarmement میں اپنے کام کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں جو اگرچہ 1927 میں شائع ہوئی تھی، آج بھی پڑھی جانے کے لائق ہے۔ اس کتاب میں یوفا لیگ آف نیشنز پر ایک بین الاقوامی ادارے کی حیثیت میں اپنے اعتبار کا اظہار کرتے ہیں جو افراد و قوموں کو ایک قسم کے تحفظ کا احساس دلاتا ہے۔ اس لیے کہ جیسا کہ وہ کہتے ہیں کوئی بھی قوم خود کو محفوظ نہیں سمجھتی جب تک اس کا ہمسایہ عسکری اعتبار سے طاقت ور رہتا ہے، اور ایسے حالات میں وہ خود بھی ترک اسلحہ جات کی خواہش نہیں کرے گی، مگر کوئی بین الاقوامی ادارہ تحفظ کی ضمانت دے تو ترک اسلحہ جات کا راستہ کھل سکتا ہے۔ یہی تصورات ہیں جو آج عام ہیں، اور اگر یوفا ان کے بارے میں بات کرنے والے پہلے شخص نہیں تھے تو انہوں نے بہت سے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ پڑا اثر طریقے پر اس کی طرف داری کی ہے۔ وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اسلحہ سازی کی صنعت کو کبھی ملکیت میں نہیں ہونا چاہیے، اور اگر ہے تو اس کو ریاست کے کنٹرول میں لایا جانا چاہیے۔ وہ اسلحے کی تجارت پر کنٹرول چاہتے ہیں اور ترک اسلحہ جات پر لیگ آف نیشنز کے موثر کنٹرول کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آج اس بات سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے گا کہ اسلحے کی پیداوار کو معاشی منافع کے لیے نہیں ہونا چاہیے، یا یہ کہ اسلحے کی بین الاقوامی تجارت پر کنٹرول ہونا چاہیے۔ لیکن، اگر ایسا ہو بھی سکے، اور کئی ممالک میں ایسا کیا جا چکا ہے، تو اب ہمیں احساس ہو رہا ہے کہ ریاست کی ملکیت میں اسلحہ سازی کی صنعت کا ہونا اور اسلحے کی فروخت پر کنٹرول بذات خود امن کی ضمانت فراہم نہیں کرتے۔ اور اگر ایسا ہو سکے تو ہمیں ان کے خیالات پر اس وقت کے تناظر میں غور کرنا چاہیے جب یہ خیال پیش کیا گیا تھا، اس عہد میں جب وسیع نجی سلطنتیں اسلحہ سازی کی صنعتوں پر حکومت کر رہی تھیں، وہ اپنی طاقت کی بلند یوں پر تھیں اور جب اسلحے کی تجارت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ آج، یہ حقیقتیں ترک اسلحہ جات کی راہ میں رکاوٹیں نہیں رہی ہیں۔ اس کے برعکس، یوفا کی پیش کی ہوئی تجویز برنگہ داری برائے ترک اسلحہ جات آج بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ اس وقت تھی، اس لیے ہمیں اس پر نئے سرے سے غور کرنا چاہیے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، لیگ آف نیشنز ترک اسلحہ جات کی اپنی کوششوں میں کام رہی تھی۔ مگر وہ

آئی جس کا ہدف مستقبل کی تعمیر ہو، اپنی جدوجہد کی پسپائی کی وجہ اس سے دست بردار نہیں ہو جاتا۔ [لہذا] یوحا بھی پسپا نہیں ہوئے۔

ان برسوں میں ان کا کام محض لیگ آف نیشنز اور Labor Office تک محدود نہیں رہا ہے۔ انھوں نے امن کے لیے کیے جانے والے ہر کام میں حصہ لیا ہے۔ انھوں نے بیٹا قی و رسائی کی ان شقوں کی موقوفی کے لیے لڑائیاں لڑی ہیں، ان کے اور بہت سے افراد کے خیال میں، جو بین الاقوامی تعاون اور مقابہت کی راہ میں نکلے۔ انھوں نے تصفیے کی کوششوں کی طرف تاریکی، بری آں (Briland) اور اسٹریسے مان (Stresemann) جس کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

[عالمی] جنگوں کے درمیان کا عرصہ تبدیلی پذیر تھا: یعنی یہ صدی کے دوسرے عشرے کی زندہ دل خوش امید سے گزر کر رفتہ رفتہ بدھتی ہوئی مایوسی تک پھیل گیا تھا۔ عالمی اقتصادی نظام منہدم ہو گیا تھا، بحران کے بعد بحران پیدا ہو رہا تھا اور ہر قوم پر بدھتی ہوئی بے روزگاری چھا گئی تھی۔ تعجب نہیں کہ یوحا جیسا انسان، ایسے حالات میں، بار بار بحرانوں کو روکنے کے مطالبے کر رہا تھا، جیسا کہ اس نے کہا ہے، جو مکمل طاقت کی حکومت، اور نتیجے میں جنگ کے لیے زرخیز زمیں فراہم کر رہے تھے۔

جرمنی میں جب ہٹلر اقتدار پر فائز ہوا تو زیادہ دور میں لوگ سال بہ سال جنگ کے خطرے بڑھتے دیکھ رہے تھے۔ یوحا ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے حالات کا صحیح تجزیہ کیا تھا، اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے برخلاف، فرانسیسی دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے سخت کوششیں کی تھیں۔ ہٹلر کی 1938 میں چیکو سلوواکیا میں پیش قدمی کے بعد یوحا نے بین الاقوامی جمہوری محاذ کوششوں بنانے کی کوشش کی تھی۔ اسی برس وہ روزویلٹ سے ملے اور ان سے جرمنی کے خلاف اقدام کرنے کی اپنا کام کوشش کی تھی۔

اور پھر جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ کے شروع دنوں ہی میں یوحا نے ایک بار پھر مزدور تحریک کو بالآخر حقیقی امن کے لیے اپنا اثر ڈالنے کے لیے زور دیا تھا۔ وہ 1942 میں جنگ کے ختم ہونے تک خود فرانس میں مقیم رہے تھے، اور جرمنوں کے ہاتھوں قید ہوئے۔

بعد کے برسوں میں، یوحا کو بہت ہی ناامیدیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پہلی ناامیدی اس وقت ہوئی تھی جب فرانس کے غیر کمیونسٹ ٹریڈ یونین کے رہنما G.G.T سے الگ ہو گئے اور 1947 میں انھوں نے اپنا لیگ ادارہ قائم کر لیا، اور اس کے بعد پھر، جب 1949 میں World Federation of Trade Unions نکلنے میں جٹ گئی تھی، دونوں صورتوں میں انھیں مزدور طبقے کے اتحاد میں دراڑ پڑتی نظر آتی تھی، سیاسی جماعتوں سے باہر کے اس اتحاد میں، جس کے لیے انھوں نے ہمیشہ سنجیدگی سے کوششیں کی تھیں۔ پھر وہ خود بھی غیر کمیونسٹ ٹریڈ یونین والوں میں شامل ہو گئے۔

اپنے ملک میں 1947 سے یوحا Conseil économique کے صدر ہیں۔ یہ ادارہ ایک مشورہ دینے والی تنظیم ہے جو تمام اقتصادی سوالات سے متعلق ہوتا ہے، انھوں نے چالیس برس قبل جس کے قیام کی تجویز

پیش کی تھی اور جس کو 1946 میں بننے والی نئی فرانسیسی حکومت نے قائم کیا تھا۔
بین الاقوامی محاذ پر انھوں نے ILO میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھی تھیں، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں
فرانس کے مندوب رہے تھے اور انھوں نے یورپ کی تحریک میں حصہ لیا تھا، 1948 میں جس کے صدر بن گئے
تھے۔

ان کے زندگی بھر کے کام کا یہ مختصر سا خاکہ دنیا کے معاملات میں یوہا کی امداد کے محض نقوش پیش کرتا
ہے۔ ان کو ان کی انفرادی سرگرمیوں کی فہرست کے ذریعے پایا نہیں جاسکتا۔ زندگی بھر کے کام کی حقیقی
معنویت اور قدر فرد کی اپنی جدوجہد سے ہی اُجاگر ہوتی ہیں۔

یوں یوہا کی ذات میں ہمیں ایسی ہی شخصیت ملتی ہے۔ ان کی پوری زندگی انھیں ایسا آدمی ظاہر کرتی ہے
جس نے اپنی نوجوانی میں قائم کیے ہوئے ہدف حاصل کرنے کی جدوجہد میں کبھی کمزوری نہیں دکھائی: ایسی
دنیا کی بنیاد رکھنے میں جو ہر انسان کے لیے ایک جیسی ہو ایسی دنیا جس میں امن کا دور دورہ ہو۔ انھیں احساس
ہو گیا ہے کہ ایسی دنیا اس وقت تک حقیقت نہیں بن سکتی جب تک کہ اس کی سوسائٹی کی بنیاد سماجی انصاف اور
جمہوریت پر قائم نہ ہو۔

وہ جانتے تھے کہ اس آدوش کی طرف پہلا قدم اٹھانے کے لیے مزدور طبقے کے معیار کو بلند کرنا اور اس
کے حالات کو بہتر بنانا ہوگا، مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ ایک نئی دنیا کی بنیاد رکھنے کا طریقہ ہوگا۔

ان سب سے ایک ایسا آدمی ابھرتا ہے، سرگرم، متحرک اور جوش دلانے والا انسان جو دوسروں کو اپنے
ساحچہ پہنچاتا ہے اور جو یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اپنے آخری ہدف تک پہنچنے کے لیے ہمیں اس دنیا کی حقیقتوں پر ہی
بھروسہ کرنا ہوگا، ہم جس میں زندہ رہتے ہیں۔

انھوں نے اپنی زندگی آدمیوں اور قوموں کے درمیان بھائی چارے کے فروغ، اور جنگ کے خلاف
جدوجہد کے کام کے لیے وقف کر رکھی ہے۔

صدر نشین، روڈیائی نوبیل کمیٹی Gunnar Jahn کی زبانی

خطبہ:

امن کی خاطر ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کے پچاس برس

آپ یقینی طور پر حیران نہیں ہوں گے اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ 5 نومبر 1951 دھبے کی شام کے
چند لمحے میری زندگی کے سب سے نیا وہ جذباتی اور خوشی کے لمحات تھے۔ ایک اخباری ماہر نے، میں جس

کی فرانس کے نشریاتی نظام پر تعریف کر چکا ہوں، جو اپنے پیٹرو و ماٹھنیر کی تشکی کے لیے مجھ سے سلسلی خیر بیان حاصل کرنے کی کوشش میں رات گئے مجھے یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ مارویائی پاریمان کی نوٹیل امن انعام کمیٹی نے مجھے دنیا کا سب سے اہم اور امتیازی انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ شاید اس خبر کے بارے میں میرے رد عمل سے حیران ہوا تھا، اس لیے کہ میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو ٹریڈ یونین اور مزدور طبقے سے اور ٹریڈ یونینوں سے متعلق غلط فہمی کیا تھا جو اس انعام کے، اور اس کے قائم کرنے والے کے بارے میں احترام کے تاثر چھوڑتا ہے، اور ان لوگوں کے مشن کے بارے میں بھی جن پر اس کو عطا کرنے کی ذمہ داری ہوتی ہے، اور ان پر بھی جنہیں یہ انعام عطا کیا جاتا ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ایک مختصر ترین لمحے کے لیے بھی میرے گمان میں نہیں تھا کہ یہ انعام تنہا مجھ کو ہی دیا جا رہا ہے۔

میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ میں امن اور انصاف کے آدرش کا مخلص ترین مسٹر ہی رہوں جو ٹریڈ یونین اداروں کا نشان امتیاز رہا ہے، اور ایسے اہم لمحے پر میرے لیے فطری تھا کہ میں خود کو ان کے ایک ادنیٰ نمائندے کی صورت میں پیش کروں۔ [لہذا] میں اس وقت ان کے نمائندے کی حیثیت میں کلام کر رہا ہوں، جب ان کی مستقل کوششوں کا تجزیہ پیش کر رہا ہوں، جو انھوں نے امن کے عہد کی ابتدا کرنے کے لیے کی تھی۔ تمام لوگ جس کی تمنا کرتے ہیں اور جن Jean Jaurès کے الفاظ میں ”مبنی نوع انسان بالآخر امن سے مطمئن ہے“ اور اپنے مقدر کے لیے خوشیاں اور ہم آہنگی حاصل کرنے کی جگہ دو میں ہے۔

[اس وقت] میرا جذبہ، پھر بھی بہت غنیمت تھا۔ نہ میرے دوستوں اور نہ میرے اہل خانہ نے، جو کسی اور کے مقابلے میں مجھے زیادہ جانتے تھے، میرے اعصاب کی مصلحت پر کبھی شبہ کیا ہے۔ [مگر] اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ وہ میری سرزنش کریں گے۔ اور ذرا کم مگر مہربان حمد خونی سے [مجھے] ایسی خاموشی کا مشورہ دیں گے، جس کو ان میں سے کچھ علم کا نام دیتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ فطرت نے مجھے مناسب درجے کے صبر اور دل جیسی سے نوازا ہے، پھر بھی میں دروغ کوئی کروں گا اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ اس اخباری نمائندے کو اپنا ہدف حاصل کرنے کے لیے خیر باد کہنے کے بعد میں سکوں سے سو گیا تھا۔

اور پھر اس طویل عرصے کے دوران مجھ پر میری یادیں حملہ آور ہو گئی تھیں۔ میرے [خاندان] نے مجھے وہ مکان دکھایا جہاں میں پیدا ہوا تھا، جو 1888 میں Grenelle کے مذبح کے ساتھ محفہ ہستی سے غائب ہو گیا تھا۔

میں دو برس کا بھی نہیں تھا، جب میرے والدین اس علاقے کو چھوڑ گئے تھے، اور ملک میں ایک مختصر وقت کے قیام کے بعد، انھوں نے Aubervilliers میں اپنا گھر بنا لیا تھا۔ یہ قصبہ پیرس سے بہت قریب واقع ہے جہاں میں نے صدی کے اواخر میں اپنے عہد شباب کے دن گزارے تھے۔ اس وقت نصف ذرا غنی ہونے کے باعث، وہ آج کے صنعتی شہروں جیسا نہیں تھا۔ اس میں ہم بچوں کے لیے کھلے میدان تھے، جو گرمیوں کے موسم میں اناج کے کھلیان بن جایا کرتے تھے اور ہمیں Courneuve دریا کے مختلف پاروں سے

میرا ب کیا کرتا تھا جو قریب ہی سے گزرتا تھا، جس میں نہانے اور چہرہ کی کرنے میں میرے خوش گوار لمحے گزرا کرتے تھے۔

اس تقریباً دہائی زندگی نے مجھے سخت کوش اور مضبوط آدمی بنا دیا تھا، اور اپنے خاندان کی نمائندگی سے پاک زندگی اور اس کے خطرات کے باوجود میں ان گزرے دنوں کو خاصی لذتوں سے یاد کرتا ہوں۔

پھر بھی، یہ Aubervilliers ہی تھا جہاں مجھے پہلی بار مزدوروں کی بہبود اور ان کی زندگی کے لیے بہتر حالات کے لیے سخت جدوجہد کے نتائج کا انداز ہوا تھا۔ یہ میرے مستقبل پر گہرے اثرات کا باعث ہوئے تھے۔

میرے والد اپنے عقیدے میں بکے کمیونسٹ تھے۔ 1871 میں مزدوروں کی شکست کے باوجود ان کے جدوجہد کے مستعد جذبے نے دیا سلائی کے کارخانے کے مزدوروں کی ہڑتالوں میں ان تھک اور توانا کردار ادا کیا تھا، جہاں، اس کے قومی ملکیت میں لیے جانے سے قبل، انھوں نے انتظامیہ کے خلاف کام کیا تھا۔ میری والدہ کی باہمت کوششیں، جو باورچی کی حیثیت میں اپنی ملازمت پر واپس گئی تھیں، میرے والد کی تنخواہ کے بند ہو جانے کے باعث کافی نہیں تھیں، اور ان ہی ہڑتالوں کے دوران، بارہ برس کا ہونے سے پہلے ہی مجھے Aubervilliers میں قائم دھلائی کے ایک کارخانے میں کام کرنے کے لیے اپنے ابتدائی اسکول کو خیر باد کہنا پڑ گیا تھا۔

میں جس مقامی اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اس کے ڈائریکٹر کی ہمت خزانہ کی بنا پہ، میرے والدہ اور بالخصوص میری والدہ چاہتی تھیں کہ مجھے National School of Arts and Crafts میں بھیجا جائے تاکہ میں بعد ایک انجینئر بن جاؤں۔ میں تعلیم کا شوقین تھا اور مجھے میں کچھ فطری ٹیکنیکی صلاحیتیں بھی تھیں، لہذا میں Colbert کے پرائمری اسکول میں داخل ہو گیا۔ ایک برس سے کم عرصے کے بعد، خاندانی بد قسمتی کی مشکلات کے باعث مجھے اسکول چھوڑنا پڑ گیا، اور Michaux Soap Works میں ملازمت اختیار کر لی پڑی تھی۔ اس کے بعد سے، سوائے اسکول کی تعلیم کی ایک اور کوشش کے، جو میں نے Diderot Vocational School میں کی تھی جب میں چودہ برس کا تھا، میں صنعتی مزدور کی مشقت سے پر زندگی میں گرفتار ہو گیا تھا۔

جب میں سولہ برس کا تھا، میں دیا سلائی کے کارخانے کی ٹریڈ یونین کا رکن بن گیا، جہاں بعد میں اپنے والد کے ساتھ شریک ہو گیا۔ میں نے یہ فیصلہ بغیر کسی رد و کد کے کیا تھا۔ میرے والد کی قوی مثال میرے ماننے والی اور میرے اپنے تجربے نے میری فطری طور پر رہنمائی کی تھی کہ میں مزدوروں کی تحریک میں شامل ہو جاؤں۔ مجھے ذاتی طور پر [موجودہ] سماجی نظام سے نقصانات ہوئے تھے۔ میرا اسکول میں گیا ہوا کام، میری دانش ورانہ صلاحیتیں، تعلیم حاصل کرنے کی میری خواہش مندی، سب صفر ہو کر رہ گئی تھیں۔ مجھے جبراً پرائمری اور تربیتی اسکول چھوڑنے پڑے، اور ایک خاکسار تنخواہ دار بننا پڑ گیا تھا۔

دنیا کے تمام ملک آج کے دن کو اقوام متحدہ میں انسانی حقوق کے عالمی اعلان کی منظوری کی سالگرہ کے

طور پر منٹاتے ہیں۔ اس جوش اور ولولے کے ساتھ جس کو قیام بلوغت کی ان یادوں نے چنگاری دکھائی ہو اور جن کے باعث اپنی پوری صلاحیتوں کے امکانات کے حصول میں ناکام ہونے کے باوجود، میں اپنے اس یقین کامل کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ ایک دن ٹریڈ یونین والوں اور سنجیدہ جمہوریت پسندوں کے طفیل، انسان کے تمام مقدس اور ناقابل تقسیم حقوق حاصل کر لیے جائیں گے، بغیر تحفظات کے ان کا اعتراف کیا جائے گا اور آدمی بغیر کسی رکاوٹ کے ان حقوق کو استعمال کر سکے گا۔

اس احساس نے کہ میرے ساتھ بہت بے انصافی ہوئی ہے، مجھے Aubervilliers کے Libertarian گروہ کے کتب خانے میں اپنا پیش تر وقت گزارنے پر مجبور کر دیا تھا، جو ان جگہوں میں سے ایک تھی جہاں میں اپنے حالات سے دانش ورانہ فرار کا وقت گزار سکتا تھا۔ وہاں مجھے احساس ہوا کہ کتابوں کے مطالعے نے میرے احساسات میں بغاوت کے جذبات کے قائم نظام اور سماجی نا انصافی کے خلاف میرے ارادوں کو مستحکم کر دیا تھا۔

میری تجویز ہے کہ اب بین الاقوامی امن کے لیے ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر نظر ثانی کی جائے۔ اس کے لیے میں دوسری تمام صورتوں سے صرف نظر کروں گا، مگر سب سے پہلے مزدوروں کی صحت کے تحفظ کی خاطر مثبت نتائج حاصل کرنے کے خیال سے میں پہلی ہڑتال کی وجہ بیان کرنا چاہوں گا، میں نے خود بھی جس میں شرکت کی تھی۔ میں نے اس ہڑتال میں ٹریڈ یونین کے ایک رکن کی حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ اس کے منظم سیکریٹری کی حیثیت میں شرکت کی تھی؛ دوسرے لفظوں میں، آپ حضرات کو اس عہدے کی فرائض اور ذمہ داریوں کی مختصر جھلک پیش کرنے کے لیے عرض کرنا چاہوں گا کہ میں ٹریڈ یونین کاؤنسل، جنرل اسمبلی اور کبھی کبھی وفود کی میٹنگ کی روک دیکھا کرتا تھا۔ میرے خیال میں، مجھ میں ویسا اعتماد نہیں تھا جیسا کہ ایک ٹریڈ یونین والے میں ہوتا ہے؛ اور جو کچھ تھا بھی تو شاید اس معمولی تعلیم کی بنا پر تھا جو میرے دوسرے ساتھیوں کی تعلیم کے مقابلے میں زیادہ تھی کہ Third Republic کے زمانے میں کی جانے والی اسکول کی اصلاحات کو جس برس بھی نہیں ہوئے تھے۔

National Federation of Match Factory Workers کے اُکسانے پر اور G.G.T سے منسلک رہتے ہوئے جو 1859 میں قائم ہوئی تھی، اس ہڑتال کا، جس میں پوری ٹریڈ کارپوریشن شامل تھی، مقصد دیا سلائی بنانے کے عمل میں فاسفورس کے استعمال سے انکار کرنا تھا، حالاں کہ بالخصوص کارکنوں کے دانتوں کی صحت کے حوالے سے، اس میں معمولی سا بھی خطرہ نہیں تھا۔ ہڑتال ایک مہینے تک جاری رہی تھی، حکمران کے نتیجے میں برن (Bern) کانفرنس بلائی گئی جس کے مطالبے پر منفرمادوں کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی۔ فطری طور پر یہ پہلی کامیابی ٹریڈ یونین کے کام میں میری ہمت افزائی کا باعث ہوئی، ساتھ ہی اس نے نا انصافی کے خلاف کام کرنے اور نوجوانی میں ٹیموں قسم کی کامیابی حاصل کرنے کی ضرورت کو ہمیز کیے رکھا۔ اسی ہڑتال کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ کام کے لیے ایک مسلسل [خود کار] مشین کی جیسا کہ ہم اس کو اس

وقت اسی نام سے پکارتے تھے، کام میں لایا جانے لگا جس سے پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ کارکنوں کی مشقتوں میں کمی بھی ہوئی۔ اس نے ٹریڈ یونین ازم کو سمجھنے میں میری رہنمائی کی کہ اسے مزدور طبقے کی آزادی اور سماجی تہذیبی اور صنعتی دونوں کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ اور مجھے اس بات کے ادراک میں دیر نہیں لگی کہ اس میں دنیا کو تباہ کرنے والی جنگ کے ہمیشہ ہرارتے ہوئے رائے سے آزادی ملنے کے موثر طریقے موجود ہیں۔

نحاتین و حضرات، میں اس حقیقت کا علی الاعلان اعتراف کیوں نہ کروں کہ امن کے لیے، ٹریڈ یونین اور بالخصوص فرانسیسی ٹریڈ یونین کی جدوجہد کا، میں نے جس میں خود کو ہی نہیں اپنی جوانی کے تمام تر اشتیاق کو بھی جھپٹ کر دیا تھا، پہلا تھوڑا سا عسکریت مخالف خیالات میں اور کبھی عمل میں بھی ہوا تھا۔ کیا جذبے کے خلاف بیج کا جان بوجھ کر چھپایا جانا سب سے بڑے گناہوں میں سے نہیں؟ اور کیا یہ فضول بات نہیں ہوگی کہ ٹریڈ یونین تحریک کو برسرِ کرنے والے مقاصد اور اثرات کی حامل تحریک ہونے کے باعث بُرا بھلا کہا جائے؟ لڑھنگ کے ماہرین سماجیات کبھی قدیم لعل کے لوگوں کو ان کے عقائد کے باعث کہ سورج کرۂ ارض کے اطراف گھومتا ہے، بُرا بھلا نہیں کہتے۔ ہم خود بھی، علم اور کافی حد تک پختہ خیالات کی کمی کے باعث، کبھی کبھی مظاہر قدرت کے خارجی روپ کے باعث خود مظاہر قدرت ہی کو غلط سمجھ بیٹھتے ہیں۔ میں اس میں یہ اضافہ بھی کرنا چاہوں گا کہ اس دور کی میری یادداشت، شاید اس سراب کے باعث، جسے گزرتے ہوئے میں تازہ کر دیتے ہیں، کسی تعمیری خواہش کے بھلے حالات کے بارے میں مزید غیر منطقی امید سے جوش و خروش پیدا کر دیتی ہے، مگر وہ شوق زیادہ بد مزگی پیدا کر دیتا ہے جو بے توجہی، جبریت اور وسوسہ داری کے اس عہد میں ہمارے ٹیڑھا عظیم پر قائم رہا ہے، ایسا ٹیڑھا عظیم جسے دو عالمی جنگوں نے اخلاقی ہی نہیں مادی طور پر قاتل کر کے رکھ دیا ہے۔ کسی خطیب نے ایک بار کہا تھا، ”جنگ چھڑ جاتی ہے تو عوام اس کے سب سے بڑے شکار ہوتے ہیں۔“ وہ جینی طور پر اپنے علم سے زیادہ صحیح کہہ رہا تھا۔ جنگ نہ صرف ہزاروں، بلکہ لاکھوں، کی تعداد میں مزدوروں کو مار دیتی ہے، ان کے گھروں کو تباہ کر دیتی ہے، ان کھیتوں کو تاراج کر دیتی ہے جن کو کھیتی کے قابل بنانے میں زمانہ لگ جاتا ہے، کارخانوں کو زمین کے برابر کر دیتی ہے جنہیں انہوں [مزدوروں] نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا، اور برسوں کے لیے مزدوروں کے معیار زندگی کو گرا دیتی ہے، بلکہ آدمی کو تباہیوں کے پیش نظر اس کی مجبوریوں کی یاد دلاتی ہے، اور نتیجے کے طور پر امن، انصاف اور بہبود کے عہد کو بڑی طرح پسپا کر دیتی ہے۔

جی ہاں! 1900 میں ہم میں بہت جوش و خروش تھا۔ کوئی بھی شے، محض وہ کچھ بھی رہی ہو، اس وقت ہمارے لیے ناممکن نہیں تھی، اور اس پر یقین کے لیے ہمارے پاس جواز تھا۔ ہمیں محسوس ہونے لگا تھا کہ وکٹر ایڈلر (Viktor Adler) [ایک آسٹریائی سیاست داں جس نے انیسویں صدی عیسوی میں سوشلسٹ ورکرز پارٹی کی بنیاد لی تھی] کے بعد ولبر براؤٹ (Wilbur Wright) [وہ پہلا انسان جس نے ہوابازی کو ممکن کر دیا تھا] ہمیں اُڑنے کے قابل بنادے گا۔

اپنی فوجی خدمت کے بعد، میں کارخانے اور ٹریڈ یونین میں واپس چلا گیا۔ اس کے بعد سے میں اپنے آپ کو تحریک کے قصے سے الگ رکھوں گا۔ اس لیے نہیں کہ ہمارے راستے جدا ہو گئے تھے کہ دراصل وہ 1909 میں پھر باہم مل جاتے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ، باوجود قریبی تعلقات کے، ٹریڈ یونین ازم آزاد خیال افرادیت پسندی سے بالکل جدا نوعیت کا کام ہے۔

تھوڑی دیر پہلے میں نے Confédération générale du travail (C.G.T) کی 1895 میں بنیاد گزاری کا تذکرہ کیا تھا۔ اس کو Federation of Trade Unions کی جگہ قائم کیا گیا تھا جس کی تشکیل 1886 میں ہوئی تھی۔ دراصل، C.G.T کے تحت کارکنوں کا مکمل اتحاد 1902 تک نہیں ہو سکا تھا جب کہ Montpellier کا گمریس میں Federation of Labour Exchanges کو Division of Labour Exchanges کی حیثیت میں C.G.T میں ضم کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس عرصے میں جب مزدوروں کے اتحاد کو مستحکم کیا جا رہا تھا، C.G.T اپنے سالانہ کانگریسوں میں تنظیم اور اداراتی دعوؤں سے آگے بڑھ چکی تھی اور 1898 میں جس نے عمومی ترک اسلحہ جات کے حق میں اپنا موقف اختیار کیا تھا۔

”کانگریس (تحریک کو پرانے انداز میں بیان کیا گیا ہے) کے نزدیک تمام لوگ بھائی ہیں، اور جنگ بنی نوع انسان کے لیے سب سے بڑا قہر ہوتی ہے؛

— یہ جانتے ہوئے کہ اسلحہ ہندامن، جو فوجوں کے اخراجات کے لیے بڑھائے جانے والے ٹیکس پر بیج ہوتا ہے، تمام لوگوں کی مبادی کا سامان ہوتا ہے؛

— اعلان کرتی ہے کہ اس دولت کو جو برسوں صرف وحشیوں، نوجوانوں، طاقتوروں اور ہنے مکے انسانوں پر کئی برس تک خرچ کی جاتی ہے، انسانیت کی خدمت کے لیے کیے جانے والے کاموں پر صرف کی جانی چاہیے؛

— اس خواہش کا اظہار کرتی ہے کہ ترک اسلحہ جات پر فوراً عمل ہونا چاہیے۔“

1900 اور 1901 میں C.G.T نے خالص نظری

آج یہ اعلانات اور فیصلے بہت نرم معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان اعلانات کے ساتھ ہی فوج مخالف احتجاج بھی کیا گیا تھا اور Dreyfus مقدمے کو دوبارہ چلانے کے لیے شدید شور و غل بھی ہوا تھا۔ مسکریت پسندوں کی جانب سے جن کے ہمام زمانہ Council of War سے تعلقات نے فوج اور خصوصاً اس کے افسروں کے بارے میں ناوابجہ شبہات پیدا کر دیے تھے، اس کی زور و شور سے مخالفت بھی کی گئی تھی۔

1902 کے بعد سے C.G.T کانگریس کے تمام ششماہی اجلاسوں میں امن کی حمایت میں کام کرنے کے بارے میں غور کیا گیا ہے۔ روس/جاپان جنگ کے چھڑ جانے کے ساتھ ہی بورجنز میں منعقد ہونے والی 1904 کی کانگریس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ”ایسے وقت میں جب دو قومیں ایک دوسرے کا گلا گانے کے در

پے ہیں، حکمرانوں اور استعمار کرنے والوں کے مفاد کی خاطر ماضی کے بڑے چیلانے کے قتل عام کے ذہرائے جانے پر، جو دنیا بھر کے ادنیٰ طبقے کو غلام رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کانگریس دونوں حکومتوں کے کم ظرف رویے پر اظہارِ رائے کرتی ہے، جو طبقہ عوام کی برہمنی ہوئی بے قراری کو دور کرنے کی غرض سے، وطن پرستانہ جذبات سے اپیل کرتی ہیں کہ وہ بغیر کسی تامل کے ہزاروں کارکنوں کے سیاسی قتل اور غارت گری میں ملوث ہوئی ہیں تاکہ وہ اپنے استحقاق کے موقف کا تحفظ کریں۔“

بین الاقوامی آسان پر [خطرات کے] بادل چھاتے جا رہے تھے، اور یونین والوں کے رویوں میں سختی پیدا ہو رہی تھی۔ 1906 میں ہونے والی کانگریس نے ”مجموعہ کی عسکریت مخالف نشر و اشاعت“ کی منظوری دی اور 1908 کی کانگریس نے فیصلہ کیا کہ وہ ”اعلانِ جنگ کے ساتھ انقلابی عام ہڑتال کے اعلان“ کا جواب دے گی۔ 1910 اور 1912 کے کانگریس اجلاس میں ان تجاویز کی منظوری دی گئی اور جبر کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا، مگر 1912 بلقان کی جنگ کا سال تھا اور حریتانہ کوششیں شروع ہو چکی تھیں، جنہوں نے جنگ کو دور تک پھیلانے کی دھمکی دے دی تھی، اور اکتوبر کے مہینے میں منعقد ہونے والے خصوصی کانفرنس نے کانگریس بلانے کا فیصلہ کیا جس کا مقصد صرف جنگ کے خوف کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس میں منظور ہونے والی قراردادیں بڑے چیلانے پر ٹریڈ یونین تنظیموں کے اہماد کی بہترین مثال تھی۔ حکومتوں کو آگ اور خون کے پھیلے ہوئے جزروں میں جانے سے روکنے کی غرض سے کانگریس نے اپنے ارادوں پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا تاکہ فوری تعیناتی کی صورت میں انقلابی قدم اٹھائے جاسکیں۔

اگر ہم اپنے آپ کو محض اس کی کانگریسوں کی منظوری قرار دالیں تو ہم درحقیقت گمے تو ہم مزدور کے اقدام کی اہمیت کے بارے میں غلط تصور پیش کریں گے۔ ان اعلانات پر قناعت کرنے کے بجائے ٹریڈ یونینوں نے بین الاقوامی اتفاق کے سلسلے قائم کیے اور ہر اس پالیسی کی حمایت میں قدم اٹھایا جو مصالحت اور افہام و تفہیم کی بنیاد پر ترتیب دی گئی تھی۔ 1900 اور 1901 کے درمیان G.G.T اور برطانوی مزدور طبقات نے اکٹھے ہو کر Entente Cordiale [صبر اور مراقبہ پر حکمرانی کے بارے میں 1904 میں برطانیہ اور فرانس کے درمیان ہونے والا معاہدہ] نامی معاہدہ کرنے میں ہاتھ بٹلائے۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اس تناؤ کی کیفیت پر غور کیا جائے جو 1898 Fashoda [میں برطانیہ اور فرانس کے درمیان افریقا کی نوآبادیات پر ہونے والا تنازعہ جس پر جنگ چھڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا] کے معاملے کے بعد پیدا ہو گیا تھا، اور ان طریقہ کار پر نظر ڈالی جائے جو ان دنوں ہو رہی تھیں۔ افاغیہ کے واقعے کے دوران 22 جولائی 1911 کو G.G.T کی جانب سے ایک وفد برلن بھیجا گیا تھا اور اس کے بعد والے مہینے میں جرمنی سے ایک ٹریڈ یونین وفد پیرس آیا۔ [گویا فرانسیسی اور جرمن طبقہ عوام مل کر جنگ کو مانگنے کی کوششیں کر رہے تھے۔

صرف ٹریڈ یونینوں کے درمیان ہونے والے یہ وقتی سلسلے ہی وہ بین الاقوامی سلسلے نہیں تھے جو قائم کیے

گئے تھے۔ I.O.E. International کی تحلیل کے بعد بین الاقوامی مزدوروں کے کئی اجتماعات ہوئے تھے۔

ایک اجتماع 1895 میں زیورخ میں ہوا تھا اور ایک 1896 میں لندن میں؛ جن میں ٹریڈ یونینوں کے مندوبین اور سوشلسٹ ذہن رکھنے والی سیاسی جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ لندن کے اجتماع میں دوسرے ٹریڈ یونین والوں کے علاوہ جو لوگ شریک ہوئے تھے ان میں Fernand Pelloutier اور Guérard براداران اور Keurer بھی شامل تھے۔ اس تعاون کے، یا، جیسا کہ بہت سے ماقدما رتخ دانوں نے اس کو افرا تفری کہا ہے، نتائج غیر معمولی نہیں تھے اور ایک خالص بین الاقوامی ٹریڈ یونین کا تصور پہلی بار 1901 میں کوپن ہیگن میں ہونے والی Congress of Scandinavian Trade Unions میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ وفد کے درمیان براہ راست قائم ہونے والے برادارانہ تعلقات کا نتیجہ تھا۔ اس کی تجویز لیگیسی (Legien) نے پیش کی تھی جو جرمنی کی ٹریڈ یونینوں کی جنرل کمیٹی کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس میں طے کیا گیا تھا کہ 1902 میں ہونے والی جرمن ٹریڈ یونین کی کانگریس میں مختلف قومی تنظیموں کو شرکت کی دعوت دی جائے۔ جرمنی، برطانیہ، آسٹریا، ہنگری، ڈنمارک، ہسپانیہ، فرانس، نیدر لینڈ، اطالیہ، ناروے، سویڈن اور سویٹزر لینڈ نے اپیل کا مثبت جواب دیا اور بین الاقوامی ٹریڈ یونین کانگریس کی تنظیم کی تجویز کی منظوری دی جنہیں پابندی سے اکٹھے ہونا تھا۔ اس کا منشور وحدت، اتحاد اور اشتراک اعدا و شمار کی ترتیب، مزدوروں پر اثر انداز ہونے والے قوانین کا آپس میں تھاپ اور بالآخر ہڑتال ہونے کی صورت میں باہمی اتفاق۔ اس کے بعد پہلا بین الاقوامی رابطوں کا سلسلہ قائم ہوا، اور 1903 میں ڈبلن میں International Trade-Union Secretariat کا قیام عمل میں آیا۔

Secretariat سے باقاعدہ طور پر علاقہ دہی کے بغیر، ہمارے فرانسیسی G.G.T نے 1904 میں اپنا چندہ دینا بند کر دیا، سیکریٹریٹ نے سکریت محالفت کے سوال کو انیسٹریٹم میں ہونے والی کانگریس کے ایجنڈے میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اس حد تک نہیں جاؤں گا کہ میں یہ کہوں کہ دوسروں کے مقابلے میں فرانسیسی ٹریڈ یونین امن کی لیے کی جانے والی جدوجہد کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں، مگر یہی طور پر وہ اس [امن] کو اپنے دل سے زیادہ قریب ضرور رکھتی ہیں۔

1908 میں مارکسز میں ہونے والی G.G.T Congress کے بعد تعلقات دوبارہ استوار کر لیے گئے اور سیکریٹریٹ کی رضامندی سے یہ طے کر لیا گیا کہ واقعی بین الاقوامی کانگریس کے انعقاد کو آئندہ ہونے والی کانگریس کے ایجنڈے میں شامل کر لیا جائے۔

یہ کانگریس، جو کہ پانچویں تھی، جیڑس میں منعقد ہوئی اور اس میں کچھ جذباتی بحثیں بھی ہوئیں، جو واقعی بہت جذباتی تھیں۔ اس کانگریٹری ہونے کے ماتے میں G.G.T کا ترجمان تھا۔ میں نے حال ہی میں اپنے ایک مضمون میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے، اور میرے خیال میں، [میرے لیے یہاں] اس کے ابتدائی کلام کا

اقتباس پیش کر رہی بھتر ہوگا، اس لیے کہ یہ الفاظ نہ صرف ہمارے بلکہ American Federation of Labor کے نمائندے کے موقف کو بھی واضح کرتے ہیں۔

”مجھے نیم ستمبر 1903 کو ایک بار پھر Gompers [سیموئل گومپرز- تاریخ کا مشہور برطانوی / امریکی ٹریڈ یونین لیڈر] نظر آیا تھا۔ یہ Trade-Union Secretariats کی بین الاقوامی کانگریس کا دوسرا دن تھا۔ میں تمام دن ایک حقیقی بین الاقوامی کانگریس طلب کرتا رہا تھا، اور بالآخر مجبوراً مجھے بڑے جوشیلے انداز میں تقاضا کرنا پڑ گیا۔ سرپہر کے اجلاس میں، جب ہم فرانسیسی C.G.T سے بحث میں کامیابی حاصل کر چکے تھے گومپرز، جو امریکی لیبر یونینوں کی نمائندگی کر رہا تھا، اُلجھ کر میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے اپنے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔“

دو اور کانفرنسیں، جن میں پہلی 1911 میں بوداپیسٹ میں ہوئی تھی، اس بار جس میں American Federation of Labor سرکاری طور پر، اور Industrial Workers of the World غیر سرکاری طور پر شامل ہوئی تھیں۔ دونوں کانگریس کے اجلاس 1913 میں زیورخ میں منعقد ہوئے تھے۔ دوسری کانفرنس میں ہم نے International Vocational Secretariats سے اپیل بھی کی تھی کہ بین الاقوامی سطح کی ایک بڑی کانفرنس بھی بلائی جائے۔ زیورخ کی کانفرنس میں منظور ہونے والی قراردادوں نے سفارش کی تھی کہ تمام ملکوں کی ٹریڈ یونینیں ایک International Federation of Labor کے قیام پر غور کریں جس کا مقصد ”تمام ملکوں کے یومیہ کام کرنے والے مزدوروں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ“ ہوگا، اور اس جملے کے آخری الفاظ ہیں: ”اور بین الاقوامی برادری اور باہمی اتفاق کا حصول۔“

ٹریڈ یونین تحریک عہد شیر خواری سے نکل کر اپنے روشن مستقبل سے آشنا ہو رہی تھی۔ زیورخ میں وہ اپنے آپ کو ایک واحد سماجی طبقہ نہیں سمجھ رہی تھی، وہ جس قسم کی بین الاقوامی ہم آہنگی لانا چاہ رہی تھی، اس ہم آہنگی سے کہیں مختلف تھی جو ہر سال کے دوران مزدوروں میں ہوتی ہے، جس کا اس وقت تک تصور کیا جا رہا تھا وہ ڈرامائی واقعات جو اس کی نشوونما کے دوران قبل از وقت پیدا ہو رہے تھے جیڑی سے اس کی بلوغت میں معاونت کر رہے تھے۔

میری ٹیل کے لوگ جولائی 1914 کے آخری دنوں کو کبھی نہیں بھول سکیں گے، بالخصوص وہ لوگ جو جیڑی سے بڑھتے ہوئے ٹھون کے سمندر کے خلاف بند باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جولائی کی 27 تاریخ کے بعد ہمارے C.G.T نے ناممکن کے حصول کی کوشش کبھی ترک نہیں کی۔

ان رہنماؤں کے نزدیک، جو قدیم قول Ultimate Right کے جذبے سے سرشار تھے، جسے باؤشا اپنی توپوں پر کندہ کرایا کرتے تھے عام آدمی کی سوچ کے خلاف تھا۔ انسان کہہ رہا تھا، ”جنگ ان مسائل کا حل نہیں جو ہمیں درپیش ہیں، یہ اب بھی ہے اور ہمیشہ انسان کی بڑی مصیبتوں میں سے ہے۔“ ہمیں اس کو دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی پڑے گی۔“ جمعہ 30 جولائی کو C.G.T نے International

Secretariat کوٹا رکے ذریعے اپنی سب سے بڑی ایٹل رٹانہ کہ جس میں استدعا کی گئی تھی کہ وہ حکومتوں پر اپنے دباؤ کے ذریعے اس معاملے میں مداخلت کرے۔

افسوس! جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں بے جگری سے کی جانے والی تمام کوششیں بے کار تھیں! یہ تباہی ہم کو اپنے آدرش کو تاج دینے پر مجبور نہیں کر سکی! اس کے برعکس، تنازعے کے بعد پہلے مہینے ہی سے اس نے، اس کے حصول کی شرائط کی طرف ہماری رہنمائی کی۔

در اصل 1914 کے آخر میں، International Federation of Labour نے National Trade-Union Organizations کی ایک بین الاقوامی کانگریس، اسی دن اور اسی جگہ منعقدہ کرنے کی تجویز پیش کی جہاں امن کانفرنس منعقد ہونے والی تھی، تاکہ طبقہ عوام اور اداروں کے درمیان اچھے تعلقات استوار رکھے جاسکیں اور امن کانفرنس میں شرکت کی بہت افزائی سے ایک دیر پا امن کی فیصلہ کن بنیاد رکھی جاسکے۔“ G.G.T کی Le Comité confédéral نے اس تجویز کو منظور کر لیا اور خود ہی تمام ٹریڈ یونین اداروں کو ایک منشور جاری کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ اس متن کا پیش تر حصہ اس سے پہلے کے متن سے کم پڑنا ہے۔ یہ مطالبے کے ساتھ نتیجہ اخذ کرتا ہے: خفیہ معاہدوں کے نظام کو چھپانا، قومیتوں کے لیے مطلق احترام، بین الاقوامی سطح پر اسلحوں پر فوری حد بندی کا نفاذ، جو طریقہ ہے ترک اسلحہ جات تک پہنچنے کا، اور قوموں کے درمیان تنازعات کے حل کے لیے لازمی ثالثی۔

یہ خیالات جلد ہی پھیل گئے۔ اور اس کی سنگ میل تھیں 1916 میں لیڈز (Leeds) کی کانفرنس، ستمبر 1917 میں لندن کی اور اسی برس جون اور اکتوبر میں بالترتیب اسٹاک ہوم اور برن میں ہونے والی کانفرنسیں۔ لیڈز میں ایک ٹریڈ یونین کے متن میں بین الاقوامی لیبر آرگنائزیشن کا خیال نظر آیا تھا، جس میں ان خطرات کی نشان دہی بھی تھی جو مزدور طبقے کو بین الاقوامی سرمایہ کاری کی مسابقت سے درپیش ہیں۔ G.G.T کی طرف سے پیش کی گئی رپورٹ میں ہم نے طے کیا کہ امن کے مباح کو مزدوروں کے اداروں کے جذبے کے تحت، United States of Europe کی بنیاد کا پہلا پتھر رکھنا چاہیے۔ لندن میں خود ہیگ آف نیشنز کے لیے شدید حمایت کی جا رہی تھی، تمام تر منطقی نتائج کے ساتھ: کہ عام ترک اسلحہ جات سے پہلے اسلحوں کے لیے حد بندی ہو لازمی ثالثی ہو، کہ G.G.T نے تین برس قبل ان دونوں کی وکالت کی تھی۔

جون 1917 میں اسٹاک ہوم میں مرکزی یورپ اور اسکیٹینڈی نیویائی ملکوں کی ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں نے ان تمام فیصلوں سے اتفاق کا اعلان کیا جو لیڈز میں کیے گئے تھے بلکہ اس سلسلے میں اتحادی ملکوں کی ٹریڈ یونینوں، بالخصوص G.G.T کو مبارکباد بھی پیش کی تھی۔ اکتوبر 1917 کی ابتدا میں Association of Swiss Trade Unions کی جانب سے برن میں ٹریڈ یونینوں کی ایک اور بین الاقوامی کانفرنس بلوائی گئی تھی۔ اس میں جرمنی، آسٹریا، بوسنیا، بلغاریہ، ڈنمارک، ہنگری، نیدرلینڈ، ناروے، سویڈن اور سویٹزرلینڈ کے قومی اداروں کی نمائندگی تھی، اور ان سب نے لیڈز اور لندن میں منظور ہونے والی تمام تجاویز کی توثیق کی

تھی۔

فروری 1918 میں منعقد ہونے والی Inter-Alleed Labour and Socialist Conference شاید زیادہ اہم تھی۔ ہمارے فرانسیسی ادارے نے ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں وہ تمام خیالات پیش کیے گئے تھے جو یقیناً پہلے بھی پیش کیے گئے ہوں گے، مگر اس میں ہم نے ایک ورلڈ قومی مقتدرہ کے قیام کا مطالبہ بھی کیا تھا یعنی: "ایک بین الاقوامی قانون ساز اسمبلی کی تشکیل" اور "ایک ایسے بین الاقوامی قانون کی بتدریج تشکیل جو سب کا منظور شدہ ہو جس کی صاف انداز میں تشریح بھی کی گئی ہو۔" ہم اپنے وقت سے آگے چل رہے تھے، دراصل بہت آگے، اس لیے کہ تینتیس برس بعد بھی یہ تجاویز نافذ نہیں کی گئی ہیں۔ کانفرنس نے استدعا کی تھی کہ "کم از کم، سرکاری نمائندوں کے ساتھ سوشل ازم اور مزدور کا ایک نمائندہ بھی سرکاری امن کانفرنس میں بیٹھے۔" اس درخواست کو، جسے G.G.T نے 15 دسمبر 1918 میں، کم و بیش ان ہی شرائط کے ساتھ دہرایا تھا، دو حکومتوں نے منظور کر لیا: اس کے نتیجے میں گوپہر زکو اور مجھے شکینگی ملبرین کی صورت میں U.S.A اور فرانس کے وفود سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ ہم نے مذاق کی تفصیل کی خاطر ٹریڈ یونین تحریک کی جانب سے اپنی تمام تر کوششوں کو یکجا کیا تھا، بالخصوص جہاں تک Part XIII کا تعلق تھا۔ مزدور رابطے زیادہ سے زیادہ تیزی سے، بین الاقوامی خرابیوں سے واقف ہوتے جا رہے تھے۔

میں مذاق کے اس حصے سے دو شتوں پر معنی اقتباس پیش کرنا چاہوں گا جنہوں نے ILO کو جنم دیا تھا اور اس کے مستقل لائحے International Labor Office کو جس کی سرگرمیوں اور محسوس کیے جانے والے نتائج کا اس مقام پر ذکر ضروری نہیں۔ یہ دونوں شتیں ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں:

"جب کہ لیگ آف نیشنز کے قیام کا مقصد عالمی امن ہے، اور ایسا امن صرف اسی وقت قائم کیا جاسکتا ہے جب اس کی بنیاد سماجی انصاف پر رکھی جائے؛

اور جب کہ مزدوروں کے حالات ایسے ہو جائیں، کہ نا انصافیاں، دشواریاں اور بڑے پیمانے پر لوگوں کی تلک دہی بے چینی پیدا کرتی ہو، کہ دنیا کا امن اور اس کی ہم آہنگی خطرے میں پڑ جائے؛ اور ان حالات میں بہتری لانی ضروری ہو جائے۔۔۔"

1918 کے بعد سے ٹریڈ یونین کے رہنماؤں کو اپنی کانگریسوں کے اجلاس میں مزدوروں کی خواہشات کا اظہار کرنا ہوتا تھا کہ امن کے حصول کے لیے دنیا کی منطقی تنظیم کی جائے۔ International Labor Office اور لیگ آف نیشنز کی جنرل اسمبلیاں، جن کے کئی اجلاس ہوا کرتے تھے عالمی مفادات کو اپنی تجاویز کے ذریعے ہوا دیا کرتی تھیں۔ پھر بھی، ٹریڈ یونین ادارے اپنی خود مختار سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ فروری 1919 میں برن میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس اور انی برس انٹرنیشنل میں منعقد ہونے والی کانگریس میں International Trade-Union Secretariat کو حقیقی International Federation of Trade Unions سے بدل دیا گیا تھا، جسے ایک دم ہی بین الاقوامی ارکان میں مل گئے تھے اس کا سب سے پہلا

قدم ایک اکیلے تھی، بین الاقوامی باہمی اتفاق کی، تاکہ آسٹریا میں پھیلی خوفناک بد بختی کو دور کیا جائے اور آسٹریا کے مزدور قحط سے بچ جائیں۔ اس اکیلے کے جواب میں ریل گاڑیوں میں بھر بھر کر ٹریڈ یونینوں کی امداد باہمی کی سوسائٹیاں انھیں امداد بھیج رہی تھیں۔ اس کا دوسرا کام ہنگری کی ٹریڈ یونینوں کے جانب سے F.S.I میں دخل اندازی تھی جو ان کی آزادی کو خطرے میں ڈال رہی تھی۔

کچھ لوگ فراموش کر چکے ہیں، کبھی کبھی فراموشی ایسی فرحت انگیز ہوتی ہے جیسے کہ لاطینی۔ کہ F.S.I نے بھی، روسی مزدوروں کی جانب سے اسی شدت سے دخل اندازی کی تھی، اس کے نمائندے اوگریدی (O'Grady)، واؤٹرز (Wauters) اور بعد میں ٹامسن (Thomson) 1923 تک روس میں مقیم رہے تھے تاکہ فیڈریشن کی کبھی ہونی غذا اور دواؤں کی تقسیم کے نگہداشت کریں۔ مزید، یہ کہنا تاریخ کو سچ کہنا نہیں ہوگا کہ یہ ہماری بین الاقوامی فیڈریشن کا پروپیگنڈا ہی تھا، بڑی طاقتوں کی اکثریت نے جس کی وجہ سے U.S.S.R کی حکومت کو تسلیم کیا تھا۔

مگر ٹریڈ یونین والوں نے خود کو جنگ کے ظالمانہ نتائج کو کم کرنے تک ہی محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے مستحکم امن کے قیام کی کوشش کی ہے، اس امر پر زور دیتے ہوئے کہ اس کو عالمی اقتصادیات اور سماجی استحکام کی بنیاد پر قائم کیا جانا چاہیے۔ دراصل، لیگ آف نیشنز کے سامنے پیش کی گئی، تنہا ویز کی اکثریت ٹریڈ یونینوں کی بین الاقوامی فیڈریشن اور عالمی امن کا گمریس کے اجتماعات سے آتی ہیں جو ثانی انداز کی ایما پر 1922 میں دی ہیگ میں منعقد ہوئے تھے۔ ہم نے تہا لے کی تقسیم، خرا دی قوت کے پھیلاؤ، خام مال کی تقسیم اور نجی استعمال کے لیے بنائے جانے والے ہتھیاروں کے بین الاقوامی پھیلاؤ کی تقسیم چاہی تھی۔

یہ وہی وقت تھا جب لیگ آف نیشنز نے اسلحہ جات، کلو باروں اور جنگی اشیا کی بین الاقوامی تجارت کے طریقوں پر غور کرنے کے لیے ایک Temporary Mixed Commission قائم کیا تھا۔ کام کرنے والوں کی رائے کا وزن اتنا اہم ہو چکا ہے کہ International Labour Office کی گورننگ باڈی کے تین ارکان کو کمیشن میں شامل کرنا پڑا تھا۔ ایک کنونشن 17 جون 1925 کو منعقد ہوا تھا جس میں، عام پروپیگنڈے کے مقابلے میں، گمرانی کے اصولوں کا اعتراف کیا گیا تھا، اور مزدور ارکان کے طفیل جس میں مجھے بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود، ہمارے سارے مشوروں پر عمل نہیں کیا گیا، مثال کے طور پر ہم نے درخواست کی تھی کہ بین الاقوامی گمرانی، کاروباری حساب کتاب کی جانچ پڑتال، پریس اور بین الاقوامی اجارے داری کو اثر انداز ہونے سے روکنے اور قومی معاشکے کی معیار بندی کی جانی چاہیے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ بین الاقوامی سطح کی گمرانی کو ہمیشہ شدید مخالفت کا سامنا ہوتا ہے۔ کل یہ نجی اسلحہ سازوں کی طرف سے تھی، تو مجھے یقین ہے کہ آج خود اسلحہ جات [استعمال کرنے والوں] کی طرف سے ہوگی، جیسے کہ C.I.S.L کے ہمارے کامریڈ کہتے ہیں کہ مکمل، بلکہ جزوی ترک اسلحہ جات پر بھی سنجیدگی سے بات نہیں ہو سکتی، جب تک کہ ہم کڑی بین الاقوامی گمرانی کی ضرورت کو منظور نہیں کر لیتے۔

میں 1927 میں منعقد ہونے والے اقتصادی کانفرنس میں ایک بار پھر ٹریڈ یونین والوں کا ترجمان بنا تھا۔ 5 مئی کے میرے بیان میں اٹھائے جانے والے اصولی مباحثہ درج ذیل تھا:

”میں اپنے کامیڈوں کی جانب سے، مزدوروں کے نمائندوں کی حیثیت سے اس بین الاقوامی کانفرنس میں ان تمام اونچے آدرشوں کو خراج تحسین پیش کرنا چاہوں گا، ٹریڈ یونین تحریک نے ہمیشہ جن کا دفاع کیا ہے۔ مزدوروں کے اداروں کی رائے ہے کہ [مختلف ملکوں کے] عوام کے درمیان اقتصادی شراکت داری ایک اہم ضرورت ہے۔ جنگ کے فوراً بعد، عارضی جنگ بندی فروری 1919- کے عرصے میں، امن کے لیے اور ان حالات کے لیے جن کی بنیاد پر لیگ آف نیشنز کی تنظیم کی جائے، مزدوروں اور سوشلسٹوں کی کانفرنسوں اور برن میں ہونے والے ملاقاتوں میں اس بات پر زور دیا گیا تھا، جیسا کہ ہمارے چیئرمین Monsieur Theunis نے بھی کل خاص کر اس بات پر زور دیا تھا، کہ لیگ آف نیشنز کو ایک مستحکم اقتصادی بنیاد پر استوار کرنا بے حد ضروری ہوگا۔

۔۔۔ 1924 میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ فیصلہ کن امن کو نہ صرف ایک قانونی ادارے کی، بلکہ امن کی اقتصادی بات کی بھی ضرورت ہوگی۔۔۔ حقیقی امن قائم نہیں کیا جاسکتا۔۔۔ جب تک کہ اقتصادی تعلقات میں ایک ظاہری عسکری حکمت عملی کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔ ہمیں ضرورت ہے ایک اقتصادی تعاون کی کمیٹی کی۔“

23 مئی کو جب کانفرنس کا آخری دن تھا، میں نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا، ”ہم تنقید کرنے میں بہت بہادری دکھاتے ہیں مگر تعمیری کاموں میں ہزدل ہو جاتے ہیں۔“

تین برس بعد، اجتماعی اقتصادی اقدام کے خیال کے ساتھ، کانفرنس نے لیگ آف نیشنز کے رکن ریاستوں کو ایک سوال نامہ جاری کیا تھا۔ فرانسیسی حکومت نے قومی اقتصادی کاؤنسل کو [سوال نامے کے] فرانسیسی جواب کے لیے ضروریات پر کام کرنے کا حکم دیا۔ 1925 سے، جب اس کاؤنسل کی بنیاد پڑی تھی، میں G.G.T کی نمائندگی کر رہا تھا، اور میں نے مختلف قوموں کے درمیان یورپی خام مال کے زیادہ سے زیادہ استعمال اور تقسیم کے لیے اطمینان بخش عملی ذریعوں پر تفتیش کی تھی۔ اپنے کامیڈوں کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے میں نے پیداوار اس کی فہرستوں کی تیاری اور مختلف ممالک کی خام مال کی ضروریات کے لیے جو مشورے دیے تھے ان میں ایک بین الاقوامی اطلاعاتی خدمت کے ادارے کا قیام بھی شامل تھا۔

ہم نے 1931 میں عملی طور پر Unemployment Committee of the Commission of the League of Nations Monetary and Economic Conference میں حصہ لیا تھا، 1933 میں لندن میں ہونے والی Monetary and Economic Conference میں اور Comité des grands travaux internationaux کے ذریعے International Labor Office اور لیگ آف نیشنز میں بھی حصہ لیا تھا، جن میں ٹریڈ یونین والوں کی جانب سے پیش کردہ تجاویز پر غور کیا گیا، جس میں قوموں کے درمیان کم روزگاری کے خلاف بورڈرل کی پیداوار کے لیے نئے منجھے تلاش کرنے کی صحت مندانہ جدوجہد کی کوشش شامل تھی۔ مگر یہ تمام کانفرنسیں، اور یہ

اجتماعات اقتصادی بحرانوں کو دور کرنے میں ناکام رہے، دنیا کو جن کا سامنا تھا۔ منطقی بنیاد پر دنیا کی تنظیم، یا کم از کم اس کی ظاہری ماموریت کی تلاش خراش صاف ظاہر ہے کہ اتنی موثر نہیں تھی کہ اس کے مجموعہ انا پرستی اور عدم ادراک کے مشترک اثرات کا مقابلہ کر سکتی۔

قوموں سے وہ تمام اسلحہ جات اور آلات موت چھیننے کی کوشش بھی، جن کے یو جی کی وجہ سے وہ جنگی جاری ہوں، اتنی ہی فضول تھی۔ اسی طرح میں Limitation and Reduction of Armaments کے ابتدائی اجلاس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ فروری 1932 کے ابتدائی دن انسانیت کے لیے امیدوں کے دن تھے۔ لاکھوں افراد بعد اعمان کاغذ پر اس کی کارروائی کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے، جس کی صدارت مشہور پیکر مزدور نواز اور جنگجو ہینڈرسن (Henderson) کر رہے تھے اور ہم، معقولیت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس کی سرگرمیوں کے پیدا کرنے میں بہت کام کیا تھا۔ Socialist Workingmen's International اور International Federation of Trade Unions نے، سرگرمی سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہوئے، ہزاروں درخواستیں اکٹھا کر لی تھیں، جنہیں مندو جین نے کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ فروری کی چھ تاریخ کو جب Socialist Worker's International کی جانب سے واندرویلڈ (Vandervelde) تقریر کر چکے، تو میں نے کانفرنس کو کروڑوں ٹریڈ یونین والوں کی طرف سے تعلان کی پیش کش کی تھی۔

وہ دن میری زندگی کا سب سے اہم دن تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ holocaust کے تازہ زخموں کے باوجود میں، نہ صرف دنیا کے تمام مزدوروں کی متفقہ امیدوں کا، بلکہ ان کے واضح ادراک کا بھی اظہار کر رہا تھا جو ترکیب اسلحہ جات کے لیے ضروری تھے۔ ان کے نام سے، میں نے کانفرنس کے ارکان کو ٹریڈ یونین کے اداروں کی مکمل تیاری کا اور قومی اور بین الاقوامی گمرانی کے تعاون کا بھی یقین دلایا تھا جس کے بغیر جزوی ترکیب اسلحہ جات یا تو پُر فریب ہوں گے یا ناقابل عمل۔

ترکیب اسلحہ جات کی کوشش اسی طرح بے ثمر ہوگی جیسی کہ اقتصادی صلے کی کوشش، اور چند برس بعد، خالی پیٹ کے بہانے، اطالوی فسطائیت نے اپنی سینیا پر چڑھائی کر دی۔ ہم ٹریڈ یونین والے اچھی طرح جانتے تھے کہ امن ایک ناقابل تقسیم شے ہے اور ہمیں کوئی شبہ نہیں تھا کہ لیگ آف نیشنز کی کم زوری اس کو بے بس کر دے گی اور قتل و غارتگری کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ ہمیں اصرار تھا، بلکہ ہم اپنے مطالبات کے معاملے میں پُر تشدد بھی ہو گئے تھے کہ عہدہ چکان پر عمل ہونا چاہیے اور یہ بھی کہ قانونی پابندیاں عمل میں لائی جائیں۔ [مگر] ہماری آوازیں صدا بھرنا ثابت ہوئیں۔ پابندیاں نہیں لگائی گئیں، انھو بیلا میں جنگ چھڑ گئی، اور اس کے بعد ہسپانیہ میں دراندازی ہوئی، [دہلیائے] رہاؤن (Rhine) کے بائیں ساحل پر دوبارہ قبضہ ہو گیا، Anschluss [امن کے ناسے کے معاہدوں کے خلاف جرمنی اور آسٹریا کا اتحاد] وقوع پذیر ہوا، میونخ کے معاہدے ہوئے، اور دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔

میں کم زوری کی اس پالیسی کے خلاف زیادہ نہیں کہنا چاہتا، جس کے باعث اجتماعی تحفظ کے اصول کو ترک کر دیا گیا تھا۔ صرف ہم ہی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جمہوریوں کی بے ہمتی نے ان کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ ایک بار پھر جنگ کے باعث زمین برباد ہوئی۔ پھر بھی، ہمیں یقین نہیں کہ امن کے ضمن میں عمل ایک Sisyphean محنت جیسا ہے؛ [یونانی اساطیر کے مطابق Sisyphus ایک بادشاہ تھا جس کو مزاد کی گئی تھی کہ وہ ایک بڑے سے گول پتھر کو پہاڑی کی چوٹی تک لی جا کر نیچے کی طرف ڈھکیل دے اور اس کو نیچے جاتا دیکھے، اور اب تک اسی عمل کو دہراتا رہے۔ مترجم]، کہ یہ خوفناک پتھر بنی نوع انسان کو کھینچنے کے لیے ہمیشہ نیچے کی طرف لڑھک کر آتا رہے گا۔ پھر بھی [ایک دن] ہم اس پتھر کو پہاڑی کی چوٹی پر جتا کر ہی دم لیں گے۔

جوں ہی ہمسایوں اور فرسٹائیوں نے جتھیا رڈالے، ٹریڈ یونین والوں نے امن کے بارے میں دوبارہ سوچنا شروع کر دیا۔

1947 کے آخر تک G.G.T.-F.O نے اپنی روایات، جذبات اور ہمارے قدیم G.G.T کو دوبارہ زندہ کیا اور تقریریں، مضامین اور رپورٹوں میں ہم نے International Federation of Trade Unions کے ساتھ مل کر دوبارہ حل مخصوص کیے جو نجات کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیے گئے تھے۔ ہم نے مارشل منصوبہ منظور کیا اس لیے وہ بین الاقوامی یک جہتی کا مظہر تھا، اس لیے کہ اس کے فوائد بغیر کسی تعصب کے کسی بھی قوم کو پیش کیے جاسکتے تھے اور اس لیے بھی کہ اس میں [کسی قسم کی] عزت کی پالیسی یا عسکری طاقت کا اظہار نہیں تھا، کہ یہ فائدہ پانے والی ریاستوں کو حق دیتا تھا کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں اپنے کریڈٹ کو استعمال کریں۔

ہم نے یورپی اتحاد کے حق میں پری پیگنڈے کی منظوری دی اور اس بات پر زور دیا کہ ہم ایسے اتحاد کو عالمی اتحاد کی جانب پہلا قدم سمجھیں گے۔ ٹریڈ یونین والا ہونے کے حیثیت میں، مجھے فروری 1949 میں European Movement کا صدر چن لیا گیا تھا، اور اس کے بعد کے موسم بہار میں، میرے ہاتھوں Westminster Economic Conference کا افتتاح ہوا، جس میں مندرجہ ذیل مشترکہ جذبات کا اظہار کیا گیا تھا:

”یہ بالکل عام ہے، منطقی ہے اور تاریخ کے جذبات کے عین مطابق ہے کہ منظم مزدور طبقے کا یورپ کی تعمیر میں عملی حصہ ہونا چاہیے۔ اس نے ہمیشہ اس بات کا یہ بائگ ڈائل اعلان کیا ہے کہ اس کی کبھی یہ خواہش نہیں رہی، یا نہیں رہ سکتی ہے کہ امن کے قیام کی مسلسل جدوجہد سے علاحدگی میں اس کی نجات ہو، اس لیے کہ ایسا کرنے میں رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں جنہیں بین الاقوامی واقعات [کی ہوائیں] بھوسے کے ڈبیر کی طرح اڑالے جاتیں۔“

یہ معاملہ ہے یورپ کے استحکام کا، اس کی علاحدگی کا نہیں۔ عوام کا وہ جتنا جس کے پاس قدرتی وسائل کی بے تحاشا دولت ہوتی ہے اور جس کی عقلی قوت صغیر ہستی پر سب سے زیادہ ہے، وہ بقیہ دنیا سے بالکل الگ

ہو جانے کی خواہش نہیں رکھتا: ”اس یورپ میں، ہم جس کی تعمیر کر رہے ہیں، دیواروں کے مقابلے میں دروازے اور کھڑکیاں زیادہ ہوں گی۔“

میں نے جولائی 1950 میں Social Conference of the European Movement کے بارے میں جاری ہونے والی اطلاعات کے تعارف میں اس کے بنیادی مقاصد سماجی انصاف اور بین الاقوامی امن کی اہمیت پر دوبارہ زور دیا تھا۔

”ہم یورپ کو یوریشیائی برعظیم (یورپ جمع ایشیا) کا محض ایک جزیرہ نہ بنانا چاہتے ہیں، جس میں ہزاروں برس سے عوام کے درمیان کے تنازعات سلجھانے کا طریقہ جنگیں ہی رہی ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ اپنی تمام تر بقلموئی کے باوجود یورپ ایک امن سے رہنے والی ایک متحد کمیونٹی بنے، جس میں تمام انسانی دکھوں اور خطرات کے خلاف ایک پرجوش اور مسلسل جدوجہد جاری رہے۔ ہم یورپ کو ایک بہت بڑی، بہتر متحدوں والی اور بہتر جھیاڑوں سے لیس گرمی [چھوٹا قلعہ] بنانے کی خواہش نہیں رکھتے۔“

ہم نے European Coal and Steel Community بنانے کے سلسلے میں Schuman Plan کی منظوری دی تھی۔ 9 مئی 1950، یا شاید 31 مئی کو، کیے جانے والے اعلان کے چند دن بعد ہی میں نے Ruhr Statute پر بات کرتے ہوئے G.I.S.L. Conference Journal میں لکھا تھا:

”اس اتحاد (Gombinat) کے محرکین یورپ کی صرف ترقی پذیر وحدت کو اپنا مقصد بنا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ وحدت خود ایک اختتامیہ نہیں ہو سکتی۔“

آخری اور لازمی ہدف، یعنی صرف جائز ہدف ہوگا مزدور کی بہبود اور اس کا پھیلاؤ، اجتماعی محنت سے تیار ہونے والی مصنوعات میں اس کا منصفانہ حصہ، یورپ کو ایک سماجی جمہوریت بنانا اور اس بات کو یقینی بنانا کہ ہر نسل، ہر زبان کے آدمی کو اس کا مطلوبہ امن مہیا ہو یہ ثابت کرتے ہوئے کہ جمہوریتیں پیداوار کی منطقی تنظیم، آزادی اور افراد کے وقار کو داؤ پر لگائے بغیر سماجی انصاف قائم کر سکتی ہیں۔

[اور قائم کیے جانے والے]۔۔۔ پول کو مسلسل تخلیق کے عمل کا صرف پہلا درجہ ہونا چاہیے۔ G.I.S.L. نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ترقیات پر کڑی نگاہ رکھے گا تا کہ وہ اس حالت میں ہو جہاں سے اسے موثر اثرات داری فراہم کر سکے۔“

ہماری سفارش ہے کہ خام مال کی ایک عالمی منڈی کی تنظیم کی جائے، اور اس سلسلے میں [ہم نے] یاد دلایا کہ ہم جمہوریت کے دفاع کے لیے کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں:

”ہم [آخر] کیا بچانے کی کوشش کر رہے ہیں؟ ہم کس شے کو تحفظ دینا چاہتے ہیں؟ شہری آزادی کو؛ بالخصوص، شہریوں کے حقوق کو کہ وہ اپنی ذاتی رائے رکھ سکیں اور اخلاقی، فلسفیانہ، سیاسی اور اقتصادی [اصولوں کی] درآمد اور انجمنیں بنانے کے حق وغیرہ کو بلا کسی روک ٹوک کے ظاہر بھی کر سکیں۔ مگر جمہوریت نہ تو ان حقوق کا منطقی احرام ہے اور نہ بن سکتی ہے۔ اسے، ہر آدمی کو ان سے لطف اٹھانے کے موثر مواقع

فراہم کرنے چاہئیں، اور اس قسم کے اخلاقی اور مادی حالات کے زیر اثر موقعے [فراہم] کرنا چاہئیں جو ان حقوق کے استعمال کی ہمت افزائی بھی کریں۔

وہ جسے مستقل طور پر اپنی معاشی مجبوریوں کی بنا پر اس میں پہلے سے شریک ہوا پڑے، ایک مستعد باشندہ نہیں ہو سکتا۔

میں نے اقتصادی کانفرنس میں اپنے ایک حالیہ خطاب میں کہا ہے کہ قوموں کی اخلاقی صحت میں اقتصادی انصاف اہم عناصر میں سے جوتا ہے۔ افراط زر کی پالیسیوں اور کم روزگاری میں کوئی اخلاقی اصول [کارفرما] نہیں ہوتا۔

G.I.S.L. نے مجھے ذمے داری سونپی ہے کہ میں اقوام متحدہ کی Lake Success میں منعقد ہونے والے جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ایک تجویز کا مسودہ پیش کروں۔ ان کے متن درج یہ ہیں: ”یہ جنرل اسمبلی شریک قوموں سے۔۔۔ سفارش کرتی ہے کہ وہ سب سے پہلے خام مال کی تقسیم اور [ان کی] قیمتوں کے استحکام کے لیے بین الاقوامی قوانین بنانے پر کام کریں، اور یہ بھی کہ اس سلسلے میں، وہ ایک مشترکہ stabilization fund قائم کریں اور اس میں اپنا چندہ بھی جمع کرائیں۔“

ہم نے اجتماعی تحفظ اور عام ترک اسلحہ جات کے دو ناقابلِ علاج اصولوں کا مسلسل دفاع کیا ہے، جن کے ذریعے مسکری قوت اور ہر قسم کے جنگی ہتھیاروں کی بین الاقوامی تجارت کی جاسکے۔

میلان (Milan) میں 1951 میں منعقد ہونے والی G.I.S.L. Congress میں بین الاقوامی بحران کی صورت میں ٹریڈ یونین تحریک کے کردار پر دی جانے والی روداد میں ہمارے نظریے میں ملاوٹ کی کوشش کی گئی تھی۔

اس روداد میں ہمارے کچھ جامد مقاصد ہیں: سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ انسانیت کو تیسری عالمی جنگ کی بھیانک ابتلا سے بچایا جائے۔

اس میں ہم نے اپنے کچھ اصول بیان کیے ہیں: اقوام متحدہ کے ڈھانچے اور سرپرستی میں عمل کے ذریعے کمیونٹی اور تعاون کے جذبات ابھارے جائیں اور اقتصادی نظم و ضبط کی طرف واپسی ہو۔

آخر میں، ہم نے کچھ طریقے وضع کیے ہیں، ہماری کارکردگی جن کو اختیار کرے گی: خام مال کی تقسیم اور بنیادی مصنوعات کی قیمتوں کے تعین کی تنظیم، رہائش کے مسائل کا حل، قومی اور بین الاقوامی cartel کی پیداوار پر بندش کے طریقے، اور سب سے بڑھ کر دنیا کے ہر ملک میں منظم مزدوروں کی انتظامیہ اور اقتصادی معاملات میں شراکت۔ چوں کہ آزاد ٹریڈ یونین کی جانب سے یہ کامریس امن کی خواہشات کا اظہار ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میں ٹریڈ یونین والوں کی طرف سے پچاس برسوں کے اس معاملے کا بہترین نتیجہ پیش کال سکتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ میں رپورٹ کی آخری سطر تک سب کچھ من و عن بیان کر دوں۔

آزاد ٹریڈ یونین کو بین الاقوامی بحران سے نمٹنے اور حقیقی امن کے ظہور کے لیے بلایا جاتا ہے۔ ضرورت

کے اعتبار سے اس کام کی وسعت بہت بڑی ہے۔ قیمت سے قطع نظر ہماری تحریک اس کام کے لیے خود کو وقف کرنے پر تیار ہے۔ میں اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ اقوام متحدہ کی موجودہ جنرل اسمبلی کی تیسری کمیٹی میں شامل حکومت کے نمائندوں کی حالیہ مداخلتوں سے اس کی بہت ہمت افزائی ہوئی ہے۔ کیوبا کے مندوب مسٹر لہ پاسو (Ichaso) نے واضح کیا ہے کہ کچھ سرکاری حلقوں نے اس خیال کو اپنایا ہے، ہم جس کو برسوں سے پھیلاتے رہے ہیں اور ہم جن کو بیسائی ورسائی (Treaty of Versailles) میں شامل کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں؛ کہ اقتصادی بے ترتیبی اور بد بختی جنگ کی ابتدا کرنے کی یقینی وجوہ میں سے ہوئی ہیں۔ نارویائی پاریمان کی کمیٹی کا یہ فیصلہ جس نے مجھے 1951 کا انعام دے کر یونین والوں کی جنگ مخالفانہ کوششوں میں ثابت قدمی اور اہمیت کے اعتراف کا اعلان کر دیا ہے، اور ان کا یہ قدم ان خیالات کو مستحکم کرنے اور اس کے حلقہ اثر کو وسیع کرنے میں بہت معاون ہوگا۔ یہ ان لوگوں کی مشترکہ خواہش کو بھی مستحکم کرتا ہے جنہوں نے ان خیالات کی پرورش کی ہے اور ان کو لوگوں کے غور و خوض کے لیے پیش کیا ہے، اور ان لوگوں کے لیے بھی جن کو انہوں نے قائل کر لیا ہے کہ ایک ایسی سوسائٹی کی تعمیر کے لیے ان تھک کام کیا جائے جو انصافی اور شہد سے پاک ہو۔

افسوس کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان اور ان کی تہذیبیں فانی ہیں۔ ہم ان کی فنا کی ذمہ داری کو غیر جانب دار فطرت پر چھوڑ دینا چاہتے ہیں اور بالآخر بنی نوع انسان کو قاتیل کے جنم کے احساں ندامت سے آنا دکر دینا چاہتے ہیں۔



رالف بنش

اعلانِ تجلیل

ڈاکٹر رالف بنش چھالیس برس قبل ریاست ہائے متحدہ کے شہر ڈیٹروئٹ (Detroit) میں پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح، آج بھی وہ نوجوان ہیں اور دراصل جناب کارل فان آزیٹسکی (Carl von Ossietzky) کی طرح سب سے کم عمر فرد ہیں جسے نوبل امن انعام دیا گیا ہے۔ لہذا، جب کہ مشتر انعام یافتگان اپنی عمر کا بہترین حصہ گزار چکے ہوتے ہیں، ڈاکٹر بنش کے سامنے اب بھی ان کی عمر کا ایک طویل عرصہ کام کے لیے موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان برسوں کی طرف بھی نظر کر سکتے ہیں جو انہوں نے اپنے ان تھک کارناموں میں صرف کیے ہیں، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں، اپنے ساتھیوں کے ساتھ امن، ہم آہنگی اور باہمی اتفاق سے رہنے کی انسانی صلاحیتوں کو بڑھانے میں۔

ڈاکٹر بنش کی زندگی کا نقشہ بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ بہت سے امریکی نوجوانوں کا ہوا کرتا ہے، یعنی مشکل حالات میں پیدائش اور نشوونما۔ انھیں بھی ابتدائے عمر میں کام کرنا پڑا تھا، سترہ برس کی عمر میں اخبار بیچنا، بارہ برس کی عمر میں ٹیکری میں دن بھر کام کرنا، جو کبھی کبھی بارہ بجے رات تک جاری رہتا تھا۔ مگر وہ عرصہ تھا جس میں ان کے والدین انتقال کر گئے تھے اور ان کی عمر رسیدہ مافی جس کا نام ”نانا“ تھا، انھیں اور دو بچے کو اپنے ساتھ لاس انجلس لے گئی تھی۔ یہاں رالف کا لڑکپن اسکول اور کام میں تقسیم ہو گیا تھا، اس لیے کہ انھیں زندہ رہنے کے لیے کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ مگر جیسا کہ انھوں نے بتایا ہے، یہ کیفیت صرف رالف بنش کے ساتھ ہی نہیں تھی۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی کے شرقی صدر طلبہ کو بھی کچھ کرنا پڑتا تھا۔ لڑکپن کی ایسی زندگی مشکل ہو سکتی ہے، مگر یہ انسان کے کردار میں صلاحیت اور اس میں مستقبل کے مسائل کا سامنا کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔

1927 میں بنش نے کیلی فورنیا یونیورسٹی کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی، اور اسی برس ہارورڈ

(Harvard) میں داخل ہو گئے جہاں سے 1934 میں انھوں نے میا سی سائنس میں ڈاکٹریٹ حاصل کر لی۔
1928 سے 1938 تک وہ انسٹرکٹر رہے، اور 1938 سے 1941 تک واشنگٹن میں واقع ہارورڈ یونیورسٹی میں
پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔

ان ہی برسوں میں بنش نے نوآبادیاتی اور نسلی مسائل کا مطالعہ کیا تھا۔ 1936 میں ان کو Social
Science Research Council کی جانب سے، جنوبی افریقہ میں غیر یورپی لوگوں کی کیفیات اور نوآبادیاتی
پالیسی کا مطالعہ کرنے کے لیے وٹھنے پر بھیج دیا گیا تھا۔ افریقہ سے واپسی سے قبل، جہاں ان کا قیام کیپ ٹاؤن
میں رہا تھا، اور بعد میں بھی وہ افریقی قبائل کے علاقوں میں بھی گئے تھے جہاں انھوں نے لندن میں اپنے
اگلے کام کی تیاری کی تھی۔

امریکا کے نیکرو باشندوں کے مطالعے میں وہ گنار میرڈال (Gunnar Myrdal) کے قریب ترین ساتھی
تھے۔ اور وہ جلد ہی امریکی انتظامیہ کی نظروں میں آ گئے، جس نے 1941 میں انھیں نوآبادیاتی معاملات کے
ماہر کے طور پر Office of Strategic Services میں تعینات کر دیا۔ بعد میں 1944 میں انھیں اسٹینٹ
ڈپارٹمنٹ میں نوآبادیاتی معاملات میں علاقائی ماہر بنا دیا، اور پھر 1945 میں وہ اس ادارے کے سربراہ
بنادے گئے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے، اس وقت تک وہ پہلے نیکرو فرد تھے جو امریکی انتظامیہ میں
اتنے بڑے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ کئی بار ان کو بین الاقوامی کانفرنسوں میں سرکاری نمائندے کے طور پر بھیجا
جاتا رہا ہے: 1944 میں ڈیمبارٹن اوکس میں، 1945 میں بین الاقوامی لیبر کانفرنس میں، اور اسی برس بران
فرانسسکو میں منعقد ہونے والی اقوام متحدہ کی دستور ساز اسمبلی میں۔ 1945 اور 1946 میں لندن میں ہونے
والی اقوام متحدہ کی کانفرنسوں میں وہ ریاست ہائے متحدہ کے وفد کے ارکان میں شامل تھے، ساتھ ہی ویرس
میں منعقد ہونے والی ILO کی کانفرنس میں بھی۔ 1946 میں انھیں اقوام متحدہ کے دفاتر میں Trusteeship
Department کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا تھا۔

یہ تھیں ان کے قابل ذکر پیشہ ورانہ دور کی جھلکیں۔ مگر صرف ان [جھلکیوں] سے خود اس شخص کے
اندرون کی پوری پرکھ نہیں ہوتی۔

بنش کے لیے، جس طرح کہ ہم لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا رہا ہے، شروع کے چند برس تشکیلی نوعیت کے
تھے۔ اپنے بچپن پر نظر ڈالیں تو بنش کو شاید ہی ایسا کوئی عرصہ ملے گا جب ان کے خاندان کے حالات از حد
افلاس کے علاوہ رہے ہوں گے۔ مگر وہ افلاس نہیں تھا جس نے اس شخص کو وہ کچھ بنا دیا جو آج ہمارے سامنے
ہے: اس لیے کہ اس افلاس کے درمیان ایک خداوند صلاحیتوں والی عورت، اس کی مافی تھی جس کا نام 'نانا' تھا۔
بنش ہمیں اپنے بچپن کے بارے میں بتاتے ہیں، جب ان کی مافی اور اس کی چابلق اولاد اپنے اہل خاندان
کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہا کرتے تھے۔ یہ ایک باہم تھا ہولنا درجہ عمری خاندان تھا، جس میں مافی
غالب شخصیت تھی۔ ایک عورت جو غلامی میں پیدا ہوئی تھی، حقیقی معنوں میں ایک غیر معمولی شخصیت رہی ہوگی،

اور بلاشبہ اس نے نوجوان رالف کے کردار کو ڈھالنے میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔
 بنش کہتے ہیں ”مگر زندگی لوگ گیت نہیں بولا کرتی۔ میں ایک روشن خیال شہر میں رہ کر بھی ٹیڑھ بنا
 سیکھ رہا تھا۔“

آگے چل کر وہ کہتے ہیں، ”مگر ایسے تجربات سے میں دل برداشتہ نہیں ہوتا تھا، اس لیے کرنا نے مجھ کو
 بغیر بغض کے ان سے نمٹنے کی تربیت دی تھی۔ اس نے ہم سب کو سکھایا تھا اور جانا، اپنے حق کے لیے، ذات کی
 قبولیت سے انکار کر دینا، مگر کسی سے عداوت نہ رکھنا، کہ یہ ہماری شخصیتوں میں بگاڑ پیدا کر دیتی ہے۔ اس فکر
 مذہبی عورت نے ہم لوگوں میں ایسا ذاتی احساسِ تفاخر پیدا کر دیا تھا جو ہر قسم کے جھگڑے برداشت کر لیتا تھا،
 مگر اس نے ہمیں مفاہمت اور برداشت بھی سکھائی تھیں۔“

یہ ایک قابلِ قدر تر کہ تھا جو مانا نے بنش کو ورثے میں دیا تھا، جو پوری زندگی ان کے کام آنے والا تھا۔
 بدلے میں، انھوں نے اس میراث کو اپنی اولاد کو دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

”وہ فلسفہ جو مانا نے ہمیں لڑکپن میں سکھایا تھا، میں نے اپنے بچوں تک پہنچا دیا ہے۔۔۔ وہ کہا کرتی
 تھیں کہ برادری کی بنیاد پر سلوک ہر انسان کا پیدا ہونے کا حق ہے۔ کبھی کسی کو اور طرح کے سلوک کی اجازت نہ
 دینا۔ بھلا کون بہتر امر کی ہے، امر کی وراثت کا بہتر پاس دار، یا وہ جو ان بنیادی اصولوں کے لیے احرام
 طلب کرتا ہے، جس پر ہمارا سماج انحصار کرتا ہے؟ مانا کہتی تھی کہ ہمارے راستے میں بڑی اور بہت رکاوٹیں
 آئیں گی، اور زندگی اسی طرح چلتی ہے۔ مگر رکاوٹوں کے مقابل صرف وہی ہتھیار ڈالتے ہیں جو کمزور ہوتے
 ہیں۔ راست باز رہو اور اپنے آپ سے اور ہمیشہ دنیا سے صاف کوئی کرو۔ جس کو تم صحیح سمجھتے ہو اس پر کبھی
 مصالحت نہ کرو۔ خود کبھی لڑائی مول نہ لو، مگر جب تمہارے اصول داؤ پر لگ جائیں تو فرار اختیار نہ کرو۔ دنیا
 میں مراؤ بچا کر کے چلو، اور اس کو ہمیشہ اوجھا ہی رکھو۔“

دنیا میں مراؤ بچا کر کے داخل ہو، حق کے لیے لڑو، مگر دوسروں سے مفاہمت اور برداشت سے پیش آؤ۔
 ایک نوجوان آدمی کے لیے کتنے قیمتی ہوتے ہیں ایسے مشورے جب وہ بچپن کے گھر کو خیر باد کہہ رہا ہو۔ رالف
 بنش کے دماغ میں یہ الفاظ کندہ ہو گئے تھے اور انھوں نے مستقبل میں آنے والے چیلنجوں کے لیے انھیں
 استقامت دی تھی۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، رالف بنش نے اپنے پیشروانہ کام کی شروعات ہی میں نسلی اور نوآبادیاتی
 مسائل کے مطالعے سے شروع کی تھی۔ A World View of Race نامی کتاب میں، جو 1936 میں شائع
 ہوئی تھی، انھوں نے نسلی معاملات میں پھیلائی گئی تمام غیر مائٹسی فضولیات کا پول کھول دیا تھا، جنھوں نے
 مدبروں اور غیر ممتاز سیاست دانوں کے ہاتھوں میں ایک آسان مگر خطرناک ہتھیار دے دیا تھا، جیسا کہ ہم
 نے جرمنی میں دیکھا ہے۔ انھوں نے فرانسیسی اور برطانوی نوآبادیاتی پالیسیوں کا تجزیہ بھی کیا ہے، جنھوں
 نے، خواہ وہ کتنے ہی مختلف ہی کیوں نہ رہے ہوں، مقامی لوگوں کو اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کی اجازت نہیں دی

ہے۔ وہ نسلی مسائل کو اٹل زرا اور بے زر لوگوں کے درمیان جنگ کی بڑی وجوہ کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس کو واقعی بہت زیادہ آسان بنا دینے کی کوشش کی جاسکتی ہے، اور بعد میں لکھی جانے والی کتابوں میں وہ انسان اور سوسائٹی کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کو وسعت دیتے نظر آتے ہیں، مگر ہم ان کو بار بار اس رائے کی طرف لوٹا دیکھتے ہیں کہ ترقی یافتہ اور پس ماندہ ممالک کے عوام کے معیار زندگی میں عدم مساوات ہی امن کے لیے سب سے بڑا امکانی خطرہ ہوتی ہے۔

جدید دنیا میں انسانی تعلقات کے عنوان سے 1947 میں لکھے گئے اپنے ایک مضمون میں انھوں نے ہمارے زمانے کے مسائل کا خاکہ پیش کیا ہے۔ وہ ایک آزاد فرد کے گروہ کے ایک رکن سے تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ”میری رائے میں انسان کی فطرت میں ایسا کچھ نہیں ہے جو اس کو اپنے ماتحتی انسانوں کے ساتھ امن سے رہنے کو ناممکن بناتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر گروہ اور سوسائٹی کے لئے ہوئے دباؤ میں موقع فراہم کریں تو ہم میں سے بیشتر لوگ خاصے تربیت پذیر ہوں گے۔ مگر لوگوں کے درمیان رشتے کبھی افراد کے حکم سے نہیں بنتے، اس لیے کہ ایک فرد بڑی حد تک پیداوار ہوتا ہے اس گروہ کی جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے، اور وہ تمام مسائل میں گروہ کا محکوم ہوتا ہے۔ جہوم کا ایک فرد اپنے گروہ کا آئینہ ہوتا ہے۔ لہذا، گروہ ہوں اور ملکوں کے درمیان کے رشتے ہمارے زمانے کے مسائل میں سب سے مشکل مسئلہ ہوتے ہیں۔“

وہ مزید کہتے ہیں کہ ”مختلف قوموں کے لوگوں کے درمیان بھائی چارہ اور اتفاق اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کو متحد کرنے کے لیے کوئی مشترک ہدف ہو اور جس کا جلد حاصل کیا جانا ضروری ہو۔“ بنش خود بھی انسان پر مستحکم یقین رکھتے ہیں: ”میں پوری طرح قائل ہوں کہ اگر صرف موقع دیا جائے تو ہر جگہ کا انسان ان ۲ درجوں کو قبول کرنے پر تیار ہوگا ہے جو انسانوں کے درمیان بھائی چارے اور اتفاق میں رچے بسے ہوتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ یہ ہو لوگوں کو یقین ہونا چاہیے کہ وہ ناپائیدار اقتصادی حالات کا نشانہ نہیں بنیں گے، انھیں اپنی بقا کے لیے، بہ جبر، نقصان دہ اور سنگ دل مسابقت پر مجبور نہ کیا جائے، اور ان کو مستقبل میں ہونے والی جنگ کے ذریعے بربادی کے مستقل خطرے سے آزاد رکھا جائے۔ مگر یہ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ انسان کم رتبہ اور ٹھک نظر لوگوں کے اثرات سے محفوظ رکھے ہوئے اپنے آدرشوں کی آزادانہ تشکیل کر سکے جو مختلف ممالک میں ان آدرشوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں مگر آرام طلب، مطمئن اور بے خبر لوگ کبھی خود کو محفوظ یا آزاد محسوس نہیں کر سکتے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ: یہ تو عقیدہ ہے، یقین ہے۔ مگر زندگی کے کام بغیر عقیدے کے کون کر سکتا ہے؟ بنش میں یہ عقیدہ پورا ہو جاتا ہے، آدمیوں کے بارے میں عمیق ادراک اور ان کے حالات زندگی سے، اور انھوں نے دونوں کو مصالحت کرانے والے کی صورت میں فلسطین میں پیش کیا ہے۔

1948 تک بنش کی سرگرمیاں سائنسی اور انتظامی کام تک محدود رہی تھیں۔ پھر بھی، جب میں مئی

1948 کو فلک برناداٹ (Folke Bernadotte) کو اقوام متحدہ نے فلسطین میں ثالثی کی حیثیت میں تعینات

کیا تو بنش ان کے قریب ترین مددگار بن گئے تھے۔ ان دو افراد نے اسی برس سترہ ستمبر کو ہما ڈاٹ کے میاں کی قتل ہو جانے تک اکٹھے کام کیا تھا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ نے بنش کو ہما ڈاٹ کا جانشین بنا دیا اور انہوں نے اگست 1948 تک فلسطین میں ثالثی کے فرائض انجام دیے تھے۔

دو افراد جو اس مشترکہ کام کے لیے اکٹھے ہوئے تھے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ ایک طرف فوک ہما ڈاٹ تھے سویڈن کے شاہ آسکر دوم (King Oscar II) کے پوتے اور سویڈن کے موجودہ شاہ کے بچپن، شاہی خاندان کی روایتوں میں شریار اور دوسری جانب بنش، جن کی دادی کی ولادت غازی میں ہوئی تھا، جن کی انشورنہ عسرت میں ہوئی تھی اور جو مکمل طور پر ایک خود ساختہ آدمی تھے۔

فوک ہما ڈاٹ کو فلسطین کے تنازعے کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ "حالات کے بارے میں میرا علم بالکل سطحی تھا۔" انہوں نے جنگ کے آخری حصے سے پہلے، جب وہ ڈنمارک اور ناروے کے قیدیوں کو جرمنی کے قید خانوں اور عقوبت خانوں سے رہائی دلانے میں کامیاب ہوئے تھے اس وقت تک بین الاقوامی مسائل پر کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اقوام متحدہ کے Trusteeship کے شعبے کے سربراہ بنش کو بین الاقوامی تنازعات کے پیدا کیے ہوئے مسائل کی شناخت اور سمجھ بوجھ کی تعلیم اور تربیت کا تجربہ تھا۔ پھر بھی، دونوں میں ایک بات مشترک تھی: وہ دونوں اپنے کام کے مقصد پر یقین رکھتے تھے۔ بنش نے ایک بار کہا تھا کہ ثالثی کرنے والوں میں کچھ خصوصیات ہونی چاہئیں: "ان کا جھکاؤ ہونا چاہیے جنگ کے خلاف اور امن کی موافقت میں۔ ان میں ایسا جھکاؤ ہونا چاہیے جو انہیں اپنے سرائیکی انسانوں کی ضروری اچھائیوں کی طرف راغب کرے اور اس حقیقت کی طرف کہ انسانی تعلقات کا کوئی بھی مسئلہ قابل حل نہیں ہوتا۔ ان کا جھکاؤ شہادت، عدم برداشت، نفرت، مذہبی اور نسلی تعصب کے خلاف ہونا چاہیے۔"

یہ دونوں خصوصیات ان میں موجود تھیں، اور درحقیقت، ان کو فلسطین میں درپیش مشکل کام کی تکمیل کے لیے ان خصوصیات کی زیادہ ضرورت تھی۔ فلسطین کے مسئلے نے اقوام متحدہ کو ایک عرصے سے مصروف رکھا تھا۔ اس تنازعے کی تفصیل میں جانے کے لیے بہت وقت درکار ہوگا، جس کی جڑیں پہلی عالمی جنگ کے اختتام تک پھیلی ہوئی تھیں۔ 1948 میں حالات اس مرحلے پر پہنچ گئے تھے کہ اقوام متحدہ میں اس مسئلے کے حل کے لیے ایک تجویز پیش کی جانے والی تھی جس میں ایک یہودی ریاست کا قیام بھی شامل تھا۔ مگر اس تجویز کی شد و مد سے مخالفت کی گئی، اور 1948 کا پورا برس، کھلی جنگ تو نہیں مگر مسلسل جھڑپوں میں گزر گیا تھا۔

15 مئی 1948 کو جب فلسطین پر برطانیہ کی حکمرانی کا اختتام ہوا، عربوں اور یہودیوں میں باقاعدہ کھلی جنگ ہو رہی تھی۔ فلسطین بھیجا جانے والا عارضی صلح کا وفد کوئی راستہ نکالنے میں ناکام ہو گیا، اور ان ہی حالات میں جس میں اقوام متحدہ نے ہما ڈاٹ کو صلح کرنے والے کی حیثیت میں تعینات کیا تا کہ عارضی جنگ بندی ہو سکے۔

ہما ڈاٹ اور بنش اٹھائیس مئی کو فلسطین پہنچے اور گیارہ جون سے نو جولائی تک، چار ہفتے کے لیے،

عارضی جنگ بندی کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ آگے کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔ مگر گیارہ جولائی کو پھر لڑائی چھڑ گئی، اور مسئلہ تاریخ کو سلامتی کاؤنسل نے جنگ بندی کا حکم جاری کر دیا۔ یہ حکم اس وقت جاری ہوا جب برٹانیا نے ذاتی طور پر اس مسئلے کو سلامتی کاؤنسل میں اٹھایا تھا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ سلامتی کاؤنسل نے اس نوعیت کا کوئی حکم جاری کیا تھا۔

پھر، سترہ ستمبر کو برٹانیا کو قتل کر دیا گیا، اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، سلامتی کاؤنسل نے ان کی جگہ بنش کو ثالث بنا دیا۔

لہذا میں عارضی جنگ بندی کا حصول مشکل تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا فوری انتظام برٹانیا اور بنش کے ذاتی تعلقات کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ بنش کہتے ہیں کہ ”یہ عارضی جنگ بندی ایک فرد واحد کا کام نہ تھا۔ کاؤنٹ برٹانیا نہایت مہذب اور کبھی نہ جھکنے والے ذاتی قوتوں کے مالک انسان تھے۔ دل سے وہ سچے بین الاقوامی تھے اور امن کے مقاصد کے لیے وقف تھے۔ وہ نڈر آدمی تھے۔ بہت ہی کم عمر سے میں انہوں نے عرب اور یہودیوں، دونوں کا احترام اور اعتماد حاصل کر لیا تھا۔“

اٹھارہ جولائی کو شروع ہونے والی عارضی جنگ بندی اکتوبر کے درمیان پھر توڑ دی گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب بنش نے سلامتی کاؤنسل کو تجویز پیش کی تھی کہ اس کو جنگ بندی کا حکم صادر کرنا چاہیے جس میں مسئلے کا آخری حل نکالنے کے لیے فلسطین اور عرب ریاستوں کے درمیان جنگ بند کرنے کے معاہدے کا حکم بھی ہو۔ سلامتی کاؤنسل نے ان کی پیش کردہ تجویز مسئلہ نومبر کو منظور کر لی تھی۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، تجویز بہت بے باک تھی، اس لیے کہ عارضی صلح [مجلس] جنگ بندی سے زیادہ بڑی چیز ہوتی ہے۔ عارضی صلح دراصل امن کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ مگر ہوا یوں کہ بنش کو حالات کا صحیح ادراک ہو گیا تھا۔ لہذا، عرب ریاستوں اور فلسطین کے درمیان بات چیت شروع ہوئی، مذاکرات گیارہ مہینے تک چلتے رہے، جو ثالثی کرنے والے پر سب سے بڑا ابوجہ بن گئے تھے۔ 1949 میں انسانی حقوق کے سلسلے میں دیے جانے والے Golgate Lectures میں بنش نے خود ان مشکلات کو بیان کیا ہے: ”دونوں جانب شبہات، جب کہ دونوں ایک دوسرے سے ملاقات سے گریزاں۔ عرب یہودیوں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھنے پر راضی نہ تھے لہذا ان کو فریقین سے الگ الگ مذاکرات کرنے پڑتے تھے اور مسلسل باہمی بے اعتباری سے نکلنے کا راستہ تلاش کرتے رہتا تھا۔ دھیان رہے کہ یہ دو فریقوں کے درمیان ثالثی نہیں تھی، بلکہ فلسطین ایک طرف اور سات عرب ریاستیں دوسری طرف تھیں، اور ساتوں ریاستوں میں سے ہر ایک سے الگ الگ معاہدے کرنے تھے۔“

بے حد صبر کے ساتھ، بالآخر بنش تمام فریقوں کو عارضی صلح پر رضامند کرنے پر تیار ہو گئے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ سب کیسے کر لیا، تو ان کا جواب تھا:

”امریکا کے ہر نیگرو کی طرح مجھے بھی خوب کٹے کھانے پڑے ہیں۔ مجھے بہت سے مایوسانہ تجربات

سے بھی گزرتا پڑا ہے۔ مجبوراً، میں تعصب کے معاملے میں بہت حساس ہو گیا ہوں۔ اس کے برعکس، اپنے ابتدائی برسوں ہی سے مجھے برداشت کی خوبیاں کا سبق پڑھایا گیا تھا، حق کے لیے لڑنا۔ جنگجوئی اور نفی کے بغیر۔ اور سماجی سائنس دان کی حیثیت سے میں نے جتنا دماغ رکھنے کا گریکھ لیا ہے، انسانی حساسیت سے معاملہ ہو تو مقصد کو نظر میں رکھنا چاہیے، جو ہمیشہ اصول ثابت ہوا ہے۔ جو فلسطین کے مذاکرات کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی اصول تھا۔ اس میں کامیابی مکمل مقصدیت پر قائم رہنے سے ہی حاصل ہوئی ہے۔

کبھی نہ ختم ہونے والے بحثوں کے مذاکرات کے دوران کبھی نہ ختم ہونے والے احساسِ خوشِ امید کی نے مجھے بہت مہارا دیا ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ جس طرح بھی ہو ہمیں کامیاب ہونا ہے۔ درحقیقت میں ایک لاعلاج خوشِ امید انسان ہوں۔“

ان الفاظ میں وہ اپنے بارے میں کہتے ہیں: بچپن کی میراث، زندگی کے آخری حصے میں حاصل ہونے والا علم اور تجربہ، ان دونوں عناصر نے شخصیت کی تکمیل کی، اس آدمی کی جو یقین سے جتھیا روڈ لوائے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نتیجے میں اقوام متحدہ کی فتح ہوئی، مگر جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے، یہ ایک فرد واحد کی کوشش تھی جس نے فتح کو ممکن بنایا۔

تقریباً ایک برس قبل ہی رالف بنش نے ثالثی کا اپنا کام مکمل کیا ہے۔ آج ہمیں پہلے سے بڑے چیلنج کا سامنا ہے۔ مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، مگر ایسے ہی وقتوں میں ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے، بلکہ جنگ کے خلاف جنگ میں اپنی تمام تر طاقت اور عقیدے کا استعمال کرنا چاہیے۔

رالف بنش، آپ نے خود کہا ہے کہ آپ ایسے خوشِ امید انسان ہیں جس کا علاج ممکن نہیں۔ آپ نے [یہ بھی] کہا تھا کہ آپ کو یقین ہے کہ فلسطین میں ثالثی کامیاب ہو کر رہے گی۔ آپ کو اب بھی ایک طویل عرصے کے کام کا سامنا ہے۔ آپ امن کے آدرشوں کو فتح دلانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، وہ بنیاد جس پر ہمیں بنی نوع انسان کا مستقبل تعمیر کرنا ہوگا۔

صدر نشین مارویائی نوبیل کمیٹی Gunnar Jahn کی زبانی

خطبہ:

اپنے زمانے کے امن کے بارے میں کچھ اندیشے

انسانی تاریخ کے اس وحشت ناک ترین عرصے میں امن کا موضوع ہے جو سب سے زیادہ تمام اہل عقل اور خیر خواہ لوگوں کی توجہ حاصل کرتا ہے۔

مزید یہ کہ اس مخصوص موقع پر، جب نوبیل فاؤنڈیشن کے قیام کو پچاس برس ہو رہے ہیں، امن کے

بارے میں بات کرنا ہی سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کوئی اور موضوع میرے اپنے دل سے اتنا قریب نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں اقوام متحدہ کے بین الاقوامی دفتر کے ایک رکن کی حیثیت میں کام کر رہا ہوں۔

ان دیگر کئی حالات میں۔ جو سخت امتحان ہیں نیک نیتی کا، یہداشت کا اور امن سے محبت کرنے والے ہر شخص کے اخلاق کا۔ صدقہ دل سے یا اعتماد سے امن کے لیے بات کرنا آسان کام نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا بھر کے مدبرین بلند و بالا اور مہذب آدمیوں پر بات کرتے ہوئے، امن اور آزادی کو خوش گنتار جملوں کی بارش سے خراج تحسین پیش کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہی لوگ خوف ناک جنگ کے مندرجاتے خطرات پر بھی بات کرتے ہیں، ہمیشہ یہ حقیقت ہوتی جنگ کی تیاریوں پر بھی، جب کہ مذاکات ہے کہ بہت مارے علاقوں میں پھیلنا، یا انھیں خطرے میں ڈالنا جاتا ہے۔

ہمارے زمانے میں مدبرین کے استعمال کیے ہوئے الفاظ کے اب کے کوئی مشترک معنی نہیں رہ گئے ہیں، یا شاید پہلے کبھی تھے بھی نہیں۔ آزادی، جمہوریت، انسانی حقوق، بین الاقوامی ضابطہ اخلاق بلکہ امن کے بھی، مختلف لوگوں کے لیے، مختلف معنی ہوتے ہیں۔ نشر و اشاعت کی روانی میں بہائے جانے والے الفاظ۔ جو خود بھی جنگ کے آلے ہو جاتے ہیں۔ عام آدمی کو گمراہ اور بے آبرو کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ غلامی کو پر شوکت بنانے کے لیے جمہوریت کی بے حرمتی کی جاتی ہے؛ آزادی اور مساوات کچھ لوگوں کے لیے تو اچھے، مگر نام نہاد ”جمہوری“ سماج کے ذریعے کچھ لوگوں کے لیے بڑے بتا دیے جاتے ہیں؛ ”آزاد“ سماجوں میں، نام نہاد انفرادی انسانی حقوق بڑی طرح سلب کیے جاتے ہیں؛ ”رہائی“ کے لہادے میں سخت گیر مہمات شروع کی جاتی ہیں۔ اس اثرش رو اور سنگدل مفروضے پر کہ سچائی وہی کچھ ہوتی ہے، نشر و اشاعت جس پر یقین کرنے پر عوام الناس کو راغب کر دے؛ سچائی اور ضابطہ اخلاق کو نشر و اشاعت کے طوفان سے تہ و بالا کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سچائی اور ضابطہ اخلاق جنگ اور نا انصافیوں کے خلاف دفاع کے طور پر بے حد کمزور ہو جاتے ہیں۔ کتنی کبریٰ بصیرت سے وولٹیر (Voltaire) نے، جنگ سے بے پناہ نفرت کرتے ہوئے اعلان کیا تھا: ”جنگ [دنیا کا] سب سے بڑا جرم ہے؛ اس کے باوجود ایسا کوئی بھی حملہ آور نہیں ملتا جس نے اپنے جرم کو انصاف کے بہانے میں رنگ نہ دیا ہو۔“

عام آدمی کے لیے دنیا کے حالات پریشان کن ہیں۔ تمام قومیں اور عوام دھوکے کرتے ہیں کہ وہ امن کے طرف دار ہیں۔ مگر امن پہلے کبھی مسلسل اچھے خطرے میں نہیں رہا ہے، جیسا کہ ماضی قریب میں ہوا رہا ہے۔ آج کی دنیا میں ایسی قومیں نہیں ہیں جو جنگی تیاریوں کے دباؤ کے پیش نظر Lebensraum [ملک و قوم کی اقتصادی بحالی اور خوش حالی کے لیے مانیسیوں کے نزدیک وسعت مکانی کی ضرورت کی اصطلاح] پر مسلسل اصرار کر رہی ہوں۔ اس کے باوجود جنگ کے منحوس سرمایے لہرا رہے ہیں۔ تاریخ انسانی میں کبھی اس سے قبل اتنے لوگوں کو آزادی کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود انسانی آزادی بذات خود ایک فیصلہ کن مسئلہ ہے اور

بڑے پیمانے پر خطرے میں ہے، بلکہ کچھ لوگ تو اس کو حاصل کرنے کے بعد گنوا بھی چکے ہیں۔
 ہر جگہ کے عوام، سیدھے سادے اور بغیر کسی رنگ کے خالص امن و آزادی کے تمنا کرتے ہیں؛ یعنی مسلح تنازعات اور قتل و غارتگری سے میرا انسانی حقوق ان کا ہدف ہیں۔ دنیا بھر کے، صرف ایک ہی نسل کے لوگ، دو تہاہ کن جنگوں کی شدید افیتیں جھیل چکے ہیں؛ اب وہ جنگوں سے اکتا چکے ہیں۔ اس میں کسے شبہ ہو سکتا ہے کہ ہمیشہ کے امن پسند، مگر بلا جواز نامی جارحیت کے زخمی۔ ماروے کے عوام امن کے خواہاں ہیں؟ کون شبہ کر سکتا ہے کہ یورپ کے تمام عوام۔ جن کے قصبے اور شہر، جن کے پڑ سکون سبزہ زار اور دیہات کو بے رحمی سے تاراج کر دیا گیا ہے؛ جن کے باپ اور بھائی، مائیں اور بہنیں، اہم نامک تعداد میں قتل یا معذور کر دیے گئے ہیں امن چاہتے ہیں؟ کون سنجیدگی سے شبہ کر سکتا ہے کہ مغربی نصف کرۂ ارض کے عوام دنیا کو برصغیر اور قلم سے بچانے کی مشترکہ کوشش میں دو جنگوں کا سامنا کر چکے ہیں، اور چارو ناچار انسانی جانوں اور مادی وسائل کے نقصان کے باوجود۔ امن کے طالب ہیں؟ کون شبہ کر سکتا ہے کہ عربیہ دراز کے لڑکھی ایشیائی اور افریقی عوام امن چاہتے ہیں؟ کیا ایسا بھی کوئی کورچم ہو سکتا ہے جس کو یہ احساس نہیں کہ جدید جنگ میں فتح محض مہربانی ہوگی کہ جنگ کا حاصل صرف بد بختی، تباہی اور رُسوائی ہوگا؟

اگر پھر جنگ ہوتی ہے تو، ایک بار پھر، چارو ناچار، دنیا بھر کے عوام کو مقابلے پر آنا ہوگا۔
 بدترین اور فلسفیوں نے بار بار تنبیہ کی ہے کہ کچھ اقدار آزادی، عزت اور عزت نفس۔ امن یا خود زندگی سے بھی زیادہ بلند ہوتی ہیں۔ یہ بات سچ ہو سکتی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی وقار اور عزت نفس، غلام بنانے والی زنجیریں، امن کی بہت بڑی قیمت کے مترادف ہیں۔ مگر جدید جنگ و جدل کی بھیاں حقیقتیں شاید ہی اس قسم کے مبالغہ کو برداشت کر سکیں گی۔ جوہری جنگ کی موت اور تباہی سے فرار صرف خودکشی ہی میں ہے، آزادی میں نہیں۔ یہی انسانیت کا سب سے بڑا تذبذب ہے۔ دنیا کے عوام کی خوش حالی اور امیدیں اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتیں جب تک کہ امن بشمول آزادی، عزت اور عزت نفس۔ قائم نہ ہو جائے۔

زمانہ قدیم سے فلسفی زمین پر امن اور انسانی بھائی چارے کے آدش کی تشریح پیش کرتے رہے ہیں۔ اگر انسانی رشتے عظیم فلسفیوں کی فراست کے تابع ہوتے تو جنگ کا کم خطرہ ہوتا، اس لیے کہ صدیوں کی اپنی اجتماعی دانش میں انھوں نے انسان کی آزاد اور پرسکون زندگی کے راستے کے واضح نقوش پیش کیے ہیں۔ مگر آدمی نے دانش مندوں کے مشوروں پر کم ہی توجہ دی ہے۔ اگر بالا راہ نہیں تو بد قسمتی کے باعث، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس میں کیا صلاحیت ہے اور اسے کیا ہونا چاہیے وہ کم نیک، کم ثابت قدم، کم عاقل، اور کم پڑ امن رہا ہے۔ اس کے تصورات کی آفت، تنگ نظر قوم پرستی، نسلی اور مذہبی ہٹ دھرمی، لالچ اور طاقت کی ہوس نے اس کو امن اور بھائی چارے کے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ اس کے باوجود، اور تقریباً مجبور کر دینے والے لگاتار حالات جنگ اور خراب انسانی رشتوں کے باوجود بھی اس نے مسلسل ترقی کی ہے۔ اپنے سائنسی

جوہرِ قابل سے آدمی نے ٹھوس مادے کے تجزے کر دکھائے ہیں اور اپنی دنیا کی قلبِ مابیت کر دی ہے۔ اس نے فطرت کو قابو کر کے غنیمتیں پیدا کی ہیں۔ مگر افسوس کہ اس نے جینے کا سلیقہ نہیں سیکھا۔ اس نے جو قدریں خلق کی ہیں وہ زیادہ تر مادی ہیں، اس کی روحانی قدریں اس سے بہت نیچے رہ گئی ہیں۔ اس نے اپنے روحانی جوہرِ قابل کا کم کم مظاہرہ کیا ہے اور انسانی بھائی چارے کے حصول میں کم ترقی کی ہے۔ اس جوہرِ مہدی میں یہ انسان کی جان لیوا کمزوری ہو سکتی ہے۔

نصفِ صدی اپنی پیغمبرانہ پیش بینی کے ذریعے افریقہ، نوٹیل اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اگر اس کے زمانے کے مملکتیں انسان کو کبھی تحمل سے جنگ شروع کرنی پر مجبوری تو اس پر ایسا ناگزیر وقت جلد آئے گا جب اسے امن اور پتھر کے زمانے میں سے ایک کے چناؤ کا بد قسمت فیصلہ کرنا پڑے جائے گا۔ انسان کو اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا وہ اس منزل پر پہنچ تو نہیں گیا ہے۔ آدمی کا موجدانہ جوہرِ قابل اب تک اس کے تعقل سے معقولیت کی صلاحیت سے نہیں بلکہ تعقل کے اطلاق کی خواہش کے باعث — آگے آگے چل رہا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ دنیا کے عوام خود کو مشکوک انداز میں مکمل تپہ کے دہانے پر پاتے ہیں۔

ہم اگر آج امن کی بات کرتے ہیں تو ہم اقوامِ متحدہ کی بات بھی کرتے ہیں کہ اس عہد میں، امن اور اقوامِ متحدہ کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اقوامِ متحدہ کا ادارہ بھی امن کا یقین نہیں دلا سکتا تو کوئی بھی یہ کام نہیں کر سکے گا۔ اگر جنگ ہوئی تو، صرف اس وجہ سے ہوگی کہ اقوامِ متحدہ ناکام ہو گئی ہے، مگر اقوامِ متحدہ کا ناکام ہونا ضروری نہیں۔ بلاشبہ ہر معقول شخص کو حتی الامکان کوشش اور دعا کرنی چاہیے کہ یہ ناکام نہ ہو۔

ان دیگر گول دنوں میں، اقوامِ متحدہ سے منسلک ہونا انسانی تاریخ میں امن کے لیے کی جانے والی سب سے بڑی کوشش ہے۔ ایک بلند فوقیت ہے اور ایک نہایت مفید تجربہ ہے۔ وہ لوگ، جو اس ادارے میں اور اس کے ساتھ کام کرتے ہیں ان میں شاید ناگزیر طور پر، اس ادارے کے امکانات کے بارے میں، اور اس طرح، امن کے امکانات کے بارے میں ایک پیشہ ورانہ قسم کی خوش امید پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ایک گہرا احساس محرومی بھی ہوتا ہے جو اس علم سے پھوٹتا ہے کہ بنی نوع انسان واقعی بہت آسانی سے امن، آزادی اور مساوات میں رہ سکتا ہے، اگر اس کے دل میں اس کی چھوٹی سی عوامیت بھی موجود ہو۔ یہ بھی ایک سادہ مگر کھری حقیقت ہے کہ عوام تو بنیادی طور پر امن چاہتے ہیں مگر ان کے رہنما اور ان کی حکومتیں انھیں لاحقہ جنگ میں جھونک دیتی ہیں، جو انھیں تباہ کر سکتی ہے یا ایک بار پھر بربریت کے طرف واپس لے جاتی ہے۔

اقوامِ متحدہ کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ حقیقت پسندی پر عمل کرے۔ اسے انسان کی کمزوریوں کا اچھا ادراک ہے۔ اسے اس بات کا احساس ہے کہ اگر دنیا میں امن ہوتا ہے تو، اس کو انسان کے ذریعے ہی حاصل کرنا پڑے گا، اور انسان کی اپنی فطرت اور اس کے اخلاقی رویے میں، وہ جیسا بھی ہو، شدید کوشش کی جاتی ہے کہ امن اور انسانی اتفاق رائے کے لیے انسان کے دل و دماغ تک رسانی حاصل کی جائے، اس حد تک کہ انسانی رویوں اور رشتوں میں بہتری آتی رہے۔ مگر یہ بین الاقوامی تعلیم کا ایک عمل ہوتا ہے، یا تربیت

برائے بہتر انداز زندگی کا، اور یہ اس وقت بہترین وقت ہے جب بدترجیح ہو۔ لوگ آہستہ آہستہ اپنے رویے تبدیل کرتے ہیں، اور یہ مشکل اپنے دماغوں کو خوف، شبہات اور تعصبات سے پاک کرتے ہیں۔

اقوام متحدہ خود بھی دنیا کے محام کا ایک حصہ ہے۔ لہذا، یہ عام نوعیت کے خوف، شبہات، اور تعصبات کو منعکس کرتی ہے جو دنیا بھر میں انسانی رشتوں پر آسیب کی مانند چھائے رہتے ہیں۔ ساٹھ سے زیادہ رکن ریاستوں کے وفد اور ادارے کے بین الاقوامی دفاتر، جن میں تقریباً سب کی نمائندگی ہوتی ہے؛ اچھائی اور برائی، راست بازی اور کھرب فریب، شجاعت اور ہزدلی، بین الاقوامیت اور شائیت۔ اس سے منکر نہیں۔ پھر بھی سب کی سرگرمیاں ایک عظیم بین الاقوامی ادارے کے ڈھانچے میں کام کرتے ہوئے امن، آزادی اور دنیا میں انصاف کے اسباب کے لیے وقف ہوتی ہیں۔

اقوام متحدہ، ناگزیر طور پر، ایک ادارہ ہے، جو کبھی کمزور ہوتا ہے تو کبھی بڑا مضبوط۔

اس کے عملی اختیارات قومی حاکمیتوں کی اہم ضروریات کے سبب اچانک محدود ہو جاتے ہیں۔ خود قوم پرستی سے کوئی تنازعہ نہیں ہوتا مگر ننگ نظرہ خود مگر قوم پرستی، حرکی عالمی سیاست کی طرح جاری رہتی ہے جو دیر پا امن کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ ایک طرف بین الاقوامی بھلائی اور دوسری جانب قومی خود پسندی ناگزیر طور پر ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ ایک محدود کردہ بین الاقوامی پارلیمان کی طرح اقوام متحدہ کے طریقہ کار اور تعلیمات ناگزیر طور پر پیچیدہ اور اکتا دیے والے ہوتے ہیں۔

اقوام متحدہ، اگر قیاس نہیں تو، اس امید پر قائم کی گئی تھی کہ دنیا کی پانچوں بڑی طاقتیں تسلسل کے ساتھ بہتر نظام کے حصول کے لیے ہم آہنگی سے کام کریں گی۔ وہ لوگ جنہوں نے 1945 کے موسم بہار میں گمراہ کن، مگر جنگ کے فائنل انتقام کے پڑسرت موقع پر اقوام متحدہ کے منشور کی تشکیل کی تھی، مغرب اور مشرق کے درمیان کی بندگی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی 'مرد جنگ' کی پیش بینی نہیں کر سکے تھے۔ پھر بھی، خوش قسمتی سے اقوام متحدہ نے ٹک کا مظاہرہ کیا ہے جس کی وجہ سے وہ بڑی طاقتوں کے درمیان نا اتفاقی کے قابل افسوس حالات سے معاملہ کر سکی تھی اور پڑا اثر طریقے سے کام کر سکی تھی۔

تمام انسانوں کی امن، تحفظ، آزادی اور انصاف کی آرزوؤں کے انعکاس کے ساتھ اقوام متحدہ کی بنیادیں مستحکم طریقے سے استوار ہیں، اور اس کے اخلاقی قوانین مضبوط ہیں۔ اس کے مکمل طور پر مستعد مرکزی دفاتر بلند اصولوں کی پاسداری اور ادارے کے مقاصد کے لیے وقف ہیں۔ ان مرکزی دفاتر کا سربراہ اقوام متحدہ کا سیکریٹری جنرل ٹریگوہ لی (Trygve Lie) ہے جو نائروے کا عظیم سپوت ہے، اور ایسا انسان ہے جس کا نام عالمی مدبروں اور امن قائم کرنے والوں کی تاریخ کے واقعات میں بھلی حروف سے لکھا جائے گا۔ کسی زندہ انسان نے اتنی ثابت قدمی اور عالی ہمتی سے دنیا کو جنگ کی مزا سے بچانے میں کام نہیں کیا ہے جتنا کہ ٹریگوہ لی نے کیا ہے۔

اپنے مختصر مگر پُر آشوب پانچ برسوں میں، پچھلے چند ہفتوں تک، کم از کم اقوام متحدہ نے یہ ثابت کر دیا ہے

کہ اس میں ابھرنے والے ایسے خطرناک بحران سے نمٹنے کی تسلی بخش صلاحیت موجود ہے جو تشدد میں پھٹ پڑا ہو یا اس کے خطرات ہوں۔ ایسا کبھی اسرائیلی سے نہیں ہوا ہے، نہ اس کی امید کی جاسکتی ہے، مگر سچ تو یہی ہے کہ یہ کیا جا چکا ہے۔ جنگ کے بعد کے برسوں میں، امن کی خاطر، اقوام متحدہ کو مقامی جنگوں کے خطرات کو ختم کرنے، اور جاری جنگوں کو روکنے کے لیے کہا گیا ہے، اور اب کوریا میں، اس سے خود بین الاقوامی پولیس کے ذریعے اقدام کے لیے اسرار کیا جا رہا ہے، جو ایک عمل جنگ کے برابر ہوگا۔ اس کی تاریخ پر اثر ہے۔ اس کی مدافعتیں اندونیشیا، کشمیر، فلسطین، اور یونان میں کم درجے کے خطرناک مسلح تنازعات کو براہ راست روکنے کی ذمہ دار رہی ہیں۔

اس طرح اقوام متحدہ کافی حد تک امن کے لیے کام کرنے کے قابل ہوتی ہے، اپنے ارکان کے اس عزم کے باعث کہ پالیسی کے طور پر عسکری طاقت کے استعمال اور بین الاقوامی مداخلت کی نئی تکنیک سے انکار کیا جائے گا، جس کو [ماضی میں] کام میں لایا جا چکا ہے۔ مہربانہ جب بھی امن کو خطرہ لاحق ہوا ہے، اقوام متحدہ خود ثالثی اور مداخلت کے لیے تنازعہ کے علاقے میں اپنے نمائندے بھیجتی رہی ہے۔

اقوام متحدہ کے، اس قسم کے ایک مشن کے سربراہ کاؤنٹ فوک مہاڈاٹ تھے جو 1948 کے موسم بہار میں فلسطین گئے تھے۔ مشرقی قریب میں اپنی آمد پر انھیں پنا چلا کہ عرب اور یہودی فلسطین میں ایک تلخ، خونیں اور بے انتہا جذباتی جنگ میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان کا جھکیا اقوام متحدہ کی جانب سے جاری کیا گیا ایک سخت مطالبہ تھا کہ عالمی امن کے مفاد میں فلسطین کے مسئلے کو پرامن طریقوں کے ذریعے حل کیا جانا چاہیے۔

یہ سفارت کی تاریخ میں اس کی بے مثال ذاتی کامیابی تھی کہ کاؤنٹ مہاڈاٹ نے اپنی تعیناتی کے دو ہفتے کے اندر ہی چار ہفتے کی عارضی جنگ بندی کرادی اور توپوں نے گولے اگھنے بند کر دیے تھے۔ عارضی جنگ بندی کی عمرانی کی خاطر، اس نے سیکریٹری جنرل سے درخواست کی اور فوراً ہی اسے سات سو فوجی اور غیر فوجی مرد اور عورتوں پر مشتمل ایک بین الاقوامی نیم فرائیم کر دی گئی تھی۔ فلسطین کے لیے تیار کی جانے والی اس ”امن فوج“ میں اسکیٹڈ نیویائی ممالک کے افراد نے جن کے پاس اسلحہ نہیں تھے، کاؤنٹ مہاڈاٹ کی رہنمائی میں امن کی قیام کی تاریخ میں بہادری کا ایک نیا باب رقم کر دیا تھا۔ اس کے رہنما نے خون اور دھس ساقیوں نے اس کو شش میں اپنی جانیں فگار کر دی تھیں۔ اقوام متحدہ اور امن سے محبت کرنے والی پوری دنیا کو ہمیشہ ان کا احسان مند رہنا چاہیے۔

ہم سبہ جنھوں نے کاؤنٹ مہاڈاٹ کی رہنمائی میں کام کیا تھا، اس کا احترام کرتے ہیں۔ وہ ایک عظیم بین الاقوامی، سرگرم انسانیت پرست، امن کے مقاصد کے لیے چکا چنگو، ایک مخلص اور شریف انفس انسان تھا۔ ہم لوگ جو اس کے کام کو لے کر آگے بڑھے تھے اس کی اپنی قربانی سے متاثر تھے اور ہم نے عزم کیا تھا کہ ہم اسے وہ خراج تحسین پیش کریں گے جو اسے سب سے زیادہ پسند ہوتا۔ اس کام کی کامیاب تکمیل جو

اس نے شروع کیا تھا، یعنی فلسطین میں امن کی بحالی۔

پہلی بار کوریا میں، اور امید ہے کہ یہ آخری بار ہوگا، تنازعے کے حل کے لیے اقوام متحدہ کی مداخلت کا کام ہوگئی تھی۔ اس لیے کام ہونی کہ شمالی کوریا کی حکومت نے نہایت ہٹ دھرمی سے نہ صرف کام کرنے کا موقع دینے سے انکار کر دیا، بلکہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جارحانہ طاقت کا استعمال کیا تھا۔ دنیا کے امن کو درپیش شدید ترین مزاحمت کے مقابل اقوام متحدہ کے پاس کوئی مناسب متبادل نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ ایک جارح قومی طاقت کو فیصلہ کن بین الاقوامی طاقت سے روک سکتی۔ اس کی کوشش کی گئی، اور اس میں ارکان کی اکثریت کے عزم کی پشت پناہی حاصل تھی، کہ امن کو محفوظ کیا جائے اور جارحیت کو پکٹل دیا جائے، جہاں بھی وہ جس کسی کی جانب سے بھی ہو۔

کوریا میں حالیہ پسپائی، اور نتیجے کے طور پر تنازعے میں کثیر تعداد میں چینی فوجیوں کی شمولیت کے باعث یہ واضح ہو رہا ہے کہ اس کے ارکان کے عزم کو کافی عسکری طاقت کی پشت پناہی نہیں فراہم کی گئی ہے تا کہ حق کا بول بالا ہو۔ [لہذا] مستقبل میں امن کی طاقتوں کو زیر دست ہونا ہوگا۔

مگر کوریا میں کی جانے والی موجودہ عسکری جدوجہد کا نتیجہ کچھ بھی ہو، جس میں اقوام متحدہ اور چین کی فوجیں صرف آرائیں، کوریا ہمیں وہ سبق فراہم کر رہا ہے جو دنیا میں امن اور آزادی کو بچا سکتا ہے، اگر تو اس سے سبق سیکھیں، اور جلد سیکھ لیں۔ دنیا میں امن کو محفوظ بنانے کے لیے ارکان کے کیے ہوئے پکے وعدوں کے مطابق، اقوام متحدہ کی اپنی کمان میں اس درجے کی عسکری طاقت ہونی چاہیے جو بین الاقوامی فوج کے ذریعے سرعت کے ساتھ جارحیت کرنے والی عسکری طاقت کا سامنا کر سکے اور مطلوبہ نتائج حاصل کر سکے۔

اگر اقوام متحدہ کو اس قسم کی طاقت فراہم کر دی جائے، اور جنرل اسمبلی کے حکم کے مطابق اس سال خزاں کے موسم تک یہ طاقت فراہم کر دی جائے گی، تو میرے خیال میں اس طاقت کو پھر کبھی جنگ میں چیلنج نہیں کیا جائے گا، لہذا اس کے استعمال کی کبھی ضرورت نہیں ہوگی۔

مگر عسکری طاقت کافی نہیں ہوگی۔ اقوام متحدہ کی اخلاقی حیثیت کو ہمیشہ ایسی طاقت ور ہونا چاہیے، جس کے خلاف جارحیت ممکن نہ ہو، اس کو ہمیشہ حق کے لیے، ثابت قدمی سے استوار ہونا چاہیے۔

بین الاقوامی مسائل، اقوام متحدہ جس سے دوچار ہوتی ہے، دنیا کے عوام کے درمیان تعلقات کے مسائل ہوتے ہیں۔ وہ انسانی مسائل ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ اس یقین میں حق بجانب ہوگی، اور اس کو یقین ہے کہ انسانی حقوق ایسے مسائل نہیں جن کا حل نہ ہو، اور ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جو پُر امن طریقے سے حل نہ ہو سکے۔ اندونیشیا، فلسطین، اور کشمیر میں، اقوام متحدہ نے معقول طریقے سے دکھلا دیا ہے کہ شدید ترین تنازعے کے فریقوں کو جنگ سے ہاتھ اٹھا لینے پر قائل کیا جاسکتا ہے، کہ مسئلے کا حل بالآخر سے اور مصالحت سے حاصل کیا جاسکتا ہے، جس میں بے شمار جانیں بچائی جاسکتی ہیں اور دیکھ کم کیے جاسکتے ہیں۔

بد قسمتی سے دنیا میں اب بھی ایسے آدمی ہوں گے جنہوں نے آج تک نہیں سیکھا ہے کہ جنگ کسی مسئلے کا

حل نہیں ہو سکتی، کہ جارح قوت کبھی کافی نہیں ہوتی، نہ کبھی اس کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو تو منظم دنیا کے بے رحم غضب کو انہیں پر کرنا چاہیے جو خود غرضی کے باعث امن کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ اس لیے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں، سوائے حملہ آور کو پسپا کرنے کے طاقت کا استعمال کرنے والی قوموں کے لیے کوئی جائز بہانہ کوئی جواز نہیں رہتا۔

اس دنیا میں اور اس میں بسنے والے لوگوں کے لیے محفوظ امن کے حصول کا کوئی آسان اور قیمتی طریقہ نہیں ہے۔ صرف صبر، ثابت قدمی، اور مدد کو مشغول سے ماکامی کے باوجود بار بار کے تجربے سے ہی امن کو حیاتا جا جاسکتا ہے۔، جیسا کہ نگلیں ادا کرنے والے سیکھ رہے ہیں اس کو سستے داموں عیناً نہیں جاسکتا۔ دنیا کی موجودہ بے چینی کی حالت میں نکاوٹیں اور پسپائیاں خطرناک بحرانات اور تشدد کے واقعات تو ہوتے رہیں گے۔ مگر ماضی کی طرح مستقبل میں بھی غیر متزلزل ارادے کے ساتھ اقوام متحدہ امن کے لیے باندھے گئے بند پہ پہرے جاری رکھے گی۔ اس مشترکہ مقصد میں، ان کی قدروں قیامت سے قطع نظر، تمام ریاستیں بے حد اہم ہیں۔

چھوٹی قومیں، رکنیت میں جن کی اکثریت ہے، اقوام متحدہ کے لیے طاقت کا عظیم منبع ہیں۔ امن کے لیے ان کی خواہش کبھی ہے اور ثابت ہے۔ خوف، شبہ اور تنازعہ، بڑی طاقتوں کے درمیان کے رشتوں کو متحکم کرتے ہیں، اور نتیجے میں پیدا ہونے والی بے ثباتی ان کو اور ان کے عوام کو تناؤ اور کوہلو کی کیفیت میں رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ بڑی طاقتوں کے درمیان کے رشتے کافی حد تک ان کے مستقبل کا تعین کرتے ہیں۔ ایک تیسری عالمی جنگ تیزی سے چھوٹی ریاستوں کو نگل جائے گی، اور ان میں سے کئی، ایک بار پھر جنگ کا میدان فراہم کریں گی۔ پہلے کی طرح، ان میں سے بہت پہ جنگ کا دباؤ، بڑی طاقتوں کے مقابلے میں، زیادہ شدید ہوگا۔ لہذا، بالخصوص، وہی [چھوٹی ریاستیں] چاہتی ہیں اور اقدام بھی کرتی ہیں۔ یہ یقینی بنانے کے لیے کہ اقوام متحدہ کو امن کی عملی آلہ کاری میں زیادہ موثر ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں، اسکیٹڈی نیویائی ممالک، تعمیراتی کوششوں میں اقوام متحدہ کی مدد کرتے ہیں

ماضی قریب کی ایک وراثت اقوام متحدہ کے کام میں نکاوٹ بن رہی ہے۔ امن کے لیے اس کی صلاحیت اس وقت تک پوری طرح استعمال نہیں ہو سکتی جب تک کہ دوسری عالمی جنگ [کے اثرات کو] کو پوری طرح ختم نہیں کر دیا جاتا۔ مغرب اور شرق کے درمیان کی بندگی نے بڑی طاقتوں کو امن معاہدے کرنے سے روک رکھا ہے جن کے ذریعے بالآخر پچھلی جنگ [مکمل طور پر] ختم ہو جاتی۔ اس میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ اگر اقوام متحدہ کو ذمے داری دی گئی ہوتی تو وہ اس اختتام میں معاون ہو سکتی تھی۔ اس وقت، اقوام متحدہ کو مکمل عالمی جنگ کے بد قسمت ماحول میں مستقبل کے امن کے لیے کام کرنا چاہیے، جب کہ اسے جنگ کے حتمی اختتام میں معاونت کرنے سے باز رکھا گیا ہے۔ یہ بظاہر، امن سے محبت کرنے والی تمام قوموں سے متعلق، اس سے قطع نظر ان کا قدروں قیامت کیا ہے، اہم معاملات ہیں۔

اس لمحے، گوریا اور بند چینی علاقے کے پریشان کن واقعات کے پیش نظر، خوف زدہ دنیا کی توجہ ایشیا پر مرکوز ہے، جو ایک اہم سوال ”امن یا جنگ؟“ کے جواب کی تلاش ہے، مگر دنیا کے امن کے اعتدال کے پیش نظر یورپ کی اصلی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یورپ کے امن، اور اس کے ساتھ دنیا کے امن کو کبھی محفوظ نہیں کیا جاسکتا، جب تک کہ جرمنی کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔

اس سلسلے میں، ان لوگوں کو جو پچھلی جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا کی خوش حالی اور مستقبل کے تحفظ کے ضمن میں یورپ کو ایک اہم عنصر کے طور پر نظر انداز کرنے پر مائل ہو رہے تھے اپنے تمام تخمینوں پر نظر ثانی کرنا پڑ رہی تھی۔ اس لیے کہ یورپ نے، اگرچہ وہ شدید دشمنوں سے چور تھا، قابلِ تعریف کچک دکھائی ہے اور بہت کم عرصے میں دنیا کے معاملات کے مدار میں دوبارہ اپنی جگہ بنائی ہے۔

مگر یورپ، اور عمومی طور پر مغربی دنیا، کو پوری طرح [اس امر سے] واقف ہو جانا چاہیے کہ ایشیا اور افریقا کے کروڑوں افراد اب امن کے تمام جوڑ توڑ کا ایک نیا اور نہایت معنی خیز عنصر بن گئے ہیں۔ چنانچہ، یہ پسے ہوئے عوام تیزی سے بیدار ہو رہے ہیں اور مستقبل کے امن، آزادی اور تحفظ کے ثمرات سے لطف اٹھانے کے حق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

ان کروڑوں افراد کو نو یافتہ آزادی کا تجربہ ہو رہا ہے۔ کئی کروڑ اب بھی نوآبادیاتی درجے کے شہری ہیں۔ ان کی آرزوئیں اور ان کے مطالبات، جنہیں آزادی مل گئی ہے، اور جو اس کے سوائی ہیں، ایک جیسے ہی ہیں: تحفظ، برابری کا ہتھیار، اور قوموں کی برادری میں معقول مقام۔

نصف صدی قبل کے مقابل، جب افریقہ، نوہیل کو احساس ہو گیا تھا، آج یہ بات زیادہ دل کو لگتی ہے کہ امن خلا میں قائم نہیں ہو سکتا۔ امن کو انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ چلانا چاہیے۔ امن اب محض لڑنے والوں اور نہ لڑنے والوں کا معاملہ نہیں رہ گیا ہے۔ ان بے شمار لوگوں کے لیے جنہوں نے جنگ اور امن دونوں میں دکھائی دیکھی ہے، امن کو، روٹی یا چاول، [صحیحیت کا] سہارا، صحت، تعلیم اور آزادی کے ساتھ انسانی وقار۔ ایک بہتر معیار زندگی۔ کاروبار دھانا چاہیے۔ اگر امن کو محفوظ ہونا ہے تو عرصے سے دنیا کے دکھی، بھوکے، فراموش کردہ عوام، غیر مراعات یافتہ اور کم غذا یافتہ سب کو بغیر کسی تاخیر ایک نیا دن اور ایک نئی زندگی ملنی شروع ہونی چاہیے۔

آج کی دنیا میں، بقیہ مغرب کی طرح، یورپ کو نئی سمت بندی۔ ایک عالمی سمت بندی کی لازمی ضروریات کا سامنا ہے۔ مابعد جنگ کا تناظر ویسا ہی فرسودہ ہے جیسے ماقبل جنگ دنیا کا تھا۔ اس مسئلہ حقیقت کے بارے میں بیداری ہونی چاہیے کہ ایشیا اور افریقا کے دورِ افتادہ کم معروف اور کم سمجھے ہوئے عوام، جو دنیا کی آبادی کی اکثریت ہیں، اب مجہول نہیں رہے، اور ان کو مزید عرصے تک نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ عالمی تصوراتی جدوجہد کا غیض و غضب ان کے اطراف بھنور کی مانند گھوم رہا ہے۔ ان کی بے شمار تعداد مستقبل کی دنیا کے انداز زندگی پر حاوی ہوگی۔ وہ جمہوریت کی نشوونما کے لیے غیر کاشت شدہ مٹی کا حکم رکھتے ہیں، مگر پہلے مغرب کو ان کی طرف سمجھ بوجھ کر بڑھنے، ان کے اعتبار کا علم حاصل کرنا، اور ان سے دوستی کرنے کا ہنر سیکھنا

چاہیے۔ مغرب کی شہنشاہیت، جبر اور استحصال کی ایک تلخ تاریخ ہے جس کو عبور کرنا ہوگا، اس کا قابل انکار مفادات کے باوجود جو مغرب نے انھیں دیا ہے۔ نوآبادیات کی تحلیل میں تیزی آئی چاہیے۔ ان لوگوں کی جانب دیتی کا ہاتھ برسنے چاہیے جو حق حاصل کردہ آزادی کے پوجھتے دبے ہوئے ہیں، اور ان لوگوں کی طرف بھی جو اس کی آرزو کرتے ہیں۔ اور اس ہاتھ میں فیضانہ مقدار میں نظر آنے والی امداد [بھی] ہوتی چاہیے۔ سرمایہ، غذا، اشیاء، ساز و سامان اور تکنیکی امداد وغیرہ۔

دنیا میں ایسے مسائل بھی ہیں جو حل طلب ہیں: لاپرواہی سے واضح کیے ہوئے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصورات اور ان کے نظام؛ انتہا پسندانہ انداز میں پیش کیے گئے جمہوریت کے تصورات، جو امداد و شمار کے شدت پسندانہ تصور کو غرا دیتے کے شدت پسندانہ تصور کے مقابل پیش کرتے ہیں؛ انسانی حقوق کا عمومی سطح پر انکار؛ انداز میں کروڑوں نوآبادیاتی عوام کی نجات کی آرزوؤں کی قابل فہم بے تابی وغیرہ۔

مگر یہ مسائل ہیں جنہیں کسی طرح بھی حل کا مقابل نہیں سمجھا جاسکتا۔ سرمایہ داری بمقابلہ اشتراکیت کا مسئلہ نظریات کا ہے جس کو واقعی، آج کی دنیا میں واضح طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو صاف طور پر اس لیے بیان نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اب صرف "سرمایہ داری" اور "اشتراکیت" ہی کی دو دنیا ہیں نہیں رہ گئی ہیں۔ اب تو ہیں ایک ہی دنیا ہے۔ تیز و شدید تصادم کی دنیا۔ جس کے مخالف نظریاتی قطبین پر یہ دو نظریے قائم ہیں۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان دو نظاموں اور نظریات کے بہت سے درجات پائے جاتے ہیں۔

دنیا میں سرمایہ داری اور اشتراکیت، دونوں کے درجات کے لیے جگہ موجود ہے، بشرطے کہ دونوں میں سے کوئی بھی نظام شد و بند سے مٹا ہٹا ہٹ کے راستے پر چل نہ پڑے۔

اقوام متحدہ کسی بھی قسم کی مٹا ہٹا ہٹ کے خلاف ہے، وہ نظریاتی ہو یا کسی اور قسم کی۔ اقوام متحدہ، نسل، مذہب، یا نظریات سے قطع نظر، آزادی اور مساوات کی علم بردار ہے۔ اب یہ ہر سوجائے کے عوام پر منحصر ہے کہ وہ نظریات، اقتصادی نظام اور ریاست اور فرد کے درمیان رشتوں کے بارے میں خود انتخاب کریں۔

اقوام متحدہ انسان کے حقوق کی ضمانت دینے کی تاریخی کوشش میں مصروف ہے۔ یہ نوآبادیاتی عوام کو اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ آزادی کی ان کی آرزوئیں پوری ہو سکتی ہیں، اگر انھیں درجہ بہ درجہ پرامن طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

تمام انسانوں کے لیے بہتر حالات زندگی اور امن دونوں فراہم ہو سکتے ہیں۔ اگر موزوں اختیار اور سہارا فراہم کیا جائے تو اقوام متحدہ اس کو یقینی بنا سکتی ہے۔ مگر فیصلہ دراصل دنیا کے عوام کو کرنا ہے۔ اقوام متحدہ کا تعلق عوام سے ہے، مگر یہ اب تک ان سے اتنی قریب نہیں ہوئی ہے، ان کے شعوری مفاد کا حصہ نہیں بن سکی ہے، جتنا کہ اس کو ہونا چاہیے تھا۔ اقوام متحدہ کو ہمیشہ عوام کے ساتھ ہونا چاہیے۔ جہاں کہیں بھی بنیادی حقوق اور مفادات کا معاملہ ہو، اس کو محض سہولت کے لیے عمل نہیں کرنا چاہیے۔ کبھی کبھی ہٹا دیا اس نے ایسا کیا ہے، مگر نہ اس کے اپنے فائدے کے لیے، نہ امن اور آزادی کے مقدس مقاصد کے لیے۔ اگر دنیا کے عوام اپنے

عزم میں پکے ہیں اور اگر وہ اقوام متحدہ کے ذریعے کام کرتے ہیں، تو انھیں کبھی جنگ کے الم ناک متبادل یا رسوا کن تھپی کا، موت کا، یا غلامی کا سامنا نہیں ہوگا۔

ایک اٹھل پٹھل دنیا کی سودائیت اور غیر معقولیت کے درمیان، کچھ ساوہ حقیقتیں اظہر من الشمس دکھائی دیں گی۔

جیسا کہ افریقہ نوٹیل نے بالآخر اخذ کر لیا تھا، لوگ کبھی جنگ کی حماقت اور اس کے خوف ناک نتائج کے باوجود اس سے باز نہیں رہتے۔ اس کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ اگر جوہری جنگ میں لوگ بچ بھی جائیں تب بھی فاتح کوئی بھی نہیں ہوگا۔ تو پھر جنگ سے کیا حاصل ہوگا جو پرامن طریقے سے حاصل نہیں کیا جاسکتا؟ یقینی طور پر قوموں کے درمیان اہم اختلافات اور تنازعات کے وسیع پہلو ہوتے ہیں، مگر ہرگز ایسا کچھ نہیں ہوتا جسے پرامن طریقے سے حل نہ کیا جاسکے گفت و شنید اور ثالثی کے ذریعے اگر امن کی حقیقی خواہش ہو اور ذرہ برابر باہمی اعتبار بھی ہو۔

مگر اس کی کم ہی امید کی جاتی ہے کہ خوف، بدگمانیوں اور الزام تراشی کے موجودہ ماحول میں بڑی طاقتوں کی ہندگی کو کھولنے کی کوشش باور ہو سکے گی۔ قوموں کے درمیان رشتوں میں خوف، بدگمانی اور الٹی الزام تراشی خطرناک طریقے سے از خود مرمب ہوتے جاتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی قومی دیوانگی کی ترقیب دیتے ہیں جو خون توازن اور مصطفیت کے انکار کے باعث، مہلک جنگ کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ پرامن گفت و شنید کے لیے موافق فضا تیار کی جانی چاہیے، اور یہ جفاکشی اور متواتر کوشش ہی سے تیار کی جاسکتی ہے۔ تنازعات میں انجمنی جماعتوں کو احساس دلانا چاہیے کہ امن کی راہ سب موزوں پر مزاحمت کی دھمکیوں سے، محض سر سے پاؤں تک مسلح ہونے سے یا دشمن کی تلاش میں ہر جھاری کو کھنکھل ڈالنے سے کبھی آڑی ترچھی نہیں کی جاسکتی۔ اس دور میں امن کی جانب ایک مہذب پہلے ضروری قدم کے لیے الٹی الزام تراشیوں اور بڑا بھلا کہنے کے عمل کو عرضی التوا میں ڈالنا ہوگا۔

دنیا میں ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جو جنگ کی مانگزیریت پر قبل از وقت راضی بہ رضا ہو جاتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو نام نہاد ”جنگ امتناعی“ کی وکالت کرتے ہیں، جو، جنگ پر راضی بہ رضا ہونے میں، دراصل جنگ کی شروعات کے لیے موزوں وقت منتخب کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ کہنا کہ جنگ، جنگ کو روک سکتی ہے، الفاظ کا بنیادی کھیل ہے اور جنگ بازی کا سٹن طریقہ ہے۔ جو امن پر سنجیدگی سے یقین رکھتا ہو اسے امن کو بچانے کی ہر با عزت کوشش کو اپنا نصب العین بنالینا چاہیے۔ دنیا میں اس بات کے بہت ثبوت موجود ہیں کہ جنگ صرف وہ حالات پیدا کرتی ہے جو مزید جنگ پیدا کرتے ہیں۔

آخری تجزیے میں، امن کے لیے سنجیدہ خواہش کا سخت امتحان وہ آمادگی ہوتی ہے جو فریقوں کے درمیان اختلافات کو اقوام متحدہ کے پرامن عمل اور بین الاقوامی رائے عامہ کے سامنے پیش کر دیتی ہے، اقوام متحدہ جس کو منقلس کرتی ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے پروپیگنڈے کے شور و غوغا پر سچائی،

تنگنوں اور انصاف غالب آسکتے ہیں، مگر ایک توانا بین الاقوامی ضابطہ اخلاق کاشت کیا جائے۔
 یہ بات زور دینے کے قابل ہے کہ اقوام متحدہ محض امن کو محفوظ رکھنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ تہذیبیاں —
 ایسی بنیادی تہذیبیاں — لانے کے لیے بھی ہے، جو بغیر تشدد آمیز انقلاب کے لائق جائیں۔ حالات
 کو بدستور برقرار رکھنے میں اقوام متحدہ کا کوئی مفاد نہیں۔ یہ متلاشی ہے ایک زیادہ محفوظ دنیا، ایک بہتر دنیا کی،
 ایسی دنیا کی جس میں تمام لوگ ترقی کر سکیں۔ ایک حرکی عالمی سوسائٹی میں، جو اقوام متحدہ کا مقصد ہے، تمام لوگوں
 کو مساوات اور برادری کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ ان لوگوں کے حقوق جو کسی وقت بھی اقلیت میں ہوں —
 نسلی، مذہب یا نظریے کے باعث — اتنے ہی اہم ہوتے ہیں جیسے کراکثریت کے اور اقلیتوں کو بھی ویسا ہی
 احترام اور تحفظ ملنا چاہیے۔ اقوام متحدہ نہیں چاہتی، نہ اس کو مناسب جانتی ہے کہ دنیا کو ایک ہی انداز میں تراشا
 جائے۔ اقوام متحدہ، دنیا کی رنگارنگی میں صرف یکا رنگت کی خواہاں ہے، ہم صوبائی یا یکسانیت کی نہیں۔
 ہماری دنیا میں تحفظ نہیں ہوگا، تکلیف دہ دباؤ سے نجات نہیں ہوگی، سنجیدہ ترقی نہیں ہوگی، نہ دیر پا امن
 ہوگا، جب تک کہ شیے (Shelley) کے خوب صورت الفاظ میں ”تنگنوں کی آواز فطرت کی آواز جیسی بلند آواز
 قوموں کو بیدار نہ کر دے گی۔“



لارڈ بائیڈ آر اعلان تجلیل

بہت سے مردوں اور عورتوں میں، جنہیں یہ انعام دیا گیا ہے، لارڈ بائیڈ آر ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ اگرچہ ان میں بہت سے مدبرین یا سیاست دانوں میں سے تھے، بین الاقوامی قانون دان تھے، یا امن کے اداروں سے منسلک افراد تھے، جب کہ جان بائیڈ آر نہ بین الاقوامی قانون دان ہیں، نہ سیاست دان، نہ مدبر، نہ ہی ان کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی عمر کے ایک طویل عرصے تک امن کے اداروں میں عملی طور پر حصہ لیتے رہے ہیں۔ ان کا کام غذا جانوروں اور انسانوں کی غذا کے مطالعے سے موسوم رہا ہے۔

مگر ان کا کام خواہ کتنا ہی بڑا سائنسی اضافہ رہا ہی تھا اس کی بنیاد پر انہیں نوبیل امن نہیں دیا جاسکتا تھا، اس لیے کہ محض سائنسی دریافتیں ہی امن پیدا نہیں کر سکتیں۔ ہاں، اگر ان کے استعمال سے قوموں کے درمیان تعاون میں اضافہ ہو سکے، تو وہ امن کے معاملے میں ایک اہم عنصر بن سکتی ہیں۔ جان بائیڈ آر کے نزدیک ان کے سائنسی کام کا مقصد انسانوں کو صحت مند اور خوش حال بنانا ہے تاکہ امن قائم ہو سکے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صحت مند اور خوش و خرم افراد کو زندگی گزارنے کے لیے جنگ کی فراہمی اور اس کی فراہمی کے لیے اسلحہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ ”ہمیں بھوک اور طلب کو زیر کرنا چاہیے اس لیے کہ افراط کے درمیان، بھوک اور طلب مہلک خرابی اور ہماری تہذیب کے لیے ٹھنک کا ٹیکا ہیں۔ یہ جنگ کی بنیاد کی وجہ سے ہیں۔ مگر سیاسی منصوبوں وغیرہ کے ذریعے اوپر سے نیچے تک ایک نئی دنیا بنانے کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں اس کو نیچے سے اوپر کی جانب بنانا چاہیے، اور سارے عوام کے لیے سب سے پہلے زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کی جانی چاہئیں جو انہیں پہلے کبھی دستیاب نہیں تھیں، اور ملک کے پس ماندہ علاقوں کو نیچے سے اوپر کی طرف بنایا جانا چاہیے۔“ وہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ”قوموں کے درمیان جنگ نہ

کرنے کے معاہدے زیادہ دیر نہیں چلے گئے، نہ ہی یہ کبھی قراہ امن کے لیے کافی ہوں گے۔ ایک مثبت ہدف کو نظر میں رکھ کر، قوموں کو روزمرہ کے تعاون سے امن قائم کرنا چاہیے، ایسا ہدف جو دیکھنے میں بھی باہمی فائدے کے لیے ہو۔ صرف یہی طریقہ جنگ کی وجہ کو دور کر سکتا ہے۔ ”بانڈ آر کے لیے راز ویلٹ (Roosevelt) کے الفاظ ”طلب سے چھٹکارا“ قوموں کے درمیان امن کی بنیاد بن چکے ہیں۔

جان بانڈ آر سب سے پہلے حقیقت پسند ہیں جیسا کہ ان کا تمام کام گواہی دیتا ہے۔ وہ 1880 میں پیدا ہوئے، ایک اسکاتش خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور کسان کی زندگی اور عملی زراعت میں ان کی جڑیں پیوست ہیں۔ کسان ہونے کے علاوہ وہ یونیورسٹی کے پروفیسر بھی ہیں اور سائنس داں بھی۔ انھوں نے اپنی طبی تعلیم گلاسگو یونیورسٹی سے شروع کی اور بعد میں ڈاکٹر بن گئے۔ ان کے سائنسی رجحان نے ان کو تحقیق کی طرف مائل کیا، اور سب سے پہلے جس نے ان کی توجہ حاصل کی وہ پالتو جانوروں کی غذا تھی۔ 1914 میں ان کو انبروڈین کے Institute of Animal Nutrition کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا تھا۔

مگر پہلی عالمی جنگ میں ان کے کام میں خلل پڑا تھا، جس میں وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے شریک تھے۔ جنگ کے بعد، 1919 میں وہ انبروڈین کے Rowett Research Institute میں ڈائریکٹر بنا دیے گئے، جس عہدے پر وہ 1945 تک تعینات رہے۔ اس کے بعد وہ انبروڈین یونیورسٹی کے شعبہ زراعت میں پروفیسر بنا دیے گئے۔ اسی برس اقوام متحدہ کے Food and Agriculture Organization میں II جو FAO کے نام سے جانا جاتا ہے ڈائریکٹر جنرل بنا دیے گئے، جس سے وہ پچھلے برس ہی سبک دوش ہوئے تھے۔

Rowett Institute میں تعیناتی کے دوران بانڈ آر نے زرعی اور غذائی پالیسیوں کی بنیاد ڈالی جس پر وہ FAO میں بھی کام کرتے رہے تھے۔ جب وہ Rowett Institute کے ڈائریکٹر تھے اس وقت انھوں نے کئی نہایت بہت پڑاثر مقالے پیش کیے تھے جن پر وہ 1928 تک کام کرتے رہے تھے اس کے بعد وہ پالتو جانوروں کے مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ ان کا پہلا کام، انسانی غذا، دودھ کی کھپت اور اسکول کے بچوں کی نشوونما پر مشتمل تھا، اور جو 1928 میں شائع ہوا تھا، کانگمی کے علاقوں میں اسکول کے بچوں پر تجربات پر مشتمل تھا۔ اس اشاعت کے ساتھ ہی مقالات کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا جس کا موضوع تھا انسانی غذا، غذا اور بیماری، غذا اور صحت، غذا اور زراعت وغیرہ۔ 1936 میں انھوں نے غذا، صحت اور آمدنی پر ایک مقالہ پیش کیا تھا، جو ایسا کام تھا جس نے غذائی مسائل پر بحث کے آغاز اور مثبت غذائی پالیسی کی بنیاد کی تشکیل میں سب سے زیادہ مدد فراہم کی تھی۔

اس تفتیش کا نیا پن نہ طریقہ کار میں تھا اور نہ غذا اور نہ مختلف طبقات زندگی میں اس کے استعمال سے حاصل ہونے والی معلومات میں۔ مختلف ممالک میں اس میدان میں پہلے ہونے والی تحقیقات نے ظاہر کیا تھا کہ کم آمدنی والے گروہوں میں آمدنی کا بڑا حصہ غذا پر خرچ ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ مختلف آمدنی والے

گروہوں میں استعمال کی جانے والی غذاؤں کی اقسام مختلف ہوتی ہیں۔ مگر یہ علم بے کار ہو چکا تھا اور اس کو غذائی پالیسی بنانے میں استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

بائیںڈ آر کی تحقیق کا نیا پن اس حقیقت میں پنہاں تھا کہ انھوں نے آمدنی کے گروہ میں استعمال ہونے والی غذا میں موجود اجزاء کے تجزیے میں ان کی غذائی قدروں کو واضح کر دیا تھا۔ مزید یہ کہ انھوں نے پورے برطانیہ کے مختلف آمدنی والے گروہوں کے غذائی درجے کا حساب پیش کر دیا تھا۔ ان کے نتائج اسے حیرتناک سمجھے کہ انھوں نے [ملک میں] ایک خروش پیدا کر دیا تھا۔ انھوں نے واضح کیا تھا کہ برطانیہ عظمیٰ میں، جہاں کا معیار زندگی نیا وہ تر ملکوں سے بہت بلند تھا، ایک بڑے حصے کا غذائی معیار اس معیار سے کم تر تھا جسے غذائی ماہرین نے لوگوں کے لیے معقول قرار دیا تھا۔ بائیںڈ آر نے یہ دکھایا تھا کہ زراعتی پیداوار میں بڑے پیمانے پر اضافہ ضروری تھا، اگر آبادی کو مناسب غذائیت ملنی ضروری ہے۔ یہ کہ زراعتی پیداوار میں اضافے سے خاصا فائدہ ہوگا، اگر آبادی کو ہر غذائیت فراہم ہو، اور اس طرح آبادی اپنی عام پیداواری صلاحیت بڑھا سکے گی۔ اس لیے ضروری تھا کہ ایسی پالیسی بنائی اور عمل میں لائی جائے جو ان دونوں ضروریات کو پورا کر سکے۔

یہ کوئی اتفاق نہیں کہ اس کے بعد بائیںڈ آر نے خود کو زرعی اور غذائی پالیسیوں کی مطابقت کے لیے وقف کر دیا تھا، صرف اس لیے نہیں کہ بنی نوع انسان کو طلب سے آزاد کر دیا جائے، بلکہ درجات، قوموں اور نسلوں کے درمیان پر امن تعاون کی بنیاد رکھی جائے۔ ابتدائی طور پر، اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ افلاس میں زندگی بسر کرنے والوں کے لیے جذبہ رحم نے ڈاکٹر کی حیثیت میں انھوں نے گلاسگو کے پس ماندہ علاقوں میں بہتوں کو خود کھیا تھا۔ انھیں بچپن ہی سے زراعت سے واقفیت رہی ہے اور 1920 سے انھیں اس بات کا علم تھا کہ ایک میٹر اور مناسب خانہ داری کے ساتھ ایک غذائی پالیسی ہونی چاہیے اسی کے ذریعے ہی زراعتی پیداوار عام لوگوں کی پہنچ میں آ سکے گی۔ وہ ہمیشہ سے محدود پیداوار پر مبنی زراعتی پالیسی کے خلاف رہے تھے۔

اپنے تصورات کی ترقی کے ساتھ، انھوں نے ایک تجویز کے ذریعے ایک شخصوں اٹھارہ لاکھ تھا، جب وہ 1932 میں اسکاٹش کمیٹی کے سیکریٹری بن گئے تھے جسے اسکاٹ لینڈ کی ترقیات کی قومی کاؤنسل نے قائم کیا تھا۔ یہ انھیں کے تصورات تھے جو بعد میں رائج کئے گئے تھے جب برطانیہ عظمیٰ کی غذائی پالیسی بنانے کا وقت آیا تھا۔

بائیںڈ آر کے تصورات نے برطانیہ کی زراعتی اور غذائی پالیسیوں پر اپنے نشان چھوڑے ہیں۔ اگر ان کا کام اسی مقام پر رک جاتا تو بین الاقوامی تعاون کی اہمیت پر اس کا کم، یا بالکل کوئی اثر نہ ہوتا۔ مگر یہ تصورات جلد ہی برطانیہ عظمیٰ کی حدوں سے باہر نکل گئے تھے اس لیے کہ ماضی کی طرح آج بھی، زراعتی اور غذائی مسائل ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔

اس کے باوجود کسی خیال کی نشر و اشاعت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ مسائل کے حل کا احاطہ کرے گا۔ اور جب تک کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد کے عرصے کی تلخ حقیقت ذمے دار افراد سے جواب کی طالب نہیں ہوتی تھی غذا کے مسائل کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ دنیا کو ایسے حالات کا سامنا تھا جس میں قحط پوری پوری آبادیوں کو کھائے جا رہا تھا، جب کہ [دوسری طرف] ضرورت سے زیادہ زرعی پیداوار کی وجہ سے زرعی بحران پیدا ہو رہے تھے اس لیے کہ وہ جنھیں ان کی ضرورت تھی انھیں خرید نہیں سکتے تھے۔ ساتھ ہی، کچھ زرعی ممالک کو اپنے صنعتی دوستوں کی مصنوعات خریدنے کا پارا نہیں تھا اس لیے کہ ان کے کسان بہت مفلس تھے۔

جنیوا میں ہونے والی World Economic Conference میں جو 1927 میں منعقد ہوئی تھی، جن مسائل کو پیش کیا گیا تھا ان میں یہ مسئلہ شامل تھا، مگر اس وقت اس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ابتدا 1934 میں ہوئی تھی جب آسٹریلیا کے ہائی کمشنر اسٹینلی بروس (Stanley Bruce) کے کہنے پر لیگ آف نیشنز نے اس سوال کو اٹھایا تھا، اور ایک بین الاقوامی کمیٹی تشکیل دی تھی جو زراعت کے ماہرین اور اقتصادیات کے ماہرین پر مشتمل تھی۔ سبائیڈ آر اس کے ارکان میں سے تھے جس نے 1936 میں اپنی رپورٹ پیش کی تھی۔ بعد میں، اسی برس، ایک کمیٹی تشکیل پائی جس میں غذا کے طبیعیاتی ماہرین، صحت، زراعت اور اقتصادیات کے ماہر شامل تھے اور ان سے کہا گیا تھا کہ وہ غذا، صحت، زراعت اور اقتصادیات کے درمیان کے رشتوں پر تحقیق کریں۔ اگرچہ، سبائیڈ آر بعد میں غمی و والی کمیٹی کے رکن نہیں تھے اس کے کام پر وہ خاصے اثر انداز ہوئے تھے۔ پھر، فوراً بعد ہی دوسری عالمی جنگ پھوٹ پڑی جس نے لیگ آف نیشنز کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

جنگ بین الاقوامی تعاون کے لیے بہت کم موقع فراہم کرتی ہے، مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک انفرادی ملک میں کچھ چیزیں جو امن کے زمانے میں ممکن نہیں ہوتیں، جنگ کے زمانے میں ہو جاتی ہیں۔ اور اس موقع پر بھی ایسا ہی ہوا۔ غذا کی تقسیم پر قابو اور مناسب اقتصادی اقدام کی بنا پر برطانوی قوم کو ایسی مناسب غذا تک پہنچائی جاتی رہیں جو وقت کے زمانے میں ممکن ہو سکتی تھیں۔ سبائیڈ آر کے طریقہ کار کے اس اخلاق کے نتیجے میں عوام کی عمومی صحت کا معیار توقعات سے زیادہ بلند رہا۔

یہ ایک قدم تھا آگے کی طرف۔ مگر اس سے کہیں زیادہ اہم یہ حقیقت تھی کہ جنگ کے زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے جن کی نظریں مستقبل پر تکی ہوئی تھیں، لوگ جو مابعد جنگ زمانے کی منصوبہ بندی کر سکتے تھے جب جنگ کی پھیلائی ہوئی تباہیوں کا ازالہ کیا جاسکتا تھا اور دنیا ایک بار پھر امن کے راستے پر قدم آگے بڑھا سکتی تھی۔ سبائیڈ آر ایسے ہی شخص تھے۔ ایک انفرادی شخص کی حیثیت میں انھوں نے 1942 میں ریاست ہائے متحدہ کا سفر اختیار کیا تا کہ وہ اپنے خیالات پر لوگوں کو قائل کر سکیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 1943 میں منعقد ہونے والی ہاٹ اسپرنگز (Hot Springs) کانفرنس پر ان کے تصورات کا اثر غالب

رہا تھا کانفرنس نے غذائی معاملات کو مربوط کرنے کی ضرورت پر صدا دیا اور ان سوالات پر غور کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی ادارے کی تشکیل کی تجویز پیش کی۔ ان مسائل کا، جنگ کے بعد جن کا فوری حل ضروری تھا، تعین کیا گیا، جیسی کہ پالیسی تھی، بالآخر، جن کے ذریعے دنیا کو طلب سے نجات دلائی جانی تھی کانفرنس کی تجاویز کی ضرورت پر بائینڈ آر کے طریقہ کار کے عین مطابق تھیں۔

ہاٹ اسپرنگز میں تجویز کیا جانے والا ادارہ، FAO، 1945 کے خزاں میں کیوبیک (Quebec) میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں قائم کیا گیا تھا۔ بائینڈ آر جنٹیل نے اس کانفرنس میں حصہ لیا تھا، اس ادارے کے ڈائریکٹر جنرل مقرر کیے گئے۔ یہ اسی عہدے کا فیض تھا کہ بین الاقوامی میدان میں انھیں بہت قابل قدر کام کرنے کا موقع ملا تھا۔

بائینڈ آر کے نزدیک اس ادارے کا قیام سب سے اہم قدم تھا جو ایک بہتر دنیا کی تعمیر اور دیر پا امن کے قیام کے لیے اس سے پہلے کبھی اٹھایا نہیں گیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا، ”تمام قوموں کو اپنے عوام کو یہ یقین دلانے کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے کہ ان کی صحت اور زندگی کے لیے ضروری خوراک کی فراہمی یقینی بنائی جائے گی۔“ اور [حکومتوں کو تعاون کے ذریعے یقین دلانا چاہیے کہ تمام ممالک کے لوگ یہ ہدف حاصل کر لیں گے۔] میثاقِ اوقیانوس میں طلب سے نجات کے لیے گئے وعدے کی تکمیل کی طرف یہ پہلا قدم ہے۔“ جنگ کے بعد FAO کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ تھی کہ جن ممالک میں قلتِ ہوان میں غذائی مصنوعات کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنایا جائے۔ اس مقصد کے لیے قائم کی جانے والی International Emergency Food Council ایک قسم کی منصفانہ تقسیم کا ادارہ تھا جس کی سرگرمیاں 1949 کے موسم گرما تک جاری رہی تھیں۔ منصفانہ تقسیم کا یہ انتظام ممکنہ قسط کو نوکنے کے لیے کیا گیا تھا، جنگ کے بعد بہت سے ممالک کو جس کا خطرہ لاحق تھا۔

مگر FAO کا ادارہ محض اس نوعیت کے کام کے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ اس کا سب سے اہم کام دنیا بھر میں زرعی ترقیات اور غذائی خام مال کی پیداوار میں معاونت کرنا تھا۔ بائینڈ آر کی رہنمائی میں FAO اس میدان کا سب سے اہم ادارہ بن چکا ہے۔ اس نے تکنیکی اور اقتصادی مسائل کے ایک سلسلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جن کے حل کے بغیر زرعی ترقیات کے میدان میں کوئی حقیقی پیش رفت ممکن نہیں۔ اس نے بے شمار طریقوں سے نئے انداز کی کاشت کاری کو متعارف کرانے میں معاونت کی ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک بڑی مہم ہے، اس لیے کہ نہ صرف یہ کسانوں کو نئے طریقے سکھائے گی، بلکہ ان طریقوں کے اپنائے جانے کو اقتصادی طور پر قابل عمل بھی بنائے گی۔ ان ممالک میں جہاں زراعت کی ترقی نسبتاً ترقی یافتہ درجے تک پہنچ چکی ہے یہ کام خاصا مشکل ہو سکتا ہے۔ مگر جو کوئی بھی پس ماندہ ملکوں میں رائج قدیم طرزِ زراعت کے طریقوں سے واقف ہو، اس کام کی تکمیل سے اچھی طرح آگاہ ہوگا۔ اور دراصل یہی وہ ممالک ہیں جہاں اس پر عمل کی اشد ضرورت ہے۔

مگر بانڈ آر کے قدم رکے نہیں۔ اس لیے کہ محض زرعی پیداوار میں اضافہ ہی کافی نہیں تھا، یہ بھی ضروری تھا کہ قیمتوں میں تیزی سے ہونے والے اتار چڑھاؤ کو قابو میں لایا جائے اور فاضل پیداوار کی ذخیرہ اندوزی کو بھی روکا جائے۔ خود یہ بھی تو صدی کے تیسرے عشرے میں زندہ تھے۔ انہوں نے کہا تھا، ”حکومتوں کو معقول قیمتوں کے ساتھ منڈی کے وجود کو یقینی بنانا چاہیے، محض کسانوں کے مفاد کے لیے ہی نہیں، مگر اس لیے بھی کہ اس سے تجارت، صنعت اور تمام لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔“ لہذا، انہوں نے ایک World Food Board قائم کرنے کی تجویز پیش کی، جس کو وسیع پیمانے کی ذمہ داری دی جائے۔ یہ ادارہ دنیا کی منڈیوں میں غذا کی قیمتوں کو مستحکم کرے، قلت کو دور کرنے کے لیے غذا کے ذخیرے قائم کرے تاکہ فصلوں کی خرابی کی صورت میں بڑھنے والی قیمتوں کا سہا پہ ہو سکے، ان ممالک کے ہاتھ فاضل ذخیروں کو فروخت کرنے کے لیے سرمایہ مہیا کیا جائے جن کی غذائی ضروریات زیادہ ہوتی ہیں، اور بالآخر عالمی بینک جیسے اداروں سے تعاون کرے، جو زراعت، صنعت اور معیشت کے لیے سرمایہ مہیا کرے تاکہ اس طرح شدہ ہدف کے حصول میں تیز رفتار ترقی ہو۔

World Food Board، جسے ٹھوس انتظامی طاقت دی جانی تھی، کبھی وجود میں نہیں آ سکا۔ یہ ایک دم سے اٹھانے کے لیے [مثالی] بہت بڑا قدم تھا۔ World Food Board کے بجائے، انتظامی طاقت کے بغیر، ایک مشاورتی ادارہ تشکیل دیا گیا، جو FAO کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے قائم کیا گیا تھا۔ 1948 کے موسم گرما میں بانڈ آر نے FAO کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا، مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ عملی زندگی سے فارغ ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے تصورات پر مسلسل کام کر رہے ہیں، جو اپنی وسعت میں بتدریج زیادہ سے زیادہ بسیط ہوتا جا رہا ہے۔ اپنے ابتدائی برسوں میں انہوں نے زرعی مسائل کا ایک کسان اور غذائی ماہر کی نظر سے دیکھتے ہوئے مظاہرہ شروع کیا تھا۔ ایک نوجوان کی حیثیت میں بھی انہوں نے آدمیوں کی غذا، ان کی صحت اور ان کی زندگی کے درمیان رشتوں کے بارے میں آفتیش کی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ایک تعلق ہے زراعت میں، جو وسائل مہیا کرتی ہے، اور بنی نوع انسان میں، جسے اپنی صحت اور اپنے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اسے استعمال کرنا ہوتا ہے۔ پہلے تو وہ اپنے تصورات کے لیے، اپنے ملک میں، اسکاٹ لینڈ اور انگلستان میں لڑے۔ مگر پھر وہ قومی مرحلوں کے پار بھی گئے اور انہوں نے لیگ آف نیشنز کے زیر اہتمام بین الاقوامی سطح پر کام شروع کیا۔ اور اس طرح، پچھلی جنگ کے بعد، ان کو ایسے ادارے کی بنیاد رکھنے کا موقع ملا جو ان کے تصورات کو حقیقت میں بدل سکتا تھا۔

بانڈ آر کبھی اپنے مرکزی مقصد سے نظر نہیں ہٹاتے۔ وہ اس امر پر زیادہ سے زیادہ سختی سے زور دیتے ہیں کہ امن کے لیے اقتصادی معاملات میں بین الاقوامی تعاون کتنا ضروری ہوتا ہے، اور وہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں تیز رفتار اقتصادی ترقی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ”اس طرح پیداوار اور قوت خرید میں اضافہ ہوگا اور زرعی اور صنعتی منڈی کو وسعت ملے گی۔ اس نوعیت کی ترقی نہ صرف بے شمار افراد

کے ہیرو کے لیے ضروری ہے، بلکہ ہماری سائنسی اور تکنیکی تہذیب کے تسلسل کے لیے اور دیہ پا امن کے قیام کے لیے بھی ضروری ہے۔“

وہ اصرار کرتے ہیں کہ سائنس، جس نے ہمیں ہر نوعیت کی تکنیکی پیش قدمی کے لیے وسائل مہیا کیے ہیں، لوگوں کو ایک دوسرے کے اس طرح قریب لے آئی ہے کہ آج جغرافیائی فاصلے بے محسوس ہو کر رہ گئے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ قوی اقتصادی نظام بھی موجود ہیں جو ایک کو دوسرے سے اس طرح علاحدہ رکھتے ہیں جیسے کچھ ہوائی نہ ہو دراصل، ہماری تیسویں صدی ان کو ماضی کے مقابلے میں زیادہ جدا دیکھتی ہے۔ مگر میں بائیںڈ آرگنٹس معنوں میں سمجھ سکا ہوں تو، ہم اسی کو وہ تناؤ کہیں گے جو مختلف ممالک کے معیار زندگی میں عدم مساوات کی بنیاد ہے، جو اب ایک بڑا خطرہ ہے، وہ خطرہ جو ایک نئی جنگ بھڑکا سکتا ہے۔

اور آج کیا کیفیت ہے؟ دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ ان ممالک میں رہتا ہے جو اقتصادی طور پر کم ترقی یافتہ ہیں۔ ان کی آبادی پہلے کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس کے لیے طبی سائنس اب قدیم دور کی بڑے چیلنجز کی وباؤں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ مگر ایک فرسودہ معیشت ہر وقت برستی ہوئی آبادی کو سہارا نہیں دے سکتی جو قحط کے سیلاب کے کنارے کھڑی ہوئی ہو۔ اس کے مقابلے ہمارے سامنے وہ ممالک بھی ہیں جن کی معیشت مضبوط ہے اور پیدائش کی شرح کم ہے۔ ان ملکوں میں نگلی طور پر آبادی کا معیار زندگی بہتر ہوا ہے اور مستقل اوپر جا رہا ہے۔

عدم مساوات سے ملکوں کے درمیان تناؤ پیدا ہوتا ہے، جو آج کل اس لیے زیادہ محسوس ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ نے قوموں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا ہے۔ زیادہ دولت مند ملکوں کے بارے میں بقیہ دنیا کی معلومات پہلے سے زیادہ ہیں، اس لیے کہ کم ترقی یافتہ ممالک کے بے شمار باشندے یورپ اور ریاست ہائے متحدہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایک بار یہ دیکھ لیں کہ لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں تو لوگ فطری طور پر طے کر لیتے ہیں کہ بہت کم عمر سے میں، ان کے اپنے ملکوں کا معیار زندگی بھی ایسا ہی ہو جائے۔ جب تک ہم اپنے تمام وسائل پس ماندہ ملکوں کی معیشت کی مدد کے لیے وقف نہیں کر دیتے، یہ تناؤ بڑھ کر ایک دن دھماکے کے نقطے پر پہنچ سکتا ہے۔

بائیںڈ آرگنٹس بات کا احساس ہو گیا ہے، جو شاید بہت کم لوگوں کو ہوا ہوگا، اور یہ تو ان کا زندگی بھر کا کام ہے، کہ وہ ہمیشہ تناؤ کو کم کرنے کے طریقے تلاش کرتے ہیں۔ ایک حقیقت پسند انسان ہوتے ہوئے، جو وہ واقعی ہیں بھی، انھوں نے مادی اور عملی درجے کے منصوبے بنائے ہیں: ”قوموں کو یک جا ہو کر ٹھوس اور عملی سوالات پر گفت و شنید کرنے دیجیے، جنہیں وہ اپنی نوع انسان کے مفاد میں سمجھتے ہیں، تب ہی وہ بات کر سکیں گے اور ہم آہنگ بھی ہو سکیں گے۔ اگر وہ مرحلوں اور حلقہ اثر پر بات شروع کر دیتے ہیں تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔“

یہ خیال بالکل نوٹیل انعام یافتہ شخصیت جین ایڈمز (Jane Addams) جیسا ہے جو اپنی کتاب

Peace and Bread میں کہتی ہے کہ ”بالآخر [ایک دن آئے گا جب] کرۂ ارض کے خاکسار ترین کروڑوں محنت کش انسانوں کے ہاتھوں قوموں کی ایک حقیقی سوسائٹی وجود میں آئے گی، جن کی زندگیاں محض اپنے اور اپنے اہل خاندان کے لیے دال روٹی مہیا کرنے میں ہی ختم ہو جاتی ہیں۔“

بائیز آرکبھی بھلا نہیں سکے ہیں کہ ایک عام انسان کس طرح سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ اس ضمن میں کسانوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک عام آدمی بھی جنگ سے نفرت کرتا ہے، اور اس شے سے بھی نفرت کرتا ہے جو اس [جن] کی طرف داری کرتی ہے۔ انھیں اس بات سے بھی نفرت ہے، اور وقت کے گزرنے کے ساتھ، امن کا تصور بھی ان پر زیادہ حاوی ہو گیا ہے۔ 1945ء میں، وہ قومی امن کانفرنس کے صدر منتخب کیے گئے تھے جو پچاس فی صد سے زیادہ امن کے اداروں کی نمائندگی کرتی ہے، اور اس برس انھوں نے نئی World Union of Peace Organizations کی صدارت کا منصب قبول کر لیا ہے۔ وہ World Movement for World Federal Government کے بھی صدر ہیں۔

ان اداروں میں ان کی رکنیت ان کی دوسری سرگرمیوں سے مکمل طور پر موافقت رکھتی ہے۔ یہ ہمیشہ ان لوگوں کے خلاف رہے ہیں جو قومی سرحدوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں؛ جو اپنے حاکمیت کے حقوق کو سب سے بالا رکھتے رہے ہیں۔ یہ کبھی امن کے بارے میں بات چیت میں بلند و بالا الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ جو کچھ بھی کہتے ہیں سیدھے اور مادہ الفاظ میں کہتے ہیں۔

عمر، ان کی کامیابیاں لا انتہا ہیں۔ چند ہی لوگ ایسے ہیں گے جو دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انھوں نے انسانیت کے لیے منصوبہ بندی کی ہے اور ایسے کام کیے ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں جیسے انسانیت؛ وہ کام جو صاف طور پر امن کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔

انسانیت کی خدمت میں ایسے ہی عظیم کام کے لیے، جو ایک بار شروع کر دیے جائیں تو کبھی روکے نہیں جاسکتے، وہ بجا طور پر نوبل امن انعام کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔

صدر نشین، روڈیائی نوبل کمیشن Gunnar Jahn کی نوابی

خطبہ:

سائنس اور امن

نوبل امن انعام کا عطا کیا جانا پہلے درجے کی اہمیت کا ایک بین الاقوامی واقعہ ہوتا ہے۔ یہ تمام ملکوں کے عوام کی دلچسپیوں کو ہمیز کرتا ہے اور ان کی توجہ مرکوز کرتا ہے ان اداروں کے مقاصد کی طرف یا ان چنیدہ

لوگوں کے تصورات کی طرف، جنہیں اس اعزاز کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ لہذا یہ نہایت مناسب ہے کہ اس خطبے میں جو قوانین کے مطابق انعام پانے والے کو دینا پڑتا ہے، امن کے امکانات اور اس کے حصول کے بہترین طریقوں کے بارے میں اپنے تصورات پیش کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس خطبے میں جنگ کی وجوہ کو دور کرنے کے امکانات، عالمی اتحاد و امن کے ایک نئے دور کے حصول کے لیے، اور فطرت کی قوتوں پر انسان کو سائنس کی فراہم کی ہوئی بالادستی کی نئی طاقتوں کے دانش مندانہ اطلاق پر غور کروں۔

جنگ کی قدیم روایت

ہماری تہذیب کی تاریخ وقتاً فوقتاً ہونے والی جنگوں سے بھری پڑی ہے۔ پچھلے پانچ یا چھ ہزار برسوں میں، فتوحات کی جنگوں کے نشے میں چورہ ایک کے بعد دوسری سلطنتیں وجود میں آئی ہیں اور اندرونی انقلاب یا بیرونی حملوں سے ملیا میٹ بھی ہوئی ہیں۔ مگر طاقت کا مرکز کا ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہوتا رہا ہے، پھر بھی سیاسی اور اقتصادی ڈھانچوں کے انداز میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اسلحے کی طاقت کے ذریعے علاقوں میں اضافہ تمام بڑی طاقتوں کی پالیسی رہی ہے، اور اپنی ریاست کے مذہب سے اس کی منظوری ہمیشہ ممکن ہوئی ہے۔ دشمن کے چھوٹے خداؤں کی تباہی نے، جو سچے مذہب کے لیے خطرہ ہوں، ہمیشہ خوف اور نفرت کے پروپیگنڈے کو جواز بنایا ہے، تاکہ ایک سپاہی کی دوسرے سپاہی کو جس سے کوئی لڑائی نہ ہو ہلاک کرنے کی فطری بے دلی پر قابو پایا جاسکے۔ کچھ جنگیں حکمرانوں کی طاقت اور اثرات کی خواہش کی بنا پر، یا ماضی کی کسی شکست کا بدلہ لینے کے لیے کی جاتی ہیں۔ مگر زیادہ تر ان کی بنیاد معاشیاتی ہی رہی ہے: تجارت کے لیے غیر ملکی کے علاقوں کی فتوحات، یا اس سر زمین کی جس میں وافر مقدار میں زرعی یا دوسرے وسائل ہوں۔ اس زمانے میں، کچھ ملکوں کی خارجہ پالیسی میں قتل پیدا کرنے والی زمیں ایک اہم عنصر ہے۔

اگر جو کچھ میں پیش کرنے جا رہا ہوں سچ ہو تو گویا ہم مقابلہ کرنے والی سلطنتوں کے عہد کی ابتدا پر پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے کہ افریقہ، نو بیل نے جس کی پیش بینی کی تھی وہ واقع ہو چکا ہے۔ سائنس نے ایسے طاقت ور ہتھیار تیار کیے ہیں کہ بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ میں نہ کوئی فاتح ہوگا نہ مفتوح۔ دونوں ہی پر تباہی غالب آجائے گی۔ ہماری تہذیب اس وقت جنگجو سلطنتوں کے عہد اور عالمی اتحاد و امن کے عہد کے درمیان کی تبدیلی سے گزر رہی ہے۔

سائنس سوسائٹی کو ڈھالتی ہے

اگرچہ کاروبار ریاست سلطنتوں کے عروج اور زوال سے بچا نکلا ہے، علم میں ہر اضافہ، سیاسی، اقتصادی اور سماجی ڈھانچے میں تبدیلی کا باعث ہوا ہے۔ اس طرح، مثال کے طور پر، ہندوؤں میں بارود کے استعمال

نے یورپ میں جاگیر داری کے نظام کو ختم کر دیا تھا۔ بھاپ سے چلنے والی مشین کی ایجاد نے، تمام تر اقتصادی اور سماجی تبدیلی کے ساتھ، میکینیکی صنعتی انقلاب کی راہ دکھائی۔ نئے خیالات کی پیدائش اس سے بھی زیادہ اہم تھی۔ سچپائی کی ایجاد سے ہونے والی نتائج ثانیہ نے یورپ، امریکا اور برطانوی سلطنت کے جمہوری نظام سے پیدا ہونے والے فرد کے حقوق اور وقار کے انقلابی خیالات کا پرچار کیا۔ یہ چند مثالیں انسانی سوسائٹی کے ڈھلچنے پر دانش کی ترقی کے اثرات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ہمارا مہمندانہ سماج میں نئی دانش کی تحریک سے ہونے والی لگاتار ترتیب سے بن کر تیار ہوا ہے۔

مگر جدوجہد کے بغیر یہی ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ ہر ناگزیر تبدیلی جو وابستہ مفاد کے لیے خطرہ ہوتی ہے یا قدیم عقائد پر قائم مقتدر کو کمزور کرتی ہے اسے طاقت رکھنے والے لوگ برداشت نہیں کرتے۔ جب سوسائٹی کا تانا بانا اس قدر سخت ہو جاتا ہے کہ یہ جلد تبدیل نہیں ہو سکتا تو سماجی بے چینی اور انقلابات سے ہم آہنگی پیدا کی جاتی ہے۔ انگلستان میں اس نئے نظریے کو قائم کرنے کے لیے کہ بادشاہ کے حقوق ایک عام آدمی کے حقوق سے زیادہ مقدس نہیں ہوتے، ایک خانہ جنگی کی ضرورت پڑی تھی۔ موروثی اشرافیہ کو اس بات پر قائل کرنے کے لیے ایک فرانسیسی انقلاب کی ضرورت پڑی تھی کہ اس کی جاہل حکمرانی کے دن ختم ہو چکے تھے اور ایک قدیم نوعیت کی حکومت سے جواز کار رفته ہو چکی تھی، جان چھڑانے کے لیے روسی انقلاب کی ضرورت پڑی تھی۔ جب انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب سے سرمایے میں تیزی سے تبدیلی ہوتی تھی، اور مزدوروں نے سرمایے میں سے ایک جائز حصہ طلب کیا تھا تو ان کے مطالبے کو ہڑتالوں اور بلوے کے بعد ہی قبول کیا گیا تھا۔

جدید سائنس کی طاقت

پچھلے پچاس برسوں میں سائنس نے جتنی ترقی کی ہے وہ دو ہزار برسوں میں بھی نہیں ہوتی تھی، اور بنی نوع انسان کو فطرت کی طاقتوں سے اتنی زیادہ طاقت دی ہے، قدیم لوگ جسے اپنے خداؤں سے منسوب کرتے تھے۔ جوہری بم کے مقابلے میں *thunder bolt or Jove* ایک معمولی سی چٹکاری تھی، خداؤں کا پیغام رسالہ مریخ، جس کی ایندنیوں میں پیرنگے ہوئے تھے ریڈیو کے مقابلے میں ایک ست تر گھوڑا گاڑی، پردی کہانیوں کے اڑنے والے جادوئی قالین کے مقابلے میں اوقیانوس پار کرنے والا ہوائی جہاز۔ حیوانی سائنس میں اگرچہ ترقی حیرت انگیز ہوتی ہے مگر اتنی پیٹم کشا بھی نہیں۔

جب سے بنی نوع انسان نے یہ نئی قوتیں حاصل کر لی ہیں، فرد کے حقوق کا تصور، یورپ میں جس کی ابتدا ہوئی تھی، ایسی تبدیلیوں کا باعث ہوا ہے کہ وہ رنگ دار نسلوں تک پھیل گیا ہے اور وہ بھی حرکی ہو گئے ہیں، اور انہی معیار زندگی کے طالب ہیں جو سفید فام نسل کے لوگوں کو حاصل ہے۔

موجودہ عالمی انقلاب اس وجہ سے ہے کہ انسانی سوسائٹی کو جدید سائنس کی قیامت خیز ترقی سے ہم آہنگ

کرنے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ [لہذا] نئی طاقتوں کے قیام اور نئے ممالک کے مطابق تبدیلیاں ناگزیر ہو گئی ہیں۔

اب ہم ایک مختصر سی دنیا بن گئے ہیں

سب سے اہم تبدیلی ریڈیو اور ہوائی جہاز کی پیدا کردہ ہے۔ نقل و حمل اور مواصلات کو اگر وقت سے ناپا جائے تو پورا کول کر دیا اب سو برس قبل کے ایک چھوٹے سے یورپی ملک کے برابر ہو گیا ہے۔ دنیا اب اتنی چھوٹی ہو گئی ہے کہ کسی ملک کا کوئی بڑا واقعہ سب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یونان یا چین کی خانہ جنگی میں اب غیر ملکی حکومتیں عملی طور پر شامل ہو جاتی ہیں، امن قائم کرنے کی ثالثی کے لیے نہیں، بلکہ اس فریق کی شکست کے لیے جس کی فتح، مداخلت کرنے والی طاقت کے مفاد کے منافی ہوگی۔ اطالیہ میں ہونے والا انٹیشن اب ایک خالص قومی معاملہ نہیں ہوتا، اب یہ دو قوموں کے گروہوں کے درمیان کا ایک مقامی مقابلہ بنتا ہے، جس میں ہر فریق دوسرے فریق کے سیاسی نظریات کے پھیلاؤ سے خوف زدہ ہوتا ہے، اور تقریباً اتنی ہی دلچسپی واشنگٹن، لندن اور ماسکو میں بھی لی جاتی ہے جتنی کہ روما (Rome) میں۔ برطانیہ پاؤنڈ کی قیمت میں کمی کرتا ہے۔ چند دن کے اندر ہی میں دوسرے ممالک کو اپنے سٹک کی قیمت میں کمی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور تمام قوموں کو اپنے مالیاتی اور تجارتی معاملات میں مناسب تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں۔ اس فیصلے کے رد عمل میں جو ایک ملک کے چند افراد نے کیے تھے۔ اب ہم طبعیاتی، سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے ایک چھوٹی سی دنیا بن گئے ہیں اور قومیں ایک دوسرے پر اتنی منحصر ہو گئی ہیں کہ اب قوموں کی مکمل قومی حاکمیت ممکن نہیں رہی۔ خواہ یہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، بین الاقوامی قانون اور اس کے نفاذ کے ساتھ کسی قومیت کی ایک عالمی حکومت، اب ناگزیر ہو گئی ہے۔

جدید ٹیکنالوجی

میں نے یہ دیکھانے کی کوشش کی ہے کہ سائنس نے ہوائی جہاز اور اٹومرلٹس تیار کر کے ایک نیا بین الاقوامی سیاسی ماحول پیدا کر دیا ہے، حکومتوں کو جس کے مطابق اپنی خارجہ پالیسی ترتیب دینی پڑتی ہے۔ سائنس نے تقریباً، اتنے ہی اہم صنعتی حالات بھی پیدا کر دیے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی پیش قدمی سے، کم سے کم افرادی طاقت سے زیادہ سے زیادہ مصنوعات تیار کی جا سکتی ہیں۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد صنعتی پیداوار اقتصادی مسئلہ نہیں رہ گئی تھی۔ مسئلہ منڈیوں کی تلاش کا تھا جن میں صنعت و حرفت اور زراعت کی پیداوار پیش کی جاسکے اور استعمال کے لیے فروخت کی جاسکے۔

انیسویں صدی کی اقتصادیات اس کا صرف یہی حل پیش کر سکتی تھیں کہ پیداوار کو معاشی طلب کے مطابق کم کر دیا جائے۔ زمینیں زراعت سے خالی ہو گئیں، جب کہ انسان بھوکے تھے۔ کارخانے بند پڑے

تھے، جب کہ ان میں پیدا کی جانے والی مصنوعات کی فوری ضرورت تھی۔ بے روزگاری ریاست ہائے متحدہ میں بڑھ کر دس ملین سے زیادہ ہو گئی تھی، برطانیہ میں تقریباً تین ملین، اور جرمنی میں چھ ملین۔ عالمی تجارت کم ہو کر ماضی کی سطح کا ایک معمولی حصہ رہ گئی تھی۔ اقتصادی نظام ٹوٹ پھوٹ کر ترو بالا ہو گیا، اس لیے کہ یہ سائنس کی پیدا کردہ دولت کا بوجھ نہیں سہا سکتا تھا۔

1933 کی اقتصادی کانفرنس میں وائی کاؤنٹ برائس (Viscount Bruce) نے حکومتوں کو تنبیہ کی تھی کہ وہ اقتصادی نظام جس نے اپنی بقا کے لیے پیداوار اور اس کی تقسیم میں کمی کر دی ہو، جس کی فوری ضرورت ہے، زیادہ دن چل نہیں سکے گا۔ اس نے تباہی کی پیشین گوئی کی تھی اور تباہی آئی۔ بے روزگاری کا علاج پہلے جرمنی میں ہوا، اور اس کے بعد دوسرے ممالک میں [مگر] دوسری عالمی جنگ کے لیے اسلحہ کی پیداوار سے۔ پچھلی جنگ کے دوران پیدا کی جانے والی برائے شے کے لیے منڈی موجود تھی، [اور] امریکا اور کناڈا کی پیداواری صلاحیت، جو جنگ کے علاقے سے باہر تھے ایک سو فی صد بڑھ گئی تھی۔ جو کچھ امریکا اور کناڈا نے کیا ہے، ہر ملک کر سکتا ہے۔ اب تقریباً دنیا کا ہر ملک، جتنی جلد ممکن ہو، تیزی سے صنعتی ہوتا جا رہا ہے۔ جنگ کے بعد کی پیداواری طاقت پوری کر دی گئی ہے، اور [اب] منڈیوں کے لیے لڑائی شروع ہو گئی ہے۔ جرمنی اور جاپان کا کیا مقام ہوگا جب وہ اپنی قبل از جنگ کی پیداواری صلاحیت دوبارہ حاصل کر لیں گے جب کہ چین اور دوسرے ممالک، جن کے مزدور امریکی اور یورپی ممالک کے مزدوروں کے معیار زندگی سے کہیں کم درجے پر بھی مطمئن ہوں گے، اور صنعت و حرفت میں ابھر کر برآمدی منڈی کی لڑائی میں شریک ہو جائیں گے؟ تو کیا ہمیں ایک بار پھر مال کی رسد کی کم ہوتی ہوئی اقتصادی طلب کا علاج پیداوار میں کمی سے کرنا ہوگا؟ یا تمام حکومتیں ایک نئے اقتصادی نظام کے لیے آپس میں تعاون کریں گی جو جدید سائنس کی پیداوار کی کھپت کے لیے ایک یقینی منڈی فراہم کریں گی؟

اگر پیداوار سے انسانی ضروریات پوری کی جائیں تو منڈی کے بارے میں کوئی دشواری نہیں رہے گی۔ جب ریاست ہائے متحدہ بے روزگاری سے جنگ کر رہی تھی، انجمنی صدر روز ویلٹ کہتے تھے کہ خراب فضا، خراب لباس اور خراب گھر والے اتنے لوگ موجود ہیں کہ اگر ان سب کی ضروریات پوری کر لی ہوں تو ہر مرد اور ہر عورت کے لیے کام ہی کام ہوگا، بشرطے کہ وہ کام کرنے پر آمادہ ہوں۔ اگر ریاست ہائے متحدہ سے متعلق یہ بات سچ ہے تو پوری دنیا کے لیے بھی یہ بات کتنی سچ ہوگی، جہاں تین ملین سے دو آدمی قبل از وقت مر جاتے ہیں، اس لیے کہ ان کو زندگی کی ضروریات میسر نہیں ہوتیں۔ ایشیا میں ہونے والی اچانک تیزی، جس کا تمام رنگ دار نسلوں میں پھیلاؤ لازمی ہے، بنیادی طور پر ایک بغاوت ہے بھوک کے اور افلاس کے خلاف۔ اس وقت تک دنیا میں امن نہیں ہو سکے گا، جب تک کہ آبادی کا بڑا حصہ یہ سمجھتا رہے گا کہ سیاسی اور اقتصادی تبدیلی ہی ان کی ضروریات زندگی پوری کر سکے گی۔ [لہذا] دنیا کے امن کو براہ راست کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔

شمولیت بذریعے فتوحات کو اتحاد بہ رضامندی ہونا چاہیے

میری پیش کردہ رائے اگر صاحب ہے تو ہم سوچ سکتے ہیں کہ [اس پر عمل سے] علم کی ترقی کے ساتھ ہمارا تمدن ترقی کرے گا، چھوٹے سے بھٹکے ہوئے قبیلے سے لے کر بڑی مستحکم کمیونٹی تک سب ایک قانون کے تحت ضم کر دیے جائیں گے، جن پر ایک حکومت کو قانون نافذ کرنے کا اختیار ہوگا۔ نقل و حمل اور ریل و سرائی میں ترقی کے وجہ سے ہر کمیونٹی بڑی ہوگئی، اور ان کے زیر اثر علاقے رقبے میں بڑے ہو گئے۔ اس طرح، بڑی ریاستیں اور سلطنتیں ظہور میں آئیں، جن میں ہر ایک کے اپنے اپنے قوانین، اپنی اپنی روایات و مذاہب اور فوجیں تھیں، جن کے ذریعے فتوحات سے علاقوں کو وسعت دی جاتی تھی، یا ہمسایہ ملکوں کی جانب سے ہونے والے حملوں کا دفاع کیا جاتا تھا۔ حالیہ دنوں میں، بارود کے استعمال اور جنگ و جدل میں دوسری تکنیکی ترقیات سے یورپی قوموں نے عملی طور پر پوری دنیا کو قابو میں کر لیا ہے۔ کرۂ ارض کا چوتھائی رقبہ اور اس میں بسنے والے برطانوی سلطنت کی ایک حکومت کے زیر نگیں ہو گئے ہیں۔

فتوحات سے قائم کی جانے والی سلطنتوں کا زوال ہمیشہ یا تو بغاوت سے ہوا ہے یا کسی حریف سے شکست کھانے سے۔ اب ہم فتوحات سے اتحاد بہ رضامندی کی جانب بڑھ رہے ہیں جس میں ہر ریاست اپنی حکومت کے ذریعے اپنے داخلی معاملات کو سلجھائے گی، مگر یہ سب ایک مرکزی حکومت کے ذریعے متحد ہوں گے، جن میں بین الاقوامی معاملات کے لیے قوانین ہوں گے اور اتحاد کے اندر جنگ نہیں ہوگی۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، وائٹلیس اور ہوائی جہاز نے دنیا اتنی چھوٹی کر دی ہے اور قوموں کو ایک دوسرے کا اتنا دست گھر کر دیا ہے کہ اب جنگ کا صرف ایک ہی متبادل ہے: ایک عالمی ریاست ہائے متحدہ۔

عالمی ریاست کی تشکیل کی کوشش

پہلی عالمی جنگ کے دوران لیگ آف نیشنز کی صورت میں ایک عالمی حکومت کی تجویز امریکا کی جانب سے آئی تھی۔ [البتہ] لیگ کی تختیر کرنا غلطی ہوگی۔ یہ گمان اتنا صائب تھا کہ تقریباً کامیاب ہو گیا تھا۔ کروڑوں افراد کو مایوسی ہوئی جو سمجھتے تھے کہ اس سے ایک نئے عہد کی ابتدا ہوگی [مگر] یہ [تجویز] ناکام ہو گئی۔

اس کی ناکامی کی دو وجوہ بیان کی جاسکتی ہیں۔ اقتصادی تصادم اور جنگوں کی طویل رزالت کے باعث، یورپی حکومتیں ایک عالمی ریاست بنانے میں اپنا حصہ ڈالنے کے بجائے اپنے خود غرضانہ مفادات کی فکر کرتی تھیں۔ یہ سیاست میں بہت زیادہ اور اقتصادیات میں بہت کم دلچسپی یعنی تھیں۔ صرف مفادات کی کمیونٹی ہی سے ایک عالمی کمیونٹی بن سکتی ہے۔ امن کی راہ صرف حکومتوں کے ایسے تعاون سے ہی ملتی ہے

جس کے ذریعے کرم ارض کے وسیع وسائل کی ترقیات سے سب فیض یاب ہو سکیں۔ یہ بات معنی خیز ہے کہ لیگ کا جو کام باقی رہ گیا تھا وہ غیر سیاسی تعاون سے متعلق تھا، جیسے کہ International Labour Office اور World Food Plan کا ابتدائی کام، جس کو 1943 کی Hot Springs Conference نے دوبارہ شروع کیا تھا، جس کا انعقاد صدر ریاست ہائے متحدہ کی ایما پر کیا گیا تھا۔

لیگ کا مقصد تصور [مثالی] قبل از وقت تھا اس لیے کہ قدیم خارجہ سفارتی معاملات کے بڑے ماہر سیاست دانوں کو یہ احساس نہیں تھا کہ انیسویں صدی کی سیاست اور اقتصادیات ہیں ویں صدی کے مائنس کے مہارے نہیں چل سکیں گی۔ انھوں نے مابعد جنگ کی تباہ شدہ دنیا کو پرانے طریقے سے بحال کیا تھا۔ 1929 کے اقتصادی بحران میں یہ متزلزل ہوئی اور دوسری عالمی جنگ میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔

اقوام متحدہ

دوسری عالمی جنگ کے بعد عالمی حکومت بنانے کی ایک اور کوشش کی گئی تھی۔ لیگ کے مقابلے میں اقوام متحدہ ایک بہتر ادارہ ہے۔ اسمبلی اور سلامتی کاؤنسل کے علاوہ، جہاں خارجہ دفتروں کے مندوبین ملاقات کرتے ہیں، اس میں خاص قسم کی ایجنسیاں بھی ہیں۔ Food and Agriculture Organization، World Health Organization اور Economic and Social Council جن کے ذریعے قومیں مائنس کے اخلاق سے کرم ارض کے وسائل پر کام کرتی ہیں۔ اور عالمی بینک بھی ہے، جو انھیں کام کرنے کے لیے مالی معاونت فراہم کرتا ہے۔ بالآخر، اب نئی نوع انسان کے پاس وسائل ہیں جن کے ذریعے حکومتیں بھوک، افلاس، بیماریاں ختم کر سکی ہیں اور زراعتی، صنعتی اور تجارتی خوش حالی کو مستحکم کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ عوام کی بنیادی ضرورتیں گرم و سرد دبا زاری میں اوپر نیچے نہیں ہوتی۔

ضروری نہیں کہ ترقیات کے نھوں منصوبے سیاسی نظریات سے متصادم ہوں۔ مزید فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں طے شدہ مقداری یا معیاری اصطلاحات گندم کوٹھی اور ٹکڑی کو معیار۔ کے ذریعے زیر بحث لایا جاسکتا ہے، جن میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہو سکتی، جیسی کہ سیاست دانوں کے مذاکرات میں ہوتی ہے، جب وہ غیر متعین اور تجربی اصطلاحات جیسے جمہوریت، یا اشتراکیت، یا سرمایہ داری وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں جن کو بغیر کسی معنی کے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ ان بین الاقوامی اداروں کے کام میں تعاون بہتر اتفاق رائے اور دوستی کا باعث ہو سکتا ہے جو سیاسی مسائل کے حل میں سہولت پیدا کرتے ہیں۔ یہ ادارے World Ministries of Food, Health, Labour, Trade and Finance اور ایک عالمی حکومت کے روپ میں ابھر سکتے ہیں۔

بدقسمتی سے اقوام متحدہ کی ان ایجنسیوں کے پاس نہ اختیار ہے اور نہ سرمایہ، جو ضروری ہوتا ہے اس کام میں، جس کے لیے ان کو قائم کیا گیا تھا۔ اگر وہ سائید حکومتیں جو اس سے اتفاق کرتی ہیں اور [اب تک]

انھیں صرف زبانی جن خرچ کا آدرش دیا ہے تو وہ اس امر سے متفق ہوں گی کہ ہر تین سگوں میں سے جو وہ جنگ کی تیاریوں کے لیے وقف کر رہی ہیں، ایک سکے ان انجینیئروں کے لیے بنائے گئے ہیں الاقوامی فنڈ میں جائے گا۔ اور اگر اس سے بھی متفق ہوں گی کہ ان [اداروں] کو ملک کی اجازت کے بغیر داخلی امور میں مداخلت کا حق بہت اختیار بھی ہوگا تو میں یہ پیش بندی کرنا چاہوں گا کہ سیاسی مسائل جو قوموں کو آپس میں تقسیم کر دیتے ہیں، بے معنی ہو جائیں گے اور امن کے راستے میں حائل رکاوٹیں بھی دور ہو جائیں گی۔

سابق نائب صدر ریاست ہائے متحدہ، مسٹر ہنری وولیس (Henry Wallace) کو یہ کہنے پر ہمام کیا گیا ہے کہ اقوام متحدہ کا کام صرف یہ ہے کہ Hottentot [افریقا کے قبیلے Khoi کی بددیانت عورتوں کو کہا جاتا تھا جن کو تماشے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا] ماؤں کو روزانہ ایک پائست دودھ فراہم کیا جائے۔ واقعی یہ عمل ایک عالمی حکومت کے بلند ترین آدرش کے مطابق ہوگا۔ جن مام نہاد عیسائی قوموں کو عام انسانی برادری کے اعتراف کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اور امن کے عظیم شہزادے کی، بھوکوں کو کھلانے کی مثال پیش کی جاتی رہے جس سے انھیں اپنے دکھوں اور بیماریوں سے نجات ملے، تو دنیا میں ایسا نیا جذبہ ابھرے گا کہ اس کے سامنے جنگ کے تمام مکروہ تصورات ماند پڑ جائیں گے۔

اقوام متحدہ، جنگ کا متبادل

کچھ کا خیال ہے کہ اقوام متحدہ نے 1946 کی بلند بالا امیدوں کو پورا نہیں کیا ہے، اس لیے یہ ناکام ہو گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ، اگرچہ یہ ایک فو زائیدہ ادارہ ہے، اس نے مقامی جنگوں کو روکنے اور قوموں کو علاقائی، زرعی اور اقتصادی ترقیات میں تعاون پر آمادہ کرنے میں بہت کام کیے ہیں۔ جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ قوموں کے درمیان تعاون کی نئی پالیسی، پچھلے پانچ ہزار برسوں کے دور سلطنت کی مسابقتی پالیسی کے مقابلے میں بالکل برعکس ہے، تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ جہد ملی میں ان لوگوں کی طرف سے مزاحمت ہوگی جو قدیم ماضی کی سیاست کے تربیت یافتہ ہیں۔ وہ لوگ جو دنیا کے اتحاد کو ناقابل حصول، بلکہ ناگوار آدرش سمجھتے ہیں، انھیں سوچنا چاہیے کہ طاقت کی سیاست کا تسلسل جنگ پر منتج ہوگا، جس کے لیے، دراصل، اب ہماری بخار زدہ حکومتیں زور شور سے تیاریاں کر رہی ہیں۔ ہمیں حالات کا سامنا کرنا چاہیے، اور اخراجات کا تخمینہ لگانے سے پہلے ہی جنگ میں کود نہیں پڑنا چاہیے۔

اعلیٰ درجے کے مقدر حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ ہر ماہ جو ہری بم سے دس سے بیس ملین افراد تک مارے جائیں گے۔ اور یہ قیاس کیا جاسکتا ہے دشمن کے پاس بھی تھوک کے حساب سے افراد مارنے کے کچھ نئے ہتھیار بھی ہوں گے۔ انسان بہت جلد اس کا رفاقی سے آگے بڑھ جائے گا۔ ایک امریکی سینئر نے کہا ہے کہ اس بات کا امکان ہے کہ ہیروشیما پر گرائے جانے والے بم سے ہزار گنا طاقت ور بم بن جائے گا۔ اس کے بعد یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ جو ہری بم کے مقابلے میں حیاتیاتی بم زیادہ آسانی سے موت سے ہم کنار

کرتے ہیں۔ جس علاقے کی طرف ان کا رخ ہو وہاں کی پیپس فی صد آبادی ماری جاسکتی ہے۔ ہمیں تنبیہ کی جا چکی ہے کہ ایسے ہتھیاروں سے کی جانے والی جنگ کے بعد ہماری دنیا ایسی ہوگی جس میں ہمدان نام کی کوئی شے، جیسی کہ ہم دیکھتے ہیں باقی نہیں رہ جائے گی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جوہری بم استعمال نہ کرنے کے بین الاقوامی معاہدوں سے جنگ کی خوف انگیز دہشت نام کی سے بچا جاسکے گا۔ یہ ایک امید لا حاصل ہے۔ جب بارود ایجاد ہوا تھا، اس کو اتنا وحشیانہ ہتھیار سمجھا جاتا تھا کہ کھیرانے، لمحوں کے علاوہ، ہر ایک کے خلاف اس کے استعمال پر پابندی عائد کر دی تھی۔ [مگر] اس نے توپ اور بکتر بند ہتھیاروں کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ کوئی مذہبی یا اخلاقی اصول جنگ کے دوران استعمال کیے جانے والے ہتھیاروں پر پابندی نہیں لگائے گا، جو بذات خود انکار ہے دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے بنیادی اصولوں سے۔ صرف انتقام کا خوف ہی اسے روکتا ہے۔ پہلی جنگ کے دوران ریاست ہائے متحدہ امریکا نے انہیں استعمال کیا تھا، جسے انتقام کا کوئی خوف نہیں تھا۔ [مستقبل کی] ایک اور جنگ میں، جو اس وقت اقتدار میں ہیں، ہٹلر اور اس کے ساتھیوں کے نیوہمبرگ (Nuremberg) کے مقدمے کے دوران ہونے والے حشر کے باوجود، آخری وقت میں کوئی بھی ہتھیار استعمال کرنے سے باز نہیں آئیں گے، جو ان کے قبضے میں ہوگا۔ محدود جنگ ناممکنات میں سے ہوتی ہے۔ کسی مخصوص ہتھیار کو غیر قانونی بنانے سے زیادہ آسان ہوگا کہ خود جنگ ہی کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے۔

کہتے ہیں کہ خدا جنہیں تباہ کرنا چاہتا ہے پہلے انہیں پاگل بنا دیتا ہے۔ یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ خوف اور نفرت کے پروپیگنڈے کی پیدا کی ہوئی نفسیاتی کیفیت تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ 'کوائینو سار' کی طرح جس نے اپنے آپ کو دفاع کے لیے زہر بکتر سے ڈھک لیا ہو، یورپی ہمدان جدید سائنس کے پیدا کیے ہوئے نئے حالات میں خود کو ڈھلنے میں ناکام ہونے کے باعث ہٹ سکتا ہے اور انسانی سہاگنی کے ارتقا کی رہنمائی کو، نوجوان اور زیادہ امن پسند ایشیائی ہمدان کے حوالے کر سکتا ہے۔

عالمی امن اور اتحاد کا راستہ

جن کے ہاتھوں میں قوموں کی تقدیر ہوتی ہے، اگر انہیں اخلاقی اور مذہبی اصولوں کے ذریعے جنگ سے روکا نہ جاسکے تو یقیناً انہیں شعوری خود غرضی سے روکا جانا چاہیے۔ جدید ہتھیاروں سے لڑی جانے والی جنگ اور اس کے بعد کی بے ترتیبی میں اس بات کا یقین نہیں ہوتا تھا کہ موجودہ رہنما اقتدار میں رہیں گے بھی یا نہیں، اور ان میں سے زیادہ زندہ بھی رہیں گے۔ دفاعی جنگ کی تیاری میں پہلے حملے کو کم تر نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ مشتعل سیاسی فضا میں کوئی معمولی سا واقعہ بھی ایسی جنگ کا باعث ہو سکتا ہے، جسے کوئی بھی نہیں چاہتا۔

امن کی جانب پہلا قدم تناؤ کو کم کرنے کے لیے اٹھنا چاہیے۔ اس کے لیے پرمکون ماحول میں موجودہ خطرناک حالات پر غور و خوض کیا جانا چاہیے۔ سب سے اہم تناؤ وہ ہے جو اس وقت اشتراکی روس اور سرمایہ دار امریکا کے درمیان ہے۔ دونوں کہتے ہیں کہ وہ امن کے خواہاں ہیں۔ لہذا، انھیں ایک دوسرے کے خوف سے آزاد ہو جانا چاہیے، اس خیال سے کہ دنیا کبھی ماسکو یا واشنگٹن سے مغلوب نہیں ہوگی۔ یوگوسلاویہ اور چین سے ملنے والے سبق بڑے واضح ہیں۔ نہ ہی اشتراکی یا سرمایہ دارانہ نظریات کو غداروں کے ذریعے اندرونی نفوذ (infiltration) سے، یا براہ راست حملے سے تباہ کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ تناؤ کو [صرف] خوف اور نفرت کے پروپیگنڈے سے کم نہیں کیا جاسکتا۔ شاید اس کو نئے طریقے سے کم کیا جاسکے، اس سے ابتدا کرتے ہوئے جسے اپنی کیفیت کے بارے میں پورا یقین ہو، جس میں ہر طاقت، دوسری طاقت کو ہر قابل ذکر کام یا بی بی پر پورا کریڈٹ بلکہ چاہلوی بھرا کریڈٹ دے، جہاں تک ممکن ہو، ان مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے جو اتفاق کا باعث ہوں۔

لہذا، مثال کے طور پر، ہمارے اشتراکی دوستوں کو اعتراف کرنا چاہیے کہ ظالمانہ سرمایہ داری کی بدترین خرابی، جو کارل مارکس نے انگلستان میں دیکھی تھی، اور بجا طور پر اس سے نفرت ظاہر کی تھی، معدوم ہو چکی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی اندر سے قلب مہیت کی جارہی ہے، اور یہ سرمایے کی پیداوار اور معیار زندگی بڑھانے میں کامیاب ثابت ہو رہی ہے، اس کے ساتھ ہی مزدوروں کی انفرادی آزادی بھی بڑھ رہی ہے، تو اب کم امید رہ گئی ہے کہ لوگ اپنے اس زمین سہن کے انداز کو تبدیل کریں گے، جس میں وہ ایک غیر ملکی نظریے کے لیے اچھا کام کر رہے ہیں۔ آدھے سچ کے اہمقانہ پروپیگنڈے کے ذریعے اس کی جڑ کاٹنے کی کوشش سے لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور روس کے بہت سے دوست غیر ہو جاتے ہیں۔

اپنے روسی دوستوں کو جمہوری ملکوں کی پیش قدمی کے لیے کریڈٹ دینے دیجیے اور اس احساس کا، کہ اس قسم کے پرامن ارتقا کو تمام ملکوں میں رائج کیا جائے گا جہاں لوگ تعلیم یافتہ ہیں اور انھیں جو کچھ بھی چاہیں پڑھنے، مباحثے کرنے اور اور حکومتوں پر معترض ہونے کی آزادی ہے۔

اس کے علاوہ، مغربی ممالک کو بھی سویت روس کو پورا کریڈٹ دینا چاہیے کہ اس نے باوجود مشکلات کے بہت سارے کام کیے ہیں جس میں سرمایہ دار ملکوں کی عداوت کے باوجود تکنیکی معاملات کی تعلیم کا بچپلاؤ، عوامی صحت کے لیے کی گئی کوششیں جو تقریباً ہر ملک میں ہو رہی ہیں، اور اس کی حیرت انگیز زرعی اور صنعتی ترقیات کے لیے کی جانے والی کوششیں بھی شامل ہیں۔ نوجوان لوگ، جن کی رگوں میں اشتراکی آدرش بھر دیا گیا ہے، اور دوسرے ممالک کی کامیابیوں کے بارے میں جن کا علم یا بہت کم ہے یا بالکل نہیں ہے، یقین کرتے ہیں کہ وہ ایک نئی اور بہتر دنیا کی تشکیل کر رہے ہیں اور یہ مقابلہ قدیم زار حکومتوں کے ان کے پاس سرگرمی دکھانے کا کوئی جواز بھی ہے۔ کسی نظام پر حملہ محض اس کے عقیدے کو مستحکم کرتا ہے، اور یہ خوف کہ ان کا کام سرمایہ دار ملکوں کے حملوں سے تباہ ہو سکتا ہے، انھیں دفاعی جنگ کی تیاری کے ضمن میں قربانی دینے پر تیار

کہہ رہا ہے۔

روسی اشتراکی ریاست کی حقیقی دشمن اشتراکیت نہیں، اس کی خفیہ پولیس اور محفوظ خانے ہیں۔ مگر مکمل آمرانہ طرز حکومت ہی وہ طرز حکومت ہے کہ یہ بلحاظ (Kremlin) کے کارپرداز جس سے واقف ہیں۔ ان میں کچھ تو اپنی زندگی کا بہتر حصہ قید میں گزار چکے ہیں۔ محام کو، تاریخی اور نفسیاتی پس منظر میں، ریاستی کنٹرول کے لیے تیار کیا گیا ہے، مغرب کے لوگ جو فرد کی آزادی سے لطف اندوز ہوتے ہیں، جسے مشکل سے سمجھ پاتے ہیں۔ مگر، ہم مغرب کے لوگوں کو اپنی نیکی کا زیادہ اچھڑوا نہیں بیٹھا چاہیے۔ بہت دن نہیں گزرے ہیں، جب ہمارے اپنے بھی غلاموں کے بازے ہوتے تھے اور اعتراف گناہ کے مقامات تھے۔ اُس شخص کے لیے جو ریاست کے اختیار کے لیے خطرہ تھا۔ امید ہے کہ ان ہی خطوط پر روس آگے بڑھے، جس پر مغربی جمہوریتیں چل رہی ہیں۔ یہ [مین] ممکن ہے کہ جنگ کے خطرے کا دباؤ موجودہ نظام کو مضبوط کرے گا اور اس کے کی ناگزیر قلب ماہیت میں تاخیر ہو۔

بہت ممکن ہے کہ ایک نئے فیاضانہ اور ہمدردانہ انداز نظر کا ایسا رد عمل ہو جو جنگ کے خطرے کو منتشر کر دے اور غفلت کی روشنی اور سچائی کی طرف رہنمائی کرے، جس سے دنیا کی ترقی میں تعاون بڑھے اور جس سے تمام ملک مستفید ہوں۔

اقتصادی تعاون

عمر مستقل امن محض جنگ کو روکنے کی کوشش سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اس وقت دنیا کے اتحاد اور امن کی طرف [واقعی] گامزن ہوں گے جب قومیں عالمی پیمانے پر گناہوں کے وسائل کی ترقیات میں سائنس کے اطلاق کے ذریعے تعاون شروع کریں گی، جس سے سب مستفید ہوں۔ تعاون کے طریقے تیار ہیں اور اقوام متحدہ کے ماہر اداروں میں خطر ہیں، جس سے تمام بڑی طاقتیں منسلک ہیں۔ یہ اگرچہ اچھے کام کر رہی ہیں [مگر] پوری صلاحیت سے نہیں، اس لیے کہ حکومتیں جنگ کی تیاری میں ضرورت سے زیادہ توانائی صرف کر رہی ہیں، جو شاید کبھی نہیں ہوگی، اور ان سیاسی مسائل پر جو نزاع سے کبھی طے نہیں ہوں گے۔

[اصل]، مشکل حقیقی شروعات کی ہے۔ یہ اس بات پر غور کیوں نہیں کرتے کہ جن بیماریوں کو پھیلنے سے روکا جاسکتا ہے انھیں World Health Organization کے ذریعے ختم کرنے، اور ضرورت کے مطابق دنیا کی غذائی رسد کو ڈگمگنا کرنے کے لیے، مشترکہ کوششوں سے کچھ ٹھوس قدم اٹھائے جائیں، جن میں عالمی بینک کے ذریعے تمام قومیں شریک ہوں اور اپنی مالی استطاعت کے تناسب سے سرمایہ مہیا کریں۔ دنیا کے تمام ملکوں کے مفاد کی خاطر ایک ٹھوس عالمی منصوبے پر کام کرتے ہوئے موجودہ غلط فہمیاں، جو قوموں کو تقسیم کرتی ہیں، بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔

کوئی قوم، یا قوموں کا کوئی گروہ جو دوستی کا ایک عظیم نیا جذبہ احساس پیدا کرے گا اور تمام حکومتوں کے ساتھ مل کر ایک مادہ مگر ٹھوس عالمی منصوبے میں شامل ہونے کی پیش کش کرے گا، اسے تمام ملکوں کے عوام کی وفاداری حاصل ہوگی جو سیاسی تنازعات اور جنگ کی تیاریوں سے بچنے لگے ہیں۔ وہی حکومت جو سب سے زیادہ طاقت ور ہے، اور اپنے بارے میں سب سے زیادہ یقین ہے، امن کی جانب پیش قدمی کی رہنمائی کرے گی۔ ایسی پیش کش حکومتوں کے اراکوں کا سخت ترین امتحان ہوگی۔ کوئی حکومت جو ہاتھ بٹانے سے انکار کرے گی اسے قوموں کے خاندان سے ویسے نکال دیا جائے گا، جب تک کہ وہ سب کی بہبود کو اپنے خود غرضانہ مفاد سے آگے نہیں رکھتی۔

عوامی تحریک

امن ہو یا جنگ، اس کا آخری فیصلہ عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ آمرانہ حکومتوں میں بھی رہنما کو عوام کی نظروں میں اپنے عمل کا جواز پیش کرنا ہوتا ہے۔ اگر عالمی استقواب رائے ہو تو، دس ہزار ووٹ اتحاد اور امن کے لیے ہوں گے تو [صرف] ایک جنگ کے لیے۔ دنیا کے عوام اب بین الاقوامی اداروں میں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ سناک ہوم میں پچھلی گرمیوں کے موسم میں مختلف اداروں کے تقریباً 350 مندوب تقریباً یرمان میں ملے تھے۔ انھیں حکومتوں سے کوئی منافی نہیں تھی اس لیے وہ آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکے تھے۔ انھوں نے دنیا کے حقیقی مسائل میں سے چند پر بات کی تھی، جیسے کہ غذائی رسد، مہاجرین اور نوآبادیاتی سوال، اور وہ طریقے جن کے ذریعے دنیا کے عوام عالمی حکومت کے قیام کی ترغیب میں معاون ہو سکتے۔ مشرق میں جاپان سے لے کر مغرب میں کینیڈا اور نیا یوک تمام نسلوں، رنگوں اور مذاہب کے مندوبین نے، جذبہ خیر سگالی میں بات چیت کی اور نتائج اخذ کیے تھے جو سیاسی تعصب اور بدگمانیوں سے ماورا حقائق کی بنیاد پر تھے۔

اگر عوام کی یہ تحریک بڑھتی رہتی ہے، جیسا کہ پچھلے چند برسوں میں ہوا ہے، تمام ممالک کے مندوبین کانفرنس میں ملاقات کرتے رہتے ہیں، تو بین الاقوامی جذبہ دوستی کے لیے یہ ایک بڑا تعاون ہوگا اور امن کی ہر تحریک کو اس سے تقویت پہنچے گی۔ [اور] امن سے محبت کرنے والی قوموں کو احساس بھی ہوگا کہ دنیا کے اتحاد کے لیے کام کرنے میں انھیں نہ صرف ان کے اپنے عوام کی، بلکہ دوسرے ممالک کے کروڑوں افراد کی بھی تائید حاصل ہے۔

اگر دنیا کے عوام اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک متحد آواز میں عالمی اتحاد اور امن کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ انھیں مل کر رہے گا۔ ہر ذہین اور خیر سگالی کا جذبہ رکھنے والے انسان کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ان بین الاقوامی عوامی اداروں کی مدد کرے۔

کسی قسم کا ناگزیر امن

میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سائنس کی کسی بھی قسم کی ترقی انسانی سوسائٹی کے احوال پر تہدیلی پیدا کرتی ہے، اور بڑی تہدیلیوں سے تھارے پیدا ہوتے ہیں اور الجھن برپا ہوتی ہے۔ سوسائٹی اب پچھلے پچاس برسوں کی بے مثال ترقی سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایک ضروری تہدیلی یہ ہو سکتی ہے کہ ایک عالمی حکومت قائم ہو جو امن برقرار رکھ سکے اور انسان کی خدمت کے لیے سائنس کی غفیم طاقتوں کو استعمال کرنے میں تعاون کر سکے۔ اس طرح جنگ کے ذریعے فوہات کی پانچ جزا رسالہ پرانی پالیسی اپنے انجام کو پہنچے گی۔

ہمیں اپنے آپ کو اس فریب میں نہیں رکھنا چاہیے کہ ہمارے حمدن کی غفیم تہدیلی کا یہ دور آسان ہو گا۔ کچھ سیاست داں ابھی تک نوآبادیات کے رجعت پسندانہ خوالوں کے آسیب کے زیر اثر ہیں اور اپنی حاکمیت مطلق کو ایک عالمی حکومت میں مدغم کر دینے کے خیال ہی سے متنفر ہیں۔ مگر وہ نئی طاقتیں، سائنس جنہیں آزاد کر چکی ہے، دوبارہ بوتلوں میں بند نہیں کی جاسکتیں۔ ان کو تعمیری کام میں استعمال کیا جانا چاہیے ورنہ یہ ایک اور جنگ میں قابو سے باہر ہو جائیں گی جو ہمارے یورپی حمدن کو اپنی تمام شان دار کامیابیوں سمیت تباہ و برباد کر دیں گی۔ کم از کم یورپ کے لیے تو یہ ناگزیر ہے۔ یا تو یہ قبر کا امن ہوگا، یا ماضی کی مردہ سلطنتوں کا امن، جو اپنے تخلیقی جذبے کھو چکی ہیں اور نئے حالات سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکی ہیں، یا پھر انسانی سوسائٹی کی نئے دور کی طرف ایک لمبی چھڑا لگ ہوگی، جس میں بھوک، افلاس اور وہ بیماریاں جن کا سدباب کیا جائے کر ارض سے مٹ جائیں گی۔ ایک عہد جس میں ہر ملک کے عوام دانش اور تہذیبی خوش حالی کے بلند درجے تک پہنچ جائیں گے، ایک عہد جس میں ”آئینی پردے“ نہیں ہوں گے اور لوگ، اگر چہ اپنے ملک سے شدت سے وفادار ہوں گے، [لیکن وہ] بغیر کسی روک ٹوک کے، عالمی باشندے کی صورت میں سفر کر سکیں گے۔ یہ ہے وہ امید سائنس نے جو ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔

لہذا، جنگ کی بات کم کی جائے، جو خوف اور دہشت پیدا کرتی ہے، اور زیادہ بات کی جائے نئے غفیم عہد کی جو پیدا ہونے کی جدوجہد میں ہے۔ ہم سب کو اس کے لیے کام کرنا چاہیے۔ کھیاؤں کو جو نامرہ کے معنی (Jesus of Nazareth) کے اعلان کردہ ابدی اور ناقابل تہدیلی سچ پر یقین رکھتے ہیں، امن کے لیے اپنی کوششوں کو دگنا کر دینا چاہیے تاکہ ہم اپنی زندگی ہی میں نئی اور بہتر دنیا کی تعمیر کی ابتدا کو دیکھ سکیں جو ہمارے بچوں کی وراثت ہوگی۔

ایمیلی گرین بالش جان ریلے ماٹ

اعلان تجلیل ایمیلی گرین بالش

وہ ماحول جس میں کسی بچے کی نشوونما ہوتی ہے، تقریباً ناگزیر طور پر، اس کے کردار پر اپنے مخصوص اور ان مٹ فٹوش چھوڑ جاتا ہے۔ یہی کچھ ایمیلی گرین بالش کے ساتھ بھی ہوا ہے۔

1867 میں باسٹن (Boston) میں پیدا ہوئیں، ان کا تعلق نیو انگلینڈ کے ایک قدیم خاندان سے ہے، اور ان کی نشوونما نسط انگیز دانش ورانہ گرد و پیش میں ہوئی، جس کی روایات کا سلسلہ کٹر عیسائیوں (Puritans) سے ملتا ہے، جنہوں نے سب سے پہلے ریاست ہائے متحدہ کو نوآبادی بنایا تھا۔ ان نوانگستانیوں نے ترکیب رسوم سے وابستہ کٹر عیسائیت کی سختیوں سے اپنی جان چھڑائی تھی مگر ورثے میں اسے سخت ضبط نفس اور توانائی اور اس دنیا کو رہنے کے لیے بہتر بنانے کی خواہش ملی تھی، بالخصوص سماج کے کم قسمت والوں کے لیے۔ اس ماحول میں انہوں نے اپنی ذاتی ذمہ داری کی آگاہی کو اپنا مخصوص قسم کا آدرش بنا لیا، اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ اقرار کرنا سیکھ لیا کہ ایک بہتر دنیا کے لیے کیا جانے والا کام اُسی وقت ثمر بار ہوگا جب اس کی ابتدا حقائق کی سخت بنیادوں پر ہوگی۔

ایک نوجوان طالب علم کی حیثیت میں انہیں پہلے ادب پڑھنے سے دلچسپی پیدا ہوئی، مگر فوراً ہی انہیں اس کام میں دلچسپی پیدا ہوگئی جس میں انہیں پہلی عالمی جنگ سے پہلے اپنی تمام توانائیاں وقف کرنی پڑ گئی تھیں: سماجی سدھار کے ذریعے زندگی کے حالات میں بہتری لانا۔ اس کام کی ضرورت ان پر اس وقت آشکار ہوئی تھی جب ان کی، امریکا کے بڑے شہروں کے پس ماندہ علاقوں میں موجود اقلیت اور غلامیت سے واقفیت ہوئی تھی۔ انہوں نے باسٹن کے ایک سماجی مرکز کے ساتھ مل کر ایک ادارے کی بنیاد رکھی اور عملی طور اس میں

کام بھی کیا، American Federation of Labor کی رکنیت بھی حاصل کی اور Women's Trade Union League of America کے قیام میں مدد بھی فراہم کی۔

یہ سب کچھ 1890 کی ابتدا میں ہوا تھا، اس وقت جب یورپ کو احساس ہو چلا تھا کہ صنعتی انقلاب نے ناقابل حل سماجی مسائل و مراثی میں چھوڑے تھے۔ مگر اس وقت تک امریکا کے افق پر روشن خیالی کی پونہ بھی نہیں تھی۔

بہر حال، ہتھ عملی کام ایمیلی بالش کی توقعات کو ختم نہیں کر سکا۔ انھیں احساس ہوا کہ اگر مزید کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہیں تو انھیں مزید علم حاصل کرنا اور اس کو دوسروں تک پہنچانا ہوگا۔ اور اس طرح، انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی؛ پہلے پیرس میں مشہور فرانسیسی تاریخ داں لیوا سیور (Levasseur) کے زیر اثر، اور بعد میں برلین میں جہاں انھوں نے اقتصادیات کے اس شعبے کی تعلیم حاصل کی جس کو professor-chair socialism کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہیں ان کا یورپی مزدور تحریک سے رابطہ ہوا اور 1896 میں انھوں نے Socialist Trade Union Congress میں بھی حصہ لیا تھا۔

اسی برس وہ ویلیمز لے کالج (Wellesley College) بھی گئیں، پہلے ایک ٹیکچر کی حیثیت میں کام کیا اور بعد میں سماجی اقتصادیات کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو گئیں۔ پہلی عالمی جنگ تک درس و تدریس ان کی مرکزی مصروفیت رہی۔ مگر سماجی کام کے میدان میں عملی مصروفیت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس، سرکاری عہدوں پر تعیناتی اور اساتذتوں کی تحقیق ان کے لیے بھاری ذمہ داریاں رہیں۔ مہاجرینوں سے متعلق ان کا کام ایک درخشاں مثال ہے۔ امریکا میں وہ پہلی پروفیسر تھیں جس نے پہلی بار طلبہ کو تارکین وطن کے مسائل پر ٹیکچر دیے تھے۔ بلاشبہ، ان کا بہترین کام امریکا میں سلاویہ کے تارکین وطن سے متعلق تھا، وہ کام جس کو تارکین وطن کے مسائل کے سائنسی تجزیے میں نشانہ زد کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ کام ان کے امانہ کاری بہترین مثال پیش کرتا ہے؛ کاغذ پر قلم کی نوک رکھنے سے پہلے وہ ریاست ہائے متحدہ میں واقع سلاویہ کے لوگوں کے مرکوزوں میں خود گئیں اور ایک برس تک انھوں نے، آسٹریا/ہنگری، کے ان علاقوں میں تحقیق کی جہاں سے زیادہ تر تارکین وطن آئے تھے۔ زبانی یا تحریری منابعوں سے مطمئن، انھیں احساس ہوا کہ انھیں بذات خود حالات کو دیکھنا، وہاں کے لوگوں سے ملنا اور براہ راست ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اور پھر پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی، جس نے ان کی یورپی ورسی کی مصروفیات کا خاتمہ کر دیا، اس لیے کہ ان کی جنگ مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے 1918 میں انھیں ہر طرف کر دیا گیا تھا۔ مگر جنگ ان کے لیے ایک تازہ چیلنج لے کر آئی، جس نے انھیں ایک نیا ہدف فراہم کر دیا تھا۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح، وہ جنگ کو ایک بہتر دنیا کی تشکیل کے کام میں بے نتیجہ رکاوٹ سمجھتی تھیں۔

محمد ان کے الفاظ ہیں کہ ”میرا رد عمل اس احساس پر مبنی تھا کہ میرے ایسے کام میں ایک الم ناک خلل پیدا ہو گیا ہے جو میرے نزدیک، اس دور کا سب سے اہم کام تھا؛ زیادہ مطمئن کرنے والے ایک اقتصادی

نظام کی تعمیر۔“ مگر ان پر اس کا اثر یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہوا ہوگا، جس کا خود انھوں نے اعتراف کرنے کی رحمت کی تھی، اس لیے کہ جنگ کی شروعات سے ہی انھوں نے اپنی تمام توانائیاں امن کے کام کے لیے وقف کر دی تھیں یا، جیسا کہ کولہیا کے پروفیسر ہم خودیچ (Simkha Vitch) نے کہا ہے، ”میں آج تک کسی ایسی ہستی سے نہیں ملا ہوں جس نے، جیسا کہ انھوں کیا ہے، اپنی زندگی کا ہر لمحہ قوموں کے درمیان امن کے کام پر وقف کر دیا تھا۔“

غالباً پہلی بارش کو احساس نہیں تھا۔ جو اس وقت بہت کم لوگوں کو ہوشیار تھا۔ کہ 1914 کا زمانہ 1939 کے مقابلے میں زیادہ اہم تھا، اس لیے وہ ہمارے زمانے کا بڑا موز تھا۔ یہ ایک عہد کا اختتام تھا، اور بعد کے واقعات نے، کئی طریقوں سے، افراد اور انصاف پر لوگوں کا عقیدہ چھین لیا تھا، جو اس وقت دنیا کے بیشتر لوگوں کی وراثت تھا اور طاقت کا منبع بھی تھا۔ اس کے بعد سے انسان زیادہ سخت جان اور زیادہ شک میں پڑ گیا ہے، اور پچھلی جنگ کے اختتام کے بعد سے جس کی لاشی اس کی بھینس کا نظریہ اندرونی اور بیرونی پالیسیوں میں بھی مزاحمت کر گیا ہے۔

یہی وہ زمانہ ہے جس میں پہلی بارش نے امن کے لیے اپنی جنگ کا آغاز کیا تھا۔ ان کے لیے وقت آسان نہیں رہا، مگر انھوں نے اپنی کوشش کو کبھی کمزور نہیں ہونے دیا، خواہ راستے میں کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ آئی ہوں۔

امن کے لیے ان کے کئی برس کے کام کے دوران وہ Women's International League for Peace and Freedom سے قریبی رابطے میں رہیں، جس کی بنیاد 1915 میں دی ہیگ میں ڈالی گئی تھی، جب جنگ جاری تھی۔ اس لیگ نے غیر جانب دار مذاک، مرکزی طاقتوں اور اتحادی جماعتوں کی صورتوں کی ملاقاتوں کے لیے ایک جگہ مہیا کر دی تھی۔ اس نوعیت کی کانفرنس اس زمانے بھی قابل عمل تھی، اس لیے کہ اس وقت تک جنگ کے نفرت انگیز دیوینکل ہتھیاروں نے اپنے ہیبت ناک دانت پوری طرح ظاہر نہیں کیے تھے۔ مگر قابل ذکر چیز یہ ہے کہ جنگ میں شریک ملکوں میں یہی ایک اہم گروہ تھا جس سے امن کے لیے کسی منصفاں اور عملی منصوبے کے لیے ملاقات کی جاسکتی تھی۔ اس لیے کہ یہ واقعی قابل عمل تھا، بالخصوص جب ہم اس کو اس کے وقت کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ ”میرا خیال ہے کہ بلا کسی شک و شبہ کے، اب تک پیش کی جانے والی تجویز میں سب سے بہتر یہی تجویز ہے،“ صدر ولسن نے Women's League کی صدر نشین جین ایڈمز (Jane Addams) سے کہا تھا۔ بعد میں لیگ کے عہد نامے میں بہت سی قراردادیں شامل کر دی گئی تھیں۔ اگرچہ خود کانفرنس نے یہ پروگرام ترتیب دیا تھا، اس کی حقیقت سے نزدیک شقیں اس علم اور پیش بینی کی مرہون منت ہیں جو پہلی بارش نے فراہم کی تھی۔

دی ہیگ میں منعقد ہونے والی کانفرنس کے فوراً بعد، وہ وفد، جن میں سے ایک کی سربراہ پہلی بارش تھیں، غیر جانب دار اور جنگ میں شامل ملکوں کے مابین کو اپنی قرارداد پیش کرنے گئے تھے۔ ہر جگہ ان کا

مثانگی سے خیر مقدم کیا گیا تھا۔ یہ کچھ حیرت انگیز نہیں تھا، اس لیے کہ خاص کر اس وقت ایک مدیر ہمیشہ مثانہ ہو جاتا ہے، جب معاملہ خواتین سے ہی مگر حقیقی خیالات مانگنے پر اس کے تجسس تبسم کے پردے میں چھپے ہوتے ہیں۔ اپنی قرارداد کے حوالے سے ان خواتین کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی، حالات کے پیش نظر اسی کی توقع تھی۔

1918 میں ایمیلی بالڈن اسٹاک ہوم گئیں اور انھوں نے Neutral Conference for Continuous Mediation میں حصہ لیا، جس کی میزبانی ہنری فورڈ نے کی تھی۔ اس کانفرنس میں بالڈن نے International Colonial Administration کے لیے اپنی تجویز پیش کی جو پیش خیمہ تھی اس فرمان کے نظام کی جو ورساکی (Versailles) میں منظور کیا گیا تھا۔

1916 میں گھروا پس پر وہ ان لوگوں میں شامل ہو گئیں جو جنگ میں امریکا کی شمولیت کے خلاف لڑ رہے تھے۔ وہ Collegiate Anti-Militarism League کی رکن تھیں اور Fellowship of Reconciliation کی کاؤنسل میں بھی شریک تھیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، امن کے لیے کام کرنے اور اپنے بنیاد پسند خیالات کی وجہ سے 1918 میں وہ پروفیسری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں تھیں اس کے بعد ایک ہفتہ وار جریدے Nation کے ادارتی کارکنان میں شامل ہو گئیں، جو منصفانہ اور مستقل امن کی جدوجہد میں آگے آگے رہتا تھا۔

امن کے ہوتے ہی، جب اتحادی بیڑوں میں امن کے معاہدے پر مذاکرات کر رہے تھے Women's League نے 1919 میں زیورخ کے مقام پر اپنی دوسری کانفرنس کا اہتمام کیا۔ اس طرح کانفرنس کو امن معاہدے کے مسودے کے مطالعے کا موقع مل گیا تھا۔ وقت مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں اس سلسلے میں منظور ہونے والی اتحادیہ پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔ مگر میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں اور کہوں گا کہ یہ عقل مندی ہوتی اگر عورتوں کے خیالات پر توجہ دی گئی ہوتی۔ کم لوگوں نے ایسا کیا ہے اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے، اگرچہ موجودہ سیاسی فضا کے پیش نظر حیرت انگیز نہیں اس کے علاوہ، کئی اتحادیہ عورتوں کی طرف سے پیش کی گئی تھیں، اور ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ہمارا مردانہ سماج عورتوں سے ملنے والے مشوروں پر کان دھرے، خواہ وہ کتنے ہی صائب کیوں نہ ہوں۔ یہ بڑی بات نہیں ہوگی اگر مرد حضرات کبھی [خیر] تبسم کو اپنے لبوں سے ہٹا کر ان کی بات سنیں۔

زیورخ کی کانفرنس کے بعد، ایمیلی بالڈن نے International Women's League کی سیکریٹری جنرل کی حیثیت میں ضیووا میں قیام کیا، جس معاہدے سے وہ 1922 میں خرابی صحت کی وجہ سے فارغ ہوئیں۔ بعد کے برسوں میں انھوں نے اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ بین الاقوامی کام کے اس مرکز میں صرف کیا۔

ان برسوں کے دوران ان کی سرگرمیوں کا ایک مختصر سے خاکے میں تذکرہ ان کے کام سے انصاف نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کانفرنس کے نو اجلاسوں میں سے بیشتر میں شرکت کی تھی، جو جنگوں کے درمیان کے

برسوں میں منعقد ہوئے تھے، اور ان میں ان کے رسوخ محسوس کیے جاسکتے ہیں، خصوصاً قرارداد کی تیاریوں میں۔ انھوں نے Women's League کی بلائی ہوئی بہت سی کانفرنسوں کی تنظیم بھی کی تھی، جن میں جنگ کے جدید طریقے، ایمون، آئرنیا کے مسائل اور اقلیتوں پر سوالات اٹھائے گئے تھے۔ انھوں نے بے ریاست افراد اور عالمی اتحادی بحران سے متعلق کانفرنسوں میں بھی حصہ لیا تھا۔ ان کے اثرات نہ صرف ان پر، بلکہ اور بہت سی کانفرنسوں تک پہنچے ہیں جن کا اہتمام Women's League نے کیا تھا۔ جیو امیں اپنے قیام کے دوران وہ لیگ آف نیشنز سے مستقل رابطے میں تھیں، صرف بڑے سیاسی مسائل ہی کے بارے میں نہیں، بلکہ ہر مسئلے پر جو بین الاقوامی تعاون میں معاون ہو سکتا تھا۔ اپنے وسیع عملی نظریے کے باعث وہ سمجھتی تھیں کہ قوموں کے درمیان مخصوص میدانوں میں معمول کے مطابق ہاتھ بنانے کی ہمت افزائی سے سیاسی رشتوں میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔

ایسے مسائل پر ان کا مثالی کام، جو امن کے بڑے مسئلے کے صرف ایک حصے سے متعلق ہے، وہ کوششیں ہیں جن کے ذریعے انھوں نے آئرنیا سے متعلق کریڈٹ کی فوقیت سے باز رکھنے کے لیے ریاست ہائے متحدہ کو Women's League کی امریکی شاخ کے ہمراہ 1921 میں اپنے دعوے سے دست برداری پر راضی کرنے میں کی تھیں۔ ان کی کوششیں کامیاب ثابت ہوئی تھیں۔ ایک اور زیادہ اہم مثال ہے ان کے کام کی جب 1926 میں انھوں نے ہائیٹی (Haiti) سے گیارہ برس کے قبضے کے بعد ریاست ہائے متحدہ کی فوجوں کی واپسی کرائی تھی۔ اس کے لیے ایک بار پھر Women's League کی جانب سے ابتدا ہوئی تھی اور پس منظر میں ایمیلی بالش ہی اصل طاقت تھیں، جس کی ذریعے سب کچھ حاصل کیا گیا تھا۔

اس وقت تک وہ کسی کام کا بیڑہ نہیں اٹھاتی تھیں جب تک انھیں تمام حقائق سے آگاہی نہ ہو جائے۔ سب سے پہلے انھوں ایک وفد کے ساتھ ہائیٹی کا سفر اختیار کیا۔ اس وفد کی تیاری ہوئی رپورٹ، جس کا بڑا حصہ خود ان کا لکھا ہوا تھا، ان کی صلاحیتوں کا مظاہرہ ثابت ہے۔ بالخصوص ان صلاحیتوں کا، جن کے ذریعے وہ مسئلے کی جڑ تک پہنچ جایا کرتی تھیں، اور عملی اور جمہوری حل نکال لاتی تھیں، بڑے پیمانے پر جس سے عوام مستفید ہوتے تھے۔ یہی وہ موزونیت ہوتی ہے، ہر سیاست داں کو جس پر رشک کرنا چاہیے۔ پھر جدوجہد شروع ہوئی کہ عمل کو منظور کرایا جائے۔ آخر میں امریکی حکومت نے عملی طور پر تقریباً تمام سفارشات قبول کر لیں اور اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔

اب یہ سوچنا بڑی غلطی ہوگی کہ ایمیلی بالش صرف کانگریسوں اور کمیٹیوں کے ذریعے دباؤ سے کام کرتی تھیں جو وہ ریاست کے صاحبان اختیار پر ڈال سکتی تھیں۔ تعلیم اور تربیت کی ضرورت کا احساس کرنے والی پہلی شخصیت وہ خود تھیں، جس نے موسم گرما کے بین الاقوامی اسکول کا خیال پیش کیا تھا، جنگ کے درمیان کے برسوں میں Women's League جن کو چلائی رہی تھی۔ انھوں نے ان اسکولوں میں خود بھی پڑھایا تھا۔ مگر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ دنیا بھر میں اپنے طویل سفر کے دوران جہاں بھی گئیں، حالات کے بارے میں

معلومات حاصل کیں، اور اسی دوران بین الاقوامی اقبام و تقسیم کا ورثہ بھی دیا۔ منسٹر میں قیام کے دوران انھوں نے مورتوں سے رابطے کی کوشش کی، فلسطین میں یہودیوں، برطانویوں اور عرب رہنماؤں سے، انگلستان میں انھوں نے Briand-Kellogg Pact جیسے معاہدوں کی توثیق کے حق میں سلسلے وار کئی ٹیکچر دیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تہائی پسندی کے خلاف لڑائی میں، جس نے ان کے ملک کو لیگ کے بہت سے کاموں سے دور رکھا تھا، بین الاقوامیت اور لیگ آف نیشنز کے موضوع پر بے شمار ٹیکچر دیے تھے۔ وہ امریکا سے اس کی سست دوی کے معاملے میں، جس میں اس کے لیے پھرتی دکھانا ضروری تھا، دست و گریباں رہی تھیں۔

مگر دن گزرتے رہے اور مایوسیاں بڑھتی گئیں، پہلی مایوسی منچوریا (Manchuria) پر جاپان کے قبضے کے باعث ہوئی تھی، اس کے بعد ایک اور جھجکا لگا۔ افق پر ایک اور جنگ کے بادل لہرانے لگے تھے۔ اس کے باوجود لوگوں کو اندازہ نہیں ہوا تھا کہ جب تشدد قیادت سمجھال لیتا ہے اور قانون کی حکمرانی ختم ہو جاتی ہے تب وقت بھٹا ہے کہ ہوشیار رہا جائے۔

ان برسوں کے واقعات نے ایمیلی میں ایک بڑا ردِ عمل پیدا کیا۔ انھوں نے تہائی پسندی اور امریکی غیر جانب داری کے بارے میں قانون سازی پر حملے کیے اور اس طرح وہ Women's League کی امریکی شاخ میں پہلی بار اختلافی گروہ میں شامل ہو گئیں۔ اور جنگ کے شروع ہوجانے سے ہم اب انھیں تنہا عرصے میں امریکا کے داخل ہونے سے اختلاف کرنے والے گروہ میں نہیں دیکھتے، جیسا کہ پہلی عالمی جنگ کی دوران تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں، شاید، کہ یہی وہ وقت تھا جب انھوں نے جنگ کے کٹر مخالفین the War Resisters League اور the Fellowship of Reconciliation، Quakers، والوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔

ایمیلی بالش کو ان کے سوالوں کا جواب مل گیا تھا، اس لیے کہ ان کے خیال میں اگر ہم شیطنت پر غالب نہیں آتے تو ہم ان خیالات کے لیے فتح کی امید نہیں رکھ سکتے، اتنے برسوں سے وہ خود جن کی جھمکھیں بنی ہوئی تھیں۔ جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران، دونوں زمانوں میں انھوں نے سرگرمی سے ریاست ہائے متحدہ آنے والے مہاجرین کے لیے کام کیا تھا، بالخصوص یہودیوں کے لیے۔ مگر اس وقت بھی وہ مسائل کے انتظار میں تھیں جو جنگ کے دوران پیدا ہونے والے تھے۔ ان کی دلچسپی محض آرام گریہ والی مجہول دلچسپی نہیں تھی، اس لیے کہ ذاتی طور پر انھوں نے امن کی تجاویز کی شرائط پر مبنی مسودات تیار کیے تھے شرائط جو غیر مشروط اطاعت کی بنا پر نہیں بلکہ ایسے حقیقت پسندانہ تصور پر استوار تھے کہ دنیا کی تعمیر نو کرنی پڑے گی، غیر مشروط دست برداری کی شرط پر ہی نہیں بلکہ اس حقیقت کے پیش نظر کہ دنیا کی تشکیل نو کرنی پڑے گی۔ انھوں نے ایک تعمیری بندوبست کے لیے بھی تجویز کا مسودہ تیار کیا تھا۔ انھوں نے نو تشکیل شدہ United Nations Organization کی بھی وفا دارانہ تائید کی اور امریکی امن اداروں پر اپنا رسوخ بھی استعمال کیا تھا، تاکہ اس کے لیے ان کی مدد حاصل کی جائے، اس کے باوجود بھی کہ اب یہ ان کے آدرشوں سے میل نہیں کھاتا۔ وہ کہتی

ہیں، ”اس لیے کہ مستقبل میں نئے ادارے کی شکل اس سے نہیں بنے گی کہ دستاویزات بظاہر کیا کہتی ہیں، بلکہ ارکان اس سے کیا اخذ کرتے ہیں۔ تعاون کا عمل ہی اقوام متحدہ کے کردار کا تعین کرے گا۔ منصوبے خیال کی دنیا کے لیے نہیں، یورپ، روس، امریکا اور تمام دوسرے ممالک، ان کے متضاد مفادات اور تصورات کے پیش نظر بنائے گئے ہیں۔ اور یہ سب کچھ خاص کر اس لیے کیا گیا ہے کہ تجاوز نہ ہو ہمارے سامنے ہیں، خاصی معمولی ہیں، جن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔“ ایک اور مثال ان کے عملی انداز کار کی ہمارے سامنے ہے۔ زندگی بھر کے تجربے سے انہوں نے سیکھا ہے کہ آنے والے دنوں کی مشکلات کتنی بڑی ہوتی ہیں۔

مگر ہم بار بار اس مقصد کے حصول کے اور اس کی حقیقی قدر دانی کے لیے، جو ہمیں درپیش ہے، مختلف قسم کے اور بے مروت طریقے اختیار کرتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ میں ان کی اپنی زبان میں ان کے الفاظ آپ کی خدمت میں پیش کرنے سے باز رہ سکوں: ”بین الاقوامی اتحاد حل نہیں ہے۔ جب تک کہ بین الاقوامی اتحاد میں اخلاقی معیار نہیں، یہ اخلاقی معیار کا نظم و ضبط قبول نہیں کرتا، اور اس میں معیار انسانیت نہیں، تو یہ اس قسم کا اتحاد نہیں ہوگا ہم جس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔“

یہ ان کا بنیادی تصور ہے کہ سارے عملی حل، اس سے قطع نظر کی وہ تکنیکی اعتبار سے کتنے نفیس ہیں، کسی کام کے نہیں ہوتے اگر وہ ارتقائی کیفیت میں نہیں، یا بنیادی اصولوں پر نہیں ہیں۔ اگر کوئی ادارہ اپنے کردار میں آمرانہ ہے، یا جذبہ تعاون اس کی رہنمائی نہیں کرتا، تو یہ بے کار سے بھی زیادہ خراب ہوتا ہے۔

ایسے بہت سے لوگ ہیں ماضی میں جو اس خیال سے متشنع تھے۔ اب شاید ان کی تعداد کم رہ گئی ہے، اس لیے کہ اس قسم کے خیالات اس جدید عہد میں زبیب نہیں دیتے۔ انھیں خواب کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مگر کیا خوابوں کے بغیر زندگی، روزمرہ کے کام کے لیے بھی، کھوکھلی اور بے کار نہیں ہوگی؟

ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے، جو یہاں موجود ہیں، بہت سے لوگ ایمیلی ہالش کے نام واقف نہیں ہوں گے، اور شاید یورپ میں بھی کم ہی لوگ ہوں گے جنہیں اب بھی ان کا نام یاد ہوگا۔ [فسوس کہ] جنگ نے کتنے نام مٹا دیے ہیں۔ یہ ایک منکسر المواج شخصیت ہیں۔ اس وقت بھی جب ان کی سرگرمیاں عروج پر تھیں، انہوں نے کبھی شہرت کی کوشش نہیں کی۔ پچھلے برس جو کچھ کارڈیل ہل (Gordell Hull) کے لیے کہا گیا تھا، میرے خیال میں، ان پر بھی صادق آتا ہے کہ اگر مقصد حاصل ہو جائے تو ان کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ کریڈٹ ان کو ملتا ہے یا کسی اور کو جاتا ہے۔

ایمیلی ہالش اب عمر رسیدہ ہو گئی ہیں، مگر اب وقت تک مستعد ہی رہتی ہیں، اور جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے، جب انھیں پچھترہویں سال گرہ پر مبارکباد دی جا رہی تھی: ”میرے خیال میں ابھی کچھ دن اور زندہ رہوں گی، اس لیے کہ جیسا کہ میرے دادا کہا کرتے تھے ایک عمر رسیدہ عورت اتنی ہی سخت جان ہوتی ہے جتنا کہ ایک عمر رسیدہ آقا۔“ خدا کرے کہ ان کے کہے ہوئے الفاظ سچ ہوں، اس لیے کہ دنیا ان جیسی ایک سے زیادہ دلیر شخصیتوں کی موجودگی کی کس قدر قافی نہیں کر سکتی۔

حالات کہ ہم ان سے یہ نہیں کہہ سکتے ”کیا آپ ہدف کے حصول پر مسکراتی نہیں ہیں؟“ وہ ہدف جو ان لوگوں کی مشعل راہ ہے جن کی نظریں دن کے ختم ہونے سے آگے لگی ہوتی ہیں، ہم اب بھی انھیں خراج تحسین پیش کر سکتے ہیں اور امن کے لیے ان کے عمر بھر کے کام کے لیے اپنے تشکر کا اظہار کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں سکھایا ہے کہ اس حقیقت کو ہم جس کے لیے کوشاں رہتے ہیں، کبھی نہ ٹھکنے والی سخت کوشش سے حاصل کرنا چاہیے مگر انھوں نے ہمیں کچھ اور بھی سکھایا ہے: ”ما توانی یا خستلی کوئی چیز نہیں اور شکست اس آدمی کو تازہ ہمت فراہم کرتی ہے جس کی روح میں مقدس شعلے فروزاں ہوتے ہیں۔“

صدر نشین مارویائی نوٹیل سمیٹی Gunnar Jahn کی زبان

خطبہ:

انسانی اتحاد کی سمت، یا قومیت سے پرے

اپنے زمانے کو سمجھنا اور ان قوتوں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرنا جو اس کو متحرک رکھتے ہیں، ایک فطری عمل ہے۔ مستقبل کے کچھ حصے کا مطالعہ ان واقعات سے ہوگا جن کی پیش بینی ممکن نہیں، اس پر ایسے میلانات بھی اثر انداز ہوں گے جو آب و وجود میں ہیں بھی اور قابل مشاہدہ بھی ہیں۔ ہم صرف توقع ہی کر سکتے ہیں کہ اس میں ہمارے لیے کیا ہے۔ مگر ہم نہ صرف واقعات کو جھیلے ہیں، [بلکہ] کچھ حصوں کو تو ہم خود پیدا بھی کرتے ہیں، یا ان کے ہونے کے طریقے پر ہم اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں نہ صرف ان کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے بلکہ ان پر عمل بھی کرنا ہوتا ہے۔ بالخصوص مستقبل کے امن کے بارے میں یہ کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ یہ سوال کہ کیا ایک طویل کوشش بغیر کسی اور بڑے تشنج کے جنگ کو ختم کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے، نہ صرف ہمارے ذہن کو بلکہ احساس ذمہ داری کو بھی چیلنج کرتا ہے۔

جہاں تک اپنے وقت کا محاسبہ کرنے، اور اس کے ذریعے مستقبل کے امکانات کی بنیاد حاصل کرنے کی بات ہے تو، ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نہ صرف ہم اس کی جانچ کے لیے بہت قریب ہیں، بلکہ ایسا کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی اس کے اثر میں ہیں۔ پھر بھی، جب کہ ہم مستقبل کے سماجی تاریخ داں کا انتظار کر رہے ہیں، ہم کچھ عارضی مشاہدے تو کر سکتے ہیں۔

I—موجودہ دور کی خصوصیات

ماری خصوصیات کی فہرست بنانے کی کوشش کیے بغیر ہم اپنے دور کی کم از کم کچھ خصوصیات کی شناخت ضرور کر سکتے ہیں۔ ہمیں مندرجہ ذیل باتوں پر غور کرنا چاہیے:

(الف): یہ دور ہے تہذیبی کا غالباً ہمیشہ ہی لوگوں نے یہی محسوس کیا ہے کہ وہ جہول کے زمانے میں زندگی گزار رہے تھے، مگر یہ سوچنے میں ہم غلط نہیں ہیں کہ خاص کر یہ زمانہ ہے بہت اہم تہذیبی کا، جس کی رفتار تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس تہذیبی کی بہت سے وجوہ تلاش کی جاسکتی ہیں۔ ایک بڑی وجہ، جس کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا، تکنیکی ہے اور اس کی بنیاد ان ایجادات اور دریافتوں پر ہے جنہوں نے پیداوار کی بنیاد کو بدل دیا ہے اور سماجی رشتوں پر بڑی طرح اثر انداز ہوئی ہیں۔ یہ بڑی تہذیبی، جو مشین کی ایجاد سے انٹھارویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی تھی، بلاشبہ جو ساری طاقت کے ساتھ رکئی نہیں ہے۔ کسلی تہذیب اور دست کاری سے مشین تک کی یہ تہذیبی، انسانی تاریخ کا ایک اہم خط تقسیم ہے۔

تہذیبی کی ایک اور وجہ، جو کم نظر آتی ہے مگر بے بنیادی، آبادی میں جدید نوعیت کا اضافہ ہے، جو سائنسی اور طبی دریافتوں سے بہت زیادہ منسلک ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ نے اس مسئلے کے لیے ایک خاص کمیشن قائم کر دیا ہے۔

تہذیبی کی تیسری، اور خاصی واضح وجہ خوف ناک جنگوں کا وہ سلسلہ ہے جس نے ماضی قریب میں انسانیت کو شدید اذیت پہنچائی ہے۔ عالمی جنگ، خاص طور پر پہلی، اپنے ساتھ وہ سب کچھ بہا لے گئی ہے جو جاگیر دار یورپ میں اور جاگیر داری کی صورت میں، بالخصوص پولینڈ، ہنگری اور جنوب مشرقی جرمنی میں باقی رہ گیا تھا۔ نظام، ان جنگوں نے نوآبادیت اور نوآبادی لہاوے میں مٹا بٹھاہیت پر آخری بھیا تک حملہ کیا ہے، جس کے زیر اثر عوام کو اسباب کی طرح استعمال کیا گیا ہے، اور ان کا استحصال ہوا ہے۔ کم از کم، ہم امید کرتے ہیں کہ اس نوعیت کی نوآبادیات اب ختم کے قریب ہیں۔ نام نہاد ”مظلمی ممالک“ کی کیا حالت ہوگی، اس کا ہمیں اندازہ نہیں ہے۔

ان جنگوں نے بڑی حد تک سرحد اور درہ ملکوں کی حیثیت میں بھی تہذیبی کردی ہے۔ فرانس اور برطانیہ کی طرح اطالیہ اور آسٹریا کے منصب میں بھی کمی کردی ہے، جرمنی اور جاپان پر تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ اس دوران روس اور امریکا کا قد بڑا ہو گیا ہے۔ اب دنیا دلچسپی سے دیکھ رہی ہے ایشیا کی طرف، نئے ہندوستان کی طرف اور (پرامید ہو کر) ایک نئے چین کی طرف، بلکہ آسٹریلیا کی طرف بھی، کہ اب وہاں سے کیا برآمد ہوتا ہے۔ جب یورپ کا تناشدید نقصان پہنچا ہو کہ وہ تقریباً آئندہ سے منہ پڑا ہوا اور افق پر ایک نئی نمود اور طویل عرصے سے متوقع انعام کی کیفیت ہو، اور وہ کامیاب ہو جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک نیا یورپی عہد طلوع ہو رہا ہے، جس میں وہ ”تہذیب کی ماں“ کی حیثیت سے باقی رہے گا ”جنگوں کی ماں“ بن کر نہیں۔ اس قسم کے لچک دار عرصے میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا وقت ان پر بھاری ہوتا ہے جو ابھرنے کی طاقت اور محو میں ترقیب نو کی استطاعت نہیں رکھتے، اور ان پر جو اپنے اندرونی استحکام کے لیے عمومی حالات اور پرانی عادات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، من چلے لوگوں کے لیے اس میں زیادہ کشش ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو اٹھارہ گرتے ہیں ان گہرائیوں پر جو ابھی اور ناقابلِ تغیر ہوتی ہیں، اور محکم

اصولوں پر بھروسہ کرتے ہیں، تہذیبی کا سامنا کرتے ہیں پوری ہمت سے، ہمت جو عقیدے پر استوار ہوتی ہے۔

(ب)؛ ہمارے دور کی دوسری خاصیت قوم پرستی کی موجودگی ہے۔ یہ اب بھی پھیل رہی ہے، نئے سماجوں پر اثر انداز ہو رہی ہے، اطراف کے علاقوں اور نام نہاد پس ماندہ لوگوں پر اس کا زیادہ اثر پڑ رہا ہے۔ تمام بڑی تحریکوں کی طرح، اس کے بھی اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں۔ چوں کہ یورپ کی جاگیر دارانہ قرون وسطیٰ کی فرقہ پرستی حد سے زیادہ پھیل رہی تھی، بڑی قومی ریاستوں نے لوگوں کو مناسب اور بڑی اکائیوں میں متحد کر لیا تھا، ان کے مقابلے میں جو رعایت یا فتوحات سے بنی تھیں۔ سیاسی اعتبار سے یہ، جہاں تک ممکن تھا، ایک متحد تعمیری طاقت تھی۔ اپنے تہذیبی اور روحانوی پہلوؤں میں بھی، بالخصوص ادب، فنون لطیفہ، مصوری، عوامی ادب وغیرہ میں بھی ایسا کچھ زیادہ نہیں ہے جو بہت قابلِ قدر ہو۔ اس کے برعکس، قوم پرستی اپنی تفریقیت (divisiveness) اور خود پسندی میں بہت زیادہ خطرناک ثابت ہوئی ہے۔ اس نے ہم کو ایک بد عمل اور طاقت ور عسکری اداروں سے بھری دنیا دی ہے، جس کی روایات و فتوحات عسکری ہزار ہا میں شراہور ہیں، جس میں تجارت کرنے والے لوگ اپنے اقتصادی مفادات کے حصول میں اتنے ہی بے رحم ہیں جیسے ان کی جنگیں۔ اس نے ہمیں کئی ریاستیں دی ہیں جن میں سے ہر ایک مکمل اور لامحدود حق حکمرانی کی طالب ہے، بغیر کسی طریقے، زور یا کسی قسم کے انضمام کے، طاقت کے مغلوب توازن کے زیر اثر جس کی سفارشی طریقوں سے نقل و حرکت کی جا رہی ہو، جو ریاستی وجود کی بنا پر قبول اصولوں پر نہیں، جو نہ کسی قسم کے مشترک مذہبی یا اخلاقی کنٹرول کے طریقوں کو ماننے ہیں، نہ ہی ان کے منظور شدہ قاعدوں کو۔ اس کے ساتھ ہی، افسوس کہ ان کے قبضے میں مادی تہذیب کی، اور جدید ترین اور نہایت خوف ناک ہتھیاروں کی بڑھی ہوئی طاقت ہے۔ انسانی دماغ کے نفسیاتی کنٹرول پر پروپیگنڈے کے فن کے ذریعے سینر شپ کی یا دوسرے طریقوں سے ”خیالات پر قابو“ پانے کی۔

ایک قوم پرست دنیا کی تقسیم شدہ حالت پہلے کے مناسب تاریخی زمانوں کی آفاقیت کے مقابلے میں کہیں مختلف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں انھارویں صدی کی éclaircissement (توضیح) یاد ہے، جب انسانی عقل اور شریفانہ طریقے اعلیٰ سمجھے جاتے تھے اور فرانسیسی زبان مستند انسانوں کا مشترک اعانتی تھی۔

ہمیں عیسائی قرون وسطیٰ کی عالمیت بھی یاد ہے، جو ایک اصول گو مانعی تھی، ایک معتد رکھیرا گو مانعی تھی جس کے قبضے میں وسیع مالیات تھے اور جو لکھ پڑھ سکتے تھے اور ان سب کے لیے ایک ہی زبان تھی۔ ہمیں عظیم رومن امن کا وہ زمانہ بھی یاد ہے جس میں ایک گلائیکی روایت، ایک سیاسی ماڈل اور ایک ادبی وسیلہ بنا کرتا تھا۔

[ہمیں] اس قوم پرست منقسم دنیا کے خطرات کا تجربہ ہو چکا ہے، ان کا مطالعہ بھی اور ان کی تفتیش بھی کی

جا چکی ہے، مگر لوگوں کی ضروریات کے حصول کے بھلے ان کو نئے طریقوں سے متحد کرنے کی ضرورت ہے۔

II — متحد کرنے کے رجحانات

اس امر کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا بہت آسان ہے کہ جدید دور کے لوگوں کو کس درجے تک تقسیم اور بے رشتہ کیا جاسکتا ہے۔ بغیر کسی مشترک وفاداری کے، وہ ریاست سے ہویا کھینسا ہے، ان میں ایک نئے نئے پیمانے پر عام ہے۔ یہ ہم کو اپنے موضوع کے ایک نئے حصے کی طرف لے جاتا ہے کچھ رجحانات کا تجزیہ کرنے کی ایک کوشش کی جانب، جو دنیا کی آبادی کے بے ترتیب ڈھیر میں مشترک دھماگوں کی طرح بافتہ ہیں۔

(۱) سب سے پہلے ہم انسان کے مختار ہونے کی خواہش پر غور کرتے ہیں۔ جدید دور کی تاریخ میں غیر ملکی حاکمیت سے نجات اور آزادی کے مطالبے کی شکل میں بغاوت ایک بڑی تشکیلی طاقت رہی ہے۔ مختار ہونے کی خواہش نے جبر یا من مانی حکومت کے خلاف جدوجہد کو خود بھی محسوس کرایا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ مختاری کے تصور نے، ایک انفرادی آدرش کی طرح، اقتدار کے خلاف بغاوت کے خیالات سے انسان کے ذہنوں کو زرخیز بنایا ہے، ان کے کردار کی اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کے جذبے کو مستحکم کیا ہے۔ ماحول کو بہتر بنانے میں اس نے تازہ ہوا کے ایک تیز جھونکے کا کام کیا ہے۔ یہ احساس کہ آزادی جو ان معنوں میں فرد کے لیے ایک اعلیٰ ترین قدر ہوتی ہے، اور آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی ایک ضرورت ہوتی ہے، سب کو میسر نہیں؛ آزادی کے اس آدرش کی قبولیت یا اس سے انکار ہی اشتراکی اور غیر اشتراکی دنیا کے درمیان شاید سب سے گہرا شکاف ہے۔

ساتھ ہی ساتھ، یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اس کا ایک جیسا ہونا ضروری نہیں۔ امریکی جمہوریہ کے ”بنیاد گزار“ ایک طرف تو یہ کہتے تھے کہ سب انسان ایک جیسے پیدا ہوتے ہیں، مگر نیگرو غلامی کو برقرار رکھتے تھے۔ وہ لوگ جو روس میں آزادی کو سلب کرتے ہیں، اپنے آپ سے یہ سوال نہیں کرتے کہ مختاری کتنی حقیقی ہوتی ہے مفلسوں میں، کم زوروں میں اور سرمایہ دار سماج کے مابعد لوگوں میں۔ اس طرح آدمی جو ”wage slavery“ کے نام سے حیرت زدہ ہو جاتے ہیں، اپنے سماجی نظام میں انسان کے خلاف اس آمرانہ جبری ریاست جیسی بھی ایک خلاف ورزی کو برداشت کرتے ہیں۔

(2) جدید دنیا میں وسیع پیمانے پر مانا جانے والے دوسرا آدرش جمہوریت ہے۔ بلاشبہ مختلف لوگوں میں اس کے مختلف معانی لیے جاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ روسیوں میں ”جمہوری“ کا مطلب روسی نظام کو پسند کرنا ہے اور مغربی لوگوں میں اس کا مطلب ہونا ہے، پارلیمانی نوعیت کی حکومت سے دوستی۔ پھر بھی عام

معنوں میں اس حقیقت کے باوجود کہ ہر ایک کے نزدیک مشکل آدرش کے مختلف پہلو ہوتے ہیں، دونوں کے نزدیک اس کا مطلب ایک جمہوری نظام ہوتا ہے، ایک نظام، جو تمام انسانوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرتا ہے، مراعات یافتہ لوگوں جیسا نہیں۔ اور دوسرا نظام، جس میں پوری طاقت عمل آبادی کی توہین کرتی ہے، اور ان ہی کے نام سے استعمال کی جاتی ہے، ایسے سماج میں جس میں عدم مساوات کو کم سے کم کر دیا جاتا ہے۔ تو کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ لیسن اور ٹکمن دونوں کی مراد ہی جمہوریت سے تھی، اگرچہ مختلف ہیئت میں اور بے حد مختلف حالات میں؟

(۳) تیسرا آدرش جس نے جدید دنیا میں اپنا مقام بنالیا ہے، وہ ہے منطق پر بھروسہ کرنا، بالخصوص وہ منطق جو جدید سائنس کی زرخیز کردہ ہے اور منظم ہے۔ باہم انسانی رسل و رسائل کی ابدی بنیاد منطق ہی ہے۔ ”تو، آئیے، مل کر منطق کی بنیاد پر بات کریں۔“ جدید نفسیات نہیں، جدید سائنس طاقت ور حل کرنے والی ہوتی ہے، خیالات کی، وہم کی اور تعصبات کی جو لوگوں کو ایک دوسرے سے دور رکھتے ہیں، اور ایک سائنسی کوڈ تیار کیا گیا ہے جو ایک ہی وقت میں اوزار بھی ہے اور حکم بھی۔ یہ [منطق] طلب کرتی ہے، ایمان دارانہ مقصدیت، غور و فکر سے میرا، کسی بھی تاثر سے ماورا سوائے سچ کی خواہش کے۔ (اس کا مطلب یہ نہیں، ہرگز نہیں، کہ سائنس والے تمام تعصبات سے پاک ہوتے ہیں)۔ جدید ترقیات میں سب سے زیادہ خوف ناک نمودار ہی ہے، ماسی جرمی میں، اور کچھ حد تک روس میں، اس یقین کی کہ سچائی کو نہیں سبھی خود غرضی کو تحقیق کی رہنمائی کرنی چاہیے، کہ وفاداری سچائی سے نہیں بلکہ پہلے سے طے شدہ عقیدے سے ہونی چاہیے۔ اس کے باوجود بھی، سائنس ہی حقیقی بندھن ہے۔

(4) اس ایک دنیا کا چوتھا عنصر جس میں ہم شعوری طور پر زیادہ سے زیادہ رہتے ہیں، وہ ہے برہنہ ہونی نرم دلی، تمام دور کر دینے والے دکھوں کے خلاف ایک بغاوت، سماج سدھار کے لیے نئی فکر کے ساتھ۔ عیسائی اور غیر عیسائی سماج دونوں میں اس کا فروغ ہوا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ چوٹا دینے والا مظاہرہ تھا، غلاموں کی ملکیت اور غلاموں کی تجارت کے خلاف بغاوت، اور [آپنی نوع انسان کے ساتھ] اس بد سلوکی کا بین الاقوامی سطح پر متروک کیا جانا۔ مزدور کے حالات کی انسانیت آموزی بھی اس کا ایک پہلو تھا، پہلے قومی ڈھلچنے میں، جس کی قانون سازی کی ابتدا ہوئی تھی انگلستان کے کارخانوں کے لیے، اور اس کے بعد بین الاقوامی سطح پر، بالخصوص ILO کے اور عہدید یونین کے ذریعے۔

آفت کے وقت اور تمام وقتوں میں مفلس، ضرورت مند، بیمار، بے راہ رو لوگوں کے لیے جو کچھ کیا جاتا ہے اس کی ترقی اور اعانت کے بارے میں اشارے کنایے سے زیادہ کہنا ممکن نہیں ہوتا، ریڈ کر اس ہے۔ جس میں اسکیٹڈے نیویائی ممالک بہت متحرک رہے ہیں۔ اور کئی دوسری تحریکیں مل کر ایک مضبوط اور حساس رشتہ بنتی ہیں، جو پوری دنیا کے تمام لوگوں کی ایک سوسائٹی بنا دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا جنگ کے صدمے کے

بعد مارشل منسوبے میں تجویز شدہ باقاعدہ امدادی منسوبہ جو یورپ کو اقتصادی طور پر بہتر بنانے کے لیے تیار کیا گیا تھا، یورپ کو اس طرح یک جا کرنے کی کوشش ہو سکتی ہے جیسی کہ پہلے کبھی نہیں کی گئی تھی۔

(5) ایک اور اہم بات — سر جڈ لوگ اب کم "private-minded" ہوتے جا رہے ہیں۔ اب ایک بڑھتا ہوا سماجی احساس پیدا ہو رہا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ وہ خواہش جسے قرون وسطیٰ کی خانقاہوں اور راہبوں کی اقامت گاہوں میں اٹھارنصیب ہوا تھا، اب نئے ڈھنگ میں ابھر رہی ہے۔ سیاسی میدان میں مشترکہ مفاد کا شعور اور مشترکہ اقدام کے زرخیز امکانات، اقتصادی جمہوریت، تعاون، جمہوری سوشلزم اور اشتراکیت کی بڑی تحریکات بن گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں، اگر ہم نے ان تاریخی لحاظ میں، جو آج کی تاریخ لکھ رہے ہیں، بے لوث مشابہت پسندی کے عناصر کو کم تر سمجھا ہے۔

مفادات کی کمیوفی کے اس احساس کا ایک تاریک اور ہولناک پہلو خوف ہے، ایک ڈراؤنے مشترکہ مقصوم کا ہو کہ جو سری اتھیاہوں کے اس عہد میں دنیا بھر کے لوگوں کے اذہان کو آلودہ کر رہا ہے۔ آدمیوں میں ایک جیسے حشر کا احساس ہوتا ہے، گویا سب ایک ہی کشتی میں سوار ہوں۔ مگر خوف ایک کم مایہ مقصد ہوتا ہے کہ جس سے کوئی توقع رکھی جائے، اور مجھے یقین ہے کہ "امن والے لوگ" غلط راہ پر چل رہے ہوتے ہیں جب وہ ایک نئی عالمی جنگ کی ہولناکی کو بڑھاپہ چاکر پیش کرتے ہیں۔ خوف اعصاب کو کم زور کر دیتا ہے اور قیاس کو ہٹا کر دیتا ہے۔ صرف خوف ہی کے ذریعے بنی نوع انسان کو تہدی اور ظلم کے آسیب سے نجات نہیں حاصل کر لینی چاہیے بلکہ زیادہ مناسب نیتوں سے، زیادہ نرمی سے اور زیادہ بہادری سے۔

(6) ایک اور بہت دلچسپ میلان ہے جس کی درجہ بندی کرنا آسان نہیں، وہ ہے جبر سے ہمہ وقت بڑھتا ہوا ترک تعلق، بالخصوص تشدد آمیز یا جسمانی جبر سے۔ اس کا سلسلہ آزادی کی لڑائی سے ملتا ہے، بالخصوص جب اروپوں کی آزادی کے احرام کا معاملہ ہوا یہ تاریخی اور اعانت کی نشوونما سے مسلسل ہوتا ہے، مگر یہ بہت واضح ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک اس کی پوری طرح قدر نہیں کی گئی ہے اور یہ بھی کہ اس کی بڑی وقعت ہونی چاہیے۔

اس سلسلے میں ایک حیرت انگیز، بے ترتیب اور خود بخود خاموش انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ اس کے ایک پہلو کو ایک شوہر اور بیوی کے درمیان رشتہ سمجھا جائے، جس میں جبر اور اختیار کے خیال نے ایک مثالی رشتے کا تصور دیا ہے، ان تمام عناصر سے پوری طرح آزاد۔ "گزیٹھر" یا تو چاکا ہے یا جانے والا ہے۔ والدین اور بچوں کے درمیان شاید ایک زیادہ حیرت انگیز متوازی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ تعلیم کے معاملے میں خوف پر بھروسہ سا کٹا چھوڑ دیا گیا ہے اور رقابت اور مسابقت پر بھروسہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ جرم کے معاملے میں بہترین طریقہ مزا کا نہیں، بلکہ دوبارہ تعلیم کا ہونا چاہیے۔ اسی طرح سیاسی ڈھانچے میں کوشش کی جاتی ہے کہ جبر کو رضامندی میں تبدیل کر دیا جائے۔

تشدد سے اس انکار کا سب سے زیادہ ڈرامائی اظہار غظیم ہندوستانی گاندھی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس نے نفرت یا تشدد کے بغیر جبر اور زور آوری پر قابو پانے میں اپنی زندگی صرف کر دی تھی۔

(7) نئی دنیا بنانے والے ان میلانات کی فہرست بناتے وقت ہمیں انسانیت میں مذہبی اور روحانی سوچ کی ترقی کو فراموش نہیں کرنا چاہیے، جن میں بھی ایک طاقت ور متحد کرنے والا میلان محسوس ہوتا ہے۔ متکبر عقائد سے اور پروٹسٹنٹ عیسائیت سے ایک قسم کا کھینچاؤ محسوس کیا جا رہا ہے۔ اور ایک تقابلی مذہب میں دلچسپی اور دوسرے عقائد کو سمجھنے، بلکہ جنینی مسلکوں کے تجربے میں بھی خاصی دلچسپی پائی جاتی ہے۔ یہ دراصل ایک قسم کی برداشت ہے (جہاں یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی نئے توحیدی نہیں) جس کا مطلب ہے، دوسروں پر کسی کے عقیدے کو زبردستی ٹھونسنے سے ناراضماندی، خواہ وہ کتنی ہی شائستہ کیوں نہ ہو۔ جہاں، زیادہ دن نہیں گزرے ہیں، ہمارے پیشین گوئی کرنے والے کہا کرتے تھے کہ وہ جو صحیح عقیدے قبول نہیں کرتے، انہیں جہنم کی آگ میں جلا دیا ہوگا، ہمیں ایک نیا روحانی موسم آتا محسوس ہوتا ہے۔ عیسائی راہنما تھوگور کا مطالعہ کرتے ہیں اور ہندو گاندھی یسوع مسیح کا خطبہ (Sermon on the Mount) پڑھتا نظر آتا ہے، اور کرہ ارض کے ہر حصے سے آنے والے دانش ور اپنے اختلافات پر بھائی بندی اور انکسار سے بات کرتے پائے جاتے ہیں۔

مجھے پروفیسر ارنسٹ ہاکنگ (Ernest Hocking) کی کتاب Living Religions and a World Faith میں بہت دلچسپی رہی ہے، جس میں وہ مذہبی سرحدوں کے پار وسیع اور وسیع ہوتے ہوئے مذہبی میدانوں کی نقش کشی کی کوشش کرتا دکھائی دیتا۔

(8) مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ متحد کرنے والے میلانات کی مکمل فہرست بنانے والا مشکل سے ان غالب خصوصیات میں سے کسی ایک کا ذکر کر سکے گا جو ہمیں ودیعت ہوتی ہیں، حسن کی خواہش، حسن کو محسوس کرنے کی خواہش، بلکہ سب سے بڑھ کر، حسن کی تحقیق کرنے کی خواہش۔ اور اس کے بے شمار پہلو موسیقی، ادب، تعمیرات، نقاشی، مصوری اور دست کاری۔ بنی نوع انسان کو کم از کم امکانی طور پر الفاظ کے رنگوں کے اور ہم آہنگ موسیقی کے غزانے عطا کرتے ہیں جو جدید ٹیکنیکی ایجادات کے ساتھ بغیر کسی حد کے پھیلتے جاتے ہیں۔

(9) ہم اب تک نفسیاتی سطح پر متحد کرنے والی طاقتوں کی بات کرتے رہے ہیں۔ مگر ایک اثر استہ نظر پاتی نہیں ہو سکتا کہ عملی اور بیرونی طور پر بے حد اہم ہو جائے۔ یہاں میری مراد ٹیکنیکی ترقیات سے ہے، جو وسیع پیمانے پر نہایت سرعت سے دنیا کی تعمیر نو کر رہی ہیں۔ مشینوں کی بنیاد پر صنعت کا پھیلاؤ، جسے پہلے سے ہمارے عہد کی خصوصیت کہا جاتا ہے، ایک ہی پہلو ہے، انقلاب کا، ٹیکنالوجی جسے تیار کر رہی ہے۔ جدید کیشیات میں ہماری جسمانی ترتیب یکسانیت کی طرف مائل ہے۔ ہمارے پاس زیادہ تر ایک جیسے ہوائی جہاز، ایک جیسے غسل خانے، اور تصویروں کی ایک ہی قسم کی نمائش گا ہیں، ویسے ہی اسپتال، ایک ہی طرح کی غذا

اور ایک ہی فیشن کے لباس ہیں۔ یہ سب مل کر ایک ہی طرح کی عادتیں اور ان کے ساتھ ایک ہی قسم کے تصورات اور ایک جیسی ذہنی ساخت تیار کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال کے طور پر، ایک آبادی کا ہر فرد ایک ہی طرح اقتصادي اور سماجی مرکز میں مشغول ہوتا ہے، اس سادہ ہی حقیقت کے ذریعے کہ سب کے پاس ایک گھڑی ہے۔ ٹیکنالوجی ہمیں ایسی سہولتیں فراہم کرتی ہے جو وقت اور فاصلے کی رکاوٹوں میں کمی کا باعث بنتی ہیں۔ ٹیلی گراف اور تار، ٹیلی فون، ریڈیو وغیرہ۔ مگر ٹیکنالوجی ایک آلہ ہے، ایک صفت یا خوبی نہیں۔ یہ اچھے یا بُرے دونوں کام میں استعمال کی جاسکتی ہے، جس طرح کہ لوگوں کو قریب لے آنے سے وہ ایک دوسرے سے محبت نہیں کرنے لگتے جب تک کہ وہ خود کو محبت کرنے کے قابل ثابت نہ کر سکیں۔ روابط کی زیادتی فساد بھی پیدا کر سکتی ہے۔

(10) ختم ریزی [یا پرچار]۔ جدید حالات کے زیر اثر تصورات اور خیالات کا، مشکل سے حاصل کیے ہوئے علم کا، حاصل کیے ہوئے حسن کا انتشار مسلسل جاری رہتا ہے۔ ایک اور بھی کبھی نہ ختم ہونے والا نیت ورک ہے منظم تعاون کا، ہر میدان کے ماہرین کے درمیان تعلیم یافتہ سوسائٹیوں کا، تکنیکی روزناموں، نمائشوں، ادبی تیمریوں کا جو اس کے ذریعے ہمیں ان سب سے آشنا کرتا ہے جو کچھ خلق کیا گیا ہے یا سیکھا گیا ہے۔ ہر قسم کی ”تحریکیں“ بھی اسی طرح، ایک فطری امجداب (osmosis) اور سوچے سمجھے پروپیگنڈے کے ذریعے خود کو آفاقی کر سکتی ہیں۔

III—باعث تقسیم رجحانات

ان سب امور پر غور کے ساتھ، جو بنی نوع انسان کو آپس میں اتحاد پر مائل کرتے ہیں، ہم نے ان تمام معاملات پر غور کیا ہے، جیسے جمہوریت، درہندی، عوامی جذبہ، جبر اور تشدد سے انکار، روحانی عالمیت، مشترکہ تہذیبی خزانے، ماحول اور عادات کی یکسانیت، وقت اور عرصے کا تکنیکی کنٹرول، اور کامیابیوں اور خیالات دونوں کو آفاقی بنانے کا رجحان۔

ان رجحانات پر غور کرتے ہوئے جو بنی نوع انسان کو متحد کرتے ہیں، اور ان کو کم تر سمجھے بغیر، ہمیں ایمان داری سے ان کا سامنا کرنا چاہیے، جو مخالفت کرتے ہوں، آدمیوں کو تقسیم کرتے ہوں، ان کو الگ کرتے ہوں اور الگ رکھنے کی کوشش کرتے ہوں اور شعوری اور جذباتی طور پر ان کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے ہوں۔ صرف جمہوریت اور شفقت کے مسلک ہی ہمارے عہد کے امتیازی نشانات نہیں ہیں، بلکہ [اور بھی ہیں جیسے] لالچ، تشدد، قومی اور نسلی چالوئی، ماسیوح اور فسطائیت جیسے سیاسی مسالک کے جنون، خود اپنے لیے طاقت اور زور آوری کی ستائش، آنکھیں بند کر کے تشدد پر اس طرح بھروسہ کرنا جیسے تمام آدرش ایک کجمرقی ہوئی جھنڈ ہوں۔ ہم سب ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔

ہم نے قسطانیت اور تسمیت کے سیلاب کا زمانہ دیکھا ہے جس میں آدم نے ناقابل بیان جانی اور مانی نقصان منجھ گئے۔ یہ تصورات ابھی اس لیے مردہ نہیں ہوئے ہیں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، کہ ایک بار پھر یہ ابھر کر سامنے آسکتے ہیں۔

مطلق العنانیت بھی [جس میں ایک ہی پارٹی کی حکومت ہو] ایک طاقت ہے جو اب بھی ابھرتی نظر آ رہی ہے۔ یہ جزوی طور پر مؤثر اور تیز و تند سیاسی تکنیک کی، سیاسی جمہوریت کی بے صبری اور اس کی ست کاری سے بھی آسکتی ہے۔ یہ اقتصادی عمل میں فراخ دلی اور انفرادیت سے متعلق سنگ دلی سے بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ بالکل غلط طریقہ ہوگا۔

مطلق العنانیت کا ایک خوف ناک پہلو وہ ہے کہ جو "آ" بنی پر دے کے الفاظ سے مشتمل ہوتا ہے، یعنی خیالات کی اس وبا کو مکمل طور پر روکنے کے لیے جو اب بقیہ دنیا میں مراہت کرتی جا رہی ہے۔ یہ یقین کرنا اب نہایت مشکل ہو گیا ہے کہ خیالات اور تجربات کے فطری پھیلاؤ کو یا تو مکمل طور پر، یا طویل عرصے کے لیے روکا بھی جاسکے گا۔

IV- متحد کرنے اور فرق واضح کرنے والی

طاقتوں کی ضرورت ہے، جنگ کی نہیں

ان چیزوں کو جو ہمیں تقسیم کرتی ہیں، ہم اتنی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کو روکنا اور سلجھانا مفید عمل ہوگا، بالخصوص ان دھماکوں کو جو سماج کو اکٹھا رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔

ہمیں اس بات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے سماجی تار و پود کے دھماکے ایک دوسرے میں سے گزرتے ہیں۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر تمام دھماکے ایک ہی طرف جاتے ہوں تو ان سے کچھ بھی بچا نہیں جاسکتا۔ تقریر کے اس پہلو کو آسانی سے توڑا، مروڑا جاسکتا ہے [اس لیے] میں صرف اتنا ضرور جتنا چاہ رہی ہوں کہ اختلافات اور مشابہتیں ناگزیر، اور مرغوب ہوتی ہیں۔ ایک یقین یا خیال جس کو چیلنج نہ کیا جاسکے، لامعنیت اور فنا کی راہ پر لے جاتا ہے۔

یہ سب گز قابل برداشت نہیں کہ آدرش اور مقاصد کے یہ تصادم جنگ کی صورت اختیار کریں۔ دراصل بنی آدم نے جو کچھ حاصل کیا ہے، اور جس کی خواہش کی ہے، اس کی روشنی میں یہ تقریباً قابل یقین معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ وقت خوف ناک قسم کی جنگ کی تیاری میں مصروف رہتا ہے۔ [مگر] زیادہ سے زیادہ خوف ناک زہر، بیماریاں پھیلانے کے طریقے اور فوری اور تقریباً لامحدود تباہی پھیلانے والے ہتھیار کی ایجاد میں بے حساب دولت اور انسانی ہوشیاری اور صنعت و حرفت کے خزانے لگائے جا رہے ہیں۔

جنگ کو ختم کرنے کی کوشش ایک خاص اور اہم مسئلہ ہے، ہمیں جس کو جلد سے جلد حل کر لینا چاہیے۔ یہ

ان طاقتوں کی ضروری تکمیل ہوگی جو انسان کو ایک دوسرے سے قریب لارہی ہیں، اگر ان [طاقتوں] کو ان [طاقتوں] پر غالب ہونا ہے جو انسانوں کو دشمن کیمپوں میں تقسیم کرتی ہیں۔

ان خیالات کے لیے جو انسان میں مشترک ہوتے ہیں، اور ان ضروریات کے لیے جنہیں وہ محسوس کرتا ہے، ایک مناسب مضمون چاہیے۔ انہیں موثر ہونے کے لیے ادارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوم نے قومی ریاست بنائی ہے۔ دنیا کی کمیونٹی کو اپنے سیاہی اظہار کے لیے [بھی] کچھ بنانا ہوگا۔ یہ اس گفتگو کے دوسرے حصے کا موضوع ہے۔

دوسرا حصہ

اب ہم اس مضمون کے دوسرے حصے، دنیا کی سوہاگلی کی تنظیم کی کوشش، کی طرف آتے ہیں۔ بہت سے افراد اور بہت سی تحریکوں نے اپنی کوششوں کا رخ اس [صرف امن کی] طرف کر دیا ہے۔ امن کے کام دراصل ایک جزو ہیں مکمل نہیں۔

تحریک امن

امن کی تحریک یا جنگ کو مایہ دکر نے کی تحریک بہت سے چشموں سے سیراب ہو رہی ہے، اور اس نے کئی صورتیں اختیار کی ہیں۔ بنیادی طور پر یہ تحریک غیر سرکاری اداروں، مقامی، قومی اور بین الاقوامی اداروں کے مبارکے جاری ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ امن کے لیے کام کرنے والوں یا عدم تشدد کے حامیوں کا بنیادی طور پر دو قسم کے نکات سے پالا پڑا ہے، اخلاقی یا انفرادی، اور سیاسی یا اداراتی۔ پہلے کی نوعیت میں، ہم ان کو لے سکتے ہیں جو اب عام طور پر جنگ مخالف کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ زیادہ تر مذہبی یا اخلاقی بنیادوں پر وہ تشدد کو رد کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ تعمیری اور دوستانہ سرگرمیوں کو ان کا اپنا مقام دیا جائے۔

بڑے پیمانے پر ہزاروں لوگوں نے، جنہیں فوجی خدمات کے لیے طلب کیا گیا تھا، اپنے ذاتی ضمیر کی بنیاد پر اس میں شامل ہونے سے انکار کیا ہے۔ جب کہ بہت سے لوگ ان کے موقف کو سمجھ نہیں پاتے اور یقینی طور پر اس کو قبول بھی نہیں کرتے۔ میرے خیال میں یہ تمام مصلحتوں سے بالاتر، ایک ان مول کو اجاگر ہے ضمیر کی برتری کی، اور ایک عظیم نوعیت کی خدمت ہے عوام کی، جو اس تصور سے متاثر ہیں کی طاقت کا فیصلہ ہمیشہ صحیح رہتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ نیورمبرگ (Nuremberg) میں چلائے جانے والے جنگی مقدمات میں عدالت نے اس اصول کو ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ اگر کسی شخص کو اس کے اعلیٰ افسر یا حکومت نے کسی کام کا حکم دیا ہو تو وہ ذاتی طور پر اس عمل کی ذمہ داری سے متبرک ہوتا ہے۔ یہ اس اصول کا قانونی اعتراف ہے جس پر باضمیر منکرین عمل قائم نظر آتے ہیں۔

مجھے حیرت ہے کہ جبری بھرتی کے نظریے سے انکار کو وسیع پیمانے پر اتنی شہرت نہیں ملی، جتنی کہ فرد کی

آزادی کی طاقت و تحریک کو ملی ہے۔ ہم فرد کی آزادی سے متعلق معمولی سی خلاف ورزی پر سخت پا ہو جاتے ہیں، جو اس سے کہیں کم درجے کے ہوتی ہے۔ مگر ہم جبری بھرتی کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ہم نے اس کو دل سے قبول کر لیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، ایک امریکی خاتون ڈوروتھی ڈیٹر (Dorothy Detzer) نے، جو عرصے سے Women's International League for Peace and Freedom کی امریکی شاخ کی سیکریٹری ہیں، پہلی بار عملی اور سیاسی طور پر جبری بھرتی کے خلاف ایک تجویز پیش کی تھی۔ ان کے مطابق اس معاملے میں Kellogg Pact بہت واضح ہے، جو حکومتوں کے درمیان ایک کثیرالسطحی معاہدہ تھا جس میں جبری بھرتی سے دست برداری کا اعلان کیا گیا تھا۔ ریلے مت ہائے متحدہ کی سینیٹ میں اسی موضوع پر ایک بل بھی موجود ہے مگر اس پر زیادہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔

میں اسے زیادہ حیرت انگیز بھی سمجھتی ہوں کہ بڑے چیلانے پر، جنگ سے انکار کو کبھی فوج کے اخراجات کے لیے ٹیکس دینے سے انکار کے برابر جرم بھی نہیں سمجھا گیا؛ وہ انکار جس میں نہ صرف نوجوان لوگ، بلکہ املاک والے بلکہ عمر رسیدہ مرد اور عورتیں بھی شامل ہوتے ہیں۔

امن کے لیے اس قسم کا کام بنیادی طور پر تعلیم پر منحصر ہوتا ہے۔ ماضی میں کیا جانے والا کام اور وہ کام بھی جو لوگوں کے اقبال کو جنگ کے خلاف اور امن کی موافقت میں کیا جا رہا ہے، شان دار ہے، اور اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ شاید اسی زمرے میں نوٹیل فاؤنڈیشن اور برٹھا فان سٹمر (Bertha von Suttner) کے کام کو شامل کیا جانا چاہیے، جس کے لیے دنیا ہی کو نہیں، فائدہ اٹھانے والوں کو بھی ممنون ہونا چاہیے۔

”امن“ کی دوسرے قسم کی مرگرمی [دراصل] سیاسی ہوتی ہے، جو بالخصوص حکومتی یا دوسرے شعبوں مقاصد کے لیے کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، امن کے اداروں نے ورسائی (Versailles) کے معاہدوں کی شکلوں پر تنقید کی ہے اور (کم از کم امریکا میں) دوسری عالمی جنگ میں غیر مشروط ہتھیار ڈالنے کے مطالبے سے اختلاف کیا گیا ہے۔

Women's International League for Peace and Freedom نے (میں ایک عرصے سے جس سے منسلک ہوں) ایک بین الاقوامی ادارے اور اس کے قومی شعبوں کی حیثیت میں 1915ء سے اب تک کام کیا ہے، اور مجھے امید ہے کہ سیاسی پارلیمنٹوں کے میدان میں، ایک عرصے تک کام کرتا رہے گا، اگرچہ وہ سیاسی سطح پر اکیلا نہیں ہوگا۔ اس کے قومی ترین مددگاروں میں ہمیشہ اسکیٹنڈی نیویا کی خواتین رہی ہیں۔ مجازت ہو تو میں نوٹیل لائبریری کو اس ادارے کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنا چاہتی ہوں: A Venture in Internationalism نام کا ایک کتابچہ، جو اب ایک مادرشے بن چکا ہے، اس لیے کہ اب اس کا شائع شدہ کوئی اور نسخہ موجود نہیں۔

امن کے لیے اس قسم کا کام جن ظاہر ہے کہ تاریخی ہو چکا ہے، ایک مسلسل اور طویل کوشش ہے ایک بین الاقوامی ادارے کے قیام کی، جسے جنگ کو روکنا بھی چاہیے اور بین الاقوامی تعاون کی پرورش بھی کرنی چاہیے۔

ایک محیط امن کی تشکیل کے ذریعے امن کے حصول کی بہت، اور مختلف نوعیت کی کوششیں کی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ متجسس وہ کنفیڈریشن تھی جس میں Iroquois Indians کے کئی قبائل شامل تھے جن کو امریکا میں The Six Nations کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سب سے قدیم اداروں میں یونان کی ایک قدیم لیگ (Amphictyonic) یا کانٹونل تھی۔ اسکیپوں کا ایک طویل سلسلہ تھا، جس میں سب، کم و بیش، قبل از وقت اور یونانی تھے، مگر سب ایک نے اپنا حصہ ڈالا تھا، جس میں سولی (Sully) اور ولیم پنن (William Penn) اور کانٹ (Kant) سے ووڈرو ولسن (Woodrow Wilson) تک اور ان کے ساتھ کام کرنے والے اور ان کے ورثہ شامل تھے۔ یون کو لیگ آف نیشنز کا قیام دیکھنا نصیب نہ ہوا، نہ ہی اس کا ملک اس میں شامل ہوا۔

جیسا کہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں، ایسی لیگ آف نیشنز جس میں نہ روس ہو اور نہ امریکا، نامکمل ادارہ تھی۔ اور یہ بھی کہ، جب مشکل وقت آیا تو، جاپان میں شہنشاہیت، ہسپانیہ میں رد عمل، اطالیہ میں فسطائیت یا جرمنی میں مائسیت کے خلاف حکومتیں قربانی دینے یا خطرات کا سامنا کے لیے تیار نہیں تھیں۔

اپنے پیش رو اداروں کے مقابلے میں اس نئی تنظیم، اقوام متحدہ، میں کچھ واضح فوائد ہیں۔ اس کی ابتدا ہوئی تھی کام سے مددگاروں کے ایک چھوٹے سے گروہ سے نہیں، جو بنیادی طور پر دوسری جنگ کے معاہدوں کی تفصیل پیش کرنے میں مصروف رہے تھے بلکہ [اس کام سے] جو بنیادی طور پر تمہیدی مباحث میں کیا جاتا تھا۔ یہ مباحث ملکوں کے ایک اچھے خاصے بڑے گروہ میں ہوئے تھے پہلے ڈمبارٹن اوکس (Dumbarton Oaks) میں، پھر سان فرانسسکو میں، جس میں اس با ریاست ہائے متحدہ اور روس دونوں شامل تھے، جس کے لیے [یہ گروہ] ممنون احسان تھا صدر فرانکلن روزویلٹ کا۔ اس کو تجربہ ہے لیگ آف نیشنز کا، اور دوسری عالمی جنگ نے اس کو مفید تنبیہات فراہم کی ہیں۔ لیگ آف نیشنز کے مقابلے میں کم آدرش، پرامیدی، اور اعتماد کے باعث، یہ زیادہ متین ہے، اور نادرے نے اسے ٹریگڈی (Trygve Lie) جیسا سیکریٹری جنرل دیا ہے جو اعتماد اور امید میں اضافہ کرتا ہے۔

دوسری جانب، اس کے کام میں وہ رکاوٹیں ہیں جو لیگ آف نیشنز کو درپیش نہیں تھیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے، جو لیگ آف نیشنز کو نہیں تھی کہ امن کے معاہدوں کی تشکیل سے پہلے ہی اس کو اپنی عملی زندگی کا آغاز کرنا پڑ رہا ہے۔ جرمنی اور آسٹریا اور جاپان اب بھی قبضے میں ہیں۔ ہندوستان کی جنگ ایک مسئلہ ہے جو بقول کسے "ہر قسم کی رعبت بڑھا دیتی ہے"۔ ممکنہ اعتبار سے بھی دنیا میں امن نہیں ہے، جرمنی کے نازک معاملے میں بھی کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے، جو اشد ضروری ہے۔ مزید یہ کہ اقوام متحدہ کو سامنا ہے فوری فیصلوں اور کئی تیلیے اور پیچیدہ معاملوں کا، یونان میں، فلسطین میں اور کوریا وغیرہ میں۔ مزید یہ کہ یہ ایسی دنیا میں کام کر رہی ہے جو جنگ کی تباہ کاریوں سے ناقابل تصور حد تک نصف کشتہ زنی ہوئی ہے۔ اب ہم تو ہندوستان اور چین کے قحط کے عادی سے ہو گئے ہیں (اگرچہ یہ اتنا ہی تکلیف دہ ہے جتنا کہ یہ سب ہمارے گھر کے قریب ہوتا)۔ اب خود یورپ بھی بھوکا دکھائی دے رہا ہے، انفرادی طور بھی اور مشترکہ صورت میں بھی، ہر

طرف لڑنے پھوٹے اسباب کے طبع کے ہیر، سوخت لکڑیاں اور حد نظر تک میدانوں میں اناج کے کھیتوں کے بجائے سفید رنگ کی گریزی مٹی چلیں۔ پیداوار اور تجارت اتنی متاثر ہوئی ہے کہ ان کی بجائی ایک مسئلہ ہے جس پر قابو نہیں پایا جاسکتا، اگر یہ سیاسی مشکلات کے باعث پیچیدہ نہ بھی ہوتیں۔ ساتھ ہی، سوویت یونین، اور اس کے دوست ممالک، اور مغربی جمہوریوں کے مابین غیر معمولی تلخ نظریاتی اور قومی اختلافات ہیں، جن کی وجہ سے دونوں بڑی طاقتیں یا طاقتوں کے بلاک، خوف اور شبہات کے ساتھ آمنے سامنے ہیں۔

اس نئی عالمی تنظیم نے اچھا کام کیا ہے جو موجودہ حالات میں حیرت انگیز ہے۔ دراصل یہ، حقیقت کے تناظر میں دیکھا جائے کہ اس کو قائم کیا جا چکا ہے اور کام بھی کر رہا ہے، تو یہ ایک معجزہ ہے۔

مگر اس کے امتحان کا وقت ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ قومی ترکیب اسلحہ جات اور مشترکہ حفاظتی فوجوں کے نتیجے معاملے میں، پولیس جیسی حیثیت ہو یا فوج جیسی، اس کو واضح کامیابی نہیں ہوتی ہے۔ جوہری توانائی کو موثر طریقے سے کنٹرول کرنے کے معاملے میں یہ مہارت ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آگے بڑھنے کی راہ میں کچھ اختلافات ہیں۔ جماعتی جنگ و جدل کا خوف اور سائنسی علوم کی دوسری برائیاں، جہاں تک مجھے علم ہے، کبھی زیر بحث نہیں رہے ہیں۔

اس کی اپنی فکری اور فوجی تیاری نہ ہونے کے باعث ایک قسم کی بے صبری پھیل گئی ہے، اور امن کے میدان میں ہونے والی ترقیات میں سب سے زیادہ واضح طلب جو برہنہ دکھائی دے رہی ہے وہ عالمی حکومت کی ضرورت ہے۔ اس ابھرتی ہوئی تحریک میں ہم سب کو دلچسپی لینا چاہیے۔ یہ قومی حاکمیت کی ضرورت کو محدود کرنے کے لیے، جہاں تک ضروری ہو، تمام انسانی گروہوں کی خواہشات اور مقاصد اور خود ارادیت کی قربانی سمیت، عوام کو تعلیم دینے کی اہم خدمت انجام دے رہی ہے۔

مگر اس تحریک کے اپنے بھی بہت سے خطرات ہیں۔ چونکہ یہ اقوام متحدہ کو کمزور کرتی ہے اور ایک مخصوص قسم کی سنگ دلی کو ہمیز کرتی ہے، اس کی ملامت کی جانی چاہیے۔ میرا تذبذب اس سے بھی آگے آگے چلتا ہے۔ میری نظر میں حکومتیں ایک مخصوص قسم کے تاریخی اداروں کی طرح ہوتی ہیں جو دانش و علم کے معنوں میں کسی طرح بھی حرف آخر نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں، ہم کو ابھی چین، روس، ہندوستان اور مستقبل کے Montesquieu [علم سیاست کے فرانسیسی فلسفی Montesquieu کا پیش کردہ فلسفہ جس کے مطابق منظم، معتدل اور عدلیہ کے درمیان سیاسی اختیارات کی تقسیم ہو۔ مترجم] جیسے فلسفیوں سے ممکنہ سیاسی حکیموں کے بارے میں سیکھنا ہوگا۔ ہمیں دنیا کے نئے اور چمک دار اداروں کو قبل از وقت پرانے اور بے لوجی مانچوں میں زبردستی ٹھونڈنا نہیں چاہیے۔

حکومتوں کے عجب میں ان کی خراب وراثت ہوتی ہے۔ یہ خطرناک ہوتی ہیں اس لیے کہ ہم ان کی عجیب کرتے ہیں اور ان کو اپنے آدرش کی جگہ دیتے ہیں، اس لیے کہ وہ طاقت کی خواہشوں سے آلودہ ہوتی ہیں اور ان کے نزدیک عزت بہت اہم ہوتی ہے اس کے علاوہ، یہ جسمانی جبر کی ذخیرہ گاہ ہوتی ہیں، جسے اور

مقامات پر رد کر دیا جاتا ہے۔ حکومت کیا شے ہوتی ہے؟ یہ وہی ہے جو بری اور بھری فوجیں رکھتی ہے، پولیس رکھتی اور ٹیکس لگاتی ہے (جہاں تک ٹیکس لگانے کا سوال ہے تو یہ اس وقت صحیح ہوتا ہے جب صحیح مقاصد کے لیے ہوا اور مناسب مقدار میں ہو، اور میں سمجھتی ہوں کہ عام طور پر عوام پر زیادہ ٹیکس نہیں لگایا جاتا)۔

جب کبھی ”عالمی حکومت“ کی بات ہوتی ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے ایک ادارہ جس کی تشکیل سونس یا امریکی نمونے پر کی گئی ہو، جس میں انتظامیہ، مختصر اور عدلیہ کی شاخیں ہوں۔ کبھی تو اس کا مجوزہ تصور بہت سادہ رہا ہوتا ہے، جس میں سارے اختیارات ایک مرکزی مقتدرہ کے پاس ہوں، تاکہ ان کے ذریعے زبردستی پر قابو پایا جائے اور جنگ کو شروع ہونے سے روکا جائے۔ میرے نزدیک اس میں ایک بھونٹی بھائی امید بھی ہوتی ہے کہ اگر کبھی ایسا خطرناک امکان پیدا ہو جائے کہ کوئی قوم بین الاقوامی قوانین پر عمل سے انکار کرے تو حکومت کے نہیں، اس کے عوام کے خلاف سخت عملی اقدام کے ذریعے اسے راہ راست پر لایا جاسکے۔ 1939 میں پہلا ایسا کون سا فرد ہوتا، سوائے ہٹلر کے، جسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کی جاتی؟ اور کیا ہٹلر کو سدھارنے کی کوشش کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ پوری طرح مسلح عوام کے ایک جم غفیر سے جنگ کی جائے؟ مجھے تشدد اور حملے کے خلاف مشترکہ تحفظ کی اہمیت کا اعتراف ہے، اور بلاشبہ لیگ آف نیشنز کی طرح اقوام متحدہ کا بھی کردار یہی ہے کہ وہ ان حالات کا سدباب کرے جن کی وجہ سے مار دھار والی جنگیں شروع ہوتی ہیں جنہیں بالآخر مشترکہ اقدام سے غلط قسم کی رہنمائی کے ذریعے قابو میں لایا جائے۔ ابھی تک تو کوئی مناسب حل نہیں نکالا گیا ہے۔ قابل فہم حد تک ممکن، قابل فہم حد تک مناسب اور موثر ہوتے ہیں، وہ کنٹرول جو غیر عسکری، اخلاقی دباؤ، اجتماعی سیاسی دباؤ، مختلف نوعیت کی اقتصادی پابندیوں، اجتماعی اقتصادی دباؤ اور آخر میں منظم پولیس اور غیر فوجی قسم کے مسلح سپاہیوں کی طاقت کے ذریعے کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود بظاہر ایسے طریقوں پر کم ہی غور کیا جاتا ہے۔

ترک اسطرح بات کے، جو ایک پرامن دنیا کے لیے کسی قدر بنیادی مسئلہ ہے، چینی طور پر نہ کوئی ۶۲ رتیں اور نہ دور دور نظر آتے ہیں۔

اگرچہ غیر ضروری حملے کے مدارک، تشدد کی روک تھام اور اجتماعی تحفظ کا انتظام کرنے کے طریقے اہم ہیں، جو سلامتی کا کونسل کے فرائض میں سے ہے، مجھے افسوس ہے کہ اس عالمی ادارے کے دوسرے فرائض میں، بالخصوص مختلف میدانوں میں تعاون کی ترقی میں، عوام اتنی دلچسپی لیتے نظر نہیں آتے جتنی کہ ہونی چاہیے۔ عالمی اتحاد کے حصول کے امکانات بہت ہیں۔ ایسے تعاون کی تنظیم کسی ایک نظریے کا انحصار نہیں ہوتی بلکہ محسوس ہونے والی ضروریات کا جواب ہوتی ہے۔ یہ وہی سمت ہے جس میں اقوام متحدہ کا ادارہ حقائق کے دباؤ کے رد عمل میں اور مشترکہ کاروبار کی ضرورت کے پیش نظر خود بہ خود ترقی کر رہا ہے۔ اس ضمن میں جو مخصوص کمیشن اور دوسرے ادارے کام کر رہے ہیں، ان کی فہرست طویل ہوگی۔ تحفظ کے میدان میں کام کرنے والوں کے علاوہ بھی لوگ ہیں جو مزدوری، تجارت، نقل و حمل، شہری ہوا بازی، اطلاعات، بین الاقوامی قانون،

ہینکارنی اور سرمایہ انسانی حقوق، عورتوں کے رُجے، غذا اور کاشت کاری، صحت، دیہاتی بیماریوں پر قابو، پناہ گزینی، تعلیم، سائنس اور تمدن (بے شمار ذیلی تقسیم سمیت)، امانت داری، آبادی کا مہیب مسئلہ، شماریات، وغیرہ وغیرہ کے لیے کام کر رہے ہیں۔

ٹامس کارلائک (Thomas Carlyle) "عضویاتی ریشوں" کی بات کرتے تھے اور ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ اقوام متحدہ کے تعاون کرنے والے شعبوں کا وقتی جذبہ انسانوں کی ایک ناقابل شکست بافت (web) تیار کر رہا ہے جو ہمیں امید ہے کہ مشترکہ مقاصد کے لیے کیے جانے والے مشترکہ کام کی عادت کے ذریعے سب کو ساتھ رکھے گا۔

اقوام متحدہ کے انتظامی پہلوؤں میں بھی بہتری کے بہت امکانات ہیں، اور اس تناظر میں بین الاقوامی منظمہ ایک قسم کا تعاون ہی تو ہے۔

اقوام متحدہ کا انتظامی کام اب تک امانت داری میں ہی زیادہ نظر آتا ہے۔ سیاسی امانت داری کا تصور سیاسی میدان میں نسبتاً ایک نئی ایجاد ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ٹیکنیکی میدانوں میں، مادیوں کے استعمال کرنے کے فن میں اتنی ایجادات ہو رہی ہیں پھر بھی آدمی ایک دوسرے سے معاملہ کرنے کی ایجادات میں کتنا پیچھے ہے۔ یٹانیوں نے ہمیں اسمبلیاں دیں، برطانویوں نے نمائندہ پارلیمان اور پارلیمانی حکومت۔ سوئٹزرلینڈ اور ریاست ہائے متحدہ نے وفاقی انداز حکمرانی ایجاد کیا، جس میں مرکزیت اور عدم مرکزیت کو یک جا کر دیا ہے۔ مگر من حیث الکل، یہ فہرست بہت معمولی ہے اور ان کی ایجادات میں سب سے بڑی حالیہ ایجاد جدید پرنٹنگنگٹن ہے، جو عوام کی رائے کی جائز تعلیم کی ایک مہارک کوشش ہے۔

عوامی امانت داری کا تصور وہ کوئی فرد دیویا ادارہ، ایک مفید خیال ہو سکتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں اسپتال، کالج، عوام کی بہبود کی ہر قسم کی ذمہ داریاں زیادہ تر امانت داروں کے ایک بورڈ کے ذمے ہوتی ہیں اور وقف کے اداروں کے لیے ان کی کارکردگی قابل احترام درجے کی ہے۔ ایک ہی آدمی جو وال اسٹریٹ (Wall Street) میں حصص کا کاربائار کرتا ہے، چیرا بنانے کی اپنی مہارت پر فخر کرتا ہے، مگر جب اسے کسی قسم کی عوامی خدمت کی امانت داری سونپی جاتی ہے تو وہ اپنی مہارت کو محض چیرا بنانے کے لیے وقف نہیں کر دیتا، بلکہ اب اس کی پہچان عوام کی بہبود کے کسی باغیچے، کسی تحقیقی ادارے، یا کسی اور معاملے سے منسلک ہو جاتی ہے۔

مگر نوآبادیات ہی وہ واحد میدان نہیں جس میں بین الاقوامی انتظام کے جوہر دکھائے جاسکیں۔ افسوس کی بات ہے کہ طیارہ رانی (aviation)، جو اپنی نوعیت میں اتنی بین الاقوامی ہے، اب تک نجی اور مسابقتی کاروبار کے طور پر ترقی پا رہی ہے۔ ہزار افسوس کہ یہ یا تو قبل از وقت ارتقا پذیر ہو گئی ہے، یا بین الاقوامی سطح پر، عوام کے لیے ایک مشترکہ کاروبار کے طور پر اس کی تنظیم دیر سے ہو رہی ہے۔ جنگ کے گردار پر اور بین الاقوامی مذاکرات پر اس کا گہرا اثر ہونے والا ہے۔ اسی طرح جوہری طاقت کو بھی بین الاقوامی انتظام کی

ضرورت ہے، اور کم از کم اس کا اعتراف تو کیا جا رہا کہ ایسا ہونا چاہیے۔

پانی کی دنیا، یعنی کرۂ ارض کے آبی راستے، ابھی تک حق شفعہ سے محروم ہیں۔ کل تک تو لہروں پر برطانیہ کی حکمرانی تھی، اور اس معاملے میں اب تک اس کے مقام کا تعین بھی نہیں ہوا ہے۔ ”بڑے سمندروں“، آبی راستوں اور نہروں کے لیے، وہ قدرتی ہول یا مصنوعی، جن کی سیاسی مسائل پیدا کرنے کے سلسلے میں مخصوص اہمیت ہیں، اقوام متحدہ کیوں کوئی مقتدر ادارہ قائم نہیں کرتی؟

مثال کے طور پر [ترکی کے سمندروں، مارمارا اور آجیجی، کے درمیان کی آبی گزرگاہ Dardanelles کی، ایک باقاعدہ تیار کی گئی عالمی مقتدرہ کے ذریعے بین الاقوامیت سے [عالمی] سیاسی نقشے پر موجود سب سے زیادہ سوزنا مسئلے کو جھٹکا گیا جاسکتا ہے۔

غیر آباد قطبی علاقے بھی، و علاقے ہیں جو خاص طور پر اقوام متحدہ کے تحت بین الاقوامی انتظام کے لیے موزوں ہیں۔ ابھی تک ان کا بیش تر رقبہ کسی کی عمل داری میں نہیں، اور [ان کے معاملے میں] دعوے داریاں اور رقابتیں بڑھ رہی ہیں اور زیادہ ہنگامہ خیز ہونی جاری ہیں۔

امید کی جاتی ہے کہ اگلی جنرل اسمبلی میں کوئی نہ کوئی حکومت ان دو مسئلوں کو اپنے فہرست کار پر رکھے گی اور مطالبہ کرے گی کہ قطبی اور بحری مسائل پر غور کرنے کے لیے وہ مخصوص کمیشن قائم کیے جائیں جو ان پر اپنی سفارشات پیش کریں۔

تمدنی سطح پر ایک عالمی تنظیم کی بھی شروعات ہو رہی ہے جو کھوتی نہیں بلکہ باضابطہ [بین الاقوامی] ہے۔ اگر UNESCO کو اس کا مقام نہیں ملا ہے، تو اس لیے کہ اس کے آگے کھڑی سائنس، موبہتی، عنائی، مذہب اور تعلیم کے میدانوں کے امکانات اتنے وسیع ہیں کہ ابھی تک ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ اس کے لیے [ابھی] بہت زیادہ انتظام کی نہیں، رابطے، مشاورت اور تعاون کی ضرورت ہے۔

اگر، جیسی کہ امید ہے، UNESCO ایک آفاقی، اضافی یا معاون زبان اختیار کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے، جس کے انتخاب کرنے اور تفصیل پیش کرنے میں International Language Association آج کل مشغول ہے، تو ادب کے لیے یہ ایک ایسا نیا سویرا ہوگا، دنیا نے اب تک شاید جس کا خواب بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ نہ کسی بھی قدرتی زبان میں دست اندازی ہوگی، نہ ان کی ترتیب نو ہوگی، نہ ان کی بنیاد کو کسی سطح پر محدود کیا جائے گا۔ مگر تمام آدمی، جو لکھ پڑھ سکتے ہیں، آفاقی سطح پر سمجھی جانے والی ایک بولی کے ماہر ہو جائیں گے۔ اس طرح صرف کاروبار، سفر اور ہر طرح کے عملی طریقوں ہی میں بڑا فائدہ نہیں ہوگا، تصورات اور خیالات کے میدانوں میں بھی اس کی خدمت بہت اہم ہوگی۔ شعرا اور بڑے ادیبوں کی پڑھ سکنے والے تک پہنچ ہو جائے گی، جس میں نہ صرف یورپی اور امریکی عوام شامل ہوں گے، بلکہ چینی، عرب، جزائر کے لوگ اور افریقا کے لوگ بھی شامل ہوں گے، بلکہ جس میں یہ سب اپنا اپنا غنیمت حصہ بھی ڈال سکیں گے۔ موبہتی اور ریاضی میں پہلے ہی سے آفاقی علامت نویسی موجود ہے جو انہماک خیال کو اب تک مہیا نہیں ہوتی

ہے۔ موتی کے مقابلے میں، طبع شدہ اور بولے ہوئے الفاظ کے لیے ایسے [رنگا رنگ] محام، عالمی ادب کو لا انتہا قوت اکٹھا کر سکتے ہیں۔

ایسی دنیا میں ہر جنگ ایک خانہ جنگی ہوگی، اور ہمیں امید کرنی چاہیے کہ اس کا ہوا روز بروز ناقابل تصور ہوتا جائے گا۔ یہ پہلے ہی سے ایسی اقتصادی تباہی اور سرکشی سلسلہ ہائے رد عمل اور ایسے خوف زدہ امکانات کے قابل ہو چکی ہے کہ وہ حقیقتاً کوئی پاگل ہی ہوگا جو جوہری جنگ شروع کر سکے گا۔

میں نے خوف کے خلاف، امن کی بنیاد پر ہی، بات کی ہے۔ ہمیں جس چیز سے خوف آنا چاہیے، بالخصوص ہم امریکیوں کو، وہ یہ نہیں ہے کہ کوئی بھی ہم پر ایک جوہری بم گرا سکتا ہے، بلکہ اس سے کہ ہم دنیا کے حالات کو اس فوج پر آمگے بڑھنے کی اجازت دے سکتے ہیں، جس میں ایک معمولی مثال کے طور پر مہذب انسان ہمارا نمائندہ بن کر، ہمارے نام سے ایسے جھجھیا استعمال کر سکتا ہے۔ ہمیں پہلے سے یہ طے کر لینا چاہیے کہ کوئی اشتعال، کوئی لالچ ہمیں جنگ کو متبادل اور خوف ناک آخری حربے کے طور پر استعمال کرنے پر آمادہ نہیں کرے گی۔

خدا کرے کہ کبھی کسی بھی نوجوان آدمی کو ایسے حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے، جن میں اسے اپنے ضمیر کے خلاف، بڑے پیمانے پر قتل و غارتگری کرنے یا ان لوگوں سے اپنے آپ کو الگ کرنے کا فیصلہ کرنا پڑ جائے، جو آزادی، جمہوریت، انسانیت کو بچانے کی کوشش میں اور کوئی راستہ اختیار نہیں کر سکتے، سوائے اس کے کہ وہ قتل کرنے کے لیے نوجوانوں کی جبری بھرتی کریں۔

جوں جوں عالمی کمیونٹی امن کے سایے میں ترقی کرتی جائے گی، انسانی فطرت میں چھپے عظیم خزانے ظاہر ہوتے رہیں گے۔ جس طرح پانی پر دباؤ پڑنے سے فوارہ پھوٹ نکلتا ہے، ویسا ہی اس نسل کا رد عمل ہوگا، جس کے نوجوان مرد اور عورتوں کی نشوونما دوستانہ اور محفوظ ماحول میں ہوگی، اس دنیا میں جسے ان کی خدمات کی ضرورت ہوگی، جو انھیں comradeship پیش کرے گی، اور ہر طرح کی جاں بازی اور چیلنجز یا فطرتوں کی طرف بلائے گی۔

ہمیں نہ کسی یونیورسٹی میں شامل ہونے کے لیے کہا جاتا ہے، نہ اس پر یقین کرنے کے لیے کہ ہم اگلے ہی ٹکڑ پر ایک کامل دنیا آراستہ ہوگی۔ ہمیں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے اور اگلے ہر قدم پر، جیسے ہی وہ عملی طور پر ممکن ہو، تیار رہنے کے لیے صبر کی تلقین کی جاتی ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم ہمت، امید، مشکل کام کرنے اور عظیم اور عالمی ہمت آدرشوں کو دل میں بسانے کے لیے تیار رہیں۔

اعلانِ تجلیل — جان ریلے مات

ایمیلی گرین بالش کی طرح جان ریلے مات بھی امریکی تھے، جنھیں ان کے ہمراہ اس برس کے نوبل

امن انعام میں شریک کیا جا رہا ہے۔ وہ ریاست نیویارک کی Sullivan County میں 25 مئی 1865 کو پیدا ہوئے تھے۔ قیاس تھا کہ وہ اپنے والد کے نقش قدم پر چلیں گے، جو ڈیلویئر (Delaware) دریا تک پانی پہنچانے والی ایک ذیلی ندی کے کنارے آبِ راستے سے، چوب (timber) فراہم کرنے کا کاروبار کرتے تھے۔ مگر یہ [جان] بڑے بڑے انسان تھے اور قصبے کے میٹھوڈسٹ پادری نے ان کے والدین کو ان کی تعلیم جاری رکھنے پر راغب کر لیا تھا۔ ایک عرصے تک اس لڑکے کو کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے۔ ان کے والد کو امید تھی کہ وہ چوب کی تجارت کی طرف واپس آئیں گے۔ جب کہ وہ خود کھیرا، قانون اور سیاست کے درمیان لہرا رہے تھے۔ مگر اپنی تعلیم کے دوران انھیں یسوع مسیح کی بنی نوع انسان کے لیے محوش خبری (Gospel of Christ) نے جتنی زور کر رکھا تھا۔ اور جب YMCA کی جانب سے انھیں امریکا اور کناڈا کے طالب علموں میں سفری سکرٹری بنانے کی پیش کش ہوئی تو انھوں نے اس پیش کش کو اپنے آقا [یسوع مسیح] کی جانب سے طلبی کی پکار پر محمول کیا۔ اور انھوں نے اس پکار کا [مثبت] جواب دیا۔ یہ [پکار] ان کو ڈیلویئر دریا کی طرف نہیں لے گئی۔ اس نے ان کو اس وسیع دنیا میں جا پھینکا، اور یہی [پکار] ان کو آج یہاں لے آئی ہے۔ جن لوگوں نے نوبیل امن انعام حاصل کیا ہے ان میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو امن کانفرنسیوں میں، ترکیہ، اسلواجات کی کانگریسوں اور ثالثی کے معاہدوں میں، یا تیکھے سپاہی مواقع کو قابو میں رکھنے میں موافقت نہ کردار کے ذریعے بڑے مشکل تنازعات کو حل کرنے میں مخلص رہے تھے۔ مگر محترم جان ماٹ آج ہمارے درمیان موجود ہیں، اس لیے کہ وہ اس پکار کے وفادار رہے ہیں جس کا مثبت جواب انھوں نے اس وقت دیا تھا جب وہ ایک نوجوان طالب علم تھے، اس لیے کہ انھوں نے عالمی ادارے بھی بنائے ہیں جنہوں نے گروہوں نوجوانوں کو امن کے عیسائی آدرش اور قوموں کے درمیان برداشت کے لیے کام کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ مگر وہ ہمیشہ ایک ابھرتی ہوئی طاقت اور یسوع مسیح کی خدمت کے لیے کبھی نہ ٹھکنے والے سپاہی، نوجوانوں کے ذہنوں کو اس روشنی کی طرف متوجہ کرنے والوں میں سے رہے ہیں جو ان کے خیال میں امن کی طرف دنیا کی رہنمائی کرتی ہے اور انسانوں کو افہام و تفہیم اور خیر سگالی کے نقطے پر مجتمع کرتی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ نوجوانوں کے لیے کام کیا ہے کہ ان پر ہی مستقبل کا دارومدار ہوتا ہے کہ وہی تو مستقبل کے رہنما ہیں۔ وہ جذبہ جو نوجوانوں کو دھڑکاتا ہے، ایک دن دنیا کی تشکیل نو کرے گا۔ اپنے آقا کے نہ ٹھکنے والے غلام کی طرح عمر رسیدہ جان ماٹ اب بھی نوجوانوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ ان کی طویل زندگی نے انھیں مایوسیوں سے بھی دوچار کیا ہے مگر وہ نہ کبھی ان کے جذبے کو مرد کر سکی ہیں، نہ ان کی سرگرمیوں کو ٹھنڈا کر سکی ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ بالآخر بھلائی کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے، کہ تمام آزمائشیں اور کوششیں، تمام مایوسیاں اور تمام ناکامیاں عیسائی وعدوں کی تکمیل کرتی ہیں اور یہ بھی کہ ایک دن تمام آدمیوں میں ایسا ہو جائے گا۔ ہمیں صرف اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا چاہیے، اور اپنے اعتماد پر بھروسہ کرنا چاہیے کہ ایک دن اس خوف بھری دنیا میں متواتر خدمت کے جذبے، امن کی کیاریوں میں بیجوں سے اُکھوے پھوٹے دیکھیں گے۔

یونیورسٹی کے اس نوجوان طالب علم کو جس نے دوسرے طلبہ تک خدائی پیغام کی تبلیغ کرنے کی خاطر ایک کالج سے دوسرے کالج تک سفر کیا تھا، ان فرائض اور امکانات سے اچھی طرح واقف تھا ہے جو اس کو ورکشاپ ہوں گے۔ وہ جانتا تھا کہ کھری اور کھلی comradeship جو عیسائی امریکا اور کناڈا کے طلبہ کو متحد کرتی ہے، دنیا کے لیے ایک نہایت طاقت ور لہر بن سکتی ہے اگر ملک ملک میں دوستی کے حلقے کو وسیع کیا جائے۔ اور انھوں نے اپنے اس خواب کو حقیقت بننے دیکھ لیا۔ World's Student Christian Federation کی 1895 میں بنیاد رکھی گئی اور ان کی رہنمائی میں Vadstena Castle میں ایک اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس خوش گوار واقعے کے بعد، مات اپنے پہلے تبلیغی دورے پر نکل پڑے۔ وہ پوری دنیا میں طلبہ کی انجمنیں منظم کرنا چاہتے تھے۔ اپنے اس سفر میں انھوں نے چوبیس ملکوں کا دورہ کیا، مہترنی انجمنوں کی بنیاد رکھی، ہندوستان، نیوزی لینڈ، چین اور جاپان میں عیسائیوں کی قومی انجمنیں بنائیں اور مصر، یوڈا، اور بہت سے یورپی ملکوں میں عالمی وفاق کے مسائل ارکان منتخب کیے۔ اس کے بعد وہ کئی بار پوری دنیا کے سفر پر گئے۔ کسی [منجھے] نے ان کے سفر کا حساب نکالا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے سفر کے دوران 20 ملین میل طے کیے ہیں، جو دنیا کے قطر کے ستر گنا کے برابر ہوتے ہیں۔

بہت کم لوگوں نے اتنے ملکوں کا سفر کیا ہے، اتنے لوگوں سے باتیں کی ہیں، اور لوگوں کو اس قدر متاثر کیا ہوگا جتنا کہ جان مات نے کیا ہے۔ وہ کافی تیاریوں کے بغیر کسی سفر پر نہیں جاتے تھے۔ جب انھیں کسی ملک کے سفر پر جانا ہوتا تو وہ پہلے اس کی تہذیب، اس کے طور طریقوں، اس کے مذہبی اور سیاسی پس منظر کا بغور مطالعہ کرتے تھے۔ اور جب واپس پہنچتے تو ان تمام لوگوں کے بارے میں بات کر سکتے تھے، جن سے وہ دوست کی حیثیت سے مل چکے تھے جو ملک کی وہاں کے لوگوں اور ان کے رہن سہن کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کا دماغ ہمیشہ نئے اثرات کے بارے میں، اور مختلف انداز میں سوچنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ وہ کبھی امریکیوں کے انداز میں پولینڈ، جنوبی امریکا یا مشرق میں انجیل کا پیغام لے کر نہیں گئے۔ وہ سادہ عیسائیت کے پیغام پر تھے اور ایسے انداز میں پیش ہوتے تھے کہ دیکھنے اور سننے والوں کو حقیقی [پیغمبر] نظر آتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ خدا ہمارا باپ ہے۔ اور اگر خدا ہمارا باپ ہے تو ہم سب آپس میں بھائی ہوئے، اور کوئی مرحدی یا نسلی تقسیم نہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔

وہ تمام طلبہ جو مات کے اداروں میں جمع ہوتے تھے صرف پروٹسٹنٹ ہی نہیں ہوتے تھے۔ وہ رومن کیتھولک، آرتھوڈوکس، ہندوستان کے Thomist، عیسائی، Nestorian، شامی اور Coptic کلیساؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ مات چاہتے تھے کہ وہ عیسائی دنیا کو ایسے نئے رہنما فراہم کریں جن کی محبت اور برداشت پر انی مرحدوں کے پار ان لوگوں تک پہنچے جو الگ ہو گئے ہیں۔ ان کے مطابق، تمام نسلیں ایک عظیم روحانی کمیونٹی کی تشکیل میں حصہ لے سکتی ہیں اور یسوع مسیح کو اپنی تمام تر طاقت اور جلال کے ساتھ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لیے نسلوں اور قوموں کی ضرورت ہوگی۔

مات خود تو ایک میٹھوڈسٹ (Methodist) ہیں مگر انھوں نے کبھی کسی فرقے کے نمائندے کی حیثیت

سے سفر نہیں کیا ہے۔ انہوں نے ہر مسلک اور ہر نسل کے لوگوں کے درمیان کام کیا ہے، اور ان کی امداد اور مشورے سب کے لیے ہوتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ نہ صرف تمام مذہبی حلقوں سے، بلکہ سائنس دانوں، سیاسی رہنماؤں، مدعوؤں، اور سب بڑھ کر جو انوں سے بھی رابطے میں رہیں۔ ان کی بے ساختہ تبلیغ ان لوگوں کے لیے بڑی محنت اور وجدان کا باعث ہوتی تھی وہ جن سے مخاطب ہوتے تھے، ان کے طاقت ور، بڑا قیاسی سفید اور نجیب کردار نے انہیں بہت سے دوست اور اتباع کرنے والے دیے، اور یسوع مسیح کے پرچم تلے قوموں کے درمیان بھائی چارے کے راستے پیدا کیے۔ ان کا مرکزی مقصد ہمیشہ تبلیغ ہوتا تھا۔

ان کی دوسری تمام خوبیوں میں ان کی عظیم تنظیمی صلاحیتوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے۔ World's Student Christian Federation جس کی انہوں نے والدستہ (Vadstena) میں بنیاد رکھی تھی، ان ہی کی رہنمائی میں ایک طاقت ور تنظیم بن کر ابھری، جس کے چالیس سے زیادہ ملکوں میں لاکھوں ارکان بنے۔ انہوں نے عیسائی طلبہ کی کانفرنسوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس کی سب سے اچھی کانفرنس 1907 میں توکیو میں منعقد ہوئی تھی، جس نے مشرق بعید میں تحریک کی ابتدا کی تھی۔

اس ادارے کے کام، اس کا پیش نامہ اور اس کی قرارداد پر، جو اس نے دنیا بھر میں کبھی تھیں، ان کی طاقت ور شخصیت کی چھاپ تھی۔ اس کی ایک قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ہم عیسائی طالب علم تمام نسلوں اور قوموں کے درمیان بنیادی مساوات پر یقین رکھتے ہیں اور عوام کے ساتھ اپنے رشتوں میں اس اصول کے انکار کو اپنا فرض مسمیٰ سمجھتے ہیں۔ ہم اس کو بھی اپنا قومی فرض سمجھتے ہیں کہ ہم ہر اس شے کے مقابلے کے لیے اپنی تمام کوشش صرف کریں جو جنگ کی طرف لے جائے اور بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لیے ہم جنگ کا بھی مقابلہ کریں گے۔ ماٹ اور اس کی طلبہ تحریک نے قوموں کے درمیان امن، خیر سگائی اور افہام و تفہیم کے بچنے کا کام کیے وہ سب امن کے شہزادے یسوع مسیح کے بارے میں ان کے تصور کے فطری سرائی تھے۔ ایک زمانے میں اس تحریک کا نصب العین یسوع مسیح کو ”شاہشاہ یسوع مسیح“ بنانا تھا۔ یہ ماٹ کے احسارات کا خلاصہ۔ یسوع مسیح بادشاہ تھے ماٹ جن کے خادم تھے اور جو جنگ وہ لڑ رہے تھے وہ جنگ تھی امن کے حصول کی، جو ان کا بادشاہ بنی نوع انسان کو دینا چاہتا تھا۔

تیس برس تک ماٹ عیسائی طلبہ کے منظم کرنے والے اور رہنما تھے۔ مگر ساتھ ہی وہ کئی عشرے YMCA میں، جس نے پہلی بار ان کو نوجوانوں کی خدمت کے لیے طلب کیا تھا، ایک اہم شخصیت رہے تھے اور 1926 میں World's Alliance of Young Men's Christian Associations کے صدر بنادے گئے تھے۔ یہ ادارہ Student Federation کی خطوط پر چلا جا رہا ہے، مگر اپنے کردار میں بہت وسیع ہے۔ اس کی رکنیت میں، جس میں ہر سماجی طبقے اور پیشے کے لوگ ہوتے ہیں، پچاس ملکوں کے دو ملین لڑکے اور نوجوان لوگ شامل ہیں۔ یہ [ادارہ] ہر عیسائی مسلک سے متعلق دنیا بھر کے خود مختار اداروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ مندوبین اور اثباتوں کا مقابلہ بھی کرتا ہے، مطالعہ کرنے والے گروپ بناتا ہے اور بین

الاقوامی اور کیمیائی اتحاد کے چلے منعقد کرتا ہے، منصوبہ بندی کے ذریعے قوموں کے درمیان امن کے مسائل کے تعمیری حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مات آج بھی World's Alliance کے سربراہ ہیں اور اس کے استحکام اور وجدان کا سرچشمہ ہیں۔ [اپنے مرکزی ادارے کی] رکن انجمنوں کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے میں ان کی غیر معمولی انتظامی صلاحیت اور پراسرار چارہ سازی نے انھیں انسانیت کے لیے بے چوڑے کام میں کامیابی عطا کی ہے، جو روحانی میدان میں ان کی کارکردگی کے علاوہ ہے۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران جب زیادہ تر بین الاقوامی تنظیمیں ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں، مات اپنی تنظیموں کے لیے وسائل اکٹھا کر رہے تھے، جو دونوں جانب کے [مقابلہ ملکوں کے] کروڑوں جنگی قیدیوں کی بہبود کا کام کر کے محاذ پر لڑنے والے سپاہیوں کے درمیان پیدا ہونے والے نفرت کے جنم کو عبور کرنے کی عظیم کوششوں میں مشغول ہوتی تھیں۔ [خود] ہمیشہ حرکت میں رہے ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک محاذوں پر جانا، جنگجو اور غیر جانب دار ملکوں کے مدبروں سے مذاکرات کرنا، اپنے بڑے بڑے منصوبوں کے لیے مددگاروں کی بھرتی کرنا، جس کے لیے اب تک وہ 250 ملین ڈالر کی رقم اکٹھی کر چکے ہیں۔ ان کے کارکن ذہنی اور جسمانی طور پر معذور انسانوں کو جنگی قیدیوں کے لیے قابل قبول ہونے کے لیے تیار کرتے ہیں تاکہ ان کو جنگ کے بعد عام زندگی کے دھارے میں شامل کیا جاسکے، ان کو ان تلخیوں سے آزاد کیا جاسکے جو جنگ اور قیدی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، تاکہ ایک بار پھر قوموں کے درمیان کام میں شراکت ممکن ہو سکے۔

صدر ٹاف (Taff) کے مطابق، امن کے لیے کیے جانے والے کاموں میں یہ سب سے بڑا کام ہے جو جنگ کی پوری تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں کیا گیا ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ خصوصی طور پر یہ مات کے تنظیمی جینینٹس اور وجدانی رہنمائی سے ہی ممکن ہو سکا ہے۔

عارضی جنگ بندی کے بعد مات کی توجہ اور توفیقی خدمات سے آزاد کر دیے جانے والوں کی طرف مبذول ہو گئی جس کا اتنا اچھا اثر ہوا کہ ہزاروں جوان لوگ جسمانی اور اخلاقی تباہی کے غار میں جانے سے بچا لیے گئے تھے۔ یہ ایک طاقت ور شہادت ہے مات کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں اور ولولے کی، جس کی بنا پر ان کو اور ان کے مددگاروں کو پلینڈ، چیکیو سلوواکیا، یونان، بلغاریہ، رومانیہ، استونیہ، لیتویا اور لیتھویینیا میں فلاحی کام کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران YMCA نے، جب مات اس کے سربراہ تھے جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں حالات بہتر بنانے کے دیونیکل کام کو دوبارہ شروع کیا۔ امن کی آمد کے ساتھ، اسی برسوں کی بد مزگی کے بعد بھی، مات ایک بار پھر جنگ کے باعث ٹوٹ جانے والے اپنے پرانے بین الاقوامی تعلقات کی تجدید اور اپنے ادارے کی پہلی عالمی کانفرنس کا انتظام کرنے کے لیے سفر پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ پچھلی گرمی کے موسم میں مات کی صدارت میں کانفرنس جینیوا میں منعقد ہوئی تھی۔

مگر ہر سرزمین کے عیسائیوں کے نوجوانوں کا یہی ایک بین الاقوامی کام نہیں تھا، جسے ماٹ کی طاقت ور رہنمائی سے کوئی قاعدہ پہنچا تھا۔ پوری ایک نسل کے لیے کھیرائی اتحاد کے سلسلے میں ماٹ رہنمایانہ شخصیت رہے ہیں۔ 1910 میں ایڈنبرا میں منعقد ہونے والی World Missionary Conference میں، یورپ، شمالی امریکا اور آسٹریلیا کے پروٹسٹنٹ کھیراؤں نے ماٹ کو ان کی بین الاقوامی سرگرمیوں کی رہنمائی سوچ دی تھی۔ بعد میں، ماٹ نے افریقا، ایشیا اور جنوبی امریکا کے کھیراؤں کو بھی اپنی انجمن میں شامل کر لیا تھا۔ انھوں نے International Missionary Council کی بنیاد بھی ڈالی تھی اور اس کی صدارت کے ساتھ Institute of Social and Religious Research کی صدارت بھی سنبھال لی تھی۔

1928 میں یروشلم میں ہونے والی World Missionary Congress کی رہنمائی میں یورپ اور امریکی کھیراؤں کے نمائندوں نے مسلم دنیا، ہندو کی اور برطانوی انڈین، چین، پاکستان، فارس، عراق، عرب اور افریقا کے کھیراؤں سے ملاقات کی تھی۔ کانفرنس نے ایک تفصیلی اور تعمیری نسلی پروگرام پر قرارداد منظور کی تھی جس میں قدیم باسیوں کو اقتصادی اور سماجی نا انصافی سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے کوڈ شامل کیا گیا تھا، قوموں کے درمیان فساد کے سدباب کے لیے اقتصادی کشادگی کی پالیسی کا ایک منصوبہ بھی تیار کیا گیا تھا۔ 1938 میں انھوں نے ہندوستان کے شہر تمپرم (Tambaram) میں منعقد ہونے والی World Congress of the International Missionary Council کی صدارت کی تھی۔

ماٹ نے نسلی امتیاز کے خلاف جنگ کے لیے دنیا کے ہر حصے میں انتھک کام کیا ہے۔ ان کو اس مسئلے کے بارے میں جتنا علم ہے، مثالیہ کسی اور کو نہیں ہوگا، اس لیے کہ وہ ہر جگہ گئے ہیں، انھوں ہر طرح کے لوگوں سے گفت و شنید کی ہے، ان تمام ملکوں کے حالات کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا جن کا دورہ کر چکے تھے۔ وانگ (Wang)، جو چار مرتبہ چین کے وزیر خارجہ رہ چکے ہیں، کہتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ میں آنے والے کئی بحرانوں میں، جب بین الاقوامی پیچیدگیوں کی وجہ سے واقعی تنازعات کھڑے ہو سکتے تھے، ماٹ نے اپنے تمام رسوخ کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک پرامن حل تلاش کر لیا تھا۔

1913 میں صدر وین نے، جو ماٹ کے کردار اور ان کی صلاحیتوں پر بے انتہا بھروسہ کرتے تھے، ان پر چین میں سفیر کا عہدہ قبول کرنے کے لیے بہت دباؤ ڈالا تھا، اس لیے کہ وہ ان لوگوں سے اور ان کے حالات سے واقفیت رکھتے تھے اور اس لیے بھی، کہ ان میں سے بہت سے لوگ جو چین میں نئی حکومت بنانے میں سب سے زیادہ مؤثر کردار ادا کر رہے تھے YMCA کے زمانے کے ان کے دوست بھی تھے اور بدوگار بھی۔ مگر ماٹ نے انکار کر دیا تھا۔ انھیں اپنے کام سے وفادار رہنا تھا۔ وہ کئی اداروں کے ذریعے اپنے امن کے کام کو آگے بڑھلا چاہتے تھے جن کے وہ صدر رہ چکے تھے۔ ماٹ کے انکار کی خبر سن کر انھوں نے کہا تھا کہ ”مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں کبھی اتنا مایوس ہوا ہوں۔“

1916 میں جب ریاست ہائے متحدہ اور میکسیکو کے درمیان ایک مشکل تنازعہ کھڑا ہوا تھا، صدر وین

نے ماٹ کو اس وفد کا رکن بنایا تھا جو میکسیکو بھیجا گیا تھا، اور یہ ماٹ کی سناٹہ کے عین مطابق تھا کہ پریس ان کی تعیناتی کو میکسیکو کی طرف بڑھے ہوئے ہاتھ سے تعبیر کرے۔ یہ قطعی غیر متوقع نہیں کہ میکسیکو کے حالات سے ان کا قریبی تعلق اور امن سے ان کا لگاؤ مذاکرات میں ہونے والی کامیابی پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہوتا۔

اگلے برس ہی، ماٹ روس جانے والی ایک سفارتی مہم کے رکن تھے۔ ان کے جرمن دوستوں نے بعد میں اس مہم میں حصہ لینے پر ان کی سرزنش کی تھی، مگر ان کا فریضہ کسی طرح بھی سیاسی نہیں تھا، اور ان کے لیے یہ ایک غیر معمولی خراج ہے کہ جرمنی والوں نے بعد میں ماٹ کی نیت پر اعتماد کا اظہار کیا، مگر وہ اس بات کو زیادہ پسند کرتے، اگر سفر اختیار کرنے سے پہلے ماٹ اس بین الاقوامی حیثیت سے دست بردار ہو گئے ہوتے۔

نسلی مخالفت کو زیر کرنے کے سلسلے میں ماٹ کا کام امن کی اس زنجیر کی ایک کڑی کی طرح تھا جو انھوں نے دنیا کے اطراف باندھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر یہ کام اس سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ یہ انفرادی قوموں کے مابین انسانوں کے درمیان رشتوں کو احرام بنانے کی ایک سعی بھی تھی۔ اپنے ملک، ریاست ہائے متحدہ، میں انھوں نے نیکرو افراد کی طرف سے بہت سے کام انجام دیے تھے۔ اپنی ہی سوسائٹی میں تعصب کے خلاف جنگ کرنے کے لیے کام کرنے والے آدمی کی شخصیت اور اس کے کردار کو کسی عام قسم کے کام کی سعی کے مقابلے میں زیادہ قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنوب کی ریاستوں میں مختلف پیشے سے تعلق رکھنے والے سفید فام اور رنگ دار دونوں نسلوں کے سربراہان پر مبنی نمائندہ اجتماعیں بنانے کی تحریک کے پیچھے ماٹ ہی کی طاقت کام کر رہی تھی۔ ان کا مقصد موجودہ نسلی دیواروں میں نرمی پیدا کرنا تھا۔ 1914 میں انھوں نے ریاست ہائے متحدہ میں نیکرو افراد کے لیے منعقد ہونے والے پہلی عیسائی کانفرنس کی صدارت کی تھی۔ اسی برس کے دوران، اور امریکا کی تاریخ میں پہلی بار، ماٹ کی صدارت میں شمال اور جنوب کی ریاستوں کے سیاہ اور سفید فام عیسائیوں پر مشتمل ایک کانگریس کا اجلاس ہوا تھا۔ ماٹ نے اپنے اختتامی خطاب میں کہا تھا کہ اگر ہم عیسائی ہیں تو ہمیں سچے دوستوں کی طرح، مساوات، انصاف اور باہمی احترام کے ساتھ کھٹے رہنا چاہیے۔

یہی وہ اصول ہے جو مختلف کلیساؤں کے تبلیغی مرکوزوں، نسلوں اور قوموں میں ماٹ کے کام پر حاوی رہا ہے۔ تین عالمی ادارے جو ایک نسل تک ان کی رہنمائی میں پھیلے پھولے ہیں، — Student Federation، Young Men's Christian Association اور the International Missionary Council، ان کے ہاتھوں کے وہ اوزار ہیں جن سے عیسائی برداشت کا جذبہ تراشا گیا، اور وہ محبت و وجود میں آئی جو دنیا کو امن عطا کر سکتی ہے۔

ایلی ہورلٹ (Elihu Root) نے جنھیں نوٹیل امن انعام مل چکا ہے اور جو امریکی وزیر خارجہ بھی رہے تھے، ماٹ کے بارے میں کہا ہے: ”میرے خیال میں ان کی طاقت و شخصیت اور امن کے لیے ان کی

کھل اور بے غرض گلشن کی کوئی بھی برآمدگی نہیں کر سکا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں اپنی سرکاری حیثیت سے فائدہ نہیں ہوا ہے بلکہ ان کے کیے ہوئے کام سے خود اس رُتبے کو اہمیت ملی ہے۔ برسوں وہ دنیا کے سفر پر رہے ہیں اور اس دوران اپنی سرکاری حیثیت کے استعمال سے انھوں نے اُن بنیادی تصورات کے حق میں ایک کانٹاتی ہمدردی پیدا کر لی ہے، جن پر امن کا دار مدار ہے۔“

[برطانیہ کے وزیر اعظم] لارڈ رائیٹلی نے کہا تھا کہ کسی قوم کا اس کے اپنے نوجوانوں کے ہاتھوں تحفظ پانا ایک شان دار اور قابل دید منظر ہوا کرتا ہے۔ مگر کیا یہ اس سے زیادہ شان دار منظر نہیں ہوگا، بقول ماٹ، کہ بین الاقوامی امن اور خوشحالی کے اونچے آدرشوں کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں ہر قوم اور نسل کے نوجوان اکٹھے کھڑے نظر آئیں؟

بہت سے مثالیت پسند مشاہیر مرد اور عورتوں نے، جو ہماری تعریف کے مستحق ہیں، امن کے قیام اور رکھوتوں کے درمیان ثالثی معاہدوں کی عام قبولیت، اور بین الاقوامی عدالتوں، بڑے آفیشلز اور اقوام متحدہ کی تشکیل کے سلسلے میں غیر معمولی کام کیے ہیں۔ یہ سب کام ماٹ [ہی] نے نہیں کیے ہیں۔ مگر انھوں نے وہ فضا تیار کرنے کی کوشش [ضرورت] کی ہے جس کے میں امن کے لیے کیے جانے والے کام کی نشوونما اور حفاظت ہوتی رہے۔

ایک بار خود انھوں نے اس بات کا اظہار ان لفظوں میں کیا تھا: ہمیں ثالثی معاہدوں اور دوسرے بین الاقوامی قوانین کو امن اور ثالثی کانفرنسوں کی ضروری معاملات کے مشتہر کرنے کی جدوجہد کو اور ان معاملات پر مضبوط عملی فیصلوں کو ہمیشہ اہمیت دینی چاہیے، مگر ہمیں سب سے بنیادی نکتے پر یک خیال ہونا چاہیے جو بقیہ کو زندگی اور اثر پذیری دے، جو تھا ایسی فضا تیار کرے اور قائم رکھے جس میں بین الاقوامی ثالثی موجود رہ سکے، جو اس کو موثر بنائے، بہتر، [حتیٰ کہ] فاضل بنادے۔ اور یہی طریقہ ہوتا ہے صحیح قسم کی فضا بنانے، دل و دماغ کو صحیح کیفیت میں لانے، قوموں کی زندگی میں معقول جذبہ ذہن نشین کرانے کا۔

ماٹ کا کام تمام بنیادی نکتوں پر مرکوز رہا ہے۔ وہ پوری دنیا میں گئے ہیں اور انھوں نے لوگوں کے دلوں کے دروازے وا کیے ہیں، امن کے تصور کے لیے، مفاہمت کے لیے، محبت اور برداشت کے لیے۔ یہ سب انھوں خدا کے حکم پر کیا ہے، اور اس حکم کی رہنمائی ہی میں انھوں وہ زمین تیار کی جس میں دنیا کی امیدیں نمودار ہوں گی۔

نوبل کمیٹی کے رکن Herman Smitt Ingebrechtsen کی زبانی

خطبہ:

رہنمائی کی ضرورت، اس نہایت اہم وقت میں

موجودہ نہایت اہم وقت میں دنیا کی تعمیری قوتوں کی قیادت کا استحکام بہت ضروری ہو گیا ہے، اس لیے کہ حالیہ برسوں میں تقریباً ہر براعظم میں ناقابل یقین، عظیم الشان اور حیران کن تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ حد سے زیادہ قوم پرستی اور انقلاب پسندی نے پرانی دنیا کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے، اور اب ایک نئی دنیا ظہور میں آرہی ہے۔ حقیقی معنوں میں یہ سچ ہے کہ پرانی چیزیں ختم ہو رہی ہیں، کہ اب سب کچھ نیا ہونے والا ہے، بد شرطے کہ ہمیں بے لوث اور ثابت قدم رہنا مل جائیں۔

اب وقت آ گیا ہے کہ بہتر منصوبوں کی مدد سے جہالت، افلاس، بیماریاں، فساد اور گناہ جیسے انسان کے قدیم دشمنوں کے خلاف زیادہ جارحانہ اور زیادہ کامیاب جنگ و جدل کی جائے۔ ایسی واضح مہمیت کی رہنمائی اب لابدی ہو گئی ہے، تاکہ نئے متمدن کے معماروں کے پاس ضروری پس منظر ہو، ہمسرت ہو اور گرفت ہو جس کے ذریعے کامیابی سے ان طاقتوں کا سامنا کیا جائے جو مخالفت کرتی ہیں اور پارہ پارہ ہو جاتی ہیں۔ کتنی مازک، طاقت ور اور بد شکون ہیں یہ سب جو شرق میں اور غرب دونوں میں موجود ہیں۔

بالخصوص صحیح قسم کے بین الاقوامی رشتوں کی پرورش کی اقلیم میں ایسی اعلیٰ معیار کی قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں [ایسی صورت میں] ضرورت اتنی شدید ہوتی ہے اس کی مزاحمت نہیں کی جاسکتی۔ کچھ معنوں میں موجودہ نسل، وہ پہلی نسل ہے جو اتنی بین الاقوامی ہو سکتی ہے مگر خود کو اس کے لیے تیار نہیں پاتی۔ مازک اور ٹکڑاویں والی بے ترتیبی اور غلط فہمیاں بھی بہت ہوتی ہیں، اور ان سے پیدا ہونے والا فساد ان کے خلاف کام کر رہا ہوتا ہے۔ [لہذا] ہمیں تمام لوگوں کے اندرون میں داخل ہونے اور ان کی نیوٹوں اور خامیوں کو تہمل کرنے کے سوا کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔

مزید یہ کہ اب ہم ایسے عہد میں داخل ہو گئے ہیں جس میں ہر مرزبان کی اقتصادی حقیقتیں اور طاقتیں بنیادی اور سنگین فکر کی طالب ہوتی ہیں۔ یہ ہم کو تیس ویں صدی کی مشینوں کے ساتھ پاتی ہیں، مگر پرانے سیاسی، سماجی اور غذائی تصورات کے پیش ناموں کے ساتھ۔ اس کے نتیجے میں حقیقتاً کروڑوں افراد بے روزگار، مآسوسہ اور تنہا ہیں۔

اسرار کے ساتھ یہ مطالبہ سامنے آیا ہے کہ نیکی کی بے لوث قیادت کو طاقت ور کیا جائے تاکہ تقسیم کرنے والی قوتوں کے حیرت انگیز طور پر بڑھتے ہوئی اثرات کا تعمیری انداز میں سامنا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اقتصادی میدان میں چونکا دینے والے انکشافات نظر آرہے ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں یہ محض واضح ہی نہیں بلکہ مفلس اور دولت مند، برسر کار اور بے روزگار کے درمیان کے پرانے تنازعات۔ جی ہاں، کچھ زیادہ ہی چونکا دینے والا معاملات بھی ہیں، جو اقتصادی شہنشاہیت، تجارتی استحصال اور قدرتی وسائل کے غیر منصفانہ استعمال اور دنیا کے نام نہاد کھیلے ہوئے علاقے جیسے فقروں کے ذریعے بیان کیے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی میدان میں بھی اختلاف برپا کرنے والی دوسری طاقتیں بھی سامنے آرہی ہیں جو حالیہ دو عالمی جنگوں میں بڑے جتانے پر اپنے خوف ناک عزائم میں کامیاب ہوئی نظر بھی آرہی ہیں۔ اختلاف برپا کرنے والے یہ

انکشافات نسلی تعلقات کے صحتوں میں موجود ہیں۔ کچھ مصلحتوں میں یہ بہت خطرناک ہو گئے ہیں اس لیے کہ ان کے بارے میں سب سے زیادہ غفلت برتی گئی ہے۔

بالا میں، اگر دنیا کی تمام تعمیری قوتوں کو کامیابی دلا رہا ہے تو ایسی مضبوط قیادت ضروری ہے اور اس کا شدت سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اور یہ مطالبہ بھی ناقابل مزاحمت ہے کہ ہر سرزمین کے ہر فرد کو دوبارہ مطالعہ کرنا، پھر سے سوچنا، دوبارہ بیان کرنا اور نئے برے سے غور کرنا چاہیے، [اور] جہاں ضروری ہو پروگرام اور منصوبوں کو بالکل تبدیل کرنا چاہیے اور نئے اور زیادہ وسیع پروگرام موثر کرنے چاہئیں۔

اب سوال یہ ہے کہ دنیا کے غول و عرض میں آج اور آنے والے کل میں نیک اور بے لوث قیادت کس قسم کی ہونی چاہیے؟

اب ضرورت ہے ادراک رکھنے والی قیادت کی۔ ایسی جسے موجودہ توسیعیاتی، اشد اور خطرناک عالمی صورت کی پوری طرح واضح اور روشن آگاہی ہو۔ قائدین کو اپنے ماضی اور پس منظر کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ انھیں اصل میدان جنگ کا علم ہونا چاہیے، اور اس طرح انھیں مخالف قوتوں اور عناصر کا بھی علم ہونا چاہیے، اور ان کا بھی جو ہمارے ساتھ ہیں۔ انھیں اپنی دنیا کا، اپنے دور کا اور اپنے مقوم کا بھی علم ہونا چاہیے۔ مستقبل کے اپنے قائدین کی دریافت میں ہمیں پُر جوش نوجوانوں کے جواب کے منظر سوالات سے اور انسانی فطرت کے امکانات سے آگاہی بھی ہونی چاہیے۔ علاوہ بریں، ہمیں اپنے فوق البشری دہانوں پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

اس قیادت کی جس کی فوری اور اشد ضرورت ہوتی ہے، صحیح مصلحتوں میں تحقیقی اور موجدانہ ہونا چاہیے۔ ہماری طلب ہے مفکرین کی، میکینیکی کارکنوں کی نہیں۔ اس زمانے کے دانش مند قائدین کی سرمد آورہ شخصیت، بشپ گورے (Bishop Gore) نے ہماری سمندر ہمیں ایک ضرورت کو ایک مقولے کے کوزے میں بند کر دیا ہے، جو آج بھی اتنا ہی بر محل ہے جیسا کہ کل تھا۔ ”ہم غور کرتے ہیں اور ہم دعا کرتے ہیں“، یعنی ہم اپنی بنیادی قوت عقل کی قوت کو استعمال ہی نہیں کرتے نہ اپنی سب سے بڑی اور بے نظیر قوت—دعا کی ملکوتی قوت—سے مدد لیتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہم سینٹ پیٹر (Saint Peter) کی تاکید ”اپنے دماغ کی کمر کس لو“ [یا، اپنا دماغ درست کر لو] پر بھی توجہ دیں۔ یہ امر کتنا ضروری ہے کہ، ان لوگوں کو، جو مستقبل کی تمھاری تحقیقی قوتوں کی قیادت کرنے والے ہیں انھیں مرگرمی سے غور کرنا چاہیے کہ ہمیں اپنی زندگی کے نظم و ضبط، اپنی روح کی تہذیب، اور اپنی روحانی دریافت کی روش کی کبرائی اور اس پر ایسا تصرف ہونا چاہیے جو ہمیں ایک سخت گیر عہد کی طلب کو پورا کرنے کے قابل بنائے۔

قیادت کو مدبر کے رتبے کا ہونا چاہیے۔ اور اس موقع پر اُسے اپنے آپ کو ایک اصل مدبر کے خدو خال—ایک حقیقی سیاسی مدبر کی یاد دلائی چاہیے۔ پس، اسے بصیرت رکھنے والی شخصیت ہونا چاہیے۔ مدبر جو کچھ دیکھتا ہے عوام کو نظر نہیں آتا۔ اس کی نگاہ، ایک نظر میں، بہت کچھ دیکھ لیتی ہے، جب کہ وہ دھڑوں کے

دیکھنے سے پہلے دیکھ لیتا ہے۔ کتنا سچ ہے یہ کہنا کہ جہاں بھسرت نہیں ہوتی وہاں لوگ تباہ ہو جاتے ہیں۔
سب سے زیادہ قابل اعتماد و قائم وہی ہوتا ہے جو رہنما اصول اختیار کرتا ہے اور ان کا اخلاق کرتا ہے۔ وہ
راہ نما ثنائی ستارے کی طرح ان پر بھروسہ بھی کرتا ہے۔ اپنے اصولوں پر چلتا ہے، خواہ کتنے ہی لوگ اس کے
خلاف ہوں، خواہ کتنے ہی موافق ہوں۔ مہاتما گاندھی کی حیرت انگیز قیادت کا یہی اصل راز تھا۔ پریشان کن
حالات میں بھی، خواہ کتنا ہی مہنگا کیوں نہ پڑے، وہ عدم تشدد مذہبی ایذا، اچھوت پن سے انکار اور اقتصادی
خود مختاری کے رہنما اصولوں پر ہی عمل پیرا رہے تھے۔ عظیم مدبرین رشتوں کا پاس کرتے ہیں۔ موجودہ
پریشان کن دور جیسے حالات میں قائدوں سے اسی کی توقع کی جاتی ہے۔

دیہ پا اثرات حاصل کرنے اور ان کو قائم رکھنے کی کوشش میں وہ صلاحیت ضروری ہوتی ہے جو مضبوط
اعصاب کے لوگوں کو دریافت کرنے اور انھیں استعمال کرنے میں کام آئے۔ یہ خاصیت، Rothschild's،
Lincoln جیسے بڑے لوگوں میں پورا اثر انداز میں ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔

اپنے زمانے کے ممتاز منتظم کرڈن (Curzon) نے کہا تھا کہ ہم دل کے ذریعے حکومت کرتے ہیں۔ اتنی
غلط فہمیوں، مزاحمت اور فساد کے موجودہ دور میں شاید اور کسی خصوصیت کی زیادہ ضرورت نہیں۔

تمام عظیم سیاسی، مذہبی اور سماجی اصلاح کے رہنماؤں کی ممتاز صفت پیش بینی رہی ہے۔ جیوڈو رولز ویلٹ
نے اپنے دفتر کی دیوار پر ایک کہادت اور اس کرکھی تھی جو صحیح معنوں میں اس کی زندگی بھر کی عادت کی توضیح کرتی
تھی: ”لوے فی صد دانش مندی، بروقت دانش مندی ہوتی ہے۔“ آپ کو یاد ہوگا کہ افریقہ کے عظیم منتظم سیسل
رہولڈز (Cecil Rhodes) کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ہمیشہ منسوبہ بندی کرتا رہا تھا کہ اس برس کے بعد
کے برس وہ دنیا کرے گا۔

ہر قوم کے، ہر طبقے کے رہنماؤں کی اولین اور چھوٹ کی طرح نکلنے والی اور دیہ پا صفت ان کا بے داغ
کردار ہوتا ہے۔ [یونانی ہیر: Plutarch] میں اور [پانچویں صدی قبل مسیح کے یونانی مدبر] Aristides the
Just کے باب میں یہ خصوصیت کتنی ابھرتی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں [پندرہویں صدی کا اطالوی مدبر]
Lorenzo de' Medici کیسا لگتا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ”وہ مہذب تھا مگر بد عنوان، دانش مند
تھا مگر ظالم، معج شکی کی تعریف لکھنے میں صرف کرتا تھا اور شب بھر بکھڑے ہونے میں۔“

صحیح معنوں میں امن اور اور خیر سگالی کی نشوونما کرنے اور نسلی اور مذہبی دشمنی پر قابو پانے والا رہنما بننے
کے لیے تعاون کے جذبے اور مقصد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایلی ہولروڈ جس نے اس خصوصیت کا مظاہرہ کیا
تھا، اس بات پر زور دیتا تھا کہ آپ کسی قوم کی عظمت اور اس کے رسوم کا اندازہ دوسری قوموں سے تعاون
کرنے کی اس کی صلاحیت سے لگا سکتے ہیں۔

جب میں تمام دنیا کے لیے مشکل برسوں میں قیادت پر بات کر رہا ہوں تو میں ماروے کے رہنماؤں کو
بھی خراج عقیدت پیش کرنا چاہوں گا۔ اس سلسلے میں جنگ سے پہلے، اس کے دوران اور بعد میں جلالت

کارڈیل ہل اعلانِ تجلیل

کارڈیل ہل نے اپنی پوری زندگی بین الاقوامی رابطوں کو پاسیدار بنانے کے لیے وقف کر دی ہے۔ ان کے بارے میں عوام جو کچھ جانتے ہیں اس میں سب سے اہم اقتصاد کے میدان میں ان کی ان تحکک کوششیں ہیں جو ریاست ہائے متحدہ امریکا اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں مطلق العنان میلانات کے خلاف جذبات کی پیداوار ہیں۔ ان کوششوں کے بارے میں جو جنگوں کے دوران، بالخصوص صمدی کے دوسرے عشرے میں، قومی پالیسیوں پر اثر انداز ہوئی تھیں وہ خود کہتے ہیں: ”جب تک انتقام اور تلخ تجارتی تنازعات صف آرا رہتے ہیں، نہ مستقل تجارتی بحالی میں، نہ اعتماد میں اور نہ امن کے معاملات میں حقیقی ترقی ہو سکے گی۔“ قوموں کے درمیان اعتماد اور امن ان کی سرگرمیوں کے ہدف کی تشکیل کی بنیاد رہے ہیں۔ یہی طاقت ہے جس نے انھیں اپنے ملک کی جداگانہ حیثیت کے خلاف جنگ، امریکی براعظموں کی ریاستوں کے مابین ایک امن بلاک بنانے کی کوشش اور اقوام متحدہ کے لیے کیے جانے والے کام کے جذبوں کو ہمیز کیے رکھا ہے۔

کارڈیل ہل 1871 میں ریاست ہائے متحدہ کی ریاست ٹینیسی (Tennessee) میں پیدا ہوئے۔ نسبتاً نو عمری ہی میں انھوں نے قانون کی تعلیم میں کامیابی حاصل کی، کچھ برس وکالت کی، اور بعد میں جج بن گئے۔ مگر اپنے پیشے کی ابتداء ہی میں انھوں نے سیاست میں قدم رکھ دیا تھا اور ریڈیو کورنگ پارٹی میں ایک عام رکن کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔ وہ ایک سیاست داں کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں جس نے بیس برس کی عمر ہی سے سیاست کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف کر دی تھیں۔ مگر 1907 سے پہلے وہ ایوان نمائندگان میں داخل نہیں ہو سکے تھے۔ اس سے پہلے، بین الاقوامی سیاست کے میدان میں ان کے رویوں کی کھوج ممکن نہیں، مگر ان کا کیا جانے والا کام اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں دیانت دارانہ اور محتاط انداز میں کرتے ہیں۔ ان کے نقطہ نظر کی کلید ایوان میں ان کی تقریر کے کچھ حصے ہیں۔ اس تقریر میں انھوں

نے پُر زور طریقے سے آجروں اور مزدوروں کے مابین ثالثی کے خیال کو پیش کیا ہے، وفاقی حکومت کی جانب سے ریلوے اور بحری جہاز سے بھیجے جانے والے مال کے کرایے کے چست نظم و ضبط کی حمایت کی ہے، اور کچھ میدانوں میں بڑے اداروں کی جانب سے طاقت کے غلط استعمال کی مخالفت کی ہے۔ یہی نقطہ نظر مالی محصولات کے نظام میں اصلاح کے ضمن میں کی جانے والی تقریروں میں بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اُس وقت وفاقی حکومت کی مالی ضروریات بلا واسطہ مالی محصولات (indirect taxation) سے پوری کی جاتی تھیں، زیادہ تر فرد محاصل (tariff) سے؛ جب کہ ریاست ہائے متحدہ کی عدالت عالیہ 1885 میں اعلان کر چکی تھی کہ 1884 میں لگایا جانے والا اکم ٹیکس وفاقی آئین کی خلاف ورزی ہے۔

اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے، نکل نے محصولات کے سوال کو دوبارہ اٹھایا، اور 1912 میں ڈیموکریٹک پارٹی کی فتح کے بعد اکم ٹیکس کے نفاذ کے آغاز کو یقینی بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر، ہماری دلچسپی محصولات کی اصلاح میں اتنی نہیں، جتنی کہ نکل نے اس کی موافقت میں کی تھی۔ یقیناً انھوں نے اس کو وفاقی حکومت کی مالیاتی ضروریات کو پورا کرنے کے زاویے سے دیکھا ہوگا، مگر ان کی اصل غمگین ٹیکس سے متعلق تھی، ٹیرف سے نہیں۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ تحفظات کے اصول اجارہ داری [کے عفریت] خلق کرتے ہیں اور چند کے فائدے کے لیے بہتوں کو زیر بار کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ ایسا نظام آزادانہ مسابقت سے میل نہیں کھاتا، وہ جس کے بڑے ناشی ہیں۔

ہم ان کو روشن خیالی کی خوبیاں کے نمائندے کی حیثیت میں دیکھتے ہیں؛ [ایسی] روشن خیالی جس کے محنت نوعیت کے سماجی مقاصد ہوں۔ اس وقت تک انھوں نے اپنے بین الاقوامی خیالات کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔

ان [خیالات] کا ابتدائی اظہار پہلی عالمی جنگ کے دوران ہوا تھا۔ جیسا کہ ان کا سوانح نگار ہینس (Hinton) کہتا ہے: ”اس وقت تک ٹیرف کے بارے میں نکل کے نظریات ان کے اس تئسن کی بنیاد پر تھے کہ [اس قسم کا] تحفظ ایک داخلی شیطنت ہے۔“ جنگ کے اختتام تک ان کے اقتصادی خیالات کو اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے: اونچا ٹیرف تجارتی ترقیات اور قوموں کے درمیان دوستی کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے، اور اس طرح دیر پا بین الاقوامی امن میں بھی رکاوٹ بن جاتا ہے۔

کانگریس میں کی جانے والی 10 ستمبر کی اپنی اعلیٰ درجے کی تقریر میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا تھا: ”اس یقین کے ساتھ جیسا کہ مجھے ہے، جنگ کا بہترین تریاق اس کی وجہ کو دور کرنا ہے، بجائے اس کے کہ ان کے ایک بار ظاہر ہونے کے بعد ان کا سید باب کیا جائے۔ یہ دیکھنے کے بعد کہ اپنی بدترین صورت میں، تجارتی انتقام اور تعصبات تلخ اقتصادی جنگوں کا باعث ہوئے ہیں، جن میں سے کئی اسلحوں کی جنگیں بن گئی تھیں، میں نے پچھلے برس کی ابتدا میں ایوان نمائندگان میں ایک تجویز پیش کی تھی، جس میں تجارتی معاہدوں کی ایک کانگریس قائم کرنے کا خیال پیش کیا گیا تھا، اس مقصد کے ساتھ کہ باہمی رضامندی

سے تمام اتفاقی اور تعصباتی طریقوں کو بین الاقوامی تجارت سے بے دخل کر دیا جائے۔

1917 میں انھوں نے تجارتی مسابقت میں رائج طریقوں کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی معاہدے کا خیال پیش کیا تھا۔ لیگ آف نیشنز میں تجارتی پابندیوں کو کم کرانے کا مسئلہ اٹھایا گیا تھا اور 1927 میں جنیوا میں منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس میں بعد کے برسوں کے کام کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ ان کوششوں کا اوج عالمی اقتصادی کانفرنس کا 1933 میں لندن میں انعقاد تھا، جس میں کل خود بھی شریک ہوئے تھے مگر اس بار وہ [ریاست ہائے متحدہ کے] سیکریٹری آف اسٹیٹ تھے۔ ہم سب، جنھوں نے ان برسوں کے دوران اس کام میں ہاتھ بٹایا تھا، جانتے ہیں کہ ہماری پیش کردہ تجاویز کو مختلف ممالک کے سیاسی حالات کے زیر اثر، بار بار کمی مزاحتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ 1933 کی کانفرنس، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، کچھ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ شروع سے ہی سٹکے کی قیمت کے استحکام کے سوال پر بہت زیادہ زور ڈالنا ایک غلطی تھی؛ [مثلاً] یہی وجہ تھی، جس کی بنا پر روز ویلٹ نے وہ مشہور تاریخی برقی بھیجا تھا جس میں اس نے سٹکے کے استحکام کے منصوبے کو اس بنیاد پر رد کر دیا تھا، جیسا کہ اس نے کہا تھا، کہ کسی قوم کی خوش حالی کا دار و مدار اس کے صحت مند اندرونی اقتصادی ڈھانچے پر ہوتا ہے، دوسرے ملکوں کے سٹکوں کی قیمت کے مقابلے میں اس کے سٹکے کی قیمت پر نہیں۔ اس رویے نے، جو ریاست ہائے متحدہ میں پایا جاتا تھا، اور روز ویلٹ کے تاریخی میں ظاہر کیا گیا تھا، اس سلسلے میں کل کے کام کو چھپ کر دیا۔ جیسا کہ اکثر بین الاقوامی سیاست میں ہوتا ہے، لوگ اپنے ملک کی مشکلات کو دیکھ [اور سمجھ] سکتے تھے اور انھیں اپنی صلاحیت پر اعتماد تھا کہ وہ دنیا سے الگ رہ کر بھی ان کو حل کر لیں گے۔ کل کو اس خیال سے کسی طرح بھی اتفاق نہیں تھا۔ 27 جولائی 1933 میں لندن میں کی جانے والی اپنی تقریر میں انھوں نے کہا تھا: ”اس لمحے بھی دنیا اقتصادی اسلحوں کی وحشیانہ مسابقت میں مشغول ہے، جو مسلسل امن اور تجارت دونوں کو تباہ کر رہی ہے۔“ اور کچھ لمحے بعد اسی تقریر میں انھوں نے اضافہ کیا تھا: ”اگرچہ تمام اندرونی منصوبے ناگزیر ہیں، وہ ان خود کاروبار کو مستقل طور پر بحالی کی بلند ترین سطح پر واپس نہیں لاسکتے۔“

پھر بھی، کل نے بار نہیں مانی، حالاں کہ لندن کی کانفرنس میں ان کے خیالات کی پستپائی ہوئی تھی۔ 1934 میں وہ ایک نئی منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے جس کی رو سے صدر [اپنی صواب دید پر] غیرف کو پچاس فی صد کم کر سکتے تھے اور ان ملکوں سے درآمد پر عائد پابندیاں کم کر سکتے تھے جو ریاست ہائے متحدہ کو اسی نوعیت کی رعایات دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے نتیجے میں اس بل کی بنیاد پر وہ کم از کم ستائیس ملکوں سے تجارتی معاہدے کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ سب کچھ ریاست ہائے متحدہ کی اقتصادی پالیسی میں بنیادی تبدیلی کی نشان دہی ہے؛ یہ انگلستان کی آزاد تجارت کے عرصے کے دوران کی پالیسی کی تہذیب ہے، جو 1860 کی Cobden Treaty کا نمونہ ہے جس کی ”سب سے نیا وہ پسندیدہ قوم“ کی طبق اس کا حصہ بنی تھی مگر چہ، یہ تبدیلی جزوی طور پر ریاست

ہائے متحدہ کی سہاہکار (creditor) کی حیثیت میں منظوری کی وجہ سے ہوئی تھی، یہ ٹل کے لیے کچھ زیادہ ہی اہم ہے۔ یہ ٹل کا ناقابل تغیر یقین ہے کہ یہ بین الاقوامی رابطوں میں بہتری کا راستہ صاف کرے گی اور جنگ کی وجہ میں سے ایک وجہ کو ختم کر دے گی۔ اس شخص میں عجیب خصوصیت ہے: اگر سامنے سے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوتا تو فوراً ہی پہلو بدل کر نئے سرے سے معلومات اکٹھا کرنے لگتا ہے۔ یہ شکست تسلیم تو کر لیتے ہیں مگر اس کو کبھی حتمی نہیں سمجھتے، اس لیے کہ معاملے پر ان کا یقین بہت گہرا ہوتا ہے۔ یہ احساس کرنے میں اسنے حقیقت پسند ہیں کہ کسی لمحے جو کچھ بھی ممکن ہو اس پر اکٹھا کر لیتے ہیں، بجلئے اس کے کہ اس دن تک انتظار کریں جب شاید وہ ممکن ہو جائے۔

میں نے اقتصادی پالیسیوں کی ضابطہ بندی کے بارے میں ٹل کے کام پر کافی تفصیل سے بات کی ہے، کہ یہ ان کے فلسفے اور طریقے کی خصوصیات کو آشکار کرتی ہے، مگر میں نے ایسا کرنے میں ان کی زندگی کے واقعات کی جڑیں ڈال دی ہیں۔

ہاں! تو میں [ریاست ہائے متحدہ کے] ایوان نمائندگان میں ان کے کام کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ یہ [اپریل 1929 میں ریاست ہائے متحدہ کی] سینیٹ کے رکن بن گئے تھے مگر 1932 کے انتخابات میں روز ویلٹ کی کامیابی کے بعد یہ ہوا کہ سیکرٹری آف اسٹیٹ کی حیثیت سے، انھیں پہلی بار خود اپنے خیالات پر نظر غائر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ اب یہ کہنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے کہ کس حد تک خیالات اور پالیسیاں سیکرٹری آف اسٹیٹ سے اخذ کی جاتی ہیں اور کسی سطح پر صدر سے۔ اور یہ اس لیے کچھ زیادہ ہی مشکل ہے کہ، جیسا کہ سمر ویلس (Sumner Welles) کہتا ہے: ”کارڈیل ٹل جیسا کم مطلق انسان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی برسوں کی ممتاز اور مددگار کارکردگی کی نمایاں بغلی روشنیوں میں سے ایک یہ رہی ہے کہ یہ خود کو پس منظر میں رکھتے ہیں اور دوسروں کو کریڈٹ اور توصیف لینے دیتے ہیں۔ میں کئی نمایاں موقعوں کا گواہ ہوں جب مسٹر ٹل نے کسی منصوبے کی سلسلے میں اپنی نگاہیں پڑھنے کی صلاحیت یا لائق مر پرستی کو کسی اور کی طرف موڑ دیا تھا تا کہ پیش کی جانے والی کسی تجویز کی تخلیق کا کریڈٹ کسی اور معتدل مزاج سرکاری افسر کو مل جائے اور وہ خود اس امر پر قناعت کر لیتے تھے کہ ایک اچھے خیال کو نشوونما پانے اور پھولنے کا موقع مل رہا ہے۔

واقعی، یہ کسی بھی انسان کے لیے اعلیٰ درجے کی تعریف کی بات ہے، مگر یہ اور زیادہ لائق ستائش ہو جاتی ہے جب کسی سیاست دان کے بارے میں کی جائے، اس لیے کہ سیاست دانوں کی ایسے الفاظ میں تعریف مثلاً ذرا نادری کی جاتی ہے۔

اس مختصر سے خاکے میں 1932 کے بعد کے برسوں میں کیے جانے والے ٹل کے کام سے انصاف کرنا بہت مشکل ہے، اس کے لیے اس زمانے کی ریاست ہائے متحدہ کی خارجہ پالیسی کا گہرا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ شاید ہی کسی اور وزیر خارجہ کو اس سے زیادہ مشکل وقت میں یہ عہدہ سنبھالنا پڑا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، جس سال وہ اس عہدے پر فائز ہوئے، اسی برس اقتصادی تعاون کی شکست ہوئی اور جرمنی

میں بھڑاقتدار میں آیا تھا۔ اس کے بعد سے ہر سال ایسے واقعات ہوئے تھے جو کسی کو بھی مایوسی کے غار میں ڈھکیل دیتے، اور جونہایت سنگ دلی سے ایک اور جنگ کی طرف لے جاتے۔ پھر بھی، اندرون اور بیرون ملک، دونوں طرف سے اختلاف کے باوجود گل نے ہارنیل مالی ساگر ان کے خیالات کے لیے ایک راستہ بند کیا، تو وہ دوسرے راستے سے کوشش کرتے تھے۔ اگر وہ اپنے آدرش کو فوراً حاصل نہیں کر پاتے تو حالات سے جو کچھ مل سکتا اس پر قناعت کر لیتے اور وقت آنے پر دوبارہ حملہ آور ہوتے تھے۔

ان کی کل امریکی (Pan-American) پالیسی سے بہتر کوئی امران کے انداز کار اور غیر جانب داری کے بارے میں ان کے رویے کو واضح نہیں کر سکتا۔ روز ویٹ اور گل کی ضمانت دی ہوئی کل امریکی پالیسی 1933 کی Montevideo کانفرنس میں جاری کی گئی تھی جس میں دونوں براعظموں کی جمہوریتوں کی نمائندگی تھی۔ روز ویٹ کی "اچھے ہمسایے کی پالیسی" فوری ابتدائی نقطہ تھا اور ایک پالیسی ہدف تھا، اس اعتراف کے ساتھ کہ پوری دنیا اس میں شریک نہیں ہو سکتی، اس کا پہلا اور سب سے نمایاں ہدف امن کا قیام اور امریکی براعظموں کی قوموں کے ساتھ اچھی ہمسائیگی تھا۔ جیسا کہ گل نے ایک نئی گفتگو میں کہا تھا، "ہمیں زندگی کا ایک ایسا انداز اپنانا ہوگا جو ہر ہنگامے کے فرو ہو جانے کے بعد جو دنیا کے لیے مثالی ہو جائے۔"

اس کانفرنس میں گفتگو کے لیے ایک مسودہ تیار کیا گیا تھا جس میں ہر قوم کے حقوق اور فرائض کی حد بندی کی گئی تھی۔ شاید اس کی سب سے اہم دفعہ وہ تھی جس میں کہا گیا تھا کہ کسی قوم کو دوسری کے اندرونی یا بیرونی معاملے میں دخل اندازی کا حق نہیں ہوگا۔ اس کانفرنس کے بعد 1936 میں ہیڈس آفیس میں اور 1938 میں لیما (Lima) میں کانفرنس منعقد ہوئی۔ ہیڈس آفیس کانفرنس کی کامیابیوں میں سے ایک کامیابی جنگ کی صورت میں اجتماعی تحفظ اور غیر جانب داری کے لیے ایک معاہدے کی منظوری تھی۔ جب لیما کانفرنس ہوئی تھی، یورپ کا منظر زیادہ ڈراؤنا ہو چکا تھا، اور گل کی تقریروں کے لہجے میں ایک قسم کی سختی اور رفاہی محسوس کی جاسکتی تھی جن کا ارتکاز آمرانہ طرز کی ریاستوں سے ابھرنے والے خطرات پر تھا۔ لیما میں گل وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے جس کی تلاش میں تھے۔ بلاشبہ، کانفرنس امن کی ایک مثالی فتح کا منظر پیش کر رہی تھی، مگر Montevideo اور ہیڈس آفیس کی کانفرنسوں سے آگے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ سب سے بڑی رکاوٹ ارجنٹائن کا موقف تھا جو مختلف وجوہ کر بنا پر اتنی ذمہ داری سنبھالتے پر تیار نہیں تھا، جتنی کہ ریاست ہائے متحدہ لے رہی تھی۔ مگر اس میں ایک واقعے کا اضافہ ضروری ہے جو گل امریکی کانفرنسوں پر اثر انداز ہوا تھا، یعنی، لیگ آف نیشنز سے [ان براعظموں کے] ممالک کے روابط۔ شمالی امریکی ممالک [لیگ آف نیشنز کے] ارکان تھے مگر ریاست ہائے متحدہ نہیں تھی، اور اس حقیقت نے مشکلات پیدا کیں جن سے کانفرنس سے متوقع نتائج حاصل نہیں ہو سکے تھے۔ یورپ میں ان کانفرنسوں کو اکثر بڑھائی ہوئی تنہائی پسندی کے طور پر کٹر دیکھا گیا ہے، مگر ان کو اس طرح نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ بین الاقوامی تعاون کے حصول کی بڑے پیمانے پر کی جانے والی کوششیں تھیں، جہاں کہیں بھی ممکن ہو، اور جیسا کہ کارلٹن گل کہتے ہیں، یہ ایک مثال تھی جو

دنیا کو متحرک کرنے والی ہے۔

جانب داری کے قانون کے بارے میں جدو جہد اور تنہائی پسندی کے خلاف جنگ اتنے حالیہ واقعات ہیں کہ ہماری یادداشتوں میں ابھی تک تازہ ہیں۔ غیر جانب داری کا ابتدائی قانون، ایک معنی میں، امن کے خیال کی خدمت کہا جاسکتا ہے، اور اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مظاہر تنہائی پسندی ایک جنگ مخالف انداز تھی۔ مگر جب کہ تنہائی پسندی کے داعی امن کو بنیادی طور پر امن برائے ریاست ہائے متحدہ سمجھ رہے تھے، ان کو ایک زیادہ بچک دار قسم کی غیر جانب داری گردان رہے تھے جو ریاست ہائے متحدہ کو دوسرے ممالک سے امن کو برقرار رکھنے میں تعاون کی اجازت دے گی، اس لیے کہ جیسا کہ انہوں نے کہا تھا، ریاست ہائے متحدہ ایک طرف طور پر صرف اپنے لیے امن کی منادی نہیں کر سکتی۔ دوسرے بیانات کی طرح اس میں بھی وہ بار بار اپنے اس موضوع کی طرف واپس آتے ہیں کہ امن کو کسی ایک قوم کا استحقاق نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ ان کے نزدیک امن کا مطلب ہر قوم کے لیے امن ہوتا ہے۔ مگر حقیقت پسند ہوتے ہوئے بھی، وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے جدو جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جب نل یورپ کی آمرانہ ریاستوں سے تعلقات پر بات کر رہے تھے تو وہ چبا چبا کر باتیں نہیں کر رہے تھے اور جب کہ جنگ قریب آ رہی تھی، ان کی تقریریں تیز اور گرم ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کے اندرون کی برائے۔ ان کا احساس انصاف، ان کی کبریٰ انسانیت۔ بغاوت کر رہی تھی ہر چیز کے خلاف جسے وہ مداخلت بچا اور خلل اندازی سمجھتے تھے، ان تمام عوامل کے خلاف، جو شائستگی کا ساتھ دیتے ہیں۔ مگر جنگ کے شرور ہونے کے بعد روز ویلٹ کی آواز ان کی آواز پر حاوی ہو گئی تھی، جو پہلے کے مقابلے میں ریاست ہائے متحدہ کی خارجہ پالیسی کے رہنما کے طور پر زیادہ سختی سے باتیں کرنے لگے تھے۔ ایسا تو ہونا تھا، اور کوئی بھی، جسے کارڈیل نل سے زیادہ قربت نہ ہو، ان برسوں میں ان کے کام کا صحیح معنوں میں اندازہ نہیں کر سکتا۔ بس صرف اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جتنا کچھ معلوم ہے: انہوں نے آمادہ بہ جارحیت طاقتوں کے خلاف صف آرا ہونے والی فوجوں کی تیاریوں کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف کر دی ہیں، مگر ساتھ ہی انہوں نے ان مسائل پر بھی پوری توجہ دی سے کام کیا جو امن کے قیام کے بعد پیدا ہوں گے۔ یہ کوششیں جس سمت جا رہی تھیں اس کا اندازہ ان چند دفعات سے لگایا جاسکتا ہے جنہیں ہماری بڑی طاقتوں نے اپنے مستقبل کی پالیسی میں شامل کر رکھا تھا جسے 1943 کی ماسکو کانفرنس میں قبول کر لیا گیا تھا۔ مزید، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، انہوں نے جنگ کے آخری مراحل میں مسائل کے حل کے لیے اپنی تمام کوششیں وقف کر دی تھیں جو نئے ادارے ”اقوام متحدہ“ کی بنیاد رکھنے سے متعلق تھیں۔ یہ تھا تازہ ترین کام میں ان کا حصہ۔ انہوں نے اپنی خراب صحت کے باعث سبکدوشی کے لیے 21 نومبر 1944 کو روز ویلٹ کے نام لکھے گئے اپنے استعفیے کے خط میں کہا ہے، ”مذاقی طور پر میرے لیے یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ میں مابعد جنگ ایسے عظیم بین الاقوامی امن اداروں کی تشکیل میں پوری طرح ہاتھ نہیں بنا سکتا تھا جو بین الاقوامی تعاون کے سلسلے میں

دوسرے بہت سے مسائل کے حل کے عالمی نظام کے لیے ایک عمل ڈھانچا فراہم کرنے کے لیے کام کریں گے۔“

روز ویلٹ نے اس خط کے جواب میں کہا تھا: ”جب اقوام متحدہ کا ادارہ قائم ہو جاتا ہے تو میں دعا کرتا رہوں گا کہ اقوام متحدہ کے باپ کی حیثیت میں آپ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت کریں۔ اس امر کا اس سے واسطہ نہیں کہ اس وقت آپ سیکریٹری آف اسٹیٹ ہیں یا نہیں، مگر پوری دنیا میں صرف آپ کو یہ افتخار چاہیے، اس واحد شخص کی حیثیت میں، جس نے امن کے اس عظیم منصوبے کو اتنا موثر بنانے کے لیے سب سے زیادہ کام کیا ہے۔ آپ نے اتنے مختلف طریقوں سے قوموں کے درمیان دوستانہ روابط کے لیے کام کیا ہے کہ اگر آپ کسی مقتدر منظمہ میں کسی حیثیت میں نہ بھی رہیں تب بھی آپ اپنی اخلاقی رہنمائی سے دنیا کی مدد کر سکتے ہیں۔“

روز ویلٹ نے انھیں ”بابائے قوم“ کے نام سے پکارا ہے۔ یقیناً، ان کی یہ دعویٰ نہیں کریں گے کہ [اقوام متحدہ کی] تنظیم ان کا کام تھا۔ ان کے لیے یہ بہت چھوٹی سی بات ہے کہ گریڈٹ ان کو ملتا ہے کو یا کسی اور کو؛ بس خیال کو کامیاب ہو جانا چاہیے۔ اس لیے کہ اپنی عظیم مثالیت کے باوجود وہ ہمیشہ حقیقت کی دنیا میں رہے ہیں۔ اور انھیں اس پر کبھی کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا ہے کہ اس [اقوام متحدہ] کو انصاف کے اصولوں کے لیے موزوں ہونے کے لیے کسی اور شکل میں ڈھالا جاسکے گا۔ انصاف کے اصول جو شاید کسی اور جگہ کے مقابلے میں ریاست ہائے متحدہ میں اسکول کے زمانے ہی سے ہر فرد کی وراثت ہو جاتے ہیں، ان کے کام کے رہنما بنائے رہے ہیں، وہ موقع و محل جہاں زندگی اور عقیدے مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے، مکمل اطمینان کے ساتھ، نارویائی پارلیمان کی نوبل کمیٹی قوموں کے درمیان مفاہمت کے لیے طویل اور آن تھک کام پر اس عظیم امریکی کو 1945 کا نوبل امن انعام پیش کرتی ہے۔

نارویائی نوبل کمیٹی کے صدر نشین Gunnar Jahn کی زبانی

تقریر قبولیت

جلالت مآب، عزت مآب، جناب چیئرمین اور پارلیمان کی نوبل کمیٹی کے ارکان! اپنے ممتاز ہم وطن، سابقہ سیکریٹری آف اسٹیٹ، بابائے اقوام متحدہ، مسٹر کارل رٹل گل کی جانب سے 1945 کے نوبل امن انعام کو قبول کرنا میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ مسٹر گل نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ اس موقع پر—میں ان کی جانب سے نارویائی پارلیمان کی نوبل کمیٹی کے صدر اور ارکان کے نام یہ پیغام پڑھ کر متاؤں:

مسٹر کارل رٹل گل خرد و دلکش شخص ہیں۔ ان کے تھے، ماروے میں، ریاست ہائے متحدہ کے سفیر مسٹر ایچ کوہنہولن نے قبولیت کی تقریر پڑھ کر متائی۔

”میں آپ کو پہلے ہی مطلع کر چکا تھا کہ میری صحت اجازت نہیں دیتی کہ میں اس یا دیگر موقع پر اسلو
 آسکوں۔ مجھے اس سے زیادہ اور کیا خوشی اور غمانیت ہو سکتی تھی، مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے جو
 دلی صدمہ اور افسوس ہوا ہے، وہ میں سمجھتا ہوں کہ اس اعزاز کی متانت میں اضافہ کر رہا ہے، جو بہ کمال مہربانی
 آپ مجھے عطا کر رہے ہیں۔ میں صدقِ دل سے اس فیاضی پر آپ کا شکر گزار ہوں۔“

مستقبل پر نظر رکھنے والی انسانیت کے جذبات اور خیالات میں نوبل امن انعام کو ایک خاص مقام
 حاصل ہو گیا ہے۔ یہ انسان کی اعلیٰ ترین خواہشات کے حصول کی کوششوں کے میدان میں سب کے ساتھ
 انصاف اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کی بنیاد پر دیر پا امن کے قیام کا ایک بلند ترین نشان امتیاز بن گیا ہے۔
 مجھے فخر ہے کہ میں ان لوگوں میں شامل ہو گیا ہوں، آج تک جنہیں آپ نے اس طرح عزت بخشے آئے ہیں۔
 ہمارے دل و دماغ میں امن کا مسئلہ آج سب سے اہم ہے، [ایسے وقت میں] جب دنیا تاریخ کی سب
 سے زیادہ پھیلاؤ والی ظالمانہ جنگ کی ابتلا سے لڑکھڑاتی ہوئی نکل رہی ہے۔ اس جنگ نے انسانیت کو تباہی کا
 ناقابلِ یقین ترقی اور خوفِ ناک حد تک تیز اور تقریباً غیر محدود سمت گامزن کیا ہے۔ ابھی فاتح سائنس اور
 ٹیکنالوجی اتنی حیرت ناک توانائی کے ہتھکڑے کے ساتھ صرف انسان کے حکم کی منتظر ہے، جس کو اگر عسکری استعمال
 میں لایا جائے تو ہماری پوری تہذیب ایک آن میں مکمل طور پر تباہ ہو سکتی ہے۔ پچھلی عالمی جنگ کے حالات
 نے دنیا پر جو منہمکن سایہ ڈالا ہے اس میں مہذب اور مثالی زندگی کے لیے امن و یہاں ضروری ہو گیا جیسے کہ
 سائنس لینے کے لیے [تازہ] ہوا۔ ہر جگہ کے محام اور حکومتوں پر اس سے بڑی اور گہرا ذمہ داری ہو سکتی ہے کہ
 وہ اس بات کا یقین دلائیں کہ، بالآخر اس بار، دیر پا امن نہ صرف قائم ہوگا بلکہ اس کو مستحکم کیا جائے گا اور
 برقرار رکھا جائے گا۔ خوش قسمتی سے، جنگ نے نہ صرف یہ شدید احساس دیا ہے کہ دنیا کے لیے ایک اور جنگ
 کا کیا مطلب ہوگا، بلکہ یہ بھی کہ ایسے ایک بین الاقوامی ادارے کا قیام ضروری ہے جس کے ذریعے دنیا کی
 قومیں، اگر چاہیں تو، امن کو ایک زمرہ حقیقت بنائیں۔

چند ہفتوں کے اندر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ایک اجتماع کے ذریعے، سان فرانسسکو کے منشور
 کے مطابق، بین الاقوامی امن اور تحفظ کے لیے باقاعدہ ایک تنظیم کی بنیاد رکھی جائے گی۔ مجھے پورا احساس ہے
 کہ یہ نیا ادارہ اپنے تنظیم مقصد کے لیے ایک آلے کی صورت کام کرنے کے بجائے انسانی انداز میں کام
 کرے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، مجھے یقین ہے کہ یہ بہتر ہوتا جائے گا۔ تجربے اور کارگزاری کی روشنی میں،
 ترقی اور نشوونما کے لیے [اس کا] منشور خاصا چمک دار ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اپنی تمام تر خامیوں
 کے باوجود اقوام متحدہ کا ادارہ کس طرح ایک مستعد نظام، دنیا کی امن سے محبت کرنے والی قوموں کو اگر وہ
 امن کے خواہاں ہوں، امن فراہم کرے گا۔

یقیناً، سماجی مشین کا کوئی بھی حصہ، خواہ وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ بنایا گیا ہو، مؤثر نہیں ہوگا جب تک کہ اس
 میں کامیابی حاصل کرنے کی خواہش اور پکا ارادہ نہ ہو۔ آج کے انسانوں اور قوموں کی پرکھ کی قطعی کسوٹی یہ

ہے؛ کیا انہوں نے ٹکٹیں اٹھائی ہیں، کیا انہوں نے شہادت کو ایک طرف رکھنا، تعصب اور کم نظری میں قیاس کیے ہوئے مفادات اور ان کے سب سے بڑے مشترکہ مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے مستعد ہونا سیکھا ہے کہ نہیں۔ دیر پا امن ہی وہ زبردست اور پناہ دینے والا مشترکہ مفاد ہے جس کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے انسان اپنی دریافت شدہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی طاقت کو انسانیت کی بھلائیوں کی ایسی بلندیوں تک لے جاسکتا ہے جس کا خواب بھی نہیں دیکھا جاسکا ہے۔

اگر آج فریڈ نوبل زندہ ہوتا تو، مجھے پورا یقین ہے کہ میرے اسی غیر متزلزل عقیدے میں میرا ہمدرد کا شریک ہونا کہ یہ قطعی پرکھ ضروری جائے گی، کہ پچھلے جنگ کے جھلسا دیے والے سبق اور اقوام متحدہ کے وعدے امن کی نئی نشان دار عمارت کے بنیادی پتھر ہوں گے اور انسانی ترقی کے نئے عہد کے سنگ میل ہوں گے۔



رابرٹ سسیل

اعلان تجلیمیل

نہیں مدبرین جو عالمی جنگ کے دوران بڑے عہدوں پر متمکن رہے تھے، عالمی جنگ کے دوران انسانی زندگی اور معاشی وسائل کی بربادی سے اسے شدید متاثر ہوئے تھے کہ وہ جنگ کو ایک سماجی دستور کی حیثیت میں بالکل فصول اور اتنا غیر اخلاقی سمجھنے لگے تھے کہ وہ بالآخر جنگ کے مخالف ہو گئے۔ اس کے بعد سے عمر بھر انہوں نے اس نوعیت کی آفت کو روکنے کے لیے اپنی بھرپوری کوشش کی تاکہ انسانیت کو پھر کبھی اس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ان میں سے دو تو انتقال کر چکے ہیں: "ووڈرو ولسن" (Woodrow Wilson) اور "اریسٹی بری آں" (Aristide Briand)۔ نوٹیل کمیٹی ان دونوں کو نوٹیل امن انعام سے پہلے ہی نواز چکی ہے۔ کمیٹی کو سرت ہے کہ وہ آج تیسری شخصیت کو نوٹیل امن انعام پیش کر رہی ہے۔ اس شخصیت کا نام ہے وائیکاؤنٹ سسیل آف چیل ووڈ (Viscount Cecil of Chelwood) جو شاید، اپنے اصلی نام لارڈ رابرٹ سسیل (Lord Robert Cecil) سے زیادہ بہتر طور پر پہچانے جاتے ہیں۔

ولسن اور بری آں کے بارے میں شاید یہ کہا جاسکتا ہو کہ کچھ معاملات میں جنگ مخالف افراد سے ان کے رابطے رہے تھے: ولسن کے، اپنی غیر مذہبی روایات کے معاملے میں اور بری آں کے نوجوانوں کی بنیادی اشتراکیت سے۔

مجھے یقین نہیں کہ لارڈ سسیل کے معاملے میں، یا تو ان روایات میں یا ان کے پس منظر میں، یا ان کے قبل از جنگ پیشے میں کسی قسم کا مماثل نکالا جاسکے گا۔ [مگر] میں اس پر یقین کرنے کو تیار ہوں کہ جنگ سے ان کی نفرت صرف اور صرف امور خارجہ کے نائب سیکریٹری آف اسٹیٹ اور نا کر ہندی کے وزیر ہونے کے باعث جنگی معاملات میں ان کے قریبی رابطوں اور تجربات کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ یہی وہ باتیں ہیں

جنھوں نے جنگ کی مابودی کے مسئلے کے حل کی طرف انھیں راغب کر دیا تھا۔

دواء ان کے پس منظر اور ان کی روایات پر غور کیجیے۔ سسپل خاندان کا درجہ انگریزی زمین دار اشرافیہ میں سب سے قدیم اور ممتاز تھا۔ ان کے والد مارکوی آف سالسبری (Marquess of Salisbury) تقریباً بیس برس [برطانیہ کی] قدامت پسند (Conservative) پارٹی کے لیڈر رہے تھے جس میں زیادہ عرصہ انھوں نے وزیر اعظم کی حیثیت میں گزر رکھا۔ امور خارجہ میں انھوں نے ڈیزرائیلی (Disraeli) کی میراث کو قبول کر لیا تھا اور برطانیہ کی شاہی کی پالیسی کو آگے بڑھانے میں بہت کام کیا تھا۔ اپنی عمر کے دوسرے عشرے کی ابتدا ہی میں نوجوان لارڈ رامٹ سسپل اپنے والد کے پرائیویٹ سیکریٹری بن گئے تھے جب وہ وزیر اعظم بھی تھے اور سیکریٹری امور خارجہ بھی۔ وہ اپنے والد کے سیاسی اور کھیسائی نظریات سے اتفاق کرتے تھے۔ [اور] یہ تقریباً ممکن لگتا ہے کہ ہیٹ فیلڈ (Hatfield) میں یا ان حلقوں میں، لارڈ رامٹ جن میں فعال تھے کبھی امن پسندی کے معاملے پر گفتگو ہوتی ہوگی، سوائے روادری کے، اس لیے کہ سنجیدہ اور حقیقت پسند لوگ بچکانہ قسم کے خواب دیکھنے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

چھوٹے بیٹے، لارڈ رامٹ نے اپنے پیش فیصلہ کیا کہ وہ اپنی روزگار کے لیے قانونی پیشے پر انحصار کریں گے۔ وہ ایک ماہر وکیل بنے، اور کچھ ہی عرصے کے اندر Queen's Counsel بن گئے۔ 1906 میں، جب وہ عمر کے چوتھے عشرے میں تھے، پارلیمان کے رکن بن گئے اور اپنے چچا زاد آرتھر بالور (Arthur Balfour) کی قیادت میں کنزرویٹو پارٹی کے نشستوں میں جا بیٹھے۔ اگرچہ شہرت میں ان کی بلندی تیزی سے نہیں ہوئی تھی، آہستہ آہستہ ان کی شہرت بڑھتی گئی اور ان کو ایک قابل قانون دان اور خطیب مانا جانے لگا تھا۔ مگر، 1915 میں، جنگ کے فساد کی وجہ سے ماسکو (Asquith) نے جب اتحادی حکومت بنائی تو وزارت خارجہ میں، مرایڈن بورڈ گری (Sir Edward Grey) کی ماتحتی میں سسپل نائب سیکریٹری آف امینٹ بن گئے۔ اگلے برس، جب لارڈ جارج (Lloyd George) نے اپنے قائد کو گرا کر پارٹی کی قیادت سنبھالی تو انھوں نے جنگ کی وزارت قائم کی جس کا منصوبہ تھا ”جنگ آخری لمحے تک“، اور سسپل مارکر ہندی کے وزیر بنا دیے گئے، جو حکومت میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت تھی۔

ان ہی برسوں کے دوران، اور بالخصوص ذہین اور قابل تعریف ایڈورڈ گری کی شراکت کے دوران، سسپل کو پہلی بار امن پسندی کے مسئلے کا سامنا ہوا تھا۔ اس [امن پسندی] نے خود کو ایک مخصوص بھیں میں پیش کیا تھا جو اس نے اس وقت اختیار کر لیا تھا۔ ”لیگ آف نیشنز“ کا سوال۔ خیال تھا تو خاصا پرانا مگر جنگ کے دوران اس نے ایک مخصوص پیکر اختیار کر لیا تھا، اور اس کی صورت گری میں سسپل کا بڑا حصہ تھا۔ انھوں نے اس سوال پر بڑی محنت کی تھی اور بلاشبہ بہتوں نے ان کے ساتھ مل کر جدوجہد کی تھی، قبل اس کے کہ وہ اس کے الجھاوے پر قابو پا لیتے اور خود کو مسئلے کا ماہر سمجھ لیتے۔

جنگ کے دواشروں اور موجودہ وقت کے درمیان امن پسند اور بین الاقوامیت کی حیثیت میں سسپل کی

تبدیلی پر نظر ڈالنا بڑا مسکور کن تجربہ ہے۔ میں جان بوجھ کر تبدیلی کو ”تبدیلی مذہب“ کے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں، اس لیے کہ لارڈ سیسل بنیادی طور پر مذہبی مزاج — High Church Episcopalian کی مہر والے ہیں۔ ان کو شریعتین سے بدلتے ہوئے من کر گمان ہوتا ہے گویا کوئی معزز بپتیجی کی صداقت کی تبلیغ کر رہا ہے، مگر ان کی گمان میں مبلغ کی دور کے علاوہ اور بھی دیریاں لگی ہوتی ہیں، وہ ایک ہنرمند وکیل ہیں، ایک تیز ذہن کے مناظرہ کرنے والے ہیں، اور موقع کی ضرورت ہو تو وہ جوڑ توڑ کے چالاک ماہر بھی بن جاتے ہیں۔ ان کی بلند قاضی، جو اب قدر سے جھکی ہوئی ہے، متاثر کن ہوتی ہے۔ مگر جب وہ خرافات پر اتر آتے ہیں اور مسکراتے ہیں تو ان کے مقصد میں پوشیدہ سنجیدگی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی نوجوانی کی لاپرواہی سے امن کے مسئلے تک تبدیلی اور اس کی مرکزی اہمیت مثالیان کی زندگی کا سب سے زیادہ اہم تجربہ ہے۔

کون کون سی رکاوٹیں اور جلیقی تعصبات تھے جن پر انھیں قابو نہیں پایا تھا۔ کوئی آدمی اپنے بچپن اور نوجوانی کے اثرات سے مکمل طور پر دامن چھڑا نہیں سکتا۔ ان میں برسوں میں جن کے دوران سیسل کو امن پسندی اور لیگ آف نیشنز کے لیے لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں، بہت سے ایسے مقامات بھی آئے تھے جب رکاوٹیں ابھر کر سامنے آتی تھیں تاکہ انھیں خود تر دیدی کی، یا متنازعہ حالات میں لے آیا جائے۔ ایک آئرش آدمی نے ان کے بارے میں کتنا دلچسپ جملہ کہا ہے: ”لارڈ رابرٹ کا ایک پیرقرون وسطیٰ میں ہوتا ہے تو دوسرا لیگ آف نیشنز میں۔“

مگر وہ اپنے نئے دریافت کردہ عقیدے کے وفادار رہے ہیں۔ یہی سب سے اہم بات ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت پٹ کر ان کا دہرا اعزاز بن جاتی ہے، اس لیے کہ ان کو اپنے اندر ہی اس تنازعے کو سلجھانا پڑا تھا۔ اگر ہم خالص لیگ آف نیشنز کے مسئلے کی جانب ان کے عقلی رویے پر غور کریں تو ہمیں ان کی مراحت پر تعجب ہوتا ہے جس سے انھوں نے اس کے پروگرام کے ضروری نکات کی ابتداء میں تشکیل کی، اور طوفانی کیفیت اور دباؤ کے باوجود جس یکسانیت سے وہ اس کے وفادار رہے ہیں۔

عارضی جنگ بندی کے اگلے دن، ۱۲ نومبر کو انھوں نے لیگ آف نیشنز کے منصوبے کے بارے میں برمنگھم یونیورسٹی سے خطاب کیا تھا۔ انھوں نے اس بات پر غور کیا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور فتح حاصل کی جا چکی ہے۔ مگر انھوں نے سختی سے اس ذمے داری کا پکا اعادہ کیا تھا ایک فتح جو فاتح پر عائد کرتی ہے۔ یہ ذمے داری ایک دیر پا امن کے قیام اور بین الاقوامی تعاون کی ہوتی ہے جو امن کے استحکام کا تحفظ کر سکے۔ انھوں نے اتحادیوں پر زور دیا کہ وہ فتح سے اپنی حاکمیت حاصل کرنے سے باز رہیں، اور اپیل کی کہ تمام قوموں کی لیگ آف نیشنز کے بنانے کے بجائے آزاد قوموں کی ایک لیگ آف نیشنز بنائیں، ایک سپر ریاست نہیں۔

اس نئی لیگ کی اصل بنیاد قانونی دستور نہیں ہونا چاہیے، جیسے ثالثی عدالت۔ اس کو صرف مددگار ادارہ ہونا چاہیے، حریک طاقت کا حامل، وہ بنیادی شے لیگ آف نیشنز جس پر محسوس کر سکے: ایک چوکس اور مطلع رائے

عامہ جو قانونی یا، اگر ممکن ہو تو ثالثی، کے ذریعے تنازعات کے پُر امن حل کا مطالبہ کر سکے، مگر، ہر حال میں مذاکرات سے اور دسراطت و تعاون سے۔ اور جب بھی کوئی تنازعہ اٹھے تو رائے عامہ کو بولنے کا ہر طرح کا موقع دیا جانا چاہیے۔

سارے نظام کا مرکزی نقطہ یہ ہونا چاہیے کہ ریاستیں اسلحے پر بھروسہ نہ کریں، جنگ نہ کریں، بلکہ خود کو رائے عامہ کی ہوشیار اور گہری آنکھ کی نگہ داری میں حل کے لیے [ضروری] تاخیر کرنے اور مذاکرات کرنے پر پابند کریں۔ سسٹم نے بھانپ لیا تھا کہ حکومتیں تمام فیصلوں کے اتفاق نگاہ پر اپنے حقوق محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گی، کہ وہ اپنے آزاد حق استرداد (liberum veto) سے دست بردار نہیں ہوں گی۔ مگر انہوں نے کہا ”چونکہ اہم امر تاخیر کرنا اور کھلی بحث کرنا یعنی، رائے عامہ کو متحرک کرنا اور ہدایت دینا ہے لہذا، یہ تجویز پر سنجیدہ نگاہ کی جینی نہیں ہے۔“ یہاں ایک انگریز پارلیمانی زبان بول رہی ہے جسے علم ہے کہ ایسے ہی نظام نے تقریباً تین صدیوں سے اس کے ملک کو انقلاب سے بچا رکھا ہے اور اس کی پُر امن ترقی پر نگاہیں گاڑ رکھی ہیں۔ انھیں امید ہے کہ دوسری قومیں بھی اسی پر عمل کریں گی۔

اگر کوئی قوم تاخیر کے ذریعے اپنا وعدہ توڑے، جان بوجھ کر مذاکرات میں رکاوٹ پیدا کرے، یا مناسب مہلت دیے بغیر جنگ شروع کر دے، تو دوسری قوموں کو اس کے خلاف اقتصادی پابندیاں لگا دینی چاہئیں۔ جنگ کے دوران ماکہ بندی کے وزیر لارڈ رائٹ نے اس اقتصادی ہتھیار کی اہمیت پر خصوصی طور پر زور دیا تھا۔ انہوں نے ترکی اسلحہ جات کے ضروری ہونے کے بارے میں تقریر کی تھی، مگر اس کے فیصلہ کن طریقے کے استعمال پر وہ فوری طور پر آمادہ نہیں تھے۔

بلکہ انہوں نے ہم آہنگ بین الاقوامی تعاون کی اہمیت پر شدت سے زور دیا تھا جسے، اپنے قریبی دوست جنرل اسمتھس (General Smuts) کے خیالات سے کھلی طور پر اتفاق کرتے ہوئے، انہوں نے لیگ آف نیشنز کے سپرد کرنے کی خواہش کی تھی، تاکہ اس کو ایک مستقل عملی حربہ بتایا جاسکے۔

اور اس طرح، لیگ آف نیشنز کی ادارے کی حیثیت میں سسٹم کے تصور اور اس کے امکانات کی واضح ضابطہ بندی ہمارے سامنے ہے۔ اس کے بعد بھی وہ ان ضروری نکات کو بار بار دہراتے رہے تھے۔

پہلا مسئلہ یہ تھا کہ تمام قوموں سے نئی لیگ آف نیشنز کے مہم نامے کی منظوری حاصل کر لی جائے۔ انھیں ویلسن (Wilson) سے پورا اتفاق تھا کہ مہم نامے کو بیعتی امن کا ایک جزو لازم بنا دینا چاہیے۔ بلاشبہ، یہ بالکل صحیح موقف تھا۔ اس مہم نامے پر عمل درآمد کو لیگ آف نیشنز کے قیام کے لیے خاص طور پر بلائی جانے والے کسی اور بین الاقوامی کانفرنس پر چھوڑ دینا سیاسی اور نفسیاتی اعتبار سے ناقابلِ اندیشی ہوتا۔ ایسی صورت میں، امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شاید ہمیں لیگ کی، جو حسبِ خواہش نہ ہو ضرورت ہی نہ رہ جائے۔ مگر اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی، اس لیے کہ اس کے بعد، اہم پیچیدگیاں اور پیچائی کا سامنا ہوا تھا۔ بد قسمتی سے، مدت میں کچھ بھی نہیں حاصل ہوا کرتا، اور سیاست میں تو ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔

میں عہد نامے کی تیاری کے سلسلے میں ہسپل کے کردار پر مزید کچھ نہیں کہنا چاہوں گا۔ جس انتہائی کافی ہوگا کہ انہوں نے قانون دان اور سیاست دان کی حیثیت میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ سرمری طور پر اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ جس ایک موقع پر ان کی قدامت پسندی نمود کر آتی تھی۔ انہوں نے اصرار کیا تھا کہ [لیگ کے] سب سے اہم عضو سلامتی کاؤنسل، میں بالخصوص سیاسی مسائل کے پیش نظر، تمام بڑی طاقتوں کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ وہ لیگ کو ایک ترقیاتی منصوبے اور پُرانی یورپی سنگت کے تسلسل کی صورت میں دیکھنا چاہ رہے تھے۔ مگر جلد ہی انہیں احساس ہو گیا تھا کہ ایسا ہونا غلط ہوگا، اور وہ اس خیال سے تائب ہو گئے۔

لیگ کے وجود کے پہلے تین برسوں، 1920 سے 1923 تک، لیگ کی سرگرمیوں میں ہسپل آگے آگے رہے تھے۔ جنگ کے فوراً بعد وہ لائڈ جارج کی کابینہ چھوڑ چکے تھے اور اس کی تین اسمبلیوں کے برطانوی نمائندوں میں شامل نہیں تھے۔ مگر جرنل اسٹینس نے جو ان کے قریبی دوست بن چکے تھے ان سے اسمبلی میں جنوبی افریقا کی نمائندگی کی درخواست کی۔ اور یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ انہوں نے یہ کام نہایت آزادی سے سرانجام دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید لارڈ ہسپل کے سیاسی اور بین الاقوامی زندگی کے یہ تین برس زیادہ خوش گوار نہیں رہے تھے۔

ابتداء ہی سے ان پر یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا تھا کہ لیگ ایک کامل اور غیر مصلحتی ادارہ نہیں ہے۔ اس کی رکنیت کے معیار اور کارکردگی میں چستی کی ترقی کے لیے اس کی پرورش کرنی ہوگی۔ ان ابتدائی برسوں میں لارڈ ہسپل نے لیگ کے ترقی پسند بازو کی سربراہی کی تھی۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے کتنی باقاعدگی سے 1918 میں برمنگھم میں پیش کیے جانے والے اپنے پروگرام کے نکات کو اٹھایا اور ان پر عمل کرانے کی کوشش کی تھی۔

وہ سب سے بڑھ کر لیگ کی کارکردگی کی تنظیم اس انداز میں کرنا چاہتے تھے کہ اس کی پوری طرح تشہیر ہوتا کہ اس پر نظر رکھی جاسکے، اس کو متحرک کیا جاسکے، رائے عامہ اس پر نکتہ چینی کر سکے اور رائے عامہ کا سب سے بڑا اشتراک کرنے والا، پریس، بھی نکتہ چینی کر سکے۔ کچھ چھوٹی ریاستوں کے، مجھے اس بات پر مسرت ہے کہ اس میں شامل کی ریاستیں شامل تھیں، نمائندوں کی حمایت سے، جن میں Hjalmar Branting اور Fridtjof Nansen بھی شامل تھے۔ انہوں نے ایک قرارداد کے ذریعے دباؤ ڈالا تھا کہ اسمبلی کو ہر ماہ اجلاس کرنا چاہیے، کہ بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ پوری اسمبلی اور کمیٹیوں کے تمام اجلاس کھلے ہوں۔ آخر میں، سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ بین الاقوامی سیاست میں کچھ قدرت شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ ہر سال ہونے والے اسمبلی کے تمام اجلاس عام بحث سے شروع ہوا کریں گے۔ مباحثے کا یہ باقاعدہ دور سیکریٹری جنرل کی سالانہ رپورٹ کی بنیاد پر ہوتا ہے، مگر اس میں کوئی بھی موضوع بحث کے لیے لایا جاسکتا ہے۔ اس طرح اسمبلی ایک آزاد خیال ششماہی بن گئی۔

یہ بات صحیح ہے کہ ہمیشہ نہیں، بلکہ کبھی کبھار کوئی مباحثہ، سوال و جواب کے باعث تباہ کن خیالات کی

بنیاد بن جاتا ہے، اکثر و بیشتر عام مباحثے ناقص ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ان تمام مباحث میں ہوا کرتا ہے جو ہماری پارلیمان میں تختہ شاہی کی تقریر سے شروع ہوتے ہیں، اور بے شمار لا تعلق مسائل پر سوالات اور جوابات کا پتلا رہ بن جاتے ہیں۔ مگر ایسا ہوا ہے، جب اسمبلی میں ایک معمولی سا اثر ارا اٹھا ہے جس نے صحیح معنوں میں مباحثے میں آگ لگا دی ہے۔

یہ سسبل ہی تھے جنہوں نے، 17 نومبر 1920 کو پہلی اسمبلی میں عام بحث کا آغاز کیا تھا۔ ان کی تقریر واقعی سننے کے قابل تھی، اور میں چند نکات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جو انہوں نے اٹھائے تھے۔ پہلے انہوں نے لیگ کے ذریعے رائے عامہ کو ابھارنے اور اس پر کام کرنے کی ضرورت پر تفصیل سے بات کی تھی۔ اسی وقت انہوں نے ایک بے مثال جملہ کہا تھا، جو دراصل ایک پورا پروگرام تھا: ”لیگ آف نیشنز کی تشریح اس کے حیات فروز خون کے مترادف ہے۔“

مگر اس کے بعد انہوں نے ان بنیادی اخلاقی اصولوں پر بات کی تھی لیگ کو جن کے تحت کام کرنا ہوگا۔ جو الفاظ انہوں نے کہے تھے ایک عظیم طاقت کے قدامت پسند سیاست داں کی زبان سے ان کا ادا ہونا قابل غور ہے، بد قسمتی سے وہ پیغمبرانہ تھے بھی: ”ہمیں اپنی طاقت سے خائف نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں مضبوط سے مضبوط تر ہونا چاہیے۔ بہت زیادہ [طاقت] سے لیگ کو کوئی خطرہ نہیں۔ لیگ کو بس ایک خطرہ ہے، کہ وہ دنیا کی سفارتی مشینری کی پیچیدگی میں الجھ کر رفتہ رفتہ ایک محترم اوسط درجے اور بے فائدہ درجے تک گر جائے گی۔ ہمیں درپیش موافقت اور مصالحت کے عظیم معاملے میں بہت سے کام لینا ہوگا۔“

انہوں نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کچھ ذاتی باتیں بھی کی تھیں۔ سننے والے جنہیں شاہید ہی بھول سکیں۔ ”میں آپ کے سامنے جنرل اسمٹ کے متبادل کے طور پر ایسا دہ ہوں۔ ذرا سوچیے! چند ہی برس گزر رہے ہیں کہ جنرل اسمٹ جنوبی افریقا کے ولندیزی تارکین وطن کسانوں (Boer) کی فوج کے نہایت زبردست اور کامیاب سپہ سالاروں میں سے تھے، جب وہ برطانوی سلطنت کے خلاف صف آرا تھے اور میں اس وزیر اعظم کا جیسا ہوں جس نے سلطنت برطانیہ کی طرف سے [ان سے] جنگ کی تھی۔ اور اب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ ولندیزی کسانوں کا جنرل برطانوی وزیر اعظم کے بیٹے سے درخواست کر رہا ہے کہ وہ لیگ آف نیشنز کی اسمبلی کے سامنے بین الاقوامی موضوعات پر ان کے خیالات کی تشریح اور توضیحات کرنے والا بن کر پیش ہو۔ آخر یہ سب کیسے ہوا؟ نہ مزدوری سے، نہ باہمت عمل سے، نہ پیپاتی پر، بلکہ ولندیزی کسانوں پر بھروسے کے عظیم عمل سے ہوا ہے، وہ عمل، مجھے یہ کہنے میں باک نہیں، جو اس وقت مجھے بے دھڑک اور قبل از وقت لگا تھا، مگر اس سے نکلنے والے نتیجے نے خود اس کی تائید کر دی ہے۔“ (بلاشبہ وہ 1906 میں کیلیمپٹیل/بننرمن (Campbell-Bannerman) کے ہاتھوں ہنگامی حکومت کی تحلیل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو جنگ کے بعد جنوبی افریقا میں کی گئی تھی اور اس کو خود مختاری دی گئی تھی)۔

سسبل نے مزید کہا، ”یقیناً یہ ہمارے لیے ایک [اچھی] مثال ہے۔ موافقت اور مصالحت کے شدید

طریقوں سے بھی نہیں کترانا چاہیے۔ یقین کیجیے، مستقبل میں یہ خود اپنی تائید کریں گے۔ اپنی تمام تر قوت سے، میں اس اسمبلی سے یہ کہنا چاہوں گا کہ ”صحیح کرو، ڈرو نہیں“ کو اپنا قولہ بنالے۔

لیگ آف نیشنز میں، اور اس کے لیے لازماً رائے کے کام پر نظر ثانی کے لیے بہت وقت درکار ہوگا۔ آئیے، جس ایک یا دو حقیقتوں پر بات کر لیتے ہیں۔

لیگ نے عہد نامے کی دفعہ 14 کے مطابق 1920 میں Permanent Court of International Justice قائم کی تھی، اور 1921 میں پہلی نشست کے چھ ہمزہ کیے گئے تھے۔ سسبل نے اس کام میں عملی طور پر شرکت کی تھی، اور جب اس کی تشکیل ہو گئی تو انھوں نے لیگ کو عہد نامے کے ”توسعے کی دفعہ“ دفعہ نمبر 8 یا دلائل جس کے مطابق بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعے ترکہ اسلحہ جات کیا جانا تھا۔ انھوں نے کہا، ”ترکہ اسلحہ جات، جو مراد مقصد ہے لیگ کو جس کی فکر کرنی چاہیے۔“

اور اسی مقصد کے لیے انھوں نے اپنی کوشش وقف کر دی ہے۔ انھوں نے ایسے طریقوں کی جستجو کی ہے جن سے کوئی آسان راستہ مل سکے، مگر اس سے صرف بند لگایا ہی ملیں، مگر انھوں نے کبھی اپنے ہدف سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

1923 میں اسٹیٹس بالڈون (Stanley Baldwin) کی کنزرویٹو حکومت میں شمولیت کے بعد وہ کانسل اور اسمبلی دونوں میں برطانیہ کے نمائندے بنے جس میں کچھ خلل بھی ہوا تھا، مثال کے طور پر 1924 کی لیبر پارٹی کی حکومت کے دوران، ”جینیوا پروٹوکول“ کے عرصے میں۔ ان کی سرکاری حیثیت نے ان کے ہاتھ باندھ دیے تھے اور ان کو عمل کی آزادی میسر نہیں تھی جو جنرل اسمت کے نمائندے کی حیثیت میں انھیں حاصل تھی۔ ان کو ہمیشہ ترکہ اسلحہ جات کے کمیشن میں شرکت کی اجازت نہیں تھی۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ کئی بار انھوں نے کنزرویٹو پارٹی چھوڑ دینے کے بارے میں سوچا تھا، مگر ان کے آبا و اجداد کے بندھن بہت مضبوط ثابت ہوئے۔ وہ برطانوی سلطنت کے نمائندے کے طور پر پارٹی کے امکان میں شامل رہے اور ترکہ اسلحہ جات کے تمہیدی کمیشن نے انھیں ترکہ اسلحہ جات مسئلے کے تکنیکی پہلوؤں کے مطالعے کی ذمہ داری سونپی تھی۔

ان برسوں میں انھوں نے کئی بار مختلف حکومتوں کی پالیسیوں کے ذریعے لیگ کی اور خود اپنی بھی سنج کئی ہوتے دیکھی جو لیگ کو ”قابل احترام اوسط درجے“ پر لے جا رہی تھی، جیسا کہ انھوں نے اسمبلی میں اپنی تقریر میں کہا تھا، جس کا انھیں بہت خطرہ تھا۔

1931/1932 کے دوران بڑی طاقتوں کی جاپان کی طرف کم زور پالیسی بھی لیگ کی سنج کئی ہی کی پالیسی تھی، اور جب سسبل نے آخری بار 1932 کے ستمبر میں اسمبلی میں شرکت کی تھی انھوں نے ترکہ اسلحہ جات پر ایک یادگار تقریر کی تھی اور اس [مسئلے] کو امن کی کسوٹی قرار دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ اگر ایک بار ترکہ اسلحہ جات پر عمل ہو گیا تو بین الاقوامی فضا کی اک دم قلب مابیت ہو جائے گی۔ قوموں کو امن کے لیے

رائے دی کر لی ہی ہوگی اور اگر انہوں نے ترکیہ اسلحہ جات کو رد کر دیا، تو دنیا واپس قبل از جنگ کے دنوں میں پہنچ جائے گی۔

میں اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہوں کہ سسبل نے اپنے ملک میں اپنی پارٹی کی پالیسی کو شیر باد کہنے کی غرض سے ایسی غیر معمولی تقریر کی تھی۔ ایوان بالا (House of Lords) میں، جہاں وہ 1928 میں وائیکاؤنٹ آف چیل ووڈ (Viscount Cecil of Chelwood) بن جانے کے بعد سے شامل تھے، انہوں نے اس نشست پر بیٹھنا شروع کر دیا جس کا کسی پارٹی سے تعلق نہیں تھا۔ وہ ہش حضرات کے ساتھ ہو گئے جو پارٹی کی وفاداریوں سے لاتعلق بن کر تھے۔

ایک بار پھر وہ آزاد انسان تھے۔

آرشمیدس (Archimedes) نے کہا تھا، ”مجھے کرۂ ارض سے باہر کھڑے ہونے کی جگہ دے دو، میں زمین کو ہلا کر رکھ دوں گا۔“

پہلے دن ہی سے سسبل نے لیگ سے باہر اپنی جگہ بنانے کے لیے کام کیا ہے تاکہ وہ اس کو حرکت میں رکھیں۔ جس جگہ کی انہیں تلاش تھی وہ رائے عامہ میں مل گئی۔ ان کی پیش قدمی نے برطانیہ میں لیگ آف نیشنز کو ایک بار سونخ مقام حاصل کرنے میں مدد دی تھی۔ سسبل آج بھی اس کے صدر کے رُتبے پر فائز ہیں۔

زیادہ تر ملکوں نے انگلستان کے نقش قدم پر آگے قدم بڑھائے ہیں۔ سسبل دو برس تک International Federation of the League of Nations Societies کے صدر رہے ہیں۔ اس ادارے کی صدارت دورے کی ہوتی ہے اور بدلتی رہتی ہے۔

حالیہ برسوں کی مایوسیوں کی طرح بھی سسبل کی آتش شوق کو ٹھنڈا نہیں کر سکی ہیں۔ جنگ اور بین الاقوامی لاقانونیت کے خلاف لڑائی کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنے کی دو بڑی کوششیں ان ہی کی تھیں۔ ان میں سے پہلی [کوشش] قومی سطح کی تھی، یعنی 1934 کی ”امن کی رائے شماری“ جو عوام کی رائے کے اظہار کے لیے ایک غیر سرکاری استصواب تھا۔ پورا پروگرام سسبل نے ترتیب دیا تھا، اس کو مشتہر کیا تھا اور وہ بذات خود اس میں عملی حصہ لے رہے تھے۔ جائیت پسند لوگوں کو توقع تھی کہ پانچ سوالوں کے جواب میں چار سے پانچ ملین تک جواب آئیں گے۔ دراصل تقریباً سارا حصہ گیارہ ملین سوال مائے واپس آئے تھے اور معلوم ہوا کہ گیارہ ملین کی بھاری اکثریت نے لیگ آف نیشنز کے حق میں رائے دی تھی، سارا حصہ دس ملین نے ترکیہ اسلحہ جات کے حق میں اور 6.8 ملین نے حملہ آور کے خلاف اجماعی پابندیاں لگانے میں۔

اس کوشش کا سب سے قابل قدر نتیجہ یہ تھا کہ نہ صرف لوگوں نے رائے دی، بلکہ ان کے علاوہ بہت سے دوسرے لوگ لیگ آف نیشنز کے ذریعے امن کے مسئلے اور اس کے حل کی طرف راغب ہوئے تھے۔ ساتھ ہی، رائے عامہ نے واضح طور پر لیگ آف نیشنز کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا، لہذا، جب ۶ مئی (Ethiopian) بحران تیزی سے شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور بالڈون کی حکومت نے عام

انتخابات کا اعلان کیا تو اس کو مشترکہ نظام سے اپنی جماعت کی ہمدردی کا اظہار کرنا پڑا تھا۔ بد قسمتی سے، ہم جانتے ہیں کہ انتخابات ختم ہونے اور حکومت کی کامیابی کے بعد اس نے نتائج سے روگردانی کی؛ اس نے پابندیوں کو اٹھانے اور ان کے بدلے انتہائی بڑے پیمانے پر اسلحہ بندی کا پروگرام شروع کر دیا تاریخ میں جس کی نظیر نہیں ملتی۔

سب جانتے ہیں کہ لارڈ سبیل کے لیے یہ بڑا تکلیف دہ دھچکا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ستر برس ہو چکی تھی؛ ان کے جگہ کوئی اور ہونا تو ہاتھ اٹھا لیتا، اور ان کی ایک ذاتی تقریر سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد سے دست بردار ہونے ہی والے تھے۔

اس طرح، یہ زیادہ قابلِ تعریف بات ہے کہ انھوں نے ایک نیا اور مشکل منصوبہ شروع کر دیا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ طائفہ رائے عامہ ان کے حق میں تھی ماب انھوں نے بین الاقوامی رائے کو تحریک کرنے کا مشکل بیڑا اٹھا لیا؛ فرانسیسی سیاست دان Pierre Cot کے ساتھ مل کر انھوں نے International Peace Campaign کی بنیاد رکھی۔ ایک عمر رسیدہ انسان کی طرف سے یہ ایک طرح کا استفہامیہ جملہ (quand même) تھا۔ اس تحریک کو خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ اس نئی تنظیم کو جو حمایت سبیل جیسے کنزرویٹو، ان کے دوست لارڈ لٹن (Lord Lytton) اور دنیا بھر کے دوسرے سربراہانِ قدامت پسند، آزاد خیال، بنیاد پرست، امداد دہندگان کی تحریک اور دوسرے غیر سیاسی حلقوں سے ملی ہے، اس نے ظاہر کر دیا ہے کہ ایک اور جنگ کے خلاف رائے عامہ کتنی مستعدی سے صف آرا ہو گئی ہے۔ یہ تو فریقہ ہسپانیہ اور مشرق بعید پر آمرانہ حملے میں جنھوں نے ارتکاز کی صورت پیدا کر دی ہے۔ بد قسمتی سے تحریک کی رکنیت اتنی نہیں نہیں ہے جتنی کہ توقع کی جاتی تھی، اس لیے کہ آمروں کے زیرِ سایہ رہنے والا کوئی بھی اس کی حمایت نہیں کر سکتا۔

بین الاقوامی تحریک امن کسی موجودہ تنظیم سے مسابقت کا ارادہ نہیں رکھتی؛ اس کا مقصد ان کو ایک مشترکہ محاذ پر متحد کرنا ہے تاکہ ایک مرکزِ عمل کو برقرار رکھیں۔ اس لیے ان کا پروگرام بہت معتدل نوعیت کا ہے۔ یہ اس کو برقرار رکھنے کے لیے کام کرتی ہے جس کو چند برس قبل بین الاقوامی تعاون اور امن کی دیرپا بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ یہ ”مشترکہ نظام“ کو مستحکم کرنے کے لیے صرف دو، بلکہ دو بہت اہم اصلاحات کی طالب ہوتی ہے جو بہر حال لیگ آف نیشنز کے مہدائے کا اندرونی عنصر ہے؛ بین الاقوامی ترک اسلحہ جات اور ”لیگ آف نیشنز کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے ایسی موثر مشینری کی ترتیب جو ان بین الاقوامی حالات کا توڑ کرے جو جنگ پر منتج ہو سکتے ہیں۔“

یہ امر قابلِ تحسین بھی اور ساتھ ہی باعثِ افسوس بھی ہے کہ لارڈ سبیل کی آخری بڑی کوشش نہ صرف عمومی طور پر مستحکم یونیورسٹی کی تقریر کے عین مطابق ہے بلکہ ان کی لفظ بہ لفظ پیروی کرتی ہے جو انھوں نے بیس برس قبل کی تھی۔ قابلِ تحسین، اس لیے کہ یہ امن کے لیے ان کے کام کی سچائی اور تسلسل پر زور دیتی ہے؛ باعثِ افسوس، اس لیے کہ یہ ہمیں دکھاتی ہے کہ اس خوف ناک موسمِ سرما میں جس کا ہم اپنی بین الاقوامی

زندگی میں تجربہ کر رہے ہیں، مجبوراً ضروری ہو گیا ہے کہ ہمیں ایک بار پھر سب کچھ بنیاد کی سطح سے بنانا پڑے گا
یعنی [ہمارے لیے] یہ سٹسی فس (Sisyphus) کے پتھر جیسا ہو گیا ہے!

مگر، میرے خیال میں ہم کو اس برس کے نوبل انعام پانے والے، لارڈ سسیل آف چل ووڈ کی
خدمت میں ڈینش زبان کے ایک شاعر کے [مذہب] مندرجے جواں نے [اپنے قومی] ہیرو 'سٹسی فس'
(Sisyphus) کے لیے لکھے تھے، پیش کرنے چاہئیں!

کام پورا نہ ہوا، پر وہ مشقت ام تھک!

اے مرے پیارے ہیرو،

ایک دن لوگ شیش گے تری رووا ضرور

ماریا یاقی نوبل کمیٹی کے رکن Christian Lous Lange کی نیا کی

خطبہ:

تمدن کا مستقبل

جب مجھے اطلاع ملی کہ ماریا یاقی نوبل کمیٹی نے مجھے 1937 کے نوبل امن انعام کے بہت بڑے اعزاز
سے نوازا ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ انعام کے قانونی اصول کے مطابق مجھے ایک موقع بھی ملنے والا ہے
اور میرا فرض بھی ہوگا کہ انعام دیے جانے کے چھ ماہ کے اندر میں ایک خطبہ پیش کروں، اور اب میں اپنا
یہ فرض پورا کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے تو مجھے اس اعزاز کے لیے نوبل کمیٹی کی خدمت میں اپنا تشکر پیش
کرنا ہے۔ ساتھ ہی، مجھے اس کو فرحت دل کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے تھا، مگر ایسے وقت میں جب
امن کے لیے کام کرنے والے تمام لوگوں کو ہمت افزائی کی بے انتہا ضرورت تھی، [میرے نزدیک] اس
کی حطا دہری نوید ہو گئی ہے۔

جب میں نے اس کے بارے میں سنا تو میں نیویارک میں تھا، اور خیرین اس وقت پہنچی تھی جب میں
کولمبیا یونیورسٹی میں تھا جو یہ عنایات فراواں مجھ کو ایک اعزاز کی ڈگری سے نواز رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ
ایک ساتھ دونوں واقعات کی بہت شہرت ہوئی جو مجھے یقین ہے کہ امن کے مقصد کے لیے بہت فائدہ مند
رہی۔ بلاشبہ، اس موقع نے مجھے موقع فراہم کیا تھا کہ میں بے شمار صحافیوں اور دوسرے افراد کو ان اصولوں
کے بارے میں بتاؤں جن کے لیے میں کام کر رہا تھا اور جن کی بدولت مجھے یہ انعام دیا گیا ہے۔

آپ کے ملک کے ان لوگوں کے لیے میرا عمیق ترین احساس تشکر جنہوں نے نوبل کمیٹی کے فیصلے پر
صاد کیا۔ بالخصوص مجھے اجازت دیجیے کہ میں جلالت باب شاہ اور ملکہ راجہ کی خدمت میں اپنا دلی تشکر پیش

کروں کہ انہوں نے بہ کمال مہربانی آج کی شام کو، اور وہ دسمبر کی شام کی محفل کے احترام کو اپنی موجودگی کے شرف سے نوازا ہے۔

مجھے اتنا اور کہنے کی اجازت دیجیے کہ یہ طانیہ اور ماروے کے شاہی خاندان کے درمیان قریبی تعلقات مجھ جیسے یہ طانوی شہری کے لیے بہت ظہانیت کا باعث ہیں۔

میں اپنے دوست ٹاکٹر لانگے (Lange) کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے میرے بارے میں اس دن جو تقریر کی تھی، وہ مجھے بہت دلچسپ لگی تھی، اگرچہ اس میں بہت زیادہ تعریفی الفاظ کہے گئے تھے۔ جو کچھ انہوں نے کہا تھا میں اس کے بارے میں سرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اگرچہ مجھے اس پر یقین نہیں آتا مگر کاش میں ویسا ہی ہوتا۔

بہر حال، میں اس پر کچھ تبصرہ کرنا چاہوں گا۔ انہوں نے ازراہ مہربانی اس بات پر زور دیا تھا کہ اس وقت جب میں نے لیگ اور امن کے لیے کام کرنا شروع کیا تھا، میں ایک ”قدیم اشرافیہ اور قدامت پسند خاندان“ سے تعلق رکھتا تھا، اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کے خیال میں یہ امر میری اہمیت میں اضافے کا باعث ہوا تھا کہ ایسے ماحول سے آنے والے نے امن کے لیے کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ [میں اس کے جواب میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا، نو جوانی کی ابتدا ہی سے میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس میں مجھے امن کی بے حد اہمیت پر یقین دلایا گیا تھا۔ میں اکثر اپنے والد، انجینیئر لارڈ سالزبری کی زبانی سنا کرتا تھا کہ موجودہ حالات میں جنگوں کو روکنا بھلا کس طرح ممکن ہوگا، اس کے باوجود وہ خود کو کبھی قائل نہیں کر پائے تھے کہ اخلاقی اعتبار سے ان [جنگوں] کا دفاع کیا جاسکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اپنی زندگی کے آخری حصے میں انہوں نے ایک سے زیادہ تقریریں کیں جن میں اس امید کا اظہار کیا گیا تھا کہ کسی بین الاقوامی اتصال کے ذریعے جنگوں کو روکا جاسکے گا۔ انھیں اپنے یقین کے اظہار میں کوئی تامل نہیں ہوا کہ اس نوعیت کا کوئی ادارہ، جیسا کہ اس وقت سے ہم کوشش کرتے رہے ہیں اور جسے لیگ آف نیشنز کے اندر قائم کیا ہے، شاید کوئی حل پیش کر سکے، جو اس کے تصور کے مطابق جنگ بڑا کی شیطنت کہلائے گی۔ مثال کے طور پر ۱۸۹۷ء میں کی جانے والی ایک تقریر میں جس میں وہ اتحاد کا، یا جیسے وہ یورپی وفاق کہنا بہتر سمجھتے تھے، دفاع کرتے رہے ہیں، انہوں نے کہا:

”یورپی وفاق کا جنین (embryo) ہی صرف ایسے یورپ کا امکانی ڈھانچا ہے جو تمدن کو تباہ کن جنگ کے اثرات سے بچانے کا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہر طرف تہی کے حربے، اسلحوں کے ذخیروں، میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے؛ موت کے جھیلار بہت تیز اور شمار میں زیادہ ہوتے جا رہے ہیں، اور ہر برس ان کو بہتر بنایا جا رہا ہے؛ اور ہر قوم اپنے تحفظ کی خاطر اس مسابقت میں شامل ہونے پر مجبور ہوتی جا رہی ہے۔ بس ایک ہی امید ہے کہ ہمیں کسی طرح اس مسابقت کو روکنا پڑے گا، اس باہمی تہی سے جو ہمارے عیسائی متمدن کے لیے موت کا پیغام ہوگی صرف ایک ہی امید ہے کہ دوستی کے مہذبات کے ساتھ تمام طاقتوں کو قریب لایا جا

تکے گا، ان تمام سوالات پر جن میں اختلافات ہو سکتے ہیں، جب تک کہ ان سب کو کسی بین الاقوامی آئین کے ہندھن میں باندھ نہ دیا جائے جو دنیا کو، ان کے استحکام کے نتیجے میں، طویل عرصے کی آزاد اور خوش حالی دینے والی تجارت اور مسلسل امن فراہم کرے۔“

میں سمجھتا ہوں کہ میرے سامعین مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ کچھ زیادہ ہی غیر معمولی پیش رفت ہے، اس کی جو واقع ہو چکا ہے اور جسے ہم اس زمانے میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آپ دیکھیں گے کہ مقرر نے ایک سے زیادہ بار اس شے کی نشان دہی کی ہے جو تمدن کے لیے خطرہ تھی۔ بد قسمتی سے اس میں کوئی شک نہیں کہ خطرہ اب بھی باقی ہے۔ مافکوں نے اسلحے کی دوڑ کا تذکرہ کیا ہے، جس میں شرکت سے کوئی بچ نہیں سکتا تھا اور جو خود بھی امن کے لیے خطرہ تھی۔ بد قسمتی سے یہ بھی سچ ہے: ان کے زمانے سے اب گنا زیادہ بچ۔

آخر میں انھوں نے بین الاقوامی آئین کا تذکرہ بھی کیا، جو ایک طرف تو مختلف قوموں کی غیر مطمئن خواہشات کی تسکین کے لیے تھا، اور دوسری طرف، اس کی عظیم طاقت سے تمدن کو جنگ کے ذریعے تباہ کرنے سے روکنے کے لیے۔

میں نے ڈاکٹر لانگے کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ کہنا مناسب جانا ہے۔ مگر اس کے علاوہ، میرے پاس ان کے اور بارے کے عوام کے لیے تحسین کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اور یہ کسی طرح بھی پہلا واقعہ نہیں ہے جس کے لیے مجھے ماریاٹی عوام کی تحسین ضروری محسوس ہو۔ بلاشبہ، یہ میری خوش قسمتی ہی ہے کہ میں لیگ آف نیشنز کے ابتدائی دنوں سے ہی جدید زمانے کی عظیم ترین ماریاٹی شخصیت سے قریبی تعاون میں ہوں۔ یقیناً یہاں میری مراد ڈاکٹر نیلسن (Nansen) سے ہے۔ بہت سے موقعے ایسے بھی آئے ہیں جن پر ان کی ژرف نگاہ ہمت نے اس سمت اشارہ کیا ہے جہاں سے جینوا کا یہ ادارہ بہتر طریقے سے امن حاصل کر سکے گا۔ واقعی، اسمبلی پر ان کا رسوخ غیر معمولی رہا ہے۔ ایک قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے، جو اگرچہ بنی نوع انسان کے لیے بہت کچھ کرنے کا دعوٰی کرتی ہے، جب کہ وہ یورپ کی بڑی طاقتوں میں سے نہیں تھی، ان کا رسوخ ان کچھ لوگوں سے کہیں زیادہ تھا جو زیادہ طاقت ور قوموں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ میں نے پچھلے چند برسوں میں بہت بری طرح محسوس کیا ہے کہ ہم واقعی اس قیادت سے محروم ہو چکے ہیں جو واقعی بہت دلہ انگیز تھی۔

مگر وہ کبھی تنہا نہیں رہے۔ ہم بہت خوش قسمت تھے کہ لیگ کے ابتدائی برسوں میں ہمیں اپنے ہمارے غیر معمولی درجے کی صلاحیت کے مددگارین میں تھے جو لیگ کے عہد نامے کے تحت بین الاقوامی تعاون کے قائل حمایتی تھے۔ میرے اپنے ملک میں انجیلی لارڈ بالٹور تھے جنہاں کی تیز نگاہ دانش نے انھیں وہ صلاحیت دی تھی کہ وہ، بہت سے مواقع پر، آگے بڑھنے کے عملی راستے کا تصور پیش کر سکتے تھے۔ ان کے علاوہ انیسویں صدی میں بھی تھے۔ ذاتی طور پر بے حد مود لینے والی اور اعلیٰ درجے کی خطیبانہ صلاحیت کی حامل

شخصیت، مکمل طور پر امن کے لیے وقف، جس نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے ملک کے اندر خارجہ امور میں وہ مقتدر حیثیت حاصل کر لی تھی جس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ میں ڈاکٹر اسٹریسمن (Stresemann) کو بھلا کیسے بھول سکتا ہوں جو، اگرچہ جینوا میں بہت دن نہیں رہے تھے پھر بھی اس ادارے پر ان کی شخصیت غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوئی تھی۔ ایک اور شخصیت، آپ کے ہمسایے ڈاکٹر برانتینگ (Branting) کی تھی۔ امن کا مستحکم ستون، جن کی صلاحیتوں میں سب سے زیادہ قیمتی صلاحیت دلچسپ انگیز اعتماد پیدا کرنے کی تھی۔ اور آخر میں کر میں آپ کو ناموں ایک لمبی فہرست منانے کے لیے روکے نہ رکھوں۔ ایک شخصیت کا ذکر کرنا چاہوں گا جو اب بھی ہمارے ساتھ ہے اور بین الاقوامی امن اور بہتر نظام کی جدوجہد میں سب سے آگے ہے، یعنی چیکو سلوواکیا کے صدر ڈاکٹر ایڈورڈ بینس (Eduard Benes)، جو امن کے بڑے رسیا ہیں اور لا انتہا وسائل کے مالک بھی ہیں۔

میں اس فہرست کو ان لوگوں کے نام شامل کر کے طویل بنا سکتا ہوں جو اب بھی جینوا میں عملی کام میں حصہ لے رہے ہیں۔ مگر ایسا کرنا شاید سامعین کو ناگوار گزرے۔ [اس لیے] یہ کہنا کافی ہوگا کہ ان عظیم لوگوں کی قیادت میں لیگ آف نیشنز کے پہلے دس برس مسلسل خوش حالی کے تھے۔ لیگ روز بروز ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی۔ اس نے اپنے دفاتر ترتیب دیے جو نہایت اچھے انداز میں کام کر رہے ہیں۔ اس کے بعد Permanent Court of International Justice کا قیام عمل میں آیا۔ یہ بھی ایک قابل ذکر کامیابی تھی جس کے ذریعے، امید ہے کہ بالآخر تمام بین الاقوامی معاملات میں قانون کی حکمرانی ہوگی۔ اور جینوا میں اسٹینڈنگ کمیٹیوں کا ایک جال سا بن دیا گیا تھا، جن میں مالیات اور نقل و حمل سے لے کر افیون اور سفید فام [کے ہاتھوں] غلاموں کے کاروبار تک، ہر قسم کے سماجی اور انسانی مسائل حل کیے جاتے ہیں۔

ابتدائی دنوں کے تمام کاموں کی تفصیل میں جا کر میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لےنا چاہتا۔ میں ان بڑے کاموں کا بھی تذکرہ نہیں کروں گا جو غیر فتنہ ساز معاملات میں کیے گئے ہیں، سوائے دو کے جن پر میں ضرور روشنی ڈالنا چاہوں گا غلامی، انسانی معاملات کی سب سے بڑی لعنت، جس کو جز سے اکھاڑ بچھڑنا ایک بڑا قدم تھا، اور بہت سے ملکوں میں نسلی، نسائی اور مذہبی اقلیتوں کو تحفظ کی فراہمی۔ ان کا بیان اس لیے کیا گیا ہے کہ بہت سے معاملات میں سے ان دو میں ڈاکٹر بینس نے انسانیت کی بھلائی کی خاطر غیر معمولی کام کیے ہیں۔

میں تمام بین الاقوامی تنازعات کے قابل دید حل کے حصول میں کامیابی کا تذکرہ ضروری نہیں سمجھتا۔ جب کبھی بے لاگ انداز میں لیگ کی تاریخ لکھی جائے گی تو، میرے خیال میں، یہ دس برس بین الاقوامی کامیابیوں کے غیر معمولی عرصے کے طور پر بیان کیے جائیں گے، دنیا نے اب تک جن سے بہتر عرصہ نہیں دیکھا ہوگا۔

جب کئی برس کی تیاریوں کے بعد 1932 میں بالآخر ترکی اسلحہ کا انفرنس منعقد ہوئی تو واقعی ایسا لگا تھا گویا ہم دنیا میں پائیدار حالات کی سمت بڑھ رہے ہیں۔ میں اب بھی اس بات پر قائل ہوں کہ ذرا زیادہ ہمت اور

پیش بینی کے ساتھ، بالخصوص ان لوگوں میں جو نام نہاد بڑی طاقتوں کے پالیسی ساز افراد ہیں، ہم بین الاقوامی اسلحہ جات میں حد بندی حاصل کر سکتے تھے، جس کے ساتھ ہمیں اور بہت سے فوائد بھی حاصل ہوتے۔ اور ذاتی طور پر، اس سلسلے میں کیا میں آپ کو اس آوی کی یاد دلاؤں جس کو شاید بالکل بھلا ہی دیا گیا ہے۔ یہاں میری مراد Henri de Jouve سے ہے، جنہوں نے ترکی اسلحہ جات کے ابتدائی مراحل میں غیر معمولی کام انجام دیے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انھیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ سب کچھ مانگا نہیں گیا ہے۔ ہم نے ایک بنیاد رکھ دی ہے جس پر، بالآخر، اصلاح کے طور پر کچھ بنایا جائے گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر دنیا کو نئی خون ریز تباہی سے بچا جائے تو اسلحہ جات کی حد بندی یا ان میں کمی کی کوشش جلد یا بدیر دوبارہ شروع کرنی ہوگی۔

جب کوئی یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ پہلے دس برسوں میں لیگ کو کیوں اس قدر کامیابی نصیب ہوئی تھی، تو بلاشبہ اسے سب سے بڑی وجہ اس دہشت میں ملتی ہے جو لسن انسانیت میں 1914 کی پہلے عالمی جنگ نے پھیلانی تھی۔ تقریباً تمام لوگ جو جنیوا میں ہونے والے کام میں مصروف تھے جنگ کے پیدا کردہ برے نتائج پر قائل عام اور تباہی سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ بہت سے لوگوں کو اس بات کے واضح خطرات صاف نظر آ رہے تھے کہ ان کے اپنے ملک برصغیر کی طرف واپس جا رہے ہیں، اور ان میں مستقبل میں جنگوں کا سدباب کرنے کی شدید خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ ان ہی محسوسات کے زبر اثر ان دنوں ہم نے کام کیے تھے اور ہم نے دنیا کی رائے عامہ سے حمایت کی درخواست کی تھی، جو مانگا نہیں گئی۔

میرے اپنے ملک میں، اور شاید دوسرے ملکوں میں بھی، اکثر لیگ آف نیشنز کے کارکنوں کی سرزنش کی جاتی ہے کہ وہ اجتماعی تحفظ اور جنگ کے جبری سدباب کو زیادہ اہمیت دیتے رہے۔ صرف اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سیاسی معاملات میں لوگوں کی یادداشت کتنی کم زور ہوتی ہے۔ درحقیقت، لیگ کے پہلے دس برسوں میں ان موضوعات کے بارے میں بہت کم کہا گیا تھا۔ ہم لیگ کے سماجی اور انسانی پہلوؤں پر زیادہ جملے رہے۔ ہم نے ترکی اسلحہ جات اور عراق پر نظر ثانی کیے جانے کی ترغیب دی تھی۔ خاص کر انگلستان میں جبری عمل پر نہیں بلکہ رائے عامہ پر زیادہ بھروسہ کیا گیا تھا۔ ہم نے تبلیغ کی تھی اور ہمیں خوشی ہے کہ کامیاب تبلیغ کی ہے لیگ کے عمل کی اہمیت کی تشہیر کے لیے، تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے کہ نہ صرف یہ کہ کیا جا رہا ہے بلکہ یہ سب جنیوا میں کیوں کیا جا رہا ہے۔ ہم نے شاید اس تصور کو زیادہ ہی اہمیت دے دی تھی کہ کوئی بھی قوم اتنی جلد یا زیادہ اتنی بد معاشر نہیں ہوگی کہ خود کو دنیا کی رائے عامہ کے خلاف صف آرا کر دے۔ اور واقعی اس وقت تک ایسا نہیں تھا، جب ہمیں منچوریا کے تنازعے کے سلسلے میں پتا چلا کہ ایک ہی قوم تھی جو ایسے معاملات سے اتنی لاپرواہ ہو گئی تھی کہ دوسرے ہتھیاروں کے استعمال کی وکالت شروع کر دی تھی، لیگ نے جن کو امن سے محبت کرنے والی قوموں کے سپرد کر دیا تھا۔

بد قسمتی سے منچوریا کا تنازعہ اس وقت پیدا ہوا جب وہ قومیں جن سے توقع کی جا رہی تھی کہ وہ کے

سہولیات کی ضرورت کی قائل ہوں گی اس وقت کے اقتصادی بحران کے باعث خود اندرونی مشکلات میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ ہم انگلستان میں اقتصادی حالات کے باعث مشکل سیاسی بحران میں گرفتار تھے اور یہ بھی کہ بالآخر بحران کا حل صرف سونے کے معیار کی دست برداری سے مل سکتا تھا۔ اور ان حالات میں شاید یہ بات گزیر بھی تھا کہ ہمارے لوگوں کو غیر ملکی معاملات میں کم دلچسپی لینا چاہیے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جزوی طور پر ان ہی وجود سے منجور یا اور چین کے دوسرے صوبے فتح ہوئے تھے اور دنیا کے تمام آرزو مند بڑوں کو سبق ملتا تھا کہ لیگ کے باوجود اور بعد اس کے باوجود، پرانی عسکری پالیسیاں کس طرح کامیاب بنائی جاسکتی ہیں۔

اور اس مرحلے پر کیا میں ایک سبق پر زور دے سکتا ہوں جس کو کبھی بھلایا نہیں جانا چاہیے کہ بین الاقوامی معاملات کا ایک مسئلہ دوسرے تمام معاملات پر عمل میں کس قدر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ، مشرق بعید میں جارحیت پر نظر رکھنے میں لیگ کی ناکامی نے پہلے تو پورے نظام پر ضرب لگائی، ہم جس کو قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور پھر اس نے بین الاقوامی تحفظ پر پڑے عملوں میں سہولت پیدا کی۔

اس کے نتیجے میں ابی سینیا (Abyssinia) پر اطالیہ کا حملہ، بین الاقوامی سطح پر، شاید زیادہ ہی ناقابلِ دفاع ہو گیا تھا، اور چین پر جاپان کا حملہ، بد قسمتی سے اتنا ہی کامیاب ہو گیا تھا۔ یہاں امن سے محبت کرنے والی طاقتوں کے لیے کوئی بہانہ نہیں تھا۔ یقینی طور پر ان کے پاس استحکام بھی تھا اور موقع بھی کہ وہ بین الاقوامی معاملات میں قانون کی برتری کے اصولوں کے دفاع کو کام بنا سکتے، مگر انہوں اس کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔

میں آپ کو وہ تکلیف دہ واقعات یاد دلانا ضروری نہیں سمجھتا جو جنگ کے خلاف دو عدد رکاوٹوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے ظہور میں آئے تھے جن کے ذمے دار جاپان اور اطالیہ تھے۔ ہم نے [جرمنی کے جنوبی علاقے] رہاؤن لینڈ (Rhineland) کے صوبوں پر دوبارہ زبردستی قبضے، ہسپانیہ میں کئی قوموں کی دخل اندازی اور جرمنی میں آئمریا کے انتظام کی صورت میں ان کا انجام دیکھا ہے۔ آخر کار، ہم نے چین پر شاید زیادہ سنجیدہ، نئے انداز میں اور زیادہ شدید حملہ بھی دیکھا ہے۔

لیگ کی ان شکستوں کے بعد، ہم آج جس دنیا کو اس کی موجودہ حالت میں دیکھ رہے ہیں اس کا [آسانی سے] اس دنیا سے مقابلہ کر سکتے ہیں جو سولہ سترہ برس قبل تھی۔ یقینی طور پر یہ تقابل زیادہ پریشان کن ہے؛ تقابل [تو اور بھی] خطرناک ہوگا، اور ابھی تک ہم اس لمحے تک نہیں پہنچے ہیں جس میں ہم مادی نقصانات اور انسانی دکھوں کا پورے طور پر اندازہ لگا سکتے، جو طاقت کے ایک گروہ کی ہوں اور دوسرے گروہ کی کم زوری کی وجہ سے اٹھانا پڑے ہیں۔ نہ ہی اس [اندازے] کی کوشش سے کوئی مقصد حاصل ہوگا، بلکہ ہمیں تو اس امر کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم اس وقت کہاں کھڑے ہیں اور [ہمیں] ایسے کون سے قدم اٹھانے چاہئیں جن سے بین الاقوامی نظام مضبوط ہو اور رجعت پسند طاقتوں کو پیچھے کی طرف دھکیلا جاسکے۔

سب سے پہلے تو ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ کچھ معنوں میں لیگ کے پہلے دس برس غیر فطری تھے۔ جنگ کی دہشت ناک، جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں، اس سے کچھ زیادہ ہی واضح تھی، جس کی دیر تک قائم رہنے کی توقع کی جاسکتی۔ امن کے حق میں بحث، اور جنگ کی دہشت، دیر تک باقی رہنے والے اثاثے نہیں ہوا کرتے۔ میرے خیال میں اس وقت ہم سب اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک بین الاقوامی نظام کو موثر انداز میں پہلے دس برس تک چلایا نہیں جاتا، بعد کے برسوں میں ہمیں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، اور یہی ہوا۔ کچھ معنوں میں، لیگ کی نام نہاد کامیابیاں، جن کے بارے میں آج بہت باتیں کی جا رہی ہیں، فطری انداز میں ہونے ہی والی تھیں کہ ایسے انسانی واقعات میں ہمیشہ لبروں کی جیسی کیفیت ہوتی ہے، ایک عرصے کے لیے لبر کی بلندی آتی ہے اور فوراً بعد میں فطیب آ جاتا ہے، اور بلاشبہ 1930 یا 1931 تک ہم امن کی لبروں کی بلندی پر تھے۔

عالمی جنگ کی مسلط کی ہوئی تباہیوں نے عسکریت کو حیران کر دیا ہے۔ لوگوں نے صرف جنگ کے دیے ہوئے ہول ناک دکھ ہی نہیں دیکھے، بلکہ اس حقیقت کو بھی دیکھا ہے کہ فتح کرنے والوں کو، بہت کم، بلکہ بالکل کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے، اور، جیسا کہ پہلے ہو چکا ہے، دنیا کے عوام کا قومی احساس یہ تھا کہ جو کچھ ہو چکا، ہو گیا، مگر ہمیں انسانی سوسائٹی کے ڈھانچے کو دوبارہ ایسے خطرات میں نہیں پڑنے دینا چاہیے۔ مگر عسکریت، اگر چہ حیران ہوئی تھی، مری نہیں تھی؛ اس کو دوبارہ سراٹھانا تھا، اور اس میں دوبارہ جان پڑ گئی ہے۔ اس کی لا انتہا روایات، اس کے دلکش نقش و نگار، عسکری رسوم کی جاذبیت، حتیٰ کہ عسکری موسیقی بھی، سب مل کر انسانی فطرت کے عظیم عناصر کو اپنی طرف لہاتے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب ہمیشہ ہی موجود رہیں گے، جن پر نگاہ رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ میں اس میں ایک اور بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ مادی قوت اور استحکام کی تعظیم کرنے کے فطری میلانات کو بہت سے ملکوں کے بڑے بڑے اداروں کے وجود نے بڑھایا ہے، جن کی دھڑکیں میں وسیع مالی استحکام اور ہر طرح کے پروپیگنڈے کے جدید طریقے ہوتے ہیں۔ یہاں میری مراد دنیا کے بڑے اسلحہ ساز ادارے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ لیگ کے ابتدائی برسوں میں اسلحہ بنانے والے ادارے نسبتاً غیر متحرک رہے ہیں۔ صرف اس وقت جب کبھی اسلحہ کی حد بندی کی کوشش کی گئی ہے تب ہی یہ جاگے ہیں اور کوشش کی ہے کہ اس ادارے ہی کو تباہ کر دیا جائے جو ان کی مالی خوش حالی پر حملہ کرنے کے ذمے دار ہوں۔ میں اسلحہ ساز اداروں کی قوت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا نہیں چاہتا، مگر مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انھوں نے لیگ کی مشکلات بڑھانے میں معاونت کی ہے۔

یہ بھی، اور ان کے علاوہ بھی ادارے ہیں، جن میں پرانے خیالات اور سفارتی روایات کے مطابق مزاحمت کی قوت ہے۔ سفارتی افسر شاہی کی مزاحمتی طاقت کو کم تر کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اس کی اپنی صلاحیت اس کی اصل قوت ہوتی ہے، عظیم اور عظیم روایات، احتیاط سے پورا ہوا یقین، کہ امور خارجہ وہ

موضوع ہیں جن کے بارے میں وہی فیصلے کر سکتے ہیں جنہیں ان کی پیشہ ورانہ تربیت دی گئی ہو اور مجھے یہ کہنے کی بھی اجازت دیجیے کہ اس میں غلط قسم کی حب الوطن غیر جانب داری بھی ہوتی ہے، جس سے ہمارے سفارت کار دوست جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھیے کہ میں اس عظیم تو قیر کو کم رہا ہوں، پرانی سفارت کاری جس کی حق دار ہے۔ نئے نظام کے وجود میں آنے سے پہلے، جنگ سے بچنے کے لیے سفارت کاری ہی کام آتی تھی، اور اس کی کامیابیاں نسل انسانی کے لیے نہات اہمیت اور قدر کی حامل ہوتی تھیں۔ مگر شاید یہ فطری بات ہے، غیر معمولی استثنا سمیت کہ اس طاقت و تنظیم کا تمام تر استحکام نئے خیالات اور خیالوں کے نئے اصولوں کے خلاف رہا ہے۔ پرانے زمانے کا سفارت کار بہت سوچ بچار کے بعد آگے بڑھتا تھا، اور خفیہ طور پر، قدیم اور قابل اعتماد روایات کے ساتھ کام کرتا تھا جن کو "the usual channels" کہا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک، کہے جانے والے کھلے مباحثے، جن میں پیشہ ور سفارت کار شامل نہ ہوں، جس میں سیاست دان اور مدبر سفارت کاری کے تکنیکی طرز بیان اختیار نہ کریں، جن کا مقصد صرف نتائج تک پہنچنا ہو اور جو سفارت کاری کو غیر ضروری بنا دیں، اس کی جہالت کے لیے تو جین آمیز ہوتا ہے۔

اب مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی ہے کہ کہیں مجھے سفارت کاری کے پیشے پر حملے کا گناہگار نہ سمجھ لیا جائے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ تمام پیشہ ور لوگوں پر صادق آتا ہے۔ مثال کے طور پر طب کے پیشے کی کوئلے بیجیے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ اگر آپ اس کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ، اگر سب نہیں تو، بہت سی دریا فتوں کا مخالف رہا ہے؟ کچھ ایسا ہی سائنسی پیشے کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ گیلیلو (Galilei) کے زمانے سے آج تک، سائنسی دنیا عام طور پر نئے خیالات سے مزاحم رہی ہے۔ چند دن قبل ہی میں مادم کیوری (Curie) کے حالات زندگی کا مطالعہ کر رہا تھا، کہ میری نگاہیں اس کی مشکلات پر انگ کر رہ گئیں، جو اس کو اور اس کے شوہر کو پیش آتی تھیں، قبل اس کے کہ انھیں اپنی دریا فتوں کے لیے سائنسی دنیا سے منظوری ملی تھی۔ اور یہ دکھانے کے لیے کسی طرح بھی میں نا انصافی نہیں کر رہا ہوں، میں اپنے ہی پیشے کی مثال پیش کرنا چاہوں گا، یعنی قانون کے پیشے کی۔ میں انگریز قانون دانوں کی بہت قدر کرتا ہوں، اور بلاشبہ غیر ملکی قانون دانوں کی بھی۔ یہ سب بڑے لوگ ہیں، اعلیٰ دماغ والے ہیں، مگر تمام قانونی اصلاحات میں جو بچھلی صدی میں میرے ملک میں کی گئی ہیں جو بہت ساری اور بے حد اہم رہی ہیں میرے خیال میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم نے قانون دانوں کی اکثریت کو ہمیشہ ان کے خلاف پایا ہے۔ اس میں کوئی خاص بد معاشی کی بات نہیں، مگر یہ بالکل فطری بات ہے کہ جن لوگوں کی ایک پیشے میں نشوونما ہوتی ہو ان کو بتایا گیا ہے کہ وہ جن پر بھروسہ کرتے ہیں وہی صحیح اصول ہیں، اور اگر ان میں تبدیلی کی جائے تو وہ خطرناک ہی نہیں، غالباً مہلک بھی ہو سکتی ہے۔

لہذا، پیشہ ورانہ دائرے تقریباً ہمیشہ تبدیلی کے خلاف ہوا کرتی ہے۔ یہ ان کارروائیوں اور ان کے جیسے اثرات ہیں جو ہمیں اس قدیم تصور کی طرف لے جاتے ہیں جسے طاقت کی سفارت کاری کہا جاتا ہے۔ ان

تصورات کے مطابق جنگ اور امن کی مکمل مخالفت دراصل بالکل ایک اجنبی صورت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مشاہدہ سخت ہو۔ اجازت ہو تو میں تشریح کروں کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں نے کسی کا مضمون پڑھا تھا جس نے قطعی طور پر لیگ اور اس کے لوگوں کے موقف کو رد کر دیا تھا، اس لیے کہ لکھنے والے کے خیال کے مطابق جنگ محض شدت زدہ امن ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک بین الاقوامی معاملات میں عام حالت قوموں کے درمیان مقابلے کی ہوتی ہے، جو جنگ میں بدل جایا کرتی ہے۔ یہ اس کا نقطہ نظر تھا کہ وہ بین الاقوامی زندگی میں عام حالت کی اصلیت کو سمجھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے خیال میں سفارت کاری، جس حد تک ممکن ہو، جنگ کو روکنے میں فائدہ مند ہوتی ہے، مگر وہ تو امکانات کی حد کی بات تھی۔ یہ کبھی جنگ روک نہیں سکتی، اور یہ تصور کہ جنگ کو روکا جاسکتا ہے محض ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔

1914 سے پہلے یورپ، بلکہ اور کسی درجے تک، پوری دنیا جنگ کے دائمی سراپے میں رہ رہی تھی، افسوس، جس طرح کہ ہم اس وقت رہ رہے ہیں۔ بلاشبہ، جب یہ [کیفیت] ایک عرصے تک جاری رہتی ہے تو لوگ بے حس ہو جایا کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ جنگ اتنی بار بار لائی جا چکی ہے تو لگاتار لائی جاتی رہے گی۔ مگر اس کے باوجود تمام بین الاقوامی پارلیمنٹیں اسی بنیاد پر بنائی جاتی ہیں کہ جلد یا بدیر، جنگ کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ ایک بار پھر یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے، اور یہ انسان کی ہر قسم کی سرگرمی پر اپنا [منہ] سرایہ ڈالتی ہے۔ جنگ کے خطرے کے باعث ہر قوم کی تمدنی زندگی میں بگاڑ، کم زوری اور رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہم دولت کے کثیرانہ رضانے کر رہے ہیں، وہ دولت جو اس دولت سے کہیں زیادہ ہے جو ہم نے، جنگ کی تیاریوں پر ماضی میں بردباری کی ہے، اس لیے کہ جنگ ایک بار پھر امکان موجود ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی، اس کی دہشت اور اس کے خطرات اس سے کہیں زیادہ ہیں جو 1914 کی جنگ سے پہلے تھے۔ لہذا، دنیا ہر سال جنگ کی تیاری پر تقریباً چار ہزار ملین پاؤنڈ خرچ کر رہی ہے، جو ہم جانتے ہیں کہ ہو کر رہے گی، اور ہمارے پورے تمدن کے لیے بے انتہا خطرہ بنی ہوگی، اس سے مطلب نہیں کہ کون فاتح ہوتا اور کس کو شکست ہوتی ہے۔ اور ہم ایک بار پھر دیکھ رہے ہیں کہ ہر پارلیمنٹ کا عملی اصول جس کی لاطینی اس کی بھینس بنی ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں طاقت ہی کی اہمیت ہوتی ہے، کہ سچائی کی اور رحم کی اور برداشت کی خوبیاں حقیقت میں خوبیاں نہیں بلکہ نشانیاں ہیں انسانی فطرت کی نرمی اور کم زوری کی، اور یہ بھی کہ خون اور فولاد کا قدیم تصور ہی وہ صورت ہے جو واقعی سچ ہے اور جس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے رد عمل کے ساتھ، ہم دیکھ رہے ہیں ایک شدید قسم کی قوم پرستی کا احیا ہو رہا ہے جو اس پر یقین رکھتا ہے کہ نہ صرف آپ کی اپنی قوم دوسری قوموں کے مقابلے میں برتر ہے، بلکہ تمام قومیں ذلیل اور کمتر ہیں، اور یہ بھی کہ ہر ملک کی حکومت کا صرف یہی کردار ہے کہ وہ اس قدیم، مہلک اور شیطانی متن پر عمل کرتے ہوئے "Everyone for himself and the devil take the hindmost" اپنے ملک کو محفوظ اور خوش حالی فراہم کرے اس سے قطع نظر کہ اوروں پر کیا گزرتی ہے۔

فی زمانہ دنیا کی کثیر آبادی نے ان نظریات کو قبول نہیں کیا ہے، اور ان ملکوں میں بھی جہاں انھیں سب سے زیادہ قبولیت ملی ہے ان کو قدرے نامکمل کے ساتھ اور امن کی وکالت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ قوم پرست خیالات کی فتح کا امن ہوتا ہے۔

وہ بڑا سوال جو اب ہمارے ذہنوں کو مشتعل کرتا ہوگا یہ ہے کہ کیا پرانے خیالات کا یہ احیاء دنیا کی زیادہ تر قوموں تک پہنچنے والا ہے۔

کسی خطرے کو کمتر نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہر اس شے کے لیے خطرہ ہوتا ہے جو ہمیں بیماری ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ کامیاب نہیں ہوگا تو یہ ہم کو 1914 میں جو خود بہت خراب تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ خراب حالت میں لے جائے گا۔ مثال کے طور پر، بظاہر، اب یہ ان لوگوں کے عام نظریے کا حصہ ہے جو اس نظام کی وکالت کرتے ہیں کہ جنگجو اور غیر جنگجو کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رہتا جائے گا، اور یہ بھی کہ ایک مکمل طور پر جائز اور دراصل ضروری طریقہ جنگ غیر قلعہ بند شہروں اور اس کے باشندوں پر بڑے پیمانے کی تباہی لائے گا۔ بلاشبہ، ایسی چیزوں کو روکنے کی خلافی جیسی کوششیں بھی ہوں گی، اور ادھر عسکری خیالات کا حامل ایک ٹکڑا ہے جو اس پر یقین رکھتا ہے کہ ایک جنگجو کے شہروں کی بمباری کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہوگا، کہ دوسرے جنگجو کے شہروں پر بمباری کی جائے۔

یہ اس قسم کے خطرے کا نمونہ ہے جو ہمیں درپیش ہے۔ میں اس پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتا اس لیے کہ زیادہ تر سامعین، بلاشبہ، اس پر غور کر چکے ہوں گے اور میری طرح ان خطرات سے پوری طرح واقف بھی ہوں گے۔ اس بات کا مقصد صرف یہ پوچھنا تھا کہ کیا ہم اس کو روک سکتے ہیں؟

اچھا، تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے، میرے خیال میں یہ بالکل یقینی ہے کہ ہم اسے روک سکتے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے اس پر کوئی شبہ نہیں۔ دنیا کی آبادی کی کثرت جنگ کے خلاف ہے، جارحیت کے خلاف ہے۔ اگر وہ اپنی خواہشات کا اظہار کریں اور اس کو موثر کر دیں تو جنگ روکی جاسکتی ہے۔ سب کچھ اس پر منحصر ہے کہ وہ مقصد کے لیے ضروری کوشش کرنے پر راضی ہیں کہ نہیں۔ اس کے لیے ایک کوشش ضروری ہوگی، کوئی بھی جسے ان موضوعات پر دنیا کی تاریخ کا علم ہے، اس پر شبہ نہیں کرے گا۔ حال ہی میں جب کہ بین الاقوامی کارروائی کے ذریعے امن کے حصول کی ہمت شکنی کرنے کے لیے بہت کچھ کیا جا چکا ہے، ہم نے دو واقعات دیکھے ہیں [جن سے ظاہر ہوتا ہے] کہ باہمت باہمی تعاون کیا کچھ انجام دے سکتا ہے۔ یہ چند مہینے قبل ہی کی بات ہے جب نایون (Nyon) کے مقام پر، بحیرہ روم کی متعلقہ طاقتیں ایک جا ہوئیں اور فیصلہ کیا گیا کہ، جسے ہسپانیہ کے تنازعے کے سلسلے میں بحری قزاقی ہی کہا جاسکتا ہے، اس کو ختم کیا جانا چاہیے اور یہ بھی کہ اگر اس پر عمل ہوتا ہے تو، اس کے سدباب کے لیے برآمدہ طاقت کو ہر قسم کے طریقے استعمال کرنے ہوں گے۔ اور اس دن سے ہی عملی طور پر وہ سلسلہ بند ہو گیا اور ایک بڑی طاقت نے، ہم جس پر قزاقی سے متعلق ہونے میں غلط یا صحیح، شبہ کر رہے تھے اعلان کر دیا کہ وہ اس کو ختم کرنے کی کوشش میں شامل ہونے

کو تیار ہے۔

اس سے بھی زیادہ حالیہ فزوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ جس عمل کو چیکو سلوواکیا کی سالمیت اور آزادی کے لیے خطرہ سمجھا جا رہا تھا ایک سخت تنبیہ کے بعد ہی رگ گیا، جس میں کہا گیا تھا کہ جو ملک بھی اس میں ملوث پایا جائے گا اس کے خلاف پوری طاقت سے سخت فوجی کارروائی کی جائے گی۔

یہ سچ ہے کہ ایسی چیزیں لیگ کے ذریعے نہیں کی جاتی تھیں، نہ جن کی وجہ میری سمجھ میں آتی تھی، نہ میں ان سے ناواقف ہونے کا بہانہ کر رہا ہوں۔ مگر یہ، بہر حال، واضح کرتی ہیں کہ اجتماعی کوشش اجتماعی تحفظ پیدا کر سکتی ہے، کہ اگر ایسی کوشش نہیں کی جاتی ہے تو اس لیے کہ اس کو کرنے کی نہ خواہش ہے اور نہ ہمت۔ اس لیے یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے، جیسا کہ پہلے کبھی نہیں تھا، کہ درپیش مسئلے کے بارے میں ہمیں فیصلہ کرنا پڑے گا: کیا ہم مجتہد یورپ میں کنٹرول سے باہر قوم پرستی کی اجازت دیں گے، یا ہم یہ کہیں گے کہ یورپی ممالک (میں پوری دنیا کے لیے کام نہیں کر رہا ہوں، مگر اس بات کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے) دراصل ایک ہی کمیونٹی کا حصہ ہیں اور بین الاقوامی امن میں ان کا مفاد بھی مشترک ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قوم پرستی کے خیال میں دل فریبی کا عنصر بہت ہوتا ہے۔ اس کی ایک طویل تاریخ ہے، یہ جذبات کو ابھارتی بھی ہے۔ مگر ہم اس کا تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر متفق ہو جاتے ہیں کہ دنیا کی تمام قوموں کو اسے رہنما اصول کے طور پر مسترد کر دینا چاہیے کہ یہ ریاست کے اختیار اور احترام کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہے جو عملی طور پر انفرادی عمل اور انفرادی ذمے داری کو تباہ کر دیتا ہے۔ قوم پرستی مکمل آمریت کی طرف لے جاتی ہے، اور مکمل آمریت پرستی کی جانب۔ یہ ریاست کا صرف اصول نہیں بنتی بلکہ ایک نیا مذہب بن جاتی ہے، اور میں اس میں لفظ ”جھجکا“ کا اضافہ بھی کروں گا۔ یہ جزوی طور پر عملی سائنسی طریقے کے نظریے پر انحصار کرتی ہے جو گزیرے ہوئے دور پر ان قدروں کی شکستگی کی طرف لے جاتی ہے جو عیسائی اخلاقیات کا حصہ ہیں۔

دوسری جانب، اگر ہم اس تصور کو قبول کر لیتے ہیں کہ تمام قومیں ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہیں، جس طرح کسی سوسائٹی میں افراد ہوتے ہیں، تو ہمیں ایک بالکل مختلف نتیجہ ملتا ہے۔ ایسا اصول دوستی اور اچھی ہمسائیگی کی طرف لے جاتا ہے اور یقیناً، یہ کہنا غیر ضروری نہیں ہوگا کہ یہ اصول ہر اس شے کی جانب لے جاتا ہے ہم اب تک جسے ترقی اور تمدن سمجھتے رہے ہیں۔

امید ہے کہ میں نے دو نظریوں کے درمیان اس شکستگی کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا ہے۔ بین الاقوامی تعاون کے اصولوں کی قبولیت تمام ریاستوں کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ ریاستیں بھی جو سمجھتی ہیں کہ وہ اپنے بیرونی پرکھڑی ہو سکتی ہیں اس تعاون سے بہت فائدے اٹھا سکتی ہیں۔ اور چھوٹی، یعنی کم زور ریاستوں کی آزادی اور انصاف کی امیدوں کے لیے تو یہ بہت ہی اہم ہے۔

جب ہم یہ سب کہہ رہے ہوتے ہیں ہمیں اپنے آپ کو بھی یاد دلانا ضروری ہوتا ہے کہ بے مہار قوم پرستی اور بین الاقوامی تعاون کے درمیان کا فرق ضروری نہیں کہ مختلف ریاستوں کی موجودہ حکومتوں کی نوعیت

پر منحصر ہو اس کا انحصار اس جذبے پر ہوتا ہے حکومتیں جن کے زیر اثر کام کرتی ہیں۔ ایسی آمرانہ خود مختار حکومتیں بھی ہیں جو دوسری حکومتوں کے سامنے بھی خود کو آزاد خیال اور انصاف پسند بنا کر پیش کرتی ہیں۔ اور ایسی جمہوریتیں بھی ہیں جو غیر ملکیوں کے لیے نفرت اور تلخ احساسات سے متاثر ہوتی ہیں۔

کچھ ریاستیں اس حالت میں ہوتی ہیں کہ ان کے لیے آمریت ہی ضروری ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آمریت کا انتظام اگر عالی ظرف ہاتھوں میں ہو تو ممکن ہے کہ وہ جمہوری طرز حکومت کے مقابلے میں زیادہ مستعد ہوں۔ مگر میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ آزاد عوام کے لیے آزاد حکومت ہی بہترین ہوتی ہے۔ یہ قدیم جملہ "Government of the people, by the people, for the people" صحیح آدرش پیش کرتا ہے۔ یہ عوام کے لیے بہترین حالت انکل بہترین ہوتی ہے۔ یہ انفرادی مرد اور عورت دونوں کے لیے بھی بہتر ہوتی ہے۔ اور چونکہ بعد میں قوم کا کردار اور اس کی خوش حالی کا انحصار ان افراد پر ہوتا ہے جن سے قوم بنتی ہے، اس قسم کی حکومت جو انفرادی ترقی میں معاون ہو عوام کے لیے بہترین ہوتی ہے۔

میں جس ملک سے آیا ہوں اس کا نظریہ یہی ہے۔ ہم آئینی ترقی کی طویل تاریخ رکھتے ہیں۔ ہمارے بہت سے تصورات پرانے ہیں، کچھ تو اس وقت سے چلے آ رہے ہیں جب ماریو بائی فاتحین نے انگلستان پر حملہ کیا تھا اور اس کو محکوم بنا لیا تھا۔ ان کے لائے ہوئے کچھ تصورات اب بھی باقی ہیں، اور پھر بہت سے خود ملک والوں نے دیے تھے۔ ہم نے غیر ملکی ذرائع سے اور باہر سے آنے والے مہاجرین سے بھی بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ تمام غیر ملکی مہاجرین کو باہر رکھنے کا تصور اقتصادی ضرورت ہو سکتا ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک نفسیاتی خرابی ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں جمہوری اصول اُتھائی اہم ہوتا ہے جتنا کہ قومی معاملات میں۔

تو بس یہی کچھ ہے ہم جس پر قائم ہیں، اور اسی وجہ سے ہم لیگ آف نیشنز کی حمایت کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس اصول میں ہمیں آپ کے ڈاکٹر نیپسن جیسے عظیم انسان کی عملی مدد ملی تھی، اور ہم یقین ہے کہ یہ بے کار نہیں۔ اس دوڑ کے انتظار میں ہیں جس میں وہ آزادی اور ترقی کی مشعل کو روشن رکھنے کے لیے شامل ہوئے تھے۔

کہ بالآخر ہمارے تصورات کامیاب ہوں گے، مجھے اس میں کوئی شک نہیں۔ نہ ہی اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ امن سے محبت کرنے والے عوام کی مشترکہ کوشش سے اب ان کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے، قبل اس کے کہ یورپ ایک بار پھر خون میں نہا جائے۔

قبل اس کے کہ بہت دیر ہو جائے، خدا کرے کہ دنیا کے مدبرین کو احساس ہو جائے کہ ضروری بہت اور عاقبت اندیشی سے اس عظیم ادارے کو ایک بار پھر مقتدر حیثیت میں بحال کر دیا جانا ضروری ہے، جس پر وہ چند برس پہلے فائز تھا، جس پر امن کا قیام، اس کا استحکام اور ہمارے تمدن کے مستقبل کا انحصار ہے۔ بلاشبہ، اس سے میری مراد لیگ آف نیشنز ہی ہے۔

کارلوس ساویدرا لاماس اعلان تجلیل

1936 کا نوبیل امن انعام جناب کارلوس ساویدرا لاماس، جمہوریہ ارجنٹائن کے وزیر خارجہ کو دیا جا رہا ہے۔ اس طرح یہ انعام ایک مدبر کو دیا گیا ہے۔

کسی مدبر کے پیشے اور اس کی کامیابی کو ہمیشہ اس کے عہد اور وقت کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے، اور گہرائی میں جا کر ایسا کرنا نوبیل کمیٹی کی صواب دید پر ہوتا ہے جب وہ کسی مدبر کی امن کے مقصد کے لیے ذاتی کارکردگی کا اندازہ لگا رہی ہو۔ لہذا اس عہد کے بارے میں چند الفاظ کہنا، جس میں ساویدرا لاماس نے کام کیا ہے بے محل نہیں ہوگا۔

ساویدرا کا ملک، ارجنٹائن، لاطینی امریکا میں ایک رہنما حیثیت کا مالک ہے، دنیا کا وہ حصہ ہے، جس کی خصوصیات اہم معاملات میں اس کو دنیا کے یورپی حصے سے ممیز کرتی ہیں، ہم جس میں رہ رہے ہیں۔ لاطینی امریکا کے بیشتر حصے میں عام طور پر بولی جانے والی زبان ہسپانوی ہے، اور عمومی طور پر ان سب کا مذہب رومن کیتھولک ہے۔ لاطینی امریکا کی قومیں سیاسی بندھن میں بھی بندھی ہوئی ہیں، اس لیے کہ ایک عرصے سے تمام میں قومی جمہوری طرز حکومت سے لطف اندوز ہو رہی ہیں، اور اس طرح بنیادی طور پر وہ عالمی جنگ سے پہلے کے یورپ سے مختلف ہیں۔

لہذا لاطینی امریکا ایسے بہت سے مسائل سے آزاد ہے جو یہاں ہمیں گھیرے ہوئے ہیں۔ نہ ان کو قوم پرستی کا عارضہ ہے، نہ ہی وہاں قدیم مقامی لوگوں سے نسلی تنازعات ہیں۔ ان کی عدم موجودگی زیادہ تر کیتھولک مبلغین کے رسوخ اور ان کے مثالی کردار کی وجہ سے ہے جنہوں نے نام نہاد ”وحشی“ لوگوں سے مفاہمت کے جذبے کے تحت تعلقات استوار کیے تھے۔

بالآخر یہ کسی طرح بھی کم اہمیت کا حامل نہیں کہ یورپ کی طرح لاطینی امریکا کثیر آبادی کے بوجھ تلے دب

ہوا نہیں ہے، اس لیے کہ اس نئی دنیا میں جنگ کی نہیں ہے۔ نئی لینڈ سمیت ہمارا اپنا ملک بھی یورپ میں سب سے کم آباد علاقہ ہے۔ جنوبی امریکا کے دس ممالک میں سے صرف ایک ملک، یوروگوئے (Uruguay) میں ماروے اور نئی لینڈ سے نیا وہ گنجان آبادی ہے، جب کہ یوروگوئے کی بھی آبادی سوئڈن سے کم گنجان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنوبی امریکا میں سرحدی تنازعات کبھی اتنے چٹکے نہیں ہوئے جیسے کی یورپ میں ہوتے ہیں۔ دراصل، دنیا کا کوئی اور حصہ سرحدی تنازعات میں ایسے دوستانہ بندوبست کی کمی ترقی نہیں کر سکتا جو اکثر و بیشتر ترقی سے حل کیے جاتے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ انیسویں صدی کے دوران، لاطینی امریکا ترقی کا گہوارہ رہا بن گیا تھا۔

ہسپانوی غلبے سے آزادی کی جدوجہد میں لاطینی امریکی ریاستوں کو شمال کی اپنی بڑی جمہوری بہن ریاست ہائے متحدہ کی حمایت حاصل تھی۔ 1830 میں صدر منرو (Monroe) نے اپنا مشہور بیان جاری کیا تھا کہ ریاستہائے متحدہ امریکی علاقے کے کسی حصے کو یورپی نوآبادی بنانے کی اجازت نہیں دے گی۔ اس بیان کا احترام کیا گیا اور اس طرح امریکا اس خطہ کی سے بچ گیا جو فریقا میں ہو چکی تھی، اور کسی حد تک ایشیا میں بھی؛ بعد میں دونوں [براعظم] یورپی طاقتوں کے درمیان شہنشاہی جدوجہد کا نشانہ بن گئے۔

جلد ہی ایک اتفاق، یا کم از کم امریکی جمہوریتوں کے درمیان منظم تعاون، کا تصور ابھرا۔ آزادی کا جمہوریتیں سیمان بولیوار (Simón Bolívar) اس خیال کا سرگرم حمایتی تھا، اور تا رنج کے اوراق میں ایسی تنظیم بنانے کی بہت سی تجاویز اور کوششوں کی اسناد موجود ہیں۔ بالآخر، 1889 میں، ان میں سے ایک کی شکل ابھرنی شروع ہو گئی تھی، جب ریاست ہائے متحدہ کے سیکریٹری آف اسٹیٹ جیمز بلین (James G. Blaine) نے واشنگٹن میں ایک کل امریکی اتحاد کانفرنس بلائی، جو اس سلسلے کی پہلی کانفرنس تھی، بعد میں جس کے کئی اجلاس منعقد ہوئے تھے۔ پچھلے بقیے کارلوس ساویدرا لاماس کی صدارت میں ارجنٹائن کے دارالحکومت میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، کانفرنسوں کی ایک تنظیم بن گئی ہے جس کی بہت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کل امریکی اتحاد کے دفاتر واشنگٹن میں قائم ہیں۔ اس نے امریکی ریاستوں کے مابین باہمی تعاون کے کئی سوالات کا مطالعہ کیا ہے؛ جن میں عوامی صحت، دانش ورانہ اثاثے سے متعلق قوانین اور اخلاعات شامل ہیں۔ اور کل امریکی ریلوے کا قیام بھی، جو جنوب سے شمال تک تمام ریاستوں کو آپس میں ملانے گی۔ اس اتحاد نے امن سے متعلق قوانین میں بھی دلچسپی لی ہے، مثال کے طور پر بین الاقوامی اتفاق کی ترقی اور ترقی میں۔

باہمی اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کی ابتدا ہی میں اتحاد کو ایک مشکل مسئلہ درپیش ہوا: یعنی شمال کی طاقت ور جمہوریت اور لاطینی امریکی ریاستوں کے درمیان تعلقات۔ لاطینی جمہوریتوں کو شبہ پیدا ہو گیا کہ کل امریکی اتحاد دراصل واشنگٹن کے مدمدین کے استعماری میلانات کے لیے محض ایک آسان بہانے جیسا ہے۔ اتحاد کا مقصد بلین خود شمالی امریکی استعماریت کے ہر اول دستے میں شامل تھا، ایک پالیسی کے تحت بعد میں جس

پر ایک مخصوص طاقت کے ساتھ کیریبین میں عمل کیا گیا۔ اس شمالی امریکی استعماریت کے سب سے مشہور فرماندے جیمز ڈو روز ویلٹ نے منرو کے 1823 کے اعلان کو ریاست ہائے متحدہ کو دیے جانے والے ایک حق کی صورت میں دیکھا، جس کے ذریعے وہ یقینی بنائے گی کہ مغربی نصف کرۂ ارض میں واقع تمام ریاستیں باقاعدہ نظام حکومت قائم کریں گی، جو اپنے ملکوں میں شمالی امریکی تاجروں کے اقتصادی کاروبار اور مالیاتی سرمایہ کاری کو تحفظ فراہم کریں گی۔

اس تشریح کی لاطینی امریکی ریاستوں میں سخت مخالفت ہوئی اور سراوید مالاماس کے وطن ارجنٹائن نے، جو لاطینی امریکا کی طاقت ور اور منظم ریاستوں میں سے ایک تھی، اس مداخلت کے خلاف جنگ کی رہنمائی کی۔ اس پس منظر میں ہمیں سراوید مالاماس کے کام پر نظر ڈالنی ہوگی۔

انہوں نے اپنی معاشی زندگی یوپی ورٹی پر وئیسر کی حیثیت میں شروع کی، اور یوپی ورٹی ہی سے وہ سیاست میں داخل ہو گئے۔ فرانسیسی زبان میں اپنے سب سے اہم علمی کام 'La Crise de la codification et la doctrine argentine de droit international' پالیسی پر شدید حملہ کیا، بالخصوص اس کی نوعیت کے خلاف جو ان کی رائے میں ریاست ہائے متحدہ نے خود تخلیق کی ہے، اور اس پر عمل شروع کر دیا ہے۔ حالیہ برسوں میں ریاست ہائے متحدہ کی پالیسیوں میں ہونے والی تبدیلیاں، پہلے جنہیں بڑے نرم انداز میں صدر ہاروڈ نے متعارف کرایا تھا، اب فرانکس روز ویلٹ ان کا کھٹے بندوں اور توازن سے تعاقب کر رہے ہیں۔ سراوید مالاماس کے لیے بہت اطمینان کا باعث بول گئی۔ یہ تبدیلیاں گلی امریکی اتحاد میں ان کو ایک زیادہ عملی کام کی طرف لے گئی ہیں جس پر اب امریکی استحصال کا بہروپ ہونے کا صرف شبہ ہی نہیں رہ گیا ہے۔

میں سراوید مالاماس کے علمی کام سے ہی چپکا نہیں رہوں گا، اس لیے کہ سیاست کے میدان میں بھی ان کا کام زیادہ قابل قدر رہا ہے۔ وہ نو عمری ہی میں سیاست میں داخل ہو گئے تھے۔ مشکل سے تیس برس کے رہے ہوں مگر جب انھیں پاریمان کی رکنیت کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا، اور 1917 تک وہ وزیر تعلیم و انصاف بن گئے تھے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، عالمی جنگ میں ارجنٹائن غیر جانبدار رہا تھا، زیادہ تر لاطینی امریکی ریاستوں کی طرح اس نے بھی تنازعے میں ریاست ہائے متحدہ کی پیروی نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود اس کو یورپ، ایشیا اور امریکا کے بارہ غیر جانبدار ممالک سمیت لیگ آف نیشنز میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی، اور ارجنٹائن کو 1930 میں بننے والی پہلی اسمبلی میں اعلیٰ درجے کی امتیازی حیثیت دی گئی تھی۔ ارجنٹائن کے مندوین نے درخواست کی کہ لیگ کے عہد نامے میں تبدیلی کی جائے جس کی رو سے کسی بھی ریاست کو بغیر جنگی درخواست اور رائے شماری کے لیگ میں داخلے کا حق ہونا چاہیے۔ جب یہ تجویز فوراً منظور نہیں ہوئی اور کسی طرف سے اس کی حمایت بھی نہیں ہوئی تو ارجنٹائن نے اسمبلی سے علاقائی اختلافی رکنی اور کئی برس تک اس کی نشست خالی رہی۔

اس کے باوجود International Labor Conference میں ارجنٹائن اپنے نمائندے بھیجتا رہا اور 1928 میں ہم نے براؤڈرالا ماس کو نہ صرف اس کے وفد کی رہنمائی کرتے دیکھا بلکہ ان کو کانفرنس کا صدر بھی منتخب کر لیا گیا۔ اس حیثیت میں ان کو جنیوا کے اداروں کا تفصیل سے مطالعہ کرنے کی ضرورت پیش آئی، اور اس طرح انھوں نے بین الاقوامی امن کی سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے کی تیاری شروع کی جو ارجنٹائن کے وزیر خارجہ بننے کے بعد ان کے کام آئی، جس عہدے پر وہ آج بھی فائز ہیں۔

وزارت کے عہدے پر ان کی تعیناتی کے چند ماہ کے اندر ہی ارجنٹائن کے ہمسایہ ملکوں، یولیویا اور پیراگوئے کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ نے تو امر سے ان کو اپنی طرف متوجہ کیے رکھا۔ وہ بین الاقوامی قانون کے عالم تھے، براؤڈرالا ماس تجربے کی بنا پر وہ موجودہ اداروں، لیگ آف نیشنز اور لیگ امریکی اتحاد سے اچھی طرح واقف تھے، اور وہ جنگ اور امن کے متعلق سوالات پر ریاست ہائے متحدہ کے مخصوص موقف سے بھی مانوس تھے۔ اس لیے انھوں نے ان تینوں عناصر کو آپس میں مربوط رکھنے کے پوری کوشش جاری رکھی تھی۔

منطقی انداز میں سوچنے والے ”لاٹینی“ کی طرح، جو خود وہ ہیں بھی، انھوں نے اپنے خیالات کا اصولی اظہار شروع کیا، اور اپنی وزارت خارجہ کے پہلے برس جنگ مخالف معاہدے کے لیے کام جاری رکھا۔ ان کے [تحریر کردہ] پہلے دو مضامین، معمولی تراش خراش کے ساتھ، بین الاقوامی قانون کے ان ہی اصولوں کا اظہار کرتے ہیں ریاست ہائے متحدہ جن کی توثیق حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے؛ پہلا، جس میں ہر قسم کی جارحانہ جنگ کی ملامت کی گئی ہے۔ جو کیلاگ-بریڈن (Kellogg-Briand) معاہدہ کا مرکزی نقطہ ہے؛ اور دوسرا، جس میں علاقائی توسیع یا سرحدی تبدیلی کی توثیق کا انکار کیا گیا ہے اگر وہ پُر امن طریقوں سے نہ کیے گئے ہوں۔ نام نہاد ”آئینہ نظریہ“ کے مطابق، جو صدر ہارڈ اور سیکریٹری آف اسٹیٹ ہنری اسٹیمسن نے 1932 کے منچوریائی تنازعے کے دوران بنا کر پیش کیا تھا، اور بعد میں لیگ آف نیشنز کی اسمبلی نے، اسی تنازعے کے نتیجے میں، اسے اپنے ایک خاص اجلاس میں منظور کر لیا تھا۔

اس طرح ساویدرا لاماس اپنے معاہدے کے لیے ریاست ہائے متحدہ کی اصول حمایت کے متلاشی رہے تھے۔

کیلاگ معاہدہ اور آئینہ نظریہ دونوں مراد، یعنی، خالص اصولی نوعیت کے اعلانات ہیں۔ براؤڈرالا ماس کا جنگ مخالف معاہدہ اس سے چند قدم آگے جاتا ہے؛ اس کی دفعہ 3 مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ریاستیں جو کسی تنازعے میں ملوث نہیں ہیں، جس میں ایک سے زیادہ ریاستیں، دفعات 1 اور 2 میں مقررہ کی گئی ذمے داریوں پر ایک مشترکہ رویہ اختیار کرنے کی خاطر بین الاقوامی قانون کے مطابق، سیاسی، قانونی اور اقتصادی پابندی عائد کرنے سے روگردانی کرتی ہیں تا کہ تنازعہ ختم ہو جائے، تو وہ عوامی رائے سے رجوع کر سکیں گی، مگر کسی بھی صورت میں جارحیت نہیں کریں گی، خواہ وہ سفارتی ہو یا مسلح، سوائے ان یقین دہانیوں کے جو

دوسرے معاہدوں کے مطابق ان پر لاگو ہوتی ہیں۔

لہذا، جنگ مخالف معاہدہ کیلگ معاہدے اور انٹرنیشنل نظریے کے نظام کے درمیان کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اعلان کرتا ہے کہ ان اصولوں کو لاگو کیا جاسکتا ہے جو لیگ آف نیشنز میں بنائے گئے اصولوں سے زیادہ سخت ہوں۔ لہذا یہ معاہدہ دونوں میں سے کسی نظام کو رد نہیں کرتا، بلکہ ان قوموں کے درمیان شراکت کا راستہ ہموار کرتا ہے جو اس وقت تک پہلے نظام کو اختیار کرنے کو فوقیت دیتی رہی ہیں۔ بالخصوص ریاست ہائے متحدہ۔ اور وہ ریاستیں جو دوسرے طریقے کو پسند کرتی رہی ہیں۔ یعنی لیگ آف نیشنز کی رکن ریاستیں۔

اپنے معاہدے کی قبولیت کو یقینی بنانے کی ان کی اپنی کوششوں نے ثابت کر دیا ہے کہ سواویڈرالا ماس ایک ہوشیار اور دور بین سفارت کار ہیں۔ انہوں نے ایک مذہبی تقریب میں، جسے انہوں نے 10 اکتوبر 1933 کو نہایت جالانگی سے ریو ڈی جینیرو (Rio de Janeiro) منعقد کرایا تھا، پہلے چھ لاطینی امریکی ریاستوں کے دستخط حاصل کر لیے۔ اس اقدام کے ذریعے انہوں نے برازیل کی طاقت و حمایت حاصل کر لی تھی، جو جنوبی امریکی ریاستوں میں سب سے بڑی ہے، جس نے اس برس قبل لیگ آف نیشنز سے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ دو ماہ بعد سواویڈرالا ماس نے Montevideo میں منعقد ہونے والی کل امریکی ریاستوں کی کانفرنس کے ایک خاص اجلاس میں اپنے معاہدے کی منظوری حاصل کر لی۔ اس کانفرنس میں جسے ریاست ہائے متحدہ نے امریکی براعظم کی چھ بہن ریاستوں کے لیے منعقد کرایا تھا، اس کے اپنے سیکریٹری آف اسٹیٹ کارڈیل ہل نی پالیسی کے ضمانت دار کی حیثیت میں موجود تھے۔

اس سال، یعنی 1933 میں، سواویڈرالا ماس لیگ آف نیشنز کے لیے اپنی حکومت کا رویہ تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے، اور جنٹانن نے تیرہ برس قبل جس سے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس طرح وہ جنیوا میں لیگ کی سیکریٹریٹ کو مطلع کرنے کے قابل ہو گئے تھے کہ اب اور جنٹانن لیگ آف نیشنز کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا خواہش مند ہے۔ اور جیسا کہ سب جانتے ہیں، چونکہ [Matthew 18:12-13 کے مطابق] آسمانوں میں ننانوے گناہگاروں میں سے جن میں توبہ کرنے کی ضرورت ہے، ایک گناہگار کی توبہ پر زیادہ خوشی منائی گئی تھی، اور جنٹانن کو بھی اس کی توبہ کا انعام مل گیا۔ اس کو فوراً لیگ کی کانفرنس میں شمولیت کے لیے منتخب کر لیا گیا، جہاں تین برس تک اس کی مخصوص نشست رہی، جو پچھلے ستمبر میں شروع ہونے والے اجلاس میں ختم ہوئی ہے۔

یہ جنگ مخالف معاہدہ جنوری 1934 میں لیگ آف نیشنز کانفرنس میں باقاعدہ پیش کیا گیا اور اس کو اتنی پذیرائی ملی کہ اس کے تحریر کرنے والے کو یقینی طور پر بہت خوشی ہوئی ہوگی۔ اس معاہدے پر، ماروے سمیت، امریکا سے باہر کی گیارہ ریاستوں نے بھی دستخط کر دیے ہیں، اور اب تک ان میں سے پانچ نے اس کی توثیق بھی کر دی ہے۔

ہم بہت آسانی سے قیاس کر سکتے ہیں کہ سواویڈرالا ماس اپنے اس معاہدے کو لیگ آف نیشنز کے

عہد نامے کی توسیع گردانتے ہیں گے، اور بنیادی طور پر جو امن کی ترغیب دینے اور جنگ سے دور رکھنے کے لیے، لیگ سے باہر ملکوں کو لیگ کے عہد نامے میں بیان کیے گئے مطالبات سے کم سخت مطالبے کے نفاذ کے ذریعے لیگ میں لے آئے گا۔

اس حقیقت میں ہمارے پاس ان کے رویے کا ثبوت موجود ہے کہ انھوں نے پچھلے تمبر میں اپنے معاہدے کو اسمبلی کے بنائے ہوئے کمیشن کے سامنے پیش کیا تھا تا کہ عہد نامے کے اصولوں کو نافذ کرنے کے لیے بہتر طریقے تلاش کرنے کے لیے چھان بین کی جائے۔ یہاں ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا ساویدرا لاماس کا معاہدہ اس بڑے مسئلے کے حل میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے۔ یہ معاہدہ اسی وقت نافذ العمل ہو سکتا ہے جب کوئی جنگ شروع ہو جائے اور جنگ کو روکنے میں سب سے اہم امن مسئلہ ہوتا ہے مداخلت کے ذریعے امن قائم کرنے کے طریقے تلاش کرنے کا قبل اس کے کہ جنگ طوفان کی طرح آپڑے۔

جب 18 جنوری 1934 کو لیگ کی کانفرنس میں ارجنٹائن کا جنگ مخالف معاہدہ پیش کیا گیا تو برطانوی وزیر خارجہ سرجان سائمن (John Simon) نے اس موقع پر یہ نکتہ اٹھایا کہ کیا یہ معاہدہ اب خصوصی دلچسپی کا باعث ہو گیا ہے، اس لیے کہ کانفرنس کو اسی اجلاس میں ”دنیا کے اس علاقے میں جہاں زیادہ تر دستخط کرنے والی طاقتیں رقی ہیں“ ایک مشکل تھارے کا سامنا ہے۔

اس مرحلے پر یہ واضح کرنا کچھ ضروری نہیں کی ساویدرا لاماس کو اس حقیقت کا علم تھا۔ پیراگوئے، اگرچہ ان پہلی ریاستوں میں سے تھا جنہوں نے معاہدے پر دستخط کیے تھے، مگر کچھ نے اس کی توثیق نہیں کی، اور بولیویا نے کم جولائی 1935 سے قبل اس کی توثیق نہیں کی تھی۔ لہذا، جنگ میں ملوث دو ریاستوں کے معاملے میں معاہدے کو نافذ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہیں موقع کا انتظار کرنا تھا۔ مگر مئی 1935 میں انھوں نے معاہدے کے مطابق طریقہ عمل اختیار کیا اور برازیل، چلی اور پیرو کے سفارت کاروں سے دیوئس آئرس میں ملاقاتیں کیں اور عام نوعیت کا مصالحتہ کام شروع کر دیا۔ ایک ثالثی کمیشن قائم کیا گیا، جس میں نمائندے شامل کیے گئے تھے ارجنٹائن سے، اور تین دوسرے ملکوں سے، جن سے پہلے ہی رابطہ کیا جا چکا تھا، اور ریاست ہائے متحدہ اور یورگوئے سے، اور اس کمیشن کے صدر خود ساویدرا لاماس تھے؛ بولیویا اور پیرو کوئے کے وزرائے خارجہ کو کمیشن کے مذاکرات میں شامل کرنے لیے راغب کیا گیا، اور بارہویں جون 1935 کو دو سیاسی بیانات پر دستخط کیے گئے جن سے جارحیت کا خاتمہ ہو گیا۔ پورا کام اس وقت ختم ہوا جب بعد میں دونوں شریک جنگ ملکوں نے حتمی بندوبست کو قبول کر لیا جس میں شرط رکھی گئی تھی کہ امن کے معاہدے کے نفاذ میں اختلاف کا فیصلہ لیگ کی عالمی عدالت انصاف کرے گی۔

اس امر کو یاد رکھا جانا چاہیے کہ ساویدرا لاماس کے جنگ مخالف معاہدے کے بین الاقوامی اصولوں کا عملی امتحان جنوبی امریکا کی زمین پر اور خود ان کی قیادت میں ہوا تھا۔

وزیر خارجہ اور ارجنٹائن وفد کے قائد کی حیثیت میں سراویدرالا ماس نے لیگ آف نیشنز کی حالیہ اسمبلی میں شرکت کی تھی۔ امن کے لیے ان کے کام کے اعتراف میں اسمبلی نے انھیں اپنا صدر منتخب کر لیا۔ اپنے الٹاچی خطاب میں انھوں نے اس حقیقت کی طرف اشارے کیے تھے کہ چھ امریکی ریاستیں، جن کے درمیان مصالحت پر انھوں نے توجہ دی تھی، جنوبی امریکا میں جنگ کو ختم کرنے کے لیے مذاکرات میں کامیاب ہو گئی تھیں اور یہ بھی کہ ان چھ میں سے دو ریاستیں، ریاست ہائے متحدہ اور برازیل، لیگ آف نیشنز کی رکن نہیں ہیں۔ انھوں نے مزید کہا تھا، ”اس بات کا امکان موجود ہے کہ کسی ٹھوس معاملے میں جیسے ٹائی کی ضرورت ہو، ہماری لیگ سے باہر کی قوموں کا تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میں اسے امن کی سفارت کاری میں ایک معنی خیز نشان راہ کی مانند دیکھ رہا ہوں۔ ہمیں اس کو ایک جداگانہ یا غیر معمولی واقعہ نہیں بلکہ وہ کچھ سمجھنا چاہیے جو ایک دن اصول کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔“

اس قسم کا بیان دیتے ہوئے، سراویدرالا ماس نے مستقبل کے لیے ایک مہم کا تعین کر دیا ہے۔ وہ ابھی [سیاسی] زندگی کے آغاز ہی میں ہیں۔ سیاست میں ان کی حالیہ کامیابیاں ہمیں اس امید کا مستحق بناتی ہیں کہ ان کی غیر معمولی قوت اور مقصد کی وحدت ان کو اس قابل بنائے گی کہ وہ قوموں کے درمیان صحیح معنوں میں دیر پا امن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

مارویائی نوبل کمیٹی کے رکن Christian Lous Lange کی زبانی

ریڈیائی خطاب

(کارلوس سراویدرالا ماس 10 نومبر کو اوسلو میں منعقد ہونے والی تقریبِ تعجیل میں شریک نہیں ہو سکے تھے اس لیے کہ اس وقت وہ نیٹس آمزس میں ہونے والی Inter-American Conference for the Maintenance of Peace میں صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جب 25 نومبر کو سراویدرالا ماس کے لیے، جو پہلے جنوبی امریکی تھے، نوبل امن انعام دیے جانے کا بیڈس آمزس میں اعلان ہوا تھا، تو اس خبر کو ہسپانوی خانہ جنگی اور صدر روزویلٹ کی کانفرنس میں شرکت کی خبروں پر سبقت دی گئی تھی۔ ریاست ہائے متحدہ کے قومی نشری ادارے نے سراویدرالا ماس کو ریاست ہائے متحدہ کے عوام کے لیے انعام کے مقصد پر ریڈیائی پیغام دینے کی دعوت دی تھی۔ 29 نومبر کی شام نیٹس آمزس سے انھوں نے ایک مختصر پیغام دیا تھا جو NBC کے نشریاتی رابطے کے ذریعے پوری ریاست ہائے متحدہ میں نشر کیا گیا تھا۔ ہسپانوی زبان میں کی جانے والے ان کی تقریر کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ کل امریکی اتحاد و اشغلیں ڈی سی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر (L S Rowe) نے پیش کیا تھا۔ چوں کہ اپنی خصوصیت میں یہ پیغام تقریرِ قبولیت جیسا ہے اور چوں کہ سراویدرالا ماس نوبل خطبہ نہیں دے سکے تھے اس لیے پیغام کا متن پیش کیا جا رہا ہے۔ اس پیغام کا متن ہو

ہو رہی ہے جو نیویارک ٹائمز نے 30 نومبر کو شائع کیا تھا۔

”میں نوٹیل امن کے لیے نامزد کیے جانے کو اپنے لیے ایک بڑا اعزاز محسوس کر رہا ہوں۔ اس امتیاز کے لیے میں کوئی ذاتی توجہ پیش نہیں کروں گا، بلکہ اس کو اپنے ملک کی اعلیٰ معیار کی خارجہ پالیسی سے ہی منسوب کروں گا۔“

یہ سچ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ سیاسی میدان میں ہاتھ بٹانے میں صرف کیا ہے اور اس آدرش کے حصول کے لیے، اور ایک امریکی باشندے کی حیثیت میں، جس نے امن کی ترقی کے لیے ہونے والی پانچ کانفرنسیوں کی صدارت کی ہے، میری خواہش ہے کہ میں اس کو اس نبرا عظیم کی قوموں کی تمناؤں کی تشریح سمجھوں۔ امریکا امن کی دنیا ہے اور اس کو جتنی طور پر اس کے نتائج کا نبرا عظیم بنایا جانا چاہیے۔

اس اعلیٰ ترین مقصد کی کامیابی کو کسی طرح بھی تنگ نظری اور انسانیت کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے، اس لیے کہ اس کائنات میں، ہم جس میں جی رہے ہیں، ہم ایسے باہمی انحصار کے ذریعے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں، دنیا کی زندگی پر امن حیثیت انگل جس کا شدید رد عمل ہوتا ہے۔

امن محض وزارت خارجہ کی معنوی کوششوں کے ذریعے ہی حاصل نہیں کیا جاسکتا، اگر وہ سیاسی میدان میں اپنے مقاصد کو، وہ عارضی ہوں یا حادثاتی، مفادات کی مطابقت تک ہی محدود رکھے۔

اس مقصد کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اقتصادی اور سماجی ضابطوں کو بھی ذہن میں رکھا جائے۔ یہ ایک کار لا حاصل نہیں تھا جب معاشی و سیاسی نے یہ اصول تجویز کیا تھا کہ سماجی امن کو زیادہ بڑے سماجی انصاف کی بنیاد پر قائم کیا جانا چاہیے۔ اور وہ مقابلہ، جسے اکثر بھلا دیا جاتا ہے، ہمیں مجبور کرے کہ ہم ہمیشہ اجتماعی انسانیت کو زیادہ تحفظ، زیادہ سکون اور زیادہ معاش فراہم کرنے کو چاہیے بنائیں۔

بے روزگاری ایک بڑا المیہ ہوتی ہے۔ وہ آدمی جو ناامیدی کے عالم میں کام تلاش کرتا پھرے تا کہ وہ اپنے بچوں کو وہ وقت کی روٹی مہیا کر سکے، تمدن کی سرزنش کے لیے ایک زندہ مثال ہوتا ہے۔ اقتصادی حالات، پھر بھی، حقائق ہی سے ابھرتے ہیں، اور لین دین میں خلل، قومی خود غرضی، رکاوٹیں اور مزاحمتیں جو انسان اپنی کورچشمی کے باعث بین الاقوامی تجارت کے راستوں میں پیدا کرتا ہے، فطرت کے خلاف ہوتی ہیں، جو یہ جانتے ہوئے کہ دولت کی نامعاری تقسیم اور اس کی علاقائی تقسیم میں تفریق ہوتی ہے، پیداوار کے لین دین کا ذریعہ قائم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

ایسی بے ترتیبی ہی بنیادی وجہ ہوتی ہے بغاوت کی، احتجاج کی اور تحریکی کارروائیوں کی۔ اس کا قلع قمع کرنے کا مطلب ہوگا ان نیتوں کا اخراج جو شدت کی حد تک اداروں کی بے قاعدگی اور ناہمواری کی وجہ ہوتے ہیں، جن کا مقصد ہوتا ہے مزاحمت کی نمائندگی اور ان کا احاطہ کرنا؛ یعنی، عوام کو اپنے مقصد کو کنٹرول کرنے کا ناقابل انتہال حق دینا، یا اس کے برعکس ان کو بازاری قیادت، اشتراکیت یا لاقانونیت میں تباہ ہو

جانے کے لیے چھوڑ دینا۔

دنیا امن کے لیے بے چین ہے، اس کو [امن کی] ویسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ مٹی کو بارش کی، تاکہ اس میں سے ایک بار پھر نئی زندگی طلوع ہو اور آدمی کو گھر کا پڑوسرت لطف ملے اور وہ محنت کے راستے پر سکون سے آگے بڑھے۔

ہم ایک بڑی جنگ کے مابعد حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔ تمدن صدیوں کی کوشش سے جس پارچے کو بن رہا ہے، وہ اگر ایک بار بکھر گیا، تو اس کی دوبارہ بہت مشکل ہوگی۔ اس کے ٹوڑے ہوئے جالے کے نیچے وہ مقامی برہمیت ہے، وہ بے مثال نظم ہے جو قدیم ترین تمدن کے مراکز کی اقتداء کیرانیوں سے ابھرتا ہے جس میں وہ تہذیب کے نشے میں گر چکے ہیں اور ان کا خوب صورت ترین وجود تباہ ہو چکا ہے۔

جاریت کی جنگ، وہ جنگ ہوتی ہے جو اگر کسی کے ملک کے مقدس دفاع کے لیے نہ ہو تو ایک اجتماعی جرم ہے۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ مفلس اور منکسر عوام کے انہود پر بیت جاتی ہے اس میں شجاعت، یا ہیرو ازم جیسی بھڑک دار کوئی بات نہیں ہوتی جس پر ٹھنڈ کیا جاسکے۔ جنگ باہمی قومی مفادات کے بارے میں کم علمی پر دلالت کرتی ہے؛ اس کا مطلب ہوتا ہے تہذیب کی بیخ کنی، بلکہ اس کی مکمل تباہی۔ یہ بہت کا فضول اور غلط اطلاق ہوتا ہے؛ اس خاموش بہت کا مخالف عکس ہوتا ہے جو دوسروں کے وجود کو ہمارے اس ناپائیدار موقع پر بھربانے کی کوشش کو ظاہر کرتا ہے۔

کارل فان آزیٹسکی

اعلان تجلیل

کارل فان آزیٹسکی، جنہیں 1935 کا نوبل انعام دیا گیا ہے کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ اشتراکی نہیں، نہ وہ کسی بھی انداز میں قدامت پسند ہیں۔ دراصل کوئی ان سے کسی قسم کی سیاسی وابستگی منسوب نہیں کر سکتا۔ اگر مجھے ان کی شخصیت کے بارے میں اپنا ذاتی تاثر دینے کے لیے کہا جائے تو میں یہی کہوں گا کہ وہ ایک روشن خیال شخص ہیں، یا اگر آپ بہتر سمجھیں تو انہیں پرانے دبستان کا روشن خیال کہہ لیں۔ اس قسم کے تعارف سے میری مراد اقتضائی روشن خیالی نہیں، بلکہ ایک بالکل مختلف قسم کی روشن خیالی ہے، محبت کی ایک فروزاں مشعل آزادی خیال و انگھارا ہر قسم کے روحانی میدانوں میں آزاد مسابقت پر ایک محکم یقین کی، ایک وسیع بین الاقوامی منظر کشی کی، دوسری قوموں کی اقدار کا احترام کرنے کی اور ان سب پر محیط ہے امن کا موضوع۔

آزیٹسکی کی زندگی پر محاکمہ تو سہ اخبار میں پایا جاتا ہے، اور میں غیر ضروری تکرار سے آپ کو آگاہ دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

انہوں نے [پہلی عالمی] جنگ میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ مگر جنگ نے ان کے امن پسند خیالات کو پختہ اور پلوں میں بنا دیا، جس پر انہوں نے ایک عرصے تک فخر کیا تھا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی انہوں نے خود کو امن کے کام کے لیے وقف کر دیا۔ جرمنی میں وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے وہ تحریک چلائی تھی جس نے ”آب جنگ نہیں ہوگی“ کا نعرہ اٹھایا گیا تھا۔ وہ جرمن امن سوسائٹی کے سیکریٹری بن گئے، جس کے صدر ڈاکٹر ہندے (Quidde) تھے جنہیں خود بھی بعد میں نوبل انعام سے نوازا گیا ہے۔ [مگر] دوسری کام آزیٹسکی کو مطمئن نہیں کر سکا۔ انہیں ان کی اصل، کارِ صحافت میں دکھائی دیا۔ اور اس طرح، سیکریٹری کا عہدہ چھوڑ کر وہ اپنی لیاقت و صلاحیت کو عوامی پلیٹ فارم پر اور اخبار و جرائد کے میدانوں میں لے

گئے۔

بمیں بتایا گیا ہے کہ وہ بڑے پائے کے خطیب ہیں، مگر جس کردار میں انھیں بہ طور پر جانا جاتا ہے وہ ایک صحافی اور مضمون نگار کا ہے۔ وہ ایک مانے ہوئے ادیب ہیں، ان کا انداز تحریر لچک دار نہیں، اور اکثر کاٹ دار طنز کا ہوتا ہے۔ ان کا میدان وسیع ہے، جدید سیاست کے تمام پہلوؤں پر نکلتے ہیں، مگر ان کے خیالات کا اثر سب سے زیادہ امن کے مقاصد پر ہوتا ہے۔ ان کا مرغوب ہتھیار نیچہ ہے۔ اچانک وار کرنا، بجلی کی سی سرعت سے روکنا۔ یہی خصوصیات ان کے انداز تحریر کی پہچان ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے اندرون میں کوئی سوراخ چھپا ہوا ہے، جو لوگ ان سے واقف ہیں، ان کے نزدیک یہی ان کی خصوصیت ہے۔

اس کے باوجود ہم آج بھی ان کی لیاقت اور ماضی میں کبھی گئے ان کے مضامین کو پڑھنے سے صحافی کی حیثیت میں ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ایک صحافی کا کام بھی اسلج پر کام کرنے والے [اٹاکار] سے ملتا جلتا ہوتا ہے، کہ وہ بھی وقت موجود میں رہتا ہے، کہ اس [کے کام] کی دوبارہ تشکیل نہیں کی جاسکتی۔ ایک صحافی کے کام کا کُل جمع اُن ہند لائے ہوئے حروف میں نہیں رہتا جسے آپ، اگر اس کی زحمت گوارا کریں تو، تلاش کر کے پڑھ سکتے ہیں۔ ایک صحافی کے ہنر کا کُل جمع، اسلج فن کار کی طرح، اُن تاثرات میں ہوتا جو وہ دوسروں کے دماغوں پر چھوڑتا ہے۔ ایک چار فن کار ہمارے ذہنوں میں رہتا ہے، ہمارے گزرے دنوں کی شفاف یادداشتوں میں، روایات میں جو وہ اگلی نسلوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی صحافی کے معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ ہم ان واقعات کو، جن سے پہلے واقفیت تھی، پرانے اخبارات میں ڈھونڈ کر [دوبارہ] پڑھ سکتے ہیں، اور ان کے حروف اب بھی ذہن کے تھانڈ کو تازہ کر سکتے ہیں، اس قوت حیات اور اس حرارت سے، جو وقت کا گرداب اُن میں بھردیتا تھا۔ مگر زندگی کی چنگاری ٹم ہو جاتی ہے، اس لیے کہ الفاظ اپنے وقت کا مرہا یہ ہوتے ہیں۔

مگر توازن رکھتے ہوئے، ہمارے پاس اُن کی گواہی کی پوری طاقت ہوتی ہے جو لڑائی میں ان کی بیرونی کرتے ہیں اور جو اُن سے متاثر ہوئے تھے۔ ایسی گواہی کے ماتخذ اپنے متفرق ہوتے ہیں اور ان کے اعداد و شمار اپنے بڑے ہوتے ہیں کہ میں ان کو اس موقع پر تفصیل سے بیان نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی توجہ ایک قابل غور حقیقت کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں: ان سے پہلے نوٹیل انعام پانے والوں میں سے کم از کم چھ افراد نے اس انعام کے لیے آئرشسکی کی مازوگی کی حمایت کی ہے۔

مگر بہت سے لوگ پوچھ سکتے ہیں کہ واقعی آئرشسکی نے امن کے لیے کیا اتنا مایا کام کیا ہے؟ کیا امن کے جدوجہد کے پھٹکی کے بھلے وہ اس کی علامت نہیں ہیں؟

میری دانست میں ایسا نہیں ہے۔ مگر ایسا ہونا تب بھی، کتنی عظیم ہے اہمیت اس علامت کی ہماری زندگی میں! مذہب میں، سیاست میں، عوامی معاملات میں، جنگ میں اور امن میں، ہم علامتوں کے اطراف جمع ہو جاتے ہیں۔ ہمیں ان کے طاقت وراث کا اندازہ ہوتا ہے جو وہ ہم پر رکھتی ہیں۔ مزید یہ کہ اجتماع کی صورت

میں، شخصیت کے بچائے علامت قابل ترجیح ہوا کرتی ہے۔ آدمیوں کا اکثر یہ بیشتر ”ہلڈر“ (Hulder) سے
تقابل کیا جاسکتا ہے، وہ بد نہاد نہ زیادتی پر ہی، جو نہایت خوب صورت [دکھائی دیتی تھی] جب اس کو سامنے سے
دیکھا جاتا، مگر عجب سے بالکل کھوکھلی [ہوتی تھی] علامت میں ایسا نہیں ہوتا، اس لیے کہ علامت خیالات
سے پیدا ہوتی ہے اور کسی خیال کو [آگے] لے جانے والی ہوتی ہے۔ علامت اس خیال کے ذریعے وجود میں
رہتی ہے جو اسے پہلے خلق کرتا ہے اور پھر، بغیر کسی جگاڑ کے، ایمان داری سے اس کو منعکس کرتا ہے۔

ہماری نظموں میں ایک علامت کے بارے میں چند مصرعے ہیں جن کا بار بار حوالہ دیا جاتا ہے:

اس لیے بھی کہ وہ عظیم بہت؛

ساری چیزوں میں سب سے ارفع ہے؛

لاکھ لہرائے وہ علم اپنا

ایک دن آدمی کو مرنا ہے

علامت کی یقیناً اپنی ایک قیمت ہوتی ہے مگر آزیٹسکی صرف ایک علامت نہیں ہے۔ وہ بالکل ہی مختلف
شے ہے، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ ایک کردار ہے؛ اور وہ ایک آدمی ہے۔

میں وہ وجود تھا جن کی بنا پر آزیٹسکی کو نوبل امن انعام دیا گیا ہے، صرف ان ہی وجود پر سان کی
امیدواری کی اسی انداز میں جانچ کی گئی تھی جس طرح کہ اوروں کی ہوتی ہے، اور ان ہی اصولوں کے مطابق
فیصلہ کیا گیا ہے۔ اگر ہم پیچھے پلٹ کر تمام عربوں اور عورتوں پر نظر ڈالتے ہیں، جنہیں پچھلے برسوں میں امن
انعام دیے گئے ہیں، تو ہمیں مختلف خیالات کی شخصیتیں نظر آتی ہیں، اور ان میں سے کئی دلولے، غم اور جھوٹ جہد
سے عبارت ہیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ایسی مختلف قسم کی شخصیتوں کو انعام دینے کے معاملے میں نوبل کمیٹی
نے نہ کسی سے اپنی رائے پر تامل خیال کیا ہے نہ ان کی تمام تخلیقات سے باہمی اتفاق کا اعلان کیا ہے۔ نوبل
کمیٹی کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ وہ اپنا فرض اور اپنی ذمہ داری نبھائے، کہ صرف امن کے لیے کیے جانے
والے کام کا صلہ دیا جائے، اور کچھ بھی نہیں۔ اور نوبل کمیٹی ایسا کرنے کے قابل ہوتی ہے اس لیے کہ وہ مکمل طور
پر خود مختار ہے۔ کمیٹی کسی کو جواب دہ نہیں، نہ ہی اس کے فیصلے کی ذمہ داری اس کے علاوہ کسی اور پر عائد ہوتی ہے۔
اس لیے، اس برس کے نوبل امن انعام کا کارل فان آزیٹسکی کو دیے جانے کا اعلان کرتے ہوئے ہم
امن کے لیے ان کے قابل قدر کام کا اعتراف کر رہے ہیں جو۔ ”کچھ زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔“

نارویائی نوبل کمیٹی کے رکن Fredrik Stang کی زبانی

(انعام پانے والے اپنی علامت اور نظر بندی کی وجہ سے نہ انعام وصول کرنے آئے اور نہ خطبہ دیے)

ان کی غیر موجودگی میں مندرجہ بالا تقریر کی گئی تھی۔

آرتھر ہنڈرسن اعلان تجلیل

اس وقت میرا فرض یہ نہیں کہ میں اپنے مہمان اور دوست مسٹر آرتھر ہنڈرسن کی سوانح حیات پیش کروں۔
ابذا میں اختصار سے کام لوں گا۔

1903 سے دارالعوام کے رکن کی حیثیت میں کم فاضل کے ساتھ—ہنڈرسن تیس برس سے زیادہ عرصے تک برطانیہ عظمیٰ کی سیاست میں شامل رہے ہیں۔ پہلے تو ان کی سیاسی سرگرمی برطانیہ کی لیبر پارٹی سے متعلق رہی، جس کی ترقی میں وہ نہ صرف شامل رہے ہیں، بلکہ انہوں نے اس میں خاصا اضافہ بھی کیا ہے۔ 1908 سے 1910 تک اور 1914 سے 1917 تک وہ لیبر گروپ کے پارلیمانی قائد رہے۔ اور کئی برسوں تک وہ اپنی پارٹی کے سیکریٹری جنرل بھی رہے ہیں۔ حال ہی میں، ان کی اپنی خواہش کے مطابق ان کو جیل کر دیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ سیاسی طور پر وہ لیبر تحریک کی بنیاد کا حصہ رہے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ پارٹی کے وسیع اصولوں کی نمائندگی کی ہے، ان پر جس کا اعتماد غیر معمولی درجے کا رہا ہے۔

آج کی شخصیت میں ہماری دلچسپی ہمیں ان کی ملکی سیاست کی سرگرمیوں سے پرے، غیر ملکی سیاست میں ان کے کام کی طرف بھی متوجہ کر رہی ہے۔

اپنے پارٹی کے دوسرے لوگوں، بلکہ اور بہت سے برطانوی سیاست دانوں کی طرح وہ غیر ملکی سیاست کے طریقوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس نے یورپ کو دو مسلح کیمپوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اور جس نے اصلاح پذیر قوموں کو 1914 کی تباہی میں جھونک دیا تھا، جس کو تھیوڈور روزویلٹ نے اپنی حالیہ تحریر میں Pontius Pilate کی جنگ کا نام دیا تھا۔ [Pontius Pilate 26 سے 36 قریب مسیح تک جوڈیا مصلوب کا رومن گورنر تھا جس نے یسوع مسیح کو مصلوب کرنے کا حکم بھی صادر کیا تھا۔] روزویلٹ کا قول اس بنیاد پر تھا کہ یورپ کے تمام مددین نے اپنے ہاتھوں پر لگی ذمہ داری کی سیاسی کو دھونے کی کوشش کی ہے۔ جنگ کی

شرذمات نے اس وقت کے قائدین پر کیسا اثر چھوڑا تھا، اس کا مظاہرہ میر ایڈورڈ گرے (Sir Edward Grey) کے رد عمل میں دیکھا جاسکتا ہے؛ جب اس کی قابل تعریف تمام کوششیں آخری وقت میں مذاکرات کرانے میں ناکام ہو گئیں، تو اپنی نکلنے کی میز پر دونوں ہاتھوں سے منکھارتے ہوئے چلایا تھا، ”میں جنگ سے نفرت کرتا ہوں۔“

چوں کی ضرورت کے پیش نظر اپنے ملک اور اپنی سلطنت کے تحفظ کی خاطر تمام برطانوی گروہ متحد ہو گئے تھے آر تھر ہنڈرسن نے 1915 میں لاسکوٹھ (Asquith) کی اتحادی حکومت میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور بعد میں لائڈ جارج (Lloyd George) کی جنگی کابینہ میں بھی شامل رہے۔ مگر 1917 میں کابینہ سے الگ ہو گئے تھے۔ لائڈ جارج کا کابینہ سے یہ اخراج دراصل علاقہ امتی تھا۔ امن کا یہی تقاضا تھا، ان کے دل میں امن کی خواہش ہی ایسی تھی جس کو اعتبار کو موقع ملا تھا۔ انہوں نے لائڈ جارج کا ساتھ اس لیے چھوڑا تھا کہ حکومت نے لیبر پارٹی کو اسٹاک ہوم میں ہونے والی Socialist Conference میں نمائندے بھیجنے کی اجازت نہیں دی تھی، جس میں مسٹر برانٹنگ (Branting) نے دوست دشمن سب کو مدعو کر لیا تھا۔

بلاشبہ، ان کی سوچ اور ان کی رائے ایسے آدمی کے مطابق ہونی تھی، جس کی وہ بہت قدر کرتے ہیں، یعنی مائچسٹر گارڈین اخبار کے مشہور مدیر مسٹر اسکاٹ (G. P. Scott)، جنہوں نے 1916 میں لکھا تھا: ”میں یورپ میں مستقل تقسیم اور صداوت کے خیال ہی سے نفرت کرتا ہوں، اور اگر ہمیں یہی سب کچھ دیکھنا ہے تو، میرا خیال ہے کہ اگر مستقبل میں مجھے کوئی دلچسپی ہوتی تو، میں اس سے باہر نکل جانا زیادہ پسند کروں گا۔ یہ مادی نقصان ہی نہیں، بلکہ مستقبل میں جنگوں اور خون ریزی کے امکانات کا معاملہ بھی ہے۔ یہ دراصل یورپ کی بادشاہت ہے، جس کا مطلب ہے مہذب دنیا میں نفرت اور انتقام کے جذبے کی بادشاہت۔“

چار برس کی ناقابل بیان خون ریزی، نقصانات اور تباہی کے بعد جنگ بند ہو گئی۔ آخر کار ہمیں امن نصیب ہوا، وہ امن جسے ”بچھلی جنگ کو ختم کرنا“ تھا، مگر بد قسمتی سے جس پر مندرجہ ذیل جذبے کی مہر لگی ہوئی تھی جسے اسی مسٹر اسکاٹ نے بیان کیا تھا کہ ”یہ مت بھولیے کہ جنگجو یا نہ وطن پرستی ختم نہیں ہوئی ہے۔“

یہ یورپ کے کسی بھی عظیم ملک میں شہنشاہیت ختم نہیں ہوئی ہے۔“

ان دنوں کے بعد سے آج تک، جب امن پر دستخط ہوئے تھے دنیا کو امن کے نتائج کا بھاری وزن محسوس ہوا ہے۔ مالیاتی اور تجارتی پالیسی میں ٹھوس ترقی رک گئی ہے، اور بے شمار پابندیوں، امتناعی احکام اور لین دین کی مشکلات کے باعث فطری رابطے بند ہو گئے ہیں۔ اور سیاسی اعتبار سے نئے عہد کی صورت باہمی بدگمانیوں، بے اعتباری اور خوف کے باعث بگڑ گئی ہے۔

لیگ آف نیشنز اب صرف امن کے اس تاریک پہلو اور بہتر وقت کے حصول کے لیے ایک اداراتی باہمی توازن کی طرح قائم ہے۔ اسی میں ہماری اشد شوقی ہے اور یہی بہترین امید ہے۔ اس کی تنظیم اور اس کا اخلاقی دباؤ، جو سب کو مفاہمت کے امکانات فراہم کرتی ہے، لیگ آف نیشنز کو دہشتہ جاتی ہے جس کے عقب

سے مصالحت اور امن کے خوشتر وقت کے حصول کے لیے حملے کیے جاسکتے ہیں۔

اور اس پشتے پر ہم آرٹھر ہنڈرسن کو بہادر ترین اور سب سے نیا وہ وفادار لوگوں میں پاتے ہیں۔

آرٹھر ہنڈرسن 1924 سے 1925 تک مسٹر مکڈونلڈ (MacDonald) کی کابینہ میں ہم سیکرٹری رہے تھے۔ مگر 1924 میں انھیں لیگ آف نیشنز کی اسمبلی میں [برطانیہ کا] نمائندہ بنانے کے بھیج دیا گیا تھا جہاں وہ Committee of Security and Disarmament کے رکن رہے اور بعد میں Twelve کے رکن منتخب کر لیے گئے جس نے ان سوالات کی دستاویز شرائط کا مسودہ تحریر کیا تھا اور وہاں انھوں نے سخت موقف اختیار کیا اور اعلان کیا کہ پہلے ترک اسلحہ جات کو نافذ کیا جائے اس کے بعد ہی تحفظ اور پابندیوں پر کیے گئے فیصلوں پر عمل درآمد کیا جاسکے گا۔

مکڈونلڈ کی دہمیری کابینہ میں 1929 میں انھیں سیکرٹری برائے خارجہ امور بنا دیا گیا اور ان کا اختیار ان کے رسوخ اور مؤثر عمل کے امکانات فطری طور پر بڑھ گئے تھے۔ ان برسوں کے دوران وہ ہمیشہ ذاتی طور پر اسمبلی میں برطانیہ عظمیٰ کے پہلے نمائندے کے طور پر پیش ہوتے رہے، جہاں ان کی خواہش اور ارادہ تھا کہ کچھ مثبت اور قابل ذکر کام کر کے دکھائیں گے۔

لہذا، جب مئی 1931 میں وہ ترک اسلحہ جات کانفرنس کے صدر بنادیے گئے تو ان سب لوگوں نے جنھیں امید تھی اور جو یقین کرتے تھے کہ اس کانفرنس سے مثبت نتائج نکلیں گے، اس امر کو ایک محکم ضمانت سمجھا کہ دہمیریوں کے مقابلے میں برطانیہ کے سیکرٹری خارجہ امور کو اس اہم عہدے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

1931 کے موسم خزاں میں مکڈونلڈ کی حکومت ختم ہوگئی، اور آرٹھر ہنڈرسن کئی برس تک برطانیہ کی سیاست سے باہر رہے۔ مگر ان کی ذاتی نیک نامی اتنے بلند درجے پر تھی، اور ان میں لوگوں کا یقین اتنا تھا کہ پُر زور عالمی مطالبے نے ان کو ترک اسلحہ جات کی کانفرنس کا صدر قائم رکھا۔

دنیا نے ان کو ان مشکل برسوں میں اس حیثیت میں کام کرتے، اور ان کی جدوجہد اور باہمت کوششوں کو دیکھا ہے۔

حکومت کے زوال سے، ظاہر ہے کہ ان کی سیاسی حیثیت کم زور ہوگئی تھی۔ وہ ترک اسلحہ جات کانفرنس کے صدر تھے مگر ان کے اپنے ملک سے ایک بھی وفد کانفرنس میں نہیں بھیجا گیا تھا۔

اپنی جدوجہد اور خود اپنے کام میں بھی وہ تنہا رہ گئے تھے۔ ایسے میں مجھے ڈر ہے (Dreyfus) کی انصاف کے لیے لڑائی کے معاملے میں بیورنسن (Bjornson) کے الما غلام اسمبلی زولا (Émile Zola) بہت یاد آتے ہیں: ”لاکھوں کے مقابلے میں ایک تنہا آدمی—واقعی دیکھنے کے قابل ایک بے حد قابل فخر منظر۔“

ترک اسلحہ کانفرنس کے صدر کی حیثیت میں آرٹھر ہنڈرسن اپنی بہترین خوبیاں پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں: موقع شناسی اور لامحدود خوش خلقی، متناظر ہمت، اور ساتھ ہی ضرورت کے وقت فیصلہ کن قدم اٹھانے کی

لیاقت سان میں لازوال برداشت اور کبھی نہ ختم ہونے والے صبر کا مادہ ہے۔ باوجود معمولی صحت، مصیبتوں اور مایوسیوں کے وہ کبھی تھکتے نہیں۔ اجلاسوں کے درمیان ہی ٹیکس، [جاری] اجلاسوں کے دوران بھی وہ مختلف حکومتوں اور رائے عامہ سے رابطے میں رہتے ہیں۔

کم لوگ ہوں گے جو اس طرح کام کرتے ہیں، کم ہی لوگ اسے مضبوط بھی ہوتے ہوں گے اور ان سے بھی کم ایسے ہوں گے جن کے پاس ضروری اختیار ہوتا ہوگا۔ اگر یہ کانفرنس اب بھی باقی ہے اور اگر اب بھی امید کا ایک نازک دھماکا موجود ہے تو یہ صرف اور صرف مسٹر آرتھر ہنڈرسن کی وجہ سے ہے۔

مگر کیا کانفرنس ابھی باقی ہے، کیا ابھی امید قائم ہے؟

میاقی امن اور لیگ آف نیشنز کے عہد نامے کے منعقدانہ الفاظ اور وعدوں کی اہمیت ردی کاغذ کے ٹکڑوں کے برابر بھی نہیں معلوم ہوتی، جس کے بارے میں کبھی ہم بہت کچھ سنا کرتے تھے اور اسی دوران ہم نے Naval Convention اور دوسرے کنونشن ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھے ہیں۔

جب حیران سننے والوں کے لیے یہ خبر نشر ہوتی ہے کہ جرمنی بھی اپنی اسلحہ بندی کر رہا ہے تو احساس بے چینی اور تہائی بڑھ جایا کرتی ہے۔

”یہ آخری جنگ ہوگی“ اور ”ایسا نہ ہو کہ ہم بھول جائیں“ یہ ہیں برس قبل کے زمانے کے الفاظ ہیں، اور وہ لوگ آج جن کے ہاتھوں میں دنیا کی تقدیر ہے شاید ایک دن خود کو بھی Pontius Pilate کی جگہ پائیں۔

”جرمنی اپنی اسلحہ بندی کر رہا ہے۔“ خوب! خدا دے ملاحت مزاج رکھنے والے لافانی لڈویگ ہلبرگ (Ludvig Halberg) نے [کسی] بد قسمت Jeppe کے بارے میں ایک جملہ لکھا تھا: ”مگر کوئی یہ نہیں پوچھتا کی Jeppe پیتا کیوں ہے؟“

ہم سب کو جو شکاریت کر رہے ہیں کہ جرمنی بھی اپنی اسلحہ بندی کر رہا ہے، اپنے خمیر کو ٹوٹنا اور خود سے پوچھنا چاہیے کہ جرمنی کیوں اسلحہ بندی کر رہا ہے؟ چند دن قبل ہر طائفہ کے دارالعوام میں اس موضوع پر مسٹر بالڈون نے کہا تھا، ”میں امید کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ بحث، جو شاید ان خیالات کے باعث نہیں بلکہ ایک حقیقی اور لازمی خواہش کے ساتھ یورپ کے حقائق جاننے کے لیے شروع کی گئی تھی، اس سے بڑے بلکہ ان کے مقابلے اور بہتر نتائج اخذ کرے گی جن کے بارے میں شاید ہم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ ایک بار پھر پہلا قدم اٹھانے کے لیے ایک موقع پیدا کیا گیا ہو کہ یورپ کی قوموں کو یک جا کیا جائے، اور ہو سکتا ہے کہ پچھلے چند برسوں میں یورپ کے حالات کی خرابی اور بگاڑ سے حاصل ہونے والی دانش کے باعث عقل کی آواز اور امن کی آواز غالب ہو جائے۔“

ان سب نے، جنہوں نے دارالعوام میں تقریر کی تھی، اتفاق کیا ہے کہ یورپ میں امن قائم کرنے اور ہر قوم کے تحفظ کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسلحہ جات کو محدود کیا جائے، اور جرمنی کو اس میں شامل ہونا چاہیے۔

جنرل سٹمس (Smuts) نے اپنی اعلیٰ درجے کی تقریر ”برطانیہ کی موجودہ پالیسی“ میں کہا تھا کہ اس کے حاصل کرنے کا ”ایک ہی طریقہ ہے کہ جرمنی اور اس کے حواریوں کو مکمل طور پر برادری کے درجے کو تسلیم کیا جائے اور یہ انصاف سے آزادی سے، اور بلا کسی استثنا کے ہوا چاہیے۔“

جی ہاں! یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں نئی زندگی اور ترکیب طرہ جات کی کانفرنس کے لیے تازہ امید کی طرف لے جائے گا، وہی راستہ جو ہمیں ہندوگی سے نکالتا ہے، جو ہمیں آگے بڑھاتا ہے، امن اور مفاہمت کا راستہ۔ آخرتھر ہنڈرسن کا راستہ۔

اس سے بہتر کوئی نہیں ہے، اس سے بڑھ کر کوئی نہیں۔

برقی آل کے تالیف پر، جو بین الاقوامی امن اور مفاہمت کی جدوجہد میں مارا گیا تھا، دل کی گہرائیوں سے پیش کیے جانے والے علامتی خراج کے طور پر کسی خاتون نے بنٹیلے کے پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ رکھ دیا تھا، جس سے تنقیدی کانفرنس کے ایک ٹکڑے پر یہ رشتہ آمیز الفاظ لکھے ہوئے تھے: ”ایک ماں کی طرف سے، سب کچھ کھودینے کے بعد بھی جس کے پاس ایک اٹھارہ برس کا بیٹا موجود ہے۔“

ایسا نہ ہو کہ ہماری کمیونٹی، ہمارا مستقبل، ہمارے بچے سب ایک نئی Armageddon میں تباہ ہو جائیں، ہم سب کو آج اس ماں کی پیچھے کی کمیوں کو ضرور یاد کرنا چاہیے:

مادرانہ پیار بھی ہو اور جوان مردی بھی ہو

دونوں مل جائیں تو حاصل امن ہو:

اسلموں کو ایک جانب پھینک دو

بے وقوفو! ہم کو روٹی چاہیے:

مشترک خطرے مٹانے کے لیے

سب کو مل کر چار کرنے کے لیے

ہے کوئی جو ہم کو بچائے مدد

ان مشکل وقتوں میں جب عوام کی آزادی خطرے میں ہے، جب آزاد کلام اور آزاد خیال پر قدغن ہے، جب طاقت انصاف کو رد کر دیتی ہے، آزادی امن کے اور لوگوں کے درمیان مفاہمت کے متبرک نام سے ہم اپنے شکرانے اور خراج تحسین پیش کرتے ہیں اس آدمی کو جو Bjarnson کے الفاظ کی سچائی پر یقین کے ساتھ، ثابت قدمی اور وفاداری سے کھڑا ہے: ”امن کا خیال دنیا کا سب سے بڑا خیال ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعے انسانی ترقی کا امتحان ہوگا اور اسی کے اطراف آزادی کی تمام کوششیں آخری جدوجہد کے لیے اکٹھی ہوں گی۔“

مارویلیائی نوبل کمیٹی کے رکن Johan Ludwig Mowinkel کی زبانی

خطبہ:

آفاقی اور دیر پا امن کے لازمی عناصر

[تمام] مرد اور عورتیں ہر جگہ ایک بار پھر وہی پرانا سوال دہرا رہے ہیں کیا امن ہے؟ یہ سوال وہ پریشانی اور خوف کے عالم میں کر رہے ہیں اس لیے کہ ایک طرف نہ تو کبھی اس طرح امن کی تمنا کی گئی ہے نہ ایسا جنگ کا خوف رہا ہے جیسا کہ آج ہے۔ دہتری طرف، کبھی تباہی پھیلانے اور موت کے اتنے بے پناہ سامان نہ تھے جیسے کہ آج تقریباً ہر ملک میں تیار کیے جا رہے ہیں۔ کسی اور سہارے سے آنے والے مہمان کے لیے ہماری دنیا اتنی ہی افسردہ گی کا منظر پیش کرے گی جتنا کہ پریشانی کا۔ اس [مہمان] کو ہمارا تمدن ایک اور عفریت صفت تناقض کے جبر کے تلے پیتا نظر آئے گا: فراط کے باوجود بھی آبادی کی کثرت سے بھوک کی ماری، اور امن کی ضمانت دینے والی قومیں جنگ کی تیاری کرتی نظر آئیں گی۔

شاید اس تناقض کا سنگین ترین پہلو یہ ہے کہ ان ہی قوموں نے ایک نئی اسلحہ بندی کی ابتدا کی ہے، جو بنیادی طور پر ترک اسلحہ جات کا فرسوس شروع کرنے اور برقرار رکھنے کی ذمہ داریاں سنبھال رہی ہے وہ منظر جو دوسرے سہارے سے آنے والا ہمارا مہمان دیکھے گا۔ یہ ہماری دنیا ہے، اور ہمیں اس کو بہترین بنانا چاہیے۔ ہم انسانیت کی مستقبل سے ناامید نہیں ہو سکتے اس لیے کہ یہ ہمارا مقصود ہے کہ ہم اس مستقبل کو بہتر یا بدتر بنائیں۔ ہم جو یہاں موجود ہیں ان قوموں سے تعلق رکھتے ہیں جو تمدن کے سہاروں دستے کا حصہ ہیں۔ دنیا کے حالات کے اس چور ہے پران ہی قوموں کی ذمہ داری ہے کہ وہ تاریخ کے ترازو میں اپنا وزن صحیح پلڑوں میں ڈالیں تاکہ فیصلہ کن توازن امن کے حق میں جائے۔

میرے خیال میں، ان ہی قوموں کے اختیار میں ہے کہ وہ دنیا کو امن کے راستوں پر واپس لے جائیں، اور میں انھیں یہ بتانے کے لیے خود کو وقف کرتا ہوں کہ میرے خیال کے مطابق، جنگ کے خوف کو دور کرنے کے لیے، جو دنیا پر اتنی بڑی طرح چھاتا جا رہا ہے، کیا کیا جاسکتا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ مگر ہم امن کی تحقیر کے لیے پہلے ہی نیگ کے عہد نامے میں کیے گئے وعدے کے ذریعے تیاریاں کر چکے ہیں، اگرچہ اس کا حصول مشکل ہے، ناممکن نہیں۔ وہ قومیں جو بنی نوع انسان کو اتحاد اور امن کی طرف لے جا رہی ہیں، بنیادوں میں پیوست ہیں اور طاقت ور ہیں۔ وہ مادی بھی ہیں اور فطری بھی، ساتھ ہی نیک بھی ہیں اور عقلی بھی۔ ہم میں حقیقت پسندی ہے، سمجھ بوجھ بھی اور حفظ نفس کی جبلت بھی، ساتھ ہی عالی ظرف خیالات اور بلند ترین آرزوئیں بھی۔ اس لیے ہمیں مایوسی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ حالات کا جائزہ لینا چاہیے، ہر قدم اٹھانے سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے اور پھر سنجیدگی اور خاموش اعتماد کے ساتھ اپنا کام کرنا چاہیے، جس

میں نہ جلدی ہو نہ وقفہ ہو۔

یہ جائزہ لینے کے لیے کہ امن کا اصل مسئلہ کیا ہے، ہمیں پلٹ کر عالمی جنگ پر، اور ان خطوط پر دنیا جن سے امن کے مسائل سے عمیق رہی ہے، نظر ڈالنی چاہیے۔ جتنا زیادہ عالمی جنگ کی تاریخ اور اس کے عوامل پر غور کیا جائے گا، اتنے ہی واضح وہ الم ناک سال ہوں گے جن میں تمدن کا انہدام ہوا ہے۔ وہ جنگ و عین پرستی کے باطل معیار اور خیالات کے نتیجے میں ہوئی تھی، جس کو قوموں کی عزت اور اہم مفادات کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنے مفادات کا دفاع کرنے میں اور جدید دنیا کے تقاضوں سے نباہ کرنے میں قوموں کی مابلی کو آشکار کیا۔ ان میں سے دو بڑی حقیقتیں یہ تھیں کہ قومیں ایک دوسرے پر تہذیبی اور مادی ضرورتوں کے پیش نظر زیادہ انحصار کرنے لگی تھیں اور جنگ کی خوف ناک برہمستی جاری تھی۔ 1914ء سے قبل کی دنیا پہلے ہی سے ایسی دنیا ہو گئی تھی جس میں ہر قوم کی بہبود انفرادی سطح پر پوری کمیونٹی کی خوش حالی سے وابستہ ہو گئی تھی۔ مزید یہ کہ اب جنگ اسکاکی طور پر اتنی شدید اور تباہ کن ہو گئی ہے کہ مدد بین کا یہ مشترک مقصد ہونا چاہیے تھا اس کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔ مگر کار ریاست کے معیار کے تقاضے نے ہر قوم کو اپنے نقطہ نظر سے اپنی ضرورت کے مطابق بد نزور اسلحے بنانے کے دعوے کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

اس کا ناگزیر نتیجہ طاقت کے توازن، اسلحہ بندی کی دائرہ دنیا کی مخالف اتحادوں میں تقسیم، اور بالآخر جنگ کی صورت میں نکلا۔ ان حالات کی جڑیں اقتصادی نظام میں کبریٰ تھیں، جن کی وجہ سے غیر ملکی تجارت میں مسابقت ہوئی، مستند یوں کے لیے اور خام مال کے ذرائع میں، جو تنازعے کی ایک بڑی وجہ تھے۔ عالمی جنگ کے چار برس، اور انسانی جان کا اتنا ضیاع جس کا تصور بھی محال ہے، صاف اس نتیجے پر لے گئے کہ اگر تمدن کی بقا مقصود ہو تو بین الاقوامی لاقانونیت کو چھوڑ دیا جانا چاہیے۔

امن کانفرنس کا انعقاد ایک منظر نامہ تھا یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ، پہلا درجہ قحطانی طاقتوں کے درمیان ایک بڑی جدوجہد کا، نئی امیدوں اور تمناؤں کا جس کے سبب سے عالمی جنگ کے کرب نے وطن پرستی کے پرانے نظام میں اور اقتصادی رشتوں میں ایک جیسے روابط پیدا کر دیے تھے۔ اس جدوجہد سے جو راضی نامہ ابھرا تھا، وہ مثال تھا لیگ کے عہد نامے میں، International Labor Organization میں اور امن کے معاہدے کے شرائط میں۔ بین حیث انگل، دونوں معاہدوں میں نئے نظام کی وکالت کرنے والے فاتح ہوئے، پرانے نظام کے جمہیتی لوگوں کو بھی کافی حد تک امن معاہدے میں فائدے ہوئے۔ مگر اس کا خیال رکھا جانا چاہیے کہ امن کانفرنس میں ایسی مضبوط قوتیں تھیں جو چاہتی تھیں کہ موجودہ عہد نامے سے آگے بڑھا جائے اور یہ بھی کہ اس کے بعد بین الاقوامی مثالیت پسندی میں کمی ہوئی تھی جو رائے عامہ اور حکومتوں کو موجودہ معاہدوں میں موجود مصالحت سے نیچے لے جاتیں۔

دنیا کی مابعد جنگ مشکلات امن کے معاہدے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس جذبے کی وجہ سے تھیں جن کے تحت اس میں کچھ شرائط رکھی گئی تھیں۔ اب تک، عہد نامہ اور International Labor Organization

کا آئین دونوں دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ حکومتوں سے بہت آگے ہیں۔ اس امر کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی احساس کیا جانا چاہیے کہ عہد نامے اور امن کے معاہدوں کے درمیان جو ربط ہے وہ خالص میکائیکی ہے۔ ریاستیں اگر ایک کی توثیق کرتی ہیں تو دوسرے کی خود بخود توثیق ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے بیاقی و رسائی میں، ایک خاص دفعہ کے ذریعے، جو ریاستیں اس کو منظور کر لیتی تھیں وہ خود بہ خود 1912 کے Hague Opium Convention میں شریک سمجھی جاتی تھیں۔ مگر ریاستیں عہد نامے کی ذمہ داریاں اسی طرح قبول کر سکتی ہیں، جیسے وہ Hague Opium Convention کے تحت کر سکتی تھیں، یعنی امن کے معاہدوں کی ذمہ داریوں کی قبولیت کے بغیر، جب کہ امن معاہدے عہد نامے پر اثر انداز ہوئے بغیر تبدیل یا بالکل منسوخ کیے جاسکتے ہیں۔ عہد نامہ کسی طرح بھی امن معاہدوں کی بنیادوں پر قائم نہیں ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے جس کو اچھی طرح سمجھ لیا جانا چاہیے۔

ان عمومی مشاہدوں کے ساتھ میں، مختصر طور پر، بین الاقوامی رشتوں کے تین بڑے حصوں پر بات کرنا چاہوں گا، اور یہ دکھانا چاہوں گا کہ وہ امن کانفرنس کے بعد سے کس طرح بنے ہیں: پہلا حصہ اقتصادی رشتے، دوسرا حصہ تنازعات کا صلح جو انداز میں بندوبست، اور تیسرا حصہ جنگ کے خلاف ضمانتیں، جن میں جنگ سے دست برداری، ترکیب طرہ جات اور جارح کی مزاحمت کے لیے مشترکہ اقدام ملے ہیں۔

اس کے بعد، میں ان ترقیات کی روشنی میں موجودہ حالت پر ایک نظر ڈالنا چاہوں گا اور میں آخر میں، یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ میرے خیال میں کیا کچھ کیا جاسکتا ہے، یا کیا کچھ کیا جانا چاہیے اگر ہم اسلحہ بندی کی دوزخ کو روکنا چاہتے ہیں، جنگ کے موجودہ خطرے کو نالنا چاہتے ہیں اور ایک آفاقی اور دیر پا امن قائم کرنا چاہتے ہیں۔

جنگ کے دوران یہ ضروری سمجھا گیا تھا کہ صرف قومی سطح پر ہی نہیں، بین الاقوامی سطح پر بھی اقتصادی زندگی کی تنظیم کی جانی چاہیے۔ امن کانفرنس میں جنگ کے دوران استعمال ہونے والے ساز و سامان کو بچانے کی مستعد کوشش کی گئی تھی، اور اسی پر Supreme Economic Council کی گہرائی میں بین الاقوامی تعمیر نو کے دوران بھی عمل کیا جانا تھا۔ مگر بے شکاوت اقتصادی انفرادیت کی طرف واپسی کے لیے وبا بہت شدید تھا۔ تھوڑے عرصے کے لیے امید برہمی تھی کہ شاید Reparations Commission اپنے فرائض کے بارے میں بھی یہی نظریہ اختیار کرے اور اس کو ایک قسم کے تعمیر نو کمیشن میں تبدیل کر دے، مگر یہ امید جلد ہی دم توڑ گئی۔ درستی اور قرض کا پورا مسئلہ تک نظر اور خود بین انداز میں نمٹایا گیا تھا، جس کے نتائج کی مسٹر کنھو (Keynes) اور دوسرے لوگ پیش بینی کر چکے تھے۔ عہد نامے کے برطانوی مسودے میں مشترکہ معاملات میں تعاون کو بڑھانے، اور بالخصوص اقتصادی اور مالیاتی مسائل کے بارے میں پیش کی جانے والی دوسری تجاویز کو بہت کم زور کر دیا گیا تھا۔ اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ عہد نامے کی بہت مبہم اور مختصر دفعات 23 اور 24 میں تکنیکی تنظیموں، مشورے دینے والی کمیٹیوں، بین الاقوامی دفاتر کے کام اور International Labor

Organization کے آئین کے بارے میں تھا۔

ابتداء میں لیگ کے اقتصادی اور مالیاتی کام میں، [جنگ کی بربادیوں کی] درستگی اور قرضوں کی موجودگی کی وجہ سے رکاوٹ ہوئی تھی، جن کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا، مگر جن کو ان خطوط پر کیا جا رہا تھا جنہوں نے قائمہ مند بین الاقوامی اقتصادی اور مالیاتی تعاون کو بے انتہا مشکل بنا دیا تھا۔ مگر بتدریج سارے سوالات پس منظر میں ڈال دیے گئے تھے۔ لیگ نے مشترکہ معاملات میں تعاون کے لیے اپنا ساز و سامان تیار کیا تھا اور ان موضوعات پر حکومتوں کے خیالات نرم پڑ گئے تھے۔ اسلئے لیگ کو تیرف کو ہاتھ لگانے کی ممانعت تھی، اور بینکاری کو ایک راز سمجھنے کا شدید میلان تھا جس کو حکومتوں کی حدود سے نکلی طور پر باہر کر دیا جانا چاہیے تھا۔ مگر رفتہ رفتہ لیگ کو اقتصادی اور مالیاتی رشتوں سے، جن میں تیرف، کوئلے، اور دوسری رکاوٹیں شامل تھیں، نمٹنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اور آج ریاست ہائے متحدہ لیگ کے کام کے ان تمام پہلوؤں میں عملی طور پر حصہ لینے کے باعث، International Labor Organization کی رکن بن گئی ہے۔

جہاں تک صلح جو یا نہ انداز میں تنازعات کے حل کیے جانے کا معاملہ ہے، تو عہد نامے کے نظام کی بڑے پیمانے پر توسیع کر دی گئی ہے۔ یہ نظام تنازعے کے ہر حریف کو حق دیتا ہے کہ وہ دوسرے حریف کو کانسل یا اسمبلی میں طلب کرے اور دونوں حریف پیش ہونے پر مجبور ہوں گے۔ یہ لیگ کے کسی بھی رکن کو، خواہ وہ تنازعے کا شریک ہو یا نہیں، حق دیتا ہے کہ وہ کانسل کی توجہ ان حالات کی طرف مبذول کرے، جو ریاستوں کے درمیان نیک نیت مفاہمت پر اثر انداز ہو سکتی ہے، جن پر امن کا انحصار ہو۔ یہ دفعہ ۱۲ کے پیمانے پر استعمال کی جا چکی ہے۔ کانسل نے کئی مثالوں کی روشنی میں اس کے طریقہ کار میں اور اختیارات میں اضافے بھی کیے ہیں، اور بہت سے موقعوں پر اسمبلی کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ نمائے گئے تنازعات بہت سے ہیں، جن میں وہ بھی ہیں جو امن کے لیے خطرہ تھے عہد نامے کی دفعہ 13 ثالثی یا حریفوں کے درمیان معاہدے یا عدالتی نظام کے ذریعے تنازعے کا حل فراہم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ دفعہ 14 ایک Permanent Court of International Justice کے قیام کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ عدالت مشہور زمانہ لازمی Optional Clause کے تحت قائم کر دی گئی ہے، اب تک جس پر لیگ کے بیالیس ارکان دستخط کر چکے ہیں، جس میں جاپان کے علاوہ تمام بڑی طاقتیں بھی شامل ہیں۔ اس وقت ریاست ہائے متحدہ کی کانگریس کے سامنے ایک بل موجود ہے جو Statute of the Court کے بارے میں چند شرائط پر مبنی ہے جنہیں لیگ کے ارکان منظور کر چکے ہیں۔ جہاں تک ثالثی کا معاملہ ہے تو ایک General Act of Arbitration بھی نافذ کیا جا چکا ہے جسے اچیس ریاستوں نے اپنے ملکی آئین میں بھی شامل کر لیا ہے۔ کئی معاہدے۔ اس وقت جن کی تعداد سیکڑوں میں ہے تنازعات کو عدالت یا ثالثی میں پیش کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں، اور لیگ کے زیادہ تر کنٹیننٹ نے کہا ہے کہ عدالت ہی یہ فیصلہ کرے گی کہ اٹھائے جانے والے سوالات کی تشریح کس طرح کی جائے۔

مختصراً، یہ کہا جاسکتا ہے کہ پرامن طریقے سے بین الاقوامی تنازعات حل کرنے کی ذمہ داریاں کاغذ پر تو اتنی مکمل اور دور رس ہیں کہ کسی ریاست کے لیے بیباق سے روگردانی کے بغیر جنگ چھیڑنا تقریباً ناممکن ہوگا۔ مگر کوئی بھی اتحادیہ نہیں ہوگا جو یہ کہے کہ امن کو یقینی بنانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اصل مشکل تو اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ بیباق کی ایسی تمام ذمہ داریاں پوری کی جائیں گی۔ اس مسئلے کی اس لیے بنیادی اہمیت ہے کہ پرامن طریقے سے تنازعات حل کرنے کی ذمہ داریاں، لیگ کے ابتدائی دنوں ہی سے، جنگ کی مذمت کرنے اور جارح کو روکنے کے عمل سے منسلک کر دی گئی ہیں۔ عہد نامے کی دفعہ 12 کے مطابق تمام تنازعات کو کسی بھی نوعیت کے مصالحتی طریقہ کار کے سامنے پیش کرنے پر رضامندی کو اس ذمہ داری سے منسلک کر دیا گیا ہے کہ کسی بھی حالت میں ایک مخصوص مدت تک جنگ نہیں کی جائے گی؛ ثالثی کے لیے ماضی ہونے یا عدالت تک جانے کے سلسلے میں دفعہ 13 رضامندی سے منسلک ہے کہ ایسی کسی ریاست کے خلاف جنگ نہیں کی جائے گی جو ثالثی یا عدالت کے فیصلے کو قبول کر لے گی؛ دفعہ 15 کہتی ہے کہ تنازعے کو کاؤنسل یا عدالت کے سامنے پیش کرنے پر رضامندی اس ذمہ داری سے منسلک ہے کہ کسی ریاست کے خلاف جنگ نہیں کی جائے گی جو کاؤنسل یا اسمبلی کی رپورٹ کو منظور کر لے گی۔ ان وعدوں کا عہد نامے کے دفعہ 16 کے تحت ذمہ داری سے انسلاک کا یہ مطلب ہوگا کہ جو بھی ریاست ان ذمہ داریوں سے انحراف میں جنگ کا راستہ اختیار کرتی ہے، اس کو لیگ کے تمام ارکان سے جنگ کرنا ہوا تصور کیا جائے گا، اور ایسی ریاست سے تعلقات منقطع کرنا، حتیٰ کہ اس پر فوجی، بحری اور ہوائی حملے کرنا ضروری ہوگا تا کہ امن میں پیدا کیے گئے خلل کو دور کیا جائے۔ پرامن طریقے سے تنازعات کے حل کے لیے یہ پورا انتظام عہد نامے کی دفعہ 11 کے تحت آتا ہے جس میں جنگ یا جنگ کی دھمکی کو جس طرح بھی ممکن ہو، دفعہ 16 کی لگائی ہوئی مخصوص ذمہ داری کے تحت، دنیا کے لیے خطرہ سمجھ کر دور کرنا لیگ کی ذمہ داری ہوگی۔ عہد نامے کی رو سے یہ ذمہ داری بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور تمام مختلف مسودوں میں بھی بنیادی تصویر کی گئی ہے، جس کی بنا پر عہد نامہ تیار کیا گیا تھا۔

فیلیمور کمیٹی (Phillimore Committee) کی وہ رپورٹ جو عہد نامے پر بعد میں کیے جانے والے کام کی بنیاد تھی، عہد نامے کو اتحاد کا ایک عام بیباق گردانتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کی پیش کردہ تجویز کا مقصد ہو گا کہ ”جس طرح بھی ہو، بہر حال، اتحاد کے ارکان کے درمیان امن ضرور قائم رکھا جائے گا۔“ اس اتحاد کے دوسرے ارکان کی نظر میں اگر کوئی ریاست جنگ کا راستہ اختیار کرتی پائی جائے گی تو اسے دوسری اتحادی ریاستوں کے خلاف خود بخود حالت جنگ میں تصور کیا جائے گا، اور سب ریاستیں اس کے خلاف ان اقدام پر متفق ہوں گی جن کے ذریعے ”تنہا یا مشترکہ طریقے سے“ فوجی، بحری، مالیاتی اور اقتصادی — عہد نامے کے دفعات میں ڈالے جانے والے رخنے کو روکا جاسکے۔“ اطالیہ، جرمنی، لارڈ بسسبل، American League to Enforce Peace اور فرانس کے منصوبے، سب نے نہ صرف اقتصادی بلکہ فوجی پابندیاں لگانے کی تجاویز پیش کی تھیں۔ تنازعات کو پرامن طریقوں سے حل کرنے اور پابندیوں کو مستحکم کرنے کے لیے

ایک طاقت ور اور وسیع نظام کے لیے جزل انٹرنس نے اپنے مشہور کتابچے ”ایگ آف نیشنز: ایک عملی مشورہ“ میں سب سے واضح اور پراثر ویسٹیشن کی تھی۔ اس کتابچے میں جزل انٹرنس شہر ظاہر کرتے ہیں کہ ”اگر ان [پابندیوں] کی فوجی اور بحری اقدام کے ذریعے حمایت نہ کی گئی“ تو اقتصادی اور مالیاتی پابندیاں شاید کافی نہ ہوں۔

موجودہ عہد نامے کے تمام مسودوں میں، جس پر سب کی رضامندی تھی، اُس وقت تک یہ ممکن نہیں تھا کہ جنگ کا، بلکہ ”تباہ“ جنگ کا، راستہ اختیار کرنے کے امکان کو خارج از بحث سمجھا جائے۔ ایسی کسی بھی ریاست کے خلاف جنگ ممنوع تھی جس نے ثالثی یا عدالتی فیصلہ قبول کر لیا ہو، یا کاؤنسل کی رپورٹ جس پر، حریفوں کے علاوہ، کاؤنسل کے تمام ارکان متفق ہوں، یا اسمبلی کی اسی قسم کی رپورٹ قبول کر لی ہو۔ جنگ ان حالات میں بھی خارج از بحث گردانی جاتی تھی جب کاؤنسل، یا اسمبلی، یا ثالثی کی جانب سے ہندوبست کے لیے کافی وقت ہو۔ اسی کو ”moratorium on war“ کہا جاتا تھا۔ لیکن، اگر کاؤنسل یا اسمبلی کسی رپورٹ پر متفق نہ ہوئی ہو تو حریف تین ماہ بعد مناسب اقدام کے لیے آزاد ہوتے تھے۔ عہد نامے میں یہی سب سے بڑا استثناء تھا۔ اس کے بعد سے عدالت یا ثالثی فیصلے کے لازم ہونے کے پیش نظر اُس معاملے میں حتمی رکاوٹ کے امکانات بہت کم ہو گئے تھے جس میں تنازعے پر کوئی فیصلہ نہ صادر ہوا ہو اور کاؤنسل یا اسمبلی میں [رپورٹ پر] اتفاق نہ ہوا ہو۔ اس طرح تین ماہ بعد جنگ کے لیے راستہ کھلا ہوتا تھا۔

دوسری جانب [صورت یہ ہے کہ]، لیگ کے تقریباً تمام ارکان Briand-Kellogg معاق پر دستخط کر چکے ہیں، یعنی سب، اپنی اپنی قومی پالیسی کے تحت، جنگ کی مذمت کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کسی بھی تنازعے یا لڑائی کے حل کے لیے، خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو، پُر امن طریقے کے سوا کوئی اور طریقہ اختیار نہیں کریں گے۔ اس عمل کو عام طور پر عہد نامے کے سقم کو دہر کرنا گردانا گیا ہے۔ اسی یقین دہانی کو دہری یقین دہانی بنانے کے لیے، پچھلی برطانوی حکومت نے، وہ مثال قائم کرنے کے ساتھ ساتھ جس سے عدالتی اور ثالثی فیصلے لازمی ہو گئے تھے، عہد نامے میں تبدیلی کی تجویز پیش کی تھی کہ اس میں بھی Briand-Kellogg معاق میں شامل جنگ کی غیر مشروط مذمت کو شامل کر دیا جائے۔ وہی ایک مقصد ہے جو ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوا ہے، مگر اس کو رد بھی نہیں کیا گیا ہے۔

تیسری جانب، عہد نامے کے ذریعے پابندی لگانے کی ذمہ داری کے بارے میں اعتماد میں ایک عام قسم کی کم زوری پیدا ہوئی ہے۔ دوسری اسمبلی تک اقتصادی اور فوجی پابندیوں کے درمیان امتیاز کی ذمہ داری کی تشریح عہد نامے کی تحت کی جاتی تھی۔ اقتصادی پابندیاں، یعنی، جارحیت کرنے والے کا بائیکاٹ کرنا لازمی تھا، جب کہ فوجی پابندیاں اختیاری سمجھی جاتی تھیں۔ یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ کوئی بھی ریاست جارحیت کرنے والے سے تجارتی اور مالیاتی تعلقات قائم رکھے بغیر جنگ کے مجرم میں شامل نہیں ہو سکتی تھی۔ ہماری، ایک دوسرے پر انحصار کرنے والی قوموں کی، جدید دنیا میں مشکل ہی سے کوئی ریاست قرض لیے بغیر اور دوسری قوموں کی منڈی سے ہر قسم کا سامان جنگ خریدے بغیر کامیابی سے جنگ کر سکتی ہے۔ یہی

• وہ ہے کہ جارحیت کرنے والے سے، کم سے کم، بائیکاٹ نہ کرنے سے یہی سمجھا جائے گا کہ اس خرابی سے چشم پوشی کی جارہی ہے جس کو دبانے کی کوشش کرنا ضروری ہے، مگر جارح سے رشتوں کا مکمل قطع کرنا مسلح انتقام کا باعث بھی ہو سکتا ہے، اور اس کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ مسلح اقدام کے خطرے کی صورت میں لیگ کے وفادار ارکان کی طرف سے اجتماعی دفاع کے ضروری انتظامات بھی کیے جانے ہوں گے۔ اس سے یہ مطلب بھی نکلے گا کہ جو پابندیوں کے سوال پر غور کر رہے ہیں انھیں اس مسئلے پر اس انداز سے بھی غور کرنا ہوگا۔ بلکہ [اب تو] زیادہ تر یہ تصور پیدا ہو رہا ہے کہ عہد نامے کے دفعات مبہم اور ناقابل اعتبار ہیں، اور یہ بھی کہ جب معاملات اس نقطے تک پہنچ جائیں گے تو حقیقتہً کوئی بھی ریاست ان پر عمل نہیں کرے گی۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ اس موضوع پر بحث کی ابتدا ہی سے، جارح کے خلاف پابندیاں لگانے کے سوال کو اسلحے میں کمی کرنے اور اس پر حد لگانے کے سوال سے منسلک سمجھا گیا ہے۔ گویا، ایک بار پھر، امن کانفرنس میں پیش کی گئی تجاویز ان حدود سے تجاوز کر گئی ہیں جو عہد نامے میں بیان کی گئی ہیں۔ جنرل اسمتھس اور کئی دوسروں نے اتحادیوں کی اسلحہ بندی میں فوری اور سخت کمی کرنے کے حق میں، جس میں جبری بھرتی کو ختم کرنا بھی شامل تھا، بہت لڑائی کی تھی، مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ مسٹر لائٹ جارج نے، کانفرنس کے اختتام پر، اپنے ساتھیوں سے کی گئی اپیل میں، جس کا عنوان تھا "Some Considerations for the Peace Conference before They Finally Draft Their Terms" مندرجہ ذیل بیان دیا تھا۔

”امن کے بندوبست کا ایک لازمی عنصر لیگ آف نیشنز کا آئین ہے، جو پوری دنیا میں عملی طور پر بین الاقوامی حقوق اور بین الاقوامی آزادی کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو، سب سے پہلے کرنا یہ ہوگا کہ لیگ آف نیشنز کے تمام سربراہ اور وہ رہنما آپس میں مل کر اسلحہ بندی کے بارے میں کسی مفاہمت پر پہنچیں۔ اگر ہم خود اپنے اسلحوں کی حد مقرر کرنے پر تیار نہیں ہیں تو میرے خیال میں جرمنی کے اسلحوں پر ایک مستقل حد عائد کرنے کی کوشش ایک شغلِ لافانی ہوگا۔“

اگر لیگ کو اپنا کام دنیا کے لیے کرنا ہے تو یہ صرف اس لیے ہوگا کہ لیگ کے ارکان خود اپنے آپ پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس لیے بھی کہ اسلحہ بندی کے معاملے میں ان کے اپنے درمیان رقابتیں اور بدگمانیاں نہیں ہیں۔ لہذا، لیگ آف نیشنز کی کامیابی کے لیے پہلی شرط یہ ہوگی کہ برطانوی سلطنت اور ریاست ہائے متحدہ، اور فرانس اور اطالیہ کے درمیان ٹھوس مفاہمت ہو اور یہ بھی کہ ان کے درمیان بحری بیڑے اور فوجیں بڑھانے میں مسابقت نہ ہو۔ عہد نامے پر دستخط سے پہلے جب تک سب یہ نہیں ہو جاتا، لیگ آف نیشنز کا قیام ایک فریب ہوگا، ایک مذاق ہوگا۔“

اس بیان میں بہت کچھ ہے، جس میں آج کے موضوعات کا رنگ بھی شامل ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، عہد نامہ اور امن کے معاہدے ابھی تک زیادہ دور نہیں پہنچے ہیں، مگر عہد نامے نے لیگ کے ارکان سے اس بات کی ضمانت لے لی ہے کہ ”انھیں [اس بات کا] احساس ہے کہ امن کو برقرار رکھنے کے

لیے قوموں کو اپنے اسلحوں میں کمی کرنی ہوگی، اس کم ترین حد تک، جو قومی تحفظ اور بین الاقوامی ذمے داریوں کے نفاذ کے سلسلے میں ضروری اقدام سے میل کھاتی ہو۔“ اس نے لیگ کے ارکان کو اس پر بھی تائل کیا ہے کہ ”نئی اداروں کے ذریعے اسلحے اور کلمہ بارود کی تیاری پر شدید اعتراضات کیے جاسکتے ہیں۔“ لیگ کی کاؤنسل ان ضمانتوں کو مؤثر کرنے کے لیے ضروری تدبیر کرے گی۔ امن کے معاہدوں نے مرکزی طاقتوں کو نہتا کر دیا ہے، اور ترک اسلحہ جات کے سلسلہ کار کو سخت بین الاقوامی گھمائی سے لالچ کر دیا ہے، اس اتفاق رائے پر کہ یہ طریقہ ہائے کار عام ترک اسلحہ جات کا ابتدائی ہے۔

ایسی صورت میں، ابتدائی سے لیگ کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ عہد نامے کے اس حصے کو مؤثر کرنے اور مرکزی طاقتوں سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کے طریقے دریافت کرے۔ ابتدائی مرحلے پر—تیسری اسمبلی کی مشہور قرارداد 14 کی منظوری کے بعد یہ اعتراف کیا گیا تھا کہ اسلحوں میں کمی اور حد بندی صرف اسی صورت میں ممکن ہوگی کہ ان کے عوض عہد نامے میں موجود یا بندی کے دفعات نافذ کیے جائیں۔ ریاستوں نے اپنے تحفظ کے لیے اسلحوں کی طاقت پر انحصار نہیں چھوڑا ہے، سوائے اس حد تک کہ جہاں لیگ دفاع کے لیے اجتماعی ضمانتیں دینے کو تیار ہو۔ قرارداد 14، Treaty of Mutual Assistance اور Geneva Protocol اس کوشش کے مسلسل درجات تھے جو تحفظ کی مستحکم بنیاد کو ممکن بناتے تھے تاکہ وہ دہریہ ترک اسلحہ جات ممکن ہو سکتا۔ Geneva Protocol لاپرواہی اور مکمل ثالثی فراہم کرتا تھا۔ عہد نامے کی دفعہ 16 کی تشریح یہ تھی کہ لیگ کا ہر رکن عہد نامے کو برقرار رکھنے میں تعاون کرے گا اور اس حد تک جارحیت کے عمل کی مزاحمت کرے گا جس حد تک اس کی جغرافیائی کیفیت اور اسلحے کے درجات اجازت دیں گے۔ اس تشریح کو لوکارنو طاقتوں (Locarno Powers) نے اپنے خط کے ذریعے اختیار کیا تھا، جس میں انھوں نے دفعہ 16 کے بارے میں جرمنی کی حکومت کو اپنے نظریے سے آگاہ کیا تھا۔ اگر Protocol کو اختیار کر لیا گیا ہوتا تو ترک اسلحہ جات کانفرنس اقتصادی بحران اور قوم پرستی میں اس کے بڑھتے ہوئے اثرات سے چند برس قبل 1925 میں منعقد ہونے لگتا کہنا کافی نہیں کہ اگر یہ ہو گیا ہوتا تو Protocol نے ایک کامیاب کانفرنس کے لیے ثالثی اور تحفظ کی بنیاد فراہم کی ہوتی اور سوویت یونین اور جرمنی کے لیگ میں داخلے کو تیز کر دیا ہوتا اور یورپ اور مشرق بعید کی تاریخ بہت مختلف ہوتی اور اتنی اہم ماک نہ ہوتی ہوتی جتنی کی ہوئی ہے۔

1930 میں ثالثی، تحفظ اور ترک اسلحہ جات کے مربوط موضوعات کو ایک بار پھر جنیوا میں بھرپور قوت سے اٹھایا گیا تھا۔ Optional Clause اور General Act دونوں کو بہت سی ریاستوں نے قبول کر لیا تھا؛ عہد نامے پر نظر ثانی شروع کر دی گئی تھی، تاکہ اس میں Briand-Kellogg Pact کی مکمل دست برداری کو بھی شامل کر لیا جائے؛ Treaty of Financial Assistance اور Treaty for Strengthening the Means to Prevent War انجام کو پہنچ چکے تھے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اور Disarmament Convention دونوں ایک ساتھ نافذ کیے جائیں گے، جو باقاعدہ منظم اور تعمیری نظام امن کے ناگزیر

عناصر تھے۔ عالمی اقتصادی بحران مستقل شدید ہوتا جا رہا تھا، سماجی اور قومی تنازعات جو مابعد جنگ حالات میں پوشیدہ تھے ابھر کر سامنے آ گئے تھے۔ ان قوتوں کے انداز کار کا ایک پہلو چین اور جاپان کے تنازعے کی شورش اور اس کے بعد لیگ سے جرمنی اور جاپان کی علاحدگی سے واضح ہو گیا تھا۔ ان علاحدگیوں کے ساتھ اور ان میں سے پیدا ہونے والے اندرونی اور بیرونی حالات محض تیز اور ڈرامائی تشریحات ہیں عالمی جیتانے پر قوتوں کے ٹکراؤ کی، جو اقتصادی مندی نے پیدا کیے تھے۔ ان قوتوں کے، چین جدوجہد کم یا زیادہ شدت کے ساتھ اور مختلف چیکروں میں، پوری دنیا میں اور ہر ملک کے اندر جاری ہے۔ اور عالمی امن کا مستقبل اس جدوجہد کے نتیجے پر منحصر ہے۔

تو اب یہ صورتِ حالات ہم سب کو درپیش ہے جو امن کے خواہاں ہیں اور اس کو یقینی بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے بغیر کسی خوش آمدی یا مایوسی کے، بلکہ ایک سنجیدہ حقیقت کے جذبے کے ساتھ یہ کہنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل، سوال یہ ہے کہ عالمی اور دیر پا بنیاد پر امن کو مضبوط کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے اور ایسے امن کے ضروری عناصر کیا ہوتے ہیں؟ اب ہم موجودہ حالات کے سیاسی پہلو کی طرف آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی اقتصادی صورت کو اس کی سیاسی خصوصیات سے مکمل طور پر الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے برعکس، موجودہ حالات کی نمایاں صفات کے عناصر یہ ہیں کہ اقتصادی سوالات بالآخر عوامی زندگی اور سیاست پر حملہ آور ہو گئے ہیں جن کو روکا نہیں جاسکتا۔ اقتصادی قوم پرستی کی طرف پیش قدمی عام قوم پرستی کے احیا کا صرف ایک حصہ ہوتی ہے۔ کچھ ریاستوں میں تو جنگجو قوم پرستی آمریت کی حدود میں پھنسی گئی ہے، جس کو کامل آمرانہ کیفیت اور جنگ کی متانت کا مسلک کہہ سکتے ہیں۔ ایک معاملے میں تو جارحیت اور بیوقوفی ہو بھی چکی ہے۔ ایسے حالات کچھ ریاستوں میں ترکِ اسلحہ جات اور جنگ کے خلاف مشترکہ اقدام کی ذمہ داریوں سے پہلو تھپی کی بنا پر ممکن ہوئے ہیں۔ یہ ناکامی اس حقیقت کی بنا پر ہوئی ہے کہ قوم پرستی کا اعادہ ایک یا دو ملکوں تک ہی محدود نہیں رہا ہے، بلکہ خاصا عام ہو گیا ہے۔ اقتصادی کسادبازاری کے سال، سیاسی رد عمل کے سال ہو گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اقتصادی بحران نے امن کا عالمی بحران پیدا کر دیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ 1931 ستمبر کے بعد سے دنیا عہد نامے کے مکمل خخل اندازوں اور جزوی حمایتوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ بھی ہے اور مصوغی سادگی بھی، مگر بد قسمتی سے، یہ کلی غلط بیانی بھی نہیں۔ ایک خیال، جس کا اظہار نمایاں مدبروں نے کیا ہے، یہ ہے کہ ہمیں ایک مکمل اجتماعی نظام بنانے کا خیال ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ تقریباً ہر ملک میں ایسے عناصر موجود ہوتے ہیں جنہیں ایسے نتائج پسند ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ طاقت کے توازن کی سیاست کی طرف واپس آنا چاہتے ہیں، یعنی بے روک ٹوک اور مادر پدر آزاد اسلحہ بندی اور جنگی تیاریوں کی طرف۔ مگر رائے عامہ جنونی انداز میں [اس خیال پر] قائم ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں پچھلے پندرہ برسوں کے تمام وعدوں اور توقعات سے دست بردار نہیں ہوگی۔ کہ میرے ملک میں رائے کی یہ بغاوت ایک حتمی حقیقت بن چکی ہے، اور میرے خیال میں ہر جگہ ایسے ہی حالات پیدا ہو گئے

ہیں۔ ہمارے لوگوں نے چار برس کی جنگ جھپٹی ہے، صرف اس لیے کہ انھیں بتایا گیا تھا کہ ان کے دکھ انسانیت کو ہمیشہ کے لیے جنگ کی آفت سے نجات دلا دیں گے۔ اس خوف ناک غرے کے بعد کے پندرہ برسوں میں، ہمارے سیاست دان، مدبرین اور جماعت کی رائے کے رہنما اور مذہبی تنظیموں کے قائدین یہ بتاتے رہے ہیں کہ صرف لیگ کی برقراری اور مضبوطی سے ہی دنیا جنگ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کی امید کر سکے گی۔ لہذا، ان کوششوں کو چھوڑنے اور ان تمام وعدوں کو بھول جانے کے بجائے، رائے عامہ بے حد راضی ہونے کے قریب ہے، ان لوگوں سے، جو ایک بار پھر ہم کو اور ہمارے بچوں کو کھنڈر میں پہنچانے والے ہیں۔

ہماری سب سے پہلی اور اہم ضرورت بلا شک و شبہ تمام دنیا کی قوموں سے سیاسی تعاون ہے۔ اس کا کوئی موثر متبادل نہیں۔ اگر قومیں طاقت کے توازن کی پالیسی کی طرف واپس جانا چاہتی ہیں، اور اس خیال سے وہ مسلح گروہوں میں تقسیم ہو جانا چاہتی ہیں کہ ہر گروہ اپنے مخالف سے زیادہ اسلحہ جمع کر لے۔ تو اس قسم کی پالیسی سے شبہات اور بدگمانیاں بڑھیں گی جس کے نتیجے میں تباہی ہی تباہی ہوگی۔ بین الاقوامی تعاون کی پالیسی لیگ کو اس حیثیت میں تبدیل کر دے گی جو اس کے بنائے والے چاہتے تھے، یعنی، دنیا کے لیے امن کی یقینی ضمانت۔ جب تک قومیں لا قانونیت کی کیفیت میں رہتی ہیں، اور اگر ہر قوم اپنے حقوق کا خود فیصلہ کرتی رہتی ہے، تو یہ [ضمانت] میسر نہیں ہو سکے گی۔

عالمی امن کے مسئلے کی تنظیم کے لیے ہمیں قانون کی حکمرانی قائم کرنی ہوگی۔ قوموں کو بین الاقوامی سطح پر منظم ہونا، شراکت داری کرنا اور کسی حد تک اپنی قومی حاکمیت کو عالمی اداروں اور ذمے داروں کے ماتحت کرنا پڑے گا۔ [صرف] اسی طرح جماعتی پیرس کا وجود حقیقی ہوگا کہ تمام قوموں کو ہر قسم کے تنازعے کو پرامن طریقے سے حل کرنا، جنگ کے ہر خطرے کو ایک مشترکہ فکر سمجھنا اور جنگ کو بین الاقوامی جرم سمجھنا پڑے گا۔

اب میں ایک منظم امن کے دو مشکل پہلوؤں کے مسائل پر بات کرنا چاہتا ہوں: پہلا سوال تحفظ کا ہے اور دوسرا مساوات کا۔ ترک اسلحہ جات کے تین سالہ تجربات سے میں قائل ہو گیا ہوں کہ عالمی اور دیر پا امن کے لیے ان دو نکات کا بندوبست ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ جنیوا میں موجود قوموں کی اکثریت اس خیال کی کیفیت کی تصدیق کرے گی۔ 11 دسمبر 1932 میں پانچ طاقتوں — ریاست ہائے متحدہ، فرانس، جرمنی، اطالیہ اور میرے ملک — کے درمیان ہونے والے معاہدے میں یہ طے پایا تھا کہ ترک اسلحہ جات کا کنونشن تمام ریاستوں کے لیے براہ راست کی بنیاد پر تحفظ کے انتظام کا انتظام کرے گا۔ مگر یہ نہیں کہا گیا تھا کہ مساوات کے حقوق کیسے حاصل کیے جائیں گے یا ریاستوں کے تحفظ کو کس طرح مستحکم کیا جائے گا۔

کیا اس سوال سے کہ جرمنی کو جنیوا کے بین الاقوامی ادارے میں واپسی اور ترک اسلحہ جات کانفرنس میں دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھنے پر راضی کر لیا جائے، ان دو مسائل کا بندوبست ممکن ہو جائے گا۔ جہاں تک حقوق کی براہ راست کا سوال ہے، تو حالیہ مہینوں میں بہت سے حلقوں میں اس کے اطلاق کے بارے میں اس بنیاد پر اعتراض اٹھایا گیا ہے کہ ہٹلر کی حکومت پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے، اس امر پر بھی زور دیا جانا ضروری

ہے کہ احساس کمتری حکومت کے ارکان تک ہی محدود نہیں بلکہ پوری جرمن آبادی پر طاری ہے۔ نیکس ٹرک اسلحہ جات کی کانفرنس کے ابتدائی مرحلوں پر ڈاکٹر برہنگ (Brühning) کا بیان یاد دلانا چاہیے گا۔ انھوں نے کہا تھا ”کانفرنس کے سامنے ان تجاویز کو پیش کرنے کے ذریعے جرمن حکومت یہ جتا دینا چاہتی ہے کہ جرمن حکومت کسی کنونشن کو قبول نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس کے تمام دفعتات دستخط کرنے والی تمام ریاستوں پر مساوی انداز میں لاگو نہیں کیے جائیں گے۔“ اس سلسلے میں یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ چانسلمر ہٹلر ڈاکٹر برہنگ کی تجاویز سے کم کوئی چیز قبول نہیں کر سکتے۔

حقوق کی برابری کے اس سوال سے منسلک معاملہ قومی تحفظ کا بھی ہے۔ کانفرنس کے طویل مباحث میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ریاستیں اس وقت تک اپنے اسلحے میں کمی کے لیے تیار نہیں ہیں، جب تک کہ طاقت کے استعمال کے بغیر تنازعات کے حل کرنے کے حتمی وعدے نہیں کیے جاتے، اور جارحیت کرنے والوں یا جنگ بازوں کے خلاف، معاہدوں کی پابندی کے لیے، ہمارے ارکان تن کر کھڑے نہیں ہو جاتے۔

گویا، صحیح معنوں میں ٹرک اسلحہ جات، لیگ آف نیشنز کے اجتماعی نظام امن کی بنیاد کے علاوہ ممکن نہیں۔ ٹرک اسلحہ جات کانفرنس نقطہ ارتکاز بن چکی ہے ایک بڑی جدوجہد کا، لا قانونیت اور عالمی نظام کے درمیان، ان کے درمیان ہوتے ہوئے کے لیے تیار ہیں اور وہ جو اپنے معاملے میں خود ہی منصف بھی ہوں گے ان کے درمیان جو گزیرے مسلح تنازعے کے بارے میں سوچتے ہیں اور جو ایک دیر پا عالمی امن قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔ اسمبلی میں اپنی پہلی تقریر میں مسٹر توئی نوو (Luvinov) نے واضح کر دیا تھا کہ ٹرک اسلحہ کانفرنس میں سوویت یونین کا تجربہ اور اجتماعی نظام امن کے استحکام کی بے چین خواہش لیگ میں داخلے کے فیصلہ کن عناصر ہوں گے۔ ریاست ہائے متحدہ اور لیگ کے درمیان مرکزی رابطہ ٹرک اسلحہ کانفرنس ہے۔

ریاست ہائے متحدہ اسلحے کی تجارت پر قابو رکھنے کے ایک کنونشن قائم کرنے کی ترغیب دی اور پیش کش کی ہے کہ ٹرک اسلحہ جات کانفرنس میں لیگ کے ارکان کے ساتھ عدم جارحیت کا معاہدہ کر لیا جائے تاکہ وہ جنگ کے خطرے کو ختم کرنے کے لیے کاؤٹیل اور اسمبلی سے تعاون کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے مزید ضمانتیں دینے کی پیش کش کی ہے کہ ریاست ہائے متحدہ اس ملک کے خلاف پابندیاں لگانے کی مخالفت نہیں کرے گی جس کو ریاست ہائے متحدہ خود بھی جارح گردانتی ہو۔

پہلے قدم کے طور پر ٹرک اسلحہ جات میں برابری کے لیے امن معاہدوں میں شامل مرکزی طاقتوں کو [اپنے] ممنوعہ اسلحوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ یہ کام اسی وقت ممکن ہوگا جب اس کے بدلے میں گمرانی کا ایک مکمل نظام قائم ہو اور سفارتی، اقتصادی اور مالیاتی ضمانتیں ہوں کہ ٹرک اسلحہ جات کے کنونشن میں طے شدہ اصولوں پر عمل کیا جائے گا؛ عدم جارحیت کا ایک معاہدہ ہو جس میں جارحیت کی تعریف بیان کی گئی ہو اور اس کو لیگ کی لگائی جانے والی پابندیوں سے مربوط کیا گیا ہو؛ اسلحے کی تجارت کی سخت بین الاقوامی گمرانی ہو اور اسلحے کے لیے بجٹ پر حد مقرر ہو؛ اور Protocol کا عہدہ کر رکھا جائے۔ یعنی عہد نامے کی دفعہ 16 کی لوکارنو

تشریح کی جائے، ایک بین الاقوامی پولیس قائم کی جائے اور شہری ہو یا زنی کو بین الاقوامی بنایا جائے۔ ان میں سے زیادہ تر تجویز کانفرنس میں چند حکومتوں نے پیش کی ہیں۔ اب ترک اسلحہ جات کے قاعدہ کو ترک کیے بغیر ممکن ہے کہ اجتماعی نظام امن کی تشکیل کو ترک کیا جاسکے۔ ایک طرف تو، عام طور پر یہ احساس ہو چکا ہے کہ جب تک اسلحے میں کمی، حد بندی اور بین الاقوامی کنٹرول نہیں ہوگا نئے جھڑپوں کی دوڑ حاوی ہو جائے گی اور بالآخر اجتماعی امن کا نظام ٹوٹ پھوٹ جائے گا، اور دوسری طرف، اسلحہ کی دوڑ کو روکا جاسکے گا اور ترک اسلحہ جات کی شروعات ہو سکے گی [مگر] صرف اس وقت جب عہد نامے کے دفعات 10 اور 16 کی بنیاد پر تمام ریاستیں مل کر ایک مستحکم دفاعی نظام قائم کرنے پر تیار ہوں۔

عالمی اور دیر پا امن کی ایک اور اہم ضرورت سماجی انصاف ہے۔ International Labor Organization کا آئین، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، لیگ آف نیشنز کے ساز و سامان کا حصہ ہے، کہتا ہے کہ آفاقی امن صرف سماجی انصاف کی بنیاد پر ہی قائم کیا جاسکتا ہے۔ آگے بڑھ کر یہ اضافہ کرتا ہے کہ مزدور کے موجودہ حالات میں بے شمار لوگوں کے ساتھ ایسی نا انصافی، بے نصیبی اور تنگ دستی ہوتی ہے کہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا اضطراب امن کو اور دنیا کی ہم آہنگی کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ گویا، امن کی جدوجہد میں دنیا کے تمام ملکوں کے لیے آزادی اور انصاف کی جدوجہد بھی شامل ہوتی ہے۔ یہ ہے پوری دنیا کے حالات کی بنیاد اور پس منظر جس کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔

میں آخر میں یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ ہم مکمل ترک اسلحہ جات کے آدھے راستے پر ہی رُک جائیں اور لیگ کے لیے ایک پولیس کا محکمہ قائم کر دیں؟ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے لیے ایک ایسی لیگ وجود میں ہو جو عالمی اقتصادی زندگی اور عالمی فوج پر قابو رکھے، تو صاف بات تو یہی ہوگی کہ ہماری بنیادی خواہش دراصل ایک عالمی دولت مشترکہ کی ہوگی، اس سے کم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ مستقبل کے لیے ایک عالمی دولت مشترکہ کا قیام ہی عالمی جنگ کا متبادل ہوگا۔ نفسیاتی رُکاوٹیں بہت بڑی ہیں مگر ایسی نہیں کہ ان کو مرنہ کیا جاسکے۔ دنیا میں قوموں پر مشتمل ایک ایسا گروہ موجود ہے جس کے درمیان ہمیشہ کے لیے جنگ کا امکان نہیں ہو سکتا۔ یہ قومیں برطانوی دولت مشترکہ، ریاست ہائے متحدہ اور بچ جانے والی یورپی جمہوریتیں ہیں۔ میں ان میں سوویت یونین کے گروہ کو بھی شامل کریں گا، جس نے اپنا بین الاقوامی پالیسی سے واضح کر دیا ہے کہ وہ امن چاہتا ہے، جنگ سے کراہت رکھتا ہے اور سنجیدگی سے ایک مثالی عالم اتحاد و تعاون پر یقین رکھتا ہے، حالاں کہ اس کے خیال میں مستقبل میں موجود سماجی نظام میں دور رس تبدیلیوں کے بغیر اس قسم کا بندھن ناممکن ہوگا۔ جسے خوش حال زندگی کہا جاتا ہے، اس کے لیے جمہوریتیں ایک مخصوص موقف رکھتی ہیں۔ اور ان کا تصور جنگ یا مکمل آمرانہ ریاست سے میل نہیں کھاتا۔ میرا خیال ہے کہ مغربی جمہوریتیں جن اقدار کو تمدن کے لیے ضروری سمجھتی ہیں وہ ایسی دنیا میں باقی نہیں رہ سکتیں جو قوم پرستی کی بین الاقوامی لاقانونیت، اور اقتصادی لاقانونیت کے حوالے کر دی گئی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ

ہمیں سماجی انصاف کی بنیاد پر دنیا کے اتحاد کے ذریعے ان دونوں قوتوں سے جتنے فائدے ممکن ہوں حاصل کرنے چاہئیں اور ان کو ایک مشترکہ بھلائی کے ماتحت گردینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے پاس لیگ آف نیشنز اور International Labor Organization ایسے ادارے ہیں جو ایسی پالیسی کے بارے میں سوچ بھی سکتے ہیں اور اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں۔ دنیا آج ایک عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ عالمی جنگ کی شروع کی ہوئی بے ترتیبی یا تو پورے تمدن کو تباہ کر دے گی یا نئی نوع انسان کو ناقابل تصور بہبود اور خوش حالی کی بلندی پر فائز کر دے گی۔

میں نے جس پالیسی کا خاکہ بنانے کی کوشش کی ہے وہ بڑی جرأت آمیز اور دور رس ہے۔ ایک عالمی دولت مشترکہ کی بنیاد رکھنا آسان اور معمولی کام نہیں ہوگا، بلکہ شاید یہ انتہائی اور اتنا مشکل کام ہوگا جو کبھی کسی گستاخ ترین انسانی ذہن میں بھی نہ آیا ہوگا۔ مگر یہ ایک فرض ہے جو ضرورت بن گیا ہے۔ یہ وہ عظیم کام ہے جو جدید دنیا کی بنیادی حقیقتوں میں بیوستہ ہے۔ اگر ہمارا مغربی تمدن اب بھی نیک نہاد ہے اور ہم جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسا ہے۔ تو ہمیں ہمت کر کے، دنیا کے لیے ایک چیلنج کی طرح، امن کے لیے ایک متبرک جنگ کے بلاوے کی طرح اس پالیسی کا اعلان کر دینا چاہیے۔ دنیا کے نو جوانوں کے لیے اس سے بہتر اور عالمی شان مقصد اور کیا ہو سکتا ہے کہ۔ صوفیوں کے پرانے خواب اور فرامندی سے۔ اس دور کے لیے ایک عظیم عالمی دولت مشترکہ قائم کی جائے جو انسانی بھائی چارے کی ایک قابل دید تجسیم ہو۔



سرنارمن انجیل اعلان تجلیل

جس طرح دوسرے کام کے میدانوں میں انسان کوشش کرتا ہے، امن کے لیے کیے جانے والے بین الاقوامی کام میں بھی محنت کو ان کی اقسام کے مطابق تقسیم ہونا چاہیے، یعنی تقسیم محنت ہونی چاہیے عملی کام کرنے والوں میں اور تعلیم دینے والوں میں۔

مسٹر آر تھر ہنڈرسن (Arthur Henderson) عملی کام کرنے والوں میں سے ہیں، ایک مدبر کی طرح، جو امن کے لیے منصوبے بناتا ہے اور ان کی قبولیت کے لیے راستے ہموار کرتا ہے۔ سرنارمن انجیل، جنھیں 1933 کا امن انعام دیا گیا ہے، تعلیم دینے والوں میں سے ہیں، جو اس رائے عامہ کو تعلیم دیتے ہیں، جو اصلاحات کے لیے راستے ہموار کرتی ہے اور مدبرین جن کو نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تعلیمی کام میں ان کا حصہ بنیادی اور بڑی رسوخ والا ہے۔

رالف نارمن انجیل لین (Ralph Norman Angell Lane) ایک کسان کے بیٹے ہیں، جو آنے والے بڑے دن کے بعد والے دن [جس کو باکسنگ ڈے کہا جاتا ہے] سناٹھ برس کی عمر کو پہنچ جائیں گے۔ ان کی صحت کبھی بہت اچھی نہیں رہی، اور نو جوانی کے دنوں میں کئی برس وہ کیلی فورنیا (California) میں رہے ہیں۔ اس طرح وہ ریاست ہائے متحدہ اور امریکی رائے عامہ سے رابطے میں تھے جس کو تمام عمر انھوں نے قائم رکھا ہے۔ پھر وہ صحافی بن گئے، اور پہلی بار جب میں ان سے ملا تھا جس کو میں برس کا عرصہ گزر گیا ہے وہ [اخبار] ڈیلی میل (Daily Mail) کے بزنس منیجر تھے اور کئی برس سے فرانس میں مقیم تھے۔ دنیا کی تین بڑی طاقتوں کی رائے عامہ سے وہ بہت قریب رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ منتخب کام کے لیے نہایت موزوں آدمی ہیں۔

مجھ یاد ہے کہ وہ اکثر اصرار کیا کرتے تھے کہ وہ جنگ باز اخبار کے مدیروں میں سے نہیں ہیں۔ انھوں

نے مجھے اپنے کام کے بارے میں بتایا تھا کہ ان کی ذمہ داری محض کاغذ اور چھپائی میں استعمال ہونے والی روشنائی خریدنا تھا۔ ایک دن انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا کہ شہنشاہ اخبارات لارڈ نارمن کلف (Northcliffe) سے ان کے اچھے تعلقات تھے ”اور اس طرح اکثر، جب ممکن ہوتا ہے، میں اپنے اخبار میں کچھ شہید و چیزیں شامل کر دیا کرتا ہوں۔“

نارمن اینجل اس وقت تک ایک مشہور ادیب بن چکے تھے۔ ان کی پہلی کتاب Patriotism under Three Flags، 1903 میں شائع ہوئی تھی، جس نے جنوبی افریقا کی جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل پر بحث شروع کی تھی، مگر جسے بہت سمری طور پر لیا گیا تھا۔ پھر 1909 میں انہوں نے چند سو صفحات کی ایک اور کتاب ”Europe's Optical Illusion“ لکھی اور پھر ایک دن وہ صبح سو کراٹھے تو خود کو مشہور و معروف پایا۔ کبھی کبھی ایک کتاب کی شہرت اتفاقیہ نہیں بھی ہوتی۔ نارمن اینجل کی [دیوہری] کتاب لارڈ ایشر (Escher) کے ہاتھ لگ گئی جو ہائی کورٹ میں افسر اور شاہ ایڈورڈ کے دوست تھے۔ اور لارڈ ایشر نے ضروری جانا کہ یہ کتاب مشہور ہو۔ ایک کے بعد دوسری اساتذتیں ہوتی رہیں، اور بعد کے سال 1910 میں نارمن اینجل نے، جزوی طور پر نظریاتی کیا ہوا، مگر خاصے اضافے کے ساتھ، ایک نیا ایڈیشن شائع کیا۔ The Great Illusion لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئی اور پچیس غیر ملکی زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے۔

غیر معمولی بات یہ تھی کہ لارڈ ایشر کے محتاط مگر مؤثر پروپیگنڈے نے نارمن اینجل کے خیالات پر ایک دولت مند آدمی کو لبھا لیا۔ اس کو عطیہ دینے والے کو Garon Foundation نام کے فنڈ میں عطیہ دینے پر راضی کیا۔ یہ فنڈ عطیہ دینے والے کے نام سے ہی بنایا گیا تھا، اس منصوبے کے ساتھ کہ نارمن اینجل کے خیالات کو تحقیق، خطبات اور اساتذتوں کے ذریعے جانا جائے۔

وہ کیسا ”Great Illusion“ ہے نارمن اینجل جس کا دھماکا کہا جا رہا ہے؟

اگر ان کے محدود بلکہ ناقافی الفاظ میں اس کو بیان کیا جائے تو اس طرح کہا جائے گا: بین الاقوامی تنازعات کو حل کرنے کے لیے جنگ بالکل ناقافی طریقہ ہے؛ جنگ سے کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوتا، فتح پانے والوں کو بھی، اقتصادی اعتبار سے تو بالکل بھی نہیں۔ کچھ نمائندہ طریقوں سے جانچ کرنے کے بعد ادیب اس نظریے کی حمایت کرتا ہے: اگر جنگ ایک فتح پانے والی جنگ — اقتصادی طور پر فائدہ مند ہوتی تو بڑی طاقتوں کے تمام باشندے جنہوں نے فتح کی ہوئی جنگوں کے ذریعے عالمی سلطنتیں قائم کر لی ہیں، چھوٹی اور جنگ سے کنارہ کش ملکوں کے باشندوں سے زیادہ فائدے میں ہوتے۔ ان دو قسم کی قوموں کی مالیات کی شماریات ثابت کرتی ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ روس کے علاوہ، ولندیزی اور سویڈش، سوئس اور نارویائی جمہور عالمی بازار جمہور میں برطانیہ کے ہزاروں کے، جرمنی کے مقابلے میں زیادہ قیمت رکھتے ہیں۔

اینجل سوال کرتے ہیں کیا جنگ سے تجارت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور خود ہی جواب دیتے ہیں: نہیں

کار کی دنیا میں پیداوار اسی وقت دولت بنتی ہے جب آپ اس کو فروخت کر دیں۔ جنگ جو آپ کے گاہکوں کی خواہ وہ فاتح قوموں کے باشندے ہوں یا مغلوب کے، مفلس کر دیتی ہے، جنگ، جو تجارت کا گلاٹھیں دباتی مگر مصنوعات کو بے قیمت کرنے کی غرض سے مزاحمت کرتی ہے، ہر طرح وہی سارا منافع کھا جاتی ہے۔ اس کتاب کا سب سے زیادہ معقول چھٹا باب ہے جس کا عنوان ہے The Indemnity Fund۔

اس موقع پر میں اپنی تاریخ نگاری میں ایک چھوٹی سے جست لگانا چاہوں گا۔ پچھلے برس، اپنی کتاب کی پہلی اشاعت کے چوبیس برس بعد، مارٹن آٹھل نے ایک غیر معمولی تجربہ کیا تھا۔ انھوں نے اپنی 1910 کی کتاب پر، ایک تعارف اور پس نوشت کے اضافے کے ساتھ، دوبارہ نظر ثانی کی تھی۔ جب وہ تقریباً ساٹھ برس کے ہو چکے تھے تب انھوں نے اپنی نوجوانی کے کام میں ترمیم کی اور اسے نئی نظر سے پرکھا۔ کچھ باب انھوں نے دوبارہ تحریر کیے، محض تراش فراش کے لیے نہیں، بلکہ ان کا خلاصہ بیان کرنے اور حال تک لانے کے لیے۔

مگر اس میں ایک باب تھا جو حرف بہ حرف اسی طرح چھاپا گیا تھا، جیسا کہ 1910 میں تھا۔ وہ [یہی] چھٹا باب تھا The Indemnity Fund۔ مارٹن ہمیں بتاتے ہیں کہ جب پہلی بار کتاب شائع ہوئی تھی تو، دراصل، اس باب کے پورے نظریے کی بنیاد پر شدید تنقید کی گئی تھی؛ اور دراصل اس کو ایک انگریز اور ایک فرانسیسی ماہر معاشیات نے رد کر دیا تھا۔ اس تنقید نے ان کے اپنے نظریے کی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اتنا، کہ بعد کی اشاعتوں میں انھیں اپنے نکسے کا جواز پیش کرنا پڑ گیا تھا۔

اب — جب کہ ہم اس کا تجربہ کر چکے ہیں جس کو مسٹر کنو (Keynes) نے The Economic Consequences of the Peace کا نام دیا ہے — مارٹن آٹھل کا خیال ہے کہ وہ، حرف بہ حرف، وہی کچھ شائع کر سکتے ہیں جو انھوں نے 1910 میں لکھا تھا؛ یعنی، جنگ سے ہونے والے نقصانات کی ضمانت دینا کاروباروں سے کم نہ ہوگا۔ ایسی ضمانت جس کو اس وقت تک ادا نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ قرض خواہ اس کو برآمدات کی صورت میں قبول کرنے پر تیار نہ ہو اور [اس بات کا قوی امکان ہے کہ] اس قسم کی ادائیگی کے خلاف باشندے اس کو "dumping" کا نام دے کر شدید احتجاج کریں گے جو حفاظت پرست محصول کی صورت میں ان کے مفاد میں لازم قرار دیا گیا ہے۔

"حقائق" کے لیے — یا مزاحیرا لیے — نے مارٹن آٹھل کے خیالات کو جائز ثابت کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی دلیل کی بنیاد فاتح جرمنی کی معیشت کے اچھے المہماک نتائج پر رکھی ہے کہ جرمنی نے 1870/1871 کی فرانسیسی جرمن جنگ کے نقصانات کے پانچ ہزار ملین طلائی فرانک عوض ادا کیے تھے۔ ماہرین نے ان کی دلیل کو رد کر دیا تھا۔ اب جرمنی کے ادا کردہ 225 ہزار ملین طلائی سکوں کا سہرا بی بلبہ ہماری آنکھوں کے سامنے بھوٹ چکا ہے۔ اب ہم سب کے خیال میں مارٹن آٹھل صحیح کہہ رہے ہیں۔ اور وہ اس بات کو بغیر کسی بیزاری یا تکبر کے، قدرے مایوسی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ دیتے ہیں۔

اب میں اپنے تاریخ وار دھماکوں کو سمیٹتا ہوں اور ان کے اہم ترین کام کی پہلی اشاعت کی طرف آتا چاہوں گا۔

اس عظیم مراب نے ان لوگوں میں جنہوں نے سرسری طور پر کتاب پڑھی ہے (یا صرف اس کے بارے میں سنا ہوگا) ایک اور مراب پیدا کر دیا ہے۔ چوں کہ نارمن اینجل نے جنگ کو احمقانہ فعل اور ناقص کاروباری مسئلہ ثابت کر دیا ہے، بہتوں نے ان کے اس بیان سے یہ سمجھ لیا ہے کہ اب یورپ میں جنگ نہیں ہوگی۔ نارمن اینجل نے بڑی شہ دہ سے اس تشریح کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ انہوں نے سوال کیا ہے کہ ”پھر میں جنگ کے خلاف اتنی لڑائی کیوں لڑ رہا ہوں؟“ تو پھر، جنگ مخالف لوگ بے مقصد اور ناپسندیدہ کام کرنے پر کیوں اصرار کرتے ہیں، اگر انہیں یقین ہے کہ اب جنگ کبھی نہیں ہوگی؟ معقول لوگ کھلا دیوارہ نہیں توڑا کرتے!

The Great Illusion کا آخری باب خارجہ پالیسی کو جنگ سے بین الاقوامی تعاون میں تبدیلی کرنے کا معقول حذر پیش کرتا ہے۔ اگر یہ نہیں کیا جاتا تو ان کے مطابق، جنگ ناگزیر ہوگی۔ اس حقیقت کے باعث، کہ ہم لوگ بین الاقوامی انحصار باہمی کی دنیا میں رہ رہے ہیں، یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم باہمی تعاون کے بندھن کی بنیاد پر بین الاقوامی کمیونٹی کی مناسب تنظیم کریں، علاحدہ قومی دفاع کے اصول کو ترک کر دیں اور مشترکہ کوشش سے قائم کیے گئے ایک مقتدر ادارے کے ذریعے ایسا تحفظ فراہم کریں جو موجود بین الاقوامی لاقانونیت کا متبادل ہو سکے۔

نارمن اینجل ایک عظیم ادیب اور صحافی ہیں۔ وہ [طرح طرح کے] کتابچے بنانے کی عظیم ترین نعمت سے مالا مال ہیں، ایک ہی بات کو بار بار کہنے، مگر نئے انداز سے کہنے کی نعمت سے، جس میں نئی نئی اور موزوں مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان کا تقابل سٹیفٹ (Switt) اور کابڈن (Cobden) سے کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بلند درجے کی ستائش ہے، مگر ایسی ستائش جس کے وہ حق دار ہیں۔ [مگر] بنیادی طور پر یہ دونوں سے مختلف ہیں۔ ان میں سٹیفٹ کی جمعی کاٹ دار تحقیر نہیں ہے۔ نہ ان میں کابڈن کا جیسا ترغیب دینے والا امتنا طبعی جوش خطابت ہے، جو مزاروں کو اس کے جلسوں میں لاتا تھا اور جو انگلستان اور یورپ دونوں میں آزادانہ تجارت کا داعی تھا۔ مگر افسوس کہ یہ ایک مختصر مدت تک ہی رہا تھا۔

نارمن اینجل، سٹیفٹ اور کابڈن جیسے بلند درجے کے انسان ہیں۔ مگر ان میں مختلف قسم کا جوہر قافی ہے۔ وہ سٹیفٹ کی طرح شاعر نہیں، نہ کابڈن کی طرح کے مبلغ ہیں۔ نارمن اینجل براہ راست انسانی دانش سے باتیں کرتے ہیں۔ بہت ٹھنڈے مزاج کے اور صاف گو ہیں۔ وہ اپنے ادراک اور اپنی معقولیت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ بالآخر ایک دن عقل کا راج ہوگا، جب ہم فریب نظر اور دانش ورانہ غلطیوں کو دور کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ان کا یقین ہی عالمی جنگ کے دوران، المیوں کی تلافی میں اور مابعد جنگ کی تلخ مایوسیوں کے دوران

ان کا مددگار رہا ہے۔

اور ان میں ان کے عقائد کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ عالمی جنگ کی شروعات کے فوراً بعد ہی انہوں نے—موریل (E. D. Morel)، رامسے میک ڈونلڈ (Ramsay MacDonald)، چارلس ٹریویلیان (Charles Trevelyan) اور آر تھر پان سنبی (Arthur Pansanky) کے ساتھ مل کر Union of Democratic Control کی بنیاد ڈالی تھی، جو اس ششمن کا پہلا متنوع تھا جہاں سے آئینی امور میں خارجہ، عوامی اور پارلیمانی کنٹرول متعارف کرایا گیا تھا۔ وہ اور ان کے کامریڈ عوامی سطح پر بحث و تحقیق کے تعلیمی اثرات پر یقین رکھتے تھے کہ اسی طرح مرآب کی دھند اُڑائی جاسکتی ہے۔

1915 میں شائع ہونے والی کتاب Prussianism and Its Destruction میں انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ انسانی غلطیوں کو ٹھیک کرنے کے لیے جنگ موثر حربہ نہیں ہوتی۔ خیالات کو آپ بندوق کی گولیوں سے مار نہیں سکتے۔ اور انہوں نے یہ واضح کر دیا تھا کہ Prussianism یعنی پروشیائی عسکریت صرف جرمنی کے اندرون ہی کی مظہر نہیں۔ اس پر جرمنی کے حمایتیوں نے، جو ان کے ساتھیوں میں سے تھے، انہیں خوب برا بھلا کہا تھا۔

مارٹن ۱۶ مئی نے امریکا کے طویل سفر کیے جن میں مفکرین کے گروہوں کو یکٹھریے تھے ساتھ ہی وہ اپنے خیالات کی حمایت میں لڑائیاں لڑتے رہے۔ ان کا صدر ولسن (Wilson) سے رابطہ تھا اس دوران انہوں نے لیگ کی ترقیات کے سلسلے میں تبادلاً خیالات کیا تھا۔

جنگ کے بعد انہوں نے امن کے بنیاد پر ہونے والے، بالخصوص اقتصادی قول و قرار پر، اعتراض کیا تھا۔ 1929 سے 1931 تک وہ لیبر پارٹی کے رکن کی حیثیت سے [برطانوی] دارالعوام میں مسٹر ہنڈرسن کے عقب کی نشست پر بیٹھتے رہے تھے۔ پچھلے چند برسوں میں، اپنی کتابوں اور خطبات میں انہوں نے اپنی کوششیں سماجی نفسیات کے کچھ مسائل پر مرکوز رکھی تھیں۔ 1932 میں شائع ہونے والی اپنی [کتاب] Unseen Assassins میں انہوں نے انسانی دماغ کے تعصبات اور غلط تصورات پر سے پردے اٹھائے تھے جن سے خود غرضانہ مفادات اور بوالہوی سیاست داں کھیلتے ہیں اور طاقت کی پالیسی اور جنگ کے خطرناک راستے پر لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ میں اس موقع پر وہ ایوان کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جو انہوں نے پچھلے برس اپنی کتاب The Intelligent Man's Way to the Prevention of War کے لیے لکھے تھے جو مجھے اوسلو کے کتب فروشوں کی کھڑکیوں میں رکھی نظر آئی تھی۔

بنی نوع انسان کا یہ بہت بڑا الیہ ہے کہ حقیقت اسے کم ہی نظر آتی ہے۔ گویا ہم سب کی آنکھوں میں "گلورین (حیاتی کیمیا سے بنے) آئینے کے ٹکڑے بیوست ہیں" (جس کی مثال سگریڈ انڈسیرٹ [Sigrid Undset] نے اپنی ایک کتاب میں دی ہے)۔ ہم، اصل حقیقت کو نہیں دیکھتے، بس وہی کچھ دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ پھر ہماری آنکھوں کے سامنے وہ دھند ہوتی ہے، وہی گھسی پٹی چیزیں ہوتی ہیں جو ہم

اپنے والدین، یا اپنے دادا پر دادا سے وراثت میں پاتے ہیں۔ عقلی طور پر ہم وہی لباس پہنے ہوئے ہیں جو ہمارے اسلاف نے اتار پھینکے تھے، اور ہمیں اس بات کا کوئی احساس نہیں کہ اب وہ ہم پر اچھے نہیں لگتے۔ اور ہمارے مدبرین، جو اپنی ضرورت کے پیش نظر اسی مادے پر کام کرتے ہیں جو مائے عامہ کے ذریعے لوگ بیچ دیتے ہیں، اسی دھند میں راستے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اسی اتارے ہوئے لباس کو زیب تن کیے رہتے ہیں، اگرچہ انصاف سے دیکھا جائے تو، انفرادی طور پر، بہتوں نے دھند سے پار اپنی آنکھیں کھول لی ہیں۔

نارمن اینجل بار بار اپنے استعارے ”دھند“ کو استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی کتاب The Great Illusion کے پچھلے ایڈیشن کے پہلے صفحے پر لکھا ہے: ”یہ کتاب اُس دھند کو صاف کرنے کی کوشش کرتی ہے جو نہ جانے کتنوں کو راستہ دیکھنے سے باز رکھتی ہے۔“

نارمن اینجل کے علاوہ چند ہی لوگ ہوں گے جنہوں نے ہم سب کی آنکھوں میں بیوست ”مگلو بن آئینے کے ٹکڑے“ کا لٹنے کی کوشش کی ہے، تاکہ وہ دھند جو ہمیں راستہ دیکھنے سے باز رکھتی ہے، صاف ہو جائے اور ہم [آگے کی طرف] قدم بڑھا سکیں۔ انہوں نے یہ کام انجام دے دیا ہے، اور مزید کرتے جا رہے ہیں اس لیے کہ انہیں بنی نوع انسان پر پورا یقین ہے، جس کو انہوں نے اپنی ایک اور کتاب میں ”بنی نوع انسان کی زیر دست معقولیت“ کہا ہے۔

خدا کرے کہ ان کی خوش امید کی کا بھرم رہ جائے۔

نارمن اینجل کی نوبیل کمیٹی کے رکن Christian Louis Lange کی زبانی

خطبہ:

امن اور عوامی ذہن

میری خواہش ہے کہ سب سے پہلے میرے الفاظ اس اعزاز کے تشکر کے اظہار میں صرف ہوں جو نوبیل کمیٹی نے مجھے عطا کیا ہے۔ آپ کو میرے جذبات کا اس وقت کچھ احساس ہو جائے گا جب میں یہ کہوں گا کہ میرے پاس اپنے اس احساس کی ترجمانی کے لیے الفاظ نہیں، کہ میں نے اس مقصد کے لیے تیس برس جو محنت کی ہے اس کو اس طرح نوازا جائے گا۔ اور چون کہ، جو کچھ میں سوچ رہا ہوں اس کو بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں، میں بس اسی قسم کے نمائشی الفاظ پر قناعت کروں گا۔

میں نے اپنے آج کے موضوع کو ”امن اور عوامی ذہن“ کا عنوان دیا ہے، جس سے میری مراد مائے عامہ ہے، یا عوام کی مائے یا احساسات ہیں جن کا عمل دخل ان پالیسیوں میں ہے جن کی وجہ سے جنگیں ہوتی

ہیں، جس میں اس رائے عامہ کی خصوصیت کا مطالعہ ہے اور ان قلعٹیوں کا جنہوں نے ان کو پیدا کیا ہے۔ یہ کہنا بلاشبہ محض ایک بدیہی امر ہے کہ دوسری سماجی یا سیاسی برائیوں کی طرح جنگ بھی انسانی سوسائٹی کی بدانتظامی کا نتیجہ ہوتی ہے، جس کی بنیاد کچھ مخصوص غلطیاں یا خامیاں ہی ہوا کرتی ہیں۔ مگر ہمارا فرض اس قسم کی قلعٹیوں یا ناکامیوں میں امتیاز کرنا ہوتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ عالمی امن کی تیاریاں ابتدا ہی سے بگاڑ دی جاتی ہیں، اس لیے کہ مسئلے کا مرکزی تصور امن قائم کرنا ہوتا ہے، جنگ کے خوف ناک دکھوں کے احساس کو شدید کرنا ہوتا ہے۔

اس سے ہمیں زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ خواہش اور احساس تو موجود ہی رہتا ہے۔ لوگ سچ سچ امن چاہتے ہیں (جس میں اور بھی چیزیں شامل ہوتی ہیں، جیسے قومی دفاع)۔ مسئلہ دراصل امن کی تشکیل کے عمل میں شدت پیدا کرنے کا ہی نہیں ہوتا کہ وہ تو موجود میں ہوتا ہے کہ وہ کوشش کیوں باطل ہو جاتی ہے، کیوں وہ بدلیسیاں جن کا ارادہ امن ہوتا ہے جنگ پیدا کرتی ہیں، لوگ کیوں نہیں دیکھتے کی اس کا حاصل کیا ہوگا۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ امن کی خواہش حقیقی ہے، تو ہمیں اس سے منسلک ایک اور سچ کا علم ہو جائے گا: جنگ اس لیے جاری نہیں رہتی کہ لوگ بد نہاد، خود غرض اور لالچی ہوتے ہیں۔ یہ سرگز جاری نہیں رہ سکتی اگر دونوں جانب کے لاکھوں افراد قربانیاں دینے کے لیے تیار نہ ہوں، ایسی قربانیاں جو کوئی اور انسانی عمل اس حد تک طلب نہیں کرتا۔

جو قوت جنگ چاہتی ہے اسے بد نہاد آدمیوں کی دلچسپی رکھنے والی مفاد پرست نیتوں سے تولامنی نہیں ملتی، اس کو اچھے لوگوں کی لاپرواہیوں سے تولامنی حاصل ہوتی ہے۔ امن پسند لوگوں نے کبھی کبھی اس صداقت کو اس طرح نالا ہے کہ وہ مزین کو بہت بڑی رعایت دے رہے ہوں، گویا (جیسا کہ ہے نہیں) جنگ کو مرے سے ختم کرنے کے لیے ہمیں شرافت چھوڑ دینی ہوگی۔

بنیادی نیتیں، بلاشبہ، ان قوتوں میں ہوتی ہیں جو جنگ پیدا کرتی ہیں۔ بنیادی نیتیں ان میں ہوتی ہیں جو عظیم گرجا گھر اور اسپتال بناتے ہیں۔ یعنی منافع کے جو یا ٹھیکے داروں، ڈاکٹروں اور مذہبی رہنماؤں کے وابستہ مفادات۔ مگر یورپ گرجا گھروں سے بھرا ہوا تو نہیں ہے اس لیے کہ ٹھیکے دار پیسے بنانا چاہتے تھے یا مہلکین نوکریوں کے مستلاشی تھے۔ عام آدمی کو پینشن فی صد آمدنی ٹیکس کا سامنا نہیں ہوتا، وہ اسلحہ بنانے والوں کے مفادات کے لیے اپنے آپ کو موت اور معذوری کے لیے پیش کر دیتا ہے۔ تو وہ کیا شے ہے جو اس کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ قربانی کے لیے جنگ باز خداؤں کے حوالے اپنی دولت اور اپنی یا اپنے بیٹے کی زندگی کر دے؟

ہمیں اس تناقض کا ایمان داری سے سامنا کرنا چاہیے کہ جو دنیا جنگ کرتی ہے، وہ وہی دنیا ہوتی ہے جو حسب معمول، واقعی امن کی غماہاں بھی ہوتی ہے۔ جو بد ارادوں کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ امن جیٹ انگل، ان اچھے ارادوں کا نتیجہ ہوتی ہے جو قبل از وقت ناکام بنا دیے جاتے ہیں۔ اسے، عام طور پر، بد نہاد لوگ یہ سمجھ کر

نہیں شروع کرتے کہ یہ غلط ہوتی ہے، بلکہ یہ ان پالیسیوں کا نتیجہ ہوتی ہے جن کو خوش فہام لوگ بھی، عام طور پر، صحیح ہی سمجھتے ہیں۔

اس وقت پریش کا ایک بڑا حصہ اس بنیاد پر باقاعدہ طور پر لیگ آف نیشنز کی مخالفت کر رہا ہے کہ یہ ادارہ برطانیہ کو جنگ میں الجھا دے گا۔ یہ قیاس نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے کہ تہائی پسندی کے طرف دار اپنے پیشرو فرانس میں امن کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ ان میں اسے ایک گروہ نے حال ہی میں جنگ سے متعلق ایک عجائب گھر قائم کیا ہے تاکہ لوگوں کو براہ راست جنگ کی ہولناکیوں سے آگاہ کر کے لیگ کے خلاف ایک دہلی کے طور پر پیش کریں۔ اگر لیگ کو براہِ یاد کرنے کی ان کی پالیسی بالآخر جنگ پیدا کر دیتی ہے تو ان کا ارادہ ہی نہیں، بلکہ ان کا فیصلہ غلطی پر ہوگا، ان کے مقاصد نہیں، بلکہ ان کی شمولیت غلطی پر ہوں گی جن کے ذریعے ان کے مقاصد حاصل ہو سکیں۔ ہمارا مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ کن معنوں میں ان کا فیصلہ ناقص ہے (اگر ہم اس کو ناقص تصور کرتے ہیں)؛ تو میں کیوں ایسی پالیسیوں پر اکثر عمل کرتی ہیں جن کا ارادہ امن رہا ہو، مگر جن کا نتیجہ جنگ کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ تو، بھلا کیوں، اور کس طرح اس معاملے میں رائے عامہ غلطی پر ہوگی۔ جب تک ہم مشکل کے اس پہلو کا سامنا نہیں کرتے، امن کے لیے نئے منصوبے بنانے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا، اس لیے کہ منصوبے رد کر دیے جائیں گے۔ فرار کا راستہ تلاش کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اگر جنہیں ان کو استعمال کرنا ہوا نہیں یقین ہی نہ ہو کہ یہی بہتر راستہ ہے اور وہ اس کو استعمال کرنے سے انکار کریں۔ یہی ہماری جدید دہائی جمہوریتوں کا مسئلہ ہے کہ انہیں بہت سارے بتائے گئے طریقوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے، جن میں کچھ ایک دوسرے کے مخالف اور کچھ ایک جیسے ہوتے ہیں، اور کچھ اعلیٰ درجے کے تکنیکی ہوتے ہیں جن کی خوبی اور خرابی کا فیصلہ کرنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

مریضوں کو اس بات کا اندازہ ہونا چاہیے کہ ان کے معالج آپس میں شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ اور اگر عام آدمی کے لیے یہ مسئلہ ہو کہ وہ کس طرح [راستے کا] انتخاب کرے تو ایک ماہر مشیر کے لیے صرف یہی مسئلہ نہیں ہوگا کہ وہ فرار کا راستہ تلاش کرے؛ سب سے پہلے ان لوگوں کو طریقہ بتانا ہوگا جن کے فرار کے لیے راستہ تیار کیا گیا ہے، اور یہ بھی دکھانا ہوگا کہ کون لوگ کسی اور سمت سفر کر رہے ہیں، یہ دیکھنے کے لیے کہ یہی صحیح راستہ ہے۔

اس کے سوا، اس مسئلے کا ایک اور بھی پہلو ہے جسے نہ جانے کیوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہم اکثر یہ قیاس کر لیتے ہیں کہ کوئی اور آکر ہمارے مرض کا علاج تلاش کرے گا، کوئی نیا منصوبہ لائے گا، اور ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہی اصل علاج ہے اور ہم اسی پر عمل کرنے لگیں گے۔ ہم ہمیشہ قائد اور قیادت دونوں کے طلب گار رہتے ہیں۔ لیکن، اگر قائد کے بتائے ہوئے راستے کو اکثریت غلط سمجھنے لگے تو، وہ اعلان کر دے گی کہ یہ قائد نہیں، بھٹکانے والا ہے۔ ناگزیر طور پر، کسی جمہوریت میں قائد وہ ہوتا ہے جو

اپنے موجودہ عقائد کو صاف انداز میں بیان کر دے، جیسا کہ کسی نے کہا تھا: "the common mind to an uncommon degree."

یہ بھلائی اور طرح کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اکثریت کے عقائد — قومیت کی بنیاد پر دنیا کی تنظیم کی خواہش جیسے نکات پر اکثر اتفاق ہوا کرتا ہے، شجیدہ عقائد ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، یہ کبھی کبھی بے حد غلط ہوتے ہیں مگر مثبت افعال معتبر بھی ہوتے ہیں۔ قوم پرستی، تجارتی تحفظ، تجارتی نظام اور تمام شرابیاں جو یورپ کو برباد کیے ہوئے ہیں اور درہم برہم کیے رہتی ہیں، شجیدگی سے غلطی سمجھی جاتی ہیں۔ اکثریت کے نزدیک، وہ سچائیں ہیں اور اگر کوئی پیغمبر بھی ان سے انکار کرے گا تو اس کو سسکار کر دیا جائے گا۔

یہ کہا جائے گا کہ یہ سچ ہے کہ اکثر اس معاملے میں پڑھے لکھے لوگ متفق نہیں ہوتے، اکثر اختلاف کرتے ہیں۔ اور یہ کہا جائے گا کہ عام لوگ کس طرح فیصلے کر سکتے ہیں جب کہ ماہرین، یعنی ڈاکٹر، ان کو اس کے برعکس مشورہ دیتے ہیں؟ اس مقام پر میں ایک تشبیل پیش کرنا چاہوں گا۔ طب کے ڈاکٹر تقریباً ہر چیز پر اختلاف کرتے ہیں مگر کیا اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ عام لوگ طبی سائنس سے فائدے نہیں اٹھا سکتے ہیں؟ عام آدمی طب کی اس نادرست سائنس سے اس درجہ فائدے اٹھا چکے ہیں کہ دنیا کی قلب مابیت سی ہو چکی ہے۔ ہماری روزانہ زندگی میں اب طاعون اور گھٹیلوں والے وبائی امراض کا خوف باقی نہیں رہا ہے، کبھی جو یورپ کو تباہ کر دیا کرتے تھے۔ عام آدمی طب کے ماہرین کے علم کی مدد سے ان وبائی امراض کو ختم کر چکے ہیں۔ طبی ماہرین کے مطابق "ایسی چیزیں بہت نہیں ہیں جن پر متفق ہو چکے ہیں مگر کم از کم، ہم اس امر پر اتفاق کر چکے ہیں: اگرچہ ہم گہنی والے طاعون یا ہیضے کا علاج نہیں کر سکتے، مگر ہم انہیں روک سکتے ہیں، اس لیے کہ اب ہم یہ جان گئے ہیں کہ یہ امراض پانی اور موذی چھوٹے جانوروں کے ذریعے لگنے والے جرثیم (microorganism) کے باعث پھیلتے ہیں۔ گندے پانی کو پینے پانی سے پرہیز کیجیے، اور چھوٹے موذی جانوروں کو اپنے گھروں سے دور رکھیے اور آپ ان وبائی امراض کو روک سکتے ہیں۔" عام آدمی نے ان نکتوں کو سمجھ لیا ہے، ضروری اقدامات کر لیے ہیں اور یہ خوف ناک امراض غائب ہو گئے ہیں۔

لہذا، اگر ہمارے عوام الناس نے پچھلے بیس برسوں میں ان چند سماجی سچائیوں کا ادراک کر لیا تھا — کہ امراض کے جراثیمی نظریے کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں — تو کم از کم اقتصادی اور سیاسی گھٹلیاں جو ہماری نسل پر حاوی ہو چکی ہیں، ابھرنے نہ پاتیں۔

میں یہ نہیں کہنا چاہ رہا ہوں کہ ان سچائیوں کے اخلاق نے ہمارے مریضی اور سماجی مسئلے کو اسی طرح حل کر دیا ہوتا، جیسے کہ گھٹیلوں والے طاعون کا مسئلہ حل ہو چکا ہے، بلکہ ان مادہ ہی سچائیوں کے اخلاق نے ہمیں اس قائل بنا دیا ہوتا کہ ہم کم از کم جنگ جیسی سیاسی گھٹی سے بچ گئے ہوتے، اور اس طرح ہمارے مسائل بھی بڑے پیمانے پر کم ہو گئے ہوتے۔

ہم ناکام ہیں، علم کی کمی کہ وجہ سے نہیں، کہ ہم سرطان کا علاج نہیں ڈھونڈ سکتے ہیں، یا مریض سے رابطہ

نہیں کر سکے ہیں۔ بنیادی طور پر ہماری خرابیاں بین الاقوامی رشتوں کے علم کا اطلاق نہ ہونے کی وجہ سے ہیں، جو عملی طور ایک اتفاقی اثاثہ ہیں، ہم روزِ مزد کی زندگی میں جن کا تجربہ کرتے رہتے ہیں۔

میں کوشش کروں گا کہ چند لہجوں میں ایک ٹھوس مثال پیش کروں، مگر پہلے میں اس قانونی تعبیر پر بات کرنا چاہوں گا شاید جو آپ میں سے کچھ کے ذہنوں میں موجود ہو۔

ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رائے عامہ کا جنگ سے واسطہ نہیں ہوتا، کہ یہ تو وہ لوگ کہتے ہیں جو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسلحہ بنانے والے ادارے یا سرمایہ داروں کے گروہ۔ مگر جب ہم مان لیتے ہیں کہ مفادات رکھنے والے زیادہ دیاؤ نہیں ڈالتے، تو اصل سوال مزید پیچھے چلا جاتا ہے۔ اتنے مارے کروڑوں لوگ ایک معمولی سی اقلیت کے مقابلے میں، جن میں چند درجن یا چند سو لوگ ہوتے ہیں جو اس تباہی سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مجبور کیوں ہو جاتے ہیں؟ بے شک، ایسے کچھ لوگ ہیں جو کروڑوں سے یہ کہتے سنائی دیں گے کہ ”ہم چاہتے ہیں کہ تم جنگ کرو، اس لیے کہ اس سے ہمارے منافع میں اضافہ ہوتا ہے۔“ مگر کروڑوں ان کی تابع داری کیوں کرتے ہیں؟ ذرا غور کیجیے کہ عمارتیں بنانے کی صنعت میں، جس میں اسلحہ سازی کی صنعت سے کہیں زیادہ سرمایہ کاری ہوتی ہے، اور یہ بھی یاد رہے کہ بہت منافع ہوگا اگر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے شہروں کو آگ لگا دیں، آپ سے کہیں کہ نمہربانی کر کے اپنے گھر جلا ڈالیں۔“ ہم جانتے ہیں کہ وہ کروڑوں افراد ان کی بات نہیں مانیں گے۔ مگر چند اسلحہ بنانے والے کس طرح لوگوں کو جنگ کرنے پر اور اپنی جانیں دینے پر تیار کر لیتے ہیں؟ جب کہ یہ بالکل ناممکن ہوتا ہے کہ لوگ اپنی جائیداد خود تباہ کر لیں تا کہ صنعتِ تعمیر کے لوگ منافع کمائیں۔ صاف ظاہر ہے کہ گھروں کو خود جلا ڈالنا حتمیٰ فعل ہوگا، جب کہ جنگ شروع کرنے کے عمل میں کوئی احتمال نہ بات نظر نہیں آئے گی۔

یہ حقیقت ہمیں مسئلے کے مرکز کے قریب تک لے جاتی ہے کہ انسانی ذہن میں ایسی کون سی نیت ہوتی ہے جو اسے جنگ کی طرف کامیابی سے راغب کر دیتی ہے؟

جنگ کی ابتدا کرنے سے قبل عوام کی اکثریت کو بہت سے ضروری اقدام کرنے ہوتے ہیں، جو بظاہر نہ جبراً ہوتے ہیں اور نہ کیے جاسکتے ہیں۔ پارلیمان اور کانگریسوں میں بحری اور بڑی افواج کے اخراجات کے تخمینوں پر رائے شماری ہوتی ہے، صرف ایک یا دو بار ہی نہیں، بلکہ سال بہ سال، خفیہ طور پر نہیں، بلکہ ان پر طویل عوامی بحثیں بھی ہوتی ہیں، پھر پارلیمان کے ارکان اور ان کے مائتین کے ذریعے جو مختلف ریاستوں سے، آزادانہ رائے شماری کے ذریعے، اکثریتی کی کثرت سے منتخب ہو کر پارلیمان میں آتے ہیں، تحفینے منظور کرائے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ رائے دہندگان جو پارلیمان کو منتخب کرتے ہیں، جو اس سرمایے پر رائے شماری کرتے ہیں جو اسلحہ بنانے والوں کو دیے جاتے ہیں۔ سگینوں کی نوک پر رائے شماری کے لیے نہیں لائے جاتے، حتیٰ کہ ان کو کسی قسم کی رشوت تک نہیں دی جاتی۔ اگر یہ ووٹ واقعی مفاد پرستوں کی طاقت کو ظاہر کرتے ہیں تو اکثریت کی یہ آزاد خاموشی براہِ راست طاقت کے استعمال سے نہیں حاصل ہوتی۔ کسی نہ کسی

طرح، کسی نہ کسی ذریعے سے، اقلیت کو پالیسیوں کے بارے میں اکثریت کا اشارہ ملتا ہے جو اکثریت کے مقاصد کو شکست دے دیتا ہے۔ یہ خاموشی کس طرح حاصل کی جاتی ہے؟ اقلیت کس مقاصد کے ذریعے اپیل کرتی ہے؟ وہ کیا ابہامات ہوتے ہیں جن سے انھیں فائدہ پہنچتا ہے؟ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں ”شریدے“ ہوئے پولیس کے ذریعے راغب کیا جاتا ہے۔ ہمیں ان حقائق کا سامنا کرنا ہوگا: برطانیہ اور امریکا کے بڑے شہروں میں عام طور پر آپ کو دو قسم کے اخبارات ملیں گے۔ پہلی قسم ان کی ہوتی ہے جو بین الاقوامی معاملات میں سچ بیان کرتے ہیں، کہ ان کے قاری غیر ملکیوں کے نکتہ نظر کو سمجھ سکیں تاکہ قوموں کے رشتوں کے درمیان پیدا ہونے والی منفی خیزی کی تلخیوں کو دور رکھا جائے۔ اس قسم کے اخبارات کی اشاعت نسبتاً کم ہوتی ہے۔ ان کو تجارتی بنیادوں پر کامیاب رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ میری ذاتی اطلاع کے مطابق، نیویارک اور لندن اور دوسرے شہروں میں، اس کوشش میں بہت سرمایہ ضائع ہوتا ہے کہ اس طرح کے اخبارات سے منافع حاصل کیا جائے۔

مگر دوسرے قسم کا اخبار، جو تجارتی اعتبار سے بہت کامیاب ہوتا ہے، جو اچھا مشاہیرہ ادا کرتا ہے، اور جو شہروں میں عام طور پر مل جاتا ہے، غیر ملکوں کی بے لاگ خبریں دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ اسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ وہ بین الاقوامی معاملات کی خبریں حقائق کے مطابق دے۔ عام طور پر ایسا اخبار غیر ملکوں کی خرابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے ایسے اخبار سے ہر شخص واقف ہوتا ہے ماسی قسم کے پولیس نے ماضی میں جنگ شروع کرنے میں معاونت کی ہے۔

اگر دونوں اقسام کے اخبار سرمایہ بنانے کے ادارے ہوتے ہیں، تو دوسرے قسم کے اخبار کیسے جنگ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اسے منافع بخش بھی ہوتے ہیں اور امن کی حوصلہ افزائی کرنے والے کم منافع کیوں دیتے ہیں؟ اس مقام پر ”قوت“ کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جب کوئی ”جانِ اجمتھ“ بیج کا اخبار خریدنے پر اپنی پینی (Penny) خرچ کرتا ہے، جو روزانہ امن کی بیج کٹی کرتا ہے اور لیگ پر حملے کرتا ہے، جس کے مقابلے میں دوسرا اس کا دفاع کرتا ہے، تو وہ [جانِ اجمتھ] مشکل ہی سے یہ کہہ سکے گا کہ سرمایہ داروں یا اسلحہ بنانے والوں نے اسے مجبور کیا ہے۔ یہ عمل طور پر ایک اختیاری عمل ہوتا ہے جس سے جنگ پر زور دینے والوں کی معاونت ہوتی ہے۔

جانِ اجمتھ کے کیے ہوئے عمل سے چشم پوشی کرنا ایسی قوتوں کو تیار کرنے کے برابر ہے جن کا وہ خود نشانہ بنتا ہے، ناقابل عمل پالیسیوں کو بھائے دوام دینے کے مترادف ہے اور اس پر ہونے والے ظلم کو بھائے دوام فراہم کرنا ہے۔ اس [جیسے انسان] کو منظم اقلیتوں کی بددعا و قوتوں سے آزاد کرانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کو ان حرکتوں اور لادوں کے بارے میں پوری آگاہی فراہم کی جائے جنہیں استحصال کرنے والے بڑی کامیابی سے استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر قوم پرستی جیسی کیفیات ایسی صورتیں اختیار کر لیں جو بے حد خطرناک ہوتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قوم پرستی کی اپیل انسان کے اعمال کی کھرابی میں،

جہلت میں اور نفسیاتی حقیقتوں میں جگہ بنا رہی ہے، ہمیں جس کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اور آمریت کے آنے کے باوجود بھی یہ حقیقت باقی رہتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آمر ”طاقت“ کے ٹل پر حکومت کرتے ہیں۔ مگر آمرانہ حکومتوں کو طاقت رکھنے کے قابل کون بناتا ہے؟ ایک ہی ذریعہ ہے جس سے ایک آدمی آمر بن سکتا ہے، کہ وہ عوام کے دماغ پر چھا جاتا ہے۔ سیاست دان اپنے ذاتی ٹل بوتے پر آمر نہیں بننا۔ اس کو بہتوں کی کروڑوں افراد کو، خاص طریقے سے اپنی طاقت کے استعمال پر راغب کرنا پڑتا ہے۔

جرمنی کے قومی سوشلسٹوں نے دس افراد کی جماعت سے ابتدا کی تھی۔ اور وہ محض دس افراد کی جماعت ہی رہتی اگر اس کے بنانے والے دوسروں کو طاقتوں کو نہیں اپنی طرف راغب نہ کر لیتے۔ جرمن قوم کی طاقت کے مقابل دس افراد کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس جماعت کی اصل طاقت اس امکانی طاقت میں ہے جس کے ذریعے وہ عوام کے ذہنوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ عوامی پسندیدگی کے بغیر یہ جماعت وجود میں آہی نہیں سکتی تھی۔ اور اگر، اور جب بھی، یہ عوامی پسندیدگی کو کھودے گی تو اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔

نقشبندی طور پر یہ صحیح ہے کہ جس طرح ان کے اپنے قیام کے بارے میں بڑے پیمانے پر رائے عامہ کی خاموشی کے بغیر آمریتیں ناممکن ہوں گی، اسی طرح جنگیں بھی ناممکن ہوں گی سوائے اس کے کہ عوام کا ایک بڑا حصہ ان پالیسیوں کے خلاف خاموش رہے، جن سے آمریتیں ابھرتی ہیں۔

مگر ان دونوں صورتوں میں اہم فرق ہے: جماعتیں، وہ فسطائی ہوں یا کوئی اور، جو آمریت لاتی ہیں آمریت چاہتی ہیں۔ مگر جانِ اجماعہ مخصوص پالیسیوں پر اصرار کرتا ہے جن سے جنگ پیدا ہوتی ہے، [مگر وہ] جنگ نہیں چاہتا۔ پہلا نتیجہ ہے اس شعوری ارادے کا ہے جو پورا کیا گیا ہے۔ دوسرا، اس ارادے کا نتیجہ ہے جو کام ہو گیا، ماکام ہوا ہے کچھ غلطیوں کی وجہ سے اور فریب کاری کی وجہ سے۔ کون سی غلطیاں، کون سی فریب کاریاں؟

میں سمجھتا ہوں کہ جانِ اجماعہ کو سیاست میں ٹال دیا گیا ہے جو اسے تباہ کر دیتی ہے، اکثر سچ کو نظر انداز کر دینے سے، جسے از خود واضح ہونا چاہیے۔ آئیے، اب ہم ایک مخصوص معاملے کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جب بڑی ریاستوں کے عوام اور حکومتیں تقریباً نہایت سنجیدگی سے کہتی ہیں کہ وہ امن چاہتی ہیں، تو دورِ اصل ان میں کچھ مدلل حدوہ بھی ہوتی ہیں۔ [محض] اتنا کہہ دینے سے کہ ہم امن چاہتے ہیں، یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کچھ بھی ہو جائے ہم لڑیں گے نہیں۔ جانِ اجماعہ، مثال کے طور پر، یقیناً یہ تو شیخ میس کرے گا کہ حملہ ہمیں لڑنے پر مجبور کر دے گا۔

جب وہ یہ کہتا ہے کہ وہ امن چاہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک امن پر ڈٹا رہے گا جب تک کہ اس پر کوئی حملہ نہیں کرتا۔ ”اگر ہم پر حملہ ہوتا ہے تو ہم لڑیں گے، جنگ کریں گے۔“ اسی طرح، ہر بڑی قوم اپنے دفاع کو امن کے قائم رکھنے پر، فوقیت دے گی۔ یہ حقیقت کہ ہر قوم اپنی فوج رکھتی ہے، کہ وہ طاقت کے مناسب حصے سے استواری سے چھٹی رہتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ مخصوص حالات میں وہ

جنگ کرے گی، اپنی دفاع کی جنگ۔

اتفاقاً، یہ ایک [مسلمہ] حقیقت ہے کہ ہر قوم امن سے پہلے اپنے دفاع کو دیکھتی ہے، یعنی، ہمارا مسئلہ امن اور دفاع کے درمیان مفاہمت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جنگ ان اقدام کی بنا پر ہوتی ہے، جو سلج قومیں اپنے دفاع کے لیے کرتی ہیں، اس عوامی غلط سوچ کے برخلاف، کہ اس سے دفاع کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ اس کو حفظِ امن کا اقدام کی حیثیت کا بگاڑ بھی کہا جاسکتا ہے۔

اب میں یہ فرض کر رہا ہوں کہ ہر بڑی قوم، اپنے دفاع کو پہلے درجے پر رکھنے میں حق بجانب ہوتی ہے مگر یہ دیکھیے کہ قومیں اس فرض کو کس طرح نبھاتی ہیں، جسے وہ سب سے زیادہ دنیا دہ سمجھتی ہیں، تمام سیاسی فرانکس سے زیادہ اہم۔ قومی دفاع۔

سب سے زیادہ مقبول دفاع کیا ہوتا ہے؟ جسکی انداز میں، عوام جس میں تعاون کریں، جیسا کہ برسوں سے کیا جا رہا ہے؟ بلاشبہ، وہ دفاع جس میں قوم کی انفرادی طاقت کا وزن بھی شامل ہو۔ عام طور پر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے: ہماری قوم سنجیدگی سے امن کی خواہاں ہے۔ یہ کبھی جارحیت کا ارتکاب نہیں کرے گی۔ غیر ملکی لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کبھی جنگ نہیں کرتے مولائے اپنے دفاع کے۔ جتنے ہم طاقت ور ہوں گے، امن اتنا ہی محفوظ ہوگا۔

یقین جانیے کہ ایسا ایک ہفتہ بھی نہیں گزرتا جس میں لندن، پیرس، روم، ماسکو، یا توکیو سے شائع ہونے والے اخبارات میں سے کم از کم ایک اخبار مکمل ترین یقین دہانی کے ساتھ اس دلیل کا اطلاق نہیں کرتا کہ اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا، یہ ظہر من الشمس ہے اور عام طور پر اس حقیقت سے مکمل لاعلمی کے ساتھ کہ یہ اخلاقیات، برابری کے حقوق اور ریاضی سب سے ایک جیسا انکار کرتا ہے۔

ابھی جنگ کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ برطانوی حکومت کے ایک وزیر نے مانچسٹر کی ایک تنظیم الشان میٹنگ میں اس بہت عام نظریے کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا: ”ہمارے پاس امن قائم کرنے اور محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم کسی بھی امکانی دشمن سے اتنے زیادہ طاقت ور ہو جائیں کہ اس کو ہم پر حملہ کرنے جرات ہی نہ ہو۔ میں اس کو ایک بدیہی قول کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔“

اس بیان کو من کر مانچسٹر کے ایک ہزار سے زیادہ سخت کوش تاجروں نے زور شور سے تائیدیں بھائی تھیں۔ جس قول پر وہ تائیدیں بجا رہے تھے وہ یہ تھا کہ دو قومیں جن میں جنگ کا امکان ہو سکتا ہے، اسی وقت امن قائم کر سکیں گی اور محفوظ رہیں گی جب ہر ایک دوسرے سے زیادہ طاقت ور ہوگی۔ غور و فکر کے بعد، یہ واضح ہوگا کہ یہ اصول ریاضی کی نفی کرتا ہے، مگر ایک بڑی اکثریت واقعی پریشان ہو جائے گی، اگر یہ کہا جائے کہ دفاع کا یہ طریقہ اخلاقیات کی بھی نفی کرتا ہے، راستی کے سرکاری انکار کی بنیاد پر قائم ہے، ان معنوں میں کہ ہر ایک دوسرے کے لیے اس حق کی نفی کرتا ہے جو وہ خود اپنے لیے چاہتا ہے۔

اس قسم کی پالیسی کے ذریعے ایک قوم کو اپنے دفاع میں مضبوط ہونے کی خاطر، اپنے امکانی دشمن سے

زیادہ طاقت ور ہونا پڑے گا۔ تو پھر دوسری قوم کے دفاع کا کیا بنے گا؟ کیا اس کو دفاع کی ضرورت نہیں ہوگی؟ ہم کسی اور کو بڑی طاقت سے دفاع کا حق دینے سے انکار کرتے ہیں، جس کا خود دعویٰ کرتے ہیں۔ یہاں میں کویم مشکل و اگر نہ کویم مشکل کی کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ مگر تکنیکی طریقوں سے اس بیان کی اہمیت عام آدمی کی نظر سے اوجھل رہتی ہے، اس لیے کہ عام آدمی انصاف پسند ہوتا ہے۔ اگر اس میں کسی قسم کا اخلاقی تناقص ہوگا تو وہ دوسروں کو ایسی حیثیت حاصل کرنے کے لیے نہیں کہے گا، جس سے وہ خود پرہیز کرے گا۔

اُسے اصرار نہیں کرنا کہ دفاع کی ماہیت اور اس کے اصل معنی کے غلط تصور کی وجہ سے ہوتی ہے۔ میرے خیال میں، ایک عام آدمی کے شعور میں، جب وہ دفاع کا لفظ استعمال کرتا ہے، ایک باقاعدہ مثال نہ رہتا نہ کھڑی مستعد فوج کا تصور ابھرتا ہے جو غیر ملکیوں کی مداخلت کو روکنے کے لیے ہو، جس طرح اپنی سرزمین پر جرمین مداخلت روکنے کے لیے بھیجی کی فوج کھڑی ہو گئی تھی۔ ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے ایک عظیم سپاہی نے، سیاہی تناظر میں، اپنی ذمہ داری کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا، ”جب میں دفاع کی بات کرتا ہوں تو میرے ذہن میں وہی کچھ ہوتا جو آپ کے ذہن میں ہوتا ہے، جس طرح آپ کسی چور سے بچنے کے لیے رات کو اپنے دروازے مقفل کر لیتے ہیں۔ ہماری بڑی اور بحری افواج اس چھٹی کی مانند ہیں جو ہم اپنے قومی گھر کے دروازے میں لگا لیتے ہیں۔“ جب وہ یہ کہہ رہا تھا، تو میں سوچ رہا تھا کہ وہ اس ملک کی تاریخ سے کس قدر واقف ہے۔ ایک انگریز ہونے کے ساتھ، بالخصوص جب ایک انگریز غیر ملکی سرزمین پر کھڑا ہو، میں اس امر پر دہل چلا کرتا ہوں کہ ہر وہ جنگ جو ہم نے لڑی ہے، خالص دفاعی جنگ تھی۔ مگر مجھے اس مراد وہی تاریخی حقیقت کا بھی خیال رکھنا پڑے گا کہ تقریباً ایک ہزار برس قبل، جب نارویگیوں نے ہمارے ساحلوں کو تباہ کر دیا تھا اور 1066 میں ہاسٹنگز (Hastings) کے ساحل پر انکینڈی نیو یارک اتر پڑے تھے، اس کے بعد سے ہر جنگ جو ہم نے لڑی ہے وہ دوسرے ملکوں میں ہوتی تھی۔

اب اگر دفاع کا مطلب محض چوروں کو گھروں سے دور رکھنا ہو تو ہم ان مواقع پر دوسرے لوگوں کے گھروں میں کیا کر رہے تھے؟

اس معاملے میں ہماری تاریخ کوئی خاص تاریخ نہیں ہے۔ ریاست ہائے متحدہ پرانی دنیا سے دوری، لڑائیوں کے الجھاؤ سے آزادی اور اپنی تہائی پر فخر کرتی ہے۔ اس کے باوجود نسبتاً، اپنی مختصر تاریخ میں اس نے کم از کم چھ غیر ملکی جنگیں لڑی ہیں جن میں تقریباً ایک سو بار اس کی فوجیں غیر ملکی سرزمین پر اتر چکی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی جنگ ایسی نہیں تھی جو امریکی سرزمین کے دفاع کے لیے کی گئی ہو۔

ہماری مہربانی، آپ لوگ مجھ کو غلط نہ سمجھیے گا۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہماری ایک ہزار سالہ جنگیں دوسرے لوگوں کے ملکوں میں لڑی گئی تھیں، تو اس سے یہ مراد ضروری نہیں کہ یہ تمام جنگیں جارحیت تھیں۔ ان میں سب یقیناً دفاعی رہی ہوں گی۔ مگر مراد ہاتھوں میں، وہ کسی سرزمین یا علاقے کے دفاع کے لیے نہیں تھیں۔ تو پھر وہ کس چیز کا دفاع کر رہی تھیں؟ ان کا مقصد دفاع تھا، قوموں کے مفادات کا، حقوق کا، ان

مفادات کا جو دنیا کے کسی حصے میں دوسری قوموں کے مفادات سے ٹکرا رہے ہوں، سمندروں کو ملائے والی فہرہوں کی تعمیر کا، ان کے مساویانہ استعمال کا، تجارتی حقوق کا، قرضوں کی ادائیگی کا، اپنی تنگنائی سے آزادانہ گزر سکنے کا، اپنے ساحلوں کی مورد چہ ہندیوں کا، برف سے پاک بندرگاہوں کے استعمال کا، غیر ترقی یافتہ علاقوں تک پہنچنے کا۔ یہ سب ایسے لامحدود امور ہیں جن میں وہ قومیں واقعی اپنے حقوق کے معاملے میں اختلاف رکھتی ہوں گی۔ یقیناً اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ قومیں آپس میں اپنے حقوق کے بارے میں اختلاف رکھتی ہیں، اور وہ اپنے اختلاف میں سنجیدہ بھی ہوتی ہیں۔ اور اکثر اس سوال کا جواب دینا نہایت مشکل ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کون حق پر ہے، اس لیے کہ وہی اس کو بہتر جان سکتا ہے جس نے بلقان میں قوموں کے الجھے دعووں کو سلجھانے کی کوشش کی ہوگی۔

اب اگر دفاع کا مطلب ہوتا ہے دفاع، قوموں کے حقوق کا، مفادات کا، تو دیکھیے کہ آپ کسی مقام پر ہوتے ہیں جب لوگ دفاع کے لیے طاقت کی برتری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایک عظیم ریاست دوسری ریاست سے کہتی ہے، جیسا کہ ترک اسطرح جات کے مباحث میں پچھلے دس برسوں سے کہتی رہی ہے: ”یہ سچ ہے کہ ہم خاصی مقدار میں طاقت کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ مثلاً، ہر چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے، آپ کی طاقت سے زیادہ۔ مگر اس سے آپ کو بالکل پریشان نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ ہم آپ کو پورا یقین دلاتے ہیں کہ یہ طاقت صرف دفاع کے لیے استعمال کی جائے گی۔ اور دفاع سے ہماری مراد یہ ہے کہ جب اپنے مفادات کے معاملے میں ہمارا آپ سے کوئی تنازعہ ہوگا، تب یہ سوال ہوگا کہ آپ سچ ہیں یا ہم، کہ دفاع سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ صرف ہم ہی اس سوال کا فیصلہ کرنے والے ہوں گے۔ اور ہم آپ سے طاقت میں اتنے برتر ہوں گے کہ آپ کو بغیر کسی عذر کے ہمارے فیصلے کا احترام کرنا ہوگا۔ کیا اس سے بھی زیادہ منصفانہ کوئی بات ہو سکتی ہے؟“

اب [بے چارہ] عام آدمی، جس کو ہم نے جان بوجھ کا نام دیا ہے، وہی رد یہ اختیار کرتا ہے جو ”دفاع کے لیے اسلحہ بندی“ کی صورت میں کیا جاتا ہے تو بلا کسی توقف کے جو کچھ وہ کہہ رہا ہوگا وہ اختیار ہی اعتبار سے ایک بھیا تک تجویز ہوگی۔ ایسی حالت میں، اس کو ذرا بھی احساس نہیں ہوگا کہ وہ اپنی طاقت کو اپنے حقوق کے پیچھے نہیں۔ جیسا کہ وہ سنجیدگی سے تصور کر رہا ہوگا، بلکہ دوسری پارٹی کے حقوق سے انکار کے فیصلے کے عقب میں رکھ رہا ہے، اور اپنی برتری طاقت پر اعتبار کر رہا ہے، جس کا وہ اپنے لیے دھوکا کرتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ حالیہ تاریخ میں کیا ہوتا رہا ہے۔ جنگ سے قبل برطانیہ میں ہم کہتے تھے اگر جرمنی کی طاقت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، اگر اس کی عسکری قوت دنیا کے سب سے بڑی جنگی مشین بن جاتی ہے، اور اس میں بحری طاقت کا اضافہ بھی ہو جاتا ہے تو وہ ہم سے کہیں زیادہ طاقت ور ہو جائے گا، اور ہم بھٹے ہو جائیں گے، یعنی اپنے دفاع کے ہر طرح کے حقوق سے محروم ہو جائیں گے۔ جرمنی سے کسی تنازعے میں ہم اس کے فیصلے کو چیلنج نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں کسی بھی بڑے تنازعے میں اس کا فیصلہ قبول

کرنا پڑے گا، اس لیے کہ ہم اس کی مزاحمت نہیں کر سکیں گے۔ بہتے مٹی کی یہ صورت ایسی کیفیت ہوگی جو کوئی بھی آزاد قوم قبول نہیں کرے گی۔

اب تک، شاید ہم صحیح راستے پر تھے۔ شاید اتنے صحیح بھی نہیں تھے جب ہم نے یہ اضافہ کیا تھا: اس لیے ہم تجویز پیش کرتے ہیں کہ جرمنی کو ہم سے کم زور ہو کر رہے۔ مٹی کی حالت اختیار کرنی پڑے گی۔ اور ہمیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ جرمنی کو ہماری برتری سے خائف نہیں ہونا چاہیے، کہ برطانوی طاقت کبھی مائنفا کی لیے استعمال نہیں کی جاسکتی، کہ اس وقت بھی جب ہم برتری میں خود فیصلہ کرنے کی حالت میں تھے، ہم نے ورسائی کا معاہدہ کیا تھا۔

جب انگریز عام طور پر کہتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں کہ غیر ملکی برطانوی بحریہ کی طاقت سے خائف ہوں، تو لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ وہ اس حقیقت پر نظر کر بھی کر رہے ہیں یا نہیں، کہ جرمنی کی نظر میں بھی وہ برطانوی بحریہ ہی تھی جس نے ورسائی کا معاہدہ کیا تھا، ان معنوں میں کہ اس طاقت کے بغیر وہ جس کی نمائندگی کرنی ہے، معاہدہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

آج معاہدے کو دیکھ کر جرمن کہتے ہیں، ”یہ ہونا ہے، جب آپ اپنے دشمن کے مقابلے میں کم زور ہوتے ہیں۔ اگلی بار ہم زیادہ طاقت ور ہوں گے۔ ہر طریقے سے ہم اپنی طاقت میں اضافہ کریں گے اور اگر ہم کو انصاف نہیں ملتا۔ جسے ہم انصاف سمجھتے ہیں۔ تو ہم معاہدے کو پڑے پڑے کر دیں گے۔“ اگر انھیں اس کو پھاڑ ڈالنے سے روکا گیا تو، امکانات اس بات کے ہیں کہ وہ بیعتی ورسائی جیسا معاہدہ کرنے کے لیے لڑیں گے۔ تو کیا یہ معاہدہ اس سے بہتر ہوگا جو 1919 میں کیا گیا تھا؟ میں، جسے اکثر جرمن پرستی کی طرف داری کا طعنہ دیا گیا ہے، یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اور بھی خراب ہوگا۔ اپنے معاملے میں جب جرمن قوم پرستی کے دیوانے پن کے جوش میں ہوں، فیصلے کرنے میں، برطانویوں یا فرانسیسیوں سے زیادہ مستعد نہیں ہوتے۔ اور جنگ کے تھوپے گئے نئے معاہدے کی صورت میں ہم برطانوی کچھ معنوں میں متاثر ہوں گے، اور ہمیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو آج جرمن کر رہے ہیں؛ کہ ہر طریقے سے، خفیہ یا علانیہ، اپنی طاقت بڑھائیں گے تاکہ انصافی کی خلاف جنگ کریں۔ اور یہ جنگ مائنفا کی خلاف ہوگی، انصاف کے لیے نہیں ہوگی۔ اور اگر اس جنگ میں ہم فاتح رہے تو، ایک اور یعنی تیسرا بیعتی ورسائی ہوگا۔ کیا یہ 1919 کے معاہدے کے مقابلے میں بہتر ہوگا؟ اس سے کہیں خراب، بلکہ کہیں زیادہ غلط ہوگا جس کا انتقام لیا جاسکے۔ اور اگر جرمنوں کو پہلے معاہدے کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور کر دیا گیا تب ان کے پاس تیسرے معاہدے سے بغاوت کرنے کا زیادہ بڑا جواز ہوگا۔ یعنی ایک مزید طرفہ معاہدہ۔ سوائے اس کے کہ اس سے بہت پہلے ہی مغربی دنیا سے پورا امن نہ، حتیٰ کہ جنگ کرنے کے صلاحیت بھی غائب ہو چکی ہوگی۔

اب یہ دیکھنا مشکل نہیں ہے کہ اونچ نیچ کی وجہ کیا ہوتی ہیں۔ بلاشبہ، ہم بین الاقوامی میدانوں میں اس طرح طاقت کا استعمال کرتے ہیں جو اس طریقے سے کہیں مختلف ہوتا ہے جو ہم ریاست کے اندر استعمال

کرتے ہیں۔ بین الاقوامی میدان میں طاقت کا قومی جنگ کرنے والوں کے درمیان ایک حربہ ہوتی ہے، جس میں ہر فریق اپنے فیصلے کو دوسرے پر تھوپنے کی کوشش کرتا ہے۔ پولیس والوں کا عام مقصد لڑنے والوں کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے، اور خود جج بن جانے سے روکنا ہوتا ہے، جب کہ بڑی اور بحری افواج میں معاملہ عام مقصد سے بالکل الگ ہوتا ہے، جس میں لڑنے والے کو اپنے حقوق کے لیے خود جج بننے دیا جاتا ہے، جب ان کے بارے میں کسی اور سے تنازعہ ہو۔

اس کے باوجود بنیادی امتیاز یہ ہوتا ہے کہ طاقت کس طرح استعمال ہوتی ہے، عوام الناس کو جس کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اس مسئلے پر تیس برس کے بحث مباحثے نے مجھے اس معاملے میں عوامی ذہن کے رویے سے خاصا آشنا کر دیا ہے۔ صرف چند دن قبل ہی، ہماری قدیم یونیورسٹیوں میں سے ایک کے طالب علم نے جان بوجھ کر کسی منطقی جیسے بیس میں ڈالتے ہوئے سوال کیا تھا کہ اگر میرے گھر میں کوئی چور گھسا ہو تو کیا میں ڈنڈا استعمال کروں گا۔ اور اس نے مجھے اس حقیقت کی سیاسی اہمیت پر غور کرنے کی دعوت دی تھی کہ پرانے زمانے کی مسہریوں میں ایک جگہ ہوا کرتی تھی جس میں گھر میں گھسنے والے چوروں کے استقبال کے لیے بندوق رکھی جاتی تھی۔ میں نے جواب دیا تھا کہ میں تو چور کا ڈنڈے سے ہی استقبال کروں گا، اور یہ بھی کہ میں نے سولہویں صدی کی بندوقوں کی اہمیت پر بھی غور کیا ہے، جو میرے خیال میں کچھ اس طرح کی تھی: ان دنوں جب عام طور پر ہر گھر والے کے پاس بندوقیں ہوا کرتی تھیں، جب ہر گھر کا تحفظ اس کی اپنی دفاع کی طاقت پر ہوا کرتا تھا تو آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ راہزن اور ڈاکو ہوا کرتے تھے جب کہ آج ہزاروں سے ایک گھر میں بھی کوئی بھی آتشیں اسلحہ نہیں ہوتا۔ لہذا، سادہ لفظوں میں [کہا جائے تو]، نسبتاً زیادہ تحفظ گھریلو ہتھیار کی ترقی کی وجہ سے نہیں ہے اس لیے کہ اب تو وہ [گھروں میں] ہوتے بھی نہیں۔ بہتری کی اصل وجہ ریاست میں اجتماعی دفاع کی ترقی ہے۔ سولہویں صدی میں ایک ڈاکو بحث کر سکتا تھا کہ: ”ہمیں ایک وقت میں ایک ہی گھرانے کی طاقت کا سامنا کرنا ہوگا، جان! سمجھ جیسا کوئی اپنی دو مائی بندوق لہراتا ہوا۔ یہ تو بہت آسان بات ہوتی۔“ مگر آج یہ کیفیت نہیں ہے۔ گویا ہم امکانی ڈاکو سے یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر وہ یہ سب کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا جان بچھڑے گا۔ سمجھ سے سامنا نہیں ہوگا، مگر، اپنی تمام رکاوٹوں کی میکینیک کے ساتھ سارے جان بچھڑے گا۔ سمجھ ایک سو مائیلی کی صورت میں منظم ہوں گے۔ جج، عدالتیں، مراعات، رزاں، پولیس اور قید خانے۔

ریاست کے اندر ہی ہم نے ایک فرد کے تحفظ کی ذمہ داری پوری کیونٹی پر ڈال دی ہے، اور اس طرح قانون کے ساتھ طاقت کی ایسی برتری ہوتی ہے کہ اس کو چیلنج کرنا ہرگز فائدہ مند نہیں ہوگا۔ اور اس حقیقت نے بڑے پیمانے پر راہیں گورائز نوں سے اور سمندروں کو قزاقوں سے پاک کر دیا ہے۔

میں نے اپنے نوجوان دوست سے کہا کہ اگر وہ قومی دفاع اور ذاتی دفاع کے درمیان مماثلت تلاش کرنا چاہتا ہے تو، دراصل، جو سوال پوچھا جانا چاہیے وہ یہ ہوگا: کیا آدمی چور کے لیے اپنی چھتری استعمال کرے گا،

بلکہ کیا وہ اپنی پولیس کو فیکس ادا کرے گا تا کہ وہ دوسروں کی حفاظت کرے، بشمول ایک نئیر پریوسی کے اس لیے کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کا پریوسی بھی پولیس کو اپنا فیکس ادا نہیں کرے گا، تو منظم سوسائٹی کے لیے پولیس نہیں ہوگی، نہ ہی کسی قسم کا تحفظ ہوگا۔

غظیم یونیورسٹی کے اس گریجویٹ دوست نے، ظاہر ہے کہ اس امر کو، جسے منظم سوسائٹی کے دفاع کا میکازیم کہا جائے گا، اسی طرح غلط سمجھا تھا جیسے عوام اس کو غلط سمجھیں گے۔ اس نے دفاع کو ایک انفرادی عمل سمجھ لیا تھا، لہذا، اس کے نزدیک اس بحث میں اصل مسئلہ مکمل طور پر قومی دفاع کو ختم کر دینے یا قدم دور کی بین الاقوامی لاقانونیت کی نگہداشت کے درمیان انتخاب کا تھا۔ مادہ لفظوں میں، وہ سمجھا تھا کہ اگر کوئی خود پرانی لاقانونیت کو ختم کرنا چاہتا ہے تو وہ قومی دفاع سے لاپرواہ ہے۔ جب کہ بلاشبہ اصل معاملہ کسی مشترکہ نظام میں قوموں کی اس طرح تنظیم ہے کہ جب تک اسلحہ رکھے جائیں گے (اور یہ اہم شرط ہے اس لیے کہ یقینی طور پر [صرف] اسلحے سے قومی دفاع نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ کچھ ریاستوں کا نظام تحفظ ظاہر کرتا ہے) وہ صرف مؤثر تحفظ کا ذریعہ ہوں گے اور اس قانون کی حمایت کریں گے جو سب کو تحفظ فراہم کرتا ہو۔ جب تک ایک فرد کے پاس، خواہ وہ شخص ہو یا ریاست، اس کے اپنے اسلحے ہوں گے اس لیے کہ وہ ان سے اپنے حقوق کا دفاع کر سکے، تو وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہوں گے جو ان کے حقوق کو چیلنج کر سکیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرا اسی قسم کے تحفظ سے محروم رہے گا۔ اپنی سرحدوں کے اندر رہتے ہوئے، بہت عرصہ پہلے انسان پر ٹھہرا کہ کمیونٹی کے لیے اس پس و پیش سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اپنی مشترکہ طاقت کو ایک محافظ قانون کے حوالے کر دے، تا کہ وہ فرد کے دفاع کی ذمہ داری سنبھال لے۔ دفاع کو اجتماعی ہونا چاہیے، ایک مشترکہ عمل، ورنہ یہ کبھی مؤثر نہیں ہو سکے گا۔

میں خاصی تفصیل سے سماجی تنظیم کی ایک اساسی حقیقت پر بات کر رہا ہوں، تا کہ اس نکتے کو مثال کے طور پر پیش کیا جائے جو امن کے مسئلے پر غلط فہمیوں کا شکار ہے، جو پڑھ لکھے آدمیوں کے ذہن میں موجود ہے، جو عام طور پر غور مند رہتے ہیں، جس کو منظم سماج کی ابتدائی میکانیک ہی کہا جاسکتا ہے۔ تصور کہ ہم اسی صورت میں اپنا تحفظ کر سکتے ہیں اگر ہم دوسروں کے تحفظ کے لیے تیار ہوں، بچکانہ درجے کی سماجی تعلیم کے مترادف ہے۔

مگر، قانون کے ذریعے تحفظ کا طریقہ کار سماج میں طاقت کا مقام، وہ مسائل ہیں جو عام طور پر شاید ہمارے عوام کی تعلیم میں مثال نہیں ہوتے ہیں۔

لیکن، اگر مغربی دنیا کے اسکولوں سے نکلنے والے بے شمار [طلبہ] میں جدید سماجی نظام کی سمجھ کم درجے کی ہے، تو انھیں جدید سرمایہ کے بارے میں کم تر درجے کی سمجھ ہوگی کہ جس کا تحفظ، یا جس کے تحفظ کے بارے میں غلط فہمیاں ہوں گی تو یقیناً یہ بھی امن کے مسائل کا حصہ ہوں گے۔

قومیں، بلاشبہ، غور مند ہوتی ہیں دفاع کے لیے ان ذرائع زندگی، گھر بار اور ان ذرائع کے بارے میں

جوان کے باسیوں کو تمدن معیار کی غذا میں اور لباس فراہم کرتے ہیں۔ قومیں ان چیزوں کا کس طرح دفاع کر سکتی، ان کو کس طرح نشینی بنا سکتی ہیں؟

ایک بار پھر، ضخیم ریاستوں نے دراصل ان سوالوں کا جواب صرف ایک لفظ ”طاقت“ سے دے دیا ہے، جس سے، زیادہ اہم قومی طاقت مراد ہے۔ عوام کے ذہن آج یہ سمجھتے ہیں کہ سرمایے کا دفاع، دراصل وسائل و مصنوعات کے دفاع میں ہوتا، جنہیں طاقت رکھنے والی غیر ملکی قوتیں چھین لے جاتی ہیں، یا ایسے تجارتی ذرائع میں ہوتا ہے جنہیں طاقت کے ذریعے محفوظ کیا جاسکے۔ اور مابعد جنگ ابھرنے والے دہشت افوں میں ایسے سیاسی ادیب پیدا ہو رہے جو علی الاطلاق کہتے ہیں کہ امن اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب دنیا کے وسائل کی تقسیم منصفانہ ہوگی: جرمنی کے پاس نو آبادیات ہوں، جاپانیوں کے پاس مصنوعات کی نکاسی کے ذرائع، اور یہی چیزیں بنیادی اقتصادی ضروریات ہوتی ہیں، جن کو اگر پُر امن طریقے سے پورا نہیں کیا جاتا تو یہ جنگ کے ذریعے پوری کی جائیں گی تو، یہ ہمیں جنگ کے اس تصور کے قریب لے جاتا ہے جسے ”روٹی کی جدوجہد“ کہتے ہیں، اور ایک محدود دنیا میں قیمتی طور پر پھیلتا ہوا ”حیاتیاتی تنازعہ“ (biological conflict) [کہتے ہیں]، جس کے بارے میں پچھلے تیس برسوں سے میں کچھ سوالات کرتا رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ ان سوالات کا اب بھی پوچھا جانا ضروری ہے۔

اب بھی میں یہی کہوں گا، جیسا کہ میں تیس سال قبل بھی کہہ چکا ہوں کہ جدید دنیا کی اقتصادی مشکلیں وسائل کی کمی میں نہیں، بلکہ ان کے لین دین اور تقسیم کی تنظیم میں ہے؛ زیادہ مشکل کمی سے نہیں بلکہ خلل سے اور بے ترتیبی سے ہوتی ہے۔

کسی ریاست کو خام مال حاصل کرنے میں کوئی مشکل نہیں، ضروری نہیں کہ وہ اسے سیاسی طور پر کنٹرول کرے۔ برطانیہ کو لوئیزیانا (Louisiana) کے کپاس کے علاقوں کو حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، تاکہ ان کی بنیاد پر اپنی سب سے بڑی برآمدی صنعت قائم کرے؛ نہ امریکا کو ربڑ کے باغات کو اپنے سیاسی کنٹرول میں کرنے کی ضرورت تھی تاکہ وہ دنیا کی سب سے بڑی کاروں کی صنعت قائم کرے۔ اگر فرانس کو لورین (Lorraine) سے خام فولاد کے حصول میں مشکل ہوئی تھی تو اس کی وجہ فرانسیسی حکومت کی اپنی محصول کی پالیسی تھی۔

سرمایے کا دفاع اس طرح نہیں ہوتا کہ ہم غیر ملکیوں کو اپنی مصنوعات خریدنے سے روکیں۔ غیر ملکی قومیں ہماری مصنوعات نہیں چاہتیں۔ ہر قوم محصولات، رسد کی مقدار اور دوسرے طریقوں سے دوسروں کی مصنوعات کو باہر رکھنے کی کوشش کرتی ہے، مضبوط کر لینے کی نہیں۔

ہمارے امیر البحر (admirals) ہمیشہ اپنی تجارتی مشاغل میں، کے تحفظ کے لیے زیادہ بحری جہازوں کی ضرورت کی بات کرتے ہیں۔ چند برسوں میں آدھی تجارتی قافلے ہو جاتی ہے، اور ہمارے زیادہ تر جہاز بندر گاہوں میں بے کار ٹنگرا ہوا ہوتے ہیں، گویا اقتصادی کسادبازاری نے ان کی ناکہ بندی کر دی ہو۔ تو بحریہ

کیا کر رہی ہے؟ اگر اس طرح مسلسل کمی ہوتی رہتی ہے تو بحری راستوں میں [تجارتی] جہازوں کے بجائے صرف جنگی جہاز ہی رہ جاتے ہیں۔

برڈ فرڈ (Bradford) جیسے بڑے صنعتی شہر کی اہم تجارت کو ہماری سلطنت، کنافا اور آسٹریلیا کے بحری تباہ کر دیتے ہیں۔ بحریہ کس طرح ان کا تحفظ کرتی ہے؟ ایک ایڈمرل نے ایک بار کہا تھا کہ اگر بحریہ نہ ہوتی تو انگلستان میں غیر ملکی اتر جاتے اور بیک آف انگلینڈ کی تجویزوں کو لوٹ لے جاتے۔ 1931 میں غیر ملکیوں نے ہمارے خلائی ذخائر پر دھاوا بول کر ہم کو خلائی معیار سے گرا دیا تھا۔ اس وقت بحریہ کیا کر رہی تھی؟

مجھے یقین نہیں کہ عوام اس تبدیلی کو پوری طرح سمجھ سکے ہیں، جو جدید عہد کے سرمایے کی فطرت پر چھا چکی ہے۔ اگر اس تبدیلی کو عوام سمجھ گئے ہوتے تو ہم ان اداروں کی قبولیت کے بہت قریب پہنچ چکے ہوتے جو ہمارے حرمین اور بیہودہ کے دفاع کے لیے ضروری ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہمیں خطرہ ہے کہ قومی احساس کے خلاف، ہمیں سرحدوں کی بڑے پیمانے پر دوبارہ ترتیب کی طرف موڑا جا رہا ہے اس لیے کہ قومی اور اقتصادی اکائی کی سرحدیں آسانی سے میل نہیں کھاتیں جس سے پہلے ترک اسلحہ جات کی مشکلات غیر ضروری ہو کر رہ جاتیں گی۔

مجھے امید ہے کہ آپ مجھ معاف فرمائیں گے، اگر میں ماضی میں آپ کے اور اپنے ملک کے تعلقات کے کچھ واقعات کے تناظر میں شاید اس تبدیلی کی توضیح پیش کر سکوں، میرے خیال میں عوام جس کا اندازہ نہیں لگا سکے ہیں۔

اتفاق ہے کہ میں انگلستان کے مشرقی ساحل کے قریب ایک چھوٹے سے جزیرے پر رہتا ہوں، جو نویں صدی میں آئلاف (Ahlaf) نام کے ایک ماریویائی کا ہیڈ کوارٹر تھا جب اس نے ہمیں [جزائر برطانیہ کو] اپنی آمد کا شرف بخشا تھا۔ [جب] آخری بار اس نے [برطانیہ کے ساحلوں کے لیے] اپنے پچاس جہازوں کے نگر اٹھائے تھے تو وہ سیکسی (Saxon) مصنوعات سے لدے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ضرورت تھی کہ غیر ملکی مہمانوں سے مصنوعات کا تحفظ کیا جائے۔ آج بھی جب میں اس جزیرے پر اپنے چھوٹے سے فارم ہاؤس کی کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں تو قریبی کھاڑی میں مجھے پچاس جہاز نگر انداز نظر آتے ہیں، ہمارے اپنے جہاز، سنسان، رنگ آلودہ، بربادہ اور ان کے ملاح بے روزگان اتنی کامیابی سے گسدا بزاری کے مارے بند کیے ہوئے کہ شاید کوئی غیر ملکی ریاست ہماری تجارت کی اتنی موثر مارے بند کی نہ کر سکے۔ ایک دن میں موج رہا تھا کہ اس نیا وہ مردانہ اور طاقت ور عہد میں ان جہازوں کو بے کار نہیں رہنا چاہیے۔ آئلاف جانتا رہا ہوگا کہ ان کا کیا کیا جائے۔ اگر ہم اس ہی طرح، کسی دن تمام کو، ان پچاس جہازوں کو، اپنی ہی طاقت و رفعت اور بحریہ کے ساتھ مارے کے ساحل پر نگر انداز کریں اور وہاں ان پر مارے کی عمارت سازی کی لکڑی، دودھ کی مصنوعات لاد دی جائیں اور ان سب کو انگلستان لے آئیں تو کیا ہوگا؟ ہمارے تجارتی تحفظ

پسندوں کو جب پتا چلے گا کہ ہمارے مسائل کی طرف بڑھتے ہوئے پچاس بڑے جہازوں پر لدی غیر ملکی مصنوعات، بغیر کسی محصول کے، ان پر اتار دی جائیں گی۔ جو شاید ان روپی مصنوعات کے دس فی صد کے برابر بھی نہ ہوں جنہوں نے انگلستان میں اتنا شور مچا کر دیا تھا۔ ایسی شدنی کے تصور پر ہی دارالعوام کا سر تحفظ پسند کھڑا ہو کر فوری ضرورت کے پیش نظر غیر لگانے کا مطالبہ کر دے گا، تا کہ غیر ملکی مصنوعات ملک میں آنے نہ پائیں۔

یہ ہے وہ پیچیدگی اعتراف کو جس کا سامنا نہ تھا۔ جب اس نے سیکسن امیج اور چھڑہ ان ساحلوں پر اتارا تھا، مجھے یقین نہیں کہ برگین (Bergen) اور اوسلو (Oslo) کے اجناس اور ٹھمن کے بازار بہت زیادہ پریشان ہوئے ہوں گے۔ مگر ہمارے زمانے میں بہت سے اقتصادی ادارے پریشان ہوں گے اس لیے کہ اس طرح کیا جانے والا کاروبار تجارتی اعتبار سے قابل عمل اور نہایت فائدہ مند ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جدید دنیا میں، صرف وہی مال سرمایہ ہوتا ہے جسے آپ ٹھکانے لگا سکیں۔ برطانوی کان کن اپنا کوئلہ کھانسیں ملتا، نہ اپنے بچوں کو اس کا بنا ہوا کپڑا پہنا سکتا ہے، نہ اس سے اپنا مکان بنا سکتا ہے۔ اگر کوئلے ہی کو برطانوی کان کن کوغذا، چھت اور لباس فراہم کرنا ہے تو کان کن کو اسے ٹھکانے لگانا ہوگا۔ ٹھکانے لگائیے، یعنی ان کو فروخت کیجیے جن کے پاس رقم ہو۔ مگر خریدنے والے کو رقم کہاں سے ملے گی؟ رقم حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہوتا ہے۔ اپنا مال اس کو فروخت کیجیے جس کے پاس رقم ہو، جو اپنا مال فروخت کر کے رقم حاصل کر سکتا ہو اور دنیا بھر میں یہی ہوتا رہتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے، ہماری جدید دنیا کا پیچیدہ تقسیم کار ایک بہاؤ کی طرح ہے، ایک تعامل (process) ہے، ٹریڈ کے مسائل، جس کو دنیا کی شاہراہوں پر چلتے رہنا چاہیے۔ اگر ٹریڈ میں رکاوٹ آجائے، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، اس بے ترتیبی سے جو جنگ کے بعد ہوتی ہے، جیسے ناقابل انافی قرض، جو مالیاتی علاقہ کی غلط تقسیم پر منتج ہوتا ہے، جس سے سارے کا اور پورا مالیاتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، منڈیاں بکھر جاتی ہیں اور جب اس قسم کی کیفیت ہوتی ہے تو مال سرمایہ نہیں رہ جاتا۔ برائیل والے اپنی کافی جلاتے ہیں اور مارے والے اپنی مچھلی، مگر دونوں میں سے کوئی بھی برطانوی کان کن کا کوئلہ نہیں جلاتا، اور وہ کافی اور مچھلی دونوں سے محروم رہتا ہے۔

مگر ٹریڈ کو ایک ہی طرف چلتا رکھا جاسکتا ہے، ٹریڈ کے قوانین کے ذریعے، سڑکوں کے قوانین کے ذریعے۔ سڑکوں کے قوانین ہمیشہ بہت اہم نہیں رہے ہیں۔ آہستہ چلتے والی ٹیل گاڑیوں کے زمانے میں، اگر کوئی بائیں چلتا اور کوئی دائیں، اور دونوں کہیں پھنس جاتے، تو ان دونوں کوئی خاص بات نہیں ہوا کرتی تھی، سوائے اس کے کہ چلانے والوں کی مناسب گالیوں کے تبادلے کے بعد، دونوں اپنے اپنے راستے چلے جایا کرتے تھے۔ مگر اب جدید سڑکوں پر، جب موٹر کاریں ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی ہیں، اگر چلانے والا یہ نہیں جانتا کہ دوسرا دائیں جائے گا یا بائیں، اور غلطی کرتا ہے تو جس۔ اس سے آگے بات کرنا ہمارے

لیے قطعی فضول ہوگا۔

اس کے باوجود عام طور پر اصولوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ جب بھی کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوتی ہے رزق و کد کرنے والا آزاد برطانوی پولیس احتجاج کرتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے: کیا ہم کو بین الاقوامی کانفرنسوں میں، یعنی غیر ملکیوں کے بنائے جانے والے قوانین پر عمل کرنا ہوگا؟ ایک اخبار نے حال ہی میں اس بارے میں ایک مضمون شائع کیا تھا: برطانیہ عظمیٰ کو سنجیدگی سے کسی بھی کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دینا چاہیے، اگر اس میں غیر ملکیوں کی اکثریت ہو۔

جب ہم غلط فہمیوں کے بارے میں بات کر رہے ہوں، تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بہت زیادہ اور مشکل اطلاعات کی غلط تشریحات کی وجہ سے نہیں ہوتیں؛ یہ پیدا ہوتی ہیں روزمرہ کی حقیقتوں سے جن سے سب واقف ہوتے ہیں۔ ہماری کچھ شراب اقتصادی پالیسیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب ہم اسی طرح کی موجود اطلاعات کا اطلاق کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ میں اس کی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ برطانوی سلطنت میں شامل ہر ملک مالیاتی اعتبار سے خود مختار ہے؛ ان کی محصولات برطانوی پارلیمان نہیں طے کرتی، خود ان کی اپنی پارلیمان یہ فرائض ادا کرتی ہیں۔ حال یہ برسوں میں "Empire Preference" نام کا ایک نظام بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے سامراجیوں کا خیال ہے کہ چلوں کہہ سستے داموں ملنے والا غیر ملکی گندم یا دوسری کاشت کاری معنوعات، برطانوی کاشت کاری کے نظام کے لیے نقصان دہ ہوں گی، ہمیں اپنی سلطنت کی سستی معنوعات کو فروغ دینا چاہیے۔ مگر سلطنتیں کس طرح بنتی ہیں۔ اگر [آئر لینڈ کے] مسٹر ڈی ولیرا (de Valera) شاہ سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں تو ان کی آزاد ریاست ایک غیر ملکی علاقہ ہو جائے گی، اور ہمارے سامراجی ہم سے کہیں گے کہ آئر لینڈ کا غیر ملکی ٹیکس، سوکھا گوشت اور انڈے برطانوی کسانوں کو بے روزگار کر دیں گے۔ مگر مسٹر ڈی ولیرا اپنا ارادہ بدل دیتے ہیں اور حلف اٹھا لیتے ہیں تو، وائے بولجی کہ آئر لینڈ کا ٹیکس، سوکھا گوشت، انڈے جو پہلے شرابی طور پر غیر ملکی بنا دیے گئے تھے، بے ضرر ہو جاتے ہیں، اور اب برطانوی کاشت کار بے روزگار نہیں ہو رہے ہیں۔ مگر یہ تو وہی ٹیکس، وہی سوکھا گوشت اور وہی انڈے ہیں۔ گویا یہ اقتصادیات نہیں جا بوجھ گری ہے۔

میں نے حال ہی میں اپنے سامراجیوں کے سامنے ایک معاملہ رکھا تھا۔ فرض کر لیجیے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس علاقے کی تجارتی ترقی ان بنیادوں پر کی جائے گی جس نے جس پر آئووا میں گنگو کی تھی، تو یہ برطانیہ کے مفاد میں ہوگا۔ ایسا ضرور ہونا چاہیے۔ فرض کر لیجیے کہ شمال کی ایک ریاست، آپ چاہیں تو اس کو ماروے کہہ لیں، ہم سے کہتی ہے کہ "ہم بھی آپ کے معاشی کلب یا حلقے میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اور ہم آپ کو وہی مراعات دینے کو تیار ہیں جو کناڈا آپ کو فراہم کرے گا، بشرطے کہ آپ ہم کو بھی وہی فائدے پہنچائیں جو آپ کناڈا کو پہنچاتے ہیں۔" میں نے سامراجیوں سے پوچھا، "کیا آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ ہماری

اقتصادی سلطنت کے وسیع ہونے سے ہمیں فائدہ پہنچے گا؟ اور خیرات انگیز بات یہ ہے کہ سامراجی ترجیحات کے سب سے بڑے داعی نے کہا کہ اس قسم کی پیشکش سختی سے ٹھکرا دی جائے گی۔ اس قسم کے قوم پرست پر یہ واضح کرنا بہت مشکل ہوگا کہ اگر ایک میرف برطانیہ اور دو ملین کناڈائیوں کے درمیان فائدہ مند ہوتا ہے تو برطانیہ اور دو ملین نارویائیوں کے درمیان اسی قسم کا انتظام بھی فائدہ مند ہو سکتا ہے۔

اگر ہمیں اس نوعیت کے تمام معاملات میں یہ نظر آتا ہے کہ عوام کی بڑی تعداد ایسی پالیسیوں کی حمایت کرتی ہے جو بین الاقوامی تنازعہ پیدا کرتی ہیں، تو یہ اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ عوام کو ان تکنیکی پیچیدگیوں کا علم نہیں تھا، مگر جیسا کہ اس خطاب کی ابتدا میں بیان کیا گیا ہے اور مثالوں سے واضح کیا گیا ہے، یہ دراصل اس لیے ہوتا ہے کہ عوام کو پالیسیوں کا پورا علم نہیں فراہم کیا جاتا، جو عام زندگی کا ایک آفاقی اثاثہ ہوتا ہے۔

اسی امر پر غور کیجیے کہ انسانی فطرت اور زندگی کے لیے ضروری نظم و ضبط کے رشتوں کے درمیان سب سے غلط تعبیر کیا ہوتی ہے۔ ہم لوگوں کو جو لیگ آف نیشنز کی طرف داری کرتے ہیں، اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ ہم انسانی فطرت کو بھول جاتے ہیں، اور اس حقیقت کو طرح وے جاتے ہیں کہ انسان اپنی فطرت میں جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ یہ حقیقت کہ انسان فطری طور پر جھگڑالو ہوتے ہیں، لیگ جیسے اداروں کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ مگر انسان کا فطری لڑاکا پن ہی لیگ جیسے اداروں کو ضروری بناتا ہے۔ اگر فطری طور پر اور انسانی سے انسان خود اپنے جج بن سکے، ہمیشہ دوسرے کے معاملے کو صحیح انداز میں دیکھ سکے، کبھی خوف زدہ نہ ہوتے، اپنے ذہن کو قابو میں رکھ سکے، کبھی اپنے ہوش و حواس نہ کھوتے اور اس کو وطن پرستی کہتے۔ تو کیوں ہم کسی لیگ کے خواہاں نہ ہوں۔ مگر ایسی صورت میں ہمیں کسی قسم کے آلات حکومت کی بھی ضرورت نہ ہوتی، جیسے پارلیمان، کانگریس، عدالتیں، پولیس اور Ten Commandments۔ یہ وسائل ہیں جن کے ذریعے ہم انسانی فطرت کے باغی عنصر سے نمٹتے ہیں۔ دنیا شگونی جا رہی ہے، اس لیے وقت آگیا ہے کہ ہم اس میں اضافہ کریں۔ اس کے باوجود میں یہ کہنے میں بالکل نہیں ہچکچاؤں گا کہ امن کی تحریک کے دس ماقدین میں سے نو اس دلیل کو الٹ دیتے ہیں۔ ”آپ انسانی فطرت کو بدل نہیں سکتے“ جیسا جملہ ایک طرح سے ان ماقدین کا منتر ہو گیا ہے۔ مثلاً آپ ”انسانی فطرت بدل نہیں سکتے“۔ مجھے اس جملے کا مطلب جاننے کی ضرورت نہیں۔ مگر یقیناً آپ انسان کے طور طریقے بدل سکتے ہیں، اور یہی ہماری ضرورت ہے، جیسا کہ تاریخ کا پورا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔

پریشانیاں اور دوسرے قسم کی حماقتیں فطری ہوتی ہیں مگر ناگزیر نہیں، اور چوں کہ وہ فطری ہوتی ہیں تو ہمیں نظم و ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک دفعہ کسی امریکی تھیسٹر میں تماشائیوں میں سے ایک آدمی چلایا ”آگ“۔ سارے تماشائی اپنی ”فطری جہالت“ کی فرماں برداری کرتے ہوئے خوف کے عالم میں دروازوں کی طرف دوڑ پڑے۔ کئی لوگ کچل کر مر گئے۔ وہاں آگ نہیں لگی تھی۔ یہ غلط گھنٹی تھی خطرے کی۔ چند دن بعد ایک اور تھیسٹر میں بھی ایسی ہی آواز بلند ہوئی تھی، اتفاق سے منبر و قیام موجود تھا، فوراً کود کر اسٹیج پر پہنچا اور اس

نے حکیمانہ لہجے میں کہا، ”اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے رہو۔ ہمارے پاس بہت وقت ہے اور تم سب جانتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ کھڑے ہو جاؤ۔ قریب ترین دروازہ تلاش کرو۔ آہستہ چلو۔ کوئی بھاگے گا نہیں!“ اور ٹھیسز بالکل صحیح انداز میں خالی کرالیا گیا، کسی کو گزند نہیں پہنچی، اگرچہ اس بار واقعی آگ لگ گئی تھی، اور بعد میں پورا ٹھیسز جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا تھا۔

کیا دونوں معاملوں میں انسانی فطرت ایک ہی جیسی نہیں تھی؟ مگر دونوں میں آپ کو ایک مختلف نتیجہ ملا، عمل سے اور دیتے سے، اس لیے کہ دوسرے معاملے میں پہلی تباہ کن تحریک دوسری مہذب قوت بحریہ کے تابع ہو گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ مخصوص انداز کی قوم پرستی جیسی قوت بحریہ کی زیادہ تباہ کن ہوتی ہے، اتنی ہی بڑی ذمہ داری اس کو باخبر عقل اور سماجی تنظیم کی طرف موڑنے کی ہوتی ہے۔

مگر یہ صرف اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب ہمیں یقین ہو کہ یہ کیا جائے گا۔ اگر ہر ایک یہ کہتا کہ ”پریشانی تو ہونی لازمی ہے، مگر پہلے ہمیں دروازے کی طرف جانا چاہیے“ تب پریشانی ضرور ہوگی۔ عوام اپنے یقین سے اسی خطرے کو پیدا کرتے ہیں جس سے خوف کھاتے ہیں۔ لیکن، اگر ایک مناسب مقدار — پانچ یا دس — میں سے ایک، غیر والے معاملے میں ہزار میں ایک — بہتر طریقے پر یقین کر لے اور اس پر قائم رہے تو وہ دوسرے کے مقابل میں کامیاب ہوگی۔

یقیناً، سماجی افعال کی ایسی سادہ اور بنیادی صداقتوں کو عوام کے ذہنوں تک، اور تعلیم کی پیداوار کی طرح سیاست میں بھی پہنچانا چاہیے۔ مگر ایسا ہوتا نہیں۔ مگر ایسی بنیادی صداقتوں کی قبولیت میں نا کامیاں کبھی کبھی تعلیم اور لیاقت کے ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں، کسی نے ایک بار کہا تھا: ”کوئی صداقت اتنی سادہ نہیں ہوتی کہ چڑھے لکھے لوگ اس کو ناقابل فہم نہ کر سکیں۔“

یقیناً، ہمارے مضمین کی دانش سے اتنا بعید نہیں کہ وہ تعلیم کے ذریعے، وہ مخصوص ہنر پیدا کر سکیں جو عام آدمی، عام ووٹ دینے والے کو، اس قائل بنادے کہ وہ ان عمومی پالیسیوں کی رہنمائی کے لیے سادہ صداقتوں کا احاطہ کر سکے، جن کے لیے وہ ذمہ دار ہے اور وہ جس کو حکومت پر لازم سمجھتا ہے۔ زیادہ علم نہیں، بلکہ اس علم کا بہتر استعمال جو ہم میں موجود ہے، جو شاید تعلیم کی اہم ضرورت ہے اور اہم تعلیمی مسئلہ ہے، جو ہمیں درپیش ہے۔

عوام کے ذہن سے تیس برس کی مسلسل زور آزمائی نے مجھے قائل کر دیا ہے کہ دراصل یہی وہ اصل کام ہے جو تعلیم کو امن کے لیے کرنا چاہیے: ایک واضح مفاہمت، ہر قوم کے مخصوص مسائل سے نہیں، اس لیے کہ اس صورت میں سماجی اقوام کی تاریخ، سیاسی جغرافیہ اور ان کی نسل نگاری کا علم حاصل کرنا پڑے گا جو عام باشندہ حاصل کر ہی نہیں سکتا، سوائے بنیادی اور مکمل اصولوں کے واضح علم کے، جن پر پوری سوسائٹی انحصار کرتی ہے، تنہا جن کے ذریعے اس کو فعال بنایا جاسکتا ہے۔

یہی وہ تین سمتیں ہیں جو ہر کروڑوں کی تعلیم کو بہتر بنایا جاسکتا ہے، جو بالآخر وہ پالیسیاں بناتے ہیں جو

سوسائٹی کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہیں۔ پہلے، عام ووٹ دینے والے اور باشندے کو اپنی فطرت کے بارے میں زیادہ آگاہی حاصل کرنی چاہیے، اور اپنی کم زوریوں کی ذمے داری لینی چاہیے، جو بار بار ہوتی ہیں اور زیادہ تباہ کن ہوتی ہیں۔ دوسرے [انھیں] سوسائٹی کی ضروری میکا نزم کی فطرت کا علم ہونا چاہیے، اور دوسرے، صداقت کی اصلیت کی تشریح کرنے کے اصل طریقوں کا، جن کے ذریعے عام طور پر دیکھے ہوئے سبب کے اطلاق کے ذریعے سماجی مسائل کے حل تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

ایسے فرائض کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں وسیع سلطنت کی طرح بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ دورِ اصل، یونان اور فلسطین جیسی چھوٹی ریاستوں کے لیے ہی، اس میدان میں آدمی کو کام کرنا ہوتا ہے، یہ نسبت ایک بڑی سلطنت کے۔ وہ دماروے جیسے چھوٹی ریاستیں ہی ہیں جنھوں نے، دوسروں کے مقابلے میں، بلند ترین ممکن، سب سے بڑا سماجی استحکام اور آزادی سے ایک ساتھ زندگی گزارنے کا فن ایجاد کیا ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں یہ ایسے راستے بھناتی ہیں جن کے ذریعے دنیا تحفظ اور امن کی آماج گاہ بن سکے۔

بچھلی چند نسلوں کے دوران مادے کے انتظام میں انسانی دانش کے اطلاق کے ذریعے انسان نے سب سے بڑا قدم اٹھایا ہے۔ اب ہمیں ایک اور مشکل مسئلے کا سامنا ہے۔ جب تک ہم بھی اس میدان میں آگے قدم نہیں بڑھاتے، خود وہ آگے ہی جو انسان نے ایجاد کیے ہیں اس کی تباہی کا سبب بن جائیں گے۔

امن کی راہ کی رکاوٹیں مادے میں رکاوٹیں نہیں ہوتیں، نہ جالہ فطرت میں، نہ پہاڑوں میں، نہ جن میں سوراخ کرتے ہیں، نہ ان سمندروں میں جن کے اوپر سے ہم پرواز کرتے ہیں۔ امن کے راستے کی رکاوٹیں دراصل انسان کے ذہنوں اور دلوں میں ہوتی ہیں۔

مادے کے مطالعے میں ہم ایمان دار، غیر جانب دار اور سچے ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کے کاروبار میں کامیاب رہتے ہیں۔ مگر ان چیزوں میں جن کی ہم پرواز کرتے ہیں۔ جن میں ہم، ہماری خواہشیں اور ہوائے نفس، ہماری وطن پرستیاں اور نفرتیں ہوتی ہیں ہم خود کو پکڑی اور سیدھی سوچ کے ایک مشکل امتحان میں پاتے ہیں۔ اس کے باوجود ہماری ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ اس میدان میں صرف دانش ورانہ راست بازی کے ذریعے ہی ہم محفوظ رہ سکتے ہیں۔ کہیں بھی جائے پناہ نہیں، سوائے صداقت کے، انسانی دانش کے اور ناقابلِ فتح انسانی دماغ کے۔

جین ایڈمز نکولاس مرے بٹلر اعلان تجلیل

دو امریکی افراد کو امن انعام دے کر نوبل کمیٹی نے ریاست ہائے متحدہ کو ان قوموں کی فہرست میں پہلا مقام دیا ہے۔ پچھلے تیس برسوں میں جن کے نمائندوں کو انعامات دیے گئے ہیں۔ اس سے قبل، سب سے زیادہ انعام پانے والے فرانس سے تعلق رکھتے تھے۔ کل چھ افراد، جب کہ دوسری قوموں میں دو یا تین سے زیادہ افراد نہ تھے۔ آج تک، سات امن انعامات امریکا کے حصے میں آچکے ہوں گے جن میں سے چار انعامات پچھلے پانچ برسوں میں دیے گئے تھے۔

جو کچھ نوبل انعامات کے سلسلے میں ہوتا آیا ہے وہی امن انعام میں بھی ہوا ہے؛ لوگ ہمیشہ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ یہ سب سے زیادہ موزوں افراد کو دیا جاتا ہے۔ مابور نوبل کمیٹی کے ارکان سے زیادہ کوئی بھی انتخاب کی مشکلات سے واقف نہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تمام لوگ اس سے اتفاق کریں گے کہ پچھلے برسوں میں صرف ریاست ہائے متحدہ ہی کو یہ انعامات ملنے چاہئیں تھے۔

ریاست ہائے متحدہ کی خود اپنی ایک دنیا ہے، اتنی بڑی جتنی کہ یورپ، اور یہ امن کی ایک ایسی عظیم سر زمین ہے جس پر ریاستوں کے درمیان جنگ، اقتصادی ہویا عسکری، ناقابل یقین ہے، مگر ساتھ ہی، ریاست ہائے متحدہ دنیا کی بڑی طاقتوں میں سے ہے، اور اقتصادی اعتبار سے یہ سب سے بڑی ہے۔ اپنی حیثیت کی وجہ سے، یہ کمرۂ انش کے علاقے میں جنگ یا امن دونوں فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں، کہ اپنے وسیع اقتصادی استحکام کی وجہ سے، یہ دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ طاقت رکھتی ہے۔ ان سب کی جنمیں دیر پا امن کی آرزو رہتی ہے، مدد کے لیے امریکا ہی کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

امریکا نے یورپ کی مدد کی تھی، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ مجبور کیا تھا۔ لیگ آف نیشنز کی تشکیل میں، جو تمام قوموں کو آپس میں امن سے رہنے کے لیے ایک مستحکم بنیاد فراہم کرے گی۔ یہ ایک بڑا دھچکا تھا کہ امریکا نے خود اس ادارے میں شرکت نہیں کی تھی، اور بلاشبہ اس کے شریک نہ ہونے سے ہی لیگ آف نیشنز توقعات پر پوری اتر نہیں سکی ہے۔ ہم اب بھی طاقت کی سیاست میں بہت ساری پرانی رقابتیں دیکھتے رہتے ہیں۔ اگر ریاست ہائے متحدہ نے شرکت کر لی ہوتی تو وہ یورپ کی کئی متنازعہ قوتوں کے درمیان فطری طور پر ایک ثالث کا کردار ادا کرتی، اس لیے کہ امریکا کسی مخصوص ملک کے مقابلے میں یورپ کے امن میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔

مگر یہ کہنا غیر ضروری نہیں کہ امن کے لیے ریاست ہائے متحدہ وہ طاقت نہیں بن سکی ہے جیسی کہ ہم چاہتے تھے۔ اکثر اس نے خود کو سامراجیت کے بہاؤ میں بہنے دیا ہے جو ہمارے عہد کی صنعتی سرمایہ داری کا فطری نتیجہ ہے۔ کئی طرح سے یہ سرمایہ دارانہ نظام کے ایک مخصوص پیکر کی وحشیانہ مثال ہے، اور اس امر نے امریکی سیاست پر ناگزیر نتائج ثابت کیے ہیں۔

مگر، ساتھ ہی امریکا نے نئے زمین پر زیادہ پرجوش مثالیت کی پرورش بھی کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مثالیت سماجی حالات کی پیدا کردہ شیطنت اور نجاست سے ہی اپنی قوت حاصل کرتی ہو، جس کو دوسرے لفظوں میں اس کے اپنے اندر کا تقابل کہا جاسکتا ہے۔ یقینی طور پر یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، جسے ہر وہ شخص محسوس کرے گا جو اس سے واقف ہے کہ امریکی قوم میں ایک جنگی اور بنیادی عقیدہ بسا ہوا ہے، جسے سوڈیزم سوڈیزم قبیل کے فلسفی انسانی تکمیلیت کہتے تھے، یعنی، زیادہ سے زیادہ کامل بننے کی صلاحیت۔ یہ ایک عقیدہ ہے جس نے ہمارے کئی عظیم مذاہب کو بنیاد فراہم کی ہے اور جس نے ترقی کے بہترین کام کے لیے وجدان پیدا کیا۔ یہ یسوع مسیح کا اعلان تھا، اسی نے ایمرسن (Emerson) اور ورگے لاند (Wergeland) جیسے انسانوں کے کام کو ہمیز کیا تھا۔ امریکی دماغ کے لیے کوئی چیز بھی ناممکن نہیں۔ ان کے اس رویے کا اخلاق صرف سائنس اور ٹیکنالوجی پر ہی نہیں ہوتا، بلکہ اسی طرح سماجی ڈھانچوں اور حالات پر بھی ہوتا ہے۔ ایک امریکی کے لیے قیاس محض ایک خوب صورت سراپ ہی نہیں، بلکہ ایک عملی حقیقت بھی ہے جس کا نفاذ ہر انسان کا فرض ہے۔ امریکا کی سماجی مثالیت خود کو ایک شدید خواہش کی صورت میں ظاہر کرتی ہے جو ایک منصفانہ سوسائٹی کی تعمیر کے کام کے لیے خود کو اور اپنی پوری زندگی کو وقف کر دیتی ہے، تاکہ لوگ ایک دوسرے کے لیے باہمی رشتوں میں التفات کا مظاہرہ کریں، کم زور کو زیادہ تحفظ دیں اور ترقیات کی مہربان قوتوں کو نیا وہ مواقع فراہم کر سکیں۔

اس امریکی مثالیت کے دو فیصد ترین نمائندوں کو آج نوبل امن انعام دیا جا رہا ہے۔ دونوں نے امن کے تصور میں دوبارہ جان ڈالنے، اپنی قوم کے اور پوری دنیا کے دلوں میں امن کے جذبے کی شمع کو دوبارہ روشن کرنے کے لیے نہایت اہم کام سے کام کیا ہے۔

جین ایڈمز کو اعزاز دینے کے ساتھ ہی ہم اس کام کو بھی خراج تحسین پیش کرتے ہیں، جو قوموں کی برادری کی بھلائی اور امن کے لیے عورتیں کر سکتی ہیں۔ پرانے تصور کے مطابق روئے زمین کے تقریباً تمام گناہوں اور فساد کی جڑ عورت ہوا کرتی تھی۔ مروجہ روایت اور شاعری میں بھی اکثر عورت ہی قوموں اور بادشاہوں کے درمیان ہونے والی جنگوں کی وجہ ہوتی تھی۔ میں اس کے خلاف صرف ایک ہی واقعے سے واقفیت رکھتا ہوں: وہ قصہ ہے سبیل (Sabine) عورتوں کا جو اپنے رومن باپ اور بھائیوں، اور کئی شوہروں کے درمیان [لڑائی لڑوانے کی خاطر] کود پڑی تھیں۔

جدید عہد میں شاعروں نے، جن میں گوٹے (Goethe)، ایسن (Ibsen) اور بیونس (Bjornson) بھی شامل ہیں، عورتوں کو ایک مختلف انداز میں دیکھا ہے: ان کی نظروں میں عورتوں نے سوسائٹی کو بلند ترین اور خالص ترین اخلاقی معیارات کے عکس کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اور بیونس سے بڑھ کر کسی آدمی نے امن کے مقصد کے لیے عورتوں کے کام پر زیادہ اعتبار نہیں کیا ہے۔ مردوں کے مقابلے میں ان کی نئی آزاد حیثیت جو عورتوں نے ہمارے عہد کی سوسائٹی میں حاصل کی ہے، ہمیں توقع دلاتی ہے کہ مستقبل میں امن کے کام میں ان پر مشتمل ایک نئی طاقت موجود ہوگی۔ بیونس کی نظر میں عورتیں "لڑائی کے ہنگام میں سکون کا ایک نیا جذبہ" بن کر ابھریں گی، اس دعا کے ساتھ کہ قتل و غارت کے جنون پر محبت غالب آجائے گی، اس یقین کے ساتھ کہ جب عورتوں کو سوسائٹی اور ریاست میں طاقت ملے گی تو جنگ کا جذبہ اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔

پھر بھی، ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ عورتوں نے ابھی تک ہماری امیدوں کو مکمل طور پر پورا نہیں کیا ہے۔ انہوں نے مردوں کی پرانی اخلاقیات، جنگ کی اخلاقیات کے لیے ضرورت سے زیادہ موقع فراہم کیا ہے۔ عملی سیاست میں ہمیں وہ محبت بہت کم دکھائی دی ہے، مادری شفقت کی وہ گرمی جو قتل و غارت گری اور جنگ کو بر عورت کی نظر میں قابل نفرت بنا دیتی ہے۔ مگر خوش قسمتی سے ہم نے اس نسوانیت کی کچھ ایسی بھی چیزیں دیکھی ہیں جو جنگ سے نفرت پیدا کر دیں گی۔ جب کبھی عورتیں منظم ہوتی ہیں تو اپنے پروگرام میں انہوں نے ہمیشہ امن کے مقاصد کو شامل کیا ہے۔ اور جین ایڈمز میں تو نسوانیت کی تمام خوبیاں یک جا ہو گئی ہیں جو کرۂ ارض پر امن کو ترقی دینے میں ہماری معاون ہوں گی۔

میری زندگی میں دو بار، پہلی بار میں برس پہلے اور ایک بار اسی سال، مجھے اس ادارے میں جانے کا موقع ملا ہے جہاں وہ اپنا وقت گزارتی ہیں۔ شکاگو کے مفلس ترین علاقے میں جہاں، پولینڈ، اطالیہ، میکسیکو اور دوسرے ملکوں کے تارکین وطن رہتے ہیں، انہوں نے ایک وسیع سماجی ادارہ قائم کیا۔ اس میں جوان اور بوڑھے سب کو، بلکہ ان سب کو جنہوں نے طلب کیا ہو، مدد فراہم کی جاتی ہے، خواہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہو یا ملازمت کی تلاش کے لیے۔ جب آپ بس ایڈمز سے یہاں ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ وہ مینٹگ کا کمرہ ہو یا کھانے کا کمرہ۔ تو آپ کو فوراً احساس ہو جاتا ہے کہ انہوں ایک گھر بنایا ہے اور اسی

میں ایک ماں دیتی ہے جو ایک کی نہیں، سب کی ماں ہے۔ وہ ایسی شخصیت نہیں جس سے زیادہ بات کی جاسکے، مگر ان کی خاموشی، ان کی وسیع القلب شخصیت اعتبار پیدا کرتی ہے اور غیر ملکی کا ایسا ماحول بناتی ہے جو جسکی طور پر ہر ایک کی اندرونی غویہوں کو ظاہر کر دیتی ہے۔

اس سماجی کام کے ذریعے، جو اکثر مختلف قومیت رکھنے والے لوگوں کے لیے کیا جاتا ہے، انھوں نے امن کے مقصد کے لیے فطری قدم اٹھایا ہے۔ اور اب تقریباً ایک ربع صدی ہونے کو آتی ہے کہ وہ امن کی ثابت قدم ترجمان رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ، بغیر کسی شور شرابے کے، صرف اپنے کام اور صائمہ اندر قربانی نفس اور خاموش حساسیت کے ذریعے، انھوں نے اپنے لیے لوگوں کے دلوں میں محبت اور عزت کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ وہ اپنی قوم کی ایک سرمد آوردہ خاتون، بلکہ سرمد آوردہ باشندہ بن گئی ہیں۔

اور جب بھی شدید ضرورت پڑی ہے، انھوں نے ہمیشہ امریکی عورتوں کو بین الاقوامی سطح پر امن کے کام کے لیے تیار کیا ہے۔ پچھلی عالمی جنگ کے دوران پوری دنیا سے، حتیٰ کہ دشمن ملکوں سے بھی، عورتوں کو جمع کرنے کے ان کے عمل کو ہم ہمیشہ بہترین واقعے کے طور پر یاد رکھا جائے گا، جس میں عورتوں کے درمیان عالمی امن پر گفتگو کی گئی تھی اور ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کا آغاز کار، جس کا اجلاس اپریل 1915 میں دی ہیگ میں منعقد ہوا تھا، دیندیزی عورتوں کی جانب سے ہوا تھا، اور صحیح معنوں میں ہمیں آنجنائی ڈاکٹر لیلیا جیکوبز (Alena Jacobs) کی روح کو فرانس میں پیش کرنا چاہیے جنھوں نے ان کی پیشوائی کی تھی۔ مگر فطری طور پر انھوں نے مس ایڈمز سے اس کانفرنس کی صدارت کی درخواست کی۔ اسی لمحے، جب جنگ شروع ہوئی تھی، انھوں نے امریکا اور دوسرے غیر جانب دار ممالک کو متحد کرنے اور جنگ کو ختم کرنے کے مقصد سے ایک پروپیگنڈہ تحریک شروع کر دی تھی، اور اس پروگرام کی حمایت کی خاطر وہ ایک عظیم تنظیم بنانے میں بھی کامیاب ہو گئی تھیں۔ اس طرح انھوں نے پوری تنہائی سے جنگ میں امریکا کی شرکت کی مخالفت کی تھی۔ وہ امن کے آدرش پر شدت سے ڈٹی رہیں، ان مشکل وقتوں میں بھی جب دوسری مصلحتوں اور مفادات نے ان کو اپنے ساتھیوں سے بدظن کر دیا تھا اور ان سب کو جنگ میں کھسٹ لے گئے تھے۔ جنگ کے پورے عرصے میں انھوں نے ایسے امن کی لیے محنت کی تھی، جو ایک نئی جنگ شروع نہ ہونے دے، اور اس طرح وہ تمام دنیا کی صلح پسند عورتوں کی ترجمان بن کر ابھری تھیں۔ کبھی کبھی ان کے خیالات، اندرون ملک اور دنیا بھر کی عوامی رائے سے ٹکرا جایا کرتے تھے۔ مگر انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور آخر میں اس عزت کے مقام کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں جو انھوں نے عوام کے دلوں میں پہلے حاصل کر لیا تھا۔ کسی ایک مقصد کے لیے وقف ہو جانے سے ہمیشہ احرام حاصل ہوتا ہے، اور اپنے عقیدے میں بسن ایڈمز ایک ایسی امریکی ہیں جس میں بھی انھوں نے پوری دنیا کے نمائندوں کے ساتھ مل کر عام ترک اطمینان کی درخواست کی ہے۔

کنولس سرمد بھلر کی شخصیت میں، جو عظیم کولمبیا یونیورسٹی کے صدر ہیں، نوبل کمیٹی ایک ایسا آدمی

دیکھتی ہے جس کی خصوصیات جین ایڈمز کی خصوصیات سے بہت ملتی ہیں۔ امن کے لیے ان کا کام، تقریباً چھٹیس برس قبل، انھیں [جین ایڈمز] کے ساتھ شروع ہوا تھا، اور ان کی ان تھک توانائی اور سرگرمی تقریباً لافانی رہی ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے کام کے لیے اپنا سب کچھ وارد دیتے ہیں، ہمیشہ مستعد اور ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ کوئی بھی شے ان کی ہمت شکنی نہیں کر سکتی، نہ ان کی قوت کو بچوڑ سکتی ہے۔ کوئی شے ان کی آنکھوں کی پڑسکون مسکراہٹ کو پریشان نہیں کر سکتی۔ ان کی شخصیت کسی چھوٹ کی بیماری کی طرح ہے، اس لیے کہ وہ اپنے تمام کارکن ساتھیوں کو اپنی جیسی دلیری، ہمت اور اعتماد سے بھر دیتے ہیں۔ ان میں دوسروں سے کام لینے اور صحیح کام کے لیے صحیح آدمی تلاش کرنے کی بے پناہ لیاقت ہے۔ اگر کسی کو سچا امریکی کہا جاسکتا ہے تو وہ آدمی بھلر ہی ہو سکتا ہے: ایک وسیع القلب کارکن اور ایک بے مثال منتظم۔ میں نے ان کو اپنی یونیورسٹی میں کام کرتے ہوئے، امن کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے دیکھا ہے وہ جدھر بھی جاتے ہیں قوتِ حیات کا ایک ہالہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا نظر آتا ہے۔

وہ تو ایک اور نوبل انعام یافتہ، فرانسیسی ڈیستوئیل ڈی کوسٹاں (d'Estournelles de Constant) تھا جس نے ان کو امن کے کام کی طرف راغب کیا اور چلی باران کی کوششوں کو صحیح راہ دکھائی تھی۔ 1907 میں ان کو Conciliation Internationale کی امریکی شاخ کا صدر منتخب کیا گیا تھا، جس کی خود ڈیستوئیل (d'Estournelles) نے بنیاد رکھی تھی۔ ڈیستوئیل کا اہم مقصد فرانس اور جرمنی کے درمیان، اور فرانس اور انگلستان کے درمیان مصالحت تھا، جب کہ بھلر نے ایک زیادہ وسیع پروگرام طے کیا تھا، اور نتیجے کے طور پر پوری تنظیم میں امریکی شاخ اہم ہو گئی تھی۔

میری رائے میں کسی اور امن کی تنظیم کا نام ایسا مشکل ہو گا جس نے اتنے موثر، محکم، مستعد اور ثابت قدمی سے امن کے لیے کام کیا ہو، جیسا کہ امریکی گروپ نے بھلر کی صدارت میں کیا ہے۔ امریکا کی مخصوص اور عملی سمجھ بوجھ کے ساتھ، انھوں نے اس کام کو ایک مستحکم اور اقتصادی بنیاد پر کرنے کی ضرورت سمجھی، اور یہ ان کا ہی اثر و رسوخ تھا جس نے کارنگی (Carnegie) کو 1905 میں ایک خاصا بڑا رفاہی ادارہ بنام Endowment for International Peace قائم کرنے پر راضی کیا تھا۔ بھلر خود اس کے ایک شعبے کے صدر بنے جس کا کام ”تعلیمی میل جول“ سے متعلق تھا، جسے بالآخر انھوں نے Conciliation Internationale کی امریکی شاخ سے منسلک کر دیا، اور بعد میں وہ اس رفاہی ادارے کے سربراہ بن گئے۔ نگرانِ برسوں کے دوران انھوں نے جو کام کیے وہ بنیادی طور پر وہی تھے۔

ہمیں فوراً ہی نظر آ جاتا ہے کہ یہ ساری سرگرمیاں عمیق علم اور وسیع نظر رکھنے والے ایک ہی شخص کی رہنمائی میں کی گئی ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو محض عام اور کھوکھلی باتوں تک ہی محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ وہ تمام سوالات بھی اٹھائے ہیں جو بین الاقوامی امن کے لیے خطرہ ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے بلقان، مشرقِ بعید اور میکسیکو میں ہونے والی جنگوں کی امکانی وجوہ کی جانچ پڑتال کرنے اور سیاسی اعتبار سے کئی خطرناک

مقامات کے بارے میں رپورٹ بنانے کے لیے ماہرین بھیجے تھے انھوں نے ہمیشہ ہر قسم کے بین الاقوامی حالات اور تعلقات کے بارے میں اطلاعات جمع کرنے پر توجہ دی ہے، اور ان کے دل میں ہمیشہ سے جھنجھکیاں دینے کی ایک ”بین الاقوامی ذہن“، اور بین الاقوامی نقطہ نگاہ سے ہر سوال کی جانچ کرنے کی جواں امر کو بھی نظر انداز نہ کرے کہ دو متحارب قوتوں کے درمیان کے ہونے والے تنازعات کے جواز پر غور کیا جاسکے اور ان کے ساتھ غیر جانب دارانہ انصاف ہو۔ وہ خود اپنی ذمہ داری نبھانے میں کبھی ماکام نہیں ہوئے، اور انھوں اپنی بساط سے زیادہ کوشش کی ہے کہ دنیا کے ہر علاقے کے معاملات پر لوگوں کی توجہ مبذول کی جاسکے۔

یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ چار یا پانچ برس قبل ایک موقع پر ان کی مداخلت سے ایسے نتائج حاصل ہوئے تھے جنہوں نے ان کے امن پسند دوستوں کو خوش کر دیا تھا۔ اپریل 1927 میں جب بری آں (Briand) نے اپنی مشہور تقریر کی تھی، جس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ فرانس اور ریاست ہائے متحدہ کو جنگ کو غیر قانونی بنا دینا چاہیے، اس وقت تک ان کی اپیل کو کسی نے قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا جب تک کہ بھلے نے اس پر زور نہیں دیا تھا اور اس کے حق میں رائے عامہ کو کامیابی سے ہموار نہیں کیا تھا۔ انھوں نے بری آں سے بذات خود اس معاملے پر بات کی تھی، اور ان کی کوششوں ہی کی وجہ سے امریکا کو مذاکرات کے لیے راضی ہونا پڑا تھا جس کے نتیجے میں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، کیلاگ (Kellogg) معاہدہ ہوا تھا۔ لوگ اس معاہدے کے عملی اثرات کے بارے میں مختلف خیالات رکھتے ہوں گے مگر کم از کم یہ امن کی ترقی کے تصور کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ یہ محض ایک اعتراف ہی نہیں تھا کہ جس دن معاہدے پر دستخط ہوئے تھے بری آں نے بھلے کا شکر یہ ادا کیا تھا۔ اور یہ ایک فطری بات تھی کہ خود بری آں کے علاوہ دوسرے دو نوبل امن یافتگان، مر آسٹن چیمبرلین (Austin Chamberlain) اور ایلھو روڈ (Elihu Root) نے اس برس کے انعام کے لیے بھلے کی مامزدگی کی پُر زور حمایت کی تھی۔

بھلے اور جیمز ایڈمز جیسے امن کے کارکنوں کے بارے میں اکثر مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے کیے ہوئے کام کے قابل دید اور واضح نتائج کو ان کی سیاسی زندگی ہی میں ان کے نام کے ساتھ منسلک کیا جاسکے۔ وہ لوگ جو اپنی نظریں رائے عامہ کو ابھارنے اور تربیت دینے پر جاتے ہیں، اس قسم کی فوری کامیابیوں کی توقع نہیں رکھ سکتے جن کو عوامی پسندیدگی حاصل ہو۔ لہذا ایسا ہی ہوا ہے۔ اور شاید ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کہ امن کے انعامات ایسے صابر رہنماؤں کے سروں کے اوپر سے گزر گئے، اور ان بدترین کو دیے گئے ہیں جو حکومت کے مقتدر عہدوں پر فائز تھے اور جن کے پاس ایسے اختیارات تھے کہ وہ امن کی کوششوں کی معاہدوں اور دوسری قسم کے سیاسی معاملات میں قلبِ مابیت کر سکتے تھے۔

مگر ایک بدبر اور وہ پالیسیاں جن کو وہ نمائندگی کرتا ہے، اپنے ملک کے سماجی اور عقلی حالات کو منعکس کرتے ہیں۔ اگر اس کے کام کو دہرا پا ہونا ہے تو اس کی بنیاد ٹھوس ہونی چاہیے۔ امن کے لیے لیگ

آف نیشنز، لوکارنو (Locarno) معاہدہ، یا کیلگ معاہدے جیسے کارہائے نمایاں ناممکن ہوتے اگر امن کے لیے دنیا کے تمام ملکوں کے عوام کے طاقت ور حصوں کی خواہشات اور ارادے ان کی حمایت نہ کر رہے ہوتے۔

یقیناً، ایسی بہت سی طاقتیں ہوتی ہیں جو سوراکی اور ریاست کی ترقی میں معاون ہوتی ہیں، طاقتیں جو ان پالیسیوں پر ناگزیر طور پر اثر انداز ہوتی ہیں ہم جن کو امن کی پالیسی کہتے ہیں۔ نئے مفادات اور نئے آدرش پیدا ہوتے رہتے ہیں جو قوموں کو نئی قسم کی تنظیم کی طرف لے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی امن اور انصاف کو کبھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہماری پوری سوراکی کی نئی بنیادوں پر تعمیر نو نہ کی جائے۔ سوراکی کے ہر میدان میں ترقی کا یہی انداز ہوتا ہے۔

مگر ہر نئے خیال کو جو بیٹھا اور پھلتا پھولتا ہے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو شفاف اور ہوش مند چکر عطا کر سکیں۔ کسی بھی سوراکی میں کوئی شے اپنے اندرون سے پیدا ہلانے والی حرکت سے آگے نہیں بڑھتی، ترقی ہمیشہ انسانی خیال، انسانی ارادے اور انسانی عمل سے ہی ہوتی ہے جو ضرورت کی ایک زندہ اور سماجی چکر میں قلب ماہیت کر دیتے ہیں۔ لہذا، ہمیں ان تمام لوگوں کے کام کی ایک عظیم تاریخی مشن کے طور پر تعریف کرنی چاہیے جو ہمیں ہدف کی طرف دیکھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں، جو ارادہ یا غیر ارادی طور پر ہم اپنے لیے بناتے ہیں، اور ان سب لوگوں کی جو سماجی تعمیر نو میں مثبت عمل کے ذریعے عام تصورات اور عوامی ارادوں کو متحد کرتے ہیں۔ ہر مخصوص تصور کے ساتھ جسے وہ عوامی ارادوں میں نصب کر دیتے ہیں، وہ ہم کو نئی سوراکی کی راہ میں ایک اور قدم بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔

اپنے ہی دو آدمیوں کو ہم خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ امن کے لیے قربانیوں سے مزین، ایک طویل عرصے کی محنت کو نوبل انعام سے نوازا جا رہا ہے۔ جس ایڈمز اور صدر بھٹکر ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے امن کے آدرش کو ہزاروں ہزار لوگوں کے دلوں میں روشن کیا ہے۔ انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے علاقوں کے باشندوں کو اپنے رہنماؤں سے امن کا مطالبہ کرنا سکھایا ہے۔ انہوں نے وہ قوتیں پیدا کی ہیں جو ترقی کو متحرک کرتی ہیں، اور وہ تمام لوگ جو کرۂ ارض پر ایک پُر امن سوراکی کی تمنا کرتے ہیں ان کے مقروض ہیں۔

مارویائی نوبل کمیٹی کے رکن Halvdan Koht کی نیابتی

چوں کہ دونوں انعام یافتگان کی آمد ممکن نہیں تھی، اس لیے ماروے میں ریاست ہائے متحدہ کے سفارت خانے کے وزیر مسٹر ہاف مین فلپ نے ان کی جانب سے انعام وصول کیا، اور دونوں کی جانب سے اور ریاست ہائے متحدہ کی جانب سے شکریہ پیش کیا۔

جونا تھن سوئڈر بلووم

اعلان تجلیل

دیکھنے والوں کو ایسا ضرور محسوس ہوگا کہ اس برس کے دو انعام یافتگان [1929 کے انعام یافتہ فریڈک کیلاگ بھی سامعین میں موجود تھے۔] ایک دوسرے سے بہت الگ ہیں نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے کہ ان کے دو ملکوں کے درمیان ایک عظیم سمندر جائل ہے، بلکہ ان کی سرگرمیوں کے میدان بھی، اپنے کام کی نوعیت کے باعث مختلف ہیں، اس وقت ہمیں جن سے سروکار ہے۔ ایک تو عالمی سیاست کی دنیا کے آدمی ہیں، جب کہ دوسرے کیسا کے آدمی ہیں، یعنی، روحانیت کے سپاہی۔

مگر جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ تمام راستے ابدی شہر ہی کی طرف جاتے ہیں، اس طرح صحیح معنوں میں یہ دعویٰ بھی کیا جاسکتا ہے کہ راستے بھی بہت سے ہیں جن پر چلنا چاہیے اور طریقے بھی بہت سے ہیں جن کی جستجو کی جانی چاہیے، اگر نسلِ انسانی کو وہ عظیم اور مقدس ہدف حاصل کرنا ہے جو ابدی امن ہے قوموں کے درمیان۔

اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے تجارتی اور اقتصادی معاملات میں بہتری کے لیے عملی کوشش کی جانی چاہیے، اطلاعات کے آسماں اور تیز تر تہاڑے کی اور ساتھ ساتھ ایسی ہی کوششیں ہونی چاہئیں تہذیبی معاملات میں اور خالص سیاسی معاملات میں بھی۔

مگر قدم جو اٹھائے جاتے ہیں اور ترقی جو ہوتی ہے، بد قسمتی سے ہمیشہ شفاف نہیں ہوتی۔ لڑکائیوں کو جنمیں سر کرنا ہوتا ہے، اختلافات کو جنمیں زور کرنا ہوتا ہے، شمار میں اور حجم میں خوف ناک ہوا کرتے ہیں۔ اور مسکے صرف عملی یا سیاسی نوعیت ہی کے نہیں ہوتے، اکثر وہ لوگوں کے دماغوں میں جاگزیں ہوتے ہیں، جنگی ذہنیت کی طرح، بد قسمتی سے جو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہے، ایک وراثت کی مانند، جو ہماری نسل کو منتقل ہوتی ہے جنمیں باوجود ہل ناک تجربات کے ہم جس سے دست بردار ہونے میں ناکام رہے ہیں۔

خود انگریز نوٹیل کو بھی امن کے کام کی پیچیدگی اور مشکلات کے بارے میں غلط فہمیاں نہیں تھیں۔ اسی وجہ سے اس نے امن کے انعامات پر سخت پابندیاں نہیں لگائی تھیں، امن کے مقصد کو آگے بڑھانے کی کوئی بھی سنجیدہ کوشش اس کی حق دار ہو سکتی ہے۔ بہت جلد ہی اس کو ریاستوں کی بین الاقوامی تنظیم کی قدر کا اندازہ ہو گیا تھا، جیسی کہ لیگ آف نیشنز جو اب ہمارے سامنے ہے اس نے جنوری 1893 میں اپنے خیالات مرتب کر لیے تھے جب، برتھان سٹمر (Bertha von Suttner) کے نام اپنے ایک خط میں، اس نے اپنے تصورات کا ایک خاکہ پیش کیا تھا، امن کے انعام کے بارے میں جو کسی شخص یا کسی تنظیم کو دیا جاسکے گا جس نے عالمی امن کے آدرش کے حصول کے لیے سب سے زیادہ خدمات پیش کی ہوں۔

اس طرح، یہ انگریز نوٹیل کے تصور کے عین مطابق ہے کہ امن کے لیے کام کرنے کے طریقوں پر کوئی پابندیاں نہیں لگائی جائیں گی، نہ اس کے برعکس کیا جاسکے گا اس لیے کہ اس کام میں دست و پاؤں دونوں دیکار ہوتے ہیں۔

اب یہ دیکھ کر کتنی حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کی تمام طاقت اس عظیم مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے متحد ہے، اور کتنے خوش ہیں ہم لوگ کہ یہ کام نہ صرف ہماری چھوٹی سی دنیا کی ان بچ قومی سرحدوں کو، بلکہ بڑا عظموں کو، الگ کرنے والی وسعتوں کو بھی پاٹ سکتا ہے۔ اور اگر ہماری یہ خواہش ہوتی کہ اس تعاون کی زیادہ حمایت ہو تو ہم اس سے صرف نظر نہیں کر سکتے جو کچھ کہ اب تک حاصل کیا جا چکا ہے؛ یعنی لیگ آف نیشنز، سب سے بڑا، سب سے طاقت ور، سب سے زیادہ غیر معمولی ادارہ جو امن کے لیے کام کر رہا ہے، جیسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے آغاز کار کے لیے ہم ریاست ہائے متحدہ کے شکر گزار ہیں۔ لیگ آف نیشنز، وہ بلند و بالا مینار ہے جس کو جنگ اور امن کے کھنڈر پر صدر ویلسن (Wilson) نے تعمیر کیا ہے، اپنے ملک کی توصیف کے لیے اور دنیا کی نجات کے لیے۔ اب تک سب سے گہرا سایہ جو اس تنظیم پر ڈالا گیا ہے وہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے، کہ ویلسن کے ملک ریاست ہائے متحدہ نے جنگ کے بعد کے بارہ برسوں میں کیے جانے والے امن کے اس عظیم بین الاقوامی کام اور مفاہمت میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے۔

عالمی جنگ کے بعد سے جنگ کو خلاف قانون قرار دیا جانے اور اس کو مجرم کا درجہ دلانے کی تحریک کی امریکا میں زیادہ حمایت ہوتی ہے۔ فرانس میں امن کے بڑے مہتممین مسٹر بری آں (Briand) نے امریکی کیلنڈر کی ایک اہم تاریخ — 6 اپریل 1927 اس واقعے کی دسویں برسی کو جس دن ریاست ہائے متحدہ عالمی جنگ میں شامل ہوئی تھی، اپنے آپ کو امن کا شاگرد بن جانے کا اعلان کرنے کے لیے منتخب کیا تھا؛ ”اگر دو جمہوریتوں [ریاست ہائے متحدہ اور فرانس] کو عوام کے سامنے امن کے لیے ایک معتبر مثال پیش کرنی پڑی تو ریاست ہائے متحدہ کے ساتھ فرانس، کسی بھی باہمی شراکت میں شامل ہو کر، جیسی کہ دو ملکوں میں کی جاتی ہے، جنگ کو غیر قانونی کرنے کا اعلان کر دے گا۔“

اور 1927 کے جون کی مئی تاریخ کو، بری آں نے پیرس میں متعین امریکی سفیر کو دونوں ملکوں کے

درمیان ابدی دوستی کے ایک معاہدے کا مسودہ پیش کیا تھا۔ مسودے کے مطابق، دونوں فریق حلفیہ اعلان کریں گے کہ وہ اپنی قومی پالیسی کے مطابق جنگ کو رد کرتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں۔

اور بحر اوقیانوس کی دوسری جانب، ریاست ہائے متحدہ امریکا کے سیکریٹری آف اسٹیٹ فرینک کیلاگ (Frank B. Kellogg) نے اس تجویز کو ایک عالمی معاہدے کا درجہ دیا تھا، جس کے مصنف کو ہم آج خراج تحسین پیش کر رہے ہیں: ”ریاست ہائے متحدہ کی حکومت فرانس کی حکومت کے ساتھ ایک ایسے معاہدے میں شمولیت پر تیار ہے جو دنیا کی بڑی طاقتوں کے درمیان ہوگا، جس میں تمام قومیں شامل ہو سکیں گی، جس کے ذریعے قومی پالیسی کے مطابق جنگ کو رد کیا جائے گا اور اس کی مذمت کی جائے گی اور جس کے تحت عدم جارحیت اور بین الاقوامی تنازعات حل کیے جائیں گے۔“

اور اس مشترکہ اقدام سے وہ معاہدہ طلوع ہوا جو آج دنیا کی تقریباً تمام قوموں کو پابند کرتا ہے۔ اس معاہدے کی دفعہ شمارہ اکہتا ہے: ”تمام بڑے اقرار کرنے والے فریق، اپنے ملکوں کے حوام کی جانب سے حلفیہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنے ملکوں کی قومی پالیسی کے مطابق، ایک دوسرے کے درمیان، بین الاقوامی قضیوں کے حل کے لیے جنگ کا راستہ اپنانے کی مذمت کرتے ہیں۔“

مثالیہ بھی کبھی کوئی تحریر ایسی بوقت لکھی گئی ہوگی، جیسی کہ [فرانس کے شہر] لی ہاویٹ (Le Havre) نے سونے کے قلم سے اس بکس پر لکھی تھی جنفرینک کیلاگ کو پیش کیا گیا تھا، جب انہوں نے پیرس جاتے ہوئے، [فرانس کے] ساحل پر پہلا قدم رکھا تھا، فرانس اور دنیا کی دوسری بڑی طاقتوں کے ساتھ معاہدے پر دستخط کے لیے 27 اگست 1928 کو [اور کہا تھا]: *si vis pacem para pacem* [یعنی اگر امن چاہتے ہو تو امن کے لیے کام بھی کرو]۔

ہمیں احساس ہے کہ کئی ممالک نے کیلاگ معاہدے کے بارے میں اعتراضات اٹھائے ہیں، اور اس کا بھی پورا احساس ہے کہ معاہدے پر دستخط ہونے اور اس کے جذبے پر عمل کرنے کے دوران ایک طویل راستہ طے کرنا باقی ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ نظریے کو حقیقت نہیں سمجھا جانا چاہیے۔

ہمیں اس امر کا بھی احساس ہے کہ تمام قوموں کے درمیان شراکت کو جس کا سب سے بڑا نتیجہ کیلاگ معاہدہ ہے، خالص سیاسی میدانوں کے علاوہ بھی پھیلا نا چاہیے۔ اس لیے کہ قوموں کے درمیان سیاسی انتشار کتنا ہی کبیرا اور تکلیف دہ کیوں نہ ہو یہ ہرگز حیدر انا مکان نہیں کہ تجارتی اور اقتصادی میدان کے اختلافات امن کے لیے شدید خطرہ نہ بنیں۔ جنگ کے قرضوں کے مسئلے کو بھی، جو اب بھی اقتصادی ترقیات پر بڑا بوجھ ہے، مؤثر طور پر اور حتمی طور پر حل کیا جانا چاہیے۔ اور ہمیں، امن کے مفاد کے پیش نظر، سد باب کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اتنی ہی توانائی کے ساتھ جتنی کہ ہم فوجی اسلحوں کے خلاف احقاقہ لڑائی میں صرف کرتے ہیں، تنہائی پسندانہ پالیسیوں کی، جو سوائے دیکھوں، بے روزگاری کے اور کچھ نہیں دیتیں اور جو عالمی مصنوعات

کے تہادے اور صحت مند اندہ تقسیم میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

ان حلقہ ہائے اثر میں بھی، تمام قوموں کے درمیان تعاون مانگنا یہ ہے، ایسا تعاون جو پوری دنیا کی بہبود کی اہمیت کے اعتراف کی بنیاد پر ہو۔

ہم بہر حال اس وقت تک کامیاب نہیں ہوں گے جب تک ہمارے ذہن اور ہمارے خیالات امن سے ہم آہنگ نہیں ہو جاتے، جب تک ہماری ذہنیت کی مکمل طور پر قلبِ مابہیت نہیں ہو جاتی۔ آرچ بشپ سوئڈر بلوم کہتے ہیں: ”کیلاگ معاہدہ ایک حلقہٴ اعلان ہے، جو ان مول ہے اگر زندگی اس کے الفاظ کی موافقت میں گزاری جائے؛ اور مراب ہے اگر افعال اس کے عقیم اور عانی نشان جذبات کے خلاف ہوتے ہیں۔“ اور یہی اس معاملے کا عقدہ ہے: کہ اس معاہدے کو متحرک کرنے کی ضرورت ہے لفظ کی روشنی سے، جذبے کی سچائی سے، امداد سے، محنت سے کہ یہ امن کے تحفظ کی پیشتر کوششوں کی ضرورت رہا ہے۔

بمیں لوگوں کو احساس دلانا چاہیے کہ جس اعلانِ کردینا کہ جنگ جرم ہوگی، کافی نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ تمام لوگ اپنے احساس اور جذبے سے یہ سمجھنے لگیں کہ ایک بین الاقوامی تنازعے کے حل کے لیے ہزاروں ہزار لوگوں کے قتل کا کوئی جواز نہیں، نہ ہی یہ قابلِ معافی ہے کہ اپنے کسی ذاتی جھگڑے کو نمٹانے کے لیے ایک فرد کو قتل کر دیا جائے۔

برنی آل نے پچھلے برس لیگ آف نیشنز میں اپنی معرکہ الا قرار دے کر کہا تھا کہ ”اس دن جب بچوں کو دھڑی قوموں کے خداداد احترام کرنا سکھایا جائے گا اور اس کی جستجو کی جائے گی جو لوگوں کو متحد کرے، چہ جائے کہ انہیں تقسیم کرے، تب ہمیں کبھی معاہدے کی ضرورت نہیں ہوگی تب قوموں کے درمیان امن کا راج ہوگا۔“ آرچ بشپ جوناٹھن سوئڈر بلوم کی عقیم کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے روح کی طاقت کو امن کی لڑائی میں جھونک دیا ہے۔ مذہبی عہدے پر فائز ہوتے ہوئے انہیں اس لڑائی میں کھینسا کی بے پناہ اہمیت اور رسوخ کا اندازہ ہوا ہے۔ عیسائی کھینسا نے بہت بڑا گناہ کیا کہ ”ان“ [یسو مسیح] کی اکثر تعلیمات کے خلاف کام کیا ہے، آدمیوں کے لیے جن کا سب سے پہلا حکم یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کریں۔ یقینی طور پر کھینسا کے پاس اب بھی یہ موقع ہے کہ وہ ذہن کے نئے رویے کی تخلیق کرے جو ضروری ہے، اگر قوموں کے درمیان امن کو حقیقت کا روپ دھانا ہے۔

”جب دل میں بھی امن ہو اور زمین پر بھی امن، تب ہی کھینسا کا فرض پورا ہوگا اور وہ امن کا شہزادہ کہلائے گا۔“

رابرٹ ڈی ٹراز (Robert de Traz) کہتا ہے: ”بنی نوع انسان کے لیے وقف جینوا کا جذبہ اب اپنے عالمی تناظر میں جنگ سے مبادمتحرک حلقوں میں مراہت کرتا نظر آ رہا ہے۔ پیداہشی عیسائیت، امن کی روح، اب اس میں واپس حلول کر رہی ہے۔ اب یہ صرف سیاست دانوں، اقتصادیات والوں اور قانون دانوں ہی کو متحرک نہیں کرتی، یہ انسانی دماغ میں داخل ہونے کی جستجو میں ہے۔“

اب اگر نئی جنگ کا خطرہ منڈلاتا ہے تو اس بار کلیسا توپوں [کی کامیابی] کے لیے دعا نہیں کریں گے۔ وہ اُن ہی کے نام سے قوموں کو روکیں گے جنہوں نے خود کو امن کا شہزادہ کہا تھا۔ کم از کم اتنا تو کہتے ہیں اور اس سے وفاداری کا عہد بھی کرتے ہیں۔ اور چوں کہ انہوں نے 1914 میں دو بار سے زیادہ اپنے آقا کا انکار کیا تھا، وہ اب بنی نوع انسان کے معافی سے بھیک مانگتے ہیں۔“

شیلر (Schiller) کی خوب صورت نظم ”گھنٹی کا گیت“ میں کلیسا کی گھنٹی نہایت متحرک لہجے میں امن کی حمد کرتی ہے:

”غیس امن، اور ملاپ پیارا

جو رفتہ رفتہ

ہمارے گھر پہ ہے مہرباں سا“

اور پھر ترغیب دیتی ہے اور پھر مسرت کرتی ہے:

”کہ امن ہے اس کی پہلی آواز،

اور تا زہ ترین بھی ہے“

لہذا، آج ہم خرافات عقیدت اور شکرانہ کا کر رہے ہیں ان دو عظیم آدمیوں کا، قوموں کے درمیان، جن کے کام نے امن کے راستے پر نئے سنگ ہائے میل نصب کر دیے ہیں۔

اور جس طرح ہر چشمہ سمندر کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح ہم امید کرتے ہیں کہ امن کے ہاتھ اور دل کا کیا ہوا کام، وہ کام جس پر کیلاگ اور سمندر بلوم کے نام ثبت ہیں، بغیر کسی مزاحمت کے ”جینوا کے جذبے“ کو لوگوں کے درمیان زندہ رکھنے میں ہماری رہنمائی کرے گا، وہی جذبہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگرچہ یہ ”اب بھی کم زور ہے، مٹا نہ ہے، اس سے نفرت بھی کی جاتی ہے، جو ہر لمحہ تباہی کے خطرے میں ہوتا ہے مگر۔ کوئی طوفان اس کو ہمیشہ کے لیے تباہ نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یہ بنی نوع انسان کی حیات فوقی منہ زور امیدوں کا حامل ہے۔“

مارویاتی نوبل کمیٹی کے رکن Johan Ludwig Mowinkel کی زبانی

خطبہ:

امن کی ترقی میں کلیسا کا کردار

میراثین کہتا ہے کہ ہم خود تو امن سے رہتے ہیں مگر ہماری نگاہ نظری اور ہمارے شیطانی جذبات ہم کو امن کی طرف نہیں لے جاتے، کہ امن صرف اپنے اور دوسروں کے اندر کے قدیم آدم سے لڑائی کے ذریعے

ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ہماری نسل نہ صرف عالمی تباہی سے گزری ہے، بلکہ اسے اپنے اندرون کے انقلاب کا سامنا بھی ہوا ہے۔ ترقی پر غیر متزلزل عقیدہ رکھنے والے لوگوں نے، اس امید کے باوجود کہ دنیا جنت کو جانے والے راستے پر گام زن ہے، خود کو دو ٹوٹے پن، نفرت اور سیاہ ترین جہنم میں ڈوبا ہوا پایا ہے۔ روحانی اذیت سے لبالب بھرے ہوئے، ہم لوگوں نے خود سے سوال کیا ہے کہ کیا اس کھیمانے جس کو ہم امن کا شہزادہ کہتے ہیں اپنا فرض ادا بھی کیا ہے یا نہیں۔ کیا ہم ہر اتوار "ساری تعریفیں ہر تر خدا کے لیے، امن زمین کے لیے، اور خیر نگاہی آدمیوں کے لیے" نہیں گایا کرتے تھے؟ کیا ہم نے ہر گرتیس کے دن یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ "تم سب ہی کا جوتا اور اس کی خون بھری وردی جو اس نے جنگ میں اپنی تھی آگ میں جلائی جائے گی۔۔۔ کہ ابدی امن کا، قانون اور انصاف کے ذریعے، قیام اور تحفظ کیا جانا چاہیے؟"

ہم، مختلف ممالک اور مختلف مذاہب، پادری اور نبی دنیا، دونوں کے لوگوں نے خود سے یہ سوال کیا ہے، اور ہمیں احساس بھی ہوا ہے کہ کم از کم اپنے سب سے زیادہ ضروری اصول "محبت کے حکم کے مطابق زندہ رہنا" کے مطابق عیسائیت بہت سچے کر سکتی تھی۔ ہمیں اس بات کا بھی احساس ہوا ہے کہ ہمیں با دانی کو اپنے اندرون سے نکال باہر کر دینا چاہیے اور یہ بھی کہ مذہب اور اخلاق کو مندرجہ ذیل دو بڑی تمہیدوں کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے (۱) محبت کا حکم سرحدوں کا پابند نہیں ہوتا، جیسا کہ نجات دہندے نے Good Samaritan کی تمثیل میں بیان کیا ہے اور (۲) انصاف کا عیسائی تصور ایک آسمانی تخلیق کے مسلسل عمل سے پیدا ہوتا ہے، اسی طرح جیسے عیسائی انصاف کا تقدس اور اس کا امتیاز رکھا جاتا ہے۔

کھیمادوں کے تعاون کی پہلی کوششیں بہت سے مختلف علاقوں سے ہوئی تھیں: جنگ کے چھڑنے کے بعد کانستینس (Constance) میں World Alliance for Promoting International Friendship through the Churches کے نام کا ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا، اور نومبر 1941 میں اسکیٹڈے نیویا، سویڈر لینڈ، نیدر لینڈ، ریاست ہائے متحدہ امریکا (جب یہ ممالک غیر جانب دار تھے) دفنی لینڈ اور ہنگری کے پادریوں کی تیاریوں کے بعد، تعاون کے لیے ایک مشترکہ انجیل جاری کی گئی تھی۔ اس انجیل کو حالات کے پیش نظر بہت جیسے اور حقارت کی نظر سے دیکھا گیا تھا۔ ہماری آوازیں اس وقت تک Ecumenical Council میں متحد نہیں ہوئی تھیں جیسی کہ آج ہیں، اور توپوں کی گھن گرج کے مقابلے میں بہت کم زور تھیں۔ میں 1917 کے گرمی کے موسم میں حالیہ مایوسیوں کے بعد ریل گاڑی کے ذریعے اسٹاک ہوم سے اُپسالا (Uppsala) جا رہا تھا۔ ہم نے ایک میٹنگ کے لیے پہلے ہی انتظامات کر لیے تھے۔ یہ دونوں جانب کے وطن پرستوں کے اعتراف کے لیے تھی، یہ دکھانے کے لیے کہ، اپنی قوم سے وفاداری کے علاوہ بھی ان کے پاس کچھ زیادہ عمیق، کچھ بنیادی اور متحد کرنے والی شے موجود ہے، جس کو Cross of the Savior کہتے ہیں۔ ابھی میں اُپسالا سے بہت دور نہیں تھا کہ میں نے ایک انگریزی اخبار خریدا اور اس کے پہلے صفحے پر لکھا

دیکھا: The British Council for Promoting an International Christian Conference۔ میری آنکھوں کو یقین نہیں آیا۔ شمال میں ہم بالکل ایسا ہی منصوبہ بنا رہے تھے۔ میں نے ان کو ایک تاریخ بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ ہماری طرف سے دعوت نامے بھیجے جانے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے اپنے ایک خطبے میں غیر جانب دار ممالک میں ملکنہ Pharisalism [قبل مسیح کے زمانے سے موجود یہودیوں کا ایک سازشی فرقہ] کے خلاف تنبیہ کر دی تھی مگر Providence [عیسائی عقیدے کے مطابق خدا کی ایک صفت] کی زیادہ تعریف نہیں کی گئی کہ اس نے اسکیٹڈے نیویائی ممالک کو بائبل عارفان کی تباہیوں سے بچایا تھا، جلال کر اس نے ان کو اس کے دکھ بھڑے مناظر دیکھنے سے باز نہیں رکھا تھا۔ گفت و شنید اور خط کتابت کے بعد اس تنظیم کی ذمہ داری ہم تینوں نے اٹھائی تھی: میں، اوسلو کے بشپ، جو ایک مشہور اور ایمان دار آدمی تھے اور سپا لاند (Sjælland) کے بشپ، جو کلیساؤں کے اتحاد کے ان تھک دانی تھے۔

اس مشترکہ دعوت نامے میں کانگریس کا مقصد عیسائی اتحاد کے طور پر بیان کیا گیا تھا۔ یہ ایک قسم کا اظہار تھا، دنیا والوں کے سامنے اس یقین کا کہ عیسائیت ان کی اہمیت کم کیے بغیر تمام سرحدیں پھاڑ گئی۔ انفرادی قوموں تک پہنچ جاتی ہے۔ جنگ کی وجہ اور خالص سیاسی ذرائع برائے حصول امن پر بات نہیں کی جاتی تھی۔ مقصد اس امر پر غور کرنا تھا کہ مختلف کلیساؤں کے خلاف جدوجہد سے کیا حاصل کر سکتے ہیں اور کس طرح وہ بہترین الاقوامی مفاہمت کے لیے ذہنی فضا تیار کر سکتے ہیں۔ ماقابت اندیش قوم پرستی کو عیسائی بھائی چارے میں بدلنا ضروری تھا۔ برطانوی تعاون، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، جو ایک متحد عیسائی اعتراف کی تحریک چلا رہا تھا، جاننا چاہتا تھا کہ غیر جانب دار شمال میں بھی کیا اس قسم کی کانگریس کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ بعد میں The Challenge نامی اخبار میں کئی مضامین شائع ہوئے، جن میں کہا گیا تھا کہ یہ کلیساؤں کا فرض تھا کہ وہ قدم بڑھاتے، اس لیے کہ اسٹاک ہوم میں ہونے والی Social Democratic Congress کا انعقاد اب موثر کر دیا گیا ہے۔ ستمبر کے درمیان تک The Challenge نے ”پُر زور الفاظ میں جنگ میں شامل اہم عیسائی شراکت داریوں کے نمائندوں پر مبنی ایک میٹنگ پر اصرار کیا“ تھا۔ اخبار نے مزید کہا تھا کہ ”کلیسا کو دنیا کو یہ دکھانے کے لیے پیش قدمی کرنی چاہیے کہ یسوع مسیح کی پیروی کرنے والے ان کی فرماں برداری میں متحد ہیں۔“ بعد کی اشاعت کے ایک اہم مضمون میں ایسی کانگریس کو ایک ناقابل فرار فرض کے طور پر بیان کیا گیا تھا جس میں موجودہ حالات میں بے مثال امکانات مضمر تھے۔ ہماری ہی طرح حیرت زدہ اخبار نے بین الاقوامی کلیسائی اسمبلی کے انعقاد اور ہمارے ارادوں کے بارے میں مزید معلومات کی درخواست کی اور اس موضوع پر ایک مضمون شائع کیا۔

Internationale Monatsschrift میں پروفیسر ایڈولف فان ہارنیک (Adolf von Harnack) نے حال میں لکھا تھا: ”ہمیں مسرت ہوتی ہے جب نیک نہاد حب الوطنی کو اس مفاہمی پرست دنیا کی روشنی میں لایا جاتا ہے، مگر مفلس ہے وہ شخص جسے اس کے بلند ترین آدرش حب الوطنی ہی میں نظر آتے ہیں، یا

وہ قوم کو ساری خوبیوں کے خلاصے کے طور پر دیکھتا ہے۔ اب، اس وقت کے مقابلے میں، کبھی عجب تبدیلی ہے، جب ہمیں اس دنیا میں ہمارے درمیان یسوع مسیح کی موجودگی کا تجربہ ہوا تھا! لہذا، ہمیں اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ بنی نوع انسان میں عیسائی اتحاد کی کوشش کرنی چاہیے، اور اپنے مختصر حلقوں میں بھی فراخ دل ہونا چاہیے، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ بنی نوع انسان کا براہ راست اتحاد یونائیٹڈ پیپلز کا ایک مثالیت پسند خواب نہیں، بلکہ ایک حقیقی مقصد ہے، جو انجیل مقدس سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔“

مغرب میں پاسپورٹ کی مشکلات کے باعث اسمبلی کو ماروسے، ڈنمارک، سویڈن، نیدرلینڈ اور سویٹزرلینڈ کے کلیسائی نمائندوں تک ہی محدود رکھنا پڑا تھا۔ اُپالالا میں کانفرنس کا اجلاس خاموشی سے منعقد ہوا تھا۔ بشپ اوٹو جینسن (Oto Jensen)، پروفیسر سورگن اسٹرن (Morgenstierne) اور پادری یوجین ہینسن (Eugene Hanssen) اُن مارویائی افراد میں شامل تھے جو آئیں سکے تھے، مگر انہوں نے اپنی حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔ بشپ برٹ اسٹولین (Bernt Støyle) اجلاس میں شریک ہوئے تھے اور جب انہوں نے اُپالالا کے بڑے کلیسا میں تقریر کی تھی تو وہ ہمارے دلوں میں سما س گئے تھے۔ دوسرے مارویائی نمائندوں میں موجودہ بشپ ایونڈ برگراف (Eivind Berggrav)، ڈین ہانسن (Dean G. Hansteen)، سیکریٹری جنرل پینے (Piene) اور موجودہ علاقائی پادری Thvedt شامل تھے۔ ڈنمارک کے دو نمائندوں میں سیالاند کے بشپ اور چیف لائبریرین لانگے (H. O. Lange) شامل تھے۔ سویڈن کے بشپ لوئس گرین (Lönegren) نے نائب صدر نشین کے فرائض انجام دیے تھے۔ مسیح کی عبادت کا تبلیغی خطبہ بشپ اسٹادے (Stadener) نے دیا تھا، جو آج کل Swedish Board of Education کے صدر ہیں۔ سیکریٹری کے فرائض مؤثر طور پر اُن تھک انسان ٹم ہسٹمان (Knut B. Westman) نے انجام دیے تھے، جو پہلے چین میں رہے تھے مگر ان دنوں اُپالالا میں پروفیسر ہیں۔

بشپ اوٹو جینسن نے ہمارا (Hamar) سے لکھا تھا: ”مجھے سب سے زیادہ یہ ہے کہ Evangelical کلیسا میں امن اور بھائی چارے کی خواہش پھیل رہی ہے۔ اتحاد اور تعاون کے ذریعے Evangelical کلیسا بھی ایک عالمی طاقت بن سکتا ہے۔ یہ Evangelical کلیسا ہی ہے جو آزادی، اختیار اور قراواں محبت میں وہ اصول رکھتا ہے جوئی دنیا میں پرنیاست نہیں کر سکتے ہیں۔“

جینس گلیڈش (Jens Gleditsch) نے خیالات کو ہمیز کر دینے والی تقریر کے اشاروں سے بھرا خط لکھا تھا، جو دو بعد میں اسٹاک ہوم میں ہونے والی Ecumenical Conference میں کرنے والے تھے۔ دسمبر 1917 میں منعقد ہونے والی میٹنگ کا نتیجہ ایک اعلان تھا جو بھائی چارے، انصاف اور امن پر عقیدے کا۔ دراصل، مجھے آج بھی وہ نوجوان مارویائی، سویڈش اور ویش کلیسائی یاد ہیں جنہوں نے میری لائبریری میں بیٹھ کر کچھ لا جواب جملے ترتیب دیے تھے جو عالم گیر عیسائیت کی تعمیر نو میں عقیدے سے بن گئے تھے۔

غیر جانپ دار ملکوں میں ہونے والی Conference of Churches نے (۱) عیسائیوں کے اتحاد (۲) عیسائی اور سماجی زندگی اور (۳) عیسائی اور قانون پر بیانات جاری کیے تھے۔ کھیرا کے غور و فکر اور ان کے کام کی رہنمائی کے لیے آسٹن ہلڈ (Ostenfeld)، اسٹوٹس (Staylen) اور سوئیڈر بلوم کی دستخط کی ہوئی دستاویزات بھی جاری کی گئی تھیں۔

کانفرنس کا ورائے قومی کردار ہماری امیدوں سے کہیں زیادہ موثر ہوا تھا۔ مشن بھی امن کا آلہ کار اور نتیجہ ثابت ہوا۔ عیسائی۔ مشن اپنی نوعیت کے اعتبار سے ورائے قومی اور ایک روحانی وجود ہے جو لوگوں کو مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف نسلوں اور قومیتوں کے انسان گردانتا ہے۔ اپنے روحانی اور عیسائی فرائض کی تکمیل کی آزادی کے بارے میں مشن کے مطالبے کو عالمی جنگ نے قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ ایڈمبرا میں قائم مشن کو The Neutral Conference نے ایک خط لکھا تھا۔ بعد میں ہم نے ان عیسائی اور دوسرے اداروں سے رابطہ کیا جنہیں ان مسائل میں دلچسپی تھی۔ ہماری درخواست پر عنایت کی نظر کی گئی اور ایک سے زیادہ موقعوں پر خاطر خواہ نتائج بھی نکلے۔

اب میں تین اہم نکات کے حوالے پیش کرنا چاہوں گا جو دسمبر 1917 میں لپسلا کی میٹنگ کے اعلان میں شامل تھے۔

(1) عیسائیوں کا اتحاد

جب ہمارا عیسائی مذہب ایک مقدس کائناتی کھیرا کی بات کرتا ہے، تو ہم کو اس عمیق اندرونی یکجہت کی یاد دلاتا ہے جو قومی اور مخصوص (scriptural) اختلافات کے باوجود عیسائی یسوع مسیح کے اور ان کی روحانیت کے کام کے بارے میں رکھتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں، بغیر عدم تشکر اور بد اعتمادی کے، ان مخصوص عیسائی تجربات اور سوچ کے بارے میں جو، ہر کھیرا نے اپنی تاریخ میں خدا سے حاصل کیا ہے، کہ اس یکجہت کو جو یسوع مسیح کی تعلیم سے ملتا ہے ہمارے انداز حیات اور تبلیغ میں بہتر بتایا جاسکتا ہے اور بتایا جانا چاہیے۔

(2) عیسائی اور سماجی زندگی

عیسائی کمیونٹی کی سب بڑی کوشش ہوتی ہے زمین کا نمک اور عالم کی روشنی بننا اور Evangelical کھیرا کو اسے روحانی انداز میں اپنی تبلیغ اور مثال سے حاصل کرنا چاہیے۔ کھیرا کو بنی نوع انسان کے جاننے والے ضمیر کی نمائندگی کرنی چاہیے۔ جنگ میں شامل تمام قوموں کے عیسائیوں سمیت، ہم یسوع مسیح کے جذبے اور جنگ کے درمیان تضاد سے اچھی طرح واقف ہیں، لہذا ہم سماجی زندگی میں عیسائیوں کے حصہ لینے کے کچھ اہم نکات پر زور دینا چاہیں گے۔

(الف) بدقسمتی سے ماضی میں کلیسا نے یگانگت پیدا کرنے والے عناصر کے بھلے اکثر اختلافات پر زیادہ زور دیا ہے، مگر اب اس کو عیسائی برادری کے آدرشوں پر ڈھونڈ کر، خود غرضی کی مذمت کرنا اور جنگ کو ختم کرنے کی کوششوں میں پوری طرح شامل ہونا چاہیے، خواہ وہ سماجی، اقتصادی یا سیاسی نوعیت کے ہوں۔

(ب) عیسائیوں کو ذہنی نشین کر لیا چاہیے کہ جزوی طور پر وہ رائے عامہ کے ذمے دار ہیں اور انھیں عوامی، قومی اور بین الاقوامی زندگی کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات میں محبت اور صداقت کی خدمت کرنی چاہیے۔ ان کو بیسویں کے خیالات، زبانوں اور رویوں کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(ج) کلیسا کو بین الاقوامی مفاہمت اور بین الاقوامی تنازعات کے بندوبست کے لیے، وساطت اور پنچائی طریقوں کے ذریعے کام کرنا چاہیے۔

(3) عیسائی اور قانون

عیسائی نقطہ نظر کے مطابق، صحیح اور غلط کی تمیز ایک رہائی تھم ہے، اور اس سے پھوٹنے والی مثالیں بھی: قانون اور شہری ضابطے۔ کم از کم بنیادی درجے تک، شہری ضابطے انجیل مقدس کی تعلیمات پر مؤثر عمل کے لیے لازمی ہیں۔ موجودہ ہر قانونی نظام نامکمل ہے، جس کو تکمیل کے لیے اخلاقی شعور کی نشوونما کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا کلیسا کو قومی سرحدوں کے اندر بھی اور باہر بھی، قانون کے تقدس کو برقرار رکھنا اور یسوع مسیح کے نام پر ان کی نشوونما کرنی چاہیے۔ اس لیے اس کو تشدد کی حموتنا اور قانون کی حکمرانی کی مخالف ہر طرح کی طاقت سے جنگ کرنی چاہیے۔ اور اسے صداقت، انصاف اور محبت کے اصولوں کی بنیاد پر اپنی ہم بودیت کی تبلیغ کرنی چاہیے تاکہ تمام قومیں اور تمام سماج قانون کے مطابق کام کریں۔

اس معاملے میں جہاں بھی کلیسا نے غلطی کی ہے، اسے انکسار سے اس کا اعتراف کرنا اور غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہیے۔

خود قانون کے ڈھانچے کی صرف ایک محدود حیثیت ہوتی ہے اور اس کو مؤثر ہونے کے لیے اپنے اندرونی اخلاقی عقائد سے میل کھانا چاہیے۔ عیسائی برادرات محبت، ضبط نفس اور انصاف جیسے حالات پیدا کرنا اور ان کی پرورش کرنا کلیسا کی مرکزی ذمے داری ہوتی ہے۔

یہ ستمبر 1917 میں ہونے والی کانفرنس کے اجماع موضوعات۔

عدالتی نظام کے تقدس کے نظریے کا وحی میں اعلان کیا گیا تھا، مگر بعد میں سے اسے اکثر غیر واضح رکھا گیا، اس کی غلط تعبیر کی گئی، اور اس کو غیر متوقع طور پر لیا گیا تھا اور اس کا مؤثر اعتراف ایک تجویز میں کیا گیا تھا جو ایک انگریز، ایک جرمن اور فرانسیسی نے 1928 میں آئزے ناخ (Eisenach) میں منعقد

Ecumenical Council اجلاس میں پیش کی گئی تھی جسے Universal Ecclesiastic World Federation

اور Ecumenical Council دونوں نے مشترک طور پر منظور کیا تھا۔

اس کی شروعات کرنے والے جی چیسٹر (Chichester) کے بشپ جی کے اے تیل (G. K. A. Bell) تھے جو Ecumenical Conference کے جانے پہچانے فرد ہیں۔ وہ سیاست دان نہیں، ایک پادری ہیں۔ اپنے گھر مذہبی عقائد اور ان تحکیمات کے باعث ان کی رائے کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ ان کے کہے ہوئے کو ہمیشہ سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔

آئرزے مانخ میں پیش کردہ ان کی تحریک کی ایک جرمن اور ایک فرانسیسی نے حمایت کی۔ یہ دونوں افراد پوری عیسائیت کے شریف ترین اور کھرے افراد ہیں۔ ایک ڈاکٹر وائلٹر سمنز (Walter Simons) ہیں جو اس وقت لایپ زیگ (Leipzig) کی National Court of Law کے صدر تھے اور ایبرٹ (Ebert) اور ہینڈن برگ (Hindenburg) کے درمیان جرمنی کے نائب صدر بھی رہے تھے۔ ان کے لکھے ہوئے مقالے 1925ء اسٹاک ہوم کی میٹنگ میں امتیازی اور پسندیدہ مانے گئے تھے۔ ایک فرانسیسی اخبار نے ان کے بلند خیالات پر تبصرہ کیا تھا جو [اس کے الفاظ میں] ان کی گوئی کے جیسے امداد کے عقب میں بھرا کرتے ہیں۔

ایک فرانسیسی فرد، پیرس کے، سیمیرانہ فطرت والے، اپنے وطن، صداقت اور امن کے لیے ہمیشہ روشن نظر آنے والے، پروفیسر ویلٹرے مونو (Wilfred Monod) تھے۔

بظاہر نظر آنے لگا کہ تجویز کی تحریک غیر ذمہ دار تخیل پرستوں نے نہیں، معجز آدمیوں نے کی تھی جو دل سے اپنے عوام کے وفادار تھے۔ یہ تجویز ایک عمل ہے اور اقدام کی طلب گار ہے۔

آئرزے مانخ تجویز مندرجہ ذیل چار نکات پر مشتمل ہے، پہلے دو نکات اسٹاک ہوم میں ہونے والی میٹنگ سے متعلق تھے:

”(۱) ہم دل کی گہرائیوں سے دنیا کی سرمد اور وہ شخصیات کے اس حلفیہ اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں جنہوں نے اپنے ممالک کی جانب سے بین الاقوامی تنازعات کو حل کرنے کے لیے کی جانی والی جنگ کی مذمت کی ہے، اور [ہم سب] اس کو بین الاقوامی طاقت کی سیاست کے آئندہ کارہائے جانے کے عمل کو مسترد کرتے ہیں۔ مزید، ہم اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ تمام تنازعات اور آویز شمس پر امن طریقوں کے علاوہ کسی اور طریقے سے حل نہیں کی جانی چاہئیں۔

(۲) ہم سمجھتے ہیں کہ بین الاقوامی تنازعات کا جنگ کے ذریعے حل یسوع مسیح کے جذبے سے مسالحت کے قابل نہیں ہے، اس لیے ان کے کلیسا کی کارکردگی اور جذبے سے بھی ناقابل مسالحت ہے۔“

تیسرا نکتہ موجودہ حالات سے متعلق ہے۔

(۳) ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب ہمیں امن کی خاطر موجودہ معاہدوں پر نظر ثانی کرنا پڑے گی، مگر ہم سمجھتے ہیں کہ تمام بین الاقوامی تنازعات اور لڑائیوں کو جنہیں سفارت کاری سے حل

نہیں کیا جاسکتا، International Court of Justice یا کسی اور عدالت کے ذریعے ثالثی سے حل کیا جانا چاہیے جس پر دونوں فریق متفق ہوں۔“

چوتھا نکتہ، جو اس تجویز کا سب سے دور رس اور نا درگتہ ہے، نہ صرف لاجواب عمومیت پیش کرتا ہے، بلکہ ایک اصول بھی طے کرتا ہے جو ہمارے عیسائی عقائد کا براہ راست نتیجہ ہے، وہ اصول جس کو کلیسا نے بھی قبول کر لیا ہے، جس پر اس وقت عمل کیا جائے گا جب جنگ کا خطرہ درپیش ہو اس لیے کہ جیسا افراد اور گروہوں میں ہوا کرتا ہے، قوموں کے درمیان ہمیشہ تنازعات اٹھتے رہیں گے۔ [اس کے پس منظر میں] ارادہ ہے کہ ایک قانونی نظام کو اس طرح پھیلا دیا جائے کہ قوموں کے درمیان جنگ کو خارج کرنے کا وہیسا ہی طریقہ موجود ہو جیسا کہ قانون کی پابندی کرنے والے سماج قبائل کے زمانے کی خون کی لڑائیاں بند کرانے میں استعمال کیا کرتے تھے۔

اس برس وہ کچھ ہوا ہے جس کا تصور عالمی جنگ سے پہلے ممکن نہ تھا: کہ چوتھے نکتے کی ایک عمومی تشکیل کو Lambeth Conference نے منظور کر لیا ہے، جسے Anglican بشپ کی بین الاقوامی کاؤنسل برآمدوں میں منعقد کرتی ہے۔

چوتھے نکتے کے مقاصد پر مزید روشنی ڈالنے کے لیے میں اس نکتے پر تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔

”(4) قانونی نظام خدا کا بنایا ہوا ہے، اور یہ کلیسا کا فرض ہے کہ اس کے تقدس پر زور ڈالے اور اس کو قومی مرحدوں سے پرے بھی پھیلانے کے لیے کام کرے۔ کلیسا کو چاہیے کہ وہ ہر معاہدے میں شامل پابندیوں پر عمل کرائے جس کے مطابق قوموں کو اپنے تنازعات ثالثی یا قانونی ذریعوں سے حل کرانے چاہئیں۔ اس طرح، اگر کلیسا کے اپنے ملک کی حکومت کسی تنازعے کو طے شدہ طریقے سے حل کرنے میں آنا کافی کرتی ہے تو کلیسا کو اس صورت سے پیدا ہونے والے جنگ کی خدمت کرنی چاہیے، اور اسے زیادتی اور عملی طور پر اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہیے۔“

کیا۔۔۔؟ اگر وہ جنگ کرنے لگے تو کیا میں وطن سے بھاگ نکلوں؟ مشکل وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ دوں؟ اپنے ملک کی قانونی حکومت سے سر تابی کروں؟ میں خود تو آئینے میں موجود نہیں تھا، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہاں موجود ہمارے بھائیوں نے خدا اور اپنے ضمیر کے سامنے اس تجویز کو پیش کرنے، منظور کرنے اور دنیا کے تمام کلیساؤں کے سماج کو بھیجنے سے پہلے اس پر سختی سے غور کیا ہوگا۔ مجھے اس خیال کے بارے میں مئی 1929 میں بتایا گیا تھا، جب میں امن کے ایک لیکچر کے سلسلے میں لندن میں موجود تھا۔ ہمیں اس معاملے کی غور سے جانچ کرنی ہوگی۔

یسوع مسیح نے کہا تھا: ”سب سے بڑی چیزیں سب سے بڑے حوالے کر دو، اور خدا کی چیزیں خدا کے حوالے۔“ سینٹ پال نے لکھا تھا: ”ہر نفس کو بڑی طاقتوں کے ماتحت ہونا چاہیے کہ خدا سے بڑی کوئی طاقت نہیں۔“ پیٹر نے

لکھا تھا: ”آفا کی خاطر، خود کو انسان کی ہر ہدایت کے حوالے کر دو۔“ یہ اصول اس وقت بھی جائز تھا جب نیر (Nero) روما کا شاہنشاہ تھا۔ زمان پسندوں اور لاپرواہ لوگوں کو یہ الفاظ بڑے لگے تھے، مگر سماج اور تاریخ رومانوی فضولیات اور خواب کوں خیالات سے نہیں بچتے، بلکہ محنت سے بچتے ہیں جو ضمیر کے کہے اور قانون کے حکم کے مطابق کی جائے۔ بس ایک ہی آفاقی عقیدہ راسخ ہے: ”ہمیں انسان کے بچائے خدا کا حکم ماننا چاہیے۔“ پھر بھی، یہ وہ عقیدہ راسخ نہیں ہم یہاں جس کی درخواست کر رہے ہیں۔ کسی کی وفاداری کو متزلزل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ حالانکہ ہمارا تمل متزلزل ہو رہا ہے اور اس کے مستقبل پر ظلمت کے سایے لہرا رہے ہیں، اس کی بنیادوں میں تبدیلی اور بھی زیادہ خطرناک ہوگی، اگرچہ وہ کامل نہیں، اور ان میں بہتری کی ضرورت ہے۔ ہمیں سچینٹ پال کے یہ الفاظ ذہن میں رکھنے چاہئیں: ”اگرچہ انصافی کا معیار ہر کار ہے: جب تک کہ یہ ختم نہ ہو جائے، اب صرف ایک ہی ہے جو اسے قابو کر سکتا ہے۔“ تو کون ہے جو اس لاقانونیت کو لگام دے گا؟ جی نہیں! ہم جس بات کا مشورہ دے رہے ہیں وہ وفاداری سے روگردانی نہیں، اس کے برعکس، یہ زیادہ بڑے احساس فرض کی تابع داری ہے۔ ایک ورائے قومی عدالتی نظام بنایا جا رہا ہے۔ ان قوموں کے درمیان جو مصالحت یا ثالثی پر مابہت قدمی سے قائم ہوتی ہیں، جب تنازعات سر اٹھاتے ہیں تو بچائے جنگ کے پابند کرنے والے معاہدوں پر عمل کیا جاتا ہے، اور یہی بنیاد ہوتی ہے قانون کی حکمرانی کی شان دار عمارت کی۔ ہم وکالت کر رہے ہیں یہ سوچ مسیح کے بتائے ہوئے اصولوں کی تابع داری کی اور ان کے حواریوں کی، جو ہمیں شہری قانون کا احترام سکھاتے ہیں۔ ہم اس کو صرف اپنے عوام یا علاقوں تک محدود نہیں کرتے۔ ہمارے عوام اور ہمارے قوموں کو ہاتھ ملانا چاہیے ایک ورائے قومی عدالتی نظام کی تعمیر میں، جو عیسائی نظریے کے مطابق خدا کی تخلیق کا ایک تسلسل ہے۔ اور جب یہ عدالتی نظام پوری طرح قائم ہو جائے تو عیسائیوں اور کھیس کو بغیر کسی تردد کے اس کو ماننا چاہیے، تنازعے کی صورت میں بھی۔

شمال کے اس علاقے میں ایسے معاملات پر بات کرنا غیر ضروری معلوم ہوگا جہاں، پچھلے سو برس کی بنیاد پر، ہم اپنے درمیان کسی تنازعے کا مشکل ہی سے تصور کر سکتے ہیں۔ پھر بھی، ہمیں اس معاملے میں پوری دنیا میں اپنے بھائیوں سے وفاداری نبھانی چاہیے، اسی طرح جیسے ہم امن کے مقصد کے لیے کام کرتے ہیں۔ کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ اسکیٹنڈینیویا کی حکومت کسی معاہدے کو توڑے گی، اور کسی اور قوم کی جانب سے ان کے درمیان ثالثی کی پیشکش کو رد کر سکے گی؟ اگر کبھی اس قسم کی ناقابل تصور بات ہوئی تو عوام ایک نئی حکومت قائم کر دیں گے اور تمام معاہدوں پر عمل کرنا ہمیں گے جیسا کہ اور پارلیمان نے کیے ہوں گے۔ یہی صورت حال کچھ اور ملکوں میں بھی ہوگی۔

کیا تمام ملکوں کے کھیس جنھوں نے ایسے پابند معاہدے کیے ہیں انجیل کے نظریے کا اطلاق کرنے کا فیصلہ کریں گے اور اس طرح آئزے ناخ تجویز کی حمایت کریں گے؟ اگر ایسا ہو تو امن کے مقصد کے لیے کچھ ضرور حاصل ہوا ہوگا۔

نمبر ۱۹۱۷ء کی طرف واپس ہوا ہوگا۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں اُپالا میں ہونے والی میٹنگ ایک تیاری تھی۔ ایک بڑی میٹنگ کا منصوبہ بنایا گیا تھا جو ۱۹۱۸ء کے موسم سرما میں ہونے والی تھی جس میں جنگ میں شامل ملکوں سے کھیس کے نمائندے بھی شامل ہونے والے تھے۔ اس کا انعقاد اوسلو میں ہونا تھا۔ میں اس سلسلے میں بشپ ٹانڈبرگ (Tandberg) کے جواب سے اقتباس پیش کرنا چاہوں گا جو انہوں نے ۱۹۱۸ء میں میرے خط کے جواب میں لکھا تھا: ”میں سمجھتا ہوں کہ ہم یسوع مسیح کے کھیس کی خاطر، دنیا میں موجودہ تنازعے کے درمیان، غیر مبہم طریقے پر عیسائی یگانگت کا پرچار کریں جو تمام دنیاوی معاہدوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ لہذا، یہ بہتر ہوگا کہ تمام سربراہان اور وہ کھیسائی مستقبل قریب میں یک جا ہوں اور ایک کانفرنس قائم کریں جس میں باہمی اتفاق کے جذبے، دعا اور سنجیدہ مذاکرات میں اس امر پر غور کریں کہ نیکی اور برادری کی کامیابی کس طرح شیطانی جنون کو شکست دے سکتی ہے جس نے برسوں سے دنیا کی مہذب ترین اقوام کو دشمن بنا رکھا ہے۔ موجودہ حالات کے تحت بین الاقوامی کھیس کا ضرور ایک بھاری ایجنڈا ہوگا۔ آپ نے جو اپیل بھیجی ہے میں اس پر دستخط کرنے کو تیار ہوں۔“

نذا کی راشن بندی کے باوجود، اوسلو آنے والے نمائندوں کی میزبانی کے لیے تیار تھا۔ اوسلو کے بشپ نے لکھا تھا کہ اوسلو کو منتخب کیا گیا تو ”میں ہر ممکن کوشش کروں گا کی میٹنگ خوش اسلوبی سے ہو۔“ انہوں نے Ecclesiastical عالمی کانفرنس میں ماروے کے شاہ اور وزیراعظم کی کبریٰ دلچسپیوں کا حلفیہ تذکرہ کیا۔ وزیراعظم کی جانب سے گھنگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا، ”ان کی خواہش ہے کہ وہ اوسلو میں میٹنگ منعقد کرنے کے لیے پارلیمان سے اخراجات کے لیے درخواست کریں تاکہ اس کو نجی کوشش نہ سمجھا جائے اور کانفرنس پر سرکاری مہر ثبت ہو جائے، جس سے اس کی اہمیت میں اضافہ ہوگا۔“

پادری یوجین مینیس نے مجھے کانفرنس کے لیے تمام تر کوشش کرنے کی ترغیب دی تاکہ وہ اس طرح ”منعقد ہو کر اس کے تمام اخراجات Evangelical کھیس کے نزدیک معتبر ہوں، تاکہ ان کو مختلف کھیسائی سماج تک پہنچایا جاسکے۔ انجیل مقدس کے نمائندے کی حیثیت سے ہمارے کھیس بین الاقوامی منبر سے بین الاقوامی سطح کے خطبے دیتے ہیں۔“

بشپ اسٹوپلین نے اُپالا کی میٹنگ کو ”موسم سرما کی تاریکی میں بہار کی توقعات بڑھانے والی شکاری“ سے موسوم کیا تھا۔ ۸ فروری ۱۹۱۸ء کو انہوں نے کچھ ایسے الفاظ بھی ادا کیے جو کھیس کے ایک قابل قدر اور سچے خدمت گاری کو زرب دیتے ہیں: ”امید کی جاتی چاہیے کہ یہ ظالمانہ عہد زیادہ دن نہیں چلے گا، اس لیے کہ ایسا لگتا ہے کہ لوگوں میں غصہ بڑھ رہا ہے، جو ان کے خیالات پر حاوی ہوتا جا رہا ہے اور ان کو سماج کے نظام کے خلاف کر رہا ہے، اور سمجھ میں آنے والی یہ تبدیلی، اپنی نا انصافی اور بے رحمی کے باعث کمیونٹی میں سرایت کرتی جا رہی ہے، جو عالمی جنگ کی وجہ اس وقت اپنے اوج پر ہے۔ [اس لیے] اپنے آپ کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے ہمیں بہت محنت کرنی پڑے گی۔“

آگرچہ جرمنی، انگلستان اور دوسرے ممالک کے دونوں طرف کے کھیسائی 1923 میں تین دن کے لیے برن (Bern) میں، غیر جانب دار ملکوں کے نمائندوں کے ساتھ اکٹھے ہوئے تھے مگر بڑے بین الاقوامی کھیسائی کی کاؤنسل کو اوسلو لانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔

بے شمار پسپائیوں اور مشکلات، اور لیبر تحریک کی ایک مشترکہ میٹنگ بلانے کی کوشش کی ناکامی کے بعد ذمہ دار وطن پرست 1913 میں دی ہیگ کے قریب اوڈ واسینار (Oud Wassenaar) کے مقام پر عالمی جنگ کے بعد پہلی بار جمع ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ دیکھے دلوں اور، خاندانوں کے [جانی] نقصانات، اور قوموں کی محرومیوں، اختلافات اور فریب کاریوں کی پیدا کردہ قابل فہم بدگمانی کے باوجود اور بدولت مشوروں کے بعد، سب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "اے ہمارے باپ، ہماری بے جا مداخلت سے درگزر کر۔" "جو لوگ اکٹھے ہوئے تھے وہ صحیح معنوں میں Evangelical کھیسائی تھے، ان میں اکثر بدنام عوامی کھیسائیوں اور نام نہاد ریاستی کھیسائیوں کے خدمت گزار تھے۔ اس طرح Evangelical کھیسائی ایک بار پھر کم زور ہو گیا، اگرچہ اس کی وجہ اس کی ناچاقی اور فرقہ بندیوں تھیں کہ دنیا میں یہی پہلا گروہ تھا لوگوں کا جو عالمی جنگ کے بعد ذمہ دار مردوں اور عورتوں کو یک جا کر رہا تھا۔

اس کے چلو میں جنیوا میں 1920 میں Ecumenical احیاء کا آگ کے ذریعے ہتھیار ہوا تھا۔ اس جذبے نے مزاحمت کی اور کامیاب رہا۔ میں اس مرحلے پر ڈک کر اس پیچیدہ راستے کا تجربہ نہیں کروں گا جو بعد کے چند برسوں میں تلاش کیا گیا تھا۔ 1925 میں اسٹاک ہوم میں مغربہ ہوا۔ اپنی تاریخ میں کھیسائی کبھی پوری عیسائی دنیا کے نمائندوں کو متحد ہو کر سنجیدہ خود احتسابی کرتے اور ایک مشترکہ کوشش کرتے نہیں دیکھا تھا جس کا اظہار سینٹ بریجٹ (Bridget) کی دعا میں ہوا: "میرے آقا، مجھے راستہ دکھا اور مجھے اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔"

اسٹاک ہوم کی میٹنگ کے بعد Evangelical Lutheran World Convention اوسلو میں مستحکم ہوا۔

اسٹاک ہوم میں قائم کی گئی Continuation Committee نے جو اس برس منظور کیے گئے قانون کے مطابق Ecumenical Council کی نمائندگی کرتی ہے، 1926 میں [سوئٹزرلینڈ کے شہر] برن میں، 1927 میں ونچسٹر (Winchester) اور 1928 میں پراگ (Prague) میں جہاں Ecumenical Council کے مادیاتی رکن پروفیسر لائیڈر برن (Lyder Brun) نے میٹنگ میں ملاحوں کی بیبورو کو پیش کیا۔ ایک معاملہ جسے لیگ آف نیشنز نے بھی اٹھایا تھا، آئزے ماخ میں 1929 میں اور شیبٹے (Chêxbres) کے مقام پر 1930 میں سب نام نہاد یوٹوپیائی خیال حقیقت بن گیا ہے۔ سرکاری یا نیم سرکاری طور پر Ecumenical Council دراصل دنیائے عیسائیت کے ایک بڑے طبقے کی نمائندگی کرتی ہے، یعنی، Holy Catholic عمومی اور Apostolic کھیسائی؛ یونانی اور Russian Eastern Orthodox کھیسائی اور Evangelical

Western کلیسا جو اپنے مذہب میں بھی اس عقیدے کا اعتراف کرتے ہیں، اس طرح ان کا تعلق "The Holy (General) Catholic Church" سے ہوتا ہے۔ تیسرے طبقے کے مرکز، روما، نے اس کو ممکن نہیں سمجھا کہ وہ اس Ecumenical کام میں سرکاری طور پر پائپائیت کی روایات کے مطابق اور 1870 کی برصغیر ہونی تہائی کی وجہ سے اس میں حصہ لے۔ یہ تینوں اول ترین دنیائے عیسائیت کے تسلسل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک یہی سمجھتا ہے کہ وہ بہترین انداز اور ایمان داری سے اپنے آقا کی پیروی کر رہا ہے۔ ان کا تنقیدی جائزہ مثالی طور پر کرے کہ ہر ایک کے نزول کے بارے میں بنیادی اصول کیا ہیں۔ یونانی کلیسا کے لیے اتحاد کا عنصر ان کی زبان ہے، روما والوں کے لیے ان کے شہر کا کلیسا ہے، اور Evangelical کلیسا کے لیے ان کا خوش آئند ابھارنے والا پیغام ہے۔ ہمارے پاس رومن کیٹھلک عوام کی شہادتیں ہیں، بالخصوص وہ جو ان کے دانش ور طبقے سے متعلق ہیں، روما کے مبلغین اور علماء سے بھی، جو ہماری کوششوں کی ہمدردی اور خوش خیالی سے پیروی کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاپائے اعظم 1928 کا بارہویں دن کا عشقی فرمان رومن کیٹھلک لوگوں کو Ecumenical اجتماعات میں شرکت سے منع کرتا ہے، اور اس میں ان اجتماعات کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ پھر بھی رومانوؤں رومن کیٹھلک ادب میں ہماری متحد کرنے کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک مستقبل میں مفاہمت کا معاملہ ہے، تو کچھ سلسلے اب بھی موجود ہیں اور مزید قائم کیے جا رہے ہیں۔ گویا خیالات، اب تک، آزاد ہیں۔

Evangelical عیسائیت کے اندر کے مختلف کلیسائی گروہ، Evangelical Lutherans, Anglicans, Methodists, Baptists, یا Presbyterians یا Calvinists یا Reformists یا Quakers وغیرہ پر ایک عام سرکاری مطلق حکومت نہیں کرتی، جس طرح کہ Benedictines, Dominicans, Franciscans, Jesuits, اور رومن کیٹھلک مبلغین اور دوسرے گروہ (جو کبھی اختلافات سے ملوث نہیں ہوتے) اور قومی سطح پر قائم رومی عوام کے کلیسا اور ریاست کے کلیسا۔ جن پر پاپائے اعظم کی حاکمیت ہے۔ اس کے باوجود ہمارے اجتماعات نے بڑے پیمانے پر ہمارے درمیان اختلافات کی تشریح کی ہے اور اس قدر، ہر طریقے پر واضح کیا ہے کہ ہم پورے Evangelical کلیسا میں اس قسم کی روحانی اور مذہبی یگانگت کی ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے۔

Ecumenical Council کی کامیابی لیگ آف نیشنز جیسی شان دار ہے۔ لیگ آف نیشنز کا صدر مقام جنیوا ہے، وہ شہر جو عظیم رومن کیٹھلک قوموں کے درمیان واقع جنت ارضی ہے، اس کی بہترین روایات اب بھی کالون (Calvin) کے جوہر قابل اور آؤدش سے مستفید ہوتی ہیں۔ جس ہال میں لیگ آف نیشنز کے اب تک اجلاس ہوتے رہے ہیں اس کے داخلے کے دروازے کے اوپر ہم "دار الاصلاح" (Salle de la Réformation) لکھا پاتے ہیں۔

جنیوا ہی وہ شہر ہے جس نے Ecumenical Council کو رہائشی حقوق عطا کیے ہیں۔ سلازم کے یہ

الفاظ پھنس ایڈولف فان ہارناک (Adolf von Harnack) کی مہارک باد کی یاد دلاتے ہیں جو اس نے 1925 کی Ecumenical Conference کو دی تھی: ”یہ کاؤنسل کھیرا کی تاریخ کا امتزاج ہے۔“

Ecumenical Council کے سوارکان پانچ حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ پہلے گھر (Orthodox) جسے کا صدر اپنے مہدے کے طفیل قسطنطنیہ کا Ecumenical جدا مہد ہے، اس لیے کہ اس کے پاس وہ روحانی اختیار ہے پوری گھر عیسائیت جس کا اعتراف کرتی ہے۔ یہ قسطنطنیہ ہی تھا جس نے اپنے طور پر، کوششوں سے ہٹ کر، 1920 میں ”Koinonia ton Ekklesion“ کے لیے، جو ایک کھیرائی کمیونٹی ہے، ایک مرکازی حکم جاری کیا تھا۔ اس کا مقصد تھا کہ بحران کے زمانے میں کھیراؤں کو اس قابل کیا جائے کہ وہ محبت کے اپنے فرائض پورے کر سکیں اور باوجود مختلف النوع مذاہب کی شمولیت کے امن کے فروغ کے لیے کام کر سکیں۔ بعینہ اپنے خیالات نے شمال میں ہماری کوششوں کو ہمیز کیا تھا اور اس درخواست کے لیے متحرک کیا تھا جو دی ہیگ کے قریب Oud Wassenaar میں منعقد ہونے والی World Alliance میں پیش کی گئی تھی۔ قسطنطنیہ کے جدا مہد کو Ecumenical Council میں اپنی صدارت کے فرائض اپنے نائب Thyateira کے لاث پادری کے ذریعے انجام دینے پڑتے ہیں جو لندن میں رہتا ہے۔

میری جگہ پر یورپی جسے کے، یا برائے اٹلی اور شمالی جسے کے ماسٹر قانون جیسی کے ڈاکٹر کپلر (Kapler) صدر بنائے گئے تھے جو ایک ممتاز کھیرائی ہیں جنہیں اس لیے منتخب نہیں کیا گیا تھا کہ وہ جمہوریت کی یونین کے صدر نشین تھے، بلکہ اس لیے کہ ان کا تعلق Ecumenical Council کے یورپی جسے سے تھا۔ وہی تھے جس نے 1922 میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کھیرا کاؤنسل کے بعد ہالسلنگ بورگ (Hälsingborg) کی Ecumenical Council میں اس کہوت کو کئی بار دہرایا تھا: ”نظریہ جدا کرتا ہے، خدمت متحد کرتی ہے“ (Lehre scheidet, Dienst vereint)۔

ہم دل و جان سے اس مقدس کام میں شرکت کرتے ہیں جس کی ابتدا امریکا کے Protestant Episcopal کھیرا نے کی تھی، عقیدے اور ضابطے قائم کرنے، برادرانہ مشورے کرنے، موافقت، اور جہاں تک ممکن ہو مذہب اور کھیرا کے قوانین کے درمیان ایک اتحاد کرنے کے لیے۔ میکائیل ہرٹزبرگ (Mikael Hertzberg)، اس مقاصد کے ایک پرجوش ہی خواہ تھے جنہوں نے 1927 میں [سویڈن لینڈ کے شہر] لوزان (Lausanne) میں ہونے والی بڑی میٹنگ میں حصہ لیا تھا۔ حال ہی میں اپنی آرزوؤں کی تکمیل دیکھ لینے کے بعد ان کا انتقال ہوا ہے۔ آج ہی میں نے Capella Johannea میں جو Church of the Priests سے متعلق ہے، جسے انہوں نے قائم کیا تھا [ان کے لیے] دعا کی ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ سکتے ہیں، نظریاتی اختلافات کم کیے جا رہے ہیں۔ پھر بھی، عیسائیوں کو آقا کی واجب کی ہوئی محبت کے فرض کی ابتدا کرنے کے لیے عمل معاہدے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ مختلف آنکھیں ابھام و نزول کی خاص روشنی کو مختلف انداز میں دیکھتی ہیں، اور کھیرا کو تقسیم کر دیا ہے انسانی کمزوریوں نے مختلف حصوں

میں، مختلف تاریخی حالات میں اور کھیرا کی غفلت کے باعث وقت کے مختلف حصوں میں۔ ایک طرف تو ہم اپنے مقدس عقیدے اور کھیرا کے احکامات کے بارے میں طویل مباحث کر رہے ہوتے ہیں، اور دوسری طرف ہم اپنے آقا کے حکم پر فوراً عمل کرتے ہیں۔ یوم حساب میں، ہم سے ستر اٹنی طریقے یا کھیرا کے قواعد اور احکام کے اقوال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا؛ ہم سے صرف اتنا کہا جائے گا کہ "Inasmuch as ye did it not to one of the least of these, ye did it not to me." بھی خدا کی خواہش کی اور خدا کی برتری کی ایک بہتر تشریح تھی۔ اسناک یوم کی میٹنگ کا کوئی نتیجہ اتنا واضح نہیں تھا جتنا کہ اس کا احساس کہ انجیل مقدس کے مطابق، خدا کو سب سے پہلے انسانوں کے دلوں میں ہونا چاہیے، اور اس طرح اس کو سب پر، سماج کے ہر گروہ پر، اور قوموں پر بھی حاکم ہونا چاہیے۔

مشرق سے مغرب کی طرف اپنے صوبے کی طرف واپس آتے ہوئے، ہم اس برطانوی حصے کی طرف آتے ہیں جس میں Ecumenically خیالات کی حامل عیسائیت، برطانیہ، آئرلینڈ اور برطانوی دولت مشترکہ اور دنیا کے ہر حصے کے Anglican کھیرا، بلکہ برطانوی سلطنت کے باہر بھی ہے۔ جیسا کہ کٹر عیسائیت میں ہوا تھا، صدر کا انتخاب اس کے عہدے کے ٹٹیل کیا گیا۔ آرچ بپش آف کینٹربری (Archbishop of Canterbury) ایٹھوا جرمین عیسائیت کے سب سے قدیم اور بڑے معتبر مقام پر قائم ہیں۔ وہ موجودہ آرچ بپش آف کینٹربری ہی تھے جس نے جنگ کے دوران امن کے لیے کیے جانے والے ہمارے کام کے اصول کا اظہار ان لفظوں میں کیا تھا: خدا کبھی کسی کا اتحادی نہیں ہو سکتا، صرف ہمارے برتر آقا کا۔ بپش ووڈز (Bishop Woods) جو 1920 سے کینٹربری کے نائب رہے ہیں، اس عظیم سماجی روایت سے منسلک ہیں جس میں مارٹن (Maurice)، کنگسلی (Kingsley)، ویسٹ کات (Westcott)، لائٹ فٹ (Lightfoot)، اسکاٹ ہالینڈ (Scott Holland) اور گور (Gore) جیسے Anglican بھی شامل ہیں۔

چوتھا حصہ امریکی Ecumenical Council میں عملی آدرش لاتا ہے جو دوسرے خصوصیات کے اضافے کے ساتھ، نئی دنیا کی گہرا رمازی کرتا ہے، جسے ہم یورپ والے اکثر غلط سمجھتے ہیں یا سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ امریکی حصے کے صدر پارکس کیڈمین (Parkes Cadman) ہیں جو پہلے North American Church Federation کے صدر تھے۔ وہ چکے ہیں۔ اپنی اتوار کی نشریات کے ذریعے، ان کی آواز کانوں تک پہنچی ہے اور ہمیں امید ہے کہ کھیرا کی تاریخ کے دوسرے مبلغین کے مقابلے میں [ان کی آواز] زیادہ لوگوں کے ذہنوں اور دلوں تک پہنچے گی۔

1927 میں لوزان کے صدر تھین، ہنریلو (Buffalo) کے بپش چارلس برینٹ (Charles Brent) جو اب انتقال کر چکے ہیں 1925 کی Ecumenical Conference کی اہم شخصیت تھے۔ وہ ہی تھے جنہوں نے یسوع مسیح کے نام پر اسناک یوم میں اپنے عقیدے پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میں بے وقوف ہو سکتا ہوں، اور اگر ایسا ہے تو، میں خدا کا بے وقوف ہوں۔"

پانچویں حصے میں مشرق اور دوسری جگہوں کے پرانے اور نئے کلیسا ہیں جو ان چار حصوں میں سے کسی سے تعلق نہیں رکھتے ابھی جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ابھی تک کوئی صدر منتخب نہیں کیا گیا ہے۔ سب سے بڑے حصے میں، یورپ میں، دو نائب صدور ہیں۔ پہلے ہادیر سلو (Haderslev) کے بشپ و لاوی میرامونسڈین (Valdemar Amundsen) ہیں جو Ecumenical کام کے سب سے تجربے کار رہنما ہیں اور World Alliance for International Friendship Founded Ecumenical (Constance) میں آیا تھا، اب تیس ملکوں میں جس کی کمیشیاں قائم ہیں۔ Ecumenical Conference کی تمہیدی ابتدا World Alliance for International Friendship نے کی تھی جس کے سیکریٹری لندن کے جرنل لارڈ ڈکنسن (Dickinson) نے اس کے مقصد کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ یہ دونوں ادارے بہت مل جل کر کام کرتے ہیں جن کی زیادہ تر مددیہ دونوں شخصیات کرتی ہیں۔

دوسرے نائب صدر، یورپی حصے کے ایک فرانسیسی باشندے، پیرس کے پروفیسر ولفے مونو ہیں جنہوں نے اسٹاک ہوم میں اعلان کیا تھا کہ Ecumenical عیسائیت اتنی طاقت رکھتی ہے کہ وہ دوسرے بین الاقوامی اداروں سے اپیل کر سکتی ہے:

”مگر اسو اسٹام (Chrysostom) اور اورینیجس (Origen) کی سنگت میں، پاسکال (Pascal) اور آسٹسی (Assisi) کے سینٹ فرانسس، مع لوتھر (Luther) اور لیوینگسٹون (Livingstone) ہمیں علاحدہ ہو جانے والے اپنے رومن کیٹھنک بھائیوں سے رجوع کرنا چاہیے ہمارے درمیان، جسمانی معنوں میں، جن کی نشستیں خالی رہی ہیں مگر روحانی معنوں میں ہمیشہ ان کی موجودگی محسوس کی گئی ہے۔

ہمیں بین الاقوامی دانش وروں، عالموں، فلسفیوں، پروفیسروں اور معلمین کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہیے آزاد خیالی کے ان شیدا کی طرف جنہوں نے کبھی جدید علم کی بنیاد رکھی تھی۔۔۔ Church of Jesus Christ اتفاق رائے سے اعلان کرتا ہے کہ اگرچہ اس کے طریقہ ہائے کار کسی حد تک جائز نتائج اخذ کرنے میں مختلف ہو سکتے ہیں، مگر اب بھی ایک واحد جذبے کو ہی اقلیم علم پر حکومت کرنی چاہیے۔ اگسٹس سے قبول کرنے والا جذبہ جس کی بنیاد حقائق سے وفاداری پر اور صداقت پر ہوتی ہے، سرف وہی منور بھی کرتا ہے اور آزاد بھی۔

اب ہمیں International Union of Labour کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جس کی تنظیم بے نام کارکنوں کی جانب سے ہوتی، ہوتی جس میں کبھی یسوع پر مبنی بھی شامل تھا۔۔۔ کاش وہ کلیسا کے ساتھ لہدی انجیل مقدس کو درہم برہم کرنے سے باز آجائیں، جو آج ویسی ہی کوشش کر رہا ہے، جیسی John the Baptist نے کی تھی کہ وہی ایک واحد آواز تھا، ایک آواز جو نجات دہندے کے سامنے گواہی دے گی۔

اب ہم لیگ آف نیشنز کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس انوکھے ادارے کی جانب جو صرف اس پہلے تصور کی تجسیم ہے جو عالمی جنگ سے ابھرا ہے۔ یہ اسی طرح نازک ہے جیسا کہ ایک ٹوٹا ہوا تھا جو بیت اللحم کے ہودے میں ’ان‘ کے ہمراہ تھا جسے Herod کے بھیجے ہوئے قاتلوں سے خطرہ تھا۔ مگر مسیحا کے کھلے ہوئے

پرچم کے دنیا کے تمام لوگ با تفریق نسل، رنگ و مذہب جمع ہوں گے۔

آخر میں، ہم حکومتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سیاسی اکھاڑے میں داخل ہوئے بغیر، عیسائی کھیسا کو اپنے آپ کو روئے زمین پر ایک ناقابل شکست پیغمبر اور اخلاقی قوانین کے منتشر کی طرح پیش کرنا ہوگا جو قومی سماج پر مائل کیے جاتے ہیں، اسی طرح جیسے انفرادی ضمیر پر۔۔۔

سب سے پہلے ہمیں پہلے مشاہدوں کی مثال پر عمل کرنا ہوگا اور اسناک ہوم سے شہروں اور قصبوں میں پیغمبروں کی طرح وہ دو پیغام رساں بھیجے ہوں گے۔ اس کے باوجود چالیس دن کے اندر دنیا کا زوال ہو جائے گا۔ بغیر قومی اور بین الاقوامی پشیمانی کے، ہماری تہذیب تباہ ہو جائے گی۔

نئے آئین کے مطابق چار صد روپائی باری باری دو دو برس کام کرتے ہیں۔

اس کا نسل کا فرض وہی ہے جو پہلے طے ہوا تھا، یعنی:

(۱) عیسائیت کی ترجمانی کرنا اور عیسائیوں کے ضمیر کے احساسات کا اظہار کرنا۔ کس بڑی طرح عالمی جنگ کے دوران ہمیں ایسے مشترکہ اعتراف کی ضرورت پیش آئی تھی۔ پاپائے اعظم نے کئی دفعہ عیسائی ضمیر کے رد عمل اور خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مگر وہ عیسائیت کے صرف ایک ہی طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ Ecumenical Council دو مختلف مرکزی جہزوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ شاید وہ دن جلد آئے گا جب Ecumenical Council میں رومن کیتھولک فرقے کی بھی نمائندگی ہوگی۔

بہر حال اس مرحلے پر تنظیم سب سے اہم عنصر نہیں ہے۔ میں نے 1919 اور 1920 کی اپنی تجویز میں کہا تھا کہ Ecumenical Council کو مقتدر حیثیت سے نہیں بولنا چاہیے، بلکہ اسے اپنے الفاظ کے ذریعے، حواری پال کی طرح، رد عمل اور نتائج کی ترقیب دینی چاہیے جیسا کہ اس نے کہا تھا: ”ہم، صداقت کے انکشاف کے ذریعے، خدا کی نظروں کے سامنے، خود کو ہر انسان کے ضمیر کے سپرد کر دیتے ہیں۔“ ہر آدمی کے دل میں اور اس کے عمل میں صداقت کا ایک خفیہ یا ظاہر حافی ضرور ہوتا ہے مگر کسی ضمیر اور صداقت کے مطالبے پر آپ کو اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنا پڑ جائے تو آپ کو اپنی بات سنانے کے لیے ضروری نہیں کہ آپ پاپائے اعظم ہوں، Ecumenical Council کے رکن ہوں یا کسی بڑے عہدے پر فائز ہوں۔ پھر بھی، جیسی بھی یہ دنیا ہے، ہم تنظیموں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ Ecumenical Council کا مستقبل اور اس کا اختیار اس میں شامل افراد یا ان کے عہدے کا محتاج نہیں ہوتا، سوائے ان کے روحانی کردار کے اور اس بات پر کہ وہ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔

ہمیں صرف ان لوگوں کو اکٹھا کر لینے سے مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے جو محض مہذب کوششوں اور بلند حوصلوں کے حامل ہوں۔ ہم چاہتے ہیں کہ کھیسائوں کی سرکاری یا نیم سرکاری نمائندگی ہو۔ اور ایسا ہونا واقعی مشکل کام ہوگا۔ ہم موجودہ کھیسائی نظام سے کیوں سر پھوڑتے رہیں، جو بے پلک، صدیوں پرانا اور اگر غیر متحرک نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے؟ تمام پیغمبروں، نجات دہندوں اور سمیت پال کو کسی کھیسائے نامزد نہیں کیا تھا۔ انھیں خدا نے بھیجا تھا، اور وہ خدا کی طرف سے کلام کرتے تھے۔ ہمیں ان کی اور ان کے پیروؤں کی

باتوں کو فوراً سے سنا چاہیے، خواہ وہ کتنی ہی درد انگیز، خفیف کرنے والی، حتیٰ کہ ہمارے خیالات اور عقائد کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر ہمیں اس امر کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ عیسائی عقیدے، محبت اور امیدوں کی آواز کو بھی سنا جانا چاہیے۔ اسناک ہوم کی اسمبلی کی تیاریوں کے دوران اور اس کے بعد، ہمیں اس بات کی تشویش رہی ہے کہ کھیرا سے الگ منتخب لوگوں کی کوئی مخصوص تنظیم نہ بنے پائے، بلکہ کھیراؤں کو وہ جیسے بھی ہوں، قبول کر لیا جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ ذاتی خصوصیات اور جذبہ ہی سب کچھ ہوتا ہے کم از کم خدا کی خدائی میں [یہ خصوصیات] بہت ہی اہم ہوتی ہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ کھیرا اپنی موجودہ حیثیت میں حصہ لے، اس کی سادہ کی وجہ یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے Ecumenical حیات نو میں ایسی چیز دریافت کی ہے جس کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے: یسوع مسیح کی تعلیمات کے اہم جوہر، یعنی امر خداوندی کی اس کی برتری کو اور اس سلسلے میں عیسائیت کی یگانگت کو، جو صرف مصالحت اور اتحاد کے ذریعے نہیں بلکہ خود کو صداقت کے سمندر میں غرق کرنے اور عظیم کائنات کی حیرت مآ کیوں کے تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔

Ecumenical Council کے جاری کردہ علامات میں برن کے پادری کا وہ خط بھی شامل ہے جو بادشاہ یسوع کے بارے میں عالمی جنگ کی وجہ، Eisenach Resolution اور روس میں مذہبیت کے خلاف جنگ کے سلسلے میں دنیا کے ضمیر سے اپیل ہے۔

(۲) اس کے علاوہ، اس Ecumenical Council سے کہا گیا ہے کہ وہ عمل کا منصوبہ بن جائے۔ کھیرا کی تاریخ میں پہلی بار دنیا نے عیسائیت کا ایک بڑا حصہ ایک مشترکہ عزم کے لیے متحد ہوا ہے: Social-Ethical Institute کے لیے جو کئی برسوں سے جنیوا میں متحرک ہے۔

Social-Ethical Institute کا کام سماجی نوعیت کا ہے۔ اور کیا یہ ناقابل یقین اور شان دار بات نہیں کہ کھیرا ایک ایسے مشترکہ کام کے لیے متحد ہیں جو سماجی نوعیت کا ہے؟ [ان کا] کام دراصل یہ طے کرنا ہے کہ انجیل مقدس کے احکام کی جدید دور کے حالات، جیسے صنعتی ترقیات اور قوم پرستی، سے کس حد تک مطابقت ہے۔ ہم ستر اٹھ سے متفق نہیں کہ آدمی وہی کچھ کرتا ہے جو صحیح ہوتا ہے اس لیے کہ وہ اسے صحیح سمجھتا ہے، مگر ہمیں اس بات میں فلسفی سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ آدمی عمل کرنے سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہے کہ صحیح کیا ہے۔ انسان کی سمجھ جزوی ہوتی ہے، اور نجات دلانے والے نے اپنی الوداعی تقریر میں کہا تھا، جیسا کہ جان کے مطابق انجیل مقدس میں موجود ہے، کہ وہ عیسائیت کو صحیح راستے پر چلانے کے لیے جذبے کی صداقت کو لازمی طور پر [بھیجے گا۔ یسوع مسیح کی عظمت اس امر میں ہے کہ انہوں نے اپنے وقت کے مخصوص حالات پر منحصر محض چند اصول اور نظریے ہی وضع نہیں کیے تھے جو جلد ہی از کار رفتہ ہو جائیں گے، انہوں نے خود اپنے آپ کو خیر خواہی کا ایک نظریہ دیا، جو ہمیشہ کے لیے جائز ہوگا اور جس کو کوئی دہرائی اور تنگ نظر معنوی سادگیوں سے توڑا مرور نہیں جائے گا۔ اس نظریے کا ہر دور میں، بالخصوص آج کے socio-ethical انقلاب میں نیک نیتی اور ذہنی فراست سے اطلاق کیا جائے گا۔ اور یہی انسانی ٹیوٹ کا اصل مقصد ہے۔ اس کے علاوہ، کچھ خالص عملی کام ہیں جیسے کہ مدد اور تحقیق کا تہاڑ، اور ماڈلے کا ذخیرہ کرنا اور اس پر کام کرنا۔ ایک نوجوان فرانسیسی

International Labor Office کے مرکزی دفاتر سے دفتر کے مربراہ کی مبارک باد کے پیغام کے ساتھ ہمارے پاس آیا تھا: ”ہمارے پاس افرادی قوت ہے؛ ہم آپ سے دنیا خیالات کے طالب ہیں۔“ دراصل بنی نوع انسان ان کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا ہے؛ صرف قلیل عرصے کے مقصد کے لیے اہتمام نہیں کیا جاتا۔ میں نے بہت سے باعمل بین الاقوامی اداروں میں سے صرف ایک کا نام لیا ہے؛ وہی جس کو اخلاقیات کا code تیار کرنے کا فرض سونپا گیا ہے۔

ہماری تحریک میں کچھ غیر معمولی شخصیات موجود ہیں، مگر Ecumenical حیات نو کو متعلقین اور عام لوگوں کے ایک حلقے تک محدود نہیں کیا جاسکتا، چاہے وہ کتنے ہی ممتاز اور کتنی ہی بڑی تعداد میں کیوں نہ ہوں۔ اس کو خارجی سمت میں زور دے کر برصغیر اور سوسائٹی کی ملکیت بننا پڑے گا، جو تمام کلیساؤں اور تمام لوگوں کا مسئلہ ہے۔ میں اپنے تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم ایسے دو گروہ موجود ہیں جنہیں شاید ہی کسی عیسائی یا کسی روحانی سوال میں دلچسپی رہی ہوگی۔ ایک جانب تو میں عام آدمیوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں، ایسے لوگ جو راست باز، سنجیدہ اور روایتی انجمنوں سے متبر ہیں اور میں ایسے بہتوں کی نشان دہی کر سکتا ہوں۔ اس سوال کے سلسلے میں مجھے کئی مدبرین سے بات کرنے اور ان کے رائے معلوم کرنے کا موقع ملا تھا۔ میں مثال کے لوگوں کو اس میں شامل نہیں کروں گا، اور Gustave Ador، Chuard، Jonkheer van Karnebeek، Herbert Hoover، Charles Evans Hughes، Lord Robert Cecil، Frank B. Kellogg (Viscount of Chelwood)، Ramsay MacDonald، Lord Parmoor، Hans Luther، Walter Simons، Paul von Hindenburg، Curtius، Thomas Masaryk، Benel، Aristide Briand، Gaston Doumergue، Albert Thomas وغیرہ کا نام لوں گا۔ بدقسمتی سے، ان تمام لوگوں نے اس معاملے کے وزن اور اس کی اہمیت کو براہے۔ لائڈ جارج (Lloyd George) نے کہا تھا کہ اگر برطانیہ کی عیسائی کمیونٹی کسی ایک سوال پر متفق المائے ہو تو کوئی حکومت اس کی مخالفت نہیں کر سکے گی۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، امن کے مقصد کے لیے کلیسا کے فرائض میں تین اہم کام شامل ہیں:

(۱) بنی نوع انسان کے دل میں برداری کے جذبے کو جانشین کرانا۔

عیسائیت کی بنیادوں میں سے ایک یسوع مسیح سے برداری کا نظریہ ہے۔ کیوں اس نظریے کو دوسرے عیسائی نظریوں کی طرح فوری اور عام طور پر ذہن نشین نہیں کرایا جاتا؟ دنیا کے عیسائیت کی ہر بنیادی انصافی کتاب میں کچھ چیزیں ایک جیسی ہوتی چاہئیں، جیسی کہ جدید سوال و جواب نامے [دریں بذریعے سوال و جواب۔] (Gatechism) میں ملتی ہیں: ”جس طرح قانون اور انصاف ریاستوں کے اندر تشدد کو روکتے ہیں، اسی طرح انھیں ریاستوں کے درمیان حکم چلانا اور جنگ کو روکنا چاہیے۔ اسی میں امن کی مادہ پوشیدہ ہے۔ تمام افراد اور تمام قوموں کو اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ اسی ہدف کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ کسی کی اپنے عوام اور اپنے ملک سے محبت کو دوسرے لوگوں کے خلاف غیر دوستانہ احساسات کے

ذریعہ خراب نہیں کرنا چاہیے۔‘‘ انہوں نے اس قسم کے خیالات کی نشوونما تاریخ کی نصابی کتابوں کے نگینے والوں کا فرض ہے۔ جیسا کہ لوگ عام طور پر جانتے ہیں، Ecumenical تحریک نے تاریخ دانوں اور تمام ملکوں کے مدرسوں سے، نصابی کتابوں سے ہر اس چیز کے اخراج کے لیے تعاون کو اپنے پروگرام میں شامل رکھا ہے، جو دوسرے ملکوں کی توہین اور نفرت کے جج بولتے ہیں اور دوسری قوموں کے بارے میں غلط اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔ یہ موضوع 1928 کے اسلومس International Congress of Historians کے اجلاس میں زیر بحث آیا تھا۔

{2} کھیرا کو خود احساس ہوا چاہیے اور اُسے دوسروں میں دانا اور طے شدہ احکامات اور غیر مشروط فے داریوں کے تقدس کو ذہن نشین کرانا چاہیے، جو انصاف کو قوموں کی سرحدوں سے پرے تک لے جاتے اور اس طرح گزشتہ خود ادعائی کو تعاون میں بدل دیتے ہیں۔

ان دو افراد میں سے جنہیں اس برس نارویائی پاریمان کی فونٹیل کمیٹی نے انعام سے نوازا ہے، ایک، جو پہلے سے ہی بہت مشہور ہیں، سیاست میں پیرامن کوششوں سے منسلک ہیں اور دوسرا [یہ خاکسار] کھیرا کی جانب سے امن کے لیے کیے جانے والے کام میں شامل ہے، جو دوائے قومی جواز ہے محبت کے حکم اور قانون کا دیوتا مسیح کی جانب سے۔ اس مقام پر ہمارے شمالی ممالک کو کچھ کہنا تھا۔ 1920 میں ناروے اور سویڈن نے مصالحت اور ثالثی کا مشورہ پیش کیا تھا۔ یہ مشورہ ان کی دو حکومتوں اور نارنگ سے مذاکرات کے بعد لیگ آف نیشنز کی چلی میٹنگ میں دیا گیا تھا۔ بعد میں 1927 میں آٹھویں اجلاس میں ناروے کے مندوب نے ثالثی پر ایک بین الاقوامی معاہدے کا مسودہ پیش کیا تھا۔ سویڈش وزیر خارجہ کی ایما پر ایک مزید مسودہ تیار کیا گیا اور 1927 میں اسے لیگ آف نیشنز کے سیکریٹری جنرل کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ ان سب نے General Act کی منظوری میں اہم کردار ادا کیا تھا جس میں مصالحت، مسائل کے عدالتی بندوبست اور ثالثی پر تین باب تھے اور چوتھا باب provisions پر تھا، جس نے [اس اجلاس کو] ایک پرامن عروج پر پہنچا دیا تھا۔

قانون کی ایسی مضبوط بنیادیں ہونی چاہئیں کہ لوگوں کے دلوں میں گڑ کر رہ جائیں۔ مجھ سے خط کتابت کرنے والے ہمارے ایک نمائندے نے، زندگی بھر جس کا کام ہی بین الاقوامی قانون پر عمل کرنا رہا ہے، دی لیگ سے لکھا ہے: اگر تمام موجود ذرائع پہلے کے مقابلے میں زیادہ مؤثر تھے بھی، تب بھی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود اداروں کو اپنی توانائی ضائع ہونے کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے، اس لیے کہ بد قسمتی سے حکومتیں اپنے مستقبل کے فوائد کو حال کے موجودہ فوائد پر دار دیتی ہیں۔ اس لیے صرف ایسی تحریکوں کی حمایت ہی سے امن کے تصور کو مفید بنایا جاسکتا ہے۔ صرف ایسی تحریکوں سے رابطے کے بعد ہی امن کے لیے کیے جانے والے سیاسی اور قانونی کام کو غلط ماہ پر ڈالے جانے سے بچایا جاسکتا ہے۔

”آدمی کو وہی کچھ خراب کرتا ہے جو اس کے اپنے اندرون سے نکلتا ہے۔ اس لیے کہ آدمیوں کے دلوں ہی سے شیطانی خیالات ابھرتے ہیں۔“ اگر روئے زمین پر امن کو حقیقت کا روپ دھارنا ہے تو اس کو لوگوں کے دلوں میں ڈھونڈنا چاہیے۔ تو پھر یہ کام کسے کرنا چاہیے، اگر کھینسا کو نہیں تو پھر اور کون کرے گا، اس لیے کہ وہ خود کو امن کا شہزادہ کہلاتا ہے اور اس کا ٹکڑے بکام بھی وہی ہے جو ربانی وعدہ ہے: ”بلند ترین تعریفیں خدا کے لیے اور امن روئے زمین کے لیے۔“ انسان کا بول ایک بے چین شے ہے، اس لیے پیغمبروں کے الفاظ میں، امن کو قانون اور ضابطوں کے مطابق، ایک ورائے عدالت نظام کے ذریعے محفوظ کیا جانا چاہیے، جس کے قبضے میں خود کو جانے کی طاقت ہو، ان قوموں کے مقابل جو امن کو خطرے میں ڈال رہی ہوں، اور جو بغیر کسی جانب داری اور مناساحت کے انصاف کو بلند ترین قانون کا مقام دیتی ہیں اس کے باوجود، ایسا کوئی بھی نظام، خواہ وہ کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو محض ایک غول رہ جاتا ہے اگر اس کو امن اور آزادی کے لیے بنی نوع انسان کی حمایت حاصل نہ ہو۔ عوام ایک واحد organism کے دست و پا ہوتے ہیں، اگر نہیں تو انھیں ایک پھیلتے ہوئے قانون نظام کے ذریعے ایسا بن جانا چاہیے۔ انھیں مخالفانہ طرز اور ایک دوسرے کی جاسوسی کرنا ترک کر دینا چاہیے۔ مگر جب کسی جسم میں روح نہ ہو تو وہ ایک مشین سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا اس صورت میں، روح انجیل مقدس کی محبت اور انصاف ہے، خود غرضی کی شیطان نہیں۔ لہذا، امن کے لیے تمام کوششیں ہمارے اپنے دلوں میں شروع ہونی چاہئیں۔ تو، لوگ بغیر نظم و ضبط اور خود وضع نگہی کے دنیا میں امن کو کس طرح بلند کر سکتے ہیں؟

(3) مندرجہ بالا پیش کیے گئے نکتے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں اپنی مسلح افواج کو ان کے ماضی کے کردار سے معزول کر دینا چاہیے، ہمارے اندر کے خوف، طاقت کے جنون نے، اور ہوں کے دیوتا نے جس کی پندرش کی تھی، اور انھیں چاہیے کہ ہم ان کو امن، تحفظ اور آزادی کا نگہبان بنائیں، بالکل اسی طرح جیسے ریاست کے اندر پولیس نگہبانی کرتی ہے۔

میں جب عارضی صلح کے دن، 11 نومبر کو، Engellbrekt کیسائیں امن کے اجتماع سے خطاب کر رہا تھا، عین اسی وقت میرا سان فرانسسکو کا ایک ساتھی، جس نے خود جنگ کی یہ عالمی تباہی دیکھی تھی، ان لحاظ کے بارے میں لکھ رہا تھا، جب عارضی جنگ بندی ہوئی تھی اور اس کا جشن منایا جا رہا تھا۔ یہ اس کے اپنے الفاظ تھے:

”دنیا نے ابھی تک پورا خون نہیں دیکھا ہے، جو انسانی ہوش و حواس، گناہ، رشک اور علم کی خاطر بہایا گیا تھا اس دن جنگ بندی کے ہمراہ بگل، جھنڈے اور خوشیاں نہیں تھیں، بلکہ اس دن تو وہ ایک قبر سے دوسری قبر، ایک میدان سے دوسرے میدان، ٹنگرائی پھر رہی تھی

ہمارے کانوں کو اب بھی اپنے زخمی دوستوں کی موت کی کراہیں سنائی دیتی ہیں
اسلموں کی چمک دمک ختم ہو گئی ہے، انسان دیوالیہ ہو چکا ہے، لوگ تھک کر خستہ ہو چکے ہیں، بس اس بات پر خوش ہیں کہ موت سے بچ نکلے ہیں

انسان نے اپنے ہتھیار ڈال دیے ہیں
 اس کو فتح نہیں کہا جاتا، یہ تو تمام حریفوں کی شکست ہے!

پتھر پتھروں میں لپٹے، پیار، بھوکے اور بدحواس لوگ بے متعدد تباہ شدہ میدانوں میں پھرتے دکھائی دیتے ہیں
 عارضی جنگ بندی کی بھیاں تک خاموشی میں وہ اپنے راستے تلاش کرتے پھر رہے ہیں، اُن گھروں کی یاد
 میں ہیں جو کبھی تھے، کبھی تھے

عظیم دنیا لہر چکی ہے، منظم طاقت ٹوٹ پھوٹ چکی ہے، پرانے خدا عثمان اور نفرت سے آسودہ ہو گئے ہیں
 پرانے کپڑوں کو جلانا پڑے گا: خون بھری وردیاں اب کسی کام کی نہیں رہی ہیں! اب نہ یہ بچل کو
 ڈرا سکتی ہیں نہ جوانوں کو رہنما سکتی ہیں

تینے اور اعزازات اب خجاعت کے نشان نہیں رہے، اب یہ بندھن بن گئے ہیں، مرنے والی نسل کے بندھن
 ہر شخص لڑا تھا، ہر ایک بہادر تھا، ہر ایک کو لڑنے کے لیے ہمت درکار تھی
 اب تو کچھ بھی باقی نہیں رہا
 حالات کتنے بدل گئے ہیں

جی نوع انسان کو احساس ہو گیا ہے کہ اب پوری دنیا کوئی جہات تلاش کرنا ہوں گی
 اس اختتام کو Advent کے دنوں سے کچھ پہلے ہی آتا تھا!
 All Saints Day نے انھیں موت سے لڑتے دیکھا ہے

عارضی جنگ بندی کے دن نے بے شمار لوگوں کو اس دیار کی طرف جاتے دیکھا ہے، طبیعیات، ریاضی
 اور طب جس کا نقشہ کھینچنے سے قاصر ہیں
 وقت گزرتا جاتا ہے

وہ تباہ شدہ توپ جو میدان جنگ کی ایک جھاڑی میں بے کار پڑی ہے، اب خوف ناک نہیں لگتی
 اس پر کافی نے ڈیرا بٹھالیا ہے، اس کے پیروں کے درمیان کی دروازوں سے چھوٹے چھوٹے پھول
 اپنے حیرت زدہ مرکال کر دیکھتے ہیں

پتیل سے بنے جیسے زنگار سے ایسے سبز ہیں، جیسے بہار کے موسم کے میدان
 چڑیوں نے ان کے دہانوں میں اپنے گھونسلے بنا لیے ہیں

تہائی کے متلاشی جوان جوڑے توپ کی گالیوں پر جا بیٹھتے ہوں گے، اور اپنے مٹھاپ، اپنی محبت اور
 اپنے مستقبل کی باتیں کرتے ہوں گے

دنیا نے بہار کی ابدی موسیقی سے ہم آہنگ الفاظ موت کے آلوں کے اطراف سرسراتے ہوں گے اسلحے
 خون کا مزہ بھول چکے ہیں

اب موت کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں، نہ وہ آوازیں جو کبھی مٹی کے نیچے سوئے ہوئے لبوں سے لگا

کرتی تھیں

جن لوگوں کو ہم سے چھین لیا گیا ہے، شاید ان کے دلوں سے غنی ہوئی کھاد بار بار برس بعد پھولوں کو زندگی دے رہی ہے

مگر ان ہی دلوں سے خواب اچانک چھین لیے گئے تھے
جنگ کو محبت کے بجائے نفرت سکھائی تھی

وہ ہاتھ جو ایک دوسرا کو پیار سے سہلانا چاہتے تھے، اب شکوہ ہیں

وہ لب جو اچھی اچھی، پیاری پیاری باتیں کرنے کے آرزو مند تھے، مر جھا گئے ہیں

زندگی چھالی گئی ہے، اس کی جگہ موت عطا کر دی گئی ہے

پھول اب انتقام کی بات نہیں کرتے؛ وہ ان دلوں سے پھوٹ کر نکل رہے ہیں، جنہیں گرم جوشی سے یاد کیا جاتا ہے؛ تلخ حقیقت میں پیوستہ، اب وہ صرف خوابوں میں کھل رہے ہیں

شاید وہ ابھی تک نہیں کہیں! ہیں!

قتل شدہ لوگوں کی عظیم فوج نہیں، بلکہ وہ سیکڑوں مزاروں لوگ، جنہوں نے سب کچھ قربان کر دیا تھا
وہ دور دراز والے؛ آسنے بلند جہاں خواب بھی نہیں پہنچ پاتے، مگر اسنے قریب، کہ الفاظ کے بغیر بھی

ہمارے دلوں سے مرکوشی کر سکتے ہیں

کیا ان سب کی قربانیاں بے کار تھیں؟

کیا تمام یتیم، بیواہیں اور بھائیوں سے بچھڑے اب زیادہ خوش حال، زیادہ سچی دنیا دیکھ رہے ہیں؟

کیا اس دنیا میں نفرت کم ہے، رشک کم ہے، مایوسی کم ہے؟

کیا کھیرا کے آستانوں کے دالانوں کے باہر، امن کا پیغام کو بج رہا ہے؟

کیا ہم اب ایک دوسرے کی طرف زیادہ شوق سے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہیں؟

جینسنس کی تخلیقات نے اب ہم کو اس قابل بنا دیا ہے کہ ہمارے الفاظ دنیا کے اطراف چند دقتوں میں پہنچ جاتے ہیں

اور فاصلوں کو کم کرنے کے لیے ہم ان کی ایجاد کردہ موبائیاں استعمال کرتے ہیں

تو کیا خدا کی ان نعمتوں نے ہم کو ایک دوسرے سے، پہلے کے مقابلے میں، زیادہ قریب کر دیا ہے؟ یہ

سوالات کسی بڑے عظیم معلم نے، کسی جماعت میں کسی مخصوص شاگرد کی طرف نہیں اچھالے ہیں

یہ تو حیران اور فکر میں غرق دلوں میں خود بہ خود ریگ جاتے ہیں، اور خاموشی سے، آدمی کو اپنے فرض اور اپنی نسل کے مستقبل پر غور کی دعوت دیتے ہیں

ہوا میں پھڑ پھڑاتے پھرے، اور گر جتے ہوئے ڈھول، تازہ ہواؤں اور نیلے آسمانوں کے نیچے پھیلے ہوئے ہیں

گھوڑوں کے ٹھونکنے کی ٹپ ٹپ، بڑھول کی تھاپ، اور چم چم کرتے بنگلے کی چنگاڑ آگے آگے چلتی ہے

آدمی ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں

ہینتیس اور پچاس کی عمر والے نہیں — کہ ان کے دلوں میں تو اب کوئی خواہش بھی باقی نہیں رہی

اب ان کو نہیں بلایا جاتا

مگر ابھرتے ہوئے، ان نوجوانوں کو بلایا جاتا ہے، جنہیں نئے خدا، نئے خیالات، نئے خواب اور نئے

فرائض سوئے جانے والے ہیں

ان نوجوان کو، جنہیں ایک نئی دنیا بنانی ہے؟

۔۔۔ بے چاری دنیا!

یہ کہا تھا مران فرانسکو کے میرے دوست نے۔

ان معاملوں کے ذریعے ہمارے عقیدے اور ہماری محبت کی برداشت کا امتحان لیا جاتا ہے۔ ہمیں کام

کرتے رہنا چاہیے، مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

Ecumenical Council کی قرارداد کے مطابق، اگلی Ecumenical کانفرنس — یعنی، کلیسا کے

امن مشن کا عام امتحان — 1935 میں لندن میں ہونے والا ہے۔ کیا اس وقت امن کے بارے میں کلیسا کے

احساس فرض کی سنجیدگی سے تفتیش کی جائے گی؟ کیا برادری کی خواہش زیادہ شدید ہوگی؟ بے اعتمادی اور خوف

کے اسلحہ جات کم ہو گئے ہیں؟ ویرانے قومی صداقتی نظام زیادہ مستحکم بنیادوں پر بنائے؟ کیا کلیسا زیادہ متحد ہوگا،

اور اس طرح امن کے لیے اپنا فرض پورا کرنے کے لیے زیادہ بہتر طور پر لیس ہوگا۔

اگر امن کے لیے کی جانے کوششوں کو کسی مقام پر پہنچنا ہے تو ماضی کے مقابلے میں ان کو زیادہ حقیقت

پسند ہونا ہوگا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ امن کی ترکیب پر عمل کرنے میں ہم ٹھہریں یا کچھ اور، بلکہ کیا امن کی ترقی

کے لیے کچھ کیا بھی جا رہا ہے یا نہیں۔ امن کے لیے کوئی شاہراہ موجود نہیں، سوائے ایک تنگ گلی کے جسے

تبدیلی کہتے ہیں۔ تمام آدمیوں پر اس کے ادراک کے لیے متحد ہونا لازمی ہوگا۔ ہمیں اپنے آپ کو کسی توحیدی

(manistic) امن کے خواب کے فریب میں نہیں آنے دینا چاہیے۔ ہمیں جدوجہد کرنی چاہیے امن کو جیتنے کی،

فرقہ بندی کے خلاف جدوجہد کی، خوف کے خلاف جنونی ہو جانے کی، مال و دولت کی بے رحمی کے خلاف، نفرت

اور انصافی کے خلاف۔ سب سے پہلے ہمیں اپنے اندر کے قدیم وحشی انسان سے جنگ کرنی چاہیے۔

مثلاً بے مبر دماغ اس نوعیت کے تصور کو لا یعنی، مایوسانہ اور چرائی وضع کہیں گے۔ مگر ہمیں حقیقت کا

سامنا کرنا ہوگا۔ عالمی امن کے لیے نیک نہاد اور عملی طریقے صرف اسی حد تک کارآمد ہوں گے جن سے خدا کی

برتری لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتی ہے۔

میں اس مقام پر وہ بھی پیش کرنا چاہوں گا جو اوزانام (A. F. Ozanam) نے اسی برس قبل La

Civilisation au cinquième siècle میں تحریر کیا تھا:

فرینک کیلاگ اعلان تجلیل

1929 کا نوٹیل امن انعام، جس کو روک لیا گیا تھا، 1930 میں جناب فرینک کیلاگ کو دیا گیا تھا، مگر تجلیل اسی اجتماع میں ہوئی جس میں جو تھن سوکدر بلوم کو انعام دیا جا رہا تھا۔ مسٹر کیلاگ اس تقریب میں شریک تھے۔ چوں کہ دونوں حضرات کی تجلیل کے لیے ایک ہی تقریر ہوئی تھی جو 1930 کے انعام میں شامل ہے، یہاں اس کو دہرایا نہیں جا رہا ہے۔ جناب کیلاگ نے کوئی خطبہ نہیں دیا تھا، بجز ایک تقریر قبولیت کے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

تقریر قبولیت

میری شدید خواہش ہے کہ میں اپنے عین تشکر کا اظہار کروں اس عظیم اعزاز کے لیے جو مجھ کو عطا کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک اس اعزاز کی وہ قدر ہے جو پہلے ملنے والے اعزازات سے کہیں زیادہ ہے، صرف اس لیے کہ یہ انعام ایک نیک مقصد کے لیے دیا جاتا ہے جسے میں اور آپ دونوں اپنے دل سے بہت قریب رکھتے ہیں۔ مجھے یہ انعام دے کر آپ صرف مجھے ہی نہیں، میرے ملک کو بھی امن کے مقصد اور زیادہ بلند تمدن کی ترقی پر ایمان رکھنے کے باعث اعزاز بخش رہے ہیں۔ مگر اس سے بڑھ کر میرا تشکر خراج عقیدت ہے، اس شخص کی یاد کے لیے جس کے عظیم تصور نے یہ انعام قائم کیا ہے، جو ہر قوم کے لوگوں کی ہمت افزائی کرتا ہے جو دیر پا امن کے مقاصد کے حصول کے لیے کام کرتے ہیں۔

میں اس قابل قدر انعام کی اس لیے اور بھی قدر کرتا ہوں کہ یہ مجھے اس ملک میں حاصل کرنے کا موقع

فراہم کر رہا جس نے خود کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا ہے اور جس کی تاریخ میں دنیا کی ترقیات کا ایک حیرت انگیز باب شامل ہو رہا ہے۔

ہمارے دو ملکوں کے درمیان اتحاد کے کئی بندگان ہیں؛ امن سے ہماری مشترکہ محبت کا، آزادی کا، آئینی حکومت کا، اور اس حقیقت کا بندگان کہ آج آپ کے ملک کے بہت سے لوگ ریاست ہائے متحدہ کے شہری ہیں، اور ہماری شہری اور اقتصادی زندگی میں ان کے بہت رسوخ ہیں، جو ہماری ترقیات میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ میری نظر سے اس سے پہلے انسانیت کے لیے کیا جانے والا ایسا کوئی کام نہیں گزرا ہے، جیسا کہ امن کے مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے، جو اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس میں عوام کی اور حکومتوں کی کوششیں شامل ہوں۔ تاریخ کی ابتدا سے انسانیت جن مشکلات کا شکار رہی ہے، اس سے نکلنے کا کوئی مختصر یا آسان راستہ نہیں۔ امن کے پستے کی آہستہ آہستہ تعمیر ہی سے یہ مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں، کہ عوام اور قوموں نے آہستگی مگر بڑی جان فشانی سے انفرادی آزادی اور نمائندہ حکومتوں کی بنیادیں ڈالی ہیں۔ ہتھیاروں کے ذریعے تھوپے جانے والے فیصلوں کے ذریعے بین الاقوامی مباحثاتیوں کے بندوبست کے مقابلے میں جو بلند آدرش درکار ہوتے ہیں وہ مردوں اور عورتوں کے دماغوں میں ضرور اٹھائے ہوئے ہوں گے، اور مجھے مسرت ہو رہی ہے یہ دیکھ کر کہ آرج بشپ سوئڈر بلوم جیسا امن کی وکالت کرنے والا انسان، امن کے مقصد کے عظیم مقاصد کی خاطر اپنے رسوخ اور اپنی آواز استعمال کر رہا ہے۔

پچھلی عالمی جنگ کی تباہی کے پیش نظر، تمام قوموں کے مدبرین ایسے ضروری اقدام کر رہے ہیں تاکہ پھر کبھی ایسی شامت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اقدام امن کی مکمل ضمانت نہ ہوں، مگر میری رائے میں، یہ روک تھام کرنے والے سب سے بڑے اقدامات ہیں جو قوموں نے پہلے کبھی نہیں کیے تھے۔ یہ توقع نہیں کی جاتی چاہیے کہ انسان کی فطرت ایک دن میں تبدیل ہو جائے گی، شاید یہ توقع کچھ زیادہ ہی بڑی ہوگی کہ جنگ کے ذریعے مقاصد کے حصول کا صدیوں پرانا طریقہ جو بین الاقوامی قوانین کے مطابق حق حاکمیت تصور کیا جاتا رہا ہے، جس نے خون اور تباہی کے قصوں سے تاریخ کے صفحات سیاہ کیے ہیں، اک دم ہی بدل جائے گا، مگر تمام قوموں کے عوام کی اس عظیم ترقی سے ہمت افزائی کی جاتی چاہیے، جنگ کے بعد سے جو امن کے مقاصد کی برآوری کے لیے حاصل ہوئی ہے۔

میں اس مختصر سے خطاب میں ان اقدامات پر محض تذکرے کے علاوہ تفصیل سے بات نہیں کر سکتا۔ اب ایک لیگ آف نیشنز ہے، جو دس برس سے کام کر رہی ہے اور جو مجھے یقین ہے کہ بہت ساری بین الاقوامی مشکلات کی صفائی اور ترتیب میں بہت فائدہ مند رہی ہے؛ جیسے پیرس معاہدہ، ثالثی بیاق، مصالحتی بیاق اور بین الاقوامی عدالت انصاف وغیرہ؛ اور میں اس میں اس قابل تعریف ترقی کو بھی شامل کرنا چاہوں گا جو اسلحہ جات کی تخفیف کے معاملے میں ہوئی ہے۔ ان معاہدوں میں سے ہر ایک، امن کی برآوری کی جانب ایک قدم ہے، جنگ کے خلاف ایک اضافی ضمانت ہے۔ یہ اسی مشینری کا فیض ہے کہ قوموں کے درمیان

تنازعہ حل کیے جائیں گے اور جنگ روکی جائے گی۔

آج میرا ارادہ پھر اس معاہدے پر بات کرنے کا نہیں، جو اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، بلکہ شاید مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، بلکہ یہ قوموں کی بنیادوں کے نامیاتی قانون میں سمٹ ہو چکا ہے، ایک حلقہ عہد کی طرح کہ اب تنازعات کے حل کے لیے جنگ نہیں کی جائے گی۔ وہ عہد جو بالارادہ کیا گیا ہے، جس کی پشت پناہی دنیا کے عوام کے متحد جذبات کرتے ہیں، اور مجھے یقین ہے کہ قومیں اس پر پوری ٹیک نیٹی سے عمل کریں گی۔ یہ عمل عوام کے مستحکم ارادوں سے اتفاق ہوا ہے کہ وہ ایک بار پھر ایسی خوف ناک تباہی سے دو چار نہیں ہوں گے۔ یہ ان مہربان میدانوں، کھنڈر گھروں اور کروڑوں افراد کی قربانیوں سے اتفاق ہوا ہے جو انہوں نے اس عظیم جدوجہد میں پیش کی ہیں۔ یہ ایک معمولی سی قیاس نہیں تھا جو دوسرے معاہدوں اور اتحادوں کی طرح، قوموں نے عارضی فائدے کے لیے کیا تھا، یہ ایک مقدس قرار تھا، دنیا کی تمام قوموں اور تمام عوام کے درمیان کہ اب ان کے اختلافات کے بندوبست کے لیے جنگ نہیں کی جائے گی، جس کے لیے ایک عام لفظ "dualaw" استعمال کیا جاسکتا ہے، کہ جنگ کو قوموں کے قوانین کے خلاف جرم قرار دیا جائے، تاکہ اگر کوئی قوم اس سے روگردانی کرتی ہے تو عالمی عوامی رائے اس کی مذمت کرے گی۔

مجھے معلوم ہے کہ ایسے بھی لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکے گا جب تک کہ ایسے معاہدوں کو توڑنے والوں کو سزا دینے کے لیے کوئی بہت بڑی خصوصی عدالت قائم نہ کی جائے، مگر میرا خیال ہے کہ جنگ کے انسداد، عالمی امن کی برقراری، بین الاقوامی مسائل کی پُر امن طریقوں سے ترتیب رائے عامہ کی طاقت کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے جو قوموں اور عوام کو کنٹرول میں رکھتی ہے کہ وہ رائے عامہ ہی ہے جو ہماری تقدیروں کو سنوارتی ہے اور انسانی معاملات میں ترقی کی رہنمائی کرتی ہے۔

مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ خود ہمارے ملک کے بہت سارے لوگ بھی یہ کہہ کر جنگ کی پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ یورپ ایسے تضاد کی تیاری کے لیے اسلحہ بندی کر رہا ہے۔ اس کے برعکس میں تو ان وسیع النظر لوگوں کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جو انسانیت کے لیے امن کی امید رکھتے ہیں۔ کیا ہم اتنی جلد ان چار برسوں کے وحشت ناک قتل و غارت کو بھول گئے ہیں، جو تاریخ کی سب سے بڑی جنگ میں ہوئی تھی، اُن کروڑوں افراد کو بھول گئے ہیں جنہوں نے اپنی جانیں دیں، اور اتنی بڑی قربانی دی، اور جو آج بھی ہم بوز فرائس کی خاک تلے ابدی نیند سو رہے ہیں؟ ان کی عظیم ترین قربانی کو ایسے حتمی وعدے کے لیے اکسایا جانا چاہیے کہ انسانیت کے خلاف پھر کبھی ایسا جرم نہیں کیا جائے گا۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اور تمام تر دینی تاکید کے ساتھ آج پھر دہرانا چاہتا ہوں، جو میں اپنے الفاظ میں مثال کر سکتا ہوں، کہ مغربی متمدن ایسے ایک اور تضاد سے زندہ نہیں بچ سکے گا، بلکہ ایک اور بھیانک آفاقی ابتری میں معجزہ سستی سے بالکل ہی غائب ہو جائے گا۔

میں وقت کی نشتا نہیں سے ایک اور جنگ کی پیشین گوئی نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سی

قوموں، بلکہ ملک تو یہ کہوں گا کہ پوری دنیا کے عوام اتنی بڑی تہی سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں، ایک بار پھر اپنے حکومتی اور اقتصادی ڈھانچوں کی تعمیر کر رہے ہیں اور ایک منظم امن کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مدبرین اپنی تمام کوششیں جنگ روکنے میں صرف کر رہے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ آج پوری دنیا اقتصادی کساد بازاری تلے پس رہی ہے کہ کروڑوں افراد بے روزگار ہیں، آج دیکھ ہی دیکھ لیں، اور یہ بھی کہ آج ان بد قسمت خرابیوں کا علاج تلاش کیا جا رہا ہے، اور یہ دنیا کے مدبرین کی توجہ پر چھائی ہوئی ہیں۔ وہ اس کی وجہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور علاج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا کوئی جادوئی نسخہ نہیں ہے جس سے قانون ساز پارلیمان فوراً علاج کر سکتی ہو۔ اگر ہم اپنے عوام کے جوہر قائل سے امید رکھیں اور ان پر بھروسہ کریں تو وہ اس مسئلے کا حل نکال لیں گے، اور ان کی صلاحیت اور صنعت ہمیں عام طبی حالات میں واپس لے جاسکتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سیاسی مہمات کی گرمی میں سیاسی جماعتوں کے رہنما عوام کو اس بات پر قائل کرنے پر مائل ہوں گے کہ ان کے پاس اقتصادی کساد بازاری کا، اب جو پوری دنیا میں پھیل چکی ہے، تیرہ ہدف علاج موجود ہے۔ مگر مدبرین اگر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ عقل مندی سے حکومت کرے تو وقت کے ساتھ ساتھ، عوام خود ہی، میرے خیال میں تھوڑے سے وقت میں، موجودہ حالات کا علاج کر لیں گے۔

میرے نزدیک یہ امر تعجب خیز نہیں ہونا چاہیے کہ جنگ میں دئی جانے والی قربانیوں اور جانیدار کی تہی کے باعث، اب عام اقتصادی قوانین میں ابتری ہوگی۔ دنیا پر ٹیکسوں کا بوجھ زیادہ ہو گیا ہے۔ بہت سی قوموں کے لوگ اب بے قاعدہ طریقوں سے پیداوار کرنے کے راستوں پر رواں ہو گئے ہیں، لہذا اب ہمارے سامنے ایک ایسی حیرت زا کیفیت ہے جس میں ضروریات زندگی کی ہر مقدار کے باوجود لوگ طلب اور ڈکھ کے شکار ہیں، مگر میں پوری دنیا کی بے چینی اور بد امنی کو جنگ کی علامت نہیں سمجھتا۔ اس کے برعکس یہ سب اس کے قدرتی مظاہر ہیں، ہم جسے مشکل وقت کا نام دیتے ہیں، اور ہم جس سے گزر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ بد امنی ہے اور دنیا کے کچھ حصوں میں اس نے آہل پھل اور انقلاب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ زیادہ تر انقلابات ہیں، مگر بلا خون ریزی کے، اور ان کی وجہ سے حکومتی جماعتوں میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ کچھ صورتوں میں کاروائیاں غیر آئینی تھیں، مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ کے بعد ایسا پہلی بار نہیں ہوا ہے کہ ان طریقوں سے حکومتوں میں تبدیلیاں ہوئی ہوں۔

پھر بھی، تمام مشکلات کے باوجود قوموں کے درمیان ایک بھی جنگ نہیں ہوئی ہے، اور ہمیں شکر گزار ہونا، اور اس کو نیک شگون سمجھنا چاہیے کہ دنیا بھر میں آج امن کا راج ہے۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ جنوبی امریکا میں ایسے انقلابات آئے ہیں، یا حکومتوں میں ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں جنہوں نے دنیا کو چونکا دیا ہے، مگر بلاشبہ وہ نتیجہ تھیں بے چینی کا جو عالمی اقتصادی کساد بازاری کی وجہ سے ہوئی تھی، اور ان کی وجہ سے کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے۔ جنوبی امریکا میں پچھلے پچاس برسوں میں کوئی جنگ

نہیں ہوئی ہے، اور میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مرکزی اور جنوبی امریکا کے ممالک امن کی برقراری میں ایمان داری سے شجیدہ ہیں۔

میری رائے میں، جنگ کی زیادہ تر باتوں کی اصل وجہ اقتصادی کساد بازاری، بے اطمینانی اور الجھن ہے جو مابعد جنگ کے فطری اثرات کی وجہ سے ہے۔ بلاشبہ، بالخصوص یورپ میں، قومی بدگمانیوں، نسلی دشمنیوں، جارحیت کے خوف اور جنگ کے بعد ہونے والے بندوبست سے بے اطمینانی ہے۔ میں ان سوالات پر شجیدہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا، سوائے اس کے کہ میں اس حقیقت کو عیاں کرنا چاہتا ہوں کہ پچھلے دس برسوں میں یورپ کے ممالک، صبر اور مدد مانہ تخیل کے ساتھ ان مشکل مسائل کو حل کرتے رہے ہیں جو دوسرے موقعوں پر بین الاقوامی تنازعات پیدا کر سکتے تھے۔ ان میں سے بہت سے تنازعات عالمی عدالت انصاف کے سامنے پیش ہوئے اور اس کے فیصلے ہمیشہ حتمی سمجھے گئے ہیں کہ اب بھی بہت سے اختلافات ہیں جن کو دور کیا جانا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں، مگر مجھے عوام پر پورا بھروسہ ہے کہ مسائل پر امن طریقوں سے حل کر لیے جائیں گے اس لیے کہ سب کو اس کا احساس ہے کہ جنگ اضافی بوجھ اور زیادہ نا انصافیوں کا باعث ہوگی، اور کیا ان میں ایسا کوئی ہے جسے یقین ہے کہ جنگ سے پیدا ہونے والے سوالات ایسے ہیں کہ جن کے لیے یورپ کو بلکہ پوری دنیا کو، ایک اور جنگ میں جھونک دیا جائے؟ ہمیں جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھیں اور عوام پر اعتماد کریں، اس لیے کہ یہ سارے سوالات جو عوام کو اٹھینٹ کر رہے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ خود بہ خود سمجھتے جائیں گے۔

قوموں کے درمیان ہمیشہ تنازعات اٹھتے رہیں گے جو کبھی کبھی عوام کو بھڑکائیں گے بھی اور تنازعات کا باعث بھی بنیں گے، مگر اہم بات دنیا کے عوام کو اس امر کی تربیت دینے کی ہے کہ وہ ہمیشہ ان کو جنگ کے بجائے بہتر طریقوں سے سلجھائیں۔ آپ کی کمیٹی کا دیا ہوا یہ انعام دنیا والوں کی توجہ اس امر پر مرکوز کرے گا اور مردوں اور عورتوں کو اکسلائے گا کہ وہ امن کے لیے زیادہ کوشش کریں۔ اور کھیسائیں، امن سومانئیں، اسکولوں اور کالجوں کو چاہیے کہ وہ اس تحریک میں اپنے رسوخ کو بھی شامل کریں۔

فرڈینینڈ بوئیسیاں لڈوگ کوئیڈے اعلان تجلیل

نوبیل کمیٹی نے اس برس کا امن انعام مشترکہ طور پر فرڈینینڈ بوئیسیاں اور لڈوگ کوئیڈے کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

پچھلے برس کی تقریب میں کمیٹی نے دنیا کے لیے تاریخی اعتبار سے نمایاں تین واقعات کو اہمیت دی تھی: Dawe کا منصوبہ، لوکارنو (Licarno) معاہدہ اور لیگ آف نیشنز میں جرمنی کی شمولیت۔ یہ حکومت کے ذمے دار کارپردازوں کے سیاسی طریقے تھے اور ہم نے اپنے چار مدبرین کو امن انعام دے کر جنھوں نے ان کو کامیاب بنانے میں غیر معمولی خدمات انجام دی تھی، ان کی اہمیت پر زور دیا تھا۔

اس برس ہم نوبیل انعام کے ذریعے امن کے لیے ایک مختلف کام کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ صرف حکومتیں اور ان کی پالیسیاں ہی امن کے لیے امکانی خطرے نہیں ہوتیں۔ جنگ کا حقیقی اور مستقل خطرہ آدمیوں کی ذہنیت میں، اور عوام الناس کی نفسیات میں بھی جاگزیں ہوا کرتا ہے۔ اس لیے عام لوگوں کی تعلیم سے پہلے امن کے لیے منظم کام کیا جانا چاہیے، ایک مہم کی صورت، تاکہ جنگ کے ذریعے مسائل کے حل کی سوچ کو عوام کے دلوں سے نکالا جائے، اس کو قوموں کے درمیان پُر امن تعاون جیسے بڑے آدرش سے بدلا جائے، اور ان کے درمیان اٹھنے والے تنازعات اور مسائل کے حل کے لیے بین الاقوامی عدالت انصاف مؤثر کردار ادا کرے۔ یہ بوئیسیاں اور کوئیڈے کی رائے عامہ کی سمت بندی تھی جس نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے ان ملکوں میں اس کام کی رہنمائی کی ہے جہاں اس کی کامیابی بہت مشکل تھی، مگر جہاں اس کی اور ملکوں کے مقابلے میں، کمزور یا ضرورت بھی تھی۔ بوئیسیاں اور کوئیڈے کو نوبیل امن انعام دینے کے

ذریعے فوئیل کمیٹی فرانس اور جرمنی کے عوام کی رائے کا اعتراف کرنا چاہتی ہے جو موثر بین الاقوامی تعاون کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہی وہ خوش آئند موقع ہے جو جرمنی اور فرانس کے درمیان مفاہمت کا باعث ہوا ہے، جس کا اظہار پچھلے برس کی انعامی تقریب میں ہوا تھا۔

فردینینڈ بوئیسل 1841 میں پیرس میں پیدا ہوئے۔ انھوں فلسفہ اور علم تعلیم کے شعبوں میں تعلیم حاصل کی مگر بعد میں انھیں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکا، اس لیے کہ انھوں نے شہنشاہ سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے وہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے جہاں 1866 سے 1870 تک مقیم رہے۔ 1870 کے موسم خزاں میں فرانس واپسی پر انھیں تدریس کے کئی عہدے ملے اور 1870 میں انھیں وزارت تعلیم میں پرائمری اسکولوں کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا تھا۔ اس عہدے پر انھیں فرانس میں مفت، لازمی اور بے نام پرائمری تعلیم کے بارے میں قوانین کی تیاری اور ان کے نفاذ کے عملی کام کا فرض سونپا گیا تھا۔ 1897 میں وہ سوربون (Sorbonne) یونیورسٹی میں شعبہ تعلیم کے پروفیسر بنا دیے گئے۔

پھر یوں ہوا کہ مشہور Dreyfus case انھیں سیاست میں کھینچ لایا۔ وہ دل و جان سے اس جدوجہد میں کود پڑے جو انصافی سے سزا پانے والے آدی کے بریت کے لیے ہو رہی تھی۔ انھوں نے French League of the Rights of Man میں شمولیت اختیار کر لی، Zola's J'accuse نے Dreyfus case کے دوران جس کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس موسائی کا مقصد ہر اس نا انصافی اور جبر کا مقابلہ کرنا تھا جو فرانس میں یا کہیں اور ہو رہا ہو۔ Radical-Socialist Party کے رکن کی حیثیت میں وہ 1902 میں Chamber of Deputies کے لیے منتخب ہو گئے۔ اگرچہ 1914 میں انھیں شکست ہو گئی تھی، 1919 میں وہ دوبارہ یوان میں چنے گئے اور 1924 تک اپنی نشست برقرار رکھی۔

امن کے مقصد سے بوئیسل کی دلچسپی اس وقت سے تھی جب وہ ایک نوجوان آدی تھے۔ انھوں نے 1867 میں League of Peace and Liberty کی پہلی کانگریس میں حصہ لیا تھا، اور مسکریٹ کی مذمت میں مضامین تحریر کیے تھے جن میں اصرار کیا گیا تھا کہ عوام الناس کی عمیق تعلیم ہی وہ طریقہ تھا جس سے جنگ کے امکانات ختم کیے جاسکتے ہیں۔

عالمی جنگ شروع ہوتی تو بوئیسل نے احتجاج نہیں کیا۔ چوں کہ فرانس پر حملہ ہوا تھا، ان کا خیال تھا کہ جرمنی کی فتح کا مطلب انصاف اور بین الاقوامی استحکام کی شکست ہوگا۔ جنگ کے ابتدائی برسوں میں ان کی لیگ بھی غیر متحرک رہی تھی۔ بوئیسل کا کہنا تھا کہ اس وقت ضروری چیز فتح ہے، کہ نہ صرف یہ جنگ ختم ہو جائے گی، بلکہ [آئندہ کی] تمام جنگوں کو بھی چھڑنے سے روکا جائے گا۔ اس یقین کے ساتھ کہ بالآخر اتحادی ہی فتح یاب ہوں گے، انھیں اس بات کی فکر لاحق ہو گئی تھی کہ فاتحین اپنی فتح کا غلط استعمال نہ کرنے لگ جائیں۔ انھیں تو ایک لیگ آف نیشنز کے قیام کے ذریعے بین الاقوامی دنیا کی بنیاد رکھنی چاہیے۔ لہذا، 1916 سے انھوں نے منعقدہ امن اور ویلسن (Wilson) کے پروگرام کے لیے آن تھک کام کیا۔

یوٹیسال کے نزدیک امن تلخ مایوسی کا باعث ہوا تھا۔ اپنے ایک کھلے خط میں جو 23 مئی 1918 کو شائع ہوا تھا۔ انھوں نے لیگ آف نیشنز کی مداخلت پر اعتراض کیا تھا اور اس کو فاتح طاقتوں کی مفاد پرستی لیگ کہا تھا مگر یہ نوشتہ تقدیر تھا اور اس کا دفاع کیا جانا چاہیے تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس کا پروپیگنڈا کیا جائے، تاکہ لیگ السداد جنگ اور بین الاقوامی استحکام کا ایک مؤثر آلہ بن سکے۔ 1924 میں یونین کی توصیف کرتے ہوئے انھوں نے اپنے یقین کا اظہار کیا تھا کہ لیگ کی نشوونما ہوگی، کہ ایک دن آئے گا جب یہ ایک طاقت ہوگی، پوری دنیا میں جس کا احترام کیا جائے گا، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی اس کا احترام کریں گے جو اس کو ایک تبسم کے ساتھ رد کر دیا کرتے تھے۔ اور پھر انھوں نے قوموں کے ترک اسلحہ جات سے پہلے نفرت کے ترک اسلحہ جات کی تبلیغ شروع کر دی۔ یوٹیسال اور ان کے دوستوں نے خود کو محض ترک اسلحہ جات پر باتیں کرنے تک محدود نہیں رکھا، انھوں نے اس کو ایک زندہ حقیقت بنانے کی کوشش کی ہے۔ Ruhr تنازعے کے وقت [جرمنی کا شہر جو 1923 سے 1925 تک فرانس اور بلجیم کی فوجوں کے قبضے میں رہا تھا۔] انھوں نے جرمنی کے امن دوستوں کو پیرس آنے اور جوابی ملاقات کے دوران وہ کچھ کرنے کی دعوت دی جو وہ جرمنی میں کر سکتے تھے۔ چودہویں برس کی عمر میں یوٹیسال وفد کے ہمراہ جرمنی گئے۔ کئی موقعوں پر تقریر کرنے کے بعد جرمن عوام سے ان الفاظ میں خطاب کیا تھا:

”ایسی بھی ایک طاقت ہے جو فرانس سے کہیں زیادہ بڑی، جرمنی سے کہیں زیادہ بڑی، کسی بھی قوم سے کہیں زیادہ بڑی ہے، اور وہ ہے بنی نوع انسان۔ مگر خود بنی نوع انسان سے بھی بالاتر انصاف ہے، جو انسانی برادری میں اپنا مکمل ترین اظہار کرتا ہے۔“

لڈوگ کوئیلے 1858 میں بریمن (Bremen) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اسٹراس بورگ (Strasbourg) اور گومینگن (Gömingen) میں تعلیم حاصل کی۔ ان کی دل چسپی قرون وسطیٰ میں جرمنی کی تاریخ میں تھی۔ ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد، کئی برس انھوں نے تصنیف اور اشاعت میں صرف کیے۔ اس جستجو میں کئی برس انھوں نے روم کے Prussian Historical Institute میں کام کیا۔ جرمنی واپسی کے بعد وہ سیاسی سرگرمیوں میں کود پڑے، اور بالخصوص امن کے لیے کام کیے۔ مالی آزادی کے باعث انھیں کسی تنخواہ دار ملازمت کی ضرورت نہیں تھی، لہذا وہ اپنی پسندیدہ مسروریات کو وقت دے سکتے تھے۔

جس زمانے میں کوئیلے روم میں مقیم تھے، انھوں نے (1894) Caligula کے عنوان سے ایک سولہ صفحات پر مشتمل کتابچہ شائع کیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے شاہنشاہ ولیم (Wilhelm) کا تاریخی اعتبار سے بالکل درست تذکرہ لکھا تھا، جس میں ان کے پاگل پن کے جنون کے تذکرے بھی کیے گئے تھے، یہ شاہنشاہ کی ذات پر ایک خاصا شفاف طنز تھا۔ اس کتابچے نے ایک طوفان برپا کر دیا۔ اس کی بڑے پیمانے پر فروخت

جو

ہوئی،

کئی ہزار نسلیں تک پہنچ گئی تھی۔ فطری طور پر، بہت سے لوگ تو اس پر بہت خوش ہوئے تھے۔ مگر، کچھ لوگوں میں اس نے ناراضی پیدا کر دی تھی، اور بعد کے کئی برسوں کے دوران کوئینڈے کو اندازہ ہوا کہ یہ رزم کتنا کاری محسوس کیا گیا تھا۔

امن کے بارے میں کوئینڈے کا کام تقریباً اسی وقت شروع ہوا جب Galigula کی اشاعت ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے وہ پیکچر اور منتظم کے طور پر بغیر رزم کے ہوئے کام کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بہت سی کانگریسوں میں حصہ لیا، جن میں سے کچھ امن کی کانگریسوں کی صدارت بھی کی ہے۔ انہوں نے Interparliamentary Union کی کانفرنسوں میں بھی حصہ لیا ہے اور ان کی بے شمار اشاعتیں بھی ہو چکی ہیں، کچھ میں موجودہ حالات پر پُر زور طریقے سے ایسی فکر پیش کی تھی کہ ان کی ضبطی ہوئی، حتیٰ کہ مصنف کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی گئی تھی۔

جنگ کی شروعات کوئینڈے کے لیے شدید اور مختلف نوعیت کی سرگرمیوں کا پیام لے کر آئی تھی۔ وہ فوراً ہی یہ سوچ کر دی ہیگ (The Hague) کے لیے روانہ ہو گئے کہ غیر جانبدار ہالینڈ کی سر زمین پر وہ فرانسیسی، انگریز اور بلجیم کے امن پسند دوستوں سے اپنے رابطے قائم رکھ سکیں گے۔ مگر انھیں بہت مایوسی ہوئی۔ لہذا وہ جرمنی واپس چلے گئے مگر وہاں سے بھی وہ جنگجو ملکوں کی رائے عامہ کو ڈگمگانے کی کوششیں کرتے رہے۔

انہوں نے اپنا بیشتر کام تنظیم اور تصنیف میں تقسیم کر رکھا تھا۔ جنگ اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل نے جرمنی میں امن پسندوں میں اختلاف پیدا کیا، تنہائی کاموں میں رکاوٹ بنے اور ثالثی کی حیثیت میں کوئینڈے کے کام کو خاصا مشکل کر دیا تھا۔ پھر بھی، انہوں نے تحریک کو نہ صرف جاری رکھا، بلکہ امن کی تنظیموں کی حمایت میں اضافے کا باعث بھی ہوئے۔ اس تمام کام سے کوئینڈے کو تصنیف کے لیے کم وقت ملتا تھا۔ جنگ کے دوران اور اس کے بعد جو کچھ کوئینڈے نے لکھا، میں اُن میں سے دو کا تذکرہ کرنا چاہوں گا، جو مجھے ان کے خیالات اور انداز کار کے عین مطابق معلوم ہوئے تھے۔

1915 میں انہوں نے Should We Annex? کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا۔ اس میں انعام کے خیالات پر حصے کیے گئے تھے جس کی، جنگ کے زمانے میں، جرمنی میں بڑے پیمانے پر حمایت کی جا رہی تھی۔ ان کے نزدیک یہ بڑی بے وقوفی تھی کہ امن حاصل کرنے کی کوششیں دشمن کو بالکل تباہ کر دیا جائے۔ اس اشاعت میں وہ کوئی خاص نقطہ نظر پیش نہیں کرتے، بلکہ خاموشی، توازن اور مدلل سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی امن کی بنیاد پر انعام کے خلاف سوالات اٹھاتے ہیں۔ وہ خود امن کے لیے ایک مثبت پروگرام پیش کرتے ہیں، جس کا سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ امن کے بنیاد پر کوششیں سمجھوتوں کی آزادی اور

بلاتعرض آنے جانے کی پالیسی اپنی جائے۔ یہ کتابچہ ضبط کر لیا گیا تھا۔ نظریاتی شدہ اشاعت کا بھی وہی حشر ہوا، مگر اس کے فرائسہ کی ترجمے کو روکا نہیں جاسکا۔

جنگ کے اختتام پر جب بھی جرم کا سوال اٹھا ہے، کوئٹڈے اپنا کتابچہ "The Question of Responsibility" لیے بحث میں شامل ہوتے نظر آئے ہیں۔ ایک بار پھر ان کے موضوع پر سکون سے بحث کی گئی ہے۔ وہ سوال کی جڑوں تک جاتے ہیں، ان ذمے داریوں میں امتیاز کرتے ہوئے جنھوں نے وہ حالات پیدا کیے جو جنگ کی شروعات کا باعث ہوئے ہیں، اور ان اقدامات کی ذمے داری بھی، جس نے فیصلہ کن موقع پر جنگ کی بائیں ذمہ داری تھیں۔ وہ امن پسندوں کی تحریک کے ارکان کے خیال سے بالکل اتفاق نہیں کرتے جو مارا الزام جرمی کے مزال جاتے ہیں، اور جیسا کہ توقع کی جاتی ہے، وہ دوسری حد تک جانے پر اور بھی کم تیار نظر آتے ہیں۔ پڑ سکون انداز میں وہ بہت سے عناصر کے درمیان باہمی تعلق داری کا تجزیہ کرتے ہوئے ذمے داری اور جرم کے درمیان امتیاز کا خط کھینچتے ہیں۔

کوئٹڈے کی تحریروں اور کام میں امن حیثیت الکل وہ خصوصیات ابھرتی ہیں: اعتدال اور ہمت۔ مگر چہ انھیں اپنے پیشہ ورانہ میدان کے باہر کسی بڑے کام کی اشاعت کا موقع نہیں ملا ہے، ان کے کیے ہوئے تمام کام پر تاریخ دانی یا دانش وری کی مہر ثبت نہیں کی جاسکتی۔ اور انھوں نے بہت سے موقعوں پر جرأت کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ Galligula کی اصلیت کا تذکرہ اور اس سے متعلق واقعات اس انسان کی خصوصیات ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یہ کتابچہ بظاہر روما کے شاہنشاہ کی زندگی اور کردار کی معروضی خاکہ کشی کرتا ہے۔ یہ یقین کرنے کے لیے کہ یہ کتابچہ تاریخی اعتبار سے درست ہے، اور یہ بھی کہ اس کے پس منظر میں کسی طرح کی سیاسی رنگ آمیزی نہیں کی گئی ہے، انھوں نے اس کے مسودے کو رومن تاریخ کے کئی ماہرین کو دکھایا تھا۔ جب انھوں نے اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا تو ان کے دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ وہ اس کو سوسائٹیز لینڈ سے شائع کریں اور اس پر بطور مصنف کسی اور کا نام ہو۔ مگر انھوں نے اس کو جرمنی ہی سے شائع کیا اور اپنے ہی نام سے شائع کیا۔ کتابچے کی اشاعت کے بعد جب ہر ایک کو توقع تھی کہ ان پر مقدمہ چلایا جائے گا، ان کے دوستوں نے ان کو سوسائٹیز لینڈ فرار ہو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر یہ اپنی جگہ ثابت قدمی سے ڈلے رہے اور اپنے ملک ہی میں رہے۔ میرا تاثر ہے کہ کوئٹڈے کی بعد میں شائع ہونے والی تعنیفات بھی اسی نوعیت کی سچائی کے رنگوں میں شریار ہیں اور بعض موقعوں پر ان کی اشاعت کے لیے کسی طرح بھی کم ہمت کی طلب گار نہیں تھیں۔

آج نوبل کمیٹی امن کے دو قابل تحریف اور ممتاز کارگزاروں کو اعزاز دے رہی ہے۔ امن کے مقصد کے لیے ان کی طویل اور ان تھک کوششوں کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ امن کے یا اس کے مقاصد کے

لیے کام کرنا زمین پر رہنے والے عوام کو مساوی حقوق فراہم کرنے اور ان کے درمیان بے لوث اور منصفانہ رشتوں کے قیام کے لیے راستہ صاف کرنے کے مترادف ہے، تاکہ انسان کی حقیقی قدر کا اعتراف کیا جائے اور اس عظیم ترین سیاسی خیال ”جنگ کی جگہ امن کا قائم کیا جانا“ کو کامیاب بنایا جائے۔

نوبل کمیشن کے صدر فرڈینانڈ Fredrik Stang کی نوابی

خطبہ — فرڈینینڈ بونیسلا جنگ اور امن کے تصورات کی تبدیلیاں

ایک عرصے تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ فوجیں جنگ چھیڑا کرتی ہیں جس کا خود قوموں کو بھی پتا نہیں ہوتا۔ پیشہ و فوجی اپنے آپ کو قومی مفاد کے دفاع کی ذمہ داری سنبھال لیتے تھے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ جنگ انھیں پراثر انداز ہوتی ہے، جب کہ ملک اپنے کام اور زندگی کے چکروں میں گم رہا کرتا ہے۔ وہ خوش کھار دن اب ہوا ہو چکے ہیں۔

آج، جنگ مختلف حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس جنگ نے، جو وہیں برس ہوئے ختم ہو چکی ہے، دکھایا ہے کہ پہلے تو اس میں پوری قوم شامل ہو جاتی ہے، اور وہ دھڑے سے یہ کہہ رہی ہے کہ آج کے ذرائع کا ”مستقبل“ میں صنعتی مراکز کی تباہی اور شہری آبادیوں کے قتل عام کے امکانات سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ”جنگ و جدل کے ہاتھوں میں جدید سائنس کے رکھے ہوئے تباہی کے ذرائع“ کی طاقت اس حد سے آگے پہنچ چکی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جنگ کے لیے سمندریوں پر قبضہ ہی کافی نہیں تھا۔ مار پیذ و کشتیاں اور آبدوز ملکوں کو ان کی تجارت سے محروم کر رہی تھیں، حتیٰ کہ شدید ضرورت کی غذاؤں کی رسید بھی روک دی گئی تھی۔ اس سے بھی زیادہ ہونے والا تھا۔

جس دن سے جنگ نے آسمانوں پر قبضہ کر لیا تھا، کوئی ان کی حرکات کو روک نہیں سکتا تھا۔ اب تو یہاں تک ممکن ہو گیا ہے کہ ناقابل چیلنج پلانٹس بلند یوں سے، جن کا دفاع ممکن نہیں، مین کے حساب سے کیمیائی مصنوعات گرائی جاسکتی ہیں جن میں وہ بھی ہو سکتی ہیں جو گھنٹوں کے اندر دنیا کے سب سے بڑے شہروں کو تباہ کر سکتی ہیں۔ وسیع علاقے میں خوف ناک بیماریاں پھیلا سکتی ہیں، جس کی مزاحمت بالکل ہی ناممکن ہے۔

اس طرح، جنگ نے خود کو خود ہی ختم کر دیا ہے۔ اس نے پورے گریڈ ارض کے لیے جوا د کا کردار سنبھال لیا ہے۔ 1921 کے بعد سے لیگ آف نیشنز نے اپنی توجہ کیمیائی جنگ کے سوال پر مرکوز کر دی ہے۔ وہ رپورٹ جو ایک بین الاقوامی سائنس کمیشن کو دی گئی تھی (جو 22 اگست 1924 کو Temps میں شائع ہوئی تھی) ان وسائل کا ایک جائزہ پیش کرتی ہے جو جارحیت کرنے والوں کے استعمال کے لیے تین قسم کے زہر

(toxins) کی صورت میں دیے گئے تھے؛ یعنی؛ پہلے؛ پھجائی کیفیت پیدا کرنے والے lachrymatory اور vesicatory اور stemutatory جمل میں سب سے زیادہ خطرناک yperite ہے (دوسرے؛ گھٹن اور غشی طاری کرنے والے زہر (asphyxiants) ہیں جن میں سب سے زیادہ خوفناک phosgene ہے؛ تیسرے؛ وہ ہیں جو اعصابی نظام پر اثر کرتے ہیں۔

ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ کیمیائی جنگ و جدل اپنے ساتھ کٹھیر پائی جنگ و جدل بھی لائے گی، موزی حشرات (pests) کی نسل افزائی، typhus اور دوسری خطرناک بیماریاں۔ ایسے خطرات کے دفاع کے ذرائع ابھی تک بالکل ناکافی ہیں۔

International Commission کا، جس سے لیگ آف نیشنز نے اپیل کی تھی، خیال ہے کہ ہمیں پوری دنیا کو تمام تر فنی کیفیات سے واقف کرنا چاہیے، نئی ہونے والی جنگ جن کو پیدا کر سکتی ہے۔ یہ اسے ذرا دینے والے ہیں کہ ان کا کوئی بھی موازنہ ان کے امکانات کی طرف اشارے تک نہیں کر سکتا۔ ان کے براہ راست نتائج نسل انسانی کی تہی اور ان سب سے دست کشی ہے اب تک جو ہمارے تمدن کیے تا رو پود ہیں۔

اخلاقی تصورات میں تبدیلی

پھر بھی، یہی جنگ کی وہ نئے انداز کی ترقیات ہیں جنہوں نے انسانی دماغ میں ٹیش کو ابھارا ہے۔ آدمی نے واضح کر دیا ہے کہ انسانی سوسائٹی حیوانی سوسائٹی نہیں ہو سکتی۔ انسانی سوسائٹی عقل کے احکامات مانتی ہے اور انصاف کا احترام اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی قوم اپنے افراد کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ طاقت کے ذریعے اپنی مرضی کا انصاف مسلط کرے۔ کسی بھی قوم میں، جب بھی اختلافی تنازعہ پیدا ہوتا ہے تو سوسائٹی اس کو انصاف کی عدالت میں بھیج دیتی ہے اس واضح تعبیر کے ساتھ کہ کسی بھی صورت میں وہ اپنے دعوے کے حصول کے لیے اسلحہ استعمال نہیں کرے گا۔ اس قانون سے مراد یہی ہے کہ اس کو مجرم اور خطا کاروں کی صف میں شمار کیا جاتا ہے۔

تو پھر ایسا کیوں ہے کہ جوں ہی قومیں ایک دوسرے سے جھگڑا کرتی ہیں، خود کو طاقت استعمال کرنے میں آزاد سمجھنے لگتی ہیں؟ اپنے تنازعے، انصاف کے تقاضوں کے بجائے تشدد کے ذریعے، خود سمجھانے کے اس غیر متوقع حق کا تمخذ کیا ہے؟

کیا اس طرح کا تشدد جرم ہوتا ہے؟ یہ جرم ہے، جس کی ذمہ داری تمام قوموں میں مشترک ہوتی ہے؛ صحیح معنوں میں، یہ ایک قسم کی حیرانی کا فطری رد عمل ہے؛ وہ قوم جو حیرانی کے عالم میں ہوتی ہے اپنے دفاع کے لیے اور کوئی طریقہ نہیں پاتی سوائے اس طریقے کے جو جلی طور پر حیوانوں میں ہوتا ہے۔ حیوان جلی طور پر وہ طاقت استعمال کرتے ہیں جو فطرت نے انہیں اپنے تمام دشمنوں سے بچاؤ کے لیے دی ہوتی ہے۔ قوم،

جب ان دیکھی مشکل میں گرفتار ہو جاتی ہے تو اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں رہتا سوائے وحشی کی بے حدو حساب نقل کرنے کے، اور اس کوشش میں وہ تباہی کے ذرائع کے اثرات سے لاپرواہ ہو جاتی ہے۔
پچھلے چھ مہینوں میں انسانیت نے ایسے رد عمل سے مقابلہ کرنے کی غیر معمولی کوشش کی ہے۔

سب سے پہلے تو، متمدن ترین قوموں نے قدم اٹھائے تھے جن میں سے دو نے دنیا کے سامنے جنگ کو جرہ قرار دینے کا ایک بالکل نیا طریقہ پیش کیا ہے۔ یہ دو قومیں ہیں فرانس اور ریاست ہائے متحدہ۔

جون 1927 میں اپنے ترجمان مسٹر بری آں (Briand) کے ذریعے فرانس نے ریاست ہائے متحدہ سے ایک نہایت جذباتی اپیل کی ہے۔ یہ اس باہمی وعدے پر کی گئی تھی کہ کچھ بھی ہو، دونوں ملکوں کے درمیان کبھی جنگ نہیں ہوگی۔

چند ماہ بعد ریاست ہائے متحدہ نے ایک مزید وسیع تجویز کے ذریعے جواب دیا تھا۔ سیکریٹری آف اسٹیٹ کیلاگ نے صدر کی جانب سے پانچ بڑی طاقتوں برطانیہ، عظمیٰ، فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان کو وہی تجویز پیش کی تھی کہ جنگ کو آلے کی صورت میں، قومی پالیسی کے ذریعے مسترد کر دیا جائے۔

ہم ایسے اہم مباحث کے مطالعے کی تلاش میں نہیں جو امریکی تجویز نے اٹھائے ہوں۔ مسائل کے حل، جن کا سامنا کرنا ہوتا ہے، سادہ نہیں ہوا کرتے۔ اپنے جواب میں، جب وہ امریکا کے ساتھ بڑی قوموں سے اپیل میں شریک تھے انھوں نے باقاعدہ تحفظات کا اظہار کیا تھا، جو ان کے نزدیک ضروری محسوس ہوئے تھے جنھیں وہ قومیں بھی جن سے اپیل کی گئی تھی بلاشبہ ضروری سمجھیں گی۔

خواہ، ہم ماہرین قانون کی ایک بڑی کمیٹی کی دانش سے متاثرہ کریں جن کے سامنے اس بے حد پیچیدہ مسئلے کو پیش کیا جائے گا، یا پھر ہم ایسی ابتدائی تفتیش سے درگزر کریں، اس بنیاد پر کہ اس کے ذریعے بیوقوفی کی شرائط میں تہدیلی کے لیے، جو تمام قوموں کے لیے ہیں، تیاری کا ایک طویل عرصہ ضروری ہے؛ یہ ضروری ہوگا کہ ایسے دفعات تیار کیے جائیں جو سہرہ دہ خطہ کرنے والے میں مکمل اعتماد کو اٹھائیں کریں۔ یہ کام ایک دن میں نہیں کیا جا سکتا۔

مگر اس کے لیے جو کچھ بھی کرنا پڑے، اور یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں، ادھر ایک بالکل ہی مختلف معاملہ ہے جس کے بارے میں ہم نوٹیل کمیٹی سے بات کر سکتے ہیں۔

میرے خیال میں، ہماری پہلی اور سب سے نمایاں اخلاقی ذمے داری اثر ڈالنا ہے، حکومتوں پر نہیں، بلکہ عوام پر۔

لہذا مجھے اس نظر ثانی کو ختم نہیں کرنا چاہیے، قبل اس کے کہ پہلے دو معنی خیز واقعات کی طرف اپنی ٹیوٹ کی توجہ دلائی جائے، جو پچھلے چھ ماہ کے دوران ہوئے ہیں۔

پہلا واقعہ مباحث کی اشاعت ہے جو پراگ کی بین الاقوامی کانگریس میں (16 سے 20 اپریل 1927) میں ہوئے تھے جو چیکو سلواکیا کی حکومت کے تعاون سے ممکن ہوئی تھی۔ حال ہی میں شائع ہونے

وائی کئی جلدوں پر مشتمل ان رپورٹوں پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا، جو کانگریس میں پڑھی گئیں اور ان پر بحث کی گئی تھی، جن کا جیو میں منعقد ہونے والی تعلیمی کانفرنس میں تفصیل سے مطالعہ ہو چکا ہے۔

ان رپورٹوں کا موضوع ایک ہی ہے: امن بذریعہ تعلیم۔ اس سنگ پابندی کی وجہ سے اس کے سوالات میں ایک درجے کی صراحت، صفت اور قوت پیدا ہو گئی ہے جس نے ان کو نوبل انسٹی ٹیوٹ کی توجہ کا باعث بنا دیا ہوگا۔

بہت سارے ماسٹر مین تعلیم، مرد اور عورتیں دونوں، نے جو دنیا بھر کے تقریباً تمام ملکوں سے آئے ہوئے تھے اس طریقے سے اس جذبے کی صراحت کی جو ہم میں پیدا ہوتی چاہیے، نوجوانوں کے لیے دی گئی ہدایات کو امن کے مقصد کے کام آنا چاہیے۔ اس پروجیکٹ کے کچھ مظاہر اس مقام پر ماموزوں نہیں ہوں گے۔

ڈاکٹر کاماریٹ (Kamaryt) نے واضح کیا تھا کہ انسانی تہذیب کے خدمت گاروں نے ہمیشہ شدت سے تشدد میں شامل ہونے سے انکار کیا ہے اور قیاس کردہ ”جنگ کے فوائد“ کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔
یوسیمیا (Bohemia) سے آئی ہوئی اسکول کی ایک استانی مس اسٹینڈا (Stendah) نے ایک تعلیمی نظام کا خاکہ پیش کیا جو، اخلاقی، سماجی اور مذہبی انداز زندگی کی مدد سے تشدد کی جڑ کو ختم کر دیتا ہے۔

ہارڈورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر پرسکاٹ (Prescott) نے ایک خلاصے سے نہایت دلچسپ اقتباس پیش کیا تھا، جو انھوں نے پلینڈ کی ایک خاتون کی جنگ کے دوران تحقیق کے نتائج سے اخذ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ضخیم دستاویزات بھی تھیں جن میں اس سوال نامے کا متن بھی موجود تھا، بچوں یا نوجوانوں سے جن کے جوابات حاصل کیے گئے تھے۔ اس میں جو حیرت انگیز بات نظر آئی وہ یہ تھی کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کو امن پر زیادہ اہتمام تھا (33 بمقالہ 57)؟ اور کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ لڑکوں کی جتنی زیادہ عمریں تھیں اتنی ہی زیادہ انھیں جنگ اور فوجی خدمت میں دلچسپی تھی؟

پراگ سے آنے والے ایک استاد مسٹر فرانٹا (Franta) نے اپنے شاگردوں سے کہا ہے کہ وہ لوگوں سے یہ سوال کرنے کو اپنی عادت بنائیں: ”جی نوع انسان کو کس نے زیادہ فائدہ پہنچایا ہے، کانز (Gannes) کے فاتح نے، یا اس غریب اچھنی نے جس نے پہلی بار فولاد سے ایک نل بنایا تھا؟“

آخر میں French League of Nations Society کے سیکریٹری جرنل مسٹر پروہوم (Prudhommeaux)، نے استادانہ انداز میں ایک مسودہ تحریر کیا ہے جس میں مذہبی ارباب اختیار سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہر قوم کو نصاب کی تمام کتابوں میں سے وہ متن خارج کر دینا چاہیے جو غیر ملکیوں سے نفرت کا باعث ہوتا ہے۔ مائٹول فرانس کے الفاظ میں وہ کہتا ہے، ”ہمیں دشمنی سے نفرت کرنا سیکھنا چاہیے۔“ امن کی حکمرانی انصاف کی حکمرانی ہونی چاہیے۔

Commission on Mutual [Intellectual] Cooperation نے 23 جولائی 1925 کے اپنے

اجلاس میں مسٹر سیزاوس (Casares) کی تجویز پہلے ہی منظور کر لی تھی۔ دو دفعات میں ایسے شفاف انداز میں اس کا خلاصہ دیا گیا ہے کہ کسی کی دل چاہی نہ ہو۔

(ا) جب ایک قومی کمیٹی یہ سمجھتی ہے کہ ایک غیر ملکی مکتب، اس کے اپنے وطن کے بارے میں اور اسکولوں کے نصاب میں استعمال کیا جانے والا ہو تو اس میں ترمیم ہوتی چاہیے۔۔۔ لہذا، اس بارے میں اس ملک کی قومی کمیٹی سے درخواست کی جائے گی جہاں یہ مکتب استعمال ہونے والا ہے۔۔۔

(ب) اس نوعیت کی درخواست ملنے کے بعد قومی کمیٹی پہلے تو یہ فیصلہ کرے گی کہ اس کو قبول کیا جائے یا نہیں؛ اس کے بعد یہ طے کرے گی کہ مجوزہ ترمیم کے بارے میں مصنفین اور ناشرین سے کسی قسم کی دوستانہ اور نجی نوعیت کی گزارشات کی جائیں یا نہیں۔ اگر یہ گزارشات کامیاب ہوتی ہیں تو کمیٹی درخواست کرنے والی کمیٹی کو اور بین الاقوامی کمیٹی کو مطلع کر دے گی؛ اگر نہیں، تو اس کی، نا کامیابی کے بارے میں کسی قسم کی تشریح کی یا کوئی قدم اٹھانے سے انکار کے بارے میں، ذمہ داری نہیں ہوگی۔

Welsh Association کے سیکرٹری نے ترقیات کی تفصیلات بیان کیں، جو انہوں نے خود دیکھی تھیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے Wales کے اسکولوں کے بچوں کے، اپنے فرانسیسی دوستوں کو لکھے ہوئے، ایک رقت انگیز خط سے اقتباس پیش کیا۔

یہ نکتہ آخری کے ایک اسٹوائی فرانسیسی اسکول کے ایک ریکٹر نے بہت صفائی سے ایک اقتباس کے ذریعے واضح کیا ہے: اسکول محض زندگی کی تیاری نہیں ہوتا؛ ڈیوے (Dewey) کے الفاظ میں اس کو "خود زندگی" ہونا چاہیے۔

آخر میں، تفصیلات میں گئے بغیر، ہمیں بین المدارس اور بین الاقوامی خط کتابت کے بارے میں ان بے شمار رپورٹوں کو یاد کرنا چاہیے جو پیرس کے مسٹر گارنیے (Garnier) نے لکھی تھیں۔ ہمیں Comenius [برطانیہ کے اسکولوں میں تعلیمات کا ایک بہت مشہور پروگرام۔] پر کیے گئے مطالعے کو نہیں بھولنا چاہیے، اور ہمیں یہ اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ ہم نے بہت ہی دوسری دستاویزات سے غفلت برتی ہے۔

اگرچہ یہ تحریر نامکمل ہے، مجھے یقین ہے کہ نوٹیل کمیٹی اس قسم کے مسئلے سے اچھی طرح واقف ہے، جس میں کسی کام کی قدر کا اعتراف کیا جا رہا ہے جو پچھلے چند ماہ میں امن کی ترقی کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ مگر آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے میرے پاس ایک اور دستاویز ہے، اور آپ دیکھیں گے کہ یہ کسی طرح بھی کم اہم نہیں ہے۔

بہت دنوں سے تجویزیں پیش کی گئی ہیں کہ فرانسیسی اور جرمن اسکولوں کے درمیان ایک میٹنگ کی جائے، مگر اس کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹیں آتی ہیں۔ 25 جون 1926 کو German Teachers Union کے صدر پورے اختیار کے ساتھ Dutch Bureau کی موجودگی میں فرانس کے مندوبین سے ملے اور پہلا رابطہ قائم ہوا۔ اسی برس کے ستمبر کی 26 تاریخ کو پیرس میں National Union

of Teachers تعلیمی انجمن میں شامل ہو گئی، اور 22-23 اپریل کو لندن میں ایک کانفرنس ہوئی، جس میں International Federation کو ملاقات کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔

برلن میں General Teachers Union کے مرکزی دفاتر میں 14-16 اپریل 1928 کو مندرجہ ذیل اداروں کی اہمیت منظور کی گئی:

1. German Teachers Union
150,000
2. National Association of French Teachers 78,000
3. Dutch Teachers Union, Holland 6,400
4. Another Dutch Association
5,000
5. National Union of Teachers
121,000
6. General Association of Bulgarian Teachers 12,000
7. Swedish Teachers Association
4,200
8. General Association of Czechoslovak Teachers
26,000
9. General Association of Teachers - Baltic Countries 3,900
10. Pedagogical Society of French Switzerland 3,200
11. Swiss Teachers

Union

10,000

12. Polish National Union of

Teachers----- 36,000

13. Yugoslav Teachers

Association-----

13,000

14. Lithuanian Teachers

Association----- 1,000

15. Teachers Union of the Dutch East

Indies----- 1,500

Total

471,200

ان سو برائٹیوں کی اصل تشویش برلن اور ویمیری جمہوں پر معلوم کی جاسکتی تھیں: ان کی سب سے اہم خواہش یہ تھی کہ وہ میاں کی طور پر غیر جانب دار رہیں۔

جرمنی کے اساتذہ کی انجمن کے سیکریٹری جنرل نے اپنے تقریر میں تعلیم دینے والوں کے فرائض پر زور دیا تھا کہ ”امن کی خواہش کو بڑھاؤ، کہ یہی کیفیت بنی نوع انسان کے قابل ہے۔“ انھوں نے مزید کہا:

”امن کی تعلیم دینا مدارس کا فرض ہے؛ انسانی تعلیم ایک کھوکھلے جملے کے سنا کچھ نہیں اگر اس کا اصل مقصد امن حاصل کرنا نہ ہو۔ ہم سے خواب دیکھنے اور تصور کرنے والوں جیسا سلوک نہیں ہونا چاہیے۔ ہم اپنے

کام کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اس کے باوجود ہمیں اس کی تکمیل کے لئے کام کرنا پڑتا ہے، کہ یہی ہے جو معلم کے کردار کو اعزاز بخشتا ہے۔ ہم نہ پیستالوزی (Pestalozzi) [ایک سوئس معلم اور متعلم] کے اور نہ یسوع

مسیح کے شاگرد ہوتے، اگر ہمیں یقین نہ ہوتا کہ ہمارا اولین فرض نوجوانوں کو امن کے تصور کی تعلیم دینا ہے، جو قانون کا نظام اور آزادی کا تصور ہے۔۔۔

لیگ آف نیشنز اپنی موجودہ شکل میں ایک کم زور شروعات ہے، اور بنی نوع انسان کو امن کے چبوترے پر متحد کرنے کی کوشش میں ہے۔ یہ ترقی کرے گی جب عوام کی حالت بہتر ہوگی، اور تعلیم ان کو اپنی اندرونی

اور پیدائشی بدگمانی دور کرنے میں مدد فراہم کرے گی، اور آخر میں، جب وہ طاقت کو انصاف اور عوام کے

درمیان فیصلہ کن مافذ سمجھنا چھوڑ دیں گے۔“

جرمنی کے نمائندے کی اس معنی خیز معائنہ سوچ کے اظہار میں، ہم خوشی سے لیاں (Lyons) کے ایک فرانسیسی معلم مسٹر پیرون (Mr. Peron) کے الفاظ سے اقتباس بھی مثال کرنا چاہیں گے: ”میں بغیر کسی تکلف کے کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں ہماری موجودگی ایک عمل ہے عقیدے کا اور ارادے کا۔ یہ بھائی ہندی میں آدمی کے یقین کی گواہی ہے۔ یہ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ ہماری رائے میں بین الاقوامی یا اتفاقی کے معاون جرم اپنی سازشوں کو بڑھانے میں فرانسیسی یا جرمن اساتذہ پر مزید بھروسہ نہیں کر سکتے۔“

مسٹر پیرون زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ فریضے پر فرانسیسی اساتذہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ”فرانسیسی جمہوریہ کی دی ہوئی مذہبی غیر جانب داری کے معنی کا پُر جوش دفاع ہمارا فرض ہے، جو تحقیقی ضمانت ہے آزادی کی ہمارے ضمیر کی اور ہماری اپنی معلمی کی۔ آج ہمیں سب سے زیادہ کس چیز کی فکر ہے: اپنے شاگردوں میں، طلبہ میں، پورے ملک کے طلبہ میں امن کی خواہش کی پرورش۔“

لہذا حضرات، یہ ثمرہ ہے اساتذہ کے اس بین الاقوامی ادارے کا۔ بغیر ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کے، ان کو درپیش مشکلات کی عمیق آگاہی کے، اور دانش مندی کے جس کا وہ ہمیشہ اظہار کرتے ہیں، بڑی ہمت سے وہ عہدہ کرتے ہیں کہ وہ بنی نوع انسان کو ایک نظر سے پر فائز کر دیں گے جس کا مطلب ہوگا فیصلہ کن ترقی۔ نوبل کمیٹی کس طرح ناکام ہو سکتی ہے ایسی قابل قدر کوشش کی ہمت افزائی میں؟ یہ لاعلم نہیں ہو سکتی اس مدد سے، پوری دنیا میں جو امن کی خاکسار فوج فراہم کر رہی ہے، جس کے ہر اول دستے وہی ہیں جو پہلے نوجوانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

خطبہ — لڈ وگ کوئیڈے

تحفظ اور ترک اسلحہ جات

اس مضمون میں جن دو مسائل پر بات کی جا رہی ہے وہ آج کی سیاست میں نہایت نازک اور تازہ ترین ہیں۔ ایک عرصے سے یہ جنگ مخالفت کے بنیادی مسائل بھی رہے ہیں۔ یہ محض اتفاق ہی نہیں کہ اس مقام پر ان دونوں پر ایک ساتھ بات کی جا رہی ہے؛ اس کے برعکس، ان کو علاحدہ کرنا ممکن بھی نہیں اس لیے کہ دونوں کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔

مہر دل عزیز، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بھولا بھلا، خیال یہ ہے کہ ترک اسلحہ جات کے ذریعے امن کو محفوظ کیا جاسکتا ہے، اور ضروری ہے کہ دیر پا امن اور تحفظ کے حصول کے لیے پہلے ترک اسلحہ جات کیا جائے۔ منظم امن تحریک کے ابتدائی دنوں میں یہی طریقہ رائج ہوا کرتا تھا۔ ہماری اس عظیم پہل کا ریمہ تھا فان

سٹر (Bertha von Stumner) نے ”ہتھیار چھینک دو“ کو اپنی مشہور کتاب کا عنوان تو بنایا تھا۔ وہ کتاب جس نے کم از کم جرمن بولنے والے ملکوں میں ہمارے مقاصد کا ہماری کانگریسوں سے کہیں زیادہ پرچار کیا تھا۔ اس عنوان کا عام مطلب یہ تھا کہ ”اپنے ہتھیار چھینک دو اور ہمیں امن نصیب ہو جائے گا۔“ یہ کریڈٹ ہماری امن تحریک کو جاتا ہے کہ جنگ سے پہلے اس نے دکھا دیا تھا کہ یہ ایک غلط فہمی تھی۔ بلکہ ہتھیاروں سے لیس ممالک اتنی ہی آسانی سے جنگ میں ملوث ہو سکتے ہیں جتنے کہ مرے پاؤں تک ہتھیاروں میں لدے ممالک۔ کھل آفاقی ترک اسلحہ جات بھی امن قائم رکھنے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ ضرورت پڑنے پر تو درانی اور دہتی موگرا بھی خود بخود ہتھیار بن جلیا کرتے ہیں۔ جنگ میں پھنس جانے والی غیر اسلحہ بند قومیں امن کے دنوں کی اپنی صنعتوں کو بھی جتنی جلد ممکن ہو جدید ہتھیار بنانے میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ ان دو مسئلوں کے آپس کے رشتے تقریباً لٹے ہیں۔ ترک اسلحہ جات کا انحصار بڑی حد تک امن کی ضمانتوں پر ہوتا ہے۔ گویا پہلے تحفظ، پھر ترک اسلحہ جات!

اسلحہ جات ضروری ہوتے ہیں، یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ جنگ کے حقیقی یا تصوراتی خطرے کے باعث ضرورت کے بہانے رکھے جاتے ہیں۔ جم تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ بہترین صورت پیدا ہو جاتی ہے، تصور کر لیتے ہیں کہ بین الاقوامی زندگی کے حالات اس فوج پر متعلق گئے ہیں کہ جنگ کا کوئی امکان نہیں رہ گیا ہے۔ تب کسی کو غیر ضروری اسلحہ جات کے لیے ایک عیسے بھی طلب کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ ہم مخالفین جنگ، بالخصوص انٹریڈ نوٹیل، کا قیاس تھا کہ ”ترک اسلحہ جات نتیجہ ہوگا محفوظ امن کا، نہ کہ اس [اسلحوں] کے حصول کے طریقوں کے نہ ہونے کا۔“

ہم جس تحفظ کی بات کرتے ہیں وہ بین الاقوامی قانون بنانے سے ہی حاصل ہوگا، ایسے بین الاقوامی ادارے کے ذریعے جس کی بنیاد انصاف اور قوانین کی بنیاد پر رکھی گئی ہو۔ جب تک امن قانون کے مطابق نہیں حاصل کیا جاتا (اسلحہ جات کی وکالت کرنے والے جس کی وکالت کرتے رہتے ہیں) کسی ملک کے عسکری تحفظ کو کمزور نہیں کیا جانا چاہیے، اور جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت ترک اسلحہ جات ممکن نہیں ہوگا۔

ہم اسی وقت اس خیال کی بنیاد پر اس سے صرف نظر کر سکتے ہیں جب ترک اسلحہ جات کا ایسا طریقہ موجود ہو جو عسکری تحفظ سے متصادم نہ ہو۔ اسلحہ جات کے موجودہ درجے سے اس کی ابتدا کی جاسکتی ہے۔ ایک بین الاقوامی میاق میں یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ تمام ملکوں میں موجود اسلحہ جات ہموار تناسب کے ساتھ کم کیے جاتے رہیں گے۔ عسکری تحفظ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اس لیے کہ یہ موجودہ اسلحہ جات کے تناسب کی بنیاد ہی پر کی جاسکتی ہے۔ سو سو کا تناسب دس دس کے مقابلے میں زیادہ تحفظ فراہم نہیں کرتا۔ لہذا غیر محفوظ امن کے اگر اسلحہ جات میں کمی کی جاتی ہے اور تمام ممالک تناسب کے ساتھ اسلحہ جات سے معذور کر دیے جاتے ہیں تو عسکری تحفظ پر کسی قسم کا منفی اثر نہیں ہوگا۔

منطقی اعتبار سے یہ صحیح طریقہ تو ہوگا، مگر یہ نفسیات کے مطابق نہیں ہوگا۔ ہماری زندگی، بالخصوص عوامی

زندگی میں، منطق کے مقابلے میں انہیات زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔ جب حکومتوں کے درمیان بڑا اعتمادی ہو، جب جنگ کا خطرہ لہرا رہا ہو، باوجود اس کے کہ منطق اشارہ کر رہی ہو کہ ترک اسلحہ جات عسکری تحفظ پر گزرنا اہم از نہیں ہوگی، وہ ترک اسلحہ جات پر گزر تیار نہیں ہوں گی۔

بار بار ہمیں تجربہ ہوا ہے کہ امن کے حصول کے لیے ترک اسلحہ جات ہی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ 1898 میں زار روس کے مشہور فرمان (Rescript) میں کسی منظم بین الاقوامی قانون کا تذکرہ نہیں، صرف اسلحوں پر پابندی ہی کی بات کی گئی تھی۔ جنگ کے مخالفین اور بین الاقوامی اتحاد کی جانب سے یہی تنقید کی گئی تھی، جس کی بنیاد پر تنازعات کے پرامن حل کے مسئلے کو دی بیگ کی کانفرنس کے ایجنڈے پر لایا گیا تھا۔ یہی مشاہدہ اس کانفرنس کے بارے میں بھی کیا جاسکتا ہے جو ٹریڈ یونینوں کی ایما پر دسمبر 1922 میں دی بیگ میں کارکنوں اور جنگ مخالف لوگوں کے درمیان تعاون کی تنظیم کے لیے بلائی گئی تھی۔ ٹریڈ یونین کے نمائندوں نے بھی، جن کے لیے اس وقت یہ نئے مسائل تھے وہی ہی باتیں کی تھیں جیسی کہ 1898 میں زار نے ترک اسلحہ جات کے ذریعے امن کے ضمن میں کی تھیں۔ یہ نہایت دلچسپ بات ہے کہ دوسری جانب، "Outlawry of War" تحریک کے شہرک مسٹر لینسن (Levinson) بھی نہایت پر زور طریقے سے یہ اعلان کریں کہ وہ جنگ مخالف نہیں تھے اس لیے کہ انہوں نے ترک اسلحہ جات کے ذریعے امن کے حصول کی خواہش نہیں کی۔ امن کی تحریک کے بارے میں انہیں کتنی کم واقفیت تھی اور ان کے نزدیک یہ عمومی غلطی کتنی کاشف ذات تھی۔

جنگ کے کچھ مخالفین سلامتی کی اہمیت کے تصور کو بہت دور تک لے گئے ہیں، اس نکتے تک کہ اس وقت تک ترک اسلحہ جات کا اعلان کرنا غیر ضروری اور بے کار ہے جب تک کہ ابدی امن حاصل نہیں ہو جاتا۔ یہ ایک نظریاتی تصور ہے جو تمام حقائق پر غور نہیں کرتا ہے۔ سلامتی سے قطع نظر، اسلحے میں کمی بذات خود اقتصادی اور مالیاتی اعتبار سے اہم ہے۔ یہ دیکھنا اتنی مشہور ہے اور اس پر اتنی بار بحث کی گئی ہے کہ اب اس پر وقت ضائع کرنا غیر ضروری ہے۔ بس اتنا ہی اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ اسلحے اقتصادی، سماجی اور عقلی اعتبار سے قوم کے وسائل پر، اس کے بجٹ پر اور ٹیکس کے نظام پر بڑا بوجھ ہوتے ہیں۔

مگر یہی سب کچھ نہیں ہے۔ ترک اسلحہ جات یا اسلحہ جات میں کمی بھی، جس کا انحصار سلامتی کے معیار پر ہوتا ہے، امن کے قیام میں مددگار ہوتی ہے۔ اسلحہ جات میں اضافہ، کبھی نہ ختم ہونے والی اسلحوں کی دوڑ۔ بذات خود بھی جنگ کی امکانی وجہ ہوتی ہے۔ بارہ سو عسکری افراد یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا پیشہ بھی اہم ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ جو اسلحہ جات میں خوف ناک اضافے سے پریشان ہوتے ہیں، اس خیال سے ان کے عادی اور راضی ہو جاتے ہیں کہ جنگ ناگزیر ہو چکی ہے۔ وہ کہتے ہیں "لاستناہی خوف سے خوف ناک انجام سے بہتر ہے۔" یہی جنگ کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ اسلحوں میں کمی کی ہر کوشش اشارہ ہے کہ باہمی مفاہمت کے حصول کی خواہش باقی ہے، اور ایسی ہر کامیابی بین الاقوامی سطح پر قانون کی حکمرانی کی حمایت کرتی

ہے۔

جنگ کے مخالفین میں سب سے آگے آگے انگریز تھے جنہوں نے ہمیشہ ترک اسلحہ جات کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ وہ کہتے تھے، عام آدمی اس قسم کی جنگ کی مخالفت کو نہیں سمجھ سکے گا جو اسے پہ فوری پابندی کے مطالبے سے غفلت برتی ہے۔ اس میدان کی کمترین کامیابی بھی رائے عامہ پر بین الاقوامی قانون کی سب زیادہ دکھائی دینے والی ترقی کے مقابلے میں زیادہ موثر ہوگی۔ براعظم میں امن کے دوست، دنیاوی طور پر فرانسیسی اور جرمن کے نمائندوں میں امیلے آرنو (Émile Arnaud) اور آلفریڈ فریڈ (Alfred Fried) جیسے لوگ شامل ہیں جنہوں نے اپنی کوششوں کا ارتکا ز زیادہ تر بین الاقوامی انصاف کی تنظیم پر رکھا ہے۔

ان مخالفتوں کے علاوہ جو اس زمانے میں ایک بار زیادہ تیزی اور سنجیدگی سے پھر ابھری ہیں، جب تک وہ ناقابل مصالحت تنازعات نہیں بن جاتیں، دو مسئلوں پر مذاکرات کا نتیجہ نہ صرف مفاہمت ہوگا بلکہ ان کا ایک دوسرے پر مکمل انحصار کا اقرار بھی ہوگا۔ اب ہمیں جنگ سے پہلے ہر ایک میں ہونے والی ترقی پر دوبارہ غور کرنا ہوگا: پہلے تحریک اسلحہ جات، پھر سلامتی۔

جب تحریک اسلحہ جات پر غور ہو تو ہمیں پارلیمان اور حکومت میں شامل جنگ کے مخالفین کے حالات کے درمیان امتیاز کرنا ہوگا۔ ہم جنگ کی مخالفت کرنے والے، اسلحہ جات کے پیدا کردہ شدید خطرات کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور ان میں کمی پر اصرار کرتے نہیں سمجھتے۔ ہم نے قرارداد منظور کی ہیں اور عوام اور حکومت کو منصوبے پیش کیے ہیں۔ ہمارے مطالبے کے دوران حاصل ہونے والا نتیجہ یہ تھا کہ اسلحوں میں کمی کا سب سے اچھا اور مثالی ایک ہی طریقہ ہے کہ بین الاقوامی معق کیا جائے جس میں تمام طاقتیں شامل ہوں اور یہ اطمینان بھی ہو کہ قومی بجٹ ہی وہ عملی پیمانہ ہے جس کے ذریعے اسلحے میں تخفیف کی جاسکتی ہے۔ جنگ سے پہلے ہم لوگ جو جنگ مخالفین میں سے تھے، اپنے مطالبات میں خاصے اعتدال پسند ہو گئے ہیں تاکہ ہم کو بے عمل مثالیت پسند نہ گردانا جانے لگے۔ ہم نے اکثر ترک اسلحہ جات کے بجائے ”اسلحوں میں حد بندی“ کی باتیں کی ہیں، اور اس اصطلاح کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاملہ کانگریسوں کے ایجنڈے پر رکھا جاتا رہا ہے۔

اگرچہ میں خود اس کا خالق ہوں، مجھے ایک تجویز کا ضرورتاً ذکر کرنا چاہیے جو قبل از جنگ پیدا ہونے والے گزرتے ہوئے حالات کے بعد پیش ہوئی تھی۔ میں اس لیے ایسا کر رہا ہوں کہ وہ لوگ، جو فیصلہ کرنے میں ماہر ہیں، اس کو واحد تجویز سمجھتے ہیں جو قبل از جنگ عرصے میں آئی تھی اور جس کو سنجیدگی سے لیا جانا چاہیے تھا، اور جو مزید مطالبے کی بنیاد بن سکتی تھی۔ یہ تجویز بین الاقوامی ترک اسلحہ جات کے ایک مسودے کے بارے میں تھی جسے میں نے 1913 کی International Peace Congress میں پیش کیا تھا اور بعد میں Conference of the Interparliamentary Union میں، جو دی ہیگ میں منعقد ہوئی تھیں۔ وہ مسودہ اس طرح صرف بجٹ کے ذریعے جوں کا توں قائم رکھنے کے بارے میں تھا کہ ملکوں کے بجٹ کو ان کے موجودہ درجے پر قائم رکھا جائے، اور ان میں، چھ برس کے عرصے میں ہر برس، پانچ فی صد کے حساب

سے شہود کا طریقے سے کی ہوئی ہے۔ اس کی تفصیلات ثالثی کے ایک نظام کا رکو دی جاتی تھی جس میں تمام معاملات اور رائے کے تمام ناگزیر اختلافات کو پیش ہوتا تھا۔

اگرچہ Interparliamentary Union کے تمام ارکان بہت بڑے امتیاز کے حق دار ہیں۔ یونین ترکیب اسلحہ جات کے بارے میں بہت کم سخن رہی ہے۔ d'Estournelles de Constant نے 1912 میں مطالعہ گروپ کی جانب سے جنیوا میں جو رپورٹ پیش کی تھی وہ عسکریت اور اسلحہ جات کی پیدا کردہ خرابیوں اور خطرات کے خلاف ایک شیریں کلام فرد جرم کے سوا کچھ اور نہیں تھی، جس میں ان پابندیوں کی شرائط تک کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا جس کے ذریعے اسلحوں میں کمی کی جائے گی۔

اس کے ایک برس بعد، جب میں اپنا مسودہ تیار کر چکا تھا، دی ہیگ میں ہونے والی Conference of the Interparliamentary Union نے مسئلے کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کے لیے ایک خصوصی کمیشن بٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ فرانس کی جانب سے اس کے سابق وزیر جنگ Messimy کو نمائندگی کرنی تھی۔ میں نے Erzberger کو جرمنی کا نمائندہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے کہ جرمنی میں Center Party کی حکومت بننے والی تھی۔ مسودے کے مصنف کی حیثیت سے میں کمیشن سے منسلک کیا گیا تھا۔ جس تاریخ کو اسٹاک ہوم میں اس کا اجلاس ہونے والا تھا اسی دن جنگ چھڑ گئی۔

زار کے فرمان نے حکومتوں کو ترک اسلحہ جات سے منہ پر مجبور کر دیا۔ پہلی ہیگ کانفرنس محض ایک قرارداد تھی جو بے اثر تھی مگر بہت اہمیت کی حامل تھی، اس لیے کہ اس نے ایک اصول کی شناخت کرنی تھی، حکومتوں نے جس کی پہلے مخالفت کی تھی۔ انھوں نے ایک قرارداد کے ذریعے متفقہ طور پر منظور کر لیا تھا کہ قوموں کی اقتصادی اور معاشی بہبود کے لیے اسلحے پر پابندی صحیح ہوگی۔ جب تک صرف ہم مفلس جنگ کے مخالفین اس قسم کی باتیں کرتے رہے ہمیں دیوانوں، ناقابلِ علاج یوں و بیانی، حتیٰ کہ مذاکرہ سمجھا گیا تھا۔ ہمارے پروپیگنڈے کے لیے یہ عام سی بات تھی کہ اب حکومتیں خود ہمارے دعووں کو مان رہی تھیں۔

دوسری ہیگ کانفرنس میں جرمنوں کی ہٹ دھرمی نے ترک اسلحہ جات کے سوال کو ایجنڈے سے باہر رکھا۔ برطانوی حکومت کے لیے ایک قرارداد کی منظوری کے لیے بھی بہت چالاکی کی ضرورت تھی۔ کوئی بحث نہیں ہوئی۔ اس قرارداد نے اس قرارداد کی منظوری دی جو پہلی ہیگ کانفرنس میں منظور ہوئی تھی اور حکومتوں کو پابند کیا تھا کہ وہ مطالعہ جاری رکھیں گی۔ ”مطالعہ جاری رکھنا“ نہایت نرم لہجے میں سخت بات کہنے کے مترادف ہے۔ درحقیقت، ان کی تو شروعات بھی نہیں ہوئی تھی کہ جنگ نے سلسلہ واقعات کو درہم برہم کر دیا تھا۔ آج کے حالات نے تو سب کچھ بالکل جہل کر دیا ہے۔

اب ہم جنگ سے پہلے کی سلامتی کے مسائل کی طرف واپس چلتے ہیں۔

ایک طویل عرصے تک عملی طور پر جس حل کا کوئی تصور کیا جاسکتا تھا وہ صرف ثالثی کی عدالت تھی۔ یہ دراصل پرانا طریقہ کار ہے، جو بظاہر ناقابلِ حل تنازعات کو سفارتی ذریعوں سے ماضی طور پر بنائی گئی ثالثی

عدالتوں کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ اس زمانے میں کافی کامیابیاں ہوتی تھیں جب ثالثی کے معاہدے کیے جاتے تھے جن میں معاہدہ کرنے والی طاقتیں پہلے سے وعدہ کرتی تھیں کہ وہ اپنے تمام تنازعات کو ثالثی عدالتوں کے سامنے پیش کریں گی، معاہدے جو نہ صرف عدالتوں کی تشکیل بلکہ ان کے طریقہ کار بھی متعین کرتے تھے۔

جنگ مخالفت کے ایجنڈے اور پارلیمان والوں کی قراردادیں ایسے معاہدوں کی ہمت افزائی کرتی تھیں، اور انیسویں صدی کے اوائل تک ان کی تعداد خاصی بڑھ چکی تھی۔ اگرچہ قدم بظاہر ایک وسیع بین الاقوامی میاق اور ایک مستقل بین الاقوامی ثالثی عدالت کا قیام تھا۔ یہ Interparliamentary Union کی، جو اس کی پیغامبر ہے، بڑی کامیابی ہے کہ اس نے Descamp کے مسودے کی صورت میں ایک مثبت سفارش تیار کی ہے۔ اس مسودے کی بنیاد پر پہلی ہیگ کانفرنس نے اپنا عظیم کنونشن منعقد کیا تھا۔

پہلی ہیگ کانفرنس کے اس نتیجے کی اہمیت کا غیر ضروری تھمیدہ لگا مشکل ہوگا، وہ نتیجہ جنگ جس کو اپنے ساتھ بہا نہیں لے سکتی ہے۔ کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ قطعاً کامیابی حاصل کر لی گئی ہے۔ کانفرنس کی قائم کی ہوئی بین الاقوامی ثالثی عدالت کا استعمال اختیاری تھا؛ لازمی نہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ متعلقہ طاقتوں پر منحصر تھا کہ وہ ریاستوں کے درمیان تنازعات کو حل کرنے کے لیے قانونی طریقے اختیار کرتی ہیں یا نہیں۔ لیکن اس کے کہ ان سہولتوں کو استعمال کرنے کے لیے ایک معاہدہ کیا جائے، برتنازعہ کے معاملے میں دونوں فریقوں کی نیک نیتی ضروری تھی۔ اپنی خرابیوں کے باوجود بھی، کانفرنس کے تشکیل دیے ہوئے ادارے جنگ روکنے میں قابل قدر حیثیت کے حامل تھے۔ اس کی بہترین مثال Dogger Bank کا واقعہ تھا۔

مگر یہ خدمت واقعی ضروری چیز نہیں ہے۔ دی ہیگ کانفرنس کی سب سے بڑی خصوصیت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں پہلی بار مہذب دنیا کی تمام ریاستوں کے نمائندے ایک ادارے کی تشکیل پر متحد ہو گئے تھے جس کا مقصد آفاقی امن کی برقراری اور بین الاقوامی تنازعات کا ہندو بست تھا۔ یہ ایک عالمی بین الاقوامی ادارے کی ابتدا تھی۔ مجھے یقین ہے کہ صدیوں بعد جب بین الاقوامی قانون کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس کو وہ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا؛ پہلا حصہ ابتدائی زمانے سے انیسویں صدی کے آخر تک کا زمانہ ہوگا، اور دوسرے کی ابتدا ہوگی دی ہیگ کانفرنس سے۔ وہ سب کچھ جواب تک حاصل کیا گیا ہے، اس کی بنیاد اس کانفرنس کے خیالات پر ہے۔

کانفرنس کے فوراً بعد ثالثی عدالت کو لازمی بنانے کے مسئلے کے طرف رجوع کرنا تھا۔ اس وقت دو امکانات سامنے تھے: ایک نئے عام کنونشن کے ذریعے ہیگ کنونشن کی تکمیل، اور دوسرا، ایک خصوصی امدادی میاق کا کیا جانا۔

پہلے طریقے کی 1807 کی دوسری کانفرنس میں کوشش کی گئی تھی۔ کوشش ناکام ہو گئی۔ دوسری ریاستوں کے مابین بہت سے خصوصی معاہدے ہوئے، مگر تقریباً سب میں ایک دفعہ کو شامل کیا گیا تھا جس کا مقصد قومی

وقار یا ریاست کے اہم مفادات پر اثر انداز ہونے والے سوالات کو ثالثی عدالتوں میں اٹھانے سے روکا جانا تھا۔ کچھ مخصوص دل چسپ معاق تھے جو Bryan کے طرز پر گئے گئے تھے۔ ان کے تحت تمام تنازعات کے پیرامن ہندو بست اور ثالثی عدالت کو مصالحتی انداز میں یک جا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

میں وراثت کے بارے میں بھی کچھ کہنا چاہوں گا۔ رفتہ رفتہ اس کا احساس ہو گیا ہے کہ امن کی پودر ش کرنا صرف ثالثی کی عدالتوں کے حلقہ اختیار میں نہیں دیا جاسکتا۔ ثالثی عدالتوں کو ان معاملات کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے جو قانونی چارہ جوئی کے لیے موزوں ہوں۔ مگر سب سے مشکل اور خطرناک تنازعے ان مفادات کے سلسلے میں ہی اٹھتے ہیں جو قانونی عمل کے اصولوں سے متعلق نہیں ہوتے۔ ایسے معاملات میں، یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ کیا منصفانہ اور صحیح ہے، ملکی مفاد کے پیش نظر وراثت کا طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کو متوازن سماجی حلقوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ملا زمین اور آجروں کے درمیان خطرناک تنازعے جو بڑی ہڑتالوں پر منتج ہو سکتے ہیں، عدالتوں کے بجائے وراثت کے ذریعے حل کیے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی حلقے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ بین الاقوامی وراثت کو بھی ثالثی ہی کی طرح منظم کیا جانا چاہیے۔

ہم مخالفین جنگ اس بات پر کسی ترقی کر سکتے ہیں کہ ہم ان پہلے لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے ثالثی کے ساتھ ساتھ وراثت کے نظام کے قیام پر بھی زور دیا ہے۔ 1905 کی لاتمرن (Lucerne) کانگریس نے فرائیڈوئیڈے (Fried-Quidde) تحریک کی منظوری دی تھی جس میں منظم مصالحت کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی تھی۔ سات برس بعد، 1912 جنیوا میں منعقد ہونے والی Union Interparliamentary کانگریس میں مسٹر کوالےفسکی (Kovalevsky) نے روسی گروپ کے رہنما مسٹر لفرے موف (Eremov) کی طرف سے اس سوال پر ایک رپورٹ پیش کی تھی۔ پھر بھی، میں یاد دلانا چاہوں گا کہ اس قرارداد پر کم توجہ دی گئی تھی۔ پارلیمان کے زیادہ تر ارکان کو ابھی تک احساس ہی نہیں ہوا ہے کہ یہ مسئلہ کتنا اہم ہے اور امن کی پودر ش کے لیے کتنا فیاضی دی ہے۔

اگر لازمی مصالحت کے لیے کوئی منظم نظام کارو جو درکھتا تو شاید عالمی جنگ نہ چھڑی ہوتی۔ یہ مسئلے — ترک اسلحہ جات اور امن کی تنظیم کے ساتھ سلامتی کی وجہ سے جنگ نے بالکل نئے حالات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ نامعقول بات ہوگی اگر ہم جنگ مخالفین ایک ترک اسلحہ جات کا پروگرام پیش کریں جو اتنا ہی ہلکا ہو جیسا کہ قبل از جنگ کے دنوں میں تھا۔ سخت اور مکمل ترک اسلحہ جات اب ہمارا ہدف ہے۔ عملی سیاسی معنوں میں مسئلہ یہ جاننا ہے کہ کتنے درجوں میں ہم اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

جنگ کے دوران پاپائے اعظم بینی ڈکٹ وہ پہلے شخص تھے جس نے جنیوا دی ترک اسلحہ جات کا پروگرام پیش کیا تھا۔ 15 اگست 1917 کے اپنے خط میں انہوں نے کہا تھا کہ جنگ کے بعد ضروری ہوگا کہ طاقت کی جگہ انصاف کو دی جائے اور اسلحے کو اس حد تک کم کیا جائے جہاں تک کہ وہ اندرونی تحفظ، سرحدوں کی حفاظت

اور قانون کی حکمرانی کے لیے کافی اور ضروری ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں: جنگ کے ارکان کے خلاف اسلحہ بندی نہیں ہوگی۔ یہ سخت نوعیت کے ترک اسلحہ جات کے برابر ہوتا ہے۔ آئندہ نہ بڑی فوج ہوگی نہ بحری یا ان سب کا متبادل ایک اندرونی پولیس کی طاقت ہوگی۔ سخت اور مکمل ترک اسلحہ جات کے مقصد کی وکالت اب سوویت وفد کر رہا ہے۔ عوامی زندگی اکثر و بیشتر حیرت ناک اتحادوں کا نظارہ پیش کرتی ہے۔

جنگ کے بعد امن کے معاق اور لیگ آف نیشنز کی تحقیق نے ترک اسلحہ جات کے سوال کو بالکل نئی بنیادوں پر نکھڑا کر دیا ہے۔

عہد نامے کی دفعہ 8 لیگ کے ارکان کو ایک مخصوص درجے تک اپنے اسلحہ جات کو کم کرنے کی پابندی کرتی ہے۔ ورمائی کے معاق کا پانچواں حصہ کہتا ہے کہ جرمنی کو ترک اسلحہ جات کا پابند کیا جا رہا ہے تاکہ آفاقی ترک اسلحہ جات کا راستہ ہموار ہو۔ 16 جون 1919 کو لکھے گئے اپنے خط میں، جس پر Clemenceau کے دستخط تھے اتحادیوں نے باقاعدہ حلفیہ اعلان کیا تھا کہ ان کا واقعی ارادہ ہے کہ وہ صرف جرمنی کے ایک طرفہ ترک اسلحہ جات پر ہی اکتفا نہیں کریں گے۔

اگر ہم یہ سوال کریں کہ عہد نامے میں وعدہ شدہ ترک اسلحہ جات کس طرح پورا ہوگا اور وہ کون سے درجے ہیں جہاں تک اسلحہ بندی کی اجازت ہوگی، تو ہمیں عہد نامے سے کوئی کام کا جواب نہیں ملے گا۔ [اس میں] بیان کیے گئے جانچ کے دو طریقے یہ ہیں کہ منظور شدہ اسلحہ قومی سلامتی کی ضمانت دیں گے اور لیگ کو دیے ہوئے قول کے مطابق ہوں گے۔ یہ حد دستی نہیں، لیکن خاص طور پر متعلق ہیں۔

پہلے ہم قومی سلامتی پر غور کرتے ہیں۔ لیگ آف نیشنز کے عہد نامے کے اپنے کے مسودے میں ورسن نے کہا تھا کہ اسلحہ جات اس درجے تک کم کیے جانے چاہئیں جو اندرونی ضابطوں کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوں۔ ان کا پروگرام واضح اور قطعی تھا: سخت ترک اسلحہ جات، جس کی تجویز پاپائے اعظم بین الاقوامی نے پیش کی تھی اور اب انقلاب پسند (Bolshevik) بھی کر رہے ہیں۔ مگر عہد نامے کے لیے ورسن کا متن خاصا تبدیل شدہ تھا، [اس میں] "اندرونی ضابطے" کی جگہ "قومی سلامتی" کر دیا گیا تھا۔ یہ تو بالکل لغو بات ہوتی۔

مسکری نقطہ نظر سے قومی سلامتی کی ضمانت کے لیے اسلحہ کی مقدار دوسری طاقتوں کی اسلحہ بندی کے درجات پر منحصر ہوگی۔ جب بھی ان طاقتوں کے پاس جو قومی سلامتی کی تشکیل میں شامل ہوتی ہے ہماری اسلحہ ہوگا، کہا جائے گا کہ یہ ہماری قومی سلامتی کے تقاضوں کی مطابق ہے۔ اگر یہ طاقتیں اپنے اسلحوں میں کمی کر دیں، تو قومی سلامتی ان کی مثال پر عمل کرنے کی اجازت دے دے گی۔

جانچ کا دوسرا طریقہ لیگ آف نیشنز سے گئے وعدے کی پاس داری ہوگا۔ کچھ مخصوص حالات میں لیگ کی کاؤنسل ارکان سے کہہ سکتی ہے کہ اس رکن کے خلاف مسکری نہ کر بندی کریں جس نے عہد نامے کی خلاف ورزی کی ہے۔ لہذا ارکان کو ایسی حالت میں ہونا ہوگا کہ وہ اپنی عارضی اشیاء کو لیگ کے احکام کے حوالے کر سکیں۔ میں اس دفعہ کے حسن و قبح پر نکتہ چینی نہیں کر رہا ہوں۔ یہ تو ہے، اگر بظاہر یہ اسلحہ جات کی موجودگی کو

قبول کر رہا ہے۔ مگر کن حدود کے اندر؟ عام نوعیت کے اسلحے کا درجہ جتنا بلند ہوگا، لڑکے کو اتنی ہی زیادہ عسکری قوت کی ضرورت ہوگی۔ ترک اسلحہ جات جتنا زیادہ ہوگا، لڑکے کی عسکری ضروریات اتنی ہی کم ہوں گی۔ دوسرے لفظوں میں، جانچ کے دونوں طریقے مانتے ہیں کہ اسلحہ بندی کی حدود کا انحصار ترک اسلحہ جات پر ہوگا۔ وہ حتمی حدود جو میس لڑکے آف میٹرز کے عہدے سے کی دفعہ 8 میں نہیں تھیں، امن کے معاہدوں میں دی گئی ہیں: جرمنی اور دوسری شکست خوردہ قوموں کے ترک اسلحہ جات کو عام ترک اسلحہ جات کا راستہ کھولنا ہوگا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ بالآخر پوری دنیا کے عام درجے کی اسلحہ بندی کو مرکزی طاقتوں کی صف میں لانا ہوگا۔ کوئی بھی یہ قیاس نہیں کر سکتا کہ ہمیشہ کے لیے اسلحہ بندی کے فارمولے پر قرار رکھے جائیں گے، ایک 1918 کے فاتحین کے لیے اور دوسرا منتقمین کے لیے۔ یہ سچ ہے کہ فرانس کے وزیر جنگ مجیدو (Maginot) نے مذاقی و رسائی کی بدنام زمانہ دفعہ 231 پر بات کرتے ہوئے اسی کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر کوئی بھی جو اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتا ہو، ان سے اتفاق کرے گا۔ اس قسم کی باتیں چند برس تک، شاید ایک لاکھ تک، کی جاسکتی ہیں، مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔ چوں کہ یہ معاہدوں کی روح سے روگردانی کرے گا اور مرکزی طاقتوں کی اسلحہ بندی کرنے کی اجازت دے گا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کے ترک اسلحہ جات کو بین الاقوامی ترک اسلحہ جات کے ماڈل کے طور پر بھی لیا جائے گا۔

تمام ملکوں کے جنگ مخالفین نے اپنی امن کاغذیوں میں اس پروگرام کے حق میں رائے دی تھی۔ برطانیہ، فرانس، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، سویٹزرلینڈ، پولینڈ سب نے اس رائے شکاری میں حصہ لیا تھا۔ برطانوی جنگ مخالفین پہلے لوگ تھے جنہوں نے "the standard of 1919" کے فارمولے کو پیش کیا تھا، یعنی، 1919 کے امن معاہدوں میں تشریح کردہ اسلحے کے درجات کے مطابق۔ جنگ مخالفین کا یہ حتمی پروگرام نہیں، اس لیے کہ ہم فطری طور پر سخت درجے کے ترک اسلحہ جات پر اپنا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر یہی پروگرام ہے عہدے سے اور معاہدوں کے تحت۔ جس کا اعتراف کرنا فوج طاقتوں کی ذمہ داری ہے۔

جنگ کے بعد سے سلامتی کے معاملے میں ہونے والی سب سے اہم ترقی لڑکے آف میٹرز کا قیام ہے۔ یقیناً، [اس کا] عہد نامہ اتنا وسیع نہیں جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ جنگ مخالفین کے لیے اس کی کم زوریوں پر نظر ثانی کرنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ [اس میں] ایک بنیادی عیب یہ ہے کہ کچھ مخصوص حالات میں یہ جنگ کو قومی مفادات کے تحفظ کے لیے ایک جائز طریقہ سمجھتا ہے۔ اگر کوئی قرارداد متفقہ طور پر منظور نہیں ہوتی تو ریاستیں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے وہ طریقے اختیار کرتی ہیں جو ان کے نزدیک مناسب ہوں۔

عہد نامے کی اس کم زوری کو دور کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ مجھے 1924 کا مشہور Geneva Protocol یاد ہے جس میں جنگ کو ایک جرہ قرار دیا گیا تھا اور اس کے دفعات بہت امتیاط سے بنائے گئے تھے جن میں تمام تنازعات کو پرامن طریقے سے حل کرنا لازمی قرار دیا گیا تھا۔ یہ پروٹوکول، جس کے لیے مسٹر پولیٹیس (Pallis) اور مسٹر بینے (Bene) کو بنیادی کردار دیا جانا چاہیے، بڑے جوش اور جذبے سے مستحق

طور پر منظور کیا گیا تھا۔ وہ جنگ مخالف جذبے کی حتمی کامیابی محسوس ہوئی تھی۔

مگر 1924 کا پروٹوکول غرق دریا ہو گیا؛ برطانیہ کی قدامت پسند کاہنہ کو رامسے مکڈونلڈ (Ramsay MacDonald) کی کاہنہ سے بدل دیا گیا؛ سلطنت کے عناصر نے یورپی معاملات میں الجھنے کے خلاف احتجاج کیا؛ اور برطانوی حکومت نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ پروٹوکول ختم ہو گیا، مگر اس میں شامل خیالات غریب نہیں ہیں؛ اس کے برعکس، برسرِ یہ اُن کی توانائی کا تازہ ثبوت فراہم کرتا ہے۔ بہت سی تجاویز، جو لیگ آف نیشنز یا رائے عامہ کے سامنے پیش کی گئی ہیں ان کا مشترکہ مقصد تمام لڑائیوں کے پُر امن حل کی ضمانت دینا ہے۔ فارمولے تبدیل ہوتے رہتے ہیں؛ خیال وہی رہتا ہے۔ Committee on Arbitration and Security، جسے Preparatory Commission for the Disarmament Conference نے قائم کیا تھا، مشورہ آیا جسے لیگ نے 1928 کے نام نہاد General Act میں شامل کر لیا ہے۔

فرانس میں یہ خیال عام ہے کہ ترک اسلحہ جات سے پہلے سلامتی کی ضمانتوں کی تکمیل ہونی چاہیے۔ فرانسیسی کہتے ہیں کہ دوبارہ اپنی فطری قوت پر بحال ہونے والا جرمنی جنگ کے نتائج کے جذباتی غلبے کو بے اثر کرنے کے لیے یا تو پُر امن طریقہ اختیار کرے گا یا بدلے کی جنگ شروع کر دے گا۔ جرمنی کے قوم پرستوں کی جانب سے ہونے والے مظاہروں نے اس تشویش میں اضافہ کر دیا ہے۔ فرانس کو خفیہ اسلحہ بندی کی اطلاع ملی ہے۔ خالص جعل سازیوں اور خیالی مبالغوں کے ساتھ، کچھ واقعی شکایات بھی ملی ہیں۔ میں اس موضوع پر اس موقع کے پیش نظر کھل کر بات کر سکتا ہوں کہ میں جو کچھ کہوں گا اس کو قبول کیا جائے گا، اس لیے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے جرمنی کی خفیہ اسلحہ بندی کے خلاف تحریک چلائی تھی اور 1924 کے مارچ میں باویریا (Bavaria) میں نافذ ایمر جنسی قوانین کے تحت مجھے میونخ میں جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ خفیہ اسلحہ بندی بے انتہا مذمت کے قابل ہے اور ان ارادوں کا ظہور ہے جو کسی طرح بھی اس سرکاری پالیسی سے قابلِ مصالحت نہیں، جرمن پارلیمان اور عوام کی بڑی اکثریت جس کی حمایت کرتی ہے۔ پھر بھی، جنگ کے تناظر میں دیکھا جائے تو، عملی طور پر اس غیر قانونی اسلحہ بندی کی مادی اہمیت صفر کے برابر ہے۔ وہ زمانہ گزر گیا جب اربابِ اقتدار ایسی چیزوں کو چھپالیا کرتے تھے اور اس وقت بھی، اگرچہ یہ بڑا خطرہ تھے اندرونی امن کے لیے، جمہوریہ کے لیے اور آئین کے لیے، دوسرے ممالک کے لیے یہ خطرہ نہیں تھے، بالخصوص فرانس کے لیے تو بالکل ہی نہیں۔ معافی و رسانی کے مطابق جرمنی مکمل طور پر بھاری اسلحے نہیں رکھ سکتا۔ نہ ان کو خفیہ طور پر تیار کیا جاسکتا ہے۔ تحریک صنعتوں میں بھاری کولے بھی نہیں بنائے جاسکتے۔ لہذا، جنگ کی خفیہ تیاری کی باتیں محض ہچکناکے بے وقوفی تھیں۔

بدلے کی جنگ کے بغیر اذقیاس خطرے کے خلاف فرانس کی ضرورت برائے خصوصی سلامتی کو 1925 کے لوکارنو معاہدے نے حل کر دیا تھا۔ اس پر تفصیل سے گفتگو کی ضرورت نہیں۔ امن کی

عہدائیں بالخصوص ہوتی ہیں اور میرے نزدیک اس پر زور دیا جانا ضروری ہے۔ مگر فرانس کے نقطہ نظر سے سب سے اہم نتیجہ یہ تھا کہ جرمنی نے بیباق و رسائی کے مطابق از خود اپنی مغربی سرحدوں کی نشان دہی کر دی تھی۔ لوکارنو کے بعد سے مغربی اور مرکزی یورپ کی سلامتی اس حد تک فراہم کر دی گئی تھی جتنی کہ معاہدے میں ضمانت دی جاسکتی تھی۔

پھر 1928 میں بین الاقوامی سلامتی کی ترقی کے لیے بنیادی اہمیت کا ایک واقعہ ہوا: یعنی کیلاگ معاہدہ ہو گیا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ معاہدہ پہلی ہیگ کانفرنس کی قرارداد کی طرح جس نے اسلحہ بندی کی مذمت کی تھی ایک اعلان سے زیادہ نہیں، یعنی ایک اصول کی تفسیق ہے۔ پھر بھی، یہ حقیقت ہے کہ جنگ سے دست برداری کا اصول ایک آگے تھا قومی پالیسی کا جسے تمام ریاستوں نے پوری اہمیت کے ساتھ سرکاری طور پر باقاعدہ جاری کیا تھا۔ آپ یقین رکھیے کہ ہم لوگ اس اعلان کا فائدہ مند استعمال کریں گے، حکومتوں کو یاد دلانے اور دنیا کے حوام کو بتانے کے لیے، کہ ایسی حکومت کی وفاداری سے انکار فرض ہے جو معاہدے کی خلاف ورزی میں جنگ کا اعلان کر دیتی ہے۔

اور اب بھی، کیا کیلاگ معاہدہ بین الاقوامی قانون کا ایک نیا عہد شروع کرے گا، یا یہ بھی محض ایک واقعہ ہوگا؟ اس کا انحصار ان نتائج پر ہوگا دستخط کرنے والے جس کی توقع کریں گے۔ اگر اس کو ایک بے وقعت تحریر نہیں ہوتا ہے تو کیلاگ معاہدے میں اضافے کیے جانے چاہئیں: پہلے تو لیگ آف نیشنز کے عہد نامے پر 1924 کے پروٹوکول، یا General Act 1928 کے جذبے کے تحت نظر ثانی کے ذریعے؛ دوسرے عام ترک اسلحہ جات کے ذریعے؛ تیسرے انفرادی ریاستوں کے آئین اور قوانین سے جنگ کرنے کے حق کے خراج کے ذریعے؛ چوتھے criminal law میں ترمیم کے ذریعے جو جنگ شروع کرنے کو جرم قرار دے پانچویں، ایک قومی اور بین الاقوامی تعلیمی پروگرام کے ذریعے جو جنگ کو غیر قانونی قرار دے جانے کے تصور سے ہم آہنگ ہو۔

اب، اس تاریخی اور تجزیاتی تجزیے کے آخر میں اس کہانی کا سب سے دلچسپ حصہ آتا ہے۔ ہمیں معائنہ کرنا اور تولنا چاہیے اور موجودہ حالت کو بھانپ لیا چاہیے، ہمیں اس امر کا احاطہ کرنا چاہیے کہ لیگ نے کیا حاصل کیا ہے اور ترک اسلحہ جات معاملے میں کیا نامکمل چھوڑ دیا ہے۔ مگر مجھے وقت کی تنگی اس سوال کی تفصیلات میں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ مجھے خود کو اپنے مشاہدوں کے علاوہ سے تک محدود رکھنا ہوگا۔

میرے خیال کے مطابق اس زمانے کی بین الاقوامی سیاست میں سلامتی اور ترک اسلحہ جات اس سے کہیں زیادہ اچھے ہوئے ہیں جتنا کہ قیاس کیا جاتا ہے۔ جب 1924 کا پروٹوکول منظور ہوا تھا، اس وقت کسی نے شبہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ ترک اسلحہ جات کے ساتھ امن کی ضمانت بھی ہوتی چاہیے۔ اگلے برس کے لیے ایک بین الاقوامی ترک اسلحہ جات کانفرنس کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ، روس اور جرمنی کو، جو لیگ کے رکن نہیں بنے تھے اس میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی۔ کانفرنس، ایک برس سے دوسرے برس، کئی بار

ملٹری کی گئی۔ اب، بالآخر 2 فروری 1932 کو منعقد ہونے والی ہے۔

اس Preparatory Commission نے جو ترکی اسلحہ کانفرنس کا راستہ صاف کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا، بین الاقوامی بیاق کے ایک لیے مسودہ تیار کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں شریات کی شمولیت کو ترکی اسلحہ کانفرنس کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس پر پہلا نمبر 1927 کے بہار کے موسم میں ہوا تھا۔ میں نے "The First Step toward World Disarmament" کے عنوان سے ایک یادداشت تحریر کی تھی، جو German Peace Cartel کے درخواست پر تیار کی گئی تھی، اور International Peace Bureau کے ذریعے لیگ کے دفاتر کو روانہ کر دی گئی تھی۔ Preparatory Commission کا کام دسمبر 1930 میں مکمل ہوا۔ 1931 کے اپریل میں Friedenswart کے مسئلے کے لیے میں نے مذاکرات کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش کی تھی، جس میں نا انصافی کے اہم نکات اور نتائج بھی شامل تھے۔ اس موقع پر میں صرف اہم نکات اور ان سے متعلق سلامتی کے سوالات کے بین الاقوامی مسئلے کا محاکمہ کروں گا۔

یہ امر معنی خیز ہے کہ مسودے کے پہلے آرٹیکل میں ترکی اسلحہ جات کے بیاق کا مقصد "جہاں تک ممکن ہو" اسلحوں کی حد بندی بتائی گئی۔ یہ جملہ "جہاں تک ممکن ہو" صحیح قابل مذمت لگتا ہے جب اس کو ترکی اسلحہ جات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے، جو لیگ آف نیشنز کے عہد نامے کے آرٹیکل 8 میں لازمی قرار دیا گیا ہے اور جب امن کے معاہدوں میں دیے گئے وعدوں کے مطابق ترکی اسلحہ جات کو رفتہ رفتہ معاہدوں کے اسلحہ بندی کے دفعات کے مطابق کیا جانا ہے کہ ترکی اسلحہ جات کی عمومی توقعات پوری ہوں۔

فرانس اور اس کے اتحادی ترکی اسلحہ جات کی مخالفت کر رہے ہیں۔ فرانس کے مطابق اس نے ترکی اسلحہ جات پر عمل کر دیا ہے اس لیے کہ اس کی عسکری خدمات کی مدت گھٹا کر ایک برس کر دی گئی ہے۔ مگر تنخواہ وارفوج میں اضافہ تو اس کو بے اثر کر دیتا ہے۔ ایک بار پھر ہم سنتے ہیں کہ ترکی اسلحہ جات پر اسی وقت غور کیا جاسکتا ہے جب فرانس کو مکمل سلامتی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہاں سلامتی سے مراد وہ سلامتی نہیں لی جاتی جو امن کے قانونی حصول سے حاصل ہوگی، بلکہ یہ عسکری سلامتی، اپنے اطراف قلعہ بندی کا حصار وغیرہ ہے۔ لہذا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اسلحہ بندی کرتے رہنا چاہیے جب تک کہ ہم ترکی اسلحہ جات کرنے کی حالت میں نہیں آجائے۔ اس قسم کا یک طرفہ خالص قومی انداز نظر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ "امن کی سلامتی کے لیے" کیا جانے والی ہر قسم کی قومی اسلحہ بندی کو ہمسایہ ریاستیں یا امکانی دشمن دھمکی یا امن کے لیے خطرے پر محمول کریں گے، جب کہ دوسری جانب بین الاقوامی ترکی اسلحہ جات دوسروں کے ترکی اسلحہ جات کے ذریعے ہر ایک کی سلامتی کا باعث بنتا ہے۔

جب تک فرانس کی بالاتر رائے عامہ ترکی اسلحہ جات کو سلامتی کے یک طرفہ قومی انداز نظر پر منحصر قرار دیتی رہے گی، اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ممکن نہیں ہوگی۔ جب تک مجھ کو صاحب کے کہے کو محض اعطاف کی

بازی گری نہیں سمجھا جاتا، کوئی بھی معاہدہ ممکن نہیں ہوگا۔ 1928 میں منعقد ہونے والی لیگ آف نیشنز کی اسمبلی نے اعلان کیا تھا کہ اب سلامتی کی حالت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اسلحوں میں کمی اور حد بندی کے لیے ایک ابتدائی معاہدہ کیا جائے، یا دوسرے کئے جو بین الاقوامی سلامتی میں بھی اضافے کا باعث ہوگا۔

کچھ جرمن تجاویز بھی جو عام منظوری حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ سرینا اس قدر معقول ہیں کہ ان پر الفاظ کو ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا اشارہ بالخصوص اس تجویز کی طرف ہے جو تربیت یافتہ فوجیوں کے لیے مخصوص فوجیوں یا ہر سال نئے بھرتی ہونے والے افراد کی تربیت، ان کے عرصہ ملازمت، اور بڑی، بھری اور فضائی فوجوں کے تمام ہتھیاروں کی فہرست سے متعلق ہے۔ ہم جرمن وفد کو ان خیالات کو پیش کرنے پر کوئی خاص کریمٹ نہیں دینا چاہتے، اس لیے کہ وہ جرمنی کے مفاد سے پیدا ہوئے ہیں، کہ وہ چاہتا ہے کہ جس قدر ممکن ہو دوسرے تمام ملکوں کی اسلحہ بندی اس کے برابر ہی رہے۔ اس خیال سے اس حقیقت میں تبدیلی نہیں ہوتی کہ تمام دنیا کے جنگ مخالفین بھی یہی چاہتے ہیں۔ ایسے ہی مطالبات فرانسیسی امن سوسائٹیوں کے مستقل وفد نے بھی کیے ہیں اور Directorate of the International Peace Bureau نے بھی کئی امن سوسائٹیوں سے یہی کچھ کہا ہے۔

برطانوی وفد نے بھی، جو 1927 میں جرمنی کی طرف داری کر رہا تھا، 1929 اور 1930 میں ایسا نہیں کیا۔ لارڈ سیمبل (Cecl) نے بھی ان نکات پر اپنا موقف تبدیل کر لیا تھا جس میں تربیت یافتہ فوجیوں کا سوال بھی شامل تھا تا کہ فرانس سے معاہدہ ہو جائے۔ برطانیہ کے جنگ مخالفین بھی جو "standard of 1919" کی تجویز میں پیش پیش تھے، Preparatory Commission کے بارے میں جرمن وفد کی مایوسی سے ناراض ہوئے تھے۔ لارڈ سیمبل کے زیر اثر، وہ اس خیال سے زیادہ قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں کہ کانفرنس کو کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ وہ کتنا ہی نا کافی کیوں نہ ہو، وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہی ہوگا، اور یہ عمل لا قانونیت کے مقابلے میں ایک عظیم بنیادی پیش قدمی ہوگا، جو اب تک موجود ہے، اور کم از کم وہ بنیاد فراہم ہوگی جس پر تعمیر شروع ہو۔

میں اپنے برطانوی دوستوں کی براہ راست تحبیہ کے لیے بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں جو اس خیال سے متفق ہیں۔ وہ اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اگر کانفرنس اسلحہ بندی کو معاہدے کے ذریعے کم و بیش موجودہ حد تک روک دینے میں کامیاب ہو جاتی، جس میں کوئی خاص بہتری نہ ہو، تو پوری دنیا میں کہری مایوسی اور تلخی پیدا ہوگی، خصوصاً جرمنی میں، اور یہ بھی کہ خود جرمنی کے اندر جو اثرات ہوں گے بین الاقوامی تناظر میں وہ بڑی اہمیت کے حامل ہوں گے اور بالآخر بین الاقوامی مساعمتی کوششوں کے عمل کو خطرے میں ڈال دیں گے۔ ایسا نتیجہ ایک مؤثر تحریک کا باعث ہوگا جو جرمنی کی لیگ سے علاحدگی اور بیوقوف و رسائی سے ترک اسلحہ جات کی دست برداری کی شدت سے وکالت کرے گی۔ ضروری نہیں کہ میں مزید نتائج کی نشان دہی کروں۔ بہت سے معاملات کو۔ بہترین حالات کے باوجود بھی۔ ایک عرصے تک فرو کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

میں تذبذب میں ہوں کہ Preparatory Commission کے خطروں کے ساتھ ساتھ چل کر ہدف تک پہنچنا ممکن ہوگا بھی یا نہیں۔ اسلحے کے معاملات سے متعلق تصدیقات طے کرنے کے لیے ایک معاہدہ ہو جانا چاہیے۔ اگر یہ معاہدہ عسکری ساز و سامان کو پھیلانے کے قول و قرار کو بہتر بنانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تب بھی ریاستوں کے اسلحوں کے درمیان ایک قابل قبول تناسب حاصل کرنے اور پچاس سے زیادہ ریاستوں کی شاریات مرتب کرنے کا کام، جس میں بھرتیوں اور مستقل فوجیوں پر بھروسہ کرنے کی شاریات مرتب کرنے کا کام شامل ہے، باقی رہ جاتا۔ مجھے خوف ہے کہ یہ کانفرنس اس کو حاصل کرنے کے قابل نہیں ہو گی۔ مگر ہمارے پاس بس ایک ہی تناسب ہے جو مب کو اچھی طرح قبول ہوگا: صفر سے صفر کا۔ لیکن، یقینی طور پر یہ کانفرنس مکمل ترک اسلحہ جات نہیں کرا سکے گی۔ خطرہ ہے کہ شاریات پر ہمارے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ کانفرنس کو اس معاملے میں ناکام نہیں ہونے دیا جانا چاہیے۔ اگر Preparatory Commission کا تجویز کردہ پیچیدہ نظام کامیاب نہیں ہوتا تو کوئی آسان طریقہ کار تیار کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے، مثلاً، ایک یکساں تناسب کی کمی پر، جو موجودہ اسلحوں کی بنیاد پر ہو، یا چند برس قبل کی۔ یہ حقیقت کہ یہ رویہ وفد کی تجویز کے تقریباً برابر ہوگا، کسی کو پریشان نہیں کرے گی۔ اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اس امر کا بھی کہ حتمی ہدف جس کی کوشش کی جائے، وہ دنیا کے اسلحوں کے درجے کا ہو اور جو امن معاہدوں کے دفعات میں شامل ترک اسلحہ جات کے مطابق ہو۔

حال میں لیگ آف نیشنز کی سوسائٹیوں میں ہونے والی ایک بحث میں خوش آمد ترقی ہوئی ہے۔ لارڈ سیمیل نے تجویز پیش کی ہے کہ اسلحے کے بجٹ میں مجموعی طور پر پچیس فی صد کی کمی کر دی جائے۔ Executive Committee کی International Federation of League of Nations Societies کے قائم کیے ہوئے کمیشن نے، ان ہی کی صدارت میں، جس کا اجلاس پیرس میں 21 اور 22 مارچ کو ہوا تھا، سلامتی کے مزید استحکام کی فرانسیسی خواہش کا اعتراف کیا ہے (بین الاقوامی قانون کے مطابق، نہ کہ عسکری سلامتی کا)، پھر بھی اس نے Disarmament Conference سے مطالبہ کیا ہے کہ اسلحوں میں کمی کی جائے باوجود سلامتی کے ان تمام سوالوں کے، جو ابھی تک اٹھائے جاتے رہے ہیں۔ کمیشن نے لارڈ سیمیل کی اسلحے کے بجٹ میں پچیس فی صد کمی کی تجویز کو جرمنی کی تجویز سے منسلک کیا جس میں کہا گیا ہے کہ امن کے معاہدوں میں دی گئی تجویزوں کے مطابق اسلحوں کے انفرادی عناصر (افراد کی قوت اور جنگی ساز و سامان) پر پابندی کی ابتدا کی جائے۔

آخر میں ہمیں ترک اسلحہ جات کے پورے تصور پر ہونے والے ممکنہ اعتراض پر غور کرنا چاہیے۔ غالباً وہ وقت قریب آنے والا ہے (یا شاید آچکا ہے) جب ٹیکنالوجی میں ہونے والی ترقیات فین اسلحہ فوجوں کے انہود، توپوں، گولہ بارود اور دھماکے بھیاڑوں کے انبار، بحریہ اور فضائی پشے وغیرہ کو بالکل بے کار کر دیں گی، ماس لیے کہ سامنے سے لڑی والی جنگ، محاذ کے پیچھے سے لڑی جانے والی ہوائی جنگ میں بدل جائے گی،

اریستی بری آں گستاف اسٹریسے مان اعلان تجلیل

ہمیں آج بھی آٹھ برس قبل کا وہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے، جب چار طویل برسوں تک دنیا میدان جنگ کی خوف زدہ کر دینے والی آوازوں، مرتے ہوؤں کی کربناک چیخوں، بے کس والدین اور بیواؤں کی اپنے بیٹوں اور شوہروں کی میتوں پر آہ و بکا سے گونجتی رہی تھی۔

اچانک پھر وہ ڈراما خواب تحلیل ہو گیا، توپوں کی گھن گرج ختم ہو گئی، اور ناقابل یقین واقعہ ہو گیا۔ جنگ ختم ہو گئی تھی!

یورپ نے پھر سانس لیا، اپنا سر اٹھایا، ٹھوکر کر جنگ کے اُداس میدانوں، اندر ہی اندر سلگتے ہوئے لاشیں کھنڈروں کے تودوں، اور اس افق کی جانب دیکھا جہاں سے دن طلوع ہو رہا تھا۔ مگر دن جلد نہیں نکلا۔ ملکوں ملکوں گھنے سیاہ بادل گھر گھر آ رہے تھے۔ طوفان زدہ آسمان ایک جگہ سے دوسری جگہ پر نشان کر دینے والے مایہ نال رہا تھا۔ گویا، افق کا ہر کونا آنے والے سورج کے انتظار میں تھا۔ ایسے میں، انسان کے ذہن میں فریب کار شبہات سرایت کر جاتے ہیں، جن سے افسردہ بے چینی جنم پاتی ہے۔ خوف غالب آ جاتا ہے، عظمت کی طاقت حکمران ہو جاتی ہے، قوموں کے درجات کے درمیان شبہ اور بدگمانی بڑھتی ہے۔

[اور] ایسی زمین میں صرف خاردار پودے ہی اُگتے ہیں۔ دشمنی ہی پیدا ہوتی، مردم بڑھتے ہوئے عدم تحفظ اور خوف کے باعث تمام اقدامات کو فالج ہو جاتا ہے، جو ہر قسم کی فاش غلطی کی راہ ہموار کر دیتا ہے۔ [اب] ایک اور جنگ کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ ایسا ہے گویا دنیا، جو [تباہی کے] غار کے اوپر منڈلا کر نیچے جھانک چکی تھی مگر آخری لمحے میں اپنے آپ کو محفوظ زمین پر کھینچ لے گئی تھی، ایک بار پھر خوف ناک اند

میرے کی گہرائیوں میں کھینچی لیے جارہی ہے۔

کیا خرابی ہے؟ کیا تم ہو گیا ہے؟ نیک انسانی خصوصیات صرف دن کے اگلے ہی میں آگ سکتی ہیں؛ بدداشت، اعتماد، جذبہ رحم، دنیا کو نئے سرے سے بنانے کی نیک خواہش میں تعاون۔

تباہ کن جنگ کے بعد مفتوحین پر فاتحین کی جانب سے فزالت آمیز شرائط قہو پنے سے امن کا بندوبست بہت آسانی سے پرزہ پرزہ ہو جاتا ہے۔ ایسی شرائط بعد میں ایسے ثمر لاتی ہیں جو چپ کر ایک نئی جنگ کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ورسائی (Versailles) کا امن بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ جنگ کی آزمائشیں جتنی طویل اور جاں کاہ ہوئی ہیں، اتنی ہی سخت شرائط قہو پائی جاتی ہیں؛ البتہ، جب بالآخر جنگ جیتی جاتی ہے تو مطالبات زیادہ مشکلہ، بلکہ ناقابل محکمل بھی ہو جاتے ہیں۔ مفتوح پر اس کی صلاحیت سے زیادہ جبر صرف زیادہ دشمنی پیدا کرتا ہے اور انتقام کی پیاس بڑھاتا ہے۔ فاتحین جب وہ معاوضہ، جو ان کے نزدیک منصفانہ ہوتا ہے، حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے تو انھیں مایوسی اور نا کامی آتی ہے۔ اس میں عدم تحفظ اور مکرر نتائج کا خوف بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جب مطالبات پورے ہوتے نظر نہیں آتے تو جبر سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ مشکلیں آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں؛ قومیں ایک دوسرے سے دور ہوتی جاتی ہیں؛ عدم تحفظ، خوف، تشویش سے اسلحہ بندی کی پرورش ہونے لگتی ہے۔

یہ ہے 1923 کی وہ تصویر جس میں جنگ کے ختم ہونے کے چار برس بعد کا یورپ دکھائی دیتا ہے۔ جب جرمنی نے خود کو تان دینے سے معذور پایا، فرانس جس کا حق وار تھا، تو فرانسیسی فوجیں Ruhr میں داخل ہو گئیں اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے نتیجے میں پورے یورپ میں تمام مصنوعات کی پیداوار بند ہو گئی۔ جرمنی میں فرانس دشمنی میں پہلے سے زیادہ شدت سے ہو گئی۔ یورپ کی تمام قوموں میں مفلوج کر دینے والی دل فشنگ پھیل گئی، اور ایک اور جنگ کی باتیں زیادہ عام ہو گئیں۔

پھر، جب اندھیرے زیادہ گہرے ہونے لگے تو امریکا نے مدد کا ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت تک ریاست ہائے متحدہ نے خود کو صورت حالات سے باہر رکھا تھا، اور وہ خاموشی سے یورپ کے ہاتھوں کو اروا قعات دیکھ رہا تھا۔ اب امریکیوں نے یورپ کو اپنے ہیروں پر واپس کھنکھڑا کرنا اپنی ذمہ داری سمجھی۔ اور اس خیال کو، جو ریاست ہائے متحدہ کے سیکریٹری آف اسٹیٹ ہیوز (Hughes) دسمبر 1922 میں پیش کر چکے تھے بڑھتی ہوئی حمایت ملنے لگی۔ خیال یہ تھا کہ ایک معتبر کمیٹی تفتیش کرے کہ جنگ کا تانوان ادا کرنے کی جرمنی کی صلاحیت کیا ہے، تاکہ ماہرانہ مائنسٹی بنیاد پر مستقبل کی بات چیت کے لیے تیاری کی جاسکے۔

بالآخر Poincaré اور French کو یہ خیال پسند آیا، اور طے ہوا کہ ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی جائے؛ امریکیوں نے Owen D. Young اور Charles G. Dawes کو نامزد کیا؛ آخر اند کر اس کے صدر نشین بنائے گئے۔

کمیٹی کی پہلی بیٹھک 8 اپریل 1924 کو پیرس میں ہوئی۔ اسی برس، اپریل کی 8 تاریخ تک کمیٹی نے

ایک منصوبے کا مسودہ تیار کر لیا تھا، جو بعد میں Dawes Plan کے نام سے موسوم ہوا۔ کمیٹی نے تجویز پیش کی تھی کہ ایک بالکل مختلف نظام کے تحت تاوان دیا جائے اور یہ بھی کہ پہلی ادائیگی پر اتوا کا اخلاق کیا جائے۔ اور کئی مزید طریقوں کے ساتھ، تجویز یہ تھی کہ جرمنی کے مالیات کو غیر ملکی قرض کے ذریعے نئے سرے سے منظم کیا جائے۔ اس منصوبے میں Ruhr کی جرمنی کی واپسی کو ایک اقتصادی ضرورت سمجھا گیا تھا۔

اس منصوبے کی اہمیت اس حقیقت کے باعث پہلے سے آشکار ہو گئی تھی کہ جب جولائی 1924 کے آخر میں یہ ظاہر ہو گیا کہ اتحادی حکومتیں اس منصوبے کو قبول کر لیں گی تو فوراً ہی یورپ کے مالیاتی نظام میں بہتری آنے لگی اور اس کے نتیجے میں یورپی حکومتوں کے سگوں میں استحکام پیدا ہونے لگا۔

یہ سچ ہے کہ منصوبے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ تاوان میں خاصی کمی کر دی جائے گی اور جرمنی کو اسے ادا کرنا ہوگا، مگر کم از کم یہ یقین کرنا ضروری جانا گیا کہ ہر برس ایک مناسب رقم ادا کی جاتی رہے گی۔ اس کے اخلاق سے Ruhr کو خالی کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ اس سے جرمنی کے تاوان کے سلسلے میں اٹھنے والے لامتناہی تنازعات میں وقتی ٹھہراؤ آ گیا، بڑی حد تک یورپ کے قنوطی منظر نامے میں پیدا ہو جانے والی تشویش اور عدم تحفظ میں کمی آ گئی جو امن کے پہلے پانچ برسوں میں اسے گھیرے ہوئے تھی۔

یہ منصوبہ صرف جرمنی، فرانس اور اتحادیوں کے لیے ہی نہیں بلکہ اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے پورے یورپ اور امریکا کے لیے بھی اہم تھا۔ اس نے یورپ کی معیشت اور اس کے مستقبل پر اعتماد بحال کر دیا۔ یہ یورپ کی سلامتی کو ایک بحران سے نکال لایا جو اس کے امن کے لیے شدید خطرہ ہو سکتا تھا۔ مگر اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ یہ آثار تھے یورپ کی ذہنیت میں نفسیاتی تبدیلی کے، ساتھ ہی اس میں لگاتار تبدیلی کا طاقتور اشارہ بھی تھا۔ اس سے، مصالحت اور امن کی پالیسی کی ابتدا ہوئی تھی جو لوکارنو معاہدے کا باعث بنی تھی۔ طویل دورِ عظمت کے بعد یہ پہلا سویرا تھا۔

امن کی راہ پر ایک اور یادگار قدم جنیوا پر وٹو کوئل تھا جو لیگ آف نیشنز کی اسمبلی نے 1924 میں منظور کر لیا تھا۔ پہلی بار تمام قوموں کے مندوبین نے جارحانہ جنگ کو جرم قرار دینے کا اعلان کیا تھا۔ انہوں نے ایک اور اصول قبول کیا تھا کہ تمام بین الاقوامی تنازعات، بلا کسی استثناء کے، پر امن طریقوں سے حل کیے جائیں گے، عالمی کے ذریعے ہو یا کسی قانونی عدالت میں۔

یہ سچ ہے کہ حکومتوں نے پر وٹو کوئل کی توثیق نہیں کی تھی، پھر بھی، یہ تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے اور مستقبل کے بدترین کے اس کو جذبے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہیں وہ جذبہ تھا جس نے اس کام کا راستہ ہموار کیا تھا جو بعد میں انجام پانے والا تھا۔ اس کے اگلے بڑے سنگ میل کا نام لوکارنو ہے۔ اس کے لیے اٹارہ جرمنی کی جانب سے آیا تھا، چانسلر لوتھر (Luther) اور وزیر خارجہ اسٹریسے مان کے ذریعے۔

بذاکرات کے دوران جو جنیوا پر وٹو کوئل سے پہلے ہوئے تھے French اور خاص طور پر اس کے سرگرم وکیل بری آل نے عنایتوں کی ضرورت کی شدت سے ترغیب دی تھی جو جارحیت اور جنگ کے خلاف تحفظ

فراہم کرے گی۔ ۹ فروری 1925 کی ایک یادداشت میں جرمنی نے تحفظ کی ضمانتوں کا ایک خاکہ پیش کیا تھا جو اس کے خیال میں ضروری تھیں، اور تحفظ پر ایک معاہدے کا مشورہ بھی دیا تھا، جو ”تمام ریاستوں کے ایک عالمی کنونشن کے لیے زمین تیار کرے گا، اسی طرح کا جیسا کہ بین الاقوامی نا اتفاقیوں کے پُر امن حل کے لیے لیگ نے جنیوا پر وٹوکل کے موقع پر ترتیب دیا تھا۔“

طویل مذاکرات کے بعد، 5 سے 16 اکتوبر 1925 تک لوکارنو میں ایک میٹنگ ہوئی۔ فرانس کی نمائندگی بری آں نے، جرمنی کی لوٹھر اور اسٹریسے مان نے، برطانیہ کی چیمبرلین (Chamberlain) نے، اطالیہ کی مسولینی نے، بلجیم کی واندرویلڈ (Vandervelde) نے، پولینڈ کی اسکریرسکی (Skrzyński) نے اور چیکو سلوواکیا کی بے نیز (Benes) نے کی تھی۔ Rhineland کے حوالے سے اٹھنے والے سوال کی توضیح کے لیے جرمنی، بلجیم، فرانس، برطانیہ، اٹلی اور اطالیہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، اور ایک جانب جرمنی اور دوسرے جانب بلجیم، فرانس، پولینڈ اور چیکو سلوواکیا کے درمیان چارٹائی کے معاہدے بھی ہوئے۔

میں ان معاہدوں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا، کہ ان سے سب واقف ہیں۔ Rhineland معاہدے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لوقی چہار دہم (Louis XIV) کے بعد، پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ یورپ کی سیاست میں Rhine [دریا] کا نام گھرار اور تنازعے کو وجہ بننا ختم ہو گیا۔ اس طرح تاریخ کا ایک باب بند ہوتا ہے۔ ان چارٹائی معاہدوں کے تحت قومیں وعدہ کرتی ہیں کہ وہ اپنے تمام تنازعات بے لاگ مصالحت یا ثالثی کے ذریعے پُر امن طریقے سے حل کریں گی، سوائے ان کے جو ”ان واقعات کی وجہ سے پیدا ہوئے ہوں گے جو موجودہ معاہدے سے پہلے ہو گئے تھے۔“

لوکارنو معاہدہ یورپ کی سیاست میں بنیادی اور مکمل تبدیلی کی ابتدا ہے، جنگ کے سابقہ دشمنوں کے درمیان رشتوں کی قلب باہت کرتا ہے اور ان میں بالکل نئے جذبے ابھرتے ہیں۔ یہ جذبہ سیاست میں باہمی دوستی کے اصولوں اور اعتماد پر چلنے کی تقریباً بے مثال کوشش کرتا ہے۔

جو چیز کسی کے اعتماد کو ابھارتی ہے، نہ وہ مثالیت ہوتی ہے اور نہ ایثار، بلکہ ایک احساس ہوتا ہے ضرورت کا جو متعلقہ لوگوں کو کوشش کرنے پر اکساتا ہے۔ وہ لوگ جو مجھے لوکارنو میں ملے تھے مثالیت پسند جنگ مخالف نہیں ہیں، وہ حقیقت پسند سیاست داں اور ذمے دار مدد ہیں، جو کبھی براہ راست متضاد پالیسیوں پر عمل کرنے والے تھے مگر اب انھیں احساس ہو گیا ہے کہ بنی نوع انسان کے لیے حقیقی مستقبل تخلیق کرنے کا صرف ایک ہی موقع ہے کہ سب سنجیدہ خواہش کے ساتھ اکٹھے ہو کر کام پر مل جائیں۔

اپنی تقریر میں جو انھوں نے معاہدوں پر دستخط کے بعد کی تھی، بری آں نے کہا تھا: ”جنگ نے ہمیں سبق سکھایا ہے کہ ایک مشترکہ مقصود ہم کو ایک بندھن میں باندھتا ہے۔ اگر ہم ہارتے ہیں تو ایک ساتھ ہاریں گے۔ اگر ہم بازیافت کے خواہاں ہیں تو ہم اسے ایک دوسرے سے آویزش میں حاصل نہیں کر سکتے، صرف ایک ساتھ مل کر کام کر کے ہی اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔“

بری آں اور اسٹریسے مان و نول نے صحیح طریقے سے اس امر پر زور دیا ہے کہ ہر فرد کو پہلے اپنے ملک کا اچھا شہری ہونا چاہیے ایک اچھا فرانسیسی، ایک اچھا جرمن اور ایک اچھا برطانوی مگر ساتھ ہی ایک اچھا یورپی بھی، جو عظیم آدرشوں کے ذریعے یورپ کے تمدن سے دوسرے یورپیوں سے ہندھا ہو، جو بچپن کی جنگ کے واقعات سے بری طرح خراب ہوا ہے۔

اگر ہمیں پوری طرح ان کی کامیابی کی داد دینی ہے جو ان مدبرین کے ہاتھوں یورپ کے امن کے لیے لوکارنو میں ہوئی تھی، تو ہمیں ان کے ملکوں میں ہونے والے قوم پرست اختلاف کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، جسے، بہتوں کو امن کے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے سہنا پڑا تھا۔ وہ بے خوف آگے بڑھتے رہے اس یقین کے ساتھ کہ اب انھیں سیدھا راستہ مل گیا ہے۔

لوکارنو کے ایک کامیاب حقیقت ہونے کے ساتھ، یہ محسوس ہوا تھا کہ ایک نیا دن نکلنے والا ہے اور یورپ میں بدتمی رہنے والی لکک کے ساتھ ہی ہمت اور تازہ اعتماد واپس آنے والا ہے۔ مگر وہ معاہدے حرکت میں نہیں لائے گئے تھے۔ ان کے دفعات میں سے ایک دفعہ یہ تھا کہ جرمنی کو لیگ آف نیشنز میں داخل ہونا چاہیے۔ اس قدم کو توقع سے زیادہ مشکلات پیش آنے والی تھیں۔ پچھلے مارچ کے اسمبلی کے خاص اجلاس کی تکلیف دہ یادیں اب بھی ہماری یادداشت میں تازہ ہیں جب مندوبین جرمنی کو لیگ میں داخل کرنے کے مقصد سے جمع ہوئے تھے مگر انھیں اس میں کامیاب ہونے سے پہلے واپس جانا پڑا تھا۔

مگر ان واقعات کے بعد پچھلے ستمبر میں جنیوا میں منعقد ہونے والی اسمبلی کی ایک میٹنگ میں، اسٹریسے مان کی سربراہی میں جرمنی کے مندوبین نے باعزت طور پر لیگ کے ارکان کے درمیان اپنی نشستیں سنبھال لی تھیں۔ جو لوگ وہاں موجود تھے وہ اس لمحے کو کبھی نہیں بھولیں گے۔

بری آں کی ایک تقریر میں جرمنی کی شمولیت کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔ دوسری بہت سی باتوں کے ساتھ، انھوں نے کہا تھا: ہنس، اب جنگ نہیں ہوگی۔۔۔ آج کے بعد صرف جج ہی فیصلہ کریں گے کہ صحیح کیا ہے۔ اسی طرح، جیسے انفرادی طور پر باشندے جج کے رویہ و اپنے تنازعات حل کرتے ہیں، اسی طرح ہم بھی اپنے مسائل، رائٹوں، مشین گنوں اور توپوں سے پرے، پرامن طریقوں سے حل کریں گے۔ مصالحت کی تالیقی کو امن کو راستہ دیجیے!

اس موقع پر ایک بار پھر ہم پھر دن کی روشنی دیکھ رہے ہیں۔ کیا یہ تقریر یوپیائی نہیں ہے جیسے کہ مہر کہ خیر و شر (Armageddon) کے بعد زمین دوبارہ سبز ہو گئی ہو۔

لوکارنو معاہدہ، جرمنی کی لیگ میں شمولیت اور اس کے بعد ہونے والی تقریریں مستقبل کے لیے محوش آئندہ ہیں۔ سب ایک نوعیت کا اعتماد پیدا کر رہی ہیں اور اچھے کام کے لیے طاقت فراہم کر رہی ہیں۔ مگر یہ سب ہمیں اس حقیقت سے لاپرواہ نہیں کر سکتے کہ ہدف کے حصول اور دیر پا امن کے استحکام کے لیے ابھی اور فاصلے طے کرنے ہوں گے۔ رہنماؤں کے لیے نوٹیل الفاظ اور نوٹیل ارادے بڑی ہمت کا باعث تو ہیں مگر اتنا

کافی نہیں الفاظ کو عمل میں اور ارادوں کو محنت میں تبدیل کیا جانا چاہیے، اس لیے کہ ماضی کے رنجشیں و عداوتیں اکثر پورے نہیں ہوتے اور امید کے نیلے آسمان پر ایک بار پھر طوفان کے بادل چھا گئے ہیں۔

ہمارا نعرہ ہونا چاہیے: ”اب جنگ نہیں ہوگی!“ مگر اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر ایک کے ساتھ ”اب جنگ نہیں ہوگی“، بالخصوص بڑی طاقتوں کی، جو چھوٹی جنگوں کے لیے ہمیشہ تیار ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ”اب جنگ نہیں ہوگی“ سوائے اس وقت کے جب کوئی طاقت بغیر زیادہ محنت کے اس قابل ہو کہ وہ اپنی برتر طاقت کی مدد سے بہ آسانی جنگل میں آجانے والے کم زور ہمسایے کو کچل سکے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ”اب جنگ نہیں ہوگی“ بجز اس وقت کے جب قومی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہو۔

اس کا مطلب ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ اس کا دراصل مطلب یہ ہے کہ کسی بھی قسم کی کوئی جنگ نہیں ہوگی، مزید کوئی جارحیت نہیں ہوگی، مزید غلوں ریز اور فضول جھڑپیں نہیں ہوں گی، جو اتنے عرصے سے بنی نوع انسانیت کا منہ کالا کرتی رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قومی پالیسیوں میں سے طاقت کے استعمال کو نکال دیا جائے۔ دوسروں پر کسی قسم کے جبر کو نکال دیا جائے خواہ وہ کسی قسم کا ہو، ہم سب کو ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا جائے جیسا کہ اگر ہم چاہیں تو کر سکتے ہیں اس بھیاں تک جنگی بدعنوانی سے، جو نسلی انسانی کے مختلف گروہوں کے درمیان ہو رہی ہے، وہ قوموں کے اندر ہو یا قوموں کے درمیان۔

میں بلا کسی شک و شبہ کے کہہ سکتا ہوں کہ ان مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے جو ہمارے حکم اور ہماری توجہ کا طالب ہے۔ یہ سوال ہی، کہ ہم جنگ [کے امکان کو] کس طرح ختم کر سکتے ہیں، ہمارے وقت کا سب سے اہم سوال ہے، نہ صرف بین الاقوامی سیاست باری کا بلکہ قومی سیاست باری کا بھی۔

کچھ لوگوں کے نزدیک یہ ایک مبہم کی بات ہوگی، بلکہ شاید زبان کا لفظ استعمال ہوگا۔ ان کے نزدیک ایسے مسائل جیسے کہ کان گنوں کی ہڑتال، سماجی اصلاح، کسٹم کی ٹکاؤٹیں وغیرہ زیادہ اہم محسوس ہوتی ہیں۔ میں یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو ایسا سوچتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

جنگ، جنگی تیاریاں اور اسلحوں کا عذاب بالخصوص بڑے ممالک کے لیے پہلے اور اہم مسائل ہیں۔ اگر ہم جنگ کے خلاف رکاوٹ کمزری کر سکتے ہیں، اگر ہم اسلحہ جات رکھنے کی روایت کو ختم کر سکتے ہیں۔ وہ عذاب جس میں آج یورپ گرفتار ہے۔ اگر ہم عسکریت کے آسیب کو ختم کر سکتے ہیں جو اب بھی دنیا پر لہرا رہا ہے تو ہم ہمیشہ کے لیے سلامتی کو محفوظ بنا سکتے ہیں، پھر ہم اپنی خواہش کے مطابق سماج سدھار کو تیزی سے ممکن بنا سکیں گے، اپنے وسائل میں اضافے کر سکیں گے اور مختلف نوعیت کی ترقیات کر سکیں گے جس کی تمنا کرتے ہیں۔ ہم ایک نئی اور بہتر زندگی کی طرح قدم بڑھا سکیں گے۔

لیکن، اگر ہم جنگ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے، اگر ہم اس کا عمل خاتمہ نہیں کر سکتے، اگر یورپ اپنے اسلحہ جات میں کمی اور اس پر حد نہیں لگا سکتا تو نہ ہم کسی قسم کی اصلاحات کر سکیں گے نہ ہی کسی قسم کی ترقی۔

ہمیں یقین ہے کہ مستقبل میں، بالکل ماضی کی طرح، اسلحہ بندی سے تقابلی اسلحہ بندی ہوگی، اتحاد اور

تفاتی اتحاد ہوں گے، اس سے شبہات اور بدگمیاں پیدا ہوں گی، یہ لوگوں کے دلوں میں خوف کو جنم دیں گی؛ اس سے بین الاقوامی بحرانات پیدا ہوں گے، نتیجے میں جنگ ہوگی، پہلے شاید مقامی چھوٹی جنگیں ہوں گی، مگر بالآخر ہم بڑی عالمی جنگوں سے بچ نہیں سکیں گے جو پچھلی جنگوں سے کہیں زیادہ خوف ناک ہوں گی۔

اگر ترک اسلحہ جات کے کام سے، جسے لیگ آف نیشنز نے شروع کیا ہے، نتائج برآمد نہیں ہوتے، اگر اسلحہ بندی اپنے حدود تک برقرار نہیں رکھی جاتی، تو جنگ تو ہوگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ماضی کے ہمارے تمام تجربات اس کو ناقابل تردید ثابت کر رہے ہیں۔ مگر میری بات پر یقین نہ کیجیے۔ اس پر غور کیجیے جو اہم اسباب اختیار کرتے ہیں۔

جنگ کی شروعات پر برطانیہ کے وزیر خارجہ نے کہا تھا، اور وہ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ یہ یورپ کی مستقل برحق ہونی اسلحہ بندی ہی ہے، جو جنگ کا باعث ہوتی ہے۔ انہوں نے ہمیں تنبیہ کی ہے کہ اگر یورپ کی اسلحہ بندی اس طرح قائم رہی، اگر دنیا کی قومیں نئی عسکری تیاریوں کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہیں تو ہم خود ایک نئی جنگ پیدا کریں گے، جیسا کہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ایک نئی جنگ کا مطلب ہمارے موجودہ تمدن کا اختتام ہوگا۔

اس موضوع پر لارڈ گری (Grey) سے بھرکون بول سکتا ہے۔ بہت سے مدثرین نے بھی مختلف اوقات پر اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میں صرف ایک کو بیان کرنا چاہوں گا۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی برس کے جنوری میں برطانیہ کے موجودہ وزیر اعظم مسٹر بالڈون (Baldwin) نے کہا تھا، ”مغرب میں ایک نئی جنگ ہوتی تو ہمارا تمدن روما کی طرح تباہ ہو جائے گا۔“

یہ لوگ جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے دیوانے نہیں، بلکہ جنگ مخالف بھی نہیں؛ یہ ذمے دار مدثرین ہیں جو اختیارات استعمال کرتے ہیں، یا مستقبل میں دنیا کی قیادت میں زیادہ اختیارات کے حامل ہوں گے۔ اگر یہ اپنے بیانات میں سنجیدہ ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب تک اگلی جنگ کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا کسی اور مسئلے پر مشکل ہی سے بات کی جاسکے گی۔

ہم تھوڑی دیر کے توقف میں اس پر غور کرتے ہیں کہ انہوں نے کیا کہا ہے۔ کیا یہ کہنا صرف ایک خیالی بات ہے کہ ہمارا تمدن تباہ کیا جاسکتا ہے؟

ہم میں توانائی اور قوت کا احساس ہے، اور یہ احساس بھی کہ ہمارے سامنے ایک تاب ناک مستقبل ہے۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ پہلے بھی بہت سے تمدن مٹ چکے ہیں۔ طاقت ور قومیں، جو ہمارے وقت کی طاقت ور قوموں جیسی تھیں، مٹ چکی ہیں۔ سلطنتِ روما، جو ہمارے جدید تمدن سے سیکڑوں برس زیادہ عرصے تک دنیا پر حکومت کر چکی تھی، وحشی گروہوں کے حملوں میں تباہ ہو گئی تھی۔

آپ کو اپنے سمروں پر منڈلاتے ہوئے خطرے کا احساس نہیں ہے، آپ اپنے اطراف زندگی کی قوتوں سے غیب واقف ہیں۔ میں بھی ان قوتوں کو محسوس کرتا ہوں۔ مگر مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ پچھلی

جنگ نے ہمارے تمدن کو بہت بڑا زخم لگایا ہے، ایسا تکلیف دہ زخم جو ابھی بھرا نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یورپ کی بنیادیں ٹل گئی ہیں۔ اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ زیادہ تر یورپی اب بھی بچھلی جنگ کی خصوصیت اور نوعیت کو سمجھ نہیں سکے ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ اس کے دیے ہوئے سبق سے کچھ سیکھتے ہو وہ اسے بھولتے جا رہے ہیں۔ وہ اپنی جانیں دینے والوں کو بھی بھولتے جا رہے ہیں۔

بلاشبہ عملی طور پر یورپ کے ہر ملک میں کروڑوں لوگ ہیں جو جنگ کی تباہیوں کو بھول نہیں سکے۔ میدان جنگ کا قتل و غارت آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا۔ وہی لوگ فرانس کے حسین دیہاتوں میں ہونے والے بے رحمانہ قتل و ذبحی کرب، بمباری اور کبھی نہ رکنے والی بندوق کی گولیوں کی سنناہٹ کے بارے میں بتا سکتے ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے کانٹے دار تاروں پر پڑے، سسکتے ہوئے، ہزاروں زخمیوں کے ناقابل تصور دکھ دیکھے ہیں، جن میں مزید درد سہنے کی تاب نہیں رہ گئی تھی، ان میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ [عذاب سے نجات کے لیے] وہ خود کو ہلاک کر سکتے۔ یہ لوگ ایسی دہشت، بلکہ اس سے بھی زیادہ دہشتوں کا بیان کر سکتے ہیں؛ اگر یورپ ان پر توجہ دے، اور اگر اس کے تمام لوگ صرف جنگ کی حیوانیت کو یاد کر سکیں، تو وہ پھر کبھی جنگ نہیں ہونے دیں گے۔

مگر جنگ کے اور بھی پہلو ہیں، شاید دوسرے لوگوں سے بھی زیادہ، مجھے جنمیں دیکھنے کے مواقع ملے تھے اب چھ بڑی سے زیادہ دن ہوئے کو آپ ہیں کہ ٹیگ آف نیشٹز کی طرف سے میرا یہ کام رہا ہے کہ میں تفتیش کروں اور جہاں تک ممکن ہو مابعد جنگ کے خوفناک اثرات کو دور کرنے کی کوشش کروں۔ ان تمام برسوں میں مجھے سامنا کرنا پڑا ہے لاکھوں جنگی قیدیوں کا، قحط سرائی کا، مہاجرین کا سہمے ہوئے مہاجرین جن میں سے ہر ایک کی داستان دل دکھانے والی، بوڑھے، عورتیں، ننھے ننھے بے یار و مددگار بچے جنمیں جنگ کی گردشوں کے باعث ان کے والدین اکیلا چھوڑ گئے تھے سب محم کردہ، ٹسے پٹے، جن کے نزدیک دنیا کی کوئی شے کسی کام کی نہیں۔

کاش میں آپ کو وہ مناظر دکھا سکتا جو میں نے خود دیکھے ہیں اور جن کا مجھے تجربہ ہوا ہے۔ کاش میں صرف ایک لمحے کے لیے آپ کو بتا سکتا کہ وحشیانہ دہشت کی ماری، دیہاتوں کی سڑکوں پر ایک پوری قوم کو بھاگتے ہوئے کودیکھ کر کیسا محسوس ہوتا ہے؛ یا قحط کے مارے لوگوں کے درمیان سفر کرنا؛ کسی جھونپڑے میں داخل ہونا جہاں مرد عورتیں اور بچے مراکت لیٹے ہوئے ہوں جن کے لبوں پر کوئی شکایت نہ ہو بس صرف موت کا انتظار ہو، جہاں قبریں کھود کر نکالی اور رکھائی جاتی ہوئی لاشیں ہوں، جہاں بھوک سے پاگل عورتیں اپنی غذا کے لیے اپنے بچوں کو ذبح کرتی ہوں۔ مگر نہیں، اب مجھے مزید بیان کرنے کا یار نہیں!

اور یہ لامتناہی بد قسمتی، یہ ماری بد بختیاں اور ناقابل یقین دکھ، یہ لاکھوں بھلائے ہوئی جنگی قیدی، یہ قحط سرائی، یہ کروڑوں بے یار و مددگار مہاجرین یہ سب بالواسطہ یا بلاواسطہ نتیجہ ہیں جنگ کا۔ مگر یقین کیجیے ایسی مصیبتیں ہمارے پورے سماجی نظام کی تباہی کے بغیر نہیں آسکتیں؛ یہ قوموں کی توانائیوں کو چوس لیتی ہیں اور

اسے کہہ رہے تھے لگاتی ہیں، اگر وہ کبھی پھر نے گلیں بھی تو ان کو ایک کو طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔
اس کے باوجود بھی، لوگ ایک اور جنگ کے امکانات کی باتیں کرتے ہیں۔ کیا وہ کبھی ایک لحظہ ٹھہر کر سوچتے نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ پھر یہ محال اگر اگلی جنگ بجھلی جنگ سے زیادہ خراب نہ ہوگی تو بھی، مجھے یقین ہے کہ یہ یورپ کے تمدن کو تباہ کر دے گی۔ مگر بلاشبہ، اگلی جنگ بجھلی جنگ جیسی نہیں ہوگی، اس کے مقابلے میں زیادہ ہی خراب ہوگی۔

میں مزید تفصیلات میں جا کر آپ کو تھکانا نہیں چاہتا۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ نئی جنگ چھڑنے کی صورت میں ہمیں اس خوف ناک حقیقت کا سامنا ہے کہ ہمارا تمدن فنا ہو سکتا ہے، اسی طرح، جیسے ماضی میں دوسرے تمدن فنا ہو چکے ہیں۔ مگر ہمارے پاس اس خطرے کو نالغے کے ذرائع بھی ہیں۔ اس وقت تک جنگ نہیں ہوتی جب تک کہ ہم خود اس کی خواہش نہیں کرتے۔ جنگ قدرت کی کسی قدرتی آفت کا نتیجہ نہیں ہوتی جس پر قابو نہ پایا جاسکے، یہ تو انسان کی خواہش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ اس کی اپنی شرمندگی ہے۔ اور کچ پوچھا جائے تو، مناسب پالیسیوں کے ذریعے جنگ کو ختم کر دینا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔
میں وہ طریقہ بتانا چاہتا ہوں، میرے خیال میں، جو ہمیں آگے بڑھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ یورپ کی حکومتوں کو متحد ہو کر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینا چاہیے جسے میں، اختصار کی خاطر، لیگ آف نیشنز کی پالیسی کا نام دوں گا۔

مجھے غلط نہ سمجھا جائے۔ لیگ آف نیشنز اب کوئی تجربی خیال نہیں رہی۔ یہ ایک زندہ وجود ہے۔ اس کے ادارے اب عالمی کنٹرول کی کارساز کی کا حصہ بن چکے ہیں۔ اگر ہم تمام انفرادی حکومتوں کی پوری مجتمع قوت کو ان اداروں کے عتب میں، ترکیب اسلحہ جات کی پالیسی کے عتب میں، لیگ آف نیشنز کی تمام پالیسیوں کے عتب میں رکھ دیں تو ہم کو جنگ مرے سے مایوس کر سکتے ہیں۔

مگر حکومتوں کو خواہ وہ بڑے ممالک کی ہوں یا چھوٹے کی، بلا تردد اپنا سب کچھ اس پالیسی پر دانا چاہیے۔ نئی جنگ لڑنے کے قدیم حقوق سے چمٹے نہیں رہنا چاہیے۔ اب ایسی خفیہ امیدیں نہیں رکھنی چاہئیں کہ اگر لیگ کچھ معاملات میں کمزور ہے تو اس کو ذاتی مفادات کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

معاملات کی اپنی نوعیت کے باعث، ترقی کا انحصار بڑی طاقتوں کے اقدامات پر ہوگا۔ مگر ہماری جمعی قومیں بھی بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ اس لیے کہ بڑی قوموں کو مختلف نوعیت کے عناصر کو نظر میں رکھنا پڑتا ہے، جس میں مختلف النوع مفادات ہوتے ہیں، کہ ان کے قارئین کو اکثر ان کے اپنے مضبوط عقائد پر بھی چلنا دو بھر ہو جاتا ہے، اور وہ ہمہ وقت جائزہ لیتے رہتے ہیں، جیسا کہ انھیں کرنا بھی چاہیے، اپنے حلقہ انتخاب کے سیاسی اتار چڑھٹ کا اور اپنے ملکوں کے مفادات کا، قطع نظر ان پیچیدہ سازشوں کے، جو ان کو گھیرے رکھتی ہیں۔ اکثر یہ حالات عمل کرنے کی ان کی آزادی میں مائع بھی ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں چھوٹی قومیں اور ان کے قارئین کو زیادہ چھوٹ ملی ہوتی ہے، ان کے متضاد مفادات کم

ہوتے ہیں، اور ان کے لیے امن کی وہ پالیسی فطری ہوتی ہے جس میں کم سے کم دکانیں اور تحفظات ہوں۔ اگر تمام چھوٹی قومیں مل کر جنگ کے آسیب کو دفن کرنے کے لیے استقلال کے ساتھ اور باقاعدہ طور پر کام کریں، تو وہ بہت کچھ حاصل کر سکتی ہیں، جس عمل میں لیگ بھی بڑی حد تک مستقیم ہوگی۔

یقیناً، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بڑی طاقتیں اکثر یہ تاثر دے سکتی ہیں، اور اکثر انہوں نے دیا بھی ہے کہ وہ لیگ کے دوسرے ارکان کے خیالات پر مناسب غور فکر کیے بغیر آمرانہ اقدام بھی کر سکتی ہیں۔ مگر چھوٹی قوموں کے پاس بھی اپنے معاملے کے بارے میں کہنے کے بہت مواقع ہوتے ہیں، اگر وہ صرف یقین اور اعتماد کے ساتھ اپنے قدم اٹھائیں مگر جب وہ ایسا کرنے میں ناکام ہوتی ہیں تو الزام ان ہی پر عائد ہوتا ہے۔ جیسا کہ پچھلی اسمبلی میں بری آل نے اپنی لاجواب تقریر میں کہا تھا، مستقبل میں ایسے کام نہیں کیے جانے چاہئیں، ”مذاکرات کے طریقے پر جو لیگ آف نیشنز کی روح کے مطابق نہ ہوں“ اور ”آئندہ لیگ کا کام ہمیشہ چمکتے سورج کی روشنی میں ہوگا، جس میں اس کے تمام ارکان کی شرکت ہوگی۔“

لہذا، یہ تمام ارکان کا فرض ہوگا، صرف چھوٹی قوموں ہی کا نہیں کہ وہ جنگ کو نابود کرنے کے لیے متحد ہوں، اس کام میں عملی طور پر شامل ہوں، مجبور طریقے سے نہیں بلکہ عملی طریقے سے۔

اگر واقعی ہم جنگ کو منجھڑستی سے مٹانا چاہتے ہیں، اگر ہم بھاری اسلحوں سے جان چھڑانا چاہتے ہیں، تو حکومتوں کو، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، پسپائی کا تصور کیے بغیر، اپنی ہر چیز کو لیگ آف نیشنز کی پالیسی کے حوالے سے داؤ پر لگانا چاہیے۔ انہیں لیگ کی طاقت اور استحکام بڑھانے کے لیے ہر طریقے سے، اور ہر موقع پر کام کرنا چاہیے۔ اگر وہ ایسا کریں گے اور اگر ان کے محام اسی جذبے کے ساتھ ان کی حمایت کریں گے تو جنگ کا بدکار دیو زمین میں گاڑ کر دیا جائے گا اور ہمارا مستقبل محفوظ ہو جائے گا، امن کے کام کی تعمیر کے لیے، اس کے اہتمام کے لیے نہیں۔

1922 کے امن انعام یافتہ Fridtjof Nansen کی زبانی

تقریر قبولیت

(بری آل کی جانب سے)

مارویائی حکومت نے، پیرس میں اپنے نمائندے کی معرفت، ازمانہ مہربانی مجھ کو مطلع کیا ہے کہ اس عالمی مرتبہ ادارے نے جس پر نوٹیل امن انعام عطا کرنے کی ذمہ داری ہے، جرنل Dawes، امر آسٹن جیمبر لین، مسٹر اسٹریسے مان اور مجھ کو انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

فرانس کے وزیر خارجہ جناب بری آل کہ جو 1926 کے انعام میں شریک تھے، ہمیں قبل ہونے والے اہم واقعات کی بنا پر انعام دیا گیا تھا۔ وہ تقریباً پچھلے سال میں شرکت نہیں کر سکے تھے۔ لہذا فرانسسی سفارت کا Billelault du Charrault نے ان کی جانب سے انعام وصول کیا تھا اور جناب بری آل کا اہم ہوا یہ تاریخہ تھا۔

میں چاہتا ہوں کہ اس عظیم اعزاز کی عطا پر جو مجھے دیا جا رہا ہے صمیم قلب سے اپنے فوری شکریے کا اظہار کروں۔ کوئی بھی اعزاز میرے لیے اتنا بیش قیمت نہیں ہو سکتا ہے جتنا کہ یہ، جو میری عوامی زندگی میں کیے جانے والے اہم کام کے باعث مجھے بخشا جا رہا ہے، جو میں نے اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ کیا ہے اور ہر ممکن طریقے سے اس کو آپ کے آدرش کے عین مطابق امن کے حصول کے لیے وقف کر دیا ہے۔

خطبہ اسٹریسے مان

نیا جرمنی

میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ آج میں آپ حضرات سے مخاطب ہوں۔ میں اپنی دل کی گہرائیوں سے اس عظیم اعزاز کی عطا پر شکر گزار ہوں جو نوبل کمیٹی نے مجھے بخشا ہے۔ آپ نے جس دلی گرم جوشی سے میرا خیر مقدم کیا ہے مجھ پر اس کا شکریہ بھی واجب ہوا۔ میں جانتا ہوں کہ اس اعزاز کی اپنی ایک عظیم خاصیت ہے، اس لیے کہ یہ صرف سائنسی اور ٹیکنیکی تحقیق ہی پر نہیں، عملی سیاست پر بھی دیا جاتا ہے۔ یہ کسی ایک انفرادی ملک کو نہیں دیا جاتا، نہ ہی انفرادی ملک کے کسی نمائندے کو، بلکہ یہ تو ان تمام ملکوں کی مشترکہ پالیسیوں کو منعکس کرتا ہے جو ایک ہی راستے پر سرگرم سفر ہوتی ہیں۔ اور اس طرح، جرمنی کے معاملے میں بھی، یہ کسی ایک فرد یا واحد ہی کے کام کے لیے نہیں دیا جا رہا ہے۔ ایک نئے فرد پرست کی طرح، یقیناً میں کسی فرد یا واحد کے ربوہ کو کم نہیں کرنا چاہتا، اس لیے کہ انہو عوام فرد کی قیادت نہیں کرتا، بلکہ فرد کو انہو عوام کی قیادت کی صلاحیت و دیعت ہوتی ہے، مگر جب بڑے خیالات اور قوم کے اہم معاملات داؤ پر لگے ہوں، تو فرد کو قوم کے روحانی رہنماؤں کی حمایت کی ضرورت ہوتی ہے۔

پچھلے چند برسوں میں مجھے جرمنی کی خارجہ پالیسی کے لیے سخت لڑائیاں لڑنی پڑی ہیں۔ اس طرح میں، شاید ان سوالات کے جوابات دینے کے لیے زیادہ موزوں ہوں گا، جو اکثر جرمنی کی ذہنی کیفیت کے بارے میں اٹھائے جاتے رہے ہیں۔ بیرون ملک رویے، ہماری ذہنی کیفیت کے بارے میں قبولیت، تشکیک پرستی، تنقید اور صداقت کے درمیان لہراتے رہتے ہیں۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں نئی جرمنی کے رہنما بیویوں کی شناخت پیش کروں اور آپ سے اس کی سیاست پر بات کروں، جہاں تک یہ تاریخی اعتبار سے جنگ کے بعد کے مختصر عرصے میں رونما ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے تو میں پرانے جرمنی کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ اس جرمنی نے بھی سٹی فیلے کے زخم کھائے ہیں، اس لیے کہ دکھاوے اور حقیقتیں لوگوں کے ذہنوں میں ہمیشہ الگ الگ نہیں رکھی جاتیں۔ سچ کہ اس نے فریڈرک ولیم اول (Frederick William) کی دلی ہوتی پد ریت کی روح کو پھیلے رکھا ہے، مگر

اس کو آہنی وفا داری اور احساسِ فرض سے ادا کیا گیا تھا، جو بیادست اور عوام کے لیے تھا۔ اس نے دوسرے ملکوں میں سرکاری کارکنوں کو نوکریاں ہی کے نام سے بدنام کیا جس کا ایک ہی آدرش تھا: ریاست کی خدمت۔ وہ پرانا جرمنی اشتراکیت کے ترقی پسند خیالات سے تنازعے میں جزوی طور پر شکست کھا گیا، اس لیے کہ اس نے عوام کو کچھ بھی نہیں دیا تھا جو اشتراکیت کے کامیاب نعم البدل کے طور پر کام کر سکتا لیکن، یہ سرزمین تھی سماجی اور سیاسی ترقی کی، جس پر دوسرے ممالک کے مقابلے میں *laissez-faire* [فرانسیسی زبان کی ایک ترکیب جو 1680 میں اس وقت کے فرانسیسی وزیر مالیات نے تاجروں سے خطاب کرتے ہوئے استعمال کی تھی، جس سے مراد ایسے ماحول کی تیاری تھی جس میں ریاستی دخل اندازی نہ ہوں] کے فلسفے کا بہت کم اثر تھا، جن کی حکومتیں اور ہی نوعیت کی تھیں۔ یہ سرزمین تھی عسکری ٹھکانوں کی، آفاقی جبری بھرتیوں کی، جہاں فوج کے لیے کبریٰ ہمدردیاں تھیں، مگر یہ کیہ پائی اور عام طور پر دوسری تازہ ترین تحقیقی ٹیکنالوجی کی سرزمین بھی تھی۔ پرانے اور نئے دونوں کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش میں تھے۔ جو بھی اس کی تاریخ لکھے گا اسے چیزوں کو مجھیں سطحی انداز میں نہیں، بلکہ ان کی کیرائیوں میں اتر کر دیکھنا ہوگا۔

یہ تھا وہ ملک، جس میں ہم سب نے جو آج کے جرمنی میں اہم حیثیت کے مہذبوں پر فائز تھے، اپنی زندگی کا بیش تر حصہ گزارا تھا۔ اسی طرح جیسے بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے، نو جوانی کے تاثرات جوانی کے عالم میں زیادہ آشکار ہوتے ہیں۔ اسی طرح جیسے بچہ اپنے باپ کا اس وقت بھی احترام کرتا ہے جب اس کو باپ کی کمزوریوں اور غلطیوں کا ادراک ہو جاتا ہے، ایک جرمن پرانے جرمنی کو کمتر نہیں سمجھے گا جو کبھی اس کے نزدیک عظمت کی علامت تھا۔ انگریزی کہوت ”[یارے] انگلینڈ، تیری تمام کتابوں کے باوجود میں تیرا عاشق ہوں“ کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے، پرانے جرمنی میں جو کچھ بھی قابلِ تعریف اور قابلِ قدر تھا۔ جس طرح انگریز، کتابتوں کے باوجود انکستان سے محبت کرتا ہے، ہمیں بھی ان تمام جرمنوں سے اصرار کرنا چاہیے جو پرانے جرمنی کا حصہ تھے اور اس کی تشکیل میں شامل تھے۔ کہ وہ آج کے جرمنی کی عظمت اور اس کی قدر کا اعتراف کریں۔

جہلی عالمی جنگ کے نتیجے میں، پرانا جرمنی زمیں بوس ہو گیا۔ زمیں بوس ہوا اپنے آئین میں، اپنے سماجی نظام میں، اپنے اقتصادی ڈھانچے میں۔ اس کا احساس اور اس کی سوچ بدل گئی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ قلبِ ماہیت مکمل ہو چکی ہے یا نہیں۔ یہ ایک عمل ہے جو نسلوں جاری رہے گا، مگر جس طرح کہ جلد بازی اور بے چینی ہماری موجودہ زندگی کی خصوصیت بن گئی ہے، پہلے کے مقابلے میں تبدیلیاں بھی بہت تیزی سے ہو رہی ہیں۔ اس کا قوموں کے درمیان تعلقات پر بھی اطلاق ہوتا ہے، جس طرح کسی قوم کے اندر تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ نوبل فاؤنڈیشن کا مقصد امن کی ترقی ہے۔ جس شخص نے اس کی بنیاد رکھی ہے اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے مینٹس سے نکلنے والی قدرتی قوتوں کو انسانی جذبے کی لگام دینے والی قوت سے قابو کرے گا۔ کیا جرمن عوام کی حالیہ ترقی ایسی ہے کہ امن کے مقصد کے لیے دیے جانے والے اس انعام کا جواز بن سکے؟ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جرمنی کی مصالحت اور امن کی پالیسی خود اس کا جواب ہے، اس لیے کہ یہ پالیسی ممکن ہی نہ ہوتی اگر

یہ جرمن عوام کی خواہشوں کے مطابق نہ ہوتی۔ انصاف اور آزادی کی پُر امن بین الاقوامی تعاون کی خواہش۔ اس مرحلے پر ہمارے سامنے دو متقابل تصورات آتے ہیں جن پر ہم کو قابو پانا ہے: قومی استحکام کا تصور اور بین الاقوامی تعاون کا تصور۔ اس کا سطحی منظر نامہ یہ ہے کہ کسی قوم کی عقلی، روحانی اور جذباتی لیاقت اس کی جغرافیائی، لسانیاتی، اور نسلی رکاوٹوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ قومی استحکام اور بین الاقوامی تعاون کو ایک دوسرے کے مقابل رکھنا میرے نزدیک احمقانہ عمل ہے۔ میں نے جینوا میں جرمنی کے نمائندے کی حیثیت میں اس مخصوص نکتے پر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ایسا ممکن ہی نہیں کہ قدرت کے منصوبے کا ارادہ ہو کہ انسان کی نجیب ترین صلاحیتوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جائے۔ میں نے یہ نکتہ اٹھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ آدمی جو اعلیٰ درجے تک اپنے قومی مہمندان کی خلقی صلاحیتوں کی پرورش کرتا ہے اسے آفاقی علم اور احساس کی بھیر تل جاتی ہے جو اس کو اپنی میراث کی حدود سے پرے تک جاتی ہے؛ اور پھر وہ ایسی چیزیں تخلیق کرنے لگے گا جو، مگر جاگھروں کی طرح، اگر چہ اس کی وطنی زمین پر بنے ہوئے ہوں، تمام انسانیت کی جنت تک بلند ہو جائیں گے۔ ایک ہیکسٹر صرف انگلستان کی زمین ہی سے پیدا ہو سکتا تھا اسی طرح، آپ کے عظیم ڈراما نگار اور شاعرنا روے کے عوام کی فطرت اور روح ہی کا اظہار کرتے ہیں، مگر وہ اس کا بھی اظہار کرتے ہیں جو آفاقی طور پر تمام بنی نوع انسان کے نزدیک صحیح ہوتے ہیں۔ دانٹے کو صرف اطالوی خیال کے سیاق و سباق ہی میں سمجھا جا سکتا ہے، اور فائوسٹ (Faust) کے بارے سوچا بھی نہیں جا سکتا اگر اسے اس کے جرمن پس منظر سے علاحدہ کر دیا جائے؛ مگر دونوں ہی ہماری مشترکہ تہذیبی میراث کا حصہ ہیں۔ وہ ان بندھنوں کو توڑتے ہیں جو انھیں اپنی قوموں سے مربوط رکھتے ہیں، اس کے باوجود وہ عظیم ہیں صرف اس لیے ان کی انگلیں ان کے اپنے ملکوں کی مٹی میں مضبوطی سے پیوست ہیں۔ قومی تہذیب، رکاوٹ بننے کے بجائے، باہمی روحانی اور عقلی اتفاق رائے کے لیے ایک پلی کا کام کر سکتی ہے۔ ایک قوم کے عظیم لوگ تمام بنی نوع انسان تک پہنچتے ہیں۔ وہ متحد کرتے ہیں، تقسیم نہیں کرتے؛ بین الاقوامی سطح پر ہم آہنگ کرتے ہیں پھر بھی قومی سطح پر عظیم ہوتے ہیں۔ فرانسسسی وزیر خارجہ ہیریرٹ (Herriot) نے اس امر کا متنی ثبوتی سے فریک فرٹ میں ہونے والے بین الاقوامی جشن موسیقی میں اظہار کیا تھا، جب اس نے کہا تھا، ”بین الاقوامیت کے لیے کام کرنے والے کو پہلے قوم پروری کی شہد ہونی چاہیے۔ امن کے لیے مؤثر کام کرنے کے لیے آدمی کو پہلے اپنے اندر کے امن سے واقفیت ہونی چاہیے۔“ اس مقام پر ہمارا سامنا ہوتا ہے اس بڑے سوال سے جو ایک قوم دوسری قوموں سے کرتی ہے، ”جب آپ تعاون کی بات کرتے ہیں تو واقعی کیا آپ کا مطلب تعاون ہی ہوتا ہے؟ آپ واقعی کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا ہم آپ کی روح کی کہانیوں میں جہنا تک کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ آپ واقعی ہمارے ساتھ مل کر کام کرنا اور تعمیر کرنا چاہتے ہیں؟“ یہی ہے وہ سوال جو اکثر جرمنی سے پوچھا جاتا ہے، جس پر میں ذرا تفصیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

اگر کوئی مابعد جنگ کے اولین برسوں کے تجربات اور رد عمل کا تجزیہ کرنا چاہے تو، تعصب کا قصور وار

ٹھہرائے بغیر، کہا جاسکتا ہے کہ مفتوح کے مقابلے میں فاتح کے لیے امن کی وکالت کرنا آسان ہوتا ہے۔ فاتح کے نزدیک امن کا مطلب ہوتا ہے اس حالت کی حفاظت جو اس نے [جنگ کے دوران] حاصل کی ہے۔ جب کہ مفتوح کے نزدیک اس کا مطلب ہوتا ہے اسی پر قیامت کرنا جو باقی بچ گیا ہے۔ دوسروں کے عقوبت میں چلنا جب آپ ایک ساتھ سڑک پر چل رہے ہوں، رشک کے بغیر دوسروں کو سبقت دینا۔ یہ کسی فرد یا قوم کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ نصف صدی کے کام نے ایک چوٹی پر پہنچایا ہے، اور پھر چوٹی سے نیچے گر جانا۔ یہ انسانی نفس کے لیے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی نفسیات کو سمجھنا جنہیں اس کا تجربہ ہوا ہو، اتنا آسان بھی نہیں ہوتا نہ اس کی اصلاح آسان ہوتی ہے، جیسا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔

یہ تمام مسئلے نئے جرمنی کا۔ جس طرح کے حالات ہو گئے تھے اور جرمنی کے لیے آسان نہیں تھے، جن کا تذکرہ آپ کے صدر نشین نے کیا ہے، جب انہوں نے لوکارنو اور جینوا کا اور لیگ آف نیشنز میں جرمنی کی شمولیت کا تذکرہ کیا تھا۔ جرمنی کو ایک عرصے تک خوش اخلاقی سے، جو [دلوں کو] فتح کرتی ہے، محروم رکھا گیا تھا۔ جرمنی کو سوپر ہیومن اور بے کی خلافی یا درستی کرنی پڑی تھی لوگ جسے کبھی نہ برداشت کرتے، اگر وہ ریاست کی خدمت کے سلسلے میں ایک سدا بہار وراثت میں جی نہ رہے ہوتے۔ تاریخ داں اب بھی جنگ کے اختتام کو جرمنی کے علاقے کھودینے، نوآبادیات میں حصہ گنوا دینے اور ریاست اور افراد کے لیے اٹائے گئے دینے سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ وہ اکثر اس عظیم نقصان کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو جرمنی نے اٹھایا ہے۔ میرے نزدیک وہ درمیانے طبقے کے دانش ور اور پیشہ ور لوگ تھے، جو درایتی طور پر ریاست کی خدمت کے تصور کو سب سے آگے رکھتے تھے، جنہیں نے جنگ کے دوران ریاست کی مکمل وفاداری کے عوض خود اپنی دولت کا، اور نتیجے میں پروتاری کے درجے تک گر جانے کا نقصان برداشت کیا۔ ان کی دولت اس وقت کاغذ کا ٹکڑا بن گئی تھی جب اس ریاست نے، جس نے انہیں جاری کیا تھا، اسے اصل قیمت پر واپس لینے سے انکار کر دیا۔ ریاست کی خدمت کی صورت میں پوری ایک نسل سے ایسی قربانی کا مطالبہ کس حد تک جائز ہو سکتا ہے، یہ ایک نزاعی معاملہ ہے جو عام آدمی اور قانون سازوں کے نزدیک ایک جیسا ہے، جس کو ابھی تک حل نہیں کیا گیا ہے۔ مگر جنگ کے بعد سے جو کچھ جرمنی میں ہوا ہے اس کو مکمل طور پر اجزے سے ہڈوں کی مزاحمت کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ ورسائی مذاق کی شرائط کے نتیجے میں، پرانی فوج کے افسر اسی طبقے کا حصہ بن گئے، اور نئی نسل کا کچھ حصہ بھی، جو پرانے جرمنی میں فوجی افسر یا سرکاری افسر بن گیا ہوتا۔ یہ ان کی اقتصادی تباہی تھی۔ مگر، یہ ان تمام لوگوں کی ذہنی اور سیاسی تباہی بھی تھی جو پانچ سو سالہ روایتی شاہی کے پٹے وفادار تھے، جن کے پاس اب اپنی سوچ اور جذبات کے لیے کوئی ٹھوس بنیاد نہیں رہی تھی۔ جنگ کے دوران وہ سب جرمنی کے نصیب کے عروج و زوال میں حصے دار تھے مگر ان میں سے ایک کو بھی ایسی تباہی کی توقع نہیں تھی۔ وہ پہلے والوں سے منحرف نہیں ہونا چاہتے تھے اس لیے کہ انہیں اس تبدیل شدہ جرمنی میں داخلے کا طریقہ

معلوم نہیں تھا۔ جیسا کہ تاریخ میں ہوتا آیا ہے، ان لوگوں کی ضرورت سے زیادہ جلد بازی سے مشکلیں بڑھ گئی تھیں، جنہوں نے پرانے اور نئے کو کسی حد تک یک جا کرنے کے بجائے اپنی اختراعات کو غیر متاثر طریقے سے بڑھایا تھا۔

روڈے اور ذلیل کیے ہوئے، بھکاری جو کبھی رہنما رہے تھے اپنی یا سیت میں اپنے ملک کی روایات کی بے احترامی اور ان پر بے جا حملوں کے شدید مآخذ بن گئے تھے۔ مزید یہ کہ سربراہ آوردہ طبقے کے زوال کے بعد کے واقعات سے۔ اس مقام پر میں اشرافیہ یا جاگیرداروں کی نہیں بلکہ پورے درمیانہ طبقے کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے زندگی بھر کے کام کے شرے کو ہوا ہوتے دیکھا، اور جنہیں نئے سرے سے روزی کمانی پڑ گئی تھی۔ پرانے جرمنی کے پورے سماجی نظام پر کچلی طاری ہو گئی تھی۔ اس کے بعد Ruhr پر حملے کی صورت میں ایک اور سیاسی زلزلہ آیا۔ ایک بار پھر لوٹ مار اور غارت گری کے احساس نے شدید مزاحمت کے شعلے بھڑکا دیے، مگر اب اس احساس نے، ان قوموں کے درمیان جو بظاہر جرمنی سے لڑائی جاری رکھنا چاہتی تھیں اور وہ جو کبھی تھیں کہ اس حملے کا کوئی قانونی جواز نہیں تھا، فرق کرنا شروع کر دیا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ سے ایسی آوازیں آنے لگی تھیں جن سے واضح ہو رہا تھا کہ امریکا باہمی تعاون کی بنیاد پر ایک پُر امن اور متحدہ یورپ کا خواہش مند ہے اس کے بعد Dawes Plan کے بارے میں کانفرنس شروع ہو گئی۔ مدیرین نے ماہرین اقتصادیات اور بینکاروں کی جگہ سنبھال لی، اور اپنے زمانہ اقتدار میں ایک دن جب مکڈونلڈ ڈاوننگ اسٹریٹ (Downing Street) چھوڑ رہے تھے انہوں نے کہا تھا کہ انہیں پرانا اسکاتش (Scotish) گیت ”کیا پرانی شناسائیاں بھلا دینی چاہئیں“ (Should old acquaintance be targat?) بہت یاد آ رہا ہے۔

پہلی بار، نجی جرمن عوام نے اپنے نمائندوں کو دیمروں کے بتائے ہوئے قانون کی محض ایک شے نہیں، بلکہ مشترکہ مذاکرات میں شریک کے طور پر دیکھا تھا، اور انہوں نے Herriot کا خود اپنی زبان سے Ruhr کے خالی کرانے کا وعدہ سنا تھا۔ ایسے لوگوں اور ان کے درمیان جدوجہد میں، جو عالمی تناظر میں کسی تہذیبی پر یقین نہیں رکھتے، اور جو جان بوجھ کر ایک نیا راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے تاہم الذکر کامیاب رہے۔ روزِ ازل ہی سے ان کے کچھ حمایتی تھے، مگر ان میں مزدور طبقے کے ارکان کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس گروپ نے، جرمنی میں جو کسی سے کم وطن پرست نہیں تھا، اپنے سیاسی اور ریڈیو یونین کامریڈوں سے اس امید پر پرانے تعلقات دوبارہ استوار کیے کہ قوموں کے درمیان تعاون کے لیے ان سے بہتر لوگ نہیں مل سکتے تھے۔

Herriot کی جگہ بری آل فرانس کے وزیر خارجہ بنے اور انہوں نے Ruhr کے انفلا کے وعدے کو عملی جامہ پہنایا۔ اس کے بعد، 9 فروری 1925 کی یادداشت کے ساتھ جرمنی کی ایما پر لوکارنو کی پالیسی کا افتتاح کیا۔ یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ اول لمحے ہی سے لوکارنو پالیسی کو خوش دل اور پُر جوش قبولیت حاصل ہوئی تھی۔ بیرونی بے اعتمادی جرمنی کے بروقت ردِ عمل میں تاخیر کا باعث ہوئی تھی۔ اندرون ملک اس کو نادانی میں بولے

ہوئے جھوٹ کا سامنا ہوا جس کو ہم ایک متحرک پالیسی کی ابتدا کہہ سکتے ہیں، اس میں کچھ لوگوں کو کم زور ہزاری اور دست برداری کی سیاست کی پرچھائیاں بھی نظر آئیں۔ ہمارے مخالفین نے امن کے لیے جرمنی کی خواہش کی سنجیدگی کو پرکھنے کی خاطر بحث میں نئے سوالات شامل کر دیے تھے۔ لوکارنو معاہدوں کے نفاذ کے لیے لیگ آف نیشنز میں شمولیت کی شرط عائد کر دی گئی۔ کیا دلچسپ تبدیلی تھی، یہ بھی۔ 1919 میں جرمنی نے لیگ آف نیشنز میں شامل ہونے کی خواہش کی تھی مگر ٹک نظرروں اور نا سمجھ لوگوں کی جانب سے اس کو رد کر دیا گیا تھا۔ اب اس کی شمولیت کی خواہش کی جا رہی ہے۔ مخالفین کی انجمن کی مثال قائم کی جانے والی لیگ آف نیشنز [اب عالمی جنگ میں اپنے طاقت ور ترین مخالفین کا تعاون اور مصالحت چاہ رہی تھی۔ یہاں بھی شدید احساسات پر قابو کیا جانا تھا، اس لیے جرمنی کی نظر میں اس کے علاقوں سے متعلق فیصلوں میں لیگ آف نیشنز نے ہمیشہ حق خود اختیاری] کے اصول [سے سرف نظر کیا تھا۔ بالآخر، بہت اونچے نیچے اور اعتماد اور بے اعتمادی کے بعد معاہدوں پر رضامندی ہو گئی۔ پھر مارچ 1926 میں، کمتر درجے کی جوڑ توڑ اور کمتر درجے کے جذبہ حسد نے ایک بار پھر لیگ میں جرمنی کے داخلے کو ناممکن بنا دیا۔ مگر بین اس وقت سابق اتحادیوں کا مذاکرات کرنے کا مشہور فیصلہ آگیا، گویا جرمنی لیگ کا حصہ تھا، حالاں کہ اس کو باقاعدہ داخل نہیں کیا گیا تھا۔

تسمیر میں جرمنی کو لیگ میں داخل کر لیا گیا۔ اس موقع پر مسٹر بری آں نے ایک تقریر میں کہا تھا، جو دنیا کے تمام علاقوں میں سنی گئی تھی، کہ توپوں اور مشین گنوں کا عہد ختم ہو جانا چاہیے۔ انہوں نے وہ لفظ کہے تھے جنہیں اس اعلان کے ساتھ بقیہ صدی تک کوٹھتے رہنا چاہیے کہ وہ عظیم قومیں، جرمنی اور فرانس نے جنگ کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابلے میں اتنے اعزازات حاصل کیے تھے کہ مستقبل کو اسے بنی نوع انسان کے لیے آدرش کی لڑائی کی طرح دیکھنا چاہیے۔

جس نے جنیوا میں یہ واقعات دیکھے، تو وہ انہیں کبھی بھول نہیں سکتا۔

قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ اتفاق کے بعد ہمیشہ عمل نہیں ہوتا۔ تاریخ وقت کی ماپ کے لیے ایک اکائی استعمال کرتی ہے جو فرد کے عرصہ حیات سے مختلف ہوتی ہے، جب کہ آدمی ہمیشہ تاریخ کے ارتقا کو اپنے پیٹانے سے ماپنے کی فکر میں رہتا ہے۔ بعد میں آنے والے عرصے میں ہم بلند یوں پر پہنچ کر کہرا نیوں میں گر گئے، ہم نے اپنے اعتماد کی کوئیلاں کو شبہات کے پالے اور جنگ کی نفسیات کے ہاتھوں مسئلے جاتے دیکھا ہے اور اب بھی، بجائے دنیا بھر سے امن کی متفقہ حمایت کے، ہم یقین کے بحران کو ارتقائی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ تھے ابتدائی اقدامات جو مابعد دشمنوں کی جانب سے مفاہمت اور ہم بودیت کے لیے ہوئے تھے۔ مگر یہ ہمیشہ ترقی پسندانہ نہیں تھے۔ میں نے قصداً جدوجہد کی پہلی ماکامیوں کی تفصیلات بے کم و کاست بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی قوم کی تاریخ کا بیان کرنا فی سلسل کو اتنا کم راہ نہیں کر سکتا جتنا کہ ہم واقعات کو اس طرح پیش کرنا گویا انہیں تو ہوا ہی تھا۔ کسی قوم کے جوانوں کو اس سے زیادہ کم راہ نہیں کیا جاسکتا کہ واقعات کے ہوتے ہی نتائج اس طرح بیان کر دیے جائیں گویا ان کی شروعات اور نتائج کے درمیان کوئی فیصلہ

وقت تھا ہی نہیں۔ نسل آدم صرف جد و جہد ہی سے آگے بڑھتی ہے۔ فرد کی زندگی ایک لڑائی ہوتی ہے غلطیوں اور رکاوٹوں سے، اور کوئی بھی کامیابی اس قدر تسلی بخش نہیں ہوتی جتنی کہ مخالفوں کے خلاف حاصل ہونے کی کامیابی۔ آدمی کی زندگی ایک ہموار سچ جیسی نہیں ہوتی جس پر وہ اپنی مرضی کے مطابق بغیر کسی مزاحمت کے حرکت کر سکے۔ آدمی کو اپنے دل یا پیسوں میں نہیں گزارنے چاہئیں، محض اس لیے کہ مختصر عرصے میں اس کے آورش کی تکمیل نہیں ہو سکی ہے۔ ایک مثالی دنیا کا حصول اس کی قوت حیات کو ختم کر دے گا جو ہم میں سے ہر ایک کو آگے بڑھاتی ہے، اس لیے کہ پھر انسان کی زندگی اپنے معنی کھودے گی، گویا اب آدمی کے لیے خواب دیکھنے اور کوشش کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ لہذا مشکلات کے اس بیان سے میں قوتیلیوں سے باتیں نہیں کر رہا ہوں، میں ان کی طرف توجہ دینا چاہتا ہوں جو سوال کرتے ہیں کہ ہم زیادہ آگے کیوں نہیں بڑھے ہیں۔ میں انھیں دکھانا چاہتا ہوں کہ ان وقتوں میں یہ قیاس کرنا مناسب نہیں ہوتا ہے کہ محض ایک ہی ضرب سے آفاقی بدگمانیاں اور اراکے رزق رفتہ رفتہ نئی روشنی میں تبدیل ہو جائیں گے۔

چوں کہ ان واقعات کے درمیان بازگشت کے لحاظ نہیں آئے تھے اس لیے کہ گرم و تیز امیدوں کے ساتھ کامیابی بھی تھیں، جرمنی کی ترقی بھی اتنا رچرچا ہواؤ کے بغیر نہیں تھی۔ انفرادیت پسند جرمن لوگوں کے احساسات اور جذبات کو آسانی سے عام انسانوں کے برابر نہیں لایا جاسکتا۔ پھر بھی، آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ جرمن پارلیمان کے حالیہ مباحث میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جرمن عوام کی بڑی اکثریت امن اور مصالحت کی خواہش میں متحد ہے۔

میں دائیں اور بائیں کے درمیان شدید جذبات کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ وہ لوگ جنہیں جرمنوں جیسے تجربات سے گزرنا پڑا ہو فطری طور پر شدت پسندوں کے لیے زرخیز زمین کے مانند ہو جایا کرتے ہیں۔ جرمن قوم کے جہاز کا متوازن رکھنے والا درمیانی بوجھ جو اس کو ہچکچاہٹوں سے بچاتا تھا، وہ درمیان کا مستحکم طبقہ باقی نہیں رہا ہے۔ اجڑے بیڑوں نے اپنی امیدیں حالات کی مکمل تبدیلی سے لگائی ہیں۔ یہی وہ وقت تھا جب جرمنی پر انقلاب پسندی (Bolshevism) غالب آگئی، جو دائیں جانب سے کمیونسٹ اور بائیں جانب سے قومی سوشل ازم دکھائی دیتی تھی۔ ایک قوم جس کا سکہ رائج الوقت ڈھچکا تھا، جس کی اقتصادی اور سماجی تنظیم نو جایا نہ تھی، جس کو بالکل ہی نئے حالات میں رہنا سیکھنا پڑ رہا تھا، اب دائیں اور بائیں بازو کی انقلاب پسندی پر قابو پا چکی ہے، اس کے جذبات کی صحت مندی، اس کی جفاکشی کا جوش، اور اس کی realpolitik تصوراتی اور مرافی کیشیات پر غالب آ چکی ہے۔

مابعد جنگ دور کے ایک جرمن مدبر نے کہا تھا کہ پولیٹکس کا مقولہ "politics is our destiny" اب درست نہیں رہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اب ہمارے مقصود کو اقتصادییات کے مساوی کہہ سکتا ہے۔ میں اس سے اتفاق تو نہیں کر سکتا، مگر میں اعتراف ضرور کروں گا کہ قوموں اور گروہوں کی سیاست پر اقتصادی رجحانات اور واقعات شاید پہلے اتنے اثر انداز نہیں رہے ہیں جتنے کہ اب ہیں۔ لہذا، میں اقتصادییات سے ابتدا کروں گا،

اس لیے نہیں کر اقتصادیات کی اہمیت پہلے درجے کی ہے، بلکہ اس لیے کہ جرمنوں میں کام کرنے کی، تخلیق کی اور تعمیر نو کی پیداہشی تحریک گزرے عشرے میں بہت واضح رہی ہے۔ *laissez-faire* کے مطابق ہم نے یہود کے تمام کام روک نہیں دیے ہیں بلکہ ہم نے تو بے روزگاری کم کرنے اور اس کے نتائج کو کم کرنے کی ہر طرح کی کوشش بھی کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ درس سماجی تشویش کے اثرات کے باعث ریاست کی جانب سے کسی انفرادی کوشش کو دبایا گیا ہو، مگر تحمل طور پر یہ پالیسی صحیح سمت میں اشارے کرتی ہے۔ نئے جرمنی میں، مزدور طبقہ، باوجود اپنی سیاسی نمائندگی کی قسم کے وہ جس کے تابع رہا ہے، مملکت اور ریاست کا حامی بن گیا ہے۔ باوجود اس تنقید کے جو اکثر اس کے فرضی طور پر بالادست طبقے پر کی جاتی رہی ہے، میں اس امر پر زور دینا چاہوں گا کہ اس کے نتیجے میں پوری قوم اور ریاست کے مابین ہونے والے گلیوٹی ملاپ (*fusion*) کی زیادہ قدر کی جاتی چاہیے مقابلے میں اس ایک طرف اور نامکمل قانون سازی کے جو اس کا باعث ہوئی ہے، اور بدنام ہونے والی ہے۔ آج پوری قوم ریاست اور اس کے مستقبل میں شریک ہے۔ پورے ملک کے شہریوں اور قریوں میں مطلق اختلاف اور موافقت کو روک دیا گیا ہے۔ پچھلی صدیوں میں بادشاہ بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ ریاست کا خادم ہے۔ مگر آج سوسائٹی کے تمام ارکان ریاست کے خادم ہیں۔

سیاسی جماعتوں میں کسی قسم کی بھی تبدیلی عوام کے اس عزم کو تبدیل نہیں کر سکتی کہ کسی بھی طبقے کو ریاست کی ذمہ داریوں میں شرکت سے نہیں روکا جائے گا۔ اس عزم نے انتہا پسندوں کے خلاف، ریاست کی تعمیر نو، مشترکہ مفاد اور قومی یگانگت کی حفاظت کے لیے ایک بنیاد فراہم کی ہے۔ جرمن عوام اپنے اداکاروں میں متحد تھے کہ وہ اس یگانگت کو تمام اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ رکھیں گے۔ وہ بدبختی کے عالم میں زیادہ طاقت ور تھے۔ نسبت خوش حالی کے۔

ان گروہوں کا ملاپ جو کبھی بنیادی طور پر ریاست کے لیے مخالفانہ جذبات رکھتے تھے ایک تقابل کی کیفیت تھی اس کراہت کا جو بہت سے دانش ور اور طاقت ور صنعت کار ریاست کے لیے رکھتے تھے، کراہت جو اہم غیر مرقی قوت سے قطع نظر، قومی جذبے کو محرک رکھتی ہے۔ یہ منفی رویے، کراہتیں اور دشمنیاں آج دائیں بازو کے چند شدت پسندوں کے گروہوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان لوگوں کا دل جیتنا جو پچھلے زمانوں میں ریاست کے مخالف تھے پیش خیمہ تھا ان کے دلوں کے جیتنے کا جو پہلے ہی ریاست اور نئے طریقہ حکومت کو مکمل طور پر مسترد کر دیا کرتے تھے۔ اس موقع پر بھی، آج کے واقعات اور سیاست اس تاریخی حقیقت کو چھند لائیں کر سکتی کہ عملی تعاون حاصل کر لیا گیا ہے۔ میں جرمنی کے صنعتی طور پر سب سے زیادہ ترقی یافتہ صوبے کی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ صوبہ جس میں سوشل ازم پلٹ کر اپنے ماضی کی طویل ترین روایات پر نظر ڈال سکتی ہے، سابقہ بادشاہت اور موجودہ آزاد Saxony ریاست پر، جہاں ایک وزارت قائم ہے جس میں اشتراکی اور قوم پرست ایک ساتھ کام کر رہے ہیں۔ یہ امنگ کہ کام ہوتے رہنا چاہیے، آگے چل کر، جماعتی وفاداریوں سے زیادہ مضبوط ثابت ہوگی۔ اب رائے کے اختلافات سرحدوں، جماعتوں اور

گروہوں تک محدود نہیں رہے ہیں، یہ انفرادی جماعتوں کے اندر بھی ہوتے رہتے ہیں۔ بالآخر، رائے کے تمام اختلافات سر کر لیے گئے تھے اس عزم سے کہ تعمیر نو کے لیے سب کی ضرورت ہے، اور یہ بھی کے ہمارے بچے اور پوتے جو ایک دن پلٹ کر ہمارے زمانے کی طرف دیکھیں تو وہ صرف ان ہی لوگوں کی طرف قبولیت کے ہمارے کریں جو ان مشکل دنوں میں الگ کھڑے نہیں رہے تھے بلکہ جنہوں نے اس گھر کی تعمیر نو میں ہاتھ بٹایا تھا، جو اُحد چکا تھا۔ سچ کہ پرانے اور نئے کے درمیان کی آمیزش ابھی تک حل نہیں ہوئی ہے۔ مگر ایک عشرے کے اندر یہ حل کیسے ہو سکتی ہے؟

مگر نئے اور پرانے جرمنی کے درمیان ناقابلِ مصالحت جدوجہد کے خیال کو نئے اور پرانے کی آمیزش کے تصور کا سامنا تھا۔ جرمنی میں کوئی بھی ماضی کے دوبارہ قیام کی لڑائی نہیں لڑ رہا ہے۔ اس کی کم زوریاں اور غلطیاں واضح ہیں۔ بہت لوگ چاہتے ہیں کہ پرانے جرمنی کی اچھائیوں اور قابلِ قدر چیزوں کا نئے جرمنی میں اعتراف کیا جائے۔ تمام واقعات شخصیتوں سے منسلک ہوتے ہیں جو ان کی علامت بن جاتی ہیں۔ جرمن عوام کے نزدیک، پرانے اور نئے کی یہ آمیزش ان کے صدر کی شخصیت میں مجسم ہے۔ وہ رائج (Reich) کے پہلے صدر کے جانشین بن کر سامنے آئے تھے جو حزب اختلاف کی صفوں سے ابھرے تھے اور انہوں نے بڑی حکمت، سیاسی فراست اور حب الوطنی سے راستے کی مامواریوں اور بے ترتیبی کو مرتب کرنے میں، اور اس ترتیب کو تعمیر نو میں تبدیل کیا۔ صدر فان ہینڈن برگ (von Hindenburg) کی شخصیت میں، جنہیں عوام نے منتخب کیا تھا، قوم و دیگا نگت دیکھتی ہے جو جماعتوں سے بالاتر ہے اور جس کا احترام کیا جاتا ہے، جس کی عزت ہے اور جس سے محبت کی جاتی ہے۔ قدیم شاہی کی روایات کے پروردہ، وہ اب ایک نو جوان جمہوریت کے نہایت مشکل اور تکلیف دہ وقت میں اپنے فرائض پورے کر رہے ہیں۔ رائج کا صدر قومی یگانگت کی تجسیم ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش کے اتنی برس جلد ہی ہونے والے ہیں، سب جس کے جشن میں شریک ہو کر اس امر کا اظہار کریں گے کہ بھاری اکثریت کے نزدیک جرمنی کا تصور سیاسی جماعتوں اور نظریات کی وفاداری سے پہلے آتا ہے۔

یقیناً، نئے جرمنی سے یہ وفاداری رفتہ رفتہ اور مشکوکوں سے حاصل کی گئی ہے، مگر ہر روز زیادہ سے زیادہ لوگ اس پر جمع ہو رہے ہیں۔ وہ محض اس کے انوکھے پن کے گرویدہ نہیں، بلکہ اپنے احتساب بانٹس کے نتائج سے راغب ہوتے ہیں، جو اس کی پائیداری کی کہیں بہتر ضمانت ہے۔ کوئی بھی وہ بات نہیں کہہ سکتا جو ہشپ [نے] قدیم جرمنی بائسٹ ہٹ (457-781 کے فرماں روا) Merovingian سے کہی تھی "اے متکبر Sicambrian [بائینڈ کے جرمن علاقے کا رہنے والا] اٹھسا رہے اپنا سر جھکا دے اس کی پرستش کر جس کو تو نے مزار آتش کر دیا ہے، اور اس کو مزار آتش کر جس کی تو نے پرستش کی ہے۔" ایسی تبدیلی ایک دن میں نہیں آتی، اس کو رواج کے اندر ہی آمیزش سے ابھرنا ہوتا ہے۔ وہ جو سخت لڑائی کے بعد، اپنے وطن کی خاطر، محبت اور وفاداری سے جرمنی کے عوام کی خدمت اور موجودہ جرمنی کے دفاع کے لیے ماضی ہی ریاست کی

بھائی کے لیے اس سے زیادہ قابل قدر ہے جو سچی طور پر ایمان لایا ہو۔

عملی تعاون کے تصور نے نئی حکومت کا قوت عمل سے محروم اور ازکار و فریب حزب اختلاف کا سامنا کر دیا ہے جو ماضی کے حسن کے تصور میں بے خود ہے۔ اس لیے، نہ صرف حال کو، بلکہ مستقبل کو بھی اس جمہوری جرمنی کو گوارا کرنا پڑے گا۔

مگر قوموں کی زندگی میں حکومت کا رنگ روپ اور جسم ہی فیصلہ کن عناصر نہیں ہوتے، یہ سوشل ازم اور قوم پرستی کے جذبے نہیں پیدا کرتے۔ ہاں، مثال کے طور پر اقتصاد کے حلقے میں پوچھا جاسکتا ہے، کہ جماعتی نظام سرمایہ داری کو دوسرے قسم کے نظام حکومت کے مقابلے میں زیادہ رسوخ فراہم کرتا ہے یا دوسرا نظام اسے زیادہ رسوخ دیتا ہے۔ جرمنی کی معیشت، ان ہندسوں کے باعث اور مابعد جنگ کے یورپ کے ڈھانچے کی وجہ سے، پہلی تھی جس نے قومی سرحدوں کو توڑا تھا اور بین الاقوامی شمولیت کے نئے راستے پر قدم بڑھایا تھا۔ نئے کاروباری اتحاد کرنے کا رجحان جو پوری دنیا میں بن رہے ہیں، جن حیثیات **انٹل** بنی نوع انسان کی ترقی کے مفاد میں نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ خود مختار جمہوں کی تعداد میں کمی کا باعث ہو رہا ہے۔ یہ ان خود مختار چھوٹے تا جمہوں کا خطرات مول لینے کا آغاز کا رہتا جس نے معیشت کو فروغ کا موقع فراہم کیا تھا۔ مگر ماضی کے بارے میں دل پسند خیالات کی عادت ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تہذیبیاں عالمی جنگ اور اس کی کونج کی لائی ہوئی ہیں۔ جنگ نے یورپ کو گزشتہ مقام سے اکھاڑ کر ایک ایسے براعظم میں اس کی قلب مابیت کردی جس کے بے شمار زخموں سے خون برس رہا تھا اور۔۔۔ صرف جرمنی ہی کو نہیں اس کی آبادی کے بیش قیمت علاقوں کو بھی کنگال کر کے چھوڑ دیا تھا۔ ”جب پہاڑوں کی درزوں میں فولاد آگئے لگتا ہے تب زمیں کے [یہ] قابض بلند ہونے لگتے ہیں۔“ یورپ اب وسائل کی فراہمی کا اہم ذریعہ نہیں رہ گیا ہے، اور اب ہم خود کفیر نہیں دے سکتے کہ یورپ دنیا کا قائد ہے۔ اسی وجہ سے یورپ کے لوگ ایک دوسرے سے قریب ہو رہے ہیں تا کہ وہ خود کو فتح اور کثرت و فراط سے محفوظ کریں۔ اور جہاں تک اقتصادیات کا سیاست پر اثر انداز ہونے کا سوال ہے، تو ایک دوسرے سے قریب ہوا، اگرچہ اقتصادی نظریے سے قابل اعتراض ہو سکتا ہے، یہ بین الاقوامی مفاہمت اور امن کے فروغ کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ حالاں کہ اس عمل کی نفسیات، جس میں اربوں لگتے ہیں، عمرانیات کے ماسٹر مین کو ٹھک کا جواز فراہم کرتی ہے، یہ عمل اب بھی قوموں کے درمیان باہمی مفاہمت کا اثاثہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں آج کے جرمنی کے معاشی/سیاسی دھاروں کی طرف آتا ہوں۔

اکثر اس حقیقت کی بنا پر جرمنی کی سرزنش کی جاتی ہے کہ اس کے اداروں میں کمیونوں افراد جمع ہوتے ہیں جو جنگ کی یادوں، محاذ کی زندگی کے جذباتوں وغیرہ کو زندہ رکھتے ہیں، مگر میں سب کے سامنے ایک سوال رکھنا چاہتا ہوں: کیا نفسیاتی کیفیت میں یہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ میں جنگ کے دوران محاذ پر نہیں رہا تھا مگر رہا بھی ہوا تب بھی، میرے لیے یہ زندگی کا سب سے زیادہ دل گداز تجربہ ہوا۔ ریاست کے خیال پر اپنی

انفرادی انا کو دہرایا، اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنا، اپنی تمام تر قوت کو بروئے کار لانا کیا دنیا میں ایسا کوئی ملک ہے جہاں وہ لوگ جو ایسے تجربات سے دوچار ہوئے ہیں، ایک دوسرے سے ان کی باتیں نہیں کرتے؟ ہمارے پاس لیتھے (Lethe) کا پانی تو نہیں جو انسان کی یادداشت ختم کر دے یا دماغ کی آنکھوں پر کندہ تصویروں کو مٹا دے۔ [یونانی اساطیر میں لیتھے نامی دریا کے پانی کی یہ خاصیت تھی کہ اس کو پینے والوں کے ذہن سے ان کی یادداشت محو ہو جاتی تھی۔]۔

ہم پڑھتے رہتے ہیں کہ جرمنی کی طرح فرانس میں بھی جنگ میں شامل رہنے والے لوگ بھی اکٹھے ہوتے ہیں۔ جب یہ پرانے کامریڈ مسٹر بری آں سے ان کی رائے معلوم کرتے ہیں تو کیا یہ ان سے بات کرنا یا ان میں ایک ہونے کا احساس ان کے لیے خوشی کا باعث نہیں ہوتا؟ میں نے مسٹر بری آں کی وہ تقریر پڑھی ہے جو انھوں نے ان سپاہیوں کے سامنے کی تھی جو مہر میں لڑے تھے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ان کی زندگی کے تین سب سے زیادہ دل خوش کن لمحوں میں سے ایک وہ تھا جب انھیں خبر ملی تھی کہ جرمن Verdun پر قبضہ نہیں کر پائے۔ تو پھر جرمنوں کو کیوں الزام دیا جاتا ہے۔ تو پھر ایک جرمن کو اس بات پر کیوں الزام دیا جائے کہ وہ اپنے دل خوش کن لمحات اور وقت کو یاد کرے جب اس نے تارمن برگ (Tarmenberg) کی لڑائی میں جرمنی کی سر زمین کو دشمنوں کے قبضے میں جانے سے بچایا تھا؟ میں مسٹر بری آں سے خود مخاطب ہوں اور ان کو جنیوا کے وہ الفاظ یاد دلانا چاہتا ہوں جب انھوں نے ماضی میں ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد میں دونوں قوموں کی بری کارگزاریوں کی یاد دلائی تھی اتنی بری کارگزاریاں مزید کارگزاریوں کو غیر ضروری بنا دیتی ہیں۔ مسٹر بری آں کی طرح مجھے بھی یقین ہے کہ وہ جنھیں عالمی جنگ میں نشان اور خوف دونوں کا تجربہ ہوا ہے اب ایک نئے عہد امن کی حمایت کریں گے۔ کچھ لوگ جو اس کے خلاف بات کرتے ہیں، ہم کو اس سے بچھٹا نہیں سکتے۔

لہذا، جب ہم جرمنی کی ذہنی کیفیت کی بات کریں تو ہمیں بے انصافی نہیں کرنی چاہیے۔ فرانس کے مدبرین کی تمام تقریریں اعلان کرتی ہیں کہ وہ امن کی حمایت کرتے ہیں اور امن کو بنی نوع انسان کے عظیم آدرش کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اور اسی فرانس میں بابی ٹچ (Arc de Triomphe) بھی تو ہے، ایک عظیم شان یا نگار، جو نیولین اول کی یاد کو زندہ رکھتی ہے۔ تو پھر لوگ کیوں اعتراض کرتے ہیں جب ہم فریڈرک اعظم (Frederick the Great) کی یادگار پر پھول چڑھاتے ہیں، اور جب ہم حب الوطنی کے جذبے کو اعزاز دیتے ہیں، جس نے ہمارے مکان اور گھر، بیوی اور بچوں کا دفاع کیا تھا، خون سے رنگین اس جرمن زمین پر جسے جنگ کے دوران اوروں کے مقابلے میں زیادہ رونا گیا تھا؟ ہر ملک میں اس کے فاحشین کی بھست کی یادیں زندہ رہتی ہیں۔ یہاں ماروے میں لوگ اس طاقت ور انسان کی موت کے گیت گاتے ہیں جس نے ان کی سر زمین کی آزادی کو تباہ کرنا چاہا تھا۔ ہر انسان کے دل میں جدوجہد اور ماضی کے ہیروؤں کی یاد زندہ رہتی ہے۔ مگر یہ یادیں مستقبل میں امن کی تمنا سے متصادم نہیں ہوتیں۔ اسی طرح، جیسے ایک شخص

جھگڑے اور فساد کی زندگی کے بعد ملنے والے امن اور راحت کو زیادہ پسند کرنے لگتا ہے، اس لیے سمندر کا مکون صرف طوفان کے بعد ہی زیادہ اچھا لگتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ دنیا جنت ہے، ہم اپنے آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہتے۔ ہمیں وہ مستحکم امید چاہیے کہ مستقبل ایک نیا عہد لائے گا، ان آدرشوں پر بنا ہوا، جو جنگ کے خون سے ابھرے ہیں۔ یورپ سے زیادہ یہ تمنا ہمیں کہاں زیادہ طاقت ور ہوں گی، اور یورپ میں بھی، ہوائے ان ملکوں کے، جنہیں سب سے زیادہ جنگ کے دکھاٹھانے پڑے تھے؟

یورپ کی تاریخ کا یہ ایک اہم موڑ تھا جب جرمنوں نے اس پالیسی کی ابتدا کی تھی جو لوکارنو کے راستے ضیوعالے مبنی تھی۔ ذرا پڑھیے تو کہ اس جرمن فیصلے کی اہمیت کے بارے میں مسٹر بری آل نے کیا کہا تھا۔ اس راستے پہ چل کر جرمنی کو بے شمار اور مایوس کن تجربات ہوئے ہیں۔ ان پر تفصیل سے بات کرنے کا یہ مقام نہیں۔ میں صرف جرمنی کے حوالے سے لوکارنو کے نتائج کی بات نہیں کرتا۔ میرے نزدیک لوکارنو زیادہ اہم ہے۔ یہ Rhine کی وادی میں ویر پا امن کا حصول ہے، جس کی ضمانت دو عظیم ہمسایہ ملکوں نے دی ہے اور دوسری ریاستوں نے بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ اس معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں جارحیت کا شکار ہونے والے کی مدد کو آئیں گی۔ وہاں امن کا خدا، Treuga Dei رائج کرے گا جہاں صدیوں سے خون ریز جنگیں ہو رہی تھیں۔ ان قوموں کے درمیان امن پھیلانے کے لیے جہاں تک ان کی اخلاقی رسوم اور رسائی ہو، اس کو عام تعاون کی بنیاد دینا چاہیے۔ جرمن عوام کی اکثریت ان مقاصد کی حمایت کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے جرمن نو جوانوں کو ساتھ ملا یا جاسکتا ہے۔ نو جوان اولمپک کھیلوں کے پُر امن مقابلے میں اپنی انفرادی جسمانی اور روحانی کامیابی چاہتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ عسکری اور عقلی ترقی کا باعث بھی ہوں گی۔

وہ لوگ جو ان آدرشوں کے لیے محنت کرتے ہیں اس صورت میں زیادہ دیر تک کامیاب نہیں رہ سکتے کہ جنگ کے بعد برسوں اس قوم میں، جو اگرچہ شکست کھا چکی ہوتی ہے، غیر ملکی سنگینیں غلاف سے باہر رہتی ہیں، مگر وہ انتقام سے الٹا کر کرتی ہے اور صرف امن مانگتی ہے۔ لوکارنو کی پالیسی بدگمانی، تشدد اور جبر کی پالیسی سے میل نہیں کھاتی۔ لوکارنو پالیسی ہے مفاہمت اور آزاد خیالی کی۔ یہ پالیسی ہے یقین کی ایک نئے مستقبل میں، اور ماضی کی پالیسیوں کے برخلاف اس کو مستقبل کی پالیسی ہونا چاہیے۔ جرمنی کو اس مستقبل کا سامنا ہے، ایک متوازن قوم کے ساتھ، جس کی بنیاد ہمیشہ محنت پر اور ایسی معیشت پر رہی ہے جو ہمارے کسے ہوئے علاقے میں گروڑوں کی آمدنی اور تحفظ فراہم کرے گی، ایک توانا جذبے کی بنیاد پر جو کائنات اور نطشے کے فلسفوں کے مطابق امن کے لیے کوشاں رہتی ہے۔

اگر میں آپ کی بات صحیح طور پر سمجھ رہا ہوں تو، یہ تو آپ کے عوام ہی ہیں۔ وہ جو سو برس تک امن سے رہے تھے اور جو نو بنیل کمپنی کے دیے گئے انعامات کے ذریعے ان خیالات پر صاد کرنا چاہتے ہیں۔ جنہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ لوکارنو کے لوگوں کا، ان کی کوششوں کے لیے، اعتراف کیا جانا چاہیے۔ اس عمل میں آپ اپنے ملک کے عظیم آدرشوں سے منسلک رہے ہیں۔ آپ نے اپنے امن کے طویل عرصے کو سائنس اور تحقیق

کے وسیع اور مختلف میدانوں میں تخلیقی کاموں میں استعمال کیا ہے۔ آپ نے لوگوں کو نفاذ سٹ کی جتنی کوششوں کے ساتھ دنیا کے دور افتادہ کونوں میں بھیجا ہے، جنہوں نے انسان کے مفاد میں جذبے کو آخری حد تک پھیلا نا چاہا ہے۔ آپ نے ان لوگوں کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیے ہیں، مابعد جنگ کے عرصے کی درمیان، جنہوں نے دکھ اٹھائے، اور ان لوگوں کے لیے بھی جن کو ان کے اپنے وطن سے بہ جبر باہر نکال دیا گیا تھا۔ اس طرح آپ نے اپنے ملک کی محبت کو اپنے وطنی ساتھیوں کی محبت اور قومی افتخار کو بین الاقوامیت میں مدغم کر دیا ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ آج، آپ کے ملک کے دارالحکومت میں مجھے اس اعزاز کے لیے اپنے تشکر کے اظہار کا موقع فراہم کیا گیا ہے جو آپ نے ہمیں بخشا ہے۔ اپنے شکر کے ساتھ میں امید کرتا ہوں کہ وہ آدرش جو اس اعزاز کی اساس ہیں، اختلاف کرنے والی قوموں کی مشترکہ جائیداد بن جائیں گے، کہ وہ عظیم جرم جن نے دوسروں سے زیادہ اپنی سرحدوں سے پڑے اپنے رسوم کو پھیلا دیا ہے، اپنے دقتوں کے بارے میں کہتا تھا ”ہمارا تعلق ایسی نسل سے ہے جو ظلمتوں سے لڑکھڑاتی روشنی میں آ رہی ہے۔“ کاش اس کے الفاظ ہمارے دقتوں پر بھی صادق آئیں۔



سر اسٹن چیمبرلین چارلس ڈاؤز

چوں کہ اس برس کا دو برابر حصوں میں تقسیم انعام بھی 1926 کی تقریب انعامات ہی میں دیا گیا اس لیے اس کی کوئی علاحدہ تقریر مجھ لیل نہیں ہوئی تھی۔

تقریر قبولیت

(جوزف اسٹن چیمبرلین)

میں نوٹیل کمیٹی کے صدر نشین سے اپنے تشکر کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، اس اعزاز کے لیے جو اس انعام نے مجھے عطا کیا ہے۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اپنے کام کے سلسلے میں مجھے دو مڈلین کی شرکت میسر ہوئی جو اپنے جذبات کی غیر معمولی فراخ دلی، اپنے فیصلوں کی خود بخاری اور امن سے محبت کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس انعام کے لیے میرا احباب تشکر اور بھی بلند ہو جاتا ہے جو مشترکہ کام کے میرے حصے کے کام کا اسی طرح اعتراف کرتا ہے جیسے کہ مسٹر بی آں اور مسٹر ایسٹریسے مان کے نہایت اہم کرداروں کا کیا گیا ہے جو انہوں نے ادا کیے ہیں۔

Dawes Committee کے غیر معمولی کام نے، جو ہمارے کام سے پہلے ہوا تھا، ہمارے لیے

برطانیہ کے وزیر خارجہ سر اسٹن چیمبرلین تقریباً تجھیل میں شرکت نہیں کر سکے تھے اس لیے ان کے حصے کا انعام سر فرانسس لینڈلے (Sir Francis O. Lindley) نے وصول کیا تھا جو اس وقت ماروے میں برطانوی سفارت خانے کے وزیر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان ہی نے سر چیمبرلین کی تقریر قبولیت بھی پڑھ کر سنائی تھی۔ سر اسٹن چیمبرلین نے کوئی خطبہ نہیں دیا۔

آسمانیاں پیدا کر دی تھیں، اور مجھے فخر ہے کہ میں ممتاز امریکی مدبر کا شریک کار رہا ہوں یورپ کی تعمیر نو کے سلسلے میں جن کا نام ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

تقریر قبولیت

(چارلس ڈاؤز)

میں Reparation Commission کی پہلی کمیٹی کے ممبرین کے کام کے اعتراف میں دیے جانے والے انعام کا، جس کا میں صدر نشین تھا، تشکر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کمیٹی میں مجھے سمیت ادون یگ (Owen D. Young)، مارجونیا اسٹامپ (Sir Josiah C. Stamp)، مر رابرٹ کھڈرسلے (Sir Robert M. Kindersley)، ژان پارمنیے (Jean Parmentier)، ایڈورڈ ایلکس (Edgard Allix)، البرٹ پریلی (Alberto Pirelli)، فریڈرک فلورا (Frederico Flora)، ایمیل فرانکی (Emile Francqui)، بیرن مارسی ہوارٹ (Baron Maurice Houtart) شریک تھے۔ ممبرین کی کوشش تھی کہ وہ ایک ایسا منصوبہ بنائیں جس کی بنیاد انصاف کے اصولوں، پاکیزگی اور باہمی تعاون پر ہو اور اس کی قبولیت اس عام خوش فہمی پر ہو جو آفاقی تحفظ امن کی دیر پا امید ہوتی ہے۔ اس کے تحت حاصل ہونے والے نتائج کو آپ کے فیصلے نے تسلیم کیا ہے اور یہ عظیم اعتراف، خراج عقیدت ہے کمیٹی کی متحدہ کوششوں کا۔



جہاں ریاست ہائے متحدہ کے نائب صدر مسٹر چارلس ڈاؤز میں تقریباً مکمل میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ ان کی جانب سے اولو میں ریاست ہائے متحدہ کے سفارت خانے کے وزیر لارڈ سلور سونسن (Lauris Selmer Swenson) نے انعام وصول کیا تھا اور مسٹر ڈاؤز کا بھینپا ہوا تار بھی پڑھ کر منایا تھا۔

فریتاف نمینسن اعلان تجلیل

مجھے یہ اعلان کرنے میں مسرت ہو رہی ہے کہ اس برس کا انعام پروفیسر فریتاف نمینسن کو دیا جا رہا ہے۔ مسٹر نمینسن نے بین الاقوامی نوعیت کا جو کام پچھلے چند برسوں میں کیا ہے اس نے ان کو انعام کا حق دار بنایا ہے۔ میں خاص کر تذکرہ کرنا چاہوں گا ان کے کام کا جو انھوں نے جنگی قیدیوں کی واپسی اور قحط کے زمانے میں گریزوں روی مہاجرین کے لیے کیا ہے، اور اب ایشیائے کوچک اور قدیم یونانی صوبے Thrace کے علاقے میں کر رہے ہیں۔ حالاں کہ ان کی موجودہ سرگرمیاں صرف چند برسوں ہی پر محیط ہیں، ان کی حیثیت اور اہمیت ایسی ہے کہ نوٹیل کمیٹی نے محسوس کیا یہ نوٹیل امن انعام جیسے تقسیم امتیاز کے قابل ہیں۔

ہم میں سے ان لوگوں کو بھی، جو اپنے ملک میں رہ کر اخباروں کے ذریعہ واقعات پر نظر رکھے ہوئے تھے، ان کی محض کچھ جھلکیاں ہی دیکھنے کو کو ملی تھیں۔ ہم نے دیکھا کہ برے بین الاقوامی کام کس طرح باہر بار نمینسن کو سونپے گئے ہیں۔ ہم نے ان کو لیگ آف نیشنز کے ہائی کمشنر، نمائندے اور مختار عمل کے روپ میں بھی دیکھا ہے۔ ہم نے ان کو یورپ کے تقریباً تمام ملکوں کے نمائندوں یا ایجنسیوں سے مذاکرات کرتے بھی دیکھا ہے۔ ہم نے ان کو پے درپے سفر میں بھی دیکھا ہے: ایک دن ہم تار میں پڑھتے ہیں کہ وہ لندن میں لائیڈ جارج (Lloyd George) سے مذاکرات کر رہے ہیں؛ پھر اچانک معلوم ہوتا ہے کہ پاپائے اعظم سے کانفرنس کے سلسلے میں روم گئے ہوئے ہیں اس کے بعد وہ قحط کا ہذاست خود معائنہ کرنے اور روی حکومت سے مذاکرات کرنے روس گئے ہوئے ہیں؛ عریخ فانوں والال بخار (typhus) ان کے کئی قریب ترین ساتھیوں کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے، مگر، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، وہ خود خطرات سے بچ نکلتے ہیں۔ ایک اور دن، تمام سیاسی نا انصافیوں سے نبرد آزما، انسانیت کے مقصد کی وکالت کرتے ہوئے جنیوا میں لیگ آف

نیشنز کی اسمبلی میں جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ ایک بار پھر وہ حال ہی میں سفر میں تھے، قسطنطنیہ اور یونان کے، تاہم اب چند دقیقوں کے لیے، اپنے وطن میں، امن انعام کے حصول کے لیے ایسا وہ ہیں جو انھیں عطا ہو رہا ہے، جس کے لیے اپنی مزدگی کی بھی انھیں خبر نہ تھی۔

لیگ آف نیشنز کو دی ہوئی مینیس کی رپورٹیں اور دستاویزات ان برسوں میں ان کی سرگرمیوں کا تحقیق شدہ اور مکمل روزنامہ پیش کرتی ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کی مدد سے اہم حقائق کا ایک خاکہ پیش کروں۔

1920 کے اپریل میں لیگ آف نیشنز نے پروفیسر مینیس کو ان جنگی قیدیوں کی ان کے ملکوں میں واپسی کی ذمہ داری سونپی جن کا ابھی تک تہا نہ نہیں ہوا تھا۔ ان کو مختلف حکومتوں سے مذاکرات، اور ان اداروں سے تعاون کے اختیارات دیے گئے تھے جو اس کام کو شروع کر چکے تھے۔

اس وقت تقریباً نصف ملین افراد اپنے گھر واپسی کے انتظار میں یورپ اور ایشیا کی جیلوں میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کا بڑا حصہ روس اور جرمنی کے درمیان جدوجہد کے دوران قیدی بنا لیا گیا تھا۔ گویا، وہ چار سے پانچ، بلکہ چھ برسوں سے انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر شدید جسمانی اور ذہنی ڈکھ اٹھا چکے تھے۔ وہ سب بے گھر، فاقہ زدہ، اذیت گزیدہ تھے اور اپنے گھروں کو واپسی کی تمنا میں تھے، جو اجڑ چکے تھے مگر جہاں اب بھی ان کا شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔

لیگ آف نیشنز کے نمائندے کی حیثیت میں، مینیس نے فوراً سوویت اور جرمن حکومتوں سے اور کئی دوسری ریاستوں سے بھی رابطہ کیا، اور قیدیوں کی حوالگی، خورد و نوش اور سفر کے لیے معاہدے بھی کیے۔ بالخصوص بلقان کے راستے پر انحصار کرتے ہوئے، وہ خاصی مشکلات کے ساتھ کچھ بحری جہاز چارٹر کرنے میں کامیاب ہو گئے جو امن معاہدے کے تحت جرمنی انگلستان کو دینے والا تھا۔ قیدیوں کی وطن واپسی کے لیے ان جہازوں کو استعمال کیا گیا اور غیر متوقع طور پر کم خرچ میں تیزی سے لوگ اپنے اپنے ملکوں تک پہنچا دیے گئے۔ کچھ قیدیوں کی جو مشرقی سائبیریا کے تھے، ولاڈی واسٹک کے ذریعے گھر پہنچایا گیا تھا، جب کہ دوسروں کو بحر اسود کے ذریعے، جس میں خاصے بڑے مسائل پیدا ہوئے تھے اور زیادہ وقت بھی لگا تھا۔

سب سے بڑی مشکل مطلوب سرمایہ اکٹھا کرنے میں ہوئی تھی اس لیے کہ مشرقی یورپ کے کئی ملکوں کے لیے سرکاری قرضوں کا انتظام کرنا تھا جن کے قیدیوں کو واپس بھیجا جانا تھا۔ اس میں کچھ وقت لگ گیا تھا مگر بالآخر سب کچھ بخیر و خوبی انجام پا گیا۔

1921 کے ستمبر میں مینیس نے لیگ آف نیشنز کو رپورٹ پیش کی کہ 350,000 قیدیوں کو بلقان کے راستے، 20,000 کو ولاڈی واسٹک کے راستے، اور 5,000 کو بحر اسود کے راستے ان کے وطن واپس پہنچانا ممکن ہو گا۔ اس طرح عملی طور پر ان کا کام مکمل ہو گیا تھا۔

مگر قبل اس کے یہ کام انجام کو پہنچنا، نینسن کو ایک اور زیادہ مشکل کام سونپ دیا گیا۔
روسی مہاجرین پورے یورپ میں بس گئے تھے جن کی تعداد کا تخمینہ ڈیڑھ ملین لگایا گیا تھا۔ ان
میں کچھ ملازمتیں حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے اور جہاں بسے وہاں کی زمینوں میں ان کی جڑیں
بیوست ہونے لگی تھیں، مگر زیادہ تر بے روزگار اور بے وساکں تھے اور نیچے میں ان ملکوں پر یو جھ بن گئے
تھے جہاں رہ رہے تھے۔

1921 کے جون میں لیگ کی کونسل نے ایک ہائی کمشنر تعینات کرنے کا فیصلہ کیا جس کو قوموں کے
درمیان باہمی تعاون کے فروغ کا کام سونپا گیا تھا تا کہ بے روزگار اور ضرورت مند قیدیوں کو ملازمتیں دی
جائیں۔ 1921 اگست میں نینسن نے یہ ہائی کمشنر کا عہدہ سنبھال لیا۔

ان کا پہلا کام بکھرے ہوئے اور بے گھر انسانوں کی ضروریات اور حالات کی تصویر کشی کرنا تھا تا کہ
ان امکانات کا جائزہ لیا جائے جو ان کو مہیا کیے جاسکتے ہوں۔ اس کے بعد ان کو ملائک کے ساتھ مذاکرت
کرنے تھے جو روسی مہاجرین کو قبول کرنے اور ان کو ملازمت کے مواقع فراہم کرنے پر تیار ہو سکتے
ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہی وہ مرحلہ تھا جس پر بڑی مشکلات کا سامنا ہو سکتا تھا۔

نینسن نے کئی ملائک سے مذاکرات شروع کیے اور اپنے نمائندے بھی تعینات کیے جو ان کی جانب
سے مذاکرات کر سکتے تھے۔ جیسی کہ توقع کی جاسکتی تھی، کئی ملکوں نے مہاجرین کو قبول کرنے سے انکار کر
دیا۔ مگر دوسرے بہتوں نے مثبت جوابات دیے۔ مزید یہ کہ ایک بڑی تعداد میں اسٹونیا کے مہاجرین کو،
جسے جیگ کے بعد روس سے الگ کر دیا گیا تھا، وطن میں واپس قبول کر لیا گیا۔

اس کام میں کافی حد تک کامیابی ہوئی ہے اس میں شک و شبہ نہیں اور تاخیر بھی ہوئی ہے جس کی وجہ
مرمائیے کی کمی تھی۔ مابین پورٹوں میں سے ایک میں نینسن کہتے ہیں کہ یہ سارا مسئلہ زیادہ تیزی سے حل کر لیا
جاتا اگر ان کے پاس اس کثیر مرمائیے کا صرف ایک معمولی سا حصہ بھی ہوتا، جو حکومتوں نے صرف ایک سال
کے عرصے میں روسی مہاجرین کی لدا کے لیے مہیا کیا تھا۔

یہ کام ابھی جاری تھا کہ نینسن کو ایک اور بہت بڑا مشن دے دیا گیا۔ روس کی قحط سالی بے اندازہ حد
تک بڑھ چکی تھی اور وسیع علاقے کو تاراجی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس ملین لوگوں کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی
تھیں۔

1921 کے اگست میں نینسن کو قحط سالی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس بار
درخواست لیگ آف نیشنز کی جانب سے نہیں، بلکہ حکومتوں کی ایک کانفرنس اور جنیوا میں واقع نئی اداروں
کی جانب سے آئی تھی۔

ایک نقطہ نظر سے، نینسن کا کام زیادہ مشکل نہیں تھا؛ اس لیے کہ کروڑوں روسی فاقہ کشی کر رہے تھے
اور ان کو امداد پہنچانی جانی تو ان کی تباہی نہیں تھی، جب کہ دوسرے ملائک میں بھاری مقدار میں امداد

موجود تھا۔ مثال کے طور پر ریاست ہائے متحدہ میں خریداروں کے انتظار میں گندم کو گھن لگ رہا تھا، اور ارجنٹائن میں جوار کے اتنے ذخائر موجود تھے کہ اسے ریلوے انجنوں میں ایندھن کے طور پر جھونکا جاتا تھا۔ روس کو مانج کی برآمد میں کوئی بڑا مسئلہ درپیش نہیں تھا کہ جہازوں کے پورے پورے بیڑے بے کار کھڑے تھے۔ مزید یہ کہ خود روس کے اندر مانج کی نقل و حمل اور تقسیم کے مناسب وسائل موجود تھے، بالخصوص اگر مانج سردیوں کے آنے سے پہلے پہنچا دیا جاتا، جب دریا اور جھیلیں بند ہو جاتی ہیں۔

مگر ایک اور بڑی مشکل درپیش تھی۔ ایک ایسی دنیا جس میں قومیں سماجی طبقات اور افراد اپنے اپنے تصورات اور اپنی امنگوں کے فروغ کے لیے لڑتے ہوں، ایسا احساس استحکام پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو اتنا قوی ہو کہ قومی سرحدوں اور سیاسی اختلافات کو عبور کر سکے۔

نیلسن نے فوراً سوویت حکومت سے رابطہ کیا اور ایک دو نکاتی معاہدہ کیا: پہلا نکتہ یہ تھا کہ مانج ان لوگوں تک پہنچے گا جن کے لیے روانہ کیا جائے گا، اور دوسرا نکتہ یہ تھا کہ نیلسن کو اختیار ہوگا کہ وہ یورپ کی حکومتوں سے سوویت حکومت کے لیے دس ملین پاؤنڈ کا قرض حاصل کریں گے۔

مانج کی رسید فوراً شروع ہو گئی۔ نجی اور نیم سرکاری اداروں کے توسط سے، اور نجی عطیات کے ذریعے معقول رقم اکٹھی ہو گئی، اور بڑی مقدار میں مانج روانہ کر دیا گیا۔

مسئلے کے عمل حل کے لیے ضروری تھا کہ روس کے قرض کا انتظام کیا جائے اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس انتظام کی بنیاد صرف عطیات ہی پر نہیں ہونی چاہیے۔ قرض کے معاملے کو ایک مشکل مزاحمت کا سامنا ہوا، اس لیے کہ دوسری حکومتوں کے نزدیک نہ سوویت حکومت منظور شدہ تھی اور نہ وہاں کامیابی انتظام قابل قبول تھا جس کی وہ نمائندگی کرتا۔ لہذا، نیلسن کے کیے ہوئے معاہدوں کے باوجود ایسے بہت سے حلقے تھے جو قائل نہیں تھے کہ دی جانے والی امداد ان لوگوں کے لیے فائدہ مند ہوگی جن کے لیے مہیا کی جا رہی ہے۔

نیلسن کے لیے اس اختلاف کو ختم کرنا سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ وہ اپنے مطالبے کی اخلاقی حمایت کے لیے کہ روسی ریاست کو قرض فراہم کیا جائے یا بار لیگ آف نیشنز کی طرف متوجہ ہوئے۔ اپنی ایک طاقت ور تقریر میں، جس کے الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں، انہوں نے لیگ آف نیشنز کے سامنے استدلال کیا تھا کہ کروڑوں افراد کو موت کے منہ میں جانے سے بچانے کے عمل کو سیاسی مقاصد کی بنیاد پر روکا نہیں جانا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ اگر کوئی سیاسی مقاصد ہیں بھی، تو بھی وہ یہی کہیں گے کہ امداد دی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ یورپ کے وہی علاقے ہیں جو کبھی مانج کے بڑی مقدار مہیا کرتے رہے ہیں، اور آج تباہ ہو رہے ہیں۔ کیا یورپ وولگا (Volga) کے اضلاع کے بغیر رہ سکتا ہے؟ کیا یورپ روس کے بغیر رہ سکتا ہے؟ کچھ لوگ استدلال کرتے ہیں کہ روس کو مانج بھیجنا روسی حکومت کی مدد کرنے کے مترادف ہے۔ نیلسن کا جواب تھا: ہم سوویت حکومت کی مدد نہیں کر رہے ہیں، بلکہ یہ تو ایک سادہ سی بات

ہے کہ اس طرح ہم روپی حکومت کو باور کرا رہے ہیں کہ یورپ میں جذبہ ہمدردی موجود ہے۔ مگر فرض کیجئے کہ یہ امداد سوویت حکومت کی حمایت سے ہوئی بھی تو کیا ایسا کوئی شخص ہے جو آگے بڑھ کر یہ کہہ سکے کہ سوویت حکومت کی حمایت سے بہتر ہے کہ کروڑوں افراد کو بھوک سے مر جانے دیا جائے؟

روس کے لیے قرض حاصل کرنا ممکن نہیں ہوا۔ دیاستوں نے مدد کی ہے جس میں ماروے شامل ہے؛ نئی اور غیر سرکاری اداروں نے بڑی مقدار میں رقم اکٹھا کی ہے؛ مگر وہ مدد جو آنت کو ابتدا ہی میں روک سکتی تھی، روک دی گئی ہے۔

انجام یہ ہے کہ اس کام سے وہ نتیجہ نہیں لگا جو حاصل کیا جاسکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ لاکھوں افراد کی مدد کی گئی ہے، اور بالآخر وہیں ملین افراد زندہ بچا لیے گئے ہیں مگر بہت سے شکار ہو گئے ہیں اندازاً دو سے چار ملین تک۔ اور چوں کہ اس برس فصل خراب ہوئی ہے، اس لیے کہ جو لوگ فصل بوسے تھے وہ بھوکے تھے اور ان کے لباس تپوں اور مویشیوں کی کمی تھی، ہم پیش بینی کر سکتے ہیں کہ بہار کے موسم کے شروع ہوتے ہی آنے والی بد بھتی ایک بار پھر خوف ناک ہو جائے گی۔

اب بین الاقوامی نوعیت کا چوتھا مشن نیلیسی کے سپرد کیا گیا ہے۔ لیگ آف نیشنز کے ہائی کمشنر کی حیثیت میں انھیں یونان اور ترکی کے درمیان جنگ کا شکار ہونے والے بد قسمت افراد کو مدد جانے والی امداد کی فراہمی کی نگرانی کرنی ہوگی۔ سب سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ مہاجرین کو امداد پہنچے جو ایشیائے کوچک اور Thrace کے علاقوں سے بلقان ممالک اور یونان میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ کام اب شروع ہو چکا ہے، اور روزانہ اخبارات میں اس کے بارے میں معلومات شائع ہو رہی ہیں۔

یہ ہیں وہ کام جو نیلیسی کے سپرد کیے گئے تھے جو انھوں نے مکمل کیے ہیں، ہم یہاں جن کا تذکرہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ، نہ صرف بہت سے افراد تھے، بلکہ اداروں کا ایک سلسلہ تھا جن کے ماتحت مل کر انھوں نے کام کیا تھا، جن کو بھی حاصل کیے گئے نتائج کے ایک بڑے حصے کا کریڈٹ دیا جانا چاہیے۔

انسانی دماغ ان وسیع و عریض اعداد و شمار کا اندازہ تو کر سکتا ہے مگر اس بے اندازہ ہمدردی کا تصور نہیں کر سکتا۔ ایک بھوکا شخص، ایک انسانی وجود، رد کیے ہوئے کباڑ کی طرح سڑک کے کنارے پڑا، پارہ پارہ ہوتا ہوا۔ اس کو ہم سمجھ سکتے ہیں، اس مرحلے پر ہمارا احساس بڑھ کر جذبہ مٹھم بن جاتا ہے۔ ایک مہاجر، بلکہ مہاجرین کا ایک گروہ، اپنے بچوں اور اسباب کو ایک ٹھیلے پر رکھے دھکیلتا ہوا جا رہا ہے۔ یہ بھی ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ مگر ایسے لاکھوں افراد ایک ملک سے دوسرے ملک بھگائے جاتے ہوئے، عقب میں ان کے جلتے ہوئے گھر، ان کے آگے مستقبل کا ایک خلا جس پر ان کو قابو نہیں۔ ایسے مرحلے پر انسان کا دماغ قفل ہو جاتا ہے؛ دماغ نقوش بنانے کے بجائے پیش کیے گئے اعداد و شمار کو دہرانے لگتا ہے۔ نئی جینے پر خیرات؛ بلکہ بڑے جینے پر خیرات، ہمارے ہم وطن لوگوں کے لیے یا ہمارے صوبوں کے لیے۔ یہ سب ہماری دسترس میں ہوتا ہے؛ ہم اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ مگر ایک پروگرام جس کا مقصد ایک بڑا عظیم کے لاکھوں

افراد کو موت اور بد بختی کے عذاب سے بچانا۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ ہوتا ہے، اس میں صد ہزار تفصیلات اور پیچ ہوئے ہیں، ہم جن سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں اور دماغ کو آرام کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔

اب یہ آنے والی نسلوں کی ذمے داری ہوگی کہ وہ اس کام کو تاریخ میں معقول جگہ دیں۔ ہم، جو ان سے گزر چکے ہیں ان پر محض تبصرہ ہی کر سکتے ہیں۔

اور اب یہی ہے، جو میں کہنا چاہتا ہوں۔

وہ کون سی ایسی شے ہے جس نے اس کام کو ہمارا دیا ہے؟ کیا یہ قوموں کی عام طور پر کام کرنے والی مشینری تھی؟ کیا یہ سیاست دانوں اور مدبروں کے ضمیر کو چھینچھوڑنا تھا، جس کا اتنا عظیم الشان اظہار ہوا ہے؟ جی نہیں۔ اس کا ماخذ کبرائی میں ہے۔ یہ اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ وہ لوگ انسان تھے جن کے عمیق ترین اور وسیع ترین آفاق سے اپیل کی گئی تھی، اور ان ہی میں سے رائے کے ایک عالم کا اظہار ہوا تھا۔ بلاشبہ، تمام سیاسی مضامینوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جانا تھا، تاکہ تصور اور احساس ان رکاوٹوں کو توڑ دے جو قوموں، طبقات اور افراد نے کھڑی کر رکھی تھیں۔ اس اپیل کو انسان کی اندرون کی عمیق ترین کبرانیوں میں اترنا تھا جس میں کارہیلاست داخل نہیں ہو سکتا۔

کبھی انسان کے عمیق ترین احساسات دعا بن کر ابھرتے ہیں، کبھی سیاست ان کو ابھارتی ہے۔ مگر سیاست کے ابھارے ہوئے احساسات وہی ہوتے ہیں جو عام طور پر تقسیم کا باعث ہوتے ہیں؛ قومی خود غرضی، طبقاتی شعور، شبہات، طاقت کے حصول کی خواہش۔ یہ سچ ہے کہ کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب سیاست اس کو اپیل کرتی ہے جو اتحاد کا باعث ہوتا ہے، جو صرف قوموں اور سماجی طبقات ہی کو متحد نہیں کرتا، بلکہ اس سے بھی اپیل کرتا ہے جو بنی نوع انسان کو متحد کرتا ہے۔ مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوا کرتا۔ میرے نزدیک ہمارے کام کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ بنی نوع انسان کے احساس کی کبرانیوں میں نفوذ کر گیا ہے، جو ہم سب کے اندرون میں دفن رہتا ہے، یہ احساس کہ آدمی کا خاندان ایک ہی ہے خواہ اس کی قومی یا سماجی تقسیم کسی بھی نوعیت کی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ مینٹس نے اپنی تقریروں میں سے ایک میں کہا ہے کہ وہ ہمسائے کی محبت ہی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے اس خدمت میں شریک ہونے کی خواہش کی تھی۔ اور وہ کامیاب رہے ہیں۔ ترقی چیز نہیں دی ہے، اور ہدف اب بھی بہت دور ہے۔ اندرون کی کبرانیوں سے انھیں ہوائی گرمی کی لہر کو [بے درد کی] برف اور ٹھنڈک نے روک لیا ہے اس کے باوجود، یہ اس حد تک آگے بڑھ گئی ہے کہ وہ کام جس کی اس نے حمایت کی ہے بنی نوع انسان کی تاریخ کا ایک واقعہ بن گیا ہے۔

ان سب سے آگے ہمیں اپنے اپنے مورچوں پر جمے کچھ جنگجو نظر آتے ہیں؛ ادارے اور افراد، سال بہ سال اس جدوجہد میں مصروف، بد قسمتی کے شکار اور ان کے بچانے والوں کے لیے تمام رکاوٹیں ہٹا کر راستے بناتے ہوئے۔ ان کے اوپر ہمیں ایک واحد انسان بھی نظر آتا ہے۔ کس قسم کے بوجھ یہ شخص اٹھائے ہوئے ہے، کبھی انتظامی صلاحیتیں اس کی ضرورت ہیں، کبھی توانائی اور کیا اقتدار ہے اس میں، کیا

بے غرض مبر ہے، کیا صلاحیت ہے جو براہ راست مسئلے کے دل تک پہنچ جاتی ہے! کس قسم کی زندگی سے گزرا ہے یہ شخص، جس نے یورپ کے دکھوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جس سے اس میں ایک احساسِ ذمے داری پیدا ہوا ہے۔

آج اس شخص کو اپنے درمیان دیکھ کر بہت سی یادیں جاگ اٹھیں۔ اس کے پیچھے ایک زندگی ہے جو اپنے خیالات میں، ہم نے اس کے ساتھ گزاری ہے۔

اس کی جس چیز نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ کسی ایک مقصد کے لیے، کسی ایک خیال کے لیے اور دوسروں کو اس کی پیروی کرنے پر تیار کرنے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگانے کی صلاحیت ہے۔

ہمیں آج وہ ایک لڑکا بھی یاد آ رہا ہے، جو لڑکا ہونے کے باوجود کچھ زیادہ ہی تھا جس نے Greenland کو ski پر پار کرنے کی [جرات مندانہ] کوشش کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شمال میں جہاں بڑی قوموں سے آنے والے مہنگی مہرات کے جہاز مرزا ہوئے تھے مارویائی کھیلوں کے سامان اور ماروے کی برف سے واقفیت کی مدد سے وہ [اپنی مہم میں] کامیاب ہو جائے گا۔ وہ کامیاب ہو گیا، اور اس کا قطب شمالی کا سفر تاریخ میں ایک سنگ میل بن گیا۔

ہمیں بچپن کا ایک آدمی بھی یاد آ رہا ہے جس نے، اپنے سائنسی علم کی بنیاد پر، ایک نظریہ پیش کیا تھا کی برقی رد قوتیں سمندر سے ہوتی ہوئی مشرق سے مغرب کی طرف بہتی ہیں۔ تقریباً تمام سائنس دانوں کو یقین تھا کہ وہ غلطی پر ہے۔ مگر اس نے اپنے نظریے [کو ثابت کرنے] پر جان کی بازی لگا دی: اس نے قطب شمالی تک جانے کے لیے خود کو مشرقی برف میں [تقریباً] جھالیا۔ وہاں برقی رد موجود تھی جو اس کو آگے اپنے برف کی طرف لے گئی۔

تو کیا جو کچھ ہم نے ابھی دیکھا ہے بالکل ویسا ہی نہیں ہے؟ ایک زبرد آب دھارا، ہم کو جس پر یقین رہا ہے، ایک بار پھر نیپسی کو بہا کر آگے لے گیا ہے! انسانی احساس کا کبرا دھارا جو برف کی تہہ کے نیچے بہتا ہے جس میں قومیں اور افراد روزمرہ کی جدوجہد اور زندگی کی آزمائشوں کے دوران خود کو بند کر لیتے ہیں۔ ان کو اس دھارے پر یقین تھا اور چوں کہ انھوں نے یقین کیا تو ان کے کام کو فتح نصیب ہوئی۔ کاش یہ دھارا [اپنے ساتھ] مستقبل کے لیے بھی بہت کچھ لے جائے۔

خطبہ:

یورپ کے دکھی لوگ

شہرِ روم کے Capitoline عجائب گھر میں سنگ مرمر پر کی ہوئی سگ تراشی کا ایک نمونہ رکھا ہوا ہے جو

میرے نزدیک، اپنی مادہ دل گدازی میں ایک بہترین تخلیق ہے۔ یہ مجسمہ ہے ایک ”مرتے ہوئے گال“ کا۔ [Gaul مغربی یورپ کے اس علاقے کا پرانا نام ہے جو اب فرانس، کسمبرگ اور سویٹزرلینڈ کا حصہ ہے۔ گال کے باشندے بھی گال ہی کہلاتے تھے۔] وہ شخص شدید زخمی میدان جنگ میں لیا ہوا ہے۔ لڑائی سے سخت کوشش اس کا تومند جسم موت کی آغوش میں جا رہا ہے۔ اس کا مولے بالوں سے ڈھکا سر ڈھلکا ہوا ہے، اس کی مضبوط گردن مڑی ہوئی ہے، مزبوریں جیسے طاقت ور کھردرے ہاتھ جو ماضی قریب میں تلوار اٹھاتے تھے اب زمین پر ٹیک دگا کر آخری کوشش سے اپنا ڈھلتا ہوا بدن منہجائے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے ان خداؤں سے جنگ کرنے پر اکسایا گیا تھا جنہیں وہ جانتا نہیں تھا، اپنے ملک سے بہت دور۔ اور اس طرح وہ اپنے انجام کو پہنچا۔ اب وہ اس مقام پر لیا ہوا خاموشی کی موت مر رہا ہے۔ دنگے فساد کی آوازیں اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہیں۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اندر کی جانب پھری ہوئی ہیں، وہ شاید آخری بار اپنے بچپن کے گھر کو ٹیک رہا تھا، اپنی جائے پیدائش کو، گال کے گھنے جنگلوں کے درمیان۔ کچھ اسی طرح میں بنی نوع انسان کو اس کے دکھوں میں دیکھ رہا ہوں، اسی طرح میں یورپ کے دکھی عوام کو دیکھ رہا ہوں، جنگ کے سنام میدانوں میں لڑائی کے بعد، جو بڑی حد تک ان کی اپنی نہیں تھی۔

یہ ہے حاصل طاقت کے نشے کا، شہنشاہیت اور عسکریت کا جو پوری دنیا پر غالب ہو گئی ہیں۔ زمین کی سنہری پیداوار کو پیروں تلے کچل دیا گیا ہے، زمین ہر طرف دیر ان پڑی ہے اور اس کی کمیونی کی بنیادیں ڈھیر رہی ہیں۔ لوگ خاموش مایوسی میں سر جھکائے ہوئے ہیں۔ جنگیوں کی لڑائی ان کے اطراف ہنگامہ مچا کیے ہوئے ہے، مگر اب وہ اسے بالکل غن نہیں پا رہے ہیں۔ وہ دباؤ معدن کے نکالے ہوئے، پلٹ کر اپنی زندگی کی مادہ اور بنیادی قدروں کو دیکھ رہے ہیں۔ دنیا کی روح شدید بیمار ہے، اس کی امید ٹوٹ چکی ہے، اس کے آدرش جھنڈائے ہوئے ہیں، زندگی کی امید ساتھ چھوڑ چکی ہے، تباہی کے دھویں کے بادلوں کے پیچھے افق جھنڈا ہو رہا ہے اور بنی نوع انسان کا اعتبار نظر نہیں آتا۔

کیا علاج کیا جائے؟ سیاست دانوں کے ہاتھوں۔ ان کے ارادے ٹھیک ہوں تو، نگر سیاست اور نئے سیاسی پروگرام اب دنیا کے قابل نہیں رہے ہیں، دنیا ایسے بہت سارے پروگرام دیکھ چکی ہے۔ [گویا] آخری تجزیہ یہ ہے کہ سیاست والوں کی جدوجہد حصول اقتدار کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

شاید سفارت کار؟ ان کے ارادے نیک ہو سکتے ہیں، مگر وہ ہمیشہ کے لیے بانجھ لیل بن چکے ہیں جنہوں نے انسانیت کی بہتری کے بجائے اس کو نقصان پہنچایا ہے۔ ذرا بڑی جنگوں کے بعد ہونے والے معاہدوں کو یاد کیجیے۔ Westphalia کا معاہدہ، Holy Alliance کے ساتھ ہونے والی ویانا کانفرنس وغیرہ۔ کیا ان میں سے کسی ایک سفارت کار نے دنیا کی ترقی کے لیے کوئی کام کیا ہے؟ اس مقام پر ہمیں [پندرہویں صدی کے، اسپالا، سویڈن کے آرچ بشپ] Oxenstierna کے مشہور الفاظ یاد آ رہے ہیں جو اس نے اپنے بیٹے سے Westphalia مذاکرات کی بابت شکایت کے طور پر کہے تھے: ”میرے بیٹے، کاش

تم جان سکتے کہ دنیا کتنی کم عقلی سے چلائی جا رہی ہے۔“

نجات کے لیے اب ہم روایتی قیادت پر مزید بھروسہ نہیں کر سکتے۔ بہت ذہن سے ہم سفارتی اور سیاسی کانگریسوں کا تجربہ کر رہے ہیں، کیا ان میں سے کوئی بھی کسی قسم کا نتیجہ نکال سکی ہے؟ اس وقت ایک [کانفرنس] لوزان (Lausanne) میں ہو رہی ہے۔ کاش یہ ہمارے لیے مشرق میں امن لاسکتی جس کا ہمیں ایک عرصے سے انتظار ہے، تاکہ کم از کم ایک پیچیدہ مسئلہ تو حل ہو سکے۔

مگر اس بڑی خرابی کا کیا کیا جائے۔ مریض کے دل کا؟ ہر طرف کا نا بھلائی ہو رہی ہے کہ فرانس جرمنی سے بندوبست نہیں چاہتا، وہ نہیں چاہتا کہ جرمنی کی جانب سے تاوان کی ادائیگی ختم ہو۔ اس لیے کہ اسے Rhine کے مغرب کے علاقے کا قبضہ و انکسار کرنا پڑے گا، اور Ruhr کے خلاف دھمکیوں سے جرمنی کی صنعت کو پریشان نہیں کر سکے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ حاسدانہ بد گوئی ہے، مگر یہ افواہیں کتنی عام ہو چکی ہیں! یہ کنکسر پھسّر بھی ہو رہی ہے کہ جرمنی کے صنعت کاروں کی قیادت فرانس سے قطعی معاہدہ بھی نہیں چاہتی۔ وہ بے یقینی کی فضا کو جاری رکھنا چاہتی ہے تاکہ رفتہ رفتہ مارک کی قیمت گرے اور جرمنی کی صنعت کو زیادہ عرصے تک بچے رہنے کا موقع مل جائے۔ اس لیے کہ اگر بندوبست ہو جاتا ہے تو مارک مستحکم ہو جائے گا، بلکہ اس کی قدر میں اضافہ بھی ہوگا اور جرمن صنعت مسابقت نہیں کر سکے گی اور برباد ہو جائے گی۔

خبر نہیں کہ یہ باتیں صحیح ہیں بھی کہ نہیں، مگر صرف ان کا زبانوں پر آنا ہی اس طریقے کو ظاہر کرتا ہے جس میں پوری یورپی کمیونٹی اور اس کا انداز زندگی بے احتیاط سیاسی اور مالیاتی سنے بازوں کے ہاتھ میں کھلنا بن کر رہ گیا ہے۔ بلکہ نقب زنیوں کے، کمتر لوگوں کے [ہاتھ میں] جنہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ان کے اقدامات کے نتائج کیا نکلیں گے، مگر وہ اب بھی یورپی تمدن کے بیش بہا مفادات پر سنے بازی کر رہے ہیں۔

اور یہ سب کس لیے؟ محض اقتدار کے لیے۔ یہ بد قسمت جدو جہد اور سریشے اور سرکشی کا دہنا جانا، سماجی طبقات حتیٰ کہ خود لوگوں کے اپنے درمیان تباہ کن تنازعات، یہ سب محض اقتدار کے لیے!

جب کسی نے قحط سالی کا سامنا کیا ہو، بھوک سے ہونے والی اموات اس کے سامنے ہو رہی ہوں، جب ہی وہ پوری طرح آنکھیں کھول کر بد قسمتی کی حالت کو دیکھ سکتا ہے۔ جب کسی نے اپنی عاجز آنکھوں سے پچھلی پڑتی ہوئی دن کی روشنی میں بھوکے بچوں کے چہرے دیکھے ہوں گے، جب تملاتی ہوئی ماؤں کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے بچوں کو مایوسی کے عالم میں دو دھ سے خالی اپنی چھاتیوں سے لگاتے دیکھا ہوگا، اور مردوں کے بھوت جیسے ڈھانچوں کو کیمین کے فرش پر پچھی چٹائیوں پر پڑے جب وہ صرف مہربان موت کے انتظار میں ہوں، دیکھا ہوگا، جب ہی وہ سمجھ سکے گا کہ یہ سب ہمیں کس طرف لے جا رہے ہیں، اور جب ہی وہ سوالات کی اصلی نوعیت کو سمجھ سکے گا۔ یہ اقتدار کی جدو جہد نہیں، بلکہ ایک واحد اور وحشت ناک الزام ہے ان لوگوں کے خلاف جو اب بھی رحم کے ایک قطرے کے لیے کی جانے والی دعا کو سننا نہیں چاہتے، جو

انسانوں کو زندہ رہنے کا موقع دے۔

یقیناً، جنہوں نے ہمارے بد انتظام یورپ میں سماقی ہوئی مہروں کو خود دیکھا ہو، اور انہیں عملی طور پر بے انت دکھوں کا کچھ تجربہ ہو انہیں احساس ہوا چاہیے کہ دنیا محض اکسیر اعظم دواؤں، کانڈ اور الفاظ پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ انہیں عملی اقدامات میں بدل دیا جانا چاہیے، مشقت طلب کوششوں کے ذریعے، دنیا کو پھر سے بنانے کے لیے جنہیں نیچے سے شروع ہونا چاہیے۔

نئی نوع انسان کی تاریخ لبروں کی طرح اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے۔ پہلے ہم یورپ میں لبروں کے حوض میں گر چکے ہیں۔ ایسا ہی ایک لبروں کا حوض سو برس قبل نیپولین کی جنگوں کے بعد بناتھی۔ مردہ شخص جس نے Worm-Müller کے لاجواب کام کا مطالعہ کیا ہے جس میں اس زمانے کے ماروے کے حالات بیان کیے گئے تھے، اس وقت اور اب کی حالت میں غیر معمولی یکسانیت دیکھی ہوگی۔ یہ جان کر کہ اس زمانے کا جہنم غائب ہو چکا ہے، جدوجہد کر کے ماروے ایک بار پھر بہتر ہو گیا ہے، مگر اس کو ایک طویل مایوس کنی عرصہ لگا ہے، تیس سے چالیس برس کے قریب۔

اس زمانے میں، جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں، لبروں کا حوض زیادہ گہرا اور بڑا ہو گیا ہے، جس میں یورپ کا بڑا حصہ سما سکتا ہے، اور اس کے علاوہ یہ ایسے حالات میں ہے جو اب زیادہ پیچیدہ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت صنعت و حرفت کا وجود نہیں تھا، لوگ بڑی حد تک زمینوں پر انحصار کرتے تھے۔ صنعت و حرفت اب خود پر انحصار کرنے لگی ہے اور کساد بازاری کے ایک عرصے کے بعد، زراعت کے مقابلے میں اس کی بازیافت زیادہ مشکل ہو گئی ہے۔ چند برس کی کامیابی زراعت کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑی کر دے گی، مگر صنعت و حرفت کی نئی مند یوں کے فروغ کے لیے کئی برس درکار ہوں گے۔ مگر یہ امید بھی کر سکتے ہیں کہ بازیافت کا عمل اس بار زیادہ تیز ہوگا، اس لیے کہ ہمارے موجودہ نقل و حمل اور اقتصادی سہولتوں کے وسیع آلات کی مدد سے ہر کام اب زیادہ تیزی سے ہو جاتا ہے۔ مگر ابھی تک فروغ کے نشانات کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ہم ابھی تک لبر کے حوض کی انتہا تک نہیں پہنچے ہیں۔

پورے یورپ میں لوگوں کے بنیادی احساسات کیا ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ نفرت اور رشک کی حمایت کے باعث بہتوں کے لیے یہ ہر شے اور ہر ایک سے مایوسی یا بے اعتمادی پیدا کرتے ہیں۔ یہ نفرت ہر روز قوموں اور طبقات کے درمیان پھیلائی جاتی ہے۔

مگر، مستقبل کبھی مایوسی، بے اعتمادی، نفرت اور رشک پر تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔

مجھے یقیناً پہلی لازمی شرط ہوتی ہے۔ سب سے پہلے خود بیماری کی وجہ اور نوعیت کی سمجھ ہونی چاہیے، سمجھے ان رجحانات کی جو ہمارے وقتوں پر نظر رکھتے ہیں کہ انہیں آبادی کے درمیان کیا ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ یورپ کی بظاہر الجھی اور پشیمان سوسائٹی کی ہر خصوصیت کی نفسیات کی سمجھ ہونی چاہیے۔

ایسی سمجھ یقیناً ایک دن میں پیدا نہیں کی جاسکتی۔ مگر اس کے حتمی حصول کی پہلی شرط سمجھنے میں سنجیدگی

ہوتی ہے، کہ یہ اس سمت میں پہلا بڑا قدم ہوتی ہے۔ ایسے گروہ کے ساتھ جو مختلف خیالات رکھتے ہوں مسلسل بدسلوکی، جیسی کہ ہم اخباروں میں دیکھا کرتے ہیں ہمیں کبھی ترقی کی طرف نہیں لے جاسکتی۔ بدسلوکی کسی کو قائل نہیں کر سکتی؛ یہ عمل بدسلوکی کرنے والے کو صرف کم رتبہ اور ظالم بناتا ہے۔ غلط بیانی اور بے جا الزامات اس سے بھی کم فائدہ پہنچاتے ہیں، اکثر وہ ان ہی پر پلٹ آتے ہیں جو ان کی ابتدا کرتا ہے۔

یہ بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی بھی کمیونٹی میں مشکل ہی سے کوئی رویہ یا تحریک انضامی ہے جس کی کوئی جائز وجہ نہ ہو، وہ سوشلزم ہو یا سرمایہ داری، قسطنطینیت ہو یا انقلاب پسندی۔ مگر ایسا صرف کسی کے لیے یا کسی کے خلاف یا خصوص خلاف۔ اندھے مذہبی جنون کی وجہ سے ہوا کرتا ہے، جو مجبور ہو کر متضاد ہو جاتا ہے اور دردناک جدوجہد اور تباہی کی طرف لے جاتا ہے؛ جب کہ گفتگو، مفاہمت، اور برداشت اس توانائی کو قابل قدر ترقی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔

اس موضوع پر مزید کچھ کہنا اس مقام پر ممکن نہیں؛ بس اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اپنے ہمسایے کی آنکھ کا تھکا دیکھ لینا اور خود اپنے آنکھ کے شبیر سے غافل ہونے کی مثال ہر زمانے پر صادق آتی ہے، محض اسی زمانے کے لیے ہی نہیں ہم جس میں زندگی گزار رہے ہیں۔

اگر سمجھ ہی عطا ہو با خصوص جب سمجھنے کی خواہش بھی ناکافی ہو، تو اندر ہی اندر انضامی ہوتی غیر یقینی کی کیفیت، جو ہمیں مکمل تباہی سے ڈراتی ہے، اپنا سرا بھارتی ہے۔ کسی کو بھی علم نہیں ہوتا کہ آنے والا دن اپنے ساتھ کیا لے کر آئے گا۔ بہت سے لوگ تو اس طرح جیتے ہیں گویا ان کا ہر دن آخری دن ہو، اور اس طرح وہ عمومی کیفیت زوال کی طرف مرکے چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد سے ڈھلان مسلسل جاری رہتی ہے اور بے رحم ہو جاتی ہے۔

اس پر بھی، غیر محفوظ ہونے کا تصور جو سب سے زیادہ خراب ہوتا ہے، اور غیر یقینی پن کی خیال آرائی انسان کو کام سے خوف دلاتی ہے؛ یہ تصور جنگ کے دوران پیدا ہوا تھا، اور خاموشی سے بڑھتا رہا ہے۔ یہ stock-jobbing [مال کے دلالوں کے درمیان لین دین کرنے] اور خیال آرائی کی پیداوار تھا، ہم سب جس کے عادی ہیں، جس کے ذریعے لوگ کم عمر سے میں خطیر رقم حاصل کر لیتے ہیں، اور اس سوچ میں ہوتے ہیں کہ وہ اپنی بقیہ زندگی بغیر کسی کام اور محنت کے گزار سکتے ہیں۔ اس کیفیت نے کام سے عار پیدا کر دیا ہے جو آج تک باقی ہے۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ایمان داری اور دل جیسی سے محنت کرتے ہیں، مگر جہاں ہمیں کام سے سنجیدہ نگاہ نظر آئی ہے، وہ وہی جگہیں ہیں جہاں بھوک کا دیوا اپنی خوف ناک فصل کاٹ رہا ہے۔

مجھے مشرقی دوگا (Volga) کے مشرق کے ایک گاؤں میں گزارا ہوا ایک دن ہمیشہ یاد رہے گا جس کے ایک تہائی باسی واپس آچکے تھے اور بقیہ دو تہائی میں سے کچھ تو فرار ہو گئے تھے یا بھوک سے ہلاک ہو

گئے تھے۔ زیادہ تر مویشی ذبح ہو چکے تھے مگر ان لوگوں کی ہمت کی چٹکاری مکمل طور پر کبھی نہیں تھی، اور اگر چہ ان کو ملازمت ملنے کے امکانات نہیں تھے، مگر مستقبل پر ان کا یقین سلامت تھا۔ انہوں نے کہا تھا، ”میں سچ فراہم کیجیے، ہم اس کی کاشت کریں گے۔“ ہم نے جواب دیا تھا، ”ضرور مگر ٹل کھینچنے والے مویشی کے بغیر تم کاشت کیسے کر سکو گے؟“ ان کا جواب تھا، ”کوئی بات نہیں، اگر مویشی نہیں تو ہم، ہماری عورتیں، ہمارے بچے خود ٹل کھینچیں گے۔“ یہ ان کی تن پروری تھی جو بول رہی تھی، یا وہ کوئی نہیں، محض شجی بازی نہیں تھی۔ یہ ان کی زندہ رہنے کی خواہش تھی، جس نے جھجھکیا نہیں ڈالے تھے۔

تو کیا ہم سب کو کام کرنے کی حقیقی قدر بھوک کی دردناک ٹیس کے تجربے سے ہی سیکھنی ہوگی؟ مجھے جرمنی کے حالات پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ کام کے لیے مہینہ کم وقت اور محدود پیداوار کی وجہ سے جرمنی اتنا کوئلہ نہیں نکال سکتا جتنی کہ اس کی ضرورت ہے اور اس کو انگلستان سے کوئلہ خریدنا پڑے گا۔ غالباً ایک ملین فی ٹن کی مقدار بتائی گئی تھی۔ اور اس کی قیمت غیر ملکی سٹکے میں ادا کی جاتی ہوگی۔ لیکن، اگر کام کرنے کے اوقات بڑھا کر روزانہ دس گھنٹے کر دیے جائیں تو جرمنی کوئلے کی اپنی ضرورت خود ہی پوری کر لے گا۔ یہ محض ایک مثال ہے۔

سوئزرلینڈ جہاں سب کچھ ٹک رہا ہے، جہاں صنعت و حرفت تباہ ہو رہی ہے اس لیے کہ وہ اپنی مصنوعات اس لاگت پر پیدا نہیں کر سکتا کہ دنیا کی منڈیاں ان کی طرف متوجہ ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اگر مناسب اجرت کے عوض روزانہ کے اوقات کار کو دس گھنٹے تک بڑھا دیا جائے تو مزدوروں کو، ہفتے میں تین دن کے بجائے، پورے ہفتے کام ملے گا جس کے دوران کارخانے نقصان کے ساتھ محض اہٹاد ہجود برقرار رکھ پا رہے ہیں۔ مزید برآں، مزدور اگر ہمت کریں تو وہ زیادہ گھنٹے کام کر سکتے ہیں، مگر وہ اسی وقت ایسا کر سکتے ہیں جب وہ اپنے یونین کے پردہ گرام سے تنہا ورنہیل کرسٹے۔ یہ ہے صورت حال۔

اس افسوس ناک صورت حال کو، اگر یہ سچ ہے تو، جزوی طور پر سرمایے کی قدر میں ناقابل عیشین کوئی اتار چڑھاؤ کا باعث کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایسی صفات والے مسائل ہیں، میرے نزدیک، ماہرین بھی جن کی تشریح نہیں کر سکتے۔

مگر، مادہ ہی بات ہے کہ ان واضح عناصر کی سطح کے نیچے، گہری بڑے اندرونی مسائل چھپے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ لوگ کام کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، اور ایک طویل عرصے سے انہیں بہت کم کام ملا ہے۔ تو یہ پوچھا جائے گا: ”جب پیداوار کے لیے کوئی منڈی نہیں ہے تو کام کرنے کا مقصد کیا ہے؟“ اور واقعی منڈیاں نہیں ہیں۔ مگر کام کے بغیر منڈیاں بھی نہیں ہو سکتیں۔ اگر کام نہیں کیا جاتا ہے، اگر منڈیاں نہیں بنتی ہیں جہاں انہیں ہونا چاہیے تو کسی قسم کی قوت خرید پیدا نہیں ہوگی اور نتیجے میں سب کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ آفاقی بیماری دراصل کام کی کمی ہے۔ اس وقت تک ایمان دارانہ کام بھی فروغ نہیں پا سکتا جب تک کہ امن اور اعتماد نہ ہو، اپنے آپ پر اعتماد دوسروں پر اعتماد اور مستقبل پر اعتماد۔

یہاں ہمارا تیر ٹھیک نتائج پر لگا ہے۔ سامن کے لیے یہ اعتماد کس طرح پیدا کیا جائے؟ کیا یہ سفارت کار اور سیاست دان پیدا کریں گے؟ ان کے بارے میں تو میں اپنی رائے پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں۔ شاید وہ کچھ کر سکیں، مگر نہ میں ان کا قائل ہوں اور نہ انفرادی ممالک کے سیاست دانوں کی صلاحیت کا، کہ وہ ان حالات میں کچھ حاصل کر سکیں گے۔ میری رائے میں، نجات کا راستہ صرف قوموں کے درمیان تعاون میں ہے جس کی بنیاد ایمان دارانہ کوشش پر ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس ہدف کا راستہ صرف لیگ آف نیشنز کی طرف سے ہو کر جاتا ہے۔ اگر یہ ادارہ نا کامیاب ہوتا ہے تو، کم از کم وقت موجود میں، مجھے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، مگر کیا ہم لیگ آف نیشنز پر اتنا اعتماد کرنے میں حق بجانب ہیں؟ اس ادارے نے اب تک امن اور اعتماد کے فروغ کے لیے کیا کیا ہے۔ یہ سوال اٹھاتے وقت ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ لیگ اب بھی ایک نو بہال ہے جسے آسانی سے ضرر پہنچ سکتا ہے اور جس کی نشوونما کو شبہ کا پالا مار سکتا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ لیگ کو اسی وقت پوری طاقت مل سکتی ہے جب اس میں بڑی قوموں سمیت جو بھی ملک شامل ہیں، تمام قومیں شامل ہو جائیں۔ مگر اپنی مختصر عمر میں بھی یہ ادارہ بہت سے اقدامات کے کریڈٹ کا دعوٰی کر سکتا ہے جو ایک روشن مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس نے اپنی مختصر زندگی میں بہت سے متنازعہ معاملات حل کیے ہیں جو بہ صورت دیگر، اگر جنگ نہیں تو، کم از کم شدید فساد کا باعث ہو سکتے تھے۔

اسی کی ایک مثال، سوئیڈن اور فنلینڈ کے درمیان Åland کا تنازعہ ہے۔ اگرچہ کچھ لوگ تھے جو صل سے مطمئن نہیں تھے، پھر بھی، انہوں نے اس کو قبول کیا، اور اس طرح مزید تعاطف پیدا ہونے سے روکا۔

یوگوسلاویہ اور البانیہ کے درمیان ایک منہوش تنازعہ پیدا ہو گیا تھا۔ مربیا کی فوجیں سرحد پار کر چکی تھیں۔ لیگ آف نیشنز نے مداخلت کی، مسئلہ حل کیا، اور دونوں حریفوں نے بغیر مزید خون خرابے کے، صل کو قبول کر لیا۔

مثال کے طور پر سیلیسیا (Silesia) جنوبی پولینڈ کے علاقے) کے تنازعے کا بھی تذکرہ کیا جاسکتا ہے جو جرمنی اور پولینڈ کی درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بھی حل کر لیا گیا ہے کچھ لوگوں کے نزدیک نہایت خراب طریقے سے، جب کہ کچھ کا خیال ہے کہ اس کا اور کوئی حل ممکن ہی نہیں تھا اس لیے کہ سابق حکومتیں میثاق ورسانی پر دستخط کر چکی تھیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے کا بندوبست دونوں حریفوں کی جانب سے ہوا تھا اور یہ بھی کہ اس کے بعد سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہے۔

ایک اور مثال پولینڈ اور لیتھوانیا (Lithuania) کی ہمارے سامنے ہے۔ یہ سچ ہے کہ لیگ آف نیشنز اس معاملے میں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکی تھی، کہ یہ مسئلہ بہت ہی وجوہ کہ بنا پر خاصا مشکل تھا، میں یہاں جس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ بہر حال، حقیقت یہ ہے کہ لیگ آف نیشنز کی جانب سے کی جانے والی تفتیش

کے باعث ہی دونوں حریف ہتھیار اٹھانے سے باز رہے تھے۔

یہ دھوکا کیا جاسکتا ہے کہ یہ تو چھوٹی قوموں کے درمیان کے نزاعات تھے لیکن اگر بڑی قوموں کے درمیان ایسے مسائل اٹھتے تو کیا ہوتا کیونکہ لیگ آف نیشنز کی ناکامی کے آگے جھک جاتیں؟ اچھا! تو میں آپ کی توجہ ایک بار پھر سیلیبیائی مسئلے کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا۔ جرمنی کوئی چھوٹی قوم نہیں، اور مزید یہ حقیقت ہے کہ فاتح بڑی قومیں جو اس سوال کو حل کرنے نکلے تھیں، کسی معاہدے تک نہیں پہنچ سکی تھیں، اس لیے اس کو لیگ آف نیشنز کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ حال ہی میں ایک اور بہتر مثال ہمارے سامنے آئی تھی کہ بڑی طاقتوں نے برطانیہ عظمیٰ اور فرانس کے درمیان ایک مسئلے کو حل کے لیے لیگ آف نیشنز کو بھیج دیا تھا۔

1921ء میں فرانسیسی حکومت نے ایک فرمان جاری کیا تھا کہ تیونس اور مراکش میں رہنے والے ہر فرد کو جبری قومی خدمت انجام دینی پڑے گی۔ اس طرح فرانسیسی زیر انتظام علاقوں میں رہنے والے برطانوی باشندے بھی فرانسیسی فوج میں جبری بھرتی پر مجبور ہو گئے تھے۔ برطانوی حکومت نے شدت سے اس کی مخالفت کی، جب کہ فرانسیسی حکومت کا کہنا تھا کہ یہ اس کا اندرونی معاملہ ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی جھکنے پر تیار نہیں تھا اور تنازعہ زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ نو برس قبل ایسے سوال پر جنگ چھڑ سکتی تھی، یا کم سے کم ایک مہنگی سفارتی کانفرنس ہو سکتی تھی۔ چوں کہ یہ مسئلہ لیگ آف نیشنز کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا، فوراً ہی تناؤ ختم ہو گیا۔

اگر لوگوں کے ذہنوں میں اب بھی لیگ آف نیشنز کی حیثیت کے بارے میں شبہات ہیں تو ہم ان کی توجہ برطانیہ کے حالیہ انتخابات کی طرف دلانا چاہیں گے۔ 1386,1 امیدواروں میں سے صرف تین امیدوار ایسے تھے جنہوں نے اپنے رائے دہندگان کے لیے یہ اعلان کرنے کی ہمت کی تھی کہ وہ لیگ آف نیشنز کے مخالف ہیں۔ دو تین نے اس موضوع پر بات نہیں کی تھی، جب کہ بقیہ تمام نے لیگ پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ میری رائے میں اب تک لیگ کی سب سے بڑی اور زیادہ اہم کامیابی، جو واقعی مستقبل کے ایک نئے یورپ کا شگون ہے، وہ جینوا میں آسٹریا کے لیے قرض کی منظوری ہے تاکہ اس کو اقتصادی تباہی کے خطرے سے بچنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ یہ اقدام یورپ کی اقتصادی سیاست میں ایک نئے اور امید افزا رجحان کا پیش خیمہ ہے۔

میرا یقین کامل ہے کہ جرمنی کا مسئلہ، جرمنی اور اس کے مخالفین کے مابین اختلافات کے باعث نہ حل ہو سکتا ہے اور نہ ہوگا، جب تک کہ یہ بھی لیگ آف نیشنز کے سامنے پیش نہیں کر دیا جاتا۔

اس کے علاوہ، مکمل یا جزوی ترک اسلحہ جات کا مشکل سوال پہلی بار جینوا کی آخری میٹنگ میں چھیڑا گیا تھا۔ اس میں بھی اور دوسرے میدانوں میں بھی لیگ کی سرگرمی میں ایک ہی نام تھا جو آگے آتا تھا وہ لارڈ رابرٹ سسل (Robert Cecil) کا تھا۔ ایک بار پھر ہمیں یاد رکھنا چاہیے، بالخصوص جزوی ترک اسلحہ جات کے معاملے میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ دنیا میں ایسی کئی اہم عسکری طاقتیں ہیں جو ابھی تک لیگ کی رکن نہیں بنی ہیں۔

مگر، فوجوں میں اسلحہ جات کی کمی سے کہیں زیادہ عوام کے اندرون میں چھپے ہوئے اسلحہ کو نکالنا، اور آدمی کی روح میں ہمدردی کی تخلیق کرنا ہے۔ اس سلسلے میں بھی لیگ آف نیشنز نے عملی اعتبار سے بہت اہم کام کیا ہے۔

میں پہلے اس عظیم کام کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جو امریکیوں نے مسٹر ہولڈر کی غیر معمولی قیادت میں انجام دیا ہے۔ جنگ کے دوران اس کی شروعات Belgian Relief سے ہوئی تھی۔ اس امداد کو مرکزی یورپ تک بڑھا دیا گیا تھا، جب ہزاروں کی تعداد میں بلجیم کے لوگوں، بچوں اور بالغوں کو، اور بالآخر روس کو بھی، پیش بہا امریکی امداد کے ذریعے نئی امید فراہم کی گئی تھی۔ جب اس کام کی تاریخ نکھی جائے گی تو یہ کام بنی نوع انسان کے واقعات میں ایک عظیم الشان صفحے کی جگہ لے گا، اور اس کی ثمرات سیاہ رات میں ایک روشن ستارے کی طرح چمکے گی۔ اس کے ساتھ ہی امریکیوں نے، دوسرے اداروں، امریکی ریڈ کراس اور Near East Relief کی مدد سے بلقان، ایشیائے کوچک اور اب یونان میں ناقابل یقین کام سرانجام دیے ہیں۔ مختلف ملکوں میں، برٹ سے یورپی اداروں نے بھی، جن میں ہمارا دارہ شامل ہے، جنگ کے دوران اور اس کے بعد بھی بہت کام کیے ہیں۔

لیگ آف نیشنز نے اپنی تشکیل کے فوراً بعد اس نوعیت کی سرگرمیوں کی کفالت کی ہے۔ اس کا پہلا کام ہزاروں کی تعداد میں جنگی قیدیوں کو ان کے وطن واپس پہنچانا تھا، جنگ بعد دو برس تک جو بکھرے ہوئے تھے، زیادہ تر سائبیریا میں اور مشرقی و مغربی یورپ میں۔ اس پر میں زیادہ وقت صرف نہیں کرنا چاہتا اس لیے کہ اس کو نوٹیل انسٹی ٹیوٹ میں پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے۔ میں صرف اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کوشش کے نتیجے میں تقریباً 450,000 قیدی اپنے گھروں کو بھیجے گئے تھے، اور بعض پیداواری کام میں لگا دیے گئے تھے۔

اس کے فوراً بعد، لیگ نے وبا کی امراض کی، جن کا اس وقت مشرق سے، پولینڈ میں، روسی سرحدوں کے ساتھ اور خود روس میں بھی پھیلنے کا خطرہ تھا، روک تھام کے لیے کام کیا ہے۔ لیگ نے اپنے لا جواب Commission on Epidemics کے ذریعے وبا کی امراض کو پھیلنے سے روکنے کے لیے موثر کام کیا اور ہزاروں کھرونی اور بلاکت سے بچایا ہے۔

لیگ آف نیشنز کی کفالت میں یورپ بھر میں بکھرے دس لاکھ سے زیادہ روسی مہاجرین کے معاش اور انھیں خوراک فراہم کرنے کی غرض سے ایک خاص ادارے کے ذریعے کوششیں کی جارہی ہیں۔

ایشیائے کوچک اور یونان میں قحط سالوں کے مارے ہوئے مہاجرین کی مدد کے لیے کیے جانے والے کام کا تذکرہ بھی ہونا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ یہ کام ابھی مشکل سے شروع ہی ہوا ہے، مگر یہ کام بھی بڑی اہمیت کا ہو سکتا ہے۔ ان علاقوں کی موجودہ حالت میں یہاں یورپ سے بھی زیادہ بد نظمی اور مایوسی پھیلنے کا خطرہ ہے۔ اگر یہ خطرہ نا لایا کم کیا جاسکتا ہے، اگر کچھ حد تک اس جان لیوا سرطان کو ختم کیا جاسکے تو یورپی کمیونٹی

میں، ایک مرطان کم ہوگا اور بے چینی، بد امنی اور مستقبل میں ریاستوں کی تحلیل کے خطرات کم ہو سکیں گے۔ اس قسم کے کام کی اہمیت پر زور دینے کے بعد بھی، مجھے ایک بار پھر اسی طرح کرنا چاہیے۔ ہزاروں گھروں میں عرووں کی واپسی سے پیدا ہونے والی اعانت، پریشانی میں مبتلا کو پہنچنے والی امداد، یہ سب مل کر اس تھکر کو جنم دیتے ہیں جو لوگوں میں اعتماد اور کام کرنے کے ماحول میں بہتری پیدا کر دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب ان سیاسی چالوں سے کہیں بہتر ہوتے ہیں جو شاید سیاست دانوں اور سفارت کاروں کے حلقے سے آگے پہنچ ہی نہیں پاتے۔

آخر میں، روس کی امداد کے بارے میں چند الماظہ۔ یہ حقیقت کے کر لیگ نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا، جس پر مجھے افسوس ہے، اس لیے کہ مجھے پورا یقین ہے کہ، جب وقت تھا، اگر لیگ نے اپنے تمام تر اختیارات کے ساتھ حمایت کی ہوتی تو روس کے حالات کو فراپ ہونے سے بچا لیا گیا ہوتا اور اب روس اور یورپ دونوں میں حالات بہت مختلف ہوتے۔

جو کام کیے جا چکے ہیں میں ان کی زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اس امر پر زور دینا چاہتا ہوں کہ غذا اور بھوکوں تک اس کی نقل و حمل کے سلسلے میں کوئی مشکل نہیں تھی۔ جی نہیں! اس وقت دنیا میں کافی سے زیادہ اناج موجود تھا اور تقسیم کی سہولیات بھی کافی تھیں۔ مسئلہ درآمدی سرمایے کی دستیابی کا تھا، ایک رکاوٹ جو امداد کی تقسیم کی کوشش پر ہمیشہ حاوی رہی ہے مگر اس وقت ایسا نہیں تھا۔

یورپی حکومتیں کس ملین پائونڈ کا قرضہ منظور کرنے پر راضی نہیں تھیں جو گزیر معلوم ہوتا تھا اگر بھوک کے مارے روسیوں کو بچانا تھا اور قحط سالی کو الپہ بننے سے روکنا تھا، نہ صرف روس میں بلکہ تمام یورپ میں۔ اس کا ایک ہی متبادل تھا کی نئی مدد پر انحصار کیا جائے اور پوری دنیا کے افراد سے خیرات کے لیے اپیل کی جائے۔

اس کا نتیجہ توقع سے کہیں زیادہ نکلا۔ تمام ملکوں سے عطیات آنے لگے، سوائے ہمارے اپنے ملکوں کے۔ باوجود اس کے کہ ہمارے اپنے ملکوں کے لوگوں نے چندے کی مخالفت کو صحیح سمجھا تھا، پھر بھی ہمارے چھوٹے سے ملک کا چندہ اتنا بڑا تھا، جس کے لیے تھکر ماریائی پارلیمنٹ کے صدر کا، ماریائی حکومت کا اور مالیائی کمیٹی کے لاجواب کام کا، جس کی وجہ سے بڑے ملکوں نے تناسب سے امداد فراہم کی ہے، کہ اب روسی قحط سالی تاریخ کا حصہ بن جائے گی۔

یورپ سے باہر ایک معمولی بات کا ذکر ضرور کیا جانا چاہیے۔ ایک بار پھر امریکی عوام نے سب سے زیادہ دیا ہے، پہلے ہاؤور (Hoover) کے ادارے کے ذریعے اور اس کے بعد خود حکومت کی جانب سے، جس نے قحط سالی کے لیے جس ملین ڈالر اس شرط پر فراہم کیے تھے کہ روسی حکومت خود بھی حج کی خریداری کے لیے کس ملین ڈالر فراہم کرے گی۔ روسی قحط سالی کے خلاف جدوجہد کے لیے امریکا میں، سب مل کر یقینی طور پر پچاس سے ساٹھ ملین ڈالر جمع ہوئے تھے اور اس طرح بے شمار ملین خزانوں کی جانیں بچا لی گئی تھیں۔

مگر کیا بات تھی کہ کچھ لوگ مدد نہیں کرنا چاہتے تھے؟ ان ہی سے پوچھیے۔ [میرے خیال میں] زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ سیاسی معاملہ تھا۔ لوگ اپنی بالنبھہ امانیت کو بڑھانے کا کرپیش کرتے ہیں اور وہ ایسے لوگوں کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے جو مختلف انداز میں سوچتے ہیں، نہ ان خصوصیات پر غور کرتے ہیں جو آج یورپ کے لیے بڑا خطرہ ہیں۔ وہ ہم کو رومانوی، کم زور، بے وقوف اور جذباتی مثالیت پسند کہتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ہم اپنے مخالفین کی اچھائیوں پر بھی کچھ یقین رکھتے ہیں، اس لیے کہ ہم غلطی سے زیادہ مہربانی پر یقین رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ بہت مرادہ مزاج ہوں، مگر ہم خطرناک نہیں۔ مگر وہ لوگ جو اپنے سیاسی پروگراموں کے سالیے میں بے حرکت ہو جاتے ہیں، جو بنی نوع انسان کو، بھوکوں کو اور گروڑوں کو مرنے والوں کو کچھ نہیں دیتے۔ وہ یورپ کے لیے تازیانے کی مثال ہیں۔

تباہیوں ہی نئی اور خوفناک قحط سالی کے خطرے میں نہیں ہے۔ یورپ کی حالت بھی خاصی خراب ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کب ختم ہوگی۔ اور ملکوں کو چھوڑ کر، روس میں بھی محرومیاں اتنی بڑھ گئی ہیں، اتنی ناقابل تخیل ہیں، حالات اتنے پریشان کن ہیں کہ وسیع پیمانے پر کی جانے والی فراخ دلی بھی سمندر میں ایک قطرے کے برابر ہے۔

یورپ کو اس کام میں ہاتھ بٹلا چاہیے۔ ہمیں شعلہ بردار صلیب اٹھانی اور مشعلیں جلا لینی چاہئیں تاکہ وہ تمام پہاڑوں سے چمکتی دکھائی دیں۔ ہمیں ہر ملک میں اپنے علم بلند کر دینے اور دنیا کے اطراف بھائی بندی کے سلسلے بنانے چاہئیں، حکومتوں کو بھی کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑا ہو جانا چاہیے، جنگ کی صف میں نہیں، بلکہ نئے عہد کے حصول کی سنجیدہ کوشش میں۔

بڑے دن (گرتیس) کی آمد آمد ہے، اور بنی نوع انسان کے لیے پیغام ہے: زمین کے لیے امن۔ محروم اور حیران بنی نوع انسان نے آج سے پہلے کبھی امن کے شہزادے کا، سخاوت و مہربانی کے شہزادے کا اتنی بے چینی سے انتظار نہیں کیا تھا، جو ایک سفید علم بلند کیے ہو اور جس پر منہرے الفاظ میں لکھا ہو "کام"۔

ہم سب، نئی نسلیں میں نئے جذبے پیدا کرنے کے لیے، زمین پر مارچ کرتی ہوئی اس کی فوج کے کارکن بن سکتے ہیں۔ اپنے ساتھی آدمیوں کے لیے محبت اور امن کی سنجیدہ خواہش۔ کام کرنے کی خواہش پیدا کرنے اور کام کو پُر اظہار بنانے کے لیے۔ ایک نئے دن کی نئی صبح پر یقین کے لیے۔

ہالمار براؤننگ کرچین لانگ

تقریب تجلیل کے بارے میں ایک رپورٹ

آج براؤننگ اور لانگ کو انعام دیے جانے کے موقع پر پروفیسر ہالمدان کوٹ (Halwadan Kohi) نے ایک طویل تقریر کی تھی۔ انھوں نے ان دونوں حضرات کی امن کے لیے کی جانے والی سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہوئے براؤننگ کے سیاسی کام پر زور دیا، جس کی انھوں نے سوشلزم سے ابتدا کی تھی اور جس نے انھیں ایک عملی مدبر اور امن کا بین الاقوامی رہنما بنا دیا ہے۔ اس کا عملی ثبوت انھوں نے سویڈن اور ناروے کے درمیان اتحاد کے پرامن ہندوبست کی کوششوں کے ذریعے کیا تھا۔

مقرر نے امن کے لیے کیے جانے والے لانگ کے کام کی مسحور شکن تصویر کشی کی، ایسا کام جو براؤننگ کے اپنے امدادی کار سے بہت مختلف رہا ہے۔ انھوں نے لانگ کو ایک غفیم منتظم کہا جو چیزوں پر عملی دسرس رکھتا ہے، کبھی خم نہ ہونے والی مثالیت، علم کی دولت اور اچھے برے دونوں وقتوں میں اپنے فرض کی ادائیگی کے عزم سے مالا مال ہے۔ انھوں نے پچھلی جنگ کی بابت ایسے ثبوت پیش کیے ہیں، جو کسی اور آدمی نے نہیں کیا ہے۔ براؤننگ اور لانگ جن کو امن انعام دیا گیا ہے، دونوں واقعی اس کے حق دار تھے، اور ہمارے لیے یہ اعزاز اور مسرت کی بات ہے کہ یہ دونوں حضرات ان دو رشتے دار ہمسایہ ملکوں کے نمائندے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

خطبہ ہالمار براؤننگ
قوموں کے درمیان برادری

امن انعام کے بارے میں نو بیل کے وصیت نامے کی بنیادی دفعات میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ انعام

اس مرد یا عورت کو دیا جائے جس نے "قوموں کے درمیان برادری کے لیے، فوج میں تخفیف کے لیے، امن کانفرنسوں کے انعقاد اور فرد بخ کے لیے کام کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"قوموں کے درمیان برادری" کو پہلے درجے پر رکھا گیا ہے۔ گویا اس نے اپنا عظیم ہدف خود متعین کیا ہے۔ دوسرے نکات میں کچھ لازمی شرائط اور ان کے حصول کے طریقوں کا ذکر ہے، جو کوشش کرنے اور تمنا کرنے کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں جو اس وقت غالب تھے جب وصیت نامہ لکھا گیا تھا۔ اس کی ضابطہ بندی خود تاریخ کے ایک مخصوص عہد کی مثال پیش کرتی ہے۔ قوموں کے درمیان برادری بہر حال انسانی فطرت کی عمیق ترین خواہش کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک ہزار برس کے دوران سب سے زیادہ ارتقاء یافتہ ممالکوں میں سے کچھ کے لیے یہ ایک آدرش کی مثال رہی ہے؛ پھر بھی تمدن کی تمام تر ترقی کے باوجود کوئی بھی آگے بڑھ کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مستقبل قریب میں یہ ہدف حاصل کر لیا جائے گا۔ پہلے بھی کہتے ہی توجہ سے محروم کیوں نہ رہے ہوں، قوموں کے درمیان واقع شکاف اور خلیج پوری طرح ظاہر ہو گئی تھی جسے عالمی جنگ نے مزید کھرا کر دیا ہے۔ اور توڑی ہوئی دنیا کے درمیان کے خلاؤں پر پل بنانے کا جرأت مندانہ کام ابھی مشکل سے شروع ہی ہوا ہے۔

اس سے مطلب نہیں کہ اس کا ہدف کتنا ہی دور کیوں نہ ہو، اور اس سے بھی مطلب نہیں کہ وہ مراب خیال کتنی شدت سے ٹوٹا ہوا ہوگا ہم اکثر جس پر غور کرتے ہیں کہ مستقبل میں متقدم قوموں کے درمیان جنگ ویسی ہی ناقابل یقین ہوگی جیسے کہ وہ اسکیپڈی نیویائی اور ملکوں کے درمیان جنگ، مگر ایک بات یقینی ہوگی: ان لوگوں کے لیے جو انسانیت کی پرورش کرتے ہیں، اس کے باوجود کہ یہ پچھلے برسوں بربریت کی طرف لوٹ گئی تھی، ایک ہی راستہ ہوگا اور وہ قوموں کی برادری کے لازوال آدرش کا راستہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اس سلسلے میں مجھے قوم پرستی اور بین الاقوامیت کے موضوع پر تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس قسم کی بین الاقوامیت جو کسی قوم کی اپنی مرحدوں کے اندر بھی جا کھیت کوڑ کر رہی ہو اور جس کا مقصد عالمی اتحاد کے حق میں اس کی مکمل نیستی و نابودی ہو، کبھی سچے بین الاقوامی جذبے کی بگاڑی ہوئی تصویر سے زیادہ نہیں ہو سکتی اس وقت بھی جب سیاق و سباق سے ہٹ کر اقتباسات کی بددشطل حال ہومثال کے طور پر، مشہور و معروف کمیونسٹ مینی فیستو کے الفاظ "مزدور کا کوئی وطن نہیں ہوتا"، ایگسٹاف ہرنے (Gustave Hervé) کی طرح، جس نے جنگ کے دوران شدید طور پر قوم پرست ہونے سے پہلے، فرانسیسی مزدوروں کو ترغیب دی تھی کہ وہ غلامت کے ڈھیر پر فرانس کا پرچم نصب کریں اس کے باوجود اس قسم کے تصورات کو کہیں کے عوام کے جذباتوں میں جگہ نہیں ملی۔

اس قسم کے طرز انکسار کی ہمت افزائی سے ملنے والی مدد دنیا دی طور پر خود وطن کو سماجی حالات میں الجھا دیتی ہے جو اس وقت اس میں موجود ہوتی ہے۔ اپنی کتاب "The New Host" میں [فرانس کا مشہور کمیونسٹ رہنما] Jaurès یا دلاتا ہوئے کہتا ہے کہ سماجی اور سیاسی طور پر مراعات یافتہ لوگوں نے کتنی بار یقین

کیا ہے، یا یقین کرنے کا بہانہ کیا ہے کہ ان کے اپنے مفادات وطن کے مفادات سے ملتے جلتے ہیں؟ "رسم و رواج، روایات، اور اتحاد کی حیوانی جبلت جو مل کر وطن پرستی کے تصور کی تشکیل کرتے ہیں، اور شاید اس کی نفسیاتی بنیاد تیار کرتے ہیں، اکثر رجعت پسند قوتوں جیسے کہتے ہیں۔ انقلابی، ایجاد کرنے والے، لوگ جو بڑے درجے کے قانون کی نمائندگی کرتے ہیں، انھیں ایک نئی اور برتر قوم کو قدامت کے جنگل سے آزاد کرنا ہوتا ہے جب مزدور اپنے ملک کو بڑا بھلا کہتے ہیں تو، وہ دراصل سماجی مایوسیوں کو بڑا کہہ رہے ہوتے ہیں جو ان پر دباؤ کی صورت چھائی ہوئی ہوتی ہیں، اور یہ ظاہری ملامت صرف ایک اظہار ہوتی ہے ایک نئی قوم کی آرزو مندی کی۔"

عالمی جنگ کے تجربات کے بعد اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ خیال صحیح تھا! قوم پرستی اور بین الاقوامیت کے درمیان تناقض کتنا مطلق دکھائی دیتا ہے جب اس کو میز سے میز سے اور یک طرفہ نمائشی فرائض اور ان کی خصوصیت کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے، جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اس عظیم انسان نے لکھا تھا "وہی مزدور جو آج paradoxical جملے غلط طور پر استعمال کر رہے ہیں اور اپنے وطن کے بنیادی تصور کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کر رہے ہیں، اس دن کھڑے ہو جائیں گے جب ان کی قومی آزادی خطرے میں ہوگی۔" "تیسرا اہم الفاظ تھے جنگی محاذ کے دونوں جانب سے صادر کیے ہوئے، اس کے باوجود ان کا قیاس کیا گیا تھا، قبل اس کے کہ کچھ بھی دائرہ لگا ہو، کہ دونوں طرف کے ملک پر بلا کسی روک ٹوک کے چڑھائی کی جاسکتی ہو۔"

بالکل یہی عیسائی احساں ہے قوم کی اہمیت کا، جو بعد میں کئی بین الاقوامیت کی ابتدا کا نقطہ آغاز بن جاتا ہے، انسانیت کے لیے جو بے وطن انیم کا ذرہ نہیں بنا ہوتا، بلکہ مقتدر قوموں کا آزادانہ اتحاد ہوتا ہے۔ عالمی جنگ اور امن کے نتیجے میں جس کی خامیاں اور خطرات سے کوئی انکار نہیں کرتا، کیا ہم ان عظیم تمناؤں، امن اور بھائی چارے کی امیدوں میں اتنے زیادہ دیر نہیں چلے گئے ہیں جتنے کہ دس میں برس قبل تھے؟

میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ حالیہ برس ان کے بارے میں ازالہ التباس (disillusionment) لائے ہیں انسانیت جو کبھی کی حاصل کر چکی ہے۔ مگر یہ ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں مایا لاکھان برسوں کو، ہم جن میں زندہ رہے ہیں، فساد اور ایسی کا عرصہ کہا جائے۔

(1)

تجربہ نو کے نشانات بہت سارے بھی ہیں اور امید افزا بھی، جو ناامیدی کی اجازت نہیں دیتے۔ تاریخ کی ابتدا کے بعد سے آج تک، وحشی قبائلی کے درمیان ابدی جنگوں کے درمیان، اور اس کے بعد کے ادوار میں بھی جن میں جنگیں ہوئیں اور تباہیاں آئی ہیں مگر ہماری فسل نے کبھی اتنا مرکوز عرصہ فساد کا اور دنیا کے ایک

بڑے حصے کی تباہی کا نہیں دیکھا تھا جیسا کہ 1۵14ء میں شروع ہوا تھا۔

پھر بھی، اتنی زبردست تباہیوں کے باوجود بھی، ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اسی سخت دردِ زہ سے ایک نیا یورپ پیدا ہوا ہے۔ تین بڑی عسکری بادشاہیاں جو بنیادی طور پر جاگیردارانہ انداز کی تھیں، زمیں بوس ہو گئی تھیں اور ان کی جگہ ایسی ریاستوں نے لی ہے جن کے آئین پہلے کے مقابلے میں زیادہ شدت سے قومیت کے اصولوں اور عوام کے حقوق خود اختیاری کا اعادہ کرتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ عوام نے، جن کے لیے یہ تبدیلی آزادی کا پہلا فائدہ اور ایک زیادہ روشن مستقبل لے کر آئی ہے، اپنے عزم کو بھٹکنے کی اجازت نہیں دی ہے، اس سے قطع نظر کہ انھوں نے کن صعوبتوں اور دکھوں کے بعد یہ آزادی حاصل کی ہے۔ ہماری اپنی مشرقی سرحدوں پر، جہاں ہم نے ایک نئی ریاست فنلینڈ (Finland) کی پیدائش کی خوشی دیکھی تھی، اس کے نیچے، بلقان کے مسائل کے کنارے، تین بلقانی ریاستیں بننے لگی ہیں، ان کے ملک پولینڈ، آزادی کے شہیدوں کی مرزین، چیکو سلوواکیا، جان ہس (John Huss) اور کیٹس (Gemeius) کا وطن، اور پورے جنوب مغربی یورپ کی کم و بیش دوبارہ بنائی ہوئی ریاستیں۔ ان سب میں، بھرپور اضافے ہوئے ہیں، اس لیے کہ ان سب کے لیے اب قومی سطح پر ترقیات کے لیے بے تحاشا اضافے کے امکانات ہیں، بالآخر جو دنیا کے لیے بھی فائدہ مند ہوں گے، ہم سب جس کے مالک ہوں گے۔

میں اس امر سے قطع نظر نہیں کر پا رہا ہوں کہ یورپ کی سیاسی کمیونٹی کی ان آزاد ریاستوں کا ظہور نہ صرف شاہِ خرچ بیٹوں کی واپسی جیسا واقعہ ہوا ہے بلکہ یہاں وہاں چھوٹے موٹے تنازعے بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ لہذا اب ہمارے سامنے اور بھی وجہ ہے دوسری قومیت کے فوائد پر ارتکاز کی، جو برسوں کے نظریات کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں؛ لیگ آف نیشنز کی ابتدا، جس میں ارکان کے درمیان تنازعات، طاقت و عسکریت کے ذریعے نہیں، بلکہ قانونی طریقوں سے نمٹائے جاتے ہیں۔

یہ بات عام طور پر کہی جا رہی ہے کہ لیگ آف نیشنز ابھی تک وہ کچھ نہیں بن سکی ہے، اس کے بے حد پر جوش پیش کار جو چاہتے تھے۔ صدر ورسن کے اپنے ملک کی، اور ان غنیمت مگر مغلوب قوموں، جرمنی اور روس، کی غیر حاضری، اسے واضح انداز میں اس کی صلاحیت کی حد بندی کو اجاگر کر رہی ہے کہ جب اس پر تنقید کرنے والے اس کو فائین کی لیگ کہتے ہیں تو یقیناً ان کے پاس اس کا کچھ جواز ضرور ہوتا ہے۔ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود جن کا ازالہ کیا جاسکتا ہے، اگر ہماری تہذیب کو باقی رہنا ہے تو یہ سمجھیے کہ لیگ آف نیشنز۔ پہلی بار ایک بڑی عسکری تباہی کے بعد۔ چھوٹی بڑی، آزاد اور خود مختار قوموں، اور دنیا بھر میں، دیر پا امن اور انصاف کے لیے نئے درکھولنے میں کامیاب ہو رہی ہے۔

کتنی عجیب اور قابلِ دید بات ہے کہ انٹرنیشنل کوئٹل کے بنیادی خیالات لیگ آف نیشنز کی صورت میں دوبارہ ابھر رہے ہیں۔ میں قوموں کے درمیان برادری سے متعلق اس کی وصیت سے اقتباس پیش کر چکا ہوں؛ مثال کے طور پر، اسلحہ جات میں کمی اور امن کا گھڑیسوں کے فروغ کے بارے میں۔ پوری دفعہ 8 میں جا

بہا اس طرح جات میں کمی کے احکام دیے گئے ہیں، اگرچہ بہت محتاط انداز میں۔ اور لیگ کی اسمبلی کے ممالک نے اجتماعات دراصل باقاعدہ امن کا گھر سمیں ہی تو ہیں جو مثال ریاستوں کو کسی حد تک ایک دوسرے سے مربوط کر رہی ہیں، جسے چھینیں برس قبل کے مدبرین محض یونیورسٹی خیال ہی کہہ سکتے تھے۔ مگر ان کے خیال میں مشابہتوں کی لکیریں بہت آگے تک جاتی دکھائی دے رہی ہیں۔ 1906 میں اوسلو میں دیے گئے اپنے خطبے میں برتھ فان سٹھر (Bertha von Suther) نے انٹرنیشنل نوٹیل کے ایک نئی خط سے، جو اس کو لکھا گیا تھا، اقتباس پیش کیا تھا: "یہ بہت جلد ہونے والا ہے کہ تمام ریاستیں خود اپنے آپ سے عہد کریں گی کہ وہ سب مل کر جارحیت کرنے والے پر حملہ کریں گی۔ اور یہی طریقہ جنگ کو ناممکن بنائے گا، بلکہ بے رحم اور نامعقول ترین طاقت کو بھی ثالثی عدالت کے سامنے فریاد کرنی پڑے گی، یا پھر وہ خاموش ہو کر بیٹھ رہے گی۔ اگر سرکاری اتحاد میں تین ریاستوں کے بجائے ہر ریاست مثال ہو جائے تو صدیوں کے لیے امن یقینی ہو جائے گا۔"

اس موقع پر نا کہ بندی کا خیال بڑے پختے انداز میں ہمارے سامنے میں آ رہا ہے۔ خوش قسمتی سے عہد نامے کی دفعہ 16 میں یہ بات نہایت نرم انداز میں پیش کی جا چکی ہے۔ پچھلے برس، لیگ آف نیشنز کی اسمبلی نے، اسکیڈے نیویائی قوموں کی ایما پر، تمام دفعات میں مزید حد بندی اور تشریح کی ہے اور نا کہ بندی میں حصہ لینے والی ریاستوں کے فرائض کی صراحت بھی کی ہے۔ مگر نوٹیل کا بنیادی خیال پورا کیا جا چکا ہے۔ پوری اجتماعی طاقت کو ضرورت کے مطابق، کم یا زیادہ دباؤ کے ساتھ جارح کی جانب موڑ دیا جائے گا۔ بغیر کسی ورائے قومی تنظیم کے، جس کا موزوں وقت ابھی نہیں آیا ہے، موجودہ رہنمائی اسی نوعیت کی ہے حالات جس کی اجازت دے رہے ہیں، جیسا کہ ماضی میں ہوا تھا، جب ریاست نے رہنماؤں کے خلاف انفرادی طور پر اختیار استعمال کیا تھا جب وہ اپنی مرضی پر پابندیاں برداشت کرنے کے عادی نہیں تھے۔

ایک ایسی لیگ کے لیے، جس میں چند کے بجائے تمام ریاستیں شامل ہوں، اوپر پیش کیے گئے خیالات کو ہماری ہمت افزائی کرنی چاہیے کہ ہمیں آج بھی اس مطالبے پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہیے جو ہم چھوٹے، نام نہاد غیر جانب دار ممالک کو ضیاع یا کسی اور جگہ پیش کرنا چاہیے: اپنے فرائض پورے کرنے کے لیے لیگ آف نیشنز کو آفاقی ہو جانا چاہیے۔

کوئی بھی قوم اتنی بڑی نہیں ہے کہ وہ برحق ہوئی آفاقی لیگ سے آئندہ بھی باہر رو سکے۔ پھر بھی، حالات کے پیش نظر، چھوٹی ریاستوں کو اس کی ترقی اور فروغ کے لیے جتنا بھی ممکن ہو کرنے کے لیے خاص وجوہ ہیں۔

لیگ کے ارکان کے درمیان برابری، جو ہر ریاست کو ایک ووٹ دیتی ہے، متعلقہ طاقتوں کے مادی وسائل کے باعث حقیقی ناممکن نہیں کر سکتی۔ بڑی طاقتیں جو مختلف نیتوں کے باعث، دنیا کے فروغ کو نیکی یا بدی کی طرف مائل کرتی ہیں، یا تو انسانیت کے ایک بلند تصور سے رابطے کراتی ہیں، یا چہر کی لاپٹی خواہشوں کی معاونت کرتی ہیں، اپنے ووٹ سے کہیں زیادہ رسوخ کا دباؤ ڈالیں گی، اس مستقل حمایت کے علاوہ جو انھیں تابع ریاستوں کے ووٹ سے مل سکتا ہو یا نہیں۔ پھر بھی، ایک باقاعدہ تسلیم شدہ برابری چھوٹی

قوموں کو ایسی حیثیت دیتی ہے جسے وہ پوری انسانیت کے آدرش کے مفاد میں استعمال کر سکتی ہیں۔ اس کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ جہاں تک ممکن ہو، ہم مزاج ہو کر کام کریں۔

یہاں، شمال میں کئی برسوں سے ہم میں فطری طور پر یہ احساس رہا ہے کہ جب ہمارے نمائندے کسی بین الاقوامی میٹنگ میں یک جا ہوتے ہیں تو ہم یا ہی مفاد اور حمایت کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس تلاش میں ہم میں سے کسی کی ایسی کوئی خواہش پوشیدہ نہیں ہوتی کہ وہ کسی کی آزادی اور رائے میں مداخلت کرے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ جسے یہ تجربہ ہوا ہے، یہ محسوس کرنے سے قاصر رہا ہے کہ ہمارے سیاسی اتحاد سے ہماری طاقت میں خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ خوش قسمتی سے، حال ہی میں، یہ ایک اصول مابین گیا ہے کہ ہمارے تینوں عوام کے نمائندوں کے خیالات ایک جیسے ہی ہوں۔

مزید یہ کہ یورپی مسائل کی نوعیت نے اکثر ہمارے معاہدے کو شمال کی حدود سے باہر نکالا ہے۔ دوسری قومیں بھی، جو عالمی جنگ میں شامل نہیں تھیں، بہتر حالات کو یقینی بنانے کے لیے ایسے ہی خیالات کی حامل ہیں۔ خود خیالات کی یکسانیت ہی ان طاقتوں کے سیاسی اتحاد کا باعث ہوئی ہے جو جنگ کے درمیان غیر جانب دار تھیں۔ جنیوا میں اکثر، غیر جانب دار ریاستیں [آلمی کے شہر] جنیوا (Geneva) کی ابتدائیات پر متفق تھیں اور خود جنیوا بھی خیالات کی بالکل فطری تبدیلی کی علامت بن گیا تھا۔ ہمیں درپیش مسئلے کی یکسانیت اتنی عام سی ہو گئی تھی کہ طاقتوں کی دوسری کانفرنسوں میں ہم "غیر جانب دار" کو گول کی جیسا کہ ہمیں کہا جاتا تھا، اہم ویلی کمیٹیوں میں خاص کر نمائندگی دی جاتی تھی۔

جہاں تک کہ دنیا کی تعمیر نو کا معاملہ ہے، تمام قوموں کے مفاد کے مرکز، ایک جیسے رویے رکھنے والے بلاک، لیگ کے اندر رہ کر بھی کام کریں گے۔ ایسی کوئی وجہ نہیں کہ مخصوص نکات پر نام نہاد غیر جانب داروں اور ایک سے زیادہ بلاک والوں کے لیے معاہدے ممکن اور مفید نہ ہوں، جو لیگ آف نیشنز میں موجود ہیں یا تشکیل کے مراحل میں ہیں۔ فن لینڈ اور بلقان کی ریاستوں سے ہماری مضبوط تہذیبی نسبت ہے۔ Entente کی ریاستیں اکثر ایسے ترقی پسند تصورات پیش کرتی ہیں جو بڑی طاقتوں کے ایک طرفہ تصورات سے مختلف ہوتی ہیں؛ اور جنوبی امریکا کی قوموں کے نمائندے ان ہی کی طرح آپس میں مل کر قدم اٹھانے کے رجحان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بن حیث انگل، لیگ آف نیشنز، جیسا کہ لوگ وقتاً فوقتاً کہتے رہتے ہیں، ناگزیر طور پر غوار ہو کر پہلے ایک کا اور بعد میں دوسری طاقتوں کا ضمیمہ نہیں بن جاتی۔ اگر ہم سب بہترین انداز میں اس حقیقی امن اور عوام کے درمیان مصالحت کے لیے اپنا کام کریں، جنھیں لیگ کے اندر رکھ کر آگے بڑھنا ہمارا پہلا فرض ہے، تو ہم توجہ کے حق دار ہو جائیں گے، اگرچہ چھوٹی قوموں کی حیثیت میں، ہم اتنے تنہا اور بے بس ہیں کہ اس کیلئے ہم سیاست کی دنیا میں بڑی طاقتوں پر بہت کم دباؤ ڈال سکیں گے۔

میں ایک اور مشاہدہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ صرف لیگ آف نیشنز ہی وہ تقریباً مرکزی ادارہ نہیں جس نے اپنے پرچم پر امن کا قیام بذریعہ قانون لکھوا رکھا ہے۔ ایسے بہت سے لوگ تھے جو جنگ

سے پہلے بین الاقوامی مزدور تحریک سے تقریباً لاعلم تھے مگر جب جنگ کا خطرہ پیدا ہوا تو اپنی ہمت کے لیے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھیں امید تھی کہ مزدور کبھی جنگ کی اجازت نہیں دیں گے۔

مگر اب ہمیں نظر آ رہا ہے کہ یہ امید بالکل تھیں۔ جنگ شروع ہو گئی، ایسے بنیادی تشدد اور ہر قسم کے ذرائع کے ساتھ جو دائے عالمہ کو ایسی راہ دکھانے یا گم راہ کرنے لگے کہ کسی کو بھی سوچنے سمجھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ مگر تمام ہشت اور خوف کے بعد، کیا یہی ہوگا کہ جنگ کے خلاف مزدوروں کے موجودہ جذبات، جو نئے پیمانے پر موجود ہیں، سرکاری کیفیت میں اسی قسم کی کی نا طاقی کا مظاہرہ کریں گے؟ اس وقت بین الاقوامی سیاست مزدوروں کے سر ہتھے اور ہر جگہ اشتراکیت (Bolshevism) کے پیدا کردہ شگاف کی وجہ سے کم زور ہو چکی ہے، مگر ایمسٹرڈیم (Amsterdam) کی بین الاقوامی ٹریڈ یونین پہلے کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہے۔ اس کے میں ملین ارکان وہ طاقت ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اور جنگ اور جنگ کے خطرے کے خلاف عوام میں ان کا لگاؤ تاریخی و بیگنڈا جاری ہے۔ اب سے چند برس بعد ایسا ہوگا کہ جب کوئی یہ سوال کرے گا کہ ماضی قریب میں کس نے ٹریڈ یونین کے جذبہ امن کے لیے زیادہ کام کیا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ جواب ملے: Amsterdam International نے!

آئیے، ہم ایک بار پھر لیگ آف نیشنز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ایسے کسی ادارے کی تشکیل، جو نمراتے ہوئے مفادات اور انا پرست خواہشات کی دنیا میں امن کی حفاظت کرنے کی حیثیت میں ہو، نہایت خطرناک کام ہے۔ مگر مشکلات کو ہمیں روک لینے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ اب مل جیسے برائے (James Bryce) کے چند جملوں پر [اپنے خطاب کا] اختتام کرنا چاہوں گا، جو امن اور انسانیت کے جمہوریت کی وصیت کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

”رکاوٹیں ناقابل عبور نہیں ہوا کرتیں۔ مگر وہ جیسی بھی ہوں، ہمیں ان کا سامنے سے مقابلہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ وہ ان خطرات کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہیں جو ہماری تہذیب کو تباہ کر دیتے رہیں گے اگر موجودہ حالات کو اسی طرح جاری رہنے دیا جائے۔ دنیا کو اس کے موجودہ حال پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اگر قومیں جنگ کے نام و نشان منانے کی کوشش نہیں کریں گی تو جنگیں ان کو ہی کو منادیں گی۔ جو قومیں امن کی قدر کرتی ہیں انھیں کسی قسم کا قدم اٹھانا ضروری ہوگا، اور مشکلات سے پیچھے ہٹنے کے بجائے ہمیں اس ضرورت کا اعتراف کرنا اور آگے بڑھنا ہوگا۔“

خطبہ کر سچین لاسکے

بین الاقوامیت

{1}

نوبل فاؤنڈیشن کے اصول کے مطابق، ہر انعام پانے والے کو اس کام کے بارے میں ایک عوامی خطبہ دینا پڑتا ہے جس شعبے میں انعام دیا جا رہا ہو۔ آج اس فرض کی بجا آوری کے سلسلے میں فطری طور پر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھے اس کام کے بارے میں تفصیلات بھی بیان کرنی چاہئیں جو بین الاقوامی امن اور قانون کے لیے کیا جا رہا ہے، جو کام میری کوششوں کا بھی حصہ ہے۔ غالباً یہ بتانا غیر ضروری ہو گا کہ یہ بیان ان تفصیلات کی اصل نہیں ہے، اس کے لیے بہت سے میدانوں سے مواد لینا پڑے گا، میں جن میں نووارد ہوں۔ زیادہ سے زیادہ اس طریقے کے اصل ہونے کا دھوکا کیا جاسکتا جس میں مواد اکٹھا کیا گیا ہے اور جس جذبے میں اسے پیش کیا جا رہا ہے۔

میں بین الاقوامیت پر بات کروں گا 'امن پسندی' پر نہیں۔ ثانیاً اند کر لفظ مجھے کبھی پسند نہیں آیا ہے یہ انسانی اعتبار سے غلط ہے، جو یک طرفہ امن کی تحریک کی معنیت کی طرف توجہ مبذول کرتا ہے، جنگ کے خلاف جدوجہد، "antimilitarism" ہماری کوششوں کے لیے زیادہ موزوں لفظ ہے۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کی میں امن پسندی یا antimilitarism کے خلاف ہوں، یہ ہمارے کام کے ضروری عناصر ہیں۔ مگر میں ان اتفاق کو ایک اخلاقی نظریہ، ایک مخصوص تعبیر دیتا ہوں [جنہیں آفاقی طور پر قبول نہیں کیا جاتا] امن پسندی کو میں اخلاقی احتجاج اور تشدد کے استعمال کے خلاف اور بین الاقوامی رابطوں میں جنگ سمجھتا ہوں۔ امن پسند عموماً کم از کم آج کل — بین الاقوامی ہوتا ہے یا اس کے برعکس۔ مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ امن پسند کے لیے کسی بین الاقوامی کی طرح سوچنا ضروری نہیں۔ مذرتجہ کے یسوع مسیح امن پسند تھے، مگر ان کی باتیں، جو ہم تک پہنچ پائی ہیں، بتاتی ہیں کہ ان کے نزدیک بین الاقوامیت ایک غیر ملکی تصور تھا، اس وجہ سے کہ انہوں نے کبھی سیاسی انداز میں نہیں سوچا تھا، وہ قطعی غیر سیاسی تھے۔ اگر ہم انہیں آج کے زمروں میں رکھنا چاہیں، تو ہمیں ان کو antimilitarist اور ایک انفرادیت پسند نرمانی کہنا ہو گا۔

بین الاقوامیت ایک سماجی اور سیاسی نظریہ ہے، ایک خاص تصور، کہ انسانی سوسائٹی کی کس طرح تنظیم کی جانی چاہیے، اور بالخصوص اس کا تصور کہ قوموں کو اپنے ہی تعلقات کو کس طرح منظم کرنا چاہیے۔

یہ دونوں نظریے، قومیت اور بین الاقوامیت، ایک دوسرے کے خلاف کھڑے نظر آتے ہیں، اس لیے کہ یہ اس سوال کے دو مختلف پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ اس طرح یہ کبھی کبھی دوسرے کی سیاست میں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں، جس میں زیادہ تر انفرادی معاملات کے فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ مگر، ایک بلند سطح کے اتحاد میں — نیگل کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کی آخری آمیزش میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف، بین الاقوامیت، اپنے نام کے اعتبار سے، جانتی ہے کہ قوموں کا وجود ہوتا ہے۔ یہ یک طرفہ قومیت کے بجائے محض ان کی گنجائش کو محدود کرتی ہے۔

دوسری جانب، قومیت اور عالمیت کے درمیان ایک جتنی آویزش ہوتی ہے۔ ثانیاً اند، اس سے ہٹ کر

دیکھتی ہے اور قومی آویزشیں اور اختلافات کو دور کرتی ہے، ان میدانوں میں بھی جن میں بین الاقوامیت اس حقیقت کو نہ صرف قبول کرتی ہے بلکہ اس بات کی حمایت بھی کرتی ہے کہ قوموں کو زندگی کے اپنے طریقے پیدا کرنے چاہئیں۔

(2)

تمام نظریات کی طرح، بین الاقوامیت کو اقتصادی اور تکنیکی میدانوں میں اپنی اس صلاحیت کرنی چاہیے؛ ان ہی میں سوسائٹیوں کے فروغ کے فیصلہ کن اور عمیق عناصر پائے جاتے ہیں۔ دوسرے عناصر بھی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، مذہبی عقائد، جو اکثر سوسائٹیوں کی تشکیل میں اثر انداز ہوئے ہیں، یا عقلی تحریکوں میں مگر یہ سب ضمنی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی تو یہ ثانوی نوعیت کے اخذ کردہ ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کے فروغ میں سب سے اہم عناصر، اقتصادی اعتبار سے، تقسیم کار، اور تکنیکی اعتبار سے، خود نظام تقسیم میں، ممنوعات کے خیالات کا تہا ملہ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، کسی مخصوص وقت میں فروغ بذریعہ نقل و حمل اور مواصلات۔

ہم علم الاقوام اور تاریخ سے سماجی گروہوں کی ترقی کے تین درجات اخذ کر سکتے ہیں، امکانات کے ذریعے محدود کیے ہوئے، بذریعہ اقتصادی اور تکنیکی ترقی، قہائی گروہ جن کے ارکان مفلس ہوتے ہیں۔ زرعی کمیونٹی، شہری ریاست، جہاں تقسیم کار کی وسعت محدود ہوتی ہے، علاقائی ریاست اور کم و بیش وسیع بادشاہت جس میں تقسیم کار اور تہا ملہ ممنوعات بڑے پیمانے تک پہنچ جاتے ہیں۔ جب بھی اقتصادی اور تکنیکی ترقی ایک قدم آگے بڑھتی ہے، سیاسی تحریکوں کی تخلیق کے لیے طاقتیں ابھرتی ہیں، کسی اقتصادی-تکنیکی سطح پر، یہ کم و بیش ایک حقیقت بن چکی ہے۔ یہ جدوجہد کے بغیر کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ ماضی بے شک ہو جاتا ہے اس لیے کہ ہم عصر سیاسی جماعتیں یا صاحبان اقتدار نئے زمانے کی ضرورت کے مطابق بالارادہ بہت کم جھکتے ہیں، اور چوں کہ ماضی کی چمک دمک اور روایات کی عام طور پر قلب مابین ہو جاتی ہے، شاعرانہ یا مذہبی غلامتوں میں، جذباتی شکلوں میں، جن کا نئے دور کی عملی اور پیوستگی کی ضروریات کے ذریعے انکار کر دیا جانا چاہیے۔ ایسے سماجی گروہ کے اندر ہی ایک احساس استحکام چھا جاتا ہے، مجبوراً ایک ساتھ کام کرنے میں اور اس سے لطف اٹھانے میں، جو ایک بلند اخلاقی قدر کا نقش ہوتی ہے۔ یہ احساس اکثر حاکم مذہب کے ذریعے، جو عام طور پر باطنی انگہار ہوتا ہے گروہی احساس کا۔ گروہ کے اندر جنگ کرنا حرم ہوتا ہے، جب کہ دوسرے گروہ سے جنگ کرنا مقدس فرض ہوتا ہے۔

آج ہم علاقائی ریاست سے عالمی کمیونٹی کی طرف لے جانے والے ایک ٹپ پر کھڑے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے ہم اب بھی علاقائی ریاست کے تصور کے محکوم ہیں، اقتصادی اور تکنیکی اعتبار سے ہم عالمی ذرائع ابلاغ اور عالمی مشینوں کی سرپرستی میں زندہ رہتے ہیں۔

علاقائی ریاست سوسائٹی کی اتنی قدیم شکل ہے، یہاں یورپ میں ہزاروں برس کی، کہ اب اسے عہد کا

احرام اور روایت کی شان و شوکت بچائے رکھتی ہے۔ ایک مضبوط مذہبی احساس، احرام اور وطن سے عقیدت آپس میں خلط ملط تھا۔

آج کی علاقائی ریاست ہمیشہ اپنا ”قومی“ لمبا دھڑبڑ بن کرنے پر تیار رہتی ہے۔ وہ قومی احساس میں اس کی اسس دیکھتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے، کم از کم پرانی ریاستوں کے معاملے میں قومیت یا وطنی احساس، ریاستی احساس کی پیداوار ہوتا ہے۔ صرف حال میں، انیسویں صدی کے درمیان، اور پھر صرف یورپ میں، ریاستوں کے بہت سے پیکروں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے، جو ایک ارادی قومی احساس نے پیدا کیے ہیں۔ خاص کر، عالمی جنگ کے بعد امن کے دوبارہ قیام کی کوشش کا رخ، ایک شعوری قومی پروگرام کے ذریعے، ریاستیں بنانے اور ان کی مرحدوں کے تعین کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔

عجیب بات ہے کہ اس کو اسی وقت ہوا تھا جب یہ سب پر زیادہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ ٹیکنیکی اور اقتصادی لحاظ سے ہم نے علاقائی ریاست کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ جدید حرفتوں نے ریاستوں کی اقتصادی اور ٹیکنیکی دونوں مرحدوں کو مسمار کر دیا ہے۔ نقل و حمل کے ذرائع کے فروغ نے ایک عالمی منڈی بنا دی ہے اور تقسیم کار کا موقع فراہم کر دیا ہے، جس میں تمام ترقی یافتہ اور زیادہ تر غیر ترقی یافتہ ریاستیں شامل ہیں۔ اس طرح دنیا کے مختلف عوام کے درمیان ایک ”باہمی خود مختاری“ کی صورت ابھری ہے جو آج کی اقتصادی زندگی کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے۔ شاید، اتنی ہی نمایاں خصوصیت عقلی انحصار یا ہمہ جہت نقل و حمل کے ذرائع کی ترقی سے پیدا ہوئی ہے: ذاک، ٹیلی گراف، ٹیلی فون، اور ہر دل عزیز اخبارات کے ذریعے۔ اخبارات میں شائع ہونے والے ایک ہی واقعے کے بارے میں مراسلوں کے پڑھ جانے سے دنیا بھر میں ایک وقت جو رد عمل آشکار ہوتا ہے، وہ پوری مہذب انسانیت میں ایک عام ذہنی بغل کی مانند دھڑکتا ہے۔ سان فرانسسکو (San Francisco) سے یوکوہاما (Yokohama) تک، ہیمرفیسٹ سے (Hammerfest) ملبورن (Melbourne) تک، ایک ہی وقت میں لوگ روس کے قطب کے بارے میں، واشنگٹن (Washington) میں ہونے والی کانفرنس کے بارے میں، رونالد آمونسن (Roald Amundsen) کے قطب شمالی کے سفر کے بارے میں پڑھتے ہیں۔ ان کا رد عمل مختلف ہو سکتا ہے، اس کے باوجود وہ ایک ہی ساتھ رد عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ پچھلی صدی کے درمیان کی آزاد تجارت کی تحریک پہلا شعوری قرار ہے ان نئے حالات کا اور ضرورت کا۔ جنگ سے کچھ برس پہلے، نارمن اینگلی (Norman Angell) نے اس کیفیت کے اظہار کے لیے ”انحصار یا ہمہ جہت“ کی ترکیب ایجاد کی تھی جو ہمارے زمانے کی اقتصادی اور روحانی تہذیب پر اپنے نشان ثبت کر رہی تھی، اور اس نے سیاسی سطح پر بین الاقوامیت کے بارے میں ایک پروگرام بھی پیش کیا تھا۔

سیاست کے اسی خیال میں ایک جلی خیاں ہے کہ اسے ”بعد میں آنا“ چاہیے۔ اس کا کام ان بیرونی تنگی پیکروں کی تلاش ہے جو اقتصادی، ٹیکنیکی اور عقلی میدانوں میں زندہ حقیقت کی صورت بنائے گئے ہیں۔

نوبیل کمیٹی کو حال میں بھیجے گئے اپنے تار میں ہالمار برانڈنگ نے بین الاقوامیت کے کام کو بالکل صحیح الفاظ میں ضابطہ بند کیا ہے جب انہوں نے کہا تھا ”عالمی تمدن کی خاطر ایک زیادہ بلند قسم کی ترقی کے لیے کام کرنا۔“ عالمی جنگ نے واضح کیا تھا کہ کتنا اشد ضروری ہے کہ یہ کام ایک فاتحانہ نتیجے پر ختم ہو۔ ہمارے تمدن کے لیے یہ ”to be or not to be“ والے مسئلے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ یورپ ایک اور عالمی جنگ سے جاں برف نہیں ہو سکے گا۔

مزید یہ کہ اگر علاقائی ریاست کو سوانحی کے فروغ کے لیے آخری لفظ ہونا ہے تو جنگ کا ہونا اہل ہے۔ اس لیے کہ ریاست اپنی فطری صفات کے باعث دعویٰ کرتی ہے حاکمیت کا، غیر محدود طاقت کے حق کا، جو صرف ذاتی مفاد کے ذریعے طے ہوتا ہے۔ یہ اپنی فطرت میں مزاحمت پسند ہوتی ہے۔ نظریاتی طور پر طاقت کے فروغ کا غیر محدود حق اور دوسری ریاستوں کے خلاف جنگ کرنا سماج دشمنی ہے، دہرا خطرناک عمل ہے، اس لیے کہ ریاست ایک انہومی وجود کی حیثیت میں ایک اوجھے اخلاقی درجے کی نمائندگی کرتی ہے۔ ظلم نفسیات میں یہ طے شدہ امر ہے کہ انہومہ کی صورت میں حرکت کرنے والوں کی روحانی سطح عوام کی اخلاقی سطح کے نصف سے بھی بہت نیچے کی ہوتی ہے۔ اس لیے بنی نوع انسان کے بہتر مستقبل کی امید کا انحصار ”عالمی تہذیب کے لیے ایک بلند درجے کی ترقی“ پر ہے، یعنی، تمام انسانوں سے محبت کرنے والی کمیونٹی۔ کیا ہم ایک خالق (teleological) نقطہ نظر رکھنے میں حق بجانب ہیں؟ یہ یقین کر ایک درخشاں اور سودمند مقصد آدمی کے اور قوموں کے مقدس کی رہنمائی کرتا ہے اور ہم کو اس بلند درجے کی سماجی ترقی تک لے جاتا ہے؟ پروپیگنڈے کے کام میں ہمیں ضروری طور پر ایک خوش امید قیاس پر اپنی تعمیر کرنی چاہیے۔ پروپیگنڈے کو بنی نوع انسان کے بہتر فیصلے اور بہتر مستقبل کے یقین سے اپیل کرنی چاہیے۔ اس یقین کے لیے، موت کے سایے کی وادی مقدس چوٹی کو جانے والی راہ کے ایک چنگی پر اوجھسی ہوتی ہے۔

مگر خالق نور یقین اور امید سے آگے نہیں لے جاتا۔ یہ ایقان نہیں فراہم کرتا تا رہنمائی ہے کہ ہمارے تمدن کے اعلیٰ درجے کے چکر و حیر ہو چکے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایسا ہی حشر ہمارے انتظار میں نہیں ہے؟

(3)

کیا کفر سوشلزم کے راستے کے علاوہ بین الاقوامیت کی کوئی حائل نہیں بنیاد ہے؟

ہزاروں برس سے پیغمبر اور مفکرین بنی نوع انسان کے اتحاد کی بنیاد کی جانب اشارے کرتے رہے ہیں۔ یونانی فلسفیوں، بالخصوص رواقیوں (Stoics) نے اس تصور کو فروغ دیا تھا، اور عیسائیت نے اپنی ابتدا سے اس کو ایک اخلاقی اور مذہبی اصول کے طور پر لیا تھا۔ آفاقی باپ سمجھنے کے نظریے کی اور برادری کی تبلیغ کی۔ اس دور کے ابتدا میں کئی ادیبوں کی جانب سے اس تصور کا ایک کہاوت کے طور پر احیا کیا گیا ان میں، ملحدین سباٹین فرینک (Sebastian Franck) مہسٹوٹ سوارٹز (Jesuit, Suárez) جو جدید بین الاقوامی

قانون کے بنیاد گزاروں میں سے تھا، اور آموں کمیٹیس (Amos Gamenlus)، جو Moravian Brethren کا آخری بشپ اور جدید تعلیم کا باپ تھا، شامل تھے۔ کمیٹیس کے ساتھ اس تصور میں عضویاتی چاشنی بھی شامل ہو جاتی ہے جب وہ لکھتا ہے: ”اس طرح ہم انسان ایک جسم کی طرح ہو جاتے ہیں جو اپنے تمام اعضا تک میں اپنی انفرادیت قائم رکھتا ہے۔“ اس کے بعد سے مغربی تہذیبوں نے اس تصور کو زندہ رکھا تھا۔ یہ مترجمیں، انٹھاریوں اور انیسویں صدیوں کے سربراہان اور وہ ذہنوں پر حاوی رہا ہے، ولیم چین (William Penn) اور لائپ نیو (Leibnitz) سے ورگے لاند (Wergeland) اور ایمرسن (Emerson) تک۔

جدید دور میں، علم الحیات نے اس تصور کے لیے ایک مکمل طور پر عاقلانہ اور اسلاف سائنسی بنیاد تلاش کر لی ہے۔ بنی نوع انسان کا اتحاد ایک عضویاتی حقیقت ہے۔ یہ جرمنی کے سائنس دان وائزمان (Weismann) کا نجم البحر (jellyfish) کا مطالعہ تھا جس نے ایسے افکار کی راہیں کھول دی ہیں۔ آگے چل کر دیگر علم ہائے علم نے ثابت کر دیا کہ وہ قانون وائزمان نے جس کا نجم البحر پر اطلاق کیا تھا، اس کا حیوانات کی تمام اقسام پر بھی اطلاق ہوتا ہے، جس میں انسان بھی شامل ہے۔ اس کو ”میرٹھوے کے مادہ حیات کا تسلسل“ (continuity of the germ plasm) کہا جاتا ہے۔

مذکر میرٹھوے کا مؤثر بیٹے کے خلیے سے اتحاد ایک نیا خلیہ پیدا کرتا ہے جو تقریباً فوراً دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تیزی سے بڑھنے لگتا ہے، اور اس سے تمام اعضا کے ساتھ ایک انسانی جسم کی تشکیل ہوتی ہے، جو اس انسانی جسم کی موت کے ساتھ ہی فنا ہو جاتا ہے۔ اس کا دوسرا حصہ، مؤثر بیٹوں کی صورت، مذکر جسم ہی میں باقی رہتا ہے۔ اس طرح ہم میں سے ہر ایک شخص میں حقیقی، چھوٹے کے اور تلاش کرنے کے قابل خلیے زندہ رہتے ہیں، جو ہمارے والدین سے، اور ان کے اجداد سے حمل کے ذریعے۔ ہم میں منتقل ہوتے ہیں اور ہمارے بچے اور بچوں کے بچے بن جاتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک، واقعی اور عضویاتی طور پر، بطور نیا نیا ایک کڑی کی صورت ہے جو بنی نوع انسان کی تشکیل کرتا ہے۔

تمام مطالعات میں کسی ایک نقطے پر پہنچ کر بکھر جاتی ہیں۔ اس کے باوجود میں بنی نوع انسان کو ایک تندرست شجر کی صورت دیکھتا ہوں، شاخوں اور انکھوؤں سمیت، جس سے پتوں، پھولوں اور پھلوں کی صورت افراد منسلک رہتے ہیں۔ وہ اپنی انفرادی، نیم خود مختار زندگیاں بیچتے ہیں، وہ

جاگتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں

شکل بدلتے، بوڑھے ہوتے اور مر جاتے ہیں

عمر شجر باقی اور جاری رہتا ہے، اپنی تمام شاخوں اور کونپلوں سمیت، اور نئے پتوں، پھولوں اور پھلوں کے ذریعے اس کی تعمیر نو ہوتی رہتی ہے۔ پھلوں کی بھی اپنی چھوٹی، مختصر اور ذاتی زندگیاں ہوتی ہیں۔ ایسی پتیاں بھی ہوتی ہیں جو مرجھاتی ہیں اور گر کر زمین کا پیوند ہو جاتی ہیں، پھول ہوتے ہیں جو اپنے رنگ اور خوشبو سے مسحور کرتے ہیں، پھل ہوتے ہیں جو توانائی اور نشوونما فراہم کرتے ہیں۔ پتیاں، پھول اور پھل بے شمار تعداد

میں آتے جاتے رہتے ہیں، ایک دوسرے سے رابطے استوار کرتے ہیں اور ناقابل شمار نکلوں سے بنا ہوا ایک جالی پورے شجر کو ڈھلپ لیتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس پر ہماری مطابقت ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے مگر شجر ایک ہے، اور بنی نوع انسان بھی ایک واحد ساخت کی مانند ہے۔

عالمی جنگ کے دوران، دو فطری سائنس دانوں نے، اپنے اپنے طور پر مگر ذہن میں ایک ہی مقصد کے ساتھ، حیاتیات اور بین الاقوامیت کی معنویت کو ترقی دی اور اس کو واضح کیا تھا۔ ان کا کام، خصوصاً دوسرے ادیب کے نظریے کے اطلاق سے، جس سے بہت سے فطری سائنس دان مشتق نہیں، ہمیں اس مرحلے پر سروکار نہیں۔ ہمارے کام کی وہ پوری حقیقت ہے جس پر یہ سب کچھ استوار ہے۔ میں [اس مرحلے پر] صرف ایک نتیجہ اخذ کرنا چاہتا ہوں: اگر بنی نوع انسان ایک حیاتیاتی وحدت ہے، تو جنگ بین الاقوامی جنگ، جو خانہ جنگی سے کسی طرح کم نہیں۔ ایک خود کشی ہے، بنی نوع انسان کی رسوائی ہے۔ اس طرح، بین الاقوامیت زیادہ مضبوط حمایت حاصل کر لیتی ہے اور اس پر تعمیر کے لیے زیادہ مستحکم بنیاد اس کے مقابلے میں، صرف خالص سوچ بچار ہی دے سکتی ہے۔

(4)

بین الاقوامیت کے نظریے کے اطلاق کے نتائج کا، جس کی یہاں تعریف اور حد بندی کی گئی ہے، ثابت کرنا مشکل نہیں ہے۔ یہ اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں ظہور کرتے رہتے ہیں، مگر خالصتاً روحانی میدانوں میں ان کی بنیادی اہمیت محدود ہے۔

اقتصادی اعتبار سے، بین الاقوامیت کے نتائج بہت واضح ہیں اور ان کی طرف اشارے بھی کیے گئے ہیں۔ ان کا مرکزی تصور بین الاقوامی یک جہتی ہے جس کا عملی اظہار عالمی سطح پر تقسیم کار میں ہوا ہے: بین الاقوامیت کے پرہیزگار کا اصل نکتہ آنا دانہ تجارت ہے۔ یہ فطری سائنس کے میدانوں کے جدید ترین خیالات اور نظریات سے بھی اتفاق کرتا ہے۔ مطابقت، یک جہتی اور باہمی تعاون سب سے اہم ذرائع ہیں نوع حیوان جن سے ہٹا پاتی ہے۔ ہر نوع جو اس حقیقت پر قابو پالیتی ہے اپنے وجود کی جدوجہد کو بہتر طریقے سے منظم کرتی ہے، ان کے مقابلے میں جو تنہا اپنی تولائیوں پر انحصار کرتی ہیں: بھیڑیوں، کی ہلا، جو غول میں شکار کرتے ہیں، شیر کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے، جو اکیلے ہی شکار کرتا ہے۔ کروپاٹکین (Kropotkin) نے اپنی کتاب (Munial Aid 1902) میں اس خیال کو حیوانی زندگی کی مثالوں کے ذریعے واضح کیا ہے اور سماجی میدانوں میں بھی اس کا اطلاق کیا ہے۔

میں بین الاقوامیت کے سیاسی نتائج پر ذرا تفصیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں ہمارا کام ہے قوموں کے درمیان عالمی اتحاد کے تصور کے لیے تنظیم کے نمونے ایجاد کرنا ہے۔ یہ ہمارے وقت کا سب سے بڑا سیاسی کام ہے۔

ماہانہ زمانے خود کو مقتدر ریاست، تحفظ تجارت اور عسکریت کے عقوب میں قلعہ بند کر لیا کرتے تھے۔ یہ نکتہ اس موضوع سے متعلق ہے جسے مارٹن اینگل نے "optical illusion" کہا تھا، یعنی، اگر کوئی ریاست اپنے رقبے میں مزید چند مربع میل علاقہ ضم کر لیتی تھی تو اس میں رہنے والا انسان اپنے قدم میں ایک انچ کا اضافہ کر لیتا تھا، کہ یہ عمل اقتصادی اور خود انحصاری کے اعتبار سے ریاست کے لیے فائدہ مند ہوا کرتا تھا، ان معنوں میں کہ جتنی ممکن ہو اس کو بیرون ملک کی مزید مصنوعات کی ضرورت ہو جاتی تھی۔ یہ قومی تحفظ تجارت سب سے پہلے ایک امریکی الیکٹرونڈ ریپبلکن (Alexander Hamilton) نے تیار کی تھی، جو ریاست ہائے متحدہ کے آئین تیار کرنے والوں میں سے تھا، بعد میں اس کا امریکی مٹی سے جرمن مٹی میں فرانسیز برخ لیسٹس (Friedrich List) نے کیا تھا جہاں اس کو تمام یورپی ریاستوں میں تحفظ تجارت کے احتجاج میں استعمال کیا گیا تھا۔

قومی اقتصادی تہائی پسندی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، عسکریت بین الاقوامیت کے بڑھتے ہوئے قدموں کے خلاف، خود مختار ریاست کی برقراری کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ کوئی ریاست عسکریت سے آزاد نہیں، کہ یہ خود مختار ریاست کے بر تصور میں دخیل ہوتی ہے۔ ریاستوں کی عسکریت میں محض درجات کا فرق ہوتا ہے۔ ایک ریاست اپنی اندرونی اور بیرونی سیاست میں عسکری حکمت عملی کو جتنی جگہ دیتی ہے اتنی ہی زیادہ عسکری ہوتی جاتی ہے۔ اس مقام پر پروشیائی - جرمن قیصری ریاست کو، خاص طور پر عالمی جنگ کے دوران، ایک مستند مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ عسکریت بنیادی طور پر سوچ کا ایک انداز، ریاست کی کارکردگی کی ایک خاص تشریح ہوتی ہے، سوچنے کا یہ طریقہ اس کے بیرونی چکر سے واضح ہوتا ہے: اسلحوں اور ریاستی تنظیم میں۔

یہ سوچ خود مختار ریاست کے اس تصور کے خلاف ہے، کہ تحفظ تجارت اور عسکریت کے باعث تہائی کی حالت میں، بین الاقوامیت کو فیصلہ کن جنگ میں مصروف ہو جانا چاہیے۔ ہمارے زمانے میں خود مختار ریاست انسانی تہذیب کے لیے مہلک خطرہ بن گئی ہے، اس لیے کہ تکنیکی ترقیات کے باعث وہ لامتناہی حدود اور تہائی کے مختلف طریقوں کو حاصل کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ ٹیکنالوجی کا آمد خدام اور خطرناک منہوم ہے۔ عسکری جذبوں کے زیر اثر تیار کیے ہوئے، خود مختار ریاست کے اسلحہ جات، جنہیں تہائی کے جدید طریقوں تک رسائی ہو، ریاست کے لیے اور دوسروں کے لیے خطرہ ہیں۔ اس نقطہ نظر سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ترکیب اسلحہ جات کا کام کتنا اہم ہے؟ یہ صرف اقتصادی نوعیت کا کام نہیں، جو غیر پیداواری اخراجات میں بچت کا باعث ہو، بلکہ یہ ریاست کو غیر فوجی یا مہذب کرنے کی کوشش سے منسلک بھی ہے تاکہ ان میں سے من مانی مزاجی پالیسی اختیار کرنے کے ترغیب کو خارج کر دیا جائے، ان کے اسلحہ جات جس پر ان کو اکسالتے رہتے ہیں۔

اگر خود مختار ریاست کو اقتصادی یکسانیت اور عسکریت کے خود پسندانہ خیالات کی تھوڑی سی بھی حمایت مل جائے تو یہ محفوظ وجود پر بھروسہ نہیں کر سکے گی، اس لیے کہ بین الاقوامیت اس کے خلاف ایک مؤثر جنگ

شروع کر سکتی ہے۔ مگر خود مختار ریاست بھی ایک روحانی اصول کا سہارا لیتی ہے: یہ ”قومی“ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے تاکہ وہ بنی نوع انسان کے ایک واضح حصے کے عوام کی انفرادیت کی نمائندگی کرے۔

یہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ زیادہ تر ریاستوں میں ”قوم“ ریاست کی پیداوار ہوتی ہے، ریاست کی تشکیل کی بنیاد نہیں۔ اور جب اس پر زور دیا جاتا ہے کہ ہر ”قوم“ کا ایک اپنا بشریاتی کردار ہوتا ہے، یعنی ایک الگ ”نسلی“ کردار تو اس کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ وہ ریاست جس میں بشریاتی اعتبار سے خالص نسل رہتی ہو ابھی تک تو پائی نہیں گئی ہے۔ سائنسی تحقیقات بت کرتی ہیں کہ تمام ملکوں میں آبادی کے مختلف حصوں کے درمیان لامتناہی بارسمنیت (crossbreeding) ہو رہی ہے۔ سب ایک ”خالص نسل“ کا کوئی وجود نہیں رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ حالاں کہ ان میں مختلف بیرونی بشریاتی امتیازات — سر کی شکل، بال، جلد کا رنگ وغیرہ ہیں، ہم یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ان میں کسی مخصوص قسم کے عقلی یا روحانی اوصاف ہوتے ہیں۔

اور اگر ”قومیت“ ایک روحانی مظہر نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ریناں (Renan) نے اس کی ایک معقول تعریف بیان کی ہے: ”قوم بنی نوع انسانیت کا حصہ ہوتی ہے جو قوم ہونے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے، قوم کا وجود ایک مسلسل اور روزانہ کی رائے شماری ہوتا ہے۔“ اس کا پہلا حصہ ایک دائرہ نما تعریف ہے۔ یہ تیزی سے حد بند بھی ہو جاتی ہے اور مکمل طور پر جامع بھی، اس لیے کہ یہ قوم بننے کی خواہش پر زور دیتا ہے۔ اس طرح قومیت کا تصور ایک روحانی سلطنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہیں کا ہوتا ہے اور اسے وہیں رہنا چاہیے۔“

بین الاقوامیت ان روحانی امتیازات کو مٹائے گی نہیں۔ اس کے برعکس، قومی خصوصیات پیدا کرے گی۔ ان کے وجود کا تحفظ کرے گی، اور ان کے فروغ کو آزاد چھوڑ دے گی۔ اس حکمران بین الاقوامیت عالمیت سے مختلف ہوتی ہے۔ باقی الذکر تمام قومی خصوصیات کو صاف کرنا یا کم از کم، روحانی میدان میں بھی، ان کی تخفیف چاہتی ہے۔ دوسری جانب، بین الاقوامیت اعتراف کرتی ہے کہ روحانی کامیابیاں قومی زندگی میں بھی اپنی گہری جڑیں رکھتی ہیں، اس قومی شعور سے آرٹ اور ادب اپنے کردار اور توانائی حاصل کرتے ہیں اور ان ہی پر کئی قسم کے انسان شناس سائنسی علوم مضبوطی سے استوار ہیں۔

قومی عقلی ترقی میں نئے نئے رنگ، مقامی حکومت میں امتیازی کردار — دونوں ہی بین الاقوامیت سے میل کھاتے ہیں، بلاشبہ جو بھر پور اور بولچھوں ترقی کے لیے لازمی ہوتے ہیں۔

وہ مشترکہ مفادات پر سیاسی اختیار رہی ہے بین الاقوامیت جس کو عوامی انتظام میں دینا چاہتی ہے۔ اس طرح، ایک عالمی وفاق، جس میں گروہوں سے منسلک انفرادی قومیں حصہ لینا چاہتی ہیں بین الاقوامیت کا سیاسی آدرش ہے۔ جنگ سے پہلے، اس سمت میں پہلا گروہی قدم اٹھایا گیا تھا جس کا کام دی ہیگ میں کیا گیا تھا۔ لیگ آف نیشنز نے اس ہدف کو حاصل کرنے کی پہلی پیچیدہ اور شعوری کوشش کی ہے۔

ان خطوط پر، جن پر یہاں بحث کی گئی ہے، بین الاقوامیت کی تعریف مندرجہ ذیل صورت میں ہو سکتی ہے۔
 بین الاقوامیت ایک کمیونی نظریہ ہے جس کی بنیاد اقتصادی، روحانی اور حیاتیاتی حقیقتوں پر رکھی گئی
 ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسانی سوسائٹی اور عالمی تمدن کی صحت مندانہ ترقی کے احرام کا تقاضا ہے کہ بنی نوع
 انسان کو بین الاقوامی سطح پر منظم کیا جائے۔ ایک عظیم عالمی اتحاد میں قومیں کو تعمیری کڑیاں بنانی چاہئیں اور
 ان کو روحانی اور مقامی کاموں میں خود مختار زندگی کی ضمانت دی جانی چاہیے، جب کی سیاسی اور بنی نوع انسان
 کے مشترک مفادات کے اقتصادی بدف پر پرامن تعاون کے لیے بین الاقوامی سطح پر رہنمائی کی جانی چاہیے۔

(۶)

آخری چند جملے۔

کیا بین الاقوامیت کے نظریے کا کوئی رشتہ ہے، ہماری مذہبی ضروریات سے، ابدیت پر ہمارے
 دعوے سے جو ناقابل مزاحمت طور پر ہر غور و فکر کرنے والے اور حساس فرد میں پیدا ہوتا ہے؟
 بلاشبہ، یقینی طور پر ہم میں بہت سے ایسے ہیں جو انکی ابدیت میں یقین کو دعویٰ سمجھتے ہیں، جسے ہمیشہ کے
 لیے بے ثبوت ہی رہنا چاہیے۔ ابدی تصور کے ذاتی سطح پر تسلسل کو۔

تو پھر کیا ہمیں اس پر یقین کرنے پر مجبور کیا جانا چاہیے کہ عربی کی تمثیل کی طرح مادہیت کے نظریے کا
 اخلاق آدمی کے خاندان پر ہوتا ہے، جس میں جھاڑی کے پتے مرجھا کر زمین پر گر جاتے ہیں اور کوئی نشان
 چھوڑے بغیر مر جاتے ہیں؟

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کے نامیاتی اتحاد اور ابدی تسلسل کا نظریہ مادی تصور کو ایک
 زیادہ بلند سطح تک لے جاتا ہے۔

ابد کا تصور ہم سب میں زندہ رہتا ہے۔ ہم ایسے یقین میں زندہ رہنے کے خواہش مند ہوتے ہیں جو
 ہماری شخصیت کو بلند کر دیتا ہے، ایک زیادہ بلند اتصال کی طرف اتصال جو انسان بھی ہے اور ”سپر ہیومن“
 بھی، کامل ہے مگر رفتہ رفتہ بڑھ بھی رہا ہے اور ترقی بھی کر رہا ہے، مثالی بھی ہے اور حقیقی بھی۔
 کیا یہ خواہش کبھی پوری بھی ہو سکتی ہے؟ یہ تو ایک حد کے اندر تناقص معلوم ہوتا ہے۔
 پھر بھی ایک یقین ہے جو اس خواہش کو مطمئن کرتا ہے اور تناقص کو حل کرتا ہے۔
 بنی نوع انسان کے اتحاد میں یہی یقین ہے۔

○

لی اوں بوٹروا اعلان تجلیل

مارویائی پارلیمان کی نوبل کمیٹی نے اپنے خط میں کہا ہے:
”مارویائی پارلیمان کی نوبل کمیٹی 1919 کا نوبل امن ریاست ہائے متحدہ کے صدر مسٹر وڈرو وین
کو اور 1920 کا انعام فرانسیسی سینیٹ کے صدر اور لیگ آف نیشنز کی کاؤنسل کے صدر مسٹر لی اوں بوٹروا
(Léon Bourgeois) کو پیش کرنے میں فخر محسوس کر رہی ہے۔
حضرات! آج جب عالمی جنگ کے بعد پہلی بار مارویائی پارلیمان کے اجلاس کا انعقاد ہو رہا ہے، یقین
کیا جاتا ہے کہ امن کا عظیم آدرش، جو قوموں کی بقا کی امیدوں میں جاگزیں ہے، حالیہ الم ناک واقعات کے
نتیجے میں ایک بار پھر آدمیوں کے ذہنوں میں نئے سرے سے نشوونما پائے گا۔“
(اس کے بعد صدر بوچس (Buen) نے وڈرو وین کے بارے میں جو کلمات کیے وہ وین کے باب
میں درج تھا)

اور پھر انعام فرانس کے عوام کی امن کی خواہش کے لیے ماروے کی سلامی کے ساتھ لی اوں بوٹروا کو دیا
جا رہا ہے جنہوں نے بڑے امتیاز کے ساتھ کئی برس تک، اچھے اور برے دنوں میں، ان کی نمائندگی کی ہے۔

خطبہ:

لیگ آف نیشنز کے قیام کی وجوہ

چند ہفتے قبل نوبل امن انعام پانے کے سلسلے میں مسٹر براہنگ (Braming) ان فرانس کو پورا

کرنے اور سلو گئے تھے جو ہر انعام یافتہ پر عام ہوتا ہے۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں وہی نہیں کر سکا ہوں۔ میری صحت مجھے ماروے کے سفر کی اجازت نہیں دیتی، جس کی وجہ سے مجھے بے حد شرمندگی ہوئی ہے۔

آپ کے صدر نشین نے مجھے مطلع کیا تھا کہ آپ مجھے تحریر کے ذریعے خطاب کی اجازت دے دیں گے۔ لہذا، اپنے دلی شکر کے ساتھ میں اپنے خیالات آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، یقیناً جنہیں میں ذاتی طور پر پیش کرنا پسند کرتا۔ حضرات! میرا دلی شکر یہ قبول کیجیے۔

(۱)

میں مسٹر برائننگ کے اُن خیالات سے اتفاق کرتا ہوں جو انہوں نے پچھلے جون کے مہینے میں آپ کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ اپنی اعلیٰ ترین بصیرت کے ساتھ انہوں نے "The Great Disillusionment" کو باقاعدہ تجزیے کے بعد صحیح نتائج میں آپ کے سامنے پیش کیا تھا جو 1814-1818 کی عالمی جنگ نے آدمیوں کے ذہنوں میں ابھارا تھا۔ یقیناً، ایسے سیاسی انقلاب کی زنجیر کشائی، جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی، اس امید کے بالکل برخلاف ہے جو نوبیل کے دل میں پل رہی تھی جب اس نے امن انعام کی بنیاد رکھی تھی۔ مگر اس مایوسی کی جو عوام کے دلوں میں بس گئی تھی، مسٹر برائننگ نے وجوہ پیش کی تھیں اس یقین کے لیے کہ ہم اب بھی اس بڑی آفت سے اعتماد پیدا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے واضح کیا تھا کہ برے وقتوں کے چھوڑے ہوئے دیرانوں کے زیر اثر ہمیں تجربہ ہوا ہے کہ تجدید نو کے بہت سارے نتائج ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہمیں حالیہ برسوں کو ایک مہذبہ زنگت سمجھ کر فراموش کر دینا چاہیے۔

فتح، سب سے بڑھ کر، قانون کی حکمرانی اور خود تمدن کی ہوئی ہے۔ تین شہنشاہوں کے انہدام کی بنیاد بڑی حد تک عسکری طاقت پر تھی جس نے کئی نئی قوموں کو جنم دیا ہے جو اپنے عوام پر حاکمیت کی ٹانہ لگی کر رہے ہیں، ساتھ ہی جمہوری اداروں کے فوائد کا لطف اٹھا رہی ہیں جنہوں نے امن کو خود بادشاہوں کی خواہش پر منحصر کر کے مستقبل میں کسی تصادم کے خطرے کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔

وہی تحریک نہ صرف مجبور قوموں کے احیاء کا باعث ہوئی ہے، بلکہ اس سے نسلوں کے درمیان سیاسی اتحاد کی تکمیل بھی ہوئی ہے جن کو ابھی تک تشدد نے ٹکڑوں میں بانٹ رکھا تھا۔

آخر میں، آزاد قوموں کی فتح کو صحیح نظر مہیا کرنے میں ایک واحد اہم حقیقت کامیاب ہوئی تھی۔ چار برسوں کی وحشت مائیک کے درمیان سے، بلند و برتر احتجاج کی مانند تمام لوگوں کے ذہنوں میں ایک نیا خیال نمودار ہو گیا تھا: قانون کی حکمرانی اور امن کے استحکام اور دفاع کے لیے مہذب قوموں کی یکجہتی کی ضرورت۔ اور 1898 اور 1907 میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں سے، 28 جون 1918 کے عہد نامے کے ذریعے، ابھرنے والی لیگ آف نیشنز ایک حقیقت بن گئی۔

نغمہ کیا یہ [ادارہ]، بالآخر، ہم کو ایک مستحکم امن کا قبالہ فراہم کر سکے گا؟ یا، جب ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم اپنے ہدف تک پہنچنے والے ہیں تو ہمیں پھر واپسی ہی رکاوٹوں کا سامنا ہوگا جس نے صدیوں سے ہر نسل، مذہب اور تمدن کے اُن یا تریوں کا راستہ روک رکھا ہے، جو امن کے آدرش کے لیے جدوجہد حاصل کرتے رہے ہیں۔

(2)

اس سوال کا جواب دینے کے لیے، جو نسل انسانی کی اذیت کی حساس رگ کو چھیڑتا ہے، اور ان انقلابات کی وجوہ کو سمجھنے کے لیے جنہوں نے بنی نوع انسان کو نزعے میں لے رکھا ہے، ہمیں نہ صرف عوام کی تاریخ میں بلکہ خود انسان کے اندر، افراد کی تاریخ کے اندر بھی، غوطے لگانے ہوں گے جس کے ولولے اس کی کمیونٹی سے مختلف نہیں ہوتے، جن میں ہمیں، اچھی ہوں یا بری، ہر نوعیت کی خواہشات، نقش کو بڑھا کر پیش کرنے والے آئینے کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔

انسانی ولولے فطرت کی قوتوں کی طرح ابدی ہوتے ہیں، ہمیں ان کے وجود سے انکار نہیں بلکہ ان کا اندازہ کرنا اور انہیں سمجھنا چاہیے۔ فطرت کی قوتوں کی طرح، ان کو آدمی کی خواہش کے ارادی عمل کے تحت کرنا اور وجود کی ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے دینا چاہیے۔ ہم قوموں کے درمیان لڑائیوں میں انہیں کام کرتے دیکھتے ہیں، اسی طرح جیسے ہم انہیں افراد کے درمیان جدوجہد میں دیکھتے ہیں، اور بالآخر ہمیں احساس ہو جاتا ہے کہ صرف ذاتی الذکر کو کنٹرول کرنے کے طریقے ہی سے اول الذکر کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

دعویٰ سے یہ کہنا کہ مختلف قوموں کے آدمیوں کے درمیان امن قائم کرنا ممکن ہے، اس دعوے کے مترادف ہے کہ آدمی خواہ وہ کسی گروہی پس منظر کا ہو، اس کی نسل، اس کے مذہبی عقائد یا اس کا فلسفہ دین کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کسی فرد کے اندر کی دو قوتیں اس کے ضمیر اور اس کی اخلاقیات کے فروغ میں مدد کرتی ہیں؛ دین اور حساسیت۔

اس کی حساسیت دیرینہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ پہلے تو اظہار ہوتا ہے محض حفظ نفس کی جبلت کا، جو ہر وجود کے اپنے اطراف کی قربانیوں پر نشوونما پاتی ہے، دوسرے وجودوں کے نقصان کے ذریعے، جن کی موت اس کے وجود کے لیے لابدی ہوتی ہے اس جبلت کے ظہور کی ایک اور صورت ہوتی ہے جو اسے دوسروں کے دکھوں کے بارے میں ذی حس بنا دیتی ہے؛ یہی ہے وہ شے جو ماں اور بچے کے درمیان، اس کے بعد باپ اور بیٹے کے درمیان، اور اس کے بعد اسی فریقے، اسی قبیلے کے درمیان ایک اخلاقی بندھن پیدا کر دیتی ہے۔ ہمدردی کی یہ جبلت ہی ہے جو آدمی کو اپنی وحشیانہ اور خود غرضانہ جبلتوں سے لڑنے اور انہیں کنٹرول کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

ایک فرانسیسی فلسفی نے اس نظریے پر اعتراض کرتے ہوئے، جس کے مطابق ”انسان کو کسی نسل کی مزید

پیدا کرنے کے پہلے کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی قوت کا مکمل ترین فروغ اور طاقت کی صلاحیت حاصل کر لے۔ واضح کیا ہے کہ یہ صرف انسان کی حیثیت کا ایک نامکمل تصور ہے۔ "اس کا مطلب تو انسان کو علاحدہ کر کے اسے ایک عالی ظرف حیوان کی صورت میں دیکھنا ہے جو زور اور بھی ہے اور مہیب بھی۔ مگر ایک مکمل شکل کی حیثیت میں دیکھنے کے لیے آدمی کو اس کی سوسائٹی کے درمیان دیکھنا چاہیے جس میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ بالائے سلسل وہی ہوتی ہے جو سوسائٹی اور گروہی ترقی سے بہترین مطابقت رکھتی ہے۔"

اس سلسلے میں، نیکی، میل جول، اور کسی حد تک احساسِ احترام برجستہ نوعیت کی صفات ہوتی ہیں جو تمام تر جہلوں کے مقابلے میں نیا وہ قابلِ قدر مگر فطری ہوتی ہیں۔ یہ احساسات ایک قوی کمیونٹی میں اسی طرح موجود ہوتے ہیں جیسے کہ کسی فرد میں، جس نے انھیں ترتیب دیا ہو۔ ان کو کسی فرد کی انسانیت سے بالا رکھنا تمدن کا کام ہے۔ کبھی کسی فرد کی طاقت کو بقیہ قوم کی ترقی کو روکنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے؛ نہ ہی کبھی قوم کی طاقت کو اجازت ہوتی چاہیے کہ وہ بنی نوع انسان کی ترقی کے آڑے آئے۔

انسان میں حساسیت ہوتی ہے جو یا تو خود غرض ہوتی ہے یا ایثار آمیز؛ مگر یہ عقل ہے جو اس کا بچہ دہنی ہے۔ یہ اس کی حسرت اور مخالف تحریکات نہیں ہوتیں، بلکہ اس کی عقل ہی ہوتی جو بچپن میں متذبذب اور کم زور ہوتی ہے، اور بعد میں اس کی طاقت بڑھتی جاتی ہے، اور بالآخر انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی حساسیت کے دونوں پہلوؤں کو شعوری اور دیر پا انداز میں ہم آہنگ کرے۔ یہ عقل ہی ہے جس نے تاریخ کی ابتدا سے ہی بنی نوع انسان کو آہستہ آہستہ ایک کے بعد دوسرے تمدن کے راستے پر چلایا ہے، یہ احساسِ دلانے کے لیے کہ ایک حالت ہوتی ہے جو زندگی کے لیے وحشی جدوجہد سے بہتر ہوتی، نہ صرف کم خطر ماحولیات میں، بلکہ صرف اس حالت میں بھی جو ضمیر کے احکامات کے ساتھ چلنے کی صلاحیت رکھتی ہو، اور اس میں یہی ہمیشہ بڑھتی رہنے والی پیچیدگی اور مضبوطی ہوتی ہے، جس کو سچی سماجی حالت کہا جاتا ہے۔

آدمی کا حیوان سے انسانی درجے تک بلند ہونے کا عمل ضرورت کی بنا پر طویل کر دیا گیا تھا تا کہ وہ مددیت اور تشدد کی حالت سے قاعدے اور امن کی حالت میں بلند ہو سکے۔ اس عمل میں بھی یہ عقل ہی تھی جس نے بالآخر آدمی کو اکسلیا کر اگر وہ خود کو سماجی حالت میں رہنے کے قابل بنانا چاہتا ہے تو اسے قانون کے زیر اثر رو کر کچھ حدود کا تعین کرنا ہوگا، ہر فرد جس کے اندر محدود درجے۔

سب سے پہلے مذہبی نظریات سے قوانین کا ارتقا ہوا۔ اس کے بعد ان کو منظور کیا گیا صرف اس صورت میں جب وہ ان لوگوں کے لیے فائدہ مند ہوں جو اسی مذہب کے پیروکار ہوں، اور جو ان ہی خداؤں کے تحفظ میں مساوی نظر آئیں۔ دوسرے عقائد کے پیروکاروں کے لیے نہ تو قانون تھا اور نہ رحم۔ یہ عہد تھا سنگ دل معبودوں Baal اور Moloch کا، یہی زمانہ تھا Jehovah کا بھی جو اپنے لوگوں کو منجوعین کو ختم کرنے کی تلقین کیا کرتا تھا۔

دنیا کے سامنے عقل کی مشعل سب سے پہلے یونانی فلسفے نے بلند کی تھی، جو جبریت (Stoicism) کی طرف لے گئی، جس کے مطابق تمام انسان برابری میں ہیں اور "ایک واحد وجود (یا انارے) کے ارکان ہوتے ہیں"

اور جس میں انسانی خواہش یا ارادے کو، قانون کے تحت، آدمی کی سرگرمی کی ایک لازم کو رہنما گردانا جاتا ہے۔ انسانی ارادے کے اس نظریے کا اظہار صمد شہنشاہی میں روم کے قانون میں اس قابل تعریف استحقاق کی تھیوری میں ہوا تھا، جو نئی قانون میں، اقرار ناموں کے جائز ہونے کے انحصار اقرار کرنے والوں کی آزادانہ رضامندی پر ہوتا تھا!

نئی قانون کی توثیق اور اسی قانون کے اعتراف کے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل ہے جو قوموں کی پالیسیوں کی رہنما قوت ہے!

پھر عیسائیت کا نزول ہوا جس نے آدمی میں رحم کی فطری صلاحیت کو ایسی شکل اور مضبوطی دی جو پہلے نہیں دیکھی گئی تھی۔ یہ سوشل مسیح کا نظریہ آدمیوں کو تائید کرتا ہے کہ اس کی نظر میں سب انسان آپس میں بھائی ہیں اور سب کو ایک دوسرے سے محبت کرنی چاہیے۔ ان کا نظریہ تشدد کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے: ”وہ جو تمہارے ساتھ زندہ رہتا ہے، تمہارا ہی سے موت پائے گا۔“ وہ ایسی عیسائی سنگت کی تبلیغ کرتا ہے جو تمام قوموں پر ترجیح دیتے ہوئے شرکوں کو۔ دوسرے لفظوں میں، گمراہی کی تمام قوموں کو۔ ایک بہتر زندگی کی امید کی پیش کش کرتا ہے جس میں بالآخر انصاف کی حکمرانی ہوگی۔

پورے قرون وسطیٰ میں اس نظریے کا فروغ ہوا، اور کئی صدیوں تک پاپائیت اپنی ثابت قدم کوششوں سے دنیا کو پیغام دیتی رہی کہ دنیا میں اگر انصاف نہیں ہو انسان کے قابو میں نہیں، اور جو عام طور پر ”خدا کی ہاتھوں میں“ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تو کم از کم مناسب وقتی امن، ”خدا کی مہلت“ ہونی چاہیے جو ناشادانہ عیسائیت کو دکھوں سے مہلت دے اور ایک لمحے کا تحفظ عطا کرے۔

مگر مذہبی جنگوں سے یورپ کو پریشان کرنے کی آویزش کا ایک نیا دور آگیا۔ یہ شاید زیادہ ظالمانہ تھا، اس لیے کہ انہوں نے خود ضمیر کو رحم دلی چھوڑ دینے پر آمادہ کیا اور وہ قوتوں کے درمیان فساد کو ابھارا جو اس وقت تک صرف ان کے درمیان ہی مشترک تھا: حسدیت اور عقل۔ ان کے درمیان اٹھارویں صدی سے پہلے مصالحت نہیں ہوتی تھی۔

Declaration of the Rights of Man نے بالآخر تمام انسانوں کے لیے انصاف کے اصول مقرر کیے جن کے بغیر دیر پا امن کی بنیادیں رکھنا کبھی ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔

قبل اس کے کہ انقلاب فرانس کے اعلان کردہ سچے انسانیت پرست اخلاقی اصولوں کا اخلاق ہوتا، ایک صدی سے زیادہ عرصے میں کتنے دکھ آنے چھو اور کتنا خون ضائع ہوا تھا۔ جیسا کہ Taine نے کہا تھا، یہ ضروری تھا کہ خیالات کو فروغ دیا جائے، تاکہ دماغ کے شعوری حصے میں پہلے کی سوچ اور خیالات کو طے شدہ مدار کے اطراف چوکس کیا جائے؛ یعنی تجربے کی بنیاد پر انسانی سر کے اندرون کی نئی تشکیل کی جائے۔“ کیا وہ عظیم ترین انقلاب نہیں تھا جس نے دلیل اور عقل کو اجازت دی تھی کہ پوری انسانیت کو قانون کے ماتحت تصور کیا جائے اور ہر انسان کے اندر کے ”آدمی“ کے رُجے کا اعتراف کیا جائے۔

تمام آدمی حقوق اور فرائض میں مساوی، تمام آدمی بنی نوع انسان کے مقبوم کے مساوی ذمے دار۔
 داد، کیا خواب ہے یہ بھی!
 کیا قانون کا تصور دنیا کی داشتہ کی صورت، بالآخر عقل کو معقول بنائے گا؟

(3)

کیا ہم آفاقی اخلاقیات اور تمدن کے فروغ کے اس درجے تک پہنچ چکے ہیں کہ وہ ہمیں لیگ آف نیشنز کو باقی رہنے کے قابل سمجھنے کی اجازت دے سکے گا۔ اگر اس کا وجود فائدہ بخش ہے تو اس میں کیا خصوصیات، اور اس کے لیے کیا حد بندیاں ہونی چاہئیں، تاکہ یہ دنیا کے معاملات کی حقیقی حالت کے مطابق خود کو ڈھل سکے؟
 یقیناً، زیادہ تر قوموں کی سیاسی، سماجی اور اخلاقی تنظیم میں بے حد ترقی ہو چکی ہے۔
 کمرۂ ارض کے تقریباً ہر کونے میں تعلیم کا فردش بہت سے ذہنوں پر طاق وراثت کا باعث ہو رہا ہے۔
 ہر مہذب قوم میں جمہوری اداروں کا غلبہ واضح طور پر نظر آ رہا ہے۔
 ہم سماجی ترقی میں دخیل رہنے والے طبقاتی تعصب میں کمزوری کے آثار دیکھ رہے ہیں، حتیٰ کہ روس میں بھی ہمیں اشتراکی نظام کی ناپسندیدگی نظر آنے لگی ہے، جو ذات کی آزادی اور ابتدائی قدم کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

بالآخر، ایسے سماجی ادارے جو اعانت، بیمہ اور فیلوشپ فراہم کرتے ہیں برہمنی تعداد میں متحرک ہیں۔ ان کا مقصد فرد کے حقوق کا تحفظ ہے، یعنی انسان پرست انصاف کا تحفظ، جس کے تحت فرد کے اعمال کی ذمے داری سماج سے الگ نہیں رہے گی۔

ہر قوم میں ایسے تمام عناصر دانش کے انقلاب کا راستہ ہموار کر رہے ہیں، ہم جس کی بات کرتے ہیں، انقلاب جو لوگوں کی رہنمائی کرے گا، توصیف میں اور برتری کی تقسیم میں، بلاشبہ جو مطلق ضرورت ہے، ایسے بین الاقوامی اداروں کی جو ان ہی اصولوں کی تنظیم اور اطلاق کریں۔

بلاشبہ، یہ سچ ہے کہ تمدن کو اس برتر شعوری حالت میں لانے کی تحریک سے بہت سے وسیع علاقے اب بھی باہر ہیں جن کی آبادیاں صدیوں سے غلامی اور خدمت گاری میں گرفتار رہی ہیں۔ ابھی تک انھیں خواب غفلت سے جگا دینے والے اثرات کے چھٹکے محسوس نہیں ہوئے ہیں، جن کو اخلاقی اور عقلی نشوونما کے لیے ایک عرصہ، بلکہ ایک طویل عرصہ چاہیے۔

پھر بھی، یہ ایک نئی اور قابل غور حقیقت ہے کہ مہذب قوموں نے، جو ”تمدن کی مقدس امانت“ کے بارے میں ہوشیار رہتی ہیں، لیگ آف نیشنز کے مہم نامے کی بائیس ویں شق کے تحت پس ماندہ لوگوں کو تعلیم دینے کی ذمے داری پوری کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے تاکہ وہ لوگ بھی ”عجیدہ دنیا کے مشکل حالات میں خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔“

صرف اداروں، تنظیموں اور رسوم ہی میں مڑتی نہیں ہوتی ہے، بلکہ خالص سیاسی نقطہ نظر سے یورپ کے، اور دنیا کے نقشے میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔

جب 1888 میں ہیگ امن کانفرنس کے اجلاس میں زار کے اُکسلا سے پر مہذب دنیا کے سامنے ترک اسلحہ جات کا مسئلہ رکھا گیا تھا، اور پہلی بار ”لیگ آف نیشنز“ کا نام لیا گیا تھا، یہ ایک امر قیمتی تھا کہ یہ مسئلہ اس وقت حل نہیں کیا جاسکے گا۔ یورپ کا سیاسی جغرافیہ عوام کے حقوق کی پامانی کی بے حد مضبوط بنیادوں پر ایسا دو تھا۔ پھلا کون، اور کس طرح، ان حالات کے پیش نظر اس کو امن کی تنظیم کی بنیاد کے طور پر استعمال کر سکتا تھا؟

آج، جنگ اس وقت کی زیادہ تر نا انصافیوں کو منادینے کی خدمت انجام دے چکی ہے۔ Alsace-Lorraine [جرمنی اور فرانس کے درمیان کان کنی ایک علاقہ جو 1871 میں جرمنی میں شامل ہو گیا تھا۔] فرانس کو واپس کر دیا گیا ہے؛ پولینڈ ایک خود مختار حیثیت حاصل کر چکا ہے؛ اور چیکو-سلوواکیہ، ڈنمارک، بلجیم، سلوواکیہ اور لاطین والوں کو اپنی خود مختار حکومتیں بنانے کے اختیار مل چکے ہیں۔ یا وہ اپنے وطن کو واپس جا چکے ہیں۔

ایشیا میں بھی قانونیت میں اور امن میں مختلف نسلوں کے تاریخی حقوق کے درمیان دیر پا توازن کی تلاش جاری ہے۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یورپ میں یا دوسرے ملکوں میں پریشانیوں کے تمام مآخذ ختم ہو چکے ہیں؟ ہم مستقبل پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرنے کی منزل سے بہت دور ہیں؛ یقیناً ہمارے سامنے پریشانیوں کے بہت واضح اور بہت قیمتی آثار ہیں جن سے تو خواب میں بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کچھ طاقتوں نے جنھیں عالمی جنگ میں شکست ہوئی تھی، اخلاقی ترک اسلحہ جات کو، جو امن کی ابتدائی شرط ہے، دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ کچھ غیر قیمتی کردار کی بے چین اقلیتیں خود اپنی ریاستوں کی تشکیل میں کم زور ہیں، سوسائٹیوں میں موجود اکثریت سے مزاحم ہیں، فطری سرحدوں سے باہر، جس میں سماجی طور پر ایک جائز زندگی پھل پھول رہی ہے، حمایت چاہتی ہیں، اس طرح وہ باہمی برداشت اور اعتماد کا گمراہ اور تشدد پیدا کریں گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ بہت سی مصنوعی تحریکیں ابھر رہی ہیں جو قومی سرحدوں کو پار کرنا، اور بہت مختلف عوام کو غیر نامیاتی اداروں میں اکٹھا کرنا چاہتی ہیں۔ Pan-Negro، Pan-Germanic، Pan-Islamic تحریکیں اپنی مشترکہ زبان یا اپنے مشترکہ مذہب یا اپنے رنگ کی بنیاد پر اپنے وجود کا جواز پیش کرتی ہیں۔ مگر جب ان تحریکوں میں غیر واضح لوگ شامل ہو جاتے ہیں تو تحریکوں کے لیے لازمی اور حقیقی اتحاد کا پس منظر یا کیونٹی کا مقصد خبط ہو جاتا ہے، اور یہ عام امن کے لیے سنگین خطرہ ہو جاتی ہیں۔

اس کے باوجود یہ سب محض دم بھر کی اہمیت کی ہو جاتی ہیں، اس لیے کہ یہ اس سیاسی یا سماجی انقلاب

کے زلزلے کے آخری جھٹکے کی مانند لگتی ہیں جنہوں نے دنیا کو متزلزل کر دیا ہے۔

مگر اس میں کچھ زیادہ گمبھیر چیز بھی ہے، کسی بین الاقوامی ادارے کے سلسلے میں جس پر بات کی جانی چاہیے۔ چند ماہ قبل آپ لوگوں کے سامنے کی جانے والی تقریر میں مسٹر براؤننگ نے واضح کیا تھا کہ سوشلسٹ کانگریسوں کی پیش کردہ طبقات کی بین الاقوامیت میں اور قوموں کی بین الاقوامیت میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، اور یہ بھی کہ صرف ثانی الذکر کے ذریعے ہی آدمیوں کے درمیان امن قائم کیا جاسکتا ہے، بجائے اس کے کہ تمام معقول امیدوں کی محض تمنا ہی کی جاتی رہے۔

حب الوطنی کا تصور انسانیت کے تصور سے نا موافق نہیں ہوا کرتا؛ اس کے برعکس، مجھے صاف صاف کہنے دیجئے کہ وہ جو جنگ مخالف کی بہترین خدمت کرتا ہے وہی حب الوطنی کی بھی خدمت کرتا ہے۔ کوئی بھی قوم کسی بین الاقوامی لیگ کی ایک اہم بنیادی اکائی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ جس طرح ایک خاندان کی تشکیل ریاست کی تشکیل کے لیے ضروری ہوتی ہے، اسی طرح ریاستیں صرف اکائیاں ہی ہیں جو ایک بین الاقوامی تنظیم کی ساخت کے لیے لازمی ہوتی ہیں۔

1914-1918 کی جنگ، قوموں کی آزادی کی جنگ ہوتے ہوئے بھی، قوم پرست میلان کو ضرورت سے زیادہ تیز کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ اس نے اخلاقی اور عقلی رجحانات کو زیادہ قوت دی جو وطن پرستی کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں؛ اس عمل نے [قوم پرستی کے] احساس کو زیادہ سرگرم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجوزہ بین الاقوامی ادارے کو ہر قوم کی صرف ناقابلِ لمس حاکمیت کی بنیاد پر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ان کی طاقت، کم زوری یا مناسب قامت سے قطع نظر سب کے لیے مساوی حقوق ہونے چاہئیں۔ صرف باقاعدہ بنائی گئی ریاستوں ہی میں نظم و ضبط اور قانون کی حکمرانی قائم ہو سکتی ہے۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر اس کا تصور بھی ممکن نہیں تھا کہ قوموں پر ادارے چھو پے جاسکیں گے۔ شاید ایک ”پیر اسٹیٹ“ کا خیال ہی، جس کی خواہش کو ابھرتے ہوئے اداروں پر چھو پاجاسکے، وطن پرستی کے انقلاب کا باعث ہوا ہے۔ ہر قوم کے لیے یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ کچھ قانونی اصولوں اور معاہدوں پر اقرار جو دونوں پارٹیوں کے مفاد میں ہوں، حاکمیتِ اعلیٰ کی دست برداری نہیں ہوا کرتے، بالکل اسی طرح جیسے نجی کاروبار کے معاہدوں میں اختیارات کی سپردگی کا مطلب ذاتی آزادی سے دست برداری نہیں ہوتا، بلکہ ان میں تو آزادی کا ارادی استعمال ہی دونوں پارٹیوں کا فائدہ سمجھا جاتا ہے۔ تو پھر ایسے معاہدے کے لیے وہ کون سی بنیادی شرط مانگزی رہتی جو بغیر کسی تحفظ کے اقرار کو یقینی بناتی ہے، جو ہر فریق کو یہ اہم فرائض کرتی ہے کہ کوئی بھی چیز لاپرواہی نہیں ہے کہ معاہدے کرنے والے کسی بھی فریق کا کوئی بھی اہم مفاد قربان نہیں کیا جائے گا۔

یہی سب سے مقدم قانون اور اقتدارِ اعلیٰ کا معیار ہونا چاہیے جس کے ذریعے ہر معاہدے کو پایا تو لا جائے، بالکل اسی طرح جیسے سائنسی دنیا میں آدمی اپنے فلسفی کرنے والے احکامات پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے، مظاہر کی قدر کے تعین اور موازنے کے لیے، انسانی فلسفی سے پاک، معیاری آلات سے مدد لیتا ہے۔

اخلاقی سطح پر وہ قانون ہی ہے، جس میں ذاتی یا قومی تعصب شامل نہ ہو جو رائے کے آثار چڑھاؤ سے
 بُرا ہو، جو دھوے اور جناب دھوے کا غیر متعصب محزر ہو۔ اپنی مطلق غیر جانب داری اور یکممانہ ثبوت کے
 ذریعے قانون و ولولوں کو جھنڈا کرے گا، انہیں غیر مسلح کرے گا، مہربانی و ممانعت کی ہمت شکنی کرے گا اور سکون و
 اہمیت کی ایسا فضا تیار کرے گا جس میں امن کا نازک پھول زندہ رہے اور نشوونما پائے سکے۔
 کیا ایسا فرماں روا اور ناقابلِ ضرر قانون کا کہیں وجود ہے؟ گزری ہوئی صدیوں کی تاریخ ایک مثبت
 جواب پیش کرتی ہے۔

اب ایک ایسا بین الاقوامی قانون وجود میں ہے جس کا نظریہ محکم ہے اور جس کی منصفی پر کوئی بھی مہذب
 قوم انگلی نہیں اٹھا سکتی۔ انیسویں صدی میں، جس میں ایک امن کانفرنسیں شروع ہوئیں اور انواع و اقسام کی
 بے شمار دوسری کانفرنسیوں کا انعقاد ہوا، بین الاقوامی قانون کے بے شمار اطلاق بھی ہوئے۔ اگر 1914 میں، اور
 جنگ کے دوران کے برسوں میں، اس قانون سے بے تحاشا روگردانی ہوئی تھی تو فتح نے غلط کو صحیح کر دیا
 ہے۔ اگر پھر کبھی ایسی روگردانی ہو تو ہمیں بنی نوع انسان کے مستقبل سے مایوس ہونا پڑے گا۔
 ایک خالص قیامی اور نظریاتی نوعیت کے اعتبار سے بین الاقوامی قانون کو رفتہ رفتہ بے شمار جلسوں کے
 ذریعے بھرپور بنایا جا رہا ہے جس میں منصفانہ نظام کے ضروری فرائض شامل ہیں، جس کی باقاعدہ حد بندی کی
 جاسکتی ہے، جسے مرتب کیا جاسکتا ہے اور قانونی طور پر لازم اور نافذ بنایا جاسکتا ہے۔ ان جلسوں کی
 وسعت مسلسل بڑھتی جاتی ہے، اور رفتہ رفتہ اس میں اخلاقی تصورات شامل ہوتے رہتے ہیں جو دعویٰ کتے ہیں
 جسے میں نے اپنے ایک حالیہ مطالعے میں بین الاقوامی اخلاقیات کے اصول کا نام دیا ہے، جو ہر اس شے سے
 متعلق ہوتا ہے جو زندگی، صحت اور تمام انسانوں کی مادی اور روحانی بہبود پر اثر انداز ہوتی ہے۔
 بین الاقوامی قانون وجود میں ہے۔

نعم، کیا ہم امید کر سکتے ہیں کہ ایک عدالتی ادارہ، جس کی قدرت میں ایسی حاکمیت ہو، کبھی قانون کی
 مخلص تخریج کرنے والا [ادارہ] بنا سکے گا جو ویسا ہی غیر متعصب اور پرسکون ہو جیسا کہ خود قانون ہوتا ہے؟
 لیگ آف نیشنز میں ہونے والی حالیہ بحثوں میں، اور Court of International Justice کی تشکیل
 ہمیں ایک بار پھر یہاں کہنے کے قابل بناتی ہے۔

(4)

اب ہم ان تین شرائط کا خلاصہ پیش کرنا چاہتے ہیں جو عصری تمدن کے ہم پلہ کسی بھی بین الاقوامی
 ادارے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ماتمی ریاستوں کے درمیان خیالات، احساسات اور ترقیات کی شراکت
 ہونی چاہیے، جو اگر ہم شکل نہ ہوں تو ان میں کم از کم مناسبت تو ہو، بین الاقوامی نظام کے اصولوں کی سمجھ ہو اور

وہ ایسے معاہدے کر سکیں جو انھیں موثر بنا سکیں۔

دوسری شرط: ان تمام قوانین کو ہر ریاست کی آزادانہ اور غیر بندیہ منظوری حاصل ہونی چاہیے اور اگر قانون میں خلل اندازی سے ان کے خلاف ماکہ بندی کا اعلان کیا جائے، تو یہ ماکہ بندیاں سب کے لیے قابل قبول ہوں، تاکہ کوئی قوم یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ اس کو مشترکہ اقدام میں زبردستی شریک کیا گیا تھا کہ اس نے ابتدا ہی میں اس کی منظوری نہ دی ہوئی۔

آخری شرط: مرکزی علاقے میں قائم ایک ثالثی عدالت ہونی چاہیے جو ہر معاملے میں بین الاقوامی قانون کے مطابق فیصلہ دے سکے اور ان پر عمل درآمد کا حکم دے سکے۔ ایسی عدالت میں کامل غیر جانبداری ہونی چاہیے جو اس کے جموں کی مامرانہ قابلیت کے باعث اس کے فیصلوں کو اخلاقی اعتبار دے سکے۔

اگر یہ تینوں شرائط پوری ہوں۔ اور یہ فوراً ہی واضح ہو جائے گا کہ ان تینوں شرائط میں ایک ابتدائی شرط بھی موثر ہے کہ ہر شریک کرنے والے اس کے قیام کی آزادانہ منظوری دی ہے، اور یہ تینوں شرائط اپنے طور پر بھی موثر ہیں۔ تو لیگ آف نیشنز کام کر سکے گی، اس چلک کے ساتھ جو اس کے ارکان کو تحفظ کا احساس دے گی کہ وہ اپنے اختیار آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں، اور ان کو ایسی اخلاقی طاقت فراہم کرے گی کہ ارکان اس کے فیصلوں سے روگردانی کے بارے سوچ بھی نہ سکیں۔

ہم اخلاقی طاقت کی بات کرتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم مادی طاقت کو خارج از امکان قرار دیتے ہیں، اس حالت میں بھی جب بعدترین معاملوں میں ان ارکان کے خلاف اس کا استعمال ضروری سمجھا جائے جو عہد نامے کی خلاف ورزی کے مرتکب پائے گئے ہوں۔ مگر ہم اس کو آخری حربہ سمجھتے ہیں، اگر ضرورت پڑ جائے، اور ہم قائل ہوں کہ اس کو اس وقت تک استعمال نہیں کیا جائے گا جب تک کہ یہ یقین نہ ہو جائے کہ تشدد اور جارحیت کا استعمال کیا گیا ہے، اور الزام شدہ جارح کا آفاقی سطح پر اعتراف کیا جا چکا ہے۔

مزید یہ کہ لیگ آف نیشنز کے عہد نامے کی دفعہ 10 اور دفعات 12، 13 اور 16 کسی طرح بھی ہماری کی ہوئی تشریح سے متصادم نہیں۔ ہمارے امریکی دوستوں نے دفعہ 10 کے بارے میں اپنے خوف کا اظہار کیا ہے کہ ان [دفعات] کے تحت ان کا ملک [ہم اس] فوجی کارروائی میں شامل ہو سکتا ہے جس کی منظوری نہ دی گئی ہو۔ یاد رہے کہ دفعہ 10 ہر قوم کو اپنے علاقوں کی سالمیت کے تحفظ کے لیے عام نوعیت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ مگر اس کے بعد کی دفعات میں سے کوئی بھی دفعہ یہ نتیجہ اخذ کرنے کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی بھی قوم اپنے ان اداروں کی واضح منظوری کے بغیر اپنا ایک اپنی مرضی کے خلاف کسی عسکری کارروائی میں ملوث ہو جو قومی حاکمیت کے مظہر ہوں۔

اسلامیات کی حد بندی کے مشکل مسئلے کے سلسلے میں نہ کاؤنسل اور نہ اسمبلی کو کبھی یقین ہوا ہے کہ ہر قوم کی کھلی حمایت کے بغیر اس سے متعلق قوانین بنائے جا سکیں گے۔ ہر قوم کو پوری آزادی ہوگی کہ وہ اپنی

اندرونی اور بیرونی سلامتی کے لیے ضروری شرائط کی وضاحت خود کرے۔ اسی طرح، ہر قوم کو کسی قسم کی اجتماعی عسکری کارروائی کے لیے اجازت دینے یا روک لینے کی پوری آزادی ہوگی۔ جتنی تجزیے میں عہد نامے کی دفعات کی مطابق ایک مزا جو ہو سکے گی، یہ کروہ لیگ آف نیشنز کی رکنیت سے ملنے والے فوائد روک دیے جائیں گے۔

ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ قومیں محض ایک ہی دن میں ان بنیادی سچائیوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکیں گی، ہم نے جن کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے وقت اور مسلسل پروپیگنڈا اور ساتھ ہی میل جول کے فوائد کا واضح ثبوت بھی درکار ہوگا۔

اس مرحلے پر ہمارا ارتکاز اس نوعیت کے پروپیگنڈے پر ہے جو واقعی کامیاب ہوتا ہے۔ جو اکثر نفرت کے معنوں میں استعمال کیا جاتا رہا ہے، اور ہم اب جسے اس کی بہتر اصلاحی تعبیر میں دوبارہ پیش کرنا پسند کریں گے جسے حقیقت کا پروپیگنڈا کہا جاسکتا ہے۔ ہمیں جس امر کو ہر شخص پر واضح کر دینا چاہیے وہ دراصل بین الاقوامی زندگی ہی ہے، جو تعصب کو زیر کرنے، تمام مزاحمتوں کو قابو کرنے اور ہر قسم کی منفی خواہشوں کو مٹتا بنانے کے لیے کافی ہے۔

اب بھی دنیا میں ایسا طاقت ور اور اتنا پیچیدہ بین الاقوامی طریقہ حیات موجود ہے کہ کوئی بھی اس کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔ صحت عامہ کا تحفظ، نقل و حمل کے ذرائع، کسٹم کی رکاوٹوں میں کمی، بین الاقوامی قرضوں کا ادارہ۔ یہ بین الاقوامیت کے وہ سارے پہلو ہیں جن سے کوئی قوم، خواہ وہ کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہو علاحدہ رہنے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس کے قداوراس کے وسیع صنعتی اور تجارتی رسوخ کے باوجود امریکا میں بے روزگاری یورپ کی قوموں سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے کہہ رہے ہیں کہ دنیا میں کیا جانے والے سب سے بڑی کو یا کریں تو آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ دنیا میں کبھی بھی بین الاقوامی نقل و حمل کے خلاف مستحکم بند بنانے کتنے ناممکن ہو گئے ہیں۔

ایسے آلوں کی تیاری جو اس قسم کے بین الاقوامی طرز حیات کی ضرورت ہوں جو مختلف نسلوں اور مختلف قوموں کے آدمیوں کے ساتھ رہنا سکھائیں، قوموں اور آدمیوں کے درمیان باہمی اتفاق کے مظاہر کو واضح کریں یہ بہترین، سب سے زیادہ متاثر کن اور سب سے زیادہ راغب کرنے والا سبق ہے جس کے تصور کو ممکن بنانا ہے۔

ایسی حقیقتوں سے متعلق سبق سب سے زیادہ قابل قدر ہوگا۔ مگر کسی اور [سبق] کو اس سے متعلق کرنا بے جوڑ بھی نہیں ہوگا۔ تمام مہذب ملکوں میں رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے پروپیگنڈے کو باقاعدہ منظم کیا جانا چاہیے جو لیگ آف نیشنز کے قیام، اس کی طاقت کے تعین، اس کی جانب سے ریاستوں کی حاکمیت کے قوانین کے سچے احترام، اور ساتھ ہی اس کی اخلاقی اصولوں کی قوت پر زور دے۔

خوش قسمتی سے، تقریباً تمام ملکوں میں ایسی بڑی انجمنیں موجود ہیں جو ان تعلیمات کو کسی سیاسی جانب

داری کے بغیر لوگوں میں عام کرتی تھی۔

لیگ آف نیشنز کی تازہ ترین تخلیق کا معنی خیر عنوان ہے: عقلی تعاون۔ ہمارے حالیہ اجلاس میں مشہور ترین متعلقین، وسیع درجے کے علم اور شان دار دانش کے مالک آدمیوں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ اس کا نام ہی امید افزا ہے۔

مادی اور سیاسی مفادات کی یکجائی کی طرح باہمی اور دانش ورانہ مفاد کے منصفانہ تبادلے کو دانش ورانہ تعاون کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ تمام زندہ اجسام میں ایک قوت محرکہ ہوتی ہے، آگے بڑھنے کا ایک جذبہ ہوتا ہے۔ تو کیا ان تمام قوموں اور نسلوں سے ابھرنے والی مختلف النوع قوتوں سے ایک اجتماعی روح، اجتماعی زندگی کے لیے ایک اجتماعی سائنس تخلیق نہیں کی جاسکتی جو ہر ملک کی روایات کو ایک مشترکہ جہد انصاف میں ضم کر لے؟

دنیا کے ہر کونے سے نکلنے والے راستوں کے ذریعے اس بلندی کی طرف جانا جہاں خود آدمی کا اپنا قانون حاکمیت کی مثال پر چھوٹنے لگے۔ کیا یہ مقام صلیب پر بنی نوع انسان کی صدیوں لمبی اور زرخیز پرزینہ چڑھائی کا اختتام نہیں؟

تا کہ کئی برسوں کی آزمائش اب ختم ہو جائے، اور اب بھی تمام انسانوں کی مراجعت کے ولولوں سے قبل کی گرج خاموش ہو جائے؛ لیکن اگر آخری ہدف کی طرف لے جانے والے راستے پر واضح نشانات بنا دیے گئے ہیں، اگر لیگ آف نیشنز جیسا ادارہ اپنی صلاحیت اور اس کے مقصد کو حاصل کر لیتا ہے تو امن کے طاقت ور فوائد اور انسان کی ایک جہتی بنائیں پر فتح پائے گی۔ ہم کم از کم اس کی جہارت ضرور کر سکتے ہیں، اور اگر اس پر غور کریں کہ تاریخ کے سویرے کے بعد سے ہم کہاں تک پہنچے ہیں، تب ہماری امیدیں اتنی قوی ہو جائیں گی کہ وہ ایک غیر متزلزل عقیدے میں تبدیل ہو جائیں گی۔



ووڈرو ولسن اعلان تجلیل

مارویائی پارلیمان کی نوبیل کمیٹی نے اپنے خط میں کہا ہے:

”مارویائی پارلیمان کی نوبیل کمیٹی 1919 کا نوبیل امن ریاست ہائے متحدہ کے صدر مسٹر ووڈرو ولسن (Woodrow Wilson) کو اور 1920 کا انعام فرانسیسی مینیٹ کے صدر اور لیگ آف نیشنز کی کاؤنسل کے صدر مسٹر لیون بورژوائس (Léon Bourgeois) کو پیش کرنے میں فخر محسوس کر رہی ہے۔

حضرات! آج جب عالمی جنگ کے بعد پہلی بار مارویائی پارلیمان کے اجلاس کا انعقاد ہو رہا ہے، یقین کیا جاتا ہے کہ امن کا عظیم آدرش، جو قوموں کی بقا کی امیدوں میں جاگزیں ہے، حالیہ الم ناک واقعات کے نتیجے میں ایک بار پھر آدمیوں کے ذہنوں میں نئے سرے سے نشوونما پائے گا۔“

صدر ولسن کا نام امن انعام یافتہ ہونے کی حیثیت میں سامنے آیا ہے تو میں اس موقع پر، جانتا ہوں کہ یہ انعام ماروے کے عوام کے شکریے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس لیے کہ اپنے معزز چودہ نکات کے ذریعے ریاست ہائے متحدہ کے صدر موجودہ زمانے کی بین الاقوامی سیاست میں انسانیت کے بنیادی قانون کا ایک نمونہ لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انصاف کا بنیادی تصور جس پر اس کا انحصار ہوتا ہے کبھی نہیں مرنے والا، بلکہ یہ تو رفتہ رفتہ قوی ہوگا، اور صدر ولسن کے نام نامی کو آئندہ نسلوں کے ذہنوں میں تروتازہ رکھے گا۔

تقریر قبولیت

(بچوں کہ صدر ولسن اپنی علالت کے باعث اوسلو انٹرنیشنل فیس لائیکے تھے، ان کی

جانب سے اوسلو سفارت خانے میں تعینات امریکی وزیر Albert G. Schmedeman نے انعام بھی قبول کیا اور ان کی مندرجہ ذیل تقریر قبولیت بھی پڑھ کر سنائی

جناب صدر! مجھے یہ اعزاز ملا ہے کہ میں صدر ووڈرو ولسن کا بھیجا ہوا آپ کو پیش کروں جس میں انہوں نے درخواست کی ہے کہ میں ان کی جانب سے 1919 کا انعام دیے جانے پر نوبل امن کمیٹی کا شکریہ ادا کروں۔ اس لیے جناب صدر! میں اس قابل احترام ادارے کے سامنے ایک پیغام پیش کرنے اور چند جملے کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

صدر ولسن نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں صدر نشین لوولینڈ (Lowland) اور اسٹارٹنگ (starting) کی نوبل امن کمیٹی کے ارکان کو مندرجہ ذیل پیغام اہمیت پیش کروں:

”آپ کے اس اعزاز کو قبول کرتے ہوئے میں نہ صرف امن کے لیے کیے جانے والے اپنے کام کے اعتراف پر کبرے تشکر سے متاثر ہوا ہوں جس کے ذریعے سے آپ نے میری سنجیدہ اور محنتانہ کوششوں کو سراہا ہے بلکہ نگاہ تیز بین کے ساتھ اس کام کی وسعت کا بھی اقرار کیا ہے جو اس مقصد کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کیا یہ موقع نہیں کہ میں انعامات کے اس مسلسل نظام کی بنیاد رکھنے والے کی اس دوراندیش فہانت کے بارے میں اپنے احترام کا اظہار بھی کروں؟ اگر اس سلسلے میں ایک ہی انعام ہوتا، یا اگر یہ آخری انعام ہوتا تو یقیناً میں اسے قبول نہیں کرتا۔ اس لیے کہ بنی نوع انسان کو ابھی تک جنگ کے ناقابل بیان خوف سے چھٹکارا نہیں ملا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری فصل نے اپنے رخنوں کے باوجود نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ مگر یہ بہتر عقل مندی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے کام کو ابھی ایک ابتدا ہی سمجھیں۔ یہ ایک محنت مسلسل ہوگی۔ ہمارے سامنے کے لامتناہی برسوں میں دہڑوں کے لیے بھی بے شمار امکانات ہوں گے کہ وہ نفرت اور خوف کے خلاف اس جنگ میں خود کو ممتاز کریں۔

نوبل انعامات کی گروہ بندی میں بھی ایک قسم کی درستی نظر آتی ہے۔ امن کے مقصد اور صداقت کے مقصد دونوں کا خاندان ایک ہی ہے، بالکل اسی طرح جیسے وہ لوگ جو مائنس سے محبت کرتے ہیں اور اپنی زندگیوں کو طبعیات یا کیمیا کے لیے وقف کر دیتے ہیں، اسی طرح جیسے لوگ جو ادب میں بنی نوع انسان کے لیے نئے آدرش تخلیق کرتے ہیں اور ان کے لیے بھی جو امن سے محبت کرتے ہیں کوئی حد متعین نہیں کی گئی ہے۔ ماضی میں جو کچھ بھی انجام کو پہنچا ہے، مستقبل کی توصیف اور وعدے کے مقابلے میں بہت معمولی ہے۔

ووڈرو ولسن

مجھے افسوس ہے کہ میں اس محترم ادارے سے مارویائی زبان میں خطاب کرنے سے قاصر ہوں؛ اگر یہ ممکن بھی ہوتا تب بھی میرے پاس ایسے الفاظ نہ ہوتے جو اس اعلیٰ اعزاز کی توصیف کا اظہار کر پاتے

جو 1919 کے نوبل امن انعام کی صورت میں نارویائی پاریمان کی نوبل کمیٹی نے میرے ملک کے عظیم ترین مدظلہ میں سے ایک، لوڈروئسن، صدر ریاست ہائے متحدہ امریکا کو عطا کیا ہے۔ یہ اعزاز جو صدر یوسن کو عطا کیا گیا ہے، میرے نزدیک اہمیت اور ارحامینان کا باعث ہے ایک موقع ہے جو ہمیشہ میری یادوں میں محفوظ رہے گا۔ ریاست ہائے متحدہ کے صدر کی جانب سے انعام قبول کرنے کا استحقاق ثبوت ہے، ان کی کوششوں کے اعتراف کا جو ہر قوم کی بلند ترین اخلاقی طاقتوں سے اپیل کے ذریعے اتفاق کو ہم آہنگی میں بدلنے کے لیے کی گئی تھیں اور یہ بھی ایک واقعہ ہے جس کی پرورش کی جانی چاہیے۔

میرے لیے غیر ضروری ہے کہ میں صدر یوسن کی ان کارناموں پر روشنی ڈالوں جو ان کو دیے جانے والے اعزاز کا جواز ہیں، بین الاقوامی معاملات کی مکمل سمجھ اور تمام لوگوں کی بہبود اور کامیابی کے معاملے میں ان کی دانش مندی اور قائل کرنے کے طریقے، اور ان کا صداقت اور قوت سے بھرپور قصد، جو لیگ آف نیشنز کے قیام پر منتج ہوا ہے، ہم سب پر اچھی طرح واضح ہے۔ انھیں شاید کم از کم کسی عوامی آدمی کی طرح، اس حقیقت کا احساس رہتا ہے کہ اب وہ وقت نہیں رہا جب ہر قوم اپنے آپ میں محدود ہو کر زندہ رہ سکتی تھی، اور ان کی محنتیں، ان امیدوں اور خیالات سے نمونپاتی تھیں کہ امن کو ایک اتفاقی زندہ حقیقت بنا دیا جائے۔ یہ ممکن نہیں کہ بین الاقوامی امن کے لیے کیے جانے والے لوڈروئسن کے اعلیٰ درجے کے کام کا تخمینہ پیش کیا جائے، جب تک کہ وقت ان کو ظہور نہ کر دے، جسے فی الحال ایک مہر شدہ کتاب ہی رہنا چاہیے۔

نارویائی پاریمان کے اراکین حضرات! میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ الفاظ ان کبرے جذبات کی ترسیل نہیں کر پا رہے ہیں جو اس وقت میرے اندر موجزن ہیں جب ریاست ہائے متحدہ کے صدر کی جانب سے اس صداقت نامے کا حصول میرے فرائض میں شامل ہو رہا ہے۔ صدر کے پیغام میں شامل الفاظ سے زیادہ موزوں الفاظ بولے نہیں جاسکتے، جس میں انھوں نے اس عظیم اعزاز کا اعتراف کیا ہے، جو نارویائی پاریمان کی نوبل امن کمیٹی نے ان کو عطا کیا ہے۔

نارویائی پاریمان کے صدر Anders Johnsen Buen کا خطاب

(صدر یوسن نے نوبل کمیٹی کو مطلع کر دیا تھا کہ خرابی صحت کے باعث وہ اوسلو نہیں آسکیں گے، سو انھوں نے نوبل خطبہ نہیں دیا۔)

ہنری لافانٹین

اعلانِ تجلیل

ہنری لافانٹین یورپ کی ہر دلی عزیز امن تحریک کے سچے قائد ہیں۔ یہ 1907ء سے برن (Bern) میں قائم International Peace Bureau کے صدر رہے ہیں۔ یہ Interparliamentary Union کے سربراہ اور رہنما بھی ہیں۔

لافانٹین 22 اپریل 1854ء کو برسلز (Brussels) میں پیدا ہوئے جہاں اب وہ Court of Appeal میں وکیل ہیں اور بین الاقوامی قانون کے پروفیسر بھی۔ 1895ء میں یہ مینیٹ میں داخل ہوئے اور 1889ء سے امن کے مقاصد کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔ لافانٹین Brussels City Council کے رکن بھی ہیں، جو سوشلسٹ پارٹی کی جانب سے نامزد کیے گئے تھے۔ امن کے لیے کام کرنے والے بہترین اطلاق یافتہ لوگوں میں سے ہیں اور ان کی پھل کاری اور توانائی نے بین الاقوامی فروغ کے لیے بہت کچھ کیا ہے بالخصوص حالیہ برسوں کی بین الاقوامی اور امن کانفرنسوں کے لیے، جہاں انھوں نے بین الاقوامی قانون کی تحریر میں اور اس کی عملی تنظیم کی تحریک میں حصہ لیا ہے۔ مثال کے طور پر، 1899ء میں ان کی سرگرمیوں میں اوسلو میں ہونے والی امن کانفرنس میں اشتراک شامل تھا۔ 1895ء میں انھوں نے International Institute of Bibliography کی، اور [بعد میں] Central Office of International Associations کی بنیاد رکھی۔ لافانٹین ادبی میدان میں بھی خاصے سرگرم رہے ہیں جس ایک مثال 1794ء سے 1900ء تک کے ناشر کے مقدموں کا عظیم دستاویزی کام ہے۔ [میری نظر میں] ایسا اور کوئی نہیں جس نے پر امن بین الاقوامیت کی تنظیم میں ان سے زیادہ ہاتھ بٹایا ہو اور ان کی غیر معمولی انتظامی لیاقت امن کی تحریک کے لیے [واقعی] اصول دی ہے۔ لافانٹین سوشلسٹ پارٹی کے اعتدال پسند بازو سے تعلق رکھتے ہیں، یہ پہلے Social Democrat تھے جسے نوبیل امن دیا گیا ہے۔

میکریٹری نوبیل کمیٹی Ragnvald Moe کی زبانی

(انعام یافتہ نے نوبیل خطبہ نہیں دیا)



ایلی ہاروٹ اعلانِ تجلیل

ایلی ہاروٹ 15 نومبر 1845 کو نیویارک کی ریاست میں پیدا ہوئے اور 1867 میں نیویارک یونیورسٹی سے قانون میں ڈگری لی۔ بہت بعد میں انھوں نے بین الاقوامی قانون پڑھا اور 1894 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ کچھ برس انھوں نے نیویارک میں وکیل کے طور پر کام کیا، اور اپنے پیشے میں سب سے اچھے وکیل بن گئے۔ اگست 1899 میں صدر مک کینلی (McKinley) نے انھیں سیکریٹری برائے جنگ بنا دیا اور یہ عہدہ ان کے پاس 1904 تک رہا تھا۔ اگلے برس روزویلٹ نے انھیں اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کا انتظام سنبھالنے پر راضی کر لیا جہاں یہ 1909 میں ہونے والے مینیٹ کے انتخابات تک کام کرتے رہے تھے۔

ہاروٹ دل فریب شخصیت کے مالک ہیں اور انھوں نے اپنے آدرش پر ہمیشہ عزم اور آزادی سے عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان دن برسوں میں جب وہ حکومت میں [سیکریٹری برائے جنگ اور سیکریٹری آف اسٹیٹ] تھے انھیں کئی مشکل مسئلے حل کرنے پڑے تھے جن میں کچھ بین الاقوامی نوعیت کے تھے۔ کیوبا کے معاملات اور ہسپانوی/امریکی جنگ کے بعد کی تنظیم کے یہی ذمے دار تھے جو بہت اہم کام تھا جس کی وجہ سے شمالی اور جنوبی امریکا کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا ہوئی تھی۔ جب 1906 کے موسم گرما میں انھوں نے جنوبی امریکا کا دورہ کیا تو انھوں نے پان امریکی تحریک کے استحکام کے لیے بہت کام کیا تھا۔ 1908 میں انھوں نے نیویارک میں Pan-American Bureau کی بنیاد رکھی۔ مرکزی امریکا کے چھوٹے ملکوں کے درمیان مفاہمت کے سلسلے میں ان کی مشق کو ششیں بار آور ہوئی تھیں۔ سب سے مشکل مسئلہ جو ہاروٹ کو درپیش تھا جب وہ سیکریٹری آف اسٹیٹ کے عہدے پر فائز تھے، وہ جاپانی تارکین وطن کے بارے میں جاپان سے

تہا زبرد تھا۔ اگرچہ اس مسئلے کا حتمی حل نہیں نکلا پایا تھا مگر اس سلسلے میں ان کا کام قابلِ قدر رہا تھا۔ حکومت سے الگ ہونے کے بعد رٹوٹ نے خود کو تنہا، امن، دشمن سے امن کے کام کے لیے وقف کر دیا ہے، اور اب وہ Carnegie Peace Foundation کے صدر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ سینیٹ کے رکن کی حیثیت میں Tall کی تجویز کے بارے میں رٹوٹ سب سے زیادہ صاحبِ عمل تھے جس میں ریاست ہائے متحدہ اور برطانیہ عظمیٰ کے درمیان شرائط سے ماورا ثالثی کی تجویز پیش کی گئی تھی؛ اور پاناما نہر کے محمول کے بارے میں انھوں نے Hay-Pauncefote Treaty کے تحت برطانیہ کی تشریح کی طرف داری کی تھی اور امریکا کے خصوصی استحقاق سے اختلاف کیا تھا۔ جب انھوں نے پچھلے برس کے موسم بہار میں سینیٹ میں تقریر کی تھی تو امن کے تمام دوستوں نے ان کو سراہا تھا۔

نوبل کمیٹی کے سکرٹری Raghvald Moe کی زبانی



ٹوبیاس آسر

الفریڈ ہرمن فرائیڈ

اعلان تجلیل

ٹوبیاس آسر (Tobias Asser) (1838) میں انیسٹریٹیم میں پیدا ہوئے اور وہیں 1862 سے 1893 تک وہ کمرشل اور قانون کے پروفیسر رہے۔ اسی دوران وہ کاؤنسل آف اسٹیٹ کے رکن بھی بنادیے گئے تھے۔ جلد ہی وہ ولندیزی وزارت خارجہ میں قانونی کاؤنسلر ہوئے اور 1904 میں منسٹر آف اسٹیٹ بنادیے گئے۔ انھیں کیمرج، ایڈمیرالٹی اور یولفا کی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں سے نوازا ہے۔ دی ہیگ کی امن کانفرنسوں میں وہ ولندیزی مندوب رہے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں روس اور ریاست ہائے متحدہ کے درمیان Bering Straits کے تنازعے میں اور ریاست ہائے متحدہ اور میکسیکو کے درمیان کیلی فورنیا کے Pious Fund کے تنازعات میں ثالث بنایا گیا تھا۔

یہ Institut de droit international کے بنیاد گزاروں میں سے تھے اور اس ادارے میں ان کے کافی رسوم تھے۔

آمریکائی عملی اور قانونی مدبر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ قانون کے سلسلے میں ان کا وہی مقام ہے جیسا کہ معروف فرانسیسی قانون دان لوی رینو (Louis Renault) کا بین الاقوامی ہابگ لا میں تھا۔ ان کی عوامی سرگرمیاں ان کی ادبی تحریروں پر اثر انداز ہوئیں جن کا اپنا الگ ایک مقام ہے۔ بین الاقوامی قانونی تعلقات کے میدان میں انھوں نے اپنا ایک مقام بنایا ہے اور وہ جدید قانونی معاملات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ان کو سرجمین صمدی عیسوی کے بین الاقوامی قانون کے احیا کا سرخیل سمجھا جاتا ہے۔

ان ہی کی اہم پروندیزی حکومت نے دی ہیگ میں 1893، 1894، 1900 اور 1904 میں بین

الاقوامی کانفرنسیں منعقد کی تھیں، جن کی صدارت امر نے کی تھی۔ ان کانفرنسوں میں بین الاقوامی قانون کے کنونشن اور عوامی تحفظ کے قوانین کے لیے راہیں ہموار کی گئی تھیں۔ بعد میں ان اداروں کی ذمہ داریاں انفرادی ملکوں کو سونپ دی گئی تھیں تاکہ وہ اپنے ملکوں میں ان قوانین کو ان کے خطوط پر ڈھال لیں۔ امر ہی نے تجویز پیش کی تھی کہ نیدرلینڈ کی مثال پر کانفرنسوں کے انعقاد کے لیے مستقل کمیشن بنائے جائیں۔ ان کے مطابق، اس طرح ایک بین الاقوامی تنظیم کی بنیاد پڑے گی جو بین الاقوامی شہری قوانین کی ترتیب کا باعث ہو گی۔ نتیجے کے طور پر ان میں سے شہری اور خانہ دہائی قوانین کے لیے سہ ماہی کنونشن قائم ہوئے، جن میں سے پانچ کوارٹر سے بھی قبول کیا گیا ہے۔

الفریڈ ہرمن فرائیڈ (1864) Alfred Hermann Fried میں ویانا (Vienna) میں پیدا ہوئے۔ نگران کی پیشہ سرگرمیاں جرمنی میں رہیں۔ وہ ان چند آدمیوں میں سے ہیں جس نے 1891 سے اپنی پوری زندگی امن کے کام کے لیے وقف کر دی ہے۔ فرائیڈ پہلے کتابیں فروخت کیا کرتے تھے اس کے بعد وہ صحافی بن گئے۔ انھوں نے از خود اکساب علم کیا ہے اور اپنی ثابت قدمی اور مصروفیت کے ذریعے، جو جرمن افراد کا خاصہ ہے، ترقی کے منازل سر کیے اور ادیبانہ تحریروں میں کمال حاصل کر لیا۔ پچھلے بیس برس کے عرصے میں شاید وہ سب سے جفاکش امن پسند رہے ہیں۔

1892 میں انھوں نے جرمن امن سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور کچھ عرصے اس کے رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ 1899 سے وہ Die Friedersware نام کا اپنا ماہنامہ شائع کر رہے ہیں جو رفتہ رفتہ امن تحریک کا سب سے اچھا رسالہ بن گیا ہے، جس میں بین الاقوامی مسائل پر عمدہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ فرائیڈ جرمنی کی یونیورسٹیوں میں بین الاقوامی قانون اور تاریخ کے شعبوں کے اساتذہ کو اپنے رسالے کے لیے مضامین لکھنے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جن لوگوں نے فرائیڈ کو نوبل امن کے انعام کے لیے نامزد کیا تھا ان میں L. von Bar, Lamprecht, Niemeyer, Schucking, Rehm اور Lenthner نام کے پروفیسر حضرات شامل ہیں۔ Swedish Parliamentary Peace Group نے بھی بیرن بانڈے (Baron Bonde) اور Swedish Peace and Arbitration Association کے ساتھ مل کر پاریمان کے کسی اور رکن کے ذریعے ان کا نام تجویز کیا تھا۔

فرائیڈ کا کہنا ہے کہ امن تحریک کو بین الاقوامی زندگی کی قانونی اور سیاسی تنظیم ہونا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ بین الاقوامی دفاتر میں ایک موثر تنظیم کے ابتدائی آثار نظر آ رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کے تمام میدانوں میں بھی ایسے دفاتر قائم ہونے چاہئیں۔ مزید تنظیم کے باعث موجودہ بین الاقوامی مزاجیت (اسلحہ بند امن) رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ امن قائم ہو جائے گا۔ اس نقطہ نظر کی بنیاد پر فرائیڈ جنگ کے خلاف جنگ پر کم زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں، وہ طریقہ جو امن پسند لوگ اپناتے ہیں، کہ جنگ کے خیال سے نفرت و لاف جائے، کافی نہیں ہوتا۔ جنگ کے آثار سے لڑنے کے

بجائے، وہ چاہتے تھا کہ سب سے پہلے اس کی وجہ یعنی، بین الاقوامی تعلقات میں پچھلی مزاحمت، سے لڑا جانا چاہیے۔ فرائیڈ نے اپنی کتاب The Basis of Pacifism میں اس نظریے پر بحث کی ہے۔

آمریکا اور جرمنی کے اخبارات میں لکھے جانے والے بے شمار مضامین کے علاوہ فرائیڈ نے امن پسندی پر بہت سے انفرادی کتابچے اور کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں Das Abrüstungs-Problem (Berlin, 1904); Die Friedenswarte; and Pan-Amerika (Der kranke Krieg (Leipzig, 1909); (Berlin, 1910); Pan-Amerika (Berlin, 1910) میں شائع ہونے والے مضامین شامل ہیں۔ ان کا سب سے اچھا کام (1905) Handbuch der Friedensbewegung ہے جس کا پہلا حصہ ایک اضافہ شدہ اشاعت کی صورت میں آیا ہے۔ اس میں امن کی تحریک کے بنیادی مسائل کی تفصیلات، کانفرنسوں کی رپورٹ، ثالثی کی عدالتوں اور امن کی تحریک کا دلچسپ تاریخی تجزیہ، امن کے دوستوں کے حالات زندگی، سو برائیوں کی تحریک کی دوسری تنظیموں کی فہرستیں بھی دی گئی ہیں۔

فرائیڈ کے احتیاج ہی کی وجہ سے مراسم کا معاہدہ بھی ہوا تھا۔

نوبل کمیٹی کے صدر نشین Jørgen Gunnarsson Løvland کی زبانی

[دونوں حضرات میں سے کسی نے بھی خطبہ نہیں دیا۔]



آگستے بیرنارت

پال ہنری ایستور نیل ڈی کونستال

اعلان تجلیل

آگستے بیرنارت

آگستے بیرنارت 1828 میں پیدا ہوئے۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے 1853 میں برسلز میں بیرنر کی حیثیت سے وکالت شروع کی۔ 1859 میں بلجیم کی Supreme Court of Appeal میں کاؤنسل کے حیثیت سے تعینات ہوئے۔ انھوں نے نو عمری ہی میں 1873 میں سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور تھیولٹ (Thielt) سے منتخب ہو گئے۔ ان کی غیر معمولی لیاقت اور سیاسی صلاحیت ایک بڑے سیاسی مستقبل کی نوید ہوئی۔

1873 میں ان کو کاروائی کا وزیر بنا دیا گیا تھا، جس عہدے پر وہ 1878 تک فائز رہے تھے اور جب لبرل پارٹی نے انتخابات جیت لیے تو چند ماہ بعد انھیں کابینہ کا سربراہ اور وزیر خزانہ بنا دیا گیا تھا۔ 1895 میں انھیں Chamber of Representatives کا صدر منتخب کر لیا گیا تھا۔

بیرنارت نے بلجیم کی سیاست میں ایک رول نما کر دیا تھا۔ یہ ان ہی کی کوشش تھی کہ Belgian Chamber نے شاہ لیوپولڈ (King Leopold) کو کانگو (Ganga) کی ریاست کا حاکم اعلیٰ بنانے پر اتفاق کیا تھا، اور ان ہی کے شکرے کے ساتھ میوز (Meuse) پر بلجیم کی غیر جانب داری کی حفاظت کے لیے قلعہ بندی کی گئی تھی۔ اس تجربے کا سیاست دان نے بلجیم کے آئین پر نظر پانی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ امن کے لیے ان کا کام یورپ کے طول و عرض جانا جاتا ہے، اور بین الاقوامی امن کانفرنسوں میں مشہور ہے۔ پہلی جنگ

(Hague) کانفرنس میں وہ اس کمیشن کے صدر منتخب تھے جو اسلحہ جات پر پابندیوں کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔
 برنارت Permanent Arbitration Commission کے، Institut de France کے اور
 Belgian Academy کے رکن تھے۔ یہ Société de droit international کے اعزازی صدر بھی تھے،
 Association for the Promotion of International Maritime Law کے کارکن صدر تھے اور
 International Law Association کے صدر تھے۔

یہ دونوں حضرات (آگسٹ بیرنارت اور بیرن ایستوریل ڈی کونستان) کا بین الاقوامی تحریک نئے امن
 اور عائلی ترمیمیں حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ نوبل کے جذبات کے عین مطابق ہے کہ ان دونوں کو انعام دیا جانا چاہیے۔

پال ہنری بنجائین ڈی ایستوریل ڈی کونستان

پال ہنری بنجائین ڈی ایستوریل ڈی کونستان ابھی اپنی زندگی اولیس حصے میں ہیں۔ لائیکلوش (La
 Flèche) میں 22 ستمبر 1852 میں پیدا ہونے والے ڈی ایستوریل قدیم فرانسیسی اثرافیر سے تعلق رکھتے
 تھے۔ بیرن ڈی کونستان کی ریبیک (Baron de Constant de Rebecque) کی حیثیت میں ان کا
 سلسلہ نسب عیسائی مجاہدوں (Crusaders) سے ملتا ہے۔

Lycée Louis le Grand پیرس میں ان کی تعلیم ہوئی، اور بعد میں انھوں نے قانون پر ڈیپلوم وہ
 Licentiate of Law تھے اور ان کے پاس School of Oriental Languages کا ڈیپلوما بھی ہے۔
 23 برس کی عمر میں وہ فرانس کے دفتر خارجہ میں اثاثی بنے اور وہ برس بعد ان کو بلقان کے علاقے میں
 تعینات کر دیا گیا تھا۔ 28 برس کی عمر میں وہ تونس کی French Residency کے سیکریٹری جنرل بن گئے
 تھے، اپنے تجربات کی بنیاد پر انھوں نے La Politique française en Tunisie تحریر کی۔ تونس میں
 اپنے قیام کے دوران ڈی ایستوریل ڈی کونستان نے قابل قدر تعلیمی کام کیا تھا۔

پیرس میں واپسی کے بعد وہ دفتر خارجہ میں بحیرہ روم کے شرقی کنارے (Levant) کے اسسٹنٹ
 ڈائریکٹر بنا دیے گئے تھے۔ اڑتیس برس کی عمر میں سفارت خانے کے کاؤنسلر متعین ہوئے جہاں ان کا مجدد
 minister plenipotentiary تھا۔ chargé d'affaires کی حیثیت سے انھوں نے سیام (Siam) [حالیہ
 تھائی لینڈ] کے بادشاہ Chulalongkorn اور فرانسیسی بحری بیڑے کے درمیان تنازعے سے فرانس اور
 برطانیہ کے درمیان جنگ کا خطرہ کم کرنے میں کام کیا۔

اس کے بعد سے وہ امن اور عائلی کی تحریک کے لیے وقف ہو گئے، اور انھوں نے اس موضوع پر کئی
 کتابیں تصنیف کی ہیں۔

وہ اپنے ملک کے سیاسی میدان میں اترے اور 1895 میں یہ بیرن، اپنے آبائی علاقے Sarthe سے

انتخابات میں کھڑے ہوئے۔ 1904 میں انھیں سینیٹر منتخب کر لیا گیا۔

1899 میں ڈی ایستور نیل ڈی کونستال کو پہلی جنگ کانفرنس میں فرانس کا مندوب تعینات کیا گیا، اور 1903 میں انھوں نے Groupe parlementaire de l'arbitrage international کی بنیاد رکھی۔ یہ ان کا کام ہی تھا جس نے بعد میں ان کے سیاسی رویوں کی سمت بندی کی۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں فرانس اور دیگر ممالک کی درمیان ثالثی کے معاہدے ہوئے، اور ان کی پالیسیوں پر فرانس کی سرحدوں سے باہر اطلاق کیا گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ خارجہ پالیسی کا کنٹرول پاریمان کے ہاتھ میں ہو اور نتیجے میں ثالثی کے گروہوں کی ہمت افزائی ہو اور ان کو مستحکم کیا جائے۔

امن کے لیے ان کا کام بند آنکھوں سے نہیں ہوا تھا۔ ایک سفارت کار کی حیثیت میں انھوں نے بین الاقوامی پالیسی کو سمجھنا سیکھا تھا اور اس کے متعلق اپنی کوششوں کی منصوبہ بندی کی تھی۔

اپنے ملک میں ڈی کونستال ایک مشہور شخصیت ہیں اور فرانسیسی پاریمان کے ارکان کے پچھلے دورے کے بعد سے برجہان کا غیر مقدم کیا جاتا ہے۔

نوبیل کمیٹی کے صدر نیشن Jørgen Gunnarsson Løvland کی زبانی

(دونوں انعام یافتگان میں سے کسی نے غلط نہیں دیا۔)



کلاس پونٹس آرنلڈ سن

فریڈرک بائر

اعلان تجلیل

کلاس پونٹس آرنلڈ سن

نارویائی پاریمان کی نوبل کمیٹی کی جانب سے میں آپ سب حضرات کو خوش آمدید کہتا ہوں جو اس عظیم سٹی مرپرست، انٹریڈ نوبیل، کی یاد دہانی کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، جس نے اپنی خطیر دولت بنی نوع انسان کو درپیش مسائل کے حل ڈھونڈنے کے لیے وقف کر دی ہے۔ اس مقام پر ہماری پہچانی ملاقات کے بعد امن انعام پانے والوں میں سے ایک، رینڈل گرمر (Randal Gremer) ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں۔ مگر وہ اپنے پیچھے ایک عظیم شخصیت اور امن و انسانیت کے ایک گرم جوش دوست کی یادیں چھوڑ گئے ہیں۔ میں آپ سب سے استدعا کرتا ہوں کہ ہم سب [ایک لمحے کے لیے] کھڑے ہو کر ان کو یاد کریں۔

اس برس نوبل کمیٹی نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ امن انعام کو سویڈن کی پاریمان کے سابقہ رکن کلاس پونٹس آرنلڈ سن اور ڈنمارک کی پاریمان کے سابقہ رکن فریڈرک بائر کو پیش کیا جائے گا۔ کمیٹی کے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ انعام ان دو حضرات کو دیا جا رہا ہے، اس لیے کہ اس کو یقین ہے کہ انتخاب کے معاملے میں اس کا فیصلہ اسکیڈی نیویائی ملکوں کی عام خواہشات کے عین مطابق ہے۔ یہ دونوں ہی امن کے آدرش کے آن تھک وکیل رہے ہیں۔

کلاس آرنلڈ سن 1844 میں گوٹنبرگ میں پیدا ہوئے اور اپنے نوجوانی کے دنوں میں یہ سویڈن ریلوے کی ملازمت میں رہے ہیں۔ اس دوران بھی یہ صحافی اور ادیب کے طور پر کام کرتے رہے، اور ان

کے محبوب موضوعات میں اس وقت بھی امن کے مقاصد شامل تھے۔ 1882 سے 1887 تک آرٹھس سوئیڈن کی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں کے رکن رہے تھے۔ 1883 میں انھوں نے شاہ کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی تھی کہ سوئیڈن کو مستقل طور پر غیر جانبدار ملک ہونے کا اعلان کیا جائے۔ ان کی تجویز منظور نہیں ہوئی مگر ایوان نے مشورہ دیا تھا کہ حکومت کو اس تجویز کے خطوط پر عمل کرنے کے لیے ضروری کام جاری رکھنا چاہیے۔ اسی برس آرٹھس نے Swedish Peace and Arbitration Association کی بنیاد گزاری میں ہاتھ بٹایا، جس نے حال ہی میں اپنی پچیسویں سالگرہ منائی ہے۔ پہلے چند برس آرٹھس اس ادارے کے سیکریٹری رہے تھے۔

آرٹھس کا کام ماروے تک پہنچا ہے۔ ہمارے بہت سے شہروں میں 1888 اور 1890 میں ان کی تقریروں کی کامیابی نے 1890 میں بلا واسطہ پارلیمنٹ کی ہمت افزائی کی کہ [ماروے کی] پارلیمنٹ کو شاہ کے سامنے پیش کی ہوئی ان کی تجویز کو منظور کر لینا چاہیے۔

آرٹھس نے امن کے موضوع پر کئی تحریروں شائع کی ہیں، جن میں سے کئی ایک کا دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ان کا سب سے اہم کام The Hope of the Centuries ہے۔ یہ عالمی امن پر ایک کتاب ہے جو قوموں کے درمیان بین الاقوامی امن کے فروغ کے خیالات سے مملو ہے۔

مسٹر آرٹھس کے ساتھ مسٹر فریڈرک بائر کو بھی اس برس کے نوبل امن انعام کے لیے نامزد کیا گیا تھا جس کی Swedish Interparliamentary Group نے اور مارویائی پارلیمنٹ کے کئی ارکان کی طرف سے بھی متفقہ طور پر حمایت کی تھی۔

فریڈرک بائر

فریڈرک بائر 1837 میں پیدا ہوئے۔ ٹوئسٹوے اور امن کے لیے لڑنے والے دوسرے سے بہت سے لوگوں کی طرح انھوں نے Dragons کے ایک افسر کی حیثیت میں 1856 سے 1865 کا شروع کیا تھا۔ پھر انھوں نے غیر ملکی زبانیں پڑھنی شروع کیں، اسکول میں استاد رہے اور بعد میں مترجم بن گئے۔ 1860 میں ہی وہ امن تحریک میں شریک ہو گئے اور فریڈرک ہیڈی سے رابطے میں تھے جنھوں نے 1867 میں پہلی فرانسیسی امن سوسائٹی قائم کی تھی۔ 1872 سے 1895 تک بائر Harsens کے علاقے سے پارلیمنٹ کے رکن رہے، اور اس دوران انھوں نے امن اور عورتوں کے حقوق کے لیے بہت کام کیے تھے۔ مسٹر بائر غیر معمولی صلاحیتوں کے ادیب ہیں۔ امن کے بارے میں انھوں نے بہت سے مضامین اور کتابچے تیار کیے ہیں۔ انھوں نے عملی طور پر امن کے لیے ہر طرح کی خدمات انجام دی ہیں۔ ماروے کے اخبارات نے بھی ان کے قلم سے بہت فوائد حاصل کیے ہیں۔

غیر جانبداری کے معاملے میں ان کا مطالعہ بہت عمیق رہا ہے۔ 1882 میں انھوں نے ڈنمارک کی

امن سویمائٹی بنیاد ڈالی تھی جس کو پہلے Society for the Promotion of Danish Neutrality کے نام سے پکارا جاتا تھا، بعد میں اس کام نام Danish Peace Society کر دیا گیا ہے۔

شروع ہی سے مسٹر بائر یورپ کی امن تحریک میں عملی حصہ لیتے رہے ہیں۔ 1884 میں انھوں نے برن میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں حصہ لیا تھا اور 1889 میں International Congress اور Interparliamentary Conference میں بھی شریک رہے تھے جس کا اجلاس پیرس کی Great Exhibition کے دوران منعقد ہوا تھا اس کے بعد سے ایسے چند ہی اجلاس رہے ہوں گے جن میں ان کی شرکت نہیں ہوئی ہوگی۔ ان ہی کی ایما اور مشورے پر برن میں International Peace Bureau کا قیام عمل میں آیا تھا۔ پچھلے برس تک بائر اس کے Board of Administration کے صدر رہے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ انتخاب میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا لہذا ان کو اعزازی صدر بنادیا گیا ہے۔

1891 سے بائر Interparliamentary Union کے کاؤنسل ہیں۔

انھوں نے شمالی ملکوں کے درمیان تعاون اور امن میں بہت دلچسپی لی ہے۔ شمالی ملکوں کے تقریباً ہر اجلاس میں انھوں نے حصہ لیا ہے اور ان ہی کی کوششوں سے Nordic Interparliamentary Union بنیاد پڑی ہے۔

فریڈرک بائر کو اس برس کے نوبل امن انعام کے لیے Danish Interparliamentary Group کے علاوہ Group Swedish Interparliamentary اور ناروے کی پارلیمان کے کئی ارکان نے نامزد کیا تھا جس میں آرلڈس کو بھی شریک کیا گیا تھا۔

نوبل کمیٹی کے صدر نشین Jørgen Gunnarsson Lavland کی زبانی

خطبہ کلاس پونٹس آرئلڈسن

عالمی استصواب رائے

بہت سی قوموں کی قدیم داستانوں کی طرح، ماروے کی بھی ایک قدیم داستان بتاتی ہے کہ ایک زمانہ تھا جب مرکز میں سونے کی اینٹوں سے بنائی جاتی تھیں مگر سونے چاندی [کی بہتات] کسی کو بھی گناہ کی طرف راغب نہیں کرتی تھی؛ وہ وقت جب لوگ پاک باز ہوا کرتے تھے اور دانش کے جذبے کے فیضان سے ان کی رسوم اور قوانین نرم تھے۔ پوری دنیا خوش حال زندگی بسر کرتی تھی۔ [اور پھر] یہ جنت نمازعات اور کم مرتبہ قدروں کی دلدل میں دفن ہو گئی۔ پھر بھی، اس کو دوبارہ پانے کی امید ابھی تک ختم نہیں ہوئی

ہے۔ بنیادی طور پر انسان کی فطرت نیک ہے، یا شاید نہ نیک ہے نہ شراب۔ بہر حال، انسان وہ شے ہے جس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو گروہ میں باندھ کر رکھ لینا چاہیے کہ انسان پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

مثلاً ہماری فصل کو [اس منزل تک پہنچنے میں] اندازاً کروڑوں برس لگے ہیں۔ لہذا، امکان اس بات کا ہے کہ انسان کا دماغ اب ترقی کی ایک بلند سطح تک پہنچ گیا ہے، اور ارتقاء کے ناقابل چیلنج عمل کے بعد یہ اب حیاتیاتی اور جسمانی اعتبار سے تمام لوگوں اور نسلوں میں ایک ہی جیسا ہے۔

اس سائنسی حقیقت کو قبول کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صحیح و سالم انسان پر علم کی روشنی کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسا کہ سورج کی روشنی کا۔ اس کی فطرت ہے کہ یہ جنگ کے بجائے امن چاہتا ہے۔ تعلیم ہی وہ یقینی راستہ ہے جس پر چل کر امن کے حتمی ہدف تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اور اس سے زیادہ بلند کوئی ہدف نہیں۔

جواب میں کوئی کہتا ہے کہ ”سچ تو یہ ہے کہ قانون کی حکمرانی زیادہ بلند ہے، اور اس طرح شخصی آزادی اور قومی خود مختاری بھی۔“ مگر ان کے لیے، جہاں تک زندگی کی اور چیزوں کا معاملہ ہے امن یہ جرم مقدم ٹھہرتا ہے۔

یہ خیال ان لوگوں کو ابھرنے میں ڈال دیتا ہے جن میں سمجھ کی کمی ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ”یقیناً، ہر ایک کو اپنا دفاع کرنا ہوتا ہے“ اور پھر وہ اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”قومی دفاع کو آتش سوزی (fire insurance) کے جیسے کے طور پر لیا جاسکتا ہے،“ یا، ”کوئی بھی نہیں چاہتا کہ اس کا مکان چوروں اور قاتلوں کے لیے کھلا ہوا ہو، یا، ”کوئی بھی جنگل میں، جو ڈاکوؤں اور رہزنوں کے گھیرے میں ہو، بغیر اسلحے کے جانا نہیں چاہتا۔“ وغیرہ وغیرہ یہ سب الجھانے والے جملے ہیں! اس لیے کہ مستعد لوگ نہ رہزنوں کے گروہ ہوتے ہیں، نہ ان کے حاکم ڈاکوؤں کے سرغنہ۔

یقیناً، یہ سوال کسی کی اپنی خود مختاری سے دست بردار ہونے کا نہیں۔ ہمیں وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے، مگر ہمیں چیزوں کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ امن کے بغیر آزادی کا تصور نہیں کیا جاسکتا، وہ انفرادی ہو یا قومی۔ جنگیں اور فسادات ایک قسم کی غلامی ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں قوانین خاموش ہوتے ہیں۔ امن کے بغیر کوئی شے بھی صحیح معنوں میں انسانی نہیں ہوتی۔ امن ہم آہنگی ہوتا ہے۔ اور ہم آہنگی زندگی کا بلند ترین آدرش ہوتی ہے۔

ایک طویل عرصے سے بہشت گم کردہ کے متلاشی انسانیت کے خدمت گاروں پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے۔ دنیا کی اندھیری دراز میں، دنیا کی نظروں میں آئے بغیر، ان کا کام ویسی ہی آہستگی سے ہوتا رہا ہے جیسے کہ ایک میرا کروڑوں برس تک تکمیل کے مراحل سے گزرتا رہتا ہے۔ جب ایک ایٹم دوسرے ایٹم میں عمل تکمیل کے ذریعے آمیز ہوتا اور بلور آہستہ آہستہ روشن ہو کر ایک شاہی تاج کی مانند چمکنے

لگتا ہے تو خاموش کھرائیوں سے کوئی آواز بلند نہیں ہوا کرتی۔

اس طرح امن کا تصور انسانیت کا سب سے چمک دار خزانہ، بالآخر ہم سب کی آنکھوں کے سامنے افش کر دیا گیا ہے۔ سب کوئی بھی اس کے حسن سے انکار نہیں کرتا، سب اس کی قدر کی ستائش ہی کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کا خراج ہمیشہ الفاظ ہی کا روپ دھارتا ہے، مثلاً دونا درہی کوئی عمل بھی ہوتا ہے۔

بالآخر تمام ملکوں کے بہت سے لوگوں پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ عسکریت ایک بھاری لعنت کی مانند زمین پر بڑی رہتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ مکمل طور پر جنگ کے ناقابل بیان اُلم کی طرح جھوٹ نہیں بولتی۔ وہ اُلم جو تفصیل کے بیان کا مقابلہ کرتا ہے۔ بد قسمتی سے، ہم اس درجے تک نہیں پہنچے ہیں جہاں عسکریت پر ان بنیادوں پر ملامت کی جاتی ہے۔

ابھی تک ہم اس کو اپنے آپ سے اتنا کم تر نہیں سمجھتے کہ اس کی تباہی کے لیے آلے ایجاد کریں۔ ابھی تک کسی مقدس غیظ و غضب نے ہمیں مکمل طور پر ڈھانپ نہیں لیا ہے، اس شیطنت کے خلاف، ہمارے اندرون پر عسکریت کے کھردرے اثر کے خلاف، وہ اثر جو زندگی کے بارے میں ہمارے منظر کو دھندلا کر رکھ دیتا ہے اور ہم میں اس پر فریب بدگمانی کی پرورش کرنے لگتا ہے جو دھوکا دے کر ہم سے ایک دوسرے پر اسے غم لگاتا ہے، اتنی نا انصافی کرنا ہے اور اسے غم پہنچاتا ہے۔

بلکہ دراصل یہ عسکریتی نظام کا اقتصاد ہی یہ جو ہوتا ہے لوگ جس کے بارے میں فکرمند ہوتے ہیں۔ انداز لگایا گیا ہے کہ انیسویں صدی کے ہر لمحے پر 1,350 سوئیڈن کروڑ صرف اسلحہ بندی، خرچ ہوئے ہیں۔ پہلی اور دوسری بیگ کانفرنسوں کے درمیان۔ یعنی آٹھ برس کے عرصے میں بڑی طاقتوں پر اسلحوں کا بوجھ 69 ملین پاؤنڈ اسٹرلنگ کے برابر بڑھ گیا ہے۔ اور یہ اضافہ اب بھی جاری ہے۔ جہاں تک چھوٹی ریاستوں کا معاملہ ہے، مثال کے طور پر 1888 اور 1908 کے درمیان کے عرصے میں سوئیڈن میں سالانہ فوجی خرچ 27.7 ملین کروڑ سے بڑھ کر 84.3 ملین کروڑ ہو گیا ہے؛ دوسرے لفظوں میں، جس برس میں یہ تین گنا سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اس اضافے کے بہت سے ثبوت، مثال کے طور پر، برن میں قائم International Peace Bureau سے یا اوسلو کے Nobel Institute سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

عسکریت اور سماجی حالات کی تیزی کے درمیان پیدا ہونے والے دباؤ کے رشتے زیادہ سے زیادہ واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ عسکریت وسیع پیمانے پر وسائل جذب کرتی جاتی ہے جس کا کسی اور کو فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر ان وسائل کو [عسکریت کے چنگ سے] آزاد کر لیا جائے تو ہم گمراہی پر اُٹھنے والی قصلوں کو دو گنی کر سکتے ہیں، گرجتے دریاؤں کی طاقت کو مملوں اور کارخانوں میں استعمال کر سکتے ہیں، اور ان مواقع کو انسان کی بہترین صلاحیتوں کے لیے وا کر سکتے ہیں جن کے ابھی خواب بھی نہیں دیکھے گئے ہیں۔

اس خرابی کو دور کرنے کے لیے، جو دنیا کی بڑی طاقتوں پر بھی اچھی طرح واضح ہے، ضرور سمجھ کیا جانا چاہیے۔

روس کے حکمران زار نے ایک Peace Manifesto جاری کیا تھا جو دی بیگ میں Permanent

Court of Arbitration کے قیام پر منتج ہوا، اور ریاست ہائے متحدہ کے صدر اس کے استعمال کے سلسلے میں قوموں کی بہت افزائی کرتے رہتے ہیں۔ آخر کار یورپ بنگری کے عمر رسیدہ حاکم کو ان کے کردار کے باعث اکثر "Emperor of Peace" کہا جاتا ہے۔ اطالیہ کے نوجوان شاہ نے ایک International Agricultural Institute قائم کیا ہے جسے وہ اپنی ذاتی آمدنی سے چلاتے ہیں، اور انھوں نے دی ہیگ میں Palace of Peace کے لیے سنگ مرمر فراہم کرنے کی پیشکش بھی کی ہے۔ برطانوی سلطنت کے سربراہ entente کی پالیسی میں آگے آگے ہیں جو ایسی پیچیدگیوں کی پیش بینی کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں جو فساد کا باعث ہو سکتی ہیں۔ شاہ ایڈورڈ (Edward) نے لندن میں منعقد ہونے والی امن کانفرنس کو ان الفاظ میں مبارکباد دی ہے جو کوئی بھی ریاستی سربراہ قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات اور معاہدہ اور مشترکہ جذبہ پیدا کرنے والے کسی برتر ہدف کے علاوہ استعمال نہیں کر سکتا، کہ یہ انسانیت کے بلند ترین آدرش کے حصول کا یقینی ذریعہ ہوتے ہیں، اور اس نے مزید وعدہ کیا تھا کہ "اس ہدف کو حاصل کرنا [اس کی] دائمی کوشش ہوگی۔" [جرمنی کے شاہنشاہ] قیصر ولیم (Kaiser Wilhelm) نے جرمنی میں ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس کو بھیجے گئے ایک تار میں کہا تھا کہ اس نے امن کی نعمت کو اپنے دل میں بسا لیا ہے، اور وہی عہد نے ان الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے، اپنے والد کی جانب سے کہا تھا کہ ان کے نزدیک امن کی برقراری سب سے اہم مسئلہ ہے "جو ہے بھی، اور ہمیشہ کے لیے تمام گئی تہذیبی ترقیات کی بنیاد رہے گا۔" فرانس کی جمہوریہ کا صدر امن کی وکالت کو ایک فطری تسلسل کا درجہ دیتا ہے، اور جاپان کا حکمران دنیا کو امن سے اپنی محبت پر قائم کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتا۔

ہر مناسب موقع پر چھوٹی ریاستوں کے سربراہ عالمی پریس میں ایسے ہی جذبے میں اپنا اظہار کرتے رہتے ہیں، اور یہی کچھ ذمے دار وزرا پارلیمانوں میں کرتے ہیں، جب وہ اپنی ریاست کے سربراہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ امن کانفرنسوں میں شریک ہو کر آتے ہیں۔

مختلف ممالک کے درمیان، ان کے نمائندوں کے ذریعے برعکس ہوا میل جول، سائنس اور فنون لطیفہ میں، صحت اور تعلیم میں، ریل و سرائیل میں، تجارت اور صنعت میں اور دوسرے تہذیبی میدانوں میں ہمیشہ اور مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ ان تمام بین الاقوامی کانگریسوں اور کانفرنسوں میں روحانی نسبت کا احساس بنیادی سبب حرکت ہوتا ہے۔ تمام لوگوں میں مشترکہ مثالیت پسندانہ لہر ملکوں کو حقیقی معاہدوں اور قوانین کے طرف لے جا رہی ہیں جو جنگ اور عسکریت سے میل نہیں کھاتے۔

اب، کم از کم، سماج کے تمام طبقات کے متحرک امن پسند لوگوں کو جدید مزدور تحریک سے مناسب مدد مل رہی ہے، جو لاشی اور ترکی اسلحہ جات کی وکالت کے ذریعے جنگ کی پیش بندی میں شریک ہوتی ہے۔ 1908 کے موسم بہار میں منعقد ہونے والی Stuttgart Congress میں دنیا کی تمام ریاستوں سے آئے ہوئے ایک کیرور منظم مزدوروں کے 900 نمائندے شریک تھے جنھوں نے ہر قسم کے عسکریتی نظام کو ختم

کرنے اور بین الاقوامی سطح پر طاقت کے استعمال کو روکنے کے لیے متفقہ طور پر ایک تجویز منظور کی تھی۔ مزید یہ کہ پچھلے برس خزاں کے موسم میں برسلز میں ہونے والی International Socialist Bureau کی میٹنگ میں متفقہ طور پر اعلان کیا گیا تھا کہ مزدوروں کی تنظیموں کا اہم فرض یہ ہوگا کہ وہ جنگ کے خطرات کو مٹانے کی کوشش کریں۔

اس طرح یہ واضح ہو گیا ہے کہ ایسے معاملات میں حکومتوں اور محکموں کے مفادات ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ حاکموں اور عوام کے بین الاقوامی اجتماعات میں اس حقیقت کی مستقل طور پر تصدیق کی جاتی رہی ہے۔ لہذا دنیا میں مستقل نوعیت کے تعطل اور تشویش کی حالت کو دوسرے مفادات سے منسوب کیا جانا چاہیے، جن سے بار بار آزمائی جانے والی جنگ کی افواہوں کے باعث یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ بھلے اس کے کہ یہ افواہیں ہم پر حاوی ہو جائیں عقل مندی یہ ہوگی کہ ہم ان کے اصل معنی اکھول کر بیان کرنے کی کوشش کریں۔ آج کل امکان اس بات کا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر کسی اختلافی موضوع پر جنگ نہیں ہوگی یہ شرطیں کہ پہلے ہی اس کو ماہرین کے معائنے کے لیے پیش کر دیا جائے۔ اہم بین الاقوامی سوالات کے معاملے میں ریاستوں کی ذمے دار حکومتوں نے اس طریقہ کار کو اصول کے طور پر اپنایا ہے۔ اگرچہ یورپ اب بھی طاقت کے کچھ گروہوں میں بنا ہوا ہے، لیکن جب کوئی اہم چیز داد پر لگ جاتی ہے تو فوراً تعاون کیا جاتا ہے، جیسا کہ مراکش، بلقان، کریٹ (Crete) وغیرہ میں دیکھا گیا ہے۔ سکیڈی نیویائی معاہدے بھی تو پُر امن طور پر زیادہ سلامتی فراہم کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ اسی نوعیت کے طریقوں کا نوآبادیاتی پالیسی میں اخلاق کا امکان ہے، باوجود اس کے کہ ”سمرن مولیٰ“ لوگ تجارتی جنگوں کے بارے میں کیا کچھ کہتے ہیں۔

امریکا سے کوئی خطرہ نہیں ہے وہ اپنی طاقت بڑھا رہا ہے۔ حال ہی میں واشنگٹن نے Pan-American Bureau کے لیے ایک نکل کی بنیاد پڑتے دیکھی ہے، جو امن کی زیارت گاہ بن کر پورے مغربی منطقے کے لیے اتحاد کا باعث ہوگا۔ جاپان سے بھی کوئی خطرہ نہیں، کہ وہ اب اپنے سالانہ عسکری اخراجات میں 360 ملین سوئڈش کرونا کی کمی کر رہا ہے۔ جنگجو یا نہ ہم جو کیاں چین کے پُر امن مزاج سے میل نہیں کھاتیں۔ ”زرد آمدھی“ غالباً اتنی خطرناک نہیں۔ ترکی کی سلطنت، پوری مسلم دنیا کے لیے طاقت و مرکز کی صورت، ایک عظیم مستعد ریاست بن کر ابھر رہی ہے۔ برطانوی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے جنوبی افریقا ایک پُر امن وفاق کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

دور پرے کی بہت سی ریاستیں فرانسیسی وزارت خارجہ کے بنائے ہوئے ”ٹالٹی“ کے نقشے پر متحد دکھائی دے رہی ہیں، جس پر ایک سرخ لکیر کے ذریعے ان پینتیس، یا شاید بیس، ریاستوں کے دارالحکومتوں کو ملا دیا گیا ہے جنہوں نے 1907 میں دی ہیگ میں منعقد ہونے والی دوسری حکومتی کانفرنس میں بین الاقوامی تنازعات پر جبری ٹالٹی کے ایک مکمل منصوبے کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اس کے بعد منظور ہونے والی تجویز بھی، جو اس کانفرنس میں پیش کی گئی تھی، اس آئندہ سے کچھ کم متفق نہیں: ”دوسری امن کانفرنس اس امر کی

تعمد بق کرتی ہے کہ 1899ء کی کانفرنس کی، عسکری اخراجات میں کمی کے ضمن میں پیش کردہ تجویز منظور کر لی گئی ہے، اور چوں کہ تقریباً ہر ملک میں اس وقت کے بعد سے، عسکری اخراجات خاصے بڑھ چکے ہیں، کانفرنس اپنی اس خواہش کا اعلان کرتی ہے کہ حکومتوں کو اس سوال پر سنجیدگی سے غور شروع کر دینا چاہیے۔“

اگرچہ پوری انسانیت جنگ کے بوجھ سے بیزار ہو چکی ہے، محض مؤثر سے زیادہ سنجیدہ محاسبے کی ضرورت ہے، اگر ہمیں اپنے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے، اس لیے کہ بالآخر انھیں اتنا ریچھٹکنا ہے۔ اگر یہ ناممکن سمجھا جائے، تو اس کی وجہ مخصوص تکنیکی مشکلات نہیں بلکہ اس کی وجہ ہماری ہمت میں سخت اخلاقی ریشوں کی کمی ہے۔

ہم دوسروں سے زیادہ مطالبہ کرتے ہیں، جب کہ اپنے آپ سے بہت کم۔ کوئی بھی سیدھے اور سبک راستے کے انتخاب میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے علاوہ، اپنی نیکیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور دوسروں کی نیکی کو کم کرنا ہمارا رویہ بن گیا ہے۔ ”بلاشبہ، ہم امن سے رہنا چاہتے ہیں“ ہم کہتے رہتے ہیں۔ ”مگر ہمارے ہمسائے اور دوسرے لوگ۔۔۔“ ”کاش ہم دوسروں کے لیے ذرا کم پریشان ہوتے اور اپنے لیے ذرا زیادہ دوسروں سے کم کی توقع کرتے اور اپنے آپ سے ذرا زیادہ کی۔“

اس کا اطلاق تمام قوموں پر ہوتا ہے۔ اس کا اخلاق، پہلے اور بعد دونوں صورتوں میں، خرابہ ہوتا ہے، بالخصوص شہریت کے سیاق و سباق میں۔ ہر ایک کو اپنے وطن، اور پوری انسانیت، کی بہبود کی ذمہ داری سنبھالنی چاہیے۔ گویا یہ ابتدائی نکتہ ہے جو ہمیشہ میرے دل سے بے حد قریب رہا ہے، اور اب وقت آگیا ہے کہ دنیا کے سامنے اس کا اعلان کر دیا جائے۔

اگر آج کوئی پیغمبر لوگوں کو امن اور عقل سلیم کی نصیحت کرے تو وہ ایک انسان کی حیثیت میں دوسرے انسان سے بات کرے گا۔ قانون کی طاقت اور انجیل کی نعمت سے وہ کچھ یوں کہے گا: ”حب الوطنی ایک نیک احساس ہے، جب تک کہ اسی پر عمل ہو جو خالص انسانی ہو، مگر جو بالکل غیر انسانی ہو اسے اس سے دور بھاگنا چاہیے۔ مارے مفادات، خواہ وہ کتنے ہی عظیم کیوں نہ ہوں، ان مفادات سے بلند نہیں ہوتے ہیں جو پوری انسانیت کے لیے ہیں۔ ان میں، سب سے آگے وہ قدیم حکم الہی ہے، قوم کی قدیم ترین دستاویزات سے بھی قدیم ہے: ”تم کسی کو قتل نہیں کرو گے۔“ تم سب کا خون ایک جیسا ہے۔ ایک دوسرے سے محبت کرو۔ عام آدمی [آپس میں محبت] کر سکتے ہیں، قومیں [بھی آپس میں محبت] کر سکتی ہیں۔ یہ سب کچھ محترم بھی ہے اور ممکن بھی، اس لیے کہ تمام انسانوں میں، محبت اسی طرح فطری ہوتی ہے جیسے کہ قومی نفرت غیر فطری۔“

ایسے جذبے کے ساتھ میرا مشورہ ہے کہ کرۂ ارض کے تمام لوگوں ایک مشترک مقصد کے لیے متحد کیا جائے۔ تمام ملکوں میں، ہر بالغ مرد و عورت سے مندرجہ ذیل اعلان پر دستخط کرنے کی اپیل کی جانی چاہیے: ”اگر دوسری تمام قومیں اپنی افواج کو ختم کر دیں اور پوری دنیا کے لیے ایک مشترکہ پولیس کی طاقت پر قناعت کریں، تو میری بھی، اپنی قوم سے درخواست ہوگی کہ وہ بھی یہی کچھ کرے۔“

امید ہے کہ ہر ملک کے منتخب تعلیم یافتہ لوگ، مثالی ہماری توقعات سے بڑھ کر اس ایٹل کا مثبت جواب دیں گے۔ مگر ایسا ہوتا ہے تو ایک نئی اور عظیم طاقت ابھرے گی۔ عوام کی متحدہ خواہش۔ پھر ان کی اگلی امن کانفرنس میں حکومتوں کو اخلاقی حمایت ملے گی، جس کی اتنی طاقت ہوگی کہ انھیں عام ترکہ اسلحہ جات کی مؤثر شروعات کرنے پر راضی ہونے کے قابل بنادے گی۔

اس کے لیے بہت کام کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلے تو ایک سنجیدہ کوشش کرنی ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ مرد اور عورتیں اس منصوبے کو، تمام قوموں میں اور کئی زبانوں میں، مشتہر کرنے میں دلچسپی لیں، خواہ اس پر کتنا ہی وقت اور رقم کیوں نہ خرچ کرنی پڑے۔

اس کے لیے امن کے بین الاقوامی اداروں — کسی انسٹی ٹیوٹ، کسی ڈائریکٹریٹ، کسی کانگریس یا کسی کانفرنس میں سے کسی ایک کی تجویز کا انتظار کرنا شاید ضروری نہ ہو۔ غالباً ایسی صورت میں ایک معمولی سا معاملہ پیچیدہ اور تکلیف دہ ہو جائے گا۔ ہاں! اسٹائٹین ضرور ہو جائے گا کہ اگر امن کی کوئی معروف شخصیت جس کے پاس نسل انسانی کے ایک رکن کی حیثیت میں اپنے ذاتی اختیار کے سوا کوئی اور اختیار نہ ہو، اس کے مقاصد کے لیے مافی و مسائل سمیت اس کے ساتھ مشیر ہو اور وہ استعواب رائے کے لیے، متعلقہ فارم اور تنظیمی تفصیلات بھیج سکے تو کام کی شروعات میں کم تاخیر کا امکان ہوگا۔

اگر اس کو اور آسانی سے بھی کیا جاسکے تو بہتر ہوگا۔ دستخط کے لیے بھیجا جانے والا فارم صرف ایک صفحے پر مشتمل ہو جس میں سب سے پہلے ایک بیان ہو، نام، پتہ وغیرہ کے لیے کالم ہوں اور اس کی پشت پر استعواب کی غرض و غایت کی مختصر تفصیل دی گئی ہو۔

فہرستوں کو کئی طریقوں سے تقسیم کیا جاسکتا ہے، صرف اخباری اشتہارات ہی کے ذریعے نہیں، جنھیں زیادہ سے زیادہ دستخطوں کے ساتھ مختلف ممالک کی امن کی انجمنوں کی کمیٹیوں کو جلد از جلد واپس کیا جائے تاکہ ان سب کو بزن کے International Peace Bureau کو اور متعلقہ حکومتوں کو بھی اگلی امن کانفرنس کے لیے بھیج دیا جائے۔

ایک بار یہ اصول اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور اس پر سختی سے عمل شروع ہو جائے تو ان کی جزئیات اپنے آپ ہی طے ہوتی جائیں گی۔ [اس طرح] ہر ایک اپنے لیے جناب وہ ہوگا اور اپنے کہے پر قائم رہے گا، یہ ہے اصل اصول اس عالمی استعواب رائے کا۔

لوگ اعتراض کر سکتے ہیں کہ: ”ہمیں تو پہلے سے اس بات کا علم ہے کہ لوگ امن سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔“ [لہذا] اس حقیقت کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔ ”اگر یہ بات صحیح ہو تو بھی اسے ایک دوسرے کے لیے خطرناک نہیں ہونا چاہیے۔ پھر بھی، چوں کہ مسکرت اب بھی پھل پھول رہی ہے، اس حقیقت کو ثابت کیا جانا چاہیے۔ جوابات حاصل کیے جانے چاہئیں، گروہوں سے نہیں، افراد سے، ہمیں ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، بلکہ بہادری سے اپنے دستخط کے ساتھ اپنی خواہش کی تصدیق کرنی

چاہیے۔

لوگ یہ اعتراض بھی کر سکتے ہیں کہ: ”یہ سب کچھ زیادہ ہی آسان ہے۔“ تو ہماری صحت کے لیے صفائی، سورج کی روشنی، تازہ ہوا وغیرہ کی ضرورت کا بھی تو سب کو علم ہوتا ہے۔ پھر بھی لوگوں کو طے شدہ طریقہ ہائے کار [اس معمولی سی بات] کو سمجھنے میں بھی بہت وقت لگتا ہے۔

اس طرح عیسائیت کی حقیقی معنویت، جب یہ کسی حد تک خفیہ حقیقت سے دور ہوتی ہے، ایک ابدی عثمانیت کا ماخذ ہوتی ہے، اگرچہ مستقبل قریب میں یہ واضح ہوگا کہ اس کا بنیادی پیغام، دینیات کے تنازعات سے مبرا، امن کا سچا مذہب ہے؛ کہ یہ فطری اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا مذہب قطعی طور پر جنگ اور عسکریت سے میل نہیں کھاتا اور یہ بھی کہ اس کی بہترین نظریہ سوسائٹی کا وہ مجسمہ ہے جو جنوبی امریکا کے دو عوام نے مشترکہ طور پر ایک پہاڑ کی چوٹی پر تعمیر کیا ہے جو ان کے دو ملکوں کو علاحدہ کرتا ہے اور یہ اعلان کرتا ہے کہ ان کے درمیان جنگ اب قصہ پارینہ بن چکی ہے۔

اس مرحلے پر ہمیں عقیدے سے کوئی مطلب نہیں، جو اکثر و بیشتر اختلافات اور schisms کا باعث ہوتے ہیں، مگر صرف ایک محبت سے ہے جو مساوی بناتی ہے اور متحد کرتی ہے۔ اسی طرح، اخلاقی مذہبی اور سماجی مفادات کو کسی بھی صورت میں عوام کے درمیان تعاون میں دخل نہیں ہونا چاہیے۔

اس معاملے میں جو اعتراض اٹھایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ”اگر کسی ملک کی آدمی سے کم بالغ آبادی عسکری ادارے کے خلاف ووٹ دیتی ہے تو یہ اکثریت کی جانب سے اس کی قبولیت کا ثبوت ہوگا۔“ ایسا نظریہ بہر حال عوام سے منسوب ہوگا جن میں قوتِ ارادی کا فقدان ہوتا ہے، ایک اہمیت جو ان میں نہیں ہوتی۔ ایسے معاملے میں بے عمل اکثریت کی پروا نہیں کی جاتی۔ صرف وہ فیصلہ لبادی کی رائے کا اظہار بھی کافی سمجھا جائے گا۔ مزید یہ کہ عام آدمی بھی ایک سادہ سے خیال کو سمجھ سکتا ہے، مگر جب وہ ایک معمولی سے معاملے میں بھی صاحب اختیار پر انحصار کرنے لگے، تو ان ہوش مندوں کو اسے جگانا چاہیے جنہیں روشنی نظر آگئی ہو۔ کچھ لوگ احتجاجاً کہیں گے کہ ”پس ماندہ ملک تو الگ ہے، آزاد ملکوں کو بھی ہر صورت میں وقت لگے گا۔“ مگر اس طرح، یہ تجویز نہیں دی جا رہی ہے کہ فوری طور پر ایک ایسی تحریک چلائی جائے جس میں تمام

متحدین لوگ شامل ہوں۔ نہ ہی اس میں جلد بازی کرنے کا ارادہ ہے، اگرچہ ضروری ہے کہ 1914 یا 1915 تک کے دستیاب وقت کا بہترین استعمال کیا جائے، جب حکومتوں کی تیسری امن کانفرنس کے انعقاد کی توقع ہے۔

ایک اور اعتراض اٹھ سکتا ہے: ”ضروریاتِ زندگی کی سخت مشکلوں میں لوگوں کو ان چیزوں کا احساس نہیں رہتا جو ان کی پہنچ سے اوپر یا دور ہو جاتی ہیں، نہ ان کے پاس وقت ہوتا ہے کہ وہ ان معاملات پر نظر رکھ سکیں۔ ایسے بے شمار لوگ ہیں جنہیں اپنے سخت اور مشکل معاملات کے باعث کبھی روشن اور وسیع آفاق پر نظر ڈالنے کے مواقع نہیں ملتے۔“ سچ تو یہی ہے کہ ایک عرصے تک زندگی کے بوجھ اور بد بختیوں کے بارے میں پرانا اور مسلسل رونا کبھی ختم نہیں ہوگا۔

نگہں در حقیقت دنیا اتنی بے رُس ہو چکی ہے کہ وہ جوشکایت کرتے ہیں ان سے امید ہے کہ وہ کم از کم زندگی میں ایک بار دنیا کو بہتر حالات میں لانے کے لیے کوئی قربانی دیں گے سرف ایک منٹ کی قربانی، اس اعلان کو پڑھنے اور اس پر دستخط کرنے کی، جو برائیوں کو ختم کرنے کے حق میں اٹھائی جانے والی آواز ہو ورنہ یہ سارا رونا دھونا بالکل ہی بے کار ہوگا۔

اور آخری اعتراض ہوگا کہ: ”سمندر میں ایک قطرے جیسے میرے دوٹ سے کیا فرق پڑے گا؟“ نگہں ہر ذمے دار آدمی کے لیے یہی بہت کچھ ہے، اور انفرادی طور پر بے حدود حساب ہے جس لوگ جب متحد ہوتے ہیں تو ایک بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی مالیوں سے بڑی ممالیاں اور ملنے والی ممالیوں ہی سے بڑے دریا، اور بحر الکاہل جیسے سمندر بنتے ہیں جو ہماری دنیا کو گھیرے ہوئے ہیں۔

ان کی اتحاد گہرائیوں سے ایک طاقت ابھر رہی ہے اور آہستہ آہستہ کرۂ ارض کی بحری اور زمینی سطح پر یکجہتی جا رہی ہے۔ اور یہ طاقت قدیم دور کی داستانوں میں موجود امن کا تصور ہے، جو جدید تہذیبی ترقیات سے زرخیز ہوتا جا رہا ہے۔

اور جو لوگ جوہر گم شدہ کے متلاشی رہتے ہیں وہ نئے عہد کے ابھرتے ہوئے آفتاب کی چمک دکھ دیکھ سکتے ہیں، جو پیش بندی ہے عیسائی دعاؤں اور مشرکین کی داستانوں کی، پیش بندی ہے امن کی سلطنت کی ہم ان الفاظ میں جس کی دعا کرتے ہیں ”Our Father - Thy kingdom come“ جسے شمال کے قدیم لوگوں نے قدیم داستانوں کے خوش حال دور میں محسوس کیا تھا۔ جب گلیاں سونے کے اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں اور انھیں کسی نے چھوا بھی نہیں تھا جب انسان نیک چلن تھا، ان کے رسوم اور قوانین نرم تھے اور عقل مندی سے ترتیب دیے گئے تھے۔

اب، گلیوں کو سونے کی اینٹوں سے بنانا بالکل غیر محفوظ ہوگا۔ مگر یہ امر یقینی ہے کہ جو سونا میری مایوں میں بچھایا گیا ہے وہ محفوظ نہیں رہے گا۔ یہ امر مجھے موقع فراہم کرتا ہے زیادہ کام کرنے کا عالمی استعواپ رائے کے لیے، جس کا خیال میں نے یہاں پیش کیا ہے۔ یہ مجھے مزید دوسرے طریقوں اور زیادہ قوت سے امن کی خدمت کرنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ لہذا، میں تشکر کے اس بوجھ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اس مقصد کو پورا کروں گا جس کے لیے مجھے پکارا گیا ہے۔

خطبہ فریڈریک بائر

تحریک امن کی تنظیم

کل ممی کی سترہ تاریخ تھی، جو ماروے میں عظیم قومی دن کے طور پر منائی جاتی ہے۔ آج کی تاریخ، ممی کی انٹارہوس کو ایک بین الاقوامی جشن کا دن ہونا چاہیے، اس لیے کہ جس برس قبل آج ہی کے دن دی ہیک میں پہلی امن کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ میرے نزدیک یہ نیک فال ہے کہ نوٹیل کمیٹی نے اس خاص دن کو میرے خطبے کے لیے منتخب کیا ہے۔

کسی قوم کی سخت عزت نفس اور دوسروں کے ساتھ خود کو بین الاقوامی بنانے کے درمیان، تاکرا امن کے اعلیٰ ترین مقصد — کے لیے بہتر مضامین فروغ پائے، کوئی تناقض نہیں ہوتا۔ یہ بین الاقوامی مضامین کا وہی تصور ہے جسے انٹرنیشنل نوٹیل نے ”قوموں کے درمیان برادری“ کہا تھا۔ ”اسلمے پیپک“ کا نعرہ لگانا ہی کافی نہیں، اس لیے کہ اس کا مطلب ”اسلمے سے پرہیز“ نہیں ہوتا۔ ہمیں ”اپنے دل کشادہ کرو“ کا نعرہ بھی لگانا چاہیے۔

میں جو خطاب شروع کرنے جا رہا ہوں اس کا عنوان ہے ”تحریک امن کی تنظیم“۔ میں نے کبھی پرہیزگندہ کرنے والے کا نہیں بلکہ تنظیم کرنے والے کا کردار ادا کیا ہے جس کا کام پس منظر میں ہوتا رہا ہے۔ میں اپنے خطاب کا عنوان ”امن کی تنظیم“ بھی رکھ سکتا تھا۔ میری اپنی سمجھ کے مطابق امن کی تنظیم، ایک ڈھانچا ہوگا جس کی بنیاد امن کی تحریک پر رکھی گئی ہو جس کو میں ایک امن منزلہ مکان سے تعبیر کروں گا۔

پہلی منزل امن کے اداروں کے لیے ہے۔ یہ ”le congrès universel“ نام سے، یا دوسرے لفظوں میں ایک بین الاقوامی سالانہ کانفرنس منعقد کرتے ہیں۔ اس کے بعد وائی منزل ایک بین الاقوامی یونین ہے، جو عام طور پر ہر سال ایک اجتماع، یعنی بین الاقوامی کانفرنس کرتی ہے۔ اور آخری، یعنی تیسری منزل، امید ہے کہ آخری نہیں رہے گی، بین الاقوامی امن کانفرنس [کی جگہ] ہے۔ مگر، ان کی ایک آسان پہچان ہے کہ: یہ عوام، پارلیمانی اور حکومتیں ہیں۔ اب میں ان تین منزلوں کے بارے میں ذرا تفصیل سے بات کروں گا۔

امن کی تحریک پر بات کرتے ہوئے میں ایک استعارہ استعمال کر سکتا ہوں۔ جناب صدر نے اپنے تعارفی الفاظ میں مجھے ایک قدیم سپاہی کہا ہے، اس لیے میں ایک سپاہی بنانا لازمی اختیار کروں گا۔ یہاں تین [فوجی ٹما] کالم ہیں جو پیش قدمی کر رہے ہیں: بین الاقوامی، بین الاقوامی اور بین الاقوامی۔ ان تینوں کو آپس میں مربوط رہنا چاہیے۔ جنگ کی حالت میں اسکیے حملہ کرنا بے کار رہتا ہے، خواہ آپ کہتے ہی بہادر کیوں نہ ہوں؛ آپ کو دائیں بائیں دونوں جانب سے رابطے میں رہنا ہوتا ہے، ورنہ کوئی بڑی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ یہ رابطہ، یہ تنظیم بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے اگر امن کی تحریک سے کوئی نتیجہ نکالنا مقصود ہو۔

میں باہمی رابطوں کی ضرورت کی تفصیل کے موضوع پر تفصیل میں نہیں جانا چاہوں گا۔ [اس کے لیے] بہت سی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ بہت سے موقعوں پر امن پسندوں نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ

ان سب کے درمیان ایک اتحاد کی بندش ہونی چاہیے جس کے ذریعے وہ سب ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں جو امن کے مقصد کے لیے، انفرادی بھی اور اقاماتی دونوں طرح کام کرتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے ایک مشترکہ بالائز مقتدرہ کی تعیناتی کا مشورہ پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ عمل کامیاب نہیں ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک مشترکہ بالائز مقتدرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہ عملی طور پر شاید ہی کامیاب ہو۔

جب 1890 میں London International Peace Congress کی تیاری ہو رہی تھی، میں نے اس کے پروگرام کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اتفاقاً طور پر، یہ وہی جگہ تھی جہاں میں 1854 میں ایک کیڈٹ رہ چکا تھا۔ میں اپنے مطالعے کے باعث اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک مشترکہ بالائز مقتدرہ ایک ناپسندیدہ [تجویز] تھی۔ اس کے بجائے میرا مشورہ ایک دفتر کے لیے ہوگا جو کچھ اسی نوعیت کا ہو جیسا کہ Universal Postal Union میں ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایسا ہی خیال پہلے بھی پیش کیا گیا تھا، جس کا مجھے علم نہیں تھا۔ 1878 کی Paris World Peace Congress میں معمر چارلس لمونیئر (Charles Lemonnier) نے تمام موجودہ لوگوں کے برخلاف اس تصور کا دفاع کیا تھا۔ دوسرے لوگ مشترکہ مقتدرہ چاہتے تھے، مگر وہ اپنے خیال پر قائم رہے کہ ایک مشترکہ دفتر ہی ہونا چاہیے۔ میں نے اس خیال کو لندن میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے کامیابی تو نہیں ہوئی تھی مگر میں نے بہت نہیں ہاری۔ میں کام کرتا رہا، اور مختصر الفاظ میں بتاؤں گا کہ یہ معاملہ کہاں تک پہنچا تھا۔

13 نومبر 1891 میں روم میں ہونے والی کانفرنس میں ایک International Peace Bureau قائم کیا گیا تھا۔ میرے خیال میں، اس کا بنیادی مقصد پوری امن تحریک پر ایک قسم کا ارتکاز رکھنا تھا، تاکہ اداروں اور افراد کے درمیان ایک اتحادی بندھن ہو جو امن کے لیے تعاون کے خواہاں تھے اور اطلاق کے اخذ کے طور پر خدمت کرنا چاہتے تھے۔ مگر جلد ہی یہ ہوا کہ Interparliamentary Conference نے، جو اس کے فوراً بعد ہی منعقد ہوئی تھی، اس قسم کی کسی چیز سے اتفاق نہیں کیا۔ پھر 1892 میں ہونے والی برن کانفرنس نے ایک بین الاقوامی پارلیمانی دفتر کے قیام پر غور کیا۔ اس کے بعد سے چھوٹے چھوٹے اختلافات پیدا ہوئے ہیں، [گویا]، امن کے بین الاقوامی اور بین الاقوامی پارلیمانی کام میں ایک قسم کی صوابیت حاوی ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ صوابیت صومالی کے عمل سے گزری ہوئی ہے، اور یہ رجحان زیادہ تیزی سے متحرک ہو جائے گا۔ امن کا گمراہوں میں منظور کی جانے والی تجاویز کو بین الاقوامی کانفرنسوں میں پیش کیا جانا چاہیے، اور کانفرنسوں کو بین الاقوامی پارلیمانی کانفرنسوں میں منظور کیے جانے والی تجاویز کے بارے میں عوام الناس پر اثر انداز ہونا اور ان کے اطلاق کے لیے کے زور دینا چاہیے۔ مزید یہ کہ اچھا ہوگا اگر کچھ اور لوگ بھی [میری ہی طرح] Interparliamentary Council اور World Peace Bureau میں ارکان کی حیثیت سے شامل ہو جائیں۔

کاش، میں یہ بات مجازاً کہہ رہا ہوں، میں امن کے اداروں کی سب سے نچلی منزل پر ایک نئے

کے لیے ٹک کر ایک سوال کر سکتا: کیا ان کو سیاسی ہونا چاہیے؟ ہاں یا نہیں؟ یہ ایک بحث طلب نکتہ ہے۔ جہاں تک امن کے معاملہ کا معاملہ ہے، اور معاملات کی طرح اسے بھی ریاست کی سرگرمیوں کا حصہ ہونا چاہیے۔ مگر ان کو سیاسی جماعتی مسئلہ نہیں بننا چاہیے۔ کسی امن کے ادارے کے اپنی راہ سے بھٹکنے کی مقامی سیاسی جماعتوں سے اس کا دور ہونا ہوتا ہے، جن کے ساتھ مل کر وہ امن کے زیادہ تر مقاصد کے مسائل کو مؤثر انداز میں سلجھایا جا سکتا ہے۔ سب کو تنہا چھوڑ دیجیے اور ملک کی اندرونی پارلیمنٹوں کے بارے میں انہیں خود اپنی رائے قائم کرنے کا موقع دیجیے۔ اس سلسلے میں، وہ بین الاقوامی گروہ، جن میں برنڈت کی سیاسی رائیں ہوتی ہیں، اچھے نمونے ہوتے ہیں۔ ڈنمارک کی پارلیمنٹ میں، ایوان زیریں کا ہر رکن، اور اسی طرح ایوان بالا کے تمام گیارہ ارکان بھی، بغیر کسی تخصیص کے بین الاقوامی گروہ کے ارکان ہوتے ہیں۔

اب، ہمارے سامنے — اور ایک بار پھر میں مسکری استعارہ کا استعمال کرنے جا رہا ہوں — بحرینی کا معاملہ ہے، تاکہ امن کے اداروں کی رکنیت کے اضافے کی ہمت خزانہ کی جائے۔ کئی برس پہلے ہونے والا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ ایک نوجوان میرے پاس آ کر گویا ہوا "میں نے نوٹیل امن انعام کے بارے میں بہت سنا ہے اور میں بھی اس کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کر سکتے ہیں؟" بڑی خوشی کے ساتھ، "میں جواب دیا، "آپ تشریف رکھیے اور میں آپ کی مدد کروں گا۔" پھر میں نے اس سے سوال کیا، "کیا آپ امن کی کسی انجمن کے رکن ہیں؟" "جی نہیں۔" اس کا جواب تھا، "اچھا تو آپ کو سب سے پہلے یہی اقدام اٹھانا چاہیے" [میں نے جواب میں کہا]۔

پہلے تو ارکان کو انجمن میں لانا چاہیے، پھر ان کو تعلیم دی جانی چاہیے اس لیے کہ اس میں بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ ایسی کسی تحریک میں شامل ہونے پر، کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے تمام لوگوں سے زیادہ عقل مند ہے جو ایک عرصے سے اس کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔ ان کو [سب کچھ] بتایا جانا چاہیے۔ گروہوں میں عام اور سالانہ اجلاس ہوتے ہیں۔ قومی سطح کے اجلاس میں، جو زیادہ تر ملکوں میں ہوتے ہیں، سالانہ امن کانفرنسوں کے لیے نمائندے منتخب کیے جاتے ہیں۔ ان نمائندوں کو باری باری، اطلاعات فراہم کی جاتی ہیں۔ [امن کانفرنسوں سے] واپس آ کر وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے کیا کچھ سنا ہے۔ اس طریقے سے باہمی تعلیم کا ایک عمل شروع ہو جاتا ہے۔

ان دستاویزات میں سے پہلی دستاویز جس کی تکمیل کا فرض برتن میں قائم دفتر کو سونپا گیا تھا، موجود امن انجمنوں کے بارے میں شماریات کا ایک سیٹ (set) تھا۔ چوں کہ ان انجمنوں کی مؤثر رکنیت کے بارے میں صحیح مواد کا حصول مشکل کام ہوتا ہے، یہ بے جا نہ ہوگا کہ آئندہ کسی وقت ہمیں ایک انسپٹر جنرل مقرر کرنا پڑ جائے جو سفر کرے اور یہ معلوم کرے کہ شماریات میں شامل کتنے ارکان واقعی کام کر رہے ہیں۔ امن کی انجمنوں کے لیے پروپیگنڈہ ایک مخصوص موضوع ہوتا ہے۔ یہ معاملہ عام طور پر لوگوں کی تعلیم کا ہے، ووٹ دینے والوں کا نہیں۔ ووٹ دینے والے عوام کے نمائندے منتخب کرتے ہیں جو بین

الپارلیمانی گروہوں میں داخل ہو کر Interparliamentary Union کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے، امن کی انجمنیں ان کے ارکان کے پیش کردہ مستقبل کے امیدواروں سے پوچھتی ہیں کہ اگر وہ منتخب ہو گئے تو کیا وہ بین الپارلیمانی گروہ میں شامل ہوں گے۔ میرے خیال میں اس وقت مزید وعدہ ضروری نہیں، اس لیے کہ کم از کم ڈنمارک میں، انتخاب از خود کثیت فراہم کر دیتا ہے۔

جہاں تک تعلیم دینے کا سوال ہے تو میں اس کو ادب کے زمرے میں رکھوں گا۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہمیں ضرورت ہے مزید ادب کی، ایک بڑے اسٹافٹی ادارے کی، ایک بڑے اخبار کی یا اس قسم کی چیزوں کی۔ مجھے اس خیال کے سلسلے میں کچھ تاثر ہے۔ ہمارے پاس ادب کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ میں اس سلسلے میں انگلستان، امریکا، فرانس اور جرمنی کے بہترین جریدوں کے نام گواہتا ہوں، اور ان کے علاوہ ہمارے درمیان ایک مشترک La Correspondance bimensuelle ہے [امن کے فروغ کے سلسلے میں پیدا کیے جانے والے ادب کے لیے ایک دو ماہی خبرنامہ۔ مترجم] جو اپنے تمام واقعی اطلاعات کے ساتھ، برن کا دفتر شائع کرتا ہے۔ جی نہیں، ہمیں اس [مزید اسٹافٹی ادارے] کی ضرورت نہیں۔ دراصل، امن کا ادب تقریباً لگ پڑھا جاتا ہے، اگرچہ امن پسند لوگ اسے شوق سے پڑھتے ہیں، جب کہ ہمیں اس [ادب] کی ضرورت ہے جو ان لوگوں کو قائل کرنے کے لیے ضروری ہے جو ابھی تک اس مقصد کی طرف لائے نہیں جاسکے ہیں۔ اب تک، ہمیں وہ کچھ بہت زیادہ ملا ہے فرانسس جے "prêcher aux convertis" کہتے ہیں۔ تہدیل کرنے کے لیے تبلیغ کا مواد۔ ہمیں ان لوگوں کے لیے زیادہ کوشش کرنی چاہیے جو اب بھی تہدیل نہیں ہوئے ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب اس سلسلے میں مجھے ایک پرندے سے، جسے cuckoo کہتے ہیں، ایک خیال ملا تھا: یہ پرندہ دوسرے پرندوں کے گھونسلوں میں انڈے دیتا ہے۔ لہذا میں نے ڈنمارک کی وزارت انصاف سے Public Trustee Office میں ایک ہزار کریونز جمع کرنے کی اجازت کی درخواست کی ہے۔ یہ سرمایے کے لیے ڈنمارک کا سب سے محفوظ ادارہ ہے، جس سے حاصل ہونے والی آمدنی اس شخص کو ملے گی جس نے پچھلے برس کے دوران کسی اخبار یا رسالے کے لیے، ایک مخصوص کمیٹی کی رائے میں، امن کے مقصد کے لیے ایک مناسب موضوع پر بہترین مضمون لکھا ہو، جیسے کہ "Folkets Tårbrødrande" [قوموں کے درمیان برادری]۔ مقابلے میں لیے جانے والے مضمون کا کسی روزنامے میں شائع ہونا ضروری ہوگا۔ آپ دیکھیں گے کہ انعام حاصل کرنے والے کو پہلے تو کسی ایڈیٹر کو اس کا مضمون شائع کرنے پر راضی کرنا ہوگا۔ اس طرح کمیٹی کا کام ہلکا ہو جاتا ہے کہ اخبار ان کو ششوں کو رد کر دے گا جو قابل قبول نہ ہوں گی۔ یہ تجربہ ڈنمارک میں کیا جانے والا ہے اور اگر کامیاب ہو گیا تو اس کو اور جگہ بھی دہرایا جائے گا۔

پروپیگنڈے کا ایک اور بھی طریقہ ہوتا ہے جسے میں "Letter Movement" کا نام دوں گا۔ میں اس لیے یہ نام دے رہا ہوں کہ یہ کسی اعلیٰ سطح کی معتد بہ اثر انداز ہونے کے لیے ہے۔ ایک پرانا

پارلیمانی ہونے کے ماتے میں جانتا ہوں کہ یہ کم ہی مؤثر ہوتا ہے۔ یہاں ایسے کئی ارکان پارلیمان موجود ہیں جنہیں میری ہی طرح علم ہے کہ اگر کوئی شخص [سیاہی عقیدے کے اعتبار سے] تبدیل نہیں کر لیا گیا ہے تو اس کو تبدیل ہونے میں اپیل کے ایک خط سے کہیں زیادہ کوشش کی ضرورت ہوگی۔ پھر بھی، اس قسم کے پروپیگنڈے کی خود اپنی بھی خاص اہمیت ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ ان لوگوں کو بھی قائل کرتا ہے جو پروپیگنڈا کیے جانے کی اپیل پر دستخط کرتے ہیں، اس طرح پروپیگنڈا کرنے والوں کی ایک فوج تیار ہو جاتی ہے، اور اگر اجازت ہو تو میں یہ کہوں گا کہ ایک تربیت شدہ فوج تیار ہو جاتی ہے۔ بہر حال ضروری ہے کہ ایسی اپیل کے لیے ایک خاص مقصد ہو۔ اور یہ کوئی دور افتادہ چیز نہیں ہونی چاہیے، ایسی ہو جو ملنے والے کو بھی متاثر کر سکے، کچھ ایسی چیز جو بہت زیادہ دور کے مستقبل کی نہ ہو۔ [اس موقع پر] میں ایک مثال دینا چاہوں گا۔ پچھلی ہیگ امن کانفرنس میں اس سست میں ایک قدم اٹھایا گیا تھا، بین الاقوامی تنازعات میں جبری ثالثی کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ آخر میں، بیس قوموں کو ووٹ دینے پر قائل کرنے کی کوشش کی گئی، اور پھر ایک تجویز آگے بڑھائی گئی تھی۔ میرے خیال میں اس کی پیش کرنے والی شخصیت آج ہمارے درمیان موجود ہے کہ ان قوموں کو متحد ہونے کی ترغیب دی جائے۔ ظاہر ہے کہ سفارتی کانفرنسوں کے دوران زیادہ تر معاملات میں متفقہ رائے کی ضرورت ہوتی ہے، مگر اس سلسلے میں کئی ریاستیں فائدے کے ساتھ متحد ہو سکتی تھیں، جب کہ بقیہ کو بعد میں شامل کیا جاسکتا تھا۔

میرے خیال میں Letter Movement کا یہی کام ہے۔ مگر اس کو صرف ان ریاستوں میں قائم کیا جانا چاہیے جہاں سے قابل ذکر رد عمل حاصل کیا جاسکے، اس لیے کہ ایسی تحریک لازمی طور پر ایک مستحکم تنظیم کی موجودگی کا قیاس کر لیتی ہے۔ ڈنمارک میں دو موقعوں پر ایسی تحریک اٹھی تھی جب ایک چوتھائی سے زیادہ بالغ آبادی اس میں شریک ہوئی تھی۔ اس قسم کی کامیابی تقاضا کرتی ہے عظیم کوشش کا اور کثیر مقدار میں سرمایے کا۔ اگر ایک لا جواب تنظیم پہلے سے وجود میں نہ ہوتی تو یہ منصوبے مشکل ہی سے کامیاب ہوتے۔

اب میں اختصار سے ایک اور طریقے پر بات کروں گا، یعنی باہمی بین الاقوامی دوروں پر۔ ایسے دورے ماضی میں کیے گئے ہیں اور، بلاشبہ، بہت قابل قدر ثابت ہوئے ہیں، بالخصوص انگلستان اور فرانس، انگلستان اور جرمنی کے درمیان۔ اسکیڈینیویائی والے پانچ برس سے پیرس کے دورے کرتے رہے ہیں۔ یہ طریقہ بہت مہنگا پڑتا ہے، اور یقیناً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کام اور تفریح دونوں ایک ساتھ چل سکتے ہیں مگر زیادہ تفریح نہیں ہوتی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ طریقہ کسی قابل ہو تو اس پر پہلے سے زیادہ اظہار کے عمل کیا جانا چاہیے۔ اس کا اخلاق ہوتا ہے عام طور پر کانفرنسوں پر اور خاص طور پر بین الاقوامی کانفرنسوں پر، اس لیے کہ جیسا کہ میں نے اشارہ کیا ہے، وہ قانون دانوں کی جلسہ گاہوں کے بچائے میاحوں کے اجتماعات سے مشابہ ہوتی ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ قانون کو طاقت کی جگہ لینا چاہیے، کہ قانون کے مفادات کا خیال رکھا جانا چاہیے۔ فطرتی طور پر، کاروبار اور تفریح کو یک جا کیا جاسکتا ہے، مگر ان

میں توازن ہونا چاہیے اور فی الذکر کو اول الذکر پر حاوی نہیں ہونا چاہیے۔

ایک اعتراض ہے جو بین الاقوامی کانفرنسوں پر لاگو نہیں ہوتا مگر جس کا اخلاق امن کانگریسوں پر ہوتا ہے: یہ اجتماعات وقت بہت ضائع کرتے ہیں۔ امن کانگریس کی ابتدائی اہمیت کے سوالات پر ضرورت سے زیادہ تفصیلات سے ہوتی ہے اور اہم ترین مسائل پر بحث کے لیے وقت نہیں رہتا۔ اکثر دیکھا گیا ہے، جیسا کہ میں نے میلان (Milan) کانگریس میں دیکھا تھا، کہ ایک صدر نشین، اپنے ہاتھوں میں بہت ساری تجاویز لیے چلا گیا، گویا یہ تاش کے پتے ہوں، یہ کہتا ہوا کہ ”آپ کو ان تجاویز کو بھی بغیر بحث ہی کے منظور کر لینا چاہیے یہ تو بالکل سیدھی سادی ہی سی ہیں۔“

کانگریسوں کا جو سب سے اہم پہلو ہے میں جس پر زیادہ زور دیتا ہوں وہ مباحثہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ جمع ہوتے ہیں: مختلف خیالات سننے کے لیے، نہ کہ محض تجاویز منظور کرنے کے لیے۔ کسی بحث کی رپورٹ پڑھنے میں جس میں دلائل پیش کیے گئے ہوں، جس میں موضوعات پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے باتیں کی گئی ہوں اور نئے خیالات پیش کیے گئے ہوں میرے نزدیک یہ تجویز کے اختصار کو پڑھنے سے کہیں زیادہ معلوماتی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم سوئیڈن والوں سے کچھ سیکھ سکتے ہیں جو کسی موضوع پر بحث کے بعد اگر وہ نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے تو اکثر اپنے اجتماع کو ایک ”یہ مباحثہ سوال کا جواب ہے“ کے ووٹ پر ختم کر دیتے ہیں۔

کانگریسوں کی ہموار کارکردگی میں ایک اہم رکاوٹ زبان ہوا کرتی ہے۔ ۱۸۸۹ میں پیرس میں ہونے والی پہلی امن کانگریس میں صرف فرانسیسی زبان استعمال کی گئی تھی۔ جب اجلاس ختم ہوا تو تمام انگریز اسکٹھے ہوئے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ پوری کارروائی کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے۔ صدر فریڈرک نیسی نے کہا کہ وہ اس تجویز پر عمل نہیں کر سکتے، اس لیے اس کے بعد جرمن بھی یہی مطالبہ کر سکتے ہیں، اور دوسرے بھی۔ مگر بعد میں یہ طے ہوا کہ انگریزی میں کی جانے والی تقریروں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا جائے گا اور vice versa، بلکہ جرمن میں بھی، اور ضروری ہوا تو اطالوی زبان میں بھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جلد ہی ہسپانوی زبان میں ترجمے کا مطالبہ بھی ماسنے آئے گا۔ اگر ہر ایک ہسپانوی زبان سمجھتا ہوتا تو یہ زبان ہر جگہ استعمال ہوتی، مگر یہ تو بہت دور کی بات ہوتی۔ میں نے سوچا کہ ایسی بڑی کانفرنسوں میں شریک ہونے والے مندوبین وہ ہونے چاہئیں، جو انگریزی زبانیں بول نہ سکتے ہوں تو کم از کم سمجھتے تو ہوں، یا ان کے ساتھ ان کے زبان دان دوست بیٹھے ہوں جو ان کو اہم نکات کے معنی سمجھاتے جائیں۔ دوسری صورت میں کتنا وقت ضائع ہوگا، اس کا پوری طرح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی تنقید کرنے سے پہلے میں آپ کی توجہ کا خواست گار ہوں گا، مگر اس اجتماع سے خطاب کے دوران میری خواہش ہوگی کہ میرے الفاظ صرف ان ہی لوگوں تک نہ پہنچیں جو یہاں موجود ہیں، بلکہ دور دور تک جائیں۔ میں یہ کہنا بھول ہی گیا تھا کہ، اگرچہ ان کانگریسوں میں بہت سارے فیصلے کیے جاتے ہیں، اس کے باوجود مندوبین بہت کم ہی کسب کر پاتے ہیں۔

مخصوص خدمات کے لیے کانگریسوں نے برن کے Peace Bureau کو اپنے ماتحت کر لیا ہے۔ یہ دفاتر وہ نہیں بن سکے بنیادی طور میں جو کچھ چاہتا تھا؛ یعنی کانگریسوں، کانفرنسیوں وغیرہ سب کے لیے ایک مرکزی دفتر۔ اس کو صرف عالمی امن کانفرنسیوں کے لیے مختص کر لیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ قابل قدر ہیں مگر یہ دفاتر وہ سب کچھ حاصل نہیں کر سکتے جن کی ان سے توقع کی جاتی ہے۔ یہ کوئی صحابہ نمونہ نہیں جس پر سب کچھ لا دیا جائے۔ کانگریس میں جب کوئی معاملہ نتیجے تک نہیں پہنچتا تو اس کو Bern Bureau کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور یہ دفتر حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دفتر ان مسائل کو حتمی مراسلے کے ذریعے تمام اداروں اور افراد کو بھیج دیتا ہے، مثلاً امور خارجہ کے وزیروں کو۔ بد قسمتی سے، بہت سے لوگ جواب نہیں دیتے، اور اگر دیتے بھی ہیں تو خود کو محض ایک رسید تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ پچھلی بار، صرف ایک وزیر خارجہ نے ایک خیال فروز جواب بھیجا تھا، دیرسا ہی جس کی ایک امن دوست سے توقع کی جاسکتی ہے، اور وہ صاحب ناروے کے وزیر خارجہ تھے۔

میرے خیال میں، بین الاقوامی کانفرنس کو اپنی توجہ اگلی ہیگ کانفرنس، سفارتی کانفرنس اور حکومتوں کی کانفرنس پر مرکوز کرنی چاہیے۔ اسی وجہ سے میں نے پچھلے برس برلین میں تجویز پیش کی تھی کہ ہر مختلف پارلیمانی گروہ کو ایک کمیشن بٹھانا چاہیے جو ایک طرف تو پرانے سوالوں کی فہرست تیار کرے جن پر ہمدردانہ غور کیا جا چکا ہے مگر جس پر 1907 کی ہیگ کانفرنس میں پوری بحث نہیں کی گئی ہے، اور دوسری جانب، اگر کوئی نئے سوالات ہیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ اگلی کانفرنس میں زیر بحث لائے جائیں گے۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ طریقہ کامیاب نہیں ہوگا، اس لیے کہ پارلیمانیوں کے پاس کرنے کے لیے بہت، بلکہ بہت زیادہ کچھ ہوتا ہے، اور دوسرے معاملات کے لیے، جیسا کہ یہ معاملہ ہے، ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود میں چاہتا تھا کہ ایک تجویز پیش کروں جس میں نئے طریقے اختیار کرنے پر زور دیا جائے۔ چوں کہ اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں کیا گیا ہے، اس لیے حکومتوں کو اس کا غور و تجزیہ کرنا ہوگا۔ جیسا کہ ہیگ کانفرنس میں کہا گیا تھا، بہت سارے مسائل ہیں جن پر قومی سطح پر غور کیا جانا چاہیے، قبل اس کے کہ بین الاقوامی سطح پر انھیں زیر غور لایا جائے۔

اب میں تیسرے قصبے پر بات کرنا چاہوں گا، یعنی ہیگ کی امن کانفرنس پر۔ اس اجتماع میں بہت سے لوگ ہوتے ہیں جس میں سے زیادہ تر نے ایک دوسرے کو پہلے نہیں دیکھا ہوتا۔ میں نے پہلی ہیگ کانفرنس کے اعداد و شمار تیار کیے ہیں، یہ دکھانے کے لیے کہ اس میں کل 138 نمائندے تھے۔ ان میں 77 سے کم سفارتی افراد تھے۔ سفارتی افراد سے معذرت کے ساتھ، جو اچھے بلکہ بہت اچھے بھی ہو سکتے ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ بہت زیادہ اچھے کام ہو سکتے ہیں، مگر مستقبل کی کانفرنسیوں میں سفارتی افراد کا کم تناسب زیادہ فائدہ مند ہوگا۔ ان میں 36 فوجی افسران بھی تھے، جن میں سے بائیس بڑی فوج سے اور 14 بحریہ کے تھے۔ اصل سیاست دان صرف 13 تھے، جن میں سے 12 بین الاقوامی قانون کے ماہر تھے، اور 6

ارکان تھے Institut de droit international کے ماگر آپ کا کردگی کی روئیداد پڑھیں تو دیکھیں گے کہ بقیہ 25 افراد تھے جنہوں نے واقعی بار اٹھایا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو مختلف کمیشنوں کی صدارت کر چکے تھے۔ پچھلی ہیگ کانفرنس کے ایسے ہی اعداد و شمار میرے پاس نہیں، جس کی کارگزاری کی روئیداد مکمل طور پر ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ اس کا تجزیہ بھی ایسے ہی نتائج پیش کرے گا۔ اس کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ میں پختہ یقین رکھتا ہوں کہ حکومتوں کو مستقبل کی ہیگ کانفرنسوں کے سلسلے میں ان باتوں پر بھی غور کرنا چاہیے تاکہ وہ زیادہ سودمند ہوں۔

ہیگ کانفرنسوں میں ایک کمیٹی، کہ Interparliamentary Union اور امن کی انجمنوں کے مقابلے میں انہیں کوئی دفتر میسر نہیں تھا۔ ہیگ میں قائم International Court of Arbitration کا اپنا ایک مرکزی دفتر ہے، مگر خود کانفرنس کو یہ سہولت میسر نہیں۔ مجھ سے پہلے آنے والے نوٹیل امن کے ایک انعام یافتہ ڈاکٹر گوبٹ (Gobat) نے بھی اس کی طرف توجہ دلائی تھی، جنہوں نے اپنا خطبہ میری یادداشت کے مطابق، 18 جولائی 1906 میں پیش کیا تھا۔ اس دوران، پچھلی ہیگ کانفرنس نے رائے دی تھی کہ ایک ادارہ قائم کیا جانا چاہیے، جو زیادہ موثر انداز میں تیاریاں کرے، جیسا کہ پہلے ممکن نہیں تھا۔ میں ہیگ میں منظور کی جانے والی قرارداد کی تشریح اس طرح کرتا ہوں کہ اگلے دو برس کے اندر اندر ایک ایسا ادارہ قائم ہو جانا چاہیے جو اگلی کانفرنس کی تیاریاں کرنے کے قابل ہو۔ [مگر] فوراً ہی کچھ مشکلات پیش آ جاتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب یہ مرحلہ آ جاتا ہے تو یہ سوال اٹھنے لگا کہ کون اس کی شروعات کرے گا۔ کسی ایک حکومت کو اس کے ذمے داری نہیں سونپی گئی ہے۔ مزید یہ بھی کہ کمیشن کی تشکیل کس طرح ہوگی؟ بلاشبہ تمام ریاستوں سے نمائندوں کو بلانا بھی ناممکن ہوگا۔

میں ایک طریقہ اختیار کرنے کا مشورہ دوں گا، جو میرے خیال میں زیادہ کارآمد ہوگا، میں جسے سوئس فیڈریشن میں سے "The Varot System" کو اختیار کرنے کا مشورہ دوں گا؛ اس نظام میں ہر رکن کو باری باری صدارت پیش کی جاتی ہے۔ فطری طور پر، [نئے انتظام کے تحت منتخب ہونے والی] ریاست کے لیے یہ اعزاز کی بات ہوگی کہ پہلی بار اسے منتخب کیا گیا ہے۔ اب تک صدارت صرف روس ہی کے پاس رہی ہے۔ پھر یہ کسی اور ریاست کے پاس جاسکتی ہے جس کی حکومت ایک کمیشن قائم کرے گی اور تیاریوں کے کام کی ذمہ داری سنبھالے گی۔

ایسا ہی ایک ہندوستان Nordic Interparliamentary Union میں شروع کیا گیا ہے، جس کی بنیاد پچھلے سال رکھی گئی تھی۔ اس کی کاؤنسل اور اس کے افسران تین اسکیڈی نیویٹا گروپوں میں سے منتخب کیے جاتے ہیں۔ کاؤنسل میں نو افراد ہوتے ہیں۔ ہر ملک سے آنے والے پہلے دو افراد ہر تین گروہ کے صدر اور نائب صدر بنتے ہیں، اور ایک تیسرا فرد ان میں سے چنا جاتا ہے۔ مجھے دو برس تک ڈنمارک کے گروہ نے یہ اعزاز بخشا تھا۔

پچھلے برس 14 ستمبر کو جب کانفرنس کی تشکیل کے سلسلے میں ہم کوپن ہیگن میں ملے تھے تو ہم نے ملے کیا تھا صدارت کو اس طرح قائم کیا جائے گا کہ ایک ہی شخص بار بار صدر منتخب نہ ہو سکے، اور اس کو "Vorort" نظام کے ذریعے ہی منتخب کیا جائے۔ اس برس سوئٹزرلینڈ کی باری ہے، جس کی ذمہ داری ہے کہ 45 ارکان اور ان سرکاری 3 سمیت جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے نمائندوں کی میٹنگ بلائے۔ اس برس 27 اگست کو، یا کچھ بعد میں، انھیں ملاقات کرنی ہے۔ صدارت میں اگلے برس ماروے کی باری ہے، اور یہ ماروے کی گروہ پر منحصر ہے کہ نمائندوں کی اسمبلی کا اجلاس ہو یا کانفرنس بلائی جائے۔ اس کے اگلے برس 1911 میں ڈنمارک کو "Vorort" کے تحت سربراہی ملے گی۔ اسی قسم کا طریقہ سوئٹزرلینڈ میں استعمال کیا جاتا ہے جب مختلف صوبوں کی امن اجتماعیں اپنا مشترکہ سالانہ اجلاس منعقد کرتی ہیں۔ سال بہ سال، باری باری، صدارت ایک ریاست سے دوسری ریاست؛ برن، نیوچاتل (Neuchâtel)، لوزرن (Lucerne)، وغیرہ کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔

قبل اس کے کہ ہیگ کانفرنسوں کے بارے میں اپنی بات کو آگے بڑھاؤں، میں ایک اصطلاح کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا جو میں نے نہیں بتائی ہے مگر اس کو کسی اور سے لیا ہے۔ یہ لفظ ہے "pacigérance" یا "waging peace" جو "belligérance" یا "waging war" کا متضاد ہے۔ میں نے ان لفظوں کو بھیج کے ایک مشہور ادیب بیرن ڈیسکان (Baron Descamps) سے مستعار لیا ہے، جو اس وقت بھیج کی حکومت میں سائنس کے وزیر اور فون لٹیر کے وزیر ہیں۔ 1898 میں انھوں نے ایک لاجواب کتاب لکھی ہے جس میں ان قانونی اصولوں پر بات کی ہے زمانہ جنگ میں جن کا اطلاق غیر جانب دار اور جانب دار پر ملکوں پر ہوتا ہے، وہ جنھیں "pacigérat" یا "pacigérance" کہتے ہیں۔ فرانسیسی علم لسانیات کے مطابق "pacigérat" سے ایک کیفیت یا ایک قانونی حیثیت کا اظہار ہوتا ہے، جب کہ "pacigérance" ایک عمل کا، ایک سرگرمی کا، کچھ کرنے کا یا کر گزرنے کا اظہار کرتا ہے۔ بعد میں ڈیسکان نے "pacigérat" کو بعد والے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

میں نے ان سے "pacigérance" کو دوسرے معنوں میں استعمال کرنے کی اجازت لے لی ہے۔ جنگ کرنے کے عمل کو ہم سب سمجھتے ہیں مگر "waging peace" کوئی لفظ نہیں ہے یا جان بوجھ کر بنایا نہیں گیا ہے۔ امید ہے کہ مجھے بہتر طور پر سمجھا جائے گا، اور ہمیں ریاستوں کو دوسری ریاستوں کے درمیان امن کرنے، "waging peace" کی طرف توجہ مبذول کرانی چاہیے، یہ بہت سے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہونا چاہیے ہم جس کے ذریعے امن کے مقصد کو آگے بڑھاتے ہیں، بالخصوص ہیگ کانفرنس کے نتائج کو عمل میں لانے میں۔ مجھے فکر ہے کہ یہ کام تیزی سے حرکت میں آئے گا۔

ایک عرصے سے ہم 'جنگ کے فن' اور 'جنگ کی سائنس' کے حامل رہے ہیں، جس کا چھوٹی چھوٹی تفصیل میں ارتقا ہوا ہے۔ جنگ وجدال کا بھی حیرت انگیز ارتقا ہوا ہے۔ جلد ہی یہ مزید بلندیوں تک پہنچے

جائیں گے۔ دراصل، جب بھی کوئی نیا خیال پیدا ہوتا ہے، مثلاً غبارے کے ذریعے سفر، تو جنگ و جدال والے اس پر فوراً قبضہ کر لیتے ہیں۔ دوسری جانب، امن کا سائنسی طور پر استعمال، فن کی صورت، ابھی تک ابتدائی مراحل میں ہے۔ مگر ہم اس کی ترقی کی نشان دہی کر سکتے ہیں، درجہ بہ درجہ ترقی کی، اور ایک وقت آنے لگا جب مخصوص افراد کو اس تحریک کی رہنمائی کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے مامور کیا جائے گا۔ ایسی بہت سی ریاستیں ہیں جن میں جنگ کی ایک یا دو وزارتیں ہوتی ہیں جن میں سے ایک بحری معاملات کا وزیر ہوتا ہے۔ میں کسی طرح بھی ان کو ختم نہیں کرنا چاہتا، جب تک کہ بین الاقوامی قانون کا حال ماضی کے مقابلے میں بہتر نہیں ہو جاتا، ہم ان کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ مگر میں فائل ہو گیا ہوں، اور اس سلسلے میں پیش قدمی کی ہمت کر رہا ہوں، کہ ایک وقت آئے گا جب کابینہ میں امن کا وزیر بھی ہوا کرے گا اور اس کی نشست وزیر اعظم کی نشست کے ساتھ ہوا کرے گی۔

امن کرنے میں جو مسائل درپیش ہوتے ہیں ان میں ایک مسئلہ "pacificance" ہوتا ہے۔ اب میں پہلے بیان شدہ امر کی طرف واپس جانا چاہتا ہوں، یعنی ریاستوں کے درمیان معاہدوں کے حصول کی طرف، جن کے مندوبین نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۷ء میں ہیگ میں بین الاقوامی تنازعات میں جبری ثالثی کی حمایت میں ووٹ دیا تھا۔

میں ایک اور معاملے کے سلسلے میں بھی بات کرنا چاہتا ہوں، میرے خیال میں، جس کو اور بہتر بتایا جاسکتا ہے۔ تمام لوگ بعد میں ہونے والے واقعات کے بارے میں جانتے ہیں کہ پچھلے برس غالباً یہ بات ہے ۱۲۳ اپریل کی بحر شمال کی اور بحر بنگال کی طاقتوں کے درمیان ایک نام نہاد "entente" ہوا تھا، جس کے ذریعے انھوں نے ایک دوسرے کے ساحلی علاقوں کی [سلامتی کی] ضمانت دی تھی۔ لیکن، اس معاہدے میں [سمندروں کی] ایک غیر معمولی تعریف بیان کی گئی تھی، یعنی، جہاں بحر شمال ختم ہوتا ہے وہیں سے [بحر بنگال شروع ہو جاتا ہے۔ مگر معاہدہ یہ نہیں بتاتا کہ بحر شمال کہاں ختم ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ پورا معاملہ گنجگ رہتا ہے، [اس لیے] میرے خیال میں بہتر ہوگا کہ ان "entente groups" — بحر شمال والوں اور بحر بنگال والوں کو ساقیوں کی مثال قریب لایا جائے۔ اور [ہمیں] پہلا قدم اٹھانا ہوگا، اس مقام پر ضرورت ہے کہ معاہدوں میں آبی راستوں کی تعریف بیان کی جائے فرانسیسی انھیں "canaux interocéaniques" کہتے ہیں [یعنی وہ راستے] جو دو سمندروں کو ملائے ہیں۔ ان میں Sound اور Great Belt اور Little Belt شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب آبی راستوں کا معاملہ ہو تو ضروری ہے کہ ان کے استعمال کرنے والوں کے حقوق اور ذمہ داریاں، دونوں کو واضح طور پر بیان کیا جائے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے منطقی طریقہ استعمال کرتے ہوئے میں کہوں گا: آئیے، ہم ایک آبی راستے سے ابتدا کرتے ہیں، مثلاً Kaiser Wilhelm Canal اور North Sea-Baltic Canal سے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس پر جرمنی کا کنٹرول ہے۔ مگر ہم Little Belt کی طرف رجوع کرتے ہیں تو، میرے خیال میں فطری طور پر کہا جائے گا کہ یہ

ڈنٹش اور جرمن دونوں کا ساحلی علاقہ ہے، لہذا، جرمنی اور ڈنمارک دونوں کو ماضی ہونا ہوگا، کہ اس کے بارے میں کیا کیا جائے۔ اور مطابقت کے اعتبار سے بالکل ایسی ہی صورت sound کے معاملے میں پیدا ہوتی ہے۔ مگر sound پہلے ہی، (موصول لگانے کے سلسلے میں) 1857 کے معاہدے کا حصہ بن چکا ہے۔ میرے خیال میں، اس معاہدے کی تشریح اس طرح کی جائے کہ یہ سیاسی اور تجارتی حالات سے متعلق ہے، strategic سے نہیں۔ میرے خیال میں بین الاقوامیت کا تنظیم ماہر Bluntschli صحیح ہے جب وہ کہتا ہے کہ جب دو ریاستوں کی سرحدیں کھلے سمندروں پر ختم ہوتی ہیں، جس میں overlapping ساحلی علاقے بھی ہوں تو جنگ کی صورت میں دونوں پر ایک دوسرے کی حمایت کرنا واجب ہوگا۔ یہ معاملہ ڈنمارک کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہوگا، اگر sound کے بارے میں اس طرح معاہدے کیے گئے کہ بلقان کے اندر اور باہر کی طاقتوں کے درمیان جنگ کی صورت میں sound تجارتی استعمال کے لیے کھلا رہے گا، مگر جنگ میں شامل طاقتوں کے جنگی جہازوں کے لیے بند رہے گا۔ ایسی صورت میں جنگی جہازوں کو Great Belt کی طرف موڑ دیا جائے گا، جو بحرِ حال میں صرف بڑے جنگی جہازوں کے لیے کھلا ہوگا sound سے گزرے نے کے لیے جن کا deep بہت زیادہ گہرا ہوگا۔ جنگ کے زمانے میں جہاز منظم جماعت کی طرح چلتے ہیں۔ لہذا Great Belt کا استعمال کوئی قربانی نہیں ہوگا، جو ایک راستہ ہے جس سے، جنگ اور امن دونوں حالات میں، ہر طرح کے جہاز گزرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ [لہذا] بلقان کو کسی بھی صورت میں بند علاقہ نہیں ہونا چاہیے۔ دراصل یہ ایسا معاملہ ہے جو تفصیلی مطالعے کا طالب ہے، اس لیے کہ اس میں کئی نازک اور اہم مسائل الجھنے ہوئے ہیں۔ میں کسی طرح بھی یہ چھوٹا دعویٰ نہیں کرنا چاہتا کہ مجھے اس کا جواب مل گیا ہے، مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے کئی ماہرین سے بات کی ہے اور ان سب نے اس خیال سے اتفاق کیا ہے کہ حالتِ جنگ میں sound کو تمام جنگی طاقتوں کے جنگی جہازوں کے لیے ممنوع قرار دیا جانا چاہیے تاکہ یہ ایک محفوظ تجارتی آبی راستہ رہے۔ اس مرحلے پر میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ میں نے 1887 میں اس موضوع پر ایک کتابچہ بھی تحریر کیا تھا، جو ڈنمارک کے بحری افسروں کے رسالے Journal of Naval Affairs میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اسی بارے میں ایک تجویز بھی پیش کی تھی جسے 1905 میں ہونے والی Lucerne Peace Congress میں منظور کر لیا گیا تھا۔ یہ میرے محبوب موضوعات میں سے رہا ہے، اس لیے، میں اپنے خیالات کو دہرانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں یہ ایک معنی خیز موضوع ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے ناروے کچھ دور افتادہ سا ہے، مگر ایک بحری سیاسی قوم ہوتے ہوئے، جس کے پاس ایک بڑا تجارتی بحری بیڑا ہے، اس میں دلچسپی لے گا کہ، بلقان کی، یا بلقان سے باہر کی طاقتوں کے درمیان جنگ کے زمانے میں sound کو جنگی جہازوں کے لیے ممنوع کر دیا جائے۔ میں، آخر میں، ایک اور سوال پر بھی بات کرنا چاہوں گا جسے حال ہی میں ڈنمارک کی پارلیمان نے اٹھایا تھا، مگر جس پر کم توجہ دی گئی ہے۔ ان کی پارلیمان کے 14 ارکان نے، مسٹر sveistrup جس کے

ترجمان ہیں، ایک تجویز پیش کی ہے کہ امن کے مقاصد کی ایک خطرہ مالی معاونت کے ذریعے حمایت کی جائے۔ اس وقت بہت کم لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ حکومت کی جانب سے امن کے مقاصد کی مالی معاونت نہیں کی جانی چاہیے۔ اس سمجھتا ہوں کہ امن بین الاقوامی سیاسی توقعات کی خدمت کرتا ہے، وہ توقعات جو ریاست کے اندرونی معاملات پر بھی سختی سے اثر انداز ہوتی ہیں؛ اس حد تک ریاست کو اس کی حمایت کے لیے سرمایہ ضرور فراہم کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں 1890 میں ماروے نے پیش قدمی کی تھی اور بین الاقوامی پارلیمانی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے مندوبین کو سفر خرچ فراہم کیا تھا۔ کچھ دنوں سے ڈنمارک نے بھی عیاضی شروع کر دی ہے۔ مگر اس آخری موقع پر ایک چوتھائی ملین کروڑ مختص کیے گئے تھے۔ لوگوں کو اس پر بہت حیرت ہوئی تھی، مگر ڈنمارک سے تعلق رکھنے والے کاؤلس کے موجودہ صدر نرگارد (Neergaard) من حیث النکل بہت خوش تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ جب اس مقصد کی مکمل تفصیل دی جائے گی جس کے لیے یہ سرمایہ فراہم کیا گیا ہے تو وہ اس تجویز کی مخالفت نہیں کریں گے۔ انہوں نے خاص کر بین الاقوامی مندوبین کے اجتماعات کا حوالہ بھی دیا تھا، ہمارے شمالی مندوبین جس کا حصہ ہیں۔ امید ہے کہ یہ معاملہ وہاں بھی زیر بحث آئے گا۔

جس کو میں نے "paciférance" کہا ہے وہ تمدن کے لیے کی جانے والی بڑی تحریک کا ایک حصہ ہے جو بڑھتے ہوئے وسیع محاذ پر فروغ پا رہا ہے؛ یہ حاکمیت بذریعہ قانون اور حاکمیت بذریعہ طاقت کے درمیان تمدن کا منقسم ہے۔ اس سیاق و سباق میں امن پسند اس امر پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ یہ حاکمیت بذریعہ قانون ہی ہے، ہم جس کے لیے لڑ رہے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ معاہدے کا نفاذ کا ضیاع ہو جاتا ہے، جب جنگ چھڑ جاتی ہے۔ یہ ایک عسکری تصور ہے کہ امن پسندوں میں برداشت کا مادہ نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنی پوری قوت سے سب کچھ کرنا چاہیے، یہ یقین کرنے کے لیے کہ قانون کا تصور ہی فاتح ہوتا ہے۔ زیادہ تر، جو امر تصورات میں الجھن پیدا کرتا ہے وہ دراصل طے شدہ تقسیم ہے، بڑی طاقتوں اور چھوٹی ریاستوں کے درمیان۔ ہم "طاقت" کو ایسی ریاست سمجھتے ہیں جس میں بڑی آبادی ہوتی ہے، بہترین تربیت یافتہ، بڑی اور بحری، فوجیں ہوتی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ایک بالاقدر اور مولے آدمی کو عظیم آدمی سمجھ لیا جائے۔ عظیم آدمی سے ہماری مراد ہوتی ہے، ایک آدمی جو اپنی فطری صلاحیتوں، اپنے کردار اور دوسری خصوصیات کے باعث حق دار ہوتا ہے کہ اسے عظیم کہا جائے اور نیچے کے طور پر جو لوگوں پر حاوی ہونے کی طاقت حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طرح یہ ہونا چاہیے کہ جسے ہم ریاست کہتے ہیں، وہ حقیقت ایک طاقت ہوتی ہے، اگر وہ تمدن کے فروغ میں ایسا کردار ادا کرے کہ پہلی صف میں شامل ہو جائے اور قانون کے لیے کی جانے والی جنگوں میں ایسی فتوحات کرے جو نام نہاد طاقتوں سے کہیں زیادہ ہوں۔

میں اپنے معزز سامعین کو مزید مکان دینے کی ہمت نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے بہت سے معاملات پر

بات کی ہے، جس میں سے بہت ایسے تھے جن پر علاحدہ موضوع کی طرح بات کی جانی چاہیے۔ میں آپ حضرات سے معذرت چاہتا ہوں کہ یہ خطاب کسی حد تک جستہ جستہ رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں نے اپنے تین منزل اور تین کالم کے استعارے کے ذریعے ان میں تسلسل کا ایک دھماکا رواں رکھا ہے، مگر اس سے قطع نظر، میں نے بے ترتیب خیالات کا اظہار کیا ہے، جنہیں میں تفصیلات کا کردار دوں گا، جو زیادہ تر ثانوی حیثیت کی تھیں۔ اگر ایسا ہے تو، ایک بار پھر عسکریت کی طرف مڑتے ہوئے، میں پروٹیا (Prussia) کے عظیم جرنیل فریڈرک دوم (Frederick II) کے الفاظ یاد کروں گا۔ فرانسیسی زبان میں اظہار خیال کے رسیانے، ایک بار کہا تھا، جو یقیناً کسی اور سیاق و سباق میں کہا گیا تھا، کہ تفصیلات سے جان چھڑانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ یہ فتح کا پہلا نرینہ ہوتی ہیں۔

Aimez donc ces détails! Ils ne sont pas sans gloire.

Ce sont les premiers pas menant à la victoire.

میں آپ حضرات کی بے پایاں توجہ پر شکر گزار ہوں، اور سربراہ حکومت کی اس خطاب میں موجودگی پر انہیں خصوصی طور پر داد دیتا ہوں۔ اور آخر میں ان لوگوں کا بے حد شکریہ، جن کی ہدایت آج میں اس مقام پر ایسا وہ ہوں؛ یعنی، نوٹیل کمیٹی اور ریالی پارلیمان۔



ارنیستو تیتو دورو مونیتا

لوی رینو

اعلان تجلیل

ارنیستو تیتو دورو مونیتا 1833 میں [اطالیہ کے شہر] میلان میں پیدا ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے آسٹریا کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لیا، اور 1859 میں گاری بالدی (Garibaldi) انیس ویں صدی کے اطالوی عسکری ہیرو کی جانب سے شمالی اور جنوبی اطالیہ دونوں میں ہونے والی دونوں جنگوں میں بھی لڑے تھے۔ مگر اس جنگ کے بعد وہ فوج سے ریٹائر ہو گئے، اور اس کے بعد سے خود کو صحافت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اپنی عمر کے تیسرے عشرے میں وہ میلان کے ایڈیٹر ان چیف ہو گئے، اور 1898 کے بعد سے وہ La Vita Internazionale نامی رسالہ شائع کر رہے ہیں۔

مونیتا 1870 سے بین الاقوامی امن تحریک میں شریک رہے ہیں اور اس میں اطالیہ کے سب سے اہم نمائندے ہیں۔ 1895 سے یہ Commission of the International Peace Bureau کے رکن ہیں۔ اطالیہ کے پریس میں اپنی نمایاں شخصیت کے باعث انھیں اپنے تصورات و خیالات کو فروغ دینے کے بہترین مواقع حاصل رہے ہیں۔ خصوصی طور پر صحافت کے میدان میں ان کا امن کے بارے میں کام، ذاتی اور عوامی نوعیت دونوں قسم کی اہم ملاقاتوں پر مشتمل رہا ہے جس کے ذریعے انھوں نے فرانس اور اطالیہ کے درمیان مفاہمت پر بھی کام کیا تھا جو اس وقت شروع ہوا تھا جب ان دونوں کے درمیان جدید دور کی دشمنی کا آغاز ہوا تھا۔

1887 میں مونیتا نے Lombard Peace Union کی بنیاد رکھی تھی، جس کے اب وہ صدر

میں انھوں نے اٹالیہ میں امن کے سلسلے میں بہت سے اجتماعات کا اہتمام بھی کیا تھا اور 1906 میں میلان میں پندرہویں بین الاقوامی امن کانفرنس کی صدارت بھی کی تھی۔

لوفی رینو 1843 میں فرانس کے علاقے Autun (Sakone-et-Laire) میں پیدا ہوئے اور بچپن میں ہی کی عمر سے بین الاقوامی قانون کے پروفیسر رہے تھے، پہلے Dijon میں اور اس کے بعد 1873 میں پیرس میں، جہاں انھوں نے یونیورسٹی میں قانون کے شعبے میں اور Free School of Exact Sciences میں ٹیچر دیے، جہاں سفارتی پیشہ اختیار کرنے کے خواہاں لوگوں اور سفارتی خدمات کے ارکان کو تربیت دی جاتی ہے۔ 1890 سے رینو وزارت امور خارجہ میں legal counselor بھی رہے تھے۔

حالانکہ رینو نے زیادہ نہیں لکھا ہے، بین الاقوامی قانون پر ان کے کئی مضامین ایک ہی موضوع کے رسائل کی صورت میں شائع ہوئے تھے، اور انھوں نے میعاد رسالوں میں بھی لکھا ہے؛ اپنے ایک ساتھی کی شراکت میں انھوں نے تجارت کے قوانین پر ایک کتابچہ بھی شائع کیا ہے جس کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ ان کی بنیادی سرگرمی یونیورسٹی میں تدریس رہی ہے۔ ان کو فرانس میں بین الاقوامی قانون پڑھانے والا جینیٹس کہا گیا ہے۔ یہ فرانسیسی وزارت امور خارجہ میں کاؤنسلر رہے ہیں اور آخر میں انھوں نے کئی بین الاقوامی اجتماعات میں فرانس کی نمائندگی بھی کی ہے، جس میں مشاعری اور قانون الطیر سے متعلق ملکیت کے تحفظ کے موضوع پر برن، پیرس میں ہونے والی کانفرنس، 1893، 1894، 1900 اور 1904 میں بین الاقوامی شہری حقوق کے قوانین سے متعلق ہونے والی معاہدوں کی کانفرنس، 1906 میں جنیوا میں ہونے والی کانفرنس برائے نظریاتی 1864 جنیوا کنونشن اور 1899، 1907 میں ہیگ میں ہونے والی بین الاقوامی امن کانفرنس شامل ہیں۔

ان تمام کانفرنسوں میں لوفی رینو نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ ضابطے کے مطابق یہ اجتماعات کے نامہ نگار رہے ہیں اور اس طرح انھوں نے نامہ نگاری کے مسودے اور سفارشات تیار کی ہیں؛ البتہ، کیے جانے والے معاہدوں اور ان کی تشکیل پر ان کا فیصلہ کن اثر رہا ہے۔ 1899 کی ہیگ کانفرنس میں کمیشن کی طرف سے رینو نامہ نگار تھے اور جنیوا کنونشن سے بحری جنگ و جدل تک کے قوانین کے اطلاق کے سلسلے میں اور مسودے تیار کرنے والی کمیٹی میں کام کر رہے تھے جس نے کانفرنس کا حتمی قانون تیار کیا تھا۔

ہیگ کی کانفرنس میں رینو کی شمولیت اور بھی زیادہ اہم تھی۔ وہ مندرجہ ذیل مسائل کے ترجمان تھے:

لڑائیوں کی شرائط

بحری جنگ میں جنیوا کنونشن کا اطلاق

بحری جنگ کی صورت میں غیر جانبدار ممالک کے حقوق اور ان کی ذمہ داریاں

بالخصوص، آخری دو معاملات دور رس اہمیت اور نہایت مازک نوعیت کے حامل ہیں۔ رینو کانفرنس کی مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی کے صدر نشین بھی اور ترجمان بھی تھے لہذا، کنونشن کے حتمی مسودے پر ان کا اثر بہت تھا؛ مباحث میں ان کے غیر معمولی کردار کی وجہ سے، جو شاید کسی اور رکن سے زیادہ تھا، انہوں نے پوری کانفرنس پر اپنے نشان چھوڑے ہیں۔

کانفرنس کے صدر مسٹر نے لی دوٹ (Nelidov) نے رینو کو ”خاص کارکن“ کہا تھا اور ایک موقع پر کہا تھا کہ ان کی اپنی لغت میں تعریف کے الفاظ کم پڑ گئے تھے جن کے ذریعے کانفرنس کے سلسلے میں رینو کے کام کے حصے کا بیان کیا جاسکتا۔

لوی رینو Institut de France اور Institute of International Law کے رکن ہیں۔
نوبل کمیٹی کے صدر نشین Jørgen Gunnarsson Løvland کی زبانی

خطبہ — ارنیستو مونٹالے

امن اور قانون — اطالوی روایات میں

جب اکتوبر 1907 میں مجھے خوش خبری ملی، جلد ہی اخباروں میں جس کا اعلان ہونے والا تھا، کہ تم کو نوبل امن انعام دیا جا رہا ہے، تو زندگی کے ہر شعبے کے لوگوں کی جانب سے آنے والے محبت اور احترام کے پیغامات میں تمام اطالویوں کا اطمینان جھلک رہا تھا، بالخصوص جلالت ماب مشاد وکلر ایمینوئل (Vicar Emmanuel) کے پیغام میں، جن کے تاریخی میں مجھے اس عظیم اعزاز کے دیے جانے پر مبارکباد کے ساتھ کہا گیا تھا ”اُن [مشاد] کی پُر جوش مخالفت ہے کہ امن کے عظیم مقصد کو فتح نصیب ہو۔“ تمام اعزازات کے ذریعے جو مجھے ملے ہیں اور عوامی نعرہ ہائے مسرت کے ذریعے جو بلند کیے گئے ہیں، اتنے بڑے کہ کوئی بھی جن کی خواہش کر سکتا ہے، آپ نے مجھے اپنا مقروض کر دیا ہے، کہ دراصل میری زندگی کے بقیہ سال بہت کم رہ گئے ہیں جس میں پروپیگنڈے کے کام کی تجدید شدہ سرگرمی دکھائیں، جو میرا کبھی نہ ختم ہونے والا تشکر بن سکے۔

میرے ہم وطن لوگوں کو آپ کا انتخاب اس لیے اور بھی پسند آیا ہے کہ وہ ایسے ملک سے آرہا تھا، جس کی سچائی اور حسن سے، جس کے شہری اطالویوں سے، جس کے شاعروں اور ڈراما نگاروں سے، جیسے اسی (Ibsen) اور بیورسن (Bjarnson)، اطالیہ میں بھی جنہیں سب سے زیادہ پسند کیا اور پڑھا جاتا ہے، جن سے اُن کے کام کے باعث ہم ایک عرصے سے محبت کرتے آئے ہیں۔ یہی تھے وہ لوگ جنہوں نے

اپنے حیرت انگیز ملک کی قابل تعریف، توانائی اور سنجیدگی سے بھرپور زندگی کی طرف دنیا کو متوجہ کر لیا تھا۔ یہی تھوہ لوگ جنہوں نے نئے سرے سے اپنے باہمت آباد اجداد وائی رکنگ (the Vikings) کی یادیں تازہ کر لی تھیں، جو اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور ناقابل شکست کھیتی باڑوں کے ساتھ نکل پڑتے تھے واقعی ایسے جنگجو تھے جو بہادری کی روایت کی صورت زندہ جاوید ہونے کے لائق تھے، فاتح تھے کرایے کے سپاہی نہیں، جنہوں نے اس زمانے میں جب جنگ عزت کا نشان تھی، اپنی بہادری اور جنگجوئی سے دنیا کو حیران کر دیا تھا۔

بغیر کسی قسم کی چال بازی کے، مگر یقیناً وائی کے ساتھ، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں سچ سچ اس کا اظہار کر رہا ہوں دنیا جو آپ کے اور آپ کے ملک کے بارے میں سوچتی ہے (مخصوصاً جو میرے ملک کے رہنے والے سوچتے ہیں، اور سب جانتے ہیں کہ غیر ملکی دوسروں کی بابت اپنے فیصلے میں ویسے ہی نیکو جانب دار اور سچے ہوتے ہیں جیسے آنے والی نسل)۔ تمام تر سنجیدگی کے ساتھ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج، ہمارے زمانے میں، آپ کی شہری زندگی ویسے ہی تعریف کی حق دار ہے جیسی جنگ اور فتوحات کے زمانے میں بہادری وائی رکنگ کی تھی۔

ایسا اس لیے ہے کہ وہ زمرہ کی جدوجہد میں گرفتار آپ کی قوم ہمیشہ بدلتی ہوئی حقیقت کا کھلی آنکھوں سے سامنا کرتی ہے اور پرانے طریقوں کو رد کر دیتی ہے۔ یہ ان رسوم و روایات سے چھٹی نہیں رہتی جن کے ہونے کی اب ضرورت نہیں رہی ہے، یہ نئی اعتبار اور ضروریات کے مطابق مسلسل اپنی تربیت کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج آپ کا ملک عالمی امن کے سہ اول دستے کا حصہ ہے۔ آپ کی پارلیمان (Storting) وہ پہلی پارلیمان تھی جس نے سرکاری طور پر عالمی ثالثی کے خیال کو برقرار رکھا تھا، Interparliamentary Union اور برن میں واقع دفاتر کے لیے علاحدہ سرمایہ مہیا کیا تھا، اور 1830 کے بعد سے مارے اور چھوٹے ملکوں کے درمیان ہونے والے معاہدوں کے لیے مشاہد کی ہمت افزائی کی تھی۔ مزید یہ کہ حال ہی میں حاصل ہونے والی آپ کی خود مختاری کی یادیں، جس کے لیے آپ نے شدید مشکلات کے دوران اپنے ذہنوں کو کوشش کی تھی، ہمارے ذہنوں میں آج بھی تازہ ہیں۔ آپ کی خود مختاری، جو بغیر غلوں ریزی کے حاصل کی گئی تھی، ایک زندہ مثال ہے نیک احساسات اور عقل مندی کی، عاقبت اندیشی اور بڑے استحکام کی، اور آپ دونوں کے لیے ہمیشہ باقی رہنے والی تحسین لائق ہے، جنہوں نے اسے حاصل کیا تھا اور ان کے لیے جنہوں نے اسے آپ کو دینے سے انکار نہیں کیا تھا۔

امن پسندی جس طرح آپ نے اس کی وکالت کی ہے، اور جس طرح آپ اس پر عمل کر رہے ہیں ملکوں کو افاقیت پرستی کی کھالی میں ڈال کر ملنا نہیں چاہتی، بلکہ ان کی تنظیم کرنا چاہتی ہے، اگر انصاف کے تقاضوں کے مطابق پہلے ہی ایسا نہیں ہو سکا ہے۔

کوئی قوم بین الاقوامی سوسائٹی کو جس قدر اپنی صلاحیتوں، اپنی نسل، اپنی روایات کی دولت سے مالا مال کرتی ہے، بنی نوع انسان کی خوش حالی کے فروغ میں اس سے زیادہ اخلاف ہوتا ہے۔

اور اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں کچھ اگلا خط انفریڈ نوبیل کو خراج تحسین کے طور پر پیش کروں جس کا آخری عمل، آپ کے درمیان میری اس مقام پر موجودگی کا باعث ہوا ہے۔ انفریڈ نوبیل اگرچہ سوئیڈش تھا، اس نے چاہا تھا کہ امن انعام کے لیے فرد کا انتخاب ماریوفاقی پارلیمان کے ہاتھوں میں ہو جو جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، پہلی پارلیمان تھی جس نے بین الاقوامی ثالثی کے تصور کی حمایت کی تھی۔

نوبیل نے ہمارے مقصد کی جو خدمت کی تھی وہ لا انتہا نوعیت کی تھی، اس لیے کہ ہمارے سامنے ایک شخص تھا جو سائنس کا آدمی تھا، صنعت کا آدمی تھا، جو ہمیشہ عملی ہدف کی تلاش میں رہتا تھا، جس نے اس فرسودہ قول کو رد کر دیا تھا کہ امن ایک ناقابل حصول یوٹوپیا ہے، جو جذباتی آدمیوں کے دل و دماغ کو رجحانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

نوبیل امن انعام کی ابتداء نے تقریباً فوراً ہی، تشکیک کے رسیا اور مصنوعی حاکموں کے طنز و تشنیع کا گلا گھونٹ دیا تھا اور اس کے بعد سے ہماری صفوں میں سرجامب سے 'تازہ واردانِ قفس' کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سیاست دان، صنعت کار، تاجر، بینکار۔ جو سب خوابِ خرگوش میں سوئے ہوئے تھے اب ہمارے مقصد کے ہم درد ہو گئے ہیں۔

ہمارے [امن کے] ادارے کے سامنے جو سب سے بڑی مشکل تھی وہ اس کی ابتداء ہی میں سامنے آ گئی تھی۔ ہمارے ارکان کو جنھوں نے جنگجو قوم پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی بنیاد رکھی تھی، جسے حامیانِ شہمی اطالیہ میں پالنا پوسنا چاہتے تھے، ہمارے دشمن "بے وطن" کہہ کر رسوا کر رہے تھے۔

یہ الزام قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ اپنے آپ کو امن کے پروگنڈے کے لیے وقف کر دینے سے پہلے، میرے دوست اور میں نے اطالیہ کی جنگِ آزادی میں پہلے حصہ لیا تھا، اور لوگوں کے درمیان امن اور بھائی برادری کا دفاع کرتے ہوئے ہم ایمان داری سے عظیم لوگوں کی تشریح کر رہے تھے جنھوں نے ہمارے انقلاب کا منصوبہ بنایا تھا اور اس کے لیے لوگوں کو اکسایا بھی تھا۔ ان کی طرح ہم نے اپنے ملک کو آزاد کرانے کی اپنی بنیادی ذمہ داری کا اعلان کر دیا تھا، ایمانوئل (Immanuel) پر یقین کرتے ہوئے، کہ متحد بنی نوع انسان کے عظیم اور مفید ظہور کو تیز تر کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ پہلے قوموں کو ان کی فطری سرحدوں کے اندر بحال کر دیا جائے۔

ہمارا انقلاب، عالمِ حکومت کے خلاف لوگوں کے اچانک اٹھ کھڑے ہونے سے، [آسمان سے] پھٹ نہیں پڑا تھا، یہ نتیجہ تھا ایک طویل عقلی اور اخلاقی ارتقاء کا، جو بڑی صلاحیتوں اور فیر معمولی صفات کے لوگوں، شعرا اور فلسفیوں کا لایا ہوا تھا جو صحیح معنوں میں عوام کے معلم ہوتے ہیں۔ آزادی اور حب الوطنی کے بارے میں بات کرتے ہوئے، ان سب نے ہمیں سکھایا تھا کہ موت کے خطروں سے آنکھیں چار کرنے سے آزادی مل تو سکتی ہے، مگر اس کی حفاظت صرف مہذب قوموں کے اعمال کے ذریعے انصاف کے اصولوں پر ثابت قدم رہنے سے ہی ہو سکتی ہے۔

اُس وقت میں ایک نو جوان آدمی تھا، جب 1848 میں لمبارڈی (Lombardy) کے دوسرے شہروں کے ساتھ مل کر میلان نے لمبارڈی اور وینس کی قومی نمائندگی سے انکار اور "امن اور برادری" کی پیشکش کو رد کر دینے کے باعث برسرِ اقتدار حکومت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ خطرے کی گھنٹی بجنی شروع ہو گئی تھی، اور ہم لوگ ریگولیس کھڑی کرنے میں مصروف تھے۔ گولیوں کی آواز میں خوشیوں کی چیخوں کی آمیزش، اور کھڑکیوں سے پھینکی گئی اینٹوں اور مانکوں کے دھماکے کی آوازوں کے درمیان ہم لڑتے رہے۔ جہاں اس عالی شان اور بہادر شاہِ جد و جہد نے، جو "پانچ دن" کے نام سے تاریخ کا حصہ بن گئی تھی، خطرے کی صورت میں ہمارے عوام کی ہمت کا مظاہرہ کیا تھا، وہیں اس نے فتح کی صورت میں ان کی فیاضی کا اظہار بھی کیا تھا، جو انتقام سے میرا تھی، ان لوگوں کے خلاف بھی جو بدنام زمانہ پولیس کے سرکارے تھے۔ وہ بہادری سے لڑے تھے، مگر مفلس غیر ملکی سے غرت کے بغیر جو نظم و ضبط کے تحت لڑنے پر مجبور تھے۔ ہمارے لڑنے والوں کے لیے عملی طور پر جشن منانے کی کچھ وجوہ تھیں کہ انہوں نے دشمن کو اچانک جالیا تھا، اور بغیر خون خرابے کے انہیں پکڑ لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دشمن کے تمام قیدیوں اور زخمیوں کی قرینے سے دیکھ بھال بھی کی گئی تھی۔

ایک دن جب میرے والد اور بھائی موجود نہیں تھے، میں نے اپنے گھر کی کھڑکی سے تین امریکی فوجیوں کو گولیوں کی بارود میں گرتے دیکھا۔ مظاہر وہ مر چکے تھے، اور انہیں قریبی میدان میں لے جایا گیا تھا۔ دو گھنٹے کے بعد پھر میں نے انہیں دیکھا، جب ان میں سے ایک آخری ہچکیاں لے رہا تھا اس متحیر کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے میری رگوں میں خون جم گیا ہو، اور مجھ پر ایک شدید جذبہ ترتم طاری ہو گیا۔ ان تین فوجیوں میں دشمن تو نظر نہیں آیا، مگر ہمارے جیسے لوگوں کے دلوں میں احساسِ مدامت پیدا ہو جاتا ہے، گویا یہ قتل ہمارے ہاتھوں ہی ہوئے ہوں۔ میرے دل میں بھی ان کے خاندانوں کا خیال آیا جو اس لمحے شاید ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔

اسی لمحے مجھے جنگ کا تمام علم اور وحشیانہ پن محسوس ہوا جو لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیتا ہے، جن کے درمیان ایک دوسرے سے دوستی اور مفاہمت ہونی چاہیے۔ مجھے سر بار ایسا ہی محسوس ہوا ہے، جب میں اپنی ان آزادی کی جنگوں میں مرنے اور زخمی ہونے والوں کی طرف دیکھتا، میں جن میں شریک ہوتا تھا۔ میں اکیلا ہی اس طرح محسوس نہیں کر رہا تھا۔ بغاوت کے بعد، فتح کے دوسرے دن، حکومت نے یورپ کے عوام کے نام ایک اعلان جاری کیا تھا جس میں کہا گیا تھا:

شاید وہ دن دور نہیں جب تمام قومیں اپنے پرانے جھگڑے بھلا دیں گی اور تمام امتیازات کو ایک طرف رکھتے ہوئے، تجارت اور صنعت کے بندھنوں میں بندھی، امن اور دوستی سے لطف اٹھاتے ہوئے ایک بین الاقوامی برادری کے پرچم تلے جمع ہو جائیں گی۔ ہم [بے چین سے] اس دن کے انتظار میں ہیں۔ ہم

اطالوی! آزاد اور خود مختار برادری کے امن کی اپنے ہاتھوں سے بحال کریں گے،
بلکہ اگر راضی ہوئیں تو، ان قوموں کے ساتھ مل کر بھیجی کریں گے، جو آج
آمریکا کی سلطنت کا حصہ ہیں۔

ہم اس عہد و بیان کے بارے میں سوچنے کو ایک مہذب موروٹی طریقے کا فروغ سمجھ سکتے ہیں،
شروع دنوں سے جو وقتاً فوقتاً اطالوی زندگی میں آشکار ہوتا رہا اور جو قانون اور انصاف کے تمام انسانی رشتوں
میں ہم آہنگی کی اصل بنیاد رہا ہے۔

ایسے ہی خیال نے Etruscans [قدیم اطالیہ کی ایک تہذیب]، [قدیم جمہوریت روما
کے ایک حصے کے لوگ] Sabines [قدیم یونانی لوگ] اور لاطینی لوگوں کی عام رسوم میں قائم کردار دیا کیا
تھا جب 47 شہروں کے مجسٹریٹ Mons Albanus [روم کے جنوب مشرق میں واقع کوہ البرز کے سلسلے]
میں واقع Temple of Jupiter میں جمع ہوئے تھے۔ ان ابتدائی اطالوی لوگوں نے آپس میں متحدہ ریاستی
وفاق ترتیب دیے جن کا واحد مقصد تھا کہ ہمسایہ ملکوں سے ہونے والے حملوں کے، اور شہری اداروں کے
مطالبات کے خلاف ایک متحدہ محاذ موجود ہو تاکہ وہ خود ایک دوسرے کے خلاف حملے نہ کر سکیں۔

وہ تصور جس کا جمہوریہ روما کے عظیم الشان عہد میں فروغ ہوا تھا Twelve Tables of the Law
میں ظاہر ہوا۔ اگرچہ یہ کم زور تھا پھر بھی اس میں آدمی کے حقوق کے وعدوں نے دولت مندوں اور مفلسوں کے
درمیان جدوجہد کو اچھڑا دیا۔ مفلس کی خواہش تھی کہ اس کو دولت مند افراد کے مساوی حقوق ملیں، اور دولت
مند نہیں چاہتے تھے کہ حکومت ان کے ہاتھوں سے پھسل جائے، اس لیے کہ وہ پہلی فتوحات کے تناظر میں روم
کا تابناک مقدر دیکھ سکتے تھے۔

یہ ایک آویزش تھی جو شاؤ و ماؤر ہی خانہ جنگی بن سکتی تھی۔ اس نے تالشی کے اصول بنائے، حوام کو
ایٹل کا حق دیا اور بد عنوان مجسٹریٹوں کی عیب جوئی کی ابتدا کی۔ اس آویزش پر شدید وطن دوستی حاوی تھی، کہ
جس نے ان لوگوں کو بہادری اور قربانی کی انسانی کیفیت میں پہنچا دیا، دنیا شاید جس کے برابر پہنچ تو سکتی مگر
آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔

چل کر اس پریسٹیج کی حکمرانی تھی، جو شہر کے رسوم کو پھیلانے کی خواہش مند تھی، اس لیے روم جلد ہی
ایک جنگجو فاتح بن گیا۔ اس کو jus retaliation [سفارت خانوں، اعلان جنگ اور امن کے معاہدوں کے قانون]
کا بھی کریڈٹ نہیں دیا جانا چاہیے، جس کی ابتدا پہلی اطالوی نسلوں کے درمیان ہوئی تھی، بالخصوص Etruscans
اور Sabines میں، جس کو سیرو (Glicero) مقدس ترین عرق ("sanctissimum jus") کہتا تھا۔

یہ قانون صحیح معنوں میں اپنے زمانے کا jus gentium [رومن قانون جو غیر ملکوں پر لاگو ہوتا تھا جو
انصاف کی، حق کی اور امن کے بالاتر ہونے کی اہم تصدیق تھی۔ اگرچہ اس کا کام بنیادی طور پر قانون اور
رسوم سے متعلق تھا، اس کے باوجود اس نے بہت ترقی کی، اس لیے کہ اس نے قانونی طریقہ کار کو ختم کر دیا

تھا، جو عائلی کے دائرہ اختیار سے متعلق قانون کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مذہبی عالموں کا ایک گروہ اس قانون کا محافظ تھا جس کی ذمہ داری تھی اعلان جنگ کرنا، اتحاد بنانا، ان کی عیب جوئی کرنا جو عوام کے قانون توڑتے تھے اور معاہدے کے احترام کے ذریعے امن کو یقینی بنانا۔

Punic Wars [تیسری صدی قبل مسیح روم میں ہونے والی جنگوں] کے بعد جب روم حاکم مطلق ہو گیا تو اس نے "Collegium Fœdaliū" [میں مذہبی رہنماؤں کے گروہ] کو غیر ضروری اور راز کار رفتہ ادارہ گردانتے ہوئے منکوری کے لیے اس کی طرف رجوع کرنا چھوڑ دیا۔

مگر چوں کہ اسلحہ کی طاقت نے عالمی سلطنت کے راستے کھول دیے تھے اس کے باوجود کہ روم کے سفیروں اور مینیٹ کے کاٹا مے نوماہیا (Numantia) جیسے شہروں کے ساتھ ظلم کے واقعات سے مبرا نہیں تھے جس نے بہادرانہ مزاحمت کی تھی، پہلا اور طاقت و راحت خود روم کے باشندوں کی طرف سے آیا تھا۔

قدیم روم کی تاریخ، Livy اور Dionysius کے Halicarnassus کے عوامی احتجاج کے واقعات سے بھری پڑی ہے جس میں روم کے عام لوگوں نے جنگجوئی اور مینیٹ کی پالیسی پر دباؤ کی مزاحمت کی تھی وہ وہ حقیقت لاطینی شاعر اور فلسفی ہی تھے جنہوں نے جنگ کو [خوفناک جنگ] "horrida bella" یا "bella matribus detestata" [وہ جنگ مائیں جن سے نفرت کریں] کا نام دیا تھا۔

حالات گہرے جا جنگوں کے سلسلے کے ذریعے روم [کی سلطنت] دنیا پر حاوی ہو گئی تھی، یہ اس کی شہری اور ضم کر لینے والی نیکیاں تھیں جنہوں نے روم کو اپنی حیثیت برقرار رکھے اور انسانیت کی خدمت کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ فوجی دستوں کے عقب میں تاجر اور کاشت کار آئے تھے جنہوں نے فتوحات کے وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ، نئے علاقوں میں مادر ملک کے شہری معیارات، یعنی، نام، زبان، اداروں وغیرہ کی شجر کاری کی تھی۔ جب کہ وہ منقوحہ لوگوں کے کردار اور رسوم میں سے کچھ اپنے اندر ضم کر رہے تھے روم نے انہیں کچھ اپنے پاس سے بھی دیا تھا، اور اس طرح تمام عوام، رہنمائی اور تہذیب ایک ہم جنس نوعیت کے وجود میں چمکل کر یک جان ہو گئے تھے اور بالآخر ان کو متاثر کرنے والا تھوہ، شہریت، پہلے خود اطالوی عوام کو اور بعد میں سلطنت روم کی تمام قوموں کو چھپا کی گئی۔

یہ اس تیزی کی تشریح کرتا ہے جس کے ذریعے منقوحہ صوبے ضم اور روم کا حصہ بنائے (Romanize) گئے تھے اور اس امر کی بھی کہ روم کتنا مشاہدہ انداز کا تھا کہ اس کی مٹی بھر فوجیں اس کی عظیم الشان سلطنت کی لانا تھا آبادی کو قابو میں رکھنے کے قابل تھیں۔ اور اگر کسی جواز کی وجہ سے یہ ہٹا کر بعد کے آنے والے مجاہد بادشاہوں کے ہاتھوں دنیا کی فتوحات کو روم کی فتوحات کی شان و شوکت سے منسوب کیا گیا تھا تو، یہ بھی یاد رکھا جانا چاہیے کہ جب جمہوریت ختم ہو گئی اور سلطنت شروع ہوئی تو یہ روم ہی تھا جس نے انسانی اور قومی حقیقت کا نظریہ پیش کیا تھا۔

اس نظریے کے وکیلوں میں سے ایک فلسفی اور معلم سیرو تھا، جس نے ایلریکو (Alberico)

(Gentili) اور گروٹی اس (Grotius) سے بھی پہلے بین الاقوامی قانون کے سچے بودبے تھے۔ سروسروس کی جنگ کے خلاف تھا، بشرطے کروہ ناگزیر نہ ہو جائے۔

اس نے کہا تھا: "تنازعے دو طریقوں سے حل کیے جاسکتے ہیں: عقل سے یا طاقت سے؛ ایک طریقہ آدمی کا ہے تو دوسرا درندے کا۔ لوگوں کو طاقت اسی صورت میں استعمال کرنی چاہیے جب عقل عاری ہو جائے۔" وہ ارسطو کے مقابلے میں زیادہ وسیع تصور کا حامل تھا، جس نے غلامی کا جواز پیش کیا تھا اور یقین رکھتا تھا کہ یہ روز آخر تک موجود رہے گی۔ سروس نے کہا تھا: "غلامی کے لبادے کے نیچے ایک آدمی سانس لے رہا ہوتا ہے؛ وہ محض ایک شے نہیں ہوتا، بلکہ ایک شخص ہوتا ہے جو اجرت پر اپنی خدمات پیش کرتا ہے، اور جس کو حق ہوتا ہے با آبرو سلوک کا اور منصفانہ تنخواہ کا۔" وہ چاہتا تھا کہ انصاف کی نظر میں سب برابر ہوں۔ [اس نے کہا تھا]۔ قانون عقل ہوتا ہے، منصف اور فطرت کے مطابق؛ یہ ذمے داریاں عائد کرتا ہے اور دھوکے بازی کی ممانعت کرتا ہے؛ [قانون] روم میں کچھ اور، استعجز میں کچھ اور نہیں ہو سکتا۔"

اگرچہ اخلاقیات کے میدان میں سروس اپنے زمانے سے بہت آگے تھا، ان خیالات کو تجویز کرنے میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ Epicurean شاعر Lucretius نے دنیائے روم کے بارے میں اپنی نظم میں، اپنی اندرونی جنگ اور جنگوں کی خوف ناکی کا تقابلی خرد مندی کی حلیم طمانیت سے کیا ہے جو، علم کے خاکسار مندر کی بلند یوں سے آدمی کے بے جس تنازعات کا تصور کرتا ہے۔ اور جب آگسٹس (Augustus) ان تنازعات کو ختم کر دیتا ہے تو بلند خیالوں کا ایک لشکر ہے، جیسے کرویر مل (Vergil)، ہورس (Horace)، پلائینی (Pliny)، سینیکا (Seneca) اور جبریت کے معتقد زینو (Zeno) کے تمام پیروکار جو امن کی تعریف بیان کرتے ہیں۔

توہمیل کے مقابلے میں کسی اور نے جنگ کی تاراجی کی اس سے زیادہ واضح تصویر پیش نہیں کی ہے۔ اگرچہ وہ خود اپنے لاطینی جذبے سے سرشار تھا، پھر بھی اس نے روم کے اصل مقصد، دنیا کو امن اور انصاف کے قوانین کی فراہمی، کی حمد و ثنا کی تھی۔

امن اور انصاف کے تصورات عیسائیت کا پیش خیمہ تھے جس نے، تمام انسانوں کے درمیان برادری کی تبلیغ کرتے ہوئے اپنا مرکز روم میں قائم کیا تھا۔ جب سلطنت بربریت کے تلوار تلے آگئی تو انسانیت پرستی اور امن کا آدرش اطالیہ میں پناہ گزین ہوا اور پھیلے روم سے حمایت کا طالب ہوا۔ پھیلنے والے بربریت تک کو تعلیم دینے کی کوشش کی تھی؛ اس نے زمانے کے ظلم کو عیسائی قانون محبت کے سامنے لا کھڑا کیا تھا؛ اور اس نے تقریباً ہمیشہ آزاد اور شہری انجمنوں کی پرورش کے لیے اپنے اخلاقی اختیار کا استعمال کیا تھا۔ اس بین الاقوامی دانش پر، جسے ہم آج امن کا بہترین تحفظ جانتے ہیں، قرون وسطیٰ کے بڑے بڑے پاپائے اعظم نے عمل کیا ہے، جنہوں نے انصاف اور بد عنوان نوکری شاہی سے با رچرک کی تھی اور عام آدمی کی آزادی کا دفاع کیا تھا۔ خدا کی دی ہوئی مہلت، جس کے دوران ہمسایہ ملکوں، مختلف گروہوں یا ایک ہی گروہ کے سیاسی فریقوں کے

درمیان مسلسل جنگیں ہوتی ہیں، رومن کھیساکے لیے مفید القابا عث بھی ہوتی ہے۔ یہ جگہ جگہ وجود میں آگئے اور جاگیر دارانہ معاشرے میں بڑھتے چلے گئے، جن کی اشرافیہ ہمارے پہاڑوں کے سطلوں سے پرے، جنگوں اور قتل عام سے فوٹی یا اداسی میں جشن مناتی رہی۔

مگر جب قسطنطنیہ کے دان دیے جانے کے بعد پاپائے اعظم دنیاوی حکمران بنے اور بجائے عوام کے اخلاقی مفادات کے، خود اپنے مادی مفادات میں دلچسپی لینے لگے تو رفتہ رفتہ ان کے ہاتھوں سے اختیار جانے لگا، معاشرے کے مفاد میں انھوں نے جسے پہلے شہری معاملات کے لیے قابو میں رکھا تھا۔

سلطنت کے آخری دنوں نے ہمارے آزاد شہروں کا فروغ دیکھا، جو روم کے بڑے حصے کے عناصر کے لیے، عیسائی عناصر کے اور ایک نئے جرمن عنصر سے بنائے گئے تھے۔

عہد وسطی کے دوران میں شہر تھے جنھوں نے اطالیہ میں آزادی کی شمع روشن رکھی تھی۔ انھوں نے اپنے باشندوں میں انسانی وقار کے جذبات ابھارے اور ان کو قائم رکھا، اور انھوں نے اشرافیہ کو اپنے قلعے چھوڑ کر شہروں اور دیہات میں آزاد شہریوں کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کر کے ان کے مجتہدوں کی سلامتی کی ضمانت دی۔ یہ وہی لوگ تھے، Hanseatic League کی پیدائش سے پہلے سلطنت کے خلاف جن کے حقوق کے دفاع کے لیے لوہارڈ لیگ کی تشکیل کی گئی تھی۔ اور یہی تھے وہ لوگ جنھوں نے لیکمانو (Legnano) کے مقام پر باربروسا (Barbarossa) کو شکست دینے کے بعد، امن کی خاطر اور رومی قانون کی تعمیل کے لیے باربروسا میں شاہی اختیار کو قبول کیا اور پاپائے اعظم الیکٹراندرو سوم کی موجودگی میں کہا تھا: ”سوائے اس کے جو اطالیہ کے وقار سے متعلق ہے، ہم خود کو اپنی آزادی سے محروم کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ یہ تو ہم نے اپنے باپ دادا اور بزرگوں سے ورثے میں پائی ہے اور ہم اس سے اپنی زندگی کے ساتھ ہی دست بردار ہوں گے، ہم غلامی میں رہنے کے مقابلے میں مر جانا پسند کریں گے۔“

مذہبی جذبات سے مستحکم آزاد شہروں سے ایسی عبودیت نے، جس نے ہر شہر کو اپنے لیے ایک سرپرست ولی کی تلاش پر اکسایا تھا، اطالیہ میں جمہوریتوں کی ایک کہکشاں پیدا کر دی تھی جو سب تجارت، صنعت اور فن و ہنر میں ایسے وقت میں پھل پھول رہی تھیں جب یورپ جاگیر داری کے جنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ بھر بھی، ایک طاقتور اور متحد اطالوی ریاست کی تشکیل ممکن نہیں تھی، اس لیے کہ کوئی اطالوی شہزادہ اپنے عوام سے معمولی سی بھی حمایت حاصل نہیں کر سکتا تھا، جو قومی عظمت کے کسی بھی گمان کے مقابلے میں اپنے شہروں کی آزادی اور عمل حاکمیت کے بارے میں زیادہ فکر مند رہتے۔

دانتے نے اس تقسیم کے خطرے اور ہمدردی کو حاسد اور حریف ریاستوں میں پیدا ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی نظم میں، حریتوں پر حملہ کرتے ہوئے ایک لافانی سطر میں کہتا ہے کہ اطالیہ ”جو صوبوں کی داہتہ نہیں تھا“ وہ ظالم اور بے رحم فرقوں کا غلام ہو گیا ہے۔

یہ شاہکار جس میں دانتے اپنے نظریے کی بنیادیں تیار کرتا ہے اس کے بارے میں، اگر اس کے از

کا رفرتہ جسے کو چھوڑ دیا جائے جو اس کے اپنے دن اور ارسطو کی مابعد الطبیعیات کے مطابق گر لیا گیا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت اور انسانی زندگی کو ایک قانون کے تحت پیش کر رہا ہے، اور اس کے لیے وہ چاہتا تھا کہ سلطنت کو روم کے حوالے کر دینا چاہیے کہ اس نے اہل روم میں وہ خصوصیتیں دیکھی ہیں جو دنیا پر حکمرانی کے لیے نہایت موزوں ہیں۔

اس نے کہا کہ تمدن کا مقصد آدمی کے عقلی امکانات کا استعمال ہوتا ہے، یعنی اس کی لیاقت کا پوری طرح فروغ ہو۔ اسی طرح عالمی امن اور قوموں کی اور عوامی اداروں کی آزادانہ کارکردگی کو ایک آفاقی سوسائٹی بنانے کے مقصد کے لیے یکسو کیا جانا چاہیے۔

ان اعلیٰ فلسفیانہ لفظوں کا عام گفتگو میں ترجمہ کیجیے تو آپ کو آفاقی امن کے حصول کے طریقے کا اور اسی کے ساتھ عظیم ترین ممکنہ آفاقی کمال کے حصول کا خاکہ بھی نظر آئے گا۔

میں نہ پیترو بلی (Piero Belli) اور نہ البیریکو جنٹی لی (Alberico Gentili) کے بارے میں بات کروں گا جو جنگ کی حد بندی اور اصولوں کے اخلاق کے سلسلے میں گروئی اس (H. Grotius) کے پیش رو تھے اور جو تمدن کی خواہشات کے مطابق امن کو قائم کرنے میں بہت آگے نکل گئے تھے۔

[اپنے موضوع سے] اس تجاویز کے نتیجے پر پہنچنے کے لیے، مجھے آج کے اپنے ممتاز تاریخ دانوں اور قانون دانوں میں سے ایک کے الفاظ دہرانے کی اجازت دیجیے: ”تمام عظیم اطالوی سیاسی رہنماؤں کو ہمیشہ امن، محبت، اتحاد اور سازگاری کی تبلیغ کی فکر رہی ہے۔“

شہری ریاستوں کی آزادی اور حاکمیت اعلیٰ کے زوال کے ساتھ یونانیوں اور رومیوں کے خطوط میں ایک نئے سرے سے پیدا ہونے والی دلچسپی رہی ہے اور اس کے ذریعے ہونے والی ثقافتی تبادلات نے سیاست سے بیزاری اور عسکری شان سے حقارت کے ساتھ ذہن کی بالائری اور بیچ اور حسن کے cult کو زندگی کا آدرش بنا دیا ہے اس نے مائنس دانوں اور علما میں مبادیانہ احساس پیدا کرنے کے ذریعے قوموں کی انجمنوں کا راستہ ہموار کیا ہے۔

مگر یہ خالصتاً عقلی امن پسند وجود، ترک اسلحہ کے ساتھ مل کر اطالیہ کے لیے مبلکہ ثابت ہوا تھا۔ جس وقت ہمسایہ علاقوں میں فوجیں رکھنے والی بڑی بڑی بادشاہتیں مضبوط ہو رہی تھیں، ہمارے ملک کی خام امن پسندی نے ایک بار پھر ہمیں حملے کے لیے بالکل کھلا چھوڑ دیا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امیر ترین اور ہمارے جزیرہ نما کا سب سے خوب صورت علاقہ پہلے آسٹریا اور اس کے بعد ہسپانیہ کے قبضے میں چلا گیا تھا۔

چوں کہ ہم زمانہ حال کے بارے میں زیادہ قہر مند ہیں، اپنے تمام تر خطرات اور اختلافات کے ساتھ، آپ اس امر کو حیرت انگیز سمجھیں گے کہ میں نے آپ سے قدیم اطالیہ اور قدیم وسطی کی اطالیہ کے بارے میں باتیں کی ہیں، بجائے اس کے کہ جدید یورپ کے پیچیدہ ڈھانچے کے اندر موجودہ اطالیہ پر بات کی جاتی۔

بہر حال، میں ماضی پر ایک نظر ڈالنے کے عمل کو بے ثمر نہیں گردانتا، اس لیے کہ یہ ماضی ہی تھا ہمارے انقلاب کے سابقین اور اولین نے جس سے فیض اٹھایا تھا۔ پوری دنیا کے لیے ایک نظام قانون کا تصور، یورپ اور امریکا کے امن پسند بچھلی اور موجودہ صدی میں جس کے مثالی رہے ہیں، روم کی تاریخ میں اور ہمارے غنیمت مددگار کے ذہنوں میں مل سکتا ہے۔

بیت پرست اور عیسائی روم دونوں نے قومی قانون کو قوموں کے قانون کی بنیاد اور سنگ میل گردانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم پرستی، جس کے نام پر اطالیہ نے بغاوت کی تھی، بدگمان نہیں ہے، نہ ہی اپنے آپ ہی میں محصور ہے، اور نہ مزید غیر ملکی علاقوں کی ملکیت کا لالچی ہے۔ اس کے برعکس، یہ تمام قوموں سے ہمدردی رکھتا ہے جو آزادی کی فضا میں سانس لیتی ہیں، یا اس کی تمنا کرتی ہیں۔

جب Giuseppe Mazzini نے اطالیہ ("Giovine Italia") کی بنیاد رکھ چکا، جس کا مقصد اطالیہ کا اتحاد اور آزادی تھا، تو اس نے برلین میں 1834 میں جرمنی اور پولینڈ کے تارکین وطن کے ساتھ مل کر نئے یورپ ("Giovine Europa") کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے ابتدا کرنے والوں کو دیے جانے والے احکامات کے مطابق، اس گروہ نے کوشش کی کہ "انسانی سوسائٹی کی اس طرح تنظیم کی جائے کہ یہ مسلسل ارتقاء کے ذریعے مختصر ترین وقت میں قانون خداوندی کو تلاش کرے جو اس پر حکومت کرے۔"

بعد میں، مازینی (Mazzini) نے لیڈر رولین (Ledru-Rollin) اور دوسرے فرانسیسی، جرمن اور ہنگری کے تارکین وطن کے ساتھ مل کر ایسی ہی ایک اور کمیٹی کی بنیاد رکھی۔

مثالیہ آپ کو یہ جاننے میں دلچسپی ہو کہ جدید اطالوی عدلیہ کے ڈیٹان کے رہنما پاسکال مین چینینی (Pasquale Stanislao Mancini) 1852 میں قوموں کے قوانین کے سلسلے میں کس چیز کی تبلیغ کر رہے تھے جب وہ تورین (Turin) یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے کہا تھا، "انسانیت ہی ہماری فکر ہے، اور ضروری ہے کہ بنی نوع انسان وافر ہمدردی اور صلاحیت کی ایک منفرد تنظیم بنائے تاکہ وہ گروہ ارض کے مقصوم کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل ہو سکے۔ مگر انسانی دنیا میں ایک عنصر اختلاف کا بھی ہوتا ہے: وہ قومیں جن میں انفرادی لیاقت اور صلاحیت ہوتی ہے، تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ قومیں بن جاتی ہیں، ان کا تمدن روشن خیال ہو جاتا ہے اور قانون کی حکمرانی ایک حقیقت بن جاتی ہے۔"

اطالیہ کی حیات نو اور دوبارہ ترتیب کے بعد بھی، مین چینینی اور دوسرے قانون دانوں، کورسی (Gorsì)، بوزاتی (Buzatti) اور پاسکال فیورے (Fiore) جھکے نہیں اور قوموں کے قانون کی وکالت، ان کی تجدید اور ترتیب کرتے رہے، یا دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ بین الاقوامی انصاف کے استحکام اور تمدن کے ارتقاء کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔

اب تک قانون دانوں کی طرف سے کی جانے والی امن کی اس غمزداری کا جواب نہیں آیا ہے، لہذا بین الاقوامی انصاف اب بھی ہماری عالمی کانفرنسوں اور پریپیگنڈے کے مقاصد میں شامل ہے۔

تقریباً ہر مہذب ملک میں بین الاقوامی قانون میں ترقی پانے کا گریڈ ۱۸ اٹالیہ کے مکتب کو جاتا ہے؛ اس مطالعے سے Institute of International Law کی پیدائش ہوئی جسے آپ نے اپنی کارکردگی کے ابتدائی دنوں میں نوبل امن انعام سے نوازا تھا۔

مگر اٹالیہ تو اس بھی زیادہ کام کر چکا ہے!

بین الاقوامی قانون کی متوقع ترتیب کے بعد سے اور درحقیقت اس وقت بھی دئی ہجک میں ایک ٹاشی کے عدالت کے سامنے اس کی درخواست موجود ہے اٹالیہ نے اپنے اتحاد کے بعد مثبت قانون سازی میں نئی بین الاقوامی قانون سے متعلق قانون سازی کے اسکول میں تقریباً تمام اصولوں کے نفاذ کی ابتدا کر دی ہے۔ اس قانون سازی نے نہ صرف یہ طے کر دیا ہے کہ "ایک غیر ملکی کو ویسے ہی شہری حقوق حاصل ہوں گے جیسے کی اٹالوی شہری کو حاصل ہیں" بلکہ شہری معاملات میں، جب وہ اٹالیہ میں مقیم ہوں تو اپنی قوم کے قوانین کا پابند ہوں گے۔ جہاں تک شہری قوانین کا معاملہ ہے، تو اس اہم سلسلے میں ہم اپنے شہریوں اور غیر ملکی باشندوں میں اختلاف مٹانے میں دوسری قوموں سے آگے بڑھ گئے ہیں اور اس طرح ہم نے اپنے قانون میں کسی کے حقوق سے متعلق اپنے نظریے کی بنیاد رکھ دی ہے۔ یہ نظریہ عمل میں لایا جا چکا ہے، اور اس کا اظہار اس حقیقت سے ہوا ہے کہ اٹالیہ نے، دوسری بڑی قوموں کی طرح اپنے ملک کے تعزیری قوانین میں سے مزائے موت کو حذف کر دیا ہے۔

یہ واضح ہے کہ نئی بین الاقوامی قانون کے کمال کے لیے اٹالیہ مسلسل ترقی کے لیے بہترین ماحول پیش کرتا ہے اور جو عوام کے قانون کو یقینی راستہ فراہم کرتا ہے۔

یہ محب وطن خود نمائی نہیں جس نے مجھے ان حقائق کو پیش کرنے پر اکسایا ہو۔ یہ اس لیے ہے کہ اس دن جب ایک بین الاقوامی پارلیمان قوموں کے عداوتی اتحاد کا اعلان کرتی ہے، جس کے بعد اس سے منسلک ترک اسلم جات ہوتا ہے، امن پسندوں کو جس دن کا انتظار تھا، تو میں سمجھتا ہوں کہ تمام قومیں، مارے سے لے کر روس تک، انگلستان اور فرانس، سب یہ ثابت کریں گے کہ انھوں نے کسی نہ کسی طرح اس غلط فہمی واقعے میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔

مگر میں یہ دکھانے کے لیے کہ ہمارے پہلے معلمین نے ہمیں بے کاری یہ نہیں سکھایا ہے کہ نہ صرف اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے، بلکہ دوسری قوموں کے لیے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے، اٹالیہ کو دوسرے جنم سے گزرنا پڑے گا۔

بد قسمتی سے، دوسری قوموں کی طرح اٹالیہ کو بھی اسلموں کی شدید ضرورت پر مجبور ہونا پڑا ہے، وقت گزرنے کے ساتھ جس میں اضافہ بھی کرنا پڑے گا، اس لیے کہ دنیا کے موجودہ حالات میں امن کے تحفظ کے لیے ان کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔

حالات حیرت انگیز طور پر اتنے نامناسب ہیں کہ ہم اپنے اتحادیوں کو بھی ایک دوسرے کے خلاف

قلعہ بندی اور اسلحہ بندی کرتے دیکھتے ہیں؛ مگر ہم اس کے لیے اٹالیہ کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔
یہ بتانے کے لیے کہ اٹالیہ کی روح جنگ کے خیال کے خلاف ہے میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں مگر صرف دو جو سب سے زیادہ خوش گفتار ہیں موزوں ہوں گی۔

1865 میں حکومت کے رہنما جرنل لا مارمورا (La Marmora) نے جو قدیم Piedmontese عسکریت کی پیداوار تھا، ویانا کی عدالت میں گروڑوں کے عوض ویانا سے دست برداری کے لیے خفیہ مذاکرات کیے تھے؛ یہ مذاکرات ابتدائی درجے سے آگے نہیں جاسکے تھے مگر اس میں لا مارمورا کی کوئی خطا نہیں تھی۔

دوسری مثال اس بھی زیادہ مثالی تھی۔

گاریبالدی نے، جو لاطینی جوہر قابل اور عسکری خیانت کی سب سے ارفع تجسیم تھا، 1860 کے ستمبر کے آخر میں وائرٹو (Voturno) کی جنگ جیت لی تھی، اور اس کے اگلے دن ہی اس نے جنوبی اٹالیہ کے آمر کی حیثیت میں یورپ کی طاقتوں کو جنگ اور اسلحہ بندی کو ختم کر دینے اور یورپ کو متحد ریاستوں میں تبدیل کرنے کا پیغام بھیجا تھا۔

اُنہی ہاتھ سے، جو چند دن پہلے آزادی کی تلوار ابرا رہا تھا، اس نے لکھا تھا: ”جنگ کرتے وقت ہم اس قدیم وحشی انسان سے کچھ کم ہی مختلف ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کا شکار سمجھانے کے لیے ایک دوسرے کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ ہم مسلسل ایک دوسرے کو مارنے جھگڑنے میں اپنی زندگی صرف کر دیتے ہیں، جب کہ یورپ کی بڑی اکثریت، نہ صرف عظیم ذہن والے بلکہ تمام ہوش مند لوگ، یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اس دائمی خوف اور باہمی دشمنی کے بغیر بھی جو قومیں پر تھوپی گئی ہے بنی نوع انسان کا کوئی غیر مرئی دشمن سائنس کی مدد سے اور صفائی سے ایک دوسرے کو قتل کرتا ہے جس کے بغیر بھی ہم بہت آسانی سے اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔“

اس نے [اپنا پیغام] ختم کیا، اس امید کے ساتھ کہ فرانس اور انگلستان، اپنی پرانی رقابتوں کو ایک طرف رکھ کر متحدہ ریاستوں کا یورپ بنائیں گے جس میں دوسری قومیں بھی جلد ہی شریک ہو جائیں گی۔
ہو سکتا ہے کہ گاریبالدی کی فرانس اور انگلستان کے اتحاد کی امیدیں، جس کا مرکزہ ایک یورپی کنفیڈریشن پیدا کر سکتا ہو پوری ہو گئی ہوں۔ یہ تو مستقبل ہی بتائے گا کہ دوسری قومیں اس میں شامل ہوں گی بھی یا نہیں۔

بلند ترین آورش کی تجسیم جسے اس نے ہمیشہ متحرک رکھا تھا، تمام لوگوں کی آزادی کے لیے سیکڑوں لڑائیوں میں لڑتے ہوئے، 1870 میں گاریبالدی، باجوہ اس کے وطن نیس (Nice) کو فرانس کے حلقہ اقتدار میں منتقلی کی تکلیف کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ فرانس کی مدد کو پہنچا جسے پورے یورپ نے تنہا چھوڑ دیا تھا۔
اور چند ہی گھنٹوں کے بعد اس نے جنیوا میں پہلی Congress for Peace and Liberty میں شرکت کی،

جس کا ان لفظوں سے اس نے انتہا کیا تھا: ”تمام قومیں ایک دوسرے کی گہنہیں ہیں اور ان کے درمیان جنگ ناقابل تصور ہے۔ اطالوی دوسرے ممالک کے باشندے، دوسرے ملکوں کے لوگ اطالیہ کے باشندے یہ ہے وہ ہدف ہمیں جس تک پہنچنا چاہیے۔“

یہ وہی جذبات ہیں اطالوی لوگوں نے انقلاب کے اوج کے لحاظ میں جن کا اظہار کیا تھا، مگر میں بے ایمانی کروں گا اگر یہ دعویٰ کروں کہ یہ عام دنوں میں ہمارے ہم وطن ساتھی کی اکثریت میں سے ہیں۔ مگر ایسا ہی معاملہ ہوتا تو ہماری امن پسندی کا پروپیگنڈا نہ کبھی ضروری ہوا ہوتا اور نہ کبھی ضروری ہوگا۔

اس کے برعکس، چوں کہ گاریبالدی نے، جو آفاقی سطح پر جانا اور پسند کیا جاتا ہے، خود بہت سے موقعوں پر کہا ہے کہ اس نے ہمیشہ اتفاق سے کسب کیا ہے ”عظیم خصوصیات اور عالی حوصلہ رومن حوام سے“ کہ اطالیہ میں محب وطن افراد کی ایک نسل اٹھی تھی جس نے، روم کی ناقابل واپسی چمک دمک کا خواب دیکھتے ہوئے، اطالیہ کو پہلے درجے کی مسکری طاقت دیکھنا چاہا تھا، بجائے اس کے اطالیہ آزادی اور برتری کے معاملے میں ایک غیر معمولی قوم رہا۔

سب سے پہلے تو ان کی خواہش ہوتی کہ فی چینو (Ticino) کے صوبے کو زیرِ دستی اپنے ساتھ ملا لیا جائے، اس کے بعد انھوں نے اپنی نظریں اٹھیوپیائی سلطنت پر گاڑ دی ہوئیں، جن کے سکے کی ڈھلائی ان ہی کے ہاں ہوتی تھی۔

فرانس کی حکومت کے، اس یقین دہانی کے باوجود کہ وہ ایسا نہیں کرے گی، تینوں میں داخلے سے ان وطن پرستوں کو یقین ہو گیا تھا کہ جرمنی کی مدد سے وہ فرانس کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں اور اس سے نہیں اور کارسیکا (Corsica) کو چھین سکتے ہیں۔

یہی مرحلہ تھا جس پر ہم، گاریبالدی کے سابق تابعین نے دوسری جماعتوں کے محب وطن لوگوں کے ساتھ مل کر، جو صوبہ فرانس کے دست میں تھا، Lombard Union of Peace کی تشکیل کی تاکہ فرانس سے خوف کے پاگل پن کا مقابلہ کیا جائے۔

نا اتفاقی کے حج بونے والوں کی فاسدانہ عمدہ بیروں سے پردہ اٹھانے فرانس کے لیے اطالیہ کے تشکر کی یادوں کو دوبارہ زندہ کرنے، کانفرنس کرنے اور ان شہروں میں جہاں ان کی زیادہ ضرورت ہو امن پسند پروپیگنڈا کمیٹیاں بنانے سے ہم اس وقت کی حکومت کو مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ ان اخباروں کو خاموش کرے جو اطالیہ اور فرانس کے درمیان نفرت کی فتنج پیدا کرنے پر مائل ہوئے ہیں۔

آپ لوگ ہمارے کام کے نتیجے سے واقف ہیں۔ برسوں سے اطالیہ میں فرانس کے خوف کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے اور ہمارے مغربی ہمسائے سے ہماری مرگرم دوستی ہو گئی ہے۔ پچھلے جون ہمارے پاس میلان اور لمبارڈی کی آزادی کی چچا سویم سالگرہ کا واضح شہوت موجود تھا۔ مزکیں، میدان اور ٹھیکڑ جھوٹے ہوئے جہوم سے چڑہا سکی واقعات اور بہادری کے بڑے کام کی ان یادوں سے لہرا ہے تھے جنھوں نے

ہمارے ملک کو آزاد کر لیا تھا۔ سب سے زیادہ گرم جوش اور متفقہ مظاہرے وہ تھے جو فرانس اور اس کی فوج کو سلام کر رہے تھے ان میں سے کئی بہادر نمائندے ہم میں سے تھے۔ 1859 کی یادگار تحریک کی بنیاد خانہ امداد کے لیے جس نے ہمیں نجات دلانے میں اکتاہٹ حاصل کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو نصف صدی کے غیر معمولی اور بد قسمت واقعات کے بعد، نہ دوسری قوموں سے حاصل ہونے والے فوائد کی دل کی کھراپوں سے متاثر کرنے والے اجداد لوگ ہو سکتے ہیں اور نہ وہ جن کی ذمہ داریاں ان کو دوسری قوموں کی سوراخوں سے وابستہ رکھتی ہیں۔

اگرچہ آج دوسری قوموں کی یہ سوسائٹی عملی سیاسی وجود سے مبرا ہے، [مگر] اسلایہ موجود ہے۔ ہم نے اطالویوں کو اس وقت آگاہ کیا تھا جب، تہابیوں کے مارے جس میں میسینا (Messina)، ریگیو (Reggio) اور گالابریا (Galabria) اور سیسیلی (Sicily) کے کئی دیہات فتن ہو گئے، دنیا بھر سے محبت اور فوری امداد کی فراہمی سے ان کے دلوں کو ٹھنڈا کیا گیا تھا۔

ایسی ہوتی ہے آفاقی انسان کی روح کی آواز جو مصیبت کے وقت، ریل سٹوں کی مصلحتوں کے تحت بنائی ہوئی مصنوعی رکاوٹ کو نظر انداز کر دیتی ہے اور انسان کی نرم دلی اور نیکی کی گواہی دیتی ہے۔

اور اپنے جشنِ یمن کے دوران ہم نے اس عظیم جذبہ رشتم اور عملی بہادری کو بھلا دیا نہیں تھا جو دوسری مہذب قوموں کی طرح آپ کے فراخ دل ملک ماروے کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔

”می لے“ (Mille) کے خطیب شاعر ایبرا (Abbra) نے خود باشا روم کی موجودگی میں اپنے خیال کے اعتبار سے اس عظیم واقعے کی متاثر کی تھی جو اس وقت اور آج بھی ہمارے عوام اور حکومت کے دلوں میں سب سے بالا حیثیت رکھتا ہے؛ اس نے یہ کہہ کر اپنی تقریر ختم کی تھی کہ امن کے مٹنے کو پورا کرنے کے لیے جو تاریخ اور یورپ میں اس کی حیثیت نے اس پر عائد کیا تھا، اطالیہ ثابت قدمی سے کھڑا ہوا ہے۔ اطالیہ کے باہر بھی سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں کوئی جماعت نہیں جو جنگ چاہتی ہو۔ پھر بھی، ہم میں، بالخصوص ہماری فوج میں ارادے کی کوئی کمی نہیں، جو واقعی جنگ کی گھاہاں نہیں، مگر جنگ آتی تو افسوس نہیں کرے گی؛ انہیں امید ہے کہ فتح کا تاج، اطالیہ کو اس کی آزادی کے وقت جس سے محروم رکھا گیا تھا، جس کے لیے اطالیہ کے عوام (نہ کہ باقاعدہ اطالوی فوج) کے جتنے لڑے تھے وہ آج قوم کی حیثیت سے اطالیہ کے ماتھے پر سج سکتا ہے۔ اس خیال کو، جو ہمارے چند ہم وطنوں کے دلوں میں جاگزیں ہے، ہم سب نے رد کر دیا ہے، جن کے دلوں میں انسانی جذبات موجزن ہیں، اور جسے تقریباً تمام مہذب ملکوں کی تاریخ نے جھٹلایا ہے، جو عظیم ہیں، خوش حال ہیں اور باعزت ہیں اس حقیقت کے باوجود کہ ان کی عسکری یادداشتوں میں فتوحات کم اور شکستیں زیادہ ہیں۔

جب اپنے عوام کی نیکی اور افواج کی بہادری کے باعث، چند برسوں کے اندر کوئی ملک اپنی تمام حکومتوں کو اتار پیچھتا رہا ہے جنہوں نے اس کو غلام بنایا ہے اور تقسیم کیا ہے، ایک نئے جنم کے حصول کے لیے، جو

اسے ایک صدی میں دوسری قوموں سے آگے لے جاتا ہے؛ کب، ترکوں کے خلاف یونانی بغاوت کے علاوہ، یورپ یا امریکا میں قومی آزادی کی کوئی جنگ ہوئی ہے جس میں اطالویوں نے آزادی کی طرف سے لڑتے ہوئے اپنے احساسِ برادری کا مظاہرہ نہیں کیا ہے؛ جب تنظیم کی کمی اور سپہ سالاران افواج کی غلطیوں کے باعث، ہمارے سپاہیوں کی بہادری جن لڑائیوں میں قابلِ ذکر رہی ہے، ہم جنہیں بارگئے تھے جیسے جینا (Jena) میں پروشیا، اور 1870-1871 کی (فرانس / پروشیا) جنگ میں فرانسیسی جب ایسی تمام باتیں درست ہوں، تب جنگوں کی ضرورت نہیں رہتی، دنیا کو یہ دکھانے کے لیے کہ اگر ہماری آزادی اور ہمارا قومی وقار ایک بار پھر خطرے میں ہو، تو ہمارے عوام اور ہماری فوج جانتی ہے کہ آخری وقت تک اپنا فرض کس طرح ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن، یہ جنگ کی مثال نہیں، اطالیہ یا کسی اور ملک کو جس کی خواہش کرنی چاہیے۔

یہ جان کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ وہ امن جو کئی برسوں سے یورپ پر غالب ہے، صرف اسی طرح قائم رکھا جاسکتا ہے کہ اسلحہ بندی پر عملی جائے، جس کا اقتصادی بوجھ قوموں کو پوری طرح اور آزادی سے ترقی کرنے سے روکتا ہے؛ اور افسوس کہ یہ امن اسی شرط پر قائم ہے کہ بہت سے سنجیدہ سوالوں کو نظر انداز کر دیا جائے ایسی حالت جو چند بے کار عذر داریوں کے بعد، طاقت کے غلط استعمال کی اجازت دے دیتی ہے، جو ممکن نہ ہوتی اگر قانون کی حکمرانی ہوتی۔

ایسا کوئی بھی سمجھ دار آدمی نہیں جو اس حالت کے خطرات کو نہیں دیکھ سکتا، یا اس آگ کے خیال سے کانپ نہیں اٹھے گا جو ہمارا متحدہ ہوگی، اگر آج ہم نے ان کا علاج تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہ کر دی۔ بہت ضروری ہے کہ سچ کی اور محبت کی کچھ شعاعیں ان تین چار لوگوں پر بھی پڑیں جو امن اور جنگ کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں، تاکہ وہ یورپ کی موجودہ جنگ بندی کو انصاف اور خوش حالی سے معموا من سے بدل دیں۔

جس دن روسی سلطنت کے چانسلر مورایوف (Muraviev) نے ژار نکولاس کی طرف سے طاقتوں کو ترک اسلحہ جات اور امن پر غور کرنے والی کانفرنس میں شرکت کا پیشی مراسلہ بھیجا تھا، ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ آفاقی اعلان کا عظیم دن قریب آ پہنچا ہے۔

انگلستان، جرمنی، روس کے بادشاہوں اور فرانسیسی جمہوریہ کے صدر کے حالیہ دورے جرمنی اور فرانس کے درمیان اکثر کی جانے والی مصالحتی کوشش، اور انگلستان اور جرمنی کے درمیان دوستی کے اظہار نے شبہات اور دشمنی کے بادلوں کو دور کر دیا ہے جو اکثر و بیشتر دونوں ملکوں کے درمیان غیر صحت مند بدگمانیاں پیدا کرتے رہے تھے یہ سب سرمد الہان ریاست کی جانب سے نیک نیتوں کے ہمارے دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ امید لگائے رکھتے ہیں ہماری ہمت افزائی بھی کرتے ہیں۔ مگر تقریباً فوراً ہی قوم پرستی کے سیاہ، مغرور اور اشتعال انگیز تکبر نے اپنا منہ منسوب کر لیا، اور امن کی جانب جانے والا وہ میدان جو ہمارے خیال میں ہم نے سر کر لیا تھا، ایک بار پھر ہمارے ہاتھ سے جاتا معلوم ہو رہا ہے۔

کیا ہمیشہ ہی ایسا ہوتا رہے گا؟ کیا پیغمبر کا پہلے سے بتایا ہوا دن کبھی نہیں آئے گا، وہ دن جب کوئی قوم دوسری قوم کے خلاف کبھی اسلحہ نہیں اٹھائے گی، جب نیزے اور تلواریں ہل میں تبدیل کر دی جائیں گی؟ کیا یہ سب کچھ بے کار گیا ہے کہ یسوع مسیح اس دنیا میں امن اور خوش حالی کا پرچم بلند کرنے کے لیے آئے، اور انھوں نے صلیب پر اس لیے جان دی کہ ایک دن تمام انسان ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں؟

دوران انقلاب فرانس پر غور کیجیے جسے امن، مساوات اور بین الاقوامی رشتوں میں بھائی چارے کی شروعات کا باعث ہوا تھا، مگر اس کے بجائے انسانی حقوق کے اعلان کے دو برس بعد ہی جنگ کے طوفانی جھکڑ چلنے لگے، جیسے اٹلیا (Amila) [روی علاقے ووگا کے خانہ بدوش ہنوز (Hunz) کا سردار] سے پہلے دنیا میں دیکھے نہیں گئے تھے۔ اس حقیقت پر غور کیجیے کہ Society of the Friends of Peace کی فرانس میں بنیاد پڑنے کے دو برس بعد ہی، اٹلی ادب نے، مدیرین نے اور جرمنی اور فرانس کے تمام مزدوروں نے جس کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا تھا، فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ پھوٹ پڑی، جو صرف فرانس کے لیے ہی نہیں، پورے یورپ میں امن کے مقاصد کے لیے تباہ کن تھی۔ اور پھر یاد کیجیے کہ ہمارے ممتاز ماہر فریڈریک ہیملی کورائے دہندگان نے منتخب نہیں کیا تھا، شاید اس لیے کہ ان سے بین الاقوامی امن کے سرگرم پیامبر ہونے کا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ اس پر بھی غور کیجیے کہ ہمارے سب سے بڑے امن پسندوں میں سے کسی ایک کو بھی خارجہ پالیسی کی راہ نمائی کے خاطر حکومت کی مریدانی کے لیے کبھی طلب نہیں کیا گیا۔ یہ بھی دیکھیے کہ پاپائے اعظم، جسے روئے زمین پر یسوع مسیح کا دنیاوی پادری کہا جاتا ہے، اقتدار چھین جانے پر احتجاج میں خود کو کوئی کن (Vatican) قیدی بنالیتا ہے؛ جب اس کی آواز بھیرائیت سے گئی محبت اور مشکل میں ہر آدمی سے بلند ہوتی چاہیے تھی تا کہ جنگ کو ابتدا ہی میں روک لیا جاتا، جو بلند نہیں کی گئی تھی، یا، اگر ہوتی تو دیر سے ہوتی تھی، یا بہت کمزور تھی، اسی طرح جیسی کہ ان کے حالیہ براہین کی آوازیں تھیں۔ چند استثناء کے ساتھ، اس پر بھی غور کرنے کا محل ہے کہ شعرا جنگ اور قتل عام کی تعریفوں کے گیت گا کر شہرت اور مقبولیت حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر بھی غور کیجیے کہ ارفع ترین خوبیاں کس طرح ہمیشہ قومی پرچم کے ساتھ ہی ختم ہوتی ہیں، جب کہ ظلم صرف دشمن سے منسوب کیا جاتا ہے تا کہ قوموں کے درمیان دشمنی اور بدگمانی باقی رہے۔ ان سب باتوں پر غور کرتے ہوئے میں آپ سب کے سامنے اعتراف کر رہا ہوں کہ مجھے بھی مایوسی کے لمحات کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور سوچ رہا ہوں کہ میرا خیال، میں جس پر قائم ہوں اور جن پر برسوں میں نے اپنا وقت اور اپنی توانائیاں صرف کی ہیں، صرف میرے دماغ کے لیے کہیں ماسی مود کی یوٹیوپیہ، یا ہمارے اپنے Campanella's City of the Sun کا سراپ تو نہیں تھا۔

مگر یہ تو مجھے غائب ہو جانے والے لمحات تھے! اور جلد ہی میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ اگر مستقبل کے امن اور انصاف کے لیے کیا جانے والا کام، تمام قوموں اور انسانوں کی مسلسل ترقی اور بار آور اور فائدہ مند محنت وغیرہ، صرف ایک سراپ تھا تو یہ ایسا خدا داد سراپ تھا جو اس حیات کو زندہ رہنے اور اس کے

لیے جان دے دینے کے قابل بناتا ہے۔

مگر یہ مراب نہیں۔ میں نے اسے اپنے اندرون کی کھرا نیوں میں محسوس کیا ہے، اور انسانی ارتقا کی تاریخ اور روزمرہ کے تجربے نے میرے لیے اس کی تصدیق کی ہے۔ وہ مناسب خیالات جو نیک لوگوں کے ضمیر میں جگہ پاتے ہیں مرتے نہیں، یہ حقیقتیں اور موثر طاقتیں ہوتی ہیں، مگر، صرف اس حد تک ایسی ہوتی ہیں کہ وہ جو ان سے واقف ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کا اظہار کس طرح کیا جاتا ہے۔ یہ ہم پر، اور اس کے بعد، ہمارے اپنے فیصلے اور ہماری ثابت قدمی پر منحصر ہوتا ہے کہ امن کا خیال عوام کی آگاہی میں جگہ پا بھی رہا ہے یا نہیں، جب تک کہ یہ تمام لوگوں کے ضمیر میں ترقی نہیں کرنے لگتا۔

بد قسمتی سے، ہمارے خیال کے مطابق، آج بہت سی حقیقتیں جو بات اچھی طرح واضح کر رہی ہیں وہ یہ ہے کہ آفاقی امن بہت دور کے مستقبل کی بات ہے، اور دوسروں کی زمین کے لیے لوگوں کے لالچ کے پیش نظر کمزور مالک طاقت و رمالک پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔

”اپنا بارود خشک رکھو اور اپنے دفاع کے لیے تیار رہو“ یہ [پیغام] اطالیہ کے لیے بھی ہے اور دوسروں کے لیے بھی، جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔

مجھے یقین نہیں کہ اس وقت یورپ میں ایسی ایک بھی حکومت ہے جو جنگ کی تیاری کر رہی ہو، مگر وہ وقت آسکتا ہے کہ جو اس کے بارے میں سوچ بھی نہ رہے ہوں، حالات کے باعث خود کو جنگ میں مبتلا پائیں گے۔ ہمارے سامنے اس کی مثال ہے 1870 کے فرانس کی، جب، جنگ سے ایک ماہ قبل، کسی کو شبہ بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے؛ مگر جب اس کی ابتدا ہو گئی تو کسی کو علم نہیں تھا کہ اس گورد کا کیسے جائے۔

مگر ایک بات یقینی ہے: آج کے اتحاد جنگ کے لیے نہیں، امن کے لیے ہیں۔ ہمیں اس کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ اتحاد میں شامل قوموں کے احتجاج اور شکایات کے بغیر، کسی ایک اتحاد میں شامل قوم دوسرے اتحاد میں شامل قوم سے دوستانہ تعلقات قائم کر سکتی ہے۔

یقیناً، ایسے بہت سے لوگ ہیں جو پہانی بدگمانیوں کے زیر اثر متدن انسان کے بھیس میں ایک وحشی کو چھپائے رہتے ہیں، جو غیر ملکی کو ایک دشمن کی صورت اور جنگ کو ایک اچھے قیاس کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اب یہ امن پسندوں کا کام ہے کہ وہ لوگوں پر یہ واضح کر کے کہ حقیقت میں جنگ میں کیا کچھ ہوتا ہے، [دنیا کے سامنے] پس ماندہ ذہنیوں کو کھول پر پیش کریں ایک فتح کے لیے بد قسمت باشندوں کو کتنے آنسو، کتنا خون اور کتنا تشدد برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس دوران، یورپ کی کیفیت اتنی الجھی ہوئی ہے، بہت سی قوموں کے درمیان کی پرانی تھنیاں اب بھی باقی ہیں، کہ کوئی بھی مستقبل کی ضمانت نہیں دے سکتا۔

لیکن، یہ بہت حیرت کی بات ہے کہ سائنس دان ہواؤں کی مزاحمت پر قابو پا چکے ہیں اور مصنوعی پروں کے ذریعے ہواؤں کو چیر کر اپنا راستہ بنا چکے ہیں، مگر ان کے ترقی پسند مدبّروں میں سے — جو بہت سے

ملکوں میں موجود ہیں ایسا کوئی بھی نہیں ہے جو شیطانی جذبات کی مزاحمتوں اور سماج دشمن مفادات پر قابو پانے کا طریقہ ایجاد کر سکے جو قوموں کی، امن، انصاف اور خوش حالی کے مشترکہ ہدف کی طرف ناگزیر پیش قدمی کو روکنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

مجھے علم نہیں کہ بڑی طاقتوں کی حکومتیں آج کل، یا بعد میں اپنی کمزوریوں، ناپائیداری اور پیش نظر خطرات سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کے لیے کیا کریں گی۔

نہی میں اس سے زیادہ پیش بینی کر سکتا ہوں کہ خود ہمارے اپنے ملک میں کون سی حکومت اور کون سی پارلیمانی مختلف نوعیت کا پارلیمانی نظام لاسکے گی۔ مگر میں اس بات کا یقین ضرور دلا سکتا ہوں کہ میں اپنے عوام کی قوتوں سے اچھی طرح واقف ہوں کہ اطالیہ نہ کبھی اسلحہ اٹھائے گا نہ انسانی قوتوں کے آزاد ضمیر پر کسی طرح بھی اثر انداز ہوگا جنہیں آفاقی امن زیادہ عزیز ہے۔

ایک حالیہ واقعہ مستثنیٰ کے لیے اچھا شگون ہے: جب 1870 میں ہر دل عزیز بادشاہ، وکٹر ایمانوئل دوم (Victor Emmanuel II) نے، اپنی بہادری کے باعث ہپوولین کی فوج کے مدد کے لیے 10,000 غری بھینچتی چابی تھمی۔ جو اس وقت جرمنی کا اتحاد روکنے کے لیے پروشیا (Prussia) سے جنگ کر رہا تھا۔ تو ہمارے عوام نے متفقہ طور پر مخالفت کی تھی اور وہ 10,000 سپاہی اطالیہ سے باہر قدم نہیں نکال سکے تھے۔

بعد میں، جب کریسپی (Crispi) حکومت فرانس کے خلاف جنگ پر آمادہ نظر آئی تو [اطالیہ کے مشہور شاہ عر] کاوالونٹی (Cavallotti) نے اطالوی جمہوریہ اور امن کے دوستوں کی جانب سے اپنی آواز بلند کی، کہ اطالوی سپاہیوں نے اگر فرانس کی سرحدوں کو پار کرنے کی کوشش کی تو ان کو ہماری لاشوں پر سے گزنا پڑے گا۔ نتیجے میں کریسپی کو اپنی پارلیمانی تبدیلی کرنا پڑی تھی اور جنگ ناممکن ہو گئی۔

چند برس بعد ایک بار پھر اسی وزیر نے ایک پوری فوج کو فریقا بھیجنے کی منسوبہ بندی کی تا کہ، عسکریت پسندوں کے مطابق، آڈووا (Adua) کی لڑائی میں ہماری ہزیمت کی وجہ سے کھوجانے والی عزت کو بحال کیا جائے۔ مگر عوام نے انقلاب کی دھمکی سے اس احتمالہ اور بے جا جنگ کا راستہ روک دیا اور اس کو اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

مگر میں آپ سے اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا کہ اگرچہ ہمارے عوام میں بہت سے اچھی ملا جلی موجود ہیں، وہ بہت جلد متاثر اور مشتعل بھی ہو جاتے ہیں، اور بچوں کے ان کے بھڑکانے والے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں، اکثر ایسا ہوا ہے کہ ان میں سے کچھ، بالخصوص طلبہ نے ایسے جذباتی مظاہرے بھی کیے ہیں جن کی بدولت اطالیہ کے اپنے ہمسایہ ملکوں سے تعلقات خراب ہو سکتے تھے۔ مگر یہ ایسی شورشیں تھیں اکثریت کا جن سے کبھی واسطہ نہیں رہا ہے۔ انہیں انتقام پر اکسایا نہیں جاسکا ہے، نہ ہی طغیوں کے جواب میں انہیں ابھانا جاسکا ہے، ہمارے شاہی سلطنت کی سرحدوں کے باہر یہ کہہ کر اطالویوں کی توہین کی جاتی رہی ہے کہ ”خون پانی

سے زیادہ گڑھا ہوتا ہے۔“

حضرات! مجھے یقین ہے، آپ کو احساس ہو گیا ہو گا کہ میرا خطاب اختتام کے قریب ہے۔ اٹالیہ نے، جو بڑی طاقتوں کے درمیان نئی اور سب سے چھوٹی طاقت ہے، سیاسی خیالات، عدالتی تصورات اور اخلاقی آدرشوں میں اپنا مناسب حصہ ڈالا ہے، جو اچھا بھی رہا ہے اور برا اور بھی، اور جو تاریک اور طوفانی دنوں میں اس کا قطب نما رہا ہے اور یہی اس کی شان، اس کی ہمت اور آنے والے وقتوں میں اس کی متحرک رکھنے والے قوت بھی رہے گی۔

اطالوی انقلاب، سب سے پہلے تو قوم کی آزادی اور اتحاد کے لیے، اور اس حصول کے بعد، آزاد ترین اور ترقی یافتہ قوموں میں شمولیت اور امن، انصاف اور تمدن میں باہمی تعاون کے لیے لڑا تھا۔

ابھی تک صرف ایک ہی بدفہم حاصل ہوا ہے، وکٹر ایمانوئل وٹم نے جو خفیہ سی ریاست پی اے مونٹے (Piedmont) کا بادشاہ تھا وٹم میں اٹالیہ کا شہنشاہ بن گیا ہے۔

اب ہمیں اپنے دوسرے آدرش کے حصول کا سامنا ہے۔

اگر وکٹر ایمانوئل (جو تمدن کی جانب سے International Institute of Agriculture کی تاسیس کے اعزاز کا حق دار ہے، کہ یہ ادارہ مستقبل کی دنیا کی اقتصادی حالت کے لیے فائدہ مند ہو گا) دنیا میں اٹالوی مقام کے حوالے سے اٹالیہ کے انقلاب کو حمایت فراہم کرے گا تو اسے اور اس کے عوام کو زیادہ شہرت ملے گی اور عوام کے اور اس کے درمیان محبت کا ہندسہ زیادہ مضبوط ہو گا۔

”سدا بلند رہے ہمت، آزادی کے لیے، انصاف کے لیے اور عوام کے درمیان امن کے لیے۔“ یہی وہ مقولہ ہے جس کے ذریعے عوام اور بادشاہ دونوں تمام رکاوٹوں کا سامنا کر سکتے ہیں اور بلند ترین بدفہم تک پہنچ سکتے ہیں۔

میں بغیر کسی اختیار کے کلام کر رہا ہوں، مگر ایک انسان کی حیثیت میں، جس نے اپنے ملک کی سیاسی نتائج کا ثانیہ کے ہر دور کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے اور اپنی قومی بہادری کے اعلیٰ ترین لحاظ میں اٹالوی روح کی لرزشوں کو محسوس کیا ہے۔

حضرات! اپنی زندگی کے اس اہم ترین موقع پر، آپ کے عوام اور تاب دار ماروے کے نمائندوں کے سامنے، جس کی مثال نے تمام، چھوٹی ہوں یا بڑی، قوموں کو سکھایا ہے کہ بغیر تشدد کے غیر فوجی فتوحات کس طرح کی جاسکتی ہیں۔ حب الوطنی اور انسانی آدرشوں کے پیش نظر، جن کی بدولت اٹالیہ اپنے تیسرے وجود میں آیا ہے، اور ان بہادروں اور شہیدوں کی طویل فہرست کے سامنے، جنہوں نے جنگ کے میدانوں میں، قید خانوں میں اور صلیبوں پر اپنی جانیں دی ہیں۔ میں، اپنے خطاب پر ایک مہر کی مانند، آپ سے حلفیہ وعدہ کرتا ہوں کہ اٹالیہ اپنے عہد سے کبھی روگردانی نہیں کرے گا جو اس نے دنیا کے سامنے کیے ہیں؛ کہ ہم ایک بار پھر، آزاد ہو کر اپنے مقدر کا فیصلہ کریں گے، جو مختصر ہو گا استحکام اور ترقی کا، امن پسندی کا اور یورپ

میں تمدن کا۔ جی ہاں! مجھے پورا یقین ہے کہ اٹالیہ کبھی ناکام نہیں ہوگا، اس لیے کہ کسی نے اٹالیہ کے لیے وہی کچھ کہا جو آپ کے ملک کے لیے ایسی نے کہا تھا:

اک کبریٰ نڈر کے بعد
پوری توانائی سے اٹھی ہے قوم
حکم پہ چلنے کو
ایسی دوز میں شامل ہے اب
جس پہ یقین بھی ہے
ایسا یقین جو امن و ترقی سے بھر پور
اور یہ امن و ترقی سب کچھ تیرے لیے، انسان!

خطبہ — لوئی رینو

1899 اور 1907 میں دی ہیگ میں کیا جانے والا کام

جیسا کہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں اس موقع کی تلاش میں رہا ہوں کہ میں اس امتیازی اعزاز کئے لیے فوٹیل کمیٹی کا شکریہ ادا کر سکوں جو انہوں نے امن العام کے ذریعے مجھے بخشا ہے، میں اس کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز جانتا ہوں۔ میں اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتا ہوں جو میں نے اس شام جب میں روانہ ہو رہا تھا، اپنے ممتاز ساتھی جناب فریڈرک بیسپی سے کیا تھا کہ میں ان کی جانب سے، عمر کے پیش نظر، اپنا فرض پورا نہ کر پانے کی معذرت آپ کو پیش کر دوں۔

آپ سب نے جس دوستی اور گرم جوشی سے میرا استقبال کیا ہے اس نے مجھ پر آپ کے تشکر کا فرض اور سوا کر دیا ہے، ایسا استقبال جس نے میرے دل کو خوش اور میرے فخر کو متین کر دیا ہے۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ماروے نے مجھے ایک اور قومی جشن کے تجربے کا موقع فراہم کیا ہے جس کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہوا۔ یہ اتفاقاً نہیں ہوا ہے کہ میں اس موقع پر موجود تھا، ورنہ اس دو ستانہ مشورے کے ذریعے ہی میں نے یہاں آنے کے لیے مناسب تاریخ کا انتخاب کیا تھا۔ پھر بھی، باوجود اس کے کہ مجھے سب کچھ بتا دیا گیا تھا، یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ کل میں وہ کچھ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا جو میری توقعات سے کہیں زیادہ تھا۔

صبح کی چمکتی ہوئی دھوپ میں تمام خوش باش نوجوان اپنی رنگ برنگی پوشاک میں، تیز تیز قدم رکھتے ہوئے اپنے پرچم کو اٹھنے پر مسرت طریقے سے لہرا رہے تھے کہ مجھے زندگی کے بہار کا موسم مستقبل میں قدم بڑھانا محسوس ہو رہا تھا۔ دو پہر کے بعد منظر کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا، اور آسمان کی تابندگی کم ہو گئی تھی، اور پھر

مجھے ایسا لگا گویا خزاں کا موسم آگیا ہو۔ میں تمام لوگوں کو تقریباً مذہبی گرم جوشی سے قومی ترانے گاتا دیکھ کر اور بے شمار سوسائٹیوں اور انجمنوں کے جھنڈوں کو ملک کی سب سے بڑی شخصیت کے سامنے سلامی کے لیے سرنگوں ہوتا دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا۔

سو یہ تھا وہ منظر میں نے جس میں مہندب ماروے کے دو چہرے دیکھے تھے ایک خوش باش، اور دوسرا سنجیدہ، مگر دونوں ایک ہی جیسے دل فریب تھے۔ میرا دل اور میری آنکھیں [انھیں دیکھ کر] پوری طرح مطمئن ہو گئی تھیں۔

آپ نے مجھے پدم قسم کی مہربانی فرمائی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ آپ مجھے اپنے ممبر کا فائدہ اٹھانے میں جلد باز سمجھ رہے ہوں گے۔ مجھے معاف کیجیے اور بس اتنا سمجھ لیجیے کہ میں تشکر کا قرض ادا کر رہا ہوں۔ میں صرف اپنی جانب ہی سے آپ کا شکریہ ادا نہیں کر رہا ہوں؛ میں ان تمام قانون دانوں کی طرف سے بھی شکریہ ادا کر رہا ہوں جنہوں نے اپنی تمام کوششیں بین الاقوامی قانون کے مطالعے میں صرف کر دی ہیں اور بہترین الاقوامی مفادات کے سلسلے میں جن کی خدمات کی آپ نے اس قدر دانی سے تصدیق کی ہے۔ Institute of International Law کو انعام دے کر آپ نے ان خدمات کو اجتماعی طور پر پہلے ہی اعزاز سے نواز دیا ہے، ایسا انعام جس نے آفاقی دل کا پی کو فروغ دیا ہے۔ بین الاقوامی افراد کی اس امن پسند فوج میں سے آپ نے ایک سپاہی کو منتخب کیا ہے جس نے قانون کی تعلیم اور اس پر عمل دونوں کی لیے کئی برس لڑائیاں لڑی ہیں۔

سیاست دانوں اور سفارت کاروں نے کافی عرصے تک ایک دوسرے کو نظر انداز کیا اور حقارت سے دیکھا ہے، اس باہمی نفرت کے باعث، خوش قسمتی سے جو اب ختم ہو چکی ہے، نظریاتی اور سفارقی معاہدوں کو نقصان پہنچا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات اتنے پیچیدہ ہو چکے ہیں کہ اگر دائرہ پر گئے بہت سے مفادات کی روشنی میں موثر طریقے سے ان کی ترتیب کی جائے تو بہت سے عدالتی اختیارات میں باہمی تعاون ناگزیر ہو جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ اب رکی قانون کا دائرہ اتنا پھیل چکا ہے کہ اس میں تقریباً تمام سیاسی، اقتصادی، عدالتی اور انتظامی امور بھی شامل ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے حالیہ کانفرنسوں میں دیکھا ہے، ہمیں ہر زمرے کے ماہرین سے مدد حاصل کرنی چاہیے۔ ایسا کرنے سے ہم شراکت داری کی کامیاب فضا تیار کر سکیں گے جو اب بے حد ضروری ہو چکی ہے۔

چوں کہ آپ نے ایک قانون داں کو منتخب کیا ہے، تو میں ایک قانون داں ہی کی حیثیت میں آپ سے مخاطب ہوں، اور میں ابتدا ہی میں اس معاملے کی خشکی کی معذرت چاہتا ہوں جسے صرف وضاحت اور درستی کی ضرورت ہے۔ آپ کی بد قسمتی کہ ضروری نہیں کہ اس پر و فیسر کی لیاقت خطیب کے مطابق ہو، جیسا کہ ہم نے امن کانفرنس میں دیکھا تھا، جس میں سب سے زیادہ اچھے مسائل بھی دل بھانے والے معلوم ہوتے ہیں۔

میں امن کانفرنسوں کے تاریخی پس منظر کی چھان بین نہیں کرنا چاہوں گا، جن کے سیاسی اور انتظامی

یہاں کی اپنی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ اسی مقام پر، 1907 کی پہلی مارنیا کی امن کانفرنس میں، میرے ممتاز ساتھی Hagerup نے ایک موضوع پر بات کی تھی جسے کبھی بھول نہیں سکتا۔ مجھ میں وہ کچھ دہرانے کی خواہش نہیں، جو انھوں نے آپ سے اختیار کے ساتھ کہا تھا، اتنے اختیار سے میں جس کے حصول کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر بھی میں عام قسم کا مشاہدہ پیش کرنا چاہوں گا، تاکہ امن کانفرنسوں کے فلسفے سے آگاہی ہو سکے۔ میں کسی تنازعے میں نہیں الجھوں گا۔ میں صرف ایک انسان کی طرح بدلوں کا جو ہمیشہ سے ان واقعات کا آرزو مند شاہد رہا ہے، اور کبھی کبھی ان میں حصہ بھی لیتا رہا ہے، اسی کی طرح، جس نے اُس وقت بھی فائدہ اٹھایا ہے جب، گرما گرم بحث سے پرے رہتے ہوئے نتائج کا اندازہ نہیں لگایا ہے جو کتنی کوششوں کے ذریعے حاصل کیے گئے تھے۔

اپنی رائے کے مطابق میں جسے دی جیگ میں کیا جانے والا کام کہتا ہوں وہ دراصل عوام کے درمیان رشتوں کے قانون کے تصور کا بتدریج ہونے والا فرد بننے ہے، مختصراً جو بین الاقوامی زندگی کی قانونی تنظیم ہے۔ اس موقع پر میں اس کام کی یاد دلانا چاہتا ہوں جو پچھلے پندرہ برسوں میں نجی بین الاقوامی قانون اور عوامی بین الاقوامی قانون کے میدانوں میں کیا گیا ہے: 1893، 1894، 1900 اور 1904 کی امن کانفرنسوں نے نجی بین الاقوامی قانون پر اور 1899 اور 1907 میں عوامی بین الاقوامی قانون پر۔

جن معاملوں پر کام ہوئے ہیں ان میں اختلافات ضرور ہیں، اس کے باوجود مشترکہ صفات رکھتے ہیں۔ ایسی کانفرنسوں میں مانے احکام کی جگہ قانون لانا چاہتی ہیں، وہ افراد کے درمیان قائم رشتوں کے ساتھ ساتھ ریاستی رشتوں سے بھی متعلق رہتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان سے متعلق مشکلات ایک جیسی نہیں ہوتیں، مگر دونوں ایک ہی جیسی بڑی ہوتی ہیں۔ ان کو حل کرنے کے لیے ہر ملک کو اپنے خیالات اور تصورات سے چمٹے رہنے کی عادت کو چھوڑنا ہوگا اور اپنے ضروری مفادات کو نقصان پہنچائے بغیر ان کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس مقام پر مجھے مارنیا کے مجسٹریٹ مسٹر بائخمان (Beichmann) کو خراج تحسین پیش کرنے کی اجازت دیجیے، مجھے جن سے کئی مواقع پر ملنے اور نجی قانون کے میدان میں ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔

پہلی ہی نظر میں اس حقیقت کے بارے میں قابل فحس یہ بات تھی کہ نجی بین الاقوامی قانون سے پہلے بین الاقوامی عوامی قانون کی ترتیب شروع ہو چکی ہے۔ مقابلہ شہری قانون کے مقدمات میں فیصلوں کے فقدان کے باعث نجی قانون کا بھی نقصان ہوا ہے، مگر یہ شکایات اتنی اہم نہیں تھیں کہ ان کی طرف مختلف حکومتوں کی توجہ مبذول ہو سکتی ہے۔ تو نیدرلینڈ کے مسٹر آسر (Asser) نامی قانون دان وزیر مملکت کی تمہید تھی جس نے بالآخر یورپی قوموں کی، شہری قانون کے تنازعات پر بحث کرنے میں رہنمائی کی تھی، اس سے پیدا ہونے والے عمل سے اچھے نتائج نکلے، اور اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نجی بین الاقوامی قانون کی ترتیب ہو رہی ہے۔

بین الاقوامی عوامی قانون کی ترتیب کا سلسلہ Crimean War کے بعد 1856 میں پیرس میں منعقد ہونے والی کانفرنس سے ملتا ہے۔ 16 اپریل 1856 کے سفارتی قانون میں جو Declaration of Paris کے

نام سے مشہور ہے بحری جنگ سے متعلق چار اصول شامل ہیں آج جو آفاقی طور پر قبول کیے جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بہت ترقی ہوئی ہے، بالخصوص مختلف نظاموں کی درمیان دو نکات پر اتفاق سے، جو فرانس اور برطانیہ عظمیٰ سے متعلق ہیں۔ یہ مفاہمت، جو پہلے ایک مشترکہ جنگ ٹھونسے اور امن کے بعد قائم ہونے کا عمل تھی، عوامی حالات کے پیش نظر انصاف اور عام مفاد دونوں کی خاطر ہوئی تھی۔ ہر ملک نے اپنے نظام کے طریقہ کار سے ہاتھ اٹھالیا تھا، جو اگر غیر منصفانہ نہیں تو خاص طور پر سخت ضرور تھا، جس کا نتیجہ غیر جانبداروں کے حق میں نکلا، جو سب سے بڑے گروہ پر مشتمل تھے، ان کے پرچم نے مضبوطی کے بغیر کارکنوں کا تحفظ کیا تھا۔ اسی طریقے سے تمام مفاہمتیں کی جانی چاہئیں۔

نگہ میں اس موقع پر Declaration of Paris کا تجزیہ نہیں کرنا چاہوں گا، اس کے برعکس، اس طریقہ کار کا، غیر معمولی نتیجہ حاصل کرنے کے لیے جس پر عمل کیا گیا تھا، یعنی، ان تمام اصولوں کا اخلاق جو ان میں دیے گئے تھے۔

Congress of Paris میں شامل نمائندہ طاقتوں نے—یعنی، یورپ کی پانچ بڑی طاقتیں، آسٹریا، فرانس، برطانیہ عظمیٰ، پروس اور روس کے ساتھ ساردینیا (Sardinia) اور ترکی بھی تھیں جو جنگجوؤں کی حیثیت سے شامل تھیں—بات چیت کے بعد ان شرائط پر اتفاق کیا تھا جو خود بخود ان پر لاگو ہو گئی تھیں اور بعد میں دوسری طاقتوں کو بھی جنھیں قبول کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ یقین دلانے کے لیے، وسیع پیمانے پر ایسی سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی پس منظر رکھنے والی حکومتوں کے درمیان، کچھ ضمانتوں کے ساتھ ایک معاہدہ طے پایا تھا، اس لیے کہ یہ تمام مختلف مفادات کے لیے کچھ اطمینان کا باعث تھا، تاکہ طے شدہ شرائط سے وفادار بچھلی حکومتوں کے موقف کو آسانی سے سمجھا جاسکے۔ پھر بھی، ان میں شامل نہ ہونے والی طاقتیں اپنے اور عام مفاد دونوں کے ضمن میں کچھ معقول خیالات ظاہر کر سکتی تھیں۔ بہر حال، برائستگی کے طریقہ کار نے ان کو ایسے مقام پر لاکھڑا کیا تھا جہاں انھیں ان کے غیاب میں منظور کیے جانے والے اصولوں کو یا تو من و عن قبول کرنا تھا یا بالکل رد کر دینا تھا۔

میدان جنگ میں فوجیوں کے زخمی ہونے سے متعلق یہی طریقہ کار 1864 کے جنیوا کنونشن میں بھی اختیار کیا گیا تھا اور 1868 میں بھی Declaration of St. Petersburg کے لیے، جس میں دھماکے سے بچنے والی گولیوں کے استعمال پر پابندی کا معاملہ اٹھایا گیا تھا، سوائے اس کے کہ ایسے معاملات میں، طریقہ کار کو صرف بڑی طاقتوں ہی تک محدود نہیں رکھا گیا تھا۔

برسلز کانفرنس میں، جو روس کی اٹلی پر بلائی گئی تھی، ایک قدم آگے کی طرف بڑھایا گیا تھا، اس کوشش میں کہ زمینی جنگ کے بارے میں کچھ قوانین اور طریقہ ہائے کار طے کرنے کی کوشش کی جائے۔ مباحثوں میں صرف بڑی اور درمیانہ درجے کی طاقتیں ہی موجود نہیں تھیں، پہلے مباحث میں جن کی نمائندگی تھی، چھوٹی قوموں کو بھی اس میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ تحفظ کے لیے، بڑی طاقتوں کے مقابلے

میں، ان چھوٹی قوموں کے اپنے خاص مفادات ہوتے ہیں، جن میں بڑی طاقتوں جیسی عسکری تنظیم نہیں ہوا کرتی، جن پر حملے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے، یہ نسبت اس کے وہ کسی پر حملہ کریں۔ پھر بھی، یاد رہے کہ مباحثے میں مزید وسعت کے باوجود بھی، یہ تحریک بلا شرکت غیرے یورپ تک ہی محدود رہی تھی۔ 1863 میں میدان جنگ میں دیے جانے والے مشہور احکامات کے نفاذ میں اس کی پیش قدمی کے باوجود اس میں ریاست ہائے متحدہ کی نمائندگی نہیں تھی۔

ایک بار پھر وہ روس ہی تھا جس نے 26 قوموں کو 1889 کی پہلی کانفرنس میں نمائندے بھیجنے پر راضی کرنے کی کوشش کے ذریعے ایک اور جدلی کی تھی؛ اس طرح یہ تحریک یورپ سے باہر تک پھیل گئی جس میں امریکا اور ایشیا کی قومیں بھی شامل ہو گئی تھیں؛ ریاست ہائے متحدہ، میکسیکو، چین، جاپان، فارس (Iran) اور سیام (Siam) [موجودہ تھائی لینڈ]۔ اس طرح آدھا راستہ طے کر لیا گیا تھا۔ یہ فیصلہ یک طرفہ طور پر روس نے کیا تھا کہ اس میں کون کون سی قومیں کو دعوت دی جائے گی، جس نے اس بنیاد پر اپنی فہرست تیار کی تھی کہ ان کے سفارتی نمائندے سینٹ پیٹرز برگ کے دربار میں ملنا یا نہیں ہیں۔ یہ آخری مرحلہ 1907 میں طے ہوا، چھالیس قوموں کو مدعو کیا گیا تھا جب کہ چوالیس نے اس میں حصہ لیا تھا۔ اس بار کانفرنس میں تقریباً پوری مہذب دنیا کی نمائندگی تھی، جسے کچھ دیر صحافیوں نے ”مینی نوٹ انسان کی پاریمان“ کا نام دیا تھا جو کئی وجوہ کے باعث غلط عنوان تو تھا، مگر اتنا ہی چمک دار بھی تھا۔

ڈاک اور ٹیلی گراف (Telegraphic) کی کانفرنسوں سے قطع نظر، جو دنیا کی طور پر انتظامی امور کے لیے بدلتی جاتی ہیں، یہ بات شاید یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس سے پہلے سفارتی اور سیاسی مفادات سے مملو ایجنڈے کی کسی کانفرنس میں اتنی بڑی تعداد میں نمائندگی نہیں ہوتی ہوگی۔ اس نوعیت کی کانفرنس کو آفاقی سطح پر نافذ کیے جانے والے قوانین منظور کرنے کا حق پہنچتا ہے، تمام جماعتوں کو اپنی رائے دینے اور اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے مساوی مواقع فراہم کیے جاتے ہیں، اور وہ حقائق سے پوری آگاہی کے ساتھ تجویز کو منظور کرتی ہیں۔ بحث میں سب کی شمولیت، بلاشبہ خود مختاری اور ریاستوں میں برابری کے اعتبار سے، ان طریقوں سے بہتر ہیں جو پہلے رواج رکھتے تھے۔ مگر، ان نظریاتی اور عملی فائدوں کے ساتھ کچھ مشکلیں بھی ہوتی ہیں جنہیں پار کرنا ہوتا ہے، پہلے تو خود مباحث میں اور پھر تجاویز کی منظوری کے دوران۔ ان مشکلات کی طرف اشارے کرنے سے میری مراد نظام کی عیب جوئی نہیں، محض ان ناقابل فراموشی کی نشان دہی ہے جن کو کم کرنے کے لیے اقدام ضروری ہوتے ہیں۔ مادی طاقت کے معاملات کے علاوہ قوموں کی برابری قانونی اعتبار سے مسلم ہوتی ہے، مگر اس مساوات کو لغوی حد تک لے جانا اکثر نامعقول ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کو بڑی نہ لگے تو اس مقام پر برطانیہ عظمیٰ اور کسمبرگ کی مثال دی جاسکتی ہے، جو اگرچہ قانون کی نظر میں برابر ہیں، مگر کیا یہ امر ممکنہ خیز نہیں ہوگا کہ بحری معاملات میں کسمبرگ کی آواز کو برطانیہ کی آواز کے برابر وزن دیا جائے؟ ان کانفرنسوں میں چھوٹی قوموں کا بہت مفید اور با عزت کردار ہوا کرتا ہے، چھوٹی

ریاستیں زیادہ تر انصاف کی چکی نمائندہ ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کے قبضے میں اتنی طاقت ہی نہیں ہوتی کہ وہ انصاف کو بہ جبر نافذ کر سکیں۔ پھر بھی، اگر وہ ان کانفرنسوں کی روایات پر عمل دیکھنا چاہتی ہوں، تو انھیں خود بھی اپنی خود مختاری کو جانے کے لیے ہمدی پن اور خود رانی سے پرہیز کرنا ہوگا۔ میں اتنی آزادی سے اپنے خیالات کے اظہار پر معذرت چاہتا ہوں؛ ایک قانون دان کی جانب سے اس قسم کی آزادی سیاسی مصالح پر نہیں بلکہ انصاف سے محبت کی بنا پر لی گئی ہے۔ میرا مقصد کسی وفد کے رویے پر اعتراض کرنا، یا کسی وفد کو خراج تحسین پیش کرنا نہیں، جس نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اس کو کیسا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس نکتے پر میں بعد میں کچھ عرض کروں گا۔

کسی بھی کانفرنس کے لیے اتفاق رائے بنیادی اہمیت کا ہوتا ہے، اس لیے کہ اس نوعیت کی کانفرنس کا ہدف، ہم پلک نگر، واضح خواہشات والوں [طاقتوں یا ریاستوں] کی صف بندی ہوتا ہے؛ اس کے برعکس، کسی پارلیمانی اسمبلی کا مقصد نمائندہ قوم سے اس کی اپنی ایک واحد خواہش کے اظہار کا حصول ہوتا ہے۔ اتفاق رائے کی یہ ضرورت ایک مزاحمتی عنصر ہوتی ہے اس لیے یہ آزادانہ و *liberum veto* کا اظہار ہوتی ہے، جو نفع کر دینے کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے، مگر یہ جلد بازی کے فیصلوں اور اتحادوں کے مفادات سے مامونیت بھی ہوتی ہے۔ یہ مصالحت کی اجازت دیتی ہے، ان معنوں میں کہ کچھ اختلافات کے باوجود بھی کوئی ایک تجویز، من حیث النکل کانفرنس کی خواہش کا اظہار ہو سکتی ہے۔ یہ معاملہ ہوتا ہے ہوشیاری اور عاقبت اندیشی کا؛ ایسے مازک مسائل ریاضی کے ذریعے حل نہیں ہوا کرتے۔ دراصل مرکزی نکتہ یہ ہے کہ کسی بھی قوم کو اس کی مرضی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور نہیں کیا جانا چاہیے۔

انسان کو ان کے بارے میں غور کرنا پڑے گا جو کسی فارمولے کے سودے کی تیاری میں مشکلات کا باعث ہو سکتی ہیں، کہ یہ مختلف مفادات، رسوم اور ادارے رکھنے والی قوموں کے نمائندوں کے لیے قابل قبول ہوگا۔ جب معاہدے کی کوئی ٹھوس بنیاد ہو تب بھی بے شمارزائستیں ہوتی ہیں، جو ذہن کے مختلف رویوں، سوچنے کی طریقوں اور دلائل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ لوگ ایک ہی زبان بولتے ہوں، مگر وہ ایک طرح ہی نہیں بولتے نہ وہ الفاظ کو وہی معنی بھی دیتے ہیں۔ اس لیے، ضروری ہے کہ مصالحتوں کو قبول کیا جائے اور مصالحت ساز اسٹیکہولڈ سے متفق ہوا جائے جنہیں منطق اور تنقیدی اذہان والے اور پڑھے لکھے لوگ برداشت نہیں کریں گے۔ میں اس کی طرف سے حالات کو نرم کرنے کی وکالت کروں گا جس نے اکثر قلم کا استعمال کیا ہے اور جو بہت سوں سے بہتر جانتا ہے کہ نتیجہ ہمیشہ کامل نہیں نکلا کرتا۔ اگر وہ تجاویز کے، مسودوں میں غیر مصالحانہ انداز اختیار کرتا ہوتا، جیسا کہ خالص سائنسی معاملات میں ہوتا ہے، تو اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مختصر یہ ہے کہ، کبھی کبھی، سخت رویہ اختیار کرنے کے بجائے ہمیں خود کو دغا کرنے کی مانند صرف

سفارشات ہی کی حدود تک رکھنا چاہیے۔ قرارداد میں "insoluble as is possible", "circumstances permit" جیسے جملوں کی بنیاد پر مجبور کر دیتی ہیں۔ جب آپ کہیں گے کہ یہ قانونی

ذمہ داری نہیں ہے، محض ایک اخلاقی فرض ہے۔ صحیح، مگر یہ معمولی بات نہیں ہے کہ قوموں کی اکثریت ایک اخلاقی فرض کو قبول کر رہی ہے۔ حالات کی مجبوری کے پیش نظر، یہ [اخلاقی فرض] ایک سخت ذمہ داری کی طرح رسم و روایت کا حصہ بن جاتا ہے۔ 1864 میں جینیوا کنونشن کے تحت قانونی ذمہ داری بن جانے سے پہلے بھی زخمی دشمن کی مدد کرنا کارِ خیر سمجھا جاتا تھا۔ ہمیں بہت زیادہ تیزی سے اس پر یقین نہیں کر لینا چاہیے کہ سرچ رسل و رسائل کے ہمارے عہد میں مادے کی طرح ذہن کو بھی تیزی سے نیا روپ دیا جا سکتا ہے۔ قانونِ دہا اور صحافی فاسد طریقوں کے بدلے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ وہ کامیاب ہو سکتے ہیں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ قومیں وہ ظالمانہ طریقے چھوڑ دیتی ہیں، ان کی حکومتیں جن سے دست برداری پر راضی نہیں تھیں۔

بالآخر، کانفرنس کے کام پر غور کرتے ہوئے ہم صرف اس کام کو ہی کام سمجھتے ہیں جس سے حتمی اور واضح نتائج نکلے ہوں، اور اس کام کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو مستقبل کی کامیابیوں کا راستہ ہموار کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ حج کے بغیر کوئی فصل پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہمیں دوسری کانفرنس سے قبل صدر رڈز ویلٹ کی جانب سے ریاست ہائے متحدہ کے مندوبین کو دیے جانے والے احکامات پر توجہ دینی چاہیے: ”آپ کو ہمیشہ اس مسلسل عمل کے فروغ پر دھیان دینا چاہیے جس کے ذریعے ہندرتنگ بڑھنے والے بین الاقوامی انصاف میں ترقی ہوتی رہے، اور آپ کو دوسری کانفرنس کے کام کو محض کانفرنس کے دوران نکلنے والے نتائج کے حوالے سے نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ اس حوالے سے بھی دیکھنا چاہیے کہ یہ مستقبل کی کانفرنسوں کے نتائج کی بنیاد بھی بن سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ تمدن کے لیے کیے گئے اس کانفرنس کے بہت سے قابلِ قدر کام ایسے بھی ہوں جن پر مندوبین کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچے ہوں گے۔“ یہ ہے وہ عملی ذہانت جس کی امن کی کانفرنسوں کو بدنام کرنے والوں میں کمی رہی ہے۔

میں 1907 میں ہونے والی کانفرنس میں تیار کی جانے والی مختلف تجاویز کا تجزیہ یا ان پر اپنی رائے دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ مندوبین نے تیرہ مسودے اور ایک اعلان تیار کیا تھا جس میں Final Act کی اہم نیک خواہشات (voeux) یا سفارشات اور عمومی قبولیت مثالی نہیں۔ میں صرف چند ضروری حقائق کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانون کے تصور کو استحکام ملا اور اس کا فروغ بھی ہوا تھا۔

سب سے پہلے تو ہم جنگ سے متعلق فرامداد پر غور کرتے ہیں۔ پہلی بات، کیا یہ paradoxical نہیں ہے کہ امن کے لیے ہونے والی کانفرنس میں جنگ کے بارے میں اتنا مصروف رہا جائے؟ طیش اور تمسخر بہت آسان ہوتا ہے اور پورے ماحول پر چھا جاتا ہے، اس وجہ سے اور بھی کہ ان کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ ایک طبقے کی عوامی رائے کا دیا ہوا نام ”امن کانفرنس“ نام ہی غیر منطقی ہے، اس لیے کہ دوسری پیغام کی بنیاد پر توقع کی گئی تھی کہ کانفرنس اگر مکمل نہیں تو کم از کم ایک جزوی ترکیبِ اسلحہ جات اور اس کے نتیجے میں ہمیشہ قائم رہنے والے امن کا باعث ہوگی۔ مگر یہ نام ہر کاری استعمال میں آگیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس

پر افسوس ہوا تھا، اس لیے کہ مجھے شبہ تھا کہ کانفرنس سے عوام کی نامعقول توقعات پوری نہ ہونے کے صورت میں اس کے اہم اور مفید نتائج بھی نظر انداز ہو جائیں گے۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ”امن کانفرنس“ بالکل غیر مناسب ہے؟ میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ کوئی بھی [عمل یا] شے جو بین الاقوامی رشتوں میں قانون کا پرچار کرے وہ امن میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔ چوں کہ مستقبل میں جنگ کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا، اس لیے وہ بالعموم دور رس ہوگی جو جنگجو اور غیر جانب داروں کے درمیان رشتوں میں جنگ سے پیدا ہونے والی مشکلات کو نظر میں رکھے؛ اور وہ بالعموم انسانیت پسند ہوگی جو جنگجو طاقتوں کے خود اپنے درمیان پیدا ہونے والی جنگ کی شیطنت کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہے، اور جہاں تک ممکن ہو شہریوں، بیادوں اور زخمیوں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ امن کانفرنسوں کے دوران، اس میدان میں کیے جانے والے کام پر طنز کرنے پر جو بھی کہیں، [یہ طے ہے کہ] زیادہ بد بدعت جنگوں کو کم یا ب نہیں کر سکتی۔

کافی عرصے تک اس سوال پر بحث ہوتی رہی ہے کہ کیا جنگ شروع کرنے والی حکومت کو اپنے دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے اسے خبردار کر دینا چاہیے؟ یہ سوال جنگجوؤں کے اپنے درمیان الزام تراشیوں کا باعث بھی رہا ہے۔ [امن] کانفرنس نے متفقہ طور پر طے کیا تھا کہ ”مشروط اعلان جنگ کے الٹی میٹم، یا طے شدہ اعلان جنگ کی واضح تنبیہ کے بغیر حملے شروع نہیں ہونے چاہئیں۔“ مستقبل ہی بتائے گا کہ اس سے آگے بھی بڑھا جاسکتا ہے یا نہیں، اس لیے کہ کچھ مندوبین کی جانب سے حملہ شروع ہونے سے پہلے تنبیہ دی جانے کے وقت کے تعین کے بارے میں سوالات کیے گئے تھے۔

جنگ کے طریقے اور قوانین طے کرنے والے 1864 کے کنونشن میں بہت احتیاط سے تہدیبیاں کی گئی تھیں۔ میں کچھ منتخب نکات پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے با معنی ترقی واضح ہوگی۔

۲۔ آئین کید دفعہ 23 جنگجوؤں کو ”حملے کا نشانہ بننے والے ملک کے باشندوں کے حقوق اور اعمال کو ختم کرنے، وقتی طور پر روکنے، یا قانونی عدالت میں ناقابل قبول بنانے“ کی ممانعت کرتی ہے۔ یہ دفعہ عملی ضرورت کے بجائے محض نظریاتی ضرورت کو پورا کرتی ہے، اس لیے کہ جنگ کے ہمارے جدید تصور اور شہریوں پر اس کے اثرات کے ساتھ، یہ خیال ہی مشکل ہوگا کہ ایک مستبدانہ ملک دشمن ملک کے باشندوں کے تمام حقوق میں رکاوٹ ڈالے گا یا ان کو سلب کر لے گا۔

دفعہ 23 میں اضافے کے مطابق ”اسی طرح جنگجو حملہ کرنے والے کو حریف کے باشندوں کے اپنے ملک کے خلاف کارروائیوں میں حصہ لینے پر مجبور کرنے کی ممانعت ہوگی، خواہ جنگ کی ابتدا سے پہلے ہی سے وہ جنگجو کی ملازمت ہی میں کیوں نہ رہے ہوں۔“ یہ دفعہ اسی خیال سے ابھری ہے جو دفعہ 44 میں پیش کیا گیا تھا۔ ”جنگجو قبضے میں لیے جانے والے علاقے میں بسے لوگوں کو دوسرے جنگجوؤں کی مسکری قوت یا اس کے دفاع کرنے والوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔“ یہ دفعہ زبردستی بھرتی کیے

جانے والے گائیڈ پر روشنی ڈالتا ہے، جو جنگ کرنے والوں کے لیے سب سے مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔ تو کیا یہ منطقی عمل ہے کہ ایک جنگجو ملک کو ممانعت کر دی جائے کہ وہ دشمن علاقے کے رہنے والے کو اپنی فوج میں بھرتی نہ کرے اور ساتھ ہی اسی آدمی کو مجبور کرے کہ وہ ان کے لیے گائیڈ کے فرائض انجام دے اور اس طرح اسے اپنے ملک کو زیادہ نقصان پہنچانے پر مجبور کیا جائے؟ کیا یہ حب الوطنی کے سب سے باعزت پہلو کے خلاف ناجائز دست اندازی نہیں؟ تو پھر کیا ہم جنگجو دلائل کی بنا پر کانفرنس کی اکثریت کو یکنے سے انکار کرنے پر اور موجودہ طریقے کو برا کہنے پر اصرار کرنے پر اس کی تحسین نہ کریں؟ بلاشبہ، اس دفعہ کے بارے میں کچھ وفود کے اپنے تحفظات تھے اس پر یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو، کیا حکومتوں کو ان طریقوں پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی چاہے متمدن دنیا کی اکثریت جن پر ملامت کرتی ہے۔ ”قائم دم“ گولیوں کے معاملے میں کیا ہوا تھا، اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

دفعہ 52 اب اس شرط پر ختم ہوتی ہے کہ، جتنی جلد ممکن ہو، مادی طلب پوری کی جانی چاہیے؛ نگی جائیداد کے احترام کی سمت یہ ایک اہم قدم ہے۔

آخر میں، اور سب سے اہم، کنونشن میں ایک دفعہ کی شمولیت ہے جس کے تحت آئین کی خلاف ورزی کرنے والے ہر حریف کو مزاد دی جاسکے گی۔ اس کے علاوہ ہر جنگجو ان تمام غلط کاریوں کا ذمے دار ہوگا جو اس کی افواج کے ارکان سے سرزد ہوں گی۔ اس نئی دفعہ کی شمولیت ان شبہات کی بنا پر کی گئی تھی جو آئین کے بارے میں مختلف طبقوں میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے کہ اس کی شمولیت کا برسلز کانفرنس سے تقابل جاتا ہے کہ کسی میں بھی اخلاقی وزن نہیں تھا۔ تمام شبہات اب دور کیے جاتے ہیں، آئین کی سب شرائط کو ذمے داریوں کی حمایت حاصل ہے کہ تمام خرابیوں کو صحیح کر دیا جائے گا اگر وہ خلل اندازی کی وجہ سے ہوتی ہوں گی۔ مزید یہ کہ جنگجو فوجوں کی غلط کاریوں کی ذمے داریوں کو بھی واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ کیا یہ ایک بڑی پیش قدمی نہیں، اور کیا اس طرح جنگجو کو آئین کی پاسداری کے لیے زیادہ ہوش مند نہیں بنا دیا گیا ہے؟

زمین پر ہونے والی جنگ میں مملوٹ غیر جانب دار طاقتوں کے خراو کے حقوق اور فرائض سے متعلق کنونشن نے 1864 کی کانفرنس کی ایک سفارش کو نافذ کر دیا ہے۔ یہ سفارش کچھ اصولوں کو واضح کرتی ہے اور اس طرح غیر جانب داروں کو ضمانت فراہم کرتی ہے جن کو ہمیشہ جنگجو حریفوں کے دائمی مطالبات کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک بار پھر، یہی امن کے قیام میں معاون ہوتا ہے۔

بہت سے نکات پر بحری بحاربے بہت سی مشکلات کا باعث ہوتے ہیں، اس لیے کہ ان میں خود جنگجووں کے اپنے درمیان کے تعلقات اور جنگجوؤں اور غیر جانب داروں کے معاملات شامل ہوتے ہیں۔ ان میں ہمیشہ کچھ بے سروپائی بھی ہوتی ہے جنگجو جن کو اپنے مفادات کے وسیع کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ مفادات یا تو منتشر نوعیت کے ہوتے ہیں یا ایسے محسوس ہوتے ہیں، اور بد قسمتی سے یہ انتشار بنیادی طور پر

جغرافیائی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے، جس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لیے، ایسے بہت سے معاملات میں کسی عام نوعیت کے معاہدے کی امید کرنا بھی فضول ہوتا ہے۔ مذاکرات کا ہونا بذاتِ خود بھی ایک کامیابی ہوا ہے، اس لیے کہ بحری سیاحت کرنے والی قومیں ایک عرصے تک خود بخود اس معاملے میں ملوث ہونے سے انکار کرتی رہی ہیں۔

ہر جانب سے کوششیں کی گئی تھیں۔ بہت سے نکات پر مفاہمت بھی ہو گئی تھی؛ تنازعات کا میدان محدود تھا، جو تمام لوگوں کے مفاد میں تھا؛ اور مستقبل کے مذاکرات اور معاہدے کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ اب یہ ہر ملک پر منحصر ہے کہ وہ اپنے حقیقی مفادات کا سنجیدگی سے جائزہ لے، یہ طے کرنے کے لیے کہ وہ مفاہمت کے حصول کے لیے کس حد تک جاسکتا ہے، جو کتنی ضروری ہو چکی ہے۔

صرف یہ واضح کرنے کے لیے کہ کسی کوشش کی گئی ہے اور کیا حاصل کیا جا چکا ہے، مجھے چھوٹی چھوٹی تفصیلات اور ان کی ممکنہ نوعیت پر بات کرنی ہوگی، مگر میں خود کو واضح خطوط کے اندر ہی محدود رکھوں گا۔

پچھلی عالمی جنگ کے بعد سے خود کا بحری بارہ دی سرنگوں کے پھیلائے جانے کے سوال نے عوامی رائے میں اضطراب پیدا کر دیا ہے، اس لیے کہ یہ سرنگیں جنگ کے بہت بعد تک پُر امن بحری جہاز رانی کے لیے خطرے کا باعث رہیں گی۔ اگر اس کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا گیا ہے تو اس لیے کہ ابھی تک ممکنہکی سوالات کے قابلِ اطمینان جوابات نہیں دیے جاسکے ہیں؛ کہ اس میں کچھ تاریک پہلوؤں کا آنا بھی لازمی ہے۔ بحری فوجوں کی بمباری سے متعلق ضمانتیں فراہم کرنے کے اصول بھی وضع کر لیے گئے ہیں جن میں مشکلات بھی آئی تھیں۔ ان دونوں نازک معاملات پر، مسٹر Hagerup کی سربراہی میں کام کرنے والی ایک ذیلی کمیٹی نے معاملہ کر لیا تھا۔

دورانِ جنگ نئی جاکماد پر قبضہ کر لینے کا حق، ایک نکتہ ہے جس پر طویل مباحث ہو چکے ہیں۔ اس کی روایتی پالیسی کی تلاش میں، ریاست ہائے متحدہ امریکا نے اس حق کے ختم کیے جانے کی تجویز پر قوموں کی اکثریت کو اپنے نقطہ نظر پر مجتمع کرنے میں کامیابی بھی حاصل کر لی ہے۔ مگر چل کر بقیہ اقلیت میں بڑی بحری جہازوں میں بھی شامل ہیں۔ اس تجویز کے فوری عملی نتائج نہیں نکل سکیں گے۔ اس کے برعکس، اگرچہ خود اس قرارداد کے اصول کو بھی کامیابی نہیں ہوئی ہے، کم از کم، قبضہ کر لینے کے حق پر کچھ اہم پابندیاں ضرور لگائی جاسکی ہیں مثلاً، دشمن یا غیر جانب دار جہازوں پر موجود ڈاک کو قبضہ کر لینا احترام قرار دیا جا چکا ہے، جس کا فائدہ جنگجو اور غیر جانب دار قوموں دونوں کو ہوگا۔ ہلکے وزن کے جہازوں اور ساحلی ماہی گیری کی کشتیوں کو مستثنیٰ قرار دیا جا چکا ہے۔ پکڑے جانے والے تجارتی بحری جہازوں کے کارکنوں سے برتاؤ کے اصول بھی سودمند طریقے سے وضع کر لیے گئے تھے۔ ماروے جیسا ملک ہی، جو بڑی حد تک بحری جہاز رانی اور ماہی گیری پر انحصار کرتا ہے، بہتر طریقے پر اس کے فوائد کی داد دے سکتا ہے۔

تمام جہازوں میں قوموں کی طرح غیر جانب دار رہنے والا ملک، ماروے خصوصی طور پر بہت فکر مند تھا

کہ غیر جانب دار ملکوں کے حقوق اور فرائض کے بارے میں ایک مکمل اصول وضع کر لیا جائے، خصوصاً جنگجو ملکوں کے بارے میں جو غیر جانب دار ہندو گاہیں استعمال کر رہے ہوں۔ [اس سلسلے میں] آئینہ نامی کاؤنٹس تو رینی (Count Torriani) کے پیش ایک کنونشن بنا لیا گیا تھا۔ یہ کنونشن، مین حیثیت انگلہ، اس مسئلے کا منصفانہ حل تلاش کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ بالآخر ان نکات پر ایک معاہدہ ہو سکے گا جس کے بارے میں کچھ طاقتوں کے اپنے شخصیات ہیں۔ امن کے مفاد میں یہ حقیقی پیش رفت کا باعث ہوگا، اس لیے کہ اس سے جنگجو اور غیر جانب دار قوموں کے درمیان عداوت میں کمی ہو سکے گی۔

میں، اس خیال کے تسلسل میں، [1864] جنیوا کنونشن سے بحری جنگ تک کے اصولوں کی منظوری کے کنونشن پر بھی بات کرنا چاہوں گا۔ [اس کے بارے میں] آسانی سے ایک معاہدہ ہو گیا تھا۔ جنیوا کنونشن میں تبدیلیوں کی روشنی میں، 1899 کے کنونشن پر بہت احتیاط سے نظر ڈالنی کی گئی تھی۔ نیک نیکی کا وہی جذبہ دونوں اجتماعات پر حاوی رہا ہے، ایک کنونشن جو زمینی جنگ میں بیمار اور زخمی ہونے والوں کے بارے میں ہے اور دوسرا بحری جنگوں سے متعلق ہے۔ کچھ معاملات میں اخلاق پر اختلافات رہے ہیں، جن کی وجہ صرف مختلف معاشرتی ماحول ہیں۔

اب میں ان نکات کی طرف آ رہا ہوں، مبادی و راست جن سے قوموں کے درمیان اچھے تعلقات متاثر ہوتے ہیں اور فطری طور پر امن کے تمام دوست جن پر خصوصی توجہ چاہیے۔ دوسری امن کانفرنس نے اس معاملے میں کتنی کوشش کی ہے اور اس مقصد میں اسے کتنی کامیابی ہوئی ہے؟

سب سے پہلے تو یہ دیکھنا تھا کہ 1899 تک کے بین الاقوامی تنازعات کے بندوبست کے معاملے میں جس پر متقدم دنیا کے تقریباً تمام ملکوں نے دستخط کیے تھے، کنونشن کا کیا کردار رہا ہے۔ میں کنونشن کے صرف ان ہی پہلوؤں پر بات کرنا چاہوں گا جن کا تعلق ثالثی سے ہے۔ مخصوص مسائل کے لیے، ثالثی کو سب سے زیادہ ان تنازعات کے لیے منصفانہ اور موثر آلہ گردانا گیا ہے جو سفارتی طریقوں سے حل نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ اس کا استعمال اختیار کر رہا ہے، مگر یہ آسانی سے متحرک کیے جانے والے قانونی نظام کا ایک حصہ ہی رہا ہے۔ جسے حقیر یا کمتر نہیں سمجھنا چاہیے۔ جب دو طاقتیں کسی تنازعے کو قانونی طریقے سے ثالثی کے ذریعے حل کرنا چاہتی ہوں تو، بہتر ہوگا کہ پہلے سے انھیں ثالثی کی تنظیم اور اس کے طریقہ کار اور تفصیلات پر بحث شروع نہیں کر دینی چاہیے۔ اس قسم کے مباحث جن کا خود تنازعے سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، بہت آسانی سے مزاحمت کا سبب بن سکتے ہیں، اور اس کے بندوبست کو زیادہ مشکل بنا سکتے ہیں۔ یہ کتنا اچھا ہو اگر تنازعات کے پیدا ہونے سے پہلے ہی، بغیر کسی خاص مقصد پر نظر رکھتے ہوئے، ان کو عام انداز کے منصفانہ طریقے سے حل کرنے کے لیے، آلے کا بندوبست کر لیا جائے۔

1899 کے کنونشن کے ذریعے حاصل ہونے والے فوائد کا پوری طرح ادراک کرنے کے لیے، ہمیں

نہ صرف اس کے مادی اور قابل دید نتائج پر غور کر لینا چاہیے، بلکہ اس کم سے کم رسوخ پر بھی جو اس نے ارباب اختیار پر ڈالا ہو، ایسے رسوخ جنہیں دو اہم طریقوں سے محسوس کیا جاسکے۔ پہلا طریقہ: جب ایک تنازعہ پیدا ہو جائے، تو اس کو ثالثی سے حل کرنے کا قابل قبول طریقہ موجود ہے، جب کہ جو لوگ پہلے ایسے حل کا تصور پیش کرتے تھے انہیں خالص نظریاتی گردانا جاتا تھا۔ میں اپنے تجربے سے اس کی تصدیق کر سکتا ہوں۔ دوسرا طریقہ: کنونشن کی دفعہ 19 کا بارہا اطلاق کیا جا چکا ہے، جس کے تحت دستخط کرنے والی طاقتوں نے اپنے حقوق محفوظ کر لیے تھے کہ وہ اپنے آپ سے نئے معاہدے کر سکتی ہیں جس کے ذریعے ان تمام معاملات میں جبراً ثالثی کا اطلاق ہو سکے، جنہیں وہ مناسب سمجھتی ہوں۔ مجھے سہرت ہے کہ وہ 14 اکتوبر 1903 کا فرانسیسی/برطانوی کنونشن ہی تھا جس پر پہلی بار دستخط ہوئے تھے اور اس میں 6 اپریل تک، ایسے ہی تقریباً ساٹھ معاہدے ہو چکے ہیں۔ میرے خیال میں، ان میں سے آخری 4 اپریل کو نافذ ہوئے اور ریاست ہائے متحدہ کے درمیان ہوا تھا۔

1899 میں منظور کیے گئے طریقے کے مطابق ابھی تک دی ہیگ کی عدالت میں 21 مقدمات پر فیصلے دیے گئے ہیں۔ اور بھی مقدمات تھے مگر وہ سادہ طریقوں سے نمٹا دیے گئے تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ تنازعہ کو دور کرنے کے لیے ثالثی کا استعمال ہوا ہے؛ ادھر استعمال ہوا اور اس طریقے سے ہوا اس طریقے سے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر میں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ہمیں بہت زیادہ ثالثی نہیں چاہیے۔ بلاشبہ، [جنگ] لڑنے سے بہتر ہے کہ مقدمہ لڑا جائے؛ مگر اس سے کہیں بہتر ہے کہ مقدمہ لڑنے کے بجائے براہ راست مفاہمت کا راستہ اختیار کیا جائے۔ دراصل وہ خوف ہوتا ہے، ثالثی کی عدالت کے ذریعے عوام میں بدنامی کا، جو حکومتوں کو بے بنیاد دعوے کو چھوڑ کر معقولیت کی راہ پر لگا دیتا ہے۔

1907 میں کنونشن پر نظر ثانی کی گئی اور اس کی تفصیلات میں کئی تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ [اس موقع پر] میں صرف International Commissions of Inquiry کے لیے بنائے گئے معمولی معاملوں کے طریقہ کار کے بارے میں بات کروں گا جس کی اثر پذیری کا اظہار Hull کے واقعے میں [1904 میں انگلستان اور روس کے درمیان ایک مادی گیری کے جہاز کا تنازعہ] بہت چمک دار انداز میں ہوا تھا۔ یہ واقعہ بذات خود 1899 کے کنونشن کو بے خطا ٹھہرانے کے لیے کافی ہوتا جس کو کچھ نہ کرنے کی بنا پر بڑا بھلا کہا جا رہا تھا۔

اب میں 1907 کی کانفرنس کے جبری ثالثی کے واقعے کی طرف آتا ہوں، ایک موضوع جس پر بہت تفصیل سے بحث ہو چکی ہے، جو کسی طرح بھی اچھے ماحول میں نہیں ہوئی تھی۔

1899 کی کانفرنس میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ اس طریقے کا محدود اطلاق کے ساتھ آغاز کیا جائے، مگر زبردست مخالفت کے پیش نظر تجویز کو واپس لینا پڑ گیا تھا۔ 1907 میں یہ تجویز پھر پیش کی گئی، اور دوبارہ منسوخ کر دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نکتے پر خود کنونشن میں بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اب بھی اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں 1899 میں تھے اور ایک ایسے معاملے میں کوئی پیش

رفت نہیں ہوئی ہے امن سے محبت کرنے والے جس کے بارے میں بہت فکر مند رہتے ہیں؟
اس طرح کہنا مناسب طریقے پر بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے مترادف ہے۔ میں اس نکتے کی
مطافی پیش کرنے اور امن کانفرنس کے موقف کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔
ہر قسم کے تنازعات کے حل کے لیے ثالثی کے طریقے کو، کم از کم ایک عام کنونشن میں، پیش کرنے کی
کوشش نہیں کی گئی تھی، خواہ ان کی کبھی ہی نوعیت کیوں نہ رہی ہو۔ ایسی دو مستعد قوموں کو، جو مستقبل میں
ہونے والے تنازعات کی پیش بندی کرنے کے قابل ہوں، کنونشن کی حدود سے بہت آگے جانے سے روکنے کا
کوئی طریقہ نہیں، جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے؛ دراصل اس ضمن میں کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر کچھ
مندوین سمجھتے تھے کہ پیش بندی کر لینے سے یہ ممکن ہوگا کہ مخصوص قسم کے تنازعات کے لیے جبری ثالثی کو
کچھ شرائط کے ساتھ، تمام قوموں میں متعارف کرایا جائے؛ مگر ان کی سختی سے مخالفت کی گئی تھی۔ مجھے یقین
ہے کہ اس مسئلے پر کبھی تفصیل سے غور نہیں کیا گیا تھا۔ ہر ممکن قسم کے اعتراضات کو یک جا کر لینے اور اس کے
ذریعے ہر ایک کو اس مسئلے کا سامنا کرنے پر مجبور کرنے سے جبری ثالثی کے دشمنوں نے، شاید نا دانش طور پر،
خود اس مسئلہ کی ناقابل بیان خدمت کی ہے جس پر وہ بڑی بے رحمی سے حملہ آور ہوتے رہے ہیں؛ اس لیے کہ
مسئلے کا سامنا کرنا اس کے یقینی حل کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ کوئی بھی اعتراض واقعی
ہیادی نہیں ہے، اور یہ بھی کہ بالآخر یہ اصول کامیاب ہو کر رہے گا۔ قانون داں اور سفارت کار نیکی کا کام
کریں گے اگر وہ 1307 کے ان جوشیلے، کبھی کبھی جذباتی، مگر ہمیشہ متواضع مباحث کا بغور مطالعہ کرنے کے لیے
خود کو وقف کر دیں۔ اس طرح انھیں ان مشکلات کا واضح ادراک ہو سکے گا جن پر قابو پایا جانا چاہیے اور ان
کے مناسب حل کی تلاش پر کام کیا جاسکے۔

میں نے جن کا ابھی تذکرہ کیا ہے، ان مباحث کا واقعی نتیجہ کیا نکلا ہے؟
بیش قوموں نے جبری ثالثی نافذ کرنے کے لیے ایک کنونشن کو مسودہ تیار کرنے کا کام سونپنے پر
اتفاق کیا؛ پہلے، عام قسم کے معاملات کے لیے جو روایتی ہوں گے، اہم مفادات اور قومی عزت والے؛ اور
دوسرے، مخصوص معاملات کے لیے جن میں مندرجہ بالا شرائط نہیں ہوں گی۔ موجود لوگوں میں سے کچھ نے
ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز کے معاملات پیش کیے اور سوال کیا کہ کیا یہاں ایسا کوئی ہے جو واقعی یہ سمجھتا ہے کہ وہ
جنگ کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اکثر جنگیں معمولی اور چھوٹے موٹے واقعات سے
پھوٹ پڑتی ہیں، اور ایسے معاملات میں، بلکہ زیادہ سنجیدہ معاملات میں بھی ثالثی کا طریقہ قابل قدر ہو سکتا
ہے۔ قبل اس کے کہ سنجیدہ واقعات پیش آئیں، ہمیں نسبتاً معمولی واقعات میں ان کو کارآمد بنانے کی عادت
ڈالنی چاہیے۔ اس کے باوجود، زیر نظر آنے والے واقعات اتنے ادنیٰ نہیں تھے جتنے کہ نظر آتے تھے، جیسا
کہ ایک معاملہ، جس میں ذمے داری کا تعین ہو گیا تھا، باقی مسئلہ صرف نقصان کی حلافی کی مالیت کا تھا۔ تجربہ
کہتا ہے کہ ایسے معاملات میں ثالثی کا طریقہ بڑھا چڑھا کر دعویٰ کرنے کو روکے گا۔ مگر، جیسا کہ عام طور پر ہوا

کرتا ہے، اقلیت نے، اتفاق رائے کے اصول کے اخلاق کے پروے میں، اسے Final Act میں شمولیت سے روک دیا، باوجودیکہ، جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، بیس قومیں مندرجہ بالا خطوط پر فیصلہ کر چکی تھیں۔ ظاہر کے کہ اسی کنونشن میں اس کی شمولیت کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا تھا، جس میں ساری قومیں دستخط کرنے پر تیار تھیں۔ کوئی بھی منفی نتیجہ پر راضی نہیں ہو سکتا تھا، لہذا Final Act میں اس سے متعلق اعلان شامل کر دیا گیا تھا۔

لہذا [اعلان کے تحت] کوئی بھی طاقت براہ راست ثالثی کو نافذ نہیں بناتی ہے، کچھ قوموں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے موقف پر نظر ثانی کریں، تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ وہ کس نوعیت کے معاملات میں اس کی اجازت دینے کے لیے تیار ہیں۔ یہ بیس قومیں، اس وقت سے تیار ہیں، مخصوص زمروں میں شامل ہونے کے لیے، اور معاہدے پر دستخط کرنے کی راہ میں ان کے لیے کوئی اور رکاوٹ نہیں ہے۔ تو، کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ صورت حال ویسی ہی ہے جیسی کہ 1899 میں تھی؟ ایسا کرنا ثبوت کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہوگا۔ ہم بے خوف و خطر کہہ سکتے ہیں کہ ثالثی کا مستقبل یقینی بنا دیا گیا ہے۔

1907 کی کانفرنس ایک معاملے میں، جو اب کسی اہمیت کا حامل نہیں رہا، ایک مخصوص نوعیت کی مزید جبری ثالثی متعارف کرانے میں کامیاب ہو گئی ہے، یہاں، میں اقرار شدہ قرض کی وصولی کے سلسلے میں طاقت کے محدود استعمال کے کنونشن کا حوالہ دے رہا ہوں۔ اصولاً، کسی ایک ملک کی حکومت دوسرے ملک کی حکومت سے اپنے باشندوں کے قرضی قرض کی وصولیابی کے لیے دعویٰ کیے جانے والے قرض کو یہ جبر وصول نہیں کر سکتی۔ مگر اس معاہدے کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اگر مقررہ حکومت نے ثالثی کی پیش کش سے انکار کیا یا اس کو نظر انداز کر دیا ہو، یا، اگر اس پیش کش کی صورت میں، اس نے مصالحت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی ہو، یا، ثالثی کے بعد فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہو۔ یہ موقع یقیناً جبری ثالثی کا ہے، جس میں قرض خواہ قوم کو ابتدا ہی میں ثالثی کی تجویز پیش کرنی چاہیے اور یہ مقررہ قوم کی صوابدید پر ہے کہ وہ اس کو قبول کرے یا نہ کرے۔ وہ قومیں جو جبر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، بیان کیے گئے طریقے کے مطابق، ابتدا ہی میں اس کے استعمال سے دست بردار ہو جاتی ہیں۔ اور کمزور قوموں کے لیے یہ کسی طرح بھی فائدے کا باعث نہیں ہوتا۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس طریقہ کار میں مکمل رعایت یا ہی نہیں ہوتی، اس لیے کہ طاقت ور قوم، جس کے مقابلے میں ایک کمزور قوم دعویٰ کرتی ہے، اس کو نظر انداز کر سکتی ہے یا ثالثی سے انکار کر دیتی ہے، یہ جانتے ہوئے کہ کمزور ملک کے پاس طاقت استعمال کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہوگا، جو طاقت کے تناسب کے پیش نظر ایک وہابیات بات ہوگی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، نہ اس حقیقت سے کہ صرف ایک محدود طریقے سے ہی کنونشن جبری ثالثی کی اجازت دیتا ہے۔ ہر حال، یہ قیاس کرنا غلط ہوگا کہ وہ ہمیشہ کمزور قومیں ہی ہوتی ہیں جو ثالثی کا مطالبہ کرتی ہیں اور طاقت ور قومیں انکار کرتی ہیں۔ 1902 میں وینیزویلا (Venezuela) بہ مقابلہ یورپی طاقتیں، بالکل اس کے برعکس ہوا تھا۔

ریاست ہائے متحدہ نے ایک مستقل ثالثی عدالت کے قیام کی تجویز پیش کی تھی جو بالکل برعکس تھی 1899 کنونشن کی ہمائے نام مستقل عدالت کی، جس کا صرف ڈھانچا ہی مستقل ہوتا ہے اور جو چلتی پھرتی رہتی ہے، اس لیے کہ یہ ہر انفرادی مقدمے کے لیے منعقد کی جاتی ہے اور فیصلہ کرنے کے فوراً بعد ہی تحلیل کر دی جاتی ہے۔ اس عدالت کے حلقہ اختیار کی حد بندی اور نشست کے سلسلے میں بہت کام کیا گیا ہے۔ یہ تجویز جب عدالت کی تشکیل کے سلسلے میں پیش کی گئی تو اس کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹیں آئیں تھیں۔ اس منصوبے کے پیش کرنے والوں کا خیال تھا کہ ایک موثر آلہ بنانے کے لیے، اس نئی ثالثی میں پرانے ججوں کو شامل نہیں کیا جانا چاہیے، اور زیادہ سے زیادہ پندرہ سے سترہ تک کا عدد مناسب معلوم ہوتا تھا۔ اگر ہم ان اعداد کا، کانفرنس میں شامل نمائندوں سے تقاضا کریں تو ہمیں اس مشکل کا آسانی سے احساس ہو جائے گا۔ [بھلا] پندرہ/ سترہ ججوں میں کس طرح تمام قوموں کے ججوں کی نمائندگی ہو سکے گی؟ اس طرح، ہم آسانی سے مختلف حصوں کی اس بات پر کھینچا تانی کی پیشینا کر سکتے ہیں کہ بڑی طاقتوں میں سے ہوں یا چھوٹی طاقتوں میں سے۔ لہذا کانفرنس میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی تمام امیدیں ترک کر دی گئی تھیں اور کارکردگی کو Final Act میں بیان کی گئی مندرجہ ذیل سفارش پر عمل کرنے کی حد تک روک دیا گیا تھا۔ ”یہ کانفرنس دستخط کرنے والی طاقتوں کی توجہ ثالثی عدالت کی تشکیل کے سلسلے میں کنونشن کے مسئلہ مسودے کی منظوری اور تفاوض کی طرف مبذول کرنا چاہتی ہے، اور چاہتی ہے کہ ججوں کے انتخاب کے معاہدے کی منظوری کے فوراً بعد عدالت کی تشکیل کی جائے۔“ امید کی جاتی ہے کہ ہم ایسی مفاہمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس میں مناسب مطالبات کو الگ رکھتے ہوئے مصالحت ممکن ہو جائے گی۔ مجوزہ مستقل عدالت قابل قدر خدمات کا باعث ہوگی، بالخصوص تین افراد پر مشتمل ایک وفد تیار کرنے میں، جو بہت سے معمولی تنازعات کا فوری طور پر فیصلہ کر سکے گا۔ یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ ان تین بڑی طاقتوں — جرمنی، انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ میں سے، جنہوں نے مشترکہ تجویز پیش کی تھی، کوئی بھی مثالیت پرستی کے حوالے سے نہیں جاتی جاتی ہے۔

میں دی بیگ کے ساتھ ساتھ کنونشن کے نظر ثانی کا اپنا کام ختم کرتا ہوں جس کا تعلق ایک بین الاقوامی انعامی عدالت کے قیام سے ہے۔ عام طور پر اس کا واسطہ جنگ کے اصولوں سے ہے؛ مگر کنونشن کے مسودے کو بھی First Commission کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا جو بین الاقوامی انصاف سے متعلق سوالات پر غور کرتا ہے، اس لیے کہ معاملے کا تعلق مقدمے کے ذریعے مشکل بین الاقوامی تنازعات سے ہے۔ میں نے اس کنونشن کو سب سے آخر میں اس لیے رکھا ہے کہ میرے خیال میں یہ دوسری امن کانفرنس کی روح، قانون کے تصور کے فروغ اور وقت کے رسوخ کا بہتر اظہار کرتا ہے۔

صدیوں سے مانا گیا ہے کہ گرفتار شدہ بحری جہازوں کو فروہ یا محاصرے میں لیا گیا جہاز، عدالتی اختیار کی توثیق کے بعد ایک انعام بن جاتا ہے۔ ہر انعام کی عدالتی منظوری ضروری ہوتی ہے۔ فیصلے کا عدالتی اختیار ہمیشہ سے گرفتار کرنے والا کا رہا ہے جو جب بہتر سمجھتا ہے، انعامی عدالتوں کا انتظام کرتا ہے۔ یہ ہرگز تعجب خیز

نہیں کہ ان ثالثی عدالتوں کے فیصلے، اور کبھی تو خود تنازعات بھی، اعتراض کا نشانہ رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ ثالثی عدالتیں اپنی حکومت کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرتی ہیں، جو یک طرفہ بھی ہو سکتے ہیں۔ مزید برآں، چوں کہ ان میں ان کے اپنے قومی مفادات شامل ہوتے ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ مشکل بلکہ خطرناک حالات میں کیا جانے والا عمل غیر قانونی پایا جائے جو ان کی اپنی قومی بحریہ کے افسران کے ہاتھوں ہوا ہو۔ یقیناً، امن کے لیے کام کرنے کا اس سے بہتر طریقہ نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کو انصاف مہیا کیا جائے جنگ کے دوران جن کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو، تاکہ تنازعے کے کچھ کھن مقاصد دور کر دیے جائیں۔ چھوٹی قومیں، جن کی آوازیں مشکل ہی سے جنگوں کے کانوں تک پہنچ پاتی ہیں، اس طریقے میں تبدیلی سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گی۔

ایک عرصے سے قانون داں اصلاح کے لیے فریاد کرتے رہے ہیں۔ Institute of International Law نے وسیع پیمانے کی ایک تجویز تیار کی تھی، مگر اسے پوری طرح سمجھنے کا موقع دیے بغیر، خالص نظریاتی کہہ کر رد کر دیا گیا تھا۔ شاید ہی کسی کو یہ خیال آیا ہوگا کہ بحری تجارت کرنے والے ملکوں کا ایک گروہ اس معاملے میں پیش قدمی کرے گا جو، اگر جنگ ہو تو اسے اپنی کے تحفظ کا زیادہ خیال ہوگا، اور اگر وہ غیر جانب دار ہو تو اس کی آواز زیادہ غور سے سنی جائے گی۔ اس کے بعد بالکل سب کچھ ایسا ہی ہوا۔ کانفرنس کی ابتدا سے پہلے ہی سے جرمنی اور فرانس نے ایسے منصوبے بنا رکھے تھے جن کا مقصد تقاضا انعامات کے لیے عدالتیں قائم کرنا۔ مگر ان کو ایسے مختلف خیالات سے متحرک کیا گیا تھا کہ مصالحت ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ ہر حال، ایک راضی نامہ حاصل کیا گیا اور چار بڑی طاقتوں، جرمنی، ریاست ہائے متحدہ، فرانس اور برطانیہ عظمیٰ کی جانب سے ایک کھل اور احتیاط سے تیار کی ہوئی تجویز کانفرنس کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ صرف چند تبدیلیوں کے ساتھ کانفرنس کی مرکزی کمیٹی نے اس کو منظور کر لیا۔ صرف ایک مخالفت آئی تھی، جو ایک غیر یورپی قوم کی جانب سے تھی۔ میں کسی کنونشن کے بارے میں تجویز کرنے کا دل میں خیال بھی نہیں لاسکتا جو اتنی وسیع تکنیک کے بارے میں ہو اور جو، دراصل نئے ادارے کے لیے ایک قانون کی بنیاد بنے۔ لہذا، میں خود کو دو بنیادی اہمیت کے نکات تک محدود رکھوں گا۔

(1) عدالت کی ساخت

عدالت میں چوبیس قوموں کے بھیجے ہوئے پندرہ ارکان ہوتے ہیں۔ ان اعداد و شمار کا تقابلی مسئلے کی مشکل کی نشان دہی کرتا ہے۔

قبول کیے گئے نظام کا ایک مختصر خاکہ کچھ یوں ہے۔ آٹھ طاقتیں، آسٹریا/ہنگری، ریاست ہائے متحدہ فرانس، برطانیہ عظمیٰ، اطالیہ، جاپان اور روس۔ سب کے قومی ترانے ان کی طاقت و رافواج بحریہ، بیوپاری بحری جہاز اور سماجی تجارت کی اہمیت کے باعث ہیں، اس لیے ہمیشہ وہی سربراہی کرنے والے ہجوں

کا انتخاب کریں گی۔ دوسری طاقتوں کے نزدیک، کنونشن سے منسلک جموں کی باری کی فہرست ہی، سال بہ سال، فیصلہ کرتی ہے کہ ان کے کتنے راج اور نائب راج ہوں گے۔ یہ نظام، اپنے طور پر اور اخلاق کے معاملے میں، مانگنے کے طور پر ایک طرفہ ہوتا ہے، اور اس پر فوراً اعتراض ہو جاتا ہے کہ یہ قانون کے معاملے میں قوموں کی برابری کے تصور کا خیال نہیں رکھتا۔ مگر کیا یہ بات منطقی معلوم ہوتی ہے کہ عدالت کی مداخلت کے سلسلے میں جرمنی، مائیکرو اور سیام کے مساوی کنٹرول کو فوقیت دی جائے؟ کیا وہ بڑی طاقتیں ہی نہیں ہیں جو اپنی انعامی ثالثی عدالتوں کے فیصلوں پر نظر ثانی پر راضی ہو کر سب سے زیادہ قربانی دیتی ہیں؟ آخر میں، مانا کہ اس کی مداخلت کی نوعیت ہی عیب دار ہے، تو کیا تمام موقعوں پر نیا عدالتی اختیار بڑی ترقی کی خبر نہیں دیتا، اور کیا یہ تمام قوموں کو، بالخصوص ثانوی طاقتوں کو مخصوص ضمانتوں کی یقین دہانی نہیں کرنا جو موجود حالات میں نا پیدا ہیں؟ اسی میں ایک فیصلہ کن نکتہ بھی پوشیدہ ہے، دلچسپی رکھنے والی اکثر پارٹیاں جس کو آسانی سے پا نہیں سکتیں۔ مجھے یہ یاد کر کے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ایک قوم کے وفد نے، جو ثانوی حیثیت کا ہے مگر اس کے پاس سب سے زیادہ تجارتی جہاز ہیں، اعلان کیا ہے کہ اس کی حکومت نے، باوجود ان اعتراضات کے جو وہ جموں کے تقرر کے معاملے میں اٹھا سکتی تھی، وعدے کے مطابق اور ترقی کی خاطر اس تجویز کو منظور کر لیا ہے۔

(2) قابل اطلاق قانون

ایسے کون سے قوانین ہیں جو نئے عدالتی اختیارات کو مؤثر کرتے ہیں؟ یہ ایک فیصلہ کن سوال ہے جو اس حقیقت سے ابھرا ہے کہ ساحلی جنگ کے قوانین بنائے نہیں گئے ہیں اور اس سے بھی کہ 1807 کی کانفرنس کی کوششوں کے باوجود بہت سے نکات پر، جن میں سے کچھ بہت اہم ہیں، بے یقینی کی کیفیت باقی رہتی ہے۔ جب ایسے روایتی قوانین موجود ہوں جو متعلقہ حکومتوں کو پابند کرتے ہیں، یا جب قوانین اسے مستحکم ہو چکے ہوں کہ وہ ان قوموں کی خواہشات کے اظہار گردانے جانے لگیں، جب بین الاقوامی عدالتی اختیار کو ایسے اصولوں کی سرف تشریح کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مگر ایک اور صورت پیدا ہو سکتی ہے جس میں قوموں کا قانون، حقیقی ہو یا ریکی، خاموش ہوتا ہے، جب بین الاقوامی عدالتی اختیار کا کیا فرض ہوتا ہے؟ ایسی صورت حالات سوچنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ یہ ہیں برطانیہ عظمیٰ کے تجویز کردہ اصول جنہیں، معمولی نظریاتی اظہار کے باوجود اور بغیر کسی سنجیدہ اعتراض کے، کانفرنس نے منظور کر لیا تھا:

”جب کسی قانونی سوال کا فیصلہ درپیش ہو، جو گرفتار کرنے والے جنگجو اور ایک طاقت کے درمیان مؤثر معاہدے کا حصہ ہو، جو خود اور اس کا باشندہ، دونوں چلنے والے مقدمے کا حصہ ہوں، تو عدالت اس معاہدے کی پابند ہوگی۔“

ایسے قوانین کی غیر موجودگی میں، عدالت بین الاقوامی قوانین کا اطلاق کرے گی۔ اگر عام طور پر مشہور قوانین موجود نہ ہوں تو عدالت انصاف اور حق کے عام اصولوں کے مطابق فیصلہ دے گی۔“ (Art. 7)

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک دلیرانہ عمل ہے، مگر امکان ہے کہ یہ بین الاقوامی جہا زراعی کے قانون کے فروغ پر بھی اچھے اثرات مرتب کرے گا۔ اس طرح جموں کے سامنے ایک نازک مرحلہ آتا ہے، مگر میں ان طاقتوں پر بھروسہ کرنا چاہیے جو انھیں احتیاط سے منتخب کرتی ہیں کہ ہم ان کی دانش اور ان کی روشن خیالی پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہوں گے کہ رد کیے بغیر، کس طرح کسی طریقہ کار کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ایسا قانون اس طاقت کے لیے تعریف کا باعث بنے گا جس نے اس کو تجویز کیا تھا، اور اس کانفرنس کے لیے بھی جس نے اس کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ میں اس پر اس لیے زور دے رہا ہوں کہ میرے نزدیک یہ بین الاقوامی تعلقات کے تصور کی غیر معمولی ترقی کا پیش خیمہ ہے۔

اس طرح 1907 کی کانفرنس نے مستقل نوعیت کا پہلا عدالتی ادارہ تخلیق کیا ہے، ان معنوں میں کہ، جوں ہی انعامی ثالثی عدالت کے فیصلوں کے خلاف دادرسی کی جائے گی، نیا ادارہ خود کام کرنے لگے گا، جس کے لیے قوموں کے درمیان کسی نئے معاہدے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میں اس کو جبری ثالثی کے فروغ کے لیے خوش آمد سمجھتا ہوں۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ معاہدہ ہو سکتا ہے کہ اہم مفادات کے، قومی وقار کے اور ذاتی تحفظات کے تنازعات کو عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اگرچہ پورا مسئلہ بہ جبر جنگ کے تصور سے منسلک کیا گیا تھا، میرے خیال میں یہ امن کانفرنس کی عمل داری میں آتا تھا۔

پہلی امن کانفرنس نے بعد میں آنے والی کانفرنس کے مطالعے کے لیے کچھ سوالات چھوڑ دیے تھے۔ دوسری کانفرنس کو اس وراثت پر، جہاں تک ممکن ہو، عمل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے عین اپنے سابق کی مثال پر عمل کیا اور پیش کیے جانے والے مختلف مسائل کو تیسری کانفرنس کے سپرد کر دیا۔ مختلف کنوینشنوں نے تیسری کانفرنس کی طلبی کا Final Act میں اس طرح اظہار کیا ہے:

”آخر میں، یہ کانفرنس تیسری امن کانفرنس کے انعقاد کی سفارش کرتی ہے، اس تاریخ سے، جس کو تمام طاقتیں مل کر طے کریں گی، اور اس کی تیسری کانفرنس کے پروگرام کی پیشگی تیاری کی طرف توجہ دلانا چاہتی ہے تاکہ اس میں ضروری اختیارات اور عمل کے ساتھ تمام مباحث کو نشیمن بنایا جائے۔“

کانفرنس کا خیال ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ بہت پسندیدہ عمل ہوگا اگر اجتماع سے تقریباً دو برس قبل، حکومتیں ایک تیاری کمیٹی کو کانفرنسوں میں پیش کی جانے والی تجاویز جمع کرنے اور یہ معلوم کرنے کی ذمہ داری سونپ دیں کہ بین الاقوامی قانون میں شامل کرنے کے لیے کون کون سے موضوعات پختہ ہو کر تیار ہو چکے ہیں۔ کمیٹی کو یہ ذمہ داری بھی سونپی جائے کہ ملکوں کے فوری و مخصوص کے لیے ایک پروگرام تیار کریں اور حکومتیں فیصلہ کریں کہ ان کے لیے کتنا وقت درکار ہوگا۔ کمیٹی کو کانفرنس کی تنظیم کی ذمہ داری بھی سونپی جانی چاہیے۔“

میں اس سفارش کو دو وجوہ کی بنا پر اہم سمجھتا ہوں۔ یہ اس حقیقت کی توثیق کرتی ہے کہ بین الاقوامی کانفرنسوں کا باقاعدہ انعقاد آفاقی سطح پر ایک منظور شدہ خیال ہے اور یہ بھی کہ تجربے کے بنیاد پر پیش کی

یعنی تجاویز کے ذریعے اس امر کو یقینی بنانا چاہیے کہ کانفرنسوں کا انعقاد موافق ترین ماحول میں ہو۔ کچھ مندوبین دوسری اور تیسری کانفرنسوں کے درمیان رابطے کے لیے ایک تنظیمی کمیٹی کے قیام کے حق میں تھے۔ مگر اس خیال کو اس فارمولے کے حق میں چھوڑ دینا پڑا تھا جس کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے، اور جس کا خاکہ تیار کرنا آسان کام نہیں۔ خالص سفارتی معقولیت کے باوجود جو اس کے الفا کا سبب ہوئی تھی، اس کے کئی دلچسپ پہلو بھی ہیں۔

بالآخر، آپ دیکھیں گے کہ تیسری کانفرنس کی طلبی محض عام طریقے سے ہوئی ہے؛ اس کی ابتدا کرنے یا اس مقام کے بارے میں جہاں اس کا انعقاد ہونا ہے، کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ یہ ادارہ خود مختار ہے اور ہر طاقت اس کو متحرک کرنے کے لیے خود ہی قدم اٹھاتی ہے۔ قانونی نقطہ نگاہ سے یہ ایک نشانی ہے ترقی کی، اس لیے کہ اب اس کے اجتماعات کسی مخصوص طاقت کے مرہون وقت نہیں ہوتے۔ پھر بھی، ایک قانون داں کی حیثیت سے، روس کا نام لیے بغیر میں ایسا کوئی بیان نہیں دے سکتا کہ 1899 میں اس نے جو قدم اٹھایا تھا تمام قوموں کی جانب سے اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے اور جنگ کی خوف ناک تباہی کے بعد بھی جسے بڑی بہادری سے محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس طرح اس نے ایک شاندار روایت کو جاری کیا ہے۔ اس نے ایک بار وہ طریقہ بتایا ہے اور آئندہ پھر بتانے میں اسے کوئی تا ٹھل نہیں ہوگا، مگر وہ متمدن دنیا میں اس کردار کو صرف اپنے لیے مخصوص نہیں رکھنا چاہتا۔ جہاں تک اجتماع کے مقام کا معاملہ ہے، اگر دی ہیگ کا انتخاب نہیں کیا جاتا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ہم اس کی عانی حوصلہ مہمان داری کو بھلا بیٹھے ہیں، مگر ولندیزی حکومت کی خاطر، جس کو لگاتار کئی برسوں تک باندھ کر نہیں رکھا جاسکتا۔ اس فارمولے میں، جسے سب نے قبول کیا ہے، تمام جائز محسوسات اور جذبات کا خیال رکھا گیا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ میں اپنے خطاب کو ختم کروں۔ کیا کیا جا چکا ہے اور مستقبل میں کیا کیا جانے والا ہے، میں نے اس کی تفصیلات بتانے کی ایک معروضی کوشش کی ہے۔ ہمیں صبر کرنا چاہیے اور جو کچھ ہو چکا ہے اس پر اعتماد کرنا چاہیے اور جو کچھ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اس کے فروغ کے لیے کام کرنا چاہیے۔ اطالوی زبان کے ایک جملے کے مصداق، وقت ایک محترم شخصیت ("galant'uomo") ہو سکتا ہے، مگر ہمیں اس کو اپنے آپ ہونے پر چھوڑ نہیں دینا چاہیے، ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اس لیے ہم سب کو جو بین الاقوامی میدان میں اپنا اثر ڈال سکتے ہیں، اس عمل کے نظریے یا اس کی تعمیل میں شریک ہونا، اور اس کو کام کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ نہ ہمیں کوہ چٹم جوش و جذبے کے لیے وقف ہو جانا چاہیے نہ اس کی کوہ چٹم بے قدری کے لیے جو کچھ کیا جا چکا ہے، مگر تعمیری تنقید کے لیے تیار رہنا چاہیے جو بہتری کا راستہ دکھا سکتی ہے؛ ہمیں کامیابی کے لیے ہر کوشش اور ہر مشورے پر مناسب توجہ دینی چاہیے۔ ہم سب کو، ہر ملک میں حقیقی مفادات کی اور تہہ بلوں کی تلاش میں رہنا چاہیے، مصالحت جن پر اثر انداز ہو سکتی ہے اس لیے کہ عادت اکثر کمزور مشیر بنا کرتی ہے جو ان معاملوں میں بلا جواز اختلاف کی ہمت افزائی کرتی ہے عام حالات میں جو سب کے لیے اچھے ہو سکتے

تھیوڈور روزویلٹ اعلان تجلیل

آج دبیر کی دسویں تاریخ کی جب اس ہال میں پہلی بار نارویائی پارلیمان کو یہ بتانے کے لیے کہ امن انعام کے بارے میں اس نے کیا فیصلہ کیا ہے، نوبل کمیٹی کا اجلاس ہو رہا ہے، یہ یاد دلانا مناسب ہوگا کہ نارویائی پارلیمان ان قومی اسمبلیوں میں سب سے پہلی ہے، جو امن کے مقصد کی حمایت کو اپنا آدرش سمجھتی ہیں۔

حضرات ابراہہ یا پندرہ برس قبل امن کے مقاصد، آج کے مقابلے میں بالکل ہی مختلف منظر پیش کرتے تھے۔ یہ مقصد جو اس وقت ایک یوٹیوپیائی خیال گردانا جاتا تھا اور اس کی وکالت کرنے والے، مخلص نگر زیادہ سرگرم، لوگ تھیل پرست گردانے جاتے تھے سیاست میں جن کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی، اور وہ زندگی کی حقیقتوں سے لاتعلقی تھے۔

اس کے بعد سے حالات بنیادی طور پر بہت بدل چکے ہیں، اس لیے کہ حالیہ برسوں میں سربراہ آوردہ مدبرین، حتیٰ کہ مربراہان ریاست بھی، اس مقصد کے حمایتی بن گئے ہیں، عوامی رائے میں جس نے اب بالکل ہی مختلف صورت اختیار کر لی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ پہلی ریاست تھی جس نے عملی سیاست میں امن کے آدرش کو شامل کر دیا تھا۔ اب ریاست ہائے متحدہ اور دوسرے ملکوں کی حکومتوں کے درمیان امن اور ثالثی کے معاہدے کیے جا چکے ہیں۔ مگر بالخصوص جس نے امن دوستوں اور پوری مہندب دنیا کی توجہات کو ریاست ہائے متحدہ کی طرف متوجہ کیا ہے، وہ صدر روزویلٹ کا دل خوش کن کردار تھا جس نے دنیا کی دو بڑی طاقتوں، جاپان اور روس، کے درمیان جاری ہوں ریز جنگ کو ختم کر لیا تھا۔

نارویائی پارلیمان کی جانب سے، جناب سفیر، میں آپ کو امن کا انعام، اس کے نشان کے ساتھ، پیش انعام یافتہ کی جانب سے ان کے ملک کے سفیر H Peirce نے انعام وصول کیا تھا۔ بعد میں صدر روزویلٹ خطبے کے لیے خود آئے تھے۔

کر رہا ہوں اور اس کے ساتھ ہماری استعداد بھی ہے کہ آپ اسے [اپنے] صدر کو پیش کر دیں، ماریٹائی عوام کے تشکر کے ساتھ، ان کی تمام تر کوششوں کے لیے، جو انہوں نے امن کے مقاصد کے لیے کی ہیں۔ میں اس عظیم ذات کے لیے دعا بھی کرتا ہوں کہ اسے دنیا میں امن کے آدرش اور امن کے تحفظ اور اس کی بحالی کے مقاصد کے لیے کام کرنے کے اور بھی مواقع ملیں۔

صدر راجا جس Guhar Khudsen کی زبانی

خطبہ:

بین الاقوامی امن

میں خصوصی غمانیت قلب کے ساتھ اس مقام پر ایسا دہ ہو کر اس امر پر اظہار تحسین کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے کونوٹیل امن انعام کی عطا کے ذریعے ایک اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ اس انعام میں جو سونے کا تمغا شامل ہے میں اس کو ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا اور اپنے بچوں کے لیے بیش بہا ورثے کے طور پر چھوڑوں گا۔ اس انعام کے ایک حصے کے طور پر ملنے والی خطیر رقم کو جو قائم کرنے والی اسی شخصیت کی جانب سے دی گئی ہے، مخصوص حالات کے پیش نظر میں اپنے لیے رکھنا پسند نہیں کرتا۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ عام طور پر انعام پانے والے اس رقم کو مکمل طور پر اپنے استعمال کے لیے رکھ سکتے ہیں۔ مگر اس معاملے میں، اگرچہ میں نے کوئی عمل سرکاری طور پر ریاست ہائے متحدہ کے صدر کے طور پر نہیں کیا تھا، پھر بھی، چوں کہ، میں ریاست ہائے متحدہ کے صدر کی حیثیت میں یہ سارے کام کرنے کے قابل تھا اس لیے میرے خیال میں یہ رقم مجھے ریاست ہائے متحدہ کی امانت کے طور پر ملی تھی۔ اس لیے میں نے اس کو صنعتی امن کے مقاصد کے لیے ایک فاؤنڈیشن کے قیام کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا ہے، جو آپ کی کمپنی کے عمومی مقاصد کے دائرے میں آتا ہے؛ اس لیے کہ ہمارے آج کے پیچیدہ تمدن کے نزدیک صرف نیکوکاری اور انصاف کے ذریعے حاصل ہونے والا امن ہی وہ امن ہے، آج کی صنعتی دنیا کی قوموں کے لیے جس کا وجود ضروری ہے۔ سرمایہ کاری کی دنیا میں ظالمانہ خود غرضی اور تکبر کا ختم کیا جانا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ مزدوروں کی دنیا میں ظالمانہ لالچ اور تشدد کو روکنا، اور بین الاقوامی تعلقات میں ظالمانہ اور غیر صحت مندانہ عسکریت کی روک تھام بھی اتنی ہی ضروری ہے۔

بھئی یہ بات ہمیشہ کے لیے ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ نیکوکاری ایک عظیم کام ہے جو آدمی اور آدمی کے درمیان، قوم اور قوم کے درمیان، انصاف سے کیا جانا چاہیے تاکہ سب کو کسی قدر بلند سطح پر اور بھائی چارے کی وسیع سطح پر رہ کر اپنی زندگی گزارنے کا موقع فراہم ہو۔ امن بذات خود ایک اچھی چیز ہے، مگر یہ اس وقت تک

اچھی چیز نہیں ہوتا جب تک کہ نیکو کاری نے اس کو اپنے ہاتھوں سے نہ بنایا ہو اور اس وقت ایک شیطانی شے ہو جاتا ہے جب یہ محض کم ہمتی اور سستی کے نقاب پہنے ہوئے ہو، یا جب جبر یا فساد کے فروغ کا آلہ کار بن جائے۔

ہم دھمکانے والوں، فساد یوں، جبر کرنے والوں سے نفرت کرتے ہیں، خواہ یہ عمل تنہائی میں کیے گئے ہوں یا کھلے بندوں عام زندگی میں، مگر ہم بزدلوں اور شہوت پرستوں سے بھی کم نفرت نہیں کرتے۔ کوئی بھی آدمی، آدمی کہلانے کے قابل نہیں جوں لڑتا نہیں، بے عزتی سے ڈر جاتا ہے، یا اپنے پیاروں کو دکھاتے دیکھتا رہتا ہے [اور کوئی قدم نہیں اٹھاتا]۔ کسی بھی قوم کو وجود میں رہنے کا حق نہیں ہوتا اگر وہ سخت اور مردانہ نیکیوں پر عمل سے دریغ کرتی ہے؛ اس سے قطع نظر کہ یہ عمل بے رحمی اور تجارت پسندی، عیش پسندی، نرمی میں اضافے کے باعث ہوا ہو، یا طویل عرصے کے لیے عیش، بغیر کوشش سے حاصل ہونے والی آسانی سے، یا کج رقت قلبی کے باعث کیا گیا ہو۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ الفاظ اسی وقت اثر انگیز ہوتے ہیں جب ان سے عمل کا اظہار ہو، یا ان کی روح پر عمل کیا جائے۔ Red Terror کے رہنما امن کے بارے میں میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے، جب کہ ان کے ہاتھ معصوم لوگوں میں رنگے ہوئے تھے، بہت سے ظالموں نے احتجاج کو خاموشی میں بدل دینے کے عمل کو بھی امن کا نام دیا ہے۔ ہمارے الفاظ کو ہمارے عمل میں تولا جانا چاہیے؛ اور بلند آوازیں کے حصول کے لیے عملی طریقے اختیار کیے جانے چاہئیں؛ اور اگر ہم یہ سب سمجھیں کہ ایک ہی سانس میں نہیں کر سکتے تو ہمیں قدم بہ قدم ان کے حصول کے لیے آگے بڑھنا چاہیے، اور صحیح سمت سے حاصل ہونے والی کامیابی پر قانع ہونا چاہیے۔

اب، جب کہ ہم اپنے کام کی حدود اور ان کی استعداد کا اعتراف کر چکے ہیں، میں سمجھتا ہوں مجھے حق پہنچتا ہے کہ میرے کہے کو سنجیدگی سے لیا جائے، جب میں یہ کہوں کہ میرے خیال کے مطابق، بین الاقوامی امن کے سلسلے میں بہت ترقی کی جاسکتی ہے۔ میں ایک عملی انسان کی حیثیت میں بات کر رہا ہوں، اور میں اس وقت جس کی وکالت کر رہا ہوں، میں نے اس پر اس وقت بھی عمل کرنے کی پوری کوشش کی تھی جب میں ایک غنیمت قوم کا سربراہ تھا اور اس کی عزت اور مفاد کا ذمہ دار تھا۔ میں دوسری قوموں سے بھی وہی عمل چاہتا ہوں جس کی میں اپنی قوم سے توقع رکھتا ہوں۔

[میرے خیال میں] کئی سمتوں میں پیش قدمی کی جاسکتی ہے۔ سب سے پہلی سمت [یہ ہے کہ] ثالثی کے معاہدے کیے جاسکتے ہیں۔ [مگر] ایسی بہت سے پس ماندہ قومیں ہیں جن سے کسی مہذب کمیونٹی کو ثالثی کے معاہدے نہیں کرنے چاہئیں، کم از کم اس وقت تک نہیں، جب تک کہ کسی بین الاقوامی پولیس کا انتظام نہیں کر لیا جاتا۔ مگر تمام واقعی متمدن کمیونٹیوں کو آپس میں مؤثر ثالثی کے معاہدے کر لینے چاہئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ معاہدے ان تمام سوالات پر محیط ہو سکتے ہیں ایسی قوموں کے درمیان جن کے پیدا ہونے کے امکانات ہو سکتے ہیں بشرطے کہ معاہدے میں شامل ہونے والوں سے یہ پکا وعدہ لے لیا جائے کہ ایک

دوسرے کے علاقوں پر اور علاقوں کے اندر سب کو حتمی حق حکمرانی حاصل ہوگا، اور ساتھ ہی یہ معاہدہ بھی کیا جائے کہ ہر قسم کے امکانی تنازعات کو (سوائے ان خال خال معاملات کے جن میں قوم کے وقار پر آنچ آئے کا امکان ہو) ثالثی عدالتوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ ایسا معاہدہ اسی صورت میں امن کی ضمانت دے گا کہ کسی ایک نے جان بوجھ کر روگردانی نہ کی ہو۔ بلاشبہ، ہمارے سامنے ابھی تک روگردانی سے مامون ایسا کوئی طریقہ نہیں آیا ہے، مگر اس نوعیت کے کئی معاہدے ایسی عالمی رائے عائد کا باعث ہو سکتے ہیں جو اس قسم کی روگردانی کرنے والوں کو اس عمل سے باز رکھیں یا ان کو مزادینے کے طریقے فراہم کرے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہیگ ثالثی عدالت پر کام ہو رہا ہے، اور ہیگ کی عدالتوں کے ضمن میں کانفرنس ہوتی ہیں۔ کتنی اچھی بات کہی گئی ہے کہ پہلی (The Hague) ہیگ کانفرنس نے قوموں کے لیے ایک Magna Carta ترتیب دے دیا ہے، اس نے ہمیں ایک آدرش فراہم کر دیا ہے جس پر جزوی حد تک عمل ہو گیا ہے، اور اس کی تکمیل کے لیے ہم سب مل کر کام کر سکتے ہیں۔ دوسری کانفرنس میں مزید پیش رفت ہوتی ہے، جب کی تیسری میں اور بھی۔ اس دوران امریکی حکومت نے کئی بار مشورہ دیا ہے کہ ایک Court of Arbitral Justice قائم کی جائے جس کا فیصلہ دوسری کانفرنس میں ہو چکا ہے۔ قوی امید ہے کہ مختلف یورپی حکومتیں، امریکا اور ایشیا کی حکومتوں کے ساتھ مل کر، سنجیدگی سے کوئی طریقہ اختیار کریں گی تاکہ اس کے قیام کی کوئی صورت نکالی جاسکے۔ میرا مشورہ تو یہ ہوگا کہ دنیا کے مددین کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ وہ اس امر پر غور کریں کہ اس عدالت کے قیام کے منصوبے کے سلسلے میں ریاست ہائے متحدہ کی عدالت عالیہ میں اب تک کیا ہو چکا ہے۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ریاست ہائے متحدہ کا آئین، بالخصوص عدالت عالیہ کے قیام میں اور مختلف ریاستوں کے درمیان امن اور اچھے تعلقات کے لیے کیے گئے اقدامات کے لیے، کچھ قابل قدر تمثیلات پیش کرتا ہے، جن کی بنا پر بین الاقوامی امن اور انصاف کے حصول اور تحفظ کے لیے ہیگ عدالتوں اور کانفرنسوں کے ذریعے ایسے بین الاقوامی وفاق بھی ترتیب دیے جاسکتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ کا آئین جو کچھ کرتا ہے، اور اس وقت جو کچھ ہم دی ہیگ سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، دونوں میں بنیادی فرق ضرور ہے، مگر ریاستوں کے درمیان ہونے والے فساد کو روکنے کے لیے اور کچھ مخصوص معاملات میں وفاق عدالت کی برتری قائم رکھنے کے لیے ریاست ہائے متحدہ کے آئین میں جو کچھ شامل کیا گیا ہے، وہ ان لوگوں کے مطالعے کے قابل ہے جو عالمی سطح پر بھی وہی نتائج چاہتے ہیں جو دی ہیگ سے حاصل ہو سکتا ہے۔

آخر میں، یہ سب سے بڑا استاد کا کام ہوگا اگر وہ بڑی طاقتیں جو امن کے بارے میں سنجیدہ ہیں، اس بات کی قائل ہو جائیں کہ ایک 'امن کی لیگ' قائم ہو جائے، صرف اس لیے نہیں کہ ان میں امن ہو، بلکہ، ضرورت ہو تو طاقت کے استعمال کے ذریعے ان کے درمیان امن قائم رکھا جائے۔ دی ہیگ کے ذریعے امن کے فروغ کے کام کے سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس کے پاس عمل کرانے کی معزز طاقت نہیں،

نہ ہی کسی قسم کی پولیس جیسی طاقت جس کے ذریعے وہ اپنے عدالتی فیصلوں پر عمل کرائے۔ کسی بھی قدر طاقت کی کمیونٹی میں عدالتوں کے اختیار کا انحصار ان کی اصل یا امرکائی طاقت پر ہوا کرتا ہے؛ پولیس کی طاقت کی موجودگی پر یا اس امر پر کہ ملک میں ایسے طاقت ور افراد موجود ہیں جو عدالتی اور قانون بنانے والے اداروں کے فیصلوں پر عمل درآمد کرنے پر تیار ہیں، بلکہ ان پر عمل بھی کرائیں گے۔ کسی نئی اور محدود کمیونٹی میں جہاں تشدد ہو، ایک شریف اور ایمان دار آدمی کو اپنا تحفظ خود کرنا پڑتا ہے، اور جب تک کہ اس کے تحفظ کو یقینی نہیں بنایا جاتا، اس کو اپنے اسلحوں سے دست برداری پر راغب کرنے کی کوشش کرنا ایک احمقانہ اور قطعاً غلط فعل ہو گا۔ اس کو اس وقت تک اپنی کوششوں ہی سے اپنے تحفظ کے حق سے ہرگز دست بردار نہیں ہونا چاہیے جب تک کہ کمیونٹی اتنی منظم نہ ہو جائے کہ وہ افراد کو عملی طور پر تشدد کے خاتمے کا یقین نہ دلا دے۔

قوموں کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہر قوم کو اس وقت تک خود کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی انتظام کرنا ہوگا جب تک کہ قوموں کے درمیان تشدد کو روکنے کے لیے کسی بین الاقوامی نوعیت کی مستعد اور موثر پولیس طاقت موجود نہ ہو۔ موجودہ حالات میں، اسی وقت دنیا بھر میں امن کو یقینی بنایا جاسکے گا جب ان بڑی طاقتوں کے درمیان کسی نوعیت کا امتزاج یقینی ہو جوامن کے معاملے میں نہ صرف سنجیدہ ہوں بلکہ وہ خود کسی قسم کی ذمہ داری کا ارادہ نہ رکھتی ہوں۔ یہ امتزاج کچھ اس طرح ہو سکتا ہے کہ پہلے وہ امن کے حصول اور اس کے قیام کے لیے کچھ حدود و شرائط پر تیار ہو جائیں؛ مگر چونکہ یہ یا حاکم ایسا امتزاج تیار کرے اسے ہمیشہ کے لیے تاریخ میں مقام اور بنی نوع انسان کے تشکر کا حق دار ہونا چاہیے۔



برتھا فان سنٹر

اعلان تجلیل

[دنیا کی] تاریخ عورتوں کے زیر دست اخلاقی اثرات کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ عورتوں نے جنگ کے خیالات کی، زندگی کے رویے کی اور ان مقاصد کی ہمت افزائی کی ہے مردوں نے جن کے لیے جنگیں کی ہیں، جن کے لیے ان کے بیٹوں کی پرورش ہوئی ہے، اور انھوں نے جن کے خواب دیکھے ہیں۔ ان خیالات میں تبدیلیاں یا ان کی درستی خاص کر عورتوں ہی کی لائی ہوئی ہوئی ہیں۔ انسان کی مردانہ ہمت اور مردانہ کارناموں کے آدرش کو زیادہ روشن خیال ہونا چاہیے، زندگی کے ہر روحانی اور مادی منفقے میں خون آلود ہیرو کی جگہ سچے آدرش کی طرح با وفا آدمی کو ہونا چاہیے۔ [تب ہی] ان کو بلند مقاصد دینے میں اور ان کے بیٹوں کو بہتر خواب دینے میں عورتیں مردوں سے تعاون کریں گی۔

ایسی بہت سی عورتیں ہیں جنھوں نے قربانی دینے اور کام کرنے کی مثال قائم کی ہے، جو فوجوں کے پیچھے چلی ہیں فرشتوں کی مثال سنکی دینے، مرہم رکھنے اور بیماروں اور دکھی لوگوں کی نگہ داری کرنے کے لیے۔ بد نصیبی کو روکنے میں اس سے زیادہ اور کوئی کیا کر سکتا ہے!

مادام بیرونس، یہ ہے وہ مرحلہ جن میں آپ نے آج کی عورتوں کی رہنمائی کی ہے۔ آپ لوگوں نے خود جنگ پر حملہ کر دیا ہے اور قوموں پر "اسلمہ بندی مردہ باد" کی نعرے بازی کی ہے۔ [ہمیں پورا یقین ہے کہ] نعرے کی یہ صدا ہی آپ کا ابدی اعزاز بنے گی۔

موسم گرما کے گرماتے دنوں میں

کھیتوں میں بستے پانیوں کی سرسراہٹ کی صدا

حیر ہو کر جنگلوں کے چھ کیا چنپی کر طوفاں ہو گئی

پھر تو وہ کبرا سمندر بھی نئے شیشے عمروں میں، مہاتجہ میں گانے لگا

اور پھر، اس کے سوا کچھ بھی نہ باقی رہ گیا

مادام بیرونس، یہ سمجھنا تے ہوئے مسرے ہمارے عظیم شاعر بیرونسن [Bjarnstjerne Bjarnson] کے ہیں جو آپ کے کام پر صادق آتے ہیں۔ یہ سب کچھ [دریائے] ڈینیوب (Danube) کی وادی کی چھاگا ہوں میں پانی کی سرسراہٹ سے ہی شروع ہوا تھا، وہی علاقہ جو کبھی تباہ کن اور جنگجو فوجوں کی شاہراہ تھا۔ [سرسراہٹ کی] یہ آواز ہمیں دنیا کے تمام جنگلوں میں سنائی دیتی ہے، اور امید ہے کہ جلد ہی عوام کا اتحاد سمندر جنگ کے ڈھول کے تھاپ اور نکل کی گونجتی ہوئی آوازوں کو ہمیشہ کے لیے نکل جائے گا۔

کچھ لوگ کہیں گے کہ اس کو بڑا بل عرصہ لگے گا۔ ہمیں علم نہیں [کتنا]۔ [مگر] ہمارا مقصد واضح ہے: تشدد کے عمل، جو جنگ کا مقابلہ کرنا چاہیے اس حد تک کہ دفاعی جواز کی جنگ بھی غیر ضروری ہو جائے۔ ہم انسان کے ضمیر کو جگا دیں گے، انصاف اور اخلاقیات کو جنگ پر حاوی کر دیں گے۔

مادام بیرونس، ہم آپ کے مستحکم یقین، آپ کی امیدوں، آپ کی بے غرضی کے اور آپ کے عمل کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں۔ ہم شمال کی سرزمین پر رہنے والے مردوں اور عورتوں، کو بھی آپ کی ضرورت ہے تاکہ آپ ہمارے درمیان یقین اور عمل کی مشعلیں روشن کریں اور انہیں روشن بھی رکھیں۔ خدا آپ کو کامیاب کرے! مادام بیرونس، امن کے محترم کے پیام بر فریڈریک پاسی (Frédéric Passy) نے آپ کو سالہا سال عظیم کام دیا ہے۔ اس کیلندی نیویا کے تمام امن دوست آپ کو اس خطاب کے لیے جانے پر شاہاں و فرحاں تھا۔

نوبل کمیٹی کے صدر نشین Jørgen Gunharsson Løvland کی زبانی

خطبہ:

تحریک امن کا ارتقا

انسانی مفاہمت کے آسمان میں ابدی سچائی اور حق کے ستارے ہمیشہ جھمکائے ہیں۔ ان کو منزلِ خاک تک لانا، عملی جیکر میں ڈھاننا، قوتِ حیات کے رنگوں میں رنگنا، اور پھر ان کو استعمال کرنا ایک ضویل عمل رہا ہے۔ تمام ابدی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ خوش حالی حالتِ امن ہی میں پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی ہے، اور تمام ابدی حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ ہر فرد کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ سب سے طاقت ور جہت، یعنی حفظِ نفس، اس حق کا اصرار رکھتا ہے، جو قدیم خدائی احکامات میں "Thou shalt not kill" کی صورت میں مقدس قرار دیا گیا ہے۔

میرے نزدیک اس امر پر زور دینا ضروری نہیں کہ ہمارے تمدن کی موجودہ کیفیت میں اس حق اور اس خدائی حکم کا کتنا کم احترام کیا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے تک، ہمارے سماج کی عسکری تنظیم امن سے انکار کی بنیاد پر رکھی گئی ہے، جو انسانی زندگی کی قدر کی توہین ہے اور قتل کی ترغیب کی قبولیت کے مترادف ہے۔

اور چوں کہ ایسا ہے تو، جہاں تک ماضی کی تاریخ ہمارا ساتھ دیتی ہے (اور دیکھا جائے تو واقعی وقت کتنا چھوٹا ہوتا ہے، اس لیے کہ چند ہزار برس کا عرصہ بھی کوئی عرصہ نہیں ہوتا) زیادہ تر لوگوں کا اس امر پر یقین رہا ہے کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اور اس امر پر عام طور پر غور و خوض بھی نہیں کیا جاتا کہ دنیا ہمہ وقت حالت تغیر و ترقی میں رہتی ہے، اس لیے کہ ارتقا کے قانون کا علم، خواہ وہ ارضیاتی عرصہ وقت میں ہو یا سماج میں، تمام اقسام حیات پر لاگو ہوتا ہے، اور یہ سب حالیہ برسوں کی سائنسی ترقی کا ہی مرہون بنتا ہے۔

یہ یقین غلط ہوگا کہ مستقبل ضرورت کے پیش نظر، ماضی اور حال کے رجحانات کو جاری رکھے گا۔ ماضی اور حال، وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے، ہم سے اسی طرح دور ہوتے رہتے ہیں جیسے دریائی ساحلوں کے کنارے، جب کشتی کو لہریں نئے ساحلوں کی طرف بہائے لیے جا رہی ہوں جن پر بنی نوع انسان سوار ہو۔

جو لوگ عمل ارتقا کے قوانین کو سمجھتے ہیں اور ان میں معاون ہوتے ہیں، ان کا ايقان ہے کہ مستقبل ہمیشہ اس سے ایک درجہ بہتر ہوگا جسے ماضی سمجھ کر رد کر دیا جاتا ہے۔ صرف مقابہت اور فطری قوانین اور طاقتوں کے ارادی اخلاق سے ہی، مادی اور اخلاقی میدانوں میں، ممکن کی آلے اور سماجی ادارے تخلیق کیے جائیں گے جو ہماری زندگیوں کو آسان، بھرپور اور زیادہ باعزت بنا دیں گے۔ ان کو اس وقت تک آدرش کہا جاتا ہے جب تک یہ تصورات کے زمرے میں رہتے ہیں اور جوں ہی ان کی قابل دید، زندہ اور موثر حکمت میں قلب ماہیت ہو جاتی ہے، یہ ترقی اور کامیابی کے نشان بن جاتے ہیں۔

اگر آپ مجھے ترقیات سے مطلع کرتے رہیں گے اور اگر میں یہ سنوں کہ امن کی تحریک عملی سرگرمی کی ماحول پر آگے بڑھ رہی ہے تو، میری طرف سے مالی امداد ہوتی رہے گی۔

یہ الفاظ اسٹینڈی نیویا کے جس فرد غصیم کی زبان سے ادا ہوئے تھے مختارین و حضرات، میری آپ کے سامنے اس وقت موجودگی اسی کی رہنمائی دیتا ہے۔ انگریز نوٹیل نے یہ الفاظ اس وقت کہے تھے جب 1892 میں اپنے شوہر کے ساتھ ان سے ملنے برن (Bern) گئی تھی جہاں ان دنوں ایک امن کانفرنس ہو رہی تھی۔

ان کا وصیت نامہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ یہ تحریک اب پارما نظریات کے گہرے فکل کر عملی طور پر ممکن الحصول بدف کی روشنی میں آگئی ہے۔ انھیں احساس تھا کہ سائنس اور تصوراتی ادب کی سرگرمیاں تمدن اور تہذیب کی نشوونما میں معاون ہوتی ہیں۔ ایسے بدف کے ساتھ انھوں نے امن کانگریسوں کے مقاصد میں ”بین الاقوامی انصاف کی تحصیل اور اس کے نتیجے میں فوجوں

کی تعداد میں کمی، کو مسلک کر دیا تھا۔

افریڈ نوبل کو یقین تھا کہ سماجی تبدیلیاں آہستہ آہستہ اور کبھی بلا واسطہ طریقوں سے بھی آتی ہیں۔ انہوں نے Andrée کی قطب شمالی کو پار کرنے کی کوشش کے لیے 80,000 فرانک دیے تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ یہ کوشش، میرے تصور سے بھی زیادہ، امن میں معاون ہو سکتی ہے۔ ”اگر Andrée اپنا ہدف حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو، یا اس کا نصف ہی حاصل کر پاتا ہے تب بھی، یہ کامیابی ان کامیابیوں میں سے ہوگی جو گنگو کا وہ سیلاب اور جوش پیدا کرے گی جس سے تصورات جنم لیں گے اور جو نئی اصلاحات کی راہ کھول دے گی۔“

مگر نوبل کی نظر میں ایک مختصر اور راست طریقہ بھی تھا۔ ایک اور موقع پر انہوں نے مجھے لکھا تھا: ”یہ جلد ہی واضح ہو جائے گا کہ تمام ریاستوں نے اجتماعی طور پر عہد کر لیا ہے کہ وہ حملہ آور پر خود حملہ کر دیں گی۔ اس طرح جنگ ناممکن ہو جائے گی، اور بدترین اور نا معقول طاقت کو بھی مجبور بنا پڑ جائے گا کہ وہ تالشی عدالت سے رجوع کرے یا پھر خاموش بیٹھ رہے۔ اگر Triple Alliance میں صرف تین کے بجائے تمام ریاستیں شامل ہو جائیں، تو صدیوں کے لیے امن محفوظ ہو جائے گا۔“

افریڈ نوبل ان بڑی کامیابیوں اور فیصلہ کن واقعات کو ہوتے دیکھتے کو زندہ نہیں رہے جن کی بدولت ”تصور امن“ (Peace Idea) کو زندگی ملی اور انھیں کئی اداروں میں عمل میں آنے کا موقع مل گیا۔

پھر بھی، وہ 1894 میں زندہ تھے جب عظیم برطانوی مدبر گلیڈسٹن (Gladstone) ایک مستقل بین الاقوامی تالشی عدالت کی تجویز پیش کر کے تالشی کے اصول سے بھی چند قدم آگے بڑھ گئے تھے۔ اس عظیم بزرگ [نوبل] کے ایک دست بھلپ اسٹن ہوپ (Philip Stanhope) نے 1894 کی Interparliamentary Conference میں گلیڈسٹن کے نام سے یہ تجویز پیش کر دی تھی اور رکن حکومتوں کو ایسی تالشی عدالت کا ایک منصوبہ بھوانے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔ افریڈ نوبل نے اپنی زندگی میں اس منصوبے کا اجرا دیکھا تھا، مگر جب اس کے نتائج برآمد ہوئے تو ان کا انتقال ہو چکا تھا؛ یعنی ہیگ کانفرنس کی طلبی اور Permanent Court of Arbitration کا قیام۔ یہ [امن] تحریک کی بہت بڑی بد قسمتی تھی کہ اس سے افریڈ نوبل، ماڈز فان ایگیڈی (Moritz von Egidy) اور یوبان فان بلاخ (Johann von Bloch) قبل از وقت چھین گئے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے آدرش اور ان کے کام ان کی قبروں سے پرے بھی جاری ہیں، مگر وہ آج ہمارے درمیان ہوتے تو ان کے ذاتی رسوخ اور ان کے کام کے اثرات سے تحریک میں کتنی تیزی آگئی ہوتی۔ کس ہمت سے وہ مسکریٹ پسندوں سے لڑائیں لڑتے جو اب تک اسی پرانے لڑناں نظام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس نظام کا مقصود ماکامی کے سوا کچھ نہیں۔ جب کوئی نیا نظام ابھرنے لگتا ہے تو پرانے نظام کو ڈھیر ہونا پڑتا ہے۔ وہ عقیدہ یا عقین جو ممکن ہو، جو ضروری ہو، اور جسے قوموں کے درمیان ایک یقینی اور منصفانہ امن کی

جگہ ملنی چاہیے، سماجی طبقات میں تہہ بہ تہہ موجود ہوتا ہے، حتیٰ کہ ان میں بھی، جو طاقت اقتدار کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کے کام اس قدر صریح انداز میں واضح کیے گئے ہوتے ہیں، اور بہت سے لوگ ان پر پہلے ہی کام کر رہے ہوتے ہیں، کہ جلد یا بدیر ان کی کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ چند برس قبل امن تحریک کے آدرش کی تعلیم دینے کے لیے ایک وزیر تک نہیں ہوا کرتا تھا۔ آج، بہت سی ریاستوں کے صدر دشمن خود یہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ پہلا صاحب اقتدار مندرجہ جس نے سرکاری طور پر ایک بین الاقوامی کانفرنس سے [اس کام کا] عہد کیا تھا، شاید، مارویائی وزیر اعظم اسٹین (Steen) تھا۔ وہ جارج لند (John Lund) تھا جس نے 1891 میں روم (Rome) میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کو یہ اعلان پہنچائی تھی اس وقت جس نے سنسٹی پیپل دی تھی۔ مزید یہ کہ وہ مارویائی حکومت تھی جس نے پہلی بار Interparliamentary Union کے ارکان کا سفر خرچ برداشت کیا تھا اور برلن میں قائم Peace Bureau کو امداد فراہم کی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انٹرنیشنل نوٹیل نے امن کے لیے چھوڑے ہوئے اپنے سرمایے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری مارویائی پارلیمان کو سونپ دی تھی۔

آئیے، اب ہم پوری دنیا پر نظر دوڑاتے ہیں، یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم امن پسند ترقیات اور ان کے مثبت نتائج کے حصول کے دعووں میں حق بجانب ہیں بھی کر نہیں۔ حال ہی میں مشرقی بعید میں دنیا کی تاریخ کی ایک بدترین جنگ [روس اور جاپان کی 1905-1904 جنگ] ہوئی ہے۔ اس جنگ کے بعد ایک انقلاب آیا جو اس جنگ سے بھی زیادہ برا تھا، جس نے وسیع روسی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا تھا، ایسا انقلاب جس کے حتمی نتائج کا ابھی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں آتش زنی، ذہنی، ہتھیار، موت کی سزاؤں، قیدیوں سے لہالب بھرے قیدخانے، تشدد اور قتل عام کی خبریں مل رہی ہیں، مختصر یہ کہ، شیطانی تشدد کا رقص جاری ہے۔ اسی دوران، مرکزی اور مغربی یورپ میں، جو جنگ سے بال بال بچ گیا تھا، بدگمانی، دشمنیاں، تلوار کی جھنکار، بخار زدہ بحری مسکریات اور اسلحہ بندی کا دور دورہ ہے۔ انگلستان، جرمنی اور فرانس میں مادل لکھے جا رہے ہیں جن میں مستقبل میں ہمسایہ ممالک کی جانب سے اچانک حملے کے پلاٹ پیش کیے جا رہے ہیں جن کے باعث اسلحہ بندی کا پاگل پن نیا وہ تیزی سے پھیل رہا ہے۔ دفاعی قلعے تعمیر کیے جا رہے ہیں، آبدوز کشتیاں تیار کی جا رہی ہیں، پورے کے پورے علاقے بارودی مرگموں سے خطرناک بنائے جا رہے ہیں، جنگ میں استعمال کے لیے غبارے جہازوں (airships) کے تجربے کیے جا رہے ہیں، اور یہ سب کچھ اتنی تندی سے ہو رہا ہے گویا اب ہمسایے پر حملہ کرنا ہی ریاستوں کا ناگزیر فریضہ رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ ویمری ہیگ کانفرنس کا پروگرام دیکھ کر (جو 1907 میں ہونے والا ہے) ایسا لگتا ہے جیسے کہ یہ امن کانفرنس نہیں جنگ کی کاؤنسل (council of war) ہومان ساری صورتوں کے پیش نظر، کیا لوگ اب بھی یہی کہتے رہیں گے کہ امن کی تحریک فروغ پاری ہے؟

ہماری آنکھوں کو ظاہری روشنیوں سے خیرہ نہیں ہونا چاہیے؛ ہمیں زمین توڑ کر نکلنے والے آنکھوں کی

تلاش میں رہنا چاہیے۔ ہمیں ان دو فلسفوں کو تمدن کے دو طبقوں کو سمجھنا چاہیے جو ایک دوسرے سے زور آزمائی کر رہے ہیں اور اس کا بھی احساس کرنا چاہیے کہ اب اس قدیم، اُدھم مچانے اور دھمکانے والے جذبے کی جگہ ایک طاقت ور نیا جذبہ لے رہا ہے۔ اور یہ نئی ہونہار زندگی، جو نہ کمزور ہے اور نہ بے ڈھنگی، وسیع چیلانے پر اپنی جگہ بنا رہی ہے اور زندہ رہنے پر اصرار کر رہی ہے۔ تحریک امن سے بالکل الگ، جو محض ایک وجہ نہیں بلکہ تہذیبی کائنات ہے، ایک قسم کی بین الاقوامیت اور انضمام کا عمل تشکیل پا رہا ہے۔ اس تہذیبی یا ترقی میں تکنیکی ایجادات، بہتر اطلاع رسانی، باہمی اقتصادی انحصار اور قریبی بین الاقوامی تعلقات کے غنا سر بھی اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ انسانی سوشلٹی میں حفظ نفس کی جبلت، جو تقریباً شعوری طور پر برسرِ کار ہے، جس طرح انسانی دماغ کے دوسرے طریقے کام کرتے ہیں انسانیت کی تباہی اور ہلاکت کے خلاف مستقل طور پر بغاوت میں مشغول ہے۔

جنگ سے آزاد عہد کی تلاش کی اس لاشعوری کوشش کے متوازی کچھ لوگ ہیں جو امدادی طور پر اس ہدف پر کام کر رہے ہیں جو عمل کے منصوبے کی ضروریات کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہیں اور جلد از جلد ہمارے مقصد کی تکمیل کے طریقوں کے متلاشی بھی ہیں۔ برطانیہ کے موجودہ وزیر اعظم، کمپبل بیئرمن (Campbell-Bannerman) نے ترک اسلحہ جات کے مسئلے کو دبا رہا تھا یا ہے۔ فرانس کے سینیٹر d'Estournelles ایک فرانسیسی (جرمن شرکت پر کام کر رہے ہیں۔ Jaurès تمام ملکوں سے جنگ کی مزاحمت کرنے کے لیے اتحاد کی دعوت دے رہا ہے۔ ایک روسی عالم نوویکوف (Novikov) دنیا کی بڑی طاقتوں کے ایک ہفت پہلو اتحاد کا مطالبہ کر رہا ہے۔ دیونڈیلٹ تمام ملکوں کو ثالثی کے معاہدے کی دعوت دے رہا ہے اور کانگریس کے نام اپنے پیغام میں کہتا ہے: ”واضح طور پر یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم عملی طور پر ہر طرح ان لمحات کو قریب لانے کی کوشش کریں جب قوموں کے درمیان فیصلوں میں تباہی کا عمل دخل نہ رہے۔“

چند لمحوں کے لیے میں امریکا کے موضوع پر بھی بات کرنا چاہوں گی۔ اس بے حد حساب و سرائی کی مرزبین میں بلند تصورات اور وسعت کے نئے نئے منصوبے بنانے اور سادہ ترین طریقوں کے استعمال سے ان کو پورا کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ قوم اپنے تصورات میں مثالیت پسند اور ان کو حقیقت بنانے میں باعمل واقع ہوئی ہے۔ ہمارے خیال میں امریکا میں امن کی جدید تحریک کے لیے حمایت حاصل کرنے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے خاصی کشش ہے۔ امریکی صدر کے کہے ہوئے الفاظ جو ابھی بیان کیے گئے ہیں، فرض کی سمجھ کو اچھی طرح بیان کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل مقاصد میں بیان کیے گئے وہ طریقے ہیں جو آج کل امریکا میں امن کی تحریک کے سلسلے میں کیے جا رہے ہیں:

(۱) ثالثی کے معاہدے

(۲) قوموں کے درمیان اتحاد امن

(۳) ایک بین الاقوامی ادارہ جو قوموں کے درمیان قانون کی عمل داری کی طاقت رکھتا ہو، جیسا کہ شمالی

امریکا کی ریاستوں کے درمیان قائم ہے، جس کے ذریعے جنگ کی تدبیر کو مؤقف کیا جاسکتا ہو۔
 جب روز ویلٹ نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۴ کو مجھے وہاٹ ہاؤس میں خوش آمدید کہا، تو انھوں نے یہ الفاظ
 ادا کیے تھے: ”عالمی امن آرہا ہے، بلاشبہ اس کا آئنا ٹھہر گیا ہے، مگر رفتہ رفتہ۔“
 اور پھر، ایسا ہی ہے۔ اس ہدف تک، خواہ وہ کتنا ہی واضح اور نظام رکتا فریبی ہی کیوں نہ ہو پہنچنے کے
 راستے پر اونچے اونچے قدموں ہی چلنا ہوگا، اور راستے میں آنے والی آن گشت رکاوٹوں کو صبر کرنا ہوگا۔
 مزید یہ کہ ہم ایسے ہدف کی بات کر رہے ہیں کہ وہ انسانیوں کو ابھی تک جس کا تصور بھی نہیں ہوا ہے
 یا، اگر ہوا ہے تو، اس کو یوٹیوپیائی خیال سمجھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، بہت سے مفاد پرست بھی اس میں شامل
 ہو گئے ہیں اس کوشش میں کہ قدیم نظام کو قائم رکھا جائے اور ہدف تک پہنچنے کو ناممکن بنا دیا جائے۔
 انسانیت کے اندرون میں موجود فطری قوانین میں پرانے نظام کے بھی خواہوں کے طاقت وراثت وراثتی
 موجود ہوتے ہیں جو تبدیلی کے خلاف ایک فطری دفاع کا کام کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے امن پسندی کوئی
 آسان جدوجہد نہیں ہوتی۔ آیا ریاستوں کے درمیان تشدد حاوی ہو گیا قانون؟ یہ سوال ہی ہمارے واردات
 سے پڑ عہد کا سب سے بڑا اور نتائج کے معاملے میں سب سے مشکل مسئلہ ہے۔ ایک محفوظ عالمی امن کے مفید
 نتائج تقریباً ناقابل تصور ہیں، مگر ان سے بھی زیادہ ناقابل تصور نتائج عالمی جنگ کے امکانات ہیں، جسے جلد
 بازی میں گمراہ لوگ قبول کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

امن پسندی کی وکالت کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے ذاتی رسوم اور طاقت کے ہمسائی
 کتنے حقیر درجے کے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تعداد میں وہ کم ہیں اور اختیار میں کمزور، مگر جب وہ خود کو اور ان
 آدرشوں کو حقیقت کی روشنی میں دیکھتے ہیں جن کے چرکار ہیں تو وہ خود کو ایک بلند ترین مقاصد کے خدمت
 گاروں کے رول میں پاتے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کا انحصار اس امر پر ہے کہ یا تو ہمارا یورپ ناکامیوں اور
 کشمکشات کی نمائش گاہ بن جائے گا، یا ہم اس خطرے کو نال سمجھتے ہیں اور اس عہد میں جلد داخل ہو جائیں
 جس کو محفوظ امن اور قانون کا عہد کہا جاسکتا ہے، جس میں ایک ناقابل تصور نشان کے تمدن کا فروغ ہوگا۔

اس سوال کے کئی پہلو ہیں کہ دوسری بیگ کانفرنس کو کن امور پر بات کرنی چاہیے، یہ ترجیح مجوزہ
 موضوعات کے جو بحری جنگوں کے قوانین اور ان پر عمل، بندرگاہوں، شہروں اور دیہات کی بمباری، زمینی
 سرنگوں کے بچھائے جانے وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اس ایجنڈے کی مشمولات ثابت کرتی ہیں کہ اگرچہ موجودہ
 سمراکئی کے دھلپنے کے حتمی جو جنگ کو قبول کرنے پر تیار ہیں، کانفرنس میں جنگ کی صفات میں تبدیلی پر
 بات کرنے آتے ہیں، وہ بنیادی طور پر موجودہ نظام کو ویسا ہی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ امن پسندی کی وکالت
 کرنے والے، وہ کانفرنس کے اندر کے ہوں یا باہر کے، اپنے اپنے مقاصد کا دفاع کریں گے اور اپنے ہدف
 کی طرف قدم بڑھانے پر زور دیں گے۔ وہ ہدف جو، صدر روز ویلٹ کے الفاظ میں ان کی حکومت کے اور
 تمام حکومتوں کے فرائض کی بنیاد ہیں، ”ان لحاظ کو قریب لانے کی کوشش کریں جب قوموں کے درمیان

رینڈل کریمر اعلان تجلیل

میں آپ کا خیر مقدم کرنے میں ایک کونہ افتخار محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کہولت، طویل مسافت اور اس برس کے بے رقم موسم کے باوجود یہاں تک آگئے ہیں۔ یہی سب سے بڑا ثبوت ہے آپ کی اس آن تھک توانائی کا جسے آپ نے اتنے برسوں تک اس مقصد کے لیے وقف کر دیا تھا، جس کی آپ نے اتنی تندہی اور ولولے کے ساتھ خدمت کی ہے اور کامیابی حاصل کی ہے۔ ہماری بہترین خواہش ہے کہ آپ امن اور عالمی کے خیالات کو بار آور اور مستحکم ہونے دیکھیں، اور چوں کہ آپ نے خود اتنے اعلیٰ قہر ف اور شجاعت اظہار کے ذریعے اپنے نوبل انعام کا استعمال کیا ہے، ہماری خواہش ہے کہ آپ اس کو مستقبل میں تکمیل پاتا دیکھیں۔

نوبل کمیٹی کے صدر نشین Jorgen Gunnarsson Løvland کی زبان

خطبہ:

بین الاقوامی ثالثی، اس کی ترقی اور فوائد

مجھے افسوس ہے کہ بہت ساری وجوہ کی بنا پر میری یہاں موجودگی میں تاخیر ہوئی ہے۔ جب سے نوبل کمیٹی نے مجھے انعام سے نوازا ہے میں ان شرائط کی تکمیل کے لیے پریشان رہا ہوں، جو ہر انعام پانے والے کو پوری کما پرستی میں کروہ کرستیانیا (Christiania) (اسلو) آئے اور اپنا خطہ پیش کرے۔

مجھے ایسے بہت سے حالات درپیش رہے ہیں جو تاخیر کا باعث ہوئے، جس کے لیے میں شرمندہ ہوں اور آپ سے چشم پوشی کا خواستگار ہوں۔

مسافرین اپنی منزل پر پہنچنے کی جگہ و دو میں خود سے سوال کرتے رہتے ہیں کہ اس کے حصول کے لیے اور کتنا سفر باقی رہ گیا ہے۔ انھوں نے جتنا کچھ حاصل کر لیا ہوتا ہے اس کو آسانی سے معلوم تو کیا جاسکتا ہے، مگر باقی رہ جانے والا فاصلہ اور ممکنہ حادثات کا تخمینہ لگانا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔

اس مثال میں ہمیں جتنا وقت میسر ہے، ہم امن کے یا ترقی لوگ اس میں ایک مسافر کا روپ دھار سکتے ہیں اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے راستے کے کتنے سنگ میل گزر چکے ہیں: آیا ہم نے واقعی کوئی ترقی کی ہے، کیا ہمارے پاس خوشی منانے کا کوئی جواز ہے کیا کوئی اور چیز، اگر ہیں تو— کون سی رکاوٹیں ہیں جو عبور کرنی باقی رہ گئی ہیں۔

ایک عرصے سے امن دوست لوگ تبلیغ کرتے رہے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ میں آپ کو اس کے بارے میں کچھ بتانا چاہوں گا جو اب تک کیا جا چکا ہے۔

پہلی بات—مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم اس بادشاہ کی حمایت اور ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو برطانوی تخت پر جلوہ افروز ہے اور پوری دنیا امن کے مقصد کے کام میں اس کے رسوم کو استعمال کر سکتے کے باعث اس کے ٹھکانے کی مقروض ہے۔ ماضی میں بادشاہوں نے دوستی اور بھائی چارے کے لیے اپنے رسوم کا انتظام استعمال کیا ہے کہ شاہ ایڈورڈ (Edward) کی قائم کی ہوئی مثال نہ صرف قابلِ تعریف ہے بلکہ وقت کی پُر امید مثالوں میں سے ہے۔

چوتھیں برس قبل، جب اس ادارے نے، جس کا میں سیکریٹری ہوں، ”قوموں کی اعلیٰ عدالت“ قائم کرنے کا منصوبہ پیش کیا تھا تو محض نظریات پرست اور یوٹوپیائی کے خطابات سے نواز کر ہمیں استہزاء کا نشانہ بنایا گیا تھا، اور طعنہ زنی کرنے والوں نے پُر زور طریقے سے کہا تھا کہ دنیا کے صرف دو ممالک بھی کبھی ایسی کسی عدالت کے قیام پر متعلق نہیں ہو سکیں گے۔

آج ہم بڑے فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ Hague Tribunal قائم کی جا چکی ہے، اور ابتدائی میں پہنچنے والے Boer War کے صدمے سے قطع نظر، اور کچھ قوموں کے بائیکاٹ کے باوجود، آج عام رائے یہ ہے کہ یہ باقی رہنے کے لیے قائم ہوئی ہے—اور مسٹر کارنگی (Carnegie) کی شاہانہ بخشش کا شکریہ کہ قوموں کی عدالت کو Palace of Peace میں ایک مستقل جگہ فراہم کی جائے گی۔

اگر کسی کو ایسی ثالثی کی عدالت کی افادیت اور پسندیدگی کا ثبوت دیکر رہتا تو وہ حالیہ ”Dogger Bank“ کے واقعے نے فراہم کر دی ہے۔ اگر ثالثی عدالت کا وجود نہ ہوتا تو شاید برطانیہ اور روس کو بحریہ اس پر غور کرنے میں کئی مہینے لگ جاتے کہ اس قسم کی نام نہاد دوست اندازی ثالثی عدالت کے سامنے پیش ہونے کے لیے ایک موزوں معاملہ ہے بھی کہ نہیں، اور اس تاخیر کے باعث پریس والوں نے عوام کے ذہنوں کو اتنا پاگل کر دیا ہوتا کہ اس کا کوئی امن پسندانہ حل ممکن ہی نہ ہوتا۔ مگر اس حقیقت نے، کہ ایک پُر امن طریقہ موجود ہے، جسے حرکت میں لایا جاسکتا ہے، باوجود اس کے کہ کچھ اخبارات اس تنازعے کو ہوا دے رہے تھے دو

حکومتیں اس کو استعمال میں لانے کے لیے چند دن کے اندر ہی بیگ کی دوستانہ ثالثی عدالت میں جانے پر راضی ہو گئیں۔

پچھلی صدی کے دوران ثالثی یا دوستانہ طریقوں کے ذریعے حل کیے جانے والے تنازعات کی تعداد تقریباً دو سو تھی۔ زیادہ تر تنازعات معمولی نوعیت کے تھے۔ ان میں کچھ مشکل بھی تھے۔ سب سے مشکل تنازعہ ریاست ہائے متحدہ اور برطانیہ کے درمیان بحری قزاقوں کے جہاز الاباما (Alabama) کا تھا۔

بہر حال، 1887ء سے پہلے یہ سوال نہیں اٹھا تھا اور اس کو میں اس کا عملی مرحلہ سمجھتا ہوں۔ اس وقت تک ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، کانفرنسیں منعقد ہوتی تھیں، اور حکومتوں کے سامنے درخواستیں پیش ہوتی تھیں، مگر امن کے دوستوں کو یہ مشکل درپیش تھی کہ شروعات کون کرے؟ کون ہی قوم آگے بڑھے گی اور ایک قابل عمل تجویز پیش کرے گی؟ اس مشکل کا سامنا کرنے اور ان اعتراضات سے عہدہ بردار ہونے کے لیے برطانیہ کے دارالعوام کے ارکان نے ریاست ہائے متحدہ کے صدر اور اس کی کانگریس کو یادداشتیں پیش کی تھیں، اس ترغیب کے ساتھ کہ ریاست ہائے متحدہ اور برطانیہ کی حکومتیں ایک نئے عہد کی ابتدا کریں اور ایسا معاہدہ کریں جو انہیں اپنے اختلافات کو ثالثی کے ذریعے حل کرنے کا پابند کرے۔

بلاشبہ، طنز و تشبیہ کرنے والوں نے اس خیال کو کہ کوئی بھی قوم ایسے معاہدے کرنے پر راضی ہو سکتی ہے ایک بار پھر گندہ کر دیا ہے، مگر جنہوں نے تفحیک کی تھی انہیں شرمندہ ہونا پڑا تھا، اس لیے کہ پچھلے بار وہ مہینوں میں مختلف قوموں کے درمیان بارہ معاہدے ہو چکے تھے۔ جن ممالک نے یہ بندھن باندھے تھے ان کے نام تھے: برطانیہ عظمیٰ اور فرانس، فرانس اور اطالیہ، برطانیہ عظمیٰ اور اطالیہ، ڈنمارک اور ہالینڈ، برطانیہ عظمیٰ اور ہسپانیہ، فرانس اور ہسپانیہ، فرانس اور ہالینڈ، ہسپانیہ اور پرتگال، جرمنی اور برطانیہ عظمیٰ، برطانیہ عظمیٰ، ناروے اور سویڈن، برطانیہ عظمیٰ اور پرتگال، سویٹزرلینڈ اور برطانیہ عظمیٰ، سویڈن، ناروے اور بلجیم۔

سات مزید معاہدے بھی ہوئے تھے جن کے مسودوں پر ریاست ہائے متحدہ امریکا کی حکومت اور برطانیہ عظمیٰ، فرانس، جرمنی، اطالیہ، ہسپانیہ، پرتگال اور سویٹزرلینڈ کی حکومتوں نے دستخط کیے تھے۔ ان معاہدوں کے علاوہ جو ریاست ہائے متحدہ سے ہوئے تھے، جن کی سینٹ سے توثیق ہوئی باقی ہے، دوسرے تمام معاہدے نافذ ہو چکے تھے، اس طرح، تیرہ معاہدے بین الاقوامی قانون کی نظر میں مکمل طور نافذ ہو چکے تھے۔

مگر، تشکیک پرست کہتے تھے کہ اب ان معاہدوں کا کیا فائدہ جب کہ آپ انہیں کر چکے ہیں؟ میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ فرانس اور برطانیہ عظمیٰ کے درمیان معاہدے پر، جو اگرچہ صرف بارہ مہینے پرانا ہے، دونوں کے درمیان رواج کے مطابق عمل درآمد شروع ہو چکا ہے جس کے تحت دونوں حکومتوں کے درمیان تمام اختلافات، جن میں سے ایک صدیوں پرانا ہے، منعقدانہ طور پر طے کر لیے گئے ہیں اور ان کی پارلیمانوں نے ان کی توثیق بھی کر دی ہے۔ لہذا، فرانس اور برطانیہ عظمیٰ، جن کے سچے ایک دوسرے کو ذبح کرتے رہے ہیں اور دونوں قوموں کے وسائل کا ضیاع کرتے رہے ہیں اب بہترین تعلقات کے ساتھ

زندگی گزار رہے ہیں۔

ان ٹائلی کے معاہدوں کا ایک اور قابل ذکر فائدہ ہے۔ دو جنوبی امریکی جمہوریتیں، چلی اور ارجنٹائن، جو متعدد بار تنازعات میں الجھی رہی ہیں، اب ان معاہدوں کے باعث مجبور ہیں کہ وہ اپنے تنازعات کو ٹائلی کے ذریعے حل کریں، اور یہ جانتے ہوئے کہ اب زور بکتر اور جنگی جہازوں کا کوئی کام نہیں رہ گیا ہے، انھیں روس، برطانیہ عظمیٰ اور دوسری طاقتوں کے ہاتھ فروخت کر رہی جو انھیں خریدنا چاہتی ہیں۔

ٹائلی کی وکالت کرنے میں ہماری پالیسیوں کا بہترین اظہار اس عہد کے ساتھ ہوتا ہے کہ ترک اسطرح جات پر یقیناً عمل کیا جائے گا۔ ہم نے جس کو ہمیشہ ذریعہ سمجھا ہے، دوسرے اس کو نتیجہ سمجھتے ہیں جس کو حاصل کیا جانا ہے۔

ہمارے خیال میں ٹائلی کے معاہدوں سے، جہاں اور بھی فائدے ہوں گے، یہ فائدہ بھی ہو گا کہ جب اختلافات ابھریں گے، تو تنازعات میں مثال قوتوں کو سوچنے کا وقت ملے گا، چوں کہ جب تک ٹائلی کرنے والے مسائل پر غور کر رہے ہوں گے حریفوں کے جذبات ٹھنڈے ہوں گے، اور جنگ کے امکانات بہت حد تک کم ہو چکے ہوں گے۔

اور، جنگ کی افواہوں کے اڑتے ہی، بازاریوں میں پکٹنے والی ضروریات زندگی کی قیمتوں میں تبدیلی ہوتی ہے، بالخصوص وہ اشیا جو سمندر پار کر رہی ہوتی ہیں اور جن پر انشورنس کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ ایسے تمام اضافے صارف ہی کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔

ایسے تمام معاہدے خوف پھیلانے والوں کے خوف ناک رسوخ کو کمزور کر دیتے ہیں اور اس طرح ایمان دار سرمایہ کاروں کو بازار حصص میں بازی لگانے والوں کی دھوکے بازی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ جنگ کی پہلی افواہ حکومتی حصص میں سرمایہ کاری کرنے والے بزدلوں کو پریشان کر دیتی ہے، اور وہ اپنے حصص کو فروخت کرنا شروع کر دیتے ہیں، بازی لگانے والے جس سے فائدے اٹھاتے ہیں۔ یہ خرابی اگر بالکل ختم نہ کی جائے، تو اس کو کم ضرور کر دے گی، اس لیے کہ سرمایہ کاری کرنے والے اس وقت تک اپنے سرمایے کو فروخت کرنے میں جلدی نہیں کریں گے جب تک کہ تنازعہ ٹائلی کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا اور اس کا حل نہیں نکال لیا جاتا، اور اس وقت تک جنگ نہیں ہو سکے گی۔

ماضی میں [جنوبی افریقا اور برطانیہ کے درمیان] ہونے والی بوئر جنگ (Boer War) ٹائلی کے فوائد کا بہترین اظہار ہے۔ اگر دونوں حکومتوں کے درمیان وہ نکات جو جنگ کا باعث ہوئے تھے ٹائلی کے سامنے پیش کر دیے جاتے تو، جیسا کہ بوئروں کی خواہش تھی، بڑا دن بہادر لوگ (جن میں مرد اور عورتیں شامل ہیں) جو ہلاک ہو گئے، 15378 بچے غوثی کیمپوں قبل میں از وقت موت کا شکار ہوئے، تباہیاں اور دکھ اور 250 ملین کا نقصان، سب کچھ بچا لیا گیا ہوتا۔

میں اب تک کیے جانے والے کچھ اچھے کاموں کا تذکرہ کرتا رہا ہوں، اور اب میں اس پر روشنی ڈالنا

چاہوں گا کہ یہ کام کسی طرح کیے گئے تھے۔

چوتیس برس قبل، برطانوی اور فرانسیسی مزدوروں نے کانفرنسوں اور مذاقوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، اور اپنے ہم وطن لوگوں سے عوام کے درمیان بہتر مفاہمت کے لیے خطاب کا آغاز کیا تھا۔

اس عرصے میں یہ کوششیں جاری رہی ہیں اور ان کے نتیجے میں فرانس اور انگلستان کے درمیان ایک ثالثی کا معاہدہ ہوا تھا۔ یہ پہلا معاہدہ تھا جو یورپ کی قوموں کے درمیان ہوا تھا۔ اس مثال کے بعد معاہدوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا، جس میں جن کے بارے میں بات کر چکا ہوں۔

یہ فتح دراصل عوام کی فتح تھی، اور اس خیال کا اظہار فرانس کے مشہور عوامی رہنما اور خطیب مسٹر جاؤرے (Jaurès) نے کیا تھا۔

میں پہلے بتانا کہ چکا ہوں کہ ایک Anglo-American Treaty of Arbitration کے لیے 1887 میں کوششیں کی گئی تھیں، جب ایسے ہی ایک معاہدے کے لیے برطانوی پارلیمان کے ارکان نے دو یادداشتوں پر دستخط کیے تھے؛ پہلی پر 234 اور دوسری پر 364 نے۔ یہ بے مثال یادداشتیں تھیں۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ایک پارلیمان کے ارکان دوسری پارلیمان کے ارکان سے مخاطب ہوئے تھے۔ ان یادداشتوں کے بعد برطانوی دارالعوام نے متفقہ طور پر ان کو منظور کر لیا تھا۔

آخر میں ایک معاہدے کا مسودہ تیار کیا گیا تھا، جس پر دونوں حکومتوں نے دستخط کیے تھے اور مینیٹ نے بڑی اکثریت سے اس کی منظوری دی تھی، مگر تین ووٹوں کی کمی سے وہ تہائی اکثریت حاصل کرنے میں ناکام ہو گئی تھیں۔ اس وقت، ایک اور معاہدہ مینیٹ میں زیر بحث ہے جس پر دونوں حکومتیں دستخط کر چکی ہیں۔ مگر اس ناکامیابی سے ایک اور طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ طاقت اب Interparliamentary Union کے نام سے جانی جاتی ہے۔

ان Interparliamentary Conferences کی، جو اس یونین کی تشکیل کا باعث ہوئی ہیں، 1888 میں اڑتیس برطانوی اور فرانسیسی پارلیمانی نمائندوں کی عہدوں میں ہونے والی ملاقات سے ابتدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے London, Rome, Bern, The Hague, Brussels, Budapest, Christiania, Paris, Vienna میں، اور پچھلے برس St. Louis میں کانفرنس ہوئی تھی۔ عہدوں کی اس مجموعی سے سینٹگ سے ہسپانیہ کے علاوہ یورپ کی سب پارلیمان میں گروپ تشکیل پائے گئے ہیں۔

اس یونین کے اب تقریباً 2,000 ہی نمائندے ہیں، اور حال ہی میں ریاست ہائے متحدہ کی کانگریس میں بھی ایک گروپ بن گیا ہے۔

اب یونین کی طاقت اور رسوخ کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ کانفرنس مینیٹ کے دفاتر میں منعقد ہوتی ہیں اور ان کے اخراجات کا بوجھ حکومتیں اٹھاتی ہیں۔

جب اس یونین کی تاریخ لکھی جائے گی، جب یہ واضح ہوگا کہ اس وقت، جب اطالیہ اور فرانس کے

درمیان جنگ کے خطرات بڑھ گئے تھے، اطالوی پاریمان سے کی جانے والی یونین کی ایلوں کے بہترین نتائج پر آمد ہوئے تھے اور ان ہی کی وجہ سے ان دو قوموں کے درمیان کشیدگی کم ہوئی تھی۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ [روس کے شاہ] زار کو اپنا فرمان جاری کرنے پر اکسایا گیا تھا جس کی بدولت بڑا پیسٹ (Budapest) کانفرنس کی کارروائی ہیگ کنونشن کا باعث ہوئی تھی۔

اسی نے یورپ اور ریاست ہائے متحدہ کے امکان پاریمان کے درمیان مفاہمت کی راہیں ہموار کی تھیں۔ اس کی حالیہ کامیابی یہ ہے کہ اس عظیم ملک کے صدر نے ایک اور کانفرنس منعقد کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے تاکہ ہیگ کانفرنس کے مکمل چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل ہو سکے۔ اسی یونین کی بدولت ہیگ کنونشن منعقد ہوا تھا جس نے قوموں کو باہمی کانفرام کیا جو ان کے تنازعات کو حل کرنے کا ایک متبادل ذریعہ فراہم کرتا ہے۔

یونین کو اس بات کا بھی کریڈٹ دیا جانا چاہیے کہ اس نے صدر روزویلٹ کو ایک اور کنونشن بلانے پر راضی کر لیا تھا، اگرچہ اس کنونشن کے دعوت نامے میں ترک اسلحہ جات پر غور کرنے کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر خصوصیت سے فرانس میں روز فرمزوں پرستی ہوئی تو قیادت کی جارہی تھیں، کہ کنونشن اسلحہ جات کے اخراجات اور خطرات پر سنجیدگی سے غور کرے گا، کہ واقعی یہ امن کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا جنگ بڑا کسانے کے لیے۔

جاپان اور روس کے درمیان جنگ سے حاصل ہونے والا سبق، اپنے بے مثال holocaust کے ساتھ، ایسا ہے کہ کنونشن کے لیے ترک اسلحہ جات کے سوال کو نظر انداز کرنا ناممکن ہوگا۔

مصنعی طبقات کے لیے یہ موضوع سب سے اہم ہے۔ مزدوروں کو فریج اٹھانا ہے، اور مزدوروں کو لڑنا بھی ہے۔

ہمارے ذمے جو کام ہے وہ بہت بڑا ہے۔ سارے مسئلہ مفادات اور عوام، جو جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ان رسالوں کے تعاون سے جن پر ان کا کنٹرول ہوتا ہے، اپنی پوری قوت سے اسلحہ جات میں کسی بھی قسم کی کمی کی مخالفت کریں گے۔

مگر سائنس بڑی تیزی سے امن کی طاقت و رد و کار رہتی جا رہی ہے، یہ بوجھ اٹھانے والوں اور عوام کی برہمتی ہوئی سیاسی طاقتوں کی بے چینی بھی وہ عناصر ہیں، جن کو برہمت کے مددگاروں اور اعلیٰ حہد ان کے مابین اس عظیم مہجد و جہد میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

میں نے کیا جانے ان تمام کوششوں اور حاصل ہونے والی تمام فتوحات کے اس مختصر سے خلا سے میں، خود کو اس حصے کا تذکرہ کرنے سے روکا ہے، مجھے جس میں Anglo-American Treaty of Arbitration کے فروغ میں حصہ لینے کا موقع ملا تھا، جو پہلی منظم کوشش تھی ایسے مقصد کے لیے، اور جس نے اس مسئلے کو عملی سیاست کی بلند سطح کے علاقے تک پہنچا دیا تھا۔ اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہوگا کہ ریاست ہائے متحدہ کے بریٹینئر کو ایک یادداشت وصول ہوئی ہے کہ وہ اپنے ادارے میں Anglo-American Treaty of

Arbitration کی توثیق کی کوشش کرے، جو اس کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس کی داغ بیل پر بد طاشیہ کی صنعتی تنظیموں کے 7,452 لوگوں نے دستخط کیے ہیں، جن کی تنظیموں کے ارکان کی تعداد تین چوتھائی ملین افراد سے بھی زیادہ ہے۔

جہاں تک ان ٹھوٹیل اور مسلسل کوششوں کا معاملہ ہے جو ضروری تھیں فرانسیسی اور برطانوی عوام کو ایک سطح پر لانے میں، پہلی بین الاقوامی کانفرنسوں کی ابتدا کرنے میں، امن کے کام کے لیے انواع و اقسام کی محنت میں، جس نے مجھے چوتھیں برس سے مشغول رکھا ہے، میں اس پر کوئی رائے دینا نہیں چاہتا اور اپنے عمل اور کارکردگی کے بارے میں فیصلہ اپنے ساتھیوں پر چھوڑ دیتا ہوں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کچھ لوگوں کی ہمت ٹوٹ گئی ہے، اس لیے کہ جاپان اور روس ایک عہد نامہ تنازعے میں الجھے ہوئے ہیں۔ مگر امن کے سب سے زیادہ مرکز وکیلوں کو یہ توقع نہیں تھی کہ ثالثی کے معاہدے ایک دم تمام جنگوں کو ختم کر دیں گے۔ جب بنی نوع انسان بد مذہبیت سے ابھر رہا تھا، پہلی بار اس نے غیر مہذب قانون بنائے تھے اور گستاخ عدالتیں قائم کی تھیں اور یہ توقع کی تھی کہ یہ کچھ کرنے سے تمام لوگ اپنے ذاتی اختلافات چکانے کے لیے ہونے والی لڑائی کو فوراً بند کر دیں گے۔

مگر ہمارے اجداد مایوس نہیں ہوئے تھے۔ عدالتیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان کے لیے جو ان کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اور اب تو مشا ذومذہبی یہ سنتے ہیں کہ ذاتی اختلافات طاقت کے ذریعے حل کیے جاتے ہیں۔ جو پہلے کبھی ایک عام روش تھی، اب وہ کم تر اور بے رحم کھجی جانے لگی ہے۔

ہمارے خیال میں یہی وہ اثر ہے جو بالآخر ان قوموں پر پڑے گا جو معاہدے کرتی ہیں اور ثالثی عدالتیں قائم کرتی ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کافی عرصے تک کچھ قومیں ایک دوسرے سے لڑتی رہیں، مگر ان قوموں کو، جو فوقیت دیتی ہیں ثالثی کو جنگ پر، عدالتوں کو میدان جنگ پر، جلد از جلد لڑاکا طاقتوں پر اثر انداز ہونا چاہیے اور جنگ کو اتنا ہی غیر مقبول بنادینا چاہیے جتنی کہ کعبہ بازی غیر مقبول ہو چکی ہے۔

حضرات! اگرچہ میرا موضوع ابھی اختتام تک نہیں پہنچا ہے، مجھے خوف ہے کہ میرے سامعین کا صبر اختتام کو پہنچ چکا ہوگا۔

مگر میں نوبل کمیٹی کی جدول سے شکرگزاری کے بغیر اپنا خطاب ختم نہیں کر سکتا کہ انہوں نے اپنے ووٹوں کے ذریعے مجھے یہ عالی شان اعزاز بخشا ہے، اور مجھے موقع فراہم کیا ہے کہ میں International Arbitration League کو اس مقام تک پہنچا دوں کہ میرے بعد بھی یہ اپنا مفید کام جاری رکھ سکے۔

میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا کہ ایک ادارہ قائم ہو جو اتنا طاقت ور ہو کہ ان قوتوں کا مقابلہ کر سکے جو جنگ چاہتی ہیں، اور شکر یہ نوبل کمیٹی کا کہ میں اس پر کافی حد تک عمل کر چکا ہوں۔ تقریباً پورے سرمایے کی جو مجھے فراہم کیا گیا تھا لیگ کے مفاد کے لیے سرمایہ کاری کی جا چکی ہے۔

مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں اس کام کو مکمل طور پر انجام نہیں دے پا رہا ہوں۔ مجھے بہر حال امید ہے کہ دوسروں کو میری قائم کی ہوئی مثال پر چلنے پر مائل کیا جائے گا، اور یہ بھی کہ میں مرنے سے پہلے اپنے خواب کی تعبیر دیکھوں گا۔

ہمارے سامنے ابھی بہت کام باقی ہے۔ امن کی وکالت کرنے والوں کو اب محض کاہل خواب دیکھنے والا نہیں کہا جاتا، اور مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو قائل کر سکا ہوں کہ ہمارے مقصد نے، دیر سے ہی سہی، حیرت انگیز ترقی کی ہے اور ہم اپنی امیدوں کے برف کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

دنیا بھونچال اور دھنوں کی رات سے گزر چکی ہے، ہماری ہم نسل مخلوق کے کروڑوں لوگ جنگ کے دیو پر قربان ہو چکے ہیں، ہر میدان ان کے خون سے شرابور ہے اور ہر سمندر ان کے خون سے رنگا ہوا ہے۔
مگر، امید، دوستو، امید!

ظلمت ختم ہو رہی ہے، ایک نیا دن طلوع ہو رہا ہے، اور مستقبل ہمارا ہے۔
شاہد! شاہد!



ایلی ڈوکوموں

البرٹ گوباٹ

اعلان تجلیل

جناب ڈوکوموں، جب ماریو پائی پاریمان کی نوبل کمیٹی کو امن کے کام کو اعزاز دینے کا فرض سونپا گیا تو ہمارا جھیان فوراً ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا جنہوں نے طویل اور مشکل برسوں میں یہ کام کیا ہے، جن کے ساتھ انکار میں بہتے ہوئے سر اور اچکتے ہوئے کاغذوں کے ساتھ، اگر تو جن نہیں تو سر دھری کے ساتھ پیش آیا گیا تھا۔ اس وقت یہ بالکل عام سی بات تھی کہ پہلے تین انعامات پانے والوں میں تین سوئس باشندے شامل تھے۔ جناب والا ابھی زیادہ دن نہیں گزرے ہیں کہ یہاں موجود عمر رسیدہ افراد کو یاد نہ ہو کہ آپ کا ملک ہمیشہ سے نہ صرف سیاسی مہاجروں، آزادی کے ایذا رسیدہ مجاہدوں اور اصلاحی کام کرنے والوں کی پناہ گاہ رہا ہے بلکہ ان کی بھی جنمیں آزاد اور ترقی پسند خیالات کے باعث غلط سمجھا گیا اور جن پر حکم کیا گیا۔ اس طرح، دھروں کے مقابلے میں آپ کے ملک میں ہمیشہ قوموں کے درمیان امن، انسانیت، انصاف اور بھائی چارے کے لیے دروندی اور عمل کی حمایت کی گئی ہے۔ جو بات ہمیں کبھی نہیں بھولی چاہیے وہ یہ ہے کہ آپ سوئس لوگوں میں زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں ایک خاص احساس بٹا ہے جس کی بدولت آپ لوگ تصورات کو حقیقت میں بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

وہ سوئس ہی تھے جنہوں نے Red Cross کی بنیاد رکھی تھی، اور اب یہ دو سوئس لوگ ہیں جو امن تحریک کی دو اہم شاخوں، پاریمان اور دھری عام شاخ کی قیادت کر رہے ہیں۔ جناب والا، ہم ثانی الذکر کے قائم Bern Peace Bureau کے ان تھک اور ہنرمند ڈائریکٹر کو، جو اپنی ہنرمندی اور قائدانہ

صلاحیتوں کے باعث دنیا بھر کی امن سوسائٹیوں کے رہنما ہیں، خوش آمدید کہتے ہیں۔
امن کی سوسائٹیوں کے لیے، جن کی سرگرمیوں کو ہم نے عام امن تحریک کا نام دیا ہے، تعریف و
توصیف کے لیے الفاظ بھی کم پڑ جاتے ہیں۔ انھوں نے اس میدان کی تیاری میں تعاون کیا ہے جن میں
یوٹی ہوئی کھیتی آج صحت مند نمو کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ انھوں نے جذبات، احساسات اور خیالات کی تشکیل
میں معاونت کی ہے جو صورت گری کرتے ہیں قومی رائے کی، جو تحریک کرتے ہیں پارلیمانوں، حکومتوں
اور سربراہان ملک کو، تاکہ وہ ہمارے مقصد کی دیکھ بھال کریں اور ہدف کے حصول میں ہمارے معاون
ہو سکیں۔

ہم آپ کو اور امن سوسائٹیوں کو اتنا کچھ سوچنے، نگہنے اور کہنے کے لیے، اور سب سے زیادہ آپ
کی رہنمائی میں امن کے مقصد کے لیے کام کرنے پر خراج تحسین و تشکر پیش کرتے ہیں۔ اتنی کامیابیوں
کے بعد بھی ہم ابھی تک ابتدا ہی میں ہیں۔ جتنا مزید کیا جانا ہے اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہمیں آپ کے
کام کی ضرورت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ میں اس تمنا کے اظہار کے ساتھ اپنی بات کو ختم کرنا چاہتا ہوں
کہ برسوں ہمیں آپ کی، آپ کے بڑے دل کی، آپ کے تجربے کی، آپ کے علم و دانش اور عملی صلاحیت
کی، اور سب سے زیادہ Peace Bureau کی سربراہی کے لیے آپ کی ضرورت رہے گی۔
میں جناب ڈوگوموں کی صحت اور طویل عمری کے لیے ایک جام تجویز کرتا ہوں۔

میں تمام تر احترام کے ساتھ اپنے سوتے مہمان، نوبل انعام یافتہ، ڈاکٹر البرٹ گوباٹ کی تحریر
کے لیے ایک جام تجویز کرنا چاہتا ہوں۔

آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ انھوں نے برن (Bern) میں قائم Interparliamentary
Bureau کے صدر نشین کی حیثیت میں، اس کی ابتدا سے، اور Interparliamentary Union کی
سرگرمیوں کی رہنمائی کی ہے۔ ان کے عہد میں یونین نے بہت ترقی کی ہے اور اب بین الاقوامی سیاست
میں اس کی حیثیت ایک بڑے عنصر کی ہو گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے بڑی سرگرمی، نگر، معقولیت کے
ساتھ آج کے مسائل کو نمٹایا ہے، اور اس کی بنیادی وجہ اس کی عملی تنظیم ہے۔

یہاں ہمیشہ سے ایک حکومتی سفارتی ادارہ موجود رہا ہے، اور مجھے مسرت ہے کہ میں اس کی نئے
انداز کی سفارت کاری۔ پارلیمانی سفارت کاری۔ کے ممتاز نمائندے ڈاکٹر گوباٹ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔
اختلاف کی صفوں سے دور رہتے ہوئے بھی، انھوں نے دکھا دیا ہے کہ وہ اقوام کی یہ سفارت کاری
فرحت بخش تعاون بھی کر سکتی ہے اور اس میں اپنا وجود بھی برقرار رکھ سکتی ہے۔

ان نتائج کے حصول پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے، جو ڈاکٹر گوباٹ کی شخصیت کی وجہ سے ممکن
ہوئے ہیں، ہم ان کے مستقبل کے کام کے لیے، اور خصوصاً حال ہی میں لندن میں منعقد ہونے والی اہم

کانفرنس کے لیے بھی اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔

خطبہ ایلی ڈو کو موموں

جنگ کی بے معنویت تاریخ کی نظر میں

کہتے ہیں کہ جنگ گہوارہ سازی کرتی ہے، بین الاقوامی سیاست کے بڑے بڑے سوالات حل کرتی ہے، قوموں کو متحد کرتی ہے، اور درحقیقت، مسلسل مراحل سے گزرتے ہوئے مہمندان کے فروغ کے اہم حق امر کی تشکیل کا باعث بنتی ہے۔

بچوں کے تمام دعووں کا احتیاط سے تجزیہ کیا جانا چاہیے تاکہ ان میں جو کچھ موجود ہو اس سے فائدہ اٹھایا جائے، آپ اجازت دیں تو کیوں نہ ہم اکٹھے ہو کر تاریخ کے واقعات کو کھنگال کر دیکھیں کہ ابتدائی دور سے آج تک جنگ نے کون سے مسائل حل کیے ہیں اور [کب اور] کسے متحد کیا ہے۔ یہ تجزیہ اس اصلاحی کردار کے بارے میں ہماری آنکھیں روشن کرے گا، دنیا میں جنگ جو آدا کرتی رہی ہے۔

تاریخ کے اوراق مشاہدہ ہیں کہ پہلا میدان جنگ اس وسیع علاقے میں سمجھا تھا جس میں یونان اور مغربی ایشیا شامل تھے۔ اس علاقے کی طرف، وقفے وقفے سے، مسلح قبائل اور خانہ بدوش گروہ ہجرت کرتے رہے تھے جن کا مقصد محض علاقوں کا حصول تھا، جہاں وہ پہلے اپنی ننھی ننھی شاہیاں، اور اس کے بعد سلطنتیں قائم کر سکیں۔ ان سب کا قانون اور معقولیت سے کوئی واسطہ نہیں تھا: ان کے نزدیک طاقت ہی سب کچھ تھی، اور ہر موڑ پر، اس کے بے محابا استعمال سے مہمندان کی راہیں روکی جاتی تھیں، اور معصوم لوگوں کو تلوار کے آگے سر جھکانے کا عادی بنایا جاتا تھا۔

اس قسم کی جنگ نما سرگرمیوں میں، تاریخ وارہ وہ شامل تھے جن کی واحد نیت لوٹ مار ہوتی تھی؛ 1260 قبل مسیح کی مہمات میں آرگوناٹ (Argonauts)؛ 1184 قبل مسیح میں یونانیوں کے ہاتھوں ٹرائے (Troy) کا قبضہ اور بعد میں Lohians [یونانی قبائل] اور Darians [رومی قبائل] کی ہجرت۔ چند برس بعد ان مہمات کا کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا، سوائے تباہی اور کھنڈر کے نظاروں کے، جن کے نشانات اس وقت تک محو نہیں ہوئے تھے جب تک ایک نئی تباہی غالب نہیں ہو گئی۔

اس دور جاہلیت (Dark Ages)، نے اور بہت چیزوں کے علاوہ، آرگائیو کا رانس (Argive) Garanus کے ہاتھوں مقدونیہ (Macedonia) کی بادشاہی قائم ہوئی تھی۔ بچوں کے ان بد قسمت مقدونیائی کے اطراف بہت کچھ ہو رہا تھا، میں آپ سے صبر کی التجا کروں گا اگر میں مقدونیائیوں کے شہادت نامے کے ہمایا تک قصے کے مطالعے کے سلسلے میں تاریخی تسلسل سے ہٹ جاؤں۔

چوتھی صدی قبل مسیح میں مقدونیہ کے ایک [بہت زیادہ] آریزیمند شہزادے فلپ (Philip) نے یونانیوں کو اپنا مطیع کر لیا تھا، جو اس کے مقابلے میں خود بھی کم لہیرے نہیں تھے۔ اور پھر ان کے میدانوں میں جنگ چھڑ گئی جس کے باشندوں کو ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ فلپ کے فاتح بیٹے اسکندر (Alexander) نے، جس کے ہاتھوں پر پانچ ملین و غارت ہوئی تھی [اور جسے] ”اعظم“ (”Great“) کہا گیا ہے، ایک بار پھر یونانیوں کو زیر کر لیا، اور اس کے بعد اہل فارس (Persians) کو بھی فتح کر لیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی، جنگ کا وہ طریقہ جو اسکندر نے خون اور دلدل سے ایجاد کیا تھا، کبھیر گیا، اور اس کی سابق سلطنت کے کھنڈر سے، جو خون کی کمی سے بے قافی ہو گئے تھے، مقدونیہ اور مصر کے سلطنتیں قائم ہوئیں۔

بدقسمت مقدونیہ کو دنیا کی ’ملکہ‘ بننے کی آرزو تھی۔ تیس برس بعد اس پر گال (Gauls) [”گائی“] دور سے فرانس، بلجیئم، سوئٹزرلینڈ اور شمال اطالیہ میں بسنے والی قوم [نے] چڑھائی کر دی اور اسے ماتحت و تاج کر دیا، پھر اہل روم نے، اور پھر قرون وسطیٰ نے اسے ترکوں کی ایڑی تکیے دیکھا۔ آج، کسی قدر کم جاں کاہ افیت میں اس کے بازو مخت و سماجت میں یورپ کے سامنے پھیلے ہوئے ہیں۔

کیا جنگ نے، اس کے وجود کے کسی بھی مرحلے پر، اسکندر اعظم کے زمانے کے مقدونیہ کے سیاسی اداروں کو سنجھم کیا ہے، اس کے عوام کی حالت بہتر بنائی ہے، یا اسے تمدن کی راہ پر گامزن کیا ہے؟ ہمیں اپنے نقوش قدم دوبارہ تلاش کرنے چاہئیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ دوسری بادشاہتوں کے ساتھ کیا ہوا تھا جو طاقت کے قانون کے ذریعے زندہ تھیں، مثلاً [قدیم فارسی] سلطنت مادا (Medes) اور سلطنت فارس (Persians)۔

600 برس قبل مسیح سلطنت مادا نے اسیریا (Assyria) کو مغلوب کیا جو مسلح لہیروں کے ہاتھوں تاج ہو چکا تھا، مگر پچاس برس بعد فارسیوں نے مادا کو فتح کر لیا، جنہوں نے اسیریا اور مصر پر بھی قبضہ کر لیا؛ نتیجہ، مزید خون کے دریا، مزید جلتے ہوئے شہر، مزید کھنڈر! ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا، اس لیے کہ جنگ فارس کے بعد، جو اکیڑوں برس تک جاری رہی تھی، فارس کا بادشاہ سائرس یونانیوں کے ہاتھوں مغلوب ہوا، اور اس کے نتیجے میں مقدونیہ کے فلپ نے ان کی بادشاہتوں کو تباہ کر دیا، جس سے کسی طرح بھی اس کے خاندان کے مستقبل، اور اس کی قوم کی برتری یقینی نہیں ہوئی تھی۔

ایک بار پھر جنگ نے کچھ بنایا نہ تھا، اس نے محض انسانی فطرت کو ذلیل کیا اور قوموں کو لا قانونیت کے غار میں دھکیل دیا تھا۔

سچ، کہ قدیم یونان نے اپنے فنِ مصوری اور ادب کی روشنیوں کے ساتھ ان برے وقتوں کے سارے بھی کبھیر دیے تھے۔ یہ سچ ہے، مگر اس سے قطع نظر کہ اس نے اپنا تمدن اس اصرار پر قائم کیا تھا کہ طاقت ہمیشہ حق پر ہوتی ہے، یونان صرف اسی وقت روشنی کا ماخذ بنا، جب اس نے بیرونی حملوں اور خانہ

جنگیوں سے ہاتھ اٹھا لیا تھا، جو اس کے جوہر قائل کے کام کی تباہی کے لیے خطرہ بن چلے تھے۔ اس امر کو دہرایا نہیں جاسکتا، مگر دنیاوی طور پر وہ امن کا قیام ہی تھا جو قدیم یونان کی شان اور خوش حالی کا باعث بنا تھا۔

اور گال کی قائم کی ہوئی تھریسیا (Thrace) کی بادشاہی کے بارے میں کیا کہا جائے، جس نے مقدونیہ کو تباہ کر دیا تھا، یا پونٹس (Pontus) کے، بائٹھیا (Bythnia) کے یا شام (Syria) کے اور Pergamum کے بارے میں [قدیم یونانی شہر جو اب ترکی علاقے میں واقع ہے] جو 301 قبل مسیح میں Ispus کے جنگ کے بعد مہم جو لوگوں نے قائم کی تھیں۔ ان قوموں کے بچنے سے بھی نشانات نہیں پائے جاتے، جن کی پیدائش تباہی میں ہوئی تھی اور موت خون میں۔

اور سلطنتِ روما کے بارے میں کیا کہا جائے؟ شہرِ روم کے بارے میں ضرور بات کی جاسکتی ہے، جو صدیوں تک سر ریاست کو کھنڈر بناتا رہا تھا اور جس نے بنی نوٹ انسان کو یہ کہہ کر چیلنج کیا تھا "میں روم کا باشندہ ہوں" ("Civis Romanus")! میرے سامنے تھمنا رڈالو یا مر جائو۔ اس کے فوجی دستوں کو، جو بادشاہ بناتے بھی تھے اور معزول بھی کرتے تھے، کیا معلوم تھا کہ وسیع فتح کی ہوئی زمین پر تمدن کی ابتدا کیسے کی جاتی ہے!

آپ شاید کہیں گے کہ قدیم روما والے، اس درجے کی تہذیب کے مالک تھے بقیہ انسانی نسل جس سے نابلد تھی، کہ وہ جہاں بھی گئے سچا اپنی تہذیب بھی لے گئے۔ بالکل غلط! لوگ قدیم زمانے کے فساد سے نالاں ہو چکے تھے جو ان کی دنیا پر غالب آچکا تھا، اور ان کے بعد ان کی امن اور سلامتی کی تمام جگہ آشکارا ہوئی تھی۔ روما کے شاہنشاہوں کی فوجیں مسلسل اس آگاہی کو مسخ کرتی رہیں، اس کے بدلے میں جو مستوحین کو اپنی بڑی بولی تہذیب کا ایک حصہ برابر حصہ بھی نہیں دیتے تھے۔ مستوحین کی حیثیت بد بخت قداموں جیسی ہی رہتی تھی۔

عسکریت پسند خیالات کی حمایت میں لوگ اکثر روما کے کچھ علاقوں کی مثالیں دیتے ہیں جن کی آبادیاں کئی بار میدانِ جنگ بننے کے باعث زوال کا شکار ہو گئی تھیں۔ حقیقت آج بھی وہی ہے، مگر ان سر زمینوں کے سر پر آوردہ خاندانوں کی بد عنوانی ہی تو فتوحات کی جنگوں کی وجہ بنتی تھی، جن کی بنا پر ان کے وطن کی خود مختاری جیسی گئی تھی۔ فاتح ان کو اپنے جوئے میں جوتے رکھتا تھا، اور جوئے کا وزن ان کے وقار کی گردن کو پامال کر دیتا تھا، شاید جس کی وجہ سے ہی وہ بغاوت آمادہ ہو جاتے تھے۔ انھیں فاتح کی فرماں برداری میں، یا روما کی شان اور مالی فائدے کے لیے جنگ لڑنا پڑتی تھی، یا وہ آقا کے بے شرم و رومی پوش خدمت گار بن جاتے، جنہیں پھر کبھی اجرت کی محنت کے پھل کا لطف اٹھانے کی امید نہیں رہتی تھی۔

یہ واقعی سچ ہے کہ اگر عالمی سطح کی سلطنت بنانے کے لیے کبھی بڑے پیمانے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ قدیم روما نے کی تھی، جس نے پوری سلطنتوں کو عوام کی کئی نسلوں کے خون میں غرق کر دیا تھا۔ اب اس

مطلق طاقت، اس دیونیکل تخلیق، جنگوں کی اس شانہ فتوحات سے کیا بچا ہے؟ Punic جنگوں، کارٹیج (Carthage) [عہد روما کے تونس کا ایک قدیم شہر] کی تباہی، اور ہسپانیہ اور Gallia Narbonensis کی فتوحات کے بعد، یہ طور صدقہ، وحشی بربر حملوں سے سلطنت روما کی تیزی ہوئی۔ پانچویں صدی بعد از مسیح میں Alans [Quevians] اور خاندہ بدوشوں نے اطالیہ، گال اور ہسپانیہ پر چڑھائی کی۔ پھر یوں ہوا کہ Visigoths اور Burgundians گال میں بس گئے، اور Saxons نے برطانیہ عظمیٰ میں ڈیرے ڈال دیے۔ اسی کے بعد، اگلی صدی کے وسط میں Heruls نے مغربی سلطنت کا تیا پانچا کر دیا۔ بعد میں ان پر Ostrogoths چڑھ کر سے خود جن کی بادشاہت کو بھی شہنشاہ Justinian نے تباہ کر دیا۔

لڑائیوں کے شور کے مانہ پڑنے کے ساتھ، مادی اور اخلاقی ابتری کی دنیا میں، تمدن کے کام کی از سر نو ابتدا ہوئی چاہیے۔ یہی تو ہے وہ، جسے ہر عہد میں جنگ کا سرفرازئی اور تہذیبی رسوخ کہا جاتا رہا ہے۔ ابھی انسانی خاندان نے اپنا توازن ٹھیک کرنا شروع ہی کیا تھا، کہ چپکے چپکے کھنڈر سے نکل کر جنگوں نے اس کو واپس، دلدل میں دھکیل دیا۔ طاقت ور ترین یا بے حیاؤں کے سنگ دل قانون نے Saracen فوجوں کے ظہور کے ساتھ، جس نے Chaldea, Phoenicia, فلسطین، مصر، قبرص Rhodes اور ہسپانیہ ایک ایک حصے پر قبضہ کر لیا تھا، ساتویں اور آٹھویں صدی میں خود کو دوبارہ جٹا شروع کر دیا۔ تب، چوں کہ ایک بار پھر فتوحات کی جنگوں کے ہاتھ کچھ بھی مستقل نہیں آنے والا تھا، Saracens کو Poitiers کے مقام پر چارلس مارٹل (Charles Martel) نے 732 میں شکست دے دی۔ نصف صدی کے بعد [روما کے شاہ] شارلمین (Charlemagne) نے اطالیہ کی لمبارڈ (Lombard) سلطنت کو کچل دیا اور Pannonia (Hungary) کے آواروں (Avars) نے جلد ہی دریائے ایبرو (Ebro) تک ہسپانیہ کو فتح کیا، اور پورے جرمنیہ (Germania) کو فتح کر لیا۔

اس طرح شاہیوں اور عوام کے طبقے پر ایک طاقت ور سلطنت کی بنیاد پڑی۔ تو کیا اب بھی ممکن ہے کہ دوبارہ توانائی حاصل کرنے کے بعد تمدن کے دھماکے کو وہیں سے اٹھایا جائے جہاں، صدیوں تک وہ کبھی نہ ختم ہونے والے انجام کی خوں ریز جدوجہد کے باعث ٹوٹا رہا تھا۔

افسوس کہ یہ ممکن نہیں۔ [اس لیے کہ] نام نہاد تمدن دنیا جب گیارہویں صدی میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ جنگ کا غضب، ایک طرف تو انگلستان اور فرانس کے درمیان کی جنگ کے پیکر میں اور دوسری جانب 1096 کی پہلی مسیحی جنگ (First Crusade) کے پیکر میں اس کا شکریہ ہے۔

انگلستان اور فرانس کے درمیان کی جنگ کی پالی پوی پہلی نفرت آٹھ صدیوں سے نیا دہ عرصے تک قائم رہی، صوبے ہاتھ سے گئے، دوبارہ لیے گئے اور پھر ہاتھ سے نکل گئے، مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ 1415 میں انگلستان کے ہنری پنجم (Henry V) کو فرانس کا شاہ بنا دیا گیا۔ 1450 میں انگریزوں کو فرانس میں علاقے سے نکال دیا گیا۔ 1755 میں ایک نئی Anglo-French جنگ شروع ہو گئی، اس کے بعد 1778 میں

ایک بحری جنگ ہوئی جو 1783 میں اس وقت ختم ہوئی جب میثاق ورسائی نے ایک سخت لڑائی روک دی تھی۔ یہ نئی توانائی کے ساتھ جلد ہی دوبارہ شروع ہو گئی اور سلطنت اور جمہوریہ کے درمیان کے عرصے تک جاری رہی۔ تو کیا ہم یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ایسی مستقل نفرت تمدن کے مقاصد کی خدمت کرتی ہے اور وہاں امن قائم کرتی ہے جہاں بین الاقوامی رشتوں پر بد امنی کا راج ہوتا ہے؟ ان جنگوں کی تفصیلی تاریخ ہمیں اس کے برعکس ثبوت مہیا کرتی ہے۔

اور صلیبی جنگیں کبھی رہیں؟ بہادری کے اس وادیات کا نام ہے، جو 1306 میں شروع ہوا تھا، اپنا مقصد ظاہر کیا کہ ہم اپنی مقدس تربتوں کی زمینوں کو ترکوں سے واپس لے کر ان کے ساتھ ساتھ صلیبی جنگیں ہو چکی ہیں۔ جنہوں نے یورپی شرافت کے پھولوں کو مسل کر رکھ دیا ہے اور نہ جانے کتنے غریب عوام کو 1250 برسوں کے لیے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس وقت یونانیوں نے صلیبی جنگ والوں کو کھدیز کے مشرقی سلطنت میں دوبارہ جان ڈال دی تھی، اور اس کے گیارہ برس بعد ترک سلطنت وجود میں آ گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ صلیبی جنگیں مشرقی لوگوں کو مغربی تمدن کے دائرے میں لے آئی تھیں۔ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ انہوں نے مغرب کو مشرقی میوب تھنے میں دیے تھے۔ ہر حال، یہ امر یقینی ہے کہ یورپ کے عوام جنہوں نے صلیبی جنگوں میں حصہ لیا تھا ان دور دراز کی مہمات کے بعد بھی، اس وقت سے بھی زیادہ جاں بحق تھے جب پہلی بار ان کے کانوں میں زاہر دوہاں ہیٹر (Peter the Hermits) کی ندا ”خدا سب کا بٹا ہے! خدا سب کا بٹا ہے!“ کو گونجی تھی۔

مزید یہ کہ، اس کا اندازہ لگانے کے لیے کہ ان مہیب اور بے کار جنگوں نے قوموں کے درمیان کس قسم کا تمدن رائج کیا تھا، مثال کے طور پر فرانس میں رائج بد امنی پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہوگا، جہاں قانون کی توہین کی عادت انہیں ایک صوبے کے بعد دوسرے صوبے، ایک شہر کے بعد دوسرے شہر، ایک قلعے کے بعد دوسرے قلعے میں ناگزیر مسلح بد امنی کی طرف لے گئی تھی؛ اور ہمیشہ کی طرح اپنے شریف آقاؤں کے گناہوں کا شکار کسان ہی کو بھرنے پڑا تھا۔

اب ہم جدید دور کی ریاست کی تشکیل کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، جہاں ہم ترقیات کے ہر مرحلے پر ایک بار پھر بد امنی اور نا انصافی کے نقصان رساں جن کو موجود پائیں گے۔

1618 میں مذہب کی آڑ میں ہم نے جرمن ریاستوں، آسٹریا، سویڈن اور فرانس میں تیس برس طویل جنگ کی ابتدا دیکھی تھی۔ قتل عام، لوٹ مار، دیہات اور کھیتوں کی آتش زنی، قریب اور اخلاقی اجڑی۔ یہ ہے ویسٹفلیڈ ڈھائی سو برس کی حماقتوں کی۔ جب جرمن عوام کا دس فی صد قتل کیا جا چکا تھا Westphalia میں امن معاہدہ ہوا جس نے پہلے کے حالات بحال کرنے، اور شہزادوں کی جن جن جن امن کو قائم رکھنے کا طریقہ بھی معلوم نہیں تھا، رعایات دینے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔

اس سے سیکھے جانے والے سبق اسنے طاقت ور معلوم ہوتے ہیں کہ وہ ایک کوراضی کر لیں گے کہ

وہ مستقل امن قائم کرنے کے لیے خود کو وقف کر دے جس کی سخت ضرورت ہے۔ مگر طوفانوں کی اٹھائی ہوئی لہریں اتنی آسانی سے پرسکون نہیں ہو جاتیں، یورپ سترہویں صدی کا اختتام سازشوں کے ایک سلسلے سے آلودہ ہو چکا تھا، جو اٹھارویں صدی تک پہنچ گیا، جس میں نام نہاد عام امن کے کچھ ایسے وقفے بھی آئے تھے جنہوں نے اس وقت بھی کچھ لوگوں کو آزادی سے سانس لینے کی اجازت دی تھی۔

یقیناً ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ عہد جاہلیت کے بعد کی صدیوں کے دوران تمدن نے ترقی نہیں کی ہے۔ جنگیں، خواہ وہ کتنی ہی متواتر کیوں نہ ہوں، کبھی اُس دانش اور اخلاقی جس کو مار نہیں سکتی ہیں جو آدمی کو وحشی جانور سے ارفع کرتی ہے۔ دریافت کا جذبہ اور باہمی اتفاق کی ضرورت، جو انفرادی خوش حالی کی پہلی شرط ہوتے ہیں، جنگوں کی بتائی اور بگاڑی ہوئی شاہیوں کے طبقے میں گم نہیں ہوئے ہیں۔ عظیم موجدوں اور اہم دریافتوں نے، پہلے افراد اور پھر گروہوں کی، تخلیقی سرگرمی کی وسعتوں کو وسیع کر دیا تھا اور انسانیت تشدد کے من مانے استعمال کے خلاف تحفظ طلب کرنے لگی تھی جس نے صرف لاعلمی اور جبر کی خدمت کی ہے۔ سترہویں صدی کے مناسب پرسکون عرصے اور اٹھارویں صدی کے پہلے نصف نے، پہلے چٹکے چٹکے روشن خیال لوگوں میں فروغ دینے کے لیے اور بعد میں عوام تک پھیلانے کے لیے، اس میلان کی آبیاری کی ہے۔ انصاف کا تصور تشدد کی بیڑیوں سے چھٹکارا پا کر طلوع ہو رہا تھا۔

اُس جمہوریہ کو جو فرانس میں شرابی شاہی کی جگہ لے چکی تھی ایسی سیاسی حکومت کے قیام کے عوامی حق پر اسرار میں جنگ کرنی پڑی تھی جو اُن کی منتخب کردہ اندرونی پارلیسی کی حمایت کرے۔ اس لیے، وہ جنگ کا شور ہی تھا جس نے بالآخر، فرانس کو اس حد تک پریشان کر دیا تھا کہ وہ فراموش کر بیٹھا کہ اس کا کردار دفاعی تھا۔ عسکریت، ہمیشہ سے زیادہ بے رحم صورت میں دوبارہ ظاہر ہوئی، جس کے باعث عیسوی لین کی جنگوں کا خوف ناک دور اور 1789 کے انقلاب کے اعلان کردہ عظیم اصولوں کی مخالف بربریت واپس آ گئی۔

ایسے بھی لوگ ہیں جن کا اسرار ہے کہ وہ جنگ جو پورے یورپ میں پھیل کر بلا کسی وقفے کے میں برسوں تک جاری رہی، اس میں جدید خیالات کو پھیلانے کا وصف تھا خواہ وہ فرانسیسی افوج کی سنگینوں کی نوک پر چند ہی آدمیوں تک پہنچتے، جو سمجھتے تھے کہ اکثر ہونے والے قتل عام، شہروں اور قصبوں کی تاراجی اور مفتوحین کو کچلنے کے اعمال، اس بار تمدن کے حقیقی کارندے تھے۔

یہ ایک فاش غلط فہمی ہے جو غیر محتاط جنگ جو یا نہ وطن پرست تاریخی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے اصول امن اور خوش حالی کے زمانے میں قوموں کے شعور تک زیادہ تیزی اور یقینی طور پر پہنچ گئے ہوتے بہ نسبت اس کے انہیں نفرت اور مرگشی کے ماحول میں غیر ضروری تشدد اور ہمت افزا زیادتیوں کے ساتھ پھیلا یا جاتا۔

یہ حقیقت ہے کہ پہلی سلطنت کی جنگوں کے اختتام نے دیکھا کہ عوام، بالخصوص فرانس کے ہر قسم کی

افراد کی قوت کے وسائل سے محروم ہو چکے تھے۔ قدیم عالمی غلبے کے خواب دیکھنے کے بعد، اپنی فوجوں کو یورپ کی دور دراز سرحدوں تک لے جانے، اور ایک جائز حکمران کے خیمہ پر قبضہ کرنے والے فرانس کو اب خود اپنے علاقے کے اس حصے کو چھوڑنا پڑ رہا تھا اور نہ جانے کہاں سے آ کر تخت نشین ہونے والے شاہوں کے تخت، ان غاروں کی مخروطی کمرانی سے چڑھائی شروع کر لی پڑ رہی تھی، عسکریت نے جن میں لاپھینگا تھا۔ بیس برس کی جنگوں کے زخمی اور تباہ شدہ یورپ کے دوسرے ممالک، اپنی تباہیوں کے باوجود تمدن سے وہ سبق نہیں لے رہے تھے جو انھیں [انسانوں کو مارنے والے بحری توپ کے] گولوں (grapeshots) کے ساتھ دیے گئے تھے۔ یقیناً لوگ قانون اور انصاف کے وہ جدید خیالات زیادہ مشتاقی سے اور بہت جلد قبول کر لیتے اگر انھوں نے پرامن انداز میں ان کی دریافت کے بجائے ان کے مابعد دریافت کر لیے ہوتے، جب ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی زمینیں برباد ہو رہی تھیں، ان کے گھر جلانے جا رہے تھے اور ان کے نوجوان مارے جا رہے تھے۔

اب کسی کو بھی مچھلین اول کی تلواریں ترقی اور تمدن کا آلہ نہیں کہنا چاہیے! شاید کچھ لوگ اعتراض کریں گے کہ اب تک میں نے صرف جنگوں اور فتوحات کی باتیں کی ہیں، اور مجھ سے دریافت کریں گے کہ خود مختاری کی جنگوں کے بارے میں میرا کیا خیال ہے جو یورپ کی 1815 کی تعمیر نو کے بعد پھوٹ پڑی تھیں، بلاشبہ خصوصاً وہ 1827 میں یونانیوں کی طرف سے کی جانے والی مداخلت کے بارے میں، اور 1860 میں آسٹریا کے غلبے کے خلاف جدوجہد میں فرانس کی جانب سے اطالیہ کو دی جانے والی امداد کے بارے میں بھی سوال کریں گے۔

اس قسم کا کوئی بھی سوال مجھے پریشان نہیں کرے گا۔ آزادی کی بازیابی کے لیے نسلوں اور قوموں کی جدوجہد پہلے زمانے کی حقوق میں دخل اندازیوں کی پیداوار ہیں، جو غیر متحرک قوموں کی آنکھوں میں کنکر ڈالنے [جگانے] کی کوشش کے مانند ہیں۔ اگر آخر الذکر اپنی خود مختاری سے محروم نہ کی گئی ہوتیں، زبردستی و باقی اور اپنی زمینوں سے بے دخل نہ کی گئی ہوتیں، جن سے ان کا فطری رشتہ تھا، تو ان کے عوام طاقت کے پہلے غلط استعمال سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی درستی کے لیے طاقت کے استعمال کا مہارا نہ لیتے، مثلاً یونان کی خود مختاری کی جنگ بھی، پہلے کی فتوحاتی جنگ کا نتیجہ تھی، اور اپنی خود مختاری کی طلب گاری میں انھیں والے عوام کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔

اسلم ہندی کے یہ مطالبے فطری صورت حالات کے اسی حالت میں دوبارہ قیام کے لیے ہیں، جیسے کہ اس دور میں غیر ملکیوں کی دخل اندازی سے قبل تھے جب طاقت کو قانون پر فوقیت حاصل ہو گئی تھی؛ یہ محض نتیجہ ہے ان حملوں اور کالمانہ طریقوں کا جو ان کو جاری رکھنے کے لیے کیے گئے تھے۔ یہ جنگیں نہ ہونی ہوتیں اور نہ حالات خود اس طرح بگڑے ہوتے، اگر عذر خواہوں کی دہزار برس سے زیادہ کی جنگ کے ذریعے دبائے جانے کے بجائے بین الاقوامی انصاف کا نظام قائم کیا گیا ہوتا، امن دوست لوگ جس کی

وکالت کرتے رہے ہیں۔

ہم اپنے زمانے کی دوسری جنگوں کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں جن کا بنیادی مقصد زبردستی دبائے جانے والے عوام کی آزادی نہیں تھا؟ سفارتی سازشوں کے یا ذاتی قیاس آرائیوں کے ہشکارے ہوئے، وقفے وقفے کے الٹ پھیر میں کیے جانے والے فرسودہ ظلم نے، سوائے بین الاقوامی تعلقات میں بدامنی پھیلانے، خون ریزی کرنے اور مستقبل کے تنازعات کی بنیاد رکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا ہے۔ 1855 میں فرانس، انگلستان اور پیچے مونٹے (Piedmont) [شمال مغربی اطالیہ کے قدیم علاقے] نے روس کو کم زور کرنے اور ترکی کو مستحکم کرنے کی غرض سے سیواستوپول (Sebastopol) [موجودہ ریاست یوکرین (Ukraine) کی ایک بندرگاہ] پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب وہی طاقتیں روس سمیت آٹمنی ہو رہی ہیں تاکہ وہ سلطان کے زیر نگیں ریاستوں کے اندرونی نظم و نسق پر اپنی خواہشات ٹھونس سکیں۔

1861 کی میکسیکو میں کی جانے والی فرانسیسی مہم پر 800 ملین فرانک خرچ ہوئے اور میکسیکو کی جانب سے ناقابل بیان مادی دولت اور افرادی قوت کی سخت مبادائی ہوئی، جو Querétaro میں ہونے والی تیہی پر ختم ہوئی تھی، جس نے سلطنت کے تمام نشانات منادے تھے جس کے تحت پر فرانسیسی فوج نے Archduke Maximilian کو بٹھا دیا تھا۔

1864 میں Schleswig-Holstein پر آسٹریا اور پروسیا کی جانب سے کیا جانے والا حملہ 1866 تک دونوں کے درمیان باہمی جوابی الزام بازی پر منتج ہوا جنہوں نے اس تشدد کے عمل کی سازش کی تھی، اور اس طرح اپنے کام کے خود جج بن بیٹھے تھے۔ سادوا (Sadowa) کے مقام پر ہزیمت کے بعد آسٹریا نے تبرا اتحاد بنانے کے لیے ایک بار پھر روس سے ہاتھ ملا لیا۔ اس اتحاد کی اب اس کا فائدہ سے زیادہ اہمیت نہیں رہی ہے جس پر اس کو نکھایا گیا تھا۔

ایک بار پھر، یورپ میں روس اور ترکی کے درمیان ہونے والی جنگ سان اسٹیفانو (San Stefano) کے مذاق کے ذریعے اپنے نتیجے پر پہنچی، جسے میثاقی برلن نے بعد میں کالعدم کر دیا تھا اور بلقان کے عوام کے دعوے کے مطابق صحیح طریقے سے تیار نہیں کیا گیا تھا۔

جہاں تک کیوبا کے قبضے کے سلسلے میں ہونے والی ہسپانوی/امریکی جنگ، یا ٹرانسوال (Transvaal) میں ہونے والی جنگ، یا چین کے خلاف مشترکہ مہم، یا موجودہ روس/جاپان جنگ کا معاملہ ہے۔ یہ سب ہمارے لیے اتنی حالیہ ہیں کہ ہم ان سے کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتے۔ ہاں، ایک بات یقینی ہے، اور وہ یہ کہ انہوں نے جنگ کی رسوائی میں قابل تعریف حصہ لیا ہے۔ ان جنگوں نے تمدن کے فروغ کے سلسلے میں، یا زمین پر انصاف کی حکمرانی کے حصول کے معاملے میں، کس قسم کا کردار ادا کیا ہے، اس کی تشریح کے مشکل کام کو میں نے مسکریٹ پسندوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اب تک انہوں نے کوئی تشریح پیش نہیں کی ہے۔ اپنے تاریخی جائزے کو ختم کرتے ہوئے، میں ان لوگوں کی توجہ کو دعوت دینا چاہتا ہوں، جو اپنی نوع

انسان کی اخلاقی و مادی ترقی اور جنگ کے درمیان رشتوں کا کوئی سنجیدہ مطالعہ کرنا چاہئے ہیں۔
امن پسندوں کی جانب سے اکثر کیا جانے والا ایک سوال ہے: مانا کہ جنگ ایک برائی ہے، مگر
جب کسی مسئلے کا دوستانہ حل ناممکن ہو جائے تو اس کی جگہ آپ کسے رکھنا چاہیں گے؟ پچھلے چند برسوں میں
کیے جانے والے ثالثی کے معاہدے اس سوال کا جواب فراہم کرتے ہیں، یہ دکھا کر بشرطے کہ دونوں
جانب خیر سگافی ہو، کہ ہمارے زمانے کے ظالمانہ استغراق، بین الاقوامی تنازعات کو آرام اور کتنی آسانی
سے سلجھائے جاسکتے ہیں۔

Convention for the Pacific Settlement of International Disputes 1933 میں
دی ہیگ میں جس پر چھٹیس ملکوں نے دستخط کیے تھے بین الاقوامی تنازعات کا ایک حل پیش کرتا ہے، ایسے
طریقے کے ذریعے، عہد جاہلیت، قدیم دنیا، بلکہ جدید تاریخ بھی جس سے ناواقف تھی: بغیر غمن رمزی کے
قوموں کے درمیان تنازعات کے بندوبست کا طریقہ۔ یہ سچ ہے کہ یہ طریقہ ابھی درجہ کمال تک نہیں پہنچا
ہے، مگر یہ [کوشش] اس امر کا اظہار ہے کہ ہم ان حالات کی بہتری کی کوشش کر رہے ہیں جنہوں نے اس کو
جنم دیا تھا۔ ممکن معاملے میں اس کا اطلاق ایک فرض بن جانا چاہیے، کہ اس کی ابتدا امن دوستوں کو بھی
مطمئن کر دے گی۔ بعد میں، جب کچھ تجربہ حاصل ہو جائے گا تو اس کو درجہ کمال تک پہنچانے کی کوشش کی
جائے گی، اور بالآخر انسانی ضمیر جاگ اٹھے گا، اور اس کو بنیاد تصور کیا جائے گا قانون اور انصاف کے
ڈھانچے کی جو مستقبل میں بین الاقوامی رشتوں کی بنیاد بن کر رہے گا۔

ان خیالات کے زیر اثر جو طاقت کے غلط استعمال کے خلاف، جنگ جس کی نمائندگی کرتی ہے، کئی
قوموں نے، بشمول بہت اہم ممالک، حال ہی میں معاہدے کیے ہیں کہ وہ اپنے درمیان پیدا ہونے والے
تنازعات کو دی ہیگ کی عدالت کے سامنے ثالثی کے لیے پیش کریں گی۔ ہم نے، فرانس اور برطانیہ عظمیٰ
کے درمیان، فرانس اور اطالیہ کے درمیان، برطانیہ عظمیٰ اور اطالیہ کے درمیان، فرانس اور ہسپانیہ کے
درمیان، اور شیدرلینڈ اور ڈنمارک کے درمیان ہونے والے ایسے معاہدوں کا خیر مقدم کیا ہے۔ تقریباً دسویں
تمام یورپی قوموں کے درمیان بھی اسی قسم کے کنونشن تیار کیے جا رہے ہیں۔ یہ اس عہد کی ایک اچھی نشانی
ہے، اور اب انسانیت کو ماضی کی حماقتوں میں ڈھکیلے کے لیے عسکری دماغوں کو بہت مشکل پیش آئے گی۔

یہ کوشش اسی مرحلے پر ختم نہیں ہوئی ہے: فرانس اور انگلستان نے، اس تحفظ کا فائدہ اٹھاتے
ہوئے، جو ان کے دستخط کردہ معاہدوں نے فراہم کیا ہے، ایک معاہدہ کیا ہے، ان تمام نوآبادیاتی سوالات
کے مسئلے میں، جو ان ریاستوں کے درمیان مکرادیا تنازعات کا سبب بنے ہوں گے، مثلاً مصر، مراکش، سیام،
نیو فاؤنڈلینڈ وغیرہ۔ ہمیں اس امر کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ اگر ہیگ کنونشن پر دستخط کرنے والی تمام
قومیں آپس میں ثالثی کے معاہدے کر لیں، اور اگر وہ ان معاملات کو حل کر لیں جو کسی تنازعے کا سبب بن
سکتے ہیں، تو امن کے اعلان کی کوئی ضرورت ہی نہ رہے گی: امن اپنے کل بدست پر قائم رہے گا۔ پھر کبھی،

امن کی حاکمیت کو جنگ سے دائمی انکار کی ضرورت نہیں رہے گی اس لیے کہ یہ انصاف کے، قانون کے اور عوام کے باہمی اتفاق کی زیریں چٹان پر قائم رہے گا۔

خطبہ البرٹ گوہبات

29 جولائی 1899 میں ہونے والے ہیگ کنونشن کا فروغ

سات برس ہونے ہی والے تھے، جب نوے بین الاقوامی کانفرنس کا اجتماع آپ کے دارالحکومت میں ہوا تھا۔ یہ ایک قابل توجہ اجتماع تھا جس میں حصہ لینے والے ایک عرصے تک ماروے کی شان دار مہمان نوازی کو یاد رکھیں گے اس اجتماع سے کچھ پہلے قوموں کے قوانین پر اثر انداز ہونے والے اہم سوالات پر گفتگو کے لیے یورپی، امریکی اور ایشیائی طاقتوں کے سرکاری نمائندے دی ہیگ میں اکٹھے ہوئے تھے اور اگست کی چوتھی تاریخ کو، جب ہمارے مذاکرات ختم کے قریب تھے، اس میں ہیگ کانفرنس میں کیے جانے والے اقدامات کے بارے میں اعلانات ملی تھیں۔ سب سے پہلے ہماری اسمبلی نے اس عظیم کام پر نعرہ مسرت بلند کیا تھا اور بہت سے مقررین نے اس کو خوب صورت خراج تحسین پیش کیا تھا، مارویائی پارلیمان کے ایوان میں، جو یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرے گا کہ عالمی طاقتوں کی یہ پہلی عام کانگریس Interparliamentary Union کی کوششوں سے ہی وجود میں آئی تھی۔ اس لیے یہ امر سزاوارتہ تعجب خیز نہیں ہوگا کہ یونین نہ صرف دی ہیگ کی قرارداد کو تصدیقی بحث کے لیے پیش کرے گی، بلکہ دوسری کانفرنس کے اجتماع کے لیے بھی کام کرے گی۔ ہماری درخواست پر صدر روزویلٹ (Roosevelt) نے ازراہ مہربانی اس معاملے میں پیش قدمی کا بار بھی اٹھایا۔ تو اب، آپ کو یقین ہو جانا چاہیے کہ اس کے لیے جو پچھلے چند برس تک Interparliamentary Union کا سیکرٹری جنرل رہا ہے، اور اس حیثیت میں اس کو نوٹیل امن انعام سے بھی نوازا گیا ہے، کتنا مشکل کام ہوگا کہ وہ دی ہیگ کے کام کو اپنے خطاب کا موضوع بنائے۔

قوموں کی اس عظیم اسمبلی نے بین الاقوامی کنونشن ترتیب دیے ہیں۔ آج میں خود کو ان میں سے صرف ایک کے لیے محدود رکھوں گا، جو بین الاقوامی تنازعات کے امن پسندانہ بندوبست سے متعلق ہے۔ اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: عام امن کی نگہداشت، اور بین الاقوامی ثالثی۔

امن کی حفاظت کے لیے! کتنا عالی شان اور کتنا خوب صورت خیال ہے یہ۔ کتنی امیدیں اس خیال سے جھوم اٹھتی ہیں کہ یہ عظیم ترین آدرش امن کو برقرار رکھنا۔ مقصد ہوا چاہیے ایک بین الاقوامی کنونشن کا

جس پر دنیا کی زیادہ تر قوموں کے دستخط ہوں۔ تب، کتنا افسوس ناک ہو جاتا ہے یہ جاننا کہ 1899 جولائی 29 ہیگ کنونشن کا یہی ایک حصہ ہے آج تک جس کا کم سے کم اطلاق ہوا ہے۔ اس لیے کہ نہ اس نے بوئر (Boer) [جنوبی افریقہ میں کسانوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ] کو روکا ہے اور نہ روس/جاپان جنگ کو۔ نوآبادیاتی جنگیں تو الگ رہیں۔

عام امن کی حفاظت کے لیے، کنونشن نے مصالحت کے طریقے بتائے ہیں۔ پہلے طریقے میں، جنگ کے اسکاٹات یا جنگ چھڑ جانے کے بعد، ایک یا کئی قومیں، جنگجوؤں کے درمیان مصالحت کرانے کی پیش کش کر سکتی ہیں۔ جو ایک نہایت مفید طریقہ ہے جس پر آسانی سے عمل بھی کیا جاسکتا ہے، اور اس کے لیے صرف ایک سفارتی خط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور چوں کہ ہیگ کنونشن کے تحت مصالحت کی پیش کش یا اس سے انکار کو معاندانہ عمل نہیں گردانا جاسکتا، تمام طاقتیں، بالخصوص وہ جو ایک یا ایک سے زیادہ حربوں سے قریب ہوں، اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے بے چین ہوں گی۔ اس کا بہت امکان ہے کہ بہت سے معاملات میں جنگ سے پرہیز کیا یا اس سے روکا جاسکتا ہے۔ بحث کے دوران جذبات کو ٹھنڈا ہونے دیجیے اور کسی بیگانے پر دہی کو مصالحت کرنے والے کی بات سننے پر راغب کرنا بھی امن کی طرف قدم بڑھانے کے مترادف ہوتا ہے۔

اگر ہم ہیگ کنونشن کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مصالحت کرانا ہر قوم کا فرض ہوتا ہے۔ دوسرے معنی میں ایسی پیش کش اس وقت کی جاتی چاہیے جب کوئی تنازعہ سنجیدگی اختیار کر لے اور جنگ کے پھوٹ پڑنے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ اس نکتے پر دفعہ 27 بہت واضح ہے۔ اب، نہ صرف قومیں اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکام ہو گئی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ جب روس اور جاپان کے درمیان جنگ کی ابتدا ہوئی تھی، قریب تھا کہ ریاست ہائے متحدہ کے صدر اپنی خدمات پیش کریں، حکومت کے افسر نے اخبارات نے اعلان کر دیا تھا کہ اس نوعیت کی کوئی بھی پیش کش معاندانہ سمجھی جائے گی۔ اس طرح اس ایک عمل سے کنونشن کی دہری خلاف ورزی ہوئی، پہلی خلاف ورزی، کسی قوم کی جانب سے خدمات کی پیش کش میں ناکامی، اور دوسری خلاف ورزی، روس کی حکومت کا غیر سرکاری اعلان، کہ ایسی پیش کش کو ایک غیر دوستانہ فعل سمجھا جائے گا۔ مگر کنونشن کی خلاف ورزی تو پہلے ہی ہو چکی تھی، ہیگ کنونشن کے صرف دو ماہ بعد۔ کسی حکومت یا کسی سربراہ ریاست نے بوئر جنگ کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ محمدان اور اخلاقیات قوموں پر ابھی تک اتنے اثر انداز نہیں ہوئے ہیں کہ وہ باقاعدہ کیے گئے اور دستخط شدہ کسی معاہدے یا وعدے کو، جب وہ بین الاقوامی قانون کا حصہ بن جاتا ہے، ناقابل خلاف ورزی سمجھنے لگیں۔ عام باشندوں سے، اگر ضرورت ہو تو، طاقت کے ذریعے ان کے وعدوں کا پاس کرایا جاتا ہے۔ مگر ذرا کسی بڑے پیمانے کے بین الاقوامی حکم کا مسئلہ کھڑا ہونے دیجیے، بھلے نفرت سے کندھے اچکانے کے حکومتیں اس کو فوراً منسوخ کر دیں گی۔